Resized

1

Aafaque Ehsen's IdeaMines Sites
for the public good
علم اپناؤ - خوشحالی پاؤ

Some of the .pdf files we download from the Internet are not fit enough for direct upload to our servers.

We enhance the scan quality of such files, resize the pages to a standard size which is resaonably readable and then upload them.

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

جامع

اردو انسائیکلوپیڈیا

③

سماجی علوم

(سیاسیات، سماجیات، معاشیات، لائبریری سائنس، تعلیم، قانون)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک-۱، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-10066

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

جامع
اردو انسائیکلوپیڈیا

③

سماجی علوم

(سیاسیات، سماجیات، معاشیات، لائبریری سائنس، تعلیم، قانون)

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔ 110066

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سنہ اشاعت : 2002
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
پہلا ایڈیشن : 3000
قیمت : -/325
سلسلۂ مطبوعات : 981
کمپوزنگ : محمد موسیٰ رضا

JAME URDU ENCYCLOPAEDIA, SAMAJI ULOOM
ISBN 81-7587-000-12
Rs. 325/-

ناشر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066
طابع: ایس نارائن اینڈ سنز، B-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریہ، فیس 2، نئی دہلی 110020، فون: 6312873, 6844549

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پروجیکٹ ڈائرکٹر

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

پروجیکٹ کوآرڈینیٹر

ڈاکٹر محمد احسن، ڈاکٹر محمد ارشد اقبال

ادارتی بورڈ

پروفیسر اے۔ایم۔ خسرو	چیئرمین
پروفیسر فضل الرحمٰن	مدیر اعلیٰ
پروفیسر شاہ محمد	نائب مدیر اعلیٰ
جناب ایس۔ایم۔ مرتضٰی قادری	نائب مدیر اعلیٰ
جناب کلیم اللہ	نائب مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر علی احمد جلیلی	نائب مدیر اعلیٰ

اور

جناب خواجہ محمد احمد

پیش لفظ

قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کی سماجی علوم پر مشتمل جلد پیش کر رہی ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی علمی پیش کش ہے جس میں مختصر اگر جامع انداز میں زمانۂ قدیم سے موجودہ زمانے تک کے مختلف علوم و فنون، مذہب و فلسفہ، تہذیب و تمدن، تاریخ و ثقافت، زبان و ادب، سائنس و طب اور دیگر اہم موضوعات کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان آٹھ جلدوں کی اشاعت میں ایک بنیادی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ ہر ایک جلد میں نوشتے ایک ہی نوعیت کے مضامین کے اعتبار سے ابجدی ترتیب میں دیے گئے ہیں۔ اس طرح اس کی ہر جلد خود اپنے آپ میں ایک انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتی ہے، مثلاً ادبیات، سماجی علوم، سائنسی علوم، ارضی علوم وغیرہ۔ یہ انسائیکلوپیڈیا بہ طور خاص ان طلبہ و طالبات کی ضروریات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے جنھوں نے ابتدائی تعلیم اردو میڈیم سے حاصل کی ہے اور جنھیں آگے چل کر مختلف النوع مضامین پڑھنے ہیں لیکن یہ ایک جنرل انسائیکلوپیڈیا ہے اور اس سے عام قارئین بھی خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ مختلف علوم کے ماہرین کے لیے بھی اس میں خاصا مواد یکجا کر دیا گیا ہے، بالخصوص ان ماہرین کے لیے جو اپنے اختصاصی دائرے سے باہر دیگر مضامین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا میں شخصی آرا کی شمولیت سے حتی الامکان احتراز رکھا گیا ہے اور صرف وہی حقائق پیش کیے گئے ہیں جنھیں عمومی طور پر تسلیم کیا جاچکا ہے۔ معلومہ اور مسلمہ حقائق کی پیش کش میں انفرادی تعبیر و توجیہہ سے گریز کیا گیا ہے خواہ وہ تعبیر و توجیہہ کتنے ہی عمدہ انداز میں کیوں نہ کی گئی ہو۔ کوشش کی گئی ہے کہ متعلقہ مضامین کے حوالے سے وہ تمام اہم معلومات جو ہمارے زمانے میں دستیاب ہیں ان کا ایک معروضی خلاصہ کسی رائے زنی کے بغیر پیش کر دیا جائے۔ اختلافی مباحث کے بیان میں مرتبین کا طریق کار یہ رہا ہے کہ کسی قسم کے ذہنی تحفظ یا تعصب کے

بغیر، موافق اور مخالف دونوں طرح کے نظریات بلاکم وکاشت پیش کر دیے جائیں۔ بنیادی طور پر یہ انسائیکلوپیڈیا توثیق یافتہ معلومات کا خزانہ ہے، توثیق طلب خیالات و نظریات کی کھتونی نہیں۔

اس انسائیکلوپیڈیا کے نوشتے پروفیسر فضل الرحمٰن مرحوم کی نگرانی میں مولانا آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد میں تیار کیے گئے تھے۔ ان کی طباعت میں چونکہ بُعدِ زمانی حائل ہو گیا ہے اس لیے ان پر نظر ثانی اور اپ ڈیٹنگ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ سماجی علوم پر مشتمل جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب، نظر ثانی، اصلاح و اضافے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان **پروفیسر ظفر احمد نظامی، پروفیسر ہاجرہ کمار، پروفیسر رحمت علی، جناب شہاب الدین انصاری، جناب عبداللہ ولی بخش قادری اور جناب انصار حسین رضوی** کی رہینِ منت ہے۔ شاید ان لوگوں کے بغیر یہ حصہ مکمل نہ ہو پاتا۔

جامع اردو انسائیکلوپیڈیا کا یہ ابتدائی نقش ہے یقیناً اس میں کچھ خامیاں اور کمیاں بھی جگہ پا گئی ہوں گی۔ قومی اردو کونسل ان کی نشاندہی کا خیر مقدم کرے گی اور آئندہ اشاعت میں ان کے تدارک کی سعی کرے گی۔ انسائیکلوپیڈیا کی عدم موجودگی اردو کے اشاعتی ذخیرے میں ایک زبردست کمی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کمی کو دور کرنے کی شروعات کر دی ہے۔ مجھے امید ہے، ہماری اس کاوش کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

آ

آبادی کا مسئلہ : آبادی کے مسئلہ کو سماجی علوم بالخصوص سماجیات اور معاشیات میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ تھامس مالتھس نے 1798 میں ایک مضمون شائع کیا۔ گوکہ خود مالتھس نے اپنے پیشروؤں کی کوشش کا اعتراف کیا ہے جنھوں نے اس موضوع کی طرف توجہ کی تھی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی نوعیت کا یہ پہلا تجرباتی اور تحقیقی مطالعہ تھا جس نے آگے چل کر علم آبادیات (Demography) کی بناء ڈالی۔ مالتھس نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ انسانی آبادی ہندسی شرح میں بڑھتی ہے یعنی 2-4-8-16-32 کے حساب سے دگنی ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف زرعی پیداوار کی شرح حسابی ہوتی ہے۔ یعنی 2-4-6-8-10 وغیرہ۔ اس اعتبار سے مالتھس نے بتایا کہ انسانی آبادی میں ہر پچیس سال میں دوگنا ہوجانے کا رجحان پایا جاتا ہے جب کہ زرعی پیداوار میں اس شرح سے اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر آبادی کے اضافہ کی رفتار پر کنٹرول نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بالآخر سخت بحرانی حالات سے سماج کو دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ مالتھس نے بتایا کہ اگر مصنوعی اور سائنٹفک طریقہ سے آبادی پر قابو نہ پایا جائے تو ایک طرف غربت اور افلاس کی وجہ سے بیماریاں پھیلیں گی اور دوسری طرف جنگیں شروع ہو جائیں گی۔ اس طرح انسانی آبادی کو محدود ہونا پڑے گا۔ مالتھس کے نظریہ آبادی پر بہت سے اعتراضات کیے گئے۔ جس میں ایک اہم اعتراض یہ تھا کہ ہندسی اور حسابی شرح کی توضیح صحیح نہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مالتھس کے زمانہ ہی میں سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے زرعی پیداواروں میں بھی تیز رفتاری سے اضافہ شروع ہوگیا تھا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آبادی اور پیدائش دولت کے مابین مسابقت کی جانب مالتھس نے جو اشارہ کیا تھا وہ بہرحال قابل توجہ ہے اور خصوصاً موجودہ صدی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد اس مسئلہ کی اہمیت پر ازسرنو توجہ دی جانے لگی ہے۔

آبادی کے مسئلہ کے تعلق سے جو مباحث ماہرین معاشیات و سماجیات نے کیے ہیں ان میں آبادی کے مسائل کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔

(1) کثرت آبادی (Over Population) : اس سے مراد وہ آبادی ہے جس میں افراد کی تعداد معاشی وسائل کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو اور اس ملک کی معاشی پیداوار اس آبادی کی اقل ترین ضروریات کی تکمیل کرنے سے قاصر ہو۔

(2) قلت آبادی (Under Population) : اس سے مراد ایسی آبادی ہے جو ملک کے قدرتی وسائل اور نظام معیشت کے لیے ناکافی ہو۔ یا جس آبادی سے موجود معاشی وسائل سے پورا استفادہ اس لیے نہ کیا جاسکے کہ آبادی کم ہے۔

(3) متوازن آبادی (Appropriate Population) : اس سے مراد ایسی آبادی ہے جس کا معاشی وسائل سے ممکنہ بہترین توازن پایا جائے۔ یعنی معاشی وسائل اور آبادی کا آپسی میل اعلیٰ ترین پیداوار کا ضامن ہو۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ تینوں تصورات اضافی ہیں کیونکہ آبادی یا معاشی وسائل کا توازن بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ عین ممکن ہے کہ کسی خاص وقت پر کسی خطے کی آبادی اس ملک کی معیشت کے لیے بار ہو اور اسے کثرت آبادی کا نام دیا جائے۔ لیکن چند معدنی وسائل کی دریافت کی وجہ سے یا صنعتی ترقی کے نتیجہ کے طور پر اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ وہی آبادی جس پر کثرت کا گمان تھا بدلے ہوئے حالات میں معاشی پیداوار کے لیے ناکافی سمجھی جانے لگی۔ یہی حال قلت آبادی کا بھی ہے۔ جہاں تک کہ متوازن آبادی کا سوال ہے یہ محض ایک خیالی نکتہ ہے جس کا قطعی

تعین کسی سماج میں کرنا مشکل ہے۔ اور یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ کس وقت آبادی اور وسائل پیداوار کا بہتر آہنگ کون سا ہوگا۔

مالتھس نے یہ واضح کیا تھا کہ ابتدا میں ہر سماج میں قدرتی توازن تھا کیونکہ پیدائش اور موت کا تناسب برابر تھا۔ معالجاتی ترقی کے سبب کثرت اموات پر قابو پالیا گیا اس کے بعد تناسب لڑکھڑا گیا۔ آبادی بے تحاشا بڑھنے لگی۔ اس کے کچھ شاگردوں نے کہا ہے کہ سائنسی ترقی کے ساتھ پیدائش میں بھی کمی ہوگی۔ اور ایک وقت ایسا آئے گا جب پیدائش بہت کم ہو جائے گی اور سماج بتدریج مرنے لگے گا۔ یہ صورت حال سوئیڈن وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

آبادی کا مسئلہ دراصل آبادی اور زمین کے تناسب کا مسئلہ ہے۔ آبادیٔ زمین (Manland Ratio) کا تناسب پیدائش دولت کے طریقوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ دراصل آبادی کے مسئلہ کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ کسی ملک کی آبادی کو اس نکتہ پر لایا جائے جب کہ بہتر پیدائش دولت ممکن ہو اور اس سے زیادہ پیداوار ان حالات میں ممکن نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں آبادی کے مسئلہ کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اور اس کے لیے ایک علاحدہ علم 'آبادیات' کی بنیاد پڑچکی ہے۔ اس علم میں مردم شماری کے رجحانات کا تحقیقاتی تجزیہ کیا جاتا ہے اور شرح پیدائش، شرح اموات اور پیدائش دولت کے مابین جو ربط پایا جاتا ہے اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ دنیا کی آبادی اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ آج کل کے زمانہ میں اس کو دھماکہ خیز اضافہ آبادی (Population Explosion) کا نام دیا جاتا ہے۔ اور بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں آبادی کے مسئلہ کی صورت حال بہت سنگین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضبط تولید اور خاندانی منصوبہ بندی پر بہت زیادہ زور دیا جارہا ہے اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر مختلف تنظیمیں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

آبادی کا مسئلہ دنیا میں سب سے زیادہ بھارت کے تناظر میں اہم ہے۔ اس کے کچھ قابل ذکر پہلو یہ ہیں۔

(1) اکیسویں صدی میں داخل ہونے والی دنیا کا ہر پانچواں آدمی ہندوستان ہوگا۔

(2) ہندوستان میں جس دھماکہ خیز انداز میں آبادی بڑھ رہی ہے اس طرح پر نو دن بعد ایک چنڈی گڑھ ہر مہینہ کے بعد دو بھوپال اور ہر آٹھ مہینے بعد ایک آسٹریلیا ہندوستان کی آبادی میں شامل ہوجاتے ہیں۔

(3) 2035 تک ہندوستان چین کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔

(4) تقریباً آدھا اضافہ صرف پانچ صوبوں بہار، مدھیہ پردیش، آسام، راجستھان اور اتر پردیش میں ہوگا۔

اس اضافہ آبادی کے لیے ذمے دار اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) پیدائش اور موت کے تناسب میں عدم توازن۔

(2) بچپن کی شادیاں۔

(3) جہالت اور ناواقفیت۔

(4)مذہب ضعیف الاعتقادی اور ضبط تولید کی مخالفت۔

(5) غریبی اور دبستگی کے ذرائع کی عدم دستیابی۔

حالات میں تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ آبادی سے متعلق پالیسیاں بھی کئی قسم کی بنائی گئیں۔

1952 میں پہلی پالیسی بنی تھی تو 1959 میں دوسری۔ لیکن ایک اہم پالیسی بنی 1972 میں جب کرن سنگھ وزیر صحت تھے۔ اس میں کئی نکات شامل تھے۔ 1979 ورکنگ گروپ نے اس کو اور زیادہ جامع بنایا۔ 1993 میں سوامی ناتھن کمیٹی بنی جس نے آبادی کے مسئلہ کو ترقیاتی منصوبوں سے جوڑ دیا۔

اتنی کوششوں کے اور دنیا کا سب زیادہ بڑا ضبط تولید پروگرام پچھلے چار دہوں سے چلانے کے باوجود ہماری آبادی دنوں دن بڑھ رہی ہے۔ ہندوستان کی غریبی کے اسباب میں بڑھتی ہوئی آبادی سرفہرست ہے۔ دراصل غریبی آبادی کے اضافے کی اور آبادی غریبی کی بڑھتی رفتار کے لیے ذمہ دار ہیں اس طرح یہ ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔

آدم اسمتھ (Adam Smith, 1723-1790) : آدم اسمتھ مشہور انگریز مفکر گزرا ہے۔ جس نے اٹھارہویں صدی میں سماجی علوم کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ اپنی تصنیفات کی وجہ سے اسمتھ کو معاشیات کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ اٹھارہویں صدی کے عظیم مفکروں کی نظر دراصل بدلتے ہوئے سماجی ڈھانچہ کے تمام پہلوؤں پر ہوتی تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اسمتھ نے معاشی جدوجہد پر زیادہ توجہ دی۔

اس کی دو تصانیف بہت اہم ہیں۔ پہلی تصنیف اخلاقی جذبات کا نظریہ ہے جو 1759 میں چھپی۔ اور دوسری اہم تصنیف "دولت اقوام" ہے جو 1776 میں شائع ہوئی۔ ان تصانیف کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آدم اسمتھ اپنے دور کے بدلتے ہوئے سماج کا بغور مطالعہ کررہا تھا اور اس کو اس بات کا احساس شدت سے تھا کہ سماجی ترقی کا انحصار معاشی ترقی اور پالیسی پر ہے جس کے تقسیم کار اور پیدائش دولت کے مختلف طریق کا بغور مطالعہ ضروری ہے چنانچہ اسمتھ نے قدیم روم اور یونان سے لے کر اپنے دور تک کے معاشی اداروں کا بغور جائزہ لیا اور معاشی طریق کے عالمی تجزیہ کی کوشش کی۔ اسمتھ کی تصانیف سماجیاتی تجزیات سے خالی نہیں ہیں جس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اسمتھ وہ پہلا شخص ہے جس نے معاشیات کو سیاسی معاشیات سے الگ کیا اور ساتھ ہی معاشی اداروں کا سماجی اداروں اور تقسیم کار سے گہرا تعلق بتایا۔ اسی وجہ سے اس کی تحریرات سماجیاتی نکات سے بھرپور ہیں۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ معیشت سے سیاست کی علاحدگی کے ساتھ ساتھ اسمتھ نے انصاف کے تصور پر بحث کی۔ اسکی تحریرات کا یہ اخلاقی پہلو دراصل معاشیات کے سماجی پس منظر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ آدم اسمتھ مکمل طور پر سرمایہ دارانہ نظام کا حامی تھا۔ اخلاقیات کے باوجود اس نے محنت کش طبقے کی مشکلوں کو اہمیت نہیں دی۔

آدم خوری (Cannibolism): دنیا کے مختلف حصوں میں کھدائی سے جو مواد اب تک ملا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں دنیا کے تقریباً سبھی حصوں میں انسانی گوشت کھانے کی رسم موجود تھی لیکن عام طور پر یہ رسم مذہبی تقریبوں کا جز ہوتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ انسانی گوشت صرف غذا کے لیے استعمال ہوتا ہو سوائے ایسی صورت کے جبکہ سخت قحط وغیرہ کا سامنا ہو۔ عام طور پر یہ مظلوم انسان دشمن کے قبیلوں کے ہوتے تھے۔ ویسے بہت ہی ابتدائی زمانہ میں جب دو قبیلوں میں لڑائی ہوتی تو ہارنے والے قبیلے کے سب لوگوں کو قتل کردیا جاتا اس لیے کہ اس زمانہ میں غذا کا حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ بعد میں جب انسان نے اس مسئلہ پر تھوڑا قابو حاصل کیا۔ کاشت کاری اور مویشیوں کی پرورش شروع ہوئی تو یہی قیدی غلام بنائے جانے لگے۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض علاقوں میں جب کوئی رشتہ دار مر جاتا تو احترام کے طور پر اس کے کچھ حصہ کو غذا بنا لیا جاتا۔ بعض جگہ سر کو دفن کرکے باقی حصہ کو کھا لیا جاتا۔ انیسویں صدی میں افریقہ اور بحرالکاہل کے بعض جزائر میں کھوج کار پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ بعض ایسے علاقوں میں، جو ساری دنیا سے بالکل منقطع تھے اور جہاں غذا کا حصول بہت مشکل تھا، مردم خوری اب تک رائج تھی۔

غلاموں کے سوداگر اپنی تجارت کو اخلاقی نقطہ نظر سے درست قرار دینے کے لیے فخریہ یہ بیان کرتے تھے کہ افریقی آدم خوروں کو انھوں نے مہذب سوسائٹی میں پہنچا کر آدم خوری بند کروادی۔ تاریک براعظم میں اکثر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے والے مشنری عیسائی لوگوں کو بھی بطور سزا افریقی قبائلی پکا کر کھاتے رہے ہیں۔

کاشت کاری پر منحصر سماجوں میں اس قسم کے رواج نہیں تھے۔ ہندوستان میں کہیں بھی اس کے آثار نہیں ملتے۔ تہذیب کے دوسرے دور میں جب انسان زمین سے غلہ اگانے لگا تو یہ رسم بند ہوگئی۔ لیکن انیسویں صدی تک انتہائی پچھڑے ہوئے علاقوں میں باقی رہی۔ اب یہ تقریباً مفقود ہے۔

آڈٹ (Audit): آڈٹ، طریقہ حساب فہمی کو کہتے ہیں۔ دفاتر اور عوامی اداروں کے مالی معاملات پر نظر رکھنے کے لیے سرکاری طور پر آڈٹ کا رواج ہے۔ ہر مالی سال گزرنے کے بعد ان دفاتر اور تنظیموں کے حسابات کی جانچ کی جاتی ہے جنھیں سرکار سے مالی امداد ملتی ہے تاکہ اگر کوئی بد انتظامی یا بدمعاملگی ہو تو وہ نظر میں آ جائے اور اس کا انسداد کیا جا سکے۔ پبلک لمیٹڈ کمپنیاں بھی ہر سال اپنی آمدنی اور اخراجات کے تعلق سے حسابات کا آڈٹ کراتی ہیں تاکہ غلط اخراجات کی نشاندہی ہو سکے اور حکومت کو ادا کیے جانے والے ٹیکسوں میں گڑبڑ نہ ہو۔

آڈٹ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک پری آڈٹ دوسری پوسٹ آڈٹ۔ پری آڈٹ کی صورت میں کسی بھی قسم کی ادائگی آڈٹ کے بعد ہی کی جاسکتی ہے لیکن عموماً پری آڈٹ کے طریقہ پر عمل نہیں کیا جاتا۔ آڈیٹرز حکومت کے مقرر کردہ ہوتے ہیں اور ڈائرکٹر آڈٹ و اکاؤنٹس کی نگرانی میں کام کرتے ہیں۔

آرٹیکل آف اسوسی ایشن (Article of Association): آرٹکل آف اسوسی ایشن ان قواعد کو کہتے ہیں جو کمپنی کے اندرونی انتظامات

کے لیے مرتب کیے جاتے ہیں۔ آرٹکلس آف اسوسی ایشن (Articles of Associations) کمپنی کے انصرام کار کو منضبط کرتے ہیں اور میمورنڈم آف اسوسی ایشن ان مقاصد کو واضح کرتا ہے جس کے لیے کمپنی قائم کی گئی ہو۔ ایک لمیٹڈ پبلک کمپنی کو آرٹکلز آف اسوسی ایشن داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ان لمیٹڈ (Unlimited) کمپنی یا لمیٹڈ کمپنی میں گارنٹی یا کسی پرائیویٹ کمپنی کو اپنے آرٹکل آف اسوسی ایشن مرتب کرنا ضروری ہے جس کی رجسٹری کمپنی کی رجسٹری کے ساتھ کروائی جائے گی۔ ان لمیٹڈ کمپنی (Unlimited Company) کی صورت میں آرٹکل آف اسوسی ایشن کے رجسٹریشن کے وقت ممبروں کی تعداد درج کی جائے گی اگر اس کمپنی کے سرمائے کا تعین ہوا ہے تو اس کا بھی اندراج رجسٹریشن کے وقت کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی حصص (Shares) کا تعین بھی کیا جائے گا۔ وہ کمپنی جس کی لمیٹڈ محدود گارنٹی ہو اس کے آرٹکل آف اسوسی ایشن میں بھی ممبروں کی تعداد درج ہوگی۔ پرائیوٹ کمپنی کی صورت میں حصص کی منتقلی پر پابندی لگائی جائے گی۔ ممبروں کی تعداد پچاس تک محدود کی جائے گی اور پبلک سے حصص یا تمسکات کی خریداری کے اعلان پر امتناع عائد کیا جائے گا۔ آرٹکل آف اسوسی ایشن میں جو قواعد کمپنی کے اندرونی انتظامات کے متعلق منضبط ہوں گے وہ کمپنی لاء یا میمورنڈم آف اسوسی ایشن کے خلاف نہ ہونے چاہئیں۔ آرٹکل آف اسوسی ایشن میں علاوہ دیگر امور کے کمپنی کے سرمائے حصہ داروں کے مختلف اقسام، حصص کی تقسیم، حصص کے سرٹیفکیٹ کی اجرائی حصص کی منتقلی، کمپنی کے سرمائے میں تبدیلی، کمپنی کے قرضہ لینے کے اختیار، میٹنگ منعقد کرنے کے قواعد، ممبروں کے رائے دہندگی کے حق، منافع کی تقسیم اور تمسک اکونٹ اور آڈٹ، ڈائرکٹرز کا تقرر، مینگ ڈائرکٹر، منیجر اور سکریٹری کے تقرر اور ڈائرکٹروں کی تعداد کے تعین کے متعلق قواعد منضبط ہوں گے۔ آرٹکل آف اسوسی ایشن میں کمپنی کے اختتام یا تحلیل کے متعلق بھی تفصیلات درج ہوں گی۔

آزاد تجارت (Free Trade): آزاد تجارت کی حالت میں بین الاقوامی سطح پر اشیا اور خدمات کا آزادانہ تبادلہ ہوتا ہے۔ حکومت درآمدات اور برآمدات پر کسی قسم کی نہ پابندی لگاتی ہے اور نہ رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ آج کی صورت حال بے معنی معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ بیرونی تجارت پر طرح طرح کی پابندیاں لگاتی ہے۔ اور اس کے لیے درآمدی ٹیرف، کوٹہ اور برآمد و اعانت کے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک زمانہ سے ماہرین معاشیات یہ کہتے آئے ہیں کہ دنیا کی تجارت اور انفرادی آمدنی کی سطح کو بڑھانے کے لیے آزادانہ تجارت ضروری ہے۔ لیکن مختلف ملکوں میں ترقی کی سطحوں میں اتنا فرق ہے کہ عملاً یہ ممکن نہیں۔ حالانکہ مجلس اقوام متحدہ اس کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔

اٹھارہویں صدی کے ختم میں جب تجارئین (Mercantalists) نے تجارت میں حکومت کی مداخلت کی حمایت کی تھی تو اس کی سخت مخالفت ہوئی تھی۔ اور نئی معاشی آزاد روی اور آزاد کاروبار نے کافی مقبولیت حاصل کی تھی۔ کلاسیکی معاشین آزادانہ تجارت کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ بین الاقوامی معاشی صورت حال کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے بلکہ آدم اسمتھ کی طرح ان کا خیال تھا کہ اگر افراد کو اپنا منافع کمانے کی آزادی مل جائے تو ہر شخص ترقی کر سکتا ہے۔ آزاد تجارت کا دور انگلستان میں تقریباً سو سال رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد معاشی قوم پرستی اپنے شباب پر پہنچی اور آزادانہ تجارت کو خیرباد کہہ دیا گیا۔ اس طرح معاشی تحفظ سب سے بڑا نظریہ بن گیا۔ اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے معاشی تحفظ کے اس نظریہ کے خلاف مسلسل جدوجہد چل رہی ہے لیکن اس میں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

آزاد ٹریڈ یونینوں کا بین الاقوامی کنفیڈریشن (International Confederation of Free Trade Unions, ICFTU): اس کنفیڈریشن کا قیام لندن میں دسمبر 1949 میں اس وقت عمل میں آیا جب کچھ ٹریڈ یونینوں نے ٹریڈ نینوں کے عالمی وفاق (WFTU) سے اپنی رکنیت ترک کردی کیونکہ اس پر کیمونسٹ حاوی ہوگئے تھے۔ اس کے دستور کے مطابق اس کا مقصد اقوام متحدہ اور بین الاقوامی تنظیم محنت اور علاقائی تنظیموں سے تعاون کرنا ہے تاکہ ٹریڈ یونینیں بطور خاص ترقی پذیر ملکوں میں آزادانہ ماحول میں سرگرم کار ہوسکیں۔ افراد 1999 تک 143 ملکوں کی 213 قومی ٹریڈ یونینوں کے ساڑے بارہ کروڑ افراد اس کنفیڈریشن سے وابستہ ہوچکے تھے۔

اس کنفیڈریشن کے مقاصد میں کام کرنے والے لوگوں کے مفادات کو فروغ دینا، ان کی تنظیموں کی آزادی تسلیم کرانا، امیروں اور غریبوں کے درمیان فرق کو کم کرنا اور انسانی اور ٹریڈ یونینوں کے حقوق کا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وقاع کرنا شامل ہے۔

کنفیڈریشن کی کانگریس کا اجلاس چار برسوں میں ایک بار منعقد ہوتا ہے جو 50 ممبروں پر مشتمل انتظامیہ بورڈ کو چار سال کے لیے منتخب کرتی ہے اس میں 5 نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ بورڈ کا اجلاس سال میں ایک بار منعقد ہوتا ہے۔

اس کا صدر مقام بروسلز (بیلجیم) ہے۔

آسائش میں مزاحمت کے متعلق حکم التواء (Injunction to Restrain Disturbance of Easement): اگر کسی شخص کو کوئی حق آسائش حاصل ہے اور اس آسائش میں مزاحمت کی جارہی ہے یا مزاحمت کی دھمکی دی جارہی ہے تو اس کے متعلق عدالتی چارہ جوئی کرکے قانون دادرسی خاص کے تحت حکم التواء حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی آسائش میں رکاوٹ پیدا کی ہو تو غالب حقدار (Dominant Owner) کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ وہ اپنے طور پر اس رکاوٹ کو رد کرے اور اس آسائش کو بدستور جاری رکھے بلکہ اسے اس کے متعلق عدالتی چارہ کار حاصل کرنا ہوگا۔

آکٹرائے (Octroi): اگر کوئی اشیا یا سامان حدود شہر کے اندر کسی دوسرے شہر یا علاقے سے بغرض استعمال یا فروخت کے لیے لایا جائے تو اس پر محصول کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے۔ اس محصول کو قانون بلدیات کی اصطلاح میں آکٹرائے کہتے ہیں اور عام اصطلاح میں اسے چنگی کہا جاتا ہے۔ آکٹرائے وصول کرنے کے لیے حدود بلدیہ پر چنگی ناکے قائم کیے جاتے ہیں اور ناکے پر ہی اس شخص کو چنگی یعنی آکٹرائے ادا کرنا پڑتا ہے جو سامان لا رہا ہو۔ اس محصول کی وجہ سے عوام کو اکثر پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس لیے زیادہ تر شہری انتظامیوں نے آکٹرائے کو ختم کر دیا ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ (All India Muslim League): لارڈ کرزن جب انیسویں صدی کے اواخر میں ہندستان کا وائسرائے بن کر یہاں آیا تو وہ انڈین نیشنل کانگریس کی مقبولیت اور اس کی باغیانہ روش دیکھ کر پریشان ہوگیا اور اس نے کانگریس کے مقابلہ پر ایک اور جماعت کی تشکیل کے لیے کوششیں شروع کردی لیکن ناکام رہا۔ البتہ اس کا جانشین لارڈ منٹو اس سلسلہ میں کامیاب رہا۔ اس نے 1906 میں شملہ میں مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کی اور ان سے اپنی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرائی اور انھیں ایک مسلم جماعت کی تشکیل کا خیال دیا۔ چنانچہ دسمبر 1906 میں جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے ہندستان کے مسلم رہنما ڈھاکہ میں جمع ہوئے تو کانفرنس کے اجلاس کے بعد ایک سیاسی انجمن کی شکل میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی قرارداد ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں نے پیش کی تھی۔ برطانوی حکومت کے تئیں وفاداری کے جذبہ کا فروغ، ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ اور ان کے اندر دوسرے فرقوں کے تئیں عداوت کا اختتام اس انجمن کے مقاصد قرار دیے گئے۔ اس کے اولین صدر سر محمد سلطان آغا خاں منتخب ہوئے اور نائب صدر کی حیثیت سے حکیم اجمل خاں کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انجمن نے مطالبہ کیا کہ 1905 میں وائسرائے لارڈ کرزن کے ذریعہ عمل میں لائی جانے والی تقسیم بنگال کو منسوخ نہیں کیا جانا چاہیے۔ پہلے اس کا صدر دفتر علی گڑھ میں قائم تھا لیکن بعد ازاں اسے لکھنؤ منتقل کردیا گیا اور 1916 میں محمد علی جناح اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال کانگریس اور لیگ کے درمیان میثاق لکھنؤ پر دستخط ہوئے۔ اس کے تحت دونوں جماعتوں میں اشتراک و تعاون کی راہیں ہموار ہوگئیں اور دونوں نے مل کر ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ بعدازاں دونوں کے درمیان اختلافات ہوگئے۔ 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہونے والے الیکشن کے بعد دونوں کے اختلافات نے شدت اختیار کرلی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران مسلم لیگ نے برطانوی حکومت کا ساتھ دیا جبکہ کانگریس نے اس کی مخالفت کی۔ 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ نے لاہور میں منعقدہ اپنے اجلاس میں دو قومی نظریہ پیش کیا اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک نئے وطن کا مطالبہ پیش کردیا۔ 1940 سے 1947 تک لیگ نے قیام پاکستان کے سلسلہ میں کامیاب کوششیں کیں جن میں اسے برطانوی حکومت کی تائید اور حمایت حاصل رہی۔ انجام کار آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کے لیے تقسیم ہند کو واحد حل تجویز کیا۔ اس کے تحت 14 اگست 1947 کو پاکستان معرض وجود میں آیا اور 15 اگست 1947 کو ہندستان کو تقسیم کے بعد آزادی نصیب ہوگئی۔

آمدنی - قومی (National Income) : کسی معیشت میں کسی خاص مدت کے دوران (عام طور پر ایک سال) اشیا اور خدمات کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مجموعی پیداوار کی زری قدر کو قومی آمدنی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا حساب تین طرح سے کیا جاتا ہے:

(1) معیشت کی اشیا اور خدمتوں کی مجموعی پیداوار کی قدر معلوم کی جاتی ہے۔ بلاواسطہ ٹکسوں اور اعانت (Subsidies) کا حساب کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے صنعتوں کے آپسی بیوپار کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے تاکہ حساب کرتے وقت کسی چیز کو دو مرتبہ نہ شامل کر لیا گیا ہو۔

(2) اس مجموعی آمدنی کا حساب کیا جاتا ہے جو خاندانوں (Households) کو ان کی پیداواری خدمات کے لیے دی جاتی ہے۔ اس میں اس منافع کو بھی شامل کیا جاتا ہے جو فرمیں محفوظات کی مد میں شریک کر لیتی ہیں۔

(3) اس خرچ کا حساب کیا جاتا ہے جو صارفین کی اشیا اور سرمایہ کاری کی اشیا پر آتا ہے۔ سرکاری اخراجات کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اور وہ خرچ بھی محسوب کیا جاتا ہے جو غیر ملکی ہماری برآمدات پر کرتے ہیں۔ اس میں سے درآمدات پر آنے والے اندرونی خرچ کو منہا کردیا جاتا ہے۔

اصولی طور پر ان تینوں طریقوں سے حساب لگانے سے جو اعداد حاصل ہوں گے وہ ایک ہی ہونے چاہئیں لیکن حساب کی دقتوں کی وجہ سے اکثر یہ ایک نہیں ہوتے اسی لیے تینوں کو بنیاد پر ایک سمجھوتے کا اندازہ (Compromise Estimate) قائم کر لیا جاتا ہے۔

چونکہ قومی آمدنی میں خدمات اور اشیا کی پیداوار کے بہاؤ کو ناپا جاتا ہے۔ اس لیے اس سے اس کا اظہار ہوجاتا ہے کہ معیشت کی حالت کیسی ہے۔ اچھی یا بُری لیکن یہ کوئی مکمل اظہاریہ (Indicator) نہیں ہے۔ اس لیے کہ صرف اتنا جاننا کافی نہیں ہے کہ اشیا اور خدمات کا بہاؤ کتنا ہے بلکہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ مختلف خاندانوں میں یہ کس طرح تقسیم ہوتا ہے، اشیا کا معیار کیا ہے، ماحول کیا ہے وغیرہ۔ اس لیے کہ قومی آمدنی اگر بڑھتی ہے تو ان سب چیزوں میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔

قومی آمدنی میں نہ صرف وہ تمام آمدنیاں شامل ہیں جو ملک کے اندر کی معیشت میں پیداوار کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں بلکہ اس میں وہ آمدنی بھی شامل ہے جو ملک کے لوگ ملک کے باہر اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ حساب کرتے وقت بلاواسطہ ٹکسوں اور فرسودگی وغیرہ کا بھی صحیح حساب کیا جائے۔

آمریت: موجودہ دور میں حکومتوں کی زمرہ بندی جس اصول کے مطابق کی جاتی ہے اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ سیاسی اقتدار کا ماٰخذ کیا ہے اور سیاسی اقتدار کا دائرہ کار کس حد تک ہے۔ اس لحاظ سے حکومتی اختیارات کا ماخذ ایک شخص ہو سکتا ہے، چند اشخاص ہو سکتے ہیں یا ایک جماعت، طبقہ، یا پارٹی ہو سکتی ہے جو اپنے اختیارات کے استعمال میں مطلق العنان ہو اور اس پر محکوموں کی طرف سے کوئی پابندی نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں جو حکومت عوام پر ان کی مرضی کے بغیر اوپر سے مسلط کی جائے وہ "آمریت" یا "اقتدار پرست" (Authoritarian) حکومت کہلاتی ہے۔ دوسری طرف اگر سیاسی اقتدار کا ماٰخذ عوام ہوں اور وہ اپنے حکمرانوں کو کنٹرول کرسکتے ہوں تو یہ "جمہوری" حکومت کہلاتی ہے۔ فرضیکہ آمریت اور جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

آمریت کی دو خاص شکلیں ہیں: اقتدار پرستی (Authoritarianism) اور کلیت پسندی (Totalitarianism)۔ اقتدار پرستانہ نظام، مطلق العنان ملوکیت، یک نفری آمریت یا چند شخصی حکومت اشرافیہ یا فوجی حکومت کی شکلیں اختیار کرسکتا ہے۔ اس نظام کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیادی توجہ حکمراں شخص، اشخاص یا جماعت یا پارٹی کے اقتدار کو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جہاں تک ضروری ہوتا ہے حکمراں، عوام کی آزادی اور حقوق پر پابندی عائد کرتے ہیں۔ باقی نجی اور گروہی معاملات میں عوام کو آزادی حاصل ہوتی ہے اور ان زمروں میں حکومت مداخلت نہیں کرتی۔ "کلیت پسندی" آمریت کی ایک مخصوص اور انتہاپسندانہ شکل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکمراں فرد یا جماعت یا پارٹی کو محض اپنے اقتدار کی حفاظت ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ حکومت اپنے ایک ہمہ گیر اور مخصوص نظریہ حیات اور پروگرام کے تحت انسان اور سماج کے تمام معاملات کو "کلی" طور پر کنٹرول کرتی اور انھیں اپنے تصور کے مطابق یکسر بدلنا چاہتی ہے۔ اس کی مثالیں دائیں اور بائیں بازو کی کلیت پسندانہ حکومتیں ہیں۔ یہ ایک نئے طرز کی آمریت ہے جسے گزشتہ ایک صدی میں انقلابی نظریات، عالمی جنگوں، اقتصادی بحران، بین الاقوامی کشیدگی اور ذاتی اور قومی عدم تحفظ کے عام احساس جیسے عوامل نے جنم دیا۔ کلیت پسند حکومتیں اپنے انقلابی نظریات کے مطابق سماج کی تشکیل نو کرنا چاہتی ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

"کلیت پسندی" کی اصطلاح غالباً بنیٹو مسولینی کی ایجاد کردہ ہے جس نے اس کی تعریف یوں کی: "ہر شے مملکت کے لیے ہے، یعنی کوئی چیز مملکت سے باہر نہیں، کوئی چیز مملکت کے خلاف نہیں۔" دورِ حاضر کی کلیت پسندانہ آمریتوں کے اسباب و علل اور ان کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں اختلاف رائے بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن اس بات پر عام اتفاق ہے کہ سبھی کلیت پسندانہ آمریتیں بنیادی طور سے یکساں کردار کی حامل ہیں اور ان سب میں چند بنیادی خصائص یا اوصاف مشترک ہیں جو درج ذیل ہیں:

(1) نظریۂ حیات: ہر کلیت پسند نظام کی ایک سرکاری آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) ہوتی ہے جسے شہریوں کو کم از کم بظاہر ضرور ماننا پڑتا ہے۔ یہ نظریہ حیات نہ صرف زندگی کے سیاسی پہلو بلکہ باقی سبھی پہلوؤں کی تشریح کرتا اور حال و مستقبل کے برتاؤ اور عمل کے لیے معیار نافذ کرتا ہے۔ اس طرح کا نظریہ انقلابی رنگت رکھتا ہے اور ماضی سے قطع تعلق کرکے مستقبل میں ایک مکمل اور برتر سماجی نظام قائم کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ روایتی آمریتوں میں پچھلی روایات اور ماضی کی کامیابیوں کی ثناخوانی کی جاتی ہے۔ لیکن کلیت پسندانہ آمریتوں میں قائد یا آمر یا تو خود مخصوص نظریۂ حیات کا خالق ہوتا ہے (مثلاً مسولینی اور ہٹلر) یا اس کا واحد مستند شارح ہوتا ہے۔

(2) قائد: ہر کلیت پسند حکومت مراتب بندی (Hierarchy) کے اصول پر مبنی ہوتی ہے۔ سب سے اوپر ایک حاکم مطلق ہوتا ہے جو نہ صرف اپنے حامیوں کی پارٹی بلکہ پوری قوم کا نجات دہندہ قائد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خود کو عوام سے پوری طرح وابستہ کرلیتا ہے۔ چنانچہ ہٹلر اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ خود جرمن عوام ہے۔ یہ قائد عموماً عوام کی صفوں ہی میں سے نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً ہٹلر یا مسولینی۔ قائد (Il Duce) یا (El Caudillo) کی ذات تمام خامیوں سے پاک اور برتر سمجھی جاتی ہے اور اس کے احکام کو بے چوں و چرا قابل اطاعت مانا جاتا ہے۔

(3) پارٹی: کلیت پسندانہ نظام یک جماعتی ہوتے ہیں ان میں کسی بھی مخالف پارٹی یا گروہ بنانے کی اجازت نہیں ہوتی، نہ ہی انھیں برداشت کیا جاسکتا ہے۔ کلیت پسندانہ پارٹی قائد کی ذات کا پرتو ہوتی ہے اور اس کی رہنمائی میں انقلابی نظریہ کی تکمیل اور عوام کی حمایت کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ پارٹیاں عموماً چیدہ، وفادار اور عالی عقیدہ اقلیت پر مشتمل ہوتی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر نازی پارٹی جرمن آبادی کے 4 فی صد اور اطالوی فاشسٹ پارٹی آبادی کے 5 فی صد حصہ پر مشتمل تھیں۔ یہ پارٹیاں یا تو حکومتی بیوروکریسی سے پیوستہ ہوتی تھیں (مثلاً نازی جرمنی میں) یا حکومتی اداروں سے بالاتر ہوتی ہیں۔

(4) تشدد اور دہشت انگیزی کا عمداً استعمال: کلیت پسندانہ حکومتیں تشدد اور جبر کے استعمال کو نہ صرف جائز سمجھتی ہیں بلکہ اسے عظمت کا درجہ دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک عوام کو کنٹرول کرنے اور انقلابی مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ پروپیگنڈے کے ساتھ دہشت انگیزی ہے۔ ہٹلر کہاکرتا تھا کہ "طاقت ہی سے کام چلتا ہے اور طاقت ہی پہلا قانون ہے۔ انسان نے جو مقصد بھی حاصل کیا ہے وہ محض اپنی جدت اور اپنی بہیمیت سے حاصل کیا ہے۔"

(5) طاقت کی اجارہ داری ہونا۔

(6) رسل و رسائل اور پروپیگنڈا کے ذرائع پر مرکزی کنٹرول ہونا۔

(7) طاقت کی اجارہ داری اور رائے عامہ، قانون یادستور کی رکاوٹوں کا فقدان ہونا۔

(8) مرکزی اقتصادی کنٹرول ہونا۔

(9) شخصی آزادی کا فقدان ہونا۔

(10) دانش دشمنی اور غیر عقلیت کا عام ہونا۔

(11) سیاسی طاقت سے قانونی بالادستی کا خاتمہ۔

آنزس معاہدہ (Anzus Treaty): آنزس یا آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کا باہمی دفاعی معاہدہ دوسری عالمی جنگ کے بعد بحرالکاہل کے علاقہ میں ریاست ہائے متحدہ کے فوجی اتحادات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس معاہدہ پر سان فرانسسکو میں 1951 میں دستخط ہوئے تھے۔ اس کا مقصد فوجی حملہ کی صورت میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی طرف سے دونوں ملکوں کے دفاع کی ضمانت دینا اور بحرالکاہل کے علاقہ میں ان ملکوں کی طرف سے امریکی فوجی مفادات کی حمایت ہے۔

اس معاہدہ کے ذریعے ارکان نے بحرالکاہل کے علاقہ میں کسی بھی حملے کی صورت میں دفاعی کارروائی کرنے اوراپنی مدد آپ اور امداد باہم کی بنیاد پر بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کو مستحکم کرنے پر اتفاق کیا۔ یہ معاہدہ بحرالکاہل کے علاقہ میں علاقائی تحفظ کا نظام قائم

کرنے کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ اس نظام کی تکمیل 1954 میں منیلا معاہدہ کے تحت معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا کی تنظیم (SEATO) کے قیام سے ہوئی جو 1977 میں تحلیل کر دی گئی۔

اس معاہدہ کے تحت آنزس کونسل جو تینوں فریقوں کے وزرائے خارجہ یا ان کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے، مشاورتی ادارہ کا کام کرتی ہے۔ اس تنظیم کا نہ تو کوئی صدر مقام اور نہ ہی کوئی مخصوص عملہ ہے نہ ہی اس کی کوئی میعاد متعین ہے البتہ کوئی بھی فریق ایک سال کا نوٹس دے کر معاہدہ سے علاحدگی اختیار کر سکتا ہے۔

آئی. یف. سی. (I.F.C.) : دیکھیے بین الاقوامی فنانس کارپوریشن۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ا

ابتدائی شہنشاہیت اور کلاسیکل نمود : جمہوری نظام سے شہنشاہیت میں تبدیلی کی وجہ سے قانون روما جو اشخاص کے متعلق تھا اس میں فطری طور پر کوئی فرق نہیں آیا البتہ ایک سال کی افراتفری کے بعد ایک قسم کا امن پیدا ہوا جو رومن لاء کے ارتقاء اور استحکام کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا۔

ابن خلدون : محمد عبدالرحمٰن ابن خلدون (1332-1406) تونس (شمالی افریقہ) میں پیدا ہوا۔ یہ ایک مشہور مدبر، فاضل جج اور زبردست مورخ اور محقق گزرا ہے۔ ابن خلدون کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس نے اسپین کی تاریخ میں اہم سیاسی خدمات انجام دی تھیں۔ اور خود ابن خلدون بھی اعلیٰ سفارتی اور سیاسی عہدوں پر فائز تھا۔ لیکن اس کا اصل کارنامہ اس کی علمی اور تحقیقی تصانیف ہیں۔ ابن خلدون نے اسپین اور شمال مغربی افریقہ میں اپنی زندگی کے بیشتر سال گزارنے کے بعد آخری پچیس سال مصر میں گزارے۔

ابن خلدون ایک عظیم مفکر اور مورخ تھا۔ اس نے فن تاریخ میں واقعات بیانی میں تحقیق اور تفتیش کے ایک نئے انداز کی بناء ڈالی۔ اس کا مقدمہ فن تاریخ کا ایک شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں ابن خلدون نے علم تمدن کی طرف زیادہ توجہ دی اور تاریخی حقائق کے اسباب وعلل کے تجزیہ کی اہمیت پر زور دیا۔ اس عظیم مفکر نے عمرانیات یعنی علم تمدن کی بناء ڈالی۔ اسی لیے ابن خلدون کو عمرانیات یا سماجیات کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی بے شمار اور ضخیم تحقیقات اب بھی بڑی حد تک مزید تشریح و توجہ کی محتاج ہیں۔ ابن خلدون نے ابن سینا اور ابن رشد کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدی کا مشہور مورخ المغربی اس کا شاگرد تھا۔ خود ابن خلدون کی تصانیف تاریخ، قانون اور فلسفہ تاریخ پر لازوال اہمیت کی حامل ہیں۔

دور جدید میں سماجی علوم کے بانیوں میں چودھویں صدی کے اس عظیم مفکر کو جتنا اعلیٰ مقام حاصل ہونا چاہیے ابھی تک اس سے پورا انصاف نہیں ہوسکا ہے۔ ابن خلدون اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جہاں سیاسیات، معاشیات اور علم تمدن وغیرہ کو ایک ساتھ پڑھا اور سیکھا جاتا تھا۔ سماجیات علم کی الگ سے کوئی شاخ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ سماجیات کو ایک علاحدہ اور مکمل علم درجہ اگسٹ کامٹے نے دیا۔

ابو حنیفہ۔امام ابوحنیفہ: اصلی نام نعمان بن ثابت بن زوطی تھا۔ کنیت ابوحنیفہ اور لقب امام اعظم تھا۔ نسلاً عجمی تھے۔ (80ھ مطابق 699ء) میں پیدا ہوئے۔ فقہ کی تحصیل اپنے وطن کوفہ کے مشہور امام و فقیہی عصر حماد سے کی۔ یہ ابراہیم نخعی کے شاگرد اور ممتاز فقیہی صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کے مکتب فقہ کے خاص نمائندہ تھے۔ امام ابوحنیفہ نے امام شعبی ہشام بن عمر سماک بن حرب، سلیمان بن مہران اعمش، قتادہ، شیبہ، عطاء بن ابی رباح عکرمہ، عمرو بن دینار، سلیمان بن یسار اور سالم بن عبداللہ وغیرہ سے احادیث کا سماع کیا۔

وہ اپنے استاد حماد کی زندگی ہی میں سن رشد کو پہنچ گئے تھے اور علم میں بھی پختہ ہوگئے تھے مگر مسند درس پر اس وقت فروکش ہوئے جب حماد کی وفات ہوگئی۔ امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس کا چرچا ہوا تو کوفہ کی اکثر درس گاہیں ٹوٹ کر ان کے حلقہ میں آملیں اور ان کے بعض اساتذہ بھی ان سے استفادہ کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ امام صاحب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ محدثین میں یحییٰ بن سعیدالقطان، عبداللہ بن مبارک، ابن ابی زائدہ، وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون، حفص بن غیاث، ابوعاصم النبیل، عبدالرزاق بن ہمام، داؤد الطائی اور فقہا میں امام، ابو یوسف، امام محمد بن حسن شیبانی، امام زفر حسن، بن زیاد، قاسم بن معین اور اسد بن

عمرو وغیرہ ان کے خرمن علم کے خوشہ چین تھے۔ (132ھ/ م 749ء) میں آل عباس تخت و تاج کے مالک ہوئے تو انھوں نے اموی خاندان کو بالکل تباہ کردیا۔ دوسرے عباسی خلیفہ منصور نے بعض بدگمانیوں کی بنا پر سادات و علوین کی بھی بیخ کنی شروع کی۔ اس کی بے رحمی سے تنگ آکر مظلوم سادات میں سے محمد نفس ذکیہ نے مدینہ منورہ میں خروج کیا اور نہایت بہادری سے لڑ کر میدان جنگ میں مارے گئے۔ ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم نے علم بغاوت بلند کیا۔ امام صاحب کی تائید اور ہمدردی ان دونوں کے ساتھ رہی اور انھوں نے ابراہیم کی علانیہ، پوری امداد بھی کی مگر جب ابراہیم کو شکست ہوئی اور وہ موت کے گھاٹ اتارے گئے تو منصوران لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنھوں نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کو بغداد طلب کیا۔ اس کے درمیان ربیع نے امام صاحب کو دربار میں پیش کرتے ہوئے کہا "یہ دنیا میں آج سب سے بڑا عالم ہے۔" منصور نے ان کے لیے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔ امام صاحب کے صاف صاف انکار پر اس نے ان کو قیدخانہ پہنچایا اور زہر دلوا دیا۔ اس طرح (151ھ/ م 767ء) میں یہ آفتاب علم و کمال ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔ آپ کی جسمانی اولاد میں صرف حماد کا نام ملتا ہے۔ یہ بھی صاحب فضل و کمال تھے۔

جس طرح علم و فضل اور ذکاوت و ذہانت کی امام ابوحنیفہ کی کوئی مثال نہ تھی، اسی طرح زہد وورع اور عبادت و ریاضت میں بھی وہ بے نظیر تھے۔ ذکر و عبادت میں ان کو خاص لطف ملتا اور بڑے ذوق و خلوص سے عبادت کرتے تھے۔ ان کے اخلاق و عادات نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھے۔ طبیعت میں بڑی بے نیازی اور خود داری تھی۔ کبھی کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کیا۔ امراء و سلاطین کے ہدیے اور تحائف قبول کرنے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ امام صاحب کو ان لوگوں کے سامنے حق بات کہنے میں کبھی تامل نہیں ہوا۔ ان کا تجارتی کاروبار نہایت وسیع تھا۔ لیکن احتیاط اور دیانت کا پورا لحاظ کرتے۔ اگر کسی مال میں خرابی یا عیب ہوتا تو گاہک کو مطلع کر دیتے۔ بڑے فیاض اور سخی تھے۔ تجارت کا ایک حصہ شیوخ و محدثین کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس سے جو نفع ہوتا ان کو دے دیتے۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے۔ شاگردوں میں جو خستہ حال ہوتے ان کی خانگی ضرورتوں کی کفالت کرتے۔ حتیٰ کہ وہ فراغت سے علم کی تکمیل کر سکیں۔

اس دولت و ثروت اور غیر معمولی عظمت و شان کے باوجود نہایت متواضع، خلیق اور حلیم تھے۔ کوئی ان سے الجھتا، برا بھلا کہتا، گالی دیتا، بدتمیزی سے پیش آتا تو خاموشی اختیار کرلیتے اور معاف کردیتے۔ ایک موقع پر خلیفہ ہارون رشید نے قاضی ابو یوسف سے ان کے اوصاف دریافت کیے تو انھوں نے فرمایا کہ ابو حنیفہ نہایت پرہیزگار تھے، منہیات سے بہت بچتے تھے، اکثر چپ رہتے تھے اور سوچا کرتے۔ کوئی شخص مسئلہ پوچھتا اور ان کو معلوم ہوتا تو جواب دیتے۔ ورنہ خاموش رہتے۔ نہایت فیاض تھے کسی کے آگے حاجت نہ لے جاتے۔ اہل دنیا سے احتراز تھا۔ دنیوی جاہ و عزت کو حقیر سمجھتے تھے۔ غیبت سے بہت بچتے تھے۔ جب کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی کے ساتھ کرتے۔ بہت بڑے عالم تھے اور مال کی طرح علم کے صرف کرنے میں بھی فیاض تھے۔" ہارون نے یہ سن کر کہا صالحین کے یہی اخلاق ہوتے ہیں۔ نہایت خوش لباس، جامہ زیب، بہت نظافت پسند تھے۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے زیب تن فرماتے۔ امام ابو حنیفہ کا علمی پایہ نہایت بلند تھا۔ تفسیر، حدیث فقہ و کلام میں خاص دسترس رکھتے تھے۔ روایت و حدیث میں امام بخاری کے استاد یحیٰی بن معین نے ان کی توثیق کی ہے۔ روایات کے رد و قبول میں نہایت محتاط تھے اور اس معاملہ میں ان کی شرائط بہت سخت تھیں۔ اس لیے دوسرے علما کے مقابلہ میں ان سے کم حدیثیں منقول ہیں۔ تقلیل روایت، تفقہ و اجتہاد میں کمال اور قیاس ودرایت میں مہارت کی وجہ سے کوتاہ نظر لوگوں نے ان پر ترک حدیث اور قیاس کو حدیث پر ترجیح دینے کا الزام عائد کیا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر بے بنیاد ہے۔ امام صاحب کا خود بیان ہے کہ:

"میرا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا کی کتاب کو دیکھتا ہوں اور اس سے مسئلہ اخذ کرتا ہوں، اگر اس میں کوئی حکم نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنت کو لیتا ہوں اور اگر اس میں بھی کوئی فیصلہ نہیں پاتا تو آپ کے اصحاب کے قول کو اختیار کرتا ہوں اور بوقت اختلاف ان میں سے جس کے قول کو مناسب سمجھتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن صحابی کے قول کے علاوہ کسی کے قول کو نہیں اختیار کرتا۔ مگر جب معاملہ صحابہ سے اتر کر ابراہیم، شعبی، حسن، ابن سیرین، عطا اور سعید تک پہنچتا ہے تو جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا تھا ویسے ہی میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔"

نیز فرمایا:

"بخدا اس شخص نے ہم پر بہتان لگایا جو یہ کہتا ہے کہ ہم نصی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں کیا نصّ کے بعد بھی قیاس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔"

اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا کہ:

"جب ہم مجبور ہوجاتے ہیں اور کتاب و سنت اور صحابہ کے فیصلوں میں کوئی دلیل نہیں پاتے تو اس وقت مسکوت عنہ کو منطوق پر قیاس کرتے ہیں۔"

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ پر میرے ماں، باپ قربان، ان کے آثار سر آنکھوں پر، ہمیں اس کی جرأت نہیں ہوسکتی کہ ان کی مخالفت کریں۔ ہمارا مختار و مسلک وہی ہے جو آپ کے اصحاب سے منقول ہے۔ ہاں جو ان کے علاوہ دوسرے لوگوں سے منقول ہے تو وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔" ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امام صاحب احادیث کو ترک کرکے صرف قیاس و استنباط سے کام لیتے تھے۔ علامہ ابن حزم اور حافظ ابن قیم نے بھی صراحت کی ہے کہ فقہائے عراق اور امام اعظم ضعیف حدیث تک کو قیاس پر ترجیح دیتے تھے۔

رہی یہ بات کہ امام ابو حنیفہ اور فقہائے عراق کو ترک حدیث کی بنا پر اہل الرائے اور علمائے حجاز کو عمل بالحدیث کی وجہ سے اہل حدیث کہا جاتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عموماً اہل حجاز شریعت کے علل و اسباب کا لحاظ کیے بغیر ظواہر حدیث سے جو کچھ ثابت ہوتا اس کی اتباع کرتے تھے۔ اس کے برخلاف اہل عراق شریعت کے علل اور اسباب کی جستجو کرتے۔ احکام کے قواعد و ضوابط کا تقرر کرتے اور استخراج و استنباط سے کام لیتے اور احادیث کے ظواہر سے زیادہ ان کی روح اور غایت کا خیال کرتے لیکن ان کا انکار نہیں کرتے۔

اس بنا پر اول الذکر کو اصحاب حدیث اور موخرالذکر کو اصحاب رائے کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نہ صرف امام ابو حنیفہ بلکہ ربیعۃ الرائے، امام مالک، سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام ابویوسف وغیرہ سب اہل الرائے کہلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب محدث بھی ہیں۔ پس اہل رائے تارک الحدیث کا ہم معنی نہیں۔

غرض امام ابو حنیفہ احادیث میں کم مایہ نہ تھے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے جنھوں نے صرف اکابر محدثین ہی کا ذکر کیا ہے، امام اعظم کو بھی حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ تفقہ و اجتہاد امام ابو حنیفہ کا خاص طغرائے امتیاز ہے۔ قیاس، استنباط، استخراج، احکام اور تفریع مسائل میں ان کو جو ملکہ حاصل تھا اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ فقہ کے مدون اور بانی تھے۔ امام شافعی کا مشہور قول ہے کہ 'الناس عیال فی الفقہ علی ابی حنیفہ'۔ یہی وجہ ہے کہ امت نے ان کو امام اعظم کا خطاب عطا کیا اور ان کے مسلک کو سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی۔ تقریباً بارہ سو سال سے امت کا سواد اعظم امام ابو حنیفہ ہی کے کتب فقہ و اجتہاد کی پیروی کر رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی طرف جو کتب فقہ منسوب ہے اسے فقہ حنفی یا کتب حنفی کہا جاتا ہے۔ یہ مکاتب اربعہ میں سب سے قدیم ہے اس کا دار و مدار مندرجہ ذیل چیزوں پر ہے۔

(1) کتاب اللہ، (2) سنت رسول، (3) اجماع، (4) قیاس، (5) استحسان، (6) عرف، (7) عادت۔ اس کتب کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:

(1) یہ نصوص نزع اور اصول عقل کے مطابق ہے (2) اس پر عمل کرنا آسان اور سہل ہے۔ (3) معاملات اور تمدنی صورتوں کا اس میں بہت لحاظ رکھا گیا ہے۔ (4) حنفی کتب میں احکام و مسائل کے علاوہ اور شریعت کی روح و منشاء کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (5) ذمیوں کے حقوق بڑی فراخ دلی سے دیے گئے ہیں۔ امام صاحب کے زمانہ میں عقائد و کلام کے مسائل کے جابجا چرچے تھے۔ لیکن ان کا ابتدائی تحصیل علم کے زمانہ میں اس طرف میلان نہ تھا۔ ان مسائل کے بارے میں ان کے آرا و اقوال موجود ہیں۔ جیسے وہ اعمال کو جز ایمان نہیں سمجھتے تھے بلکہ دونوں کو دو جداگانہ چیز خیال کرتے تھے۔ اسی طرح ان کے نزدیک ایمان میں کمی بیشی نہیں ہتی اور نہ کسی کا ایمان دوسرے کے ایمان سے بہتر اور فائق ہوسکتا ہے۔ وہ تمام اہل قبلہ کو مسلمان مانتے تھے اور ان کو تکفیر نہیں کرتے تھے۔

امام کے کمالات کے ثبوت کے لیے تصنیف و تالیف کا وجود ضروری نہیں اور نہ متاخرین کی طرح ان سے زیادہ کتابیں یادگار ہیں۔ ممکن ہے ان کی بعض تصنیفات رہی ہوں اور اب وہ معدوم ہوگئی ہوں۔ جس طرح اس دور کو دوسرے اکابر کی تصنیفات کا کتب سیر و تراجم میں ذکر تو ملتا ہے مگر اب وہ ناپید ہیں۔

امام صاحب کی جانب جو کتابیں منسوب ہیں گو محققین کے نزدیک ان کی نسبت امام صاحب کی طرف محقق اور ثابت نہیں تاہم ان

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کے نام درج کیے جاتے ہیں۔ فقہ اکبر، العالم و المتعلم اور مسند۔

اپیل: کوئی قرض دار قرض خواہ رسیور یا اور کوئی متضرر شخص دیوالیہ کے متعلق عدالتی فیصلے کے خلاف ڈسٹرکٹ کورٹ میں مرافعہ کرسکے گا اور ڈسٹرکٹ کورٹ کا فیصلہ ایسی صورت میں قطعی ہوگا۔ البتہ ہائی کورٹ اس امر کی جانچ اور اطمینان کرنے کے لیے کہ تحت کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا گیا ہے یا نہیں۔ تحت کا رکارڈ طلب کرکے ایسا حکم دے سکے گا جو ہائی کورٹ کی رائے میں مناسب ہو۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص بھی جو مرافعہ کی بناء پر دیے ہوئے عدالت کے حکم سے ناراض ہو ہائی کورٹ میں مرافعہ کرسکتا ہے۔

اتحاداسلامی (Pan Islamism): پان اسلام ازم کی تحریک عالم اسلام میں قوم پروری کی نشوونما اور مغربی استعمار و تسلط سے اس کی کشمکش کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ اسلام محض ایک تہذیب و ثقافت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لیے ضابطہ حیات رکھتا ہے اس سے اسلامی ممالک میں یہ نظریہ ہمیشہ سے مقبول رہا ہے کہ تمام مسلمانان عالم کو اسلامی اشتراکی بنیاد پر متحد ہوکر ایک ہی حکومت کے پرچم تلے جمع ہوجانا چاہیے یا کم از کم ایک اسلامی وفاق بنا لینا چاہیے۔ پان اسلام ازم کی تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جب 1774 میں دولت عثمانیہ نے روس کے ساتھ کوکوکنارک (Kuku Kanyarca) کا معاہدہ کیا اور سلطنت عثمانیہ نے اپنی سرحد کے باہر رہنے والے مسلمانوں پر، (بالخصوص جو کریمیا میں مقیم تھے)، اپنے مذہبی دائرۂ اختیار کا دعویٰ کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں 1880 تک اس نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی اور صدی کے خاتمہ تک اس کا پروگرام اور پروپیگنڈہ اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی (1876-1908) اس کے سرپرست اور جمال الدین افغانی اس کے پیشرو اور فلسفی تھے جنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اس کی زبردست وکالت کی۔ ان کا رسالہ 'العروۃ الوثقیٰ' اس کا بیباک ترجمان تھا۔ چنانچہ 1897 میں جب جمال الدین افغانی کا انتقال ہوگیا تو پان اسلام ازم کی تحریک پوری اسلامی دنیا میں ایک مشن کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ اسلامی دنیا کے مختلف دوردراز ملکوں مثلاً (جاوا، تیونس اور شنگھائی) میں اسلامی مراکز قائم ہوچکے تھے۔ 1903 میں عبداللہ سہروردی نے لندن میں اسلامک سوسائٹی قائم کی۔ ان کا رسالہ 'پان اسلام' اس حیثیت سے ممتاز تھا کہ وہ ملکی حالات کے لحاظ سے انسانیت دوستی کو فروغ دیتا اور یورپ کی برائیوں کے مقابلہ میں ایشیا کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

پان اسلام ازم کی تحریک کی بابت یہ امر ملحوظ رہنا چاہیے کہ دولت عباسیہ کے زوال کے بعد دینی اور دنیوی امور میں خلیفہ کا اقتدار کسی دور میں بھی عالمگیر اور بہرصورت قابل اطاعت تسلیم نہیں کیا گیا۔ 1517 میں سلطان سلیم نے مصر کو فتح کرکے اپنی حکومت میں ضم کرلیا۔ اسی طرح عثمانی خلفاء کو اسلامی دنیا میں عروج تو حاصل ہوا لیکن مراکش کے شریفوں اور ہند کے مغل بادشاہوں نے ان کا حریف بننے سے گریز کرنے کے باوجود ان کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کردیا پھر بھی مغربی سائنسی صنعت کاری، استعماریت اور سیاسی قوم پروری کی یلغاروں سے تحفظ کے لیے اسلامی معاشرہ کے محافظوں نے خلافت عثمانیہ کے اقتدار کا سہارا لیا بعدازاں پان اسلام ازم (اسلامی اتحاد) کی تحریک نے مزید استحکام بخشا۔

جب سلطان عبدالحمید (1876-1908) تخت نشیں ہوا تو ہند اور مراکش کی بادشاہتوں کے سورج غروب ہوچکے تھے۔ دولت عثمانیہ کا یہ آخری خلیفہ تھا جس نے اسلامی اتحاد کے جذبہ کو استعمال کرکے تقریباً تیس سال تک دولت عثمانیہ پر آمرانہ و جابرانہ حکومت کی۔ اس نے اتحاد اسلامی کے لیے اسلامی برادری کو للکارا اور اس کے لیے اسلام پسندوں سے اپیل کی تاکہ انھیں ایک متحدہ قوم بناکر مغرب سے جنگ آزمائی کی جاسکے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے اوائل میں اس تحریک کا مقصد خلافت کے ادارہ کو جو دولت عثمانیہ کے سلطان کی ذات سے مختص تھا، قائم رکھنا اور اس کا دفاع کرنا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد 2/ مارچ 1924 کو کمال اتاترک نے سلطان عبدالحمید کی حکومت کے ساتھ پان اسلام ازم (اسلامی اتحاد) کی تحریک کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ بعدازاں فرمانروائے مکہ شاہ حسین نے خلافت قائم کرنے کی کوشش کی مگر جلد ہی ابن مسعود نے اس کا تختہ پلٹ دیا۔ اس کے بعد 1926 میں مکہ و قاہرہ اور 1931 میں یروشلم میں پان اسلامی اجتماعات ہوئے لیکن یہ بے سود ثابت ہوئے۔ بالآخر آج تک کوئی لائحہ عمل ایسا وضع نہ کیا جاسکا جو مسلمانان عالم کو باہم متحد کردے۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل نے 1962 میں مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی جس کا مقصد اسلامی اتحاد کا فروغ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ضرورت مند مسلم ممالک کی مالی اعانت، مسلم ملکوں کے درمیان تعلیمی و ثقافتی تبادلہ، تعلیمی وظائف اور مسلم ملکوں میں سیمنار اور کانفرنسیں منعقد کرنا تھا جو اب بھی سرگرم کار ہے لیکن پان اسلام ازم کی تحریک کے نقطہ نظر سے نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ اسی طرح 1969 سے دسمبر 1970 تک مسلم سربراہان مملکت کی چوٹی کانفرنسوں کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی "اسلامی کانفرنس" جس کے 48 سے زیادہ ممبر ہیں اپنے قیام سے آج تک صرف تجاویز پاس کرنے کے علاوہ اتحاد اسلامی کی سمت میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کر سکی۔

اثنا عشریہ: یہ لوگ مندرجہ ذیل بارہ ائمہ کے قائل ہیں:

(1) حضرت علی، (2) حضرت حسنؓ، (3) حضرت حسینؓ، (4) حضرت علی زین العابدین، (5) محمد باقر بن زین العابدین، (6) جعفر صادق بن باقر، (7) موسیٰ کاظم، (8) علی رضا، (9) امام محمد تقی، (10) علی نقی، (11) حسن عسکری، (12) محمد مہدی (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سر من رائے میں روپوش ہوگئے)۔

ایران کے اکثر اور عراق کے شیعہ اثنا عشری ہیں شام لبنان اور بعض دوسرے اسلامی ملکوں کے شیعہ بھی اس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

اجارہ ۔ تعین قیمت : بازار میں اجارہ کی صورت اس وقت پائی جاتی ہے جب ایک فرم کسی ایسی شے کو فروخت کرتا ہے جس کا کوئی قریبی بدل نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دوسرا فرم اس شے کو بنا سکتا ہے اس طرح اجارہ دار کو شے کی رسد پر اختیار ہوتا ہے۔ حکومت یا کسی نجی ادارہ کے ذریعہ برقی قوت کی فراہمی یا حق ایجاد پر دیے گئے پیٹنٹ کے تحت کسی شے کی پیداوار اجارہ کی مثالیں ہیں۔ اجارہ دار کو چونکہ شے کی رسد پر اختیار ہوتا ہے اس لیے وہ ایک ہی قیمت پر شے کی جتنی چاہے مقدار فروخت نہیں کرسکتا بلکہ زیادہ قیمت پر کم اور کم قیمت پر زیادہ مقدار فروخت کرسکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مقدار رسد میں کمی اور بیشی کرکے قیمت بڑھا اور گھٹا سکتا ہے اس کی وجہ سے کم قیمت پر زیادہ مقدار فروخت کرکے اپنی کل آمدنی میں اضافہ تو کرسکتا ہے لیکن کم قیمت پر مزید مقدار فروخت کرنے سے اس کی مختتم آمدنی (Marginal Revenue) (شے کی مزید مقدار فروخت کرنے سے جو مزید آمدنی حاصل ہوتی ہے،) گھٹتی جاتی ہے جو قیمت کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر 20-9-8-1-7 روپے فی شے قیمتوں پر علی الترتیب شے کی 1-2-3 اور 4 اکائیوں کی فروخت سے اسے 10-24 اور 28 روپے بطور جملہ آمدنی حاصل ہوں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ 10-9-8 اور 7 روپے قیمتوں پر علی الترتیب 10-8-6 اور 2 روپے کی مختتم آمدنی ہوگی۔

شے کی رسد چونکہ اجارہ دار کے اختیار میں ہوتی ہے اس لیے وہ قلیل مدت ہو یا طویل مدت اس میں صارفین کی کل بازاری طلب کے پیش نظر ایک ایسی قیمت مقرر کرسکتا ہے جو شے کی مطلوبہ مقدار کے اوسط مصارف سے زیادہ ہو اور اسے غیر معمولی منافع حاصل ہوسکے جسے منافع اجارہ کہتے ہیں۔ اجارہ دار کا مقصد بھی بیشترین کل منافع کمانا ہوتا ہے جو پیداوار فروخت کے جملہ مصارف اور جملہ آمدنی کے درمیان بیشتری فرق کے مساوی ہوتا ہے۔ اس کے لیے وہ ایک ایسی قیمت مقرر کرتا ہے جس پر شے کی مقدار فروخت کے مختتم مصارف اور مختتم آمدنی مساوی ہوجائیں۔

اگر 1-2-3 اور 4 اکائیوں کے جملہ مصارف علی الترتیب 4-9-15 اور 22 روپے ہوں تو اس لحاظ سے 4-5-6 اور 7 روپے مختتم مصارف ہوں گے۔ اجارہ دار 8 روپے قیمت پر 3 اکائیاں فروخت کرے گا کیونکہ اس کے مختتم مصارف اور مختتم آمدنی دونوں میں 6 روپے کے مساوی ہیں یہاں جملہ آمدنی 24 اور جملہ مصارف 15 روپے ہوں گے جس کا فرق 9 روپے کے مساوی ہوگا جو بیش ترین منافع ہے۔

اجتماعی برتاؤ (Collective Behaviour): سماجیات میں اجتماعی برتاؤ سے مراد ایسا برتاؤ ہے جو کسی مشکل سماجی مسئلہ کی صورت میں بین عمل کے عام تسلسل اور رجحان کے برعکس واقع ہوتا ہے۔ اس میں ملوث لوگ مل جل کر ایسے اقدامات کرتے ہیں جو وہ انفرادی اور شخصی صورت میں نہیں کرسکتے۔ اجتماعی برتاؤ کی ضرورت دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ سماجی بین عمل کے عام طور طریق کسی مسئلہ کو حل کرنے میں یا اسے سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ یوں تو پورے معاشرہ کے برتاؤ کو بھی غیر اصطلاحی زبان میں اجتماعی برتاؤ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن سماجیات میں اس سے مراد وہی اجتماعی عمل یا رد عمل ہے جو بعض مخصوص حالات میں نمودار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی تباہی آجاتی ہے مثلاً آگ لگ جائے، طغیانی آجائے یا اسی قسم کا کوئی حادثہ واقع ہو یا پھر کسی خاص وجہ سے بھری پری شاہ راہ پر کوئی بھیڑ جمع ہوجائے تو ان کا جو

رد عمل یا برتاؤ ہوگا اسے اجتماعی برتاؤ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مشتعل مجمع اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے یا کسی مقصد کے حل کے لیے دھاوا بول دیتا ہے تو یہ بھی اجتماعی برتاؤ میں شامل ہے۔ اسی طرح سے منظم اور غیر منظم گروہوں کے لمحاتی عمل اور رد عمل کو بھی اجتماعی برتاؤ میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ افراد کی قابل لحاظ تعداد اجتماعی طور سے (Collectively) کسی مقصد یا اظہار خیال کے لیے آمادہ عمل ہوتی ہے۔ عام طور سے اجتماعی برتاؤ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کہ کوئی دشوار (Problematic) صورت حال پیدا ہوجائے۔ ایسی صورت میں برتاؤ کے عام اور نارمل انداز غیر موثر نظر آنے لگتے ہیں اور ان طریقوں سے کوئی حل نکلتا نظر نہیں آتا۔ جس کی وجہ سے لوگوں میں ذہنی بے چارگی اور اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے اجتماعی برتاؤ کی تشکیل ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں اجتماعی برتاؤ غیر منطقی اور بعض اوقات شدت پسند صورت اختیار کرلیتا ہے۔ دراصل جذباتیت اور اضطراب کی بنیادی نوعیت ہر سماجی عمل کے پس منظر میں موجود ہوتی ہے لیکن فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ عام سماجی عمل افراد کے برتاؤ کو عام حالات میں اس طرح منظم کرتا ہے کہ اس سے شدت اور بے ساختگی کی وہ کیفیت نہیں پیدا ہونے پاتی جو اجتماعی برتاؤ کی صورت میں نظر آتی ہے۔

اجتماعی برتاؤ کی تین اہم خصوصیات ہیں:

(1) خود روی یا بے ساختگی (Spontaniety)

(2) بے اعتدالیت اور تشدد پسندی (Extremist or Violent Attitude)

(3) عارضی نوعیت (Transitoriness)

(1) خود روی یا بے ساختگی: جب کوئی مسئلہ جاتی صورت حال یکایک پیدا ہوجاتی ہے تو لوگوں میں ذہنی بے چینی رونما ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے حالات کے رد عمل کا عام طریق بے موقعہ نظر آتا ہے۔ اور لوگ جذباتی اور نفسیاتی رد عمل کے نتیجہ کے طور پر بے ساختہ طور سے کسی طریقہ کار کو اپنا لیتے ہیں جو عام طور سے وہ خود اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے ایسے رد عمل کو خود رو یا بے ساختہ صفت کا حامل کہتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی احتجاجی گروہ کسی خاص حادثہ کے وقت کوئی طریقہ کار اختیار کر لیتا ہے تو بالعموم اس کی فکر اور اس کا عمل بے ساختگی کا نتیجہ ہوتا ہے جس پر یہ ممکن ہے کہ بعد میں تاسف یا فخر کیا جائے لیکن انفرادی طور پر کبھی دہرایا نہ جاسکے۔

(2) بے اعتدالیت اور تشدد پسندی: اجتماعی برتاؤ کی دوسری صفت بے اعتدالیت اور تشدد پسندی ہے۔ سر راہے جب کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے اور لوگ حق کی تائید میں یا ناحق کی حمایت میں جذباتی طور سے ملوث ہو جاتے ہیں اور اکثر پر تشدد عمل کرتے ہیں تو اسے بے اعتدالیت یا تشدد پسندی کہتے ہیں۔

(3) عارضی نوعیت: اجتماعی برتاؤ کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عارضی ہوتا ہے یعنی اجتماعی برتاؤ بالعموم لمحاتی ہوتا ہے اور اسے استقرار حاصل نہیں ہوتا۔

عام طور سے اجتماعی برتاؤ کے محرکات میں سماجی بحران، مسابقت، سماجی تصادم اور جدت پسندی یا مہم پسندی کے عوامل شریک ہیں۔ ان تمام صورتوں میں لوگوں کا برتاؤ نئے تجربات اور عمل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ سماجی برتاؤ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ برتاؤ ہے جو سماج کے اقدار معینہ اور معمولی طریق کار اور توقعات کے مطابق ہوتا ہے اور دوسرا وہ برتاؤ ہے جو عام نہج سے ہٹ کر کسی خاص صورت حال میں رونما ہوتا ہے۔ اس دوسرے قسم کے برتاؤ کو منفی اجتماعی برتاؤ کہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال مجمع کا برتاؤ (Crowd Behaviour) ہے۔ مجمع کی نفسیات پر لی بان (Le Bon) نے 1895 میں مشہور تجزیاتی کتاب لکھی ہے جس پر بعد میں بہت کافی کام ہوا ہے۔ مجمع کا برتاؤ بھی اجتماعی برتاؤ کی نمائندہ مثال ہے خواہ لوٹ یا غارت گری کا کوئی موقعتی گروہ ہو یا طغیانی میں جان بچانے والوں کا فلاحی گروہ دونوں کے برتاؤ عام سماجی توقعات سے مختلف ہوتے ہیں۔ گوکہ اس برتاؤ کے پس پردہ بھی سماجی اقدار ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا اظہار نئے اور بے ساختہ انداز پر ہوتا ہے۔

اجتماعی تحفظ (Collective Security): یہ نظام تصور جنگ کا سدباب کرنے اور بین الاقوامی امن و تحفظ کے قیام و بقا کے سلسلہ میں توازن طاقت کے اصول کی خامیوں کی تلافی کرنے اور اس کی جگہ لینے کے لیے ایجاد کیا گیا کیوں کہ قیام امن کے لیے توازن طاقت اور فوجی گروہ بندیوں کے عمل کو بے اثر پایا گیا تھا۔ جہاں توازن طاقت کا تصور بین الاقوامی نظام کی ایک حقیقت کا اظہار کرتا ہے وہیں اجتماعی تحفظ کا تصور بین الاقوامی اخلاق، عینیت اور قانون پر مبنی ہے۔ اجتماعی تحفظ کے معنی یہ ہیں کہ "قیام امن کی ذمہ داری ساری کی ساری بین الاقوامی برادری کی مشترکہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ذمہ داری ہے۔ اس برادری کے ایک رکن کے خلاف جارحیت پوری برادری کے خلاف جارحیت مانی جائے گی اور پوری برادری اپنے مشترکہ وسائل سے جارح کو روکے گی اور عدول حکمی کی صورت میں اس کے خلاف فوجی، اقتصادی اور سیاسی تعزیرات نافذ کرے گی۔" اجتماعی تحفظ کی اسکیم توازن طاقت کی اسکیم سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں اقوام دو یا دو سے زاید اتحادات میں منقسم ہونے کے بجائے ایک ہمہ گیر اتحاد یا تنظیم میں منسلک ہوجاتی ہیں۔ اس طرح قیام امن کی ذمہ داری انفرادی یا دوفریقی ہونے کے بجائے پوری جماعت کی ذمہ داری ہوجاتی ہے۔ توازن طاقت کے نظام میں ہر مملکت یا مملکتوں کا اتحاد اپنے نجی یا گروہی مفادات کو پیش پیش رکھتا ہے۔ لیکن اجتماعی تحفظ کے مثالی نظام میں ہر مملکت اپنے انفرادی مفادات کو اجتماعی مفادات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ اس طرح کے انتظام کا بنیادی مقصد حالت موجودہ (Status Quo) کا ہر ممکنہ جارحیت سے دفاع کرنا ہوتا ہے۔

ایک نصب العین کے طور پر اجتماعی تحفظ تمام خامیوں سے مبرا ہے۔ یہ آزاد اور خودمختار مملکتوں کی برادری میں قانون کے نفاذ کے مسئلہ کا مثالی حل پیش کرتا ہے۔ لیکن اجتماعی تحفظ کو عملی شکل دینے کی جو دو کوششیں اب تک کی گئی ہیں یعنی جمعیت اقوام کے میثاق کی دفعہ 16 اور اقوام متحدہ کے منشور کا باب ہفتم، وہ اس نصب العین کو حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں اور ان دونوں دستاویزوں کے تحت دونوں تنظیموں کے اسکان کی کارروائیاں اجتماعی کارروائیاں کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ میثاق کی دفعہ 16 میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جمعیت اقوام میثاق کی دفعات 12، 13 اور 15 میں بیان کیے گئے، بین الاقوامی جھگڑوں کے پرامن تصفیہ سے متعلق دفعات کی خلاف ورزی میں جنگ کے ارتکاب کے خلاف اجتماعی کارروائی کرے گی۔ بین الاقوامی قانون کی دیگر خلاف ورزیاں اس کے دائرہ سے خارج تھیں۔ لیکن عملاً جمعیت کی تعزیری کارروائیاں سفارش کرنے کی حد تک محدود تھیں۔ ان کو نافذ کرنے کا کام ارکان کا انفرادی کام تھا گو یہ کام جمعیت اقوام کی کونسل کی نگرانی میں ہونا تھا۔ لیکن جمعیت کے سامنے میثاق کی خلاف ورزی میں جارحیت کے ارتکاب کے جتنے معاملات آئے ان میں اجتماعی تعزیرات کے نفاذ کے جواز اور ضرورت کے باوجود جمعیت نے کوئی اجتماعی کارروائی نہیں کی۔ 1937 میں چین پر جاپان کے حملہ کی تنہا مثال ایسی ہے کہ لیگ کی اسمبلی نے چین کو جارحیت کا مرتکب قرار دے کر لیگ کے ارکان سے سفارش کی کہ وہ دفعہ 16 کے مطابق انفرادی طور پر جاپان کے خلاف تعزیری اقدامات کریں۔ لیکن کسی بھی ملک نے جارح کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

اقوام متحدہ کے منشور کے باب ہفتم (دفعات 39 تا 51) میں قانون کے نفاذ کی ایک مرکزی ایجنسی قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ بین الاقوامی امن و تحفظ کے قیام اور اس کی حفاظت کی بنیادی ذمہ داری سلامتی کونسل (سکیورٹی کونسل) پر ڈالی گئی ہے۔ دفعہ 39 کے تحت کونسل امن کے لیے خطرہ، امن کی خلاف ورزی یا جارحیت کے اقدام کی موجودگی کا تعین کرتی ہے اور اس بات کا حاکمانہ فیصلہ کرتی ہے کہ دفعات 41 اور 42 کے تحت امن کے قیام یا بحالی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ کونسل کے فیصلے سفارش کا درجہ نہیں بلکہ مستند حکم کا درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ منشور کی دفعہ 25 کے تحت یہ ہر رکن کی ذمہ داری ہے کہ وہ منشور کے تحت سکیورٹی کونسل کے فیصلوں کو قبول کرنے اور انھیں نافذ کرنے پر تیار ہوں۔ اسی طرح اقتصادی تعزیرات نافذ کرنے کے معاملہ میں بھی کونسل خود مختار ہے۔ (دفعہ 41) دفعہ 42 کے تحت کونسل فوجی تعزیرات نافذ کرنے کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ لیکن دفعہ 43 کے تحت قیام امن کو درکار بین الاقوامی پولس فورس کے لیے عملہ اور وسائل سکیورٹی کونسل اور اقوام متحدہ کے انفرادی ارکان کے درمیان سمجھوتہ کے ذریعہ فراہم کیے جائیں گے۔ البتہ اقوام متحدہ کی فوج تیار ہونے کے بعد اس سے کام لینے کی تمام تر ذمہ داری کونسل کی ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ کچھ ارکان اپنی ذمہ داری کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کونسل سے تعاون نہ کریں۔ اس سے بڑھ کر خود اس باب میں دو دفعات ایسی ہیں جو اقوام متحدہ کے اجتماعی تحفظ کے نظام کو بے اثر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ایک ہے دفعہ 51 جس کے تحت منشور نے اقوام متحدہ کے ارکان کو اپنے خلاف مسلح حملہ کی صورت میں انفرادی اور اجتماعی طور پر ذاتی دفاع کا فطری حق تسلیم کیا ہے۔ دفعہ 27 پیراگراف 3 میں سکیورٹی کونسل کے طریق کار کی وضاحت کی گئی ہے اور کونسل کے کسی بھی فیصلہ کے حق میں پانچوں مستقل ارکان (چین، فرانس، برطانیہ، روس اور ریاست ہائے متحدہ امریکا) سمیت 9 ارکان کی مثبت رائے لازمی قرار دی گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر باب ہفتم کے تحت کونسل کے کسی مجوزہ اقدام سے کوئی مستقل رکن اختلاف کرے تو کونسل فیصلہ نہ کرسکے گی اور نہ قانون کے نفاذ کی مشینری حرکت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں آئے گی۔ مستقل ارکان کے حق تنسیخ (ویٹو پاور) کی یہی بنیاد ہے۔ اقوام متحدہ کے اجتماعی تحفظ کی کارکردگی کی بنیاد مشرق و مغرب کے درمیان سرد جنگ کے چھڑ جانے سے یہ مشینری فرسودہ ہوکر رہ گئی۔ دونوں عظیم ترین طاقتوں نے دفعہ 51 کے تحت دفاعی بلاک اور علاقائی اتحادات قائم کیے۔ تنظیم کے اجتماعی اقدام کی تنہا مثال عام اسمبلی کی جانب سے نومبر 1950 میں "اتحاد برائے امن قرار داد" (Uniting for Peace Resolution) کی منظوری تھی جس کے تحت ارکان سے جنوبی کوریا کے خلاف شمالی کوریا کی جارحیت کو روکنے کی سفارش کی گئی۔ چونکہ اسمبلی کی قرارداد محض سفارش کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا نفاذ کا انحصار ارکان کی رضامندی پر ہوتا ہے۔ وہ ان سفارشات کو ماننے یا رد کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ کوریا میں اقوام متحدہ کی کارروائی بڑی حد تک امریکا کی کارروائی تھی۔

سیاسی اعتبار سے بھی اجتماعی تحفظ کا نظام پائدار نہیں ہوسکتا کیوں کہ اجتماعی تحفظ میں لازمی طور سے "حالت موجودہ" (Status Quo) کا دفاع مضمر ہے۔ اس طرح جمعیت اقوام کے اجتماعی تحفظ کے نظام کا مقصد 1919 میں بنائے گئے علاقائی نقشہ کی حفاظت تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے والی قومیں اس نقشہ کی مخالف تھیں کیوں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی۔ امریکا اور روس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن فرانس اور اس کے اتحادیوں کے نزدیک، جن کو 1919 کے معاہدات امن کے تحت وجود میں آنے والے نقشہ سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا، تحفظ کے معنی یہ تھے کہ 1919 کی سرحدوں کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے۔ حالت موجودہ کی موافقت اور مخالفت میں قوموں کی صف بندی پہلی جنگ عظیم کے بعد کی کیفیت نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔ استقرار پسند اور توسیع پسند طاقتوں کی کشمکش بھی نئی نہیں۔ اقتدار کی اس کشمکش کو اگر مملکتی نظام کی اکائیوں کی قومی انانیت اور مفاد پرستی کے آئینہ میں دیکھا جائے تو اجتماعی تحفظ عملی اعتبار سے ناقابل عمل ثابت ہوگا۔ اجتماعی اقدام اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب تمام اقوام حالت موجودہ کی خلاف ورزی کو ناجائز قرار دے کر اجتماعی کارروائی کریں۔ اگر ایسی مثالی صورت حال پیدا بھی ہوجائے تو اس کا منطقی نتیجہ مقامی اور محدود جنگوں کو عالمی اور غیر محدود بنانے کا ہوگا۔

اجتماعی سودا بازی (Collective Bargaining) تقسیم دولت: مزدوروں کی انجمنیں اجرت میں اضافہ کے ساتھ روزگار بحال رکھنے میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ یہ انجمنیں انھیں صنعتوں میں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں جن میں محنت کے بدلے سرمایہ کا استعمال دشوار ہو۔ کارخانے زیادہ تر ایک جغرافیائی علاقہ میں واقع ہوں یا مختلف علاقوں میں قائم کارخانوں میں کام کرنے والوں کے درمیان ربط آسانی کے ساتھ ممکن ہو۔ متعلقہ صنعت کی پیداوار کی طلب نسبتاً بے لچک ہو اور محنت کی مبادل خدمات کی رسد کی لچک کم ہو۔

جس صنعت کی پیداوار مسابقت والے بازار میں فروخت ہوتی ہو اس میں مزدوروں کی جانب سے اجتماعی سودہ بازی اجرت میں اضافہ کا مطالبہ منوا سکتی ہے مگر اس سے روزگار میں واقع ہونے والی کمی کو نہیں روک سکتی۔ البتہ اگر پیداوار میں اجارہ داری یا ناکمل مسابقت کا دور دورہ ہو تو اجتماعی سودہ بازی روزگار میں کمی کے بغیر اجرت میں اضافہ کروانے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ بسا اوقات کارخانہ بھی اجتماعی طور پر مزدوروں کی انجمنوں سے اجرت کے بارے میں سودہ بازی کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں اجرت کے تعین میں معاشی عوامل سے زیادہ طاقت کے توازن کو دخل ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں حکومتی تعین اجرت کے معاملہ میں مداخلت کرتی ہیں تاکہ صارفین کے مفاد اور معیشت کے مجموعی مصالح کی رعایت بھی ملحوظ رہے اور پیداوار عمل میں تعطل کے بغیر مزدوروں اور کارخانہ داروں کے درمیان اجرت کے بارے میں کوئی منصفانہ سمجھوتہ ہوسکے۔

اجتنابی رشتے (Avoidance Relationship): بعض سماجوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ مخصوص رشتہ داروں سے یا تو بالکل رسمی (Formal) تعلقات رکھے جاتے ہیں یا پھر بے حد کم روابط کی اجازت ہوتی ہے۔ ایسی صورتوں میں سماجی تمدنی اہتمام کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے مابین یا تو بہت جزوی یا پھر انتہائی محدود بین عمل واقع ہونے پائے۔ مثال کے طور پر ساس اور داماد کے مابین اکثر روایاتی سماجوں میں انتہائی محدود پیمانہ پر روابط کا رواج پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ روایتی ہندو سماج میں عموماً بہو سسر جیٹھ اور بڑے نندوئی سے اجتناب برتتی ہے۔ وہ ان کو منھ نہیں دکھاتی، بات نہیں کرتی اور کسی قسم کی قربت کا اظہار نہیں کرتی۔ روایتی معاشرے میں سگے رشتہ دار ہی نہیں بلکہ دور دراز کے رشتہ داروں سے یہاں تک کہ پورے گاؤں کے بزرگوں سے بھی دوری رکھی جاتی ہے اور پردہ کیا جاتا ہے جو ہندو

خواتین باہر پردہ نہیں کرتیں۔ وہ بھی رشتہ داروں سے گھر کے اندر منہ ڈھانکتی ہیں۔ یہ رواج غالباً اس لیے قائم کیا گیا تھا کیونکہ ان رشتے داروں کے ساتھ بے تکلفی قربت یا زنا کو گناہِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ دیور اور چھوٹے نندوئی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ یا ہنسی مذاق کو روا رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ویدیک زمانے کے کچھ بعد تک دیوروں سے شادی کرنے کی اجازت تھی۔ دیور کا لفظی مطلب بھی دوسرا 'ور' یا دوسرا شوہر ہے۔ آج کے مہذب سماج میں بھی اس رواج کی باقیات موجود ہیں۔ جیٹھ سے احترام آمیز دوری اور دیور سے مذاق روا رکھا جاتا ہے۔ جہاں اجتنابی رشتے ہوتے ہیں وہاں سماج میں مذاقیہ رشتے (Jocking Relations) بھی ہوتے ہیں تاکہ سماجی سطح پر ایک توازن برقرار رہے۔

اجتہاد: لغوی معنی کسی معاملہ میں پوری طاقت صرف کردینا اور کسی چیز میں غیر معمولی کاوش اور انتہائی کوشش کرنا ہیں۔ لیکن فقہ کی اصطلاح میں اس کوشش کا نام اجتہاد ہے جو شریعت کے دلائل کے ذریعہ اس کے احکام مستنبط کرنے کے لیے کی جائے اس کا مقصد یہ ہے کہ جن پیش آنے والے امور و مسائل میں قرآن و احادیث نبوی میں کوئی واضح اور صریح ہدایت موجود نہ ہو ان میں قرآن و سنت کے اشارات میں غور کرکے یہ طے کرنا اور پتہ لگانا کہ کون سی بات کتاب و سنت سے قریب ترین ہوسکتی ہے۔ پس اجتہاد کا کام ایسے امور میں شارع کے منشا کی تلاش و تعین ہے جن میں وہ معلوم و متعین نہ ہوں اجتہاد کی ضرورت اس وقت بھی پیش آتی ہے۔ جب کسی مسئلہ میں اجتہاد کے ذریعہ کوئی حکم متعین کیا گیا ہو لیکن پھر وہ حکم نئے حالات یا زمان و مکان کی تبدیلیوں کے پیش نظر ناکافی اور معتبر نہ ہو اور وہ مصالح کے حصول سے قاصر نظر آنے لگے تو اس مسئلہ میں سابق اجتہاد ترک کرکے نئے اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ اجتہاد کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ زندگی کی تبدیلیاں نت نئے مسائل سامنے لاتی رہتی ہیں بالخصوص ان دائروں میں جن میں شارع کی حکمت نے صرف بنیادی ہدایات دی ہیں۔

اس تعریف سے واضح ہوا ہوگا کہ اجتہاد کا معاملہ بڑا اہم اور نہایت نازک ہے اس لیے اس میں پوری احتیاط اور ذمہ داری ضروری ہے۔ چنانچہ فقہ کی کتب میں مجتہد کے جو اوصاف شرائط تجویز کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف وہی لوگ اس منصب کے اہل ہوسکتے ہیں جو دین میں پوری بصیرت علم میں پختہ استوار اور گہری سمجھ رکھتے ہوں جن کا مذاق کتاب و سنت کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہو جو زندگی کے معاملات کے نشیب و فراز اور زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ان مقاصد و مصالح کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہوں جو شریعت کے احکام میں ملحوظ ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا عملی اور اخلاقی درجہ اتنا بلند ہو کہ ان کی نسبت یہ شبہ نہ کیا جاسکتا ہو کہ وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں اپنی خواہش کو دراندازی کا موقع دیں گے یا کسی خوف اور طمع سے مغلوب ہوکر جھوٹے اجتہادات کریں گے اور جھوٹے فتوے دیں گے۔

اجتہاد کا ذریعہ قیاس ہے اس لیے قدیم اصطلاح میں یہ قیاس و رائے کے ہم معنی بولا جاتا تھا۔ اس لیے مجتہد وہ شخص کہلائے گا جو اپنی غیر معمولی جدوجہد کاوش سے علمی وجہ البصیرۃ کوئی ذاتی رائے قایم کرے اس کے برعکس مقلد اس کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے کا قول یہ جانے بغیر کہ اس کی دلیل کیا ہے مان لے۔ اس کی دو قسمیں ہیں مجتہد مطلق جیسے ائمہ اربعہ اور مجتہد منتسب یعنی ایسا مجتہد جو اصول میں تو کسی خاص فقہ کا پابند ہو لیکن فروع میں آزادی رائے سے کام لے۔ ائمہ اربعہ کے بعد یہ درجہ متعدد فقہا کو حاصل ہوا۔ اجتہاد میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر مجتہد کا فیصلہ غلط بھی ہو تو اس کو ثواب ملے گا کیونکہ اس نے محنت و کاوش کی ہے اور اگر اس کا فیصلہ درست ہوا تو اسے دہرا ثواب ملے گا۔ ایک اس کی کوشش کا جو اس نے تفقہ دین میں کی دوسرا اس کی اصابت رائے کے نتیجہ میں۔

اجتہاد کی نزاکت کے باوجود اس کی ضرورت ہر زمانہ کی طرح اس دور میں بھی مسلم ہے اس کا دروازہ مسدود قرار دینا غلط ہے۔

اجرت (Wages) - تقسیم دولت : کلاسیکی معاشین یہ سمجھتے ہیں کہ اجرت کی شرح گزربسر کی سطح پر قائم رہتی ہے۔ سرمایہ دار قومی پیداوار کے ایک حصہ کو مزدوروں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں جسے اجرت فنڈ (Wages Fund) کا نام دیا گیا تھا۔ انسانی آبادی ایسی سطح پر قائم رہتی ہے کہ یہ اجرت فنڈ مزدوروں کو گزربسر کے بقدر اجرت دینے کے لیے کافی ہوجائے۔ بعد میں اجرت فنڈ کا نظریہ غیر حقیقت پسندانہ قرار دے کر ترک کردیا گیا اور حاشیائی پیداواری پر مبنی نظریہ مقبول ہوا۔ ابتدا میں حاشیائی تجزیہ کے تحت یہ بتلایا گیا تھا کہ محنت کی رسد کا تعین وہ تکلیف یا منفی افادہ (Disutility) کرتی ہے جو مزدور محنت کرنے میں محسوس کرتا ہے۔ مگر بعد میں اس غیر عملی تصور کو ترک کردیا گیا اور اب محنت کی رسد

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی وضاحت آمدنی حاصل کرنے یا آرام کرنے کے درمیان مزدور کی ترجیحات کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریہ اجرت میں رسد کی وضاحت ہمیشہ غیر تشفی بخش رہی ہے۔

اگرچہ اکثر ماہرین معاشیات محنت کی طلب کے تعین میں حاشیائی پیداآوری کو فیصلہ کن سمجھتے ہیں مگر ان کے نزدیک بھی شرح اجرت کے تعین میں بہت سے غیر معاشی عوامل مثلاً تہذیب و تمدن، رسم و رواج، سیاسی حالات وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ حاشیائی پیداآوری کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ یہ بتائے کہ مذکورہ بالا عوامل کے نتیجہ میں متعین ہونے والی اجرت پر کتنے مزدوروں کو روزگار مل سکے گا۔ "حاشیائی پیداآوری پر مبنی نظریہ اجرت" (Marginal Productivity Theory of Wages) کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ اجرت کی شرح مزدور کی پیداآوری کی تعین میں ادا کرنے والے رول کو نظر انداز کردیتی ہے۔ حاشیائی پیداآوری پر مبنی نظریہ کی ان کمزوریوں اور عدم مسابقت کی غیر موجودگی میں اس کا اطلاق نہ ہونے کے باوجود اب تک اجرت کا کوئی متبادل نظریہ نہیں دریافت کیا جاسکا۔ معاشین کی توجہ اب اجرت کے تعین کے کسی عام نظریہ کی تلاش کے بجائے اس ضمن کے دوسرے مسائل کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔

مثلاً یہ کہ اجتماعی سودہ بازی (Collective Bargaining) کو تعین اجرت میں کتنا دخل ہے اور مزدوروں کی پیشہ ورانہ انجمنیں (Trade Unions) کیا کردار ادا کرتی ہیں۔ نیز یہ کہ مختلف کاروباری اداروں اور صنعتوں میں اجرتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کے کیا اسباب ہیں؟

اجرتوں کا فرق - تقسیم دولت: جدید نظریہ اجرت میں اجرتوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کی توجیہ کی طرف خاصی توجہ کی گئی ہے۔ اس کے لیے کام کی نوعیت درکار معلومات یا فنی تربیت کارخانہ یا صنعت کی نفع آوری روزگار کا استقرار یا عدم استقرار نقد اجرت کے علاوہ دوسری سہولتوں یا مراعات اور سماجی وقار وغیرہ جیسے عوامل کا ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف پیشوں اور مختلف علاقوں میں اجرت کی شرحوں کے درمیان توازن اس وقت پایا جائے گا جب ان تمام امور کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے ان شرحوں کے درمیان یک گونہ یکسانت حاصل ہوجائے۔

اجماع: یہ اسلامی فقہ کا تیسرا بنیادی ماخذ ہے لغت میں اس کے معنی کسی کام کا پختہ ارادہ اور عزم کرنا یا کسی امر پر اتفاق رائے کرنا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں امت کے اہل حل و عقد یا اصحاب و اجتہاد کے کسی معاملہ میں اتفاق کا نام اجماع ہے۔ یعنی رسول اللہ کی وفات کے بعد کسی بھی زمانے میں کسی بھی شرعی مسئلے میں ائمہ مجتہدین کا اتفاق اجماع کہلاتا ہے اس طرح عوام یا غیر علماء و مجتہدین کا اتفاق کو اجماع نہ کہا جائے گا۔

اجماع حالات و تقاضے کی مناسبت سے ملت کی فلاح و بہبود سے متعلق جملہ امور میں ہوسکتا ہے۔ یہ دراصل قانون کی حالات و زمانہ کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک قسم کا اختیار ہے جو مقنن حقیقی کی طرف سے ان لوگوں کو عطا ہوا ہے جو فکری و علمی حیثیت سے ممتاز ہیں اور اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اجماع کا ثبوت کتاب و سنت کی متعدد تصریحات میں موجود ہے۔ اسی لیے اسلام کے قانونی نظام میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور اجماع کے ذریعہ جو فیصلہ ہوجائے وہ نہایت مستند اور واجب العمل مانا جاتا ہے۔ اس کی مخالفت جائز نہیں ہوتی چنانچہ عام علما نے اجماع کو حجت شرعی قرار دیا ہے۔ البتہ اجماعی فیصلہ میں چونکہ زمانہ کے اِقتِضا اور فقہاء کی فکری و ذہنی حالت کو بڑا دخل ہوتا ہے اس بنا پر اس کا اتباع خاص اسی زمانہ والوں پر واجب ہوگا بعد کے لوگ حالات کی تبدیلی کی بنا پر دوسرے اجماعی فیصلہ پر عمل کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اسی طرح ایک ہی زمانہ میں اگر حالات تبدیل ہوجائیں تو اجماعی فیصلہ بھی بدل جائے گا۔

اجماع کی تین قسمیں ہیں۔ (1) اجماع قولی، (2) اجماعی فعلی، (3)اجماع سکوتی۔ اجماع قولی عام علما سے امت کے باہمی مشورہ اور زبانی اتفاق رائے سے واقع ہوتا ہے۔ اجماع فعلی وہ ہے جو فقہا کے بغیر کچھ کہے مجرد ان کے عمل پیرا ہونے سے ثابت ہواجماع سکوتی کا مطلب یہ ہے کہ بعض اہل نظر کے اتفاق سے کوئی بات شائع ہو اور دوسرے اہل نظر اس سے خاموشی اختیار کریں۔

اول الذکر دو قسموں کا اجماع صریحی کہتے ہیں اور عموماً اہل علم کے نزدیک تینوں قسم کا اجماع معتبر ہے۔ اجماع کی حجت اس بنا پر ہے کہ امت کے تمام اہل علم و فضل کبھی کسی ایسے امر پر اتفاق رائے نہیں کرسکتے۔ جس کے لیے ان کے پاس کوئی شرعی دلیل نہ ہو اس لیے ان کے اتفاق رائے کا اعتبار و لحاظ کیا جائے گا۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت ضلالت پر متفق نہیں ہوسکتی۔

اجنبی (Alien): ہر وہ شخص جو اس سماجی اور سیاسی گروپ سے وابستہ نہ ہو جہاں وہ عام طور پر رہتا ہے اسے اجنبی کہتے ہیں۔ اس گروپ کا طرز عمل اس شخص کے متعلق روایت رواج اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس زمانے کی حکومتوں نے ایسے غیر ملک کے باشندوں کو کچھ حقوق اور مراعات عطا کی ہیں اور اس کے متعلق بین الاقوامی قانون میں کافی مواد بھی موجود ہے کسی مملکت کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ غیر ملک کے باشندے کو ملک سے باہر جانے کا حکم دے۔ کئی ممالک بشمول ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اپنے غیر ملک کے باشندوں کے ملک میں داخلے پر پابندی عائد کی ہے جو مجرم ہوں یا مفلس ہوں یا بیمار ہوں۔ ایک غیر ملک کا باشندہ جس ملک میں رہتا ہے اس ملک کے قانون کا پابند ہوتا ہے۔ اگرچہ کہ وہ اپنے ملک کا وفادار ہوتا ہے غیر ملک کا کوئی باشندہ (Alien) اپنے ملک کے شہری ہونے کی بنا پر اپنی حکومت سے ضروری کارروائی کی درخواست کر سکتا ہے اگر مقامی حکومت اس کے جان و مال کی حفاظت سے قاصر ہے۔

اجنبیت (Alienation) : اجنبیت یا بیگانگیت کی اصطلاح جدید سماجیاتی ادب میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یوں تو یہ اصطلاح قدیم مابعد الطبعیاتی ادب میں مستعمل رہی ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر پلاٹینس (Plotinus) کی تحریرات میں ملتا ہے۔ لیکن بعد میں نو افلاطونی تصانیف میں یہ تصور زیادہ عام رہا ہے۔ جدید دور میں ہیگل نے اجنبیت کے تصور پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں جس کے بعد فوئرباخ نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح مذہب فرد میں احساسِ اجنبیت پیدا کرتا ہے۔ کارل مارکس اور اس کے بعد جدید سماجیات دانوں کی تحریرات میں اجنبیت کی تھیوری پر اظہار خیال ملتا ہے۔ مارکس نے فلسفیانہ نقطہ نظر کو چھوڑ کر اجنبیت کے سماجیاتی پہلو پر زیادہ زور دیا۔ ہیگل سے متاثر ہوتے ہوئے بھی مارکس نے ان عوامل کی توضیح و تشریح کی جو افراد میں بتدریج خود اپنے تخلیق کردہ ماحول کے تعلق سے احساس اجنبیت پیدا کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں انسان صنعت و ٹکنالوجی کی مدد سے زیادہ سے زیادہ مادی اور سائنسی اشیا پیدا کرتا جارہا ہے۔ اور جیسے جیسے خارجی پیداوار کی قدر و قیمت بڑھتی جارہی ہے۔ خود انسان کی اہمیت ان اشیا کے درمیان گھٹتی جارہی ہے اور حصولِ زر میں انسان اس قدر مصروف ہوگیا ہے کہ اس کے وجود کا مقصد کم ہوتا نظر آرہا ہے۔ وجودیت اور وجود کی اہمیت صارفی اشیا کی بڑھتی ہوئی پیداوار کی کوششوں کی نذر ہوتی جارہی ہے جو احساس اجنبیت پیدا کررہے ہیں۔ انسان مشینوں کے درمیان اور صنعتی پیداوار کے تیز دھارے میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرنے لگا ہے۔ ہر فرد کی حیثیت ایک بڑی مشین میں ایک چھوٹے سے پرزے کی ہو کر رہ گئی ہے۔ اور یہ چیز موجودہ سماج میں ایک شدید احساس اجنبیت کا سبب بنتی جارہی ہے۔

کارل مارکس نے اجنبیت کے احساس کو اس قسم کی اشیا کی پیداوار سے جوڑا ہے جو بذات خود انسان کو غلام بنا لیتی ہیں جیسے گھڑی یا بھگوان کی مورتی اس نے ان اشیا کی پیداوار کو بھی اجنبیت کا محرک مانا ہے۔ پیدا کرنے والا یعنی مزدور اور کسان خود استعمال نہیں کرپاتا۔ جیسے عمدہ عمارتوں کے معمار اور مزدور کبھی ان میں قیام نہیں کرپاتے اس لیے ان کو بنانے والے پیدا کی گئی اشیا سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں اور ان کو اپنے سے اعلیٰ اور بلند سمجھتے ہیں یعنی خالق مخلوق کا محکوم ہو جاتا ہے۔

کارل مارکس کے خیال کے مطابق انسان دو قسم کے حالات میں احساسِ اجنبیت کا شکار ہوتا ہے۔ ایک تو وہ حالات ہوتے ہیں جب انسان اور ماحول کے درمیان تعلق خاطر کا احساس کم ہوتا ہے یا ماحول کی خارجیت کا احساس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ فرد بھیڑ بھرے ماحول کے درمیان تنہائی یا اجنبیت کا احساس کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اگر کسی معاشرہ کے اقدار، طور طریق اور طریقۂ رہائش سے مطابقت پیدا کرنے میں فرد یا افراد کو دشواری محسوس ہوتی ہے تو فرد اور ماحول ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں اس لیے بھی علاحدگی یا اجنبیت کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ دونوں قسم کی اجنبیت فرد کو بیک وقت بھی شکار بنا سکتی ہے۔

بہرحال یہ احساس بیسویں صدی کے نصف آخر میں زور پکڑنے لگا تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی بحیثیت مجموعی انفرادی وجود کو اتنا کم اہم ثابت کرتی جارہی ہے کہ غیر معمولی ترقی کے باوجود انسان کی تنہائی، الجھنیں اور نفسیاتی عوارض بڑھتے جارہے ہیں۔

احتساب (Censorship) : اگر حکومت کی طرف سے اظہار خیال پر پابندی لگائی جائے یا اس پر تحدید عائد کی جائے تو اسے احتساب یا سنسر شپ کہا جاتا ہے۔ حکومت اظہار خیال پر یہ پابندی اس عذر پر لگاتی ہے کہ اس سے سیاسی، سماجی یا اخلاقی نظام کو خطرہ ہے۔ یہ پابندی مرکزی حکومت کی طرف سے بھی لگائی جا سکتی ہے یا مقامی انتظامیہ یا کسی مذہبی ادارے کی طرف سے بھی۔ یہ پابندی اخباروں، تھیٹر، سنیما، ریڈیو، تقریر،

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تحریر، ادب، غرض اظہار خیال کے سب ہی یا کسی ایک یا زیادہ وسائل پر لگائی جا سکتی ہے۔ یہ پابندی اظہار خیال سے پہلے بھی احتیاط کے طور پر لگائی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں سنسرشپ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جب ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں جب 1976 میں ایمرجنسی لگائی گئی تھی تو ملک میں سنسرشپ کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ احتساب کا رواج آج دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں ہے اور جہاں جمہوریت نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی شکل میں ڈکٹیٹر شپ یا مطلق العنانی ہے وہاں تو مکمل احتساب ہے۔ جمہوری ملکوں میں بھی کم یا زیادہ مگر احتساب کا نظام ضرور موجود ہے۔

مشرق اور مغرب دونوں جگہ احتساب کا نظام زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ رومن دور سے آج تک کی مطلق العنان حکومتوں میں سخت اور مکمل قسم کا احتساب ہمیشہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض وقت بادشاہ کے اپنے فرقہ کے عقائد کے سوا باقی تمام عقائد پر پابندی لگا دی جاتی تھی۔ بلکہ اس پر لوگ جیلوں میں بھی بند کر دیے جاتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں تو ہر ملک کو احتساب کی ضرورت کو ماننا پڑتا تھا۔ عہد وسطیٰ میں عیسائی ملکوں میں مسلمہ مذہبی عقائد سے ذرا سا بھی انحراف کرنے پر تعزیر اور سخت سزا کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پادریوں نے اس کے لیے طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں ایجاد کر رکھی تھیں۔ رومن کیتھولک بادشاہ پروٹسٹنٹ عقائد والوں پر حملے کر دیتے تھے۔

19ویں صدی میں اکثر ملکوں میں فحش نگاری کے خلاف سخت قوانین بنائے گئے تھے اور ان قوانین کا فائدہ اٹھا کر ہر اس تحریر اور کتاب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی جو حکمرانوں کو پسند نہیں تھیں۔ بغاوت کے پرچار کے خلاف قوانین بنا کر تحریر و تقریر کی ہر آزادی کو کچلنے کی کوشش کی گئی۔ جب آزاد ملکوں کا یہ حال ہو تو ایشیا و افریقہ کے محکوم ملکوں کے بارے میں کیا کہا جائے؟ یہ ممالک تو اظہار خیال کی ہر آزادی سے محروم تھے۔

آزادی کے بعد ہندوستان ایک بڑی جمہوریت کے طور پر ابھرا، جہاں تحریر و تقریر کی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق تھی مگر اپنے دور ایمرجنسی میں اس ملک کو بھی سنسرشپ کے سخت مراحل سے گزرنا پڑا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ساری دنیا میں آزادی اور آزادی خیال کی تحریکوں کو بہت بڑھاوا ملا۔ خاص طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں پچھلی پابندیاں بہت کم ہو گئی ہیں۔ اگرچہ بہت سارے نو آزاد ملکوں میں جہاں جمہوری حکومتیں نہیں ہیں سخت احتساب کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

احکام: حکم کی جمع ہے مگر قرآن میں صرف واحد استعمال ہوا ہے اس کے معنی صحیح اور فہم اور صحیح فہم کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے۔ گو اس کا اطلاق صحیح کی طرح غلط فیصلے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے (مالك كيف تحكمون) تم لوگ کیسے فیصلے کرتے ہو۔ دوسری جگہ ہے (افحكم الجاهلية يبغون) یعنی کیا وہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں لیکن اصلاً یہ صحیح فیصلہ دو ٹوک بات اور قول فیصل کے لیے بولا جاتا ہے۔

اس لفظ کے دوسرے معنی اس اصلی معنی پر مبنی ہیں جیسے امر اختیار اور فرمان کے معنی میں۔ اللہ کا ارشاد ہے الا له الخلق و الامر (آگہ اللہ ہی کے لیے پیدا کرنا اور حکم دینا ہے) دوسری جگہ ہے ان الحكم الا الله (فیصلہ امر و اختیار صرف خدا کا ہے)اسی طرح حکومتوں کے کلی اختیارات اور بادشاہوں کے اوامر اور فرامین کے لیے بھی یہ عام طور پر مستعمل ہے۔

شارع کے ارشادات و ہدایات اور شریعت کے مسائل و قوانین اور تشریحی ضوابط بھی احکام کہلاتے ہیں فقہ کی کتابوں کے مختلف ابواب و فصول میں جو مسائل درج ہوتے ہیں وہ بھی احکام کہے جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی خاص موضوع کے اصول و قواعد و فنون کے ضوابط و قوانین بھی احکام کہلاتے ہیں۔ احکام النحو کا مطلب یہ ہے کہ نحو کے قواعد و قوانین اسی طرح احکام النجوم سے مراد نجوم کے مسائل و تعلقات ہوتے ہیں۔

اختتامی مکتب خیال (Marginal School): اختتامی مکتب خیال ان معاشین پر مشتمل ہے جو معاشی نظریوں کی تشریح میں معاشی مقداروں (Economic Quantities) کے مختتم تصور کو پیش کرتے ہیں۔ طلب و رسد کے تعین کے سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح قانون طلب کی بنیاد قانون تقلیل افادہ پر ہے اور کسی شے کی قیمت اس کے افادہ مختتم سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح قانون رسد کا تعلق قانون تقلیل مصارف سے ہے اور کسی شے کی قیمت رسد اس کے مصارف مختتم سے کم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ معاشی نظریوں کے اس تجزیہ و توجیہ کو اختتامی تجزیہ (Marginal Analysis) کہتے ہیں۔ اس طریق تجزیہ کے ذریعہ ہی پانی اور ہیرے جیسی چیزوں کی قدر و قیمت کے تضاد کو حل کرنا ممکن ہو سکا اور اس کی مدد سے اشیا صرف کی قیمتوں کے تعین کے ایک عام اصول کی

تشکیل ممکن ہوئی اور ساتھ ہی عاملین پیداوار کی قیمتوں کے تعین کے عام اصول (جسے تقسیم کا نظریہ پیداواری مختتم (Marginal Productivity Theory of Distribution کہتے ہیں) بنائے جاسکے۔ اقتصادی تجزیہ پر باوجود اس ہیئت کے مختلف قسم کی تنقیدیں کی جاتی رہی ہیں جن میں سے کچھ تقسیم کے نظریہ پیداواری مختتم سے اور کچھ اشیا صرف کی قیمتوں کے تعین کے اصول سے متعلق ہیں۔ جہاں تک اشیا صرف کی قیمتوں کے تعین کا افادہ مختتم اور مصارف مختتم کے مساوی ہونے کا تعلق ہے مختلف تنقیدوں میں اہم تنقید یہ ہے کہ اگر دو یا دو سے زیادہ اشیا کا استعمال مشترکہ ہو اور ان کا تناسب معین ہو تو کسی ایک شے کے افادہ مختتم کا تخمینہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح دو یا دو سے زیادہ اشیا کی مشترکہ پیداوار اور معین تناسب میں کسی صورت میں ان میں سے کسی ایک کے مصارف مختتم کا تخمینہ ممکن نہیں۔ ایک اور قابل ذکر اعتراض یہ ہے کہ فرم عملی طور پر نہ تو ہمیشہ بیشترین منافع حاصل کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی اس کے ذہن میں مصارف مختتم کا کوئی تصور ہوتا ہے وہ عموماً اوسط مصارف کو پیش نظر رکھتا ہے اور بیشترین منافع کے بجائے بیشترین مقدار فروخت کے ذریعہ ایک معقول مقدار منافع کو کافی سمجھتا ہے۔ لیکن یہاں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی خریدار مختلف اشیا کی خریداری کے سلسلہ میں یہ نہیں سوچتا کہ جو روپیہ وہ کسی ایک چیز کی مزید مقدار پر خرچ کرے گا اگر وہی کسی دوسری شے کی مزید مقدار پر کرے تو اسے کس قدر افادہ حاصل ہوگا۔ اس طرح ایک فرم اپنی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلے میں اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ مزید پیداوار کو بڑھانے سے جو مزید مصارف ہوں گے اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی مزید آمدنی سے مزید فائدہ حاصل ہوسکے۔ پیداکار اور صارفین کے اسی قسم کے عام طرز عمل کو ظاہر کرنے کے لیے "مختتم" کا تصور معاشی تجزیے میں جو اہمیت رکھتا ہے اس کو بالکلیہ طور پر رد نہیں کیا جاسکتا۔

اخوان المسلمون (Ikhwan-ul-Muslimun) : اخوان المسلمون دنیائے عرب میں عہد حاضر کی سب سے بڑی اسلامی سیاسی تحریک ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اوائل سے اب تک اسلامی احیا اور سیاسی بیداری کی جتنی بھی کوششیں عالم عرب میں ہوئیں ان میں سب سے ممتاز مقام اخوان المسلمون کو حاصل ہے۔ دراصل یہ مصر کی ایک مذہبی اور سیاسی تحریک ہے جس کی بنیاد مصر کے ایک ممتاز عالم دین حسن البنا نے 11/ اپریل 1929 میں ڈالی تھی۔ اس تحریک کا مقصد خالص دین اور مذہبی روایات کو زندہ کرنا اور ان کے مطابق مسلم معاشرہ اور حکومت کی تجدید کرنا تھا۔ اس تحریک نے مصر کے تمام طبقوں بالخصوص زیریں اور متوسط طبقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور اس کے اثرات دوسرے تمام عرب ملکوں میں پھیل گئے۔

1936 میں جب فلسطین کی کشمکش شروع ہوئی تو اخوانیوں نے عربوں کی ہر ممکن حمایت کی۔ 1939 میں دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں اخوان المسلمون نے سیاسی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور تجارتی جدوجہد کے میدانوں میں قدم رکھا۔ جنگ عظیم دوم (1939-1945) کے دوران مصر کی سیاسی حالت دگرگوں تھی۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد اخوانیوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف عدم تعاون کی زبردست تحریک چلائی اور اس کے خلاف اعلان جہاد کا مطالبہ کیا۔ 1948 کی جنگ فلسطین میں اخوانیوں نے عرب لیگ کے پرچم تلے عدیم المثال شجاعت اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ 8/ دسمبر 1949 کو محمود فہمی النقراشی نے اخوانیوں کے دوبارہ اعلان جہاد کے مطالبہ پر اپنی حکومت کی بقا اور انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے اسے غیر قانونی تنظیم قرار دے کر اس پر پابندی عائد کردی۔ اس کے بعد جلد ہی بیس روز کے اندر النقراشی کو قتل کردیا گیا۔ اس کا الزام اخوانیوں پر لگا چنانچہ جوابی کارروائی میں اس تحریک کے بانی حسن البنا کو 12/ فروری 1949 کو شہید کردیا گیا۔

اکتوبر 1951 کی آزادی کی کشمکش میں اخوان المسلمون نے بھرپور حصہ لیا۔ جولائی 1952 میں شاہ فاروق کے خلاف جنرل نجیب کی بغاوت اور پھر 1953 میں فوج میں بھی نفوذ کرگئے تھے کیونکہ ان کے فوجیوں سے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اخوانیوں کا اثر فوج میں خاصا بڑھ گیا تھا۔ 1948 کی جنگ فلسطین میں اخوانیوں اور فوجی افسروں نے باہم مل کر جنگ لڑی تھی اور اخوانیوں کی جانبازی اور خلوص نے ان افسروں کو بہت متاثر کیا تھا۔ 52-1951 میں پھر جنگ سوئز میں بھی اخوانیوں کو داد شجاعت دینے کا موقع ملا۔ اس طرح اخوانی لوگ فوج سے بہت قریب ہوگئے۔ لیکن 1952 کے انقلاب کے بعد جدید مصر کی تعمیر نو کے مسئلہ پر فوج اور اخوانیوں کے مابین اختلاف برپا ہوگیا اور اس نے ناقابل عبور خلیج کی صورت اختیار کرلی۔ جو وقت کے ساتھ دراز ہوتی گئی۔ اخوانی اسلامی ریاست کے قیام کے خواہاں تھے اور فوج سیکولر ریاست قائم

کرنا چاہتی تھی۔ اخوانی محرمات کے مکمل انسداد، نہر سوئز سے انگریزوں کا غیر مشروط انخلا کے ساتھ مصر اور نہر سوئز کو بین الاقوامی شاہ راہ تسلیم کیے جانے کے سخت خلاف تھے۔ 28/ مارچ 1954 کو جمال عبدالناصر کے فوجی حکمراں بن جانے کے بعد اخوانیوں اور حکومت کے مابین کشمکش نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ 26/ اکتوبر 1954 کو جب ناصر پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا تو حکمنہ قاتل کو اخوان المسلمون سے منسوب کر کے اس پر پابندی عائد کردی گئی۔ بڑے پیانہ پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اس کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں اور اس کے چوٹی کے علما و فضلا تختہ دار پر چڑھا دیے گئے۔ ان میں سید قطب شہید کا نام بہت نمایاں ہے۔

اخوان المسلمون کی شاخیں مختلف ملکوں میں کام کرتی ہیں۔ شام کے شہر دمشق میں بھی 1937 میں اس کی شاخ قائم ہوگئی۔ مختلف علاقوں میں اس کی شاخیں مختلف ناموں سے کام کرتی ہیں۔ یروشلم، لبنان اور سوڈان میں بھی اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ 1946 میں لبنان کی شاخ نے جنگ فلسطین میں نہایت سرگرم حصہ لیا۔ عراق میں یہ تحریک شیخ محمد محمود الطاف کے زیرنگرانی کام کرتی تھی۔ مشرقی افریقہ کے بعض حصوں تک بھی یہ تحریک پہنچی اور واقعہ یہ ہے اس تحریک کے اثرات تمام اسلامی دنیا پر مرتب ہوئے جو آج یعنی 2001 میں بھی اس کے وابستگان مختلف مسلم ممالک میں مختلف سطحوں پر موجود ہیں۔ ان کا مرکز مصر ہے اور موجودہ حکومت نے ان پر پابندی تو نہیں عائد کی ہے تاہم ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ اخوان المسلمون کے موجودہ مرشد عام قائد مصطفیٰ مشہور ہیں۔

اداره (Institution): عام طور سے ہم کسی بھی انجمن یا تنظیم کو ادارہ کے نام سے منسوب کردیتے ہیں۔ مثلاً 'ادارہ علم وادب' یا 'ادارہ فلاح قوم' وغیرہ۔ معاشرتی علوم کے زاویہ نظر سے ادارہ کی صطلاح کا یہ استعمال غلط ہے۔ اصلاً ادارہ کسی چیز کو منظم کرنے کا نام ہے۔ یہ لوک ریت (Folkways) سخت اقدار (Mores) اور قوانین کا ایک مربوط مجموعہ ہے جو ایک یا اس سے زیادہ تفاعلات کے گرد تعمیر کیا جاتا ہے یا ہو جاتا ہے۔ معاشرتی ربط و ضبط کے مسلمہ مروجہ مقبول اور منظور شدہ طریقوں کے عظیم سلسلہ کو ہم ادارہ کہتے ہیں۔ یہ معاشرتی تعلقات کا ایک ایسا منظم نظام (System) ہے جو مشترک اقدار (Values) اور طرزہائے اقدار (Procedures) کو مادی شکل عطا کرتا ہے اور سماج کی بعض بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ 'مشترک اقدار' سے ہمارا اشارہ مشترک تصورات و مقاصد کی طرف ہے۔ 'مشترک اقدار' سے ہم وہ معیاری (Standardized) کرداری وضعات (Behaviour Patterns) مراد لیتے ہیں جن کی تعمیل گروہ (Group) کرتا ہے۔ 'تعلق کے نظام' سے مراد کارہائے منصبی (Roles) اور حیثیتوں (Statuses) کا وہ تانابانا ہے جس میں افراد کا عمل جاری رہتا ہے۔

اس تشریح کی روشنی میں خاندان مشترک اقدار کا ایک مرکز (محبت اولاد اور خاندانی زندگی سے متعلق) مشترک طرز اقدار کا ایک مجموعہ (بچے کی تربیت خاندانی معمولات سے متعلق) اور کارہائے منصبی اور حیثیتوں کا ایک جال (شوہر بیوی بچہ نوجوان یا دوشیزہ اور منسوب یا منسوبہ کو محیط کرتے ہوئے) ہوتا ہے۔ یہ سب مل کر معاشرتی تعلق کا ایک ایسا نظام تشکیل دیتے ہیں جس کے ذریعہ خاندانی زندگی کو جاری رکھنا ممکن ہے۔

ادارہ کو بنیادی طور پر سماجی اور انفرادی ضروریات سے جوڑ کر سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہر سماج میں افراد کی بے شمار نجی اور سماجی ضروریات ہوتی ہیں۔ ان ضروریات کو سماج میں قابل قبول بلکہ پسندیدہ انداز میں پورا کرنے کے لیے ایک طریقہ کار سکھایا جاتا ہے۔ ساتھ میں کچھ ذرائع بھی ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ کار اور ذرائع ہر شخص کو ایک ہی انداز میں نبھانے پڑتے ہیں کیونکہ ہر انسان اگر من مانے طریقے سے اپنی ضروریات کو پورا کرنے لگے تو سماجی نظام چکنا چور ہو جائے۔

کولے نے 'ادارہ' کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے۔ "لگاتار جاری رہنے والی ضروریات یا خواہشات کو پورا کرنے والے سماجی وراثت کے ذریعہ حاصل ہونے والے اجتماعی برتاؤ کا نظام ادارہ کہلاتا ہے۔"

بوگاردس نے بھی تقریباً یہی کیا ہے کہ "ایک سماجی ادارہ سماج میں ایک ساختی بندوبست ہے جو تسلیم شدہ طریقوں کے ذریعہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔"

ہندوستان اور دوسرے قدامت پسند معاشروں میں سماجی اداروں کی کچھ خصوصیات اس طرح ہیں:

(1) قدامت، (2) تسلسل، (3) انجذاب، (4) تمام اکائیوں کا بنیادی اتحاد اور (5) مذہب پرستی یا بنیاد پرستی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

قدیم سماجوں میں مختلف ضروریات کو جو نجی اور سماجی دونوں طور پر تسلیم شدہ ہوں، پورا کرنے کے لیے مختلف ادارے قائم کیے جاتے ہیں۔ سماج ان کو دھیرے دھیرے غیر شعوری طور پر راہ دیتا ہے۔ یہ اکثر خود رو پودھوں کی طرح بڑھ جاتے ہیں لیکن بعد میں کاٹ چھانٹ کر ان کو ایک بہتر شکل دے دی جاتی ہے۔

دور حاضر کے پیچیدہ (Complex) معاشرہ میں پانچ اہم بنیادی ادارے مانے جاتے ہیں جو خاندان، مذہب، حکومت، معاش اور تعلیم سے متعلق ہیں۔ آج کل جبکہ سائنس کی اقدار اور طرز ہائے اقدار کو بے انتہا اہمیت حاصل ہوچکی ہے اور یہ بے حد معیاری ہوچکے ہیں۔ بعض اصحاب نظر "سائنسی ادارہ" کو بھی اس فہرست میں شامل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔ معاشرتی خدمت (Social Service) یا طبی نگہداشت (Medical Care) میں شامل فعالیات (Activities) اس قدر متعین طور پر وضع (Pattern) اختیار کر چکی ہیں کہ کردار کے ان نظاموں کو بھی ادارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ادارہ کی عالم وجود میں آنے کے لیے کسی منصوبہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لوگ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر قابل عمل وضعات ان کے ہاتھ آجاتی ہیں جو تکرار عمل کی وجہ سے معیاری رسوم (Customs) کی شکل میں پختہ پڑ جاتی ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے یہ وضعات لوک اساطیر (Folklore) کی ایک شکل اختیار کرلیتی ہیں جو انھیں حق بجانب ثابت کرتی ہے اور ان کے لیے جواز فراہم کرتی ہے۔ مثلاً نسبت یا سگائی نے شوہر بیوی کے جوڑے کے انتخاب کے سلسلہ میں رواج کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔

جہاں ایک طرف ہر ادارہ کی اپنی انفرادی خصوصیات ہوتی ہیں وہاں پر ہر ادارہ کچھ حیثیتوں سے دوسرے تمام اداروں سے مماثل بھی ہوتا ہے۔ تمام اداروں کے لیے اپنے شرکا کی وفاداری کا برقرار رکھنا، مختلف اہل تفاعل (Functionaries) کو اختیار (Authority) سونپنا، کردار کے معیارات کی ضابطہ بندی کرنا اور دوسرے اداروں کے ساتھ میل جول کرنے کے طریقوں کو فروغ دینا لازمی ہوتا ہے چونکہ یہ عام مسائل ہیں اس لیے انھیں حل کرنے کے لیے وہ ادارے بھی جن کے ہدف (Goals) ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہوتے ہیں کافی حد تک مماثل طریقہائے کار (Techniques) استعمال کرتے ہیں۔

تمام ادارے اپنے مخصوص علائم (Symbols) کو تشکیل دیتے اور پروان چڑھاتے ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی یاد دہانی اجمال کے ساتھ کراتے رہتے ہیں۔ مثلاً قومی جھنڈے کو سلامی ریاست سے وفاداری کی یاددہانی کراتی رہتی ہے۔ بعض اوقات ترنم بھی علامت بن جاتا ہے جیسے جلسہ یا بھجن وغیرہ میں ترنم مذہب سے وفاداری کو تقویت دیتا ہے۔ اسی طرح عمارت بھی ادارہ کی علامت بن سکتی ہے۔ مثلاً مندر، مسجد، گرجا، گرودوارہ وغیرہ کی عمارتیں۔

وفاداری کے عام احساس کی تلقین کے ساتھ ادارہ اپنے ارکان سے ان کارہائے منصبی کو لازماً انجام دلاتا ہے جو انھیں ادارہ کی طرف سے تفویض کیے گئے ہیں۔ ان کارہائے منصبی کا اظہار اکثر رسمی قوانین (Formal Codes) کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً ملک سے وفاداری کی قسم شادی کے رشتہ کا عہد۔ قوم کی خدمت کا عہد وغیرہ۔ یہ رسمی قوانین اس مجموعی کردار کا ایک حصہ ہوتے ہیں جس سے ادارتی (Institutional) کار منصبی وجود میں آتا ہے۔

ہر ادارہ کی ایک ساخت (Structure) ہوتی ہے اور معیاراتی (Normative) ساخت معیارات (Norms) توقعات قواعد طرز اقدام — کا تحریری یا غیر تحریری یا غیر رسمی (Informals) طائفہ ہوتا ہے۔ عملہ جاتی (Personnel) ساخت اشخاص کارہائے منصبی اور حیثیتوں کا جال ہوتی ہے۔ جن کے ذریعہ ادارہ کی فعالیات کو جاری رکھا جاتا ہے۔ دونوں معیاراتی اور عملہ جاتی ساختوں کو چست (Closely) یا ڈھیلا ڈھالا (Loosely) ساخت کہا جا سکتا ہے۔

بعض ادارتی اکائیاں (Units) چست ساخت شدہ ہوتی ہیں کیونکہ ان میں اختیار بے انتہا مرکوز (Centralized) ہوتا ہے اور طرزہائے اقدار بے حد معیاری ہوتے ہیں۔ ادارتی اکائیوں میں مقامی گروہوں (Local Groups) یا افراد کے لیے خودمختاری (Autonomy) قطعاً نہیں ہوتی۔ دوسری ڈھیلی ڈھالی ساخت شدہ ادارتی اکائیوں میں مرکزیت (Centralization) کم ہوتی ہے اور عمل کے لیے زیادہ آزادی میسر ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بیشتر مواقع کے لیے قواعد کے تجویز (Prescription) کرنے میں بھی نسبتاً زیادہ آزادی ہوتی ہے۔ ڈھیلی ڈھالی ساخت شدہ ادارتی اکائی میں کارہائے منصبی کی توضیح کم ہوتی ہے اور حالات کے تقاضے کے مطابق فرد یا مقامی گروہ کے ذریعہ ان کارہائے منصبی کا توافق (Adjustment) ممکن

ہو جاتا ہے۔ ریاست اور فوج عموماً چست ساخت شدہ ادارے ہوتے ہیں جن کے کارہائے منصبی اور ہر صف (Rank) کے لیے ایک حیثیت (Status) احکامات کی بے لوچ تعمیل اور مفصل تنظیمی وضعات کی متعین طور پر توضیح ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں خاندان ایک لچکدار ساخت شدہ ادارہ ہے جس میں کارہائے منصبی اور حیثیتیں غیر یقینی ہوتی ہیں بلکہ بعض اوقات یہ خاصی گنجلک ہوتی ہیں۔

معاشرہ اس قدر پیچیدہ ہے اور اس کی قوتیں (Forces) اتنی قسم کا باہمی تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں کہ کسی خاص عمل کے تمام نتائج کی پیش بینی کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ادارہ کے تفاعلات (Functions) معاشرہ کی پیچیدگی کی وجہ سے ہی یک جہتی نہیں بلکہ دو جہتی ہوتے ہیں۔ اس کے مظہر (Manifest) تفاعلات وہ ہوتے ہیں جن کو آسانی کے ساتھ ادارہ کے صریح مقاصد (Processed Objectives) کے جزو کی حیثیت سے شناخت کیا جاسکتا ہے اور مستور (Latent) تفاعلات وہ ہوتے ہیں جو بے قصد ہوتے ہیں اور بے شناخت ہوسکتے ہیں یا اگر شناخت شدہ ہوں تو انھیں فروعی پیداوار (By Products) قرار دیا جائے گا۔ ہمارے اقتصادی اداروں کا مظہر تفاعل اشیا کی پیداوار تقسیم خدمات اور منافع ہے۔ ان کے مستور تفاعلات شہری زندگی (Urbanisation) کو فروغ دینا خاندانی نظام میں ردو عمل کرنا ٹریڈ یونینوں کی تعداد میں اضافہ کرنا تعلیم کا رخ بدلنا اور دوسری بہت سی تبدیلیاں لانا ہیں۔ کسی ادارہ کے مستور تفاعلات صریح مقاصد کے لیے ممد و معاون ہوسکتے ہیں یا اس سے غیر متعلق (Irrelevant) ہوسکتے ہیں۔ یا ایسے نتائج تک پہنچا سکتے ہیں جو کہ خود اداروں کے معیارات کے لیے ضرر رساں ثابت ہوں۔

کوئی بھی ادارہ خلا میں عمل پیرا نہیں ہوتا۔ ہم کسی بھی معاشرتی ادارہ کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ متعلقہ ثقافت (Culture) کے ساتھ اس کی نسبتوں کا مطالعہ نہ کریں۔ مذہب، حکومت، تجارت، تعلیم، خاندان سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ عمل متقابل کی ایک مستقل حالت میں وجود رکھتے ہیں۔ تجارتی حالات متعین کرتے ہیں کہ کتنے لوگ خود کو ازدواجی زندگی کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل تصور کرتے ہیں۔ شادی اور پیدائش کی شرح اشیائے ضرورت کی طلب کو متاثر کرتی ہے۔ تعلیم ان رویوں (Attitude) کو پروان چڑھاتی ہے جو مذہبی اعتقادات کو قبول یا رد کراتے ہیں جواباً مذہب یا تو علم و فضل کو مہمیز کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ خدا کا علم نصیب ہوتا ہے یا سائنسی تلاش و جستجو کی فکر کرتا ہے کہ اس سے ناقص تصورات پر زد پڑتی ہے۔ تاجر، معلم، مذہبی پیشوا اور دوسرے تمام اداروں کے اہل تفاعل حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ حکومت کے کام ان کے اداراتی کاموں کی کامیابی یا ناکامیابی کے ذمہ دار ہوسکتے ہیں۔

تمام ادارے تبدیل ہوتے ہوئے معاشرہ کے مطابق اپنا تطابق (Adaptation) لازماً اور مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ ایک ادارہ میں تبدیلیاں دوسرے اداروں کو حسب ضرورت تبدیل ہونے پر مجبور کردیتی ہیں۔ مثلاً اگر خاندانی وضعات میں تبدیلی واقع ہوگی تو ریاست معاشرتی تحفظ کے نظام کو قائم کرے گی۔ اگر مزدور کھیتوں سے کارخانوں کی طرف ہجرت کریں گے تو اہل مذہب کو اپنا انداز بیان و تبلیغ بدلنا پڑے گا تاکہ نئے حالات کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ اس طرح کوئی بھی ادارہ نہ تو دوسرے اداروں کو متاثر کرنے سے گریز کرسکتا ہے اور نہ خود کو دوسرے اداروں سے متاثر ہونے سے بچا سکتا ہے۔

اڈیکٹا مجسٹریٹم (Edicta Magistratum): اڈیکٹا مجسٹریٹم رومن لاء کی اصطلاح میں ان اعلانات یا احکامات کو کہا جاتا تھا جو ابتدا میں کوئی اعلیٰ مجسٹریٹ ان امور کے متعلق جس کا اسے اختیار تھا زبانی دیا کرتا تھا۔ رومن لاء کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مجسٹریٹ جن کو کسی مسئلے کے متعلق اختیار سماعت دیا جاتا تھا وہ اس کا پوری طرح استعمال کرتے تھے اور ان کے صادر کردہ احکامات رومن لاء کے اہم ترین ماخذ بن گئے۔

اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی (Urban Development Authority): شہری ترقی کے لیے وسائل مہیا کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے سرکاری سطح پر اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی ایک قانون کے ذریعہ قائم کی جاتی ہے۔ اس اتھارٹی کے فرائض میں ماسٹر پلان کی تیاری شامل ہے جس کے تحت مقامی انتظامیہ کے مشورے سے شہر کی توسیع اور دیگر ترقیاتی اسکیمیں عمل میں لائی جاتی ہیں اور زمینوں کے استعمال کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ارکان حکومت کے نامزد کردہ ہوتے ہیں۔

ارتقاء (Evolution): ارتقاء ان چند تصورات میں سے ہے جو

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دنیائے فکر کے مختلف میدانوں میں مشترک ہیں۔ چنانچہ ارتقاء کی اصطلاح سماجی علوم طبعی علوم اور فلسفہ تینوں میں مستعمل ہے۔ گوکہ ہر میدان میں اس تصور کے مضمرات جدا جدا ہیں۔ ارتقاء کے تصور کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عالم موجودات میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے وہ ایک نامعلوم اور لامتناہی تبدیلیوں کے سلسلہ کا ایک تفاعلی نتیجہ ہے۔ اور کسی وقت جو بھی کیفیت یا نظم پایا جاتا ہے۔ وہ بھی تبدیلیوں کے سلسلہ کی محض ایک کڑی ہے۔ گویا ارتقاء قانون فطرت کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ ارتقاء کے تصور سے جو نکات وابستہ کیے جاتے ہیں ان میں تبدیلی، نظم، جہت، ترقی اور اکمال اہم ہیں۔ ارتقاء کا بنیادی نکتہ تبدیلی ہے یعنی اس کائنات کا ہر ذرہ اور اس کی ہر حقیت مسلسل تبدیلیوں سے گزرتی رہتی ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں میں ہمیشہ ایک قسم کا نظم و ضبط پایا جاتا ہے۔ مفکرین کا یہ بھی خیال ہے کہ تبدیلی اور نظم کے طریق بے منزل نہیں ہوتے بلکہ اس خاص اور بامعنی جہتیں ہوتی ہیں۔ تبدیلیوں کی یہ جہتیں موجودات کو ترقی کی سمت لیے جارہی ہیں اور تبدیلیوں کا یہ پورا سلسلہ اور اس کا مقصد عالم موجودات اور خارجی حقائق کو تکمیل یا کمال کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ اس پورے ماحول کو جو ہمیشہ سے جاری ہے عمل ارتقاء کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ طبعی سماجی فکری اور مابعد الطبیعیاتی ہر میدان میں ارتقاء کا سلسلہ ابتدا سے جاری ہے۔ دوسرے کچھ مفکرین اس سلسلے کو مثبت یا منفی نہ سمجھ کر محض ایک عمل اور ردعمل کا سلسلہ سمجھتے ہیں۔

زندگی اور قوت نمو کے ارتقاء کے ساتھ سماجی ارتقاء کے تصور کو وسط انیسویں صدی سے اہمیت حاصل ہوگئی۔ 1959 میں ڈارون کی مشہور کتاب 'آغاز انواع' (The Origin of Species) کی اشاعت کے بعد ارتقائی نظریہ کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ڈارون ارتقائی نظریہ کا بانی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ڈارون کی کتاب کے بعد بیشتر مغربی مفکرین نے فطری اور سماجی علوم میں اس تصور کو اپنے مباحث کا مرکز قرار دیا۔ چنانچہ مشہور سماجیات داں ہربرٹ اسپنسر نے 1864 اور 1867 کے درمیان سماجی ارتقاء پر کافی بحث کی۔ سماجی ارتقاء کے تعلق سے دو قسم کے نظریات پیش کیے گئے۔ ایک نظریہ کی رو سے تمام سماج ایک ہی جہت یا منزل کی طرف مختلف راہوں سے رواں دواں ہے۔ اس نظریہ کو سماجی ارتقاء کا یک جہتی نظریہ (Unilinear Evolution) کہا جاتا ہے۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ارتقاء کا سلسلہ مختلف جہتوں میں بھی ہوسکتا ہے اور کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر سماج لازمی طور پر ارتقاء کی یکساں منازل سے گزرے۔ اس نظریہ کو ہمہ جہتی (Multilinear) ارتقاء کا نظریہ کہتے ہیں۔ مختلف ممالک میں مختلف ماحول اور حالات میں سماجی ادارے اور سماجی انجمنیں ارتقاء کی منزلوں سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ ادارے اور انجمنیں جو جہتیں اختیار کرتی ہیں ان کا دارومدار بین سماجی تعلقات انسانی فہم، ادراک، تجربے اور خارجی ماحول کے تقاضوں پر ہوتا ہے۔ مختلف زمانوں اور حالات میں سماجی برتاؤ کے معینات (Determinants) جدا جدا ہوتے ہیں۔ اور سماجی ارتقاء کا طریق ان ہی معینات کے زیراثر ہوتا ہے۔ چونکہ تبدیلی قانون اور ارتقاء کا بنیادی نکتہ ہے اس لیے اس کا سلسلہ ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ لیکن ارتقائی تبدیلیوں کا انحصار سماجیاتی نقطہ نظر حالات کے تقاضوں اور افراد کے ردعمل کے نتیجہ پر ہوتا ہے۔ یہ ردعمل کبھی مثبت ہوتے ہیں اور کبھی منفی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقتی طور پر ارتقاء میں تعطل سا نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعطل نہیں ہوتا بلکہ تبدیلی کی ایک نسبتاً غیر فعال یا سکونی کیفیت ہوتی ہے جو ہمیشہ اضافی ہوتی ہے اور کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ سماجی ارتقاء کے نظریہ کو انیسویں صدی میں جو مقبولیت حاصل تھی اس میں بیسویں صدی میں کمی ہوگئی ہے۔ بیسویں صدی میں 1920 کے بعد سے یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ انسان بڑی حد تک ارتقاء کی جہتوں کو اپنے قابو میں کرکے بامقصد سماجی اور نظریاتی ماحول کی تشکیل کرسکتا ہے۔ چنانچہ سماجی منصوبہ بندی کے نظریات اسی انداز فکر کا نتیجہ ہیں۔

تمدنی ارتقاء : کائنات کا ہر ذرہ ہر لمحہ تخلیق، تبدیلیوں، تفرقات اور امتزاجات کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ اور اس پورے ماحول کو ارتقاء کہا گیا ہے۔ مخلوقات عالم میں انسان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنی فکر دوررس کی مدد سے بڑی حد تک نہ صرف ماحول پر قابو پاسکا ہے بلکہ اس میں اپنی ضرورت کے مطابق تغیر اور تبدیلی بھی کرتا رہا ہے۔ اسی لیے انسان کو تمدن ساز کہا گیا ہے۔ تمدن سے مراد انسان کی ہر وہ مادی یا غیرمادی اکتسابی تخلیق ہے جس کی مدد سے انسان ایک طرف تو اپنے ماحول سے آگہی حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف اس سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد لیتا ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی، زبان، ادب، فلسفہ، شاعری، موسیقی، فن تعمیر، زراعت و صنعت غرض کہ ہر وہ تکنیک جو انسانی زندگی کے کسی نہ کسی مقصد کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ اس کے تمدن کا جزو کہلاتی ہے جس طرح کائنات کے دوسرے مظاہر ارتقاء کی منزلوں سے گزر

رہے ہیں اسی طرح تمدن بھی ارتقائی منازل طے کرتا رہا ہے۔ اور سادہ ترین قبائلی تمدن سے شروع ہو کر موجودہ پیچیدہ منزل تک پہنچا ہے۔

تمدنی ارتقاء پر سب سے پہلے مفکرین نے اس وقت توجہ دینی شروع کی جب مغربی مہم پسندوں کو نئے ممالک کی دریافتوں کے دوران نئے ممالک اور نئے تمدنوں سے سابقہ پڑا۔ یہ سلسلہ بالخصوص سترہویں صدی سے شروع ہو کر حال تک جاری ہے۔ انیسویں صدی میں ڈارون، ہربرٹ اسپنسر مورگن اور ٹائلر ارتقائی نظریہ کے اہم مفکرین گزرے ہیں۔ تمدنی ارتقائی نظریہ کے دو اہم مکاتیب ہیں۔ ایک کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام تمدن درجہ بدرجہ یکساں ارتقائی مراحل سے گزرتے ہیں۔ اسے یک جہتی ارتقائی نظریہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے مکتب خیال کی رو سے مختلف تمدن ایک دوسرے سے غیر متعلق اور آزادانہ طور پر ارتقائی منزلیں طے کرتے رہے ہیں اسے ہمہ جہتی ارتقاء کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے تمدنی ارتقائی مفکرین میں اے جی کیلر لزلی وہائٹ جولین اسٹیوارٹ اور گارڈن چائلڈ قابل ذکر ہیں۔

یہاں یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ سماجی ترقی (Social Development) اور تمدن ارتقاء کو ایک نہیں سمجھنا چاہیے۔ (سماجی ترقی کی تفصیل آگے موجود ہے)

ارسطو (Aristotle) : ارسطو (384 تا 322 ق.م.) قدیم یونان کا سب سے عظیم فلسفی اور مفکر گزرا ہے۔ جو یونان کے دارالسلطنت مقدونیہ کے قریب اسٹاگرا کے شہر میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کے بیس سال افلاطون کی اکاڈمی میں گزارے اور اس عظیم فلسفی کی صحبت اور اس کے مباحث سے استفادہ کیا۔ افلاطون کے انتقال کے بعد ارسطو ایتھنز منتقل ہو گیا جہاں اس نے ایک مشہور درسگاہ قائم کی۔ درمیانی وقفہ ارسطو نے سکندر اعظم کے اتالیق کی حیثیت سے بھی گزرا۔

ارسطو کی تصانیف تمام اہم موضوعات پر مشتمل ہیں جن میں منطق، نظریۂ سائنس، طبیعیات، حیاتیات، نفسیات، مابعدالطبیعیات، اخلاقیات، سیاسیات، خطابت اور جمالیات کے فنون شامل ہیں۔ ان تمام علوم پر اس کی دقت نظر اتنی زیادہ تھی کہ بجا طور سے ارسطو کو ان میں سے اکثر علوم کے سب سے بڑے اور ابتدائی مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔

جہاں تک سماجی علوم کا تعلق ہے ارسطو کی تخلیقات حسب ذیل موضوعات پر زیادہ ممتاز اور نمایاں رہی ہیں۔ (1) اس نے تحقیق کے نئے طریقوں کی بناء ڈالی جس میں انسان کی عقلیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ارسطو نے انسان اور قدرت کے قانون تسلسل اور ارتقاء کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ (2) ارسطو نے اخلاقی اور سماجی قوتوں اور محرکات کے باہمی بین عمل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ آج کے اس خیال سے متفق نہیں تھا کہ سماجی علوم کو "لاقدرانہ" (Value Free / Non-normative) ہونا چاہیے یا اخلاقیات کو ایک علاحدہ آزادانہ وجود حاصل ہونا چاہیے۔ (3) اس نے اخلاق سیاست اور سماجی نظریہ کے باقاعدہ مطالعہ کی بناء ڈالی اور اسی کے ساتھ ساتھ معاشیات، قانون اور تعلیم کے تصورات اور سماج میں ان کے فعالی اور باہمی تعلق پر تحقیقاتی روشنی ڈالی۔ سماجی علوم کے میدان میں ارسطو کا عظیم کارنامہ تحقیق کے میدان میں نئے اور سائنسی طریق کی دریافت ہے۔ جس میں استخراجی (Deductive) اور استقرائی (Inductive) طریقہ ہائے تحقیق کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ بعد کے تمام بڑے مفکرین نے ان ہی خطوط پر اپنی تحقیقات کو آگے بڑھایا ہے۔ ارسطو کی بے شمار تصانیف میں سیاسیات (Polity) اس کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ یہ کتاب محض پولیٹکل سائنس تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی اداروں کے ارتقاء کے فطری نظام، ایک مثالی سماجی نظم کی تشکیل موجودہ سماجی سیاسی اشکال اور اداروں کی درجہ بندی اور اُن کے تجزیہ کے مباحث شامل ہیں۔ سماجی فکر میں ارسطو کا مقام بہت بلند ہے کیونکہ اس نے سماجی ارتقاء، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، قانون اور تعلیم کے موضوعات پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

ارکان اور حصہ داران (Members and Share Holders): حصہ دار (Share Holder) سے وہ شخص مراد ہے جس نے کمپنی سے حصص خریدے ہوں اور ممبر سے مراد وہ شخص ہے جس کا نام ممبروں کے رجسٹر میں درج ہو اور وہ شخص مراد ہے جس نے میمورنڈم آف اسوسی ایشن پر دستخط کیے ہوں۔ عام طور پر کمپنی لاء کے تحت ممبر اور حصہ دار (Share Holder) کے ایک ہی معنی ہیں۔ خصوصاً ایسی کمپنی جس کا سرمایہ صرف حصص پر مبنی ہو اس کا ہر حصہ دار (Share Holder) ممبر کہلاتا ہے البتہ ایسی کمپنی جو لمیٹڈ گارنٹی رکھتی ہو یا جو ان لمیٹڈ (Unlimited) ہو اس میں ہر ممبر کا حصہ دار (Share Holder) ہونا ضروری نہیں ہے اس لیے کہ ایسی کمپنی کا ممبر اس وقت بن جاتا ہے جب وہ کمپنی

کا ممبر ہونے کے لیے آمادہ ہو۔ ایسے شخص کو مزید کسی درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس کے نام کوئی حصہ (Share) مختص کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کمپنی کے رجسٹریشن کے بعد وہ شخص ممبر بن جاتا ہے وہ ڈائرکٹرز جو رجسٹرار کمپنی کے سامنے دستخط کرتے ہیں اور مطمئن کرتے ہیں کہ وہ لازمی حصص (Qualifying Shares) خریدیں گے انھیں بھی کمپنی کے رجسٹریشن کے بعد کمپنی کا ممبر سمجھا جائے گا۔ کمپنی لاء میں یہ تو تعریف نہیں کی گئی کہ کونسا شخص ممبر بن سکتا ہے لیکن وہ شخص جو ممبر بنتا ہے وہ کمپنی سے ایک قسم کا معاہدہ کرتا ہے اس لیے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہر وہ شخص کمپنی کا ممبر بن سکتا ہے جو قانون معاہدہ کے تحت معاہدہ کرنے کا مجاز ہو۔ ایک نابالغ شخص کسی کمپنی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ ایک کمپنی دوسری کمپنی کی ممبر بن سکتی ہے۔

ایک ممبر کسی کمپنی کا ممبر باقی نہ رہے گا:

(1) اگر اس نے اپنے حصص کو دوسرے شخص کو فروخت کر دیا ہو اور اس دوسرے شخص کا نام کمپنی کے رجسٹر آف ممبرز میں درج ہو۔

(2) اگر سود یا دیگر ادا شدنی رقوم کی عدم ادائیگی کی بناء پر کمپنی کی جانب سے حصص کی ضبطی عمل میں آئی ہو۔

(3) اگر اس ممبر نے اپنے حصص کمپنی کو واپس کر دیے ہوں۔

(4) اگر اس نے پراسپکٹس میں کوئی غلط بات درج کی جانے کی وجہ سے اپنی رکنیت کے معاہدے کو فسخ کر دیا ہو۔

(5) اگر کمپنی ختم یا تحلیل ہو گئی ہو۔

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: یہ بارھویں صدی ہجری کے نامور اور جلیل القدر عالم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (1114-1176ھ) کی معرکۃ الآرا اور مہتم بالشان تصنیف ہے اس کا اصل موضوع خلفائے راشدین خصوصاً شیخین (حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی خلافت کی اثبات ہے جس سے اسلام میں صحابہ کرام کا درجہ و مرتبہ ان کے فضائل و مناقب اور حقوق وغیرہ پوری طرح واضح ہوگئے ہیں اس سلسلہ میں حدیث تفسیر اور کلام کے متعدد نکات و معارف بھی زیر بحث آئے ہیں۔ علاوہ ازیں خلافت کی حقیقت و اہمیت اسلام کے اصول عمران و تمدن اور اسلامی نظریہ سیاست و حکومت پر نہایت محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔

گو کتاب مقصد اہل سنت و الجماعت کے نقطہ نظر کی توثیق و اثبات ہے تاہم ایسے نزاعی مسئلہ میں بھی مصنف نے بڑا سلجھا ہوا معقول اور معروضی انداز اختیار کیا ہے اور کہیں غیر جانبدارانہ رنگ نہیں آنے دیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے دلائل تحقیق اور انصاف کے ساتھ لکھا ہے، اس بنا پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا یہ بجا خیال ہے کہ اس موضوع پر پورے اسلامی لٹریچر میں ایسی مفید اور عمدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اور چار جلدوں میں چھپی تھی اس کے اردو اور عربی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

ازالہ حیثیت عرفی (Defamation): حیثیت عرفی کسی شخص کی اس حیثیت کو کہتے ہیں جو اس کو سماج میں حاصل ہو یہ حیثیت اس کو خاندانی وجاہت یا عہدے یا کسی کار خیر کے کرنے اور اس کی نیک چلنی یا کوئی اور کام کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس حیثیت عرفی کو قائم و برقرار رکھنے کا شخص مذکور کو قانونی حق حاصل ہے اور دیگر اشخاص کا یہ فرض ہے کہ اس شخص کی اس حیثیت عرفی کو کسی فعل یا الفاظ سے کسی قسم کی ٹھیس نہ پہنچائے۔ اس مخصوص ٹارٹ (Tort) کا نام ازالہ حیثیت عرفی ہے۔ اس شخص کو جس کی توہین ہوئی ہو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مرتکب ٹارٹ (Tort) کے خلاف دیوانی دعویٰ کر کے ہرجانہ پائے۔

ازالہ حیثیت عرفی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تحریری اور دوسرا تقریری۔

ازالہ حیثیت عرفی تحریری (Libel): جب کبھی کوئی شخص تحریر یا تصویر یا تمثیل کی صورت میں کوئی چیز بغیر جواز کے شائع کرے اور جس سے یہ احتمال ہو کہ جن کے پاس وہ پہنچے گی ان کے دل میں مدعی کے متعلق خیالات حقارت پیدا ہوں گے اور اس سے مدعی کی نیک نامی متاثر ہوگی اور اس کا امکان ہوگا کہ اس سے مدعی کے کاروبار متاثر ہوں گے یا اس کے پیشہ کو نقصان پہنچے گا تو اسے ازالہ حیثیت عرفی تحریری کہا جاتا ہے۔ ازالہ حیثیت عرفی ٹارٹ بھی ہے اور جرم بھی۔

ازالہ حیثیت عرفی تحریری و تقریری کا فرق (Difference between Libel and Slander):
پہلے قسم کے ازالہ حیثیت عرفی میں مدعی پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی

خاص نقصان کو ثابت کرے البتہ دوسری قسم میں جب تک کسی نقصان کو ثابت نہ کرے مدعی کو کامیابی نہ ہوگی۔ سوائے اس کے کہ الفاظ استعمال شدہ سے مدعی پر کسی جرم کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو۔ یا یہ بتلایا گیا ہو کہ مدعی کسی ایسے متعدی مرض میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے میل جول کے قابل نہ رہا ہو یا استعمال شدہ الفاظ مدعی کے کاروبار یا پیشہ سے متعلق ہوں اور جس سے اس کو نقصان پہنچا یا جب کہ مدعیہ عورت یا لڑکی ہو اور یہ ظاہر کیا جائے کہ وہ آوارہ یا بدچلن ہے۔ متذکرہ بالا صورتوں میں خاص نقصان ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔

ازالہ حیثیت عرفی تقریری (Slander): جب کبھی کوئی شخص بذریعہ بیان زبانی بغیر وجہ یا عذر جائز کے مدعی کے متعلق شائع کرے یہ احتمال ہو کہ جن کے پاس وہ پہنچے گا ان کے دل میں مدعی کے متعلق خیالات حقارت و تنفر پیدا ہوں گے اور اس کی ذات یا کاروبار کو نقصان پہنچے گا تو بیان ازالہ حیثیت عرفی تقریری (Slander) کہلائے گا۔

استحصالِ اطفال (Child Abuse): ایک عام اندازہ کے تحت آج تقریباً 37 فیصد افراد ہندستان میں چودہ سال سے کم عمر ہیں لیکن "بچہ" کی تعریف اس سے کچھ وسیع ہے۔

بھارت کے جے۔ جے۔ ایکٹ (Juveniele Justice Act, 1986) کے مطابق گرل چائلڈ ہر اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکی کو کہا ہے۔ اس کے باوجود آئی۔ پی۔ سی کے تحت پندرہ سال کو بچپن کی سرحد مانا گیا ہے۔ اقوام متحدہ نے اٹھارہ سال تک کی عمر کو بچپن کہا ہے۔ بچہ مزدوری کے سلسلے میں بھی کئی پیمانے ہیں۔

1989 میں جنرل اسمبلی میں بچوں کے حقوق کے سلسلے میں کنونشن تیار کیا گیا اور فوراً منظور کر لیا گیا۔ اسی وقت کل ملا کر 61 ملکوں نے اس پر دستخط کر دیے۔ یہ 54 نکاتی کنونشن بچوں کو بنیادی تحفظ مہیا کراتا ہے لیکن جو بچے اس کے دائرے سے باہر رہ جاتے ہیں ان کا استحصال کیا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے تیسری دنیا کے ممالک میں سے اکثر میں بچوں کو تحفظ فراہم نہیں کیا جاتا گو کہ ان میں سے کئی نے اس قرارداد پر دستخط کیے ہوئے ہیں۔

استحصالی رویہ کو سمجھنے سے پہلے قرارداد کے اہم نکات کو سمجھنا ضروری ہے۔ مثلاً

- ہر بچے کو اپنی زندگی بچانے اور زندہ رہنے کا حق ہے۔
- ہر بچے کو نام اور وطنیت ملنی چاہیے۔
- تمام قانونی معاملات بچے کی بہتری کے حساب سے طے ہونا چاہیے۔
- حقوق دینے میں کوئی جانب داری نہیں برتی جانی چاہیے۔
- بچے کو عام حالات میں والدین کے ساتھ رہنا چاہیے۔
- بچے کے محافظ ماں باپ ہیں لیکن حکومت اس میں مدد کرے گی۔
- حکومت بچوں کو جسمانی اور دماغی بدسلوکی اور استحصال سے بچائے گی۔
- بے خان ماں بچوں کو حکومت ایک کنبہ فراہم کرے گی۔
- معذور بچوں کو خاص سہولتیں دی جائیں گی۔
- معالجاتی اور تعلیمی خدمات حکومت کا فریضہ ہوں گی۔
- بچے کو کھیلنے کودنے اور آرام کا وقت ملے گا۔
- حکومت بچوں کو معاشی تحفظ دے گی اور مالی استحصال سے بچائے گی۔
- بچوں کی تجارت نہیں ہوگی۔
- بچوں کو سزائے موت اور دوسری سخت سزائیں نہیں ہوں گی۔
- بچے قید کا زمانہ بڑے لوگوں کے ساتھ نہیں بلکہ بچوں کے ساتھ ہی گزاریں گے۔
- بچوں کو تشدد اور دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہونے سے بچایا جائے گا۔
- قبائلی اور اقلیتی گروہوں کے بچوں کو ان کی اپنی پسند کا ماحول ہر ممکن حد تک فراہم کیا جائے گا۔
- جو بچے استحصال کا شکار ہو چکے ہیں ان کی آبادکاری کا ہر ممکن پروگرام بنایا جائے گا۔
- اگر بچے کو قانونی سزا دی جائے گی تو وہ ایسی نہیں ہوگی جو کہ توہین آمیز ہو یا عزت نفس کو مجروح کرے۔

ان سب سارے نکات کے باوجود بچوں کو کئی طرح سے استحصال کا شکار بنایا جاتا ہے۔ ان کے لیے کئی مشکل حالات موجود ہیں۔ مثلاً :

(1) بچوں کو محرومیت اور غلامی۔

(2) بچہ مزدوری۔

(3) بچہ کی سڑک نشیں سرگرمیاں (Street and Working Children)۔

(4) بچے کی گھروں میں نوکری۔

(5) بچیوں سے جانب دارانہ سلوک۔

(6) بچوں کا جنسیاتی استحصال۔

(7) بچہ جسم فروشی اور پورنوگرافی۔

(8) دہشت گردی اور اسلحہ چلانے کی ٹریننگ اور ان کا دہشت گرد کے طور پر استعمال کرنا۔

ان سب کے علاوہ عنفوانِ شباب میں قرار پانے والے حمل اور حمل میں ہی قتل کردیے جانے والی بچیوں کی موت کو بھی پوری طرح سے استحصال ہی کی مد میں ہی رکھنا چاہیے۔

بھارت سرکار شروع سے ہی بچوں کے لیے اپنے فرائض سے آگاہ رہی ہے۔ 22ر اگست 1974 کو سرکار نے بچوں کے لیے ایک مکمل پالیسی کا اعلانیہ جاری کیا۔ اس میں بچوں کے لیے چائلڈ ویلفیئر بورڈ قائم کردیا گیا۔ جس میں استحصال اور بے توجہی کا شکار بچوں کے لیے کئی قسم کی خدمات شروع کی گئی۔ یہ پالیسی عالمی ترجیحات اور ہندستانی پس منظر کے مطابق بنائی گئی لیکن زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ بچے نہ تو ووٹ بینک ہیں اور نہ ہی اپنی یونین بنا سکتے۔ اس لیے ان کے پاس سیاسی طاقت نہیں ہے۔ اسی لیے مختلف سیاسی جماعتیں ان کو نظرانداز کرتی ہیں۔

ان کا استحصال پورا سماج کرتا ہے افسوس تو یہ ہے کہ اس میں والدین بھی شامل ہیں۔

تیسری دنیا میں اکثر بچوں کے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ لڑکیاں کبھی کبھی پیدائش سے پہلے ہی مار دی جاتی ہیں۔ بچوں کو موت کے علاوہ گھٹیا زندگی، خراب صحت اور بھاری کام سماج اور خاندان کی طرف سے ورثے میں ملتا ہے۔ اس طرح پس ماندہ ممالک کے بچے ہر طرح سے پستے ہیں۔

ہندستان میں چونکہ کنبہ ابھی تک کافی مضبوط بنیادی اکائی ہے اس لیے بچے کو نام وظیفہ اور خاندان عموماً ملتا ہی ہے لیکن بڑھتی ہوئی دہشت گردی بے وطنی اور ہجرت کی وجہ سے آج کل مشکلات پیدا ہوتی جارہی ہیں۔

بچوں میں محرومیت اور غلامی دو بہت بڑے مسائل ہیں جن پر غور تو کیا جاتا ہے مگر ان کے لیے ابھی تک زیادہ کچھ نہیں کیا گیا۔ مثلاً قالین بافی کا بچہ غلامی سے تعلق ہے اس کے علاوہ اسٹون کریشر میں کام کرنے خاندان اور ان کے بچے بھی غلام یا رہن شدہ لوگ ہوتے ہیں۔ سوامی اگنی ویش اور کیلاش ستیارتھی وغیرہ نے اس سلسلے میں رضاکارانہ تنظیموں کے ذریعہ بہت کام کیا ہے۔ ان کے کام کو مقامی ملکی اور بین الاقوامی طور پر بہت اہمیت دی گئی ہے لیکن بچہ غلامی ختم نہیں ہوئی۔

بچہ مزدوری بچہ غلامی سے ملتی جلتی ہی ہے۔ غیر سرکاری رپورٹ کے مطابق بھارت میں تقریباً ساڑھے چھ کروڑ بچے بال مزدور ہیں جن میں سے تقریباً سب ہی غیر منظم (Unorganized) مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ یونی سیف نے دس کروڑ ہندوستانی بچوں کے اسکول نہ جانے کا سبب کسی نہ کسی حد تک بال مزدوری کا شکار مانا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ ہندستان بال مزدوری کا سب سے بڑا سپلائر ہے۔ ان غیر اسکولی بچوں میں اکثریت لڑکیوں کی ہے جو باہر کے ساتھ ساتھ گھر میں بھی مصروف رہتی ہیں۔

سڑک نشیں بچے اس قسم کے بچے ہیں جن کو غیر رسمی مزدور سمجھا جاتا ہے۔ سڑک نشیں بچے (Street and Working Children) کہلاتے ہیں۔ ان کی موجودگی کو شہروں کی طرف ہجرت اور گاؤں اور قصبوں کے شہر بن جانے کے عمل سے جوڑا جاتا ہے۔ اکثر یہ لاوارثوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں بھیک مانگنا اور جسم فروشی بھی ان میں عام ہوتی ہے۔ یہ سڑکوں فٹ پاتھوں اور جھگیوں میں رہتے ہیں۔ بالغ دنیا میں یہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتے ہیں۔

گھروں میں گھریلو کام کاج کے لیے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں رکھے جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کی جاتی ہے۔ ویسے بھی بچے کا کام کرنا اسکول نہ جانا اور کھیل نہ سکنا اپنے آپ میں ہی استحصال ہے۔ ان بچوں کے ساتھ بے رحمانہ مارپیٹ کی ہی نہیں بلکہ جسمانی استحصال کی خبریں بھی اکثر چھپتی رہتی ہیں۔ سڑک نشیں بچے بھی

استحصال کے شکار بچوں کی ایک قسم ہیں۔ جو ہر بڑے شہر میں نظر آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ استحصالی عمل میں ماں باپ کا کردار بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بچیوں کے سلسلے میں غیر منصفانہ رویہ بھی والدین ہی اپناتے ہیں۔ جس کو معاشرے کی حمایت بھی حاصل ہوتی ہے۔ بیٹیوں کی شیر خواری میں جان سے مار کر کبھی کسی بارات کی میزبانی نہ کرنے پر فخر کرنا ہمارے ملک میں عام ہے۔ پڑھے لکھے لوگ جنس کی تحقیق کرواکر کوکھ میں ہی لڑکیوں کو مار دیتے ہیں۔ بچپن کی شادی اور بچپن کی بیوگی کے ذریعہ لڑکیوں کا بچپن چھین لینا ہمارے ملک میں روایت رہی ہے۔ آج بھی شوکاسی وغیرہ میں بچیوں سے کام کروانا اور لڑکوں کو اسکول بھیجنا عام ہے۔ غذا اور تعلیم میں جانب داری تقریباً ہر گھر میں نظر آجاتی ہے۔ یہ مانا جاسکتا ہے کہ مختلف قسم کے استحصال کا شکار لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

بچہ طوائفیت اور ان کی عریاں فوٹوگرافی آج کی صنعتی دنیا کی ایک انڈسٹری بن چکی ہے۔ طوائف کا پیشہ اختیار کرنے والی کافی عورتیں اپنی لڑکیوں کو بچہ طوائفیت میں ملوث کروادیتی ہیں۔ طوائفیت کے علاوہ آج کل پورنوگرافی کا کام کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی مدد سے ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کے فحش کھیل جن میں بچیوں کی تصویریں ہوتی ہیں بہت مقبول ہورہے ہیں۔

ان سب سے زیادہ تخریب کار ہے دہشت گردی میں بچوں کا اشتراک۔ اس میں بچوں کے کچے ذہنوں کو ایک خاص قسم کی ذہنیت کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اور مرنے کے لیے توپوں کے سامنے کھڑا کردیا جاتا ہے۔ اس سے کچھ لوگوں کے سیاسی مقاصد پورے ہوتے ہیں لیکن یہ بچوں کے حق میں یہ بدترین قسم کا استحصال ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ بچوں کی برین واشنگ مذہب کے نام پر اور اکثر مذہبی اداروں میں ہوتی ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ بہترین قسم کے حقوق کے مستحق سمجھے جانے والے بچے درحقیقت بدترین استحصال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں پالیسیاں بنائی گئیں۔ ادارے قائم کیے گئے پروگرام شروع کیے گئے، بجٹ بنائے گئے لیکن زیادہ کچھ نہیں ہوسکا اس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) ماں باپ کی نظر میں اولاد کی کم اہمیتی

(2) غریبی اور مفلوک الحالی کی انتہا۔

(3) سرمایہ دارانہ نظام جس میں غریبوں کی کسمپرسی کا کوئی تدارک نہیں ہوتا۔

(4) دھماکہ خیز اضافہ آبادی

(5) سیاسی انتشار خاص طور سے تیسری دنیا کے ممالک میں جاری مستقل سیاسی اتھل پتھل۔

ان سب عوامل کے سبب ان مسائل کا فی الحال کوئی کافی و شافی حل نہیں نکل سکا ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں میں مثبت رائے عامہ بنے گی ہے۔ لیکن عملی طور پر صورت حال پہلے جیسی ہی ہے۔

استحصال بالجبر (Extortion): کوئی شخص اگر بالارادہ کسی دوسرے شخص میں خود سے یا کسی اور شخص کو نقصان پہنچانے کا خوف پیدا کرے اور اس کے ذریعہ سے بددیانتی سے شخص مخوف کو کسی جائداد یا کفالت المال یا کسی شے کے جو کفالت المال بنائی جاسکے، کسی شخص کے حوالہ کرنے کی تحریک کرے وہ استحصال بالجبر کا مرتکب ہوگا۔

نقصان پہنچانے کا ایسا خوف پیدا کرنا جس کی وجہ سے وہ شخص جس کو ڈرایا جائے کوئی مال حوالہ کرے اور اگر اس تخویف اور اس کی وجہ سے مال کی حوالگی وقوع میں آئے تو یہ جرم استحصال بالجبر ہوجاتا ہے۔

کسی شخص کو دھمکی یا خوف دلاکر اس سے کوئی چیز بددیانتی سے حاصل کی جائے یا کسی دوسرے شخص کے حوالے کروائی جائے یا اس شخص سے ایسا کام کروایا جائے جس سے اس کو مالی یا جسمانی نقصان پہنچے تو یہ سب چیزیں کروانے والا جرم کا مرتکب ہوگا۔

مثلاً زید بکر کو یہ دھمکی دے کہ وہ اسے روپیہ دے ورنہ وہ ایک ایسی تحریر شایع کردے گا جس سے اس کی حیثیت عرفی متاثر ہوگی اور بکر سے روپیہ دینے کا مطالبہ کرے تو زید استحصال بالجبر کا مرتکب ہوگا۔

زید بکر کو ضرر شدید پہنچانے کی دھمکی دے کر سادے کاغذ پر اس کے دستخط یا مہر حاصل کرلے اور بکر اس کاغذ پر دستخط کرکے زید کے حوالے کردے تو یہ استحصال بالجبر ہوگا کیوں کہ اس صورت میں وہ کاغذ جس پر اس طرح دستخط ہوئے کفالت المال ہوسکتا ہے۔

عدالت کو ہر مقدمہ کے حالات کے لحاظ سے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ مضرت جس کی دھمکی دی گئی تھی وہ ایسی تھی یا نہیں کہ جس سے وہ اثر پیدا ہوسکتا جس کے پیدا کرنے کی ملزم کی نیت تھی اور حالات کے لحاظ سے شخص مخوف کو واقعی یہ اندیشہ پیدا ہو کہ اس کی تعمیل نہ کرنے کی صورت میں مضرت کا پہنچنا یقینی تھا۔ جس شخص کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی گئی ہو اس کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ اس

نے مال اس لیے حوالہ کیا کہ اس پر خوف طاری ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ کا سوال ہے اور اس کے متعلق رائے قائم کرتے وقت مقدمہ کے کل حالات اور واقعات پر غور کرنا ضروری ہے۔ خوف ایسی نوعیت کا ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے مخص مخوف کو آزادی حاصل نہ رہے اور اس کے زیر اثر وہ ایسے فعل پر راضی ہوجائے جس پر وہ اس صورت میں رضامند نہ ہوتا اگر اس پر اس خوف کا اثر نہ ہوتا۔

کسی شخص کو یہ دھمکی دے کر روپیہ حاصل کرنا کہ اس کو نوکری سے موقوف کرا دیا جائے گا، استحصال بالجبر ہے۔ کسی ملزم نے اگر ایک شخص کو گرفتار کرکے حبس بے جا میں رکھا اور اس کو دھمکی دی کہ وہ اس وقت تک رہا نہ کیا جائے گا جب تک دو سو روپیہ ادا نہ کرے اور اس شخص نے شخص ثالث سے دو سو روپیہ قرضہ لے کر ملزم کو دے دیے تو اس صورت میں ملزم استحصال بالجبر کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

استصواب (Reference): اگر کوئی حاکم فوج داری ضلع یا سیشن جج مناسب سمجھے تو کسی قانونی بحث کے متعلق جو کسی مقدمے میں پیدا ہو ہائی کورٹ سے استصواب کر سکے گا یا مقدمہ کا فیصلہ اس شرط پر کرے گا کہ اس کا نفاذ ہائی کورٹ کے فیصلے پر منحصر ہو جب کسی امر کی بابت ہائی کورٹ سے استصواب کیا جائے تو ہائی کورٹ بعد فیصلہ اپنی تجویز کی نقل اس عدالت میں بھیج دے گا جس نے استصواب کیا ہو اور عدالت اس مقدمے کا ہائی کورٹ کی تجویز کی مطابقت میں فیصلہ کرے گی۔

استصواب رائے (Refrendum): استصواب رائے عوامی انتخاب کا ایک ایسا طریقہ کار ہے جس کے مطابق کسی مخصوص سیاسی مسئلہ پر رائے دہندگان کی رائے معلوم کی جائے تاکہ براہ راست عوام کی رائے سے اس کا فیصلہ کیا جاسکے۔ مثلاً قومی حکومت یا مجلس قانون ساز سے اگر کسی مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہوجائے اور یہ محسوس کیا جائے کہ اس مسئلہ پر عوام کا نقطہ نظر بھی جاننا ضروری ہے تو اس صورت میں جو رائے شماری ہوگی اسے استصواب رائے (ریفرنڈم) کہا جائے گا۔ بعض ملکوں میں دستور میں کسی بھی قسم کی تبدیلی استصواب رائے کے ذریعہ عوام کی رضامندی لے کر ہی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً آئرلینڈ اور آسٹریلیا کے دساتیر استصواب رائے کے ذریعہ ہی تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔ انتخاب کا یہ طریقہ کار محض دستوری مسائل تک ہی محدود نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ میں نہ صرف دستور میں تبدیلی کے لیے بلکہ اس قانون کے لیے بھی استصواب رائے ضروری ہے جس کے لیے تیس ہزار شہری اصرار کریں۔

استصواب رائے کی تین اقسام ہیں۔ ایک لازمی، دوسرے اختیاری، تیسرے رضاکارانہ۔ لازمی استصواب رائے سے مراد یہ ہے کہ کسی دستور کے بعض حصے ایسے ہوسکتے ہیں جن سے متعلق قانون سازی کے لیے استصواب رائے ضروری ہو۔ ایسی صورت میں متعلقہ قانون منظور یا مسترد ہوسکتا ہے۔ مثلاً امریکی دستور میں ترمیم و تنسیخ لازمی استصواب رائے سے تعلق رکھتی ہے۔

اختیاری استصواب رائے سے مراد یہ ہے کہ مقننہ کے بنائے ہوئے کسی بھی قانون کو جب معتد بہ رائے عامہ اسے عدالت میں چیلنج کردے تو استصواب رائے کرلیا جاسکتا ہے۔

رضاکارانہ استصواب رائے سے مراد یہ ہے کہ مقننہ کسی بھی مسئلہ کو استصواب رائے کے ذریعہ رائے دہندگان کے سامنے پیش کر سکتی ہے تاکہ وہ متعلقہ مسئلہ کو حل کرسکیں یا اس کی بابت اپنی رائے دے سکیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکا اور سوئٹزرلینڈ میں استصواب رائے کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ دولت مشترکہ کے بیشتر ملکوں میں بھی دستوری ترمیم کے لیے استصواب رائے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ پاکستان میں جنرل محمد ضیاء الحق استصواب رائے ہی کے ذریعہ صدر منتخب ہوئے تھے۔ تاہم استصواب رائے کا استعمال عام حالات میں ہندوستان اور برطانیہ میں نہیں کیا جاتا۔

استصواب، نگرانی و تجویز ثانی (Reference, Revision and Review):

استصواب (Reference): عدالت خود یا کسی فریق کی درخواست پر ایسے مقدمہ کو جس میں اس کی صدرہ ڈگری کا مرافعہ نہ ہوسکتا ہو یا تعمیل ڈگری میں کوئی بحث قانونی یا رواج کے متعلق پیدا ہو اور اس عدالت کو شبہ ہو تو وہ مجاز ہے کہ مختصر واقعات لکھ کر مع اپنی رائے کے بغرض فیصلہ ہائی کورٹ میں پہنچے اور کارروائی مقدمہ کو جاری رکھے یا ملتوی کردے۔ لیکن جواب کے حصول تک فیصلہ صادر نہ کرے ہائی کورٹ کو مجاز ہے کہ استصواب کو ضروری ترمیم کے لیے اس عدالت تحت میں

واپس بھیجے اور فریقین کے عذرات سماعت کرکے اس استصواب کی نسبت فیصلہ صادر کرے اور اس کی نقل استصواب کنندہ عدالت میں بھیجے جو اس کے متعلق فیصلہ کرے گی خرچہ استصواب جزو خرچہ مقدمہ سمجھا جائے گا۔

نگرانی (Revision): امور ذیل ظاہر ہوں تو ہائی کورٹ کو مجاز ہے کہ مثل مقدمہ کی جس کا مرافعہ ہائی کورٹ میں نہ ہوسکتا ہو اور جس کا عدالت ماتحت نے فیصلہ کیا ہو طلب کر سکے اور مناسب حکم صادر کر سکے۔

(الف) عدالت نے وہ اختیار استعمال کیا ہو جو قانوناً حاصل نہ تھا یا

(ب) وہ اختیار استعمال میں نہ لایا گیا ہو جو حاصل تھا یا

(ج) عدالت ماتحت نے اختیار کا استعمال خلاف قانون کیا ہے یا کوئی اہم غلطی کی ہو۔

تجویز ثانی (Review): ذیل کے وجوہ کی بنیاد پر ہر ڈگری یا حکم کی تجویز ثانی ہوسکے گی خواہ ڈگری یا حکم عدالت ابتدائی کا ہو یا مرافعہ کا۔

(الف) جبکہ کوئی جدید اور اہم امر یا شہادت کا علم ہو جس کا علم صدور ڈگری یا حکم تک باوجود کافی کوشش کے نہ ہوا ہو یا جو نہ پیش کی جاسکتی ہو یا

(ب) جبکہ بادی النظر میں کوئی غلطی یا سہو ایسا ظاہر ہو کہ اس سے درخواست گزار کو نقصان پہنچا ہو۔ یا

(ج) جبکہ کوئی اور کافی وجوہ ہوں۔

اس مدت کا اخراج جو قانونی کارروائی میں گزرے: میعاد سماعت جو کسی مقدمہ مرافعہ یا درخواست کے لیے مقرر ہے اس کے محسوب کرنے میں جس دن سے کہ وہ میعاد شمار ہونی چاہیے وہ خارج کیا جائے گا۔ مرافعہ درخواست اجازت مرافعہ اور درخواست تجویز ثانی کی میعاد کے شمار کرنے میں وہ دن جب فیصلہ صادر ہوا ہو اور وہ مدت خارج کی جائے گی جو ڈگری میں سزا یا حکم کی جس کا مرافعہ یا تجویز ثانی کی گئی ہو یا جس کا قانوناً پیش کرنا ضروری ہو نقل حاصل کرنے میں گزرے۔

جب کسی ڈگری کا مرافعہ یا اسکی تجویز ثانی کی درخواست پیش ہو تو وہ مدت بھی خارج کی جائے گی جو اس فیصلہ کی نقل حاصل کرنے میں گزرے وہ مدت بھی خارج کی جائے گی جو اس فیصلہ کی نقل حاصل کرنے میں گزرے جس پر وہ ڈگری بنی ہو۔

جو میعاد درخواست فیصلہ نالش کے لیے مقرر ہے اس کے شمار کرنے میں وہ مدت خارج کی جائے گی جو اس فیصلہ کی نقل حاصل کرنے کے لیے ضروری ہو۔

اس میعاد کے شمار میں جو کسی مقدمہ کے لیے مقرر کی گئی ہو وہ مدت خارج کی جائے گی جس میں مدعاعلیہ یا منجملہ ایسے مدعاعلیہ کے جس کی شرکت کے بغیر مقدمہ رجوع نہ ہوسکے ایک یا ایک سے زیادہ مدعاعلیہم ہندوستان کے یا ان علاقہ جات کے باہر رہتے ہوں جن کی ڈگریوں کی تعمیل ہندوستان میں کسی قرارداد کی بناء پر ہوسکتی ہو یا احکام صرف مدعاعلیہ سے متعلق ہوں اور دعویٰ مدعی بمقابلہ مدعاعلیہ میں میعاد کا آغاز نہ ہوگی مدعی جو ہندوستان کے باہر رہتا ہو اپنے مختار مجاز کے ذریعہ پیروی کرسکتا ہے لیکن جب کہ وہ بالارادہ ہندوستان کے باہر رہتا ہو تو میعاد رک نہیں سکتی یہ احکام اس مدعی سے متعلق نہیں ہے جو بوجہ حبس دوام ہندوستان کے باہر رہتا ہو۔

اس مدت کا اخراج نیک نیتی سے کسی ایسی عدالت میں کارروائی کی جائے جسے اختیار سماعت حاصل نہ ہو۔

اس میعاد کی سماعت میں جو کسی مقدمہ کے لیے مقرر کی گئی ہو وہ مدت خارج کی جائے گی۔ جس میں مدعی بہ تمدی قرار واقعی مدعاعلیہ کے مقابلہ میں دوسری کارروائی دیوانی کی پیروی میں عدالت ابتدائی یا عدالت مرافعہ میں مصروف رہا ہو بشرطیکہ وہ کارروائی اس بنائے دعویٰ پر مبنی ہو نیک نیتی سے ایسی عدالت میں کی گئی ہو جو بوجہ نقص اختیار سماعت یا اس طرح کے اور اسباب سے اس کی سماعت نہ کرسکتی ہو۔

اس میعاد کے شمار میں جو کسی درخواست کے لیے مقرر کی گئی ہو وہ مدت خارج کی جائے گی جس میں وہ درخواست گزار تن دہی سے قرار واقعی دادرس کے لیے اس فریق کے مقابلہ میں دوسری کارروائی دیوانی عدالت ابتدائی یا عدالت مرافعہ میں کرتا رہا ہو بشرطیکہ کارروائی مذکور نیک نیتی سے ایسی عدالت میں کی گئی ہو جو بوجہ نقص اختیار سماعت اور سبب کے اس کی سماعت نہ کرسکتی ہو۔

جس عرصہ تک مقدمہ یا درخواست سابق دائر رہی ہو اس کے خارج کرنے میں اس مقدمہ کے رجوع کرنے اور درخواست دینے کا دن اور وہ دن جب کارروائی ختم ہوئی ہو دونوں محسوب ہوں گے۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

احکام صدر کے اغراض کے لیے مدعی اور اس درخواست گزار کے متعلق جو کسی مرافعہ پر اعتراض کر رہا ہو یہ سمجھا جائے گا کہ کارروائی کر رہے ہیں حتی مابعد کے استعمال بیجا فریقین یا استعمال بیجا بنابائے تحقیقات جاری ہوں اور فریقین اس کے فیصلے کے لیے چارہ کار قانون میں معروف ہوں تو یہ قرار دینا کہ اس وقت اس کی میعاد جاری رہے گی اصول میعاد کے خلاف ہوگا۔

اس میعاد کے شمار میں جو کسی مقدمہ یا درخواست تعمیل ڈگری کے لیے کی گئی ہو جب مقدمہ یا ڈگری کی تکمیل حکم امتناعی یا کسی اور حکم کی بنا پر ملتوی کی گئی ہو وہ میعاد جب تک حکم امتناعی قائم رہے اور وہ دن جب وہ جاری اور منسوخ ہوا ہو خارج کیا جائے گا۔

جب کسی قانون کی رو سے مدعی پر لازم ہو کہ مقدمہ کسی عدالت میں رجوع کرنے سے قبل کسی اور محکمہ میں اس کے متعلق کارروائی کرے یا اجازت حاصل کرے یا مدعاعلیہ کو نوٹس دے تو وہ مدت جو اس کارروائی میں یا اجازت حاصل کرنے میں گزرے یا جو اس کے لیے قانون میں معین ہو میعاد کے شمار میں خارج کی جائے گی۔

جو مقدمہ حصول قبضہ کے لیے ایسے مشتری کی طرف سے ہو جس نے کسی نیلام صیغۂ تعمیل ڈگری میں جائداد خریدی ہو اس کی میعاد شمار کرنے میں وہ مدت جس میں فسخ نیلام کی کارروائی ہوتی رہی ہو محسوبانہ ہوگی۔

استعمار، استعماریت : استعماریت (Colonialism) کے عام معنی ایک ملک کے ذریعہ دوسرے ملک یا علاقہ کو بتدریج اور منظم طریقہ سے سیاسی اور اقتصادی طور پر محکوم بنانے یا ایسے محکوم علاقوں کو برقرار رکھنے کی پالیسی کے ہیں۔ اس معنی میں نوآبادیوں یا محکوم علاقوں کا وجود قدیم زمانہ سے ملتا ہے۔ ایشیا میں عربوں، منگولوں اور چینیوں کی توسیع، استعماری نوعیت کی تھی۔ خصوصی طور پر استعمار سے مراد یورپی طاقتوں کی پندرھویں اور سولھویں صدی کی جغرافیائی دریافتوں کے بعد سے سمندر پار علاقوں میں جنگ، فتوحات اور خالی علاقوں میں نوآبادکاری کی کوششوں سے ہے۔ استعماری طاقتیں نئے علاقوں کی تلاش، نوآبادکاری اور جنگ کے حادثوں سے استعماری طاقتیں بن گئیں۔ اس سلسلے میں اسپین اور پرتگال نے نوآبادکاری کی ابتدا کی۔ انگلستان، فرانس اور ہالینڈ نے ان کے مقبوضات پر دست درازی کی اور یہ ممالک اپنی استعماری سلطنت وسیع کرتے گئے۔ بعد میں ڈنمارک، ناروے اور سویڈن نے بھی معمولی علاقے حاصل کیے۔ یورپی استعمار انیسویں صدی کے خاتمہ تک اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا جس کے محرکات سیاسی اور اقتصادی دونوں تھے۔ ایشیا اور افریقہ میں یورپ کی استعماری توسیع کا محرک سامراجیت بھی تھی یعنی اندرون یورپ بڑی طاقتوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش میں سمندر پار مقبوضات کا حصول قومی طاقت کی نشانی اور اس کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ دوسری طرف یورپ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے صنعتی انقلاب کے پھیلنے اور قومی سرمایہ دارانہ نظام کے پھلنے پھولنے سے آزاد تجارت، سرمایہ کی نکاسی، خام مال کی فراہمی اور مصنوعات کی فروخت کے لیے منڈیوں کی تلاش ہوئی۔ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کے علاوہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں بلجیم، جرمنی، اطالیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکا اور جاپان نے بھی اہم نوآبادیاں حاصل کیں۔

استعماری تسلط اور استعماری حکومت کے جواز میں کئی طرح کے دلائل دیے گئے۔ مثلاً نوآبادکار ملک کے اپنے مفادات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ نوآبادی کی پسماندہ اور غیر مہذب قوم کی تنظیم، ان کے امور کی نگہداشت اور ان کی سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی و بہبود کا اخلاقی نصب العین۔ یا نوآبادکار ملک اپنے یہاں آبادی کی کثرت اور اقتصادی ترقی کے لیے خام مواد کی نایابی کی بنا پر مزید علاقے اور منڈیاں حاصل کرنے کا جواز پیش کرتا ہے مثلاً دونوں عالمی جنگوں کے درمیان جرمنی، اطالیہ اور جاپان کی توسیع، نوآبادیاتی نظام، پہلی عالمی جنگ کے بعد سے ٹوٹنا شروع ہوا اور دوسری عالمی جنگ کے بعد قومی آزادی کی تحریکوں اور اقوام متحدہ کی کوششوں سے دنیا کی بیشتر نوآبادیاں آزاد ہوچکی ہیں۔ درحقیقت استعماری ملکوں کی حیثیت صنعتی اور معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ اور ان کی تہذیب مشینی دور کی پیداوار تھی جبکہ نوآبادیاتوں کی معیشت پسماندگی سے دوچار تھی اور زراعتی تھی جہاں نہ تو صنعتوں کا وجود تھا اور نہ ہی تعلیم کا دور دورہ۔ نوآبادیاتی علاقے محض حکمراں ممالک کی مصنوعات کے لیے منڈیوں اور خام مال کے رسد کا مرکز تھے۔

استعماری حکومت کے امتیازی خصائص مندرجہ ذیل ہیں:

(1) یورپی ملکوں یا یورپی نسل کے لوگوں سے آباد ملکوں کا دوسری نسل کے لوگوں خصوصاً ایشیائی و افریقی اقوام پر براہ راست سیاسی کنٹرول۔

(2) نوآبادی کے اندر ایک سفید فام حکمراں اقلیت کی بالادستی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(3) مقامی افراد پر مشتمل ایک وفادار نوکر شاہی جو حکمراں طاقت کے سیاسی، فوجی اور اقتصادی مفادات کی تکمیل اور ملکی وسائل کے استعماری استحصال میں مدد دیتی ہے۔

(4) نوآبادی میں سائنس و ٹکنالوجی پر مبنی مغربی تہذیب اور مقامی زراعتی اور جاگیردارانہ نظام سے وابستہ فرسودہ مشرقی تہذیب کے درمیان ٹکراؤ اور مغربی تہذیب کا تسلط۔

(5) نوآبادی کے عوام اور وسائل کا معاشی استحصال۔

(6) حکمراں اقلیت میں نسلی، تہذیبی اور اخلاقی برتری کا احساس اور مقامی آبادی کو ذہنی، اخلاقی، تہذیبی، علمی اور تکنیکی اعتبار سے پسماندہ اور محتاج رکھنے کا رویہ۔

جہاں ایشیا و افریقہ و لاطینی امریکا کے پسماندہ خطوں میں استعماری نظام ٹوٹ چکا ہے وہیں توسیع پسند طاقتوں نے نوآزاد ملکوں پر بالواسطہ سیاسی و اقتصادی تسلط جمانے کے لیے نئے طریقے اپنائے ہیں۔

استعمار نو : نئے استعمار (Neo-Colonialism) سے مراد استعمار کی بالواسطہ اور نئی شکلیں ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے باوجود سامراجی طاقتیں ایشیا و افریقہ اور لاطینی امریکا کے پسماندہ ملکوں کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اپنے زیراثر رکھنا چاہتی ہیں۔ مغربی طاقتوں نے اکثر ان سابق نوآبادیات کے عوام میں قومی آزادی کی تحریکوں کو اقتصادی ترقی کے غیر سرمایہ دارانہ راستوں کو اپنانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی ہے۔ "نیا استعمار" اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے طرح طرح کے سیاسی ذرائع استعمال کرتا ہے مثلاً متعلقہ ملکوں میں فوجی اڈوں کا قیام یا پرانے اڈوں کی برقراری، نئی اقوام کو بین الاقوامی بلاکوں سے وابستہ کرنے اور انھیں ان کا محتاج و دست نگر بنانا، خانہ جنگیوں میں سفارتی اور بالواسطہ فوجی مداخلت اور اپنے موافق فریق کو جتانے کی کوشش، فوجی انقلابات کے ذریعہ کٹھ پتلی حکومت کا قیام وغیرہ۔ اقتصادی ذرائع میں بیرونی امداد کو اولیت حاصل ہے جس کے ذریعہ نئے ملکوں میں پسماندہ زراعتی معیشت کو قائم رکھ کر نجی کاروبار کو بڑھاوا دے کر انھیں صنعتی ملکوں کے لیے خام مال کی فراہمی اور مصنوعات کے نکاس کی منڈی بنائے رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں سے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں تشکیل شدہ کثیر قومی کارپوریشنوں (Multinational Corporations) کی سرگرمیاں بھی نواستعماری مقاصد کے حصول میں مدد دیتی ہیں۔ کیونکہ یہ ادارے ملکی معیشت کی اپنی اجارہ دارانہ حیثیت کی بنا پر ملکی صنعت و ٹکنالوجی کی نشوونما کو روکتے، ملکی وسائل کا پوری طرح استحصال کرتے اور ملکی سرمایہ کو باہر بھیجتے ہیں۔

استقرار حق (Declaration of Title): وہ شخص جو کسی جائداد کے متعلق کوئی قانونی حق رکھتا ہو ایک ایسے شخص کے خلاف جو اس کے اس قانونی حق کو نہ مانے قانون دادرس خاص (Specific Relief Act) کے تحت چارہ جوئی کر سکتا ہے اور عدالت اس شخص کو جائداد پر قانونی حق کے متعلق داد رس دے سکتی ہے۔ استقرار حق (Declaration of Title) کی بابت یہ عدالتی فیصلہ صرف فریقین مقدمہ کی حد تک قابل پابندی رہے گا۔

اسٹاف (Staff): انتظامی ڈھانچہ اسٹاف (عملہ یا رکن) کسی بھی ادارہ کے انتظامی ڈھانچے میں نظم و نسق کے لیے لازمی جزو ہوتا ہے۔ نظم و نسق عامہ میں ملازمین سرکار کے انصرام کار یعنی ان کی زمرہ بندی، درجوں میں تقسیم، بھرتی، ترقی، تربیت وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ملازمین کی تنخواہ، شرائط ملازمت، چال چلن، نظم و ضبط، باہمی مشاورت اور بدعنوانیاں جیسے متعدد امور بھی اس میں زیر بحث آتے ہیں۔

خدمات عامہ کا انتظام اور اس کے مسائل ہر ملک کے اپنے تاریخی پس منظر، آئین و قوانین، قواعد اور ضوابط کے تابع ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں متعلقہ عملہ کے انتظام کا ایک مخصوص طریقہ رائج ہے۔

ہر ملک میں نظم و نسق مختلف اداروں کو تفویض ہوتا ہے۔ یہ ادارے یا تو آئینی اساسی رکھتے ہیں یا پھر عاملانہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔

ترتیب و درجہ بندی : انتظامی ڈھانچے کی ترتیب اور درجہ بندی نظم و نسق عامہ کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ درجہ بندی سے مراد فرائض، مناصب، ذمہ داریوں اور ضروری قابلیتوں کے لحاظ سے اسٹاف کی مختلف زمروں میں تقسیم ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ اس طریقہ کار سے اہل غرض حضرات نیز انتظامیہ کے لیے سہولت پیدا کی جائے تو دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ ملازمت کے خواہاں امیدواروں کے لیے روشن امکانات پیدا کیے جائیں۔ اس تعلق سے بھرتی کا ایک باقاعدہ طریقہ رواج

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پاتا ہے۔ نیز اسٹاف کی ترقی کی ایک مستقل پالیسی معین ہوتی ہے جس سے انتظامیہ کو اسٹاف کی ترقی کے لیے موزوں سہولتیں مہیا کرنے کا موقعہ ملتا ہے تو ملازمین کی تنخواہوں کے اسکیل مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی وضاحت بھی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ درجہ بندی کی وجہ سے تقسیم کار اور حکومت کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے اسٹاف کے درمیان منصفانہ برتاؤ کی بنیاد مستحکم ہوتی ہے اور ساتھ ہی اسٹاف کی کارگزاری کی مؤثر نگرانی بھی کی جا سکتی ہے۔ غرض یہ کہ اسٹاف کی زمرہ بندی اور درجہ واری تقسیم، نظم و نسق کی منصوبہ بندی کا ایک مؤثر اور معقول طریقہ ہے۔

بھرتی : کسی ادارہ یا محکمہ کی خدمات کے لیے بھرتی کا اصول ایک مؤثر طریقہ ہے۔ نظم و نسق عامہ میں سرکاری ملازمین کی حد تک تو یہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی لحاظ سے ملازمین سرکار کا پورا ڈھانچہ اسی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے۔ سیول سروس میں ملازمین کے روشن مستقبل کا دار و مدار اسی بھرتی کے طریقۂ کار پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خدمات عامہ کی کارکردگی اور اخلاقی معیار کا انحصار بھی بڑی حد تک بھرتی کی پالیسی ہی پر ہوتا ہے۔ یہ پالیسی امیدواروں کے لیے تقرر کے مساوی مواقع فراہم کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس پالیسی میں امتحانوں کا سلسلہ ہوتا ہے تاکہ تقررات میں جانب داری کے امکانات کم سے کم پیدا ہوں۔ امیدواروں کی قابلیت سے متعلق قواعد مقرر کرنے اور بعض قیود عاید کرنے کا منشا بھی یہی ہوتا ہے کہ کارکردگی کے ضروری معیار کو برقرار رکھا جائے۔ بھرتی کے لیے بعض امور ضروری ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ متعلقہ ادارہ یا محکمہ اپنا مطلوبہ منصوبہ بھرتی کرنے والی ایجنسی کو بھیجتا ہے۔ تشہیری ذرائع سے مطلوبہ اسامیوں کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ موزوں امیدوار اپنی خدمات پیش کر سکیں۔ مقابلاتی امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں تاکہ بہتر صلاحیتوں والے امیدواروں کا انتخاب کیا جا سکے۔ امتحان کے بعد منتخب کامیاب امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے۔ اس انٹرویو میں مدعو ماہرین متعلقہ امیدواروں سے گفتگو کر کے ان کی صلاحیتوں کو پرکھتے ہیں اور ان میں سے بہتر امیدواروں کو منتخب کرتے ہیں جن کی فہرست متعلقہ ادارے / محکمہ کو بھیج دی جاتی ہے اور پھر کہیں متعلقہ محکمہ ان امیدواروں کا تقرر کرتا ہے۔

ترقی : کچھ ادارے اور محکمے براہ راست بھی اپنے لیے کارکنوں کا انتخاب کرتے ہیں لیکن وہاں بھی سلسلہ ایسا ہی ہوتا ہے یعنی پہلے امتحان اور پھر انٹرویو۔ خدمات عامہ کے نظام میں ملازمین کی ترقی سے نہ صرف ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بڑھتی ہیں بلکہ ان کے مرتبہ، عہدہ اور یافت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ترقی، تنخواہ پانے والے افراد کو بہتر کارکردگی کی جانب مائل کرنے اور قابل و تجربہ کار افراد کو اپنی خدمات سے وابستہ رکھنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ اس طرح کی حوصلہ افزائی سے ملازمین بھی یکسوئی اور محنت سے کام کرتے ہیں اور تنخواہ میں اضافے سے ان کو اپنی معاشی بہتری کے مواقع بھی ملتے ہیں۔ اس طرح انتظامیہ اور ملازمین دونوں کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ جہاں انتظامیہ ایک طرف تجربہ کار اور مستعد ملازمین کی کارکردگی سے مستفید ہوتا ہے تو وہیں دوسری طرف ملازمین کو ان کی کارکردگی اور فرض شناسی کا صلہ بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کی پوری کارروائی سے انتظامیہ اور ملازمین کو بڑا تعلق خاطر رہتا ہے تاہم اس معاملہ میں دونوں الگ الگ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ انتظامیہ ملازمین کے نظم و ضبط اور ان کے اخلاقی معیار کو بہتر سے بہتر دیکھنا چاہتا ہے اور ان کی کارکردگی کو بڑھانے پر زور دیتا ہے تو ملازمین کے نزدیک ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ان دو نقاط نظر میں ایک خوشگوار توازن پیدا کرنا بھرتی کرنے والی ایجنسیوں کا فرض ہے۔ ملازمین کی ترقی کے سلسلہ میں عام طور سے قابلیت اور اہلیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے لیکن اس میں سنیارٹی کو اسی وقت ترجیح دی جاتی ہے جبکہ امیدواروں کی قابلیت اور اہلیت تقریباً مساوی مساوی ہو۔ البتہ لیو ویکنسی میں عارضی ترقی سنیارٹی کی اساس پر ہی کی جاتی ہے۔

تربیت (Training) : انتظامیہ ملازمین کی ٹریننگ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ بھرتی کے وقت امیدواروں کی صرف عام صلاحیتوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ کارکردگی کا اعلیٰ معیار برقرار رکھنے اور متعلقہ معاملات کی تہ تک پہنچ کر انھیں صحیح ڈھنگ پر نپٹانے کے لیے اسٹاف کی ٹریننگ نہایت ضروری ہوتی ہے کیونکہ بجا طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ تربیت یافتہ عملہ ہی نظم و نسق کے پیچیدہ مسائل اور آئے دن کی ضروریات کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ اگر ایسی تربیت نہ دی جائے تو عملہ لکیر کا فقیر ہو کر رہ جائے گا۔ نہ تو اس میں بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوگا اور نہ وہ نئے تقاضوں کو سمجھ سکے گا۔ ٹریننگ ہی کی بدولت عملہ اپنی خامیوں کو دور کر سکتا اور جدید معلومات و تجربات سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

استفادہ کر سکتا ہے۔ تربیت کی بدولت نظر میں وسعت، کردار میں استقامت اور مزاج میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ تاہم ٹریننگ کے بارے میں ہر ملک کی اپنی اپنی پالیسی اور الگ الگ طریقۂ کار ہوتا ہے جس کا زیادہ تر دار و مدار کسی مخصوص خدمت کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ ملازمین سرکار کی ضروریات کے مطابق ٹریننگ کے مختلف پروگرام عمل میں لائے جاتے ہیں۔ یہ ذمہ داری عموماً مختلف ٹریننگ انسٹیٹیوٹ اور یونیورسٹیاں اٹھاتی ہیں۔

انتظام ۔ نظام : ایک چیف اگزیکیٹو کے لیے یہ عملاً ناممکن ہے کہ وہ اپنے دفتر کے پورے کام بذات خود انجام دے۔ حکومت کو بڑے اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے جنھیں ڈپارٹمنٹ یا محکمے کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت میں بہ حیثیت مجموعی حکومت کی مشنری کے اجزا ہیں۔ ڈپارٹمنٹ کام کی نوعیت کے اعتبار سے چھوٹے اور بڑے ہو سکتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مختلف ڈپارٹمنٹ کے قیام کی وجہ سے عوام کو انتظامیہ سے ربط قائم کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

سرکاری محکموں کی تقسیم کچھ اسی طرح کی جاتی ہے۔

سکریٹری

اڈیشنل سکریٹری یا جائنٹ سکریٹری

ڈپٹی سکریٹری

اسسٹنٹ سکریٹری

سکشن افسر

عملے کے دیگر افراد

اعلیٰ عہدہ دار آل انڈیا سروس کے ہوتے ہیں اور وہ حکومت کی سیاسی تبدیلیوں سے مطلق متاثر نہیں ہوتے۔ وہ حکومت کے مستقل عہدہ دار ہوتے ہیں جو اپنے سیاسی افسروں کی پالیسی کی تشکیل اور اسکیم کی ترتیب میں مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور ان کے کام میں مدد دیتے ہیں۔ ان عہدہ داروں کی موجودگی سیاست دانوں کے لیے ضروری ہے۔

اسرافیل: یہ بھی ایک فرشتہ کا نام ہے جو قیامت کے روز صور پھونکیں گے جب اللہ کا حکم ہوگا اور یہ پہلی مرتبہ صور پھونکیں گے تو سارے جاندار انسان جنات چرند پرند فنا ہو جائیں گے۔ صور کی آواز نہایت تیز اور ڈراؤنی ہوگی۔ جب حضرت اسرافیل دوسری دفعہ صور پھونکیں گے تو سب زندہ ہو جائیں گے۔

اسکول کے نفسیاتی امدادی کام (Psycho-auxilary Activities of School) : ہمارا آج کا تعلیمی نظام بڑی حد تک ان اصولوں پر مبنی ہے جو براہ راست نفسیات کے مطالعہ کے نتیجہ ہیں۔ مغرب میں تعلیم کو بچہ کی نفسیات پر قایم کرنے کی جو تحریک انیسویں صدی کے آخر میں پستالوزی ، ہربارٹ اور فروبل کی کوششوں سے شروع ہوئی تھی، اپنے اثر کے اعتبار سے برابر ترقی کرتی رہی اور آج صرف یہی نہیں کہ نصاب،طریقۂ تعلیم اور امتحانات کو تمام تر تعلیمی نفسیاتی اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش برابر جاری ہے بلکہ بچہ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں جو گھر کے علاوہ اسکول کے اثرات کا بھی نتیجہ تسلیم کی جاتی ہے، اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ اسکول میں درس و تدریس کے علاوہ کچھ ایسے نفسیاتی امدادی کاموں کا بھی انعقاد کیا جائے جو بچہ کی تمام ذہنی، جذباتی، اخلاقی اور سماجی ضرورتوں کو پورا کر سکیں اور ان تمام نفسیاتی مسائل کو حل کرنے میں بچہ کی مدد کر سکیں جو آپ سے اپنی روز مرہ کی زندگی میں ماحول کی ناسازگاری اور دیگر شخصی وجوہ کی بنا پر پیش آتے ہیں۔

یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں کہ استاد ایک مقرر کردہ نصاب بچہ کو مکمل کراوے اور پھر امتحان لے کر اسے کامیاب یا ناکامیاب قرار دے۔ بلکہ صحیح معنوں میں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ کی تمام ذہنی، جذباتی، اخلاقی اور سماجی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کی پوری شخصیت کی تعمیر کی جائے۔ لیکن یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ صلاحیت کے اعتبار سے ہر بچہ دوسرے سے مختلف ہے اور اسی لیے ہر بچہ کے مسائل بھی جداگانہ ہیں۔ مدرس جس کا بنیادی کام آج بھی مضمون کی تعلیم دینا ہے اس میں شک نہیں کہ اپنے منصب کے اعتبار سے بچہ کی شخصیت کی تعمیر کا بھی ذمہ دار ہے لیکن آج کے پیچیدہ سماج میں جو روز بروز اور بھی پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اور جس کے مسائل بھی روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، ایک استاد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی مخصوص محدود تربیت کی مدد سے بچوں کے نفسیاتی مسائل کو سلجھانے میں بھی ان کی مدد کر سکے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت سمجھی گئی کہ اسکول میں کچھ ایسے امدادی کاموں (Services) کا بھی اہتمام کیا جائے جو بچہ کو اس کی تعلیمی شخصی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں اس کی مدد کر سکیں۔

نفسیاتی امدادی کاموں کی تحریک کا آغاز امریکا میں بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں ہوا۔ اس کی ابتدا دو مختلف تحریکوں کے اثر کا نتیجہ کہی جا سکتی ہے۔ ایک ذہنی حفظان صحت (Mental Hygiene) کی تحریک اور دوسری نفسیاتی جانچ (Psychological Testing) کی تحریک۔ یہ ساری تحریکیں در اصل تعلیم میں نفسیات کے بڑھتے ہوئے اثر کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں۔ جیسے جیسے بچوں کے نفسیاتی مطالعہ میں دلچسپی بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ تحریکیں بھی زور پکڑتی گئیں اور آج امریکا میں ایسے اسکول کم ملیں گے جن میں اس طرح کے کاموں کی تھوڑی بہت جھلک نہ ملتی ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دولت کی فراوانی اور ذرائع کی فراہمی کے باوجود امریکا میں آج بھی تقریباً آدھے اسکول ایسے ہیں جن میں نفسیاتی امدادی کام محض برائے نام کیے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں تو ابھی اس طرح کے کام پانچ فی صد اسکولوں میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ آزادی کے بعد کچھ روشن خیال ماہرین تعلیم کی کوششوں سے نفسیاتی امدادی کام سے ملتی جلتی ایک دوسری تحریک جسے صلاح کاری کی تحریک (Guidance Movement) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ہندوستان میں شروع ہوئی اور اتر پردیش کے تعلیمی شہر الہ آباد میں بیورو آف سائیکالوجی (Bureau of Psychology) کی بنیاد پڑی۔ اس بیورو کا سب سے اہم کام آٹھویں جماعت کے بچوں کو نفسیاتی جانچ کی بنیاد پر اعلیٰ ثانوی (Higher Secondary) تعلیم کے لیے مضامین کے انتخاب میں ان کی مدد کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اس بیورو میں ایک چھوٹے پیمانہ پر ذہنی امراض میں مبتلا بچوں کا نفسیاتی علاج بھی کیا جاتا تھا۔ 1954 میں مرکزی حکومت نے صلاح کاری کی تحریک کو فروغ دینے کے لیے دہلی میں سنٹرل بیورو آف ایجوکیشنل اینڈ ووکیشنل گائیڈنس (Central Bureau of Educational & Vocational Guidance) قائم کیا جس کا خاص مقصد صلاح کاروں (Counsellors) کی تربیت کا انتظام کرنا تھا تاکہ وہ تعلیم اور پیشے سے متعلق اصلاح کاری کے فرائض کو بخوبی انجام دے سکیں۔ یہ کام آج بھی جاری ہے۔ یہاں پر یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ مقصد کے اعتبار سے نفسیاتی امدادی کام اور صلاح کاری دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ مگر عمل کے اعتبار سے صلاح کاری کا دائرہ زیادہ وسیع ہے کیونکہ اس میں بچہ کے نفسیاتی، شخصی، سماجی مسائل کے علاوہ اس کی تعلیم اور پیشے سے متعلق ضرورتوں کو پورا کرنے پر بھی زور دیا جاتا ہے اور کونسلر (Counsellor) یا صلاح کار جو اس کام کے لیے مقرر کیا جاتا ہے اپنی تربیت کے اعتبار سے ایک نارمل بچہ کے جملہ مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ لیکن نفسیاتی امدادی کام کا تعلق مخصوص طور پر ان بچوں سے ہوتا ہے جو ذہنی، جسمانی یا سماجی پس ماندگی کے باعث نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ ان مسائل کا اثر اکثر ان کی تعلیم اور شخصیت پر برا پڑتا ہے۔ اسی لیے ماہر نفسیات مدارس یا اسکول سائیکالوجسٹ (School Psychologist) کے فرائض میں وہ تمام کام آتے ہیں جو بچہ کو اپنے مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں اس کی مدد کر سکیں اور اس طرح اس کی شخصیت کی بہتر تعمیر و تشکیل میں معاون ہو سکیں۔ ماہر نفسیات مدارس (School Psychologist) اپنے کام کو سائنٹفک طور پر انجام دینے کے لیے نفسیاتی جانچ کے ذریعہ بچہ کی ذہنی اور شخصی سماجی زندگی سے متعلق ایسا مواد فراہم کرتا ہے جو اُسے بچہ کو پوری طرح سمجھنے اور اسے مدد دینے میں اس کی رہنمائی کر سکے۔ نفسیاتی جانچ کے علاوہ وہ بہت سی قابل اعتبار (Reliable) اطلاعات اسکول، گھر اور پڑوس سے بھی حاصل کرتا ہے۔

ماہر نفسیات مدارس (School Psychologist) کے کام کو چند مثالوں کے ذریعہ واضح کیا جا سکتا ہے۔ اسکول میں کچھ بچے ذہنی پس ماندگی یا تعلیمی پچھڑے پن کا شکار ہوتے ہیں۔ ذہنی پس ماندگی یا تعلیمی پچھڑاپن ان بچوں کے لیے بہت سے نفسیاتی مسائل پیدا کرتا ہے۔ ماہر نفسیات مدارس (School Psychologist) کا یہ کام ہے کہ وہ ذہنی پس ماندہ بچوں کے لیے ان کی ذہنی سطح کے مطابق مناسب نصاب کا انتظام کرائے اور ان بچوں کے لیے جو تعلیمی پچھڑے پن (Educational Backwardness) کا شکار ہیں اصلاحی مدد بہم پہنچائے تاکہ وہ جلد ہی عام بچوں کی تعلیمی سطح پر پہنچ سکیں۔ بہت سے بچے سماجی و نفسیاتی اسباب کی بنا پر بے راہ (Delinquent) ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچے پڑھنے سے جی چراتے ہیں اور اکثر اسکول سے بھاگ جاتے ہیں۔ ماہر نفسیات مدارس (School Psychologist) کا یہ کام ہے کہ وہ مناسب نفسیاتی تدابیر کے ذریعہ انھیں راہ پر لگائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے بچہ کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ہوتا ہے اور پھر اس کے ماحول، مزاج اور دلچسپی کے مطابق اسے ضروری مدد دینا ہوتا ہے تاکہ رفتہ رفتہ بچہ اپنے اوپر قابو پا سکے اور صحیح راہ اختیار کر لے۔ اکثر بچے والدین یا استادوں کی بے جا سخت گیری کے باعث یا سماج کی کوتاہ اندیشی کے سبب سے ایسی ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی ذہنی اور عملی زندگی پر بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ ایسے بچے نہ تو اپنی پڑھائی میں اور نہ زندگی کے دوسرے مسائل کو حل کرنے میں کامیابی حاصل کر پاتے ہیں ۔ ماہر نفسیات مدارس (School Psychologist) ایسے بچوں کے علاج کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسکیمو (Eskimo): اسکیمو شمالی امریکا کے انتہائی شمال کے علاقہ کے لوگ ہیں جو زیادہ تر منطقہ قطب شمالی میں رہتے ہیں۔ ان کی کل تعداد 60 ہزار کے لگ بھگ ہے۔ تقریباً 2 ہزار باشندے سابق سوویت یونین کے سائبیریا علاقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے گرین لینڈ علاقہ کے باشندوں کی نسل میں سفید فاموں کا میل ہے ورنہ زیادہ تر آبادی الگ تھلگ ہے اور صدیوں سے ان کی نسل میں کوئی میل نہیں ہوا ہے۔ خدوخال کے اعتبار سے وہ کسی مخصوص نسل کے نمائندہ نظر آتے ہیں۔

اسکیمو سیکڑوں میل کے علاقہ میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن سب ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ جسمانی اور تہذیبی طور پر بھی یکساں ہیں۔ ان کے چہرے منگولیائی ہیں اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے بھی ایشیائی معلوم ہوتے ہیں۔ قطب شمالی کے انتہائی سرد موسم سے انھوں نے انتہائی کامیابی کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا ہے۔ بڑی بڑی سمندری مچھلیاں اور دوسرے دودھ دینے والے جانوروں پر ان کی زندگی مرکوز ہے۔ غذا، کپڑے، کھانے پکانے اور جلانے کا تیل، مختلف ضروریات کے اوزار اور دفاع کے ہتھیار سب ان ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ شکار کے فن میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ گوشت وہ بغیر پکائے کچا ہی کھا لیتے ہیں۔

موسم گرما میں یہ پورے علاقہ میں تازہ پانی اور غذا کے لیے گھومتے ہیں۔ مچھلیوں اور جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ سیل یا دریائی بچھڑے کی کھال سے وہ نہ صرف کپڑے بناتے ہیں بلکہ ڈیرے بھی تیار کرتے ہیں جن میں وہ گروہوں میں رہتے ہیں۔ سرما میں یہ لکڑی کے مکان بنا کر رہتے ہیں یا پھر زمین میں گڈھے کھود کر پتھر کی دیواریں بنا لیتے ہیں اور چھت کو لکڑی یا کھال سے ڈھکتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ برف کے گھر بناکر رہتے تھے۔ ان کو اپنی ضروریات کے لیے دور دور سفر کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے سامان ڈھونے کے لیے وہ ایک قسم کی بغیر پہیہ کی گاڑی 'سلیج' بنا لیتے ہیں۔ جنھیں سدھے ہوئے بڑے بڑے کتے کھینچتے ہیں۔

اسکیمو فنون لطیفہ میں کافی ترقی یافتہ ہیں۔ ہڈیوں اور سینگھوں سے یہ نہایت خوبصورت چیزیں بناتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گروپ میں رہتے ہیں۔ ہر گروپ کا ایک سردار ہوتا ہے جو قابلیت اور صلاحیت کی بناء پر چنا جاتا ہے۔ بہت کم چیزیں نجی ہوتی ہیں۔ سب چیزیں ہر شخص اپنی ضروریات کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے۔ لڑائی جھگڑے اور اختلافات حل کر طے کر لیے جاتے ہیں۔ مذہب کافی ترقی یافتہ ہے لیکن روزانہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ جدید آلات حرب مثلاً پستول، بندوقیں وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئی ہیں جن سے شکار کے کاموں میں انھیں کافی مدد ملتی ہے۔

روایتی انداز میں رہنے والے اسکیمو اپنے قبیلے میں ایک بڑے مشترکہ خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ان کو ہر چیز مل جل کر استعمال کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ سخت موسم کی وجہ سے یہ اپنے بزرگوں کو مرنے کے لیے برف کے طوفان میں چھوڑ جاتے ہیں۔ موسم بدلتے وقت جب وہ ہجرت کرتے ہیں تو اپنے بزرگوں کو ساتھ نہیں لے جاتے ہیں۔ ان میں تمدن اپنے ابتدائی شکل میں موجود ہے اس لیے ماہرین سماجیات اس کا مطالعہ کرنے کے لیے وہاں جاتے ہیں۔ ان کو بجاطور پر زندہ عجائب گھر سمجھا جاسکتا ہے۔

اسماعلیہ: یہ بھی فرقہ امامیہ کی ایک شاخ ہے جو اسامیل بن جعفر کی طرف منسوب ہے۔ ائمہ کے سلسلہ میں امام جعفر صادق تک ان کا اثنا عشریون سے اتفاق ہے مگر ان کے بعد وہ ان کے بیٹے موسیٰ کاظم کے بجائے ان کے دوسرے بیٹے اسامیل کو امام قرار دیتے ہیں گو اسامیل کے بعد محمد مکتوم امام ہوئے جو مستور ائمہ میں پہلے امام تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے جعفر صادق پھر ان کے بیٹے محمد حبیب کو امام قرار دیا گیا جو آخری مستور امام تھے۔ ان کے بعد عبداللہ مہدی امام ہوئے جن کو امام المغرب کہا جاتا ہے اس کے بعد ان کی اولاد مصر کی خلیفہ ہوئی جو فاطمی کہلائے اس فرقہ کے نزدیک امام کا ظاہر ہونا ضروری نہیں وہ مستور بھی ہوتا ہے اور اس حالت میں بھی اس کی اطلاعت لازمی ہے امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا اس کے افعال پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں یہ لوگ کسی حد تک جنوبی وسطی افریقہ بلاد شام پاکستان اور ہندوستان میں آباد ہیں کسی زمانہ میں یہ برسراقتدار بھی تھے فاطمیہ مصر و شام اسامیلی ہی تھے۔ قرامطہ جو ایک زمانہ میں متعدد ملکوں پر قابض تھے اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ لوگ باطنیہ اور باطنیتی بھی کہلاتے ہی کیونکہ یہ اپنے عقائد کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں ابتدا میں جور و ستم کے ڈر سے اخفاء کا رجحان

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ان کے اندر پیدا ہوا مگر پھر یہ ان کی عادت ثانیہ بن گئی۔ علاوہ ازیں وہ اکثر حالات میں امام کو مستور مانتے ہیں ان کی رائے میں مغرب میں ان کی سلطنت کے قیام تک مستور تھا۔ ان کو باطنیہ کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ ان کے خیال میں شریعت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ عام لوگوں کو صرف ظواہر شریعت کا علم ہوتا ہے مگر امام کو باطن کا علم بھی ہوتا ہے اسی بنا پر وہ الفاظ قرآن کی تاویلیں کرتے ہیں۔

اسمتھ، آدم (Smith, Adam) : آدم اسمتھ انگلستان اور یورپ کا مشہور دانش ور ماہر معاشیات تھا۔ انگلستان کی کلاسیکی معاشیات کی بنیاد انھیں کے معاشی نظریوں پر رکھی گئی ہے۔

ایڈم اسمتھ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ اس کی پرورش اس کی ماں نے کی۔ چودہ سال کی عمر میں گلاسگو یونیورسٹی میں اس نے فرانسس ہچسن (F. Hutchison) کی رہ نمائی میں تعلیم حاصل کی جہاں اسے آکسفورڈ یونیورسٹی میں مزید تعلیم کے لیے وظیفہ ملا۔ یہاں اس نے 1746 تک چھ سال گزارے۔ 1748 سے 1751 تک اس نے ایڈنبرا یونیورسٹی میں تعلیم دی۔ 1751 سے 1763 تک وہ گلاسگو یونیورسٹی میں رہا۔ پہلے اسے منطق کا پروفیسر بنایا گیا اور اس کے ایک سال بعد فرانسس ہچسن کی جگہ اخلاقی فلسفہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔

1764 سے 1766 تک وہ ڈیوک آف بک لیوگھ کا اتالیق رہا اور ڈیوک کے ساتھ فرانس کی سیر کی۔ ایڈم اسمتھ نے معاشیات پر اپنی سب سے اہم تصنیف "دولت اقوام کی نوعیت اور اسباب کے بارے میں تحقیقات" (An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations) 1776 میں شائع کی۔ ایڈم اسمتھ کی اسی تصنیف پر برطانیہ کی مشہور کلاسکی معاشیات کی بنیاد پڑی جس کی ابتدا ریکارڈو سے ہوتی ہے۔ اور اس کا سلسلہ مارشل سے ہوتا ہوا اے.ایل.ہگو تک چلا گیا۔ ایڈم اسمتھ نے اپنی تصنیف میں یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ کسی کمیونٹی میں دولت کس طرح بڑھتی ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں اس نے فطر آئینون (Physiocrats) کے اس نظریہ کو رد کردیا تھا کہ زراعت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے مصنوعات کی پیداوار کو بھی مساوی اور اہم مقام دیا ہے۔ اور قدر (Value) کو جانچنے کے لیے محنت (Labour) کو بنیادی پیمانہ قرار دیا ہے اور بتلایا کہ اگر (الف) کام کرنے کے لیے دو آدمیوں کی محنت درکار ہوتی ہے اور (ب) کام کے لیے چار آدمیوں کی تو (ب) کی قدر (الف) سے دوگنی ہوگی اگرچہ چیزوں کی حقیقی قیمت ان کی طلب اور رسد پر منحصر ہوتی ہے۔

اسمتھ نے بتلایا کہ افزائش دولت میں دو عناصر کام کرتے ہیں۔ (1) مزدور طبقہ کی مہارت، (2) پیداواری اور غیر پیداواری محنت کا آپسی تناسب۔ جہاں تک مزدور طبقہ کی مہارت کا تعلق ہے اس میں تقسیم محنت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً پن بنانے کی صنعت کو لیجیے۔ اگر سارے کام یعنی تار کھینچنے، اسے کاٹنے، اس کے سر کو موٹا کرنے اور دوسرے سرکو نوک دار بنانے کے مختلف کام ایک ہی شخص سے لیے جائیں تو پنوں کی پیداوار بہت کم ہوگی لیکن اس کے برعکس اگر ایک شخص کام کے صرف کسی ایک حصہ میں مہارت حاصل کرلے اور پورے کام کئی ماہرین کریں تو اس سے اتنے ہی وقت میں پہلے کے مقابلہ میں کئی سو گنا پنیں تیار ہوں گی اور پیداوار کا انحصار مال کی کھپت یا طلب پر ہوگا۔ جہاں تک دوسرے عنصر یعنی پیداواری وغیرپیداواری محنت کے تناسب کا سوال ہے اس کا انحصار اجتماع دولت (Accumulation of Wealth) پر ہے جس کی مدد سے ایسی مشینیں تیار ہو سکتی ہے جو کام میں مزدور کی مدد کریں اور روزگار کے مواقع میں اضافہ ہو۔ اور اس کے لیے اسمتھ نے اجرتوں کے فنڈ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ کسی بھی عمل پیداوار میں پیداوار کے قابل استعمال شکل تک پہنچنے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن اس دوران مزدوروں کی ضروریات کی تکمیل ہوتی رہنی چاہیے۔ اسمتھ کا یقین تھا کہ معاشی نظام بڑی خوش اسلوبی اور ہم آہنگی کے ساتھ چل رہا ہے اور اس میں حکومت کی مداخلت کم سے کم ہونی چاہیے (دیکھیے معاشیات عدم مداخلت)۔ اسمتھ کے نزدیک اگرچہ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کام کرتا ہے لیکن اس کے اس طرح کام کرنے سے سب ہی کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کے پیچھے ایک غائبانہ طاقت کام کرتی ہے اور یہ سب کچھ آزادانہ مسابقت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک کارکرد معیشت کے لیے آزاد مسابقت نہایت ضروری ہے۔

اسمتھ کی دولت اقوام کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف معاشیات اور تاریخ کا طالب علم تھا بلکہ بڑا عملی انسان بھی تھا مثلاً اسے اس کا احساس تھا کہ وہ کون سی قوتیں ہیں جو آزادانہ مسابقت کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ ایک ہی کاروبار کے لوگ اگر کبھی دل بہلانے یا خوشی منانے کے لیے جمع ہوتے ہیں تو اس قسم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کا اجتماع عوام کے خلاف کوئی سازش کرنے یا قیمتیں بڑھانے کی ترکیب ڈھونڈنے پر ختم ہوتا ہے۔ مالیات پر بحث کرتے ہوئے اس نے ٹیکس کے بارے میں چار اصول گنائے ہیں۔ (1)مساوات (ہر شخص پر اس کی ادائگی کی صلاحیت کے مطابق ٹیکس لگانا چاہیے)،(2)یقین کی کیفیت (Certainty)، (3) آسانی (Convenience) ، (4) کفایت (Economy)۔

اسنادیات : گزشتہ پچاس برس میں کتب خانہ کے ذخیرہ میں اقسام مواد کے اعتبار سے بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ کتاب کے علاوہ غیر کتابی مواد- تحقیقات علمی کی رپورٹ، قلمی یا ٹائپ کیے ہوئے مسودے، رسالہ اور رسالہ کے مضامین کی عکسی نقل، پیٹنٹ اور معیار- ذخیرہ کتب خانہ کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔ مخصوص دائرہ علم سے متعلق کتب خانوں میں جو کسی تحقیقی و ترقیاتی ادارے سے منسلک ہیں غیر کتابی مواد غالب اکثریت میں ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجہ سے کتب خانہ میں موجود مواد کتاب کے نام سے نہ منسوب کرکے اس کے لیے سند کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ لفظ سند جس سے علم قانون کی اصطلاح میں وہ تحریر مراد ہے جو مصدقہ ہو اور وقت ضرورت کسی دعوئی کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکے یا علم تعلیم میں اپنے پانے والے کی تعلیمی صلاحیت کی تصدیق کرے، علم کتب خانہ داری میں وسیع مفہوم میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اگرچہ بنیادی مفہوم یعنی "مصدقہ تحریر" اب بھی باقی رہا۔ علم کتب خانہ داری میں سند سے مراد وہ معلوماتی واحدہ ہے جو متعلقہ مضمون کے نودریافت خیال، نظریہ، کلیہ یا تحقیق کے نتائج کا احاطہ کرتا ہو اور جسے وجود میں آنے کے بعد پہلی دفعہ اظہار کا جامہ پہنایا گیا ہو۔ اس پس منظر میں عموی حوالجاتی خدمت کے لیے کتابی مواد سے مرتب کتابیات کی جگہ ایک خاص ماہر مضمون کے لیے نودریافت نتیجہ تحقیق کی تحریرات پر مبنی اشاریہ نے لے لی اور اس عمل اور اس خدمت کو اسنادیات کا نام دیا گیا۔

مختلف علماء نے اسنادیات کی اپنے اپنے طور پر تعریف بیان کی ہے۔ مورتمر تابے (Mortimer Taube) کے مطابق "اسنادیات نام ہے ان مجموعی سرگرمیوں کا جو مخصوص نوعیت کی معلومات کی ترسیل میں کی جاتی ہیں ان میں ترسیل سے قبل کے عمل یعنی حوالہ جاتی مواد کی تیاری، ان کی نقل کاری اور بعد کے عمل یعنی فراہمی حوالہ دونوں شامل ہیں۔ لائبریرینس گلاسری مرتبہ ہیرڈ کے مطابق "علم اور حوالہ علم کو رقم کرنا ان کی اس طور پر ترتیب کہ فوری نشاندہی ممکن ہوسکے اور مختلف وسائل کے ذریعہ ان کی ترسیل کا نام اسنادیات ہے"۔ پروفیسر ایس آر رنگاناتھن نے اسنادیات کی تعریف زیادہ وضاحت سے کی ہے ان کا کہنا ہے کہ آج کا لائبریرین درجہ اختصاص کے قارئن کی جانب سے نوزائیدہ مختصر ترین تصور کی فرمائش کے پیش نظر نئے حالات سے دوچار ہے۔ اب اسے نئے طریقۂ کار، نیا رویہ اور خدمت قاری کے لیے نئے انداز کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اسنادیات کی اصطلاح اسی طریقہ کار، رویہ اور سرگرمیوں کی شدت کے اظہار کو واضح کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔ رنگاناتھن صاحب کے مطابق "علم کی مخصوص شاخ میں درجہ اختصاص کے دانشور کے نودریافت مختصرین نکتہ تصور کے حوالہ کو لائق استفادہ بنانا اور اس کا فروغ اسنادیات ہے" دوسرے لفظوں میں یہ حوالہ فراہمی کی وجہ خدمت ہے جو ایک ماہر دانشور کے لیے مکمل طور پر برق رفتاری سے بعینہ نودریافت مختصرترین تصور جو درکار ہو اس کی نشاندہی کرے۔ اس تعریف میں تین شرائط پرزور ہے۔ خدمت حوالہ کی رفتار تیز ترین ہونی چاہیے کہ دانشور کا وقت قیمتی ہے، حوالہ ٹھیک ٹھیک اسی تصور یا نکتہ کا ہونا چاہیے اور خدمت حوالہ میں درکار نکتہ خیال کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ ہونا چاہیے۔

تاریخ: حوالہ فراہم کرنے کی اسنادیاتی خدمت کتب خانوں کے حوالہ فراہم کرنے کے روایتی ڈھنگ کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئی۔ روایتی کتب خانوں میں کتابوں کو قارئین تک پہنچانے سے زیادہ توجہ تحفظ کتب و اسناد پر دی جاسکے جس کے نتیجہ میں فہرست سازی عموماً مصنف کے نام سے کی جاتی تھی۔ چنانچہ برٹش میوزیم (حال برٹش لائبریری) اور لائبریری آف کانگریس کے مطبوعہ کیٹلاگ مصنف وار مرتب ہیں۔ اس طرح کے کیٹلاگ سے کسی ایک مضمون یا اس کے کسی ایک پہلو پر مواد کی تلاش کا کام بہت مشکل تھا۔ یہ مشکل خاص طور پر سائنسی اور تکنیکی مضامین کے دائرہ میں کام کرنے والوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ دوسری طرف طباعت کے طریقے میں تبدیلی کے سبب شائع شدہ مواد کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ سترہویں صدی کے وسط میں سائنسدانوں نے اکیڈمیاں قائم کرنی شروع کردی تھیں۔ سائنسی موضوعات پر رسالے شائع ہونے لگے تھے۔ سائنسی علوم پر پہلا رسالہ پیرس سے جرنل دی اسکاوانس (Journal des Scavans) کے نام سے 1665 میں شائع ہوا۔ دو ماہ بعد فلاسفیکل ٹرانزیکشنز (Philosophical Transactions) رائل سوسائٹی نے انگلینڈ سے شائع کیا۔ انیسویں صدی تک یہ تعداد اتنی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بڑھ چکی تھی کہ اب درکار مضمون کی تلاش غیر ممکن ہو چکی تھی۔ چنانچہ اسمتھسونین انسٹی ٹیوٹ (Smithsonian Institute) کے سکریٹری جوزف ہنری (Joseph Henry) نے 1854 میں برٹش ایسوسی ایشن برائے ایڈوانسمنٹ آف سائنڈ کے سامنے مضامین کی اشاریہ سازی کی تجویز رکھی جس کے نتیجہ میں 1901 میں شائع جملہ سائنسی مضامین کے 22 جلدوں پر مشتمل اور موضوعی ترتیب پر مرتب کیٹلاگ 1902 میں شائع ہوا لیکن یہ تجربہ بہت جلد ناکام ہوگیا۔

اسی زمانہ میں بروسیلز میں سماجی علوم کے مضامین کی ایک دنیا بھر میں شائع مضامین کی جامع کتابیات شائع کرنے کے لیے پال اٹلٹ (Paul Otlet) اور لافونٹین (La Fontaine) کارڈوں پر اشاریہ سازی کر رہے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں نے 1895 میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ببلوگرافی (International Institute of Bibliography) قائم کیا۔ اپنے کارڈوں کو موضوعی اعتبار سے مرتب کرنے کے لیے انھوں نے ڈیوی ڈیسمل اسکیم درجہ بندی منتخب کی لیکن جب اس کے مطابق کارڈوں کو ترتیب دینے کا کام شروع کیا تو اسکیم کے اصول و ضوابط اور ڈھانچے میں تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ نتیجہ میں ایک نئی اسکیم درجہ بندی یعنی یوڈی سی یا یونیورسل ڈیسمل کلاسی فی کیشن وجود میں آئی۔ 1931 میں انسٹی ٹیوٹ کا نام بدل کر انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈاکومینٹیشن (International Institute of Documentation) رکھا گیا۔ اس طرح کتابیات کی تیاری کے ضمن میں اسنادیات کی اصطلاح منظر عام پر آئی۔ بیسویں صدی کے وسط تک رسائل کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ چکی تھی اور مختلف کاروباری کمپنیوں اور تحقیقی اداروں اور انجمنوں نے رسائل کے مضامین کی اشاریہ سازی اور تلخیص نگاری شروع کردی تھی لیکن کسی مرتب نظام کی عدم موجودگی میں ان خدمات میں ہم آہنگی نہ تھی جس کی وجہ سے کچھ مضامین میں اشاریہ سازی اور تلخیصی خدمات بیک وقت کئی جگہوں پر ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف کچھ مضامین ایسے تھے جن کی طرف توجہ کی کی تھی۔ صورت حال کی اس پیچیدگی اور اس کے نقصانات کی جانب اشارہ پروفیسر جے ڈی برنال (J.D.Bernal) نے اپنے مضمون میں کیا جسے انھوں نے 1948 کی رائل سوسائٹی کی سائنٹفک کانفرنس میں پڑھا تھا۔ 1950 میں یونیسکو نے اپنے تکنیکی امداد پروگرام کے تحت مختلف ممالک میں ڈاکومینٹیشن یا اسنادیات کے فروغ کے لیے قومی سطح کے ڈاکومینٹیشن سنٹر کے قیام کے لیے ماہرین کی خدمات، ضروری ساز و سامان اور مالی امداد دی۔ ہندستان میں انسڈاک (Indian National Scientific Documentation) 1952 میں یونیسکو کے تعاون سے قائم ہوا۔ انسڈاک میں جہاں حوالہ جاتی خدمت کے لیے سائنسی مضامین کی اشاریہ سازی شروع ہوئی اس کے ساتھ ہی مواد علمی کی عکسی نقل کی تیاری اور یورپی زبانوں میں شائع مضامین کے انگریزی ترجمہ کا بھی بندوبست کیا گیا۔ اب قومی سطح پر دوسرے مضامین میں بھی ڈاکومینٹیشن مرکز یا اسنادیاتی مرکز قائم ہو چکے ہیں جن میں نیشنل اسمال اینٹرپرائز نیشنل ڈاکومینٹیشن سنٹر (حیدرآباد) سوشل سائنس ڈاکومینٹیشن سنٹر (دہلی)، انڈین نیشنل ڈاکومینٹیشن سنٹر فار فیملی پلاننگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر انٹرنیشنل نیوکلیر انفارمیشن سسٹم (دی آنا) اور انٹرنیشنل انفارمیشن (اینس) سسٹم فار اگریکلچرل سائنسز اینڈ ٹکنالوجی (اگیرس) قابل ذکر ہیں۔

دائرہ کار: اسنادیاتی مرکز کے دائرہ کار میں درج ذیل امور آتے ہیں:

ترتیب اسنادیاتی فہرست: یعنی اسنادیات کا موضوع کے اعتبار سے مرتب کرنا۔ اس فہرست میں درج مضامین و دیگر حوالہ جاتی مواد کی ترتیب مصنف کے نام سے نہ کرکے نفس مضمون کے مطابق کی جاتی ہے تاکہ مطلوبہ موضوع پر جملہ مواد یکجا درج ہو۔ جملہ مواد ایک متعلق موضوعی سرخی کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ موضوعی سرخی حاصل کرنے کے مختلف طریقے وضع کیے گئے۔ ایک طریقہ زنجیری طریقہ ترتیب سرخ یا چین پروسیجر (Chain Procedure) ہے جسے ڈاکٹر رنگاناتھن نے وضع کیا ہے۔ عالمی سطح پر مروج ایک دوسرا طریقہ پریسس (Precis) کہلاتا ہے۔ امریکا کی لائبریری آف کانگریس نے امکانی موضوعی سرخیوں کی ایک فہرست کئی جلدوں میں لائبریری آف کانگریس سبجیکٹ لسٹ کے نام سے ترتیب دی ہے۔ اس پر مبنی ایک مختصر فہرست سیرس لسٹ آف سبجیکٹ ہیڈنگس (Sears List of Subject Headings) یا سیرس کی فہرست موضوعی سرخی بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ ایک اور طریقہ موضوعی سرخی کے بجائے مضمون کے عنوان میں آئے بنیادی الفاظ کو بطور سرخی استعمال کرنے کا بھی ہے۔ اگرچہ اب کمپیوٹر کے استعمال کی بدولت سرخی وضع کرنے کی اہمیت کم ہوگئی ہے کیونکہ کمپیوٹر کی بدولت کسی بھی لفظ کے ذریعہ مطلوبہ موضوع پر جملہ مواد کی فہرست حوالہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

خدمت اسنادیات: درجہ اختصاص کے دانشوروں کے مطلوبہ

موضوع پر حوالجاتی خدمت فراہم کرنا اس کے تحت محققین کے لیے ان کے زیر تحقیق موضوع سے متعلق مختصر ترین پہلو پر نودریافت لیکن جامعیت لیے ہوئے مواد کی فہرست حوالہ برق رفتاری سے فراہم کی جاتی ہے۔ اکثر یہ خدمت ہر محقق کے لیے علاحدہ کی جاتی ہے اس لیے اسے ایس ڈی آئی (Selective Discrimination of Information) یا منتخب قاری ترسیل علمی مواد کا نام دیا گیا ہے۔

تلخیص نگاری: اسنادی مرکز محض مخصوص موضوع پر مواد علمی کا اشاریہ بنانے پر اکتفا نہ کرکے ان کی تلخیص بھی درج کرتے ہیں تاکہ محققین کو اپنے مصرف کے مواد کو منتخب کرنے میں زیادہ آسانی ہو اور مکمل مطالعہ صرف اسی مضمون کا کرنا پڑے جو ان کے دائرہ تحقیق کے اندر آئے۔

عکسی نقل مضمون : اگر حوالہ کا طالب محقق مرکز اسنادیات سے باہر ہے تو اس کے لیے درکار مضامین یا دوسرے علمی مواد کی عکسی نقل بھی فراہم کرنے کا بندوبست مرکز اسنادیات میں موجود ہوتا ہے۔

ترجمہ نگاری: اسنادیاتی خدمت میں اگر درکار مواد ایسی زبان میں ہو جس سے طالب حوالہ ناواقف ہے تو اسنادیاتی مرکز مضمون کا طالب حوالہ کی مطلوبہ زبان میں ترجمہ بھی فراہم کرتا ہے اس کے لیے مرکز کے پاماہر ترجمہ نگاروں کی فہرست موجود ہوتی ہے۔

کسی بھی سائنسداں، سماجی علوم کے دانشور یا ماہر تکنیکی علوم کے لیے اسنادیاتی مرکز کی مدد کے بغیر تحقیق کے کام میں پیش قدمی اب ممکن نہیں رہی۔ ملک میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، کونسل برائے سائنسی و صنعتی تحقیق (CSIR) سائنس و ٹکنالوجی کا قومی معلوم نظام (NISSAT) اور ہندستانی کونسل برائے تحقیقات سماجی علوم (ICSSR) کی بدولت جملہ علوم میں اسنادیاتی خدمات کے قومی مرکز قائم ہیں۔

اسیران جنگ (Prisioners of War):

قدیم زمانہ میں اسیران جنگ کی موت و حیات کا دار و مدار فاتح ملک کی صوابدید پر تھا۔ رفتہ رفتہ بجائے قتل کرنے کے اسیران جنگ سے بحیثیت غلام کام لینے کا طریقہ رائج ہوا اور یہ طریقہ تقریباً موجودہ زمانے تک باقی رہا۔

قدیم جاگیرداری نظام (Feudal System) میں اسیران جنگ کو واپس کرنے کا طریقہ رائج ہوا اور اعلیٰ فوجی افسر جو قیدی بن کرآئے تھے ان کو اپنے فوجی افسر کی رہائی کے معاوضے میں واپس کیا جاتا تھا۔ اسیران جنگ کے متعلق پہلا بین الاقوامی کونشن ہیگ امن کانفرنس (Hague Peace Conference) میں منظور کیا گیا اس میں مزید اضافہ ہیگ کونشن (Hague Convention) 1907 کے ذریعہ کیا گیا۔ جنگ عظیم کے بعد ہیگ کے قواعد (Hague Rules) ناکافی ثابت ہوئے۔ بین الاقوامی ریڈ کراس نے اس سلسلے میں مکمل دستور مرتب کیا۔ سوئزرلینڈ کی گورنمنٹ کی دعوت پر سینتالیس ممالک نے ایک میٹنگ میں شرکت کی جو 1929 میں جنیوا میں منعقد ہوئی تھی اور ان ممالک کے نمائندوں نے جنیوا کونشن پر دستخط کیے۔ جنیوا کونشن اسیران جنگ سے متعلق ہے اور اس میں درج کردہ قواعد کو بین الاقوامی قانون کا درجہ حاصل ہے۔

اشاریائی خدمات (Indexing Services):

کتابیات کی مقبول ترین صنف رسائل و کتابوں میں موجود مضامین کا اشاریہ ہے۔ علمی دنیا میں خصوصاً سائنسی علوم میں دنیا کے مختلف مقامات پر ہونے والے تحقیقی کارناموں سے ایک دوسرے کو باخبر رکھنے کے لیے جب کتابیں اپنی اشاعت میں تاخیر کی بدولت معاون نہ رہیں تو دانشوروں نے متعین مدت پر رسائل شائع کرنا شروع کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ رسائل کی تعداد میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے پہنچتے تک رسائل میں موجود مواد کی نشاندہی مشکل نظر آنے لگی۔ رسائل میں منتشر مضامین تک دسترس میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ولیم فریڈرک پول (William Fredrict Poole) نے انگریزی زبان میں شائع 1802 تا 1881 تک کے مضامین کا ایک مشترک اشاریہ ترتیب دیا جو 1882 میں شائع ہوا اور اس طرح اشاریہ سازی کی ابتدا ہوگئی۔ آج جبکہ ایک اندازہ کے مطابق 130,000 علمی رسائل شائع ہورہے ہیں ان میں درج مضامین کی نشاندہی اشاریہ کے بغیر ناممکن ہوگئی ہے۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں کی مشکل سے بچنے کی غرض سے بیسویں صدی کے شروع سے عصری مضامین کی کتابیاتی احاطہ بندی کا عمل شروع ہوگیا۔ "ریڈرس گائیڈ ٹو پیریاڈیکل لٹریچر" (Reader's Guide to Periodical Literature) (امریکا) کی اشاعت 1905 میں شروع ہوئی۔ شروع میں یہ اشاریے وسیع الدائرہ شکل میں مرتب کیے گئے لیکن مضامین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور تحقیقی عمل میں معروف قارئین کی مخصوص ضرورت کے پیش نظر موضوعاتی اشاریے بھی مرتب ہونے لگے۔ آج گائیڈ ٹو پیریاڈیکل لٹریچر کے شانہ بہ شانہ "گائڈ ٹو لیگل پیریاڈیکلس (Guide to Legal Periodicals) وغیرہ بھی شائع ہوتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اشاریہ کا مقصد موضوع پر معلومات فراہم کرنے کے بجائے صرف اس مقام کی نشاندہی کرنی ہوتی ہے جہاں سے درکار معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لیے مضمون کے مصنف اور عنوان مضمون کے بعد رسالہ کی متعلقہ تفصیلات درج کی جاتی ہیں ان میں رسالہ کا نام جلد نمبر اور یا نمبر شمار، تاریخ اشاعت اور صفحات کی تعداد شامل ہوتی ہے۔ جملہ مضامین کی ترتیب مصنف کے ناموں سے حروف تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ شمارہ کے آخر میں موضوعاتی مدخل (Subject Heading) کا اشاریہ ہوتا ہے۔ اشاریہ رسائل ایک متعین وقفہ سے شائع ہوتے ہیں اور سال کے اختتام پر یا پانچ و دس سال کی مدت پر یکجا شائع کیے جاتے ہیں۔ اکثر اعلیٰ سطحی کتب خانے اپنے ادارے کے دائرہ مطالعہ مضامین پر اشاریہ شائع کرتے ہیں۔ مثلاً نیشنل میڈیکل لائبریری (ہندستان) انڈکس ٹو میڈیکل لٹریچر شائع کرتی ہے۔ موضوعاتی مدخل کے لیے کسی معتبر فہرست موضوعاتی مدخل مثلاً سیرس لسٹ آف سبجیکٹ ہیڈنگس (Sears List of Subject Heading) سے مدد لیتے ہیں یا مدخل وضع کرنے کے مختلف طریقوں سے خود وضع کرتے ہیں۔ لیکن اشاریہ رسائل کی بڑی تعداد تجارتی کمپنیاں یا تحقیقاتی ادارے تجارتی اصولوں پر شائع کرتے ہیں۔ چنانچہ ایچ ڈبلیو ولسن کمپنی اشاریہ سازی کی ایک معروف امریکن کمپنی ہے۔

عصری مضامین کے اشاریوں کے علاوہ گزشتہ سالوں کے مضامین کو یکجا (Retrospective Index) شائع کرنے کا بھی رواج ہے۔ یہ کسی ایک رسالہ کے مضامین کا مشترک اشاریہ ہوسکتے ہیں مثلاً آج کل (اردو) کا اشاریہ یا کسی ایک مضمون پر مختلف رسائل میں ایک لمبے عرصہ تک شائع شماروں میں موجود مضامین کا اشاریہ ہوسکتے ہیں۔ مثلاً انڈین ایجوکیشن انڈکس 1947 - 1978(دہلی) ایک امریکی ماہر اشاریہ سازی یوجین گارفیلڈ (Eugene Garfield) نے گزشتہ صدی کے چھٹے دہے سے دو نئے قسم کے اشاریے شائع کرنا شروع کیے ہیں۔ ان کے نام ہیں کرنٹ کنٹنٹ (Current Content) اور سائی ٹیشن انڈکس (Citation Index)۔ کرنٹ کنٹنٹ میں مضامین کے ایک دائرہ میں شائع رسائل کی فہرست عنوانات کو یکجا کرکے شائع کردیا جاتا ہے۔ یہ سماجی علوم اور سائنسی علوم دونوں میں دستیاب ہیں۔ ان کی مدد سے ماہرین مضامین لائبریری میں رسالہ تک پہنچنے سے پہلے ان کے اندراجات سے واقف ہوجاتے ہیں۔ سائی ٹیشن انڈکس میں کسی کلیدی نوعیت کے مضامین کا حوالہ دینے والے جملہ مضامین کو اس مضمون کے تحت درج کیا جاتا ہے جس کی بدولت قاری کو اس موضوع پر دیگر مضامین سے بھی واقفیت ہوجاتی ہے۔ اب اشاریہ ساز رسائل کے مضامین کے علاوہ کانفرنس میں پڑھے گئے مضامین اور کتابوں میں درج مضامین کا بھی احاطہ کرنے لگے ہیں اس کی ایک مثال انڈکس اسلامکس (لندن) (Index Islamicus) ہے۔

ہندستان سے شائع بیشتر اشاریاتی رسائل کسی نہ کسی علمی مواد مرکز مثلاً انسڈاک، نسڈاک، ڈیسی ڈاک (INSDOC, NASSDOC, DESIDOC) وغیرہ سے شائع ہوتے ہیں۔ نجی کمپنی کی طرف سے شائع رسائل میں گائیڈ ٹو انڈین پیریاڈیکل لٹریچر (Guide to Indian Periodical Literature) 1964 سے شائع ہورہا ہے۔ اشارائی رسائل کی ایک جامع فہرست الرچ انٹرنیشنل پیریوڈیکل ڈائریکٹری (Ulrich International Periodicals Directory) میں مل سکتی ہے۔

اشاریہ و اشاریہ سازی : اشاریہ سے مراد کتاب کے آخر میں یا رسالہ کی مکمل جلد کے آخر میں شامل وہ فہرست ہے جو کتاب، رسالہ یا دیگر علمی شے میں موجود معلوماتی اجزا — الفاظ، نام، تصور — کی نشاندہی اور ان تک رسائی کے لیے حوالہ مقام شناخت یا مقام ذکر پر مشتمل ہوتی ہے۔ حوالہ مقام ذکر عموماً صفحہ نمبر ہوتا ہے۔ ایک عام قاری اشاریہ سے کتاب کے آخر میں دیے اشاریہ سے واقف ہوتا ہے لیکن محققین و دانشوروں کے نزدیک اشاریہ سے مراد بالعموم رسائل میں شائع مضامین کے مرتب اشاریہ سے ہوتی ہے جو ایک متعین مدت کے وقفہ سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

برطانوی محکمہ معیاربندی نے اشاریہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ کتابوں، رسائل یا دوسری علمی اکائی میں موجود "لفظ" تصور یا شے کے مقام ذکر تک رسائی کے لیے ایک متعین نظام ترتیب پر تشکیل رہنما ہے۔" یہ مدخل (Entry) کے ایک ایسے تسلسل سے مرتب ہوتا ہے جو تصنیف میں مذکور ترتیب میں نہ ہوکر معلومات کے متلاشی کی لفظ تصور یا شے تک بہ سرعت رسائی کی خاطر کسی دوسری ترتیب (مثلاً الف بائی) پر مع حوالہ مقام ذکر مرتب ہوتا ہے۔" امریکا کے قومی معیار کے مطابق اشاریہ کسی "مجموعہ" میں موجود معلوماتی اجزا یا مجموعہ سے مستنبط تصورات کا ایک متعین ترتیب میں درج رہنما ہے۔ معلوماتی اجزا یا تصورات ایک

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

معروف یا پہلے سے واضح کی گئی ایسی ترتیب میں مرتب ہوتے ہیں جو (متلاشی مواد کے لیے) تلاش مواد میں معین ہو، مثلاً الف بائی، تاریخی یا شماری ترتیب۔ عموماً یہ ترتیب مجموعہ میں موجود معلوماتی اجزا یا تصورات کی ترتیب سے مختلف ہوتی ہے۔ اس تعریف میں مجموعہ سے مراد وہ مواد ہے جس کا اشاریہ مرتب ہوا ہو اور یہ کوئی کتاب یا مواد مرکب (Composite Matter) ہوسکتا ہے یا نقوش کا مجموعہ مثلاً نقشہ جات، تصاویر کے البم یا آرٹ کے فن پاروں کے چربے۔

اشاریہ سازی کی ابتداء مذہبی کتابوں کے لیے مرتب اشاریوں سے ہوئی۔ یہ اشاریے جو سولھویں، سترھویں صدیوں میں مرتب ہوئے الفاظ، نام یا عبارت کے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتے تھے انھیں ابجدی اشاریہ (Concordance) کہا جاتا ہے۔ مغربی زبانوں میں شائع کتابوں میں اب اشاریہ کا ہونا عام بات ہے بلکہ معروف برطانوی صحافی میلکم مگرج (Malcolm Muggridge) کے مطابق بغیر اشاریہ کی کتاب ایک ایسے ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرح ہے جس میں اسٹیشن کے نام نہ درج ہوں۔ اشاریہ سازی کے مقتدر ماہر ایچ ڈبلیو وھیٹلے (H.W.Wheatley) کے مطابق اشاریہ تو متلاشی معلومات کے لیے درکار معلومات کی نشاندہی کا وسیلہ ہے۔ اردو زبان کی کتابوں میں اشاریہ شامل کرنے کی روایت بہت کمزور بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں تک کہ انگریزی یا دوسری مغربی زبان سے اردو میں ترجمہ ہونے والی کتابوں کے ناشر بھی کتاب میں موجود اشاریہ کے متوازی اشاریہ تیار کراکر شامل کرنا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اپنے ابتدائی دور طباعت میں کتابوں میں اشاریہ کی روایت موجود ہے۔ چنانچہ مرقوم دہلی کالج سے شائع 1847 کی کتاب میں اشاریہ موجود ہے۔ اسی طرح حیات جاوید مطبوعہ نامی پریس (1901) میں بھی اشاریہ ملتا ہے۔ حیدر آباد سے دارالتراجم کی کتابوں میں بھی اشاریہ کا التزام تھا۔

کتابوں کے برعکس رسائل کی اشاریہ سازی نسبتاً زیادہ قدیم نہیں۔ یوں تو سائنسی علوم میں تحقیق کی روز افزوں رفتار کی بدولت رسائل کی اشاعت کی تعداد اٹھارہویں صدی سے ہی بڑھنے لگی تھی لیکن انیسویں صدی کے آخری دو دہے تک ان میں شائع مضامین کی تعداد اتنی بڑھ چکی تھی کہ سائنسدانوں کو اشاریہ کی مدد کے بغیر واقفیت حاصل کرنا مشکل ہوگیا۔ نتیجہ میں رسائل کی اشاریہ سازی کی داغ بیل پڑی۔ آج اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے کتابوں کے اشاریے سے کہیں زیادہ رسائل کے اشاریوں کا مقام ہے۔ رسائل کے اشاریہ سازی میں معاون قاعدے اور ضابطے مرتب ہوئے ہیں، صراحتی الفاظ (Descriptors) اور کنزاللغات (Thesaurus) مختلف مضامین و موضوعات میں اشاریہ سازی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وضع کیے گئے۔ یہاں بھی اردو زبان میں اشاریہ سازی کا کام اب شروع ہوا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں معارف برہان آجکل فکر و نظر اور اردو ادب کے اشاریے شائع ہوئے ہیں۔

اشاریہ کے اجزائے ترکیبی : اشاریہ کی بنیادی اکائی "مدخل" ہے۔ مدخل کسی بھی کتاب یا رسالہ کے مضمون کے کلیدی لفظ یا تصور اور اس کے مقام مرکز کی نشاندہی کرنے والے صفحہ نمبر یا متبادل حوالہ سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ متبادل حوالہ کی ضرورت اس صورت میں پڑتی ہے جبکہ متن مضمون میں ایک ہی بنیادی خیال کو مختلف مقامات پر مترادفات کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ اشاریہ ساز ایک اصطلاح کو سرمدخل (Heading) کے لیے منتخب کرلیتا ہے اور دوسری مترادفات سے متبادل حوالہ کے ذریعہ قاری کی رہنمائی کرتا ہے۔

مدخل میں درج تفصیل کی مناسبت سے اشاریہ کی درج ذیل چار سطحیں بتائی گئی ہیں:

الفاظ و نام کا ابجدی اشاریہ (Concordance)

کتاب اشاریہ (Book Index)

رسائل اشاریہ (Journal Index)

معلومات بازیابی نظام اشاریہ (Information Retrieval System Index)

الفاظ و نام کا ابجدی اشاریہ (Concordance) : اشاریہ کی آسان ترین سطح ہے جس میں کتاب میں موجود نام کو ابجدی ترتیب سے درج کرتے ہیں۔ عام طور پر مذہبی کتابوں میں ان کی مدد سے قاری متن میں کسی شخص، چیز یا جگہ کے نام تک پہنچ جاتا ہے۔ اس میں متبادل حوالہ نہ دے کر ہر لفظ اور اس کے مترادفات کو بطور مدخل استعمال کرتے ہیں۔ آج کل مذہبی کتابوں کے علاوہ اس طرح کے اشاریے پیٹنٹ نمبر اور فارمولا اشاریہ میں بھی مقبول ہیں۔

مثال : المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم۔ مرتبہ محمد فواد

عبدالباقی۔ بیروت 1994 A concordance of Quran Comp. by Hanna E.Kassis, California, 1989

کتاب اشاریہ : ایک اچھا اشاریہ کتاب میں درج معلومات سے استفادہ میں بہت معاون ہوتا ہے۔ اس کی ساخت کی پیچیدگی یا سادگی کا انحصار کتاب کے مضمون اور متوقع قاری کی علمی سطح پر ہوتا ہے۔ عموماً کتابوں میں دیے گئے اشاریے مدخل، ذیلی مدخل اور متبادل حوالوں کی مدد سے تیار کیے جاتے ہیں۔ مترادفات کے لیے متبادل حوالے دیے جاتے ہیں۔ درسی کتابوں میں درج اشاریہ محض اشخاص اور مقام کے نام پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ عموماً یہ ایک بار تیار کیا جاتا ہے اور ایک شخص اسے تیار کرتا ہے۔

رسائل اشاریہ : کتاب اشاریہ سے رسالہ اشاریہ کئی جہتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ رسالہ کی ایک جلد یا کئی جلدوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اور پانچ یا دس سال کے وقفہ سے مجموعہ اشاریہ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ ایک مضمون یا ایک مخصوص دائرہ علم (مثلاً سماجی علوم، علوم انسانی) میں شائع ہونے والے ایک سے زائد رسائل کے مضامین کا اشاریہ بھی تیار ہوتا ہے۔ ایک مخصوص موضوع پر ایک سے زیادہ افراد مختلف جغرافیائی مقام پر رہ کر اشاریہ تیار کرسکتے ہیں۔ سائنسی علوم میں اشاریہ کی روایت بہت مستحکم اور وسیع الدائرہ ہے۔

رسائل میں مضامین کے ساتھ ساتھ مراسلے، اداریے اور اشتہارات بھی ہوتے ہیں۔ اشاریہ ساز ادارہ یا شخص کو ان کے شامل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ رسالہ کے اشاریے دو طرح سے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک قسم تو وہ جس میں ایک جلد یا کئی جلدوں میں شائع مضامین کو مصنف کے نام کی ابجدی ترتیب میں درج کیا جاتا ہے اور حوالہ میں جلد نمبر، شمارہ نمبر تاریخ و صفحات دیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی عنوان مضامین کو بھی عنوان میں پہلے لفظ کی مدد سے ابجدی ترتیب میں مرتب کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہوتی ہے جس میں مضامین پہلے سے وضع سرمدخل کے تحت درج کیے جاتے ہیں اور موضوعات کے مترادفات کو متبادل حوالہ سے رہنمائی کرکے قاری کو منتخب سرمدخل سے واقف کراتے ہیں۔ جملہ اقسام کے اشاریوں میں حوالہ کی تفصیل عموماً یکساں ہوتی ہے جو جلد نمبر، شمارہ نمبر (اگر شماروں میں صفحات پوری جلد کے لیے تسلسل سے نہ ہوں) سال و ماہ اور صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔

معلومات بازیابی نظام اشاریہ (Information Retrieval System Index) : کسی مضمون یا مخصوص موضوع پر باہمی تعلق اور مناسبت رکھنے والے مواد علمی کو ایک منطقی اصول پر تشکیل سرمدخل کے ذریعہ علمی معلومات کے ذخیرہ کاری کو اس خیال کے پیش نظر کہ ضرورت پر ذخیرہ سے معلومات کا حصول جلد ممکن ہو اور مکمل طور پر ہو معلومات بازیابی نظام اشاریہ کہتے ہیں۔ مواد علمی کی بہتات، محققین کی مواد ضروری کی مخصوص نوعیت اور وقت کی کمی کے پیش نظر یہ اشاریے مشین کی مدد سے تیار ہوتے ہیں اور معلومات کی بازیابی بھی مشین کے واسطے سے کی جاتی ہے۔

اقسام اشاریہ : اپنے سرمدخل کے انتخاب اور ان کی ترتیب میں پیش نظر اصول و ضوابط کی وجہ سے اشاریہ کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

مصنف اشاریہ : جس میں سرمدخل مصنف کا نام ہوتا ہے جو ابجدی اصول پر مرتب ہوتا ہے۔ رسائل کے اشاریہ میں اشاریہ میں درج جملہ مضامین مصنف کے نام کے نیچے درج ہوتے ہیں۔ کتاب کے اشاریہ میں کتاب میں مذکور مصنفین کے ناموں کو ابجدی ترتیب میں درج کرکے اشاریہ تیار کرتے ہیں۔ مصنف ایک یا ایک سے زائد اشخاص، کوئی ادارہ، سرکاری محکمہ یا شعبہ یا کوئی کانفرنس ہوسکتی ہے۔

موضوعی ابجدی اشاریہ : اس اشاریہ میں مضمون یا موضوع سے متعلق بنیادی سرمدخل، ان کے ذیلی سرمدخل، مترادف سرمدخل سے ایک ابجدی ترتیب میں درج کیے جاتے ہیں۔ مترادفات کا بنیادی سرمدخل سے تعلق متبادل حوالہ کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے اشاریہ میں کسی ایک موضوع سے متعلق مواد منتشر ہوجاتا ہے۔

موضوعی اشاریہ : اس قسم کے اشاریہ میں ابجدی ترتیب بنیادی سرمدخل سے کی جاتی ہے۔ ذیلی و وضاحتی سرمدخل نیم متبادل حوالہ کے سرمدخل بھی درجہ وار بنیادی سرمدخل کے تحت درج ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اشاریہ میں موضوعی ابجدی اشاریہ کی طرح ذیلی مدخل تک سیدھے نہیں پہنچا جاسکتا تاہم موضوعی اشاریہ کی سب سے نمایاں صفت کسی خاص موضوع کے جملہ پہلوؤں کے بارے میں معلومات کا یکجا کرنا ہے۔

مساوی حیثیت اشاریہ : "بولیائی" (Bouolean) ماڈل پر مبنی یہ اشاریہ مساوی حیثیت اصطلاحات سے تشکیل ہوتا ہے اور تلاش مواد کے لیے مضمون یا موضوع سے متعلق دو یا تین اصطلاحوں کو یکجا کرکے تلاش

حوالہ کرتے ہیں۔ مثلاً "تحریک" "آزادی" "ہندستان" تینوں کو یکجا کر کے "ہندستان کی تحریک آزادی" ایک منفرد موضوع قائم ہوگیا۔ اس طرح کے اشاریہ سے استفادہ میں کامیابی کے لیے صحیح اصطلاحوں کا انتخاب شرط ہے۔

رودبدل الفاظ عنوان اشاریہ (Permuted Title Index): کسی مضمون کے عنوان میں موجود الفاظ کو سرِ مدخل کے طور پر استعمال کر کے اشاریہ سازی کی روایت قدیم ہے لیکن حالیہ زمانہ میں فراہمی حوالہ کے مواد کو جب مشین (کمپیوٹر) کی مدد سے انجام دینے کی شروعات ہوئی تو عنوان میں موجود کلیدی الفاظ کی ترتیب میں رودبدل کر کے عنوانات کو درج کیا گیا اور اس طرح اشاریہ سازی کو رودبدل الفاظ عنوان اشاریہ سازی کہا گیا۔ رودبدل الفاظ کے دو طریقے مروج ہیں۔ ایک جس میں تبدیلی ترتیب الفاظ سیاق و سباق میں کی جاتی ہے جسے کوک (Kwoc) (Keyword in Context) کا نام دیا گیا ہے۔ دوسرا جس میں تبدیلی ترتیب الفاظ سیاق و سباق سے صرف نظر کر کے کی جاتی ہے جسے کواک (Kwoc) (Keyword out of Context) کہتے ہیں۔ چنانچہ مصنفین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عنوان قائم کرنے میں انھیں الفاظ کو استعمال کریں جن میں ترسیلی حوالہ صلاحیت ہو۔

پہلو وضاحتی اشاریہ (Faceted Index): پروفیسر ایس آر رنگا ناتھن کے وضع کیے ہوئے زنجیری عمل اشاریہ سازی (Chain Procedure) کی مدد سے تیار یہ اشاریہ اپنے مدخل کے لیے نظام درجہ بندی میں موجود اصطلاحات اور ان کی وضاحت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی بھی مضمون کے موضوعی نشان (Class Number) میں موجود انفرادی اعداد یا رمزیات کو بتدریج درجہ بندی اصطلاح میں تبدیل کر کے سرمدخل حاصل کرتے ہیں جو بعد میں ابجدی اصول پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ چونکہ ترجمہ کے اس عمل کو ایک کڑی کی شکل میں کرتے ہیں اس لیے اس کا نام زنجیری عمل اشاریہ سازی پڑا۔ اس درجہ بندی نظام میں مضمون کے مختلف پہلوؤں کو منسلک کر کے موضوعی نشان تشکیل ہوتا ہے اس لیے اس پر مبنی اشاریہ کو پہلو وضاحتی اشاریہ کہا گیا۔

اشاریہ سازی کا یہ طریقہ اگرچہ اپنی اصلی شکل میں بہت زیادہ مقبول نہیں ہوا لیکن اس میں مضمر فلسفہ سے مغربی اشاریہ ساز ماہرین متاثر ضرور ہوئے۔ چنانچہ اشاریہ سازی کا ایک بہت مقبول طریقہ جسے پریسس (Precis) کہتے ہیں رنگا ناتھن کے اصول سے متاثر تسلیم کیا گیا ہے۔

حوالہ اشاریہ (Citation Index): اس اشاریہ میں سرمدخل ایک مکمل مضمون ہوتا ہے جس کے ذیل میں ایسے تمام مضامین جن میں مضمون مذکور کا حوالہ موجود ہو مصنف کے ناموں کے اعتبار سے درج ہوجاتے ہیں۔ اس طرح کسی ایک مخصوص موضوع پر موجود مضامین کے حوالے ایک جگہ آجاتے ہیں۔

صفات اشاریہ

(1) اشاریہ کو مضمون یا کتاب میں مترادفات کی صورت میں منتشر تصور کے حوالوں کو ذیلی سرمدخل اور متبادل حوالہ سرمدخل کے ذریعہ یکجا کرنا چاہیے۔

(2) اشاریہ کے لیے متن میں موجود جملہ اہم مواد کا اظہار لازم ہے۔ صرف نظر مواد کی وضاحت کی جانی چاہیے۔

(3) اشاریہ میں اصطلاح و تصور کو موزوں، واضح اور غیر مبہم سرمدخل کے ذریعہ درج کیا جانا چاہیے۔

(4) اشاریہ کو اشاریہ ساز کے خیالات کا مظہر نہ ہوکر متن کے نفس مضمون کا مظہر ہونا چاہیے۔

(5) اشاریہ میں استعمال سرمدخل کی ساخت اور ان کے استعمال میں یکسانیت قائم رہنی چاہیے۔

اشتراکیت: دیکھیے سوشلزم۔

اشتراکیت تعین قیمت: اشتراکی معیشت میں ہر قسم کی اشیا یا خدمات کی قیمتوں کا تعین مرکزی منصوبہ بندی مجلس (Central Planning Board) کرتی ہے۔ یہ تعین اس مجلس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ خریداروں اور فروشندوں کے باہمی مسابقت کے ذریعہ طلب و رسد کے زیر اثر متعین نہیں ہوتا اس میں اشتراکیت کے مخصوص نظریہ کے تحت قومی آمدنی کی تقسیم اور معاشی ترقی کے لیے اجتماع اصل (Accumulations) کے مقاصد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

اشیا اجرت کی قیمتوں کے مقرر کرنے کا ایک عام اصول یہ ہے کہ اشیا کی مقررہ قیمتوں پر فروخت سے جو جملہ آمدنی حاصل ہو اس سے نہ صرف ان کے مصارف پیداوار نکل سکیں بلکہ اتنا حاصل زاید (Surplus) مل سکے جو حکومت کے ان تمام اخراجات کی پابجائی کرسکے جو اسے ترقیاتی

سرمایہ کاری "نظم و نسق" ملکی دفاع تعلیمی و طبی خدمات کی فراہمی اور دیگر فلاحی خدمات مفت طور پر انجام دینے میں لاحق ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اشیا صرف کی مقررہ قیمتوں پر فروخت سے جملہ آمدنی جو حکومت کو حاصل ہو وہ ان تمام افراد کی مجموعی آمدنی کے مساوی ہو جو انھیں مختلف قسم کے پیداوار کے کام انجام دینے کے معاوضے میں بطور اجرت و تنخواہ اور وظایف و انعام وغیرہ کی صورت میں حاصل ہو نیز امداد باہمی زراعت یا خانگی پیشے کے ذریعہ حکومت کو لگان اور ٹیکس دینے کے بعد جو کچھ آمدنی ہوتی ہے یا خانگی پس اندازی کو حکومت کے تمسکات خریدنے سے جو سود حاصل ہوتا ہے اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اشتراکیت میں چونکہ زمین اور اصل خانگی ملکیت نہیں ہوتے اس لیے افردا کا بنیادی ذریعہ آمدنی اجرت و تنخواہ ہوا کرتی ہے جس میں مہارت اور کارکردگی کی بنا پر بہت کچھ فرق پایا جاتا ہے۔

اشیا صرف کی قیمتوں کے مقرر کرنے سے پہلے مرکزی مجلس یہ طے کرتی ہے کہ کس قسم کی اور کتنی مقدار میں اشیا صرف پیدا کی جائیں جس کا انحصار مادی اور غیر مادی وسائل کی اس مقدار پر ہوتا ہے جو دفاعی ضروریات اور اجتماعی اصل کے لیے مختص کرنے کے بعد بچ رہتی ہے۔ اس بچی ہوئی مادی اور غیر مادی وسائل کی مقدار سے مختلف قسم اور مقدار میں اشیا صرف کی پیداوار کے تعین میں صارفین کی ضروریات اور عادات کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور پھر ان اشیا کی قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں جن پر صارفین اپنی آمدنی کی بنا پر مختلف اشیا مختلف مقداروں میں خرید سکتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اشیا صرف کی قیمتیں ان کے مصارف پیداوار سے زیادہ ہوئی ہیں تاکہ حاصل زاید مل سکے۔ چنانچہ یہ حاصل زائد بڑی حد تک ایک خاص قسم کے محصول فروخت پر مشتمل ہوتا ہے جسے الٹ پھیر ٹیکس (Turn Over Tax) کہتے ہیں۔ یہ ٹیکس تمام اشیا صرف پر عاید کیا جاتا ہے اور اشیا پیداوار عموماً اس سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ حکومت سرمایہ کاری اور اپنے دیگر اخراجات کی تکمیل اس محصول کے ذریعہ کرتی ہے۔ اشیا صرف کی اس طرح مقررہ قیمتوں میں تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے۔ اشیا صرف کی اس طرح مقررہ قیمتوں میں تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے۔ اگر کسی شے کی مقررہ قیمت پر اس کی فراہم کردہ مقدار فروخت نہ ہورہی ہے تو قیمت کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شے کی قیمت بہت زیادہ ہونے سے قلت ہو جائے تو اس کی قیمت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ کسی مقررہ قیمت پر اس کی مقدار رسد فروخت نہ ہورہی ہو تو اس کی قیمت میں کمی یا بیشی کے ذریعہ رسد کو طلب کے مساوی کرنے کی بجائے اس کی پیداوار کم کردی جائے اور اس کی وجہ سے بچے ہوئے وسائل سے وہ شے پیدا کی جائے جس کی مانگ زیادہ ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور ایسی اشیا صرف بنائی جائیں جو اب تک صارفین کو میسر نہ ہوئی تھیں۔

اشتراکیت میں اشیا صرف کی پیداوار اور ان کی قیمتوں کے اس طرح تعین کے پیش نظر یہ کہا جاتا ہے کہ صارفین کو ایک حد تک آزادی انتخاب (Freedom of Choice) حاصل ہوتی ہے اگرچہ انھیں صارفین کی خودمختاری (Sovereignty of Consumers) حاصل نہیں ہوتی جو سرمایہ دارانہ معیشت کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ جس میں پیداوار میں اجرتوں کی مختلف شرحیں مقرر کردی جاتی ہیں اور افراد اپنی خواہش کے مطابق پیشہ اختیار کرنے کے لیے بھی بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔

حسابی (Accounting) اور ظلی (Shadow) قیمتیں :

اشتراکیت میں اشیا کی قیمتوں کا تعین اور اس میں تبدیلی مرکزی مجلس کرتی ہے اور ان کی نوعیت حسابی قیمتوں کی ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ کم ترقی یافتہ معیشت میں بھی منصوبہ بندی کے لیے حسابی ظلی قیمتوں کا تصور اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ بازار کی قیمتیں سماجی نقطہ نظر سے اشیا کی حقیقی قدر کو ظاہر نہیں کرتیں۔ ظلی قیمت کا تصور وسائل کی قلت کی بنا پر اس کے متبادل استعمال پر مبنی ہوتا ہے۔ جو سماجی نقطہ نظر سے زیادہ افادہ بخش قرار دیا جاتا ہے۔ ظلی قیمت بازار قیمت سے زیادہ یا کم ہوسکتی ہے۔ بے روزگاری کی صورت میں محنت کی ظلی قیمت یا اجرت اس کی بازار اجرت سے کم ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے اشیا اصل کی قلت کی بنا پر ظلی شرح سود بازار شرح سود سے زیادہ ہوتی ہے۔ اشیا صرف میں تعیشات کی بازاری قیمتیں ان کی ظلی قیمتوں سے کم ہوتی ہیں اگر ان محدود وسائل کو جو ان اشیا کی پیداوار میں استعمال ہوتے ہیں دوسری ایسی اشیا بنانے میں لگایا جاسکے جن کی قدر سماجی اور خوشحالی کے نقطہ نظر سے زیادہ ہو۔ ظلی قیمتوں کا صحیح تخمینہ اگرچہ مشکل ہے لیکن کم و بیش اندازہ کیا جاسکتا ہے اور عوامی شعبہ پیداوار میں منصوبے کے تحت محدود وسائل کی تقسیم کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اگر عاملین کی قیمت کا اندازہ ان کی انفرادی پیداواری کے بجائے سماجی پیداواری مختتم (Social Marginal Productivity) کے لحاظ سے کیا جائے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اشخاص جو معاہدات کی تعمیل مختص کی دادرس حاصل کرسکتے ہیں (Persons who may obtain specific performance):

کسی معاہدہ کا ہر فریق تعمیل مختص کے لیے عدالتی چارہ جوئی کرسکتا ہے۔ اگر معاہدہ افراد خاندان کے درمیان حقوق معترضہ (Doubtful Rights) کے تعلق سے ہو تو اس خاندان کا کوئی فرد جسے اس معاہدے سے فائدہ پہنچ سکتا ہو (Beneficiary) تعمیل مختص کے لیے عدالت میں چارہ جوئی کرسکتا ہے۔

ایسا شخص جس پر جائداد کی ملکیت عود کرے اگر سابق مالک نے شخص ثالث سے اس جائداد کے متعلق کوئی معاہدہ کیا ہو تو موجودہ مالک اس معاہدے کے نفاذ کے لیے اس شخص ثالث کے خلاف تعمیل مختص کی دادرس عدالت سے طلب کرسکتا ہے۔

اگر کسی کمپنی نے کسی سے معاہدہ کیا ہو اور وہ کمپنی کسی اور کمپنی میں ضم ہوجائے تو نئی کمپنی اس معاہدے کی تعمیل مختص کے لیے قانون دادرس خاص (Specific Relief Act) کے تحت عدالت سے چارہ جوئی کرسکتی ہے۔

اشخاص فاترالعقل (Provisions as to Accused, Persons of Unsound mind):

جب کسی مقدمہ یا کارروائی میں حاکم فوج داری کو یہ معلوم ہو یا یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ ملزم فاترالعقل ہے اور اس وجہ سے اپنی جواب دہی کی قابلیت نہیں رکھتا تو اس کے فاترالعقل ہونے کی نسبت تحقیقات کرے گا اور طبی معائنہ کے بعد سرکاری ڈاکٹر کی رائے حاصل کرے گا اور ڈاکٹر کا بیان قلمبند کرے گا اور اگر حاکم فوجداری کی رائے میں ملزم فاترالعقل قرار پائے اور اس وجہ سے جواب دہی کرنے کے قابل نہ ہو تو وہ اس مقدمے میں مزید کارروائی ملتوی رکھے گا۔

اصول:

یہ اصل کی جمع ہے جس کے معنی جڑ اور بنیاد کے ہیں۔ ماخذ حقیقت مادہ قاعدہ ضابطہ اور قانون وغیرہ کو بھی اصل و اصول کہتے ہیں۔ جس طرح ہر چیز کے کچھ نہ کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں اسی طرح دین کے بھی اصول و ضوابط ہیں جن کو اصول دین کہاجاتا ہے۔ اہل سنت و الجماعت کے نزدیک ان سے اسلام کے پانچ بنیادی ارکان مراد ہیں:

(1) شہادتیں یعنی اللہ ایک ہے اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندہ اور رسول ہیں۔

(2) نماز (3) روزہ (4) زکوٰۃ (5) حج

اور اہل تشیع کے نزدیک اس سے مراد یہ چیزیں ہیں:

(1) توحید، (2) عدل، (3) نبوت، (4) امامت، (5) آخرت

دینی و دنیاوی علوم کے ضوابط قوانین اور قاعدوں کو بھی اصول کہا جاتا ہے۔ جیسے اصول تفسیر اصول حدیث اور اصول فقہ وغیرہ نیز اصول اقلیدس، اصول سیاسیات و معاشیات وغیرہ۔

عموماً اصول اور علم الاصول سے اصول فقہ مراد ہوتے ہیں یہ وہ علم و فن ہے جن میں شریعت کے فروعی احکام و مسائل سے استنباط کے دلائل ماخذ اور ضابطہ بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد فروعی احکام کے استنباط کے ملکہ کی تحصیل ہے۔ اصول فقہ کے چار دلائل و مآخذ اولین اور بنیادی ہیں۔

(1) کتاب، (2) سنت، (3) اجماع اور (4) قیاس۔

اصول تلافی مافات (Compensation Principles):

اصول تلافی جو عام طور پر جدید فلاحی معاشیات سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی تشکیل انگریز معاشین پروفیسر. ہکس (Hicks) اور پروفیسر کالڈر (Kaldor) نے کی تھی۔ اور اس لیے اس کو کالڈر ہکس معیار (Kaldor-Hicks Criterion) بھی کہا جاتا ہے۔ اس معیار کی بنیاد پریٹو کے نظریے پر ہے۔ ان دونوں معاشین نے پیداوار اور مبادلہ کے مسئلہ کو جو کہ کارکردگی کے معروضی معیار (Objective Criterion of Efficiency) پر ہے۔ تقسیم آمدنی کے مسئلہ سے جو انصاف کے موضوعی معیار (Subjective Criterion of Equity) پر مبنی ہے علیحدہ رکھتے ہوئے اپنا استدلال پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پیداوار میں اضافہ کے ساتھ آمدنی کی ایسی تقسیم کی جاسکتی ہے جس سے کسی شخص کی خوشحالی میں کمی کیے بغیر دوسرے لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اضافہ خوشحالی کا جو معیار پریٹو نے پیش کیا تھا اس کا انطباق اس صورت میں بھی ہوسکتا ہے جبکہ کسی تبدیلی سے کچھ لوگوں کو معاشی فائدہ اور کچھ لوگوں کو نقصان ہو رہا ہے بشرطیکہ فائدہ حاصل کرنے والے نقصان اٹھانے والوں کے نقصان کی تلافی کردیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اضافی حصص۔ تقسیم دولت: معاشیات کلی پر مبنی نظریات تقسیم نے ایک بار پھر ماہرین معاشیات کا مرکز توجہ اسی مسئلہ کو بنا دیا ہے جسے ریکارڈو نے اقتصار سیاسی (Political Economy) کا اصل مسئلہ قرار دیا تھا۔ مجموعی قومی آمدنی میں اجرت اور اجرت کے علاوہ دیگر آمدنیوں کی اضافی نسبتیں کیوں کر طے پاتی ہیں؟ اس پر زمانہ حال میں کافی تحقیقات کی گئی ہیں۔ اعداد و شمار کی روشنی میں بعض معاشین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ معاشی ترقی اور قومی آمدنی کے نمو (Growth) کے باوجود مجموعی قومی آمدنی میں اجرت کا اضافہ حصہ ایک سطح پر قائم رہتا ہے۔

اضطرار: ضرور ضرورت سے مشتق اور افتعال کے وزن پر مصدر ہے۔ اس میں ت ط سے بدل گئی ہے۔ کیونکہ عربی میں یہ قاعدہ ہے کہ جب ض کے ساتھ ت آتی ہے تو اس کو ط سے بدل دیتے ہیں۔ اضطرار کے لفظی معنی مجبور ہونا اور مجبور کرنا ہیں۔ اس سے مضطر بنا ہے جس کے معنی مجبور کے ہیں۔ مگر اصطلاح فقہ میں اس سے وہ شخص مراد ہوتا ہے جو کسی حرام قول و فعل کے ارتکاب کے لیے اس حد تک مجبور ہوجائے کہ اس کا ارتکاب نہ کرنے کی صورت میں اس کی جان چلی جانے کا اندیشہ ہو۔ جیسے کسی کو سخت بھوک یا پیاس لگے اور اس کے پاس کھانے پینے کی کوئی حلال اور مباح چیز نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کو مردار وغیرہ کھاکر اور شراب پی کر اپنی جان بچا لینے کی شرعاً رخصت اور اجازت ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص کلمہ کفر ادا کرنے کے لیے اتنا مجبور ہوجائے کہ اس کے بغیر جان ہی محفوظ نہ رہے تو کفر کا لفظ زبان سے ادا کرکے وہ اپنی جان بچا سکتا ہے۔

لیکن پہلی صورت میں یہ شرط ہے کہ آدمی کو مردار کھانے اور شراب پینے کی معمولی رغبت اور ذرا سی چاہت بھی نہ ہو بلکہ وہ مردار کو نہایت ناگواری سے کھائے اور شراب کو شدید نفرت کے ساتھ پیے اور محض سلامتی کے بقدر ہی کھائے پیے اور کھانے پینے میں حد سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔ اسی طرح دوسری صورت میں کلمہ کفر زبان سے ادا تو کردے مگر دل سے نفرت اور ایمان کی جانب رغبت میں کوئی کمی اور فرق نہ آئے بعض فقہا کے نزدیک اس طرح کی صورتوں میں رخصت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے اگر فائدہ نہ اٹھائے اور جان چلی جائے تو یہ خودکشی ہوگی۔ مگر دوسرے لوگ صبر و عزیمت سے کام لینے کو افضل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جان دے دینا اور رخصت سے فائدہ نہ اٹھانا ہی بہتر اور اولیٰ ہے۔

افرادی طاقت۔ منصوبہ بندی (Man Power Planning): کسی بھی معیشت میں مختلف قسم کی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ ان سرگرمیوں کے لیے مختلف درجے کی مہارت رکھنے والے لوگ مختلف تعداد میں درکار ہوتے ہیں۔ افرادی منصوبہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ معیشت کے لیے درکار مختلف مہارتوں کا معیار مقرر کیا جائے اور مزدوروں کی اس تعداد کا تخمینہ کیا جائے جو معیشت کے جداگانہ شعبوں میں درکار ہوگی۔ پھر ان مہارتوں کی فراہمی کے لیے تعلیم اور تربیت کی مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں۔ افرادی منصوبہ بندی میں ان کمترین وسائل کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو افراد کی تربیت کے لیے وقف کیے جانے چاہیے تاکہ معاشی منصوبہ بندی کے مقرر کردہ نشانوں کا حصول ممکن ہوسکے۔

معاشی منصوبہ بندی کے مقابلے میں افرادی منصوبہ بندی کا تصور نیا ہے۔ مختلف ممالک میں تعلیم کی ترقی سماجی ترقی کی ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر ظہور میں آئی اور اس کا براہ راست تعلق معاشی مقاصد کے حصول سے قائم نہیں کیا گیا ہے۔ معاشی، تعلیمی اور افرادی طاقت کی منصوبہ بندی کے درمیان خط فاصل کھینچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

افرادی منصوبہ بندی کے تعلق سے مختلف مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ ایک نزاعی مسئلہ یہ ہے کہ آیا معاشی اور تعلیمی منصوبہ بندی کے بغیر افرادی طاقت کی منصوبہ بندی ممکن ہے۔ اگر افرادی طاقت کی منصوبہ بندی مفصل اور جامع ہو تو اس سے اختراعی صلاحیتوں کے اظہار کے مواقع گھٹ جاتے ہیں اور معاشی نظام کی لچک پذیری کم ہوجاتی ہے اس کے علاوہ اس قسم کی منصوبہ بندی جمہوری اقدار کے بھی مغائر ہوسکتی ہے۔

افرادی طاقت کی منصوبہ بندی تین طرح کی ہوسکتی ہے:

(1) قلیل مدتی، (2) اوسط مدتی اور (3) طویل مدتی۔

طویل مدتی منصوبہ بندی میں معیشت کی ضروریات کی پیش قیاسی کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں لیکن قلیل مدتی منصوبہ بندی زیادہ موثر ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے اوسط مدتی منصوبہ بندی ہی قابل ترجیح سمجھی جاتی ہے۔ منصوبہ بندی کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ پہلے موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں آئندہ کے لیے افرادی طاقت کی ضروریات کا تخمینہ کیا جاتا ہے اور آخر میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ معیشت کے مختلف شعبوں میں ضرورت کے مطابق موزوں مہارت رکھنے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

والے مزدور دستیاب ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معیشت کو مختلف پیشوں اور شعبوں میں تقسیم کیا جائے۔ مثلاً صنعت، زراعت وغیرہ ہر شعبے کی افرادی طاقت کی ضروریات کا تعین کرنے کے بعد ان کی تکمیل کے لیے مطلوبہ تعداد میں مزدوروں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے مثلاً کسی صنعت میں کتنے انجینئر درکار ہوں گے۔ ان کی مہارت کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ کتنے فورمین مطلوبہ ہوں گے۔ کتنے بامہارت مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔ زراعت میں کس قسم کی مہارت کی ضرورت ہوگی۔ زراعت کے کتنے گریجویٹ درکار ہوں گے۔ فصلوں کی بیماریوں کے کتنے ماہرین کی ضرورت پیش آئے گی۔ آبپاشی کے نظام میں توسیع کے لیے کس تعداد میں انجینئر چاہئیں یا بجلی کی فراہمی کے لیے کس قسم کے بامہارت مزدوروں کی ضرورت ہوگی۔

اس طرح مختلف مہارتوں کے حصول کے لیے تعلیم اور تربیت کا مکمل نظام قائم کرنا ہوتا ہے جس کے لیے ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ عام تعلیم و تربیت پانے والے کتنی مدت صرف کریں اور کن معیارات کی مہارت کے حامل ہوں۔ ایک قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک کی افرادی منصوبہ بندی ایک جیسی ہوگی یا اس میں فرق ہونا چاہیے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی بعض اقسام کی اعلیٰ مہارتوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ درکار تعداد میں ڈاکٹر اور انجینئر دستیاب نہیں ہوتے۔ اس لیے آیندہ کی ضروریات کا تخمینہ موزوں مہارت رکھنے والوں کی فراہمی پر منحصر ہے۔ اس کے لیے مناسب تعلیمی اور تربیتی سہولتیں فراہم کرنی ہوں گی۔ ترقی پذیر ممالک میں شدید بے روزگاری ہوتی ہے ایک طرف بہت سے مزدور جزوی یا کلی طور پر بے روزگار ہوتے ہیں تو دوسری طرف با مہارت مزدوروں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں معیشت کے دو شعبے ہوتے ہیں ایک جدید صنعتوں کا شعبہ دوسرا روایتی شعبہ ان دونوں کی ضروریات میں فرق ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے ان دونوں شعبوں کے لیے درکار مزدوروں کی مہارت کے معیار اور نوعیت میں بھی فرق ہوگا۔ مثلاً اگر ترقی پذیر ممالک میں زراعت ہی معیشت کا سب سے اہم شعبہ ہے جس کی ترقی کے ساتھ معاشی ترقی وابستہ ہوتی ہے اس لیے اس شعبے کے لیے درکار محنت کی مناسب تربیت ہو۔

مثلاً امداد باہمی کے ادارے چلانے کے لیے مناسب لوگ فراہم ہوں۔ نئے طریقہ کاشت کی ترویج کے لیے ایسے تربیت یافتہ لوگ ہوں جو نئی کھاد کے استعمال کے طریقے سکھا سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی فنی مہارت عام تعلیمی اداروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے علیحدہ ادارے قائم کرنے ہوں گے۔ ترقی پذیر ملکوں میں روزگار کے مواقع صرف مالیاتی سرمایہ کاری سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ تربیت یافتہ مزدوروں کی موجودگی بھی روزگار کے لیے نئے مواقع پیدا کرتی ہے۔ مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ تربیت یافتہ افراد موجود ہوں تو دیہات کے بے روزگار مزدوروں کی بڑی تعداد کو سیلابوں کے روک تھام کے کام پر لگایا جائے۔ تربیت یافتہ افراد موجود نہ ہوں تو یہ کام ممکن نہ ہوگا۔ مختلف ملکوں میں افرادی منصوبہ بندی کے عمل آوری کا کام مختلف انتظاموں کے تفویض ہوتا ہے۔ بعض ملکوں میں یہ کام وزارت تعلیم کے سپرد کیا جاتا ہے۔ میکسیکو میں آزاد یا نیم آزاد ادارے افرادی طاقت کی ضروریات کے تخمینے مرتب کرتے ہیں۔ ہندوستان میں وزارت داخلہ کے تحت افرادی طاقت کی نظامت قائم کی گئی ہے۔

افرادی طاقت کی منصوبہ بندی معاشی منصوبہ بندی سے قریبی تعلق رکھتی ہے اس لیے ان دونوں میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری ہے۔

افراط زر (Inflation) : قیمتوں میں بتدریج اضافہ کا عمل جس سے زر کی قوت خرید برابر گرتی جاتی ہے افراط زر کہلاتا ہے۔ افراط زر ایک ایسا مرض ہے جو دوسری عالم گیر جنگ کے بعد سے دنیا کے تقریباً تمام ملکوں کو لاحق ہے اور اس پر معاشین نے کافی توجہ دی ہے۔ اس کے متعلق جو نظریے پیش کیے گئے ہیں ان کے مطابق اس کی دو قسمیں ہیں :

(1) لاگت کا افراط زر (Cost Push Theories)

(2) طلب کا افراط زر (Demand Pull Theories)

- ثانی الذکر میں قیمتوں کی سطح میں تبدیلی رسد زر کے زیر اثر عمل میں آتی ہے۔ اس کے حسب ذیل تین حل تجویز کیے جاتے ہیں۔

(الف) اجتماعی طلب پر روک لگانے کے لیے مالیاتی پالیسی اور زری پالیسی کا استعمال (ب) بے روزگاری میں کمی کرکے افراط زر کے دباؤ کو کم کرنا (ج) اشیا کے عوامل پیداوار اور اشیا کے بازار میں براہ راست

مداخلت کرکے قیمتوں اور اجرتوں پر روک لگانا بعض ملکوں میں یہ بھی تجویز ہے کہ اجرتوں میں اضافہ کرنے والی فرموں پر اجرتوں کے اضافہ کی نسبت سے ٹیکس لگایا جائے تاکہ آجراجرتوں میں اضافہ کے مطالبوں کی مزاحمت کریں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ اس سے قیمتوں کے نظام پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ محض انتظامی اقدامات سے افراط زر پر پوری طرح قابو نہیں پایا جاسکتا اس کے لیے ملک کی طلب کو قابو میں کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ محض انتظامی اقدامات سے اجرتوں اور قیمتوں میں مضر اضافہ روکنا بہت مشکل ہے۔

اس کارروائی میں اصلی وقت یہ پیش آتی ہے کہ افراط زر کی لاگت اور اس کو روکنے کی لاگت میں کس طرح توازن پیدا کیا جائے خاص طور پر جب بے روزگاری اونچی سطح پر ہو اور حقیقی خدمات اور اشیا کی پیداوار کم ہو۔ اگر افراط زر معمولی یعنی 2 یا 3 فیصدی سے زیادہ نہ ہو تو اس میں حرج نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ترقی پذیر معیشت کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

افراط زر کے معیشت پر کئی قسم کے اثرات ہوتے ہیں۔ مثلاً (1) آہستہ رفتار افراط زر میں زبردست تیزی پیدا ہوسکتی ہے جس کے نتائج نہایت تباہ کن ہوتے ہیں۔ (2) سرمایہ داری سماج میں دولت کی تقسیم میں بڑا تفاوت پیدا ہوجاتا ہے چنانچہ جن لوگوں کی آمدنی میں افراط زر کے مقابلہ میں کم شرح سے اضافہ ہو وہ اور پریشان حال ہوجاتے ہیں اور سماج میں ان ہی لوگوں کی اکثریت ہے۔ ایک محدود مالدار طبقہ ایسا بھی ہے جس کی آمدنی میں اضافہ افراط زر میں اضافہ سے زیادہ ہوتا ہے زیادہ تباہ حالی کے وہ لوگ شکار ہوتے ہیں جن کی آمدنی کااضافہ کم ہوتا ہے مثلاً پنشن پانے والے یا مقررہ اجرت یا تنخواہ پانے والے (3) افراط زر سے بچت کا رجحان بھی کم ہونے لگتا ہے اس لیے جو لوگ بچت کرتے ہیں ان کی بچت کی قدر و قیمت کے ساتھ گھٹنے لگتی ہے۔ البتہ بینک وغیرہ اس لحاظ سے اپنی شرح سود میں اضافہ کردیتے ہیں۔ (4) اس کا سب سے برا اثر بین قومی تجارت پر پڑتا ہے اس لیے کہ افراط زر سے اشیا کی لاگت بڑھ جاتی ہے اور دوسرے ملکوں سے مقابلہ مشکل ہوجاتا ہے اور اس طرح درآمد بڑھتی جاتی ہے اور برآمد گرتی جاتی ہے۔ قومی آمدنی گر جاتی ہے اور توازن ادائگی کا مسئلہ بھی مشکل بنتا جاتا ہے۔ البتہ اگر افراط زر صرف چند ملکوں میں ہو تو یہ صورت پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اکثر ملکوں میں یکساں طور پر افراط زر ہو تو پھر بین قومی معاشی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن عملاً ایسا ہوتا نہیں۔ اس لیے اکثر ممالک کو افراط زر کی تیز رفتاری پر قابو پانے کے لیے سخت جد وجہد کرنی پڑتی ہے۔

افریقی ایشیائی بلاک (Afro-Asian Bloc) : دوسری جنگ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک سامراج سے آزاد ہوچکے تھے لیکن ابھی وہ معاشی اور سیاسی طور پر اتنے طاقت ور نہیں تھے کہ عالمی سیاست پر اثرانداز ہوسکتے۔ ان کے اپنے کئی مشترکہ معاشی اور سیاسی مسائل بھی تھے ان سب نے انھیں مجبور کیا کہ وہ متحدہ طور پر اقدام کریں، مشترکہ مسائل پر آپس میں مشورہ کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ 1945 اور 1962 کے درمیان ایشیا اور افریقہ کے چالیس ملکوں کو آزادی مل چکی تھی پھر ان کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہا اور اب یہ سبھی آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوچکے ہیں۔

اس آپسی تعاون کی ابتدا 1950 میں ہوئی جب ان ملکوں نے مجلس اقوام متحدہ میں آپس میں مشورہ اور مشترکہ اقدام کرنا شروع کیا۔ 1955 میں بانڈونگ (انڈونیشیا) میں ان کی پہلی کانفرنس ہوئی جس میں چین کے چواین لائی، ہندستان کے جواہر لال نہرو، مصر کے جمال عبدالناصر اور انڈونیشیا کے سوکارنو نے اہم حصہ لیا تھا۔ یہیں غیر جانبداری اور دوسرے ملکوں کے معاملات میں عدم مداخلت کے بارے میں پنچ شیل، یا پانچ اصول مرتب ہوئے تھے۔ اس کانفرنس میں ایشیا اور افریقہ کے نوآزاد 29 ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ مجلس اقوام متحدہ کے اندر اور باہر اس اتحاد کی کوششوں کا محکوم ملکوں کی جدوجہد آزادی پر بہت گہرا اثر پڑا۔ 1960 میں ان کی کوشش سے مجلس اقوام متحدہ نے یہ تجویز منظور کی کہ بقیہ کالونیوں اور محکوم ملکوں کو فوراً آزادی حاصل ہو۔ 1961 تک ان ملکوں کی تعداد مجلس اقوام متحدہ میں آدھے سے زیادہ ہوچکی تھی چنانچہ جنرل اسمبلی نے اس سال ایک خاص کمیٹی مقرر کی جس کا کام محکومی سے متعلق 1960 کی تجویز کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ اس کی کوششوں سے بہت سارے ملکوں نے آزادی حاصل کرلی۔

ظاہر ہے کہ ان ملکوں میں سب ہی سیاسی طور پر ہم خیال نہیں ہیں۔ ان میں کیمونسٹ بھی ہیں، سوشلسٹ بھی اور سرمایہ داری کے حامی بھی اسی لیے بعض مسائل پر اختلافات بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن معاشی

ترقی، معاشی غلامی سے نجات اور آزادی کی حفاظت ان کے مشترکہ مقاصد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اکثر متحد رہتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یہ ایک بہت بڑی جدوجہد میں مصروف ہیں کہ کس طرح ترقی یافتہ صنعتی ممالک اور نوآزاد غریب ترقی پذیر ممالک کی درمیانی خلیج کو پُر کیا جائے اور کس طرح ترقی یافتہ ممالک کو مجبور کیا جائے کہ وہ انھیں معاشی امداد اور رعایتیں دیں اور معاشی تعلقات میں توازن پیدا کریں۔

افریقی ترقیاتی بینک (African Development Bank, ADB): افریقی ترقیاتی بینک کا قیام اقوام متحدہ کے کمیشن برائے افریقہ کے ذریعے ستمبر 1964ء میں عمل میں آیا اور اس نے جولائی 1966 سے کام کرنا شروع کیا۔ اس میں 53 علاقائی اور 25 غیر علاقائی رکن ممبر شامل ہیں۔

اس کا صدر مقام عابد جان (آئوری کوسٹ) ہے۔

افریقی نیشنل کانگریس (African National Congress): افریقی نیشنل کانگریس جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں کی سب سے پرانی سیاسی جماعت ہے۔ اس کا آغاز 1882 میں کیپ ٹاؤن میں نیٹو ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس وقت اس کا مقصد نسل پرستی پر مبنی "پاس ضوابط" (Pass Laws) کے خلاف جدوجہد کرنا اور افریقیوں کے سماجی، معاشی اور تعلیمی حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ بعدازاں اس کا نام نیٹو نیشنل کانگریس تجویز ہوا پھر 1912 میں اسے بدل کر افریقی نیشنل کانگریس کردیا گیا۔ اس وقت اس جماعت کا خاص مقصد جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی پالیسی کے خاتمے اور تمام شہریوں کے لیے یکساں سماجی، معاشی، قانونی اور سیاسی حقوق و مراعات کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ 1913 میں نیٹو لینڈ ایکٹ جب پارلیمنٹ میں زیر بحث تھا تو افریقی نیشنل کانگریس نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ افریقہ کے تمام رنگ و نسل کے لوگوں کو مساوی طور پر پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے برسوں جدوجہد کی، ہڑتالیں کیں، مظاہرے کیے، عدالتوں کے دروازوں پر دستکیں دیں، پولس کے مظالم سہے اور گرفتار ہوکر قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد "پاس" ضوابط کے خلاف زبردست مزاحمت کی۔ 1947 میں جب نیشنل پارٹی کی فتح ہوئی اور اس نے نسل پرستی پر مبنی سفید فاموں کی برتری کی پالیسی اختیار کی تو افریقی نیشنل پارٹی کے ممبروں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی اور 1952 میں ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔

1960 میں پان افریقی کانگریس اور افریقی نیشنل کانگریس نے مل کر متحدہ طور پر جب شارپ ویل (Sharpvelle) ٹاؤن میں سیاہ فاموں نے پاس ضوابط (Pass Laws) کے خلاف پرامن عوامی مظاہرہ کیا تو سرکاری پولس نے خودکار ہتھیاروں سے گولیاں برسا کر 80 مظاہرین کو ہلاک اور سیکڑوں کو زخمی کردیا۔ اس خونیں واقعہ کے بعد فوراً پورے جنوبی افریقہ میں ہنگامی حالات کا اعلان کرکے سیاہ فاموں پر سخت پابندیاں عائد کردی گئیں، عوامی سطح پر گرفتاریاں عمل میں آئیں اور افریقی کانگریس اور افریسی نیشنل کانگریس دونوں کو خلاف قانون قرار دے کر ان پر پابندی عائد کردی گئی۔ اس کے بعد افریقی نیشنل کانگریس کے کارکن روپوش ہوگئے۔ بہتوں نے دوسرے ملکوں میں پناہ لے کر دوسری تنظیموں کے ساتھ مل کر نسل پرستی کے خلاف گوریلا مزاحمت شروع کردی۔ 1976 میں سوٹو سانحہ پیش آیا جس میں پولس اور فوج نے مل کر چھ سو (600) سیاہ فاموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 1980 میں افریقی نیشنل کانگریس کے گوریلاؤں کے ایک کار بم نے ایرفورس کے مرکز پر حملہ کرکے سیکڑوں کو قتل اور زخمی کردیا۔

1989 میں نسلی امتیاز کے تئیں حکومت کی پالیسی میں نرم ہونا شروع ہوئی اور حکومت کا یہ عندیہ رہا کہ وہ جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں کو بھی سیاسی حقوق دینے پر غور کررہی ہے۔ فروری 1990 میں افریقی نیشنل کانگریس پر تیس سالہ عائد پابندی اٹھالی گئی اور اس کے قائد نلسن منڈیلا برسوں کے بعد جیل سے رہا کردیے گئے۔ 17/ مارچ 1992 کو تمام رنگ و نسل کے لوگوں کو مساوی حقوق دینے کی غرض سے محض سفید فاموں کے مابین استصواب رائے کرایا گیا جس میں 85.6% فیصد لوگوں نے اس کے حق میں رائے دی۔ 22/ دسمبر 1993 کو پارلیمنٹ نے ایک عبوری دستور کی منظوری دی جس کا مقصد کثیر نسلی پارلیمنٹ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ 27/ اپریل 1994 کو عبوری دستور کو پانچ سال کے لیے نافذ کردیا گیا اور اس کی رو سے عام انتخاب کے بعد افریقی نیشنل کانگریس کے قائد نلسن منڈیلا نے بڑی اکثریت سے کامیاب ہوکر 10/ مئی 1994 کو جنوبی افریقہ کے صدر کی حیثیت سے حلف لیا۔ مختصراً یہ کہ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خاتمہ میں افریقی نیشنل کانگریس کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

افلاطون (Plato): افلاطون غالبًا دنیا کا سب سے بڑا فلسفی گزرا ہے۔ یہ یونان میں 427ق.م. میں پیدا ہوا اور 347ق.م. میں اسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ افلاطون ماں اور باپ دونوں طرف سے دولت مند تھا اور اس کا پرتو اس کے فلسفہ اور اس کی تحریرات میں نظر آتا ہے۔ وہ سقراط کا شاگرد تھا۔ دراصل اسی کے تحریر کردہ "مکالمہ سقراط" کی وجہ سے دنیا سقراط سے واقف ہو سکی۔ لیکن بہت جلد افلاطون سقراط سے بہت آگے نکل گیا۔ اور اس کی فکر نے فلسفہ، منطق اور سماجی علوم میں نئی راہیں کھول دیں۔ اسے بجا طور پر نظریہ سیاسیات اور سماجیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ جمہوریہ (The Republic) اس کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں سیاست اور سماج پر عالمانہ بحثیں شامل ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے افلاطون جمہوری خیالات کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دانشور قیادت اور حکومت کریں گے اور جاہل عوام ان کی اطاعت کریں گے۔ لیکن سماجی نظریہ میں وہ اجتماعیت کا قائل تھا۔ چنانچہ اس کا کہنا تھا کہ تم کو کل کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ نہ کہ کل کو تمہارے لیے۔ افلاطون سماجی استحکام کا قائل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سماج میں جو بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ان کا منبع اور سرچشمہ حکمراں طبقہ ہوتا ہے۔ اور اگر حکمراں طبقہ میں بدلتے ہوئے خیالات سے ہم آہنگی کی صلاحیت نہ پائی جائے تو وہ مائل بہ انحطاط ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے پورا سماج انتشار اور افراتفری کا شکار بن جاتا ہے۔ غالبًا اسی لیے اس نے حکمراں طبقہ کے افراد کی بہتر تعلیم پر زور دیا۔ تعلیم پر اس کے مباحث بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ افلاطون نے اعلیٰ طبقہ کی بصیرت اور بہتر تعلیم کو سماجی ترقی کی ضمانت قرار دیا ہے۔ افلاطون کا ایک بڑا کارنامہ اس کی اکیڈمی کا قیام ہے جو اس زمانہ میں علم کا سب سے اہم مینارہ نور ثابت ہوئی۔

اقبال جرم (Confession): کسی جرم کے ارتکاب کے متعلق قطعی ثبوت ہے (Conclusive Proof) یہ بات قابل ذکر ہے کہ قانون شہادت کے تحت صرف اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے متعلق جو کسی عدالت میں زیر نزاع ہے شہادت دی جا سکتی ہے۔ غیر متعلقہ واقعہ کی شہادت نہیں دی جاسکتی ہے اور نہ عدالت اسے قبول کرے گی۔

اقتدار (Authority) اور خاندانی نظام : طاقت، اثر اور قیادت کی طرح اقتدار یا اختیار کی اصطلاح بھی سماجی علوم میں مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ اقتدار سیاسی، معاشی، سماجی یا مذہبی نوعیت کا ہو سکتا ہے۔ اقتدار کا دائرہ اثر صدر خاندان قبائلی اقتداری اشکال سے لے کر دور جدید کی قومی اور بین الاقوامی نیز جمہوری اقتدار کی تمام اشکال پر محیط ہے۔ افلاطون سے لے کر جدید مفکرین تک اس تصور کا مرکزی نکتہ وہ اثر اور اسکا نفوذ ہے جو فرد یا گروہ دوسرے افراد یا گروہوں پر رکھتے ہیں۔

پدری اقتدار (Patriarchal Authority): پدری اقتدار یا اختیار سے مراد پدری خاندان یا سماج میں پایا جانے والا اختیار ہے جو باپ کو اپنے خاندان کے دیگر افراد پر حاصل ہوتا ہے۔ رشتہ داری یا قرابتداری نظام میں جدید کے مقابلہ میں جیسے جیسے ہم پچھلے سماجوں کی طرف جائیں ہمیں پدری اختیار زیادہ سے زیادہ فعال اور موثر نظر آتا ہے۔ قبائلی پدری نظام اس کی بہترین مثال ہے۔

تمام اقوام عالم کے ساتھ ہندوستان میں بھی کثرت ازدواج کا رواج رہا ہے۔ یہ مردوں کی برتری اور بالادستی کا ایک ثبوت ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک ہندو اور مسلمان راجا اور نوابین اپنے اپنے حرم رکھتے تھے اور اپنی کنیزوں کی تعداد کو اپنی حیثیت سے جوڑتے تھے۔ قدیم کتابوں میں پرانے ہندو سماج میں ایک باحیثیت مرد کے لیے "مہیشی" (خاص بیوی) پری ور تک یا (بارتبہ) "ودتا" (منظور نظر) اور پالاگلی (نچلے طبقے کی) کا ذکر ملتا ہے۔ پدری نظام میں عورتوں کی حیثیت مردوں کے دل بہلانے والی یا گھر کا کام کرنے والی خادمہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ اس نظام میں تمام اختیارات اور جائیداد وغیرہ کے اوپر پورا حق کسی کنبے کے مردوں کا ہوتا ہے۔ عموماً خاندان کا بزرگ مرد کنبہ کا کھیا سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظام تقریبًا تمام مہذب سماجوں میں پایا جاتا ہے۔

مادری نظام : تمدن کی ابتدا میں مادری نظام تقریبًا ہر معاشرے میں پایا جاتا تھا۔ باقاعدہ قسم کی شادی کے رواج سے پہلے تمام رشتے صرف ماں یا ماں کے رشتے داروں کے ہی ساتھ ہوتے تھے۔ قبیلے کے تمام انسان اپنی ماں یا ماں کی ماں کے ساتھ رہتے تھے اور اسی کو اپنے خاندان کا محور سمجھتے تھے۔ سب اسی کا کہنا مان لیتے تھے۔ یہ اس لیے بھی ہوتا تھا کیونکہ زمانۂ قدیم کا مرد عورت کو اپنے سے برتر سمجھتا تھا۔ عورت ماں بن کر خاندان میں اور قبیلے میں مرکزی حیثیت اختیار کرلیتی تھی جو مرد کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے تمام قدیم مذاہب عالم کی ابتدائی شکلوں میں دیویوں کا رتبہ دیوتاؤں سے زیادہ اہم رہا ہے۔ مادرانہ نظام میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کثرت ازواج عورتوں کی ایک سے زیادہ شادیوں اور ایک عورت کے کئی شوہروں کی شکل میں پایا جاتا تھا۔ عموماً جنوبی ہند کے اور جانسربابر وغیرہ قبیلوں میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہاں یا تو تمام بھائی ایک عورت سے شادی کرلیتے ہیں یا کئی غیر متعلق لوگ ایک عورت سے شادی کرتے ہیں اور رخصت ہوکر سسرال میں رہتے ہیں۔ سلسلۂ نسل عورت کی طرف چلتا ہے۔ دولت اور جائداد ماں سے بیٹی کی طرف منتقل ہوتی ہے کیونکہ آج مہذب سوسائٹی میں کئی شوہروں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے ہندوستان اور دوسرے ممالک میں یہ رواج کم ہوتا جارہا ہے۔

جہاں تک اقتدار کا سوال ہے تمام اقوام عالم میں رفتہ رفتہ انفرادیت بڑھتی جارہی ہے اور خاندان کا فرد واحد پر کنٹرول کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ مہذب سماج میں عموماً پدری نظام رائج ہے جس کو آج کل آزادئ نسواں کی حامی انجمنیں اور افراد مسلسل چیلنج کررہے ہیں۔

اقتصادی کمیشن برائے افریقہ (Economic Commission For Africa, ECA): یہ کمیشن اقوام متحدہ کی اقتصادی واجتماعی کونسل کی ایک قرارداد کے نتیجے میں 1958 میں قائم ہوا تاکہ افریقہ کی اقتصادی ترقی کے لیے اقدامات کیے جاسکیں۔ اس کے ممبران میں افریقی ممالک ہی شامل ہیں اور کوئی غیر افریقی ملک شامل نہیں ہے۔

اس کا صدر دفتر عدیس ابابا(اتھوپیا) میں واقع ہے۔

اقتصادی کمیشن برائے لاطینی امریکا وکیری بین (Economic Commission for Latini America & Caribbean, ECLAC): اس کمیشن کا قیام 1948 میں عمل میں آیا۔ پہلے اس کا نام اقوام متحدہ اقتصادی کمیشن برائے لاطینی امریکا تھا لیکن 1984 میں اسے موجودہ نام دیا گیا۔ اس کے ممبروں میں علاقائی ملکوں کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ امریکا اور برطانیہ بھی شامل ہیں۔ اس کمیشن کا مقصد لاطینی امریکا میں اقتصادی ترقی کے فروغ سے متعلق پالیسیوں میں تال میل پیدا کرنا ہے۔

اس کا صدر دفتر سانتیاگو، چلی میں واقع ہے۔

اقتصادی کمیشن برائے یورپ (Economic Commission for Europe, ECE): یہ کمیشن 1947 میں قائم ہوا۔ اس میں یورپی ملکوں کے علاوہ ریاست ہائے متحدہ، کینڈا، اسرائیل اور وسط ایشیا کی جمہوریائیں بھی شامل ہیں۔ ان ملکوں کے نمائندے اپنے اپنے علاقوں کے اقتصادی، ماحولیاتی اور تکنیکی مسائل پر غور اور ان کے حل کے لیے لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ ECE اقوام متحدہ کے علاقائی کمیشنوں میں قائم ہونے والا سب سے پہلا کمیشن ہے۔ اس کے مدد کے لیے ایک سکریٹریٹ اور مختلف تحقیقی کمیٹیاں ہیں۔

اس کمیشن کا صدر دفتر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں واقع ہے۔

اقتصادی وسماجی کمیشن برائے ایشیا وپیسفک (Economic & Social Commission for Asia & Pacific, ESCAP): اس کمیشن کا قیام 1947 میں عمل میں آیا تاکہ ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کی اقتصادی ترقی میں مدد کی جاسکے۔ ابتدا میں اس کا نام اقتصادی کمیشن برائے ایشیا ومشرق بعید تھا۔ لیکن 1974 میں کمیشن کی تنظیم نو کے بعد اس کا نام اقتصادی وسماجی کمیشن برائے ایشیا وپیسفک ہوگیا۔

اس کمیشن کا صدر دفتر بنکاک (تھائی لینڈ) میں واقع ہے۔

اقتصادی وسماجی کمیشن برائے مغربی ایشیا (Economic & Social Commission for Western Asia, ESCWA): اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی کونسل کی قرارداد کے ذریعے اس کمیشن کا قیام 1974 میں عمل میں آیا تاکہ ان ملکوں کی اقتصادی ترقی کے لیے وسیع تر سہولیات مہیا کی جاسکیں جو پہلے اقوام متحدہ کے اقتصادی اور سماجی دفتر (بیروت) کی نگرانی میں تھے۔ اس کا موجودہ نام 1985 میں دیا گیا۔ اس میں بھی عرب ممالک شامل ہیں اور کوئی غیر عرب ریاست اس کی رکن نہیں ہے۔

1982 میں اس کا صدر دفتر بغداد (عراق) میں واقع تھا۔ 1991 میں اسے عمان (اردن) منتقل کردیا گیا۔ 1994 میں کمیشن کے ممبروں نے اسے بیروت (لبنان) میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔

اقرار: اصل میں یہ قرار سے بنا ہے اس لیے اقرار کے معنی ٹھہرانا اور ثابت کرنا ہوئے۔ جنھیں قبول کرنے، اعتراف کرنے اور تسلیم کرنے کو بھی اقرار کہتے ہیں کیونکہ آدمی جس کو مانتا، قبول کرتا اور تسلیم کرتا ہے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس پر اپنے آپ کو ثابت اور برقرار رکھتا ہے۔ اسی لیے قول و قرار اور عہد و پیماں کو بھی اقرار کہا جاتا ہے۔ اصطلاحاً خدا اور رسول کی زبان سے شہادت اور گواہی کا نام اقرار ہے چنانچہ ایمان کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

اقرار باللسان و تصدیق بالقلب و عمل بالارکان زبان سے اقرار کرنا کہ خدا اور رسول برحق ہیں اور اس کو دل سے سچا جاننا اور احکام الٰہی و ارکان دین کو ہاتھ پاؤں اور اعضا وجوارح سے بجا لانا۔

احکام و قوانین عدالتی فیصلوں اور مقدمات کے سلسلہ میں بھی اقرار کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ شرعی دلائل میں دعوے کے ثبوت کے لیے سب سے قوی دلیل مدعاعلیہ کا اقرار ہی سمجھی جاتی ہے۔

یعنی یہ کہ مدعاعلیہ اس بات کو تسلیم کرے جس کا اس پر دعویٰ کیا گیا ہے یا بالفاظ دیگر اپنے خلاف گواہی دے اور اقرار کرے کہ مدعی نے جو کچھ دعویٰ کیا ہے وہ درست ہے۔

اس اقرار کے بعد مقر (اقرار کرنے والا) پابند ہو جاتا ہے۔ لیکن اقرار کی صحت کے لیے شرط یہ ہے کہ اقرار کرنے والا عاقل و بالغ ہو اور اس پر کسی قسم کا جبر نہ کیا گیا ہو اگر کسی سے جبراً اقرار کرایا گیا ہو تو یہ صحیح نہیں مانا جائے گا۔ اسی طرح نابالغ، پاگل یا ان جیسے مرفوع القلم لوگوں کا اقرار بھی معتبر نہ ہوگا۔

جب مدعاعلیہ اقرار کرے تو حقوق العباد میں اپنے اقرار سے نہیں پھر سکتا البتہ حقوق اللہ میں اختلاف ہے۔

اقلیتیں : اقلیت کی اصطلاح دراصل سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپی سیاسی نشیب و فراز کی پیدا کردہ ہے۔ اس زمانہ میں یورپ کی مختلف طاقتیں اپنے اثر اور رسوخ کو بڑھانے میں مصروف تھیں اور جب بھی کوئی نیا علاقہ کسی طاقت کے زیر اقتدار آیا تو وہاں کے لوگوں کے ساتھ سیاسی معاشی اور دوسری سطحوں پر تعصبانہ سلوک برتا جانے لگا۔ یوں تو اس قسم کا امتیازی سلوک تاریخ کے ہر دور میں فاتحین نے مفتوحین کے ساتھ روا رکھا ہے لیکن سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں اس کے لیے اقلیت کی اصطلاح وضع ہوئی اور اس کے بعد سے یہ اصطلاح مختلف وسیع اور محدود معنی میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ عام طور سے اقلیت سے مراد کسی سماج کا وہ گروہ ہے جو عددی اعتبار سے دوسرے گروہ یا گروہوں سے کم ہو اور سماج میں اثر و نفوذ کے اعتبار سے بھی اس کا موقف کمزور ہو۔ چنانچہ ہر بڑے سماج میں تہذیبی، مذہبی، لسانی اور نسلی اقلیتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی اقلیتی گروہ اپنے بالمقابل عددی اعتبار سے لازمی طور پر ایک بڑا اکثریتی گروہ رکھتا ہو۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی سماج میں کوئی واحد بڑی اکثریت موجود نہ ہو بلکہ پورا سماج بے شمار اقلیتوں کا مجموعہ ہو۔ چنانچہ افریقہ کے بہت سے ممالک میں افریقی ایشیائی اور سفید نسلی گروہ سب اپنے آپ کو اقلیت میں محسوس کرتے ہیں۔ دراصل سماجیاتی اعتبار سے اقلیتی گروہ کی سب سے اہم شرط یہ ہے کہ یہ ایسا گروہ ہوتا ہے جسے کسی سماج کے اقتداری ڈھانچہ میں کمزور موقف حاصل رہتا ہے۔ اور جو مختلف قسم کے امتیازات اور ترجیحی برتاؤ کا شکار رہتا ہے۔ ترجیحی برتاؤ اور امتیازی سلوک کی بناء پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اقلیت کا تصور جمہوری اقدار کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ اگر جمہوریت کا مفہوم انفرادی حقوق اور شخصیتی نشوونما کی رہنمائی ہے تو اقلیت کا تصور گروہی اساس پر افراد کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرتا ہے۔ حقیقت دراصل یہ ہے کہ اقلیت کا تصور سامراجی تصورات کی جھلک پیش کرتا ہے جن کا اثر اور نفوذ آج کے جمہوری دور میں بھی مختلف سماجوں میں باقی ہے۔ تقریباً دنیا کے ہر ملک میں تہذیبی نسلی قومیتی اور مذہبی اقلیتیں موجود ہیں لیکن ان تمام اقلیتوں میں وہ اقلیتیں سب سے زیادہ استحصال کا شکار ہیں جو سیاسی، معاشی، قانونی اور سماجی روابطی بنیادوں پر بہت سی مراعات سے محروم ہیں۔ اقلیتیں تو ہر سماج میں پائی جاتی ہیں لیکن سیاسی بنیاد پر پائی جانے والی اقلیتیں سب سے زیادہ کمزور موقف میں ہیں۔ اقلیت کی بنیاد یا تو نظریات کا فرق ہوتا ہے یا پھر سیاسی امتیازات۔ اکثریت اور اقلیت کے مابین مختلف سطحوں پر تصادم کی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ مذہب بھی اکثریتی اور اقلیتی تفریق بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اقلیتیں اپنے تحفظ کے لیے عموماً اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اور اس کا انحصار ان کی جدت پسندی اور اختراعی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک طرف اقلیتیں سماجی تبدیلی کا محرک بن سکتی ہیں تو دوسری طرف اقلیتوں کو یہ بھی احساس رہتا ہے کہ عام سماجی تبدیلیوں کا ریلا ان کی انفرادیت کو ختم کر نہ دے اس لیے بسا اوقات اقلیتیں سماجی تبدیلی کی راہ میں رکاوٹیں بھی پیدا کرتی ہیں۔

موجودہ صدی میں ماہرین علم الاقوام اور سماجیات دانوں نے

اقلیتوں پر بہت سے تحقیقی کام کیے ہیں۔ ان محققوں میں گارڈن ایلپورٹ، جے فرانکلن، جی مرڈال، اے ایچ رچمنڈ، چارلس واگلے اور مروِن ہیرس کی تحقیقات قابل ذکر ہیں۔ اقوام متحدہ کا اقلیتی کمیشن بھی اقلیتوں کے مسائل پر تحقیق میں مصروف ہے۔ ان کے دائرے میں خاص طور سے اقلیتوں کے 'انسانی حقوق' آتے ہیں۔

ہندوستان کے بے شمار مذاہب، بے حساب زبانیں اور ذات پات کا پیچیدہ نظام سماج میں کئی قسم کے درجات پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے تقریباً 20 فیصد لوگ مذہبی اعتبار سے اقلیت سمجھے جاتے ہیں۔ سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے یہ ایک بڑی طاقت بھی ہے اور ملک کی کمزوری بھی۔ مذہب کے علاوہ رنگ و نسل علاقائیت مادری زبان اور ذات پات اکثریتی اور اقلیتی تقسیم کے دیگر عوامل ہیں۔

اقوام متحدہ : مجلس اقوام متحدہ ان ریاستوں کی انجمن ہے جنھوں نے بین الاقوامی امن و تحفظ کے قیام اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی، سماجی، ثقافتی اور انسانی مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں تعاون کا عہد کیا ہے۔ اس کا نام "اقوام متحدہ" امریکی صدر فرینکلن ڈی روزیلٹ نے منتخب کیا تھا جسے پہلی بار یکم جنوری 1942 کے اقوام متحدہ کے اعلانیہ میں دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اس وقت استعمال کیا گیا جب 26 ملکوں کے نمائندوں نے اپنی حکومتوں کی جانب سے محوری طاقتوں کے خلاف نبرد آزما رہنے کا عہد کیا تھا۔

اقوام متحدہ کے منشور کو 25/اپریل سے 26/ جون تک بین الاقوامی تنظیم سے متعلق اقوام متحدہ کی سین فرانسسکو میں منعقدہ کانفرنس میں 50 ملکوں کے نمائندوں نے تیار کیا تھا۔ ان نمائندوں نے اس کانفرنس میں ان تجاویز پر غور و خوض کیا تھا جو چین، سوویت یونین، برطانیہ اور امریکا کے نمائندوں نے ڈمبرٹن اوکس (واشنگٹن) میں 21/اگست سے 28/ ستمبر 1944 تک اپنی نشستوں میں منظور کی تھیں۔ منشور پر 50 ملکوں کے نمائندوں نے سین فرانسسکو میں 26/ جون 1945 کو دستخط کیے۔ بعدازاں اس پر پولینڈ نے بھی دستخط کر دیے اور اس طرح اس کے دستخط کنندہ ریاستوں کی تعداد 51 ہو گئی۔

باقاعدہ طور پر اقوام متحدہ کا وجود 24/اکتوبر 1945 کو عمل میں آیا۔

رکنیت : اقوام متحدہ کی رکنیت کے دروازے امن سے محبت کرنے والی ہر اس ریاست کے لیے کھلے ہوئے ہیں جو اس کے منشور کو تسلیم کرتی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہے۔ نئے اراکین کو سیکورٹی کونسل کی سفارش پر جنرل اسمبلی داخلہ کی منظوری دیتی ہے۔ منشور میں اس کے ضوابط کی خلاف ورزی کرنے پر اراکین کے اخراج کی شق بھی شامل ہے لیکن اب تک اس سلسلے میں کسی رکن کو معطل نہیں کیا گیا ہے۔

2000 تک اس کے اراکین کی تعداد مندرجہ ذیل تھی۔

نام ریاست	سن رکنیت	نام ریاست	سن رکنیت
افغانستان	1946	بیلاروس	1945
البانیہ	1955	بلجیم	1945
الجیریا	1962	بیلائز	1981
انڈورا	1993	بینن	1960
انگولا	1976	بھوٹان	1971
انٹی گوا اور باربڈا	1981	بولیویا	1945
ارجنٹینا	1945	بوسنیا ہرزے گووینا	1992
آرمینیا	1992	بوٹسوانا	1966
آسٹریلیا	1945	برازیل	1945
آسٹریا	1945	برونائی	1984
آذربائیجان	1992	بلغاریہ	1955
بہاما	1973	برکینیافاسو	1960
بحرین	1971	برونڈی	1962
بنگلہ دیش	1974	کمبوڈیا	1955
بارباڈوس	1966	فرانس	1945
کیمرون	1960	گیبون	1960
کینڈا	1945	گیمبیا	1965
کیپ ورڈی	1975	جارجیا	1992
سینٹرل افریکن ریپبلک	1960	جرمنی	1973
چاڈ	1960	گھانا	1957
چلی	1945	گریس (یونان)	1945
چین	1945	گویٹ مالا	1945
کولمبیا	1945	گنی	1958
کوموروس	1975	گنی بساؤ	1974
جمہوریہ کانگو	1960	گیانا	1966
جمہوریہ جمہوریہ کانگو	1960	ہیتی	1945

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کوسٹاریکا	1945	ہونڈورس	1945
کوسٹ آئوری	1960	ہنگری	1955
کروشیا	1992	آئس لینڈ	1946
کیوبا	1945	انڈیا (ہندوستان)	1945
سائپرس (قبرص)	1960	انڈونیشیا	1950
چیک جمہوریہ	1993	ایران	1945
ڈنمارک	1945	عراق	1945
جبوتی	1977	جمہوریہ آئرلینڈ	1955
ڈومینیکا	1978	اسرائیل	1949
ایکویڈر	1945	اٹلی	1955
مصر	1945	جمائکا	1962
ایلسلواڈور	1945	جاپان	1956
ایکویڈوریل گنی	1968	جارڈن (اردن)	1955
اریٹریا	1993	قزاخستان	1992
ایسٹونیا	1991	کینیا	1963
جزیرہ فجی	1970	شمالی کوریا	1991
فن لینڈ	1955	کویت	1963
فرانس	1945	قرغستان	1992
لبنان	1945	لاؤس	1955
		پاکستان	1947
لیسوتھو	1966	پلاؤ	1994
لائبیریا	1945	نیاما	1945
لیبیا	1955	پپوانیوگنی	1975
لیچ ٹیمین	1990	پیراگوئے	1945
لتھوانیا	1991	پیرو	1945
لکسمبرگ	1945	فلپائن	1945
میسیڈونیا (مقدونیا)	1993	پولینڈ	1945
میڈاگاسکر	1960	پرتگال	1955
ملاوی	1964	قطر	1971
ملیشیا	1957	رومانیہ	1955
مالدیپ	1965	روس	1945
مالی	1960	روانڈا	1962
مالٹا	1964	سینٹ کٹس اینڈ نیوس	1983
مارشل آئی لینڈس	1991	سینٹ لوسیا	1979

موریطانیہ	1961	سینٹ ونسینٹ اینڈ گرینا ڈائنس	1980
ماریشس	1968	سموا	1976
میکسیکو	1945	سین میری نو	1992
مائکرونیشیا	1991	ساؤتوم اینڈ پرنس پی	1975
مولڈورا	1992	سعودی عرب	1945
موناکو	1993	سینگال	1960
منگولیا	1961	سیچلز	1976
مارکو (مراکش)	1956	سیرالیون	1961
موزمبیق	1975	سنگاپور	1965
میانمار	1948	سلوواکیہ	1993
نمیبیا	1990	سلووینیا	1992
نیپال	1955	سالومن آئی لینڈس	1978
نیدرلینڈس	1945	صومالیہ	1960
نیوزی لینڈ	1945	جنوبی افریقہ	1945
نکاراگوا	1945	اسپین	1955
نائجر	1960	سری لنکا	1955
نائجیریا	1960	سوڈان	1956
ناروے	1960	سرنیام	1975
عمان	1971	سوازی لینڈ	1968
تاجکستان	1992	سویڈن	1946
تنزانیہ	1961	سیریا	1945
تھائی لینڈ	1946	یوکرین	1945
ٹوگو	1960	متحدہ عرب امارات	1971
ٹرینی ڈاڈ اینڈ ٹوبیگو	1962	یونائیٹڈ کنگڈم	1945
ٹیونیشیا (تیونس)	1956	ریاستہائے متحدہ امریکا	1945
ترکی	1945	اروگوائے	1945
ترکمانستان	1992	ازبکستان	1992
یوگینڈا	1962	ونواتو	1981
یوگوسلاویہ	1945	وینے زویلا	1945
زامبیا	1964	ویت نام	1977
زمبابوے	1980	یمن	1947

مالیہ: اقوام متحدہ رکن ممالک اس کے لیے مالیہ فراہم کرتے ہیں۔ اس کے لیے جنرل اسمبلی نے ایک پیمانہ مقرر کیا ہے کہ کون سا ملک

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کس قدر مالیہ فراہم کرے گا۔ اس سلسلہ میں عالمی معیشت میں رکن ملک کا حصہ اور ادائی کے لیے اس کی بساط کو ذہن نشیں رکھا جاتا ہے۔

زبانیں: اقوام متحدہ نے عربی، چینی، انگریزی، فرانسیسی، روسی اور اسپینی زبانوں کو تسلیم کیا ہے۔

ساخت: اقوام متحدہ کے منشور نے چھ اہم اداروں کو قائم کیا ہے۔ ان میں سے پانچ کے صدر دفاتر نیویارک میں واقع ہیں جبکہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا صدر دفتر ہیگ میں واقع ہے۔ ان کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

جنرل اسمبلی: یہ اسمبلی تمام رکن ممبروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔ اس کا اجلاس سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ ہر اجلاس کے شروع ہوتے ہی اسمبلی اپنا صدر، 21 نائب صدر اور ساتوں کمیٹیوں کے چیئرمین منتخب کرتی ہے۔ عام اجلاسوں کے علاوہ حسب ضرورت سیکورٹی کونسل کی درخواست پر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہنگامی اجلاس بھی منعقد کیے جاسکتے ہیں۔ امن و تحفظ، نئے ملکوں کی رکنیت اور بجٹ سے متعلق امور جیسے معاملات میں فیصلوں کے لیے دو تہائی ممبروں کی اکثریت ضروری ہے۔ دیگر معاملات کے لیے موجود ممبروں کی اکثریت کافی ہوتی ہے۔

جنرل اسمبلی کا کام چھ خاص کمیٹیوں میں منقسم ہے جن میں ہر رکن ریاست کو نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کمیٹیاں درج ذیل ہیں:

(1) ترک اسلحہ و بین الاقوامی تحفظ کمیٹی (Disarmament and International Security Committee)

(2) اقتصادی اور مالیاتی کمیٹی (Economic and Financial Committee)

(3) سماجی، انسانی اور ثقافتی کمیٹی (Social, Humanitarian and Cultural Committee)

(4) سیاسی و نوآبادیات مخالف خصوصی کمیٹی (Special Political and Decolonization Committee)

(5) انتظامی و بجٹ کمیٹی (Administrative and Budgetary Committee)

(6) قانونی کمیٹی (Legal Committee)

ایک جنرل کمیٹی بھی قائم ہے جو اسمبلی کی کارروائیوں اور اس کی کمیٹیوں کے درمیان تال میل قائم رکھتی ہے۔

یہ جنرل کمیٹی 29 ممبران پر مشتمل ہوتی ہے جس میں جنرل اسمبلی کا صدر، اس کے نائب صدر اور خاص کمیٹیوں کے 6 چیئرمین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایک Credential Committee بھی ہے جو 9 ممبران پر مشتمل ہے جنھیں ہر اجلاس کے صدر کی تجویز پر جنرل اسمبلی مقرر کرتی ہے۔

جنرل اسمبلی کی 2 اسٹینڈنگ کمیٹیاں ہوتی ہیں جو (1) انتظامی اور بجٹ سے متعلق امور کی مشاورتی کمیٹی اور (2) چندوں سے متعلق کمیٹی کہلاتی ہیں۔ جداگانہ مسائل سے متعلق وقتاً فوقتاً یہ ذیلی اور ایڈہاک کمیٹیاں قائم کرسکتی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) قیام امن آپریشن سے متعلق خصوصی کمیٹیاں (Special Committee on Peace Keeping Operation)۔ یہ 34 ممبران پر مشتمل ہوتی ہے۔

(2) انسانی حقوق سے متعلق کمیٹی (Human Rights Committee)۔ یہ کمیٹی 18 ممبران پر مشتمل ہے۔

(3) باہری خلا کے پرامن مقاصد سے متعلق کمیٹی (Commi- ttee on the Peaceful Uses of Outer Space)۔ یہ 61 ممبروں پر مشتمل ہے۔

(4) فلسطین سے متعلق کمیشن (Conciliation Commission for Palestine)۔ یہ کمیشن 3 ممبروں پر مشتمل ہے۔

(5) ترک اسلحہ سے متعلق کانفرنس (Conference on Disarmament)۔ اس میں 38 اراکین ہیں۔

(6) بین الاقوامی قانونی کمیشن (International Law Commission)۔ اس کے 34 ممبر ہیں۔

(7) جوہری اثرات سے متعلق سائنسی کمیٹی (Scientific Committee on the Effects of Atomic Radiation)۔ یہ کمیٹی 21 ارکان پر مشتمل ہے۔

(8) نوآبادیاتی ملکوں اور لوگوں کو آزادی دیے جانے کے اعلانیہ پر عمل آوری سے متعلق خصوصی کمیٹی (Special Committee on the Implementation of the Declaration of Granting Independenc to Colonial Countries and Peoples)۔ اس کمیٹی میں 25 ممبر ہیں۔

(9) کمیشن برائے بین الاقوامی قانونی تجارت (Commission on International Trade Law)۔ یہ 36 ممبروں پر مشتمل ہے۔

جنرل اسمبلی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور میں بیان کردہ ہر معاملہ پر بحث کرسکتی ہے۔ اس کی سفارشات کی پشت پر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

عالمی رائے عامہ کی طاقت ہوتی ہے۔ اسمبلی دوسرے اعضا سے رپورٹیں حاصل کرتی ہے، نئے ممبروں کو داخل کرتی ہے، ترقیاتی سرگرمیوں کی نگرانی کرتی ہے، پالیسی سازی کرتی ہے، سکریٹریٹ کے پروگرام طے کرتی ہے، سکریٹری جنرل کا تقرر کرتی ہے جو اقوام متحدہ کے کاموں کے بارے میں اسے ہر سال اپنی رپورٹ پیش کرتا ہے اور اقوام متحدہ کا بجٹ منظور کرتی ہے۔

نومبر 1950 کی جنرل اسمبلی کی "اتحاد برائے امن" (Uniting for Peace) قرارداد کے تحت اگر سلامتی کونسل (Security Council) کے مستقل ممبروں میں اتفاق رائے نہ ہونے کے سبب کسی ایسے معاملہ میں جب امن کو خطرہ لاحق ہو یا جارحیت کا امکان ہو تو جنرل اسمبلی کو اس سلسلہ میں عمل کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

سلامتی کونسل (Security Council): اقوام متحدہ کے منشور کی رو سے سلامتی کونسل کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی امن و سلامتی قائم کرے۔ اس کے ہر ممبر کے لیے لازم ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے صدر دفتر پر موجود رہے۔

اس کی صدارت ہر ماہ گشت کرتی ہے۔ اس کے ممبروں کی تعداد 15 ہے۔ ان میں سے 5 ممبر مستقل ہیں اور بقیہ 10 رکن غیر مستقل ممبر ہیں جو دو سال کے لیے جنرل اسمبلی کے دوتہائی ممبران کی اکثریت سے منتخب ہوتے ہیں۔ ہر فیصلہ کے لیے تمام مستقل ممبروں کا متفق ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک بھی مستقل رکن کسی معاملہ میں حق تنسیخ (Veto) استعمال کرتا ہے تو اس کا فیصلہ کالعدم قرار پاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مستقل ممبر کسی معاملہ میں اس حق کو استعمال نہ کرنا چاہے تو وہ غیر حاضر ہوجاتا ہے۔ ویسے ہر مستقل ممبر نے اپنے حق تنسیخ کو کسی نہ کسی معاملہ میں استعمال کیا ہے۔

اسٹینڈنگ کونسل کی دو کمیٹیاں ہیں (1) طریق کار کے ضوابط سے متعلق ماہرین کی کمیٹی (Commitee of Experts on Rules of Procedure) اور (2) نئے اراکین کی شمولیت سے متعلق کمیٹی (Committee on the Admission of New Members)۔ ان کے علاوہ کونسل وقتاً فوقتاً ایڈہاک (عارضی) کمیٹیاں اور کمیشن قائم کرسکتی ہے۔

جب امن کو خطرہ سے متعلق کوئی معاملہ کونسل کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو کونسل تنازع کے متعلقہ فریقین سے پرامن طریقہ سے تصفیہ کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ یہ ثالثی کے لیے کہہ سکتی ہے اور تصفیہ کے لیے اصول وضع کرسکتی ہے اور جنگ بندی کی ہدایات، اقتصادی پابندیوں، قیام امن کے منشوں یا کچھ معاملات میں اجتماعی تحفظ کے ذریعہ اپنے فیصلوں پر عمل آوری کے لیے اقدامات کرسکتی ہے۔ بین الاقوامی امن و سلامتی کے قیام کی غرض سے کونسل ممبر ملکوں سے ان کی افواج سے مدد طلب کرسکتی ہے۔ اس کی خود کی ملٹری اسٹاف کمیٹی اس کی مدد کرتی ہے جو مستقل ممبروں کی افواج کے سربراہوں یا ان کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

سکریٹری جنرل کے تقرر کے سلسلے میں کونسل اقوام متحدہ کی جنرل کونسل سے سفارش کرتی ہے اور اسمبلی کے ساتھ انٹر نیشنل کورٹ آف جسٹس کے ججوں کو منتخب کرتی ہے۔

مستقل ممبر: سلامتی کونسل کے مستقل ممبروں میں چین، فرانس، روسی وفاق، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا شامل ہیں۔ سابقہ سوویت یونین کی جگہ دسمبر 1997 سے روسی وفاق نے لے لی ہے۔

اقتصادی اور سماجی کونسل (The Economic and Social Council): یہ کونسل بین الاقوامی اقتصادی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور صحتی امور سے متعلق کاموں میں مصروف اقوام متحدہ کا حصہ ہے۔ کونسل کا کام متعلقہ تنظیموں، تخصیصی ایجنسیوں، کمیشنوں اور کمیٹیوں کے ذریعہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ یہ 54 ممبروں پر مشتمل ہے جو جنرل اسمبلی کے ذریعہ دو تہائی ووٹوں سے تین سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ اس میں افریقہ کے 14، ایشیا کے 11، مشرقی یورپ کے 6، لاطینی امریکا اور کیری بین کے 10، مغربی یورپ اور دیگر ریاستوں کے 13 ممبر ہوتے ہیں۔ اس کے ایک تہائی ممبر ہر سال ریٹائر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ریٹائر ہونے والے ممبر دوبارہ منتخب ہوسکتے ہیں۔ ہر ممبر ایک ووٹ کا حقدار ہوتا ہے۔ فیصلے موجود ممبروں کی اکثریت سے کیے جاتے ہیں۔ 1998 تک مندرجہ ذیل ملک اس کے ممبر تھے:

الجیریا، ارجنٹینا، بنگلہ دیش، بیلاروس، بلجیم، برازیل، کینیڈا، کیپ وردی، سینٹرل افریکن ری پبلک، چلی، چین، کولمبیا، کوموروس، کیوبا، چیک ری پبلک، جبوتی، ایلسلواڈور، فن لینڈ، فرانس، گبون، گیمبیا، جرمنی، گیانا،

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

آئس لینڈ، ہندوستان، اٹلی، جاپان، جارڈن، کوریا، کمبوڈیا، لبنان، لیسوتھو، ماریشس، میکسیکو، موزمبیق، نیوزی لینڈ، نکاراگوا، عمان، پاکستان، پولینڈ، رومانیہ، روس، سینٹ لوسیا، سیرالیون، اسپین، سری لنکا، سویڈن، ٹوگو، تیونس، ترکی، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکا، ویت نام اور زیمبیا۔

کونسل کے 9 فکشن کمیشن، 5 علاقائی اقتصادی کمیشن، 9 قائمہ (اسٹینڈنگ) کمیٹیاں اور ماہرین کے ادارے ہیں۔ تقریباً 1500 ایسی غیر سرکاری تنظیمیں ہیں جو مشاورتی حیثیت سے کونسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ غیر سرکاری تنظیمیں کونسل کی عوامی میٹنگوں میں اپنے مشاہدین بھیج سکتی ہیں۔

تولیتی کونسل (The Trusteeship Council) : اس کونسل کا قیام اس لیے عمل میں آیا تھا کہ ٹرسٹ کو خودمختاری یا آزادی کے لیے تیار کیا جاسکے۔ سیکورٹی کونسل کے پانچوں مستقل ممبران (چین، فرانس، روس، برطانیہ اور امریکا) پر مشتمل ہے۔ 1994 میں نو آبادیاتی امور مکمل ہوگئے تھے جب سیکورٹی کونسل نے اقوام متحدہ کے آخری تولیتی معاہدہ کو امریکا کے زیرانتظام پلاؤ (Palau) کو معطل کردیا۔ تمام تر ٹرسٹی بڑی ٹریز نے یا تو خودمختاری یا آزادی حاصل کرلی تھی یا ہمسایہ آزاد ملکوں میں شامل ہوگئی تھیں۔ 1994 کے بعد سے اب تک اس کی کارکردگی پر نظرثانی ہو رہی ہے۔

بین الاقوامی عدالتِ انصاف (International Court of Justice) : یہ عدالت اقوام متحدہ کا خاص عدالتی عضو ہے۔ اس کے دو اہم کام ہیں : (1) بین الاقوامی قانون کے مطابق ریاستوں کے ذریعہ لائے گئے قانونی تنازعات کا تصفیہ کرنا اور (2) بین الاقوامی ایجنسیوں اور تنظیموں کے بااختیار قانونی مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرنا۔

یہ عدالت ایک آئین (Statute) کے تحت کام کرتی ہے جو اقوام متحدہ کے منشور کا اہم حصہ ہے۔ اقوام متحدہ کے تمام اراکین عدالت کے آئین کو تسلیم کرتے ہیں صرف سوئٹزرلینڈ اور ناروے اس کے رکن نہیں ہیں۔ یہ عدالت 15 ججوں پر مشتمل ہے جو تمام تر مختلف قومیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں 9 سال کی مدت کے لیے جنرل اسمبلی اور سیکورٹی کونسل مکمل اکثریت سے منتخب کرتی ہے۔ ان کا انتخاب ہر تیسرے سال عمل میں آتا ہے جس میں ایک تہائی جج منتخب ہوتے ہیں اور انھیں دوبارہ بھی منتخب کیا جاسکتا ہے۔ یہ جج اپنے ملکوں کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ عدالت کے آزاد ججوں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ عدالت تین سال کے لیے اپنا صدر اور نائب صدر منتخب کرتی ہے اور سال بھر معروف کار رہتی ہے۔

فیصلے موجود ججوں کی اکثریت سے کیے جاتے ہیں۔ فیصلہ حتمی ہوتا ہے لیکن دس سال کے عرصہ میں اس پر نظرثانی بھی کی جاسکتی ہے۔ اس عدالت نے 1946 سے آج تک 67 تنازعات کا تصفیہ کیا ہے اور 23 قانونی آرا کا اظہار کیا ہے۔

سکریٹریٹ (The Secretariat) : اقوام متحدہ کے پانچوں ادارے اپنے روزمرہ کے کاموں کے لیے سکریٹریٹ پر منحصر رہتے ہیں۔ اس کا صدر دفتر نیویارک میں ہے جس میں 8900 افراد کام کرتے ہیں۔

اس کا سربراہ سکریٹری جنرل ہوتا ہے جو سیکورٹی کونسل کی سفارش پر 5 سال کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کی دوبارہ تجدید بھی ہوسکتی ہے۔ سکریٹری جنرل انتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت جنرل اسمبلی سلامتی کونسل (Security Council) اقتصادی و سماجی کونسل (Economic & Social Council) اور تولیتی کونسل (Trusteeship Council) کی تمام تر میٹنگوں میں شرکت کرتا ہے۔ سکریٹری جنرل کی مدد کے لیے کئی انڈر سکریٹری جنرل اور معاون سکریٹری جنرل (Assistant Secretary General) ہوتے ہیں۔ 1977 میں ایک ڈپٹی سکریٹری جنرل کے تقرر کو اصولی طور سے جنرل اسمبلی نے تسلیم کرلیا تھا جس کا اعلان 1998 میں کردیا گیا۔

اقوام متحدہ : ادارہ غذا و زراعت (FAO) : 1943 میں غذا اور زراعت سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ ورجینیا میں ایک عبوری کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جس کے دستور پر 16/اکتوبر 1945 کو کیوبک (کینیڈا) میں دستخط کیے گئے اور اسے ادارہ غذا و زراعت کا نام دیا گیا۔ آج اس کے ممبر ملکوں کی تعداد 175 ہے اور اس کا صدر مقام روم (اطالیہ) ہے۔

اس ادارہ کا مقصد تغذیہ کی سطحوں اور معیار زندگی میں بلندی، جنگلاتی، ماہی گیری اور زراعتی پیداواروں کے طریقوں میں اصلاح اور دیہی آبادیوں کے حالات میں اصلاح کرنا ہے تاکہ دنیا سے بھوک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاسکے۔ اس کے ترجیحی مقاصد میں زراعتی اور دیہی ترقی شامل ہے تاکہ قدرتی وسائل کی نگہداری اور غریبوں کے لیے کافی مقدار میں غذا کی فراہمی ممکن ہوسکے۔

ادارہ غذا و زراعت ترقی پذیر ملکوں کو زراعتی میدان میں تعلیم و تربیت کی سہولیات عام کرنے کے لیے امداد فراہم کرتا ہے اور بہتر زمین،

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

آبپاشی کے لیے پانی، بہتر فصلوں اور مویشیوں کی نگہداشت کو فروغ دیتا ہے۔ ہنگامی حالات میں متاثرہ ملکوں کی مدد کے لیے خصوصی پروگرام وضع کرتا ہے اور راحت رسانی کا اہتمام کرتا ہے تاکہ غذا کی فراہمی جاری رہے۔

اس کے باقاعدہ پروگراموں کے لیے مالیہ کی فراہمی ممبر ملکوں کی حکومتوں کے ذمہ ہے اور تکنیکی امدادی پروگرام کے لیے اضافی وسائل کو بروئے کار لایا جاتا ہے جس کا سب سے بڑا اہم اور عطیہ دہندہ اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (UNDP) ہے۔

ادارہ غذا و زراعت کی اعلیٰ اختیاری تنظیم اس کی کانفرنس ہوتی ہے جو تمام ممبروں پر مشتمل ہے اور ہر دوسرے سال منعقد ہوتی ہے۔ یہی کانفرنس اس ادارہ کی پالیسی مرتب کرتی ہے اور بجٹ اور پروگراموں کو منظور کرتی ہے۔ کانفرنسوں کے اجلاسوں کے درمیان ادارہ کی 49 رکنی کونسل مجلس منتظمہ کی حیثیت سے سرگرم کار رہتی ہے جس کا انتخاب کانفرنس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے ویسے اس کا بیشتر کام درجنوں علاقائی یا خصوصی کمیشنوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کا ڈائریکٹر جنرل چھ برسوں کے لیے منتخب ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ: بین الاقوامی فنڈ برائے تجارتی ترقی (International Fund For Trade Development, IFTD)

: یہ فنڈ جون 1976 میں ایک سمجھوتہ کے تحت ترقی پذیر ملکوں میں زراعتی ترقی کے منصوبوں کے لیے مالیہ فراہم کرنے کے لیے قائم ہوا۔ اس کا اصل مقصد غذائی پیداوار کے اضافہ میں امداد کرنا ہے۔ یہ رعایتی شرحوں پر قرضے دیتا ہے۔ اس کا صدر مقام روم (اطالیہ) ہے۔ اس کے ارکان تین زمروں میں منقسم ہیں:

(1) ریاست ہائے متحدہ، جاپان اور مغربی یورپ کے ممالک۔

(2) تیل پیدا کرنے والے ممالک

(3) ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے ترقی پذیر ممالک۔ اس فنڈ کی امداد موجودہ مالی اداروں مثلاً عالمی بینک، علاقائی بینکوں، ادارہ غذا اور زراعت کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے ذریعہ تقسیم کی جاتی ہے لیکن فنڈ پروجیکٹوں پر اپنا کنٹرول رکھتا ہے۔

اقوام متحدہ ترقیاتی پروگرام (United Nations Development Programme, UNDP)

: اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اس پروگرام کو 1965 میں ترقی پذیر ملکوں کے قدرتی اور انسانی وسائل کی افزائشی صلاحیتوں کو وسیع تر کرنے کے سلسلے میں مدد دینے کے لیے شروع کیا تھا۔

جنوری 1994 میں اس ادارہ اور اقوام متحدہ آبادی فنڈ (UNFPA) کی گورننگ کونسل کو جنرل اسمبلی کی منظوری کے بعد ایگزیکٹیو بورڈ میں منتقل کردیا تھا، اب یہ بورڈ بین الحکومتی ترقیاتی پروگرام اور آبادی فنڈ کو بین الحکومتی مدد بہم پہنچاتا ہے اوران کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتا ہے۔ بورڈ 36 اراکین پر مشتمل ہے جس میں 8 ممبر افریقہ، 7 ممبر ایشیا، 4 مشرقی یورپ، 5 لاطینی امریکا اور کیری بین اور 12 ممبر مغربی یورپ اور دوسرے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔

ترقیاتی پروگرام کے علاقائی دفاتر بھی ہیں اور ہر اس ملک میں جو اس پروگرام کے تحت مدد حاصل کرتا ہے اس کا دفتر موجود ہے۔

UNDP 150 ترقی پذیر ملکوں اور 40 بین الاقوامی ایجنسیوں کو تکنیکی مدد فراہم کرتا ہے تاکہ ان کی اقتصادی ترقی کی رفتار تیز اور ان میں بسنے والے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوسکے۔

اس پروگرام میں اقوام متحدہ کا سکریٹریٹ، اس کے تحقیقی ادارے، دوسری تنظیمیں، علاقائی ترقیاتی بینک اور عرب فنڈ برائے اقتصادی واجتماعی ترقی حصہ لیتے ہیں۔ یہ پروگرام اقتصادی اور اجتماعی کونسل کی وساطت سے جنرل اسمبلی کے تئیں ذمہ دار ہے۔

اس کا صدر مرکز نیویارک میں واقع ہے۔

اقوام متحدہ: صنعتی ترقیاتی تنظیم (United Nations Industrial Development Organization, UNIDO)

: یہ تنظیم اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ذریعے 1966 میں وجود میں آئی اور 1985 میں اسے اقوام متحدہ کی سولہویں خصوصی ایجنسی کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس تنظیم کا مقصد ان ملکوں کی صنعتی ترقی میں مدد کرنا ہے جو ترقی پذیر اور تغیر پذیر معیشتوں کے حامل ہیں۔ یہ سرکاری اور نجی زمرہ کی قوتوں کو بروئے کار لاکر صنعتی پیداوار کو ترقی دیتی ہے اور ان کی قوت میں اضافہ کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح یہ بین الاقوامی صنعتی شراکت داری اور تکنیکی تعاون کو فروغ دیتی ہے۔ اس تنظیم کا نصب العین یہ ہے کہ پائدار ترقی اور معاشی استحکام کے لیے ایسی صنعتی بنیاد رکھے کہ لوگوں کی زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔

1993 میں منعقدہ جنرل کانفرنس نے تنظیم میں اصلاح سے متعلق سفارش کی توثیق کردی اور اس کی سرگرمیوں کے دائرہ کار کو وسعت دی۔

تنظیم کی جنرل کانفرنس ہر دوسرے سال منعقد ہوتی ہے اور اس کے میزانیہ کو منظوری دیتی ہے۔ یہ تمام رکن ملکوں پر مشتمل ہے 53 ممبروں پر مشتمل (جس میں 33 ممبر ترقی پذیر ملکوں سے متعلق ہوتے ہیں) صنعتی ترقیاتی بورڈ اس کا انتظامی ادارہ ہے جو جنرل کانفرنس کے ذریعے چارسال کے لیے منتخب ہوتا ہے۔ جنرل کانفرنس ہی چار سال کے لیے تنظیم کے ڈائریکٹر کا تقرر کرتی ہے۔

مارچ 1999 میں اس تنظیم کے اراکین کی تعداد 168 تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا نے 1996 میں اور آسٹریلیا نے 1997 میں اپنے آپ کو اس تنظیم سے علاحدہ کرلیا۔ اس کا صدر دفتر ویانا (آسٹریا) میں واقع ہے۔

اقوام متحدہ غذائی کونسل (World Food Council, WFC): یہ کونسل غذائی اجناس کی پیداوار اور تقسیم کے لیے دسمبر 1974 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ذریعے تشکیل کی گئی تھی۔ کونسل کے لیے 36 ممالک باری باری 1993 تک منتخب کیے جاتے رہے لیکن بعدازاں جنرل اسمبلی کے فیصلہ کے مطابق اقوام متحدہ کے علاحدہ ادارہ کی حیثیت ہے اس کے سکریٹریٹ نے کام کرنا بند کردیا جو روم (اٹلی) میں واقع تھا کیونکہ اس کے کاموں کا جائزہ جاری ہے۔

اس کونسل کا کام غذائی پیداوار، تغذیہ، غذائی تحفظ، غذائی تجارت، غذائی امداد اور دوسرے متعلقہ معاملات پر اقوام متحدہ کے اداروں کی پالیسیوں اور سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرنا، ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر غور کرنا اور ان کے حل کے لیے سفارشات پیش کرنا تھا۔

اقوام متحدہ کا تعلیمی، علمی اور ثقافتی ادارہ (United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation, UNESCO): یونسکو کے دستور پر 16 نومبر 1945 کو 37 ملکوں نے لندن میں دستخط کیے تھے اور اس ادارہ نے یہ حقیقت ذہن نشین کرتے ہوئے کہ "چونکہ جنگیں انسانی ذہنوں سے شروع ہوتی ہیں اس لیے امن کا دفاع بھی انسانی ذہنوں میں ہی تعمیر ہونا چاہیے"۔ اس ادارہ نے نومبر 1946 میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔

اس میں 187 اراکین شامل ہیں لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکا اس کا رکن نہیں ہے۔ یونسکو کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ تعلیم، سائنس، مواصلات اور ثقافت کے ذریعے اقوام عالم کے مابین تعاون کو فروغ دیا جائے تاکہ دنیا میں اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق امن و تحفظ کا قیام عمل میں آسکے اور انصاف قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق، اور بنیادی آزادیوں کے تئیں احترام ممکن ہوسکے۔ اس کا صدر دفتر پیرس (فرانس) میں واقع ہے۔

تعلیم کے میدان میں یونسکو کی سرگرمیاں ہر شخص کے لیے بنیادی تعلیم کی فراہمی، بنیادی تعلیم تک تمام لوگوں کی رسائی، بنیادی تعلیم کے معیار میں اصلاح اور اکیسویں صدی میں تعلیم کے فروغ پر مرکوز ہیں۔ سائنس کے میدان میں یونسکو حالاتِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بین الاقوامی سائنسی اشتراک اور سائنسی تحقیقات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ مواصلاتی نقطۂ نظر سے یونسکو اطلاعات کی بآسانی فراہمی، آزادی اظہار وذرائع ابلاغ کے فروغ کی سمت میں سرگرم عمل ہے۔ ثقافت کے میدان میں ثقافت اور ترقی کے درمیان ربط قائم کرنے کے سلسلہ میں تحقیق پر اپنی نظر مرکوز کرتا اور دنیا کے ثقافتی ورثہ کے تحفظ کے لیے کوششیں کرتا ہے۔ غرضیکہ یونسکو تجربہ، معلومات اور افکار کا دنیا کے ماہرین کے درمیان تبادلہ کرانے میں مدد دیتا ہے۔ سائنسدانوں، فنکاروں، ادیبوں اور ماہرین تعلیم کی قومی اور بین الاقوامی انجمنیں قائم کراتا ہے۔ سائنسی، فنی اور تہذیبی موضوعات پر بین الاقوامی اجتماعات اور کانفرنسیں منعقد کراتا ہے۔ دستاویز بندی کے طریقوں کو معیاری بنا کر علمی تحقیق کے لیے وظائف دیتا ہے۔ تحقیقی تصانیف، عام کتابیں بنیادی ماخذ، رپورٹیں، رسالے اور حوالہ کی کتابیں شائع کرتا ہے۔ تعلیمی، علمی اور ثقافتی میدانوں میں بین الاقوامی سمجھوتے کراتا ہے، اور دانشوروں اور فن کاروں کے کاموں کے حق طباعت کی بین الاقوامی کاپی رائٹ کنونشن کے تحت حفاظت کراتا ہے۔ دانشورانہ میدان میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دیتا ہے۔ یہ ادارہ ترقی پذیر ملکوں میں خواندگی کو عام کرنے کی کوشش کرتا ہے، معلموں اور ترقیاتی کارکنوں کی تربیت کا انتظام کراتا ہے، کتب خانے اور دستاویز بندی کے مراکز قائم کراتا ہے، صحافیوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے کارکنون کی تربیت کا انتظام کرتا ہے، سائنس اور تکنیکی تعلیم کو بہتر بنانے اور ثقافتی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ترقی کے میدان میں منصوبہ بندی کرنے والوں کی تربیت کے انتظام میں اپنے ماہرین کے ذریعے مدد دیتا ہے۔ بین الاقوامی امن کے لیے یونیسکو نسلی مسائل، عورتوں کے سماجی مرتبہ اور ان کی تعلیم، انسانی حقوق اور بین الاقوامی مسائل پر تحقیقات کا اہتمام کرتا ہے۔ اکثر رکن ملکوں میں یونیسکو سے تعاون کے لیے قومی کمیشن قائم کیے گئے ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں یونیسکو نے حکومتوں کو مشورہ دینے کے لیے خود اپنے مشن بھی قائم کیے ہیں۔ یونسکو کا اپنا بجٹ ہوتا ہے جس کے لیے ارکان چندہ دیتے ہیں اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام سے بھی اسے مدد ملتی ہے۔

اقوام متحدہ کا فنڈ برائے اطفال (United Nations Children's Fund, UNICEF): اس فنڈ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے چلڈرنس ایمرجنسی فنڈ کی حیثیت سے بچوں کے لیے جنگی راحت کے کاموں کی خاطر قائم کیا تھا۔ 1950 میں اس کا مقصد ترقی پذیر ملکوں کے بچوں کی ضروریات کی تکمیل سے متعلق کردیا گیا۔ 1953 میں جنرل اسمبلی نے اسے ایک مستقل ادارہ بنانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ ترقی پذیر ملکوں کے بچوں کے مفادات کی تکمیل ہوسکے۔ فی الوقت اس کا اصل میدان ترقی پذیر ملکوں میں بچوں کی بہبود کے لیے کام کرتا ہے۔

اس فنڈ کاایک ایگزیکیٹو بورڈ ہے جو اس کی گورننگ باڈی ہے۔ اس کی نشست سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے تاکہ پالیسی طے کی جاسکے، پروگراموں کا جائزہ لیا جاسکے اور اخراجات کی توثیق ہوسکے۔ اس کے ممبروں کی تعداد 36 ہے جو تین سال کے لیے ECOSOC کے ذریعے منتخب ہوتے ہیں۔

یونیسیف اقوام متحدہ کا ایک ملحقہ ادارہ ہے اور اس کا عملہ اقوام متحدہ کے سکریٹریٹ کا جزو ہے۔ اس کا سربراہ ایک انتظامی ڈائریکٹر ہوتا ہے جسے اقوام متحدہ کا سکریٹری جنرل یونیسیف کے انتظامی بورڈ کے مشورے سے مقرر کرتا ہے۔چونکہ یونیسیف خالصۃً بچوں کی بہبود کے لیے وقف ہے اس لیے یہ بچوں کے حقوق کے میثاق کی عمل آوری کے لیے ذمہ دار ہے جن کا اطلاق ستمبر 1990 میں ہوا۔ یہ میثاق بچوں کے انفرادی حقوق سے متعلق ہے اور ان کے تحفظ کے لیے ذمہ دار ہے۔

اس کا صدر دفتر نیویارک میں ہے اور کے علاقائی دفاتر مختلف ملکوں میں واقع ہیں۔

اقوام متحدہ کی ایجنسی برائے راحت و اعمال (UNRWA): اقوام متحدہ کی یہ ایجنسی مشرق وسطی کے لبنان، شام، اردن، مغربی کنارہ اور غزہ پٹی میں فلسطینی تارکین وطن کی راحت، صحت اور تعلیم اور بہبود سے متعلق امور کے لیے 1950 سے مصروف کار ہے۔ اس ادارہ کے نزدیک ایک فلسطینی تارک وطن وہ شخص ہے جو 1948 کی کشمکش سے کم از کم دو سال پہلے سے فلسطین میں سکونت پذیر تھا اور جس نے عرب اسرایلی رقابتوں کے نتیجے میں اپنے گھر بار اور ذرائع معاش کو کھو دیا۔ اس مالی امداد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ وہ تارک وطن مذکورہ بالا پانچ علاقوں میں سے کسی ایک میں رہائش پذیر ہو۔ تارکین وطن کے ورثاء بھی اس اوارہ کی مالی امداد کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں اگر وہ چند مقررہ شرائط کی تکمیل کرتے ہوں۔

جون 1967 میں مشرق وسطی میں عرب اسرائیلی رقابتوں کی تجدید کے بعد جنگ اور اسرائیل کے مقبوضہ علاقوں سے بھاگ کر مشرقی اردن، شام اور مصر میں پناہ گزیں ہوگئے۔ اس ہنگامی صورت حال میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد کی رو سے اس ادارہ نے ان تارکین وطن کو بھی ہنگامی بنیاد پر اورعارضی طور سے امداد بہم پہنچای جو فلسطین سے متعلق نہیں تھے لیکن فوری ضرورت کے مستحق تھے۔ عملی طور پر اس ادارہ کے پاس مالیہ کی کمی تھی اس لیے ایسے پناہ گزینوں کی امداد کا بار متعلقہ عرب حکومتوں پر ڈالا گیا۔

بعد ازاں لبنان میں انتفاضہ کے نتیجہ میں 1987 میں مغربی کنارہ اور غزہ پٹی کے سکونت پذیر پناہ گزینوں کے لیے بھی اس ادارہ نے طبی امداد فراہم کی۔ اسی طرح 1991 میں عراق اور دیگر اقوام کے مابین فوجی کارروائی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال میں بھی اس ادارہ نے قابل تعریف امدادی اقدامات کیے۔ 1993 میں تنظیم آزادی فلسطین اور اسرائیل کے درمیان معاہدہ کی روشنی میں اس ادارہ نے فلسطینی تارکین وطن کے حالات میں اصلاح کے لیے قیام امن کے پروگرام کی عمل آوری کی سمت میں اقدام کیے۔

اس ادارہ کا سربراہ ایک کمشنر جنرل ہوتا ہے جس کا تقرر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ اس کی مدد بلجیم، مصر، فرانس، جاپان، اردن، لبنان، شام، ترکی، برطانیہ اور امریکا کی حکومتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشاورتی کمیشن کرتا ہے۔ پانچوں مذکورہ بالا علاقوں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

میں اس ادارہ کے علاقائی دفاتر موجود ہیں۔

اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت وترقی (United Nations Conference on Trade And Development, UNCTAD): یہ کانفرنس اقوام متحدہ کے ایک عضو کی حیثیت سے اس کی جنرل اسمبلی کی ایک قرار داد کے تحت دسمبر 1964 میں وجود میں آئی۔ اس کا مقصد اقتصادی ترقی کو تیز تر کرنے کی غرض سے ترقی پذیر ملکوں کی بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینا ہے۔ اسی طرح ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں قسم کے ممالک کی تجارتی پالیسیوں میں تال میل قائم کرنا اور نئے اصول وضع کرنا ہے تاکہ ترقی پذیر ملکوں کی بیرونی تجارت اور اقتصادی ترقی کو فروغ دیا جاسکے اور انھیں ادائگیوں کے بحران سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ بین الاقوامی اقتصادی تعاون اور بین الاقوامی تجارت سے متعلق امور کے بارے میں گفتگو اور مذاکرات کے لیے اس کانفرنس کو جنرل اسمبلی کے اہم ترین آلہ کار کا درجہ حاصل ہے۔

یہ کانفرنس رکن ملکوں کی مختلف راجدھانیوں میں ہر چوتھے برس منعقد ہوتی ہے۔ دو اجلاسوں کی درمیانی مدت میں ایک "تجارتی وترقیاتی بورڈ" اور اس کی متعدد کمیٹیاں اور ماتحت ادارے کانفرنس کا کام جاری رکھتے ہیں۔ بورڈ چھ بڑی کمیٹیوں پر مشتمل ہے جو اجناس، مصنوعات، غیر مرئی برآمدات ودرآمدات، تجارت کے مالیہ، جہاز رانی ٹیکنالوجی کی منتقلی اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون اور یکجہتی کے قیام سے متعلق ہیں۔

کانفرنس کا چوتھا اجلاس مئی 1976 میں نیروبی (کینیا) میں منعقد ہوا تھا۔ اس کا آٹھواں اجلاس فروری 1992 میں کارتاجینا (کولمبیا) میں اور نواں اجلاس اپریل 1996 میں جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) میں منعقد ہوا۔ کانفرنس میں 188 ممبر شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کی رکن ریاستوں کے علاوہ اور بہت سی تنظیمیں مشاہدین کی حیثیت سے اس میں شریک ہیں۔ اس کا صدر مقام جنیوا (سوئٹزر لینڈ) ہے۔

اقوام متحدہ کے علاقائی کمیشن (Regional Commisions of the United Nations): اقوام متحدہ کی اقتصادی واجتماعی کونسل نے یورپ، مغربی ایشیا، ومشرق بعید، لاطینی امریکا اور افریقہ کے لیے پانچ اقتصادی کمیشن قائم کیے ہیں ان کمیشنوں میں علاقائی ملکوں کے علاوہ باہر کے ترقی یافتہ ممالک بھی مشورہ اور امداد دینے کے لیے شامل ہوتے ہیں۔ ان سبھی کمیشنوں کا مقصد متعلقہ علاقوں کے صنعتی، زراعتی اور ٹیکنالوجی کے مسائل کا مطالعہ کرنا اور رکن ملکوں کی اقتصادی ترقی کے لیے سفارشات پیش کرنا اور علاقائی وبین الاقوامی اقتصادی تعاون کو فروغ دینا ہے۔

اقوام متحدہ ہائی کمشنر برائے پناہ گزیناں (United Nations High Commissioner for Refugees, UNHCR): اس عہدہ کو اقوام متحدہ نے 1951 میں قائم کیا تھا تاکہ پناہ گزینوں کے لیے بین الاقوامی سطح پر تحفظ کی فراہمی ممکن ہو اور ان کے مسائل کا پائدار حل تلاش کیا جاسکے۔

ہائی کمشنر کا انتخاب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ذریعے سکریٹری جنرل کی نامزدگی پر عمل میں آتا ہے۔ اس لیے ہائی کمشنر جنرل اور اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی کونسل کے تئیں جواب دہ ہوتا ہے۔ اس کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ پناہ گزینوں کی بین الاقوامی طور پر حفاظت کرے اور ان کی اپنے وطن کو رضاکارانہ واپسی یا دوسرے ملکوں میں باز آبادکاری یا پناہ دہندہ ملک میں ان کی مستقل سکونت کا انتظام کرے اور ان کے مسئلہ کا مستقل حل تلاش کرے۔ اس کے علاوہ وہ قدرتی آفات کے نتیجے میں بڑے پیانے پر تباہ کاریوں میں بھی بحالی اور باز آبادکاری سے متعلق امور میں مدد کرے اور مشورہ دے۔

اس کا دفتر جنیوا (سوئٹزر لینڈ) میں واقع ہے۔

اکادمی : ایک علمی یا تعلیمی ادارے کو اکیڈمی یا اکادمی کہا جاتا ہے۔ ویسے یہ لفظ بہت پرانا ہے۔ یہ اصل میں ایتھنز کے ایک باغ کا نام تھا جو ایک عالم اکیڈیمس (Academs) کے نام پر بنایا گیا تھا۔ یہاں سنہ 387 ق م میں افلاطون درس دیا کرتا تھا۔ یہ مغربی خطہ کی پہلی یونیورسٹی تھی۔ افلاطون کے بعد اس کے شاگرد اور پھر پیرو یہاں تقریباً 9 سو سال تک اکٹھا ہوتے رہے اور ان مجلسوں میں علمی اور فلسفیانہ مسائل پر مباحثے ہوتے رہے۔ 529 میں سیزر جسٹی نین (Justinian) کے عہد میں یہ بند کردی گئی۔ اس کے بعد سے لفظ اکادمی، افلاطون کے مکتب فلسفہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔ موجودہ دور میں یہ علمی، سائنسی اور فنون لطیفہ وغیرہ کے اداروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اگست کامٹ (Auguste Comte) : ان کی پیدائش 19/ جنوری 1798 کو فرانس میں ہوئی۔ کامٹ اس روایت کے علمبردار تھے جس کو Enlightenment کا نام دیا گیا ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے یورپ میں روشن خیالی کی یہ روایت دراصل فلسفیانہ اور ثقافتی تحریک تھی جس میں مسلمہ عقائد کی گرفت کی گئی۔ عقل کے آزادانہ استعمال پر زور دیا گیا۔ سائنسی تجربوں اور مشاہداتی علوم کو فروغ دیا گیا اور جس میں انسانی فلاح و بہبود کو سب سے زیادہ اہم قرار دیا گیا۔

کامٹ فرانس کے انقلاب کے خلاف تھے کیونکہ اس میں کیتھولک فرقہ پر زیادتیاں ہوئی تھیں اور چونکہ وہ حکومت کے ملازم تھے اس لیے سماجی نظم و ضبط کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ کامٹ سماج کی سائنسی تشکیل کرنا چاہتے تھے جس کے ذریعے انسان کی اب تک کی ترقی کے بارے میں علم حاصل ہوسکے اور مستقبل میں ہونے والے حالات کی آگاہی ہوسکے۔ کامٹ ان قوانین کو جاننا چاہتے تھے جس کے تحت سماج ایک تاریخی دور سے دوسرے دور کی جانب سفر کرتا ہے۔ یہ ان حالات کا جائزہ لینا چاہتے تھے جو کسی بھی تاریخی لمحے میں سماج کو ایک ٹھہراؤ دیتا ہے۔ کامٹ نے سماجیات کو اس کا نام دیا۔ یہ لاطینی اور یونانی لفظوں کا مرکب ہے۔ شروع میں انھوں نے سماجیات کو سوشل فزکس کا نام دیا تھا۔

انھوں نے سماجیات کو دو حصوں میں بانٹا۔ سماجی حرکیات (Social Dynamics) اور سماجی سکونیات (Social Statics)۔ جس کے ذریعے سماج میں ترقی اور نظام، تبدیلی اور ٹھہراؤ کی بابت پتہ لگایا جاسکے۔ کامٹ کا کہنا تھا کہ انسانی سماج کو انھی سائنسی اصولوں سے سمجھنا ہوگا جنھیں اب تک قدرتی نظام کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ جس طرح کائنات قدرت کے قانون کے ماتحت ہے بالکل ایسے ہی سماج کی حرکت اور ٹھہراؤ بھی قوانین کے دائرے میں آتے ہیں۔ کائنات کی سائنس نے قدرت کی دنیا کو جس طرح دریافت کیا اسی طرح انسانی سماج کو سمجھنے کا وقت آگیا تھا۔ جس طرح سائنس کی بنیاد مشاہدے پر اور اصل واقعات پر ہوتی ہے بالکل ایسے ہی سماج کے علم کو مشاہدات اور حقائق کی ضرورت پڑے گی۔ انسانیت کی بہبود کے لیے سائنس کی جو خدمات ہیں وہی خدمات کامٹ کے بقول سماجیات سے بھی حاصل ہوں گی۔

1822 میں کامٹ نے انسانی ترقی کے قوانین مقرر کیے جسے اس نے Law of Three Stages یا "تین منازل کا قانون" کا نام دیا۔ کامٹ کا کہنا تھا کہ انسانی دماغ کا ارتقا سماج کے ارتقاء کے شانہ بشانہ چلا ہے۔ جس طرح بچپن میں انسان زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر یقین کرتا ہے، نوبلوغیت میں تصور میں دنیا بساتا ہے اور تنقید کرتا ہے اور ادھیڑ عمر میں حقائق سے قریب ہو جاتا ہے بالکل ایسے ہی سماج کے پورے ارتقاء میں انسانیت تین بڑے ادوار سے گزری۔ دراصل یہ تین ذہنی رجحانات تھے۔ (1) مذہبی (Theological) یا تصوراتی (Fictitious)، (2) مابعدالطبیعاتی (Abstract or Metaphysical)، (3) سائنسی یا واقعاتی (Positive)۔

کامٹ کے بقول مذہبی دور میں انسانی دماغ وجود کی حقیقی ماہیت کی تلاش کرتا ہے اور ہونے والے واقعات کی شروعات اور مقاصد کا تجزیہ کرتا ہے۔ ایک مفروضہ یہ کارفرما رہتا ہے کہ دنیا میں ہونے والے تمام واقعات فوق البشر طاقتوں کے سبب ہوتے ہیں۔ مابعدالطبیعاتی دور میں انسانی دماغ ہونے والے واقعات کے اسباب کو غیرمرئی طاقتوں میں تلاش کرتا ہے۔ واقعات پر مبنی دور کے شعور میں انسانی دماغ حقیقت اولی کی تلاش ترک کردیتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کائنات کی پیدائش اور مقاصد کی تلاش سے متعلق سوالات بھی پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس دماغ کی جستجو کائنات کو چلانے والے قوانین کے تجزیہ میں وقف ہو جاتی ہے۔

گرچہ کامٹ انسانی دماغ کی بتدریج آزادی کے ارتقا کا تجزیہ کررہے تھے مگر اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سماجی تنظیم کی ترقی کے مختلف شکلوں کے قوانین کا احاطہ بھی کیا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ سماجی ارتقا میں کامٹ نے جن قوانین کی نشاندہی کی اس میں زیادہ زور ذہنی یا تصوراتی پہلوؤں پر ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کامٹ نے سماج کے ہر دور کو ایک خصوصی سماجی تنظیم اور سیاسی اقتدار سے منسلک کیا۔ مثلاً مذہبی دور میں مذہبی پیشواؤں اور فوجیوں کی حکومت تھی۔ مابعدالطبیعاتی دور کا تعلق یورپ کے قرونِ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ سے تھا۔ اس زمانے میں چرچ کے عہدہ داران اور قانون دانوں کی حکومت تھی مگر سماج کے پوزیٹیو دور میں سماجی نظام کی باگ ڈور صنعت و حرفت کے منتظمین اور سائنسی رہنماؤں کے ہاتھ میں آگئی۔

کامٹ کی دوسری مشہور تھیوری کا تعلق مختلف علوم کی درجہ بندی سے ہے۔ اس درجہ بندی میں کامٹ نے علم نجوم کو سب سے کم حیثیت کا بتایا اور معیاری علوم میں فزکس، کیمسٹری، بایولوجی کے بعد سب سے اعلیٰ معیار کی سطح پر سماجیات کو رکھا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کامٹ کا تعلق فرانس کے پرآشوب سماجی دور سے تھا۔ اس زمانے کی سیاسی اتھل پتھل کے پیچھے معاشی اور سماجی تبدیلی بھی تھی۔ دراصل صنعتی انقلاب کا اثر انسانی زندگی پر رونما ہوچکا تھا۔ کامٹ اپنے عہد میں علمی حلقوں کی توجہ کا مرکز نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیالات میں نہ تو راسخ العقیدگی تھی اور نہ ہی فکری رجحانات کے دیے ہوئے ڈھانچوں کی پابندی تھی۔ اگرچہ کامٹ کی تھیوری اور اس کے نظریات کی حیثیت سماجیات کی تاریخ میں تحریک کی ہے لیکن اس کے باوجود سماجیات کے بے قیاس سوالات جو سماجی ترقی اور تسلسل کے آپسی ٹکراؤ سے پیدا ہوتے ہیں وہ کامٹ کی تھیوری کے بڑے دائرے میں آج بھی محیط ہیں۔

کامٹ کا ماننا تھا کہ جس طرح بایولوجی میں Anatomy (علم تشریح الاعضاء) یا Physiology (علم افعال الاعضاء) کو الگ الگ سمجھنا مفید ہوتا ہے بالکل یہی فرق سماج کے ساکت اور متحرک پہلوؤں میں کرنا چاہیے۔ اس فرق کے بارے میں کامٹ کا کہنا تھا کہ یہ دو الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں بلکہ تھیوری کے دو مختلف پہلو ہیں۔ ان کا تعلق سماجی نظام اور سماجی ترقی سے ہے۔ نظام میں سماجی وجود کے مختلف حالات کی آپسی مستقل ہم آہنگی کو دیکھا جاتا ہے جبکہ ترقی میں سماجی ارتقاء کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ نظام اور ترقی، سماج کے ساکت اور متحرک پہلوؤں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔

کامٹ سماجیات کے ساتھ ساتھ پوزیٹیو یا مثبت فلسفہ کی تھیوری کے لیے بھی مشہور ہیں۔ ان کے ذہن میں مستقبل کے پوزیٹیو سماج کا ایک خاکہ تھا، وہ سماج جس میں نئے پوزیٹیو مذہب (بمعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے) کا مذہبی پیشوا، بینک اور انڈسٹری کے لیڈران کے اشتراک میں سماج پر حکومت کرے گا۔ ان کے پاس اعلیٰ علم کی طاقت ہوگی جس کی بنا پر وہ لوگوں کو اپنے فرائض پر عمل کروا سکتے ہیں۔ یہ حکمراں تعلیم کے ڈائرکٹر ہوں گے اور سماج کے ہر فرد کی صلاحیتوں کو سمجھنے والے اعلیٰ منصف بھی۔ اس نئے سماج میں جن چیزوں کو حکومت کے انتظامیہ میں شامل کیا جائے گا وہ دراصل افراد کے آپسی تعلقات ہوں گے۔ اس نئے سماج میں محبت اصول ہوگا جس کی بنیاد نظم و ضبط میں ہوگی اور جس کا اعلیٰ مقصد ترقی ہوگا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کامٹ اپنے آپ کو سماجی سائنٹسٹ ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک نئے مذہب کا بانی بھی۔ وہ مذہب جس میں انسانیت کو اس کے امراض سے نجات دلانے کا وعدہ تھا۔ سماجیات کی تاریخ میں کامٹ کے خیالات کا یہ پہلو صرف تاریخ کا حصہ ہوکر رہ گیا کیونکہ سماجیات پر سائنس کا غلبہ طاری ہونا شروع ہوگیا تھا۔ لیکن ہمیں کامٹ کو اس کے اپنے عہد کے تقاضوں اور پیرایے میں دیکھنا چاہیے۔

الاحکام السلطانیہ: امام ابوالحسن علی بن محمد ماوردی (متوفی 450ھ/1058ء) کی مشہور تصنیف ہے وہ شافع مسلک کے مشہور فقیہ اور اپنے زمانہ کے اکابر علماء مصنفین میں تھے۔ بصرہ میں پیدا ہوئے تھے آخر میں بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ مختلف شہروں میں قضا کی خدمت پر بھی مامور رہے تھے۔ الاحکام السلطانیہ کے علاوہ فقہ، تفسیر، اصول دین اور ادب وغیرہ مستند کتابیں لکھی تھیں۔ الاحکام السلطانیہ اسلامی نظام و آئین حکرانی اور سیاست مدن پر مبسوط اور اہم کتاب ہے جو بیس ابواب پر مشتمل ہے اس میں حکومت کے جملہ شعبوں مثلاً امارت والیان ریاست فوج پولیس قضا فوج داری امامت صلوۃ تحصیل زکوۃ امارت حج جزیہ و خراج تقسیم فی غنیمت موات افتادہ زمین چراگاہ پڑاؤ اقطاع (جاگیرات) دفاتر جرائم کے قوانین اور احتساب کے احکام وغیرہ پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب مصر سے چھپ گئی ہے۔ 1895 میں پیرس سے فرنچ ترجمہ و شرح کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اردو ترجمے حیدرآباد اور کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔

اختلافات ابو حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ۔ یہ بھی لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ سے چھپی ہے۔ اس میں امام ابو یوسف نے اپنے دونوں استادوں کے اختلافات نقل کرکے اکثر مسائل میں امام ابو حنیفہ کی اور بعض میں ابن ابی لیلیٰ کی رائے کو ترجیح دی ہے اور کہیں کہیں دونوں سے اختلاف کیا ہے۔ اس کے راوی امام محمد ہیں۔

الاسلام و اصول الحکم: یہ کتاب شیخ علی عبدالرزاق کی تصنیف 1343ھ م 1925ء میں مصر سے شائع ہوئی تھی۔ مصنف شیخ مفتی محمد عبداللہ کے شاگرد جامعہ ازہر کے فاضل اور مصر کی مذہبی عدالتوں میں عہدۂ قضات پر فائز رہے تھے۔ وہ جدت پسند واقع ہوئے تھے اس کتاب میں بھی ان کے بعض ترقی پسندانہ خیالات موجود ہیں۔ اس میں وہ خلافت کی منسوخی اور دین وسلطنت کی تفریق کا ذکر کرکے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ فقہ اسلامی کو شہری زندگی کے ضابطے کی حیثیت سے ترک کردینا چاہیے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

تاکہ ایک ایسا نیا اور ترقی پذیر معاشرہ وجود میں آسکے جو عقل و حکمت اور متمدن قوموں کے تجربات پر مبنی ہو۔

الجامع الصغیر: یہ فقہی احکام و مسائل کا مجموعہ ہے ان میں اکثر کا ماخذ حدیث نبوی اور آثار صحابہ و تابعین ہیں۔ امام ابو یوسف نے ان سے فرمائش کی تھی کہ وہ ان روایتوں کو جمع کردیں جو میں نے امام صاحب کے واسطہ سے ان کو سماع کرائی ہیں۔ چنانچہ جب امام محمد نے اس کو مرتب کرکے ان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کی بڑی تحسین کی۔ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کا حاشیہ بھی متداول ہے۔

الجامع الکبیر: اس میں بھی نادر اور اہم مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور یہ روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے بے نظیر ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ فقہ میں اس سے زیادہ جامع کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کی اہمیت اور گوناگوں فوائد کی وجہ سے ممتاز فقہائے مجتہدین نے اس کی متعدد شرحیں لکھیں۔ احیاء المعارف النعمانیہ سے یہ کتاب چھپ گئی ہے۔

الڈر مین (Alderman) : بعض ریاستوں میں قانون بلدیات کے تحت بلدیہ کے اراکین کے علاوہ چند الڈرمین کا بھی انتخاب کیا جانا ضروری ہے۔ یہ انتخاب اراکین بلدیہ یعنی ممبران کمیٹی یا کارپوریشن کرتے ہیں۔ ایسے اشخاص کا انتخاب بہ حیثیت الڈرمین کیا جاتا ہے جو پہلے کبھی اراکین بلدیہ رہ چکے ہوں یا رٹائرڈ انجینیر یا ڈاکٹر یا سرکاری افسر رہے ہوں۔ الڈرمین کی ضرورت اس لیے سمجھی گئی کہ وہ اشخاص جنھیں شہری اور پبلک نظم و نسق کا تجربہ ہو ان کی رائے اور مشوروں سے استفادہ کا موقع مل سکے۔ الڈرمین کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو دیگر ارکان شہری انتظامیہ کی ہوتی ہے لیکن کسی الڈرمین کا انتخاب بہ حیثیت چیرمین بلدیہ یا بہ حیثیت میئر میونسپل کارپوریشن نہیں کیا جاسکتا۔

الرد علی سیر الاوزاعی: یہ بھی حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں جنگ کے قوانین اور اس سے متعلق امور کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اہل شام کے مرجع امام اوزاعی نے امام ابو حنیفہ کی کتاب کا رد لکھا تھا۔ امام ابویوسف نے امام اوزاعی کے جواب میں یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں ہر عنوان کے تحت پہلے امام ابوحنیفہ کا قول نقل کیا ہے پھر اس کے بارے میں امام اوزاعی (متوفی 157ھ/ 773ء) کے اعتراض کا ذکر کرکے اس کی مدلل تردید کی ہے۔

الرسالہ فی اصول: یہ اصول میں سب سے پہلا رسالہ ہے جو قاہرہ سے 1312ھ میں چھپا تھا۔ اس میں شریعت کے مصادر اور اصول فقہ سے بحث کی ہے اور اس ضمن میں قرآن و سنت کا درجہ متعین فرما دیا ہے اور خبر واحد کی صحت اجماع اور قیاس پر بھی مدلل بحث کی ہے۔ اس کے متعدد زبانوں میں ترجمے چھپ گئے ہیں۔ اردو ترجمہ بھی پاکستان سے طبع ہوا ہے۔

الزیادات: یہ بھی فقہ میں امام محمد کی تصنیف ہے۔ اس کو الجامع الکبیر کا ضمیر سمجھنا چاہیے کیونکہ جو فروع اس میں اس کے نہ تھے وہ اس میں آگئے ہیں۔ اس کی بھی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ زیادات کے بعد زیادات الزیادات بھی لکھی تھی جو مزید فروع پر مشتمل ہے۔ امام محمد کی متعدد اور تصانیف کا بھی اصحاب فہرست و تراجم نے ذکر کیا ہے۔

السیر الصغیر: سیر و مغازی پر امام ابو حنیفہ اپنے تلامذہ کو جو کچھ املا کراتے تھے امام محمد کی یہ کتاب اس کا مجموعہ ہے۔

السیر الصغیر و السیر الکبیر: یہ دونوں کتابیں فقہ حنفی کے مشہور مدون و جامع اور امام ابوحنیفہ کے نامور شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کی تصنیفات ہیں۔ پہلے انھوں نے السیر الصغیر لکھی اس کو امام اوزاعی نے دیکھا تو طعن کیا کہ اہل عراق کو سیر مغازی سے کیا نسبت۔ امام محمد کو خبر ہوئی تو انھوں نے السیر الکبیر لکھی جو فن سیر و مغازی کی نہایت عمدہ کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اس میں جہاد و قتال اور صلح جنگ کے طریقوں اور مواقع کا ذکر نیز دوسری قوموں سے مسلمانوں کے تعلقات تجارت ان کے حقوق اور دوسرے معاملات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ امام محمد کے اخیر زمانہ کی تصنیف ہونے کی وجہ سے قوت استدلال اور دقت نظر کے اعتبار سے ان کی تمام کتابوں میں ممتاز ہے خلیفہ ہارون رشید نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور اپنے شہزادوں کو امام صاحب کے پاس بھیجا کہ ان سے اس کی سند لیں۔ السیر الکبیر کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس کا ترکی ترجمہ ہوا ہے اور کئی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ امام سرخس کی 490ھ/1097ء شرح سب سے زیادہ مقبول ہوئی یہ مع متن حیدرآباد سے چھپی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

العالم و المتعلم: سوال و جواب کے طرز پر ایک رسالہ ہے۔

العقد الفرید: یہ ادب کی نہایت مشہور کتاب ہے اس کا مصنف شہاب الدین ابو عمرو احمد بن محمد بن عبدربہ تیسری چوتھی صدی ہجری کا ممتاز ادیب نقاد اور شاعر تھا اپنے عمدہ مذاق، شعر و ادب کی وجہ سے وہ اندلس کے خلفائے بنی امیہ کا امیر الشعراء ہوگیا تھا۔ العقد الفرید اس کا شاندار ادبی شہ پارہ ہے جو اس زمانہ کے مروجہ علوم و فنون کا مخزن ہے اسکی حیثیت دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی ہے جس میں متفرق مسائل مختلف واقعات انساب امثال طب، موسیقی، شعر و شاعری اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ کے متعلق گوناگوں نادر معلومات جمع کیے گئے ہیں۔ اس سے عربوں کے اجتماعی سیاسی، معاشی اور ادبی حالات کا پتہ چلتا ہے۔

العقد الفرید اسم بامسمی ہے اس کے پچیس ابواب ہیں ابن عبدربہ نے تمام عمدہ معلومات ہار کے موتیوں کی طرح بڑی خوبی سے مرتب کیے ہیں ہر باب کا نام کسی قیمتی پتھر یا جوہر پر رکھا ہے وہ ہر باب کے شروع میں اس کی غرض و غایت بھی بتا دیتا ہے۔

ابن عبدربہ کی ولادت 246ھ / 860ء میں قرطبہ میں ہوئی تھی اور وہیں 328ھ / 940 میں وفات ہوئی۔

الکٹرانک وسائل حوالجاتی خدمات: کتب خانہ سے ملنے والی مختلف خدمات میں حوالہ جاتی خدمات مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ خدمات عام طور پر دو قسم کے سوالوں کے جواب میں فراہم کی جاتی ہیں۔ سوالات کی ایک قسم وہ ہے جو کیا، کب، کہاں، کون وغیرہ جیسے الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ ہندستان کا پہلا صدر کون تھا، کب پیدا ہوا، کہاں پیدا ہوا وغیرہ اس قسم کے سوالوں کی مثال ہیں۔ دوسرے قسم کے سوالات وہ ہوتے ہیں جن کے جوابات کے متلاشی محققین ہوتے ہیں جو اپنے زیر مطالعہ موضوع کے سلسلے میں ہوئی کسی بحث، کسی دوسرے فرد کی اسی موضوع پر ہونے والی تحقیق کے نتائج، کسی نکتہ کی وضاحت کے لیے حوالہ جاتی خدمت کے لائبریرین کی مدد چاہتے ہیں۔ پہلے قسم کے سوالات کے جوابات کے لیے کتب خانہ میں پہلے سے مرتب لغات، انسائیکلوپیڈیا، دستی کتب، ڈائریکٹری و سوانحی لغات جیسی حوالہ جاتی کتابیں ہوتی ہیں جبکہ دوسرے قسم کے سوالات کے جوابات کے لیے حوالہ خدمت لائبریرین مختلف ذرائع اور وسائل کا استعمال کرکے موضوع سے متعلق کتابیات اور دوسرے اشاریائی خدمات کی مدد اور کبھی کبھی ماہرین کی مدد لے کر جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عمل میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔

حوالہ فراہمی کی خدمت کے اس روایتی طریقہ میں پچھلی صدی کے نصف آخر میں معلومات کی ذخیرہ کاری اور فراہمی کے عمل میں ٹکنالوجی کے میدان میں ہونے والی پیش رفت نے ایک انقلابی تبدیلی پیدا کردی ہے اور جس تلاش میں پہلے گھنٹوں اور دنوں کو صرف کرنا پڑتا تھا کمپیوٹر کی بدولت معلومات کے الیکٹرانک شکل میں دستیاب ذخیرہ: ڈیٹابیس سے وہ منٹوں سکنڈوں میں مکمل ہوجاتا ہے۔ حوالہ جاتی خدمات کے کارکن کی میز بقول ولیم اے کاٹز کتابوں کی جگہ اب مانیٹر، اسکینر (Scanner)، کی بورڈ، ٹیلی فون، فیکس اور کمپیکٹ ڈسک (منضبط چھوٹی طشتری) نے لے لی ہے۔ معلومات کی فراہمی کتابوں اور رسائل سے سیدھے طور پر نہ ہوکر ڈیٹابیس یا الیکٹرانک ذخیرہ مواد کے ذریعہ ہونے لگی ہے۔ یہ ڈیٹابیس کمپیکٹ ڈسک ریڈاونلی میموری (CD- ROM) یا منضبط طشتری محض برائے مطالعہ کی شکل میں یا ان لائن (On Line) کمپیوٹری واسطہ تار پر دستیاب ہیں۔ ان الکٹرانک وسائل کی مدد سے حوالہ جاتی خدمات کی جامعیت اور رفتار فراہمی دونوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

ڈیٹابیس جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈیٹا کی شکل میں دستیاب ذخیرہ معلومات ہے۔ اصطلاحی معنوں میں ڈیٹا معلومات کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کا تنہا کوئی مفہوم نہ ہو لیکن سیاق و سباق میں بامعنی بن جائے لیکن عرف عام میں یہ لفظ معلومات کا مترادف ہے۔ ڈیٹابیس کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب ایک ڈیٹابیس فراہم کرنے والی کمپنی معلومات فراہم کرنے کا نقشہ بناتی ہے۔ اس وقت اسے فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کمپیوٹر کے یاد خانے میں محفوظ کی جانے والی معلومات کی شناخت کے لیے کون سے اجزا اہم ہیں جنھیں نمایاں طور پر درج کیا جائے اور کون سے اجزا ہیں جن کی ترتیب میں کمپیوٹر کی مدد سے ردوبدل کرکے حسب منشا معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مشینی مطالعہ صلاحیت کی اس معلومات کی فائل کمپیوٹر ٹیپ یا ڈائروی ڈسک پر لیزر شعاعوں کی مدد سے بھی تیار ہوتی ہے اور شناخت بھی ہوتی ہے۔ یہ عددی صورت میں مقناطیسی فیتہ یا ڈسک پر ثبت ہوتی ہے جس کا مطالعہ ایک مرتب کمپیوٹری زبان یا سافٹ ویر کی مدد سے کیا جاتا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہے۔ جب ڈیٹا مشینی مطالعہ صلاحیت حاصل کرلیتا ہے تو اس تک دسترس کے راستے ایک سے زائد ہوجاتے ہیں۔ ڈیٹا بیس کے اندراج کو کیٹلاگ کارڈ پر اندراج کی تفصیل سے سمجھا جاسکتا ہے۔ کیٹلاگ کارڈ کتب خانہ کے علمی مواد کا ایک غیر الیکٹرانک ریکارڈ یا ڈیٹا بیس ہے۔ اس کے مدخل (Entry) کی تیاری میں اولیت مصنف یا عنوان کو دی جاتی ہے۔ اس کے بعد مواد کی دیگر معلومات درج ہوتی ہیں جو اس مواد کی شناخت اور کتب خانہ میں اس کی موجودگی کی جگہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مدخل کا پہلا لفظ (مصنف کا خاندانی نام) نقطہ دسترس (Access Point) ہوتا ہے۔ دیگر تفصیلات اپنی جگہ نہ بدل سکنے کی صورت میں نقطہ دسترس نہیں بن سکتیں۔ لیکن یہی معلومات جب الیکٹرانک ڈیٹا بیس میں درج ہوتی ہیں تو عنوان، عنوان میں موجود کلیدی الفاظ، سن اشاعت، ناشر جیسے منجمد نقطہ دسترس (Static Access Points) مرتعش نقطہ دسترس (Dynamic Access Points) بن جاتے ہیں اور اس طرح ڈیٹابیس میں موجود مواد تک پہنچنے کی راہیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں کیونکہ ان جملہ اندراجات کی ترتیب میں ردوبدل کرکے کسی کو بھی اولیت دی جاسکتی ہے۔ کمپیوٹر میں موجود بولین منطق (Boolean Logic) کی بنیاد پر کلیدی الفاظ یا اصطلاحات کے بامعنی جوڑ (Set) بنانے کی صلاحیت اور الفاظ میں عمل قلم تراشی (Truncation) کی بدولت ابتدائی یا آخری جز حرف کو حذف کرکے مواد کی تلاش دائرہ وسیع کیا جاسکتا ہے۔ بولین منطق میں اور ر یار نہیں جیسے لفظ جوڑ کر بامعنی سیٹ بنائے جاتے ہیں۔

مولانا آزاد اور خلافت

مولانا آزاد یا خلافت

مولانا آزاد نہیں خلافت

کسی بھی سیٹ سے مواد تلاش کرسکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کمپیوٹر کو حکم دیں کہ صرف کاری والے الفاظ مانیٹر پر دکھائے جائیں تو ہمیں سحر کاری، شجرکاری، کشیدہ کاری، منبت کاری جیسے سیٹ دیکھنے کو مل سکتے ہیں اور پھر ہم اپنی ضرورت کے لفظ ر اصطلاح کی نشاندہی کرکے درکار مواد حاصل کرسکتے ہیں۔ کمپیوٹر کی مختلف ڈھنگ سے اشاریہ سازی کی صلاحیت بھی مطلوبہ حوالہ حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ مثلاً لفظ ڈیٹابیس کو مختلف سیاق و سباق میں دیکھ سکتے ہیں۔

ڈیٹا بیس - انتظام

ڈیٹا بیس - دسترس

ڈیٹا بیس- ڈیزائن

ڈیٹابیس- فائل

اس طرح نہ صرف یہ کہ مواد تک دسترس کے راستوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے بلکہ بسا اوقات مکمل طور پر صحیح ترتیب میں الفاظ نہ سوچ سکنے کی صورت میں درکار مواد تک دسترس ممکن ہوجاتی ہے۔

الیکٹرانک ڈیٹابیس یا الیکٹرانک ذخیرہ معلومات کو داخلی خصوصیات کی بنیاد پر کتابیاتی (Bibliographic) اور غیر کتابیاتی ڈیٹابیس میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ کتابی ڈیٹابیس روایتی اشاریائی اور تلخیصی خدمات کے مترادف ہیں۔ عرف عام میں ڈیٹابیس سے مراد اسی قسم کا ذخیرہ مواد ہوتا ہے۔ اس میں بنیادی ریکارڈ مضمون یا کتاب کی کتابیاتی تفصیل مثلاً مصنف کا نام، عنوان مضمون، رسالہ جہاں مضمون شائع ہوا اس کی جلد شمارہ نمبر اور تاریخ و صفحات کی تفصیل اور اگر ضرورت ہو تو اس کی تلخیص پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ ڈیٹابیس ایک موضوع پر مضامین اور کتابوں میں موجود مواد کا ریکارڈ ہوسکتا ہے یا ایک خاص قسم کے مواد کا کتابیاتی ڈیٹابیس ہوسکتا ہے۔ مثلاً ڈسرٹیشن ایبسٹریکٹ آن لائن۔ غیر کتابیاتی ڈیٹابیس کو درج ذیل اقسام میں رکھا گیا ہے:

متنی ذخیرہ معلومات الیکٹرانک (Full Database) جس میں مواد کا مکمل متن دستیاب ہوتا ہے۔

عددی ذخیرہ معلومات الیکٹرانک (Numeric Database) اس میں اعداد و شمار، سائنسی فارمولے، کیمیائی عناصر اور مرکبات کی طبعی خصوصیات وغیرہ ہوتی ہیں۔

نقشی ذخیرہ معلومات الیکٹرانک (Image Database) اس طرح کے ڈیٹابیس میں ٹریڈ مارک غیر رومن حروف، علامت و نشانات، تجارتی فرموں کے امتیازی نشان (Logo) علم کیمیا سالمہ کے ساخت (Chemical Structure) وغیرہ ہوتے ہیں۔

ڈائریکٹری ر ایڈریس ذخیرہ معلومات الیکٹرانک (Directory Database) اس کا بنیادی ریکارڈ تجارتی فرموں کے پتے ہوتے ہیں۔ اس

کے علاوہ سوسائٹیوں اور اداروں نیز انجمنوں کے پتے بھی ہوسکتے ہیں۔

الیکٹرانک وسائل کی ایک اور قسم ہے جسے کتابیاتی رفاہی ذخیرہ (Bibliographic Utilities) کہہ سکتے ہیں۔ یہ بڑی تعداد میں کتب خانوں کے کٹیلاگ ریکارڈ کو یکجا کرنے سے وجود میں آتے ہیں۔ ان کی ایک مثال لائبریری آف کانگریس کی فہرست کتب ہے۔ لائبریری آف کانگریس نے کٹیلاگ یکجا کرنے کے لیے ایک معیاری اندراجی خاکہ بنایا ہے جسے مارک یا مشینی مطالعہ صلاحیت کٹیلاگ کا نام دیا گیا ہے۔ اب دوسری قومی لائبریریوں نے بھی اس کی اتباع کی ہے۔ امریکا کی ریاست اوہیو میں موجود آن لائن کمپیوٹر لائبریری سنٹر (OCLC) کے پاس 18000 کتب خانوں کے 300 زبانوں میں موجود 30 ملین ذخائر کا ریکارڈ موجود ہے جو کمپیوٹر کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے۔

معلومات فراہمی نظام: ڈیٹابیس سے مواد حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں: آن لائن ریٹریول سسٹم (بین کمپیوٹر حصول مواد نظام) اس طریقہ میں متلاشی مواد اپنے کمپیوٹر کا تعلق معلوماتی ذخیرہ کار کمپنی یا ادارہ کے کمپیوٹر سے قائم کرتا ہے۔ یہ رابطہ کمپیوٹر میں لگائے ایک موڈیم کی مدد سے ہوتا ہے۔ موڈیم کا کام پیغام کو کمپیوٹری زبان میں بدل کر دوسرے کمپیوٹر تک بھیجنا اور موصول پیغام کو کمپیوٹر پر پڑھ سکنے کی زبان میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ اس طریقہ تحصیل مواد کی بڑی خوبیاں ہیں۔ متلاشی مواد فرد یا کتب خانہ ایک سے زائد ڈیٹابیس سے رابطہ قائم کرسکتا ہے۔ لاتعداد ڈیٹا تک دسترس ہوجاتی ہے۔ مثلاً امریکا کو قومی لائبریری برائے طب کے پاس ہزاروں کی تعداد میں ڈیٹابیس موجود ہیں لیکن اس طریقہ تحصیل مواد میں کچھ مشکلات بھی ہیں۔ ہر کمپنی یا ادارہ اپنے ڈیٹابیس تک دسترس کے لیے مخصوص کمپیوٹری زبان (Software) اور اشارے (Command) وضع کرتا ہے جسے معلوم ہونا ضروری ہے۔ کچھ ڈیٹابیس ایسے ہوتے ہیں جو صرف ایک ہی ادارے سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک وقت میں کئی اداروں سے رابطہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتب خانہ میں موجود مشینی وسائل کے اور بھی مقامی مصرف ہوتے ہیں۔ اس بار بار تبدیلی رابطہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر دسترس مالی پہلو بھی رکھتی ہے اس تلاش مواد کی ہنرمندی بہت ضروری ہے۔ آن لائن نظام بندش آزاد نظام ہے جس کی تین بڑی خوبیاں ہیں۔ اول کمپیوٹر میں محفوظ معلومات کی تعداد غیر محدود ہوتی ہے اور متلاشی مواد کو منٹوں اور سکنڈوں میں دستیاب ہوجاتی ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تازہ ترین معلومات کسی لمحہ بھی محافظ خانے میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح آن لائن نظام میں تازہ ترین معلومات دستیاب ہوتی ہیں۔

سی ڈی روم: حصول مواد کا دوسرا طریقہ بصری طشتری نظام (Optical Disc System) ہے۔ بصری طشتری سے مراد وہ الیکٹرانک وسیلہ ہے جس پر معلومات ثبت کرنے کا عمل اور مطالعہ دونوں میں لیزر ٹیکنالوجی (Laser) کا استعمال ہوتا ہے۔ اس طشتری پر متن مضمون، اعداد و شمار، نقش، تصاویر یا ان سب کا مجموعہ عددی صورت میں ثبت ہوتا ہے۔ ایک ڈسک پر کم از کم 250,000 صفحات ثبت کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے معلومات سمونے کی صلاحیت میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ چنانچہ اب صرف ایک طشتری پر جملہ دستیاب یونانی ادب کا 99% حصہ درج کیا جاسکتا ہے۔ نسبتاً کم قیمت اور آسانی سے لائق استعمال منضبط طشتریاں حوالجاتی خدمات میں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اب ایک ہی طشتری سے مقامی نظام انسلاک کمپیوٹر (Local Area Network) یا لان کے ذریعہ کئی مانیٹروں پر مواد دیکھا جاسکتا ہے۔ عموماً ڈسک پر معلومات ایک خاص مدت تک درج ہوتی ہیں لیکن فراہم کرنے والی کمپنیاں نئی معلومات اضافہ کے ساتھ متعین وقفہ سے نئی ڈسک فراہم کرتی ہیں۔ معلومات اضافہ کی دو قسمیں ہیں ایک جس میں پہلے سے موجود مواد میں مزید اضافہ کردیا جاتا ہے دوسرا جس میں اگر ایک سال کا نیا مواد شامل کیا گیا تو شروع کے ایک سال کا مواد نکال دیا گیا۔

منضبط طشتری کی کئی اقسام ہیں۔ ایک جس میں درج معلومات صرف پڑھی جاسکتی ہیں اسے سی ڈی روم (CD-ROM) یعنی منضبط طشتری محض برائے مطالعہ کہتے ہیں۔ دوسری وہ ہوتی ہیں جن پر معلومات تبدیل بھی کی جاسکتی ہیں۔ لیکن کتب خانوں میں سی ڈی روم ہی مقبول ہیں۔

ہندستان میں قومی سطح کے اداروں مثلاً نیشنل سائنس انفارمیشن سنٹر بنگلور، انسڈاک نئی دہلی، نیشنل سوشل سائنس ڈاکومینٹیشن سنٹر نئی دہلی اور نیشنل انفارمیٹک سنٹر نئی دہلی نے کئی اہم ڈیٹابیس سی ڈی کی شکل میں حاصل کرلیے ہیں اور ان سے حوالہ خدمات فراہم کرتے ہیں۔ ان اداروں نے مقامی طور پر بھی سی ڈی وضع کی ہیں جن پر تجارتی ضرورتوں کے اور سائنسی موضوعات سے متعلق خدمات دستیاب ہیں۔

کیا آئندہ برسوں میں الیکٹرانک وسائل حوالہ جات کتابی وسائل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کی ضرورت ختم کردیں گے۔ اس سوال کا جواب ابھی ممکن نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ الیکٹرانک وسائل نے معلومات کی دستیابی کو بہت آسان اور برق رفتار بنا دیا ہے۔ اور علاقائی اور عالمی سطح الیکٹرانک وسائل کی تشکیل اور استعمال بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ آج انٹرنیشنل اٹیمک انرجی ایجنسی کی الیکٹرانک حوالہ جاتی وسیلہ انس (INIS) اور فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن کی حوالہ جاتی خدمت اگرس (AGRIS) کے بغیر تحقیق کا کام مشکل ہو جائے گا۔

المسالک الممالک: یہ فن جغرافیہ کی ایک کتاب کا نام ہے جس میں بغداد سے مختلف ملکوں کی آمدورفت کے راستوں اور مسافتوں کا ذکر ہے مصنف کا نام ابوالقاسم عبداللہ بن احمد بن خردازیہ تھا وہ اپنے دادا کے نام کی نسبت سے ابن خرداذیہ کہلاتا تھا۔ یہ مجوسی تھے اور برامکہ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔

ابن خردازیہ کا اصلی وطن خراسان تھا مگر اس نے مستقل سکونت بغداد میں اختیار کرلی تھی۔ 211ھ /826ء میں اس کی ولادت اور 300ھ / 912ء میں وفات ہوئی۔

ابن خردازیہ ڈاک اور خفیہ اطلاعات کے محکمہ کا افسر اور عباسی خلیفہ معتمد کا خاص مصاحب اور ندیم تھا اس نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں المسالک الممالک بہت مشہور اور عربی زبان میں فن جغرافیہ پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔ اس میں راستوں کے علاوہ بعض ملکوں اور قوموں کی عادات و مالوفات نیز مختلف تاریخی معلومات بھی درج ہیں۔ ابن خردازیہ کے علم جغرافیائی معلومات کی بنیاد بطلیموس کا جغرافیہ ہے لیکن معلومات اس کے محکمہ کی سرکاری اطلاعات اور تاجروں اور سیاحوں سے اس کی ملاقات کا نتیجہ ہیں۔

المسالک الممالک میں ہندوستان کے بری و بحری راستوں اور یہاں کی قوموں اور مختلف ذاتوں کے بارے میں بھی معلومات بیان ہوئے ہیں۔ یہ کتاب تیسری صدی ہجری کے وسط میں تحریر کی گئی تھی۔

نوٹ: المسالک الممالک کے نام سے ابن حوقل (358ھ / 979ء) نے بھی ایک کتاب لکھی تھی وہ بھی مشہور سیاح اور جغرافیہ نویس تھا۔ اس کی کتاب لیڈن سے طبع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ابو اسحاق ابراہیم بن محمد اصطخری نے مسالک الممالک کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ یہ ابن حوقل کا ہم عصر اور فن جغرافیہ کا عالم تھا اس کی کتاب بھی لیڈن سے چھپی ہے ان دونوں کتابوں کا موضوع بھی جغرافیہ ہے۔

الہدایہ: یہ اسلامی قانون اور فقہ حنفی کی مستند اور مہتم بالشان کتاب ہے جو حنفی فقہ کی بہترین و عمدہ اور اسلامی فقہ کی اہم کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اس کے مصنف برہان الدین علی بن ابو بکر بن عبدالجلیل فرغانی (530ھ/ 1135) میں پیدا ہوئے اور 593ھ/ 1197 میں وفات پائی۔ وہ اپنے زمانہ کے فقہ اور اصول فقہ ادبیات اور دوسرے متداول علوم کے ماہر تھے۔ شیخ اکمل الدین کا بیان ہے کہ ہدایہ کی تصنیف میں تیرہ سال تک مشغول رہے اور اس مدت بھر روزہ رکھتے رہے۔ ان کے زہد و ارتقا کی وجہ سے ہدایہ کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اور یہ ہر دور میں درسیات میں داخل رہی۔ انھوں نے پہلے بدایۃ المبتدی کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے مسائل کو ہدایہ میں مفصل تحریر کیا ہے۔ یہ حقیقتاً ابوالحسن احمد بن محمد کی مختصر القدوری اور امام محمد کی الجامع الصغیر کی شرح ہے۔ اس میں ابوحنیفہ اور اکابر فقہائے احناف کے علاوہ امام شافعی اور دوسرے ائمہ کے اقوال و دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔

ہدایہ کی مقبولیت کی وجہ سے اس کی عربی، فارسی اور ترکی وغیرہ میں بے شمار شرحیں اور تعلیقات لکھی گئی ہیں جن میں عنایہ اور ابن ہمام کی فتح القدیر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ بعض علما نے ان حدیثوں کو یکجا کر کے ان کی تخریج لکھی ہے جو ہدایہ میں متفرق طور پر درج تھیں۔ اس طرح کی کتابوں میں نصب الرایہ بہت معروف ہے۔

ہدایہ کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ لارڈ ہسٹنگز کے حکم سے چارلس ہملٹن نے انگریزی ترجمہ کیا تھا جو 1791 میں لندن سے شائع ہوا تھا۔ اور مولوی غلام یحییٰ خان اور دوسرے فضلا نے اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا جو 1807 میں کلکتہ سے چھپا تھا۔

امام: یہ لفظ ام یوم سے بنا ہے جس کے معنی قصد کرنا ہیں۔ پس امام وہ ہے جس کو مرجعیت حاصل ہو اور لوگ اس کا قصد کریں اس کی جمع ائمہ ہے۔ اسی لیے کسی قوم کے سربراہ، سردار، قائد، رہنما، مقتدر، پیشوا اور ہادی کو امام کہا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں اور مشکل امور و مسائل میں ان کی جانب سے رجوع ہوکر ان سے رہنمائی حاصل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کرتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ لفظ اس مفہوم میں بہت عام ہے۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کو لوگوں کا امام اس حیثیت سے کہا گیا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں سبھی کے پیشوا تھے اور سب ان کے متبع ہونے کے مدعی ہیں۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی قرآن نے ائمہ کہا ہے اور خود قرآن اور رسول کریم ﷺ کو بھی امام کہے جانے کا سبب یہی ہے کہ مسلمان ان دونوں کو اپنا ہادی اور راہبر سمجھتے ہیں اور ان کی تعلیم و ہدایت کی پیروی کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں امام کا لفظ راستہ کے معنی میں بھی آیا ہے کیونکہ لوگ راستے پر چلنے اور اس کا قصد کرتے ہیں انسان کے نامۂ اعمال کو امام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قیامت میں اس کی پیروی کی جائے گی اور اس میں جو کچھ درج ہوگا اس کے مطابق انسان کو سزا اور جزا دی جائے گی اب یہ لفظ عموماً حسب ذیل معنوں کے لیے اصطلاحی ہوگیا ہے۔

(1) نماز پڑھانے والے کو بھی امام کہتے ہیں اس کے لیے سب سے مقدم وہ شخص سمجھا جاتا ہے جو کتاب و سنت کے علم میں سب سے فائق اور برتر ہو اس کے بعد اچھا قرآن پڑھنے والا زیادہ متقی زیادہ معمر شخص ہے۔ اگر نماز پڑھانے کے لیے موزوں اور اہل شخص نہ ہو تو غیر موزوں افراد کے پیچھے بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر پاگل، مجنوں، مدہوش، نابالغ لڑکے، عورتیں اور خلقتہً معذور اشخاص امامت نہیں کرسکتے۔

اہل تشیع کے یہاں نماز پڑھانے والا امام نہیں کہلاتا کیونکہ وہ امام کا اطلاق صرف ائمہ اثناعشر (بارہ اماموں) پر کرتے ہیں اس کو پیش نماز کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک نماز پڑھانے والے کے لیے یہ اوصاف ضروری ہیں ایمان، عدالت، عقل، بلوغ، طہارت اور نسب۔ اگر ان اوصاف کے حامل اشخاص نہ ہوں تو نماز فرداً فرداً اور بلا جماعت ادا کی جائے گی۔

امام ابن حنبل: ابو عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل ان چار مشہور ائمہ اسلام اور فقہائے مجتہدین میں ہیں جن کے اجتہادی و فقہی مسلک پر چوتھی صدی سے اب تک مسلمانوں کا برابر عمل چلا آرہا ہے۔ یہ (164ھ م 780ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی تعلق قبیلہ عدنان کی شاخ بنوشیبان سے تھا۔ اصلی وطن خراسان کا مشہور شہر مروروز تھا لیکن نشوونما بغداد میں ہوئی۔ اس کے علاوہ کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کے علما محدثین سے کسب فیض کیا۔ ان کے شیوخ میں قاضی ابو یوسف، امام شافعی، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد، طیالسی، عبدالرحمٰن ابن مہدی، وکیع بن جراح، عبداللہ بن نصیر، یحییٰ بن سعید اور حافظ ہشیم بن بشیر واسطی جیسے مشہور ائمہ و حدیث اور اکابر فضل و کمال شامل ہیں۔

امام احمد کو بڑی مرکزی حاصل ہوئی۔ ان کے حلقہ درس سے بے شمار ممتاز اہل علم وابستہ تھے۔ ان کے بعض اساتذہ نے بھی ان سے روایت کی ہے اور صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد کو بلا واسطہ اور امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ کو بالواسطہ شرف تلمذ حاصل ہے۔ امام صاحب بڑے عبادت گزار اور متبع سنت تھے۔ احادیث و سنت کی نشر و اشاعت اور بدعنوانی کا استیصال ان کی زندگی کا خاص مشن تھا۔ وہ اعتقادی اور کلامی مسائل میں غور و خوض اور تحقیق و تدقیق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں معتزلہ کا زور و اثر بڑھ جانے کی وجہ سے لوگ عموماً اس کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ مگر جب آپ سے ان کے بارے میں سوالات کیے جاتے تو فرماتے کہ ان مسائل میں بحث و تفتیش بدعت اور سکوت افضل ہے۔ اس دور میں معتزلہ کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ خود مامون الرشید اور اس کا جانشین معتصم باللہ بھی ان کے ہمنوا ہوگئے تھے۔ خلفا کی پشت پناہی کی وجہ سے وہ لوگوں سے بزور شمشیر خلق قرآن کا اقرار کرا رہے تھے۔ امام احمد نے اس عقیدہ کو ماننے سے انکار کیا تو ان کو سخت ابتلا و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ مامون الرشید معتصم اور واثق باللہ کے عہد خلافت میں قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ سخت جسمانی اذیتوں سے بھی دوچار کیے گئے۔ وہ ان ساری آزمائشوں کو نہایت پامردی کے ساتھ جھیلتے رہے۔ لیکن خلق قرآن کا عقیدہ ماننے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ جب متوکل خلیفہ ہوا تو یہ تنازعہ ختم ہوا اور اس کے ساتھ معتزلہ کی قوت بھی ختم ہوگئی۔

امام احمد کے اخلاق و عادات نہایت عمدہ تھے نہ کبھی کسی کے ساتھ بدسلوکی کی اور نہ کسی کی دل آزاری کی۔ طبیعت میں انکسار تھا کبر و غرور سے نفرت تھی لیکن نہایت خوددار اور غیرت مند تھے کبھی جاہ و منصب کے طلب گار نہ ہوئے اور نہ امرا و سلاطین کے دربار سے وابستہ ہوئے۔

(241ھ م 855ء) میں انتقال ہوا اور باب حرب کے مقبرہ میں دفن کیے گئے۔ جنازہ میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی شریک تھے۔ اولاد میں ابوالفضل صالح اور ابو عبدالرحمٰن زیادہ مشہور ہوئے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

امام صاحب کی کئی تصنیفات بھی یادگار ہیں۔ ان میں کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزہد اور کتاب السنۃ اہم اور مشہور ہیں۔ یہ تینوں چھپ گئی ہیں لیکن ان کی سب سے مشہور اور حدیث کی مہتم بالشان کتاب مسند ہے۔ اس کے پہلے اور اس کے بعد مسانید کے کئی مجموعے مرتب کیے گئے مگر ان میں سے کسی کو بھی مسند احمد جیسی شہرت، مقبولیت اور اعتبار نصیب نہیں ہوا۔ یہ سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی حدیثوں کی تعداد چالیس ہزار ہے۔ ان میں تیس ہزار اصل مسند کی روایتیں ہیں۔ باقی دس ہزار امام صاحب کے صاحبزادہ عبداللہ کے زوائد ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مکررات کے ساتھ چالیس ہزار اور حذف مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں ہیں۔

امام احمد نے اس کو بڑی احتیاط سے مرتب کیا تھا۔ اس لیے اس کا شمار حدیث کی صحیح اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس کو کتب حدیث کے دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور جامع ترمذی کے ہم پایہ قرار دیا ہے۔ امام صاحب اس کو خود باقاعدہ مدون نہیں کرسکے تھے۔ ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس میں بعض اضافے کرکے اس کی باقاعدہ تہذیب و تنقیح کی۔ مسند کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ اعتنا کیا ہے۔ وہ نصاب درس میں بھی شامل رہی ہے اور اس کی متعدد شرحیں تعلقات، حواشی اور مختصرات لکھے گئے ہیں۔

وہ جس درجہ کے محدث تھے اسی درجہ کے فقیہ و مجتہد بھی تھے۔ حنبلی مسلک کی نسبت امام صاحب ہی کی جانب ہے۔ اس مسلک کا اصل دار و مدار نقل و روایت اور احادیث و آثار پر ہے۔ امام صاحب خود اور ان کے متبعین بلاضرورت قیاس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس کی اشاعت بغداد سے ہوئی۔ ایک زمانہ میں اسلامی دنیا کے کئی حصوں میں اس کا رواج رہا ہے لیکن دوسرے تینوں فقہی مسلکوں کے مقابلہ میں اس کے ماننے والوں کی تعداد کم رہی۔ تاہم کوئی صدی بھی اس کے ماننے والوں سے خالی نہ تھی۔ اس زمانہ میں سارے بلاد نجد و حجاز میں یہ سرکاری مذہب کی حیثیت سے مروج ہے۔

امام شافعی: ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی غزہ (فلسطین) میں (150ھ م767ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت ہی کے روز امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تھا۔ امام شافعی کا نسب نویں پشت میں رسول اللہ ﷺ کے نسب سے مل جاتا ہے۔ شافعی کی نسبت امام کے جد اعلیٰ شافع بن سائب کی طرف ہے۔

وہ بہت ذہین و طباع تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید اور دس سال کی عمر میں موطا حفظ کرلیا تھا۔ پندرہ سال کے ہوئے تو اپنے استاد کی اجازت سے فتویٰ دینے لگے۔ ان کی نشوونما اور تعلیم و تربیت مکہ معظمہ میں ہوئی۔ یہاں کے شیوخ میں مفتی حرم مسلم بن خالد زنجی اور سفیان بن عینیہ سے احادیث کا سماع کرچکے تو مدینہ منورہ میں امام مالک اور عراق میں امام محمد سے کسب فیض کیا۔ امام محمد سے بحث و مناظرہ بھی کیے۔ امام شافعی کے درس و تدریس کا آغاز مکہ میں ہوگیا تھا آخر عمر میں مصر تشریف لے گئے۔ جہاں انھوں نے اپنے قدیم افکار و آرا پر نظر ثانی کی اور بعض رایون سے رجوع بھی کرلیا۔ اس بنا پر کتابوں میں ان کے قول قدیم و جدید کا ذکر ملتا ہے۔ قدیم سے مصر کے قیام سے پہلے کے اور جدید سے مصر کے قیام کے زمانہ کے اقوال مراد ہیں۔ ان کا 204ھ م 819ء میں مصر میں انتقال ہوا۔ ان کے قدیم شاگردوں میں امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ، امام ابوثور، موسیٰ بن جارود، حسن بن محمد بن الصباح اور مصری تلامذہ میں امام اسماعیل بن یحییٰ مزنی، یوسف بن یحییٰ، بولیطی، ربیع بن سلیمان مرادی، حرملہ بن یحییٰ تحیبی اور یونس بن عبدالاعلی صدفی مشہور ہیں۔

امام شافعی کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ماں نے پرورش کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد، معاش کی فکر ہوئی تو یمن چلے گئے۔ مصعب بن عبداللہ قرشی قاضی یمن کی مدد سے ان کو ایک کام مل گیا۔ یہاں امام صاحب رعایا کو حکام وامرا کے شر اور ظلم سے بچانے کے لیے فکر کرتے اور گورنر کی بے جا حرکتوں پر اس کو ٹوک بھی دیتے تھے جس سے اس کو بڑی ناگواری ہوتی۔ اس نے چاہا کہ بغاوت کے الزام میں امام صاحب قتل کر دیے جائیں۔ چنانچہ اس نے خلیفہ ہارون الرشید کو یہ شکایت لکھ کر بھیجی کہ امام صاحب عباسی حکومت کے مخالف اور علویون کے طرف دار ہیں۔ اس پر وہ خلیفہ کے یہاں طلب کیے گئے۔ امام صاحب کو قوت بیان اور حسن تعبیر کا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ ان کی قوت بیان اور زور استدلال کام آیا۔ ہارون رشید کے حاجب فضل بن ربیع کی مدافعت اور قاضی بغداد امام محمد کی سعی و سفارش سے بھی وہ اس فتنہ اور سازش سے محفوظ رہے۔

امام شافعی کی شخصیت بڑی جامع اور علمی حیثیت سے نہایت ممتاز تھی۔ ان کو دینی علوم کی طرح عربی زبان و ادب کی جملہ اصناف پر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بھی مکمل قدرت تھی۔ ان کے زمانہ میں غیر عربوں کے اختلاط سے عربی زبان اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں تھی۔اس لیے امام شافعی نے قبیلہ ہذیل میں جاکر خالص زبان عربی سیکھی اور بہت سے اشعار حفظ کیے۔ اصمعی جیسا باکمال اور یگانہ روزگار ادیب و امام لغت میں ان کی عربیت کا معترف تھا۔ وہ ھذیل کے اشعار کی تصحیح امام صاحب سے کرتا تھا۔ ان کے اشعار اور تحریر فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ انھوں نے خالص عربوں کی طرح تیراندازی کا علم بھی سیکھا تھا۔ فن حدیث میں ان کے کارنامے نہایت مہتم بالشان ہیں۔ انھوں نے جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت اور راویوں کے درجات و مراتب کے امتیاز کے لیے قواعد مقرر کیے۔ احادیث کی حجیت، دین میں اس کی ضرورت اور اہمیت پوری طرح واضح کی اور ان کے بارے میں مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیے اس لیے وہ ناصرالسنت کہلاتے ہیں۔

امام شافعی کی زیادہ شہرت کتب فقہ و اجتہاد کے بانی کی حیثیت سے ہے۔ وہ دراصل فقہ و حدیث دونوں علوم کے مجتہد تھے۔ انھوں نے مختلف مکاتب فکر کا امکانی نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اپنے پیش رو مکاتب فقہ کا ناقدانہ جائزہ لے کر ان کی خوبیوں اور خرابیوں سے واقفیت حاصل کی تھی۔ مالکی کتب کو براہ راست اس کے بانی امام مالک سے اور حنفی کتب کو اس کے ایک اہم اور بڑے داعی و جامع امام محمد سے جانا تھا۔ اسکے بعد انھوں نے اپنی راہ ان دونوں سے علیحدہ نکالی۔ اس طرح ایک نیا فقہی و اجتہادی کتب وجود میں آیا جو کتب شافعی کے نام سے اب تک موسوم ہے۔ قدامت کے لحاظ سے مکاتب اربعہ میں یہ تیسرا کتب ہے۔

اس مسلک کی اولین بنیاد قرآن مجید ہے۔ امام شافعی ظاہر قرآن سے اس وقت انحراف کرتے جب ان کو کسی دلیل سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ظاہر قرآن مراد نہیں۔اس کے بعد حدیث کو لیتے ہیں اور اخبار آثار (بشرطیکہ ان کے روایت ثقہ ہوں) پر عمل کرنے کی پرزور حمایت کرتے ہیں۔ جب کسی کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک بہ سند متصل پہنچ جائے تو امام مالک کی طرح اس کے بعد وہ کسی عمل کی جو حدیث کی تائید کرتا ہو، اوراہل عراق کی طرح شہرت حدیث کی شرط نہیں لگاتے۔ وہ احادیث صحیحہ کواس نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے قرآن مجید کو دیکھتے ہیں۔ احادیث کی اس تائیداور روایات کی جانب شدت اعتنا کی وجہ سے شافعی مسلک کو اہل حدیث میں نہایت حسن قبول حاصل ہوا۔ احادیث کے بعد وہ اجماع پر عمل کرتے ہیں اور جب کوئی منصوص دلیل نہیں ہوتی تو وہ قیاس پراس شرط کے ساتھ عمل کرتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی معین اصل موجود ہو۔ اہل عراق جس چیز کو استحسان اور مالکی جس چیز کو استصلاح کہتے ہیں۔ انھوں نے اس کی شدت کے ساتھ تردید کی ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ ان فقہا کی رائے اور قیاس میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ البتہ وہ استدلال کو مانتے ہیں جو استحسان و استصلاح کے قریب ہے۔ امام شافعی کے چند اہم فقہی و اجتہادی کارنامے یہ ہیں۔ جن سے ان کے مسلک کی نمایاں خصوصیات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

(1) انھوں نے علم الفقہ کے اصول مرتب کیے اور اصول فقہ میں سب سے پہلے کتاب (الرسالہ فی اصول) لکھی۔

(2) امام شافعی سے پہلے مرسل و منقطع روایتیں بے تکلف قبول کرلی جاتی تھیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ اگر حدیث کے تمام طریق جمع کرکے دیکھے جائیں تو بہت سی مرسل روایات بے اصل یا مسند روایات کے خلاف نظر آئیں گی۔ اس صورت میں ان کو قبول کرنے سے دین میں خلل واقع ہوگا۔ اس لیے انھوں نے مرسل حدیثوں کے ماننے کے لیے کچھ شرطیں عاید کیں۔

(3) روایتوں کے جمع و تطبیق کے قاعدے وضع کیے اور اصول مرتب کیے۔

(4) صحابہ کرام اور تابعین عظام کو بعض حدیثوں کا علم نہ ہوسکا اور وہ تیسرے طبقہ میں یا اس کے بعد میں اس وقت ظاہر ہوئیں جب محدثین نے گوشہ گوشہ چھان کر تمام روایات اور ان کے سب طریق کا پتہ لگایا اور ایک ایک شیخ کومعلوم کرکے اس کے تمام مرویات منظر عام پر لائے۔ اس عدم واقفیت کی بنا پر صحابہ و تابعین نے اصول شریعت کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے فیصلے کیے۔ اس قسم کی روایتوں کے بارے میں اس زمانہ کے عام فقہا کے برعکس امام شافعی کا موقف یہ تھا کہ کسی علاقہ کے لوگوں کا ان روایات کو نہ لینا ان کے نقص کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ خود صحابہ و تابعین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر مسئلہ میں کتاب اللہ کے بعد حدیث کو تلاش کرتے تھے جب حدیث ان کو نہ ملتی تب استدلال کے دوسرے طریقوں سے کام لیتے تھے اور اگر بعد میں حدیث مل جاتی تو وہ اپنے اجتہاد سے رجوع کرکے اس حدیث کو اختیار کرلیتے تھے۔ پس صحابہ و

تابعین کا مجرد کسی حدیث کو نہ لینا اس کی خرابی کی دلیل نہیں ہوسکتا، حدیث میں خرابی اس وقت ہوسکتی ہے جب انھوں نے اس کو بیان کیا ہو۔ اسی اصول کی بنا پر امام شافعی کا مسلک قلتین اور خیار مجلس کی حدیثوں میں امام مالک اور امام ابوحنیفہ سے الگ ہے۔

(5) امام شافعی کے زمانہ میں جب صحابہ کے اقوال و آثار جمع کیے گئے تو ان کے باہمی تعارض و اختلاف کا پتہ بھی چلا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صحیح حدیثیں نہ پہنچنے کی وجہ سے صحابہ کے بعض اقوال ان کے خلاف ہیں۔ ایسی صورت میں سلف اپنی رائے چھوڑ کر صحیح حدیث کو اختیار کرلیتے تھے۔ اس لیے امام شافعی نے صحابہ کے اختلاف کی صورت میں ان کے اقوال سے استناد کو صحیح نہیں سمجھا اور فرمایا کہ ہم رجال و نحن رجال یعنی صحابہ بھی آدمی تھے اور ہم لوگ بھی آدمی ہیں۔

(6) اختلاف احادیث اور تعداد روایات کی صورت میں وہ ان حدیثوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کی سندیں زیادہ صحیح اور روایات قوی ہوتی ہیں۔

امام شافعی کے ایک نئے اور مستقل فقہی کتب کو وضع کرنے اور اس کے اصول و ضوابط مقرر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جو فقہی مکاتب اپنے اپنے علاقوں کے علما و فقہا کے اقوال کے دائروں میں سمٹ گئے تھے وہ روایات و آثار کے ظاہر ہونے اور پھیلنے کے بعد ان کے پورے ذخیرہ سے فائدہ اٹھائیں اور سلف کے طریق پر روایات مل جانے کی صورت میں اپنے قیاسات و اجتہادات سے دست بردار ہوجائیں۔

امام شافعی سے پہلے علما، فقہا، اہل حدیث و اہل رائے دو گروہوں میں منقسم ہوگئے تھے اور دونوں کے درمیان گہری خلیج حائل ہوگئی تھی۔ ان کے انداز فکر اور طرز عمل نے دونوں گروہوں کا بعد کم کردیا۔

علامہ ابن الندیم نے امام شافعی کی تصنیفات کی طویل فہرست دی ہے۔ ابن حجر نے ان کی تعداد 140 لکھی ہے مگر ان میں اکثر ناپید ہیں اور بعض کتاب الام میں شامل ہیں۔ چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں۔

مسند شافعی: یہ ان حدیثوں کا انتخاب ہے جو کتاب الام وغیرہ میں درج ہیں۔ اس کے اصل مرتب کروہ ابوالعباس اصم ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوالعباس کے ایما سے محمد مطر نیشاپوری نے اس کو مرتب کیا تھا حالانکہ ان کی حیثیت ناقل و کاتب کی ہے۔ متعدد علما نے اس کی تشریحیں لکھی ہیں اور یہ طبع ہوچکی ہے۔

سنن شافعی: یہ بھی امام صاحب کی مشہور کتاب ہے۔ آپ کے شاگرد ابو ابراہیم بن اسماعیل نے امام صاحب سے اور ابوابراہیم سے ابوجعفری طحاوی نے اس کی روایت کی ہے۔

امام مالک: امام دارالہجرت ابوعبداللہ مالک بن انس کی ولادت مدینہ منورہ میں 93ھ میں ہوئی اس زمانہ میں مدینہ گل و گلزار بنا ہوا تھا اس لیے امام صاحب کو حصول علم کے لیے وہاں سے باہر نہیں جانا پڑا ان کے دادا، چچا اور والد بلند پایہ محدث تھے ان لوگوں سے اور مدینہ کے دوسرے ارباب کمال سے استفادہ کیا دوسرے شہروں کے جو اصحاب علم و فضل مدینہ آئے ان سے بھی امام صاحب کسب فیض کیا مگر حضرت عبداللہ بن عمر کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع حدیث میں اور ابو عثمان ربیعۃ الرائے فقہ میں ان کے سب سے ممتاز استاد تھے۔ امام مالک نے نافع کے واسطہ سے اور انھوں نے ابن عمر کے واسطہ سے جو حدیثیں بیان کی ہیں ان کو سلسلۃ الذہب طلائی زنجیر کہا جاتا ہے۔

امام مالک ان ہی لوگوں سے روایت کرتے تھے جو صدق و طہارت اور حفظ و ضبط میں معروف اور فقہ و بصیرت میں ممتاز تھے شیوخ کے انتخاب میں انھوں نے غیر معمولی احتیاط کی اس بیان سے اندازہ ہوگا وہ فرماتے ہیں مسجد نبوی کے صحن میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو قال اللہ و قال الرسول کہتے سنا لیکن میں ان کے پاس بھی نہیں بیٹھا مدینہ میں ایسے ایسے بزرگ تھے کہ اگر بارش کی دعا کی جاتی تو ان کی برکت سے پانی برسنے لگتا ان لوگوں کو بہت سی احادیث و مسائل کی سماعت میں بھی حاصل تھی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیونکہ وہ صرف متقی و زاہد تھے اور حدیث و روایت اور فقہ و فتویٰ کے لیے تقویٰ کے ساتھ علم و فہم کی پختگی بھی ضروری ہے تاکہ وہ یہ جانے کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ یہ علم حدیث دین ہے اس لیے پہلے دیکھ لو کہ اس کو کس سے حاصل کرتے ہو۔

ربیعۃ الرائے اور نافع کی زندگی ہی میں امام مالک کو بڑی اہمیت اور مرجعیت حاصل ہوگئی تھی لیکن وہ ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد ہی مسند درس پر رونق افروز ہوئے ان کے تلامذہ میں خلفا میں و امرا فقہا و محدثین مفسرین و مورخین قضاۃ صوفیا زہاد ائمہ شعر و ادب اور فلاسفہ سب

ہی طبقوں کے ۔۔۔ ب افراد شامل تھے۔ امام صاحب کے بعد کے اکابر محدثین اور صحاح و مسانید کے مصنفین بھی ایک یاد و واسطوں سے ان کے شاگرد امام مالک کی مجلس درس نہایت پر تکلف اور بڑی آراستہ ہوتی تھی وہ حدیث کا املا صرف مسجد نبوی یا مجلس درس ہی میں کرتے تھے۔ عجلت میں یا مصروفیت کے وقت یا راہ چلتے حدیث نہیں بیان کرتے تھے۔

ان کا درجہ فقہ و اجتہاد میں بہت بلند تھا وہ ان چار مشہور ائمہ میں تھے جن کے اجتہادی کتب پر آج تک مسلمان عمل کر رہے ہیں وہ تفقہ و اجتہاد میں کتاب اللہ اور سنت نبوی کے بعد حضرت عمر کے فیصلوں، حضرت ابن عمر کے فتووں اور دوسرے تمام صحابہ و تابعین خصوصاً فقہا کے مدینہ سعید بن مسیب وغیرہ کے آرا و اقوال کو پیش نظر رکھتے تھے فقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کی بنا پر حج کے زمانہ میں حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ ان کے اور ابن ابی ذئب کے علاوہ کوئی فتویٰ نہ دے۔

فتویٰ و اجتہاد میں امام مالک کی احتیاط اور خداترسی کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور ان کو اس جزئیہ سے واقفیت نہ ہوتی تھی تو بے تکلف فرماتے کہ لاادری یعنی میں نہیں جانتا اور جب کوئی قیاسی مسئلہ بیان کرتے تو کہتے ان نظن الاظنا و ما نحن بمستیقنین۔ جب کسی مسئلہ میں اپنی غلطی کا علم ہوجاتا تو فوراً اپنی رائے سے رجوع کرلیتے۔

اہل الرائے میں شمار کیے جانے کے باوجود محدثین کے نزدیک ان کا درجہ مسلم ہے وہ جس پایہ کے فقیہ و مجتہد تھے اس پایہ کے محدث بھی تھے۔ ابن معین ابن قطان ابن مہدی، امام ثوری، امام ابن عیینہ، امام شافعی،امام ابن حنبل اور ابن ابی حازم وغیرہ کبار محدثین و نقاد ان کے فن، ان کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔

امام صاحب تقویٰ طہارت اورزہد و عبادت میں بھی یکتا تھے۔ درس و افتا سے جو وقت بچتا وہ زیادہ تر عبادت و تلاوت میں گزرتا رسول اللہ کا اس قدر ادب ملحوظ تھا کہ جب آپ کا ایک نام مبارک زبان پر آتا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا مسجد نبوی میں شور و غل کو سخت ناپسند اور آستانہ نبوی میں گستاخی خیال کرتے تھے کیونکہ اسکے ایک حجرہ میں روضہ انور ہے جب وضو یا غسل کرکے مودب بیٹھ جاتے تب ہی کلام نبوی زبان سے ادا ہوتا تھا کبھی سوار ہوکر مدینہ میں نہیں نکلے فرماتے کہ جو سرزمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کی سموں سے کیسے روندوں۔ مدینہ سے اس قدر محبت تھی کہ حج کے علاوہ کبھی وہاں سے باہر نہیں نکلے۔ منصور نے بغداد میں قیام کی درخواست کی تورد کردی۔ مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور کہلایا کہ بغداد کا عزم کیجیے ارشاد ہوا کہ جی چاہے تو اشرفیاں لے جاؤ مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔

حق گوئی میں بے مثال تھے۔ سلاطین و امراء ان کا بڑا اعزاز کرتے تھے۔ مگر ان کی خوشنودی کے لیے کبھی شریعت کی خلاف ورزی نہ کرتے حق کے معامل میں ذرا بھی مروت یا رعایت نہ کرتے چاہے اس کی وجہ سے ان کو ظلم و تشدد ہی کا نشانہ کیوں نہ بننا پڑتا۔ جعفر والی مدینہ لوگوں سے جبراً بیعت لے رہا تھا اس بنا پر اس نے امام مالک کو جبری طلاق کے عدم اعتبار کا فتویٰ دینے سے منع کیا کیونکہ اس سے جبری بیعت کی عدم صحت اور بے اعتمادی کے لیے لوگوں کو سند مل جائے گی۔ مگر امام مالک نے اس کی پرواہ نہیں کی اور بدستور جبری معاملات کی عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے جعفر نے غضبناک ہوکر ان کو ستر کوڑے لگوائے اور اونٹ پر بیٹھا کر مدینہ میں تشہیر بھی کرائی اس حالت میں بھی امام صاحب یہ کہتے جاتے تھے کہ جو مجھ کو جانتا ہے سو جانتا ہے لیکن جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور یہ فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبر مکرر درست نہیں ہیں۔ منصور کے خلاف محمد نفس زکیہ نے علم بغاوت بلند کیا اور وہ اور ان کے بھائی ابراہیم شہید کردیے گئے۔ امام صاحب نے اپنے اوپر منصور کی نوازشوں کے باوجود اس کی ہم نوائی نہ کی بلکہ یہ فتویٰ دیا کہ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے لوگوں نے کہا ہم منصور کی بیعت پر حلف لے چکے ہیں فرمایا منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے اس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں۔

خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹوں موسیٰ و ہارون کو حکم دیا کہ وہ امام مالک سے موطا سنیں۔ شہزادوں نے امام صاحب کو بلایا تو جواب دیا کہ درس علم بیش قیمت چیز ہے اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں۔ چنانچہ مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے۔

اس تعزیر کا مقصد امام صاحب کی تذلیل تھا مگر اس سے ان کی عظمت وقار میں اور اضافہ ہوا خود منصور کو جعفر کی حرکت پسند نہ آئی اس نے اس کو معزول کرکے بغداد طلب کرلیا اور امام صاحب کو معذرت کا خط لکھا۔

ان کے اتالیق نے امام صاحب سے پڑھ کر سنانے کے لیے کہا تو ارشاد ہوا کہ ہمارے علما کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں شیوخ سنیں۔ اسی

طرح خلیفہ ہارون اپنے شہزادوں امین و مامون کو لے کر حج کے لیے آیا اور موطا کے املا کے لیے امام صاحب کو طلب کیا۔ امام صاحب موطا کے بغیر ہی تشریف لے گئے۔ ہارون نے شکایت کی تو فرمایا کہ علم آپ کے گھر سے نکلا ہے خواہ اس کو ذلیل کیجیے یا عزت دیجیے اس جواب کو سننے کے بعد وہ خود صاحبزادوں کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا وہاں طلبہ کا ہجوم دیکھا تو فرمائش کی کہ اس بھیڑ کو الگ کردیجیے ارشاد ہوا کہ شخصی فائدہ کے لیے عام لوگوں کا مفاد نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہارون مسند پر بیٹھا تو امام نے فرمایا امیرالمومنین تواضع پسندیدہ ہے وہ نیچے اتر آیا اور قرات کی درخواست کی، جواب ملا کہ خلاف عادت ہے۔ آخر معین بن عیسیٰ کو جو اس وقت مسند طالب علم تھے اور آگے چل کر بڑے محدث ہوئے حکم دیا اور انھوں نے قرأت کی۔

امام مالک نہایت خوددار اور غیرت مند بھی تھے۔ لوگ منصور کے دربار میں جاتے تو اسی کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے مگر انھوں نے کبھی یہ گوارہ نہیں کیا۔ خودداری ہی کی وجہ سے انھوں نے علم کی شان میں کبھی فرق نہیں آنے دیا مگر اہل علم کا بڑا اعزاز کرتے اور ان کے سامنے تواضع سے بچھ جاتے چنانچہ ایک دفعہ امام ابو حنیفہ تشریف لائے تو ان کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور امام شافعی طالب علم کی حیثیت سے آئے تو ان کے لیے خود گھر سے کھانا لاتے اور وضو کا پانی رکھ دیتے اور جب واپس ہوئے تو بازار تک جاکر سواری بھی کردی اور اشرفیوں کی ایک تھیلی بھی دی۔ صفائی بہت پسند تھی، ہمیشہ صاف ستھرے اور بیش قیمت کپڑے زیب تن فرماتے اور خوشبو کا استعمال کرتے۔ مجلس درس نہایت معطر اور اتنی پاکیزہ ہوتی کہ فرش پر ایک تنکا بھی دکھائی نہ دیتا۔

آخر میں ضعف کی وجہ سے مسجد نبوی اور جماعت کی شرکت سے معذور ہوگئے تھے مگر اس کے باوجود درس افتا کی خدمت میں مشغول رہتے۔ 86 برس کی عمر میں ربیع الاول 179ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ امام مالک کی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

(1) رسالہ مالک الی الرشید: اس میں ہارون رشید کو دینی، دنیاوی اور اخلاقی نصیحتیں کی ہیں یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور لاہور سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

(2) رسالہ مالک الی ابن وہب: مسئلہ قضا وقدر سے متعلق ہے۔

(3) رسالہ مالک الی ابن مطرف فتویٰ سے متعلق ہے۔

(4) کتاب الاقضیہ عہد قضا سے متعلق مفید اصول و ہدایات پر مشتمل ہے۔

(5) کتاب المناسک۔ اس میں حج کے احکام و مناقب درج ہیں۔

(6) تفسیر غریب القرآن اس کے روائی خالد بن عبدالرحمٰن مخزومی ہیں۔

(7) کتاب المجالسات عن مالک امام صاحب اپنی مجلسوں میں حدیث و آثار کے متعلق جو فوائد و نکات بیان کرتے تھے ان کو ابن وہب نے اس میں جمع کیا ہے۔

(8) موطا۔ امام صاحب کی سب سے مشہور اور اہم تصنیف ہے۔ یہ فقہ احکام کا مجموعہ ہے اس میں احادیث آثار صحابہ و تابعین کے اقوال اور علمائے مدینہ کے فتوے درج ہیں۔ موطا خوب پامال روندے اور چلے ہوئے راستہ کو کہتے ہیں۔ اس لیے یہ وہ کتاب ہے جس کے مندرجات پر آنحضرت صلعم کے بعد صحابہ کرام و تابعین عظام گزرے اور انھوں نے اس پر اتفاق کیا۔

اہل سنت اس بڑے اور جید عالم کو بھی امام کہتے ہیں جو علوم دینیہ میں ممتاز ہو۔ دینی علوم کے کسی خاص شعبہ اور شاخ میں کامل دسترس رکھتا ہو قرآن و حدیث کے مطالب سے بھی اچھی طرح واقف ہو اور دوسرے کو بھی اپنی تحریر و تقریر سے اچھی طرح سمجھا اور بتا سکتا ہو ایسے لوگوں کو مجتہد بھی کہا جاتا ہے اور عموماً مسلمان ان کی تقلید و اتباع کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں اس طرح کے ائمہ کی تعداد بے شمار ہے مگر اہل تشیع ان لوگوں کو امام کے بجائے مجتہد کہتے ہیں۔

امام کا لفظ خلیفہ سلطان اسلامی مملکت کے حکمراں اور فرمان روا کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس معنی میں امام کی حیثیت خدا اور اس کے نبی کے جانشین کی ہوتی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ مسلمان امامت کے منصب پر مامور ہوگئے ہیں اور دنیا کی قیادت و امارت ان کے سپرد کی گئی ہے۔ نصب امارت کی ضرورت اور امام کے تقرر کی اہمیت پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کیونکہ نبوت کی جانشینی کے لیے امامت و خلافت ناگزیر ہے لیکن کسی کو امام مقرر کیا جائے اس میں اختلاف ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس میں سب سے پہلے امت کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہو اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دو بڑے فرقے شیعہ اور سنی وجود میں آئے۔

اہل تشیع کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰ بالاتفاق امام اول ہیں وہ

ان کو تمام صحابہ سے افضل مانتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے نزدیک گیارہ ائمہ ہوئے مگر اہل سنت کے نزدیک امام اور خلیفہ حضرت ابو بکر تھے اس کے بعد حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی خلیفہ ہوئے۔

اہل سنت معتزلہ اور زیدیہ کے نزدیک ہر صاحب سیاست امام ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے خلیفہ راشد کی قید نہیں کیونکہ وہ یہ مانتے ہیں کہ مسلمانوں کے ائمہ کو ظاہری و باطنی اوصاف میں انبیا کا جانشین ہونا چاہیے اور ان کے کمالات کا پوری طرح تشبیہ اختیار کرنا چاہیے تاہم دنیوی معاملات میں اعتبار صرف ظاہر ہوتا ہے اس لیے جو بھی صاحب دعوت ہو اور بے دین کے خلاف پرچم بلند کرتا ہو، اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنے کی جدوجہد کرتا ہو، مذہب اسلام پر کاربند ہو، سنت نبوی کے سوا کسی دوسرے طریقہ کو اختیار نہ کرتا ہو، سیاست میں آئین نبوی پر عمل کرتا ہو اور قوانین مصطفوی کو نافذ کرتا ہو۔ وہ امام تسلیم کرلیا جائے گا اور اس کی امامت پر بیعت کرلی جائے گی خواہ ان سب چیزوں میں وہ خلوص نہ نافذ کرتا ہو وہ امام تسلیم کرلیا جائے گا اور اس کی امامت پر بیعت کرلی جائے گی خواہ ان چیزوں میں وہ مخلص نہ بھی ہو تاہم ان کے نزدیک امام میں متعدد ضروری اوصاف و شرائط ہونے چاہئیں جن کا ذکر اس موضوع کی کتابوں میں موجود ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک بادشاہت امامت کے لیے شرط نہیں اگر کسی بزرگ میں دونوں منصب جمع ہوجائیں گے تو ان کے نزدیک امام کے ضروری اوصاف حسب ذیل ہیں۔

(1) منصوص من اللہ ہو یعنی پیغمبروں کی طرح اللہ کی جانب سے مامور مقرر۔

(2) معصوم ہو یعنی نبیوں کی طرح صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے پاک ہو۔

(3) ہر لحاظ سے عام امت سے افضل ہو جیسے علم میں شجاعت اور سخاوت وغیرہ میں یکتا ہو۔

(4) ہاشمی ہو یعنی رسول خدا کی اولاد میں ہو۔

امام محمد: ابوعبداللہ محمد بن حسن فرقد شیبانی، عراق کے ایک گاؤں واسط میں 133ھ م 749ء میں پیدا ہوئے۔ شیبانی کی نسبت ولائی ہے یعنی امام محمد کا خاندان قبیلہ بنو شیبان کا غلام تھا۔ ولادت کے چند سال بعد ان کے والد کوفہ منتقل ہوگئے۔ یہیں امام محمد کی نشوونما ہوئی۔ تیرہ چودہ سال کے ہوئے تو امام ابوحنیفہ کی مجلس درس میں تشریف لے گئے۔ چار سال بعد جب ان کا انتقال ہوگیا تو یہ امام ابو یوسف کے دامن فیض سے وابستہ ہوئے اور علوم فقہ کی تکمیل کی۔ حدیث کی تکمیل کے لیے وہ امام دارالہجرت مالک بن انس کے پاس تین سال تک مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے۔

امام محمد مسند آرائے درس ہوئے تو دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے تشنگان علم ان کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے۔ امام شافعی، ابو عبید قاسم بن یحییٰ بن معین وغیرہ ائمہ فقہ و حدیث نے ان سے کسب فیض کیا تھا۔

امام محمد ان علمائے اسلام میں تھے جو حکومت کا کوئی عہدہ قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم بعض وجوہ سے جب وہ رقہ کے قاضی مقرر کیے گئے تو انھوں نے بڑی دیانت داری سے اور بلا کسی رعایت کے اس کے فرائض انجام دیے۔ کبھی اپنے فیصلہ میں خلیفہ وقت یا اعیان دولت کی پرواہ نہیں کی۔ ایک دفعہ ہارون کی مرضی کے مطابق فیصلہ نہ دینے کی وجہ سے سخت معتوب ہوئے اور عہدہ قضا سے برطرف کردیے گئے۔ خلیفہ نے ان کو فتوئ دینے سے بھی روک دیا۔ اس کے نتیجہ میں قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی۔ امام جعفر کی سفارش سے رہا ہوئے تو ہارون نے ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا اور قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا مگر اس کے کچھ ہی دن بعد خلیفہ کے ہمراہ رے تشریف لے گئے یہیں 189ھ م 805 میں انتقال ہوگیا اور جبل طبرک میں سپرد خاک کیے گئے۔

امام محمد گو تفسیر حدیث اور دوسے مروجہ علوم میں بھی یکتا ہے لیکن فقہ و اجتہاد ان کا اصلی طرۂ امتیاز تھا۔ وہ حنفی مسلک کے اساطین اور امام اعظم اور امام ابو یوسف کے ممتاز ترین شاگرد تھے۔

ائمہ ثلاثہ میں امام شافعی و امام احمد نے ان سے فقہ کی تعلیم پائی اور امام مالک گو ان کے استاد تھے۔ لیکن بعض علما کا خیال ہے کہ امام محمد ان سے بڑے فقیہ تھے وہ تفریع مسائل کے لیے نہ صرف فقہائے احناف بلکہ دوسرے مسلکوں کے فقہا کے مقابلہ میں بھی مشہور و ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ امام محمد تفحص و تعمق کے عادی تھے۔ اس لیے بعض اوقات اپنے اساتذہ اور معاصرین سے بحث مباحثہ کی نوبت آجاتی۔ امام ابو یوسف اور امام مالک سے بھی ان کے بعض مباحثے ہوئے۔ وہ مسائل پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے اور ان میں تفقہ و استنباط کی صلاحیت بدرجہ اتم تھی اور مسائل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی تحقیق و استنباط میں وہ غیر معمولی کد و کاوش اور نہایت دیدہ ریزی سے کام لیتے تھے۔ متعدد مسائل میں انھوں نے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف سے اختلاف کیا ہے اس لیے ان کے مجتہد مطلق ہونے میں کلام نہیں مگر وہ خود کو امام ابو حنیفہ کا متبع ہی کہتے تھے۔

امام احمد اپنے ہم عصروں میں تصنیفات کی کثرت کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے۔ ذیل میں ان کی چند مشہور اور معرکۃ الآرا تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

امامیہ: اس فرقے کی تعداد زیادہ ہے ۔ ایران، عراق، پاکستان، ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک میں اسی مسلک کے شیعی پائے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک امام کے صرف اوصاف بتانے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ صریح لفظوں میں اس کی تعین کردی گئی ہے۔ چنانچہ آنحضرت محمد ﷺ نے حضرت علی کو متعین اور نامزد کردیا تھا اور انھوں نے بعد میں آنے والے امام کو متعین کردیا تھا۔ یہ لوگ ائمہ کو اوصیا بھی کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں امام کو تشریع کا پورا اختیار ہے اس کی ہر بات شریعت کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ وہ معصوم عن الخطا اور بھول چوک سے مبرا ہے اور وہ ائمہ کے خارق عادت امر کو معجزہ کہتے ہیں۔

امامیہ فرقہ کے لوگ آنحضرت کی نص قطعی سے حضرت علی کو وصی مانتے ہیں اور ان کے بعد ان کی اولاد کو اوصیا میں شمار کرتے ہیں۔ اس حد تک تو ان کا عقیدہ اجماعی ہے مگر اس کے بعد ان میں اختلاف ہوا اور وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے دو فرقے زیادہ مشہور ہیں۔

امر باعث تکلیف (Nuisance): ہر صاحب جائداد کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جائداد سے کامل طور پر ہر قسم کا فائدہ حاصل کرے لیکن اس پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے آرام و آسائش میں خلل انداز نہ ہو۔ ہر پڑوسی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی جائداد کا مناسب استعمال کرے اور کوئی ایسا فعل نہ کرے جس سے پڑوسی کو یا اس کی جائداد کو کسی قسم کا ہرج یا نقصان پہنچے اور اس کے جائز تمتع میں خلل نہ ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے مکان میں شور و غل مچائے جس سے پڑوسی کی نیند میں خلل ہو یا اپنے مکان میں اس قدر آگ سلگائے کہ اس کا دھواں پڑوسی کے مکان میں داخل ہو کر اس کے آرام میں خلل انداز ہو یا کوئی شخص اپنے مکان میں اس قدر پانی جمع کرلے کہ وہ پڑوسی کی دیوار کو نقصان پہنچائے یا اس سے پڑوسی کی دیوار منہدم ہوجائے تو یہ تمام امور باعث تکلیف ہیں۔ جائداد کے استعمال سے متعلق قانون کا ایک اصول یہ ہے کہ وہ اس طرح استعمال نہ کی جائے کہ جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ یا اس سے اس کی جائداد کے تمتع میں فرق آئے۔ ایسے فعل نارٹ کی تعریف میں آتے ہیں۔

امر باعث تکلیف کی دو قسمیں ہیں ایک امر باعث تکلیف خاص جس کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں اور دوسرا باعث تکلیف عام۔

امر باعث تکلیف عام وہ ہے کہ جس سے عام لوگوں کے آرام اور صحت پر اثر پڑے۔ مثلاً کسی شاہراہ پر رکاوٹ کھڑی کرنا یا کھانے پینے کی ایسی چیزیں فروخت کرنا جو استعمال کے قابل نہ ہوں۔ اس کے خلاف چارہ جوئی صرف حکومت کرسکتی ہے اور قانون فوج داری کے تحت تعزیری مقدمہ بھی چلا سکتی ہے۔ اس کے لیے کوئی شخص نارٹ میں دعویٰ کرنے کا مجاز نہیں ہوتا سوائے ایسی صورت کے جبکہ وہ ثابت کرسکے کہ اس کو ایسا ذاتی نقصان پہنچا ہے جو دوسروں کو نہیں پہنچا۔ مثلاً جب شاہراہ پر کسی رکاوٹ اس کے گھر کا راستہ بھی بند کردیتی ہے۔

امر باعث تکلیف خاص اور عام میں فرق یہ ہے کہ خاص کی صورت میں اگر ارتکاب 20 سال تک متواتر اور پرامن طریقہ سے اور علانیہ ہوتا رہے تو مرتکب کو اس کے ارتکاب کا قانوناً حق حاصل ہوتا ہے اور اس کے خلاف کوئی نالش نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس امر باعث تکلیف عام کا ارتکاب خواہ کتنی ہی مدت گزرے جائز نہیں ہوسکتی۔

امر باعث تکلیفِ عامہ (Public Nuisance): اگر پولس تھانہ کی رپورٹ کی بناء پر متعلقہ حاکم فوجداری کی یہ رائے ہو کہ

(1) کسی راستہ یا ندی نالہ جسے عوام بطور جائز استعمال میں لاتے ہیں یا لاسکتے ہیں یا کسی مقام عام سے کوئی ناجائز رکاوٹ یا امر تکلیف دہ دور ہونا چاہیے۔

(2) کسی تجارت یا پیشہ یا مال تجارتی کو جو عام لوگوں کی تندرستی یا آسائش جسمانی کے لیے مضر ہو موقوف کیا جانا یا کسی دوسری جگہ اٹھوایا جانا ممنوع قرار دیا جانا مناسب ہے۔

(3) کوئی عمارت یا کسی شے کا اس طریقے سے استعمال کرنے سے روکنا چاہیے تاکہ آگ نہ لگنے پائے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(4) کوئی عمارت ایسی حالت میں ہے کہ غالباً گر پڑے گی اور اس کے گرنے سے ان اشخاص کو جو اس کے متصل رہتے ہوں یا کاروبار کرتے ہوں یا اس کے پاس سے گزرتے ہوں ضرر پہنچے گی اس لیے اس کا گروا دیا جانا یا اس کی مرمت کرنا یا اس کو سہارا دینا ضروری ہے۔

(5) کسی تالاب یا باولی یا گڑھے پر جو کسی عام راستہ یا عام مقام کے متصل ہو ایسی باڑ لگانا چاہیے کہ اس سے وہ خطرہ جو عوام کو ہو دور ہو جائے۔

تو حاکم فوجداری مذکور اس شخص کو جو ایسی رکاوٹ یا امر تکلیف دہ کا باعث ہو یہ حکم دے سکے گا کہ وہ میعاد معینہ میں اس رکاوٹ یا امر تکلیف دہ کو دور کرے یا تجارت پیشہ کو موقوف کرے یا اٹھا دے یا عمارت کی تعمیر روک دے یا بند کردے یا عمارت کو گرا دے یا اس کی مرمت کرے یا اس میں سہارا لگا دے یا اس شے کے رکھنے کے طریقے کو بدل دے یا تالاب یا باولی یا گڑھے کے اطراف باڑ لگا دے۔ حکم مذکور کی جہاں تک ممکن ہو اس شخص پر جس کے نام وہ صادر ہو اس طریقے سے تعمیل کی جائے گی جو طلب نامے کی تعمیل کے لیے مقرر ہے۔ اگر حکم مذکور کی اس طور سے تعمیل نہ ہو سکے تو اس کا اس طور سے اعلان کیا جائے گا جیسا کہ قانون کے تحت ضروری ہو۔ اس اعلان کے علاوہ اس حکم کی ایک نقل ایسے مقام یا مقامات پر چسپاں کی جائے گی جو اس شخص کی اطلاع کے لیے مناسب معلوم ہوتی ہو۔ اس شخص کو جس کے پاس ایسا حکم وصول ہو یا ضروری اور لازم ہوگا کہ:

(1) جس فعل کے کرنے کی ہدایت حکم میں ہو میعاد معینہ حکم کے اندر اس کی تعمیل کرے۔

(2) خود یا بذریعہ وکیل حاضر ہو کر اس حکم کے خلاف وجہ ظاہر کرے۔

(3) وہ حاکم فوجداری سے جس نے وہ حکم صادر کیا ہو اس امر کی تجویز کے لیے کہ آیا وہ حکم معقول و مناسب ہے پنچوں کے تقرر کی درخواست کرے۔ اگر کوئی شخص نہ تو حکم کی تعمیل کرے اور نہ پنچوں کے تقرر کی درخواست دے تو حکم قطعی کردیا جائے گا۔ اگر میعاد معینہ کے اندر امر مذکور کی تعمیل نہ کی جائے تو حاکم فوجداری کو اختیار ہوگا کہ وہ اس کی تعمیل کرائے جو خرچ حکم کی تعمیل میں ہو وہ جرمانے کے طور پر وصول کیا جائے گا۔

امر عارضی (Estoppel): اگر کوئی شخص اپنے اقرار یا فعل یا ترک فعل کے ذریعہ دوسرے شخص کو کسی بات پر بھروسہ کرنے کے لیے اور اس بھروسے کی بنا پر کوئی کام کرنے کے لیے اجازت دے تو بعد میں کسی عدالتی کارروائی میں اس شخص کے خلاف اپنے اس اقرار فعل یا ترک فعل سے انکار نہ کر سکے گا۔ اس کے متعلق بے شمار عدالتی نظائر ہیں کہ کون سا فعل کن حالات میں امر عارضی (Estoppel) کی تعریف میں آتا ہے اور اس سے فریق مقابل کو کس حد تک فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی جائداد غیر منقولہ کا کرایہ دار ہے تو وہ مالک جائداد کی ملکیت سے قانونی طور پر انکار نہیں کرسکتا۔

اگر یہ بات ثابت کرنا ہو کہ کوئی واقعہ اتفاقی تھا یا نتائج کے علم سے ارادی طور پر کیا گیا تھا ایسی صورت میں یہ بات کہ اس قسم کے اور بھی واقعات اس شخص سے سرزد ہوئے ہیں۔ واقعہ متعلقہ قرار پائیں گے۔ مثلاً اگر ایک شخص نے اپنے گھر کو آگ لگا دی تاکہ اسے بیمہ کی رقم مل جائے ایسی صورت میں یہ بات کہ اس واقعہ سے پہلے بھی اس کے دوسرے گھر میں جس میں وہ رہتا تھا آگ لگی تھی۔ واقعہ متعلقہ ہو جاتا ہے کسی مملکت (State) میں پرامن سوسائٹی کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپس میں مقدمہ بازی کم ہو جہاں اس غرض کے لیے مختلف قوانین نافذ کیے گئے ہیں۔ مثلاً قانون میعاد سماعت وغیرہ وہاں ایک قانون اصول یہ بھی ہے کہ فریقین کے درمیان اگر اس امر تنقیح طلب کے متعلق عدالت نے تمام عدالتی کارروائی کی تکمیل کے بعد فیصلہ صادر کیا ہے تو پھر اس امر تنقیح طلب کے متعلق دوسری کسی عدالت میں دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اسے قانون کی اصطلاح میں امر فیصل شدہ (Res Judicate) کہا جاتا ہے اور سابقہ دعویٰ کے فیصلے کو ثبوت کے طور پر پیش کر کے ایسے دعویٰ کو خارج کرنے کی استدعا فریق مقابل کی جانب سے کی جاسکتی ہے۔

امر فیصلہ شدہ (Res Judicata): جب کوئی مقدمہ یا تنقیح صراحتاً اور دراصل تنقیح طلب ہو کر مسموع اور قطعاً طے ہو جائے تو بار ثانی اس تنقیح یا مقدمہ کی تجویز ثانی کوئی عدالت نہ کرے گی بشرطیکہ

(الف) وہ امر سابقہ مقدمہ میں اور دراصل تنقیح طلب پا کر فیصل ہو چکا ہو اور

(ب) عدالت مجاز نے فیصلہ کیا ہو اور

(ج) فریقین مقدمہ حال وہی ہوں یا ایسے ہوں جو مقدمہ سابق کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فریقین کے ذریعہ سے دعویدار ہیں۔

(د) سابق و حال کے مقدمے میں اس استحقاق پر دعویٰ ہو۔

توضیح (1) الفاظ سابقہ مقدمہ سے ایسا مقدمہ مراد ہے جو اس دوسرے زیر بحث مقدمے کے قبل فیصل ہو چکا ہو خواہ اس کے قبل رجوع ہوا ہو یا بعد۔

توضیح (2) دفعہ ہذا کی اغراض کے لیے اس کا فیصلہ کہ آیا کوئی عدالت کسی مقدمہ کی تجویز کی مجاز ہے۔ بلا لحاظ اس کے کیا جائے گا کہ فیصلہ عدالت مذکور کے مرافعہ کے متعلق کیا احکام ہیں۔

توضیح (3) ضروری ہے کہ متذکرہ صدر امر سابقہ مقدمہ میں ایک فریق کی جانب سے بیان کیا گیا ہو اور دوسرے فریق نے صریحاً یا معناً اس سے انکار یا اقبال کیا ہو۔

توضیح (4) ہر امر جو سابقہ مقدمہ یا جوابدہی کی بناء پر قرار دیا جاسکتا تھا اور دیا جانا چاہیے تھا سمجھا جائے گا کہ اس مقدمہ میں صراحتاً اور دراصل تنقیح طلب تھا۔

توضیح (5) جو دادرسی دعوے میں چاہی گئی ہو اور ڈگری میں صریحاً منظور نہ کی گئی ہو وہ مقدمہ ہذا کے اغراض کے لیے نامنظور ہونا سمجھی جائے گی۔

توضیح (6) جب چند اشخاص نیک نیتی سے کسی عام یا خاص حق کے متعلق دعویدار ہوں جس کا ان کے یا بہ شرکت دیگر اشخاص کے دعویٰ ہو تو تمام اشخاص جو اس حق میں غرض رکھتے ہوں ان اشخاص کے ذریعہ دعویدار سمجھے جائیں گے جنہوں نے ایسا دعویٰ پیش کیا ہو۔

یہ ضابطہ ایک معمولی مقدمہ سے متعلق ہے لیکن بعض مخصوص مقدمات ایسے ہوتے ہیں جن میں مزید تفصیلات کا ذکر کیا جاتا ہے مثلاً خلاف سرکار دعوے میں نالش سے قبل نوٹس دینے کا لزوم ہے اس طرح مقدمات منجانب سرکار میں بھی چند ایسی تفصیلات ہوتی ہیں جو معمولی مقدمات میں نہیں ہوتیں۔ اسی طرح نالشات متعلق جائداد غیر منقولہ و دستاویزات قابل بیع و شراء و مقدمات فسخ شراکت و مقدمات منجانب نابالغان و اشخاص فاترالعقل و اشخاص نادار میں چند دیگر امور سے متعلق احکام ہوتے ہیں مثلاً اگر مدعی نابالغ ہو تو وہ ایک ولی مقدمہ کے ذریعہ سے ہی دعویٰ کرسکتا ہے۔ فاترالعقل اشخاص کے لیے بھی یہی لزوم ہے۔ ناداری میں مقدمہ چلایا جاسکتا ہے بشرطیکہ مدعی اپنی ناداری کو ثابت کرے۔ مقدمات میں المتنازعین کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی ہے۔ اسی طرح قانون دیوالیہ و قانون امانت و قانون دادرسی خاص وغیرہ کے تحت جو مقدمات دائر کیے جاتے ہیں ان میں مزید تفصیلات کی ضرورت ہوتی ہے۔

امور: (وہ امور جو ازالہ حیثیت عرفی کے دعوے میں مدعی کو ثابت کرنا لازمی ہیں)

(1) تحریر یا الفاظ وغیرہ جن کی شکایت کی گئی ہے توہین آمیز ہیں۔

(2) وہ مدعی کی طرف منسوب ہیں یا منسوب کیے جاسکتے ہیں۔

(3) ان کو مدعاعلیہ نے شائع کیا تھا۔

(4) ازالہ حیثیت عرفی تقریری کی صورت میں مدعی کو خاص نقصان پہنچا ہے۔

(5) تحریر یا الفاظ وغیرہ جن کی شکایت کی گئی ہے وہ بالکل غلط ہیں۔

ازالہ حیثیت عرفی کے ہر دعوے میں شائع شدہ بیان کی بابت یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ مدعی کے متعلق جھوٹ اور غلط ہے پس شائع شدہ بیان کی صحت کی بابت مدعاعلیہ پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے اگر مدعاعلیہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوجائے کہ شائع شدہ بیان بالکل درست اور صحیح ہے یا الفاظ مفاد عامہ میں نیک نیتی کے ساتھ کہے گئے ہوں تو مدعی کا دعویٰ خارج کر دیا جائے گا۔ بیانات جو خاص حالات میں دیے گئے ہوں وہ ذمہ داری سے قطعاً محفوظ ہوں گے۔ مثلاً

(1) پارلیمنٹ یا اسمبلی کی کارروائی کے اثناء میں۔

(2) عدالتی کارروائی کے دوران۔

(3) سرکاری دفاتر کی کارروائی کے سلسلہ میں۔

متذکرہ بالا مواقع ایسے ہیں جب کہ بیان کرنے والے کو قطعی حفاظت حاصل ہے اس کے علاوہ چند ایسے مواقع ہیں جن میں مدعاعلیہ کو صرف مشروط حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ بشرطیکہ بیانات صریح کینہ سے نہ کیے گئے ہوں اگر کینہ ثابت ہو تو مشروط حفاظت کا حق زائل ہوجاتا ہے مشروط حفاظت کے مواقع حسب ذیل ہیں۔

(1) جبکہ کوئی شخص اپنے علم یا خاص فرض کی انجام دہی میں کرے خواہ ایسا فرض قانونی ہو یا اخلاقی۔

(2) جبکہ بیان اپنے کسی جائز حق کی حفاظت کے سلسلے میں کیا جائے۔ اگرچہ کہ بیان سے کسی دیگر شخص کی توہین کیوں نہ ہوتی ہو۔ بشرطیکہ بیان صریح کینہ پر مشتمل نہ ہو۔

(3) کسی جلسہ عام یا پارلیمنٹ و اسمبلی کارروائی یا کسی عدالتی کارروائی کی صحیح و درست رپورٹ ہو۔

امین یا ان کے قائم مقاموں کے مقابلے میں مقدمات :

اگر کوئی مقدمہ ایسے شخص کے مقابلہ میں ہو جس کو کوئی جائداد کسی خاص اغراض کے لیے بطور امانت حاصل ہو یا اس کے قائم مقامان قانون کے جو ایسے نہ ہوں جس نے قیمتاً لیا ہو۔ اس غرض سے رجوع کیا جائے کہ اس کے یا ان کے قبضہ میں جائداد مذکور کو یا اس کی آمدنی پر حق قائم رہے یا اس غرض سے کہ جائداد یا آمدنی کے حسابات کیے جائیں تو وہ کسی مدت کے گزر جانے پر ممنوع سماعت نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی جائداد کسی خاص غرض یا مقصد کے لیے صریحاً امانت رکھی گئی ہو اور اس امانت کی بناء پر جائداد امین کو پہنچ گئی ہو تو وہ شخص اس جائداد کو استعمال کرنے کا حق دار ہوگا جو کسی وقت اس کے مقابلہ میں جائداد اور امانتی دلا پانے کی بابت نالش دائر کرنے کا مجاز ہوگا۔

انبیاء : نبی کی جمع ہے اس کے لفظی معنی خبر دینے والے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں خدا کے وہ برگزیدہ بندے انبیا کہلاتے ہیں جو اس کا پیغام انسانوں کو پہنچاتے ہیں اور اس کی مرضی اور احکام سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں اور ان چیزوں سے روکتے ہیں جو خدا کی مرضی اور منشا کے خلاف ہوتی ہیں۔ اللہ ان کو اپنے مکالمہ اور وحی سے مشرف کرتا اور ہدایت خلق کے منصب پر مامور کرتا ہے۔

انبیا علیہم السلام معصوم گناہوں سے پاک اور گمراہی و بے راہ روی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ فضائل و حسن اخلاق کا پیکر اور رذائل و ذمائم اخلاق سے بالکل کنارہ کش ہوتے ہیں۔ نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت ان کی فطرت ہوتی ہے۔ اس لیے عام انسانوں سے ان کا درجہ اس طرح بہت بلند ہوتا ہے جس طرح حیوانوں سے انسانوں کا بلند ہوتا ہے کیونکہ ان میں وحی کو قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی۔ لیکن بایں ہمہ وہ عام انسانوں کی طرح بشر ہوتے ہیں۔ دوسرے مذاہب نے خدائی اور نبوت کو ملا دیا یا کم سے کم قریب تر کر دیا تھا۔ ان کے متبعین نبیوں کو مافوق البشر اور فلانسان کے درجہ سے بالاتر سمجھتے تھے۔ اس خیال کی بدولت رام کرشن زردشت اور حضرت عیسیٰ کو عین خدا یا کم از کم مظہر خدا سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے اس کی سختی سے تردید کی اور خدائی و نبوت کی سرحدیں بالکل جدا جدا کر کے بتایا کہ تمام رسول نوع انسانی ہی میں سے بھیجے گئے تھے۔

انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے معجزے بھی دیے ہیں۔ معجزہ وہ چیز ہے جو نبی کے ذریعہ عادی طریقوں کے برخلاف ظاہر ہوتا ہے اور عام انسان اس کو کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ یہ نبوت کی حقیقت میں تو نہیں لیکن اس کے لوازم میں ضرور داخل ہے۔ معجزات کو برحق ماننا اسلامی عقائد میں ہے۔

انبیا دین و شریعت کے نام پر جو کچھ کہتے اور بتاتے ہیں وہ سب منجانب اللہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے جی اور طبیعت سے کوئی بات نہیں کہتے۔ البتہ ان کی تعلیم و ہدایت اور اقوال و فرمودات کی دو نوعیتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ اللہ کے احکام وہ اللہ کے ہی متعین الفاظ میں بتاتے ہیں اس کو وحی متلو کہا جاتا ہے اور دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ نبی خدا کے منشا اور مرضی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کے حکم کو اپنے اجتہاد سے اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق ہر قوم، ہر ملک اور ہر خطہ میں اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو بعثت ہوئی ہے۔ اس طرح جو انبیا دنیا میں تشریف لائے ان کی تعداد بے شمار ہے۔ قرآن مجید میں جن نبیوں کا ذکر ہے ان سب پر تعین کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے لیکن جن نبیوں کا قرآن میں ذکر نہیں ہے ان پر اجمالی ایمان لانا کافی ہے۔ اس طرح کے نبیوں کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ واقعی خدا کے رسول تھے البتہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ جو انبیا بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں ہم ان سب کو مانتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فرق ہیں کرتے۔

یہ انبیا مختلف وقتوں میں لوگوں کی اصلاح کے لیے آتے رہے ہیں جب لوگ ایک نبی کی تعلیم فراموش کر کے کفر و شرک میں پڑ جاتے تھے تو خدا دوسرے نبی کو بھیجتا تھا سب سے آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب آپ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا کیونکہ آپ کی نبوت عالمگیر اور دائمی ہے۔ آپ کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کو خدا نے جو دین و شریعت عطا کی ہے وہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہر حیثیت سے بالکل مکمل اور جامع ہے۔ علاوہ ازیں آپ کو خدا نے جو کتاب دی تھی وہ بالکل محفوظ ہے اس میں باطل کی ذرا بھی آمیزش نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی نے اس میں کسی طرح کا رد و بدل کیا ہے۔ اس لیے کسی اور نبی کی آپ کے بعد ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب تمام لوگوں کے لیے آپ پر ایمان لانا ضروری ہے اس کے بغیر نہ کسی کو خدا کے دین سے واقفیت ہو سکتی ہے اور نہ اس کے سوانحات کا کوئی راستہ ہے پس جس طرح تمام انبیا پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح آپ کو خاتم النبیین سمجھنا اور ماننا بھی ضروری ہے اور جس طرح کسی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے اسی طرح ہی ختم نبوت کو تسلیم نہ کرنا بھی کفر ہے۔

انتشار (ثقافتی) (Cultural Diffusion): ثقافتی انتشار سے مراد کسی ثقافتی گروہ یا علاقہ سے ثقافت کا دوسرے گروہ یا علاقوں تک پہنچنا ہے۔ ثقافتی خاصوں (Traits) کا انتشار کبھی یک رخی نہیں ہوتا۔ بلکہ بالعموم جب دو یا زاید ثقافتیں ایک دوسرے سے ربط میں آتی ہیں تو دونوں کی ثقافت کے اجزاء انتقال پذیر ہوتے ہیں۔ یوں تو مشہور مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے پانچویں صدی قبل مسیح میں بھی ثقافتی انتشار کی مثالیں پیش کی ہیں۔ لیکن درحقیقت نئی جغرافیائی دریافتوں بالخصوص امریکا کی دریافت کے بعد ثقافتی انتشار پر بطور خاص بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ اور اس پر بے شمار تحقیقات کی گئیں۔ سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا نئی دنیا کی ثقافت اپنے جغرافیائی ماحول کی پیداوار ہے یا اس میں دنیا کے قدیم علاقوں بالخصوص ایشیا سے بے شمار ثقافتی عناصر درآمد کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں دو مکتب خیال پیدا ہوگئے۔ ایک وہ جو ارتقائی نظریہ کے قائل تھے اور جن کا خیال تھا کہ مختلف علاقوں میں آزادانہ طور سے بلا خارجی ربط کے بھی مماثل ثقافتی خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ دوسرے مکتب کا یہ خیال تھا کہ ارتقائی امکانات کے باوجود ہر ثقافت کی نشوونما میں انتشار کا بنیادی رول رہا ہے۔ اس مکتب خیال کا سب سے بڑا حامی اڈورڈ ٹائلر (Edward Tylor) تھا جس نے انیسویں صدی میں ثقافتی انتشار پر متعدد تحقیقی مقالہ تصنیف کیے۔

1890 تک یورپ اور امریکا میں یہ بات تسلیم کی جاچکی تھی کہ آزادانہ ارتقا کے نظریہ میں بے شمار منطقی جھول پائے جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ثقافتی انتشار ہر زمانہ میں کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے۔ چنانچہ امریکا میں فرانز بواس (Franz Boas) فرانس میں گبریل تارد (Gabriel Tarde) اور جرمنی میں فریڈرش ریٹزل (Friedrich Ratzel) اس کے زبردست حامی تھے۔ 1911 میں فرٹز گربنر (Fritz Graebner) نے سب سے پہلے نظریہ انتشار پر باقاعدہ رسالہ لکھا۔ لیکن درحقیقت امریکی انسانیات دانوں نے اس میدان میں سب سے زیادہ کام کیا۔

ثقافتی انتشار کا سب سے اہم سبب کسی ثقافت کے افراد یا گروہوں کا دوسری ثقافت میں منتقل ہونا ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کبھی بھی کسی ثقافت کے تمام اجزاء دوسری ثقافت میں بجنسہ تسلیم نہیں کرلیے جاتے۔ بلکہ عموماً درآمدی ثقافت ان میں سے کچھ خاصوں کو اپنے مزاج اور ضروریات کے اعتبار سے قبول کر لیتی ہے۔ اور اس میں بھی مقامی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ نوآبادیاتی دور میں اس کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں جبکہ یورپین اقوام نے نئی دنیا اور ایشیائی افریقی ممالک پر تسلط حاصل کیا۔ ان تمام مواقع پر نہ صرف یہ کہ نوآبادیاتی ثقافتوں نے مغربی ثقافتوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ بلکہ خود یورپ میں بھی ان علاقوں کی ثقافتوں سے بے شمار خاصے منتقل ہوئے۔ اسی لیے پہلے بھی کہا جاچکا ہے کہ بالعموم ثقافتی انتشار دو رخی ہوتا ہے۔ بعض اوقات حاکم یا مقتدر اقوام کی ثقافت کے بعض اجزاء کو محکوم ثقافتوں کے لوگ محض وقار کی خاطر اختیار کرلیتے ہیں۔ اگرچہ کہ یہ اجزاء ان کی ثقافت آب و ہوا اور ضروریات کے لیے بالکل موزوں نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر استوائی ثقافتوں کے عوام نے سامراجی تسلط کے زمانہ میں یورپی لباس کو اپنایا اور باوجود اس کے کہ یہ گرم لباس ان کے لیے موزوں نہ تھا۔ لیکن پھر بھی اس کو وقار کی علامت سمجھا جاتا رہا۔ بلکہ آج بھی اس کے آثار کافی حد تک ان علاقوں میں موجود ہیں۔

ثقافتی انتشار کے بارے میں یاد رکھنا چاہیے کہ جو ثقافت دوسری ثقافت سے کافی خصوصیات قبول کرچکی ہوتی ہے۔ اس کے لیے مزید خاصوں کے قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ یعنی جس قدر ثقافتی ربط اور بین عمل بڑھتا جاتا ہے اسی تناسب سے ثقافتی انتشار زیادہ آسان اور قابل قبول ہوتا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بعض ثقافتی خاصوں کی درآمد کے نتیجہ کے طور پر بے شمار دوسرے خاصے بھی لازمی طور سے یکے بعد دیگرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بارود کی ایجاد اور اس کے انتشار کے ساتھ ساتھ یورپ اور ایشیا کی مختلف ثقافتوں میں یکساں قسم کی فوجی تنظیم اور طرز جنگ کی خصوصیات پیدا ہونے لگیں۔ اس کی سب

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سے آسان مثال ٹکنالوجی کے موجودہ دور کا ثقافتی انتشار ہے۔ جہاں جہاں بھی ٹکنالوجی کی توسیع ہوتی جائے گی وہاں یکساں ثقافت کی دوسری خصوصیات بھی مقامی ضروریات اور تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی جائیں گی۔ بعض اہم ثقافتی خاصوں کے انتشار کے ساتھ ساتھ پورے سماج اور اس کے اداروں میں بھی کے بعد دیگرے تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے کہ یہ تبدیلیاں کبھی بھی صد فی صد متماثل نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر گوتھک آرٹ (Gothic Art) جرمنی، فرانس اور اٹلی میں بالکل ایک سا نہ تھا۔ اسی طرح انڈونیشیا کا ہندو اور بدھ آرٹ ہندوستان سے کافی مختلف ہے۔ اسی طرح یونانیوں نے سامی زبان کے حروف تہجی کو اختیار کیا۔ لیکن اس کی طرز تحریر اور استعمال میں مقامی تبدیلیاں ہوئیں۔ چنانچہ پورے یورپ میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا اثر ہے۔ لیکن ہر ملک کی زبان نے اپنا مقامی رنگ طرز تحریر اور معانی اختیار کرلیے ہیں۔ ثقافتی انتشار کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ عام طور سے مذہبی مبلغین، سیاحوں، ڈاکٹروں، تاجروں اور مہم پسندوں نے اس کے انتشار میں حصہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ مذہبی مبلغین نے مذہبی اقدار کے انتشار پر زیادہ توجہ مرکوز کی جب کہ تاجروں اور سیاحوں کے نقطہ نظر دوسرے تھے اور ان کی نگاہ ثقافت کے دوسرے اجزاء پر زیادہ تھی۔ گویا ثقافتی انتشار میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے ایجنٹ یا آلہ کار کس قسم کے افراد یا ذرائع ہیں۔ سماجیات اور انسانیات کی تحقیقات نے بیسویں صدی میں ثقافتی انتشار پر کافی توجہ دی ہے۔ چنانچہ لنٹن (Linton, 1936) کے مطابق یہ تسلیم کیا جاچکا ہے کہ انسانی ثقافت کے تیز تر ارتقا کا انحصار اس کے ثقافتی انتشار کی رفتار پر ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد وسائل حمل و نقل اور رسل و رسائل کی وجہ سے عالمی ثقافتیں ایک دوسرے سے اس قدر قریب آگئی ہیں کہ جدتوں اور ایجادات کا ایک ثقافت سے دوسری ثقافت تک انتشار حیرت انگیز رفتار سے بڑھتا جارہا ہے۔

ثقافتی انتشار کے ساتھ ملوث ایک اور نظریہ ہے "نفاست پزیری کا عمل" (Sanskritization)۔ یہ ایم ایس سری نواسن کا دیا ہوا نظریہ ہے جس کے مطابق ہر گروہ کسی اپنے سے بہتر اور بلند گروپ کو اپنے لیے مثالیہ گروہ سمجھ کر ہر معاملے میں اس کی نقل کرتا ہے۔ صحیح اور غلط اس کے معیار کے مطابق طے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فیشن میں فلم اسٹارز کی نقل کی جاتی ہے۔ یہ نقل شعوری اور غیر شعوری دونوں طور پر ہوتی ہے۔ عالمی شہرت کے حامل سری نواسن ہندستانی سماجیات داں ہیں۔ ان کا یہ نظریہ Cultural Diffusion کی ایک تھیوری بن گیا ہے۔

انتظام جائداد : عدالت کسی دیوالیے کے مقدمہ کے دوران سماعت اس شخص کی جائداد کے متعلق جسے دیوالیہ قرار دینے کے لیے مقدمہ دائر کیا گیا ہے ایک رسیور مقرر کرے گی اور جس تاریخ سے رسیور مقرر کیا جائے گا اس تاریخ سے وہ جائداد رسیور کے تصرف میں رہے گی۔ عدالت اس سلسلے میں یہ حکم دے سکے گی کہ:

(1) رسیور اس رقم کی بابت مناسب ضمانت داخل کرے جو اسے اس جائداد کے انصرام و انتظام کے سلسلے میں وصول ہو۔

(2) رسیور کو اس کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس جائیداد کی آمدنی سے مناسب معاوضہ دیا جائے۔

رسیور مامور کرنے کے بعد عدالت یہ حکم دے سکے گی کہ رسیور جائداد کو اس شخص کے قبضے سے حاصل کرے جس کے قبضے میں جائداد رسیور مامور کرنے سے قبل تھی لیکن کسی ایسے شخص کے قبضے سے وہ جائداد نہ لی جاسکے گی جسے بے دخل کرنے کا اس شخص کو حق نہیں تھا جسے دیوالیہ قرار دیا گیا ہو۔ اگر رسیور نے بروقت حسابات داخل نہیں کیے یا اگر اس کی غفلت یا لاپروائی کی وجہ سے جائداد کو نقصان پہنچا ہو تو عدالت یہ حکم دے سکے گی کہ اس نقصان کی بھرپائی رسیور کی جائداد کو فروخت کرکے کی جائے۔ حکومت کو اس کا اختیار ہوگا کہ کسی خاص رقبے کے لیے ایک سرکاری رسیور مقرر کرے۔ ایسی صورت میں اگر وہ رقبہ کسی عدالت کے حدود سماعت میں واقع ہو تو پھر عدالت کسی اور شخص کو رسیور مقرر نہ کرے گی بلکہ سرکاری رسیور بھی اس مختص مقدمے کی حد تک عدالت کا مقرر کردہ رسیور متصور ہوگا سرکاری رسیور کو وہ تنخواہ دی جائے گی جو حکومت مقرر کرے۔ اگر کسی مقدمے میں رسیور مقرر نہ کیا جائے تو عدالت کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جو ایک رسیور کو حاصل ہوتے ہیں۔

انتظامی شاخ (Executive Branch): سیاسی انتظامیہ (Political Executive) کے خاص فرائض پالیسی کی تشکیل، پالیسی پر عملدرآمد یعنی انتظامیہ کی نگرانی اور انتظامیہ کے کاموں میں تال میل پیدا کرنا ہے۔ سیاسی عاملہ کی جو ایک مقررہ میعاد کے لیے عوام کے ذریعے

منتخب کی جاتی ہے، ماتحتی میں ایک مستقل انتظامیہ کام کرتی ہے جس کی موزوں تنظیم، موثر کارکردگی اور ذمے داری کے احساس ہی پر حکومت کی تمام پالیسیوں کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ حکومت کی ساری انتظامی شاخ، اہرام مصر کے مانند نچلے حصے میں وسیع تر ہوتی ہے لیکن اوپر اس کا حجم سمٹتا جاتا ہے اور سب سے اوپر منتظم اعلیٰ کی ذات اس کی وحدت کی علامت ہوتی ہے۔ سرکاری محکموں کی تنظیم، شعبہ جاتی تقسیم (Departmenta-lisation) اور تخصص(Specilisation) کے اصول پر کی جاتی ہے۔ سرکاری محکموں کے طرز تنظیم کو بیوروکریسی (دفتر شاہی) بھی کہتے ہیں۔ بیورو کریسی کے چار لازمی عناصر ہیں۔

(1) کنٹرول اور نگرانی کی مرکزیت، یعنی مرتبہ بندی (Hierarchy) کا اصول جس کے تحت انتظامیہ مین اوپر سے نیچے کی جانب حاکیت کا ایک خط کھینچ دیا جاتا ہے۔ یہی نیچے سے اوپر ذمہ داری کا خط بھی ہوتا ہے۔ اور اس خط کے واسطہ سے ساری معلومات، تمام اعضا اور کارکنوں تک پہنچتی ہیں۔

(2) انتظامیہ کا ہرکارکن قوانین وضوابط کے مطابق کام کرنے کا پابند ہے اور اس کی آزادانہ کارکردگی کے لیے تحفظات فراہم کیے جاتے ہیں۔

(3) انتظامی شاخ تمام امور کے ریکارڈ اور کاغذات کو محفوظ رکھنے کی پابند ہے۔

(4) حکومت کے فیصلوں اور معاملات کے سلسلہ میں رازداری برتنے پر کاربند ہوتی ہے۔

سرکاری عملہ کو سول سروس یا عوامی ملازمین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ چند امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ (1) ان کی بھرتی لیاقت کی بنیاد پر کی جاتی اور ان کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے عملی تربیت دی جاتی ہے۔ (2) وہ سیاسی طور پر غیر جانب دار ہوتے ہیں۔ یعنی نہ وہ سیاست میں حصہ لے سکتے نہ ہی کسی سیاسی پارٹی کے رکن ہوسکتے اور نہ حکمراں پارٹی کے اغراض کے تابع ہوسکتے ہیں۔ (3) شہریوں سے روزمرہ کے روابط میں بھی وہ غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ یعنی سیاسی یا مذہبی یا طبقاتی بنیادوں پر تفریق نہیں کرسکتے۔ (4) ان کے عہدہ کی معیاد، حقوق وفرائض اور شرائط ملازمت معین ہوتی ہیں۔ ان کے خلاف تادیبی کارروائی یا ان کی برطرفی ضوابط کے مطابق ہی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

سول سرونٹ سے مراد وہ اشخاص ہیں جو حکومت کے شہری انتظام کے لیے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ مسلح افواج اور قانون ساز اور عدالتی اداروں کے ارکان سول سروس کے زمرہ میں نہیں آتے۔ برطانیہ میں سول سروس کا نظام 1870 میں قائم ہوا اور وہاں سے ریاست ہائے متحدہ امریکا اور ہندستان میں آیا۔ برطانوی سول سروس پانچ زمروں میں منقسم ہے: (1) منتظم طبقہ یعنی فیصلہ سازی کرنے والے حکام جن کی تعداد نسبتاً تھوڑی ہے۔ یہ اعلا ترین سطح پر منصوبہ بندی تنظیم، تال میل، میزانیہ سازی اور انتظامی کارروائی اور عملہ کی نگرانی کرتے ہیں۔ (2) تنفیذی طبقہ جو پالیسی سازوں کی ماتحتی میں حکومت کے روزمرہ کے کاموں کو انجام دیتا ہے۔ مثلاً محصول جمع کرنے والے، آڈٹ کرنے والے وغیرہ۔ (3)ماہروں کا طبقہ یعنی پیشہ ور ماہرین مثلاً ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں اور ماہرین اقتصادیات وغیرہ۔ (4) کلرکوں کا طبقہ، یعنی دفتروں میں ریکارڈ رکھنے اور افسروں کو ضوابط اور کاغذات فراہم کرکے فیصلہ سازی میں ان کی مدد کرنے والے افراد۔ اور (5) ذیلی مدد گاروں کا طبقہ مثلاً ٹائپسٹ، اسٹوگرافر وغیرہ۔ ہندستان میں سرکاری خدمات کی زمرہ بندی اس طرح کی گئی ہے۔ (1) کل ہند سرویز یعنی انڈین ایڈ منسٹریٹیو سروس (آئی اے ایس)، انڈین پولس سروس (آئی پی ایس)اور انڈین فارین سروس (آئی۔ ایف۔ ایس)۔ (2) مرکزی سرویز مثلاً انکم ٹیکس، آب کاری، کسٹم، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف، ریلوے، اکنامک وغیرہ) اور (3) ریاستی سرویز (مثلاً صوبائی انتظامی سروس اور دوسری تخصیص سرویز) ان سروسوں میں مختلف قسم کے کلاس اور گریڈ پائے جاتے ہیں۔ 1976 میں حکومت ہند نے اپنے عملہ کو باعتبار مشاہرہ چار گروہوں (A,B,C,D) میں تقسیم کیا۔ جمہوری ملکوں میں انتظامیہ کو ذمہ دار اور مسئول رکھنے کے حسب ذیل طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ (1) اندرونی کنٹرول: یعنی اعلا انتظامیہ خود عملہ کو تادیبی اقدامات اور ترقی اور مالی کنٹرول کے ذریعے ذمہ دار رکھتی ہے۔ (2) پارلیمانی کنٹرول: انتظامیہ کے تمام مسائل پر پارلیمان حکومت سے جواب طلب کرسکتی ہے۔ تمام سرکاری محکموں کے مطالبات زر پارلیمنٹ میں مباحثہ کے لیے پیش ہوتے ہیں اور ان کی کارکردگی زیر غور آتی ہے۔ اس طرح پارلیمان کی عوامی حسابات کمیٹی، تخمینہ جات کمیٹی اور عوامی زمرہ کے اداروں سے متعلق کمیٹی باریکی سے ان کی کارکردگی کی چھان بین کرتی اور پارلیمان کو اپنی رپورٹ پیش کرتی ہیں۔ اور (3) عدالتی کنٹرول: چونکہ جمہوری ملکوں میں انتظامیہ قوانین وضوابط کے مطابق کام کرنے کی پابند ہے لہٰذا ان کے غیر قانونی کاموں یا احکامات کو ہمیشہ عدالت میں چیلنج کیا

جاسکتا ہے۔

انتظامی عدالتوں کے قیام کے وجوہات :

(1) خاص علمی مہارت: یہ مہارت تمام قانون داں اشخاص کو حاصل نہیں ہوتی۔ ان معاملوں کے فیصلوں کے لیے مقننہ کی پالیسی یا حکمت عملی کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے و نیز نظم و نسق کا تجربہ بھی درکار ہوتا ہے اس ضرورت کو ایک انتظامی عدالت بھی پورا کرسکتی ہے۔

(2) کفایت رسوم عدالت: ان گنت مسائل جن کا تعلق عوام کی بھلائی سے ہوتا ہے ان کا فیصلہ کم سے کم خرچ میں ہونا چاہیے۔

(3) تعجیل (Precipitation) : کئی ان گنت مسائل کا جن کا تعلق عوام کی بھلائی سے ہے جلد سے جلد فیصلہ نہ ہو تو اس کا امکان ہے کہ انتظامی کام میں رکاوٹ پیدا ہوجائے گی اور ان اشخاص کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا لہٰذا ایک ایسے ادارہ کی ضرورت ہے جو کم سے کم وقت میں ان مسائل کا فیصلہ کرسکے اور یہ ادارہ ایک انتظامی عدالت میں ہوسکتا ہے۔

(4) لچک (Flexibility) : ملک کی معمولی عدالتیں نظائر کی پابند ہوتی ہیں۔ اگر کوئی نظیر طے شدہ ہو تو اسی کی پابندی کی جاتی ہے برخلاف اس کے انتظامی عدالتیں عموماً نظائر کی پابند نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے وہ قانون میں لچک پیدا کرکے نئے نئے اصول مرتب کرسکتی ہیں جس سے جدید سماجی قوانین کا منشا پورا ہوسکتا ہے۔

(5) سادگی (Simplicity) : یہ عدالتیں ملک کی معمولی عدالتوں کی بہ نسبت ضابطہ دیوانی و قانون شہادت کے اصول و قواعد کی جکڑ بندیوں سے بری ہوتی ہیں اگرچہ کہ ان عدالتوں کے طریق کار کے متعلق مختلف قسم کے قواعد مرتب کیے گئے ہیں لیکن ان کو اختیار ہے کہ انصاف کے تقاضہ کو ملحوظ رکھ کے کسی قانون یا قاعدہ پر عمل کریں۔

حکومت کی ذمہ داری (Responsibility of the Govt.):

قانون انتظامیہ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ شہریوں اور حکومت میں حقوق کے متعلق ہمیشہ اختلاف رہتا ہے ایک طرف عوام کی بھلائی کی خاطر حکومت مختلف طریقے اختیار کرتی ہے اور سماجی بھلائی کی خدمات انجام دیتی ہے تو دوسری طرف اس کے اختیارات کے استعمال کی وجہ سے شہریوں کے حقوق میں مداخلت ہوتی رہتی ہے۔ انگلستان، امریکا اور خود ہندوستان میں ہمیشہ یہ مسئلہ درپیش رہا ہے کہ آیا حکومت نقض معاہدہ یا کسی ٹارٹ کی وجہ سے شہریوں کو ہرجانہ ادا کرنے کی ذمہ دار ہے یا نہیں۔ انگلستان میں 1947 تک یہ قانون تھا کہ عہدیداران تاج شاہی نہ تو نقض معاہدہ اور نہ ٹارٹ (دیوانی ضرر) کی بابت ہرجہ ادا کرنے کے پابند ہیں لیکن 1947 کے قانون چارہ کار بخلاف تاج شاہی کے تحت اس قانون کو بدل دیا گیا ہے اور اب یہ ملازمین تاج شاہی ہرجانہ ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ امریکا میں "قانون مطالبات بخلاف حکومت وفاقی بر بناء ٹارٹ بابت 1946 کی رو سے وفاقی حکومت کے عہدیدار اگر نقض معاہدہ یا ٹارٹ یعنی فعل ناجائز کے مرتکب ہوں تو ہرجہ دلانے کی وفاقی حکومت پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہندوستان میں اس قسم کا کوئی کوئی قانون نہیں ہے اور زیادہ تر حکومتی ذمہ داری کی بابت قانون نظائر پر مبنی ہے۔ اگرچہ کہ دستور ہند کی دفعہ 300 کے تحت شہریوں کو مرکزی حکومت یا ریاستی حکومتوں کے خلاف دعوئی کرنے کا حق دیا گیا ہے تاہم اگر کوئی ملازم سرکار کسی ٹارٹ کا دوران ملازمت مرتکب ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا فعل ناجائز جس کی بابت ہرجانہ کا دعوئی کیا گیا ہے کسی ایسے کام کے دوران وقوع میں آیا ہو جس کا تعلق حکومت کے سرکاری اختیارات کے تحت نہ ہو اور اگر حکومت کے سرکاری اختیارات کے استعمال کے دوران فعل ناجائز کا ارتکاب ہوا ہو و حکومت ہرجہ دلانے کی ذمہ دار نہیں ہوتی اور اگر فعل ناجائز ایسے اختیارات کے استعمال کے دوران وقوع میں آیا ہو جس کا تعلق سرکاری اختیارات سے نہ ہو بلکہ ایسے اختیارات سے ہو جس کا استعمال کوئی خانگی شخص بھی کرسکتا ہو تو ایسی صورت میں حکومت پر ہرجہ دلانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

لوک پال و لوک آیوکت (Ombudsman Lok Pal and Lok Aayukt): سوئڈن میں 1807 میں ایک عہدیدار جس کو اوم بڈس مین(Ombudsman) کہتے ہیں کا تقرر کیا جس کا یہ فرض تھا کہ وہ شہریوں کی ان تمام شکایتوں اور اعتراضات کی جو عہدیداران سرکاری کے خلاف ہوں جانچ پڑتال کرے اور ان کی شکایات و اعتراضات کو دور کرنے کے لیے اس عہدیدار کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ اگر وہ اپنی دریافت میں یہ محسوس کرے کہ عہدیدار متعلقہ راشی ہے یا خلاف قانون عمل کرتا ہے یا بدنیتی سے کسی شخص کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے جس سے شہریوں کے حقوق میں مداخلت ہورہی ہو تو اس عہدیدار کو سزا دی جائے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس عہدیدار کا تقرر شہریوں کے حقوق کی ضمانت تھی۔ ڈنمارک میں 1926 میں اس قسم کے ایک عہدیدار کا تقرر عمل میں آیا۔ 1962 میں انگلستان میں نیوزی لینڈ میں بھی ایسے عہدیدار کا تقرر عمل میں آیا۔ 1967 میں انگلستان نے بھی اس پر عمل کیا۔ ہندوستان میں اس قسم کے عہدیداروں کے تقرر کی اہمیت پر زور دیا جارہا ہے اور ان کا نام لوک پال اور لوک آیوکت رکھا گیا ہے۔ 1971 میں پارلیمنٹ میں ایک بل پیش ہوا جس کا نام لوک پال بل ہے۔

انٹر نیشنل- تیسری (Third International) : 1914 میں جب جنگ چھڑی اور پھر 1917 میں روس میں انقلاب کامیاب ہوا تو لینن کو یہ توقع تھی کہ یورپ کی دوسری پارٹیاں بھی یہی راہ اختیار کریں گی۔ لیکن جب انھوں نے جنگ اور اپنی حکومت کی تائید کا اعلان کیا تو لینن نے 1919 میں انقلابیوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم "تیسری انٹر نیشنل" قائم کی۔ اس کی شاخیں تیزی کے ساتھ سارے یورپ میں قائم ہونے لگیں۔ اور خود جرمنی کے صوبہ بویریا اور ہنگیری میں انقلابی طاقتوں کو عارضی کامیابی حاصل ہوئی لیکن انھیں کچل دیا گیا۔ جب تیسری انٹر نیشنل یا کومنٹن کی دوسری کانگریس جولائی 1920 میں ماسکو میں منعقد ہوئی تو اس وقت تک یہ تحریک کافی آگے بڑھ چکی تھی اس میں ایک درجن سے زیادہ منظم اور بڑی کیمونسٹ تحریکوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے اور آیندہ چل کر اس تحریک نے نہ صرف یورپ کی سوشلزم کی تحریک بلکہ چین ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی جدوجہد آزادی میں بھی کافی مدد کی۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد سے یورپ کی مزدور تحریک بری طرح بٹ گئیں۔ کئی ملکوں میں سوشلسٹ پارٹیاں حکومت میں آگئیں لیکن خود ان کے آپس میں کافی نظری اختلافات تھے۔ خود یورپ کے اندر معاشی بحران تیزی کے ساتھ ابھر رہا تھا اور اسی کے ساتھ فاشسٹ تحریکیں ابھر رہی تھیں۔ سوشلسٹ کیمونسٹوں سے ہاتھ ملاتے ڈرتے تھے اور اکیلے ان کے لیے فاشزم کی مزاحمت ممکن نہیں تھی اور اس کمزور اور متزلزل پالیسی کا یہ نتیجہ نکلا کہ پہلے اٹلی میں فاشزم نے کنٹرول حاصل کیا اور اس کے بعد جرمنی میں فاشزم نے اقتدار حاصل کرتے ہی نہ صرف کیمونسٹوں کو اپنے ظلم و تشدد کا مرکز بنایا بلکہ سوشلسٹوں کو بھی نہیں بخشا۔ اسے دیکھ کر سوشلسٹوں نے اپنی پالیسی بدلی اور فرانس میں سوشلسٹوں اور کیمونسٹوں کی مشترکہ حکومت بنی لیکن اب تک فاشزم کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ 1939 میں جب عالمگیر جنگ چھڑی اور 1940 میں فرانس کو شکست ہوئی تو سوشلسٹ پارٹی پر امتناع عاید کیا گیا۔

انٹر نیشنل - دوسری (Second International) : پہلی انٹر نیشنل جب قائم ہوئی تو اس نے یورپ کے مختلف ملکوں میں سوشلسٹ تحریکوں کی شروعات کی اور ان کی ترقی میں مدد دی لیکن آگے چل کر ان سب ملکوں میں یہ تحریکیں تیزی سے بڑھیں اور مختلف شکلیں اختیار کرنے لگیں۔ ویسے تو یہ سب ہی مارکسزم کا دم بھرتی تھیں لیکن عملاً انقلابی راستہ ترک کرکے اصلاح پسندی اور پارلیمانی سرگرمیوں کی طرف مائل ہونے لگیں تھیں اور سوائے روس کے یورپ کے تقریباً سب ہی ملکوں کی پارلیمنٹوں میں یہ نہایت اہم طاقت بن کر ابھریں۔

1889 میں جب سوشلسٹ تحریک کی دوسری بین الاقوامی تنظیم یا دوسری انٹر نیشنل کی بنیاد پڑی تو پوری سوشلسٹ تحریک کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ بجائے نظری طور پر ایک متحد انقلابی تنظیم کے اب وہ سوشلسٹ تحریکوں کی گویا ایک پارلیمنٹ تھی۔ اس کانگریس پر جرمنی سوشل ڈیماکریٹک پارٹی چھائی ہوئی تھی اور اس کے اثر سے کانگریس نے یہ طے کیا کہ کوئی سوشلسٹ پارٹی اپنے ملک کی بورژوا حکومت میں حصہ نہیں لے گی۔ فرانس کی پارٹی نے زاورے کی سرکردگی میں اس کی سخت مخالفت کی لیکن آخرکار 1914 میں عالم گیر جنگ چھڑی تو سب سوشل ڈیماکریٹک پارٹیوں نے دنیا کے مزدور ایک ہوجاؤ کا نعرہ ترک کر دیا اور ہر ایک جنگ اور اپنی اپنی حکومتوں کی حامی بن گئی۔

انجذاب (Assimilation) : انجذاب سے مراد ایسا طریق ہے جس کے ذریعہ ایک فریق دوسرے فریق یا ایک جماعت دوسری جماعت کے خیالوں، رجحانوں، جذبوں اور روایتوں کو اس طرح اپناتی ہے کہ وہ مشترک تمدنی زندگی کا جزو بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے قریب آنے سے پیشتر جو خیالوں، مسلکوں اور رجحانوں میں غیر یکسانیت پائی جاتی تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے جس کی بناء پر وہ ایک مشترک تمدنی زندگی کے حامل نظر آتے ہیں۔

سماجیات اور نفسیات کے ماہروں نے انجذاب کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا ہے۔ انھوں نے مہاجروں اور غیر ملکی لوگوں کو غالب تمدن

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(Dominant Culture) میں ضم ہوتے دیکھا ہے۔ وہ بھی اس طرح سے کہ چند برسوں کے بعد نئے تمدنی نمونے ان کی سماجی زندگی پر اس طرح حاوی ہوگئے کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے اصلی تمدنی نمونوں کو بھول بیٹھے۔

بچے بھی بڑی آسانی کے ساتھ غالب تمدن کے اثرات کو قبول کر لیتے ہیں چاہے پیدائشی طور پر ان کا تعلق اس تمدن سے ہویا نہ ہو۔ ہندستانی بچے جب غیر ملک میں رہنے بسنے لگتے ہیں یا غیر ملک کے بچے ہندستان میں رہنے لگتے ہیں تو وہ اپنے اطراف کے ماحول کو اتنی آسانی سے قبول کرلیتے ہیں کہ ان کے ابتدائی خاندانی اثرات کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کا لب و لہجہ انداز گفتگو، رہنے سہنے کا طریقہ میل ملاپ کے آداب اور پہناوا سب ہی ماحول کا زبردست اثر قبول کرلیتے ہیں۔ یہی حال ان شادی شدہ جوڑوں کا ہوتا ہے جن کا تعلق مختلف تمدنی زندگی سے ہونے کے باوجود وہ مفادوں، مقصدوں اور دلچسپیوں کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے تمدنی نمونوں کو بڑی آسانی سے قبول کرلیتے ہیں۔ انجذاب کی انتہائی شکل تبدیل مذہب میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔

انجذاب ایسا سماجی طریق ہے جو کسی خاص سماجی گروہ سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ہماری سماجی زندگی کا اہم جزو ہے۔ ساتھ ہی یہ سمجھنا غلط ہے کہ انجذاب ایک طرفہ طریق ہے جس کی وجہ سے فرد یا جماعت اپنے تمدنی نمونوں کو کلیتہً چھوڑ کر غالب تمدن میں جذب ہوجاتے ہیں بلکہ جب کبھی بھی افراد یا جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں اور ان میں باہمی میل ملاپ بڑھتا جاتا ہے تو ان کا ایک دوسرے کے تمدنی نمونوں سے نادانستہ اور دانستہ طور پر متاثر ہونا اور ان کا قبول کرنا ضروری ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدائی (Primary) نوعیت کے تعلقات میں انجذاب کا طریق زیادہ سرعت سے آگے بڑھتا ہے اور ثانوی (Secondary) نوعیت کے تعلق میں انجذاب کے عمل کی رفتار کس قدر کم ہو جاتی ہے۔

انجذاب کے طریق کو آگے بڑھانے میں چند عامل کارفرما ہوتے ہیں مثلاً زبان جو اظہار خیال کا زبردست آلہ ہے۔ اگر افراد اور جماعتیں ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوں تو تمدنی باریکیوں کو سمجھنے اور انھیں اختیار کرنے میں سہولت ہوتی ہے ورنہ زبان کی عدم واقفیت کی وجہ سے اس میں غیر معمولی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ سماج میں ہم آہنگی تجربوں کی یکسانیت پر مبنی ہوتی ہے جو انجذاب کے طریق کو فروغ دینے میں اہمیت رکھتی ہے۔

غرض انجذاب ایک ارتباطی (Associative) طریق ہے جس میں بین عمل کی نوعیت ایک دوسرے کے قریب آنے پر مائل کرتی ہے۔ افراد پسندیدہ اور ناپسندیدہ حالت کا اندازہ لگا کر ایسے عمل کی طرف مائل ہوتے ہیں جس سے دوستی کا رجحان بڑھتا ہے، ایک دوسرے کے قریب آنے کی امنگ بڑھتی ہے جس کی وجہ سے انجذاب کا طریق آسان ہوتا جاتا ہے۔

انجذاب کے لیے بین عمل کا دائرہ وسیع ہونا ضروری ہے۔ افراد اور جماعتوں کے تعلقات جتنے زیادہ وسیع ہوتے جائیں گے اتنی ہی آسانی کے ساتھ لوگ اونچ نیچ، برتری اور کمتری پر مبنی خیالات کو چھوڑ کر ایک دوسرے کی اچھائیوں کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوں گے۔ اس آزادانہ بین عمل (Free Interaction) کے لیے نہ صرف ایک دوسرے کا برسوں تک ساتھ رہنا ضروری ہے بلکہ خیالوں میں وسعت، ایک دوسرے کے تمدنی نمونوں کا احترام ضروری ہے ورنہ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جب کہ مختلف تمدنی نمونوں سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی، مالک اور نوکر، آجر اور مزدور کے درمیان تناؤ اور کھینچاؤ پیدا ہوتا رہا ہے اور زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے خیالوں کا احترام نہ کرسکے۔

انجذاب کے طریق کی وضاحت کے لیے عام طور پر امریکا کی مثال دی جاتی ہے۔ یہاں بسنے والوں میں کچھ ایسے تھے جنھیں آزادی سے محبت تھی، بعض ایسے تھے جنھیں پیسے کا لالچ کھینچ کر لایا تھا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو موقعوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ بہرحال ان کی زندگی کا مقصد اور مطمع نظر چاہے کچھ ہی ہو، ہر ایک کے پاس قدرت کا کچھ نہ کچھ عطیہ ضرور تھا اور یہ اپنی صلاحیتوں کو امریکا کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانا چاہتے تھے۔ ان میں آئرش بھی تھے، ڈچ بھی تھے، انگریز بھی تھے، فرانسیسی بھی، ہسپانوی بھی اور نیگرو بھی۔ یہ اپنے ساتھ اپنا مخصوص ادب اور فنون لطیفہ بھی لائے تھے اور فن تعمیر اور فن دستکاری بھی۔ ان کے ساتھ موسیقی بھی تھی اور آلات موسیقی بھی۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انھیں اپنے دست و بازو پر ناز تھا جس کی وجہ سے انھیں یقین کامل تھا کہ وہ کسی کے آگے دست نگر نہیں ہوں گے۔ غرض یہ مہاجرین ایک نئی دنیا میں مضبوط بنیادوں پر معاشی عمارت کھڑی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے زمین کو صاف کیا طرح طرح کے بیج بوئے۔ لکڑیاں کاٹیں، کارخانوں میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کام کیا، کانیں کھودیں، سڑکیں بنائیں اور جانوروں کی گلہ بانی کی۔ غرض انھوں نے یہ اور اسی نوعیت کے ان گنت کاموں میں اپنی محنت اور وقت صرف کیا۔ ان کے لوک گیت اور لوک کہاوتیں جن میں برس ہا برس کا تجربہ پنہاں تھا قدم قدم پر ان کی رہنمائی کرتی رہیں۔ ان سب کے باوجود مقصد کی یکسانیت انھیں ایک دوسرے کے اس طرح قریب لائی کہ وہ سب ایک مشترک تمدن میں گھل مل گئے۔

اس لحاظ سے جو عوامل انجذاب کے طریق میں معاون ثابت ہوتے ہیں ان میں رواداری، معاشی موقعوں کی یکسانیت، اجنبیوں اور ان کے تمدن سے ہمدردی، تمدنی نمونوں کی مشابہت شامل ہیں۔ رواداری کی وجہ سے ترسیل (Communication) کا عمل بہت زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔ لوگوں میں اندرونی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر زندگی گزارنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جس دور میں بھی لوگوں کو تبدیل مذہب یا کسی خاص سیاسی مسلک کو قبول کرنے کے لیے مجبور کیا گیا یا دباؤ ڈالا گیا تب لوگوں نے ترک وطن کو ترک مذہب اور ترک مسلک پر ترجیح دی اور ایسے ملکوں میں پناہ لینا پسند کیا جو ان کے ساتھ روادارانہ سلوک کرنے کی طرف مائل تھے۔ ہر وہ معاشی نظام جو روایتی بندھنوں کو توڑ کر افراد کو محض ان کی نجی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی بناء پر ترقی کے موقع فراہم کرتا ہے وہ انجذاب کے طریق کو تقویت پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برخلاف جب ذات پات، رنگ روپ، جائے پیدائش، خاندانی امارت کی بناء پر افراد اور گروہوں کی تفریق عمل میں آتی ہے تو وہاں انجذاب کے طریق میں بڑی زبردست رکاوٹ پیش آتی ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ انجذاب کے عمل کے ساتھ ہی ساتھ اکثر انجذاب کے بدلے مشترکہ تمدن (Composite Culture) پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کوئی بھی تمدن دوسرے میں جذب نہیں ہوتا بلکہ دونوں اپنے اپنے مقام پر باقی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں ساختی اور وضعی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہندستان میں رہنے والے ہندو اور مسلمان صدیوں تک ساتھ رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوئے البتہ دونوں کی تہذیب و تمدن پر ایک دوسرے کے گہرے اثرات پڑے۔ سماجیات کی اصطلاح میں اس عمل کو Aculturation کہا جاتا ہے۔ اس طرح اکلچریشن کے ساتھ ہی ساتھ مشترکہ تمدن بھی پنپتا ہے جو دونوں بنیادی تمدنوں کی خصوصیات کا حامل ہونے کے باوجود ایک مختلف نوعیت کا حامل ہوتا ہے جیسے کالی اور سفید چڑیوں کے میل سے پیدا ہونے والی چتکبری چڑیا۔ یہ عمل عموماً غیر محسوس طور پر دھیمی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔

انجمن (Association): سماج بے شمار انجمنوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انجمن سے مراد ایسا باقاعدہ (Formal) گروہ ہے جو واضح اور مخصوص مقاصد کے لیے تشکیل پاتا ہے۔ ہر انجمن کے معینہ قواعد ہوتے ہیں۔ اس کی باقاعدہ تنظیم ہوتی ہے۔ اور مسلمہ طریقہ کار ہوتا ہے۔ اس کی ایک باقاعدہ اور رسمی قیادت بھی ہوتی ہے۔ انجمن کے افراد کے مابین جو تعلقات پائے جاتے ہیں اس کی اساس مشترکہ مفادات پر قائم ہوتی ہے۔ چونکہ انجمن کے اغراض و مقاصد مشترک ہوتے ہیں اور اکثر اس میں افراد کا راست کردار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے عام طور سے انجمنوں میں شخصی اور راست کے بجائے غیر شخصی اور ثانوی تعلقات پائے جاتے ہیں۔ اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کی وجہ سے انجمنیں دوسرے منظم گروہوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ موجودہ سماج بے شمار انجمنوں کا جال ہوتا ہے۔ جس میں کاروباری انجمنیں، مزدور یونین، مدرسے، سیاسی جماعتیں، کھیل کے کلب وغیرہ شامل ہیں۔

انجمن کی ایک دوسری صفت یہ ہے کہ اس میں بین عمل کا ایک نسبتاً مستقل قسم کا طریقہ رائج ہوتا ہے۔ اور اس اعتبار سے تقریباً وہ تمام گروہ جو واضح اغراض و مقاصد رکھتے ہیں۔ انجمن کی تعریف میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کی اہم اقسام میں رضاکارانہ اور غیر رضاکارانہ انجمنیں شریک ہیں۔ اس کی دوسری اقسام میں اخلاقی اور پیشہ ورانہ انجمنیں بھی شامل ہیں۔ رضاکارانہ انجمنوں سے مراد ایسی انجمنیں ہیں جن کی رکنیت متعلقہ افراد کی مرضی کی پابند ہوتی ہیں مثال کے طور پر کسی پیشہ ورانہ یا ادبی انجمن کی رکنیت کسی فرد کے لیے لازمی نہیں ہے۔ چاہے تو وہ رکن بنے، چاہے تو اس سے مستعفی ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف غیر رضاکارانہ انجمنیں وہ ہیں جن کی رکنیت یا تو پیدائش کی بنیاد پر ہوتی ہے یا پھر جس کی رکنیت حاصل کرنے کے بعد کوئی فرد آسانی سے مستعفی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض حالات میں فوجی ملازمت سے علاحدگی کا سپاہیوں کو اختیار نہیں ہوتا۔

رضاکارانہ انجمنیں ادبی اور ثقافتی ہونے کے علاوہ فلاحی اور رفاہی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بھی ہوتی ہیں۔ ایک مہذب سماج میں ہر فرد کئی رسمی اور غیر رسمی انجمنوں کا رکن ہوتا ہے۔ ان کے حساب ہی سے اس کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہوتے ہیں۔ ایک سادہ سماج میں انجمنیں کم ہوتی ہیں جبکہ ایک پیچیدہ معاشرے میں کئی قسم کی انجمنیں قائم ہوتی رہتی ہیں سماج میں تبدیلیاں ہونے کے ساتھ انجمنوں کی اقسام بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً آج کل انٹرنیٹ کے ذریعہ دوستی کرکے لوگ مختلف ادارے اور انجمنیں بنا لیتے ہیں جبکہ اراکین کی کبھی ملاقات نہیں ہو پاتی۔

انجمن دراصل سماج کی ایک چھوٹی سی تصویر ہوتی ہے۔ سماج میں تبدیلی کے ساتھ ہی انجمنوں کی ساخت بھی بدلتی رہتی ہے۔

انجمن اقوام جنوب مشرقی ایشیا (Association of South East Asian Nations, ASEAN): یہ انجمن ایک علاقائی بین الحکومتی تنظیم ہے جسے انڈونیشیا، ملیشیا، فلپائن، سنگاپور اور تھائی لینڈ کے وزرائے خارجہ نے 8/اگست 1967 کو بنکاک اعلامیہ کے ذریعہ بنکاک میں قائم کیا۔ برونی نے 1984 میں، ویت نام نے 1995 میں ، لاؤس اور میانمار نے 1997 میں اس میں شمولیت اختیار کی۔ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی میدانوں میں ترقی کی تیز رفتاری، باہمی دلچسپی کے امور میں مدد، جنوب مشرقی ایشیائی علاقہ میں سیاسی واقتصادی استحکام کا تیقن اور ایسے ہی مقاصد کی حامل بین الاقوامی وعلاقائی تنظیموں کے تعاون کا حصول ہی اس انجمن کے مقاصد ہیں۔

یہ انجمن سابقہ "انجمن جنوب مشرقی ایشیا" کی جانشین ہے جو ملیشیا، فلپائن اور تھائی لینڈ پر مشتمل تھی جس کے تمام پروجیکٹوں کی تکمیل کی ذمہ داری موجودہ انجمن نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ سربراہان حکومت کا اجلاس اس انجمن کی خصوصیت ہے جو ہر تیسرے سال منعقد ہوتا ہے۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ وزرائے خارجہ کی سالانہ کانفرنس ہے۔ اس کی استقراری کمیٹی کہلاتی ہے اور جسے پالیسی سازی کا اختیار حاصل ہے۔ اقتصادی، سائنس، ٹیکنالوجی اور ثقافتی امور سے متعلق بہت سی کمیٹیاں بھی ہیں۔ مرکزی سکریٹریٹ کا سربراہ ایک سکریٹری جنرل ہے جس کا تقرر ہر تیسرے سال حروف تہجی کے مطابق ممبر ملکوں میں گشت کرتا ہے۔

انجمن کا صدر دفتر جکارتا (انڈونیشیا) میں واقع ہے۔

انجورو سسیو (Injorecessio): رومن لاء میں یہ بھی جائداد کی منتقلی کا ایک طریقہ تھا جو قانونی دعویٰ کے ذریعہ عمل میں لایا جاتا تھا۔ منتقل علیہ مجسٹریٹ کے سامنے یہ ادعا کرتا تھا کہ یہ چیز اس کی ہے اور منتقل کنندہ جو مدعاعلیہ ہوتا تھا اس امر کا اقبال کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔ ایسا دعویٰ پیش ہونے پر اور اقبالی جواب پیش ہونے پر مجسٹریٹ یہ فیصلہ کرتا تھا کہ وہ چیز منتقل علیہ کو دے دی جائے۔

انحرافی برتاؤ (Deviant Behaviour): انحرافی برتاؤ اور سماجی بدنظمی کے تصورات کی جو توضیحات کی گئی ہیں ان سے اس بات کا گمان پیدا ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تصور کے دو نام ہیں۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ دشواری یہ ہے کہ جب کسی سماج میں مسائل پیدا ہوتے ہیں تو ان کے تعلق سے جو موضوعی (Subjective) نقطہ نظر پیدا ہوتا ہے ان کو سائنٹفک قرار دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن چونکہ سماجیاتی مسائل سے گریز ممکن نہیں اس لیے تقریباً ہر سماج میں بسا اوقات ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کو کبھی سماجی انحراف اور کبھی سماجی بدنظمی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات اپنی جگہ اہم اور سماجیاتی نقطہ نظر سے قابل غور ہیں۔ لیکن یہ مکمل طور پر ہم معنی نہیں ہیں۔

انحرافی برتاؤ سے مراد وہ برتاؤ ہے جو مروجہ اصول اور طریقوں، توقعات اور سماجی نظام کے عام برتاؤ سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جرم کو انحرافی برتاؤ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سماج کے متعینہ اصول اور قواعد کی خلاف ورزی پر منحصر ہوتا ہے۔ زندگی میں نظم باقاعدگی اور اقدار کی پابندی ہر سماج میں کم و بیش واضح اور متعین ہوتی ہے۔ خواہ اس کا تعلق سماج کے رسمی اداروں اور گروہوں سے ہو یا غیر رسمی تعلقات سے۔ ہر سماجی تعلق اور رشتہ کی پشت پر کوئی نہ کوئی سماجی قدر کار فرما ہوتی ہے۔ خواہ اس کا تعلق دوستوں کے حلقہ سے ہو یا خاندان، کاروباری گروہ، فیکٹری یا قومی سماج سے۔ ان تعلقات کے سبب سے فرد کا جو رشتہ پیدا ہوتا ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک مطابقت (Confirmity) کا اور دوسرا انحراف (Deviance) کا کسی برتاؤ کو انحرافی قرار دینے کے لیے تین امور پر غور کرنا ضروری ہے۔

(1) محض کسی معاشرہ کے اکثریتی برتاؤ سے انحراف کو انحرافی برتاؤ نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ انحرافی برتاؤ سے مراد وہ برتاؤ ہے جو سماج میں کم پسندیدہ یا غیر متوقع سمجھا جاتا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(2) انحرافی برتاؤ کا ایک اہم سبب فرد کی نفسیاتی اور مرضیاتی کیفیت ہوتی ہے یعنی بعض افراد یا گروہ ذہنی اعتبار سے ایسے برتاؤ کے مرتکب ہوتے ہیں جو عام برتاؤ کے مختلف ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اس قسم کے برتاؤ کے مختلف نفسیاتی اور سماجی اسباب ہوسکتے ہیں۔ اس ضمن میں درکھائم نے اپنی مشہور تصنیف "خودکشی" میں کافی روشنی ڈالی ہے۔

(3) انحرافی برتاؤ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ایسا برتاؤ سماجی اقدار کے خلاف ہوتا ہے مثلاً دھوکہ دینا، جعل سازی کرنا، چوری کرنا، سماجی اقدار اور روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اس لیے جو فرد یا افراد ایسے عمل کے مرتکب ہوں انھیں انحرافی برتاؤ کا ذمہ دار کہا جائے گا۔

وسیع تر معنوں میں انحرافی برتاؤ کا ہر حال میں سماج کے لیے مضر ہونا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر جتنے بھی مذہبی پیشوا اور انقلابی رہنمائے پیدا ہوئے انھوں نے عام طور سے اپنے زمانہ کے سماجی رواج اور اقدار کی شدت سے مخالفت کی۔ اور اس اعتبار سے بلاشبہ ان کا برتاؤ انحرافی تھا۔ اگرچہ کہ بعد کے تجربات اور نتائج سے پتہ چلا کہ ایسے افراد کا طریق سماج کی ترقی اور مثبت تبدیلیوں کے لیے انتہائی مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے انحرافی برتاؤ کے نتائج مثبت بھی ہوسکتے ہیں اور منفی بھی لیکن اس کا اہم عنصر سماج کے مروجہ طریقوں سے انحراف ہے۔

انحرافی برتاؤ پر جن لوگوں نے اساسی تحقیقاتی کام کیے ہیں ان میں درکھائم (1897)، مرٹن (Merton, 1949-1957)، تھامس (Thomas) اور زنانیکی (Znaniecki, 1920)، کلیفرڈ شا (Clifford Shaw) اور ہنری میکے (Henry Mckay, 1942)، سنڈر لینڈ (1947)، ڈی. آر. کریسی (D.R.Cressey, 1964)، جی. ایچ. میڈ (G.H. Mead, 1934)، ٹی پارسنس(T.Parsons,1951) اور کوہن(Cohen,1955) قابل ذکر ہیں۔

انحرافی برتاؤ کے لاتعداد سماجیاتی اسباب ہوتے ہیں۔ اور سماج جس قدر زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ تبدیل ہوتا ہے۔ اسی تناسب سے انحرافی برتاؤ میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ انحرافی برتاؤ میں سے بعض سماجی ارتقاء اور پیش قدمی کا باعث بنتے ہیں اور بعض اس میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ سائنسی نقطہ نظر سے کسی برتاؤ کے انحرافی یا غیر انحرافی قرار دیے کا انحصار وقت اور حالات کے تقاضوں پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ہمہ وقت تحقیق اور تجزیہ کا متقاضی ہے۔ کیونکہ یہ اضافی نظریہ ہے اور اس کی تفہیم اور تشریح کے بغیر سماجی نظام اور سماجی توازن قائم نہیں رکھا جاسکتا۔

یہاں یہ نقطہ قابل غور ہے کہ انحرافی برتاؤ کے سلسلے میں قدامت پسند سماج کا رویہ سخت ہوتا ہے جبکہ ترقی پسند اور ترقی یافتہ معاشرہ اس کے تئیں نرم رویہ رکھتا ہے۔ اور اس میں اکثر انحرافی برتاؤ کو جلد ہی سماج کے خاص دھارے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ جبکہ قدامت پسند سماجی نظام میں انحرافی برتاؤ ایک طویل مدت تک غلط اور غیر معیاری ہی سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "ہم جنسیت" جس کو ہندستان اور دوسرے قدامت پسند ملکوں میں گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ امریکا میں پوری طرح قانونی اور سماجی سپورٹ حاصل کرچکی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج کتنا بھی قدامت پسند کیوں نہ ہو، انحرافی برتاؤ ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے۔ مطابقت (Confirmity) سے الگ ہٹ کر چلنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ فرق اتنا ہے کہ آزاد سماج میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے جبکہ قدامت پسند سماج انحرافی برتاؤ کے خلاف سخت قدم اٹھاتے ہیں لیکن کوئی سماج بھی انحرافی برتاؤ کو مکمل چھوٹ کبھی نہیں دیتا۔

انڈین نیشنل کانگریس (Indian National Congress)

انڈین نیشنل کانگریس (Indian National Congress) : انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ایک ریٹائرڈ آئی سی ایس آفیسر ایلن آکٹیوین ہیوم (1912-1829) اور ہندستانی رہنماؤں کی مشترکہ کوششوں سے عمل میں آیا۔ مسٹر ہیوم ہندستانیوں کو باغیانہ اقدامات سے دور رکھنے کے لیے ان کی توانائی کو آئینی سمت میں موڑ دینا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندستانی رہنماؤں سے مدد لی اور وائسرائے لارڈ ڈفرن (1888-1884) کو بھی اعتماد میں لیا جو کانگریس کو حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے والی انجمن کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کا پہلا اجلاس 28ر دسمبر 1885 کو بمبئی میں منعقد ہوا جس میں ہندستان کے مختلف حصوں سے 72 مندوب شریک ہوئے اور ڈبلیو. سی. بنرجی (1906-1844) نے اس کی صدارت کی۔ تمام محبان وطن کے درمیان دوستانہ جذبات کو فروغ، ان کے اندر قومی اتحاد کے جذبات کا استحکام، اہم معاشرتی مسائل پر تعلیم یافتہ ہندستانیوں کے درمیان غور و

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

خوش اور اگلے سال کے لیے عوامی مفاد سے متعلق پروگرام کا تعین اس کے مقاصد قرار پائے۔ کانگریس کا دوسرا اجلاس 1886 میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا۔ تیسرا اجلاس بدرالدین طیب جی کی صدارت میں 1887 میں مدراس میں انعقاد پذیر ہوا اور چوتھا اجلاس 1888 میں جارج یول کی صدارت میں الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس طرح کانگریس کے اجلاس ہر سال ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہوتے رہے اور ان میں مندوبین کی تعداد میں مستقل اضافہ ہوتا گیا۔

کانگریس کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(1)اس کا پہلا حصہ 1885 سے 1905 تک محیط رہا۔ اس دور کو اعتدال پسندوں کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ کانگریس پر ان رہنماؤں کا غلبہ رہا جو حکومت کے وفادار تھے، مغربی تعلیم سے آراستہ تھے، برطانوی جمہوری اداروں کو ہندستان میں قائم کرنا چاہتے تھے، انگریزوں کے منصفانہ جذبہ میں یقین رکھتے تھے اور ان کے وجود کو ہندستان کے لیے باعث رحمت تصور کرتے تھے۔

(2) لیکن اعتدال پسندوں کی پالیسیوں سے کانگریس کے رہنماؤں کا ایک طبقہ اختلاف رکھتا تھا۔ وہ اعتدال پسندوں کی اصلاحات اور مراعات کی پالیسی کو خیرات کی پالیسی سے تعبیر کرتا تھا اور ہندستان کو ہندستانیوں کی تقدیر سمجھتا تھا۔ وہ اس پر ہندستانیوں کا تصور کرتا تھا۔ یہ دور 1905 سے 1919 تک جاری رہا اور انتہا پسندوں کے دور سے موسوم ہوا۔ اس کے رہنماؤں میں لالہ لاجپت رائے، بال گنگادھر تلک اور بپن چندر پال بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ 1907 میں اعتدال پسندوں اور انتہاپسندروں کے مابین اختلافات کے سبب دو حصوں میں منقسم ہوگئی اور اعتدال پسندوں کو کانگریس کی رکنیت سے خارج کردیا۔ بعد ازاں 1916 میں جب مسلم لیگ اور کانگریس نے میثاق لکھنؤ پر دستخط کیے تو انتہاپسندوں کو دوبارہ کانگریس میں داخل کرلیا گیا۔ 1918 میں مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات پر اختلافات کے سبب اعتدال پسند کانگریس سے منحرف ہوگئے اور انھوں نے اپنے آپ کو لبرل پارٹی کے نام سے منظم کرلیا۔

(3)کانگریس کا تیسرا دور 1919 سے 1947 تک محیط رہا ہے۔ اسے مہاتما گاندھی کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں گاندھی جی نے افریقہ سے ہندستان واپس ہوکر 1917 میں چمپارن میں پہلا ستیہ گرہ کیا، احمد آباد کے مل مزدوروں کی تحریک چلائی، 1919 رولٹ بل کی مخالفت میں ستیہ گرہ کیا، 1920 میں خلافت عدم تعاون تحریک کی قیادت کی، 1930 میں ڈانڈی مارچ کرکے نمک کا قانون توڑا، 1932 میں تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا، 1940 میں جنگ کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ کیا اور 1942 میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں "ہندستان چھوڑو" تحریک کی قرارداد پیش کی۔ اس کے نتیجے میں کانگریس کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کرکے گاندھی جی کو آغا خاں پونا میں نظربند کردیا گیا اور دوسرے رہنماؤں کو احمد نگر کے تاریخی قلعہ میں قید کردیا گیا۔

23ر مارچ 1940 کو جب مسلم لیگ نے لاہور اجلاس میں دو قومی نظریہ کی بنیاد پر لاہور قرارداد کے تحت مسلمانوں کے لیے ہندستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو کانگریس نے شدت سے اس کی مخالفت کی لیکن برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کیا اور اس کی پالیسی سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ ہر قدم پر اس کی مدد بھی کی اور بالآخر ہندستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذریعہ تین جون پلان کے تحت 14ر اگست 1947 کو پاکستان کا قیام عمل میں آگیا اور 15 اگست کو ہندستان آزاد ہوگیا۔ حصولِ آزادی کے بعد کانگریس تیس برس تک مرکز اور کئی برسوں تک ریاستوں میں برسر اقتدار رہی۔ تاہم کانگریس کو 1977 میں مسز اندرا گاندھی کے الیکشن میں ناکامی کے بعد اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا اور جنتا پارٹی نے مرارجی دیسائی کے زیرِ قیادت اقتدار کی ذمہ داری سنبھالی تاہم 1980 میں مسز گاندھی دوبارہ برسر اقتدار آگئیں اور انھوں نے کانگریس کو کانگریس (آئی) کے نام سے موسوم کیا۔ مسز گاندھی اس کی صدر منتخب ہوئیں۔ اکتوبر 1984 میں ان کی شہادت کے بعد ان کے بیٹے راجیو گاندھی کانگریس کے صدر اور وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ 1989 میں کانگریس پھر اقتدار سے محروم ہوگئی تاہم 1991 میں پھر برسر اقتدار آگئی اور 1995 تک صدر کانگریس نرسمہاراؤ کی وزارت عظمٰی میں اقتدار پر قابض رہی۔ اس کے بعد سے 2001 تک یہ اقتدار سے محروم ہے اور اس کی باگ ڈور راجیو گاندھی کی بیوی اور مسز اندرا گاندھی کی بہو سونیا گاندھی کے ہاتھوں میں ہے۔

انسانی اقدار سماجیاتی تناظر میں (Sociology of Human Values)

انسانی اقدار سماجیاتی تناظر میں (Sociology of Human Values): سماجیات میں قدر (Value) کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب سائنسی علم کے برعکس وہ علم پیش کیا جاتا ہے جس میں اخلاقی معیار اور 'کیا ہونا چاہیے' پر گفتگو ہوتی ہے۔ یہ وہ علم کا خطہ ہے جو سائنسی علم کے زمرے میں نہیں آتا۔ کسی بھی سماج کے افراد اپنے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سامنے کچھ مقاصد رکھتے ہیں اور کچھ بنیادی عقائد کے تحت اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ مشہور امریکی ماہر سماجیات ٹالکوٹ پارسنس (Talcott Parsons) کا ماننا تھا کہ آپسی مشترک قدریں افراد کو ایک سماجی ڈھانچے میں پروتی ہیں جس سے سماجی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی تنقید میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ پارسنس نے مشترک اقدار کے رول کو سیاسی اور معاشی اقتدار کے مقابلے میں زیادہ بااثر بتایا۔ بعض ماہرسماجیات کا یہ بھی کہنا ہے کہ اقدار کے آپسی ٹکراؤ کے باوجود افراد سیکھے ہوئے عقائد میں یقین رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان عقائد کو دل سے اپناتے ہیں بلکہ بعض فکری رجحانات فقط رواج کا حصّہ ہوتے ہیں۔

سماجیات میں عام طور سے اقدار کو سماجی زندگی کا حصہ مانتے ہوئے اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے یعنی جس طرح چند حقائق کو اعداد وشمار میں بیان کیا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح انسانی اقدار کا بھی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سماجی زندگی میں قدر اگر سائنسی تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے تو اس قدر کا کیسے احاطہ کیا جائے گا جس کا اشارہ اخلاقی معیار کی طرف ہوتا ہے اور جو سماجی امکان کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ قدر کا یہی پہلو اس وقت مسئلہ بن جاتا ہے جب ماہر سماجیات ایک محقق کی حیثیت سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو تحقیقی مشاہدے کا حصہ بنالے۔ مشہور ماہر سماجیات میکس ویبر (Max Weber) کا ماننا تھا کہ سماجی محقق کو یہ چاہیے کہ تحقیق اور مثبت یا منفی قدروں کو الگ الگ رکھا جائے۔ سماجی تحقیق کے سلسلے میں اس نے اقدار سے غیر جانبداری (Value Neutrality) کا اصول مرتب کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سماجی علوم، سماجی حقیقت کو مشاہدے کی گرفت میں لاسکتے ہیں مگر انسانی مقاصد اور اقدار کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ اس نے مزید یہ کہا کہ نہ تو ماہر سماجیات کو اقدار کے سلسلے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنی پیشہ ورانہ (Professional) حیثیت کا استعمال کرتے ہوئے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو فروغ دینا چاہیے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اقدار کے سلسلے میں غیر جانبداری کو تقریباً چار معنوں میں دیکھا جاسکتا ہے اور ہر ایک تصور کے اپنے مسائل ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ بہت مشکل بات ہے کہ سماجی محقق کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی سے متعلق اقدار تحقیق کے موضوعات پر اثرانداز نہ ہوں۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر محقق کے اقدار تحقیق کے عمل پر اثرانداز ہوتے ہیں تو یقیناً تحقیق سچ کو ثابت کرنے کے اعلیٰ معیار سے دور ہوتی چلی جائے گی۔

اگر اقدار سے غیر جانبداری ناممکن ہے تو اس صورت میں ویبر (Weber) نے اقدار کے ایک اور پہلو کی جانب نشاندہی کی ہے۔ اس کے مطابق کوئی بھی سماجی محقق اقدار سے چھٹکارا نہیں پاسکتا۔ لیکن اس سے نجات کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ماہر سماجیات اس کا اہتمام کرے کہ اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کو سائنسی تقاضوں اور معیار کے ماتحت رکھے مگر اس کا برتنا بہت مشکل ہے۔ دوسرے ماہر سماجیات نے یہ بتایا کہ اگر امیر یا بااقتدار افراد یا جماعتیں اپنے مقاصد کے حصول میں سماجی ریسرچ پر سرمایہ لگاتی ہیں تو تنخواہ دار ماہر سماجیات اسی سماجی مسئلے کے گرد گھومتا رہ جائے گا جس کی پہلے سے نشاندہی کی جاچکی ہے۔

اقدار اور سائنسی تجزیہ کے تعلق سے بعض سماجی علوم کے ماہرین نے ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ ان میں سب سے مشہور گنار مرڈل (Gunnar Myrdal) کہے جاسکتے ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ سماجی حقیقت کو کسی بڑے عزم کے سامنے رکھے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ ان کے مطابق ایک غیر جانبدار سماجی علم ناممکن ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ علم سماجیات کے مافی الذہن انسانی اقدار سے آزاد نہیں ہوتے بلکہ ان میں کھلے طور پر سیاسی پسندیدگی اور ناپسندیدگی شامل ہوتی ہے۔ یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ سائنسی معیار کی خاطر سماجی محقق اپنی اقدار کو کھلے طور پر سامنے رکھ دے۔ یہ بہت مشکل سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ ماہر سماجیات کی کون سی اقدار اسے متاثر کیے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ضرور سمجھا جاسکتا ہے کہ ویسے ہوئے سماج میں لوگ کن اقدار کے تحت آرزوئیں رکھتے ہیں۔

مرڈل (Myrdal) نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ منفی اقدار کبھی کبھی محقق کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں خصوصاً اس وقت جب نسلی اعتبار سے ریسرچ کرنے والا اور جس پر ریسرچ کی جارہی ہے، ان کا تعلق الگ الگ دنیاؤں سے ہو۔ آخر ماہر سماجیات اس کلچر کا حصہ ہوتا ہے کہ جس میں وہ رہتا ہے اور اس کے لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعور کو نسلی امتیاز کے تعصّبانہ پہلوؤں سے آزاد کرپائے۔ سائنس کی تحقیق میں محقق کے ذاتی جھکاؤ کے مثبت اور منفی پہلو ہوسکتے ہیں مگر دونوں صورتوں میں تحقیق کے سائنسی معیار پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ امریکی نیگرو سماج کے سلسلے میں کی گئی تحقیقات کبھی کبھی ان ماہر سماجیات کی معرفت بھی کی گئی جو امریکی نیگرو افراد سے دوستی رکھتے تھے۔ اس قسم کی تحقیقات نے اکثر ایک صاف ستھری پالیسی کی فرمائش کی اور نیگرو کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پچھڑے پن کی حمایت کی۔ تعصب کے ماحول میں محقق کی دوستی اور دشمنی تحقیق کے اصول کے لیے مضر ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیگرو دوست ماہر سماجیات ان مشاہدوں کو گرفت میں نہ لاسکے گا جن میں نیگرو سماج کی تنقید شامل ہے۔ محقق کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار وہاں پر بھی ہوا جب سماج کو جنوبی امریکا میں سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ نیگرو سے ہمدردی رکھنے والے ماہر سماجیات اور ان سے بغض رکھنے والے محقق دو الگ الگ نتائج اخذ کرتے ہوئے دیکھے گئے۔ یہ یاد رکھیے کہ جنوبی امریکا میں کالے لوگوں کی بہتات تھی اور یہ علاقہ شمالی امریکا کے مقابلے میں زیادہ پچھڑا ہوا تھا۔ اس پچھڑے پن کے کیا عوامل تھے۔ اس سوال کا جواب یوں بھی دیا جاسکتا ہے کہ نیگرو آبادی کی بہتات نے جنوبی سماج کو پچھڑے پن کے حوالے کیا اور اس صورت حال سے بچنے کے لیے سفید امریکیوں کی عوام اپنی تعداد میں بہت کم تھی لیکن یہی جواب ایک دوسری شکل اختیار کرلیتا ہے جب یہ کہا جائے کہ سفید امریکیوں کی نسلی بالادستی کے تحت جنوب کی نیگرو آبادی بدحالی کا شکار رہی۔

سماجی تحقیق میں اقدار کا ایک اور پہلو قابل غور ہے اور وہ ہے محقق کا انقلابی یا دقیانوسی ہونا۔ اس نظریاتی جھکاؤ کے تحت دیکھنے میں آیا کہ سماج بنائے ہوئے نظام کے محافظین سماجی مسئلے کے لیے نیگرو عوام کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس کے برعکس انقلابی ماہر سماجیات نسلی کمتری کے اصول کو رد کرتے ہوئے مسئلے کے عوامل کو ان محرومیوں اور ناانصافیوں میں ڈھونڈتے ہیں جو نیگرو عوام کی زندگی کا حصہ ہیں۔

بالکل اسی طرح سے سماجی محقق کے فکری شعور پر اگر قنوطیت یا روشن خیالی حاوی ہے تو مشاہدہ اور تجزیہ پر اس کا اثر دو مختلف انداز میں ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر یہ سوچا جائے کہ سماجی ناانصافیوں اور نابرابری کا کوئی حل ممکن نہیں ہے یا روشن خیالی کے تحت ان مسائل کا حل ہے تو ان دونوں رجحانات کا اثر تحقیق پر لازمی طور پر پڑے گا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ انسانی اقدار خواہ منفی ہوں یا مثبت، اگر وہ سماجی محقق کے شعور پر حاوی ہیں تو ان کا تدارک صرف یہ کہہ کر نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنا مطلب صرف ٹھوس حقائق سے رکھیں گے اور اعداد وشمار کی زبان میں ہی بات کریں گے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سماجی حقیقتیں اور ان کے اعداد وشمار کسی بھی ایسے حصار میں نہیں ہوتے کہ جو انسانی اقدار کے اثر سے علاحدہ ہوں۔ ان اقدار سے اس طرح بھی فرار حاصل نہیں ہے کہ سماجی محقق یہ فیصلہ کرلے کہ وہ تحقیق سے حاصل کیے گئے علم کو عملی طور پر بروئے کار نہیں لائے گا۔ دیکھنے میں یہ آیا کہ علم کو عمل سے علاحدہ رکھنے کے پیچھے کچھ خاص قسم کی اقدار شامل رہتی ہیں۔ مگر یہاں ہم اس بات کی تلقین نہیں کررہے کہ سماجی علوم اور عملی پروگرام کا ہر حال میں اشتراک بامعنی ہے۔ کبھی کبھی عملی پروگرام چند اقدار سے متاثر ہوکر سماجی مشاہدے کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور سائنسی عمل کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ہندستان میں سماجیات کی تاریخ میں رادھا کمل مکھرجی کا نام یہاں اس لیے لیا جاسکتا ہے کیونکہ انھوں نے سماج کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی بنیادی اکائی انسانی قدریں ہیں۔ مکھرجی کے بقول اقدار وہ خواہشات اور منازل ہیں جنھیں اجتماعی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے اور جو سماجی تربیت اور سیکھنے کے عمل کے تحت انسان کی داخلیت کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔ اس کا مظہر وہ انسانی شعور ہے جس کے تحت انسان چیزوں کا انتخاب کرتا ہے۔ انھیں پسند یا رد کرتا ہے زندگی کے معیار کا تعین کرتا ہے اور اپنے خوابوں کی دنیا سجاتا ہے۔ ایک معنوں میں یہ شعور انسان کی فطری ضروریات اور سماجی نظام کے درمیان ایک تال میل پیدا کرتا ہے جس کے تحت انسانوں کی جماعت ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سماج میں انسانی قدروں کا اظہار معانیت اور اجازت، سزا اور انعام، کنٹرول اور آزادی کے طور پر بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے متعدد افراد کے فکری رجحانات الگ الگ سمتوں میں جائے بغیر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ عملی طور پر انسانی قدریں لاشعور کا حصہ بھی ہو جاتی ہیں اور شعور کی گرفت میں بھی آجاتی ہیں۔ لیکن انسانی قدریں ساکت و جامد نہیں ہوتیں بلکہ فرد کی معرفت ماحول کی تبدیلی سے مسلسل دوچار رہتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی قدریں نہ صرف تبدیل ہوتی ہیں بلکہ ان کا خاتمہ بھی ہوتا ہے اور نئی قدریں وجود میں آتی ہیں۔ ایک بات اور قابل توجہ ہے۔ انسانی قدروں میں درجہ بندی بھی ہوتی ہے۔ کچھ اقدار دوسری اقدار کے مقابلے میں زیادہ اہم قرار دے دی جاتی ہیں۔ اقدار کی اس درجہ بندی کا اظہار انسان کی شخصیت کی تشکیل میں بھی ہوتا ہے اور سماجی نظام کی ترتیب کا تعین بھی اس سے طے ہوتا ہے۔ یہی سماجی نظام جب انسانی قدروں کے حساب سے ٹوٹتا ہے تو شخصیت کا ردعمل احساس ملامت اور شرمندگی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ سماجی

طور پر اسی بات کا ردِ عمل نابرابری، استحصال اور سماجی بے راہ روی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی قدروں کے ساتھ ساتھ انسانی قدروں کی نفی ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور سماج کو للکارتی رہتی ہیں — اہم بات یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد انسانی اقدار کی پامالی پر مجبوری اور لاچاری کے ساتھ کڑھتے ہیں یا ایک منصوبے کے تحت اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا عزم لیتے ہوئے انسانی قدروں کی بحالی کے لیے سماجی تحریک کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔

انسانی حقوق : ہمہ وقت بدلتے ہوئے سماجی معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی وجہ سے کئی قسم کے ازم آئے اور چلے گئے۔ اس کے علاوہ بے شمار مذاہب آئے اور حیات انسانی کو خاصا متاثر کرتے رہے۔ لیکن فاشزم اور نازی ازم کے غلبے اور اس کے زوال کے بعد اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کچھ بنیادی اصول اور نظریہ وضع کیے جائیں تاکہ اقتدار کی باگ ڈور سنبھالنے والے اپنے رہنما ازم کی روشنی میں من پسند اختیارات نہ حاصل کرلیں اور عوام کے تمام جمہوری اور خصوصی اختیارات پامال نہ کردیں۔ ادارۂ اقوام متحدہ نے 1948 کو "بین الاقوامی اعلانیہ انسانی حقوق" (Universal Declaration of Human Rights) پیش کیا۔ جس پر تمام ممبر ممالک نے دستخط کیے۔

انسانی حقوق کے نظریہ کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو انسانی زندگی گزارنے کے لیے کچھ آزادی کچھ وقار اور کچھ حقوق چاہیے ہیں۔ جن کی عدم موجودگی کوئی بھی انسان انسان کی طرح نہیں جی سکتا۔ یہ حقوق ہر انسان کو صرف انسان ہوئے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا ادارہ مسلسل ان کو Update کرتا رہتا ہے۔ 1948 کے بعد 1966 میں انٹر نیشنل کنونشن آف سول پولیٹیکل سائنس کا اعلانیہ جاری کیا اس کے علاوہ اسی سال معاشی معاشرتی اور تمدنی حقوق کے سلسلے میں اعلانیہ پیش کیا گیا۔

اقوام متحدہ نے عوامی عالمی اطلاعاتی کمیشن برائے حقوق انسان قائم کیا۔ ہندستان نے شروع سے ہی حقوق انسان میں بے حد دلچسپی لی۔ یہ دلچسپی ملکی اور عالمی دونوں سطحوں پر تھی۔ بھارت اکثر وبیشتر ہونے والے کنونشنوں میں حصہ لیتا رہا اور مختلف فیصلوں پر دستخط کرتا رہا۔ نوے کی دہائی میں ہندستان نے اپنا انسانی حقوق کمیشن شروع کردیا جو شروع سے ہی بہت فعال رہا۔ ہندستان میں انسانی حقوق سیکشن 2 تحفظ حقوق انسان ایکٹ 1993 میں پیش کیا گیا جس پر صدر ہندستان نے 8/ جنوری 1994 کو دستخط کردے۔ ان حقوق کو زندگی آزادی مساوات انسانی وقار اور سماجی انصاف سے متعلق شعبوں میں شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ حقوق انسانی پر کافی تحقیق ہوتی رہی ہے اور اس کے کئی پہلو زیر بحث رہے ہیں۔ اس کے باوجود بنیادی حقوق کو تقریباً 30 آرٹی کل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ 30 آرٹی۔ کلس مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) تمام عالم انسان کو بنیادی طور پر یکساں حقوق حاصل ہونا چاہیے اور ان میں مساوات اور بھائی چارہ ہونا چاہیے۔

(2) اقوام متحدہ کے اعلانیہ میں درج ہر قسم کی آزادی، نسل، رنگ، جنس، مادری زبان، مذہب، سیاسی نظریات، جائے پیدائش، مالی حیثیت اور خاندان کو مدنظر رکھے بغیر یکساں طور پر ہر فرد کو حاصل ہونی چاہیے۔ کم حیثیت اور طاقت ور افراد اور ممالک کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جانا چاہیے۔

(3) ہر فرد کو زندگی آزادی اور ان دونوں کے تحفظ کا پورا حق ہونا چاہیے۔

(4) غلامی اور غلاموں کی تجارت کسی قیمت پر منظور نہیں کی جانی چاہیے۔

(5) کسی بھی انسان کو ایذا، ظلم اور غیر انسانی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

(6) ہر فرد کو ایک انسانی پہچان دی جائے گی جس کا مطلب ہے کہ اس کا نام اور انفرادی پہچان ہوگی۔

(7) قانون کے سامنے ہر فرد برابر ہوگا۔ کسی قسم کا ترجیحی سلوک حقوق انسان کی سخت خلاف ورزی ہوگا۔

(8) ہر فرد حقوق، انسان اور بنیادی حقوق دونوں کے استحصال کے خلاف ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں جاسکتا ہے۔

(9) بغیر کسی وجہ کے کسی کو نہ قید کیا جائے گا نہ نظر بند اور نہ جلا وطن ہی کیا جائے گا۔

(10) ہر قسم کی حراست میں بند ہر انسان کو صاف ستھری مساوات پر مبنی اور غیر جانبدار عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(11) (الف) ہر ملزم معصوم تصور کیا جائے گا جب تک کہ جرم ثابت نہ ہو۔
(ب) جرم ہونے کے بعد لاگو ہونے والے قانون کے تحت کوئی بھی فرد سزا نہیں پائے گا۔

(12) کسی کی ذاتی زندگی، خاندانی تعلقات، خط و کتابت اور دیگر پرائیویٹ معاملات میں کوئی قانون مداخلت نہیں کریگا۔

(13) اپنی ریاستی حدوں کہیں بھی رہنے یا سفر کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہوگا۔

(14) (الف) دوسرے ممالک میں پناہ اور تحفظ حاصل کرنے کا بھی ہر شخص کو حق ہوگا۔
(کچھ ممالک پناہ گیروں کو خاص طور پر آسرا دیتے ہیں انھوں نے ایک خاص کونشن پر دستخط کیے ہوئے ہیں)۔
(ب) اس حق کا اطلاق غیر سیاسی جرائم اور اقوام متحدہ کے اصول کے برعکس حرکت کرنے والا افراد پر نہیں ہوگا۔

(15) ہر فرد کو شہریت کا حق حاصل ہوگا۔ نہ کسی کی شہریت زبردستی غضب کی جائے گی اور نہ ہی نیشنلٹی (Nationality) تبدیل کرنے سے روکا جائے گا۔

(16) ہر عاقل اور بالغ مرد اور عورت کو شادی کا حق حاصل ہوگا۔ ہر شخص شادی کرکے خاندان کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ شادی کے بندھن میں بندھنے اور ٹوٹنے دونوں صورتوں میں عورتوں کے تحفظ کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ ہر خاندان کو سماج کی اکائی سمجھا جائے گا اور اسے قانون کی طرف سے پورا تحفظ حاصل ہوگا۔

(17) ہر فرد شرکت میں یا ذاتی طور پر جائیداد خرید سکتا ہے۔ کسی کو اس کی جائیداد سے جس کا وہ قانون طور پر مالک ہے بلا وجہ محروم نہیں کیا جائے گا۔

(18) ہر فرد کو اپنے اصول اور نظریہ اپنے ضمیر اور مذہب کی روشنی میں رکھنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اس کا اظہار کرنے کا بھی پورا موقع اسے میسر ہونا چاہیے۔

(19) ہر فرد کو آزادئ رائے اور اظہار خیال کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔

(20) ہر فرد کو پرامن طور پر ملنے انجمن بنانے اور مظاہرہ کرنے کا حق ہونا چاہیے لیکن کسی کو کسی انجمن کا ممبر بننے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(21) (الف) اپنے ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات اور سرکار کے انتخاب میں حصہ لینے کا ہر ایک کو اختیار ہے۔
(ب) اپنی حکومت کے تحت چلنے والی سہولتوں پر ہر ایک کا برابر حق ہے۔
(ج) جمہوری طرز کے صحیح اور صاف ستھرے انتخابات ہونا بھی ہر فرد کا حق ہے اور ان میں حصہ لینا بھی بنیادی انسانی حق ہے۔ چنندہ نمائندوں والی سرکار ہی اصلی سرکار سمجھی جانی چاہیے۔

(22) ہر فرد کو سماجی تحفظ (Social Security) کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

(23) ہر فرد کو کام کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ بے روزگاری سے تحفظ بھی اس میں شامل ہے۔ ہر فرد کو اپنے کام کرنے کے سلسلے میں ٹریڈ یونین کا ممبر ہونے ٹریڈ یونین قائم کرنے اور اس میں حصہ لینے کا پورا حق ہونا چاہیے۔

(24) ہر فرد کو کام کے ساتھ آرام اور تفریح کا بھی پورا حق حاصل ہونا چاہیے اس میں کام کے گھنٹوں اور چھٹیوں کا معاملہ بھی شامل ہے۔

(25) ہر فرد کو ایک خوشحال معیار زندگی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس میں روٹی کپڑا مکان دوا اور سماجی تحفظ شامل ہے۔ اس کے علاوہ زچگی اور حمل کے دوران خصوصی دیکھ بھال اور بچے کی صحیح پرورش کا پورا حق ہر عورت اور بچے کو حاصل ہونا چاہیے۔ چاہے بچہ شادی شدہ تعلقات سے پیدا ہوا ہو یا شادی کے بغیر۔

(26) ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ بنیادی تعلیم فراہم کرنا جمہوری حکومت کا فرض ہے۔ تعلیم قوام متحدہ کے نظریہ کے برعکس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود والدین کو حق حاصل ہے کہ اپنی پسند کی تعلیم اولاد کو دیں۔

(27) ہر فرد کو اپنی تمدنی زندگی گزارنے کا اور سائنسی ایجادات سے ہونے والے فوائد حاصل کرنے کا پورا حق ہونا چاہیے۔ اپنی ایجادات اور دریافتوں سے ہونے والے معاشی اور اخلاقی فوائد کے تحفظ کا اختیار بھی اس میں شامل ہے۔

(28) مقامی اور عالمی سطح پر دی جانے والی آزادی پر بھی حق ہونا چاہیے

تاکہ ان تمام حقوق پر عمل ممکن بنایا جاسکے۔

(29) تمام عالم انسانی کے لیے ہر فرد کے مختلف سطح پر فرائض بھی ہیں جو دوسروں کی حقوق انسانی کے تحفظ کی گارنٹی دیتے ہیں۔ اس طرح انسانی حقوق پر مبنی معاشرہ عالم وجود میں آتا ہے۔ جو کہ دراصل ہر فرد کو اس کی شخصیت کی ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ہر فرد فرائض اور حقوق کے ذریعہ فلاح انسانی کے ایک خاص معیار کو حاصل کرسکتا ہے۔

(30) ان حقوق انسان کی اس طرح تاویل نہ کی جائے کہ امن، آتشی، آزادی اور دوسروں کے حقوق کا استحصال ہونے لگے۔ دوسرے الفاظ میں اپنی کلچرل آزادی دوسروں کے لیے دہشت گردی نہ بن جائے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یو.این.او نے مختلف کمیشن اور سب کمیشن قائم کیے۔ حقوق نسواں، حقوق اطفال کے ساتھ اقلیتوں کے حقوق، ہم جنسوں کے حقوق، پناہ گیروں اور مہاجروں کے حقوق وغیرہ کے اصول مرتب کیے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں مذہب اور معاشرے کے حقوق وغیرہ کے اصول مرتب کیے۔ تیسری دنیا میں مذہب اور معاشرے کی سرحدیں اکثر حقوق انسانی کے آڑے آتی ہیں۔ ہندستان میں حقوق انسانی پر بہت کام ہوا ہے لیکن اس کے باوجود سماجی طور پر ابھی بہت کام باقی ہے۔ تیسری دنیا کے حوالے سے 'ترقی کرنے کا حق' اور 'ماحولیاتی آلودگی روکنے کا حق' بہت معنی خیز ہیں۔

یو.این.ڈی.پی. کی طرف سے شائع ہونے والی سالانہ رپورٹ یعنی انسانی ترقی کی رپورٹ 2000 میں کہا گیا ہے کہ ایچ.ڈی.آئی. یعنی پیمانہ ترقی انسان میں درحقیقت تین چیزیں شامل ہیں۔

(1) وقت پیدائش طویل زندگی کے امکانات : مثلاً محفوظ حمل، زچگی، معالجاتی سہولیات، دوا اور غذا کا حصول وغیرہ۔

(2) تعلیمی ترقی : یعنی بچوں کا رجسٹریشن پرائمری اور ثانوی اسکولوں میں، تعلیم بالغان وغیرہ کے علاوہ اسکولوں اور ٹیچروں کی موجودگی پڑھانے کے لیے دلچسپی اور ذمہ داری۔

(3) اس کے علاوہ کل گھریلو پیداوار (G.D.P.) اور قوت خرید (P.P.P.) کا ایک خاص معیار۔

اس طرح یہ سہ رخی پیمانہ ترقی انسان، حقوق انسان کی صورت حال کو بھی کسی معاشرہ میں عیاں کرسکتا ہے۔ کیونکہ انسانی حقوق کے تحفظ کے بغیر انسانی ترقی ممکن نہیں ہے۔

انسانی ماحولیات (Human Ecology): انگریزی زبان میں ماحولیات (Ecology) کی اصطلاح دراصل نباتیات اور حیوانیات سے لی گئی ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی میں ماہرین نباتیات اور حیوانیات نے نباتی اور حیوانی عضویات پر ماحول کے اثرات کا سائنٹفک مطالعہ کیا۔ چونکہ انیسوی صدی میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے حیات کی تمام انواع کو ایک ہی سلسلہ کی مختلف شاخیں قرار دیا تھا اس لیے سماجی علوم کے ماہرین نے بھی ان مختلف شاخوں میں اور ان کے ارتقاء کے طریقوں میں ربط دریافت کرنے پر زیادہ توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ نباتیات اور حیوانیات کی عام اصطلاحیں سماجی علوم میں بھی مستعمل ہونے لگیں۔ خصوصاً بیسویں صدی کے آغاز کے بعد سماجیات میں سماج کے اصلاحی نقطہ نظر کا رجحان آہستہ آہستہ ترک کیا جانے لگا۔ اور ماہرین سماجیات کی یہ کوشش رہی کہ اصلاحی اغراض و مقاصد سے بالاتر ہوکر سماجی میکانزم کے اصول دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس کے بعد سے نباتی اور حیوانی ماحولیات کی مثالوں کو سماجیات میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نقطہ نظر کے اختیار کرنے کے بعد سماجیاتی نظریات میں بڑی تیزی سے ترقی شروع ہوئی۔

نباتیاتی اور حیوانی ماہرین ماحولیات کے نظریات کی روشنی میں سماج کے ماحولی نظام (Eco System) کے تجزیہ پر زیادہ توجہ دی گئی جس میں انسانی آبادی اور خارجی ماحول کے آپسی روابط کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ انسانی ماحولیات میں دراصل انسان اور خارجی ماحول کے آپسی روابط اور ایک پر دوسرے کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ 1924 میں میکنزی نے سماج اور ماحول کے آپس کے روابط پر تحقیق کی۔ اس زمانہ میں امریکا کے بہت سے سماجیات داں اس موضوع پر تحقیقات میں مصروف رہے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ کی سب سے اہم تحقیق 1956 میں ڈنکن (Duncan) نے کی۔ ڈنکن نے انسانی ماحولیات کے چار اہم متغیرات (Variables) بتائے جن میں آبادی تنظیم ماحول اور ٹکنالوجی شامل ہیں۔ یہ چاروں عوامل انسانی ماحول میں مسلسل ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اور ان ہی کے بین عمل سے دراصل سماجی ماحول کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسٹیوارڈ نے جو ایک مشہور ماہر انسانیات ہے، اپنی تاریخ میں انسانی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ماحولیات کو انسانی تمدن اور خارجی ماحول کے بین عمل کے مطالعہ کا نام دیا ہے۔ موجودہ صدی میں بے شمار سماجیات دانوں اور انسانیات دانوں نے جغرافیائی تمدنی حیاتیاتی اور صنعتی ماحول کے آپسی عمل اور رد عمل پر انتہائی سیر حاصل اور سائنٹفک بحثیں کی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں کے ماحولیات کا مطالعہ موجودہ سماجیات کا ایک اہم موضوع ہے۔ اور اسی طرح دیہی ماحولیات کے جو اثرات وہاں کے سماج پر پڑتے ہیں ان کا سائنٹفک مطالعہ بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے۔

انسانی ماحولیات کی ایک شاخ تمدنی ماحولیات بھی ہے جس میں مخصوص ماحول میں تمدنی عوامل کے آپسی بین عمل اور رد عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انسانی ماحولیات کے مطالعہ میں موجودہ صدی کے آخری ربع میں بڑھتی ہوئی آبادی سے عالمی سطح پر جو دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہورہی ہے اس کے تجزیہ اور نتائج پر بھی بے شمار تحقیقات ہورہی ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سماجی ماحولیات کے چار عوامل میں کس عامل کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانی ماحولیات کو آج کل سماجیات کے اہم موضوعات میں شمار کیا جاتا ہے۔

ماحول میں تبدیلی کے ساتھ تہذیب و تمدن میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ سب سے عام مثال یہ ہے کہ جب تک کسی معاشرے میں انسان کھیتی باڑی کرتے ہیں اور قدیم طریقے استعمال کرتے ہوئے انسانی ہاتھوں کی محنت کو استعمال کرتے ہیں تب تک وہ مشترکہ خاندانوں میں رہتے ہیں۔ اور زیادہ اولاد پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن صنعتی دور کے آتے ہی مشترکہ خاندان ختم ہونے لگتے ہیں اور لوگ چھوٹی سے چھوٹی فیملی پسند کرنے لگتے ہیں کیونکہ انسانی ہاتھوں کے بدلے مشینوں کے ذریعہ کام ہونے لگتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانی روایتیں، رسم و رواج بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور انفرادیت پر مبنی تمدن پنپنے لگتا ہے۔

اس طرح تمدنی ماحول اور قدرتی ماحول کا گہرا رشتہ ثابت ہوتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia) : علوم انسانی کو کوزہ میں بند کرنے کا نام انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ لفظ یونانی زبان کے اینکائکلیوس پیڈیا (Enkyklios Paideia) سے نکلا ہے جس کا مفہوم ہے "عمومی تعلیم"۔ انسائیکلوپیڈیا کے معنی ہیں "دائرہ علوم" یوں تو جملہ علوم کی ابتدا ارسطو اور افلاطون سے ہوتی ہے لیکن کتاب کی شکل میں جس پہلی تصنیف کو انسائیکلوپیڈیا تسلیم کیا گیا ہے وہ پلی نی (Pliny) کی نیچرل ہسٹری ہے جس کے 131 اجزا آج بھی موجود ہیں۔ ہنرخ آلسٹیڈ (Henrich Alsted) نے پہلی بار لفظ انسائیکلوپیڈیا اپنی کتاب انسائیکلوپیڈیا کرسس فلاسوفی کی (Encyclopaedia Cursus Philosophici) میں استعمال کیا۔ اٹھارہویں صدی میں معروف فرانسیسی ادیب فلاسفر ڈینس ڈیڈرو (Diderot) نے جملہ علوم انسانی کا احاطہ کرنے کی غرض سے انسائیکلوپیڈی (Encyclopedie) مدون کی۔ لیکن جس کتاب کو لفظ انسائیکلوپیڈیا کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے وہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا ہے جو پہلی بار تین جلدوں میں 71-1768 میں ایڈنبرا میں شائع ہوئی تھی۔ یورپی ممالک میں جرمنی میں جے ایچ زیڈلر نے 64 جلدی انسائیکلوپیڈیا (1736-50) شائع کیا اور امریکا سے انسائیکلوپیڈیا امریکانا 1829 میں شائع ہوا۔

ہندستان میں جدید خطوط پر انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ البتہ سنسکرت زبان میں "واتسورتاکوش" جو پہلی بار 1959 میں مرتب ہوکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان میں شائع کی گئی ہے۔ غالبًا دسویں اور پندرہویں صدی کے درمیان مرتب کی گئی تھی۔ ہندستانی زبانوں میں پہلا انسائیکلوپیڈیا بنگالی زبان میں 1846 اور 1851 کے درمیان شائع ہوا۔ اسے کرشناموہن بنرجی نے مرتب کیا تھا۔ انگریزی زبان میں ہندستان کا پہلا انسائیکلوپیڈیا "سائیکلوپیڈیا آف انڈیا اینڈ آف ایسٹرن اینڈ ساؤدرن ایشیا" ہے جسے ایڈور بال فور نے 1857 میں مدراس سے شائع کیا۔ ناگری پرچارنی سبھا نے پہلی ہندی انسائیکلوپیڈیا "ہندی وشوکوش" 13 جلدوں میں (1960-70) شائع کیا۔ اردو میں پہلا مکمل انسائیکلوپیڈیا پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے 23 جلدوں میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے نام سے شائع کیا گیا جو 1991 میں مکمل ہوا۔ آج ملک کی بیشتر زبانوں میں انسائیکلوپیڈیا موجود ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا ایک ایسی حوالجاتی کتاب ہے جس کی جانب ہر حوالہ جاتی خدمت فراہم کرنے والے کا ہاتھ اس وقت سب سے پہلے جاتا ہے جب کوئی متلاشی مواد معلومات اس کے پاس اپنے کسی سوال کے جواب کے لیے آتا ہے۔ یہ ایک طرح کی لغت ہے لیکن لغت میں ہمیں صرف "کیا ہے" کا جواب ملتا ہے جبکہ انسائیکلوپیڈیا کیا، کب، کیسے، کہاں اور کیونکر جیسے جملہ سوالوں کا مختصر لیکن تشفی بخش اور قابل بھروسہ جواب

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فراہم کرتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا یہ خدمت کیسے انجام دیتی ہے اس کے لیے اس کی تدوین کے طریقہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہیوکنر (Hugh Kenner) کے مطابق انسائیکلوپیڈیا ان تمام علوم کو (جنھیں فکر انسانی وجود میں لا سکی ہے) جسے ہم جانتے ہیں ٹکڑے ٹکڑے کردیتی ہے اور پھر ان ٹکڑوں کو ترتیب دیتی ہے تاکہ ایک وقت میں ایک ٹکڑا دیکھا جاسکے۔ اس کا وجود ٹکڑوں کی تنظیم کا کمال ہے نہ کہ سمجھنے کا کمال اگر پورا انسائیکلوپیڈیا کوئی مفہوم رکھتا ہے تو اس کے مرتب کرنے والوں میں کوئی اس مفہوم سے واقف نہیں سمجھا جاسکتا۔"

انسائیکلوپیڈیا میں جملہ قابل ذکر واقعات، مقامات، اشخاص، تصورات، اقوام و قبائل، ممالک، سائنسی و تکنیکی ایجادات و تحقیقات و فنون، تہذیب و تمدن، سماجی، انسانی و سائنسی علوم پر مختصر لیکن مصدقہ اور جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے مضامین ہوتے ہیں جو موضوع پر تسلیم شدہ دانشوروں سے لکھوائے جاتے ہیں۔ ان کی ترتیب ناموں کے اعتبار سے حروف تہجی کے مطابق ہوتی ہے۔ بیشتر معیاری انسائیکلوپیڈیا کئی جلدوں میں ہوتے ہیں۔ آخری جلد میں اشاریہ ہوتا ہے۔

انصاف: آزادی، مساوات، اخوت یا تعاون کے اصولوں کے ساتھ جمہوریت کا ایک آخری اصول انصاف یا عدل (Justice) ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں۔ (1) محدود معنی میں انصاف سے مراد قانون کی صحیح طور سے اور غیر جانبدارانہ طور پر تشریح کرنا، قانونی حق اور ناحق کا فیصلہ کرنا اور قانون کی خلاف ورزی کو روکنا ہے۔ قانونی انصاف یہ ہے کہ افراد وافراد، افراد وحکومت اور حکومتوں کے آپس کے قانونی رشتوں میں راست بازی اور توازن کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور (2) وسیع تر معنی میں انصاف وہ اخلاقی آدرش ہے جو سارے قانون کا منبع ہے اور جس کی تکمیل کے لیے قانون وجود میں آیا ہے۔ اس معنی میں یہ حق یا راست کے مترادف ہے۔

لفظ 'جسٹس' لاطینی زبان کے الفاظ جسٹس (Justus) اور جسٹیشیا (Justitia) سے ماخوذ ہے جس کے معنی جوڑنے، مربوط کرنے یا رشتہ یا بندھن کے ہیں۔ اخلاقیات میں انصاف سے مراد مختلف اخلاقی اقدار میں ربط پیدا کرنا اور سیاسیات میں اس کے معنی مختلف سیاسی اقدار کو یکجا اور مربوط کرنا ہے۔ انصاف یا حق کے تصور کی ابتدا مختلف مصادر سے ہوئی ہے مثلاً مذہب، عقل سلیم، اقتصادیات اور اخلاقیات یا اخلاقی حس۔ انصاف کا موجودہ جمہوری تصور مغرب میں سیاسی فکر کے صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ یہ بذات خود مذہب واخلاقیات سے جداگانہ ہے۔ لیکن اس کی بنیاد اخلاقی اصولوں پر ہے۔ اور سارے اخلاقی اصولوں کی بنیاد فرد کی شخصیت کی قدر واہمیت پر ہے۔ سماجی انصاف کا مطلب یہ ہے کہ قومی سماج اپنے تمام ارکان کی شخصیتوں کی تمام صلاحیتوں کی ممکنہ حد تک ترقی کی کوشش اور ہمت افزائی کرے۔ سیاسی اور قانونی انصاف یہ ہے کہ مملکت جو قومی سماج کا قانونی روپ ہے اپنے قانون کے ذریعے وہ تمام حالات پیدا کرے اور ان تمام حقوق کی ضمانت دے جو اس کے شہری کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ترقی دینے کے لیے ضروری ہیں۔

چنانچہ انصاف وہ بالاتر رہ نما اصول ہے جو حقوق کی عام تقسیم کو اور اس کے مختلف اصولوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مملکت کی قانونی تنظیم کے اندر قانونی طریقوں سے انسانی روابط میں صحیح نظم وضبط لانے کا اصول ہے۔ ایک طرف یہ افراد کے درمیان اس طرح مطابقت پیدا کرتا ہے کہ ان سب کو مملکت کے نظام میں برابر کے حقوق حاصل ہوں تو دوسری طرف حقوق کی تقسیم کے ہر اصول (مثلاً آزادی، مساوات، تعاون) کو حقوق کی تقسیم کے عمل میں واجبی حصہ اور وزن دے کر ان مختلف اصولوں کے درمیان مطابقت پیدا کرتا ہے۔

انصاف اگرچہ ایک اصول ہے جو سارے قانون کا ماخذ، منبع اور ہدف ہے لیکن یہ محض ایک مجرد اصول ہی نہیں بلکہ ایک ایسا تخیل ہے جو ہر آن تمام ذہنوں میں موجود رہتا ہے۔ یہ جمہوریت کا ایک ورثہ ہے جس کی نشوونما اور ترقی صدیوں کی سیاسی وسماجی تفکر سے ہوئی۔ چونکہ اس کی بنیاد انسانی ضمیر اوراخلاقی حس پر ہے اس لیے یہ ایک زندہ وجاوید سماجی حقیقت ہے۔

لیکن انصاف کے اس قانونی تصور سے قطع نظر انصاف کے معنی کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جن نکات سے انصاف کی ماہیت کی تعریف کی جاسکتی ہے وہ نہ صرف مختلف ہیں بلکہ اندرونی تضاد رکھتے ہیں اور ان کی مختلف تعبیر کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر انصاف کی چار خاص تعبیریں یہ ہیں۔

(1) ہر شخص کو اس کے کام کا معاوضہ دیا جائے۔

(2) ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔

(3) ہر شخص کو اس کے اخلاقی حقوق کے مطابق دیا جائے۔

(4) ہر شخص کو قانون کے مطابق دیا جائے (قانونی انصاف)

چونکہ یہ مختلف نکات ایک دوسرے سے متصادم ہیں اس لیے منصفانہ سیاسی نظام کے کردار کے بارے میں مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔ انفرادیت پسندوں کے نزدیک وہ لوگ سب سے زیادہ سہولیات اور مراعات کے مستحق ہیں جو عوامی خدمت میں سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ اشتراکیوں کا کہنا ہے کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مفلسوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کی جائیں خواہ اس کی خاطر مال داروں کو ان کی دولت سے محروم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ لیکن قدامت پسند پھر یہ دلیلیں دیں گے کہ انصاف کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ افراد کے اخلاقی اصولوں کا احترام کیا جائے اور نجی ملکیت چونکہ افراد کا قانونی اور اخلاقی حق ہے لہٰذا ان کو اس سے محروم کرنا ناانصافی ہوگا۔ اس لیے سرمایہ داری، جمہوری اشتراکیت، مارکسی اشتراکیت اور فسطائیت کے نظریوں میں انصاف کی جداگانہ تعبیریں پائی جاتی ہیں اور خود جمہوریت پسندوں کے درمیان بجا طور پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

انضمام و تفریق اختیارات: انضمام اختیارات (Fusion of Power) کے معنی حکومت کے قانون سازی اور قانون کو نافذ کرنے کے اختیارات کا باہم مدغم ہونا ہے۔ جیسا کہ پارلیمانی نظام حکومت میں پایا جاتا ہے۔ تفریق اختیارات (Separation of powers) کے اصول کے تحت حکومت کی تینوں شاخوں یعنی مقننہ، عاملہ اور عدالتی اختیارات علاحدہ، علاحدہ شاخوں کو تفویض کیے جاتے ہیں۔

مغرب اور مشرق کی معاصر جمہوری حکومتیں ان دونوں اصولوں کے مطابق دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

(1) پارلیمانی حکومتیں جہاں تشریعی اور عاملانہ اختیارات دونوں کو ایک ہی شخص یا اشخاص استعمال کرتے ہیں اور جس میں پارلیمنٹ کی بالاتری مسلّم اصول ہے۔ عدالتی شاخ، الگ اور آزاد ہوتی ہے لیکن اسے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو رد کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ روایت برطانیہ، مغربی یورپ اور دولت مشترکہ کے بیشتر ملکوں میں پائی جاتی ہے اور (2) صدارتی حکومتیں جن کی بنیاد تشریعی، عاملہ اور عدالتی اختیارات کی تفریق پر ہے۔ یعنی ایک بالاتر دستور تینوں اختیارات کو الگ الگ اداروں کو تفویض کرتا ہے۔ یہ تینوں ادارے ہم مرتبہ ہیں۔ لیکن ہر ایک کو دوسرے پر روک لگانے کا کچھ اختیار دیا جاتا ہے تاکہ کوئی بھی شاخ مطلق العنان اور غیر ذمہ دار نہ ہوجائے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا میں تینوں شاخیں اور ان کے عملے علاحدہ علاحدہ ہیں۔ کانگریس کے ارکان بیک وقت کوئی دوسرا وفاقی عہدہ (عاملہ یا عدلیہ میں) نہیں سنبھال سکتے۔ اس طرح صدارتی کابینہ کا کوئی رکن کانگریس کا رکن نہیں ہوسکتا۔ مرکزی تصور یہ ہے کہ ایک ہی شخص یا ادارہ کو قانون بنانے، اسے نافذ کرنے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف فیصلہ صادر کرنے کا اختیار نہیں دیا جانا چاہیے۔ امریکا میں کہا جاتا ہے کہ ایک ہی شخص کو "مدعی، جج اور جیوری" نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر تفریق اختیارات کو اس کے منطقی نتیجہ تک لے جایا جائے تو تینوں شاخوں میں سے کوئی دوسری شاخ کے کاموں میں کبھی بھی حصہ نہیں لے سکے گی۔ اس لیے مطلق تفریق اختیارات عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی دستور میں تحدید وتوازن (Checks and Balances) کا نظام اس سے پیوست کیا گیا ہے جو اگرچہ منطقی طور پر اس اصول کے منافی ہے لیکن عملی طور پر اس کے لیے ناگزیر ہے۔ چنانچہ امریکا میں آج قانون سازی کے میدان میں کانگریس کے بجائے عاملہ کو قیادت حاصل ہے۔ صدر کو کانگریس کے بنائے ہوئے قانون کو رد کرنے (ویٹو کرنے) کا اختیار حاصل ہے۔ اس طرح کانگریس کے ایوان بالا (سینیٹ) کو تمام اہم انتظامی تقرریوں اور معاہدوں کی توثیق کا اختیار حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ عدلیہ کو نہ صرف قانون کی تشریح کرنے بلکہ قوانین کو غیر دستوری قرار دے کر کالعدم کرنے کا اختیار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شاخ دوسری شاخوں کے میدان میں مداخلت کرسکتی ہے۔ لیکن تحدید وتوازن کے اس نظام کے باوجود تفریق کا بنیادی تصور باقی ہے۔ اور ہر شاخ اپنے اختیارات کو دوسروں کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ تینوں شاخوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی ضمانت، سپریم کورٹ کے عدالتی یا دستوری تنقیح کے اختیار سے دی گئی ہے۔

تفریق اختیارات کے پس پشت یہ مقصد ہے کہ حکومتی اختیارات کو ایک یا چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہونے دیا جائے۔ تاریخی اعتبار سے یہ اصول مطلق العنان بادشاہوں کے اختیارات اور دعووں پر پابندی لگانے کی جدوجہد کے دوران وضع کیا گیا تھا۔ سترھویں صدی کے انگلستان

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں سرایڈورڈ کوک (Sir Edward Coke) نے دعویٰ کیا تھا کہ کامن لا (ججوں کا بنایا ہوا قانون) بادشاہ اور پارلیمنٹ دونوں سے بالاتر ہے۔ اٹھارہویں صدی کے فرانس میں، مان تس کیو (Montesquieu) نے انگلستان کے دستوری بادشاہت کے نظام میں شہریوں کی آزادیوں کی بہترین ضمانت کا مشاہدہ کیا جو اس کی نگاہ میں تفریق اختیارات کے اصول پر مبنی تھا۔ تفریق اختیارات کے موجودہ اصول کا خالق مان تس کیو ہے۔ اصلاً اس طرح کی تفریق انگلستان میں نہیں پائی جاتی تھی کیونکہ انتظامی اختیارات بادشاہ کو نہیں ملکہ کابینہ کو حاصل تھے، جو پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی تھی۔

مزید برآں برطانیہ کی عدلیہ پارلیمانی کنٹرول سے اس حد تک آزاد نہیں تھی جتنی کہ دستور کے ذریعے تشکیل کی گئی امریکی عدالتیں تھیں۔ مان تس کیو کا نظریہ امریکی انقلاب کے بانیوں میں بہت مقبول ہوا، جو برطانوی گورنروں کی مطلق العنانی اور چیرہ دستی کا تجربہ کر چکے تھے اور اس لیے کابینی نظام کے مخالف تھے۔ امریکی دستور میں تفریق کا اصول اصلاً اس خیال کے مطابق رکھا گیا کہ حکومت ایک ناگزیر برائی ہے اس لیے اس کے اختیارات کو الگ الگ اداروں میں منقسم کر کے اسے محدود اور کمزور رکھنا چاہیے۔ شہریوں کے حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کی ضمانت اسی تدبیر سے ہو سکتی ہے۔ بہرحال اٹھارہویں صدی کے حالات میں یہ اصول خواہ کتنا ہی صادق کیوں نہ رہا ہو، آج کے حقائق سے میل نہیں کھاتا۔ اس کی بیّن مثال یہ ہے کہ انتظامی ضروریات کے پیش نظر کانگریس اپنے قوانین کے ذریعے آزاد کمیشنوں اور بورڈوں کو قانون کا درجہ رکھنے والے ضوابط بنانے اور نافذ کرنے اور اس طرح نیم عدالتی فرائض انجام دینے کے اختیارات دیتی رہی ہے۔ سپریم کورٹ نے اسے تفریق اختیارات کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا ہے۔

انفارمیشن اینڈ لائبریری نٹ ورک سنٹر (انفلب نٹ) (Information and Library Network Centre)

(Information and Library Network Centre) : کمپیوٹر اور ذرائع ابلاغ میں پیش رفت کی بدولت ایک ملک گیر بلکہ عالمگیر نظام مواصلات کے امکان قوی ہوگئے اس پس منظر میں ملک کے دانشوروں کو معلومات کی فراہمی میں بہتری لانے اور غیر ضروری ایک سے زائد رسائل و کتابوں کو ملک میں آنے سے روکنے کے خاطر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے 1988 میں ملک کی یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور سائنسی تجربہ گاہوں کے کتب خانوں کو ایک نظام میں منسلک کرنے کا منصوبہ بنایا جسے انفارمیشن اینڈ لائبریری نٹ ورک یا "ان فلب نٹ" کا نام دیا گیا۔ لیکن اتنے بڑے نظام کے لیے جو رقم درکار تھی اس کی فراہمی کی مشکلات کے پیش نظر 1991 میں منصوبہ کے دائرہ کار اور مدت میں ترمیم کی گئی اور اس کے مقاصد درج ذیل قرار پائے:

یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں کے کتب خانوں کے کاموں میں کمپیوٹر کے استعمال کا فروغ، تعلیم و تحقیق میں درکار معلومات تک دسترس کی بہتر سہولت اور معلوماتی مواد کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقلی کی ضرورت کے پیش نظر ان کے اندراج کے لیے ضابطہ کار کا فروغ، کتب خانوں اور معلوماتی وسائل مراکز میں موجود معلوماتی وسائل کو ایک نظام میں منسلک کر کے ان کے استعمال میں شرکت کی سہولت کی فراہمی اور وسائل کے امکانی حد تک وسیع پیمانہ پر استعمال کا فروغ، حلاشی مواد کے لیے بغیر غیر ضروری تاخیر تسلی بخش فراہمی مواد خدمات کا فروغ، 1995 میں یو جی سی نے ان فلب نٹ کو ایک سوسائٹی کی حیثیت دے کر اسے ایک انٹر یونیورسٹی سنٹر بنا دیا اور اس کا صدر دفتر احمد آباد میں قائم کیا گیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے سلسلے میں ادارہ نے اب تک درج ذیل کام کیے ہیں:

ذخیرۂ ڈیٹا (Data Base) کی تخلیق یونیورسٹی کتب خانوں میں موجود کتابوں، رسائل اور تحقیقی مقالہ جات ڈیٹا، یونیورسٹی ماہرین مضامین ڈیٹا، یونیورسٹیوں میں زیر تکمیل مقالہ جات کا ڈیٹا، یو جی سی کی ریسرچ، کانفرنس اور اشاعتی اسکیموں کا ڈیٹا

معیار سازی: ڈیٹا کی ہیئت اور تفصیل اندراج کی یونیسکو معیار سے مطابقت کی معیار سازی۔ یونیورسٹی ہوم پیج (Home Page) کی تشکیل جس کے ذریعہ یونیورسٹیوں کے کورس داخلہ استعداد اور اساتذہ کی تفصیل حاصل کی جا سکتی ہے۔

سائنسی رسائل کے صفحہ فہرست مضامین اور مضامین کی تلخیص فراہمی خدمات (یہ خدمت قومی مرکز برائے سائنسی معلومات (بنگلور) کے تعاون سے فراہم کی جاتی ہے)

خودکاری "سافٹ ویر" کی تخلیق: سول (SOUL) کے نام سے موجود ہے۔ سرچ اسٹیشن (مرکز برائے رابطہ انٹرنٹ): انٹرنٹ سے رابطہ کے لیے سرچ اسٹیشن کا قیام، تربیتی سرگرمیاں۔ یونیورسٹی کارکنان کے لیے کمپیوٹر کے ذریعہ کاموں کو انجام دینے کے لیے مختصر المدتی تربیتی پروگرام۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

سالانہ وقفہ سے قومی کنونشن برائے اعلیٰ سطحی تعلیمی اور تحقیقی کتب خانہ کارکنان (Caliber) 1994 سے یہ کنونشن ملک کے کسی بڑے شہر میں منعقد کیا جاتا ہے جہاں دوران سال پیش رفت کا جائزہ اور تجاویز پر غور ہوتا ہے۔

"ان فلب نٹ" نیوز لیٹر: سہ ماہی خبرنامہ جس میں ادارہ کی پیش رفت مطبوعات مستقبل کے پروگرام اور ملک کی یونیورسٹیوں میں خودکاری کے میدان میں ہونے والی پیش رفت کا ذکر ہوتا ہے۔

انقلاب: طاقت کی تنظیم اور اس کے استعمال کے تین پرانے طریقوں یعنی پولیس، فوج اور عدالت کے علاوہ دور حاضر میں تین مزید طریقے پائے گئے ہیں۔ فوجی یا سیاسی بغاوت (Group d'etat) تشددانہ انقلاب اور جنگ۔ ان ساری کارروائیوں میں جملہ عناصر کے ساتھ تشدد ایک لازمی عنصر ہے۔ فوجی یا سیاسی بغاوت سے مراد تھوڑے وقت میں یا ناگہانی طور پر موجودہ حکومت کا تختہ پلٹنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کی غرض سے کی گئی تشددانہ کارروائی سے ہے۔ مثلاً آج تیسری دنیا کے ملکوں میں شہری حکومتوں کے خلاف فوج کی بغاوت اور فوجی حکومتوں کے خلاف فوج کے مختلف دھڑوں یا افسروں کی بغاوت اور اقتدار پر قبضہ ایک عام بات ہے۔ بغاوت، انقلاب (Revolution) کا نقطہ ابتدائی بھی ہوسکتی ہے اور بذات خود حکومت پر قبضہ کرنے میں مدد بھی دے سکتی ہے۔ اس سے مراد محض انقلابیوں کا بزور طاقت حکومت کی مشنری پر قبضہ کرنا اور حکمران طبقہ کو معزول کرکے اپنے ہمنواؤں کو اقتدار سے ہمکنار کرنا ہے۔ بغاوت عموماً کمزور یا عوام کی حمایت سے محروم حکومتوں کے خلاف کامیاب ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف انقلاب زیادہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انقلاب کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ "یہ نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی لانے کی کوشش ہے" لیکن کامیاب انقلاب بنیادی تبدیلی لانے کی کوشش سے بڑھ کر ہے۔ وہ عملاً سارے نظام کو بدل ڈالتا ہے۔ یہ طاقت کے ذریعے اور تیزی سے اقتدار کے بنیادی ڈھانچہ اور سماج میں فوائد ووسائل کی تقسیم کے ڈھرّے کو بدل دیتا ہے۔ مثلاً تحریک اصلاح (Reformation)، انقلاب انگلستان (1788)، انقلاب امریکا (1776)، انقلاب فرانس (1689)، بالشویک انقلاب روس (1917)، انقلاب چین (1949)، انقلاب مصر (1950)، انقلاب کیوبا(1957)، اورانقلاب عراق (1958)، کے نتیجہ میں نہ صرف متعلقہ ملکوں کا نظام حکومت بدل گیا بلکہ دور رس سماجی، اقتصادی اور تہذیبی تبدیلیاں بھی واقع ہوئیں۔

ہر انقلاب کے پس پشت کچھ عوامل کارفرما ہوتے ہیں جو عملی انقلاب کے رونما ہونے سے پہلے انقلابی گروہ یا طبقہ یا پارٹی کو اس کے لیے تیار کرتے ہیں۔ انقلاب کے تمام اسباب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں لیکن کلیرنس برنٹن نے اپنی کتاب "انقلاب کی تشریح بدنی" (1952) میں تمام عظیم انقلابات کا مطالعہ کرکے عمومی تجزیہ کیا ہے کہ انقلابی حالات قدیم نظام کے حکمران طبقہ کی نااہلی یا معاشی بحران یا جنگ یا کسی اور غیر معمولی خلفشار انگیز عوامل کے نتیجہ میں مکمل یا جزوی شکست کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ ابتدا میں انقلاب کے آثار کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوتے۔ رفتہ رفتہ سماجی کشیدگیاں اور دباؤ بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب یہ اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو سیاسی نظام ٹوٹ کر منتشر ہوجاتا ہے۔ حاکمیت اور جواز حاکمیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ حکومت اپنے بچے کھچے اقتدار کو سنبھالنے کے لیے زیادہ سے زیادہ جبر و تشدد سے کام لیتی ہے جس سے اس کا اقتدار اور بھی محدود ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں ایسے گروہ طاقت اور اثر حاصل کر لیتے ہیں جو اب تک غیر معروف تھے۔ ایسے گروہ موجودہ نظام کا تختہ پلٹنے اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کے علانیہ مقصد کے ساتھ انقلابی تحریکوں کی شکل میں ہر طرف پھیل جاتے ہیں۔

ہر انقلاب کی پشت پر پرانے انتظام کی جگہ کسی مادّی یا اخلاقی قدر کی ازسرنو تقسیم کا کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔ ہر انقلاب کی پشت پر منظم طاقت، منظم گروہی مفادات اور گروہی محرکات کارفرما ہوتے ہیں۔ انقلابات طبقاتی، قومیتی، قومی، علاقائی یامذہبی اختلافات اور کشمکش سے رونما ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں خانگی خلفشار کا سب سے بڑا سبب طبقاتی کشمکش ہے۔ کبھی انقلاب کے رونما ہونے کے بعد اس طرح کے گروہ جو پرانے نظام کے ٹوٹنے سے متاثر ہوتے ہیں یا جنھیں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے، باہم مجتمع ہوکر انقلاب کو واقع ہونے سے روکتے ہیں یا اگر وہ واقع ہوچکا ہے تو اس کو ختم کردینا چاہتے ہیں۔ اس کارروائی کو "مزاحمت" یا "جوابی انقلاب" (Counter Revolution) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انقلاب کے مختلف نظریات افلاطون وارسطو کے زمانہ سے لے کر قرون وسطیٰ اور انیسویں صدی تک پائے گئے ہیں۔ موجودہ دور کے نظریات میں حریت پسندانہ جمہوری نظریہ، پرولتاری، اشتراکی، کمیونسٹ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نظریہ اور شاخیں یعنی مارکسیت، لیننیت، ٹراٹسکیت، ماؤیت، ٹیٹوئیت، کاسٹرویت، یورپی کیمونسٹوں کے دستوری پرولتاری انقلاب کا نظریہ، اور فسطائیت اور قومی اشتراکیت کے نظریے قابل ذکر ہیں۔

اولی گوپولی (Oligopoly) : دیکھیے چند اجارہ۔

ایجاب (Offer): کسی معاہدے کی بنیاد وہ ایجاب (Offer) ہے جو کسی شخص کی جانب سے کیا جائے یا وہ اعلان ہے جو کسی کام کے کیے جانے کے متعلق مشتہر کیا جائے۔ مثلاً یہ اعلان کہ اگر کوئی شخص یہ کام کرے تو اسے انعام دیا جائے گا۔ ایجاب (Offer) کی تعریف میں ہوگا۔ اگر کوئی ایجاب (Offer) قبول (Accept) کر لیا جائے تو وہ معاہدے میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جس میں چند شرائط کے ساتھ یا بغیر کسی شرط کے اس کام کے کیے جانے کا محض وعدہ کیا گیا ہو۔ کسی ایجاب کے قبول کیے جانے کی صورت میں ایجاب کنندہ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اس قبول سے اتفاق کرے یا نہ کرے یہ بات مختلف عدالتی فیصلہ جات سے صاف ہو گئی ہے کہ فروخت شدنی سامان کی فہرست کی اشاعت ایجاب نہیں ہے بلکہ ایجاب کی ایک ترغیب ہے۔ اس امر کے متعلق اگرچہ عدالتی فیصلے مختلف ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سامان جو قیمت کی سلپ کے ساتھ دکان پر رکھا جاتا ہے۔ دراصل اس دام پر سامان فروخت کرنے کی ایجاب نہیں سمجھا جائے گا۔

ایڈورڈ برنٹ ٹائلر (Edward Burnett Tylor, 1832-1917) : مشہور انگریز ماہر انسانیات اور علم الاقوام ہے۔ 1855 میں خرابی صحت کی وجہ سے اسے لندن چھوڑنا پڑا اور تبدیلی آب و ہوا کے خیال سے وہ امریکا گیا۔ یہاں سے اس کی سفری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ میکسیکو اور دوسرے مقامات کی مقامی اور قبائلی زندگی کا اس نے بغور مطالعہ کیا۔ اس کی تصنیفات ماہرانہ انسانیاتی اور ثقافتی تجزیوں سے بھرپور ہیں جن میں انسان کی ابتدائی تاریخ کی تحقیقات 1865 میں (Researches into the Early History of Mankind) اور انسانیات (Anthropology) کی تحقیقات میں 1871 مشہور ہیں۔ انسانیاتی مطالعہ میں ٹائلر نے تقابلی طریقہ تحقیق پر زور دیا ہے۔ ٹائلر ثقافت میں یک خطی (Unilinear) ارتقاء کا قائل نہیں تھا۔ اسے بجا طور پر سے انیسویں صدی میں ثقافت کے ہمہ جہتی ارتقائی نقطہ نظر کا رہنما سمجھا جاسکتا ہے۔ ٹائلر نے امریکا میں ثقافتی انسانیات کی بنیاد ڈالی۔ اسے برطانیہ میں انسانیات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ٹائلر کے عالمانہ مشاہدوں نے انسانیات اور علم الاقوام میں اس کو بہت شہرت دی ہے۔

ایس۔ آر۔ رنگاناتھن : ہندستان میں کتب خانہ کی ہمہ جہت توسیع کے دور جدید کے محرک افراد کی فہرست میں راؤ صاحب پدم شری سیالی رامامرت رنگاناتھن (Siali Ramamrit Ranganathan) کا نام سر فہرست ہوگا۔ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کتب خانہ خدمات میں نئے انداز کے تعارف، علم کتب خانہ کے لیے نظری اساس کی تعمیر و تفہیم، کتب خانہ کے کاموں کے فنی پہلوؤں کی معیاربندی، کتب خانہ عمارت اور فرنیچر کے لیے معیاربندی، ملک میں توسیع کتب خانہ کے لیے منصوبہ بندی، عوامی کتب خانہ قوانین کا خاکہ، علم کتب خانہ کی تعلیم کے لیے نصاب کی تشکیل، غرض کتب خانہ اور علم کتب خانہ کے جملہ پہلوؤں پر محیط ہے۔ ہندستان میں اعلیٰ سطح پر علم کتب خانہ کی یہ بانی "شخصیت 9/اگست 1882 کو تنجور ضلع کے سیالی تعلقہ میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم ریاضی میں حاصل کرکے رنگاناتھن صاحب نے اپنی ملازمت کی زندگی کا آغاز گورنمنٹ کالج منگلور میں ریاضی کے استاد کی حیثیت سے شروع کیا۔ لیکن قدرت کو ان سے جو کام لینا تھا وہ کچھ اور تھا چنانچہ 1924 میں مدراس یونیورسٹی نے انھیں اپنا لائبریرین منتخب کرکے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیج دیا۔ لندن یونیورسٹی میں علم کتب خانہ کی تعلیم کے دوران انھوں نے وہاں مختلف شہروں میں موجود کتب خانہ کے کاموں اور ان کی سماجی خدمات کو بغور دیکھا۔ لیکن جس چیز نے انھیں سب سے زیادہ متوجہ کیا وہ مروجہ درجہ بندی ضابطہ تھا جس کے مطابق کتاب کے علامتی نشان کی تشکیل کرنے والے کا رول بہت محدود تھا اور نتیجہ میں کتاب کے نفس مضمون کو علامتی نشان کے ذریعہ پورے طور پر نہیں ظاہر کیا جاسکتا تھا۔ انگلینڈ میں رنگاناتھن نے بچوں کے کھلونے دیکھے جن کے اجزاء کو جوڑ حسب منشاء شکلیں بنائی جاسکتی تھیں۔ اس مثال کو بنیاد بناکر انھوں نے درجہ بندی کا ایک ضابطہ ترتیب دیا جس میں ہر مضمون/شعبہ علم کو بنیادی مجرد خیال کی سطح پر پانچ خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا اور کسی بھی کتاب یا رسالہ کے مضمون کو درجہ بند کرنے میں مجرد خیال کے اظہار کے عنوانات کو کولن (:) کی علامت کی مدد سے جوڑ کر اس کا علامتی نشان تشکیل دیا جاسکتا تھا۔ کولن کلاسی فیکیشن کے نام سے یہ ضابطہ 1931 میں پہلی بار شائع ہوا اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اب اس کے ساتویں ایڈیشن کا ایک حصہ شائع ہوچکا ہے۔

رنگاناتھن کا بنیادی خیال کہ مضمون کے اجزاء کو متعین خانوں میں تقسیم اور پھر ان کو ضرورت کے مطابق جوڑ کر علامتی نشان بنانا تجزیاتی امتزاج (Analytico-Synthetic) نظریہ درجہ بندی کی اساس بنا اور درجہ بندی ضابطہ کی تشکیل کے عمل کو ایک نئی راہ ملی۔ مغربی دنیا کے ماہر علم کتب خانہ کولن درجہ بندی ضابطہ کے بنیادی فلسفہ سے بہت متاثر ہوئے اور ان اصولوں پر مزید تحقیق کے لیے "درجہ بندی تحقیق گروپ" (Classification Research Group) تشکیل کیا گیا۔

ڈاکٹر رنگاناتھن نے فہرست سازی کے ضابطے بھی مرتب کیے۔ ان کی کتاب درجہ بند فہرست سازی کتب خانہ ضابطہ (Classified Catalogue Code) مطبوعہ کے بنیادی اصولوں کی جھلک 1961 میں پیرس میں منعقد بین الاقوامی فہرست سازی کتب خانہ کانفرنس کی سفارشات میں صاف جھلکتی ہے۔ رنگاناتھن کی کوششوں سے یونیسکو نے ایک معیاری عوامی کتب خانہ پراجیکٹ کے تحت 1951 میں دہلی پبلک لائبریری قائم کی اور سائنس کے موضوعات پر حوالہ جاتی خدمت کی فراہمی کے لیے انڈین نیشنل سائنٹفک ڈاکومینٹیشن سنٹر یا انسڈاک (Indian National Scientific Documentation Centre, Delhi) قائم کرنے میں تکنیکی ساز و سامان و ماہرین کی خدمات فراہم کیں۔

علم کتب خانہ کی تعلیم کے فروغ میں رنگاناتھن کا رول بہت اہم رہا ہے۔ انھوں نے نہ صرف مدراس، بنارس، دہلی اور وکرم یونیورسٹی اجین میں شعبہ برائے تدریس وتربیت لائبریری سائنس میں لائبریری سائنس کی تدریسی خدمات انجام دیں بلکہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ایماپر اس کا نصاب مرتب کیا اور یونیورسٹی و کالج لائبریری کے لیے درکار اسٹاف کی تعداد کے تعین کا معیاری فارمولا مرتب کیا۔ انڈین اسٹینڈرڈز انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ مل کر درجہ بندی اور فہرست سازی کی اصطلاحات کی تعریف مرتب کی اور فرنیچر کا معیار متعین کیا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انھوں نے بنگلور میں انڈین اسٹیٹسٹیکل انسٹی ٹیوٹ (Indian Statistical Institute) کے تعاون سے ڈاکومینٹیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ سنٹر (DRTC) قائم کیا۔ ملک میں کتب خانہ تحریک کے فروغ کے لیے برسوں انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے کانفرنسوں کا انعقاد کیا جہاں لائبریری کے مسائل پر غور و فکر کے ذریعہ راہیں تلاش کی گئیں۔ عوامی کتب خانہ کے لیے قانون سازی کے میدان میں مدراس پبلک لائبریری ایکٹ کا مسودہ تیار کیا جو 1948 میں ملک میں عوامی کتب خانہ کا پہلا قانون بنا۔ ملک کے لیے ماڈل پبلک لائبریری ایکٹ کا مسودہ بھی تیار کیا۔

کتب خانہ کی جملہ خدمات کے دائرہ کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے درج ذیل پانچ نکاتی کلیہ وضع کیا:

کتابیں پڑھنے کے لیے ہیں (Books are for use)

ہر قاری کو اس کی درکار کتاب ملے (Every reader has his book)

ہر کتاب کو اس کا موزوں قاری ملے (Every book has its reader)

قاری کے اوقات کی بچت کریں (Save the time of reader)

کتب خانہ ایک افزائش پذیر عضویہ ہے (Library is a growing organism)

ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کرکے یونیسکو نے اپنے کتابیاتی پروگراموں میں انھیں اپنا مشیر بنایا، انٹرنیشنل فیڈریشن برائے ڈاکومینٹیشن (FID) نے اپنا نائب صدر منتخب کیا۔ دہلی اور پٹس برگ یونیورسٹیوں نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ حکومت ہند نے نیشنل پروفیسر برائے لائبریری سائنس تاحیات بنایا اور پدم شری کا اعزاز عطا کیا۔ دنیا بھر میں ہندستان کا نام روشن کرنے والے بیس سے زیادہ کتابوں اور ہزاروں مضامین کے مصنف، اپنی زندگی بھر کی کمائی یونیورسٹیوں میں علم کتب خانہ کی تعلیم کے لیے وقف کرنے والے اس محیّر انسان نے 27/ستمبر 1972 کو بنگلور میں اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کرلیے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک (Asian Development Bank, ADB)

: یہ بینک اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن برائے ایشیا کے زیر اہتمام قائم کیا گیا۔ اس نے دسمبر 1966 میں کام کرنا شروع کیا۔ اس میں کل 56 ممالک شامل ہیں جن میں سے 40 علاقائی رکن اور 16 غیر علاقائی ارکان ہیں۔ اس کا قیام ایشیائی اور بحرالکاہل کے علاقوں میں اقتصادی وسماجی ترقی کو فروغ دینے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ اس کے مقاصد میں اقتصادی ترقی کو فروغ دینا، غریبی کم کرنا، خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانا، انسانی ترقی کو مستحکم کرنا، آبادی کی منصوبہ بندی کرنا اور ماحولیات کا تحفظ کرنا شامل ہے۔ بینک مالی امداد کے لیے علاقائی اور قومی منصوبوں اور پروجیکٹوں کو فوقیت دیتا ہے۔ مالی امداد کے علاوہ اس کے پروگرام میں تکنیکی مشاورتی امداد اور اقوام متحدہ کی تحقیقی ایجنسیوں کے تعاون کا حصول بھی شامل ہے۔ یہ چھوٹے اور کم ترقی یافتہ ملکوں کی ضرورتوں پر خصوصی توجہ صرف کرتا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

بینک کا اعلیٰ ترین پالیسی ساز ادارہ اس کا بورڈ آف گورنرز ہے جس کی نشست ہر سال ہوتی ہے۔ 12رکنی بورڈ آف ڈائریکٹرس اس کی مجلس انتظامیہ ہے۔ سات مختلف ملکوں میں بینک کا مشن بھی قائم ہیں۔ ان کے علاوہ تین نمائندہ دفاتر بھی ہیں۔

اس کا صدر مقام منیلا (فلپائن) میں ہے۔

ایف۔ بی۔ آئی (F.B.I.): فیڈرل بیورو آف انوسٹیگیشن امریکا کی وزارت انصاف کا ایک حصہ ہے۔ اس کا کام ملکی مفاد کے لیے خفیہ معلومات جمع کرنا اور خفیہ تحقیقات کرنا ہے۔ یہ ادارہ 1908 میں قائم ہوا تھا۔ 1924 میں جب ایڈگر ہوور اس کے ڈائرکٹر بنے تو امریکی کانگریس نے اس کی ذمہ داریاں اور اختیارات کافی بڑھا دیے اور پھر یہ بڑھتے ہی رہے۔ 1933 میں اس کی جدید تنظیم ہوئی اور اختیارات اور بھی بڑھ گئے۔ اسی زمانہ میں اس نے ہوور کی سرکردگی میں منظم جرائم پیشہ وروں کے خلاف زبردست مورچہ لیا اور انھیں کچلنے کی کوشش کی۔ اسی زمانہ میں امریکا میں شراب پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ اس پابندی کو ناکام بنانے اور خفیہ طور پر شراب بنانے اور درآمد کرنے میں ان جرائم پیشہ لوگوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے خلاف بھی ایف بی آئی نے زبردست مہم چلائی۔

ایف بی آئی کے فرائض میں امریکی قوانین کی خلاف ورزیوں کے بارے میں تحقیقات کرنا، ملک کے اندرونی تحفظ کے لیے بغاوتوں اور سازشوں وغیرہ پر نظر رکھنا شامل ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ساری دنیا میں بائیں بازو کی لہر اٹھی تو اسے کچلنے میں اس محکمہ نے کافی حصہ لیا۔ واٹرگیٹ افیر کے تعلق سے سابق صدر امریکا رچرڈ ایم نکسن کے بارے میں تحقیقات کے دوران یہ بھی انکشاف ہوا کہ یہ ادارہ ملک کی اندرونی سیاست میں بھی کافی الجھا رہا ہے۔

ایک سے زائد مدعی یا درخواست گزار کی صورت میں کسی ایک کی ناقابلیت: جب ایک سے زیادہ اشخاص مشترکہ طور پر کوئی مقدمہ رجوع کرنے یا ڈگری کی تعمیل کی درخواست پیش کرنے کے حقدار ہوں اور ان میں سے کسی ایک میں کوئی ناقابلیت متذکرہ بالا ہو اور اسے ناقابل کی رضامندی کے بغیر دادرس دی جاسکتی ہو تو ان سب کے مقابلہ میں میعاد اس طرح محسوب ہوگی گویا کسی ایک شخص میں ناقابلیت نہ تھی لیکن جب ایسی دادرسی نہ دی جاسکتی ہو تو ان میں سے کسی کے مقابلہ میں میعاد محسوب نہ ہوگی جب تک کہ ان میں سے کوئی اس قابل نہ ہوجائے کہ دیگر کی بلارضامندی دادرس لے سکے یا جب تک کہ ناقابلیت رفع نہ ہوجائے۔

ایلس کننگھم فلیچر (Allis Cunningham Fletcher, 1838-1923): ایلس فلیچر مشہور امریکن ماہر علم الاقوام تھی جو اپنے والدین کے عارضی قیام کے دوران کیوبا میں پیدا ہوئی۔ اس نے علم الاقوام اور علم اثار قدیمہ میں ہارورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ایلس فلیچر کو امریکن انڈین قبائل سے بہت دلچسپی تھی۔ ان قبائل کی خوشحالی اور ان کے حقوق کے لیے اس نے بہت کام کیے۔ اس کا یہ نظریہ تھا کہ نہ صرف ریڈ انڈین کو ان کے حقوق ملنے چاہئیں بلکہ انھیں آہستہ آہستہ امریکن ثقافت میں جذب ہونے کی سہولت بھی فراہم ہونی چاہیے۔ امریکی قبائلی زندگی اور ان کے مذہب پر اس نے تحقیقی کام کیے ہیں۔ 1890 میں اس نے واشنگٹن میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں وہ خواتین کی انسانیاتی سوسائٹی (Women's Anthropological Society) کی رکن بنی اور 1890 میں اس کی صدر ہوئی۔ ایلس فلیچر کا انتقال (85) برس کی عمر میں ہوا اور وہ اپنی زندگی ہی میں انسانیات اور علم الاقوام میں ایک مثالی عالمانہ مقام حاصل کرچکی تھی اور ان علوم میں تحقیق کی ترقی کے لیے اس کی خدمات قابل قدر ہیں۔ وہ اس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتی تھیں جو علم سماجیات اور انسانیات کے درمیان فرق کو اہمیت نہیں دیتا ہے۔

ایم. جے. ہرسکووٹز (M.J. Horskovits, 1895-1963): ہرسکووٹز مشہور جدید امریکی ماہر انسانیات ہے۔ وہ 1895 میں پیدا ہوا اور 1963 میں اس کا انتقال ہوا۔ ہرسکووٹز کے تصور انسانیات کو سمجھنے کے لیے دو نکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(1) پہلا یہ کہ وہ انسان دوست تھا اور اسے مجموعی تمدنی برتاؤ سے دلچسپی تھی۔ (2) دوسرا یہ کہ ہرسکووٹز کا خیال تھا کہ صرف استقرائی طریقہ تحقیق ہی انسانیات کے لیے موزوں ہوسکتا ہے۔ ان دونوں افکار کی تشکیل میں ہرسکووٹز پر فرانزبواز کا بہت گہرا اثر پڑا ہے جو کولمبیا یونیورسٹی میں اس کا استاد تھا۔

ہرسکووٹز کی سب سے مشہور اور جامع کتاب Man and His Work (انسان اور اس کے کام) ہے جو 1948 میں شائع ہوئی اور بعد میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پھر ترمیم اور اختصار کے ساتھ "تمدنی انسانیات" کے عنوان سے 1955 میں شائع ہوئی۔ ہرسکووٹز کے پیش نظر تمدن کا ایک بہت ہی وسیع اور جامع تصور تھا جس میں انسان کی کرداری اور نظریاتی زندگی کے دونوں پہلو شامل ہیں۔ ہرسکووٹز نے تمدن کی توضیح کے لیے تاریخ کی اہمیت پر زور دیا کیونکہ اس کے بغیر تمدنی تبدیلی کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ تمدن کے مختلف رجحانات ان کی تاویل ان کی بقا اور نئے امتزاجات کو تاریخی زاویوں کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

افریقہ میں ریسرچ کے دوران ہرسکووٹز نے ماضی اور حال کے تمدنی تسلسل پر بہت زیادہ زور دیا ہے وہ اطلاقی انسانیات کا اتنا زیادہ قائل نہیں تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہر ایک تمدن اپنا ایک انفرادی پیچیدہ پس منظر اور ماحول رکھتا ہے جس کو خارجی افکار یا نظریات کے سانچہ میں ڈھالنا مناسب نہیں ہے۔وہ تمدنی اضافیت کا قائل تھا۔ اس نے سب سے زیادہ کوشش اس بات کی کی کہ اپنی تحقیقات میں مختلف قبائل کے تمدنی عوامل کا انتہائی گہرا جائزہ لیا جائے تاکہ انسانی برتاؤ اور رجحانات کے تعلق سے اگر ممکن ہو تو آفاقی اصول اپنائے جاسکیں۔

ہرسکووٹز نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی آخری مشہور کتاب "The Human Factor in Changing Africa" (بدلتے ہوئے افریقہ میں انسانی عوامل) ہے جو 1962 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل اس کی بے پناہ وسیع انسانیاتی معلومات کا خلاصہ یا نچوڑ ہے۔ ہرسکووٹز قدیم تقاضوں کی بازیافت کے لیے مشہور ہے۔

ایمائیل درکھائم (Emile Durkheim) : ایمائیل درکھائم (1858 تا 1917) دور جدید کا عظیم فرانسیسی ماہر سماجیات گزرا ہے جس نے سماجی علوم میں تحقیقی فکر و نظر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے چنانچہ ٹالکاٹ پارسنس (Talcott Parsons) جیسے مشہور امریکی سماجیات داں کی رائے میں درکھائم کا شمار ان پہلے دو عظیم سماجیات دانوں میں کیا جاسکتا ہے جنھوں نے سماجیات کے نظریات کی بنیادیں مستحکم کیں۔ دوسرا سماجیات داں جرمن مفکر میکس ویبر (Max Waber) ہے۔

درکھائم کی چار تصانیف اساسی نوعیت کی حامل ہیں۔ (1) 'سماج میں طبقاتی تقسیم' 1893 میں شائع ہوئی۔ (2) 'سماجیاتی تحقیق کے اصول' 1895 میں، (3) 'خودکشی' 1897 میں اور (4) 'مذہبی زندگی کی ابتدائی اشکال' 1912 میں شائع ہوئی اس کے علاوہ درکھائم نے بے شمار مضامین مقالے اور لیکچر لکھے تھے جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ پہلے بورڈیوکس یونیورسٹی میں اور بعد میں سوربون یونیورسٹی میں درکھائم سماجیات کا پروفیسر رہا۔ سماجیات میں درکھائم کی تخلیقی فکر کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ بہت سے اہم سماجی تصورات اور اصطلاحات کی اختراع اور اس کی توضیح و تشریح اس کا کارنامہ ہیں۔ سماجی حقیقت (Social Fact) کی جتنی سائنٹفک اور جامع تشریح درکھائم نے کی ہے اس سے سماجیاتی تحقیق کے طریقوں میں جدید زاویوں کے اضافہ میں مدد ملی ہے۔ سماجیاتی تحقیق کے اصول میں درکھائم نے تجزیاتی فکر و انداز پر بڑی عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ درکھائم کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس کی فکر پر انگریزی تجرباتی انداز اور افادیت پسندی کے ساتھ ساتھ جرمن مثالیت کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اور ان دونوں کے بین بین درکھائم نے ایک نئے انداز فکر کی بنیاد ڈالی ہے۔ درکھائم کا ایک اہم کارنامہ نظریہ تمدن ہے جس میں اس نے 'اجتماعی نمائندگی' (Collective Representation) کی تصور سے بحث کی ہے۔ اس نے مادی اور غیر مادی تمدن یعنی تہذیب اور تمدن کے آپسی امتیاز کو سماجی تبدیلی کے دوران ملحوظ رکھنے پر زور دیا ہے۔ درکھائم کی سماجیاتی فکر کو سمجھنے کے لیے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کی تحریرات میں تمدن کے تقابلی اور ارتقائی پہلو دونوں اہمیت کے حامل ہیں۔ اور ان دونوں میں درکھائم نے تمدنی اور علاماتی یا رمزی عناصر کو زیادہ قابل توجہ قرار دیا ہے۔ جدید سماجیاتی فکر کی تشکیل و ارتقاء میں درکھائم کی تخلیقات کا سب سے زیادہ اثر رہا ہے۔ ان کی وفات کے بعد 'تعلیم کی سماجیات' اور 'تعلیم میں اخلاقیات' وغیرہ اس کے کچھ اور مقالے شائع ہوئے۔

درکھائم کے سماجی تصورات میں سماجی حقیقت کو ایک 'چیز یا شے' سمجھا گیا ہے۔ جس کی دو خصوصیات ہیں، ایک خارجی ساخت اور دوسری اس کا موضوعاتی (Subjective) نہ ہو کر ٹھوس سائنسی حقیقت ہونا۔ اس کا مفہوم ہے کہ سماجی حقیقت کسی عالم کی اپنی سوچ نہیں ہے بلکہ وہ کئی لوگوں کے ذریعہ محسوس کی گئی اور اجتماعی شعوری فکر (Collective Consciousness) پر مبنی ہے۔

اجتماعی نمائندگی کا فلسفہ بھی اسی کا ایک پہلو ہے۔ ہر سماج میں کئی نظریے، جذبات اور احساسات دوسرے سماج سے الگ ہوتے ہیں اور وہ سماج کی اکثریت پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر سماج کے لیے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

معیار مقرر کرتے ہیں اور سماجی دباؤ اور کنٹرول قائم رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔ کچھ فرد ان معیاروں کو رد کرسکتے ہیں لیکن اکثریت کی اہمیت غالب رہتی ہے اور ان معیاروں کا کنٹرول قائم رہتا ہے۔

سماج میں طبقاتی تقسیم نامی مقالے میں انھوں نے الگ الگ کاموں کے لیے الگ الگ طبقے کی ضرورت ظاہر کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تقسیم کاری علاحدگی پسندی کو جنم ضرور دیتی ہے لیکن سماج کے تمام گروہوں اور اکائیوں کے درمیان ایک دوسرے سے تعلق اور انحصار بھی پیدا کرتی ہے۔

'مذہبی زندگی کی ابتدائی اشکال' میں انھوں نے سماج کو مذہب کی پیدائش کا سبب مانا ہے۔ ان کے خیال میں مذاہب صرف سماج میں ایکتا پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ انھوں نے ٹوٹم کو مذہب کی ابتدائی شکل بتایا ہے اور مذہب کی کسی قسم کی روحانی اہمیت سے انھوں نے انکار کیا ہے۔

انھوں نے خودکشی کی جو تھیوری پیش کی ہے وہ ان کی کتاب 'خودکشی' (Le Suicide) میں موجود ہے۔ خودکشی ایک سماجی واقعہ ہے صرف غریبی اور مایوسی سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق مندرجہ ذیل خودکشی کی شکلیں ہوسکتی ہیں۔

(1) انا پر منحصر خودکشی (Egoistic Suicide): جب معاشرہ انسان کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور کسی خطا یا جرم کے سبب اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو وہ اکثر سماج کو چھوڑ کر اس کی نفی کرسکتا ہے اور پوری طرح معاشرے سے دوری صرف خودکشی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

(2) بے غرض خودکشی (Alruistic Suicide): یہ وہ صورت حال ہوتی ہے جب کوئی فرد واحد کسی خاص معاشرتی مقصد کے حصول کے لیے یہ اپنی قربانی دیتا ہے۔ ستی، انسانی بم وغیرہ اس قسم کی ہی خودکشی ہوتی ہیں۔

(3) غیر فطری دباؤ کے تحت خودکشی (Anomiqui Suicide): زندگی میں اچانک ہونے والی تبدیلیاں کچھ لوگوں کے لیے بے حد گھٹن پیدا کرتی ہیں۔ اچانک کسی امیر آدمی کے لیے دیوالیہ بن جانا ایسا ہی صدمہ ہوتا ہے اور وہ اسے جھیل نہ پانے کے سبب وہ دنیا چھوڑ سکتا ہے۔

درکھائم کے کچھ اور نظریہ بھی بہت مشہور ہوئے مثلاً 'علم کی سماجیات' اور 'سماجی تبدیلی'۔ علم کی سماجیات میں انھوں نے اجتماعی انداز فکر کو ہر قسم علم اور تحقیق کی بنیاد بتایا ہے۔ سماجی تبدیلی کے لیے انھوں نے انحرافی برتاؤ اور سماج میں ہونے والی غیر منظم تحریکات کو ذمے دار قرار دیا ہے۔ سماج میں گڑبڑ سے انسان کے اندر بھی مایوسی اور منفی انداز فکر پیدا ہوتا ہے اور وہ انحرافی برتاؤ پر اتر آتا ہے۔

مختصراً درکھائم وہ مفکر ہیں جنھوں نے سماج کو سب سے اہم اور مرکزی قوت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ سماجیات کے مفکر کے طور پر ان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سماجیات کو ایک تحقیقی سائنس کی شکل دینے میں ان کی کوششوں کا خصوصی رول ہے۔

اہل الذمہ: اہل اور ذمہ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ذمہ عہد پناہ ضمانت حق اور حرمت کے معنی میں ہے اہل الذمہ ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کا اطلاق اسلامی حکومت میں آباد غیر مسلم لوگوں پر ہوتا ہے۔ چونکہ یہ غیر مسلم مسلمانوں کے حفظ و امان اور عہدو پناہ میں ہوتے ہیں اور اسلامی حکومت ان کے ہر قسم کے تحفظ کی ذمہ دار اور ضامن ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو اہل الذمہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔ اس ذمہ داری اور حفاظت کے معاوضہ میں اسلامی حکومت ان سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے اس کو جزیہ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ٹیکس بھی ان ہی لوگوں سے لیا جاتا ہے جو واقعی دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ بچے، بوڑھے، عورتیں دوسرے مجبور، معذور اشخاص اور غریب لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اسلام میں ہر مسلمان پر جنگی خدمت فرض ہے لیکن جو غیر مسلم اسلامی حکومت کے ماتحت شہری زندگی گزارتے ہیں اس نے ایک نظم مقرر کردیا کہ جزیہ ادا کرنے کے بعد وہ جنگ میں شرکت سے مستثنیٰ کردیے جائیں اور اگر وہ جنگ میں بخوشی شریک ہوں تو ان سے جزیہ نہ لیا جائے یہ ٹیکس مسلمانوں سے نہیں لیا جاتا اور ان پر دوسری طرح کے ٹیکسوں کا بوجھ چنانچہ وہ زکوٰۃ دیتے، عام صدقات و خیرات میں حصہ لیتے ہیں علاوہ ازیں جنگ پیش آنے کی صورت میں اس کا بوجھ بھی اٹھاتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں غیر مسلم شہریوں سے نہ صرف جزیہ لیا جاتا ہے جس کے عوض میں ان کو گوناگوں حقوق دیے گئے ہیں جیسے اگر دشمن ان پر حملہ آور ہوئے تو ان کی مدافعت کی جائے گی۔ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے گا بلکہ ہر طرح کی مذہبی آزادی دی جائے گی۔ ان کی عبادت گاہیں مسمار نہ کی جائیں گی، ان کو ناقوس اور سنکھ بجانے کی اجازت

ہوگی۔ جزیہ وصول کرنے والے ان کے پاس جاکر جزیہ لیں گے وہ خود محصلین کے پاس جزیہ دینے نہ آئیں گے۔ ان کی جان، مال، عزت و آبرو محفوظ ہوگی، ان کی زمین جائداد محفوظ رہے گی اور ان کے قبضہ میں باقی رہے گی۔ ان کو ان سے بے دخل نہ کیا جائے گا۔ ان سے عشر اور زکوۃ نہ لی جاےء گی۔ جو حقوق پہلے سے حاصل تھے ان کو سلب نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان ان کو قتل کرے گا تو ان کو قصاص لینے کا حق ہوگا اور اس کے بدلے مسلمان قتل کردیا جائے گا۔ غرض مسلمان اور ذمی میں کسی طرح کا فرق و امتیاز نہ برتا جائے گا اور نہ ان کا درجہ و مرتبہ مسلمانوں سے کم ہوگا۔

اہل سنت (حنفی): مسلمانوں کے مشہوراور بڑے فقہی مکاتب چار ہیں ان میں سب سے قدیم حنفی ہے اس کی نسبت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی کی طرف ہے جو 80ھ میں پیدا ہوئے اور 150ھ میں وفات پائی۔

حنفی مسلک کی نشو ونما امام ابوحنیفہ کے وطن کوفہ میں ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ عراق کے تمام شہروں میں پھیل گیا۔ پھر نواحی بغداد، مصر، روم، بلخ، بخارا، فرغانہ، بلاد فارس اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں اس کی اشاعت ہوئی۔ امام ابو یوسف کو ہارون رشید نے قاضی القضاۃ مقرر کیا تو ممالک محروسہ عباسیہ میں ان کے اثر سے یہاں کے تمام لوگوں کا اس مسلک پر عمل کرنے لگے۔ ترکی میں اس کی حیثیت سرکاری مسلک کی ہوگئی تھی۔ عثمانی سلطنت کا بھی یہی مسلک تھا اور اس کے زیر حکومت ملکوں میں محکمہ عدل و قضا میں حنفی مسلک ہی پر عمل ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ترکی، شام، عراق، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان وغیرہ میں حنفیوں کی کثرت ہے اور امت کے سواد اعظم کا اس مکتب پر عمل ہے۔

عقائد میں احناف امام الہدی ابو منصور محمد ماتریدی حنفی کے متبع ہیں۔ حنفی کتب کے متعلق مزید تفصیل امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے زیر عنوان بھی ملے گی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ب

بار ثبوت (Burden of Proof): اگر کوئی شخص عدالت میں اپنے کسی قانونی حق یا ذمہ داری یا کسی امر کے وقوع پذیر ہونے کا ادعا کرے تو اس حق یا ذمہ داری یا امر کو ثابت کرنے کی ذمہ داری اس پر رہے گی اسے قانون شہادت کی اصطلاح میں بار ثبوت (Burden of proof) کہا جاتا ہے۔ کسی واقعہ کو ثابت کرنے کا بار ثبوت قانون شہادت کے تحت شہادت پیش کرنے سے پورا ہو سکتا ہے۔ شبہ (Suspicion) کو خواہ وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو ثبوت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اگر کسی ملزم نے حفاظت خوداختیاری (Self Defence) کا عذر کیا ہو تو اس امر کا بار ثبوت کہ حالات نے اسے حفاظت خوداختیاری کے تحت کسی فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا ملزم پر رہے گا۔ اگر ملزم نے یہ عذر کیا ہو کہ اس کی جانب سے جس فعل کا ارتکاب ہوا ہے وہ استثنائی صورتوں (Exceptions) کی تعریف میں آتا ہے تو اس کے عذر کو ثابت کرنے کا بار ثبوت ملزم پر رہے گا۔

شبہ کا فائدہ (Benefit of Doubt) کلکتہ ہائی کورٹ نے شبہ کے فائدے کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے۔ چار اشخاص کے منجملہ تین اشخاص جن کا نام ابتدائی رپورٹ (First Information) میں نہیں ہے حالانکہ اطلاع دینے والے نے انھیں واقعہ کے وقوع پذیر ہوتے وقت جائے وقوع پر دیکھا تھا۔ وہ ملزم جس سے اس شخص کی دشمنی ہو جس کے گھر میں رہزنی (Robbery) کی واردات ہوئی ہو ایسے کارتوس کی برآمدگی کو ملزم کی بندوق میں بھرے نہیں جاسکتے تھے۔ ایک اہم گواہ جس سے جرح نہیں کی گئی اور جرح نہ کرنے کے متعلق عدالت کے روبرو کوئی مناسب وجہ بیان نہ کی گئی ہو۔ استغاثہ کی جانب سے پیش کردہ گواہوں کی تضاد بیانی یہ سب ایسی مثالیں ہیں جس میں شبہ کا فائدہ (Benefit of Doubt) ملزم کو دیا جانا چاہیے۔ ملاحظہ ہو اے آئی آر 1965 (1956 AIR) اور محض شبہ کی بناء پر کوئی جرم ثابت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

بارہ جدول (XII Tables): مورخین نے رومن لاء میں بارہ جدول کو بڑی اہمیت دی ہے جو 451 قبل مسیح اور 450 قبل مسیح کے درمیان مرتب کیے گئے۔ یہ شہنشاہیت کے خاتمہ سے کم و بیش 60 سال بعد کا زمانہ تھا۔ مورخین نے بارہ جدول کی ترتیب کی جو تفصیل بتائی ہے وہ غیر مربوط ہے مگر روایات سے ظاہر ہے کہ بارہ جدول کی ترتیب حقیقتاً سیاسی انصاف حاصل کرنے کے لیے عوام کی جدوجہد کی ایک کڑی ہے۔ حقیقی مقصد یہ تھا کہ ایک تحریری اور عوامی دستور ہو تاکہ مجسٹریٹ اپنی مرضی سے اس میں کوئی تبدیلی یا ترمیم نہ کرسکیں اور اپنے منشاء کے مطابق قانون یا رسم و رواج کی تعبیر نہ کرسکیں۔ بارہ جدول (XII Tables) کی صداقت اور سند کو حال میں چیلنج کیا گیا ہے لیکن جدید ترین رائے یہ ہے کہ تمام شکوک و شبہات کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رومن لاء کے بارہ جدول میں قانونی کوڈ کی شکل دی گئی اور یہ کتاب پانچ صدی قبل مسیح میں لکھی گئی۔

بازار (Market): بازار وہ ہے جہاں خریدار موجود ہوں اور جو اشیا یا خدمات سے اپنے زر کے تبادلہ کے لیے تیار ہوں اور ان کا ربط بیچنے والوں سے ہو جو اپنی اشیا اور خدمات کا تبادلہ زر کے عوض کرنے کے لیے راضی ہوں اس طرح بازار کو طلب اور رسد کی بنیادی قوتوں کے الفاظ (Terms) میں ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص جغرافیائی مقام سے نہیں ہے۔ موجودہ دور کی معاشیات میں جہاں سرمایہ داری یا آزاد تجارت کا نظام رائج ہے بازار منڈی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

بازار قیمت (Market Price): ایک ایسی چھوٹی مدت کی

قیمت ہے جو شے کی پیداوار کے لیے درکار مدت سے کم ہوتی ہے۔ اس مدت میں طلب کے اضافے سے قیمت میں اضافہ ہوتا ہے اور فروشندے زیادہ مقدار پیداوار فروخت کے لیے نہیں لاسکتے۔ اور طلب میں تخفیف سے قیمت گرنے لگتی ہے۔ مثلاً گوشت اور پھل جیسی زوال پذیر اشیا یا ایسی غیر زوال پذیر اشیا جن کا ذخیرہ نہ کیا جاسکتا ہو تو رسد میں کمی ممکن نہ ہوگی اور رسد بالکل معین رہے گی۔ ایسی صورت میں طلب جس قیمت پر بھی رسد کے مساوی ہوجائے فروشندے شے کو فروخت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح قیمت بالکلیہ طو پر طلب کے زیر اثر متعین ہونے کی وجہ سے افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اگر قیمت اوسط اور مختتم مصارف سے زیادہ ہو تو فروشندوں کو غیر معمولی منافع ملتا ہے اور قیمت کے کم ہونے کی صورت میں نقصان ہوتا ہے۔

بال سنگھار : بالوں کے بنانے، سنوارنے کی رسم اتنی ہی پرانی ہے جتنا سماج خود پرانا ہے۔ انتہائی قدیم زمانہ میں وحشی قبیلوں کے لوگ اپنے بالوں میں مٹی لگا کر ان کے گچھے بنا لیتے تھے۔ اور اس طرح یہ بعض وقت شخصی یا قبیلوں کی نشانی بن جاتے۔ عورتیں سامنے سے بالوں کو کسی چیز سے باندھ لیتیں تاکہ وہ آنکھوں پر نہ گریں اور بعد میں یہ ایک فیشن بن گیا۔ ابتدائی دور میں بال سنوارنے کی ایک رسم بن گئی تھی۔ بہت سارے وحشی قبیلوں کے مرد اور عورتیں بالوں کو پیچھے سے باندھ کر ان میں خاص پرندوں کے پر لگا لیا کرتے تھے۔ یہ رسم افریقہ وغیرہ میں آج بھی رائج ہے۔ چینیوں میں چوٹی کی رسم مرد اور عورتیں دونوں میں تھی۔ عیسائی راہبوں میں سر کی چندیا منڈوانے کی رسم تھی۔ بہت سے ملکوں میں خادمائیں اپنی لٹیں کھلی چھوڑ دیتی تھیں اور بیویاں جوڑے گوندھتی تھیں۔

بالوں کو رنگنے، ان کا رنگ بدلنے، گھنگھرالے بنانے، چوٹیاں ڈالنے، ان میں تیل لگانے، حنابند کرنے، خوشبو لگانے کاٹ کر مختلف وضع پر ڈھالنے، انھیں موڑنے، مصنوعی بال لگا کر جوڑے کو موٹا کرنے، جالی سے انھیں ڈھکنے، مختلف قسم کے پھولوں، پتیوں، کنگھیوں، زیورات، پروں، پٹوں وغیرہ سے انھیں سنوارنے اور سجانے کی رسم بھی سماج کے ابتدائی دور سے آج تک چلی آرہی ہے۔ سماج کی ترقی کے ساتھ اس میں نزاکت و نفاست بڑھتی رہی ہے۔ ایلورا، اجنتا اور دوسرے قدیم مندروں میں جو مجسمے اور تصویریں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بناؤ سنگھار کرکے اور خاص طور پر بالوں کے جوڑے بنا کر انھیں کتنا خوبصورت بنالیتی تھیں۔ بال سنوارنا آہستہ آہستہ ایک فن بن گیا اور عہد وسطی تک اسے اتنی ہی اہمیت حاصل ہوگئی جتنی خوش پوشاکی کو حاصل تھی۔ اس کے بعد سے عورتوں کے بال لمبے، چھوٹے، بڑے ہوتے رہے اور ان کو سنوارنے کے نئے نئے ڈیزائن ایجاد ہوئے اور آج بال بنانے کی بے شمار دوکانیں ہر شہر میں قائم ہیں۔

ہندوستان جیسے قدیم ملک میں بالوں سے متعلق کئی رسم و رواج موجود ہیں۔ مثلاً برہموں کا چوٹی رکھنا، زمانہ قدیم میں مردوں کا اپنی چوٹی لمبی رکھنے کا خاص اہتمام کرنا اور بچوں کے منڈن کو ایک متبرک تقریب کے طور پر منانا وغیرہ۔

چوٹی اور بال منڈوانا ہندوستان میں برا سمجھا جاتا ہے۔ چتا کو آگ لگانے والا اپنے سر کے بال منڈوا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بال منڈوا کر گدھے پر سوار کروانا یہاں کا پرانا رواج ہے جس سے سماج میں بے عزتی اور سزا دونوں مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ چونکہ سر کے بالوں کو خوبصورتی سے متعلق سمجھا جاتا ہے اس لیے بیوگان کا سر منڈوانے کا پرانا رواج تھا جو گذشتہ صدی تک قائم رہا۔ تاکہ وہ اپنے کو توجہ کے قابل نہ سمجھیں اور نامحرموں کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔

ایشورچند ودیاساگر نے جب بیواؤں کی شادی کے سلسلے میں قانون بنوانے کی کوشش کی تب انھوں نے اسی رسم قبیح کی طرف بھی توجہ دی اور حجاموں سے عہد لیا کہ وہ بیواؤں کا سر نہیں منڈوائیں گے۔

ہندستان میں بدھ بھکشو اور جین سادھو اپنا سر منڈواتے ہیں۔ کچھ اور سادھو دوسرے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان میں 'ناوگھڑ' اور 'اداسی' دونوں مدرسۂ فکر جٹاؤں کو بڑھانے پر یقین کرتے ہیں۔

سکھ حضرات مذہبی اعتبار سے سر کے پورے بال اور داڑھی رکھنے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ مسلم حضرات بھی داڑھی رکھنے کو سنت سمجھتے ہیں اس کے علاوہ بدلتے ہوئے فیشن کے اعتبار سے قلمیں، لمبی مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی کا بھی رواج پایا جاتا ہے۔ ہندستان میں آج کل اکثریت معمولی انگریزی کٹ بال رکھنا پسند کرتی ہے اور خواتین میں ہمیشہ کی طرح لمبے اور گھنے بال خوبصورتی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ ماڈرن نسل کی لڑکیاں باب کٹ بھی رکھواتی ہیں۔ بالوں کا سماج اور تمدن سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ ذات، طبقہ، سماجی اور خاندانی حیثیت وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں۔ سماجیات دانوں کے لیے بالوں سے متعلق رسم و رواج کا

مطالعہ دلچسپی کا باعث رہا ہے۔

بالفور اعلان (Balfour Declaration): اعلان بالفور سے مراد اس خط کا متن ہے جسے 2/ نومبر 1917 کو برطانیہ کے خارجہ سکریٹری آرتھر جیمس بالفور (Arthur James Balfour) نے حکومت برطانیہ کی جانب سے ایک صیہونی رہنما لائینل والٹر روتھس چائلڈ (Lionel Walter Rothschild) کو لکھا تھا۔ اس خط میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے "ایک قومی وطن" (National Home) قائم کرنے میں مدد دے گی اور ملک میں ایسے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور انتظامی حالات پیدا کرے گی جس سے یہودیوں کے لیے قومی وطن کے قیام کی راہ ہموار ہو اور تمام غیر یہودی فلسطینی باشندوں کے قومی، معاشی اور مذہبی حقوق کے تحفظ کی ضمانت بھی دی جاسکے۔

خط کا متن درج ذیل ہے:

"ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کو آسان اور سہل بنانے کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کرے گی لیکن یہ امر واضح رہنا چاہیے کہ کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو فلسطین کی موجودہ غیر یہودی اقوام کے معاشرتی اور مذہبی حقوق کے منافی یا دوسرے ملکوں میں رہنے والے یہودیوں کے حقوق اور ان کی سیاسی حیثیت کے لیے مضرت رساں ہو۔"

اعلان بالفور سے یہودیوں کے قلوب میں امید کی کرن جگمگا اٹھی اور انھیں اپنا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا۔ چنانچہ یہی اعلان آگے چل کر صیہونیت (فلسطین کو یہودی مملکت بنانے کی تحریک) کے مطالبات کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیے جانے کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اتحادی طاقتوں نے اعلان بالفور کی تائید اور برطانیہ اور فرانس نے سان ایمو کانفرنس میں اس کی توثیق کردی تھی۔ پھر برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کرلیا اور 1920 میں اس اعلان کو معاہدہ سیورز کے متن میں شامل کردیا گیا۔ اس کے بعد 24/ جولائی 1922 کو انجمن اقوام نے بھی اس کی تائید کرکے فلسطین کی نگرانی برطانیہ کے سپرد کردی تاکہ وہ وہاں یہودیوں کے لیے قومی وطن کی تشکیل کرسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پہلی عالمی جنگ ختم ہوتے ہی برطانیہ نے فلسطین میں براہ راست اپنی حکومت قائم کرکے یہودیوں کی آبادکاری شروع کردی۔ مئی 1939 میں برطانیہ میں یہودی آبادکاری پر مکمل پابندی عائد کردی گئی۔ صیہونیوں نے برطانیہ کی اس نئی پالیسی کی سخت مذمت کی اور اسے عربوں کو خوش کرنے کی پالیسی قرار دے کر مسترد کردیا۔ ان مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں فلسطین کی سرزمین پر 1948 میں اسرائیل کے نام سے یہودی مملکت کا قیام عمل میں آگیا اور بالآخر بالفور اعلان کے عزائم کی تکمیل ہوگئی۔

بال مزدوری (Child Labour) : ہندستان جیسے ملک میں جہاں ہر قسم کے روزگار میں مشقتی ترجیحات (Labour Intensive) زیادہ ہیں اور سرمایہ کارانہ ترجیحات (Capital Intensive) پس منظر میں رہتی ہیں، عموماً صنعت و حرفت یا کاشتکاری میں خاندان کے خاندان یا پھر پیشہ ور مزدور ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ہندی سماج میں کیونکہ زمانۂ قدیم سے تعلیم کچھ طبقوں یا ذاتوں کے مخصوص تھی اس لیے عوام کی اکثریت کسی نہ کسی پیشے سے جلد از جلد منسلک ہو جاتی تھی ۔ اس لیے بچوں کا کام کرنا ہمارے ملک میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے زمانۂ قدیم کے غلام، قرون وسطیٰ میں خواجہ سرا اور عہد حاضر میں بال مزدور سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

آج کل اس مسئلے کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ کیونکہ یہ ہندستان کا ہی نہیں بلکہ ترقی پذیر ملک کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ اب اس سلسلہ میں سائنٹفک انداز میں کام ہونا شروع ہوگیا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے بچہ کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن اس تعریف میں اختلاف ہے۔ مثلاً ہندستان کے آئین میں آرٹی کل 24 کے تحت 16 سال سے کم عمر والے انسان کو بچہ کہا گیا ہے۔ جبکہ اقوام متحدہ کنونشن برائے حقوق اطفال آرٹی کل 1 میں 18 سال سے کم عمر افراد کو بچہ کہا گیا ہے۔ 1986 میں پاس ہونے والے بال مزدور ایکٹ میں بچہ چودہ سال سے کم عمر افراد کو ہی کہا گیا ہے۔ آئی.ایل.او بین الاقوامی محنت کش تنظیم نے 1983 میں بال مزدور کی تعریف اس طرح کی ہے۔ "بال مزدوروں میں قبل از وقت بالغ لوگوں کی زندگی گزارنے والے بچے شامل ہیں وہ کافی گھنٹوں تک کم مزدوری پر وہاں کام کرتے ہیں جہاں ماحول ان کی صحت، ذہنی اور جسمانی ترقی کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ عموماً وہ اپنے خاندان سے دور رہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کو موثر تعلیم اور تربیت کے مواقع فراہم نہیں ہوتے جس کی وجہ سے ان کو بہتر مستقبل سے محروم رہنا پڑتا ہے۔"

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دنیا کے تمام تر ممالک میں بچہ مزدوری کے خلاف جہاد چھیڑا جاچکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تعداد کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ منسٹری آف لیبر کے سکریٹری لکشمی دھر مسرا جو کہ بچہ مزدوری کے خاتمہ کی مہم میں بے حد سرگرم ہیں اس سلسلے میں بتاتے ہیں کہ 1991 کی مردم شماری کے مطابق ہندستان میں بچوں کی کل آبادی 297 ملین تھی جن میں 5-14 سال کے درمیان عمر والے بچے 203 ملین تھے۔ ہر سال 21 ملین بچے پیدا ہوتے ہیں اور 13 ملین (رام آہوجہ کے مطابق 18 ملین) بچے آبادی میں جڑ جاتے ہیں۔ اس طرح 1997 تک 78 ملین ان میں جڑ چکے تھے۔ اس وقت بچوں کی تعداد تقریباً 275 ملین تھی۔ اس میں سے اسکول جانے کے قابل بچے 255 ملین تھے۔ ان میں سے 112 ملین بچے باقاعدہ اسکول جاتے تھے اور 7 ملین غیر رسمی اسکولوں میں پڑھتے تھے اس طرح تقریباً 130 ملین بچے اسکول نہیں جاتے اور کسی نہ کسی باضابطہ اور بے ضابطہ طور پر روزگار سے جڑے ہیں۔ آئی.ایل.او اور یونی سیف نے اس تعداد کو 100 ملین بتایا ہے۔

بچہ مزدوری کو کئی درجات اور طبقات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً (1) کاشتکاری سے متعلق، (2) صنعت و حرفت سے متعلق، (3) خدمت گاری سے متعلق۔

کاشتکاری سے متعلق : اپنے گھر میں یا محنتانہ لے کر کاشتکاری کا کام کرنا ہمارے ملک کا قدیمی پیشہ ہے۔ اس کام میں لگے ہوئے بال مزدوروں کی اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔ (1) مہاجر مزدور، (2) نادیدہ مزدور، (3) بندھوا مزدور۔

صنعت و حرفت سے متعلق : چھوٹے یا بڑے صنعتی اداروں میں کام کاجی بچوں کی تعداد کافی سے زیادہ ہے۔ یہ اکثر ہجرت کرکے بڑے شہروں میں آتے ہیں۔ قالین بافی، ماچس سازی، شیشہ سازی وغیرہ صنعتیں بچوں کی مزدوری پر انحصار کرتی ہیں۔

خدمت گاری سے متعلق : گھریلو نوکروں کی طرح اور ڈھابوں وغیرہ میں کام کرنے والے بچے الگ قسم کی دشواریوں کا سامنا کرتے ہیں۔ اس میں سے اکثر مہاجر ہوتے ہیں۔ خادمانہ سیکٹر میں وہ ذاتی اور نجی اکائیوں کی طرح نامعلوم مزدور اور تنخواہ دار مزدور کے طور پر کام کرتے ہیں۔

نامعلوم مزدور، مہاجر مزدور اور بندھوا بچہ مزدور کی وضاحت درج ذیل ہے۔

نامعلوم مزدور : یہ وہ مزدور بچے ہیں جن کا اندراج نہ اسکول میں ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کارخانے میں وہ غیر منظور شدہ چھوٹے چھوٹے کارخانوں یا کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ سن 1996 میں آئی.ایل.او نے اس قسم کے بچوں کی تعداد تقریباً 56 ملین بتائی ہے۔ ہندستان میں 100 ملین (دس کروڑ) بچے اسکول نہیں جاتے۔ ان میں سے 56 ملین بچے نامعلوم کام کرتے ہیں۔ نہ اسکول جاتے ہیں نہ کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔

مہاجر مزدور : مہاجر بال مزدور وہ بچے ہیں جو گاؤں سے چھوٹے شہروں اور قصبوں سے بڑے شہروں میں آجاتے ہیں۔ انہیں کام تو مل جاتا ہے لیکن اکثر ان کو اپنے خاندان سے دور رہنا پڑتا ہے۔ اکثر پورے خاندان ہی ہجرت کرلیتے ہیں۔ کبھی کبھار بچے والدین کی سختیوں سے تنگ آکر ہجرت کرتے ہیں اور بغیر کسی منزل کے یہاں وہاں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ان میں سڑک چھاپ بچے (Street Children) بھی شامل ہیں جو گلیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور سڑکوں پر زندگی گزار دیتے ہیں۔

تقریباً 78 فی صد کام کاجی بچے کھیتوں میں کام کرتے ہیں، ان میں بچیوں کی تعداد تقریباً 50 فی صد ہے۔

بال مزدوری کے لیے ذمے دار صرف غریبی ہی نہیں ہے بلکہ بچوں کی بہتات، ماں باپ کی بے حسی اور کام دینے والوں کا بچوں کو ملازمت دینے میں ترجیح دینے کا رویہ اس کے اسباب ہیں۔

ہندستان کے آئین میں آرٹی کل 23، 24، 39، 45 اور 51 بچہ مزدوری کی پوری طرح مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ 1986 میں بال مزدوری ایکٹ پاس کیا گیا جس میں کچھ شرائط کے ساتھ کچھ صنعتوں میں ان کو کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ نئی بال مزدور پالیسی 1987 میں بنی۔ اس دوران بین الاقوامی بال مزدوری کے خاتمے کا پروگرام جو آئی.ایل.او کے ذریعہ چلایا گیا، نافذ ہوا۔ یہ IPEC کے نام سے دسمبر 1991 سے تمام بال مزدوری کے خلاف جدوجہد کرنے والا ممالک پر لاگو کیا گیا۔

ہندستان میں یہ اس طرح کی پہلی مہم نہیں تھی۔ 1929، 1944، 1979 میں بال مزدوری کی جانچ کے سلسلے میں کمیٹیاں بنیں اور برٹش راج میں کئی قانون بھی بنے۔ اس کے باوجود آج تک دنیا کا سب سے بڑا بچہ مزدور سپلائر ہندستان ہی ہے۔ آج ہندستان میں 76 NCLP یعنی نیشنل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

چائلڈ لیبر پروجیکٹس 13 ریاستوں کے 133 ضلعوں میں چلائے جارہے ہیں۔ یہ ان اضلاع میں ہیں جہاں بال مزدوری کی روایت ہے۔ یہاں غیر رسمی تعلیم کے مراکز مخصوص اسکول، نائٹ اسکول، رین بسیرے اور کمیونٹی سینٹر وغیرہ چلائے جاتے ہیں۔ عوام میں بیداری پیدا کی جاتی ہے اور بال مزدوروں کی مشکلات کو سلجھایا جاتا ہے۔ سرکاری کوششوں کے علاوہ یونی سیف اور آئی.ایل.او دونوں اس میں پوری طرح دلچسپی لے رہے ہیں۔ بال مزدوری میں ایک زاویہ بچیوں کے استحصال کا بھی ہے۔ عموماً لڑکیوں سے نچلے درجے کی مزدوری کروائی جاتی ہیں۔ شوکاسی میں بچیاں کام کرتی ہیں اور ان کے بھائی اسکول جاتے ہیں۔ عموماً بچیاں گھر کے کام اور چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کے لیے اسکول جانے سے رہ جاتی ہیں۔ اسکول نہ جانے والے بچوں میں سے 20 فی صد بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کے لیے رک جاتے ہیں جن میں سے اکثر چھ سال سے کم ہوتے ہیں۔ ان میں 80 فی صد لڑکیاں ہوتی ہیں۔ لڑکیاں غیر منظم سیکٹر میں کام کرتی ہیں اور کافی کم مزدوری پاتی ہیں اس کے بعد گھر کے کاموں میں مشغول ہوجاتی ہیں۔ ان کو بچپن گزارنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ بال مزدوری کی عبرت آمیز مثالوں میں بچہ جسم فروش اور بچہ سپاہی شامل ہیں جو اکثر دہشت گردوں کے ذریعہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بچہ جسم فروشی اور پورنوگرافی کے لیے لڑکے اور لڑکیوں دونوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔

پوشیدہ اور غیر منظم بچہ مزدوری کو بند کرنا بے حد مشکل ہے۔ البتہ منظم سیکٹر میں بچہ مزدوری کو ختم کرنے کے لیے بین الاقوامی اداروں نے کافی مدد کی ہے۔ 1992 میں امریکا میں بچہ مزدوری سے بنی مصنوعات پر پابندی لگا دی اسی قسم کا مہم یورپ میں بھی چلی۔ فی الوقت کم سے کم ہندستان کے بڑے شہروں میں بیداری پھیل رہی ہے۔ یہاں رضاکارانہ فلاحی تنظیموں کی کارگزاریوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ سوامی اگنی ویش کی بندھوا مکتی مورچہ، ریتا پانے کرکی بٹر فلائز اور ڈاکٹر نیتی مہانتی کی جگیانسو ٹرائبل ریسرچ سینٹر کے علاوہ بھی دہلی اور ممبئی میں بے شمار تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ اس وقت گورنمنٹ نے 'چائلڈ لائن' قائم کرکے بال مزدوروں کے لیے 24 گھنٹے ایمر جنسی کارروائی بیڑا اٹھایا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک کے مقابلے میں بھارت نے اس سلسلے میں کافی نمایاں کام کیا ہے اس کے باوجود ابھی تک بہتری کی صورت پیدا نہیں ہوئی ہے۔

یہ معلومات نیشنل لیبر انسٹی ٹیوٹ نوئڈا کی رپورٹوں اور ڈاکٹر لکشمی دھر مسرا کی مضامین پر مبنی ہیں۔

بانڈونگ کانفرنس (Bandung Conference) : یہ کانفرنس ایشیائی اور افریقی ملکوں کے سربراہوں کی وہ پہلی چوٹی کانفرنس تھی جس کا انعقاد کولمبو طاقتوں کے ایما پر انڈونیشیا میں واقع بانڈونگ نامی جزیرہ میں اپریل 1955 میں عمل میں آیا۔ کولمبو طاقتوں سے مراد ان ایشیائی ملکوں سے ہے جنھوں نے اپریل 1854 میں لنکا کی راجدھانی کولمبو میں جمع ہوکر اپنے اور نوآزاد ایشیائی اور افریقی ملکوں کے درمیان قریبی تعاون کے لیے ایک سمجھوتہ کیا تھا۔ کولمبو کے اس اجتماع میں ہندستان، پاکستان، برما، لنکا اور انڈونیشیا کی حکومتوں کے سربراہ شریک ہوئے تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا معاہدہ کی تنظیم (SEATO) سے وابستگی اختیار کرنے کے بعد 1954 کے اخیر میں پاکستان نے کولمبو طاقتوں کے گروہ سے تعلقات منقطع کرلیے تھے۔ ہندستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو اور انڈونیشیا کے صدر احمد سوکارنو کے ایما پر ہی کولمبو طاقتوں نے اپریل 1955 میں بانڈونگ ایشیائی افریقی کانفرنس کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس کانفرنس میں 28 ملکوں نے شرکت کی تھی جن میں افغانستان، برما، کمبوڈیا، لنکا، چین، مصر، حبش، گھانا، ہندستان، انڈونیشیا، ایران، عراق، جاپان، اردن، لاؤس، لبنان، لائبیریا، لیبیا، نیپال، پاکستان، فلپائن، سعودی عرب، سوڈان، شام، تھائی لینڈ، ترکی، شمالی ویت نام اور یمن شامل تھے۔ اس کانفرنس کی کارروائیوں میں سرخ چین کے وزیراعظم چواین لائی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ دراصل ہندستان نے تبت پر چین کی بالادستی تسلیم کرلینے کے بعد 29 اپریل 1954 کو چین کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کیے تھے جسے پنچ شیل معاہدہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے ابتدائیہ میں باہمی روابط کے قیام کے سلسلے میں پنچ شیل یعنی پرامن بقائے باہم کے پانچ اصولوں کو رہنما تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ پانچ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

(1) ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور اقتدار اعلیٰ کا احترام
(2) عدم جارحیت
(3) ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت
(4) مساوات اور باہمی منفعت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(5) پرامن بقائے باہم اور اقتصادی تعاون۔

بعدازاں وزیراعظم ہند جواہر لال نہرو اور وزیراعظم چین چواین لائی نے ایک دوسرے کے ملکوں کا دورہ کرکے ان اصولوں کی ازسرنو توثیق کی اور یہ طے کیا کہ پنج شیل کے ان اصولوں کو بانڈونگ میں منعقد ہونے والی افریقی و ایشیائی کانفرنس کے رہنما اصولوں کے طور پر اختیار کرلیا جائے گا۔ چنانچہ بانڈونگ کانفرنس میں دس اصول وضع کیے گئے جن میں پنج شیل کے علاوہ کمیونسٹ مخالف ملکوں کے تجویز کردہ پانچ دوسرے اصولوں کو بھی اپنا لیا گیا۔

بانڈونگ کانفرنس کی دسویں سالگرہ کے موقع پر چین اور انڈونیشیا نے یہ طے کیا کہ الجزائر کی راجدھانی الجزیرہ میں جون 1965 میں دوسری افریقی ایشیائی کانفرنس منعقد کی جائے گی لیکن چین اور روس کے درمیان اختلافات رونما ہو جانے کے سبب اور عین وقت پر الجزائر میں فوجی انقلاب برپا ہوجانے کی وجہ سے اس کانفرنس کو ملتوی کردیا گیا اور پھر اس کے انعقاد کا خیال ہی ترک کردیا گیا۔

تاہم بانڈونگ کانفرنس بین الاقوامی تعلقات اور قیام امن کے سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

باہمی رضامندی سے طلاق (Divorce By Mutual Consent): عدالت میں زن و شوہر کی باہمی رضامندی سے طلاق کی درخواست دی جاسکتی ہے۔ اس درخواست میں بتلانا ہوگا کہ دونوں ایک سال سے ایک دوسرے سے الگ ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے اور دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ شادی ختم کردی جائے۔ اگر ایسی درخواست درخواست دینے سے اٹھارہ مہینے تک واپس نہ لی جائے تو عدالت مناسب دریافت کے بعد یہ حکم دے سکے گی کہ شادی منسوخ کی جاتی ہے اور نتیجتاً طلاق کی ڈگری دے دی گئی۔ باہمی رضامندی سے طلاق کی درخواست شادی کے ایک سال کے اندر نہ دی جاسکے گی۔ بجز خاص صورتوں کے جب عدالت مطمئن ہوجائے کہ فریق ثانی پر ظلم ہورہا ہے۔ ایسی صورت میں بھی اگر عدالت کوئی حکم دے تو اس کا نفاذ شادی کی تاریخ سے ایک سال پہلے تک نہ ہوسکے گا۔

جب ایک شادی طلاق کی ڈگری کے ذریعہ ختم ہوچکی ہو اور اپیل کی مدت ختم ہوچکی ہو اور کسی فریق نے اپیل بھی نہیں کی اور یہ کہ اگر اپیل دائر کیے جانے کے بعد خارج ہوچکی ہو تو ایسی صورت میں ہر دو فریق کو اس کا اختیار ہوگا کہ دوسری شادی کرے۔

اگر کسی شادی کا اختتام طلاق یا انفساخ پر ہوگیا ہو اور ازدواجی زندگی کے دوران استقرار حمل ہوگیا ہو تو جو اولاد بعد میں ہوگی وہ قانونی ہوگی اور اس کو والدین کی جائداد پر حق ہوگا۔

بحری قزاقی (Piracy): پہلے سمندر میں ہتھیاروں کے استعمال کرنے کے ذریعہ جو ڈکیتی کی جاتی ہے اسے بحری قزاقی کہتے ہیں۔ چونکہ بحری قزاقی انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے نہ کی کسی ایک قوم کے خلاف اس لیے بحری قزاقی کے مجرم کا مقدمہ کسی بھی عدالت میں چلایا جاسکتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں تجارتی جہازوں کو غرق کرنے کو بحری قزاقی کہا جاتا تھا لیکن اس عمل کو بحری قزاقی کہنا غور طلب ہے اس لیے ہوجاتا ہے کہ یہ عمل ایسی مملکت کی جانب سے کیا جاتا ہے جو برسر جنگ تھیں۔ بہرحال واشنگٹن میں 1921 میں ایک معاہدہ مرتب کیا گیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ ایک ایسے شخص کی جانب سے جو کسی ملک کی ملازمت میں ہو جہاز کی تلاش بین الاقوامی قانون کی اصطلاح میں بحری قزاقی کہلائے گا۔

بدل (Consideration): اگر ایجاب (Offer) اور قبول (Acceptance) مکمل ہوجائے گا اور اگر ایجاب کنندہ (Offerer) یا قبول کنندہ (Offeree) اس کام کی تکمیل نہ کرے جو از روئے معاہدہ تکمیل کرنا تھا تو فریق متضرر چارہ کار قانونی چارہ جوائی کرسکتا ہے۔ کیوں کہ دوسرے فریق معاہدہ نے اس شرط کی تکمیل نہیں کی جو اسے تکمیل کرنی تھی۔ لیکن قانون کے تحت مزید ایک شرط کی تکمیل معاہدے کے لیے ضروری ہے فریق متضرر کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ معاہدہ تحریری اور دستخطی تھا اور اس معاہدے کے لیے بدل (Consideration) قرار داد ہوا پہلی شرط تو موجودہ قوانین کے تحت ایک ضابطے کی تکمیل ہے لیکن دوسری شرط جو بدل سے متعلق ہے وہ اس قدر منطقی تو نہیں جیسا کہ ہونی چاہیے لیکن ایک تاریخی پس منظر ضرور رکھتی ہے۔ انگلستان میں سولھویں صدی کے ختم تک قانونی وکلاء اور مبصرین عدالتوں میں اس حد تک بحث کر پاتے تھے کہ فریق مخالف نے معاہدے کی تکمیل نہیں کی ہے۔ جہاں تک اخلاقی ذمہ داری کا تعلق ہے عدالتوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ اس فریق کی مدد کریں جس کے فائدے کے لیے معاہدہ کیا گیا ہو اگرچہ بدل (Consideration) کسی

تیسرے فریق نے دیا ہو لیکن بعد میں عدالتوں نے یہ تجویز کیا کہ کسی معاہدہ کا فریق متضرر صرف اس صورت میں دعویٰ کرسکتا ہے۔ جبکہ اس معاہدے کی تکمیل کے لیے بدل (Consideration) کا قراردلو بھی ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر عدالتوں نے یہ تجویز کیا کہ معاہدے کی تکمیل کے لیے ایجاب (Offer) اور قبول (Acceptance) کے ساتھ بدل (Consideration) کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ بدل (Consideration) وہ عمل یا وعدہ ہے جو ایک فریق معاہدہ کی طرف سے کیا جائے۔

اور خود دوسرے فریق معاہدہ کی طرف سے اس معاہدہ کی تکمیل کی بابت بطور بدل (Consideration) قبول کیا جائے۔

بلیک اسٹون (Black Stone) جس نے اپنے لیکچروں میں کہا ہے کہ کوئی بھی معاہدہ جو بغیر بدل (Consideration) کے کیا جائے کالعدم ہے اور کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس نے بدل (Consideration) کی تعریف یوں کی ہے کہ بدل (Consideration) ایک معاوضہ ہے جو ایک فریق معاہدہ دوسرے فریق معاہدہ کو دینا طے کرے۔

بدل کی موزونیت (Adequacy of Consideration):

اول اول عدالتوں نے یہ تجویز کیا کہ وہ بدل کی موزونیت یا معقولیت (Adequacy of Consideration) کے متعلق کوئی چرچا نہیں کریں گی۔ بہ الفاظ دیگر وہ اس کا تقابلی تجزیہ نہ کرے گی کہ جس کام کی تکمیل کا معاہدہ کیا گیا ہے۔ آیا فی الواقعی بدل (Consideration) کا تعین اس کام کی نوعیت کے اعتبار سے کافی اور معقول ہے یا نہیں اور جبکہ ابتداً عدالتیں معاوضے کی معقولیت (Adequacy of Consideration) کے بارے میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کوئی فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں تاہم بعض عدالتی فیصلہ جات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں عدالتیں اس حد تک تیار ہوئیں کہ اس مسئلے پر بھی غور کیا جائے اور ایسے معاہدوں کے قانونی جواز پر تبصرہ کیا جن کا بدل (Consideration) واقعات کی غلط تعبیر پر مبنی تھا لیکن اگر واقعات کی تعبیر صحیح مانی گئی تو عدالتوں نے ایسے معاہدے کے جواز پر حرف گیری نہیں کی۔ اس وقت عدالتوں کا یہ رجحان تھا کہ کوئی معاہدہ اگر جزاً قانون کے مطابق ہو تو ایسے معاہدے کو بالکل قرار نہ دیا جائے البتہ ایسے معاہدے کو اس وقت قابل عمل قرار دیا جائے جب وہ قانونی نقص دور ہوجائے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بدل کی موزونیت (Adequacy of Consideration) کے بارے میں غور کرنے سے بعض وقت بیع (Sale) اور ھبہ (Gift) میں امتیاز کرنے میں دشواری ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص اپنی نئی امبیسڈر کار کسی دوسرے شخص کو بغیر کسی معاوضہ کے دینے کا وعدہ کرلے تو یقیناً کسی بدل (Consideration) کا تصور پیدا نہ ہوگا۔ اور نہ اسے معاہدے کی تعریف میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر پہلا شخص اپنی نئی امبیسڈر کار کسی کو دینے کا وعدہ کرلے بشرطیکہ وہ اسے گیرج سے لائے تب بھی کسی بدل (Consideration) کا تصور قائم نہ ہوگا اور اسے بھی معاہدے کی تعریف میں نہیں لایا جاسکتا۔ بہ شرطیکہ دوسرا شخص امبیسڈر کار کو گیرج سے لائے وعدہ کا بدل نہیں ہوسکتا البتہ اسے شرط ماقبل کیا جاسکتا ہے۔ ان پورے معاملات کو معاہدہ بیع نہیں کہا جائے گا بلکہ مشروط ھبہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن پہلا شخص اگر یہ وعدہ کرے کہ وہ اپنی نئی امبیسڈر کار دوسرے شخص کو ایک روپیہ میں دے گا تو ایسی صورت میں بدل (Consideration) کا اور اس کے ساتھ ساتھ معاہدے کا بھی تصور ہوگا۔

ایک اور بات اس سلسلے میں قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی شخص فرائض منصبی کی ادائیگی کے سلسلے میں کسی شخص کے لیے کوئی کام انجام دے تو اس میں بدل (Consideration) کا تصور پیدا نہ ہوگا۔ مثلاً قانونی تصور یہ نہیں ہے کہ کوئی ذمہ دار ملازم سرکار اپنے منصبی کی ادائیگی کرتے ہوئے کسی شخص کی مدد کرے اور اس کا بدل (Consideration) طے کرے لیکن بعض وقت ایسی صورت میں بھی عدالت نے ایک ملازم سرکار کو معاوضہ دلانے کے متعلق فیصلہ کیا ہے۔ مقدمہ (England Vs Davidson) میں مدعاعلیہ نے یہ اعلان اخبار میں دیا تھا کہ جو شخص کسی مفرور شخص کی بابت اطلاع دے گا اسے انعام دیا جائے گا۔ ایک پولس کانسٹبل نے اس مفرور شخص کی بابت اطلاع دی اور گواہی بھی دی۔ مدعاعلیہ نے یہ استدلال کیا کہ پولس کانسٹبل نے محض اپنے فرائض کی ادائیگی کی ہے اس لیے انعام کا مستحق نہیں ہے۔ اس مقدمہ میں عدالت نے حسب ذیل الفاظ میں فیصلہ کیا۔

میرے خیال میں بعض خدمات ایسی بھی ہیں جن کی ادائیگی ایک کانسٹبل کے فرائض میں داخل تھیں اور نتیجتاً یہ خدمت جو کانسٹبل نے کی ہے اس معاہدے کا جزو قرار پاسکتی ہے۔

برتاوی علوم (Behavioural Science):

برتاوی علوم میں انسانی برتاؤ کا سائنٹفک مطالعہ کیا جاتا ہے۔ برتاوی علوم اور سماجی علوم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں محض نقطہ نظر کا فرق ہے۔ برتاوی علوم میں سماجیات انسانیات (باستثنائے آثاریات تکنیکل لسانیات اور جسمانی انسانیات) نفسیات (باستثنائے جسمانی نفسیات) اور حیاتیات، معاشیات، جغرافیہ، قانون اور سیاسیات کے برتاوی پہلو شامل ہیں۔ برتاوی علوم کی اصطلاح سب سے پہلے ریاست ہائے متحدہ امریکا میں 1950 کے بعد کے دہے میں ہوئی۔ اور دس پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں اسے امریکی جامعات اور دوسرے ممالک میں بھی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ دراصل فورڈ فاونڈیشن کی ایک کمیٹی نے 1951 سے پہلے جو تحقیقاتی کام شروع کیا تھا اس کی رپورٹ 1952 میں تیار ہوئی جس میں برتاوی علوم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ گذشتہ ربع صدی میں برتاوی علوم پر سینکڑوں مقالے شائع ہوچکے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ برتاوی علوم کے خدوخال کا قطعی تعین ابھی تک نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس اصطلاح سے واضع ہے برتاوی علوم میں مختلف سماجی علوم کے ان پہلوؤں کا سائنسی تجزیہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن کا تعلق افراد اور گروہوں کے واقعی برتاؤ سے ہو مثلاً لوگوں کا عملی برتاؤ ان کے عقائد رجحانات توقعات محرکات اور احساسات کس طرح تشکیل پاتے ہیں اور کس طرح ان کی سماج میں عمل آوری ہوتی ہے۔ ان علوم کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی برتاؤ کے محرکات اور مضمرات کا صحیح تجزیہ کرنے سے سماجی بین عمل کو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔ دراصل برتاوی علوم کے نئے نقطہ نظر نے سماجی علوم کی ایک جہت کو زیادہ نمایاں اہمت عطا کردی ہے۔ برتاوی علوم کے موضوع بحث میں علاقائی اور بین الاقوامی سیاسی برتاؤ ذرائع ابلاغ و ترسیل اقدار اور عقائد اور مختلف گروہوں کے سماجی اور معاشی عمل اور تمدنی روعمل کے موضوعات شریک ہیں اور اس طرح برتاوی علوم کے دائرہ میں تمام سماجی علوم کے مشترکہ موضوعات شامل ہیں۔ سماجیات، نفسیات، علم انسان اور سماج کاری (سوشل ورک) خاص طور پر برتاوی علوم کے دائرے میں آتے ہیں۔

برطانوی دستور کی اہم روایات: تاج برطانیہ کے متعلق اہم عمل درآمد اور مفروضہ یہ ہے کہ بادشاہ وقت ہمیشہ وزرا کے مشورے پر عمل کرتا ہے۔ ابتدا میں بادشاہ وقت کابینہ کے اجلاس کی صدارت کرتا تھا لیکن اب یہ عمل جاری نہیں ہے۔ موجودہ عمل کی بنیاد جارج اول کے زمانے میں ہوئی۔ نئے ہندورین بادشاہ انگلستان کے لیے ایک اجنبی شخص تھا وہ نہ صرف انگریزی ہی نہیں جانتا بلکہ انگلستان کے مسائل سے بھی ناواقف تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملک کے تمام کام وال پول (Wal Pole) کے سپرد کردیے جو بادشاہ کی غیر موجودگی میں کابینہ کے اجلاس کی صدارت کرنے لگا۔ اس طرح انگلستان میں وزیراعظم کی خدمت کے قیام کی ابتداء ہوئی۔ وزیراعظم کی خدمت کا سب سے پہلے 1877 میں سرکاری کاغذات میں ذکر ہوا۔ بعد میں پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعہ اسے قانونی درجہ دیا گیا۔ پارلیمنٹ کا یہ قانون 1906 میں نافذ کیا گیا۔

دوسری اہم روایت تاج برطانیہ کے متعلق یہ ہے کہ بادشاہ وقت ہاؤس آف کامنس میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر سے یہ خواہش کرے کہ وہ ایک کابینہ کو تشکیل دے۔ یہ رسم دفعتاً نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قائم ہوئی ہے۔ اقتدار زمانہ کے ساتھ یہ بات سمجھی گئی کہ انھیں اشخاص کو یہ حیثیت وزیر مقرر کرنا چاہیے جو پارلیمنٹ کا اعتماد رکھتے ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب کہ ایوان کی اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو وزارت بنانے کے لیے بادشاہ وقت کی طرف سے دعوت دی جائے اور چونکہ اس لیڈر کو ایوان میں اکثریت حاصل رہتی تھی اس لیے بادشاہ وقت کو مملکت کے مختلف مسائل کو شخصی طور پر حل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ وزیراعظم کو وزرا کے انتخاب میں پوری پوری آزادی تھی۔ وزیراعظم اور دیگر وزرا ایک ہی جماعت کے رکن ہوا کرتے تھے۔

ایک اور اہم روایت یہ ہے کہ جب کوئی مسودہ قانون پارلیمنٹ کے دونوں ایوان سے منظور ہوتا ہے اور بادشاہ وقت کے پاس دستخط کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو بادشاہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پاس شدہ مسودہ قانون پر دستخط ثبت کرے۔ بادشاہ وقت اس مسودہ قانون کے متعلق جو پارلیمنٹ سے منظور ہوا ہے کوئی استردادی تجویز نہیں کرسکتا کیونکہ اسے اس کا علم ہے کہ ایسا فعل اس کے لیے کئی دشواریوں کا سبب بن سکتا ہے ایک اور اہم رواج یہ ہے کہ برطانیہ کا بادشاہ پارلیمنٹ کو اپنی صوابدید سے تحلیل کرسکتا ہے لیکن پارلیمنٹ کی تحلیل کا حکم وزرا کے مشورے کے بغیر نہیں دے سکتا دستور برطانیہ میں ایک عام مقولہ ہے کہ بادشاہ کبھی غلطی نہیں کرتا۔ اس فقرے کے یہ معنی ہیں کہ بادشاہ وقت پر کسی ایسے فعل یا ترک فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوسکتی ہے جو اس کے نام سے کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہ وقت وزرا کے مشورے کے بغیر انفرادی طور پر انصرام مملکت کے متعلق کوئی حکم صادر نہیں کرسکتا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

برطانوی دستور کے اہم خد و خال اور خصوصیت (Salient Features and Speciality of the British Constitution)

: برطانوی دستور کے کئی اہم خد و خال میں سب سے پہلی بات جو برطانوی دستور کے مطالعہ کرنے والے کو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی دستور کی نوعیت ارتقائی ہے اور رفتہ رفتہ اس نے موجودہ دستور کی صورت اختیار کرلی ہے۔ پریسیڈینٹ ووڈ راولسن (Wood Raw Wilson) نے یہ کہا تھا کہ دستور برطانیہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سیاسی ادارے مسلسل ارتقائی دور سے گزرتے رہے۔

برطانوی دستور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ جزوی طور پر تحریری اور جزوی طور پر غیر تحریری ہے۔ برطانوی دستور کا تحریری جز حسب ذیل دستاویزات پر مشتمل ہے:

(1) میگنا کارٹا (Magna Carta)

(2) پٹیشن آف رائٹ، 1628 (Petition of Rights, 1628)

(3) دی ایکٹ آف سٹلمنٹ، 1907 (The Act of Settelment, 1907)

(4) ایکٹ آف یونین آف انگلینڈ اینڈ اسکاٹ لینڈ (The Act of Union of England and Scotland)

(5) ریفارمس ایکٹ آف 1818, 1822, 1832, 1867, 1884

(6) پارلیمنٹ ایکٹ آف 1911 (Parliament Act of 1911)

(7) دی لوکل گورنمنٹ ایکٹ، 1688, 1890, 1929, 1933 (The Local Government Act 1688, 1890, 1929, 1933)

(8) دی ابڈیکشن ایکٹ آف 1936 (The Abdiction Act of 1936)

(9) دی پارلیمنٹری اینڈ میونسپل الیکشن ایکٹ آف 1872 (The Parliamentry and Municipal Election Act 1872)

(10) اسٹیچوٹ آف ویسٹ منسٹر 1931 (Statute of West Minister 1931)

دستور برطانیہ کا غیر تحریری جز دستور کی حقیقی عمل آوری میں انتہائی اہم رول ادا کرتا ہے۔ بادشاہ، پارلیمنٹ اور دیگر سیاسی امور مملکت کے اہم اجزاء غیر تحریری روایات میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کابینہ کا ادارہ، وزیراعظم کے عہدہ کا تصور، ہاؤس کامنس کے ارکان سے کسی ایک رکن کا بہ حیثیت وزیراعظم کا انتخاب، ہاؤس آف کامنس کے متعلق وزیراعظم اور کابینہ کے ارکان کی ذمے داری پارٹی سسٹم کا قیام، ہاؤس آف کامنس (House of Commons) میں اسپیکر کی پوزیشن۔ چونکہ یہ دستوری روایات دستور برطانیہ کے اہم اور بنیادی اجزاء میں اس لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کا دستور تحریری دستور ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ دستور برطانیہ کے غیر تحریری جز نے دستور کی مجموعی کارکردگی میں ایک انتہائی اہم رول ادا کیا ہے لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ تحریری قوانین میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ایسا وقت بھی دور نہیں جب کہ دستور کے غیر تحریری جز کے ساتھ ساتھ تحریری جز بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم مساوی حیثیت حاصل کرے گا۔

انگلستان میں پارلیمنٹری فارم کی حکومت پائی جاتی ہے۔ عاملہ، مقننہ کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہوتی ہے۔ صرف وہی پارٹی حکومت بناتی ہے جس کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ یہ حکومت اس وقت تک برسر اقتدار رہتی ہے جب تک اس پر ایوان کا اعتماد رہتا ہے اگر کسی وزارت کو ایوان میں شکست ہوجاتی ہے تو اسے استعفیٰ دینا پڑتا ہے۔ ہر وزیر پارلیمنٹ میں اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہے۔ انگلستان میں حکومت کا نظم و نسق عوام کی منظوری کے مطابق ہوتا ہے جس کا اظہار عوام کے منتخبہ نمائندوں کے ذریعے ہاؤس آف کامنس میں کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے انگلستان کا دستور امریکا کے دستور سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

برطانیہ کا دستور لچکدار ہے۔ ممالک متحدہ امریکا میں دستور کی تبدیلی کا طریقہ نہایت پیچیدہ اور دشوار ہے لیکن اس کے برخلاف انگلستان میں دستور میں تبدیلی بہ آسانی کی جاسکتی ہے دستور برطانیہ اسی طریقے سے تبدیل کیا جاسکتا ہے جیسے کہ ایک عام قانون۔ فی الحقیقت دستور برطانیہ میں تبدیلی کا کوئی ایک علاحدہ خاص طریقہ نہیں ہے لیکن چونکہ انگریز قوم کا مزاج اور رجحان انتہائی قدامت پسندانہ ہے اس لیے دستور میں کوئی دور رس اور انقلابی تبدیلی کا قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ابڈیکشن ایکٹ، 1936 (Abdiction Act of 1936) پارلیمنٹ میں پیش ہونے پر صرف نصف گھنٹے میں منظور کیا گیا۔ ہندوستان اور ممالک متحدہ امریکا میں فیڈرل فارم کی حکومت قائم ہے جہاں مختلف صوبوں اور اسٹیٹ کی حکومتوں کو کافی اختیارات دستوری طور پر دیے گئے ہیں اس کے برخلاف دستور برطانیہ میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پورے ملک میں صرف ایک حکومت کا تصور (Unilateral Govt.) ہے۔

دستور برطانیہ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قانون کی برتری اور قانون کی حکومت کو کافی اہم مقام حاصل ہے۔ کسی شخص کو اس وقت تک سزا نہیں دی جاسکتی جب تک یہ کلی طور پر ثابت نہ ہوجائے کہ اس نے ملک کے کسی رائج الوقت قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ اس کا مقام سوسائٹی میں کسی درجے یا مقام کا ہو اسے ملک کے عام قانون کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قانون کی عمل آوری اور پابندی کئی طریقوں سے کی جاتی ہے۔ ایک تو رٹ آف ہیبس کارپس (Writ of Habeas Corpus) کے زائد یا غلط طور پر یا دھوکے سے حبس بیجا میں رکھنے کے سلسلے میں عدالتی چارہ جوئی حاصل کی جاسکتی ہے۔ قانون کی حکومت اور برتری کے قیام کے لیے عدالتوں میں چند ضابطوں کی تکمیل ضروری ہے۔ دستور برطانیہ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں برٹش پارلیمنٹ کی ہمہ گیر برتری کا تصور پایا جاتا ہے۔ دستور برطانیہ کی ایک اور خصوصیت دستور میں اختیارات کی مرکزیت ہے۔ حکومت کو ملک کے مالیہ پر پورا اقتدار و اختیار حاصل ہے۔ ہاؤس آف کامنس ایسے کسی مسودہ قانون پر غور نہیں کرتا جو تاج (یا الفاظ دیگر حکومت) کی جانب سے پیش نہ کیے گئے ہوں۔ کابینہ کو حکومت پر پورا پورا کنٹرول ہے اور اس طرح پورے اختیارات کابینہ میں مرکوز ہیں۔ دستور برطانیہ کی ایک اور خصوصیت اس کے نظریے اور عمل کا فرق ہے۔ یہ صحیح طور پر کہا گیا ہے کہ برطانیہ میں مطلق العنان شاہی ہے لیکن حقیقت میں وہاں ایک محدود شہنشاہیت ہے اور عملی طور پر ایک جمہوری طرز کی حکومت قائم ہے۔ برطانیہ میں دستوری طور پر وہ چیز نہیں ہے جو بظاہر نظر آتی ہے۔ انگلستان میں ایک ملکہ ہے لیکن فی الحقیقت وہ کوئی اختیار استعمال نہیں کرتی۔ ہم پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کی باتیں کرتے ہیں لیکن اقتدار برطانیہ کی کابینہ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ حقیقت میں برطانیہ میں ایک چھپی ہوئی جمہوریت کارفرما ہے۔ نظریاتی طور پر کابینہ مختلف محکموں کی پالیسی کا تعین کرتی ہے لیکن عملی طور پر عہدہ داران سرکاری اس سلسلے میں انتہائی اہم رول ادا کرتے ہیں اور عام طور پر حکومت کی پالیسی کی تشکیل میں بالواسطہ انھیں کا ہاتھ رہتا ہے۔ وزراء اسی کو عقل مندی سمجھتے ہیں کہ وہ عہدہ داران سرکاری کے رائے کو مان لیں۔ انگلستان میں ہاؤس آف لارڈز مرافعہ کی اعلیٰ ترین عدالت ہے لیکن عملی طور پر جب ہاؤس آف لارڈز کی نشست بہ حیثیت عدالت ہوتی ہے تو صرف لاء لارڈز (Law Lords) اس میں حصہ لیتے ہیں اور عدالتی کارروائی چلاتے ہیں۔ دوسرے لارڈز اس میں حصہ نہیں لیتے دستور برطانیہ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر عدالتی فیصلوں پر مبنی ہے۔ انگلستان کے باشندوں کے موجودہ حقوق کی بنیاد دراصل وہ عدالتی فیصلہ جات ہیں جن کے ذریعہ ان حقوق کو تسلیم کیا گیا۔

انگلستان کے دستور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر دستوری عمل پر نگرانی کی گنجائش موجود ہے۔ مثال کے طور پر برطانوی پارلیمنٹ کے ہر دو ایوان مل کر ایک قانون بنا سکتے ہیں لیکن اس قانون پر اس وقت تک عمل آوری نہیں ہوسکتی جب تک اس پر ملکہ کے دستخط نہ ہوجائیں اس طرح ملکہ کا کوئی حکم اس وقت تک نافذالعمل نہیں ہوتا جب تک اس پر کسی وزیر کے دستخط نہ ہوجائیں۔ انگلستان میں وزیر پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہے۔ پارلیمنٹ جس وقت چاہے اس کے خلاف عدم اعتماد کی رائے دے کر علیحدہ کرسکتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس مسودہ قانون کو ناقابل قبول قرار دیا جائے جو اس وزیر کی جانب سے ایوان میں پیش کیا گیا ہو۔

اگر پارلیمنٹ کسی وزیر، کابینہ یا وزارت کے کسی مسودہ قانون یا بجٹ کی نامنظوری سے علاحدہ کرسکتی ہے تو اسی طرح کابینہ یا وزارت بھی پارلیمنٹ کے ممبران کو علاحدہ کرواسکتی ہے۔ اس طرح کہ وزیر اعظم ملکہ کو یہ رائے دے سکتا ہے کہ پارلیمنٹ کو تحلیل کیا جائے اور عمل درآمد یہ ہے کہ جب وزیر اعظم پارلیمنٹ کی تحلیل کی رائے دیتا ہے تو ملکہ کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کو تحلیل کرے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وزرا بھی بالکل بے دست و پا نہیں ہیں۔ برطانیہ کے دستور میں تقسیم اختیارات کا نظریہ پوری طرح صادق نہیں آتا۔ ملکہ برطانیہ نہ صرف عاملہ کی صدر ہے بلکہ اس کے ساتھ مقننہ کی اہم ترین جز ہے۔ لارڈز چانسلر نہ صرف برطانوی کابینہ کا ممبر ہوتا ہے بلکہ ہاؤس آف لارڈز کا پریسیڈنٹ بھی ہوتا ہے اور عدلیہ کا بھی صدر ہوتا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز مقننہ کا ایک اہم جز ہے اور عدالتی کارروائی میں اعلیٰ ترین کورٹ آف اپیل ہے۔

برطانیہ کا وزیر اعظم: رسم و رواج کے مطابق یہ عمل کہ جب برطانیہ میں عام انتخابات ہوجاتے ہیں تو اسکے بعد بادشاہ وقت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو طلب کرے اور اس

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

سے وزارت بنانے کی خواہش کرے۔ یہ کام ظاہر ہے بہت آسان ہے اس میں عام طور پر کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ جب کوئی وزیراعظم استعفیٰ دیتا ہے یا فوت ہوجاتا ہے تو ایسی صورت میں بادشاہ وقت مستعفی ہونے والے وزیراعظم سے مشورہ کرسکتا ہے یا دارالعوام میں اکثریتی جماعت کے ان لیڈروں سے مشورہ کرسکتا ہے جو وزیراعظم کے خدمت کے دعویدار نہ ہوں اور اس کے بعد اس شخص سے وزارت بنانے کی خواہش کرسکتا ہے جو اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت رکھتا ہو ابتدا میں وزیراعظم اپنی حکومت کے علاوہ بھی بعض محکمے اپنے ذمے لیتا تھا لیکن کثرت کاری کی وجہ سے غالبًا آئندہ وزیراعظم برطانیہ اپنے ذمے حکومت کے کسی محکمہ کا کام نہ لے سکے گا۔ وزیراعظم مرکزی کابینہ کا صدر ہوتا ہے اور کابینہ کے اجلاس کی صدارت کرتا ہے اور حکومت کے ہر محکمہ پر اپنی نگرانی رکھتا ہے۔

برونسلا میلی نوسکی (Bronislaw Malinowski, 1884-1942) : برونسلا کیاسپر میلی نوسکی پولینڈ میں پیدا ہوا لیکن اپنی عملی سرگرمیوں کا بیشتر حصہ اس نے انگلستان میں اور آخر کے چند سال امریکا میں بھی گزارے۔ میلی نوسکی مشہور ماہر سماجی انسانیات ہے۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا انگلستان میں 1910 سے شروع ہوئی۔ جس کے بعد وہ آہستہ آہستہ علم (و تحقیق اور فیلڈورک کے میدان میں عالمی شہرت کا حامل بنتا گیا۔ میلی نوسکی نے انیسویں صدی کی قیاسی انسانیات کو عملی تجرباتی اور تجزیاتی سائنس میں تبدیل کیا۔ وہ غیر معمولی ذہین محقق اور ماہر استاد تھا۔ اگرچہ اس کے طریقہ تعلیم پر اس کے شخصی اور ذاتی انداز تدریس کی بناء پر اعتراضات بھی کیے گئے۔ میلی نوسکی کی تحقیقات کا سب سے اہم دور ٹروبریِنڈ جزائر میں گزرا ہے جو نیوگنی سے دور قبائلی جزیرے ہیں۔ ان تمام تحقیقات میں میلی نوسکی نے تمدن کی آفاقی نوعیت پر انتہائی باریک بین نگاہ سے غور کیا۔ اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ مخصوص تمدنوں کے مقامی عناصر کیا ہوتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ تمدنوں کی وہ کون سی خصوصیات ہوتی ہیں جو آفاقی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں۔

میلی نوسکی تفاعلی (Functional) اسکول کا بانی تھا۔ اس نے تمدن کے تفاعلی مطالعہ پر زور دیا۔ اپنے مشاہدوں اور نظریات کو میلی نوسکی نے 1913 میں اپنی مشہور کتاب 'تمدن کا سائنٹی نظریہ' میں پیش کیا۔ تمدنوں کے مطالعہ میں اس نے ہمیشہ کھلے ذہن سے تحقیق کی۔ اس کا اندازہ تعصبات سے پاک اور خالص تحقیقی تھا۔ آسٹریلیا، میلیشیا، افریقہ اور آخر میں امریکا کے بعض قبائل کی تحقیقات کے دوران میلی نوسکی نے انسانیاتی ادب کے لیے جو مواد جمع کیا اور تحقیق کے جو طریقہ دریافت کیے ہیں انھیں انسانیاتی ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ بالخصوص انگلستان میں اس کے شاگردوں کی ایک ایسی تربیت یافتہ ٹیم تیار ہوگئی تھی جس نے انسانیاتی تحقیقات کی ترقی میں غیر معمولی حصہ لیا۔ شروع ہی سے میلی نوسکی کو مختلف زبانوں سے واقفیت تھی۔ مثلاً اسکوپولش، روسی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور اسپینی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ لسانیاتی میدان میں اس کی غیر معمولی صلاحیت نے دوسرے تمدنوں کی زبانوں کو سمجھنے اور ان کے تمدنی مضمرات کا تجزیہ کرنے میں بڑی مدد دی۔ چنانچہ جس قبیلہ میں بھی وہ پہنچا وہاں کی زبان بڑی قلیل مدت میں سیکھ لی۔ میلی نوسکی نے زبان کی تمدنی تفاعلی اہمیت پر محققانہ بحثیں کی ہیں۔ اس کی تصانیف بے شمار ہیں۔ اور اپنی تمام علمی بحثوں میں اس نے تمدنی تبدیلی کو اپنی تحقیقات کا مبحث بنایا۔ انسانیات میں اس کے نظریاتی مباحث کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔

بعض صورتوں میں میعاد کی توسیع (Extension of Limitation): کوئی مرافعہ یا درخواست تجویز ثانی یا باز دائری یا اجازت مرافعہ یا کوئی اور درخواست جو کسی قانون یا قاعدہ نافذالوقت کی رو سے متعلق کیا جائے بعد میعاد مقررہ کے منظور کی جاسکے گی اگر مرافعہ یا درخواست گذار عدالت کو مطمئن کردے کہ وہ اس کو اندرون میعاد بوجہ کافی پیش نہ کرسکا جو تاخیر ہائی کورٹ کے کسی فیصلہ یا حکم یا عمل درآمد کی وجہ سے مغالطہ میں پڑنے سے واقع ہوئی ہو وجہ کافی متصور نہ ہوگی۔ عدالتوں کو بہ اغراض انصاف رسانی وسیع اختیارات تمیزی حاصل ہیں جن کا استعمال صحیح طریقہ پر اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی طرح مرافعہ کو منصفانہ دادرسی عطاء کی جاسکے۔ بشرطیکہ وہ نیک نیت ہو اور اس کی جانب سے کوئی غفلت یا لاپرواہی عمل میں نہ لائی گئی ہو۔

بغیر منافع کے کاروبار کرنے والی انجمن (Association not for Profit) : ایسی کمپنی کے میمورنڈم آف اسوسی ایشن میں کمپنی کا نام درج کیا جائے گا پبلک کمپنی کی صورت میں آخر میں لمیٹڈ اور پرائیوٹ کمپنی کی صورت میں پرائیویٹ لمیٹڈ لکھا جائے گا۔ گورنمنٹ کمپنی کے قیام کے لیے لائسنس عطا کرے گی اور اس کی اجازت دے گی کہ کمپنی کا رجسٹریشن کرلیا جائے۔ گورنمنٹ ایسی صورت میں لائسنس دے گی جبکہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وہ انجمن یا کمپنی جو قائم کی جانے والی ہو وہ تجارت، فن، سائنس، مذہبی کام یا خیراتی کام یا اس نوعیت کے دوسرے کارآمد مقاصد کے لیے قائم کی جائے اور جو آمدنی ہو اسے تقسیم نہ کیا جائے بلکہ اس مقصد کے لیے صرف کیا جائے جس مقصد کے لیے کمپنی قائم کی گئی ہو اس طرح رجسٹری ہونے کے بعد کمپنی ایک لمیٹڈ کمپنی کے طور پر اپنا کام انجام دے گی۔

بلاک ڈیولپمنٹ افسر (Block Development Officer): کسی ایک تعلقے کو مختلف مواضعات کے گروپ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مواضعات کے ان گروپ کو بلاک کہتے ہیں۔ ایک بلاک میں تیس یا چالیس یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ مواضعات رہتے ہیں۔ اس بلاک کی تمام ترقیاتی اسکیمات کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے تحت مرتب کیا جاتا ہے جس کی نگرانی حکومت کے ایک افسر کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ اس افسر کو بلاک ڈیولپمنٹ افسر کہتے ہیں۔ بلاک ڈیولپمنٹ افسر کے تحت اکسٹنشن افسروں (Extention Officers) کی ایک ٹیم کام کرتی ہے جن کا مختلف محکمہ جات سے تعلق ہوتا ہے۔ جیسے اکسٹنشن افسر پنچایت، اکسٹنشن افسر امداد باہمی، اکسٹنشن افسر علاج حیوانات یا صنعت و حرفت وغیرہ۔ اس ٹیم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بلاک کے تمام مواضعات کا دورہ کر کے مقامی باشندوں سے ربط پیدا کرے اور زراعت، علاج حیوانات، گھریلو صنعتوں اور دیگر امور کے متعلق نئے طریقوں سے انھیں واقف کرائے۔ بلاک ڈیولپمنٹ کے انصرام کار میں مقامی باشندوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے کمیٹی (مشاورتی کمیٹی) تشکیل دی جاتی ہے جو ایسے ارکان پارلیمنٹ اور ارکان قانون ساز اسمبلی پر مشتمل ہوتی ہے جو اس علاقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس مشاورتی کمیٹی میں نمایاں مقامی شخصیات کو بھی حکومت کی جانب سے نامزد کیا جاتا ہے۔

بلدیات ۔ ذرائع آمدنی : بلدیات یعنی شہری انتظامیہ کے اہم ذرائع آمدنی حسب ذیل ہیں :

(1) محصول جائداد	Property Tax
(2) آکٹرائے	Octroi
(3) محصول تفریحات	Entertainment Tax
(4) محصول پیشہ	Profession Tax
(5) لائسنس فیس	License Fee

بلدیات ـــ لازمی اور اختیاری فرائض : بلدیات (شہری انتظامیہ) کے لازمی فرائض میں پانی کی فراہمی، صحت عامہ، سڑکوں کی تعمیر اور درستگی، سڑکوں اور گھروں کے لیے روشنی کا انتظام ہے۔ ماسٹر پلان کے تحت شہر کی ترقی اور توسیع کی اسکیمات پر عمل آوری بھی بلدیات کے فرائض میں شامل ہے۔ ان فرائض کے لیے ضروری عہدہ داروں اور عملے کو مامور کرنا بلدیہ کے لیے ضروری ہے۔ بلدیات کے اختیاری فرائض میں تعلیمی اداروں اور اسکولوں کا قیام اور دیگر امور کا انتظام ہے جو حکومت بلدیہ کو تفویض کرنا مناسب خیال کرے۔

بلدیات ـــ مالی موقف : کم و بیش تمام ممالک میں بلدیات (شہری انتظامیہ) کا مالی موقف زیادہ مستحکم نہیں ہوتا ہے۔ بلدیات کی آمدنی میں وسعت اور پھیلاؤ کی گنجائش اس وجہ سے نہیں ہے کہ محصول ادا کرنے والوں کی مالی استطاعت ایک حد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ٹیکس ادا کرنے والوں کے بار کو کچھ ہلکا اس طرح کیا جائے کہ مرکزی حکومت مرکز کی آمدنی سے مناسب رقم بطور گرانٹ دے۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ دیہی آبادی کا قابل لحاظ حصہ دن بدن شہروں میں تلاش روزگار کے لیے منتقل ہوتا جاتا ہے اور قریب کی دیہی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ روزانہ شہر آتا ہے اور دن بھر شہر میں کام کرنے کے بعد دیہات واپس چلا جاتا ہے۔ اسے شہر کی فلوٹنگ آبادی کہتے ہیں۔ بلدیات کی آمدنی کے وسائل اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ وہ تیزی سے بڑھنے والے شہر کی بلدی ضروریات مرکزی حکومت کی مدد کے بغیر پوری کر سکیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ بلدیات ان محصولات سے پورا پورا استفادہ نہ کریں جن کے عائد کرنے کا انھیں قانوناً اختیار دیا گیا ہے۔ ممالک متحدہ امریکا میں تیس سال پہلے اسٹیٹ اور لوکل ٹیکسیشن کے تعلق سے اصلاحات کی گئی تھیں۔ ان اصلاحات میں اسٹیٹ اور شہری انتظامیہ کو علاحدہ علاحدہ محصول عائد کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ لیکن یہ سسٹم پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور اس کے بجائے ایک نئی نوعیت کا سسٹم رائج کیا گیا۔ وہ سسٹم یہ تھا کہ اسٹیٹ اور مقامی انتظامیہ کو محصولات سے جو آمدنی ہو اس کی تقسیم اسٹیٹ اور مقامی انتظامیہ میں کی جائے۔ محصولات کی تقسیم کا یہ طریقہ امریکا میں کافی عرصے سے رائج ہے۔ یورپ میں مقامی انتظامیہ میں محصول عائد کرنے اور مالیے کی فراہمی کی نوعیت یہ ہے کہ جو بھی مرکز کے محصولات ہوتے ہیں ان پر سرچارج کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

صورت میں زائد محصول وصول کیا جاتا ہے جو شہری انتظامیہ کی آمدنی کا اہم جزو ہوتا ہے۔ یہ سسٹم یورپ میں اس وقت بھی رائج ہے اور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اس کے نتیجے کے طور پر شہری انتظامیہ کی آمدنی کا بیشتر حصہ مرکز کی امداد پر منحصر ہونے لگا اور مرکزی آمدنی کا ایک حصہ مجالس مقامی کے لیے مختص کیا جانے لگا۔ جرمنی اور روس میں اس طریقے میں اور ترقی ہوئی اور مرکزی آمدنی کا جو حصہ مجالس مقامی کے لیے مختص کیا جاتا تھا اس میں کافی اضافہ کیا گیا اور مرکزی خزانے سے کافی رقم مقامی ضرورتوں کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجالس مقامی کی عام مالی حالت کم و بیش ہر ملک میں یکساں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شہری انتظامیہ کی آمدنی مقامی شہری آسائیشوں کی فراہمی کے لیے عموماً ناکافی ہی ثابت ہوتی ہے۔ آج کل لفظ مقامی کے مفہوم میں عملاً بہت کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ مقامی ضروریات بڑی حد تک قومی ضروریات ہی ہوتی ہیں جن کی تکمیل پر پورے ملک کی خوش حالی کا انحصار رہتا ہے۔ مقامی طور پر محصولات بلدیہ سے بلدیات کو جو آمدنی ہوتی ہے، اگر صرف اس پر ہی انحصار کیا جائے تو ترقیاتی اسکیمات کی منصوبہ بندی اور عمل آوری میں مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے مرکزی خزانے سے مقامی انتظامیہ خواہ وہ شہری ہوں یا دیہی، ہر ضرورت میں فراخدلانہ امداد کے مستحق ہوتے ہیں۔ تمام متمدن ممالک میں آج کل یہی نظریہ کار فرما ہے۔

ہندوستان میں بھی یہی صورت ہے اور جن مسائل سے ہندوستان کی میونسپلٹیاں اور میونسپل کارپوریشن دوچار ہیں، ان کے حل کے لیے مقامی انتظامیہ کی آمدنی قطعی ناکافی ہے۔ اگرچہ بلدیات کو مختلف نوعیت کے محصول عاید کرنے کا اختیار ہے لیکن ان محصولات سے بلدیات کو معقول آمدنی نہیں ہوتی، اس لیے مرکزی حکومت کی امداد ضروری ہے۔

بلونت رائے مہتا کمیٹی: حکومت (ہند) نے بلونت رائے مہتا کمیٹی کو مقرر کیا تاکہ وہ کمیونٹی بلاک ڈیولپمنٹ اسکیم کی مکمل جانچ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ 1958 میں یہ رپورٹ پیش کی گئی۔ اس رپورٹ میں دیہی ترقیاتی نظام میں غیر معمولی اہم تبدیلیاں تجویز کی گئیں اور یہ رائے دی گئی کہ نامزد مشاورتی کمیٹیوں کو ختم کر کے منتخبہ کمیٹیاں قائم کی جائیں، جو مقامی ترقیاتی امور کے لیے مکمل طور سے ذمہ دار ہوں۔ ان سفارشات کو بنیادی طور پر قبول کرتے ہوئے مرکزی حکومت نے تمام ریاستی حکومتوں کو ضروری قانون سازی کی ہدایت کی۔ چنانچہ جملے ریاستی حکومتوں نے ان خطوط پر قانون بنائے جن کی سفارش بلونت رائے مہتا نے اپنی رپورٹ میں کی تھی۔ اس قانون سازی کے نتیجہ کے طور پر ہر موضع کے لیے یا چند مواضعات کے گروپ کے لیے ایک پنچایت کا قیام ضروری تھا اور ہر بلاک کے لیے ایک پنچایت سمیتی یا بلاک سمیتی قائم کی جانی تھی اور ہر ضلع کے لیے ایک ضلع پریشد۔ با الفاظ دیگر ایک ضلع کو مختلف بلاکوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر بلاک میں مواضعات کی تعداد کے اعتبار سے متعدد پنچایتیں قائم کی گئیں۔ آج بھی ہندوستان میں یہ تنظیمی سلسلہ جاری ہے اور پنچایت، پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد کی کارکردگی پر دیہی ترقیاتی نظام کا انحصار ہے۔ اس نظام کو سہہ رخی نظام (Three Tier System) یا پنچایت راج بھی کہا جاتا ہے۔ اس سسٹم کی بدولت کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم ایک سرکاری اسکیم نہ رہ کر ایک عوامی اسکیم بن گئی ہے جس کے تحت منصوبہ بندی اور منصوبوں کی تکمیل عوامی نمائندوں پر مشتمل ادارے، ذمہ دارانہ طور پر پورے اختیارات کے ساتھ کرتے ہیں۔ موجودہ پنچایت راج سسٹم قدیم سسٹم سے یوں بھی مختلف ہے کہ پہلے گاؤں کے لیے صرف پنچایتیں اور ضلع کے لیے ڈسٹرکٹ بورڈ ہوتے تھے اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی خاص ربط نہیں تھا۔ لیکن پنچایت، پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد کے فرائض اور ذمہ داریاں اور اختیارات ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ پنچایت کے سالانہ بجٹ کی منظوری پنچایت سمیتی دیتی ہے تو پنچایت سمیتی کے سالانہ بجٹ کی منظوری ضلع پریشد کی ذمہ داری ہے۔

بلوہ (Riot): جب کوئی خلاف قانون مجمع یا اس میں شریک کوئی فرد کوئی مشترکہ غرض پوری کرنے یا مقصد حاصل کرنے کے لیے جبر یا تشدد سے کام لے تو یہ مجمع یا اس میں شریک ہر شخص بلوہ کا مجرم کہلائے گا۔

بلوہ کے لیے مجمع کا خلاف قانون ہونا ضروری ہے۔ جب کوئی خلاف قانون مجمع ایک خاص طریقہ پر عمل کرتا ہے تو بلوہ کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اس جرم میں جبر کا استعمال ہوتا ہے اور اس جبر کی وجہ سے جرم مجمع خلاف قانون سے مختلف ہوتا ہے۔

بلوہ کو ثابت قرار دینے کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ ملزمان کی تعداد پانچ یا اس سے زیادہ تھی، مجمع خلاف قانون تھا اور ان کی غرض مشترک تھی اور مجمع خلاف قانون یا اس کے کسی شریک فرد نے

مشترکہ غرض حاصل کرنے کے لیے جبر یا تشدد سے کام لیا۔

جب یہ ثابت ہوجائے کہ کوئی مجمع "خلاف قانون" ہے اور اس کے کسی شریک فرد کی جانب سے جبر کا استعمال ہوا ہو تو وہ بلوہ قرار پائے گا۔ خواہ جبر سنگین قسم کا ہو یا خفیف قسم کا۔ بشرطیکہ وہ کسی غرض مشترکہ کے حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ بلوہ کے لیے واقعی جبر یا تشدد کا استعمال لازمی ہے۔ جبر یا تشدد کی محض نمائش کافی نہیں۔

یہاں لفظ تشدد جبر سے زیادہ وسیع ہے اور وہ اس صورت پر بھی حاوی ہے جب کسی کے مقابلہ میں جبر استعمال کیا جائے مثلاً اگر کوئی مجمع کسی کے مکان کو مسمار کرنے کے لیے جمع ہو اور وہ مکان مسمار کرنا شروع کرے تو کہا جائے گا کہ تشدد کا استعمال کیا گیا اور وہ لوگ بلوہ کے مرتکب ہوئے۔

جب کسی مجمع خلاف قانون کا کوئی ایک شریک فرد بھی مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے جبر یا تشدد کا استعمال کرے تو کل شرکاء بلوہ کے مرتکب سمجھے جاتے ہیں۔

بلوہ اور ہنگامہ میں فرق (Difference between Riot and Affray) : ہنگامہ کا ارتکاب صرف عام مقام پر ہوسکتا ہے اور بلوہ کا ارتکاب ایسے مقام پر بھی ہوسکتا ہے جو عام نہ ہو۔ ہنگامہ کے لیے صرف دو آدمی کافی ہیں لیکن بلوہ کے لیے کم سے کم پانچ آدمی ہونے چاہئیں۔

بناؤ سنگھار : چہرے اور جسم کے دوسرے حصوں، آنکھوں اور بالوں کو سنوارنے اور انھیں زیادہ خوبصورت بنانے کی رسم انتہائی قدیم ہے۔ نہایت ابتدائی سماج میں عورتوں سے زیادہ مرد اس طرف توجہ کرتے تھے۔ وہ اپنے جسم پر مختلف رنگوں سے نقش نگار بناتے تھے۔ جن کا مقصد دشمنوں اور بدروحوں کو ڈرانا اور صنف نازک کو لبھانا دونوں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ عورتیں اپنے چہروں، آنکھوں اور بالوں کو خوبصورت بنانے کے لیے طرح طرح کے طریقہ اختیار کرتیں۔ اس کے لیے بالوں کو رنگنے کے لیے مختلف قسم کے رنگ، آنکھوں کے لیے کاجل اور چہرے کے لیے طرح طرح کے مسالے تیار کیے جاتے۔

مصر میں فراعین کی قبروں سے اور بہت سی چیزوں کے ساتھ عورتوں کا سنگھار دان بھی ملے ہیں۔ اسی قسم کے سنگھار دان عراق میں عہد آشور کے قبرستانوں سے بھی نکلے ہیں۔ ان میں اور چیزوں کے علاوہ کحل یا کاجل کے بوتل اور آنکھوں میں کاجل لگانے کے چھوٹے چمچ بھی تھے۔ چہرے پر ایک قسم کا رنگ لگایا جاتا تھا اور انگلیاں حنا یا مہندی سے رنگی جاتی تھیں۔ یونانی عورتیں کوئلے کی باریک فسلیں آنکھوں میں پھیرتیں اور چہرے پر ایک مرکب پاوڈر کی طرح استعمال کرتیں۔

بناؤ سنگھار کا فن رومن سلطنت کے دور میں اپنی انتہا پر پہنچ گیا۔ مالدار عورتیں بناؤ سنگھار کروانے کے لیے خاص طور پر لونڈیاں رکھتیں۔ چہرے پر ایک قسم کا پاوڈر لگاتیں اور اس پر سرخی کی ہلکی تہہ جماتیں۔ اور بہت ساری چیزوں کی طرح بناؤ سنگھار میں بھی مشرق کی عورتیں آگے رہی ہیں۔ ہندستان میں بھی کاجل، سرما، سرخیاں، عطر اور طرح طرح سے بالوں کی آرائش ہمیشہ سے سنگھار کا اہم جزو رہے ہیں۔ ایلورا، اجنتا اور قدیم مندروں میں بنے مجسموں اور تصویروں سے اس کی تفصیل ملتی ہیں۔ صندل اور ہلدی کا بنا ابٹن اب بھی عورتیں اور خاص طور پر دلہنیں استعمال کرتی ہیں جس سے نہ صرف جسم کا حسن نکھرتا ہے بلکہ وہ خوشبو سے بھی معطر ہو جاتا ہے۔

جب یورپ کے عیسائی صلیبی مشرقِ وسطیٰ آئے تو وہ یہاں سے بناؤ سنگھار کے بہت سارے طریقے، مختلف تیل اور عطر بھی لے گئے۔ عہد نشاۃ ثانیہ میں خاص طور پر 17 ویں صدی میں بناؤ سنگھار پر کئی کتابیں نکلیں۔ خوش حال عورتوں کا بناؤ سنگھار ایک پیشہ بن گیا اور حمام قائم ہونے لگے جہاں انھیں دودھ اور شراب سے غسل دیا جاتا۔

1760 کے بعد خاص طور پر انقلاب فرانس کے بعد سے، جبکہ سارے یورپ میں جاگیرداری نظام اور امیرانہ عیش و عشرت کے خلاف بغاوت ہوئی تو بناؤ سنگھار یورپ سے تقریباً غائب ہو گیا۔ لیکن 1900 سے یہ پھر ابھرا اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح بناؤ سنگھار کی چیزیں بھی بڑے اور سائنٹفک طریقہ پر تیار ہونے لگیں اور اس کے کارخانے قائم ہونے لگے اور اب تو بالوں کو سنوارنے، چہرے، آنکھوں، ناخن وغیرہ کو خوبصورت بنانے کی صنعت ترقی پا چکی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں میں اس کے ماہر ہر جگہ بڑی بڑی دکانیں چلاتے ہیں۔

بناؤ سنگھار کا ہندستان میں سماجی مقام ہے۔ کاجل، مسّی، سیندور اور مہندی صرف سہاگنوں کا حق ہے۔ بیواؤں کے لیے آج بھی ہر سنگھار اور زیور ممنوع ہے۔ ہندستان قدیم کے کلاسکی ادب میں سولہ سنگھار کا خاص طور پر ذکر ہے۔ جس میں پان کھانا اور ہاتھ میں پھول تھامنا بھی

شامل ہے۔ ہندستان کی پرانی کتابیں اس فن کے علم کا ذخیرہ ہیں۔ ان میں موقع کی مناسبت سے سنگھار کا تفصیلی ذکر ہے۔

ہندستان میں بناؤ سنگھار مقامی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مختلف قبائل دیہاتی ایریا، شہری علاقے جنوبی ہند اور شمالی ہند کی بناؤ سنگھار سے متعلق رسموں میں کافی اختلاف ہے۔

دوسرے تمام قدیم سماجوں میں بناؤ سنگھار سے ہر انسان کی حیثیت کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مشرق بعید کے چند ممالک میں کنواری لڑکیاں چوٹی باندھتی ہیں جبکہ شادی شدہ ہر قسم کے اسٹائل بنا سکتی ہے۔ خوشبو، پھول، اور نمایاں سنگھار بھی صرف شادی شدہ عورتوں کا حصہ ہے۔ آج یہ بندھن ڈھیلے ہوتے جارہے ہیں لیکن ختم نہیں ہوئے۔ یاد رہے مردوں میں بھی خوبصورت نظر آنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ آج مردوں کے حسن کاری کے مرکز بھی موجود ہیں۔

بنتھم جریمی (Benthan Jeremy, 1748-1832) : فلسفہ افادیت (Utilitariaism) کا مشہور عالم، اس کا فلسفہ تھا کہ انسان سرگرمیوں کا واحد محرک اس کا ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ اور زندگی کو مسرت سے بھرنا انسان کا واحد مقصد ہوتا ہے۔ حکومت کا کام یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کے مسرتوں کے خزانوں کو پُر کرنے کی کوشش کرے۔

بنٹو : افریقہ کا ایک نسلی و لسانی گروہ جو کانگو کے جنوب میں پورے افریقہ میں پھیلا ہوا ہے سوائے انتہائی جنوب مغربی علاقے کے۔ ان کی تعداد 5½ کروڑ کے قریب ہے۔ بنٹو زبان کی تقریباً سو شاخیں ہیں۔ ان میں لوگانڈا، زولو اور سواحلی شامل ہیں۔ زولو عام طور پر جنوبی افریقہ میں استعمال ہوتی ہے اور سواحلی مشرقی افریقہ میں یورپی اقوام کے افریقہ میں آنے سے پہلے بنٹو لوگ زیادہ تر چرواہے اور جنگجو تھے یا زراعت پیشہ اور پر امن۔ بنٹو آبادی کی اکثر ریاستیں کافی ترقی یافتہ تھیں۔ ان میں یوگانڈا کی ریاست ابھی کچھ عرصہ تک یوگانڈا میں موجود تھی۔ آج ان کے علم و فن رو بہ زوال ہیں۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) : شہریوں کے عام حقوق وہ ہیں جنھیں مملکت کا عام قانون تشکیل کرے اور جن کا تحفظ عام قانون کرے۔ لیکن بنیادی حقوق وہ حقوق ہوتے ہیں جن کی ضمانت ملک کا بنیادی قانون یعنی دستور دیتا ہے اور ان کے لیے خصوصی تحفظات فراہم کرتا ہے۔ یہ وہ حقوق ہیں جو ہر فرد کو اس بنیاد پر ملنے چاہئیں کہ وہ ایک انسان ہے جن کے بغیر وہ مہذب اور شائستہ زندگی گزارنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے انھیں مملکت کے اقتدار سے بالاتر بھی سمجھا گیاہے۔ کیونکہ جب اصولاً وہ مملکت کے تشکیل کردہ نہیں ہیں تو وہ ان میں رد و بدل اور ترمیم بھی نہیں کرسکتی۔ ان بنیادی حقوق کا ذکر شہری آزادیوں یا حقوق کے نام سے بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ساری اصطلاحیں نسبتاً دور جدید کی پیداوار ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ان کا سلسلہ قدیم یونان کے رواقی فلسفیوں کے فطری حقوق سے ملتا ہے۔ قانون فطرت اور فطری حقوق کے نظریات سلطنت روما اور قرون وسطیٰ سے لے کر سترھویں صدی تک یورپی فلسفہ پر حاوی رہے۔ اس فلسفہ کے مطابق انسان ایک ابدی اور ناقابل تغیر فطرت کا حامل ہے۔ اسے عقل سلیم ودیعت کی گئی ہے۔ یہی عقل سلیم اسے چند حقوق عطا کرتی ہے جن کے بغیر وہ انسان نہیں رہ سکتا۔ ان فطری حقوق کی جان لاک نے اپنے فارمولا "زندگی، آزادی اور ملکیت" میں تلخیص کی (بعد میں امریکی اعلان آزادی 1776 اور فرانسیسی اعلان حقوق انسانی وشہری 1789 کی رو سے اس فہرست میں مسرت کے حصول کا اضافہ کیا گیا)ان فطری حقوق کامقصد افراد کو حکومت کے مطلق العنان اقتدار سے محفوظ کرنا تھا۔ انھیں فطری حقوق نے جمہوریت کے ارتقا کے ساتھ شہری آزادیوں کی شکل اختیار کی اور ان کا دائرہ تمام شہریوں کی انفرادی واجتماعی سرگرمیوں کو محیط ہوتا گیا۔ اس کا سلسلہ حق رائے دہی، مذہبی آزادی، علمی آزادی، اظہار خیال کی آزادی سے شروع ہوا اور اجتماعی بہبود کے حق میں نجی ملکیت پر پابندی لگانے اوردولت کے ارتقا کو روکنے پر تمام ہوا۔

اٹھارہویں صدی سے اب تک دستوری نظریوں کا منتہا یہ رہا ہے کہ کس طرح مملکت کے اقتدار کو مطلق العنان ہونے سے روکا جائے اور کس طرح شہریوں کی نجی زندگی کے زمرہ کو حکومت اور دوسرے ارباب اقتدار کی دخل اندازی سے محفوظ کیا جائے۔ شہری حقوق کی دستوری ضمانت اس سلسلہ میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ جان اسٹورٹ مل نے اپنی شہری آفاقی تصنیف 'آزادی' میں شہری آزادی کو سماج کے لیے فائدہ مند بتایا اور اس لیے حکومت اور سماج کی چیرہ دستیوں سے اس کا دفاع کیا۔ آدم اسمتھ کے زمانہ کی حریت پسندی اس قسم کی انفرادی آزادی اور اس کی

دستوری ضمانت کی طالب تھی۔ بنیادی حقوق کی دستوری ضمانت کی اولین مثال امریکی دستور سے منسلک دستاویز حقوق (Bill of Rights) ہے۔ دوسرے جمہوری ملکوں میں بھی اس کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن وہاں اس کی وسعت اور طریقہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں عدلیہ نے مقننہ اور انتظامیہ کی کارروائیوں کی عدالتی تنقیح (Judical Review) کا اختیار استعمال کرکے دستور اور بنیادی حقوق کے نگہبان ہونے کا حق ادا کردیا ہے اور اکثر صورتوں میں شہری آزادیو ں کی حفاظت کی ہے۔ لیکن اکثر جمہوریتوں میں شہری آزادیوں کی حفاظت کی ذمہ داری قومی پارلیامنٹ پر عائد کی گئی ہے اوران ملکوں میں ان کی اصل نگہبان، رائے عامہ ہوتی ہے۔ انگلستان میں بنیادی حقوق کی کوئی دستوری ضمانت نہیں ہے لیکن وہ اس قدر محفوظ ہیں جتنے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ہیں۔ مغربی یورپ کے بعض ملک مثلاً فرانس، سوئٹزرلینڈ ، ڈنمارک اور سوئڈن میں قانون انتظامی کے تحت انتظامی عدالتوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ انتظامیہ کی طرف سے ان حقوق کی خلاف ورزی سے تحفظ فراہم کرسکتی ہیں لیکن وہ قومی مجلس قانون ساز کی خلاف ورزی کی کوئی گرفت نہیں کرسکتیں۔ خواہ دستوری ضمانت حاصل ہو یا نہیں۔ شہری آزادیوں کی اصل ضمانت بیدار رائے عامہ ہی ہے۔ ہندستان نئی جمہوریتوں میں پہلا ملک ہے جس نے اپنے دستور میں باب سوم، بنیادی حقوق کے لیے وقف کیا جو مساوات کے حق، آزادی کے حق، استحصال کے خلاف حق، مذہب کی آزادی، ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے نام سے موسوم ہیں۔ اور ان کے تحفظ کے لیے عدالتی چارہ جوئی کی ضمانت دی ہے۔ ان تمام جمہوری ملکوں میں ناگہانی حالات میں قومی امن وسلامتی اور مفاد عامہ کے حق میں اب آزادیوں اور حقوق پر بعض پابندیاں بھی عائد کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف انفرادی حقوق کے مقابلہ میں سماجی حقوق کی برتری بھی تسلیم کی گئی ہے۔

بونس (Bonus): بونس ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل آج تک نہیں نکالا جاسکا۔ بونس کا ادعا معاشرتی انصاف کے تصور کی بنیاد پر ہے اور فی الحقیقت زندگی کی بقا کے لیے جس قدر اجرت کی ضرورت ہے اور جو حقیقی اجرت دی جاتی ہے اس میں جو فرق ہے اسے پورا کرنے کے لیے بونس دیا جاتا ہے۔ کسی صنعتی یا کاروباری ادارے کے لیے جو ضروری اخراجات ہوتے ہیں اسے منہا کرنے کے بعد جو رقم بچتی ہے اس سے ملازمین کو بونس دیا جاتا ہے۔ ٹکسٹائل لیبر انکوائری کمیٹی (Textile Labour Enquiry Committee) نے بونس سے متعلق یہ اظہار خیال کیا ہے کہ بونس ملازمین کو ایک نقد رقم کی ادائیگی ہے جو ماہانہ اجرت کے علاوہ دی جاتی ہے اور جس کی ادائیگی ملازمین کی کارگزاری کے ایک معینہ معیار حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ چونکہ مزدور اور سرمایہ دار دونوں ہی صنعتی ادارے کی کارکردگی اور آمدنی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اس لیے قدرتی انصاف کا تقاضا ہے کہ مزدور بھی اس آمدنی سے کچھ فائدہ حاصل کریں اگر ضروری اخراجات منہا کرکے بعد آمدنی کا کچھ حصہ بچ جائے۔ جس کسی صنعتی یا کاروباری ادارے میں ضروری اخراجات کی ادائیگی کے بعد بونس کی ادائیگی کی مالی سکت ہو تو ایسی صورت میں اس صنعتی یا کاروباری ادارے کو چاہیے کہ وہ اپنے ملازمین کو بونس ادا کرے اور جس کسی صنعتی یا کاروباری ادارے میں اتنی سکت نہ ہو تو ایسی صورت میں بونس کو ملازمین کی ضروریات کی تکمیل کی ایک عارضی صورت سمجھنا چاہیے۔ بونس کی مقدار کا تعین متعلقہ صنعتی یا کاروباری ادارے کے کاروبار یا ترقی پر منحصر ہونا چاہیے۔ کاروبار کی ترقی کو جانچنے کا معیار اس کمپنی کی آمدنی ہے۔ اس فارمولے کے تحت باقی ماندہ سرمایہ حسب ذیل اخراجات کی منہائی کے بعد بونس کی ادائیگی کے لیے باقی رہتا ہے۔

(1) مشنری کی دیکھ بھال کے اخراجات (Depreciation)
(2) انکم ٹیکس کی ادائیگی
(3) سرمایہ پر مناسب منافع کی رقم
(4) ریزرو فنڈ پر مناسب منافع کی رقم
(5) صنعت کو فروغ دینے یا جدید ایجادات کی وجہ سے مشنری کی تبدیلی کے اخراجات

بونس ایکٹ، 1965 (Bonus Act , 1965) کے دستوری جواز کو پہلی مرتبہ سپریم کورٹ میں متعدد رٹ (Writ) کے ذریعہ چیلنج کیا گیا تھا۔ اس مقدمے میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو کافی اہمیت ہے کیوں کہ اس فیصلے میں بونس کی ادائیگی کو حقیقی منافع کی بنیاد پر نہیں بلکہ معاشرتی انصافاً اور ملازمین کے ادعا کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے متعلق اظہار خیال کیا گیا۔

بوہرہ: یہ گجراتی لفظ وہورود سے بنا ہے۔ اس کے معنی تاجر کے ہیں۔ اب اس کا اطلاق مسلمانوں میں شیعی فرقہ اسماعلیہ کے ماننے والوں پر ہوتا ہے چونکہ یہ لوگ اہل بازار تھے اس لیے اس لقب سے موسوم کیے گئے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فرقہ مشہور فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کے بعد ان کے بیٹے مستعلی کو امام مانتا ہے۔ مغربی ہند میں ان کی بڑی تعداد آباد ہے۔

ان کے نزدیک وصی امام کو امام داعی کو نص کرکے مقرر کرتا ہے۔ امام کی غیبت میں ایک داعی دوسرے کو داعی کو نص کرکے اپنا جانشیں نامزد کرتا ہے اس طرح دعات مطلقین کا سلسلہ جاری رہتا ہے ان کے عقیدہ کے مطابق امام معصوم ہوتا ہے اور داعی کی بھی یہی حیثیت ہوتی ہے۔ یہ دونوں غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ رسول وصی اور امام کے نہ ہونے پر داعی مطلق نیابت خداوندی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ بوہروں کی چند ممتاز خصوصیات ہیں۔ (1) یہ اپنے مذہبی اصول پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں (2) پاکیزہ روزگار ہوتے ہیں اپنی آمدنی کا دسواں حصہ (عشر) اپنے پیشوا کو دیتے ہیں (3) سادہ اور بے تکلف زندگی گزارتے ہیں (4) نشی اشیا کے استعمال سے اس قدر اجتناب کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک تمباکو بھی ممنوع ہے (5) ان میں بے مثال اتحاد و اخوت ہے۔

بوہروں کی جماعت دو حصوں میں منقسم ہے۔ ان کی بڑی جماعت شیعوں کی ہے یہ لوگ سب کے سب تاجر ہیں۔ تھوڑی تعداد سنیوں کی بھی ہے جو عموماً کاشتکار ہیں۔ کچھ بوہرے برما وغیرہ میں آباد ہوگئے ہیں اور تجارتی کاروبار کرتے ہیں۔ یہ سب خوش حال ہیں۔ ہندوستان میں بوہروں کا ایک فرقہ داؤدی کہلاتا ہے جو داؤد بن قطب شاہ کو امام مانتا ہے۔ ان کے پیشوا کا عموماً قیام بمبئی (ممبئی) میں رہتا ہے لیکن ان کا صدر مقام سورت ہے۔ ان کے پیشوا ملا طاہر سیف الدین کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ عام طور پر لوگ ان کو ملاجی اور سیدنا صاحب کہتے ہیں مگر ان کا دفتری لقب الداعی المطلق ہے۔

بھرمالی (Dumping): کسی بیرونی منڈی پر اشیا کو حاشیائی لاگت (Marginal Cost) سے کم پر لاد دینا بھرمالی کہلاتا ہے۔ یہاں برآمد کرنے والا ملک مقابلہ کو ختم کرنے اور اس طرح اجارہ داری حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر نقصان برداشت کرلیتا ہے۔ ملک کی فاضل پیداوار سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی بھرمالی کی جاتی ہے۔ اس کے لیے ملک کے اندر کی قیمتوں میں یعنی پیداکار کی آمدنی میں کمی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹیرف اور تجارت کے علم معاہدہ کے تحت اس کی اجازت ہے کہ اس پالیسی کو ناکام بنانے کے لیے خاص درآمدی ٹیکس عائد کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ بھرمالی ہورہی ہے۔ روم کی یورپی معاشی کیمونٹی معاہدہ کے تحت بھی بھرمالی ممنوع ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر کسی ملک کی برآمدی قیمتیں اس ملک کی اندرونی قیمتوں سے کم ہوں تو ضروری نہیں کہ یہ صورت حال بھرمالی کی تعریف میں آئے۔ مختلف بین الاقوامی اداروں مثلاً یورپی آزاد تجارت کی اسوسی ایشن یورپی معاشی کیمونٹی وغیرہ کے معاہدوں میں بھرمالی کے خلاف دفعات شریک کی گئی ہیں۔

بیت المال: دو لفظوں بیت اور مال سے بنا ہے جس کے معنی مال کا گھر یعنی خزانہ (Treasury) کبھی کبھی اس سے پورا مالی نظام مراد ہوتا ہے۔ مگر دراصل یہ اسلامی حکومت کے سرکاری خزانہ کا اصطلاحی نام ہے۔ حکومت جو مال جمع کرتی ہے اسی میں کرتی ہے اور پھر جو کچھ خرچ کرتی ہے تو اسی سے خرچ کرتی ہے۔

عہد رسالت اور عہد صدیقی میں جو مال آتا وہ فوراً مسلمانوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ مگر عہد فاروقی میں پہلی مرتبہ باقاعدہ بیت المال قائم ہوا اور اس کے افسران مقرر کیے گئے۔ حضرت عمر نے پہلے دارالخلافہ مدینہ منورہ میں بڑا خزانہ قائم کیا تھا اس کے بعد دوسرے تمام صوبہ جات میں اور صدر مقامات میں بھی بیت المال قائم کرکے ان کے لیے افسران مقرر کیے۔ ان کے بعد کی اسلامی حکومتوں میں بھی اسی طرح ایک مرکزی بیت المال ہوتا تھا جس کی صوبہ اور ضلع وار شاخیں ہوتی تھیں۔ یہ شاخیں مقامی ضرورتوں کی کفالت مرکز کے احکام کے مطابق انجام دیتی تھیں۔

بیت المال کی آمدنی کے ذرائع و رسائل مندرجہ ذیل ہیں:

بیت المال کی آمدنی کے ذرائع کی دو نوعیت ہیں ایک کو مستقل اور دوسری کو غیر مستقل کہہ سکتے ہیں۔ مستقل آمدنی میں محاصل (Taxes) شامل ہیں ان کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

بیرون ملک کی کمپنی (Foreign Company): ایک کمپنی جس کی رجسٹری کسی بیرون ملک میں ہوئی ہو لیکن جو کاروبار ہندوستان میں کرتی ہو اسے بیرون ملک کی کمپنی (Foreign Company) کہا جائے گا۔ کمپنی لاء میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر کسی بیرونی کمپنی کے پچاس فیصد سے زیادہ حصص کسی ہندوستانی باشندے یا کسی کمپنی نے جو ہندوستان میں رجسٹر کرائی گئی ہو خریدیں ہو تو ایسی صورت میں ایسی کمپنی، کمپنی لاء اور اس کے بنائے ہوئے قواعد کے تحت اسی طرح کام

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کرے گی جیسے کہ وہ کمپنی ہندوستان میں رجسٹر کروائی گئی ہو۔ قانون کے اس اصول کا منشا یہ ہے کہ بیرونی کمپنی جو اپنے حصص ہندوستانی باشندوں کو فروخت کرکے سرمایہ جمع کرتی ہے اور اپنے کاروبار کا بیشتر حصہ ہندوستان میں انجام دیتی ہے اس پر کمپنی لاء کے تحت کنٹرول قائم رکھا جاسکے۔

بیرونی عناصر (Foreign Elements): ملک کی عدالتوں میں جب کبھی ایسامقدمہ پیش ہوتا ہے جس کے فریقین اسی ملک کے باشندے ہیں اور نزاعی امر یا مدعاعلیہ اسی ملک میں ہو اور بنائے نالش اسی ملک میں ہوئی ہو تو مقدمہ کا فیصلہ اسی ملک کے قانون کے مطابق ہوگا اور تصادم قوانین کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن بعض مقدمات جو کسی ملک کی عدالتوں میں دائر ہوتے ہیں ان میں بیرونی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً فریقین مختلف ممالک کے باشندے ہوسکتے ہیں جن کا تعلق دنیا کی مختلف قانونی وحدتوں سے ہوسکتا ہے یا نزاعی امر یا مدعی یا مدعاعلیہ اس ملک کے حدود ارضی میں نہ ہو یا بنائے نالش اس ملک کے حدود ارضی میں نہ ہوئی ہو۔ یہاں یہ بات کہ فریقین یا ان میں کوئی ایک فریق غیر ملکی ہے جو اس ملک کے قانون کا تابع نہیں ہے ایک بیرونی عنصر ہے اسی طرح یہ امر کہ شے متنازعہ اس ملک کے حدود ارضی میں واقع نہیں ہے جس پر عدالت کے حکم یا فیصلہ کی تعمیل نہیں ہوسکتی ایک بیرونی عنصر ہے۔ اسی طرح یہ امر کہ بنائے نالش اس ملک کی عدالتوں کے اختیار سماعت کی حدود ارضی میں واقع نہیں ہوئی بلکہ کسی غیر ملک میں وقوع میں آئی ہے ایک بیرونی عنصر ہے۔ بیرونی عناصر کی چند دیگر مثالیں یہ ہیں:۔

مثلاً کسی نقص معاہدہ کے مقدمہ میں یہ امر کہ معاہدہ کسی دوسرے ملک میں ہوا یا اس معاہدہ کی تعمیل کسی دوسرے ملک میں عمل میں آئے گی یا نقص معاہدہ بیرون ملک ہوا ہے یا یہ کہ معاہدہ کی تعمیل کسی دوسرے ملک کی کرنسی کی ادائیگی سے عمل میں آئے گی یا یہ کہ فریقین معاہدہ کسی دیگر ملک کے قانون کو جو معاہدہ کے امور متنازعہ کا فیصل کرے منتخب کیا ہو تو یہ تمام بیرونی عناصر ہیں۔ اسی طرح اگر ٹارٹ کی بابت ہرجانہ کا دعویٰ کیا جائے تو یہ امر کہ ٹارٹ کا ارتکاب بیرون ملک ہوا ہے بیرونی عنصر ہے۔ اگر طلاق کا دعویٰ کیا جائے تو یہ امر کہ فریقین یا کوئی ایک فریق غیر ملکی ہے یا یہ کہ شادی کسی دیگر ملک میں ہوئی یا یہ کہ شوہر کی مستقل سکونت غیر ملک میں ہے بیرونی عناصر ہیں۔

اگر ایسے بیرونی عناصر موجود ہوں تو مقدمہ غیر معمولی نوعیت اختیار کرلیتا ہے اور قبل اس کے کہ حاکم عدالت مقدمہ کی سماعت شروع کرے اور فیصلہ لے اسے دو چیزوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(1) وہ سماعت مقدمہ کا مجاز رکھتا ہے یا نہیں۔

(2) اگر وہ مجاز سماعت رکھتا ہے تو اس مقدمہ میں کس ملک کا قانون نافذ ہوگا۔ ایک تیسرا سوال بعض اوقات درپیش آتا ہے وہ یہ کہ آیا کسی دیگر ملک کی عدالتوں کے فیصلے واجب تسلیم و تعمیل ہیں یا نہیں۔

تصادم قوانین کا کام صرف مندرجہ بالا سوالات کے جواب فراہم کرنا ہے۔ ان سوالات کے جواب فراہم کرنے کے بعد تصادم قوانین کا کام ختم ہوجاتا ہے مقدمہ کا فیصلہ اس قانون کی روسے ہوگا جس کا از روئے قواعد تصادم انتخاب ہوا ہو۔

بیشترین سماجی فلاح - معاشی پالیسی : فلاحی معاشیات کا کوئی نظریہ ایسا نہیں جو ایسے ایجابی معیار فراہم کرتا ہو جن کی بنا پر پیداوار اور تقسیم دونوں سے متعلق ایسی پالیسیاں اختیار کرنے میں مدد مل سکے جن سے بیشترین سماجی فلاح حاصل ہوسکے۔ اس سلسلے میں پریٹو نے جو معیار پیش کیا اور انسب حالت (Optimum Situation) کی جو تعریف کی وہ صرف پیداوار اور مبادلہ سے متعلق ہے جو چند لازمی شرائط میں سے صرف ایک ہے۔ نیز یہ حالت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جبکہ معیشت میں مکمل مسابقت کی صورت پائی جائے۔ نیز پیداوار اور صرف کے خارجی کفایات اور عدم کفایات نہ پائے جائیں یعنی کسی ایک شے کی پیداوار کا دوسرے شے کی پیداوار پر مفید یا مضر اثر نہ پڑتا ہو اور کسی ایک شخص کے صرف کا اچھا یا برا اثر دوسرے شخص پر نہ پڑتا ہو۔

عملی طور پر مکمل مسابقت بہت کم پائی جاتی ہے اور اشیا و خدمات کی خرید و فروخت میں مکمل یا نامکمل اجارہ کی صورت عام ہے۔ پیداوار اور صرف کے سلسلے میں بھی کفایات اور عدم کفایات بھی اکثر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ حکومت جہاں تک ممکن ہو اجارہ کو ختم یا کم کرنے کی کوشش کرے اور ایسی اشیا جن کی پیداوار اور صرف کے سلسلے میں کفایات حاصل ہوں ان کو امداد دی جائے اور عدم کفایات کی صورت میں محصول عاید کیے جائیں۔ ایک اور اہم مسئلہ یہاں پر یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ پریٹو کے معیار میں سماجی اشیا (Social

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(Goods) کی پیداوار و تقسیم کے مسئلے کو خارج از بحث کہا گیا ہے۔ سماجی اشیا سے مراد ایسی اشیا ہیں جن کو تمام افراد معاشرہ بلا کسی رکاوٹ کے یکساں مقدار میں استعمال کرتے ہیں جن کی فراہمی بازار میں مبادلہ کے ذریعہ نہیں ہو سکتی ہے مثلاً دفاعی خدمات۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے سماجی اشیا کی فراہمی حکومت ہی کر سکتی ہے۔

جہاں تک انسب تقسیم (Optimum Distribution) کا مسئلہ ہے یہ بات واضح ہے کہ اسے کسی اخلاقی قدر کی بنیاد کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مناسب تقسیم کے معروضی معیار کی عدم موجودگی کی بنا پر سماجی فلاح ایسے نظریے کو جو انفرادی آزادی پر مبنی ہو ترک کر دیا جائے۔ اگر انفرادی آزادی کی انسانی زندگی میں کوئی قدر ہے تو تقسیم کے سلسلے میں تشفی حاصل کرنے کی یکساں صلاحیت کے مفروضے پر افادہ کے بین شخصی تقابل کے کام لینے میں کوئی حرج نہیں۔ محض علم کی ایجابیت یا "سائنیت" (Positism or Senitism) کی خاطر کسی کارآمد اخلاقی معیار کو کسی پالیسی کی اختیار کرنے میں اگر معاشین احتراز کرنے کا رویہ اختیار کریں تو غیر معاشین جن کی کمی نہیں وہ اختیار کریں گے۔ دولت اور آمدنی کی تقسیم میں کس حد تک مساوات کی پالیسی اختیار کی جائے اس کا فیصلہ معاشین زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ تقسیم آمدنی کے سلسلے میں اصل مسئلہ مکمل مساوات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ عدم مساوات میں کمی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ معاشرتی خوشحالی حاصل کرنے کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف بیگو کا نظریہ خوشحالی سے متعلق پالیسی اختیار کرنے میں صحیح سمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ لارڈ کینز (Lord Keynes) کے انقلابی معاشی نظریے جو زیادہ تر معاشی کساد بازاری سے متعلق ہیں وہ تقسیم آمدنی میں زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کرنے کی پالیسی کو کساد بازاری کے دور کرنے میں معاون قرار دیتے ہیں۔ نیز معاشی ترقی کے نظریے پیش کرنے والے بھی جو ابتدا میں تقسیم آمدنی میں بہت زیادہ مساوات پیدا کرنے کی پالیسی کو اجتماع اصل میں روکاوٹ کی بنا پر مناسب نہیں سمجھتے تھے اب ان میں سے بہتر تقسیم آمدنی کی عدم مساوات کو دور کرنے یا کم از کم روکنے کی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں۔ اسی لیے کہ انھیں اس امر کا اندازہ ہو چکا ہے کہ معاشی خوشحالی کے لیے نہ صرف اجتماع اصل بلکہ مشقت کی کارکردگی اور ترغیب کار میں اضافہ بھی ضروری ہے جس کے لیے آمدنی میں عدم مساوات کی نامناسب صورت باقی رہنے یا بڑھنے سے روکارٹ پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا عدم مساوات کو تدریجاً دور کرنے کی پالیسی سے نہ صرف معاشی ترقی میں مدد ملتی ہے بلکہ اس کے ذریعہ افراد معاشرہ کی خوشحالی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

بیش قدری (Appreciation): کسی اثاثہ کی قدر میں اضافہ عمل فرسودگی (Depreciation) کے متضاد ہے۔ قدر میں اضافہ قیمتوں میں اضافہ افراط زر رسد میں کمی یا آمدنی میں اضافہ کے نتیجے میں ہو سکتا ہے۔

بین الاقوامی امان (Amnesty International):
بین الاقوامی امان ایک آزاد اور عالمی تحریک ہے۔ اس کا قیام 1961 میں اس غرض سے عمل میں آیا کہ ان مردوں اور عورتوں کی رہائی او ربحالی کے لیے رائے عامہ کو بیدار کیا جائے جو اپنی حکومتوں کے ہاتھوں اپنے ضمیر یا سیاسی یا مذہبی خیالات کی بنیاد پر قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ بشرطیکہ انھوں نے نہ تو تشدد کی تشہیر کی ہو اور نہ ہی اس کا استعمال کیا ہو۔ یہ تنظیم سیاسی قیدیوں کے مقدمات کی جلد اور منصفانہ سماعت کے لیے کوشش کرتی ہے۔ یہ سزائے موت کی مخالف ہے اور زدو کوب کے خلاف ہے۔ یہ اغوا اور قتل وغارت گری کے خلاف بھی سرگرم عمل ہے۔
اس کے اخراجات چندوں سے پورے ہوتے ہیں۔

اس کا صدر مقام لندن (انگلستان) ہے۔

بین الاقوامی ایوانِ تجارت (International Chamber of Commerce, ICC): اس ایوان تجارت کا وجود 1919 میں عمل میں آیا تاکہ عالمی سطح پر کاروباری طبقوں کے مفادات کی نمائندگی ممکن ہوسکے اور بین الاقوامی تجارت کی عظیم تر آزادی اور معقول تجارتی طریقے اختیار کیے جاسکیں۔ یہ ایوان غیر کمیونسٹ ملکوں کے ایوان ہائے تجارت کے قومی کمیشنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ ستمبر 1994 تک اس کی رکنیت 5360 انفرادی کارپوریشنوں اور 1700 تنظیموں تک وسعت پاچکی تھی۔ دسمبر 1994 تک 64 ملکوں میں قومی سطح پر اس ایوان کے مقاصد سے تال میل قائم کرنے کی غرض سے قومی کمیٹیاں یا کونسلیں قائم ہو چکی تھیں۔

ایوان کی کونسل اس کا انتظامی ادارہ ہے جو قومی کمیٹیوں کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ذریعے نامزد ممبروں پر مشتمل ہے اور اس کے اجلاس سال میں دو بار منعقد ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ایکزیکٹیو بورڈ ہے اور ایک بین الاقوامی سکریٹریٹ ہے جس کا صدر دفتر پیرس (فرانس) اور اضافی دفاتر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) اور نیویارک (ریاست ہائے متحدہ امریکا) میں واقع ہیں تاکہ اقوام متحدہ سے مستقل روابط قائم رکھے جا سکیں۔

بین الاقوامی بینک برائے تعمیر و ترقی (International Bank for Reconstruction and Development — I.B.R.D.): 1944 میں بریٹن ورڈس (Bretten Words) میں مجلس متحدہ کی ایک زری و مالی کانفرنس ہوئی جس میں 44 ملکوں نے شرکت کی تھی۔ یہاں بین الاقوامی مالی فنڈ (I.M.F.) کے ساتھ بین الاقوامی بینک برائے تعمیر و ترقی یا عالمی بینک (World Bank) قائم کرنے کی بھی تجویز منظور کی گئی اور 1946 سے اس بینک نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس بینک کا مقصد یہ ہے کہ ممبر ملکوں کی تعمیر اور ترقی کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کے لیے رضامند کرتا ہے۔ یا خود اپنے وسائل سے بھی قرض کی شکل میں سرمایہ مہیا کرتا ہے۔ اس بینک کا ہر ممبر اپنے چندہ کا دو فیصدی سونے یا ڈالر کی شکل میں ادا کرتا ہے۔ 18 فیصدی خود اپنی کرنسی میں دیتا ہے۔ اور بقیہ 80 فیصدی اپنے پاس رکھتا ہے۔ جب کبھی بینک کو اپنے واجبات کی ادائی کے لیے ضرورت ہوتی ہے تو وہ اس 80 فیصدی حصہ میں سے مانگ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بینک کی منڈیوں میں اپنے بانڈس فروخت کر کے سرمایہ جمع کرتا ہے۔ عام طور پر یہ بینک راست حکومتوں کو قرضہ دیتا ہے۔ یا ایسے اداروں کو جن کی ضمانت حکومت دے۔

عالمی بینک اب عام طور پر کسی ملک کی ایک خاص اسکیم یا منصوبے کے لیے قرضہ مہیا کرتا ہے۔ بینک کے افسر پہلے اس اسکیم یا منصوبہ کا جائزہ لیتے ہیں اور اگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ قابل عمل ہے تو پھر قرضہ مہیا کرتے ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ قرضہ عام طور پر زرعی منصوبوں وغیرہ کے لیے دیا جاتا ہے۔ خود ہندوستان میں کئی منصوبے اسکی مدد سے چل رہے ہیں۔ یہ ترقی پذیر ملکوں کی مالی پالیسیوں پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ مالی فنڈ کی طرح یہ بینک بین الاقوامی مالی کارپوریشن اور بین الاقوامی ترقیاتی اسوسی ایشن کے ذریعہ اپنا کاروبار جاری رکھتا ہے جو اس کے معاون رکن ہیں۔ بین الاقوامی مالی فنڈ کی طرح کوئی سوشلسٹ یا کیمونسٹ ملک اس تنظیم کا ممبر نہیں ہے۔

بین الاقوامی پریس انسٹی ٹیوٹ (International Press Institute, IPI): اس انسٹی ٹیوٹ کا قیام 1951 میں عمل میں آیا جو 85 ملکوں کے تقریباً 2000 صحافیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں صحافی، ناشر، نشریہ کار اور مدیر شامل ہیں۔ اس کا مقصد آزاد اور ذمہ دار پریس کی حمایت کرنا ہے۔ اس کی سرگرمیاں پریس کی آزادی ممبروں کی علاقائی نشستوں، تربیتی پروگراموں، ریسرچ اور لائبریری کو محیط ہیں۔ اس کی جنرل اسمبلی کا اجلاس سال میں ایک بار منعقد ہوتا ہے۔ اس کا صدر مقام ویانا (آسٹریا) ہے۔

بین الاقوامیت: بین الاقوامیت کا مطلب یہ ہے کہ آزاد ملک ایک دوسرے سے الگ رہ کر تنہا اپنی کوششوں سے اپنے عوام کو خوشحال نہیں بنا سکتے، اس لیے انھیں اپنے عوام کے امن اور تحفظ کے لیے بین الاقوامی ادارے قائم کر کے ان کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر کے باہمی مفادات کو فروغ دینا چاہیے۔

لفظ "بین الاقوامی" (انٹرنیشنل) کا پہلے پہل استعمال انگریز فلسفی جریمی بنتھم سے منسوب ہے۔ "بین الاقوامیت" (انٹرنیشنلزم) کی کیفیت قومی مملکتوں کے تعاملات اور روابط کی توسیع و ترقی سے ماخوذ ہے۔ اقوام کے درمیان سرکاری، قانونی اور سفارتی تعلقات کے علاوہ دوسرے بہت سے شعبہ جات زندگی میں طرح طرح کے تعلقات قائم ہوتے ہیں مثلاً اقتصادی، تہذیبی، علمی، فنی، ادبی، صنعتی وغیرہ۔ کفالت باہم کی ضرورت اور بین الاقوامی روابط کی وسعت نے ایک بین الاقوامی برادری کے وجود کے احساس کو جنم دیا ہے جس طرح قومیت یا قوم پرستی کے معنی میں قومی برادری کی وحدت، سالمیت اور اس کے مشترکہ مفادات کا احساس شامل ہے اسی طرح بین الاقوامیت، بین الاقوامی برادری میں یکجہتی، امن و آشتی، اور مشترکہ مفادات کے لیے تعاون سے عبارت ہے۔ اس کے معنی ہر طرح کے بین الاقوامی تعلقات میں اضافہ کے بھی ہیں اور ایسے نظریوں کے بھی جو اس اضافہ کی تائید اور وکالت کریں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک بین الاقوامیت، بین الاقوامی تعاون کا ایک طریقہ ہے جو بین الاقوامی تنظیم اور عالمی اداروں پر مشتمل ہے۔ بعض مفکرین اس اصطلاح کو صلح پسندی اور انسانیت پسندی جیسی عالمی نظریاتی تحریکات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن صحیح معنوں میں بین الاقوامیت ایک معاصر کیفیت ہے جس کا مفہوم قومیت کے مفہوم کی طرح ایک خاص رویہ یا ذہنی حالت یا ایک عالمی سماج

یا دنیا کے عوام کی برادری کا رکن ہونے کا شعور اور اس برادری کے ذریعے یا اس کے لیے قائم ہوئی تنظیمات میں اپنی قوم کو شریک کرنے پر آمادگی اور بین الاقوامی تعاون کے حق میں اپنے کچھ حاکمانہ اختیارات سے دست بردار ہونے پر رضامندی ہے۔ اس سلسلہ میں اعتدال پسند مکتبہ فکر عالمی اداروں (یعنی بین الاقوامی تنظیم) کو اتنے ہی اختیارات دینا پسند کرتا ہے، جتنا بین الاقوامی امن کے قیام اور اس کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن انتہا پسندوں کا نصب العین بالآخر ایک مرکزی عالمی حکومت کا قیام ہے۔ ان دونوں مکتبوں کے درمیان بین الاقوامیت کے مختلف درجہ کے نظریات پائے جاتے ہیں۔ بین الاقوامیت کا تصور اقوام کے جداگانہ وجود اور ان کی سیاسی آزادی کے اعتراف کے ساتھ انھیں عظیم تر بین الاقوامی جماعت کے اجزا تسلیم کرتا ہے۔ اس کے دائرہ سے نوع انسانی کی حد سے زیادہ معیار بندی اور جمع بندی جو سامراج (Imperialism) اور وسیع المشربی (Cosmopolitanism) جیسے نظریات کا مقصود ہے خارج ہے اور دوسری طرف قومی بالاتری اور حاکمیت کے دعوے بھی جو قوم پروری اور عزلت پسندی جیسے نظریات کا جوہر ہیں وہ بھی اس کے دائرے سے خارج ہیں۔

اگرچہ بین الاقوامیت کی جڑیں قدیم تاریخ میں پیوست ہیں لیکن بطور ایک رجحان یا ذہنی کیفیت کے اس کی ابتدا انیسویں صدی کے نصف آخر میں قرار دی جاتی ہے۔ چونکہ اس کی نشوونما قوم پرستی کی ضد کے طور پر ہوئی اس لیے روشن خیالی کے دور کے ذہنی رجحانات سے قریبی تعلق کے باوجود بین الاقوامیت اپنی نوعیت کا ایک بالکل نیا تاریخی تصور ہے۔ اس نے یورپ میں 1848 کی انقلابی تحریکات میں جنم لیا۔ ہیگ میں 1899 اور 1907 کی بین الاقوامی کانفرنسوں سے اسے تقویت ملی لیکن عملی تجربہ کے مرحلہ میں بین الاقوامیت پہلی عالمی جنگ کے بعد 1919 میں جمعیت اقوام کی تشکیل کے ساتھ داخل ہوئی لیکن دوسری عالمی جنگ تک کے عرصہ میں اجتماعی تحفظ کا بین الاقوامی منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ بین الاقوامیت اپنے تعمیری مرحلہ میں 1945 میں اقوام متحدہ کی تنظیم کے قیام کے ساتھ داخل ہوئی۔ اگرچہ عظیم ترین طاقتوں کے آپسی ٹکراؤ کے نتیجے میں تنظیم اجتماعی تحفظ کا نظام قائم کرنے میں ناکام رہی ہے لیکن اپنے تخصیصی اداروں کے ذریعے عملی میدانوں میں بین الاقوامی تعاون اور مفاہمت کو وسعت دینے میں بڑی حد تک موثر ثابت ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر سے دنیا میں کچھ ایسے اہم معروضی عوامل کام کررہے ہیں جن کے نتیجہ میں بین الاقوامیت کا فروغ ناگزیر ہے۔ ان میں سے چند اہم عوامل یہ ہیں۔

(1) کرۂ ارض پر واقع علاقائی اکائیوں کے ارتباط اور کفالت باہم کا روز بروز بڑھنا اور اس کے نتیجہ میں ملکوں کے داخلی اور خارجی معاملات کے درمیان حد فاصل کا مبہم ہونا، اور انسانی مسائل کے حل میں تنہا قومی مملکت کا ناکافی ثابت ہونا۔

(2) سائنس پر مبنی ٹیکنالوجی کے ذریعے ترقی یافتہ ملکوں میں اقتصادی پیداوار میں عدیم المثال وسعت، مصنوعات کا تنوع اور صنعتی ملکوں میں اقتصادی تخصص کا بڑھنا۔

(3) اس اقتصادی تقسیم عمل اور تخصص کے نتیجہ میں اقوام کے اندر اور ان کے درمیان تجارت اور تبادلہ کا بڑھنا۔

(4) بڑے پیانہ کے کثیر قومی اقتصادی اداروں (Multi- national Corporations) کا ارتقا اور توسیع جو بیک وقت خود مختارانہ طور پر کئی ملکوں یا بہت سے ملکوں میں کام کرتے ہیں۔

(5) دنیا کی انسانی آبادی میں عدیم المثال اضافہ جو ہر دوسری نسل میں تقریبا دوگنی ہوجاتی ہے۔

(6) زمین کی سطح کا تاریخی سمٹاؤ اور اس سے حاصل ہونے والے معدنی وسائل مثلاً تیل، لوہا، کوئلہ اور دوسرے وسائل کا تیزی سے صرفہ اور اس کے نتیجہ میں اقوام کی اقتصادی خود مختاری کا سمٹنا۔

(7) صنعتی کارروائیوں کے نتیجہ میں کرۂ ارض کی فضا اور پانی اور انسانی زندگی کے لیے لازمی دوسرے اہم عناصر کا آلودہ ہونا۔

(8) روایتی اور نیوکلیائی اسلحہ کی ٹیکنالوجی میں روز افزوں ترقی اور اس کے نتیجہ میں انسان کی ہلاک کرنے اور تباہ کرنے کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ۔ چنانچہ انسان روئے زمین پر بسنے والی انواع میں مہلک ترین اور سب سے زیادہ تباہ کن ہوگیا ہے۔

(9) فضائی مواصلات اور جیٹ کے زمانہ میں ملکوں کے درمیان جغرافیائی فاصلہ کا سمٹنا اور اس کے نتیجہ میں ارض وعلاقہ کی دفاعی افادیت کا زائل ہونا۔

(10) عالمی پیانہ پر خواندگی کا عام ہونا اور عوام کا دور و نزدیک کے ملکوں

کے حالات و کوائف سے باخبر ہونا۔

(11) اس کے نتیجہ میں عوام میں سیاسی شعور کی بیداری اوران کا اپنی حکومتوں سے انسانی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں روز افزوں توقعات کا وابستہ کرنااور سیاست دانوں کی یہ کشمکش کہ قلیل وسائل کو کیوں کر روز افزوں عوامی مطالبات کی تکمیل کے لیے استعمال کیاجائے۔

(12) جدید فوجی اسلحہ کے نتیجہ میں اقوام کے روایتی دفاعی وسائل کی کمزوری اور عدم تحفظ کا عام احساس وغیرہ۔

چنانچہ موجودہ بین الاقوامی مملکتی نظام میں قبائلیت اور نیم منظم نراج کی کیفیت کے جاری وساری ہونے کے باوجود مذکورہ بالا عوامل کے نتیجہ میں کچھ ایسی طاقتیں بھی وجود میں آئی ہیں جو بین الاقوامیت کی سمت میں کام کررہی ہیں۔ کرۂ ارض کی بقا، نوع انسانی کی سلامتی اور ملکوں کے اندر اہم ترین انسانی مسائل کے حل کے لیے حکومتوں کی انفرادی کوششیں ناکافی ہیں۔ چنانچہ ہر شعبہ میں بین الاقوامی اقدام ناگزیر ہوگیاہے۔

بین الاقوامی تجارت (International Trade): دو یا دو سے زاید ملکوں کے درمیان سامان اور خدمات کا تبادلہ بین الاقوامی تجارت کہلاتا ہے۔ یہ تبادلہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ مختلف ملکوں کی لاگت پیداوار میں فرق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ملک میں استعمال کے لیے حاصل اشیا اور خدمات میں تنوع پیدا کرنے سے اس کی معاشی خوش حالی بڑھتی ہے۔ مشہور ماہر معاشیات ریکارڈو نے یہ بتلایا ہے کہ تقابلی فائدہ (Comparative Advantage) کے قانون کے تحت کسی دوسرے ملک کے ساتھ تجارت کے لیے اس اشیا کی لاگت میں کلی فائدہ (Absolute Advantage) کی صورت حال ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی ملک میں جو اشیا تیار ہوتی ہیں ان کی لاگت دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ ہو تب بھی ایسی تجارت ہوسکتی ہے۔ جو سب کے لیے فائدہ بخش ہو۔ بشرطیکہ مختلف اشیا کی اضافی لاگت پیداوار کم ہو۔

وسائل کی عدم یکسانیت کی بنا پر مختلف ملکوں کی لاگت پیداوار میں فرق ہونا لازمی ہے ان ملکوں میں کچے مال کی نوعیت اور مقدار، موسم، مالیے کی مقدار، مزدوروں کی تعداد، اور ان کی صلاحیت مختلف ہوتی ہیں۔ ہر ملک ایسی اشیا برآمد کرنا چاہتا ہے جن کے بنانے میں ان وسائل کا استعمال ہو جو اس کے یہاں زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ منڈیوں کی وسعت کے ذریعہ مزدوروں میں مہارت کی تخصیص (Specialisation of Labour) پیدا کرکے اور پیمانہ کفایات (Economics of Scale) حاصل کرکے بین الاقوامی تجارت کو پابندیوں سے آزاد کروایا جاسکتا ہے۔ کلاسکی معاشیین تجارت پسندوں پر یہ الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ تجارت پر حکومتی پابندی لگوانا چاہتے ہیں تاکہ برآمدات سے فاضل آمدنی (Surplus) حاصل ہوسکے۔ 19 ویں اور ابتدائی بیسویں صدی کا دور برطانیہ میں آزاد تجارت کا دور تھا۔ دو عالم گیر جنگوں کے درمیان آزاد تجارت کی جگہ معاشی تحفظ نے لے لی تھی۔ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد 1948 میں "ٹیرف و تجارت کے عام معاہدہ" (دیکھیے گاٹ (G.A.T.T.)) کے ذریعہ آزاد تجارت پھر سے بحال کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ اس سے درآمدات میں ٹیرف (Tariff) میں کمی کرنے میں مدد ملی اور پھر 1967 میں کینیڈی معاہدہ (Kennedy Round) ہوا۔ اس کے باوجود درآمدات پر پھر بھی کئی پابندیاں لگائی گئیں۔ اس کے علاوہ یورپی ملکوں، لاطینی امریکا اور وسطی امریکا کے ملکوں وغیرہ میں آپس میں کسٹم کے الگ الگ معاہدے ہوئے اور کسٹم یونین قائم ہوئی۔ ان یونینوں کے ممبروں میں آپس میں درآمد پر سے پابندیاں ہٹالی گئیں لیکن ان سے باہر کے ملکوں سے درآمد پر پابندیاں باقی رہیں۔ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد سے اشیا اور خدمات کی تجارت کی شکل کافی بدل گئی۔ اور اس میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور ایشیا افریقہ کے بہت سے ملک آزاد ہوگئے ہیں اور اب وہ پہلے کی طرح سستا مال مہیا کرنے والے نہیں رہنا چاہتے بلکہ وہ نئی نئی صنعتیں قائم کررہے ہیں۔ اور تیارشدہ مال برآمد کررہے ہیں۔ دوسری طرف ترقی یافتہ ملک ٹکنالوجی میں بڑھتی ہوئی مہارت کا فائدہ اٹھاکر ان اشیا اور خدمات کی برآمد میں اپنا حصہ بڑھارہے ہیں۔

بین الاقوامی ترقیاتی اسوسی ایشن (International Development Associations — I.D.A.): یہ ادارہ 1960 میں قائم ہوا اور بین الاقوامی بینک برائے تعمیر و ترقی (عالمی بینک) سے ملحق ہے۔ یہ ترقی پذیر ملکوں کو کم شرح سود پر طویل مدتی قرضے دیتا ہے۔ یہ ایسے منصوبوں کے لیے قرض دیتا ہے جس کے لیے عام طور پر قرضے ملنا مشکل ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ سڑکوں کی تعمیر، پینے کا پانی یا بجلی وغیرہ مہیا کرنے کے لیے قرضے مہیا کرتا ہے۔ جولائی 1970 میں عالمی

بینک نے ترقیاتی بینک کو اپنی امداد دوگنی کردی تھی جو 800 ملین ڈالر سالانہ تھی۔ اس امداد میں بڑا حصہ امریکا، برطانیہ، مغربی جرمنی، فرانس، کینیڈا اور جاپان کا ہے۔

بین الاقوامی ترقیاتی انجمن (IDA) : یہ انجمن نومبر 1960 سے عالمی بینک کے متعلقہ ادارہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کا مقصد غریب ترین ترقی پذیر ملکوں کو آسان شرائط پر عالمی بینک کے مقابلہ میں کمتر شرح سود پر سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اس کی آمدنی کے وسائل ترقی یافتہ اور صنعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ملک کے چندوں اور امداد پر منحصر ہے۔ اس انجمن کے کارکن عالمی بینک کے صدر دفتر میں ہی معروف کار رہتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات (International Relations) :
بین الاقوامی تعلقات سے ریاستوں کے مابین آپسی تعلقات اور ان تعلقات کا علمی مطالعہ دونوں مراد لیے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ تاہم یہ اصطلاح کئی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے جو درج ذیل ہیں :

(1) بین الاقوامی تعلقات محض ریاستوں کے مابین تعلقات کا نام نہیں بلکہ اسے ریاستوں کے دائرۂ اختیار سے باہر افراد وجماعت کے مابین ہر قسم کے تعلقات و روابط کے وسیع اور لامحدود معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(2) بین الاقوامی تعلقات کا استعمال محض ان تعلقات کے لیے ہوتا ہے جو ریاستوں کے مابین استوار ہوتے ہیں۔

(3) بین الاقوامی تعلقات کا استعمال محض ریاستوں کے مابین ہر قسم کے آپسی تعلقات کے لیے ہوتا ہے۔

(4) بین الاقوامی تعلقات کا اطلاق ریاستوں کے مابین محض ان تعلقات پر ہوتا ہے جو سیاسی نوعیت کے ہوں یعنی جن سے مفادات و مقاصد کے تصادم کا اظہار ہوتا ہو۔

بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح کے مفاہیم نہایت مبہم اور غیرواضح ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کا علم ان سب سے سروکار نہیں رکھتا بلکہ ہرلڈ اور مارگریٹ اسپراؤٹ کی کتاب "بین الاقوامی سیاست کی بنیادیں" (Foundations of International Politics) کی رو سے یہ مضمون بنیادی طور پر ریاستوں کے مابین تعلقات سے بحث کرتا ہے اور یہ محض انھیں تعلقات اور امور کو زیربحث لاتا ہے جس میں کسی نہ کسی نوعیت سے مقاصدو مفادات پائے جاتے ہوں۔ غیر سیاسی امور اس کے دائرہ بحث سے خارج ہوتے ہیں۔ اور سیاسی امور سے مراد ایسے معاملات ہیں جن میں مفادات و مقاصد کے حصول کی کشمکش کے حوالہ سے دوسرے کی مخالفت، کسی دباؤ کی مزاحمت یا اپنے مقاصد کے حصول کی سعی و کوشش کے عناصر شامل ہوں۔

کوئنسی رائٹ نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات کا مطالعہ" (A Study of International Relations) میں نسبتاً زیادہ وسیع مفہوم بیان کیا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق بین الاقوامی تعلقات کا دائرہ محض ریاستوں کے مابین تعلقات تک محدود نہیں بلکہ ریاستوں، اقوام، حکومتوں، عوام، معاہدات، اتحادات، بین الاقوامی تنظیموں اور منطقوں یہاں تک کہ صنعتی، تہذیبی اور مذہبی تنظیموں کے باہمی تعلقات بھی بین الاقوامی تعلقات کے دائرہ مطالعہ میں شامل ہیں۔ تاہم رائٹ بین الاقوامی تعلقات کے اپنے بیان کردہ اس مفہوم پر زور دینے کے بجائے مروجہ مفہوم کی تائید کرتے ہوئے بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ میں ریاستوں کے باہمی تعلقات کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ عالمی معاشرہ کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرنے کی غرض سے اس نے بین الاقوامی تعلقات کو متعدد ذیلی موضوعات میں تقسیم کردیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

بین الاقوامی قانون، بین الاقوامی سیاست، بین الاقوامی تنظیم، بین الاقوامی معاشیات، بین الاقوامی تعلیم اور سفارت کاری وغیرہ۔ لہٰذا رائٹ کے خیال میں بین الاقوامی تعلقات کا مضمون دیگر مضامین کی طرح کوئی منفرد اور مستقل مضمون نہیں بلکہ متعدد مضامین سے استفادہ کرتا ہے اور اپنا ایک وسیع، جامع اور بین الموضوعاتی میدان رکھتا ہے۔

مختصراً یہ کہ بین الاقوامی تعلقات کی اصطلاح اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود کسی نہ کسی حیثیت سے ریاستوں کے مابین سیاسی، معاشی، قانونی، تنظیمی اور سفارتی تعلقات پر منحصر ہے جس میں مفادات اور مقاصد کے حصول کے تئیں تنازعات اور کشمکش کے حوالہ سے تعلقات کی نوعیت کا مطالعہ سب پر مقدم ہے۔

بین الاقوامی تنظیم صحت (World Health Organisation, WHO) : 1945 میں بین الاقوامی تنظیم

سے متعلق اقوام متحدہ کی جو کانفرنس سان فرانسسکو میں منعقد ہوئی تھی اس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ صحت سے متعلق ایک ایسی واحد بین الاقوامی تنظیم قائم کی جائے جس کا دائرہ اختیار صحت عامہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ چنانچہ 22/جولائی 1946 کو ایک کانفرنس میں اس تنظیم کا دستور منظور کیا گیا اور یکم ستمبر 48 سے بین الاقوامی تنظیم صحت نے اپنا کام شروع کردیا۔ "دنیا کے عوام کی بہتر سے بہتر صحت کا حصول" اس تنظیم کا بنیادی مقصد قرار پایا۔

صحت کی عالمی اسمبلی، ایگزیکیٹو بورڈ اور سکریٹریٹ اس تنظیم کے اہم ادارے ہیں۔ عالمی اسمبلی میں تمام ارکان شرکت کرتے ہیں سال میں ایک مرتبہ منعقد ہوتی ہے۔ یہ اسمبلی تنظیم کا پالیسی ساز ادارہ ہے ایگزیکیٹو بورڈ 24 اشخاص پر مشتمل ہوتا ہے اس کے اجلاس سال میں کم سے کم دو مرتبہ منعقد ہوتے ہیں۔ یہ اسمبلی کے عاملانہ فرائض انجام دیتا ہے۔ سکریٹریٹ ایک ڈائرکٹر جنرل کے علاوہ حسب ضرورت فنی انتظامی عملہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

بین الاقوامی تنظیم صحت جن امور میں تعاون وامداد بہم پہنچاتی ہے ان میں دیگر باتوں کے علاوہ حسب ذیل فرائض بھی شامل ہیں:-

طبی تحقیقات میں ربط پیدا کرنا، طب میں استعمال ہونے والے حیاتیاتی مادوں کا ایک بین الاقوامی معیار قائم کرنا، صحت کے نقطہ نظر سے ہوائی، زمینی اور سمندری راستوں سے مسافروں کی آمدورفت پر کنٹرول رکھنا اور سائنٹفک معلومات کا تبادلہ کرنا۔ اس کے علاوہ وہ متعدی بیماریوں پر قابو پانے، حفظان صحت کی اصلاح اور صحت عامہ کی خدمات نیز طبی عملہ کی تربیت کے سلسلہ میں ہر حکومت کی فرداً فرداً مدد بھی کرتی ہے۔ اس تنظیم کی طرف سے 1956 میں ملیریا کے خاتمہ کے لیے ایک عالمی پروگرام شروع کیا گیا تھا تاکہ ساری دنیا سے یہ بیماری نیست ونابود ہوجائے اسی طرح کا ایک اور پروگرام چیچک کے قلع قمع کے لیے 1967 میں شروع کیا گیا تھا۔

عالمی صحت کی تنظیم اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ڈاکٹروں، نرسوں، سینیٹری انجینئروں، تجربہ گاہوں کے فنی عامہ اور صحت عملہ سے متعلقہ افراد کی تعلیم اور ٹریننگ وغیرہ پر خرچ کرتی ہے وہ صحت کے پیشوں سے متعلقہ مدارس کے قیام میں مدد کرتی ہے اورجہاں ضرورت ہو ماہر مشیروں اور تدریسی عملہ کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ ہیلتھ اسمبلی نے 1948 سے زچگی۔ بچوں کی بہبودی، صحت بخش غذا اور صحت بخش ماحول جیسے مسائل پر بھی توجہ دینا شروع کیاہے۔ صحت عامہ کے عالمگیر مسائل پر بھی وہ خصوصی ریسرچ کے پروگرام بروئے عمل لاتی ہے۔ غرضیکہ صحت کے میدان میں مختلف النوع اور پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں اس کی سرگرمیاں قابل ستائش ہیں۔

بین الاقوامی تنظیم مزدوران (International Labour Organisation, ILO):

دنیا کے محنت کش عوام کے ساتھ سماجی انصاف کو پائیداری کی ایک لازمی شرط تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1919 میں آئی۔ایل۔ او کا قیام اسی مقصد کے تحت عمل میں لایا گیا۔ 1946 میں یہ تنظیم اقوام متحدہ کی ایک خصوصی ایجنسی کی حیثیت اختیار کرگئی۔ یہی ایک واحد اور اہم تنظیم ہے جو 1919 میں لیگ آف نیشنز کے قیام کے ساتھ اس کے ایک جزو کی حیثیت سے وجود میں آئی اور آج تک موجود ہے۔

آئی۔ ایل۔ او کے اہم ادارے بین الاقوامی مزدور کانفرنس، گورننگ باڈی اور بین الاقوامی لیبر آفس پر مشتمل ہیں۔ ان میں لیبر کانفرنس سب سے اعلا ادارہ ہے جہاں مزدوروں کے مسائل پر غور وفکر کیا جاتا ہے۔ یہ کانفرنس گورننگ باڈی کا انتخاب کرتی ہے، تنظیم کا بجٹ منظور کرتی ہے اور محنت کشوں سے متعلق معاہدوں اور سفارشوں کی توثیق کرتی ہے۔ یہ ادارہ ملک کے چار نمائندوں پر مشتمل ہوتاہے۔ جن میں سے دو سرکاری نمائندے ایک آجروں کا نمائندہ اور ایک مزدوروں کانمائندہ ہوتاہے۔ آئی۔ایل۔ او کی مجلس عاملہ گورننگ باڈی کہلاتی ہے۔ وہ پالیسی اور پروگرام کو طے کرنے کی غرض سے سال میں تین یا چار مرتبہ اپنے اجلاس بمقام جینوا منعقد کرتی ہے۔ اس کا سکریٹری بین الاقوامی لیبر آفس کہلاتا ہے جس کا سربراہ آئی۔ ایل۔ اول کا ڈائرکٹر جنرل ہوتاہے۔

آئی۔ایل۔ او کے اغراض ومقاصد کی اس کے دستور کے دیباچہ میں صراحت کردی گئی ہے۔ یہ دستور 1919 میں مرتب کیا گیا تھا۔ آئی۔ ایل۔ او کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ میں کام کرنے کے حالات کو بہتر بنایاجائے تاکہ اس طرح سماجی انصاف کو فروغ حاصل ہوسکے۔ آئی۔ ایل۔او کے سامنے چند بنیادی امور ہیں مثلاً اوقات کار میں باقاعدگی پیدا کرنا بیروزگاری کی روک تھام، قابل گذارہ اجرت کی فراہمی، ضعیف العمر اشخاص کی کفالت اور مساوی کام کے لیے مساوی اجرت وغیرہ۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

آئی۔ ایل۔ او کی سرگرمیاں بہ غرض سہولت دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق محنت اور اجرت کے بین الاقوامی معیارات قائم کرنے سے ہے دوسرا ان معیارات کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں امداد واشتراک سے ہے۔ یہ معیارات روایات اور سفارشات کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ اس ضمن میں آئی۔ ایل۔ او کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے متعدد معیاری روایات اور سفارشات کی بنیاد ڈالی اور اس طرح ایک جامع بین الاقوامی ضابطہ محنت وجود میں آیا۔ انٹرنیشنل لیبر اسٹینڈرڈز کا دائرہ اب اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اس میں مزدور مسائل کے علاوہ سماجی امور اور بنیادی انسانی حقوق بھی شامل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ 1971 کے اواخر تک انٹرنیشنل لیبر کانفرنس نے 280 لیبر اسٹینڈرڈز کو مسلمہ قرار دیا ہے۔

آئی۔ ایل۔ او مختلف ممالک کے معاشی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے وہاں کی حکومتوں کو راست امداد بھی دیتی ہے۔ یہ کام وہ خود انجام دیتی ہے۔ اس کی یہ سرگرمیاں فنی تعاون کی سرگرمیاں کہلاتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مزدوروں کی مہارت بڑھانے، انھیں بہتر اجرتیں دلوانے اور ملک کی صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے بین الاقوامی امداد بھی بہم پہنچاتی ہے مزید براں وہ پیشہ ورانہ ٹریننگ مینجمنٹ کی تربیت اور پیداواری صلاحیتوں کی اصلاح سے متعلق پروگرام بھی چلاتی ہے۔ یہ سارے کام زیادہ تر اس مالی امداد کے مرہون منت ہوتے ہیں جو اقوام متحدہ سے مختلف ادارے اور خصوصی ایجنسیاں فراہم کرتی ہیں۔ یہ امداد عموماً ماہرین کی فراہمی، وظائف اور ساز وسامان کی شکل میں ہوتی ہے۔ 1960 میں مزدوروں کے مسائل کے مطالعہ کی غرض سے اس نے جنیوا میں ایک انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے یہ انسٹی ٹیوٹ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہے جہاں بالخصوص سماجی اور مزدوروں کے مسائل زیر مطالعہ آتے ہیں۔ 1915 میں کے مقام تیورن میں ایک اور بین الاقوامی مرکز قائم کیا گیا جہاں اعلیٰ معیار کی فنی اور پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ اب تک اس مرکز نے انتظامی امور کی جانکاری اور طریقہ تدریس کی جدید ٹیکنالوجی سے ساری دنیا کے ممالک کو فیضیاب کیا ہے۔

1961 میں پچاسویں سالگرہ کے موقعہ پر آئی۔ ایل۔ او نے فراہمی روزگار کا ایک عالمگیر پروگرام شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دنیا کی غیر معمولی طور پر بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر کام کرنے کے مواقع اور کام کی تربیت کے سلسلہ میں مختلف حکومتوں کی مدد کی جاسکے۔ اس پروگرام میں خاص طور سے لاطینی امریکا، ایشیا اور افریقہ کے ممالک کو پیش نظر رکھا گیا اوران ہی کے لیے بھی پروگرام مرتب کیے گئے۔ اس کے چار علاقائی دفاتر ہیں جو افریقہ کے لیے عابد جان میں، امریکا کے لیے پیرو میں، عرب ریاستوں کے لیے جنیوا میں اور ایشیا اور پیسفک کے لیے بنکاک میں واقع ہیں۔

اس کے رکن ممالک کی تعداد 173 ہے اور اس کا صدر مقام جنیوا (سوئٹزر لینڈ) ہے 1969 میں آئی۔ ایل۔ او کو نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا۔ یہ اس کے گزشتہ سالوں کی محنت شاقہ کا اعتراف تھا۔

بین الاقوامی ذراتی توانائی ایجنسی (IAEA): اس ایجنسی کا قیام ایک بین الاقوامی ایجنسی کی شکل میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے فیصلہ کے تحت 1957 میں آسٹریا میں عمل میں آیا۔ اگرچہ یہ اپنے معاملات میں خودمختار ہے تاہم انتظامی طور پر اقوام متحدہ سے وابستہ ہے اور ہر سال اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو پیش کرتی ہے۔ اس کا اہم مقصد یہ ہے کہ جوہری توانائی کو پوری دنیا میں امن، صحت اور ترقی کے لیے استعمال کیا جائے اور کسی قسم کے فوجی مقاصد کی تکمیل سے احتراز کیا جائے۔

اس کی جنرل کانفرنس ملک ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہر سال ایجنسی کی پالیسی، میزانیہ اور پروگرام سے متعلق فیصلے کرتی ہے۔ یہ بورڈ آف گورنرس کو منتخب کرتی ہے، ڈائریکٹر جنرل کے تقرر کی توثیق کرتی ہے اور نئے ممبروں کو شمولیت کی منظوری دیتی ہے۔ بورڈ آف گورنرس اس ایجنسی کا اہم ترین پالیسی ساز ادارہ ہے جو جنرل کانفرنس کے تئیں ذمہ دار ہے۔

یہ ایجنسی تکنیکی تعاون کے میدان میں جوہری توانائی کے پرامن استعمال کے لیے کی جانے والی تحقیقات کے سلسلے میں امداد فراہم کرتی ہے اور اس بات کا تیقن کرتی ہے کہ اس کے ذریعہ فراہم کردہ اطلاعات کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جارہا ہے۔

اس کے اراکین کی تعداد 123 ہے۔

بین الاقوامی صلیب احمر (International Red Cross): بین الاقوامی صلیب احمر کی تحریک تین اجزا سے مرکب ہے:

(1) صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(2) صلیب احمر سوسائٹیوں کی لیگ اور

(3) قومی صلیب احمر سوسائٹیاں۔

بین الاقوامی صلیب احمر کا اعلیٰ ترین ادارہ صلیب احمر کی بین الاقوامی کانفرنس ہے جس میں جنیوا معاہدات میں شریک ملکوں کی قومی صلیب احمر سوسائٹیوں، ہلال احمر، سرخ شیر اور آفتاب سوسائٹیوں کے وفود شرکت کرتے ہیں۔ یہ کانفرنس ہر چوتھے سال منعقد ہوتی ہے۔ دو کانفرنسوں کے درمیان اس کا مستقل کمیشن کام کرتا ہے جس کے سالانہ دو جلسے ہوتے ہیں۔

صلیب احمر کی بین الاقوامی کمیٹی جنیوا میں 1863 میں قائم ہوئی تھی۔ یہ صلیب احمر کے اصولوں اور جنگی زخمیوں، قیدیوں، شہریوں وغیرہ سے سلوک پر جنیوا معاہدات کی نگہبانی کرتی ہے۔ صلیب احمر سوسائٹیوں کی لیگ کو 1919 میں جنیوا میں امریکا، فرانس، اطالیہ اور جاپان کی قومی صلیب احمر سوسائٹیوں نے ایک مستقل رابطہ کی انجمن کے طور پر قائم کیا تھا۔

1949 میں جنگ سے متاثرہ انسانوں کے ساتھ سلوک سے متعلق جنیوا میں چار میثاقوں پر دستخط کیے گئے تھے جن کی رو سے صلیب احمر کو زخمیوں، بیمار فوجیوں، ڈاکٹروں، طبی عملوں اور مذہبی افراد کے ساتھ ہی سمندری علاقوں میں پائے جانے والے زخمیوں، بیماروں، طبی عملوں، تباہ شدہ جہازوں کے لوگوں، جنگی قیدیوں اور شہری آبادی کی حفاظت کا بار سونپا گیا۔ دراصل صلیب احمر انسانیت، بے غرضی، غیر جانبداری، رضاکارانہ خدمت، آزادی، اتحاد اور آفاقیت جیسے آفاقی اصولوں پر عمل پیرا ہے۔

بین الاقوامی فضائی نقل و حمل کی انجمن (International Air Transport Association, IATA): اس انجمن کی تشکیل 1945 میں ہوئی تاکہ محفوظ، کفایتی اور باضابطہ فضائی نقل و حمل کی سہولتوں میں اضافہ اور فضا کی نقل حمل کے میدان میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دیا جاسکے۔ اس میں 130 اقوام کے 230 ارکان شامل ہیں۔ دراصل 1919 میں ہیگ میں بین الاقوامی فضائی آمدورفت کی انجمن کا قیام اس وقت عمل میں آیا تھا جب پہلی بین الاقوامی پرواز شروع ہوئی تھی۔ بین الاقوامی فضائی نقل و حمل کی انجمن اسی بین الاقوامی فضائی آمدورفت کی انجمن کی جانشین ہے۔ اس کے دفاتر مانٹریال (کینیڈا) اور جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں واقع ہیں۔ انجمن کی رکن ایرلائنیں جنیوا میں واقع اس کے کلیرنس ہاؤس سے اپنے بین الاقوامی حسابات کا تصفیہ کرانے کے بعد ڈالروں یا پاؤنڈ اسٹرلنگ کی شکل میں نقد ادائیگی کراسکتی ہیں۔ سبھی ایرلائنیں بے معاوضہ اپنے درمیان معلومات اور تجربہ کا تبادلہ کرتی ہیں۔ ٹریفک کانفرنسوں کے ذریعے بین الاقوامی ایرلائنیں اپنی حکومتوں کی منظوری سے بین الاقوامی کرایوں کی شرحیں مقرر کرتی ہیں۔ اس انجمن کو بین الاقوامی شہری ہوائی تنظیم، بین الاقوامی مواصلاتی یونین اور عالمی ہوائی تنظیم کا قریبی تعاون بھی حاصل ہے۔

بین الاقوامی فینانس کارپوریشن (International Finance Corporation — I.F.C.): اس کارپوریشن کا عالمی بینک سے الحاق ہے۔ 1950 کے اوائل میں یہ محسوس کیا گیا تھا کہ عالمی بینک کے قرضوں کے لیے سرکاری ضمانت ضروری ہے اس کے بغیر ترقی پذیر ملکوں کے لیے نجی ذرائع سے قرضے حاصل کرنا مشکل ہوگا چنانچہ 1956 میں بین الاقوامی فیناس کارپوریشن قائم کیا گیا تاکہ نئے منصوبے شروع کرنے کے لیے نجی وسائل سے سرمایہ حاصل کیا جاسکے۔ 1961 تک اس کے کاروبار نہایت محدود رہے اور یہ ادارہ بہت کم سرمایہ حاصل کرسکا۔ اس لیے کہ یہ جس منصوبہ میں سرمایہ لگاتا تھا اس کے حصص میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ 1961 کی ترمیم کے بعد سے اس کے کاروبار بہت بڑھ گئے۔ اس لیے کہ اب یہ کارپوریشن راست سرمایہ لگا سکتا ہے۔ اور نجی سرمایہ کاروں کو ضمانت دے سکتا ہے۔ وہ نجی کمپنیوں میں حصہ دار بن سکتا ہے۔ اگرچہ یہ حصص کل کے 25 فی صدی سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔ یہ کارپوریشن اب عالمی بینک سے قرضہ لے سکتا ہے اور بغیر حکومت کی ضمانت کے نجی سرمایہ کاروں کو قرضہ دے سکتا ہے۔ اس کا سرمایہ ممبروں کے چندے سے جمع ہوتا ہے جن کی تعداد 80 سے زیادہ ہے۔

بین الاقوامی قانون (International Law): بین الاقوامی قانون قواعد اور اصولوں کے مجموعے کا نام ہے جو کوئی مملکت (State) اپنے لیے قانونی طور پر واجب التعمیل سمجھتی ہے اس قانون کی ابتدا ایک حد تک قرون وسطیٰ میں ہوئی۔ اگرچہ اس کے بعض اصول قدیم زمانے سے بھی رائج تھے۔ حقیقت میں بین الاقوامی قانون کے عام اصولوں کا آغاز اواخر سولھویں صدی اور اوائل سترھویں صدی میں ہوا جب یورپ میں کئی آزاد مملکتوں کا قیام عمل میں آیا اور ان کے باہمی تعلقات اور طرز

عمل کے تعین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بین الاقوامی قانون کے عنوان پر ابتدائی دور کے فاضل اور نامور مضمون نگاروں نے بالخصوص ہیوگوگروٹس (Hugogrotus) نے بین الاقوامی قانون کو مملکتوں کے باہمی تعلقات کے قیام اور ان تعلقات کو قانونی طور پر ماننے پر ہمیشہ زور دیا ہے۔ اس امر کی البتہ کبھی بھی معقول تشریح نہیں کی جاسکی کہ جب ایک مملکت دوسری مملکت سے کوئی معاہدہ کرتی ہے تو اس معاہدے کی کیوں پابندی کرتی ہے اور کیوں اس معاہدے کو فسخ نہیں کرسکتی۔ اگرچہ ان فاضل مضمون نگاروں نے باہمی معاہدہ کی قانونی پابندی کو تسلیم نہیں کیا لیکن اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جو مملکت کسی معاہدے پر دستخط کرتی ہے تو وہ اس معاہدے کے شرائط کی تکمیل کی پابندی ضروری خیال کرتی ہے۔ بین الاقوامی اور مملکتوں کے داخلی قانون میں فرق یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون زیادہ مربوط نہیں ہے اس کے برخلاف مملکتوں کے داخلی قانون کافی مربوط ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہ قواعد بالکل ناکافی ثابت ہوئے درآں حالانکہ ابتدا میں میں جنگ کے قواعد کی پابندی نہایت ضروری سمجھی گئی تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امن کے زمانے میں مملکتوں کے درمیانی تعلقات کے جو اصول ہیں وہ بہتر طور پر پائے جاتے ہیں اور ان پر عمل آوری بھی ہوتی ہے۔

زمانہ امن میں بین الاقوامی قانون کی پابندی بہت آسانی سے سمجھائی جاسکتی ہے اور سمجھ میں آتی ہے۔ عام طور پر مملکتیں زمانہ امن میں بین الاقوامی قانون کی پابندی کرتی ہیں کیونکہ اس کی خلاف ورزی کرنے کی کوئی وجہ تحریک نہیں ہوتی اور یہ کہ اس قانون کا دباؤ مملکتیں بہت آسانی کے ساتھ برداشت کرلیتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ بین الاقوامی قانون کی کسی مملکت کی جانب سے وقتاً فوقتاً خلاف ورزی دوسری مملکت کو جوابی کارروائی کے لیے مجبور کرسکتی ہے جو کسی مملکت کے سکون اور بقا کے لیے نامناسب بات ہوگی۔ اس لیے زمانہ امن میں مملکتیں بین الاقوامی قانون کی پابندی کرتی ہیں۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کی توثیق (Sanction) کے ابہام کے باوجود مملکتیں اس قانون کی بہت کم خلاف ورزی کرتی ہیں اگرچہ کہ بین الاقوامی قانون کے بعض پہلوؤں کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں اور تفصیلی قواعد موجود نہیں ہیں لیکن وہ ایک مکمل سسٹم ہے جسے مملکتوں کے داخلی قوانین کو سامنے رکھ کر جانچنا چاہیے۔ ان داخلی قوانین کو مختلف ٹریبونل (Tribunal) نے بین الاقوامی قانون کا جزو قرار دیا ہے، مثال کے طور پر اگر کسی مملکت سے دوسری مملکت کو نقصان پہنچا ہو تو اسے معاوضہ دینا ہوگا اور یہ کہ امر عارض مخالف (Estoppel) کا اصول بھی بین الاقوامی قانون میں نافذ رہے گا۔ اس طرح امر فیصل شدہ (Res Judicata) کے اصول کا اطلاق بین المملکتی نزاع ہوسکے گا۔

بین الاقوامی قانون بر بناء رواج (International Law of Convention):

بین الاقوامی قانون بر بناء رواج (International Law of Convention) سے عام طور پر وہ معاہدات (Treaties) مراد ہیں جو مختلف مملکتوں کے درمیان صدہا معاہدات جو اس وقت نافذ ہیں وہ بین الاقوامی قانون کے بکھرے ہوئے شیرازے کے اہم اور بنیادی اجزا قرار دیے جاسکتے ہیں۔ انیسویں صدی میں یہ ممکن ہوسکا کہ ایک سے زیادہ مملکتوں کے درمیان جو معاہدات طے پائے ہیں ان سے فریقین میں معاہدہ کے درمیان قانونی تعلقات قائم کرنے میں مدد لی جائے۔ آج کل بین المملکتی معاہدات قانون الفاظ میں ترتیب دیے جاتے ہیں اور یہ معاہدات اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امر بہرحال ملحوظ رکھنا ہے کہ اس قسم کے جو معاہدات ہوتے ہیں وہ بجز چند اشیاء کے عام طور پر ان مملکتوں کے لیے قابل پابندی ہوتے ہیں۔ جن کی جانب سے ان معاہدات پر دستخط کیے گئے ہوں۔ بین الاقوامی قانون میں رواج کا تصور معاہداتی دور سے قبل ان معنوں میں بھی تھا کہ معاہدات کی پابندی اس رواج کے مطابق ہوتی تھی جو دو مملکتوں کے درمیان کسی معاہدہ سے قبل باہمی تعلقات کے بارے میں قائم تھا۔ بین الاقوامی قانون بر بنائے رواج کسی کو ثابت کرنے کے لیے پہلے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہ سابق سے مختلف مملکتوں کے درمیان عمل درآمد رائج تھا اور یہ کہ یہ بات باہمی طور پر تسلیم شدہ تھی کہ یہ عمل درآمد ایک ایسے قاعدے کے تابع تھا جو مملکتوں کے لیے قابل پابندی رہا ہو قانون پر بناء رواج کو عمل درآمد سے ملحوظ رکھنا چاہیے خواہ وہ عمل درآمد کافی متواتر اور پائے دار ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ ایسے عمل درآمد (Mutation) کی پابندی مملکتوں کی جانب سے اخلاقاً ہوتی ہے نہ کہ کسی توثیق (Sanction) کے تحت بین الاقوامی امور میں مملکتوں کے متفق عمل کی تصدیق (Convention of Usage) سے یہ تصور قائم ہوسکتا ہے کہ وہ عمل کس قانون کے تحت کیا گیا اور کسی دوسری مملکت کی جانب سے اس قانونی تصور کے جواز کو چیلنج نہ کرنے کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

لیے یہ متفق ہوں گے کہ جو بھی عمل کیا گیا قانون (Treaties) کے تحت کیا گیا عام طور پر قانون کے ہر سسٹم کے متعلق یہ مفروضہ ہے کہ قانون ان معنوں میں مکمل ہے کہ کسی بھی قانونی مسئلہ کا قانونی حل موجود ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بین الاقوامی قانون یا مملکتوں کے داخلی انتظامی قانون میں بعض امور کے متعلق واضح اصول درج نہ ہوں جو کسی مخصوص مقدمے کے فیصلے کے لیے ضروری ہوں لیکن اصول قانون کے دائرہ عمل میں نہ یہ بات شامل ہے کہ فریقین کے متضاد حقوق اور مفاد کے متعلق فیصلہ کیا جائے خواہ اس خاص نزاع کے متعلق کوئی مخصوص قانون موجود نہ ہو۔ کسی مخصوص قانون کے نہ ہونے کی صورت میں عام اصول قانون کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور جو نزاع زیر فیصلہ ہے اس کا تصفیہ کرنا ہوگا۔

بین الاقوامی قانون تدوین (Codification of International Law):

انیسویں صدی کے وسط سے یہ تجویز تھی کہ قانون میں بین الاقوامی قانون کو مضبوط بنیادوں پر رائج کرنے کے لیے اس کی تدوین کی جائے کیوں کہ ایک استوارگی کی موجودگی سے بین الاقوامی قانون میں ایک قطعیت آجائے گی۔ اس سسٹم کو ہر طرح مکمل کیا جاسکے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تحریک نہایت مناسب و موزوں تھی اور اس تحریک کی وجہ سے اس سلسلے میں کافی پیش رفت ہوئی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس کا احساس ہوا کہ اس عمل سے بین الاقوامی دائرہ عمل میں غیر متوقعہ دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بین الاقوامی قانون کی تدوین کے لیے کوئی قانون ساز ادارہ اس وقت تک قائم نہیں ہوا۔ اس تدوین کے لیے قریب ترین ذریعہ وہ متعدد معاہدات (Treaties) ہیں جو مملکتوں نے آپس میں کیے ہیں لیکن جن کی پابندی صرف ان مملکتوں کے لیے ضروری ہے کہ جو فریق معاہدہ میں نتیجتاً جب تک یہ معاہدات عالم گیر طور پر تسلیم نہ کیے جائیں اس وقت تک ان معاہدات کو بین الاقوامی قانون کارروائیوں کا ماخذ قرار نہیں دیا جاسکے گا. کیوں کہ ایسے معاہدات مملکتوں کے لیے قابل قبول نہ ہوں گے۔ جو ان معاہدات کے فریق نہ ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بڑا قدم منشور اقوام متحدہ (Charter of United Nations) ہے جس کے ذریعہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ حالات کا مطالعہ کرے اور قانون میں بین الاقوامی کی ترقی اور تدوین کے لیے سفارشات پیش کرے اس طرح اقوام متحدہ نے غور کیا کہ بین الاقوامی قانون کے استحکام اور تدوین میں پھر ساتھ ساتھ غور کرنا ضروری ہے اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیے جاسکے۔ بین الاقوامی قانون کی تدوین کے سلسلے میں ماہرین کا ایک کمیشن 1947 میں قائم کیا گیا تھا اس کمیشن کا طریقہ کار یہ تھا کہ بین الاقوامی قانون کے اہم عنوانات کے مختلف پہلوؤں کی ہر لحاظ سے جانچ کرے اور اپنی رپورٹ جنرل اسمبلی میں مسودہ قواعد اور اس پر تبصرہ کے ساتھ پیش کرے۔ بحری قانون کے متعلق اپنی افتتاحی رپورٹ میں کمیشن نے یہ رائے دی کہ سفارتی سطح پر ایک کانفرنس (General Diplomatic Conference) طلب کی جائے چنانچہ 1958 میں چھیاسی ملکوں کے نمائندے جنیوا میں بحری قانون پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ کانفرنس توقع کے مطابق مملکتی بحری حد بندی (Territorial Waters) کی حدود کے تعین کے سلسلے میں متفق نہ ہوسکی۔ یہ اتنا ہی اہم مسئلہ تھا لیکن بہرحال کانفرنس اس بارے میں کوئی تصفیہ نہ کرسکی۔ ساحل کے بحری امور کے مسائل سے متعلق کانفرنس کافی کامیاب رہی اور سفارشات کے مسودات کے متعلق اتفاق رائے ہوا جو بحری قوانین سے متعلق تھے۔ ان مسودات کی سو دفعات تھیں۔ یہ مسودات مملکتی مقامی سمندر (Territorial Sea) کے حق (Right) اور سمندری وسائل (Resources) کے استفادہ اور استعمال کے عنوانات پر مشتمل تھے۔

بین الاقوامی قانون کا دائرۂ عمل (Sphere of Operation of International Law):

انیسویں صدی کے ختم تک یا اس کے کچھ بعد تک بین الاقوامی قانون ایک ایسا قانون سمجھا جاتا تھا جو آزاد اور خودمختار مملکتوں کے باہمی تعلقات قائم کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہو لیکن بیسویں صدی میں مملکتوں نے قدیم اصولوں کو بالکل توڑ دیا اور 1928 میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس (International Court of Justice) نے اس بات کو تسلیم کیا کہ آزاد مملکتیں اگر چاہیں تو معاہدے کے ذریعہ کسی منفرد شخص کو بھی کچھ حقوق عطا کرسکتی ہیں۔ ان اشخاص نے جو صرف نظریات کے پابند تھے اس بارے میں ایک نیا پہلو یہ پیدا کیا بین الاقوامی قانون کے ذریعہ کوئی مملکت کسی انفرادی شخص سے کوئی معاہدہ نہیں کرسکتی لیکن بہرحال مقامی عدالتیں اس بات پر مجبور تھیں کہ ہر ایسے منفرد شخص کے متعلق بین الاقوامی قانون کا اطلاق کریں جس نے کسی مملکت سے معاہدہ کیا ہو اور جس کا مقدمہ ان کے پاس فیصلہ کے لیے پیش ہو 1928 میں انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس نے یہ فیصلہ کیا کہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ڈنبرگ کی عدالت (Court of Danzig) کو اس مقدمے کا اختیار سماعت حاصل تھا جو مملکت کے ایسے معاہدے کے نتیجے کے طور پر دائر ہوا ہو جو ایک انفرادی شخص سے کیا گیا تھا اور یہ کہ ایسے معاہدات کی تعمیل کروائی جاسکتی ہے اگرچہ معاصر قوانین میں اس نوعیت کے معاہدات کا کوئی ذکر نہ ہو موجودہ بین الاقوامی قانون کے ماہرین کے پیش نظر یہ امر تھا کہ آئندہ جنگ ہونے کے امکانات کو کم سے کم کیا جائے اور اس سسٹم کا بنیادی اصول صرف یہ ہو کہ آئندہ جنگ نہ ہونے پائے اور ماہرین بین الاقوامی قانون کی یہ بھی کوشش تھی کہ اگر دو مملکتوں میں جنگ چھڑ بھی جائے تو دوران جنگ کچھ اصول اور قواعد کی پابندی ہونی چاہیے اور یہ کہ ایسی جنگ جو قانونا درست اور حق بجانب ہو اور ایسی جنگ جو قانونا درست اور حق بجانب نہ ہو امتیاز کرنا چاہیے۔ یہ کوشش اپنی جگہ کوشش ضرور تھی اور رہے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے ہ ایسی کوشش عملی طور پر زیادہ اہمیت کی حامل اس لیے نہیں ہے کہ کوئی بین الاقوامی ادارہ ایسا نہیں ہے جو اس کا فیصلہ کرسکے کہ کوئی خاص جنگ صحیح طور پر آغاز کی گئی یا غلط طور پر نتیجتاً اوائل انیسویں صدی میں یہ کوشش ترک کردی گئی اور عام طور پر مجبوراً یہ تصور قائم کیا گیا کہ جنگ کوئی غیر قانونی اقدام نہیں ہے لیکن بعد میں بیسویں صدی میں پھر ابتدائی تصور کا اضافہ ہوا اور حق بجانب اور غیر حق بجانب جنگ کے امتیاز اور تفریق کو ضروری خیال کیا گیا۔ 1946 میں اقوام متحدہ کے منشور (United Nations Charter) میں اس بات کا اضافہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کا کوئی رکن اپنے بین الاقوامی تعلقات میں کسی دوسرے ملک کے خلاف دھمکی یا قوت کا استعمال نہ کرے گا اور دوسرے ملک کے سیاسی اور داخلی آزادی میں کوئی مداخلت نہ کرے گا۔

بین الاقوامی قانون کے ماخذ (Source of International Law)

بین الاقوامی قانون کے متعلق ماخذ سے مراد وہ ذرائع (Agencies) ہیں جن کی بناء پر مملکت کے طرز عمل کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے اور جو ایک معینہ صورت میں قابل پابندی ہوجاتے ہیں۔ لازمی طور پر قانون کے ہر سسٹم میں ایک ایسا معیار ہونا چاہیے جس کے ذریعہ کسی خاص وقت پر کسی امر کے بارے میں قانون نافذ العمل کا تعین ہوسکے۔ بین الاقوامی قانون کے ماخذ کے متعلق بین الاقوامی عدلیہ (International Court of Justice) کی دفعہ نمبر 389 کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت رجوع کردہ نزاعت کا فیصلہ کرتے وقت انٹر نیشنل کورٹ آف جسٹس کو حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے:

(1) بین الاقوامی رواج (International Convention) کو خواہ وہ عام نوعیت کے ہوں یا خاص قانون کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

(2) بین الاقوامی رسم (International Customs) جسے کسی عمل کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

(3) قانون کا وہ عام اصول جسے ہر مذہب اور قوم تسلیم کرتی ہے۔

(4) عدالتی فیصلہ جات اور دیگر فاضل قانون دانوں کی کتابوں اور مقالوں کو بین الاقوامی قانون کے اصول کے تعین کرنے کے لیے بطور ماخذ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

بین الاقوامی قانونی ، مقامی اختیار سماعت (Domestic Jurisdiction)

بین الاقوامی قانون کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس قانون کے مقامی عدالتوں سے ربط کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ روایتی بین الاقوامی قانون جس کے متعلق ایک عرصے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بین المملکتی امور کے فیصلے کے لیے ہے۔ اس کے نفاذ اور اس پر عمل آوری کے لیے مقامی عدالتوں کا تعاون ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بین الاقوامی قانون کا ایک قدیم اصول یہ ہے کہ بیرون حکمراں یا بیرون ملک کے سفراء کو مقامی قانون کی دسترس سے باہر رکھا جاتا ہے اس قاعدے کو بروئے عمل لانے کے لیے مقامی عدالتوں کا تعاون ضروری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مقامی عدالتیں اس قاعدے کو مقامی قانون کا جزو سمجھتی ہیں ایک مکتب خیال یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کو مقامی قانون کا جزو قرار دیا جانا چاہیے اور مقامی عدالتوں کو صرف مقامی قانون کے متعلق اختیار سماعت رکھنا چاہیے اور یہ کہ بین الاقوامی قانون کے متعلق اگر مقامی عدالتیں کوئی فیصلہ کریں تو وہ اس مملکت کی حد تک محدود رہنا چاہیے جہاں کی عدالت نے فیصلہ کیا ہے ہر دو مکاتب خیال پر عمل آوری کے لیے بعض وقت کافی دشواریاں ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسا معاہدہ جس کا مقامی قانون میں کوئی ذکر نہ ہو مقامی عدالت فیصلہ نہیں کرسکتی۔ دوسری صورت میں مقامی عدالتوں کو بین الاقوامی نزاع کا اختیار سماعت دینا بے اثر ہوگا کیوں کہ مقامی عدالت کا فیصلہ ہر ایک کے لیے قابل پابندی نہیں ہوسکے گا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جمہوریہ آئرلینڈ، فرانس اور جرمن فیڈرل جمہوریہ کے دستور ہی میں کہا گیا ہے کہ بین الاقوامی قانون

مقامی قانون کا جز رہے گا۔ موجودہ بین الاقوامی قانون کا بیشتر حصے کا اطلاق منفرد اشخاص پر ہوتا ہے اور جس کے مسائل فیصلے کے لیے مقامی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بین الاقوامی قانون کو بڑی حد تک عمل آوری مقامی عدالتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ انگلستان کے دستور میں بین الاقوامی قانون کی پوزیشن اتنی سیدھی نہیں ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انگلستان میں روایتی بین الاقوامی قانون کو داخلی قانون کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ انگلستان کی عدالتیں بین الاقوامی قانون کا بھی نوٹس (Judicial Notice) لیتی ہیں۔ مفروضہ یہ ہے کہ مقامی عدالتیں بین الاقوامی قانون سے بالخصوص واقف ہیں اور اس ضمن میں انھیں کسی ماہر قانون کی رائے لینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا انگلستان کی عدالتیں اپنے غیر لچک دار اصولوں کو ان مقامات پر بھی عائد کرتی ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی قانون سے ہوتا ہے۔ اگر کسی عدالت نے ابتدا میں خالص بین الاقوامی قانون کو کسی مقدمے کے فیصلے کے وقت استعمال کیا ہے تو وہ فیصلہ انگلستان کے اصول قانون کے تحت منتقل قاعدے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور یہ فیصلہ بعد میں عدالتوں کے لیے قابل پابندی ہوجاتا ہے۔ حالانکہ بین الاقوامی قانون میں اس اثناء میں قدرتی طور پر اہم تبدیلیاں واقع ہوچکی ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک خاص اور اہم مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ بین الاقوامی قانون کے تحت غیر ملک کے فرمانروا کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسے ملک کے مقامی قانون کی دسترس سے باہر اٹھایا جائے۔ یہ سیدھا سادھا قاعدہ انگلستان میں ایک انتہائی پیچیدہ اور فنی شکل اختیار کر گیا کیوں کہ انگلستان کے دستور میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے اور عدالتوں کی اس سلسلے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہ بات واضح ہے کہ انگلستان کا تحریری قانون مستقل حیثیت رکھتا ہے اور اس میں عدالت کوئی اور تعبیر نہیں کرسکتی۔ یہ انگلستان کی پارلیمنٹ کا کام ہے کہ وہ عدالتوں کو اس دشواری سے آزاد کرے۔ کسی دوسرے ملک سے کیا ہوا معاہدہ اگرچہ حکومت برطانیہ پر قابل پابند ہو لیکن یہ معاہدہ برطانیہ کی عدالتوں کے قانونی نوٹس میں نہ آئے گا اور نہ عدالتوں کے لیے قابل پابندی ہوگی۔ اگرچہ اس معاہدے کی وجہ سے قانون میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے تو یہ انگلستان کی پارلیمنٹ کا کام ہے کہ اس میں قانون سازی کے ذریعہ تبدیلی کرے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں البتہ نوعیت دوسری ہے جہاں غیر ممالک سے اس قسم کے معاہدات کو عدالتیں تسلیم کرتی ہیں۔ خواہ یہ معاہدات ملک کے قانون کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن (IFC) : یہ کارپوریشن عالمی بینک کے ملحقہ ادارہ کی شکل میں 1956 میں وجود میں آیا تاکہ رکن ملکوں خصوصاً پسماندہ ممالک میں پیداوار اور نجی کاروبار کی ہمت افزائی ممکن ہوسکے۔

عالمی بینک کے ڈائریکٹر ہی اس کارپوریشن کے ڈائریکٹر بھی ہوتے ہیں اور عالمی بینک کا صدر ہی اس کارپوریشن کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس کے رکن ملکوں کی تعداد 168 ہے اور اس کا صدر دفتر واشنگٹن میں واقع ہے۔

بین الاقوامی مالی فنڈ (International Monetary Fund — I.M.F.) : یہ فنڈ 1944 میں بریٹن ووڈس کے مقام پر 44 ملکوں کی ایک کانفرنس میں قائم کیا گیا تھا جو مجلس اقوام متحدہ کی طرف سے منعقد کی گئی تھی۔ اس کا مقصد مالیات کے میدان میں بین الاقوامی تعاون کو فروغ دینا اور زرمبادلہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ تاکہ اس کی مدد سے ممبر ملکوں کے شرح مبادلہ میں استحکام پیدا ہوسکے۔ اور ایک ہمہ جہتی ادائی نظام قائم ہوسکے۔ اس معاہدہ کے تحت ممبر ملکوں پر یہ الزام تھا کہ شرح مبادلہ میں اتار چڑھاؤ ہم سطح قدر (Par Volume) سے ایک فی صدی سے زیادہ نہ ہونے پائے۔ ہم سطح قدر امریکی ڈالر یا سونے سے جڑی ہوئی ہے۔

دسمبر 1971 میں پیرس کلب یا دس ملکوں کے گروہ نے نئی مرکزی قدر (Central value) پر اتفاق کیا تاکہ ڈالر کی قیمت میں دس فی صدی کمی کی جاسکے۔ یہ فیصلہ نجی تھا اور کہا گیا تھا کہ اس پر بین الاقوامی سطح پر گفتگو کی جائے گی۔

ابتدائی معاہدہ کے تحت اس فنڈ کے ہر ممبر پر لازم ہے کہ اپنی کونسل کی قدر میں کمی یا بیشی کرتے وقت بین الاقوامی مالی فنڈ سے مشورہ کرلے۔ ہر ممبر پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس فنڈ میں اپنے حصہ کا کوٹہ ادا کرے اور جو 25 فی صدی سونے کی شکل میں اور 75 فی صدی متعلقہ ملک کی کونسل کی شکل میں ہوتا ہے۔ 1970 تک کوٹہ میں تین مرتبہ اضافہ کیا گیا اور یہ کل 28,900 ملین ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

یہ فنڈ ممبروں کے ادائیگی کے خسارہ کی وقتی مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح شرح مبادلہ میں ٹھہراؤ قائم کرتا ہے۔ ہر ملک کے قرض حاصل کرنے اور ووٹ دینے کی قابلیت کا انحصار اس کے اپنے کوٹہ پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس وقت امریکا کو 23 فی صدی اور یورپ کی معاشی کمیونٹی کو 19 فی صدی ووٹ کا حق حاصل ہے۔ اور چونکہ فنڈ کے آئین میں تبدیلی صرف 85 فی صدی کی اکثریت سے ہوسکتی ہے۔ اس لیے امریکا اور یورپی معاشی کمیونٹی کو ویٹو حق حاصل ہے۔ اس طرح فنڈ کے قرضوں کی منظوری بڑی حد تک ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔

جس ملک کو توازن ادائی (Balance of Payment) میں عارضی گھاٹے کا سامنا ہو وہ اپنی کونسل کے عوض فنڈ سے بیرونی زر مبادلہ حاصل کر سکتا ہے۔ جو اسے 3 تا 5 سال میں واپس لوٹانا ہوتا ہے۔ اور ایسے ممالک جب اپنی کونسل کو بہتر بنانے کے اقدامات کرتے ہیں تو انھیں مالی فنڈ سے مشورہ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اکثر ترقی پذیر ممالک جو مالی فنڈ کے مقروض ہوتے ہیں وہ اس فنڈ کے اصرار پر اپنی کونسل کی زر قدری (Devaluation) پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اور عام طور پر انھیں اپنی معاشی منصوبہ بندی کے سلسلے میں بھی مالی فنڈ کی خواہشات کا احترام کرنا ہوتا ہے۔

پچھلے برسوں میں برطانیہ جیسے ملک نے بھی اپنی کرنسی کو مستحکم رکھنے کے لیے مالی فنڈ سے قرض لیتا رہا ہے۔

1960 کے اوائل میں یہ بات واضح ہوگئی کہ فنڈ کی مقدار کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ 1982 میں دس ملکوں کے گروہ یا پیرس کلب کے ملکوں نے (امریکا، برطانیہ، مغربی جرمنی، فرانس، بلجیم، نیدرلینڈ، اٹلی، سویڈن، کینیڈا اور جاپان) قرض حاصل کرنے کے معاہدے پر دستخط کیے اور فنڈ کے لیے 6 ہزار ملین ڈالر مہیا کیا۔ اس کے علاوہ سوئٹزرلینڈ نے، جو ممبر نہیں ہے، 200 ملین ڈالر مہیا کیے۔ مالی فنڈ اپنی کوئی رقم قرض دینے والوں کی مرضی کے بغیر صرف میں نہیں لاسکتا۔ ستمبر 1967 میں مالی فنڈ نے ایک بین الاقوامی کاغذی کرنسی قائم کرنے کی تجویز رکھی جو جولائی 1969 میں منظور ہوئی۔ اس کے تحت بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے ممبروں میں کوٹہ کے لحاظ سے تقسیم ہوگی۔

بین الاقوامی مواصلاتی یونین (ITU) : 1932 میں ٹیلی گراف کنونشن (1865) اور ریڈیو ٹیلی گراف کنونشن (1906) کے انضمام کے نتیجہ میں بین الاقوامی (ITU) کا وجود عمل میں آیا۔ 1947 میں یہ اقوام متحدہ کی خصوصی ایجنسی قرار دے دی گئی اور اب یہ یکم جولائی 1994 سے ایک نئے دستور اور کنونشن کے تحت سرگرم کار ہے۔ اس کے مقاصد میں برقی مواصلات کے استعمال میں عالمی تعاون حاصل کرنا، اس کی حوصلہ افزائی کرنا، ترقی پذیر ملکوں کو مواصلاتی میدان میں تکنیکی امداد فراہم کرنا، تکنیکی سہولیات کی ترقی اور ان کی موثر عمل آوری کو فروغ دینا، مواصلاتی نظام کو کارآمد اور مفید بنانا اور اسے عوام تک پہنچانا شامل ہیں۔

اس ادارہ کا اعلیٰ ترین حصہ ایک کانفرنس ہے جو چار سال میں ایک بار منعقد ہوتی ہے۔ 46 اراکین پر مشتمل اس کی ایک کونسل ہے جس کا انتخاب کانفرنس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ اس کونسل کا اجلاس ہر سال جنیوا میں منعقد ہوتا ہے اور یہ اس کے دوسرے شعبوں میں تال میل پیدا کرتی ہے۔ اس ادارہ کا سربراہ سکریٹری جنرل کہلاتا ہے جسے کانفرنس ہی منتخب کرتی ہے۔ فی الوقت اس کے ممبران کی تعداد 187 ہے۔

بین الپارلیمانی یونین (IPU): یہ یونین 1889 میں دنیا کی پارلیمانوں کے ارکان کے درمیان شخصی تعلقات کو فروغ دینے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس میں 72 ملکوں کے قومی بین الپارلیمانی گروپ شامل ہیں۔ اس کا صدر مقام جنیوا ہے۔ بین الپارلیمانی کانفرنس ہر سال منعقد ہوتی ہے جس میں یونین کی عاملہ بین الپارلیمانی کونسل کی پیش کردہ قراردادوں پر غور کیا جاتا ہے۔ یونین کا سکریٹریٹ پارلیمانی بیورو کہلاتا ہے جو قومی بین الپارلیمانی گروہوں سے رابطہ کرکے نشستوں کا اہتمام کرتا ہے، مطالعاتی پروگراموں کی حوصلہ افزائی کرتا اور اس کی مطبوعات کی اشاعت کرتا ہے۔

بین الحکومتی بحری جہاز رانی مشاورتی تنظیم (IMCO): اس تنظیم کا قیام اقوام متحدہ کی خصوصی ایجنسی کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت 1948 میں جنیوا میں منعقدہ بحری جہاز رانی کانفرنس میں عمل میں آیا۔ اس معاہدہ نے 17/ مارچ 1958 کو اس وقت عملی شکل اختیار کی جب 21 ملکوں نے اس کی توثیق کردی۔ اس تنظیم نے 1959 میں اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ بعد ازاں 1982 میں اس کا نام IMCO سے بدل کر بین الاقوامی بحری جہاز رانی تنظیم (IMO) کردیا گیا۔

جہاز رانی کے تکنیکی امور و وسائل پر حکومتوں کے درمیان تعاون کی سہولیات مہیا کرنا، سمندر میں حفاظتی تدابیر کرنا، جہاز رانی کو

محفوظ بنانا اور سمندری ماحول میں جہازوں کے ذریعہ پھیلائی گئی کثافت کو دور کرنا، اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ بحری جہاز رانی سے متعلق بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد اور اس سے متعلق معاہدات کا مسودہ تیار کرنا بھی اسی تنظیم کی ذمہ داری ہے۔

اس میں 156 ملک شامل ہیں اور اس کا صدر مقام لندن ہے۔

بین عمل (Interaction) : سماجی تعلقات کی سب سے بنیادی نوعیت سماجی بین عمل ہے۔ سماجی بین عمل کے بغیر کسی بھی سماجی فعل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لحاظ سے سماجی بین عمل تمام حرکیاتی سماجی تعلقات (Dynamic Social Relation) کی نشان دہی کرتا ہے چاہے یہ تعلقات افراد کے درمیان ہوں یا جماعتوں کے مابین پائے جائیں یا افراد اور جماعتوں کے درمیان قائم ہوں۔ دوسرے الفاظ میں دو یا دو سے زیادہ افراد یا جماعتوں کا ایک دوسرے کی توقعات کے مطابق عمل کرنا سماجی بین عمل کہلاتا ہے۔ سماجی بین عمل کے طریق پر غائر غور و فکر کرنے والوں میں سب سے پہلے جارج سمل کے مباحث کو اہمیت حاصل ہے۔

سماجی بین عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب افراد ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ان کا آپس میں مصافحہ کرنا، سلام علیک، ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنا اسی طریق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اکثر صورتوں میں تو الفاظ کے استعمال یا بات چیت کی بھی نوعیت نہیں آتی بلکہ مختلف حرکات و سکنات، اشاروں اور آوازوں کے ذریعے ایک دوسرے کے خیالوں، رجحانوں اور احساسوں کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس طرح سماجی بین عمل دو طریقوں پر مبنی ہے۔ پہلا لفظی یعنی (Verbal) اور دوسرا غیر لفظی یعنی (Non-verbal)۔ سماجی بین عمل میں جس طرح لفظی طریقہ نمایاں نوعیت کا حامل ہے اسی طرح غیر لفظی طریقے کے ذریعے بھی مثبت اور منفی سماجی تعلقات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہر ملک اور سماج میں ان کے معنی یکساں نہیں لے جاتے بلکہ مختلف سماجوں میں مختلف حرکتوں اور اشاروں کو مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن ان میں سے چند ایسے غیر لفظی طریقے ہیں جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں اور جن کے معنی مطلب تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کے اشارے سے کسی کو اپنی طرف بلانا یا روک دینا۔ سر کو اس طرح جنبش دینا کہ اس سے "ہاں" یا "نہیں" کا اظہار ہو وغیرہ وغیرہ۔

سماجی بین عمل کے لیے سماجی ربط یعنی (Social Contact) اور ترسیل یعنی (Communication) کا ہونا ضروری ہے۔ سماجی ربط کسی فرد یا جماعت سے تعلقات قائم کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس فرد یا جماعت سے واقفیت یا شعور پیدا ہوتا ہے۔

اگرچہ سماجی ربط کے لیے جسمانی ربط ناگزیر نہیں ہے پھر بھی جسمانی ربط کی تاثیریت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جسمانی ربط سماجی بین عمل کے لیے محرک ثابت ہوتا ہے۔ تہذیب اور شائستگی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ افراد جب اپنے عزیز و اقارب، دوست احباب اور جان پہچان کے لوگوں سے ملتے ہیں تو اپنی وابستگی اور یگانگت کا مختلف طریقے سے اظہار کرتے ہیں۔ کسی سماج میں مصافحہ عام ہے تو کسی سماج میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہونا، کسی سماج میں ایک دوسرے کے پیر دھونا عام ہے تو کسی سماج میں ایک دوسرے کی ناک کو رگڑنا۔ بہرحال ہر سماج میں طریقۂ ربط (Touch System) کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے اور ان طریقوں سے انحراف یا گریز سماجی بین عمل کی نفی کرتا ہے۔

سماجی ربط کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک اثباتی اور دوسرا منفی۔ اثباتی سماجی ربط کی نوعیت حرکیاتی (Dynamic) ہوتی ہے جس کا نتیجہ ارتباطی سماجی بین عمل (Associative Social Inter Action) میں ظاہر ہوتا ہے جہاں سے تمام خوش گوار تعلقات کا آغاز ہوتا ہے۔ ان تعلقات کا انحصار، تعاون، سمجھوتے، رواداری اور ایک دوسرے سے گھل مل کر زندگی گزارنے کے رجحان پر مبنی ہوتا ہے۔

منفی سماجی ربط کا نتیجہ غیر ارتباطی بین عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ افراد ایک دوسرے سے کسی قسم کے سماجی تعلقات قائم کرنے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ سماجی ربط کی مزید دو نوعیتیں سماجی بین عمل کے طریق پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی ابتدائی سماجی ربط میں فرد ایک دوسرے کے مدمقابل یا روبرو ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کا براہ راست اثر دوسرے فرد یا جماعت پر پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف ثانوی سماجی ربط میں تیسرے فریق یا ایجنسی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ثانوی ربط کی مزید دو طرح پر تقسیم ممکن ہے۔ براہ راست ثانوی اور بالواسطہ ثانوی ربط۔ براہ راست ثانوی ربط میں تمدن کے ان عناصر کا استعمال کیا جاتا ہے جس کا راست اثر کسی حس پر پڑتا ہے مثلاً ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود ٹیلی فون پر ایک دوسرے کی آواز

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سن کر افراد ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ بالواسطہ ثانوی ربط میں کسی دوست یا جان پہچان والوں کی مدد ضروری سمجھی جاتی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کا پیام پہنچا سکیں۔

بہر حال ساجی ربط ابتدائی نوعیت کا ہو یا ثانوی، اثباتی ہو یا منفی، براہ راست ہو یا بالواسطہ اس کے نتیجے بہت ہی دور رس ہوتے ہیں۔ کیونکہ سماجی ربط میں احساس اور جذبات پنہاں ہوتے ہیں۔ سماجی بین عمل میں سماجی ربط کے علاوہ ترسیل کی بہت زیادہ اہمیت ہے جس پر سیر حاصل بحث ترسیل کے موضوع کے تحت کی گئی ہے۔

سماجی بین عمل پر بحث کے سلسلے میں علاحدگی یا (Isolation) کے تصور پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ مکمل علاحدگی کی صورت میں انسانی زندگی سے ربط اور ترسیل کے تمام ذریعے ختم ہو جاتے ہیں۔ گو طبعی ماحول سے ربط برقرار رہتا ہے لیکن فرد اور جماعت سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ علاحدگی کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ جزوی علاحدگی اور مکمل علاحدگی۔ علاحدگی کے کئی اسباب ہوتے ہیں مثلاً طبعی ماحول، حادثے، ناتفاقی حالات کسی حس کی غیر موجودگی یا خرابی، دماغی کمزوری یا بیماری، جذباتی انتشار، نسلی یا تمدنی اختلافات جس کی وجہ سے نسلی تعصب پیدا ہوتا ہے۔ زبان سے ناواقفیت اور ذات پات کے طریق سے جماعتیں تمدن کی بین زرخیزیت یعنی (Cross Fertilization of Culture) سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

سماجی بین عمل کے طریق کو سمجھنے کے لیے اختلافوں اور مشابہتوں پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم کسی دو افراد کے افعال و اعمال کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مختلف چیزوں کی طرف ان کا رد عمل مختلف ہوتا ہے جو ان کے حیاتیاتی اختلافات یعنی (Biological Variations) اور نشوونما کے زمانے میں مختلف تجربات کے دور سے گزرنے کا نتیجہ ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ افراد میں فرق اور مشابہتوں کا اندازہ زبان، حرکات و سکنات، خیالات، رجحانات اور افعال و اعمال کے مختلف نمونوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ اختلافوں کی وجہ سے افراد کے درمیان بعد یا فصل پیدا ہوتا ہے اور مشابہتوں کی وجہ سے قربت پیدا ہوتی ہے۔

کبھی کبھار ایسی صورت بھی آتی ہے کہ بین عمل کو روک دینے کے لیے انسان مکمل تنہائی اختیار کرتا ہے۔ اکثر مذہبی سماجوں میں اس کی مختلف اشکال موجود ہیں۔ ذہنی ارتکاز کے لیے دوسروں سے رابطہ ختم کیا جاتا ہے اس کے پیچھے یہ مقصد کار فرما ہوتا ہے کہ دوسرے دماغی عمل کو متاثر نہ کریں۔ اسلام میں اعتکاف ہندو اور بدھ مذہب میں سادھی کی روایت موجود ہے۔ سنیاس لے کر ہمالیہ کے غاروں میں تنہائی کی زندگی گزارنا بھی اسی قسم کا عمل ہے جس کے پس پشت یہ نظریہ ہے کہ دنیا اور دنیاوی عوامل انسان کے ذہنی ارتکاز میں خلل ڈالتے ہیں۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے سماجی بین عمل پورے طور پر روک دینا تنہائی میں بھی تقریباً ناممکن ہے۔

بینے لکس اقتصادی یونین (Benelux Economic Union):

بلجیم، نیدر لینڈ اور لکسمبرگ کی یہ اقتصادی یونین 1958 کے بینے لکس معاہدہ کے تحت نومبر 1965 میں وجود میں آئی۔ اس کا مقصد تینوں ملکوں کا اقتصادی انضمام ہے۔ وزارتی کمیٹی، کونسل، کورٹ آف جسٹس، بین البارلیمانی مشاورتی کونسل، اقتصادی واجتماعی مشاورتی کونسل اور سکریٹریٹ اس یونین کے حصے ہیں۔

اس کا صدر مقام بروسلز (بلجیم) ہے۔

بیوپار چکر (Trade Cycle):

چند برسوں کے اندر کاروباری سرگرمیوں میں جو باقاعدہ اتار چڑھاؤ آتا ہے اسے بیوپار چکر کہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور میں مغربی ملکوں کی معیشت کے بیوپار چکر پر اس حد تک قابو پا لیا گیا ہے کہ اب پیداوار میں یکساں اور مسلسل اتار نہیں آتے۔ بیوپار چکر کی جگہ اب سرد بازاری (Recession) نے لے لی ہے۔ اس میں مجموعی پیداوار کا اضافہ تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اضافہ کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ آزاد کاروباری معیشت (Free Enterprise Economics) میں پیداوار اور روزگار میں تیزی کے ساتھ اتار پر تو قابو پا لیا گیا ہے لیکن مسلسل ترقی اور مکمل روزگار کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس پر کافی کام ہوا ہے۔ اور بہت سارے نظریے بھی سامنے آئے ہیں۔

بیورو کریسی (Bureaucracy):

ایڈمنسٹریٹو سروس کے ذمہ دار عہدہ دار جو حکومت کے مختلف محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اسے نظم و نسق کی اصطلاح میں بیورو کریسی کہتے ہیں اور عہدیداران بیوروکریٹ کہلاتے ہیں۔ یہ بیورو کریٹس ہی ملک میں نظم و نسق کے لیے

ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بیوروکریٹس کا انتخاب یونین پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ہوتا ہے جس کے بعد انھیں تربیت کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس تربیت کے بعد حکومت کے مختلف محکموں اور اداروں میں ان کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ بیوکریٹس کی تجاویز اور مشوروں پر کارکردگی کا لائحہ عمل بنایا جاتا ہے جس کے مطابق ہی متعلقہ دفتر کو چلایا جاتا ہے۔ بیورو کریٹس کی تجاویز کو عاملہ، مقننہ اور عدلیہ میں زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہر بیوروکریٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرائض نہایت احتیاط سے قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجام دے۔

وہ منتخب لوگ جو کسی حکومت میں بر سر اقتدار ہوتے ہیں وہ اپنے پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی پارٹی کے اشخاص کو خدمات سونپتے ہیں اور کاروباری اشخاص کو بیرون ملک سے تجارت کے لائسنس دیتے ہیں تاکہ ان اشخاص کی مدد انھیں حاصل رہے۔ اس طریقہ عمل کو یقیناً پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے ایسے نظم و نسق کی ضرورت ہے جو اس نوعیت کے دباؤ کو قبول نہ کرے، کیونکہ پبلک نظم و نسق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ حکومت کا تصور ہے جبکہ سیاست داں تو عام طور پر اس نظریے کو سامنے رکھتے ہیں جس سے ان کی گرفت علاقائی سیاست اور اقتدار پر مضبوط رہے۔ بیوروکریٹس یعنی سرکاری عہدہ داران جو حکومت کے مختلف محکموں میں ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوتے ہیں اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر حکومت کی جانب سے سیاسی دباؤ میں کسی غیر اصولی تجویز کو رو بہ عمل لانے کے لیے طے کیا جائے تو وہ اس کی حمایت نہ کریں بلکہ صحیح نظریات اور اصول حکومت کے غور و فکر کے لیے رکھیں اور کسی خاص مسئلے میں اگر کوئی تبدیلی سیاست داں لانا چاہتے ہیں تو اس تبدیلی کی خوبی اور خامی سے حکومت کو آگاہ کریں۔ ان کے اس رویّہ کی پذیرائی کرنے کی بجائے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ سرکاری عہدہ دار ہر اس سفارش کی عمل آوری میں رکاوٹ بن جاتے ہیں جو نظم و نسق میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے کی جاتی ہے جبکہ سرکاری عہدہ دار سختی سے قواعد و ضوابط کی پابندی کرنا چاہتے ہیں۔ مملکت کے منتخبہ حکمرانوں کے تصفیوں کا پس منظر سیاسی حکمت عملی ہے جبکہ بیوروکریٹس کے پیش نظر نظم و نسق کو صحیح طور پر چلانا ہوتا ہے۔ حکومت خواہ کسی قسم کی پالیسی تیار کرے جب تک بیوروکریٹس کا تعاون نہ ہو وہ پالیسی رو بہ عمل لائی نہیں جا سکتی۔ کسی حکومت کے عملی اقدامات کا نمایاں مظہر اس کا نظم و نسق ہے اور ملک میں نظم و نسق کے لیے بیوروکریٹس ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔

بے احتیاطی یا غفلت کے باعث ہلاکت عمل میں آنا (Causing Death by Rash or Negligent Act)

(Causing Death by Rash or Negligent Act): کوئی شخص اگر بے احتیاطی یا غفلت سے کسی شخص کی ہلاکت کا سبب بنے اور اس کا یہ فعل انسانی قتل کی مجوزہ سزا کی حد تک نہ پہنچتا ہو تو وہ بے احتیاطی یا غفلت کے باعث ہلاکت عمل میں آنے کے جرم میں ماخوذ ہوگا۔

اس جرم کے مختصراً تین اجزاء ہو سکتے ہیں جن کے اثبات پر اس جرم کا ارتکاب عمل میں آتا ہے۔

(1) کوئی شخص ہلاک ہوا ہو۔

(2) ملزم اس ہلاکت کا باعث ہو۔

(3) جس فعل سے ہلاکت واقع ہوئی، ملزم اس کا بے احتیاطی یا غفلت سے مرتکب ہوا اور وہ فعل، انسانی قتل کی مجوزہ سزا کی حد تک نہیں پہنچا۔

پہلے کے دو اجزاء صاف صریح ہیں جو محتاج بحث نہیں ہیں۔ البتہ تیسرے جز کی وضاحت جرم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس جز میں دو الفاظ اہم ہیں۔ بے احتیاطی یا غفلت۔ ان پر مختصر طور پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ بادی النظر میں کسی فعل کا بے احتیاطی سے کیا جانا اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ بغیر سوچے سمجھے کیا جائے لیکن اس میں ایسا فعل بھی داخل ہے جس کے ارتکاب کے وقت کافی احتیاط اور توجہ سے عمل نہ کیا گیا ہو۔ محض احتیاط و توجہ کسی فعل کے کرنے میں کافی نہیں بلکہ حالات کے مد نظر جس قدر ایک معمولی اور عام فہم آدمی سے احتیاط اور توجہ کی توقع کی جا سکتی ہے اس قدر احتیاط و توجہ برتی جانی چاہیے۔ یعنی کسی کام کے کرنے میں کافی احتیاط اور کافی ہوشیاری اور توجہ ہونی چاہیے۔ ملزم سے کسی فعل کے کرنے میں لاپرواہی حالات و واقعات کے پیش نظر نہیں ہونی چاہیے۔

"غفلت" سے کسی فرض کی خلاف ورزی مراد ہے۔ جب کوئی ایسا فعل ترک کیا جائے جو معمولی فہم کے آدمی کو کرنا چاہیے یا جب کوئی ایسا فعل کیا جائے جو معمولی فہم کے آدمی کو نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً "ایک ملازم کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ صرف ایک ایک گاڑی سڑک کے ڈھلواں حصہ پر چلائے۔ اس نے اس ہدایت کے خلاف زیادہ گاڑیاں ایک ساتھ

چلائیں اور وہ بے قابو ہوگئیں اور ایک قلی ان کو روکنے کی کوشش میں ہلاک ہوا۔ ملازم کا یہ جرم قابل سزا قرار دیا جائے گا۔ ایک حکیم نے بواسیر کے ایک مریض پر ایک معمولی چاقو سے عمل جراحی کیا جسکی وجہ سے خون اس کثرت سے نکلا کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ حکیم کا جرم قابل سزا قرار پائے گا کیوں کہ اس نے عمل جراحی میں جن خصوصی آلات کو جس طرح استعمال کرنا چاہیے نہیں کیا۔ اس صورت میں بھی وہ بے احتیاطی کے جرم میں ماخوذ کیا جاسکتا ہے۔

ایک عورت کی گود میں بچہ تھا، ایک مرد نے اس عورت کو مارنے کے لیے لاٹھی چلائی۔ وہ لاٹھی بچہ کو لگ گئی اور وہ ہلاک ہوگیا۔ ملزم نے یہاں غفلت و بے احتیاطی سے کام لیا۔ لاٹھی چلانے سے پہلے اس نے سوچ لیا ہوتا کہ اس عورت کی گود میں بچہ ہے اگر لاٹھی چوک جائے تو لاٹھی کی مار بچہ کو لگے گی جس سے وہ ہلاک ہوجائے گا۔

ریلوے کے چوکیدار نے کراسنگ پر گیٹ بند نہیں کیا اور اس کی وجہ سے ایک آدمی ہلاک ہوگیا۔ اس چوکیدار کا فرض تھا کہ وہ ریل گاڑی کے آنے کے وقت گیٹ بند کرتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یعنی اس سے ترک فعل ہوا جس سے ایک آدمی کی ہلاکت وقوع میں آئی۔ بے احتیاطی اور غفلت کی پاداش میں چوکیدار کو سزا ہوگی۔ پبلک سڑک پر موٹر بے احتیاطی اور غفلت سے چلائی جائے تو راہ گیروں کی جان خطرے میں پڑ جانے کا احتمال رہتا ہے۔ اگرچہ ڈرائیور کی نیت کسی راہ گیر کو ہلاک کرنے کی نہیں رہتی ہے لیکن اس کو اس امر کا علم ہوتا ہے کہ اس کی اس بے احتیاطی سے چلانے سے راہ گیروں کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اس کے اس فعل سے کسی راہ گیر کی ہلاکت عمل میں آئے تو یہ ڈرائیور بے احتیاطی و غفلت سے موٹر چلانے کے جرم میں مستوجب سزا قرار دیا جائے گا۔

ملزم سے یہ توقع نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ حالات کے تحت غیر معمولی احتیاطی برتے اور غیر معمولی ہوشیاری یا توجہ سے کام لے۔ لیکن موجودہ حالات میں جس قدر احتیاط و توجہ اور ہوشیاری کی توقع ایک معمولی اور عام فہم آدمی سے کی جاسکتی ہے اس قدر احتیاط و توجہ کی توقع ملزم سے کی جائے تو یہ بات بالکل معقول سمجھی جائے گی۔

بے گھری کی سماجیات (Sociology of Homelessness)

: "بے گھری" کے سماجیاتی معانی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ معاصر سماج میں "گھر" کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ معاصر سماج اپنی ہیئت میں عالمی نوعیت اختیار کرگیا ہے۔ "گھر" نے انسانی زندگی کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ آدمی کے پاس گھر نہیں ہے اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ رات کو سونے کے لیے نجی جگہ کا انتظام نہیں ہے۔ بے گھری کے معنی یہ ہے کہ آدمی سماجی دروبست سے باہر کھڑا ہے۔ بے گھری آدمی کو کذھب اور بے تکا بناتا ہے۔ اس کا اعتبار ختم کرتا ہے اور اسے جذباتی استحکام سے محروم کرتا ہے۔ ایک ناکردہ گناہ شخص دنیا بھر کے جرائم کا مرتکب لگنے لگتا ہے۔ اس کا وجود مہذب زندگی کے لیے خطرے کی گھنٹی دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس سب کے باوجود بے گھری عام سماجی زندگی اور اس کے عوامل میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ انھی میں پروان چڑھتی اور پھیلتی ہے۔

گھر کی اہمیت سے لوگ ہمیشہ واقف رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ آدمی کی سب سے بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ مگر جدید دنیا میں گھر میں رہنے کا تصور روایتی تصور سے مختلف معنی رکھنے لگا ہے۔ آج کا جوان گھر کے ان روایتی تصورات کی توڑ پھوڑ کررہا ہے جن میں پڑوس، گاؤں، شہر، علاقہ، ملک اور قوم سبھی کچھ شامل تھا۔ آدمی جب گھر یا گھر سے وابستگی کا خیال کرتا ہے تو چار بنیادی چیزیں ہیں جو اس کے معنی کا احاطہ کرتے ہیں۔ اولاً گھر سماجی نظم کا نمونہ اور رکھوالا ہے، دوم گھر سماجی یکجہتی کی اساس ہے، سوم گھر اعتبار کی اصل ہے اور چہارم گھر جذباتی استحکام اور تعین جہت کا منبع ہے۔

"گھر چھوڑنے" کا عمل موٹے طور پر دو طرح کا ہے۔ پہلا ہے رضاکارانہ۔ اس میں متعدد عناصر کا شمول ہے۔ ان عناصر نے آج کی صنعتی دنیا میں بڑی ثقافتی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ بہت ہیں جو برضا و رغبت گھر چھوڑنے پر آمادہ اور جست بھرنے کے لیے تیار بلکہ بیقرار ہیں۔ توجہ کا مرکز مختلف النوع تجربات کا حصول ہے، اعلیٰ تعلیم ہے، عارضی معاملات اور بے روزگاری کا ملاجلا آمیزہ ہے،دور دراز کا سفر اور ملک سے باہر قیام ہے، ایڈونچر، صنف مخالف کے ساتھ شادی کے بغیر رہنے کے تجربات کا شوق یا محض مغربی سماج میں زندگی کرنے کے تجربے کا حصول اور مغربی سماج سے جیون ساتھی چننے کا موقع ہے۔ یہی شاید وہ امکانات ہیں جن کی جستجو اور تلاش آدمی کو گھر سے باہر نکلنے پر اکساتی ہے۔

لیکن غیر رضاکارانہ "بے گھری" اکثر اوقات کسی بلائے ناگہانی،

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

خوف، تشدد کی زائیدہ سراسیمگی، قتل عام اور علاقائی اقتصادی نشیب و فراز کا شاخسانہ ہے۔ جنگوں کے شکار بڑے گروہوں کی اذیت ناکی، اندرونی مارکاٹ، اقتصادی سرگرمیاں (مثلاً دریا پر بڑے بندوں کی تعمیر) اور قدرتی آفات کی بھی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ اس زمرے کا بے گھرپن کافی پیچیدہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ اخلاقیاتی طور پر مبہم ہے۔ اس کی اصل حقیقت تک رسائی آسان نہیں ہوتی اور یہ تاریخی اور سیاسی پیچیدگیوں میں بھی بار بار الجھ جاتا ہے۔ اس کے جلو میں خوف و تشویش اور فریبِ نظر بھی ہوتے ہیں۔ اس کا اصلی چہرے دیکھنے دکھانے کے لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جدیدیت روایتی زاویوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں کررہی ہے پھر بھی خاندانی گھر کا پرانا تصور ابھی زندہ ہے۔ گھر کا تصور مسکن، حفاظتی خول اور فرد کے اپنے آپ کو لپیٹ لینے کی خواہش کے اظہار کے طور پر ابھی ختم نہیں ہوا اور نہ ہی کسی دوسرے متبادل تصور نے اس کی جگہ گھیرلی ہے۔ گھر، جب آدمی اس سے نکل گیا ہو تو خواب نما بھی بن سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے آدمی خواب میں اپنے بدن سے باہر آجاتا ہے۔ دل وہیں ہے جہاں گھر ہے۔ گھر سے دور آدمی کو گھر کی یاد ستا سکتی ہے۔ گھر کی یاد کے کئی پیچیدہ عوامل ہیں جس میں ناسٹلجیا یا مثالی گھر کی بیزاری بھی شامل ہے۔ لوگ درحقیقت اس گھر کی یاد سے بھی بیقرار ہوتے ہیں جو انھوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے یا کسی ناممکن الحصول گھر کے لیے بھی بیتاب ہوسکتے ہیں جو کبھی اس دنیا میں وقوع پذیر ہی نہ ہوگا۔ امید اور گھر کا رشتہ قریبی ہے۔ گھر سے بے گھر لوگوں کو آوارہ گرد یا دیگر ایسے ہی دوسرے منفی ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی شناخت اس سے نہیں بنائی گئی کہ وہ کیا کرتے ہیں اور کیا رکھتے ہیں بلکہ ان کے پاس جو نہیں تھا اس سے پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کی غیر منصفانہ اصطلاح سازی میں "بے گھری" ایک ایسے معنی اختیار کرگیا جس میں پوشیدہ خوف و سراسیمگی اور لعنت کا طوق شامل تھا۔ یہ بعض سیاسی اور طبقہ وارانہ قدروں کا بھی مخفی اشارہ بن گیا۔ جدید سماج میں بے جائداد لوگ اجنبیوں کے بھی اجنبی بن گئے ہیں۔ یہ فلاکت زدہ طبقہ ہے جس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی بھی لمحہ یہ لوگ سماج دشمنی اور مجرمانہ حرکات کے مرتکب ہوسکتے ہیں۔ ان کو شک اور تحقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بے جڑ کا، اکھڑا ہوا اور گھر کے ناقابل تصور کیا جاتا ہے۔ بے گھری کو متمدن دنیا کا اندرونی خطرہ سمجھا جاتا ہے۔

معاصر بے گھری کے بیش تر نظریات کا فوکس مہاجرین، شرنارتھی، جلاوطن، اکھڑے ہوئے لوگ اور ان کی وہ بیقرارانہ کوششیں ہیں جن کے بل پر وہ ان رکاوٹوں سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں جو ان کو معاش، تحفظ اور عزت نفس کے حصول میں بے وجہ یا بے ضرورت مانع آتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس بین الاقوامی ہجرت اور لگاتار ثقافتی نفوذ کی دنیا میں معتبریت پنپ سکتی ہے؟ اس معاصر عالمی بھنور میں گھر کا کردار کیا ہے؟ دیکھا جائے تو دو بہت مختلف قسم کے نقاط علاحدگی ہیں جن سے معاصر دنیا جوجھ رہی ہے۔ پہلا ہے روایت کی متواتر تحلیل اور ہر شے کا عالمی روپ دھارنے کا عمل، جو باہم مل کر گھر کے بامعنی تصور کی جڑ بنیاد کھودے ڈال رہے ہیں۔ دوسرے سرے پر گھر کی ایک مرکزی اور حاوی نقطہ استحکام کے طور پر تجدید ہورہی ہے۔ ایسے بہت سے شواہد ہیں جو اس امکان کو قوی بناتے ہیں۔ یہ ہم کو مقامی، علاقائی اور قوم پرست تصورات کی روز بروز افزودی میں صاف نظر آنے لگے ہیں۔ سماجی علوم نجات کی راہیں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور مقامیت، علاقائیت اور قوم پرستی کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں کیونکہ انھی کے توسل سے ثقافتی معتبریت کی راہ ہموار ہوسکتی ہے۔ اسی سے سماجی یک جہتی، نظم، انفرادی استحکام اور تعین جہت حاصل ہوں گے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پ

پالیسی سائنس: "پالیسی" کے لفظی معنی لائحہ عمل کے ہیں۔ وسیع تر معنی میں پالیسی سے مراد وہ ٹھوس فیصلے یا پروگرام ہیں جنھیں حکومت اپنے طبعی یا سماجی ماحول کے چیلنجوں اور مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے اختیار کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جنگ، قحط، معاشی بحران، نقل آبادی، انفرادی اور گروہی مفادات کا ٹکراؤ وغیرہ۔ سرکاری پالیسی ماحول کے دباؤ سے تشکیل پاتی ہے۔ ماحول کے بدلنے سے سرکاری پالیسی بدلتی ہے یا سرکار خود ماحول کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔ علم سیاسیات میں سرکاری پالیسی اور پالیسی سازی کے بعد یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ان پالیسیوں کی تشکیل، تنفیذ اور اطلاق کا بھی مطالعہ کیا جائے جن کے ذریعہ سیاسی جماعت تنازعات کا تصفیہ کرتی، اجتماعی زندگی میں نظم لاتی اور وسائل کی تقسیم کرتی ہے۔ سرکاری پالیسیوں کا مطالعہ علم سیاسیات میں ایک طویل عرصہ سے جاری ہے لیکن اب تک عوامی پالیسی سائنس (Policy Science) وجود میں نہیں آسکی ہے جس کی روشنی میں "سائنس" پالیسیوں کی سفارش کی جاسکے۔

"پالیسی سائنس" کے نہج فکر کے نامور حامی ہیرلڈ لیسویل اور جیمس پولک (James Pollock) ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ سماجی اور سیاسی مسائل کے حل کی خاطر سماج کو موزوں اور دانش مندانہ پالیسی کے انتخاب میں مدد دینے کے لیئے علم سیاسیات اور دوسرے سماجی علوم کو ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے۔

چونکہ ایک فرد کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی مخصوص سیاسی مسئلہ کے حل میں معاون، روز افزوں معلومات اور طریقوں کو سماجی علوم سے جمع کرسکے اس لیے بین الموضوعاتی تعاون مناسب رہے گا۔ اگرچہ پالیسی سے متعلق اصلاح دینے والے افراد ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہوئے ہیں۔ "پالیسی سائنس" کی اصطلاح دوسری عالمی جنگ کے بعد کے برسوں میں رائج ہوئی۔

لیسویل وہ پہلا مفکر ہے جس نے اپنی کتابوں "علم الامراض"، "نفس اور سیاسیات" (1930) اور "جمہوریت بذریعہ رائے عامہ" (1941) میں حقائق کو اقدار سے جوڑنے کی کوشش کی اور اس طرح علم سیاسیات کے ایک "پالیسی سائنس" ہونے کا دعویٰ پیش کیا۔

کچھ عرصہ پہلے پالیسی سے متعلق تحقیقات کو فروغ دینے کے لیے ڈینیل لرنر (Daniel Lerner) اور سیویل کی ادارت میں ایمسٹرڈم (ہالینڈ) سے "پالیسی سائنسز" کے نام سے ایک سہ ماہی مجلّہ کا اجراء ہوا تھا۔

پالیسی علوم فیصلہ سازی یا انتخاب کے عمل کا مطالعہ کرتے اور مخصوص مسائل کے حل کے لیے مہیا معلومات کی افادیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ مخصوص فیصلوں کے ماحصل اور ان کے اسباب و نتائج اور فیصلہ سازی کی کارروائی سے بحث کرتے ہیں۔ اسی طرح نہ صرف انھیں سرکاری پالیسی سازی سے سروکار ہے بلکہ وہ غیر سرکاری تنظیموں اور افراد کے فیصلہ سازی کے عمل پر بھی بحث کرتے اور موجودہ معلومات کا اطلاق کرتے ہیں۔ لیسویل کے مطابق اس مطالعہ میں فہم و ادراک کی مختلف سطحوں پر پانچ کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ مقاصد کی توضیح، رجحانات کا بیان، حالات کا تجزیہ، مستقبل کے واقعات کا اندازہ اور مختلف پالیسیوں کی دریافت، ان کی جانچ اور انتخاب۔ پالیسی علوم میں فلسفہ، تاریخ، پیش گوئی اور اخلاقیات کو باہم سمویا جاتا ہے۔

پبلک اکاؤنٹس کمیٹی (Public Accounts Committee): پبلک اکاؤنٹس کمیٹی پارلیمنٹ کے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور مقننہ کے منظور کردہ بجٹ کے لحاظ سے آمدنی اور خرچ میں جو تفاوت عملاً واقع ہوتا ہے اسے جانچتی ہے اور حکومت سے دریافت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کر سکتی ہے کہ اس تفاوت کی کیا وجہ ہے ؟ کسی خاص مد میں متوقعہ آمدنی نہ ہونے یا یہ کہ جو رقم کسی خاص مد پر خرچ کرنے کے لیے مختص کی گئی ہو، اور وہ نہ خرچ کی جائے تو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اس کے لیے حکومت سے پوچھ سکتی ہے۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اس آڈٹ رپورٹ کو پیش نظر رکھتی ہے جو ملک کی آمدنی و خرچ کے تعلق سے چیف آڈیٹر کی جانب سے مرتب کی جاتی ہے۔ یہ رپورٹ اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ اس میں ملکی انتظامیہ کی جانب سے آمدنی اور خرچ میں جو بے ضابطگیاں واقع ہوتی ہیں انھیں واضح کیا جاتا ہے۔

پبلک سروس کمیشن (Public Service Commission): نظم و نسق کو معیاری بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت چلانے کے لیے ایسے اشخاص کا تقرر کیا جائے جن کی صلاحیت، وفاداری اور دیانت داری مسلمہ ہو۔ پبلک نظم و نسق کی بہتر کارگزاری ایسے ہی کارکنان کی صلاحیتوں پر منحصر ہوتی ہے جو پبلک عہدوں پر مامور کیے جاتے ہیں۔ وہ اشخاص جو مختلف عہدوں پر مامور ہوتے ہیں ان کی ذہانت اور صلاحیت پر ہی اچھا یا برا نظم و نسق انحصار کرتا ہے۔ سرکاری عہدیدار جو اعلیٰ قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہیں، حکومت کے نظم و نسق کو بہتر طور پر چلانے میں بڑی حد تک معاون ہوتے ہیں۔ ہندوستان کا دستور بنانے والوں نے عوامی خدمات کی اہمیت کے مد نظر ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے امریکا کے اسپائلز سسٹم (Spoils System) کو نہیں اپنایا بلکہ تقرریوں کے لیے ایسے ادارے قائم کیے گئے جو ہر قسم کے سیاسی اثرات سے محفوظ ہوں اور جن کے ارکان کی دیانت، ذمہ داری اور سچائی پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ اکثر ممالک میں جہاں جمہوری نظام قائم ہے وہاں پبلک سروس کمیشن قائم کیے گئے ہیں تاکہ اہم سرکاری عہدوں کے لیے جو بھی تقرر کیے جائیں وہ سیاسی اثرات کے تحت نہ ہوں بلکہ قابلیت اور ذہانت کی اساس پر ہوں۔ ملک میں حکومت کسی بھی پارٹی کے بنے لیکن یہ سرکاری افسر اپنے عہدوں پر قائم رہتے ہیں البتہ متعلقہ حکومت ان کے تبادلے کر سکتی ہے۔ دستور ہند کی دفعہ (315) کے تحت ایک یونین پبلک سروس کمیشن مرکزی حکومت کے لیے اور ہر ریاست کے لیے علاحدہ علاحدہ پبلک سروس کمیشن قائم کیے گئے۔ کمیشن کے کم از کم نصف ارکان ایسے سرکاری عہدہ دار ہوتے ہیں جو مرکز یا ریاستی حکومت میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ بقیہ ارکان ملک کی اہم شخصیات میں سے نامزد ہوتے ہیں۔

پبلک سروس کمیشن کی جانب سے مختلف سرکاری عہدوں کی اسامیوں کے لیے امتحانات منعقد کے جاتے ہیں پھر امتحانات میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو انٹرویو میں پرکھا جاتا ہے اور موزوں اشخاص کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کا وزارتوں اور دوسرے سرکاری اداروں میں اہم عہدوں پر تقرر ہوتا ہے۔

پبلک کمپنی (Public Company): وہ کمپنی جو پرائیویٹ کمپنی نہ ہو اس کو پبلک کمپنی کہتے ہیں۔ پبلک کمپنی عام پبلک سے خریداری حصص یا فروخت تمسکات کا اعلان کر سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ممبروں کی تعداد کا تعین پبلک کمپنی میں نہیں کیا جاتا البتہ ممبروں کی کم سے کم تعداد سات ہونا چاہیے اور کمپنی کے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں ممبروں پر اپنے حصص فروخت کرنے پر کوئی پابندی نہ ہونی چاہیے بلکہ اپنے حصص آزادی کے ساتھ فروخت کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ پبلک کمپنی کے نام کے آخر میں لفظ "لمیٹڈ" لکھا جانا ضروری ہے۔ پبلک کمپنی میں چونکہ عوام کا سرمایہ لگا رہتا ہے اس لیے اس پر گورنمنٹ کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرائیویٹ کمپنی کی صورت میں ایسے کنٹرول کی ضرورت نہیں ہوگی اگر کسی پرائیویٹ کمپنی نے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کی کسی شرط کی خلاف ورزی کی ہو تو وہ پرائیویٹ کمپنی، کمپنی لا کی قانونی مراعات سے استفادہ نہ کر سکے گی۔ بلکہ اس کمپنی پر کمپنی لا کا اس طور سے اطلاق ہوگا جیسے کہ پبلک کمپنی کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر شرط کی کوئی خلاف ورزی اتفاقی ہو تو عدالت ایسی صورت میں ایسی پرائیویٹ کمپنی کو پبلک کمپنی قرار دینے کے متعلق مناسب حکم صادر کر سکے گی۔ ایک پرائیویٹ کمپنی حسب ذیل صورتوں میں پبلک کمپنی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ کمپنی ایک قرارداد میں یہ طے کرے کہ آئندہ سے بہ حیثیت پبلک کمپنی اپنے کاروبار انجام دے گی اور اس مناسبت سے اپنے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں تبدیلی کرے۔ اس طرح ممبروں کی تعداد پچاس سے زیادہ ہو سکے گی اور حصص (Shares) کی منتقلی پر کوئی پابندی نہ ہوگی اور پبلک سے کمپنی کے حصص یا تمسکات کی خریداری کا اعلان جاری کیا جا سکے گا۔ ممبروں کی تعداد اگر سات سے کم ہو تو اسے کم سے کم سات کیا جائے گا۔

ایک پبلک کمپنی بھی پرائیویٹ کمپنی میں تبدیل کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے کمپنی کو ایک اسپیشل قرارداد پاس کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ ممبروں کی تعداد گھٹا کر پچاس کردی جائے گی اور حصص کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

منتقلی پر پابندی عائد کی جائے گی اور اس طرح حصص یا تمسکات کی فروخت پر بھی پابندی عائد کی جائے گی۔ پبلک کمپنی کو پرائیویٹ کمپنی میں منتقل ہونے کے لیے گورنمنٹ کی منظوری کی ضرورت ہے۔

پبلک نظم و نسق (Public Administration):

حکومت چلانے کے لیے جو پالیسیاں رو بہ عمل لائی جاتی ہیں، انھیں پر پبلک نظم و نسق انحصار کرتا ہے۔ پبلک نظم و نسق ایک جامع اصطلاح ہے جس میں حکومت کے تمام شعبوں کی کارکردگی کے اصول، ضوابط و طریقے آجاتے ہیں۔ حکومت کی پالیسیوں کا تعین پارلیمنٹ کی جانب سے کیا جاتا ہے اور ان پالیسیوں کو رو بہ عمل لانے کے لیے قانون بنائے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ارکان منتخبہ ہوتے ہیں اور رائے عامہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن یہ ارکان نظم و نسق چلانے کے لیے عموماً مہارت نہیں رکھتے۔ جب کوئی قانون بنایا جاتا ہے تو اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے قواعد و ضوابط کی تشکیل بھی ضروری ہوتی ہے۔ یہ قواعد و ضوابط ان حالات اور نظریات کو پیش نظر رکھ کر بنائے جاتے ہیں جن کے تحت کسی قانون کی عمل آوری مقصود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک قانون ٹریفک کو منظم کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اس قانون کے ذریعہ سڑکوں اور شاہراہوں پر آبادی کی مناسبت اور اسکولوں اور اسپتالوں کے محل وقوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے موٹروں اور بسوں وغیرہ کی رفتار کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس قانون میں اس امر کو بھی واضح کیا جاتا ہے کہ اس قانون کو رو بہ عمل لانے کے لیے کون سے ذرائع اختیار کیے جائیں۔ تجربہ کار اشخاص کو جو ٹریفک ضوابط کے بارے میں ماہرانہ معلومات رکھتے ہیں، قانون پر عمل در آمد کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ قانون کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں خاطیوں کو سزا دلانے کے لیے ضروری کارروائی کرنے کے مجاز ہوتے ہیں اور قانون کے تحت جو قواعد اور ذیلی قواعد بنائے جاتے ہیں، عوام سے ان کی پابندی کرواتے ہیں۔

سیاسی فکر انسانی فطرت کا ایک اہم جزو ہے اور حکومت کا تصور اس وقت تک صحیح طور پر انسانی فہم میں نہیں آسکتا جب تک انسانی فطرت کا مطالعہ مسلسل اور نزدیک سے نہ کیا جائے۔ ایسے بہت سے مسائل ہوتے ہیں جن کے حل کی توقع سیاسی اداروں سے کی جاتی ہے اور وہ حل کبھی تو آسانی سے اور کبھی بدیر حاصل ہوتے ہیں۔ بعض انسانی ضروریات اس نوعیت کی ہوتی ہیں جس کے حصول کے لیے کافی جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔

یہ بات اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم کسی مملکت کی پارلیمنٹ، عدلیہ، انتظامیہ کا جائزہ لیتے ہیں کیونکہ پبلک نظم و نسق انھیں اجزاء کی مشترکہ کارکردگی پر انحصار کرتا ہے۔

پبلک نظم ونسق۔ اختیارات کی تقسیم اور تفویض:

نظم و نسق کا دائرہ عمل مملکت کے رقبہ اور آبادی پر بھی انحصار کرتا ہے۔ اگر کسی مملکت کا رقبہ وسیع اور آبادی زیادہ ہو تو ہاں کسی ایک شخص یا عہدہ دار پر اختیارات و اقتدار کو مرکوز کرنے سے نظم و نسق چلانے میں رکاوٹ اور تاخیر ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ قوانین و ضوابط یا ذیلی قواعد کے حوالے سے حکومت کے اختیارات ایسے مرکزی یا مقامی عہدہ داروں کو تفویض کیے جائیں جن تک عوام کی رسائی آسان ہو۔ داد رسی میں سہولت ہو اور سرخ فیتے کی دفتریت کم سے کم ہو لیکن ایسا کرنے کے لیے کئی امور کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اگر مقامی عہدیداروں کو زیادہ اختیارات تفویض کر دیے جائیں تو اس کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ حکومت کی پالیسی پر صحیح طور پر عمل پیرا نہ ہوں اور اس طرح اختیارات تفویض کرنے کا اصل منشا ہی فوت ہو جائے گا۔ کسی بھی قانون کی کارکردگی کے لیے مقننہ کی عام نگرانی کسی نہ کسی توسط سے ضروری ہوتی ہے اور اس نگرانی کو مؤثر بنانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اختیارات کی تفویض‌کی نہایت احتیاط کے ساتھ کی جائے ورنہ اس کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ جو منصوبہ بندی یا نظریات مقننہ کے پیش نظر ہیں ان کی تکمیل پوری طرح نہ ہو سکے اور ان میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں۔ اس کا بھی امکان ہو سکتا ہے کہ وہ عہدہ دار جنھیں مقامی طور پر تصفیہ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اس خاص امر اور اس مقام کے تعلق سے کافی معلومات نہ رکھتے ہوں جس کے بارے میں تصفیہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ فیصلہ کرنے والوں کی نیت پر نظر رکھنی ہوتی ہے۔ حکومت کے اختیارات کی تقسیم یا تفویض کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کوئی قانون عمل در آمد کے لیے یا حکومت کی جنرل پالیسی کی عمل آوری ایک فنی، تجارتی یا صنعتی اسوسی ایشن کو تفویض کر دی جائے جس میں مختلف نظریات کی نمائندگی ہو۔ اس کی مثال ہم کو جرمن رائش (German Reich) میں ممبر اسٹیٹ لوکل یونٹس (Local Units) اور معاشی کونسل میں ملتی ہے۔ اسی طرح برطانیہ میں جس کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہاں اختیارات بڑی حد تک مرکز کے پاس ہیں، وہاں بھی کاؤنٹی کونسل (County Council) اور رورل ڈسٹرکٹ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کونسل (Rural District Council) اور بورڈ قائم ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اختیارات کا جتنا پھیلاؤ ہو گا، اتنا ہی ان کا صحیح استعمال ہو سکے گا اور کارکردگی بڑھے گی۔ جب ممالک متحدہ امریکا میں عوام سے متعلق حکومت کی پالیسی کا تعین امریکا کے دستور بنانے والوں کے سامنے در پیش تھا تو نتیجے کے طور پر ایک فیڈرل سسٹم کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید نظم و نسق کی بہتر کارکردگی کئی امور پر منحصر ہے۔ سیاست دانوں کے علاوہ کسی خاص میدان میں مہارت رکھنے والوں کی رائے اور صلاحیتوں سے استفادے کی شدید ضرورت ہوتی ہے کیونکہ موجودہ نظم و نسق کے مسائل قدیم دور کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ آج ایک مسئلے کا دوسرے پر انحصار ہوتا ہے اور اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اگر کوئی تصفیہ کیا جائے تو اس کے رد عمل کے طور پر ملک کے معاشی اور معاشرتی نظام پر کیسا اور کس حد تک اثر پڑے گا۔ یہ اثرات دیرپا ہوتے ہیں اس لیے آج نظم و نسق کے معاملہ میں وہ صحیح فیصلے ہی کار آمد ہو سکتے ہیں جو حالات اور ضرورتوں کو پیش نظر کیے جائیں۔

پبلک نظم و نسق - اسپائلز سسٹم (Public Administration – Spoils System): امریکا میں اسپائلز سسٹم رائج ہے۔ اس سسٹم میں حکومت کے اہم عہدوں پر برسر اقتدار سیاسی پارٹی کے اشخاص کا تقرر کیا جاتا ہے۔ قومی سطح پر یہ سسٹم دو سیاسی پارٹیوں فیڈرالسٹس (Federalists) اور ڈیموکریٹک ریپبلی کنز کے اقتدار میں آنے سے شروع ہوا جسے شروع کے صدور امریکا اور خاص طور سے تھامس جیفرسن نے فروغ دیا۔

انیسویں صدی کے دوران اسپائلز سسٹم پر اعتراضات ہونے شروع ہوگئے اور امریکا کے عوام نے یہ اظہار خیال کیا کہ اسپائلز سسٹم میں سرکاری تقررات کے وقت صرف بر سر اقتدار پارٹی کے مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے نہ کہ قوم کی فلاح و بہبود کو۔ اور واقعی اسپائلز سسٹم اختیار کرنے میں یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔ اگر پارٹی کے لوگ نظم و نسق کے لیے ذمہ دار ہو جائیں تو وہ پارٹی کے لیڈروں سے اپنی وفاداری نبھائیں گے نہ کہ عوام کی خدمت کریں گے۔ ہندوستان نے امریکا کے اسپائلز سسٹم کو اختیار نہ کر کے پبلک سروس کمیشنوں کے ذریعہ سرکاری عہدیداروں کے انتخاب کا طریقہ اپنایا ہے۔ اس طریقے میں حکومت کسی پارٹی کی ہو، عہدیدار سیاسی پارٹی کے مفادات کے نگراں نہ رہ کر ملک و قوم کے لیے کام کرتے ہیں۔

پبلک نظم و نسق - انتظامیہ: کسی بھی ملک کے لیے دو ذمہ داریاں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مناسب قانون سازی کی تجاویز مرتب کی جائیں اور حکومت کے سامنے رکھی جائیں تاکہ اس محکمے کی کارکردگی میں وسعت اور بہتری آئے۔ دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ محکمہ حکومت کے دوسرے محکموں سے ربط رکھے اور اپنے محکمے کی حد تک حکومت کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنائے۔ مابعد الذکر ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا تمدن اور تہذیب کے ان مرحلوں پر دشوار ہو جاتا ہے جہاں متعدد امور کی نشاندہی براہ راست حکومت کی جانب سے کی جاتی ہے تاکہ مختلف انتظامی اداروں کے باہمی ربط میں کوئی تضاد پیدا نہ ہو۔ نظم و نسق کے انتظامیہ کو ان اشخاص کی ضرورت پڑتی ہے جو دنیا کے مختلف ممالک کے نظم و نسق کے بارے میں نہ صرف معلومات رکھتے ہوں بلکہ نظم و نسق کا عملی وسیع تجربہ بھی رکھتے ہوں۔ ایسے اشخاص کا نہ صرف قابل بلکہ ایماندار اور بلند کردار ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسے لوگ ہی حکومت کی پالیسیوں پر عمل کرتے ہوئے ملکی نظم و نسق کو بہتر طور پر چلا سکتے ہیں، چاہے وہ حکومت کے کسی بھی محکمہ سے متعلق ہوں۔

پبلک نظم و نسق - اہم خدو خال: پبلک نظم و نسق تین شاخوں پر مشتمل ہے:

(1) مجلس قانون ساز(Parliament)

(2) عاملہ (Executive)

(3) عدلیہ (Judiciary)

پبلک نظم و نسق یعنی انتظامیہ کو ان تینوں شاخوں کی مجموعی کارکردگی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پبلک نظم و نسق کے بعض ماہرین اسے صرف عاملہ یعنی ایکزیکیٹو کی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ نظم و نسق کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ عوام کے مسائل کو سمجھا جائے اور ان کو سہولتیں فراہم کی جائیں۔ مہذب نظم و نسق مندرجہ ذیل خصوصیات پر انحصار کرتا ہے:

(1) تنظیم

(2) ایڈمنسٹریٹو سروس

(3) منصوبہ بندی

(4) رہنمائی

(5) رابطہ

(6) بجٹ

ایک انسانی زندگی کے لیے تنفس یعنی سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ضروری توانائی، خون کی روانی، جسمانی قوت اور دل و دماغ کی کارکردگی ضروری ہے۔ ایک عضو کے بغیر دوسرا عضو کام نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کا فلسفہ انتظامیہ یعنی پبلک نظم و نسق کا ہے۔ اور اس لیے حکومت کے مختلف محکمہ جات میں ذمہ دار اور باصلاحیت افراد کا تقرر پبلک نظم و نسق کے لیے ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر نظم و نسق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظم و نسق چلایا جا سکتا ہے۔ حکومت کے دائرہ عمل میں پولس، تعلیمات، صحت عامہ، تعمیرات، زراعت ، عدلیہ وغیرہ آتے ہیں اور یہ سب شعبے پبلک نظم و نسق کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان محکمہ جات کی کارپردازی کے لیے جو درجات مقرر کیے جاتے ہیں ان کا بھی نظم و نسق سے بہت قریبی تعلق ہے۔عام انتخابات سے قبل جو حکومت کسی ملک میں قائم تھی اور عام انتخابات کے بعد جو حکومت قائم ہوتی ہے ان کے درمیان پبلک نظم و نسق ایک رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حکومت کی تبدیلی سے نظم و نسق کی بنیادی کارکردگی میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ نئی حکومت نے کسی خاص امر کے بارے میں کوئی نئی پالیسی بنائی ہو۔ اگر ایسا ہو تو انتظامیہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس نئی پالیسی کے تحت کام کرے اور نظم و نسق کو اس نئی پالیسی سے ہم آہنگ بنائے۔

پبلک نظم و نسق ۔ بجٹ : بجٹ پبلک نظم و نسق میں انتہائی اہم دستاویز ہوتا ہے جس میں حکومت کے مختلف محکمہ جات کی جانب سے آئندہ مالیاتی سال میں تکمیل پانے والے پروگراموں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان پروگراموں پر خرچ کی جانے والی رقم کا تعین بھی اس میں کیا جاتا ہے۔ اس امر کا بھی تعین کیا جاتا ہے کہ یہ رقم کہاں سے حاصل کی جائے گی اور کون سے ذرائع، فراہمی رقم کے لیے اختیار کیے جائیں گے۔ جاری محصولات کی شرح میں کیا ردو بدل ہوگا اور نئے محصولات کس شرح سے عاید اور نافذ کیے جائیں گے۔ بیشتر ممالک میں بجٹ کی تجاویز حکومت کے متعلقہ محکمہ جات اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق تیار کرتے ہیں جس میں مجوزہ اخراجات اور ان اخراجات کے لیے متوقع آمدنی کا اندازہ بھی درج کیا جاتا ہے۔ بجٹ پارلیمنٹ یا ریاستی قانون ساز اسمبلی میں حکومت کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے جہاں بجٹ کی مجوزہ تجاویز کا نہ صرف گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے بلکہ متعلقہ ایوان تجاویز کے لیے اپنی منظوری دینے سے پہلے ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتا ہے۔ ایوان کی منظوری کے بعد بجٹ میں مندرج تجاویز کے تعلق سے آمدنی اور خرچ کا قانونی جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ بجٹ میں دیے ہوئے اعداد کے تحت جو آمدنی ہوتی ہے اور جو خرچ کیا جاتا ہے اس کی ایک ایسے ذریعہ سے جانچ یا آڈٹ کروائی جاتی ہے جس کا نظم و نسق کے متعلقہ انتظامی محکمے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایوان کی جانب سے جو بجٹ منظور کیا جاتا ہے عملی طور پر وہ آئندہ سال کے لیے حکومت کی جملہ کارکردگی اور پروگراموں کا ایک منصوبہ ہوتا ہے جسے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بجٹ میں آئندہ سال کے پروگرام کی تکمیل کے لیے جن اشخاص کی اور جس معیار کے فنی عہدہ داروں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے ۔ نمائندہ حکومت یعنی جمہوری سسٹم کا ارتقاء کچھ اس طور پر ہوا کہ حکومت کے بجٹ پر ایوان کی گرفت رفتہ رفتہ کافی مکمل اور مضبوط ہو گئی اور بغیر ایوان کی منظوری کے بجٹ کا تصور ہی اب تقریباً باقی نہیں رہا۔ بجٹ میں سال آئندہ کے لیے محصولات کی تجاویز کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک سے یا معینہ مدت کے لیے بانڈ جاری کر کے یا ورلڈ بینک سے قرضوں کے حصول کی تجاویز بھی مرتب کی جاتی ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بجٹ میں آئندہ سال کے لیے حکومت کی اسکیمات کی عمل آوری کے تعلق سے جو بھی تجاویز ہوتی ہیں ان کی صحیح طور پر عکاسی کی جاتی ہے۔

پبلک نظم و نسق۔ پارکن سن (Parkinson) : انتظامیہ یعنی نظم و نسق کے بارے میں دفتری کارروائیوں کے تعلق سے۔ایڈمنسٹریٹو سروس کے عہدہ داروں کا نظریہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ نظم و نسق کی ہر تجویز وہ پہلے فائلوں پر لاتے ہیں جو مختلف مرحلوں سے گزر کر ہی عمل میں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ہر وقت یہ بات رہتی ہے کہ ان کی تجویز کی کبھی بھی پبلک تحقیقات ہو سکتی ہے اور دوران ملازمت کسی بھی سرکاری عہدہ دار سے کسی بھی خاص تجویز یا خاص سفارش کی منظوری یا اسے رد کیے جانے کے بارے میں وجوہ پوچھی جا سکتی ہیں۔ یہ بھی دریافت کیا جا سکتا ہے کہ کسی سفارش یا درخواست کو نامنظور کرتے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وقت اس عہدہ دار نے کسی اور ماہر قانون سے رائے لی تھی یا نہیں وغیرہ۔ اس لیے ایک سرکاری عہدہ دار اسے انتہائی ضروری سمجھتا ہے کہ دفتری فائیلوں میں ہر معاملہ میں خانہ پُری مکمل رہے تاکہ بوقت تحقیقات وہ اس رکارڈ کو پیش کر سکے۔ بالفاظ دیگر ہر فائل کو اختتام تجویز سے قبل کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس سلسلہ میں کافی کارکنوں کی شمولیت ہو جاتی ہے۔ ایک کارکن کسی تجویز کے تعلق سے ایک فائل کی شروعات کرتا ہے جس میں مختلف عہدیدار حسب مراتب شامل ہوتے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک طویل سلسلہ بن جاتا ہے۔ اس طرح انتظامی اخراجات بڑھتے جاتے ہیں جن کا کم کرنا از بس ضروری ہے۔ پارکن سن نے پبلک نظم و نسق پر ہونے والے اخراجات میں کفایت کو پیش نظر رکھنے کی سفارش کی ہے۔

پبلک نظم و نسق۔ خصوصیات : پبلک نظم و نسق کی سب سے اہم خصوصیت حکومت چلانے کی مشنری کا قیام اور اس کے مختلف شعبوں کا انتظام ہے۔ ان شعبوں کی مثالیں حسب ذیل ہو سکتی ہیں۔

(1) صحت عامہ

(2) تعمیرات

(3) تعلیمات

(4) قدرتی وسایل سے استفادے کی اسکیمیں

(5) حمل و نقل کے ذرائع

(6) مختلف صنعتی اور کاروباری اداروں کی ہمت افزائی اور ان کے لیے امداد کی فراہمی۔

(7) بندرگاہوں کا قیام

(8) جنگلات کی نگرانی

(9) امن عامہ (Law and Order)

ہر شعبے کی کارکردگی کے لیے باصلاحیت اور تجربہ کار اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ متعلق ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف مختلف امور کا تعین کیا جائے بلکہ قانون اور ضوابط کا اطلاق بھی صحیح طرح سے ہو۔ ہر شعبے کے لیے ضروری سرمائے کی فراہمی، کام میں اولیت اور حکومت کے مختلف محکمہ جات میں ہم آہنگی نظم و نسق کے لیے ضروری امر ہے۔

پبلک نظم و نسق۔ دفتری دستور (Organisational Manual) : حکومت کے ہر محکمے میں نظم و نسق چلانے کے لیے ایک دفتری دستور ہوا کرتا ہے۔ اس دستور میں نہایت تفصیل سے کارکردگی کے تعلق سے حسب ذیل امور کی بابت ہدایات ہوتی ہیں۔

(1) عہدہ دار اور دفتر کے دیگر کارکن دفتر کس وقت آئیں اور کس رجسٹر پر اپنی حاضری کے دستخط کریں۔

(2) رخصت کی درخواست کب دی جائے اور کسے ایڈریس کی جائے۔

(3) اگر کوئی تجویز کسی کارکن کے پاس آئے تو وہ کس طرح اور کتنے وقت میں فائل بنا کر اپنے سے اوپر کے عہدہ دار کے پاس اسے پیش کرے اور وہ عہدہ دار اس فائل کو کتنی مدت میں تجویز کو رد کر کے یا کسی سوال کے ساتھ واپس کرے یا اپنی سفارش کے ساتھ اپنے سے اعلیٰ عہدہ دار کے پاس بھیج دے۔

(4) اگر دفتر میں کوئی کاغذ یا خط باہر سے آیا ہو تو اسے وصولی ڈاک کے رجسٹر میں درج کر کے متعلقہ شعبے یا سکشن میں بھیج دیا جائے۔ اسی طرح دفتر سے جانے والی ڈاک کا بھی اندراج کیا جاتا ہے۔

(5) ہر عہدہ دار کو کسی مسئلے کے تصفیے کا کہاں تک اختیار ہے۔

(6) کن صورتوں میں عہدہ داران کو تصفیے کے لیے فائلیں اپنے سے اعلیٰ افسران کے پاس بغرض منظوری روانہ کرنی چاہئیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ دستور کے ضوابط میں دفتری حالات کے تحت وقتاً فوقتاً رد و بدل کیا جا سکتا ہے لیکن بہ ہر حال دفتر میں کارروائیوں کے دوران اور تصفیے کے لیے جو طریقے دفتری دستور میں درج رہتے ہیں ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کے دفتری دستور کی ترتیب و تدوین بھی پبلک نظم و نسق کا ایک اہم حصہ ہے۔

پبلک نظم و نسق۔ رائے عامہ سے ربط : پبلک نظم و نسق کا رائے عامہ سے بالواسطہ ربط رہنا ضروری ہے کیونکہ منتخبہ ارکان پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلی کے بنائے ہوئے قانون پر عمل در آمد مرکزی یا ریاستی انتظامیہ کے ذریعہ کروایا جاتا ہے اور قانون میں جو لچک یا گنجائش سامنے آ جاتی ہے اسے مختلف زاویوں سے جانچا جاتا ہے اور متعلقہ قانون پر اس کی

صحیح تعبیر کرتے ہوئے عمل در آمد کیا جاتا ہے۔ غلط قانون سازی مملکت کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے، اس لیے اس پر عمل آوری ناممکن ہو جاتی ہے۔ اگر قانون میں کسی بات کی کمی ہوتی ہے تو وہ اشخاص جو نظم و نسق کا تجربہ رکھتے ہیں اور حکومت میں ذمہ دارانہ خدمت پر مامور ہوتے ہیں وہ حکومت کے سامنے قانون میں ترمیم کی تجویز پیش کرتے ہیں اور حکومت ایسی تجاویز کو متعلقہ وزارتوں میں غور و فکر کے بعد، مقننہ میں پیش کرتی ہے جہاں ضروری قانون سازی کے ذریعہ اس کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔ ایسی ترمیم کو قانونی زبان میں امنڈمنٹ (Amendment) کہتے ہیں۔ وہ اشخاص جنھیں نظم و نسق کا تجربہ ہوتا ہے ان کے ذریعہ ہی قوانین پر عمل در آمد کا انتظام ضروری ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عدلیہ پر اس امر کی نگرانی کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ ہر قانون کی عمل آوری صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔

پبلک نظم و نسق کا قانون ساز ادارے یعنی مقننہ سے قریبی ربط ہوتا ہے اور مقننہ کی رائے کا عکس پبلک نظم و نسق میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پبلک نظم و نسق نہ صرف ملک کے تمدن اور معیار زندگی کا آئینہ ہوتا ہے بلکہ اس سے قوم کے سیاسی شعور کے متعلق بھی رائے قائم ہوتی ہے۔ نظم و نسق کے بالاترین زینے پر جو شخصیت ہوتی ہے وہ ملک کے سیاسی شعور اور سوسائٹی کے تعلق سے ذمہ دارانہ طور پر فیصلے کر سکتی ہے۔ پارلیمنٹ ملک کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار ہوتی ہے جہاں منتخب قومی نمائندے ملک و قوم کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اس لیے ملک کے بہتر نظم و نسق کے لیے انتظامیہ کو مقننہ کے زیر اثر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی سطح کا لیڈر ایک سیاست داں ہوتا ہے نہ کہ ایک ماہر نظم و نسق۔ ایک سیاست داں کو قومی لیڈر بنانے کی اس لیے ضرورت ہے کہ وہ نظم و نسق کے ماہرین کو بر سر اقتدار منتخبہ اشخاص کی رائے سے واقف کرا سکے اور مطلوبہ انصرام کار کی ہدایت دے سکے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عوام اور دیگر سیاست دانوں کو نظم و نسق کے ان نکات سے واقف کراتا ہے جن سے سیاسی مقصد کے حصول میں آسانی پیدا ہو۔

نظم و نسق کے ذمہ دار اشخاص کو اس کا حق رہتا ہے کہ جو شخص قانون کی خلاف ورزی کرے یا جو نافذ قانون سے لاپرواہی برتے اس کے خلاف عدالتی کارروائی کریں۔ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ نظم و نسق اور پالیسی سازی حکومت کے الگ الگ شعبے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں شعبے ایک دوسرے سے انتہائی مربوط ہیں۔ پالیسی سازی نامکمل ہوگی اگر اس پالیسی کو روبہ عمل لانے کے لیے کوئی مؤثر انتظامی مشنری قائم نہ کی جائے کیونکہ یہ انتظامی مشنری یعنی انتظامیہ ہی ہوتا ہے جو قانون پر عمل درآمد کرنے کے لیے ذمہ دار ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے ایک پولس کانسٹیبل گرفتار کرتا ہے نہ کہ وہ قانون جو قانون ساز اسمبلی کی مجلد کتابوں میں محفوظ رہتا ہے۔

پبلک نظم و نسق۔ قواعد: پارلیمنٹ یا ریاستی قانون ساز اسمبلی میں قانون بنایا جاتا ہے۔ کم و بیش ہر قانون میں حکومت کو اس کا اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ قانون کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تفصیلی قواعد و ضوابط مرتب کرے۔ یہ قواعد و ضوابط نافذ کرنے سے پہلے پارلیمنٹ یا متعلقہ قانون ساز اسمبلی کے سامنے رکھے جاتے ہیں جسے یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ ان قواعد و ضوابط میں ترمیم و اضافہ کے لیے حکومت کو ہدایت دے۔ نظم و نسق چلانے کے لیے قانون کے علاوہ قواعد و ضوابط کی بھی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ قانون میں ہر تفصیل کا مدون کیا جانا ضروری نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی قانون میں یہ درج ہو کہ حکومت کس قسم کی انڈسٹری کے قیام کی اجازت دے گی تو قواعد و ضوابط میں یہ وضاحت ہوگی کہ حکومت کی وزارت صنعت نمونۂ مقررہ پر ماتحت عہدہ داروں سے مناسب رپورٹ ملنے کے بعد ہی وہ انڈسٹری لگانے کی اجازت دے گی۔ عام طور پر وہ عہدہ دار جو کسی محکمے کے ہیڈ کی حیثیت میں ہوتے ہیں وہ قواعد و ضوابط کا مسودہ مرتب کر کے حکومت کے متعلقہ وزیر کے سامنے پیش کرتے ہیں جو حکومت کی منظوری کے بعد گورنمنٹ گزٹ میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ ان قواعد و ضوابط پر عذرات یا سفارشات عوام سے ایک خاص مدت معینہ میں طلب کیے جاتے ہیں۔ وہ مدت گزرنے کے بعد ملنے والے عذرات اور سفارشات پر غور کیا جاتا ہے اور غور کرنے کے بعد اگر ضروری ہو تو رد و بدل کے بعد قواعد و ضوابط کی منظوری حکومت دیتی ہے اور ایک بار پھر یہ قواعد و ضوابط نفاذ کے لیے شائع کیے جاتے ہیں۔ ان قواعد کا نفاذ عام طور پر گورنمنٹ گزٹ میں اشاعت کی تاریخ سے ہوتا ہے بجز اس کے کہ ان قواعد و ضوابط کے نفاذ کے لیے کوئی اور تاریخ مقرر کی گئی ہو۔ قواعد و ضوابط میں ضرورت حالات اور معاملات کے مطابق ترمیم و اضافے ہوتے رہتے ہیں تاکہ محکمہ جاتی کارروائیاں صحیح ڈھنگ سے چلتی

رہیں اور عوام کو پریشانی نہ ہو۔ نظم و نسق چلانے میں ان قواعد و ضوابط کی بہت اہمیت ہے۔

پبلک نظم و نسق ۔ کنٹرول : یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاستی حکومتوں کا شہری انتظامیہ پر کافی کنٹرول ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتدا ہی سے یہ روش چلی آرہی ہے۔ بلدیات کے بجٹ کی منظوری حکومت دیتی ہے۔ بلدیات کے حسابات کی جانچ اور آڈٹ کا انتظام حکومت کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شہری انتظامیہ اپنے کسی پروجکٹ کے لیے قرض لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسے ریاستی حکومت کی منظوری لینی ہوگی۔ شہری انتظامیوں پر حکومت کے اس کنٹرول میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے مگر دیگر ممالک کے تجربات اس خیال کی تائید میں ہیں کہ ریاستی یا مرکزی حکومت کا کنٹرول مقامی انتظامیوں پر کم نہ ہونا چاہیے۔ طے شدہ محصولوں کے علاوہ کوئی نیا محصول ریاستی یا مرکزی حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی بھی مقامی یا شہری انتظامیہ نافذ نہیں کر سکتا۔

کنٹرول میں یہ بات بھی شریک ہے کہ اگر کوئی انتظامیہ اصول و ضوابط کے مطابق ٹھیک ڈھنگ سے کام نہ کرتا ہو تو اسے حکومت تحلیل کر سکتی ہے۔ میونسپل کمیٹیوں اور میونسپل کارپوریشن کے پاس کیے ہوئے ریزولیشنوں کو منسوخ کرنے کا اختیار بھی قانوناً ریاستی یا مرکزی حکومت کے پاس ہی ہوتا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ بلدیاتی کمیٹی یا کارپوریشن کے ممبران منتخب ہوتے ہیں اس لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ریاستی یا مرکزی حکومت ان کی کارکردگی پر موثر نگرانی رکھے تاکہ ان کی مقامی ترقیات کی تجاویز حکومت کی عام پالیسی سے ہم آہنگ رہیں۔

پبلک نظم و نسق ۔ معیار : انسانی سماج میں پبلک نظم و نسق کی اہمیت بنیادی ہوتی ہے اس لیے اس کا معیار ایسا ہونا چاہیے کہ مملکت کا انتظام بہتر طور پر چلے مگر یہ معیار حاصل کرنے کے لیے کافی کنٹرول اور ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ نظم و نسق کے ہر شعبے میں بد معاملگی اور تساہلی کا کافی امکان موجود رہتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ نظم و نسق کو ان خامیوں سے پاک رکھا جائے۔ کنٹرول کئی نوعیت کے ہوتے ہیں ۔ حکومت جس سیاسی رجحان کی حامل ہوتی ہے، اس سیاسی نظریے کو وسعت دینے کے لیے جو احکام دئے جاتے ہیں ان پر عمل در آمد کی نگرانی حکومت اپنا اولیں فرض سمجھتی ہے ۔ دوسرا کنٹرول باضابطگی کا ہے یعنی اس امر پر نظر رکھنی چاہئے کہ ماتحت عہدہ دار خوش اسلوبی سے نظم و نسق چلا رہے ہیں یا نہیں۔ تیسرا کنٹرول یہ ہے کہ اگر انتظامیہ کے جاری کردہ ضوابط کے حوالے سے کوئی امر کسی قانون یا قاعدے کے خلاف ہو جائے تو متاثر شخص قانون کی اس خلاف ورزی کے لیے عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے اور عدالت انتظامیہ کے خلاف ان کے احکام کو قانون کی روشنی میں جانچ کر فیصلہ صادر کرتی ہے۔ اس قسم کے کنٹرول کو نظم و نسق پر عدالتی کنٹرول کہا جا سکتا ہے۔

مقننہ کی جانب سے نظم و نسق پر کنٹرول کی غرض سے کئی کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بجٹ اسٹیمیٹ کمیٹی (Budget Estimate Committee)، پبلک اکاؤنٹس کمیٹی (Public Accounts Committee) اور سب آرڈرینیٹ لیجسلیشن کمیٹی (Subordinate Legislation Committee)۔ ایسی سب ہی کمیٹیاں اپنے اپنے دائرۂ کار میں ذمہ دار ہوتی ہیں۔

پبلک نظم و نسق۔ منصوبہ بندی : منصوبہ بندی خواہ کسی انداز میں کی گئی ہو اور خواہ اس کا دائرہ عمل کتنا ہی وسیع یا محدود کیوں نہ ہو وہ ملک کی قومی زندگی کے ارتقاء کے لیے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں انفرادی زندگی اور مملکتوں کے انتہائی پیچیدہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہے۔ صحیح منصوبہ بندی کے ذریعہ ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہو کر خود کفیل اور خوشحال بنتا ہے۔ معاشی اعتبار سے ملک کا خود کفیل بننا بھی منصوبہ بندی کا ایک اہم مقصد ہوتا ہے۔ عملاً منصوبہ بندی معینہ مدت کے حوالے سے ہوتی ہے۔ چار سال، پانچ سال یا کسی اور معینہ مدت میں نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں ملک کی ترقی کے تعلق سے تجاویز کی ترتیب و تشکیل اور اس کے لیے مالیہ کی فراہمی ہے۔ منصوبہ بندی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ حکومت کی کابینہ کے ارکان اور دیگر ماہرین نظم و نسق پر مشتمل کمیٹی یا کمیشن قائم کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی پلاننگ کمیشن قائم ہے۔ کمیشن ملک کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر حکومت کے ہر شعبے کی ترقی کے تعلق سے تجاویز مرتب کرتا ہے۔ مثلاً زراعت، تجارت، تعلیمات، صحت عامہ، صنعت و حرفت، میڈیا، بے روزگاری وغیرہ وغیرہ۔ ملک کے وسائل سے استفادے کی اسکیمیں تیار کرنا بھی اسی کمیشن کی ذمہ داری ہے۔ جیسے بڑے شہروں کے لیے سڑکوں کا جائزہ اور وسعت اور ایک شہر

سے دوسرے شہر کو ملانے کے لیے شاہراہوں کی تعمیر، کاشت اور پینے کے لیے پانی کی فراہمی اور اسکول اور کالجوں کا مختلف مقامات پر قیام۔ لیکن کمیشن کی مجوزہ اسکیموں پر عمل در آمد کا انحصار کئی امور پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شہروں کی آبادی، صنعتی اور تجارتی مراکز کا محل وقوع، شہریوں کا اپنے معیار زندگی کے تعلق سے تاثر وغیرہ۔ منصوبہ بندی میں مجوزہ اسکیموں کو رو بہ عمل لانے کے لیے ایسے خصوصی اسٹاف اور عملے کی ضرورت ہوتی ہے جو مختلف عہدوں پر کام کر چکا ہو اور ہر قسم کی ذمہ داری نبھانے کا تجربہ رکھتا ہو۔ منصوبہ بندی میں ملک کے متعلقہ مسائل کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور ملک کی ضرورت اور فراہم سرمایہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسکیموں کو منتخب کیا جاتا ہے اور اس کا تعین کیا جاتا ہے کہ کوئی خاص اسکیم کتنے دنوں یا سالوں میں اور کتنے مراحل کے ساتھ تکمیل پائے گی۔ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ کون سی اسکیم ملک کے کون سے مسئلے کا حل بنے گی اور وہ مسئلہ کتنا اہم ہے۔

پٹرم الکلنڈروچ سوروکن (Pitrim Alexanderaich Sorokein):

پٹرم الکلنڈروچ سوروکن معمولی دیہاتی ماحول میں 1889 میں شمالی روس کے ٹوریا نامی گاؤں میں پیدا ہوا۔ سوروکن بچپن ہی سے غیر معمولی صلاحیت کا حامل اور سخت محنت کا عادی تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی میں تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اس کا شمار دور حاضر کے عظیم ترین ساجیات دانوں میں ہوتا ہے۔ روس چھوڑنے کے بعد امریکا میں منی کوٹا یونیورسٹی میں سب سے پہلے وہ ساجیات کے شعبہ سے منسلک ہوا۔ روس چھوڑنے سے پہلے سینٹ پیٹرس برگ یونیورسٹی میں وہ ساجیات کا پہلا پروفیسر تھا۔ سوروکن کی تصانیف میں 'سماجی اور تمدنی حرکیات'، 'سماجی نقل پذیری' اور 'عصری ساجیاتی نظریات' کو خاص طور سے کلاسکی درجہ حاصل ہوچکا تھا۔ اس کی تصانیف ساجیات کے مختلف شعبوں پر حاوی ہیں جن میں نظریاتی ساجیات، علم ساجیات، فن کاری و ساجیات، سیاسی ساجیات، سماجی درجہ بندی، طریقیات اور ساختیاتی ساجیات قابل ذکر ہیں۔ اس کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ 1922 سے قبل کا ہے جب کہ وہ روس میں تھا اور بالشویک حکومت کی مخالفت کی بنا پر اسے روس سے بھاگنا پڑا۔ اور دوسرا حصہ 1922 سے بعد کا ہے جو اس نے امریکا میں گزارا جہاں اس نے اپنی اکثر تخلیقات مکمل کیں۔

طالب علمی کے زمانہ میں سوروکن کو سیاسی اور عملی زندگی سے لگاؤ تھا اور غیر کیمونسٹ انقلابی حلقوں میں وہ کافی سرگرم عمل تھا۔ اس نے انقلاب روس میں بھی حصہ لیا۔ لیکن بعد میں اسے اس تحریک سے عقیدت باقی نہیں رہی۔ امریکا میں قیام کے بعد سے سوروکن سماجی تنظیم بد نظمی اور سیاسی تنظیم کے مطالعہ میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا رہا۔ اور اس کا یہ خیال تھا کہ ان ہی طریق کے مطالعہ سے سماجی تبدیلی کے رجحانات کا صحیح تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

سوروکن نے سماجی تمدنی ماحول کی پیچیدگی اور اس کے تجزیہ کی اہمیت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ سماج میں مادی، تصوراتی اور عقلی تینوں قسم کے رجحانات تبدیلی کے عوامل کے طور پر فعال رہتے ہیں۔ اور ان کے تجزیہ کے بغیر سماجی حرکیات کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ "انقلاب کی ساجیات" جو 1925 میں شائع ہوئی۔ سوروکن کی ایک اور اہم تصنیف ہے۔ "انسان اور سماج بحران میں" 1942 میں شائع ہوئی۔ یہ بھی سوروکن کا اہم تصانیف میں شامل ہے۔ سوروکن بذات خود انقلابی ادوار کاشکار رہا تھا۔ اس لیے اس کے تصورات میں سماجی بحران اور انقلابی لہروں کے بڑے اہم تجزیے نظر آتے ہیں۔ وہ عددی اور شماریاتی تحقیق کا مخالف نہیں تھا لیکن اس نے سماجی تمدنی حقیقت کے مافوق عضویاتی اور مافوق انفرادی تجزیہ پر زیادہ زور دیا۔ جدید ساجیاتی ارتقاء میں سوروکن کا مقام بہت بلند ہے۔

سوروکن کی کچھ اور کتابیں ہیں : جرم اور سزا (1914)، ساجیات کے عوامل (1919)، ساجیات کے نظام (1920)، ساجیات کے عصری نظریات (1925)، ہمارے دور کا بحران (1940)، سماج تمدن اور شخصیت (1947)۔

تمدن سے متعلق نظریات : سماجی اور تمدنی تبدیلی (1937) میں اس نے تمدن کی کئی اقسام کے بارے میں لکھا تھا مثلاً :

شعوری تمدن (Sensate Culture): یہ صرف دیکھنے سننے والا اور چھونے کے قابل ٹھوس چیزوں سے تعلق رکھنے والا تمدن ہوتا ہے۔ خیالات اور نظریات اس کے دائرے سے باہر ہیں۔

تمثیلی تمدن (Ideational Culture): سچائی، علم، فن، مذہب اور اخلاقیات، یہ سب فلسفہ و تصورات پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ ٹھوس نہیں ہوتے۔ لیکن یہ شعوری تمدن کی بنیاد ہوتے ہیں۔

مثالی تمدن (Idealistic Culture): اس میں شعوری اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تمثیلی تمدن دونوں ہی ملے جلے انداز میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ ان دونوں کا درمیانی مقام ہے۔

سماجی تبدیلی کے عمل کو سوروکن نے انھیں خطوط پر سمجھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شعوری تمدن ہمیشہ تمثیلی تمدن کی طرف راغب ہوتا ہے اور تمثیلی تمدن شعوری تمدن کی طرف گامزن رہتا ہے۔ سماج کسی پنڈولم کی طرح ایک طرف سے ٹکرا کر دوسری طرف چلتا ہے لیکن وہاں سے ٹکرا کر پھر پہلی طرف چلتا ہے۔ اسی عمل اور رد عمل کے دوران کچھ عرصہ وہ درمیان میں گزارتا ہے۔ وہی دراصل مثالی تمدن کا مختصر سا وقفہ ہوتا ہے۔

انقلاب کے سلسلے میں سوروکن کا نظریہ : اپنی زندگی کے تجربات کی وجہ سے سوروکن انقلاب کا سخت مخالف تھا۔ اس کے خیال کے مطابق انقلاب نہ تو فطری عمل ہے اور نہ ہی اس سے کبھی کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ انقلاب روکنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے سماج سدھار کے جو پروگرام شروع کیے جائیں ان میں کچھ نکتہ ضرور سامنے رکھنے چاہئیں۔ مثلاً :

(1) سدھار کے پروگرام انسانی فطرت کے مطابق ہونے چاہئیں۔

(2) کوئی بھی اصلاح کا پروگرام شروع کرنے سے پہلے حالات کا سائنٹفک انداز میں مطالعہ کرلینا چاہیے۔

(3) پہلے ہر پروگرام چھوٹے سے پہلے گروہ پر تجربہ کے طور پر کرکے دیکھ لینا چاہیے۔

(4) سارا پروگرام قانون اور آئین کے دائرے میں ہی ہونا چاہیے۔

سوروکن کے بے شمار نظریات عصری سماجیات کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ان کے مقالوں پر برابر مزید تحقیقات ہو رہی ہیں اور نئے نئے پہلو سامنے آرہے ہیں۔

پٹرول برآمد کرنے والے عرب ملکوں کی تنظیم

(Organization of Arab Petroleum Exporting Countries (OAPEC):

تیل پیدا کرنے والے عرب ملکوں کی اس انجمن کا قیام 1968 میں عمل میں آیا تاکہ اس کے رکن ملکوں کے مفادات کا تحفظ ممکن ہو اور پٹرولیم کی صنعت سے متعلق اقتصادی سرگرمیوں میں تعاون کے طریقوں پر غور کیا جاسکے۔ اس کے رکن ملکوں میں الجیریا، بحرین، مصر، عراق، کویت، لیبیا، قطر، سعودی عرب، شام اور متحدہ عرب امارات شامل ہیں۔ اپریل 1979 میں مصر کی رکنیت منسوخ کردی گئی تھی لیکن مئی 1989 میں دوبارہ اس کی تجدید کردی گئی۔

اس کی کونسل ممبر ریاستوں کے پٹرولیم کے وزراء پر مشتمل ہوتی ہے جو اس کا اعلیٰ ترین ادارہ ہے۔ کونسل اس کی پالیسی سازی کی ذمہ دار ہے جو ہدایات جاری کرتی ہے اور اپنے قوانین وضع کرتی ہے۔ سال میں دوبار اس کی نشستیں ہوتی ہیں۔ انجمن کا ایک انتظامی بیورو اور ایک سکریٹریٹ بھی ہے۔ اس کا جوڈیشیل ٹریبونل عرب ملکوں کے سات ججوں پر مشتمل ہے جو انجمن کے معاہدوں کی تشریح اور ان کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کرتا ہے۔

انجمن کا صدر مقام کویت ہے لیکن اگست 1990 میں کویت پر عراق کے قبضہ کے بعد کونسل نے اپنے صدر دفتر کو عارضی طور سے مصر منتقل کردیا تھا۔

پٹرول برآمد کرنے والے ملکوں کی تنظیم

(Organization of the Petroleum Exporting Countries (OPEC):

یہ تنظیم 1960 میں ایران، عراق، کویت، سعودی عرب اور وینے زویلا کے ذریعہ بغداد میں وجود میں آئی۔ ممبر ملکوں کی پٹرولیم سے متعلق پالیسیوں کو یکسانیت سے ہمکنار کرنا، انفرادی اور اجتماعی طور سے ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے بہترین طریقے طے کرنا، بین الاقوامی تیل کی منڈیوں میں تیل کی قیمتوں کے استحکام کے تیقن کے بہترین ذرائع استعمال کرنا، تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی مستقل آمدنی کا تحفظ کرنا، تیل استعمال کرنے والی اقوام کے لیے باقاعدہ پٹرولیم کی فراہمی کرنا اس کے مقاصد میں شامل ہیں۔ ایک جائزہ کے مطابق دنیا بھر کے 75 فیصد تیل کے ذخائر پر اوپیک ملکوں کا قبضہ ہے جس میں سے دوتہائی مشرق وسطیٰ میں واقع ہیں۔ اوپیک نے 1976 میں ترقی پذیر ملکوں کو رعایتی شرح پر قرضہ جات دینے کی غرض سے بین الاقوامی ترقی کا خصوصی فنڈ بھی قائم کیا۔

اس کے ارکان میں الجیریا، انڈونیشیا، ایران، عراق، کویت، لیبیا، نائجیریا، قطر، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور وینے زویلا شامل ہیں۔

کانفرنس بورڈ آف گورنرز اور سکریٹریٹ اس کے اہم ادارے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہیں۔ کانفرنس اس کا اعلیٰ ترین ادارہ ہے جس کی نشست سال میں کم از کم دوبار ضرور منعقد ہوتی ہے۔ اس کا صدر دفتر وی آنا (آسٹریا) میں واقع ہے۔

پیٹریا پوٹسٹاس (Patria Potestas): ایک رومن خاندان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک صدر خاندان کا تصور پایا جاتا تھا جسے پیٹریا پوٹسٹاس (Patria Potestas) یا بالفاظ دیگر اختیار پدری کہا جاتا تھا۔ عام طور پر باپ اپنے بچوں کے متعلق وہ حق استعمال کرنے کا حق رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بچوں کو اہم سزا دینے کا بھی حق رکھتا تھا۔ اگر کسی لڑکے نے کوئی جائداد خریدی ہو تو وہ اس کے باپ کی ملکیت ہوجاتی تھی۔ ایک باپ اپنے کسی لڑکے کو یا کوئی آقا اپنے غلام کو اپنی کسی جائداد کو اس طرح استعمال کرنے کی اجازت دے سکتا تھا جیسے کہ وہ ان کی ذاتی ہو لیکن رومن لا کے تحت یہ جائداد باپ یا آقا کی ہی متصور ہوتی تھی۔ جسٹینین (Justinian) کے زمانے میں جائداد کی پوزیشن کے متعلق بہت کچھ تبدیلی عمل میں آئی۔ باپ جو جائداد اپنے بیٹے کو عطا کرتا تھا وہ قانوناً باپ ہی کی جائداد متصور ہوتی تھی لیکن پکولیم (Peculium) کا اصول نہ صرف پیشہ ورانہ آمدنی سے متعلق کہا جاتا تھا بلکہ دوسری جائداد کے متعلق بھی اس کا اطلاق ہوتا تھا مثال کے طور پر اگر کسی لڑکے کو ماں کی جانب سے کوئی جائداد وراثت میں ملی ہو تو ایسی صورت میں باپ کا حق اس جائداد پر باپ کی زندگی تک رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ جائداد لڑکے پر عود کرتی تھی۔ رومن لا کے تحت اختیار پدری باپ کی وفات پر ختم ہوجاتا تھا لیکن باپ اپنی رضامندی سے کسی لڑکے کو اپنے اختیارات کی پابندیوں سے آزاد کرسکتا تھا اور ایک لڑکی اپنے باپ کے اختیار پدری میں باقی نہیں رہتی تھی اگر اس کی شادی اس طور سے کی جائے کہ وہ اپنے شوہر کے مکمل اقتدار میں آئے جسے مانس (Manus) کہا جاتا تھا۔

پختون: پشتون یا پٹھان ایک قوم ہیں جو افغانستان اور پاکستان کے کچھ حصوں میں رہتے ہیں۔ ان کی تعداد دس لاکھ سے اوپر ہے۔ ایک زمانہ میں انھوں نے کافی بڑی سلطنت قائم کرلی تھی اور پٹھان حکمراں سو سال تک ہندستان کے شمالی حصہ پر حکومت کرتے رہے۔ موجودہ دور میں ان کی بڑی تعداد نیم خانہ بدوشی کی زندگی گزارتی ہے۔

پختون بڑے بہادر اور جانباز ہوتے ہیں۔ انھوں نے کبھی بھی بیرونی حکمرانوں کو اپنے ملک میں آسانی سے داخل نہیں ہونے دیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں انگریزوں نے انھیں زیر کرنے کے لیے زور لگایا لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔ انھیں افغانستان کی آزادی تسلیم کرنی پڑی اور افغانستان اور برطانوی ہندستان کے درمیان سرحدی علاقہ میں انھیں بڑی حد تک خود مختاری دینی پڑی۔

1947 میں ہندوستان کی آزادی کے بعد جب پاکستان بنا تو سرحد اور سرحدی علاقہ پاکستان میں آگیا۔ اس کے بعد سے خاں عبدالغفار خاں کی سرکردگی والی پختونستان کی تحریک چلتی رہی ہے جس کا مقصد پشتو بولنے والے تمام لوگوں کو متحد کرنا ہے۔ اسے افغانستان کی پوری تائید حاصل رہی ہے۔ اور پاکستان اور افغانستان میں اس مسئلہ پر جھڑپیں بھی ہوئی ہیں۔ افغانستان پورے پختون علاقے کو اپنے ملک میں شامل کرنا چاہتا ہے۔

دور حاضر میں ان تمام حالات میں تبدیلی آچکی ہے۔ پختون آج کل افیون اگانے والا سب سے زرخیز علاقہ ہے۔ تمام علاقہ میں غیر قانونی اسلحوں اور افیون کو ہیروئن بنانے والی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں کی بھرمار ہے۔ اس طرح یہ علاقہ منشیات آمیز دہشت گردی (Narcoterrorism) کے لیے بدنام ہوگیا ہے۔

سماجیات دانوں کے لیے یہاں کی جہالت اور خواتین کی انتہائی پست حالت تشویش ناک مسائل ہیں۔ پختون کے دوسرے معنی 'غیرت' بھی ہیں۔ اسی روایتی غیرت کے تحت وہ عورتوں کو خاندانی آنا اور وقار کے لیے بہ آسانی قتل کردیتے ہیں۔ یہ قتل بھی 'کاروکاری' کے زمرے میں آتے ہیں۔ کاروکاری (Killing for Family Honour) یہاں کا عام رواج ہے۔

طالبان کے عروج میں آنے کے بعد افغانستان اور پاکستان کے بارڈر کا یہ حصہ بے شمار سیاسی اور تخریبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا ہے۔

عورتوں کی زبوں حالی یہاں کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ حکمرانوں کو ان کی حالت سدھارنے سے فی الوقت کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔

کچھ حصہ علاقہ ٔغیر کہلاتا ہے جس پر Noman's Land کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر قانون اور ڈسپلن کا کنٹرول کافی کم ہے۔

پراسپکٹس (Prospectus): رجسٹریشن کا سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے بعد پروموٹر کمپنی کے لیے سرمائے کی فراہمی کی بابت ضروری کارروائی

کریں گے۔ ایک پبلک کمپنی عوام سے کمپنی میں سرمایہ لگانے کی درخواست ایک اعلان کے ذریعہ کرے گی اور اس سلسلے میں ایک پراسپکٹس (Prospectus) شائع کرے گی۔ پراسپکٹس کی اشاعت کا اصل منشا یہ ہے کہ عوام کو قائم کی جانے والی کمپنی کے اغراض و مقاصد سے واقف کرایا جائے اور عوام سے کمپنی کے حصص یا تمسکات خریدنے کی اپیل کی جائے۔ مختصر الفاظ میں پراسپکٹس کمپنی کے حصص یا تمسکات خریدنے کے لیے شائع دعوت نامے کو کہتے ہیں یہ پراسپکٹس جو کسی کمپنی کی جانب سے شائع ہوتا ہے اس میں تاریخ کا درج کرنا ضروری ہے۔ اس تاریخ کو پراسپکٹس کی اشاعت کی تاریخ قرار دیا جاتا ہے۔ کسی پراسپکٹس کی اشاعت اس وقت تک نہ ہوسکے گی جب تک اس کی ایک کاپی رجسٹرار کمپنی کے پاس پیش نہ کی گئی ہو اور جس پر ڈائرکٹرز یا مامور شدہ ڈائرکٹرز کے دستخط نہ ہوں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پراسپکٹس کی باقاعدہ اشاعت کی اس صورت میں ضرورت نہیں ہے جب پروموٹر کو اس بات کا اعتماد ہو کہ وہ حسب ضرورت سرمائے کی رقم خانگی طور پر بغیر پراسپکٹس کی اشاعت کی فروخت حصص سے جمع کرسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں پراسپکٹس کے بجائے ایک اسٹیٹ منٹ (Statement) رجسٹرار کمپنی کے پاس پیش کرنا ہوگا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی اپنے آرٹیکل آف اسوسی ایشن کے ذریعہ حصص یا تمسکات کی خریداری کے لیے کسی اعلان کی اشاعت نہ کرنے کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ پرائیویٹ کمپنی کے لیے ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ پراسپکٹس کے بجائے اسٹیٹ منٹ (Statement) رجسٹرار کمپنی کے پاس پیش کرے۔

پروموٹرز اور ڈائرکٹرز پراسپکٹس ہی کے ذریعہ عوام کو کمپنی کے حصص خریدنے اور کاروبار میں منافع کے روشن امکانات کو واضح کرتے ہیں۔ پراسپکٹس کے ساتھ دیگر ضروری کاغذات بھی رجسٹرار کمپنی کے پاس داخل کیے جاتے ہیں۔

پراسپکٹس میں منجملہ دیگر امور کے حسب ذیل باتیں درج ہوتی ہیں:

(1) کمپنی کے اغراض و مقاصد
(2) حصص کی تعداد کا تعین اور منافع اور سود کی ادائیگی کی تفصیلات۔
(3) اقل ترین حصص کی تعداد جو ڈائرکٹرز کو خریدنا ضروری ہے۔
(4) ڈائرکٹرز کی تنخواہ، نام، پتہ اور پیشہ۔
(5) کم از کم مالیت کے حصے کا تعین جو خریدا جاسکتا ہے۔
(6) حصص کی خریدی کے لیے درخواست دینے کی آخری تاریخ۔
(7) کمپنی کے سابقہ کارکردگی کے متعلق نفع و نقصان کے بارے میں آڈیٹر (Auditors) کی رپورٹ۔

چونکہ پراسپکٹس ہی کی بنیاد پر اشخاص کمپنی میں سرمایہ لگاتے ہیں اس لیے پراسپکٹس میں کوئی بات غلط نہ ہونی چاہیے اس لیے ان اشخاص پر جو پراسپکٹس جاری کرتے ہیں اس کی صحت کے متعلق بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر پراسپکٹس میں کوئی خلاف واقعہ بات درج ہو تو اس کی وجہ سے حصے داروں کو کمپنی کے خلاف اور کمپنی کے پروموٹر اور ڈائرکٹرز کے خلاف چند حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔

پرامن بقائے باہم (Peaceful Co-existence):

پرامن بقائے باہم، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک ایسی صورت حال ہے جس میں مختلف طرز کے سماجی نظام اور متضاد نظریات زندگی رکھنے والے ممالک جنگ سے پرہیز کرتے ہوئے باہمی امن و آشتی سے رہتے ہیں۔ پرامن بقائے باہم بین الاقوامی نظام کی ایک حقیقت ہے اور بین الاقوامی قانون کا ایک تصور بھی ہے۔ بقائے باہم کی کیفیت آزاد و خودمختار قومی مملکتوں والے لامرکزی سیاسی نظام میں ناگزیر ہے۔ اگرچہ ہر قومی مملکت اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں مکمل طور سے آزاد ہے لیکن کوئی مملکت نہ مکمل طور سے خودکفیل ہوسکتی ہے نہ دوسروں سے علاحدہ رہ کر باقی رہ سکتی ہے۔ کفالت باہم کی ضروریات اسے بین الاقوامی برادری سے لین دین پر مجبور کرتی ہیں۔ ان مملکتوں کے روابط کو منضبط کرنے کے لیے بین الاقوامی قانون وجود میں آیا جس کو اس نظام میں کوئی مرکزی طاقت نافذ نہیں کرتی بلکہ تمام ممالک رضاکارانہ طور پر اس کی عملداری کو تسلیم کرتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کا مقصد امن و جنگ میں ملکوں کے تعلقات کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کا حتمی مقصد یہ ہے کہ وہ پرامن طور پر خود زندہ رہیں اور دوسروں کو زندہ رہنے دیں۔

پرامن بقائے باہم کے اصول 1954 کے ہند چین معاہدہ میں درج "پنچ شیل" سے ملتے جلتے ہیں یعنی:

(1) ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت اور قومی اقتدار اعلیٰ کا احترام۔
(2) ایک دوسرے کے خلاف جارحیت سے اجتناب۔

(3) اندرونی معاملات میں مداخلت سے پرہیز۔

(3) برابری اور باہمی فائدہ رسانی اور

(4) مختلف سماجی و سیاسی نظام والے ملکوں کا پرامن بقائے باہم۔

ان پانچ اصولوں میں بین الاقوامی معاہدوں اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا اصول اور قومی خوداختیاری کے حق کو شامل کرنا ضروری ہے۔ یہی اصول اقوام متحدہ کے منشور اور بانڈونگ کانفرنس کے اعلانیہ میں شامل ہیں۔

یورپی مملکتی نظام میں توازن طاقت اور بقائے باہم کے اصول، عدم استحکام کے ادوار کو چھوڑ کر سولہویں صدی سے لے کر پہلی عالمی جنگ تک متفقہ طور پر مانے اور برتے گئے ہیں۔ چوں کہ یہ سارے ملک مشترک مسیحی تہذیب کے حامل تھے اس لیے ان کے درمیان اپنی برادری کے روابط کے سلسلہ میں اخلاقی اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ ان سب کا مقصد اپنی قومی اکائیوں کی بقا کے ساتھ بین الاقوامی نظام کی بقا بھی تھا۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد روس میں بالشیوک انقلاب اور اطالیہ و جرمنی میں فاشسٹ حکومتوں کے ظہور سے یہ اخلاقی اتفاق ختم ہوگیا اور نظام کے اندر ایسی طاقتیں رونما ہوئیں جو سارے نظام کو توڑ کر نیا نظام قائم کرنے کے درپے ہو گئیں۔ مثلاً سوویت روس کے اولین رہنماؤں نے پرولتاری بین الاقوامیت اور عالمی اشتراکی انقلاب کا ہی راستہ اپنایا۔ ان میں سے کم از کم ایک حصہ کے نظریہ کے مطابق اشتراکی روس اور سرمایہ دار ملکوں کے درمیان واقعی پرامن بقائے باہم ناممکن تھا۔ کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام بنیادی طور سے ایک دوسرے کی ضد تھے اور ان کا ٹکراؤ یقینی تھا۔ ان اشتراکیوں کا عقیدہ تھا کہ اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں اشتراکیت کی فتح لازمی ہے۔ چوں کہ اشتراکیت مستقبل کا نظام ہے اس لیے اس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ پہلے اسے ایک ملک (روس) میں تعمیر کیا جائے تاآنکہ وہ دوسرے ملکوں میں انقلاب برپا کرنے کے قابل ہوسکے۔ اسے سرمایہ دارانہ طاقتوں کی مداخلت، جنگوں اور سازشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے ساتھ "عارضی" بقائے باہم لازمی ہے۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد بین الاقوامی میدان میں واقع ہونے والی انقلابی تبدیلیوں نے اسٹالن کے جانشینوں کو پرامن بقائے باہم کی ضرورت کو تسلیم کرنے اور جنگ و تشدد کے بجائے پرامن اور نظریاتی طریقوں سے اشتراکیت کے پرچار کے اصول کو اپنانے پر مجبور کیا۔ سوویت یونین کی نئی پالیسی کو نکیتاخروشچیف نے 1956 میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کے بیسویں اجلاس میں تین نکات کی شکل میں پیش کیا:

(1) روایتی مارکسی لینی نظریہ کے برعکس جنگ ناگزیر نہیں ہے۔ نیوکلیائی انقلاب کے دور میں پرامن بقائے باہم بنیادی ضرورت ہے۔

(2) طبقاتی جدوجہد اور اشتراکی انقلاب تشدد کے بغیر پرامن ذرائع سے بھی برپا کیا جاسکتا ہے اور

(3) اشتراکیت کی منزل تک پہنچنے کا محض ایک ہی راستہ نہیں ہے بلکہ مختلف راستوں کے ذریعہ اس تک پہنچا جاسکتا ہے۔ 1956 سے 1978 تک کے عرصہ میں سوویت خارجہ پالیسی کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ روایتی انقلابی مقاصد ماند پڑ چکے تھے اور سوویت مملکت بھی جملہ قومی مملکتوں کی طرح بین الاقوامی برادری میں پرامن طریقہ سے رہنا اور اس برادری کو مستحکم کرنا چاہتی تھی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی کے اوائل میں سوویت یونین کے سقوط کے بعد تو بقائے باہم کے اصول کو اور بھی تقویت ملی ہے۔

پرائیویٹ کمپنی (Private Company): ایک پرائیویٹ کمپنی سے ایسی کمپنی مراد ہے جس میں حصص کی منتقلی پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ جس میں جملہ ممبروں کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور پرائیویٹ کمپنی پبلک سے حصص یا کمپنی کے تمسکات (Debentures) کے فروخت کا عام اعلان نہیں کرسکتی۔ پرائیویٹ کمپنی کے لیے قلیل ترین ممبروں کی تعداد دو ہے۔ ایک پرائیویٹ کمپنی کے نام کے آخر میں "پرائیویٹ لمیٹڈ" درج کیا جائے گا اور رجسٹریشن ہونے کے فوری بعد پرائیویٹ کمپنی اپنے کاروبار کا آغاز کرسکتی ہے۔

پرورش یا نان و نفقہ (Maintenance): ایک ہندو کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کی پرورش کرے۔ ایک بیوی اپنے شوہر سے نان و نفقہ کے ساتھ قانوناً الگ رہ سکتی ہے۔

(1) اگر اس کا شوہر اس کی طرف توجہ نہ کرے اور اسے چھوڑ دے۔

(2) اگر اس کے شوہر کا سلوک اچھا نہ ہو۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(3) اگر اس کے شوہر کی کوئی اور بیوی زندہ ہو۔

(4) اگر اس کے شوہر نے اسی گھر میں ایک داشتہ کو رکھا ہو۔

(5) اگر اس کے شوہر نے ہندو مذہب ترک کرکے دوسرا مذہب اختیار کرلیا ہو۔

(6) اگر کوئی اور معقول وجہ ہو۔

ایک ہندو بیوہ کو یہ حق رہے گا کہ اس کا خسر اس کی پرورش کرے اگر اس کی کوئی ایسی جائداد نہ ہو جس سے وہ اپنی پرورش کرسکتی ہو یا اس کی کوئی ایسی اولاد نہ ہو جس سے وہ اپنی پرورش کرسکتی ہو۔

اسی طرح ہندو لا کے تحت ہر شخص پر یہ لازم ہے کہ وہ جائز یا ناجائز بچے اور اپنے ضعیف والدین کی پرورش کرے۔ ایک بیٹا خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز سن بلوغ کے پہنچنے تک اپنے ماں باپ سے پرورش کا حق طلب کرسکتا ہے۔

ہندو لا کے تحت متعلقین میں حسب ذیل رشتہ دار شامل ہیں:

(1) باپ (2) ماں (3) بیوہ (4) نابالغ بیٹا (5) فوت شدہ بیٹے کا نابالغ بیٹا بشرطیکہ اس کو اپنے باپ سے کوئی جائداد نہ ملی ہو۔

پروموشن (Promotion): یہ کمپنی کے قیام کا پہلا مرحلہ ہے۔ ایک شخص یا چند اشخاص مل کر کاروبار کے امکانات پر غور کرکے اس کے متعلق ایک اسکیم تیار کرتے ہیں کہ کس طرح کمپنی قائم کی جائے۔ کس طرح سرمایہ فراہم کیا جائے اور کس طرح کاروباری اسکیم کو روبہ عمل لایا جائے۔ ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد ضروری اقدامات کیے جاتے ہیں۔ ان اقدامات میں فیکٹری کے لیے جگہ کی خریداری مشینری کی فراہمی شریک ہیں۔ اصطلاح پروموٹر (Promoter) کی خاص تعریف کمپنی لا میں نہیں کی گئی ہے لیکن اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی کاروبار کے متعلق کسی شخص یا چند اشخاص کی طرف سے اسکیم مرتب کرنے والے اور اسے روبہ عمل لانے والے کو پروموٹر کہتے ہیں۔ کسی پروموٹر کو کمپنی قائم کرنے کے بعد کمپنی سے کوئی معاوضہ لینے کا حق نہیں ہے۔ البتہ کمپنی ایک قرارداد (ریزولوشن) کے ذریعہ کسی پروموٹر سے معاہدہ کرسکتی ہے اور معاوضہ کا تعین کرسکتی ہے۔

پریٹر (Praeter): رومن لا میں جورس ڈکشن (Jurisdiction) کے فرائض میں انصاف رسانی کے طریقوں کی نگرانی کرنا تھا نہ کہ مقدمات میں عدالتی فیصلے کرنا۔ عدالتی فیصلے کرنے کا اختیار شہنشاہ وقت کو تھا۔ جیسے جیسے عام کاروبار اور دربار کے کاموں میں اضافہ ہوا یہ اختیار شہنشاہوں کے مشیروں کو منتقل ہوا اور جب دوسرے فرائض کی وجہ سے مشیروں کے لیے بھی اختیار کو مؤثر طور پر ادا کرنے میں دشواری ہوئی تو 367 قبل مسیح میں ایک نئے مجسٹریٹ کا اس غرض کے لیے تقرر کیا گیا جسے پریٹر (Praeter) کہا جاتا تھا۔ 252 قبل مسیح میں اجنبی اشخاص کی تعداد روم میں زیادہ ہوگئی تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے اجنبی اشخاص کے درمیان فصل خصومات کا انتظام علاحدہ کیا جائے اور یہ کہ ایسے مقدمات جس کے فریقین صرف رومن ہوں علاحدہ انتظام کیا جائے اس غرض کے لیے ایک دوسرے پریٹر (Praeter) کا تقرر کیا گیا جو صرف اجنبی اشخاص کے درمیان جو نزاع ہوتی تھی اس کا قانونی فیصلہ کرتا تھا۔ روم کے دوسرے عہدہ دار جن کے ذمہ عام بازاروں کی نگرانی تھی ان کے فیصلے اور احکام کافی اہمیت کے حامل تھے۔ صوبوں میں اعلیٰ ترین عدالتی اختیارات گورنروں کو حاصل تھے۔

پس افتادہ بچوں کی تعلیم (Education of the Backward Children): جن بچوں کے لیے خاص مدارس (Special Schools) قائم کیے جاتے ہیں ان میں ایسے بچے بھی شامل ہیں جو غبی یا کند ذہن ہوں۔ ایک ایسا بچہ جو ذہنی اعتبار سے اپنے ہم عمر اوسط درجہ کے بچوں سے کمتر ہو، موزوں تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنے فطری میدان میں کامیاب اور اس قابل ہو سکتا ہے کہ اپنی روزی کماسکے۔ بچوں میں عام ذہانت کے لحاظ سے اختلافات کے وسیع مدارج پائے جاتے ہیں یعنی بچوں کا ذہنی قدر ذہانت (Intelligence Quotient 'I.Q') 10 سے لے کر 150 تک ہو سکتا ہے۔ ایسے بچے جن کا ذہنی قدر ذہانت اوسط یعنی 100 سے کم ہو غبی یا کند ذہن کہلاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کم ذہانت کے بچے آسان نصاب تعلیم اور خاص تدریسی طریقوں کے مستحق ہیں۔ اگر ان کی تربیت فطری صلاحیتوں کے بالکل مطابق نہ ہو تو وہ نا امید ہو جائیں گے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ سست و کاہل ہو جائیں اور غیر سماجی رویہ اختیار کرلیں۔ ان کے علاوہ بعض بچے ایسے بھی ہوں گے جن کی پس افتادگی محض عارضی ہو گی اور صحیح قسم کی انفرادی توجہ کے زیر اثر ان کی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ یہ عارضی کیفیت بیماری

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

166

یا جذباتی بے چینی کے باعث پیدا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان حالات کے پیش نظر صحیح تشخیص (Correct Diagnosis) کی شدید ضرورت پائی جاتی ہے اور محض اس بنا پر بچوں کی رہنمائی کے اداروں کا قیام ضروری ہے تاکہ پس افتادگی کی دریافت اور اس کے علاج کے موثر طریقے اختیار کیے جا سکیں۔ تعلیم کے نظام میں اس قسم کے اداروں کو ایک لازمی جز کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

پس افتادہ بچوں کی تعلیم میں بعض امور کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ مدرسہ میں داخلہ کے وقت عمر سات سال سے کم نہ ہونی چاہیے اور سولہ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کسی طالب علم کو مدرسہ میں نہ روکا جائے۔ حسب ذیل مضامین کی تعلیم دی جائے۔

پڑھنا، لکھنا اور حساب (Three Rs.)، گانا اور نظم خوانی۔ اس میں صحیح طور پر سانس لینے کی مشق بھی شامل ہونی چاہیے۔ مطالعہ قدرت (Nature Study) ، ڈرائنگ، سلائی کرنا (برائے طالبات)، جسمانی ورزشیں، حرفہ (ہاتھ کا کام)۔

طریقۂ تدریس میں اظہار نہایت واضح اور حقیقت پسندانہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عملی کام بھی لیا جائے۔ کمرۂ جماعت میں طلبا کی تعداد 30 سے زیادہ نہ ہونی چاہیے اور ہر ایک کے لیے کرسی اور ڈیسک فراہم کی جائے۔ حرفے کے لیے علاحدہ کمرہ ہو۔

ایسے بچوں کا سال میں دو مرتبہ طبی معائنہ ہو اور اس کا ریکارڈ لکھنا ضروری ہے۔ اگر تیرہ سال سے کم عمر کا کوئی بچہ تعلیمی اعتبار سے کافی ترقی کرلے اور اس میں دوسرا کوئی عیب نہ ہو تو اس کو علمی مدارس میں داخل کرا دیا جائے۔

نظام مان ہایم (The Mannheim System): مان ہایم (جرمنی) میں ایک بے مثل اور کامیاب تجربہ کیا گیا۔ وہاں درمیانی مدارس (Intermediate Schools) قائم کیے گئے یعنی ایسے مدارس جو عام اور خاص مدارس کے درمیان ہوں۔ ان مدارس کے قیام کے کئی اسباب ہوئے:

(1) یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ ابتدائی مدارس کے تقریباً دس فیصد طلبا تعلیمی رفتار ترقی میں ایک اوسط قابلیت رکھنے والے طالب علم کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

(2) ایسے بچوں کے لیے تعلیم اور حفظ صحت کی خاص تدابیر کی ضرورت محسوس کی گئی۔

(3) یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ بہتر ذہنی قابلیت اور بہتر جسمانی قوت رکھنے والے بچوں کے ساتھ ایک ہی جماعت میں ان پس افتادہ بچوں کی موجودگی عام ترقی میں مانع ہوگی۔

لہٰذا نظام مان ہایم کے تحت مدرسہ کی تنظیم تین شعبوں پر مشتمل ہوتی ہے:

(1) عام جماعتیں 8 درجے (Normal Classes 8 Grades)

(2) پس افتادہ جماعتیں 4 یا 6 درجے (Backward Classes 4 or 6 Grades)

(3) ذہنی نقص کی جماعتیں 4 یا 6 درجے (Mentally Defective Classes 4 or 6 Grades)

یہ ضروری نہیں کہ پس افتادہ جماعتوں میں طلبا کو دائمی طور پر رکھا جائے۔ ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ طلبا کو درمیانی جماعتوں سے معمولی جماعتوں میں ترقی دی جاتی ہے۔ پس افتادہ جماعتوں میں تعداد کے لحاظ سے فی جماعت (30) طلبا کی حد مقرر ہے۔ دوسرے دو شعبوں میں طلبا کی تعداد ہر جماعت میں (50) تک رکھی جا سکتی ہے۔

پستالوزی یوہان ہنرخ (Pestalozzi, Johann Heinrich, 1746 - 1827): مشہور ماہر تعلیم سوئٹزرلینڈ کا باشندہ۔ یہ پہلا دانشور ہے جس نے صنعتی دور کے تعلیمی مسائل کا مطالعہ کیا اور بہتر اور عام تعلیم پر زور دیا۔ اس نے بتایا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی میں تعلیم حاصل کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کا مادہ ہوتا ہے اور اس لیے ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس نے ایک ایسا طریقۂ تعلیم مرتب کیا جس سے طالب علم کی صلاحیتیں ترقی پاکر اُبھر سکتی ہیں اور وہ خود اپنی اور دوسروں کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کا طریقۂ تعلیم مقبول ہوا اور استادوں کی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ اس کے بہت سارے اصول جدید ابتدائی تعلیم میں قبول کر لیے گئے ہیں۔

پستالوزی 12/ جنوری 1746 کو زیورچ میں پیدا ہوا۔ مقامی سیاسی حالات اور روسو کی تعلیمات نے اسے بے حد متاثر کیا۔ اس کے زیر اثر اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نے دینیات کی تعلیم ترک کر دی اور نیچر کا رخ کیا یعنی 1769 میں اس نے زراعت شروع کی۔ جب اس کاروبار میں ناکامی ہوئی تو اس نے کچھ غریب بچے اپنے گھر لاکر رکھ لیے اور انھیں کاتنے اور بننے کے کام پر لگا دیا تاکہ وہ ایک طرف تعلیم حاصل کریں اور ساتھ ہی اپنے اخراجات بھی پورے کر سکیں۔ اگرچہ یہ منصوبہ بھی ناکام رہا لیکن پستالوزی نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ ساتھ ہی اپنے ملک کی سیاست سے بھی دلچسپی باقی رکھی۔

جب عملی میدان میں اسے کامیابی نہیں ہوئی تو لکھنے کی طرف مائل ہوا۔ 1780 میں اس نے ایک کتاب "راہب کی شام" لکھی جس میں اس نے تعلیم کا یہ بنیادی نظریہ پیش کیا کہ اسے نیچر کے مطابق ہونا چاہیے اور انسان کی مسرت کے لیے گھریلو تحفظ نہایت ضروری ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک ناول "لیونارڈ اور گرٹ روڈ" بھی لکھی جس میں ایک جرمن دیہاتی زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویر پیش کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح ایک اچھی عورت سماج کی بے ایمانیوں کو بے نقاب کرتی ہے اور اپنی گھریلو زندگی کو اس طرح مثالی بنا دیتی ہے کہ اسے دیہات کے ایک اسکول کا ماڈل بنایا جا سکتا ہے۔ پستالوزی کی تمام کتابوں میں بچوں کی ابتدائی تعلیم میں ماں کے رول کا بار بار ذکر آیا ہے۔

پستالوزی نے اپنی زندگی کے تیس سال تنہائی میں اپنے فارم پر گزارے اور تعلیمی، سیاسی اور معاشی موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھیں جن میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غریبوں کی حالت کس طرح بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ پستالوزی کو انسان کی صلاحیت پر اٹوٹ یقین تھا اور وہ غربت اور پس ماندگی کا ذمہ دار انسان ہی کو تصور کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم کے ذریعہ ہی انسان کی تمام صلاحیتیں اجاگر کی جا سکتی ہیں لیکن بدقسمتی سے اس کے ہم وطنوں نے اس کے خیالات کی قدر نہیں کی۔

جب فرانس میں انقلاب آیا تو اس کے لیے عمل کا راستہ کھلا۔ اس وقت وہ پچاس سال کا ہو چکا تھا۔ خود سوئٹزرلینڈ میں ریپبلک قائم ہوئی اور پستالوزی کو اعلیٰ تعلیم منظم کرنے کی دعوت دی گئی لیکن اس میں اس کا من نہیں تھا۔ اسے ابتدائی تعلیم سے دلچسپی تھی۔ اس نے جنگ کے دوران یتیم ہونے والے لاوارث، غریب بچے جمع کیے اور تن تنہا ان کے لیے ایک خاندان کی زندگی مہیا کرنے اور ان کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی کوشش کی۔ پستالوزی نے اس کام پر جو چند ماہ صرف کیے اس کے مطابق یہ اس کی زندگی کے سب سے مسرت بخش مہینے تھے۔

1800 سے 1804 تک پستالوزی نے برگ ڈارف میں ایک تعلیمی ادارہ چلایا اور 1805 سے 1825 تک یورڈن میں اقامتی اسکول (بورڈنگ اسکول)۔ دونوں اداروں کے اخراجات طلبا کی فیس سے پورے کیے جاتے تھے اگرچہ چند غریب طالب علم بھی لیے جاتے تھے۔ ان اداروں میں اس نے بنیادی تعلیم پر کئی تجربے کیے۔ یہاں ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت پر زور دیا جاتا تھا۔ بعد میں فنی اور شہریت کی تعلیم (سیوک تعلیم) بھی شامل کر لی گئی۔ اس کے بورڈنگ اسکول نے سارے یورپ میں زبردست شہرت حاصل کر لی اور یورپ کے کونے کونے سے طالب علم آنے لگے۔ مشہور ماہران تعلیم مثلاً فرویل، ہربارٹ اور کارل رٹر (Karl Ritter) نے اس کے طریقۂ تعلیم کا خاص طور پر مطالعہ کیا اور اپنے طریقوں میں اس سے بہت ساری چیزیں لیں۔

ان اداروں میں پستالوزی نے اس پر زور دیا تھا کہ طالب علم کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہیے۔ اسے خود آپ سوچنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ پہلے مشاہدہ کرنا چاہیے، اسے سمجھنا چاہیے اور پھر صاف تصویر ذہن میں قائم کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ پستالوزی اخلاقی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔

آخری دور میں اس کے اسکول کے اساتذہ میں آپس میں سخت جھگڑے پیدا ہو گئے۔ اسکول کی وہ شہرت ختم ہو گئی اور جب وہ حالات پر قابو نہ پا سکا تو سنہ 1825 میں چند طالب علموں کو لے کر وہ اپنے فارم پر چلا گیا لیکن اپنے طریقۂ تعلیم پر اس کا عقیدہ اٹل رہا۔ 17 رفروری 1827 کو اس کا انتقال ہو گیا۔

پنچایت : ہندوستان دیہاتوں کا ملک ہے اور ملک کی آبادی کا بڑا حصہ دیہاتوں میں ہی بستا ہے۔ دیہاتوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ جنھیں لوگ مقامی طور پر ہی حل کرنا چاہتے ہیں۔ کورٹ کچہری کے چکروں میں وقت بھی خراب ہوتا ہے اور پیسہ بھی۔ اس لیے آزادی کے بعد یہ کوشش کی گئی کہ دیہاتوں اور قصبوں میں پنچایت راج کو رواج دیا جائے۔ آزادی کے بعد برسر اقتدار آنے والے رہنماؤں نے مرکز اور مختلف ریاستوں میں پنچایتوں کے تعلق سے 1947 کے بعد قوانین وضع کیے۔ 1958 کے بعد پنچایت راج کا قیام اور پھیلاؤ ان اشخاص کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ 1947 میں اقتدار سنبھالنے کے بعد سب سے اہم قدم دیہی نظم و نسق کی از سر

تنظیم کی طرف اٹھایا گیا اور پنچ سالہ منصوبہ بندی میں دیہی نظام کو خاص مقام دیا گیا اور اس سلسلہ میں خصوصی قدم اٹھائے گئے۔ پنچایت کسی ایک موضع یا ایک سے زیادہ موضع گروپ کے لیے قائم کی جاتی ہے۔ در اصل پنچایت کا قیام آبادی کے تعداد پر انحصار کرتا ہے۔ پنچایتوں کے لیے جو قوانین تشکیل کیے گئے ہیں ان میں پنچایتوں کی کارگزاری کے تعلق سے تفصیل دی گئی ہے۔ پنچایت کے ارکان عوام کے منتخبہ ہوتے ہیں جو پنچ کہلاتے ہیں۔ یہ پنچ ایک صدر کا انتخاب کرتے ہیں جسے سرپنچ کہتے ہیں۔ پنچایتوں کو موضع کی بلدی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ بعض دیوانی نوعیت کے جھگڑوں کے تصفیے کا بھی اختیار دیا گیا ہے۔ جب پنچایتیں اس نوعیت کے اختیار کو استعمال کرتی ہیں تو انھیں نیائے پنچایت کہا جاتا ہے۔ نیائے پنچایت کی صدارت کرنے والا پردھان کہلاتا ہے۔

پنچایت سمیتی: کسی موضع یا موضع گروپ کے لیے قانونا مقرر کردہ آبادی کی بنیاد پر پنچایتیں قائم کی جاتی ہیں تو پنچایتوں کا گروپ بلاک کہلاتا ہے۔ بلاک کے لیے ایک پنچایت سمیتی قائم کی جاتی ہے اور اس پنچایت سمیتی کے ارکان کا بالواسطہ انتخاب کیا جاتا ہے۔ یعنی اس بلاک میں جو پنچایتیں قائم ہیں ان کے سرپنچ، پنچایت سمیتی کے ممبر ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ بعض سرکاری عہدہ دار باعتبار عہدہ پنچایت سمیتی کے ارکان بن جاتے ہیں۔ پنچایت سمیتی کے ممبران ایک ایسے ممبر کو صدر منتخب کرتے ہیں جو سرکاری عہدہ دار نہ ہو۔ ہر پنچایت سمیتی کے انتظامی اور دفتری امور کی نگرانی کے لیے ایک عہدہ دار کا تقرر کیا جاتا ہے۔ اسے بلاک ڈیولپمنٹ افسر کہتے ہیں۔ بلاک ڈیولپمنٹ افسر کے ساتھ کئی اکسٹنشن افسروں کا تقرر کیا جاتا ہے، مثلاً اکسٹنشن افسر پنچایت، اکسٹنشن افسر امداد باہمی، اکسٹنشن افسر علاج حیوانات، اکسٹنشن افسر صنعت و حرفت وغیرہ۔ یہ اکسٹنشن افسر بلاک کی مختلف ترقیاتی اسکیموں کے لیے پنچایت سمیتی کو مشورے دیتے ہیں اور پنچایت سمیتی کی ہدایت کے تحت کام کرتے ہیں۔ یہ افسران مختلف مواضعات کا دورہ کر کے عوام کو نہ صرف مختلف ترقیاتی اسکیموں کی افادیت سے روشناس کراتے ہیں بلکہ بہتر کارکردگی کے لیے ان کا تعاون بھی حاصل کرتے ہیں۔ پنچایت سمیتیوں کو ضلع پریشد کے توسط سے مختلف محکموں سے گرانٹ دی جاتی ہے جسے ضلع پریشد کے توسط سے پنچایت سمیتیاں خرچ کرتی ہیں۔ پنچایت راج سسٹم میں پنچایت سمیتی کو ایک کلیدی مقام حاصل ہے چونکہ یہ پنچایت اور ضلع پریشد کے درمیان کی کڑی ہے لیکن بنیادی طور پر ترقیاتی اسکیموں پر عمل در آمد کی ذمہ داری بڑی حد تک پنچایت سمیتی کی ہوتی ہے۔

پنچایتی راج (Panchayati Raj) : ہندستان میں جمہوری لامرکزیت (Democratic Decentralisation) کے اصول پر ضلعی سطح پر تین سطحی مقامی نظام حکومت کو پنچایتی راج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ موجودہ پنچایتی راج کے قیام کی سفارش بلونت رائے مہتا کمیٹی نے کی تھی جسے منصوبہ بندی کمیشن نے 1957 میں اجتماعی ترقی کے منصوبہ کا جائزہ لینے کی غرض سے تشکیل دیا تھا۔ اس سفارش کو حکومت ہند نے 1958 میں منظوری دی تبھی سے یہ نافذ العمل ہے۔

مہتا کمیٹی کے خیال میں اجتماعی ترقیاتی منصوبے کی ناکامی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اضلاع کی سطح پر نمائندہ مقامی حکومت کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جس کے ذریعہ عوام کو ترقیاتی منصوبوں سے مربوط کیا جاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مہتا کمیٹی نے جمہوری لامرکزیت کا اصول پیش کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت کی اعلیٰ سطح سے نچلی سطح کو اختیارات تفویض کیے جائیں۔ دوسرے الفاظ میں ضلعی سطح پر تین نمائندہ ادارے تشکیل دے کر ہر ادارہ کو اس کی متعلقہ سطح پر منصوبہ بندی اور ترقیاتی کاموں کی ذمہ داری تفویض کر دی جائے۔ جمہوری لامرکزیت کے پانچ بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔

(1) ہر ضلع میں مقامی حکومت کا تین سطحی (گاؤں، بلاک اور ضلع) نظام ہو اور ہر سطح پر ان کے نمائندے منتخب ہوں اور خود مختار ادارے تشکیل دیے جائیں اور یہ تینوں ادارے باہمدیگر مربوط ہوں۔

(2) ریاستی سطح سے عملی طور پر ان اداروں کو مناسب اختیارات و فرائض تفویض کیے جائیں۔

(3) ان اداروں کو معقول مالی وسائل فراہم کیے جائیں تاکہ وہ اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔

(4) ان سطحوں پر سماجی معاشی ترقیات کے سارے کام انھیں اداروں کے توسط سے روبہ عمل لائے جائیں۔

(5) مستقبل میں پنچایتی راج نظام کو مزید اختیارات، ذمہ داریاں اور وسائل سونپے جائیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مذکورہ بالا نکات 1958 سے لے کر اب تک پنچایتی راج سے متعلق حکومت ہند کی تمام پالیسیوں کی بنیاد تسلیم کیے جاتے ہیں اور پنچایتی راج کی سطح پر تمام ترقیاتی منصوبے انھیں نکات کو سامنے رکھ کر تیار کیے جاتے رہے ہیں، لیکن مقامی حکومت کا مضمون ریاستی فہرست میں شامل ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت نے محض اس سے متعلق اصولوں کو تسلیم کیا ہے اور ان کے عملی نفاذ کو ریاستوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی سے اپنی ضرورت کے مطابق علاحدہ قانون سازی کرکے اپنے یہاں پنچایتی راج کا نظام قائم کر سکیں۔ زیادہ تر ریاستوں میں گاؤں کی سطح پر گرام پنچایت، بلاک کی سطح پر پنچایت سمیتی اور ضلع کی سطح پر ضلع پریشد قائم کی گئی ہیں۔ غرضیکہ ہند میں پنچایتی راج کا نظام ملک گیر سطح پر قائم ہے۔ راجستھان اولین ریاست ہے جس نے سب سے پہلے 1959 میں اپنے یہاں پنچایتی راج قائم کیا۔ زیادہ تر ریاستوں میں ضلع پریشد رابطہ اور منصوبہ بندی کی حیثیت سے کام کرتی ہے جبکہ اصل ترقیاتی کام پنچایت سمیتی انجام دیتی ہے۔ حالیہ برسوں میں حکومت ہند نے پنچایتی راج کو مزید اختیارات و فرائض تفویض کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاہم ابھی تمام ریاستوں کے ذریعہ انھیں رو بہ عمل آنے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔

پھسلا لیے جانے (Seduction): ایسے شخص پر ہرجانہ کا دعویٰ ہوسکے گا جو کسی دوسرے شخص کی زوجہ یا ملازم کو پھسلا لے جائے یا کسی ایسی زوجہ کی جان بوجھ کر پناہ دے جس نے اپنے شوہر یا آقا کو ناجائز طور پر چھوڑ دیا ہو۔

اس دعوے کی اصلی بناء یہ ہے کہ شوہر اپنی زوجہ کی صحبت سے اور آقا اپنے ملازم کی خدمت سے محروم ہوتا ہے۔

باپ یا ماں اس شخص کے مقابلہ میں ہرجانہ کا دعویٰ کر سکیں گے جو ان کی بیٹی کو اس وقت پھسلا لے جائے جب وہ ان کی خدمت میں ہو جس کی وجہ سے وہ خدمت سے محروم ہوجائیں۔ مدعی کو ثابت کرنا چاہیے کہ جس لڑکی کو پھسلایا گیا ہے وہ پھسلائے جانے کی وقت ان کی خدمت میں تھی اور مدعی خدمت سے اس وجہ سے محروم رہا کہ وہ حاملہ ہوگئی یا مدعاعلیہ نے اس کو مدعی کے پاس نہ آنے دیا۔ بیٹی معنوی طور پر اپنے والدین کی خدمت میں اس وقت متصور ہوگی جب وہ ان کے گھر میں رہتی ہو اور فی الواقعی خدمت انجام دیتی ہو خواہ ایسی خدمت کیسی ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ اور جب بیٹی نابالغ اور ناکتخدا ہو تو والدین کی خدمت میں سمجھی جائے گی خواہ وہ کسی دوسرے شخص کی ملازمت میں کیوں نہ ہو۔ لڑکی خود دعویٰ نہیں کرسکتی کیونکہ اس کی رضامندی سے یہ بات ہوئی ہے۔ باپ کے دعوے کی بناء پر اپنی لڑکی کی خدمت سے محروم ہوتا ہے۔

پیداوار اور مصارف مختتم (Production and Marginal Costs): کسی شے کے مصارف پیداوار ان تمام معاوضوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو اس کی پیداوار کے لیے مختلف عاملین کو زر کی شکل میں ادا کیے جاتے ہیں۔ کسی شے کی پیداوار کے لیے جو مدت درکار ہوتی ہے اس کے اعتبار سے مصارف کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک قلیل مدتی دوسرے طویل مدتی ایک ایسی مدت جس میں ایک خاص پیمانے پر ایک مقررہ کارخانے (Plant) سے کسی شے کی مختلف مقداریں حاصل کی جاسکتی ہیں تو ان کے مصارف کو قلیل مدتی مصارف (Short Term Cost) کہتے ہیں۔ یہ مصارف ایک تو معین عاملین (Fixed Factors) مثلاً مشین۔ کارخانے کی عمارت منیجر کی تنخواہ وغیرہ کے اخراجات اور دوسرے متغیر عاملین (Variable Factors) مثلاً محنت خام اشیا وغیرہ کے معاوضے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جنھیں علی الترتیب معین مصارف (Fixed Cost) متغیر مصارف (Variable Cost) کہتے ہیں۔ پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ معین مصارف میں اضافہ نہیں ہوتا لیکن متغیر مصارف میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تین قسم کے مصارف میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ایک فی اکائی اوسط مصارف (Average Cost) جو جملہ مصارف کو جملہ پیداوار سے تقسیم کرکے معلوم کیے جاتے ہیں۔ دوسرے فی اکائی اوسط متغیر مصارف (Average Variable Cost) جو جملہ متغیر مصارف کو جملہ پیداوار سے تقسیم کرکے معلوم کیے جاتے ہیں۔ اور تیسرے فی اکائی مختتم مصارف (Marginal Cost) جو شے کی مزید اکائی پیدا کرنے کی وجہ سے جملہ متغیر مصارف میں اضافہ کے مساوی ہوتے ہیں۔ کسی شے کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ تینوں قسم کے مصارف پہلے گھٹتے اور پھر بڑھنے لگتے ہیں ان تینوں مصارف میں سے پہلے مختتم پھر اوسط متغیر اور اس کے بعد اوسط مصارف اپنی اپنی کمترین حدوں کو پہنچتے ہیں۔ ان تینوں مصارف کی تبدیلی میں حسب ذیل ربط پایا جاتا ہے:

(1) اوسط مصارف کے مقابلے میں اوسط متغیر مصارف کم ہوتے ہیں۔

(2) اوسط اور اوسط متغیر مصارف جب تک گھٹتے جاتے ہیں مختتم مصارف سے زیادہ ہوتے اور جب یہ دونوں بڑھتے جاتی ہیں تو مختتم مصارف کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں اور اسی لیے

(3) اوسط مصارف اور اوسط متغیر مصارف اپنے کمترین حدود پر مختتم مصارف کے مساوی ہو جاتے ہیں۔ کسی شے کی پیداوار میں تبدیلی کے ساتھ ان تینوں مصارف میں تبدیلی اور ان کے درمیان مندرجہ بالا تعلقات کے عام رجحان کو قلیل مدتی مصارف پیداوار کا قانون کہا جاتا ہے۔

پیریٹووی نظریے (Paretian Theory): ولفریدو پیریٹو (Vilfredo Pareto) ایک اطالوی معاشی نے سب سے پہلے معاشی فلاح میں کمی و بیشی کا ایک ایجابی معیار (Positive Criterion) قائم کیا اور اس کی وضاحت کی کہ بیشتری سماجی بہبود کس صورت میں حاصل ہوسکتی ہے۔ افادہ کے موضوعی تصور کے پیش نظر وہ اسبات کو تسلیم کرتا ہے کہ افادے کا بین شخصی تقابل نا ممکن ہے اور اس لحاظ سے آمدنی کی انسب تقسیم (Optimum Distribution) کی کوئی عام قابل قبول تعریف نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس کے خیال میں چونکہ بیشترین بہبود کا انحصار بنیادی طور پر پیداوار پر ہوتا ہے وہ تقسیم کے مسئلہ کو اپنے معیار کی بنیاد پیداوار اور مبادلہ پر رکھتا ہے اس کا معیار یہ ہے کہ پیداوار اور مبادلہ میں تبدیلی سے اگر سماج کے تمام افراد یا کم از کم ایک فرد کو بھی فائدہ پہنچے تو یہ تبدیلی بہبود میں اضافہ کرنے والی تبدیلی قرار پائے گی اور اگر کسی تبدیلی سے تمام افراد یا کم از کم ایک فرد کو بھی نقصان پہنچے تو یہ تبدیلی بہبود میں کمی کرنے والی تبدیلی قرار پائے گی۔ چنانچہ اس بناء پر پریٹو کے نزدیک پیداوار اور مبادلہ کی انسب حالت (Optimum Situation of Production) جس سے بیشترین بہبود حاصل ہوسکتی ہے وہ ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی سے نہ تو تمام افراد یا کسی ایک فرد کی بہبود میں اضافہ ہو اور نہ تمام افراد یا کسی ایک فرد کی بہبود میں کمی کی جاسکے۔ بہ الفاظ دیگر یہ ایک ایسی صورت ہے جس میں تبدیلی سے کسی شخص کی بہبود میں اضافہ بغیر کسی دوسرے شخص کی بہبود میں کمی کے ناممکن ہو۔ اس صورت کو عام طور پر پریٹوی انسبیت (Paretian Optimum) کہا جاتا ہے۔ لیکن پریٹوی انسب کے نقط ایک کے بجائے لاتعداد ہوتے ہیں جن میں سے تقسیم کے کسی اقدار فیصلے پر کوئی ایک نقطہ منتخب کیا جاسکتا ہے۔ بیشترین بہبود کی صورت پیدا کرنے کی مترادف سمجھا جاسکتا ہے۔ بہر حال پریٹو جس بات کو اہم قرار دیتا ہے وہ یہ ہے کہ پیداوار اور مبادلہ میں تبدیلی سے کچھ لوگ یا ایک شخص کی بہبود میں اضافے سے کچھ دوسرے لوگ یا ایک شخص کی بھی بہبود میں کمی ہو جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بحیثیت مجموعی بہبود میں اضافہ ہوا یا کمی ہوئی۔ کیونکہ اس کے لیے افادے کا بین شخصی تقابل ضروری ہے جس کی بنیاد یکساں تشفی حاصل کرنے کی صلاحیت ہے جو کہ ایک اقداری فیصلہ سمجھا جاتا ہے جسے بالاتفاق تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ خلاف اس کے کسی کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کو فائدہ پہنچانا ایک ایسی قدر ہے جس سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرسکتا اور چونکہ پریٹو کا معیار اسی قدر پر ہے۔ اس لیے اس کو پیریٹو کا متفقہ اصول (Pareto's Unanimity Rules) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر کردینا مناسب ہے کہ پیریٹو اعمرانیات کے میدان میں اپنی آخری معرکتہ الآرا تصنیف میں ایک ایسی تبدیلی کو جس سے یہ استثنا تمام افراد معاشرہ کی بہبود میں اضافہ ہو بیشترین سماجی بہبود کے نقطے پر پہنچنے کو معاشی نقطہ نظر سے مناسب قرار دیتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے معیار کی بنیاد "کسی کو بھی نقصان نہ پہنچے" کی بجائے "ہر کسی کو فائدہ پہنچے" کے اصول پر رکھتا ہے جو آزادانہ مبادلہ سے مسالقیت رکھتا ہے اس لیے کہ آزادانہ مبادلہ کی صورت میں دونوں فریق کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ بہر حال اس حقیقت کے پیش نظر نہ بہت کم ایسی معاشی پالیسیاں ہوتی ہیں جن سے کسی نہ کسی شخص کو نقصان نہ پہنچتا وہ پیریٹو کے معیار کو ایک عام معیار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ نیز اگر کسی کو نقصان نہ بھی پہنچے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی پالیسی سے فائدہ اٹھانے والے کون ہیں۔ اگر ایک خاص فرد یا طبقے کو مسلسل فائدہ پہنچتا رہے تو بھی اس کو عام معاشی بہبود میں اضافہ کا متفقہ معیار قرار نہیں دیا جائے گا۔

پیشہ ورانہ تعلیم : ایک جدید تصور جو خاص طور سے ترقی پذیر ملکوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ ہے جس میں معاشی ترقی اور بالخصوص اضافہ پیداوار اور تعلیم کو ایک دوسرے سے مربوط کیا جاتا ہے۔ کسانوں کی ٹریننگ اور پیشہ ورانہ تعلیم کا پروگرام جسے حکومت ہند نے 1968 میں شروع کیا تھا اسی تصور کو عملی شکل دینے کی ایک کوشش ہے۔ یہ پروجکٹ تین مرکزی وزارتوں یعنی وزرات زراعت، تعلیم اور اطلاعات و نشریات کے مشترکہ کوشش سے شروع کیا گیا ہے۔ اسے یونیسکو اور دیگر عالمی اداروں کی امداد و تعاون بھی حاصل ہے۔ وزارت زراعت کسانوں کی عملی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تربیت کا ضروری ساز و سامان اور زمینی سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ وزارت تعلیم پیشہ ورانہ تعلیم کا انتظام کرتی ہے اور وزارت اطلاعات و نشریات کسانوں سے متعلقہ خصوصی نشریات آل انڈیا ریڈیو سے نشر کرتی ہے تاکہ زیر تربیت کسان ان سے مستفید ہو سکیں۔ ہمارے پروگرام میں در حقیقت اس بنیادی حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ زراعت کے طبعی اور انسانی لازمات کے درمیان نئی اقسام کے تخموں، کیمیائی کھاد، پانی اور قرضہ جات جیسی درآمدات اور انسانی وسائل (ٹریننگ خواندگی اور زرعی معلومات و طور طریق) کے درمیان ایک راست تعلق ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ "سبز انقلاب" کو کامیاب بنانے کا ایک مربوط اور ہمہ جہتی پروگرام ہے۔

یہ تصور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ (الف) خواندگی اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے ایک بڑی اسکیم کے تحت جو مادی اور تعلیمی وسائل پر مشتمل ہو ایک جزولاینفک طور پر اختیار نہ کیا جائے۔ (ب)ایسی تعلیم کسان کو اس کی روزانہ زندگی اور پیشہ میں اس کی انفرادی ذمہ داریوں اور جماعتی طرز عمل میں ممد و تعاون ثابت ہو اور اس میں نئی اور پیچیدہ فنی جانکاری کو سمجھ کر اسے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ (ج) ایسے کسان جو کاشتکاری کے موجودہ طریقوں کو بہتر بنانا چاہتے ہیں، ایسی صورت میں تعلیم میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔ جب انہیں اس کا یقین ہو جائے کہ تعلیم واقعی زرعی اصلاح اور توقیر آمدنی کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہے کہ پیشہ ورانہ خواندگی محض خواندگی سے کچھ وسیع تر مقاصد رکھتی ہے۔ یہ دراصل ہمارے ترقیاتی مقاصد رکھتی ہے۔ یہ دراصل ہمارے ترقیاتی مقاصد کی رو بہ عمل لانے کی تربیت ہے۔ جو غیر رسمی ہونے کے علاوہ تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنے پر اکساتی ہے۔

ان معنی میں کسانوں کی خواندگی اسکیم، (شاکشرتا یوجنا) تعلیم بالغان سے متعلق اس سے پہلے کی تمام اسکیموں سے بالکل مختلف ہے۔ پچھلی کوششیں روایتی طور پر صرف نوشت و خواند اور تھوڑی بہت حسابی مشقوں تک محدود ہوا کرتی تھیں۔ لیکن موجودہ تصور، تعلیم کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اسی وجہ سے تعلیم کی ہر سطح پر اس کے مضمرات کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔

مختصر یہ کہ نئے پیشہ ورانہ طریقہ تعلیم میں سماجی اور معاشی پہلوؤں کو اولیت دی جاتی ہے اور ہمہ جہتی ترقی کے ایک پروگرام کے ایک جزولاینفک کی حیثیت سے اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ بالغ شہریوں کو نئی تبدیلیوں اور جدید طریقوں کی جانب مائل کیا جائے اور ان میں نئی پیشہ ورانہ صلاحیت، امنگ اور لگاؤ پیدا کیا جائے تاکہ وہ مقررہ سماجی، معاشی نصب العین کی جانب زیادہ علم و یقین کے ساتھ قدم بڑھا سکیں۔ یہ مربوط سہ رخی پہلو ہمارے مشترکہ پروجکٹ (Project) کی نمایاں خصوصیت ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے دو اہم مقاصد یہ ہیں۔

(الف) زرعی پیداوار کے طریقوں میں اصلاح و ترمیم کے ذریعہ سماجی و اقتصادی تبدیلی لانا۔

(ب) زرعی ترقی کی غرض سے تعلیمی صلاحیت اور معلومات میں اضافہ کرنا۔

مزید برآں قومی تعلیمی پالیسی (1986) کے تحت تعلیم بالغان اور مسلسل تعلیم (Continuation Education) کے لیے ایک وسیع پروگرام مرتب کیا گیا ہے جس میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں:

(i) تعلیم کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے دیہی علاقوں میں مرکزوں کا قیام۔
(ii) آجرین، مزدوروں کی تنظیموں اور حکومت کی متعلقہ ایجنسیوں کے ذریعے مزدوروں کی تعلیم۔
(iii) کتابوں، کتب خانوں، مطالعہ گھروں کا وسیع پیمانے پر فروغ۔
(iv) عام گروپ و تعلیمی ذرائع کے طور پر ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلموں کا استعمال۔
(v) ثانوی سطح کے بعد کی تعلیم کے ادارے۔
(vi) متعلمین کے گروپوں اور تنظیموں کی تشکیل۔
(vii) فاصلی تعلیم (Distance Learning) کے پروگرام۔
(viii) خود آموزی (Self Learning) کے لیے امداد کی تنظیم۔
(ix) ضرورت اور دلچسپی پر مبنی پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام۔

پیائی معاشیات (Econometrics): معاشی مسائل کے حل کے لیے ریاضیاتی اور شماریاتی طریقہ عمل کے استعمال کا نام اکانومٹرکس یا پیائی معاشیات ہے۔ اس میں کسی ایک مسئلہ کے بارے میں ایک ریاضیاتی ماڈل تیار کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بارے میں حاصل کردہ اعداد و شمار کو لیکن اس ماڈل کے تخمینوں کے پیرامیٹر (Parameters) شماریات کے طریقوں سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد شماریاتی نتائج (Statistical Inferences) کو استعمال

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کرکے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جس مفروضہ (Hypotheses) کی بنیاد پر یہ ماڈل بنایا گیا ہے وہ مفروضہ صحیح ہے یا نہیں۔ چنانچہ پیمائی معاشیات کے ذریعہ ہم کسی معاشی نظریہ کی جانچ کرسکتے ہیں۔ کہ وہ صحیح ہے یا نہیں اور پھر آئندہ کے لیے ہم پیشن گوئی بھی کرسکتے ہیں۔

پین یورپین یونین (Pan European Union) : یہ اتحاد 1923 میں لوزان (سوئٹزرلینڈ) میں اس غرض سے قائم ہوا کہ ممالک متحدہ یورپ کی تشکیل کی تحریک چلائی جاسکے اور یورپی وطنیت کی بنیاد پر یکساں تجارتی، دفاعی اور اقتصادی پالیسیوں کو اپنایا جاسکے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ت

تاریخی ارتقا - معاشیات : ریاضیاتی معاشیات کی ابتدائی کوشش سادہ ریاضیاتی وسیلوں جیسے عددی مثالیں اور خاکوں کے ذریعہ ان کی پیش کش پر مبنی تھیں۔ ارسطو کے "منصفانہ مبادلات" کے نظام اور کوئیزنے کے ٹیبلوڈی اکانامی (1785) میں ہندسی توضیحات کی گئی تھیں۔ ایچ لائیڈ (H.Llyod - 1771) پیٹرو ویری (Pietroverri, 1771) اور دیگر اطالوی معاشین کی وجہ سے اٹھارہویں صدی میں مساوات کے استعمال نے اہمیت اختیار کی۔ ان میں سے اکثر مقالات قیمتوں کے تجزیے سے متعلق تھے۔ مساواتی طریقہ اکثر عام توازنی ماڈل کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہندسی خاکے دو یا تین متغیروں تک محدود رہتے ہیں اور تیارشدہ گراف سے ہندسی خاکے دو یا تین متغیروں تک محدود رہتے ہیں اور تیار شدہ گراف یا تو کسی رویہ کے اثرات پر بہت زور دیتے ہیں یا پھر مستعملہ غیر حقیقی مفروضات کو چھپا دیتے ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال K شکل کا لاگتی منحنی خط ہے جس میں مستحسن لاگت کے وجود کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور حاصل کی اہمیت کو کم کیا گیا ہے۔ دوسری مثال بین قومی تجارت کی ہندسی خاکوں کے ذریعے پیش کشی ہے جو ناظرین میں یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ تجارتی فیصلے کرتے وقت دونوں ممالک تیسرے ملک کو معدوم فرض کر لیتے ہیں۔

معاشیات میں حاشیائی (Marginal) انقلاب اور تفرقی احصاء کا ارتقاء ہم عصر ہیں۔ اختتامی انقلاب کے بعد توازن بہبود اور نمو کے نئے کلاسیکی نظریوں نے متغیر کے احصاء اور تفرقی و تکمیلی احصا کے استعمال کے تعلق سے بہت چھان بین کی ہے۔

تاشقند سمجھوتہ (Tashkent Declaration) : 1965 میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان جنگ نے دونوں ملکوں کے اختلافات کو ہوا دی اور کشیدگی میں اضافہ کردیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں دونوں ہی ملکوں کو نقصان اٹھانا پڑا اور ان کے درمیان فاصلے اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے سمٹنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ ایسے حالات میں سوویت یونین کی کونسل آف منسٹرس کے چیئرمین الکسی کوسی گن نے پہل کی اور ہندستان کے وزیراعظم لال بہادر شاستری اور پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں کو تاشقند میں مذاکرات کی دعوت دی۔ دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے 4 جنوری سے 10 جنوری 1966 تک مذاکرات میں حصہ لیا جو 10 فروری کو ایک اعلانیہ کی شکل میں منتج ہوئے جسے تاشقند ڈکلریشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تاشقند سمجھوتے میں کہا گیا کہ :

(1) ہندستان کے وزیراعظم اور پاکستان کے صدر اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ہندستان اور پاکستان کے درمیان ہمسائگی کے بہتر تعلقات قائم کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ طاقت کے استعمال سے گریز کرکے اپنے تنازعات کو پرامن طریقوں سے حل کریں گے۔ دونوں رہنما محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خطہ اور بطور خاص برصغیر ہندو پاک میں امن کے مفادات اور ہندستان اور پاکستان کے عوام کے مفادات دونوں ملکوں کے درمیان تناؤ کو جاری رکھنے میں نہیں ہیں اسی تناظر میں جموں اور کشمیر کا موضوع بھی زیربحث آیا اور دونوں فریقین نے اپنی اپنی وضاحت پیش کی۔

(2) دونوں اتفاق کرتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی افواج 25 فروری 1966 تک 5 اگست 1965 سے پہلے کی صورت اختیار کرلیں گی اور جنگ بندی لائن پر جنگ بندی کی شرائط قبول کرلیں گی۔

(3) ہندستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کے اصول پر مبنی ہوں گے۔

(4) دونوں جانبین ایک دوسرے ملک کے خلاف ہر قسم کے پروپیگنڈہ کی حوصلہ شکنی کریں گے اور ایسے پروپیگنڈہ کی حوصلہ افزائی کریں گے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

جس سے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے ارتقا کو فروغ حاصل ہو۔

(5) پاکستان میں ہندستان کے ہائی کمشنر اور ہندستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر اپنے اپنے عہدوں پر فائز ہوں گے اور دونوں ملکوں میں سفارتی مشنوں کی عام کارکردگی بحال کی جائے گی۔ سفارتی معاملات میں دونوں حکومتیں 1961 کے ویانا کنونشن عمل پیرا ہوں گی۔

(6) ہندستان اور پاکستان کے درمیان اقتصادی اور تجارتی تعلقات، مواصلات اور ثقافتی مبادلوں کی بحالی کے لیے اقدامات کیے جائیں گے اور دونوں ملکوں کے درمیان موجودہ معاہدوں کی عمل آوری کے سلسلہ میں قدم اٹھائے جائیں گے۔

(7) دونوں نے اتفاق کیا کہ وہ اپنے اپنے افسروں کو جنگی قیدیوں کے تبادلے کو عملی شکل دینے کی ہدایات جاری کریں گے۔

(8) دونوں جانبیں پناہ گزینوں اور غیر قانونی داخلوں کے مسائل پر مذاکرات جاری رکھیں گے۔ دونوں نے اس امر سے بھی اتفاق کیا کہ دونوں جانبین ایسے حالات پیدا کریں گے جن سے لوگوں کی انتقال آبادی کو روکا جاسکے۔ انھوں نے یہ بھی طے کیا کہ تنازعہ کے سلسلے میں جائداد اور ملکیت کی واپسی پر بھی مذاکرات ہوں گے۔

(9) وزیراعظم ہند اور صدر پاکستان نے طے کیا کہ دونوں جانبین دونوں ملکوں کے براہ راست تعلق رکھنے والے معاملات پر اعلیٰ ترین اور دوسری سطحوں پر ملاقاتیں کریں گے۔ دونوں نے مشترکہ ہندستانی پاکستانی اداروں کے قیام کی ضرورت کو محسوس کیا جو اپنی اپنی حکومتوں کو یہ رپورٹ پیش کریں گی کہ اس سلسلہ میں اور کیا مزید اقدامات کیے جائیں۔ وزیراعظم ہند اور صدر پاکستان سوویت یونین کے رہنماؤں، سوویت حکومت اور ذاتی طور سے سوویت یونین کی کونسل آف منسٹرس کے چیئرمین کے تئیں احساس تحسین و تشکر کرتے ہیں جنھوں نے اس ملاقات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں عملی، دوستانہ اور ممتاز کردار ادا کیا جس کے اطمینان بخش نتائج برآمد ہوئے۔ وہ ازبکستان کی حکومت اور وہاں کے عوام کے تئیں بھی پرخلوص اظہار تشکر کرتے ہیں جنھوں نے ان کا شاندار استقبال کیا اور فراخدلانہ میزبانی کی۔

غرضیکہ کئی روز کی کوششوں کے بعد وزیراعظم کوسی گن کی ثالثی سے ہندستان اور پاکستان کے درمیان تاشقند سمجھوتہ کے تحت مصالحت ہوگئی اور آئندہ کے لیے قیام امن کے لیے راہیں ہموار ہوگئیں۔ لیکن 10 جنوری 1966 کو سمجھوتہ پر دستخط کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی وزیراعظم ہند لال بہادر شاستری کی وفات ہوگئی۔

تبادلہ اشیا (بارٹر) : اشیا یا خدمات کا براہ راست یا بغیر زر کے تبادلے کو بارٹو کہتے ہیں۔ اس طریقے کے تحت دو افراد میں آپس میں تبادلہ اشیا کے لیے ضروری ہے کہ دونوں دو مختلف اشیا رکھتے ہوں اور دونوں ہی اپنی ضرورت کے پیش نظر اس کے تبادلے کے لیے تیار ہوں مثلاً الف کے پاس گیہوں ہے اور (ب) کے پاس چاول، اب اگر الف کو چاول کی ضرورت ہو اور ب کو گیہوں کی تو ان دونوں میں اشیا کا تبادلہ ہوگا یہی بارٹو ہے۔ دو کے بجائے کئی لوگوں کے درمیان بھی اس قسم کا تبادلہ ہو سکتا ہے اور اس طرح ان میں سے ہر ایک اپنی ضرورت کی اشیا حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً الف اپنا سامان ب کو ب اپنا مال ج کو دے سکتا ہے۔ یہ طریقہ تکلیف دہ ہے۔ آج کی ترقی یافتہ معیشت میں جبکہ تقسیم عمل اور تخصیص کار (Specialisation) اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکے ہیں۔ ان حالات میں تبادلہ کے لیے کسی قسم کے زر کا چلن ضروری ہے تاکہ ہر شے کی قدر معین ہوسکے۔ آج بھی بین الاقوامی تجارت بارٹو کے طریقے پر مبنی ہے۔

تبنیت کے اثرات (Effects of Adoption): تبنیت کے بعد وہ لڑکا اپنے متبنی باپ اور ماں کا بیٹا سمجھا جائے گا۔ تبنیت کی تاریخ سے اس لڑکے کے تمام تعلقات اس خاندان سے منقطع ہوجائیں گے جہاں اس کی پیدائش ہوئی۔ البتہ وہ لڑکا اس لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا جس سے وہ اپنے پہلے خاندان میں شادی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تبنیت جو اس قانون کے نفاذ سے قبل عمل میں آئی ہو اس پر یہ قانون اثر انداز نہ ہوگا اور وہ تبنیت قائم رہے گی۔ کسی کو متبنی لینے کی وجہ سے متبنی باپ یا ماں کے اس اختیار میں کوئی کمی نہیں ہوتی جو اپنی جائداد کو وصیت کے ذریعہ یا کسی اور طور پر منتقل کرنے کے متعلق ہو وہ شخص جس نے کسی لڑکے کو متبنی لیا ہے اس کی بیوی اس لڑکے کی ماں سمجھی جائے گی ایک بار تبنیت واقع ہو جانے کے بعد متبنی باپ یا ماں کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ تبنیت کو فسخ کردیں اور یہ کہ متبنی لڑکے یا لڑکی کو اس کا اختیار نہیں ہوتا

کہ وہ تبنیت کو فسخ کرکے اپنے خاندان میں واپس ہو جائے۔

تبنیت (Adoption) کے دوسرے شرائط: وہ شخص جو متبنیٰ لے رہا ہے اس کا کوئی ہندو لڑکا یا پوتا یا پر پوتا خونی رشتے سے یا تبنیت کے رشتے سے نہ ہونا چاہیے اگر کوئی مرد متبنیٰ لے رہا ہو اور جس کو متبنیٰ لیا جارہا ہے ایک عورت ہے تو متبنیٰ لینے والے کی اس لڑکی کی عمر جسے متبنیٰ لیا جارہا ہے اکیس سال زیادہ ہو اس طرح اگر متبنیٰ لینے والی عورت ہو تو اس کی عمر اس لڑکے سے جسے متبنیٰ لیا جارہا ہے اکیس سال زیادہ ہونا چاہیے۔ اس لڑکے یا لڑکی کو دو جگہ متبنیٰ نہیں لینا چاہیے۔

وہ لڑکا جو تبنیت میں دیا جارہا ہے اسے فی الحقیقت تبنیت میں دیا جانا ضروری ہے اور دوسرے شخص کا اسے تبنیت میں لینا ضروری ہے اور اس وقت نیت یہ ہو کہ اس لڑکے کو اس خاندان سے جہاں وہ پیدا ہوا ہے منتقل کیا جارہا ہے یا وہ لڑکا جس کے والدین کا علم نہ ہو اس خاندان سے جہاں اس کی پرورش ہوئی ہو متبنیٰ لیا جائے تبنیت کو قانونی طور پر تسلیم کرنے کے لیے دتاھمن (Dattahaman) کی رسم تکمیل ضروری نہیں ہے۔

تبنیت میں دینے کا اختیار: بجز ماں باپ یا سرپرست کے کوئی شخص کسی بچے کو تبنیت کے لیے نہیں دے سکتا۔ بچے کا باپ اپنے لڑکے کو تبنیت میں دے سکتا ہے لیکن تبنیت میں دینے سے قبل اس کو بچے کی ماں سے اجازت لینا ضروری ہے بجز اس کے کہ بچے کی ماں تارک الدنیا ہوچکی ہو یا فاترالعقل ہوچکی ہو یا ہندو مذہب ترک کرچکی ہو اسی طرح ماں بھی اپنے بچے کو تبنیت میں دے سکتی ہے اگر بچے کے باپ کا انتقال ہوچکا ہو یا باپ تارک الدنیا ہوچکا ہو یا فاترالعقل ہوگیا ہو یا ہندو مذہب ترک کرچکا ہو۔ اگر بچے کے والدین کا انتقال ہوچکا ہو یا وہ تارک الدنیا ہوچکے ہوں یا فاترالعقل ہوگئے ہوں تو بچے کا سرپرست اس کو تبنیت میں دے سکتا ہے۔

تجارت پسندی (Mercantalisation): سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں جب یورپ میں "بین الاقوامی تجارت" نے کافی ترقی کرلی اور تاجروں نے ان ملکوں میں بڑا اثر و رسوخ پیدا کرلیا تو ایک مکتب خیال ایسا پیدا ہوا جسے قومی دولت اور بیرونی توازن تجارت کی بڑی فکر تھی۔ ان تجارئین (Mercantalists) کو قومی معیشت کے بڑھتے ہوئے اثر اور طاقت کا احساس تھا اور وہ چاہتے تھے کہ معاشی سرگرمیوں میں مداخلت کرے تاکہ قومی دولت زیادہ سے زیادہ بڑھ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ معاشی ترقی کی ضروریات کے مقابلہ میں نظام زر بہت پرانا اور کمزور تھا اور اسے بدلنے اور ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت تھی۔ بعض وقت وہ قومی دولت کو قیمتی دھات یعنی سونے کی مقدار سے ناپتے تھے اور اس پر غیر ضروری زور دیتے تھے۔ اس باوجود اس مکتب خیال کے لوگوں نے معاشی نظریوں کے ارتقا اور بین الاقوامی تجارت کے تجزیہ میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔ جی میلینز (Malynis)، ای مسل ڈن (E. Misselden)، ٹی من (T. Mun) اور اے سرآ (A. Serra) اس مکتب خیال کی اہم شخصیتیں گزری ہیں۔

تجاویز ملک غیر کا تسلیم کیا جانا اور ان کی تعمیل: یہ تصادم قوانین کا ایک اہم جز ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ کسی ملک کی عدالتوں کی تجاویز یا فیصلے (Judgements) صرف اسی ملک میں مؤثر و محدود ہوتے ہیں۔ لیکن ملکوں کا باہمی عمل درآمد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے عدالتی فیصلے کو تسلیم اور ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ اگر کوئی ملک کسی دوسرے ملک کے بارے میں ایسا عمل نہ کرے تو دوسرا ملک بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ کرے گا۔ ملک غیر فیصلوں (Judgements) کو تسلیم کرنے کی چند شرائط ہیں مثلاً یہ کہ فیصلہ عدالت مجاز کا ہو اور وہ قطعی ہو وغیرہ۔ ہندوستان میں ضابطہ دیوانی ہند 1908 کی دفعہ 13 کی رو سے ریاست غیر کی عدالت کے فیصلے کو صرف اسی وقت تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

(1) جب کہ وہ عدالت مجاز کا صادر کیا ہوا ہو۔

(2) نفس مقدمہ سے متعلق ہو۔

(3) قانون بین الاقوام کی صحیح تعبیر پر مبنی ہو۔

(4) وہ کارروائی جس میں فیصلہ صادر کیا گیا ہو قدرت انصاف کے خلاف نہ ہو۔

(5) فیصلہ فریب سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

(6) مقدمہ قانون ہند کی خلاف ورزی پر مبنی نہ ہو۔

انگلستان میں غیر ملک کی ایسی تجاویز کو تسلیم نہیں کیا جاتا جو تعزیری نوعیت کی ہوں یعنی جبکہ فیصلہ میں کوئی تاوان عائد کیا گیا ہو نیز

ایسی تجاویز کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا جو مصلحت عامہ کے خلاف ہوں۔

ملکوں میں عموماً ایک دوسرے کے فیصلے کی تعمیل کے لیے آپس میں معاہدات ہوتے ہیں جن کی رو سے ایک ملک دوسرے ملک کے فیصلے کی اپنی عدالتوں کے ذریعہ تعمیل کرواتا ہے۔

تحدید (Sanction): قانونی طور پر کسی شخص کو کسی کام کرنے پر پابندی لگانے کو تحدید کہتے ہیں اصطلاح تحدید کو لیگ آف نیشن (League of Nations) نے جبری اقدام (Coercive Measure) کے متعلق استعمال کیا ہے جو کسی ملک کی جانب سے جارحانہ کارروائی کو روکنے کے لیے اختیار کیے جائیں۔ کسی ملک کی جانب سے کی جانے والی جارحانہ کارروائی کو روکنے کے لیے ضروری اقدام کا جو اختیار اقوام متحدہ (United Nations) کو دیا گیا ہے اس میں تحدید شریک ہے اگرچہ اس اصطلاح کا استعمال منشور اقوام متحدہ میں نہیں کیا گیا ہے۔

تحریری اقرار کا اثر (Effect of Acknowledgement in Writing): اگر کوئی کسی جائداد یا حق کے متعلق کسی مقدمہ یا درخواست کے لیے مقرر ہے اس جائداد یا حق کی بابت ذمہ داری کے لیے کسی تحریری اقرار پر وہ شخص دستخط کر دے جس کے مقابلہ میں اس جائداد یا حق کا دعویٰ ہو یا کوئی ایسا شخص جس کے واسطے سے شخص مذکور کو حق حاصل ہوا ہو یا اس پر ذمہ داری عائد ہوئی ہو تو ایک نئی میعاد سماعت اس وقت سے شمار کی جائے گی جبکہ اقرار مذکور پر اس طرح دستخط کیے جائیں۔ جب تحریر اقرار بلاتاریخ ہو تو دستخط کے زمانہ کی بابت شہادت زبانی دی جاسکتی ہے لیکن بہ متابعت احکام قانون شہادت اس کے مضمون کی بابت زبانی شہادت نہ لی جائے گی۔ توضیح (1)۔ باغراض احکام اقرار کافی ہے گو اس میں جائداد یا حق کی خاص نوعیت کی تصریح نہ ہو یا اس میں یہ لکھا ہو کہ ادا یا حوالگی یا تعمیل یا تمتع کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ اس اقرار کے ساتھ مجرا دلا پانے کا دعویٰ ہو یا وہ اقرار اس شخص کے سوائے جو جائداد یا حق کا مستحق ہو کسی اور شخص کے نام لکھا گیا ہو۔

توضیح (2)۔ اغراض احکام ہذا کے لیے دستخط سے مقر یا اس کے ایسے کارندہ کے دستخط مراد ہیں جو اس بارے میں مجاز ہو۔

اقرار تحریری (Written Acknowledgement) کوئی معاہدہ نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک اقرار ہے جو میعاد کی حفاظت کرتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اقرار مذکور میعاد مقررہ گزرنے کے قبل کیا جائے ورنہ حافظ میعاد نہ ہوگا۔

جب کسی قرضہ کی نسبت مسلسل اقرارات ہوں اور ہر اقرار سابق اقرار جدید کی میعاد آغاز ہونے کے اندر کیا گیا ہو اور اقرار اولی قرضہ لینے کی تاریخ سے اندرونی تین سال کیا گیا ہو تو نالش بغرض وصول قرض مذکور بین المیعاد متصور ہوگی بشرطیکہ آخری اقرار کی تاریخ سے تین سال کے اندر رجوع کی گئی ہو۔ ملحوظ رہے کہ اقرار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ میعاد جو جاری تھی وہ ختم ہو جاتی ہے اور ایک بالکل نئی میعاد اقرار کی تکمیل کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔

تدریسی تکنیکیں (Teaching Techniques): طریقۂ تعلیم کو موثر بنانے کے لیے استاد کو بہت سے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ سبق کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ مقصد کا واضح تعین کرنا پڑتا ہے اور بعض مخصوص قسم کی تکنیکیں اور ترکیبیں استعمال کرنی ہوتی ہیں۔ یہ تمام تکنیکیں اور ترکیبیں مواد تعلیم کو پیش کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔ ایک اچھے استاد کا فرض ہے کہ وہ مواد تعلیم کو پیش کرتے وقت نہ صرف علم و آگہی کا خیال رکھے بلکہ طلبا کے اندر صحیح رویے بھی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

تعلیم کے نظریات اور تعلیمی دستور میں بہت تیزی سے تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں۔ تبدیلی کی رفتار کو تیز کرنے والا عامل تکنیکیات (Technology) ہے۔ چنانچہ فن تدریس میں اس کو ایک اہم مقام دیا جا رہا ہے۔

تدریسی ترکیبیں بعض خارجی ذرائع ہیں جو زبانی تدریس کو مؤثر بنانے میں معاون ہوتی ہیں۔ ان میں سے خاص خاص ترکیبیں حسب ذیل ہیں۔

بیان: بیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک قسم جس کے تحت کوئی کہانی سنائی جاتی ہے یا کوئی واقعہ یا روئیداد بیان کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متعلم کو وضاحت کے ساتھ دلچسپ انداز میں سلسلہ دار کہانی سنا دی جائے یا واقعہ بیان کر دیا جائے تاکہ اس کے سامنے واقعات کی بازیافت کر سکیں۔ بیان کو موثر بنانے کے لیے زبان اور الفاظ کے انتخاب پر قدرت ہونی چاہیے۔ کیونکہ مؤثر تصویر کشی کے لیے الفاظ کا مناسب

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

انتخاب ضروری ہے۔ الفاظ کی ادائیگی پر بھی توجہ دینی چاہئے تاکہ بیان میں ایک ڈرامائی عنصر پیدا کیا جا سکے۔

بیان کی دوسری قسم بھی اول الذکر کے مماثل ہے۔ اس کے ذریعہ بھی واقعات، تجربات اور طریقۂ عمل کی لفظی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ بیان میں زبان کا موثر استعمال ضروری ہے تاکہ تجربات اور طریقۂ عمل کے بیان میں زور پیدا کیا جا سکے۔ کبھی تشبیہ اور کبھی استعاروں کے استعمال سے بیان میں تاثیر پیدا کی جا سکتی ہے۔ طریقۂ عمل بیان کرتے وقت ایسے عمل بیان کرنے چاہئیں جن سے طلبا مانوس ہوں۔ بیانیہ مضامین، بیانیہ نظمیں اور دوسری قسم کے بیانیہ اصناف سخن کے مطالعے سے طالب علموں کے اندر اس قسم کے بیان کی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے۔

تشریح : پڑھانے کی ایک ایسی ترکیب ہے جس کے ذریعے کسی مواد یا خیال کی تشریح کی جاتی ہے۔ عام طور پر زبان، سائنس یا سماجی علوم کے اسباق میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے طالب علموں میں زیر مطالعہ مواد کی بصیرت پیدا کی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ استاد تفصیل کے ساتھ تشریح کرے بلکہ تشریح کسی قدر تشنہ بھی رہ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں تاکہ طالب علم اپنے تخیل سے کام لینا سیکھیں، بذات خود تفصیلات دریافت کرنے کی عادت ڈالیں۔

تشریح کے دوران سادہ الفاظ استعمال کرنا چاہئے۔ الفاظ کی بھرمار سے مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر استاد قوت بیان یا توضیحات سے کام لے سکتا ہے۔

سوال و جواب: بچے میں فعلیت اور جبلی تجسس کو حرکت میں لانے کا یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ بچوں کو مواد تعلیم سے واقف کرایا جاتا ہے۔ فکر و تجسس کی عادت ڈالی جاتی ہے اور مناسب رویے پیدا کرنے میں ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ لہٰذا استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سوال کرنے اور جواب وصول کرنے کا مناسب طریقہ دریافت کرے۔ سوالات عام طور پر تین قسم کے ہوتے ہیں۔ تمہیدی، تعمیری اور اعادی۔ تمہیدی سوالات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سابقہ معلومات کی بنیاد پر طلبا میں تحریک پیدا کی جائے اور نئے اسباق سے متعارف کرایا جائے۔ تعمیری سوالات سبق کے دوران کیے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ منزل بہ منزل سبق کی نشو و نما کی جائے۔ اعادی سوالات ایسے ہونے چاہئیں جن کے ذریعہ طالب علم اس مواد کو اپنے ذہن میں مرتب کر سکیں جو دوران سبق انھوں نے پڑھا ہے۔

سوالات چاہے کسی منزل کے ہوں، طلبا کی عمر اور لیاقت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ کون، کیا اور کب سے سوال کا آغاز کرنے کے بجائے کیسے اور کیوں کے سوالات موزوں ہوتے ہیں۔ صحیح قسم کے سوالات اعلیٰ درجے کی تخلیقی قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ سوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ جواب وصول کرنے کی بھی تربیت ضروری ہے۔ جواب پوری توجہ کے ساتھ سننے چاہئیں۔ نامکمل جوابوں کو مزید سوالات کی مدد سے مکمل کرنا چاہئے اور دل شکنی کیے بغیر جوابات مسترد کر دینا چاہئے۔

بعض اساتذہ نے سوال و جواب کے طریقے میں ذرا تنوع پیدا کیا۔ انھوں نے (سپرد کیے ہوئے) موضوعات پر طلبا کے بیانات کا سلسلہ شروع کیا۔ شہری مسئلوں پر بحثیں ہونے لگیں اور شاگردوں کی قوت اظہار کو بروئے کار لانے کا زیادہ موقع ملا۔

اندازۂ قدر : اس کے ذریعہ طلبا کی ترقی اور استعداد کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ طریقۂ تعلیم کو بہتر بنایا جاتا ہے اور طالب علموں میں پڑھنے کا شوق پیدا کیا جاتا ہے۔ آخرالذکر کو پڑھانے کے لیے بطور ایک ایک ترکیب استعمال کیا جاتا ہے۔ اس غرض سے استاد جانچ کا ایک ایسا پرچہ تیار کرتا ہے جو پورے نصاب پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ کام بغیر کسی اہتمام کے معمول کے مطابق ہونا چاہئے۔

توضیحات : توضیحات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ لفظی توضیحات اور مقرون توضیحات۔ لفظی توضیحات مشکل نکات کو اور مقرون توضیحات مجرد تصورات کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اول الذکر میں مثال، تشبیہ، استعارہ، مماثلت اور کہانی شامل ہیں۔ آخرالذکر میں اصل شئے، ماڈل، تصویر اور فوٹوگراف، خاکہ اور نقشہ، گراف اور سمعی بصری توضیحات جیسے فلم، ٹیلی ویژن اور فلم پٹی وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ زبانی اور مرئی توضیحات بھی مستعمل ہیں۔ جیسے مدرسہ کا عجائب گھر، سیر و تفریح اور مشاہدات فطرت وغیرہ۔

متحدہ تدریس (Team Teaching): پڑھانے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس کے تحت دو یا دو سے زیادہ اساتذہ مل کر ایک ہی گروپ کو پڑھاتے ہیں۔ متحدہ تدریس (Team Teaching) کا کوئی واحد طریقہ رائج نہیں بلکہ ہر ٹیم کا طریقۂ کار مختلف ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے جو خیال کارفرما ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مل جل کر پڑھانا اکیلے پڑھانے سے بہتر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہے۔ بڑے گروپ کی تدریس ہو یا چھوٹے گروپ کا مباحثہ یا خود مختاری کے ساتھ مطالعے کا کام، اس کے ذریعہ ہر تدریسی کام میں سہولت ہوتی ہے۔ متحدہ تدریس (Team Teaching) کے دو طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ ابراہی ہے جس کے تحت سب سے اوپر ٹیم کا لیڈر ہوتا ہے۔ دوسرا طریقہ اشتراک باہمی پر مبنی ہے۔ اس میں تمام اساتذہ مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں دو یا دو سے زائد اساتذہ کے اشتراک باہمی سے تدریس کا کام انجام پاتا ہے۔ یہاں ماہر استاد کا تصور کار فرما نہیں ہے بلکہ تدریس رہنمائی اور ضرورت کے مطابق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

تدریسی مشین (ٹیچنگ مشین) : تدریس ساز و سامان کے میدان میں سب سے زیادہ سنسنی خیز جدت اس مشین کی باریابی ہے جس کے ذریعہ معلومات کے اس ذخیرے کو جو طالب علم تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے کنٹرول کیا جاتا ہے اور مطلوبہ جوابی عمل کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت اس بات کی بھی گنجائش ہوتی ہے کہ متعلم اپنے جوابی عمل کا، مطلوبہ جوابی عمل سے موازنہ کر سکے۔ ٹیچنگ مشین کے ذریعہ ذخیرۂ معلومات کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ متعلم کی توجہ کسی نقطے پر مرکوز کرائی جا سکتی ہے اور اس کو ذہنی پراگندگی سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ متعلم کو اس بات سے بھی روکا جا سکتا ہے کہ وہ غور و فکر کے بجائے مطلوبہ جوابی عمل کی تاک میں لگا رہے۔ اس کے علاوہ اس کی مدد سے معلم کے ساتھ ساتھ ہر منزل پر طالب علم کی انفرادی کارکردگی کا بھی اندازہ ہوتا رہتا ہے لیکن یہ ترکیب مہنگی ہے۔ اس لیے ہندوستان جیسے ملک میں اگر رائج بھی ہو جائے تو آبادی کا چیدہ طبقہ ہی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔

تراش خراش (Sanskritisation): سنسکریٹائزیشن کا تصور یعنی نفاست پذیری کا عمل باقاعدہ طور پر پروفیسر ایم.ای. سری نواس کے 1952 میں سماجیات کو دیا تھا۔ ان کا خیال تھا نچلی طبقے اور ذاتیں اونچی ذاتوں کے طور طریقے اور تمدن اپناتی ہیں خاص طور پر ہندوستانی سماج میں وہ برہموں کے نقش قدم پر چل کر وہ خود کو اعلیٰ محسوس کرتی ہیں۔ اس طرح اکثر وہ کچھ نقصان دہ رسم و رواج کو بھی اپنا لیتی ہیں۔ مثلاً بیوہ کی شادی نہ کرنا، نابالغ کی شادی کر دینا یا بے شمار برت رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

تراش خراش کے عمل کے کچھ خصوصیات ہیں مثلاً :

(1) سنسکریٹائزیشن میں قابل تقلید صرف برہمن ہی نہیں ہوتے بلکہ جو بھی گروہ معاشی یا سیاسی طور پر اہم ہوتا ہے، قابل تقلید بن جاتا ہے۔

(2) یہ عمل معاشی طور پر مضبوط ذاتوں اور طبقوں میں جلد ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو اونچا ثابت کرنے کے لیے زیادہ فکرمند ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہمیشہ لازمی نہیں ہے۔

(3) سیاسی طور پر مضبوط ذاتوں کو اکثر روایتی طور پر اونچی ذاتیں بھی قابل تقلید مانتی ہیں مثلاً مقامی ٹوٹم اکثر برہموں کے ذریعہ بھی پوجے جاتے ہیں۔

(4) تقلید کرنے والے فرد واحد نہیں بلکہ گروہ ہوتے ہیں۔

(5) برٹش راج میں اس تراش خراش کی تحریک میں بہت تیزی آئی تھی لیکن آزادی کے بعد اس کی رفتار دھیمی ہوگئی ہے۔ انگریزوں کی اندھی تقلید بہت بڑے پیمانے پر کی گئی۔

(6) سماجی ساخت میں تبدیلی نہ ہوتے ہوئے بھی اس تراش خراش کی بدولت نچلی ذاتوں کی سماجی پوزیشن یعنی رتبہ میں بدلاؤ آتا ہے۔

(7) یہ ایک طویل عمل ہے عموماً اس کا اثر دو نسلوں کے بعد ہوتا ہے لیکن اونچا جانے کی خواہش اس قدر زبردست ہوتی ہے کہ نچلی ذاتیں اور طبقے اس کوشش میں لگے ہی رہتے ہیں۔

اگرچہ یہ صرف ہندستانی پس منظر میں تشکیل کیا ہوا نظریہ ہے لیکن یہ دوسرے سماجوں میں بھی لاگو کیا جا سکتا ہے۔ سری نواس کے اس نظریے کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

ترسیل (Communication): سماجی تعلقات کا ڈھانچہ ترسیل کا مرہون منت ہے۔ چاہے ترسیل براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے روشناس نہ ہوں اور انھیں اس کا علم بھی نہ ہو کہ ان کے خیالات اور عمل سے کون کس حد تک متاثر ہو رہا ہے۔

عام طور پر ترسیل کا موثر ذریعہ الفاظ ہیں لیکن غیر لفظی یا (Non-verbal Communication) کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غیر لفظی ترسیل میں الفاظ کا استعمال بالکل نہیں ہوتا بلکہ جسم کے مختلف حصوں کی حرکت سے معنی مطلب واضح ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہاتھ اور بازو کی حرکت، بھوؤں کے اتار چڑھاؤ، پیشانی کے بل،

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

آنکھوں کا پھیرنا، چہرے کا تاثر، سبک اور برق رفتار چال سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سماجی تعلقات کی نوعیت مثبت (Positive) ہے یا منفی (Negative)۔ ان بے شمار حرکات و سکنات کے علاوہ مختلف آوازیں۔ چیخیں، نشانیاں اور علامتیں خیالوں اور مسلکوں کو ایک دوسرے تک پہنچانے کا موثر ذریعہ ہیں جن کا استعمال دانستہ اور غیردانستہ طور پر روزانہ ان گنت مرتبہ کیا جاتا ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غیر لفظی ترسیل عالمی نوعیت کی حامل ہے کیونکہ ہر شخص میں ان حرکات و سکنات کو سمجھنے کی پیدائشی صلاحیت موجود رہتی ہے۔ لیکن یہ بیان مطلق صداقت کا حامل نہیں۔ مختلف تمدنوں میں مختلف حرکتوں اور آوازوں کے مختلف معنی لیے جاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ خوشی اور مسرت میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ یا ہنسی کا انداز، حقارت میں لپٹی ہوئی طنز آمیز مسکراہٹ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح دہشت اور ڈر سے نکلی ہوئی چیخیں، خوشی اور فرط مسرت سے نکلی ہوئی آوازوں یا چیخوں سے الگ ہوتی ہیں جنھیں کسی بھی تمدن میں پرورش پانے والا فرد سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح نفی میں جواب دینے کے لیے سر کو جنبش دینا ایسی حرکت ہے جو کم و بیش ہر جگہ سمجھی جاتی ہے لیکن پھر بھی بہت سی حرکتیں اور علامتیں بے معنی اور مبہم رہ جاتی ہیں اگر ان کے مفہوم کسی خاص سماجی تناظر میں نہ سمجھے جائیں۔

اداکاری میں حرکتوں یا غیر لفظی ترسیل کی خاص اہمیت ہے۔ بہترین اداکار اور رقاص وہی سمجھا جاتا ہے جو اپنا مدعا یا معنی مختلف حرکتوں، اشاروں اور کنایوں سے اس طرح ظاہر کرے کہ دیکھنے والا دم بخود رہ جائے اور اس کے سامنے الفاظ بے اثر ثابت ہوں۔

سماجی نفسیات کے ماہر جارج ہربرٹ میڈ (George Herbert Mead) نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ میڈ غیر لفظی علامتوں (Non-verbal Symbol) اور جسمانی حرکتوں (Physical Gesture) میں واضح فرق بتاتے ہیں۔ جسے وہ "بدیہی علامتیں" (Significant Symbols) اور فطری اشارے یا (Natural Signs) کہتے ہیں۔ میڈ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ غیر لفظی علامتیں جو بدیہی علامتیں ہیں انھیں سیکھنا پڑتا ہے جب کہ جسمانی حرکتیں دراصل فطری حرکتیں ہیں۔ ان میں سوچ بچار کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ اتفاقیہ طور پر سرزد ہوتی ہیں کیونکہ فرد کو خود اس بات کا احساس نہیں رہتا کہ وہ کس موقع پر کس قسم کی حرکت کر بیٹھے گا۔ یہی فطری اشارے غیر انسانی سماجوں میں بہت عام ہیں۔ جب گروہ کے کسی جانور کو خطرے کا احساس ہوتا ہے تو وہ چیخ کر بھاگنے لگتا ہے اور دوسرے تمام جانور اس بات کو تاڑ جاتے ہیں۔

اگر کسی بنیاد پر انسان کی برتری کا ثبوت دیا جاسکتا ہے تو وہ قوت گویائی ہے۔ جو ایک پیچیدہ عصبی نظام کی مرہون منت ہے۔ گویائی کی صلاحیت اور زبان کی وجہ سے انسان ایسی چیزوں کے بارے میں بھی بات چیت کر سکتا اور اپنے خیالوں کو منتقل کر سکتا ہے جو موجود نہ ہوں۔ یہاں تک کہ متوقع مستقبل کے بارے میں بھی پیش قیاسی کی جاسکتی ہے اور حال میں مستقبل کے لیے منصوبے تیار کیے جاسکتے ہیں۔

زبان کی وجہ سے ایسی تمام چیزیں جن کا مشاہدہ ممکن نہیں ہے ان کے بارے میں بھی تبادلہ خیال کیا جاسکتا ہے مثلاً خدا، انصاف، قانون، قوم، خوشحالی اور امید ایسے تصورات ہیں جن پر بحث و مباحثہ صرف الفاظ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

الفاظ ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ کسی مزے، منظر، بو(Smell) وغیرہ کا ذکر کر سکیں اور پچھلے تجربے کا حظ اٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ معلومات اور الفاظ کے استعمال کی وجہ سے منطقی صلاحیت ابھرتی ہے۔

سماجی تعلقات کا اظہار الفاظ کے ذریعہ بہتر طریقے پر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی وجہ سے ایک دوسرے کی معلومات اور تجربوں سے سیکھنے کا بیش بہا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ زبان ہی کی ذریعہ تمدنی ورثے کی حفاظت ممکن ہے۔

بہرحال ترسیل چاہے لفظی ہو یا غیر لفظی اہم بات یہ ہے کہ اس میں توقع یا (Expectation) کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے یعنی کہنے والا اس بات کا توقع کرتا ہے کہ سننے والا ایک خاص طریقے پر عمل کرے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی یہ کہے کہ "مہربانی کرکے مجھے گزر جانے دیجیے" تو وہ اس بات کی توقع کررہاہے کہ سننے والا ایک طرف سرک جائے گا تاکہ وہ گزر سکے۔ اس بات کا ردعمل مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں ظاہر ہوسکتاہے۔ ممکن ہے وہ ہٹ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ انکار کردے۔ بہرحال ہر دو صورت میں تعلقات کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح افراد مطابقت، اور باز مطابقت کے دور سے مسلسل گزرتے رہتے ہیں۔

یہاں پر یہ غور طلب امر ہے کہ جس شخص سے ارتسال کیا جانے والا ہے یا کیا جارہا ہے اس کے عمل کا ایک خیالی پیکر ہمارے سامنے ضرور موجود رہتا ہے۔ تصور ہی تصور میں اس سے باتیں بھی ہوتی ہیں۔ بے شمار سوالات و جوابات دماغ میں گردش لگاتے ہیں۔ جتنا زیادہ کسی فرد کا خیال ہمارے دل و دماغ پر مسلط رہے گا۔ اسی رفتار سے ترسیل کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا لیکن ترسیل کی نوعیت افراد اور گروہ کی خصوصیت ہے بالواسطہ تکلف آمیز اور قاعدہ قانون پر مبنی ترسیل ثانوی گروہ میں پائی جاتی ہے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سماجی گروہ ایسے افراد کا مجموعہ ہے جن کے دماغ میں مشترک توقعات (Common Expectations) کا ایک نظام ہوتا ہے۔ ترسیل کی وجہ سے یہ توقعاتی نظام جنم لیتا ہے چاہے اس کی بنیاد ماضی میں پڑی ہو یا حال میں، چاہے وہ ترسیل براہ راست قائم ہو یا کسی دوسرے فرد کی وجہ سے۔ چونکہ اکثر و بیشتر افراد کی توقعات پوری ہوتی ہیں۔ اس لیے دوسرے افراد کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ مطابقت منظم سماج کے لیے ضرورت ہے ورنہ انتشار اور بد نظمی پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر جب فریقین کے مابین معنی و مطلب اور خیالوں کی یکسانیت پائی جاتی ہے تو اسے مکمل ترسیل یا (Perfect Communication) کہا جاتا ہے اور جب معنی مطلب مبہم، شک و شبہ پر مبنی اور توقعات کے خلاف ہوں تو اسے نامکمل ترسیل (Imperfect Communication) سے تعبیر کیا جائے گا۔

شخصی نوعیت سے ہٹ کر ترسیل کی ایک اور نوعیت ہے جسے ذرائع ابلاغ (Mass Communication) کہا جاتا ہے۔ عام طور سے ذرائع ابلاغ کا مطلب ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار، رسالے، کتابیں اور فلموں سے لیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ذرائع ابلاغ سے مراد کسی منظم ذریع سے سامعین کی بکھری ہوئی، غیر یکساں اور کثیر تعداد کو متاثر کرتا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں چاہے ٹیلی ویژن ہو یا روزنامے، ماہنامہ یا ہفتہ وار رسالے سب کے پیش نظر وہ مواد کے پیش کرنے پر زور ہوتا ہے جو عوام کے لیے پسندیدہ اور اہم ہو۔ چونکہ معینہ وقت پر مواد پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اس لیے فیصلے کی اہلیت کہ کون سا مواد کس وقت پیش کیا جائے بہت زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ معلومات کی فراہمی میں سب سے اہم رول ان شخصیتوں کا ہوتا ہے جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر افراد، جماعتوں اور انجمنوں سے ربط قائم کرتے اور واقعات کا عینی مشاہدہ کرتے ہیں جس مقصد سے مشاہدہ کیا جاتا ہے اور جس طریقے سے مشاہدہ کو قلم بند کیا جاتا ہے وہ مشاہدہ کرنے والے کی قابلیت اور صلاحیت کی دلالت کرتا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ صرف کسی واقعہ کا مشاہدہ کرنا اور واقعات کی وضاحت کردینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا پتہ چلانا بھی ضروری ہے کہ اطلاعیں اور خبریں کن لوگوں تک پہنچی ہیں اور عوام پر اس کا کیا اثر ہوا۔ اس طرح ساجیاتی اعتبار سے یہ بات بہت دلچسپی کی حامل ہے کہ لوگوں کے تاثرات کا پتہ چلایا جائے۔ اس کا اندازہ تو ایک طرف اخبارات رسائل اور کتابوں کی فروخت کی رفتار سے لگایا جاسکتا ہے تو دوسری طرف ایڈیٹر کے نام خط۔ ٹیلیفون کی اطلاعوں سے کہ کس پروگرام کو عوام پسندیدہ سمجھتے ہیں اور کس پروگرام کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کا اہم مقصد یہ ہے کہ وہ معلوماتی بھی ہو اور تفریحی بھی۔ کہا جاتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی نوعیت فعلیاتی (Functional) ہوتی ہے بشرطیکہ وہ سماجی اداروں کی بقا میں معاون ثابت ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ماس کمیونیکیشن کا ہر نتیجہ سماجی نظام کے لیے مثبت قدر (Positive Value) کا باعث نہیں ہوتا۔ اس لیے ماس کمیونیکیشن کے ایسے اثرات جو سماج کی بقا میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں غیر فعلیاتی (Dysfunctional) کہلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیملی پلاننگ کے پروگرام کو عوام تک پہنچانے میں جس طرح ماس کمیونیکیشن سے کام لیا جارہا ہے اس کا واضع عمل (Manifest Function) تو معیار زندگی کو بلند کرنے میں نمودار ہوتا ہے مگر معلومات جس طرح عوام تک توڑ موڑ کر پہنچتی ہیں اس سے یہ غلط نتیجہ بھی اخذ کر لیا جاسکتا ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی ایک طرح کی نسل کشی ہے، مذہب کے خلاف ہے، بڑھاپے میں بیماریوں کا باعث ہے۔ دوسری طرف لوگوں کے اخلاق اس طرح سے متاثر ہوتے ہیں کہ وہ ترغیبی ذریعے یعنی پیسوں کی لالچ میں ضمیر کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اس لحاظ سے فیملی پلاننگ پروگرام کا یہ غیر فعلیاتی پہلو ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی وجہ سے سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی شعور کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے اور کس طرح عدم توجہی، بے اعتنائی، کاہلی اور قسمت پرستی کی بجائے زندگی میں امنگ پیدا کی جاسکتی ہے۔ بالواسطہ طور پر لوگوں کی توجہ کو کسی ایک خاص مرکز پر لانے کی ذمہ داری پروگرام ڈائریکٹر پر ہوتی ہے۔ اگر وہ شخصی اور جماعتی نفسیاتی پہلو کو پیش نظر رکھ کر ایسے پروگرام مرتب کرے جن میں کشش

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ہو اور نفس کو لبھانے والے ہوں تو ترسیل موثر ثابت ہوتی ہے۔

ذرائع ابلاغ کے تین اہم عنصر ہوتے ہیں:

(1) سامعین، (2) پیغام، (3) پیغام رساں

یہ تینوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جتنا زیادہ موثر پیغام اور پیغام رساں ہوگا۔ اسی تناسب سے سامعین کے خیالات رجحانات اور مسلک متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ماس کیونیکیشن ہی کا اثر ہے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں رہنے سہنے کھانے پینے اوڑھنے تفریحی مشاغل، فرصت کے اوقات گزارنے کے طریقے کافی متاثر ہو چکے ہیں۔

ترسیلی مواد کا تجزیہ (Content Analysis): سماجی علوم میں ترسیلی تجزیہ کے ذریعہ ترسیل کی نوعیت اس کے مفہوم، اس کے طریق اور جو لوگ گفتگو تحریر یا ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیال میں مصروف ہیں۔ ان کے سائنٹفک تجزیہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترسیلی تجزیہ محض تنقید، تبصرہ یا تشریح سے مختلف ہوتا ہے گو کہ یہ کوئی باقاعدہ طریقۂ تحقیق نہیں ہے پھر بھی اس میں مواد جمع کرنے، اس کی درجہ بندی اور تصورات کی باقاعدہ تعریف و توضیح کی جاتی ہے تاکہ ان کے آپسی تعلقات اور روابط کے پیش نظر واقعات کی تاویل اور اس کا تجزیہ کیا جاسکے۔ ترسیلی تجزیہ کی سب سے باقاعدہ کوشش سوروکن کی تصانیف ہیں۔ جس میں اس مشہور ماہر سماجیات نے مغربی یورپ کی سماجی تبدیلیوں کا اس کے پورے تاریخی پس منظر میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ اور یورپ کے آرٹ موسیقی ادب فلسفہ کی معنوی اور سماجی وضاحت کی۔ اس کے بعد لاس ول (Lass Well) نے 1938 میں اس موضوع پر کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران عوامی ترسیل پر تحقیق کی گئی۔ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ سیاسی پس منظر میں کیا کیا افکار اور بیانات اس زمانے کے فیصلوں پر اثرانداز ہو رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ کون کہتا ہے، کیا کہتا ہے، کس سے کہتا ہے، کیسے کہتا ہے اور اس کے کہنے کا بالآخر کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی طرح اس بات کا بھی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ جمہوریت کیونزم انگلستان اور ہٹلر جیسے الفاظ تصورات یا علامتوں کا لوگوں پر اور ان کے سیاسی انداز فکر پر کیا اثر پڑتا ہے۔ 1950 کے بعد سے ترسیلی تجزیہ سماجیات اور طریقیات کا ایک اہم موضوع بن چکا ہے جس میں بین عمل کے طریق، تمدنی مظاہر، سماجی برتاؤ، سماجی ماحول اور حالات کا غائر مطالعہ اور تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ترسیلی تجزیہ میں مزدور، عوام، نوجوان اور معمر افراد فرد اور گروہ نیز سماجی تحریکات اور نظریات کے اثرات اور ان کے رد عمل کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرے بہت سے سماجی طریق اور ان کے تحقیقی مسائل کی طرح ترسیلی مواد کا تجزیہ کا طریقہ بھی ابھی تجزیاتی دور میں ہے۔ اور نتائج پر پوری طور سے اعتماد کرنا مشکل ہے کیونکہ واقعات اور نتائج کا تنوع نیز مفروضات کی پیچیدگیاں اتنی زیادہ ہیں کہ ابھی اس طریقہ تحقیق کی پختگی میں کافی وقت لگے گا۔ تاہم سماجیات داں اور دوسرے برتاوی علوم کے ماہرین اس اہم تحقیقی مسئلہ کے تحقیقاتی پہلوؤں کو باقاعدگی دینے میں مصروف ہیں۔ چنانچہ تھامس زنانیکی شنائیدر وغیرہ میکس ویبر کے سماجیاتی تجزیاتی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس طریقہ تحقیق کے خد وخال متعین کرنے میں مصروف ہیں۔ میکس ویبر کے نظریہ "معاشرتی فہم کے طریقۂ کار" کا آج کل اچھی طرح تجزیہ کیا جارہا ہے جس کے مطابق ترسیلی مواد کا تجزیہ دو طرح سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(1) **منطقی طریقہ کار:** جس کے دو پہلو ہیں دلائل آمیز اور ریاضی آمیز۔

(2) **ہموردانہ طریقہ کار:** اس طرح کے طریقۂ کار ہیں دوسروں کی کہی یا ان کہی باتیں سمجھنے کے لیے خود کو ان کی حالت میں رکھ کر سوچنا ضروری ہے۔

آج کل صنعتی دنیا میں ترسیل کی بے حد اہمیت ہے اس کے لیے ٹریننگ کے مخصوص کورس ہوتے ہیں اور ان کے ماہرین بھی موجود ہوتے ہیں۔

تصادم (Conflict): تصادم کی اساس جسمانی، ذہنی، نفسی اور تمدنی اختلافات ہیں۔ ان اختلافات کی بناء پر لوگ ایک دوسرے سے بے اعتنائی برتنے اور ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کی بجائے ایسا جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے ایک دوسرے کو نقصان پہنچ سکے۔ چونکہ تصادم میں غصے اور نفرت کے جذبات ملے جلے ہوتے ہیں اس لیے ایک فریق دوسرے فریق کو اذیت پہنچانا چاہتا ہے۔ لہٰذا تصادم سے مراد ایسا سماجی طریق ہے جس میں افراد اور جماعتیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر جارحانہ حملہ کرتے یا جارحانہ حملہ کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Conflict may be defined as that social process in which individuals or groups seek their ends by directly challenging their rivals through actual violence or the threat of violence.

تصادم کی کئی شکلیں ہوتی ہیں: (1) شخصی تصادم، (2) نسلی تصادم، (3) جماعتی تصادم، (4) سیاسی تصادم، (5) بین قومی تصادم۔

شخصی تصادم اکثر و بیشتر بغض للہی پر مبنی ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو ابتداء ہی سے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے پر اقتدار جمانے یا اثر ڈالنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے کو مضحکہ خیز ناموں یا تذلیلی الفاظ سے مخاطب کرتے، جملے کستے، دھمکیاں دیتے اور بالآخر ہاتھاپائی پر اتر آتے ہیں۔

انسانی تاریخ نسلی تعصب کی داستان سے بھری پڑی ہے۔ جب کبھی مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے سے قریب آئے ان میں مقابلے کی وجہ سے برتری اور کمتری کا احساس اجاگر ہوا جو بالآخر تصادم کا باعث بنا۔ گوروں اور کالوں کی لڑائیاں، گوروں اور جاپانیوں کا آپس میں تناؤ اور کھینچاؤ ہمیشہ ناخوشگوار تعلقات میں ظاہر ہوا جس کی وجہ سے کبھی کھلی اور کبھی چھپی جنگیں وقفہ وقفہ سے جاری رہیں۔

نسلی تصادم دراصل تمدنی اور مفاداتی ٹکراؤ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ گروہی ٹکراؤ کسی ایک گروہ کے اقتدار اور ذاتی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مفادات چاہے سماجی اقدار کے اطراف گردش کریں یا سیاسی اقتدار اس میں پنہاں ہو، معاشی اغراض پوشیدہ رہیں یا مذہبی برتری کا احساس ہو، ہمیشہ برتر قوتیں کمزور افراد اور قوموں کا استحصال کرتی رہی ہیں۔ گروہی تصادم کے متعلق کسی قسم کی پیش قیاس ممکن نہیں بلکہ یہ سماجی حالات، مقام اور وقت کے تابع ہے۔

سیاسی تصادم قومی اور بین قومی دونوں صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی قوم کی مختلف سیاسی جماعتوں کا ٹکراؤ قومی تصادم کی نشانی ہے اور مختلف قوموں کے درمیان تصادم بین قومی صورت حال ہوگی۔ مختلف جنگیں قومی تصادم کی عام مثالیں ہیں جو ہمیشہ جذبہ حب الوطنی کے تحت لڑی جاتی ہیں اور جس میں خاندان، جائیداد اور تمدن کی حفاظت کا خیال درپیش رہتا ہے۔ اس کے علاوہ تصادم کے ماخذ اور بھی کئی ہیں۔ مثلاً معاشی اغراض، فتوحات کی خواہش، ملک کے حدود بڑھانے کا لالچ، سیاسی مسلک اور مذہبی وحدانیت۔

موجودہ زمانے میں تصادم کا اہم ذریعہ معاشی اغراض ہیں۔ مختلف صنعتی اداروں میں مفادات کے ٹکراؤ کی وجہ سے آجر اور مزدور میں اکثر و بیشتر تناؤ اور کھینچاؤ پیدا ہوتا ہے جو واک آؤٹ، کام بند کرو اور ہڑتالوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اکثر کاروباری اداروں میں لوگ بے اطمینانی کا اظہار مختلف مظاہروں کے ذریعے کرتے ہیں۔

غرض تصادم کی اصل جڑ مفادوں اور اغراض کا ٹکراؤ ہے۔ ٹھیک کہا تھا کارل مارکس اور فریڈرش انجلز نے کہ "دنیا کی تاریخ گروہی کشمکش کی ایک لامتناہی داستان ہے۔"

اچانک تبدیلیاں بھی مختلف افراد اور سماجوں میں تصادم کا باعث بنتی ہیں۔ اچانک تبدیلیوں کی وجہ سے پرانی قدریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سماجی تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے جب افراد کھیتی باڑی پر کارخانوں کو ترجیح دیتے ہیں تو مشینی زندگی کی وجہ سے سوچ بچار کے طریقے متاثر ہوتے ہیں۔ تمدنی اختلافات اور مفادوں کے ٹکراؤ کی وجہ سے انتشار اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔

سماج پر تصادم کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جب تصادم دو مختلف گروہوں میں ہوتا ہے تو ایک ہی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد میں تعاون اور اتحاد بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے کیونکہ گروہ کی بقا اور گروہی اقدار کی حفاظت ان کے پیش نظر رہتی ہے اسی لیے وہ اندرونی اختلافات کو ایسے وقت پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خیالات اور مقصد میں زیادہ یگانگیت پائی جاتی ہے۔ لیکن جب تصادم ایک ہی گروہ سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد میں پیدا ہوتا ہے تو گروہ کی وحدت کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔

تصادم کے بعد عام طور سے شخصیتوں میں تغیر نمودار ہوتا ہے چونکہ تصادم کے بعد الجھنیں ختم ہو جاتی ہیں۔ نفسی اور ذہنی بار کم ہو جاتا ہے۔ خود غرضیوں اور مفاد پرستی کی وجہ سے جو کوتاہ بینی پیدا ہوگئی تھی وہ بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہے اس لیے مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا لوگوں میں خیال پیدا ہوتا ہے۔

ہر ملک و قوم کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جب کہ تصادم کی قیمت انسانی خون، مالی نقصان اور تہذیب و تمدن کی بربادی کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ ہر جنگ کا نتیجہ بربادی اور غارت گری میں نمودار ہوتا ہے۔ فاتح قوم مفتوح قوم کا استحصال کرتی ہے اور مفتوح قوم گو وقتی طور پر اپنی شکست کا اعتراف کرتی ہے مگر نفرت کے جذبات دل و دماغ

میں اس شدت سے موجود رہتے ہیں کہ وہ چھپے ہوئے طریقے سے اپنی کھوئی ہوئی حیثیت اور مقام کو حاصل کرنے کے لیے تیاریاں کرتے اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ بروقت بدلہ لیا جاسکے۔ البتہ جب نزاعوں میں گرفتار افراد، گروہ اور ملک طاقت اور قوت کے اعتبار سے یکساں اور ہم پلہ ہوتے ہیں تو ایک کا دوسرے کو مکمل طور سے نیست و نابود کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی قسم کا بھی نقصان اٹھانے سے بیشتر ایسے سمجھوتے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو فریقین کے لیے قابل قبول ہو۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تصادم انسانی زندگی کی ایک ناگزیر کیفیت ہے۔ سترہویں صدی کے انگریز مفکر تھامس ہابس (Thomas Hobbes) اس خیال کے حامی تھے کہ انسانی فطرت میں بدلہ لینے اور غارت گری کا جذبہ فطری طور پر پایا جاتا ہے لیکن گورمنٹ کے ادارہ کی وجہ سے ایسے قانون اور قاعدے مرتب ہوچکے ہیں جس کی وجہ سے طاقتور کمزور کو بالکل نیست و نابود نہیں کرسکتا گو ان کا استحصال ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح انسانی اور غیر انسانی سماج کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ غیر انسانی سماج میں تصادم کھلا ہوتا ہے جس کا اظہار ایک دوسرے پر فوراً جھپٹ پڑنے، دانتوں، سینگوں اور پنجوں سے کاری ضرب پہنچانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی سماج نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے ان گنت طریقے دریافت کرلیے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ افراد گروہ یا ملک ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے رہیں۔ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور رہتے ہوئے زہریلی گیس اور بموں کے استعمال سے چند گھنٹوں کے اندر سارے ملک کو خاکستر کر دیا جاسکتا ہے۔ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے الفاظ کا استعمال بھی ضروری نہیں۔ نفسی اور ذہنی تکلیف مختلف طریقوں سے پہنچائی جاسکتی ہے۔ نام، شہرت اور کیریر کو ملیامیٹ کیا جاسکتا ہے۔

تصادم کے ساتھ ہی ساتھ اس کو روکنے کی کوششیں بھی سماج میں جاری رہی ہیں۔ ہر طرح کی اخلاقی اور اصلاحی تعلیمات اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آج اگرچہ تصادم بہت بڑھ چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی طور پر اس سے بنٹنے کے طریقے بھی کھوجے جارہے ہیں۔

تصادم بچپن میں ہی شروع ہوتا ہے۔ جب ایک نیا بچہ پیدا ہوتا اور بڑا بچہ برادرانہ رقابت (Sibling Rivalry) کاشکار ہوتا ہے، بڑا ہو کر یہی بچہ نسلی مذہبی لسانی اور امیری غریبی کی تفریق کا شکار ہوتا ہے۔ سماج سے تصادم کو مکمل طور پر نہیں نکالا جاسکتا کیونکہ یہ مقابلہ (Competition) کا منبع ہے لیکن ایک حد کے بعد اسے کنٹرول کیا جاتا ہے۔

آج کے سماج جس طرح پرتشدد ہوتا جارہا ہے وہ ایک چونکا دینے والا عمل ہے۔ یہ پرتشدد تصادم کبھی بھی جنگ عظیم کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔

تصادم قوانین (Conflict of Laws): تصادم قوانین کو شخصی قانون بین الاقوام بھی کہتے ہیں۔ اس قانون کو تصادم قوانین اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا اطلاق اسی وقت ہوتا ہے جبکہ کسی ایک علاقہ کے قانون یا کسی ایک ملک کے قانون اور کسی دوسرے علاقہ یا ملک کے قانون میں تصادم ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی مقدمہ میں (جس میں کہ یہ تصادم رونما ہوا ہو) کسی علاقہ یا ملک کے قانون کا اطلاق ہوگا ایسی صورت میں جس قانون کا اطلاق ہوگا اس کی بابت جو قواعد کسی ملک نے معین کرلیے ہوں ان قواعد کے مجموعہ کو تصادم قوانین یا شخصی قانون بین الاقوام کہتے ہیں۔ اس مجموعہ قواعد کو شخصی قانون بین الاقوام اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس قانون کا تعلق اقوام عالم کے ایک دوسرے کے قوانین سے ہوتا ہے اور "شخصی" کا لفظ اس لیے اضافہ کیا گیا ہے کہ اس کو عمومی قانون بین الاقوام سے ممیّز کریں اور یہ ظاہر کریں کہ اس قانون میں اشخاص کے تعلقات سے بحث ہوتی ہے نہ کہ اقوام یا ملک کے باہمی تعلقات سے۔

دنیا میں جتنے ممالک ہیں اتنے ہی طریق قوانین (System of Law) بھی ہیں۔ ہر ملک کا قانون اس ملک کے مخصوص حالات و ضروریات کے مدنظر مدون ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ملک کا قانون دوسرے ملک کے قانون سے مختلف ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک ہی ملک میں دو یا دو سے زیادہ طریقہ قانون ہوتے ہیں۔ جس طرح برطانیہ میں انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کے قوانین ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکا میں جہاں پچاس سے زیادہ ریاستیں ہیں ہر ریاست کا ایک مخصوص قانون ہے جس کی وجہ سے اس ملک میں مختلف طریق قوانین (System of Law) ہیں۔

اس طرح دنیا میں ایسی سیاسی وحدتیں (Political Units) ہیں جہاں صرف ایک ہی طریق قانون نافذ ہے۔ مثلاً سویڈن اور فرانس جو

سیاسی وحدتیں ہیں اور ان دونوں ممالک میں صرف ایک ہی طریقہ قانون نافذ ہے بہ الفاظ دیگر ان ممالک کی سیاسی وحدت اور قانونی وحدت (Legal Units) میں یکسانیت ہے۔ تصادم قوانین کا انھیں قانونی وحدتوں سے تعلق ہے کیونکہ ایک ہی ملک کی دو یا دو سے زیادہ قانونی وحدتوں میں تصادم ہوسکتا ہے مثلاً انگلستان کے قانون کا اسکاٹ لینڈ کے قانون سے تصادم ہوسکتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں قانونی وحدتوں کی ایک ہی سیاسی وحدت یعنی سلطنت متحدہ برطانیہ سے تعلق ہے بلکہ وہ اس اس کے جز ہیں۔

تصادم قوانین کی نوعیت اور اس کی وسعت: تصادم قوانین یا شخصی قانون بین الاقوام قومی قانون کا ایک شعبہ ہے ہر ملک کے قانون میں چند ایسے قواعد مرتب کیے جاتے ہیں جن سے اس ملک کی عدالتوں کے بیرونی عناصر والے مقدمات کے فیصلہ میں مدد ملے۔ اگر ملک کی کسی عدالت میں کوئی ایسا مقدمہ دائر ہو جس کا تعلق دو یا دو سے زیادہ قانونی وحدتوں سے ہو تو عدالت کا فرض ہے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ قبل اس کے کہ مقدمہ کی سماعت شروع ہو عدالت یہ معلوم کرے کہ آیا اس مقدمہ میں اس کو اختیار سماعت ہے یا نہیں نیز یہ کہ وہ اپنے فیصلہ کی تعمیل بھی کرواسکتا ہے یا نہیں۔ مثلاً جائداد غیر منقولہ کے نزاعات اسی ملک کی عدالتیں بہتر طریقہ سے فیصل کرسکتی ہیں جہاں وہ جائداد واقع ہو۔ مثلاً اگر فریقین کے مابین ایک ایسی آراضی کی ملکیت کی نزاع ہے جو جنوبی افریقہ میں واقع ہے تو ہندوستان کی عدالتوں کو اختیار سماعت نہیں ہے کیونکہ وہ جائداد مذکورہ کے کسی فریق کو قبضہ دلانے سے قاصر ہیں۔ جنوبی افریقہ کی عدالتیں بھی اس کام کو انجام دے سکتی ہیں۔ اگر اختیار سماعت کا جواب نفی میں ہے تو مقدمہ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ لیکن اگر جواب اثبات میں ہو تو دوسرا سوال قانون متعلقہ کا ہوتا ہے یعنی اگر مقدمہ کا تعلق مختلف ممالک کے قوانین سے ہو تو ان میں سے کسی ملک کے قانون کو منتخب کرنا چاہیے۔

اب عدالت کے لیے غور طلب بات یہ ہوتی ہے کہ کسی ملک کی عدالتیں اپنے ملک کے قانون کے بجائے دوسرے ملک کے قوانین کا کیوں انتخاب کریں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حقوق کی نوعیت، ان کی وسعت اور ان کا چارہ کار ہر ملک کے قانون میں جداگانہ ہوتا ہے۔ اگر کسی مقدمہ میں یہ ظاہر ہو کہ فریقین نے کسی دوسرے ملک کے قانون کی رو سے مفادات یا حقوق حاصل کیے ہیں تو ان حقوق کی خاطر خواہ حفاظت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس قانون کے تحت مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے۔ ملکی قانون کے اطلاق سے بسااوقات ناانصافی ہوتی ہے اور ہر ملک کی عدالتیں انصاف کرنا چاہتی ہیں۔ اس لیے قانون متعلقہ کی تلاش ہوتی ہے تاکہ اگر مقدمہ اس ملک کی عدالت میں چلے تو اسی طرح کا فیصلہ صادر ہوگا۔

تصدیق: صدق سے نکلا ہے۔ اس کے اصل معنی سچا کرنا اور سچ ماننا ہیں۔ یہیں سے یقین کرنا اعتماد کرنا اور ایمان لانا بھی تصدیق کہلاتا ہے کیونکہ آدمی جس چیز کو سچ مانتا ہے، اس پر اعتماد و یقین بھی کرتا ہے اور ایمان بھی لاتا ہے۔ اسی لیے تصدیق کا ضد تکذیب (جھٹلانا) حجو و کفر (انکار کرنا) ہوتا ہے۔ ایمانیات کے سلسلہ میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ خدا اور رسولوں کی صدق دل سے گواہی دینا ان کو قلب سے سچا جاننا اور ماننا اور ان کے تعلیمات کے برحق ہونے کا یقین رکھنا۔ گویا صرف زبان سے ایمان کا اقرار کافی نہیں ہے بلکہ دل سے اس کی تصدیق کرنا بھی ضروری ہے اسی لیے ایمان کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ اقرار باللسان و تصدیق بالقلب۔

تعاون (Co-operation): سماجی زندگی میں دو عنصر کارفرما نظر آتے ہیں۔ تعاون اور مقابلہ تعاون کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور مشترک اغراض کو حاصل کرنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مقابلہ کا خیال لوگوں میں اور فاصلہ پیدا کرتا ہے۔ علاحدگی کا رجحان بڑھتا ہے اور ایک دوسرے کی رفاقت گراں گزرنے لگتی ہے۔ زندگی میں بیسیوں مثالوں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ شادی اور طلاق کام اور ہڑتال، بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ فساد ان ہی دو رجحانوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ہر سماج ان تعمیری اور تخریبی رجحانوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تعاون اور مقابلہ کی نوعیت زمان و مکان اور موقع محل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی ملک میں طلاق کی شرح زیادہ ہے تو کسی میں کم۔ کسی ملک میں ذات پات اور رنگ و روپ پر مبنی احساس برتری زیادہ ہے تو کسی میں کم۔ کسی جگہ لوگ "جیو اور جینے دو" کی پالیسی پر کاربند نظر آتے ہیں تو کہیں جھگڑا فساد پھیلا رہتا ہے۔ بہرحال تعاون اور مقابلہ کی شدت کو بڑھانے اور کم کرنے میں تمدنی اثرات کا بہت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

زیادہ دخل ہوتا ہے۔

سماجی مفکرین کا خیال ہے کہ بین عمل کی سب سے بنیادی شکل تعاون ہے اور انسان کی سماجی زندگی تعاون، مقابلہ اور تصادم کے اطراف گردش کرتی ہے۔ ان مفکرین کا خیال ہے کہ عضویہ کا ارتقا خود اس امر کا مکمل ثبوت ہے کہ ہر نوع اپنی بقا کے لیے ایک دوسرے کے تعاون کی محتاج ہے۔ موزوں ترین کی بقا (Survival of the Fittest) کا نظریہ اس حقیقت کا ضامن ہے کہ سب سے زیادہ تعاون کرنے والے عضویے ہی بقا کے مستحق ہیں۔

جب دو یا دو سے زیادہ افراد ایک ایسے مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جو سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہو تو اس طریق (Process) کو تعاون کہا جاتا ہے۔

افراد اور جماعتوں میں تعاون اسی تناسب سے پایا جاتا ہے جس تناسب سے افراد میں ایک دوسرے کو سمجھ کر ہمدردی کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تعاون کے لیے احساس (Understanding) ضروری ہے لیکن محض احساس (Understanding) سے تعاون کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تاوقتیکہ دوسرے افراد کے احساسات کی قدر نہ کی جائے اور ان سے ہمدردی نہ ہو۔

تعاون کی ابتدائی نوعیت تو وہ ہے جو مشترک کام (Collective Efforts) میں نظر آتی ہے جب کہ لوگ ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی کو مشکل کا سامنا کرتے دیکھ کر مدد کے لیے آگے بڑھنا یا کسی کی موٹر کو کیچ میں دھنسی دیکھ کر ڈھکیلنے کے لیے آگے آنا۔ اس قسم کے تعاون میں ذاتی غرض یا مفاد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایسے کئی سماج ہیں جہاں پیسے کی فراوانی اور ضرورت کی اشیاء کی بہتات کے باوجود لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ تاکہ خوش گوار تعلقات کا لطف اٹھا سکیں۔

تعاون کی دوسری نوعیت وہ ہے جب کہ مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے کا پاس و لحاظ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی عمارت کی تعمیر میں مختلف فن کاروں اور کاریگروں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا اور ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا۔

تعاون کا مفہوم اس وقت اور بھی واضح ہوتا ہے جب ہم مقابلے کے طریق پر غور کرتے ہیں۔ کشمکش حیات کا سب سے بنیادی اصول مقابلہ ہے کیونکہ مقابلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب ضروریات کی اشیاء اور تعیشات کی چیزیں وافر مقدار میں نہیں ہوتیں۔ ان محدود چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے لوگ آپس میں جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ملک میں تعلیم یافتہ اور فنکار افراد کی زیادتی ہو اور مسائل محدود۔ تو افراد میں مقابلہ جاری رہتا ہے۔ مقابلہ زندگی کے کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ضروریات زندگی کے علاوہ آرام و آسائش کی اشیاء سماجی حیثیت، شہرت، زور و اقتدار، شادی بیاہ غرض زندگی کے ہر پہلو میں لوگ بہتر پوزیشن اور اونچے معیار پر زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

غرض مقابلہ کا گہرا تعلق سماجی قدروں سے ہے۔ جن چیزوں کی سماج میں قدر ہوتی ہے یا اونچے معیار کی سمجھی جاتی ہیں لوگ ان کے حصول کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تعلقات کی نوعیت سے مقابلے کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ مثلاً خاندان کے افراد، دوست احباب، والدین اور بھائی بہنوں کے تعلقات میں مقابلے سے زیادہ تعاون کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ایسے تمام لوگ جن سے خوشگوار تعلقات رہتے ہیں اگر وہ کسی ایک دفتر یا کارخانے میں ملازمت کریں تب بھی مقابلہ سے زیادہ وہ ایک دوسرے سے تعاون کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف جب لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں تو ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور ایک دوسرے کو شکست دینے کا بہت زیادہ خیال رہتا ہے۔ بہرحال ارتسال (Communication) افراد کے معاملے میں جتنا زیادہ مکمل ہوگا اور بین شخصی (Inter Personal) تعلقات جتنے خوشگوار ہوں گے اسی لحاظ سے تعاون اور مقابلہ کی نوعیت متاثر ہوگی۔

تعاون کے وقت لوگوں کے پیش نظر ذاتی مفاد بھی پنہاں رہتا ہے۔ ان کے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ تعاون کی وجہ سے جو نتیجہ حاصل ہوگا اس سے انھیں کتنا فائدہ پہنچے گا اگر انھیں اس کا احساس ہو جائے کہ انھیں زیادہ فائدہ ہوگا تب اسی تناسب سے تعاون کو رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب لوگوں کو اس کا احساس ہوجاتا ہے کہ تعاون کے باوجود نتیجہ غیر یقینی رہے گا تب ان کے رجحان میں فرق آجاتا ہے مثلاً کالج کا گروپ کسی ایک آیٹم یا ڈرامہ کی تیاری میں پوری کوشش کرے گا مگر ساتھ ہی ہر فرد کی یہ خواہش رہے گی کہ اس کی ایکٹنگ سب سے اچھی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

رہے تاکہ وہ انعام کا مستحق قرار پائے۔

بہر حال تعاون اور مقابلہ عالمی نوعیت کے حامل ہیں اور فطری طور پر ہر جاندار عضویے میں پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے انھیں اچھا یا برا قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ وہ زندگی کے لیے ناگزیر اور بدیہی ہیں۔ "موزوں ترین کی بقا" (Survival of the Fittest) سے متعلق ڈارون کا تاریخی اہمیت رکھنے والا نظریہ تصادم اور مقابلہ کو اساسی فطری قانون قرار دیتا ہے۔ اس نظریے کے منکرین مقابلہ کے توڑ پر تعاون سے متعلق غور وفکر کرنے لگے جس میں سب سے پیش پیش کروپوٹکن (Kropotokin) کی وہ مشہور و معروف تصنیف ہے جو "Mutual Aid" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تعاون کو فطری قانون قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی طریق کو بھی فوقیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ تعاون اور مقابلہ دونوں ایک دوسرے پر منحصر ہیں اور دونوں میں بہت قریبی تعلق ہے۔ اس بیان کی صداقت کو کئی طریقے سے جانچا جاسکتا ہے۔ لوگ زیادہ چیزوں کی پیداوار کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور بالآخر اس کے نتیجے سے سب ہی مستفید ہوتے ہیں۔ البتہ ہر سماج کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان دونوں طریق (Processes) میں خوشگوار امتزاج پیدا ہو۔ اس لیے ہر تمدن حدود کا تعین کرتا ہے کہ کون سے لوگ کس کے ساتھ کس وقت پر اور کس طرح مقابلہ کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ کسی سماج میں مقابلہ کو کامیابی اور ترقی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے تو کسی سماج میں تعاون کے ذریعہ آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان دونوں طریق کی نوعیت سماج کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ امریکی سماج میں مقابلہ پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسے کامیابی اور ترقی کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن امریکیوں کے اس فلسفہ حیات کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی کے نظام، مسلک حیات، سرمایہ دارانہ معیشت، کھلے طبقاتی نظام (Open Class System) نسلی اور قومی اختلافوں اور سب سے زیادہ جمہوری نظام کی روایتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہندستان کے روایتی نظام میں مقابلے سے زیادہ تعاون اور قربانی کی اہمیت ہے۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تصادم کی طرح تعاون بھی ہر انسان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ آج کل "نصیبہ ور لوگوں کی طرف سے کم نصیب لوگوں کی مدد" (From Fortunates to Less Fortunates) تعاون کی ایک شعوری کوشش ہے۔ سماج کے حاشیہ پر رہنے والے (Marginalized) لوگوں کو سماج کے خاص دھارے میں رہنے والے لوگوں کا تعاون حاصل ہوتا ہے تو وہ بھی حاشیہ سے اندر آجاتے ہیں۔ سماجی زندگی میں شعوری تعاون سماجی منصوبہ بندی کا ایک خاص جزو ہے۔

تعصب (Prejudice) : تعصب کے تصور کو سماجی برتاؤ میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ انگریزی زبان میں تعصب کے لیے (Prejudice) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ دو الفاظ Pre اور Judice سے مل کر بنا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں قبل از وقت فیصلہ یعنی کسی مسئلہ کے بارے میں تحقیق اور مطالعہ سے پہلے ہی اگر کوئی رائے قائم کرلی جائے تو اسے انگریزی اصطلاح کے مطابق تعصب (Prejudice) کہیں گے۔ بعض سماجیات دانوں کا کہنا ہے کہ ہر قبل از تحقیق فیصلہ کا لازمی طور سے غلط ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے ان کی رائے میں صرف وہی فیصلے تعصب کے زمرہ میں شمار کیے جائیں گے جن پر تحقیق اور تردید کے بعد بھی لوگ اٹل رہیں یا ہٹ دھرمی کریں۔ اردو میں تعصب کا لفظ عصبیت سے ماخوذ ہے یعنی جب کسی مسئلہ یا موضوع کے تعلق سے جذباتی یا عقائدی وابستگی پائی جائے جسے نئے علوم کی تحقیق کے باوجود لوگ ترک کرنے پر تیار نہ ہوں تو اسے تعصب کہا جاتا ہے۔ تعصب یا عصبیت ایک سماجی بیماری ہے جس کو آفاقی حیثیت حاصل ہے اور جو ہر سماج میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے۔ لوگ اجنبیوں سے تعصبانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ اسی طرح تعصب کے تاریخی مذہبی معاشی اور تمدنی اسباب ہوتے ہیں۔ تعصب کے تعلق سے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ ایک اکتسابی عمل ہوتا ہے جسے بالعموم افراد یا گروہ نسلاً بعد نسل اپناتے چلے جاتے ہیں۔ تعصب کا جذبہ اپنی حفاظت یا اپنے جائز وناجائز مفادات کی برقراری کے لیے نشوونما پاتا ہے۔

تعصب کا لازمی نتیجہ مقابل افراد یا گروہوں کے تعلق سے مخاصمت یا دشمنی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ سماجی تعصب کی وجہ سے بے شمار سماجی امتیازات رونما ہوتے ہیں۔ گورے اور کالوں کے درمیان تعصبات کی جو دیوار پائی جاتی ہے اس نے امریکا اور افریقہ میں بڑے پیچیدہ مسائل پیدا کردیے ہیں۔ اسی طرح مذہبی تمدنی اور تہذیبی یا لسانی تعصبات مختلف سماجوں میں کشیدگی کا باعث ہوتے ہیں۔ جدید تحقیقات کے ذریعہ اس بات کی مسلسل کوشش کی جارہی ہے کہ سماجی برتاؤ میں عصبیت کے دخل اور امتیازی سلوک کو کم کیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود گروہی اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

محدود مفادات کے پیش نظر اب بھی یہ رجحان عام طور سے پایا جاتا ہے کہ لوگ دانستہ طور پر بھی تعصبات کو کاملاً ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ تعصب محض گروہی یا مقامی یا قومی حد تک نہیں ہوتا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی تعصبات کی لہریں پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے سماجی کشیدگی اور انتشار کا مسلسل اندیشہ رہتا ہے۔ اس کا انسداد سماجی ہم آہنگی کے لیے ضروری ہے۔

تعصب پروپیگنڈا کا سہارا لے کر سرد جنگ میں خاص کردار ادا کرتا ہے۔ کچھ ذاتوں اور قوموں کے خلاف بہت گہرا تعصب ان کے خلاف غیر منطقی گہرے تاثرات (Stereotypes) کو راہ دیتے ہیں جن کی کوئی منطقی تاویل نہیں ہوتی لیکن بچپن سے سنتے سنتے وہ ذہن میں گہری جڑیں جما لیتے ہیں جیسے اسکاٹ یا یہودیوں کو کنجوس سمجھنا اور سکھوں کو بارہ بجے کے قریب دماغی صلاحیتوں کو کھو دینے والا سمجھ لینا وغیرہ۔ یہ سب دراصل گہرے تاثرات ہیں جو غیر شعوری طور پر دل میں جم جاتے ہیں۔ یہ تعصب کی بدولت ہی پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہو کر اور بھی گہرا تعصب پیدا کرتے ہیں۔

زمانہ قدیم سے تعصب تمام سماجی رشتوں میں رونما رہا ہے۔ آ کل ہر جنگ اور سرد جنگ کے دوران ذرائع ابلاغ کا سہارا لے کر ہر قسم کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ فسطائی طاقتوں نے پہلی دفعہ سائنٹفک انداز میں اس کا استعمال کیا تھا۔

ستمبر 2001 میں ہونے والی نسل واد کے خلاف کانفرنس تعصب کے خلاف منظم جنگ کی ابتدا ہے۔ یہ کانفرنس ڈربن میں ہوئی تھی۔

تعلیم۔ امتحان اور اندازۂ قدر (Education - Examination and Evaluation)

امتحان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ باضابطہ تعلیم کی، اور امتحان کے طریقے بھی تعلیم کے مقاصد کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ شروع شروع میں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ طالب علم نے درسی مضامین پر کس حد تک عبور حاصل کر لیا ہے، استاد زبانی امتحان لیا کرتا تھا۔ لیکن جوں جوں ذخیرہ علم میں اور طالب علموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ہر ایک طالب علم کا الگ الگ زبانی امتحان لینا مشکل تر ہوتا گیا۔ اس مشکل کا حل تحریری امتحان کی شکل میں نکالا گیا اور رفتہ رفتہ اس کا چلن عالم گیر ہو گیا۔ تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک تحریری امتحان کی ایک ہی شکل مروج تھی۔ یعنی مضمون نگارانہ امتحان جس میں کسی دیے ہوئے موضوع کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنی ہوتی تھی۔ گزشتہ صدی کے آخر میں بعض مغربی ممالک میں مضمون نگارانہ امتحان کی کمزوریوں پر شدت سے بحث و مباحثہ شروع ہوا۔ اس کی دو خامیوں پر خاص توجہ دی گئی۔ ایک تو یہ کہ اس قسم کے امتحان میں طلبا کو جو نمبر دیے جاتے ہیں ان کی معتبری کم ہوتی ہے جیسا کہ اس وقت بعض تحقیقات سے ثابت ہو چکا تھا اور دوسرے یہ کہ اس امتحان میں نصاب تعلیم کی محض چند چیزیں ہی شامل کی جا سکتی تھی۔ ان دونوں وجوہ کی بنا پر مضمون نگارانہ امتحان کے ذریعہ کسی طالب علم کی قابلیت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے جو طریقہ وضع کیا گیا اسے معروضی امتحان کہتے ہیں۔ اس میں اس نوعیت کے سوال ہوتے ہیں جن کا ایک مختصر اور مخصوص جواب ہوتا ہے۔ طالب علم کو یا تو اپنی یادداشت سے صحیح جواب دینا ہوتا ہے یا کئی دیے ہوئے جوابات میں سے صحیح جواب کی شناخت کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا جواب جانچنے اور نمبر دینے میں ممتحن کی صواب دید کا دخل نہیں ہوتا اور اس وجہ سے ایسے امتحان کی معتبری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مزید برآں معروضی امتحان میں نصاب کے زیادہ سے زیادہ حصہ کا احاطہ کر لینے کا امکان ہے۔ اس طرح مضمون نگارانہ امتحان کی ان دو بڑی خامیوں سے بچا جا سکتا ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم (19-1914) کے دوران معروضی امتحان کو بہت بڑے پیمانہ پر استعمال کیا گیا۔ خصوصاً ریاستہائے متحدہ امریکا میں فوج میں بھرتی کی غرض سے ذہانت کی آزمائش کے لیے جو امتحانات وضع کیے گئے وہ معروضی قسم کے تھے۔ اسی دوران 1918 میں مشہور ماہر نفسیات ایڈورڈ تھارن ڈائک نے ایک چونکا دینے والا مقولہ پیش کیا "جو چیز بھی عالم وجود میں ہے اس کی کچھ نہ کچھ کمیت ضرور ہے۔ لہٰذا اس کی پیمائش کی جا سکتی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی کردار کے ہر پہلو کی ناپ تول ممکن ہے۔ اس خیال کو اس تحریک سے بھی تقویت ملی جو علم نفسیات کے میدان میں انیسویں صدی کے آخری حصہ میں شروع ہوئی تھی اور جو اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے طبعیات اور حیاتیات کے علوم سے متاثر ہو چکی تھی۔ ان علوم میں تجرباتی طریقہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ تجرباتی طریقہ کی روح ناپ تول اور پیمائش ہے۔ اس لیے نفسیات کی تحقیقات میں بھی سابق الذکر علوم کی طرح ہر چیز کو ناپنے تولنے کی کوشش کی جانے

گی۔ چنانچہ انسانی کردار کے جملہ پہلوؤں کی پیائش کے لیے طرح طرح کی تکنیکیں وضع کرنے کی مہم بڑی شد و مد کے ساتھ شروع ہوئی۔ مثال کے طور پر نہ صرف مختلف درسی مضامین سے متعلق تحصیلی آزمائشیں تیار کی گئیں بلکہ رویے، شخصیت اور سیرت کی پیائش کے لیے آزمائشیں اور درجہ پیا مرتب کیے گئے اور ان کے وضع کرنے اور کام میں لانے کے سلسلہ میں شماریاتی طریقہ استعمال کیا گیا۔

تحریک پیائش میں جو ولولہ رجائیت کار فرما تھا اور جو اس کی صحت، معتبری اور افادیت کے بارے میں دعوے کیے گئے تھے وہ تجربہ کی کسوٹی پر صحیح ثابت نہیں ہوئے۔ انسانی کردار کی پیائش میں دو بنیادی دشواریاں لا محالہ سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں صفر مطلق کا تعین اس طرح نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ لمبائی یا وزن کی پیائش میں ممکن ہے۔ مثال کے طوز پر اگر کسی فرد کو تاریخ کی ایک تحصیلی آزمائش میں صفر نمبر ملے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ تاریخ کے علم سے بالکل بے بہرہ ہے۔ اسی طرح اگر جمہوریت کی طرف فرد کا رویہ معلوم کرنے کے لیے ایک درجہ پیا مرتب کیا جائے تو اس میں صفر کا نشان بے معنی ہوگا۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ انسانی کردار سے متعلق کسی بھی آمائش کے پیانہ میں ہر جگہ ایک نشان یا ایک نمبر کی قدر یکساں ہونا ضروری نہیں مثلاً اگر کسی آزمائش میں ایک طالب علم بیں نمبر حاصل کرے اور دوسرا ساٹھ تو یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے طالب علم کے مقابلہ میں دوسرے کا علم تین گنا ہے۔ اس قسم کی بعض اور دشواریوں کا تجربہ ہوا جس کی وجہ سے 1930 اور 1945 کے درمیانی وقفہ میں انسانی کردار کی پیائش کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور اس قسم کی پیائش کے بارے میں زیادہ حقیقت پسندانہ رویہ اپنایا گیا اور اس کے لیے ایک نئی اصطلاح "اندازۂ قدر" وضع کی گئی۔

اندازۂ قدر کا تصور روایتی امتحان یا آزمائش کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کے جامع مقاصد کی روشنی میں اس بات کا اندازہ لگایا جائے کہ کسی طالب علم نے ان کے اکتساب میں کس قدر کامیابی حاصل کی ہے اور اس اندازۂ قدر سے جن کمزوریوں یا خامیوں کا انکشاف ہو ان کے تدراک کی تدبیر کی جائے۔ اس طرح تعلیمی عمل اور اندازۂ قدر کا ایک باہمی اور مسلسل رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اندازۂ قدر کی عملی صورت یہ ہے کہ تعلیم کے بڑے بڑے مقاصد کو اس طرح واضح کیا جائے کہ طالب علم کے کردار میں ان کی مخصوص شکل کیا ہوگی یعنی خاص مقصد کے حصول سے کسی طالب علم کے کردار میں کون سی تبدیلی واقع ہوگی۔ پھر اسی تبدیلی کو ناپنے یا اس کا اندازہ لگانے کے لیے کس قسم کے آلہ کار یا طریقۂ کار کی ضرورت پڑے گی اور اس آلہ یا طریقہ کو کس طرح زیادہ سے زیادہ صحیح اور معتبر بنایا جا سکتا ہے۔

ایک اچھے نمونہ کے اندازہ قدر کی چند خصوصیات یہ ہیں۔ (1) یہ عمل فرد کی پوری طالب علمانہ زندگی پر پھیلا ہوتا ہے۔ یہ کسی خاص وقت یا معینہ مدت کے بعد نہیں بلکہ مسلسل ہوتا رہتا ہے اور اسکول کا تمام عملہ جو طالب علم سے متعلق ہے اس میں تعاون کرتا ہے۔ (2) اندازۂ قدر جن صورتوں میں کیا جاتا ہے وہ سب طلبہ کے لیے لازمی طور پر یکساں نہیں ہوتیں۔ مثلاً کسی درسی مضمون میں تحصیلی آزمائش تو ایک ساتھ کی جا سکتی ہے مگر اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ طلبہ کہاں تک ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ ہر ایک طالب علم کا مختلف حالات میں مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہوگی جبکہ وہ کسی جماعتی منصوبہ میں شریک ہو۔ (3) یہاں طالب علم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کا امتحان لیا جا رہا ہے بلکہ وہ اسے اپنی تعلیم کا ایک نارمل حصہ سمجھتا ہے۔ اس قسم کے اندازۂ قدر کے ذریعہ ہر ایک طالب علم کی تعلیمی تشخیص ہو جاتی ہے اور اس بنا پر اس کی تعلیمی رہنمائی اور بعد ازاں پیشہ ورانہ رہنمائی کی جا سکتی ہے۔

اندازۂ قدر کے آلات (سامان) کو کبھی کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ کسی جماعت یا اسکول نے مجموعی طور پر کس حد تک تعلیمی مقاصد حاصل کر لیے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں اندازہ قدر کی بعض تکنیکوں کو مختلف منازل کے نصاب تعلیم کی اصلاح کے لیے بھی کام میں لایا گیا ہے۔

اندازۂ قدر میں جو مختلف قسم کے آلہ جات استعمال کیے جاتے ہیں ان میں تحصیلی آزمائش کے علاوہ آزمائش ذہانت، آزمائش صلاحیت اور درجہ پیا شخصیت شامل ہے۔ ذہانت کی کوئی ایسی تعریف نہیں جو جامع اور مانع ہو پھر بھی ذہانت کی آزمائش کے بہت سے آلے مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ذہانت کا تصور یہ ہے کہ یہ سیکھنے کی ایسی عام صلاحیت ہے جو کم و بیش خلقی یا فطری ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ آیا شخصیت کے کسی پہلو کے خلقی اور اکتسابی حصوں کو الگ الگ کیا جا سکتا ہے۔ آزمائش ذہانت کی بنا پر افراد کے مابین امتیاز برتا جاتا ہے۔ صلاحیت کا

تصور بھی ذہانت ہی کی طرح مبہم ہے۔ صلاحیت کو حصول علم کے لیے آمادگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس آمادگی کا انحصار فرد کی ذاتی خصوصیات، اس کی سابقہ معلومات اور ماحول کے تعلیمی اثرات پر ہے گو کہ اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ آمادگی پیدا کرنے میں ان عناصر میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہے۔ آزمائش ذہانت کے برعکس آزمائش صلاحیت کردار کے کسی مخصوص پہلو کی پیائش کرتی ہے۔ مثلاً میکانکی صلاحیت، صلاحیت موسیقی، صلاحیت زبان دانی وغیرہ۔ کسی مخصوص صلاحیت کی آزمائش کی بنا پر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیندہ متعلقہ علم یا فن میں کوئی فرد کس درجہ کامیاب ہوگا۔ اس قسم کی آزمائشیں، طلبہ کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

جہاں تک درجہ پیا شخصیت کا تعلق ہے اس میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ لگانے کے لیے آزمائشیں شامل کی جاتی ہیں۔ خاص خاص پہلو یہ ہیں۔ (1) اوصاف سیرت مثلاً ایمانداری، اشتراک عمل وغیرہ۔ (2) ماحول کے ساتھ ہم آہنگی۔ (3) مزاج۔ (4) دلچسپی یا شوق اور (5) رویے۔ ہر پہلو سے متعلق مختلف قسم کی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں۔ کسی فہرست میں جو مدات درج ہوتی ہیں ان کے بارے میں یا تو وہ شخص خود اپنے رد عمل کا اظہار کرتا ہے جس کی شخصیت کی پیائش مقصود ہے یا پھر کوئی مشاہد ان مدات کی بنا پر اس کی شخصیت کی درجہ پیائش کرتا ہے۔ بہر کیف اس قسم کی پیائش تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ نیز فرد کو اپنے ذاتی مسائل کے سمجھنے اور حل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ (مزید معلومات قدر پیائی سے حاصل کی جا سکتی ہے)۔

تعلیم ۔ ایک عالمی جائزہ (Education- A World View):

(1) 1950 میں دنیا کی کل آبادی 1579 ملین تھی جس میں سے 700 ملین افراد ناخواندہ تھے۔ 1960 میں 1881 ملین بالغ افراد کے منجملہ 740 ملین افراد ناخواندہ تھے۔ 1970 میں 2335 ملین بالغ افراد کے منجملہ 810 ملین افراد ناخواندہ تھے۔ ان اعداد و شمار سے دو حقائق سامنے آتے ہیں۔ (الف) بیسویں صدی کے نصف آخر میں بھی اس کرۂ ارض پر ناخواندہ افراد کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور (ب) خواندگی کی شرح میں نمایاں اضافے کے باوجود بالغ ناخواندہ افراد کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ افراد کی سب سے زیادہ تعداد دنیا کے جن علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ ہیں ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکا اور عرب ممالک جہاں اسکول جانے والوں کی شرح سب سے کم ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ جن علاقوں میں سب سے زیادہ ناخواندگی ہے، دیہی علاقے سب سے زیادہ کم ترقی یافتہ بھی ہیں۔

(2) یورپ، شمالی امریکا اور سوویت روس کی صورت حال اس سے مختلف ہے۔ ان ممالک میں ناخواندگی کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے بلکہ چند رہائشی علاقوں کی حد تک یہ صورت حال پائی جاتی ہے۔ جن ممالک میں ناخواندگی کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے وہاں لاتعداد ایجنسیوں کے ذریعہ تعلیم بالغان اور مزید تعلیم و تربیت کے پروگراموں پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً پبلک اسکول اور یونیورسٹیاں، ٹریڈ یونین، لائبریریاں، مذہبی اور ثقافتی ادارے، مراسلاتی تدریس اور شام کے نصابات (ایوننگ کورس) وغیرہ کے ذریعہ یہ کام انجام دیا جاتا ہے۔

(3) ممالک متحدہ امریکا میں یہ خدمات کس قدر اعلیٰ سطح پر کالج اور یونیورسٹی انجام دیتی ہے۔ ہر سال ایک بہت بڑی تعداد ان توسیعی خدمات سے فیض اٹھاتی ہے۔ اس کے علاوہ سارے ملک میں ٹیلی ویژن اسٹیشنوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے جہاں دن و رات تعلیم بالغان کے متعدد پروگرام نشر کیے جاتے ہیں اور اس طرح عوامی تعلیم کی تکمیل ہوتی ہے۔

(4) انگلستان میں تعلیم بالغان زیادہ تر نصابات کے ذریعہ دی جاتی ہے جو غیر پیشہ ورانہ مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں اور خاص طور سے اٹھارہ سال سے زائد عمر والوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے نصابات کا انتظام یونیورسٹیوں کے غیر درسگاہی شعبے، مزدوروں کے تعلیمی ادارے، متعدد رضاکار جماعتیں، حکومت مقامی کے شعبے اور اقامتی کالج کرتے ہیں۔

(5) جرمنی میں تعلیم بالغان کا تقریباً سارا کام رضاکارانہ تنظیمیں کرتی ہیں البتہ حکومت ان کی مالی امداد کرتی ہے۔ آزادانہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی حد تک پیشہ ورانہ تعلیم بھی یہاں کے تعلیم بالغان کے نظام میں شامل ہوتی ہے۔

(6) ڈنمارک کا عوامی ہائی اسکول، یہاں کے تعلیم بالغان کے نظام کی سب سے غیر معمولی خصوصیت ہے۔ یہ مدارس اقامتی ہوتے ہیں اور یہاں زیادہ تر غیر فنی اور غیر پیشہ ورانہ تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ مدارس ان بے شمار تکنیکی اداروں اور پیشہ ورانہ تربیتی مراکز کے علاوہ ہیں جہاں اسکول نہ جانے والے نوجوانوں اور بالغ افراد کو مختلف فنون اور پیشوں کی تربیت دی جاتی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(7) امریکا کی طرح کنیڈا میں بھی ہر اسکول بورڈ کے ذمہ داران تعلیم بالغان کے فروغ میں عملی تعاون کرتے ہیں۔ وہاں کا تدریسی عملہ خود اپنے مدارس میں ان بالغ طالب علموں کی مدد کرتا ہے۔ اسی طرح کئی جامعات ہیں جو سلسلہ تعلیم کو جاری رکھنے میں مختلف طریقوں سے ہاتھ بٹاتی ہیں۔ شام کو موسم گرما کے زمانے میں ایسے نصابات پڑھائے جاتے ہیں اور مراسلاتی تدریس کے ذریعہ کئی بالغ افراد کو ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ "پروگرام - 5" کے تحت بے روزگار افراد کو نئے نئے ہنر اور پیشوں کی تربیت (Training) دی جاتی ہے تاکہ انھیں روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہو سکیں۔

(8) جہاں تک سوویت روس کا تعلق ہے 1919 میں لینن کے ایک حکم نامہ کے ذریعہ ناخواندگی کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی تعمیل میں وہاں کی حکومت نے ایسے موثر اقدامات کیے کہ چند ہی برسوں کے اندر روس کی ساری آبادی زیور تعلیم سے آراستہ ہو گئی۔ البتہ بعض رہائشی علاقے ایسے رہ گئے تھے جہاں تعلیم کی برکات عام کرنے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سوویت روس میں تعلیمی پروگرام کو ایک مسلسل عمل کی طرح چلایا جاتا ہے۔ وہاں مزدوروں اور محنت کش عوام کی ایسی متعدد یونیورسٹیاں قائم ہیں جہاں بالغ مزدوروں کو نہ صرف فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم دی جاتی ہے بلکہ عام تعلیم اور تہذیبی ترقی کے اسباق بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ یہی طریقہ دیگر سوشلسٹ ممالک میں بھی رائج ہے۔

(9) ایک لحاظ سے تعلیم بالغان، تعلیم عامہ کے میدان میں ایک نیا اضافہ ہے۔ ایک دوسرے مفہوم میں تعلیم بالغان اتنی ہی قدیم ہے جتنے پہاڑ اور دریا ہیں۔ اس کی اہمیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ وسعتیں اور نئی شکلیں اختیار کرتی جا رہی ہے۔ بقول ڈاکٹر جے. آر. کڈ تعلیم بالغان کا میدان قدیم ترین ہونے کے باوجود جدید ترین ہے۔

تعلیم تا حیات (Continuing Education): تعلیمی کمیشن (66-1964) نے دیگر امور کے علاوہ تعلیم بالغان کے سارے مسئلہ کا جائزہ لینے کے بعد حسب ذیل رائے ظاہر کی۔

"تعلیم کا سلسلہ مدرسہ چھوڑنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو ساری عمر جاری رہتا ہے۔ آج کی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا اور سماج کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کا صحیح صحیح اندازہ کرنا ایک بالغ شہری کے لیے از حد ضروری ہے یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو بھی حصول تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان کا علم از کار رفتہ ہو کر رہ جائے گا۔"

ایک ایسے ملک میں جہاں کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد حصول علم کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہے اگر کہیں ایسی سہولتیں موجود بھی ہوں تو ملک کی سماجی اور اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے ان سے پوری طرح استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ عمر بھر تعلیم دینے کا تصور بڑی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن رسمی طریقۂ تعلیم سے اکثر خوش حال لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ طرز تعلیم بالارادہ نہ سہی ایک آزاد اور منصفانہ معاشرہ کے مقصد کے بھی خلاف پڑتا ہے جہاں سب کے لیے مساوی مواقع فراہم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ کھلی یونیورسٹیوں (Open Universities) میں آج اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف ڈگریاں تقسیم کرنا نہیں ہے بلکہ وہ کئی دیگر وسیع تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اسی لیے موجودہ زمانہ میں اعلیٰ تعلیم کو صرف باقاعدہ طالب علموں تک ہی محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ کئی دیگر طبقے ایسے ہیں جو حصول تعلیم کے ذریعہ اصلاح و امداد کے طالب ہیں۔ مختلف عمر اور مختلف تعلیمی پس منظر رکھنے والے لوگ آج اعلی سطح پر تعلیم اور پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آج علم کے متلاشی طرح طرح کے لوگ یونیورسٹیوں کے دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھیں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ کچھ ایسے ہیں جنھیں حالات نے ترک تعلیم پر مجبور کر دیا تھا۔ بعض لوگ کسی مخصوص سائنٹفک شعبہ میں مزید علم حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اعادی نصاب (Refresher Course) یا اعلیٰ نصاب کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے پیشوں کی جدید ترین تبدیلیوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ بعض لوگ تمام مضامین کے بجائے صرف ایک مخصوص مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں اور بعض اپنے محکمہ یا سائنسی میدان یا لبریٹری وغیرہ سے اپنا ربط اور رشتہ منقطع کرنا نہیں چاہتے۔ ایسے تمام لوگوں کے لیے غیر رسمی جامعاتی تعلیم کے امکانات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اس صورت حال سے نپٹنے کے لیے بہ ظاہر تین راستے کھلے ہوئے ہیں جنھیں مستقبل قریب میں اختیار کرنا پڑے گا۔ اول مراسلاتی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

نصاب (جو بہت زیادہ توجہ کا مستحق ہے)، دوم کھلی یونیورسٹیاں، سوم بالغ طالبان علم کے لیے حدود کتب کے اندر یا باہر مواقع کی فراہمی۔ ظاہر ہے یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں جن سے روایتی اور نئی یونیورسٹیوں کے مقاصد کی کماحقہ تکمیل ہو سکتی ہے اور پرانی اور نئی یونیورسٹیوں میں بھی ان نئے طریقوں پر عمل کیا جا سکتا ہے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ طریقے ایسے ہوں جو غیر رسمی تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کر سکیں اور قدامت پرستی کے جو گڑھ اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں بن گئے ہیں وہ مسمار ہو سکیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی کھلی یونیورسٹی کے چانسلر لارڈ کروتھر نے اس مقصد کی اس طرح وضاحت کی ہے۔ اول تو یہ کہ ہمارا دروازہ سب کے لیے کھلا ہے۔ ایک تعلیمی سطح سے دوسری تعلیمی سطح تک بتدریج پہنچنے کا جو محتاط طریقہ روایتی یونیورسٹیوں نے اپنایا ہے ہم اس کے قائل نہیں۔ ہمارے پاس جگہ کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ ہماری یونیورسٹی کمروں اور حجروں کی پابند نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا طریقہ تعلیم بھی بالکل کھلا اور آزاد ہے۔ انسانی ابلاغ کے ہر اس طریقہ کو ہم آزمانا چاہتے ہیں جس سے انسانی فہم و ادراک کے معیار کو بلند کرنے میں مدد مل سکے۔ ہم خیالات کے معاملہ میں بھی کھلا ذہن رکھتے ہیں۔

ایک کھلی یونیورسٹی نہ صرف غیر رسمی اعلیٰ تعلیم کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی ہے بلکہ خود اعلیٰ نظام تعلیم کی تشکیل جدید کے لیے بھی وہ ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ کم تر سطح پر بھی ہم کھلی یونیورسٹی کے نمونہ کو اختیار کرنے کی کوشش کریں تاکہ طالب علم ثانوی یا مناسب پیشہ ورانہ علوم میں بھی مہارت حاصل کر سکیں۔

مرکزی حکومت اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ تعلیمی سہولتیں آبادی کے تمام طبقات کو مہیا کی جائیں اور اس ضمن میں یہ نہ دیکھا جائے کہ ان کی تعداد کیا ہے یا یہ کہ وہ بڑے بڑے شہروں سے قریب رہتے ہیں یا دور۔ چنانچہ دسمبر 1970 میں کھلی یونیورسٹی کے موضوع پر جو سیمنار منعقد ہوا تھا وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا اقدام کیا جائے جو پرانی ڈگر سے ہٹ کر ہو اور جو جدید تقاضوں کو پورا کر سکے۔ سیمنار میں اس بات سے اتفاق کیا گیا کہ سماجی تبدیلیاں لانے اور تعلیم کے وسیع تر مواقع فراہم کرنے کی غرض سے کھلی یونیورسٹی کے قیام سے شروعات کی جائے اور رفتہ رفتہ اس تعلیمی تجربہ میں اتنی وسعت پیدا کی جائے کہ ایک طرف تو وہ کمی پوری ہو جائے جو اب تک تعلیمی میدان میں پائی جاتی تھی اور دوسری طرف تعلیمی معیار کو بھی بلند سے بلند تر کیا جائے۔ سیمنار کی یہ بھی رائے تھی کہ کھلی یونیورسٹی خود اساتذہ کی تعلیم اور فن کاروں کی ٹریننگ کا انتظام کرے اور اس کے علاوہ باقاعدہ سندی نصابات (Degree Courses) سے ہٹ کر ایسی تعلیمی سہولتیں بھی فراہم کرے جہاں مختلف پیشوں اور فرقوں میں پہلے مامور شدہ اشخاص اپنے علم اور تجربہ کو بڑھا سکیں۔ یونیورسٹیوں کی یہ بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ خود اپنے مخصوص پروگراموں کے ذریعہ آس پاس میں رہنے بسنے والوں کی خدمت کریں اور ان کی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ سیمنار کی یہ سفارشات حکومت ہند کے پیش نظر ہیں۔

تعلیم بالغان سے متعلق اس وقت ہندوستان میں جو بھی غور و فکر ہو رہی ہے اس سے دو امور سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ احساس کہ ماضی کے ہمہ وقتی اور باقاعدہ نظام تعلیم میں توسیع کی جانی چاہئے۔ اسی لیے اب اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ تعلیم کچھ اس طرح کی ہو کہ ہر فرد سے اس کا سیدھا تعلق پیدا ہو جائے اور وہ اس کے لیے سودمند ثابت ہو۔ اسی مقصد کو ہماری سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اس طرح پیش کیا تھا کہ "بلا شبہ اچھے اداروں ، اچھے اسکول، اچھے کالج اور یونیورسٹیوں کی ہمیں ضرورت ہے لیکن تعلیم کوئی ایسی چیز نہیں جو صرف کلاس روم تک ہی محدود ہے۔ آدمی مسلسل سیکھتا رہتا ہے۔ خود اپنی ذات سے اور اپنے اردگرد کے حالات سے، ان لوگوں سے جن سے وہ ملتا ہے، ان کتابوں سے جو اس کے زیر مطالعہ رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان واقعات سے بھی جو دنیا کے دور دراز مقامات پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ انسان کی یہی وہ صلاحیت ہے جو بجا تعلیم کہلائی جا سکتی ہے۔ چاہے آپ کارخانہ میں کام کرتے ہوں یا کسی کھیت میں، تعلیم کا سلسلہ بہر حال جاری رہتا ہے۔ ایسی تعلیم حاصل کرنے سے کیا فائدہ جو صرف اپنے سینہ ہی میں دفن رہے۔ اسے کسی مقصد کے لیے استعمال بھی کیا جانا چاہئے اور جب تک آپ ایسا نہ کریں آپ کبھی حقیقی مسرت محسوس نہیں کر سکتے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس بامقصد اور نہ ختم ہونے والے تعلیمی سلسلہ کو عوام تک کیسے پہنچایا جائے۔ اس معاملہ میں ہماری مرکزی وزارت تعلیم کا فیصلہ یہ ہے کہ کوئی علاحدہ یا متوازی تعلیمی نظام رائج کرنے کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بجائے مروجہ طریقہ تعلیم میں ردو بدل کے ذریعہ ہی یہ مقصد حاصل کیا جائے۔ بقول سابق وزیر تعلیم پروفیسر نورالحسن "موجودہ تعلیم کا تقریباً پورا ڈھانچہ روایتی بنیادوں پر قائم ہے اور تمام مدارج میں کل وقتی تعلیمی اداروں ہی کے ذریعہ درس و تدریس کا کام لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے کئی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اول تو یہ کہ اس طریقہ تعلیم سے آبادی کا صرف وہی حصہ (چاہے وہ بچوں پر مشتمل ہو یا نوجوانوں اور بالغ افراد پر) مستفید ہو سکتا ہے جو کسی ملازمت، پیشہ، دھندے یا کاروبار میں مشغول نہ ہو اور اس طرح برسرکار افراد کی ضروریات یک سر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ آدمی کام بھی کرتا جائے اور تعلیم بھی حاصل کرے۔ اور یوں یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پائے۔ اسی لیے ہمیں چاہئے کہ ایک مربوط قومی نظام تعلیم کے سلسلہ میں فوری قدم اٹھائیں۔ ایک ایسا نظام تعلیم جس میں تینوں شعبے یعنی کل وقتی درس تعلیم، جز وقتی درسی تعلیم (Part-time School Education) اور غیر درسی ذاتی تعلیم تمام مراحل پر سماج کے تمام طبقات کے لیے مناسب ڈھنگ سے ترقی کر سکیں۔ تنظیمی سہولت، اثر پزیری اور کفایت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس سے بہتر متبادل اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

تعلیم۔ عمل آموزش (Education- Learning Process)

(Education- Learning Process): عمل آموزش کے ماحول کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرکے زیادہ نمایاں اور وسیع عمل کے ایک جزو کی حیثیت قرار دیا جاتا ہے۔ عام آدمی کے نزدیک محض حصول معلومات اور مہارت کا نام آموزش ہے لیکن ماہرین نفسیات اس رائے کو بہت کم قابل اعتبار سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں انھیں پچھلی صدی کے فلسفیوں کے خیال کی تائید نظر آتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بچے کا ذہن بالکل خالی ہوتا ہے اور اسے معلومات سے پُر کرنا معلم کی ذمہ داری ہے جس کی حسب ضرورت باز آوری کی جا سکتی ہے۔ کردار پر توجہ کرنے والے دور حاضر کے ماہرین نفسیات اس خیال سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

آموزش کی جدید تعریفیں اسے تجربات پر مبنی کرداری تبدیلیوں سے تعبیر کرتی ہیں۔ یہاں لفظ تبدیلی کی قدرے وضاحت درکار ہے۔ آموزش اور پختگی دونوں سے تبدیلی رو نما ہوتی ہے اور ان کا تعامل اتنا زیادہ ہے کہ ایک کا اثر دوسرے کے اثر سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم آموزش سے مراد وہی تبدیلیاں ہوتی ہیں جو کسی خاص تسیخ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ آموزش میں ان تبدیلیوں کا شمار نہیں کیا جاتا جو موروثی ساخت اور فطری میلان کی پختگی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں اور نہ ان وقتی تبدیلیوں کو شامل کیا جاتا ہے جو تسیخ کے رد عمل کے اثر سے متعلق ہوتی ہیں۔ جیسے تھکن یا نشہ، معلومات، مہارت اور رویّوں کے حصول کو آموزش کہتے ہیں۔ اس کے اندر کام کرنے کا نیا ڈھنگ بھی شامل ہے۔ رکاوٹ یا دشواری دور کرنے کی سعی کرنے یا نئی صورت حال سے مطابقت پیدا کرنے سے بھی آموزش ہوتی ہے۔ اس سے کردار کے اندر تدریجی تبدیلی آتی ہے۔ یہ تبدیلی ایک صورت حال کے بار بار رونما ہونے اور فرد کی بار بار سعی سے اس پر موثر رد عمل ہونے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب رکاوٹ یا دشواری دور کرنے یا نئے حالات کا سامنا کرنے میں پرانا ڈھنگ کام نہیں دیتا۔ آموزش عمودی اور افقی دوران ہے۔ کیفیت یا کمیت کے اضافے سے بھی وہ مراد ہوتی ہے۔ گویا مہارت میں بہتری یا رفتار میں تیزی یا حصول میں زیادتی بھی آموزش ہے۔ کردار کے اندر قدرے مستقل تبدیلی کو آموزش تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسی تبدیلیاں آسان مہارتوں اور معمولی باتوں کی واقفیت سے لے کر پیچیدہ میکانکی کام اور دقیق عبارت کی تفہیم تک کچھ بھی ہو سکتی ہیں۔ آموزش کے ذریعہ شوق کی آبیاری یا مقصود کی برآری ہوتی ہے اور جذبات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آموزش کے نتائج مہارت و عادت، سماجی اہلیت اور مجرد فکر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

ماہر نفسیات کے درمیان اس امر پر بنیادی اتفاق پایا جاتا ہے کہ تجربے کی بنا پر کارگزاری میں تبدیلی کو آموزش کہتے ہیں۔ لیکن اس کی توضیح و تشریح بالعموم تین مختلف نظریات کے تحت ہوتی رہی ہے۔ ایک علاقیت پسندی کا نظریہ جسے تھارڈائک (Thoridike) کے ساتھ خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک آموزش ایک ایسا عمل ہے جس میں مہیج اور جوابی عمل کے درمیان رابطہ قائم ہوتا ہے۔ اس نے آموزش کے تین بنیادی قانون مرتب کیے ہیں جو کہ آمادگی، مشق اور اثر کے قانون کہلاتے ہیں۔ ان قوانین کے تحت وقوع پذیر ہونے والی آموزش کو آموزش بہ سعی و خطا کہتے ہیں۔ دوسرا کرداریت پسندی کا نظریہ ہے جس کی بنیاد التزام پر ہے۔ اس نظریے کے مطابق آموزش دراصل عادت پڑ جانے کا نام ہے جو کہ التزام ہے جبکہ ایک مہیج اپنے سے کمزور یا علامتی مہیج کے ساتھ اس طور مربوط ہو جاتا ہے کہ آخرکار جوابی عمل محض کمزور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

یا علامتی مہیج کی بدولت رونما ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں پیولاو (Pavlov, 1900) کا نام سرفہرست آتا ہے۔ اب اس نظریے کو کلاسیکی التزام کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ تیسرا گیسٹالٹ (Gestalt) نظریہ یا ہیئت مجموعی کا نظریہ ہے جو کہ آموزش بہ بصیرت پرزور دیتا ہے۔ اسے پیش کرنے والے گشٹالٹ نقطہ نظر کے علمبردار کافکا اور کوہلر (Koffka, Kohler, 1929) ہیں۔ اس نظریے کے مطابق آموزش کا تعلق پورے فرد سے ہے جو کہ فرد اور ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے۔ گیسٹالٹ کو مہیجی صورت حال کے ادراک کی ایک طرز، تشکل یا ہیئت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس بات پر زور ہے کہ مہیجیات اور جوابی عمل ایک منظم اور متحد طرز میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور بطریق کل ہی آموزش ہوتی ہے۔ آموزش بہ بصیرت کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں مسئلے کا حل یکایک سامنے آ جاتا ہے۔

دور حاضر کے ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ یہ اختلاف رائے دراصل ایتلافی اور وقوفی نظریات کے بنیادی فرق سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ اول الذکر تقویت رسانی (Reinforcement) کی صورت میں مہیج اور جوابی عمل کے درمیان ایتلاف (Association) پر زور دیتا ہے۔ تقویت کا اصول اسکنر (Skinner, 1966) کے پیش کردہ نظریے فعالی التزام (Operant Conditioning) کے اندر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ آموزش کے نظریۂ تقویت میں تحریک ذہنی مقصود مزاحمت، جوابی عمل، تقویت اور تعلیم کے مدارج کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ وقوفی نظریے ہیئت کی تنظیم نو کو سراہتے ہیں۔ یہ مسئلہ کسی حد تک اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کس تشریح سے آموزش کی ایک صورت کی بہتر وضاحت ہوتی ہے اور کسی سے دوسری کی۔ مثلاً فعالی التزام کے مطابق جوابی عمل کے مخصوص طرز کو بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے اور وقوفی تشریح کے اعتبار سے حل مسئلہ کے مسائل روابط یا امتیازات کی وضاحت بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ نیز ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک نظریہ اپنے طور پر مکمل اور جامع ہونے کا دعویدار ہے۔ لیکن بیشتر ماہر نفسیات ایک انتخابی نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مہارتوں کے حصول کو علاقیت اور تقویت کے اصولوں کے تحت بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے اور جہاں تفہیم درکار ہے اسے ساختی تشریحات کے ذریعے زیادہ واضح کیا جا سکتا ہے لیکن رویوں کی تشریح غالباً التزام، تقویت، ادراکی تنظیم نو جیسے متعدد اصولوں کے تحت ہی بہتر طریقے پر ممکن ہے۔

آموزش میں وہ مشتمم اعمال پائے جاتے ہیں یعنی تفریق اور تکمیل ایک کل اپنے اجزا میں منقسم ہوتا ہے اور اجزا سے ایک نئے کل کی تشکیل ہوتی ہے۔ گیسٹالٹ نظریے کے مطابق تفریق کو اس عمل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس میں دائرۂ ادراک مخصوص حصوں میں بٹ جاتا ہے اور تکمیل سے مراد ایک نئی یا بامعنی ہیئت لی جا سکتی ہے جس میں اجزا کا صحیح تال میل پیدا ہو جاتا ہے۔ آموزش کی تمام صورتوں میں تفریق اور تکمیل کے اصول یکے بعد دیگرے کارفرما ہوتے ہیں۔ لہٰذا آموزش کے دوران واقع ہونے والی تبدیلیاں شاذ ہی یکایک، فوری اور مکمل ہوتی ہیں بلکہ ان کی حیثیت تدریجی اعمال کی ہوتی ہے جو کہ ایک مدت میں پورے ہوتے ہیں۔

آموزش کے عمل اور حاصل میں بھی تمیز برتنی ضروری ہے۔ اساتذہ بنیادی طور پر آموزش کے اس عمل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں حاصل کی ہی اہمیت نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کارکردگی کیسی رہی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اگر عمل صحیح ہے تو حاصل بھی صحیح ہونے کا میلان رکھتا ہے۔ جبکہ حاصل کے صحیح ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں ہے کہ عمل بھی صحیح رہا ہو۔ مثلاً ایک بچہ جمع کے سوال کا صحیح جواب ٹھیک طور پر جوڑ کر بھی نکال سکتا ہے اور نقل کر کے بھی لکھ سکتا ہے۔ اس بات کے کہنے کا یہ منشا نہیں ہے کہ حاصل کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے یا عمل اور حاصل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مدرسے کا تعلق دونوں سے ہے لیکن اس کی بنیادی ذمہ داری کیا کے بجائے کیوں ہونی چاہئے۔ محض امتحان کی کامیابی کے بجائے اس کا مقصد حقیقی تعلیم ہی ہے۔

رسمی آموزش اور غیر رسمی آموزش میں بھی تمیز کی جا سکتی ہے۔ اول الذکر میں دانستہ طور پر مخصوص آموزش کا منصوبہ بنایا جاتا ہے اور آخرالذکر میں بے ضابطہ ڈھنگ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اتفاقی آموزش اور آموزش بہ عمل تدریجی میں فرق ہے۔ پہلو صورت میں کسی خاص ارادے کے بغیر ضمنی طور پر آموزش ہو جاتی ہے اور دوسری صورت میں ایک حاصل کسی دوسرے عمل آموزش کے حصول میں درمیانی قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔

انتقال آموزش (Transfer of Learning) بھی ایک اہم مسئلہ ہے کیوں کہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اور زندگی کی ضرورت بھی۔ اس کے بیان میں تین نظریے خاص طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یعنی صوری ضبط کا نظریہ جو ملکات کی الگ الگ اکائیوں پر مبنی ہے، مماثل عناصر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کا نظریہ اور تعمیم تجربات کا نظریہ۔ اس باب میں معلمین کے نظریات نے اکثر تعلیم کے فلسفے، طریقے، نصاب اور انتظام کو متاثر کیا ہے۔

تعلیم کی منزلیں (Stages of Education): اسکول کے زمانہ کی تعلیم کو عموماً تین منزلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قبل مدرسہ یا ماقبل تحتانی تعلیم 3 سے 6 سال، ابتدائی یا تحتانی تعلیم 6 سے 11 سال اور ثانوی تعلیم 11 سے 17/16 یا 18 سال کی عمر کے بچوں کے لیے۔ یہ تعلیم نفسیاتی اصول کے اعتبار سے بچے کے تین ادوار یعنی طفولیت، لڑکپن اور عنفوان شباب کی بنا پر کی جاتی ہے۔ سماجی نقطہ نظر سے ایک زمانہ تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ ابتدائی تعلیم کا تعلق عوامی طبقہ کے بچوں اور ثانوی تعلیم کا تعلق مخصوص اور خوش حال بچوں سے ہے۔ جمہوریت کی ترقی کے ساتھ یہ فرق بالکل مٹ گیا ہے۔ ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کی بنیاد پر بھی ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں امتیاز کیا جاتا رہا یعنی ابتدائی جماعتوں میں ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ اور ثانوی جماعتوں میں انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جاتی رہی۔ یہ امتیاز بھی اب باقی نہیں رہا کیوں کہ اب ہندوستانی زبانوں میں نہ صرف ابتدائی اور ثانوی بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی دینے کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔

قبل مدرسہ تعلیم میں نرسری اسکول، کنڈرگارٹن اور مانٹیسوری اسکول شامل ہیں۔ قبل مدرسہ تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ گھر کا ماحول پیدا کر کے کم سن بچوں میں اچھی عادتیں ڈالی جائیں۔ ان کو اپنا جسم اور لباس صاف رکھنے، دوسروں کا لحاظ رکھنے، اپنے جذباتی کیفیات اور ارادی افعال پر قابو پانے اور گفتگو میں اچھا لب و لہجہ اختیار کرنے کی تربیت دی جائے۔ نیز ان میں جمالیاتی ذوق پیدا کیا جائے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما کی جائے۔ قبل مدرسہ منزل میں حسّی تربیت کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے لیے کنڈرگارٹن میں فروبل کھلونے اور فروبل سامان مشغلہ (Gifts and Occupation) اور مانٹیسوری اسکول میں مانٹیسوری سامان تعلیم (Didactic Apparatus) استعمال کیا جاتا ہے۔ نرسری اسکول ان بچوں کے لیے خاص طور پر مفید ہوتے ہیں جن کے ماں اور باپ دونوں دن بھر حصول روزگار میں گھر کے باہر مصروف رہتے ہیں۔ قبل مدرسہ تعلیم کے اسکول عام معنوں میں اسکول نہیں ہوتے بلکہ اسکول کی باقاعدہ تعلیم کے لیے بچوں کو تیار کرنے کے ادارے ہوتے ہیں۔

ان اداروں میں تین یا چار سال کے بچوں کو کچھ پڑھنا لکھنا اور حساب سکھایا بھی جاتا ہے تو وہ کھیل کے طریقہ پر سکھایا جاتا ہے اور درس و تدریس کی جانب اتنی توجہ نہیں کی جاتی جتنی کہ تربیت اور کھیل کی جانب کی جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو باقاعدہ طور پر لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔ ان کو ان کے ماحول سے روشناس کرایا جائے۔ ان کے کردار کی تعمیر کی جائے ان کے قوائے ذہنی کی تربیت کی جائے اور ان کی انفرادی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے اور عام طور پر ان کو ایسی تعلیم اور تربیت دی جائے جو آیندہ چل کر خود ان کے اور سماج کے لیے مفید ثابت ہو۔

ترقی یافتہ ممالک میں عموماً 6 یا 7 سال سے 14 یا 15 سال کی عمر کے بچوں کے لیے ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ سوویت روس میں 7 تا 15 سال، ریاستہائے متحدہ امریکا اور جرمنی میں 6 تا 14 سال اور انگلستان میں 5 تا 15 سال کے بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہے۔ فرانس اور جاپان میں لازمی تعلیم کی مدت نو سال ہے۔ دستور ہندوستان کے ہدایتی اصول کے اعتبار سے اس کی مدت آٹھ سال ہے۔ جرمنی میں جو بچے 14 سال کی عمر کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں ان کے لیے 18 سال کی عمر تک تسلسلی مدارس (Continuous Schools) میں جزو وقتی تعلیم لازمی ہے اور ان کو عام تعلیم کے ساتھ گیارہ اور بارہ سال کی عمر کے عملی رجحان رکھنے والے بچوں کے لیے سنٹرل اسکول قائم ہیں جہاں انھیں اپنی علمی استعداد بڑھانے کے علاوہ صنعتی یا تجارتی تعلیم حاصل کرنے کا بھی موقع دیا جاتا ہے۔ فرانس میں عام پرائمری اسکولوں کے علاوہ ہائی پرائمری اسکول بھی ہوتے ہیں جن کی اوپر کی جماعتوں میں طالب علموں کو 16 سال کی عمر تک ہنر مند (Skilled) کاریگر کی حیثیت سے صنعتی کارخانوں میں ملازمت اختیار کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں ان بچوں کے لیے جو 16 سال کی عمر میں کوئی تجارتی یا صنعتی پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہوں تو میڈل اسکول قائم ہیں جہاں ان کو عام تعلیم کے ساتھ متعلقہ پیشہ کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں تحتانی تعلیم کو لوئر پرائمری اور اپر پرائمری میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو بچے لوئر پرائمری یعنی جماعت پنجم کے بعد معاشی مشکلات کے باعث اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے ہیں ان کے لیے 14 سال کی عمر تک جزو وقتی تعلیم کا انتظام کرنا طے پایا ہے۔ اعلیٰ ابتدائی

(Upper Primary) کے نصاب کی تکمیل کے بعد جو طلبا اپنے طبعی رجحان کے موافق عملی تعلیم کے خواہاں ہوں ان کے لیے فنی، صنعتی اور پیشہ ورانہ ادارے جیسے ٹکنیکل ہائی اسکول، انڈسٹریل ٹریننگ اسکول اور بعض جگہ زراعتی اسکول قائم ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی طرح ثانوی تعلیم کو بھی عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ثانوی (سکنڈری) اور اعلیٰ ثانوی (ہائیر سکنڈری) ثانوی تعلیم کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ جو طلبا اعلیٰ تعلیم کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کو جامعات میں داخلہ کے لیے تیار کیا جائے اور باقی طلبا کے لیے یا تو ان کے طبعی رجحانات کے مطابق فنی، صنعتی یا پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتیں مہیا کی جائیں یا ان کو ایسی تعلیم و تربیت دی جائے جو ان کے عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ان کے لیے مفید ثابت ہو۔ انگلستان میں ثانوی تعلیم پانے والے بچوں کی عمر 11 اور 12 سال سے 18 اور 19 سال تک ہوتی ہے اور ثانوی مدارس میں پبلک اسکول، گرامر اسکول اور ماڈرن اسکول کے علاوہ فنی اور پیشہ ورانہ اسکول بھی شامل ہوتے ہیں۔ پبلک اسکولوں میں 13 سے 18 سال اور دوسرے ثانوی اسکولوں میں 11 سے 18 سال کی عمر کے طالب علم شریک رہتے ہیں۔ جرمنی میں نصاب کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف اقسام کے ثانوی مدارس قائم ہیں یعنی پانچویں جماعت سے گیارہویں بارہویں اور تیرہویں جماعت کے ثانوی مدارس۔ سوویت روس میں 12 سے 18 سال کی عمر کے بچے ثانوی مدارس میں شریک رہتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں آٹھویں گریڈ کے بعد یا تو چار سال کے ثانوی مدارس ہوتے ہیں یا دو سال کے جونیر ہائی اسکول اور اس کے بعد دو سال کے سینیر ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ کالج ہوتے ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج، اعلیٰ تعلیم پانے کی صلاحیت رکھنے والے طلبا کو کسی کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے تیار کرتے ہیں اور باقی طلبا کے لیے فنی یا پیشہ ورانہ تعلیم کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔ جاپان اور سری لنکا میں بھی اسی قسم کے جونیر کالج موجود ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکا کی بعض ریاستوں میں طلبا چھ سال تحتانیہ مدارس میں اور اس کے بعد چھ سال ثانوی مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ ہندوستان میں ثانوی منزل آٹھویں، نویں اور دسویں جماعتوں پر اور اعلیٰ منزل گیارہویں اور بارہویں جماعتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ساتویں جماعت کے بعد طالب علم کسی ہائی اسکول میں امتحان سکنڈری اسکول سارٹیفکٹ یعنی دسویں جماعت کے سرکاری امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے ہائیر سکنڈری مدارس اور انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کالج کا مقصد طلبا کو محض یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے تیار کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو طالب علم اعلیٰ تعلیم پانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں ان کے لیے زراعت اور صنعت و حرفت کی تعلیم، دفتری امور (Secretarial Work) اور تربیت اساتذہ (Teacher Training) نیز طالبات کے لیے امور خانہ داری کی تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

تعلیم کی سب سے اونچی منزل اعلیٰ تعلیم ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبا میں انسانیت، رواداری اور خدمت خلق کے صفات کی تخلیق کی جائے۔ ان کی قوت استدلال کو ترقی دی جائے، ان کے خیالات میں بلندی پیدا کی جائے اور ان کو سچ کی تلاش کرنے اور تحقیقاتی کام کرنے کا موقع دیا جائے ۔ اعلیٰ تعلیم ماقبل سندی (Under Graduation)، سندی (Graduation)، مابعد سندی (Post Graduation) اور پیشہ ورانہ مطالعات (Professional Studies) شامل ہیں جنھیں اعلیٰ فنی اداروں مثلاً انسٹیٹوٹ آف ٹکنالوجی کو یونیورسٹی کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی میں شرکت کے وقت ہندوستان میں طلبا کی عمر عموماً 17 سال ہوتی ہے لیکن اکثر دوسرے ممالک جیسے انگلستان، جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکا اور سوویت روس میں 18 یا 19 سال سے کم نہیں ہوتی اور ان ممالک کے اکثر طلبا اسکول کی تعلیم کی تکمیل کے بعد یا تو کسی فنی، صنعتی یا پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرتے ہیں یا ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی مدت 3 سال سے 7 یا 8 سال تک مطلوبہ ڈپلوما یا ڈگری (سند) کے لحاظ سے ہوتی ہے۔

تعلیم نسواں (Woman Education): تعلیم نسواں کا مسئلہ زمانہ قدیم سے اس بنیادی سوال سے منسلک رہا ہے کہ سماج میں عورت کی حیثیت کیا ہے۔ بہت عرصہ تک یہ عقیدہ کار فرما رہا کہ فرد کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت کا دار و مدار اس کی جنسیت پر ہے اور یہ کہ عورت فطرتاً مرد کے مقابلہ میں ہر دو اعتبار سے کم تر ہے۔ اس طرح یہ مذہبی عقیدہ بھی رہا ہے کہ سماجی زندگی کے کاروبار میں عورتوں کو مردوں سے الگ رکھنا چاہیے۔ انہیں یکجا کرنے سے گناہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ لہٰذا عصر جدید میں جنسی مساوات یعنی عورت اور مرد کی برابری کے اصول کا تسلیم کیا جانا واقعی ایک بڑا سماجی انقلاب ہے۔ یہ دراصل ان تبدیلیوں کا رہین منت ہے جن کا آغاز یورپ کے صنعتی انقلاب کے نتیجہ کے طور پر طریق پیداوار میں ہوا اور زمانہ حال میں سائنس اور ٹکنالوجی کی لگاتار ترقی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی بدولت تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ صنعتی اور زرعی میدان میں جوں جوں جدید ٹکنالوجی کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے پیداواری کام میں عورتوں کی شمولیت ضروری ہوتی جا رہی ہے اور اسی قدر عورت اور مرد کی برابری کا اصول قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں بروئے کار آ رہا ہے۔ اب جو تعلیم نسواں پر اس قدر زور دیا جاتا ہے اس کی اصل وجہ بھی حقیقت ہے۔

ان ممالک کو چھوڑ کر جو صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں باقی تمام ملکوں میں بالعموم تعلیمی سہولتیں ناکافی ہیں اور اس وجہ سے آبادی میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب حقیر ہے اور خواندہ لوگوں میں عورتوں کی تعداد عموماً مردوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ چنانچہ ان ملکوں میں تعلیم بالغان اور علم مدارس کی تعلیم کے پروگرام میں عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کی طرف اب توجہ دی جانے لگی ہے۔ حقیقت کا احساس بڑھ رہا ہے کہ عورتوں کی تعلیم سے پورے سماج کو تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ بنانے میں زیادہ مدد ملے گی۔ اس لیے کہ عورت اپنے سارے خاندان کی تعلیم کی ضامن ہوگی، اپنے کنبہ والوں کی صحت اور خوراک کی مناسب دیکھ بھال کر کے ان کی کارکردگی میں اضافہ کرے گی نیز پیداواری عمل میں خود موثر حصہ لے کر قومی وسائل کو تقویت پہنچائے گی۔

نفسیات اور سائنس کی تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد اور عورت میں کوئی قابل لحاظ فرق نہیں ہے۔ عورت وہ تمام کام انجام دے سکتی ہے جو مرد کر سکتا ہے۔ چنانچہ اب بہت سے ممالک میں بہ شمول ہندوستان ان کے اپنے دستور اساسی کی رو سے مرد اور عورت کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ چاہے روزگار یا ملازمت کا معاملہ ہو یا تعلیمی اور تہذیبی مواقع کا، خواہ کسی سرکاری عہدہ کا سوال ہو یا قانون ساز ادارے میں نمایندگی کا مرد اور عورت کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ مگر آئین ضمانت کے باوجود اکثر ممالک میں عورت کو ان حقوق سے عملاً فائدہ اٹھانے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔

عورتوں کی تعلیم کے سلسلہ میں جو پروگرام مرتب کیے گئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ جن کا مقصد عورتوں میں ناخواندگی کو ختم کرنا ہے اور دوسرے وہ جو عورتوں کی آیندہ نسل کو تعلیم یافتہ بنانے پر زور دیتے ہیں۔ جن عورتوں کی عمر پندرہ اور پینتالیس سال کے درمیان ہے اور جنھیں یا تو تعلیم کے مواقع ملے نہیں یا اگر بچپن میں انھوں نے اسکول میں کچھ پڑھنا لکھنا سیکھا بھی تھا تو اب بھول گئی ہیں، ان کے لیے خواندگی کی مہم چلائی جا رہی ہے اور ایک معینہ مدت کے اندر انھیں تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسری طرف آئندہ نسل کو تعلیم یافتہ بنانے کی خاطر تمام لڑکیوں کے لیے مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ پہلا کام اسکول سے باہر بے ضابطہ تعلیم سے متعلق ہے اور دوسرا اسکول کی باضابطہ تعلیم کے زمرہ میں آتا ہے۔ بے ضابطہ تعلیم کی مہم میں عورتوں کی رضاکارانہ انجمنیں جو عورتوں کی فلاح و بہبود کے جملہ کاموں میں مصروف ہیں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ عورتوں کی خواندی کے پروگرام میں ایسی چیزیں شامل کی گئی ہیں جن کی ضرورت کا عورتوں کو خود احساس ہے۔ مثال کے طور پر غذا، بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت، صفائی اور حفظ صحت امور خانہ داری سے متعلق بعض مہارتیں اور ضروری سماجی رجحانات اور رویے وغیرہ ان کے نصاب تعلیم میں شامل ہیں۔

جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم کا تعلق ہے ان رکاوٹوں کو دور کیا جارہا ہے جو روایتاً اس کے راستہ میں حائل ہیں۔ ایک رکاوٹ سماجی تعصب ہے جو عام طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کو اگر مضر نہیں تو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس تعصب کو مٹانے کے لیے تمام ذرائع مواصلات مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار، سنیما وغیرہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لڑکیوں اور ان کے سرپرستی میں خود اعتمادی اور احساس سلامتی پیدا کرنے کے لیے مخلوط تعلیم کے اسکولوں میں لازمی طور پر چند استانیاں رکھی جا رہی ہیں۔ نادار سرپرستوں کی لڑکیوں کو تعلیمی فیس کی معافی کے ساتھ ساتھ کتابیں اور دوسرا تعلیمی سامان نیز لباس مفت فراہم کیا جا رہا ہے۔ اب بھی یہ تجویز ہے کہ گھر کے کام کی وجہ سے جو لڑکیاں اسکول میں پورے وقت حاضر نہیں رہ سکتیں ان کے لیے جز وقتی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔

ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی منزل پر بھی لڑکیوں کی تعلیم میں برابر ترقی ہو رہی ہے اور یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ کیا انھیں مخصوص قسم کے تکنیکی کاموں کے لیے تربیت دینی چاہیے۔ ترقی پذیر ملکوں میں یہ میلان پایا جاتا ہے کہ تہذیبی روایات کا خیال رکھتے ہوئے ہونہار لڑکیوں کو معلمی اور طب کے لیے خاص طور پر تیار کیا جائے۔ ویسے ان ملکوں میں بھی ترقی یافتہ ملکوں کی طرح تعلیم یافتہ خواتین قومی زندگی کے ہر شعبہ میں کام کر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

رہی ہیں۔ گو کہ علوم و فنون اور اعلیٰ پیشوں کے میدان میں مردوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے پھر بھی بعض خواتین نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں یوں تو عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ رہی ہیں لیکن وہاں بھی سماجی ضرورتوں کے پیش نظر عورتوں کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی کی طرف دھیان دیا جا رہا ہے۔

تعیدی: یہ لفظ عبادت سے بنا ہے جس کے معنی بندگی، پرستش، خصوص و تذلل کے ہیں (دیکھیے عبادات) تعید تفعیل کے وزن پر مصدر ہے اس کے معنی عبادت اور بندگی کرنا ہیں۔ تعیدی میں وائی نسبت لکھی ہوئی ہے اس لیے امر تعیدی اس حکم کو کہیں گے جو عبادت والا ہو۔ اصطلاحاً اس سے شریعت کے وہ احکام و اعمال مراد ہوتے ہیں جو اللہ و رسول کی جانب سے شروع ہیں اور ان میں قیاس اور عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس کے مقابلہ میں قیاسی نقلی اور غیر تعیدی وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔

تفاعلی تجزیہ (Functional Analysis): جدید سماجی علوم کی تاریخ میں سماج کی ساخت اور اس کے مختلف اجزاء اور اعضاء کے وظائف اور تعامل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ ساختی تفاعلی تجزیہ (Structural Functional Analysis) کی اصطلاح نسبتاً نئی ضرور ہے لیکن اس مشکل اصطلاح کے وجود سے پہلے بھی ہر زمانہ میں اس موضوع پر غور و فکر ہوتا رہا ہے۔ انتہائی سادہ اور عام معنوں میں ساختی تفاعلی تجزیہ سے مراد سماج کے سائنسی تجزیہ سے زیادہ اور کچھ نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ اس تجزیہ کی تحقیق کے طریقوں میں بہت زیادہ پیچیدگی اور گہرائی پیدا ہو گئی ہے اور متعدد سماجیات دانوں نے اس پر تحقیقات کی ہیں۔

آسان فہم الفاظ میں ساختی تفاعلی تجزیہ میں سماج کی ساخت اور اس کی عملی کارکردگی کے تعلق سے بعض بنیادی سوالات کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(1) جس سماجی ماحول کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اس میں وہ کون سی سماجی حقیقتیں یا سماجی نمونے نظر آ رہے ہیں جو سماجی عمل پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

(2) وہ کون سے سماجی حالات یا نتائج ہیں جو اس سماجی ماحول کے نتیجہ کے طور پر رونما ہوتے ہیں۔

(3) وہ کون سے سماجی طریق، سماجی عمل، سماجی نمونوں کی تبدیلیاں اور سماجی حالات ہیں جو کسی مخصوص متماثل سماجی ماحول میں ملتے ہیں۔

ان سوالات کے ذریعہ یہ پتہ چلتا ہے کہ سماجی ساخت اور اس کی عملی تشکیل میں کیا ربط اور رشتہ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیا کوئی خاص سماجی ساخت مخصوص سماجی اعمال کا سبب بنتی ہے یا پھر یہ کہ مخصوص سماجی اعمال کسی خاص سماجی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ساختی تفاعلی تجزیہ سے کسی سماج کی عملی صلاحیتوں سماجی تعلقات اور ان کے امکانات کا جائزہ لینے اور پتہ لگانے میں کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گوکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابھی طریقیاتی اعتبار سے تحقیق کا فن اس قدر پختہ نہیں ہو سکا ہے کہ تجزیہ کے موجودہ نظریوں کو پوری حد تک کامیاب کہا جا سکے۔ لیکن شماریات اور روزافزوں سائنسی تکنیک کی مدد سے ساختی تفاعلی تجزیہ میں اطمینان بخش پیش رفت جاری ہے۔ جس طرح حیاتیات میں جوزف وڈگر نے اس موضوع پر کامیاب تحقیقات کی ہیں اسی طرح رابرٹ مارٹن نے بیسویں صدی کے وسط میں سماجی ساخت اور اس کے تفاعلی تجزیہ کے مختلف پہلوؤں پر بڑی عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ اور اب سماجیات اور انسانیات دونوں علوم میں مختلف قسم کے سماجوں مثلاً قبائلی سماج زرعی سماج قبل از صنعتی سماج اور صنعتی سماج کے تفاعلی تجزیہ پر کافی تحقیق ہو رہی ہے۔ کسی سماجی ساخت کے مختلف اجزاء کے آپسی روابط اس کے مضمرات اور نتائج سے آگاہی نہ صرف بجائے خود ایک مفید سماجیاتی تحقیق ہے بلکہ اس کی مدد سے کسی سماج کی تبدیل پذیری کے امکانات اور اس کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے میں بھی مدد ملتی ہے۔ جس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جدید دور میں سماجی منصوبہ بندی اور سماجی ترقی کے متعینہ مقاصد کے حصول کے لیے حسب ضرورت نئے امتزاجات پیدا کر کے ساخت میں تبدیلی اور نتائج میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ جدید سماجیات میں اس تعلق سے معاشیات کی طرح سماجی نظام کے نئے ماڈل بنانے میں مدد لی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سماجی ماڈل کی تشکیل اور عمل آوری کے بغیر معاشی منصوبہ بندی بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اس اعتبار سے جدید سماجیاتی ادب میں ساختی تفاعلی تجزیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

تفتیش کوتوالی (Police Investigation) : اگر کوئی اطلاع

کسی جرم قابل دست اندازی کے ارتکاب کے متعلق کسی عہدہ دار منتظم تھانہ کو زبانی دی جائے تو وہ اطلاع دہندہ کا بیان خود قلم بند کرے گا یا اپنی نگرانی میں کسی سے قلم بند کرائے گا اور اطلاع دہندہ کو پڑھ کر سنانے کے بعد اس پر اپنے دستخط کرے گا اور تھانے کے روزنامچے عام میں اس کا خلاصہ اس اطلاع کے متعلق لکھا جائے گا۔ اگر کسی عہدہ دار منتظم تھانہ کو اس کے تھانہ کی حدود کے اندر کسی جرم ناقابل دست اندازی کے ارتکاب کی اطلاع دی جائے تو اس کو چاہیے کہ تھانے کے روزنامہ عام میں اس کا خلاصہ درج کرکے اطلاع دہندہ کو متعلقہ حاکم فوج داری کے پاس استغاثہ پیش کرنے کی ہدایت کرے اس عہدہ دار کو یہ یہ اختیار نہ ہوگا کہ متعلق حاکم فوج داری جس کا درجہ مجسٹریٹ درجہ اول یا درجہ دوم سے کم نہ ہو کے حکم کے بغیر اس جرم کی تفتیش کرے۔ کوئی عہدہ دار منتظم تھانہ اس ضلع یا دوسرے ضلع کے کسی منتظم تھانہ سے کسی مقام کی تلاشی کی درخواست ایسی حالت میں کرسکے گا جس میں کہ وہ خود ایسی تلاشی اپنے تھانے کی حدود میں کرسکتا وہ عہدہ دار کوتوالی جس سے ایسی درخواست کی جائے ضروری کارروائی کرے گا اور اگر شے مطلوبہ دستیاب ہو تو اس کو عہدہ دار کوتوالی جس نے تلاشی کی درخواست کی ہو کے پاس بھجوا دے گا۔ ہر عہدہ دار کوتوالی جو کسی جرم کی تفتیش کر رہا ہو ہر ایسے شخص کا جو مقدمہ کے واقعات اور حالات کا واقف معلوم ہو بلا حلف اظہار لے سکتا ہے اور وہ شخص جس سے سوال کیا جائے اس کا فرض ہوگا کہ ان جملہ سوالات کا جواب دے جو عہدہ دار مذکور دریافت کرے البتہ وہ شخص ان سوالات کے جوابات دینے کا پابند نہ ہوگا جس کی وجہ سے کوئی جرم فوج داری اس پر عائد ہوتا ہو۔ کوئی بیان جو عہدہ دار کوتوالی کے روبرو دیا جائے اور قلم بند کیا گیا ہو اس پر بیان دینے والے کے دستخط نہ لیے جائیں گے اور وہ بیان قابل ادخال شہادت نہ ہوگا۔ مگر شرط یہ ہے کہ جب کوئی ایسا شخص بطور گواہ عدالت میں پیش کیا جائے جس کا بیان عہدہ دار کوتوالی نے بھی پہلے قلم بند کیا ہو تو عدالت ملزم کی استدعا پر اس کے اس بیان کو دیکھ سکے گی جو اس نے عہدہ دار کوتوالی کے روبرو دیا ہو۔ قانوناً تفتیش مقدمہ کے دوران لیے گئے تمام شہادتی بیانات و دیگر جمع شدہ تحریری شہادتوں کی معقولات ملزم کو بنا کسی معاوضہ کے دی جائیں گی اور وہ بیان اس گواہ کے بیان کو جو وہ عدالت میں دے غلط ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔

کسی عہدہ دار کوتوالی کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ ملزم کو اس الزام سے متعلق کوئی ایسی ترغیب دے یا دھمکی دے یا وعدہ کرے جس سے الزام کی کارروائی کے متعلق اسے کسی فائدے کی امید ہوسکے۔ ہر حاکم فوج داری کو جو عہدہ دار کوتوالی نہ ہو اس کا مجاز ہوگا کہ ملزم کے کسی بیان یا اقبال کو قلم بند کرے جو اثناء تفتیش میں یا کسی وقت تحقیقات شروع ہونے کے بعد اس کے روبرو دیا جائے۔

جب کبھی یہ رائے قائم کرنے کی وجہ ہو کہ الزام معقول وجہ پر مبنی ہے اور ملزم کی گرفتاری سے چوبیس گھنٹے کے اندر تفتیش کی تکمیل نہیں ہوسکتی تو عہدہ دار کوتوالی منتظم تھانہ قریب ترین حاکم فوج داری کے پاس درخواست مہلت جس میں وجوہ مہلت بصراحت درج ہوں فوراً ارسال کرے گا اور وہ ملزم بھی بلاتوقف اندر میعاد چوبیس گھنٹے حاکم مذکور کے روبرو حاضر کیا جائے گا کہ کسی مناسب مدت کے لیے جس کی مجموعی میعاد پندرہ روز سے زیادہ نہ ہو رکھنے کی اجازت دے۔ اگر اس تفتیش کے بعد عہدہ دار کوتوالی منتظم تھانہ کو یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ حاکم فوج داری کے روبرو حاضر کرنے کے لیے کافی شہادت یا معقول وجہ نہیں ہے اور اگر وہ حراست میں ہو تو حاکم فوج داری مجاز کے روبرو حاضر ہونے کے لیے مچلکہ مع ضمانت جیسا کہ عہدہ دار تھانہ خیال کرے داخل کرنے پر رہا کر دیا جائے گا۔ اگر اس تفتیش کے بعد عہدہ دار منتظم تھانہ کو یہ باور کرنے کی معقول وجہ ہو کہ کافی شہادت یا معقول وجہ موجود ہے تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ ملزم کو حراست میں اس حاکم فوج داری کے پاس بھیج دے جو اس جرم کی سماعت کا مجاز ہو اور اگر وہ جرم قابل ضمانت ہو تو ملزم سے متعلقہ حاکم فوج داری کی عدالت میں تاریخ معینہ پر حاضر ہونے اور اگر کسی طور پر ہدایت نہ ہو تو روزانہ حاضر رہنے کے لیے ضمانت لے۔ جب کوئی عہدہ دار کوتوالی منتظم تھانہ کسی ملزم کو حاکم فوج داری کے پاس بھیجے تو اس شخص کے ساتھ ہر قسم کا برآمدہ ہتھیار اور شے بھی جو مجسٹریٹ کے روبرو پیش کرنا ضروری ہو روانہ کرے گا اور اپنی کارگزاری تفتیش کے متعلق کیس ڈائری بھی پیش کرے گا۔

جب کسی عہدہ دار کوتوالی منتظم تھانہ کو اس امر کی اطلاع پہنچے کہ کوئی شخص خودکشی کا مرتکب ہوا ہے یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے یا کسی جانور یا کسی حادثے سے ہلاک ہوا ہو یا ایسے حالات میں فوت ہوا ہو جس سے معقول شبہ پیدا ہوتا ہو کہ کسی شخص نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو تو اس کو لازم ہوگا کہ فوراً امر مذکور کی اطلاع اس حاکم فوج داری (مجسٹریٹ)

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کو دے جو قریب تر ہو۔ اور وجہ موت کی تحقیقات کا مجاز ہو اور خود مقام واقع پر جائے اور قرب و جوار کے دو سے زیادہ معتبر باشندوں کے روبرو مقدمے کی تفتیش کرے اور موت کے اسباب ظاہری کی نسبت ایک یادداشت مرتب کرے جس میں زخموں، مار، چوٹ کے نشانات کا اندراج ہو اور یہ صراحت ہو کہ کس طرح سے اور کس ہتھیار یا آلہ کے ذریعہ ان نشانات کا پیدا کیا جانا ظاہر ہوتا ہو ایسی یادداشت پر عہدہ دار کوتوالی اور وہ اشخاص مذکور یا ان میں اس قدر اشخاص جو اس یادداشت سے اتفاق کریں ان کے دستخط ثبت ہوکر حاکم فوج داری متعلقہ کے پاس بھیج دی جائے گی۔ اگر موت کی وجہ کی نسبت کچھ شبہ ہو تو عہدہ دار کوتوالی اس لاش کو سرکاری ڈاکٹر کے پاس جو قریب تر ہو اور جس کو حکومت نے اس کام کے لیے مقرر کیا ہو امتحان کے لیے بھیج دے گا۔

تفریط زر (Deflation): کسی معیشت میں جب معاشی سرگرمی کی سطح گر جاتی ہے تو اسے تفریط زر کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قومی آمدنی روزگار اور درآمد کی سطحیں بھی گرجاتی ہیں اور اجرتوں اور قیمتوں میں اضافہ کی رفتار بھی سست پڑ جاتی ہے۔ تفریط زر زری پالیسیوں کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً اگر مرکزی بینک شرح سود بڑھا کر زر کی رسد کم کردے۔ یہ مالیاتی پالیسیوں کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے مثلاً اگر براہ راست اور بالواسطہ ٹیکس بڑھا دیا جائے یا حکومت اپنے اخراجات میں کمی کردے۔ تفریط زر کا ایک مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ توازن ادائیگی کو بہتر بنایا جائے اس کے لیے اندرون ملک طلب کو کم کیا جائے۔ اس سے درآمدات کم ہوں گے۔ اور ضبط افراط (Disinflaion) کی مدد سے برآمد میں اضافہ کیا جائے۔

تقابلی تعلیم (Comparative Education): تجسس علم کی بنیاد ہے۔ مختلف ملکوں کے طریقۂ تعلیم میں اہل علم کی دلچسپی قدرتی ہے۔ کئی ملکوں کے طریقۂ تعلیم کا مقابلہ اسی دلچسپی سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اپنے ملک کے طریقۂ تعلیم کو بہتر بنانے کا خیال بھی اس دلچسپی کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں اسپارٹا کی ترقی اور طاقت کو دیکھ کر افلاطون کو وہاں کے طریقہ تعلیم میں دلچسپی پیدا ہوئی اور اس خیال سے کہ ایتھنز بھی اسی طرح ایک عظیم ریاست بن جائے اس نے اپنے ملک کے لیے تعلیم کا ایک نیا خاکہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقابلی تعلیم کی ابتدا بہت قدیم ہے۔ پھر بھی مجموعی اور منظم طور سے اس کا آغاز تقریباً 150 برس پہلے ہوا۔ اس کے ابتدائی محققین میں جولین ہوریس مین، میتھو آرنلڈ، سر لیوڈرک کلارک، نکولس ہنس وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔

شروع شروع میں یورپ کے ممالک اور خاص طور پر جرمنی کا دورہ کر کے وہاں کے طریقہ تعلیم امتیازی تعلیمی اداروں، تعلیمی ترقی وغیرہ کا مطالعہ تقابلی تعلیم کے ماہرین کا مقصد تھا۔ اور اسی غرض سے شروع کے دور میں ماہرین برطانیہ، امریکا اور دیگر ملکوں سے باہر بھیجے گئے۔ جو رپورٹیں لکھی گئیں ان میں تعلیم کے متعلق اہم اعداد و شمار پیش کیے گئے۔ لیکن جلد ہی ماہرین تقابلی تعلیم یہ محسوس کرنے لگے کہ محض اعداد و شمار کو مد نظر رکھ کر کوئی قابل وثوق نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے۔ تجربے کی بنا پر یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے کسی دوسرے ملک کی نقل کرنا ضروری نہیں کہ سود مند ہو۔ چونکہ ہر سماج کا طریقہ تعلیم وہاں کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت اور تاریخ و تمدن سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور تعلیمی اداروں کے اندرونی معاملات بیرونی سماج کے حالات سے منسلک ہیں۔ ان کو نظر انداز کر کے کسی ملک کے طریقہ تعلیم کا یا اس کے کسی اہم حصے کا دوسرے ملک میں اختیار کرنا بے معنی ہی نہیں نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

کچھ ماہرین نے کئی ملکوں کے طریقہ تعلیم کا تاریخی یا فلسفیانہ نقطہ نظر سے مطالعہ کیا اور ایسے اصول بنانے کی کوشش کی جو طریقہ تعلیم کی بنیاد کہلا سکیں۔ انگلستان کے ماہرین ایسے فلسفیانہ اصولوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ تعلیم کے دائرے میں اتنا ہی عملیتی اور تجربی (Pragmatic Empirical) ہے جتنا قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ ویسے بھی دنیا میں ایک ہی نظریۂ فکر و عمل (Ideology) کو ماننے والے ملکوں میں ایک ہی جیسا طریقہ تعلیم نہیں پایا جاتا ہے۔ تقابلی تعلیم کی وسعت اور اس کے مقاصد پر ماہرین میں اختلاف رائے ہے۔ مختلف اہم عناصر جیسے جغرافیہ، مذہب، زبان، سیاسی نظام وغیرہ طریقۂ تعلیم کی تشکیل کرتے ہیں، اس لیے ماہرین اپنی تحقیق اور مطالعہ کی مدد سے یہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح مذاہب یا اقتصادیات وغیرہ ملکوں میں تعلیم کو متاثر کرتے ہیں۔ کچھ مختلف ملکوں کے تعلیمی مسئلوں کا مطالعہ زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ جیسے زبان کا مسئلہ یا تعلیم بالغان یا تعلیم اور مساوات۔ لیکن اس نظریہ پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تعلیم کا کوئی مسئلہ ہی شاید ایسا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہو جو دو ملکوں میں ایک ہی شکل میں پایا جاتا ہو۔ نہ ہی کسی ایک مسئلے کو حل کرنے کا کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا ہے جس کو کسی ردو بدل کے بغیر کئی ملکوں میں کامیابی سے اختیار کیا جاسکے۔ کئی لوگوں نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ تعلیم کا فلاں مسئلہ ملک کے سامنے ہے اس پر اس ملک سے باہر کے ماہرین کی رائے کی کیا کوئی اہمیت ہے۔ ہمیں اپنے نظریہ سے دوسرے ملکوں میں مسئلے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ایک ملک میں لڑکے اور لڑکیوں کے لیے علاحدہ تعلیمی ادارے ہیں تو ہم اکثر فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں مشترکہ تعلیم ایک مسئلہ ہے اور اس پر رائے زنی کرتے ہیں اور کوئی حل پیش کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ کیا اس ملک کے لوگوں اور سرکار کی نظر میں بھی یہ ایک تعلیمی مسئلہ ہے یا نہیں۔

کسی ملک کی قومی زندگی سے تعلیمی مسئلوں کو علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تقابلی تعلیم کی تحقیق کے لیے ایک مکمل اور ہمہ گیر نظریہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی خیال سے علاقائی اور خطی طرز نظر اپروچ زیادہ جامع اور قابل وثوق تصور ہوئی ہے۔ کسی ایک علاقے کی تعلیمی ترقی اور نظام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ و تمدن، جغرافیائی اور مالی حالت، سیاسی اور معاشرتی زندگی وغیرہ کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تعلیم کے مسائل کی تحقیق تعلیم کے دائرے میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ماہرین کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً سیاسی رہنما منصوبہ بندی کے ماہرین (Planning Experts) وغیرہ وغیرہ۔ لازمی طور پر اس قسم کی تحقیق میں کئی مضامین کے ماہرین میں تال میل ہونا چاہئے۔ خاص طور پر ان لوگوں میں جو اعلیٰ معیار کی تحقیق کے خواہشمند ہیں۔ ایسے ماہرین کے لیے کسی مخصوص علاقے کی زبان جاننا وہاں کے ادب اور تاریخ کا مطالعہ کرنا اور وہاں تعلیمی دورہ پر جانا ضروری سا ہے۔ لیکن تقابلی تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے عام آدمی کے لیے یا بی. ایڈ اور ایم. ایڈ وغیرہ کے طلبا کے لیے اس مضمون پر دستیاب کتابوں اور رسالوں کو پڑھنا ہی کافی ہے۔

تقابلی تعلیم کی 150 سالہ تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) اپنے ملک میں نئی قسم کی درسگاہ مثلاً تربیت اساتذہ کے ادارے (Teachers Training) شروع کرنے کی غرض سے یا کسی ایسے ہی اور منشا سے دوسرے ملک میں وہاں کی نئی درسگاہوں یا نئی عملی باتوں کے مطالعہ کے لیے جانا یا اس پر رپورٹ وغیرہ پڑھنا۔ (2) بیسویں صدی میں اس مضمون کی اہمیت اس لیے بڑھی کہ کئی ملکوں کو پرائمری یا سیکنڈری تعلیم کو لازمی قرار دینے کا مسئلہ درپیش تھا۔ (3) تعلیم کی ہمہ گیر ترقی میں مختلف قسم کے اداروں کی کیا حقیقت اور اہمیت ہے اور تعلیم کی ایک منزل (Stage) کا دوسری منزل (Stage) سے کیا تعلق ہونا چاہئے۔ 1950 کے بعد اس قسم کے سوالوں کا حل نکالنا تقابلی تعلیم کا کام تھا۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ایسے سوالوں کے حل نکالنے میں کیا نظریے ہر دلعزیز اور قابل قبول ہو رہے تھے، اس پر روشنی ڈالی گئی۔ (4) 1960 کے بعد اس مضمون کا ایک اہم ترین مقصد یہ ہوگیا کہ ملک کے مختلف شعبوں میں جیسے مالی، سیاسی، ادبی وغیرہ جو قومی فیصلے کیے جارہے ہیں ان کے لیے تحقیق کے ذریعے ایسے تعلیمی مفروضہ (Data) مہیا کرنا جو سیاسی رہنما، منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission) وغیرہ کے لیے مفید ثابت ہوں۔

تقابلی تعلیم کو ایک علاحدہ مضمون مانتے ہوئے بھی اس کے ماہرین دوسرے مضامین سے نہ صرف استفادہ کرتے ہیں بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ قومی زندگی کے اہم ترین معاملوں میں فیصلہ کرتے وقت تعلیمی پہلو کو موجودہ دنیا میں کوئی ملک نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کسی مضمون مثلاً سائنس، ریاضی، مادری زبان وغیرہ میں مختلف ملکوں کے طلبا کی لیاقت کسی مخصوص عمر پر کتنی ہو جاتی ہے، طلبا دوسرے ملکوں کی بابت کیا رائے رکھتے ہیں، تاریخ اور دوسرے مضامین کی کتابوں میں ایک دوسرے ملک کی بابت بچوں کو کیا نظریہ پیش کیا جاتا ہے اور کیا تصویر پیش کی جاتی ہے، ایسے سوالوں کے لیے جواب تیار کرنا بھی اب تقابلی تعلیم کی تحقیق کا ایک اہم مقصد ہے۔ اس مضمون سے بین الاقوامی دوستانہ تعلقات کو بھی فروغ ہوتا ہے۔ اس مضمون پر جو ادب شائع ہوا ہے اس میں مندرجہ ذیل نام قابل ذکر ہیں۔ برطانیہ میں جے. اے. لائر، ایس، اے. جے. کنگ، برائن ہومز، امریکا میں آئی ایل کینڈل، جارج بیریڈے، آرنلڈ اینڈرسن وغیرہ وغیرہ۔ فرانس، جرمنی، روس، جاپان اور کئی دوسرے ملکوں میں تقابلی تعلیم کے مشہور مرکز ہیں اور کئی انجمنیں (Societies) قائم ہیں۔ اس مضمون کی ترقی کے لیے کئی ملکوں میں علاحدہ علاحدہ اور مشترکہ بھی کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ امریکا کی کمپریٹیو ایجوکیشن سوسائٹی (Comparative Education Society)، ہمبرگ (جرمنی) کی یونسکو انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن (UNESCO Institute of

(UNESCO پیرس میں یونسکو ہیڈ کوارٹرس Education، Headquarters) وغیرہ سے تقابلی تعلیم پر بہت اچھے معیار کے رسائل اور کتابیں شائع ہوتے ہیں۔

یونسکو (UNESCO) کی طرف سے World Surveys of Education وسیع پیمانے پر مرتب ہوئے ہیں۔ 1960 سے پیرس میں او.ای. سی. ڈی(OECD) یعنی آرگنائزیشن فار ایکونامک کوآپریشن اینڈ ڈولپ منٹ (Organisation for Economic Co-operation & Development) اور 1963 سے انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ (International Institute of Educational Planning) اور کونسل آف یورپ (Council of Europe) وغیرہ نے جو ادب شائع کیا ہے وہ بھی تقابلی تعلیم کے طلبا اور ماہرین کے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اس مضمون کے تین رسائل قابل ذکر ہیں۔ انگلینڈ سے کمپریٹو ایجوکیشن (Comparative Education) امریکا اور ہمبرگ (جرمنی) سے کمپریٹیو ایجوکیشن ریویو (Comparative Education Review) جو تین زبانوں میں چھپتا ہے۔ جاپان میں انگریزی زبان میں بھی اس مضمون پر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایران میں تبریز یونیورسٹی میں تقابلی تعلیم کا ایک مرکز ہے اور ایشیائی ملکوں کی تعلیم کے مطالعے کے لیے ایک سوسائٹی (Society) بنائی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں اور قریب قریب دوسرے ملکوں میں بی. ایڈ اور ایم. ایڈ اور دوسرے ایسے امتحانوں کے لیے لازمی یا اختیاری (Elective) مضمون کے طور پر تقابلی تعلیم موجود ہے۔

تقابلی سیاسیات (Comparative Politics): تقابلی طریقہ تحقیق اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ سائنس۔ کیوں کہ سائنس کا پہلا کام یہ ہے کہ کائنات کے حقائق و اشیاء کی ترتیب و زمرہ بندی کر کے ان کا باہم مقابلہ کرے۔ تقابلی طریقہ کا مقصد محض ترتیبی اسکیمیں یا انواع کی زمرہ بندی (Typologies) نہیں بلکہ ایسے مفید نظریات کا وضع کرنا ہے جن سے ان اشیاء اور حقائق کو سمجھنے میں مدد ملے۔ علم سیاسیات میں تقابلی طریقہ کوئی نیا نہیں بلکہ ارسطو کے زمانہ سے ہی پایا جاتا ہے۔

علم سیاسیات میں تقابلی سیاسیات کی حیثیت کسی علاحدہ شاخ یا ذیلی مضمون کی نہیں بلکہ ایک تحریک کی ہے جس کی غرض سیاسی نظریہ کو مالامال کرنا ہے۔ اس کی نشوونما اور ارتقاء دوسری عالمی جنگ سے قبل مروجہ "تقابلی حکومت" سے ہوئی جس کے اندر مغرب کی مختلف حکومتوں اور سیاسی نظاموں کا، مملکتی اداروں، ان کے ڈھانچوں، قانونی رشتوں اور دستوروں کا اس سرسری اور عام نوعیت کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اس کا خاص طریقہ تحقیق، تاریخی، رسمی اور قانونی تھا۔ اس کے لیے نظریہ سازی کی غرض سے نہ کوئی منظم تصوراتی نطاق اپنایا گیا تھا نہ مواد فراہم کرنے اور ان کے تجزیہ کی سائنسی تکنیکیں ہی استعمال کی گئی تھیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد "تقابلی سیاسیات" کی جس تحریک نے امریکا میں جنم لیا اس کے پیچھے گیبریل المنڈ کے بیان کے مطابق چار اہم اثرات کارفرما تھے: (1) غیر مغربی سیاسی نظاموں سے متعلق بڑی مقدار میں مواد کا اکٹھا ہونا، (2) غیر ممالک کی سیاسیات کے مطالعہ میں امریکا کے سلوکی علم سیاسیات کے تصورات اور منہاجیات کا بڑھتا ہوا استعمال، (3) کلچر اور ثقافت کے بارے میں بشریات، نفسیات اور تحلیل نفسی کے نظریات اور (4) تاریخی سماجیات اور سماجیاتی نظریہ کے تصورات اور معلومات۔ دوسرے لفظوں میں جنگ کے بعد سے تقابلی مطالعات محض مغرب کی قوی مملکتوں تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کی تجربی وسعت میں غیر مغربی سیاسی نظاموں کے عمیق مطالعہ اور مغربی سیاسیات کے ان پہلوؤں کے تجزیہ سے اضافہ ہوا جن کا اب تک مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ مثلاً سیاسی عمل، جماعتی سیاست، فشاری گروہ اور دوسرے سماجی عوامل وغیرہ۔ ساتھ ہی تقابلی سیاسی مطالعات کو زیادہ سے زیادہ منظم اور سائنسی بنانے کی کوشش کی گئی۔ مرتب تحلیلی مناہج اور مواد کی فراہمی اور تحلیل، تصور سازی اور تصدیق کے لیے خالص سائنسی کارروائیاں اور تکنیکیں اختیار کی گئیں۔ ان سماجی گروہوں، سماجی اداروں کے سیاسی رول پر خاص توجہ دی گئی جو سیاسی اقدار اور ادراکات سیاسی وفاداریوں اور تشخص کو تشکیل کرنے میں اہم حصہ لیتے ہیں۔ آخر میں سیاسی نظاموں کی تحلیل و تجزیہ اور دوسرے سماجی علوم سے مستعار لیے گئے نطاق ہائے فکر مثلاً ساختمانی عملیتی نظریہ یا مواصلاتی نظریہ کے تحت ان مسائل سے متعلق نئے سوالات اٹھائے گئے۔ خصوصاً سیاسی نظام کے فرائض (Functions)، ان وظیفوں کو ادا کرنے کے لیے متعلقہ ڈھانچوں یا اداروں (Structures or Institutions) کی صلاحیتوں بہ طور مجموعی سیاسی نظام کی کارکردگی، سیاسی تبدیلی کی ضرورت اور اس کی میکانکیت، سیاسی نظام کے استحکام اور سیاسی ترقی کے بارے میں تحقیقات کی گئیں۔

موجودہ تقابلی سیاسیات کے لٹریچر کو بڑے پیمانہ پر تین زمروں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(1) مغرب کے ترقی یافتہ سیاسی نظاموں کا مطالعہ (شمالی امریکا، مغربی یورپ)،

(2) مشرق کے اشتراکی سیاسی نظاموں کا مطالعہ (سوویت یونین، مشرقی یورپ، چین) اور

(3) "تیسری دنیا" کے تغیر پذیر سیاسی نظاموں کا مطالعہ۔ (ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا)۔ تقابلی سیاسیات کی سرخی کے تحت زیادہ تر لٹریچر ایسی کتابوں پر مشتمل ہے جو ان تینوں زمروں کے سیاسی نظاموں کا انفرادی طور پر تجزیہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد بڑا حصہ لٹریچر کا روایتی "تقابلی حکومتوں" کے دائرہ میں آتا ہے۔ یعنی حکومتوں اور ان کے اداروں کا رسمی، قانونی اور ادارہ جاتی طریقوں سے مطالعہ (ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے سیاسیات میں اسی روایت کی تدریس و تحقیق ہورہی ہے) اب رہ گیا سوال واقعی علمی سطح پر تقابلی تحقیق کا، تو یہ کام نسبتاً تھوڑا ہوا ہے۔ لیکن جو کچھ ہوا ہے اس کی نظری اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔

تقابلی مطالعات کو نظری اور علمی طریقہ سے فروغ دینے کی کوشش 1951 میں امریکی سوشل سائنس ریسرچ کونسل کے تحت گیبریل ایلمنڈ کی صدارت میں "تقابلی سیاسیات کی کمیٹی" کے قائم ہونے سے شروع ہوئی۔ 1960 میں گیبریل ایلمنڈ اور جیمس کولیمن کی مرتبہ کتاب "ترقی پذیر علاقوں کی سیاسیات" (The Politics of the Developing Countries) شائع ہوئی جس کے مقدمہ میں پہلی بار سیاسی نظام کا وظیفہ جاتی ماڈل (Functional Model) پیش کیا گیا۔ دوسری اہم کتاب ایلمنڈ اور جی۔پاویل کی "تقابلی سیاسیات کا ترقیاتی منہاج" (Politics: A Developmental Approach) 1966 میں شائع ہوئی جس میں ساختیاتی، وظیفہ جاتی ماڈل میں ترقیاتی ماڈل (Developmental Model) پیوست کیا گیا اور اس تحلیلی نطاق کا اتباع کرتے ہوئے شمالی امریکا اور مغربی یورپ میں سیکڑوں تجربی مطالعات پیش کیے گئے۔

گزشتہ چند برسوں میں تقابلی سیاسیات میں "ترقی" اور "جدیدکاری" کے موضوعات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ان دونوں تصورات کی اس قدر تعریفیں پائی جاتی ہیں اور ان کے معنی اتنے ہی ہیں جتنے کہ ان پر لکھنے والے۔ روپرٹ ایمرسن کی "سلطنت سے قوم تک" (1960) (From Empire to Nation) جو تاریخی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے، بہت مشہور ہوئی۔ خالص نظری تحلیل ڈیوڈ ایپٹر کی "جدیدکاری کی سیاسیات" (The Politics of Modernization) (1965) اور "سیاسی تبدیلی" (The Politics of Change) (1973) یا میرین لیوی کی "جدیدکاری اور سماجوں کی ساخت" (Modernization and the Structure of Societies) (1965) میں پائی جاتی ہے۔ سیاسی ترقی کے مسائل کا واضح ترین احاطہ پائی کی کتاب "سیاسی ترقی کے چند پہلو" (Aspects of Political Development) (1965) میں کیا گیا ہے۔ جس میں سیاسی نظام کے چند "بحرانوں" کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً تشخص، جواز، نفوذ، اشتراک اور یکجہتی کے بحران، جن کو کامیابی سے دور کرنے پر ہی اس کی رائے میں سیاسی ترقی ممکن ہوسکتی ہے۔ ان سارے نظریات کے اطلاق میں مغرب اور ایشیا میں بے شمار تحقیقات شائع ہوچکی ہیں۔

المختصر، سلوکی انقلاب کی طرح تقابلی انقلاب نے بھی سیاسیات کے علمی مطالعہ کو پروان چڑھانے میں بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ تقابلی سیاسیات کی وسعت میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے اور چوں کہ تقابلی طریقۂ علم سیاسیات کی تقریباً تمام شاخوں میں سرایت کرچکا ہے لہٰذا وہ دن دور نہیں جب سیاسی نظریہ اور تقابلی سیاسیات مترادف سمجھے جائیں گے۔

تقسیم آمدنی۔ کلاسکی نظریہ : کلاسکی معاشین کے نزدیک سماج کی مجموعی آمدنی سرمایہ داروں زمینداروں اور مزدوروں کے درمیان منافع لگان اور اجرت کی صورت میں تقسیم ہوتی ہے۔ آدم اسمتھ (Adam Smith) تقسیم کا زیادہ گہرا اور تفصیلی تجزیہ نہ کرسکا۔ اس کے نزدیک پیداوار محنت (Labour) کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے۔ مزدور کی محنت ان وسائل کی قدر (Value) میں اضافہ کرتی ہے جن پر وہ محنت صرف کرتا ہے۔ محنت کا کیا ہوا یہی اضافہ اجرت کے تعین کی بنیاد ہے۔ چونکہ سرمایہ دار مزدوروں کو اجرت دینے اور دوسرے وسائل اکٹھا کرنے میں سرمایہ لگاتا ہے اور کاروبار کی تنظیم کرتا ہے اس لیے اسے بھی صلہ ملتا ہے۔ یہ صلہ منافع (Profit) کہلاتا ہے جو مزدور کی محنت کی پیداوار میں سے ایک حصہ کے طور پر علیحدہ کرلیا جاتا ہے۔ شرح منافع کے تعین میں سرمایہ کی مجموعی مقدار کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ سماج کی ترقی کے ساتھ سرمایہ کی مقدار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر اس کے منافع اور استعمال کے مواقع رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے سماج کی ترقی کے ساتھ منافع کی شرح گھٹتی جاتی ہے۔ مسابقت (Competition) کا عمل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سماج میں منافع کی یکساں شرح قائم رکھتا ہے۔

تقسیم کی طرف توجہ کرنے اور اس کو اقتصاد سیاسی (Political Economy) کا اصل مسئلہ قرار دینے کا سہرا رکارڈو (Recardo) کے سر ہے۔ رکارڈو کے نظریہ تقسیم میں اس کے نظریہ لگان کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ زمین کی انفرادی ملکیت اور زرخیز زمینوں کی کم یابی (Scarcity) زمینداروں کے لیے یہ ممکن بنا دیتی ہے کہ وہ زمین کے استعمال کا لگان (Rent) وصول کریں۔ زمین کے مختلف خطوں کی زرخیزی مختلف ہوتی ہے۔ زمین کی پیداوار کی طلب انسانی آبادی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ طلب میں اضافہ نسبتاً کم زرخیز زمینوں کی کاشت بھی لازم کردیتا ہے۔ زیرکاشت زمینوں میں سے سب سے کم زرخیز زمین کی پوری پیداوار اس زمین پر کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت اور اس سرمایہ کار کے منافع میں صرف ہوجاتی ہے جو اس زمین کی کاشت پر لگایا گیا ہو۔ اس حاشیائی زمین (Marginal Land) سے کوئی لگان نہیں ملتا۔ اجرت کی نارمل (Normal) سطح ایسی ہوتی ہے جو مزدوروں کی گزر بسر کے لیے کافی ہو۔ حاشیائی زمین کی پیداوار میں سے اجرت کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ سرمایہ کا منافع قرار پاتا ہے۔ مسابقت کا عمل پوری معیشت میں منافع کی یکساں شرح قائم رکھتا ہے۔ نسبتاً زرخیز زمینوں اور حاشیائی زمین کی پیداوار کے درمیانی فرق کو زمیندار لگان کے طور پر وصول کرلیتا ہے۔ لگان (Rent) کے ظہور کا سبب زرخیز زمینوں کی کم یابی ہے۔ لگان کی مقدار زمینوں کی زرخیزی میں فرق سے متعین ہوتی ہے۔ سماج کی ترقی آبادی میں اضافہ اور طلب کے بڑھنے سے نسبتاً کم زرخیزی زمینیں زیرکاشت آتی جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں لگان میں اضافہ ہوتا ہے اور زمیندار طبقہ کی آمدنی اپنی مقدار اور مجموعی قومی پیداوار میں اپنے اضافی حصے دونوں کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے۔ اجرت کی شرح گزر بسر والی سطح (Subsistence Level) پر قائم رہتی ہے اور مجموعی قومی پیداوار میں مزدور طبقہ کا اضافی حصہ بھی کم و بیش اتنا ہی رہتا ہے جتنا پہلے تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ منافع کی شرح اور مجموعی قومی پیداوار میں سرمایہ دار طبقہ کا اضافی حصہ دونوں کم ہوتے جاتے ہیں۔

کلاسیکی نظریہ تقسیم کا جامع بیان جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) کے یہاں ملتا ہے اگرچہ یہ زیادہ تر رکارڈو کے تجزیہ پر مبنی ہے البتہ مل نے ان اسباب و عوامل کی نشاندہی کی ہے جو سماج کی ترقی کے ساتھ شرح منافع میں مسلسل کمی کے اس رجحان کا مقابلہ کرتے ہیں جس کا اثبات اسمتھ اور رکارڈو نے کیا ہے۔ دوسرے کلاسیکی ماہرین معاشیات کی طرح مل نے بھی سود کو نفع ہی ایک حصہ سمجھا ہے مگر اس نے سود اور منافع کے دوسرے عناصر اجرت تنظیم (Wages of Organisation) صلہ خطرانگیزی (Reward of Risk-bearing) اور خسارہ کی تلافی کرنے والے حصہ منافع کے درمیان واضح طور پر امتیاز کیا ہے۔

تقسیم دولت و آمدنی : معاشین جو دولت کی پیداوار مبادلہ اور صرف کا تجزیاتی مطالعہ کرکے اس سلسلے میں کارفرما قوانین کا انکشاف کرتے ہیں۔ شروع ہی سے دولت و آمدنی کی قسم میں بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ زمین اور دوسرے قدرتی وسائل کو اپنی محنت اور کاروباری جدو جہد کے ذریعہ معاشی اشیا اور خدمات (Economic Goods and Services) کی پیداوار میں استعمال کرکے انسان جو کچھ پیدا کرتا ہے اس کی تقسیم پیداواری عمل میں حصہ لینے والوں نیز سماج کے مختلف افراد اور طبقات کے درمیان کیوں کر عمل میں آئی ہے۔ معاشی ترقی کا عمل اس تقسیم کو کس طرح متاثر کرتا ہے اور خود یہ تقسیم معاشی ترقی کے عمل میں کیا حصہ لیتی ہے۔ ان موضوعات پر غور وفکر کا عمل عرصہ سے جاری ہے جس کے نتیجہ میں تقسیم کے بارے میں متعدد علمی نظریات سامنے آچکے ہیں۔ تقسیم دولت و آمدنی کے موضوع سے دلچسپی کا ایک اہم سبب یہ بھی رہا ہے کہ انسان کو سماجی انصاف کی تلاش میں اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ دولت اور آمدنی کی عدم مساوات کے پیچھے کارفرما معاشی اور سماجی عوامل کا پتہ لگایا جائے اور دیکھا جائے کہ عدم مساوات کے سماجی اور معاشی اثرات و نتائج کیا مرتب ہوتے ہیں۔ اس عدم مساوات میں کمی کرنے یا اس کو ختم کرنا کسی حد تک مفید اور مطلوب ہے اور ایسا کرنے کے وہ کون سے طریقے ہیں جو معاشی زندگی میں کارفرما اصول و قوانین سے ہم آہنگ ہوں۔ اس موضوع پر غور کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ ہم دولت اور آمدنی کے درمیان فرق کو سمجھ لیں۔ دولت (Wealth) سے مراد معاشی افادیت رکھنے والی اشیا و خدمات وسائل اور قوتوں کا وہ ذخیرہ (Stock) ہے جو کسی خاص وقت پر موجود ہو۔ جبکہ آمدنی (Income) سے مراد اشیا و خدمات کی وہ مقدار ہے جو کسی خاص مدت وقت کے اندر پیدا کی گئی ہو۔ دولت ایک ذخیرہ ہے اور آمدنی ایک بہاؤ (Flow)۔ دونوں تصورات کے درمیان گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی مقررہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وقت میں کسی خاص ملک میں معاشی اشیا و خدمات کی جو مقدار حاصل ہوتی ہے اس کے پیدا کرنے میں اس ذخیرہ دولت کو استعمال کرنا ہوتا ہے جو ملک کو میسر ہوتی ہے۔ دولت، آمدنی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دوسری طرف کسی مقررہ مقدت میں جو اشیا اور خدمات پیدا کی جاتی ہیں ان کا ایک بڑا حصہ اگرچہ اس مدت کے اندر صرف کر دیا جاتا ہے مگر عام طور پر ایک حصہ کو بچا کر اس ذخیرہ میں شامل کیا جاتا ہے جسے ہم دولت کہتے ہیں چنانچہ عام طور پر کسی خاص مدت مثلاً ایک سال کے آغاز میں دولت کا جو ذخیرہ ہوگا۔ اس میں دوران سال کچھ اضافہ ہو جائے گا اور سال کے آغاز کے مقابلہ میں سال کے آخر میں اس ذخیرہ میں کمی واقع ہو جائے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب سال بھر کا صرف سال بھر کی پیداوار سے زاید ہو۔

اگرچہ یہ سوال بھی خاصا اہم ہے کہ سماج میں دولت کی تقسیم کیوں کر عمل میں آتی ہے۔ ایک زمانہ میں ماہرین معاشیات اس کا جواب تلاش کرنے کی طرف خاصی توجہ دیتے تھے مگر زمانۂ حال میں اس کے بجائے توجہ کا مرکز یہ ہوگیا ہے کہ سماج میں آمدنی کی تقسیم کیوں کر عمل میں آتی ہے۔ اس تبدیلی کا سبب یہ ہے کہ پہلے دولت کی تقسیم میں میراث عطیہ اور غیر اکتسابی ذرائع کو زیادہ اہمیت حاصل تھی مگر اب سماج میں دولت کی تقسیم زیادہ تر آمدنی کی تقسیم کی تابع ہے۔ اس تبدیلی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اب دولت کی تقسیم پر علمی اور نظری بحثیں بھی کم ملتی ہیں اور اعداد و شمار بھی کم ملتے ہیں۔

جہاں تک آمدنی کی تقسیم کا تعلق ہے یہ اصطلاح جدید علم معاشیات میں تین مختلف مفہوم رکھتی ہے پہلا مفہوم یہ ہے کہ پیداوار کی تقسیم ان پیداواری عوامل میں آتی ہے جو عمل پیداوار میں حصہ لیتے ہیں۔ اس مفہوم کو ان الفاظ میں بھی ادا کیا جاتا ہے کہ پیداواری خدمات یا عوامل پیداوار کی قیمتوں کا تعین کس طرح ہوتا ہے۔ اس مفہوم کے تحت معاشین کی توجہ اس امر پر رہی ہے کہ اجرت سود منافع اور لگان کی شرحیں کیوں کر متعین ہوتی ہیں اور ان شرحوں میں تبدیلی کن اسباب کی بناء پر عمل میں آتی ہے۔

تقسیم آمدنی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سماج کے مختلف طبقات، زمینداروں سرمایہ داروں کاروباری جدوجہد کرنے والوں اور مزدوروں کی مجموعی آمدنیاں کس طرح متعین ہوتی ہیں اور مجموعی قومی آمدنی کی یہ تقسیم کن اسباب کی بنا پر بدلتی رہتی ہے۔ اس مفہوم کو ان الفاظ میں تقسیم کن اسباب کی بنا پر بدلتی رہتی ہے۔ اس مفہوم کو ان الفاظ میں بھی ادا کیا جاتا ہے کہ قومی آمدنی میں لگان سود منافع اور اجرت کے حصے کیوں کر متعین ہوتے ہیں اور ان کے اضافی حصص (Relative Shares) میں کمی بیشی کا سبب کیا ہوتا ہے۔

معاشین نے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ افراد اور خاندان کی آمدنیوں کی مقداریں کیسے متعین ہوتی ہیں اور کن اسباب و عوامل کے نتیجہ میں گھٹتی بڑھتی ہیں۔ تقسیم آمدنی کے اس مفہوم کے مطابق ان کی دلچسپی نہ ان کاموں (Functions) سے ہوتی ہے جن کے صلہ میں آمدنی حاصل ہو جیسا کہ پہلے مفہوم کے تحت ہے، بلکہ وہ آمدنی کی مقداروں کے اعتبار سے افراد اور خاندان کی درجہ بندی کرتے ہیں اور اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ پوری آبادی کی آمدنی کے اعتبار سے یہ درجہ بندی کن اسباب و عوامل کے نتیجہ میں بدلتی ہے۔

تقسیم محنت (Division of Labour): عمل پیداوار میں جب مزدور کسی حصہ یا شعبہ میں تخصیص حاصل کرلیتے ہیں تو یہ عمل تقسیم محنت کہلاتا ہے۔ آدم اسمتھ کے زمانے سے تقسیم محنت کو کفایت پیمانہ (Economics of Scale) کا مبدلہ اور مبادلی معیشت (Exchange Economy) کی ترقی کا بنیادی سبب قرار دیا جاتا رہا ہے۔ تقسیم محنت کا جو رخ آدم اسمتھ نے پن بنانے کے کارخانے میں دیکھا تھا وہ موجودہ دور کے موٹر سازی کے کارخانہ میں اپنے عروج پر پہنچ گیا ہے جہاں کسی ایک مزدور کا کام صرف ایک خاص قسم کی ڈھبریاں (Nuts) کسنے تک محدود رہتا ہے۔ آدم اسمتھ نے تقسیم محنت کے فائدے بھی گنائے ہیں۔ مثلاً اس سے ہنر میں اضافہ ہوتا ہے۔ تخصیص عمل کی وجہ سے کام میں تیز رفتاری آتی ہے۔ اور چونکہ مزدور ایک ہی صنعت میں ایک کام سے دوسرے کام اور دوسرے سے تیسرے میں منتقل نہیں ہوتے اس لیے وقت کی بڑی بچت ہوتی ہے۔ عام الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ تقسیم محنت ہی کی وجہ سے ہم موجودہ مبادلی معیشت تک قدم بڑھا سکتے ہیں۔ آج کوئی شخص بھی اپنی ضرورت کی ہر چیز خود نہیں بناتا بلکہ کسی ایک کام میں تخصیص کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً ایک شخص صرف ٹوپیاں بناتا ہے اور اپنی ضروریات کی بقیہ تمام چیزیں زر کے بدلے میں بازار سے خریدتا ہے جو دوسرے لوگوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ اس تخصیص کے عمل کو مزید آگے بڑھا کر تقسیم محنت کے فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تقلیل حاصل کا قانون (Law of Deminishing Return) :

اس قانون کے مطابق عملی پیداوار میں مختلف عاملین کو قائم رکھ کر اگر صرف ایک عامل پیداوار میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کرتے جائیں تو کل پیداوار تو بڑھے گی لیکن حاشیائی پیداوار گھٹتی جائے گی۔ اور پھر ایک نقطہ کے بعد کل پیداوار بھی گھٹنے لگے گی۔ اس قانون کا مفروضہ یہ ہے کہ متغیر عوامل (Variable Factors) کی اکائیاں مماثل ہیں۔ اور ٹکنالوجی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ چونکہ یہاں فرض یہ کیا جاتا ہے کہ کم از کم ایک عامل مستقل ہے اس لیے یہ مفروضہ صرف مختصر عرصہ کے لیے ہے اگرچہ اسے قانون کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ دنیا کی ٹکنالوجی کے بارے میں معاشین کا ایک دعوی ہے اگر ان مفروضہ حالات (متجانس داخلات (Homogeneous Inputs) اور قائم ٹکنالوجی) میں حاصل (Return) نہ گھٹے تو اس قانون کا اثر نہ ہوگا۔ منطقی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً مشینوں کی ایک خاص تعداد کو قائم رکھ کر اگر مزدوروں کی تعداد بتدریج بڑھائی جائے تو ایک نقطہ ایسا آجاتا ہے جب ایک مزدور اور بڑھا دیا جائے تو مزید پیداوار میں پہلے کے مقابلے میں کم اضافہ ہوگا اور اس کی آخری صورت میں یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قائم عامل (Fixed Factors) کے مقابلے میں تغیر پذیر (Variable) عامل میں اتنا اضافہ ہو کہ اس اضافہ سے کل پیداوار میں یا تو کوئی فرق نہ پڑے یا پھر کرنے لگے۔

تلخیصی رسائل خدمات (Abstracting Services) :

اشاریائی رسائل قارئین کو ان کی دلچسپی کے موضوع پر شائع مضامین کی محض نشاندہی کرتے ہیں۔ اس لیے ان میں کسی مضمون کی تفصیل میں مصنف، عنوان کے بعد مضمون کی کتابیاتی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ اس تفصیل کی مدد سے ہم اصل مضمون تک پہنچ سکتے ہیں۔ تلخیصی رسائل میں درج تلخیص ایک قدم آگے بڑھ کر مضمون کے ضروری نکتوں کو بھی بیان کرتی ہے۔ بقول کولیسن (Collision) عام طور پر تلخیص 50 سے لے کر 150 الفاظ تک کی ہوتی ہے۔ انھیں حدود میں رہتے ہوئے اس میں مضمون کے اساسی نکتے، انداز بیان، دلائل، بحث کے نتائج اور مضمون کا ماحصل سب کا احاطہ ہوتا ہے۔

تلخیص کے دو بنیادی مقاصد ہوتے ہیں۔ اول مضمون کے اختصار کو اس طور پر پیش کرنا کہ اس دائرہ مضمون میں دلچسپی رکھنے والے یہ فیصلہ کر سکیں کہ انھیں یہ مضمون پڑھنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ دوم تلخیص کے ذریعہ وہ اپنے دائرہ مضمون میں ہونے والی پیش رفت سے باخبر رہ سکیں۔ تلخیص قاری کے وقت کی بچت میں معاون ہوتی ہے۔

تلخیص کے متن میں دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصہ میں اشاریہ ہی کی طرح مصنف/مصنفین کے نام عنوان، مضمون اور پھر مضمون کی کتابیاتی تفصیل اس کے بعد دوسرے حصہ میں مضمون کی تلخیص۔ اپنے انداز تلخیص کے اعتبار سے تلخیص کی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ لیکن عام طور پر تلخیص دو قسم کی ہوتی ہیں۔ معلوماتی تلخیص (Informative) اور اشارتی تلخیص (Indicative)۔ جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے معلوماتی تلخیص میں مضمون کے بنیادی نکتے، دلائل، دلائل کی بنیاد، نفس مضمون کے نتائج اور ماحصل سب اس ڈھنگ سے پیش کیے جاتے ہیں کہ قاری تلخیص پڑھ کر ہی مضمون سے پوری طرح واقف ہوجائے جبکہ اشاراتی تلخیص مضمون کے اہم نکتوں کے بیان تک ہی محدود رہتی ہے۔

اشاراتی رسائل کے برعکس تلخیص کسی خاص مضمون یا موضوع تک ہی خود کو محدود رکھتی ہے کیونکہ اس کا مقصد اعلیٰ سطحی قارئین کی مدد ہے۔ اسی لیے اس میں اندراجات کی ترتیب بھی مضمون کے درجات کے مطابق یا موضوعاتی مدخل (Subject Heading) کے تحت کی جاتی ہے اور آخر میں مصنف اشاریہ درج ہوتا ہے۔

عام طور پر تلخیص کے لیے تلخیصی رسائل شائع ہوتے ہیں لیکن اصل مضمون کے ساتھ تلخیص شائع کرنے کا رواج بھی بہت عام ہے۔ ایسے رسائل مصنفین کو تلخیص تیار کرنے کے قواعد اپنے رسالہ میں شائع کرتے ہیں اور مصنفین سے توقع کرتے ہیں کہ وہ مضمون کے ساتھ اس کی تلخیص بھی بھیجیں گے۔ وہی تلخیص، مضمون شروع کرنے سے پہلے درج کی جاتی ہے۔

سائنسی علوم میں تجارتی خطوط پر شائع معروف رسالہ کیمیکل ابسٹریکٹ (Chemical Abstract) تلخیص ہے جو 1907 سے امریکا سے شائع ہورہا ہے۔ بین الاقوامی ایجنسیوں کے ذریعہ شائع تلخیصی رسائل میں انس انڈکس (INIS Index) اور ایگرس انڈکس (AGRIS Index) قابل ذکر ہیں۔ ہندستان سے انڈین سائنس ابسٹریکٹ انسڈاک (نئی دہلی) سے شائع ہوتا ہے۔ سماجی علوم میں معروف تلخیصی خدمات میں ہسٹوریکل ابسٹریکٹ، سائیکولوجیکل ابسٹریکٹ (امریکا)، سوشیالوجیکل ابسٹریکٹ قابل ذکر ہیں۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اردو میں نوائے ادب (ممبئی) میں ایک ضمیمہ مقالہ نما کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ تخصیصی رسائل کے بارے میں جانکاری کے لیے الرچ انٹرنیشنل پیریاڈیکل ڈائریکٹری (Ulrich's International Periodcials Directory) ایک قابل بھروسہ ماخذ ہے۔

تمدنی نفوذ یا انتشار (Cultural Diffusion): تمدنی نفوذ یا انتشار سے مراد کسی تمدن کے خاصوں کاایک تمدن سے دوسرے تمدن یا ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں منتقل ہونا ہے۔ تمدنی انتشار کا تصور نیا نہیں ہے۔ چنانچہ پانچویں صدی قبل مسیح میں بھی مشہور عالم مورخ ہیروڈوٹس نے تمدنی انتشار کی بے شمار مثالوں کو اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے۔ لیکن امریکا کی دریافت کے بعد تمدنی انتشار کا مسئلہ سماجی علوم کے ماہرین کے لیے بڑی اہمیت اور دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا زمانہ ارتقائی نظریہ کی مقبولیت کا زمانہ رہا ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس دور میں ارتقائی نظریہ اور تمدنی انتشار دونوں موضوعات پر مفکرین توجہ دیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایڈورٹائلر نے مختلف تمدنی خاصوں کے انتشار پر انتہائی عالمانہ مقالے لکھے ہیں۔ 1890 کے آس پاس یورپ اور امریکا میں ارتقائی نظریہ پر تنقیدیں شروع ہوئیں۔ چنانچہ امریکا میں فرانزبواز، فرانس میں گبرل تارد اور جرمنی میں فریڈرش راٹزل نے ارتقائی نظریہ پر سخت تنقیدیں کیں اور تمدنی انتشار کی اہمیت پر زور دیا۔ اسکینڈینیویا کے ماہرین علم الآثار قدیمہ نے بتایا کہ یورپ میں کانسہ کے دور میں یہاں کے تمدن پر مشرق اور بحیرۂ روم کے خطہ کے تمدنوں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس طرح اسکینڈے‌نیویا کے محققین نے تمدنی انتشار کے موضوع پر انتہائی تحقیقی مقالے پیش کیے۔ فرٹز گوبھر نے 1919 میں سب سے پہلے تمدنی انتشار کے نظریہ پر ایک باقاعدہ تحقیقی کتاب شائع کی جس کے بعد تمدنی انتشار کے موضوع پر تحقیقات کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہوگیا۔ امریکا کے علاوہ یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں محققین نے تمدنی انتشار اور اس کے تقابلی مطالعہ پر مواد جمع کرنا شروع کیا۔ سماجی اور تمدنی انسانیات نیز سماجیات میں تمدنی انتشار کو بہت اہمیت حاصل ہے اور یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زبان سے لے کر فکر اور تمدن کے ہر میدان میں انتشار کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔ ہندستان میں بعض مترجمین نے تمدنی انتشار کے لیے تمدنی نفوذ کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ اور یہ دونوں اصطلاحیں ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔

کسی بھی تمدن میں نئی ایجادات اور تمدنی انتشار کے سلسلے ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں اور ان دونوں کے ارتباط اور اضافہ سے کسی بھی تمدن کا اثاثہ بڑھتا رہتا ہے۔

اسی انتشار کی بدولت تہذیب و تمدن کا دامن وسیع ہوتا جاتا ہے۔ تمدنی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ انتشار فطری اور مثبت ہوتا ہے۔ لیکن ایک انتہا کو پہنچ کر سماج میں بدنظمی کو جنم دیتا ہے۔

تنسیخ حکم دیوالیہ: اگر عدالت کی رائے میں کسی قرض دار کو دیوالیہ قرار نہ دیا جانا چاہیے تھا یا اگر عدالت مطمئن ہوجائے کہ قرض دار کے جملہ قرض ادا ہوچکے ہیں تو قرض دار کی درخواست پر یا کسی اور شخص کی درخواست پر جسے قرض دار سے دلچسپی ہے یا عدالت اپنے طور پر حکم دیوالیہ کی منسوخی کا حکم دے سکے گی۔ اگر عدالت کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ اس قرض دار اور انھیں قرض خواہوں کے درمیان کسی اور عدالت میں درخواست دیوالیہ زیر تجویز ہے اور یہ کہ دوسری عدالت میں زیر دوران درخواست کے تجویز پر اس درخواست دیوالیہ کا خود بخود فیصلہ ہوجائے گا تو ایسی صورت میں عدالت حکم دیوالیہ کو منسوخ کر سکتی ہے یا اگر کارروائی دیوالیہ زیر دوران ہے تو اسے ملتوی کر سکتی ہے۔ اگر حکم دیوالیہ عدالت سے منسوخ کر دیا جائے تو حکم دیوالیہ کی منسوخی سے قبل قرض دار کی جو جائداد فروخت ہوئی ہے یا جو رقم قرض خواہوں کو ادا کی گئی ہے وہ قانوناً درست قرار پائے گی اور اس شرط کو پیش نظر رکھا جائے گا کہ قرض دار جو دیوالیہ قرار دیا گیا ہے اس کی جائداد اس شخص کی ملکیت قرار پائے جس کے متعلق عدالت فیصلہ کرے۔ تنسیخ حکم دیوالیہ کا ہر گزٹ میں شائع کیا جائے گا۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین (Palestine Liberation Organisation): تنظیم آزادیٔ فلسطین ایک ایسی تنظیم ہے جو فلسطین سے نکالے گئے پندرہ لاکھ سے زائد عربوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی تشکیل فلسطینی قومی کونسل کے ذریعہ 1964 میں عمل میں آئی۔ اسے عربوں اور فلسطینیوں کے متعدد گروپوں اور تنظیموں کے مابین رابطہ تنظیم (Co-ordination Organisation) کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا مقصد سرزمین فلسطین کو اسرائیل سے آزاد کرانا اور فلسطینیوں کی ایک آزاد و خودمختار حکومت قائم کرنا ہے۔ اس کی منتظمہ کا انتخاب فلسطین کونسل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے ڈیڑھ سو ممبران کرتے ہیں۔ جس میں فلسطینی فوجی اور شہری تنظیموں کے نمائندے بھی شامل ہیں۔ اس کا اجلاس کسی عرب ملک کی راجدھانی میں ہوتا ہے۔ 1969 سے تاحال اس تنظیم کے چیرمین الفتح کے قائد یاسر عرفات ہیں جو سب سے بڑی گوریلا تنظیم رہ چکی ہے۔ منظمہ میں یاسر عرفات کے علاوہ تین اور رکن "الفتح" کے ہیں اور دو ممبران صاعقہ کے ہیں جو شام کے زیر اثر ایک گوریلا تنظیم تھی۔ صاعقہ کے دو شعبے ہیں ایک "عوامی محاذ برائے آزادی فلسطین"، دوسرا "عوامی جمہوری محاذ" ان میں سے ہر ایک کارکن شامل ہے۔ اور پانچ دوسرے ارکان ہیں۔ ان کی مالی امداد کے لیے عرب ملکوں میں آباد فلسطینی باشندوں سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ نے اسے فلسطینیوں کی جائز حکومت کی حیثیت سے 1974 میں تسلیم کیا۔ 1971 میں پی ایل او کے جس گروپ کو نکال دیا گیا تھا وہ بیروت و لبنان میں منتقل ہوگئے تھے۔ 1982 میں جب اسرائیل نے ان پر حملہ کردیا تو وہ وہاں سے منتشر ہو کر مختلف عرب ممالک میں پھیل گئے خاص طور پر شام اور تونس میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ تنظیم اسرائیل کے خلاف دہشت انگیز کارروائیاں بھی کرتی رہی ہے لیکن 1993 میں اسرائیل کے ذریعہ اسے تسلیم کیے جانے اور غازہ پٹی اور مغربی کنارے کے علاقوں پر مشتمل فلسطینی خودمختار انتظامیہ کے وجود میں آجانے کے بعد اب وہ اس طرح کی سرگرمیوں سے دست کش ہوگئی ہے۔

تنظیم آزادی فلسطین (پی ایل او) کی داستان ادھوری رہے گی اگر اس میں حماس (اسلامی مزاحمتی تحریک) کا ذکر نہ کیا جائے۔ حماس اسرائیل کے خلاف ایک مزاحمتی تحریک ہے۔ اس کے بانی شیخ احمد یٰسین ہیں جنھوں نے اسے "حركته المغاومة الاسلاميه" کے نام سے 15/ دسمبر 1987 کو قائم تھا۔ حماس اسی کا مخفف ہے جس کے معنی اسلامی جذبۂ شجاعت و بہادری کے ہیں۔ شیخ احمد یٰسین مجسم مفلوج ہیں۔ ان کا صرف دل و دماغ اور زبان کام کرتی ہے اور وہ محض وھیل چیر پر ہی حرکت کرسکتے ہیں۔ انھوں نے فلسطین کے ہر گاؤں محلے اور مسجد کا دورہ کیا۔ لوگ انھیں کاندھوں پر اٹھا کر گھر گھر لے جاتے ہیں جہاں وہ اپنی قوت ایمانی اور شعلہ بیانی سے فلسطینیوں کے قلوب میں ایمانی غیرت و حمیت کا طوفان برپا کردیتے ہیں۔

حماس کا آغاز دراصل اس وقت ہوا جب 1967 کی جنگ کے بعد فلسطین میں اسرائیلی یہودیوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ 1967 سے 1976 تک اپنے پہلے مرحلے میں اس نے اپنے مرکز کو مستحکم کرنے، یہودیوں کے پیداکردہ معاشرتی بگاڑ کو درست کرنے اور عوام کے اندر اسلامی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 1976 سے 1981 تک کے اپنے دوسرے مرحلے میں اس نے اپنے مراکز کو پھیلانے اور اس کو مزید وسعت دینے اور ان اداروں میں فلسطینی اکثریت کے مضبوط رابطے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 1982 سے 1987 تک کے اپنے تیسرے مرحلے میں اس نے مختلف علاقوں میں اپنی شاخیں قائم کرنے اور فلسطینی نوجوانوں کو مزاحمتی کارروائیوں کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی تاکہ اسے ایک طاقت ور سیاسی تنظیم کی شکل دی جاسکے اور اسرائیلی قبضے اور اس کی فوج کے خلاف مسلح جہاد کا آغاز کیا جاسکے۔ 1987 سے 2001 تک اسرائیلی قبضہ کے خلاف اس کی مزاحمت جاری ہے۔ یہ تحریک 9/ دسمبر 1987 میں انتفاضہ تحریک کے وجود میں آنے کے بعد منظر عام پر آئی اور کہا جاتا ہے کہ انتفاضہ حماس ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

انتفاضہ کے لغوی معنی بیداری کے ہیں۔ یہ دراصل فلسطین کے مغربی کنارے کے علاقوں میں اسرائیلی قبضہ کے خلاف پرامن مزاحمت کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ہم پرامن تحریک مزاحمت برائے آزادی فلسطین کہہ سکتے ہیں۔ اس کا آغاز 9/ دسمبر 1987 کو اس وقت ہوا جب فلسطینی نوجوانوں کے ایک گروپ نے مغربی کنارے کے علاقہ میں گشتی فوجوں پر گھات لگا کر غلیلوں اور پتھروں سے حملہ کردیا۔ یہ حرکتیں کچھ دنوں تک جاری رہیں اور دھیرے دھیرے اس میں دوسرے نوجوان بھی شامل ہوتے گئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ مزاحمت مغربی کنارے کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔ ان پتھروں اور غلیلوں کا جواب اسرائیلی فوجوں نے خودکار اسلحوں سے دینا شروع کیا جس کے نتیجے میں سیکڑوں فلسطینی ہلاک اور زخمی ہوگئے اور پھر انتفاضہ کی یہ سرگرمیاں روز کا معمول بن گئیں۔ چنانچہ 1989 تک آٹھ سو (800) فلسطینی اور 44 یہودی ہلاک ہوگئے۔

اسرائیلیوں کا دعویٰ ہے کہ انتفاضہ کو پی ایل او نے قائم کیا تھا تاکہ اس کے ذریعہ فلسطین کے مقاصد کے حصول کے لیے عالمی رائے عامہ کی توجہ مبذول کرائی جائے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکیں اور اسرائیل کو امن و امان بحال رکھنے کے لیے طاقت کے استعمال کا جواز پیش کرنا مشکل ہوجائے۔ بہرحال انتفاضہ خواہ پی ایل او کی کوششوں کا نتیجہ ہو یا

حماس کی، اس سے پیدا شدہ حالات کا سامنا کرنے کے سلسلے میں اسرائیل کی بڑے پیانہ پر مذمت کی گئی۔ تشدد کا سب سے بدترین واقعہ اس وقت پیش آیا جب 8/ اکتوبر 1990 کو یروشلم کے مندر کے پاس 17 فلسطینیوں کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ چنانچہ اس مہینہ میں اقوام متحدہ نے متفقہ طور پر ایک تجویز پاس کی جس میں مقبوضہ غازہ پٹی اور مغربی کنارے کو "فلسطینی علاقہ" تسلیم کرلیا گیا اور عرب شہریوں کے ساتھ اسرائیلی برتاؤ کی پرزور الفاظ میں مذمت کی گئی۔

حماس کی مقبولیت اور نوجوانوں میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر اسرائیلی حکام خائف ہوگئے کیونکہ یہ ایک اسلام پسند گروپ تھا جس کے مقاصد میں عسکری مزاحمت کے لیے فلسطینیوں کو تیار کرنا، تمام شعبہ ہائے زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا اور حصول آزادی کے بعد فلسطین کو اسلامی فلاحی مملکت بنانا شامل تھا اور تحریک انتفاضہ دراصل اس کی پروردہ تھی جس نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا اس لیے انھوں نے حماس کے مقابلہ میں پی ایل او کے صدر یاسر عرفات کو غنیمت جانا اور نہایت خفیہ طور پر اوسلو (ناروے) میں یاسر عرفات کے ساتھ 1993 میں مذاکرات شروع کردیے۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں تنظیم آزادی فلسطین کی تاریخ میں ایک انقلابی موڑ اس وقت آیا جب 10/ دسمبر 1993 میں اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابین (Yitzhak Rabin) نے پی.ایل.او. کو فلسطینی عوام کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرلیا اور اس کے صدر یاسر عرفات نے دہشت گردی کو ترک کردینے اور اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ ان دونوں رہنماؤں کے درمیان واشنگٹن میں 1993 میں ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق غازہ پٹی اور جریکو (Jericho) کے علاقہ میں فلسطینیوں کی محدود خود مختار حکومت کا حق تسلیم کیا گیا۔ 9/ فروری 1994 میں اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز اور یاسر عرفات کے مابین مصر (غازہ پٹی اور جریکو) اردن سرحد عبور کرنے پر کنٹرول اور غازہ پٹی کے تینوں حصوں میں یہودی آبادکاروں کے تحفظ کے انتظام کی بابت ایک اور سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔

غازہ پٹی اور جریکو میں فلسطینیوں کی خودمختار انتظامیہ کے قیام کے پہلے مرحلہ کے لیے قاہرہ میں اسرائیل اور فلسطین کے مابین 4/ مئی 1994 کو ایک سمجھوتہ ہوا جس پر اسحاق رابین اور یاسر عرفات دونوں نے دستخط کیے۔ اسرائیل اور فلسطین نے واشنگٹن میں 28/ ستمبر 1995 کو ایک اور معاہدہ پر دستخط کیے جس میں طے پایا کہ فلسطین کے 7 بڑے قصبات میں سے چھ میں اور 460 چھوٹے قصبات اور دیہاتوں میں فلسطینی انتظامیہ کے انتخاب کے دوران اسرائیل اپنی فوجوں کو پھر سے تعینات کرے گا تاکہ انتخابات پرامن طریقے سے کرائے جاسکیں۔ اپریل 1996 میں 82 رکنی فلسطینی کونسل کے ممبران اور اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر (Head of the Executive Authority) کا انتخاب عمل میں آگیا۔ تاہم اس دوران سوائے چند مہینوں کے پورے مغربی کنارے پر مستقل اسرائیلی فوجیں تعینات رہیں۔ مغربی کنارہ اور غازہ پٹی کو مستقل حیثیت دینے کے لیے 1996 میں مذاکرات شروع ہوئے۔ ان میں 0.17 M مغربی کنارے اور 0.18 M مشرقی یروشلم میں آباد یہودیوں کی حیثیت، یروشلم کی حیثیت، فوجی جائے وقوع (Military Location) اور پانی سپلائی جیسے موضوعات زیربحث آئے۔ 4/ نومبر 1995 کو جب اسحاق رابین کا قتل ہوگیا تو اسرائیل فلسطین امن کوششوں کو نقصان پہنچا۔ اردن کے شاہ حسین کی کوششوں کے نتیجہ میں طے پانے والے ایک معاہدہ کے تحت جس پر 15/ جون 1997 کو اسرائیلی وزیراعظم اور فلسطینی صدر نے دستخط کیے، یہ شیڈول طے پایا کہ مغربی کنارے کے تمام علاقوں اور ہبرون کے 80% حصوں سے اسرائیلی فوجی دستوں کی واپسی کا عمل 28/ فروری 1996 اور 31/ اگست 1998 کے درمیان تین مرحلوں میں انجام پائے گا۔ فروری 1998 کو اسرائیل کی جانب سے مشرقی یروشلم میں نئی یہودی بستی بسانے کا ایک منصوبہ پیش کیا گیا جسے ایک فلسطینی مبصر نے امن کوششوں کے قتل سے تعبیر کیا۔ امریکی تجویز پر اکتوبر 1998 میں اسرائیل مغربی کنارہ سے 13.1% فیصد علاقہ کی واپسی کے لیے جسے وہ پہلے مسترد کرچکا تھا، تیار ہوگیا۔ اس تجویز پر ابھی 2% فیصد ہی عمل ہوپایا تھا اور 250 فلسطینی قیدی جیل سے رہا ہوپائے تھے کہ نیتن یاہو کی مخلوط حکومت گرگئی اور انتخاب کا اعلان ہوگیا اور بقیہ حصوں سے فوجوں کی واپسی اور فلسطینی انتظامیہ کو ان علاقوں کی حوالگی کا عمل انتخاب بعد تک کے لیے ملتوی کردیا گیا۔

معاہدہ اوسلو سے لے کر دیگر تمام اندرونی معاہدات جو یاسر عرفات اور اسرائیل کے درمیان اب تک ہوئے ہیں تقریباً سبھی ناکام ہوگئے ہیں۔ ان معاہدات اور فلسطینی خود مختار انتظامیہ کے باوجود غازہ پٹی کا ایک تہائی اور نصف سے زائد مغربی کنارے پر اب بھی اسرائیل کا قبضہ ہے اور وہ جب چاہتا ہے فلسطینی گزرگاہوں کو بند کردیتا ہے۔ اسرائیل کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس قبضہ کو ختم کرنے کے مطالبہ کی بنیاد پر اسرائیل اور فلسطینیوں کے مابین ستمبر 2000 سے تصادم پھر شروع ہوگیا ہے اور تحریک انتفاضہ نے پھر زور پکڑ لیا ہے اور 13/ مارچ 2001 تک 344 فلسطینی، 65 اسرائیلی اور 13 عرب باشندے مارے جاچکے ہیں۔ مختصراً یہ کہ پی ایل او میں اب وہ دم خم باقی نہیں رہا جو اس کے آغاز میں تھا۔

تنظیم اتحاد افریقی (Organization Of African Unity) (OAU):

25/ مئی 1963 کو افریقہ کے 32 سربراہان حکومت و مملکت نے عدیس ابابا میں منعقدہ ایک کانفرنس میں ایک منشور پر دستخط کرکے تنظیم اتحاد افریقہ قائم کی۔ آج 54 افریقی ممالک میں سے 53 ملک اس کے ممبر ہیں۔ مراکش ہی ایسا ملک ہے جو اس تنظیم کا رکن نہیں ہے کیوں کہ مغربی صحارا کو تنظیم میں شامل کرنے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے 1985 میں اس نے اپنے آپ کو اس تنظیم سے الگ کرلیا تھا۔ نومبر 1995 میں اس تنظیم نے ان کے واجبات ادا نہ کرنے کے سبب نو ملکوں کو رکنیت سے خارج کردیا تھا۔

تنظیم اتحاد افریقی کے مقاصد میں افریقی اتحاد و استحکام، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی، صحتی، سائنسی اور دفاعی پالیسیوں کے مابین تال میل، افریقہ سے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ، اقتدار اعلیٰ کا احترام، علاقائی سالمیت اور آزادی کا تحفظ شامل ہیں۔

تنظیم کے اعلیٰ ترین ادارے سربراہان مملکت کی سالانہ کانفرنسیں اور وزارتی کونسل ہیں۔ افریقی ملکوں کے درمیان ثالثی کے لیے ایک کمیشن عدیس ابابا میں 1964 سے قائم ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کمیشن بھی سرگرم کار ہیں۔ اس کا انتظامی ادارہ اس کا عام سکریٹریٹ ہے۔

تنظیم کا صدر مقام عدیس ابابا (اتھوپیا) ہے۔

تنظیم برائے اقتصادی تعاون و ترقی (Organization for Economic Cooperation and Development (OECD):

اس تنظیم کو 30/ ستمبر 1961 کو بیس ملکوں نے مل کر قائم کیا تھا۔ جسے یورپی اقتصادی تعاون کی تنظیم کے قائم مقام کی حیثیت سے وجود میں لایا گیا تھا اور جس کی تشکیل 1948 میں مارشل پلان کی تکمیل کے لیے عمل میں آئی تھی۔ آسٹریلیا، کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کی شمولیت سے اس تنظیم کی خالصتاً یورپی حیثیت ختم ہوگئی۔ موجودہ تنظیم کے مقاصد میں رکن ملکوں کی اقتصادی اور اجتماعی ترقی کو فروغ دینا، ان ملکوں کی جانب سے ترقی پذیر ملکوں کو اقتصادی امداد دلانا، لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنا، عالمی معیشت کو ترقی دینا، شامل ہیں۔

یہ تنظیم آسٹریلیا، آسٹریا، بلجیم، چیک جمہوریہ، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، یونان، ہنگری، آئس لینڈ، آئرلینڈ، اٹلی، جاپان، جمہوریہ کوریا، لکسمبرگ، میکسیکو، نیدرلینڈس، نیوزی لینڈ، ناروے، پولینڈ، پرتگال، اسپین، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ترکی، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا پر مشتمل ہے۔

اس تنظیم کا صدر مقام پیرس (فرانس) ہے۔

تنظیم برائے معاشی تعاون ممالک یورپ (Organisation for Europe Economic Co-Operation):

دوسری عالم گیر جنگ کے بعد جب یورپ سخت بدحالی کا شکار تھا تو امریکا نے معاشی امداد کا پیش کش کیا۔ چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے جولائی 1947 میں پیرس میں ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں مغربی یورپ کے ملکوں میں معاشی بحالی کے ایک پروگرام میں تال میل پیدا کرنے کے لیے یورپی ملکوں کی ایک کمیٹی برائے معاشی تعاون قائم کی گئی۔ اپریل 1948 میں یورپ کے سولہ ملکوں یعنی آسٹریا، بلجیم، ڈنمارک، فرانس، یونان، آئس لینڈ، اٹلی، لکومبرگ، نیدرلینڈ، ناروے، پرتگال، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ترکی اور برطانیہ نے ایک معاہدہ پر دستخط کیے۔ ان ملکوں کے علاوہ اس میں مغربی جرمنی پر قابض متحدہ ملکوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ اس معاہدہ کے تحت ہمہ جہتی تجارت کو فروغ دینا ہمہ جہتی ادائگی کا نظام قائم کرنا اور تجارتی پابندیوں کو کم کرنا طے پایا۔ اس کا فوری کام ان ملکوں کی معیشت کی بحالی کا منصوبہ بنانا اور اسے عملی شکل دینا تھا۔ جس کا مقصد امریکی امداد کی مناسب طریقہ پر تقسیم کا انتظام کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تجارتی پابندیوں کو بتدریج کم کیا گیا اور اس تنظیم برائے معاشی تعاون ممالک یورپ (O.E.E.C.) کی مدد سے ہمہ جہتی ادائگیوں کا انتظام کیا گیا۔ بعد کے برسوں میں سرمایہ اور مزدوروں کے آزادانہ طور پر ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخلہ کا راستہ پیدا کیا۔ اس ادارے نے "یورپی آزاد تجارت کا علاقہ" قائم کرنے اور یورپی معاشی کمیونٹی کا دوسرے ممبر ملکوں کے ساتھ

ربط پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ان میں یورپی ساجھا منڈی کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ 1961 تک جب مسائل بڑھ گئے تو تنظیم برائے معاشی تعاون ممالک یورپ (.O.E.E.C) کی جگہ تنظیم برائے معاشی تعاون و ترقی (.O.E.C.D) نے لے لی۔ یورپ کے پرانے ممبروں کے علاوہ اس میں امریکا اور کینیڈا بھی شریک ہوگئے۔

تنظیم ریاست ہائے امریکا (Organization of American States, OAS)

یہ تنظیم براعظم امریکا کی ایک علاقائی تنظیم کی حیثیت سے وجود میں آئی جسے ریاست ہائے امریکا کی نویں بین الاقوامی کانفرنس نے اپریل اور مئی 1948 میں کولمبیا کے شہر بوگوتا میں قائم کیا تھا۔ اسے اس تنظیم کی جگہ وجود میں لایا گیا جسے "بین الاقوامی دفتر برائے جمہوریہ ہائے امریکا" کے نام سے امریکی ریاستوں کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس نے 1890 میں قائم کیا تھا۔

اس تنظیم کے مقاصد میں شامل ہے کہ براعظم میں امن و تحفظ کو استحکام حاصل ہو، عدم مداخلت کے اصول کے احترام کی بنیاد پر نمائندہ جمہوریت کے استحکام کو فروغ ملے، رکن ریاستوں کے مابین تنازعات کے پرامن حل کا تیقن ہو، حملہ کی صورت میں مشترکہ عمل ہو، مشترکہ کوششوں سے اقتصادی، سماجی اور ثقافتی ترقی ممکن ہو اور اسلحہ جات کو موثر طریقوں سے محدود کر دیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ وسائل کو اقتصادی اور اجتماعی ترقی کے لیے استعمال کیا جاسکے، قانونی مسائل کو بین الاقوامی عدالت کے سپرد کرنے کے لیے قوانین مرتب کیے جائیں اور عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔

اس تنظیم میں اینٹی گوا اور باربوڈا، ارجنٹائنا، بہاما، بارباڈوس، بیلزے، بولیویا، برازیل، کینیڈا، چلی، کولمبیا، کوسٹاریکا، کیوبا، ڈومنکا، ڈومنکن جمہوریہ، ایکویڈر، سیلواڈور، غرناطہ، گوائٹے مالا، گیانا، ہیٹی، ہونڈورس، جمیکا، میکسیکو، نکاراگوا، پناما، پیرے گوے، پیرو، سینٹ کٹس، ویو، سینٹ لوسیا، سینٹ ویسٹ وگرینے ڈائنس، سری نام، ٹرینی ڈاڈ، ٹوبے گو، ریاست ہائے متحدہ امریکا، ارگوے اور وینیز ویلا شامل ہیں۔

اس کے مستقل مشاہدین بھی ہیں۔ اس کی رکنیت مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ ہر ممبر کو ایک ہی ووٹ کا حق حاصل ہے اور کسی ملک کو ویٹو کا حق حاصل نہیں ہے۔

تنظیم معاشی تعاون و ترقی (Organisation for Economic Co-Operation and Development-O.E.C.D.)

: یہ تنظیم 1961 میں یورپی معاشی تعاون (.O.E.E.C) کی جگہ قائم کی گئی۔ اس میں (.O.E.E.C) کے سولہ یورپی ممبروں کے علاوہ اسپین، امریکا اور کینیڈا بھی شریک ہوگئے۔ 1964 میں جاپان بھی رکن بن گیا۔ اس کے حسب ذیل تین اہم مقاصد تھے : (1) ممبر ملکوں کی معاشی ترقی، بڑھتے ہوئے روزگار، اور مالی استحکام کے کاموں کی ہمت افزائی کرنا (2) ممبر ملکوں میں سے مقابلتاً کم ترقی یافتہ ملکوں کی معاشی ترقی میں مدد دینا اور (3) دنیا کی ہمہ جہتی (Multilateral) تجارت کو وسعت دینے میں مدد کرنا۔ روزمرہ کے کام کے لیے اس تنظیم کا ایک سکریٹریٹ اور کمیٹیاں ہیں مثلاً معاشی پالیسی کی کمیٹی، سائنٹفک تحقیقاتی کمیٹی، تجارتی کمیٹی، ترقی کے لیے امداد کی کمیٹی وغیرہ۔ یہ تنظیم اپنے ممبر ملکوں کی معاشی سرگرمیوں کے اعداد و شمار شائع کرنے کے ساتھ ساتھ معاشی حالات اور امکانات کے بارے میں تبصرے بھی شائع کرتی ہے اور دنیا کے دوسرے اہم معاشی مسائل پر مواد پیش کرتی رہتی ہے۔ یہ اس تنظیم کی نوعیت صنعتی ملکوں کے لیے ایک اہم مرکز کی ہے۔ جہاں وہ بین الاقوامی زری مسائل اور ترقی یافتہ ملکوں کو مالی و تکنکل امداد مہیا کرنے کے مسائل پر تبادلہ خیال کرسکتے ہیں۔ کیمونسٹ اور سوشلسٹ ملک اس کے ممبر نہیں ہیں۔

تنظیم معاہدۂ جنوب مشرقی ایشیا (South East Asian Treaty Organisation, SEATO)

: یہ معاہدہ 8، ستمبر 1954 کو آٹھ ملکوں یعنی آسٹریلیا، فرانس، نیوزی لینڈ، پاکستان، فلپائن، تھائی لینڈ، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے مابین منیلا (فلپائن) میں عمل میں آیا تھا۔ اسی معاہدہ کے تحت جنوب مشرقی ایشیائی تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے رکن ملکوں نے یہ طے کیا کہ ان میں سے کسی بھی ریاست پر کسی بیرونی حملہ یا داخلی خلفشار کی صورت میں سبھی ملک اجتماعی طور سے کارروائی کریں گے۔ دراصل اس تنظیم کے مقاصد میں اقتصادی امور کے بجائے فوجی اور کیمونسٹ مخالف اقدامات پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ 1972 میں پاکستان اس سے علاحدہ ہو گیا۔ 1974 میں فرانس نے بھی اس کی فوجی سرگرمیوں سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اس لیے تنظیم کی وزارتی کونسل نے 1975 میں یہ فیصلہ کیا کہ اسے آئندہ دو برسوں میں باضابطہ طور سے ختم کر دیا جائے گا لیکن رکن ملکوں کے

وزرائے خارجہ سال میں ایک مرتبہ غیر رسمی صلاح و مشورہ کے لیے اجلاس کرتے رہیں گے۔ ویسے سرد جنگ کے خاتمہ کے آثار اور امریکا و چین کے تعلقات میں اعتدال آنے سے بھی سیٹو کی اہمیت میں کمی آگئی تھی اس لیے 1977 میں اس تنظیم کو شکست کر دیا گیا۔

سیٹو کا دفتر بنکاک میں واقع تھا جہاں اس کی کونسل اور سکریٹریٹ بھی موجود تھے۔

تنظیم معاہدۂ شمال اوقیانوس (North Atlantic Treaty Organziation, NATO)

تنظیم معاہدۂ شمال اوقیانوس (North Atlantic Treaty Organziation, NATO): 4/اپریل 1949 کو بلجیم، کینیڈا، ڈنمارک، فرانس، آئس لینڈ، اٹلی، لکسمبرگ، نیدر لینڈس، ناروے، پرتگال، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے وزرائے خارجہ نے معاہدۂ شمال اوقیانوس پر دستخط کرکے شمال اوقیانوس اتحاد قائم کیا۔ بعدازاں 1952 میں یونان اور ترکی، 1955 میں وفاقی جمہوریہ جرمنی، 1982 میں اسپین اور 1999 میں چیک جمہوریہ، ہنگری اور پولینڈ بھی اس میں شریک ہوگئے۔ اس طرح اب اس تنظیم میں 19 ارکان شامل ہیں۔

یہ اتحاد اقوام متحدہ کے منشور کی شرائط کے مطابق آزاد ملکوں کے دفاعی، سیاسی اور فوجی اتحاد کی شکل میں عمل میں آیا۔ یہ تنظیم، سیاسی، فوجی، اقتصادی، سائنسی اور دوسرے غیرفوجی معاملات میں تعاون اور مشورے کے ذریعہ اپنے رکن ملکوں کے لیے تحفظ فراہم کرتی ہے۔

1991 میں وارسا پیکٹ کے خاتمہ اور روس کے ساتھ تعلقات میں بہتری کے بعد ناٹو نے یورپ میں نئے حفاظتی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی ہیئت اور پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں کرلی ہیں۔ اس نے اتحاد کے سیاسی کردار کو مستحکم کرنے پر اپنی توجہ بطور خاص مرکوز کی ہے۔ اس تبدیلی کے پیش نظر وسطی اور مشرقی یورپ اور سابقہ سوویت یونین کی ریاستوں کے مابین حفاظتی روابط کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کی اہم کڑی شمال اوقیانوس تعاون کونسل (NACC) ہے جس کا قیام 1991 میں عمل میں آیا اور جو ناٹو کے نئے نظریے کا اہم حصہ ہے جسے اسی سال ریاستوں اور حکومتوں کے سربراہوں نے منظور کیا تھا۔

یہ تنظیم مشرقی بلاک کے خلاف مغربی طاقتوں کا سب سے بڑا اور طاقتور فوجی اتحاد ہے۔ اس کا صدر مقام بروسیلز (بلجیم) ہے۔

تنظیم معاہدۂ وسطیٰ (Central Treaty Organisation, CENTO)

تنظیم معاہدۂ وسطیٰ (Central Treaty Organisation, CENTO) : معاہدۂ وسطیٰ کی تنظیم مغربی ایشیا کے منطقہ میں ایک فوجی اور دفاعی تنظیم کی حیثیت سے عمل میں آئی جس میں ایران، ترکی، پاکستان اور برطانیہ شامل تھے۔ اور امریکا اس کی فوجی، اقتصادی اور تخریب کاری مخالف کمیٹیوں کا ممبر تھا۔ اس کا مقصد رکن ملکوں کی سلامتی اور دفاع کے لیے کوشش کرنا اور باہمی تعاون کے ذریعہ اس منطقہ کے ملکوں کی اقتصادی ترقی میں اضافہ کرنا تھا۔ اسے ریاست ہائے متحدہ امریکا اور مغربی طاقتوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ تنظیم دراصل معاہدۂ بغداد کی جانشین تھی جو مارچ 1959 میں عراق کی علاحدگی کے سبب کمزور ہوگئی تھی۔ عراقی انقلاب کے رونما ہوجانے کے بعد اس کا صدر دفتر بغداد سے انقرہ (ترکی) منتقل کر دیا گیا۔ انقرہ میں امریکا نے ایران اور پاکستان کے ساتھ فوجی اور اقتصادی تعاون کے لیے دو فریقی معاہدے کیے تھے۔

سینٹو کی وزارتی کونسل کا اجلاس ہر سال باری باری رکن ملکوں کی راجدھانیوں میں منعقد ہوتا تھا۔ اس میں وزرائے خارجہ یا سینئر کابینی وزراء شرکت کرتے تھے اور امریکا کا ایک مشاہد شرکت کرتا تھا۔ اس کونسل کی چار کمیٹیاں تھیں۔ (1) فوجی کمیٹی، (2) تخریب مخالف کمیٹی، (3) رابطہ کمیٹی اور (4) اقتصادی کمیٹی۔ انجام کار اس تنظیم کو 1979 میں شکست کردیا گیا۔

توازن طاقت

توازن طاقت: توازن (Balance) ایک عمل ہے، ایک نظریہ ہے اور پالیسی بھی۔ بطور ایک عمل کے اس کا وجود طبیعی اور حیاتیاتی نظاموں میں پایا جاتا ہے۔ یہاں سے قیاساً اس کا اطلاق میکانکی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تاریخی میدانوں میں کیا گیا۔ توازن سے مراد متعدد خودمختار اجزاء سے مرکب کسی نظام کا استحکام ہے۔ جب بھی کسی بیرونی طاقت کے دخول سے یا نظام کے اجزائے ترکیبی میں کسی اہم تبدیلی سے توازن بگڑ جاتا ہے تو وہ نظام تبدیلی پر قابو پاکر پرانے توازن کو بحال کرنے یا اس سے مطابقت پیدا کرکے نیا توازن قائم کرنے کے رجحان کا مظاہرہ کرتا ہے۔

توازن طاقت (Balance Power) کا سیاسی نظریہ اور پالیسی دو مفروضات پر قائم ہے:

(1) یہ کہ وہ اجزاء جنھیں ایک دوسرے سے متوازن کرنا ہے نظام کے وجود کے لیے ضروری ہیں، یا آزادانہ وجود کے حق دار ہیں اور

(2) یہ کہ اگر ان کے درمیان توازن قائم نہ کیا گیا تو ان میں سے کوئی ایک عنصر دوسروں پر حاوی ہوکر انھیں فنا کردے گا۔ چنانچہ توازن طاقت کا مقصد نظام کے عناصر ترکیبی کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے استحکام کو قائم رکھنا ہے۔ لیکن استحکام مقصود بالذات نہیں۔ کیوں کہ ایک طاقت کے دوسروں پر حاوی ہونے اور اپنا تسلط قائم کرنے سے بھی استحکام حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کا مقصد استحکام کے ساتھ اکائیوں کا آزادانہ وجود بھی قائم رکھنا ہے۔ بین الاقوامی سیاسی نظام میں توازن کا یہ تصور طبیعیات اور میکانیکیات کے اتباع میں یورپ میں سولھویں، سترھویں، اور اٹھارھویں صدیوں میں رائج ہوا۔ اس تصور کے مطابق بین لاقوامی نظام ایک میزان یا ترازو کے مانند ہے جس کے پلڑوں میں برابر برابر کا وزن ہے۔ جب کبھی کسی پلڑے کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے تو میزان بردار (Balancer) ردوبدل کرکے توازن کو درست کردیتا ہے۔

موجودہ بین الاقوامی نظام جو آزاد و خودمختار قومی و علاقائی اکائیوں پر مشتمل ہے، محض نظری اعتبار سے "نظام" ہے ورنہ اس کی واقعی ماہیت "نیم منظم نراج" کی یا "لامرکزی سماج" کی یا "طاقت کے نراجی نظام" کی ہے۔ جس میں ہر اکائی کی خصوصیت اس کا اندرونی و بیرونی اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) ہے اور بین الاقوامی سطح پر اس کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ خود اس کی اپنی قومی طاقت (National Power) ہے۔ اس نظام کی اکائیوں کے روابط کو کوئی مرکزی طاقت کنٹرول نہیں کرتی بلکہ ہر ایک اکائی "اپنی مدد آپ" کے اصول پر کام کرتی ہے۔ لیکن جب کوئی مرکزی طاقت ان کے روابط کو منضبط نہیں کرتی تو پھر کون سی طاقت اس نظام کو انتشار سے بچاتی ہے۔ ان اکائیوں اور ان کی برادری کی بقا و تحفظ کا روایتی وسیلہ "توازن طاقت" کا اصول ہے جو اس وقت سے کام کر رہا ہے جب سے مملکتی نظام کا وجود عمل میں آیا ہے بلکہ جو قدیم زمانہ میں بھی پایا جاتا تھا۔ توازن طاقت کا کلاسیکی نظام یورپ میں معاہدہ ویسٹ فیلیا (1648) سے 1914 تک قائم رہا۔ اس اصول نے تین صدیوں تک یورپ میں استحکام اور امن و امان قائم رکھا۔ انیسویں صدی کے دوران برطانیہ نے خصوصیت سے میزان بردار کا رول ادا کیا اور یورپ میں پانچوں بڑی طاقتوں کے درمیان توازن طاقت کا اصول نافذ رکھا۔

عظیم طاقتوں نے توازن طاقت کے حصول کے لیے موقع و محل کے لحاظ سے مندرجہ ذیل طریقے استعمال کیے:

(1) اتحادات اور جوابی اتحادات۔

(2) علاقہ کا حصول اور متنازعہ علاقوں کی مساویانہ حصہ کی تقسیم۔

(3) اسلحہ بندی اور ترک اسلحہ۔

(4) مداخلت اور عدم مداخلت۔

(5) حائل مملکتوں کا قیام۔

(6) تفرقہ ڈالنے اور حکمرانی کرنے کی پالیسی۔

(7) مخالف طاقتوں کے اتحادیوں کو توڑنا اور ان کی سیاسی و فوجی صلاحیت کو زائل کرنا وغیرہ۔

توازن طاقت کے متنوع نظریات اور مختلف تعبیرات پائی جاتی ہیں۔ تاہم بین الاقوامی روابط میں توازن طاقت کے عمل کے لازمی معنی یہ ہیں کہ "بین الاقوامی سطح پر مخالفتوں اور جوابی مخالفتوں کے ذریعہ کسی ایک ملک یا ممالک کے اتحاد کو اتنا طاقتور نہ ہونے دیا جائے کہ وہ دوسروں کے وجود یا سلامتی کے لیے خطرہ بن جائے۔" لیکن توازن طاقت کا مقصد محض نظری طور پر طاقت کی برابری قائم رکھنا ہے۔ عملاً اس کا نتیجہ نابرابری ہوتا ہے کیوں کہ ہر مملکت یا اتحاد اپنے حریف سے زیادہ طاقت ور ہونا اور توازن طاقت کو اپنے حق میں یا اپنی پوزیشن کے لیے سازگار دیکھنا چاہتی ہے۔ یہی "اقتدار کی سیاست" (Power Politics) کی جڑ ہے جس کی اخلاق پسندوں نے برائی کی ہے اور جس کی جگہ اجتماعی تحفظ اور بین الاقوامی تنظیم کا نظام قائم کرنے کی وکالت کی ہے۔ موجودہ دور میں تنظیم اقوام متحدہ اسی مقصد سے قائم ہوئی لیکن ناکام ثابت ہوئی۔ موجودہ توازن طاقت "توازن ہیبت" پر یعنی عظیم طاقتوں کے نیوکلیائی اسلحہ کی مانعی طاقت پر مبنی ہے۔

توضیح تلویح: صاحب شرح وقایہ صدرالشریعہ عبیداللہ بن مسعود حنفی م 747ھ الاصول کے نام سے حنفی فقہ کے اصول پر ایک مفید کتاب لکھی تھی۔ اس میں فخرالاسلام بزدوی (م 484ھ) کی توضیح پر تنبیہ بھی کی ہے اور اصول ابن حاجب وغیرہ کا خلاصہ کرکے اس پر اضافہ بھی کیا ہے۔ پھر التوضیح فی حل غوامض التنقیح کے نام سے خود ہی اس کی شرح بھی لکھی اور تنقیح کے نکات کو حل کیا۔ تنقیح کی اور بھی کئی شرحیں لکھی گئیں ان سب میں زیادہ عمدہ التلویح الی کشف حقائق التنقیح ہے جس کی اہمیت اور خوبی کی وجہ اس کے متعدد حواشی لکھے گئے۔ ملا حسن چلپی اور ملا محمد خسرو کے حواشی

زیادہ مشہور ہیں۔ یہ تینوں کتابیں حنفی فقہ کے اصول پر بہترین خیال کی جاتی ہیں اور عام طور پر مقبول و متداول ہیں۔ توضیح تلویح کے نام جو مجموعہ بعض مدارس عربیہ کے نصاب میں رائج ہے اس سے تنقیح کی بھی دونوں شرحیں مراد ہیں۔ ان میں اول الذکر توضیح خود مصنف ہی کے قلم سے ہے اور موخرالذکر تلویح مسعود بن عمر سعدالدین تفتازانی (م 791ھ) کی شرح ہے۔

توہین استحقاق و توہین مال (Scandal of Title and Goods): توہین استحقاق سے مراد کسی شخص کی کسی جائداد غیر منقولہ کی ملکیت کی بابت کوئی ایسا بیان کرے خواہ وہ تقریری ہو یا تحریری جس کی وجہ سے شخص مذکور کی ملکیت سے متعلق انکار ہو یا اس کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہوں۔

توہین مال سے مراد کسی تاجر یا صنعت کار کے مال و اسباب سے متعلق ایسی غلط بیانی کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نقلی یا گھٹیا ہیں جس کی وجہ سے خریدار اس مال یا اسباب کو خریدنے سے گریز کرے اس تاجر کو بیان کنندہ کے خلاف حق نالش ہوگا۔

لیکن اگر کوئی شخص صرف یہ بیان کرے کہ اس کی دکان کا مال دنیا میں سب سے بہتر ہے تو ایسا بیان دوسرے دکان داروں کے مال کی توہین میں داخل نہ ہوگا۔

ہر دو اقسام کی توہین کی صورت میں نقصان اٹھانے والا حکم امتناعی و ہرجانہ پانے کا مستحق ہوگا۔

تیسری دنیا: تیسری دنیا سے مراد افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکا کے پس ماندہ ممالک سے ہے۔ پہلی دنیا سے مراد ریاست ہائے متحدہ، کینیڈا، مغربی یورپ اور جاپان کی خوشحال ترقی یافتہ صنعتی دنیا ہے۔ "دوسری دنیا" سے مراد سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ترقی یافتہ کمیونسٹ ممالک ہیں۔ جنھوں نے صنعتی ترقی میں حصہ لیا اور مغرب کے برابر ہوتے جارہے ہیں۔ "تیسری دنیا" کی اصطلاح کچھ غیر متعین سی ہے۔ اس کا استعمال اصلاً ان نوآزاد ملکوں کے لیے کیا گیا جنھوں نے مشرق و مغرب کی سرد جنگ میں خود کو کمیونسٹ یا کمیونسٹ مخالف بلاک سے وابستہ کرنے سے انکار کیا۔

یہ ناوابستہ ممالک سطح ارض کے 50 سے 60 فیصد علاقہ کو محیط ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی دنیا کی کل آبادی کا 30 فیصد ہے۔ ان میں سے بیشتر ممالک دوسری عالمی جنگ تک برطانیہ، فرانس، اطالیہ، بلجیم اور ہالینڈ کی نوآبادیاں تھیں۔ ان ملکوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ اقتصادی اور سماجی طور پر پس ماندہ، صنعتی طور پر غیر ترقی یافتہ، زراعتی ملک ہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر ملکوں کی حکومتیں جدید کاری کے راستہ پر گامزن ہیں تاہم ان ملکوں کی معیشت، سماج اور انتظام پر ابھی تک استعماری استحصال اور سامراجی تسلط کے اثرات باقی ہیں۔ چند کے سوا یہ افریشیائی ممالک آسانی سے حاصل ہونے والے قدرتی وسائل خصوصاً ایندھن اور طاقت کے سستے وسائل سے محروم ہیں۔ یورپ اور امریکا کی ٹھنڈی اور معتدل آب و ہوا کے برخلاف یہاں سردی اور گرمی کی انتہا پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک ملک میں شرح پیدائش زیادہ ہے اور آبادی تیزی سے بڑھنے کے ساتھ ساتھ معیار زندگی میں کوئی بہتری نہیں آئی ہے۔ یہاں کے عوام کا مقدر افلاس، بیماری، گندگی، بے روزگاری اور قبل از وقت موت ہے۔ جبکہ حکمراں طبقہ کی اقلیت اعلیٰ معیار زندگی سے سرفراز ہوتی ہے۔ لیکن ان ملکوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی حکومتیں حددرجہ قوم پرست ہیں اور سیاسی آزادی اور اقتصادی حق خوداختیاری کو انتہائی اہمیت دیتی ہیں۔

ان ملکوں نے بین الاقوامی سطح پر سرد جنگ اور طاقتی بلاکوں کی سیاست کے دور میں خاصی اہمیت حاصل کی۔ عالمی برتری کے حصول کی غرض سے ہر فریق نے تیسری دنیا کو جیتنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے کچھ نے بڑی طاقتوں سے وابستہ ہونے سے انکار کیا۔ کچھ نے علاقائی اور بین الاقوامی سیاست میں سرگرم آزادانہ رول اختیار کیا۔ بعضوں نے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے متصادم کرکے اپنے مفادات کی تکمیل کرنی چاہی۔ کچھ ملک بظاہر ناوابستہ رہتے ہوئے مغرب نواز رہے اور کچھ دوسرے کمیونسٹ نواز۔ لیکن ان سب کی مشترکہ صفت یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی عظیم ترین طاقت کے بلاک سے رسمی وابستگی سے پرہیز کیا اور وہ بڑی حد تک اپنی آزادی کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ ناوابستگان کا وجود برقرار رکھنے میں توازن ہیئت کی نئی صورت حال کا کچھ کم دخل نہیں تھا۔

تیسری دنیا کے ممالک کے لیے ترقی پذیر یا غیر ترقی یافتہ ملکوں کی اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ط

ٹارٹ (Tort): عام اصول (General Principles) ٹارٹ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے اور ٹارٹ کے معنی ضرر کے ہیں۔ لیکن قانونی اصطلاح میں ہر فعل جس سے ضرر پہنچے ٹارٹ نہیں ہو سکتا۔ ٹارٹ اس مخصوص فعل کو کہتے ہیں جس سے کسی قانونی حق میں مداخلت ہوتی ہے۔ قانون نے ہر شہری کو کچھ حقوق عطا کیے ہیں۔ جس سے اس کے جان و مال، صحت و عافیت اور اس کی آزادی و حیثیت عرفی وغیرہ کی حفاظت ہو اور ان حقوق کے تحفظ کے لیے دوسروں پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ ماسوائے اس کے کہ ایسی مداخلت کا کوئی قانونی جواز ہو یا اس کی کوئی ایسی معقول وجہ ہو جس کو قانون تسلیم کرے۔

جب کبھی کسی شخص کے قانونی حق یا حقوق میں بے جا مداخلت ہو تو وہ اس مداخلت کنندہ کے خلاف عدالت مجاز میں دعویٰ دائر کر کے ہرجانہ پانے کا مستحق ہوگا۔ ہرجانہ ٹارٹ کا چارہ کار ہے۔ جس کی مقدار کی تشخیص عدالت کے اختیار میں ہے۔ ٹارٹ کی بنائے نالش حاصل ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ مدعی کو کوئی ضرر یا نقصان پہنچے۔ اگر مدعی کو کسی قانونی حق میں مدعاعلیہ نے بے جا طور پر مداخلت کی ہو تو یہ کافی ہے۔ ٹارٹ اور جرم میں فرق کرنا بھی ضروری ہے۔ ٹارٹ سے دیوانی نالش کا حق پیدا ہوتا ہے اور جرم سے مجرم سزا پانے کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ دیگر یہ کہ کسی جرم کے ارتکاب کے لیے نیت مجرمانہ ضروری ہے۔ برخلاف اس کے ٹارٹ کے لیے کسی خاص نیت یا وجہ تحریک کی ضرورت نہیں۔ اگر مدعاعلیہ نیک نیتی کے تحت بھی مدعی کے کسی قانونی حق میں مداخلت کرے تو وہ ٹارٹ کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ ٹارٹ کی نالش کا حق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے قانونی حق میں مداخلت ہوئی ہو برخلاف اس کے جرم کے ارتکاب سے عوام کو بھی حق نالش پیدا ہوتا ہے اور عوام کی جانب سے مجرم کے خلاف عدالت فوج داری میں پولیس مقدمہ دائر کرتی ہے۔ ٹارٹ کا تعلق دیوانی قانون سے ہے اور جرم کا تعلق فوج داری قانون سے۔

ٹارٹ اور نقض معاہدہ میں بھی فرق کرنا چاہیے اگرچہ ٹارٹ اور نقض معاہدہ میں بعض امور مشابہ ہیں۔ مثلاً دونوں کا تعلق دیوانی قانون سے ہے اور دونوں میں کسی خانگی شخص کے حق یا حقوق میں مداخلت ہوتی ہے اور دونوں کا چارہ کار ہرجانہ ہے لیکن ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

ٹارٹ ان حقوق میں مداخلت کا نام ہے جو ہم کو قانون سے حاصل ہیں برخلاف اس کے نقض معاہدہ ان حقوق سے محروم کرنے کا نام ہے جو معاہدے کے فریقین کو باہمی سمجھوتہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگرچہ دونوں قسم کے افعال کا چارہ کار ہرجانہ ہے لیکن نقض معاہدہ کی صورت میں عدالت نقصان اٹھانے والے کو ہرجانہ دلواتی ہے یعنی صرف وہی ہرجانہ جس کا فریقین نے بوقت معاہدہ تعین کرلیا ہو۔ اگر تعین نہ کیا گیا ہو تو عدالت اپنے صوابدید پر چند اصول کے تحت معقول ہرجانہ دلوائے گی۔ برعکس اس کے ٹارٹ کے دعوے میں ہرجانہ غیر معینہ ہوتا ہے اور اس کی تشخیص عدالت کرتی ہے جس کے لیے کوئی مخصوص قواعد قانون میں مدون نہیں کیے گئے ہیں اور اس کا اختیار ہر مقدمہ کی نوعیت پر ہوتا ہے۔

ٹارٹ کی بابت حسب ذیل اشخاص دعویٰ نہیں کرسکتے۔

(1) دشمن کی رعایا یعنی ایسے ملک کے شہری جس کے لیے حکومت سے اجازت حاصل کرے۔

(2) مجرمین جن کو موت کی سزا دی گئی ہو یا ایسی سزائے قید دی گئی ہو جس کی وجہ سے ان کا مال و جائداد بحق سرکار ضبط کر لیے گئے ہوں ایسے مال و جائداد کی نسبت اگر کسی ٹارٹ کا ارتکاب ہوا ہو تو خود مجرم اس کی بابت نالش نہیں کرسکتا۔ البتہ ایسے ٹارٹ کی بابت کرسکتا ہے جن کا تعلق جسمانی ضرر سے ہو۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(3) دیوالیہ اپنی جائداد کے ٹارٹ کے متعلق دعویٰ نہیں کرسکتا لیکن جسمانی ضرر سے متعلق حقوق کی بابت کرسکتا ہے۔

اسی طرح ٹارٹ کی بابت بعض اشخاص کے خلاف ہرجانہ کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔

(1) اپنے یا غیر ملک کے بادشاہ یا صدر مملکت کے خلاف یا سفیر یا ان کے خاندان یا عہدہ داروں کے خلاف بجز اس کے کہ وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے فریق مقدمہ بننا منظور کرلیں۔

(2) کارپوریشن کے مقابلہ میں ہرجانہ کا دعویٰ صرف اس صورت میں ہوسکے گا جب وہ فعل یا ترک فعل جو ٹارٹ کی تعریف میں آتا ہے کارپوریشن کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ میں ہو لیکن اگر ٹارٹ کا ارتکاب ایسے کام کے اثنا میں کیا گیا ہو جو کارپوریشن کے اغراض و مقاصد میں داخل نہ ہوں تو کارپوریشن کے مقابلہ میں دعویٰ نہیں ہوسکے گا۔ بلکہ ان عہدہ داران یا اشخاص کے خلاف ہوگا جنھوں نے اس کام کی اجازت دی ہو یا جنھوں نے اس کا ارتکاب کیا ہو۔

جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے ٹارٹ ایسے فعل یا ترک فعل کا نام ہے جس کا کوئی قانونی جواز نہ ہو اور جس سے کسی دوسرے شخص کے قانونی حقوق میں مداخلت ہو۔ خواہ اس شخص کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے اگر ایسے فعل یا ترک فعل کا کوئی قانونی جواز ہو تو اس کی بابت ہرجانہ کی نالش نہیں ہوسکتی، نہ ایسے فعل یا ترک فعل کی بابت ہوسکتی ہے جو دوسرے فریق کی مرضی سے کیا گیا ہو یا ایسا فعل جو محض اتفاقی یا ناگزیر ہو۔

ٹارٹ کا ارتکاب نیابتانہ بھی ہوسکتا ہے۔ نیابتانہ ذمہ داری ایسی ذمہ داری کو کہتے ہیں جو کسی شخص پر اس کے ہی فعل یا ترک فعل سے عاید نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کے فعل یا ترک فعل سے جو قانوناً ناجائز ہوں عاید ہوتی ہے۔

مثلاً بعض صورتوں میں مالک اپنے نوکر کے افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ نقصان اٹھانے والے فریق کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ مالک اور نوکر دونوں کے خلاف چارہ جوئی کرے۔ لیکن مالک صرف اس وقت ذمہ دار ہوتا ہے جب نوکر اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں ٹارٹ کا مرتکب ہوا ہو۔

اگر کوئی ملازم نہ ہو اور اس سے ٹھیکہ پر کام لیا جارہا ہو تو اس کے ٹارٹ کا مالک ذمہ دار نہیں۔ سوائے ایسی صورت کے جب مالک نے اسے نہ صرف کوئی کام تفویض کیا ہے بلکہ اس کام کو انجام دینے کے طریقے بھی متعین کیے ہوں یا کسی نااہل ٹھیکہ دار کو یہ کام سپرد کیا گیا ہو۔

ایسی صورتیں بھی پیش آسکتی ہیں جن میں مالک پر اپنے جانوروں کے افعال ٹارٹ کی بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مثلاً ایسے جانوروں کے نقصان رساں افعال جن کی بری عادتوں سے واقفیت کے باوجود مالک انھیں کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

ٹارٹ کے قانونی چارہ کار کی دو قسمیں ہیں۔

ایک عدالتی یعنی بذریعہ نالش دوسرے عدالت کی مداخلت کے بغیر۔

عدالتی چارہ کار تین اقسام کے ہیں۔ (1) ہرجانہ (2) حکم امتناعی (3) مال کی واپسی۔

عدالتی چارہ کار بذریعہ نالش حاصل ہوتے ہیں۔ عدالتی چارہ کار میں سب سے اہم چارہ کار ہرجانہ ہے۔ ہرجانہ نقد رقم کی صورت میں دلایا جاتا ہے اگر جبکہ ہرجانہ کی مقدار عدالت کے صوابدید پر منحصر ہے لیکن اگر مدعی اپنا دعویٰ ثابت کرے تو بہرصورت ہرجانہ پانے کا مستحق ہوگا خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ ہرجانہ کی مقدار کا انحصار ہر مقدمہ کی نوعیت پر ہے۔ ہرجانہ کے چار اقسام ہوتے ہیں۔

(1) حقارت آمیز، (2) برائے نام، (3) واجبی، (4) عبرت انگیز یا بطور سزا۔

(1) حقارت آمیز ہرجانہ سے ایسی قلیل رقم مراد ہے جس کو عدالت حقارت آمیز انداز میں دلواتی ہے۔ یعنی اس وقت جبکہ عدالت کی رائے میں ایسا مقدمہ رجوع نہ ہونا چاہیے تھا یا جبکہ مدعی کا چال چلن قابل اعتراض ہو لیکن چونکہ ٹارٹ کا ارتکاب ہوا ہے اس لیے عدالت کا یہ قانونی فرض ہے کہ وہ مدعی کو کچھ نہ کچھ ہرجانہ دلائے۔

(2) برائے نام ہرجانہ ان صورتوں میں دلایا جاتا ہے جب کہ مدعی کے کسی قانونی حق میں مداخلت ہوئی ہو لیکن اس کی وجہ سے مدعی کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔

(3) واجبی ہرجانہ ان مقدمات میں دلایا جاتا ہے جبکہ متضرر کو واقعی نقصان پہنچا ہو۔ اس قسم کے ہرجانہ کا مقصد مدعی کے اس خاص نقصان کی تلافی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

216

ہے جو اس کو ٹارٹ کی وجہ سے پہنچا ہے۔

(4) عبرت ناک یا تعزیری ہرجانہ ان مقدمات میں دلایا جاتا ہے جن میں مدعاعلیہ کا رویہ قابل اعتراض ہو اور ٹارٹ کا ارتکاب قصداً نقصان پہنچانے کی غرض سے کیا گیا ہو یا اس ٹارٹ کے ارتکاب کی وجہ سے مدعی کی بدنامی یا توہین ہوئی ہو یا اس کو ذہنی تکلیف پہنچی ہو۔ ایسے ہرجانہ کا مقصد نہ صرف مدعی کے نقصان کی تلافی ہے بلکہ مدعاعلیہ کو سزا دینا بھی مقصود ہوتا ہے۔

ٹارٹ متعلقہ مال یا جائداد منقولہ (Tort about Property): ہر شخص کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جائداد منقولہ یعنی مال و متاع کو اپنے قبضہ میں رکھے اور اپنے تصرف میں لائے وہ تمام حقوق استعمال کرے جو مالک جائداد کو حاصل ہیں۔ مثلاً اس کو مستعار دے یا اس کو فروخت کردے یا رہن رکھے۔ یا اس کو ہبہ کردے وغیرہ وغیرہ دیگر اشخاص پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ دوسروں کی جائداد منقولہ یا مال و متاع میں کسی قسم کی مداخلت بلا جواز قانونی یا بلارضامندی مالک جائداد کے نہ کرے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی جائداد منقولہ کی بابت حقوق میں مداخلت کرے تو وہ ٹارٹ کا مرتکب ہوگا۔

جائداد منقولہ سے متعلق ٹارٹ کی تین اقسام ہیں۔

(1) مداخلت بیجا، (2) مداخلت روک کر رکھنا اور (3) مداخلت کا تصرف بیجا۔

(1) مداخلت بیجا: اس مال میں جو مدعی کے قبضہ میں ہو جبراً دست اندازی کرنا مراد ہے۔

(2) مال روک کر رکھنا: اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی مال ناجائز طور پر روک کر رکھا جائے جس کے فوری قبضہ کا مدعی مستحق ہو۔ اس کے لیے اس مال کا صرف مالک ہونا کافی نہیں ہے۔

(3) مال کا تصرف بیجا: اس وقت کہا جاتا ہے جب مدعی اس کا مالک ہو قابض ہو یا فوری قبضہ کا حق رکھتا ہو اور مدعاعلیہ کا رویہ یا عمل ایسا ہو جس سے مدعی اپنے ان حقوق کا استعمال نہ کرسکے۔

مثلاً مدعاعلیہ یہ مال تلف کردے، فروخت کردے یا دوسرے کے حوالے کردے۔

مداخلت بیجا اور مال روک کر رکھنے یا تصرف بیجا میں اہم فرق یہ ہے۔

مداخلت بیجا کی صورت میں مال مدعی کے قبضہ میں رہتا ہے اور مال روک کر رکھنا یا تصرف بیجا کا دعویٰ اس وقت ہو سکتا ہے جب مال کے قبضہ سے مدعاعلیہ نے مدعی کو محروم کیا ہو۔ عدالتوں کا قیام انصاف رسانی کے لیے ہے۔ اگر کوئی شخص کسی فوج داری میں محض عداوت سے کسی دیگر شخص کے خلاف استغاثہ کرے اور منصوبہ جرم ملزم کے خلاف ثابت نہ ہو اور وہ بری کردیا جائے تو ملزم کو حق حاصل ہوگا کہ وہ مستغیث کے خلاف عدالت دیوانی میں رجوع ہوکر ہرجہ و خرچہ کی نالش کرے۔ اس طرح کی کارروائی کو قانون ٹارٹ میں "کینہ سے فوج داری کارروائی رجوع کرنا" کہتے ہیں۔

کینہ میں فوج داری کارروائی رجوع کرنا اس وقت سمجھا جائے گا جب بغیر جائز اور مناسب وجہ کے فوج داری کارروائی رجوع کی گئی ہو جس میں مستغیث ناکام رہا ہو اس کو مستغیث کے خلاف دیوانی نالش کا حق حاصل ہوگا اور مستغیث کا ایسا فعل ٹارٹ ہے۔ اس قسم کے دعوے میں مدعی پر لازم ہوگا کہ وہ حسب ذیل امور کو ثابت کرے۔

(الف): مدعاعلیہ نے مدعی کے مقابلہ میں فوج داری کارروائی رجوع کی۔

(ب): اس کارروائی کو بلامناسب و معقول وجہ کے رجوع کیا گیا۔

اس ٹارٹ کا ارتکاب صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب کہ مدعاعلیہ نے خود یا بذریعہ پولیس عدالت فوج داری میں مدعی کے خلاف استغاثہ کیا ہو اگر محض پولیس میں رپورٹ دینے کی بنا پر پولیس خود متحرک ہوئی ہو تو ایسی صورت میں مدعاعلیہ مستغیث نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ٹارٹ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عدالت سے خواہ وہ ابتدائی ہو یا عدالت مرافعہ ہو بری کردیا گیا ہو نیز مدعی کو یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ مدعاعلیہ نے کینہ سے یعنی عداوت سے یا نقصان رسانی کی خاطر استغاثہ کیا ہو اگر مدعی یہ ثابت کردے کہ بلامناسب یا معقول وجہ کے یا محض شبہ کی بنا پر اور بغیر کسی قانونی مشورہ کے استغاثہ کیا ہو تو ایسی صورت میں عدالت یہ نتیجہ نکالے گی کہ یہ کینہ یا عداوت سے کیا گیا ہے۔

ٹریٹوریل واٹر (Territorial Water): وہ تمام ساحلی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سمندر جو کسی ملک کے اقتدار میں ہو ٹریٹوریل واٹر (Territorial Water) کہلائے گا۔ بعض آبی راستے ایسے ہوتے ہیں جن پر صرف ایک ملک کا تصرف یا کنٹرول رہتا ہے۔ اگر کوئی آبی راستہ جس کے اطراف صرف ایک ہی ملک واقع ہو اور جو کسی بین الاقوامی جہاز رانی کے راستے میں واقع ہو مثال کے طور پر نہر پناما (Panama) نہر باسفورس (Basforus) وغیرہ تو ایسی صورت میں معاہدات کے ذریعہ ایسی آبی راستوں یا نہروں کو جہازوں کی آمد ورفت کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت کسی مملکت کو عام طور پر اس ملک کے ساحل سے تین میل دور تک پورا دیوانی اور فوج داری (Civil and Criminal) اختیار حاصل ہوتا ہے۔

ٹریڈ یونین۔ انجمن مزدوران: صنعتی مزدوروں میں ٹریڈ یونین کا تصور ہندوستان میں ابتدا میں انیسویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس وقت تک آجر اور مزدور ملازمت کی شرائط معین کرنے میں بالکل آزاد تھے اور اس متعلق کوئی قانونی پابندی یا تحدید نہ آجر پر تھی نہ مزدور پر۔ آجرین اور صنعت کاروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مزدوروں سے کم تر معاوضے پر معاملہ کیا۔ اس قدر کم معاوضے یا اجرت پر کہ وہ ان کی گزر بسر کے لیے ناکافی تھی۔ علاوہ ازیں آجر مزدوروں کو کسی قسم کی سہولتیں فراہم کرنے کے بھی پابند نہ تھے۔ مزدوروں کی کوئی انجمن نہ تھی جو ان کے حقوق کے لیے آجرین سے مقابلہ کرتی اور اپنا حق منواتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کئی صنعتوں میں مزدوروں کی انجمنیں قائم ہوئیں جنھیں عرف عام میں ٹریڈ یونین کہا جاتا ہے۔ ان انجمنوں نے آجرین کے ساتھ مزدوروں کے لیے بہتر شرائط ملازمت اور مناسب اجرت کے متعلق گفت و شنید کی۔ ابتدا میں آجرین نے مزدوروں کی انجمن کو نہات ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا اور اس عمل کو غیروفادارانہ قرار دیا۔ بعض صنعت کاروں نے ٹریڈ یونین کے تصور کی سختی سے مخالفت کی اور یونین لیڈرس کو نہ صرف ناپسندیدہ قرار دیا بلکہ ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی اور ہر قسم کی تخویف اور قوت کا استعمال کیا۔ لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود مزدوروں کا احساس بیدار ہوا اور اس احساس نے بڑی حد تک ٹریڈ یونین تحریک پر سیاسی اثر کا غلبہ بڑھتا گیا کیونکہ ٹریڈ یونین کے لیڈر کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ رہتے تھے اور مزدوروں کی یونین کے پلیٹ فارم سے سیاسی لیڈر ملک کے عام حالات پر تبصرہ کرتے تھے۔ پہلی بار آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس 1920 میں منعقد ہوئی۔ انڈین ٹریڈ یونین ایکٹ (The Indian Trade Union Act) کے ذریعہ مزدوروں کی کافی ہمت افزائی کی گئی اور ٹریڈ یونین قائم کرنے اور ان کو رجسٹرڈ کروانے کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس قانون کے تحت کسی صنعت یا کارخانے کے سات یا سات سے زیادہ مزدور مل کر انجمن کے صدر، معتمد اور دیگر عہدہ داروں کے نام کے ساتھ اور انجمن کے اغراض و مقاصد کو واضح کرتے ہوئے انجمن بنا سکتے ہیں اور اسے رجسٹر کرا سکتے ہیں۔ کسی رجسٹرڈ یونین کے ممبر کو آجر سے معاہدہ کرتے وقت تعزیرات ہند کی بعض دفعات کے اثر سے مستثنٰی رکھا گیا ہے۔ کسی صنعتی ادارے کے ملازمین سے ہٹ کر کسی اور شخص کو اس ادارے کے مزدوروں کی انجمن کا صدر، نائب صدر یا معتمد بنانے کا طریقہ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک میں عام طور پر رائج نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک کو سیاسی لیڈروں نے پروان چڑھایا۔ رائل کمیشن نے لیبر تحریک پر ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد یہ رائے دی کہ صنعت کے مزدوروں اور ملازمین ہی کو یونین کی خدمات دینی چاہیے۔ انھیں اس قسم کی تربیت دینی چاہیے کہ وہ یونین کی ذمہ دارانہ خدمت انجام دینے کے اہل ثابت ہو سکیں۔ کارخانے یا صنعت سے باہر کے اشخاص کو یونین کی خدمات دینے کا طریقہ مستحسن نہیں ہے۔ 1958 میں کوڈ آف ڈسپلن نافذ کیا گیا۔ جس کے ذریعہ مزدوروں کو یونین بنانے کی پوری آزادی دی گئی اور اس امر کی بابت کچھ اصول بھی مرتب کیے گئے کہ کس یونین کو صنعتی ادارے کی جانب سے تسلیم کیا جانا چاہیے۔ نتیجتاً یہ رائے دی گئی کہ وہ یونین جس کے ارکان کی تعداد اس صنعتی ادارے یا کارخانے میں سب سے زیادہ ہو اسے تسلیم کیا جانا چاہیے اور اس طرح تسلیم کرنے کی مدت کم از کم دو سال ہونا چاہیے بشرطیکہ وہ یونین کوڈ آف ڈسپلن کے اصولوں کے مطابق کام کرے۔

ٹریڈ یونینوں کا عالمی فیڈریشن (World Federation of Trade Unions, WFTU): اس فیڈریشن کی بنیاد عالمی سطح کی تنظیم کے طور پر 1945 میں لندن اور پیرس میں منعقدہ بین الاقوامی ٹریڈ یونینوں کی کانفرنسوں میں ڈالی گئی تھی جن میں ہٹلر مخالف ملکوں کی ٹریڈ یونینوں کے مراکز کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد عالمی ٹریڈ یونین تحریک کو ازسرنو متحد و منظم کیا جائے لیکن سیاسی اختلافات کے سبب 1949 میں بعض مغربی ملکوں کی فیڈریشنس نے اس سے علاحدگی اختیار کرکے اپنی نئی تنظیم کو جنم دیا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

آج عالمی فیڈریشن کی رکنیت صنعتی طور سے ترقی پذیر ملکوں پر مشتمل ہے جن یں ہندوستان، ویت نام اور دوسرے ایشیائی ملک، برازیل، پیرو، کیوبا، لاطینی ملک، شام، لبنان، کویت اور دوسرے عرب ممالک کے محنت کشوں کی فیڈریشنس شریک ہیں۔ عالمی ٹریڈ یونین کانگریس کا اجلاس ہر چوتھے سال منعقد ہوتا ہے۔

اس کا صدر مقام پراگ (چیکوسلواکیہ) ہے۔

ٹوکیو ٹرائل (Tokyo Trial): دوسری جنگ کے شکست خوردہ مجرمین پر مقدمہ چلانے کے لیے گیارہ قوموں کے نمائندوں پر مشتمل ایک ٹریبونل قائم کیا گیا (Eleven Nation Tribunal) اور ٹوکیو میں مقدمہ چلایا گیا جس طرح نازی مجرمین کے خلاف شہادت پیش کی گئی تھی اس تحقیقات میں بھی شہادت پیش کی گئی اور ٹوجو (Tojo) کو سزائے موت دی گئی۔

ٹیرف و تجارت۔ عام معاہدہ (General Agreement on Tariffs and Trade, G.A.T.T.): دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے مختلف معاشی خلفشار کے مسائل میں بین الاقوامی تجارت کا مسئلہ بھی تھا۔ ہر ملک اپنی معیشت کی حفاظت میں پابندیاں لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مسئلہ پر غور کے لیے 1947 میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ایک بین الاقوامی تجارتی تنظیم قائم کرنے پر بھی غور کیا گیا لیکن کچھ نتیجہ نہیں نکلا البتہ جنوری 1948 میں ایک معاہدہ ہوا جو "ٹیرف اور تجارت کا عام معاہدہ" (گاٹ) کے نام سے مشہور ہے اور اسی نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ جس کا دفتر اور سکریٹریٹ جنیوا میں ہے اس وقت اسی(80) سے زائد ممالک اس کے ممبر ہیں۔ اس معاہدہ کے تحت تمام رکن ممالک ہمہ جہتی تجارت کی کوشش کریں گے۔ اور رکاوٹوں کو کم کرنے کی کوشش کریں گے۔ درآمدی کوٹہ اور ٹیرف میں کمی کریں گے۔ مختلف ملکوں کے آپسی تجارت میں ترجیح کے معاہدوں کو ختم کردیا جائے گا۔ اس ادارہ کے قیام کے ساتھ ہی اس کے ممبر ممالک میں اس سلسلہ میں بات چیت ہوتی رہی جو 1964 سے 1967 تک جاری رہی اور طویل بات چیت کو کینیڈی معاہدہ (Kennedy Round) کہا جاتا ہے۔

گاٹ کے معاہدوں میں ترمیم کے لیے سب سے پہلی بڑی کانفرنس مارچ 1955 میں ہوئی تھی۔ اس میں صنعتوں کو برآمد کے قابل بنانے کے لیے اعانت (Subsidy) کے مسئلہ پر مباحثے ہوئے تھے۔ اور یہ طے ہوا تھا کہ اگر کوئی ملک اپنی کسی صنعت کو اعانت دے تو اسے اس کی تفصیل بتانی چاہیے اور اگر اس سے دوسرے ملکوں کو مفاد کو نقصان پہنچے تو اسے بحث مباحثہ کے ذریعہ کم یا ختم کرنا چاہیے۔ یہ بھی طے ہوا کہ جہاں تک برآمدی اعانت کا تعلق ہے ان ملکوں کو ابتدائی پیداوار (Primary Products) کی اعانت سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر کسی شے کی برآمدی قیمت گھریلو قیمت سے کم ہو تو دوسری اشیا کی برآمد کے سلسلے میں دی جانے والی اعانت چاہے براہ راست ہو یا بلواسطہ اس کو جلد سے جلد ختم کردینا چاہیے۔

1965 میں ترقی پذیر ملکوں کے مسائل پر خاص طور سے توجہ کی گئی اور تجارت اور ترقی کی کمیٹی کے ذمہ یہ کام تفویض کیا گیا کہ وہ ایسی تدابیر اختیار کرے جس سے ترقی پذیر ملکوں کی برآمد کی رکاوٹیں کم ہوسکیں۔ کینیڈی دور کی بات چیت کے بعد سے مختلف ملکوں میں اپنے مفاد کے تحفظ کی ذہنیت تیزی سے ترقی کرگئی۔ غیر ٹیرفی حدبندیاں قائم ہونے لگیں۔ ترجیحی تجارت ترقی کرنے لگی اور اس کے لیے معاشی بلاک بننے لگے۔ مثلاً یورپ کی معاشی کمیٹی بنی جس سے بحیرۂ روم کے ملکوں کے ساتھ ترجیحی رویہ اختیار کیا۔ یہی صورت امریکا نے جنوبی امریکا کے ملکوں کے ساتھ اختیار کی۔ پچھلے برسوں میں اس مسئلہ پر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں بحث مباحثہ اور کشمکش چلتی رہی ہے۔

ٹیکس (Tax): کسی شخص گروہ یا ادارہ سے لازمی طور پر کوئی رقم (سامان یا خدمت) حکومت کو منتقل کی جائے تو یہ ٹیکس کہلائے گی۔ یہ رقم لوگوں کی دولت یا آمدنی پر عائد کی جاسکتی ہے۔ اس قسم کے ٹیکس کو راست ٹیکس کہا جاتا ہے۔ قیمتوں پر سرچارج لگاکر وصول کیے جانے والے ٹیکس کو بالواسطہ ٹیکس کہا جاتا ہے۔ حکومت کے اخراجات پورا کرنے کا بڑا ذریعہ ٹیکس ہوتے ہیں۔

ث

ثالث: اس کے لفظی معنی تین اور تیسرے ہیں۔ مگر اصطلاحاً اس سے حکم اور پنچ مراد ہوتا ہے اسلامی شریعت نے اجازت دی ہے کہ دو شخصوں کے درمیان اگر کسی جائداد یا دوسرے شخصی حقوق کے بارے میں نزاع واقع ہو تو وہ اپنے معاملہ کو کسی تیسرے شخص کے سپرد کردیں اور وہ جو فیصلہ کرے دونوں اس کی پابندی کریں۔ اس کو تحکیم بھی کہتے ہیں۔ ثالث کی حیثیت قاضی و حاکم کی ہے۔ اس لیے اس میں بھی وہی اصناف ہونے چاہئیں جو قاضیوں میں ہوتے ہیں۔

ذمیوں اور کافروں کو اختیار ہے کہ چاہیں تو مسلمانوں کے اندر سے یا اپنے مذہب والوں میں سے کسی کو ثالث مقرر کریں۔ قصاص اور حدود میں ثالث و حکم مقرر نہیں کیے جاسکتے۔

ثالث عدالت کی طرح شہادت سماعت کرنے اور حلف دینے کا مجاز ہے۔ پس وہ گواہوں کی شہادت یا فریقین سے قسم لے کر کوئی فیصلہ کرسکتا ہے ایک کے اقرار اور دوسرے کے انکار پر بھی کوئی فیصلہ صادر کرسکتا ہے۔

ثالثی (Arbitration): ثالثی فریقین کا اپنے تنازعات کو عدالت سے باہر باہمی اتفاق سے کسی ایسے ثالث کے ذریعہ تصفیہ کرانے کا نام ہے جو تصفیہ شدہ فیصلہ کو قانونی طور پر نافذ کرنے کا مجاز ہو۔ ثالثی کا استعمال عام طور پر تجارتی تنازعات میں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال مزدور یونین اور انتظامیہ کے تنازعات اور بین الاقوامی سطح پر آزاد و خودمختار ریاستوں کے مابین تنازعات کے تصفیہ میں بھی ہوتا ہے۔ ریاستوں کے مابین تنازعات کے تصفیہ میں ثالثی کا استعمال عموماً اس وقت عمل میں آتا ہے جب سفارتی ذرائع کے استعمال سے تشفی بخش نتائج کی امید نہ ہو۔

تیسرا فریق یا ثالث ایک فرد بھی ہوسکتا ہے اور ایک ٹریبونل بھی ان میں سے جو بھی ہو وہ فریقین کا منتخبہ ہو اور زیر بحث مسئلہ سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ البتہ ثالث زیر بحث مسئلہ کا اس معاہدہ یا قانون کی روشنی میں تصفیہ کرانے کا پابند ہوگا جس قانون پر زیر بحث مسئلہ سے متعلق فریقین کا اتفاق ہوگیا ہو۔

بین الاقوامی تناظر میں ثالثی سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ ممالک باہمی تنازعات کے تصفیہ کے لیے اپنی مرضی سے ایک یا ایک سے زائد ثالثوں یا ٹریبونل مقرر کرلیں۔ ان میں سے کوئی فریق اپنی مرضی سے فریق ثانی کو کسی ثالث یا ٹریبونل کے سامنے پیش ہونے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ ثالثی کے لیے فریقین کسی معاہدہ کے ذریعہ باہمی اتفاق کرسکتے ہیں۔ ثالث کا فیصلہ قانون کی رو سے حتمی مانا جاتا ہے بشرطیکہ متعلقہ معاہدہ میں اس کے برخلاف کوئی دفعہ نہ رکھی گئی ہو جس کا ماننا فریقین کے لیے لازم ہو۔ لیکن اگر کوئی فریق فیصلہ ماننے سے انکار کردے تو چونکہ وہ فریق ایک آزاد و خودمختار ملک ہے اور ایسے ملکوں کے اوپر کوئی بااختیار قوت نافذہ نہیں ہے اس لیے فریق ثانی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کا سہارا لے کر فریق اول کو فیصلہ کی عمل آوری پر مجبور کرے اور اپنے حق میں عالمی رائے عامہ ہموار کرکے اس پر اخلاقی دباؤ ڈالنے کی کوشش کرے۔

بین الاقوامی ثالثی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ قدیم یونان میں شہری ریاستوں کے مابین تنازعات میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ ثالثی کے تصور میں مزید ترقی اس وقت ہوئی جب ریاستہائے متحدہ امریکا اور برطانیہ کے مابین 1794 میں جے معاہدہ (Jay Treaty) عمل میں آیا جس کے ذریعہ امریکی انقلاب سے پیداشدہ تنازعات کا تصفیہ ہوا۔ تاہم عہد جدید میں تنازعات کے پرامن تصفیہ کا تصور 1899 کی ہیگ کانفرنس (Hague Conference of 1899) میں ابھرا اور ایک بین الاقوامی ادارۂ ثالثی کا قیام

عمل میں آگیا۔ ہیگ کی دوسری کانفرنس کے ذریعہ 1907 میں اس پر نظرثانی کی گئی۔ اس وقت سے اب تک ایسے سیکڑوں کثیر الجہات بین الاقوامی معاہدات وجود میں آچکے ہیں جو تنازعات کے تصفیہ کی تمام ممکنہ صورتیں ناکام ہوجانے کے بعد ثالثی کی راہ ہموار کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر معاہدہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی دفعہ 30 ہے جسے اس نے 1949 میں اقوام متحدہ کے منشور میں شامل کیا۔

بین الاقوامی ثالثی میں ابھی بڑی رکاوٹیں ہیں کیوں کہ خود مختار ریاستیں اپنے اقدام میں ابھی بہت محتاط رویہ رکھتی ہیں۔ اس لیے ایک ایسا عام خود مختار ادارہ کا ہونا ضروری ہے جو ان خود مختار ریاستوں کے مابین ثالثی کے فیصلہ کو تحکمانہ طور پر نافذ کرنے کا مجاز ہو۔

ثمود: یہ عرب کی ایک معروف قوم کا نام ہے جس کا تعلق سامی قوموں سے ہے۔ جس طرح حضرت نوح کے بعد قوم عادان کی جانشین ہوئی اسی طرح ثمود کی ہلاکت کے بعد ان عادان کے جانشین ہوئے اس لیے عاد کو عاد اولیٰ اور ثمود کو عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ ان کی آبادی حجر میں تھی۔ اس لیے یہ 'اصحاب بھی کہلاتے ہیں۔ ثمود کی بستیوں اور کھنڈرات کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ان کے جد اعلیٰ کا نام ثمود تھا اسی نسبت سے یہ قوم ثمود کہلاتی ہے۔

یہ نہایت شان و شوکت والے لوگ تھے۔ خدا نے ان کو دولت، ثروت، فارغ البالی اور حکومت و سلطنت عطا کی تھی۔ یہ پتھروں کو کاٹ کر شاندار عمارتیں بناتے اور میدانوں میں محل تعمیر کرتے، کھجوروں اور انگوروں کے باغ کھیت، چشمے غرض دنیا کی ہر طرح کی نعمت اللہ نے انھیں دی تھی۔ مگر یہ دولت کے نشہ میں ایسا سرشار ہوئے کہ خدا کو بھول گئے اور ہر قسم کی برائیاں کرنے لگے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے ان ہی قوم کے اندر سے ایک پیغمبر حضرت صالح کو مبعوث کیا انھوں نے ان کو بہت سمجھایا اور کہا کہ صرف اللہ کی بندگی کرو اور اس کا کہا مانو تو زمین پر فساد نہ برپا کرو، جو مہلت ملی ہے اس میں اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اپنی حرکتوں سے باز آؤ مگر ان لوگوں پر حضرت صالح کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی خدا کے رسول ہو تو کوئی نشانی دکھاؤ۔ حضرت صالح نے خدا سے دعا کی جو مقبول ہوئی اور اللہ کی اونٹنی بطور نشانی ان کو دی گئی۔ انھوں نے ثمود سے کہا کھالو۔ ثمود نے کہا اگر اونٹنی کو گزند پہنچایا تو اللہ تعالیٰ تمھیں ہلاک اور برباد کردے گا۔

ثمود کے منع کرنے پر بھی بدمعاش لوگوں کی ٹولی شرارت اور فساد مچاتی رہتی تھی اور لوگوں کو گمراہ کرتی تھی اس نے سازش کی اور اس کے ایک فرد قدار بن سالف نے آگے بڑھ کر اونٹنی کی کونچیں کاٹ دی پھر سب نے مل کر اس کو ہلاک کردیا اور حضرت صالح سے کہا تمہارا عذاب کہاں ہے۔ وہ بہت مغموم ہوئے اور فرمایا بدبختو! اب تمہاری ہلاکت میں کیا شبہ ہے۔ تین روز انتظار کرو اس کے بعد تم ہلاک ہوجاؤ گے۔ چنانچہ تین دن کے بعد ایک خوف ناک اور دہشت ناک آواز ہوئی اور جو جہاں تھا وہیں ڈھیر ہوگیا۔

اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچے جو حضرت صالح پر ایمان لائے تھے ان کی تعداد تھوڑی تھی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ج

جارج سمل (George Simmel, 1858-1918):
جارج سمل ایک جرمن فلسفی اور ساجیات داں تھا۔ اس کی شخصیت آج بھی متنازعہ سمجھی جاتی ہے۔ بعض لوگ اسے جدید ساجیات کا بانی قرار دیتے ہیں جبکہ دوسروں کا خیال ہے کہ سمل نے ساجیات کو کوئی نئی فکر نہیں دی۔ یہ صحیح ہے کہ سمل نے کسی قسم کے سماجی نظام کی تصوراتی تشکیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس نے فکر کی بہت سی راہیں دکھلائیں جو فلسفیانہ تاریخی اور ساجیاتی اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سمل بڑی حد تک فلسفیانہ انداز فکر رکھتا تھا۔ خود سمل نے بھی اپنے آپ کو محض ساجیات سے وابستہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔اس کی فکر پر ہیگل، مارکس، شوپنہار اور نطشے کا اثر رہا ہے۔

ساجیات میں سمل نے شکلی ساجیات (Formal Sociology) کو خالص ساجیات قرار دیا۔ سمل کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شکل (Form) اور مواد (Content) میں امتیاز کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ساجیات کا خاص موضوع بحث سماجی اشکال یعنی سماج روابط کی اشکال کا مطالعہ ہے۔ بہت سے جرمن مفکرین کی طرح سمل بھی اپنی گہری نظر کرنے کے لیے مشہور ہے۔ سماجی واقعات کی انتہائی باریک بینی سے تحقیق اور اس کا مشاہدہ سمل کے انداز فکر کا خاصہ رہا ہے۔ اور غالباً اسی لیے اس کو شکلی ساجیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس طرز فکر کی بنیاد سمل نے 1890 میں رکھی۔ اس نے وضاحت کی کہ ساجیات کا مقصد سماجی بین عمل اور بین تعلقات کا مطالعہ ہے اور اس میں بھی ساجیات کا زیادہ تعلق ان تعلقات کی اشکال سے ہے۔ ساجیات اور سماج کاری کے طریق کو اس اعتبار سے سمل کی ساجیات میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور غالباً اسی لیے سمل نے ساجیات کو شکلی ساجیات کے مطالعہ کا علم کہا ہے۔ اس کی مشہور کتاب "Soziologie"، 1908 میں شائع ہوئی جس سے اس کی تجزیاتی انداز فکر کا پتہ چلتا ہے۔

جارحیت (Aggression): روایتی بین الاقوامی قانون میں قومی پالیسی کے مقاصد کے حصول کے لیے طاقت یا جنگ کے استعمال کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد جمعیت اقوام کے میثاق نے طاقت کے استعمال کے حق کو محدود کردیا۔ اس کی دفعہ 12(1) کے تحت رکن ملکوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ اپنے ایسے آپسی تنازعات میں جن سے کشیدگی پیدا ہونے کا خطرہ ہو، معاملہ کو ثالثی یا عدالتی تصفیہ کے لیے یا جمعیت کی کونسل کو تحقیق کے لیے پیش کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ثالث یا عدالت کا فیصلہ یا کونسل کی رپورٹ کے صادر ہونے سے تین ماہ تک جنگ کا سہارا نہیں لیں گے۔ خیال یہ تھا کہ اس تین ماہ کی میعاد میں پہلی عالمی جنگ کی طرح اچانک جنگ چھڑ جانے کا خطرہ عافیت سے ٹل جائے گا۔ میثاق نے جنگ کو ممنوع قرار دیا لیکن دفعہ 10میں ارکان پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ جمعیت کے تمام ارکان کی علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کا احترام کریں گے اور بیرونی جارحیت سے ان کی حفاظت کریں گے۔ لیکن 1938 کے کیلگ، برائن ترک جنگ معاہدہ میں جس پر 63 ملکوں نے دستخط کیے، بین الاقوامی تنازعات کے حل کے لیے جنگ کا سہارا لینے کی مذمت کی گئی اور باہمی روابط میں قومی پالیسی کے آلہ کار کے طور پر جنگ کے استعمال کو ترک کرنے کا عہد کیا گیا لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کردیا کہ "جنگ" یا "جارحیت" کی کوئی متفقہ تعریف نہ ہونے سے تشدد اور جارحیت کے اکثر واقعات کو اس کے دائرہ سے خارج کیا جاسکتا تھا اور یہی کیا گیا۔ اس لیے اقوام متحدہ کے منشور میں معنوی نزاع سے بچنے کے لیے "جنگ" کی اصطلاح کی جگہ "طاقت کا استعمال یا اس کے استعمال کی دھمکی" "امن کے لیے خطرہ" یا "نقض امن"

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف پالیسی، ایسے طریقہ سے جو اقوام متحدہ کے اغراض و مقاصد کے مطابق نہ ہو، طاقت کے استعمال یا اس کی دھمکی سے پرہیز کریں۔ لیکن یہ ممانعت عموی اور غیر متعین ہے۔ اس کے ساتھ دفعہ 51 کے تحت ارکان کو مسلح حملہ ہونے کی صورت میں آزادانہ انفرادی اور اجتماعی دفاع کے لیے طاقت کے استعمال کا حق دیا گیا ہے۔ دفعہ 39 کے تحت "امن کو خطرہ، نقض امن یا جارحیت کے اقدام کے وجود" کا فیصلہ کرنا تنہا سیکورٹی کونسل کے اختیار میں ہے جس میں ہر رکن اپنی سیاسی مصلحت سے ووٹ دیتا ہے۔

چنانچہ اس امر کے تعین سے کہ طاقت کا کس طرح کا استعمال منشور کی خلاف ورزی ہے سیاسی عوامل کو خارج کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی عام اسمبلی نے 1951 میں بین الاقوامی قانون کمیشن سے یہ درخواست کی کہ جارحیت اور جارحانہ کارروائیوں کی تعریف کرے۔ تب سے یہ مسئلہ 1974 تک کمیشن، عام اسمبلی کی چھٹی کمیٹی اور تین خصوصی کمیٹیوں کے زیر غور رہا۔ بالآخر دسمبر 1974 میں عام اسمبلی نے اپنے 29ویں اجلاس میں قرارداد نمبر 3314 کے ذریعہ جارحیت کی تعریف منظور کی جس کی دفعات یہ ہیں:

دفعہ 1: جارحیت کسی ملک کے ذریعہ دوسرے ملک کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف یا کسی ایسے طریقہ سے جو اقوام متحدہ کے منشور کے غیر مطابق ہو جیسا کہ اس تعریف میں درج کیا گیا ہے، مسلح طاقت کا استعمال ہے۔

دفعہ 2: کسی ملک کے ذریعہ منشور کی خلاف ورزی میں مسلح طاقت کے استعمال میں پہل جارحیت کے فعل کی بدیہی شہادت ہوگی۔

دفعہ 3: مندرجہ ذیل کارروائیاں قطع نظر اعلان جنگ کے دفعہ 2 کے بیان کے مطابق جارحیت کی کارروائیاں سمجھی جائیں گی:

(الف) ایک ملک کی مسلح طاقت کے ذریعہ دوسرے ملک کے علاقہ پر حملہ یا اس حملہ کے نتیجہ میں فوجی قبضہ خواہ کتنا ہی عارضی کیوں نہ ہو یا کسی دوسرے ملک کے علاقہ کا یا اس کے کسی حصہ کا بزور طاقت الحاق۔

(ب) ایک ملک کی مسلح افواج کے ذریعہ دوسرے ملک کے علاقہ پر بم باری یا ایک ملک کے ذریعہ دوسرے کے علاقہ کے خلاف کسی بھی قسم کے ہتھیاروں کا استعمال۔

(ج) ایک ملک کی مسلح افواج کے ذریعہ دوسرے ملک کی بندرگاہوں یا سواحل کی ناکہ بندی۔

(د) ایک ملک کی مسلح افواج کے ذریعہ دوسرے ملک کی بری، بحری یا فضائی افواج یا بحری و فضائی دستوں پر حملہ۔

(ہ) ایک ملک کی فوج کا جو دوسرے ملک میں سمجھوتہ کے تحت متعین ہو، سمجھوتہ کی دفعات کی خلاف ورزی میں استعمال یا سمجھوتہ کی میعاد ختم ہونے کے بعد ایسے علاقہ میں ان کی موجودگی میں توسیع۔

(و) وہ ملک جس نے اپنے علاقہ کو کسی دوسرے ملک کے تصرف میں دیا ہو، اگر اس علاقہ سے کسی تیسرے ملک کے خلاف جارحیت کا اقدام کرنے کی اجازت دے تو یہ طرز عمل جارحانہ تصور کیا جائے گا۔

(ج) دوسرے ملکوں کے علاقوں میں مسلح ٹولیوں، گروہوں، بے ضابطہ یا کرایہ کے سپاہیوں کو اتنی شدت کے مسلح طاقت کے اقدامات کرنے کے لیے بھیجنا جو اوپر درج کیے گئے یا ان اقدامات میں متعلقہ ملک کا ملوث ہونا۔

دفعہ 4: مندرجہ بالا اقدامات کی فہرست مکمل نہیں ہے۔ سیکورٹی کونسل یہ طے کرنے کا اختیار رکھتی ہے کہ منشور کی دفعات کے تحت اور کونسی کارروائیاں جارحیت ہیں۔

دفعہ 5: (1) کسی بھی نوعیت کی کوئی مصلحت خواہ سیاسی ہو یا معاشی یا فوجی یا دیگر جارحیت کو جائز ثابت کرنے کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

(2) جارحیت کی جنگ بین الاقوامی امن کے خلاف ایک جرم ہے۔ جارحیت بین الاقوامی مسئولیت کا پیش خیمہ ہوگی۔

(3) جارحیت کے نتیجہ میں کسی علاقہ یا خصوصی فائدہ کا حصول نہ قانونی ہے نہ اسے تسلیم کیا جائے گا۔

دفعہ 6: اس تعریف کی کسی بھی دفعہ کو اقوام متحدہ کے منشور کے دائرہ کو بشمول ان دفعات کے جن میں طاقت کے استعمال کو قانوناً جائز قرار دیا گیا ہے، کم و بیش کرنے کے معنی نہیں دیے جائیں گے۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

دفعہ 7: اس تعریف کی کوئی دفعہ کسی بھی طریقہ سے ان لوگوں کے حق خود اختیاری، آزادی اور خود مختاری کے حق کو پامال نہیں کرے گی جو جبراً اس حق سے محروم کیے گئے اور نہ ان لوگوں کے حق کو جو اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقاصد کے مطابق اس حق کی جدوجہد کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں حمایت چاہتے اور پاتے ہیں۔

جاگیردارانہ نظام (Feudalism): جاگیردارانہ نظام کی اصطلاح تاریخی طور پر اس سیاسی، معاشرتی اور فوجی نظام کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو رومی سلطنت کی شکست و ریخت کے بعد وجود میں آیا اور شالیمان سلطنت کے زوال کے بعد مطلق العنان بادشاہتوں کے قیام تک یورپ کے عہد وسطی کے بیشتر حصوں میں جاری و ساری رہا۔ جاگیردارانہ نظام کی اساس زمین کی ملکیت پر تھی جو بادشاہتوں کی طرف سے امراء اور سرداروں کو ان کی خدمات کے عوض بطور عطیہ جاگیر کی شکل میں عطا کی جاتی تھی۔ اس نظام میں چونکہ ساری زمین کا مالک بادشاہ ہوتا تھا اس لیے جاگیر یافتہ امراء اور سردار اپنی جاگیر کے عوض بادشاہ سے وفاداری اور بوقت ضرورت اپنی فوجی خدمات پیش کرنے کا عہد کرتے اور بادشاہ کے تابعدار کہلاتے تھے۔ ان جاگیرداروں نے اپنی مختلف خدمات کے عوض جب زیادہ زمینیں حاصل کرلیں تو پھر انھی شرائط پر یہ جاگیردار اپنے چھوٹے سرداروں کو اپنے تابعدار (Vassals) کے طور پر مقرر کرنے اور اپنی جاگیر میں سے انھیں زمین بھی عطا کرنے لگے۔ یوں ایک ایسا معاشرتی نظام وجود میں آگیا جس کی اساس زمین کی ملکیت پر ہوگئی اور مالکان زمین آقا و تابعدار کے درجوں میں منقسم ہوگئے۔ سب سے بڑے امراء، بادشاہ سے براہ راست زمین حاصل کرتے تھے جو اپنے سے چھوٹے اور وہ ان سے چھوٹے کو زمین عطا کرتے تھے اور اس طرح یہ سلسلہ جاگیردار تک جا پہنچتا تھا جو ایک جاگیر کا مالک ہوتا تھا۔ یہ قبضہ تعلقہ کی حیثیت رکھتا تھا جو ہبہ کی رسمی تقریبات سے حاصل ہوتا تھا۔ بحیثیت مجموعی معاشرہ تین طبقوں میں منقسم تھا۔ امراء، پادری اور کسان۔ ان میں کسان کی حالت سب سے بری تھی۔ وہ مطلق زمین کا مالک نہیں ہوتا تھابلکہ عملی طور پر زمیندار کی بیگاری کرتا اور اس کے معاوضہ میں گزر بسر کے لیے زمین کی پیداوار میں سے کچھ پاجاتا تھا۔

جاگیردارانہ نظام دراصل غلاموں کی محنت پر مبنی نظام معیشت کی جگہ وجود میں آیا تھا۔ چنانچہ صنعتی انقلاب اور آزادانہ تجارت کے عروج کے بعد بادشاہوں کے اقتدار میں استحکام اور جاگیردارانہ نظام میں زوال آنا شروع ہوگیا جو بالآخر 16ویں صدی تک اختتام پذیر ہوگیا۔ جاگیردارانہ نظام کی اصطلاح محض یورپ کے معاشرتی و سیاسی نظام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عہد قدیم سے عہد حاضر تک ان خصوصیات کے حامل جتنے بھی نظام معاشرت، معیشت و سیاست بشمول ہندو چین اور جاپان وغیرہ رہے ہیں ان سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جاگیردارانہ نظام کی چند مشترکہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

(1) آقا اور تابعدار کا رشتہ۔

(2) شخصی نظام حکومت جس میں مقامی سطح پر آقا کو مکمل طور سے ہر قسم کے انتظامی، سیاسی اور فوجی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

(3) زمینوں کی ملکیت کا نظام جاگیروں کے عطیات پر مبنی ہوتا ہے۔

(4) ہر بڑے آقا کی اپنی ذاتی فوج ہوتی ہے جس کے ضابطہ اخلاق میں وفادارانہ فوجی خدمات پر زور دیا جاتا ہے۔

(5) آقا کو کسانوں پر شاہی اور جاگیردارانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ جاگیردارانہ نظام آقا اور اس کے تابعداروں کے مابین خالصتاً شخصی وفاداری کے روابط کا نظام ہے۔ یہ نظام اگرچہ صنعتی انقلاب کے بعد ختم ہوگیا تاہم ابھی یہ بالکل معدوم نہیں ہوا ہے بلکہ بہت سے ممالک میں اس کے باقیات اب بھی موجود ہیں۔

جاگیرداری نظام (Feudalism): موجودہ دور میں جاگیرداری نظام کی اصطلاح ایک خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس کی بنیاد لگان پر ہوتی ہے۔ ہر جاگیر میں ایک جاگیردار ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی زمین آسامیوں یا لگان داروں میں کاشت کے لیے تقسیم کردیتا ہے۔ یہ سب لگان دار جاگیردار کے شخصی طور پر وفادار ہوتے ہیں۔ جاگیر کا سارا نظم و نسق جاگیر دار کے کارندے چلاتے ہیں جن کو چھوٹی چھوٹی جاگیریں ملتی ہے۔ جاگیردار کو اپنی رعایا پر پولس، عدالت اور مالی سب ہی اختیارات ہوتے ہیں۔

مغربی ملکوں میں جاگیرداری نظام نے جو شکل اختیار کی اس میں قابل کاشت علاقے مینرس (Manors) میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر مینرس ایک گاؤں ہوتا تھا اور اس کے اطراف کاشت شدہ زمین، چراگاہیں اور جنگل

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وغیرہ ہوتے تھے اور ان سب پر کسی نہ کسی جاگیردار کا اقتدار ہوتا تھا۔ چراگاہوں، جنگلات اور بے کار زمینوں پر سب کا یکساں تصرف ہوتا تھا۔ زیرکاشت زمین اکثر دو حصوں میں بٹی ہوتی تھی۔ ایک تہائی اور بعض اوقات آدھے حصہ پر جاگیردار کا تصرف ہوتا تھا اور باقی دوتہائی یا نصف لگان داروں، آسامیوں یا کاشتکاروں کے تصرف میں کاشت کار نہ صرف اپنی زمین پر کاشت کرتا بلکہ ہفتہ میں دو تین دن بلامعاوضہ جاگیردار کی زمین پر بھی کام کرتا تھا۔ بوائی، کٹائی، فصلوں کی حفاظت غرض کہ ہر چیز میں جاگیر دار کی زمین کو اولیت حاصل رہتی اس کے علاوہ ان کاشتکاروں کو جاگیر دار کے بے شمار دوسرے کام بھی کرنے پڑتے۔

جاگیرداری نظام میں ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ہر چیز میں یکسانیت نہیں تھی لیکن چند چیزیں مشترک ضرور تھیں۔ کاشتکار بآسانی جاگیردار کا ماتحت اور پابند تھا۔ وہ بغیر جاگیردار کی مرضی اور اجازت کے اس کی جاگیر چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر شادی بیاہ نہیں ہوسکتے تھے۔ ایک کاشتکار مرجاتا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے یا اور کسی کو جانشیں بنانے کا جاگیردار کو پورا حق حاصل ہوتا۔

زمین چھوٹے جاگیرداروں کی بھی ملک نہ ہوتی بلکہ ان کو یہ زمین ان سے بڑے جاگیرداروں سے ملتی جس کا یہ معاوضہ ادا کرتے رہتے تھے اور یہ بڑے جاگیردار بھی بادشاہ کے تحت ہوا کرتے تھے۔ ان چھوٹے جاگیرداروں کو شادی بیاہ اور بہت سارے معاملات میں جاگیردار یا بادشاہ سے اجازت حاصل کرنی ہوتی۔ یورپ میں نظام جاگیرداری کی ابتدا 8ویں صدی عیسوی کے قریب فانٹیش سلطنت (Faantish Kingdom) کے دور میں ہوئی اور اس سلطنت کی فتوحات سے یہ نظام اٹلی، اسپین وغیرہ میں پھیلا۔

9ویں صدی عیسوی تک یہ نظام یورپ کے کافی حصہ میں پھیل چکا تھا۔ بادشاہتیں قائم ہوچکی تھیں۔ کلیسا پر بھی اب اس نظام کی چھاپ آچکی تھی۔ قانون کی حد تک اب کلیسا کی جگہ عدالتوں نے لے لی تھی۔

تجارت کی ترقی اور پھر صنعتوں کے عروج سے شہر آباد ہونے لگے اور تاجروں، صنعت کاروں اور بینک کاروں کی طاقت بڑھنے لگی۔ جاگیرداری نظام کی حدبندیاں آزاد تجارت کی راہ میں رکاوٹ بننے لگیں اور آہستہ آہستہ یہ نظام ٹوٹنے لگا۔14ویں صدی تک اس کا معاشی اور سیاسی اثر کافی حد تک ٹوٹ چکا تھا۔

جاگیرداری نظام کی صورت ایشیا اور افریقہ کے بہت سارے حصوں میں یورپ سے مختلف تھی۔ مشرق قریب، ہندوستان اور چین وغیرہ میں کاشت کاری کا دارومدار بارش پر تھا۔ دیگر ذرائع آب پاشی کا انتظام کاشتکار اپنے طور پر نہیں کرسکتے تھے۔ اس پر حکومت کا کنٹرول ہوتا تھا۔ ان ممالک میں یورپ کی طرح کے جاگیرداروں کا وجود نہیں تھا۔ پوری زمین پر بادشاہت کا اقتدار ہوتا۔ ایک طرح کی خود مکتفی دیہی زندگی تھی۔ پورا ملک بے شمار دیہاتوں میں بٹا ہوتا اور ہر دیہات ایک معاشی اکائی ہوتا۔ ہر دیہات کی زمین پر پورے دیہات کا مشترکہ تصرف ہوتا اور ہر قسم کی زرعی و دوسری پیداوار آپس میں کام اور صورت کے لحاظ سے تقسیم کرلی جاتی حکومت اپنے علاقے صوبوں میں تقسیم کرکے صوبہ داروں کے حوالے کر دیتی اور ان کے کارندے لگان وغیرہ وصول کرنے اور حکومت آب پاشی کا انتظام ڈاکوؤں سے حفاظت اور اسی قسم کے دوسرے کاروبار انجام دیتی۔

جامع بیان العلم و فصلہ: یہ حافظ ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر قرطبی مالکی (متوفی 463ھ 107ء) کی مشہور تصنیف ہے علامہ بن عبدالبر نامور محدث و فقیہی تھے۔ خصوصاً حدیثوں کی شرح و ترجمہ میں وہ بڑے ممتاز تھے۔ مالکیہ میں اس پایہ کا اور کوئی شارح حدیث نہیں گزرا۔ جامع بیان العلم و فصلہ علم کی حقیقت علما کی عظمت اور ان کے فرائض وغیرہ کے متعلق ایک مفید اور جامع کتاب ہے۔ اس میں علم کی اہمیت اس کی ضروری آداب اور طلبہ، شیوخ اور علما کے اوصاف اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں اور دین میں علم و نظر فکر و استدلال قیاس و اجتہاد فہم و بصیرت اور دلیل و برہان کی ضرورت اور تقلید و اتباع کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ مصنف علامہ نے بحث و مباحثہ قیاس و رائے اور تقلید کی مختلف قسموں پر گفتگو کرکے دکھلایا ہے کہ ان کی کون سی صورتیں پسندیدہ اور کون سی ناروا اور ناپسندیدہ ہیں۔ ان امور کے بارے میں روایات اور آثار اور سلف صالحین کے اقوال کا عمدہ ذخیرہ جمع کردیا ہے اور روایتوں کی صحت و سقم اور سندوں کی قوت و ضعف پر فنی کلام بھی کیا ہے۔ یہ کتاب 1928 میں شائع ہوئی تھی۔ احمد بن عمر محمصانی بیروتی ازہری نے اس کا مختصر شائع کیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایما سے اس مختصر کا اردو ترجمہ کرکے ندوۃ المصنفین دہلی سے 1953 میں شائع کیا تھا۔

جامع ترمذی: یہ مشہور محدث ابو عیسیٰ محمد بن سورہ ترمذی (278ھ م

892ء) کی شہرہ آفاق تصنیف اور صحاح ستہ کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کو سنن ترمذی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض اہل فن کے خیال میں اس کا افادہ صحاح کی تمام کتابوں سے زیادہ ہے۔ صحیحین سے صرف صاحب کمال اور صاحب نظر ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن امام ترمذی نے احادیث کی ضروری تشریح کردی ہے اس لیے اس سے محدثین و فقہا وغیرہ ہر طبقہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بجز دو حدیثوں کے اس کی تمام روایتیں معمول بہ ہیں۔ مصنف نے سند کے عیب و ہنر کو واضح کردیا ہے جس سے پڑھنے والے کو حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت کا علم ہوجاتا ہے۔ نیز فقہی حدیثوں کے ضمن میں فقہا کے مسلک، استنباطات اور دلائل نقل کرکے اپنی رائے ظاہر کردی ہے جس سے ائمہ کے مسلک اور ان کے اختلافات سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ ترتیب و عدم تکرار کے لحاظ سے بھی اس کو اکثر کتب حدیث پر برتری حاصل ہے۔ جامع ترمذی کے ساتھ علما نے بڑا اعتنا کیا ہے۔ اس کی متعدد شرحیں اور حواشی لکھے اور مختصرات بھی مرتب کیے۔ سب سے پہلی اور قدیم شرح ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بن بالعربی (546ھ م 1151ء) کی عارضۃ الاخوذی ہے چند اور مشہور و مفید شرحوں کے نام یہ ہیں:

جلال الدین سیوطی (911ھ۔م1505ء) کی القوت المغتذی، ابوالحسن محمد بن عبدالہادری سندھی (1138ھ۔م1725ء) کی شرح ابوالطیب سندھی (1109ھ۔م1697ء) کی شرح، مولانا رشید احمد گنگوہی (1323ھ۔م1905ء) کے افادات الکوکب الدری، مولاناانور شاہ کشمیری (1352ھ۔ م1933ء) کی العرف الشری اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (1353ھ۔ م1934ء) کی تحفۃ الاحوذی وغیرہ۔

جان م. کوپر (John M. Cooper, 1881-1949) : جان مانٹگمری کوپر مشہور امریکی ماہر انسانیات تھا۔ وہ ایک پادری بھی تھا اور اس نے تعلیم اور سماجی بھلائی کے کام بھی انجام دیے۔ ابتدا میں اس کو مذہبی تعلیم سے بہت دلچسپی تھی جس کی خاطر اس نے روم کا بھی سفر کیا جہاں اس نے 1902 میں پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری حاصل کی اور 1905 میں مذہبیات کی ڈگری بھی حاصل کی۔ 1909 میں امریکا کی کیتھولک یونیورسٹی میں وہ مذہبی تعلیم کا استاد بھی رہا۔ 1928 میں وہ سماجیات کا پروفیسر بن گیا۔ جب 1934 میں انسانیات کا شعبہ قائم ہوا تو کوپر کو صدر شعبہ بنایا گیا۔ اور اس خدمت پر وہ تاحیات فائز رہا۔ 1917 اور 1925 کے درمیان کوپر کی دلچسپی سماجیات سے بڑھتی گئی اور اس صدی کے چوتھے دہے میں تصنیف کردہ انسانیات پر اس کی تصانیف بہت قابل قدر سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی پہلی اہم کتاب "ٹیرا ڈل فیوگو" قبائل کی تجزیاتی اور تنقیدی فہرست (Analytical and Critical Bibliography of the Tribes of Tierra Del Fuego) ہے جو 1917 میں شائع ہوئی۔ اس نے کناڈا اور امریکا کے قبائل کے مذہب اور جادو کے نظام کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کا کنواس محدود تھا اس لیے اسے قبول عام حاصل نہ ہوسکا۔

جانوروں کی بابت ذمہ داری (Liability for Animals): قانون میں جانوروں کے دو اقسام ہیں (1) گھریلو (2) وحشی یا جنگلی۔

گھریلو یا پالتو جانور مثلاً کتا، بلی، گھوڑا، بیل، گائے، وغیرہ کی بابت مالک پر یہ ذمہ داری عائد ہے کہ وہ ان جانوروں کو اس طرح اپنے گھر میں رکھے کہ ان کی وجہ سے کسی شخص کو کوئی ضرر نہ پہنچے یا آوارہ پھرنے سے عوام کے حقوق میں مداخلت نہ ہو اگر اس قسم کے جانور کسی دوسرے شخص کو ایسا نقصان پہنچائیں جو اس قسم کے جانور کی فطرت کے خلاف نہ ہو تو ان کا مالک اس نقصان کی بھرپائی کا پابند ہوگا۔ لیکن اگر کوئی جانور جیسے کتے میں وحشیانہ عادت ہے اور اس کے مالک کو اسکا علم ہے تو وہ کتے کی ضرر رساں حرکت کا ذمہ دار ہوگا۔

وحشی جانور سے وہ جانور مراد ہیں جو معمولاً پکڑ کے نہیں رکھے جاتے ہیں مثلاً ہاتھی، ریچھ، بندر وغیرہ ایسے جانوروں کو جو شخص پالے وہ اپنی ذمہ داری پر پالتا ہے ایسے جانوروں سے جو ضرر پہنچے گا اس کی بابت مالک ذمہ دار ہے یہ قطعی ذمہ داری کی مثال ہے۔

جائداد (Property): ایک انگریز قانون دان کے لیے جو انگلش قانون انتقال جائداد میں جائداد منقولہ اور جائداد غیر منقولہ کی تفریق اور تقسیم کی نزاکتوں کا عادی ہے اسے رومن لا میں اس قسم کا کوئی امتیاز نہیں ملے گا رومن لا کے تحت کوئی شخص جائداد منقولہ اور جائداد غیر منقولہ کا کاملاً مالک ہوسکتا تھا اگرچہ روم میں ایک ایسا دور بھی آیا ہے جب کہ زمین بعض طبقے یا جماعت کی متفقہ ملکیت ہوتی تھی۔

جائداد پر عورت کی ملکیت : ہندو قانون وراثت1956 کے تحت

ہندو بیوہ اپنی جائداد کی کامل مالک ہے نہ کہ محدود مالک۔ جائداد سے مراد جائداد منقولہ وغیر منقولہ ہے جو وراثتاً ملی ہو یا اور طور پر مکسوبہ ہو۔ البتہ اگر کسی وصیت یا اور کسی دستاویز کی بنیاد پر کسی جائداد کے متعلق کسی ہندو عورت کو کوئی عدالتی ڈگری ملی ہو تو اس عورت کی ملکیت ان شرائط کے تابع ہوگی جن کے تحت وہ عدالتی ڈگری دی گئی ہو۔

جائداد سے استفادہ: جائداد غیر منقولہ کے ہر مالک کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنی جائداد کا قانون بلدیہ اور دیگر قانون کے تابع ہر طرح سے استفادہ کرے اس طرح جائداد غیر منقولہ کے مالک کو اس کا بھی اختیار رہے گا کہ وہ اپنی جائداد سے جو ہوا گزرتی ہے اور جو روشنی آتی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ ہر مالک جائداد کو اس کا بھی حق رہے گا کہ اس کے آرام میں کوئی شخص خلل نہ ڈالے اور غیر معمولی آواز اور گڑبڑ نہ کرے جس سے اسے تکلیف ہوتی ہو۔

اگر کسی شخص کی زمین سے چشمے کا پانی قدرتی طور پر بہتا ہو تو کسی اور شخص کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ وہ اس پانی کو پہلے شخص کی زمین پر گزرنے سے قبل گندہ کرے یا اور طور پر ناقابل استعمال کرے یا اس چشمے کے پانی کے بہاؤ میں کوئی تبدیلی کرے البتہ اگر چشمے کے پانی کا کوئی معین بہاؤ نہ ہو تو ایسی صورت میں کوئی شخص اپنی زمین پر واقع چشمے کے پانی کو جس طور سے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔

جائداد کا حق زائل ہونا (Extinguishment of Right of Property): اس قانون میں جو میعاد کسی شخص کی جانب سے جائداد کے قبضہ کے دعوے کے لیے مقرر ہے اس کے ختم ہوتے ہی جائداد کے متعلق اس شخص کا حق زائل ہو جائے گا۔

ان مقدمات میں جس میں قانوناً مختص الامر یا مختص المقام کی رو سے میعاد کا تعین کیا گیا ہو ان سے یہ احکام متعلق نہ ہوں گے۔ تاہم اہم امور جو اوپر مذکور ہوئے وہ مقدمات تحت قانون مختص الامر یا قانون مختص المقام پر موثر ہو سکیں گے۔

چونکہ قانون کا منشا دعوے کے بعد عروض تمادی ناقابل سماعت قرار دینے کا ہے اس لیے اگر کوئی مدیون اپنے دائن کو تمادی عارضی ہونے کے بعد کوئی رقم ادا کرے تو اس کی واجب الادا رقم متصور ہوگی اور رقم مذکور کی بازیافت کا مدیون مستحق نہ ہوگا۔

خارج المیعاد قرضہ جات مجرادہی کی شکل میں وصول کیے جاسکتے ہیں۔

جائداد کی تقسیم: کسی قرض دار کی جائداد کی تقسیم کے لیے حسب ذیل قرضوں کو اولیت اور ترجیح دی جائے گی۔

(1) حکومت یا کسی مجلس مقامی کو رقم واجب الادا کی ادائگی۔

(2) ایسے ملازمین کو تنخواہوں کی ادائگی جو فی کس بیس روپیوں سے زائد ہو اور جو دیوالیہ کا دعویٰ کرنے سے پہلے قرض دار کی جانب سے ملازمین کو واجب الادا ہوں۔ وہ رقوم جس کی صراحت اوپر کی گئی ہے مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی اور ان کی ادائگی کامل طور پر ہوگی بجز اس کے کہ دیوالیے کی جائداد کی مالیت کم ہو ایسی صورت میں رقم کی ادائگی تاحد مالیت ہوگی۔ جائداد کے انتظام کے سلسلے میں جتنی رقم درکار ہوگی اس کی منہائی کے بعد جو رقم بچ جائے گی اس سے حسب بالا مدات کی بابت رقم کی ادائگی ہوگی۔ عدالت بعض صورتوں میں اس شخص کو جسے دیوالیہ قرار دیا گیا ہو جائداد کے انتظام کے لیے مامور کر سکتی ہے اور ایسی ماموری کی صورت میں وہ شخص جائداد کا انصرام و انتظام عدالت کی عائد کردہ شرائط کے ساتھ اس طور سے کرے گا جس سے آمدنی ہو اور جس سے قرض خواہوں کو فائدہ ہو۔ قرض خواہوں کی رقم کی ادائگی کے بعد جو رقم بچ جائے اس سے استفادہ کا دیوالیے کو حق رہے گا۔ اگر عدالت مناسب خیال کرے تو قرض خواہوں کو اس کا اختیار دے سکتی ہے کہ وہ ایک کمیٹی مقرر کریں جو قرض دار کی جائداد کے متعلق رسیور کے کام پر نگرانی رکھ سکے۔ اگر کوئی قرض خواہ یا قرض خواہوں کی جانب سے مامور کردہ شخص رسیور کے کسی عمل کے متعلق اعتراض رکھتا ہو تو وہ عدالت میں درخواست دے سکے گا اور عدالت اس عذر کی سماعت کے بعد رسیور کے زیر بحث عمل کی یا تو توثیق کرے گی یا اس میں ترمیم کرے گی۔

جب میعاد ختم ہونے کے دن عدالت بند ہو: جب میعاد جو کسی مقدمہ مرافعہ یا درخواست کے لیے کی گئی ہو ایسے دن ختم ہو جب عدالت بند ہو تو مقدمہ مرافعہ یا درخواست اس دن رجوع یا پیش ہو سکے گی جب عدالت کھلے عدالت کے لیے دفعہ نمبر 5 قانون میعاد سماعت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اس لیے یہ دفعہ ہر صورت میں متعلق ہوگی قطع نظر اس سے کہ عدالت بوجہ عام تعطیل کے بند ہو یا کسی اور وجہ سے فی الواقع

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بند ہو۔ اغراض دفعہ کے لیے عام تعطیل ہونے کی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ عدالت بند ہے باوجود اس کے کہ حاکم نے اس روز عدالت کھول رکھی ہو۔

جدت (Innovation): کسی تمدن میں نئے عناصر یا خاصوں کے شمول یا اضافہ کو جدت کہا جائے گا۔ تمدن کے یہ نئے عناصر مادی بھی ہوسکتے ہیں اور غیر مادی بھی۔ دراصل جدت کی اصطلاح بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ جس میں دریافت، ایجاد، اختراع، ذہنی اور فکری اضافہ سب شامل ہیں۔ تمدنی سرمایہ میں اضافہ یا موجودہ سرمایہ کے مختلف عناصر کی جزوی یا کلی ترتیب دونوں جدت میں شامل ہیں۔ کسی سماج میں جدتوں میں اضافے یا کمی کا انحصار اس سماج کے تمدنی ورثہ پر ہوتا ہے۔ بند اور غیر فعال سماج میں جدتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف فعال، ترقی پذیر یا ترقی یافتہ سماج میں تبدیلیوں کے تناسب کے اعتبار سے جدت کی رفتار متعین ہوتی ہے۔ موجودہ صنعت اور ٹکنالوجی کے دور میں انسانی ضروریات کی تمام اشیاء میں نہ صرف مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ مختلف اشیائے ضرور کے طریقہ استعمال میں بھی ان گنت جدتیں نظر آتی ہیں۔ جدتوں کی رفتار اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس کے نتیجہ کے طور پر ایجادات میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ ایجادات اور جدتیں ایک دوسرے کے رفتار میں مسلسل اضافہ کررہی ہیں۔ موجودہ دور میں قومی روابط کے بڑھتے اور ترسیل کے بے پناہ ذرائع کی وجہ سے تمدنی روابط اضافہ کا باعث بن رہا ہے جس کی وجہ سے زندگی کے ہر میدان میں جدت کے امکانات بڑھتے جارہے ہیں۔ کسی تمدن کی تاریخ کو ناپنے کا ایک اہم پیانہ اس کی ایجادات اور جدتوں کی پیائش ہے۔ عالمی سطح پر جدتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ نے عالمی معاشرہ کے قیام کے امکانات کو زیادہ قابل عمل بنا دیا ہے۔

ترقی یافتہ معاشرہ تبدیلیوں اور جدتوں کو جلدی قبول کرلیتا ہے۔ جبکہ ترقی پذیر معاشرہ قدامت پسند ہوتا ہے اور وہاں جدتوں کو قبول کرنے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ جدت پسندی عموماً نوجوانوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ جن سماجوں میں رہنمائی صرف بزرگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہاں جدت پسندی آسانی سے قابل قبول نہیں ہوتی۔ پھر بھی سائنسی اور صنعتی ترقی کی تیز رفتاری کے سامنے قدامت پسندی کو عموماً ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔

جدیدکاری (Modernization) : جدیدکاری عمرانیات کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک سماجی تبدیلی کے ذریعہ اپنے اندر ترقی یافتہ ممالک کے اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں گوکہ جدیدکاری کے لوازم اور جدیدیت کے معیار کے باب میں کوئی متفقہ رائے نہیں ملتی تاہم اس کے ماہرین کی تصنیفات کی روشنی میں اس کے چند بنیادی نکات درج ذیل ہیں :

(1) جدیدیت کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ ملکی معیشت میں کسی نہ کسی حد تک مستقل ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔ یا کم از کم اتنی ترقی ہوتی ہے کہ اس سے پیدائش و صرف میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

(2) سیاسی نظام عوامی شرکت پر مبنی ہوتا ہے، یا کم از کم مقننہ کی سطح پر عوامی نمائندگی پائی جاتی ہے۔

(3) قومی تہذیب و ثقافت میں لامذہبیت اور عقلیت پسندی کے اصول کار فرما ہوتے ہیں۔

(4) معاشرہ میں نقل و حرکت کی آزادی کا فروغ یعنی ہر شخص کو جسمانی، سماجی اور نفسیاتی طور پر نقل و حرکت کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔

(5) مذکورہ بالا نکات کے مطابق افراد کے رجحانات اور رویّوں میں تبدیلی ہو تاکہ وہ تبدیل شدہ معاشرتی نظام میں بہتر طور پر کام کرسکیں۔

جرم (Crime) : انسانیات، علم تحلیل نفسی، سماجی نفسیات، قانون اور سماجیات کے جدید ادب میں جرم کے موضوع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس اصطلاح کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں۔ جرم سے مراد مروجہ قانون یا سماجی رواج کی ایسی خلاف ورزی ہے جو قابل دست اندازی ہو اور جسے مستوجب سزا قرار دیا جائے۔ جرم کے بے شمار نظریات پیش کیے گئے ہیں جن میں سماجی انحراف کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے۔ اہم نظریات میں جرم کے اسباب کا کلاسیکی نظریہ، نفسیاتی نظریہ، انسانیاتی نظریہ اور سماجیاتی نظریہ شامل ہیں۔ جرائم کے موروثی اسباب کے مقابلہ میں اب ماحولیاتی عوامل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے جس کی رو سے افراد یا گروہوں کے برتاؤ پر ماحول کا اثر اور اس کی گرفت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے جس کے نتیجہ کے طور پر سماجی توافق یا انحراف پیدا ہوتا ہے۔ جرمیات کو سماجی

علوم میں اب ایک علاحدہ علم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

جرم ایک طرف سے بدنظمی اور معاشرتی انتشار کی پیداوار ہے دوسری طرف سے یہ فرد واحد کے انحرافی برتاؤ کا عکس ہے۔

مشہور ماہر سماجیات پال تھاپن (Paul Tappan) نے اپنے مقالے 'جرم انصاف اور اصلاح' میں جو نیویارک سے 1960 میں شائع ہوا تھا۔ مجرمانہ فعل کی مندرجہ ذیل خصوصیات قلم بند کی ہیں۔

(1) جرم ایک باقاعدہ فعل یا حرکت ہونا چاہیے۔ کوئی صرف خیالات کے لیے سزایاب نہیں کیا جاسکتا۔

(2) جرم کرنے والے نے اختیاری طور پر جرم کیا ہونا چاہیے مجبوراً یا کسی کی زبردستی کی وجہ سے کیے گئے کام کو جرم نہیں سمجھا جاسکتا۔

(3) یہ حرکت بے ارادہ نہیں ہونی چاہیے۔

(4) یہ فعل کسی نہ کسی قانون کے تحت جرائم کی فہرست میں شامل ہو۔

(5) خود حفاظتی کے لیے کیا گیا کام جرم کے زمرے میں نہیں آتا۔

اسی طرح ہال جیورم (Hall Jerome) نے جرمیاتی قانون کے عام اصول (General Principles of Criminal Law) میں جرائم کی پانچ خصوصیتیں بتائی ہیں۔ مثلاً (1) جرم قانونی طور پر ممنوع ہونا چاہیے۔ (2) یہ ارادی ہونا چاہیے۔ (3) یہ سماج کے لیے نقصان دہ ہونا چاہیے۔ (4) اس کے پیچھے مجرمانہ مقصد ہونا چاہیے۔ (5) اس کی کچھ نہ کچھ سزا بھی مقرر ہونا چاہیے۔

انحرافی برتاؤ کے تین اقسام ہیں۔ (1) قابل برداشت انحرافی برتاؤ۔ (2) کسی حد تک ناقابل برداشت انحرافی برتاؤ۔ (3) وہ انحرافی برتاؤ جس کو سختی کے ساتھ ناپسند کیا جائے۔ یہ تیسری قسم ہی جرم کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

یہاں یہ بے حد ضروری ہے کہ سماجیات کا طالب علم جرم اور قانون کے گہرے تعلق کو سمجھ لے۔ قانون کے خلاف ہونے سے ہی کوئی فعل جرم بنتا ہے۔ ایک ہی فعل امریکا کی ایک ریاست میں جرم ہوتا ہے مثلاً رشتہ کے بھائی بہن کی آپس میں شادی لیکن یہ کہیں اور جرم نہیں ہوتا۔ ہندستان میں مسلمانوں میں دوسری شادی یا دو بیویاں ایک ساتھ رکھنا قانوناً جائز ہے جبکہ غیر مسلمانوں کے لیے یہ غیر قانونی ہے اور دوسری بیوی صرف داشتہ کا درجہ پاسکتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی جنس کے دو افراد کی شادی امریکا میں ہوسکتی ہے لیکن ہندستان کا قانون اسے تحفظ نہیں دیتا۔

آج ساری دنیا میں جرائم کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ یہ سماجی بدنظمی، صارفیت، خاندان کے بکھراؤ اور سماجی قدروں کے انحطاط کا نتیجہ ہے۔

جرمیات (Criminology) : جرمیات سے مراد وہ علم ہے جس میں جرم کے اسباب اور اس کے انسداد کی تدابیر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جرمیات کو حقیقی معنوں میں ایک علاحدہ علم کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ اس میں جرم اور اس کے متعلقہ ماحول کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نیز اس میں ان ذرائع کی بھی تحقیق کی جاتی ہے جن کی مدد سے مجرموں سے مناسب برتاؤ کا تعین کیا جاسکے۔ اس کے موضوع بحث میں علم اور فن دونوں شریک ہیں۔ جرمیات کی اصطلاح سب سے پہلے 1885 میں اطالوی مفکر رافیل گاروفلو (Raffaele Garofalo) نے استعمال کی۔ ابتداً اس میں مجرم اور اس کی قانون شکنی کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کا موضوع بحث ہنوز واضح نہیں ہے۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ جرمیات کو جرم کے اسباب کے سائنٹفک مطالعہ تک محدود رہنا چاہیے۔ اور بعض لوگوں کی رائے ہے کہ جرم، سزا اور جرم کی اصلاحات کے تمام مسائل اس کے موضوع بحث میں شامل ہونے چاہئیں۔ لیکن سائنسی تحقیق میں دلچسپی رکھنے والے ماہرین کا خیال ہے کہ جرم اور اس کے تعلق سے سماج کے ردعمل یعنی سزا اور اصلاح کے تمام مسائل کو خلط ملط کرنا پڑے تو الجھاؤ اور پیچیدگی کا باعث ہوگا۔ اور یہ کام مختلف علوم کے سپرد ہونا چاہیے۔

بہرحال جرمیات کے موضوع بحث میں سب سے اہم مسئلہ جرم کے اسباب اور جرائم کے ماحول کا سائنسی تجزیہ ہے۔ دشواری یہ ہے کہ جرم کے تعلق سے مختلف ادوار میں بے شمار نظریات ابھرے ہیں جن کی روشنی میں ہر زمانہ میں اس مسئلہ کے تعلق سے جدا جدا نقطہ نظر رہے ہیں۔ ان تمام کا مطالعہ جرمیات کی تاریخ میں صرف تذکرہ کی حد تک اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے۔ ورنہ سائنسی اعتبار سے جرم کے تعلق سے کم از کم ماضی بعید میں جو رجحان رہا ہے اسے موجودہ سائنسی چوکھٹے میں رکھ کر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پیش نہیں کیا جاسکتا حتیٰ کہ گذشتہ چند صدیوں میں بھی جرم کے تعلق سے جو نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ سولہویں صدی میں گامباتستا دلا پورتا (Gambattista Della Porta) نے مجرموں کے جسمانی مطالعہ پر اہم تحقیقاتی کام کیے۔ چنانچہ اسے پہلا ماہر جرمیات کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں فرانز جوزف گال (Franz Joseph Gall) نے انسانی دماغ کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ امریکا میں فلاڈلفیا کے مشہور ڈاکٹر بنجامن رش (Benjamin Rush) نے اس ضمن میں کافی تحقیقات کیں۔ اور مجرموں کے غیر نارمل انحرافی اور مجنونانہ اعمال پر روشنی ڈالی۔ 1876 میں مشہور اطالوی سیزر لومبر دسو (Cesare Lombraso) کی معرکتہ الآرا کتاب 'مجرم انسان' (L' Uomo Deliquente) شائع ہوئی۔ اس کتاب میں لمبروسو نے مجرموں کی پیدائشی جسمانی خصوصیات پر بحث کی۔ اس کتاب پر بعد میں کافی اعتراضات کیے گئے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تصنیف نے جرمیات کے مطالعہ میں انیسویں صدی میں کافی دلچسپی پیدا کردی۔

انیسویں صدی میں کارل مارکس، ڈارون، درکھائم (Durkheim) اور گیبرل تارد (Gabriel Tarde) کی تصانیف نے جرمیاتی فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ محض مجرم کو جرم کا ذمہ دار قرار دینے کے بجائے اس کے پورے ماحول اور سماج کے مطالعہ اور سماجیاتی تجزیہ پر توجہ دی جانے لگی۔ یہاں ان بے شمار مفکرین کا تذکرہ ممکن نہیں جنھوں نے اس میدان میں کام کیا ہے۔ لیکن یہ بات ضرور اہم ہے کہ ابتداً زیادہ تر تحقیقاتی کام یورپ میں ہوئے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں جرمیات پر زیادہ تر تحقیقاتی کام قانون اور طب کے شعبوں میں کیا گیا۔ البتہ بیسویں صدی کے آغاز سے سماجیات دانوں کی دلچسپی کے نتیجہ کے طور پر امریکا میں بھی جرمیات میں نظریاتی مطالعہ کی ابتدا ہوئی اور جرمیات پر بیشتر تحقیقات سماجیات کے شعبہ کے تحت کی گئی ہیں۔ چنانچہ چارلس کولے (Charles Cooley)، گڈنگس (Giddings) اور اڈورڈ راس (Edward Ross) نے اس طرف خاص توجہ کی۔ 1905 تک امریکا کی کئی جامعات میں جرمیات کا مطالعہ شروع ہوچکا تھا۔ لیکن زیادہ توجہ جرم کے اصلاحی پہلو پر تھی۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ سماجیات دانوں نے جرمیات کے مطالعہ اور اس کی تحقیق میں خاص حصہ لیا ہے۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمیات کے میدان میں غیر معمولی تحقیقاتی کام ہوئے ہیں۔ جرم کے اصلاحی اداروں کے بارے میں امریکا، انگلستان اور ناروے میں بالخصوص بہت کچھ تحقیق اور تصنیف ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جرم کے تعلق سے نظریات اور رجحانات میں غیر معمولی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جرم اور سماجی ماحول کے آپسی رشتے پر بہت سی تحقیقات کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے جرم کے تعلق سے غیر معمولی انکشافات سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ آج امریکا اور یورپ کی تقریباً تمام جامعات میں جرمیات کا مطالعہ شریک نصاب ہے۔ اس ضمن میں جرمیات، سماجیات، نفسیات، قانون اور انتظامیہ کے علوم میں باہمی ربط و تعاون ناگزیر ہے۔

جرمیات کی تھیوریاں کئی ہیں لیکن ان کو چھ حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ مثلاً

(1) جسمانی یا ساختیاتی نظریہ

(2) دماغی بیماری یا غیر معمولی ذہنی کیفیت پر مبنی نظریہ

(3) معاشیاتی نظریہ

(4) مخصوص شخصیت کا نظریہ

(5) انسانی ماحول پر مبنی نظریہ

(6) جدید یا انقلابی نظریہ

بعد میں ریڈ سیوی لس نے اپنے مقالے جرم اور جرمیات (Crime and Criminology) 1976 میں ان نظریات کو صرف تین حصوں میں بانٹا۔ مثلاً (1) کلاسکی اور مثبت نظریات، (2)جسمانی، نفسیاتی، معالجاتی نظریات، (3) سماجی نظریات۔

کلاسکی اور مثبت نظریات : اس تھیوری میں انسان کی اپنی سوچ اور ہر چیز کو سمجھنے کا نظریہ ہی اس کو جرائم کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی جسمانی ساخت بھی اسے اس کے لیے مجبور کرتی ہے۔

جسمانی، نفسیاتی اور معالجاتی نظریات : دماغی کمزوری دماغی خلل اور شخصیاتی نقص (Personality Disorder) بھی اکثر جرائم کا سبب سمجھے جاتے ہیں۔

سماجی نظریات: معاشرتی اور معاشی نظریات بھی اہم ہیں۔ غریبی، بے روزگاری، سماجی بائیکاٹ بھی انسان کو جرم کی طرف راغب کرواتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اسی طرح سزا کی بھی بدلتے وقت کے ساتھ تھیوریز بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے سزا دوسروں کو عبرت دلوانے کے لیے دی جاتی تھی پھر وہ آنکھ کے بدلے آنکھ، جان کے بدلے جان کے نظریہ پر انحصار کرنے لگی۔ آج کل سزا اصلاح کے لیے دی جاتی ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ سزا کے ان تینوں نظریات میں کچھ نہ کچھ کمیاں ہیں۔

ہندستان میں جرمیات کے سلسلے میں کافی تحقیقات ہوئی۔ بچوں کی جیلیں، بچوں کی عدالتیں، بچوں کے فیصلوں کے لیے بورڈ وغیرہ قائم کیے گئے۔ بے دیوار جیلیں (Wall Less Prisons) بنوائی گئیں۔ جدید تحقیقات کا واضح اثر ملک کے جیل خانوں کے سدھار اور مجرموں کے تعلق سے جدید رویہ میں نظر آتا ہے۔ لیکن ہر ملک کے تمدن اور حالات کے اعتبار سے جرم کے مطالعہ میں مقامی عوامل (Variables) کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر ہم جرمیات کے عام نظریے، مقامی حالات اور اسباب کی مکمل وضاحت نہیں کرسکتے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہندستان میں بھی جرمیات کے علاحدہ شعبوں اور تحقیقاتی اداروں کا قیام شروع ہوچکا ہے اور بہت جلد بہت سی جامعات میں اس کے علاحدہ شعبے قائم ہونے کی تجاویز پاس ہورہی ہیں اور ان کے قیام کا قوی امکان ہے۔ اس کے علاوہ دہلی میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ڈفنس (National Institute of Social Defence) اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف کرمنالوجی (Indian Institute of Criminology) اس سلسلے میں تحقیقاتی کام کررہے ہیں۔

جزوی معاشیات (Micro-Economics): معاشیات کے نظریوں کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (1) جزوی معاشیات (Micro Economics)، (2) کلی معاشیات (Macro-Economics)۔ مائکرو معاشیات میں مطالعہ انفرادی و فیصلہ اکائیوں (Decision Unit) مثلاً صارف، خاندان، کمپنی وغیرہ میں کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کے فیصلوں کا تعلق کس طرح اشیا کی قیمتیں مقرر کرنے، پیداوار کے عناصر کا تعین کرنے اور ان کی خرید و فروخت کی مقدار مقرر کرنے سے ہے۔ اس کا بنیادی مقصد اس ڈھانچے کو سمجھنا ہے۔ جس کی مدد سے سماج کے تمام وسائل کو مختلف استعمال کے لیے تقسیم کیا جاتا ہے۔ جزوی معاشیات کا مرکزی تصور بازار (Market) ہے۔

جزیہ: یہ وہ محصول ہے جو ذمیوں سے فوجی خدمت اور ان کی محافظت کے عوض میں لیا جاتا ہے۔

جس انروریم (Jus Honorarium): مختلف نوعیت کے مجسٹریٹ اور پریٹر (Preater) کے احکامات کی بنا پر جو قانون بنا اسے رومن لا کی اصطلاح میں جس انروریم (Jus Honorarium) کہا جاتا تھا۔

جسٹینین انسٹی ٹیوشن (Justinian Institution): جسٹینین انسٹی ٹیوشن اس فہرست کو کہتے ہیں جس میں قانون روما کے دستوری اور غیر دستوری ماخذ درج ہے۔ اگرچہ کہ قدیم دور کے اختتام پر رواج سے ہٹ کر جدید قانون روما کا سب سے اہم ماخذ شہنشاہ وقت کے احکام تھے۔

جس جن ٹیم (Jus Gentium): رومن لا کے تحت ایک شے جس کا کوئی مالک نہ ہو اور جس کے متعلق ملکیت قائم کی جاسکتی ہو جس نے سب سے پہلے اس پر قبضہ حاصل کیا ہو۔ یہ اصول ان اشیاء سے متعلق ہے جو اپنے مالکوں کی جانب سے چھوڑ دی گئی ہوں یا جن کی دیکھ بھال مالک نہیں کررہے ہوں رومن لا کے تحت کسی جائداد غیر منقولہ کے متعلق کسی کرایہ دار کو معاہداتی حق کے سوا اور کوئی تحفظ نہیں تھا۔ کوئی کرایہ دار جائداد کو کسی دوسرے شخص کو کرائے پر نہیں دے سکتا تھا۔

جس سول (Jus Civil): رومن لا کی اصطلاح میں جس سول (Jus Civil) اس قانون کو کہتے تھے جو مقننہ کی جانب سے یا رسم و رواج کی بنا پر نافذ کیا جائے۔

جسمانی تعلیم (Physical Education): جسمانی تعلیم، عام تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کی تعلیم ان جسمانی سرگرمیوں کے ذریعہ دی جاتی ہے جس میں جسم کے بڑے بنیادی عضلات کام کرتے ہیں۔ اس سے فرد کو اپنے جسم کی نشو و نما اور کنٹرول میں مدد ملتی ہے۔

اس کا پروگرام عموماً منظم جسمانی سرگرمیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جمناسٹک، جسمانی ورزش اور کھیل کود کے علاوہ اس پروگرام میں اکثر جسمانی حفظان صحت اور صحت عامہ کے اصول اور صحت کے مسائل کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔ جسمانی تعلیم کے پروگرام کو مرتب کرتے وقت تشریح عضویات، نفسیات، فلسفہ اور آرٹ کے اصولوں اور جدید تحقیقات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔

جسمانی تعلیم کے رواج سے قومی تہذیب اور فوجی طاقت کا ارتقا عمل میں آتا ہے۔ اس کے ذریعہ افراد کی عضوی قوت اور عصبی عضلی مہارتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ کھیل کود اور تفریحی مشاغل کا شوق بڑھتا ہے اور سماجی اور اخلاقی معیار کو سنوارنے اور بلند کرنے میں مدد ملتی ہے۔

جسمانی تعلیم قدیم زمانہ میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی اور تعلیم کے اب سے پرانے طریقوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ قدیم قومیں اپنی بقا کے پیش نظر اور جنگ کی تیاری کی غرض سے اپنے نوجوانوں کو فوجی مہارتیں سکھانے اور ان کے جسم کو مضبوط اور تندرست بنانے کی تربیت کا انتظام کرتی تھیں تاکہ وہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہ سکیں۔

یونانی قوم نے 776 قبل مسیح میں پہلے پہل جسمانی تعلیم کے فلسفہ کو ایک علم کا درجہ دیا اور اس طرح یونان میں اولمپک کھیل کود کا آغاز ہوا۔ یونان میں ایتھنز نے جسمانی تعلیم کو عام تعلیم کا حصہ بنا دیا اور فرد کی ہم آہنگ نشو ونما پر زور دیا۔ ان کے نظریہ کے پیش نظر جسمانی تعلیم کا مقصد انسان کی جسمانی، ذہنی، جمالیاتی اور اخلاقی اہلیتوں کو اجاگر کرنا تھا تاکہ وہ بہتر طریقہ سے ریاست کی خدمت انجام دے سکیں۔

رومیوں نے یونانی تہذیب کا بہت اثر قبول کیا لیکن ان کی جسمانی تعلیم کے فلسفہ کو پورے طور پر نہیں برتا اور انھوں نے جسمانی تعلیم کو جنگ جو سپاہی تیار کرنے کا ذریعہ بنایا۔

اٹھارہویں صدی میں روسو (1712-78) اور پسٹالوزی (1746-1827) کی تعلیمات سے جسمانی تعلیم کا رجحان پیدا ہوا اور اس کے پروگرام کو عام آبادی تک پھیلانے میں مدد ملی۔

نپولین کے عہد میں اور اس کے بعد کے تین ممالک جرمنی، سویڈن اور ڈنمارک نے جسمانی تعلیم کے میدان میں بہت ہی نمایاں کام کیا۔ ان میں سے جرمنی نے سب سے پہلے جسمانی تربیت کا نظام مرتب کیا جس کو جرمنی جمناسٹک سسٹم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سویڈش اور ڈینش سسٹم مرتب ہوئے۔

دراصل منظم کھیلوں کے رائج کرنے کا سہرا برطانیہ کے سر ہے۔ ابتدا میں انگلستان میں سویڈش سسٹم کی رسمی ورزشوں کو اپنایا گیا لیکن بعد میں ان ورزشوں کے ساتھ کھیلوں کے پروگرام کو بھی شامل کر لیا گیا اور کھیلوں کی تعلیمی اہمیت پر بہت زور دیا۔ 1945 کے بعد سکھانے کے طریقوں میں بھی تبدیلی ہوئی۔ تیارشدہ گوشوارہ کی ورزشوں کی رسمی طریقہ سے سکھانے کی بجائے انفرادی مشاغل اور فطری سرگرمیوں پر زیادہ زور دیا گیا۔

امریکا نے جسمانی تعلیم کے کام کو سائنسی طریقہ پر مرتب کرنے میں بہت نمایاں کام کیا۔ یہاں نئی باتیں اپنانے اور پروگرام میں تنوع اور جدت پیدا کرنے کے عمل کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ باسکٹ بال، امریکن فٹ بال اور بیس بال ان کے قومی کھیل ہیں۔ دوسرے کھیل ٹینس، بیڈمنٹن، کسرتیں (ایتھلیٹکس) اور تیراکی وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

روسیوں نے جسمانی تعلیم کو فرد کی ہم آہنگ نشو ونما کے لیے بہت ہی ضروری سمجھا اور اپنے قومی کاموں میں اولیت کی جگہ دی۔ اپنے پروگرام کے ذریعہ نوجوانوں میں طاقت اور قوت برداشت پیدا کرنے اور عوام الناس کی جسمانی ترقی کی طرف بہت زور دیا۔ تمام اسکولوں اور کالجوں میں جسمانی تعلیم لازمی ہے اور ان اداروں میں سب سہولتوں کا معقول انتظام ہے۔ کارخانوں اور کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کے لیے سارے ملک میں جا بجا بہت بڑی تعداد میں کھیل کود کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔

ہندوستان میں بھی جسمانی تعلیم کو جسمانی نشو ونما، فوجی طاقت کو مضبوط کرنے اور کھیل کود کے لیے استعمال کیا گیا۔ ڈنڈ، بیٹھک، سوریہ نمسکار، یوگ آسن کی ورزشیں، کشتی، ملکھم، ناچ، کبڈی اور کھو کھو کھیل وغیرہ سرگرمیاں ایک عرصہ دراز سے رائج ہیں۔ انگریزوں کے دور حکومت میں جرمنی، سویڈن اور ڈنمارک کے سسٹم کی ورزشوں کو فوج اور اسکولوں کے پروگرام میں شامل کیا گیا۔ بعد میں ماہوار تعلیم نے ٹیم کے کھیلوں کو پروگرام میں شامل کیا اور اسکولوں میں ورزش اور کھیل کا ملا جلا پروگرام مرتب کیا۔

آزادی کے بعد جسمانی پروگرام پر کافی توجہ دی گئی ہے۔ جسمانی تعلیم کا قومی پلان سنہ 1956 میں مرتب کیا گیا۔ جسمانی تعلیم کو عام تعلیم کا ایک جزو تسلیم کیا گیا اور مدرسوں میں اس پروگرام کو لازمی قرار دینے کی طرف قدام اٹھائے گئے۔ ابتدائی مدرسوں میں ایک گھنٹہ روزانہ اس کام کے لیے وقت ہوتا ہے اور ثانوی اسکولوں میں کھیل کے میدان اور سامان کی سہولتوں کے اعتبار سے 2 سے 5 گھنٹے تک ٹائم ٹیبل میں رکھے جاتے ہیں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اور جسمانی تعلیم کے تربیت یافتہ اساتذہ اس پروگرام کو چلاتے ہیں۔

جسمانی تعلیم کے ذریعہ چار قسم کی یعنی جسمانی نشو ونما، حرکی نشو ونما، ذہنی نشو ونما اور سماجی نشو ونما ہوتی ہے۔

جسمانی تعلیم کے پروگرام میں ایسی مختلف سرگرمیاں شامل ہوتی ہیں جن کے ذریعہ جسم مضبوط، ٹھوس اور چست بنتا ہے۔ عضلات تحریک پیدا ہوتی ہے۔ ہاضمہ بہتر ہوتا ہے اور دوران خون، اخراجی اور تنفسی نظام وغیرہ باقاعدگی سے کام کرنے لگتے ہیں۔ محنت اور مشقت کے کام کرنے کے لیے جسم میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ تکان دیر سے آتی ہے اور جسم میں توانائی اور امراض کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی فرد بالکل صحت مند اور توانا ہو جاتا ہے۔

حرکی نشو ونما سے مراد ہے ایسی جسمانی حرکتیں جو کار آمد ہوں اور جس کے کرنے سے زور کم پڑے اور جسم میں ایک جمالیاتی حس پیدا ہو جائے۔ اس کا تعلق کام، کھیل اور ہر اس چیز سے ہے جس میں جسمانی حرکت درکار ہے۔ کارگزار جسمانی حرکت کا دارو مدار عصبی عضلی ہم آہنگی پر ہے جس سے انسان اپنے روزمرہ کے کام کو بغیر کسی تکان کے بخوبی انجام دے سکے اور یہ خوبی ایسی جسمانی سرگرمیوں کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے جس میں دوڑنے، لٹکنے، کودنے، پھینکنے، چھلانگ لگانے، ٹِک لگانے، جھکنے، مڑنے، وزن لے جانے اور اٹھانے کی مہارتیں کام میں لائی جائیں۔ مختلف کھیل کود میں حصہ لینے سے مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ فرد زندگی سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اس کو مسرت اور شادمانی حاصل ہو سکتی ہے اور حوصلہ اور اعتماد پیدا ہو سکتا ہے۔

ذہنی نشو ونما کا انحصار ایسے حصول معلومات سے ہے جس کا تعلق ایک جانب جسمانی سرگرمیوں اور کھیلوں سے ہے اور دوسری طرف فعالیت کے دوران سوچنے سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے کی صلاحیت سے ہے۔ جسمانی مشاغل کو سیکھنے میں عصبی عضلی ترتیب کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے حاصل کرنے میں بچے کو سوچنا سمجھنا پڑتا ہے۔ یہ مہارت "سعی و خطا" کے عمل سے ہوتی ہے۔

سماجی خوبیوں کی نشو نما کے مواقع اجتماعی منظم کھیلوں میں بہت ملتے ہیں۔ ٹیم کے کھیلوں کے ذریعہ بچے میں "ہم" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور عوام الناس کی بہتری اور کامیابی کے لیے سوچنے اور اس کے لیے دل و جان سے کوشش کرنے کا تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اجتماعی کھیلوں کے ذریعہ ساتھیوں سے مل کر کام کرنے، دوستی و بھائی چارہ بڑھانے، ایک دوسرے کی عزت کرنے، قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کرنے، کپتان کی اطاعت و قیادت قبول کرنے جیسے اعمال کی بہترین تربیت ہوتی ہے۔

جسمانی تعلیم کے نصاب کی تشکیل میں معقول تعلیمی اصول، بچوں کی نشوونما، شوق اور نوجوانوں کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور یہ پروگرام ایسے متنوع مواقع فراہم کرتا ہے جو وسعت مراد اور شدت کے اعتبار سے ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھنے والے طلبا کے لیے موزوں ہوتا ہے۔

جسمانی تعلیم کے اغراض و مقاصد نرسری یا ثانوی منزل پر ایک ہی رہتے ہیں۔ البتہ مختلف درجات کی سطح پر مخصوص مقاصد کے پیش نظر نصاب کے مواد میں فرق ہوتا ہے۔

جسم فروشی (Prostitution) : جسم فراموشی جو آج کے صارفی معاشرے میں اپنی شکل بدل بدل کر سامنے آرہی ہے۔ دراصل ہندستان میں ایک قدیم ترین پیشے کے طور پر قائم تھی۔اس کا کچھ تعلق ہماری روایتوں سے بھی ہے۔ قدیم ہند میں 'نگر بدھو' کی روایت تھی جس کے مطابق اگر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے نوجوانوں میں دشمنی کی بنیاد پڑتی تھی تو ان لڑکیوں کو 'نگر بدھو' یا شہر بھر کی بیوی (یا طوائف) بنا دیا جاتا تھا۔ اس دور میں لڑائیوں کے دوران سپاہیوں کے دل بہلانے کے لیے طوائفوں کے گروہ ساتھ جاتے تھے۔ اور رات میں ناچ گانا ہوتا تھا۔ مندروں میں رقص اور موسیقی کو عبادت کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے لیے دیو داسیاں یعنی بھگوان کی کنیزیں ہوتی تھیں جن کو پجاری اور دیگر صاحب ثروت اصحاب طوائفوں کی طرح دل بہلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ روایت اب بھی باقی ہے۔ جاگیردارانہ تہذیب میں ان کو شاہدان بازاری اور ارباب نشاط کہا گیا ہے۔ اردو شاعری کے جفا پیشہ محبوب میں بھی اکثر طوائفیت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

مختصراً جسم فروشی اگرچہ ہر سماج میں موجود تھی اور ہے لیکن ہندستان میں اسے عبادت کا درجہ حاصل تھا۔ قدیم دور کے امیر و کبیر لوگوں کے لیے ہندستان میں عورت کنیز، رقاصہ اور طوائف ہر طرح ایک استعمال کی چیز رہی۔ ان سب سے بڑھ کر کثرت اموات کی وجہ سے بیوہ ہو جانے والی عورتوں کو بھی اکثر و بیشتر باضابطہ یا بے ضابطہ طور پر طوائف

بن جانا پڑتا تھا۔ اکثر ایسی عورتوں کو گھر کے لوگ تیرتھ استھانوں پر چھوڑ دیتے تھے اسی لیے ہمارے پرانے تیرتھ استھان آج بھی جسم فروشی کے لیے مشہور ہیں۔ گیا، ورانسی، الہٰ آباد، ہری دوار وغیرہ میں اکثر جسم فروش عورتیں ایک وقت کے کھانے بلکہ اکثر ایک سنترہ یا کیلے کے لیے آج بھی مل جاتی ہیں۔ قدیم ہند سے کیونکہ کسی بھی قسم کے معاشی کردار کی عورتوں سے امید نہیں کی جاسکتی تھی اس لیے اکثر کام کرنے والی عورت کا مطلب جسم فروش عورت سے لگایا جاتا تھا۔ مثلاً تاجر طبقے کے افراد کو 'ویشہ' کا لقب دیا گیا ہے لیکن اسی لفظ کا مونث یعنی 'ویشیا' کا مطلب تاجر عورت نہیں بلکہ طوائف ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں استعمال ہونے والا لفظ 'کسبی' طوائف کے لیے استعمال ہوتا رہا اگرچہ اس کا لفظی مطلب روزگار کرنے والی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر عورت روزی کمائے گی تو صرف جسم فروشی کرکے ہی۔ عوام الناس میں کثرت سے استعمال ہونے والا لفظ 'رنڈی' دراصل رانڈ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ہے بیوہ۔ ان سب الفاظ سے سماج کے متعصبانہ اور غیر منطقی رویہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

آج کے بزنس کی بنیاد پر کھڑے سماجی ڈھانچے میں 'سیکس ورکرز' کئی طرح سے کام کررہی ہیں۔ کہیں یہ ہوٹلوں میں میزبان ہیں، کہیں وہ دفتروں میں سوشل سکریٹری (ہوٹلوں کی میزبان اور دفتروں کی سوشل سکریٹری خواتین کو کلیہ کے طور پر کال گرل یا طوائف سمجھ لینا بہت بڑی زیادتی ہوگی) کہیں کال گرل اور کہیں گندے ریڈ لائٹ ایریا میں طوائف۔ اونچے طبقے کی پانچ ستارہ ہوٹلوں میں گھومنے والی کال گرلز کے کاروبار میں ان کی اپنی مرضی، خوشی اور جلد از جلد امیر بننے کی تمنا شامل ہوتی ہے ان کاروبار کی بنیاد استحصال پر کم ہی ہوتی ہے جبکہ گندے کوٹھوں اور جسم فروشی کے گھٹیا اڈوں پر رہنے والی مخلوق حالات کا شکار ہوکر اکثر صرف زندہ رہنے کے لیے جسم کا کاروبار کرتی ہے۔ بڑے شہروں میں جہاں اکثر مرد اپنی فیملی کے بغیر رہتے ہیں، ان کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ بلٹز مئی 20/ 1987 میں ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ انڈین ہیلتھ آرگنائز کے سروے کے مطابق ممبئی، کلکتہ اور دہلی میں ایک ایک لاکھ طوائفیں موجود ہیں۔ بھارتیہ پتیا ادھار سمیتی ایک غیر سرکاری تنظیم کی ریسرچ کے مطابق 1988 میں ہندستان میں ساڑھے سترہ لاکھ طوائفیں اور ان کے پچاس لاکھ بچے موجود تھے۔ (ہندستان ٹائمز 11/ اکتوبر 1988)۔

اب یہ تعداد تقریباً دوگنی ہوچکی ہوگی۔ ہندستانی قانون میں 1956 میں یہ ایکٹ پاس ہوگیا تھا کہ جسم فروشی بذات خود ایک جرم نہیں ہے بلکہ قحبہ خانہ چلانا، جسم فروشی کی کمائی کھانا، کسی کو جسم فروشی کے لیے مجبور کرنا، جسم فروشی کے اڈے پر انتظامی امور کو دیکھنا، منظر عام پر نازیبا حرکات کرنا اور اپنے قبضے رہنے والی کسی بھی عورت سے جنسی تعلقات قائم کرنا قابل تعزیر جرائم ہیں۔ جسم فروشی اور ان کے گاہکوں کو اس میں قابل سزا نہیں سمجھا گیا ہے۔

آج ہندستان میں بنگلہ دیش اور نیپال سے برابر تیرہ چودہ سال کی لڑکیاں آتی رہتی ہیں اور ممبئی اور دہلی کے چکلوں میں پہنچا دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی بنگال آندھرا پردیش اور بہار سے غریب لڑکیوں کی کھیپ ہر سال آتی ہے۔ سندربن کے علاقہ میں جنگلی جانوروں اور دوسرے خطرات کی بدولت بے شمار مرد ہلاک ہو جاتے ہیں ان کی عورتیں کلکتہ کے سوناگاچھی علاقہ میں پہنچا دی جاتی ہیں۔ وہ وہاں دس سال گزار کر وہ واپس آتی ہیں۔ اس کے علاوہ جسم فروش عورتوں کا سب سے بڑا سپلائر آج بھی کولہاپور ہے۔ یہاں یلما دیوی کے مندر میں دیوداسی بننے والی لڑکیاں کچھ دنوں تک گاؤں کے کھیا کے تصرف میں رہتی ہیں اس کے بعد پونا اور ممبئی بھجوادی جاتی ہیں۔ اس مندر سے ہر سال دس ہزار لڑکیاں جسم فروشی کے اڈوں میں بھجوائی جاتی ہے، یہ سب نچلی ذاتوں کی ہوتی ہیں۔

نچلے درجے کی طوائفوں کا انجام دردناک ہوتا ہے۔ خاندان اور آمدنی نہ ہونے کے سبب اکثر وہ بھکاریوں کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں اس کے علاوہ وہ عموماً جنسی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ملکی غیر ملکی تنظیموں کے علاوہ سرکار بھی آج کل جنسی بیماریوں کے معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے کیونکہ ایڈس جو آج کل وبائی بیماری کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ ہندستان میں حملہ آور ہوچکی ہے۔ فی الوقت ہندستان میں 33 ملین مریض ایڈس یا ایچ آئی وی کا شکار ہیں۔ ایڈز کے جراثیم کا کیریر سیکس ورکر خاص طور پر ہوتی ہیں۔

ہندستان میں اگرچہ آتشک اور سوزاک میں بھی بدستور موجود ہیں لیکن ایڈس کے مہلک اثرات کے سامنے ان کو نظرانداز کردیا گیا ہے۔

جہاں تک جسم فروشی کے اسباب کا تعلق ہے غریبی اس کی ایک وجہ ہے۔ ہماری روایتیں بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ مدھیہ پردیش اور راجستھان کے کچھ قبیلے اس کو ایک باقاعدہ کاروبار سمجھتے ہیں اور

ہائی وے پر ان کے گاؤں کے گاؤں بسے ہیں جہاں کھلے عام یہ کاروبار ہوتا ہے۔ اور باپ اور بھائی اپنے گھر کی عورتوں کے لیے گاہک ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔

ان عورتوں کے لیے یہ پیشہ چھوڑنا بے حد مشکل ہے کیونکہ عام سماج میں مقام بنانے کے سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ سماج ان کو قبول نہیں کرتا اور اگر وہ یہ کام چھوڑنا بھی چاہیں تو یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان کے دلال اور نائکائیں ان کو اپنے جال سے نکلنے نہیں دیتے اس کے علاوہ کسی اور کام میں ان کو سماج لگنے نہیں دیتا۔ نہ کوئی ان کو نوکری دیتا ہے نہ یہ گھر گرہستی بسا سکتی ہیں۔

کئی غیر سرکاری تنظیمیں ان کے لیے کاموں میں لگی ہیں۔ ممبئی کی ایک رضاکارانہ تنظیم 'ساودھان' نے ان کے لیے ریسرچ اور آبادکاری کے کئی پروگرام بنائے ہیں۔ 1990 میں اس تنظیم نے ممبئی کی لاکھوں طوائفوں میں سے نو سو کو قحبہ خانوں سے نکال کر ان کے گھروں میں پہنچایا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اپنے پرانے چکلا گھروں میں واپس آگئیں۔

نرملا نکیتن کالج آف سوشل ورک نے ممبئی میں پریرنا نام سے کماٹی پورہ (ریڈ لائٹ ایریا) میں ایک پروجکٹ شروع کیا ہے اس کے علاوہ دہلی میں بھی کئی تنظیمیں کام کررہی ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں نے ان عورتوں کی مشکلات کو الگ طرح سے سمجھا ہے۔ سرکاری رویہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن اکثر غیر سرکاری تنظیمیں ان میں کنڈوم بانٹتی ہیں اور ان کو محفوظ مباشرت کے طریقے سکھاتی ہیں۔ ان کے میڈیکل چیک اپ اور علاج کی سہولتیں مہیا کرواتی ہیں۔ ان کے بچوں کے لیے اسکول اور ننھے بچوں کے لیے نرسری اور کریش کا انتظام کرتی ہیں۔

ڈپارٹمنٹ آف سوشل ورک دہلی کے پروفیسر مکھرجی کی تحقیقات کے مطابق شمالی ہند کی زیادہ تر طوائفیں سماج کے نچلے طبقوں مثلاً درج شدہ ذاتوں یا قبیلوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ تقریباً ستر فیصد ناخواندہ ہوتی ہیں ان کے خاندانوں میں زیادہ تر مرد بے زمین مزدور ہوتے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے سماج کے ٹھکرائے ہوئے اور حاشیہ پر رہنے والے خاندانوں کی افراد ہوتی ہیں۔ ان میں خاندانی طور پر اکثر طوائفیں ہوتی ہیں اکثر جانتے بوجھتے اس پیشہ میں آتی ہیں۔ وہ جو دوسرے کاموں کے سلسلے میں بہکا کرلائی جاتی ہیں وہ بھی اپنی قسمت پر جلد شاکر ہوجاتی ہیں۔ تقریباً آدھی طوائفیں اس پیشے کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتیں لیکن اکثر اپنے بچوں کو پڑھانا لکھانا چاہتی ہیں۔

یہاں پر جسم فروشی کے سلسلے میں مرد طوائفوں (Male Prostitutes) کو بھولنا نہیں چاہیے۔ حسن کاری کے مرکزوں میں مالش کرنے والے یا دوسرے تن آسان اور بے روزگار نوجوان مغربی ممالک میں اس پیشہ میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے گاہکوں میں ادھیڑ عمر کی خواتین ہوتی ہیں جو ان لوگوں کو موٹی فیس دیتی ہیں۔ ہندستان کے بڑے شہروں میں بھی یہ رواج چل نکلا ہے۔ مغربی ممالک میں اکثر وبیشتر مردوں کو بے لباس ہوکر کیھرے بھی کرنا پڑتا ہے۔ ایک ہندستانی ذہن کے لیے یہ شاید مضحکہ خیز ہو مگر ترقی یافتہ ممالک میں یہ ہوتا رہتا ہے جس کے ٹکٹ لڑکیوں کے کیھرے ڈانسوں سے کہیں زیادہ مہنگے ہوتے ہیں۔

انجام کار یہ کہا جاسکتا ہے کہ جسم فروشی ایک قدیم ترین پیشہ ہے اور موجودہ دور میں بھی یہ موجود ہے۔ سدھار کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کا سدباب نہیں کیا جاسکا ہے۔

جغرافیائی معلمات ماخذ (Geographical Sources):

کتب خانہ اور خاص طور پر عوامی زمرہ کے کتب خانہ میں معلومات کی تلاش میں آنے والوں کی بڑی تعداد کی معلوماتی ضرورت جغرافیہ کے کسی پہلو کی ہوتی ہے۔ شہروں اور قصبات کے محل وقوع، وہاں کی آب و ہوا، پہنچنے کے ذرائع، دستیاب غذائی اجناس، زبان، سکے وغیرہ کی معلومات سیر و سیاحی کرنے والوں کے سوالات کا مرکز ہوتے ہیں۔ کسی اہم کانفرنس کے انعقاد کی جگہ کے بارے میں لوگوں کی جستجو ہوتی ہے۔ سیاسی افق پر کسی بھی وجہ سے کسی غیر معروف علاقے کے ابھرنے سے بھی لوگ اس علاقے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ یا زلزلہ کی زد کے علاقے کس نوعیت کے ہیں، سائکلون اور ٹائی فون کیا ہیں ان سب کو جاننے اور سمجھنے کی جستجو ہمیں کتب خانے کی طرف لی جاتی ہے اور ان کے جوابات کے لیے حوالہ جاتی خدمت لائبریرین جغرافیائی ماخذ سے استفادہ کرتا ہے۔

جغرافیائی حوالہ ماخذ اس قسم کے بہت سے سوالوں کا جواب فراہم کرتے ہیں۔ جغرافیائی ماخذ میں نقشے، اٹلس، گلوب، گزیٹیر اور سیاحت میں رہنمائی کے لیے مرتب گائڈ کتابیں شامل ہیں۔ عام انسائیکلوپیڈیا اور بڑے حجم کی لغات بھی مقامات اور قدرتی بری اور بحری علاقوں کے بارے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

میں معلومات فراہم کرتی ہیں لیکن ماہرانہ تفصیل مخصوص نوعیت کی جغرافیائی انسائکلوپیڈیا اور لغت سے ہی ملتی ہیں۔ ویبسٹر نیو جیوگرافیکل ڈکشنری (Webster New Geographical Dictionary) میں مقامات کے 47000 اندراجات ہیں۔ اسی طرح چیمبرس ورلڈ گزیٹیر (Chambers World Gazetter) خود کو جغرافیائی معلومات کی الف سے ی تک کی تفصیل کا دعویٰ کرتا ہے۔

اٹلس نقشوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں جبکہ نقشہ سطح زمین یا خلائی سیاروں کا ایک پیمائشی مناسبت یعنی اسکیل کے مطابق بنایا ہوا مظہر ہے۔ بیشتر ممالک اپنے نقشہ کشی کے شعبہ سے نقشہ تیار کراتے ہیں۔ ہندستان میں سروے آف انڈیا، نیشنل اٹلس اور تھیمیٹک میپنگ آرگنائزیشن (National Atlas and Thematic Mapping Organisation) وغیرہ نقشہ بنانے کے مجاز ہیں۔

آج کل مختلف اقسام کے اٹلس دستیاب ہیں جن میں آبادی، معاشی موضوعات، سیاسی اور تاریخی نیز طبعی تقسیم کے اٹلس زیادہ استعمال میں رہتے ہیں۔ رینڈ میکنلی (امریکا) اور فلپ (انگلینڈ) دو معروف اٹلس ساز کمپنیاں ہیں جن کے عالمی اٹلس معروف اور مصدقہ ہیں۔ نقشہ کی مدد سے ہمیں سیاسی اور سماجی خبروں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تاریخی اٹلس دنیا کے ممالک کی بدلتی ہوئی سرحدوں کی نشاندہی کرتے ہیں، مقامات کے بدلتے ہوئے ناموں سے ہمیں واقف کراتے ہیں۔

گزیٹیر کے دو مفہوم بتائے جاتے ہیں پہلا مفہوم کسی اٹلس کا اشاریہ ہے اور دوسرا مفہوم ایک علاحدہ سے تیار کتاب حوالہ جس میں دنیا کے مقامات کے بارے میں معلومات دی گئی ہو۔ ہندستان میں گزیٹیر پہلی بار 9 جلدوں میں 1881 میں شائع ہوا۔ انگریزی دور حکومت میں اس کا آخری ایڈیشن 1931 میں 26 جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ پہلی جلد سے آخری جلد تک حروف تہجی کے اعتبار سے ایک ترتیب میں درج معلومات کے اصول پر مرتب ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر ضلع کے گزیٹیر بھی شائع کیے گئے تھے۔ یہ گزیٹیر ان اضلاع کے بارے میں تاریخی معاشی اور سماجی تاریخ کا ماخذ ہیں۔ آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے کل ہند گزیٹیر 4 جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ہر ریاست نے اپنے اپنے اضلاع کے ضلعی گزیٹیر شائع کیے ہیں اور کر رہے ہیں۔

سیاحوں کی سہولت کے لیے رہنما کتابیں جغرافیائی معلومات کے ایک مفید ماخذ ہیں یہ کتابیں ریاستوں کی حکومتیں اپنے شعبہ سیر و سیاحت سے شائع کرتی ہیں۔ چند معروف کمپنیاں بھی ایسی رہنما کتابیں شائع کرتی ہیں، ان میں قابل ذکر ناشرین فوڈور (Fodor) اور مرے (Murray) ہیں۔

جلاوطنی (Exile): کوئی حکومت اپنے کسی شہری کو سزا کے طور پر یا کسی اور وجہ سے ملک بدر کردے یا خود وہ شخص سزا سے بچنے کے لیے ملک چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے تو یہ اسے جلاوطنی کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یونان کی شہری ریاستوں خاص طور پر ایتھنز میں سیاسی مخالفوں کو تمام حقوق سے محروم کرکے سماجی طور پر ان کا مقاطعہ کردیا جاتا تھا۔ قدیم رومن سلطنت میں لوگ سزاؤں سے بچنے کے لیے ترک وطن کرلیتے تھے۔ ایسے لوگوں پر حکومت نگاہ رکھتی تھی اور اگر وہ شخص پھر واپس آجاتا تھا تو قانونا ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ اسے قتل کردے۔ جب رومن سلطنت کا حلقہ اثر بڑھ گیا تو پھر وہاں جلاوطنی کی سزا بھی دی جانے لگی۔ عہد قدیم میں اسرائیلیوں کے یہاں یہ قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص قتل کے جرم کا مرتکب ہوتا تو حکومت اسے کسی شہر میں خاص جگہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتی اور اس کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کرتی تھی۔

قدیم اطالوی شہری ریاستوں میں سیاسی مجرموں کے لیے جلاوطنی کی سزا عام تھی۔ انگلستان میں بھی بعض مجرم آسٹریلیا اور دوسرے دور دراز علاقوں کی جیلوں میں بھیج دیے جاتے تھے اور زار شاہی دور میں ہزاروں مجرم اور سیاسی قیدی سائبیریا جلاوطن کیے جاتے تھے۔

ہندوستان میں جلاوطنی کی سزا بہت قدیم ہے۔ تپسیا کے لیے اور سزا کے طور پر لوگ جلاوطن کیے جاتے تھے اور انھیں بن باس دیا جاتا تھا۔ سری رام چندر جی اور سیتا جی کو بھی بن باس جانا پڑا تھا۔ انگریزی دور حکومت میں ہزاروں سیاسی قیدیوں کو جلاوطن کرکے کالے پانی یا جزائر انڈمان بھیج دیا جاتا تھا۔

موجودہ دور میں قومی ریاستیں قائم ہوئیں اور ریاستوں کے درمیان سیاسی تعلقات قائم ہوے تو جلاوطنی کی سزا بہت کم ہوگئی لیکن اب بھی انقلاب یا سیاسی بغاوت کی صورت میں شکست خوردہ بہت سارے لوگ اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جابسنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات اس انقلاب یا بغاوت کے حامی یا مخالف دوسرے ملک اس پناہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

گزیں کی حمایت کرتے ہیں اور اس میں مدد کرتے ہیں۔ جیسے ویت نام اور کمپوچیا میں مغربی طاقتوں کے حامی لوگوں کی جلاوطنی میں اور پھر انھیں اپنے یہاں بسانے کے سلسلے میں مغربی ممالک مدد کر رہے ہیں۔ بعض اوقات ایک حکومت کے خلاف بغاوت ہوتی ہے یا کوئی دوسرا اس پر قبضہ کرلیتا ہے تو وہ حکومت اور اس کے سربراہ دوسرے ہمدرد ملک میں پناہ لے لیتے ہیں اور وہاں جلاوطن حکومت قائم کرلیتے ہیں۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں جنرل ڈی گال نے لندن میں فرانس کی جلاوطن حکومت قائم کرلی تھی۔ اسی طرح بعض اوقات کسی ملک میں آزادی کی تحریک شدت اختیار کرلیتی ہے تو اس کے رہ نما کسی باہر کے ملک میں اپنی "جلاوطن" حکومت قائم کرلیتے ہیں اور کچھ ممالک اسے تسلیم بھی کرلیتے ہیں۔ جیسے پچھلے برسوں الجزائر میں جنگ آزادی تیز ہوئی تو ایک "جلاوطن" حکومت قائم کرلی گئی تھی اور اسے تمام عرب اور دوسرے کئی ملکوں نے تسلیم کرلیا تھا۔

جماعتی نظام: نمائندہ جمہوریت کا بنیادی مقصد "نمائندہ" اور "ذمہ دار حکومت" کا قیام ہے۔ آج کی جمہوری حکومتیں عوام کے ذریعہ منتخب شدہ مجلس قانون ساز اور ان کے عوام کے تئیں یا براہ راست دستور اور عوام کے تئیں ذمہ دار وزارتوں کے ذریعہ کام کرتی ہیں۔ موثر نمائندگی اور ذمہ دار حکومت کا قیام سیاسی جماعتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ سیاسی پارٹیاں جدید سیاسیات کی شہ رگ ہیں۔ ان کے وجود اور کارکردگی کے نتیجہ میں نمائندہ حکومت رسمی طور پر بلاواسطہ حکومت نہ ہوتے ہوئے بھی عملاً بلاواسطہ حکومت کے طور پر کام کرتی ہے۔ کیوں کہ پارٹیاں ہی نمائندوں کو منتخب کرتی ہیں، انھیں اصول اور پروگرام تفویض کرتی ہیں، انتخابات میں ان کی حمایت کرتی ہیں اور انتخابات کے بعد پارلیمنٹ میں ان کی کارکردگی پر نگرانی رکھتی ہیں۔ یہ پارٹیاں چوں کہ ہمہ وقت رائے دہندگان سے رابطہ قائم رکھتی ہیں اس لیے اب بالواسطہ اور بلاواسطہ حکومت میں کوئی واضح فرق نہیں رہ گیا ہے۔

سیاسی پارٹی کی ماہیت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ انگریز سیاست داں ایڈمنڈ برک کے نزدیک پارٹی انسانوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو قومی مفاد کے حصول کے لیے کسی اصول پر متفق ہو۔ دوسری اصطلاح کے مطابق پارٹی افراد کے اس منظم گروہ کا نام ہے جس کا مقصد حکومتی اقتدار پر قبضہ کرنا اور اقتدار پر فائز ہونے کے بعد اس کے فوائد سے متمتع ہونا ہے۔ ایک تیسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ سیاسی پارٹی سماج کے مختلف طبقوں کے مفادات کی نمائندگی کرنے والے گروہوں کے متحدہ محاذ کا نام ہے۔ دراصل سیاسی پارٹیوں کی تشکیل میں اصول عوامی اقتدار کے حصول اور وسیع پیمانہ پر مفادات کو متحد کرنے کے سبھی عناصر پائے جاتے ہیں۔ سیاسی پارٹی کا کام حکومت کے عہدوں کے لیے امیدوار کھڑے کرنا، ان کی حمایت میں مہم چلانا اور چناؤ میں کامیابی کے بعد حکومت سنبھالنا اور اپنے پروگرام کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف منظم فشاری گروہ جو خصوصی مفادات کی ترجمانی کرتے ہیں انتخابات میں حصہ نہیں لیتے بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ یا تکمیل کے لیے حکومتی اداروں پر پس پردہ اپنے اثرات کو استعمال کرتے ہیں۔ جمہوری حکومت کی کارکردگی کے لیے دو جماعتی یا کثیر جماعتی نظام کا ہونا لازمی شرط ہے۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی دستوری اور پرامن کشمکش کے بغیر حکومتی اقتدار کو دستور اور عوامی خواہشات کے مطابق استعمال کرنے کا امکان محدود ہے۔ اس کی مثال بعض ملکوں کے ایک جماعتی نظام میں ملتی ہے جہاں رائے دہندگان کو آزادانہ اور مساویانہ طور سے اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے اور ان کو کنٹرول کرنے کا حق نہیں دیا جاتا جہاں حکمراں مخالف اپنے سوا کسی کے تئیں جواب دہ نہیں ہوتے۔

جمہوریت: سیاسیات میں "جمہوریت" ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی متعدد اور متنازع فیہ تعریفیں اور تشریحیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے مستند تعریفوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) جمہوریت کے معنی محض ایک خاص طرز حکومت کے ہیں جس میں عوام یا "بہت سے لوگ" سیاسی کنٹرول کا استعمال کریں۔ اس تنگ مفہوم کے اعتبار سے یہ تعریف جمہوریت کی یونانی تعریف سے قریب تر ہے اور (2) جمہوریت محض ایک نظام حکومت ہی نہیں بلکہ پہلے ایک طرز زندگی اور ایک سماجی نظام بھی ہے۔ یہ ان چند اصولوں اور رویوں کے مجموعہ کا نام ہے جو کسی سماج کے ارکان کی نہ صرف سیاسی میدان میں بلکہ ان کے نجی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی امور میں بھی ان کے برتاؤ اور طرز عمل کی رہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں پہلی تعریف کو ہم "سیاسی جمہوریت" اور دوسری کو "سماجی اور اقتصادی جمہوریت" بھی کہہ سکتے ہیں۔

پہلے مفہوم میں جمہوریت ایک ایسی سیاسی تنظیم ہے جس میں عوام یا ان کی اکثریت تمام اہم عوامی مسائل پر آخری فیصلہ کرنے اور سیاسی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اقتدار کو کنٹرول کرنے میں آزادانہ حصہ لیتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عوام براہ راست حکومت کریں یا ان کی اکثریت حکومت کرے۔ بلکہ اس سے مراد عوام کی اپنی پسند کی حکومت کے انتخاب سے ہے۔ چنانچہ رابرٹ میک آئیور کہتا ہے کہ "جمہوریت اکثریت یا دوسرے طریقہ سے حکومت کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ بنیادی طور پر یہ طے کرنے کا ذریعہ ہے کہ کون حکومت کرے گا اور وسیع طور پر کن کن مقاصد کے لیے۔" گویا نمائندہ اور جواب دہ حکومت جمہوری نظام کا جوہر ہے۔ لیکن یہ حکومت بذات خود کوئی مقصد نہیں بلکہ دوسرے اہم مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس کی انتہائی مقبول تعریف کرتے ہوئے ابراہم لنکن نے کہا ہے کہ "جمہوریت عوام کی حکومت ہے، عوام کے لیے ہے اور عوام کے ذریعہ چلائی جاتی ہے۔" ہیرالڈ لاسکی کہتا ہے کہ جمہوری تصور کا جوہر یہ ہے کہ انسان اپنے جوہر کا اظہار کرنے اور اس راستہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے نزدیک سیاسی، سماجی اور اقتصادی آزادی اور برابری کی مانگ جمہوری ترقی کی بنیاد ہے۔ جب تک نابرابری قائم ہے تب تک آزادی اور انصاف کا وجود ممکن نہیں۔ جمہوریت کے دونوں تصورات باہم مربوط ہیں۔ سیاسی جمہوریت سماجی جمہوریت کے بغیر بے معنی ہے اور اسی طرح سماجی جمہوریت کے مقاصد جمہوری حکومت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتے۔

جمہوریت کا فلسفہ چند اخلاقی مزعومات پر مبنی ہے جن کو اٹھارہویں صدی کے سیاسی مفکروں نے پیش کیا۔ ان مزعومات کی اہمیت اور جمہوریت کی ضرورت آج بھی باقی ہے:

(1) آزادی: جمہوریت کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہر انسان کسی بھی مقصد کا ذریعہ ہونے کے بجائے بذات خود ایک مقصد ہے۔ لہٰذا اسے اپنی ذات کے اظہار کی تکمیل اور ترقی کی آزادی ہونی چاہیے۔

(2) مساوات: برابری سے مراد فطری برابری یا تمام معاملات میں آزادی نہیں بلکہ محض قانونی مرتبہ کی برابری، قانون کے اطلاق میں برابری، رائے دہی اور اقتصادی و سیاسی مواقع کی برابری ہے۔

(3) عقلیت: ایک انسان ایسی مخلوق ہے جسے عقل و دانش ودیعت کی گئی ہے۔ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اپنے امور کا خود انتظام کرنے اور اپنی حیثیت کو بہتر بنانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

(4) اخلاقیت: انسان بنیادی طور سے اخلاقی حس کا مالک ہے۔ وہ اچھے برے اور اپنے پرائے کے حقوق کی پروا کرنے اور انفرادی اور اجتماعی مفادات کے درمیان توازن رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(5) ترقی: چونکہ انسان ایک باعقل و بااخلاق ہستی ہے لہٰذا ان صفات کے ذریعہ اس میں اپنی ہستی کو بہتر بنانے اور مزید در مزید مادی، ذہنی اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنے کی بھی اہلیت رکھتا ہے۔

(6) حکومت خوداختیاری: چوں کہ جمہوریت کے بنیادی مزعومات آزادی و مساوات اور ترقی ہیں لہٰذا سب کے لیے ان مقاصد کے حصول کا بہترین ذریعہ حکومت خود اختیاری ہے۔ حکومت خوداختیاری کے اصول کو عملی شکل "ایک فرد' ایک رائے" یعنی عام نمائندگی اور موقت انتخابات کے ذریعہ ملتی ہے۔

جمہوری مملکت مندرجہ ذیل چند ممتاز خصوصیات کی حامل ہے:
(1) عام حق رائے دہی اور نمائندہ حکومت، (2)دستور کی بالادستی، (3)جواب دہ حکومت، (4)حکومت کے شعبہ جات میں تقسیم اختیارات، (5)قانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی آزادی، (6)اظہار خیال کی آزادی، (7)سیاسی جماعت بنانے اور حکومت پر تنقید کرنے کی آزادی، (8)اختلاف رائے کو انگیز کرنے اور سماجی تنازعات کو گفت و شنید، مصالحت اور پرامن ذرائع سے طے کرنے کا رویہ، (9)اقلیت کے نقطہ نظر کو بھی جگہ دینے اور اس کے حقوق کی حفاظت کا جذبہ، (10)انفرادی آزادی اور بنیادی حقوق کا تحفظ اور (11)فلاح عامہ کا نصب العین۔

جمہوریت کے قیام اور اس کی بقا کی چند لازمی شرائط بھی ہیں۔ جن کے بغیر نہ تو جمہوری سماج اور نہ ہی جمہوری حکومت کا وجود ممکن ہے۔ (1) اظہار خیال اور کارکردگی کی عام آزادی، (2)اس حد تک اقتصادی ترقی اور بہبود کہ عوام کے مختلف طبقوں میں انتہائی درجہ کی عدم مساوات کا اظہار نہ ہو، (3)عوام کی فلاح و بہبود کی عملی اور پرزور کوششیں، (4)دستور و قانون کا احترام اور حکومتی افسروں کی جواب دہی، (5)سماج کے اندر نسبتاً اعلیٰ سطح کی سماجی اور سیاسی نقل پذیری (Mobility)، (6)سماج کے ارکان میں ہمہ وقت اپنی حیثیت اور حالت کے بارے میں یک گونہ بے چینی کا وجود۔ جس کے نتیجہ میں وہ مسلسل اپنی ذات کی بہتری اور ترقی کے لیے کوشاں رہیں، (7)سیاسی قائدوں اور سیاست دانوں کی قابلیت پر حد سے زیادہ تکیہ نہ کیا جائے بلکہ انھیں عام انسانوں کی طرح خامیوں اور خوبیوں کا مرکب سمجھا جائے، (8)عوام کو تعلیمی اور اقتصادی طریقوں سے جمہوری

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

مقاصد اور پالیسیوں کو قبول کرنے پر تیار کیا جائے نہ کہ طاقت اور تشدد کے ذریعہ۔ طاقت اقتدار اعلیٰ کی غلام ہے نہ کہ اس کی آقا، (9) مدنی کلچر کا وجود۔ اس سے مراد جمہوری عقائد، اصولوں اور رویوں کے اس مجموعہ سے ہے جن پر عام اتفاق اور عمل کے بغیر جمہوریت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یعنی لوگ اقتصادی و سماجی اختلافات اور امتیازات کے باوجود بنیادی مسائل پر ہم خیال ہوں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر دوسروں کے ہم درد ہوں۔ شخصی و گروہی مفادات پر اجتماعی مفادات کو ترجیح دیں اور مفادی ٹکراؤ یا خیالات کے اختلاف کو پرامن طریقہ سے رفع کریں وغیرہ۔

جمہوریت کی خامیاں بھی بے شمار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تمام طرز ہائے حکومت میں بہترین ہے۔ کیوں کہ یہ محکوموں کی رضامندی، انسانی آزادی کے تحفظ اور اجتماعی بھلائی کی فکر جیسے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لچک دار اور قابل عمل ہے۔ کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں جس میں حکومت کو جواب دہ بنایا جاسکے یا جس میں ناپسندیدہ حکومت کو عوام بدل سکیں یا گروہی مفادات کے ٹکراؤ کو تشدد کے بغیر پرامن تبادلہ خیال اور مصالحتی اسپرٹ سے ختم کرسکیں۔ جمہوریت اگرچہ بہترین طریقہ سے کام نہیں کرتی لیکن اس کی افادیت کا ثبوت یہ ہے کہ یہ بہرحال کام کرتی ہے اور دور حاضر کے انقلابات کے نتیجہ میں جہاں آمریتوں کا وجود ختم ہوگیا، جمہوریتیں برقرار رہیں اور اس کے حامیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔

جمعیت اقوام (League of Nations) : جمعیت اقوام یا انجمن اقوام کی تشکیل پہلی جنگ عظیم میں اتحادی ملکوں کے جنگی مقاصد میں شامل تھی۔ جنگ کے خاتمہ پر ایک عالمی تنظیم کے قیام کی تجویز صدر امریکا وڈرولسن کے چودہ نکات کا حصہ تھی۔ اس تجویز کے تحت جمعیت اقوام کا قیام 10/ جنوری 1920 کو جنیوا میں عمل میں آیا اور اس کا پہلا اجلاس نومبر 1920 میں منعقد ہوا۔

اس کے مقاصد میں بین الاقوامی تعاون کا فروغ، عالمی تنازعات کا پُرامن تصفیہ، اقوام کے درمیان منصفانہ اور باعزت تعلقات کا قیام، جنگی سرگرمیوں کو روکنا، تخفیف اسلحہ کے لیے سرگرم عمل رہنا، عالمی تجارت کو فروغ دینا، جارحیت کا متحد ہوکر مقابلہ کرنا، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا، اجتماعی تحفظ اور عالمی امن کو برقرار رکھنا، بین الاقوامی قانون کا مکمل نفاذ، خواتین کے حقوق کا تحفظ، محنت کشوں کے لیے بہتر اجرتیں، مناسب اوقات کار اور دیگر سہولتیں حاصل کرنا شامل تھے۔ اس کا قیام ایک میثاق کے تحت عمل میں آیا تھا جس میں 26 دفعات تھیں۔

میثاق کے رُو سے جمعیت کے ایک رکن پر حملہ کو سبھی ارکان پر حملہ قرار دیا گیا تھا اور سبھی پر لازم کیا گیا تھا کہ وہ انفرادی طور سے جارح ملک کے خلاف اقتصادی تعزیرات نافذ کریں۔ اس تنظیم میں 42 ارکان شامل تھے لیکن ریاست ہائے متحدہ امریکا اس میں شمولیت اختیار نہیں کرسکا کیونکہ امریکی سینیٹ نے اس انجمن کے منشور کی توثیق کرنے سے انکار کردیا تھا۔

جمعیت اقوام چار شعبہ جات پر مشتمل تھی۔ اس کی جنرل اسمبلی کے ہر رکن ممبر ملک کو ایک ووٹ حاصل تھا۔ اس کا اجلاس سال میں ایک بار منعقد ہوا کرتا تھا۔ جمعیت کا دوسرا شعبہ حفاظتی کونسل کہلاتا تھا۔ اس کے اختیارات جنرل کونسل کے مساوی تھے۔ کونسل مستقل اور عارضی ارکان سے مرکب ہوتی تھی اور اس کے اجلاس وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے تھے۔ جمعیت کا تیسرا شعبہ اس کا سکریٹریٹ تھا جسے اس تنظیم کی سول سروس کہا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی عدالتِ انصاف اس کا چوتھا شعبہ تھا۔ بین الاقوامی ادارۂ محنت بھی جمعیت سے متعلق ادارہ تھا۔ ان کے علاوہ جمعیت نے اقلیتوں کے حقوق، منتقبہ نوآبادیاتی وغیرہ امور کے سلسلے میں حسب ضرورت خصوصی کمیشن بھی قائم کیے تھے۔

جمعیت اقوام نے عالمی امن کے قیام کے سلسلے میں عملی کوشش کیں۔ اس نے 1925 میں یونان اور بلغاریہ کے مابین سرحدی تنازعہ کو پرامن طریقہ سے حل کرایا لیکن یہ اٹلی اور اتھوپیا کے درمیان 1935-1936 میں تنازعہ کو حل کرانے میں بری طرح ناکام ہوگئی اور اسی واقعہ نے اسے کمزور کردیا اور اس کی ساکھ جاتی رہی۔ بیشتر ملکوں نے اس کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ امریکا بھی اس کا رکن نہیں بن سکا۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان طاقت ور ملکوں کی حیثیت سے ابھرنے لگے۔ انھی وجوہات سے جمعیت اپنے مقاصد میں ناکام ہوگئی۔

دوسری عالمگیر جنگ سے قبل جمعیت اقوام مختلف ملکوں کے جارحانہ اقدامات کو روکنے میں بری طرح ناکام رہی اور جنگ کے دوران عضوِ معطل سمجھی جاتی رہی۔ جنگ کے خاتمہ پر اس کا آخری اجلاس 18/ اپریل 1946 کو منعقد ہوا جس میں اس نے اپنے اثاثہ کو اپنی جانشیں تنظیم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مجلس اقوام متحدہ کو منتقل کردیا۔

جنگ (War): دو مقتدر مملکتوں کے درمیان یا ایک ہی مملکت کے دو گروہ (Factions) کے درمیان ہتھیاروں کے ساتھ لڑائی کو بین الاقوامی قانون کی اصطلاح میں جنگ کہتے ہیں۔ یہ جنگ ایسی ہونی چاہیے جو لڑنے والے کے جان و مال کو نقصان پہنچائے اور موجودہ طریقہ جنگ میں میدان جنگ میں لڑنے والوں کے علاوہ سول آبادی کو بھی نقصان پہنچے اور جنگ کے نتیجے کے طور پر شکست کھانے والے ملک پر فاتح ملک کی جانب سے شرائط صلح مسلط کی جائیں اپنی زمین یا علاقہ پر اگر شکست کھانے والے ملک پر فاتح ملک کی جانب سے شرائط صلح مسلط کی جائیں اپنی زمین یا علاقہ پر اگر جنگ لڑی جائے تو بین الاقوامی قانون کی نظر میں اسے مدافعتی جنگ کہا جاتا ہے اور اگر دوسرے ملک کی زمین یا علاقہ میں جنگ لڑی جائے تو اسے جارحانہ جنگ کہا جائے گا۔ ایک ایسی جنگ بھی بین الاقوامی قانون کے تحت ہوتی ہے۔ جہاں ایک ملک جس کی فوجی طاقت میں دن بدن اضافہ ہورہا ہو اور جو مسلسل دھمکیاں دے رہا ہو اور اس پر دوسرے ملک کی جانب سے حملہ کر دیا جائے تاکہ وہ ملک خود بخود حملہ نہ کرسکے۔ جنگ میں صرف فوجی لوگ ہی نہیں لڑتے بلکہ ملک کے ہر شخص اور ہر جائداد سے خواہ وہ خانگی ملک ہی کیوں نہ ہو اور ملک کے تمام وسائل سے استفادہ کیا جاتا ہے تاکہ مجموعی طور پر ملک کی قوت میں جنگ کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں سہولت ہو۔ اگرچہ جنگی قانون اس کے مہلک اثرات کو کم کرنے کے لیے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ موجودہ طریقہ جنگ میں اور اس کی تباہ کاریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ جس کی وجہ سے کثیر جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں قریب ایک کروڑ آدمی ہلاک ہوئے اس کے علاوہ نامعلوم تعداد میں اشخاص ہوائی حملوں اور بیماریوں کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

جنگی جرائم (War Crimes): دوسری جنگ عظیم میں اتحادی قوتوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جنگ کے مجرمین کو سزا دی جائے جنگی جرائم سے مراد جارحانہ جنگ کی سازش اور غیر مسلح سول آبادی کے ایک گروہ کے خلاف مظالم ہیں۔ اس سلسلے میں پہلا اقدامی اعلان ماسکو میں کیا گیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ جرمن جنگی مجرمین کے خلاف مقدمہ چلایا جائے 13/ اکتوبر 1943 کے کچھ دن بعد اقوام متحدہ نے جنگی جرائم کی تحقیقات کے متعلق ایک کمیشن قائم کیا جس نے مشتبہ اشخاص کی فہرست تیار کی برطانیہ، فرانس، سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکا نے ایک قانون نازی لیڈروں (جنگی اور سول) کے خلاف مقدمہ چلانے کے سلسلے میں مرتب کیا۔ 1945 ایک ٹریبونل (Tribunal) اس خصوص میں قائم کیا گیا اور اس ٹریبونل کا اجلاس نیورمبرگ (Nuremburg) میں ہوا اور تحقیقات کا آغاز 1945 میں ہوا۔ اس امر کی بابت کافی شہادت پیش کی گئی کہ جارحانہ جنگ کی سازش کی گئی تھی اور سول آبادی خصوصاً یہودی آبادی ختم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ مقبوضہ علاقوں میں لوٹ مار کی گئی تھی اور اسیران جنگ کو قتل کیا گیا تھا۔ جن مجرمین کو سزائے موت دی گئی اس میں گورنگ ربن ٹروپ اور اسٹر یجر کا نام مشہور ہے۔ جان سرفیٹ اور وان پاپن کو رہا کردیا گیا۔ عدالت نے نازی آرگنائزیشن کے کارندوں یا جرمن جنرل اسٹاف کے خلاف کوئی سزا تجویز نہیں کی اور نہ سزا دی۔

جوا (قمار بازی) (Gambling): جوئے یا قمار بازی کی ابتدائی تاریخ تاریکیوں میں گم ہے۔ لیکن قیاس کے ذریعہ یہ بات بڑی حد تک وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے ہر دور میں کچھ نہ کچھ افراد اس تفریحی مشغلہ کا شکار رہے ہیں گوکہ یہ بھی صحیح ہے کہ اتفاقات کے اس کھیل کو جو بسا اوقات تباہ کن اور خطرناک نتائج کا حامل رہا ہے تقریباً ہر سماج نے ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھا ہے۔ جوئے کو کبھی سماجی توثیق حاصل نہیں رہی اس کے باوجود اور کئی دیگر زیر زمین یا خفیہ اداروں کی طرح قمار بازی کا ادارہ بھی ہر سماج میں کم از کم محدود پیمانہ پر قائم رہا ہے۔ جوئے بازی سے مراد ایسا سماجی بین عمل ہے جس میں ملوث افراد یا پارٹیاں شرط لگا کر رضاکارانہ طور پر روپے پیسے یا کسی اور چیز کی ہار یا جیت کے لیے فیصلہ کرتی ہیں۔ یہ ہار یا جیت اتفاقی اور غیر یقینی ہوتی ہے اس کے باوجود اس کھیل سے بہت سے لوگ محظوظ ہوتے ہیں۔ نشہ آور چیزوں اور دواؤں کی طرح جوئے کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے جس کی ملوث افراد کو عادت ہو جاتی ہے۔ ہار اور جیت سے قطع نظر جوا بازی بذات خود متعلقہ افراد کو نفسیاتی تسکین عطا کرتی ہے جس کے بغیر وہ ذہنی الجھن اور پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے جوئے بازی ذہنی فرار کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ مہابھارت میں جوئے کے ذریعہ بیوی کی بازی لگانے کا تفصیلی بیان ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی کشتریہ جوئے کی دعوت کو رد نہیں کرسکتا۔

سماج کے ناپسندیدہ اور غیر منظورہ اداروں میں جوئے اور قماربازی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کے ادارہ کو ایک آفاقی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ساجیاتی اعتبار سے جوا انحرافی برتاؤ کی ایک ادارتی شکل ہے۔ فٹ پاتھ اور گلی کوچوں، مکانوں اور گلیوں سے لے کر زیرزمین اور اعلیٰ ترین قماربازی کے مراکز تک جوئے کے بے شمار کھیلوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ آج کل بھی ہمیشہ کی طرح روزانہ کروڑہا افراد اس انحرافی برتاؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ جوئے کے معاشی مضرات بے شمار ہیں اور اس سے سماجی زندگی بالخصوص خاندانی زندگی پر لاتعداد اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ دشواری یہ ہے کہ تقریباً ہر سماج میں اور بالخصوص موجودہ مغربی سماج میں لوگوں کا نقطہ نظر جوئے کے تعلق سے بڑی حد تک غیرواضح الجھا ہوا اور بارہا متضاد نظر آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوئے کے تعلق سے قانون سازی میں بھی اکثر ممالک کو دشواریاں پیش آرہی ہیں اور ایسی بے شمار مثالیں ہر ملک میں ملتی ہیں جہاں حکومتیں کم از کم محدود پیانہ پر قماربازی کی اجازت دینے یا اس کے لیے لائسنس جاری کرنے پر مجبور ہیں۔ یوں تو مختلف قسم کے جوئے سماج کے ہر طبقہ میں کھیلے جاتے ہیں اور شہر اور دیہات کی بھی اس میں کوئی قید نہیں ہے لیکن موجودہ زمانہ میں خاص طور سے بڑے شہروں میں جوئے یا قماربازی کے اڈے یا زیرزمین تہہ خانے اکثر پائے جاتے ہیں جہاں ناقابل اندازہ کثیر رقومات روزانہ ہاری اور جیتی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر 1951 کی کیفر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکا میں غیر قانونی شرطوں پر بیس ہزار ملین ڈالر کا جوا ہوتا تھا۔ 1963 میں سرکاری رکارڈ کے مطابق دو ہزار سات سو ملین ڈالر صرف گھوڑ دوڑ میں کھیلے گئے۔ اسکارن (Scorne) نے 1961 میں اندازہ لگایا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں اگر تمام اقسام کی جوابازی کی رقومات کا حساب کیا جائے تو یہ رقم پانچ لاکھ ملین ڈالر سالانہ سے کم نہیں ہوسکتی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں چونکہ ہر سماجی مسئلہ پر تحقیق اور ریسرچ بہت زیادہ کی جاتی ہے۔ اس لیے اعداد و شمار حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ لیکن دوسرے ممالک میں بھی اس مسئلہ کی سنگینی کسی اعتبار سے کم نہیں۔ جوئے کے سماجی اور نفسیاتی مضرات سماجی ہم آہنگی ہر دور اس نتائج کے حامل ہیں اور سماجی انحراف کی یہ ایک خطرناک صورت ہے جس سے خاندانی اور اجتماعی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

ہندستان میں رائج لاٹری کاروبار بھی ایک طرح سے قماربازی ہے جسے قانونی تحفظ حاصل ہے۔ قماربازی ترقی یافتہ ملکوں میں فروغ پارہی ہے۔ امریکا میں لاس انجلز میں اور اٹلی اور فرانس کے ترقی یافتہ شہروں میں اس کا بے حد رواج ہے۔ یہاں اکثر قمار خانہ قحبہ خانے بھی ہوتے ہیں۔ تمام ترقی یافتہ ممالک میں کسینو کے علاوہ ریس وغیرہ بھی ہوتی ہیں جن پر بازیاں لگتی ہیں جوکہ جوئے کی ایک اور قسم ہے۔

جواز حکمرانی: جواز حکمرانی (Legitimacy) کی اصطلاح قرون وسطیٰ سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک مختلف معنوں میں اور مختلف مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی رہی۔ لیکن سیاسی اقتدار اور سیاسی نظام کے ایک لازمی عنصر کے طور پر اس کا تصور نیا اور نامذہبی (Secular) ہے۔ حاکمیت (Authority)کااستعمال ایک عام کیفیت ہے جو ہر تنظیم میں پائی جاتی ہے۔ حکومت کا جوہر یہ ہے کہ وہ اپنی حدود میں تمام شہریوں سے اپنی مرضی کو منوا سکتی ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو حکومت اپنی طاقت (Force) استعمال کرکے اطاعت پر مجبور کرسکتی ہے۔ طاقت کی اجارہ داری اور جبر، حکومت کا وہ خاصہ ہے جو اسے دوسری انسانی تنظیموں سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن حکومت ہر حال میں اور ہر کام کے لیے طاقت کا استعمال نہیں کرتی۔ اس کے احکام کو منوانے کے لیے اس کی حاکمیت (Authority) کافی ہونی چاہیے۔ "حاکمیت پہلے اور طاقت بعد میں" یا حاکمیت طاقت کی آقا ہے نہ کہ اس کی غلام۔ حاکمیت کا جوہر یہ ہے کہ محکومین یا عوام ازخود حکومت کے فرمان کو قانونی طور پر مستند اور قابل اطاعت سمجھیں۔ جتنی مستحکم حاکمیت ہوگی اتنی ہی زیادہ حکومت لائق اطاعت ہوگی۔ اسی لیے مستحکم حاکمیت کی بنیاد "جواز" ہے۔ عام ترین مفہوم میں جواز سے مراد یہ ہے کہ حکومت اس شعور کے ساتھ حکمرانی کرے کہ یہ اس کا جائز حق ہے اور محکومین بھی شعوری طور پر اس جائز حق کو تسلیم کریں۔ جواز حکمرانی (خواہ اس کا ماخذ کوئی بھی ہو) عوام کے عقیدہ پر مبنی ہے اور اس کو اطاعت پر آمادہ کرتا ہے۔ جواز کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی نظام میں اس احساس کو پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کی صلاحیت ہو کہ موجودہ سماجی ادارے سماج کے لیے مناسب ترین ہیں۔ جواز کے معنی یہ بھی ہیں کہ عوام کو حاکمیت کے جائز ہونے اور حکومت کے مناسب فرائض اور دائرہ کار سے اتفاق ہو۔

جیمس جارج فریزر (James George Frazer) : فریزر مشہور برطانوی ماہر سماجی انسانیات ماہر لوک ریت اور کلاسیکی محقق

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گزرا ہے۔ یہ 1854 میں گلاسگو میں پیدا ہوا اور 1941 میں اس کا انتقال ہوا۔ انیسویں صدی کے اس مشہور ماہر انسانیات نے تمدنی رموز اور افکار پر زبردست تحقیقاتی کام کیے ہیں اور اپنے زمانہ میں بالخصوص انیسویں صدی کے اواخر تک انسانیاتی فکر میں فریزر کو اعلیٰ مقام حاصل رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فریزر نے قبائلی سماج کے عقائد ان کے نظریات زندگی اور رسوم و رواج پر اتنا مواد پیش کیا ہے کہ اس زمانہ کے وسائل کا اندازہ کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ فریزر کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی سماج جادوئی، مذہبی اور سائنسی مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ اس کی مشہور کتاب 'سنہری شاخ' (The Golden Bough) قدیم سماج کی بڑی دلچسپ اور رنگین تفصیل پیش کرتی ہے۔ فریزر نے اس نکتہ پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ قبائلی سماج میں تمام لوگ قدامت پسندانہ خیالات ہی کے حامل ہوتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر سماج خواہ وہ قبائلی ہو یا جدید اس میں تشکیک تفتیش اور تحقیق کے تمام عناصر موجود ہوتے ہیں اور قدیم ترین سماج میں بھی ایسے افراد ہوتے ہیں جو ماضی کی اندھی تقلید نہیں کرتے اور عقلیت کی اساس پر اس پر اعتراض اور بغاوت سے گریز نہیں کرتے۔ فریزر کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انسانیاتی نظریات کے علاوہ اس نے انسانی سماجی اداروں کے تقابلی مطالعہ پر زور دیا ہے۔

جین بوڈن (Jean Bodan) : جین بوڈن 1529-1530 میں فرانس میں پیدا ہوا اور 1596 میں اس کا انتقال ہوا۔ اس نے قانون اور تعزیرات پر عالمانہ کتابیں لکھیں۔ بوڈن کا شمار سولہویں صدی کے مشہور مفکرین میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنے زمانے کے سماجی تغیرات، معاشی پالیسیوں اور قانون کا بغور مطالعہ کیا۔ بوڈن کا سب سے اہم کارنامہ سماجی اداروں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ صحیح علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ دنیا کی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ نہ کیا جائے۔ تاریخ اور سماج کے مطالعہ سے وہ علوم کی مختلف شاخوں کو مربوط کرنا چاہتا تھا۔ اور اس اعتبار سے بوڈن کا نقطہ نظر علم کے مختلف موضوعات کے امتزاج کے حق میں تھا۔ دراصل بوڈن افلاطونی نقطہ نظر کا حامل تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سولہویں صدی میں سماجی علوم کی بنیاد ڈالنے میں بوڈن کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ اور جدید علوم کی عظیم الشان عمارت اس کی قائم کردہ بنیادوں پر استادہ ہے۔

یہاں پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر تک سوشیولوجی یا سماجیات کو صرف معاشیات کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ جین بوڈین بھی علم کی اس شاخ کو نیا نام یا شناخت نہ دے سکا۔ یہ کام بعد میں اگسٹ کامٹے نے کیا۔

جیوری (Jury): گورنمنٹ کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ بذریعہ اشتہار حکم دے کہ کسی خاص قسم کے مقدمات کی تجویز ہائی کورٹ میں جیوری کی مدد سے ہوگی یا کسی عدالت سیشن میں جیوری یا اسیسر کی مدد سے کی جائے گی۔ عدالت نظامت سیشن میں جیوری کی تعداد طاق عدد میں ہوگی۔ عام طور پر تین سے کم اور نو سے زیادہ نہ ہوگی جیوری کا فرض ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ واقعات بیان کردہ کے کس پہلو پر نظر ڈالنے سے صحیح رائے قائم ہوگی اور دیگر تمام امور کا فیصلہ کرے جو قانونی امور واقعاتی تصور کیے جائیں۔ مقدمے کا خلاصہ اور عدالت کی ہدایت سن لینے کے بعد اہل جیوری اپنی رائے پر غور کرلیں تو ان کا صدر ان کی رائے یا غلبہ آرائی سے عدالت کو مطلع کرے گا۔ ہائی کورٹ میں جب اہل جیوری متفق الرائے ہوں یا ان میں سے چھ متفق الرائے ہوں اور عدالت بھی ان کی رائے سے اتفاق کرے تو اس رائے کے مطابق تجویز صادر کی جائے گی۔ اگر عدالت کو جیوری کے غلبہ آرائی سے اختلاف ہو تو جیوری برخاست کردی جائے گی۔

ہر سال کے آغاز سے قبل ایک فہرست ان اشخاص کی مرتب کی جائے گی جن سے جیوری کا کام لیا جائے گا۔ کسی شخص کو اپنا نام فہرست جیوری میں شریک کرنے کا اس وجہ سے حق حاصل نہ ہوگا کہ گزشتہ سال اس کا نام فہرست جیوری میں شریک تھا۔ جیوری کی فہرست ابتدائے سال میں گورنمنٹ گزٹ میں شائع کی جائے گی۔

نوٹ: ملک کے آزاد ہونے کے بعد ضابطہ فوج داری میں ترمیم کرکے جیوری یا اس کی امداد سے سماعت مقدمہ کا طریقہ ختم کر دیا گیا تھا۔ نئے ضابطہ فوج داری 1974 میں جیوری یا اسیسر کا کوئی کوئی تذکرہ نہیں ہے اور ہائی کورٹ یا سیشن عدالت بغیر کسی امداد کے سماعت مقدمہ کرتی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

چ

چارٹرڈ کمپنی (Chartered Company): چارٹرڈ کمپنی مخصوص منشور کے ذریعہ قائم کی جاتی ہے جو حکومت کی جانب سے جاری کیا جاتا ہے۔ چارٹرڈ کمپنی کے کاروبار کی نوعیت اور اختیارات کا تعین منشور (Charter) ہی میں کر دیا جاتا ہے۔

چند اجارہ (Oligopoly): ایک خاص قسم کی منڈی جس میں مقابلتاً زیادہ ارتکاز ہوتا ہے۔ یعنی صرف چند فرموں کے ہاتھ میں پیداوار، روزگار وغیرہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی منڈی کا خاص پہلو یہ ہوتا ہے کہ فرموں کو فیصلہ کرتے وقت ایک دوسرے پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہر فروشندے یا بیچنے والے کو کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے مقابلہ کنندوں کے رد عمل کا اندازہ لگانا ہوتا ہے اس سے صنعت میں کافی بے یقینی اور خطرہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس خطرے سے مقابلے اور منافع میں اضافہ کی غرض سے چند اجارہ دار آپس میں پالیسی کے بارے میں گٹھ جوڑ کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ معاہدہ کرلیتے ہیں کہ قیمتوں میں مقابلہ بازی نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ اشیا کی اور خاص طور پر استعمالی اشیا کی کوالٹی کے بارے میں مسابقت پھر بھی باقی رہتی ہے۔

اس اجارہ داری سے فائدہ اٹھاکر یہ کمپنیاں اشیا کی قیمتیں پیداوار سے بہت زیادہ رکھتی ہیں۔ اور اشیا کو بہتر بنانے پر بہت خرچ کرتی ہیں۔ اسی لیے معاشین ان پر سخت تنقید کرتے رہتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکا میں ان پر کچھ پابندیاں بھی لگائی گئی ہیں۔ ان سب کے باوجود ترقی یافتہ ملکوں کی موجودہ دور کی معیشت میں انھیں انتہائی اہم مقام حاصل ہوتا جارہا ہے۔

چندسری حکومت- اشرافیہ : شخصی آمریت کی طرح چند سری حکومت کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ (1) اشرافیہ (Aristocracy) جس کے اصل معنی چیدہ اور بہترین شہریوں کی حکومت کے ہیں عملاً ممکن نہیں۔ شروع کے اشرافی طبقے استقرار مفاد اور سیاسی تسلط کے استحکام کے ساتھ موروثی جاگیردارانہ طبقوں میں بدل گئے۔ دوسرے بہترین لوگوں کے اوصاف یا ان کے انتخاب کے معیاروں پر کوئی اتفاق نہیں پایا جاسکتا۔ (2)عینیت (Oligarchy) اکثر غیر جمہوری ملکوں میں جہاں یعنی حکومت قائم ہے، حکمراں طبقہ کی امتیازی خصوصیت مالی طاقت ہوتی ہے۔ عینیت اشرافیہ سے اس بات میں مختلف ہے کہ ثانی الذکر میں چند اخلاقی اوصاف مثلاً عزت، ذہانت، عوام کی خدمت کا جذبہ، حسب و نسب کا رشتہ اور عوامی مقبولیت وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جہاں کا حکمراں طبقہ اشراف اور متولین دونوں سے مرکب ہے۔ دور حاضر کا رجحان اشرافیہ کے زوال اور اس کی جگہ اقتصادی و مالی اعتبار سے طاقتور طبقوں کے عروج کی سمت ہے۔ یہ رجحان نہ صرف غیر جمہوری ملکوں میں پایا جاتا ہے بلکہ جمہوریتوں میں بھی ان عناصر کی عمل داری بڑھتی جارہی ہے۔ ارسطو کے نزدیک عینیت اشرافیہ کی مسخ شدہ شکل ہے۔

فوجی ٹولہ کی حکومت: یہ کیفیت ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے نسبتاً غیر ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ پرانی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے بعد فوج اقتدار کی مستقل مالک بن جاتی ہے اور فوجی طبقہ ایک نئے خواص یا حکمراں طبقہ کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔

طبقاتی حکومت: کوئی آمر خود کو سماج کے کسی ایک طبقہ سے وابستہ کرکے اس کے غلبہ کو مستحکم کرتا ہے مثلاً ارجنٹائن کا سابق صدر جنرل پیرون خود کو مفلس اور مزدور طبقہ کا نمائندہ کہتا تھا۔

خواص کی حکومت (Elite's Rule): یعنی ایک ایسے چیدہ اقلیتی طبقہ کی حکومت جو اپنی صلاحیتوں اور اپنے مزاج کے اعتبار سے دوسرے طبقوں پر حکومت کرنے کا اہل ہو۔ خواص کی اصطلاح اگرچہ یورپ و امریکا میں عرصہ سے مستعمل تھی لیکن اس کا خاص استعمال پہلی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

عالمی جنگ کے بعد ہوا۔ مسولینی اور اس کی فاشسٹ پارٹی نے خواص ہونے کا دعویٰ کیا جو اپنی اہلیت اور عزم کی بناء پر نئے اطالیہ کی حکمرانی اور اس کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ نازی جرمنی میں ایڈولف ہٹلر اور اس کے نازی حامیوں نے خود کو آریائی نسل کا بہترین نمونہ قرار دے کر خواص میں شامل کرکے اپنے برتر کردار، نظم و ضبط، قائد کی اطاعت اور جماعتی اصولوں کی پابندی سے جرمنی کی نشاۃ ثانیہ اور دنیا میں اس کی سلطنت قائم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

مذہبی طبقہ کی حکومت (Theocracy) یعنی کسی ایک مذہب کے اصولوں پر مبنی حکومت جس میں مذہب کا پرچار کرنے والوں کا غلبہ ہو۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں یورپ میں چرچ مملکت سے بالاتر اور اس کے معاملات میں پوری طرح دخیل تھا، یہاں تک کہ بادشاہ کی تقرری بھی پوپ کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اگرچہ ایشیا کے بعض ملکوں میں تھیوکریٹک تحریکیں کافی طاقت ور ہیں تاہم آج دنیا کے کسی ملک میں تھیوکریسی کا وجود نہیں ہے۔

چھوت چھات (Untouchability) : ہندستان میں سماج کی اکائی کے روپ میں ذات پات کا ایک تانا بانا بنا ہوا ہے۔ اس کے آخری سرے پر بستے ہیں اچھوت لوگ جوکہ دراصل ذات پات کی چاروں قسموں سے باہر ہیں۔ آج بھی گاؤں میں جہاں کہیں گندی جھونپڑیوں کا جھنڈ نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں نچلی ذاتیں رہتی ہیں جن پر گاؤں کی صفائی ستھرائی کا دار و مدار ہے۔ لیکن وہ خود تنگ و تاریک گندی جھونپڑیوں میں رہتی ہیں۔

ان ذاتوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پرانی کتابوں میں چانڈال نشا دغیرہ نام ان کے لیے ملتے ہیں۔ اتر ویدک کال اور سمرتی کال میں چھوت چھات اور نچلی ذاتوں کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ چھواچھوت ہندستان میں کیوں پیدا ہوئی۔ یہ حتمی طور پر بتایا نہیں جا سکتا۔ اونچے خاندان کی عورتوں کی نچلی ذاتوں کے مردوں کے ساتھ شادی پر سخت پابندی تھی۔ اس قسم کی شادی کو روکنے کے لیے ان کی اولاد کو اچھوت کا درجہ دیا گیا۔ مشہور ماہر سماجیات گھریے اور مجمدار کا خیال ہے کہ آریوں سے پہلے ہندستان میں چھوت چھات نہیں تھی۔ آریوں نے آکر ہندستان کی قدیم اقوام کو نچلی ذاتوں کا درجہ دے دیا ہے۔ اس طرح ذات کو نسل پر منحصر سمجھا جاسکتا۔

مینس فیلڈ نے ذاتوں کو پیشوں سے منسلک کیا ہے مثلاً کمہار، لوہار، مالی وغیرہ مہاتما گاندھی نے اس کو فطری یا مذہبی ادارہ نہ سمجھ کر اونچی ذات والوں کی سازش کہا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ چھواچھوت خدا کی نہیں بلکہ شیطان کی بنائی ہوئی ہے۔ چھواچھوت کو مکمل شکل منوسمرتی میں دی گئی جہاں اچھوتوں کو گاؤں سے باہر لکڑبگھوں اور کتوں کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک ہی جرم کے لیے برہمن کو معمولی اور اچھوت کو سخت ترین سزائیں دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

بدھ ازم چھوت چھات کا مخالف، ہندستان کا پہلا مذہب تھا۔ بدھ ازم سے لے کر آریہ سماج تک سب سدھارواری تحریکات اور نظریات اس میں ترمیم لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس سے کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا بلکہ چھوت چھات بڑھتی رہی۔

قرون وسطیٰ میں سمرتی دور کی وراثت کو آگے بڑھاتے ہوئے مشہور شاعر تلسی داس کہتے ہیں کہ شودر کو پیروؤں کے تلے دباکر رکھنے میں ہی بھلائی ہے۔ دش رتھ کی موت کے بعد بھرت کا راج تلک ہوتا ہے تو گرو وششٹھ اپدیش دیتے ہیں "دش رتھ کے مرنے کی کوئی چنتا نہ کرو فکر کی تو بات یہ ہے کہ کوئی شودر بحث مباحثہ نہ کرسکے۔ (ایودھیا کانڈ 171/3)۔ ایک اور جگہ تلسی داس لکھتے ہیں کہ "شودر چاہے کتنا باوصف کیوں نہ ہو اس کی عزت نہیں کرنی چاہیے اور برہمن چاہے بددعا دینے والا، مارنے والا اور بیہودہ گو کیوں نہ ہو، ہر حال میں پرستش کا حقدار ہے۔ (ارنیہ کانڈ 33/1)۔ اس طرح دھیرے دھیرے گزرتی ہوئی صدیوں کے ساتھ ذات پات کے علاوہ چھوا چھوت کا زہر ہماری سماجی زندگی میں گھلتا گیا۔ یہ نظام ایک اکٹوپس کے قسم کا ہزار ہاتھوں والا دیوپیکر درندہ بن گیا اور ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت کے مذہب میں بھی جگہ بنالی۔ اگرچہ اسلام ذات پات اور اونچ نیچ کو نہیں مانتا پھر بھی آج کے ہندستانی مسلم سماج میں بھی جمعداروں اور چماروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ تعجب کا مقام ہے کہ انیسویں صدی کے سماج سدھارکوں نے اس نظام پر حملہ نہیں کیا۔ غالباً مہاتما گاندھی پہلے ہندستانی سماج سدھارک تھے جنھوں نے اس نظام پر بھرپور حملہ کیا۔ تقریباً اسی دور میں ڈاکٹر امبیدکر بھی اس سلسلے میں فعال ہوگئے حالانکہ دونوں کا فلسفہ مختلف تھا لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں ان دونوں نے اس سلسلے میں اقدام اٹھائے۔ لیکن اس روایت پرستی میں تبدیلی نہیں ہوئی یہاں تک کہ ہندستان آزاد

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہوگیا اس سے پہلے ہی 1931 میں درج شدہ ذاتوں کی فہرست بن گئی تھی جس میں اچھوتوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔

آزاد ہند میں ان کو کچھ مراعات حاصل ہوئیں۔ آج اچھوتوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً 1/6 ہو چکی ہے۔ قانوناً سب برابر ہیں لیکن سماج میں ان کا درجہ نیچا ہی ہے۔ ان میں چمار، موساہر، بھنگیا، دھوبی، پاسی، رنگو، ڈوم، بھوگتا اور حلال خور شامل ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تعداد اترپردیش میں (21 فیصد) پائی جاتی ہے۔ ان میں سے 84 فیصد گاؤں میں رہتے ہیں اور عموماً بے زمین مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ہمارے آئین میں چھوت چھات کو جرم مانا گیا ہے۔ 1950 کے چھوت چھات مخالف قانون کے باعث اس جرم کو قابل تعزیر سمجھا گیا ہے لیکن سماجی طور پر ذات ایک کافی پرقوت ادارہ ہے۔

چھوت چھات کا نظام سمجھنے کے لیے ہمیں دو زاویوں سے سوچنا پڑے گا۔

(1) کچھ ذاتوں یا قوموں کے اوپر اچھوت ہونے کا ٹھپا یا لیبل لگنا۔

(2) باقی قوموں اور ذاتوں کا ان کی قربت سے لگنے والے اچھوت پن سے تحفظ کی کوششیں کرنا۔ اس لیے اچھوتوں سے ہمیشہ محتاط فاصلہ پر رہنا اور روٹی اور بیٹی کا تعلق کبھی نہ جوڑنا۔

سماج کے حاشیے پر رہنے والی دلت قومیں نہ صرف نظر انداز کی جاتی رہی ہیں اور لگاتار تحقیر ہی نہیں بلکہ غیرانسانی سلوک کی شکار ہوتی رہی ہیں۔ کچھ نیچ مانے جانے والے پیشے ہی ان کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ ان کو مکمل طور پر سماج سے باہر رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن ان کی محنت اور مشقت کو استعمال کرنا ہر قسم کے کام کے جائز سمجھا گیا وہ بے زمین مزدور کے طور پر کام کرتے رہے لیکن زمین کے مالک نہیں بن سکے۔

سرکار کی طرف سے ملنے والی مراعات اور ریزرویشن کا فائدہ نچلی ذاتوں کے لیڈروں نے لیا اور پورے طبقے کے اوپر کی کریمی سطح تک ہی ساری فلاحی کارروائی آکر رک گئی۔ کئی ماہرین سماجیات مثلاً ایل.پی. ودیارتھی اور سچدانندا وغیرہ نے اچھوت طبقوں میں آنے والی سماجی تبدیلیوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ دلت آج کل سماج کی اکثریت میں شامل ہونے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں اور ان میں کسی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

دلتوں میں آج بیداری پیدا ہورہی ہے۔ سچدانند نے 1976 میں لکھا ہے کہ سرکار کا فلاحی رویہ، ہری جنوں کی بیداری اور سماجی مثبت تبدیلی بالآخر ان کو عام دھارے سے جوڑ ہی دے گی۔ ان کو اہم مقام دلانے میں مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر امبیدکر دونوں کا اپنا اپنا کردار رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کو مین اسٹریم میں جوڑنا بہت دیر طلب کام ہے۔ جس کے تاریخی سماجی نفسیاتی اور معاشی پہلو بھی ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ح

حافظین: حافظ کی جمع اور لفظی معنی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ فرشتوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس سے وہ فرشتے مراد ہیں جو انسان کے اعمال کو لکھنے اور محفوظ کرنے کی حیثیت پر مامور ہیں۔ یعنی آدمی جو کچھ بھلا یا برا کرتا ہے وہ سب کو لکھتے رہتے ہیں۔ اسی تحریری ریکارڈ کے مطابق اللہ تعالیٰ لوگوں کو قیامت کے دن جزا یا سزا دے گا۔ ان فرشتوں کی صفت کراماً کاتبین بھی بیان ہوئی ہے۔ کرام کریم کی جمع ہے جس کے معنی معزز اور شریف کے ہیں اور کاتبین کاتب کی جمع ہے اور اس کے معنی لکھنے والے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ ان فرشتوں کے یہ اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

حبس بے جا (Wrongful Confinement): کسی شخص کا کسی کی اس طرح سے مزاحمت بے جا کرنا کہ اس کو حدود معینہ کے باہر جانے سے روکا جائے حبس بے جا کہلائے گا۔

آزادی کا اصلی جز یہ ہے کہ کوئی شخص جہاں چاہے وہاں جاسکے۔ لفظ "حبس" کے معنی اس اختیار کے زائل ہونے کے ہیں۔ حبس بے جا اس وقت سمجھا جائے گا جب کسی شخص کی اس طرح مزاحمت بے جا کی جائے کہ وہ ان حدود معینہ سے باہر نہ جاسکے جن سے باہر جانے کا اسے حق ہو اور وہ جانا چاہے۔

مثلاً زید کی ایماء پر بکر کسی چار دیواری کے اندر جائے اور زید قفل لگاکر اس کو اس کے اندر بند کردے اور بکر دیوار کے خط محیط سے باہر نہ جاسکے تو یہ سمجھا جائے گا کہ زید نے بکر کو حبس کیا۔ یا زید چند مسلح آدمیوں کو بکر کے مکان کے اطراف متعین کر دے اور بکر کو خبردار کردے کہ اگر تم باہر نکلے تو وہ لوگ گولی مار دیں گے تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ زید بکر کے خلاف حبس بے جا کا مرتکب ہے۔

قانون نے ہر شخص کو اس بات کا حق دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے اور جس سمت میں چاہے جاسکے۔ بشرطیکہ اس کی اس حرکت سے دوسروں کے حقوق متاثر نہ ہوں اور اس مقام پر اور اس سمت میں جانے کی قانوناً ممانعت نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے اس حق آزادی نقل و حرکت میں کسی طرح سے مزاحم ہو تو ایسا کرنا مزاحمت بے جا کی تعریف میں داخل ہوگا۔

مزاحمت بے جا و حبس بے جا میں یہ فرق ہے کہ مزاحمت بے جا میں مدعی کسی ایک یا دو سمتوں میں جانے سے روک دیا جاتا ہے۔ جن سمتوں میں اس کو جانے کا قانوناً حق حاصل ہے برخلاف اس کے حبس بے جا میں چاروں سمت مسدود کر دیے جاتے ہیں۔ حبس بے جا نہ صرف ٹارٹ ہے بلکہ جرم بھی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ ثابت کردے کہ اس کو کسی دوسرے شخص کو محبوس رکھنے کا قانوناً حق حاصل ہے۔ مثلاً باپ کو بیٹے پر، شوہر کو بیوی پر، استاد کو شاگرد پر تو ایسی صورت اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

حدیث: اس کے معنی خبر، بیان اور نئی بات کے ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس سے وہ بات باخبر اور بیان مراد ہے جس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف ہو علما نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر (جو کام دوسروں نے آپ کے سامنے کیا ہوا اور آپ نے اس سے منع نہ کیا ہو) کا نام حدیث ہے اس آخری مفہوم میں دینی روایات کا پورا ذخیرہ حدیث کہلاتا ہے جو حضرت محمد ﷺ کے واسطہ سے منقول ہے۔ جمہور علما کے نزدیک حدیث کے مفہوم میں سنت خبر اور اثر کے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ بعض لوگ صحابہ کے اقوال و افعال اور تقریرات کو بھی حدیث ہی کے ضمن میں داخل سمجھتے ہیں۔

حدیث کے دو جز ہیں سند اور متن۔ سند میں از اول تا آخر ان

لوگوں کا نام ہوتا ہے جنھوں نے متن حدیث کو ایک دوسرے تک پہنچایا ہے اس کو سلسلہ روایت یا سلسلہ اسناد بھی کہتے ہیں۔ متن میں روایت کی اصل عبارت اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد درج ہوتا ہے۔

اب علم الحدیث کی حیثیت ایک مستقل علم و فن کی ہے اس کی تحریر و کتابت اور جمع و تدوین کا آغاز تو رسول اللہ کے زمانہ ہی میں ہوگیا تھا مگر اس کو باقاعدگی کے ساتھ پہلی صدی ہجری میں مدون و مرتب کیا جانے لگا اس طرح کتب حدیث کے مختلف مجموعے ترتیب دیے گئے۔

کتب حدیث کے جو مجموعے مرتب کیے گئے ان کی کئی قسمیں ہیں۔ صحاح مسانید سنن سیر مغازی جوامع اور مصنفات وغیرہ صحت و قوت کے اعتبار سے حدیث کی کتابوں کے چھ مختلف طبقے ہیں پہلے طبقہ میں موطا امام مالک اور صحیحین (صحیح بخاری و مسلم) شامل ہیں۔ دوسرے طبقہ میں صحاح ستہ کی باقی چار کتابیں سنن ابی داؤد جامع ترمذی، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ) اور مسند احمد بن حنبل داخل ہیں۔

روایت حدیث کی دو صورتیں ہیں۔ روایت باالفاظ اور روایت بامعنی روایت کی قوت و ضعف اور سند وغیرہ اور دوسری مختلف حیثیتوں سے احادیث کی متعدد قسمیں ہیں جیسے متواتر متفقین، مشہور صحیح حسن غریب اور ضعیف۔ پھر مرفوع متصل مسند منقطع مرسل اور مفصل وغیرہ۔

احادیث کی ضبط و تحریر کا کام جب باقاعدہ شروع ہوا تو تنقید احادیث اور جرح و تعدیل کا فن بھی ایجاد ہوا جس میں روایات کے اسناد و متون کی تحقیق کی گئی اور ان کے صحت و سقم کے اصول اور قاعدے متعین کیے گئے۔ نیز حدیثوں کی صحت و عدم صحت کا پتہ چلانے کے لیے روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے ان پر بحث و کلام کیا گیا۔ اس طرح اصول حدیث اور فن جرح و تعدیل سے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

قرآن کے بعد احادیث ہی اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے۔

حرام: جس کام سے بچنے کے لیے قرآن و حدیث میں صاف صاف حکم دیا گیا ہو اور جس سے اللہ اور اس کے رسول نے سختی سے منع کیا ہو۔ جو حرام کو حرام نہ سمجھے وہ کافر ہے اور حرام سمجھ کر بھی کرے وہ سخت گنہ گار ہوگا۔ غرض حرام کا مرتکب فاسق اور منکر کافر ہے۔ جیسے جھوٹی گواہی، شراب، جوا، سور کا گوشت وغیرہ۔

حریت یا آزادی (Liberty) : جمہوری مملکت کی بنیاد کانٹ (Kant) کے اس اخلاقی نکتہ پر کہ انسان بذات خود اپنا مقصد ہے اور اس اخلاقی نکتہ پر مبنی اس علمی نکتہ پر ہے کہ "تم اس طرح کام کرو کہ ہمیشہ خود اپنی اور دوسروں کی انسانیت کو بطور ایک مقصد کے استعمال کرو، نہ کہ بطور اس کے ذریعہ کے"۔ چونکہ فرد کی شخصیت کے اظہار اور اس کی تکمیل کے لیے آزادی ناگزیر ہے لہذا ہر جمہوری مملکت فرد کی آزادی کی ضمانت دیتی اور اس کا تحفظ کرتی ہے۔

حریت کی اصطلاح اتنی کثرت سے استعمال ہوتی ہے کہ اس کے بہت سے معنی اور مفہوم پائے جاتے ہیں۔ اس لیے حریت کے جمہوری اصول کی تشریح کے ضمن میں پہلے اس کے معنی کو واضح کرنا ضروری ہے۔ (1) مطلق آزادی کے معنی فرد اور گروہ کی تمام بیرونی پابندیوں سے آزاد رہ کر ارادۂ فکر اور عمل کی آزادی ہے لیکن منظم سماج کے اندر مطلق اور لامحدود آزادی محال ہے۔ کیوں کہ اس کے معنی سماجی نراج کے ہیں۔ سماج کے اندر آزادی مطلق ہونے کے بجائے نسبتی ہے۔ یعنی فرد صرف اسی حد تک آزادی کا استعمال کرسکتا ہے جہاں تک کہ وہ دوسروں کی آزادی کو پامال نہ کرے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں جان لاک کے محدود اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کے زیر اثر آدم اسمتھ، ڈیوڈ ریکارڈو، جریمی بنتھم اور جیمس مل نے حریت کا یہ منفی تصور پیش کیا کہ سرکار افراد کے تمام نجی و گروہی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ لیکن آزادی محض پابندیوں کے فقدان کا نام نہیں جیسا کہ جان اسٹورٹ مل نے اشارہ کیا۔ فرد کی آزادی کو محض سرکار کی مداخلت ہی سے نہیں بلکہ سماج میں دوسرے افراد اور گروہوں کی چیرہ دستیوں سے بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ (2) عملی طور پر حریت کے جدید تصور میں دو باتیں مضمر ہیں:

(الف) چونکہ فرد فکر و عمل کی آزادی کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار اور اس کی تکمیل کا خواہاں ہے لہٰذا وہ دوسرے افراد، گروہوں، حکومت اور سماج یا حالات کی عائد کردہ پابندیوں سے آزادی کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن (ب) جہاں ایک طرف آزادی میں پابندیوں کا فقدان مضمر ہے۔ دوسری طرف آزادی میں پابندیوں کا پہلو بھی مضمر ہے۔ سبھی افراد کی مساویانہ آزادی اور پورے سماج کی حفاظت و بہبود کے لیے جمہوری مملکت آزادی کے ساتھ چند پابندیاں بھی عائد کرتی ہے۔ یہ بندشیں اکثریت کی مرضی کے خلاف نہیں بلکہ ان کے عین مطابق ہوتی ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دوسرے لفظوں میں جمہوری آزادی کے معنی دوسروں کی بے جا مداخلت سے آزادی کے ساتھ ساتھ فرد اور گروہ کی سماجی ذمہ داری کے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر ہتک عزت اور دیگر جرائم کی روک تھام کے لیے مملکت قانون بناتی ہے تاکہ سبھی افراد کی آزادی محفوظ رہ سکے۔ لیکن مملکت کا فرض اس منفی معنی میں آزادی کی حفاظت پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سے بڑھ کر وہ آج مثبت طور پر ایسے اقدامات بھی کرتی اور ایسے حالات پیدا کرتی ہے جن کے تحت افراد کو اپنی شخصیتوں کی ترقی اور تکمیل کے لیے پورے مواقع میسّر آسکیں۔ دوسرے لفظوں میں حریت کے جدید تصور میں شخصی اور سیاسی حریت کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی حریت پر بھی اتنا ہی زور دیا گیا ہے۔ جب تک یہ ساری آزادیاں ایک ساتھ عطا نہیں کی جائیں گی افراد صحیح معنوں میں ترقی سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ یہ مثبت حریت مملکت کی طرف سے ضمانت دیے گئے حقوق کی پیداوار ہے۔ حقوق اور مواقع کے حصول کے بغیر انسان افلاس، جہالت اور بیماری کی لعنتوں سے آزادی نہیں پاسکتے۔ چنانچہ آج کی فلاحی اور اشتراکی مملکتوں نے تعلیم کو جبری کرنے، مزدوروں کی حالت سدھارنے، کارخانوں کے لیے ضوابط بنانے، اُجرت اور اوقات کار طے کرنے، بچوں سے محنت لینے کی ممانعت کرنے اور صنعت و دولت کو چند ہاتھوں میں سمٹنے سے روکنے کے لیے بے شمار قانون بنائے ہیں۔ آج کی مملکت عدم مداخلت کار نہیں بلکہ فرد اور سماج دونوں کی بھلائی کے لیے سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں مداخلت کرتی ہے۔

اوپر بتایا گیا کہ جمہوری آزادی کی حیثیت قانونی آزادی کی ہے۔ یہ ایک جامع اصطلاح ہے جس کے تحت متفرق آزادیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں آزادی کی تین مختلف شکلوں سے بحث کی جائے گی جو مملکت کے اندر بیک وقت ہم آہنگ بھی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ان کا آپس میں ٹکراؤ بھی ہوتا ہے۔

(1) شخصی یا شہری آزادی (Civil Liberty): اس سے مراد انسان کی بہ حیثیت فرد واحد کی آزادی ہے۔ بلیک اسٹون کے نزدیک شہری آزادی کے تین اجزاء ہیں۔ ذاتی تحفظ نہ صرف صحت اور زندگی کا بلکہ عزت و وقار کا بھی۔ ذاتی آزادی خصوصاً نقل و حرکت کی اور نجی جائداد کی آزادی۔ یعنی ہر طرح کی املاک کی آزادانہ خرید وفروخت اور استعمال کی آزادی۔ لیکن آج کے دور میں شہری آزادی تین مختلف نکات پر مشتمل ہے۔

فرد کی جسمانی آزادی، یعنی فرد کی زندگی، صحت اور نقل و حرکت کی تمام خطرات سے آزادی۔ ذہنی آزادی، یعنی اظہار رائے اور عقیدہ کی۔ اور عملی آزادی یعنی کاروبار کے میدان میں اپنی آزادانہ مرضی اور انتخاب سے معاہدہ کرنے اور دوسرے افراد سے رابطہ قائم کرنے کی آزادی۔

(2) سیاسی آزادی: فرد کی شخصی آزادی کے بعد اس کی بہ حیثیت مملکت کے رکن یا شہری ہونے کے سیاسی آزادی کا درجہ ہے۔ انیسویں صدی میں سیاسی آزادی بیشتر منفی نوعیت کی تھی۔ بلیک اسٹون کے نزدیک اس کے معنی حکومت کو محدود اور پابند رکھنے کے تھے۔ اس کے حسب ذیل نکات تھے۔ پارلیمنٹ کا دستور اس کے اختیارات اور مراعات، بادشاہ کے اختیارات کی حدبندی، شکایات کے ازالہ کے لیے عدالتوں سے رجوع کرنے کا حق، تکالیف کے ازالہ کے لیے حکومت سے درخواست کرنے کا حق اور بقائے نفس اور دفاع کے لیے ہتھیار رکھنے اور ا[illegible] کرنے کا اختیار۔ بلیک اسٹون کے زمانے میں سیاسی آزادی کے منفی تصور کی جگہ ایک مثبت تصور نے لے لی ہے۔ لیکن آج کے دور میں حکومت کو عوام سے الگ ہیئت فرض کیا جاتا تھا اور سیاسی آزادی کے معنی اس خارجی طاقت کو پابند رکھنے کے تھے۔ لیکن آج حکومت خود عوام کی ہے۔ لہٰذا عوام کی سیاسی آزادی حکومت کو پابند رکھنا نہیں بلکہ اس کی تشکیل اور اس کے کنٹرول میں آزادانہ انتخابات میں اپنی آزادانہ رائے دینے اور تمام انتخابی عہدوں کے لیے امیدوار ہونے، سیاسی مسائل پر اظہار رائے اور تبادلہ خیال کی آزادی شامل ہیں۔ لاسکی کا کہنا ہے کہ سیاسی آزادی کے حقیقی ہونے کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں۔ اولاً یہ کہ ہر شہری کو اس حد تک ضرور تعلیم یافتہ ہونا چاہیے کہ وہ سیاسی امور کو سمجھ سکے اور اپنے خیالات کو دوسروں کو سمجھا سکے۔ باشعور رائے عامہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ثانیاً شہریوں کو تمام خبریں اور معلومات صحیح صحیح اور بے کم و کاست فراہم کی جائیں تاکہ فیصلہ کرنے والے معتبر مواد کی بنیاد پر فیصلہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر مواصلات عامہ (ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات) پر اگر حکومت یا کسی خاص طبقہ کا تسلط ہو تو عوام کو صحیح معلومات کی فراہمی مشکل ہے۔ اس طرح وہ فیصلہ سازی کی آزادی سے محروم رہیں گے۔

(3) اقتصادی آزادی: جس طرح شہری آزادی فرد کو بطور ایک شخص کے اور سیاسی آزادی بطور ایک شہری کے ملتی ہے اسی طرح مملکت

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کے اندر اسے ایک تیسری آزادی بطور کارکن کے ملنا چاہیے۔ معاشی آزادی سے مراد فرد کی حصول معاش کی آزادی اور معاشی تحفظ ہے۔ فرد کو لین دین کرنے اور اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کی آزادی ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مملکت خود بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرے۔ مملکت کا یہی فرض موجودہ فلاحی اور منصوبہ ساز مملکت کا جواز ہے۔ اس سے بڑھ کر لاسکی کے نزدیک معاشی آزادی میں صنعتی جمہوریت کو بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ صنعتی میدان میں بھی کارکنوں کو بہ طور شہری کے چند حقوق دیے جائیں اور صنعتی انتظام میں مزدوروں کو بھی نمائندگی دی جائے تاکہ ضوابط کی پابندی جبر کے ذریعہ نہیں بلکہ تعاون سے ہو سکے۔

جمہوریت کے تحت حکومت آزادی کی ان تینوں شکلوں کے درمیان توازن قائم کرنے اور ان کے مساوات و انصاف اور مملکتی اقتدار اعلیٰ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لنڈسے کے الفاظ میں جمہوری آزادی دو انتہاؤں کے درمیان اوسط کا درجہ رکھتی ہے۔ یعنی یہ انتہا پسند نقطہ نظر کے کہ سماج کو جبر کی ضرورت نہیں اور جمہوری سماج میں جبر کا واقع ہونا ممکن نہیں اور دوسرے اس انتہا پسندانہ نظریہ کے درمیان کہ حکومت کو جو ایسی تنظیم ہے جو اپنی پشت پر طاقت رکھتی ہے۔ تمام سماجی کارروائیوں کو کنٹرول کرنا چاہیے اور یہ کہ یہ بات حریت کے عین مطابق ہوگی۔

حریت کی تعریف دراصل مساوات کے تصور سے مربوط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہریوں کا سماجی مرتبہ مساوی ہے اور کسی کو خصوصی مراعات حاصل نہ ہوں۔ مزید برآں سبھی کو برابری کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

حصص کی تقسیم (Allotment of Shares): وہ اشخاص جو کمپنی کے حصص خریدنا چاہتے ہیں اس معینہ فارم پر جس کا نمونہ پراسپکٹس میں دیا جاتا ہے درخواست پیش کرتے ہیں اس درخواست کو قانونی معاہدہ کی اصطلاح میں ایجاب کہا جاسکتا ہے اور جب اس درخواست کو قبول کیا جاتا ہے تو اسے الاٹ منٹ کہتے ہیں۔ حصص کے الاٹ منٹ کے بعد کمپنی کی جانب سے شیئر سرٹیفکیٹ اجرا ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حصہ اس شخص کا ہے جس کے نام سرٹیفکیٹ جاری ہوا ہے۔

حفاظ: حافظ کی جمع اور ٹھیک اس معنی میں ہے جو "حافظین" میں بیان کیے گئے ہیں۔

حق آسائش (Easement): اس میں وہ حق بھی داخل ہوگا جس سے بغیر معاہدہ کے کسی شخص کو حق ہو کہ وہ کسی اور کی زمین کی مٹی یا کسی اور شے کو جو اس زمین میں اگی ہوئی ہو یا اس سے ملحق یا اس پر قائم ہو اپنی منفعت کے لیے اٹھالی جائے اور تصرف میں لائے۔

نیک نیتی (Good Faith): کوئی امر نیک نیتی سے کیا گیا متصور نہ ہوگا جس کے کرنے میں مناسب توجہ عمل میں نہ لائی جائے۔

پرامسری نوٹ (Promissory Note) سے ہر وہ دستاویز مراد ہوگی جس کی رو سے کوئی شخص کسی اور سے بغیر کسی شرط کے اندرونی مدت یا بوقت مندرجہ دستاویز یا عندالطالبہ زر معین ادا کرنے کا وعدہ کرے۔

مقدمہ (Suit) اس میں مرافعہ یا درخواست شامل نہ ہوگی لفظ نالش اور دعویٰ ایک ہی معنی میں استعمال ہو سکتا ہے لیکن بادی النظر میں مقدمہ اور نالش میں فرق معلوم ہوتا ہے لفظ مقدمہ ایک عام لفظ ہے جس میں دعویٰ نالش مرافعہ یا درخواست داخل ہو سکتی ہے لیکن قانون کے اغراض کے لیے لفظ مقدمہ کی وسعت گھٹا دی گئی ہے۔ اس سے لفظ مرافعہ اور درخواست خارج کردیا گیا ہے۔

امین (Custodian) میں بے نامی دار اور ایسا مرتہن جو بعد میں ایفائے زر رھن قابض رہے یا ایسا شخص جو بلاحق کے خود قابض ہو داخل نہ ہو سکے گا۔

حق آسائش بر بناء رواج (Customary Easement): بعض حقوق آسائش عام رواج کی بناء پر حاصل ہوتے ہیں جنہیں حق آسائش بر بناء رواج (Customary Easement) کہا جاتا ہے مثال کے طور پر ایک گاؤں میں ایک آراضی عام چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس گاؤں میں ایک شخص نے ایک زمین خریدی اور اس پر کاشت شروع کی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس شخص کو اس کا حق حاصل رہے گا کہ وہ اپنے مویشی بھی اس عام چراگاہ میں بھجوائے۔

اگر کسی غالب حق دار (Dominant Owner) نے اپنی جائداد دوسرے شخص کو منتقل کر دی ہو یا وہ جائداد کسی اور شخص کو کسی قانون کے تحت منتقل ہوگئی ہو تو عام طور پر یہ منتقلی اس آسائش پر اثرانداز نہ ہوگی جو اس جائداد سے متعلق ہے۔

اگر غالب حق دار کو تابع حق دار (Servient Owner) نے یہ طمانیت (Undertaking) دی ہو کہ وہ اپنے مکان کی تیسری منزل نہ بنائے گا جس کی وجہ سے غالب حق دار کی ہوا اور روشنی رک جائے تو یہ معاہدہ ہر اعتبار سے قابل نفاذ ہوگا۔ ملاحظہ ہو بلرام داس گوسوامی بنام چوان چندر اے آئی آر 1975

غالب حق دار کو چاہیے کہ وہ حق آسائش کا اس طرح استعمال کرے کہ تابع حق دار کو کم سے کم تکلیف پہنچے مثلاً اگر کسی شخص کو دوسرے شخص کی زمین سے ہو کر گزرنے کا حق راہ ہے تو اسے چاہیے کہ صرف معینہ راستے کو استعمال کریں۔ درمیان سے اس زمین کو بطور راستہ استعمال نہ کرے۔ اس طرح غالب حق دار کو حق آسائش میں کوئی تبدیلی کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کو دوسرے شخص کی زمین سے ہو کر گزرنے کا حق راہ ہے تو غالب حق دار کو اس کا اختیار ہوگا کہ اپنے حق آسائش کا پورا پورا استعمال کرے لیکن اگر تابع حق دار کی جائداد کو کوئی نقصان پہنچا ہو تو غالب حق دار کو چاہیے کہ فوری اس کی درستی کرے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کو دوسرے شخص کی زمین سے پائپ لے جانے کا حق آسائش ہے تو وہ زمین کھود کر پائپ لے جاسکتا ہے۔ لیکن اسے چاہیے کہ فوراً زمین کو ہموار کرلے تاکہ تابع حق دار کو کوئی تکلیف نہ پہنچے بصورت دیگر غالب حق دار کو یہ لازم ہوگا کہ تابع حق دار کو معاوضہ ادا کرے۔

حق آسائش کے تعین کے متعلق بعض اصولوں کو قانونی طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر کوئی حق آسائش کسی ضرورت کے تحت قائم کیا گیا ہو تو وہ حق آسائش صرف اس وقت تک باقی رہے گا جب تک وہ ضرورت باقی رہے اس طرح اگر کسی شخص کو حق راہ ہے تو یہ حق آسائش صرف حق راہ کی حد تک محدود رہے گا۔ اس میں کوئی اور حق آسائش شریک نہ کیا جاسکے گا کسی دروازے یا کھڑکی سے ہوا یا روشنی کی آمد کا تعین اس لحاظ سے کیا جائے گا جب کہ ابتدا میں ہوا یا روشنی کی آمد کا تعین کیا گیا ہو۔ غالب حق دار کو حق آسائش میں کوئی اضافہ کرنے کا حق نہ ہوگا۔

حق آسائش بر بناء قدامت (Acquisition of Easement by Prescription): اگر کوئی شخص اپنی عمارت تک جانے کا حق راہ یا عمارت کے لیے ہوا اور روشنی کا استعمال بغیر کسی وقفے یا مزاحمت کے بیس (20) سال تک مسلسل کرتا رہا ہو یا اسے اور کوئی حق آسائش بلا کسی وقفے یا مزاحمت کے بیس سال تک مسلسل حاصل رہا ہو تو راستہ روشنی یا ہوا یا دیگر آسائش کا یہ حق قطعی (Absolute) ہوجاتا ہے اگر کسی شخص نے اس حق آسائش کو نہ مانتے ہوئے کوئی دعویٰ دائر کیا ہو تو بیس سال کی مدت دعویٰ دائر کرنے سے دو سال قبل ختم متصور ہوگی۔

حق آسائش ظاہر (Apparent Easement): ظاہر حق آسائش ایک ایسے حق آسائش کو کہیں گے جس کے وجود کا علم کسی ذمہ دار آدمی کی جانچ کے بعد ہوسکے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کی زمین سے دوسرے شخص کی زمین میں ایک ڈھکے ہوئے نالے کا پانی آتا ہو اور دوسرا شخص پانی کو استعمال کرتا ہو لیکن ڈھکے ہوئے نالے کا علم ایک ذمہ دار آدمی کے معائنے کے بعد ہی ہوسکتا ہو تو پانی کے اس استعمال کو حق آسائش ظاہر کہا جائے گا۔

حق آسائش غیر ظاہر (Non Apparent Easement): اگر ایک شخص کے مکان سے ایسا حق آسائش متعلق ہو جس کی وجہ سے دوسرے شخص کے لیے مکان کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا رہتی ہے تو ایسے حق آسائش کو حق آسائش ظاہر کہا جائے گا۔

حق آسائش کا سقوط تعطل اور تجدید (Extinction by Dissolution Suspension and Revival of Easement): اگر کوئی آسائش قائم کرنے سے پہلے کوئی شرط عائد کی گئی ہو اور اس شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں تابع حق دار (Servient Owner) کا اس جائداد پر کوئی حق باقی نہ رہا ہو تو ایسی صورت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں اس جائداد سے متعلق جو بھی آسائش قائم تھی وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر الف نے ایک مربع ب کو اس شرط کے ساتھ دیا ہو کہ وہ ج سے شادی نہ کرے اور ب نے اس موقع کے متعلق کوئی آسائش قائم کی ہو لیکن بعد میں ج سے شادی کرلی ہو تو ایسی صورت میں اس مربع پر ب کو کوئی حق باقی نہ رہے گا اور نتیجے کے طور پر وہ آسائش بھی ختم ہو جائے گی جو اس جائداد کے متعلق اس نے قائم کی ہو۔

ایک حق آسائش کا سقوط عمل میں آتا ہے اگر غالب حقدار (Dominant Owner) پر حاصل وہ واضح طور پر یا غیر واضح طور پر جو تابع حق دار (Servient Owner) کو واضح طور پر اس جائداد پر حاصل تھا اگر اس کی تابع حقیقت (Servient Heritage) ہی ختم ہوجائے۔ مثال کے طور پر الف کی ایک سمندری چٹان کے دامن سے حق راہ حاصل ہے سمندر میں طوفان کی وجہ سے وہ راستہ مستقلاً سمندر میں غرق ہو جاتا ہے ایسی صورت میں حق آسائش خود بہ خود ختم ہوجائے گا۔

اگر کسی حق آسائش کا بیس (20) سال تک مسلسل استعمال نہ کیا جائے تو وہ حق آسائش ساقط ہو جاتا ہے۔

حق آسائش کا قیام حصول اور منتقلی (The Imposition, Acquisition and Transfer of Easement)

حق آسائش: کو بعض حالات میں حدود مختصر اور مدت معینہ کے اندر قائم کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص نے کوئی زمین بیس (20) سال کے لیے دوسرے شخص سے کرائے پر لی ہو تو وہ اس زمین سے متعلق کوئی حق آسائش قائم کرسکتا ہے لیکن یہ حق آسائش صرف کرائے داری کی مدت تک ہی قائم رہے گا۔

اگر کسی جائداد غیر منقولہ کے تین مالک ہوں تو کسی ایک مالک کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ اس جائداد سے متعلق دوسرے مالکین کی رضامندی کے بغیر کوئی آسائش قائم کرنے کی اجازت دے۔

مقدمہ (Nafisunnisa Vs. Mohd. Ishaq A.I.R. 1978)
نفیس النساء بنام محمد اسحاق اے آئی آر 1978۔

میں اس کے متعلق یوں اظہار خیال کیا گیا ہے کہ قانون آسائش میں اس کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی رضامندی سے اپنی جائداد کے متعلق کسی قسم کا حق آسائش قائم کرنے کی اجازت دے۔

آسائش کے قیام سے مراد مالک جائداد یا کرایہ داری کی اجازت یا رضامندی سے آسائش کا قیام ہے۔

قانون آسائش کے تحت ایک تابع حق دار (Servient Owner) کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ غالب حق دار (Dominant Owner) کے علاوہ کسی اور شخص کو بھی اس جائداد کے متعلق کسی آسائش کی اجازت دے۔ بشرطیکہ سابقہ غالب حق دار (Dominant Owner) کے حق آسائش میں اس جدید حق آسائش کی وجہ سے کوئی فرق واضح نہ ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص کی فیکٹری کے لیے دوسرے شخص کی زمین پر واقع چشمے (Stream) سے پانی آتا ہو تو وہ شخص کسی تیسرے کو بھی اپنے چشمے کے پانی سے استفادہ کا موقع دے سکے گا بشرطیکہ پہلے شخص کے کارخانے (فیکٹری) کے لیے جو پانی دیا جاتا ہے اس میں کوئی کمی واقع نہ ہو۔

اس طرح اگر ایک جائداد رہن کی گئی ہو یا کرایہ پر دی گئی تو راہن (Mortgager) یا مالک (Lessor) کو اس جائداد کے متعلق کوئی آسائش قائم کرنے کا اختیار ہوسکے گا۔ بشرطیکہ ایسی آسائش سے شرائط رہن یا کرایہ کی کوئی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ کوئی کرایہ دار یا ایسا شخص کسی غیر منقولہ جائداد پر استخراجی حقوق (Derivative Rights) حاصل ہوں اس جائداد کے متعلق آسائش (Easement) قائم کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس آسائش پر عمل آوری کرایہ کی مدت گزرنے کے بعد ہو اور اصل مالک جائداد اس پر راضی ہو۔

حق آسائش کے اقسام: حق آسائش کی متعدد اقسام ہیں۔ ایک تو وہ حق آسائش ہے جو مسلسل (Continuous) ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے مکان میں ایسے روشن دان ہوں جس سے پڑوس کے کسی فعل کے بغیر روشنی اور ہوا قدرتی طور پر آتی ہو تو اسے قانون کی اصطلاح میں مسلسل حق آسائش کہا جائے گا۔

ایک حق آسائش کی نوعیت ایسی ہوتی ہے جو غیر مسلسل (Discontinuous) ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو اپنے مکان تک پہنچانے کے لیے کسی دوسرے کی زمین سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے تو اس حق راہ کو غیر مسلسل حق آسائش (Discontinuous Easement) کہا جائے گا۔

حق آسائش میں مزاحمت (The Disturbance of Easement)

غالب حق دار کو اس کا اظہار ہوگا کہ وہ حق آسائش

کو بغیر کسی مزاحمت (Disturbance) کے استعمال کرے۔ مثال کے طور پر الف ایک زمین کا مالک ہے اسے ب کی زمین سے ہو کر گزرنے کا حق راہ حاصل ہے۔ ج نے اس حق راہ یا راستے پر ایک رکاوٹ قائم کردی ہو ایسی صورت یں الف کو اس کا حق حاصل رہے گا ج کے خلاف عدالت میں رکاوٹ دور کرنے کا دعویٰ دائر کرے۔ اس طرح اگر کسی حق آسائش کے استعمال میں رکاوٹ قائم کی جائے تو غالب حقیقت (Dominant Heritage) کے مالک کو اس رکاوٹ کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی بابت عدالتی چارہ جوئی کرنے کا حق رہے گا۔ بشرطیکہ اس رکاوٹ کی وجہ سے غالب حق دار (Dominant Owner) کو کافی نقصان پہنچا ہو۔

حق ارجاع مقدمہ پیدا ہونے کے قبل فوت ہوجانے کا اثر: (1) جب وہ شخص جو زندہ ہونے کی صورت میں مقدمہ پیش کرنے یا درخواست پیش کرنے کا حق رکھتا ہو اس حق کے پیدا ہونے سے قبل فوت ہوجائے تو میعاد اس وقت سے شمار ہوگی جب متوفی کا کوئی قائم مقام قانونی مقدمہ رجوع کرنے یا درخواست پیش کرنے کے قابل ہو۔

جب وہ شخص جس کے مقابلہ میں اس کے زندہ ہونے کی صورت میں مقدمہ رجوع کرنے یا درخواست پیش کرنے کا حق ہوتا اس حق کے پیدا ہونے کے قبل فوت ہوجائے تو میعاد اس وقت سے شمار ہوگی جب متوفی کا کوئی قائم مقام قانونی ہو جس کے مقابلہ میں مقدمہ رجوع یا درخواست پیش ہوسکے۔

یہ صراحت ان مقامات سے متعلق نہ ہوگی جو کہ نفاذ جائداد غیر منقولہ یا کسی موروثی عہدہ پر قبضہ دلانے کے لیے ہوں۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ مکمل بناء دعویٰ اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ ایک شخص جو نالش رجوع کرنے کے قابل ہو اور دوسرا شخص جس کے مقابلہ میں نالش رجوع کی جاسکتی ہو موجود نہ ہوں میعاد تحت قانون معطل رہتی ہے۔ منصفان عہدہ پر قبضہ دلانے کے لیے اس وقت تک حق نالش پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ ایک ایسا شخص جو نالش رجوع کرنے کے قابل اور ایک ایسا دوسرا شخص موجود نہ ہو جس کے مقابلہ میں نالش رجوع کی جائے۔ جس وقت تک وفات میعاد شروع نہ ہوئی ہو تو وہ اس وقت تک شروع نہ ہوگی جب تک کہ قائم مقام قانونی موجود نہ ہو۔ دعویٰ رجوع کرنے کے قابل اور جس کے خلاف میں دعویٰ رجوع کیا جاسکتا ہو۔

حق خود اختیاری: خود اختیاری (Self Determination) کی اصطلاح پہلی جنگ عظیم کے دوران امریکی صدر ووڈ رو ولسن کے اس اعلان کے بعد رائج ہوئی کہ جنگ کے خاتمہ پر شکست خوردہ وسطی طاقتوں (جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور ترکی) سے صلح نامہ کی بنیاد ان کی سلطنتوں کے مختلف حصوں میں بسنے والی مختلف قومیتوں کے لیے حکومت خود اختیاری کے اصول پر ہوگی۔ دوسری طرف ان علاقوں میں قوم پرور تحریکیں بھی زور پکڑ چکی تھیں۔ چنانچہ خود اختیاری کے اصول کا قوم پروری کی امنگوں سے گہرا رشتہ ہے۔

صدر ولسن نے جب خود اختیاری کی اصطلاح استعمال کی تو ان کا منشا مشرقی یورپ میں جرمنی، آسٹریا اور سلطنت عثمانیہ کی محکوم قوموں کو آزادی دلانا تھا۔ چنانچہ 1919 کے معاہدہ امن کے تحت خود اختیاری کے اصول کے مطابق ایک طرف مشرقی یورپ کی اقوام، مثلاً چیکوسلواک، سرب، رومانوی کی جداگانہ سیاسی اکائیاں تشکیل ہوئیں تو دوسری طرف اتحادیوں نے ایشیا و افریقہ میں نہ صرف اپنی نوآبادیات کو بدستور اپنا محکوم رکھا بلکہ جرمن نوآبادیات اور سلطنت عثمانیہ کے عرب صوبوں کی بھی آپس میں تقسیم کرلی۔ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم تک کا عرصہ ان علاقوں میں قوم پرور تحریکوں کی نشوونما اور حق خود اختیاری کے مطالبہ کے عروج کا زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرق میں ہندستان اور انڈونیشیا کی آزادی سے نوآبادیات پے در پے آزاد ہوتی گئیں۔ استعماری نظام کے خاتمہ میں ان ملکوں کی جدوجہد آزادی کے علاوہ ایک اہم کردار اقوام متحدہ کی تنظیم نے ادا کیا جس کی کوششوں سے افریقہ کے تمام ممالک آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوگئے۔

اقوام متحدہ کی عام اسمبلی نے اپنی 12/ دسمبر 1958 کی اقوام اور محکوم علاقوں کے حق خود اختیاری سے متعلق قرارداد کے اعلانیہ میں اس حق کو تسلیم کیا۔ اور نوآبادیاتی ممالک اور اقوام کو آزادی دینے سے متعلق اعلان میں جو 14/ دسمبر 1960 کو جاری ہوا، اسی مطالبہ کا اعادہ کیا گیا۔ اس وقت تک نوآبادیات کا مسئلہ بین الاقوامی سیاست کا اہم ترین مسئلہ بن چکا تھا۔ چنانچہ حقوق انسانی کے دونوں میثاقوں کی دفعہ اول میں اقوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرکے اس حق کو باقی تمام انفرادی و اجتماعی حقوق پر

فوقیت دی گئی۔ 1970 میں پھر عام اسمبلی نے اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق ملکوں کے درمیان دوستانہ روابط اور تعاون سے متعلق بین الاقوامی قانون کے اصولوں کے اعلان میں اقوام کے مساویانہ حقوق اور ان کے حق خود اختیاری کی تائید کی گئیں۔

لیکن اقوام متحدہ کی جانب سے محض اس حق کا اثبات کافی نہیں تھا۔ چنانچہ رکن ملکوں پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے کہ مشترکہ اور انفرادی طور پر اس حق کے حصول میں اور قومی آزادی کے مستحق عوام کو سیاسی اقتدار کی منتقلی میں مدد دیں۔

اگرچہ خود اختیاری کے سیدھے سادہ معنی آزادی کے ہیں لیکن خود اختیاری اور "قوم" کی قطعی اور متعین تعریف تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے یہ قانونی حق نہیں بلکہ محض ایک سیاسی اور اخلاقی اصول ہے۔ بین الاقوامی قانون کے اندر اس اصول کو کوئی درجہ حاصل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قبرصی قوم پروروں نے سارے قبرصی عوام کی جانب سے قبرص کے لیے حق خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب ترک قبرصوں نے ایک علاحدہ قوم ہونے کا دعویٰ کرکے خود اختیاری کا مطالبہ کیا تو اسے رد کردیا گیا۔ اسی طرح لبنان کے مارونی عیسائی ایک علاحدہ قوم ہونے کے دعویدار اور علاحدہ مارونی ریاست کے طالب ہیں۔ نائجیریا میں ایک خطہ کے عیسائی قبائل نے بیافرا کے نام سے اپنی الگ مملکت قائم کی جو مرکزی حکومت کے سامنے پسپا ہوکر رہی اور پھر کسی نے ان کے لیے حق خوداختیاری کی بات نہیں کی۔

حقوق : جمہوری مملکت کا حتمی مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی شخصیتوں کی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے۔ اسی کا نام انصاف ہے۔ مملکت کی بنیاد حق اور انصاف پر قائم ہے اور اس کا قانون اسی حق و انصاف کے اظہار اور تکمیل کا وسیلہ ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ مملکت اپنے زیادہ سے زیادہ ارکان اور صلاحیتوں کو ممکن ترین حد تک پروان چڑھانے کے لیے ضروری خارجی حالات کی ضمانت دیتی ہے۔ ان ہی ضروری حالات کا دوسرا نام حقوق ہے۔ لاسکی کے لفظوں میں حقوق سماجی زندگی کی وہ لازمی شرائط ہیں جن کے بغیر کوئی فرد عام طور پر اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کرسکتا۔ چونکہ مملکت اسی مقصد کے حصول کے لیے وجود میں آئی ہے اس لیے حقوق کی حفاظت اور ضمانت کرکے ہی وہ اس مقصد کو پورا کرسکتی ہے۔ اپنے ارکان کے حقوق کا ایک نقشہ تیار کرنے کے بعد مملکت ان ہی آزادی، مساوات اور اخوت کے عام اصولوں کی روشنی میں عوام کے درمیان تقسیم کرتی ہے۔ مملکت کے اندر اور اس کے قانون کے تحت حقوق کا نظام، شہری کے مرتبہ اس کی قوت عمل اور اس کی ساری قانونی شخصیت کی بیخ و بنیاد ہوتا ہے۔ حقوق کا فوری ماخذ مملکت اور اس کا قانون ہے۔ حقوق اس وقت تک بامعنی نہیں ہوسکتے جب تک قانون ان کے تحفظ کی ضمانت نہ دے۔ لیکن حقوق کا بالاتر ماخذ حق اور انصاف کا تخیل ہے۔ انصاف کا منشا ہی یہ ہے کہ سماج کے سبھی ارکان کی شخصیت کی تکمیل اور ان کی صلاحیتوں کی ممکنہ حد تک نشوونما کی جائے۔ اس لحاظ سے حقوق فرد کی شخصیت ہی کے اندر مضمر ہیں اور اس کی شخصیت کی تکمیل کی لازمی شرط ہونے کا وصف رکھتے ہیں۔ دراصل فرد کی قانونی شخصیت اور اس کی اخلاقی شخصیت دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ حق و انصاف اولین قدر ہے آزادی مساوات اور اخوت ثانوی اور اس سے ماخوذ قدریں ہیں۔

حقوق کے اس نظریہ کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ فرد مملکت سے محض حقوق کا دعویدار اور فرائض سے مبرا ہے۔ حقوق فرد کو اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی شخصیت کی حفاظت اور اس کا اظہار کرسکے لیکن حقوق اسے بہ حیثیت فرد نہیں بلکہ مملکت اور جماعت کا رکن ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ لہٰذا وہ سماج سے آزاد نہیں ہے۔ چنانچہ حقوق کے مساوی ہونے کی وجہ سے اس پر کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ حقوق کی بنیاد فرد کی شخصیت پر ہے اور سماج کی بہبود کا دار ومدار فرد کی بہبود پر ہے۔ اسی لیے سماجی بہبود کے خلاف کسی کو کوئی حق نہیں دیا جاسکتا کیونکہ پھر یہ اس بہبود کے منافی ہوگا جس کا گہرا اور اٹوٹ تعلق فرد کی بہبود سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں افراد مملکت کے خلاف حقوق کا دعویٰ نہیں کرسکتے بلکہ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے عائد کردہ فرائض کی تکمیل کریں لیکن جب مملکت اپنے آدرشوں سے بھٹک جائے تو افراد کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اس کی مزاحمت کریں۔

ذیل میں جمہوری حقوق کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ اس میں تمام حقوق کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

- جمہوریت
  - حریت
    - شہری آزادیاں یا حقوق
      - مثبت حقوق
        - معقول آمدنی
        - تعلیمی سہولیات
        - صحی خدمات
        - مکان
      - منفی حقوق
        - حکومت کے خلاف
          - سیاسی حقوق
            - ووٹ دہی
            - عہدوں کے لیے امیدواری
            - سیاسی بحث و مباحثہ
            - جلسہ و جلوس کی آزادی
            - سیاسی تنظیم کی آزادی
            - عدالتی چارہ جوئی کا حق
          - معاشی حقوق
            - جائداد کی ملکیت اور استعمال کا حق
            - پیشہ و کاروبار کا حق
            - معاہدہ کرنے کی آزادی
            - خرید و فروخت کی آزادی
          - شخصی حقوق
            - زندگی کا حق
            - جسمانی آزادی
            - مذہبی عقیدہ و عمل
            - فن اظہار کا حق
            - تحقیقات
            - تدریس و تبلیغ
            - خلوت کا حق
        - نجی افراد و گروہوں کے خلاف
          - جسمانی آزار سے تحفظ
          - اقتصادی جبر و استحصال سے حفاظت
          - ہتک عزت سے حفاظت
          - ہر طرح امتیازی برتاؤ سے حفاظت
          - بیگار سے تحفظ

حقوق الدول: وہ کتاب جس کو فہمی یا شاہ عثمانی نے ترکی میں لکھی تھی جو 1300ھ میں قسطنطنیہ سے چھپی تھی وہی لوگ قصری اور نخلہ قلفاط نے اس کا عربی ترجمہ کر کے 1896 میں شائع کیا تھا۔ اپنے موضوع پر مفید کتاب ہے۔

حقوق انسانی (Human Rights) : اگرچہ انسانی حقوق کا رشتہ سولہویں اور سترہویں صدی کے فطری حقوق اور اٹھارہویں صدی کے حقوق انسانی سے ہے، جیسا کہ انگلستان میں میگنا کارٹا، 1628 کی حقوق سے متعلق عرضداشت اور 1689 کی دستاویز حقوق، انقلاب فرانس کے بعد جاری ہونے والے انسانی اور شہری حقوق کے اعلانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکا کے اعلان آزادی اور اس کے آئین کے حقوق کی دستاویز سے ظاہر ہے، لیکن انسانی حقوق کی اصطلاح خاص طور سے بیسویں صدی کی ایجاد ہے جو بنیادی فلسفہ بھی ہے اور قانون فطرت کے اوہام سے بھی پاک ہے۔ یعنی حق و انصاف کا تقاضہ ہے کہ ساری دنیا کے انسانوں کو وہ تمام بنیادی حقوق اور آزادیاں حاصل ہوں جو مہذب زندگی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے لازمی ہیں۔

اس ضمن میں بالشویک انقلاب اور اس کے اصولوں کے ساتھ ہی اقوام متحدہ کے 1948 کے حقوق انسانی سے متعلق عالمی اعلانیہ جیسی دستاویزوں کو انسانی حقوق اور آزادیوں کی سمت میں جدوجہد کو انتہائی اہم سنگ ہائے میل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے موجودہ عہد کے بیشتر ممالک کے جمہوری دساتیر بنیادی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت کی علامت بن گئے ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر حقوق انسانی کے مسئلہ کو پہلی بار اہمیت دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکی صدر فرینکلن روزویلٹ کے چار آزادیوں سے متعلق اعلان سے حاصل ہوئی۔ جنگ کے خاتمہ پر جب اقوام متحدہ کی تنظیم وجود میں آئی تو نازی اور فاشی آفرینوں کے انسانیت کش اور آدمیت سوز مظالم ذہنوں میں تازہ تھے۔ چنانچہ بین الاقوامی سطح پر انسانی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

آزادیوں کے احترام و تحفظ کے سلسلہ میں اس تنظیم پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی گئیں۔ اقوام متحدہ کے منشور اور اس کی تحقیقی تنظیموں کے دساتیر کے ذریعہ ارکان نے نہ صرف نسل، قوم، جنس، زبان یا مذہب کی بنیادوں پر دوسروں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے سے اقرار کرنے بلکہ بین الاقوامی پیانہ پر سبھی کے لیے انسانی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دلانے کے لیے اقدام کرنے کا عہد کیا۔

لیکن جہاں اقوام متحدہ کے دستور میں بنیادی انسانی حقوق کے احترام کا عہد کیا گیا وہاں ان حقوق کی کوئی تعریف نہیں کی گئی۔ لہٰذا 1945 میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس مقصد کے لیے ایک بین الاقوامی جامع دستاویز حقوق مرتب کرکے رکن ممالک اسے منظور کریں۔ چنانچہ 1947-48 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ مجوزہ دستاویز کو تین حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ (1) بنیادی حقوق اور آزادیوں کا اعلانیہ، (2)ان کو ممالک پر نافذ کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی یثاق اور (3)ان کے نفاذ سے متعلق عملی انتظامات۔ ان میں سے پہلی دستاویز کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948 کو حقوق انسانی کے عالمی اعلان (Universal Declaration of Human Rights) کے عنوان سے منظور کیا۔ تیس دفعات پر مشتمل یہ عالمی اعلان ایک ایسی اہم دستاویز ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اسے ایک طرح کا اخلاقی منشور یا اخلاقی آدرشوں کے مجموعہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس میں نہ صرف روایتی، شخصی و سیاسی حقوق بلکہ مختلف سماجی و اقتصادی حقوق کا بھی اثبات کیا گیا ہے۔ مثلاً تعلیم و روزگار کا حق، بے روزگاری کے بھتہ اور با تنخواہ چھٹیوں کا حق وغیرہ۔ مزید برآں اقوام متحدہ اور اس کی تحقیقی ایجنسیوں کے زیر اہتمام انفرادی حقوق کے تحفظ سے متعلق معاہدے اور یثاق بھی وجود میں آچکے ہیں۔ مثال کے طور پر انجمن سازی اور اجتماعات سے متعلق آزادی کے تحفظ کا یثاق (1948)، نسل کشی مخالف یثاق (1948)، خواتین کے سیاسی حقوق سے متعلق یثاق (1952)، پناہ گزینوں سے متعلق یثاق (1951)، بے ریاست افراد سے متعلق یثاق (1954)، جبری محنت کی ممانعت سے متعلق یثاق (1957)، روزگار اور پیشہ میں امتیاز برتنے سے متعلق یثاق (1960)، اور نسلی تفریق کے ازالہ سے متعلق بین الاقوامی یثاق (1965) اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

ان حقوق کو قانونی شکل دینے کی غرض سے جنرل اسمبلی کی درخواست پر اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کمیشن نے دو یثاقوں کے مسودے تیار کروائے۔ ایک تو شہری اور سیاسی حقوق کا یثاق اور دوسرا سماجی، اقتصادی اور تہذیبی حقوق کا یثاق۔ ان دونوں یثاقوں کو جنرل اسمبلی نے 16/ دسمبر 1966 کو قبول کرلیا اور 35 ملکوں کی مطلوبہ تعداد کے ذریعہ توثیق ہو جانے کے بعد یہ دونوں یثاق 1976 سے نافذ ہوگئے۔

تیسری دستاویز یعنی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات اور موثر مشنری کے قیام سے متعلق آج تک تمام اعلانات، قرار دادوں اور سفارشوں کے باوجود کوئی ٹھوس ترقی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی لیے آج تک بین الاقوامی قانون کے تحت حقوق انسانی کو معقول مشنری کے ذریعہ نافذ کرنے والے واجب الاطاعت عام ضوابط کی تشکیل نہیں ہو سکی ہے۔ اس لیے دونوں یثاقوں کی حیثیت بھی اخلاقی وعدوں کی ہی سی ہے۔ کیونکہ اگرچہ اب انسانی حقوق اور آزادیوں کا مسئلہ کسی بھی ملک کا خالص داخلی معاملہ نہیں رہ گیا ہے تاہم دوسرے ممالک اور بین الاقوامی تنظیمیں اس معاملہ میں نکتہ چینی اور سفارش کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ علاقائی سطح پر 1950 کا یورپی میثاق برائے تحفظ حقوق انسانی غالباً واحد مثال ہے جس کے تحت معاہدی ملکوں کے اندر انسانی حقوق کے عملی تحفظ کے لیے "یورپی کمیشن برائے انسانی حقوق" کی شکل میں ایک انتظامی ادارہ اور "یورپی عدالت برائے انسانی حقوق" کی شکل میں ایک تنفیذی ادارہ قائم کیا گیا ہے۔

انسانی حقوق کی تحریک کو مزید تقویت ہلسنکی میں "یورپی تحفظ و تعاون کی کانفرنس" کے اس آخری اعلانیہ سے ہوئی ہے جس پر یکم اگست 1975 کو دستخط ہوئے اور جس کے ساتویں حصہ میں مشرق و مغرب کی طاقتوں نے اپنے اپنے علاقوں میں انسانی حقوق کے تحفظ اور ان کو پروان چڑھانے کا عہد کیا۔

ایک قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ انسانی حقوق کی فہرست میں محض افراد کے حقوق ہی نہیں بلکہ گروہوں اور قوموں کے اجتماعی حقوق کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً محکوم قوموں کے لیے حق خود اختیاری، نسلی گروہوں کے لیے بقا و سلامتی کا حق، 1948 کے جنیوا نسل کشی مخالف یثاق کے ذریعہ زبان اور مذہب کی حفاظت کا حق "جس کی تائید" شہری و سیاسی حقوق کے یثاق" میں کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ عالمی پیانہ پر انسانی حقوق کے اس طرح کے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

سارے اعلانات نہ تو مثبت قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں نہ ہی مثبت حقوق کنندہ کی۔ کیونکہ ان کو نافذ کرنے والی کسی مرکزی عالمی حکومت کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر بینتھم اور آسٹن کو ماننے والے مثبت قانون دانوں کی رائے لی جائے تو وہ فطری حقوق کی طرح ان انسانی حقوق کو بھی بالکل لایعنی قرار دے دیں گے۔

تاہم بین الاقوامی نظام اور بین الاقوامی قانون کی تمام تر خامیوں کے باوجود بین الاقوامیت کی فضا موجود ہے اور حق و انصاف پر مبنی اخلاقی حقوق کی وکالت نہ صرف بامعنی بلکہ عالمی پیانہ پر امن، آزادی، مساوات و تعاون کے اصولوں کو پروان چڑھانے کے لیے ناگزیر ہے اور اب کوئی طاقت اس دعوے کی نفی نہیں کرسکتی کہ ہر جداگانہ قومی گروہ کو اپنے علاقہ میں حکومت خود اختیاری کا حق حاصل ہے۔

حکم امتناعی (Injunction): حکم امتناعی عدالت مجاز کے اس حکم کو کہتے ہیں جس کی رو سے کسی شخص کو کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا پابند کیا جاتا ہے حکم امتناعی کے دو اقسام ہیں (1) تاکیدی (2) امتناعی۔

حکم امتناعی عدالت کے صوابدید پر جاری کیے جاتے ہیں مدعی کو اس کے جاری کرانے کا کوئی قانونی حق نہیں ہوتا۔

حکم امتناعی ان صورتوں میں جاری ہوتے ہیں جبکہ ہرجانہ کا چارہ کار ناکافی ہو یا جبکہ ٹارٹ کے ارتکاب کی دھمکی دی گئی ہو یا مدعاعلیہ اس کی تیاری کر رہا ہو۔

تاکیدی اس وقت جاری کیا جاتا ہے جب کسی شخص کو کوئی کام کرنے کا پابند کرنا مقصود ہو مثلاً اگر زید بکر کی آراضی پر ناجائز طور پر کوئی دیوار تعمیر کرے تو زید کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ناجائز تعمیر کو ہٹا دے۔ امتناعی اس وقت جاری ہوتا ہے جب کسی شخص کو کوئی کام کرنے سے منع کرنا مقصود ہو مثلاً اگر زید اپنی ہی آراضی پر اس طرح دیوار تعمیر کر رہا ہو کہ اس کی وجہ سے بکر کے مکان کے دریچہ سے ہوا اور روشنی کی آمد میں کافی کمی ہوجاتی ہے تو زید کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اس طرح سے اپنی دیوار تعمیر نہ کرے جس کی وجہ سے بکر کے حق آسائش میں کمی واقع ہو۔ حکم امتناعی یا تو عارضی ہوتا ہے یا دوامی۔ عارضی حکم امتناعی ایک مخصوص مدت کے لیے مقدمہ کے دوران جاری کیا جاتا ہے۔

دوامی حکم امتناعی مستقل نوعیت کا ہوتا ہے جو مقدمہ کی کارروائی کے اختتام پر جاری ہوتا ہے۔

حکم دیوالیہ کے بعد گرفتاری کا اختیار: اگر اس بات کا یقین ہو یا باور کرنے کی معقول وجہ ہو کہ قرض دار فرار ہونے والا ہے یا عدالت کے حدود سماعت سے باہر چلا گیا ہے تاکہ وہ اس ذمہ داری سے بچے جو اس پر عائد کی گئی ہو تو عدالت قرض خواہ یا رسیور کی درخواست پر قرض دار کی گرفتاری کا حکم دے سکتی ہے اور عدالت میں حاضر ہونے کے بعد اگر یہ رائے قائم ہو کہ قرض دار کی یہ نیت نہ تھی تو اسے مناسب ضمانت داخل کرنے کا حکم دے سکتی ہے اور ضمانت داخل ہونے پر رہا کرسکتی ہے۔ ضمانت داخل نہ ہونے کی صورت میں محبس دیوانی میں اس شخص کو عدالت کے حکم کی بناء پر رکھا جاسکتا ہے جس کی زیادہ سے زیادہ مدت تین ماہ ہوسکتی ہے۔

حکم نامہ تلاشی (Search Warrant): اگر کسی حاکم فوج داری کو یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ کوئی شخص ناجائز حبس میں رکھا گیا ہے تو اسے اس کا اختیار ہوگا کہ حکم نامہ تلاشی جاری کرے اور جس شخص کے نام حکم نامہ مذکور جاری کیا جائے وہ اس شخص کو تلاش کرنے کا مجاز ہوگا اور تلاشی حکم نامے کے مطابق عمل میں آئے گی اور شخص مذکور متعلقہ حاکم فوج داری کے پاس پیش کیا جائے گا اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ شخص ناجائز طور پر حبس بے جا میں رکھا گیا تھا تو حاکم فوج داری فوراً اسے رہا کرنے کا حکم صادر کرے گا۔

اگر عدالت یہ رائے قائم کرے کہ کسی دستاویز یا دیگر شے کا کسی تفتیش تحقیقات یا کارروائی میں پیش ہونا ضروری اور مناسب ہے تو عدالت مذکور طلب نامہ اس شخص کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کرے گی کہ وہ تاریخ اور مقام مندرجہ طلب نامہ یا حکم نامہ حاضر ہوکر دستاویز یا شے مذکور پیش کرے۔ ایسی صورت میں اس شخص کو اس کا اختیار ہوگا کہ اس دستاویز یا شے کو پیش کرے یا دوسرے شخص کے ذریعہ پیش کرائے لیکن اس قانون کے ذریعہ کسی ایسے خط یا پوسٹ کارڈ یا تار اور شے کو پیش نہ کیا جاسکے گا جو عہدہ دار ٹپا یا تار برقی کی تحویل میں ہو یا کوئی ایسی دستاویز یا شے جو امور مملکت سے متعلق ہو اور جس کے پیش کیے جانے کے متعلق گورنمنٹ نے اجازت نہ دی ہو یا کوئی دستاویز پر جو کسی عہدہ دار سرکاری کے اختیار میں باعتبار رازداری ہو اور جس کا اختیار اس کی دانست میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اغراض سرکاری کے لیے مضر ہو۔

تلاشی کے متعلق عام احکام یہ ہیں کہ جب وہ مقام بند ہو جس کے معائنہ یا تلاشی کی ضرورت ہو تو اس شخص کو جو اس میں رہتا ہو یا اس کے نگراں کا یہ فرض ہوگا کہ اس عہدہ دار یا دیگر شخص تعمیل کنندہ حکم نامہ کو حکم نامہ پیش کرنے پر بلا مزاحمت اندر آنے دے اور تلاشی میں ہر طرح کی سہولت معقول دے۔ غروب آفتاب کے بعد اور طلوع آفتاب سے قبل کسی مکان میں تلاشی نہ لی جاسکے گی البتہ اگر اس امر کے باور کرنے کی وجہ ہو کہ وہ شے جس کی تلاش ضروری ہو اس وقت تلاش نہ کرنے کی صورت میں مقام تلاشی سے تلف کردی جائے گی یا وہاں سے نکل جائے گی تو ایسی صورت میں غروب آفتاب کے بعد بھی تلاشی لی جاسکتی ہے۔ تلاشی لینے سے پہلے تلاشی لینے والے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ مقام تلاشی کے قریب رہنے والے دو معتبر باشندوں کو تلاشی کے وقت حاضر رہنے کے لیے طلب کرے اور ان کے روبرو تلاشی لے۔ تلاشی لینے والا ان جملہ اشیاء کی جو تلاشی میں دستیاب ہوں اور اس مقام کی جہاں وہ دستیاب ہوں ایک فہرست مرتب کرے گا اور اس فہرست پر ہر دو اشخاص مذکور کے دستخط لے گا۔

حکم نامہ گرفتاری (Warrant of Arrest): اگر کسی شخص پر یہ الزام ہو کہ اس نے ایسا جرم کیا ہے جس میں حکم نامہ گرفتاری جاری ہونا چاہیے تو عدالت حکم نامہ گرفتاری جاری کرے گی اور ہر وہ مقدمہ جس میں عدالت طلب نامہ جاری کرسکتی ہے ذیل کی صورتوں میں معقول وجہ کی بناء پر حکم نامہ گرفتاری جاری کرسکے گی۔

(1) اگر طلب نامہ جاری کرنے سے قبل یا طلب نامہ جاری کرنے کے بعد مگر اس وقت سے پہلے جو اس کی حاضری کے لیے مقرر ہو عدالت کو یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ ملزم فرار ہوگیا ہے یا طلب نامہ کی تعمیل نہ کرے گا۔

(2) اگر ملزم وقت مقررہ پر حاضر نہ ہو اور یہ ثابت ہوجائے کہ طلب نامہ حسب ضابطہ ایسے وقت تعمیل ہوگیا تھا کہ اس کے مطابق اس کا حاضر ہونا عین ممکن تھا اور عدم حاضری کی کوئی معقول وجہ ظاہر نہ کی جائے۔

حکم نامہ گرفتاری ایک سے زیادہ عہدہ داران کوتوالی کے نام لکھا جاسکے گا۔ جب حکم نامہ کسی عہدہ دار کوتوالی کے نام لکھا جائے تو اس کی تعمیل کوئی اور عہدہ دار بھی کرسکے گا جس کا نام حکم نامہ کی پشت پر اس عہدہ دار نے لکھ دیا ہو جس کے نام حکم نامہ جاری یا منتقل ہوا ہو۔ گرفتار کنندہ کا یہ فرض ہوگا کہ وہ بلاتوقف غیر ضروری شخص گرفتار شدہ کو اس عدالت میں حاضر کرے جس میں اس کے حاضر کیے جانے کا حکم ہو۔ اگر کسی عدالت کو یہ باور کرنے کی معقول وجہ ہو کہ جس شخص کی گرفتاری کے لیے حکم نامہ جاری کیا گیا ہے وہ مفرور یا روپوش ہوگیا ہے اور اس پر حکم نامہ کی تعمیل نہیں ہوسکتی ہو تو عدالت ایک اشتہار کی تشہیر کی تاریخ سے تیس دن سے کم نہ ہو اس مقام پر حاضر ہوجائے جو اشتہار میں درج ہے اگر وہ شخص جس کی حاضری یا گرفتاری کا طلب نامہ یا حکم نامہ گرفتاری جاری کیا گیا ہو اس عدالت میں موجود ہو تو عدالت کو اس کا اختیار ہوگا کہ اس سے مچلکہ یا ضمانت تحریر وعدۂ حاضری لے۔

حملہ (Assault): کسی شخص کی موجودگی میں ایسے تیور اختیار کرنے یا ایسی تیاری کرنا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس موجود شخص کے خلاف مجرمانہ جبر کا استعمال ہونے والا ہے۔

مثلاً زید بکر کے خلاف گھونسا تانے اور بکر کو یہ باور کرائے کہ وہ اس کو عنقریب مارنے والا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زید نے حملہ کا ارتکاب کیا ہے۔ یہاں بکر کو اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ زید جبر مجرمانہ استعمال کرنے کو ہے۔

اس طرح اگر زید اپنے خوں خوار کتے کو اس طرح کھولنا شروع کرے کہ بکر کو اس کا احتمال ہوجائے کہ زید عنقریب اس کتے کو اس پر چھوڑنے والا ہے تو سمجھا جائے گا کہ زید نے بکر پر حملہ کا ارتکاب کیا عام طور پر کسی جرم کے ارتکاب کی محض تیاری قابل سزا نہیں ہے لیکن جب تیاری اس علم سے کی جائے کہ دوسرے فریق کو اس کا یقین ہوجائے کہ اس پر مجرمانہ جبر کا استعمال ہونے والا ہے تو ایسی تیاری حملہ قرار دی جاتی ہے۔ کسی مکان میں کوئی بوتل یا پتھر وغیرہ اس نیت سے پھینکنا کہ اس مکان کے رہنے والوں کو ضرر پہنچے یا وہ خوف زدہ ہوں حملہ کی تعریف میں آتا ہے۔

محض لفظ حملہ کی حد تک نہیں پہنچ سکتے لیکن الفاظ جو استعمال کیے گئے ہوں ان سے یہ نتیجہ نکل سکے کہ عنقریب مجرمانہ ارتکاب ہونے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

والا ہے تو پھر یہ الفاظ حملہ کی تعریف میں آجائیں گے۔

حملہ کا شبہ جائز قرار دینے کے لیے اس امر کی شہادت ہونی چاہیے کہ ملزم اس وقت اور اس موقع پر جبر مجرمانہ استعمال کرنے والا تھا۔

جرم کی تفہیم کے لیے جبر مجرمانہ کی صراحت ضروری ہے اور اس سے جرم کے سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

کسی شخص پر اس کی رضامندی کے بغیر بالارادہ کسی جرم کے ارتکاب کے لیے جبر یا زور کرنا یا اس نیت سے یا اس علم سے کہ اس کا احتمال ہے کہ جبر سے اس شخص کو مضرت یا خوف یا رنج پہنچے گا "جبر مجرمانہ" کہلائے گا۔

حنبلی: یہ اہل سنت کا چوتھا فقہی مکتب ہے جو امام احمد بن حنبل کی طرف منسوب ہے ان کی ولادت 164ھ میں بغداد میں ہوئی اور وہیں 241ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس کی اول اول نشوونما بھی بغداد ہی میں ہوئی۔ پھر شام کے شہروں میں اور دوسری جگہ اس کی اشاعت ہوئی۔ اس زمانہ میں مملکت سعودیہ عربیہ کا بھی سرکاری مسلک ہے اور بلاد نجد میں اسی کو غلبہ حاصل ہے اور دوسرے عربی ملکوں میں اس کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ فلسطین، شام اور عراق وغیرہ میں بھی ان کی مجموعی تعداد اچھی خاصی ہے مگر دوسرے مسلکی فقہ کے مقابلہ میں مقابلۃً ان کی تعداد کم ہے۔

عقائد میں یہ لوگ بھی اشعری مسلک کے قائل ہیں بعض حنابلہ کو تجسیم کا قائل بھی بتایا جاتا ہے۔

حوالہ جاتی خدمات (Reference Service) : آج سے تقریباً دو سو سال پہلے معروف انگریزی ادیب سیموئیل جانسن نے کہا تھا کہ "آدھی معلومات یہ جاننے میں ہے کہ معلومات کہاں ہے۔ ایک معلومات تو وہ ہے جسے ہم جانتے ہیں۔ دوسری وہ ہے کہ ہم جانتے ہیں وہ کہاں ہے لیکن معلومات کے بڑھتے ہوئے انبار کی بدولت وہ زمانہ گذر چکا جب ایک انسان جملہ علوم کا احاطہ کرلیتا تھا۔ ممکن ہے وید اور اپنشد کے دور میں ایسے علماء رہے ہوں لیکن تاریخ کے مطابق مفکرین میں ہمہ دانی کا تاج لیونارڈو داونچی اور لائبنز (Liebniz) کے سر پر رکھا گیا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ لائبنز جرمنی کے ایک کتب خانے کا لائبریرین تھا اور اسے ویٹکن (Vatican) کے کتب خانہ کی نظامت بھی پیش کی گئی تھی جو اس نے قبول نہیں کی۔ لیکن اب بقول ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن کسی عالم کے لیے یہ ممکن نہیں رہ گیا کہ وہ اپنے لیے حوالہ فراہمی لائبریرین بھی بن سکے۔ کتب خانہ کے عروج کا ایک بڑا اثر یہ بھی ہوا ہے کہ اب تحقیق کے کام کے دو حصوں، تلاش مواد اور تحقیق موضوع میں سے لائبریریوں نے پہلے کام کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ تحقیق کے عمل میں مواد کی نشاندہی اور فراہمی کے اسی کام کو حوالہ جاتی خدمت یا ریفرنس سروس کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ کتب خانہ میں ہونے والے جملہ کاموں کا مقصد مواد علمی اور قاری کے درمیان تعلق قائم کرنا ہے تاکہ کتابیں پڑھی جائیں اور قارئین کو ان کی ضرورت کا علمی مواد دستیاب ہو، مواد طلب سے مطابقت رکھتا ہو اور اس تک رسائی قلیل ترین مدت میں بہم پہنچائی جائے۔

کتب خانہ کے قارئین کی ان کی ضرورت حوالہ خدمت کے مطابق چار قسمیں کی جاسکتی ہیں۔ پہلی بار آنے والے قارئین، عام دلچسپی رکھنے والے، کسی ایک خاص نوعیت کی معلومات کے متلاشی، کسی ایک موضوع پر تحقیق میں مصروف قارئین۔ قارئین کی اس تقسیم سے مطابقت رکھتی ہوئی حوالہ خدمت بھی چار درجوں میں رکھی جاسکتی ہے۔ پہلی قسم کے قاری کی بنیادی ضرورت کتب خانہ سے متعارف ہونا ہے جبکہ دوسری قسم کے قاری کی تلاش مواد کے پیچھے کوئی واضح مقصد تلاش مواد کا نہیں اسے کتب خانہ سے اپنی ضرورت کی کسی کتاب یا رسالہ کو دیکھنا ہے یا اسے جاری کرانا ہے۔ تیسری قسم کے قاری کی ضرورت کسی شخص کی سوانح، کسی تاریخی واقعہ کا پس منظر، کسی مقام کا جائے وقوع، کسی تصور یا نظریہ کی تفصیل وغیرہ قسم کی واضح ضرورت ہے۔ اس کی تشفی حوالہ خدمات، کتب خانہ میں موجود حوالہ جاتی کتب (Reference Books) کی مدد سے کرتا ہے۔ محققین اور کسی پراجیکٹ پر کام کرنے والے قارئین کی حوالہ ضرورت کی تسکین کا کام دیر طلب ہوتا ہے۔ اس خدمت میں پہلا قدم ضرورت مواد کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنا ہے پھر ذخیرہ کتب خانہ میں ان کی نشاندہی، ان کی قدرشناسی کرنا اور آخر میں اس کی فراہمی۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدمت قلیل مدت میں نہیں دی جاسکتی ہے۔

اوپر مذکور قارئین کی تقسیم کی حیثیت محض برائے وضاحت ہے ورنہ ایک پہلی دفعہ داخل ہونے والا قاری محقق ہوسکتا ہے اور محقق کی ضرورت کبھی بہت مخصوص نوعیت کے اعداد و شمار کی یا کسی مفکر کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سن ولادت کی ہو سکتی ہے۔ کتب خانہ کی حوالہ خدمات کو اس کے دائرہ مواد اور نوعیت مواد کے اعتبار سے مختصرالدائرہ/ مختصرالمدتی یا حقائق تلاش خدمت (Fact Finding/ Short Range/ Ready Reference) اور طویل المدتی/ وسیع الدائرہ (Long Range Reference Service) حوالہ خدمت میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حوالہ خدمت کی پہلی قسم کی خصوصیت اس کی تکمیل کے لیے درکار مختصر مدت ہے۔ اس کے تحت حوالہ جاتی خدمت کسی معروف شخصیت کی تاریخ پیدائش، کسی ملک کے صدر یا وزیر اعظم کا نام کسی اصطلاح کی وضاحت کی فراہمی ہوتی ہے جو عموماً پہلے سے مرتب حوالہ جاتی خدمات کتابوں مثلاً انسائکلوپیڈیا، ڈکشنری، سالنامہ، ڈائریکٹری یا سوانحی لغات وغیرہ میں مل جاتی ہیں۔ کتب خانہ میں اس کام کے لیے انفارمیشن ڈسک یا حوالہ میز ہوتی ہے جہاں موجود عملہ یہ خدمت مہیا کرتا ہے۔ یہ حوالہ جاتی ماخذ یا حوالہ جاتی خدمات کتابیں حقائق و اعداد و شمار کے ٹکڑوں کو اس طرح مرتب کرکے بنائی جاتی ہیں کہ ان سے معلومات آسانی سے مل سکے۔ عموماً ان میں مواد مسلسل مطالعہ کے لیے نہیں ہوتا۔ اس زمرہ میں لغات، سوانحی لغات، انسائیکلوپیڈیا، سالنامہ، جغرافیائی ماخذ، دستی کتاب، ڈائریکٹری، اشاریاتی، تلخیصی رسائل اور کتابیات وغیرہ آتی ہیں۔ اس طرح کی کتابیں مرتب کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ سنسکرت میں "امرکوش" اور "انوکرامیکا"، عربی میں فہرست ابن ندیم اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات الاعیان اس قبیل کی معروف کتابیں ہیں۔

وسیع الدائرہ (Long Range) حوالہ جاتی خدمت یونیورسٹی اور تحقیقی اختصاص رکھنے والے اداروں کی امتیازی خدمت ہے۔ اس قسم کی خدمت کی خصوصیات میں وقت کازیادہ صرف ہونا، روایتی ماخذی وسائل کے رول کی کمی اور درکار معلومات کی گہرائی اور گیرائی کی نوعیت شامل ہیں۔ اس خدمت کے لیے حوالہ خدمت لائبریرین کو متلاشی مواد کے رفیق کے طور پر تلاش مواد کرنا پڑتا ہے تلاش کا کام شروع کرنے سے پہلے متلاشی مواد سے گفتگو کرکے معلومات کی نوعیت سمجھنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی ماہرین مضمون کی مدد لینی پڑتی ہے۔

حوالہ خدمت کی یہ دونوں اقسام کے پس پشت یہ مفروضہ ہے کہ یہ خدمت طلب پر ہی دی جاتی ہے۔ اس میں عمل کی سرگرمی نہیں پائی جاتی ہے لیکن آج کے دور میں بنیادی نوعیت کے علمی مواد مثلاً سرکاری مطبوعات، تحقیقی اداروں اور مراکز کی رپورٹیں، یونیورسٹیوں کے مقالے اور رسائل میں شائع مضامین وغیرہ کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوچکا ہے۔ تحقیق کا عمل مسابقت کے دور میں داخل ہوچکا ہے۔ اس میں سبقت کا انحصار محققین کو درکار معلومات بروقت ملنے پر ہے۔ اس لیے کتب خانے حوالہ خدمت مہیا کرنے کے لیے قاری کی منتظر رہنے کے بجائے حوالہ خدمات کی امکانی ضرورت کا اندازہ کرکے پہلے سے ہی حوالہ جاتی وسائل مرتب کرنے لگے ہیں۔ حوالہ فراہمی خدمت کے تحت درج ذیل سرگرمیاں اب کتب خانہ کے کام کا جزو بن گئی ہیں :

عصری علمی پیش رفت متعارفی خدمت (Current Awareness Services)
منتخب معلومات ترسیلی خدمات (Selective Dissemination of Information)
اشاریہ سازی و تلخیصی خدمات (Indexing and Abstracting Service)
علمی پیش رفت جائزہ خدمات (State of Art/ Literature Survey Service)
ترجمہ خدمات (Translation Service)
علمی مواد فراہمی خدمات (Document Supply Service)
نقل مواد فراہمی خدمات (Reprography Service)

عصری علمی پیش رفت متعارفی خدمت کا مقصد اپنے قارئین کو کتب خانہ میں موصول تازہ مضامین اور کتابوں سے واقف کرانا ہے۔ ایک فہرست نئی کتابوں کی نیم مطبوعہ یا مطبوعہ شکل میں مناسب وقفہ سے جملہ ارکان تحقیقی ادارہ میں تقسیم کی جاتی ہے تاکہ لائبریری میں آنے والے مواد سے قارئین واقف ہوتے رہیں۔ نئی کتابوں کی الماریوں میں نمائش کی جاتی ہے، رسائل کے شمارے اعلیٰ حکام کے پاس بھیجے جاتے ہیں، اخبار کے تراشے بورڈ پر لگائے جاتے ہیں۔

منتخب معلومات ترسیلی خدمت۔ اس خدمت کا مقصد کسی ایک موضوع پر تحقیق میں مصروف فرد واحد یا افراد کے ایک منتخب گروہ کو موضوع سے متعلق تازہ ترین علمی مواد سے بغیر کسی تاخیر کے واقف کرانا ہوتا ہے۔ اس خدمت کی فراہمی کے لیے شعبہ حوالہ جاتی خدمات فرد یا گروہ کا علمی خاکہ یا پروفائل پہلے سے تیار کرکے اپنے ریکارڈ میں رکھتا ہے اور نئے موصول مواد علمی سے ان کی مطابقت کراتا رہتا ہے تاکہ صحیح مطابقت رکھنے والے مواد سے فرد یا گروہ کو واقف کرانے میں تاخیر نہ ہو۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اشاریہ سازی و تلخیصی خدمت۔ عصری علمی پیش رفت متعارفی خدمت کی یہ زیادہ متعین صورت ہے جس میں تازہ مضامین کے اشاریہ کو مع تلخیص ہفتہ وار یا پندرہ روزہ وقفہ سے تقسیم کرتے ہیں۔ قارئین اپنی پسند کے مضمون کی حسب ضرورت فرمائش کرتے ہیں اور انھیں متعلقہ رسالہ بھیج دیا جاتا ہے یا کتب خانہ میں آکر اس کا مطالعہ کرتے ہیں یا مضمون کی نقل حاصل کرلیتے ہیں۔

علمی پیش رفت جائزہ۔ شعبہ حوالجاتی خدمت کا ایک فرد جو مضمون سے واقف ہوتا ہے تحقیقی ادارے کے دائرہ میں آنے والے سال بھر کے مضامین اور مطبوعات کا ایک جائزہ تیار کرکے جملہ اراکین ادارہ کو بھیجتا ہے تاکہ متعلقہ موضوع پر سال بھر کی پیش رفت کا اندازہ ہوسکے۔

ترجمہ خدمت کا مقصد تحقیقی ادارہ کی دلچسپی کے دائرہ میں شائع غیر زبان کے مضمون کا قارئین کی زبان میں ترجمہ فراہم کرنا ہے تاکہ زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے وہ اہم تحقیقی انکشافات سے ناواقف نہ رہ جائیں۔ اس خدمت کے لیے کتب خانہ یا علمی مواد فراہمی مرکز مترجمین کے ایک پینل کا ریکارڈ رکھتا ہے جن کی مدد سے ترجمہ کرلیا جاسکتا ہے۔

علمی مواد فراہمی خدمات۔ محققین کو درکار مواد ضرورت کی تکمیل اگر کتب خانہ اپنے ذخیرہ رسائل سے نہیں کرسکتا تو درکار مضمون، رپورٹ یا اعداد و شمار کسی دوسرے علمی مواد مرکز سے حاصل کرتا ہے۔ مہیا کرانے کی یہ خدمت علمی مواد فراہمی خدمت کہلاتی ہے۔

زیراکسنگ خدمت کی ضرورت کی بڑی وجہ محققین کے پاس تجربہ گاہ کے کام یا فیلڈ ورک کی وجہ سے فرصت کی کمی ہے کتب خانہ یا علمی مواد مرکز (Documentation Centre) انھیں مطلوبہ مضمون کی نقل فراہم کرنے کے لیے زیراکسنگ کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔

مندرجہ بالا حوالہ جاتی خدمات کو زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ اور زیادہ منضبط طور پر فراہم کرنے میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی پیش رفت بہت معاون ثابت ہوئی ہے۔ ڈیجیٹل شاہراہ یعنی تحریر کو برقی سگنل میں تبدیل کرکے دور تک پہنچانے کی سہولت میں روزافزوں بہتری، معلومات کا بنیادی ڈھانچہ ڈیٹابیس یعنی الیکٹرانک چپس ریکارڈ کرنے کی سہولت وغیرہ کی بدولت اب معلومات سی ڈی کی مختلف شکلوں اور برقی رو کے واسطے سے دنیا بھر میں نٹ ورک یعنی نظام انسلاک کے سہارے براہ راست ذاتی کمپیوٹر پر دستیاب ہیں۔ شعبہ حوالہ جاتی خدمت کی میز بقول ولیم کاٹز (William Katz) الیکٹرانک ڈیٹا مرکز بن چکی ہے اب متلاشی مواد اپنے ذاتی کمپیوٹر سے دنیا کے کسی بھی کتب خانہ سے رابطہ کرسکتا ہے اور درکار مواد کی شناخت اور حصول کرسکتا ہے۔ لیکن مختلف ڈیٹابیس میں موزوں ترین کے انتخاب اور اس سے استفادہ کے لیے مناسب سافٹ ویر (زبان) کے استعمال کے سلسلے میں حوالہ خدمت لائبریرین کی ضرورت بدستور رہے گی کیونکہ پہلے کی طرح الیکٹرانک حوالہ خدمات مفت نہیں ہیں اور کوشش و ناکامی کے عمل سے گذرنے کا کام نہ صرف وقت طلب بلکہ مہنگا بھی ہے۔

حوالہ جاتی کتاب / کتاب حوالہ (Reference Book):

کتب خانہ خدمات میں حوالہ فراہمی خدمت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ قارئین کتب خانہ اپنے علمی کاموں کے سلسلے میں یا محض جستجو کے مزاج کی بدولت اپنی ضرورت کی معلومات حاصل کرنے کے لیے کتب خانہ میں آتے ہیں۔ معلومات کی نوعیت اگر عام قسم کی ہوتی ہے تو حوالہ خدمت پر معمور عملہ چند مخصوص نوعیت کی کتابوں سے معلومات فوری طور پر فراہم کردیتا ہے۔ عام نوعیت کی معلومات کی شناخت قاری کے معلومات حاصل کرنے کے لیے کیے گئے سوال سے ہوجاتی ہے۔ عموماً یہ سوالات زبان، پس منظر، فرد، رخ یا جھکاؤ، مقام یا جگہ، ادارہ، حقائق اور اعداد و شمار، فہرست مواد علمی اور تصاویر، ڈائی گرام وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں اور کیا، کون، کیسے، کب کہاں وغیرہ سے شروع ہوتے ہیں۔ کتب خانہ میں موجود کتابوں میں ایک خاص قسم حوالہ جاتی کتابوں کی ہوتی ہے جو اس طرح کے سوالوں کے فوری جواب کے لیے مرتب کی جاتی ہیں۔

حوالہ جاتی کتاب کی تعریف آسان نہیں۔ اگر ہم کہیں کہ اس سے مراد ایسی کتاب ہے جس سے فوری طور پر جانکاری مل جاتی ہے تو اس زمرہ میں کوئی بھی کتاب آسکتی ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اس طرح کی کتابوں کو تسلسل سے نہیں پڑھا جاتا تو بقول ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن کچھ لوگ عام لغت کو تسلسل سے پڑھتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ درجہ بندی نظام وضع کرنے والوں نے مضامین کے ایک زمرہ کو طریقہ اظہار بیان کا نام دیا ہے جس کے تحت درج مضامین کو جملہ مضامین کے ساتھ بطور لاحقہ استعمال

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً رسائل، سالنامے، لغات و انسائیکلوپیڈیا، کتابیات وغیرہ اس طرح کی کتابوں کو حوالہ جاتی کتابیں کہا جاسکتا ہے، لیکن حوالہ جاتی کتابوں کی زیادہ بہتر تعریف ان کے مندرجات کی خصوصیات کی مدد سے کی جاسکتی ہے چنانچہ حوالہ جاتی کتابیں وہ کتابیں ہیں:

جو عموماً تسلسل سے پڑھے جانے کے لیے نہیں ترتیب دی جائیں۔

جن کے اندراجات اپنے تحت درج تفصیلات کے اعتبار سے چھوٹے بڑے ہوسکتے ہیں۔

جن کے اندر مضامین کے ٹکڑوں کو ان کے نام کے حروف تہجی اعتبار سے یا درجہ نمبر کے اعتبار سے درج کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مضمون کے خیالات کا تسلسل نہیں قائم رہتا۔

معلوماتی عنصر کی ترتیب کتاب میں اس طور پر کی جاتی ہے کہ ان تک پہنچ آسان ہو۔ مختلف ماہرین نے اس طرح کی کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ ولیم اے کاٹز نے انھیں دو بڑے زمرہ میں رکھا ہے۔

(1) معلوماتی وسائل منضبط کرنے والی اور ان کی جانکاری دینے والی کتابیں

(2) معلومات فراہم کرنے والی کتابیں

پہلی قسم کی حوالجاتی کتابیں درج ذیل ہیں:

کتابیات (Bibliography)

اشاریائی اور تلخیصی خدمات مطبوعات (Indexing and Abstracting Service Sources)

دوسری قسم میں درج ذیل کتابیں آتی ہیں:

لغات (Dictionaries)

انسائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia)

سوانحی لغات (Biographical Dictionaries)

جغرافیائی معلومات وسائل (Geographical Sources)

دستی کتابیں، سالنامے (Handbooks, Yearbooks)

ڈائرکٹری (Dircetory)

عصری معلومات وسائل (Current Affairs Sources)

باوجود مندرجہ بالا خصوصیات کی نشاندہی اور فہرست حوالہ جاتی کتب یہ بات ذہن میں ضرور رہنی چاہیے کہ بسا اوقات فوری حوالہ فراہم کرنے والی کتاب کو حوالہ جاتی کتاب اور عام کتاب کی تقسیم میں رکھنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

مزید دیکھیے اندراجات

انسائیکلوپیڈیا، دستی کتاب، ڈائرکٹری، سوانحی لغات، کتابیات، لغت

دستی کتاب / دستورالعمل (Handbooks Manuals):

ماخذی کتب کے دائرہ میں شامل یہ کتاب عموماً ایک خاص سطح کے علمی یا پیشہ ور ماہرین کے لیے مرتب کی گئی کتاب ہوتی ہے جس میں اس مضمون یا پیشہ کے علمی اور عملی پہلو سے متعلق معلومات، فارمولے یا ہدایات درج ہوتی ہیں۔ چونکہ تحقیقات میں مصروف یا کسی تخلیقی یا تعمیری کام میں مصروف افراد کو چند مخصوص معلومات کی کسی وقت بھی ضرورت پڑسکتی ہے اس لیے ایسی کتابوں کو وہ کام کے وقت اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اسے دستی کتاب کا نام دیا گیا ہے۔ اصولاً تو اسے ہلکا پھلکا اور کم حجم کا ہونا چاہیے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ سائنسی مضامین میں استعمال دستی کتابیں خاصی حجم کی اور وزنی ہوتی ہیں۔

ماہرین کے لیے تیار کی جانے کی وجہ سے دستی کتاب کی زبان عام قاری کے لیے مشکل ہوتی ہے اور اسے سمجھنے کے لیے قاری کو مضمون کی بنیادی معلومات سے واقف ہونا چاہیے۔ حسب ضرورت ان کتابوں میں ڈائی گرام، گراف، اعداد و شمار، فارمولے، جدول اور عملی طریقے بھی دیے جاتے ہیں۔

حال کے برسوں میں دستی کتابوں کی نوعیت میں بنیادی تبدیلی آئی ہے اور اب یہ عام معلومات کی کتابیں ہوتی جارہی ہیں جن میں انعامات، اعزازات پانے والوں کے نام، کسی ہنر، کھیل کود، جسم کی ساخت یا عجیب و غریب کارنامہ انجام دینے والے یا ملک بھر یا دنیا بھر میں اولیت حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اندراج ہوتا ہے۔

اسی طرح اعداد و شمار کی دستی کتاب، واقعات کی تاریخ وار تفصیل کی دستی کتاب، علاقائی یا لسانی ادب کی دستی کتاب بھی عام طور پر مرتب ہونے لگی ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

معلومات میں روزافزوں اضافہ یا تبدیلی کی بدولت عام نوعیت کی دستی کتابیں ہر سال نئے ایڈیشن میں شائع ہوتی ہیں لیکن مخصوص علمی مضامین کے لیے تیار دستی کتابوں کے ایڈیشن چند برسوں کے وقفہ سے ہی شائع کیے جاتے ہیں۔

دستی کتاب کی ایک اور قسم دفتری اصول و قواعد کی تفصیل پر مشتمل مطبوعات ہیں جو عام طور پر سرکاری اداروں کی جانب سے شائع ہوتی ہیں۔

دستورالعمل (Manuals): یہ دستی کتاب کی ایک قسم ہے جس میں کسی کام کو انجام دینے کے طریقے اور درکار ضروری اشیا اور اوزار وغیرہ کی تفصیل دی ہوتی ہے۔

خ

خاص صورتوں کا استثنیٰ (Special Exceptions): احکام متعلق قانونی ناقابلیت یا چند شرکاء کی ناقابلیت احکام مقدمات نفاذ حقوق شفاعہ سے متعلق نہ ہوں گے اور باوجود احکام متذکرہ صدر ناقابلیتوں کے رفع ہونے یا شخص ناقابل کے فوت ہونے کی تاریخ سے تین سال کے بعد کوئی مقدمہ رجوع یا ڈگری تعمیل کی درخواست پیش نہ ہوسکے گی مثلاً کسی کو ایک مال وصیت کی نالش کا استحقاق اس کے زمانہ نابالغی میں حاصل ہو اور اس حق کے حاصل ہونے کے گیارہ سال بعد وہ سن بلوغ کو پہنچا تو وہ میعاد معینہ کے لحاظ سے رجاع دعویٰ کے لیے صرف ایک سال باقی رہا لیکن دفعہ نمبر 7 اور دفعہ نمبر 4 کے باوجود اس کو اور دو سال مہلت دی جائے گی یعنی کل میعاد رجاع دعوے کے لیے اس کو تاریخ بلوغ سے تین سال کی ملے گی۔

اس طرح کسی کو ایک موروثی منصب کی بابت دعویٰ کرنے کا حق اس وقت حاصل ہوا جبکہ وہ مجنوں تھا اس حق کے پہلے سال کے چھ ماہ بعد اس کا جنون رفع ہوا ایسی صورت میں وہ جب عام قانون تمادی کے تاریخ رفع جنون سے چھ سال کے اندر دعویٰ رجوع کرسکتا ہے اس کے لیے اس میعاد میں کوئی توسیع نہ ہوسکے گی۔

خالق: خلق کا اسم فاعل ہے جس کے معنی پیدا کرنے والے کے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں ہے کیونکہ سارا عالم اور اس کے اندر کی تمام چیزیں اور سب کچھ اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اس کے علاوہ سب مخلوق ہیں۔ عام طور پر اہل عرب بھی خدا کو خالق مانتے تھے مگر وہ دوسری مخلوقات اور اپنے سے پہلے کے لوگوں کو بھی خدا کی صفات میں شریک قرار دیتے تھے اور خالق حقیقی کی طرح ان کی بھی پرستش کرتے تھے۔ اسی لیے قرآن نے ان کو مخاطب کرکے کہا کہ اس خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا۔ الخالق اور الخلاق کا اطلاق بجز خدا کے اور کسی پر نہیں ہوتا۔ خلق کے معنی صحیح اور درست اندازہ لگانے کے بھی ہیں اور کسی چیز کو بغیر نمونہ اور پیروی کے بنانے اور ایجاد کرنے کے بھی ہیں آخری معنی کے اعتبار سے یہ ابداع و اختراع کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

خاندان (Family) : خاندان کا تصور سماجیات میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اور تاریخ کے ہر دور میں اسے سماج کی سب سے مختصر لیکن بنیادی اکائی کا موقف حاصل رہا ہے۔ کسی ایسے دور کا پتہ نہیں چلتا جبکہ خاندان کا وجود کسی نہ کسی شکل میں نہ رہا ہو۔ دنیا میں خاندان کی اتنی اقسام رہی ہیں کہ کسی واحد تعریف کے ذریعہ اس آفاقی ادارہ کو الفاظ کی بندشوں میں جامع اور مانع طور پر محدود کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن عام طور سے خاندان سے مراد شادی شدہ مرد اور عورت اور ان کی اولاد کا وہ مختصر ترین گھریلو گروہ ہے جو مشترک رہائش اور مشترک معیشت کی زندگی گزارتا ہے۔ لیکن یہ تعریف اس لیے محدود ہے کہ ہر زمانہ میں شادی شدہ جوڑوں کے والدین اور دیگر قریبی اعزاء بھی عام طور سے ایک ساتھ رہتے آئے ہیں۔ اور وہ بھی علمی اور نظریاتی ہر اعتبار سے اسی خاندان کے افراد شمار کیے جاتے رہے ہیں۔ بہرحال خاندان سے مراد ازدواجی رشتوں میں منسلک زن و شوہر اور ان کی اولاد کا ایسا گروہ اور ان کے قریبی رشتہ دار ہیں جو ایک ساتھ رہتے بستے ہیں اور زندگی کے امور میں آپسی مشاورت اور فیصلوں کے پابند ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے سماجوں میں مثلاً قبائلی سماج زرعی اور دیہی سماج قدیم شہری اور جدید صنعتی شہری سماج میں خاندان کی ساخت اس کے سائز اور اس کے پھیلاؤ میں کمی اور اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجیات دانوں اور ماہرین انسانیات نے مختلف اقسام کے خاندانوں کی تفصیلی بحث کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کرنے کے بجائے ان کی علاحدہ تحقیق اور تجزیہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ مختلف سماجوں میں رشتہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دارانہ نظام کا پھیلاؤ خاندانی تعلقات اور خاندانی وابستگی کی اساس پر منحصر رہا ہے۔ عام طور سے سائز کی بنیاد پر خاندان کو تین قسموں میں بانٹا جاتا ہے۔

(1) مشترک خاندان (Joint Family)، (2) توسیعی خاندان (Extended Family) اور (3) نیوکلیر خاندان (Nuclear Family)۔

(1) مشترک خاندان (Joint Family): مشترک خاندان زرعی اور قبل صنعتی سماج کی خاص خصوصیت رہا ہے۔ اس میں صدر خاندان کی تمام اولادیں اور ان کی اولادیں ایک ہی ساتھ ایک بڑے مکان کے مختلف حصوں میں رہتی ہیں۔ اور ان تمام چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے بننے والا یہ وسیع خاندان مشترک معیشت اور باہمی تحفظ کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ مشترک خاندان زرعی سماج کے لیے اس لیے بھی بہت اہم تھا کہ ایک خاندان کے زیر سایہ افراد کی تعداد جتنی زیادہ ہو، زرعی کاروبار کے لیے اسی مناسبت سے زیادہ مفید اور کارکرد ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جب سے زرعی سماج صنعتی سماج کے دور میں داخل ہوا ہے مشترک خاندان آہستہ آہستہ مختصر اکائیوں میں ٹوٹتا جارہا ہے۔ ترقی پذیر زرعی ممالک مثلاً ہندستان میں اب بھی دیہی علاقوں میں مشترک خاندان کی مثالیں ملتی ہیں جو نئے دور کے تغیرات سے دو چار ہیں۔ مشترک خاندان کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں صدر خاندان کو تمام امور میں مکمل اختیار حاصل رہتا ہے اور خاندان کے سارے افراد صدر خاندان کے فیصلہ کے پابند ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار بڑے بڑے تجارتی خاندان بھی مشترکہ خاندان کی تعریف میں آتے ہیں۔

(2) توسیعی خاندان (Extended Family): توسیعی خاندان مشترکہ خاندان کا ایک ایسا ٹکڑا ہوتا ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ بھائی بہن اور والدین یکجا رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر کمانے والا شخص اپنی مختصر اکائی کے مصارف خود برداشت کرتا ہے۔ اور اگر کسی شخص کو صدر خاندان تسلیم بھی کیا جائے تو اس کے احکام یا فیصلے کا ہر ایک کو پابند رہنا لازمی نہیں۔ اس کے علاوہ توسیعی خاندان میں اس کی ہر مختصر اکائی کا علاحدہ باورچی خانہ بھی ہوسکتا ہے۔ یا اگر کھانے پکانے کا انتظام مشترک ہو تو ہر کمانے والا شخص اپنی آمدنی یا خرچ کی مناسبت سے اس میں حصہ لیتا ہے۔ مشترک خاندان کے ٹوٹنے کے بعد توسیعی خاندان اس کے عبوری دور کی ایک منزل ہے۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کے دیہاتوں اور شہروں میں خاندان توسیعی خاندان کی منزل سے گزر رہا ہے۔

(3) نیوکلیر خاندان (Nuclear Family) : اس کے برخلاف نیوکلیر خاندان سب سے چھوٹی اکائی ہے جس میں ماں باپ اور بچے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ اور صرف یہی افراد ایک دوسرے کے لیے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ خاندان کی یہ مختصر اکائی صنعتی دور کی پیداوار ہے اور دنیا کے ہر ملک میں خاندان کی یہی قسم سب سے زیادہ عام ہوتی جارہی ہے۔ بالخصوص مغربی ممالک میں زیادہ تر نیوکلیر خاندان ہی ملتا ہے۔

دنیا کے جتنے بھی قسم کے خاندان پائے جاتے ہیں یا پائے جاتے رہے ہیں ان کو اختیارات یا اقتداری اعتبار سے دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ (1) پدری خاندان، (2) مادری خاندان۔

(1) پدری خاندان سے مراد وہ خاندان ہے جس میں باپ یا مرد کو کم و بیش مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا کا سماج بحیثیت مجموعی پدر سری اختیارات کے طریقہ پر رائج رہا ہے۔ اور آج بھی پورے وثوق کے ساتھ بڑی حد تک انسانی سماج کو مرد اختیاری سماج کہا جاتا ہے۔

(2) تاہم ایسے قبائل بھی موجود ہیں جہاں مادری یا مادر اختیاری خاندان ملتے ہیں۔ مادر سری خاندان میں ماں یا عورت کو خاندانی امور میں مکمل اختیارات حاصل رہتے ہیں۔

پدرسری خاندان پدر نسبی اور پدر مقامی بھی ہوتا ہے۔ پدر نسبی سے مراد خاندان کی وہ قسم ہے جس میں جائیداد مردوں کے سلسلہ میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور عورتیں حق جائیداد سے محروم رہتی ہیں۔ پدر مقامی سے مراد یہ ہے کہ شادی کے بعد عورت مرد کے گھر جاکر رہتی ہے اس کے برعکس مادر نسبی میں جائیداد کا سلسلہ صرف عورتوں میں چلتا ہے اور مرد حق جائیداد سے محروم رہتے ہیں۔ اسی طرح مادر مقامی خاندان میں شادی کے بعد شوہر بیوی کے گھر جاکر رہتا ہے۔ پدرسری اور مادر سری خاندان کی یہ خصوصیات قبل صنعتی سماج میں زیادہ رائج رہی ہیں۔ موجودہ صنعتی سماج میں جو کہ جمہوری اقدار کا حامل ہے اس میں مرد اور عورت دونوں کو حق جائیداد تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں مل چکا ہے اور اس اعتبار سے پدرسری اور مادر سری خاندانوں کی پرانی پابندیاں اس حد تک باقی نہیں رہی ہیں۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں خاندان کی بے شمار اشکال ظہور میں آتی رہی ہیں۔ بالخصوص موجودہ دور میں خاندان انقلابی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ ازدواجی تعلقات کو وہ تقدس یا پائیداری اب حاصل نہیں ہے جو سابقہ

سماجوں میں تھی۔ چنانچہ مغربی سماج میں شادی کی اہمیت محض ایک "ساتھ" کی رہ گئی ہے جو کبھی بھی چھوٹ سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے خاندانی تعلقات بڑی تیز رفتاری کے ساتھ شکست و ریخت کا شکار ہورہے ہیں۔ چنانچہ بعض سماجیات داں یہ سوال بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی منزل بھی آئے گی جب کہ خاندان کا ادارہ بالکل تحلیل ہوجائے گا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ گو کہ خاندان ساخت اور ڈھانچہ کے اعتبار سے تغیرات کی منزلوں سے گزر رہا ہے لیکن اس کی مکمل تحلیل قرین قیاس نہیں کیونکہ باہمی آہنگ اور وابستگی کا یہ ادارہ بنیادی یا جوہری اہمیت کا حامل ہے جو انسان کی سماجی صفت کا مختصر ترین نکتہ ہے۔ اس کی بقاء انسان کی سماجی فطرت کے مطابق ہے اس لیے یہ تو ہوسکتا ہے کہ خاندان شکلی اعتبار سے تغیر پذیر ہوتا رہے لیکن اس کا خاتمہ دشوار نظر آتا ہے۔

مختلف ممالک میں خاندان پر ریسرچ اور تحقیق کے کام وسیع پیمانہ پر ہورہے ہیں کیونکہ سماجی نظام میں خاندان ہی وہ بنیادی اور آفاقی ادارہ ہے جو افراد کو ایک مضبوط آہنگ اور رشتہ میں منسلک کرتا ہے۔ اسی آہنگ اور رشتہ پر سماجی تعلقات کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے بدلتے ہوئے خاندان کے رموز اور مسائل کا تحقیقی جائزہ سماجیات کا سب سے اہم موضوع ہے۔

موجودہ حالات میں ترقی یافتہ ملکوں میں خاندان کی سالمیت کمزور ہوچکی ہے اس کی ساخت میں بھی بے حد تبدیلیاں ہوچکی ہیں جن کا اثر ہندستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں بھی ہورہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں آج کل تین قسم کے خاندان موجود ہیں۔ (1) نیوکلیر خاندان، (2)صرف والدہ یا والد کا خاندان، (3) گتھے ہوئے خاندان (Blended Family)۔

(1) نیوکلیر خاندان نوے کی دہائی میں کینیڈا میں صرف 35 فی صد باقی بچے تھے۔ (2) صرف والدہ یا والد کا یعنی ایک جنم داتا کا خاندان وہ ہے جس میں لڑکا یا لڑکی اپنی اولاد کے ساتھ رہتے ہیں یہ جنم داتا عموماً غیر شادی شدہ ہوتا ہے۔ (3) تیسری قسم کے خاندان میں ماں اور باپ دونوں اپنے پرانے شوہر یا بیوی سے پیدا اولادوں کے ساتھ ایک نئے شادی شدہ رشتے میں بندھ کر ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ ان کی پچھلی اولادیں آپس میں بغیر کسی خونی رشتے کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس طرح کے خاندان میں ساتھ رہنا محض رسمی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہم جنسیت میں گرفتار جوڑے، غیر شادی شدہ جوڑے اور گروہی شادی کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں بھی کسی نہ کسی شکل میں خاندان کا روپ اختیار کرلیتے ہیں۔

ہم جنسی جوڑے باقاعدہ قانونی شادی کرتے ہیں۔ اور ایک ساتھ رہتے ہیں۔ وہ اولاد تو پیدا نہیں کرسکتے لیکن اور ہر اعتبار سے ایک خاندان بناتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے قانونی وارث بھی ہوتے ہیں۔ شادی کے بغیر ایک ساتھ رہنا گھر بسانا اور اولاد پیدا کرنا مغربی ممالک میں بے حد عام بات ہے۔ اس کے علاوہ گروہی شادی بھی ہوتی ہے جن میں لڑکیوں کا ایک گروپ لڑکوں کے ایک گروپ سے شادی کرلیتا ہے۔ ہر مرد ہر لڑکی کا شوہر ہوتا ہے۔ وہ سب مل جل کر رہتے ہیں اور عموماً ہپی طرز زندگی اپناتے ہیں۔ اس قسم کی غیر روایتی شادیاں کچھ سوالوں کو جنم دیتی ہیں مثلاً شادی کا مقصد کیا ہے؟ کیا شادی کرنا سماجی اعتبار سے لازمی ہے؟ کیا بغیر شادی اور کنبہ سماج چل سکتا ہے؟

اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ نئے انکشاف ہوسکتے ہیں۔ شادی کے روایتی مقاصد ہے خاندان بنا کر رہنا، محنت کی تقسیم کرکے زندگی کو آسان بنانا۔ بچوں کی پرورش کرنا، سماجی تحفظ اور انس و محبت خاندان کے ہر ممبر میں بانٹنا۔

بدلتے حالات میں محنت کی تقسیم بھی غیر یقینی ہوگئی ہے۔ کمانا اور امور خانہ داری کی ذمے داری اٹھانا دونوں ہی کام مرد اور عورتیں دونوں کررہے ہیں۔ بچوں کو پیدا کرنا بھی مغربی ممالک میں کم ہوگیا ہے۔ کیوں کہ رشتے کمزور ہو گئے ہیں۔ اس لیے سماجی تحفظ انس و محبت بھی خاندان اب نہیں دے پاتا۔ اس طرح خاندان کے بنیادی مقصد پر ہی سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ شادی کی رسم یا قانونی خانہ پری مغربی ممالک میں بالکل بھی ضروری نہیں ہیں۔ اس کے باوجود خاندان کی اکائی کے بغیر سماج کا چلنا ناممکن تو نہیں لیکن بہت مشکل ضرور ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ خاندان کسی نہ کسی مشکل میں سماج میں کافی عرصے تک باقی رہنے والا ہے۔ گھر بنانا اور اسے دوسروں کے ساتھ بانٹنا انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی : خاندانی زندگی ہمیشہ سے سماجی زندگی، انفرادی خوشحالی اور بچوں اور بوڑھوں کی نگہداشت کے اساس پر قائم رہی

ہے۔ چونکہ خاندانی منصوبہ بندی میں خاندان کی صحت بہبودی اور بھلائی کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ منصوبہ بندیوں کی بنیاد ہے۔

عورتوں کو بار بار زچگی کی زحمتوں سے دور رکھنے اور زچگی کے دوران کی شرح اموات کو کم کرنے کے لیے امریکی نرس مارگریٹ سیانگر نے بیسویں صدی کے شروع میں امریکا میں تولید کی تحریک چلائی۔ ذی شعور اور روشن خیال لوگوں نے اس کی تائید کی اور اب یہ "خاندانی منصوبہ بندی" کی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ عام طور پر خاندانی منصوہ بندی کا مقصد صرف افزائش نسل کو روکنا یعنی برتھ کنٹرول(Birth Control) سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اس منصوبے میں بچے اتفاقاً نہیں بلکہ ضرورتاً پیدا کیے جاتے ہیں۔ تاکہ ان کی نشو ونما اچھی طرح سے ہوسکے اور ان کی صحت اور تعلیم وغیرہ کا خاطر خواہ انتظام ہوسکے۔ اس کے علاوہ دو بچوں کی پیدائش کے درمیان کا وقفہ بڑھانے سے اور بچوں کی تعداد محدود کرنے سے عورتوں کی زچگی کی بار بار زحمتوں سے بچایا جاسکتا ہے۔ ان کو اپنی اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرنے اور امور خانہ داری کی طرف متوجہ ہونے کے لیے کافی وقت اور اچھی صحت میسر ہوتی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا مقصد ایسے ہی منصوبہ بند اور آسودہ حال خاندان کو وجود میں لاتا ہے۔

قدیم زمانے کے لوگوں کو فرد اور سماج کی آسودہ حال خاندانی زندگی کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ آج انسانی جسم سے متعلق معلومات میں اضافہ ہوگیا ہے۔ بیماریوں پر قابو پایا جارہا ہے۔ شرح اموات اب گھٹنا شروع ہوگئی ہے۔ اس لیے لوگ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لیے شرح پیدائش کو گھٹانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ کئی مفکروں نے بڑھتی ہوئی آبادی کے متعلق تردد کا اظہار کیا تھا اور خاندانی زندگی اور خاص طور پر اولاد کی بہبودی کے پیش نظر ضبط تولید کے طریقے استعمال کرتے ہوئے آبادی کے اضافے کو قابو میں رکھنے کی صلاح دی ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک بڑھتی ہوئی آبادی کے مدنظر خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے۔ ہندوستان کے ذی شعور لوگوں نے منصوبہ بند خاندان کی فوری ضرورت کو پہلے ہی سے محسوس کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ 1925 کو پروفیسر آر.ڈی.کاروے نے بمبئی میں پہلا ضبط تولید (Birth Control) کلینک قائم کیا۔ بہرکیف بہبودی خاندان کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی مختلف ممالک میں مختلف طریقوں سے روبعمل لائی گئی ہے۔

ہندوستان پہلا ملک ہے جس نے خاندانی منصوبہ بندی کو 1952 میں قومی بنیادوں پر شروع کیا۔ جس کا مقصد خاندان کی صحت اور بھلائی کے لیے منصوبہ بند اور آسودہ حال خاندانوں کو وجود میں لانا ہے۔ 1961 میں جمہوریہ کوریا نے بھی خاندانی منصوبہ بندی کو قومی سطح پر عمل میں لایا۔ صحارا آفریقہ میں دو زچگیوں کے درمیان پیدا کرنے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تاکہ افراد خاندان کی صحت کی برقراری کے لیے خاطر خواہ توجہ دی جاسکے۔ بعض افریقی ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی متنازعہ مسئلہ ہے۔ لاطینی امریکی ممالک میں خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے افزائش نسل کو ماں اور بچوں کی صحت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک منصوبے کے تحت روبعمل لایا جارہا ہے۔ ایران میں سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیاں اس منصوبے کو روبعمل لارہی ہیں جس کی رہبری و رہنمائی وزارت صحت کرتی ہے۔ عرب جمہوریہ میں خاندانی منصوبہ بندی کی خدمات وزارت صحت اور سماجی بھلائی کے ذریعے بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں منصوبہ ڈسٹرکٹ پلاننگ بورڈ کے ذریعہ اس کو عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔ تیونس اور عراق میں خاندانی منصوبہ بندی بچہ و ماں کی صحت کی نگرانی کرنے والے مراکز اور دواخانوں میں رائج ہے۔ لبنان میں خاندانی منصوبہ بندی کے خدمات دواخانوں میں انجام دی جاتی ہیں اور خانگی ڈاکٹر بھی اپنے مطب میں مشورے دیتے ہیں۔

25 ممالک نے خاندانی منصوبہ بندی کے تعلق سے موافق رویہ اختیار کیا۔ جبکہ اس کے علاوہ 22 ممالک گوکہ اس پروگرام کو قومی سطح پر نہیں اپنائے لیکن خاندانی منصوبہ بندی کی عملاً تائید و مدد کرتے ہیں۔ اور 55 ممالک ایسے ہیں جو کسی حد تک خاندانی منصوبہ بندی کی تائید کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تقریباً 70 فیصد آبادی ایسے ممالک میں ہے جو خاندانی منصوبہ بندی پر یا تو عمل پیرا ہے یا پھر تائید کرتے ہیں۔

مانع حمل طریقے (Methods of Contraception):

خاندانی منصوہ بندی میں مانع حمل کے مختلف زنانہ و مردانہ طریقے رائج ہیں۔ جن میں کچھ طریقے عارضی نوعیت کے ہیں اور بعض مستقل۔ عارضی طریقوں پر اس وقت عمل کیا جاتا ہے جبکہ استقرار حمل کو کچھ عرصے کے لیے عارضی طور پر روکنا مقصود ہو۔ اگر ان عارضی طریقوں کا استعمال ترک کردیا جائے تو پھر حمل قرار پاجاتا ہے۔ بچوں کی پیدائش کو مستقلاً بند کرنا ہو تو مستقل طریقے اپنائے جاتے ہیں۔

(1) عارضی مانع حمل طریقے (Temporary Methods of Contraception):

(الف) طبعی طریقے (Natural Methods): (i) محفوظ دن (Safe Period): اگر ماہواری ایام 28 دن کے ہوں تو پہلے دن سے 8 ویں دن تک اور 18 ویں دن سے 28 ویں دن تک محفوظ مدت ہے۔ اگر ان دنوں میں مباشرت کی جائے تو حمل قرار نہیں پاتا۔ 9 ویں دن سے 17 ویں دن تک غیر محفوظ مدت ہے اگر ان دنوں میں مباشرت کی جائے تو حمل قرار پاسکتا ہے۔

(ii) ادھوری مباشرت (Coitus interruptus): اس میں مرد دوران مباشرت منی کو عورت کے اندام نہانی کے باہر ہی خارج کر دیتا ہے جس کی وجہ سے حمل قرار نہیں پاتا۔

(ب) میکانیکل طریقے (Mechanical Methods): (i) ڈیا فرام (Diaphragm): اس طریقے میں ڈیافرام (رحم کا منہ بند کرنے کی ٹوپی) کو جو خاص ناپ کی ہوتی ہے مباشرت سے عین قبل فرج میں اس طرح سے داخل کردیا جاتا ہے کہ وہ رحم کا منہ پوری طرح سے ڈھانپ دیتی ہے۔ ڈیافرام کو فرج سے آٹھ گھنٹے سے قبل نہیں نکالنا چاہیے۔

(ii) نرودھ (Candom): نرودھ ربڑ کا بنا ہوا غلاف ہے جس کو مباشرت کے وقت ایستادہ ذکر پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس کے بند سرے پر خالی جگہ ہوتی ہے جس سے ہوا خارج کرکے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ خارج شدہ منی اس میں آسکے اور یہ پھٹنے نہ پائے۔

(ج) کیمیائی طریقے (Chemical Methods): (i) کف دار گولیاں (Foom Tablets): ایک گولی کو پانی میں بھگا کر مباشرت سے 5 منٹ پہلے فرج کے اندر جہاں تک ممکن ہے داخل کیا جاتا ہے گولی سے نکلا ہوا کف مرد کے بیج (Ovum) کو تباہ کر دیتا ہے۔

(ii) جیلی (Jelly): جیلی کی مقررہ مقدار کو پچکاری میں لے کر فرج کے اندر مباشرت سے قبل داخل کیا جاتا ہے تاکہ یہ بیج ضائع کردیں۔

(د) لوپ (Intra Uterine Device- IUD): لوپ پلاسٹک کی بنی شکل کی ہوتی ہے جس کو ماہواری کے فوری بعد رحم میں ایک آلہ کی مدد سے لگوا دیا جاتا ہے۔ یہ رحم کی دیواروں کو حمل قرار دینے کے لیے عارضی طور پر ناقابل بنا دیتی ہے۔

(ہ) کھانے کی گولیاں (Oral Pills): یہ گولیاں ہارمونس (Harmones) کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جس کو کھانے سے عورت کے بیج تھیلی (Ovary) بیج (Ovum) پیدا ہی نہیں کرپاتی جس کی وجہ سے حمل قرار نہیں پاسکتا۔

(2) مستقل مانع حمل طریقے (Permanent Methods of Contraception):

(الف) زنانہ نس بندی (Tubectomy): عورت کو بانجھ بنانے کا یہ جراحی طریقہ ہے۔ اس میں رحم (Uterus) کو بیج (Ovum) لے جانے والی دونوں نلیوں (Fallopian Tubes) کے تھوڑے سے حصے کو کاٹ کر نکال دیا جاتا ہے تاکہ عورت کا بیج (Ovum) مرد کے بیج (Sperm) سے اختلاط نہ کرپائے۔

(ب) مردانہ نس بندی (Vasectomy): مرد کے خصیوں (Testicals) سے جو دو نلیاں (Vas Deferensy) مرد کے بیج (Sperms) کو لے جاتی ہیں عمل جراحی کے ذریعے اس کے تھوڑے سے حصے کو کاٹ کر نکال دیا جاتا ہے تاکہ مرد کا بیج (Sperms) عورت کے رحم (Uterus) میں داخل نہ ہوسکے اور حمل قرار نہ پائے۔

بعد میں اگر ضرورت پڑے تو پھر عمل جراحی کے ذریعے ان کاٹے ہوئے نلیوں کے سروں کو جوڑ دیا جاتا ہے اور پھر حمل قرار کرنے کی صلاحیت لوٹ آتی ہے۔

خانقاہ: وہ مکان جو درویشوں اور صوفیوں کے رہنے اور ان کے ذکر و شغل کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے اس کا تصور غالبًا مسجد نبوی کے صفہ سے پیدا ہوا ہوگا جہاں وہ صحابہ کرام رہتے تھے جو دنیاوی مشاغل سے کنارہ کش ہوکر خدا کی یاد میں لگے رہتے تھے اور آنحضرت ﷺ سے تربیت حاصل کرتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہ نے معمر بن زیاد کی اخبار الصوفیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پہلی خانقاہ بصرہ میں تعمیر ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں ایک عیسائی امیر نے شام کے مقام رملہ میں خانقاہ تعمیر کی تھی اور جب تصوف اور صوفیہ کے طریقوں کی باقاعدہ تدوین ہوئی تو تیسری صدی ہجری کے آخر میں متعدد خانقاہیں وجود میں آئیں۔ جن میں فقر و تصوف کا درس دیا جاتا تھا۔ خانقاہ میں جو لوگ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تربیت حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں ان میں بعض ہمیشہ وہیں قیام پذیر رہتے ہیں اور باقی مسافر ہوتے ہیں ان سب کے جملہ اخراجات خانقاہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی حیثیت مسلمانوں کے ایک ادارہ کی ہوگئی ہے۔

خانقاہ کا صدر سجادہ نشیں کہلاتا ہے یہ مذہبی اصول اور اعمال زندگی کا معلم ادارہ کا منتظم اور اس کی آمدنی کا مہتمم ہوتا ہے اور عام طور سے خانقاہ کی بچی ہوئی آمدنی کا وہی مستحق سمجھا جاتا ہے۔ بعض خانقاہوں میں اس کے علاوہ واقف کے اہل خاندان اور متولی بھی نذر و نیاز کی آمدنی کی بچت کے مستحق ہوتے ہیں۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ : معروف مورخ سرجادوناتھ سرکار کے مطابق ہندستان میں فنون لطیفہ کو انگریزی عہد حکومت میں حیات ثانی دینے والے وائسرائے لارڈ کرزن نے 1903 میں جب خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ذخائر دیکھے تو ان کی زبان پر فارسی کا یہ مشہور شعر تھا "اگر فردوس بروئے زمیں است۔ ہمیں است ہمیں است و ہمیں است" جادوناتھ سرکار ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے (خدابخش کے) تحفہ کی قدر و قیمت اور ہماری قوم کی ترقی میں اس کی اہمیت بڑھتی جائے گی"۔ جب یہ عبارت لکھی جارہی تھی تو کتب خانہ میں مخطوطات کی تعداد 5000 تھی۔ آج یہ تعداد 18000 سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ دنیا بھر میں اپنے نادر و کمیاب عربی و فارسی کے مخطوطات کے اس کتب خانہ کے قیام کا سہرا ایک فرمانبردار بیٹے کی اپنے باپ کی آخری خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ 1876 میں مولوی محمد بخش نے بستر مرگ سے خدابخش کو اپنے جمع کیے ہوئے 1400 مخطوطات دیتے ہوئے وصیت کی کہ ان مخطوطات سے ایک عام کتب خانہ قائم کردیا جائے۔ کتب خانہ کی تاریخ میں 1876 بہت مبارک سال تھا کہ اسی سال امریکا میں کتب خانہ کارکنان کی انجمن قائم ہوئی، اسی سال ڈیوی درجہ بندی ضابطہ کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا اور چند ماہ بعد ہی انگلینڈ میں بھی ایک لائبریری انجمن قائم ہوئی۔

خدابخش پٹنہ کے کامیاب وکلاء میں تھے۔ چند برس کے لیے حیدرآباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی بنائے گئے تھے۔ اپنی سماجی خدمات کی بدولت سرکار سے خان بہادر کا خطاب بھی پایا لیکن ایک معروف زندگی گزارنے کے باوجود اپنے والد کی وصیت کی تکمیل سے غافل نہیں رہے۔ کتب خانہ کے لیے پٹنہ کے بانکی پور علاقہ میں ایک خوبصورت عمارت تعمیر کرائی جس میں 1891 میں بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر کے ہاتھوں کتب خانہ کا افتتاح ہوا۔ انیسویں صدی ہندستان میں پرانے تہذیبی نظام کے بگڑنے اور ایک نئے نظام کے وجود میں آنے کا دور تھا جس میں سب سے زیادہ نقصان علمی سرمایہ کا ہوا۔ مغل حکمرانوں کے کتب خانے لٹے، اودھ کی موتی محل لائبریری تاخت و تاراج ہوئی۔ ٹیپو سلطان کا کتب خانہ ضبط ہوا، امرا و رؤسا کے گھروں سے مخطوطات زبردستی لے کر انگلینڈ، جرمنی اور فرانس بھیج دیے گئے۔

ایسے دور میں جن دو اشخاص نے ملک کے علمی خزانہ کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ان میں نواب صاحب رام پور کے ساتھ دوسرے خدا بخش تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دونوں میں ایک خاموش مقابلہ تھا لیکن بقول سرجادوناتھ سرکار جیت خدا بخش کی اس وقت ہوئی جب وہ نواب صاحب کے مقابلہ میں مخطوطات کے ماہر متلاشی محمد مکی عرب کو اپنے یہاں ملازم رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ محمد مکی نے خدابخش کے لیے عراق، شام، مصر اور ایران سے مخطوطے حاصل کیے۔ ملک کے مخطوطہ فروش مخطوطہ فروخت کرنے میں اولیت خدا بخش کو دیتے تھے کیونکہ خدا بخش انھیں پٹنہ کے سفر کا دوگنا کرایہ دیتے تھے۔ کوشش کے ساتھ ساتھ قسمت نے بھی ساتھ دیا چنانچہ ایک بار کتب خانہ میں چوری ہوئی اور کئی قیمتی مخطوطے نکل گئے۔ لیکن جس کے ہاتھ وہ بیچے گئے اس نے لاعلمی میں انھیں دوبارہ فروخت کے لیے خدابخش کے پاس ہی بھیجا۔ اسی طرح ایک بار حیدرآباد میں انھیں کتابوں کا ایک ڈھیر نظر آیا جسے خدابخش نے خرید لیا۔ اس ڈھیر میں چند نہایت قیمتی مخطوطات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ برٹش میوزیم نے پورے ذخیرہ کو حاصل کرنے کے لیے خطیر رقم پیش کی لیکن خدابخش نے ذخیرہ کو ملک میں ہی رکھنے کو ترجیح دی۔

خدا بخش کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ یہ قیمتی اثاثہ نجی انتظام میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انھوں نے پٹنہ میں موجود انگریز افسران کی مدد سے حکومت بنگال سے رابطہ قائم کیا۔ کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل سر ڈینسن راس کی تحریک پر لارڈ کرزن نے کتب خانہ کی مزید توسیع کے لیے رقم منظور کی اور مولوی محمد مقتدر کو فہرست سازی کے لیے منتخب کیا گیا۔ 1891 میں حکومت بنگال کی سرپرستی میں ایک انتظامی

کمیٹی بنائی گئی۔ آزادی کے بعد بہار کے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین کی تحریک پر 1962 میں کمیٹی کی جگہ ایک انتظامی بورڈ بنایا گیا جس کا چیئرمین بہار کا گورنر مقرر ہوا۔ 1969 میں کتب خانہ کو مرکزی حکومت کے قانون کے تحت قومی اہمیت کا ادارہ بنایا گیا اور لائبریرین کی جگہ ڈائریکٹر کی آسامی قائم کی گئی۔ بورڈ میں مرکزی و ریاستی حکومت کے نمائندے شریک ہیں۔

کتب خانہ کو اپنی شہرت کی بدولت بہت سے ذاتی ذخیرے تحفتاً بھی ملنے لگے۔ ان میں قابل ذکر گورکھپور کے رئیس سبحان اللہ خاں کا ذخیرہ جس میں مغل حکمرانوں کے کتب خانہ کے دیوان حافظ کا نسخہ تھا، عنایت اللہ خاں کا ذخیرہ جس میں اورنگ زیب عالمگیر کے مخطوط "احکام عالمگیری" کا نسخہ تھا اور صفدر نواب کے ذخیرے شامل ہیں۔

کتب خانہ کے عربی و فارسی مخطوطات کی فہرستیں 1965 تک 32 جلدوں میں شائع ہو گئی تھیں۔ اطہر شیر کے مرتب کردہ ایک کتابچہ کے مطابق کتب خانہ کے ذخیرہ میں 1965 میں 8497 مخطوطات اور 35500 مطبوعات تھیں۔ 1961 میں بہار میں دیسنہ کا کتب خانہ ذاکر صاحب کی تحریک پر کتب خانہ کو منتقل ہو گیا۔ لیکن کتب خانہ کی اصل توسیع 1972 سے شروع ہوئی جب ڈاکٹر عابد رضا بیدار کتب خانہ کے ڈائریکٹر مقرر کیے گئے۔ نئے انتظامیہ کی کوششوں سے کتب خانہ میں تحقیق کے کاموں کے لیے خدابخش فیلوشپ قائم کی گئی، مائکروفلم یونٹ کا قیام عمل میں آیا، آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ معروف دانشوروں کی آواز اور کلام محفوظ کیے گئے۔ رسائل کے اشاریہ سازی کا کام شروع ہوا اور اشاعتی سرگرمیوں کے تحت قدیم مطبوعات کے نئے ایڈیشن شائع کیے جانے لگے۔ توسیعی خطبات اور قومی و علاقائی سمینار منعقد ہوئے۔ خدابخش میموریل اور قاضی عبدالودود میموریل لکچر کا انعقاد ہوا اور دوسرے کتب خانوں میں موجود اہم مخطوطات کی فلمیں حاصل کی گئیں۔ آج ہندستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ و تہذیب پر کوئی کام خدابخش کتب خانہ سے استفادہ کے بغیر شاید ہی مکمل کیا جاسکے۔ خدابخش ایوارڈ سال میں ایک بار ملک کی کسی معروف شخصیت کو دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا ایوارڈ ممتاز سیاسی رہنما اور جنگ آزادی کے مجاہد ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے کو دیا گیا تھا۔

خراج: جو زمین مسلمان فاتحین نے غیر مسلم مفتوحین یعنی ذمیوں کو دے دیں یا وہ بدستور سابق ان کے قبضہ و تصرف میں باقی رہیں ان پر جو ٹیکس لیا جاتا ہے اس کو خراج یا لگان کہتے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے بلکہ یہ زمین کی قوت پیداوار اور قیمت پیداوار کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہے۔ خراج میں خلیفہ کمی کرسکتا ہے اور اس کو معاف بھی کرسکتا ہے۔

خطرناک اشیاء اور جانوروں سے نقصان (Loss due to Dangerous Things and Animals): یہ ٹارٹ قطعی ذمہ داری کا ہے۔

(الف) کوئی شخص جو اپنی آراضی پر اپنے اغراض کے لیے کوئی ایسی شے لائے یا جمع کرلے یا رکھے جس کی وجہ سے دوسرے شخص کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے وہ ایسا عمل اپنی ذمہ داری پر کرتا ہے اور اگر اس کی وجہ سے ہمسایہ کو نقصان پہنچے تو وہ اس نقصان کی بابت ذمہ دار ہے خواہ وہ اس کی غفلت کا نتیجہ ہو یا نہ ہو۔ اس اصول کے چند مستثنات ہیں۔ مثلاً

(1) اگر اس خطرناک شے کو مدعاعلیہ نے مدعی کی رضامندی سے اور دونوں کے باہمی فائدے کے لیے جمع کیا یا رکھا ہے۔

(2) اگر اس سے وہ شے ایسے اشخاص کے فعل ناجائز کی وجہ سے نقصان پہنچاتی ہو جو مدعاعلیہ کے زیراثر نہ ہوں۔

(3) یا اگر قدرتی یعنی ایسے واقعات کی وجہ سے جس پر انسان اختیار نہ رکھتا ہو نقصان پہنچے۔ جیسے موسلادھار بارش یا بجلی کا گرنا یا زبردست برف باری ہونا وغیرہ یا مملکت کے دشمنوں کے فعل سے۔

خطیب: ابوبکر احمد بن علی بن ثابت 24/ جماد الآخر 392ھ م 1002 کو عراق کے ایک گاؤں دوزیحان میں پیدا ہوئے اور دارالسلام بغداد میں نشوونما پائی اسی لیے بغدادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد درزیحان میں خطیب تھے۔ اس نے یہ ان کے نام کی طرح ان کے فرزند کے نام کا بھی جز ہو گیا تھا۔

خطیب اپنے وطن میں تعلیم حاصل کرچکے تو بصرہ، کوفہ، نیشاپور، اصفہان، دینور، ہمدان، رے، مکہ، مدینہ، دمشق اور صور تشریف لے گئے اور ان جگہوں کے علما و اساطین فن سے استفادہ کیا۔ ان کی دماغی قوت و صلاحیت حیرت انگیز تھی اور وہ علم و مطالعہ کے بڑے شوقین تھے۔

خطیب صورۃً جسمانی اعتبار سے وجیہ و شکیل نہایت باوقار، متین اور سنجیدہ شخص تھے ان میں ظاہری وجاہت اور بڑا رعب داب بھی تھا۔ زہد و تقویٰ میں نمایاں تھے۔ عبادت و تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا۔ انفاق فی سبیل اللہ کا ذوق بہت بڑھا ہوا تھا۔ خدا نے وافر دولت سے نوازا تھا۔ ان کی دولت غریبوں، ناداروں خصوصاً محتاج، اہل علم اور طلبہ حدیث کے لیے وقف تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے وفات سے پہلے بیماری کے زمانے میں اپنا سارا مال و اثاثہ محدثین، فقہا اور فقرا میں تقسیم کردیا۔ ان کے تعلقات امرا و عیان دولت سے بھی تھے مگر مزاج میں طمع اور حرص و جاہ کی طلب کا کوئی جذبہ نہ تھا۔

خطیب کے زمانہ میں اسلامی ممالک خصوصاً بغداد میں بڑا خلفشار مچا ہوا تھا۔ ایک طرف شیعی و تصدم اور مختلف فقہی مکاتب کے ماننے والوں کے باہمی اختلافات نے ملت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کر دیا تھا اور دوسری طرف امرا سلاطین کی اقتدار کی خاطر باہمی کشمکش اور افتراق نے حکومت و سلطنت کے نظام کو تہہ و بالا کر دیا تھا ان حالات کا اثر خطیب پر پڑا اور وہ بغداد چھوڑ کر قید و بند اور جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہوگئے۔ 440ھ / م1048ء اور 450ھ / م1058ء کے درمیان بغداد میں ارسالان المعروف بہ لبساسیری کا جو ایک ترکی غلام تھا اور ترکوں کا سردار اور باطنی شیعہ تھا عروج و اقتدار بڑھا تو خطیب بغداد سے دمشق چلے گئے۔ وہاں کا حکمراں بھی شیعی تھا اس کے بعض کاموں پر خطیب نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اس نے ان کو قتل کر دینا چاہا مگر شریف زینبی کی کوشش سے معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ تاہم امیر نے دمشق سے ان کی جلاوطنی کا فرمان جاری کر دیا چنانچہ یہ پہلے صور پھر حلب و طرابلس ہوتے ہوئے عراق واپس ہوئے۔ خطیب شافعی المسلک تھے اور اشاعرہ متکلمین سے ان کے تعلقات بھی تھے اس لیے حنابلہ نے بھی ان کو زد و کوب کیا۔

اکہتر سال کی عمر میں دوشنبہ 7/ذی الحجہ 463ھ / 1071ء کو خطیب کا انتقال ہوا۔ ان کی خواہش کے مطابق باب حرب میں بشر حافی کی قبر کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

تذکرہ و تراجم اور تاریخ سیرت کا خاص موضوع تھا اور ان کی اصل شہرت مورخ ہی کی حیثیت سے ہے تاہم دینی علوم فقہ و حدیث وغیرہ کے بھی ماہر تھے۔ ان کا شمار مشہور محدثین و حفاظ اور فن رجال اور جرح و تعدیل کے ماہروں میں ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب فصیح البیان، خطیب اور خطاط اور خوش نویسی کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز تھی۔ مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(1) کتاب اقتضاء العلم

(2) کتاب الجامع فی ادب الراوی و السامع

(3) کتاب الموتلف و المختلف یہ ضخیم کتاب امام دار قطنی کی تصنیف المولف والمختلف فی اسماء الرجال سے ماخوذ ہے مگر اس میں بکثرت اضافے بھی ہیں۔

(4) کتاب التطفیل والطفلین خطیب نے اپنے کسی دوست کی فرمائش پر اس میں طفلیون کے واقعات و حکایات ان کے متعلق نادر اقوال و اشعار جمع کیے تھے۔ اس کا شمار ادب و محاصرات کی دلچسپ کتابوں میں ہوتا ہے۔

(5) کتاب شرف اصحاب الحدیث، حدیث کے راویوں و ناقلین کے فضائل پر مشتمل احادیث و آثار سلف کا مجموعہ ہے۔

(6) کتاب غنیۃ الملتمس فی تمیز الملتبس۔ رجال پر ایک مفید کتاب ہے اس میں مشتبہ ناموں کے بارے میں اشتباہات رفع کیے گئے ہیں۔

(7) تلخیص المتشابہ فی الرسم و حمایۃ ما شکل منہ عن نوادر التصحیف والوھم۔ یہ رجال پر ایک ضخیم کتاب ہے جو راویوں کے نام و نصاب اور ان واقعات و اخبار کی تحقیق کے لحاظ سے بڑی مفید ہے۔

(8) کتاب الکفایہ۔ مصطلحات حدیث پر اہم کتاب ہے اس میں روایات و احادیث کے اصول و ضوابط کے متعلق اصحاب فن اور محدثین کے اقوال سنداً بیان کیے گئے ہیں۔ جز میں مباحث میں علمائے جرح و تعدیل کے اختلافات منقول ہیں ان کو ذکر کرکے ترجیحی رائے بھی تحریر کی ہے۔

(9) تاریخ بغداد خطیب کی شہرہ آفاق اور نہایت ضخیم کتاب ہے جسے بے نظیر اور حیرت انگیز حسن قبول حاصل ہوا۔ اس میں خلفاء، امراء، قضاۃ، اشراف فقہا، محدثین، مورخین، مفسرین شعراء، اصحاب علم و ادب، زہاد اور صلحا مختلف طبقوں کے ایک ہزار آٹھ سو اکتالیس ان مشاہیر رجال کا تذکرہ ہے جو بغداد میں اسلامی عہد کے ابتدا سے مصنف کے زمانہ تک گزرے ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ پہلی جلد بغداد کی تاریخ اس کی تعمیر اور اس کے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

متعلق مختلف النوع علمی فقہی کلامی اور تاریخی معلومات درج ہیں۔

یہ صرف رجال بغداد ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ رجال کے حالات کے ضمن میں متعدد علمی و فقہی مباحث بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

تاریخ بغداد کے متعدد ذیول اور تلخیصات لکھے گئے اور بعض کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں مگر ان کو زیادہ شہرت نہیں مل سکی۔

خطی ماڈل - معاشیات : خطی ماڈل جدید معاشیات میں بہت استعمال کیے جارہے ہیں۔ داخلات (Inputs) و حاصلات (Outputs) ماڈل کے تصور کو سب سے پہلے ڈبلیو لیانٹف (W. Leontie) نے 1951 میں پیش کیا اور یہ سازگار منصوبہ کے ماڈل کی تیاری میں بطور تکنیک استعمال کیے جارہے ہیں داخلات ماڈل ایک خطی علاقائی پیداوار نظام بن جاتا ہے جو عوامل کے مابین کسی طرح کی ردلا بدلی کے امکانات سے دور رہتا ہے۔ نیز حاصلات اور درمیانی عامل کے ماحصل کی سطح کا اظہار کرتا ہے جو دیے ہوئے علاقے کی اخری طلب سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہاں پروگرام بنانے کی تکنیک کے ارتقاء سے متعلق بیان خالی ازعلت نہ ہوگا۔ اس تعلق سے معاشین نے علم ریاضیات کی جو مدد کی ہے وہ اہمیت کی حامل ہے۔ خطی پروگرام بنانے کی جس تکنیک کو کانتوروویچ (1939) اور ڈانزک (1949) نے ترقی دی خطی ماڈل کو مستحسن ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ بشرطیکہ خطی مساوات کی بندشیں موجود ہوں۔ علم ریاضیات میں اس تکنیک کی بہت اہمیت ہے چنانچہ انجینیری اور فطری و سماجی علوم میں بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس تکنیک کی قابل ذکر خوبی مستحن مادل میں دوری اور سابقہ قیمت کے نظریہ کی موجودگی ہے۔ سایہ قیمتیں (حسابی (Accounting) قیمتیں یا داخلات کی قیمتیں) منصوبہ بندی اور پراجکٹوں کا اندازہ لگانے میں مفید ثابت ہوتی ہے۔ پروگرام بنانے کی غیر خطی تکنیک گوکہ عام ہے لیکن اس کا استعمال اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ ہونا چاہیے۔

گذشتہ دو دہوں میں معاشیات میں استعمال کی جانے والی ریاضیاتی تکنیک میں قابل لحاظ تبدیلی ہوئی ہے چنانچہ خطی اسپیس (فضاء) میں جداپذیر مستویوں اور محدب سٹون کے شوابط کو تقابلی توازن کے تجزیے کے لیے آسانی سے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ سرگرمی کے تجزیے اور سٹون کے نظریے کے استعمال کی وجہ سے روئے اور توازن کے نظریہ کا وجود اور یکتائی کے تجزیے تک پھیلاؤ ممکن ہوسکتا ہے۔

خلاف قانون اور باطل معاہدات (Illegal and Void Contracts) : بعض ایسے معاہدات ہوتے ہیں جو قانونی طور پر باطل قرار پاتے ہیں مثلاً ایک معاہدہ جس کے ذریعہ تنخواہ کا بقایا یا آئندہ ملنے والے وظیفہ کا بدل (Consideration) مقرر کیا جائے باطل قرار دیا جائے گا۔

باطل معاہدات کی ایک اور شکل معاہدات بطور شرط کی ہے جسے عرف عام میں (Wagering Contract) کہا جاتا ہے۔ معاہدہ بطور شرط (Wagering Contract) ایک ایسے معاہدے کو کہیں گے جس کے بدل (Consideration) کا انحصار آئندہ غیر یقینی واقع کے وقوع پذیر ہونے پر منحصر ہو جیسے کہ ریس کے گھوڑے کی جیت یا ایک ایسے شہر کی آبادی کے متعلق بازی لگائی جائے جس کی مردم شماری تکمل نہیں ہوئی ہو اور مختلف لوگ مردم شماری کے اعداد (آبادی) کے متعلق مختلف رائے رکھتے ہیں۔ معاہدہ بطور شرط (Wagering Contract) کے کئی اور اہم پہلو ہیں۔ اولاً یہ کہ اس کا دار و مدار ایک آئندہ غیر یقینی واقع پر ہوتا ہے جو قانوناً درست نہیں۔ معاہدہ بطور شرط کا دوسرا اہم جز یہ ہے کہ اس میں ایک واقعہ سرزد ہونے پر صرف ایک فریق کو نفع ہوتا ہے اور دوسرے فریق کو نقصان۔ حقیقت یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے ہر فریقین معاہدے کو کسی معاہدے کے تحت نفع ہونا چاہیے یا نقصان معاہدہ بطور شرط (Wagering Contract) کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ شرط کی رقم بھی معاہدے کا بدل (Consi-deration) ہوجاتی ہے۔ تمام معاہدات جو بطور شرط (Wagering Contract) کیے جاتے ہیں۔ قانون کی نظر میں کلیتاً کالعدم ہیں۔

خواص (Elites): خواص ایک سماجیاتی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد کسی سماج کے ایسے خاص افراد ہیں جو منظم سماجی زندگی میں بااثر اور نمایاں رول انجام دیتے ہیں۔ ہر سماج میں خواہ وہ سادہ ہو یا پیچیدہ، زرعی ہو یا صنعتی، ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اثر اور اقتدار رکھتے ہوں۔ عام زندگی کے نمائندہ ہوں اور اس معاشرہ کے اقدار کے حامل ہوں جنھیں مثالی حیثیت حاصل ہو۔ ہر سماج میں ایسے خاص افراد کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں مثلاً سیاسی خواص، سماجی خواص، مذہبی خواص، دانشور، صنعتی خواص اور مختلف اہم پیشہ ور خواص وغیرہ۔ یہ تمام افراد سماج کے اہم فیصلوں میں بنیادی اور مرکزی رول انجام دیتے ہیں۔ اس اصطلاح کو سب سے پہلے اطالوی مفکر پریٹو (Pareto) نے 1902-1903 میں استعمال کیا۔ جیسے جیسے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

تھارسٹین ویبلین (Thorstein Veblen, 1857-1921) نے اپنے مقالہ "عیش پسند طبقے کا نظریہ" (The Theory of Leisure Class) 1899 میں لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ سارا سماج ایک خاص طبقے کے لیے محنت میں جٹا رہتا ہے۔ لیکن یہ طبقہ بھی خود عیش نہیں کرتا بلکہ ان کے لواحقین موج کرتے ہیں۔ اصلی سرمایہ دار بے حد مصروف رہتے ہیں اور ہر وقت محنت کرتے ہیں۔

آج کے دور میں ہر شخص اونچے طبقے میں شامل ہونے کے لیے کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے ہر قسم کا جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کرتا ہے پھر بھی عوام اور خواص کا فرق برقرار رہتا ہے۔

خواص کی حکمرانی : "خواص" (Elite)، عوام (Masses) کی ضد ہے۔ اس اصطلاح میں انتخاب یا برگزیدگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ "خواص" سے مراد چیدہ یا برگزیدہ افراد کا طبقہ ہے جو اپنی صلاحیتوں، اثرات اور نفوذ کی بناء پر حکمراں طبقہ ہوتا ہے۔ خواص کی اصطلاح اصلاً یورپ میں ایجاد ہوئی لیکن اب عام طور پر سماجی علوم میں مستعمل ہے۔ تجربی طور پر طبقہ خواص کی بنیاد کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ رنگ و نسل، نظریہ و تحریک، مذہب، فوج، صنعت، زمین داری حسب و نسب وغیرہ سے وابستگی۔ کمیونسٹ نظام میں پارٹی کی قیادت اعلیٰ ترین حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جبکہ سماج کے اندر کمیونسٹ پارٹی کو خواص کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح فاشسٹ نظام میں طبقہ خواص مختلف سماجی عناصر - فوجی، مذہبی، صنعتی، جاگیردارانہ اور اشرافی - سے مرکب ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سا عنصر سیاسیات پر حاوی ہوتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں اینگلو سیکسن نسل کے شہری طبقہ خواص کہلانے کے مستحق ہیں۔ حکومت عوام کی ہونی چاہیے یا خواص کی۔ یونان و روم کی تہذیبوں سے آج تک یہ ایک زندہ سیاسی مسئلہ ہے۔ بہترین افراد کی حکومت ہمیشہ سے ایک مثالی اور مفید طرز حکومت تسلیم کی گئی ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اس طرح کے بہترین افراد کو کیوں کر منتخب کیا جاسکتا ہے۔ آیا حسب نسب، دولت، اقتصادی کامیابی، قومیت، نسل یا ذہانت و قابلیت اور اخلاقی کردار کی بناء پر منتخب کیے گئے حکمراں گروہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کی حکومت سبھی طبقوں کے لیے اور سبھی حالات میں بہترین حکومت ہوگی۔ بہترین لوگوں کی مثالی حکومت کا تصور صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن اس کی راہ میں حائل دشواریوں کا ازالہ ممکن نہیں۔

سماج پیچیدہ اور جمہوری طرز کا بنتا جارہا ہے خواص کا ڈھانچہ بھی پیچیدہ اور اہم ہوتا جارہا ہے۔ ان کو سماجی قیادت کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔ سماجی ارتقاء کے ہر دور میں خواص کی اہمیت رہی ہے۔ چنانچہ قدیم قبائلی سماج میں بھی بزرگوں، مذہبی پیشواؤں، امرا اور سردار خاندانوں کا ایک مختصر گروہ ہوتا تھا جو سماجی فیصلوں میں کلیدی رول انجام دیتا تھا۔

موجودہ سماج میں خواص کے طبقہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) حکمراں طبقہ، (2) امراء یا شرفاء کا طبقہ، (3) دیگر اہم خواص۔

خواص کی درجہ بندی اور اس کی خصوصیات پر انیسویں صدی میں سینٹ سائمن (Saint Simon) نے 1860 میں اور بیسویں صدی میں من ہائم (Mannheim) نے 1945 میں بحث کی ہے۔ خواص کے تصور نے سماجی تبدیلی کے نظریات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ فسطائیت (Fascism) کے نظریہ نے خواص کو سماج کے فیصلہ کن طبقہ کی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت دی ہے جو ایک اعتبار سے جمہوریت میں انفرادی مساوات کے تصور سے متصادم ہے تاہم اس کے سیاسی مضمرات سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر سماج میں ذہنی اور علمی تربیت کا ایک ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہتا ہے جو سماجی فیصلوں میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

ولفریڈو پریٹو (Vilfredo Pareto, 1848-1923) اور میکس ویبر (Max Weber, 1864-1920) دونوں نے خواص کے اوپر کافی کچھ لکھا ہے۔ پریٹو کا نظریہ "خواص کی ایک دائرے میں گردش" بہت مشہور ہوا اس کے مطابق جو لوگ سماج میں اونچائی پر پہنچ جاتے ہیں جلد ہی زوال پذیر ہوتے ہیں۔ ویبر کہتے ہیں کہ "تاریخ خواص کا قبرستان ہے"۔ ویبر خواص کی طاقت کا سرچشمہ ان کی دولت کو مانتے ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق خواص عوام کا خون چوستے ہیں اور یہی عوام جب خواص بن جاتے ہیں تو وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ مارکس کی جو تھیوری بورژوا (Bourgeoisie) اور پرولے ٹیریٹ (Proletariat) کے تصور پر مبنی ہے وہ بھی عوام اور خواص کی تقسیم کے سلسلے میں ایک نظریہ پیش کرتی ہے۔ مارکس کا کہنا ہے کہ بے وسائل لوگ ہمیشہ ہی بیچارگی کا شکار ہوتے ہیں اور خواص ہمیشہ ہر طرح کے وسیلے قبضہ رکھتے ہیں کبھی یہ غلاموں کے مالک ہوتے ہیں کبھی زمیندار اور کبھی سرمایہ دار۔ سماج کے ہر خزانے کی چابیاں ان کے ہی پاس ہوتی ہیں۔ دور چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

قدیم یونانیوں کے نزدیک حکومت کی زمرہ بندی عددی معیار سے کی جاتی تھی یعنی ایک شخصی حکومت (آمریت)، چندسری حکومت (عینیت)، اور کثیر شخصی حکومت (جمہوریت)۔ موجودہ دور میں ان تینوں شکلوں میں سے چند سری حکومت پر (جو اشرافیہ، عینیت اور خواص کی حکمرانی کے مختلف ناموں سے معروف ہے) سائنسی اعتبار سے سب سے زیادہ بحث ہوئی ہے۔ جمہوریت کے مخالفوں اور افضل اور عینی طبقوں کے حامیوں میں ایڈمنڈ برک، طامس کارلائل، سینٹ سائمن، الکسی دی تاکویل، ہیگل، مکلے، ٹرائشکے اور نیٹشے کے نام پیش پیش ہیں۔ نئے زمانہ میں والٹرلپ مین اور جیمس برن ہیم نے اکثریت کی حکومت کا پردہ فاش کرکے حکمراں اقلیت کا رول واضح کیا۔

"خواص" کا تحلیلی تصور خصوصیت کے ساتھ اطالیہ کے دو نئے میکیاویلیائی مفکروں ولفریدو پارتو (Vilfredo Pareto, 1848-1923) اور گیتانو موسکا (Geetano Mosca, 1858-1941) نے اپنی تصنیفات میں پیش کیا۔ ان کے نزدیک سارے اشکال حکومت خواہ وہ جمہوری ہوں یا آمری محض نمائشی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر سیاسی نظام کے اندر سارا اقتدار ایک اقلیتی "حکمراں طبقہ" استعمال کرتا ہے۔

اسی حقیقت کا اظہار ایک دوسرے مفکر رابرٹو مشیلز (Roberto Michels) نے اپنی کتاب Political Parties : A Sociological Study of the Tendencies of Modern Democracy, 1915) میں کیا۔ مشیلز نے بیسویں صدی کے آغاز میں جمہوری سیاسی پارٹیوں کی ایڈیالوجی، ساخت اور کارکردگی کا مطالعہ کرکے اپنا مشہور "عینیت کا آہنی قانون" پیش کیا۔ جس کے مطابق جمہوریت پسند گروہ، اگرچہ شروع میں جمہوری طریقوں سے اور جمہوری مقاصد کے لیے منظم کیے جاتے ہیں لیکن بالآخر ان پر چند اشخاص حاوی ہوکر انھیں محض اپنے ذاتی مقاصد کا آلہ کار بنادیتے ہیں۔

یہ واضح ہوچکا ہے کہ ہر نظام حکومت میں اصل ارباب حل و عقد چند ہی اشخاص ہوتے ہیں۔ یہ سیاسی قیادت مختلف شکلیں اختیار کرسکتی ہے: (1)حکمران، (2)حکمراں طبقہ، (3)اشرافی طبقہ، (4)اعیان اور (5)فیصلہ ساز خواص (Strategic Elite)۔ یہاں آخرالذکر کی ماہیت ان کی زمرہ بندی، بھرتی اور ان کے مقاصد پر روشنی ڈالنا مناسب ہوگا۔ موجودہ ترقی یافتہ سیاسی نظاموں میں خواص کسی ایک سماجی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ سیاسی اداروں اور سیاسی اعمال کی تفریق ور تفریق کے نتیجہ میں مختلف زمروں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ان کی بھرتی، خاندان اور حسب و نسب یا دولت و جاگیر کی بناء پر نہیں بلکہ لیاقت، ہنرمندی اور مہارت کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یہ طبقات خواص ایک دوسرے سے بڑے لچکدار رشتہ میں مربوط ہوتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کا حتمی مقصد سماج میں اتحاد و یکجہتی کا قیام، سماج کے مقاصد کا حصول اور کشیدگی اور اختلافات کا ازالہ ہے۔ سیاسی نظام انھیں کی کارکردگی سے چلتا ہے۔

فیصلہ ساز خواص کو مملکت کے پانچ خاص عملیتی مسائل (مقاصد کا حصول، ماحول سے مطابقت، یکجہتی کا حصول، روایات کے سلسلہ کی بقا اور کشیدگی کا ازالہ) کے مطابق ان زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1)سیاسی خواص جنھیں "ارباب اقتدار" اور "اعلیٰ ترین بااثر اشخاص" بھی کہا جاتا ہے یعنی سیاست دان، حکومتی قیادت اور بیوروکریسی (جن کا کام عوامی پالیسی بنا کر عوامی مقاصد کا حصول ہے)۔ (2) سائنسی، اقتصادی، ڈپلومیٹک اور فوجی خواص (جن کا کام سیاسی نظام اور اس کے مقاصد کو ماحول کے مطابق بنانا ہے)۔ (3) دانش ور فلسفی اور مذہبی خواص (جن کا کام سماجی یکجہتی کا قیام عمل میں لانا ہے) اور (4) فن کار، ادیب، اداکار اور مواصلات عامہ کے میدان کے کارکن (جن کا کام تہذیبی تسلسل کو برقرار رکھنا ہے)۔ ان میں سے ہر زمرہ اپنے اپنے میدان میں مفادی اختلافات کا تصفیہ کرنے، ہم آہنگی برقرار رکھنے اور عوامی مقاصد کے حصول پر حکومت اور عوام کے درمیان مفاہمت کا کام کرتا ہے۔

خوجہ: اصل میں لفظ خواجہ تھا جو ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں تاجروں کے لیے مستعمل تھا۔ یہ مسلمان لوگ تجارت پیشہ تھے اس لیے خواجہ یا خوجہ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ تین فرقوں میں منقسم ہیں۔ اسامیلی اثناعشر اور سنی۔ لیکن غالب تعداد اسماعلیوں کی ہے۔ جو فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کی وفات کے بعد دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئے تھے جن لوگوں نے خلیفہ کے بیٹے نزار کو اپنا امام تسلیم کیا وہ نزاریہ کہلائے اور جنھوں نے اس کے دوسرے بیٹے مستعلی کو امام مانا وہ مستعلیہ کہلائے۔ ہندوستان کے خوجوں کا تعلق فرقہ اسماعلیہ کی شاخ نزاریہ سے ہے اور بوہروں کا مستعلیہ سے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ خوجوں کے حاضر امام آغا سلطان محمد شاہ کو برطانوی حکومت نے ہزہائی نس اور نائٹ وغیرہ کے خطابات دیے اور دربار فارسی سے آغاخان کا لقب ملا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس فرقہ کے ماننے والے مختلف ملکوں میں آباد ہیں۔ ایران میں ان کو اللہ عطائی، وسطی ایشیا اور چینی، ترکستان میں مولائی شام و مصر میں اسماعلیہ اور ہندوستان میں خوجہ کہا جاتا ہے خوجیوں کا خیال ہے کہ ہزہائی نس آغاخان فرقہ اسماعلیہ نزاریہ کے حاضر امام ہیں خوجوں میں حاضر امام کے بعد دوسرا منصب پیر کا ہوتا ہے جو امام کی عدم موجودگی میں اس کی نیابت کرتا ہے۔ اس طرح کے پیروں میں صدرالدین بہت مشہور گذرے ہیں۔

خوجے اپنی آمدنی کا دسواں حصہ امام کو دیتے ہیں۔

خودکشی: قتل انسانی (Homicide) کی یہ ایک قسم ہے۔

جب کوئی شخص اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے تو وہ خودکشی کہلاتی ہے۔ مثلاً زہر کھانے سے کوئی شخص فوت ہوجائے۔ اگر کوئی شخص ہلاک ہونے پر رضامند ہوجائے اور دوسرا شخص اپنے فعل سے اس کی ہلاکت کا باعث ہو تو یہ خودکشی نہیں ہوگی بلکہ قتل ہوگا اور شخص ثانی قتل کی سزا کا مستحق ہوگا۔

جب کوئی ایسا شخص جس کی عمر 18 سال سے کم ہو یا ایسا شخص جو جنون یا فتور عقل یا نشہ کے باعث اپنے فعل کی ماہیت یا اس کے نتائج کو نہ سمجھ سکا ہو "خودکشی" کا ارتکاب کرے تو وہ شخص جو ایسی خودکشی میں مدد کرے گا تو اس کو "قتل انسان مستلزم سزا" کے اقدام کی سزا دی جائے گی۔

پورے قانون فوجداری میں خودکشی کا جرم ایک ایسا ہے جس کے مکمل ہونے پر کوئی سزا تجویز نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ آدمی جس نے خودکشی کرلی ہو زندہ نہیں رہتا۔

خودکشی کی ایک ہی شکل ہے جہاں قانون فوج داری سزا عائد کرسکتی ہے اور وہ ہے اقدام خودکشی۔ کوئی شخص جو خودکشی کا اقدام کرے اور ایسے جرم کے ارتکاب میں کوئی فعل کرے جو جرم خود کشی کے ارتکاب کی طرف مائل ہو تو اس کو خودکشی کے ارتکاب کے اقدام کی سزا دی جائے گی۔

مثلاً کوئی شخص بعض وجوہ سے اپنی زندگی سے تنگ آجائے اور زہر پینا شروع کردے اور اس وقت کوئی دوسرا شخص اسے اس طرح پینے سے روکے اور بروقت طبی امداد پہنچانے پر وہ شخص بچ جائے تو اس شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس نے خودکشی کے ارتکاب کا اقدام کیا اور اس پر اقدام خودکشی کا مقدمہ دائر کیا جائے گا۔

اقدام جرم خودکشی میں یہ ثابت ہونا ضروری ہے کہ محض ڈرانا یا نمائش مقصود نہ تھی مثلاً ملزم نے ایک شخص سے یہ کہا کہ اگر وہ کسی بات سے باز نہ آئے گا تو ملزم اپنے آپ کو ہلاک کردے گا۔ صرف ایسا کہنے سے ملزم جرم کا مستوجب سزا نہیں ہوگا۔

خیار: یہ لفظ خیر سے بنا ہے جس کے معنی بہتر اور افضل کے ہیں۔ پس خیار کے یہ معنی ہوئے کہ دو چیزوں میں سے اچھی اور بہتر چیز کو طلب کرنا عمدہ اور افضل کا انتخاب کرنا اور اس کو پسند کرلینا۔ فقہی اصطلاح میں اس سے وہ اختیار مراد ہوتا ہے جو خرید و فروخت کے سلسلہ میں بائع اور مشتری کو ہوتا ہے۔ ان کی کئی قسمیں ہیں۔ مگر یہاں بعض مشہور صورتوں ہی کا ذکر کیا جائے گا۔

بائع و مشتری اگر یہ کہیں کہ ہم چاہیں گے تو بیع باقی رہے گی ورنہ فسخ ہوجائے گی تو اس کو خیار شرط کہتے ہیں۔ اس کا اختیار بائع اور مشتری دونوں کو ہوتا ہے اگر ان دونوں میں اختلاف ہوگیا اور ایک نے کہا کہ خیار شرط تھا اور دوسرے نے کہا نہیں تھا تو خیار کے مدعی کو گواہ پیش کرنا ہوگا۔ اگر نہ پیش کرسکا جو انکار کر رہا ہے اس کی بات درست مانی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اختیار کی مدت تین دن یا اس سے کم ہے اگر اس سے زیادہ مدت مقرر کی گئی تو بیع باطل ہوجائے گی۔ یہی اختیار کی شرط لگانے والا چاہے تو مدت کے اندر اس کو فسخ کردے اور چاہے تو نہ فسخ کرے اگر اختیار والے نے بیع کو دوسرے فریق کی عدم موجودگی میں باقی رکھا تو یہ جائز ہے لیکن اگر وہ فسخ کرے تو دوسرے فریق کی موجودگی ضروری ہے۔

اگر اختیار والا مر گیا تو اس کا اختیار باطل ہوجائے گا اور وارثوں کی طرف نہ منتقل ہوگا یہ امام اعظم کا مسلک ہے لیکن امام مالک اور شافعی کے نزدیک ورثہ کو بھی اختیار رہے گا۔

امام مالک اور ابو حنیفہ کے نزدیک بائع و مشتری چاہیں تو اجنبی یعنی اپنے علاوہ کسی اور شخص کو بھی اختیار حاصل ہوجائے گا۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔

خیار روئیت کسی نے کوئی چیز بغیر دیکھے خرید لی تو بیع جائز ہے مگر خریدنے والے کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو چیز کو لے یا لوٹا دے لیکن اگر بیچنے والا اپنی چیز کو دیکھے بغیر بیچ دے تو اس کو دیکھنے کے بعد مشتری سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

لینے کا اختیار نہیں ہے۔

مبیع کو پوری پوری اور مکمل دیکھنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی جز اور حصہ دیکھ لینا کافی ہے جیسے غلہ کے ڈھیر کا ظاہری حصہ کپڑوں کے گٹھر کا بالائی حصہ جانور کا منہ (سامنے کا حصہ) اور گھر کا صحن دیکھ لیا اور ڈھیر کے پیچھے حصے کی نچلی تہیں جانور کے پچھلے حصے اور گھر کے سب کمرے نہیں دیکھے تو اس کے پھیرنے اور لوٹانے کا اختیار نہیں رہے گا۔ لیکن امام زفر کے نزدیک اندرونی حصے دیکھنا بھی لازمی ہے اور نہ دیکھنے پر اس کو چیز واپس کرنے کا اختیار رہے گا۔

اندھے کو بیع و شرا جائز ہے اور خریدنے کی صورت میں اس کو بھی اختیار حاصل ہوگا اگر اندھا شخص چیزوں کو چھونے، سونگھنے اور چکھنے سے ان کو پہچان لیتا ہو تو اس کا اختیار ساقط ہو جائے گا۔ مگر عقار (زمین) میں اس کا اختیار اس وقت باطل ہوگا جب اس سے اس کا وصف بیان کردیا جائے اگر کسی نے دوسرے کی چیز فروخت کردی تو مالک کو اختیار ہوگا کہ چاہے بیع کو باقی رکھے یا فسخ کردے۔

اگر یہ اختلاف ہو کہ مشتری کہے کہ میں نے مبیع کو نہیں دیکھا تھا اور بائع کہے کہ دیکھ کر خریدا تھا تو مشتری کی بات تسلیم کی جائے گی۔

دیکھنے کا اختیار صرف مشتری کو ہوتا ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کے ورثہ کی جانب یہ حق منتقل نہیں ہوگا مگر امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک ورثہ کو بھی اختیار رہے گا۔

اگر بیچنے والا کوئی چیز کا عیب ظاہر کیے بغیر بیچ دے تو عیب معلوم ہونے پر خریدار اس کو واپس کرسکتا ہے اس کو فقہی اصطلاح میں خیار عیب کہا جاتا ہے اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مشتری نے عقد کے وقت یہ کہا ہو کہ اگر عیب معلوم ہوا تو واپس کردوں گا۔

عیب کا پتہ چل جانے پر مشتری کو اختیار ہے کہ چاہے مبیع کو واپس کردے یا چاہے تو اس کو پوری قیمت پر خریدے مگر اس کو واپس نہ کرنے اور دام کم کرنے کا اختیار نہیں۔

بائع کے لیے بیع کا عیب ظاہر کرنا واجب ہے چھپانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ اسی طرح مشتری کو قیمت کا عیب ظاہر کر دینا بھی لازمی ہے۔

خیار تعیین۔ اگر بائع کے یہاں فروخت کے لیے دو یا تین چیز ہوں تو مشتری کو اختیار ہوگا کہ ان میں سے کسی ایک کو وہ پسند کرے خریدے اسی اختیار کا نام خیار تعیین ہے مگر چار چیزیں ہوں تو یہ اختیار نہیں ہوگا۔

خیار مجلس۔ جس نشست میں خرید و فروخت کا معاملہ ہو اس میں جب تک بائع و مشتری موجود ہوں ان کو بیع فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ یہ امام شافعی کا مسلک ہے امام ابو حنیفہ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ فقہائے امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک صرف بیع میں خیار مجلس صحیح ہے۔

نکاح کے بعض اختیارات بیع و شرا کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی متعاقدین کو بعض اختیارات و حقوق حاصل ہوتے ہیں جیسے عقد نکاح میں اگر فریقین بالغ ہوں تو ان کی مرضی ضروری ہے۔ اگر کسی شخص ولی نے کسی بالغ عورت کا نکاح اس کی مرضی کے بغیر کردیا تو اس کو اختیار ہے کہ چاہے اس کو باقی رکھے یا فسخ کردے۔ نابالغ لڑکے اور لڑکیوں کو فسخ کا اختیار نہیں ہے لیکن بالغ ہونے کے بعد وہ اس نکاح کو چاہیں باقی رکھیں یا فسخ کردیں جس کو ان کے باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور ولی نے کیا ہے۔

شوہر کو شریعت نے طلاق کا اور عورت کو خلع کا اختیار دیا ہے۔

خیار عتق۔ اگر لونڈی کا نکاح اس کے ولی نے اپنی مرضی سے کر دیا تو آزاد ہونے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ چاہے وہ اپنے نکاح کو باقی رکھے یا فسخ کردے۔

جہیز۔ یہ لفظ جہاز بفتح اول (بکسر اول) کی بگڑی ہوئی شکل ہے اس کے اصلی معنی سامان کے ہیں۔ مگر اب عرف میں اس سے وہ سامان مراد ہوتا ہے جو لڑکیوں کو شادی کے وقت دیا جاتا ہے مردوں کے کفن دفن کا سامان بھی جہیز کہلاتا ہے۔

قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں کہ لڑکیوں کو کس قدر سامان دیا جائے مگر کتب سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ کو یہ چیزیں جہیز میں دی تھیں۔ (1) ایک پلنگ (2) ایک لحاف (3) ایک بستر جو چمڑے کا گدا تھا اور اس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی (4) دو چکیاں (5) ایک مشکیزہ (6) مٹی کے دو گھڑے۔

خیانت مجرمانہ (Criminal Breach of Trust) : یہ جرم اس وقت عائد ہوگا جب کوئی شخص کسی کو اپنا مال امانتاً سپرد کرے یا کسی مال کے متعلق اس کو کوئی اختیار تفویض کرے اور وہ بددیانتی سے اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کا تصرف بے جا کرے یا بددیانتی سے اپنی غرض کے لیے استعمال کرے۔

اس جرم میں ملزم کو مال پر قبضہ امانت کے طور پر حاصل ہوتا ہے اور جب وہ اس امانت کی خلاف ورزی کرکے اس مال کو اپنے تصرف میں ملاتا ہے تو وہ جرم خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہوتا ہے برخلاف اس کے تصرف بے جا مجرمانہ کی صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ مال کسی اتفاق سے یا اور طرح پر اس کے قبضہ میں آتا ہے لیکن بعد میں ملزم کی نیت بدل جاتی ہے جس سے وہ مال کو اپنے تصرف میں لاتا ہے۔ تصرف بے جا مجرمانہ کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہ مال ملزم کے قبضہ میں بہ طریق امانت نہ آیا ہو۔ جب تک یہ نہ ثابت ہو کہ مال ملزم کی امانت میں دیا گیا تھا خیانت مجرمانہ کا جرم عائد نہیں ہوسکتا۔ اس صورت میں یہ بھی دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ امین کو کار امانتی کی انجام دہی کے لیے کوئی معاوضہ دیا گیا تھا یا نہیں اور نہ ہی یہ دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اس نے مال کا تصرف بھی خود اپنے لیے کیا یا کسی شخص ثالث کے فائدے کے لیے۔

اگر کسی امانت کے مال کے ایفاء کرنے کا طریقہ معین ہو اور ملزم اس ہدایت کی خلاف ورزی کرے تو بھی وہ اس جرم کا مرتکب ہوگا مثلاً اگر زید جو کسی شخص متوفی کے وصیت نامہ کی رو سے وصی مقرر ہو، بددیانتی سے اس قانون کے خلاف کرے جس میں وصیت نامہ کے مطابق ترکہ کی تقسیم کرنے کا حکم ہے اور ترکہ کو اپنے لیے صرف کرلے، زید خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہوگا۔

اگر مال کے متعلق کوئی اختیار ملزم کو ملا ہو اور ملزم اس کو حسب تفویض استعمال نہ کرے تو وہ اس جرم میں ماخوذ ہوگا۔

محکمہ آب رسانی کے انسپکٹر کو تفویض پانی کی نگرانی تھی اور اس کو یہ اختیار تھا کہ وہ ٹیکس لے کر پانی دے۔ ایسا نہ کرکے اگر انسپکٹر پانی اپنے تصرف بے جا میں لے آئے یا اپنے کاشت کاروں کو بغیر مقررہ محصول وصول کیے ہوئے پانی دے تو وہ خیانت مجرمانہ کا مرتکب ہوگا۔

اگر ملزم کسی امانت کے بارے میں معاہدہ کرے اور اسے پورا نہ کرے، مال اپنے استعمال میں لے آئے تو وہ اس جرم کا مرتکب ہوگا۔

خیانت مجرمانہ کے جرم کا تعلق صرف جائداد منقولہ سے ہوتا ہے۔ جائداد غیر منقولہ مثلاً مکان زمین وغیرہ کا خیانت مجرمانہ نہیں ہوسکتا۔

د

دائے بھاگ (Daya Bhaga) : دائے بھاگ کسی مختص کتاب پر تبصرہ نہیں ہے بلکہ تمام کتابوں پر حاوی ایک کلیدی کتاب ہے جسے جی موتاوھانس (Jimutavahans) نے لکھا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ جنوبی ہند میں ہندو لاء کا وہ تبصرہ جو مہادیوا خاندان کے دور حکومت میں جی موتاوھانس نے لکھا ہے وہ دائیھاگ کے نام سے موصوف ہے۔ متاکشرا کو مہاراشٹر، شمالی کونار اور رتناگری میں اہمیت دی جاتی ہے اور بنگال میں دائے بھاگ پر عمل کیا جاتا ہے۔

دجال: دجل سے مبالغہ کا صیغہ ہے جسکے معنی ملمع کرنا، خلط ملط کرنا، گڈمڈاور تلبیس کرنا، حقیقت کو چھپانا، دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا ہوتے ہیں گویا دجال کے اندر یہ سب باتیں ہوں گی۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ قرب قیامت میں ظاہر ہوگا اور خدائی کا دعوئی کرے گا اور لوگوں کو دھوکہ اور فریب دے گا۔ حدیثوں میں اس کا نام مسیح الدجال بھی آیا ہے۔ دجال پہلے عراق و شام کے درمیان ظاہر ہوگا اور نبوت کا دعوئی کرے گا پھر اصفہان جائے گا اور الوہیت کا دعوئی کرے گا وہ کانا ہوگا، اس کی آنکھ میں پھولی ہوگی، حبشیوں کی طرح گھنگریالے بال ہوں گے، پیشانی پر کافی لکھا ہوگا جس کو مسلمان پڑھ لیں گے مگر کافر نہ پڑھ سکیں گے۔ اس کے پاس ایک باغ ہوگا جس میں جنت اور آگ ہوگی جس کو دوزخ سے موسوم کرے گا۔ اپنے موافقوں کو جنت میں اور مخالفوں کو دوزخ میں داخل کرے گا۔ اس سے خوارق کا ظہور بھی ہوگا۔

دجال کی فتنہ پردازی کا سلسلہ چالیس روز تک رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا اور دوسرا ایک ماہ کے اور تیسرا ایک ہفتہ کے برابر ہوگا۔ باقی دن عام دنوں جیسے ہوں گے۔ اس کا ساری دنیا پر قبضہ ہوجائے گا مگر مکہ اور مدینہ میں نہیں داخل ہوسکے گا۔ وہ جب مدینہ کے قریب آئے گا تو تین دفعہ زلزلہ آئے گا جس کے خوف سے بدعقیدہ اور منافق لوگ وہاں سے نکل کر اس کے ساتھ ہوجائیں گے اس وقت مدینہ میں ایک بزرگ ہوں گے جو دجال سے مناظرہ کریں گے اور بالآخر اس کو شکست دیں گے۔ وہاں سے ناکام ہوکر وہ شام کا رخ کرے گا لیکن اس کے دمشق پہنچنے سے پہلے امام مہدی وہاں اس سے جنگ کی تیاریاں مکمل کرچکے ہوں گے۔ اسی وقت حضرت عیسیٰ کا ظہور بھی ہوگا وہ امام مہدی کی فوج میں شامل ہوکر دجال کو بیت المقدس کے قریب لد کے مقام پر قتل کردیں گے۔

آنحضرت ﷺ دجال کے فتنہ سے بچنے کے لیے یہ دعا کرتے تھے اللھم انی اعوذبک من فتنہ المسیح الدجال (اے اللہ میں تجھ سے مسیح دجال کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں)۔ مسلمان بھی نمازوں کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دجال کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک گروہ کا نام ہے۔

درجہ بندی کتاب (Book Classifcation) : انسان اپنے ماحول کی ساری اشیا اور ذہن کے سارے تصورات کو کسی نہ کسی ترتیب میں دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ترتیب کے اس عمل کو جب نظری اساس فراہم کردی جاتی ہے تو اسے ضابطہ درجہ بندی کہا جاتا ہے۔ درجہ بندی مختلف اشیا اور تصورات کی عمومی مشابہتوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

تجربہ کے ایک لمبے دور سے گذرنے کے بعد کتابوں کی درجہ بندی کے لیے ان کا نفس مضمون مناسب ترین بنیاد قرار پایا۔ اس سے پہلے حجم، جلدبندی، عنوان اور مصنف کے نام کے مطابق درجہ بندی کی جاتی تھی۔ دنیا کے کئی مفکروں اور علم کتاب خانہ کے ماہرین نے اپنے اپنے زمانہ میں علم و فن کی ترقی اور وسعت کے مطابق علوم کی درجہ بندی کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اور اس کے مطابق کتب خانوں میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں رکھنے کے لیے جگہ متعین کردی جاتی تھی۔ یہ طریقہ اس وقت تک قابل عمل تھا جب کتابیں خطی ہوتی تھیں اور تعداد کم۔ چھاپہ کی ایجاد کے ساتھ کتابوں کی بہتات ہوگئی اور متعین جگہ پر رکھنے کا طریقہ اپنی افادیت کھو بیٹھا۔ اسی علوم کی نوعیت میں بدلتے رجحان کی بدولت علوم کی خالص تصوراتی درجہ بندی ناکافی ہونے لگی۔ اب ایک کتاب میں کئی علوم جمع کردیے جاتے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر کئی افراد کئی نظریوں سے بحث کرتے ہیں۔ ایک ہی موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں مختلف مقاصد یا معیار سے لکھی جاتی ہیں۔ ان سب کی درجہ بندی علم کی تصوراتی تقسیم یا درجہ بندی کے ذریعہ کیسے ممکن ہے ساتھ ساتھ کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ترتیب کتاب کی مشکلوں کو دوچند کردیا اور علوم کی درجہ بندی کے تحت کتابیں رکھنے کا طریقہ ناکافی نظر آنے لگا۔ کتابوں کی درجہ بندی اور علوم کی درجہ بندی میں فرق کی ضرورت کا احساس بڑھا۔ کتب خانوں میں مختلف علوم و فنون کے لیے علاحدہ علاحدہ جگہ کی تخصیص بھی ممکن نہ رہی ان دشواریوں کا حل یہ نکلا کہ علوم و فنون کے خانے متعین کرنے کی جگہ علوم و فنون کے اظہار کے لیے علامتیں متعین کی جائے جو کتابوں پر درج کردی جائے اور کتابوں کی ترتیب ان علامتوں کی مدد سے کی جائے اس طرح کتابوں کو خانوں کی قید سے آزاد کردیا گیا اور آزادی دلانے میں بڑا رول معروف امریکی لائبریرین میلویل ڈیوی کا تھا۔ علوم فنون کی تصوراتی تقسیم میں زاویہ نگاہ، انداز بیان اور ترتیب مواد کے اظہار کے لیے بھی علامتوں کا سہارا لیا گیا اور اب کتابوں کی نوعیت کے مطابق درجہ تشکیل کرنے کے لیے دستیاب علامتوں نے کتاب کی ترتیب کو مزید آسان بنا دیا۔ انیسویں صدی میں وجود میں آئے درجہ بندی کے یہ طریقے مضامین کی تسلسلی تقسیم کے اصول پر مبنی تھے اور اس کی نمائندہ مثال میلویل ڈیوی کا ڈیسمل ضابطہ درجہ بندی تھا جو 1876 میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس ضابطہ میں ایک بڑی رکاوٹ مختلف جہات کے حامل نئے ابھرتے ہوئے موضوعات کے لیے موزوں علامتی نمبر کی تشکیل تھی۔ اس میں استخراجی طریقے کے مطابق علوم کی تقسیم در تقسیم کی جاتی تھی اور ایک سلسلہ میں ان کا اندراج کیا جاتا تھا۔ ضابطہ کو زیادہ لچکیلا بنانے کی ایک کوشش 1905 میں کی گئی اور نتیجہ میں یونیورسل ڈیسمل کلاسی فی کیشن وجود میں آیا لیکن ضابطہ کے نظری ڈھانچہ میں کسی بڑی تبدیلی کی گنجائش نہ تھی جس کی بدولت ایک بہتر ضابطے کے وضع کرنے کی کوشش جاری رہی۔ امریکا میں لائبریری آف کانگریس نے اپنی کتابوں کے ذخیرہ کو درجہ بند کرنے کے لیے ایک منفرد ضابطہ وضع کرنے کی کوشش کی لیکن جو ضابطہ وجود میں آیا وہ مختلف مضامین کے لیے بنے ضابطوں کا مجموعہ بن کر رہ گیا اور مرتب ضابطہ جملہ مضامین کی درجہ بندی کا نہ ہوسکا۔ بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ہندستان میں ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن نے واضح نظری بنیادوں پر قائم ایک ضابطہ مرتب کیا جس میں کائنات علوم کی ایک تسلسل میں درجہ بندی کے بجائے اساسی درجہ مضمون یا موضوع کو اس کے بنیادی اجزا میں تقسیم کرنے اور ایک فارمولا کے تحت حسب ضرورت اجزا کو باہم مربوط کرنے کی سہولت پیدا کی گئی۔ اس طریقہ تقسیم اور درجہ بندی کو تجزیاتی ترکیبی (Anlytico Synthetic) طریقہ درجہ بندی کہا گیا۔ مضامین یا موضوع کو اجزا میں تقسیم کرنے اور باہم مربوط کرنے کی صلاحیت کی بدولت اس ضابطہ کے ذریعہ علوم کی دنیا میں ہونے والے نت نئے اضافوں کے لیے مناسب جگہ پر رکھنے کا امکان بڑھ گیا۔ رنگاناتھن نے اجزا کی ترتیب کے لیے اصول و ضوابط بنائے۔ علامتوں کا ایک نظام وضع کیا اور اس طرح درجہ بندی کے عمل کو فکری اور نظری بنیادیں فراہم کیں اور اگرچہ یہ ضابطہ مقبولیت کے اعتبار سے زیادہ کامیاب نہ رہا لیکن فکری سطح پر اس کی پذیرائی پوری علمی دنیا میں ہوئی اور درجہ بندی پر غور و فکر کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ ہندستان میں ڈاکومینٹیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر بنگلور میں اس ضابطہ پر مزید تحقیق کا کام ہورہا ہے جبکہ انگلینڈ میں کلاسی فی کیشن ریسرچ گروپ جسے عرف عام میں سی آر جی کہا جاتا ہے انھیں خطوط پر ایک عالمی ضابطہ درجہ بندی کے امکان پر تحقیق کر رہا ہے۔ رنگاناتھن نے اپنے ضابطہ کو کولن ضابطہ درجہ بندی کا نام دیا کیونکہ کتاب کے پہلے ایڈیشن میں اجزا کو باہم مربوط کرنے کے لیے رموز اوقاف میں سے کولن کو منتخب کیا گیا تھا

(مزید دیکھیے ڈیوی ڈیسمل ضابطہ درجہ بندی اور کولن ضابطہ درجہ بندی)

درخواست دیوالیہ پیش ہونے پر عدالتی کارروائی: اگر کسی قرض دار کی جانب سے دی گئی درخواست دیوالیہ کو تجویز کے لیے قبول کرلیا گیا ہو تو قرض دار کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اپنی تمام حسابی کتابیں اور رجسٹروں کو عدالت میں پیش کرے اور ان تمام قرضوں اور قرض خواہوں کی فہرست داخل کرے جنھیں اسے قرض ادا کرنا ہے۔ عدالت سماعت مقدمہ کے دوران ایک عارضی رسیور مقرر کرے گی اور تمام امور متعلقہ کی بابت شہادت قلم بند کرے گی اور ریکارڈ کی جانچ کرے گی اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس نتیجے پر پہنچے گی کہ آیا قرض دار سے ایسے افعال سرزد ہوئے ہیں جن کی بناء پر اسے دیوالیہ قرار دیا جاسکتا ہو۔ عدالت قرض دار کی جائداد کی کلیتاً یا جزاءً ضبطی کا حکم دے سکے گی اور قرض دار کی گرفتاری کا بھی حکم دے سکے گی۔ اگر کسی قرض خواہ نے کسی قرض دار کے دیوالیہ ہونے کی بابت درخواست دی ہے اور عدالت کی رائے میں قرض دار سے ایسا کوئی فعل سرزد نہیں ہوا ہے جس کی بناء پر اسے دیوالیہ قرار دیا جاسکے تو عدالت اس درخواست کو نامنظور کر سکے گی۔ فیصلہ عدالت کے بعد وہ شخص جو دیوالیہ قرار دیا گیا ہے اس امر کی پوری کوشش کرے گا کہ اس کی جائداد سے جو بھی رقم وصول ہو وہ قرض خواہوں میں تقسیم ہو جائے۔ وہ حکم عدالت جس کے ذریعہ کسی شخص کو دیوالیہ قرار دیا گیا ہے سرکاری گزٹ میں شائع کیا جائے گا۔ اس حکم عدالت کے بعد وہ تمام اشخاص جن کا یہ ادعا ہے کہ انھوں نے قرض دار کو قرض دیا ہے انھیں اپنے قرض کی مقدار رقم کو ثابت کرنا ہوگا اور عدالت ایسے تمام اشخاص کی شہادت اور ثبوت پر غور کرنے کے بعد یہ حکم دے سکے گی کہ کن اشخاص کو کس قدر قرض واجب الادا ہے۔ ایسے اشخاص کی فہرست عدالت کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کی جائے گی۔

ایسا قرض دار جس کے متعلق عدالت سے حکم دیوالیہ صادر ہوچکا ہو اپنی گرفتاری یا زیر حراست نہ رکھنے کے متعلق عدالت میں درخواست دے سکے گا۔ عدالت ایسی درخواست پر مناسب حکم دے سکے گی۔ ایسا حکم قرض دار کے تمام قرضوں یا ان میں کسی قرضے کے متعلق دیا جاسکتا ہے اور اس تاریخ سے نافذ العمل ہوگا جو عدالت مقرر کرے۔ عدالت کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ اس حکم میں تبدیلی کرے یا کوئی ترمیم کرے۔ کسی قرض خواہ کو بھی یہ حق رہے گا کہ وہ عدالت میں حاضر ہو کر قرض دار کی ایسی درخواست کی مخالفت کرے۔

درخواست دیوالیہ کے شرائط: کوئی قرض خواہ کسی قرض دار کے خلاف دیوالیہ کی درخواست حسب ذیل صورتوں میں دے سکتا ہے:

(1) جب قرض کی رقم پانچ سو سے زائد ہو یا اگر کئی قرض خواہ ہوں تو قرض کی مجموعی رقم پانچ سو سے زائد ہو۔

(2) جب قرض ایک طے شدہ رقم کے متعلق ہو جس کی ادائیگی فوری یا کچھ دنوں کے بعد کرنی ہو۔

(3) وہ فعل جس سے کوئی قرض دہندہ دیوالیہ قرار دیا جاسکتا ہو۔ قرض دہندہ کی جانب سے درخواست دیوالیہ پیش کرنے سے اندرون تین ماہ سرزد ہوا ہو۔ اگر تین ماہ جس دن ختم ہوتے ہیں اس دن عدالت بند ہو تو جس تاریخ کو عدالت کھلے درخواست دی جاسکتی ہے۔

ایک قرض دار دیوالیہ قرار دینے کی بابت عدالت میں درخواست نہ دے سے گا۔

(1) اگر اس کے قرض کی رقم یا اگر متعدد قرض خواہ ہوں تو قرض کی مجموعی رقم پانچ سو ہو۔

(2) اگر وہ شخص کسی اور قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں ڈگری کی تعمیل میں قید ہو۔

(3) کسی اور قرض کے سلسلے میں اس کی جائداد پر عدالت سے قرقی آئی ہو۔ دیوالیہ قرار دیے جانے کے متعلق اس عدالت میں درخواست دی جاسکے گی جس کے حدود سماعت میں قرض دار عام طور پر رہتا ہو۔

قرض دار کی جانب سے پیش کردہ درخواست دیوالیہ میں حسب ذیل امور کا اندراج ہونا ضروری ہے۔

(1) درخواست میں یہ بات ظاہر کی جائے گی کہ قرض دار قرض کی ادائیگی کے موقف میں نہیں ہے۔

(2) وہ مقام جہاں قرض دار عام طور پر سکونت پذیر ہے۔

(3) اگر قرض دار کسی اور قرض کی بناء پر یا کسی عدالتی حکم کی بناء پر قید میں ہو تو اس عدالت کے فیصلے کا حوالہ دیا جائے گا۔

(4) قرض کی مقدار اور قرض خواہوں کا مقام رہائش اور پتہ۔

(5) قرض دار کی جائداد کی تفصیلات اور اس کی مالیت کا تعین۔

(6) درخواست کے ساتھ ایک راضی نامہ دیا جائے گا جس میں اس بات کی رضامندی دی جائے گی کہ درخواست گزار اپنی جائداد کی عدالت کی صوابدید اور اختیار میں دینے کے لیے تیار ہے۔

(7) درخواست کے ساتھ اس بارے میں ایک بیان بھی داخل کیا جائے گا کہ درخواست گزار نے اس سے قبل دیوالیہ ہونے کی درخواست نہیں دی اور اگر درخواست دی تھی تو آیا وہ نامنظور تو نہیں ہوئی اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اگر نامنظور ہوئی ہو تو اس کے کیا وجوہ تھے یا اگر درخواست دیوالیہ منظور ہوئی ہے تو کیا بعد میں دیوالیہ کا حکم منسوخ کیا گیا۔

کوئی درخواست دیوالیہ بغیر عدالت کی اجازت کے واپس نہیں لی جاسکتی عدالت میں درخواست دیوالیہ کے فیصلے کے وقت ضابطہ دیوانی کے قواعد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

درخواست و حکم دیوالیہ: اگر کسی قرض دار نے کوئی ایسا فعل کیا ہو جو افعال دیوالیہ کی تعریف میں آتا ہو تو ایسی صورت میں قرض خواہ یا قرض دار کی جانب سے عدالت میں یہ درخواست دی جاسکتی ہے کہ اس شخص کو دیوالیہ قرار دینے کا حکم صادر کرے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی قرض دار کی جانب سے اگر عدالت میں یہ درخواست پیش کی جائے کہ اسے دیوالیہ قرار دیا جائے تو اس شخص کی یہ درخواست اسے دیوالیہ قرار دینے کے لیے کافی سمجھی جائے گی اور عدالت اس کی بناء پر اسے دیوالیہ قرار دینے کا حکم صادر کرسکے گی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دیوالیہ کی درخواست کسی ایسے کارپوریشن ، کمپنی یا ایسوسی ایشن کے خلاف نہ پیش ہوسکے گی جس کی رجسٹری کروائی جاچکی ہو۔

دستاویزات کی تصحیح (Rectification of Instruments): اگر کسی فریب کی وجہ سے یا باہمی غلطی (Mutual Mistake) کی وجہ سے کوئی دستاویز غلط طور پر مرتب ہوگیا ہو تو فریقین معاہدہ یا ان کے نمائندے قانون دادرسی خاص کے تحت تصحیح (Rectification) کے لیے چارہ جوئی عدالت میں کرسکتے ہیں۔ معاہدے کا کوئی فریق بھی تصحیح (Rectification) کے لیے عدالتی کارروائی کرسکتا ہے۔

ایسا شخص جس کے خلاف کوئی تحریری دستاویز کالعدم یا قابل انفساخ موجود قانون دادرسی خاص کے تحت تنسیخ دستاویز کی چارہ جوئی عدالت میں اس عذر کے ساتھ کرسکتا ہے کہ اس دستاویز کی موجودگی اس کے لیے آئندہ نقصان کا باعث ہوگی۔

دستور برطانیہ (British Constitution): کسی مملکت کا دستور ان قواعد اور قوانین کے مجموعے کا نام ہے جن میں اس مملکت کے طرز حکومت کا تعین ہوتا ہے اور اس امر کا بھی تعین ہوتا ہو کہ حکومت کا اقتدار اور اس کے فرائض کسی شہری کے متعلق کیا ہوں گے اور کسی شہری کو حکومت سے کس نوعیت کے توقعات وابستہ رکھنا چاہئیں۔ حقیقت میں دستور ان تحریری اور غیر تحریری بنیادی قوانین کے مجموعے کو کہہ سکتے ہیں جس کے ذریعہ حکومت کرنے والوں کے حقوق اور رعایا کی بنیادی سہولتوں کا تعین کیا گیا ہو۔ معروف سیاست داں ولیم پٹ (William Pitt) کے الفاظ میں برطانیہ کا اہم ترین کمال اس کا دستور ہے جو جمہوریت کے مضر اثرات اور شہنشاہیت کے استبدادی عزائم سے محفوظ اور آزاد ہے۔ اس دستور کی ہم آہنگی کا راز ماضی اور حال کے اوراق میں پوشیدہ ہے۔ دستور برطانیہ جزوی طور پر تحریری اور جزوی طور پر غیر تحریری ہے۔ اس کی ابتدا ماضی کے پیچیدہ حالات میں ہوئی اور اب اس کا وجود رسم و رواج اور عمل درآمد کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ دستور برطانیہ کی بنیاد عام قانون (Common Law) نظائر، میگناکارٹا (Magna Carta) بل آف رائٹ (Bill of Right) پر ہے۔ دستور برطانیہ فی الحقیقت جزوی طور پر مختلف قوانین کی شکل میں اور جزوی طور پر پارلیمنٹ کے رسم و رواج اور عمل درآمد میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دستور برطانیہ برطانوی باشندوں کی ذہانت کا بہترین کارنامہ ہے۔ دستور برطانیہ کی تدوین عام انگلش قانون (English Common Law) کے ساتھ ساتھ بتدریج روایات اور رواج کی بنا پر ہوئی۔ کسی مقتدر اعلیٰ کے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت قانون سازی کے ذریعہ نہیں ہوئی۔ پارلیمنٹ کا آغاز بھی شاہی کونسل کے قیام کی وجہ سے عمل میں آیا۔ جس میں ابتداءً بادشاہ وقت ملک کے بڑے بڑے دانشوروں سے مشورے کرتا تھا بعد میں ان عام لوگوں سے بھی مشورہ کیا جانے لگا جو مختلف علاقوں اور اضلاع کی نمائندگی کرتے تھے۔ ابتدا میں پارلیمنٹ میں انھیں مسائل پر بحث ہوتی تھی جس میں تاج برطانیہ اور لارڈز اور عوام میں اختلاف پایا جاتا تھا۔

جارج برنارڈ شاہ (George Barnard Shaw) نے کہا ہے کہ برطانوی دستور موجود ہے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے کیونکہ وہ کسی کتاب میں لکھا ہوا نہیں ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی جس طرح کہ ممالک متحدہ امریکا کے دستور میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ ممالک متحدہ امریکا کا دستور ایک کتاب کی شکل میں لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انگلستان میں کوئی دستور نہیں ہے لیکن یہ بے شک صحیح ہے کہ برطانیہ میں اس طور سے دستور مدون شدہ نہیں ہے جیسا کہ ہندوستان، ممالک متحدہ امریکا یا سوویت یونین کا دستور ہے۔ برطانیہ کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دستور کا مطالعہ وہاں کے رسم و رواج، عمل در آمد بعض تحریری مدون شدہ قوانین کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ لارڈ برے ای (Lord Bryee) کا یہ کہنا ہے کہ برطانیہ کا دستور فی الحقیقت بے شمار نظائر کا ذخیرہ ہے اور وکلاء اور سیاست دانوں کے پاس رواج عمل در آمد مفروضات اور فیصلہ جات کے ذریعہ حکومت کا نظم و نسق چلایا جاتا ہے۔ ان رواج، عمل در آمد وغیرہ کے علاوہ برطانیہ میں نظم و نسق چلانے کی غرض سے قوانین بھی مدون کیے گئے ہیں اور جس امر کے بارے میں قانون مدون کیے گئے ہیں اس میں کافی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔

دستور برطانیہ کے ماخذ (Sources of British Constitution): دستور برطانیہ کے کئی ماخذ ہیں اور اس میں سب سے اہم دستوری اور امتیازی درجہ میگنا کارٹا، 1215 (Magna Carta of 1215)، پٹیشن آف رائٹس، 1689 (Petition of Rights, 1689)، بل آف رائٹس، 1689 (Bill of Rights, 1689)، ایکٹ آف سٹلمنٹ، 1701 (Act of Settlement,1701)، ایکٹ آف یونین آف انگلینڈ اسکاٹ لینڈ، 1701 (Act of Union between England and Scotland of 1701)، پارلیمنٹ ایکٹ، 1911 (Parliament Act,1911)، اسٹیٹوٹ آف ویسٹ منسٹر، 1931 (Statute of West Minister,1931) وغیرہ کو حاصل ہے۔ یہ امتیازی دستاویزات دستور برطانیہ کے اہم جز ہیں اور اگرچہ کہ ان میں سے اکثر پارلیمنٹ کے مدون کردہ نہیں ہیں لیکن کوئی انگریز سیاست دان ان دستاویزات میں درج کردہ اصول اور ضابطے کے خلاف کوئی عمل نہیں کرسکتا۔

دستور برطانیہ کا ایک اور ماخذ وہ قوانین ہیں جو وقتاً فوقتاً برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیے ہیں اس سلسلے میں رفارمس ایکٹ 1832، 1867، 1884، 1928، اور 1949 کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دی اکٹنل ایکٹ، 1616 (The Sepennial Act,1616)، آئرش فری اسٹیٹ ایکٹ، 1922 (Irish Free State Act, 1836)، دی میونسپل کارپوریشن ایکٹ، 1836 (The Municipal Corporation Act, 1836)، پارلیمنٹری اینڈ میونسپل کارپوریشن الیکشن ایکٹ آف 1872 (Parliamentary and Municipal Corporation Election Act, 1972)، دی منسٹر آف کراؤن ایکٹ، 1937 (The Minister of Crown Act, 1937)، لائف پیرج ایکٹ، 1932 (The Life Perage Act,1836)، دی انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ، 1947 (The Indian Independence Act, 1947)، ری پریزینٹیشن آف پیپلز ایکٹ (The Representation of People Act)۔ اس ایکٹ کے ذریعہ رائے دھندگان کی عمر کو اکیس سال سے کم کرکے اٹھارہ سال کیا گیا۔

عدالتی فیصلہ جات بھی برطانوی دستور کا اہم جز ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف اہم عدالتی فیصلے قابل ذکر ہیں جو ولکس بنام ووڈ (Wilks Vs. Wood) میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ تلاشی کے جنرل وارنٹ کی اجراء اور ایسے دستاویز کی ضبطی غیر قانونی ہے جس دستاویز پر لکھنے والے کا نام نہ ہو مقدمہ ہول (Howell) کے فیصلے میں ججوں (Judges) سے بازپرس نہ کرنے کی ضمانت اور طمانیت دی گئی ہے ممبران جیوری کے رائے دینے کی آزادی کا قانونی تصور بشل (Bushell) کے مقدمے میں قائم کیا گیا۔ گاڈن بنام ہالٹس (Godden Vs. Halt) میں یہ اصولی فیصلہ کیا گیا کہ بادشاہ برطانیہ کو کسی بھی قانون کو منسوخ کرنے کا اختیار ہے۔ مقدمہ ایس بی بنام وائٹ (Ash By Vs. White) میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس رٹرننگ افسر کے خلاف کارروائی کرنا چاہیے جو ایک جائز رائے دہندہ کو رائے دینے سے روک دے۔ اسی طرح ولکس (Wilks) کے مقدمے میں یہ فیصلہ پایا کہ عوام کو اس کا حق ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو اپنا نمائندہ منتخب کریں۔ نہ حکومت کو اور نہ ہاؤس آف کامنس (House of Common) کو اس کا اختیار ہے کہ وہ عوام کے اس حق انتخاب میں مداخلت کرے۔ مقدمہ اوکیلی بنام ہاروی (O'Kelly Vs. Harvey) میں یہ انتہائی اہم فیصلہ کیا گیا کہ اگر اشخاص کے کسی اجتماع سے نقض امن کے اندیشے کی معقول وجہ ہو اور یہ کہ نقض امن کو روکنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو ایسے مجمع یا اجتماع کو منتشر کیا جاسکتا ہے اور مجمع کو منتشر کرنے کے لیے جو اقدامات کیے جائیں وہ قانوناً درست ہیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ بنام بونر (Secretary of State Vs. Boner) میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی عدالت نے کسی ملزم کو رہا کر دیا ہے تو عدالت کے اس حکم کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوسکتی البتہ ہیبس کارپس (Habeas Carpus) کی رٹ میں کوئی شخص ایک عدالت سے دوسری عدالت میں قانونی چارہ جوئی کے لیے جاسکتا ہے۔ مقدمہ لیورسٹی بنام انڈرسن (Liversiti Vs. Anderson) میں یہ اہم فیصلہ کیا گیا کہ ہوم سکریٹری کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کسی شخص کو حراست میں رکھنا چاہیے یا نہیں۔ یہ ایک انتظامی صوابدید ہے اور یہ کہ کسی وزیر کو کلیتاً قانونی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا ضروری نہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر مسئلے

میں قانونی رائے دے۔

دستور برطانیہ کا ایک اور ماخذ عام قانون (Common Law) ہے۔ عام قانون کی تعریف فاؤگاس (Fao Ggas) نے یوں کی ہے۔ عام قانون وسیع قانونی تصورات اور عمل درآمد کے مجموعے کو کہا جاسکتا ہے جن پر صدیوں سے عمل آوری ہوتی ہے اور جنھوں نے قابل تعمیل اور ناقابل تبدیلی اصولوں کی نوعیت حاصل کرلی ہے۔ پروفیسر منرے (Prof. Munre) کا یہ کہنا ہے کہ عام قانون وضع کردہ دستوری دیگر قوانین کی طرح عدالتی فیصلہ جات کے ارتقائی نظریات کے تحت ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ عام قانون عدالتی فیصلوں کی بنیاد پر قائم شدہ اصولوں کا نام ہے جو کسی بادشاہ وقت نے نافذ نہیں کیے اور نہ کسی پارلیمنٹ نے وضع کیے۔ عام قانون تعزیری مقدمات میں تاج برطانیہ کے اختیارات مقدمات کی سماعت اور تحقیقات، تقریر کی آزادی ایک مقام پر جمع ہونے کے حق اور گورنمنٹ کے خلاف کسی نقصان کے متعلق چارہ کار ضابطہ اختیار کرنے کی بنیاد ہے۔ دستور برطانیہ کا ایک اور اہم ماخذ دستور پر لکھی ہوئی درسی کتابیں ہیں ان میں سے چند کتابوں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(1) آرسن (Aurson) کی کتاب قانون دستوری اور دستوری رواجات

(2) مے (May) کی کتاب پارلیمنٹری پریکٹس (Parliamentary Practice)

(3) ڈائسی (Diecy) کی کتاب دستوری قانون (Law of Constitution)

(4) باگی ہو (Bagiho) کی کتاب انگلش دستور

(5) جننگ (Jenning) کی کتاب قانون اور دستور کابینہ کا طرز حکومت (The Law and the Constitution and Cabinet Govt.)

(6) لاسکی (Laski) کی کتاب "انگلستان میں پارلیمنٹری گورنمنٹ" اگر یہ معلوم کرنا ہے کہ انگلستان کا قانون دستوری ہے تو مندرجہ بالا کتابوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

دستور برطانیہ کا ایک اور ماخذ شاہی اختیارات ہیں۔ اعلان جنگ کا اختیار اور معاہدات کرنے کا اختیار بادشاہ کو حاصل ہے اس طرح مجرموں کی معافی اور پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا اختیار بھی شاہی اختیارات میں داخل ہے۔ دستور برطانیہ کا اہم ترین ماخذ دستوری روایات ہیں۔ ایک مصنف کی زبان میں دستوری روایات ان مفروضات، عمل اور عمل درآمد کا نام ہے جو ملک کے حاکمان مقامی کے باہمی تعلقات اور ان کی کارکردگی کو بڑی حد تک منظم کرتی ہے۔

بالڈون (Baldwin) کا کہنا ہے کہ مستقبل کے مورخین ہی یہ واضح طور پر بتا سکیں گے کہ ماضی میں کسی خاص وقت پر دستوری پریکٹس کیا تھی لیکن ایک ایسے برطانوی مصنف کے لیے جو بقید حیات ہے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ موجودہ زمانے میں جملہ متعلقہ امور کے متعلق ملک کا دستور کیا ہے۔ دستوری روایات کی موجودگی کی وجہ سے برطانوی دستور کے متعلق یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ یہ دستور روایات پر مبنی ہے۔

دستور یا آئین (Constitution) : "دستور" مملکت کا وہ بنیادی قانون ہے جس کے تحت عام قوانین وضع کیے جاتے ہیں۔ اس بنیادی قانون میں حکومت کی تنظیم، اس کے اختیارات اور شہریوں کے حقوق کا تعین کیا جاتا ہے۔ عام طور پر دستور ایک تحریری دستاویز کی شکل میں ہوتا ہے جسے کسی دستور ساز جماعت نے مدون کیا ہو یا مختلف پارلیمانی قوانین، احکام، عدالتی فیصلوں (نظائر) اور مختلف قسم کی روایتوں اور قوائد کا مجموعہ بھی ہوتا ہے۔ ہر مملکت کا ایک دستور ہوتا ہے خواہ وہ تحریری ہو یا غیر تحریری۔ کسی قانون ساز ادارہ کے ذریعہ وضع کیا گیا ہو یا صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہو۔

دساتیر کی تحریری اور غیر تحریری زُمروں میں تقسیم لایعنی اور غیر علمی ہے۔ دونوں میں اصل فرق نوع کا نہیں محض زاویہ کا ہے۔ کیونکہ ہر تحریری دستور میں ایک معتدبہ غیر تحریری عنصر داخل ہوکر رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ امریکا کا دستور 1789 میں نافذ ہوا اور جو تحریری دستور کا پہلا نمونہ ہے، دو سو برس کے سیاسی، اقتصادی، سائنسی و ٹکنالوجیکی اور بین الاقوامی ارتقاء کے نتیجہ میں آج بالکل بدل چکا ہے۔ اس دستور کے تین بنیادی اصولوں یعنی "تفریق اختیارات، وفاقیت اور عدالتی تنقیح" کا مفہوم آج وہ ہرگز نہیں ہے جو اصلاً وضع کرتے وقت پیش نظر تھا۔ یہ ارتقاء حالات، روایات، ملکی و بین الاقوامی تقاضوں، عدالتی نظائر، انتظامی احکام، پارلیمانی روایات، غرض کہ مختلف عوامل کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح برطانیہ کا جزوی طور پر غیر تحریری دستور (جسے بے جا طور پر "غیر تحریری" دستور کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے) اب بڑی حد تک تحریری صورت اختیار کرچکا ہے۔ اگرچہ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ

برطانوی پارلیمنٹ نے تمام دستوری ضوابط و قوانین کو ایک مستند و مرتب دستاویز کی شکل میں مدون کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانیہ کی سیاسی روایات مثلاً کابینہ کی تشکیل، دارالامراء اور دارالعوام کے اختیارات اور ان دونوں کے بیشتر روابط عدالتوں کی تنظیم اور ان کے اختیارات وغیرہ اب قوانین کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے بجائے دساتیر کو لچکدار اور بے لچک زمروں میں تقسیم کرنا زیادہ علمی اور مفید ہوگا۔

دستور کے لچکدار (یعنی ترمیم میں آسان) اور بے لچک (ترمیم میں دشوار) ہونے کا معیار یہ ہے کہ بنیادی قانون اور عام قانون میں کیا رشتہ ہے۔ اگر بنیادی قانون اور عام قانون کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں اور مجلس قانون ساز دونوں میں یکساں طریقہ سے ترمیم و تنسیخ کرسکتی ہے تو دستور لچکدار کہلائے گا۔ مثلاً برطانیہ کے سلسلہ میں سر آئیور جیننگز (Sir Ivor Jennings) نے کہا ہے کہ وہاں "دستوری قانون" نام کی کسی چیز کا وجود نہیں ہے کیونکہ دستوری قانون اور عام قانون میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی کے نتیجہ میں عدالتوں کو کسی پارلیمانی ایکٹ کو اس بناء پر رد کرنے کا اختیار نہیں کہ اس سے کسی دستوری دفعہ کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس بے لچک دستور کی مثال ریاست ہائے متحدہ امریکا کا دستور ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی قانون لازمی طور سے عام قانون سے بالاتر ہے۔ لہذا اس کی بالادستی اور اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں طریقہ عام قانون کی ترمیم کے طریقہ سے مختلف ہو۔ خصوصی ترمیمی طریقہ اور عدالتی تنقیح ایسے دو اصول ہیں جو کسی دستور کو غیر لچکدار بناتے ہیں۔ یعنی مجلس قانون ساز ایک خاص کارروائی کو اختیار کیے بغیر اس کی دفعات میں رد و بدل نہیں کرسکتی۔ لیکن غور کیا جائے تو غیر لچکدار ہونے کا یہ رسمی معیار بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر امریکا اور سوئٹزرلینڈ کے دساتیر میں ترمیم کے لیے بہت ہی دشوار گزار اور پیچیدہ طریقے اپنائے گئے ہیں لیکن امریکی دستور میں اب تک 22 اور سوئس دستور میں 84 ترمیمات ہوچکی ہیں۔ مزید برآں امریکی دستور رسمی ترمیم سے اس قدر تبدیل نہیں ہوا ہے جتنا کہ دستور کی عدالتی تشریحات سے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ "ریاست ہائے متحدہ امریکا کا دستور اسے کہتے ہیں جسے سپریم کورٹ کے جج دستور قرار دیں"۔ لہذا لچکدار اور بے لچک کا اصل معیار عملی ہے نہ کہ قانونی۔ امریکا کا قانونی طور پر بے لچک دستور اب اپنے لفظی معنی میں ختم ہو چکا ہے لیکن برطانیہ کا دستور، جہاں روایات کا عنصر غالب ہے، بہت ہی کم تبدیل ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رائے عامہ پر مبنی ہونے کے سبب روایات پائیدار ہوتی ہیں اور کوئی پارلیمنٹ سیاسی نظام کو شکست کرنے کا خطرہ مول لیے بغیر راسخ روایات کو نہیں توڑ سکتی۔ اسی لیے دستور کی ترمیم پذیری کو عملی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔

دستور ساز اسمبلی وہ مجلس ہے جو عوام کی نمائندہ ہو اور خاص اس مقصد کے لیے منتخب کی گئی ہو کہ وہ ملک کا دستور وضع کرکے اس پر غور و خوض کرے اور اسے باضابطہ اختیار کرے۔ مثال کے طور پر 1787 میں فلاڈیلفیا میں منعقدہ دستوری کنونشن یا ہندستان میں 1946 میں بالواسطہ منتخبہ دستور ساز اسمبلی۔ دستور ساز اسمبلی کا تصور جمہوریت اور عوام کی نمائندگی کے اصولوں کے زیر اثر ابھرا ہے۔

دستوریت (Constitutionalism) : دستوریت یا دستور پسندی مغرب میں جمہوریت اور عوامی نمائندگی کے ارتقاء کی ایک کڑی ہے۔ دستوریت کا اہم ترین مقصد انفرادی آزادی اور بنیادی حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ دستوری تحریکوں کی عصر حاضر میں ابتدا 1776 میں ہوئی، جب انگلستان، فرانس اور امریکا میں غیر ذمہ دار اور مطلق العنان حکمرانوں کے خلاف آزادی، مساوات اور قانون کی حکمرانی کے لیے جدوجہد شروع ہوئی۔ دستوریت کے معنی "دستور یا قانون کی حکومت" کے ہیں، نہ کہ شخصی حکومت کے۔ مغربی دستوریت کے ارتقا میں قدیم یونانی، رومی اور قرون وسطی کی دستوری تحریکوں کا براہ راست رول رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دستوریت کے معنی یہ ہیں کہ حکومت ایک بالاتر اور عوام کی حاکمیت پر مبنی دستور کے تحت چلائی جائے۔ حکومت کی شاخ کے اختیارات متعین ہوں، افراد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور دستور کی بالاتری، محدود حکومت کے اصولوں اور شہری حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری ایک آزاد اور غیر جانبدار عدلیہ کے سپرد کی جائے۔ کیونکہ جمہوریت میں بیدار رائے عامہ کے ساتھ بیدار ضمیر اور آزاد عدلیہ ہی قانون کی حکمرانی، فرد کی آزادی اور حکومت کی ذمہ داری کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

دستوریت حکومت کے اختیارات کو محدود کردیتی ہے اس لیے اسے مہذب حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے جس میں حکمرانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ قوانین اور اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہوں لیکن یہ بھی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ایک حقیقت ہے کہ ایک دستوری حکومت کا قیام ایک جمہوری ملک ہی میں ممکن ہے۔

دفتری عملہ ۔ انتظام: دفتری عملہ کا انتظام کسی ادارہ یا دفتر کے کل نظم و نسق کے لیے ذمہ دار بھی ہوتا ہے اور اٹوٹ حصہ بھی۔ نظم و نسق عامہ کے تعلق سے ان ہی کے مسائل اور انصرام کار سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ امور عام طور سے ان دستوری شرائط، مجالس مقننہ کے تشکیل کردہ قوانین اور قواعد نیز انتظامی ہدایات کے تابع ہوتے ہیں جو متعلقہ حکومت وقتاً فوقتاً نافذ کرتی ہے۔ دفتری عملہ یہ ذمہ داری ایک ایسے ادارے کے تحت انجام دیتا ہے جسے دستوری طور پر تشکیل دیا جاتا ہے۔

ملازمین سرکار کی مختلف زمروں میں تقسیم اور درجہ بندی، ان کے مناصب، فرائض اور ذمہ داریوں کے علاوہ ضروری شرائط ملازمت کی اساس پر عمل میں آتی ہے۔ اس طرح ایک مرتبہ درجہ بندی کر لینے کے بعد عملہ کا انتخاب کمپی ٹیٹو امتحانوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ یہ طریقۂ عمل، نظم و نسق کی کارکردگی اور ضروری معیار کو برقرار رکھنے کی غرض سے اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح فرض شناسی پیدا کرنے اور کارکردگی بڑھانے کی خاطر میرٹ اور / یا سینیارٹی کی بناہ پر اسٹاف کو ترقی کے لیے مختلف مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ملازمین سرکار کو وقتاً فوقتاً مختلف نوعیت کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے تاکہ اس طرح وہ جدید ترین تکنیکوں اور معلومات سے آگاہ ہو کر اپنی کارکردگی کو خوب سے خوب تر کر سکیں۔ ناقص کارکردگی اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے اس نوع کی ٹریننگ نہایت ضروری سمجھی جاتی ہے۔

نظم و نسق عامہ کو ملازمین سرکار کے مختلف مسائل سے سابقہ پڑتا ہے مثلاً ان کی تنخواہ اور شرائط ملازمت، ان کا چال چلن اور نظم و ضبط، دفتر کی بدعنوانیاں اور رشوت ستانی، مشترکہ مشاورت اور گفت و شنید وغیرہ۔

نظم و نسق کے تمام مسائل میں سب سے اہم مسئلہ اسٹاف کی تنخواہ کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ ملازمین کی سماجی، معاشی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ کسی ادارہ کے اسٹاف میں تناؤ اور تنازعہ کا بنیادی سبب بھی عموماً یہی مسئلہ ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے اکثر اوقات ملازمین کی ہڑتالیں بھی ہوتی ہیں۔ آجر اور ملازمین کے درمیان تعین تنخواہ کے گریڈز اکثر اختلافات کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح ملازمین کے چال چلن اور ضبط و نظم کا مسئلہ بھی صورت حال کو بگاڑ دیتا ہے آجر ملازمین کی کارکردگی کے تعلق سے کچھ اصول و ضوابط مقرر کرتا ہے۔ لیکن ملازمین ان کی پابندی کرنے کے بجائے اکثر ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تادیبی کارروائی کی نوبت آتی ہے۔ تادیبی طریقۂ کار ملازمین پر نگرانی کرنے اور ان میں فرض شناسی پیدا کرنے کی غرض سے اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف شرائط ملازمت سے متعلق آجر اور ملازمین میں باہمی صلاح و مشورہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپسی اختلافات اور تصادم کے دائرہ کو کم سے کم کیا جائے۔ باہمی مشاورت کا طریقہ جسے مشاورتی انتظامیہ (Participative Management) بھی کہا جاتا ہے، جمہوریت کی دین ہے۔ اس طریقہ پر اب اکثر ملکوں میں عمل ہوتا ہے۔ انتظامیہ کا آخری مسئلہ جس کی اہمیت کم نہیں ہے۔ رشوت ستانی اور بدعنوانی کا ہے۔ یہ وبا کسی نہ کسی شکل میں سرکاری و غیر سرکاری دفتروں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں۔ ملازمین پر جو جرمانے عاید کیے جاتے ہیں یا جو تادیبی کاروائیاں کی جاتی ہیں وہ اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ مسئلہ کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ بدعنوانیوں کی روک تھام کے لیے چال چلن کے ضابطوں کے ذریعہ مختلف پابندیاں عاید کی جاتی ہیں۔ سرکار اینٹی کرپشن اور وجی لینس کے ادارے بھی قائم کرتی ہے جن کا کام بدعنوانیوں اور کرپشن کی تحقیق کرنا اور ان پر قابو پانا ہوتا ہے۔

دو طرفہ تجارت (Bilateralism): دو ملکوں میں جب ایک تجارتی سمجھوتہ ہو جائے جس کے تحت وہ اپنی بیرونی تجارت میں خصوصی مراعات کو ایک دوسرے کی حد تک محدود رکھیں (مثلاً درآمد کے کوٹہ میں یا درآمدی محصول پر خاص رعایت) تو بین الاقوامی تجارت پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ملکوں کے درمیان اشیا کے تبادلہ میں مصنوعی رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

پہلی جنگ اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان یہ طریقہ تجارت بہت عام تھا جبکہ سخت معاشی بحران کی وجہ سے ہر ملک اپنے مفادات کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ 1933 میں اٹاوہ (Otava) کی کامن ویلتھ کانفرنس میں برطانیہ کے کامن ویلتھ ملکوں کے ساتھ اس قسم کے کئی معاہدے ہوئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں یورپ کے ملک تباہ ہوگئے۔ جنگ کے بعد انھیں امریکا کی معاشی طاقت سے ڈر تھا۔ چنانچہ 1947 میں ٹیرف اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تجارت کے عام معاہدہ کے ذریعہ دوطرفہ تجارت کے رجحان کو روکا گیا اور ہمہ جہتی تجارت کو فروغ دیا گیا۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک اپنی تجارت میں زیادہ تر دو طرفہ تجارت کا طریقہ اپناتے ہیں۔

دولت مشترکہ : دولت مشترکہ اس وقت وجود میں آتی ہے جب کسی سلطنت کے اندر حاکم طاقت اور محکوم اجزاء کے رشتے کمزور پڑ جائیں اور ماتحت ملک حکمراں ملک سے وابستہ رہتے ہوئے اندرونی خود مختاری حاصل کرلیں۔ اس کی مثال برطانوی دولت مشترکہ (جس کی ڈومینینس، آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور جنوب افریقہ، تاج برطانیہ کے وفادار رہتے ہوئے بھی اندرونی و بیرونی معاملات میں کلی طور پر آزاد تھیں)۔ دوسری مثال فرنچ یونین کی ہے۔ اس میں فرانس کی وہ سابق نوآبادیاں شامل تھیں جنھوں نے بیرونی معاملات پر فرانس کی عملداری کے ساتھ فقط اندرونی آزادی حاصل کی تھی۔ لیکن نوآبادیاتی اور سامراجی نظام کے خاتمہ کے ساتھ ان دونوں دول مشترکہ کی نوعیت بدل گئی۔ برطانوی دولت مشترکہ نے "دولت مشترکہ اقوام" کی صورت اختیار کر لی جس میں برطانوی خاندان کے ملکوں کے علاوہ ایشیا، اور افریقہ کے اکثر آزاد ممالک جو پہلے برطانیہ کے محکوم تھے، تاج برطانیہ کی وفاداری کا اقرار کیے بغیر شامل ہیں۔ فرنچ یونین اب فرنچ کمیونٹی کہلاتی ہے جس میں سابق فرانسیسی آبادیاں آزادی اور برابری کی بناء پر شریک ہیں۔ دونوں ادارے اب محض بین الاقوامی انجمن یا فورم کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی بنیاد باہمی جذباتی لگاؤ اور تعاون و خیر سگالی کی امنگ ہے۔ ان انجمنوں کے فیصلے رکن ملکوں پر قطعاً واجب الاطاعت نہیں ہوتے۔

برطانوی دولت مشترکہ کا تصور اصلاً غیر متعین تھا۔ سلطنت برطانیہ (برٹش امپائر) سے امریکی نوآبادیات کی علاحدگی اور 1838 میں کینیڈا کی بغاوت کے بعد برطانیہ نے اپنی ان نوآبادیات کو، جہاں اس کی نسل کے لوگ آباد تھے، اندرونی خود مختاری دے دی۔ اسے "ڈومنین کا درجہ" کہا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا اور جنوبی افریقہ، برطانوی دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے اندرونی و بیرونی معاملات میں آزاد تسلیم کیے گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایشیا و افریقہ میں برطانوی نوآبادیات کے آزاد ہونے پر انھیں بھی دولت مشترکہ میں شامل کیا گیا۔ اور "برطانوی" کا لفظ خارج کر دیا گیا۔ موجودہ دولت مشترکہ آزاد ریاستوں کی رضاکار انجمن برطانیہ کی برائے نام قیادت میں مختلف علاقوں، نسلوں اور تہذیبوں کی اقوام کا ایک فورم ہے۔ ان سب کو محض ایک جذباتی تعلق اور بین الاقوامی دوستی اور تعاون کی خواہش یکجا کرتی ہے۔ اس کا قیام 1926 میں عمل میں آیا۔ فی الوقت اس کے 54 ارکان ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا کی تیس فیصد آبادی کو محیط ہیں۔ یہ سبھی ملک برطانیہ کی سابق نوآبادیاں ہیں۔ جدید دولت مشترکہ کی موجودہ شکل 1947 میں ہندستان اور پاکستان کا داخلے کے بعد واضح ہوئی۔ آئرلینڈ نے 1948 میں جنوبی افریقہ نے 1961 میں، پاکستان نے 1972 میں اور فجی نے 1987 میں دولت مشترکہ کی رکنیت ترک کر دی تھی لیکن پاکستان نے 1989 میں، جنوبی افریقہ نے 1994 میں، فجی نے 1997 میں اس میں دوبارہ شمولیت اختیار کرلی جسے انسانی حقوق کی پامالی کرنے کے سبب 1995 میں دولت مشترکہ سے برخاست کردیا گیا تھا۔ دولت مشترکہ کے سربراہاں حکومت کی کانفرنس مختلف راجدھانیوں میں منعقد ہوتی ہے۔ دولت مشترکہ کا کوئی تحریری آئین نہیں ہے۔ اس کے ارکان دولت مشترکہ کے اعلانیہ کے ان اصولوں اور آدرشوں کو تسلیم کرتے ہیں جس کی توثیق 1971 میں سنگاپور کی کانفرنس نے کی تھی۔ اسی طرح سربراہان مملکت نے 1977 میں نسلی امتیاز، 1979 کے لوساکا کانفرنس میں نسلی تفریق 1981 میں ملبورن میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تعلقات 1982 میں نئی دلی میں اقتصادی عمل، اسی سال علاقہ میں داخلی تحفظ، 1985 میں عالمی نظام، 1989 میں وانکوور میں عالمی تجارت، 1991 میں ماحولیات، اسی سال ہرارہ اعلانیہ میں نسلی تفریق، اوٹاوہ اعلانیہ میں خواتین اور 1993 میں کثیرالجہت تجارت سے متعلق تجاویز منظور کیں۔ 1959 سے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کی سالانہ نشستوں سے پہلے وزرائے مالیات کی نشست ہوتی ہے جس میں مختلف موضوعات پر بحث ہوتی ہے — سربراہوں کی کانفرنسوں میں باقاعدہ فیصلے نہیں لیے جاتے، صرف بین الاقوامی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ دولت مشترکہ کے فیصلوں اور اس کے امدادی منصوبوں کو نافذ کرنے کے لیے لندن میں "دولت مشترکہ کا سکریٹریٹ" کام کرتا ہے۔ ویسے دولت مشترکہ کا نہ تو کوئی منشور ہے، نہ معاہدہ ہے اور نہ ہی کوئی دستور ہے۔ اس کا سکریٹریٹ ہی مرکزی تال میل کا ادارہ ہے جو تعاون، مشاورت اور باہمی امداد کا ذریعہ ہے۔ اس کا قیام 1965 میں عمل میں آیا تھا۔ یہ حکومتوں کے مابین نشستوں کا اہتمام اور تعاون کے پروگراموں کا انتظام کرتا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دین: اس کی جمع ادیان ہے یہ لفظ کئی معنوں کے لیے آتا ہے۔

(1) مذہب و شریعت طریقۂ زندگی (2) اطاعت و فرماں برداری (3) ملکی قانون

قرآن مجید میں ان سب معنوں میں دین کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن یہ جب مطلقاً بولا جاتا ہے تو اسے مذہب و شریعت مراد ہوتے ہیں اس مفہوم میں یہ ہر مذہب و ملت کے لیے رائج ہے لیکن قرآن مجید نے جہاں الدین کہا ہے وہاں اس سے مقصود اسلام ہے یہ وہ دین ہے جس کو خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت اور ان کو زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ بتانے کے لیے بھیجا تھا تمام انبیا اس دین خالص کی دعوت و تبلیغ کرتے رہے ہیں اور یہ ازل سے خدا کا سچا دین ہے اس کی پیروی اور اسی کی خاطر جینے مرنے کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب نے اپنی اپنی اولاد کو کی تھی مگر بعد میں لوگوں نے اس میں تحریف کی اور یہودیت وغیرہ کے فتنے کھڑے کر دیے اور اعتدال سے ہٹ گئے۔

دیوالیے سے برأت: ایک قرض دار عدالت سے حکم دیوالیہ صادر ہونے کے بعد عدالت کی مقرر کردہ مدت میں دیوالیے سے برأت کی درخواست دے سکے گا عدالت اس درخواست پر ایک تاریخ مقرر کرے گی اور قرض خواہوں کو اور اگر کوئی رسیور مقرر ہوا ہے تو نوٹس دے گی کہ اس متعلق اگر کوئی عذر ہے تو پیش کیا جائے اور عذرات کی سماعت کے بعد برأت کی درخواست منظور یا نامنظور کرے گی اور حکم دیوالیہ کی تعمیل کو ایک معینہ مدت تک کے لیے ملتوی کرے گی اور برأت کا حکم چند شرائط کے ساتھ دے سکے گی۔

عدالت ایسی صورت میں برأت کا حکم دینے سے انکار کرے گی جب کہ قرض دار کی جائداد کی مالیت اس کی ادا شدنی رقمی ذمہ داری سے نصف سے کم ہو بجز اس کے کہ قرض دار یہ بات عدالت پر واضح کر دے کہ اس کی جائداد کی مالیت اس کی ادا شدنی رقمی ذمہ داری سے نصف سے کم ان حالات کی وجہ سے ہوئی ہے جو اس کے اختیار سے باہر تھے۔ حسب ذیل صورتوں میں بھی عدالت دیوالیے سے برأت کا حکم دینے سے انکار کر سکے گی۔

(1) جب قرض دار نے اپنے کاروبار کے متعلق ضروری حساب کتاب نہ رکھا ہو۔

(2) جب قرض دار نے اپنی جائداد کی کمی کے بارے میں کوئی خاطر خواہ وجہ نہیں بتلائی ہو جس کے نتیجے کے طور پر وہ اپنا قرض ادا نہ کر سکا۔

(3) جب قرض دار نے دیوالیہ ہونے کے بعد بھی اپنا کاروبار جاری رکھا ہو۔

(4) جب قرض دار سابق میں کسی وقت دیوالیہ قرار دیا جا چکا تھا یا اس نے اپنے قرض خواہوں سے کسی اور طور پر معاملت کر لی ہو۔

امور بالا کے متعلق رائے قائم کرتے وقت عدالت رسیور کی رپورٹ کو پیش نظر رکھے گی۔ عدالت کے کسی حکم برأت کی بناء پر دیوالیہ شخص ذیل کی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہ ہو سکے گا:

(1) وہ قرض جو گورنمنٹ کو واجب الاد ہو۔

(2) ایسے قرض کی ذمہ داری جو اس پر اس عمل کی بنا پر عائد ہوئی جس کے ذریعہ اس نے کسی کو دھوکہ دیا ہے یا جعل سازی سے کام لیا ہے برأت کا حکم دینے کے بعد قرض دار جو دیوالیہ قرار دیا گیا ہو اس ذمہ داری سے سبک دوش متصور ہوگا جو اس پر عائد ہوتی ہے۔

دستاویز کی تاریخ گریگورین کیلنڈر کے مطابق شمار کی جائے گی۔

قانون کے اغراض کے لیے تمام دستاویزات کے متعلق یہ متصور ہوگا کہ وہ گریگورین کیلنڈر کے مطابق لکھی گئی ہیں:

آسائش کی تعریف قانون آسائش ہند کی دفعہ 4 میں اس طرح کی گئی ہے کہ جو حق کسی شخص کی اپنی جائداد سے متمتع ہونے کے لیے دوسرے شخص کی جائداد پر حاصل ہوتا ہے وہ حق آسائش کے نام سے موسوم ہے۔ جائداد میں آراضی اور جو اشیاء آراضی سے ملحق ہوں داخل ہے اور لفظ تمتع میں صریحی فائدہ یا بعہدہ منفعت یا مملکت البقاء تمتع داخل ہے۔

ان احکام پر کسی رواج کو ترجیح حاصل نہ ہوگی۔

تمتع جو مزاحمت کی متحمل نہ ہو بنا آسائش قرار نہیں پا سکتی ہے۔

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ بیس سال تک کسی حق سے متمتع ہونے کے بعد وہ حق قطعی طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن یہ تعبیر صحیح نہیں ہے۔ ارجاع دعوے سے دو سال پہلے استفادہ جاری رہنا ضروری ہے دعوئی رجوع ہونے کے دو سال قبل اگر نزاع یا مزاحمت ہوئی ہو تو حس آسائش کا ادعا نہ ہو سکے گا۔ صرف زمانہ قدیم سے تمتع کا ہوئے رہنا کافی

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

286

نہیں ہے کہ حق کی قرارداد کے لیے ایسے تمتع کا تاریخی دعوے سے دو سال کے اندر تک ہوتے رہنا لازمی ہے۔

دیہی حکومت مقامی (Rural Local Government): ہر مقامی حکومت چاہے وہ دیہی ہو یا شہری اپنے اپنے علاقے کے نظم و نسق کے لیے ذمہ دار ہوتی ہے۔ دیہی علاقوں میں مقامی نظم و نسق بلاک پنچایت، ڈسٹرکٹ بورڈ یا میونسپل کمیٹی کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے اور اس مقامی انتظامیہ میں دہاں کے باشندوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہ مقامی ادارے خود مختار ہوتے ہیں اور اپنی انتظامی ضرورتوں کے مطابق اصول و ضوابط وضع کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ مقامی ادارے اپنے انتظامی اخراجات کے لیے پبلک پر ٹیکس عاید اور وصول کر سکتے ہیں۔ ایسے اداروں کو مرکزی حکومت سے بھی گرانٹ ملتی ہے۔ یہ ادارے اپنی آمدنی کو علاقائی باشندوں کے مفاد اور ایسی بہتر سہولتوں کی فراہمی کے لیے خرچ کر سکتے ہیں جن کی نوعیت مقامی ہو۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مقامی انتظامیہ وہی ٹیکس عاید اور وصول کر سکتی ہے جس کی اجازت قانوناً انھیں دی گئی ہو۔ مجالس مقامی اپنی ذمہ داریاں مرکزی یا ریاستی حکومت کی دخل اندازی کے بغیر انجام دے سکتی ہیں کیونکہ انھیں یہ اختیارات قانونی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ مقامی حکومت یا انتظامیہ کا تصور نہایت قدیم ہے اگرچہ تب اس وقت اس کے انصرام کار کے طریقے مختلف تھے۔ بڑے شہروں میں ایسے ادارے میونسپل کمیٹی، میونسپل کارپوریشن یا مختلف ترقیاتی بورڈوں کے طور پر قائم تھے، جہاں مختلف مکاتب خیال کے نمائندے نامزد یا منتخب ہو کر شہر کے مسائل کے بارے میں غور و فکر کرتے اور ان کا حل ڈھونڈتے تھے۔ ایسے اداروں کا اعلیٰ عہدیدار کمشنر، ایڈمنسٹریٹر، ڈائرکٹر وغیرہ کہا جاتا ہے۔ منتخب امیدواروں کی کمیٹی کا اعلیٰ عہدیدار صدر یا میئر کہلاتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہندوستان میں قدیم زمانے میں ہر موضع میں ایک پنچایت یا مجلس مقامی قائم تھی۔ اب بھی ملک کے بیشتر آبادی گاؤوں میں بستی ہے، اگرچہ آج کل روزگار کی تلاش میں دیہی آبادی کا کچھ حصہ شہروں میں منتقل ہوتا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں اس نوعیت کی مجلس مقامی زیادہ مؤثر ان معنوں میں تھی کہ موضع کے بیشتر مسائل یا تو نجی طور پر خاندان کا سربراہ طے کرتا تھا یا علاقے کے معزز حضرات موضع میں بسنے والے خاندانوں کے سربراہوں کے ساتھ مل کر غور و فکر، تبصرے اور بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ کرتے تھے۔ طریقہ جمہوری تھا۔ موضع کے مقتدر لوگوں کے باعث اتنا سرمایہ جمع ہو جایا کرتا تھا کہ وہ اپنے ان فیصلوں پر عمل در آمد بغیر کسی مرکزی گرانٹ کے کر سکتے تھے، جن کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جاتی تھی۔ محصولات مقامی نقد یا جنس کی شکل میں وصول کیے جاتے تھے۔ مواضعات میں وقف جائدادیں بھی تھیں جن کی آمدنی سے مختلف رفاہی کام، رفاہی ادارے، دواخانے اور اسکول چلائے جاتے تھے۔ وہ تمام لیڈر جو آزادی کے بعد برسر اقتدار آئے انھوں نے ان ہی پرانے اصولوں کا احیاء کیا تاکہ قدیم تہذیب و ثقافت کی خوبیوں سے آج بھی مستفیض ہوا جا سکے۔

دیہی سماجیات (Rural Sociology) : دیہی سماجیات، سماجیات مضمون کا وہ میدان ہے جس میں غیر شہری اور غیر قبائلی انسانوں کی اجتماعی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سماجیات کے اس میدان میں داخل ہونے سے پہلے دیہی سماج کو سمجھنے کی کوئی باضابطہ روایت نہ تھی۔ اکثر اوقات ماہر معاشیات پٹواری کے رجسٹر اور مردم شماری (Census) کی رپورٹ کے اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنی تھیوری کو پروان چڑھاتے تھے۔ اس قسم کی رپورٹ ایک بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی سماجی حقیقت کو شعور کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتی تھی مگر ایک چھوٹے علاقے کا باریک بینی سے تجزیہ جس میں چھوٹے چھوٹے مشاہدات اور تفصیل ہو اس کی گرفت سے باہر تھی۔ ملک کے منصوبہ بنانے والے افسران اس طرح کی رپورٹ کا استعمال تو کرتے تھے مگر انسانی زاویہ اس رپورٹ سے باہر رہتا تھا۔ دیہی سماجیات نے اس کمی کو پورا کیا اور ہماری توجہ دیہات کی اس سچائی کی جانب مبذول کرائی جس میں گاؤں کی جماعت (Community) کو ایک اکائی کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس پر مشاہدہ کی بنا پر تحقیق کی۔ 1955 وہ اہم سال ہے جس میں دیہی سماج پر سماجیات کی بے شمار کتابیں منظر عام پر آئیں۔ شیاما چند دوبے، مجمدار، میکم میریٹ، م.ن. سری نواس وغیرہ قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس میدان میں فیلڈ ورک (Field work) اور مشاہدے کی بنا پر دیہی سماج کی تحقیق کی۔

ہندستان میں دیہی سماجیات کے میدان میں انسانی سماج سے متعلق مختلف نکتے سامنے آئے۔ مثلاً سری نواس نے سنسکری ٹائزیشن (Sanskritization) کے تصور سے یہ سمجھانا چاہا کہ جب موسوم کی گئی نچلی ذات کے لوگوں کی زندگی میں سماجی اور معاشی بہتری آتی ہے تو ان کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

طریقوں میں مختلف تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اپنے مذہبی فکر و عمل میں اپنے سے بڑے ذات کے لوگوں سے مشابہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ سری نواس نے یہ بھی بتایا کہ اونچی ذات کے لوگوں میں جب تبدیلی واقع ہوتی ہے تو وہ مغربی کلچر کے اثر کو زیادہ قبول کرتے ہیں۔

اس عمل کو سری نواس نے Westernization یا مغرب زدگی کا نام دیا۔ انھی تحقیقات میں یہ بات بھی صاف طور سے سامنے آئی کہ مختلف ذات برادری کے لوگ سماجی درجہ بندی کی صورت اختیار کرتے ہیں اور کچھ خاص حالات میں کسی ایک ذات کو سماجی، معاشی اور ثقافتی بالادستی حاصل ہوجاتی ہے۔ ان تحقیقات نے ایک دلچسپ بحث کا بھی آغاز کیا۔ کیا گاؤں پورے ملک کی نمائندگی کرسکتا ہے؟ کیا ہندستان میں ہر گاؤں ایک ہندستانی گاؤں کہلا سکتا ہے؟ اس بحث کے نتیجے میں کچھ باتوں کی وضاحت ہوئی مثلاً یہ کہ ہر گاؤں کی ایک مخصوص شخصیت ہوتی ہے، اس کی زندگی کا ایک خاص ڈھانچہ ہوتا ہے اس میں خاندانی رشتوں کا تانا بانہ ہوتا ہے۔ مختلف ذاتوں کا مرکب، کچھ ذاتوں کی بالادستی اور سماجی قیادت کی ایک خاص شکل ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ شمالی اور جنوبی ہندستان کے گاؤں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مہاراشٹر کے کچھ گاؤں میں والدین احتراماً اپنی بیٹیوں کے پیر چھوتے ہیں جبکہ راجستھان میں بیٹیاں اپنے والدین کے پیر چھوتی ہیں۔ اسی طرح راجستھان کے میواڑ علاقے میں تیلی مٹھائی بھی بناتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹھائی اونچی ذات کے برہموں کو قابل قبول ہوتی ہے مگر جنوبی ہندستان کے کچھ علاقوں میں تیلی کی بنائی ہوئی مٹھائی برہموں کو قابل قبول نہیں ہوتی۔ اس طرح کے بے شمار فرق گنائے جاسکتے ہیں۔

دیہی سماج پر کی گئی تحقیقات سے ایک اور بات کی وضاحت ہوئی اور وہ یہ کہ ذات پات کے نظام کی جو تصویر مذہبی کتابوں میں ملتی ہے وہ حقیقی زندگی سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً کتابی شعور سے ذات پات کا نظام چار ورنوں میں بٹا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر دراصل گاؤں میں لوگ بے شمار جاتیوں میں بٹے ہوئے دکھائی دیے۔ کتابی تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک ذات پورے ہندستان کے لیے اونچی ذات ہے جبکہ سماجیات کی تحقیقات نے بتایا کہ ذات پات کی درجہ بندی اور کسی ایک ذات کی بالادستی کی شکل ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں مختلف ہوجاتی ہے۔

میواڑ میں روایتی طور پر دائی کا رول نائی کی بیوی کیا کرتی تھی جسے نائین کہا کرتے تھے مگر جنوبی ہندستان میں بچے کی پیدائش ایک ذات سے متعلق نہیں بلکہ دو ذاتوں سے ہوتی تھی اور نائن اس وقت بچے کے معاملات سنبھالتی تھی جب اس کو مذہبی طور پر ایک پاک صاف کیا جاچکا ہوتا تھا۔ جنوب اور شمال ہی نہیں ایک علاقے سے دوسرے علاقہ خاصا مختلف ہوجاتا ہے جب ہم زندگی کے مختلف پہلوؤں کا موازنہ کریں۔ مثلاً زبان، لہجہ، اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ، لباس، مذہبی رسومات، رشتہ داروں کے نام، حتیٰ کہ معاشیات میں بھی زمیندار اور نوکر کا تعلق اپنے سماجی اور ثقافتی تفصیل میں جگہ جگہ تبدیل ہوجاتا ہے۔

ورن اور جاتی میں اگر کوئی بات مشترک ہے تو وہ نابرابری یا آپسی درجہ بندی ہے ورنہ کسی بھی علاقے میں ذات پات کا نظام کوئی ساکت جامد حقیقت نہیں ہے بلکہ اس میں بلا کا تغیر اور غیر یقینی پن ہے۔ کسی بھی ذات کے لوگ اکثر یہ بحث کرتے ہوئے پائے جائیں گے کہ ان کی حیثیت کسی بھی دوسری ذات کے مقابلے میں اونچی ہے۔ اس بحث کا سماجی پہلو یہ ہے کہ کوئی بھی ذات ایک لمبے عرصے پر اپنی حیثیت بدلتی رہتی ہے اور اپنے طریقوں میں اس قدر تبدیلی لے آتی ہے کہ وہ اپنی پرانی سماجی شکل سے یکسر مختلف ہو جاتی ہے۔ اگر دیہی سماج کے مختلف گروہوں کو نابرابری کی سیڑھی پر چسپاں کیا جاسکے تو ایک ذات کسی ایک مقام پر بہت دیر ٹھہری نہیں رہتی بلکہ اوپر یا نیچے چلی جاتی ہے اور اک ہی ذات جو کسی ایک علاقے میں اونچا یا نیچا، بہتر یا بدتر مقام پر ہوتی ہے اسی ذات کا دوسرے علاقے میں کوئی ضروری نہیں کہ وہی مقام ہو۔

دیہی سماج پر کی گئی تحقیقات مستقبل کے مؤرخوں کے لیے دیہی سماجی زندگی سے متعلق مشاہدات اور اعداد و شمار کا خزانہ فراہم کرتی ہے اور یہ تفصیلات ان سیاحوں کے بیانات سے مختلف ہیں جو انھوں نے بھاگتے دوڑتے حاصل کیے۔

دیہی سماج کی کتابی تصویر اور اصل فیلڈ کی تصویر کا فرق دراصل اصول اور حقیقی عمل کا فرق ہے۔ مذہب کے سماجی استعمال میں افراد کا رویّہ اور عمل کیا ہوتا ہے اور مذہبی کتاب کی رو سے کیا ہونا چاہیے۔ یہ فرق خصوصی طور پر دیہی سماجیات نے بہت واضح طور پر اپنی مختلف تحقیقات میں پیش کیا۔ مشہور ماہر سماجیات ایم.این. سری نواس 1948 میں ایک گاؤں کے مندر میں گاؤں کے بزرگوں کے ساتھ ایک مذہبی رسم کو دیکھنے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گیے۔ یہ بزرگ بارش کے دیوتا "باساوا" سے بارش کے سلسلے میں مشورہ کرنے گیے۔ رسم کچھ اس طرح شروع ہوئی کہ پہلے پجاری نے سنسکرت زبان میں منتر پڑھنے شروع کیے اور پھر گاؤں کے بڑے لوگوں نے ایک ایک کرکے اس دیوتا سے سوال کرنے شروع کیے۔ خصوصاً وہ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ آنے والے کچھ دنوں میں کیا بارش ہوگی یا نہیں۔

ایم.این. سری نواس متوقع تھے کہ معتقدین اپنے عمل میں کچھ ویسا ہی کریں گے جیسے اونچی ذات کے لوگ دوسرے گاؤں میں کرتے ہیں یعنی سر جھکائے، ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں گے، آنکھیں بند ہوں گی اور بہت احترام سے اپنے الفاظ کی ادائیگی کریں گے۔ جس میں اس دیوتا کے تئیں خوف ہوگا اور اس پر مکمل انحصار ہوگا۔ ایم.این. سری نواس نے لکھا کہ ان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب انھوں نے دیکھا کہ لوگوں نے ان الفاظ کا استعمال کیا جو دو برابر لوگ ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لہجے میں غصہ تھا، وہ دیوتا پر چیخ رہے تھے ان کی باتوں میں طعنے اور تشنے تھے اور حد تو یہ ہے کہ انھوں نے غصے کے عالم میں یہ کہا کہ انھیں اس دیوتا سے زیادہ حکومت پر اعتماد ہے۔ اس مشاہدے میں ایم.این. سری نواس نے یہ نوٹ کیا کہ وہ لوگ بلا کے سنجیدہ تھے۔ یہ لکھنے کے بعد سری نواس نے یہ سوال کیا کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے اگر اس کا موازنہ ایک پڑھے لکھے شہری ہندو کے خیالات سے کیا جائے تو انسان اور خدا کی دو الگ الگ تصویریں سامنے آتی ہیں۔

کتابی تصویر اور سماجی حقیقت کی اصل شکل دیہی سماج کے ایک شعبے میں نہیں بلکہ ہر پہلو میں اجاگر ہوتی ہے۔ مثلاً عام طور سے مذاہب کے بارے میں الگ الگ تصور قائم کر لیا جاتا ہے مثلاً اسلام اور عیسائیت مذہب کی تبدیلی میں پیش پیش رہتے ہیں جبکہ ہندو مذہب کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مذہب کی یہ تصویریں بھی فقط کتابی ہیں اور سماجی تحقیق سے حاصل کیا گیا مواد ہمیں بتاتا ہے کہ برتنے کی سطح پر مذہبی لوگوں کا رویہ الگ الگ حالات میں مختلف ہوتا ہے۔

دیہی سماجیات کے مختلف مقالات ہمارے ملک کی سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی تاریخ کو اجاگر کرتے ہیں۔ دیہی سماجیات کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گاؤں کی زندگی میں تسلسل اور تبدیلی کی مختلف تصویریں ہمیں اس بات کی بھی جانکاری دیتی ہیں کہ آزاد ہندستان میں حکومت کی منصوبہ بند پلان اور پالیسیوں کا علاقائی سطح پر کیا اثر ہوا۔ دیہی سماجیات سے ہمیں اس بات کی بھی آگاہی ہوتی ہے کہ ہندستان کی تاریخ میں پہلی بار گاؤں کی زندگی میں روایت سے انحراف ایک انقلابی صورت میں ممکن ہوپایا۔ سروے اور مشاہدے کی بنا پر کی گئی تحقیقات ہمیں نہ صرف مستقبل کی جانب بڑھنے کے لیے بہتر شعور دیتی ہیں بلکہ یہ اطمینان بھی کہ آنے والے عہد میں تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا آسان نہ ہوگا۔

ڈ

ڈارون۔ چارلس رابرٹ ڈارون (Charles Robert Darwin, 1809-1882) : چارلس رابرٹ ڈارون مشہور انگریز سائنس داں گزرا ہے۔ جس نے انیسویں صدی میں دنیائے فکر میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ ابتداً اس کا ارادہ طب کا مطالعہ کرنے کا تھا۔ لیکن بہت جلد اس نے محسوس کیا کہ اس پیشہ اور فن سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ بعد میں اس نے مذہبی تعلیم کی طرف توجہ دینے کی کوشش کی لیکن اس سمت میں بھی اسے خاطر خواہ دلچسپی نہیں ہوئی۔ فطرتاً ڈارون فطرت سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا اور اپنے ماحول میں حیات کے ہر مظہر کو بغور دیکھتا رہتا تھا۔ بالآخر اسے ایک جہاز پر دنیا کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ یہ مشہور جہاز 'دی بیگل' (The Beagle) تھا۔ اس پر اسے کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ لیکن چونکہ اسے فطرت کے مطالعہ کا جنون کی حد تک شوق تھا اس لیے اس نے اس مہم پر جانا پسند کیا۔ اس مہم کے دوران دنیا کے مختلف ممالک میں نباتات اور حیوانات کی مختلف اقسام کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پہاڑوں اور جنگلات پر اس نے قدیم جانوروں کی ہڈیاں بھی دیکھیں اور اس تمام مشاہدہ نے اسے حیات کے ارتقاء کے مطالعہ پر راغب کیا۔ بالآخر 1859 میں اس کی معرکۃ الآرا کتاب 'انواع حیات کی ابتدا' (Origin of Species) شائع ہوئی۔ اس کے بعد 1871 میں اسکی دوسری کتاب 'ورود انسان' (The Descent of Man) اور 1872 میں 'انسان اور حیوانات میں جذبات کا اظہار' (The Expression of Emotions in Man & Animal) شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری تصانیف اور مضامین بھی ہیں۔ ان تحقیقات کا اثر محض ظاہری حد تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی میں جتنے نظریوں کو فروغ حاصل ہوا ان سب کے پس منظر میں ڈارون کے ارتقائی نظریات کارفرما ہیں۔ بالخصوص انسانیات میں انسانی ارتقا کی پوری تفصیل ڈارون کی نظریات کے پیش نظر تیار کی گئی ہے۔ اسی طرح ہربرٹ اسپنسر نے سماجیات میں سماج کا جو عضویاتی نظریہ پیش کیا ہے وہ بھی ڈارون کے نظریات سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ ڈارون کی تحلیقات میں انسان کی زمین پر آمد اور اس کے ارتقاء کی ایک انقلابی تشریح پیش کی گئی ہے۔

سماجیات کے سلسلے میں ڈارون کا ڈائریکٹ کوئی کام نہیں ہے لیکن حیوانیات اور علم انسان کے لیے جو کچھ انھوں نے لکھا وہ بہت اہمیت کا حامل تھا اور سماجیات میں اس کا بالواسطہ دخل رہا۔ انھوں نے زندگی کی ابتدا ایک ہی سیل کے جاندار سے مانی ہے۔ آخرکار انتہا کو پہنچ کر یہ انسان اور دوسرے ترقی یافتہ جانداروں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

ان کے نظریات تمام رائج شدہ مذاہب کے خلاف تھے۔ کچھ تنگ نظر لوگوں نے ان کی مخالفت بھی کی لیکن بعد میں ڈارون کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی تحقیقات کی وجہ سے مذہب کی سماجی علوم پر گرفت ڈھیلی ضرور ہوئی۔

ہندستان میں علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈارون کی تھیوری پڑھانے کی مخالف ہوئی کیونکہ یہ مظاہر قدرت کی تشریح تھی۔ اس لیے سرسید کو طنزاً نیچری کہا گیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ مذہب نہیں بلکہ قانون فطرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ تصور بھی راج ہوگیا کہ علی گڑھ میں پڑھنے والے لڑکے بے دین ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ ڈارون، مارکس اور فرائیڈ وغیرہ کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آج ڈارون کے نظریات کے دنیا کے تقریباً ہر علم پر اثرات پائے جاتے ہیں۔

ڈائرکٹرز: کمپنی کی صرف قانونی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے انصرام کار کے لیے جو شخص مقرر کیا جاتا ہے اسے ڈائرکٹر کہتے ہیں۔ ایک سے زیادہ ڈائرکٹرز مقرر کیے جاسکتے ہیں۔ ایسی صورت میں بورڈ آف ڈائرکٹرز کہا جاتا ہے۔ پبلک کمپنی کی صورت میں ممبروں کی جنرل میٹنگ میں ڈائرکٹر کا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تقرر کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص بیس سے زیادہ کمپنیوں کا ڈائرکٹر مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ ڈائرکٹر کو کمپنی کا کم از کم ایک حصہ (Share) خریدنا ضروری ہے۔ کسی کمپنی کا ڈائرکٹر کو حصہ داران (Share Holders) علاحدہ کرسکتے ہیں۔ گورنمنٹ کے حکم سے بھی ڈائرکٹر کو علاحدہ کیا جاسکتا ہے۔ کمپنی سے کسی معاہدے کے تحت یا بورڈ آف ڈائرکٹرز کی میٹنگ میں یا میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کے تحت کسی شخص کا مینیجنگ ڈائرکٹر مقرر کیا جاسکتا ہے جو کمپنی کے تمام کاروبار کا ذمہ دار ہوگا۔

ڈائریکٹری (Directory) : کتب خانہ میں فوری حوالہ فراہم کرنے والے ماخذی مواد میں ڈائریکٹری اہم مقام رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ افراد یا اداروں کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتی ہے جس کی بدولت متلاشی معلومات ان تک پہنچ سکے۔ ڈائریکٹری کی سب سے عام فہم مثال ٹیلی فون ڈائریکٹری ہے۔ ڈائریکٹری اگر افراد کی ہے تو اس میں نام تعلیمی یا فنی صلاحیت، تجربہ، ادارہ جس سے فرد کا تعلق ہے اور اس کا پتہ مع فون نمبر درج ہوتا ہے۔ اداروں اور جماعتوں کی ڈائریکٹری میں نام کے ساتھ ساتھ ادارہ کا انتظامی ڈھانچہ اہم عہدہ داروں کے نام، دائرہ کار، خصوصیات اور پتہ درج ہوتا ہے۔

ڈائریکٹریاں اکثر سالنامہ کے طور پر سال بہ سال نئے ایڈیشن میں شائع ہوتی ہیں۔ یہ عام نوعیت کی ہوسکتی ہیں یا کسی پیشہ یا مضمون سے متعلق ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی احاطہ کے اعتبار سے یہ عالمی دائرہ کی ہوسکتی ہیں یا قومی، علاقائی یا مقامی نوعیت کی ہوسکتی ہیں۔ ان کے ناشر ادارے یا تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں۔

ڈائریکٹری کی شناخت کے لیے ضروری نہیں کہ ان کے نام میں لفظ ڈائریکٹری لگا ہو۔ ان کی شناخت اس میں درج معلومات سے ہی ہوتی ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں :

عالمی ڈائریکٹری : ورلڈ آف لرننگ (World of Learning)، لندن، یوروپا ایربک، ایربک آف انٹرنیشنل آرگنائزیشنز (Year book of International Organisation) بروسیلز، یونین آف انٹرنیشنل ایسوسی ایشنز۔

قومی ڈائریکٹری: یونیورسٹیز ہینڈ بک آف انڈیا، نئی دہلی، ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز۔

مقامی ڈائریکٹری: کمپری ہنسیو کلکتہ سٹی گائیڈ اینڈ ڈائریکٹری (Comprehensive Calcutta City Guide and Directory)

پیشہ و ہنر سے متعلق ڈائریکٹری : ڈائریکٹری آف سائنٹفک اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوشنز ان انڈیا (Directory of Scientific and Research Institutions in India) نئی دہلی، انسڈاک 1989

ڈائریکٹری اردو ناشرین و تاجران کتب مرتبہ انور دہلوی، دہلی، اردو اکادمی۔

ڈسٹرکٹ بورڈ : موجودہ پنچایت راج سے قبل ہر ضلع کے لیے ایک ڈسٹرکٹ بورڈ قائم تھا۔ عوامی فلاح و بہبود جس کی ذمہ داری تھی۔ یہ بورڈ تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے پرائمری اسکول اور مڈل اسکول قائم کرتا تھا تو ضلع کے شہریوں کی دیکھ بھال کے لیے دواخانے اور اسپتال چلاتا تھا۔ صوبہ بمبئی، بہار اور مغربی بنگال میں پنچایتوں کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور ان پر نگرانی رکھنا بھی ڈسٹرکٹ بورڈ کی ذمہ داری تھی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی آمدنی کا 40 تا 55 فیصد حصہ سرکاری گرانٹ پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرے ذرائع آمدنی بھی تھے مثلاً لوکل ٹیکس، تعلیمی اداروں کی آمدنی، محصول جائداد، محصول تفریحات، اسٹامپ ڈیوٹی پر سرچارج اور لائسنس فیس وغیرہ۔ بمبئی اسٹیٹ میں مالگذاری کا 15 فی صد ڈسٹرکٹ بورڈ کو بہ طور گرانٹ دیا جاتا تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کے تعلق سے بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کے پیش نظر ڈسٹرکٹ بورڈ کی کارکردگی تشفی بخش نہیں رہی ہے۔ پھر بھی ڈسٹرکٹ بورڈ بتدریج اضافہ شدہ امداد اور قرض کے سہارے کسی نہ کسی طرح باقی رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کی اہمیت اور کنٹری بیوشن معاشی اور معاشرتی نظام میں اتنا بھرپور نہیں رہا جتنا ابتداء میں تھا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی گرتی ہوئی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ اس کو حاصل ہونے والے سرمایہ میں کمی کے ساتھ کارکردگی میں گراوٹ اور ضلع کے رقبے کی وسعت کے پیش نظر ترقیاتی اسکیموں میں اضافہ تھا جن کی تکمیل کے لیے ذمہ دار ڈسٹرکٹ بورڈ تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پالیسی سازی اور عاملانہ اختیارات، ڈسٹرکٹ بورڈ کے صدر، نائب صدر اور اسٹینڈنگ کمیٹی میں مرکوز تھے، جس کے سبب کسی معینہ پالیسی کی تکمیل میں عملی دشواریوں کی وجہ سے ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتظامی ذمہ داروں کو دو چار ہونا پڑتا تھا۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ڈکیتی (Dacoity) : جب پانچ یا پانچ سے زیادہ اشخاص مل کر سرقہ بالجبر (رہزنی) کا ارتکاب یا اقدام کریں یا وہ تمام اشخاص جنھوں نے سرقہ بالجبر میں حصہ لیا یا اقدام کیا اور وہ اشخاص جو وہاں موجود تھے اور انھوں نے اس ارتکاب یا اقدام میں مدد کی اور ان سب کی مجموعی تعداد پانچ یا پانچ سے زیادہ ہو تو ہر شخص جو ارتکاب یا اقدام کر رہا ہو یا اس میں مدد کر رہا ہو ڈکیتی کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ ڈکیتی کے جرم کا اصل جز یہ ہے کہ سرقہ کے ارتکاب میں جبر کا استعمال کیا گیا ہو یا اس کی دھمکی دی گئی ہو۔ جبر کی دھمکی کا قیاس مجمع کی حیثیت، حالت اور طرز عمل سے کیا جاسکتا ہے۔

ڈکیتی کے لیے سرقہ یا استحصال بالجبر (رہزنی) ثابت کرنا ضروری ہے۔

ڈگریوں کا مرافعہ ثانی یا ثالث: ہر ڈگری کا جو مرافعہ اولی میں صادر ہوئی ہو۔ مرافعہ ثانی ہوسکے گا بشرطیکہ

(1) فیصلہ کسی خاص قانون یا رواج کے خلاف ہو یا

(2) فیصلہ میں کوئی اہم تنقیح متعلق قانون یا رواج یا تصفیہ نہ کیا گیا ہو یا

(3) ضابطہ مقررہ کے متعلق کوئی اہم غلطی یا نقص ہو جس سے فیصلہ روداد پر موثر وہ یا

(4) موازنہ شہادت کی وجہ یا اور اہم وجہ سے انصاف میں خلل ہوا ہو۔

درخواست مرافعہ ثانی یا ثالث کے ساتھ نقل فیصلہ ڈگری عدالت ابتدائی و عدالت مرافعہ منسلک کی جائے گی۔ باقی کارروائی اسی طرح مرافعہ اولی میں ہوتی ہے۔

ڈومینیم (Dominium): رومن لاء کی اصطلاح میں ڈومینیم کامل ملکیت کو کہتے تھے کامل ملکیت کا تصور بنیادی طور پر رومن ہے اور اس نظریہ سے مختلف ہے جس کے تحت ایک جائداد کی ملکیت کے متعلق یہ تصور تھا کہ جو زیادہ حق دار ہے اس کے قبضے اور ملکیت میں وہ جائداد رہے۔

ڈی لی سیٹ (Dlicit): رومن لاء کے جو قانونی اصول بارہ جدول میں درج ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت قانون بالکل عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ابتدا میں شخصی انتقام کے بجائے اسٹیٹ نے اس بات پر اصرار کیا کہ بجائے شخصی انتقام کے وہ شخص جسے نقصان پہنچا ہے اس شخص سے جس نے نقصان پہنچایا ہے کوئی مناسب معاوضہ حاصل کرے۔ اس طرح کسی حملے کی صورت میں اگر ایک آدمی حد سے تجاوز کرے تو دوسرے شخص کو اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بھی اسی نوعیت کا ضرر پہنچائے جتنا ضرر اسے پہنچایا گیا ہے لیکن دوسری صورتوں میں جرمانے کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے دوسرے شخص کو ایک ضرب لگائی ہو یا ایک طمانچہ مارا ہے تو اس شخص کو جسے ضرب لگائی گئی ہے بیس گدھے بطور جرمانہ ادا کرنا ہوتا تھا اور اگر کسی نے چوری کی ہے تو وہ چیز چرائی گئی ہے اس سے دو چند قیمت کی چیز اس شخص کو دینا ہوتا تھا جس سے اس نے وہ چیز چوری کی ہے لیکن اگر چور چوری کرتے وقت پکڑا جائے تو ادائگی کا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ڈیورنڈ لائن (Durand Line) : ڈیورنڈ لائن سے مراد پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلی علاقوں کو افغانستان سے جدا کرنے والی بین الاقوامی سرحد ہے۔ برطانوی عہد میں برطانیہ کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ شمال مغربی سرحد پر روس کا اقتدار نہ بڑھ جائے یا خود افغان حکومت شمال مغربی صوبہ کے اندر شورش نہ برپا کردے۔ ان اندیشوں سے مستقل نجات حاصل کرنے کے لیے شمال مغربی سرحد کی حدبندی ضروری تھی چنانچہ ایک برطانوی افسر سرمارٹمر ڈیورنڈ (Sir Martimer Durand) نے افغانستان کے حکمراں عبدالرحمٰن خاں کے ساتھ مذاکرات کرکے 1893 میں ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے سرحد پر یہ حدبندی عمل میں آئی۔ یہ سرحد شمالی گلگت سے شروع ہوکر کوہ ملک سیاہ پر، جو افغانستان، ایران اور پاکستان کی سرحدوں کا نقطہ اتصال ہے، ختم ہوتی ہے۔ ڈیورنڈ لائن کی لمبائی 1400 میل ہے۔ یہاں پانی نہیں ملتا اور ذرائع رسل و رسائل بھی ناپید ہیں۔

پاکستان برطانیہ کی جانشیں مملکت کی حیثیت سے ڈیورنڈ لائن کو پاکستان و افغانستان کے مابین بین الاقوامی سرحد تسلیم کرتا ہے۔ البتہ افغان حکومت نے 1947 میں پاکستان بننے کے بعد ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور دعویٰ کیا کہ دریائے اٹک کا علاقہ کابل کی فرمانروائی میں ہے کیونکہ بقول ان کے یہاں افغان نسل و زبان کے لوگ آباد ہیں۔ کابل کی حکومت کی شہ پر صوبہ سرحد کے کچھ رہنماؤں نے "پختونستان" قائم کرنے کا مطالبہ کیا جو بے سود رہا۔ اور آج بھی ڈیورنڈ لائن ہی پاکستان و افغانستان کے مابین بین الاقوامی سرحد ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ : کتب خانہ میں کتابوں کو ایسی ترتیب سے رکھنا کہ ضرورت پڑنے پر مطلوبہ کتاب آسانی سے ذخیرہ کتب سے نکالی جاسکے کتب خانہ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ انیسویں صدی تک جو طریقہ ترتیب عام طور پر مروج تھا اس کے تحت کتابیں کتب خانہ میں ایک متعین جگہ کی نسبت سے ترتیب دی جاتی تھیں۔ ان پر کمرہ و الماری نمبر ثبت کردیے جاتے تھے۔ اسی طرح فہرست کتب مصنف کے نام سے تیار کی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط سے جب کتابوں کی تعداد اشاعت میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوا اور کتب خانوں میں ان کی تعداد بڑھنے لگی تو مروج طریقہ اپنی سہولت و صلاحیت کھونے لگا اور درجہ بندی کتب کے متبادل طریقوں کی تلاش ہوئی۔ نتیجہ میں جو طریقے وجود میں آئے ان میں تعداد اشاعت اور مقبولیت کے اعتبار سے اعشاری درجہ بندی ضابطہ کو اولیت حاصل ہے۔

ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ ایمہرسٹ کالج کے لائبریرین میلول ڈیوی نے 1876 میں "کتب خانہ کے لیے درجہ بندی اور موضوعی اشاریہ برائے فہرست سازی و ترتیب کتب و پمفلٹ" (A Classification and Subject Index for Cataloguing and Arrangement of Books and pamphlets of a Library) کے نام سے شائع کیا۔ کتاب پر مصنف کا نام درج نہیں تھا۔ 44 صفحات کی یہ ایک مختصر کتاب تھی جس میں ایک تعارفی نوٹ اور شعبہ جات علم کا ایک گوشوار مع اشاریہ شامل تھا۔ ایک مفصل ایڈیشن جو 314 صفحات پر مشتمل تھا 1885 میں "اعشاری درجہ بندی اور نسبتی اشاریہ از میلویل ڈیوی" (Decimal Classification and Relative Index Melvil Dewey) کے نام سے شائع ہوا۔ 1931 میں ڈیوی کے انتقال تک اس کے بارہ ایڈیشن ڈیوی کی نگرانی میں اور آئندہ 1942 تک دو اور ایڈیشن میلویل ڈیوی کے قائم کردہ ادارہ لیک پلیسڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی جانب سے شائع ہوئے۔ چھوٹے کتب خانوں کی ضرورت کے پیش نظر ایک معیاری ایڈیشن 1951 میں شائع ہوا۔ سولہویں ایڈیشن سے جو پہلی بار دو جلدوں میں لائبریری آف کانگریس کے ڈی ڈی سی کسٹر کی ادارت میں 1958 میں شائع ہوا۔ اعشاری ضابطہ درجہ بندی کی ادارتی ذمہ داری امریکا کی لائبریری آف کانگریس کو منتقل ہوگئی اور اب تک اکیسواں ایڈیشن (1996) شائع ہوچکا ہے۔ بیسویں ایڈیشن سے اس ضابطہ کے مشینی مطالعہ ایڈیشن بھی دستیاب ہیں۔

فنی پہلو اور خصوصیات : ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ میں کتابوں کے موضوع کی مناسبت سے انھیں علامتی نمبر دے کر ان کی کتب خانہ میں ترتیب کو "متعین جگہ" کے بدلے "نسبتی جگہ" کا اصول پہلی بار اپنایا گیا جس کی بدولت کتابوں کی ترتیب مضمون اور موضوع کے اعتبار سے میکانکی صورت اختیار کر گئی۔ ڈیوی نے دائرہ علم کو تقسیم کرنے کے لیے ولیم ٹوری ہیرس کے وضع کردہ تقسیم علوم کو اپنایا۔ ہیرس نے فرانسس بیکن کے تقسیم علوم کو معکوسی انداز میں رکھ کر اس کی توسیع کی تھی۔ چنانچہ "یادداشت"، "تخیل" اور عقلی دلائل کے تحت جملہ علوم کو ڈیوی نے دس شعبہ جات علم یا جماعتوں میں تقسیم کیا اور ان کے لیے مضمون کی اصطلاح نہ استعمال کرکے شعبہ علم کی اصطلاح استعمال کی۔ شعبہ علم کو ظاہر کرنے کے لیے ہند-عربی اعداد بطور علامت استعمال کیے گئے ہیں اور یہ سب اعداد بطور کسور اعشاریہ استعمال ہوتے ہیں۔ ڈیوی کے تقسیم علوم کا پہلا خلاصہ عمومیات اور نوشعبہ جات علم کا احاطہ کرتا ہے۔ دوسرا خلاصہ پہلے خلاصہ کے ہر شعبہ کو مزید ایک عام اور نو مخصوص موضوعات میں تقسیم کرتا ہے اور تیسرا خلاصہ مخصوص موضوعات کو مزید دس ذیلی موضوعات میں تقسیم کرتا ہے۔ اس طرح شعبہ علم بتدریج وسیع دائرہ سے مخصوص دائرہ کی جانب بڑھتا ہے۔ اسی لیے اس ضابطہ کو "تدریجی ضابطہ" (Heirarchical Scheme) کہتے ہیں لیکن علامتی شکل ہر خلاصہ میں تین عددی ہوتی ہے۔ اس لیے پہلے خلاصہ میں عدد کے ساتھ دو صفر، دوسرے خلاصہ میں دو اعداد کے ساتھ ایک صفر لگا کر تین عددی بنایا جاتا ہے۔

پہلا خلاصہ	دوسرا خلاصہ	تیسرا خلاصہ
000 عمومیات	500 سائنس (عام مطالعہ)	510 ریاضی
100 فلسفہ	510 ریاضی	511 حساب
200 مذہب	520 فلکیات	512 الجبرا
300 سماجیات	530 طبعیات	513 جیومیٹری
400 لسانیات	540 کیمیا	514 علم مثلثات
500 سائنس طبعی علوم	550 علم طبقات الارض	515 نظری علم ہندسہ
600 فنون مفیدہ	560 علم بشریات	516 مخروطی علم جیومیٹری
700 فنون لطیفہ	570 علم حیاتیات	517 احصار
800 ادب	580 علم نباتات	518
900 تاریخ و جغرافیہ	590 علم حیوانات	519 امکانیات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تقسیم کا یہ اصول عام شعبہ علم سے جزئی اقسام تک جاتا ہے۔ اگرچہ اس تقسیم کی بنیاد کسی اصول پر نہیں بنی ہے۔ تقسیم کی اس خصوصیت کی بدولت ڈیوی درجہ بندی ضابطہ کو تقسیمی ضابطہ (Enumerative Scheme) بھی کہا جاتا ہے۔ یادداشت کی سہولت کے لیے ڈیوی اعشاری درجہ بندی میں ہر تین عدد کے بعد ایک نقطہ لگاتے ہیں۔ شعبہ علم کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ڈیوی نے پہلے ایڈیشن میں ایک جدول صوری تقسیم (Form Division) کی بھی شامل کی تھی جس میں بنیادی مضمون کے پیرایہ بیان، صوری انداز اور کسی دوسرے شعبہ علم کا ایک شعبہ علم کو وسعت دینے کے لیے استعمال کے اظہار کی وضاحت شامل تھی:

صوری تقسیم گوشوارہ

01	اصول یا فلسفہ
02	خلاصے
03	دائرۃ المعارف، لغات
04	مضامین و مقالے
05	رسائل
06	انجمنیں
07	درس و تدریس
08	مجموعے، کلیات، انتخابات
09	تاریخی بیان و مقامی حالات

آئندہ چل کر انھیں مزید وسعت دی گئی اور ہندستانی ماہر علم کتب خانہ ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن کے اصول تجزیاتی درجہ بندی سے متاثر ہوکر ڈیوی عشری درجہ بندی میں ان امدادی جدول کا نام اضافی جدول (Auxiliary Tables) رکھا گیا اور اب ان کی تعداد سات تک پہنچ گئی ہے۔ ان جدول کے علامتی نمبر بنیادی علامتی نمبروں کے ساتھ بطور لاحقہ استعمال ہوتے ہیں مثلاً:

نظری علم ہندسہ رسائل 515.05، تاریخ علم جیومیٹری 513.09

انتظامی بندوبست : ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ بارہویں ایڈیشن تک میلول ڈیوی کی ذاتی نگرانی میں تیار ہوا۔ ڈیوی نے 1924 میں لیک پلیسڈ کلب ایجوکیشن فاؤنڈیشن اس کام کی دیکھ ریکھ کے لیے قائم کیا اور 1931 میں ڈیوی کے انتقال کے بعد ادارتی کاموں میں شرکت میں اضافہ کی غرض سے 1937 میں ڈیسیمل کلاسی فکیشن ایڈیٹوریل پالیسی کمیٹی تشکیل کی گئی۔ 1953 میں اور پھر 1970 میں کمیٹی کے ممبران کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ اس کمیٹی کا کام دنیا بھر سے موصول تجاویز پر غور اور ان کو ضابطہ کے نئے ایڈیشن کے لیے قبول یا مسترد کرنا ہے۔ دو ایڈیشنوں کے درمیان ضابطہ میں ہونے والی تبدیلیوں سے ضابطہ پر کاربند اداروں کو باخبر رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً "ڈیوی اعشاری ترمیم، وضاحت و ابحاث" (D.D. Addition, Notes and Discussion) شائع کیے جاتے ہیں۔ سولہویں ایڈیشن سے ضابطہ تیار کرنے کی ادارتی ذمہ داری اب امریکا کی لائبریری آف کانگریس کی ہے۔ 1988 سے ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ کے ناشر فارسٹ پریس اب آن لائن کمپیوٹر لائبریری سینٹر (OCLC) کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔

ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ اور ہندستان : مغرب میں تیار کیے گئے ڈیوی اعشاری ضابطہ کے کسی منطقی بنیاد پر قائم نہ ہونے کی بنا پر اس کی جدول میں درج موضوعات اور ذیلی موضوعات مشرقی دنیا کے مذاہب، زبان، ادب اور ثقافت کی صحیح اور مفصل تصویر نہیں پیش کرتے جس کی وجہ سے کتب خانوں کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہندستان میں ان مشکلات کے حل کے لیے اکثر و بیشتر ان شعبہ جات علم کی جدول کی ترتیب و توسیع کی کوششیں ہوئی ہیں۔ 1935 میں انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے معروف لائبریرین محمد شفیع صاحب کو اسلامیات کے جدول کی توسیع کا کام تفویض کیا گیا۔ شفیع صاحب کی توسیع کراچی سے 1949 شائع ان کی کتاب "انتظام کتب خانہ" میں دی گئی ہے۔ ڈاکٹر انیس خورشید نے "اسلام: ڈیوی اعشاریائی تقسیم، شفیع توسیعات" کے نام سے 1977 میں کراچی سے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ سید سجاد حسین رضوی نے اپنی کتاب "لائبریری اور اس کی تنظیم" مطبوعہ 1940 میں اردو زبان و ادب کی جدول کی ایک توسیع پیش کی تھی۔ ہمدرد دواخانہ دہلی کے زیراہتمام قائم انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے محمود حسین قیصر کی مدد سے مرتب "لائبریری کلاسی فکیشن شیڈول آن اسلام اینڈ ریلیٹڈ ٹاپکس" 1970 میں شائع کی۔ پاکستان سے غنی الاکرم سبزواری نے "درجہ بندی: فلسفہ مشرق اسلام، النسا شرقیہ پاکستان" (1981) اور محمد اصغر نے "اردو زبان و ادب کی درجہ بندی" (1988) ڈیوی عشری ضابطہ کی توسیع کی ہے۔ ڈیوی عشری بندی کے نام سے محمود حسین قیصر صاحب نے ضابطہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے اختصاری ایڈیشن کا ترجمہ کیا ہے جو ترقی اردو بیورو دہلی نے 1985 میں شائع کیا۔

انڈولوجی یا ہندستانی موضوعات کی توسیع کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں۔ مکرجی نے ایک توسیع اپنی کتاب "ڈیولپمنٹ آف لائبریریز اینڈ لائبریری سائنس ان انڈیا" میں دی ہے۔ ایک کوشش انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کے سابق صدر پی این گور نے بھی کی تھی۔ بڑودہ یونیورسٹی کے پی کے مکرجی اور نیشنل میوزیم کے بال کرشن کی توسیعات "انڈین لائبریرین" نامی رسالہ کے 1963 اور 1970 کے شماروں میں شائع ہوئی تھیں۔ پانڈے ایس کے شرما نے "ڈیوی ڈیسیمل کلاسی فکیشن فار انڈولوجی وِتھ اسپیشل ریفرنس ٹو انڈین فلاسفی اینڈ انڈین لینگویجز" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی ہے۔

ڈیوی۔ جان (Dewey, John, 1859-1952):

امریکا کے مشہور ماہر تعلیم، فلسفی اور ماہر نفسیات جان ڈیوی کو فلسفہ کے نظریہ عملیت (پریگ میٹزم) کے بانیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ تفاعلی نفسیات (فنکشنل سائیکلوجی) کے مدرسہ فکر کے بانیوں میں ڈیوی کو اہم مقام حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں امریکا کے تعلیمی نظام کی اصلاحات میں بھی ڈیوی کا بہت اہم حصہ رہا ہے اور تعلیم کی ترقی پسند تحریک کے اہم مفکروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ڈیوی کا سماجی، سیاسی فلسفہ اس دور کے امریکی عوام کے صحیح جذبات اور تمناؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بیسویں صدی کی امریکی جمہوریت کا سچا نمائندہ تھا۔ 1930 میں جب پیرس یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری عطا کی تو اس کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ "امریکی ذہانت کا سب سے مکمل اور سب سے اعلیٰ نمائندہ ہے"۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اگر قومی فلاسفر کا کوئی لقب ہوتا تو وہ ڈیوی ہی کو ملتا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک انتہائی جامع شخصیت تھا۔

جان ڈیوی 20ر اکتوبر 1859 کو ایک معمولی کسان گھرانے میں امریکا کے ایک مقام برلنگٹن میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم برلنگٹن ہی میں حاصل کی اور اس کے بعد ورمان یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اور یہاں سیاسیات، معاشیات، فلسفہ اور مذہب میں تعلیم حاصل کی۔ شروع ہی سے اسے کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے ماں باپ بھی اس میں اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ڈیوی نے تین سال تک ہائی اسکول میں مدرسی کی اور 1882 میں فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ بالٹی مور کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس کا سابقہ پروفیسر جارج سلوسٹر مارس سے پڑا جو فلسفہ نوہیگلیت (نیو ہیگلن ازم) کا استاد تھا۔ سنہ 1884 میں یہاں سے اس نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد مِچی گن یونیورسٹی میں فلسفہ اور نفسیات کا استاد مقرر ہو گیا۔ 89-1888 میں وہ مینوسٹا یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر بھی رہا لیکن اس کے بعد دس سال اس نے اس مِچی گن یونیورسٹی ہی میں استاد کے طور پر صرف کیے۔ اس دوران اس نے سارا وقت ہیگل اور برطانیہ کے نوہیگل فلسفیوں کے مطالعہ پر صرف کیا۔ اسی زمانہ میں امریکا میں نئی تجرباتی عضویاتی نفسیات کا چرچا شروع ہو چکا تھا۔ ڈیوی نے اس کا بھی مطالعہ کیا۔

مِچی گن کے قیام کے دوران ڈیوی نے 1886 میں اپنی ایک شاگردہ ہیربٹ ایلس چپ مین سے شادی کر لی اور اسی کے اثر سے وہ سماجی اور تعلیمی مسائل میں بھی دلچسپی لینے لگا۔

1894 میں ڈیوی نے مِچی گن چھوڑ دیا اور شکاگو یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ، نفسیات اور تعلیم کا پروفیسر اور صدر مقرر ہوا۔ اسے یہ نیا کام اس لیے بھی زیادہ پسند آیا کہ اس کا تعلق نہ صرف فلسفہ بلکہ نفسیات اور تعلیم سے بھی تھا۔ یہاں اس نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ارتقائی حیاتیات اور نفسیات سے اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے زیر اثر اب اس نے ہیگل کے فلسفہ کو ترک کر دیا اور علم کا ایک آلاتی نظریہ اختیار کیا جس کے تحت اطراف کے ماحول میں پیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے خیالات و تصورات کو ایک آلے یا اوزار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈیوی نے بعد میں چل کر ہیگل کے مطلق ذہن کے تصور کو بھی رد کر دیا اور اس کی جگہ اصلیت یا حقیقت کا ایک نیا اور قابل قبول نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق سائنٹفک اور معمولی تجربات میں ہمیں جس نیچر سے سابقہ پڑتا ہے وہی اصل حقیقت ہے۔ اس کے نزدیک انسان نیچر ہی کی ایک پیداوار ہے اور زندگی کے معنی اور منزل وہ اپنے دوران حیات ہی میں پا لیتا ہے۔

یہ خیالات اور نظریات آگے چل کر ڈیوی کی فلسفیانہ سرگرمیوں کے مرکز بن گئے اور ان ہی کے اطراف ڈیوی اور شعبہ فلسفہ کے اس کے ساتھیوں نے اپنا تحقیقاتی کام منظم کیا۔ 1903 تک فلسفہ کا یہ مکتب خیال

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اس سال جب ڈیوی اور اس کے سات ساتھیوں نے مضامین کا ایک مجموعہ "مطالعہ نظریہ منطق" (Studies in Logical Theories) شائع ہوا تو مشہور فلسفی ولیم جیمس نے زوردار الفاظ میں اس کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ ایک نئے مدرسہ فکر "شکاگو مدرسہ فکر" نے جنم لیا ہے۔

نفسیات میں بھی ڈیوی کا کام کافی قابل قدر ہے۔ اس موضوع پر جو مضامین اس نے لکھے تھے انھیں اب کلاسکی مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ نفسیات کی تاریخ میں ڈیوی کو ہمیشہ اہم مقام حاصل رہے گا۔ نفسیات پر اس کے ایک مضمون "اضطرایہ ایک تصور نفسیات ہو" (The Reflex are Concept of Psychology) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس سے گویا تفاعلی نفسیات (Functional psychology) کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں مکمل عضویہ (Total Organism) کے اپنے ماحول سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ تعلیم سے متعلق ڈیوی کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک مدرسہ اور سماج (School and Society) اور دوسرے "بچہ اور تعلیمی نصاب" (Child and Educational Syllabus) جس میں اس نے تعلیم پر اپنے فلسفہ سے بحث کی ہے۔ ان میں یہی بتلایا ہے کہ تعلیم کی شروعات بچے کی دلچسپی سے ہونی چاہئے اور اس پر آئندہ تعلیم کی بنیاد رکھنی چاہئے۔ دوسرے اپنی کلاس کے تجربات سے سوچنے اور عمل کرنے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تال میل کا موقع بچے کو ملنا چاہئے۔ تیسرے اسکول کی تنظیم اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ ایک چھوٹی کیونٹی بن جائے۔ چوتھے استاد کو ساتھی اور رہنما ہونا چاہئے، ایک سخت گیر ماسٹر نہیں جو مقررہ سبق پڑھاتا ہے اور رٹاتا ہے۔ پانچویں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم ہر سمت اور ہر پہلو ترقی کرے۔

تعلیم کے شعبہ میں ڈیوی کی عملی سرگرمیوں میں سے ایک یہ تھی کہ اس نے ایک شعبۂ تعلیم قائم کیا اور ایک تجرباتی اسکول بنایا جس میں تعلیم سے متعلق فلسفیانہ اور نفسیاتی اصولوں کو جانچا جا سکتا تھا۔ یہ اسکول جنوری 1896 میں قائم ہوا تھا۔ اس نے دور دور شہرت حاصل کر لی تھی اور ترقی پسند نقطہ نظر کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ اس نے شکاگو یونیورسٹی کا وقار بھی بہت بلند کر دیا تھا۔

شکاگو کے قیام کے زمانہ میں ڈیوی کو ان زبردست سماجی تبدیلیوں کے مطالعہ کا بھی موقع ملا جو اس وقت وہاں کی زندگی میں رو نما ہو رہی تھیں۔ اسی زمانہ میں شکاگو کی غریب مزدور بستیوں میں ایک بستی ہل ہاوس نامی تھی۔ ڈیوی اس کا ایک ٹرسٹی بھی تھا۔ یہاں اسے غریب تارکین وطن اور اقلیتوں کی تباہ حالی اور ان کی لوٹ کھسوٹ کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور اس نے دوسرے لبرل رہنماؤں کی طرح ان کے حقوق کی حفاظت اور اجارہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف قوانین بنانے کی جدوجہد میں بہت آگے بڑھ کر حصہ لیا۔

1904 میں شکاگو یونیورسٹی کے صدر سے اختلاف کی بنا پر ڈیوی نے اس یونیورسٹی سے استعفی دے دیا اور کولمبیا یونیورسٹی، نیویارک میں فلسفہ کی پروفیسری قبول کر لی۔ کولمبیا یونیورسٹی کے ساتھ اس کا تعلق 47 سال رہا۔ پہلے پروفیسر کی حیثیت سے بعد میں اعزازی پروفیسر کے طور پر۔ اس دوران وہ امریکا کا سب سے مقبول اور باأثر پروفیسر بن گیا اور ہزاروں طالب علم اس کے شاگرد بننے اور اس کے لکچر سننے کے خواہش مند رہتے تھے۔

کولمبیا کے دور میں اس کی سرگرمیاں درس و تدریس تک محدود نہیں تھیں۔ بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی تصنیفات کی فہرست صرف 125 صفحوں پر مشتمل ہے۔ منطق، نظریہ علم، نفسیات، تعلیم، سماجی فلسفہ، فنون لطیفہ، مذہب غرضیکہ کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جس پر اس نے نہ لکھا ہو۔ اس نے اسے امریکا کا سب سے بڑا فلسفی اور مصنف بنادیا۔ ان کے علاوہ رسالہ نیو ریپبلک میں وہ حالات حاضرہ پر مضامین لکھا کرتا تھا جن میں اندرونی اور بین الاقوامی حالات پر تبصرے ہوتے تھے جو انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

ڈیوی صرف صاحب قلم ہی نہیں تھا۔ وہ ان تمام اداروں کی عملی مدد کرتا تھا جن کے مقاصد سے اسے دلچسپی ہوتی۔ وہ امریکی یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کی انجمن کا بانی اور پہلا صدر تھا۔ اور شہر نیویارک کے استادوں کی سب سے پہلی یونین کا بانی ممبر تھا۔ شہری آزادی کی یونین، صنعتی جمہوریت کی لیگ اور عوامی لابی کا سرگرم رکن تھا۔ 1930 کے معاشی بحران کے دوران وہ امریکا کی دونوں پارٹیوں ریپبلکن اور ڈیماکریٹس کا سخت مخالف ہو گیا تھا۔ انھیں اجارہ داروں کا ایجنٹ سمجھتا تھا اور ایک تیسری پارٹی بنانے کی کوشش کرتا رہا۔

ڈیوی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ اسے جاپان، چین، جنوبی امریکا، روس اور ترکی وغیرہ مدعو کیا گیا تھا۔ ان سب جگہوں سے واپسی پر نیویارک میں اس نے مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ نہ صرف

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

امریکا کی کئی یونیورسٹیوں اور اداروں سے بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی اعلیٰ ترین اعزازات ملے۔

عمر کے آخری ایام میں جب علوم، منطق اور نفسیات نے ترقی کی تو ڈیوی کے خیالات اور نظریات بھی سخت تنقیدوں کا شکار بنے۔

ڈیوی کی صحت ہمیشہ بہت اچھی رہی اور کبھی اپنے کسی کام میں ناغہ نہیں کیا۔ اپنی نوویں سالگرہ کی تقریبات میں وہ خود شریک ہوا۔ نومبر سنہ 1951 میں گرنے سے اس کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا لیکن پڑھنے کا کام برابر جاری رہا۔ 31/ مئی سنہ 1952 کو اس پر نمونیا کا حملہ ہوا جس سے جانبر نہ ہو سکا اور یکم جون سنہ 1952 کو اس کا انتقال ہو گیا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ذ

ذات پات (Caste): ذات پات کے مسئلہ کا سماجی درجہ بندی سے گہرا تعلق ہے اور بعض سماجیات دانوں کا خیال ہے کہ تقریباً ہر بڑا سماج ذات پر مبنی گروہوں میں منقسم ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر ماہرین سماجیات اور انسانیات کا خیال ہے کہ اپنے محدود اور مخصوص معنوں میں ذات پات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی سماج سے ہے جہاں پیچیدہ سماجی نظام میں ذاتوں کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اسی لیے جب کبھی ذات پات کے مسئلہ پر بحث کی جاتی ہے تو زیادہ تر اشارہ ہندو سماج کی طرف ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ نیپال، سیلون اور جنوبی ایشیا کے بعض علاقوں میں سماج ذاتوں میں منقسم پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ماہرین نے اس اصطلاح کو بہت وسیع تر معنوں میں استعمال کرکے اسے دوسرے سماجوں پر بھی لاگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس اصطلاح کا یہ استعمال زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ذات پات کے تصور میں جو سماجی اور تمدنی مضمرات ہیں وہ ہندستانی ذات پات کے باہر دوسرے سماجوں میں اس طرح نہیں ملتے۔ اس لیے اس اصطلاح کا دوسرے سماجوں پر اطلاق درست نہیں ہے۔

ذات پات کی اصلاح کے لیے انگریزی میں Caste کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ دراصل سولہویں صدی میں ایک پرتگیز نے جو ہندستان آیا ہوا تھا۔ یہاں کی سماجی درجہ بندی کو بیان کرنے کے لیے Caste کا لفظ استعمال کیا جس سے اس کی مراد سماج کی متعین اور درجہ بند گروہوں میں تقسیم تھی۔ چنانچہ بعد میں اسی لفظ سے انگریزی زبان میں لفظ Caste ماخوذ ہوا اور مستعمل ہے۔ ہندستانی سماجی تنظیم میں ذات پات کے لیے "جاتی" کا لفظ زیادہ مستعمل ہے۔ ہندستان کا ہندو سماج ہزاروں برس سے مختلف جاتیوں میں منقسم ہے۔ ہندو سماج مختلف جاتیوں میں کس طرح تقسیم ہوا اس کے بارے میں متعدد نسلی، سیاسی اور مذہبی نظریات بیان کیے جاتے ہیں۔ ذات پات کے تعلق سے معاشی نظریہ کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ آج سے کئی ہزار برس پہلے سماج کے مختلف گروہ معاشی اور پیشہ ورانہ اساس پر مختلف جاتوں اور جاتیوں میں تقسیم ہوگئے۔ ہندوستان کے مشہور اور قدیم مفکر منو کا خیال ہے کہ "ورن" کے فلسفہ کی بنیاد پر ہندستان کا ہندو سماج جاتیوں میں منقسم ہے۔ بہرحال ان مختلف نظریات سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج ہزاروں برس سے چار بڑی اور بے شمار ذیلی ذاتوں میں منقسم چلا آرہا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق جدید ہندستان میں بھی کم و بیش تین ہزار ذاتیں اور ذیلی ذاتیں پائی جاتی ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ذات پات کے ابتدائی ادوار میں مختلف ذاتوں کے افراد ایک ذات سے دوسری ذات میں منتقل ہوسکتے تھے۔ لیکن کم از کم گذشتہ دو تین ہزار برس کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ذات کے آدمی کا دوسری ذات میں منتقل ہونا بعید از قیاس سمجھا جاتا تھا۔

ذات پات کے بارے میں مختلف لوگوں نے تعریفات پیش کی ہیں لیکن اب بھی مشہور ماہر انسانیات اے. ایل. کروبیر کی دی ہوئی تعریف بہت جامع اور مکمل نظر آتی ہے۔ کروبیر کے الفاظ میں ذات پات "کسی تمدن کا درون ازدواجی موروثی ذیلی گروہ ہوتا ہے جس کو سماجی درجہ بندی میں دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں اعلیٰ ادنیٰ موقف حاصل ہوتا ہے۔" ایک ذات کے افراد دوسری ذات میں شادی بیاہ نہیں کرسکتے تھے اور عام طور سے پیشوں کی تبدیلی کا رواج بھی نہ تھا۔ جہاں تک سب سے نچلی ذاتوں یعنی شودر کا تعلق تھا ان کی بستیاں بھی عام آبادی سے الگ تھلگ ہوتی تھیں۔ ذات پات کے تعلق سے یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ ذات پات کے نظام میں جملہ سماجی درجہ بندی میں ہر ذیلی گروہ عموماً اور الگ علاحدہ علاحدہ خانوں میں بٹا ہوا ہوتا تھا۔ اور ایک ذات کا دوسری ذات میں ضم ہونے کا سوال بہت کم ہوتا تھا۔ ہر ذات کے لوگ مخصوص

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

روایات، عبادات، رسومات اور نقطہ نظر کے حامل ہوتے تھے۔ چنانچہ اسی بناء پر ذات پات کے نظام نے ہندو سماج کو ایک انتہائی پیچیدہ اور روایاتی سماج بنا دیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض سماجیات داں ہندستانی سماج کو مخلوط سماج کی سب سے پیچیدہ مثال قرار دیتے ہیں۔ گو کہ بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ دراصل ہندستان کا ہندو سماج ایک ہی سماج ہے جو مختلف جاتی اکائیوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور اس لیے اسے مختلف سماجوں کا مجموعہ یا مخلوط سماج نہیں کہنا چاہیے۔ تاہم تمدنی تفریقات اور روایاتی فرق کی وجہ سے ہندستان کے وسیع سماج کو ایک پیچیدہ اور مخلوط سماج کہنا ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ صرف قدیم ہندو سماج میں ہی اس قسم کی ذات پات کا نظام کیوں پنپا جو کہ دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں کچھ نظریات ہیں مثلاً روایتی نظریہ، سیاسی نظریہ، مذہبی نظریہ، پیشہ ورانہ تقسیم پر مبنی نظریہ نسل پر مبنی نظریہ اور انجذابی نظریہ وغیرہ۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

روایتی نظریہ: روایتی نظریہ رگ وید اور یجروید میں ملتا ہے۔ جس کے مطابق برہمن برہما کے سر سے، شتریہ برہما کے بازوؤں سے، ویشیہ برہما کے دھڑ سے اور شودر برہما کے پیروں سے پیدا ہوئے۔ اس نظریہ کے غیر سائنسی ہونے میں کلام نہیں لیکن اس کے ذریعہ ہر ذات کے روایتی فرائض پر روشنی پڑتی ہے۔

سیاسی نظریہ: ابے ڈو بائس (Abbe Dubois) وغیرہ کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ یہ برہمنوں کے ذریعہ بنائی ہوئی ایک چالاکی سے چلائی جانے والی اسکیم ہے جس کے ذریعہ وہ راجاؤں کو قابو میں رکھتے تھے اور کچھ کے بغیر ہر چیز میں سے بہترین حصے کے حقدار بن جاتے تھے۔ یہ نظریہ درست ہو یا نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں اس نظام سے تمام تر فائدہ صرف اعلیٰ ذاتوں کو ہی ہوتا ہے۔

مذہبی نظریہ: اس نظریہ کے تحت مذہبی رسوم کے لیے ایک الگ گروپ (برہمن) کی ضرورت نے ذات پات کو جنم دیا۔ اس نظریہ میں بھی کچھ سچائی ہو سکتی ہے۔

پیشہ ورانہ تقسیم پر مبنی نظریہ: سماج میں الگ الگ پیشوں کے لیے الگ الگ کام کرنے والے گروہ بن گئے اس طرح ہماری ذاتیں اور ذیلی ذاتیں اپنے ساتھ روایتی پیشہ بھی لاتی ہیں۔

نسل پر مبنی نظریہ: گھریہ وغیرہ کچھ دوسرے ماہرین سماجیات ویدک سماج سے پہلے کے آریہ اور غیر آریہ نسلوں کی آپسی چپقلش اور ٹکراؤ کو ذات پات کی بنیاد بتاتے ہیں۔ ہندستان کے قدیم باشندے بہت ذہین تھے لیکن لڑنے میں ماہر نہیں تھے۔ اس لیے آریہ نسل کے لوگوں سے وہ ہار گئے۔ آریوں نے غیر آریوں کو شودروں کا درجہ دیا۔ اسی لیے آریوں کو غیر آریوں سے شادی کو سختی سے روکا اور خاص طور سے آریہ عورتوں کی غیر آریوں سے شادی کو سماج کی تباہی کا موجب بتایا۔ اسی لیے قدیم ہندستان میں عورتیں اپنے شوہروں کو آریہ پتر کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اس نظریہ میں سچائی ہو سکتی ہے۔

انجذابی نظریہ: اس کے تحت مختلف گروہوں کو معاشرے میں مقام دلانے کے لیے ان کو حیثیت اور مخصوص فرائض (Status and Role) دے دیے گئے تاکہ سماج کا ایک نظام اور ساخت بنی رہے۔

زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک ذات پات ہمارے سماج میں قائم ہے۔ اس سے فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہوئے۔ اس کی وجہ سے جہیز کی رسم، کلین ازم، سماج میں منافرت، استحصال اور سماجی بکھراؤ جیسی سماجی کمزوریاں پیدا ہوئیں۔ اس کے باوجود یہ نہ صرف قائم رہی بلکہ موجودہ دور میں یہ اور بھی زیادہ مستحکم ہوتی چلی گئی۔ ووٹ بینک کی سیاست نے نئی ذاتیں اور نئی گروہ بندیاں پیدا کردی ہیں۔ اتنا ہی نہیں سماج میں ذات پات اتنی بڑھ گئی کہ دوسرے مذاہب کو بھی متاثر کرنا شروع کردیا۔ ہندستان کے مسلمانوں میں بھی ذات پات کا چلن ہوگیا۔ عیسائی حضرات بھی اپنی قدیم ذات کو یاد رکھتے ہیں مثلاً شادی کے اشتہار میں "ایک برہمن کرسچن لڑکے کے لیے اونچے برہمن کرسچن خاندان کا رشتہ درکار ہے" قسم کی عبارتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

گاندھی جی اور ڈاکٹر امبیڈکر اپنے اپنے انداز میں ذات پات کے خلاف لڑتے رہے۔ ہمارے آئین میں ذات پات کے خاتمے پر زور دیا اور چھوت چھات کو جرم قرار دیا۔ لیکن اس کا اثر کچھ زیادہ نہ ہوا۔ بلکہ جو سہولتیں اور مراعات نچلی ذاتوں کو سماجی انصاف کے نام پر دی گئی تھیں ان کی بدولت منافرت اور تناؤ اور بھی بڑھ گیا۔

آج ذات پات کے نام پر تشدد اور مارکاٹ کا ماحول بن گیا ہے۔ درج شدہ ذاتوں کو جو کچھ حاصل ہوا ہے لیکن وہ بھی زیادہ تر ان کے اوپری طبقے (Creamy Layer) کو ہی مل پایا ہے۔ ذات آج بھی سماجی بے انصافی پیدا کرنے کا سب سے بڑا منظم نظام ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ذاتوں کے لیے جو سہولیتیں اور مراعات دی گئی ہیں ان کی وجہ سے بھی ذات پات کے قانونی خاتمہ کے باوجود اس کی سیاسی اور معاشی اہمیت بڑی حد تک برقرار ہے۔ بہرحال ذات پات کا مسئلہ ایک انتہائی پیچیدہ سماجی مسئلہ ہے جس پر خاص طور پر گزشتہ پچاس سال کے دوران بہت سے تحقیقی کام ہوئے ہیں جن کے نتائج سے ہندستانی سماج کی پیچیدگی اور اس کی گتھیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن کا سلجھانا بہت ہی دشوار اور صبر آزما مسئلہ ہے۔ آج ذات پر مبنی گروہ کو ووٹ بینک سمجھا جاتا ہے۔

ذہین بچوں کی تعلیم (Education of the Gifted Children) :

جس طرح پس افتادہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاحدہ انتظامات عمل میں لائے جارہے ہیں اسی طرح یہ بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں اعلیٰ قابلیت رکھنے والے بچوں کا بھی خاطر خواہ لحاظ کیا جائے۔ غیر معمولی ذہین بچوں کے باقاعدہ مطالعہ سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ سماجی نشوو نما میں ایسے بچوں کو بعض دشواریاں پیش آتی ہیں اور ان دشواریوں کا راست تعلق ان کی غیر معمولی ذہانت سے ہوا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے بچے کو لیجیے جس کی حقیقی عمر تو نو سال کی ہے لیکن ذہنی عمر 14 یا 15 سال ہے۔ اس کی قدر ذہانت (I.Q.) 160 سے اوپر ہوگا اور ایسا بچہ فطین (Genius) کہلائے گا۔ یہ بالکل فطری امر ہے کہ ایسے غیر معمولی ذہین (Gifted) لڑکے کے لیے مدرسہ میں دوستوں کا پیدا کرنا یا ہم مزاج ساتھیوں کی صحبت حاصل کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف تو ہم عمر بچوں کے کھیل اس کے لیے کافی دلچسپی اور شوق کا باعث نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف اس کی عمر اور جماعت کے اعتبار سے چودہ یا پندرہ سال کی عمر کے لڑکے جو ذہنی لحاظ سے اس کے مساوی ہیں اس کو اپنے گروہ میں شامل نہیں کریں گے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے علاحدگی اختیار کرے اور شاید اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ وہ اپنی خداداد قابلیت کو قوم کی خدمت میں کس طرح استعمال کیا جائے، سیکھ نہ سکے۔ ماہران تعلیم کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ ایک طرف تو ہم اپنے کمزور بچوں کے ساتھ بے التفاتی نہ کریں اور دوسری طرف پُر زور بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی بھی نہ کریں۔ کیوں کہ یہی بچے اعلیٰ ترین قسم کے دماغی کاوشوں کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کا قوی امکان ہے کہ اگر ان کی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو انسانی نسل کے مزید ارتقا میں اہم حصہ ادا کریں گے۔ چونکہ ایسے بچے معدودے چند ہوتے ہیں لہٰذا ان پر بطور خاص انفرادی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اوسط ذہنی عمر کے بچوں کے پیش نظر نصاب تعلیم کا تعین ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ موسیقی میں غیر معمولی قابلیت کا اظہار کرے تو اس صلاحیت کو ترقی دینے میں اس کی ہمت افزائی کی جائے مگر یہ امر ملحوظ رہے کہ تعلیم کا بوجھ ان کی صحت کو متاثر نہ کرنے پائے کیوں کہ بیشتر صورتوں میں ایسے غیر معمولی ذہین بچے جسمانی صحت کے اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں۔

ر

رابرٹ ایم میک ائیور (Rober M. Mac Iver) : میک آئیور 1882 میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا۔ یہ دور جدید کا مشہور ساجیات داں، سیاسیات داں اور فلسفی گزرا ہے۔ اس نے امریکا کی مختلف جامعات میں ساجیات اور سیاسیات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ اس نے اندرون و بیرون ملک کے متعدد علمی اعزازات حاصل کیے۔ ساجیاتی اور سیاسیاتی، فکری اور نظریاتی سطحوں پر میک آئیور جمہوریت کا اہم نقیب رہا۔ اس کا نقطہ نظر تھا کہ حکومت کو انسانی مقاصد کی ایک اہم اور فعال ایجنسی ہونا چاہیے۔ ساجیات میں اس کی فکر کی چار اہم جہتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اس نے بنیادی ساجیاتی تصورات کی تشکیل اور اس کی تشریح میں بڑا حصہ لیا۔ دوسرے یہ کہ ناقابل عمل سائنسی باریک بینی کی ساجیاتی مسائل میں غیر ضروری دخل اندازی کے خلاف احتیاط کرنے پر توجہ دی۔ اور نظریات کے قائم کرنے پر زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ سائنس کی ترقی کا انحصار فکر کی ترقی پر ہوتا ہے۔ اس لیے ذہنی پیچیدگیوں کو ذریعہ کار بنانے کی بجائے لوگوں کو فکری تحقیقات پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ تیسرے اس کا خیال تھا کہ انسانی فطرتاً تخلیقی ہوتا ہے۔ جسکی معروضی توقعات، جذبات، تمنائیں، اقدار اور آئیڈیل ہوتے ہیں۔ سائنسیت کے چکر میں ان امور کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ چوتھے اس کا ایقان تھا کہ ساجیاتی تحریرات کو زیادہ واضح ہونا چاہیے جس میں سے لفظی گھماؤ پھراؤ اور ذہنی الجھاؤں کو حتی الامکان حد تک کم کرنا چاہیے۔ ساجیاتی فکر میں میک آئیور کا ایک اور اہم کارنامہ عالم اسباب اور مقصد حیات کے مابین امتیاز ہے۔ میک آئیور کی مشہور زمانہ کتاب Society : An Introductory Analysis ہے جو اس نے اپنے رفیق کار پیج کے ساتھ مل کر لکھی تھی۔ اس کتاب کو ساجیات میں ایک ستون کا درجہ حاصل ہے۔

رابطہ عالم اسلامی (World Muslim League): رابطہ عالم اسلامی کا باضابطہ قیام 1969 میں رباط (مراکش) میں مسلم سربراہان مملکت کی ایک چوٹی کانفرنس اور مارچ 1970 میں جدہ، اور دسمبر 1970 میں کراچی میں منعقدہ مسلم ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنسوں کے نتیجے میں عمل میں آیا۔ اس تنظیم میں مندرجہ ذیل مسلم ممالک شامل ہیں :

افغانستان، الجزائر، بحرین، بنگلہ دیش، کیمرون، چاڈ، مصر، گابون، گامبیا، گنی، گنی بساؤ، انڈونیشیا، ایران، اُردن، کویت، لبنان، لیبیا، ملیشیا، مالی، موریطانیہ، جبوتی، مراکش، نائجر، عمان، پاکستان، قطر، سعودی عرب، سینگال، سیرالیون، صومالیہ، سوڈان، شام، تیونس، ترکی، یوگنڈا، متحدہ عرب امارات اور یمن۔

رابطہ عالم اسلامی کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

(1) رکن ممالک کے درمیان اتحاد اسلامی کو فروغ دینا۔ (2)ان کے درمیان اقتصادی، اجتماعی، تہذیبی، عالمی اور دوسرے میدانوں میں تعاون کو مستحکم کرنا اور بین الاقوامی تنظیموں میں شامل رکن ملکوں کے درمیان صلاح و مشورہ کرنا۔ (3) نسلی تعصب، نسلی امتیاز اور استعمار کی سبھی شکلوں کا خاتمہ کرنا (4)انصاف پر مبنی بین الاقوامی امن و تحفظ کی حمایت کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرنا۔ (5)مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے تمام کوششوں میں ربط قائم کرنا، فلسطینی عوام کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرنا اور ان کے قومی حقوق اور ان کے وطن کی بازیافت کے لیے ان کی مدد کرنا۔ (6)مسلمانانِ عالم کے وقار، آزادی اور قومی تحفظ کے لیے ان کی جدوجہد کو استقامت بخشنا، اور (7)رکن ممالک اور دوسرے تمام ملکوں کے درمیان تعاون اور مفاہمت کو فروغ دینے کے سلسلے میں مناسب فضا پیدا کرنا۔

رابطہ کے ایما پر 1972 میں ایک بین الاقوامی مسلم خبررساں ایجنسی کا قیام عمل میں آیا اور 1974 میں ایک مسلم بینک اور بے شمار ملکوں

میں اسلامی ثقافتی مراکز قائم کیے گئے۔

راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن : آزادی کے بعد ہندستان میں عوامی کتب خانہ کے فروغ کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے جو اقدام اٹھائے گئے ہیں ان میں کتب خانہ مشاورتی کمیٹی زیر صدارت سنہا اور راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن کا قیام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ملک میں تعلیمی اور سماجی بہبود کے میدان میں اپنی خدمات کی بدولت راجہ رام موہن رائے کا نام ہندستان میں تہذیب و تمدن کے دور جدید کے بانیوں میں لیا جاتا ہے۔ اسی لیے ملک کی آزادی کی سلور جوبلی کے موقع پر جو راجہ رام موہن رائے کے دو سوسالہ یوم پیدائش کی تقریبات کا سال بھی تھا حکومت نے راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن قائم کیا اور اس کا صدر دفتر کلکتہ میں رکھا۔

فاؤنڈیشن کا بنیادی مقصد تو کتب خانہ تحریک کو چھوٹے شہروں اور گاؤں میں پھیلانا ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے درج ذیل اقدام اس کے جملہ مقاصد کا احاطہ کرتے ہیں :

ملک میں کتب خانہ تحریک کا فروغ

ملک کی کتب خانہ قومی پالیسی کی وضاحت اور مرکزی و ریاستی حکومتوں کو اسے اپنانے کے لیے آمادہ کرنا۔

ملک میں کتب خانہ قانون بنانے کے لیے راہ ہموار کرنا۔

کتب خانوں کو مالی و تکنیکی امداد دینا

علاقائی کتب خانہ خدمات مراکز کا قیام۔

ملک کے قومی، ریاستی، ضلعی اور دوسرے کتب خانوں کے باہمی لین دین کے اشتراک کی مدد سے ایک قومی کتب خانہ نظام کی تشکیل کرنا۔

کتب خانہ کے فروغ سے متعلق خیالات اور معلومات پر تبادلہ خیال کے لیے ایک مرکز کا کام کرنا۔

ملک میں عوامی کتب خانہ کے فروغ سے متعلق جملہ پہلوؤں پر حکومت کے مشیر کا رول ادا کرنا۔

کتب خانہ کی ترقی اور فروغ کے لیے اور اس سے استفادہ کے لیے معاون جملہ اقدام پر عمل کرنا۔

پانچ سال بعد فاؤنڈیشن نے اپنے کاموں کا جائزہ لینے کے لیے نہرو میموریل میوزیم کے ڈائریکٹر جناب بی آر نندہ کی سربراہی میں ایک جائزہ کمیٹی تشکیل کی جس کی سفارشات کی روشنی میں فاؤنڈیشن کے دفتر میں ایک تحقیقاتی شعبہ و علم معلومات کے مضامین کی کتابوں پر مشتمل ایک کتب خانہ اور ایک شماریاتی یونٹ قائم کیا گیا۔ 1986-87 میں وزارت برائے فروغ وسائل انسانی کے کلچرل ڈپارٹمنٹ نے رضاکار اداروں کو جو کتب خانہ خدمات فراہم کر رہے ہوں مالی امداد دینے کا کام بھی فاؤنڈیشن کے سپرد کردیا۔

فاؤنڈیشن نے عوامی کتب خانوں کو مالی و تکنیکی امداد دینے کے لیے دو طرح کی اسکیمیں بنائی ہیں۔ مساوی شرکت اسکیمیں اور غیر مساوی شرکت اسکیمیں۔ ان دونوں کے تحت درج ذیل امدادی اسکیمیں زیر عمل ہیں۔

مساوی شرکت اسکیمیں: جن میں فاؤنڈیشن اور ریاستی حکومتیں برابر کی رقمیں فراہم کرتی ہیں۔ ان کے تحت درج ذیل اسکیمیں آتی ہیں:

وافر مقدار میں کتابیں اور دوسرے مطالعاتی مواد کے لیے امداد جن کی فہرستیں ریاستی سطح پر تیار کی جاتی ہیں۔

کتابوں کے ذخیرہ کے رکھنے اور انھیں قارئین کے لیے نمایاں کرنے کے لیے فرنیچر کے لیے امداد۔

ریاستی مرکزی کتب خانہ اور ضلعی کتب خانہ میں تعلیم کی ترویج کے لیے ٹیلی ویژن اور وی سی آر کے لیے امداد۔

ضلع سے نیچے کی سطح پر قائم عوامی کتب خانوں کی عمارت میں توسیع کے لیے امداد۔

سمینار، ورک شاپ و تربیتی بندوبست نیز نمائش کے لیے امداد۔

غیر مساوی شرکت اسکیمیں : جن کے تحت جملہ مالی امداد فاؤنڈیشن اپنے فنڈ سے فراہم کرتا ہے اس کے تحت درج ذیل اسکیمیں زیر عمل ہیں :

وافر مقدار میں کتابیں اور دوسرے مطالعاتی مواد کی فراہمی کے لیے امداد۔ جن کی فہرست فاؤنڈیشن تیار کرتی ہے۔

بچوں کے کتب خانہ اور عوامی کتب خانوں میں بچوں کا شعبہ قائم کرنے کے لیے امداد۔

عوامی کتب خانوں کو صدی تقریبات منعقد کرنے کے لیے امداد۔

قومی سطح پر قائم کتب خانہ سے متعلق انجمنوں کو مذاکرات، ورک شاپ، کانفرنس کے لیے امداد۔

رضاکار انجمنوں کو عوامی کتب خانہ خدمات فراہم کرنے کے لیے امداد۔

مساوی شرکت اسکیمیں فاؤنڈیشن ریاستوں میں قائم ریاستی کتب خانہ منصوبہ بندی کمیٹی/ ریاستی کتب خانہ کمیٹی کے تعاون اور توسط سے چلاتی ہے۔ اس کے لیے ہر ریاست اپنے متعین حصے کی رقم فاؤنڈیشن کے فنڈ میں پہلے سے جمع کرتی ہے جس کے مساوی رقم فاؤنڈیشن اپنی جانب سے شامل کرتی ہے۔

22 رکنی فاؤنڈیشن کا سربراہ چیئرمین ہوتا ہے جو مرکزی وزیر یا اس کا نامزد فرد ہوتا ہے۔ 21 ممبران میں سکریٹری شعبہ کلچر حکومت ہند اور تیرہ اشخاص جنھیں حکومت نامزد کرتی ہے ان میں معروف لائبریرین اور ماہرین تعلیم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انڈین لائبریری ایسوسی ایشن، ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کی نمائندگی کے لیے تین افراد نامزد ہوتے ہیں۔ شعبہ تعلیم، شعبہ کلچر اور وزارت مالیات کے ایک ایک نمائندے حکومت کی جانب سے نامزد کیے جاتے ہیں۔ فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر اس کا ممبر سکریٹری ہوتا ہے۔ ممبران کی مدت تین سال کی ہوتی ہے۔ فاؤنڈیشن نے چار علاقائی دفاتر دہلی، ممبئی اور کولکتہ میں قائم کیے ہیں جہاں موجود نائب فیلڈ افسر دورہ کرکے فاؤنڈیشن کے ذریعہ دی گئی رقموں کے جائز استعمال کا معائنہ کرتے ہیں۔ اپنے توسیعی کاموں کے تحت فاؤنڈیشن معلوماتی کتابیں اور "گرنتھانہ" کے نام سے ایک چھ ماہی رسالہ شائع کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عوامی کتب خانہ سے متعلق موضوعات پر قومی سطح کے مذاکرے بھی منعقد کرتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے یادگاری سالانہ خطبہ، راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن فیلوشپ اور "بہترین کتب خانہ عطیہ" جو سال میں ایک بار ایک ریاستی مرکزی کتب خانہ کو اور چھ ضلعی کتب خانوں کو دیا جائے گا کا فیصلہ فاؤنڈیشن نے اپنی حالیہ نشست میں کیا ہے۔

راس۔ اڈورڈ السور تھ راس : اڈورڈ السور تھ راس (1866-1951) مشہور امریکی ساجیات داں گزرا ہے۔ راس ترقی پسند مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشہور نظریاتی مفکر تھا جس نے امریکا میں ساجیات کی مقبولیت کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اس کی پہلی مشہور کتاب مبادی ساجیات ہے جو 1897 اور 1904 کے دوران تکمیل پائی۔ یہ دراصل اس کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اس نے سماجی نظریات کی تشکیل نو کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں راس نے سماجی طریق پر تفصیلی بحثیں کیں۔ 1905 میں راس نے سماجی طریق کے گیارہ زمرے بتائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ 32 ذیلی اقسام سے بحث کی۔ لیکن 1920 میں اس نے سماجی طریق کی چار اہم اشکال (تعاون، بالادستی، استحصال، اختلاف) پر اکتفا کیا۔ اس سے قطع نظر کہ سماجی طریق ماحول کی کتنی اقسام ہونی چاہئیں یا ہوسکتی ہیں۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سماجی ماحول میں سماجی طریق کی اہمیت اور اس کے تجزیہ کی طرف توجہ دلانا راس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ 1901 میں راس کی دوسری اہم کتاب "سماجی کنٹرول" شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر راس کی ایک انتہائی اہم تخلیق ہے۔ اسی طرح 1908 میں راس کی ایک اور کتاب "سماجی نفسیات" شائع ہوئی جس کو ساجیاتی ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ "سماجی کنٹرول" میں راس نے سماجی نظم کے رسمی اور اشکالی عوامل سے بحث کی ہے۔ جبکہ سماجی نفسیات میں غیر رسمی اور غیر اشکالی عوامل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ گیبریل تارد اور ولیم گراہم سمز کے شانہ بہ شانہ راس کو امریکا کے اولین اور سب سے بڑے ساجیات دانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے اس براعظم میں ساجیات کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ راس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دوبار 1914 اور 1915 میں وہ امریکی ساجیاتی سوسائٹی کا صدر تھا۔ اس کے علاوہ 1929 سے 1937 تک وسکونسن یونیورسٹی کے شعبہ ساجیات کا صدر تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ راس عصری ساجیات کا ایک قدآور مفکر تھا۔

رالف لنٹن (Ralph Linton, 1893-1953) : لنٹن مشہور امریکی ماہر ثقافتی انسانیات ہے۔ بالخصوص بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں اس نے انسانیات کی تعمیر نو پر جو کام کیا وہ بہت اہم مانا جاتا ہے۔ 1936 میں اس کی مشہور کتاب "The Study of Man" شائع ہوئی جس میں انسانی برتاؤ، سماجی ڈھانچے اور ثقافتی تنظیم پر بہت تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ لنٹن کی تحریرات میں انسانی حیاتیات، آثار قدیمہ، انسانیات اور ثقافتی

تاریخ سب ہی شامل ہیں۔ اس نے اپنی تصانیف میں ان تمام مسائل پر بحث کی ہے۔ ثقافتوں کے مطالعہ میں لنٹن نے تمدن کے مستقبل کے بارے میں مایوسی محسوس کی۔ اس کا خیال تھا کہ موجودہ ثقافت کا مستقبل تاریک ہوگا۔ اسی لیے اس نے اپنی مشہور کتاب "The Study of Man" کو "اگلے تمدن" سے منسوب کیا۔ اس کی دوسری کتاب (The Tree of Culture) جو 1955 میں شائع ہوئی، اس میں بھی مایوسی کا یہی انداز نظر آتا ہے۔ لنٹن کی یہ تمنا تھی کہ سماجی علوم کو بہتر مستقبل کی تعمیر میں فوری اور اہم حصہ لینا چاہیے۔ تدریس کے میدان میں بھی لنٹن ایک بہت ہی شاندار اور قادر بیان استاد تھا۔

رام پور رضا لائبریری: موجودہ رام پور رضا لائبریری نوابین رام پور کے مختلف ادوار میں جمع کیے ہوئے ذخیرہ کتب پر مشتمل ہے۔ نوابین میں سب سے پہلے جس نے کتب خانہ کے قیام کے لیے خصوصی توجہ دی وہ نواب سید محمد سعید خان تھے۔ ان کے زمانہ میں کتابوں کے لیے علاحدہ کمرہ مختص کیا گیا الماریاں بنوائی گئیں جن میں کتابیں ترتیب سے رکھی گئیں۔ کتابوں کے لیے ایک مہر بھی بنوائی گئی۔ نواب صاحب نے نہ صرف قلمی کتابیں فراہم کیں بلکہ بہت سی نادر و نایاب کتابوں کی خط نسخ کے ماہرین کے ذریعہ نقلیں بھی تیار کرائیں۔ ذخیرہ کتب کی ایک فہرست بھی تیار کرائی تھی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کا دور رام پور سے مرزا غالب کی وابستگی کا دور ہے۔ کتب خانہ کے لیے ایک خاص عمارت تعمیر کرانے کا کام نواب کلب علی خاں کے عہد میں ہوا۔ اگرچہ کتب خانہ اس میں منتقل نہیں ہوسکا۔ اردو کے مشہور شاعر امیرمینائی کتب خانہ کے نگراں مقرر ہوئے اور مولوی مہدی علی خاں نے کتب خانہ کی پہلی فہرست مرتب کی۔ اس وقت تک کتب خانہ میں 8821 کتابوں کے علاوہ 248 قلمی تصاویر کا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ قلمی کتابوں کی تعداد 5590 تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ میں خدا بخش اپنے کتب خانہ کے لیے کتابیں جمع کر رہے تھے۔

رام پور رضا لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح 1892 میں خدا بخش لائبریری کی عمارت کے افتتاح کے ایک سال بعد ہوا۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کتب خانہ کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کی نگرانی میں قدیم عربی مخطوطات و مطبوعات کی ایک فہرست مکمل ہوکر شائع ہوئی۔ یہ نواب حامد علی خاں کا زمانہ تھا۔ حکیم صاحب کی کوششوں سے کتب خانہ میں طب کی کتابوں کا عمدہ ذخیرہ جمع ہوگیا۔ حافظ احمد علی خاں شوق ناظم کتب خانہ مقرر ہوئے اور 1897 سے 1931 تک کتب خانہ کی نظامت ان کے سپرد رہی۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ تاریخ کتاب خانہ رضا کی تالیف ہے جس میں کتب خانہ کی عہد بہ عہد تاریخ کے ساتھ رام پور کے علمی، تصنیفی اور ثقافتی پیش رفت کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ حال ہی میں کتب خانے نے اسے مع توضیحی حوالوں کے شائع کیا ہے۔

کتب خانہ کو علمی دنیا سے متعارف کرانے کا کام مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے 1932 میں ناظم کتب خانہ مقرر ہونے پر شروع ہوا۔ عرشی صاحب علوم اسلامی اور عربی وفارسی زبان کے متبحر عالم تھے۔ انھوں نے کتب خانہ کے علمی و تاریخی مخطوطات کی تدوین کرکے انھیں شائع کیا۔ عربی مخطوطات کی فہرست 6 جلدوں میں شائع کی۔ اردو مخطوطات کی بھی پہلی جلد جو 210 مخطوطات پر مشتمل ہے شائع ہوئی۔ امپیریل لائبریری (حال نیشنل لائبریری) کے لائبریرین چیپ مین (Chapman) کو مشورہ اور جدید کاری کے لیے مدعو کیا گیا۔ مخطوطات کو تحفظ کی غرض سے گودریج کی لوہے کی الماریوں میں رکھا گیا۔

آزادی کے بعد کتب خانہ کے لیے انتظام و انصرام ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ کتب خانہ 1957 میں پرانی عمارت سے منتقل ہوکر موجودہ عمارت حامد منزل میں آیا۔ 1975 میں حکومت ہند نے پارلیمنٹ کے ایک قانون کے تحت رام پور رضالائبریری کو بھی قومی اہمیت کا ادارہ بنا دیا اور عرشی صاحب لائبریرین کی جگہ کتب خانہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوگئے۔ کتب خانہ کا انتظام و اختیار اب ایک بورڈ کے ذمہ ہوا جس کا چیئرمین ریاست اترپردیش کا گورنر بربنائے عہدہ ہوتا ہے۔ عرشی اصحب کے 1981 میں انتقال کے بعد سے بوجوہ ڈائریکٹر کی آسامی پُر نہیں کی جاسکی ہے اور حکومت ہند کا مقرر کیا ہوا آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کتب خانہ کے جملہ انتظامات و خدمات کا ذمہ دار ہے۔

کتب خانہ اپنے قدیم اور نادر مخطوطات کے علاوہ خطاطی کے بیش بہا نمونوں اور مغل عہد کی قلمی تصاویر کے قیمتی ذخیرہ کی وجہ سے بھی معروف ہے۔ یہاں عربی، فارسی، سنسکرت، ترکی، اردو اور پشتو کے پندرہ ہزار مخطوطات، پانچ ہزار قلمی تصویریں تین ہزار اسلامی خطاطی کے نمونے موجود ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کی تعداد پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔ ریاست رام پور سے اردو کے معروف شعراء مرزا غالب، داغ، امیر مینائی، امیراللہ تسلیم کا تعلق رہا ہے جس کی وجہ سے یہاں شعراء کے کلام کے

مسودوں کا بیش قیمت ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ پچھلے دنوں لوہارو خاندان کا کتب خانہ بھی رام پور آگیا جس کی بدولت غالب اور عہد غالب پر کام کے لیے یہ حصہ مزید قیمتی ہوگیا ہے۔ اکثر قلمی کتابوں پر مغل بادشاہوں کے دستخط یا مہریں ہیں۔ عہد جہانگیر میں تزک جہانگیری کے لیے مرقعے تیار ہوئے تھے ان میں سے چند پرسی براؤن (مصنف انڈین پینٹنگ انڈر دی مغلس) کے مطابق رام پور رضالائبریری میں موجود ہیں۔

کتب خانہ کے مخطوطات اور تصاویر کی مرمت و تحفظی تدابیر کے لیے 1995 میں ایک کنزرویشن لیباریٹری قائم کی گئی ہے۔ اشاعتی پروگرام کے تحت کتابیں شائع کی گئی ہیں اور رضا لائبریری جرنل دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ کتب خانہ کی جانب سے نواب فیض اللہ خاں اعزاز اور نواب رضا علی خاں اعزاز قائم کیا گیا ہے۔ جونیئر و سینئر ریسرچ فیلوشپ کا بھی بندوبست ہے۔ کتب خانہ قومی و بین الاقوامی سمینار بھی منعقد کرتا ہے۔ پچھلے سال سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی یادگاری خطبہ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

رائے : نظر علم اعتقاد اور ظن وغیرہ کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن اصطلاح میں اس کو قیاس و اجتہاد کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جب معاشرتی و تمدنی ضرورتوں اور تقاضوں کے ماتحت نئے مسائل کے بارے میں فیصلوں کی ضرورت ہوئی اور صحابہ کرام تابعین اور ائمہ امت کو ان کے بارے میں کتاب و سنت کے اندر کوئی واضح حکم نہ ملا تو مجبوراً نظائر سابقہ کی بنا پر انھوں نے اپنی اپنی رائے کا استعمال کیا ان کے نزدیک رائے کا مطلب یہ تھا کہ کسی مشابہ معاملہ میں دین کے عام قواعد پر قیاس کرکے کوئی حکم دیا جائے جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل نے آنحضرت ﷺ کے استفسار کے جواب میں فرمایا تھا کہ اگر مجھے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت میں حکم نہ ملا تو اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ آگے چل کر مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہوگئے ایک وہ جن کا کام حدیثوں اور روایتوں کو جمع کرنا تھا یعنی اہل حدیث جن کو اہل حجاز بھی کہا جاتا تھا یہ لوگ احادیث سے من حیث الراویۃ کو بحث کرتے تھے۔ دوسرا گروہ حدیثوں سے استنباط احکام و استخراج مسائل کرتا تھا اور نص نہ ملنے کی صورت میں قیاس رائے سے بھی کام لیتا تھا۔ انھیں اہل الرائے اور اہل عراق کہا جاتا تھا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب خاص طور پر اہل الرائے کہلاتے تھے۔ مگر چونکہ رائے کا استعمال دوسرے مجتہدین بھی کرتے تھے اس لیے امام مالک، سفیان ثوری، امام اوزاعی ابن ابی لیلیٰ اور ربیعۃ الرائے وغیرہ بھی اسی زمرہ میں شامل سمجھے جاتے تھے حالانکہ ان کا شمار کبھار محدثین میں بھی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کا استعمال نئی ضرورتوں کے تحت تشریح میں کم و بیش پابندیوں کے ساتھ چاروں ائمہ نے کیا ہے۔ قیاس ورائے میں فرق یہ ہے کہ قیاس قرآن مجید سنت اور اجماع سے کسی حکم کو مشابہت کی دلیل یا علت غائی کے اشتراک کی وجہ سے مستخرج کرنے کو کہتے ہیں اور رائے فقہ کا انفرادی عقلی استدلال ہے لیکن وہ کسی نص صریح کے مخالف ہوکر نہیں ہوتا اگر مخالف ہو تو اسے رائے باطل کہتے ہیں جس کی اتباع کا کسی سے مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ شروع میں رائے قیاس شرعی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا لیکن جب لوگوں نے خالص رائے اور شرعی قیاس میں امتیاز کرنا چھوڑ دیا اور ہر قسم کی رائے کو شرعی احکام کے اثبات کے لیے دخیل بنا دیا تو اس کو قیاس سے علیحدہ کردیا گیا اور آہستہ آہستہ اس میں ذم کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ اس طرح رائے کے استعمال کے لیے فقہی قواعد واصول منضبط کیے گئے تاکہ اس کا استعمال مقاصد شریعت اور اصول دین کے تحت کیا جائے جو رائے آزادانہ استعمال کی جائے یا اس کی وجہ سے کسی اصول پر زد پڑے تو اس پر سخت نکیر کی جائے گی۔

رجسٹرڈ سرمایہ: رجسٹرڈ سرمائے سے وہ سرمایہ مراد ہے جو ایک کمپنی کو فراہم کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور جس رقم پر وہ اسٹامپ ڈیوٹی اور رجسٹریشن فیس دیتی ہے۔ یا تو پوری رقم کے حصص یا تمسکات فروخت کیے جاتے ہیں یا اس قدر رقم کے حصص یا تمسکات فروخت کیے جاتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔ رجسٹرڈ سرمائے کے منجملہ جس قدر رقم کے حصص یا تمسکات فروخت کیے جاتے ہیں اسے کمپنی لاء کی اصطلاح میں اجراشدہ سرمایہ کہا جاتا ہے۔

رجسٹرڈ کمپنی (Registered Company): رجسٹرڈ کمپنی اس کو کہتے ہیں جو کمپنی لاء کے تحت رجسٹر کروائی جاتی ہے اس نوعیت کی کمپنیاں اس تاریخ سے وجود میں آتی ہیں جو تاریخ رجسٹری کرانے کے بعد سرٹیفکیٹ آف رجسٹریشن میں درج ہوتی ہے۔ رجسٹرڈ کمپنی اپنے اختیارات کمپنی لاء اور اس کے تحت بنائے ہوئے قواعد اور میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کے تحت حاصل کرتی ہیں۔ عام طور پر ایسی نوعیت کی کمپنیاں قائم ہوتی ہیں۔ یہ کمپنیاں یا حصص کی حد تک محدود ہوتی ہیں یا ضمانت کی حد

تک محدود ہوتی ہیں یا غیر محدود نوعیت کی ہوتی ہیں۔

رسالت: اس کے لفظی معنی سفارت، پیغام بری اور پہنچانے کے ہیں شریعت کی اصطلاح میں رسالت خدا کا اپنے رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ بندوں کے پاس پیغام پہنچانے اور سفارت کا نام ہے۔ اس سلسلہ کو قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بندے اس کی مرضی اور اس کے احکام سے واقف ہوں اور ان پر عمل کریں اور اس کی ناراضگی اور ناپسندیدگی کو معلوم کرکے اس سے بچیں۔ یہ اسلام کا تیسرا بنیادی عقیدہ ہے۔

رس پانسا پروڈینشیم (Responsa Pradentium):
رس پانسا پروڈینشیم کو فتوہ رائے مجتہدین کہا جاسکتا ہے بعض مسائل کے متعلق پیشہ ورانہ رائے کو رومن لاء کے نظام میں خصوصی اہمیت حاصل تھی اور اس خصوصیت نے بڑی حد تک رومن لاء کے ماخذوں میں سے ایک ماخذ کی حیثیت اختیار کرلی کیونکہ وہ فاضل قانونی مجتہدین تھے جنھوں نے رومن لاء کو اس کا مقام دیا اور ایک مکمل قانون کی صورت دی 100 قبل مسیح کے بعد سے روما میں ایسے اشخاص کی ایک جماعت قائم ہوئی جن کی دلچسپی تھی کہ رومن لاء کی اسٹڈی کریں۔ انھیں جورس کنسلٹی (Juris Consulti) یا جورس پروڈنٹس (Juris Prudents) کہا جاتا تھا۔ یہ اشخاص پیشہ ورانہ وکیل نہ تھے بلکہ انتہائی قابل اشخاص تھے جو اپنی عوامی زندگی کو ترقی دینے کے لیے اور اپنی ہر دلعزیزی میں اضافے کے لیے لوگوں کو بغیر معاوضہ کے قانونی رائے دیتے تھے۔ یہ رائے اس زمانے کے وکلاء کی رائے سے کہیں زیادہ وزن کی حامل ہوتی تھی یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ اشخاص جو مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے وہ رومن لاء کے سسٹم کے تحت قانون داں نہیں ہوتے تھے بلکہ عام طور پر فہمیدہ اشخاص ہوتے تھے جنھیں کسی قانونی مسئلے کے متعلق کسی جیوری یا جج کی رہبری کی ضرورت نہیں تھی بلکہ فریقین کے دلائل اور استدلال کی سماعت کرکے مقدمہ کا فیصلہ کرتے تھے۔ شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کے بعض جورسٹ کو اس کا اختیار دیا کہ وہ شاہی احکامات کے تحت قانونی رائے دیں۔ اس طریقۂ کار کی وجہ سے غالبًا اس نظریے کی بنیاد پڑی کہ اگر کسی مدعاعلیہ نے کسی جیورسٹ کی رائے اپنی جانب سے مدافعت میں پیش کی ہو تو اسے عام طور پر قبول کیا جائے۔

رسل: رسول کی جمع ہے۔ رسول کے معنی سفیر پیغام بر اور پیغام رساں کے ہیں۔ دینی اصطلاح میں اس سے وہ برگزیدہ ہستیاں مراد ہوتی ہیں جن کو اللہ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے مامور کیا ہے اور جن کو وہ اپنی وحی الہام اور مخاطبت کا شرف بخشا ہے اور وہ خدا کے احکام بندوں تک پہنچاتے اور انھیں رشد و ہدایت کی تلقین کرتے ہیں اس کی مفصل تشریح انبیا کے ضمن میں گزرچکی ہے۔ نبی اور رسول میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کا کام اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کی تبلیغ ہے۔ بعض لوگ دونوں میں یہ فرق بتاتے ہیں کہ رسول پر نئی شریعت اور خدا کی کتاب نازل ہوتی ہے اور نبی سابق کتاب و شریعت کی پیروی کی دعوت دیتا ہے خود اس کی شریعت اور کتاب نہیں عطا کی جاتی۔

رسیور کے فرائض (Duties of Receiver): عدالت اگر کسی دیوالیے کے مقدمے میں رسیور مقرر کرے تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مناسب طریقے سے قرض دار کی جائداد کو حاصل کرے اور اس کا انتظام کرے اور اس سے جو منافع حاصل ہوتا ہے وہ قرض خواہوں میں تقسیم کرے۔ اس غرض کے لیے رسیور کو اس کا اختیار ہوگا کہ قرض دار کی کسی بھی جائداد کو فروخت کرے۔ جو بھی رقم وصول ہوتی ہو اس کی رسید دے اور عدالت کی اجازت سے حسب ذیل امور کی انجام دہی کرے۔

(1) قرض دار کا اگر کوئی کاروبار ہے تو اسے جاری رکھے اور اس طور سے اس کاروبار کو ختم کرے جس سے مجموعی طور پر فائدہ ہو۔
(2) قرض دار کی کسی جائداد کے متعلق مقدمہ دائر کرے یا اس کی جواب دہی کرے یا دوسری اور کوئی ضروری قانونی کاروائی کرے۔
(3) عدالت کی منظوری سے قرض دار کی جائداد کے تحفظ کے لیے کوئی وکیل یا ایجنٹ مقرر کرے۔
(4) قرض خواہوں کو قرض کی ادائگی کے سلسلے میں قرض دار کی کسی جائداد کو کہیں رہن رکھے۔

رقیب و عقید: اول الذکر کے معنی نگراں اور موخرالذکر کے تیار کرنے اور مہیا کرنے والے ہیں۔

رکاز : اس سے مراد دفینے معدنیات اور قدرتی خزانے وغیرہ ہیں ان کا پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہوگا اور بعض صورتوں میں زمین جب وہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

حکومت کی مملوکہ زمین میں نکلے تو کل بیت المال کا حق ہوگا۔

روح القدس: خدا کے قریب فرشتے حضرت جبریل کو روح القدس بھی کہتے ہیں۔ روح کے معنی نفس اور حیات ہیں۔ یہ لفظ قرآن اور دوسرے فرشتوں کے لیے بھی قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ قدس کے معنی طہارت اور پاکی کے ہیں۔ حضرت جبریل کے متعلق سفارت کی خدمات ہے یعنی وہ خدا کے پیغام اس کے پیغمبروں کے پاس لاتے تھے۔ اللہ تعالی ان سے جو کچھ کہتا تھا وہ اس کو بے کم و کاست اس کے رسولوں تک پہنچاتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ کے پاس بھی وحی حضرت جبریل ہی لاتے تھے۔

روسو۔ ژان ژاک (Rousseau, Jean Jacqes, 1712-1778) : ژان ژاک روسو اٹھارہویں صدی کے یورپ کا ایک عظیم دانشور تھا۔ انقلاب فرانس کے رہنماؤں پر اس کی تحریروں کا زبردست اثر تھا۔ یورپ کی اٹھارہویں صدی کی پوری نسل پر اس نے گہرے نقش ثبت کیے۔ وہ ایک رنگا رنگ شخصیت کا مالک تھا۔ فلسفہ، سیاست اور تعلیم پر اس کی تصنیفات نے یورپ میں زبردست انقلاب پیدا کیا۔ بحیثیت فلسفی اس نے عیسائیت اور اپنے عہد کی مادیت و عقلیت پسندی کے درمیان تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی اور دونوں کو ملانے کے بعد اپنے اس نظریہ کا نام اس نے "عقلمند کی مادیت یا" سیویل مذہب" رکھا۔ سیاست میں اس کی تصنیفات معاہدہ عمرانی (Social Contract) اپنے عہد کی ایک نہایت اہم تصنیف ہے۔ تعلیم کے متعلق اس کے نظریے اور استاد اور طالب علم کے درمیان تعلقات بہتر بنیادوں پر قائم کرنے کی اس کی کوشش نے نظام تعلیم پر گہرا اثر چھوڑا۔ بعد کے تمام تعلیمی نظریوں کی بنیاد اس کے مرتب کردہ خیالات پر ہے۔

ژان ژاک روسو 28/ جون 1712 کو پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام آئی ژاک روسو تھا۔ وہ جنیوا میں ایک گھڑی ساز تھا۔ اس کی ماں ایک کالون پادری کے خاندان سے تھی۔ روسو کے بچپن ہی میں ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی تعلیم بہت جلد یعنی چھ سال کی عمر ہی سے شروع ہو گئی۔ پڑھنے لکھنے کا شروع ہی سے بہت شوق تھا۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے باپ کے کتب خانے سے کتابیں نکال کر پڑھتا، شروع میں ناولوں اور ڈراموں کا شوق رہا لیکن بعد میں تاریخ کا بہت شوق ہو گیا۔ پلوٹارک کی "مشاہیر یونان و روم" اس کی بہت پسندیدہ کتاب تھی۔

روسو کا باپ جمہوریت پسند تھا۔ اس کے باپ کے ورک شاپ اور مزدوروں کے کلب میں ان مسائل پر بحث ہوتی۔ یہ مباحث روسو بڑی دلچسپی سے سنتا۔ اپنی آپ بیتی "اعتراف" (Confessions) اور دوسری تصنیفات میں جنیوا کے اس دور کے حالات پر اس نے کافی روشنی ڈالی ہے۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں روسو جنیوا کی مزدور بستی میں رہتا تھا جو اعلیٰ طبقہ کے علاقہ سے الگ تھی۔ مزدور بستی میں ہمیشہ ہل چل رہتی تھی۔ چنانچہ سنہ 1722 میں ایک "اعلیٰ خاندان" کے فرد سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اسے جلا وطن ہونا پڑا اور جنیوا کے باہر رہنا پڑا جہاں اس نے کلاسکی ادب کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ سنہ 1724 میں وہ جنیوا پھر واپس آ گیا اور ایک کلرک کے طور پر کام کرنے لگا۔ یہیں اس نے ممنوعہ کتابیں پڑھنی شروع کیں۔ سنہ 1728 میں وہ جنیوا سے بھاگ کھڑا ہوا اور ٹیورن چلا آیا جہاں وہ کچھ عرصہ کے لیے پادریوں کے اسکول میں بھی رہا۔ کندہ کاری کا کام سیکھتا رہا۔ ٹیکس آفس اور فارم میں بھی کام کیا۔

1740 میں وہ لیونس (Lyons) بچوں کا استاد بن کر گیا۔ سنہ 1742 میں وہ پیرس پہنچا اور اپنے ساتھ اپنی تصنیف کی ہوئی موسیقی پر ایک کتاب، ایک کامیڈی اور دو نظمیں بھی لایا لیکن اسے وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جس کی اسے امید تھی۔ 1742 میں اس نے جدید موسیقی پر ایک رسالہ، ایک آپیرا، ایک کامیڈی اور کیمیا پر کچھ رسالے شائع کیے۔ اس کے بعد وہ پیرس سے ویانا آیا اور فرانسیسی سفیر کا سکریٹری بن گیا۔ ایک سال بعد وہ پیرس لوٹ آیا۔

شروع 1745 میں وہ پیرس میں اپنے ہوٹل کی ملا (Chamber Maid) تھیریز (Therese) کے ساتھ رہنے لگا جس سے کئی بچے ہوئے جو سب کے سب "ناجائز بچوں کی پرورش گاہ" بھیج دیے گئے۔ بعد میں اس نے تھیریز سے باقاعدہ طور پر شادی کر لی۔ پیرس واپس آنے کے فوراً بعد اس کی ملاقات ڈینس ڈکٹے رو (Denis Dicterot) سے ہوئی۔ یہ ابھی ایک نوجوان فلسفی تھا لیکن اس نے آیندہ چل کر روسو کو بہت متاثر کیا۔ سنہ 1745 سے 1752 تک روسو دو پین (Dupin) خاندان میں بحیثیت سکریٹری نوکر رہا۔ اس دوران اس نے مادام دوپیکن کی عورتوں سے متعلق ایک کتاب کی تیاری میں مدد کی۔ اپنے اس کام کے ساتھ ڈیڈرو کے اکسانے پر اس نے "سائنس اور آرٹ" پر ایک مضمون

لکھا جسے مقابلہ میں پہلا انعام ملا۔ شایع شدہ مضمون میں اصل کے کئی صفحے حذف کر دیے گئے۔ خاص طور پر "آزادی" کا لفظ ہر جگہ خارج کر دیا گیا اور کئی صفحے جو اس نے بادشاہوں کے ظلم و تشدد اور کلیسا کی عیاریوں کے بارے میں لکھے تھے حذف کر دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود باقی ماندہ مضمون میں بھی سائنس اور ادب پر سخت حملے کیے گئے تھے کہ کس طرح وہ چند مٹھی بھر مالدار لوگوں کے پروپگنڈہ کے ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور عوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کی تنقید یورپ کی بادشاہتوں کے تمام سائنٹفک اور ادبی اداروں پر صادق آتی تھی۔

روسو کے اس مضمون کی اشاعت پر بحث و مباحثے کا دروازہ کھل گیا جو تین سال تک جاری رہا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے خیال کی اور زیادہ وضاحت شروع کی۔ اس نے امیری اور عیش و عشرت ہی کی مذمت نہیں کی بلکہ ان کے اسباب بھی تلاش کیے۔ اس کے الفاظ آج بھی کتنے حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے لکھا تھا:

> "تمام برائیوں کی جڑ سماج میں نابرابری ہے۔ نابرابری کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں اکٹھا ہونے لگی۔ امیر اور غریب کی اصطلاحیں اضافی ہیں۔ جب سب لوگ مساوی ہو جائیں گے تو یہ تفاوت خود بخود ختم ہو جائے گا۔ جب دولت اکٹھا ہوتی ہے تو اس سے عیش و عشرت اور کاہلی جنم لیتی ہے۔"

اسی زمانہ میں روسو موسیقی بھی مرتب کرتا اور لکھتا رہا۔ جب ڈیڈرو نے 'انسائیکلوپیڈیا" مرتب کی تو اس کے لیے موسیقی پر تمام مضامین روسو نے لکھے۔ بعد میں اس نے انھیں الگ بھی "موسیقی کی لغت" میں شایع کیا۔ 1752 میں اس نے آپیرا "چالاک انسان" لکھا جو پہلی مرتبہ شاہی خاندان کے سامنے پیش کیا گیا۔ دوسرے دن جب انعام کے لیے روسو کو پندرہویں لوئی کے دربار میں پیش کیا جانے والا تھا تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا آپیرا بہت مقبول ہوا اور اس کے نقادوں نے جب یہ اعتراض کیا کہ اس کے اپنے مشہور مقالے میں ظاہر کیے ہوئے خیالات کے خلاف ہے تو اس نے جواب دیا کہ زہر کا علاج میں زہر سے کر رہا ہوں۔ بے ایمانوں کو بے نقاب کر کے ان کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ اس نے اپنی تمام قیمتی چیزیں فروخت کر ڈالیں۔ بینک کی نوکری چھوڑ دی اور عسرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کے خیالات کی وجہ سے 1753 سے پولس نے اس پر اپنی نگرانی قائم کر دی۔ جہاں تک معاشیات اور سیاسیات کا تعلق ہے روسو نے اپنے مضامین میں تفصیلی جائزہ لیا ہے کہ کس طرح شروع میں سب انسان مل جل کر رہتے تھے اور کس طرح زراعت کی ترقی اور لوہے کی دریافت سے ذاتی ملکیت کا رواج شروع ہوا اور اس نے امیر و غریب کی تفریق پیدا کی اور پھر اس نے جنگوں کو جنم دیا۔

دی دے رو کی انسائیکلوپیڈیا کے "سیاسی معیشت" پر ایک مضمون میں اس نے اس تفریق کو کم کرنے کے تین طریقے بتلائے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ سیاسی فرایض اور حقوق میں مساوات پیدا کی جائے۔ جس سے مالدار لوگ دوسروں کی زندگی میں مداخلت نہ کر سکیں۔ دوسرے تعلیم عام کی جائے۔ تیسرے ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جائے کہ جس میں مالدار لوگوں پر بھاری ٹیکس لگایا جائے اور سرکاری جائداد کی آمدنی عوام کی بھلائی پر صرف کی جائے۔

1754 اور اس کے فوراً بعد کے دور میں روسو انسائیکلوپیڈیا والوں اور ان کے فلسفہ کی برابر حمایت کرتا رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ان سے الگ کر لیا۔ وہ اگرچہ کیتھولک نہیں بنا لیکن اپنے ساتھیوں کی طرح تمام مذاہب کو اپنے حملوں کا نشانہ بھی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ دل کی مذہبیت کا قائل تھا۔ اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا کے حامی نئے ابھرتے بورژوا طبقہ کے ساتھ تھے۔ انھیں عوام کی حالت بہتر بنانے کی بجائے پیداوار بڑھانے سے دلچسپی تھی۔

1775 میں روسو پیرس کی زندگی سے تنگ آکر ایک دوست کے یہاں دیہات میں چلا گیا اور وہاں اس نے ایک ناول "جولی" لکھا جس میں اس نے اخلاقیات، فلسفہ، مذہب حتیٰ کہ معاشیات تک پر اپنے خیالات پیش کیے۔

اسی زمانہ میں انسائیکلوپیڈیا گروپ سے اس کے اختلافات اور بڑھ گئے اور مذہب اور آرٹ کے مسائل پر اس نے اس گروپ پر سخت حملے کیے۔ پیرس سے باہر اپنے قیام کے زمانہ میں اس نے تعلیم کے مسئلہ پر بھی کافی توجہ کی۔ اس نے تعلیم پر اپنی کتاب "ایمیلی" میں اس پر زور دیا کہ ماؤں کو اپنے بچوں کو خود اپنا دودھ دینا چاہیے اور انھیں جسمانی طور پر

تومند بنانا چاہیے۔ بچوں کو اپنی دلچسپی کے مضامین چننے کا موقع ملنا چاہیے۔ بڑے ہونے کے بعد استاد اور شاگرد میں آزادانہ تعلقات ہونے چاہئیں اور استاد کا فرض ہے کہ طالب علم کو مذہب کی مسرتیں حاصل کرنے اور سماج میں پیش آنے والے مشکلوں کا سامنا کرنے کا اہل بنانے میں مدد دے۔

اپنی کتاب معاہدہ عمرانی (Social Contract) میں اس نے اپنے سیاسی خیالات تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ اس میں اس نے یہ بتلایا ہے کہ کس طرح سماج میں عدم مساوات پائی جاتی ہے۔ کیوں ایک آدمی ایک دوسرے کی محکومی پر مجبور ہوتا ہے اور اس مسئلہ کے حل کے معاہدہ عمرانی ضروری ہے جسے سب اپنی مرضی سے قبول کریں اور اپنے کو اس کا پابند بنائیں۔ ان سب کی بنیاد شخصی آزادی ہے۔ امیر غریبوں کا استحصال نہ کر سکیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں ہر شخص کو کچھ مل سکے اور کسی کو بہت زیادہ نہ ملے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ اختیار کلی عوام کو حاصل رہے اور وہ اپنا اختیار ایک ایسی حکومت کے ذریعہ استعمال کر سکیں جسے وہ جس وقت چاہیں ہٹا سکیں۔ رومن سلطنت کے طریقہ کار کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ "تبدیل مذہب" سیاسی طور پر ضروری ہے جس میں ہر مذہب کو یکساں حق حاصل رہے گا۔

1762 میں پیرس کی پارلیمنٹ نے اس کی کتابوں ایمیل اور معاہدہ عمرانی کی سخت مذمت کی اور انھیں حکومت اور مذہب کے خلاف بتلایا۔ روسو کو بھاگ کر سوئٹزرلینڈ میں پناہ لینی پڑی لیکن وہاں بھی اس کی کتابیں ممنوع قرار پائیں۔ روسو نے اپنی کتابوں پر اعتراضات کا سختی سے جواب دیا۔ 1764 میں اسے ایک پمفلٹ "ایک شہری کے احساسات" ملا جس پر لکھنے والے کا نام نہیں تھا۔ اس میں اس پر سخت حملے کیے گئے تھے۔ اسے وحشی، ریاکار، شقی القلب باپ اور احسان فراموش دوست کہا گیا تھا۔ جب روسو کو یہ معلوم ہوا کہ وہ والٹیر نے لکھا تھا تو اسے بے حد صدمہ ہوا اور جب اس صدمہ سے جانبر ہوا تو اس نے اپنی مشہور خود نوشتہ سوانح عمری "اعتراف" (Confessions) لکھنی شروع کی۔

1765 میں اس کی ایک تصنیف پروٹسٹنٹ کلیسا نے بے حد شور مچایا۔ دوستوں کی مدد سے جنوری 1766 میں وہ انگلستان آیا اور انگریز فلسفی ہیوم نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا لیکن دونوں میں سخت لڑائی ہو گئی اور روسو 1764 میں پھر فرانس آ گیا اور نام بدل کر رہنے لگا۔ اپنی کتاب "لغت موسیقی" شائع کی اور "اعتراف" لکھنے لگا۔ اب اس کی صحت خراب ہو چکی تھی اور ہر ایک پر وہ سازش کا شبہ کرنے لگا تھا۔ جولائی 1778 کو اس کا انتقال ہو گیا اور اسے ارمینیان ویلا (Earmenon Villa) میں ایک جھیل کے پاس دفن کیا گیا۔ فرانس کے انقلاب کے بعد اس کا تابوت پیرس میں منتقل کر دیا گیا۔

رومن لاء (Roman Law): رومن لاء سے مراد وہ قانون ہے جو قدیم شہر روما کے آباد ہونے کے بعد جس کی تاریخ عام طور پر 753 ق م خیال کی جاتی ہے نافذ ہوا اور پانچویں صدی عیسوی میں مغربی حصہ مملکت کے زوال کے بعد یہ قانون صرف مشرقی حصہ میں 1453 تک (جب ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا) نافذ رہا۔ رومن لاء کا اثر رومن سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی صدیوں تک باقی رہا۔ مثال کے طور پر رومن لاء پورے جرمنی کے لیے ایک مشترک قانون مرتب ہونے تک (1900) ملک کے ایک بڑے حصہ میں ایک ذیلی قانون کی حیثیت سے رائج رہا۔ یہی حالت یورپ کے اکثر حصوں کی تھی البتہ اگرچہ ان علاقوں میں رومن لاء باقی رہا لیکن اپنی اصلی حالت میں نہیں بلکہ کچھ مقامی ترمیمات کے ساتھ۔

رومن لاء کی تاریخ (History of Roman Law):

شہر روم کی بنیاد سے شہنشاہ جسٹینین (Justinian) (565-527) کی وفات تک تیرہ صدیاں گزریں۔ وقت کی اس طویل میعاد میں رومن لاء مختلف مدارج سے گزرا اور نافذ رہا۔ یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ کسی مخصوص وقت پر رومن لاء کس نوعیت سے نافذ تھا کیونکہ اس کے نافذ العمل رہنے کے معیاد کافی طویل رہی۔ ایک حد تک اس کے مدارج کی تقسیم ذیل کے دور میں کی جا سکتی ہے۔

(1) قیاسات کا دور (Period of Conjecturs) اس دور میں شہنشاہیت کا زمانہ 753 قبل مسیح سے 510 قبل مسیح تک اور جمہوریت کا زمانہ بارہ جدول (XII Tables) کے نفاذ تک 451 قبل مسیح 450 قبل مسیح) شریک کہا جا سکتا ہے۔

(2) وسط جمہوریت کا دور۔ یہ دور بارہ جدول کے نفاذ سے دوسری صدی قبل مسیح کے درمیان کا زمانہ ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(3) جمہوریت کا آخری دور۔ یہ جمہوریت کے آخری ڈیڑھ سو سال کا زمانہ ہے۔ اس دور میں رومن لاء کے متعلق سے متعدد کتابیں قانون داں دانشوروں نے لکھیں۔ غیر ملکی اجنبی اشخاص (Foreigners) کا موقف اس زمانے میں نہایت کمزور تھا اور اجنبی آدمی کی حیثیت ایسی شعبہ کی طرح تھی جس کا کوئی مالک نہ ہو بجز اس کے کہ اس اجنبی کے ملک اور روم کے درمیان کوئی معاہدہ پہلے سے نہ ہوا ہو۔ اس زمانے کے دوسرے قانونی سسٹم کی طرح رومن لاء عام طور پر ان اشخاص سے متعلق تھا جو رومن ہوں یعنی رومن قانون صرف رومن سلطنت میں رہنے والوں کے لیے تھا نہ کہ اجنبی اشخاص کے لیے۔ لیکن اس زمانے میں بھی بیرونی ممالک سے معاہدات تھے اور ان معاہدات کے تحت اجنبی اشخاص کی حفاظت رومن سلطنت میں کی جاتی تھی۔

ارسطو نے قانون کو دو اقسام میں تقسیم کیا تھا ایک قانون جو بالکل قدرتی ہو اور دوسرا قانون وہ جسے انسانوں نے بنایا ہو۔ ارسطو نے یہ بات واضح طور پر کہی ہے کہ قدرتی قانون ہر جگہ نافذ تھا ارسطو کا یہ نظریہ ان مقامات پر مطابق آتا ہے جہاں انسانی زندگی بالکل قانون قدرت کے تحت چلتی ہے۔

رومن لاء کے ماخذ(Sources of Roman Law):
رومنوں (Romans) نے اپنے قانون کو قانون موضوع اور قانون غیر موضوعہ میں تقسیم کیا تھا۔ رومنوں کے نزدیک قانون غیر موضوعہ (Jusnonscriptum) یا غیر تحریری قانون سے مراد وہ رواج تھے جو ضبط تحریر میں لائے گئے اور وہ قوانین بھی تھے جو باقاعدہ قانون سازی کے ذریعہ نافذ نہیں کیے گئے بلکہ ایسے ماخذ سے لیے گئے جن کا ثبوت تحریراً موجود تھا یا اس نوعیت کے ماخذ سے لیے گئے جن کا ثبوت تحریراً موجود تھا۔ اس نوعیت کے ماخذ کو لیگاس پلیبیشین (Legas Plebician) کہا جاتا تھا۔

ریاستوں کے حقوق و فرائض : بین الاقوامی قانون ان اصولوں اور ضابطوں کا مجموعہ ہے جن کا مقصد ریاستوں کے آپسی روابط کو منضبط کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر لازم کرنا بھی ہے۔ چونکہ ایک مہذب بین الاقوامی سماج کے وجود کے لیے ان اصولوں پر عمل کرنا ناگزیر ہے ریاستیں رضاکارانہ طور پر بین الاقوامی قانون کو اپنے اوپر لازم تسلیم کرتی ہیں اور اکثر و بیشتر اس کی دفعات پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ بین الاقوامی نظام کے تاریخی ارتقاء کے دوران ریاستوں کے حقوق و فرائض بھی متعین ہوئے ہیں لیکن ان سے متعلق اصول عمومی، لچکدار اور غیر مرتبہ ہیں۔ اسی لیے مدت سے بین الاقوامی قانون کے ماہروں کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ ریاستوں کے بنیادی حقوق و فرائض کی ایک مستند اور جامع فہرست مدون کریں۔ بعض بین الاقوامی کانفرنسوں اور اداروں نے بھی اس سلسلے میں کوشش کی۔ مثال کے طور پر 1916 میں امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انٹر نیشنل لاء کی قرارداد اور 1933 کی مان ٹوایڈو کنونشن (Montiuido Convention)، بابت حقوق و فرائض ممالک۔ اس سمت میں اقوام متحدہ کے بین الاقوامی قانون کمیشن نے بھی ایک کوشش کی۔ 1949 میں مملکتوں کے حقوق و فرائض کے اعلان کا مسودہ پیش کیا گیا۔ یہ مسودہ ابھی تک مسودہ کی شکل ہی میں ہے اور رکن ممالک کے زیر غور ہے۔ چونکہ اکثر ممالک کھل کر اور قانوناً خود کو اس کی دفعات کا پابند کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لہٰذا اس کی منظوری کا امکان کم ہے۔

اقوام متحدہ کے اس اعلان میں چند خاص حقوق کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: ریاستوں کی آزادی و خودمختاری اور علاقائی اقتدار اعلیٰ کا حق۔ قانون کے تحت دوسری ریاستوں سے برابری کا حق اور مسلح حملہ کی صورت میں اپنے دفاع کا حق۔ ملکوں کے چند خاص فرائض یہ ہیں۔ دوسرے ملکوں کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت، دوسرے ملکوں میں خانگی خلفشار پھیلانے سے پرہیز، اپنی سرزمین کو غیر ممالک کے خلاف سیاسی دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال ہونے سے روکنا، جنگ و تشدد کو قومی پالیسی کے حربہ کے طور پر استعمال نہ کرنا اور معاہدات کی نیک نیتی سے تعمیل کرنا۔ اس مسودہ کا مطمح نظر اخلاقی ہے۔ یعنی بین الاقوامی روابط کو انصاف اور قانون کی بنیاد پر منضبط کیا جائے۔ یہی مقصد فطری حقوق سے متاثر پرانے دو بین الاقوامی قوانین کا تھا۔

ریاضیاتی معاشیات : معاشیات کی ساخت اور اس کے نظریوں کی توضیح کے لیے معاشیات کے ایک شعبہ کی حیثیت سے ریاضیاتی معاشیات کے ظہور سے قبل، علم معاشیات ارتقا کی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ معاشیات سے متعلق ابتدا جو کچھ لکھا گیا وہ غیر ریاضیاتی تھا۔ آدم اسمتھ کا معاشی ارتقا کا نظریہ یا کارل مارکس کا تغیر کل کا نظریہ معاشی نظاموں سے متعلق دستاویزات کی حیثیت رکھتے تھے۔ آدم اسمتھ کی تشکیل

دولت کی ماہیت سے متعلق تحقیق 1776 سے آلفریڈ مارشل کے روزمرہ زندگی میں تاجر کے روپے کے تجزیے 1890 تک کے دور کی معاشی غور وفکر پر انیسویں صدی کے علم ریاضیات اور ریاضیاتی طبعیات کے ارتقان بڑا اثر ڈالا۔ موجودہ دور کی بیشتر ریاضیاتی معاشیات کی بنیاد نیوٹن کے نظریات توازن و تفرق احصا پر رکھی گئی ہے۔

معاشی نظریات سے ریاضیاتی معاشیات کا تعلق ریاضیاتی منطق نے پیدا ہونے والے چند مفروضات کی مدد سے معاشی استدلال کی اساس اخذ کرنے سے ہے۔ معاشی نظریات کی ریاضیاتی احساس، حقائق کو منفصل سے تسلسل میں، غیر متجانس سے متجانس میں، ماہیتی سے کمیتی میں اور تجربی سے مثالی صورت حال میں تبدیل کر دیتی ہے۔ تاہم کسی بھی سائنسی اصولوں کے پیش نظر ریاضیاتی معاشیات معاشی رویہ کی پیش کشی میں استعمال ہونے والے چند مفروضات کی مدد سے حقائق کو ان یکسانیتوں کی سطح تک لے آتی ہے جس کو عام طور پر ماڈل (نمونے) کہا جاتا ہے۔ لیکن مفروضات کی جانچ کیے بغیر ان ریاضیاتی ماڈل کو معاشی حقائق کے مساوی نہیں قرار دینا چاہیے۔

ریاضیاتی ماڈل تین اہم مقاصد کے لیے تشکیل دیے جاتے ہیں۔ معاشی مسائل کی معقول توضیح، معاشی رویّہ اور نتائج کی پیش قیاسی اور بالآخر تجزیاتی ماڈل کی فراہمی تاکہ دوسرے مفروضات، نتائج اور دعووں پر روشنی پڑسکے۔ ریاضیاتی منطق استخراجی نوعیت کی حامل ہے۔ لیکن معیشت چونکہ تجرباتی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کوئی شخص بھی معاشی رویہ اور معاشی نظام سے متعلق استقرائی بیان دے سکتا ہے۔ ریاضیاتی استخراج سے متعلق مفروضات کی نوعیت اکثر مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے ان مفروضات کو ٹھیک طور پر سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے۔ مثلاً پیدائش اور صرف میں یکتا توازن کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے خارجی اثرات کا فقدان ضروری ہے لیکن ان اثرات کا وجود مختلف اور معقول معاشی رویّے کی بھی تشریح کرتا ہے۔ ایسے ریاضیاتی ماڈل کو مفروضات کی معقولیت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے وہ پیش قیاسیوں کے لیے ٹھیک ہوسکتے ہیں۔ فریڈمن (1953) کا کہنا ہے کہ ایسے ماڈلوں (نمونوں) کا جو پیش قیاسی کے لیے معقول ہوں معاشی تجزیے کے لیے استعمال ان کے مفروضات سے متعلق بحث میں پڑے بغیر کیا جاسکتا ہے۔ وسیع میدان پر محیط معاشی ماڈلوں کے تعلق سے تعین کرنے والے ریاضیاتی ماڈلوں کی بنیاد پر پیش قیاسی زیادہ محفوظ خیال کی جاتی ہے۔ مثلاً کینز کا نظریے ضارب پیش قیاسی کی اچھی صلاحیت رکھتا ہے حالانکہ تمام آمدنیوں سے متعلق صرف کے حاشیائی (Marginal) رجحان میں قرار و یکسانت کے مفروضہ کا معقول ہونا ضروری نہیں ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ریاضیاتی معاشیات نے معاشین کو چند ایسے میدانوں کی سیر بھی کرائی ہے جو نظری معاشین کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ سایہ قیمت سے متعلق لگرانجیوں کی تعبیر نے کسی کام کی لاگت اور منافع کے تجزیے اور خانگی و سماجی فوائد میں امتیاز کی طرف رہبری کی ہے۔ اصول ضارب اور اصول اسراع نے تجارتی چکروں سے متعلق دعووں کی تشکیل میں معاشین کی رہنمائی کی ہے۔

ریاضیاتی معاشیات۔ مستقبل : موجودہ دور میں معاشی تجزیے کے لیے استعمال کی جانے والی تفویض مدت معاشی رویّے کے اکمل تجزیے کے لیے ناموزوں خیال کی جاتی ہے۔ چند دیگر پیمانے مثلاً آمدنی، اسٹاک یا قیمتیں مدت کا اچھا بدل ثابت ہوسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خطی نظریات نے معاشی تجزیہ کو بڑی حد تک محدود کر رکھا ہے جبکہ غیر خطی ماڈل حقیقی اور دور رس معاشی اطلاق کی صلاحیت کے حامل ہوسکتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ معاشی متغیروں جیسے سرمایہ، اسٹاک، محنت، افادہ وغیرہ کے جمیتی نوعیت کے مسائل کے لیے ریاضیاتی معاشیات کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اگرچہکہ اشاری عدد طریقہ کار میں جمیتی خصوصیت ہے پھر بھی خطی مفروضات پر انحصار باقی رہتا ہے۔ آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاضیاتی استدلال اپنی پوری مہارت سے کئی مخفی مفروضات کو ظاہر کرنے اور معاشی قوانین کو تقویت دینے کے باوجود صرف قابل مطالعہ اور قابل اطلاق معاشی قانون ہی تصور کیا جاسکتا ہے۔

معاشیات ایک تجربی علم ہے۔ معاشی مفروضات کی تصدیق اور نتائج اخذ کرنا معاشی تجزیہ کا ایک حصہ ہے۔ واقعات کے اظہار و مفروضات کی آزمائش کے مقصد سے پیمائشی معاشیات میں تعین کرنے والے ریاضیاتی ماڈل اور تعلقات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے ریاضیاتی معاشیات کو اصول معاشیات اور پیمائشی معاشیات کے مابین واسطہ کہا جاسکتا ہے۔

ریکارڈو، ڈیوڈ (Recardo, David, 1772-1823) :
19ویں صدی کا مشہور برطانوی عالم معاشیات جس نے علم معاشیات کا

باقاعدہ مطالعہ کیا اور کلاسکی شکل دی۔ اس کا باپ لندن کے اسٹاک ایکسچینج کا ممبر تھا۔ 1786 میں وہ اپنے باپ کے کاروبار میں شریک ہوگیا اور غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ مذہبی اختلافات کی وجہ سے وہ اپنے خاندان سے الگ ہوگیا۔

ریکارڈو نے پہلی دفعہ یہ دکھلایا کہ کس طرح قیمتوں کی سطح کا تعلق بینک نوٹس سے ہے۔ بینک نوٹس میں اضافے سے قیمتیں بڑھتی ہیں۔

اس کا دوسرا اہم کارنامہ اس کی تصنیف معاشیات کے اصول اور ٹیکس (Principles of Political Economy and Taxes) ہے۔ 1814 میں ریکارڈو کاروبار سے الگ ہو کر پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا۔ ریکارڈو کی رائے کا تمام ماہرین معاشیات بڑا احترام کرتے تھے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ز

زرعی معاشیات : زرعی معاشیات معاشیات کی وہ شاخ ہے جہاں فصلوں، درختوں، مویشیوں، مرغیوں اور مچھلیوں جیسی حیاتیاتی اشیا کی پیداوار، تقسیم اور کھپت کے لیے تقسیم وسائل کے مطالعہ میں معاشی تجزیہ کے معیاری طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ زمین اور دیگر قدرتی وسائل جیسے بارش وغیرہ کا ان اشیا کی پیداوار میں اہم حصہ ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے موسمی پیداوار کا ایک خاص اور نسبتاً غیر لچکدار ڈھنگ متعین ہوجاتا ہے اور پیداوار میں ایسی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے جس کا اندازہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ مزید برآں چونکہ یہ اشیا جلد خراب ہوجاتی ہیں اس لیے ان کی حفاظت پر کثیر صرفہ کرنے کے باوجود ان کی رسد کا لگاتار جاری رکھنا غیر یقینی ہوتا ہے۔ چونکہ زرعی پیداوار اساسی طور پر عضویاتی ضروریات کی تکمیل کرتی ہے اس لیے ان میں سے کئی چیزوں کی طلب مقررہ نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ان کے حصول میں ذرا سی دشواری ان کی قیمتوں میں قابل لحاظ اتار چڑھاؤ پیدا کرتی ہے۔

ہندوستان میں اب زرعی پیداوار سخت محنت اور جانفشانی سے حاصل کی جاتی ہے۔ اسی لیے دیہی علاقوں میں خوردنی اشیا کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف شہری علاقوں میں فی کس آمدنی زیادہ ہونے کے باوجود خوردنی اشیا کا فی کس استعمال نسبتاً کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ شہری آبادی کی عضویاتی ضروریات مقابلتاً کم ہوتی ہیں اور کچھ یہ کہ خوردنی اشیا کی قیمتیں دیگر استعمال ہونے والی اشیا کا لحاظ کرتے ہوئے دیہی علاقوں سے نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں۔ آمدنی کے موجودہ فرق کی وجہ سے دیگر اشیا ضروریات کی طلب گھٹ جاتی ہے کیونکہ مالدار طبقہ غریب طبقہ کے مقابلہ میں خوردنی اشیا نسبتاً کم خرچ کرتا ہے غرض یہ کہ میکانکی طریقہ پیداوار اور شہری آبادی میں اضافہ کی وجہ سے جہاں خوردنی اشیا کی طلب کے گھٹ جانے کا امکان ہے وہیں آبادی میں غیر معمولی اضافہ فی کس آمدنی کے بڑھنے اور آمدنی کے فرق کے کم ہونے سے خوردنی اشیا کی طلب میں اضافہ ہونا ضروری ہے لیکن ابھی تک چونکہ فی کس آمدنی میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے اور آمدنی کا فرق بھی اور زیادہ بڑھ گیا ہے اس لیے اضافہ آبادی کو پیداوار کی مانگ میں اضافہ کی اہم وجہ قرار دیا جاتا ہے۔

اضافہ آبادی کی وجہ سے پیشہ زراعت میں صحت مند اور نوجوان مزدوروں کی زیادہ کھپت ہونے لگی ہے ساتھ ہی زراعت میں جدید تکنیک کے استعمال سے پیداوار کے زیرکاشت علاقہ اور فی ایکڑ پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کئی فصلہ کاشت کا طریقہ بھی عام ہورہا ہے۔ ذرائع آب پاشی میں سرکاری اور نجی سرمایہ کاری بھی زرعی پیداوار میں اضافے کے ایک اہم وجہ ہے۔ چھٹے دہے کے وسط میں تخموں کی انتہائی بارآور اقسام اور مصنوعی کھاد (فرٹیلائزر) جیسی جدید ٹکنالوجی کا استعمال بھی ہندوستان کی زرعی پیداوار میں اضافہ کا ایک اہم سبب ہے۔

ہندوستان میں معاشی منصوبہ بندی کے گذشتہ پچاس برسوں میں زرعی پیداوار میں سالانہ تین فیصد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور فی کس آمدنی میں اضافے کی وجہ سے پیداوار کی رسد کے مقابلہ میں طلب پیداوار کی رفتار کہیں زیادہ ہے۔ زرعی پیداوار کی طلب اور رسد کی اس غیر متوازن صورت حال نے دوسری اشیا کے مقابلہ میں زرعی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اور اگر چھوٹے پیداکار اپنی آمدنی میں حقیقی اضافہ کی وجہ سے زیادہ غلہ استعمال کرنے لگیں اور بڑے پیداکار قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے اپنی ضروریات کو کم کرکے زیادہ اناج فروخت کرنا شروع کردیں تو زرعی پیداوار کی قیمتوں میں مزید اضافہ کا امکان ہے۔ اور چونکہ بڑے کسان ہی اپنے غلہ کی فاضل پیداوار فروخت کی غرض سے مارکٹ میں لاتے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ غلہ کی قیمت میں اضافہ کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وجہ سے مارکٹ میں بھی غلہ زیادہ مقدار میں جمع ہوتا رہے۔

قیمتوں میں اضافہ سے بڑے کسان ہی نسبتاً زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ چھوٹے کسانوں کے مقابلہ میں اپنی پیداوار کی زیادہ مقدار فروخت کے لیے بازار میں لاسکتے ہیں۔ آمدنی کا فرق حقیقی معنوں میں اور بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ غریب طبقہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ اناج ہی پر صرف کردیتا ہے۔ زرعی خام مال کی قیمتوں کے بڑھ جانے نیز اجرتوں کے امکانی اضافہ کی وجہ سے صنعتی پیداوار کی لاگت بھی بڑھ جاتی ہے۔

قیمتوں میں اضافہ کا یہ رجحان اپنے آپ ختم نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر کسی مخصوص فصل کی مقدار میں اس کی قیمت میں اضافہ کی بناء پر خاص خواہ اضافہ ہو بھی جائے تب بھی زرعی پیداوار میں بہ حیثیت مجموعی کوئی خاص اضافہ نہیں ہوسکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پیداوار بڑھانے کی بہت کم چیزیں دستیاب ہوتی ہیں اس کے علاوہ بڑے پیانہ کی آبپاشی یا فرٹیلائزر جیسے زرعی کاروبار میں سرمایہ لگانا ہر انفرادی کسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

دیہات کا مالدار طبقہ جو فیصلہ کن سیاسی اقتدار کا بھی حامل ہوتا ہے اس بات سے قطعی دلچسپی نہیں رکھتا کہ مالدار لوگوں پر ٹیکس عائد کرکے قوامی سرمایہ کاری کے وسائل مجتمع کیے جائیں۔ اس کی دلچسپی تو بس اس حد تک ہے کہ جدید زرعی ٹکنالوجی کی مدد سے اپنی ذاتی پیداوار میں اضافہ کرے اور اسے منہ مانگے داموں پر فروخت کرکے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔

غلہ کی کمی کے مسئلہ کو جو زراعت میں ناکافی سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے۔ حکومت غلہ کی درآمد کے علاوہ تقسیم اناج کے ایک پبلک نظام لازمی لیوی اور مقررہ قیمتوں کے ذریعہ حل کرنا چاہتی ہے لیکن یہاں بھی دیہات کا مالدار طبقہ اپنی چالوں سے اسے ناکام بنادیتا ہے۔

زراعت کی حیاتیاتی نوعیت کی وجہ سے صنعتی ٹکنالوجی کی طرح باہر کی ترقی یافتہ زرعی ٹکنالوجی کا یہاں پر من و عن اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں قابل لحاظ سرمایہ کاری کے علاوہ ایسی مدت بھی درکار ہوتی ہے جس میں بلحاظ اقسام اراضی و موسمی حالات نئی ٹکنالوجی ملک میں جڑ پکڑ سکے۔ ابتدائی مرحلوں میں ترقی یافتہ ممالک کی ٹکنالوجی جسے زرعی فارم میں میکانیکی آلات کا استعمال وغیرہ ہندوستان کے ایسے ہی علاقوں میں رواج پاسکتی ہے جو زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور جہاں کے مالدار کسان سرمایہ کاروں کے وسائل رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف علاقوں اور کسانوں کے مختلف طبقات میں آمدنی کا فرق اور بڑھ جاتا ہے۔ خانگی سرمایہ کاری میں جدید تکنیک کے استعمال کی وجہ سے محنت کی ہر اکائی پر زیادہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے اور اس کے نتیجہ میں روزگار کے مواقع کم سے کمتر ہوجاتے ہیں۔

ہندوستان میں زمینداری اور جاگیرداری نظام کی برخاستگی آزادی کے بعد کی ایک اہم ادارہ جاتی اصلاح ہے تاہم پیشہ زراعت سے وابستہ آبادی کے مقابلہ میں قابل دستیاب اراضی کی قلت کو ملحوظ رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ملکیت اراضی کا موجودہ تفاوت بہت زیادہ ہے۔ صاحب اقتدار بڑے کسان ملکیت اراضی پر قانونی حد بندی، حق کاشتکاری کی ضمانت سے متعلقہ قوانین معقول لگان اور اجرتوں سے بڑی حد تک بچنے کی کوشش کرتے ہیں اراضی کی خرید و فروخت کے باوجود جو "فاضل اراضیات" کی تقسیم کے مقابلہ میں انتقال اراضی کا اہم ذریعہ رہی ہے۔ بڑے کسانوں کے پاس اب بھی اتنے وسیع مقبوضے ہیں کہ ان پر اجرتی مزدوروں کے ذریعہ بمشکل اچھی کاشت کی جاسکتی ہے۔ اس لیے یہ لوگ اپنی اراضی قول یا بٹائی پر دے دیتے ہیں یا پھر ممکن ہو تو میکانیکی طریقوں سے کاشت کرتے ہیں۔ چھوٹے قطعات اراضی کو قول یا بٹائی پر دینے کی وجہ سے زیادہ سرمایہ لگانے یا جدید ٹکنالوجی کو اپنانے کے مواقع نہیں ملتے اور اگر میکانیکی طریقہ کاشت اختیار کیا جائے تو وہ پیداوار اور روزگار کے نقطہ نظر سے سود مند نہیں ہوتا کیونکہ چھوٹے کھیتوں میں فی ایکڑ پیداوار اور روزگار کے مواقع بہ حیثیت بڑے فارمس کے زیادہ ہوتے ہیں۔

بڑے کاشتکار بہ آسانی رعایتی شرح سود پر ادارہ جاتی قرضے حاصل کرلیتے ہیں جو ان کی مقبوضہ اراضی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں اور چھوٹے کاشتکاروں کو لامحالہ مہاجنوں ہی کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے جو زیادہ سے زیادہ شرح سود پر قرضے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے کھیتوں کی پیداوار بہ نسبت چھوٹے کھیتوں کے زیادہ ہوتی ہے۔ پیداوار میں بہ حیثیت مجموعی اس صورت میں اضافہ ہوسکتا ہے جبکہ ادارہ جاتی اصلاح کے ذریعہ افزائش پیداوار کے پورے عمل میں چھوٹے کاشتکاروں اور کھیت مزدوروں کا مؤثر تعاون و اشتراک حاصل کیا جائے۔

زر قدر (Value of Money): زر کی قدر سے مراد اس کی قوت خرید (Purchasing Power) ہے۔ یعنی زر کی ایک اکائی مثلاً ایک

روپیہ سے اگر ایک کلو چاول یا ایک میٹر کپڑا خریدا جاسکے تو ہم کہیں گے کہ ایک روپیہ کی قدر ایک کلو چاول یا ایک میٹر کپڑا ہے۔ لیکن روپیہ کے ذریعے بے شمار قسم کی اشیا خریدی جاسکتی ہیں اس لیے روپیہ کی قدر کو ان تمام اشیا کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ ظاہر کرنا مشکل ہے۔ تمام اشیا کی ایک اوسط مقدار کے ذریعہ روپیہ کی قدر کو ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ مختلف اشیا کی اکائیوں کی پیائش مختلف پیمانوں کے ذریعہ کی جاتی ہے جن کو کسی یکساں اکائی میں تبدیل کرکے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال زر کی قدر کی ایک خاص وقت میں پیائش اور اس کے تعین کے بجائے دراصل اس کی قدر میں مختلف اوقات میں تبدیلی کی پیائش اور تعین ایک اہم مسئلہ ہے۔

چنانچہ ایک خاص وقت میں مختلف اشیا کی اوسط قیمت کا دوسرے وقت میں ان ہی اشیا کی اوسط قیمت کے تخمینہ کے ذریعہ مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ زر قدر یعنی اس کی عام قوت خرید میں کیا تبدیلی ہوئی ہے۔ اگر اوسط قیمت دوگنی ہوگئی ہے تو کہا جائے گا کہ زر کی قدر نصف ہوگئی ہے۔ اشیا کی اوسط قیمت میں ایک خاص وقت کو بنیاد قرار دے کر اس کے مقابلے میں دوسرے وقت میں تبدیلی کو ظاہر کرنے والے عدد کو قیمت کا اشاریہ عدد (Price Index Number) کہتے ہیں۔

زر کی قدر میں تبدیلی کیوں ہوتی ہے اس کا سب سے مشہور عام اور قدیم نظریہ وہ ہے جسے نظریہ مقدار زر (Quantity Theory of Money) کہتے ہیں جو مختصراً یہ ہے کہ اگر کسی مدت میں اشیا کی مقدار میں جن کا مبادلہ زر کے توسط سے ہوتا ہے کوئی تبدیلی نہ ہو۔ لیکن زر کی جملہ مقدار میں تبدیلی ہوجائے تو قیمت کی عام سطح میں اسی تناسب سے تبدیلی ہوگی یعنی اگر زر کی مقدار دوگنی ہوجائے تو قیمت کی عام سطح دوگنی اور زر کی عام قدر نصف ہوجائے گی۔

اگر زر کی مقدار نصف ہوجائے تو قیمت کی سطح نصف اور زر کی قدر دوگنی ہوجائے گی۔

زکوٰۃ: یہ وہ ٹیکس ہے جو مسلمانوں سے ان کی جمع شدہ مال پر لیا جاتا ہے۔ سونے، چاندی اور روپے پیسے پر بھی زکوٰۃ لی جاتی ہے اور مویشیوں اور تجارت پر بھی بشرطیکہ پورا ایک سال گزر جائے۔

زن و شوہر میں علاحدگی (Judicial Separation between Wife and Husband): اگر زن و شوہر میں اختلاف ہو تو علاحدگی کے لیے عدالت میں رجوع ہوسکتے ہیں اور عدالت سے علیحدگی کی ڈگری حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن بعد میں فریقین میں سے کسی ایک کی درخواست پر عدالت حالات سے مطمئن ہوکر پھر سے زن و شوہر کے تعلقات قائم کرنے کی غرض سے ڈگری کو واپس لے سکتی ہے۔

کوئی شادی جو قانون کے خلاف کی گئی ہو وہ قانوناً کالعدم متصور ہوگی اور کسی ایک فریق کی درخواست پر عدالت سے ایسی شادی کو کالعدم قرار دینے کی ڈگری دی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی شادی حسب ذیل صورتوں میں فسخ کی جاسکتی ہے:

(1) شادی عملاً واقع نہیں ہوئی کیونکہ مرد میں مردی نہ تھی۔

(2) قانون کے تحت جو شرائط درج کیے گئے ہیں ان کے خلاف شادی عمل میں آئی ہے۔

(3) درخواست گزار سے شادی کے لیے رضامندی جبراً یا دھوکے سے لی گئی ہے یا جن صورتوں میں سرپرست کی رضامندی کی ضرورت ہے سرپرست کی رضامندی جبراً یا دھوکے سے لی گئی ہے۔

(4) عورت شادی کے وقت حاملہ تھی۔

تیسری شرط بالا کے تحت فسخ شادی کی درخواست جبر یا دھوکے کے ایک سال کے اندر دی جانی چاہیے ورنہ درخواست قابل قبول قرار نہ پائے گی۔

زنا تعلق آمیز (Adultery) کے متعلق سیدھی شہادت (Direct Evidence) بہت کم دستیاب ہوتی ہے لیکن ایک شخص کا دوسرے شخص کی جوان بیوی کے کمرے سے آدھی رات میں باہر آنا قانونی طور پر واقعاتی شہادت ہوجاتی ہے۔ واقعاتی شہادت (Circumstantial Evidence) کی بنا پر کسی جرم کو ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ واقعات کا تسلسل انتہائی مضبوط ہو تاکہ عدالت کو شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اے آئی آر 1967 منی پور (A.I.R. 1967, Manipur) اگر کسی جرم کا عینی شاہد نہ ہو تو واقعاتی شہادت (Circumstantial Evidence) کی بنا پر جرم ثابت کرنے کے لیے انتہائی لازمی ہے کہ واقعات متعلقہ کی جانچ پوری طور پر کر لی گئی ہو اور یہ کہ ان واقعات متعلقہ کے تسلسل کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہ ہو (1967 اے آئی آر) عینی شہادت (Eye Witness) اگر کوئی مادی یا اہم اختلاف (Material or Fatal Contradiction) پیش نہ کیا گیا ہو تو

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

عینی شہادت میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں ہے کہ اگر کسی مقدمے میں عینی شہادت کو قبول نہ کیا جائے تو اس جرم کو دیگر واقعاتی شہادت سے ثابت نہیں کیا جاسکتا اگر دیگر واقعات متعلقہ نہایت مضبوط ہوں تو عدالت ان واقعات متعلقہ پر غور کرسکتی ہے۔

قانون شہادت کی رو سے عدالتوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ کسی واقعہ کو ثابت کردہ فرض کریں (Presumed) بجز اس کے کہ اس کے خلاف کوئی اور شہادت پیش کی گئی ہو۔ اگر قانون شہادت کی رو سے ایک واقعہ کسی دوسرے واقعہ کو ثابت کرنے کے لیے قطعی ثبوت (Conclusive Proof) ہو تو عدالت پہلا واقعہ ثابت ہونے کی صورت میں دوسرے واقعہ کے خلاف کوئی شہادت قبول نہ کرے گی مثال کے طور پر اگر عدالت میں ایک بار کسی مرد اور عورت کی شادی ثابت ہوجائے تو ایک مدت کے بعد بھی ان دونوں کے باہمی تعلقات شوہر اور زوجہ ہی کے سمجھے جائیں گے اور اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہوگی اور اس کے خلاف کوئی شہادت عام طور پر عدالت قبول نہ کرے گی۔

زیدیہ: یہ لوگ حضرت زید بن علی بن حسین کی نسبت سے زیدی اور زیدیہ کہلاتے ہیں۔ اہل تشیع کے تمام فرقوں میں یہ فرقہ اہل سنت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ اپنے ائمہ کو منصب نبوت پر فائز یا نبیوں کے ہم پلہ نہیں قرار دیتا بلکہ عام لوگوں کی طرح ان کو بھی انسان سمجھتا ہے مگر آنحضور صلعم کے بعد تمام لوگوں سے افضل مانتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ عقیدہ بھی نہیں ہے کہ آپ نے کسی کو امام متعین اور نامزد کر دیا تھا بلکہ ان کے خیال میں آپ نے کچھ اوصاف بتائے ہیں جو امام میں پائے جانے ضروری ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان اوصاف کے حامل رسول اللہ کے بعد حضرت علی تھے جو افضل الصحابہ تھے تاہم وہ مفضول کی امامت کو جائز سمجھتے ہیں اس بنا پر وہ حضرت ابوبکر و عمر وغیرہ کی امامت کو درست اور صحیح مانتے ہیں اور جن لوگوں نے ان حضرات سے بیعت کی وہ کافر نہ تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک بیک وقت دو مختلف علاقوں میں الگ الگ دو امام ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے علاقہ کا امام ہوگا بشرطیکہ وہ اوصاف مذکورہ کا حامل ہو۔ معتزلہ کی طرح ان کے نزدیک بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب ابدی جہنمی ہے۔

حضرت زید کے بعد ان کی اولاد کی جانشینی ہوئی مگر بتدریج اس فرقہ کا اثر کم ہوتا رہا اور متاخرین کے خیالات متقدمین سے مختلف ہوگئے جو علم روافض کی طرح شیخین کی امامت تسلیم نہیں کرتے۔

آج کل اس فرقہ کے لوگ یمن میں موجود ہیں اور ان کے عقائد متقدمین زیدیہ سے زیادہ قریب ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے نوشتہ شیعہ)

زیر قدری (Devaluation): سرکاری طور پر کسی کرنسی کی بیرونی شرح مبادلہ میں کمی کرنے کو زیر قدری کہتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کے اکثر ملکوں میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے کئی مرتبہ زر کی زیر قدری ہوئی ہے۔ بین الاقوامی مالی فنڈ (International Monetary Fund) کے قیام کے بعد اس بات پر زور دیا گیا کہ ہر ممبر ملک اپنی کرنسی کو بہ لحاظ شرح مبادلہ ڈالر یا سونے کے مقابلہ میں مستحکم رکھنے کی کوشش کرے گا اور اتار چڑھاؤ ایک فی صدی سے زیادہ نہیں ہونے دے گا (یہ حد 1971 میں 2.25 فی صدی کر دی گئی) اور اگر شرح میں تبدیلی کرنی ہوئی تو اس کے بین الاقوامی مالی فنڈ کی اجازت لینی ضروری ہوگی اور یہ تبدیلی اسی صورت میں کی جائے گی جبکہ توازن ادائی کا بحران سخت ہوجائے۔ چنانچہ اکثر ترقی یافتہ ملک توازن ادائگی کے بحران کی صورت میں زیر قدری کو آخری حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لیے اکثر تفریط زر (Deflation) اور بیرونی قرضہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ زیر قدری کی مدد سے توازن ادائگی کو ٹھیک کرنا اس لیے ممکن ہے کہ اس سے برآمدات کی قیمت گر جاتی ہے اور اندرونی منڈی میں درآمد کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن تخفیف زر سے نتیجہ ہمیشہ اچھا نہیں نکلتا۔ اس کا فوری نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ تجارت کے شرائط بدل جاتے ہیں۔ اسی قدر مال برآمد کر کے جو بیرونی زر اب حاصل ہوتا ہے اس سے درآمد میں کم مال آتا ہے۔ چنانچہ درآمد کی پرانی مقدار اور پرانی سرمایہ کاری باقی رکھنے کے لیے برآمد بڑھانی پڑتی ہے۔ اور اس کے لیے مال کی اندرونی کھپت کو کم کرکے برآمد کو بڑھانا پڑتا ہے۔

بعض اوقات زیرقدری سے حقیقی آمدنی گھٹ جاتی ہے اور توازن ادائگی کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر کسی ایسے وقت میں زیرقدری کی جائے جبکہ ملک کی معیشت مکمل روزگار کی سطح پر ہے تو اندرون ملک بڑھتی ہوئی طلب کی تکمیل کے لیے حکومت کو پیداوار میں اضافہ کے لیے بہت سارے اقدامات کرنے ہوں گے۔ اور اگر یہ نہ کیا گیا تو ملک کو افراط زر (Inflation) کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سے توازن ادائگی کی بہتر صورت حال پھر سے ایک مسئلہ بن جائے گی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

س

سازش (Conspiracy) : قانونی ٹارٹ کے معنی یہ ہیں کہ دو یا دو سے زیادہ اشخاص آپس میں مل کر نقصان پہنچانے کی نیت سے ایسا کام کریں جس سے کسی دوسرے شخص کے قانونی حقوق کو نقصان پہنچے۔ سازش کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ طریقہ کار جو اختیار کیا گیا وہ قانونی طور پر جائز تھا یا نہیں ہر ایک شخص جو ایسی سازش میں شریک ہو قابل مواخذہ ہے۔ سازش اگر کسی جرم کے ارتکاب کے لیے کی جائے یا کسی جائز غرض کے حصول کے لیے ایسے وسائل اختیار کیے جائیں جو قانوناً ممنوع ہوں تو وہ جرم ہے۔

ہر اس شخص کو ہرجانہ کے دعوے کا حق حاصل ہے جس کو کسی سازش سے نقصان پہنچے۔ لیکن محض دو یا دو سے زیادہ اشخاص کا آپس میں مل کر کوئی ایسا کام کرنا جس کی غرض اپنے کاروبار کو فروغ دینا ہو اگر جب کہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے شخص کے کاروبار کو نقصان پہنچے تو یہ ٹارٹ کی تعریف میں نہیں آتا ہے۔ بشرطیکہ جو وسائل اختیار کیے جائیں وہ قانوناً ناجائز ہوں مثلاً دو یا دو سے زیادہ تاجر اپنے مال کی قیمت گھٹا کر اس کو فروخت کریں تاکہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے تاجر کے کاروبار متاثر ہوں تو یہ سازش نہیں ہوگی۔

ساکن ماڈل - معاشیات : سکونی مستحسن نظریہ کا استعمال صارف کے رویہ، پیداوار اور تقسیم آمدنی کے معاشی تجزیے کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً صارف کے لیے بیشترین افادیوں کا مستحسن حل یہ ہے کہ اس کی حاشیائی خرید اور صرف کے افادہ حاشیائی میں اس طرح مطابقت پیدا کی جائے کہ کسی شے پر ہر زائد روپے کے خرچ کا حاشیائی افادہ تمام اشیا کے لیے یکساں رہے۔ معاشیات میں روپے اور تکنیکی فیصلوں سے متعلق مسائل پر مستحسن بتانے کے احصا کے انطباق کے فوائد کو ان تحدیدات کے مقابلہ میں جو ماڈل نے خود معاشی رویہ پر رکھی ہیں، اہمیت دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ ایک تو یہاں افادی تفاعل کے تسلسل کو فرض کر لیا گیا ہے۔ دوسرے یہ تکنیک نامساوات کو قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ تیسرے یہ کہ فیصلہ کا اصول اپنے مختصر حدود میں اپنی فیصلے کے حتمیر کے تفاعل سے مملو ہے جس میں کہ حاشیائی (Marginal) شرائط کی جانچ کی جاتی ہے۔ کوئی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ معقول معاشی رویہ ایسے فیصلہ کے اصول سے مملو ہو سکتا ہے۔

ماہرین ریاضی اور معاشیین دونوں ہی معاشیات میں سکونی اور تقابلی سکونی ماڈل کے ارتقا کا موجب تھے۔ معاشیات کے ارتقا کا بیشتر حصہ ریاضیاتی تکنیک کے استعمال کا مرہون منت ہے۔ والرس کیسل (Walras Cassel) (1974) کا عام توازن کے سکون کا ماڈل کسی معیشت میں مسابقتی قیمتوں پر اشیا کی پیداوار اور صرف کی تفصیلات بیان کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ساتھ ہی اگر تقابلی قیمتوں پر وسائل مہیا ہوں تو ماڈل 2n+2n متغیروں میں 2n+2n مساواتوں کا نظام ہوگا۔ اس ماڈل میں فرض کر لیا گیا ہے کہ طلب و رسد انفرادی طور پر تقابلی رویہ اور مکمل آزادی رکھتے ہیں۔ حالانکہ آزاد رویہ سے متعلق خیالی مفروضہ کی بنیاد پر صرف اضافی قیمتوں کا قیاس ممکن ہے۔ معلومات کی موجودگی اور لین دین کی لاگتیں ظاہر کرتی ہیں کہ بازار کا رویہ ناقص اور نامکمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے دوسرے ریاضیاتی ماڈل زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں۔ وان نیومن (Von Neumann) اور مارگسٹرن (Morgeustorn, 1974) کی جانب سے بازیوں کے نظریہ (Game Theory) کی پیش کشی نے دو اجارہ بازار کے رویہ کے معاشی تجزیے کے لیے ایک اہم وسیلہ فراہم کیا۔ آزاد دو اجارہ دار (Collusion Free Duopolism) سے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ حکمت عملی سے کام لیتا ہے اور یہ کہ دونوں پیداکاروں کے لیے توازنی حل مستحسن

سالانہ جنرل میٹنگ: سالانہ کا انعقاد ضروری ہے۔ اس میٹنگ کا مقصد یہ ہے کہ ممبروں کو سال بھر کے کاروبار کی تفصیل سے آگاہ کرلیا جائے گا بعض حالات میں غیر معمولی جنرل میٹنگ بھی منعقد ہوسکے گی۔ ممبرز ایک ایسے مطالبہ کے ذریعہ جن پر ممبروں کی معینہ تعداد کی دستخط ہوں ڈائرکٹرز کو مجبور کرسکتے ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی میٹنگ طلب کریں۔

سالانہ حسابات (Annual Return): کمپنی لاء کے تحت ہر کمپنی جس میں حصص کا سرمایہ لگا ہو ہر سال رجسٹرار کمپنی کے پاس سالانہ حساب، سالانہ جنرل میٹنگ کے تیس دن کے اندر پیش کرے گی۔ سالانہ حساب پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رجسٹرار کمپنی کو یہ معلوم ہوسکے کہ دوران کمپنی کے دستور اور کارکردگی میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور کمپنی کے عام کاروبار کیسے رہے۔ سالانہ حسابات پر کمپنی کے ڈائرکٹرز منیجرز یا سکریٹری کی دستخط ہونا ضروری ہے۔

سال نامہ اور المناک (Yearbook and Almanac):
سالنامہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں پہلے سے متعین عنوانات کے تحت ایک سال کے اندر رونما واقعات و حالات درج ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی یا عالمی۔ بین الاقوامی سالناموں میں اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی تنظیموں کی سرگرمیوں کا حال دنیا کے ممالک کی ترقی کا حال ہر ملک کے عنوان کے تحت لکھا جاتا ہے۔ ہر ملک کے ذیل میں اس کے دستوری ڈھانچہ، ارکان حکومت، تازہ سیاسی و معاشی حالات، عدالتی نظام، رقبہ، آبادی، تعلیم، دفاع، ذرائع نقل و حمل وغیرہ سے متعلق تازہ صورت حال لکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ معلومات عامہ سے تعلق رکھنے والی اطلاعات جیسے ایجادات، نوبل اور دیگر مشہور انعام پانے والوں کی فہرست، کھیلوں وغیرہ کی روداد کو اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ بعض سالناموں میں اہم شخصیتوں کی مختصر سوانح حیات بھی دی جاتی ہے۔ یوروپا ایربک (1959) اسٹیٹس مین ایربک چند مثالیں ہیں۔ سالناموں سے تازہ ترین صورت حال سے واقفیت فراہم ہونے کی وجہ ان کتابوں کی علمی حلقوں میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ کتابیں سالانہ وقفہ سے شائع ہوتی ہیں اور انگریزی زبان میں موجود چند سالنامے انیسویں صدی کے وسط سے شائع ہورہے ہیں۔ مثلاً اسٹیٹس مین ایربک 1884 اور وھٹیکر المناک 1969 شائع ہورہے ہیں۔

قومی سطح پر شائع سالنامے ملک کی مختلف ریاستی اکائیوں اور مرکز سے متعلق سیاسی سماجی تعلیمی و ثقافتی پیش رفت کا جائزہ پیش کرتے ہیں اس کی مثال انڈیا: اے ریفرنس اینول اور منورما ایربک ہیں۔

عام نوعیت کے ان سالناموں کے علاوہ مضامین اور پیشوں سے متعلق پیش رفت کا جائزہ پیش کرنے والے خاص قسم کے سالنامے بھی حوالجاتی کتابوں کی مقبول قسم ہیں۔ اکثر معروف انسائیکلوپیڈیا اپنا نیا ایڈیشن نہ نکال کر سالنامہ کے ذریعہ مواد کو عصری نوعیت فراہم کرتے ہیں۔ برٹنکا بک آف دی ایر اس کی ایک معروف مثال ہے۔ کسی مخصوص مضمون پر شائع بین الاقوامی سالنامہ میں یونائیٹڈ نیشن ایربک (1946/47) قابل ذکر ہے جبکہ قومی سطح پر مخصوص نوعیت کے سالنامہ کی ایک مثال ہندستان سے شائع ایربک آن انڈیاز فارن پالیسی ہے۔

المناک: آکفورڈ شارٹر ڈکشنری کے مطابق المناک ایک سالانہ جدول یا جدول پر مشتمل کتاب ہے جس میں مہینہ اور دنوں کے کلینڈر درج ہوتے ہیں اور فلکیات سے متعلق معلومات و اعداد و شمار دیے ہوتے ہیں۔ لیکن ہیرڈ کی گلاسری برائے لائبریرین اسے ایک ایسی اشاعت سے تعبیر کرتی ہے جو عموماً سالانہ ہوتی ہے اور جس میں متفرق مضامین پر مختلف قسم کی مفید معلومات اور اعداد و شمار ہوتے ہیں۔ یہ دونوں تعریفیں المناک کے بدلتے ہوئے مفہوم کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ اس لیے جہاں انڈین ایفیمیرکس اینڈ ناٹیکل المناک (Indian Ephemerics and Nautical Almanac) روایتی مفہوم میں المناک کی مثال ہے وہاں انفارمیشن پلیز المناک اٹلس اینڈ ایربک (Information please Almanac Atlas and Yearbook) بدلتے ہوئے مفہوم کی نمائندگی کرتا ہے اور بڑی حد تک سالنامہ کی ایک قسم ہے لیکن جہاں سالنامہ میں سال سے متعلق حالات و اعداد و شمار ہوتے ہیں المناک گزشتہ برسوں کے حالات اور اعداد و شمار بھی درج کرتا ہے۔ اسی طرح عام سالنامے ایک سال کے وقفہ سے شائع ہوتے ہیں جبکہ المناک کا وقفہ اشاعت مختلف بھی ہوسکتا ہے مثلاً المناک آف امریکن پالٹکس دو سال کے وقفہ سے شائع ہوتا ہے۔

روایتی مفہوم کے المناک میں فلکیاتی گوشوارہ جات، نظام شمسی کی گردش، چاند و سورج کا طلوع و غروب، چاند گرہن، سورج گرہن اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مدوجزر سے متعلق معلومات درج ہوتی ہیں۔ ہندستان النناک کی متبادل جنتریاں اور تقویم ہیں جن میں اس طرح کی معلومات کے علاوہ اور بھی متفرق معلومات دی جاتی ہیں۔

سالیانہ (Annuity): ایک مستقبل سالانہ ادائگی - ایک مشت بڑی رقم دے کر آئندہ یکساں وقفہ مثلاً سالانہ یا ماہانہ ادائگی کا انتظام کرنا۔ 'یقینی سالیانہ' (Certain Annuity) وہ ہے جس میں ادائگی ہوتی ہے جس نے یہ حاصل کیا ہے۔ سالیانہ فوری بھی ہوسکتا ہے جس میں اس کے خریدنے کے ساتھ ہی ادائگی شروع ہوجاتی ہے اور موقوف بھی اگر "ادائگی" مستقبل میں کسی خاص تاریخ سے شروع ہوئی ہو۔

برطانوی حکومت 1962 تک سالیانے فروخت کرتی رہی۔ اب بیمہ کمپنیاں اسے بیچتی ہیں۔ سالیانہ کی قیمت بڑھتی گھٹتی رہتی ہے اور اس کا دارو مدار کسی خاص وقت کی شرح سود پر ہوتا ہے۔

سامراج (Empire) : سامراج اور سامراجیت (Imperialism) کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سامراج کے معنی مختلف نسلی، علاقائی اور قومی عناصر پر مشتمل سلطنت یا ایک طاقت ور قوم کے ذریعہ کسی دوسری نسل یا تہذیب کو کمزور قوم پر مسلط کرنے کے ہیں۔ "سامراجیت" سے مراد "کسی ملک کی کسی دوسرے کمزور ملک کو علانیہ یا مخفی سیاسی، فوجی، اقتصادی اور تہذیبی طریقوں سے متاثر کرنے، استحصال کرنے یا محکوم بنانے کی توسیعی کوشش یا پالیسی ہے۔"

پروفیسر ہانس مارگنتھاؤ (Hans J. Margenthau) کے بیان کے مطابق سامراجی یا توسیعی پالیسی لازمی طور سے حالت موجودہ (Status Quo) کو برقرار رکھنے کی پالیسی کی ضد ہے۔ یعنی سامراجی پالیسی موجودہ سیاسی نقشہ کو بدلنے کے لیے وضع کی جاتی ہے۔ چند مخصوص حالات سامراجی پالیسیوں کے لیے سازگار ہوتے ہیں اور اگر سرگرم خارجی سیاست کی مطلوبہ داخلی اور معروضی کیفیات موجود ہوں تو وہ لازماً سامراجی پالیسی کو اپنانے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

(1) جیتی ہوئی جنگ: جنگ کے بعد فاتح قوم یا اقوام علاقائی نقشہ کو اپنے مفادات کے مطابق ازسرنو مرتب کر سکتی ہیں۔ مثلاً وارسائی معاہدہ (1919) کے تحت اتحادیوں نے شکست خوردہ جرمنی کے علاقوں کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔

(2) ہاری ہوئی جنگ: چونکہ جنگ کے بعد فتح یاب قوم کا موقف شکست خوردہ قوم کے موافق نہیں ہوتا لہٰذا اسے مجبوراً اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے لیکن درپردہ اسے تباہ کرنے کی کوشاں ہوتی ہے۔ چنانچہ ہٹلر کی قیادت میں جرمنی نے 1935 سے 1939 تک حالات کو اپنے حق میں بدلنے کی کوششیں کیں۔ اور

(3) کمزور ملکوں یا "طاقت کے خلا" کی موجودگی بھی سامراجی مداخلت کی ترغیب دیتی ہے۔ مثلاً افریقہ و ایشیا و لاطینی امریکا کے پس ماندہ ملکوں میں سامراجی ملکوں کے اثرات یا نئے استعمار کی کارکردگی۔

سامراجیت کے تین مقاصد ہوسکتے ہیں:

(1) عالمی سلطنت کا قیام: مثلاً اسکندر اعظم، رومائے عظمیٰ، ساتویں اور آٹھویں صدی میں عربوں، اور حالیہ زمانہ میں نپولین اول اور اڈولف ہٹلر نے اس کی کوشش کی۔ (2) براعظمی (Continental) سلطنت، مثلاً براعظم یورپ میں لوئی چہار دھم، نپولین سوم اور ولیم ثانی نے براعظمی سلطنت کے قیام کی کوشش کی۔ انیسویں صدی میں یورپ میں برطانیہ کو شروع ہی سے اور براعظم امریکا میں ریاستہائے متحدہ امریکا کو غلبہ و تفوق حاصل ہے۔ اور (3)مقامی سامراج یا تسلط۔ یعنی کسی ملک کو اپنی برتر طاقت کی بناء پر کسی ایک جغرافیائی علاقہ میں، بالاتری حاصل ہو جائے جیسے انیسویں صدی میں بسمارک نے وسطی یورپ میں سیاسی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔

توسیعی یا سامراجی مقاصد کو حاصل کرنے کے تین عام طریقے ہیں:

(1) فوجی توسیع یعنی جنگ اور فتوحات کے ذریعہ دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا جائے مثلاً ہندستان میں برطانوی سامراج کا عروج۔ (2)اقتصادی توسیع، مثلاً ایران میں پٹرولیم کے ذخائر کی ملکیت کے لیے انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع تک برطانیہ اور روس کی چشمک۔ یا مشرقی وسطی میں نہر سوئز اور تیل کے ذخائر کی وجہ سے برطانیہ کا براہ راست اور بالواسطہ تسلط، اور (3) ثقافتی سامراج، یہ سامراج کی بڑی ہی مخفی قسم ہے۔ ثقافتی سامراج علمی، فنی، ادبی، تہذیبی اور سماجی شعبوں میں سامراجی ملک کے اثرات نافذ کرکے لوگوں کے دماغوں پر قبضہ جمانا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اور انھیں اپنے مفادات کے لیے کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر نئے ترقی پذیر ملکوں میں بڑی طاقتوں کی سرگرمیوں میں پراپگنڈا اور ثقافتی یلغار کا عنصر غالب ہے۔

سامراج کے محرکات کے بارے میں تین نظریات عام ہیں: (1) مارکسی کیمونسٹ نظریہ، جس کی تشکیل ولادیمیر لینن نے اپنی کتاب "سامراج : سرمایہ داری کا اعلیٰ ترین مرحلہ" (1917) (Imperialism : The Highest Stage of Capitalism) میں کی۔ اس نقطہ نظر سے سامراج ترقی یافتہ سرمایہ داری کی آخری شکل ہے۔ سرمایہ دار ملکوں میں صنعتی ترقی اور پیداوار میں اضافہ اور اجارہ داریوں کا ایک دور وہ آتا ہے جب سرمایہ داروں کو اپنا فاضل سرمایہ ملک سے باہر لگانے، اپنی فاضل پیداوار کی کھپت کے لیے بیرونی منڈیاں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سامراجی جنگیں اور سامراجی تسلط اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ یہ نظریہ جزوی طور پر مغربی یورپ کے بیسویں صدی کے شروع کے سامراج کی تشریح کرتا ہے۔ سرمایہ داری کے زمانہ سے پہلے کے سامراجیوں، سرمایہ دار سامراجیوں اور سامراجی سرمایہ داروں کا اصل مقصد اقتصادی نفع کے حصول سے زیادہ اقتدار کا حصول تھا۔ اقتدار کی توسیع کی یہی جدوجہد سامراج سے عبارت ہے۔

(2) لبرل نظریہ جسے انگریز ماہر اقتصادیات جے.اے.ہابسن نے اپنی کتاب "سامراج" (Imperialism : 1905) میں پیش کیا اور جس کو لینن نے اپنے نظریہ کی بنیاد بنایا۔ ہابسن اور اس کے مدرسہ فکر کی نگاہ میں سامراج سرمایہ داری کا ہی نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی چند خامیوں کا نتیجہ ہے۔ سامراج کی ضرورت فاضل سرمایہ اور فاضل پیداوار کی وجہ سے پیش آتی ہے جن کی نکاسی کے لیے بیرونی منڈیاں درکار ہوتی ہیں۔ لیکن ہابسن کے نزدیک فاضل پیداوار اور سرمایہ کی کھپت کے لیے سامراجی توسیع نہ تو کوئی ناگزیر طریقہ ہے نہ معقول ترین۔ چونکہ پیداوار کے فاضل بچ رہنے کا سبب ملکوں کی قوت خرید کی غیر مساویانہ تقسیم ہے لہٰذا اس کا علاج معاشی اصلاحات، قوت خرید میں اضافہ اور حد سے زیادہ بچت کرنے کی حوصلہ شکنی کرکے گھریلو منڈی کو وسعت دینے میں ہے۔ بیرونی منڈیاں حاصل کرنے کے بجائے گھریلو منڈی کی توسیع مارکسی نظریہ کے برخلاف لبرل نظریہ کا ماحصل ہے۔ اور (3) ابلیسی نظریہ، جسے بعض امن پسندوں نے ایجاد کیا، یہ ہے کہ منظم مالی اور صنعتی مفادات نے ریاست ہائے متحدہ امریکا کو پہلی جنگ عظیم میں شمولیت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چونکہ جنگی سازو سامان تیار کرنے والے اسلحہ بنانے والے اور بین الاقوامی پیمانہ پر بینک کاری کرنے والے سرمایہ دار جنگ سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں لہٰذا جنگ برپا کرانے میں ان کا خاص ہاتھ رہتا ہے۔ یہی "ابلیس" جنگ کی منصوبہ بندی اور سازش کرتے ہیں۔

سب آرڈینیٹ لیجسلیشن کمیٹی (Subordinate Legislation Committee): یہ کمیٹی بھی ارکان مقننہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ آئین میں حکومت کو قواعد و ضوابط کی تشکیل کا جو اختیار دیا جاتا ہے او رجو قواعد اس اختیار کے تحت بنائے جاتے ہیں ان کا مقننہ کے سامنے پیش کرنا ضرو ری ہے۔ مقننہ ان قواعد کو سب آرڈینیٹ لیجسلیشن کمیٹی کے سپرد کرتی ہے جو ان قواعد کو جانچتی ہے کہ آیا وہ قواعد قانون کے خلاف تو نہیں ہیں اور کوئی ایسا قاعدہ تو نہیں بنایا گیا جو حکومت کی پالیسی سے میل نہ کھاتا ہو۔

کسی بھی پبلک نظم و نسق پر اشخاص یا اداروں کی جانب سے اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کیونکہ نظم و نسق ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں سب ہی کچھ ہر شخص کی مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تنقید سے تعمیر کے پہلو نکلتے ہیں۔ اعتراضات کے سہارے کمیاں پوری کی جاتی ہیں اور اس کے لیے مختلف قسم کے کنٹرول یا نگرانی کے طریقے مختلف سطحوں پر قایم کیے جاتے ہیں تاکہ ایسا بہتر نظم و نسق قایم ہو جو عوام کے لیے سود مند رہے اور وہ سیاسی مقاصد بھی حاصل ہوں جن کے حصول کے نام پر سیاسی پارٹی بر سر اقتدار آئی ہو۔

سپنڈ: ہندو میرج ایکٹ کے تحت سپنڈ (Sapind) ایسے رشتہ داروں کو کہتے ہیں جن سے رشتہ داری ماں کی طرف سے تین پشتوں سے ہو اور باپ کی طرف سے پانچ پشتوں سے ہو۔

سجادہ نشین: دو لفظوں سجادہ (مصلی جائے نماز) اور نشین (بیٹھنے والا) سے مرکب ہے۔ اردو میں سجادہ کا لفظ درویشوں اور بزرگان دین کی مسند کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور سجادہ نشین اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی بزرگ کی مسند اور گدی پر اس کے بعد بیٹھے اور اس کی جانشینی کی خدمت انجام دے۔ اس طرح سلوک و طریقت کے سلسلہ میں شیخ السجاد

اور سجادہ نشین سے مراد امیر طریقت ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت متولی سے مختلف اور بلند ہوتی ہے۔ متولی تو صرف دنیاوی خدمت پر مامور ہوتا ہے لیکن سجادہ نشین روحانی خدمت انجام دیتا ہے اور طالبین سلوک کو درس و تلقین اور وعظ و ارشاد کرتا ہے اور ان کی اصلاح و تربیت کرتا ہے۔ ایک ہی شخص متولی اور سجادہ نشین دونوں ہوسکتا ہے۔ نابالغ سجادہ نشین نہیں ہوسکتا۔ بدچلنی کی بنا پر اس کو برطرف بھی کیا جاسکتا ہے۔

آج کل عموماً اس سے مراد کسی خانقاہ یا درگاہ کا ذمہ دار ہوتا ہے جس کی خدمت میں عام لوگ تبرک اور تربیت حاصل کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔

سرپرست: سرپرست سے مراد ماں، باپ، دادا، دادی، سگا بھائی، سوتیلا بھائی، بشرطیکہ لڑکی اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہو۔ سگا چچا، سوتیلا چچا بشرطیکہ لڑکی اپنے سوتیلے چچا کے ساتھ رہتی ہو۔ نانا، نانی سگا ماموں سوتیلا ماموں، کوئی شخص بہ حیثیت سرپرست شادی کے فرائض انجام نہ دے سکے گا جب تک خود اس کی عمر اکیس سال سے زیادہ نہ ہو جائے۔ اگر ایک سرپرست کسی وجہ سے ناقابل ہو تو دوسرا سرپرست فرائض انجام دے سکتا ہے۔

ایک ہندو خاندان میں شادی فریقین کے خاندان میں جو رسوم و رواج رائج ہیں اس کی پابندی کے ساتھ انجام دی جاتی ہے۔ اگر رسم و رواج میں سپتاپدی (Saptapadi) کی رسم ہے یعنی مقدس آگ کے اطراف دولہا دولہن کا ساتھ چلنا یا طواف کرنا تو ایسی صورت میں ساتویں قدم یا طواف پر شادی مکمل ہوجائے گی۔

سرد بازاری (عالم گیر) (Depression): عالم گیر سرد بازاری میں بڑے پیمانے پر کاروبار میں کمی آجاتی ہے۔ صنعتوں میں بڑے پیمانے پر اتار آجاتا ہے۔ اور بے روزگاری انتہا پر پہنچ جاتی ہے۔ تعمیری سرگرمیاں سرد پڑنے لگتی ہیں۔ آبادی اور لیبر فورس گھٹنے لگتی ہے۔ بین الاقوامی سرمایہ کی گردش اور منتقلی میں سخت مشکلیں در پیش آجاتی ہیں۔ محدود سرد بازاری چند ملکوں تک محدود رہتی ہے۔ لیکن یہ عالم گیر ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کی سب سے بڑی سرد بازاری 1929 میں آئی تھی جس نے نہ صرف یورپ، یورپی ملکوں کے مقبوضات اور نوآبادیوں بلکہ امریکا تک کو سخت معاشی بحران اور تباہی کا شکار کردیا تھا۔ اسی سرد بازاری کے اثرات کو روکنے کے لیے فرانکلن روز ولٹ نے اپنی نئی معاشی پالیسی کے ذریعہ کاروبار پر چند تحدیدات عائد کیے تھے۔

سرد بازاری (محدود) (Recession): کسی ملک یا چند ملکوں کے کاروبار میں معمولی اتار آجائے تو اسے محدود سردبازاری کہتے ہیں۔ اس میں پیداوار گھٹنے لگتی ہے اور روزگار میں کمی واقع ہوتی ہے۔ انفرادی خاندانوں کی آمدنی اور خرچ کم ہوجاتا ہے۔ گو یہ ہر صورت میں ضروری نہیں۔ اس میں کاروبار کا رجحان اتار کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ آئندہ کے بڑے پیمانے پر خرید کے منصوبے ملتوی کردیتے ہیں۔ سرمایہ کاری میں بھی کمی آجاتی ہے۔

اس زمانہ میں لوگ استعمال کی صرف ضروری چیزیں خریدتے ہیں۔ دیرپا چیزوں کی خریداری ملتوی رکھی جاتی ہے۔ کاروباری لوگ اور صنعت کار مشینیں اور سامان کم خریدتے ہیں۔ کارخانہ دار، مل مالک اور کاروبار کرنے والے اپنے گوداموں میں اسٹاک کم سے کم رکھتے ہیں۔ آئندہ کی ضروریات کی چیزوں کی خریداری میں زیادہ سے زیادہ کمی کردی جاتی ہے۔ اس سے عام کاروبار پر برا اثر پڑتا ہے۔

محدود سردبازاری زیادہ گہری ہوسکتی ہے اگر حالات پر قابو پانے کے لیے موثر اقدامات نہ کیے جائیں اور حالات موافق نہ ہوں۔ اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ پچھلی خوش حالی کے زمانہ میں کریڈٹ کی حالت کیا تھی۔ سٹہ بازوں کو کھل کھیلنے کا کتنا موقع ہے اور اس کا تدارک کیسے کیا جاتا ہے۔ زائد پیداوار کتنی ہے اور سرد بازاری سے نپٹنے کے لیے حکومت زری اور مالی پالیسیاں اپناتی ہیں۔

سرد جنگ: لفظ سرد جنگ دوسری عالم گیر جنگ (1939-1945) کی پیداوار ہے۔ یہ کیمونسٹ بلاک اور سرمایہ دار ملکوں خاص طور پر امریکا کے درمیان کشمکش کا نام ہے۔ جنگ کے دوران سوویت یونین اور اتحادیوں یعنی برطانیہ، فرانس اور امریکا کے درمیان ہٹلر کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہوا تھا لیکن اسی دوران آپسی مفادات میں تصادم شروع ہوگیا۔ جنگ کے بعد شبہات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ہٹلر کی شکست کے بعد سوویت یونین کی فوجیں مشرقی یورپ اور جرمنی میں داخل ہوئیں اور یہاں ان کی مدد سے سوشلسٹ حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یونان اور ایران وغیرہ میں کیمونسٹوں اور بائیں بازو کی طاقتوں نے جدوجہد تیز کردی اور ان سب کے علاوہ سامراج

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات میں آزادی کی جدوجہد تیز ہوگئی۔ خاص طور پر ہندوستان، انڈونیشیا، ویت نام وغیرہ میں۔ دوسری طرف چین میں کمیونسٹ فوجیں چیانگ کائی شیک کے خلاف بڑھنے لگیں اور ان سے قدرتاً امریکا اور خاص طور پر سب سے بڑے سامراجی ملک برطانیہ اور اس کے وزیراعظم سر ونسٹن چرچل پریشان ہوگئے۔ خود یورپ میں بائیں بازو کی طاقتیں تیزی سے ابھرنے لگیں اور اکثر ملکوں کی حکومتوں میں سوشلسٹ نفوذ کرگئے۔ ان بدلتے ہوئے حالات میں یہ ضروری تھا کہ سامراجی ملک اپنے مقبوضات کو بچانے کے لیے اقدامات کریں۔ چنانچہ ونسٹن چرچل نے اپنی فلٹن کی مشہور و معروف تقریر (1946) میں کمیونسٹ خطرہ اور اس کے خلاف مغربی طاقتوں کے متحد ہونے اور فوجی تیاری کا نعرہ بلند کیا۔ یہ تقریر سرد جنگ کا پہلا قدم سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد امریکا کے صدر ٹرومن نے "ٹرومن نظریہ" (Truman Doctorine) پیش کیا جس میں چرچل کے خیالات کو اور زور و شور سے پیش کیا گیا تھا۔ اسی کے تحت ترکی اور یونان کو فوراً فوجی امداد بھیجی گئی۔ یورپ کی تعمیر نو کا پروگرام شروع کیا گیا۔ 1949 میں امریکا اور یورپ کے گیارہ دوسرے ملکوں نے شمالی اٹلانٹک (NATO) تنظیم قائم کی۔ اس کے جواب میں کمیونسٹ ملکوں کے ذریعہ وارسا معاہدہ کی تنظیم (Warsa Treaty Organization) عمل میں آئی اور یہاں سے سرد جنگ تیزتر ہوگئی۔ 1949 ہی میں چین میں چیانگ کائی شک کی حکومت کو شکست ہوئی اور ماوزے تنگ کی سرکردگی میں کمیونسٹ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ چیانگ کائی شک نے تائی وان میں پناہ لی۔ امریکا نے کمیونسٹ حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور وہ چیانگ کائی شک کی ہر طرح مالی و فوجی امداد کرتا رہا۔ 1950 میں شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ امریکا نے اپنا بحری اور ہوائی بیڑہ جنوبی کوریا کی امداد کے لیے بھیج دیا اور چین نے اپنی فوجیں شمالی کوریا کی مدد کے لیے بھیج دیں۔

آزادی کی لہر جب ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، ملایا اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں میں پھیلنے لگی تو اس سے امریکا، برطانیہ اور فرانس کے مفادات کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا اور انھوں نے جنوب مشرقی ایشیا کی حفاظت کے لیے ایک تنظیم سیاٹو (SEATO) قائم کی۔ 1953 میں اسٹالن کا انتقال ہوگیا اور اس کے جانشینوں نے نکیتا خروشچیف کی سرکردگی میں ہتھیار بندی پر پابندی، سرد جنگ کو کم کرنے اور بقائے باہم کے لیے مہم شروع کی۔ اس سے مغرب اور مشرق کے درمیان تناؤ کچھ کم ہوا اور لوگوں کو امید بندھ چلی کہ یہ سرد جنگ کچھ کم ہوگی۔ مشرق اور مغرب کے درمیان تہذیبی تبادلوں اور اچھے تعلقات کی شروعات ہوئی۔ لیکن یہ امید بہت دن تک قائم نہ رہ سکی۔ 1957 میں سوویت یونین نے اپنا پہلا خلائی گولا اسپوتنک خلا میں بھیجا۔ اس سے سارے امریکا میں سوویت یونین کی اس قدر بڑھتی ہوئی طاقت سے خوف پیدا ہوگیا۔ آئزن ہاور کے دور صدارت میں امریکا کے وزیر خارجہ فاسٹر ڈلیس نے ویت نام میں امریکی مداخلت شروع کی۔ اس نے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی ہر طرح کی امداد میں اضافہ کردیا۔ افریقہ میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے کی کوششیں کیں۔ خود اپنے ملک میں ہر قسم کی امن اور سرد جنگ کی مخالف تحریکوں کو دبانے کے لیے سخت اقدامات کرنے کے سبب ایک بار پھر سرد جنگ اور تیزتر ہوکر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ 1960 اور 1970 کے درمیان کا دور سرد جنگ کا نقطہ عروج رہا ہے۔ ویت نام، لاؤس، کمبوڈیا وغیرہ میں جنگ تیز سے تیز تر ہوگئی۔ کیوبا پر سی آئی اے کی مدد سے حملہ ہوا۔ سویت یونین نے کیوبا میں اپنے میزائل بھیجے جس سے امریکا اور سوویت یونین ہی نہیں بلکہ ساری دنیا جنگ کے دہانے تک جا پہنچی اور بڑی مشکل سے اسے ٹالا گیا۔ اس کے بعد دونوں عظیم طاقتوں نے نیوکلیائی جنگ سے بچنے کے سلسلہ میں سرد جنگ کے بجائے مفاہمت کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ بعدازاں سوویت یونین اور امریکا میں ہتھیار کم کرنے اور سرد جنگ ختم کرنے کے سلسلہ میں مذاکرات نے عملی شکل اختیار کی اور سرد جنگ کی کشیدگی دور ہوتی گئی۔ پھر پہلا سالٹ (SALT) معاہدہ اور ہتھیار کم کرنے اور باہمی تعاون بڑھانے کا دوسرا سالٹ معاہدہ عمل میں آیا۔ حتیٰ کہ امریکا اور روس کے تعلقات خوشگوار ہوگئے اور دونوں نے بین الاقوامی میدان میں اشتراک و تعاون کا راستہ اپنایا۔ 1990 میں سوویت یونین کے انتشار کے بعد سرد جنگ تاریخ کا حصہ بن گئی۔

سرد جنگ کے ازالہ میں کئی عوامل کارفرما رہے ہیں مثلاً

(1) طاقتی بلاکوں کا زوال، کمیونسٹ کیمپ میں اختلافات، روس اور چین کا تنازعہ امریکا اور اس کے ناٹو اتحادیوں میں نااتفاقی۔

(2) مغربی یورپ میں علاقائی یکجہتی اور غیر جانبداری کا رجحان۔

(3) تیسری دنیا اور غیرجانب دار ملکوں کا ظہور، ان کی بڑھتی ہوئی طاقت۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(4) جاپان اور جرمنی کی بڑی طاقتوں کی حیثیت سے نمایاں ہونا۔

(5) محکوم ملکوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کی تحریک۔

سرسری انتظام جائداد: عدالت کو اس کا اختیار ہوگا کہ اگر قرض دار کی جائداد کی مالیت پانچ سو روپیہ سے زیادہ نہ ہو تو قرض دار کی جانب سے درخواست پیش ہونے پر یا اس کے خلاف حلف نامہ کے ساتھ درخواست پیش ہونے پر اس جائداد کو اپنی تحویل میں لے لے اور بطور رسیور اس کا انتظام کرے۔

سرقہ (Theft): عام الفاظ میں سرقہ کے معنی چوری کے ہیں۔ کوئی شخص کسی اور کا مال اس کے قبضہ سے بلا اس کی رضامندی لے لے تو سرقہ ہے۔ یہاں مال سے مراد جائداد منقولہ ہے یعنی ایسی اشیاء جن کا نقل و حمل کیا جاسکتا ہے یا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جاسکتی ہیں۔

غیر منقولہ جائداد کا تعلق مداخلت بے جا مجرمانہ کے جرم سے ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص مالک مکان یا آراضی کی اجازت کے بغیر یا اس کی رضامندی کے بغیر اس مکان یا آراضی پر قدم رکھے یا ایسے مالک کی رضامندی کے بغیر وہاں ٹھہرے اور اس نیت سے قدم رکھے وہ ٹھہر جائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے تو وہ مداخلت بے جا مجرمانہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ مال کسی شخص کے قبضہ میں ہونا چاہیے یہاں کون مالک ہے یا یہ مال کس کی ملکیت ہے یا اس مال کا کوئی قانونی طور پر حق دار ہے اس سے بحث نہیں ہے۔ صرف دیکھنا یہ ہے کہ اس مال پر کس کا قبضہ ہے۔ جائز اور ناجائز قبضے سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ آیا ملزم نے مال کو قابض مال کے قبضہ سے اس کی رضامندی کے بغیر اس کی جگہ سے ہٹا دیا ہے یا نہیں اگر اس مال کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا ہے یا مال کو تبدیل کردیا ہے تو وہ جرم سرقہ کا مرتکب ہوگا۔ اس مال کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہو یعنی اس مال کو قابض کے قبضہ سے لے کر دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہو۔ جرم سرقہ کے لیے یہ امر قابل لحاظ نہیں ہے کہ ملزم کی نیت اس مال کو دواماً اپنے تصرف میں لانے کی تھی یا محض عارضی طور پر۔ اس جرم کے لیے یہ کافی ہے کہ مال بددیانتی یا بدنیتی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیا جائے۔ یہاں یہ ثابت کرنا کافی ہے کہ وہ مال قابض کی رضامندی کے بغیر بددیانتی یا بدنیتی سے منتقل کیا گیا۔ سرقہ کے لیے محض تبدیل جگہ کافی ہے۔ بشرطیکہ اس تبدیلی میں بددیانتی کا عنصر شامل ہو۔ سرقہ کا ارتکاب ایسے مال کے متعلق بھی ہوسکتا ہے جس پر قابض کو ملکیت کے حقوق حاصل نہ ہوں۔ مثلاً اگر کسی سارق کے قبضہ میں کوئی مال ہو اس کی رضامندی کے بغیر اصل مالک کے سوائے کوئی اور شخص بددیانتی سے وہ مال لے لے تو وہ سرقہ کا مرتکب ہوگا۔

سرقہ میں سارق کسی اور کے مال کا ناجائز استحصال کرتا ہے اور جس شخص کا مال سرقہ ہوا ہے اس کو ناجائز نقصان پہنچتا ہے یعنی سارق کو کسی دوسرے کے مقبوضہ مال پر اختیار حاصل ہوتا ہے جس کا وہ مستحق نہیں تھا۔

سرقہ بالجبر (Robbery): سرقہ بالجبر میں دو صورتیں شامل ہیں ایک تو سرقہ ہے اور دوسرے استحصال بالجبر سرقہ، سرقہ بالجبر ہوگا جب اس کے ارتکاب میں سرقہ سے کام لیا گیا ہو، مرتکب عمداً کسی شخص کی ہلاکت یا ضرر یا مزاحمت بے جا کا باعث بنا ہو یا وہ خود اس کا اقدام کرے یا فوری ہلاکت یا فوری ضرر یا فوری مزاحمت بے جا کی تخویف کا باعث بنے یا اس کا اقدام کرے اور استحصال بالجبر سرقہ بالجبر ہوگا۔ جب اس کے ارتکاب کے وقت مرتکب، شخص مخوف کی موجودگی میں ہو اور خود کی اپنی یا کسی دوسرے شخص کی فوری ہلاکت یا فوری ضرر یا فوری مزاحمت کے ڈر سے استحصال بالجبر کا ارتکاب کرے اور اس طرح ڈرا دھمکا کر مجبور کرے وہ شخص وہ چیز اس وقت اس کے حوالے کردے۔

مرتکب جرم کا شخص مخوف کی موجودگی میں ہونا اس وقت تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ وہ اس قدر قریب ہو کہ یہ شخص مخوف کے لیے فوری ہلاکت، فوری ضرر یا فوری مزاحمت بے جا کی تخویف کے لیے کافی ہو۔

یعنی سرقہ، سرقہ بالجبر اس وقت ہوگا جب اس کے ارتکاب یا اس مال مسروقہ کے لے جانے کا مرتکب عمداً کسی شخص کی ہلاکت یا ضرر یا مزاحمت بے جا کی تخویف کا باعث ہو۔

سرقہ بالجبر کا اہم جزیہ ہے کہ اس میں خوف یا جبر فوری ہوتی ہے۔

سرقہ کے ارتکاب کے لیے یا اس کے ارتکاب میں یا اس مال کے لے جانے میں جو سرقہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہو ہلاکت یا ضرر یا مزاحمت بے جا کا ارتکاب ہونا ضروری ہے۔

سرقہ بالجبر کا اصل جز جبر ہے اور کوئی شخص جبر کے خوف کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وجہ سے کوئی مال حوالہ کرتا ہے تو قانون کی نظر میں وہ خوف ہی جبر خیال کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بچہ کو اٹھا کر کہے کہ اگر اس کو روپیہ نہیں دیا جائے گا تو وہ اسے دریا میں پھینک دے گا اور دوسرا شخص اس کو روپیہ دے دے یہ تو سرقہ بالجبر ہوگا۔

زید و بکر آموں کا سرقہ کر رہے تھے۔ مالک نے ان کو گھیر لیا۔ اس پر زید نے مالک کو ایک لاٹھی مار کر بے ہوش کردیا۔ یہ سرقہ بالجبر کی ایک مثال ہے۔

سرکاری مالیات (Public Finance): معاشیات کی ایک شاخ ہے جس میں حکومت کی مالیاتی پالسی کی تشخیص (Identity) اور اس کا اندازہ (Appraisal) کیا جاتا ہے۔ اس میں حکومت کے ٹیکس اور اخراجات کی پالسی کے اثرات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ افراد اور اداروں پر بحیثیت مجموعی پوری معیشت کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اس میں بعض معاشی اقدام کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے کہ ان سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کتنی کامیابی ہوئی اور ان اقدامات کو اور مؤثر کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔

سرمائے کی فراہمی (Raising of Capital): کمپنی کی رجسٹری کے بعد پراسپکٹس کی کاپی رجسٹرار کمپنی کے پاس داخل کی جاتی ہے۔ اعلان کردہ تاریخ پر پراسپکٹس پبلک کو اجراء کیا جاتا ہے۔ کوئی پراسپکٹس اس وقت تک اجراء نہیں ہوسکتا جب تک اس کی ایک کاپی رجسٹرار کمپنی کے پاس داخل نہ کی گئی ہو۔ وہ لوگ جو سرمایہ لگانا چاہتے ہیں وہ پراسپکٹس کی کاپی کمپنی کے دفتر سے یا کمپنی کے بینکرز (Bankers) سے حاصل کرسکتے ہیں۔ اشخاص حصص کے لیے اپنی درخواست رقم کے ساتھ کمپنی کے بینکرز کے پاس جمع کرائیں گے جن کا تعین پراسپکٹس میں کیا گیا ہے۔ کمپنی کے بینکرز حصص کی ان تمام درخواستوں کو کمپنی کے ڈائرکٹرز کے پاس روانہ کریں گے اور اس پر ڈائرکٹرز اشخاص کے حصص کے متعلق تصفیہ کریں گے۔ حصص کی اس تقسیم کو کمپنی لاء کی اصطلاح میں الاٹ منٹ (Allotment) کہتے ہیں۔ ان اشخاص کو جنھیں حصص الاٹ کیے گئے ہیں الاٹ منٹ لیٹر روانہ کیے جائیں گے۔ حصص کے الاٹ منٹ کی ایک فہرست رجسٹرار کمپنی کے پاس روانہ کی جائے گی اور حصص کے سرٹیفکیٹ حصہ داروں کے نام اجرا کیے جائیں گے۔ بعض پبلک کمپنیاں اعلان کے ذریعہ حصص کے فروخت کی درخواستیں طلب نہیں کرتیں بلکہ بغیر اعلان ہی کے اشخاص میں حصص کی تقسیم کردیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کمپنی رجسٹرار کمپنی کے پاس پراسپکٹس کے بجائے اسٹیٹ منٹ داخل کرے گی۔ پراسپکٹس اور اسٹیٹ منٹ دونوں کمپنی لاء کے تحت عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

سرمایہ حصص (Share Capital): سادہ الفاظ میں سرمائے سے مراد وہ رقم ہے جس سے کسی کمپنی کے کاروبار کی ابتدا کی جاتی ہے۔ کمپنی کی صورت میں سرمایہ حصص سے مراد وہ رقم ہے جو حصص کی اجرائی سے وصول ہوتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) : سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسا معاشی سیاسی نظام ہے جس کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل اور عروج برطانیہ کے صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا اور پھر یہیں سے یہ نظام پورے یورپ، امریکا اور آسٹریلیا وغیرہ میں رائج ہوگیا اور بالآخر 19 ویں صدی کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ مغربی ممالک نے ایشیا و افریقہ میں اپنی نوآبادیات قائم کرکے اسے پوری دنیا میں عام کردیا۔

سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق بنیادی طور پر صنعت کاری سے ہے۔ عہد قدیم اور عہد وسطی میں صنعتی سرمایہ داری تو نہ تھی البتہ تجارتی سرمایہ داری موجود تھی اور اسی تجارتی سرمایہ داری نے 16 ویں صدی کے برطانیہ میں ترقی کرکے صنعتی سرمایہ داری کی صورت اختیار کرلی۔ اس کی موجودہ اہمیت صنعتی انقلاب کے بعد محسوس کی گئی۔ اس میں شخص کے معاشی کاروبار پر زور دیا جاتا ہے اور ریاست محض تجارت وغیرہ سے متعلق انضباطی قوانین وضع کرتی ہے۔ نفع اندوزی اس کا خاص عنصر ہے اور 20 ویں صدی کے سرمایہ دارانہ نظام میں اس عنصر کا بے حد فروغ ہوا۔ علاوہ ازیں سرمایہ دارانہ نظام کے خدوخال کو واضح کرنے والے چند بنیادی عناصر درج ذیل ہیں :

(1) صنعت کا کارخانہ دارانہ نظام (Factory System)
(2) تقسیم عمل کا اصول (Division of Labour)
(3) کثیر پیداواری اصول (Large Scale Production)
(4) آزاد منڈی مقابلہ جاتی اصول
(5) ذاتی منفعت کا اصول

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(6) نجی ذاتی ملکیت کا حق

(7) سیاسی میدان شخصی آزادی اور جمہوریت کا اصول

مختصراً یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسا معاشی نظام ہے جس میں پیداوار تقسیم اور تبادلہ کے بنیادی ذرائع نجی ہاتھوں (شخصی اور کمپنی زمرہ) میں ہوتا ہے اور منافع میں مسابقتی اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔

سرمایہ داری (Capitalism): یہ معاشی نظام آج مغرب کے تقریباً تمام ممالک میں حاوی ہے۔ اس میں ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت ہوتی ہے۔ پیداوار اور اس کی تقسیم بازار کی پابند ہوتی ہے۔ سرمایہ دار نظام بطور ایک باقاعدہ نظام کے سولہویں صدی سے وجود میں آیا۔ لیکن عہد وسطی میں پہلے سے اس نظام کے چھوٹے چھوٹے مرکز موجود تھے۔ جون میں جاگیرداری نظام ٹوٹنے لگا یہ اس کی جگہ لیتا گیا۔

سولہویں سترہویں اور 18 ویں صدی عیسوی میں جب انگلستان میں کپڑے کی صنعت ترقی کرنے لگی تو سرمایہ دار نظام بطور ایک معاشی اور سماجی طاقت کے ابھرنے اور ترقی پانے لگا۔ سرمایہ دار نظام دوسرے پچھلے معاشی نظاموں سے اس طرح مختلف ہے کہ اس میں پیداوار کی جو فاضل مقدار صرف سے بچتی ہے اسے غیر پیداواری اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وقت کے تاریخی حالات اور ضروریات نے بھی اس رجحان کو بڑھایا۔

سرمایہ داری کی ترقی میں ایک چیز جو مددگار ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ یورپ کے ملک ایشیا، افریقہ اور امریکا میں پھیل رہے تھے اور وہاں سے سونا اور دوسری قیمتی دھاتیں بڑی مقدار میں آرہی تھیں جس کے نتیجہ میں افراط زر کی حالت پیدا ہوگئی۔ اس زمانہ میں اجرتوں کے مقابلے میں قیمتیں زیادہ تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ اس کی وجہ سے سرمایہ دار طبقہ کو زیادہ فائدہ پہنچ رہا تھا۔ سنہ 1500 سے 1750 تک کاروبار یورپ میں قومی حکومتوں کے قیام اور بڑھتی ہوئی بیرونی تجارت کا دور تھا اور ان کی منزل مقصود قومی دولت بڑھانا اور معاشی اقتدار کو وسیع کرنا تھا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے ملکوں میں منظم اور یکساں مالی وقانونی نظام قائم کیا۔ غرض کی سیاسی معاشی اور سماجی حالات سرمایہ داری کے فروغ کے لیے عین موافق تھے۔ 18ویں صدی کے شروع سے انگلستان میں سرمایہ داری کے ارتقا کا مرکز تجارت سے صنعت کی طرف منتقل ہونے لگا۔ پچھلی صدیوں میں جو سرمایہ اکٹھا ہوا تھا وہ اب صنعتی انقلاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ فرانس کے انقلاب کے بعد سارے یورپ میں آزادی اخوت اور مساوات کے نعرے گونجنے لگے اور آزاد تجارت اور آزاد معیشت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ کلاسکی ماہرین معاشیات کا ایک بڑا گروہ پیدا ہوگیا (دیکھیے کلاسکی معیشت) جس کا نعرہ ہی یہ تھا کہ صنعتوں اور کاروبار کو کھلی آزادی دی جائے اور حکومت کسی قسم کی مداخلت نہ کرے۔

پہلی عالم گیر جنگ کے بعد سرمایہ داری نظام میں بڑا تغیر آیا۔ ایک طرف روس میں انقلاب آیا جس نے ایک بڑے حصہ سے سرمایہ داری کو ختم کرکے سوشلزم قائم کیا۔ دوسری طرف بین الاقوامی منڈی کافی سکڑ گئی۔ قومی کرنسی کے مقابلہ میں معیار زر (Gold Standard) کو میدان سے ہٹنا پڑا۔ بینکنگ کا تسلط (Hegemony) یورپ سے ہٹ کر امریکا پہنچ گیا۔ ایشیا اور افریقہ میں آزادی کی لہریں اٹھنے لگیں اور ان سب کی وجہ سے آزار تجارت ختم ہوتی گئی۔ اور ہر ملک درآمدات کے خلاف رکاوٹیں کھڑی کرنے لگا۔ 1930 میں ساری سرمایہ داری زبردست معاشی بحران کا شکار ہوگئی۔ اور دنیا کے اکثر ملکوں سے آزاد معیشت (Laissez Fair) کا دور ختم ہوگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کے تقریباً سب ہی ملک جو اب تک محکوم تھے وہ آزاد ہوگئے۔ یورپ اور ایشیا کے کئی ملکوں نے سرمایہ داری نظام ختم کرکے سوشلزم کی راہ اختیار کی۔ نئے آزاد شدہ ملکوں میں سے اکثر نے ملی جلی معیشت یا غیر سرمایہ داری معیشت کی راہ اختیار کی اور آج بڑے سرمایہ دار ملک صدیوں کی اپنی جمع کی ہوئی دولت کے سہارے اپنے نظام کو بچانے میں مصروف ہیں۔

سفارت کاری (Diplomacy) : سفارت کاری دراصل ایک ایسی حکمت عملی کا نام ہے جس کے ذریعہ ملکوں کے مابین تنازعات کا پرامن تصفیہ کرنے اور ان کے مابین خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ سفارت کاری کا لفظ خاص طور پر دو مفاہیم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک وسیع مفہوم جس سے خارجہ پالیسی کی وہ حکمت عملی مراد ہوتی ہے جس کے ذریعہ کوئی ملک بین الاقوامی نظام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے جسے ہم عام سیاسی مفہوم کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے محدود مفہوم سے مراد وہ فنی مہارت ہے جس کے ذریعہ حکومتیں اپنے نمائندوں کے توسط سے ایک دوسرے سے تعلقات استوار کرتی ہیں جسے ہم فنی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مفہوم کہہ سکتے ہیں۔

عام سیاسی مفہوم میں کسی بھی ملک کی سفارت کاری سے مراد حکومت کی ہر سطح پر خارجہ پالیسی کے تعین و تشکیل اور اس کی عمل آوری سے ہے۔ فی الواقع سفارت کاری تمام ملکوں کی قومی طاقت کا لازمی عنصر ہے اور ان کے قومی مفادات کو فروغ دیتا ہے۔ اس وسیع ترین مفہوم میں سفارت کاری خارجہ پالیسی کے تمام اہم امور پر محیط ہے۔ اور ان میں سے خاص طور پر چار امور لازماً اس کے دائرہ عمل میں آتے ہیں جو درج ذیل ہیں :

(1) سفارت کاری خارجی امور میں اپنے مقاصد کے تعین اور اس کے حصول کی کوشش ملک کے موجودہ اور تمام ممکنہ وسائل کی روشنی میں کرتی ہے۔

(2) سفارت کاری دوسرے ملکوں کی خارجہ پالیسی کے قومی مقاصد اور ان کے قومی عزائم کا تخمینہ اور ان عزائم کے حصول کے لیے ان کے دست یاب وسائل یا ان کی امکانی طاقت و قوت کا اندازہ لگاتی ہے۔

(3) سفارت کاری مختلف قومی مقاصد کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

(4) سفارت کاری اپنے مقاصد کے حصول کے لیے موزوں ترین ذرائع کا انتخاب کرتی ہے۔

سفارت کاری اگر مذکورہ بالا امور میں سے کسی ایک امر کو بھی انجام دینے میں ناکام رہے تو ملک کی خارجہ پالیسی ناکام ہو جاتی ہے۔

محدود معنی میں سفارت کاری ایک ایسے فن کا نام ہے جس کے ذریعہ حکومتوں کے مابین آپسی روابط عمل میں آتے ہیں۔ عہد قدیم میں سفارت کاری کا لفظ ریاستوں کے مابین ہر قسم کے پرامن ریاستی تعلقات پر مشتمل تھا لیکن عہد حاضر میں ایسا نہیں ہے۔ آج کل ملکوں کے مابین تعلقات استوار کرنے کے بے شمار ایسے طریقے رائج ہوگئے ہیں جنھیں سفارتی عمل کا نام دینا مشکل ہے۔ جیسے حکومتی پالیسی کے اعلانات، سرکاری حکام کی تقریریں اور بیانات وغیرہ۔ لہٰذا اب سفارت کاری کا مفہوم مملکتوں کے مابین ہر قسم کے روابط نہیں بلکہ اس سے مراد محض بین المملکتی گفت و شنید، روابط اور مواصلات کے لیے ایسے معتمد سفارتی عملہ کے استعمال سے ہے جو نہ صرف ریاستوں کے مابین تصفیہ، تنازعات کے پرامن حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ریاستوں کے مابین دوستی اور تعاون کی راہ ہموار کرنے، خوشگوار تعلقات کو فروغ دینے اور انھیں مستقل بحال رکھنے کی بھی سعی پیہم کرتا ہے۔

سفارتی سروس (Diplomatic Service): سفارتی سروس ملک کے ان سفراء اور دیگر نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کسی ملک کی جانب سے دوسرے ملک میں خارجی تعلقات قائم کرنے کی غرض سے مامور کیے جاتے ہیں۔ سترھویں صدی تک بین الاقوامی تعلقات ایسے سفرا کے ذریعہ قائم کیے جاتے تھے جو خاص طور پر کسی خاص مقصد کے لیے دوسرے ملک میں متعین کیے گئے ہوں۔ یا پھر سربراہ مملکت کی جانب سے خط و کتابت کے ذریعہ بین الاقوامی تعلقات قائم کیے جاتے تھے۔ یہ طریقہ غیر تشفی بخش ثابت ہوا اور دوست ممالک کے ساتھ مستقل سفارتی تعلقات قائم کیے جاتے تھے۔ وینس (Venice) پہلا ملک تھا جسنے قرون وسطی کے اواخر میں دوسرے ملک میں مستقل سفیر کو مقرر کیا۔ اس قسم کے نمائندے کے کئی درجے ہیں پہلا درجہ سفیر (Ambassador) دوسرا درجہ منسٹر (Minister) اور تیسرا درجہ چارج ڈی افیر (Charge de Affair) کا ہے۔ اس کے علاوہ کسی خصوصی مقصد کے لیے سفیر کو کسی دوسرے ملک میں روانہ کیا جاسکتا ہے۔ سفارتی سروس کے تمام اشخاص کو اس ملک میں جہاں انھیں متعین کیا جاتا ہے بعض مراعات حاصل رہی ہیں مثلاً یہ کہ ان کے مکان کی تلاشی نہیں لی جاسکتی۔ انھیں گرفتار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان پر مقدمہ چلایا جاسکتا۔

سلطنت (Empire) : سلطنت ایک قدیم سیاسی نظام ہے۔ کوئی طاقت ور مملکت جب دوسری اقوام اور ان کے علاقوں پر فوجی طاقت کے ذریعہ یا سیاسی نفوذ کے نتیجہ میں اپنا تسلط قائم کرلیتی ہے اور ان کے اندرونی اور بیرونی امور کو کنٹرول کرتی ہے تو وہ علاقے اس کی سلطنت کے اجزاء تسلیم کیے جاتے ہیں۔ امپیریل ملک قانونی طور پر سارے محکوم علاقوں کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے۔ سلطنت روما، سلطنت روس، سلطنت برطانیہ، سلطنت عثمانیہ، اس کی مثالیں ہیں۔ قوم پرستی کے عروج کے نتیجہ میں دور حاضر کی تمام سلطنتیں (بشمول روس جہاں قومیتوں کو سوویت اتحاد میں ضم کرلیا گیا تھا) منتشر ہوچکی ہیں اور ان کے جگہ قومی مملکتیں قائم ہو گئی ہیں۔

سماج کاری (Social Work) : سماج کاری کی ابتدا مذہبی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

326

رجحانات اور انسان دوستی سے ہوئی۔ شروع شروع میں سماج کاری خیرات اور دان پن کی شکل میں ہوتی تھی۔ دوسری الفاظ میں سماج کاری کی ابتدائی شکل سماجی خدمت تھی۔ بقول ناتھن کوہن سماج کاری ہمیشہ انسان دوستی کے طریقوں کی تلاش میں رہی ہے۔ جیسے جیسے نئے تجربات حاصل ہوتے گئے مختلف سماجی علوم میں نئی دریافتیں ہوتی گئیں۔ سماج کاری ایک سائنس اور باضابطہ پیشہ بنتا گیا۔ اس وقت سماج کاری ایک پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ جس کی بنیاد ایک طرف تو انسان دوستی اور جمہوریت پر ہے تو دوسرے طرف سماجی علوم اور سماج کاری کے اپنے تجربات پر ہے جو خدمات کے صلہ میں حاصل ہوتے رہے ہیں۔ سماج کاری کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ 'یہ ایک پیشہ ورانہ خدمت ہے جس کی بنیاد انسانی تعلقات قائم کرنے کی مہارت پر ہے اور جس کا تعلق انفرادی اور یہ بین شخصی مطابقتی مسئلوں سے ہے جو نہ پوری ہونے والی شخصی، گروہی اور جماعتی ضروریات سے پیدا ہوتے ہیں۔' سماج کاری کا تعلق اور رجحان شروع ہی سے مطابقتی مسائل کی طرف رہا ہے۔ موجودہ دور میں سماج میں مطابقت کے لیے فرد اور سماج دونوں ہی میں تغیر لانا ضروری سمجھا جاتا ہے اور سماج کے ڈھانچے اور سماجی طاقتوں کے سائنسی مطالعہ کو اس مقصد کے حصول کے لیے لازمی قرار دیا جاتا ہے۔ سماج کاری کا مطابقت کا تصور موجودہ حالت کے استقرار کو نہیں مانتا بلکہ انسانی بہبود کے لیے سماجی ڈھانچ میں انسان دوستی، سماجی انصاف اور جمہوریت کی بنیاد پر تبدیلی لانے پر زور دیتا ہے۔

سماج کاری کا فلسفہ : سماج کاری کے فلسفہ کی بنیاد جمہوریت، سماجی انصاف اور انسان دوستی پر ہے۔ ایس. سی. کوہن کے مطابق سماج کاری کی دس بنیادی اقدار ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) انسان کی عظمت میں یقین اور انسانیت کی تعظیم۔

(2) انسانی فطرت کی پورے طور پر ترقی کرنے کی اہلیت میں یقین۔

(3) اختلاف کے حق کو تسلیم کرنا۔

(4) بنیادی انسانی احتیاجات کو پورا کرنے کی ضرورت میں یقین۔

(5) آزادی

(6) خود ارادیت۔ اپنے فیصلے خود کرنے کے حق پر یقین۔

(7) اپنے فیصلے دوسرے پر نہ لادنے کا نظریہ۔

(8) تعمیری سماجی تعاون۔

(9) کام کی اہمیت اور خالی وقت کا کارآمد استعمال۔

(10) اپنی ذات کو انسان اور فطرت سے پہنچے والے نقصان سے تحفظ کا حق۔

کوہن کی بتائی ہوئی اقدار سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ترقی پذیر ممالک کے سماجی حالات میں سماج کاری کے اقدار میں مندرجہ ذیل اقدار کا شمول ضروری ہے۔

(1) ذرائع پیداوار کی سماجی ملکیت میں کسی حد تک یقین۔

(2) پیداوار کی سماجی موزونیت میں یقین۔

(3) منصفانہ تقسیم پر یقین۔

(4) نفع اندوزی کی ترغیب سے انکار۔

(5) سماجی اور اقتصادی استحصال سے انکار۔

(6) سماجی ترقی کا ایک ایسا تصور جس میں سماج کا ایک حصہ نہیں بلکہ پورا سماجی نظام ترقی کرسکے۔

سماج کاری کے طریقے : سماج کاری کے تین بنیادی اور تین ذیلی طریقے ہیں۔

بنیادی طریقے : (1) انفرادی سماج کاری : یہ انفرادی طور پر افراد کے مسائل کو سلجھانے کا کام کرتی ہے۔ پرل من کے مطابق انفرادی سماج کاری ایک ایسا طریق ہے جس کو جنھیں سماجی کارکن اس لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ افراد کی ان کی ذاتی اور شخصی مصیبتوں اور تکلیفوں میں مدد کریں کہ وہ سماجی کارکردگی کے مسائل کا زیادہ بہتر طریقہ پر سامنا کرسکیں۔

(2) گروہی سماج کاری : یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس میں افراد کی شخصیت کی ترقی کے لیے گروہی اعمال کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹریکر کے مطابق یہ "ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ایک سماج کار، افراد کی (گروہوں میں، سماجی اداروں میں) امداد کرتا ہے۔ اور پروگرام کی سرگرمیوں میں ان کے بین عمل کی ایسی رہنمائی کرتا ہے کہ وہ اپنی اہلیت کے مطابق ترقی کرسکیں جس سے انفرادی، گروہی اور جماعتی ترقی ہوسکے"۔ اس طریقہ کا استعمال عموماً آس پاس کی آبادی کی ترقی کے لیے کیا جاتا ہے۔ سماج جتنا زیادہ صنعتی اور شہری ہوتا جاتا ہے اسی تناسب سے شخصی تعلقات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

327

کی کمی ہوتی جاتی ہے اور اسی قدر اس طریقہ کی افادیت بڑھتی جاتی ہے۔ سماجی کارکن بچوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر ان کو نئی باتیں سکھاتے ہیں۔ اس سے ان کی سماج میں ایڈجسٹ ہونے کی صلاحیت بڑھتی ہے۔

(3) جماعتی تنظیم : یہ طریقہ ایک پوری جماعت کو خود کفیل بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کے ذریعہ کوشش کی جاتی ہے کہ ایک مخصوص جماعت خود ہی اپنی ضروریات کو پہچانے، ذرائع کی دریافت کرے اور پھر حصول مقاصد کے لیے قدم بڑھائے۔ سماج کار محض ایک رہنما یا ہادی کی حیثیت میں مدد کرتا ہے۔

ذیلی طریقے : ذیلی طریقے بھی تین ہیں۔ (1) سماجی تحقیق، (2) سماجی نظم و نسق، (3) سماجی عمل۔

ہندستان اور اس جیسے ترقی پذیر ممالک کے لیے سماجی عمل کی اہمیت اب بہت ہی زیادہ ہے اور قاعدہ سے تو اسے سماج کاری کا ایک بنیادی طریقہ کار قرار دینا چاہیے کیونکہ اس کا مقصد ہوتا ہے سماجی ترقی کے لیے متحدہ عمل۔ آج سماج کاری کے سامنے جو بے شمار چیلنج ہیں ان کا سامنا کرنے کے لیے سماجی عمل ایک نہایت ہی مفید طریقہ ہوسکتا ہے۔ نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا میں سماج کار آج اس طریقہ کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ اور اسے سماجی ڈھانچے اور نظام میں تغیر لانے کے لیے استعمال کررہے ہیں۔ بظاہر یہ ایک مہم یا تحریک کا ہم شکل لگتا ہے۔ فوری تبدیلی یا انقلاب لانے کی اتنی ہی صلاحیت بھی اس میں ہوتی ہے لیکن یہ بہت باریکی سے منصوبہ بند طریق ہے اس لیے یہ مہم یا تحریک نہ ہوکر سماجی عمل ہوتا ہے۔

سماج کاری کا میدان عمل : سماج کاری کا استعمال ہر اس دائرہ میں ہوسکتا ہے جہاں شخصی یا سماجی عدم مطابقت پائی جاتی ہے۔ عام طور پر سماج کاری کا استعمال جن حلقوں میں کیا جاتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں : فلاح اطفال، فلاح خواتین، معذوروں کی فلاح، مزدوروں کی فلاح، دیہی فلاح، مجرموں کی اصلاح، مریضوں کی فلاح، پچھڑی جاتیوں کی فلاح، ضعیفوں کی فلاح، مدرسوں میں سماج کاری وغیرہ وغیرہ۔

سماج کاری ایک پیشہ کی حیثیت میں : سماج کاری ایک رضاکارانہ خدمت سے آگے بڑھ کر ایک مکمل پیشہ بن چکی ہے۔ سماج کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سماج کاری کے سائنسی علم اور اس کی مہارتوں کو باقاعدہ حاصل کرے اور کسی ادارہ کے عہدہ دار کی حیثیت سے سماج کاری کے طریقوں کا استعمال شخصی یا سماجی عدم مطابقت کے مسائل حل کرنے کے لیے کرے۔ ایک پیشہ کے لیے جن باتوں کا ہونا ضروری ہے وہ سب سماج کاری میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی بنیاد ایک منظم اصول پر ہے۔ اس کی تعلیم کا ایک باقاعدہ نظام بنا ہوا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس کی ایک پیشہ ورانہ تنظیم بنی ہوئی ہے جس کے تحت سماج کاری کی باقاعدہ تعلیم حاصل کیے ہوئے افراد اس کے رکن ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ضابطہ اخلاق بنا ہوا ہے جس کا تعلق افراد، اداروں، ہم منصبوں، جماعت اور سماج کاری کے پیشے سے ہے اور جس کی پابندی ہر پیشہ ور سماج کار کے لیے ضروری ہے بھارت میں ایک مرکزی تنظیم "انڈین اسوسی ایشن آف ٹرینڈ سوشیل ورکرس تھی جس کی شاخیں سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اندرونی خلفشار کی وجہ سے اب وہ کام نہیں کررہی ہیں۔ البتہ چھوٹی چھوٹی کئی تنظیمیں موجود ہیں۔ سماج کاری ملک کی تقریباً سو (100) اداروں میں بطور ایک مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔ ایک مرکزی تنظیم سارے تعلیمی اداروں کی بھی ہے۔ جسے اسوسی ایشن آف اسکولس آف سوشیل ورک کہتے ہیں۔ سماج کاری کی تعلیم یونیورسٹیوں میں بی.اے. ایم.اے.، پی.ایچ.ڈی. اور ڈی.لٹ. کی سطحوں پر دی جاتی ہے۔

یو.جی.سی. نے سماج کاری کی تعلیم کے لیے کئی تبصرانہ کمیٹیاں اور نصاب کی بہتری کے لے کونسلیں بنائی ہیں۔ جس کے تحت مختلف اداروں میں نصاب کو معیاری بنایا جاتا ہے اور مقامی ضروریات کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنس جو ممبئی میں واقع ہے ہندستان کا پہلا سماج کاری کا تعلیمی ادارہ ہے۔ یہ 1936 سے قائم ہے اب اسے دیمڈ یونیورسٹی (Deemed University) کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔

سماج کاری کا جدید رجحان : سماج کاری ہمیشہ سے ایک ایسا پیشہ رہی ہے جس کی توجہ سماج کی ضروریات اور مسائل کی طرف ہوتی ہے ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے۔ بنیادی اور ذیلی طریقے بھی ہیں۔ ان کا استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ نیا رجحان یہ ہے کہ اس کے ہر طریقہ کو منفرد طور پر استعمال کرنے کے بجائے انھیں ایک ساتھ استعمال کیا جائے اور ان کا استعمال سماجی نظام یا ڈھانچے میں حسب ضرورت رد وبدل کے لیے کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح ہوسکے۔ سماج کاری سماج کی سماجی انجینئرنگ میں دلچسپی رکھتی ہے اور ایک جمہوری اور سماجی انصاف پر مبنی سماج کا قیام چاہتی ہے۔ اس لیے تمام بنیادی اور ذیلی طریقوں کو ملا کر ایک

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

گھلا ملا طریقہ کار (Integrated Method) وضع کیا گیا ہے۔ عموماً گندی بستیوں اور گاؤں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

جدید رجحان کے تحت سماج کاری کے میدانِ عمل کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ سماجی فلاح و بہبود اور سماجی ترقی (Social Welfare and Social Development)۔ اول الذکر میں افراد اور چھوٹے گروہوں کا بہت نزدیک سے مطالعہ کرکے ان کو ان کے مسائل کے مطابق مدد دی جاتی ہے۔ آخرالذکر میں ان لوگوں کے ساتھ بھی کام کیا جاتا ہے جو فی الوقت کسی بڑے مسئلہ سے دو چار نہیں ہوتے۔ یہ عموماً احتیاطی یا ترقیاتی کارروائی ہوتی ہے تاکہ مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔ مثلاً سماجی فلاح اور بہبود میں منشیات کے عادی لوگوں کو نشہ سے نجات دلائی جاتی ہے جبکہ ترقیاتی کارروائی میں منشیات کی پیداوار پروسیسنگ اور ترسیل ہر میدان میں انسدادی کام کیا جاتا ہے۔ تمام لوگوں کو شامل کرکے باقاعدہ مہمات اور تحریکیں چلائی جاتی ہیں۔ تاکہ منشیات کی پیداوار یا ترسیل ہی نہ ہوسکے۔

بڑے بڑے مسائل جیسے انسانی حقوق، ہتھیار بندی، دہشت گردی وغیرہ بھی آج سماج کاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ آج اس کا دامن بہت وسیع ہوچکا ہے۔ اور ہر قسم کی ریسرچ ہورہی ہے۔ غیر سرکاری ادارے اور بین الاقوامی تنظیمیں اس میں خاص کردار نبھا رہی ہیں۔ بھارت میں اس کی ترقی کے بے حد امکان ہیں۔

سماجی اتصال (Social Cohesion): سماجی اتصال سماجیات کی ان چند اصطلاحوں میں سے ایک ہے جس نے ماہرین کی توجہ جدید صدی میں اپنی طرف منعطف کی ہے۔ موجودہ صدی میں گروہوں کے روابط اور ان کے آپسی تعلقات کا مطالعہ کرنے والوں نے محسوس کیا کہ ہر گروہ میں افراد کے مابین جو تعلقات پائے جاتے ہیں ان کی مضبوطی یا گہرائی کا انحصار متعدد عوامل پر ہوتا ہے اور یہی وہ عوامل ہوتے ہیں جو بالآخر اس گروہ یا کمیونٹی کے افراد میں آپسی قربت تعاون یا عدم قربت اور عدم تعاون کے روابط پیدا کرتے ہیں۔ ایسی سماجی طاقت یا سماجی طاقتیں جو افراد کو آپسی روابط کے مضبوط سے مضبوط تر رشتوں میں کھینچتی ہیں سماجی اتصال کی قوتیں کہلاتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے میکڈوگل نے 1908 میں، ٹراٹر نے 1916 میں، کرٹ لیون نے 1948 میں اور اس کے بعد بے شمار سماجیات والوں نے سماجی اتصال پر عالمانہ تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ سماجی اتصال کی قوتوں میں سب سے اہم قوت افراد میں ہم آہنگی یا یکسانیت پیدا کرنے کا طریق ہوتا ہے۔ کسی سماج کے افراد اپنے متعین مقاصد کے حصول کے لیے انفرادیت کو قربان کرکے سماجی اتصال کے طریقہ کو اپناتے ہیں تاکہ مشترک مقاصد کا حصول ممکن ہوسکے۔ گروہی ساخت اور ہر گروہ کے مختلف اجزاء کے باہمی عمل اور رد عمل میں سماجی اتصال کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے۔ جس قدر سماجی اتصال زیادہ پایا جائے گا اسی مناسبت سے اجتماعی عمل اور طریقہ کار میں ہم آہنگی اور ہم شعوری پائی جائے گی۔ جب سماجی اتصال کسی گروہ یا معاشرہ میں مائل بہ انحطاط ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے انتشاری قوتیں زیادہ فعال اور کارکرد بن جاتی ہیں جن کو اجتماعی مفاد کے لیے دوبارہ قابو میں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگر سماجی تبدیلیوں کا منفعت بخش شعور اور صحیح ادراک نہ ہو تو اس کا بھی اندیشہ رہتا ہے کہ سماجی اتصال کی قوتیں تبدیلیوں کی راہ میں رکاوٹ بن کر سماج کے لیے دشواریاں پیدا کرسکتی ہیں۔ بہرحال سماجی اتصال سماجی وابستگی کا اہم عنصر ہے۔

سماجی اتصال ایک مسلسل چلنے والا عمل ہے۔ سماج کے مختلف گروہ لگاتار ایک دوسرے کی طرف چلتے ہوئے متصل ہوتے ہیں اور اکثر مدغم ہوجاتے ہیں اس کے بعد وہ اکثر اپنی شناخت کی بازیافت کرتے ہیں۔ اور ٹکراؤ تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ٹکراؤ (Conflict) سماجی اتصال کے ساتھ ہی ساتھ چلتا رہتا ہے۔

سماجی اتصال بنیادی طور پر غیر شعوری عمل ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ شعوری بھی ہوسکتا ہے کسی آئیڈیل گروہ کی نقل کرنے کی ترغیب اکثر سماج کے معتبر افراد دیتے ہیں۔ کبھی یہ کوشش جبر پر مبنی بھی ہوتی مثلاً افریقی غلاموں کو امریکا میں رہ کر عیسائی ہونے اور انگریزی زبان بولنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ آج بھی ایرانی انقلاب اور طالبان حکومت کے دوران عورتوں کو مروجہ روش ترک کرکے کچھ بنیاد پرست رویہ اپنانے پر مجبور کیا جاتا رہا ہے۔

اس طرح سماجی اتصال کے ساتھ ٹکراؤ (Conflict) کا عمل بھی ساتھ چلتا رہتا ہے۔

سماجیاتی طریق عمل: طریقہ اور طریق عمل — سماجیاتی طریق عمل کے بیان کے قبل یہ مناسب ہوگا کہ ہم پہلے یہ بتائیں کہ "طریقہ" سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہماری کیا مراد ہے۔ ایک تعریف کے مطابق "طریقہ سے مراد ہے ہر وہ طریق کار جو مختلف اشیاء پر کسی عقلیت پسند نظام یا نظام بند نمونے کا اطلاق کرے۔" طریق عمل کی تعریف کرتے ہوئے سیلوبڈور جز کا کہنا ہے کہ یہ "کسی بھی علم میں استعمال کیے جانے والے طریقوں کا نظام بند مطالعہ ہے۔" جنر (Giner) کا کہنا ہے کہ طریق عمل سے مراد ان تمام مختلف طریقوں کا سلسلہ ہے جنھیں سماجیات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق سماجیاتی طریقے کے متعلق ہم جزوی طور پر ہی بات کرسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے کچھ لوگ سماجیاتی تخیل کی بات کرتے ہیں یعنی اس علم کی روح کی بات کرتے ہیں۔ جس کی بنیاد سماجی حقیقت سے متعلق نظریے پر ہے۔ جز نے سماجیاتی طریقوں کو تحقیقی تکنیک کے معنوں میں لیا ہے جبکہ باٹومور (Bottomore) نے انھیں سائنسی طریقوں یا سماجیاتی تفتیش کی منطق کے معنوں میں لیا ہے۔

سماجیاتی طریق عمل سماجیاتی تفتیش کی منطق کے معنوں میں :
سماجیاتی طریق عمل کو اگر ہم تفتیش کی منطق کے معنوں میں لیں تو اسے چار طریقوں یا نظریوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی تواریخی طریقہ تقابلی طریقہ، ثقافتی طریقہ اور رسمی یا منظم طریقہ۔

(1) تواریخی طریقہ : اس طریقہ کی بھی دو شکلیں رہی ہیں۔ ابتدائی ماہرین سماجیات نے جو طریقہ اختیار کیا اس پر فلسفہ تاریخ کا اثر تھا اور بعد میں ارتقاء کے حیاتیاتی نظریے کا اثر ہوا۔ یہ طریق ان مسائل پر توجہ دیتا ہے کہ سماجی اداروں، سماج اور تہذیبوں کا منبع کیا تھا ان کا ارتقاء کیسے ہوا اور ان میں تغیر کیسے آیا۔ اس نقطہ نظر کا تعلق انسانی تواریخ کے پورے پھیلاؤ سے اور سماج کے تمام بڑے اداروں سے ہے۔ یہ نقطہ نظر کانٹے، اسپنسر اور ہاب ہاؤس کی تصنیفوں میں ملتا ہے۔ کبھی کبھی اس نقطہ نظر کا تعلق کسی مخصوص سماجی ادارے کے ارتقاء سے ہی ہوتا ہے جیسے وسٹرمارک کی تصنیف "انسانی شادی کی تواریخ" یا اوپنہائیمر کی "ریاست" میں ملتا ہے۔ اس نقطہ نظر میں کچھ صداقت ضرور ہے مگر اس بات پر اصرار سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا کے سماجی تغیرات کو سمجھنے کے لیے انھیں نوع انسانی کے پورے سماجی ارتقاء کے ایک جامع نقشے میں رکھنا ضروری ہے۔ اس اصرار کی ایک بین مثال کٹر مارکسزم ہے۔ مارکس نے جدید سرمایہ داری کا جو ایک نادر مطالعہ کیا اسے سماجی ارتقا کا ایک اصول بنا لیا گیا۔

دوسری شکل اس طریقے کی وہ ہے جو میکس ویبر نے استعمال کی۔ ویبر نے اسبابی تشریح کے مقابلے تفسیر (Interpretation) پر زور دیا۔ اور مارکس وادیوں کے اس دعوے کو غلط بتایا ہے کہ وہ اپنے طریقے سے سماجی ارتقاء کے پورے دور کی تشریح کرسکتے ہیں۔ ویبر کے مطالعوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سماجی ڈھانچوں اور سماج کی قسموں کے مخصوص تواریخی تغیرات کی تفتیش کی گئی ہے۔ اور ان کا مقابلہ دوسرے قسم کے تغیرات اور دوسرے قسم کے سماجوں سے کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان مطالعوں میں اسبابی تشریح اور تواریخی تفسیر دونوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعد کے ماہرین سماجیات میں اس طریقے کا استعمال سی رائٹ ملس (C.Right Mills) اور ریمنڈ ایرون (Reymond Aron) کی تصنیفات میں ملتا ہے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں میں صنعت کاری اور سماجی تغیر کے مطالعے کے لیے ویبر کے طریقے کا استعمال مقبول ہوتا جارہاہے۔

(2) تقابلی طریقہ: اس طریقے کا پہلے پہل استعمال ارتقائی ماہرین سماجیات نے کیا لیکن اس طریقے کے استعمال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ارتقائی نقطہ نظر کا استعمال کیا ہی جائے۔ دور کھیم نے "سماجیاتی طریقے کے قواعد" میں اسی طریقے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے یہ دعوی کرنے کے بعد کہ سماجیاتی تشریح کا مطلب ہے محض اسبابی تعاملات کو ثابت کرنا ہے۔ مزید یہ کہا کہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ایک مظہر دوسرے مظہر کا سبب ہے ناگزیر ہے کہ ہم ویسے معاملات کا معائنہ کریں جن میں دو مظاہر بیک وقت موجود یا غیر موجود ہوں اور اس طرح یہ ثابت کریں کہ کیا ان میں سے ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ ریڈ کلف براؤن کے مطابق تقابلی طریقہ تنہا کافی نہیں ہے جب تک ہم اس میں کچھ اور شامل نہ کریں۔ ان کے مطابق یہ طریقہ مفروضات کی جانچ کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ تقابلی طریقے میں جو مشکل پیش آتی ہے اس کا سبب مفروضات کا موجود یا غیر موجود ہونا ہے یا یہ ہے کہ شروع میں کوئی واضح مفروضہ نہیں قائم ہو پاتا۔ علاوہ ازیں اور مشکلات بھی ہیں۔ پورے پورے سماجوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس میں اکثر ہوتا یہ ہے کہ دو مختلف سماجوں میں کسی خاص سماجی ادارے یا تعلق کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ لیکن نقادوں کا کہنا ہے کہ بظاہر جو ادارے یکساں لگتے ہیں وہ دو مختلف سماجوں میں دراصل بالکل مختلف ہوسکتے ہیں اور کسی ادارے کو سماج سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہاب ہاؤس وہیلر اور جنسبرگ نے قدیمی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

سماجوں میں کچھ بڑے اداروں کا باضابطہ تقابلی مطالعہ کیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ مختلف اقتصادی نظاموں میں تفریق کریں اور یہ دیکھیں کہ حکومتی اداروں اور سماجی درجہ بندی کا اقتصادی اختلافات سے کیا تعلق ہے۔ اب دوبارہ ماہرین سماجیات کی دلچسپی سماجوں کے موازنے کی طرف ہوگئی ہے۔

(3) تفاعلی طریقہ : یہ طریقہ دراصل ارتقائی فلسفہ خیال کے طریقوں اور دعووں کے خلاف ایک رد عمل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ طریقہ ارتقائی خیال والوں کے اس دعوے کو رد کرتا ہے کہ انسانیات کے تصور کے داغ بیل ہربرٹ اسپنسر نے ڈالی تھی۔ اس کی بنیاد اس پرانے تمثیلی استدلال پر ہے جو سماج اور ایک عضویہ کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ اس تصور کی سب سے پیچیدہ تشکیل دور کھیم نے اپنی تصانیف "سماج میں تقسیم محنت" اور "سماجیاتی طریقے کی قواعد" میں کی۔ دور کھیم نے سماجی اداروں کا تفاعلی کردار اس طرح بتایا کہ ان میں اور سماجی عضویہ کی ضروریات میں مطابقت ہوتی ہے۔ مالی ناؤسکی نے تفاعلی طریقے کو ایک انتہا تک پہنچا دیا اور اس بات پر زور دیا کہ مخصوص طریقہ کار میں سماجی کردار کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔ لہٰذا ہر سماجی عمل کا اس کے وجود کے سبب ایک تفاعل ہے اور ہر عمل دوسرے اعمال کے ساتھ اتنا مربوط ہے کہ کوئی واحد مظہر سماجی سیاق و سباق سے الگ کرکے نہیں سمجھا جاسکتا۔ دورکھم کے مطابق مذہب کا سماجی تفاعل سماجی اتحاد کا اظہار اور استحکام ہے۔

(4) رسمی اور منظم طریقہ : اس کا آغاز جارج رسمل نے کیا۔ اس طریقے کے مطابق سماجیات ایک نیا طریقہ ہے جس سے ہم ان واقعات کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ جنھیں دوسرے سماجی علوم زیر غور لاچکے ہیں۔ یہ طریقہ تفاعل باہمی یا شرکت کی اشکال پر غور کرتا ہے۔ بجائے ان کی تواریخی ماہیئت پر غور کرنے کے۔ مزید برآں یہ طریقہ تفاعل باہمی کی ان شکلوں پر بھی غور کرتا ہے جو بڑے اداروں مثلاً ریاست اقتصادی نظام وغیرہ میں نہیں ہوتی بلکہ افراد کے بیچ چھوٹے اور وقتی تعلقات میں پائی جاتی ہیں۔ اس کو ہم سماجیات اصغر کہہ سکتے ہیں۔ جس کا تعلق افراد کے بیچ غیر رسمی روزمرہ کے باہمی تعلقات سے ہے جبکہ تقابلی طریقے کا تعلق رسمی سماجی اداروں سے ہے۔ یہ دونوں ہی طریقے انسانی سماج کے باضابطہ مطالعے کے لیے مناسب طریق کار فراہم کرتے ہیں۔

سماجیاتی طریق عمل کی ایک مختلف طبقہ بندی : اس کی بنیاد تحقیقی تکنیک پر ہے۔ جیسے بیانیہ طریقے جن کا مقصد سماجی حقیقت کے ایک مخصوص حلقے کی ایک تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ یا نفسیاتی سماجیاتی طریقے جن کا مقصد سماجی زندگی کے نفسیاتی پہلوؤں کی تفتیش کرنا ہے یا تجرباتی طریقے جن میں قابو یافتہ حالات میں کسی عامل (Variable) کا اثر دیکھا جاتا ہے۔ طبقہ بندی کی اس شکل میں ہے۔ تواریخی اور تقابلی طریقوں کو شمار کرسکتے ہیں جو تحقیق کے لیے تواریخ کا مطالعہ کرتے ہیں یا جماعتوں اداروں اور گروہوں کا موازنہ کرتے ہیں۔

سماجی مطالعے کے نمونے : پروفیسر ہلیکس انکلس نے سماجیاتی طریق عمل بجائے "سماجی نمونے" کی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے پانچ نمونے بتائے ہیں۔ ارتقائی نمونہ، عضویاتی نمونہ، توازنی بمقابلہ تکراری نمونہ، طبعی سائنس کا نمونہ اور اعداد وشماری اور ریاضیاتی نمونہ۔ ان کے مطابق ماہرین سماجیات خطرناک طور پر خود ساختہ نمونوں سے ہی امر واقعہ پیدا کرلیتے ہیں بجائے اس کے کہ آزادانہ مطالعے کی بنیاد پر واقعات کو معلوم کریں۔ کوہن اور نیگل کا کہنا ہے کہ "علوم طبیعی زیادہ جسارت کرسکتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ احمقانہ خیالات، قدرتی واقعات کے جھٹکے سے رد کردیے جائیں گے۔ سماجی میدان میں بہرحال یہ کہنا مشکل ہے کہ احمقانہ خیالات سے کیا نقصان ہوگا۔ قبل اس کے کہ ان کی حماقت بالآخر ظاہر کی جاسکے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ظاہر ہو۔"

سماجی انجذاب (Assimilation):

سماجی انجذاب یا ادغام سماجیات اور انسانیات کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ سماجی انجذاب ایک سماجی طریق ہے جس میں مختلف نسلوں اور تمدنوں کے لوگ آپس میں عمل کے نتیجہ کے طور پر تفریقات کو ترک کرکے وسیع ترکیونٹی کے طرز زندگی کو اپنا لیتے ہیں۔ سماجی انجذاب کا عمل عارضی یا موقعتی مطابقت سے گزر کر کم و بیش مکمل ہم آہنگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جب دو یا مختلف گروہ ایک عرصہ دراز تک باہم مختلف تعلقات میں منسلک ہوتے ہیں تو عام طور سے ان گروہوں میں ایک دوسرے کے طور طریق کو اختیار کرلینے اور مکمل مفاہمت پیدا کرلینے کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ ایسے گروہوں کے مابین شدید نظریاتی فاصلہ، کشیدگی اور تصادم نہ پایا جاتا ہو۔ تاریخی اعتبار سے اس تصور کی طرف سب سے پہلے 1782 میں توجہ کی گئی۔ جس کے بعد سے خاص طور سے امریکی سماج میں مختلف قوم اور نسل کے لوگوں کی آمد اور ان کے انجذاب کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا رہا۔ امریکی سماجیاتی ادب میں (Fair Child) فیئر چائلڈ نے اس اصطلاح پر سب سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پہلے 1913 میں بحث کی جس کے بعد پارک اور برجس اور دوسرے ساجیات دانوں نے اس موضوع پر تفصیلی بحثیں کیں۔ عام طور سے ساجی انجذاب سے مراد یہ ہے کہ جب مختلف افراد یا گروہ آپسی روابط اور بین عمل کے نتیجہ کے طور پر ذہنی، جذباتی اور اجتماعی سطحوں پر ایک دوسرے سے مطابقت یا مماثلت پیدا کرلیتے ہیں۔ اور اس طرح ایسے تمام افراد یا گروہ ایک مشترکہ تمدن کا جزو بن جاتے ہیں تو ساجی انجذاب کا عمل پورا ہوتا ہے۔ چنانچہ آبادیاتی انتقال یا ہجرت کی مثالوں سے ایشیا اور امریکا کے بہت سے ساجوں میں پتہ چلتا ہے کہ کس طرح مختلف نسلوں اور تمدنوں کے افراد نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو کسی خاص تہذیب یا تمدن میں جذب یا ضم کردیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بعض نظریاتی اور نسلیاتی مسائل ہمیشہ اتنے پیچیدہ اور الجھے ہوئے رہے ہیں کہ انجذاب کا عمل بہت سی صورتوں میں نامکمل رہا ہے۔ جس کی وجہ سے بے شمار ساجی اور تمدنی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر نیگرو (آج نیگرو لفظ ایک غیر مہذب لفظ سمجھا جانے لگا ہے۔ ان کو بلیک یا افریقن امریکن کہا جاتا ہے۔ نیگرو لفظ یوں بھی غلط ہے کیونکہ یہ محض مذکر ہے مونث لفظ نیگریس ہے) گروہوں کا ساجی انجذاب امریکا میں کبھی کامیاب نہیں رہا۔ یا پھر ہندستان میں مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ ہے جو مقامی ساجی اور تمدنی دھارے میں اپنی انفرادیت کو ضم کردینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود بعض مادی اور منطقی سطحوں پر ساجی انجذاب کا عمل نظر آتا ہے۔ بہرحال کسی ساج میں مختلف گروہوں کے آپسی تعلقات کا انحصار انجذاب کے درجہ پر ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ساجی انجذاب ہمیشہ اور ہر حال میں مفید یا پسندیدہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ دراصل اس قسم کا ہر فیصلہ خود متعلقہ ساج کے افراد کے انداز فکر پر منحصر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں انجذاب اگر رضاکارانہ یا غیر شعوری ہو تو اس کا روکنا بے حد مشکل اور غیر ضروری ہوتا ہے۔ لیکن لادا ہوا یا ٹھونسا ہوا انجذاب ایک گروہ کی بالادستی کی علامت ہوتا ہے جو کہ ایک جمہوری اور فلاحی ساج کے لیے مہلک ہوتا ہے۔

ساجی انصاف (Social Justice): ساجی انصاف کی اصطلاح آج کل بہت استعمال ہو رہی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کئی معنوں میں مستعمل ہونے لگی ہے۔ ساجیات کے طالب علم کے ذہن میں اس کا تصور بالکل صاف ہونا چاہیے۔ ساجی انصاف کا تصور نشاۃ ثانیہ کے درمیان یورپ میں پیدا ہوا۔ اس دوران لوگوں نے ساجی بندشوں کے خلاف جدوجہد شروع کردی تھی۔ فرانسیسی انقلاب نے عوام کو جن حالات سے دوچار کیا ان کی وجہ سے نہ صرف ساجی انصاف کا فلسفہ پنپا بلکہ ساجی ترقی کے ایک سنگ میل کی صورت میں اس اصطلاح کا استعمال بھی عام ہو گیا ہے۔

چونکہ انسان بنیادی طور پر مساوات کا طلب گار اور حقدار ہے اس لیے ہر قسم کی عدم مساوات، استحصال، جبر اور ناانصافی کو مٹا دینا اس کا حق اور فرض دونوں ہیں۔ اس سلسلے میں کام کرنے والے دانشور مانتے ہیں کہ ساج خود بخود سدھر نہیں سکتا۔ عدل اور انصاف پر مبنی ایک نظام قائم کرنے کے لیے صحیح پالیسی، چست اور درست کارکنوں، رضاکارانہ تنظیموں اور بیدار عوام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کے دیے ہوئے انسانی حقوق کے آئین میں دیے ہوئے بنیادی حقوق اور مہذب معاشرہ (Civil Society) ساجی انصاف پر منحصر ایک نظام قائم کرنے میں مدد کرسکتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں برابری، آزادی (شخصی اور گروہی) اور ہر شخص کی خودداری اور ذاتی وقار کا خیال رکھا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے اعلان کے ساتھ ہی تقریباً ہر ملک ساجی انصاف کے سلسلے میں غور کرنے لگا۔ اس کے بعد 1966 میں بین الاقوامی سطح پر معاشرتی معاشی اور تمدنی حقوق کے سلسلے میں اعلانیہ تیار کر دیا گیا اس کے بعد ہر قسم کے نسلی امتیاز کو ختم کرنے کا عہد کیا گیا۔ گو اس کے اوپر عمل کرنا کافی مشکل تھا لیکن کئی ممالک نے ان معاہدات پر دستخط کیے اور انھیں لاگو کیا۔ ہندوستان میں پورا آئین ہی ساجی انصاف کا منہ بولتا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ 1976 کے بیس نکاتی پروگرام سے لے کر 1993 کی تہترویں اور چوہترویں آئینی تبدیلیاں ساجی انصاف کے پیش نظر ہی ہوئی ہیں۔ صوبائی اسمبلی، پارلیمنٹ، نوکریاں، تعلیمی ادارے ہر جگہ صدیوں سے عدم مساوات کا شکار لوگوں کے لیے سیٹیں محفوظ کردی گئی ہیں۔

آج ساجی انصاف کا تصور متحرک ہو رہا ہے۔ یہ بڑھ اور پھیل رہا ہے۔ محفوظ سیٹیں کئی اور گروہوں کو بھی ساجی انصاف کے طالبوں کی صف میں لا کھڑا کرسکتی ہیں۔ آج کل اقلیتیں اور خواتین بھی محفوظ سیٹوں کا مطالبہ کرنے لگی ہیں۔

1990 میں منڈل کمیشن کی رپورٹ آئی تھی۔ جس کی بدولت کئی نئی ذاتیں اور گروپ درج شدہ ذاتوں کے برابر مراعات کے حقدار بن

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

332

گئے۔ اس پر ملک گیر ہنگامہ ہوا۔ اور طالب علموں نے اس کی ڈٹ کر مخالفت کی لیکن معاملہ ٹھنڈا پڑ جانے پر حکومت نے منڈل کمیشن کی سفارشوں کو لاگو کر دیا۔ ایک گروہ کا خیال ہے اس طرح کا سماجی انصاف غیر درج شدہ ذاتوں کو ناانصافی کا شکار بنا رہا ہے۔

اس طرح موجودہ پس منظر میں سماجی انصاف ایک فلسفہ سے زیادہ ایک سیاسی نعرہ بن چکا ہے۔

سماجی بحران (Social Crisis): سماجی بحران ان تصورات میں سے ایک ہے جنھیں ابھی اپنے قطعی اور واضح معنی کی تلاش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحران کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ اس کے باوجود یہ اصطلاح اتنی پہلودار ہے کہ اکثر مفکرین اور اسکالر اس کے استعمال کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ عام طور سے بحران کو دباؤ افراتفری تباہی بربادی تشدد اور انتشار وغیرہ کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سماجی بحران سے مراد عام زندگی کے دھارے اور انداز میں ایسا فرق ہے جو فیصلہ کن تبدیلی کا مرحلہ ثابت ہو۔ بحرانی کیفیت میں سماجی تنظیم اور ادارے انتشار اور افراتفری سے عبارت ہوتے ہیں اور عام طور سے ایسے حالات میں افراد اور گروہوں کو واضح سماجی فیصلے کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ وائمنر (Wie Ner) اور کان (Kahn) نے 1962 میں بحران کی تعریف کی تلاش میں بارہ ایسے نکات پیش کیے جن سے سماجی بحران کی کیفیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ 1963 میں ملر اور اسکو (Iscoe) نے سماجی بحران کی سماجیاتی اور نفسیاتی اعتبار سے توضیح کرتے ہوئے اس کے پانچ مندرجہ ذیل مضمرات بتائے۔

(1) بحرانی صورت حال گمبھیر اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ لیکن اس کا مستقل ہونا لازمی نہیں ہے۔ تاہم بحرانی حالات کی مدت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔

(2) بحران کے نتیجہ کے طور پر سماجی برتاؤ میں مرضیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں لوگ عدم کارکردگی یا فرار کے رجحانات کا اظہار کرتے ہیں۔

(3) بحران کی وجہ سے افراد کے مقاصد کا حصول خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

(4) بحران ایک اضافی تصور ہے۔ بیک وقت ایک گروہ کی نظر میں مخصوص حالات بحرانی ہوسکتے ہیں تو دوسروں کی نظر میں یہ حالات معمولی بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔

(5) بحران کی وجہ سے سماجی تنظیم اور منصوبوں میں کشیدگی اور بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

گذشتہ تین دہوں میں بہت سے سماجیات دانوں نے سماجی بحران کے موضوع پر کام کیا ہے جن میں متذکرہ بالا سماجیات دانوں کے علاوہ رابنسن (1962)، چارلس ہرمن (1963)، رابنسن اور سنائیڈر (Snyder) (1965)، رکسن اور ڈبروسکی (Dabrowski) (1964) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ پٹرم سوروکن جیسے مشہور سماجیات داں اور ٹوائن بی جیسے مورخ نے بھی بحران کے سماجی مضمرات اور اس کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے لیکن سماجی بحران کا تصور علمی اعتبار سے اسی وقت مفید ثابت ہوگا جب کہ اس کے تعلق سے واضح نظریے پیش کیے جاسکیں اور سماجی بحرانی کیفیت کے مختلف متبادلات کا قطعی تعین کیا جاسکے۔

جرائم کی بڑھتی رفتار، صارفیت اور دہشت گردی کی وجہ سے آج کے سماج میں سماجی بحران اور انتشار کی رفتار بے حد بڑھ گئی ہے۔ اس کے سبب سماج کی ساخت اور نظام کے وجود کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔

سماجی بہبود عمل (Social Welfare Function): اس حقیقت کے پیش نظر کہ افادہ یا خوشحالی کا بین شخصی تقابل بغیر کسی اقداری فیصلے کی بنیاد کے ناممکن ہے برگسان (Bergson) اور سیموئیلسن (Samuelson) جیسے معاشین کے نزدیک بہبود معاشیات اگرچہ بنیادی طور پر ایک معیاری علم (Science) ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ معاشین اس کی عملی طور پر تدوین نہیں کرسکتے۔ چنانچہ انھوں نے معاشرہ خوشحالی کے نظریے کی تدوین کے سلسلے میں ایک تو اقداری فیصلوں کو جن میں تقسیم کا معیار شامل ہے، شریک کرنے کو ضروری سمجھا۔ دوسرے یہ کہ انفرادی خوشحالی کا ایک وسیع مفہوم اختیار کیا۔ یعنی انفرادی خوشحالی نہ صرف معاشی بلکہ ہمہ قسم کے غیر معاشی ذرائع اور اجتماعی زندگی کے عام تعلقات اور حالات پر منحصر ہوتی ہے۔

معاشرتی عمل خوشحالی دراصل ایک ایسا قاعدہ یا اصول ہے جس کے ذریعہ انفرادی ترجیحات کے پیمانے سے اجتماعی ترجیحات کا پیمانہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں معاشرے کے مختلف حالات میں افراد

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کو جو خوشحالی حاصل ہوسکتی ہے اس کے اپنے اپنے ترجیحی پیمانے کی بنا پر جو ترتیب (Ordering or Ranking) دیے جاسکتے ہیں ان سے ایک معاشرتی ترتیب (Social Ranking) معلوم کی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر اس کا طریقہ کیا ہے کس طرح انفرادی ترتیب (Individual Ordering) سے معاشری ترتیب (Social Ordering) معلوم کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں عموماً جمہوری رائے دہی کا طریقہ پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی تمام افراد یا افراد کے منتخب نمائندوں کی اکثریتی رائے کی بنا پر معاشری ترتیب معلوم کی جاسکتی ہے۔

لیکن اس سلسلے میں جیسا کہ کینتھ ایرو (Kenneth Arrow) نے اپنی تصنیف "معاشری انتخاب اور انفرادی اقدار" (Social Choice and Individual Values) میں واضح کیا ہے کہ اگر دو سے زیادہ متبادل حالات یا دوسرے لفظوں میں دو سے زیادہ متبادل معاشی پالیسیوں میں سے انتخاب کا مسئلہ ہو تو رائے شماری کے تضاد (Paradox of Voting) کا امکان ہے اس کے معاشری انتخاب یا ترقی یا ترتیب کا قطعی فیصلہ ناممکن ہے۔

چونکہ رائے شماری کے تضاد کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو ایک رائے کا حق ہے جس کا انحصار اس طرح اقداری فیصلے پر ہے جس طرح کہ ہر شخص میں یکساں تشفی کی صلاحیت کا مفروضہ ایک اقداری فیصلے پر ہے اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ برگسان اور سیموئیلس کے نظریے کے مقابلے میں پیگو کا نظریہ جس کی بنیاد یکساں تشفی کی صلاحیت پر ہے زیادہ سیدھا سادہ اور قابل عمل ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں اس طرح کا تضاد نہ ہو معاشری عمل خوشحالی کے نظریے کے لحاظ سے معاشی پالیسیاں اکثریت کی رائے کے مطابق اختیار کی جاسکتی ہیں۔ لیکن معاشری خوشحالی تمام افراد کی خوشحالی پر مشتمل ہوتی ہے جس میں کسی ایک فرد کی ترجیح کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اکثریت کا فیصلہ اس طرح بے معنی ہوگا جس طرح کہ اقلیت کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ یہاں پر ایک دلچسپ اور اہم سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا موجودہ نسل کے لوگ جو معاشی فیصلے کرتے ہیں ان کا اثر آئندہ نسل کی خوشحالی پر پڑتا ہے جن کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

سماجی بہبود - نظریہ پیگو (Old or Pigorian Theory of Social Welfare) : انگلستان کے مشہور معاشی اے.سی.پیگو (A.C.Pigoue) نے اپنے استاد شہرہ آفاق انگریز معاشی الفرڈ مارشل (Alfred Marshall) کے معاشی خیالات کی بنیاد پر جو نظریہ پیش کیا ہے اسے "قدیم بہبود معاشیات" (Old Welfare Economics) کہتے ہیں۔ پیگو یہ مانتا ہے کہ افادہ ایک موضوعی شے ہے لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ افادے کا بین شخصی تقابل ناممکن ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان میں تشفی حاصل کرنے کی صلاحیت کا مفروضہ افادے کے بین شخصی تقابل کے لیے ایک معقول اور جائز بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور اس طرح بہبود معاشیات کی تشکیل ہوسکتی ہے جو سماجی بہبود میں اضافے کی پالسی اختیار کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ پیگو کا استدلال یہ ہے کہ مختلف افراد ایک خاص حقیقی آمدنی (Real Income) سے کم و بیش یکساں افادہ حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہ خیال صحیح نہیں کہ امیر غریبوں کے مقابلے میں فطرتاً مختلف ہیں اور تشفی حاصل کرنے کی کم صلاحیت رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یکساں تشفی حاصل کرنے کے مفروضے کی بنا پر اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ حقیقی آمدنی ایک ہی شے پر مشتمل ہے۔ اور قانون تقلیل افادہ مختتم کے تابع ہے تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ زیادہ آمدنی والوں کو زیادہ اور کم آمدنی والوں کو کم تشفی حاصل ہوگی۔ لہٰذا امیروں سے غریبوں کو آمدنی کی منتقلی سے لازماً جملہ یعنی سماجی بہبود میں اضافہ ہوگا۔ لیکن حقیقی آمدنی ایک سے زیادہ اشیا پر مشتمل ہوتی ہے جن کے تناسب میں پیداوار اور تقسیم کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ ایک حقیقی آمدنی دوسری حقیقی آمدنی سے زیادہ ہے اور ایک شخص ایک آمدنی سے دوسری آمدنی کے مقابلے میں زیادہ خوشحالی حاصل کرتا ہے۔ نیز مختلف اشیا پر مشتمل حقیقی آمدنی پر قانون تقلیل افادہ مختتم کا اطلاق مشکل ہے۔ پیگو ان تمام مشکلات کو مانتا ہے لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ رقمی آمدنی (Money Income) یکساں ہوتی ہے جس پر قانون تقلیل افادہ مختتم کا لازماً اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا امیروں سے غریبوں کو رقمی آمدنی کی منتقلی سے سماجی بہبود میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس نظریے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیشترین سماجی بہبود حاصل کرنے کے لیے رقمی آمدنی کی بالکلیہ تقسیم لازمی ہے۔ اس لیے کہ جب تک آمدنی کا فرق باقی رہے گا امیروں کی آمدنی پر ٹیکس سے جو نقصان ہوگا اس کے مقابلے میں غریبوں کی آمدنی میں اضافہ سے ہونے والا فائدہ زیادہ رہے گا اور یہ صورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک آمدنی کی تقسیم بالکل مساوی

نہ ہو جائے اور مساوات افادہ مختتم کی شرط پوری نہ ہو جائے۔

اس نظریہ کی رو سے بیشترین اجتماعی بہبود کے لیے بالکل مساویانہ تقسیم آمدنی کے منطقی نتیجے کے پیش نظر ایک عام اور بنیادی اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس سے اجتماعی اصل (Accumulation of Capital) اور پیداوار کے کاموں کی ترغیب کی کمی ہوگی اور بالآخر جملہ حقیقی آمدنی میں کمی ہو جائے گی۔ اس کا جواب پگو یہ دیتا ہے کہ جب تک حقیقی طور پر اجتماع اصل اور پیداوار ترغیب متاثر نہ ہو اس وقت تک آمدنی کی عدم مساوات کو دور کرنا ضروری ہے۔ دوسرا اہم اعتراض جس پر بہت زیادہ زور انگریز معاشی لارڈ رابنس (Lord Robbins) نے دیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان کے تشفی حاصل کرنے کی یکساں صلاحیت کا مفروضہ معروضی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا انحصات اقداری فیصلے (Value Judgement) پر ہے لہٰذا اس بنیاد پر بنائے ہوئے نظریے ایجابی نہیں کہلا سکتے بلکہ معیاری ہی رہیں گے۔ اگرچہ رابنسن اس مفروضے پر پالیسی اختیار کرنے کا مخالف نہیں ہے۔

سماجی تحقیق کے اصول (Social Research Methodology) : سماجی تحقیق کے میدان میں میتھڈ اور میتھڈولوجی کو ہم معنی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ میتھڈ کے ایک سادہ معنی ریسرچ کی تکنیک (Technique) سے لیے جاتے ہیں۔ تکنیک سے مراد وہ تمام طریقے یا ٹول ہیں جیسے کہ انٹرویو یا سوال نامہ، جس کے ذریعے ریسرچ کی معلومات اکٹھا کی جاتی ہے۔ مگر میتھڈ کے گہرے اور تفصیلی معنی بھی ہیں۔ سماجی تحقیق میں ماہر سماجیات اپنے ذہن میں سماج، انسانی رویہ اور سائنس کے بارے میں سینکڑوں مفروضے رکھتا ہے اور یہ مفروضے ایک فلسفیانہ مطمع نظر کا حصہ ہوتے ہیں۔ سماجی تحقیق کے متعدد فکری رجحان ہیں اور ہر ایک فکری رجحان اپنی الگ تکنیک الگ منطق اور الگ طریقہ اختیار کرواتا ہے۔ یہاں تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے مگر پھر بھی دو متضاد فکری رجحانات جو عام طور سے سماجی تحقیق میں استعمال کیے جاتے ہیں ان کو یہاں بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان دو فکری رجحانات کے الگ الگ بنیادی فلسفیانہ مفروضے ہیں اور ان میں الگ الگ طریقے سے اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ انسانی سماج کا علم کس طرح حاصل کیا جائے گا۔

پہلا فکری رجحان اگست کامٹ کے پازیٹیو (Positive) فلسفے سے ہے جس کا ماننا تھا کہ سوشل سائنس کی تحقیق میں وہی منطق، طریقے اور تکنیک استعمال کی جائے گی جو کہ نیچرل سائنس میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس فکری رجحان میں یہ مانا گیا کہ سماج وہ حقیقت ہے جو اپنے طور پر موجود ہوتی ہے۔ اور اس بات سے آزاد ہوتی ہے کہ محقق کیسے اس کے بارے میں معلومات اکٹھا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فکری رجحان کو اپنانے والے ان طریقوں کا استعمال کرتے ہیں جو کہ عام طور سے قدرتی سائنس کے دانشور دنیا کے مشاہدے میں اپناتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں قدرتی دنیا اور سماجی دنیا سے جمع کی گئی معلومات کا یکساں اصولوں کے تحت تجزیہ کیا جاتا ہے۔

سوشل سائنس میں بڑی بڑی تحقیقات جنھیں سروے کا نام دیا جاتا ہے۔ ان میں انٹرویو اور سوال نامے ریسرچ کا آلہ کار ہوتے ہیں اور یہ اسی فکری رجحان کی غمازی کرتے ہیں۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انٹرویو اور سوال نامہ سماجیات کی ریسرچ کی خصوصیت ہے جبکہ درحقیقت یہ صرف ایک روایت کا اثاثہ ہے۔

سماجیات کی تحقیق کی دوسری متضاد روایت کو تشریحی طریقہ (Interpretive) کہا جاتا ہے۔ اس طریقے کی روایت ایمینول کانٹ (Immanuel Kant) کے اس فلسفیانہ مفروضے سے جاکر ملتی ہے جس کے تحت علم کے حصول کا دار ومدار انسانی دماغ کی پیچیدہ کارروائیوں کے ذریعے ہوتا ہے جو مشاہدہ پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ وہ ماہر سماجیات جو اس روایت کے دائرے میں تحقیق کرتے ہیں وہ سماجی حقیقت کو ایک خاص ترتیب میں دیکھتے ہیں جس کی صرف ظاہری صورت ہی نہیں ہوتی بلکہ اندرونی طور پر گہرے معنی بھی ہوتے ہیں۔ اس روایت میں یہ کہتے ہیں کہ مشاہد سماجی حقیقت کو خود تعمیر (Construct) کرتا ہے اور اس تعمیر کرنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے مشاہدے کی تشریح کس انداز سے کی۔

عام طور پر سماجیات کا عمل سائنس کے ماڈل کی اطباء کرتا ہے۔ اس عمل کا پورا سفر ایک دائرے کی شکل میں تصور کیا جاسکتا ہے یعنی سماجی محقق کے تحقیقی سوالات کا آغاز جس نکتے سے شروع ہوتا ہے وہی نکتہ تحقیق کے اختتام پر پھر دوبارہ سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے ماہر سماجیات نے دائرے کی تشبیہ کی تصحیح کی۔ اس نے کہا کہ دائرے سے بہتر تشبیہ Spiral یا مرغولے کی شکل ہے جس کا آخر اوّل سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک محقق عارضی طور پر ایک سوال سامنے رکھے جس کے کچھ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

امکانی جوابات اس کے ذہن میں آئیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ سوال کے امکانی جوابات دی ہوئی تھیوری سے حاصل کیے جائیں، بغیر مشاہدے یا فیلڈورک کے۔ اس طرح کے فکری عمل کو Deduction یا استخراجیت کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر سماجی بے راہ روی کے ایک گروہ کی تحقیق کرتے ہوئے بغیر مشاہدے کے کوئی ماہر سماجیات یہ کہہ سکتا ہے کہ اس گروہ کی قدریں اپنے والدین اور علاقائی سرپرستوں کی قدروں سے مختلف ہوں گی۔ ریسرچ کی زبان میں ابھی تک کا عمل Hypothesis یا عارضی سوال جواب کی پیدائش کا عمل ہے۔ سائنس کا دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ سوال کو مشاہدے کی مدد سے اس کے اصل جواب تک پہنچایا جاسکے۔ مشاہدے سے پہلے اٹھائے گئے سوال کا عارضی جواب یا تو صحیح ثابت ہوتا ہے اور یا غلط۔ تحقیقی سوال کا مستند جواب مشاہدے کی سطح پر ابھی بھی سائنسی علم کا حصہ نہیں ہوتا۔ اس منزل کے بعد مشاہدے کی زبان کو سائنس کی عام زبان میں تبدیل کیا جاتا ہے۔

تحقیق کے سفر میں سائنس کی عام زبان وہ مقام ہے جس میں یا تو شروع میں اٹھایا گیا سوال اور اس کا عارضی جواب بے بنیاد تھا یا صحیح تھا۔ اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ محقق کے ذہن میں جو تھیوری تھی اس کی بنیاد کس حد تک حقیقت پر مبنی تھی۔ تحقیق کے اس موڑ پر ماہر سماجیات کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی سوچ کا دوبارہ تجزیہ کرے یا پھر تحقیق کے ان طریقوں پر نظرثانی کرے کہ جن کی مدد سے تحقیق شروع ہوئی۔ اکثر اوقات محقق کا سوال اور عارضی جواب نہ تو مکمل طور پر صحیح ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی غلط بلکہ ہر تحقیق کے آخر میں سینکڑوں سوالات پھر سامنے آتے ہیں اور محقق کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اپنی تھیوری اور ریسرچ کے عمل میں نئے سوالات کو کھوجنے کے لیے گنجائش پیدا کرے۔ سماجیات کے تحقیقی عمل کا اوپر دیا ہوا بیان بظاہر طے شدہ اقدامات اور ترتیب سے بروئے کار لایا جاتا ہے مگر یہ صرف منطقی تصویر ہے۔ تحقیق کا حقیقی بیان خاصا پیچیدہ اور بے ترتیب ہوتا ہے۔ سماجی سائنس کی تحقیق کی منطق اس کی اصل حقیقت سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ سائنسی طریقہ (Scientific Method) دراصل تحقیق کے طریقوں کی منطق ہے۔ تحقیقی عمل نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مکمل سماجی تحقیق کا ماڈل پیش کیا جاسکتا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ سماجی تحقیق کا مثالی خاکہ (Ideal Model) پیش کرنے میں ان اصول و قواعد کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جن کی مدد سے ماہر سماجیات اپنے تجزیہ اور مشاہدے کو اس زبان میں پیش کرپاتا ہے جو دوسرے ماہر سماجیات کی سمجھ میں آسکے۔ مگر عملی طور پر تحقیقی عمل کسی طے شدہ منطق پر پورا پورا کھرا نہیں اترتا۔ تحقیق کے عمل کی بے ترتیبی کو منفی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس بے ترتیبی سے نئی تخلیق کی شروعات ہوتی ہے۔

وہ تمام ماہر سماجیات جو تشریحی روایت کہ دائرے میں ریسرچ کرتے ہیں ان کا تحقیقی عمل سائنس کے ماڈل سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اس روایت سے منسلک ماہر سماجیات کا تحقیقی سفر کسی سوال سے شروع نہیں ہوتا۔ تشریحی ماڈل میں ماہر سماجیات اپنے آپ کو کسی ایک سماجی عمل یا صورت حال میں شریک پاتا ہے اور اس شرکت کے سبب جو علم حاصل ہوتا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس شرکت میں اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ وہ افراد جو کچھ خاص حالات میں گھرے ہوئے ہیں ان کی تشریح کس طرح کرتے ہیں۔ دوسروں کے تجربے کو قریب سے سمجھنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع حاصل نہیں ہوتا۔

ہر سماجی تحقیق خواہ اس کا تعلق کسی بھی فکری روایت سے ہو اس کا مفروضہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جن چیزوں کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے اس میں ایک ترتیب یا ڈیزائن پایا جاتا ہے مگر ہر مشاہدہ کو کسی تھیوری کی مدد سے سمجھا جاتا ہے۔ علمی سوچ اور تجربے کے درمیان ایک مسلسل مکالمہ جاری رہتا ہے۔ مشاہدہ تھیوری کا غلام نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ آزادانہ عمل ہے جس کے تحت محقق مشاہدے میں اپنے معنی بھی پہناتا ہے۔

اپنے سوال کے جواب میں ماہر سماجیات یا تو ان مشاہدات اور اعداد و شمار کا استعمال کرتا ہے جو کسی اور محقق نے جمع کیے اور یا اسی مواد کو وہ خود اپنے طور پر جمع کرتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماہر سماجیات جن حقائق کی روشنی میں اپنی تھیوری کو پروان چڑھاتا ہے ان کو دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ تحقیقی معلومات جسے کسی دوسرے ماہر سماجیات نے کسی اور مقصد کے لیے جمع کیا اور یا وہ دوسری تحقیقی معلومات جسے ماہر سماجیات براہ راست خود جمع کرے۔ معلومات کی پہلی قسم کو سیکنڈری Data کہتے ہیں اور دوسری قسم کو پرائمری Data کہتے ہیں۔ تحقیقی معلومات کے سیکنڈری ماخذ میں وہ تمام ریکارڈ اور رپورٹ آتے ہیں جنھیں حکومت کے افسران نے جمع کیا ہو لیکن اسی زمرہ میں وہ تمام روداویں اور بیانات بھی شامل ہیں جن کو مختلف افراد نے اپنے طور پر قلم بند کیا ہو۔

تحقیقی مواد کی پرائمری شکل میں وہ تمام طریقے شامل ہیں جن

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی مدد سے ماہر سماجیات اپنے مشاہدات اور تاثرات خود جمع کرتا ہے اس میں نہ صرف دور سے مشاہدہ کیا جاتا ہے بلکہ شرکت کی معرفت بھی مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جب ماہر سماجیات کسی بھی سماجی تحقیق کے ذریعے سے دیے ہوئے مسئلے پر معلومات جمع کرتا ہے تو اس کے سامنے دو متضاد تقاضے اس کے محدود وقت کو دو الگ الگ سمتوں میں کھینچتے ہیں۔ سماجی تحقیق کی ایک ضرورت تو یہ ہوتی ہے کہ بہت سی مثالوں کے ذریعے سماج کے تحقیق طلب پہلو کے مختلف شکلوں کا جائزہ لیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ہر ایک کیس (Case) کا اتنا تفصیلی جائزہ ضرور ہونا چاہیے جس کی بنیاد پر سماجیات کی تھیوری اور علم کی بنیاد بن سکے۔ سماجی تحقیق کی مختلف تکنیک میں دو پہلو متضاد ثابت ہوتے ہیں۔ کتنے لوگوں سے معلومات فراہم کی اور ایک ہی آدمی سے کتنے انہماک اور گہرائی سے معلومات جمع کی۔ ظاہر سی بات ہے کہ اگر بہت سے لوگوں سے معلومات حاصل کی گئی ہے تو یہ ماہر سماجیات کا انہماک ہر ایک فرد پر بہت کم ہو جائے گا لیکن اگر چند لوگوں پر ایک لمبے عرصے تک تحقیق کی جائے تو ماہر سماجیات کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ کافی گہرائی سے معلومات کی چھان بین کر سکتا ہے۔ اس پس منظر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سوشل سروے اور مشاہدہ برائے شرکت دو الگ الگ تحقیقی طریقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سوشل سروے میں ڈھیر سارے لوگوں سے معلومات جمع کی جاتی ہے مگر ماہر سماجیات کا انہماک اور گہرائی فی فرد بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مشاہدہ برائے شرکت (Participant Observation) میں کم لوگوں سے زیادہ انہماک کے ساتھ ایک لمبے عرصے تک معلومات جمع کی جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں ماہر سماجیات کی دسترس بہت چھوٹے علاقے تک محدود رہتی ہے۔

عام طور سے ماہر سماجیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سماجی تحقیق سب سے اعلیٰ درجہ کو اس وقت پہنچتی ہے جب اس کی بنیاد ایک تکنیک پر نہیں بلکہ متعدد طریقوں پر ہوتی ہے۔ کوئی بھی تحقیق یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس کا طریقہ سب سے اچھا ہے۔ کسی بھی ایک سوال یا مسئلے کا حل کئی طریقوں سے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ہر طریقے کے اپنے دعوے ہیں، اپنی مضبوطی ہے اور اپنے حدود ہیں۔ یہ بھی بات واضح ہے کہ کوئی ایک طریقہ سماجی حقیقت کے تمام پہلوؤں پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ بجائے اس کے کہ ایک طریقے کو دوسرے طریقے کی ضد میں دیکھا جائے، ماہر سماجیات کا کہنا ہے کہ سماجی حقیقت کو بہتر طریقے سے سمجھنے کا ذریعہ یہ ہوگا کہ متضاد طریقوں کو ایک ہی سوال کے حل کرنے میں استعمال کیا جائے۔ اس سوچ کو مثلثی (Triangulation) پیائش کہا جاتا ہے۔ سماجی تحقیق میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ تحقیق کو ایک پیچیدہ عمل کے طور پر لیا جائے نہ کہ نپے تلے اقدامات کو قسطوں میں بانٹ کر صاف ستھرے انداز میں تجزیے کے حوالے کیا جائے۔ تحقیق میں ماہر سماجیات مختلف فیصلے کرتا ہے اور کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ فیصلے مکمل اور آخری ہیں۔

سماجی ترقی (Social Development): سماجی ترقی سماجی فلاح اور بہبود سے کچھ مختلف اصطلاح ہے۔ سیاسی مدبرین سے لے کر ماہر سماجیات مذہبی رہنما اور سماج کاری کے کارکنوں تک سب ہی اس کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس اصطلاح کا اصل مفہوم سماج کاری کے پس منظر میں ہی اُجاگر ہوتا ہے۔ سماجی ترقی کا تصور کسی سماج میں پھیلے ہوئے سیاسی اور معاشرتی آدرشوں پر منحصر ہے۔ اگر سماج روحانی اقدار کو سرفہرست رکھتا ہے تو اس سماج میں معاشی ترقی کو سماجی ترقی کا متبادل نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری طرف اگر سماج میں مادیت پھیل رہی ہے تو صرف معاشی ترقی کو سماجی ترقی سمجھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر سماج میں ہر گروہ کی ترقی بہتری اور پرسکون زندگی سماجی ترقی کا ایک انداز سمجھا جا سکتا ہے۔ ترقی، خوشحالی اور امن و سکون، یہ تین نشانیاں ہی کسی سماج میں ترقیاتی عمل مناسب رفتار سے چلنے کی ضامن ہیں۔ دوسرے الفاظ میں امن، معاشی خوشحالی، ماحولیاتی تحفظ، انصاف اور جمہوری قدروں پر عمل سماجی ترقی کے پیمانے ہیں۔

سماجی ترقی کی کئی شکلیں ہیں مثلاً :

سماجی ترقی بطور معاشی ترقی : سماج میں کل پیداوار اور انفرادی آمدنی میں اضافہ معاشی ترقی کی علامت ہے۔ غریب ممالک میں ان کو سماجی ترقی کی علامتیں بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

سماجی ترقی بطور منصفانہ تقسیم : سماج میں آمدنی، وسائل اور مواقع کی منصفانہ طور پر تقسیم ہونی چاہیے۔ کسی فرد یا گروہ کی ان پر مکمل اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بھی سماجی ترقی کی علامت ہے۔

سماجی ترقی بطور بہتر معیار زندگی : یونی سیف، ائی ایل او، اور ڈبلو ایچ او، مناسب صارفیت، روزگار اور معالجاتی سہولتوں کو بہتر معیار زندگی میں شامل کرتے ہیں۔ بہتر معیار زندگی میں لمبی عمر، شرح

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اموات و پیدائش میں کمی اور خواندگی وغیرہ شامل ہیں۔

سماجی ترقی بطور استحصال اور انحصار سے آزادی :

سماج کے دبے کچلے لوگوں میں اونچا اٹھنے کی لگن پیدا کردینا ہی سماجی ترقی ہے۔

سماج کاری کے طالب علموں کو سماجی ترقی کی مندرجہ ذیل خصوصیتوں کا علم ہونا چاہیے۔

(1) سماجی ترقی ایک پروگرام بھی ہے اور ایک تحریک بھی جس کے ذریعہ کسی بڑے سماجی مسئلے یا معاملے کو حل کیا جاتا ہے۔

(2) سماجی ترقی کے ذریعہ فوری راحت کا بندوبست نہیں ہوسکتا۔ اس کے ذریعہ "یہاں اور ابھی" خدمات حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ یہ عموماً طویل المدتی منصوبوں کو جنم دیتی ہے۔

(3) یہ چونکہ مسائل کی جڑوں پر حملہ کرتی ہے اس لیے یہ دھیرے دھیرے تبدیلیاں لاتی ہیں۔

(4) بڑے گروہ کی ضرورتیں یا سارے سماج کے لیے اشیا اور سہولتوں کا مہیا ہونا سماجی ترقی کا مقصد ہوتا ہے۔

(5) آبادی کے ایک بڑے حصے کو ترقیاتی منصوبوں میں حصہ دار بنانا پڑتا ہے۔

(6) سماجی عمل جیسے طریقۂ کار کا اس مدد کے طریقہ میں استعمال ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ٹکراؤ کی نوبت آتی ہے۔

غریبی گھٹانے کے پروگرام ان میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی مسئلہ پر لوگوں کی رائے ہموار کرنا، ایک بڑی جماعت کا تعاون حاصل کرنا، استحصالی قوتوں کے خلاف بغاوت کرنا اور معیار زندگی بلند کرنا عموماً ان کے پروگرام میں شامل ہوتا ہے۔

کسی سماج میں بہتر معیار زندگی، زچہ اور بچہ کی دیکھ بھال، تعلیم، مناسب غذا، دوا علاج، نوزائیدہ بچوں کی کم سے کم اموات وغیرہ سماجی ترقی کی علامتیں ہیں۔ اس کے علاوہ بجٹ کا کچھ فیصد فلاحی کاموں میں خرچ کرنا بھی ترقی کی ایک نشانی ہے۔ حقوق نسواں اور حقوق بچگاں کا تحفظ، انسانی حقوق کے اعلانیہ پر عمل آزادی امن، خوش حالی، روزگار اور ہر فرد کا سماج میں مقام و مرتبہ سماجی ترقی کی علامتیں ہیں۔

ہندستانی میں ترقیاتی سماج کاری (Developmental Social Work) ایک نظریہ ہی نہیں سماج کاری کے پیشے اور علم کا جزو بن چکا ہے۔ اس کو یہ مقام دلانے کا سہرا پروفیسر پی.ڈی. کلکرنی، پروفیسر ناناوتی اور پروفیسر شنکر پاٹھک کے سر ہے۔ کافی مخالفت کے بعد سماجی ترقی کو سماج کاری کی تعلیم کا ایک حصہ بنالیا گیا ہے۔ سماجی ترقی کو سماجی ارتقا نہیں سمجھنا چاہیے۔ سماجی ارتقا (Social Evolution) انسانی نسل و معاشرے کی حیاتیاتی (Biological) نقطہ نظر سے تبدیلی کا نام ہے جبکہ سماجی ترقی معاشرے کی منصوبہ بند مثبت تبدیلی کا نام ہے۔

سماجی تصادم (Social Conflict): سماجی تصادم سماجی بین عمل کا ایک اہم طریق ہے۔ سماجی تصادم سے مراد اقدار سماجی رتبے اقتدار یا محدود وسائل کے حصول کے لیے اختیار کیا جانے والا طرز عمل یا طریقہ کار ہے جس کے نتیجہ کے طور پر دو افراد یا گروہوں کے مابین ان مقاصد کے حصول کے لیے ایسا ٹکراؤ واقع ہو جو فریق ثانی کو یا تو بے عمل کردے یا اسے نقصان پہنچائے۔ اور یا پھر اسے اپنی راہ سے ہٹا دے۔ سماجی تصادم افراد کے مابین یا افراد اور گروہوں کے مابین واقع ہوسکتا ہے۔ تصادم بین گروہی بھی ہوسکتا ہے اور درون گروہی بھی۔ بہرصورت سماجی تصادم سماجی عمل کے ہر دور میں ایک لازمی جزو رہا ہے۔ اسی وجہ سے اسے سماجی بین عمل کا ایک اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی میں سماجیات دانوں نے اس موضوع پر کافی لکھا ہے۔ ہیگل، مارکس، ڈارون، اسپنسر، رائزن، ہوفر، درکھائم اور سمز نے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ماسکا پریٹو ٹونیز سمل اور ویبر نے بھی سماجی تصادم پر بحثیں کی ہیں۔ سمل کہتا ہے کہ سماجی تصادم ایسا سماجی برتاؤ ہے جس میں اختلاف اور ٹکراؤ کی بناء پر افراد یا گروہوں کے عمل میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ ہیگل کی جدلیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مارکس نے معاشی طاقتوں کو تبدیلی کا باعث قرار دیا ہے۔ البتہ مارکس نے ہیگل کی عینیت کے نظریے سے انحراف کرتے ہوئے مادی اسباب کو تبدیلی کا سب سے اہم محرک قرار دیا ہے۔ نیز مارکس کی نظر میں تمام انسانی تمدن کی تاریخ طبقاتی تصادم سے عبارت ہے۔ (دیکھیے مارکسزم)۔ ہر سماجی تصادم مضرت رساں نہیں ہوتا۔ دراصل تصادم حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اور بسا اوقات تصادم کی تنظیم سماجی مقصد براری کے لیے نہ صرف مفید بلکہ لازمی ہوتی ہے۔ بعض سماجیات دانوں کا خیال ہے کہ تصادم کی چوکھٹ پار کیے بغیر ترقی کے میدان میں داخل ہونا مشکل ہے۔ آج کے دور کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

خاص خصوصیات میں نظریاتی تصادم کا وہی مقام ہے جو پہلے مذہبی اور عقائدی تصادم کی صورت میں نمایاں اہمیت رکھتا تھا۔ تمدنی تحریکوں میں بین افرادی اور بین گروہی تصادم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کسی سماج کی ارتقاء کے انحصار متصادم اور غیر متصادم عناصر کے توازن پر ہوتا ہے۔ ایک طرف سماجی تصادم سماجی تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اگر سماجی تصادم نہ ہو تو سماج جمود اور انحطاط کا شکار ہوجاتا ہے۔ سماجیات میں سماجی تصادم کا مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

سماجی توافق (Social Cohesiveness) : افراد کی توافق پسندی کسی گروہ میں ان کے آپسی اشتراک و انسلاک کا سبب ہوتی ہے اور دراصل اسی صفت کی بناء پر انسان ایک سماجی حیوان کہلاتا ہے۔ افراد کے مابین کسی نہ کسی حد تک موافقت تائید یا تقلید اور تعاون کا جذبہ اور محرک پایا جاتا ہے۔ اور یہی خصوصیت لوگوں کو مخصوص سماجی رشتوں میں باندھتی ہے۔ دراصل حیاتی اور نباتی عضویوں میں بھی آپسی امتزاج کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت سماجی توافق پسندی کی خصوصیت سے مختلف ہوتی ہے۔ سماج کے افراد مخصوص اقدار کے زیراثر بین عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ توافق سے مراد کسی فرد کا وہ سماجی عمل یا برتاؤ ہے جو کسی گروہی قدر کے زیراثر یا کنٹرول میں رہتاہے۔ ظاہر ہے کہ توافق پسندی اور عدم توافق پسندی دونوں کے رجحانات افراد میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن کسی سماج کی زیادہ سے زیادہ شیرازہ بندی کا انحصار باقاعدہ اور منظم توافق پسندی کے رجحانات، میلانات اور ان کے اظہار پر ہوتاہے۔ توافق پسندی کے موضوع پر سماجی فلسفیوں نے راست یا بالواسطہ طور سے ہر زمانہ میں بحث کی ہے۔ لیکن اس پر سب سے پہلے باقاعدہ اور سائنسی تحقیق 1935 میں مظفر شریف نے کی۔ انھوں نے توافق پسندی کے رجحانات کا لیبوریٹری میں سائنٹفک مطالعہ کیا۔ اس کے بعد سے سماجیات داں مسلسل اس سماجی برتاؤ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات میں مصروف ہیں۔ مظفر شریف نے (1) فرد، (2) سماجی بین عمل، (3)گروہی عمل اور (4) ردعمل کا غائر مطالعہ اور تجزیہ کیا۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ کس طرح افراد مختلف حالات میں ایک دوسرے سے موافقت پر برضا و رغبت یا بہ مجبوری مائل ہوتے ہیں۔ اسی موضوع پر سالومن ایش (Soloman Asch) نے 1952 اور 1956 میں مزید تحقیقات کیں۔ ایش نے اپنی تحقیقات میں مظفر شریف کی اسکیم میں اہم طریقیاتی اضافے کیے۔ اور اسے سائنٹفک اور جامع طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ کسی بھی سماج میں افراد ذاتی مفادات گروہی مفادات اور سماجی نظریات عقائد اور یا آئیڈیالوجی کی بناء پر توافق پسندی یا عدم توافق پسندی کے فیصلے کرتے ہیں۔ لیکن غیر جمہوری یا آمرانہ اور اقتداری سماج میں بسا اوقات انفرادی فیصلوں کے برعکس اجتماعی اور نظریاتی فیصلوں کی بناء پر افراد توافق پسندی پر مجبور ہوتے ہیں۔ سماجی توافق پسندی کے بے شمار محرک ہوتے ہیں جن میں ذاتی خانگی اور حکومتی محرکات کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ کسی سماج کے طرز عمل و رجحانات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے سماجی توافق پسندی کے رجحانات اور اس کے طریق کا سائنٹفک مطالعہ ضروری ہے۔ اس موضوع پر یوں تو گذشتہ چالیس پینتالیس سال میں بہت کام ہوا ہے لیکن ابھی اس کے نتائج ابتدائی منازل میں ہیں اور مختلف سماجوں میں اس موضوع پر ریسرچ کی ضرورت ہے تاکہ توافق پسندی کے محرکات اور اس کے میکانزم کا زیادہ واضح اور جامع تصور پیش کیا جاسکے۔

سماجی حقوق (Social Rights) : اٹھارہویں صدی کی شخصی آزادیوں اور انیسویں صدی کی شہری و سیاسی آزادیوں کے مقابل بیسویں صدی میں چند نئی قسم کی آزادیوں اور حقوق کا مطالبہ کیا گیا۔ انھیں سماجی حقوق اور آزادیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ ان حقوق کا مطالبہ بے لگام سرمایہ داری اور غیر مداخلت کار مملکت کی پیدا کردہ برائیوں کے نتیجہ میں سامنے آیا۔ ان برائیوں کا علاج جمہوری اشتراکیت اور فلاحی مملکت نے فراہم کیا۔ فلاحی مملکت سے بڑھ کر منصوبہ ساز اشتراکی مملکت، سماجی انصاف کو پورے طور پر نافذ کرنے کی دعوے دار ہوئی ہے۔

ان نئی سماجی و اقتصادی آزادیوں اور حقوق کا تعلق حکومت کے اقتدار پر پابندی عائد کرنے سے نہیں بلکہ اجتماعی اقدام اور حکومت کے دائرہ کار کی توسیع سے ہے۔ ان میں سماجی تحفظ، روزگار، آرام و فرصت، تعلیم، معقول معیار زندگی اور تہذیبی زندگی میں شرکت کے حقوق شامل ہیں۔ ان میں بعض حقوق مثلاً تعلیم، اٹھارہویں صدی میں فطری حقوق میں شامل کیے گئے تھے۔ لیکن ان سماجی و اقتصادی حقوق کی اصل اہمیت بیسویں صدی ہی میں ثابت ہوئی ہے۔ ان حقوق کا مقصد فرد کو حکومت یا دوسرے ارباب اقتدار سے محفوظ کرنا نہیں بلکہ ارباب اقتدار سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فرد کی شخصی و سیاسی آزادی کی چند دوسری آزادیوں کی ضمانت دے کر تکمیل کریں جنھیں فرائڈ رک کی زبان میں آفرینش کی آزادیاں کہا جاسکتا ہے۔ یہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وہ حقوق ہیں جو انسان کو خوف و ہراس، بیماری و آزاری اور افلاس و نکبت سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ حقوق انسانی شخصیت کی مکمل ترقی کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں اور مجبوریوں سے نجات دلاتے ہیں۔ یہ حقوق اور آزادیاں اگرچہ بظاہر پرانی آزادیوں سے یکسر مختلف ہیں لیکن بہرحال انسان کے لیے بہ حیثیت انسان کے ناگزیر ہیں۔ ان کے بغیر آزادی و مساوات محض مجرد اصول رہیں گے۔ اس سلسلہ میں ریاستہائے متحدہ امریکا کی وفاقی سپریم کورٹ کا رول لائق ستائش رہا ہے جس نے شہری حقوق کو اجتماعی بہبود کے تابع تسلیم کرکے انتظامیہ کی ان کارروائیوں کی تائید کی ہے جن کا مقصد فلاحی مملکت کا قیام ہے۔ بعض امریکی ریاستوں نے اپنے دساتیر میں فراخ دلی سے ان سماجی حقوق کی ضمانت دی ہے۔ سوویت یونین کا دستور غالباً پہلا دستور تھا جس نے روزگار، تعلیم، طبی امداد اور ضعیفی میں سہارے کے حقوق کی ضمانت دی۔ برطانیہ میں سماجی تحفظ کے متواتر قوانین اور بنیادی صنعتوں اور عوامی افادہ کی خدمات کو قومی ملکیت میں لینا اسی مقصد کے تحت تھا۔ لیکن نسبتاً کم ترقی یافتہ ممالک ان حقوق کی ضمانت دینے سے قاصر ہیں حالانکہ وہ ان کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ آئرلینڈ اور ہندستان کے دساتیر میں چند رہ نما اصول وضع کیے گئے ہیں جنھیں عدلیہ کے ذریعہ نافذ نہیں کرایا جاسکتا لیکن جو بہرحال ملکی پالیسی اور انتظام میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندستان میں سماجی انصاف کے اصول کو مملکتی پالیسی کا کلیدی رہ نما اصول قرار دیا گیا ہے۔

سماجی رجحانات (Social Trends) : سماجی رجحانات نفسیات اور سماجیات کا اہم موضوع ہے۔ جس پر بے شمار جدید اور قدیم مفکرین نے لکھا ہے۔ لیکن موجودہ صدی کے دوسرے ربع سے اس تصور پر بہت زیادہ تحقیقاتی کام ہوئے ہیں۔ سائنسی اصطلاح میں رجحان سے مراد کسی خاص موضوع یا موقع کے تعلق سے ایسا نقطہ نظر ہے جس کی بناء پر فرد یا گروہ اپنے ترجیحی برتاؤ کا فیصلہ کرتے ہیں۔ رجحان کی سب سے اہم سماجی خصوصیت اس کی استقراری کیفیت ہے۔ یعنی رجحانات میں ایک درجہ استقلال کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اور یہ کیفیت مخصوص عقائد یا نظریات کی اساس پر قائم ہوتی ہے۔ لوگ کسی خاص مسئلہ یا موقف کے بارے میں ایک نقطہ نظر قائم کر لیتے ہیں۔ اور اسی نقطہ نظر کی بنیاد پر ایک طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی نظریہ، آئیڈیالوجی، مذہب، تمدن یا سیاسی مسلک کے بارے میں لوگ رجحانات قائم کرلیتے ہیں اور یہی رجحانات ان کے انفرادی یا اجتماعی برتاؤ کا محرک ثابت ہوتے ہیں۔ سماجی رجحانات کا راست اور گہرا اثر سماجی تبدیلی پر پڑتا ہے۔ خواہ سماج میں چھوٹے گروہ ہوں یا بڑے ہر ایک کے پیش نظر کچھ نہ کچھ رجحانات ہوتے ہیں جن کی روشنی میں وہ تبدیلیوں کا خاکہ تیار کرتے ہیں۔ رجحانات کی جڑیں فکر اور تمدن میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور ان پر سماجی حالات نیز تغیرات کا بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ جہاں رجحانات میں ایک قسم کی استقامت پائی جاتی ہے۔ وہیں ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ تبدیلیوں کا عنصر بھی کارفرما رہتا ہے۔ اور بالآخر ان دونوں کے توازن سے حقیقی سماجی برتاؤ کی راہ متعین ہوتی ہے۔ کسی سماج میں تبدیلی اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ لوگوں کے رجحانات میں بھی تغیر اور لچک نہ پیدا ہو اس لیے بالخصوص قدیم یا ترقی پذیر سماجوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس بات کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ ایسے سماج کے افراد سے ذہنی رجحانات میں بتدریج تبدیلی لائی جائے کیونکہ ہر تبدیلی کے لیے ذہنی تبدیلی لازمی ہوتی ہے۔ جدید سماجیات نفسیات اور برتاوی علوم میں رجحانات پر بہت زیادہ ریسرچ کی جارہی ہے۔ چنانچہ اسمتھ برونروہائٹ کاٹز اور اسٹاٹ لینڈ وغیرہ نے 1950 کے آس پاس رجحانات کے موضوعات پر انتہائی مفید تحقیقات پیش کی ہیں۔

سماجی فلاح و بہبود : سماجی فلاح و بہبود کی کوششیں سماج میں اتنی ہی قدیم ہیں۔ جتنی انسانی تہذیب و تمدن۔ ایک طرف انسانی فطرت، لالچ ظلم اور خودغرضی کے عناصر اپنے اندر سموئے رہتی ہے تو دوسری طرف فیاضی رحم اور بے غرضی کا جزو بھی اس میں بھرپور انداز میں موجود رہتا ہے۔ اس لیے زمانے قدیم سے ہی انسان دین دکھیوں کی مدد کرتا آیا ہے۔ جیسے ہی انسان کی اپنی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں وہ دوسروں کی مصیبتوں پر دھیان دیتا ہے اور اکثر ان کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوشش انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ہو سکتی ہیں۔

سماجی فلاح و بہبود کو اکثر سماجی خدمت، سماجی اصلاح، سماج کاری اور سماجی تحفظ سے خلط ملط کیا جاتا ہے۔ یہ مغالطہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کیونکہ ان سب عوامل کا محرک ایک ہی ہے یعنی بنی نوع انسان کی فلاح اور بہتری۔ سماجی فلاح و بہبود کو سمجھنے کے لیے ان سب کے مفہوم سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ (1) سماجی خدمت (Social Service) کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کسی بھی فلاحی ریاست میں ریاستی ذمے داری کے طور پر ایسی خدمات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

انجام دی جاتی ہیں جو افراد کا حق اور ریاست کا فرض ہیں وہ سماجی خدمت کہلاتی ہیں۔ مثلاً مفت تعلیم اور صحت کی دیکھ بھال۔ یہ خدمات ہر خاص و عام کے لیے ہوتی ہے۔ (2) سماجی اصلاح معاشرتی خامیوں کے خلاف جہاد کے نام ہے جو اکثر افراد شروع کرتے ہیں۔ حکومت بعد میں مثبت رویہ اختیار کرتی ہے۔ (3) سماج کاری (Social Work) کے سلسلے میں تفصیل دوسرے باب میں موجود ہے۔ (4) سماجی تحفظ (Social Security) موت بڑھاپے بیماری اور بے روزگاری کے خلاف حکومت اور افراد کی طرف سے مہیا کیا جانے والا ایک حفاظتی غلاف ہے۔ بڑھاپے کی پنشن وغیرہ اسی کی ایک شکل ہے۔ ان سب کے برعکس سماجی فلاح و بہبود سماج کے خاص قسم کی ضرورتوں کے شکار افراد اور گروہوں کے لیے کیا جانے والا پروگرام ہے۔ اس میں حکومت، افراد، رضاکارانہ انجمنوں (N.G.Os) بین الاقوامی اداروں اور پالیسیوں کا کردار ہوتا ہے۔ یہ گرے ہوئے طبقوں، حاشیہ پر رہنے والے افراد (Marginalized Groups)، معذوروں، بچوں، بے آسرا لوگوں اور مفلسوں کے لیے کیے جانے والی خدمات کا نام ہے۔ اس کے علاوہ ان میں بے زمین مزدوروں، ناخواندہ لوگوں اور اکثر عورتوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر طبقے کے لیے مخصوص ادارے، قوانین پروگرام، اور کام کرنے والے افراد اور گروپ شامل ہیں۔

لارڈ ولیم بیورج نے ضرورت، بیماری، جہالت، بے مکانی، اور معذوری کو ان حالتوں میں شمار کیا ہے جب سماج کو اپنا فرض سمجھ کر ان کے شکار افراد گروہ اور طبقے کی مدد کرنا چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سب پر بے حد اخراجات ہوتے ہیں لیکن متمدن سماج کا نظریہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں، جنگی طیاروں اور خلانوردی کے مقابلے ان پر خرچ کرنا زیادہ ضروری بھی ہے اور منصفانہ بھی۔

ہندستان کی تاریخ گواہ ہے کہ سماج کی فلاح و بہبود نہ صرف یہاں پنپنے والے مذاہب کا، بلکہ معاشرتی اور سیاسی نظام کا بھی حصہ رہی ہے۔ کوٹلیہ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "ارتھ شاستر" میں سماجی فلاح کو راجا کا فرض بتایا ہے۔ اشوک نے اپنے زمانے میں انفرادی خیرات کے منتظم اور جیل خانوں کے نگراں مقرر کردیے تھے تاکہ خیرات غلط ہاتھوں میں نہ جائے اور قیدخانوں میں ظلم نہ ڈھائے جائیں۔ ہرش وردھن شیرشاہ سوری اور اکبر نے بھی اس سلسلے میں بے شمار اقدامات کیے لیکن نوآبادیاتی دور میں یہ سب ختم ہوگیا اور غریبی بے روزگاری اور احتیاج نے ہر طرف اپنی جڑیں جمالیں۔ اسی دوران مشنریوں نے کافی خدمات انجام دیں جو وہ لوگ آج بھی کررہے ہیں۔ یہاں یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ابتدا میں برطانوی حکمراں مشنریوں کے غلبے کے خلاف تھے۔ کیونکہ تاریک براعظم میں مشنریوں کی کوششوں کی وجہ سے ان کو اکثر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مشنری اس لیے کلکتہ میں داخل نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ وہ برطانیہ کے زیرتسلط تھا۔ ہندستان کی باقاعدہ اور منظم مشنری سری رام پور میں قائم ہوئی کیونکہ ان کو یہیں تک آنے کی اجازت تھی۔ آزادی کے بعد دستور ہند میں سماجی فلاح و بہبود کو گاندھی جی کے نظریہ کی روشنی میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد تمام پنج سالہ منصوبوں میں بھی اس کی اہمیت قائم رہی۔ آج کل کے تہذیب یافتہ سماج میں مندرجہ ذیل سمتوں میں سماجی فلاح کا کام ہوتا ہے۔ خاندانی فلاح و بہبود جسمانی اور دماغی صحت اور فلاح و بہبود، فلاح نسواں، فلاح اطفال، فلاح بے مکان، فلاح مزدور، فلاح اقلیت اور فلاح و آبادکاریٔ معذور۔ منشیات کے عادی افراد کا معالجہ اور آبادکاری، درماندہ طبقوں کی بہبود۔ درج شدہ ذاتوں اور قبائلوں کی فلاح و بہبود بزرگوں کی فلاح و بہبود وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حاشیہ پر رہنے والے لوگ مثلاً بال مزدور، خانہ بدوش مزدور، غریبی کی سطح سے نیچے رہنے والے افراد وغیرہ کے لیے چلنے والے پروگرام بھی اس فہرست میں آتے ہیں۔

ہندستان میں سماجی فلاح اور بہبود کاکام سماج اور حکومت دونوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہندستان ایک واحد ملک ہے جس میں رضاکارانہ تنظیموں کو حکومت کی طرف سے باقاعدہ گرانٹ ملتی ہے اور ملک گیر پیمانے پر ان کی دیکھ ریکھ کے لیے 1953 میں سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کی تشکیل کی گئی ہے جس کی شاخیں ہر ریاست اور صوبے میں ہیں۔ اس کے علاوہ ہر صوبے اور مرکز میں بھی سماجی فلاح و بہبود کی الگ الگ وزارتیں قائم ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک میں ہندستان کا سماجی فلاح و بہبودی کا نظام اور پالیسیاں مشعل راہ ہیں۔ تقریباً ہر میدان میں حکومت اور رضاکارانہ تنظیموں نے کام کیا ہے۔ دونوں نے مل جل کر ایک تانا بانا سا بن لیا ہے لیکن ضروریات لاانتہا ہیں اور ذرائع محدود۔ مثلاً تقریباً 37 فیصد آبادی 14 سال سے کم ہے۔ جس کے لیے سماجی بہبود کے بے شمار کام ہونے چاہئیں۔ 22 فیصد یعنی 22 کروڑ، درج شدہ ذاتوں اور پس ماندہ قبیلے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

والے ہیں۔ 6.7 فی صد (کروڑ) بزرگ افراد ہیں اس کے علاوہ 47 فیصد (کروڑ) کے لگ بھگ خواتین ہیں۔ جو کئی معاملات میں سماجی بہبودی کے پروگرام کی مستحق ہیں۔

اس طرح ہمارے ملک میں ضرورتیں لامحدود ہیں اور ذرائع کم ہیں۔ اسی لیے ہماری پالیسیاں صرف کچھ حد تک ہی عمل میں لائی جاتی رہی ہیں۔ آئین میں کیے گئے عہد کے باوجود ہمیں پورا بہبودی حفاظتی غلاف میسر نہیں ہو سکا ہے۔

سماجی گروہ (Social Group) : جدید ساجیاتی علوم میں گروہی مطالعہ کو مختصراً گروہ ریسرچ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ گروہ سے مراد افراد کی وہ تعداد یا وہ اراکین ہیں جن میں سے ہر ایک گروہی میٹنگ میں ایک دوسرے سے بین عمل میں مصروف رہتا ہے یا اس کی صلاحیت رکھتا ہے یا کم از کم اس کے وجود اور اثر کا معترف ہوتا ہے۔ اور اس اعتبار سے چھوٹے گروہ کی اصطلاح کو بڑے گروہوں کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور تمام ساجیات دانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان گروہوں میں زندگی گزارتا ہے۔ مختلف ماہرین اور مفکرین نے سماجی گروہوں کی جدا جدا درجہ بندی اور اسکی تقسیمیں پیش کی ہیں۔ مثلاً سنڈرسن نے سماجی گروہوں کو درون گروہ اور بیرون گروہ کی قسموں میں بانٹا ہے۔ فرڈیننڈ ٹونیز نے گروہوں کو کیمونٹی اور انجمنوں میں تقسیم کیا ہے۔ سماجی گروہ کے تعلق سے کولے نے ابتدائی گروہ کا نظریہ پیش کیا۔ ابتدائی گروہ سے مراد وہ گروہ ہے جس میں افراد کے مابین ہم شعوری کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ راست تعلقات کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ ابتدائی گروہ کے تصور کے ساتھ ہی ثانوی گروہ کا تصور پیش ہوا جس میں وہ تمام وسیع گروہ شامل ہیں جن میں افراد کے مابین راست تعلقات جذباتی لگاؤ یا ذہنی تعلق کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ اس صدی کی ابتداء میں ولیم جیمس چارلس کولے اور جارج میڈ نے ابتدائی گروہ کے تصور پر زیادہ زور دیا لیکن 1930 کے بعد سے مختصر گروہ سائنٹفک مطالعہ کا مرکزی نقطہ بن گیا ہے چنانچہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مختصر گروہ پر سب سے پہلے زیادہ توجہ دی گئی۔ جدید ساجیات میں ساجوں اور تمدنوں کی تفہیم اور تشریح کے لیے مختصر گروہوں کے مطالعہ اور تجزیہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کیونکہ یہی گروہ درحقیقت وسیع تر سماج کے رجحانات اور بدلتے ہوئے تشکیل پذیر تعلقات پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

سماج کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جب تک سماجی گروہ کو سامنے نہ رکھا جائے۔ سماجی گروہ کو موٹے طور پر تین قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ مثلاً :

(1) بنیادی گروہ
(2) ثانوی گروہ اور
(3) پیشہ ورانہ گروہ

(1) بنیادی گروہ : ان میں وہ گروہ شامل ہیں جو سماج میں فطری طور پر موجود ہیں۔ مثلاً خاندان، دوستوں کا قریبی گروپ، برادری یا پھر پاس پڑوس۔ ہر فرد چاہے یا نہ چاہے ان کا ممبر ہوتا ہے اور اکثر جذباتی طور پر ان سے جڑا ہوتا ہے۔ اور طویل عرصے تک ان کے زیر اثر رہتا ہے۔

(2) ثانوی گروہ : یہ وہ گروہ ہوتے ہیں جو سماج میں اپنے آپ نہیں بنتے بلکہ بنائے جاتے ہیں۔ ان میں کارخانوں کے مزدور، اسکول کے بچے وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا ممبر ہونا اکثر و بیشتر فرد کی اپنی خواہش پر منحصر ہوتا ہے۔ ان سے رشتہ عام طور پر صرف سہولت کے لیے ہوتا ہے۔

(3) پیشہ ورانہ گروہ : یہ وہ گروہ ہوتے ہیں جو کسی کار خاص کے لیے یا علاج معالجے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ کسی ڈرامے کی ریہرسل کرنے کے لیے ملنے والے، کسی پل کو بنانے والے، دشمن پر چڑھائی کرنے والے گروہ اس قسم میں شامل ہیں۔ یہ کسی مہذب سماج کے لیے بے حد ضروری ہیں۔

مہذب سماج میں ہر فرد کئی گروہوں کا ممبر ہوتا ہے۔

سمرتی : سمرتی انتہائی قدیم رشیوں اور دانشوروں کے بتائے ہوئے اصولوں کا نام ہے۔

سنت: اسلامی فقہ و قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے اس کے لغوی معنی سیرت طریقہ نہج کے ہیں۔ قطع نظر اس کے وہ طریقہ محمود ہے یا مذموم لیکن فقہا کی اصطلاح میں سنت سے رسول اکرم ﷺ کے تمام اقوال و افعال اور دوسروں کے وہ اقوال و افعال مراد ہیں جو آپ کے سامنے کہے اور کیے گئے مگر آپ نے ان پر سکوت اختیار کیا اور ان کو قائم و برقرار

رکھا۔ گویا اصول فقہ میں سنت سے وہ تمام امور مراد ہیں جو رسول صلعم سے کتاب اللہ کے علاوہ منقول ہیں۔ بعض نے صحابہ کے اقوال و افعال کو بھی سنت میں شامل کرلیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اور خود احادیث میں بھی سنت کے اسلامی فقہ کے ماخذ ہونے کی تصریح موجود ہے۔ اس کی حیثیت کتاب اللہ کی تشریح و تفسیر اور تفصیل کی ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید کے اسلامی قانون کا یہ دوسرا ماخذ ہے۔

ظاہر ہے قرآن مجید کی تشریح و توضیح کرنے کا حق رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اور کسی کو نہ تھا اور نہ کسی کی تشریح و توضیح کی وہ حیثیت ہوسکتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تشریح و توضیح کی ہے بشرطیکہ وہ صحیح طریقہ پر آپ سے ماسور و منقول اور ثابت ہو۔

بعض لوگوں کے نزدیک سنت و حدیث کے الفاظ مترادف ہیں لیکن دراصل سنت کا لفظ زیادہ وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ دراصل اس سے مقصود حضور اکرم ﷺ کی سیرت و طریقہ کار آپ کا منہاج اور وہ نظم عقائد و اعمال ہے جس پر حضور ﷺ برابر کابند رہے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی جماعت بھی اس پر پوری طرح پابند رہی اور ان کے بعد امت من حیث الجماعت اسپر عمل پیرا رہی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا لفظ بدعت ہے جو دین کے اندر کسی ایسی بات کو ایجاد کرنے کا نام ہے جو حضور ﷺ سے منقول نہ ہو۔

شریعت کی اصطلاح میں جب لفظ عبادات میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے وہ نوافل مراد ہوتے ہیں جو رسول اللہ سے منقول ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

سنت غیر موکدہ: ایسے کام جن کو آنحضرت ﷺ نے عموماً کیا ہو لیکن ان کی مستقل پابندی نہ کی ہو بلکہ کبھی کبھی بلاعذر ترک بھی کر دیا ہو۔ اس کو کرنے والا ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور نہ کرنے والا عذاب کا مستحق نہیں ہوتا۔

سنت موکدہ: وہ کام جن کو رسول اللہ ﷺ اکثر کرتے رہے ہیں اور آپ نے دوسروں کو بھی ان کے کرنے کا حکم دیا ہو اس لیے ان کو ایک دو مرتبہ چھوڑنے سے سزا نہ ہوگی لیکن اگر کوئی اس کو مستقل چھوڑنے کی عادت بنالے تو وہ یہ بہت برا ہے اور اس پر عذاب کا بھی خطرہ ہے جیسے فجر کی سنتیں۔

سنڈیکالزم (Syndicalism): 1871 کے پیرس کیمون کے قیام اور اس کے بعد کے خون خرابے کے بعد فرانس کی ٹریڈیونین تحریک پھر سے منظم ہوئی تو سنڈیکالزم کی تحریک اس سے ابھری۔ اس کا خیال تھا کہ پارلیمان اور پارلیمانی سرگرمیوں میں وقت صرف کرنا محض وقت ضائع کرنا ہے اور سماجی تبدیلی کے لیے مزدوروں کو اپنی ٹریڈ یونینوں کے ذریعہ راست اقدام کرنا چاہیے۔ اس کے لیے عام ہڑتال منظم کرنی چاہیے جس کے بعد منظم مزدوروں کے ہاتھ میں اقتدار آجائے گا اور پھر یونینیں پیداوار کو منظم کریں گی۔

انگلستان اور دوسرے ملکوں کے بہت سارے دانش ور اس تحریک کی طرف کھنچ آئے اور اپنی تحریروں کے ذریعہ انھوں نے اس کے لیے نظری و فلسفیانہ بنیاد مہیا کی۔ ان میں سب سے مشہور جارج سوریل (George Sorel) تھا جس کی کتاب Reflection of Violence (1916) بہت مشہور ہوئی اور آج تک بہت سارے انقلابیوں کو گرماتی رہی۔ اگرچہ سوریل خود بعد میں انتہائی دائیں بازو کی تنظیم سے جاملا تھا۔

سنن ابن ماجہ: ابوعبداللہ بن یزید ماجہ (273ھ / 887ء) کی مشہور تصنیف اور صحاح کی چھٹی کتاب ہے بعض علما نے اس کے بجائے موطا امام مالک کو اور بعض نے امام داری (255ھ / 869ء) کی سنن کو صحاح ستہ میں محسوب کیا ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس کی حدیثوں کی تعداد چار ہزار ہے۔

گو صحاح ستہ میں اس کو آخری درجہ پر رکھا گیا ہے تاہم اس کی بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جن سے صحاح کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔ حسن ترتیب و تبویب اور عدم تکرار کے لحاظ سے بھی اس کو حدیث کی بہتر کتابوں میں خیال کیا جاتا ہے۔

امام ابن ماجہ سے ان کے جن تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے ان میں چار اشخاص زیادہ مشہور ہیں۔ (1) علی ابن ابراہیم ابوالحسن قطان (345ھ /956ء) (2) سلیمان بن یزید (3) ابو جعفر محمد بن عیسی (4) ابو بکر حامد البہری۔ اول الذکر کی روایت کو زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ جلال الدین سیوطی (911ھ / 1505ء) اور محمد بن عبدالہادی سندی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(1138ھ/ 1725ء) کی شرحیں زیادہ مشہور ہیں۔ مولانا وحید الزماں وقار نواز جنگ (1338ھ/ 1919ء) نے ایک مختصر اردو شرح کے علاوہ سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

سنن ابی داؤد: یہ امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی 275ھ/ 887ء) کی تصنیف اور حدیث کی امہات کتب ہے۔ حدیث کی جو چھ کتابیں صحت ووثوق کے لحاظ سے بے نظیر خیال کی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک صحیحین (بخاری و مسلم) کے بعد اس کا درجہ ہے۔ مصنف نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی تھیں مگر انتخاب کے بعد صرف چار ہزار آٹھ سو حدیثیں باقی رہ گئیں۔ اس سے پہلے حدیث کی جو کتابیں مرتب کی گئی تھیں ان میں سنن و احکام، تفسیر قصص و اخبار مواعظ و آداب، ہر قسم کی روایتیں شامل ہوتی تھیں۔ امام ابو داؤد کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے صرف سنن و احکام کی روایتوں کو نقل کیا ہے۔ اس لیے فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔

مصنف کا خود بیان ہے کہ انھوں نے مقدور بھر صحیح اور سند کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی حدیثیں نقل کی ہیں۔ مسند اور متصل حدیثوں کے نہ ملنے کی صورت میں مرسل روایتیں نقل کی ہیں اور جن حدیثوں کے متروک و ساقط ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے یا جو متروک الاحادیث اشخاص سے مروی ہیں۔ ان کو نقل نہیں کیا ہے اسی طرح منکر اور ضعیف الاسناد حدیثوں کو بھی نظرانداز کردیا ہے مگر صحیح روایتیں جب نہ مل سکیں تو ان کو ان کے ضعیف و نکارت کی تصریح کرنے کے بعد نقل کرلیا ہے۔ غریب اور شاذ کے بجائے مشہور اور معمول بہا احادیث جمع کرنے پر خاصی دھیان دیا ہے۔

امام ابو داؤد فرماتے تھے کہ سنن کی صرف چار حدیثیں دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ پہلی "انما الاعمال بالنیات" دوسری "من حسن اسلام المرتر که مالایعنیہ" تیسری لایکون المومن مومنا حتی یرضی لاخیہ مایرضاہ لنفسہ" اور چوتھی "الحلال بین والحرام بین و بینھما مشتبھات" امام ابوداؤد سے ان کے سات تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے لیکن چار تلامذہ کے نسخے مشہور و متداول ہیں۔

(1) ابو علی محمد بن احمد لولوی (2) ابو عیسیٰ اسحٰق بن موسیٰ الی (3) ابوبکر محمد بن بکر تمار المعروف بابن دآ (4) ابو سعید احمد بن محمد المعروف بابن الاعرابی۔

لولوی کا نسخہ بلاد مشرق میں اور ہندوستان میں اور ابن واسہ کا بلاد مغرب میں مروج ہے۔ سنن ابو داؤد کی سب سے مشہور شرح امام ابو سلیمان خطابی (388ھ/998ء) کی معالم السنن ہے۔ ہندوستانی علما میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی (متوفی 1329ھ/1911ء) نے ایک مطول شرح غایۃ المقصود کے نام سے اور دوسری مختصر عون المعبود کے نام سے لکھیں۔ یہ دونوں بہت مشہور اور مفید ہیں۔ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی (656ھ/ 1258ء) کا مختصر بھی متداول ہے۔

سنن نسائی: یہ امام عبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی (303ھ/915ء) کی مشہور اور عظیم الشان کتاب ہے۔ امام صاحب نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں۔ سنن کبریٰ و سنن صغریٰ، موخرالذکر دراصل اول الذکر کا انتخاب ہے۔ اس لیے اس کا نام المجتبی اور المجتنی بھی ہے اور یہی صحاح ستہ میں شامل ہے۔

عموماً سنن نسائی کو ابو داؤد اور ترمذی کی کتابوں کے بعد جگہ دی گئی ہے تاہم اس کا نام بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس لیے قریب قریب یہ بھی ان کے ہم پایہ ہے اور بعض حیثیتوں سے یہ سب میں منفرد ہے۔ بعض محدثین کا تو یہ خیال ہے کہ امام نسائی کے شرائط امام بخاری و مسلم سے بھی سخت ہیں۔ علاوہ ازیں وہ جرح و تعدیل کے ماہر تھے اس لیے احادیث کے علل و اسقام کا بیان ان کا خاص وصف سمجھا جاتا ہے۔ امام نسائی نے ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کرکے اس سے مختلف مسائل مستنبط کیے یں جو ان کے تفقہ کی دلیل ہے۔ حسن و تبویب کے لحاظ سے بھی اس کا پایہ بلند ہے۔ سنن کبریٰ کے راوی ابوبکر محمد بن معاویہ المعروف بابن الاحمر (358ھ/968ء) ہیں۔ علامہ سیوطی کی شرح (911ھ/1505ء) زہرالربی اور محمد بن عبدالہادی سندھی (1138ھ/1725ء) کا حاشیہ مشہور و متداول ہے۔

سنّی: اہل سنت والجماعت کو سنی بھی کہا جاتا ہے اس پر پہلے نوٹ تحریر کیا جاچکا ہے۔

سوانحی لغات (Biographical Dictionary):
قلیل المدتی حوالہ خدمات میں سہولت کے لیے مرتب حوالہ جاتی کتب میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سوانحی ماخذ ایک بہت زیادہ استعمال میں آنے والا وسیلہ معلومات ہے۔ سوانحی لغات تاریخ میں معروف شخصیتوں کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہیں جس میں ان کا مکمل نام خاندانی اور خانگی تفصیلات، تعلیم و پیشہ و ہنرمندی کارنامے تصانیف ملازمت وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ تاریخ ولادت اور تاریخ وفات وغیرہ درج ہوتی ہیں۔

سوانحی معلومات حاصل کرنے کے کئی ذرائع ہیں جن میں لغت، ڈائریکٹری، انسائیکلوپیڈیا، ادب کی دستی کتاب اور اخبارات کے صفحہ وفیات قابل ذکر ہیں۔ لیکن جس ماخذ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ سوانحی لغات ہیں۔ دوسرے ماخذ کے لیے سوانحی اندراج دوسرے معلوماتی اندراجات کا محض ایک حصہ ہوتا ہے جبکہ سوانحی لغات میں سوانحی خاکے ہی ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی ترتیب ناموں کے حروف کی مدد سے حروف تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ سوانحی لغات کے تین خاص مقاصد بتائے جاتے ہیں۔

کسی شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنا

کسی پیشہ یا ہنر میں موجود معروف اشخاص کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا

کسی فرد کے بارے میں مزید تفصیل کی جستجو کی تشفی

سوانحی لغات کی روایت عربی زبان میں بہت قدیم ہے۔ ابن خلکان کی وفیات الاعیان، البلاذری کی انساب الاشراف، نوراللہ شوستری کی مجالس المومنین وغیرہ ایسی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں معروف مصنفین، علما و صوفیا کی سوانح موجود ہیں۔ یورپی زبانوں میں یہ سلسلہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے اگرچہ عصری طرز پر لکھی گئی سوانحی لغت بیسویں صدی کے ابتدائی دور سے ملتی ہیں۔

سوانحی لغات کو اس کے اندراجات کے مطابق مختلف خانوں میں رکھا جاسکتا ہے۔

عالمی لغت: ابتدائے زمانہ سے عصر حاضر کے معروف افراد کے سوانحی خاکے: جملہ علوم و فنون کے افراد / مخصوص علم و فن کے افراد

عالمی لغت: عصر حاضر کے معروف افراد کے سوانحی خاکے: جملہ علوم و فنون کے افراد، مخصوص علم و فن کے افراد

قومی لغت: ابتدائے زمانہ سے عصر حاضر تک کے کسی ایک ملک کے معروف افراد کے سوانحی خاکے: جملہ علوم و فنون کے افراد، مخصوص علم و فن کے افراد

قومی لغت: کسی ملک کے عصر حاضر کے معروف افراد کے سوانحی خاکے: جملہ علوم و فنون کے افراد، محض علم و فن کے افراد

قومی سوانحی لغات میں انگلینڈ کی ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی (لندن 1900-1885) کو معیاری سوانحی لغت تسلیم کیا گیا ہے۔اس کا بنیادی سیٹ 21 جلدوں میں شائع ہوااس کے بعد سے ہر دس سال پر ایک تکمیلی جلد شائع ہوتی ہے۔ ابتدائی بنیادی سیٹ میں 29000 افراد کا سوانحی خاکہ دیا گیا تھا۔ ہندستان میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹوریکل اسٹڈیز کلکتہ کی جانب سے "ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی" چار جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس میں 1800 تا 1947 تک کے 1400 افراد کا سوانحی خاکہ موجود ہے۔ اب تک اس کی کئی ایک تکمیلی جلدیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے علاوہ عصری سوانحی لغات جو عموماً سالانہ وقفہ سے شائع ہوتی ہیں ہوازہو (Who's Who) کے نام سے معروف ہیں۔ اس قسم کی سوانحی لغات اب دنیا کے تقریباً تمام بڑے ملک شائع کرتے ہیں۔ ہندستان میں پہلے ایسا ماخذ "ٹائمس آف انڈیا ڈائریکٹری اینڈ ہو از ہو" کے نام سے شائع ہوتا تھا جو 1986 میں بند ہوگیا۔ 1970 سے "انڈیا ہو از ہو" نئی دہلی سے شائع ہورہا ہے۔

عالمی سوانحی لغات میں جس میں زمانہ قدیم سے دور جدید تک کے معروف افراد کا تذکرہ ہے کیمبرج بائیوگرافیکل ڈکشنری (1990) (جو 1897 سے چیمبرس بائیوگرافیکل ڈکشنری کے نام سے شائع ہورہی تھی) میگراہل انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ بائیوگرافی (1973) اور "ویبسٹرس نیوبائیوگرافیکل ڈکشنری" (1988) معروف اشاعتیں ہیں۔ سوانحی حوالہ کے لیے ایک اور قسم ماخذ کی اب دستیاب ہے جسے سوانحی اشاریہ کا نام دیا گیا ہے۔ 1947 سے نیویارک سے ولسن نامی فرم بائیوگرافی انڈکس شائع کر رہی ہے جس میں رسائل اور کتابوں میں شائع سوانحی خاکوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ سہ ماہی وقفہ سے شائع اس اشاعت کی سی. ڈی. بھی دستیاب ہے اور یہ انڈکس کمپیوٹر کے واسطے سے ہمہ وقت دستیاب ہے۔ اشاریہ کے خطوط پر یکجا 9 ملین سوانحی خاکوں کی نشاندہی "بائیوگرافی اینڈ جینیالوجی ماسٹر انڈکس" (Biography and Genology Master Index) سے ہوتی ہے۔ یہ ریکارڈ کتابوں، رسائل اور سوانحی لغات کے تقریباً 700 وسائل سے

تلاش کر کے تیار کیا گیا ہے۔ سوانحی ماخذ کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اب ماہرین مضامین، معروف پیشہ ور اور ہنرمند افراد کے قومی سطح پر سوانحی لغات کی ترتیب کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اراکین پارلیمنٹ و ریاستی اسمبلیاں تحریک آزادی کے شرکا، خواتین، سائنسداں، سماجی علوم کے ماہرین ہر ایک دائرہ اشخاص کے لیے ایک بار اور مسلسل شائع ہونے والے لغات عام ہو چکی ہیں۔ درج ذیل اس کی ایک مثال ہے۔

ہندستان کے اردو مصنفین اور شعرا، مرتبہ گوپی چند نارنگ اور عبداللطیف اعظمی دہلی، اردو اکادمی، 1996۔

سود یا اصل کی ادائیگی کا اثر:

(1) جب کسی قرض یا عطیہ وصیتی کا سود ارتقا میعاد معینہ قانون اس شخص نے جو عطیہ وصیتی کے مرتہن کی ادائیگی کا ذمہ دار ہو یا اس کے ایسے کارندے نے بطور سود ادا کیا ہو جو اس بارے میں مجاز ہو اصل قرضہ کا کوئی جز ادا کیا ہو تو جدید میعاد اس وقت سے شمار ہوگی جب کہ ادائیگی مذکور عمل میں آئی ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اصل قرضہ کا کوئی جز ادا ہونے کی صورت میں ادا کیا جانا اس شخص کی تحریر یا دستخط سے ظاہر ہوتا ہو جس نے ادا کیا ہو۔

(2) جب جائداد غیر منقولہ مرتہن کے قبضہ میں ہو تو اس کی آمدنی کا وصول ہونا ضمن ایک کی اغراض کے لیے بمنزلہ ادا متصور ہوگا۔

توضیح: قرضہ میں وہ روپیہ بھی داخل ہے جو عدالت یا ڈگری یا حکم کی رو سے قابل ادا ہو۔

ان احکام کا یہ منشا ہے کہ جب سود یا اصل قرضہ کا کوئی جز قبل از قضاء میعاد معینہ قانون میعاد سماعت اصل مالک یا اس کے کارندہ مجاز نے ادا کیا ہو تو اس باقی ماندہ قرضہ کی میعاد جدیداً اس تاریخ سے شروع ہوگی جب ادائیگی تحریر یا دستخط کی گئی ہو۔ ان احکام سے سابقہ میعاد میں توسیع ہوتی ہے کوئی جدید عطا نہیں ہوتی۔

یعنی وہ حصہ میعاد جو عمل مندرجہ بالا سے پہلے منقضی ہوگیا ہو خارج ہو جائے گا۔

سوشل ڈیماکریسی - جرمنی میں :

جرمنی میں جرمن مزدور تحریک کا رہ نما فرڈینڈ لاسال (1825-1864) مارکس سے اس بات پر متفق تھا کہ مزدوروں کی الگ تنظیم ہونی چاہیے لیکن وہ ساتھ ہی حکومت سے مدد بھی چاہتا تھا تاکہ مزدوروں کے امداد باہمی کے پیداواری ادارے قائم کیے جائیں اور ان کی مدد سے مزدوروں کو سرمایہ داروں سے نجات دلائی جائے۔ مارکس حکومت سے کسی قسم کی بھی مدد کے سخت خلاف تھا۔ چنانچہ مارکس نے 1869 میں ایک الگ سوشل ڈیماکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1875 میں ایک مشترکہ پروگرام کی بنا پر یہ دونوں جماعتیں متحد ہو گئیں۔

سوشل ڈیماکریٹک تحریک نے جرمنی میں زبردست ترقی کی اور اسے بسمارک کے سخت قوانین بھی دبا نہ سکے۔ 1877 میں سوشلسٹوں نے جرمن پارلیمنٹ کے چناؤ میں 5 لاکھ ووٹ حاصل کیے اور اس کے ایک درجن ممبر چنے گئے۔ 1881 تک اس پارٹی کے ممبر 3 لاکھ سے زیادہ تھے جو 1890 میں 14 لاکھ سے زیادہ ہوگئے اور پارٹی نے لاسال کے نظروں کو ترک کر کے پوری طرح مارکسی نقطہ نظر اختیار کرلیا۔

بعد کے دور میں سوشل ڈیماکریٹک تحریک کے لیڈر تقریروں میں اور نظری طور پر مارکس کے انقلابی نظریوں کے حامی رہے۔ لیکن عملاً ان کی سرگرمیاں زیادہ تر پارلیمانی میدان میں محدود ہونے لگیں۔ اور کارل کاوٹسکی (Karl Kautsky, 1854-1938) کی رہ نمائی میں انھوں نے معاشیات میں ایک نیا نظریہ پیش کیا کہ سوشلزم کے لیے انقلاب کی ضرورت نہیں۔ معاشی قوتوں کی ترقی کے نتیجہ کے طور پر ہی سوشلزم قائم ہو جائے گا۔ پارٹی نے سرکاری طور پر اس فلسفہ کو نہیں مانا مگر وہ عملاً اسی راہ پر چلتی رہی اور پھر ایڈورڈ برنسٹائن (1850-1932) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انگلستان کی طرح جرمنی میں بھی پارلیمنٹ کے دباؤ سے سوشلزم آسکتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ پارٹی نے عملاً جو راہ اختیار کر لی ہے اسے نظری طور پر مان لینا چاہیے۔

ایک زمانہ تک کاوٹسکی اور برنسٹائن کے درمیان نظری جنگ چلتی رہی جس نے پارٹی کو ہلا دیا۔ 1903 کی کانگریس میں اگرچہ برنسٹائن کو شکست ہوئی لیکن پہلی جنگ عظیم تک جرمن سوشل ڈیماکریٹک پارٹی اس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ اس کے تمام لیڈروں نے جرمن حکومت اور جنگ کی تائید کی اور اپنی انقلابیت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

سوشلزم (Socialism):

لفظ اشتراکیت یا سوشلزم کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق سماج میں سماجی انصاف ہونا چاہیے اور ذرائع پیداوار اور دولت پر انفرادی قبضہ کے بجائے قومی کنٹرول ہونا

چاہیے۔ یہ لفظ ان تحریکوں کے بارے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جو ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے چلائی جاتی ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے سوشلزم کی اصطلاح بہت عام ہو گئی ہے اور ایشیا اور افریقہ کے نوآزاد ملکوں میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جو سوشلزم کا نظام قائم کرنے کا دعویٰ نہ کرتا ہو اس کے ساتھ ہی اسلامی سوشلزم، عرب سوشلزم، افریقی سوشلزم، وغیرہ کی اصطلاحات بھی سننے میں آتی ہیں۔ چنانچہ اب اس لفظ کے معنی و مفہوم بھی الگ الگ ہوگئے ہیں۔ غرض اس نظام کی جتنی تعبیریں ہوئی ہیں اور اس کے تصور کو جتنے معنی پہنائے گئے ہیں اتنے شاید کسی اور سیاسی اصطلاح کو پہنائے گئے ہوں گے۔

سوشلزم کی تاریخ پر اگر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی تصورات افلاطون کی "جمہوریہ" میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تھامس مور کی یوٹوپیا (Utopia) اور 18 ویں صدی کے یوٹوپیائی ادب میں سوشلزم پر بڑی خیال آرائیاں کی گئی ہیں۔ موجودہ دور کے سوشلزم کی ابتدا اصل میں صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری نظام کے جنم لینے کے بعد ہوئی ہے جبکہ اس دور کے بہت سارے عالم سماجیات اور معاشیات نے اس نظام کے سماجی رشتوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور انھوں نے اس عدم مساوات کا ناانصافی اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی جو سرمایہ داری طریقہ پیداوار اور آزاد بازار کی پیداوار تھے۔ انھوں نے ایک ایسی دنیا کا تصور قائم کیا جس میں ذرائع پیداوار پر عوام کا کنٹرول ہوگا اور حکومت کی باگ ڈور سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھ میں آجائے گی۔

19 ویں اور بیسویں صدی کی سوشلسٹ تحریکوں میں آپس میں ان بنیادی تصورات پر تو اتفاق ہے لیکن تفصیلات پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس مقصد کو قومی ملکیت بنانا ہوگا۔ دوسروں کا خیال تھا کہ صرف بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت میں شامل کرنا اور بقیہ پر کنٹرول رکھنا کافی ہوگا۔ اسی طرح بعض کا خیال تھا کہ پوری معیشت پر حکومت کا مکمل کنٹرول اور رہنمائی ضروری ہے تو کچھ کا خیال تھا کہ قیمت نظام سوشلزم کافی ہوگا۔ جس میں بازار کی رہنمائی اور ہدایت کا کام سوشلسٹ منصوبہ کار کریں گے۔ سوشلسٹوں میں سوشلسٹ سماج کی تنظیم کے بارے میں بھی اختلافات رہے ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ نظم و نسق میں مرکزیت رہنی چاہیے اور اس سماج کے تمام کاروبار حکومت کو چلانے چاہیے۔ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ جہاں تک ہوسکے عدم مرکزیت ہونی چاہیے اور مختلف اداروں مثلاً پنچایتوں میونسپلٹیوں امداد باہمی کے اداروں وغیرہ کو زیادہ اختیارات ہونے چاہیے۔ بہتر تقسیم دولت کے بارے میں سب کو اتفاق تھا لیکن بعض مکمل مساوات چاہتے تھے اور بعض کام کے لحاظ سے آمدنی کے فرق کو جائز سمجھتے تھے۔ اکثر سوشلسٹ کا یہ نعرہ رہا ہے کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے لحاظ سے ملنا چاہیے۔ جتنا وہ سماج کی مشترکہ دولت کی پیداوار میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے بشرطیکہ سماج ہر شہری کے لیے رہنے، کپڑے اور کھانے کا مناسب انتظام کرے اور ساتھ ہی ہر ایک کی تعلیم صحت و علاج نقل و حمل اور تفریح کا بندوبست ہو۔

سوشلسٹ سیاسی طور پر بھی تمام شہریوں کے حقوق میں مساوات کے حامی ہیں اگرچہ اس میں اختلاف رہا ہے کہ جب فیصلے لینے کی منزل آتی ہے تو وہاں سب ہی کی حیثیت برابر کی ہونی چاہیے یا کچھ فرق و امتیاز ضروری ہے۔

سوشلزم کے بارے میں جدید تصورات کی ابتدا تقریباً 1830 سے ہوتی ہے۔ فرانس میں فورئے (Fourier) اور سینٹ سائی موسن (Saint Saimoman) اور انگلستان میں رابرٹ اوون سے اس کی شروعات ہوتی ہے۔

ہنری ڈ سینٹ سائی مون (Henry de Saint Simon, 1760-1825) ایک غیر معمولی ذہن مگر سنکی مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے اپنی تحریروں میں بتلایا کہ سماج بے لگام خود پسندی کی وجہ سے تباہ ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے صنعت کار اور تکنکی ماہر صنعتوں کو ترقی دے رہے ہیں اور عنقریب ان ہی کی حکمرانی ہوگی۔ اس سماج میں سب مساوی تو نہیں ہوں گے لیکن ہر ایک کو اپنی صلاحیت کے مطابق ترقی کا موقع ملے گا اور ریاست بحیثیت ایک جابر (Co-ercine) طاقت کے ختم ہو جائے گی۔ پورا سماج ایک کارخانہ کی طرح کام کرے گا جس میں حکمرانی کی جگہ انتظام لے لے گا۔ سائی مون کے جانشینوں نے ان خیالات کو اور آگے بڑھایا اور کہا کہ اس نئے صنعتی سماج میں ذاتی ملکیت کو جگہ نہیں مل سکتی۔

فرانسوا- ماری - چارلس فورئے (1772-1837) نے ساری عمر بطور ایک سیلزمین گزاری اور اسے کاروبار میں باہمی مقابلہ اور تجارت میں تصنع اوقات سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ اور وہ خیالی محل بنایا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آئندہ جو دنیا بنے گی اس میں نہ صرف زبردست سماجی تبدیلی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہوگی بلکہ قدرتی حالات بھی بدل جائیں گے۔ اس نے جو خیالی سماج کا ڈھانچہ بنایا تھا اس میں کسی کو اپنی مرضی کے خلاف کام کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ ہر شخص اپنی پسند کا کام کرے گا۔ چاہے تو وہ صبح میں ترکاری بوئے اور شام کو آپرا تھیٹر میں گانا گائے۔ اور اس سماج میں تمام لوگ پیار اور محبت کے رشتوں میں بندھے ہوں گے۔

اپنے دور کے اور لوگوں کے مقابلہ میں انگلستان کا رابرٹ اوون (Robert Owen, 1771-1858) زیادہ سنجیدہ مزاج تھا۔ شروع کے دور میں اسکاٹ لینڈ میں اس کا ایک سوتی کارخانہ تھا۔ وہ ایک مثالی آجر کے طور پر مشہور تھا۔ تعلیم سے اسے دلچسپی تھی اور کارخانوں میں اصلاح کا پرچارک تھا۔ خود صنعت کار ہونے کی وجہ سے وہ اپنی کمزوریوں سے واقف تھا چنانچہ دوسرے صنعت کار اس کے خلاف ہوگئے اور یہ خود ٹریڈ یونین تحریک میں جو ابھی شروع ہوئی تھی شریک ہوگیا۔ اس نے سرمایہ داری کی مدد سے دولت کمائی تھی اور اس لیے یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر اس میں سے مقابلہ کا جز ختم کردیا جائے تو یہ نئی پیداواری طاقتیں ساری انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال ہوسکتی ہیں۔ اور خراب طریقہ تعلیم کو ختم کرکے اس سے روشن خیالی پھیلانے کا کام لیا جاسکتا ہے۔

رابرٹ اوون نے صنعتوں کو امداد باہمی کے اصولوں پر چلانے کی تلقین کی اور اتحاد اور امداد باہمی کی اساس پر دیہات بسانے کا پرچار کیا تاکہ کسان فصلیں اگانے کے علاوہ اپنی دماغی اور جسمانی حالت بھی بہتر بنا سکیں۔ اوون کی امداد باہمی کی تحریک انگلستان یا امریکا کہیں بھی کامیاب نہیں ہوسکی لیکن اس نے برطانیہ کے ذہن پر اور خاص طور پر سوشلسٹ تحریک پر گہرے اثرات چھوڑے۔

اس کے بعد فرانس اور انگلستان میں اور بھی تحریکیں ابھریں لیکن چونکہ یہ زیادہ تر حقائق پر مبنی نہیں تھیں اس لیے وہ زندہ نہ رہ سکیں۔

19 ویں صدی کے شروع میں انگلستان میں کئی دانش ور پیدا ہوئے جنھوں نے سرمایہ داری کی عدم مساوات پر سخت حملے کیے اور بعض نے مشہور عالم معاشیات ریکارڈو کی کسی قدر انقلابی توجیہ کے ذریعہ اجرتی محنت پر سخت تنقید کی۔ اس کے کچھ بعد کے دور میں فریڈرک ڈیلی سن مارس اور چارلس کنگسلے نے ایک عیسائی سوشلسٹ تحریک شروع کی اور ترقی پسند (Radical) معاشیات کو سیاسی قدامت پرستی سے جوڑنے کی کوشش کی۔ 1830 اور 1840 کی چارٹسٹ تحریک ایک سوشلسٹ تحریک کی نسبتاً ایک مزدور طبقہ کی تحریک ہے اگرچہ مخالف سرمایہ داری خیالات اس پر کافی حاوی ہیں۔

سوشلزم۔ افریقی : دوسری عالم گیر جنگ سے پہلے تقریباً پورا افریقہ مختلف یورپی ملکوں کے قبضہ میں تھا۔ ان ممالک میں جب آزادی کی تحریکیں ابھریں تو انھیں منظم کرنے والے وہی لوگ تھے جنھوں نے اپنے حکمراں ممالک مثلاً برطانیہ، فرانس، پرتگال وغیرہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ تعلیم کے زمانہ میں ان کے مقاصد سے ہمدردی زیادہ تر کمیونسٹ اور پھر سوشلسٹ دکھلاتے تھے اور ان ہی لوگوں نے آزادی کی تحریک منظم کرنے میں مدد دی۔ چنانچہ ان ملکوں کی آزادی کی تحریکوں کے اندر کمیونسٹ اور سوشلسٹ گروپ بھی تھے۔ جب آزادی ملی تو انھوں نے ان خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ تونس، الجیریا، گنی وغیرہ کی تحریکوں پر فرانس کی کمیونسٹ اور سوشلسٹ تحریکوں کا زیادہ اثر تھا۔ اور ان کے لیڈر بھی مارکسی خیالات کے تھے۔ ان کے مقابلہ میں کینیا، تنزانیہ وغیرہ کی تحریکوں پر مارکسزم کا اتنا گہرا اثر نہیں تھا۔ پرگالی مقبوضات مثلاً گنی بساؤ، انگولا و موزمبیق اور جنوبی افریقہ، زیمبیا و نمی بیا وغیرہ کی آزادی کی جد وجہد سخت تھی۔ اور جدوجہد میں زیادہ تر سوویت یونین، کوریا اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں نے ان کی مدد کی۔ اس لیے یہاں کے لیڈروں پر مارکسزم کا کافی گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

سوشلزم - ایشیائی : دوسری عالمی جنگ کے بعد برما، انڈونیشیا، سیلون وغیرہ میں سوشلسٹ پارٹیاں قائم ہوئی تھیں لیکن وہ آہستہ آہستہ ختم ہوگئیں یا بہت کمزور پڑ گئیں۔ صرف جاپان میں سوشلسٹ تحریک کافی مضبوط ہے اور یورپ کی طرح ایک فلاحی ریاست قائم کرنا چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں بھی لیبر پارٹیاں کافی طاقت ور ہیں۔ جو برطانیہ کی لیبر پارٹی کے راستہ پر چلتی ہیں۔ جنوبی امریکا کے کئی ملکوں میں بھی سوشلسٹ تحریک کافی مضبوط ہے اور سوشلسٹ پارٹیاں کئی مرتبہ حکومتوں میں شریک ہوچکی ہیں۔

سوشلزم - جنگ کے بعد کا دور : جنگ میں فاشزم کی شکست کے بعد یورپ میں جو حکومتیں قائم ہوئیں تو شروع میں اکثر ملکوں میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(برطانیہ کو چھوڑ کر) سوشلسٹ کیمونسٹ اور بائیں بازو کی دوسری پارٹیاں متحد طور پر شریک ہوئیں۔ لیکن یہ بہت دن نہ چل سکیں۔ کیمونسٹ اور بائیں بازو کی دوسری پارٹیاں الگ کر دی گئیں اور سوشلسٹوں نے کرسچین ڈیماکریٹک پارٹیوں اور اس قسم کی درمیانی یا دائیں بازو کی طرف جھکی ہوئی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ اس وقت تک یورپ کی سب ہی سوشلسٹ پارٹیاں مارکسزم سے کافی دور ہوچکی تھیں اور اب وہ فلاحی ریاست (Welfare State) کی حامی ہو گئی تھیں۔ انھوں نے اب تمام ذرائع کو قومی ملکیت بنانے کی راہ ترک کردی تھی اور ملی جلی معیشت (Mixed Economy) کے حامی ہوگئے تھے۔ جس کے مطابق بعض کلیدی صنعتوں پر سرکاری کنٹرول اور باقی پر نجی کنٹرول کے ساتھ کسی حد تک مرکزی منصوبہ بندی کے ذریعہ سب کے لیے خوش حالی کا راستہ تلاش کرنے کی بات کی گئی تھی۔ پارٹیوں نے (مثلاً جرمن سوشلسٹ پارٹی) اپنے مینی فیسٹو سے مارکسزم طبق داری جنگ وغیرہ جیسے الفاظ بھی نکال دیے ہیں۔ برطانوی لیبر پارٹی کسی وقت بھی مارکسی نہیں تھی۔ اس لیے جنگ کے بعد اسے اپنے آپ میں زیادہ تبدیلیاں لانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس وقت یورپ کے اکثر ملکوں میں سوشلسٹوں کی حکومت ہے (مثلاً جرمنی، اسٹریا وغیرہ) یا وہ پھر ملی جلی (Coalition) حکومتوں میں شریک ہیں۔

سوشلزم - فرانس میں : فرانس کی سوشلسٹ تحریک کی روایات قدیم ہیں۔ 1871 کے پیرس کیمون میں بالانگی (Balanqui) اور پراوڈہون (Proudhon) نے اہم حصہ ادا کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک آپس کے جھگڑوں کا شکار رہے اور انقلابی اور اصلاح پسند گروہوں میں کافی کشمکش رہی۔ متحدہ پارٹی کی پہلی کانگریس میں اس کے 35 ہزار ممبر تھے۔ اور 1906 کے پارلیمنٹ کے چناؤ میں اسے 54 سیٹیں ملیں۔ 1914 تک پارلیمنٹ میں اس کے سو ممبر تھے۔ جرمنی کی طرح اس کے بھی دو راستے رہے۔ نظری طور پر یہ مارکسی انقلابی تھی اور عملاً پارلیمانی۔ پہلی جنگ عظیم سے عین پہلے ان کا مشہور لیڈر اور مقرر ژان ژاورے (Jean Jaures) قتل کردیا گیا اور اکثر سوشلسٹ جنگ اور اپنی حکومت کے حامی بن گئے۔

19 ویں صدی کے آخر میں یورپ کے اکثر ملکوں میں مارکسی نظریوں کی بنیاد پر سوشل ڈیماکریٹک پارٹیاں قائم ہوگئیں۔ ان میں ڈنمارک، ناروے، آسٹریلیا، بلجیم اور ہالینڈ کی پارٹیوں نے کافی اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ ٹریڈ یونین قائم کیں۔ ڈچ پارٹی نے پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے پارلیمنٹ میں بیس فی صدی سیٹیں حاصل کر لی تھی تھیں۔

یورپ کی ساری پارٹیوں میں انقلابیوں اور غیر انقلابیوں میں مسلسل کشمکش ہوتی رہی اور اکثر اوقات جب مختلف پارٹیوں کی مخلوط حکومتوں میں شریک ہونے کا مسئلہ آیا تو ان تجویزوں کو بہت معمولی اکثریت سے شکست ہوئی۔

سوشلسٹ انٹر نیشنل (Socialist International) :

اشتراکی جماعتوں کی بین الاقوامی انجمن یعنی سوشلسٹ انٹر نیشنل کا قیام 1951 میں لندن میں عمل میں آیا۔ یہ انجمن لیبر اینڈ سوشلسٹ انٹر نیشنل کی جانشین کی حیثیت سے قائم ہوئی جس میں 57 اشتراکی جماعتیں شریک ہوئیں اور آج اس کے ایک کروڑ پچاس لاکھ ارکان ہیں۔ اس انجمن کا مقصد جمہوری اشتراکیت کو فروغ دینا اور مختلف ممالک کی اشتراکی جماعتوں سے تبادلہ خیال اور ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔

انٹر نیشنل ورکنگ مینس ایسو سی ایشن مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن تھی جسے "پہلی انٹر نیشنل" کے نام سے کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کے ہمنواوں نے انگلستان، فرانس اور بلجیم کے مزدوروں کی انجمنوں نے 1868 میں لندن میں قائم کیا تھا۔ اس انجمن سے وابستہ لوگ کارل مارکس کی تعلیمات کے حامی تھے۔ جب ان کے اور نراج پسندوں کے درمیان تصادم ہوا تو 1876 میں اسے شکست کردیا گیا۔ "دوسری انٹر نیشنل" انٹر نیشنل سوشلسٹ کانگریس کے نام سے 1889 میں پیرس میں وجود میں آئی لیکن بعدازاں یہ بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ 1919 میں اسے دوبارہ زندہ کیا گیا جو 1923 سے 1940 تک سرگرم کار رہی اور لیبر اینڈ سوشلسٹ انٹر نیشنل کہلاتی رہی۔ "تیسری انٹر نیشنل" کا وجود "کیمونسٹ انٹر نیشنل" یا کومنٹرن کے نام سے ہوا جو 1943 تک موجود رہی۔ 1947 میں اس کی جگہ کومن فارم نے لے لی جو 1956 میں شکست کر دی گئی۔ انٹر نیشنل سوشلسٹ کانفرنس کے نام سے دوبارہ دوسری انٹر نیشنل کا ظہور ہوا۔ یہی وہ تنظیم ہے جسے تشکیل نو کے بعد "سوشلسٹ انٹر نیشنل" کے نام سے پکارا گیا۔

سوشلسٹ انٹر نیشنل کا صدر مقام لندن (انگلستان) ہے۔

سوشلسٹ تنظیمیں - غیر مارکسی : سوشلسٹ ڈیماکریٹک تحریک

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کے علاوہ، جو مارکسزم پر عقیدہ رکھتی تھی یا کم از کم اس کا دعوٰی کرتی تھی۔ برطانیہ کی فیبین تحریک، سنڈیکلزم، گیلڈ سوشلزم اور امریکی سوشلسٹ تحریکیں کافی اہم ہیں (تفصیلات کے لیے دیکھیے ان پر مختصر نوشتے)۔

یورپ میں جہاں جنگ کے زمانہ میں سوشل ڈیماکریٹک پارٹیوں نے اصلاح پسندی اور جنگ کی تائید کی راہ اختیار کی وہاں سوویت یونین میں سوشل ڈیماکریٹک تحریک لینن کی سرکردگی میں انقلابی راہ پر قائم رہی اور روس میں انقلاب لاکر دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست قائم کی (تفصیل کے لیے دیکھیے انقلاب روس)۔

سونا۔ اور بیرونی زر مبادلہ (Gold and Foreign Exchange): کوئی ملک اپنے پاس سونے اور بیرونی کرنسی کا اسٹاک اس لیے محفوظ رکھتا ہے کہ اگر کوئی قرض خواہ مطالبہ کرے تو اس کے ذریعہ قرض کی ادائی کی جاسکے۔ قرض خواہوں کے مطالبات کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ان واجبات (Liabilities) کی مقدار کیا ہے اور اس مقدار کا دار و مدار توازن ادائیگی کے فاضل ہونے یا خسارہ پر ہوتا ہے۔ مطالبات کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ قرض خواہ کتنا انتظار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ محفوظات پر دباؤ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس ملک کی تجارتی حیثیت کیا ہے۔ توازن اس کے موافق ہے یا مخالف۔ دوسرے اس کی شرح مبادلہ کی صورت کیا ہے وہ گرنے والی تو نہیں ہے۔ محفوظات کا اندازہ صرف محفوظ کرنسی اور سونے ہی سے نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس ملک کی ساکھ بیرونی منڈیوں میں کیا ہے۔ کیا وہ اپنے واجبات کی ادائیگی کے لیے بین الاقوامی معاشی اداروں مثلاً عالمی بینک وغیرہ سے حسب خواہش عارضی طور پر قرض لے سکتا ہے۔

سونا معیار (Gold Standard): کوئی ملک اس وقت سونا معیار پر ہوگا کہ اگر وہاں کے عوام ملک کی کرنسی مرکزی بینک میں پیش کریں تو انھیں اس کے عوض سونا مل سکے۔ 1919 سے پہلے تک انگلستان میں سونا معیار تھا۔ اور کوئی بھی فرد بینک میں نوٹ داخل کرکے سونا حاصل کرسکتا تھا۔ کلاسکی معیشت کے دور میں بین الاقوامی تجارت کے توازن میں سونے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت تک ہر کرنسی سونے میں بدلی جاسکتی تھی اور تمام بین قومی قرضے سونے کی مدد سے طے کرلیے جاتے تھے۔ جس ملک کو تجارت میں فاضل توازن حاصل ہوتا ملک کے مرکزی بینک میں اسی کے بقدر سونا جمع ہوجاتا۔ اس کی وجہ سے مرکزی بینک بغیر کسی تکلیف کے نوٹ چھاپ کر زر کا چلن بڑھا سکتا تھا۔ اس سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے قیمتوں کے بڑھنے سے برآمد گھٹ جاتی ہیں۔ اور ادائیگی کے فاضلات کا توازن کم ہوجاتا ہے اور تجارت کے توازن میں خسارہ سے اس کا الٹا نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔

سوویت یونین (Soviet Union): سوویت یونین کا سرکاری نام سوویت اشتراکی جمہوریاؤں کا اتحاد (Union of Soviet Socialist Republics) تھا۔ اس کا رقبہ 1,38,40,000 مربع کلومیٹر تھا اور اس کی آبادی 1970 کی مردم شماری کے مطابق 24,17,48,000 تھی۔ اس کی راجدھانی ماسکو تھا۔ یہ اتحاد پندرہ جمہوریاؤں پر مشتمل تھا جن میں سب سے بڑا اور سب سے اہم جمہوریہ، روسی سوویت کا وفاقی اشتراکی جمہوریہ (Russian Soviet Federation of Socialist Republic) تھا۔ اس جمہوریہ میں سوویت روس کا بیشتر یورپی حصہ اور ایشیائی حصہ کا بیشتر شمالی علاقہ شامل تھا۔ زار روس نکولس دوم کو روس میں برپا ہونے والے انقلاب کے نتیجے میں 15 مارچ 1917 میں تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا۔ 14 ستمبر کو روس کو ایک جمہوریہ میں منتقل کردیا گیا اور 7 نومبر 1917 کو اقتدار حاصل کرنے کے بعد لینن کی قیادت میں روسی وفاقی جمہوریہ کے نام سے قائم کردی گئی۔ سوویت یونین کا باضابطہ قیام 1923 میں عمل میں آیا جس میں روسی وفاقی جمہوریہ و بائی یوریشیا، یوکرین اور ٹرانس کاکیشین سوویت ری پبلک شامل تھیں۔ بعدازاں 1925 میں ازبکستان اور ترکمانستان اور 1929 میں تاجکستان شامل ہوگئے۔ 1936 میں ٹرانس کاکیشین ری پبلک تین جمہوریاؤں میں منقسم ہوگئی جو آرمینیا، آذربائیجان اور جارجیا کے نام سے موسوم ہوئیں۔ 1939 میں قازخستان، کرغیزیا نے بھی جمہوریہ کی شکل اختیار کرلی۔ 1940 میں اسٹیونیا، لتھونیا اور مالڈیویا نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ 1956 میں کریلو، فنش جمہوریہ بھی روسی وفاقی جمہوریہ کا حصہ بنا دی گئی۔

1929 میں اسٹالن انتہائی بااختیار شخص ہوگیا۔ اس نے سخت گیری کی پالیسی اپنائی اور خوف و دہشت کا بازار گرم کیا۔ پنجسالہ منصوبوں کی تکمیل نے سوویت یونین کو ایک طاقتور صنعتی ریاست میں منتقل کردیا۔ کمیونسٹ پارٹی اور حکومت میں مخالفین کو تہہ تیغ کردیا گیا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

5 دسمبر 1936 کو سوویت یونین کا ایک نیا آئین وضع کیا گیا۔ ستمبر 1939 میں روسی افواج نے مشرقی پولینڈ پر قبضہ کرلیا۔ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی شکست کے بعد انگلستان، امریکا اور روس نے طے کیا کہ مشرقی پرشا (Prussia) کو سوویت یونین کا حصہ بنادیا جائے۔ جاپان کی شکست کے بعد 1945 میں سخالن اور کورائل کے جزیروں کو بھی اتحادیوں کی رائے سے سوویت یونین میں شامل کردیا گیا۔

1950 میں اسٹالن کی موت کے بعد نکیتا خروشچیف کیمونسٹ پارٹی کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے تو انھوں نے 1956 میں اسٹالن کی قیادت کی تنقید کی۔ مغرب کے ساتھ بقائے باہم کے اصول کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ کیوبا میزائل کے واقعہ کے بعد چین سے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ 1985 میں میخائیل گرباچوف کے برسر اقتدار آنے کے بعد گلاس نوسٹ (کشادگی) اور پریسٹرائکا (تعمیر نو) کا افتتاح ہوا لیکن اقتصادی مسائل نے سوویت یونین کو گھیر لیا جو انجام کار 1991 میں اس کے انتشار میں منتج ہوئے اور اس کی اکائیاں اپنی اصل شکل میں واپس آگئیں۔

سوویت یونین نے بیسویں صدی میں جنم لیا تھا اور اسی صدی میں اس کا خاتمہ بھی ہوگیا۔

سوویت یونین میں قانون سازی کا اختیار سپریم سویت کو حاصل تھا جو سوویت یونین کی مقننہ تھی لیکن اصل قانون سازی اس کی مجلس وزارت (پریسیڈیم) اس کے اجلاسوں کے درمیانی وقفوں میں کرتی تھی۔ سپریم سویت کا اجلاس سال میں چند ہی روز کے لیے ہوتا تھا جو مجلس وزرا منتخب کرنے کی ذمہ دار ہوتی تھی۔ مجلس وزرا سوویت یونین کا اعلیٰ ترین انتظامی اور تنفیذی ادارہ تھی۔ سوویت یونین میں اصل طاقت تو کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے پریسیڈیم کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی تھی جس کا سکریٹری گرباچوف تھا۔ کیمونسٹ پارٹی سوویت یونین کے تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور تنظیموں کی نگرانی کرتی تھی۔ اس کے ارکان مکمل آبادی کی ایک چھوٹی سی اقلیت پر مشتمل ہوتے تھے۔

سیاسیات (Politics): سیاست کے عام معنی امور مملکت کا انتظام کرنے کے ہیں۔ سیاسیات کی ابتدا تہذیب (Civilization) کے ساتھ ہوئی۔ لفظ "پالٹکس" (سیاست) یونانی زبان کے لفظ "پولس" (Polis) سے مشتق ہے جس کے معنی شہر کے ہیں۔ سیاسیات کا چلن تمدنی زندگی کے وجود میں آنے سے ہوا۔ مہذب زندگی کو وحشیانہ یا بربری طرز زندگی سے حسب ذیل عناصر ممیز کرتے ہیں:

(1) تمدنی یا شہری زندگی کا ارتقاء۔

(2) تحریر کا رواج۔

(3) علاقائی مملکت کا وجود میں آنا اور سیاسیات کا چلن۔

(4) مذہبی طبقہ اور کلیسا کا وجود میں آنا۔

(5) طبقہ امراء افراد کے ہاتھوں میں زمین کی نجی ملکیت کے ادارہ کا قیام اور

(6) سماجی طبقات یا ذاتوں اور برادریوں کا وجود میں آنا۔

ان متعدد عناصر کے درمیان کوئی متعین علمی رشتہ نہیں پایا جاتا بلکہ مختلف زمان و مکان میں مختلف عناصر نے تہذیب کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے نزدیک دریائی وادیوں میں بسنے والے قبائل کو معاشی بحران کے خطرہ نے آب پاشی کے ذرائع اور زراعت کا راستہ ایجاد کرنے پر مجبور کیا ہوگا۔ بہت سے لوگوں نے جنگ اور فتوحات کو مملکت کے قیام کا اصل سبب قرار دیا ہے۔ بہرحال مختلف اسباب نے مختلف ادوار میں ابتدائی علاقائی مملکت کے وجود میں لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

قدیم یونان (500-300 سال قبل مسیح) میں متعدد ترقی یافتہ شہری مملکتیں (City States) قائم تھیں۔ یونانی شہری مملکت کی ترکیب ان اجزاء سے ہوتی تھے:

(1) مملکت یا حکومت

(2) قوانین

(3) دستور اساسی (صرف چند شہروں میں پایا جاتا تھا) اور

(4) اساطیر۔

افلاطون اور ارسطو کے سیاسی افکار اور نظریات ان ہی شہری مملکتوں اور خصوصاً ایتھنز کے تجربات پر مبنی تھے۔ اگرچہ قدیم مصر، ایران اور عراق میں علاقائی مملکتیں (Territorial States) بھی پائی جاتی تھیں لیکن وہ اعلیٰ متمدن زندگی، علوم و فنون اور سیاسیات میں ان یونانی شہری مملکتوں کی ہم پلہ نہ تھیں۔ ان شہری مملکتوں کا مقصد اپنے شہریوں کو بہتر زندگی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گزارنے کے مواقع میسر کراتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں سیاسیات شہریوں کے لیے اچھی زندگی کے وسائل مہیا کرنے اور مملکت کے انتظام میں براہِ راست حصہ لینے کے مترادف تھی۔ ہر شہری کے لیے ضروری تھا کہ وقت آنے پر وہ مملکت کے فرائض انجام دے۔ قدیم یونان میں سیاسیات زندگی کے تمام پہلوؤں، حتیٰ کہ مذہب کو بھی محیط تھی۔ چنانچہ افلاطون نے اپنے مکالمات "اعتذار" میں سقراط کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں:

"میرے خیال میں مملکت میں کبھی اتنی عظیم اچھائی نہیں واقع ہوئی جتنی کہ میری خدمت خدا ہے"۔

قدیم یونان میں سیاسیات کو تقدس اور صالح زندگی کے مترادف درجہ اس لیے دیا جاسکا کہ ان چھوٹی چھوٹی شہری مملکتوں میں تمدن اپنے عروج پر تھا اور شہریوں کی جماعت محض چند سو افراد پر مشتمل ہوتی تھی جن کی سیاسی اور تہذیبی سرگرمیوں کی بنیاد غلاموں اور آزاد کارکنوں کی بہت بڑی اکثریت کے استحصال پر مبنی تھی۔ مثال کے طور پر ارسطو کے زمانہ میں ایتھنز کی آبادی میں دو لاکھ غلام تھے جنھیں کوئی بھی حق حاصل نہیں تھا۔ 20 ہزار آزاد کارکن، اور تین ہزار غیر ملکی، جنھیں فقط محدود شخصی حقوق حاصل تھے، اور باقی شہری تھے جن کی تعداد کسی بھی وقت 15 سو سے زیادہ نہ تھی۔ فقط یہی وہ شہری تھے جنھیں شخصی حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی حقوق یعنی امور مملکت کے انتظام میں حصہ لینے کے حقوق حاصل تھے۔ شہری مملکت میں حسب ذیل ادارے کام کرتے تھے۔ دو کونسلیں (سینٹ) جن کا کام فیصلہ سازی کے کام میں مدد دینا تھا۔ اکلیز یا شہریوں کی عام اسمبلی جس میں بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ جیوریاں (جن میں 30 سے 60 کی تعداد میں جج ہوتے تھے اور قرعہ اندازی سے منتخب کیے جاتے تھے) اور مجسٹریٹ (جو قرعہ اندازی سے یا انتخاب کے ذریعہ مقرر کیے جاتے تھے)۔ ظاہر ہے کہ سیاست ملکی میں ہر شہری کے حصہ دار ہونے کا تصور محض یونانی شہری مملکت میں ممکن تھا۔

بعد کی صدیوں میں تحفظ، دفاع اور انتظامِ ملکی کی ضروریات نے چھوٹے شہروں کو ایک مرکزی اقتدار کے ماتحت کرنے اور اس طرح علاقائی مملکت کی بنیاد ڈالنے کا راستہ ہموار کیا۔ علاقائی مملکت کے ساتھ مملکتی اقتدار اعلیٰ اور مملکتی قانون کا وجود عمل میں آیا۔ جدید سیاسیات کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے یا جمہوریت کے آنے سے پارلیمانی سیاست، جماعتی سیاست اور انتخابی سیاست کا جنم ہوا۔

سیاست سے مراد وہ عمل یا کارروائی ہے جس کے ذریعہ مقاصد کے حصول کے لیے مناسب ذرائع اختیار کیے جائیں۔ سیاست کا عمل محض انسانی گروہوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ افراد کے درمیان۔ اس کے لازمی اجزاء یہ ہیں :

(1) مفادات یا مقاصد کا ٹکراؤ۔

(2) اس کے نتیجہ میں دو گروہوں کی آپسی کشمکش اور

(3) اس کشمکش کا تصفیہ۔

سیاست کے عمل میں مصالحت ایک اہم عنصر ہے۔ سیاست کے مقاصد کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح اس کے ذرائع بھی متنوع ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک سیاست اقتدار کی کشمکش سے عبارت ہے اور یہ کشمکش مملکت کے اندر گروہوں کے درمیان، مملکت کے اداروں کے اندر اور ان کے درمیان اور بین الاقوامی سطح پر واقع ہوتی ہے۔ اس کشمکش میں وہ فریق کامیاب ہوتا ہے جس کی صلاحیتیں زیادہ موثر ہوتی ہیں۔ اس کشمکش کے تصفیہ کے ساتھ سیاست کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

سیاسی بشریات (Political Anthropology) :

بشریات (Anthropology) بشر یا انسان (انتھروپوس) کا علم ہے۔ لیکن درحقیقت یہ جملہ انسانی وسماجی علوم میں سے ایک ہے۔ اس کا مقصد ان تمام علوم کی معلومات اور منہاجیات سے استفادہ کرکے انسان کے حیاتیاتی، سماجی اور ثقافتی ارتقاء کی تشریح کرنا، انسانی آبادیوں کے گروہی خصائص اور ان کے تغیرات اور اختلافات کو واضح کرنا ہے۔ بشریات کی دو خاص شاخیں ہیں : ساختمانی یا طبعی بشریات (Physical Anthropology) جس میں انسان کے جسمانی ارتقاء سے بحث کی جاتی ہے اور اس لحاظ سے یہ حیاتیات (Biology) سے قریب تر ہے۔ اگرچہ وہ تاریخ، جغرافیہ اور علم الانسان (Ethnology) سے بھی استفادہ کرتی ہے۔ دوسری شاخ سماجی اور ثقافتی بشریات (Social and Cultural Anthropology) ہے جس کی توجہ ابتدائی مرحلہ کے سماجوں کے سماجی نظام اور ان کی ثقافتی خصوصیات کے مطالعہ پر مرکوز ہے۔ اس طرح کے ابتدائی سماج جو افریقہ، علاقہ ہائے بحرالکاہل، شمالی امریکا اور ایشیا کے بعض خطوں میں پائے جاتے ہیں، کوئی مرکزی سیاسی یا سماجی تنظیم نہیں رکھتے اور ان میں وحدت کے بجائے کثرت اور اتفاق کے بجائے اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ سماج خاندان، قبیلہ اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نسلی گروہ کی اکائیوں میں بٹے ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد قرابتی رشتوں پر ہوتی ہے۔ سماجی بشریات ان غیر ترقی یافتہ غیر مغربی سماجوں کے اندر ثقافت، فرد کی شخصیت، قرابت کے رشتوں، سماجی تنظیم، سماجی کنٹرول اور قیادت، نیز ان کی معاشیات، سیاسیات، مذہب اور ثقافت کے بارے میں مواد اکٹھا کرتی ہے۔ پھر اس مواد کا بین الثقافتی (Cross-Cultural) بنیاد پر تقابل کر کے مفروضات اور تعمیمات کی تشکیل کرتی ہے۔ اس کا طریقۂ تحقیق خالصۃً سائنسی اور وسیع فیلڈ ورک، مشاہدہ اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہوتا ہے۔

سیاسی بشریات (Political Anthropology) اس سماجی اور ثقافتی بشریات کی ایک شاخ ہے جس کی ابتدا میئر فورٹس اور ای.ای.ایوانس پرچرڈ (مرتبین) کی "افریقی سیاسی نظام" (1940) (African Political Systems) نامی تصنیف کی اشاعت سے ہوئی۔ اس ذیلی مضمون کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ابتدائی (Primitive) تجدد پذیر (Modernizing) یا تغیر پذیر (Changing) سماجوں کے اندر سیاسی اداروں اور سیاسی عوائد کو آزاد عوامل تسلیم کرتے ہوئے سماج کے دوسرے اداروں میں ان کے اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ شروع کے سیاسی بشریوں نے ابتدائی سماجوں کی سیاسیات کا مطالعہ خاندانی قرابت کے رشتوں یا قبائلی رشتوں کے وسیلہ سے کیا۔ کیونکہ ان میں سیاسی تنظیم اور سیاسی حاکمیت ان سطحوں سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ لیکن 1960 کے بعد سے غیر ملکیوں کو جب بڑے پیمانہ کے سماجوں یا از خود جدید کاری کا راستہ اپنانے والے سماجوں سے سابقہ پڑا تو روایتی تصورات اور قرابتی عوامل ان کے سیاسیات کی تشریح میں ناکافی ثابت ہوئے۔ چنانچہ ان ماہرین کی توجہ ان سماجوں کے کلی (Total) سیاسی عمل (Political Process) کی تحلیل کی سمت مبذول ہوئی۔ اس مقصد سے سیاسی بشریات نے اپنے نظری ڈھانچے یا نطاق کار (Theoretical Framework) کے لیے سماجیات اور سلوکی علم سیاسیات کے تصورات مستعار لیے۔ اس نئی دلچسپی کے نتیجہ میں محققین نے انفرادی اور اجتماعی طور پر اس طرح کے موضوعات پر بے شمار تصنیفات شائع کیں۔ مثلاً سیاسی نظاموں کی زمرہ بندی، سیاسی نظاموں کا دوسرے ذیلی نظاموں سے رشتہ، مختلف سیاسی نظاموں کا تقابل۔ سیاسی گروہوں اور سیاسی رول کا مطالعہ، سیاسی کنٹرول کے ذرائع، گروہی نزاعات، سیاسی فیصلہ سازی کا عمل، دفتر شاہی کے اندر دھڑے بندیاں، سیاسی ادارے اور ان کی تنظیم و کارکردگی، سیاسی پارٹیاں، گروہ بندیاں وغیرہ۔

سیاسی پناہ (Asylum): کسی بیرونی ملک کے مفرور آدمی کو اپنے پاس ٹھہرانے کو سیاسی پناہ دینا کہتے ہیں۔ موجودہ بین الاقوامی قانون کے تحت دوسرے ملک کے کسی پناہ گزیں یا مفرور آدمی کو پناہ دینا کسی مملکت کا قانونی حق ہے۔ کیونکہ اسے اپنے ملک کے ہر مقام پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے اور وہ کسی مفرور آدمی کو پناہ دے سکتی ہے۔ ایک مفرور آدمی یا پناہ گزیں کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ملک کو پناہ دینے کے لیے مجبور کرے جہاں وہ پناہ کی خاطر گیا ہو۔ بیشتر ممالک کے درمیان ایسے معاہدات ہیں جن کے تحت ایک ملک دوسرے ملک کے ایسے فرار شدہ شخص کو واپس کر دیتا ہے جس نے کسی تخریبی جرم کا ارتکاب کیا ہو اور دوسرے ملک میں آکر پناہ لی ہو البتہ عام طور پر یہ رجحان ضرور ہے کہ سیاسی پناہ گزینوں کو اور ایسے اشخاص کو پناہ دی جائے جن پر دوسرے ملک نے ناقابل برداشت حالات پیدا کر دیے ہوں اور جن پر ظلم کیا جارہا ہو۔

سیاسی جغرافیہ : سیاسی جغرافیہ (Political Geography) جغرافیہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ ایک بین الموضوعاتی مضمون ہے جو مملکت اور اس کے داخلی و خارجی ماحول کے مابین تعلق کا مطالعہ کرتا ہے۔ روایتاً اس کا تعلق سیاسی حد بندیوں، سرحدوں اور نقشوں سے تھا۔ لیکن معاصر سیاسی جغرافیہ، سیاسی نظاموں اور سیاسی علاقوں کے رشتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ علم ہے جو طبعی ماحول کی سیاسیات اور خصوصاً مملکت کی تشریح کرتا ہے۔ یہ تین مفروضات پر قائم ہے:

(1) طبعی ماحول، لازمی طور سے سیاسیات کو متاثر کرتا ہے۔

(2) سیاسیات طبعی ماحول کی انسانی اہمیت پر اثرانداز ہوتی ہے،

اور

(3) کرۂ ارض پر آزاد و خود مختار علاقائی مملکتیں اپنا وجود رکھتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی بقا و سلامتی کے لیے دوسروں کی نسبت سے اپنے اقتدار اور صلاحیتوں کو برقرار رکھنا اور افزوں کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ سیاسی جغرافیہ کا بیشتر لٹریچر مملکت پر مرکوز ہے، جو ایک منظم علاقائی اکائی ہے، لہٰذا یہ شاخ علاقائی جغرافیہ (Regional Geography) سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس کا مقصد مملکت کی ہیئت ترکیبی کے طبیعی، انسانی اور

تنظیمی عناصر کی تحلیل کے ساتھ بعض بین المملکتی روابط کا مطالعہ کرنا بھی ہے۔ اسی طرح اس مضمون میں تحت القومی سیاسی اور انتظامی اکائیوں پر بھی توجہ دی گئی ہے اور ان علاقائی اکائیوں میں پائے جانے والے حاکمیت، محکومیت کے عملیتی رشتوں کو سمجھنے کے لیے معاشی جغرافیہ میں پائے جانے والے ماڈلوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ ملکی وسائل کے انتظام اور خانگی و بیرونی پالیسی سے متعلق فیصلوں کو، نئی مملکتوں کے ترقیاتی مسائل کو اور مختلف ملکوں میں علاقہ اور قوم پروری کے درمیان ربط کو سمجھنے کی بھی کاوش کی گئی ہے۔ سیاسی جغرافیہ کی معلومات محض بین الموضوعاتی دلچسپی کی ہیں۔ یہ اپنا علاحدہ نظریہ تشکیل نہیں کرسکا ہے۔

جغرافیائی سیاست (جیوپالیٹکس) کوتنسی رائٹ کی نگاہ میں سیاسی جغرافیہ کا "فن" ہے جس کا مقصد عالمی سیاست میں طبعی ماحول سے فائدہ اٹھانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جیوپالیٹکس سے مراد "ممالک کے بیرونی سیاسی مسائل خصوصاً قومی طاقت، سرحدوں اور توسیعی امکانات سے متعلق مسائل پر سیاسی اور معاشی جغرافیہ کا اطلاق ہے"۔ چنانچہ اسے اطلاقی سیاسی جغرافیہ کہا جاسکتا ہے۔ درحقیقت جغرافیہ سیاسی جب ایک فن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو وہ جیوپالٹکس کہلاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بین الاقوامی میدان میں سیاسی اور اسٹراٹجک اغراض حاصل کرنے کے لیے جغرافیائی ماحول سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جیوپالٹکس کی "سائنس" دونوں جنگوں کے درمیان جرمنی میں ایجاد ہوئی۔ لیکن اصلاً یہ سائنس نہیں بلکہ چند قیاسات اور ناقابل تصدیق مفروضات کا مجموعہ تھی۔ اس کا اصل مقصد علاقائی توسیع کا علمی جواز تلاش کرنا تھا۔ چنانچہ بعض حلقوں میں سرے سے اس کی علمیت کا انکار کیا گیا اور اس کی مذمت کی گئی۔ چونکہ یہ ایک مادی حقیقت ہے کہ روئے زمین پر وسائل کی تقسیم بے ضابطہ اور غیر مساویانہ ہے لہٰذا جیوپولیٹکل قیاسات اور مفروضات سے مفر نہیں اور اسی لیے اب بھی جغرافیائی عوامل کے حوالہ سے سیاسی ساختوں مثلاً سلطنتوں، بالادستی، دائرہ اثر، منطقۂ نفوذ وغیرہ کی تشریح اور ان سے متعلق پیش گوئی کے لیے مفروضات پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کے مفروضات عموماً متعلقہ زمانہ میں ٹکنالوجی کی حالت سے متعلق مسائل پر مبنی ہوتے ہیں۔

جیوپولیٹکل نظریہ سازوں کی، خواہ وہ پرانے ہوں یا نئے، ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ فرض کرتے ہیں کہ موجودہ مملکتی نظام جس کا کردار نیم منظم نراج کا ہے، اور علاقائی قوم پروری غیر معینہ مدت تک قائم رہے گی اور قومی مملکتوں کے روابط میں تعاون کے بجائے مقابلہ اور کشمکش کا غلبہ رہے گا۔ لیکن پرانے نظریہ سازوں نے جس میں کپتال الفرڈ، تھیئر ماہن، سر ہالفرڈ جے میکنڈر اور السورتھ ہن ٹنگٹن قابل ذکر ہیں۔ ارضی اور فضائی عوامل کی جبریت کے قائل ہیں۔ یعنی ان کے سامنے جدید سائنس پر مبنی ٹکنالوجی کی انقلابی ترقیوں کا کوئی نقشہ نہیں تھا۔ اور وہ یہ باور نہیں کرسکتے تھے کہ انسان کبھی اپنے زور بازو سے روئے زمین کو یا جیوپولیٹکل حقائق کی سیاسی اہمیت کو بدل سکے گا۔ اس کا ثبوت اسرائیل، تائیوان اور جنوبی کوریا کی مثالوں سے ملتا ہے جنھیں کلاسیکی مفروضات کے برخلاف ہمسایہ بڑی طاقتیں اس لیے جذب نہیں کرسکیں کہ ان کے دفاع کی ذمہ داری امریکا کی نیوکلیائی طاقت اور برتر فوجی صلاحیت پر ہے۔ اس کے برخلاف بعض معاصر جیوپولیٹکل نظریہ ساز کھل کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صنعتی اور ٹکنالوجی کے اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک جغرافیائی نقشوں کو بدل سکتے ہیں یا جغرافیائی ماحول میں مضمر سیاسی مواقع کو اپنے حق میں بدل سکتے ہیں۔ قوموں کے درمیان ٹکنالوجی کے تفاوت کی اہمیت بڑھتی جائے گی کیونکہ اسی سے ان کی نسبتی فوجی و سیاسی اور اقتصادی طاقت کی سطحوں کا اشارہ ملتا ہے۔ اس طرح کے نمائندہ افکار ولیم تھامس جوئیر کی مرتبہ کتاب "روئے زمین کو بدلنے میں انسان کا رول" (1956) میں ملتے ہیں۔

سیاسی سماجیات (Political Sociology) : سیاسی سماجیات ایک نیا علمی مضمون ہے جو سیاسیات اور سماجیات کی حدود کے مابین واقع ہے۔ اسے سیاسیات اور سماجیات دونوں ہی اپنی شاخ تسلیم کرتی ہیں۔ اسی طرح سیاسی سماجیات کی تدریس و تحقیق پرانی جامعات میں سیاسیات اور سماجیات دونوں کے شعبوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک بین الموضوعاتی (Interdisciplinary) مضمون ہے جو امریکی محققوں کی سیاسیات و سماجیات کی کاوشوں اور سماجی علوم میں سلوکی انقلاب کا مرہون منت ہے۔ امریکی علم سیاسیات پر سماجیات اور دوسرے سماجی علوم کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جارہا ہے۔ سیاسی سماجیات دونوں مضامین سے الگ اپنا انفرادی وجود رکھتی ہے۔ یہ سماجیات کی شاخ اس لیے نہیں ہے کہ سماجیات میں محض سماجی طبقوں اور ان طبقوں پر مرتب ہونے والے مخصوص سماجی اثرات اور سماجی کنٹرول کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ کنٹرول مخصوص حالات میں اور محدود پیمانہ پر کام کرتا ہے۔ لیکن سیاسیات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اور حکومت کو سماج کے اندر آزاد اور منفرد عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کو سماج کے دوسرے گروہ کنٹرول نہیں کرتے بلکہ حکومت سب پر بالادستی، حاکمیت اور فوقیت رکھتی ہے۔ اور سیاسی و سماجی تبدیلی لاسکتی ہے۔ حکومت کے مطالعہ میں روایتاً سیاسی اداروں پر زور دیا گیا ہے۔ سیاسی سماجیات میں سیاسی اداروں کا ان کے سماجی گردو پیش میں اور سیاسیات پر سماجی طاقتوں کے عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال سمیورلپسٹ کی "سیاسی انسان : سیاسیات کی سماجی بنیاد" (Political Man : The Social Basis of Politics, 1960) میں ملتی ہے۔ تحلیلی اعتبار سے سماج مملکت سے مقدم ہے یا مملکت سماج سے اس بحث کی اب زیادہ اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ کیونکہ اب محققین متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ سماجی علوم کا مقصد انسان کی تمام کارروائیوں اور اس کے تمام اداروں کا مطالعہ کرنا ہے۔ دائرہ کار جداگانہ ہونے کے باوجود ہر سماجی مضمون کا ہدف سماجی نظام کے اندر انسان کے برتاؤ کا تجزیہ کرنا ہے۔ المختصر سیاسی سماجیات، سماج اور مملکت، سماجی ڈھانچوں اور سیاسی اداروں کے درمیان باہمی رشتوں کا معروضی اور علمی مطالعہ ہے۔

سیاسی سماجیات کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس میں سیاسی گروہوں اور سیاسی قیادت کی تنظیم اور کارکردگی پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اس مضمون میں سیاسی جماعتوں کی رسمی وغیر رسمی دونوں طرح کی تنظیم سے اور سرکاری بیوروکریسی، نظام قانون، مفادی گروہ اور رائے دہندگان سے ان کے ربط کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کی مخصوص تعریفوں سے قطع نظر سیاسی سماجیات کا اصل سروکار اس حقیقت سے ہے کہ سیاسی نظام کو صحیح معنوں میں کس طرح جمہوری بنایا جاسکتا ہے اور سیاسی جمہوریت کے اقتصادی، سماجی اور نفسیاتی شرائط و لوازمات کیا ہیں۔

سیاسی نظام کا اصل کام سماج کے اندر وسائل اور سہولتوں کی تقسیم ہے۔ لیکن نظام کی کارکردگی کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اول اس کے بنیادی اصولوں کو اس کے ارکان تسلیم کریں۔ دوم، وہ سماج کے اندر مفادات اور اقدار کے اختلافات سے نبرد آزما ہوکر انھیں رفع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ان دونوں مسائل سے اجتماعیت میں جواز (Legitimacy) اور نزاع (Cleavage) کی سرخیوں کے تحت بحث کی جاتی ہے۔ سیاسی اجتماعیات کے اصل موضوعات بھی یہی ہیں۔ سیاسی جواز کے مسائل (یعنی حکومت کو حکمرانی کا تسلیم شدہ حق حاصل ہو) حاکیت کا جواز کن طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ (آیا روایت کے ذریعہ یا غیر معمولی شخصی صفات کے ذریعہ یا قانون اور دستور کے ذریعہ) جواز کی مختلف شکلوں کے کیا نتائج ہوں گے؟ کسی حکومت کے جواز کو کن طریقوں سے تقویت پہنچائی جاسکتی ہے؟ حکومت کیوں کر موثر ہوسکتی ہے؟ جمہوری سیاسی نظام کن وسائل سے سماجی نزاعات کو رفع کرتے ہیں؟ جماعتی نظام اور رائے دہی کے طریقے، نمائندگی کے معقول ہونے کا مسئلہ، سماجی طبقے اور سیاسیات، مذہب اور سیاسیات، طبقہ، مذہب، علاقہ اور زبان کا تعامل وغیرہ۔ یہ سیاسی سماجیات کے موضوعات تحقیق کی کوئی جامع یا مکمل فہرست نہیں ہے۔ ان کی دلچسپی سیاسی جواز، سیاسی استحکام، اتفاق اور اختلاف رائے دہی کے عمل کے تجزیہ یا نمائندگی کے مسائل سے ماورا بھی ہے۔ یعنی سیاسی شعور پذیری (Political Socialization) مختلف سطحوں پر سیاسی اشتراک (Political Participation) نئی سماجی اور سیاسی تحریکات کے پیچھے کارفرما حالات اور محرکات، سیاسی تغیر وغیرہ وغیرہ کے موضوعات پر کافی لٹریچر سامنے آچکا ہے۔

سیاسی عزلت پسندی (Political Isolationism):

"عزلت پسندی" (Isolationalism): خارجہ امور میں دوسری طاقتوں کے معاملات میں غیر مداخلت اور بین الاقوامی سیاست سے بے تعلقی کی پالیسی کا نام ہے۔ اکثر وسیع تعمیمات کی طرح "عزلت پسندی" کی اصطلاح کی بھی کوئی قطعی یا متعین تعریف نہیں کی جاسکتی۔ کسی ملک کی بین الاقوامی برادری سے عزلت کی کئی قسمیں ہیں:

(1) جغرافیائی عزلت مثلاً چین اور جاپان صدیوں تک باہر کی دنیا سے بالکل بے تعلق رہے تا آنکہ یورپی طاقتوں سے ان کا سامنا ہوا۔ لیکن نئی دنیا میں نقل وحمل کی ایجادات، بین الاقوامی لین دین اور انحصار باہم کی ضرورت کے پیش نظر آج مکمل جغرافیائی عزلت محال ہے۔

(2) یورپ میں سولہویں سے انیسویں صدی تک توازن طاقت کے اصول کے تحت کچھ عظیم طاقتیں متحد ہوکر ہر اس طاقت کو بین الاقوامی برادری سے باہر کردیتی تھیں جو بہت زیادہ طاقتور ہونے یا دوسروں پر غالب ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ بیسویں صدی میں اس طرح کی سیاسی عزلت کی مثالیں معاہدہ وارسا کے تحت جرمنی کی اور 1949ء کے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

355

بعد سے 1971ء تک ریاست ہائے متحدہ امریکا کے ہاتھوں عوامی جمہوریہ چین کی ہیں۔

(3) وسیع و عریض علاقہ اور سمندری سواحل رکھنے والی اس عظیم طاقت کی عزلت پسندی جو معاشی طور پر بڑی حد تک خود کفیل ہو اس طرح کی طاقت بیرونی دنیا سے تجارتی تعلقات رکھتی ہے لیکن محض فوجی وسیاسی ذمہ داریاں اٹھانے سے گریز کرتی ہے۔ اس قسم کی پالیسی پر ریاست ہائے متحدہ امریکا اپنے قیام سے پہلی جنگ عظیم تک کاربند رہا۔

انیسویں صدی میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی عزلت پسندی کے معنی محض براعظم یورپ کے فوجی وسیاسی معاملات سے کنارہ کشی کے تھے۔ اس عرصہ میں نہ صرف اس کے بیرونی دنیا سے سفارتی، تجارتی اور تہذیبی تعلقات برقرار رہے بلکہ وہ خود اپنے منطقۂ نفوذ یعنی جنوبی امریکا میں سامراجی مداخلت کی کارروائیاں کرتا رہا اور اس نے کرۂ ارض کے نصف غربی حصہ پر اپنا تسلط قائم کیا۔ 1864ء میں امریکا نے جاپان کے خلاف برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کا ساتھ دیا۔ اس عزلت گزینی کا بڑا سبب سیاسی تھا۔ امریکا پرانی دنیا سے جغرافیائی طور پر الگ اور اقتصادی طور پر خود کفیل تھا۔ اسے یورپ کی اقتدار کی سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا سیاسی نظام جمہوریت، حریت اور مساوات پر مبنی تھا۔ اس کے پہلے صدر جارج واشنگٹن نے امریکا کو دائمی اتحادات اور یورپی سیاست سے ملوث کرنے کی ممانعت کی تھی۔ امریکی سیاست داں یورپ کے معاملہ میں اس سیاست پر اس لیے کامیابی سے گامزن رہ سکے کہ انیسویں صدی میں برطانیہ کے زیر اثر یورپی توازن طاقت کے مستحکم رہنے سے امریکا کی سلامتی کو کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں امریکا کو اتحادیوں کے حق میں مداخلت کرنی پڑی۔ اس کے بعد وہ پھر عزلت گزین ہوگیا۔ دریں اثناء جمعیت اقوام کا نظام امریکا کی عدم شمولیت سے دیرپا ثابت نہیں ہوا اور دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ میں دنیا کا توازن خطرہ میں پڑ گیا۔ چنانچہ اس جنگ میں امریکا نے اپنی پوری طاقت اتحادی طاقتوں کے حق میں صرف کردی اور جنگ کے بعد سے وہ عالمی طاقت ہونے کے ناطہ دنیا کے ہر خطہ کے امور پر نگاہ رکھنے لگا۔ اس کے سیاسی ودفاعی مفادات اب عالمگیر ہیں۔ برطانیہ بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنی "شاندار عزلت" سے دست بردار ہوگیا اور اس نے امور عالم میں نمایاں اور اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ موجودہ دور کے جغرافیائی، اقتصادی، سیاسی اور ٹیکنالوجی کے حقائق کے پیش نظر کسی ملک کی خارجی سیاست عزلت گزینی پر مبنی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

سیاسی عمل (Political Process) : سیاسی عمل سے مراد وہ تمام واقعات کارروائیاں اور تعاملات ہیں جو سیاسی نظام کے اندر واقع ہوتے ہیں۔ عملی نہج فکر (Process Approach) جملہ سائنسی منہاج فکر میں سے ایک ہے اور ہر فطری اور سماجی علم میں مستعمل ہے۔ کائنات کی کیفیات کو سمجھنے کے لیے انھیں تحلیلی مقصد سے مختلف عملوں (Processes) میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ مثلاً طبیعاتی، کیمیائی، حیاتیاتی، نفسیاتی، سماجیاتی، سیاسی، معاشی وغیرہ۔ ہر ایک عمل، متعلقہ کیفیات کے تجزیہ کے ایک مختلف زوایہ یا طرز فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ جدید سیاسیات میں عمل نہج فکر پرانی سیاسیات کے رسمی قانونی نہج فکر کے ردّ عمل کے طور پر اپنایا گیا، جس کے مطابق سیاست محض بے جان ڈھانچوں، مملکت اور اس کی شاخوں اور ان کی رسمی تنظیم اور قانونی فرائض کے مطالعہ سے عبارت تھی۔

سیاسی عمل سے مراد انسانی گروہوں کی وہ تمام کارروائیاں ہیں جن کے ذریعہ وہ ذاتی یا گروہی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اقتدار پانے یا اقتدار کو استعمال کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ عمل وحدانی اور وفاقی مملکتوں میں، سرکار کے مرکزی اداروں میں، قانونی اقتدار کی جگہیں حاصل کرنے کے لیے مختلف سیاسی پارٹیوں، دھڑوں، ٹولوں اور قائدوں کی کوششوں کو محیط ہے۔ اسی طرح یہ عمل قوموں اور بین الاقوامی بلاکوں کے درمیان لامتناہی تنازعات میں بھی جاری وساری ہے۔ یہ عمل نہ صرف قومی اور بین الاقوامی سطح بلکہ تحت القومی سطح پر بھی کام کرتا ہے۔ یعنی سیاسی کشمکش کی کیفیات کارپوریٹ اداروں کی اندرونی حکمت میں سرکاری اداروں میں، کلیساؤں میں، جامعات میں، مزدور انجمنوں میں، کلبوں میں، مقامی آبادیوں میں بھی کام کرتا ہے۔ سیاسی عمل کے مقاصد اور ذرائع متنوع اور متعدد ہیں۔

اس نہج فکر کے پیش روؤں میں والٹر بیج ہاٹ، ووڈرو ولسن، جیمس برائس اور آرتھر بنٹلی اور بانیوں میں گیبریل ایلمنڈ، رابرٹ ڈھل، جان ڈیوی، ڈیوڈ ایسٹن، وی. او. کی. جونئر، ہیرلڈ لیسویل، چارلس میریم، ٹیلکاٹ پارسنس، ہربرٹ سائمن اور ڈیوڈ ٹرومین نمایاں ہیں۔

بنٹلی کی تصنیف "حکومت کا عمل" (1967/1908) مرتبہ ایچ.

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اوڈیگرڈ (Arthur F. Bentley, The Process of Government) اس سمت میں انقلابی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے سیاسی عمل کو حکومت سے باہر، سرکاری اداروں اور سماجی گروہوں کے تعامل میں دیکھا۔ بنٹلی کی پیروی میں دوسرے مصنفوں نے حکومت کے اندر اور باہر متعدد قسم کے منظم گروہوں کی کارروائیوں کا مطالعہ کیا اور اس سے آگے بڑھ کر افراد، ان کے مشترکہ مفادات اور اخلاقی اقدار پر بھی توجہ کی۔ اس نہج فکر کا نتیج "گروہی نظریہ" (Group Theory) ہے جسے ڈیوڈ ٹرومین کی کتاب "سرکاری عمل" (David B. Truman, The Governmental Process, 1951) اور ارل لیتھم کی "سیاسیات کی گروہی بنیاد" (Earl Latham, The Group Basis of Politics, 1952) میں مستند طور سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ گروہی نظریہ کا تجربی اطلاق کامیاب نہیں ثابت ہوسکا اس لیے اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود دوسرے مناہج یعنی فلسفیانہ، قانونی، تاریخی، تجربی، سلوکی اور نظامیاتی طریقوں سے سیاسی عمل اور اس کی ضمنی شاخوں اور اقسام (انتخاباتی، تشریعی، عدالتی، تنقیدی، انتظامی اور بین الاقوامی) کا مطالعہ جاری ہے۔ ان میں سے ہر موضوع کے مزید شاخ در شاخ ہونے کا رجحان بھی قائم ہے۔

سیاسی فلسفہ (Political Philosophy) : سیاسیات کے مطالعہ میں چار خاص مناہج پائے جاتے ہیں۔

(1) تاریخی: یعنی امر واقعی یا جو کچھ پہلے ہو چکا یا اب ہورہا ہے اس کی دریافت سیاسی مورخ کا کام ہے۔

(2) سائنسی: یعنی حقائق کے مطالعہ سے عام قوانین یا نظریات اخذ کرنا جن کی بنیاد پر مستقبل کے رجحانات اور امکانات کی پیش گوئی کی جاسکے۔ یہ کام ماہر سیاسیات (پولیٹیکل سائنٹسٹ) کا ہے۔ سائنس کا مقصد تجربی مشاہدہ کرنا، منطقی استنباط کرنا، تشریحی تصورات اور منظم نطاق فکر قائم کرنا ہے۔ جن کے ذریعہ امکانات اور رجحانات (Tendencies) کی نشان دہی کی جاسکے۔ دوسرے لفظوں میں سائنسی نظریہ کا مقصد، تشریح اور پیش گوئی دونوں ہیں۔

(3) فلسفیانہ : یعنی یہ معلوم کرنا کہ انسان یا سماج کے لیے کیا مستحسن (Desirable) ہے۔ یہ کام سیاسی فلسفی کا ہے۔

(4) عملی : یہ دریافت کرنا کہ کن حالات میں کون سی پالیسی یا طرز عمل ممکن (Possible) ہے، سیاست داں کا کام ہے۔ اطلاقی سیاسیات، سیاست دانوں اور پالیسی سائنٹسٹوں دونوں کا میدان ہے۔

ان میں سے فلسفیانہ طرز فکر سیاسیات کے مطالعہ میں قدیم ترین ہے جو دو ہزار برس قبل مسیح سے لے کر کم و بیش انیسویں صدی تک غالب رہی۔ عصر حاضر میں تجربی اور سائنسی طرز فکر کے حاوی ہونے سے فلسفیانہ طریقہ کالعدم نہیں ہوا بلکہ اس کا اثر اور اس کا چلن بدستور باقی ہے۔

فلسفہ کا مقصد انسانی زندگی اور اداروں میں غایت اور معنی کی دریافت ہے۔ اس کا سرچشمہ ذاتی غور و فکر، استدراک اور اذعان ہے۔ جبکہ سائنس کا مقصد محض حقائق کی دریافت اور ان کی تشریح ہے۔ اور اسے انسانی اقدار یا مقاصد سے سروکار نہیں۔ گو فلسفہ سائنس میں ان سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ فلسفہ کا مقصد انسانی محرکات، اقدار، عقاید اور معیاروں کی تشریح ہے۔ اس کا مقصد حقائق کے علم میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ فہم و دانش میں اضافہ کرنا ہے۔ فلسفہ کی اصل شاخیں مابعدالطبیعیات (Metaphysics)، معنویات (Epistemology) منطق اور اخلاقیات ہیں۔ سیاسی فلسفہ کا براہ راست رشتہ اخلاقیات سے ہے۔ سیاسی فلسفہ کا مقصد انسانی معاشرہ کے لیے صالح ترین سیاسی نظام کی تلاش ہے۔ اخلاقیات کا کام معروضی طور سے خیر کی دریافت اور شر کا ازالہ ہے۔

سیاسی فلسفہ کا مقصد یہ ہے کہ کن حالات میں کیا کیا جانا چاہیے اور اس مقصد کو کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مرکزی مسئلہ ابتدا سے یہ رہا ہے کہ فرد اور مملکت اور حاکمیت اور فردی آزادی کے درمیان کیا رشتہ ہونا چاہیے یا حاکمیت اور سیاسی اقتدار کو کس طرح محدود اور منضبط کیا جائے کہ مملکت کے اندر افراد صحیح سلامت رہتے ہوئے بہتر زندگی گزار سکیں۔ حاکمیت اور فرد کے حقوق، مملکت کی ماہیت، غایت، طریقہ کار اور اس کا دائرہ کارکردگی۔ آزادی و مساوات، سماجی انصاف، حکومت کے اندر انتظامی اداروں کا قانون ساز اداروں سے رشتہ، سیاسی تابعداری کی بنیادیں وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر ہر دور کے سیاسی مفکروں نے اپنے ماحول کے کوائف کے پیش نظر خیالات پیش کیے ہیں۔ ان فلسفیانہ افکار کا مطالعہ ان کے تاریخی پس منظر میں ہی صحیح طریقہ سے کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ علم میں سیاسیات اگرچہ تجربی ہے اور اس کا مقصد حقائق کی تشریح ہے۔ لیکن سیاسی فلسفہ کو اس کا ایک اہم جزو تسلیم کیا گیا ہے۔ کیونکہ کسی

بھی انسانی یا سماجی مطالعہ میں بالآخر اقدار اور قدری فیصلوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ سماجی حقائق اور سماجی اقدار باہم پیوست ہیں۔

سیاسی فلسفہ کی اہمیت اور موجودہ دور میں اس کی معنویت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سیاسی فلسفہ ایک اہم ترین دانش ورانہ مضمون ہے۔ اس کے سیاسی عمل پر فیصلہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر معاہدہ عمرانی کے نظریات جمہوریت اور حریت پسندی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور انقلاب فرانس کے پس پشت کارفرما نظریات نے یورپ میں ہلچل مچادی۔ اسی طرح کارل مارکس کی تعلیمات دنیا کے مختلف حصوں میں اشتراکی انقلابات اور بائیں بازو کی تحریکوں اور تنظیموں اور نظریات کا سبب ہوئیں۔ آج کے سائنسی اور تکنالوجی کے دور میں اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ سیاسی فلسفہ سے موجودہ اہم مسائل مثلاً حکومت کے مقاصد اور دائرہ کار فرد اور گروہ کی آزادی اور مملکت کے مقابلہ میں ان کے حقوق، سیاسی انصاف وغیرہ کے حل تلاش کیے جائیں۔

سیاسی معیشت (Political Economy) : سیاسی معیشت سماجی علوم کی وہ شاخ ہے جس نے بعد میں علم معاشیات (اکنامکس) کی شکل اختیار کی۔ پرانے علم معاشیات کا مقصد مملکت کے مالیہ اور دوسرے عام وسائل کو بڑھانا تھا۔ ایڈم اسمتھ (Adam Smith) پہلا مفکر تھا جس نے معیشت سیاسی کے اصولوں کو مرتب اور منظم شکل میں اپنی کتاب "دولت اقوام" (The Wealth of Nations, 1936) میں پیش کیا اور اس کی یہ تعریف کی کہ یہ "دولت کا علم ہے" یا اس علم کے ذریعہ اقوام کی دولت کی ماہیت اور اس کے اسباب کی تلاش کی جاتی ہے۔ یہ اصطلاح سترہویں صدی کے شروع میں ان معاشی یا اقتصادی و سیاسی مسائل کے مطالعہ کے لیے استعمال ہوئی جو قرون وسطی کے خاتمہ پر یورپ میں جاگیردارانہ، مذہبی، سیاسی نظام کے انتشار کے بعد ظہور پذیر ہوئے تھے۔ جبکہ سیاسی اور مذہبی تاریخ میں عہدوسطی اور دور جدید کے درمیان حد فاصل نہایت واضح ہے۔ معاشی یا اقتصادی تاریخ خصوصاً اقتصادی افکار کی تاریخ میں قرون وسطی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک ذرا بھی تغیر نہیں پایا جاتا۔ اٹھارہویں صدی میں قوم پرستی کا دور ختم ہوچکا تھا۔ اور فردیت یا حریت پسندی کی تحریک جنم لے چکی تھی، مغربی یورپ صنعت کاری کی راہ پر گامزن تھا اور عظیم طاقتوں نے یورپ سے باہر استعماری توسیع شروع کردی تھی۔ اسی زمانہ میں ان قومی مملکتوں کی حکومتوں نے اپنی دولت بڑھانے کے لیے عمداً منصوبہ بند اقتصادی پالیسیاں اور کارروائیاں اختیار کیں۔ مملکت کی اقتصادی پالیسی پر مرکوز لٹریچر اس صدی کے آخر میں "تجاریت" (Mercantilism) کہلایا۔ یہ مکتبہ فکر قرون وسطی کی اخلاقیت پسندی (Moralism) اور آدم اسمتھ کے بعد کے دور کی سائنس پسندی (Scientism) کے درمیان حد فاصل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت اخلاق پسندانہ عملیت (Moralistic Pragmatism) ہے۔ اس زمانہ کی معاشیات یا علم الاقتصاد کے لٹریچر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) وہ تصنیفات جن میں اقتصادی پالیسی کے کسی فوری مسئلہ سے بحث کی گئی ہو یا (2) حکمرانوں اوران کے وزیروں کی رہنمائی کے لیے تیار کی گئی کتابیں جن میں حکمرانی اور اقتصادی امور کے انتظام کے لیے ضوابط اور مشوروں کی تدوین کی گئی ہو۔

پرانے اقتصادیو ں یا تجاریوں کی تحریروں کی دوسری نمایاں خصوصیت ان کی سیاسی نوعیت تھی۔ یہ ناگزیر تھا۔ کیوں کہ ان کا مقصد مملکتی پالیسی کی رہنمائی کرنا تھا۔ ان کا نصب العین اقتصادی حقائق کا تجربی یا نظری مطالعہ کرنا یا نظریہ سازی نہیں تھا۔ یہ ارتقاء بعد کی بات ہے۔ یہ لوگ یا تو حکومت وقت یا کسی گروہ، طبقہ یا پادریوں کی حمایت کی ترجمانی کرتے تھے۔ تیسری خصوصیت اس لٹریچر کی یہ ہے کہ اس کی اصطلاحات میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ مغربی یورپ میں تجاریت کا دور اٹھارہویں صدی کے وسط تک ختم ہو چکا تھا۔

فرانس میں طبعیوں (Physiocrats) اور انگلستان میں آدم اسمتھ کے ساتھ علم معاشیات نے ایک تجربی علم کی حیثیت اختیار کی اگرچہ اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی تحریروں میں فلسفہ یا اخلاقیات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ نئے علم معاشیات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے طریقہ، ساخت اور عام طرز فکر میں سائنسی ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں ڈیوڈ رکارڈو کی "اقتصادی و سیاسی اور ٹیکس کاری کے اصول" (1817) اور جان اسٹورٹ کی "سیاسی معیشت کے اصول" (1948) میں پیداوار قدر، مبادلہ اور تقسیم کے مسائل پر توجہ دی گئی۔ 1750 سے 1920 تک کے عرصہ میں اقتصادیات کے کئی مکاتیب فکر کا عروج اور زوال ہوا تھا۔ اس زمانہ کے لٹریچر کو کلاسیکی اقتصادیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے ماہرین معاشیات کے درمیان زبردست فکری اور اسلوبی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اشتراکیت اور انفرادیت، آزاد تجارت اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تحفظ پسندی، اور تاریخی و تحلیلی طریقوں کے حامیوں کے درمیان نزاعات۔

بیسویں صدی کے آغاز میں "سیاسی معیشت" کی جگہ "اقتصادیات یا معاشیات" کی اصطلاح رائج اور راسخ ہوئی جس سے اس مضمون کی ماہیت، طریق فکر اور مقصد میں بنیادی تبدیلی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ موجودہ اقتصادیات ایک تحلیلی اور علمی میدان ہے جس کی غرض اقتصادی زندگی کے حقائق اور عوامل کا مطالعہ کرنا اور ایک عام اقتصادی نظریہ کی تشکیل ہے جس کے ذریعہ اقتصادی نظام کی کارکردگی کو سمجھا جاسکے۔

علم اقتصادیات نے اب تک بے انتہا ترقی کی ہے اور اس کی شاخوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔

سیاسی نظام (Political System) : سیاسی نظام ایک تجربی حقیقت بھی ہے اور ایک تحلیلی تصور بھی۔ بطور ایک تجربی حقیقت کے سیاسی نظام کے تین مفہوم ہیں(1) روایتی مفہوم: یعنی سیاسی نظام، مملکت وحکومت کے مترادف ہے۔

(2) جدید مفہوم: یعنی سیاسی نظام میں مملکت، دستور و قانونی تنظیم کے علاوہ سیاسی زندگی کی دوسری حقیقتیں اور سیاسی برتاؤ کی واقعی اور مطلوبہ شکلیں بھی شامل ہیں۔

(3) وسیع ترین مفہوم میں سیاسی نظام فقط مملکت وحکومت سے وابستہ نہیں بلکہ سماجی نظام کے ہر اس بین تفاعلی (Interaction) مجموعہ کو سیاسی نظام قرار دیا جاسکتا ہے جس میں نمایاں حد تک اقتدار، حکمرانی یا حاکمیت کے رشتے پائے جائیں۔ سیاسی عمل وہ عمل ہے جس کی غرض اقتدار اور اثر کا حصول ہو۔ اس لحاظ سے سیاست محض مملکت تک محدود نہیں رہتی بلکہ سماج کی آزادانہ انجمنوں اور غیر حکومتی اداروں میں بھی سیاست، سیاسی کاروباری فرموں، ٹریڈ یونینوں اور دوسرے گروہوں کے سیاسی نظام کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

ٹی بی بوٹو مور نے اپنی کتاب "اجتماعیات" (Sociology, 1962) میں سیاسی نظاموں کی اس طرح سے زمرہ بندی کی ہے:

(1) ابتدائی معاشرے۔

(الف) وہ جن میں ممیز اور مستقل سیاسی ادارے نہیں پائے جاتے۔

(ب) وہ جن میں ممیز اور مستقل سیاسی ادارے پائے جاتے ہیں۔

لیکن جن پر قرابتی رشتوں اور مذہب کا گہرا اثر ہے۔

(2) شہری مملکتیں: (مثلاً وہ جو 300-500 برس قبل مسیح بحیرہ متوسط کے سواحل پر پائی جاتی تھیں)

(3) شہری مملکتوں پر مبنی سلطنتیں۔

(4) ایشیائی مملکتیں جہاں مرکزی بیوروکریسی کام کرتی ہے۔

(5) قومی مملکتیں (Nation States)

(الف) جدید جمہوری مملکتیں

(ب) جدید استبدادی اور کلیت پسند مملکتیں۔

(6) قومی مملکتوں پر مبنی سلطنتیں۔

اس فہرست میں دو مزید اجزاء شامل کردیے جائیں تو یہ فہرست مکمل تو نہیں، کسی حد تک نمائندہ ضرور ہو سکتی ہے۔

(1) فوق القومی (Super National) سیاسی نظام جن میں سلطنتوں کے ساتھ بین الاقوامی تنظیمیں (مثلاً جمعیت اقوام یا اقوام متحدہ) کنفیڈریشن (مثلاً متحدہ جمہوریہ عرب)۔ اقلیتی تنظیمیں (مثلاً تنظیم اتحاد افریقی، عرب لیگ، انجمن اقوام جنوب مشرقی ایشیاء)، معاہدات (مثلاً شمال اطلس دفاعی تنظیم اور معاہدہ وارسا کی دفاعی تنظیم، وسطی ایشیائی معاہدہ کی تنظیم) اور فوق القومی معاشی تنظیمیں (مثلاً یورپی اقتصادی برادری اور کونسل برائے اقتصادی تعاون) وغیرہ۔ اور (2) تحت القومی (Subnational) جن میں قبائلی جماعتیں دیہی جماعتیں، شہر اور علاقہ شامل ہیں۔ یہ کوئی واحد زمرہ بندی نہیں۔ میکس ویبر (Max Waber) نے سیاسی نظاموں کو روایتی، شخصی اور عقلی قانونی خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

سیاسی نظاموں کی مکمل ترین ترتیب کی ایک کوشش کارل فرائڈرخ نے اپنی کتاب "انسان اور اس کی حکومت" (Man and His Government, 1963) میں کرکے 14 اقسام شمار کرائی ہیں۔ (1) نراج، (2) طوائف الملوکی، (3) پجاری بادشاہ کے تحت قبائلی حکمرانی، (4) استبدادی ملوکیت، (5) طبقہ امراء کی اعانیت، (6) اہل ثروت کی اعانیت، (7) دینی طبقہ

کی اعانیت، (8) براہ راست جمہوریت، (9) شخصی آمریت، (10) موروثی بادشاہت کے تحت دفتر شاہی نظام، (11) پارلیمانی کابینی حکومت۔ (12) صدارتی کانگریسی حکومت، (13) فوجی آمریت، (14) کلیت پسند آمریت۔

سیاسی نظاموں کی ان زمرہ بندیوں کا معیار اداراتی (Institutional) ہے جبکہ علمائے اجتماع کا رجحان عملیتی (Functional) معیاروں کو اپنانے کی سمت میں ہے۔ چنانچہ ولیم کارن ہاوزر (William Kornhouser) نے اپنی تصنیف "جماہیری معاشرہ کی سیاسیات" (The Politics of Man Society, 1959) ۔ میں حکمرانی خواص اور محکوم عوام کے درمیان رشتہ کو اور سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان روابط کو بنیاد بنایا۔ کارل ووئچ (Karl W. Deutch) نے "حکومت کے اعصاب" (The Nerves of Government, 1963) میں سیاسی نظام کو مواصلات اور کنٹرول کا ایک نظام قرار دیا۔ گیبرل ایلمنڈ اور سڈنی وربانے اپنی تصنیف "مدنی کلچر: رویے اور جمہوریت پانچ اقوام میں" (The Civic Culture : Attitudes and Democracy in Five Nations, 1963) میں مخصوص ملکوں کے مخصوص سیاسی کلچر کو وہاں کا سیاسی نظام قرار دیا ہے۔ لیکن یہ زمرہ بندیاں ماہرین قانون کے لیے افادیت سے عاری ہیں کیونکہ ان کی تحلیلی اکائیاں ٹھوس اور شخصی مملکتی ادارے ہیں۔

ایک تحلیلی تصور (Analytical Concept) کے طور پر "سیاسی نظام" محض ایک نظری ماڈل ہے جو تجربی سیاسی نظاموں کا تجزیہ کرنے کے لیے تشکیل کیا گیا ہے۔ یہ تصور جدید سیاسی تحلیل کا بنیادی تصور ہے جو اس کے موجدوں کے خیال میں روایتی علم سیاسیات کے بنیادی تصور، مختلف "مملکت" کی تحلیلی خامیوں کی تلافی کرتا ہے۔ سیاسی نظریہ سازوں نے "سیاسی نظام" کے جو مختلف ماڈل تخلیق کیے ہیں ان کی حیثیت محض رہنما افادی ماڈل کی ہے۔ وہ قطعیت یا جامعیت کی حامل نہیں۔ علم سیاسیات میں "سیاسی نظام" کا تصور فطری اور سماجی علوم کے اتباع میں اور عام نظامیاتی نظریہ (General Systems Theory) سے متاثر ہو کر تشکیل کیا گیا ہے۔ نظامیاتی نظریہ موجودہ فلسفہ علم (Philosophy of Science) میں ایک پروگرام یا تحریک ہے جس کا مقصد سارے انسانی علوم کو یکساں طریقہ تحقیق کے ذریعے مجتمع کرتا ہے۔ اس عام طرز فکر کے تحت کسی بھی سائنسی نظریہ یا ٹیکنالوجی کے مسئلہ کو بخوبی بیان کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جس طرح ایک انجینئر مختلف مادی اجسام کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے میکانکی نظام تشکیل کرتا ہے اسی طرح ماہر اقتصادیات چند عوامل کے درمیان رشتے مقرر کرکے اقتصادی نظام بناتا ہے اور اس طرح ماہر سیاسیات چند عوامل کے مجموعہ سے سیاسی نظام کا تصور قائم کرتا ہے۔

فطری علوم میں علم نظامیات کا تصور سب سے پہلے ایک جرمن فلسفی لڈوبگ فان برٹالانفی (Ludvig Von Bertalanffy) نے پیش کیا۔ فطری علوم کی نظامیات سے متاثر ہوکر سماجیات میں ٹیلکاٹ پارسنس (T.Parsons) نے "سماجی نظام" (Social System) کا تصور پیش کیا اور اس کی تصنیفات "سماجی نظام" (The Social System, 1951) اور ایڈورڈ شلز کے ساتھ ایک عام نظریہ "عمل کی سمت" (Towards a General Theory of Action, 1952) اور "جدید سماجوں کی ساخت اور عمل" (Structure and Process in Modern Societies, 1960) نے امریکی علمائے سیاست کو کافی متاثر کیا۔ گیبریل ایلمنڈ پہلا مفکر ہے جس نے پارسنس کی پیروی میں "سیاسی نظام" کا تصور پیش کیا۔ اس کی تعریف کے مطابق سیاسی نظام وہ نظام عمل ہے جس کے ذریعے سیاسی فیصلے کیے جاتے اور نافذ کیے جاتے ہیں۔ اس نظام کی بنیادی اکائی رول (Role) یا ساخت (Structure) یا سیاسی ادارہ (Institution) ہے۔ ان رولوں (کارہائے منصبی) کو سیاسی قائد چلاتے ہیں۔ سیاسی نظام کے چند فرائض (Functions) ہیں جنھیں وہ اپنے ماحول کے سیاسی کلچر (Political Culture) کے مطابق انجام دیتا ہے سیاسی نظام کے سارے عناصر انحصار باہم کے تحت یا ایک دوسرے پر منحصر (Interdependent) ہوتے ہیں۔

ایلمنڈ کے سیاسی نظام کے ماڈل کا سب سے پہلے اطلاق ایلمنڈ اور جیمس کول من (مرتبین) کی "ترقی پذیر علاقوں کی سیاسیات" (The Politics of Developing Areas, 1960) میں ایشیا، افریقہ، مشرقی وسطی اور لاطینی امریکا کے ملکوں پر کیا گیا۔ اس کتاب کے مقدمے میں ایلمنڈ نے سیاسی نظام کے فرائض کے بارے میں حسب ذیل سات نکاتی اسکیم پیش کی۔

(الف) داخلی فرائض (سیاسی)

(1) سیاسی شعور کی تربیت اور سیاسی بھرتی۔

(2) مفادات کا اظہار۔

(3) مفادات کی جمع بندی۔

(4) سیاسی مواصلات۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(ب)۔ حاصلی فرائض (حکومتی)

(1) قانون سازی۔

(2) قانون کا اطلاق۔

(3) قانون کی تعبیر و تشریح۔

بعد میں اس اسکیم میں اس نے تین فرائض اور شامل کیے: داخلات یعنی مطالبات کو فیصلوں میں بدلنے کا کام۔ اپنے فرائض کی ادائیگی اور نظام کو برقرار رکھنے کی صلاحیت کا ترقیاتی منہاج" (1966) میں بتایا گیا ہے کہ سیاسی نظاموں کو اپنی ترقی کے عمل میں چار قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے مملکت کی تعمیر، قوم کی تشکیل، سیاسی اشتراک اور تقسیم کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

سیاسی نظام کی تحلیل میں نظامیات کی دو مختلف شکلوں سے کام لیا گیا ہے (1) ساختیاتی۔ عملیتی نظریہ جسے ہلمنڈ اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کیا اور (2) داخلاتی۔ حاصلاتی نظریہ (Input-output Theory) جس کا اطلاق ڈیوڈ ایسٹن نے اپنی کتابوں A Framework for Political Analysis (1965), اور A System Analysis of Political Life, 1965 میں سیاسی نظام کی تحلیل کے لیے کیا۔ اس کے بیان کے مطابق سیاسی نظام سماج کا وہ ذیلی نظام ہے جو سماج کے سبھی امکانات کو محیط ہے اور جو اقدار کی حاکمانہ تقسیم کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سیاسی نظام ان تمام کارروائیوں پر مشتمل ہے جن کا سروکار سماجی پالیسی کی تشکیل اور اس کی تنفیذ سے ہے۔ ایسٹن کے نزدیک سیاسی نظام کا سب سے بڑا مسئلہ اس کی بقا، استحکام اور کشیدگیوں کا ازالہ ہے۔ اس کے لیے نظام کی کامیابی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ ماحول کے مطالبات کو موزوں پالیسیوں اور فیصلوں میں تبدیل کرکے ماحول سے اپنے لیے حمایت حاصل کرے۔ اس کی بنیادی اسکیم یوں ہے:-

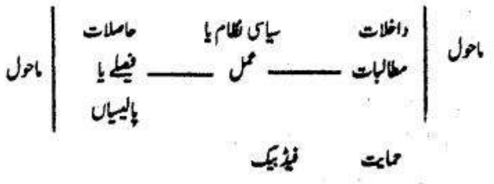

داخلاتی۔ حاصلاتی تحلیل سے کام لینے والوں مین کارل دوئچ اور ولیم مچل قابل ذکر ہیں (دیکھیے Karl W. Dentsch's, The Nerves of Government, 1963) اور (William O. Mitchell, The American Polity, 1962)۔ سیاسی نظام کے تحلیلی تصور پر بجا طور پر یہ نکتہ چینی کی گئی ہے کہ یہ ایک جامد تصور ہے۔ اس کا رجحان موجودہ اداروں کی کارکردگی کا عقلی جواز فراہم کرنے اور اس طرح سماجی قدامت پسندی کی حمایت کی جانب ہے۔

سیاسی نظریہ (Political Theory): سیاسی نظریہ، سیاسی فلسفہ، سیاسی فکر اور سیاسی آئیڈیالوجی سے مختلف ہے۔ سیاسی فلسفہ میں ان اخلاقی اقدار اور اہداف سے بحث کی جاتی ہے جو کسی خاص سماج کی پالیسی کی رہنمائی کرتے ہیں۔ سیاسی فکر سے مراد مخصوص ادوار میں مخصوص اقوام کے سیاسی خیالات/ عقائد اور تصورات سے ہے۔ سیاسی نظریۂ حیات (آئیڈیالوجی) کے معنی ان باہم مربوط عقائد اور اصولوں کا مجموعہ ہے جو فرد اور سماج کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی رہنمائی کرتا اور ان کے حال اور مستقبل کے طرز عمل کو متعین کرتا ہے۔ مثلاً اشتراکی یا فاشسٹ یا جمہوری نظریہ حیات۔ ان تینوں اصطلاحوں کے برعکس سیاسی نظریہ کی ماہیت یہ ہے کہ یہ سماج کے سیاسی پہلو کی تشریح کرتا ہے، معروضی ہے اور سیاسی زندگی کی تشریح کے مشن میں سیاسی حقائق اور سیاسی اقدار دونوں سے بحث کرتا ہے۔

تجربی یا سائنسی سیاسی نظریہ کا مقصد حقائق کو جمع کرنا، ان کو مرتب کرنا اور ان کی تشریح کرنا، اور اس کے ساتھ ان تجربی حقائق کی بنیاد پر تحلیلی تصورات اور جامع نظریات کی تشکیل کرنا ہے جن سے آئندہ سیاسی زندگی میں ایک نہج سے واقع ہونے والے حالات کی پیش گوئی اور تشریح کی جاسکے۔ ہر نظریہ تجریدی تعمیمات (Abstract Generalisations) کا مجموعہ ہوتا ہے جس کی مدد سے حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ سیاسی نظریہ کا کام سیاسی حقائق کی وضاحت کرنا اور علم سیاسیات کی دریافتوں اور معلومات کو مرتب کرنا اور ان کو ایک نظام میں پرونا ہے۔ سیاسی نظریہ ساز کا کام یہ ہے کہ وہ سیاسی حقائق کا ہر زاویہ اور ہر پہلو سے مطالعہ کرکے نتائج اخذ کرے اور مسائل کے حل کے لیے پالیسیوں کی سفارش کرے۔

معاصر سیاسی نظریہ کوئی جامع یا مرتب یا یکساں نظریہ نہیں بلکہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس سے مراد وہ تمام متنوع تصورات، نظریات اور فکری نقطہ ہائے فکر ہیں جنھیں مختلف نظریہ سازوں نے مختلف سطحوں پر، مختلف منہاج فکر کے مطابق اور مواد اکٹھا کرنے اور مواد کی تحلیل کے مختلف طریقوں سے کام لیتے ہوئے، تشکیل کیا ہے۔ چنانچہ سیاسی نظریہ کی حیثیت سرسری دعوؤں کی ہے۔ اسے ابھی صداقت یا حتمیت یا قطعیت کا درجہ حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ موجودہ سیاسی نظریہ کے چند اہم بنیادی تصورات میں : گروہ، اقتدار، کنٹرول، اثر، عمل، طبقہ خواص، فیصلہ سازی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے نمایاں مناہج : تاریخی، تقابلی، سلوکی، ساختیاتی عملیتی، مواصلاتی، عقلیتی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ موجودہ سیاسی نظریہ بڑی حد تک دوسرے ترقی یافتہ سماجی علوم مثلاً سماجیات، نفسیات، بشریات، عددیات اور معاشیات کا مرہون منت ہے۔ اس کا مقصد یکساں طور سے واقع ہونے والے واقعات کا معروضی اور غیر جانبدارانہ مشاہدہ کرکے قابل آزمائش مفروضات کی تشکیل کرنا ہے۔

سیکولرازم (Secularism) : سیکولرازم اور غیرمذہبی انداز فکر دراصل ہندستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک خاصا نیا نظریہ ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ پرانے فلسفوں میں اس کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ پرانی تاریخ اگرچہ مذہبی جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ محض قرونِ وسطیٰ کی صلیب و ہلال کی جنگیں ہی نہیں بلکہ عیسائیوں کے درمیان کیتھولک اور غیرکیتھولک فرقوں کی جنگیں بھی کافی تباہ کن رہی ہیں لیکن ہندستان کے حملہ آوروں کی لڑائیوں کو مذہبی جنگ یا جہاد کا نام نہیں دیا جاسکتا اس کے باوجود ان مٹ بھیڑوں میں مذہبی عوامل کارفرما رہے ہیں۔ اتنے زیادہ مذہبی جنون کے باوجود سیکولرازم بھی ایک نظریہ کے طور پر ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ ہندستان میں یہ ہندستان کی تاریخ جتنا قدیم ہے۔ قبل از مسیح زمانے میں بھی اشوک اعظم نے اور قرونِ وسطیٰ میں اکبراعظم نے ہر مذہب، ملت کے لوگ دربار میں شامل میں کیے مذہب کی بنیاد پر جانب داری کی پوری طرح مذمت کی گئی۔ اکبر نے جزیہ بھی ختم کردیا تھا۔

یہ کہنا تو ٹھیک نہ ہوگا کہ ہندستان میں فرقہ واریت موجود ہی نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس ذات پات کی بدولت ہندستان میں مکمل اتحاد کا جذبہ کسی بھی وقت موجود نہیں تھا۔ غیر ذات کے لیے برداشت کی کمی کی وجہ سے غیرمذہب کے لوگوں کو ملیچھ اور کافر سمجھنا معمولی بات تھی۔ آج بھی ہر سال تقریباً پانچ سو گمبھیر فرقہ وارانہ فسادات کا ہونا معمولی بات ہے۔ اس سب کے باوجود ہندستانی سماج کی خصوصیت ہے کہ پوری طرح مختلف ہندو مسلم دونوں اتنے بڑے گروپ جو نہ صرف تعداد بلکہ قوت کے اعتبار سے بھی منفرد تھے برسوں ساتھ رہتے رہے اور اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی۔ عموماً دو تہذیبوں کے ٹکراؤ میں کمتر تہذیب اپنے آپ کو پرقوت تہذیب میں مدغم کرلیتی ہے۔ ہندستان میں ایسا نہ ہوا اور ہندو مسلم اور دیگر مذاہب ساتھ ساتھ رہتے رہے اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی شکل میں ابھرے۔ محمد غزنوی اور راجہ جے پال، بابر اور رانا سانگا، اکبر اور رانا پرتاپ، اورنگ زیب اور شیواجی وغیرہ مختلف مذاہب کے ضرور تھے لیکن ان کی لڑائیاں مذہبی نہ ہوکر خالص سیاسی تھیں۔ انھیں روایتوں کے زیراثر آج بھی ہندستان میں اتنے فسادات کے باوجود یکجہتی کا ماحول ملتا ہے۔ اقلیتوں کی حالت خاصی بہتر ہے ان کو اپنی پہچان چھپانے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ پاکستان میں شیعہ اور احمدی، ایران میں بہائی، افغانستان میں شیعہ اور غیر مسلم اور کئی دوسرے ممالک میں غیرعیسائی اپنے آپ کو غیرمحفوظ سمجھتے ہیں۔ ہندستان میں کئی پہلوؤں سے اقلیتوں کی حالت بہتر ہے۔

ہندستان میں دور حاضر میں سیکولرازم اور قومی یک جہتی پر پہلی ضرب لارڈ کرزن کے زمانے میں پڑی جبکہ انھوں نے 1905 میں بنگال کی تقسیم کی اس کے بعد دوسری مشکل 1937 میں تجرباتی ہندستانی حکومت کے دور میں آئی جب انگریزوں نے مسلمانوں کو مسلمانوں کو اور ہندوؤں کو ہندوؤں کو ووٹ دینے کا قاعدہ بنایا۔ اس کے بعد بھی غیر ملکی حکمران برابر 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پالیسی اپناتے رہے۔ اس طرح ہندستان میں علاحدگی پسند عناصر بڑھتے رہے اور اس کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی شکل میں 1947 میں ظاہر ہوا۔ اس کے ساتھ بھی اس کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ فرقہ واریت کا دیوپیکر مسئلہ خون پی پی کر اور بھی طاقت ور ہوتا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسری اقلیتیں اور کبھی اکثریت بھی اس کا شکار ہوتی رہی۔

سیکولرازم کی ہندستانی شکل مغربی شکل سے مختلف ہے۔ گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے ہوئے سیکولرازم ہمارے لیے تمام مذاہب کے لیے قوت برداشت اور تمام مذاہب کی عزت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جبکہ مغربی نظریہ یہ ہے کہ ریاست یا حکومت کو مذہب کے لیے کوئی رعایت رکھنی نہیں چاہیے بلکہ قطعی بیگانگی اور لاتعلقی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہندستانی رویہ کی بدولت ہر مذہب کے تیوہاروں کی چھٹی اور دیگر مراعات کے لیے گنجائش نکلتی رہی جبکہ دیگر ممالک میں ایسا ممکن نہ تھا۔ بھارت کا آئین شروع سے ہی سیکولر مزاج کا امین تھا۔ بنیادی حقوق کے ذریعہ ہر شہری کو برابر درجہ دیا گیا۔ اس کے باوجود سیکولر کا لفظ کافی عرصہ بعد استعمال ہوا۔ 1976 میں بھارت کے آئین میں یہ لفظ جوڑا گیا۔ ہندی نقطہ نظر کی نرمی کے پیچھے خیال یہ تھا کہ جبری طور پر کوئی مذہب کسی پر تھوپا نہ جائے اور ہر مذہب کو اپنے فطری انداز میں پھلنے پھولنے کا ہی نہیں بلکہ پھیلنے کا بھی حق ملے۔ صاف اور واضح طور پر یہ حق بھارت کے آئین میں ہر مذہب کو حاصل ہے۔ اس کے باوجود مذہب کے نام پر قتل و غارت گری بھی پھیلتی جارہی ہے۔

ہندستان متضاد انتہاؤں کا ملک ہے۔ ایک طرف مذہبی تنافر کی انتہا ہے تو دوسری طرف قومی یک جہتی دوستی اور محبت کی حد بھی ہے۔ بہمنی سلطنت کو قائم کرنے والے حسن گنگو، امیر خسرو، سائیں بابا، نانک اور کبیر کی دھرتی میں قومی یک جہتی کا بیج بہت گہرا گڑا ہوا ہے۔ مغربی انداز کا سیکولرازم یہاں کی آب و ہوا میں تناور درخت نہیں بن سکا لیکن ایک مخصوص انداز کی برداشت اور گنجائش کی یہاں پر کمی نہیں ہے۔

آزادی کے بعد کافی عرصہ تک سکون رہا اور تقسیم کے زخموں کو بھرنے کی کوشش جاری رہی لیکن سال در سال فسادات بھی ہوتے رہے۔ 1984 میں ہونے والے سکھ مخالف فسادات نے کافی عرصہ کے لیے قومی یک جہتی کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد دوسرا بڑا جھٹکا بابری مسجد کی غارت گری تھی اس کے بعد اس بھونچال کے جھٹکے بار بار آتے رہے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہندستان کی مٹی میں مذہب پرستی کا عنصر موجود ہے۔ مذہب انسانی شعور میں ایک کمزور نقطہ کی طرح موجود ہوتا ہے لیکن اس پر آنچ آنے پر انسان اشتعال میں بہت جلد آجاتا ہے۔ اس لیے یہاں پر انتہا پسند مذہبی جماعتیں بھی کافی پھلتی پھولتی ہیں اور اپنا اثر سیاست پر بھی ڈالتی ہیں۔ بارہا ان جماعتوں پر پابندی بھی لگی لیکن وہ اپنا کام کرتی رہیں۔ سیاسی اقتدار کانگریس اور بائیں بازو کی جماعتوں کے پاس سے نکل جانے کے بعد ملک میں مذہبی سیاست اور مسلکی تنافر کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اس میں جدت یہ ہے کہ یہ زیادہ مضبوط ہے۔ آج کا ہر انتہا پسند پہلے سے زیادہ پراعتماد ہوچکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو زبردستی اور تشدد کے نئے نفسیاتی معاشی اور تکنیکی طریقے اچھی طرح معلوم ہیں اور ان کا استعمال بھی اب عام ہوتا جارہا ہے۔ کوئی منافرت پھیلانے والا واقعہ ہونے کے بعد اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی تحریک چل پڑتی ہے اور یہ سفر جاری رہتا ہے۔ انتہاپسندی، انتہاپسندی کو ہی جنم دیتی ہے۔ یہاں تک کہ آج فرقہ پرستی کے ہاتھوں ہندستان کی بقا اور سالمیت کو زبردست خطرہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی رائے اس سلسلے میں بہت اہم ہے لیکن سیاسی خواہش (Political Will) کا فقدان اس کو بے اثر کردیتا ہے۔ ڈاکٹر گوپال سنگھ سابق گورنر ناگالینڈ نے عوام اور سیاست داں دونوں کے لیے کچھ مشورہ دیے ہیں اور ان کو دس نکاتی پروگرام کا نام دیا ہے۔ اس کا تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(1) جہاں تک ممکن ہو غریبی اور پیداوار کے ناقص طریقوں کو ختم کردینا چاہیے۔ غریبی میں فرقہ واریت بڑھ جاتی ہے۔

(2) مذہب، زبان، علاقائیت اور ذات کسی سیاسی جماعت کی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔

(3) دریائی پانی کے جھگڑے بہت غیر جذباتی اور غیر جانبداری کے انداز سے سلجھانا چاہیے۔

(4) کالجوں کے داخلوں میں علاقائی ترجیحات کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ یہی رویہ نوکری کے میدان میں بھی ہونا چاہیے۔

(5) آسان ہندی اور ہندستانی سیکھنا لازمی ہونا چاہیے اور انگریزی کو رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔

(6) روزگار کا حق جہاں تک ممکن ہو عوام کو ملنا چاہیے کم از کم ایک فرد ہر کنبہ میں روزگار کا مستحق سمجھا جانا چاہیے۔

(7) تاریخ کی کتابیں پھر سے لکھی جانی چاہیے اور قومی یکجہتی کی مثالوں کو اجاگر کرنا چاہیے۔

(8) کسی مندر یا مسجد کو توڑ کر دوبارہ دوسرے مذہب کی عبادت گاہ نہیں بنانا چاہیے۔ خواہ اسے ماضی بعید میں تبدیل ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔

(9) نہ کوئی فرقہ واریت پر مبنی جلوس جلسہ پریس ریلیز یا سینا وغیرہ ہونا چاہیے نہ ہی اس کی اجازت ہونی چاہیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(10) ریاستوں کی سرحدوں اور پانی کے جھگڑے عدالت عظمیٰ کی ایک خاص بنچ کے ذریعہ سلجھانا چاہیے۔

ڈاکٹر گوپال سنگھ کے بیان کردہ دس نکاتی پروگرام کو حرف آخر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ابتدائی اقدام ہو سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ تاریخی، سماجی اور نفسیاتی پہلو رکھنے والے دیو پیکر مسلہ فرقہ واریت کو شکست دے کر سیکولرازم کو مضبوط بنانا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے مجاہدانہ اسپرٹ سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور عوام کو متحد ہو کر رائے عامہ اور سول سوسائٹی (Civil Society) سے حکومت اور دوسرے عناصر کو متاثر کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دور حاضر کی تشدد آمیز سماجی اور نفسیاتی ذہنیت سیکولرازم کے سلسلے میں منفی کردار کر رہی ہے اگرچہ مذہبیت گھٹ رہی ہے لیکن مذہب کے نام پر تشدد بڑھ رہا ہے۔

سینیٹ کوسٹیا (Senete Cosatta): سینیٹ کو ابتدائی رومن شہنشاہی کے دور میں قانون سازی کے اختیارات تھے۔ اگرچہ یہ اختیارات کسی شاہی قانون کے ذریعہ سینیٹ کو عطا نہیں کیے گئے تھے۔ سینیٹ کا ریزولیشن کسی قانونی مسودہ کو عوام کے سامنے پیش کرنے سے قبل ایک قطعی حیثیت رکھتا تھا اور قانون ساز اسمبلی کے انحطاط کے بعد سے سینیٹ کی منظوری ضابطے کی محض ایک رسم رہ گئی تھی جسے نظرانداز بھی کیا جاسکتا تھا۔

ش

شادی (Marriage): یہ ایک اعلانیہ اقبال ہے اور اس امر کا قانونی اثبات (Registration) کہ ایک مرد اور ایک عورت دونوں زندگی کے ساتھی بن کر رہیں گے۔ شادی کو سماجی منظوری (Sanction) حاصل ہے تاکہ مرد اور عورت دونوں کے درمیان پائیدار تعلقات قائم ہوں اور ان کو جنسی مباشرت کا حق حاصل رہے۔ اس عمل کے ذریعہ ہی انھیں والدیت (Parenthood) کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور خاندان وجود میں آتا ہے۔ اس طرح شادی شوہر اور بیوی کے رشتہ کو جہت عطا کرتی ہے۔ افزائش نسل کے لیے جنسی مباشرت کو قبولیت بخشتی ہے۔ اقتصادی تعاون اور جذباتی تعلق کو مستحکم کرتی ہے اور شجرہ کی تشکیل کرتی ہے۔ خاندان کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ اولاً داخلی زوجیت (Endogamy) جو قبیلہ گروہ یا ذات (Caste) میں شادی کو محدود رکھتی ہے۔ ثانیاً خارجی زوجیت (Exogamy) جس میں شادی قبیلہ گروہ یا شجرہ کی ایک شاخ کے باہر ہوتی ہے۔ ہر معاشرہ میں ان دونوں کا رواج رہتا ہے۔ دنیا میں مختلف نوعیت کی شادیاں ہوتی ہے مثلاً ایک زوجی، کثیر زوجی، کثیر شوہری، گروہی شادی وغیرہ۔ ان سب کی مثالیں ہندستان کی مختلف ذاتوں اور قبیلوں میں مل جاتی ہیں۔ ہندوؤں میں شادی ایک مذہبی شعار (Sacrament) ہے لیکن اسلام میں یہ ایک سماجی معاہدہ ہے۔ اسی وجہ سے ہندو مذہب میں شادی کا رشتہ اٹوٹ ہے لیکن اسلامی شریعت بعض شرائط کے تحت اسے توڑنے کی اجازت دیتی ہے۔

شادی ہر سماج کا سب سے اہم ستون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر سماج میں یہ مختلف انداز میں انجام پاتی ہے۔ ہندستان میں جس میں دنیا کے تقریباً تمام بڑے مذاہب موجود ہیں، ہر قسم کی شادیاں ہوتی ہیں۔

ہندوستان کی ہندو اکثریت میں شادی ایک پیچیدہ مذہبی عمل ہے۔ شادی سے ہی خاندان بنتا ہے جو سماجی اکائی ہوتا ہے۔

ہندو مذہب اور سماج میں شادی کے تین مقاصد ہیں۔ (1) مذہبی فرائض کی انجام دہی، (2)خاندان میں نئے افراد کا اضافہ کرنا اور سماج کو ایک مستقبل دینا، (3)اور جنسی خواہش کو پورا کرنا۔ اس تفصیل سے یہ ظاہر ہے کہ جنسی پہلو کو ہندو سماج نے آخری مقام دی ہے۔

ہندستانی سماج میں پائے جانے والے مختلف رجحانوں کی وجہ سے یہاں زمانہ قدیم سے ہی کئی قسم کی شادیاں رائج رہی ہیں۔ عام طور پر ہونے والی شادی برہم ویواہ کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ گندھرو ویواہ، اسور ویوِاہ، راکشس ویواہ اور پیشاچ ویواہ کو غیر مقدس سمجھا گیا ہے کیونکہ اس میں پوجا وغیرہ نہیں ہوتی۔ لیکن دیو ویواہ، پرجاپتی اور ارشہ ویواہ کو مقدس سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ پورے رسم و رواج کے ساتھ ہوتی ہیں۔

ہندستان میں اس کے علاوہ کئی شوہروں کا اور کئی بیویوں کا رواج زمانہ قدیم سے آج تک رائج ہے۔

آج ہندو شادی میں قانونی طور پر طلاق کا امکان بھی ہے گوکہ پہلے شادی کو صرف جانے کا راستہ سمجھا جاتا تھا واپس آنے کا نہیں۔ آج ہندو شادی میں صرف ازدواج واحد کی اجازت ہے۔ یہ سب اصلاحی قانون 1956 میں پاس ہوئے تھے۔ آج ہندو شادی ہر ذات میں کی جاسکتی ہے لیکن قریبی رشتے داروں کے ساتھ یہ بندھن نہیں باندھا جاسکتا۔

مسلم شادی میں کچھ مختلف قسمیں رائج ہیں۔ مثلاً نکاح جو تقریباً ہر ذات اور ہر مسلم گروہ میں ہوتا ہے۔ متع جو صرف کچھ شعیہ گروہوں میں ہوتا تھا۔ قانونی اعتبار سے مختلف ذاتوں، گروہوں اور ذیلی ذاتوں میں شادی ممکن ہے۔ اس شادی میں مہر کا طے ہونا بے حد ضروری ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ صرف ایک معاہدہ ہے۔ مسلم سوسائٹی میں شادی رشتے کے بھائی بہنوں میں ہوسکتی ہے مرد چار بیویاں رکھ سکتے ہیں اور مرد عیسائی یا یہودی عورتوں سے شادی کرسکتے ہیں اس کے علاوہ وہ یہ

آسانی طلاق بھی دے سکتے ہیں اس کے لیے انھیں عدالت میں جانے کی ضرورت نہیں۔ طلاق احسن اور طلاق حسن ایک یا تین مہینے کے درمیان ہوجاتی ہے۔ ایک بار مہر دینے کے بعد طلاق شدہ شوہر اور بیوی کے درمیان کچھ لین دین نہیں بچتا۔ پچھلی دہائی میں یکساں سوال کوڈ کی مانگ کی گئی تھی کیونکہ شاہ بانو نامی ایک عورت کو چالیس کی شادی شدہ زندگی کے بعد طلاق دے کر نکال دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ آواز ٹھنڈی پڑ گئی۔ ہندستان ٹائمز جون 27/ 1998 میں چھپا تھا "عموماً ہر ہزار ہندو اور سکھوں میں تقریباً 72 لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے ہیں جبکہ مسلمانوں میں صرف 15 لوگ ایسا کرتے ہیں"۔ 1975 میں شائع ہونے والی ہندستانی عورت کی حالت کا جائزہ لینے والی کمیٹی کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ ایک سے زیادہ بیویاں سب سے زیادہ قبائلی رکھتے تھے۔ (15.25 فیصد) بدھسٹ کا نمبر دوسرا ہے (7.97 فیصد)، جین مذہب کے ماننے والے تیسرے نمبر پر ہیں (6.75 فیصد)، ہندو حضرات (5.8 فیصد) حالات میں دو بیویاں رکھتے ہیں جبکہ مسلمان صرف (5.7 فیصد) حالات میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔ آج بھی یکساں سول کوڈ کے سلسلے میں گاہے بگاہے آواز اٹھتی رہتی ہے۔

اس کے علاوہ عیسائی اور پارسی اپنے انداز میں اپنے رسم و رواج نبھاتے ہیں۔

ہندوستان میں شادی ہم جنسوں کے درمیان ممکن نہیں ہے۔

مختلف رسموں کے باوجود ہندوستان میں شادی ایک اہم ہی نہیں بلکہ ایک پختہ رشتہ ہوتا ہے جس کا ٹوٹنا ایک بہت سنگین حادثہ ہوتا ہے۔ ہندستان میں ازدواج واحد سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے۔ جو سماج کی اور رشتہ داری کی بنیاد ہوتا ہے۔

آج شادی کے تقدس کو بدلتے حالات سے تھوڑا سا خطرہ لاحق ہے۔

شادی کی شرائط (Conditions of Marriage):

ایک ہندو کی شادی کے لیے شرائط ذیل ضروری ہیں:

(1) لڑکا اور لڑکی کی اور کوئی بیوی یا شوہر نہ ہو۔

(2) بوقت شادی لڑکا اور لڑکی فاترالعقل نہ ہوں۔

(3) لڑکے کی عمر اٹھارہ سال اور لڑکی کی عمر پندرہ سال سے کم نہ ہو۔

(4) لڑکا یا لڑکی آپس میں ایسے رشتہ دار نہ ہوں جن کی باہمی شادی نہ ہوسکتی ہو۔

(5) لڑکا اور لڑکی سپنڈ (Sapind) نہ ہوں بجز اس کے مقامی رواج اس کی اجازت دیتا ہو۔

(6) اگر لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو تو لڑکی کے سرپرست کی رضامندی لے لی گئی ہو۔

شافعی: یہ بھی فقہ اسلامی کا ایک ممتاز مکتب ہے اس کی نسبت امام محمد بن ادریس شافعی کی طرف ہے ان کی ولادت 150ھ میں اور وفات 204ھ میں ہوئی۔ ان کے متبعین اہل حدیث بھی کہلاتے ہیں۔ امام شافعی نے امام مالک سے براہ راست اور امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی سے کسب فیض کیا تھا۔ انھوں نے ان دونوں مسلکوں کو سامنے رکھ کر ایک جدید مکتب فقہ کی بنیاد رکھی۔ مصر میں نمایاں ہوا پھر عراق میں داخل ہوکر بغداد پر قابض ہوا۔ اس کے علاوہ خراسان توارن شام ماورالنہر بلاد فارس حجاز اور ہندوستان کے بعض شہروں میں بھی داخل ہوا اور تیسری صدی کے بعد افریقہ اور اندلس میں بھی پہنچا۔

اس زمانہ میں مصر فلسطین، اردن اور حجاز کے بعض حصوں میں شوافع کی تعداد زیادہ ہے ایران کے سنیوں میں زیادہ تر شافعی ہیں۔ جزائر سیلون، سماترا، جاوہ، فلپائن، ملیشیا، شام، ہند، چینی آسٹریلیا اور ہندوستان کے ساحلی شہروں مالابار وغیرہ میں بھی شوافع کی کثرت ہے۔ اس مسلک کو ماننے والے عقائد میں امام ابوالحسن اشعر کے متبع تھے۔

شبہات: شبہ کی جمع ہے اس سے شبہ بھی بنا ہے جس کے معنی مانند طرح مثل او مشابہ کے ہیں جب دو چیزیں آپس میں ایک دوسرے کے اتنا مشابہ ہوں کہ ان میں تمیز نہ ہوسکے تو اس التباس گڈمڈ اور عدم تمیز کو شبہ کہیں گے اس لیے شریعت کے ماہرین کہتے ہیں کہ شبہ وہ ہے جو ثابت کے مشابہ ہو لیکن حقیقتاً ثابت نہ ہو اس کی چند قسمیں ہیں۔

شبہ فعل: کسی فعل کی حدت و حرمت کے بارے میں شبہ ہوجائے مثلاً مطلقہ یا مخلوعہ (خلع کی ہوئی) عورت کے پاس یہ جان کر گیا کہ عدت میں اس کے ساتھ جماع حلال ہے تو ایسی صورت میں بدکاری کی مقررہ سزا نہ دی جائے گی۔

شبہ محل: شوہر بیوی کو اشارہ و کنایہ سے طلاق دے اور طلاق ہوگئی مگر شوہر یہ سمجھ کر کہ طلاق نہیں ہوئی اور بیوی مجھ پر حرام نہیں ہوئی اس کے پاس گیا تو اس میں بھی مقررہ سزا نہ دی جائے گی۔

شبہ عقد: کوئی عورت نکاح کرے لیکن شرعی حیثیت سے نکاح منعقد نہ ہو مثلاً گواہ نہ تھے یا وہ عورت اس کے لیے حلال نہ تھی تو ایسی صورت میں اگر نکاح کرنے والا اس یقین کی بنا پر اس کے پاس گیا کہ عورت اس کے لیے حلال ہوگئی اور نکاح درست ہوگیا تو بھی مقررہ سزا نہ دی جائے گی اور اگر حرام سمجھنے کے باوجود ایسا کرتا ہے تو سزا دی جائے گی۔

اس طرح قتل کے فقہا نے کئی صورتیں بیان کی ہیں ان میں ایک قتل شبہ عمد بھی ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا قصد کرے جو ہتھیار اور اس کے مشابہ نہ ہو مگر صاحبین ابو یوسف (امام محمد) کے نزدیک بڑے پتھر اور بڑی لاٹھی سے مارنا بھی قتل عمد ہے شبہ عمد یہ ہے کہ ایسی چیز سے مارنے کا قصد کیا جائے جس سے عموماً قتل نہیں ہوتا جیسے کسی گھونسے یا لات سے مارا اور وہ مر گیا تو یہ قتل شبہ عمد ہے۔

حدود کے بیان میں فقہا نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ شبہات کی وجہ سے حدود دفع ہوجائیں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حدود اور قتل سے جہاں تک ہوسکے اللہ کے بندوں کو بچاؤ پس اگر 99 ثبوت موجود ہوں اور ایک بات میں شبہ ہوجائے تو حد ساقط ہوجائے گی۔

قصاص کی نوعیت بھی حدود ہی جیسی ہے جس طرح شبہات سے حدود ساقط ہوجاتے ہیں اسی طرح قصاص بھی ختم ہوجائے گا البتہ تقریر شبہ کے باوجود باقی رہے گی۔

شبہ کا فائدہ (Benefit of Doubt): قانون مفروضہ یہ ہے کہ ہر شخص نیک نیت ہے اور شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جانا چاہیے۔ کسی قتل کے مقدمے میں جرم کے ثابت کرنے کے لیے چشم دید شہادت اور واقعات متعلقہ کے بارے میں قوی شہادت (Over whelming Direct and Circumstancial Evidence) فراہم ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی فوج داری مقدمے میں شہادت کا ایک جز ملزم کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہو لیکن شہادت کا دوسرا جز یہ ظاہر کرے کہ ملزم نے کوئی جرم ہی نہیں کیا ہے تو ایسے صورت میں شبہ کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیے۔ ایک گواہ کا بیان جو ملزم کا رشتہ دار ہے بالکلیہ ناقابل بھروسہ قرار نہیں دیا جائے گا۔ لیکن اس بیان کی بنا پر کسی نتیجے پر عدالت کو کافی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ فوج داری مقدمات میں بار ثبوت (Onus of Proof) استغاثہ پر رہے گا محض اس بنا پر کسی شخص کی گواہی کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے کہ اس شخص کو اس مختص واقعہ سے جو عدالت میں زیر نزاع ہے دلچسپی ہے۔ عدالت کو چاہیے کہ اس کے بیان کے اس اس امر کو پیش نظر رکھ کر جانچے کہ اس شخص کا امر مابہ النزاع سے دلچسپی ہے اگر کسی شخص نے بیان دیا ہو جو بعد میں فوت ہوگیا ہو تو اسے بیان قبل از مرگ (Dying Declaration) کہا جاتا ہے۔ قانون شہادت کے تحت ایسے بیان کو متعلقہ سمجھا جائے گا خواہ بیان دینے والا اپنی موت سے آگاہ ہو یا نہ ہو۔ وہ واقعات جو کسی واقعہ تنقیح طلب سے اس قدر مربوط نہیں کہ ایک ہی واقع کی کڑی بن سکتے ہیں تو ایسے واقعات بھی واقعاتی شہادت کی تعریف میں آجائیں گے۔ اگر بندوق چلاتے وقت کوئی شخص نزدیک کھڑا ہوا تھا تو گولی چلانے کے فوری بعد اس کا بیان واقعاتی شہادت کی تعریف میں آتا ہے۔ ایک قتل کے مقدمے میں اگر قاتل کی بیوی نے واقعہ قتل کے کافی دیر بعد ہیڈ کانسٹبل کو اطلاع دی کہ اس کے شوہر نے قتل کیا ہے تو وہ واقعاتی شہادت کی تعریف میں نہیں آتا کیونکہ واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے فوری بعد اس نے اطلاع نہیں دی۔ ہر وہ واقعہ جو واقعاتی شہادت (Circumstantial Evidence) یا تیاری (Preparation) کو ظاہر کرے اور واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد یا قتل کے واقعات جو کسی شخص کی جانب سے یا اس کے ایجنٹ کی جانب سے کیے جائیں واقعات متعلقہ ہوگا۔

اگر کسی واقعہ کے متعلق سیدھا عینی گواہ (Eye Witness) موجود ہو تو ایسی صورت میں مقصد (Motive) کے متعلق کوئی بھی شہادت صرف ثانوی (Secondary) حیثیت رکھے گی اور اگر مقصد کے متعلق کوئی شہادت پیش نہ ہو تو خلاف نتیجہ اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر کسی حق یا رواج (Custom) کے متعلق کوئی واقعہ ثابت کرتا ہے تو وہ حالات یا واقعات جس کے ذریعہ ایسے حق یا رواج کو قبول کیا گیا ہو یا انکار کیا گیا ہو قانون شہادت کی رو سے واقعہ متعلقہ قرار دیا جائے گا۔ وہ امور جو ذہنی کیفیت (State of Mind) کو ظاہر کریں مثلاً ارادہ کسی بات کا عدم نیک نیتی یا غفلت جلد بازی امور متعلقہ ہوجائیں گے۔ کسی گواہ کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بیان پر فریق مخالف کو جرح کا حق قانون شہادت کی رو سے دیا گیا ہے۔ کسی گواہ سے اس نوعیت سے سوال نہیں کیا جاسکتا کہ اس سوال کا جواب بھی اس سوال سے ظاہر ہوتا ہو البتہ جرح میں ایسا سوال کیا جاسکتا ہے۔ عدالت کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ کسی گواہ سے کوئی تحقیقی سوال جو امر تنقیح طلب سے غیر متعلق ہے کرنے کی اجازت نہ دے۔ اگر کوئی سوال امر تنقیح طلب سے متعلق نہ ہو لیکن اس سوال کا تعلق گواہ کے کردار (Character) سے متعلق ہو تو عدالت کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایسے سوال کی اجازت دے یا نہ دے البتہ جرح میں ایسے سوال کرنے کا قانوناً حق دیا گیا ہے جس سے گواہ کی شخصیت اور سوسائٹی میں اس کا قیام اور جو اس کے بیان کو ناقابل قبول قرار دینے یا اس کے کردار (Character) کو مجروح کرنے کے متعلق ہے سماعی شہادت (Hearsay Evidence) قانوناً ناقابل قبول شہادت ہے۔

شخص ناقابل کارندہ (Person not Capable Agent)

(Person not Capable Agent) : دفعات 11-20 میں الفاظ کارندہ جو اس بارے میں مجاز ہو شخص ناقابل کی صورت میں اس کے ولی ایسے کارندہ پر حاوی ہوں گے جو اس ولی کی طرف سے اقرار پر دستخط کرنے یا روپیہ ادا کرنے کا مجاز ہو۔

(1) دفعات مذکور کی رو سے مشترک معاہدہ کنندگان شرکاء اوصیاء یا مرتہنان میں سے کوئی شخص اس وجہ سے ذمہ دار نہ ہوگا کہ اس میں سے کسی دوسرے یا دوسروں نے یا اس کے یا ان کے کارندہ نے اقرار پر دستخط کیے یا روپیہ ادا کیا ہے۔

(2) باغراض احکام صدر (الف) ایک اقرار کسی ذمہ داری کے متعلق کسی بیوہ کے کارندہ مجاز کا دستخط شدہ ہو یا جزوی مالک جائداد کی جانب سے اس نے دستخط کیے ہوں جو تابع دھرم شاستر ہو وہ جائز اقرار سمجھا جائے گا یا اس کی جانب سے کوئی ادائگی ہو تو وہ دیگر ہندو خاندان مشترکہ کی جانب سے متصور ہوگی۔ (ب) جبکہ کوئی ذمہ داری کسی غیر منقسمہ ہندو خاندان کی طرف سے کی گئی ہو تو ایسا اقرار یا ادائگی منجانب کارندہ مجاز منتظم خاندان کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ تمام خاندان کی جانب سے ہے۔

ملحوظ رہے کہ جب خاندان منقسم ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں اقرار منجانب منتظم جو اس کے بعد کیا گیا ہے اس سے دیگر ارکان پابند نہیں ہوں گے۔ اس طرح اگر اقرار کسی رکن خاندان مشترکہ کے سامنے کیا ہو جس کی حیثیت منتظم کی نہ ہو تو اس سے دیگر ارکان خاندان پابند نہیں ہوتے سوائے ان اشخاص کے جو اس کے ذریعہ سے اپنے حقوق قایم کرتے ہیں مثلاً اس کے لڑکے۔

شخصی قانون بین الاقوام (تصادم قوانین) و عمومی قانون بین الاقوام میں فرق (Differnce between Private Int. Law and Public Int. Law) :

(1) شخصی قانون بین الاقوام قومی قانون کا ایک شعبہ ہے جس کی وجہ سے دنیا میں جتنی قانونی وحدتیں ہیں اتنے ہی شخصی قانون بین الاقوام ہیں۔ برخلاف اس کے عمومی قانون بین الاقوام ملکوں کے باہمی برتاؤ کے قواعد کا مجموعہ ہونے کے اعتبار سے وہ قومی قانون کا شعبہ متصور نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دنیا میں عمومی قانون بین الاقوام یکساں ہے۔

(2) شخصی قانون بین الاقوام کا تعلق قانونی وحدتوں سے ہے برخلاف اس کے عمومی قانون بین الاقوام کا تعلق سیاسی وحدتوں سے ہے۔ قانونی وحدت ایک ایسے قطعہ اراضی کو کہتے ہیں جس میں ایک ہی طریقۂ قانون رائج ہو۔ مثلاً انگلستان ایک قانونی وحدت ہے کیونکہ اس قطعہ ارضی میں ایک ہی طریقہ قانون جس کو کامن لا کہتے ہیں رائج ہے۔ اسی طرح اسکاٹ لینڈ ایک قانونی وحدت ہے کیونکہ اس قطعہ ارضی میں ایک ہی طریقہ رائج ہے اور جو انگلستان کے کامن لا سے بالکل مختلف ہے۔

سیاسی وحدت ایک ایسے قطعہ ارضی کو کہتے ہیں جہاں ایک ہی حکومت ہو اور اس حکومت کا اقتدار اعلیٰ اس سارے قطعہ ارضی پر حاوی ہو۔ مثلاً برطانیہ عظمیٰ جو انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور ویلز پر مشتمل ہے۔

(3) شخصی قانون بین الاقوام خانگی اشخاص کے باہمی تنازعات (جس کا تعلق دو یا دو سے زیادہ قانونی وحدتوں سے ہو) کے فیصلے سے متعلق اصولوں کا نام ہے۔

(4) شخصی قانون بین الاقوام میں اسی طرح تبدیلی لائی جاسکتی ہے جس طرح قومی قانون کے دیگر شعبہ جات میں لائی جاتی ہے لیکن عمومی

قانون بین الاقوام میں کوئی ایک ملک یک طرفہ تبدیلی نہیں لاسکتا۔

تصادم قوانین قومی یا ملکی قانون کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے سوائے قانون فوجداری کے یہ بحث چھڑ سکتی یا دوسرے الفاظ میں کوئی بیرونی عنصر مقدمہ میں موجود ہو۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ تصادم قوانین کے قواعد سے رہبری حاصل کرنے کے بعد مقدمہ کا فیصلہ کسی ایک ملک کے قانون کی رو سے ہی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کسی ایک مقدمہ کے ایک جز کا فیصلہ ایک ملک کے قانون کی رو سے ہو اور دوسرے جز کا فیصلہ کسی دیگر ملک کے قانون سے۔ مثلاً نقص معاہدہ کے دعوے میں یا معاہدہ کی تعمیل مختص کے دعوے میں انعقاد معاہدہ کا تعلق کسی دیگر ملک کے قانون سے ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ معاہدہ لندن میں ہوا تھا تو یہ سوال کہ معاہدہ جائز ہے یا کالعدم ہے انگلستان کے قانون کی رو سے طے پائے گا اور تعمیل معاہدہ سے متعلق ہر سوال اس ملک کے قانون کی رو سے طے پائے گا جس ملک میں معاہدہ کی تعمیل ہوتی ہے۔ اوپر کے معاہدہ میں جو شہر لندن میں ہوا اگر تعمیل اٹلی کے شہر نیپلز میں ہوتی ہے تو تعمیل سے متعلق ہر سوال اٹلی کے قانون کی رو سے طے پائے گا۔

شراب نوشی (Drinking and Alcoholism): انسانی تاریخ میں کسی ایسے دور کا پتہ نہیں چلتا جبکہ افراد یا گروہوں نے ہر قسم کے نشہ سے مکمل طور سے احتراز کیا ہو۔ نشہ آوری کے لیے مختلف تہذیبوں اور ادوار میں لاتعداد اقسام کے مشروبات اور ادویات استعمال کی جاتی رہی ہیں جن میں شراب کی مختلف اقسام بھی شامل ہیں۔ شراب نوشی اور نشہ آوری کا مقصد غالبًا جذبات اور احساسات میں گرمی پیدا کرنا اور بعض اوقات خود پر بے خودی کی کیفیت طاری کرنا رہا ہے۔ اکثر تہذیبوں میں شراب بعض مذہبی اور سماجی رسومات میں بھی استعمال ہوتی رہی ہے۔ جنگ و جدال کے مواقع پر لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے مختلف قسم کے نشہ کا استعمال عام رہا ہے۔ اس کے علاوہ عیش و نشاط کی محفلوں میں نشہ بازی کا رنگ سب سے گہرا اور چوکھا رہا ہے۔ حالانکہ تقریبًا ہر زمانے میں مختلف قسم کے نشہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی مدہوشی اور سرمستی کی وجہ سے جو مضر سماجی اثرات مترتب ہوئے اس کے خلاف مذہبی اور سماجی رہنماؤں نے آواز بھی اٹھائی ہے لیکن کبھی بھی مکمل طور سے نشہ بندی کا نفاذ بہت دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ بعض مذاہب میں ہر قسم کی نشہ آوری کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ خصوصاً اسلام میں شراب نوشی حرام ہے۔ اس کے باوجود ایک مختصر عرصہ کو چھوڑ کر خود اسلامی تاریخ کے ہر دور میں محدود یا وسیع پیمانہ پر مذہبی ممانعت کے باوجود نشہ بازی کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ محدود پیمانے پر نشہ کے استعمال سے صحت پر مضر اثرات نہیں پڑتے۔ لیکن ہر قسم کے نشہ آور اشیا کی سب سے بڑھ کر خصوصیت یہ ہے کہ اس کو محدود رکھنا کم و بیش ناممکن ہے۔ باوجود اس کے کہ طبی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شراب عادت بن جانے والی شے ہے اور اس کے اثرات انتہائی مضر ہیں۔ شراب نوشی میں مسلسل اضافہ جاری ہے۔ موجودہ دور میں مہاتما گاندھی نے شراب کے مضر اثرات کے خلاف سب سے زیادہ پروپیگنڈا کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک ایسی عادت یا لت ہے جس سے چھٹکارہ مشکل نظر آتا ہے۔ خصوصاً موجودہ سماج جو لاقدری کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور جس میں روایاتی مذہبی اور اخلاقی اقدار کا اثر کم ہوتا جارہاہے، نشہ بازی کے اپنانے کے لیے راہ ہموار کر دیا ہے۔ خصوصاً مغربی ممالک میں یہ لت تقریبًا پورے سماج پر چھا چکی ہے حتیٰ کہ کم عمر لڑکے اور لڑکیاں بھی اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ اور مختلف قسم کی ادویات اور مشروبات کے ذریعہ خود فراموشی کی عادت میں گرفتار ہوتے جارہے ہیں۔ امریکا میں 1930 کے دوران نشہ بندی کی زبردست کوشش کی گئی لیکن ناکام رہی۔ مہاتما گاندھی کے اثر کے نتیجہ میں آزاد ہندستان میں نشہ بندی کی مسلسل کوشش جاری ہیں لیکن یہ بے اثر ثابت ہورہی ہیں۔ عادی لوگ تو ایک طرف مدارس اور کالجوں کے طلباء بھی تیز رفتار سے شراب نوشی میں ملوث ہوتے جارہے ہیں۔ شراب نوشی کا سب سے مہلک سماجی اثر یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسانی اعصاب کی استقامت میں خلل پڑجاتا ہے۔ لوگ جذباتی اور موذی ہو جاتے ہیں اور فوری اغراض و مقاصد کے لیے نشہ کے جھونک میں ہر بیجا اور ناروا طریقہ کار کو اپنانے سے گریز نہیں کرتے۔ جس کا نتیجہ سماجی بد نظمی اور بدانتظامی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ گذشتہ پچاس سال میں اسکینڈینیویا، کناڈا، ہالینڈ اور امریکا میں نشہ بازی کے مہلک اثرات پر ریسرچ کے بڑے بڑے ادارے قائم ہوچکے ہیں لیکن موجودہ تیز رفتار سماج ان تحقیقات کے نتائج سے بے پرواہ نشہ کی لت میں دھت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سماجی بیماری پر قابو پانا تقریبًا ناممکن ہے۔ کیونکہ روز بروز تمام کوششوں

کے باوجود کم ہونے کے بجائے اس میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ آزادی کے بعد سے ہندستان میں نشہ بندی کے لیے مسلسل قانون سازی ہوتی رہی ہے لیکن اس پر عمل آوری میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی ہے اور جن ریاستوں میں نشہ بندی لاگو ہے ان خشک علاقوں سے لوگ بڑی تعداد میں تر علاقوں میں نشہ آوری کے لیے آتے جاتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کے جرائم پر نشہ آوری کا راست اثر رہا ہے اور جرمیات کے ماہر اس امر پر متفق ہیں کہ جرائم کے اضافہ میں نشہ بازی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

نشہ بندی کے علاوہ شراب کے عادی افراد کے علاج کے لیے بے حد کوششیں کی جارہی ہیں۔ یہ کوشش معالجانہ، سماجی اور نفسیاتی ہر طرح کی ہیں۔ ہندستان کے ہر بڑے شہر میں شراب نوشی چھڑانے کے کلینک ہیں۔ اس کے علاوہ الکوہولک اینونیمس نام کی تحریک کے تحت چلنے والے ادارے نفسیاتی اور ترغیباتی انداز میں ان لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں۔ کچھ دوائیں بھی کھوج لی گئی ہیں جو شراب کے لیے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

کچھ بھی ہو، آج کی دنیا میں مغربی تمدن کی تقلید کی وجہ سے شراب نوشی بڑھتی جا رہی ہے۔ مہذب سماج مغرب کی نقل کی وجہ سے اور قبائلی اور دیہی سماج اپنی روایتوں کی وجہ سے شراب نوشی میں ڈوبتے جارہے ہیں۔ جو کہ ایک تشویش ناک صورت حال ہے۔

سماجی نفسیات کے ماہرین کثرت شراب نوشی کو ایک بیماری سمجھتے ہیں اور اس کے علاج کی کوشش کرتے ہیں۔

شراب نوشی کو دیگر منشیات کے ساتھ ایک خانے میں نہیں رکھنا چاہیے۔ ڈرگس انسان کو غلام ہی نہیں بلکہ حیوان بنا دیتی ہیں۔ ان کے نقصانات شراب سے کہیں زیادہ ہیں۔

شرح سود (Rate of Interest) (تقسیم دولت): نفد سرمایہ پر سود کی توجیہ کلاسیکی عالم معاشیات این. ڈبلو. سینیر (N.W. Senior) نے یہ کی تھی کہ یہ سرمایہ داروں کے اپنی دولت کے صرف سے پرہیز کرنے کا صلہ ہے آگے چل کر سرمایہ کی پیداواری پر زور دیا گیا۔ بام باورک (Bhoem Bawerk) نے سود کے مختلف نظریات کا تنقیدی جائزہ لے کر یہ بتایا کہ محض پرہیز (Abstinence) کسی صلہ (Reward) کا مستحق نہیں بن سکتا۔ یہ ثابت کرنا بھی ممکن نہیں کہ قدر کی پیداواری (Value Productivity) سرمایہ کی لازمی صفت ہے۔ بام باورک کے نزدیک انسان عام طور پر زمانہ حال کی کسی رقم کو مستقبل میں ملنے والی مساوی رقم پر ترجیح دیتا ہے۔ صارفیت کے علاوہ پیدا کار بھی ترجیح وقت (Time Preference) کا مظاہرہ کرتے ہیں کیوں کہ جو مال آج موجود ہو وہ فنی طور پر مستقبل میں ملنے والے اس مال سے برتر ہوتا ہے۔ چنانچہ پیداواری عمل میں آج لگائی جانے والی رقم مستقبل میں اضافہ کے ساتھ واپس ہوتی ہے۔ سرمایہ کے استعمال پر مبنی پیداواری طریقوں میں وقت لگتا ہے۔ پیداوار دولت کے یہ بالواسطہ طریقے (Round about Methods) پیداوار دولت کے راست طریقوں سے زیادہ پیدا آور ہوتے ہیں۔ یہ پیدا آوری اس مدت کی لمبائی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے جو پیداواری عمل کے آغاز اور اس کے تکمیل پانے کے درمیان گزرتی ہے۔ سرمایہ کا سود اسی پیدا آوری پر مبنی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ وابستہ ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں سود کی توجیہ اور شرح سود کے تعین کرنے والے اسباب کے طور پر ترجیح وقت اور سرمایہ کی حاشیائی پیدا آوری کے تصورات مرکز توجیہ بنے رہے۔ مارشل (Altred Marshall) نے ایک بار پھر انتظار (Waiting) پر زور دیا جو اصلاً سینیر کے پرہیز (Abstinence) کا بدلا ہوا روپ تھا۔ دوسری طرف بعض معاشین نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ شرح سود کا تعلق اصلاً زر (Money) سے ہے اور اس کے تعین میں پیدا آوری یا انتظار وغیرہ اصلی (Real) عوامل کو اتنا دخل نہیں حاصل ہے جتنا زر کو۔ اصلی عوامل پر مبنی نظریات طویل مدت (Long Term) میں شرح کے تعین سے بحث کرتے تھے جبکہ زر پر مبنی نظریات (Monetary Theories) نے قلیل مدت (Short Term) میں شرح سود کے اتار چڑھاؤ کو مرکزی بحث بنایا۔ کینز نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہر مال دار اپنی دولت کا ایک حصہ سیال (Liquid) شکل یعنی نقد کی صورت میں رکھنا پسند کرتا ہے جسے وقت ضرورت پر فوراً استعمال کیا جاسکے۔ ترجیح نقد (Liquidity Preference) کے پیچھے احتیاط (Precaution) روزمرہ لین دین (Transaction) اور تمسکات (Securities) کے بازار میں سٹہ بازی (Speculation) کے محرکات کار فرما ہوتے ہیں۔ ترجیح نقد سے معیشت میں نقد کی مجموعی طلب متعین ہوتی ہے۔ نقد کی رسد ملک کا نظام زر کرتا ہے۔ بازار میں سود کی ایسی شرح متعین ہوتی ہے جو نقد کی رسد اور اس کی طلب کے درمیانی توازن اور مساوات برپا کرسکے۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کلاسیکی فکر کے مطابق شرح سود کی تعین بچت اور سرمایہ کاری (Saving and Investment) کرتی ہیں۔ بچت کی مقدار سود کی شرح بڑھنے کے ساتھ بڑھتی ہے جبکہ سرمایہ کاری کی مقدار سود کی شرح بڑھنے کے ساتھ گھٹتی ہے۔ بازار میں سود کی ایسی شرح متعین ہوتی ہے جو ان مقداروں میں مساوات اور توازن برپا کرسکے۔ زر پر مبنی نظریات سود کے سامنے آنے کے بعد نو کلاسیکی ماہرین معاشیات نے زر کی اہمت تسلیم کرتے ہوئے کلاسیکی نظریہ سود میں کچھ ترمیم کرلی۔ ان کے نزدیک شرح سود کا تعین قابل قرض رقوم (Loanable Funds) کی رسد اور طلب کرتی ہے۔ طلب کا انحصار سرمایہ کاری کی نفع آوری پر اور رسد کا انحصار بچت کی صورت میں شرح سود پر ہے۔ مگر کچھ رقوم اس لیے بھی طلب کی جاتی ہیں کہ ان کو نقد ذخیروں کی شکل میں رکھا جاسکے۔ نیز رسد کا ایک منبع ان ذخیروں سے باہر لائی جانے والی رقمیں بھی ہیں۔

کینز کے نظریہ سود کے زیر اثر شرح سود کی بابت نسبتہ جامع نظریات بھی مرتب کیے گئے۔ ہکس (J.R.Hicks) اور ہانسن (A.H. Hansen) نے یہ واضح کیا کہ شرح سود کے تعین میں بچت سرمایہ کاری ترجیح نقد پر مبنی زر کی طلب اور زر کی رسد چاروں عوامل کو دخل حاصل ہے۔ ان چاروں عوامل کے درمیان تعاون اور توان کے نتیجہ میں معیشت میں سود کی شرح اور آمدنی کی سطح ایک ساتھ متعین ہوتی ہے۔

سود کی بدلتی ہوئی توجیہات اور نت نئے نظریات کے باوجود سود کی کوئی ایسی توجیہ نہیں کی جاسکی ہے۔ جس پر اکثر معاشین متفق ہوں نہ ہی شرح سود کی تعین کے بابتہ کوئی ایسا نظریہ پیش کیا جاسکا ہے جسے عام مقبولیت حاصل ہو۔ سود کے مباحث میں عام طور پر نقد سرمایہ کے سود اور اشیا اصل کے حاصلات (Return to Capital Goods) کے درمیان امتیاز نہیں برتا جاسکا ہے۔ بسا اوقات دوسرے بارے میں اخذ کردہ نتائج کو بغیر کسی مزید استدلال کے پہلے منطبق کردیا جاتا ہے۔ اسی طرح سود اور نفع کا باہمی فرق ہمیشہ واضح نہیں رہتا۔ مسابقت کی صورت میں شرح منافع اور شرح سود ایک ہی مقدار کے دو نام قرار پاتے ہیں۔ سرمایہ کی پیداواری پر مبنی نظریات سود کی ایک بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ سرمایہ کاری کی مقدار بڑھنے کے ساتھ اس کی حاشیائی پیداواری گھٹتی جاتی ہے۔ مگر علم کی ترقی اور فنی معلومات کے تسلسل نے اس مفروضہ کو مشکوک بنا دیا ہے۔ سود کے ان نظریات پر ایک بجا اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ مستقبل میں متوقع پیداوار اوراس کی قیمت یا زر سے وابستہ عدم تعین کی پوری رعایت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

معاشین کی توجہ آج کل اس امر کی طرف زیادہ ہے کہ مختلف مدتوں کے لیے دیے جانے والے قرضوں اور مختلف کاموں کے لیے دیے جانے والے قرضوں کی سود کی شرحوں میں فرق کیوں کر اور کتنا ہوتا ہے؟ ان کے درمیان کیا ربط پایا جاتا ہے؟ اور سود کی شرحوں کی ساخت (Structure of Interest Rate) کیوں کر بنتی اور بدلتی ہے؟

شرکا ٹارٹ (Joint Tort-feasors): جب ایک سے زائد اشخاص بالاشتراک کسی ٹارٹ کے مرتکب ہوں تو ان کی ذمہ داری سے ذیل کے اصول متعلق ہوں گے:

(1) جو اشخاص بالاشتراک کسی ٹارٹ کے مرتکب ہوں تو ان کے مقابلہ میں بالاشتراک یا انفرادی طور پر دعوی ہوسکے گا جب دعوئ بالاشتراک ہو تو ہرجہ سب سے یا ان میں سے کسی ایک یا زائد سے وصول ہوسکے گا۔

(2) جب کسی ایک شخص کے مقابلہ میں ڈگری حاصل کرلی جائے تو دوسرے اشخاص پر اس ٹارٹ کی بناء پر دعوئ نہ ہوسکے گا خواہ ڈگری تعمیل نہ ہوئی ہو۔

جملہ اشخاص جو بالاشتراک ٹارٹ کے مرتکب ہوں تو ان کے مقابلہ میں صرف ایک بنائے دعوئ ہے اور اگر اس بنائے دعوے سے دستبرداری کی جائے یا وہ بنائے دعوئ ڈگری میں ضم ہوجائے تو دوسرا دعوئ کرنے کا حق نہیں رہتا۔

(3) جب شخص متضرر کسی ایک شریک کو بری الذمہ کر دے تو وہ دوسرے اشخاص کے مقابلہ میں دعوئ نہ کرسکے گا۔

(4) اگر تمام شرکا ٹارٹ کے مقابلہ میں ایک ہی دعوئ رجوع کیا جائے اور مدعی کا دعوئ ڈگری ہوجائے تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ ڈگری کی تعمیل کسی ایک شریک کے خلاف کرے اس سے پورا ہرجانہ وصول کرلے کیونکہ شرکاء ٹارٹ پر ہرجہ ادا کرنے کی ذمہ داری مشترکاً و منفرداً عاید ہوتی ہے۔

قانون ٹارٹ کی رو سے مشترکہ ذمہ داری اس وقت عاید ہوتی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہے جب دو یا دو سے زیادہ اشخاص بالاشتراک ٹارٹ کے مرتکب ہوں یہ ضروری ہے کہ ان اشخاص کی نیت ایک ہی ہو اور وہ آپس میں مل کر شخص متضرر کے خلاف ٹارٹ کا ارتکاب کریں۔ دیگر یہ کہ وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کو ٹارٹ کے ارتکاب میں اس کی اعانت کرے یا اس کو اکسائے تو ان دونوں اشخاص پر مشترک ذمہ داری عاید ہتی ہے و نیز قانون ٹارٹ کی رو سے جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو ٹارٹ کے ارتکاب کا حکم دے یا اگر ٹارٹ کا ارتکاب اس کی جانب سے ہو اور وہ ثابت ہو جائے۔

شرکت: اس کے لفظی معنی ساجھا کے ہیں مگر اصطلاح شریعت میں یہ ایک ایسے معاملہ کا نام ہے جو دو یا کئی شخصیتوں کے درمیان ہوتا ہے اور ہر ایک اس میں شریک اور ساجھی ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

(1) شرکت املاک: جب دو یا چند آدمیوں کو کوئی چیز وراثت میں ملی یا سب نے مل کر اسے خریدا اور وہ سب اس کے مالک ہوگئے تو اس قسم کی شرکت کو شرکت املاک کہا جاتا ہے۔ اس میں شریکوں میں سے کسی کو دوسرے کے حصہ میں اس کی مرضی شریک کے حصے کے بارے میں اجنبی جیسی ہوتی ہے۔

(2) شرکت عقود: یہ معاملہ کی شرکت ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے یوں کہے کہ میں فلاں معاملہ یا چیز میں تیرے ساتھ شریک ہوااور دوسرا کہے کہ میں نے اس کو قبول اور منظور کیا۔

اس کی چار قسمیں ہیں:

(1) شرکت معاوضہ: اس میں ہر ہر شریک دوسرے کا وکیل کفیل اور ضامن ہوتا ہے اس کی شکل یہ ہے کہ دو یا چند آدمی کسی معاملہ میں برابر کے شریک ہوں ان کے مال و اسباب اور تصرف کے حقوق یکساں ہوں اور دونوں یا سب شریکوں کا دین بھی ایک ہی ہو اس طرح یہ شرکت آزاد اور غلام بالغ اور نابالغ مسلمان اور کافر کے درمیان نہیں ہوتی اس قسم کی شرکت میں اگر ایک شریک کوئی چیز خریدے تو وہ دوسرے کو بھی مشترک سمجھی جائے گی۔ لیکن اگر کسی نے اپنے گھر والوں کے لیے کوئی کھانے یا پہننے کے لیے کوئی چیز خریدی تو وہ مشترک نہ ہوگی۔ البتہ جو قرض کسی ایک شریک پر تجارت غصب اور ضمانت وغیرہ کی وجہ سے عائد ہوگا وہ دوسرے پر بھی لازم ہوگا۔

(2) شرکت عنان: اس میں شریک دوسرے شریک یا شرکاء کا وکیل ہوتا ہے۔ مگر کفیل نہیں ہوتا اس لیے اگر ایک کا مال زیادہ اور دوسرے کا کم ہو لیکن نفع دونوں شرکاء برابر برابر لیں تب بھی درست ہے اور اگر مال تو دونوں برابر لگائیں مگر نفع ایک کم اور دوسرا زیادہ لے تب بھی صحیح ہوگا اور اگر ایک کا روپے (دراہم) اور دوسرے کی اشرفیاں (دنانیر) ہوں تب بھی شرکت صحیح ہوگی۔

اگر شرکا چاہیں تو بعض مال ہی میں شرکت کریں اور بعض میں نہ شرکت کریں اور جب دونوں شریکوں میں سے کسی ایک نے کوئی چیز خریدی تو قیمت کا اسی سے مطالبہ کیا جائے گا اور دوسرے سے نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس شرکت میں کفالت نہیں ہوتی۔ اگر شریکوں کا مشترک مال ضائع ہوگیا یا خریداری سے بیشتر ایک شخص کا مال ضائع ہوگیا تو دونوں صورتوں میں شرکت باطل ہو جائے گی لیکن اگر ایک شریک اپنے مال کے عوض کوئی چیز خرید لے اور اس کے بعد دوسرے کا مال تلف ہو جائے تو جو سامان خریدا جاچکا ہے وہ دونوں کے درمیان مشترک ہوگا اور جس نے خریدا ہے وہ اپنے شریک کے حصہ کے مطابق اسباب کی قیمت اس سے وصول کرے گا۔

شرکت معاوضہ اور شرکت عنان دونوں میں ہر ایک شریک کو اختیار ہوتا ہے کہ مشترک مال بطور بضاعت کسی کے حوالہ کردے یا مضاربت پر دے دے یا ٹھیکہ پر دے دے یا امانت میں رکھے یا کسی کو اس کا وکیل کردے۔

(3) شرکت صنائع: اس کی صورت یہ ہے کہ دو درزی یا دو رنگ ریز یا درزی اور ایک رنگ ریز اس شرط پر معاملہ کریں کہ دونوں مل کر کام کریں گے اور جو کچھ کمائی یا اجرت ملے گی اس کو دونوں میں تقسیم کریں گے اگر ایک شریک کوئی کام منظور کرے تو دونوں کے لیے اس کو کرنا لازمی ہوگا۔ اگر کام صرف ایک ہی شریک نے کیا اور دوسرے نے نہ کیا تب بھی کمائی دونوں میں مشترک ہوگی شرکت صنائع کو شرکت عمل بھی کہا جاتا ہے۔

(4) شرکت وجوہ: اس میں دو یا اس سے زیادہ اشخاص بلا سرمایہ شریک ہوتے ہیں اور وہ قرض لے کر کاروبار شروع کرتے ہیں اور جو نفع ہوتا ہے وہ باہم تقسیم کرلیتے ہیں اس قسم کی شرکت کو امام مالک اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

امام شافعی نے صحیح نہیں قرار دیا ہے مگر امام ابو حنیفہ نے جائز قرار دیا ہے۔

اس شرکت میں وکالت ہوتی ہے یعنی ایک شریک دوسرے شریک یا شرکاء کا وکیل ہوتا ہے اگر وہ یہ طے کریں کہ نصف نصف مال خریدیں گے تو نفع بھی آدھا آدھا ہوگا اور اگر ایک کا مال ایک تہائی اور دوسرے کا دو تہائی ہو تو نفع بھی اسی حساب سے ہوگا۔

لکڑیاں لانے اور شکار کرنے میں شرکت درست نہیں ہے بلکہ جو کام کرے گا اسی کی کمائی بھی ہوگی۔ لیکن اگر ایک شریک لکڑیاں لائے اور دوسرا اس کی اس میں اعانت کرے تو اصل چیز صرف کام کرنے والے کو ملے گی مگر دوسرے کو رواج اور دستور کے مطابق مزدوری کے طور پر کچھ دیا جائے گا۔

جن صورتوں میں شرکت فاسد ہوجائے ان میں نفع ہر ایک کے مال کی مقدار کے لحاظ سے ہوگا خواہ زیادہ کی شرط کیوں نہ لگائی گئی ہو۔

جب دونوں شریکوں میں سے کوئی ایک مر جائے یا پاگل ہوجائے تو شرکت باطل ہوجائے گی۔ لیکن اگر کئی شریک ہوں تو جو نہ مرے یا پاگل ہوئے ہوں ان کے درمیان شرکت باقی رہے گی۔

دونوں شریکوں میں سے کسی کو یہ حق و اختیار نہ ہوگا کہ وہ دوسرے کی طرف سے زکوۃ ادا کردے، ہر شریک کو اس کا حق ہے کہ وہ جب چاہے شرکت فسخ کردے مگر اس کے متعلق وہ دوسرے کو پہلے مطلع کردے۔ شرکت کے فسخ کے بعد کسی شریک کو مشترکہ مال میں تصرف کرنا جائز نہیں۔

شرکتی ساجیات (Participatory Sociology) :

ساجیات وہ علم ہے جسے ماہر ساجیات سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ کرکے حاصل کرتا ہے اور اس تحقیق میں شرکت لازم ہے۔ پھر شرکتی ساجیات کی الگ سے بات کیوں کی جاتی ہے۔ دراصل یہ تصور تعلیم بالغان کے ان پروگراموں سے شروع ہوا جو تیسری دنیا کے مختلف ممالک میں یونیسکو نے شروع کیے۔ ایک ملک کا قصہ کچھ یوں بتایا جاتا ہے کہ تعلیم بالغان کے پروگرام میں اسکول کے بچوں نے ایک ڈرامہ خود تیار کیا جس کے مکالموں اور کہانی میں تعلیم کی موافقت کا پیغام چھپا ہوا تھا۔ اس ڈرامے کو ملک کے کونے کونے میں پیش کیا گیا۔ جمائیکا میں اس پروجیکٹ کا نام ڈرامہ برائے ترقی یا Drama for Progress کہلایا۔ اس ڈرامے کی اہمیت کا تعلق اس کی کامیابی میں نہ تھا بلکہ اس کی ناکامیابی میں تھا اور اس بات میں بھی کہ کیسے ڈرامہ کو پیش کرنے والے طلبا اور طالبات اور خود ناخواندہ گاؤں کے لوگوں نے، کیسے ڈرامہ کی غلطی کی تصحیح کی۔ اصل واقعہ کچھ یوں تھا کہ ڈرامہ کو پیش کرنے والے اور ڈرامہ کے دیکھنے والوں کا جوش مختلف وجوہات سے تھا۔ ڈرامہ کو پیش کرنے والے لوگ اپنی نظر میں ایک بڑا کام کررہے تھے مگر ڈرامہ دیکھنے والے لوگوں کے پاس اس وقت اپنا دل بہلانے کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ رہا سوال تعلیمی پیغام کا تو وہ ڈرامہ پیش کرنے والوں کے ذہنوں میں ضرور تھا مگر ڈرامہ دیکھنے والے اس سے بالکل بے خبر تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ ڈرامہ لکھنے والوں نے ڈرامہ لکھتے وقت یہ نہیں سوچا کہ ڈرامہ جن لوگوں کو دکھایا جائے گا وہ کون سے لطیفوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ کن باتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ علم کی اہمیت ان کی زندگی میں کہاں ہے اور کون سی کشش انھیں تعلیم بالغان کی کلاسوں میں کھینچ کر لائے گی۔ ڈرامہ کے لکھنے والوں کو یہ باتیں کون بتائے گا اور کس ذریعہ سے وہ ان باتوں کو جان پائیں گے۔

شرکتی ساجیات کی بنیاد اسی سوال کے جواب کو حاصل کرنے کے عمل سے شروع ہوتی ہے۔ لوگوں کی زندگی کو سمجھنے کے لیے ڈرامہ لکھنے والوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ وہ گاؤں والوں سے رجوع کریں گے اور ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر ان کی باتیں سنیں گے نہ کہ اپنی باتیں انھیں سنائیں گے۔ انھیں لیکچر نہ دیتے ہوئے خود ان کی باتوں سے نوٹس لیں گے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے موضوعات، نئے لطیفے اور نئے خاکے نکل کر آئے جن کی مدد سے کچھ نئے ڈرامے تیار ہوسکے۔ مگر پھر بھی ڈرامہ دکھانے والوں اور ڈرامہ دیکھنے والوں کے درمیان خلیج بدستور قائم رہی۔ اس بار طلباء نے ایک دوسرا قدم اٹھایا۔ تجزیہ کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ اگر ڈرامہ کی اسکرپٹ گاؤں والوں کی مدد سے لکھی گئی تو کیوں نہ گاؤں والے خود اس ڈرامے میں شرکت کریں۔

اس تجربہ سے یہ بات سامنے آئی کہ علم کا سفر شروع میں تعلیم یافتہ سے شروع ہوکر ناخواندہ پر ختم ہوا مگر تجربے نے اس بات کی نشان دہی کی کہ علم کی پیداوار اور اس کا فروغ خود لوگوں کی اپنی زندگی اور اس کے عمل سے پیدا ہوتا ہے جس میں باہر سے آئے ہوئے طلباء شرکت کرسکتے ہیں۔ یہ واقعہ شرکتی ساجیات سے متعلق تحقیقات کے لیے بہت اہم ثابت ہوا۔ خصوصاً اس محقق کے لیے جو سماج میں علم تو بٹورتا ہے مگر

واپس اسی سماج تک وہ علم نہیں پہنچاتا۔ ایک نئی شکل کی ریسرچ جسے شرکتی سماجیات کہہ سکتے ہیں مندرجہ ذیل سوالات کی جانب ہماری توجہ مبذول کرتی ہے۔

(1) تحقیق کی شروعات کیسے ہوئی؟ (2)اس تحقیق کا تعلق سیاست سے کس طور پر ہے؟ (3)شرکت سے کیا مراد ہے؟ (4)غریب لوگ اپنے فائدے کے لیے ریسرچ کو کس طرح کنٹرول کرسکتے ہیں؟ (5)سماجی اور معاشی حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا شہر میں کام کرنے والا مزدور اس قسم کی ریسرچ میں شامل ہونے کے لیے وقت نکال سکتا ہے؟ (6) تحقیقی علم اور عمل میں بیلنس (توازن) کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

شرکتی سماجیات وہ سماجی علم ہے جو تحقیق برائے تحقیق سے گریز کرتے ہوئے سماجیات کے طالب علم کو دعوت دیتی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی میں اس طرح شریک ہوں کہ اس سے سماجی علم بھی حاصل ہو اور لوگوں کی زندگی خود ان کے منصوبوں کے تحت تبدیل ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ سماجیات کا یہ بدلا ہوا رجحان شاہد اور مشہور کو مختلف شکل میں ایک دوسرے سے جوڑتا ہے اس طرح کی تحقیق میں غریب لوگ محض اپنے بارے میں محقق کو صرف اعداد وشمار نہیں بتاتے بلکہ تحقیق کے عمل میں اس طرح شامل ہوجاتے ہیں کہ سماجیات سے نکلا ہوا علم نہ صرف ان کی زندگی کے لیے موزوں ہوتا ہے بلکہ اس علم کے ذریعے ان کی زندگی میں مناسب تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

شرکتی سماجیات میں سماجی تحقیق کو لوگوں کی اجتماعی زندگی میں شرکت سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ تحقیق اور شرکت کے اس مرکب سے شرکتی سماجیات پیدا ہوتا ہے۔ سماجیات کی تاریخ میں تحقیق کے ذریعے جمع کیا گیا علم اکثر اوقات حکمرانوں کے حوالے کردیا جاتا ہے تاکہ وہ عوام کی بہبود کے لیے پالیسیاں بناسکیں۔ اس شکل کی سماجیات میں تحقیق اور عوام کے درمیان بے شمار بچولیے (Intermediaries) ہوتے ہیں۔ مگر شرکتی سماجیات میں سماجی محقق اور وہ لوگ جن پر تحقیق کی گئی ان کے درمیان روایتی خلیج نہیں ہوتی۔ شرکتی سماجیات میں سماجی علم محض ماہر سماجیات اپنے طور پر تصنیف نہیں کرتا بلکہ علم کا حصول اور تشکیل ایک ملی جلی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں ماہر سماجیات اور لوگوں کی شرکت جمہوری اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی جاتی ہے۔ شرکتی سماجیات میں سماجی ریسرچ سے متعلق پروجیکٹ کا مقصد محض لکھے ہوئے نتائج برآمد کرنا نہیں ہوتا بلکہ سماج کو حقیقی طور پر کچھ نئی سمتوں کی جانب ڈھالنا بھی ہوتا ہے۔ روایتی سماجیات میں مقالہ یا کتاب ایک ریسرچ کا ماحصل ہوتا ہے مگر شرکتی سماجیات میں انسانی گروہ کی اجتماعی زندگی میں خاطر خواہ تبدیلی بھی تحقیق کے عمل سے جڑی ہوتی ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ افراد جن پر کہ ریسرچ کی جارہی ہے وہ خود اس ریسرچ کا حصہ نہ بنیں۔ نہ صرف حصہ بنیں بلکہ اپنے مسائل کا اظہار کرسکیں اور مسائل کے حل کی جستجو میں شریک رہیں۔ جنوبی امریکا میں اس قسم سینکڑوں تحقیقات کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ شرکتی سماجیات، ماہر سماجیات اور عوام کے درمیان ایک لمبے مکالمے کا دوسرا نام ہے۔ سماجی تحقیق کے ٹول مثلاً سوال نامہ، انٹرویو وغیرہ بھی اپنی شکل بدل لیتے ہیں۔ شرکتی سماجیات میں یہ ٹول مکالمہ کو فروغ دینے والے ٹول بن جاتے ہیں۔ شرکتی سماجیات میں سماجی تحقیق کا مقصد عوامی تعلیم کو فروغ دینے کا مقصد بھی بن جاتا ہے تاکہ دبے ہوئے انسانوں کی چھپی ہوئی صلاحیتیں اجاگر ہوں اور مسائل کے حل میں انسانی وسائل کا کل ممکن استعمال ہوسکے۔ شرکتی سماجیات اپنے آپ کو سیاسی طور پر بے دخل نہیں کرتی بلکہ یہ مانتی ہے کہ علم کا تعلق اقتدار سے ہے اور جب لوگوں کی شرکت خود اپنی زندگی کو سمجھنے میں ہوگی تو یقیناً اس سے سماج میں برابری حاصل کرنے کی کشمکش اور جدوجہد سے تصادم اور تبدیلی پیدا ہونے کا امکان اور بھی قوی ہوجائے گا۔

شروتی (Sruties): ہندو لاء کے بنیادی ماخذ ہیں۔ ان میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ آج کل کی قانونی زبان میں نہیں ہیں۔ شروتی میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ آریوں میں انسان کی اخلاقی ذمہ داری کا زبردست تصور موجود تھا۔

شہادت(Evidence): قانون شہادت اس اصول پر مبنی ہے کہ

(1) شہادت صرف ان واقعات کی نسبت پیش ہونی چاہیے جو امور تنقیح طلب (Facts in Issue) پر اثرانداز ہوں۔

(2) اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی یعنی سب سے اچھی شہادت جو بھی دستیاب ہوسکے وہ پیش ہونی چاہیے۔

(3) سماعی شہادت سنے سنائے بیانات قابل قبول شہادت نہیں یعنی کسی واقعہ کی نسبت دوسرے شخص سے حال سن کر کوئی گواہ بیان کرے تو وہ ناقابل قبول ہوگا۔

اس طرح مقاصد عدالت کے لیے جو شہادت مانی جاتی ہے نہ وہ اس درجہ کی ہے جس کو کامل یقین کا درجہ حاصل ہے نہ وہ اس درجہ امتیاز کی ہے جس پر روزمرہ کی زندگی کا کاروبار ہوتا ہے بلکہ ان دونوں میں ایک متوسط درجہ کی شہادت ہے۔

شہر، ایک سماجی حقیقت (City, as a Social Reality)

شہر، ایک سماجی حقیقت (City, as a Social Reality) : گنجان اور ارتکازی انسانی آبادیوں کا وجود تاریخ کے ہر دور میں رہا ہے۔ اور سب سے انسانی تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔ شہروں کا وجود ہمیشہ سے ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ شہر اور اس سے متعلقہ مسائل اور ماحول کے مطالعہ کی طرف مفکرین نے بہت کم توجہ دی۔ چنانچہ آج بھی اس تصور کی تعریف اور اس کی تشریح کے تعلق سے ماہرین کی آراء اور ان کے نقطہ نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی بستیوں میں شہروں کا وجود ہر زمانے میں ایک نمایاں نوعیت اور اہمیت کا حامل رہا ہے۔ شہر سے مراد محض وہ عمارات، قلعے، عبادت گاہیں اور شاہی محلات نہیں ہیں۔ جو کسی خاص مقام پر پائے جاتے ہیں۔ یا اس سے مراد محض بڑے بازار یا خرید و فروخت کی سہولتیں غلے اور تجارتی مال کے گودام ہی نہیں ہیں بلکہ شہری ماحول کو مجموعی اور انفرادی کیفیت عطا کرتا ہے ایک مخصوص نفسیاتی اور سماجی پس منظر جو ہر شہر کا منفرد خاصہ ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں بڑے شہر حکمرانی کے مراکز میں پھیلے ہوئے ہوتے تھے۔ اور بالخصوص صدر مقام یا پایہ تخت کے شہر مضبوط دیواروں یا فصیلوں سے گھرے ہوتے تھے تاکہ شہری آبادی اور وہاں کے صاحبان اقتدار بیرونی حملوں یا خطرات سے محفوظ رہیں۔ شہر کی دیواروں میں زندگی کے تنوع کے باوجود ایک قسم کی وابستگی اور آہنگ کا شعور پایا جاتا تھا۔ اور ایسے شہروں کے تمام لوگ ایک قسم کے سیاسی اور معاشی شعور کے حامل ہوتے تھے۔ لیکن پچھلے زمانے میں جو شہر پائے جاتے تھے وہ رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے بہت مختصر ہوتے تھے۔ ان شہروں کی سماجی زندگی اور ان کے مسائل کے بارے میں سب سے پہلے افلاطون اور ارسطو نے اور اس کے بعد گیووانی بوتیزو (Giovanni Botezo) نے 1588 میں توجہ دلائی۔ اس کے بعد شہری سماج اور اس کے مسائل پر انیسویں صدی میں بہت کچھ لکھا گیا۔ شہر کے تعلق سے اسنادی مواد کی کمی کے باوجود یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مصر کی قدیم ترین تہذیب میں بھی ممفس (Memphis) جیسے مشہور شہر موجود تھے۔ اس کے علاوہ بابل و نینوا اور دوسری مشرقی تہذیبوں میں بھی بڑے شہروں کا ذکر پایا جاتا ہے۔

البتہ گذشتہ اور موجودہ صدی میں شہروں پر بہت زیادہ تحقیقاتی کام کیے گئے ہیں۔ چنانچہ ورزسو مبارث، میکس ویبر اور دوسرے بے شمار سماجیات دانوں کے نام گنائے جاسکتے ہیں جنھوں نے موجودہ صدی کی ابتداء میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ شہروں کے ارتقاء کی تاریخ اتنی قدیم ہے کہ شہروں کی مختلف قسموں کا تذکرہ بہت دشوار ہے۔ سہولت کی خاطر قبل صنعتی اور مابعد صنعتی ادوار کے شہروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ قدیم شہر تمدنی روایات کا مظہر ہوا کرتے تھے۔ جہاں اس تہذیب کے تعلق سے گہرے اور جذباتی روابط کا وجود ہوتا تھا۔ جدید شہر یا صنعتی شہروں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ روایات کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ جدتوں اور تبدیلیوں کا بھی یہ سب سے بڑا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج کے انتہائی تیزی سے بدلتے ہوئے سماج میں رسل و رسائل کی ترقی کے نتیجہ کے طور پر عالمی شہر (Cosmopolitan City) برق رفتار تبدیلیوں کا ایک انتہائی پیچیدہ ماحول پیش کررہے ہیں۔ سماجیاتی اعتبار سے جدید شہر تبدیلی اور ترقی کا مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ سماجی ماحولیات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ کسی سماج میں تبدیلیوں کا سب سے تیز دھارہ شہری سرچشموں سے پھوٹتا ہے جہاں اس سماج کے مختلف گروہوں اور طبقات کے لوگ اکٹھا ہو کر مخلوط تمدن کے تجربہ میں معروف رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہری سماجیات ایک علاحدہ علم بنتا جارہا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ گذشتہ دو سو برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دیہی آبادیاں شہروں میں منتقل ہوتی جارہی ہیں۔ اور اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ ایک سو برس کے اندر دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی شہروں میں منتقل ہوچکی ہوگی۔ شہروں کا وجود یا ان کا قیام محض ایک طبعی ماحولیاتی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے سماج کے بین گروہی تعلقات اور معیار زندگی کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں جو سلم (Slum) یا افلاس زدہ بستیاں پائی جاتی ہیں ان سے پیدا ہونے والے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ بہرحال شہری بستیوں کا قیام اور ان کے ماحول کے سماجی مسائل، جدید دور اور جدید سماجیات کا ایک انتہائی اہم اور نازک موضوع بن چکے ہیں جن پر ہر ملک میں بے شمار تحقیقات جاری ہیں۔

شہری زندگی کے منفی پہلو: شہری زندگی چونکہ پیچیدہ ہوتی ہے اس لیے اس میں مشکلات اور دشواریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان دشواریوں کی مکمل فہرست تو نہیں بنائی جاسکتی لیکن کچھ مخصوص مشکلات کا احوال مختصراً یہاں درج ہیں۔

گندی بستیاں (Slums): شہروں میں رہنے والے تمام افراد رہائش کے سلسلے میں ہونے والی دشواریوں سے بخوبی واقف ہیں۔ مکان سے متعلق دشواریوں کے لیے شہر مخصوص ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے غریبی کے باوجود رہنے کی جگہ پا لیتے ہیں لیکن شہروں میں گندی بستیوں میں انتہائی غلاظت اور تنگی کے درمیان رہنے کی وجہ سے رہنے والے نہ صرف جسمانی اور ذہنی مسائل سے دوچار ہوتے ہیں بلکہ ایک مجرمانہ اور منفی انداز زندگی بھی اپنا لیتے ہیں۔ 1991 کی مردم شماری کے مطابق دہلی میں 44 فیصد، ممبئی میں 45 فیصد، کلکتہ میں 42 فیصد اور چینئی میں 39 فیصد آبادی سلیم ایریا میں رہتی تھی۔ تمام صنعتی شہروں میں یہی حال ہے دھاراوی بمبئی میں ایشیا کی سب سے بڑی گندی بستی یا سلم ہے۔ گندی بستیاں زیادہ تر غیر منصوبہ بند شہری نشوونما کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ لاطینی امریکا کے سلم میں بہت مشہور ہیں۔

روزمرہ ضروریات کی اشیا کی کمی: آبادی کے بے حد بڑھنے سے شہروں میں تمام ضروریات زندگی نایاب ہوجاتی ہیں۔ خاص طور پر پانی اور بجلی کی کمی لاحق ہو جاتی ہیں۔ پانی کی نکاسی بھی ٹھیک سے نہیں ہوسکتی۔ فاصلے زیادہ ہونے کی وجہ سے آنے جانے میں دشواری ہوتی ہے۔ بسیں اور لوکل ٹرینیں آبادی کی وجہ سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں۔ ان سب اسباب سے صفائی کی حالت بھی سقیم ہی ہوتی ہے۔

ماحولیات اور آلودگی: ہندستان میں اکثر بڑے شہر قریبی ندیوں میں اپنی صنعتی آلودگی بہادیتے ہیں۔ دہلی دنیا کا چوتھا سب سے زیادہ آلودہ شہر ہے۔ 1995 میں سپریم کورٹ 146 انڈسٹریز کو دہلی سے باہر لے جانے کا حکم دیا تھا جس پر ابھی تک مکمل طور سے عمل نہیں ہوسکا ہے۔ اسی قسم کا ایک حکم آندھرا پردیش میں بھی دیا جاچکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان شہروں میں کینسر کا خطرہ بھی بہت زیادہ ہے۔ فی الوقت ڈیزل کو چھوڑ کر .C.N.G استعمال کرنے والی بسیں بھی آلودگی کنٹرول کرنے کے لیے چلائی جارہی ہیں لیکن کوئی خاص ماحولیاتی بہتری ابھی نظر نہیں آئی ہے۔

تنہائی اور غیر شخصی تعلقات: بے حد بھیڑ ہونے کے باوجود بھی "بھیڑ میں اکیلاپن" ایک مخصوص کیفیت شہریوں کے دماغوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ جس میں وہ کسی کے جینے یا مرنے کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ شہروں میں بے اطمینانی ہی نہیں بلکہ مختلف دماغی امراض، جرائم اور خودکشی کا رجحان دیہاتی لوگوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ساجیات میں اس کیفیت کو ذاتی انتشار (Personality Disorganization) کہا جاتا ہے۔

تمدنی بحران: شہر میں پرانی تہذیب و تمدن کا ساتھ چھوٹتا جاتا ہے اور نئی تہذیب کو پوری طرح قبول نہیں کیا جاتا اس لیے ہر فرد بے اطمینانی کا شکار ہوتا ہے۔ خاندان جیسی اکائی کا زوال ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے ہر انسان عدم تحفظ سے خوف زدہ رہتا ہے۔

سڑک چھاپ بچے (Street Children): شہروں میں گندی بستیوں اور گاؤں سے شہر کی طرف برابر ہجرت کے سبب لاکھوں بچے سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے پھرتے ہیں جو نہ اسکول جاتے ہیں نہ باقاعدہ مزدوری کرتے ہیں۔ یہ بچے بے توجہی کا شکار ہوتے ہیں پولیس اور دوسرے گروہ ان کا ہر قسم کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ مزدوری، قلی گیری، بوٹ پالش، خونچہ لگانے کا یا بھیک مانگنے کا پیشہ کرتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کبھی کبھار جسم فروشی یا منشیات کی ترسیل کا کام بھی کرتے ہیں۔ حکومت ہند اور یونی سیف ان سڑک چھاپ بچوں (Street Children) کے ساتھ بہت سے پروگرام چلا رہی ہے۔

مختصر طور سے شہری زندگی دشواریوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے باوجود آج یہ لازمہ حیات ہے۔ مہاتما گاندھی نے شہروں کو دھرتی کا کوڑھ اور زخم کہا ہے لیکن ان سے مفر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے شہری زندگی میں سدھار لانے کی کوشش لازمی ہیں۔

شہر (ارتقاء اور مقاصد): شہر کسی سماج کی ایسی بستی یا بستیوں کے مجموعہ کو کہتے ہیں جہاں آبادی گنجان ہوتی ہے۔ زندگی کی ضروریات کے اعتبار سے خود کار اور خود کفیل ہوتی ہے۔ ثقافتی اعتبار سے یہ سماج کے بڑے حصہ کی یہ نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی زندگی پیچیدگی، تنوع اور تغیر پذیری سے عبارت ہوتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں شہر آباد ہوتے رہے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں یوں تو زرعی پیداوار دیہی اکائیوں یعنی گاؤں میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہوتی تھی لیکن بے شمار گاؤں کے بیچ میں کسی ایسے محل وقوع پر جہاں سے دوسرے مقامات سے ربط اور حمل و نقل کی زیادہ سہولت ہوتی تھی، شہر بھی آباد ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قدیم زمانہ کے بڑے بڑے شہروں پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یا تو وہ دریا کے کنارے آباد تھے یا ساحل سمندر پر۔ یا ایسے میدانی یا پہاڑی مقامات پر جہاں سے دور دراز علاقوں سے ربط قائم رکھنا ممکن ہوتا تھا۔ دراصل ہر شہر اپنے موقف کے اعتبار سے ایک تمدنی مرکز ہوتا تھا۔ جہاں پیداوار اور تقسیم دولت کا لین دین ہوا کرتا تھا۔ نیز جہاں سے انتظامی اور نظم و نسق کی بحالی کے کام بآسانی انجام دیے جاسکتے تھے۔ چنانچہ بادشاہوں اور راجاؤں کے صدر مقام امراء کے قلعے یا ان کے مستقر تجارتی منڈیاں اور جغرافیائی اہمیت کے حامل مقامات شہر کا درجہ حاصل کرلیتے تھے۔

پچھلے زمانہ میں بھی ساجیاتی اعتبار سے شہر کے دو اہم کام ہوتے تھے۔ پہلا اپنے سماج کی زندگی کی رہنمائی کرنا اور دوسرا دیگر تمدنی مراکز کی اختراعات اور اقدار سے استفادہ کر کے اپنی ثقافت میں اضافہ کرنا گویا شہر وہ مراکز ہوا کرتے تھے جہاں چھوٹے یا بڑے پیمانہ پر ثقافت سازی اور اس کی توسیع ہوتی تھی۔ آج سے ہزاروں سال پہلے ظاہر ہے کہ دنیا کی آبادی بہت کم تھی اس لیے بڑے بڑے شہروں کی آبادی بھی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی شہروں کی وسعت میں مسلسل اضافہ جاری رہا جو آج حیرت انگیز حدوں تک پہنچ گیا ہے۔

شہری زندگی کی اہم خصوصیات میں سماجی پیچیدگی، تغیر پذیری رسمی تعلقات کی بہتات اور تیز تغیرات کی وجہ سے سماجی انحراف اور جرائم شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ شہر علم، تجزیہ، مشاہدہ تحقیقات کا مرکز بھی ہوتے ہیں۔ صنعتی انقلاب سے پہلے سماجی زندگی کا انحصار زرعی معیشت اور اس سے متعلقہ ثقافت پر تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے شہر یا تو فوجی چھاونیاں ہوتے تھے یا کسی ملک کے اہم جغرافیائی مقامات یا صدر مقام ہوتے تھے۔ جہاں بااقتدار طبقہ اپنے انتظامی مراکز قائم کرتا تھا۔ اور زندگی کی سہولتوں کی فراہمی کے لیے مختلف پیشوں اور دستکاری کی سرپرستی کرتا تھا۔ لیکن اس وقت تک شہری زندگی اس صنعتی تمدن کے ماحول سے قطعی ناآشنا تھی جس نے انیسویں صدی سے زندگی کو ایک انتہائی تیز رفتار دھارے کے حوالے کر دیا۔

صنعتی انقلاب کے بعد شہری زندگی صنعتی معیشت کی پیداکردہ ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور، حاکم اور محکوم افسر اور نوکر کے تعلقات پچھلے زمانہ کے مقابلہ میں بڑی حد تک بدل چکے ہیں نیز وسائل حمل و نقل نے شہروں کو ایک دوسرے سے جغرافیائی فصل کے باوجود بہت قریب کردیا ہے۔ آج کا شہر سماجی تبدیلیوں کا انتہائی تیزی سے بدلتا ہوا مظہر ہے۔ خصوصاً بڑے بڑے شہر مثلاً نیویارک، لندن، پیرس، بمبئی، ٹوکیو وغیرہ صبح و شام تبدیلیوں کے مظاہرہ پیش کرتے ہیں۔ جہاں زندگی کی کیفیت سیمابی ہو گئی ہے اور اس کی وجہ سے بے شمار پیچیدہ مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ آبادیاتی اعتبار سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دیہی آبادیاں شہروں کی طرف منتقل ہورہی ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے شہر رقبہ اور آبادی میں بہت آگے بڑھتے جارہے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ پچاس سال میں دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی شہروں میں رہنے بسنے لگے گی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دیہاتی مرکز بھی شہروں میں تبدیل ہوتے جارہے ہیں۔ اور میکانیت اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے دیہات اب ان معنوں میں دیہات نہیں رہ جائیں گے جن معنوں میں گذشتہ صدی میں انھیں دیہات کہا جاتا تھا۔ عام طور سے کسی ملک کو شہروں اور دیہاتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے لیکن امریکا جیسے ترقی یافتہ صنعتی ملک میں اب حقیقتاً خالص دیہات بہت کم باقی رہ گئے ہیں ان کی سماجی اکائیوں کو نیا نام شہری دیہی بستیاں (Rurban Areas) ہے اور جیسے جیسے صنعت اور میکانیت دنیا میں پھیلتی جائے گی اسی تناسب سے شہروں میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

تمدنی اعتبار سے شہر کے اہم فرائض میں نظم و نسق، تعلیم، تربیت، تفریحات تخلیق کاری ایجاد و اختراع، تغیر پذیری، نقل پذیری اور ثقافتی روابط و انتشار شامل ہیں۔ سماجی زندگی کی رہنمائی اور رہبری میں شہروں کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ یہ بڑی حد تک سماجی فیصلوں اور اجتماعی اقدامات کے مراکز ہوتے ہیں۔ یہ دراصل وہ مراکز ہیں جنھیں تمدنی جنریٹر (Generator) کہا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی سماج اپنی شہری زندگی میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرسکے تو اس کے نتیجہ کے طور پر پورے سماج میں یہی صفات پیدا ہوسکتی ہیں اس کے برعکس اگر شہری زندگی ناقابل کنٹرول انتشار اور جرائم کی آماجگاہ بنتی جائے تو اس سے سماجی توازن اور ہم آہنگی کو خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے ساجیاتی تحقیقات میں شہری زندگی کا مطالعہ اور اس کا تجزیہ سماجی رجحان کے سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

شہریت (Citizenship): روم میں شہریت محض قانون کے

اطلاق کے لیے ضروری تھی۔ رومن لاء کے بعض حصے صرف رومیوں پر ہی نافذ ہوتے تھے اسے جس سول (Jus Civil) بھی کہا جاتا تھا۔ عام اصول یہ تھا کہ اگر والدین کے درجوں یامدارج میں فرق ہو تا تھا تو لڑکا اپنے باپ کی روش پر چلتا تھا بشرطیکہ والدین کا ازدواجی رشتہ رومن لاء کے تحت باقاعدہ شادی کے ذریعہ طے ہوا ہو ورنہ لڑکا اپنی ماں کی روش پر چلتا تھا۔ اس کے متعلق ایک قانون روما کے جمہوری دور میں نافذ کیا گیا اس قانون کے لحاظ سے اگر ازدواجی رشتہ شادی کے ذریعہ طے نہ پائے اور اس رشتے میں ایک رومن باشندہ ہو اور دوسرا اجنبی ہو تو ایسی صورت میں لڑکا اس روش کی پابندی کرے گا جس پر اس کی ماں چلتی تھی شہریت اور شہری حقوق کے اصول میں جو عظیم وسعت کا راسالن (Caracallan) نے دی اس نے رومن لاء کے اس جزو کی اہمیت کو بہت کچھ کم کردیا تھا۔

شیاطین: شیطان کی جمع ہے اہل بصرہ کے نزدیک یہ شطن سے مشتق اور فعال کے وزن پر ہے جس کے معنی دور ہونا ہے اور اہل کوفہ اس کو شیط سے مشتق اور فعلان کا ہم وزن بناتے ہیں جس کے معنی ہلاک ہونا اور جلنا ہے پہلے خیال کے لوگوں کے نزدیک جو نیکی سے دور اور رحمت الٰہی سے مایوس ہو اس کو شیطان کہیں گے او دوسرے خیال والوں کے نزدیک غصہ اور حسد میں جلنے بھننے اور اپنے فاسد اعمال کی وجہ سے ہلاک و برباد ہونے کے نتیجے میں وہ شیطان کہلائے گا۔

شیطان عموماً خبیث سرکش باغی شریر اور خودسر کے مفہوم میں بولا جاتا ہے اس لیے جنوں اور انسانوں میں سے جو بھی سرکش باغی اور خبیث ہوں ان کو شیطان کہا جائے گا۔ ابلیس کو اس لیے شیطان کہا گیا ہے کہ اس نے سرکشی اور بغاوت کی وجہ سے خدا کا حکم نہیں مانا اور غرور و استکبار کی بنا پر حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا اور رحمت الٰہی سے ناامید ہوکر لوگوں کو گمراہ کرنا اپنا مشن بنا لیا۔

شیطنت دراصل گمراہی اور برائی کی ایک علامت وقوت کا نام ہے جو ازل ہی سے آدم اور ان کی اولاد کے خلاف سرگرم عمل ہے اور ابد تک رہے گی۔

شیعہ: مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں ان میں بڑے دو ہیں۔ سنی اور شیعہ۔ شیع کے لفظی معنی پیروکار، حمایتی اور مددگار کے ہیں۔ چونکہ مسلمانوں کا یہ فرقہ حضرت علیؓ کا دم بھرتا اور ان سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ اس لیے ابتدا میں یہ لوگ شیعانِ علی یعنی حضرت علی کے متبعین اور اعوان کہلاتے تھے اور بعد میں صرف شیعہ کہلانے لگے۔

اس فرقہ کا ظہور حضرت عثمان کے عہد خلافت کے آخری دور میں ہوا۔ شروع میں مصر میں بھی اس مسلک کی اشاعت ہوئی لیکن ان کا بڑا مرکز عراق تھا۔ سنیوں سے ان کا اصل اختلاف امامت اور خلافت کے مسئلہ میں ہے۔ وہ اس کو اسلام کا اصل الاصول سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نبی پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے وہ ائمہ کو بھی معصوم خیال کرتے ہیں اور حضرت علی کو آنحضرت ﷺ کا خلیفہ مختار اور تمام صحابہ کرام میں سب سے افضل مانتے ہیں۔

شیعوں کا اعتدال پسند گروہ گو تفضیل علی کا قائل ہے مگر وہ دوسرے صحابہ پر طعن نہیں کرتا مگر ان کا غلو پسند طبقہ حضرت علی کی نبوت اور الوہیت کا بھی قائل تھا اور بعض ان کو آنحضور صلعم سے بھی افضل قرار دیتے ہیں مگر اب شیعوں کا یہ غالی گروہ معدوم ہوچکا ہے اس زمانہ میں ان کے بڑے بڑے یہ فرقے باقی رہ گئے ہیں۔ (حوالہ کے لیے دیکھیے نوشتہ شیعہ)

شیئر وارنٹ (Share Warrant): شیئر وارنٹ وہ دستاویز ہے جو کمپنی سے اس تخصیص کی بابت کے برخلاف شیئر وارنٹ کسی دوسرے شخص کو منتقل ہوسکتا ہے اور ایک قابل معاہدہ (Negotiable Instrument) دستاویز ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ص

صحیح بخاری: حدیث کی نہایت مشہور اور اہم کتاب ہے اس کا پورا نام "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ ﷺ وسنہ و ایامہ ہے اور مصنف کا نام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری ہے جو موجودہ ازبکستان میں واقع شہر بخارا میں 194ھ مطابق 810ء) میں پیدا ہوئے آخر عمر میں ایک ابتلا سے دوچار ہوئے۔ حاکم بخارا کے فرمان سے آپ کو وہاں سے نکل جانا پڑا۔ آپ نے سمرقند کا قصد کیا۔ چنانچہ اس کے قریب ایک بستی خرتنگ میں رہنے لگے۔ یہیں جلاوطنی کی حالت میں (256ھ مطابق 870ء) میں انتقال کیا۔ اپنے فضل و کمال اور احادیث میں غیر معمولی تبحر کی بنا پر امام المحدثین اور امیرالمومنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔ ان کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ صحیح بخاری کی ترتیب و تالیف ہے جس کو لازوال شہرت نصیب ہوئی۔ یہ تقریباً دس ہزار حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی کتابوں کی تعداد ایک سو ساٹھ اور ابواب کی تیس ہزار چار سو ہے۔ ابواب و تراجم مصنف کے عظمت شان، جودت طبع، ذہن رسا، دقیقہ سنجی، نکتہ آفرینی، بالغ نظری، وسعت علم، فقہ و اجتہاد اور استخراج و استنباط وغیرہ کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔

امام بخاری نے اپنی صحیح کی ترتیب میں نہایت کاوش اور بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ صحت، قوت، روایت، اتصال، اسناد اور دوسری بے نظیر خوبیوں کی وجہ سے اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر امت نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے اور وہ ہر زمانہ میں درس و تدریس کا لازمی جز رہی ہے اور اس کے متعلق بے شمار کتابیں اور شرحیں لکھی گئی ہیں۔ حافظ ابن حجر کی فتح الباری اور علامہ عینی کی عمدۃ القاری زیادہ مشہور شرحیں ہیں۔

صحیح بخاری کے علاوہ مصنف سے متعدد کتابیں یادگار ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں: التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط، التاریخ الصغیر، الجامع الکبیر، خلق افعال العباد، کتاب الضعفاء، الادب المفرد وغیرہ۔

صدقات: زکوٰۃ کے علاوہ اصحاب ثروت اپنی دولت میں سے جو کچھ دیتے ہیں ان کو صدقات کہا جاتا ہے۔ عام حالات میں ان کی حیثیت مستحسن کی ہے لیکن بعض حالات میں یہ واجب قرار دیے گئے ہیں نفلی صدقات کی ادائیگی تو آدمی خود کرسکتا ہے۔ مگر صدقات واجبہ بیت المال کا حق ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بیت المال کی آمدنی کے چند ذرائع ہیں۔ جیسے اسلامی حکومت کی مملوکہ زمین ان کی کئی صورتیں ہیں (1) حکومت کسی مفتوحہ ملک کی کچھ زمین خالصہ قرار دے دے اور اس کو اجرت پر کاشت کے لیے دے دے یا کوئی زمین خریدے تو اس کی پیداوار بھی بیت المال کا حق ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی ذمی بغاوت کرکے یا کوئی مسلمان مرتد ہو کر دارالحرب کو فرار ہوجائے تو ان کا تمام مال ضبط ہو کر بیت المال کی ملکیت ہوجاتا ہے۔

یہ تو بیت المال کی آمدنی کے وسائل و ذرائع کا ذکر ہوا ان سب کے مصارف کی حد بھی اسلامی شریعت نے تعین کردی ہے اور بتا دیا ہے کہ ان کو کن کن مدوں میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔ مصارف کی تفصیل قرآن اور احادیث نبوی میں بھی بیان کی گئی ہے اور فقہ و قانون کی کتابوں میں بھی طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

صرف اشیا-افادہ مختتم (Consumption and Marginal Utility): کسی شے کے راست استعمال سے جو تشفی حاصل ہوتی ہے اسے افادہ (Utility) کہتے ہیں۔ جب ہم ایک خاص وقت میں کسی شے کا یکے بعد دیگرے استعمال کرتے ہیں تو اس کی ہر مزید اکائی سے جو افادہ حاصل ہوتا ہے وہ گھٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ شے کی چند اکائیوں کے استعمال سے ہماری حالت کی پوری تشفی ہوجاتی ہے۔ شے کی تمام اکائیوں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سے جو جملہ تشفی حاصل ہوتی ہے اسے افادہ کلی (Total Utility) اور ہر مزید اکائی سے جو تشفی ہوتی ہے اسے افادہ مختتم (Marginal Utility) کہتے ہیں۔ چونکہ کسی شے کے استعمال کے سلسلہ میں افادہ مختتم کے گھٹنے کا یہ رجحان عام ہے اس لیے اس رجحان کو قانون تقلید افادہ مختتم (Law of Diminishing Marginal Utility) کہتے ہیں۔ اس قانون سے جو اہم نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ کسی شے کی زیادہ مقدار پر تو اس کا افادہ مختتم کم اور کم مقدار پر افادہ مختتم زیادہ ہوتا ہے۔ افادہ چونکہ ایک موضوعی تصور (Subjective Concept) ہے اس کا معروضی (Objective) تخمینہ نہیں ہوسکتا پھر بھی کسی شخص کے ذہن میں کسی شے کی مختلف مقداروں کے افادہ مختتم کا جو احساس ہوتا ہے اس کا تخمینہ زر (Money) کی اس مقدار سے کیا جاتا ہے جو وہ اس شے کی مزید اکائی حاصل کرنے کے لیے بطور قیمت دینے کو تیار ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شے کی پہلی دوسری اور تیسری اکائیوں کے لیے علی الترتیب 4، 3 اور 2 روپے دینے کے لیے تیار ہوجائے تو سمجھا جائے کہ اس کے نزدیک شے کا افادہ مختتم ایک اکائی کی صورت میں 4 روپے فی اکائی 2 اکائیوں کی صورت میں 3 روپے فی اکائی اور 3 اکائیوں کی صورت میں 2 روپے فی اکائی کے مساوی ہے۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قانون تقلیل افادہ مختتم کا اطلاق زر پر بھی ہوتا ہے لیکن سہولت کی خاطر زر کے افادہ مختتم کو مستقل فرض کر لیا جاتا ہے۔

صنعتی تنازعہ (Industrial Dispute): صنعتی نزاع سے مراد وہ نزاع ہے جو ایک آجر (Employer) اور دوسرے آجر کے درمیان یا آجر اور مزدور کے درمیان یا دو مزدوروں کے درمیان ملازمت کی علاحدگی یا شرائط ملازمت اور کارکردگی کی شرائط کے متعلق پیدا ہو۔

کوئی مختص نزاع صنعتی نزاع کی تعریف میں آسکتی ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق مزید بحث اس لیے ضروری نہیں کہ اس قسم کی نزاع کی نوعیت ہر وقت مختلف ہوتی ہے اور اس کی بابت بے شمار عدالتی فیصلہ جات ہیں لیکن کسی عدالتی فیصلے کو کلیے کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہر مقدمے کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی ہے۔

کسی نزاع کو صنعتی نزاع اس صورت میں کہیں گے جب وہ مزدوروں کی یونین کی جانب سے کیا گیا ہو یا جب متعدد اور مزدور بھی اس نزاع میں شریک ہوں مقدمہ سنٹرل پراونس ٹرانسپورٹ سروس لمیٹڈ بنام رگھوناتھ گوپال پرورده 1957 میں یہی فیصلہ کیا گیا ہے۔

مقدمہ دھرم پت پریم چند کے مزدور بنام دھرم پت پریم چند میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر اٹھارہ مزدور ایک ہی دن میں برطرف کیے گئے ہوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک گروپ ہے اور اس وجہ سے جو نزاع پیدا ہوا اسے صنعتی نزاع قرار دیا جائے گا۔

مقدمہ ورکنگ جرنلسٹ بنام دی ہندو میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر کوئی صنعتی نزاع لیبر کورٹ میں رجوع کیا جائے اور اس نزاع سے بعض مزدور بعد میں اپنی بے تعلقی کا اظہار کریں تب بھی صنعتی نزاع باقی رہتا ہے۔

صنعتی سماجیات: صنعتی سماجیات، سماجیات کی ایک شاخ ہے اس کی ابتدا ایک باقاعدہ علم اور موضوع بحث کی حیثیت سے دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوئی۔ صنعتی سماجیات میں صنعتی ماحول اور اس کے مسائل کا سماجیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے انسانی تاریخ کے طویل دور میں صنعتی دور بہت مختصر ہے۔ یوں تو فطرتاً انسان صناع واقع ہوا ہے اور ابتداء ہی سے اس نے اپنے ماحول میں حسب علم و ضرورت تبدیلی کی ہے لیکن موجودہ اصطلاحی معنوں میں ان تمام تخلیقی کاموں کو شریک نہیں کیا جاتا بلکہ صنعتی زندگی کی ابتدا صنعتی انقلاب سے ہوئی ہے۔ صنعتی انقلاب سب سے پہلے انگلستان میں 1760 اور 1840 کے درمیان واقع ہوا۔ اس انقلاب نے افزائش دولت کی دنیا میں زبردست تبدیلیاں پیدا کیں۔ قدیم زرعی معیشت اور اس سے متعلق چھوٹی چھوٹی گھریلو یا محدود صنعتوں کے بجائے وسیع پیمانے پر صنعتی پیداوار کے مراکز قائم ہوئے۔ سائنسی ایجادات اور اس معاشی انقلاب سے ایک نئے طرز زندگی کی بنیاد پڑی۔

آہستہ آہستہ صنعتی انقلاب کا اثر یورپ اور امریکا میں پھیلتا گیا۔ موجودہ ثقافت اور تمدن اسی صنعتی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں مغربی ممالک نے صنعتی میدان میں زبردست ترقی کی ہے اور اس کا اثر پوری سماجی زندگی پر پڑا ہے۔ صنعتی پیداوار کا دائرہ اتنا وسیع ہوچکا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک کی ترقی یا پسماندگی کا اندازہ ان کی صنعتی ترقی یا پسماندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔

زرعی دور کے روایتی سماج کے برعکس صنعتی سماج کا ماحول اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اس کے مسائل بہت مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی سماجیات کو ایک علاحدہ اور مستقل علم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ صنعتی سماج میں فرد کے رتبہ کے تعین موروثی یا ثقافتی بنیادوں پر نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار فن اور کارکردگی پر ہوتا ہے۔ فن اور کارکردگی (Skill and Efficiency) صنعتی زندگی کی بنیادی قدریں سمجھی جاتی ہیں۔

ساری دنیا میں صنعتوں کا جال اتنی تیزی سے پھیلتا جارہا ہے کہ اس نے سماجی زندگی کو بڑی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے جہاں بڑی بڑی صنعتیں قائم ہورہی ہیں وہاں نئی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہے۔ محنت کش طبقوں کی ہجرت کی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ صنعتوں میں کام کرنے والے یہ افراد مختلف مذاہب، زبانوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں جس کی وجہ سے نئے ماحول میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے میں بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں جن کا تجزیہ اور مطالعہ صنعتی سماجیات میں کیا جاتا ہے۔

اہم صنعتی مسائل میں (1) مزدوروں کے آپسی تعلقات، (2)مزدوروں اور انتظامیہ کے باہمی تعلقات، (3)صنعتوں کے تعلق سے حکومت کی پالیسی وغیرہ شامل ہیں۔ کسی صنعت یا فیکٹری میں مزدوروں کی بہبود، حفظان صحت کی سہولتیں، انسانی روابط، وقفہ، تفریح وغیرہ کا انتظام صنعتی سماجیات کے موضوع بحث میں شامل ہے۔ ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں پیدائش دولت کا پہیہ اتنی تیزی سے گھوم رہا ہے کہ بعض وقت ایسا احساس ہوتا ہے کہ پرانی انسانی قدریں ختم ہو جائیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے بات دراصل یہ ہے کہ تیز رفتار صنعتی ترقی کی وجہ سے سماجی روابط اور تعلقات میں بھی بڑی تیزی سے تغیر ہورہا ہے لیکن اس دوہری صنعتی اور سماجیاتی تبدیلی کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ تغیرپذیر سماجی اقدار اور انسانی فطرت میں آہنگ اور توازن قائم رکھا جاسکے اور یہی صنعتی سماجیات کا مقصد ہے۔

صنعتی سماجیات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ صنعت کو سماجی زندگی سے علاحدہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسان صرف مزدور نہیں ہے بلکہ مزدوری اس کی جملہ سماجی زندگی کا ایک لازمی جز ہے۔ اس لیے محنت کے اوقات اور ان اوقات میں اس کی مصروفیات کا مطالعہ اور تجزیہ اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی سماجیات میں انسانی تعلقات (Human Relations) پر کافی بحث کی جاتی ہے۔ موجودہ صنعتی سماجی زندگی نے سماج کے اہم اداروں مثلاً خاندان، مذہب، تعلیم اور مملکت کے اداروں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی سماجیات میں اس طرز زندگی سے پیدا ہونے والے تمام مسائل کا سماجیاتی زاویہ نگاہ سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔

صنعتی سماجیات میں صنعتی نفسیات اور صنعتی سماج کاری بھی شامل ہیں۔ اس کے ماہرین صنعتی اکائیوں میں بطور مشیر کار کام بھی کرتے ہیں۔

صنعتی معاشیات : صنعتی معاشیات دراصل اس صنعتی تعلیم کا حصہ ہے جس کو صنعتی انقلاب کے بعد فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ تعلیم اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان۔ قبائلی دور کا انسان بھی اپنے پیشوں کی تعلیم حاصل کرتا تھا تاکہ ضروریات کی اشیا بنا سکے مشینوں کے بتدریج استعمال سے تربیت کے طریقوں میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ صنعتی معاشیات کا باقاعدہ مطالعہ صنعتی انقلاب کے ساتھ شروع ہوا۔ آدم اسمتھ کی تحریروں میں صنعتی مسائل سے متعلق تفصیلی بحث ملتی ہے (1723 سے 1790) یہ وہ زمانہ تھا جب سائنسی ایجادات اور اختراعات کے باعث صنعتی انقلاب مغربی یورپ میں رونما ہورہا تھا۔

ماضی کے پس منظر میں اگر ہم افلاطون اور ارسطو کے معاشی افکار کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان دونوں فلسفیوں نے زراعت کو بنیادی اہمیت دی ہے لیکن صنعت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح عہد وسطی کی معاشیات ہویا فزیوکریسی اور مرکنٹلزم کا دور ان سب کے یہاں پیداوار کے تین شعبے گنائے جاتے ہیں۔ زراعت، صنعت اور تجارت۔ ان میں سے بعض نے بنیادی اہمیت زراعت کو دی اور بعض نے تجارت کو، لیکن ان میں سے کسی نے بھی صنعت کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا۔ دراصل یونان اور روم کی تہذیبوں سے لے کر عہد وسطی کے تمدن تک محنت کی عدم نقل پذیری کے باعث صنعتی تمدن جنم نہ لے سکا۔ لیکن مرکنٹلزم کے تجارتی انقلاب کے ساتھ ہی (16 ویں صدی عیسوی) صنعتی معاشیات کے نقوش ابھرنے لگے۔ زراعت سے نکلنے والے مزدور صنعتوں کے لیے سستی محنت فراہم کررہے تھے۔ اس زمانے میں صناع ہاتھ کے آلات استعمال کرتے تھے۔ تاجروں کا فاضل اصل صناعوں کے لیے سرمایہ کاری کے کام آرہا تھا۔ اس تبدیلی کی ایک اہم وجہ زراعت کی بڑھتی ہوئی پیدا آوری تھی۔ قدیم دور اور آج کی صنعت میں فرق صرف اتنا ہے کہ اب پہلے کے مقابلہ میں اصل کی بھاری مقدار استعمال ہورہی ہے اور انسانی محنت کی جگہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

خود کار مشینیں استعمال ہو رہی ہیں۔

صنعتی معاشیات کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ وسائل کی دریافت اصل کی تشکیل اور طریقہ پیداوار میں تبدیلی۔ سائنسی ترقی نے نئے وسائل دریافت کیے اور ان کے بہتر استعمال کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ پیداوار کی بدلتی ہوئی تکنیک اور بڑے پیانہ کی پیداوار کے نتیجہ میں اصل کی مقدار میں اضافہ ہوا جو مزید پیداوار کے لیے مددگار ثابت ہوا۔ بڑھتے ہوئے اصل کے ساتھ پیداوار کی تکنیک بھی بدلتی گئی اور خودکار مشینیں بھاری مقدار میں اشیائے صرف اگلنے لگیں۔ ہاتھ سے تیر کمان بنانے والا انسان خود کار مشینوں کی مدد سے رائفل اور توپیں ڈھالنے لگا۔ غاروں میں پناہ لینے والا آدمی آرام دہ عمارتیں بنانے کے فن سے واقف ہوگیا۔

صنعتی معاشیات کے دو اہم پہلو ہیں۔ پیداوار کے مسائل اور تنظیم کے مسائل صنعتی پیداوار کے مسائل میں معاشین اس بات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ مختلف عوامل پیداوار کے متبادل استعمال سے کم سے کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ مقدار میں بہتر معیار کی پیداوار کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے لیے وسائل کی کھوج اور ان کے متبادل استعمال کے ساتھ تکنیکی ترقی اور تشکیل اصل کے مسائل پر توجہ دی جاتی ہے۔ صنعتی تنظیم کے مسائل میں پیداوار کے انتظامی پہلو سے بحث کی جاتی ہے جس کو نیجری معاشیات (Managerial Economics) بھی کہا جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی پیداوار کو بازار تک پہنچانا اور بڑے کارخانوں کا انتظام بذات خود ایک علم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

صنعتی معاشیات کے ساتھ سرمایہ کی اہمیت بھی بڑھتی گئی کیونکہ بڑی صنعتوں کے لیے اصل کی زیادہ مقدار درکار ہوتی ہے۔ اس کے لیے سرمایہ کو اکٹھا کرنے کے نئے نئے طریقے وجود میں آئے۔ جن میں مشترکہ سرمایہ، کاروبار اور نظام بینک کاری قابل ذکر ہیں۔ سرمایہ کی بڑھتی ہوئی اہمیت نے معاشی اقتدار کو مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں مرکوز کر دیا جس کے نتیجے میں جلد ہی استحصال کے خلاف آوازیں بلند ہونی شروع ہوگئیں۔

کارل مارکس (1867) سرمایہ دارانہ تہذیب کے لیے اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرنے کی بسارت دی کیونکہ اس نظام میں مزدور طبقے کی محنت کے نتیجہ میں تشکیل پانے والا اصل چند ہاتھوں میں جمع ہو رہا تھا۔ اس طرح آجر اور مزدور کے مسائل توجہ کا مرکز بنتے گئے محنت کش طبقے نے اپنے حقوق کو منوانے کے لیے ایک طویل جدوجہد کی ہے۔ مزدور تحریک کام کے گھنٹوں میں کمی، کام کرنے کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کی فراہمی اور اسی قسم کے مسائل سے صنعتی معاشیات بھری پڑی ہے۔ اس طویل کشمکش کے نتیجہ میں مزدوروں کے حقوق کو تسلیم کیا گیا اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حالت نسبتاً بہتر ہوتی گئی۔ لیکن مزدوروں کے حقوق اور مزدور آجر مسائل آج بھی سماجی بے اطمینانی کا باعث ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے۔

موجودہ دنیا میں معاشی ترقی صنعتی ترقی کے ہم معنی ہے۔ صنعتی ملکوں کا معیار زندگی زرعی ملکوں کے مقابلے میں بلند ہوتا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں نوآزاد اور پسماندہ ممالک نے منصوبہ بندی کا طریقہ اختیار کر کے صنعتی ترقی کو اپنا بنیادی مقصد قرار دیا ہے۔ مغربی اقوام ان معنوں میں خوش قسمت ہیں کہ صنعتی انقلاب ان ملکوں سے شروع ہوا اور دنیا کے باقی ممالک کو اس انقلاب کے لیے شعوری کوشش کرنی پڑی۔ چنانچہ 1917 کے انقلاب کے فوراً بعد ہی روس نے 1920 سے صنعتی ترقی کی کوشش شروع کردی اور آج اتنے کم عرصے میں ان ممالک کے مدمقابل ہے جن کی ترقی صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی شروع ہوچکی تھی۔ اسی طرح ہندوستان نے بھی آزادی کے بعد جب 1950 سے اپنے معاشی منصوبے شروع کیے تو دوسرے پنج سالہ منصوبے سے ہی واضح طور پر صنعتی ترقی کی پالیسی کو اپنایا چنانچہ 1956 کی صنعتی ترقی کی قرارداد اس ملک کی معاشی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز صنعتی ترقی کے لیے کسی قوم کو زیادہ بھاری قربانی دینی پڑتی ہے۔

صنعتی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کی زرعی بنیادیں مضبوط ہوں چونکہ صنعتی ترقی کے نتیجہ میں آبادی زراعت ترک کر کے صنعتوں کی طرف آنے لگتی ہے۔ اس لیے زراعت کے شعبے پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ یہ کہ صنعتوں میں جگہ پانے والوں کے لیے غذا اور بڑھتی ہوئی صنعتی گنجائش کے لیے بھاری مقدار میں خام مال فراہم کرے۔ صنعتی ترقی کے نتیجہ میں حمل و نقل اور رسل و رسائل کا ایک جال پھیل جاتا ہے تاکہ خام مال کو کارخانوں تک اور تیار شدہ اشیا کو بازار تک پہنچایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی محنت کی نقل پذیری بڑھ جاتی ہے جو صنعتی تمدن کی اساس رہی ہے۔ صنعت کاری کے نتیجہ میں بہت سے انسانی اور سماجی مسائل پیدا ہوئے جن میں شہروں کی تعداد میں اضافہ، آبادی کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گنجانی، صنعتی بیروزگاری اور صحت عامہ کے مسائل شامل ہیں۔ شہر کاری کے نتیجہ میں مشترک خاندان ٹوٹنے لگے اور انفرادی آزادی میں اضافہ ہوا۔ اس سے صنعتی ترقی میں ضرور مدد ملی لیکن دوسرے سماجی مسائل پیدا ہوئے۔ موجودہ مشینی دنیا میں صنعتی علاقوں میں فضا کی آلودگی، دھوئیں کی گندگی، صنعتی تلچھٹ کو پھینکنے کا انتظام، یہ ایسے مسائل ہیں جن کا حل صنعتی ترقی کے ساتھ مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔

صنعتی ترقی کے نتیجہ میں بڑے کارخانے وجود میں آتے ہیں جو چھوٹے کاروبار کو بازار سے باہر ڈھکیل کر خود اجارہ دار بن جاتے ہیں۔ اس طرح صنعتی ترقی پر مبنی نظام سرمایہ داری اپنی بنیادی خصوصیت یعنی بازار کی مکمل مسابقت سے محروم ہونے لگتا ہے۔ صورت حال سے نمٹنے کے لیے ٹرسٹ مخالف اقدامات کیے جاتے ہیں۔ اور کوشش کی جاتی ہے کہ اجارہ کو توڑ کر مکمل مسابقت اور بازار معیشت کو بحال کیا جائے۔ اس میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن معاشی اقتدار جس میں قیمتوں اور مقدار پیداوار کا تعین بھی شامل ہے۔ چند ہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا۔ ان لوگوں کے فیصلے اور اقدامات پوری معیشت کو متاثر کرتے ہیں۔ آمدنی اور دولت کا اس طرح چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جانا معاشی ترقی اور سماجی انصاف دونوں حیثیتوں سے قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے آج کی دنیا میں معاشی اور صنعتی ترقی کے ساتھ تقسیم دولت کے مسئلہ کو اہمیت دی جارہی ہے۔ اور ایسی ترقی جو دولت کی بہتر تقسیم اور سماجی انصاف سے گریز کرتی ہو قابل قبول نہیں سمجھی جاتی۔

صیہونیت (Zionism) : صیہونیت ایک ایسی تحریک کا نام ہے جس کا مقصد فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک آزاد خود مختار ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا تاکہ دنیا کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے یہودیوں کو ان کے دو ہزار سال پہلے کے وطن یعنی فلسطین میں واپس لایا جاسکے جہاں سے وہ رومی تسلط کے بعد جلاوطن کردیے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بہت سی تحریکیں چلائی گئیں اور کوشش کی گئی کہ یہودیوں کی واپسی کی دیرینہ آرزو پوری ہوسکے۔ گوکہ یہ تحریک وسطی یورپ سے اٹھی تھی تاہم اس کی زیادہ تر حمایت و امداد امریکی اور یورپی یہودیوں نے کی۔ شروع میں یہ ایک ثقافتی تحریک تھی لیکن انیسویں صدی کے اواخر سے اس نے سیاسی صورت اختیار کرلی۔

جدید نظریۂ صیہونیت کا بانی تھیوڈور ہرزل (1904۔ 1860) ہے جو نسلاً یہودی نہیں تھا لیکن بعد میں اس نے یہودیت اختیار کرلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہودیوں کا اس وقت تک خاطر خواہ تحفظ نہیں ہوسکتا جب تک کہ خود ان کی اپنی حکومت قائم نہ ہو جائے۔ اگرچہ اس کے اس خیال کی مخالفت اس وقت کے غیر نسلی یہودیوں نے کی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ان ملکوں میں محفوظ سمجھتے تھے جہاں وہ عرصہ سے سکونت پذیر تھے۔ لیکن اب یہودی قوم کی بڑی اکثریت صیہونیت کی حامی ہے۔

صیہونیت کی پہلی کانگریس سوئٹزرلینڈ کے شہر باسیل میں منعقد ہوئی تھی جس میں یہودیوں کے لیے ایک ایسی ریاست کے قیام کے لیے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا جس میں عوامی قانون کے ذریعہ ان کا تحفظ کیا جاسکے۔ اس تحریک کا مرکزی دفتر وائنا میں تھا۔ اس کانگریس کا اجلاس 1901 تک سالانہ اور پھر ہر دوسرے سال ہوتا رہا۔ 1903 میں دولت عثمانیہ نے جب ہرزل کی، فلسطین کو خود مختاری تفویض کرنے سے متعلق درخواست مسترد کردی تو اس نے برطانیہ کی طرف دست سوال دراز کیا چنانچہ برطانیہ نے اسے 600 مربع میل زمین یوگنڈا میں دینے کی پیش کش کی جسے اس نے قبول نہیں کیا۔

1917 میں برطانیہ نے بھی بالفور اعلان کے ذریعہ یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کی حمایت کی اور پہلی جنگ عظیم کے بعد خفیہ طور سے انھیں فلسطین میں آباد ہونے میں مدد دی۔ اس صورت حال سے عربوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوگیا اور وہ صیہونیت کی اس تحریک کی پوری شدت سے مخالفت کرنے لگے۔ 1930 میں برطانیہ نے ایک فلسطینی کمیشن مقرر کیا جس کی سفارشات کی بنیاد پر فلسطین میں مزید یہودیوں کے داخلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ تاہم ان کی آمد کا سلسلہ بند نہ ہوسکا۔ دریں اثنا فلسطین کے دستوری مسائل کے سوال پر یہودی اور فلسطینی عربوں کے مابین کشمکش جاری رہی۔ 1947 میں برطانیہ نے فلسطین کے مسئلہ کو اقوام متحدہ کے سپرد کرکے 15/ مئی 1948 کو فلسطین سے اپنے تخلیہ کا اعلان کردیا۔ برطانیہ کے اعلان کرتے ہی یہودی رہنماؤں نے اسی دن اسرائیل کے قیام کا اعلان کردیا۔ اقوام متحدہ نے اپنی تحقیقات کے بعد فلسطین کو عرب اور یہودی ریاستوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی۔ اس سفارش پر عمل درآمد کی نوبت آنے سے پہلے ہی عربوں اور یہودیوں کی خانہ جنگی نے جنگ کی صورت اختیار کرلی جس میں عرب شکست کھا گئے اور یہودی اسرائیل کے نام سے ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

طرح صیہونیت کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوگئی۔ اگرچہ صیہونیت کا اصل مقصد اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد حاصل ہوچکا ہے تاہم اب بھی ان کا مطمح نظر اس کی سرحدوں کو عرب علاقوں تک وسیع کرنا ہے جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بھی شامل ہیں۔ اس تناظر میں صیہونیت آج یعنی 2001 بھی ایک بین الاقوامی زندہ طاقت ہے جو اسرائیل کے مفادات کا تحفظ اور اس کے اثرات کو وسیع تر کرنے میں مصروف ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ض

ضابطہ دیوانی تعمیل ڈگری (Civil Procedure Execution of Decree): ڈگری کی تعمیل وہ عدالت کرتی ہے جس نے ڈگری صادر کی ہو یا وہ عدالت جس میں وہ تعمیل کے لیے بھیجی جائے۔ ہر مفروضہ مقدمہ میں ڈگری دار کو اک مقررہ رقم بطور ہرجانہ نقص معاہدہ کی بابت دلائی جائے گی اور جو ڈگری کی تعمیل جس میں زر نقد کے ادائیگی کا یا کسی اور دادرسی کے بجائے زر نقد کی ادائیگی کا حکم مدیون ڈگری کے محبس دیوانی رکھنے سے یا اس کی جائداد کی قرقی اور نیلام سے یا دونوں سے ہو سکتی ہے۔ اگر مدیون ڈگری زر نقد یعنی رقم ڈگری نقد ادا کر دے تو ایسی صورت میں اس کے محبوس کیے جانے کا یا اس کی جائداد قرق یا نیلام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ صورت اس وقت درپیش آتی ہے جب کہ مدیون ڈگری تعمیل ڈگری سے گریز کرے۔

ضابطہ دیوانی تنقیحات اور فیصلہ (Civil Procedure Issues and Judgement): تنقیح طلب امور دو قسم کے ہوتے ہیں۔ واقعاتی و قانونی مقدمہ کی سماعت اول پر عدالت عرضی دعوے کے اور جواب دعوے کو پڑھنے اور فریقین سے ایسے استفسار کے بعد جو ضروری خیال کر کے یہ تعین کرتی ہے کہ واقعات یا قانون کے مطابق کن امور کی بابت فریقین میں نزاع ہے اور ایسے تنقیح طلب امور جن پر عدالت کی رائے میں مقدمہ کے صحیح طور پر فیصلہ کا مدار ہو قرار دیتی ہے۔

ف۔ اگر مقدمہ کی سماعت اول کے وقت یہ معلوم ہو کہ فریقین میں کسی قانونی مسئلہ یا واقعات کے متعلق نزاع نہیں ہے تو عدالت اسی وقت فیصلہ صادر کر دیتی ہے اور اگر فریقین میں نزاع ہو اور عدالت نے امور تنقیح طلب قرار دی ہو تو عدالت یہ معلوم کرے گی کہ کن تنقیحات کا کون سے فریق مقدمہ پر بار ثبوت ہے عموماً فریقین سماعت اول پر ہی گواہوں کی فہرست پیش کر دیتے ہیں زیادہ تر مدعی پر بار ثبوت ہوتا ہے پس وہی دوسری پیشی پر شہادت پیش کرتا ہے شہادت سے متعلق قانون شہادت میں احکام درج ہوتے ہیں۔ فریقین پر ان احکام کی پابندی لازی ہوتی ہے۔ فریق اول اپنی دستاویزی یا زبانی شہادت پیش کرنے کے بعد فریق ثانی اپنی تردیدی شہادت پیش کرتا ہے۔ پیش کردہ دستاویزات پر اِیگزب اٹ کا نشان لگایا جاتا ہے اور گواہوں کی زبانی شہادت حاکم عدالت خود قلم بند کرتا ہے جس پر گواہوں کے دستخط لیے جاتے ہیں۔ بعد اختتام ثبوت مدعی یا اس کا وکیل واقعاتی اور قانونی امور جو مقدمہ سے متعلق ہوں اپنے دعوے کی تائید میں عدالت سے مخاطب ہو کر ان پر بحث کرتے ہیں جس کے بعد مدعاعلیہ یا اس کے وکیل کو جوابی بحث کا اختیار ہوتا ہے بعد سماعت مباحث حاکم عدالت اسی وقت یا آئندہ کسی تاریخ پر جس کی اطلاع فریقین یا ان کے وکلا کو دی جاتی ہے برسر اجلاس فیصلہ سناتا ہے۔ فیصلے میں مقدمہ کے واقعات کا مختصر بیان اور فیصلہ طلب امور اور ان کا فیصلہ موید مع وجوہ کے لکھا جاتا ہے۔ فیصلے کے بعد اس کے مطابق ڈگری مرتب کی جاتی ہے ڈگری میں مقدمہ کا نشان فریقین کے نام و پتہ اور دعوے کی تفصیل درج ہوتی ہے اور دادرسی معطیہ جو امور فیصل ہوئے ہوں بصراحت لکھا جاتا ہے۔ ڈگری میں اس امر کی بھی صراحت کی جاتی ہے کہ مقدمہ میں کس قدر خرچہ عائد ہوا اور اس کو کون شخص اور کس نسبت سے ادا کرے گا۔ ڈگری میں تاریخ درج کی جاتی ہے جو فیصلہ صادر کرنے کی تاریخ ہے اور جب حاکم عدالت کو اطمینان ہو جائے کہ ڈگری فیصلہ کے مطابق مرتب ہوئی ہے تو وہ اس پر اپنے دستخط کر دیتا ہے۔

ضابطہ دیوانی- ڈگری کا مرافعہ (Civil Procedure Appeal of Decree): ڈگریوں کا مرافعہ اولی عدالت ابتدائی کے فیصلے سے اگر کوئی فریق ناراض ہو تو اس کو قانوناً عدالت بالا دست جس کو عدالت مرافعہ کہتے ہیں۔ مرافعہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ مرافعہ

اولی کے ہر فریق کو قانوناً حق حاصل ہے۔ لیکن مرافعہ ثانی یا ثالث صرف اسی وقت دائر کیا جاسکتا ہے جبکہ چند شرائط کا تکملہ ہو۔

ف۔ ہر ڈگری عدالت ابتدائی کی ناراضی سے مرافعہ اس عدالت میں ہوگا جو اس کی سماعت کی مجاز ہو۔ ڈگری یک طرفہ کا بھی مرافعہ ہوسکتا ہے لیکن جو ڈگری برضامندی صادر ہو اس کا مرافعہ نہیں ہوسکتا۔ ہر مرافعہ درخواست کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس پر مرافع یا اس کے وکیل کے دستخط ہوں گے اس کے ساتھ نقل ڈگری و نقل فیصلہ داخل کرنا پڑتا ہے وجوہ مرافعہ مختصر فقرہ وار تحریر میں کیے جائیں گے۔ محض مرافعہ دائر کرنے کی وجہ سے ڈگری یا حکم زیر دفعہ کارروائی ملتوی نہ ہوسکے گی لیکن کافی وجہ ہو تو عدالت مرافعہ کی مجاز التوا ہے۔ ڈگری کے اجرا کا التوا ذیل کی صورتوں میں کیا جائے گا۔

(الف) جبکہ عدم التوا کی صورت میں درخواست گزار کو نقصان واقعی پہنچے گا۔

(ب) جبکہ درخواست غیر ضروری تاخیر کے بغیر پیش ہوئی ہو اور

(ج) جبکہ درخواست گزار نے ضمانت داخل کردی ہو۔

ف۔ درخواست مرافعہ پیش اور درج رجسٹر ہونے کے بعد مرافع کو چاہیے کہ سات دن کے اندر درخواست کی اتنی نقلیں داخل کردے جتنے مرافعہ علیہ ہوں۔ مرافعہ علیہ کے پاس اطلاع نامہ کے ساتھ ایک نقل بھی بھیجی جاتی ہے۔ تاریخ مقررہ پر مرافع کی بحث سماعت کرنے کے بعد اخراج مرافعہ کی رائے نہ ہو تو عدالت مرافعہ علیہ کا جواب سماعت کرے گی۔ ایسی صورت میں مرافع کو جواب الجواب کا حق ہوگا۔ فریقین یا ان کے وکلا کی بحث اور معائنہ مثل کے بعد عدالت فیصلہ زبان عدالت میں اس وقت یا کسی تاریخ مابعد پر سنائے گی اور اس میں امور ذیل درج ہوں گے۔

(1) امور قابل انفصال

(2) ان کا فیصلہ

(3) وجوہ فیصلہ

(4) جب ڈگری تحت منسوخ یا ترمیم کی گئی ہو تو داد رسی جس کا مرافع مستحق ہے۔ عدالت مرافعہ میں مرافعہ دائر کر سکے گا۔ عدالت مرافعہ عنہا کی ڈگری کو بحال یا تبدیل یا منسوخ کر سکے گی۔ فیصلے کے بعد اس کے مطابق ڈگری مرتب ہوگی۔

ضابطہ دیوانی کے عام اصول (General Principles of Civil Procedure)

: ہر ملک کے قانون کے دو بڑے اقسام ہوتے ہیں۔

قانون اصلی اور قانون اضافی یا ضابطہ۔ قانون اصلی سے مراد وہ قانون ہے جس کے ذریعہ سے حقوق کی تعریف کی جاتی ہے اور ضابطہ کا قانون ایسا قانون ہے کہ جس کے ذریعہ سے چارہ کار یا دادرسائی معین کی جاتی ہیں۔

اضافی قانون یا قانون ضابطہ میں ضابطہ۔ پلیڈنگ، میعاد سماعت اور شہادت کے احکام درج کیے جاتے ہیں۔ پس ضابطہ کے احکام حسب ذیل امور پر مشتمل ہوتے ہیں:

(1) اختیار سماعت

(2) عدالت جو نزاع کے فیصلے کی مجاز ہے۔

(3) عدالت مجاز میں کارروائی کا طریقہ۔

(4) عدالت کے فیصلہ کی تعمیل۔

(5) مرافعہ استصواب و نگرانی و تجویز ثانی۔

ہر حکومت کے فرائض میں عدل گستری ایک اہم فریضہ ہے اس غرض کے لیے حکومت عدالتوں کا قیام عمل میں لاتی ہے اور ان عدالتوں میں طریقہ کارروائی کے لیے ایک ضابطہ بھی مدون کرتی ہے تاکہ حکام عدالت و نیز فریقین مقدمہ کی رہ نمائی کی جائے ملک کی تمام عدالتوں کے طریقہ کارروائی میں یکسانیت پیدا ہو۔ عدالتوں کے دو اقسام ہوتے ہیں ایک دیوانی اور دوسری فوج داری۔ دیوانی عدالتوں کے طریقہ کارروائی کو مجموعہ ضابطہ دیوانی کہتے ہیں اور فوج داری عدالتوں کے طریقہ کارروائی کو مجموعہ ضابطہ فوج داری کہتے ہیں۔

ف۔ ضابطہ دیوانی میں ارجاع نالش سے لے کر تعمیل فیصلہ جات کے تمام مدارج ہوتے ہیں مدافعہ استصواب و نگرانی و تجویز ثانی جو فیصلہ عدالت ابتدائی کے بعد کے مدارج ہیں۔

ضابطہ دیوانی متفرقات (Civil Procedure

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Miscellaneous) : مقدمات متدائرہ کوئی عدالت ایسے مقدمہ کی تحقیقات نہ کرے گی جو ملک کی کسی دیگر عدالت میں دائر ہو جبکہ

(الف) تنقیح طلب امر صراحتاً اور دراصل وہی ہو جو پہلے رجوع کیے ہوئے مقدمہ میں ہے۔

(ب) مقدمہ انھیں اشخاص کے مابین ہو یا ایسے اشخاص کے جو فریق سابق کے ذریعہ سے دعویدار ہیں۔

(ج) ایک ہی استحقاق پر خصومت قایم کی گئی ہو۔

ضابطہ فوج داری (Crimnal Procedure): قانون تعزیرات کی عمل آوری کے لیے جو ضابطہ مدون کیا گیا ہے اسے ضابطہ فوج داری کہتے ہیں۔ ضابطہ فوج داری میں ابتدائی طور پر ان عدالتوں کا تعین کیا جاتا ہے جو تعزیری جرائم کی وجہ سے دائر کردہ مقدمات کی سماعت کرتی ہیں۔ ان عدالتوں کے اختیار سماعت اور حدود سماعت کا بھی تعین ضابطہ فوج داری میں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ہر پرگنہ کے لیے ایک سے زاید منصف مجسٹریٹ اور ہر ضلع کے لیے ایک سیشن جج کا تقرر کیا جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں کام کے اعتبار سے ایک سے زائد سیشن جج کا تقرر کیا جاتا ہے۔ منصف مجسٹریٹ اور سیشن جج دیوانی مقدمات کے علاوہ فوج داری مقدمات کی بھی سماعت کرتے ہیں۔ پورے اسٹیٹ کے لیے ایک ہائی کورٹ کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے جو سیشن جج کے فیصلوں کی اپیل سماعت کرتا ہے معمولاً کسی فوج داری مقدمے کی سماعت اور تحقیقات اس عدالت میں ہوتی ہے جس کا اس کو اختیار سماعت حاصل ہے فوج داری عدالتوں کے اختیار سماعت کا تعین حدود آراضی کے علاوہ کسی جرم کے لیے سزا کی میعاد کے متعلق بھی کیا جاتا ہے تاکہ فوج داری مقدمات کے انفصال میں سہولت ہو۔ ہر حاکم فوج داری کو جسے اختیار سماعت حاصل ہے اس کا اختیار ہوگا کہ استغاثہ کی جانب سے جرم ثابت کیے جانے پر سزا کا حکم صادر کرے جس کی مدت زیادہ سے زیادہ اس میعاد تک ہو سکے گی جو قانون تعزیرات میں مقرر ہے۔ اگر کسی شخص کے خلاف کئی جرم ثابت ہوں تو عدالت یہ حکم دے سکے گی کہ مختلف سزاؤں کی میعاد ایک ساتھ شروع ہو یا یہ حکم بھی دے سکے گی کہ ایک سزا کی میعاد ختم ہونے پر دوسری سزا کا آغاز ہو۔ ہر شخص پر یہ قانونی فرض عائد کیا گیا ہے کہ جب کوئی حاکم فوج داری یا عہدہ دار کوتوالی کسی ملزم کے گرفتار کرنے میں مدد طلب کرے تو وہ مناسب مدد دے۔ ہر شخص کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ کسی جرم کا ارتکاب کسی شخص نے کیا ہے تو اس کی اطلاع کوتوالی کو دے۔

ضرائب: ہنگامی ضرورتوں جیسے زمانہ جنگ قحط سالی، رفاہ عام اور عوام کی بے روزگاری دور کرنے کے لیے زکوۃ و صدقات کے علاوہ جو ٹیکس اغنیا پر اسلامی حکومت کی جانب سے لگایا جاتا ہے اس کا نام ضرائب ہے۔

ضروری آسائش (Easement of Necessity): اگر ایک شخص اپنی جائداد دوسرے شخص کو منتقل کرتا ہے اور اس فروخت کرنے والے شخص کی کسی اور جائداد سے کوئی حق آسائش اس فروخت شدہ جائداد سے متعلق ہو تو وہ شخص بھی جس کے نام وہ جائداد فروخت کی گئی ہو۔ اس آسائش کا حق دار ہوگا اسے ضروری آسائش کہتے ہیں اس طرح اگر کسی جائداد سے جو منتقل کی گئی ہو ایسی آسائش متعلق وجوہات کی دوسری جائداد کے لیے ضروری ہو تو منتقل شدہ جائداد کے مالک یا اس کے قانون قایم مقام پر یہ لازم ہوگا کہ وہ اس حق آسائش کو برقرار رکھے۔

ضلع پریشد: قانوناً ہر ضلع کے لیے ایک ضلع پریشد قایم کی جاتی ہے۔ ضلع میں واقع پنچایت سمیتیوں کے صدر ضلع پریشد کے رکن ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ متعلقہ رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ بھی ضلع پریشد کے رکن ہوتے ہیں۔ پورے ضلع کے ترقیاتی کاموں کی نہ صرف منصوبہ بندی ضلع پریشد کے فرایض کا حصہ ہے بلکہ اس منصوبہ بندی کے تحت جو اسکیمیں مرتب کی جاتی ہیں انھیں روبہ عمل لانا بھی ضلع پریشد کا ہی کام ہے۔ ضلع پریشد کے تحت انجینیروں کا تقرر کیا جاتا ہے جو تعمیری کاموں کی نگرانی کرتے ہیں۔ ضلع پریشد کے تحت کئی دستوری کمیٹیاں قایم کی جاتی ہیں۔ ڈسٹرکٹ کلکٹر اور ضلع انتظامیہ کے اہم عہدہ دار ایسی کمیٹیوں کے رکن ہوتے ہیں۔ یہ دستوری کمیٹیاں ضلع کی ترقیاتی امور سے متعلق بنیادی فیصلے کرتی ہیں جن کی توثیق کے لیے ضلع پریشد ان پر عمل در آمد کرتی ہے۔ ضلع پریشد کی کارگزاریوں پر حکومت کے اندرونی کنٹرول کے لیے، اس کی دستوری کمیٹیوں میں ضلع کے متعلقہ اہم سرکاری عہدیداروں کو شریک رکھا جاتا ہے تاکہ جو بھی منصوبہ بندی ہو اور عوامی بہبود کے لیے جو بھی فیصلے کیے جائیں، ان کا حکومت کی عام پالیسی سے ٹکراؤ نہ ہو۔ اگرچہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بلونت رائے مہتا کی رپورٹ میں ایسی مقامی انتظامیوں کے لیے نئے محصولات عائد کرنے کی سفارش نہیں کی گئی ہے لیکن یہ ضرور اظہار خیال کیا گیا ہے کہ جو بھی محصولات عائد اور وصول کرنے کی اجازت قانون نے دیہی انتظامیوں کو دی ہے انھیں صحیح طور پر عائد اور وصول کرنا چاہیے۔ سرکار کی طرف سے ضلع پریشدوں کو فراخدلی سے گرانٹ دی جاتی ہے اور ضلع پریشد اسی گرانٹ کو حسب ضرورت پنچایت سمیتیوں میں تقسیم کرتی ہے تاکہ ضلع کی ترقیاتی اسکیموں کو رو بہ عمل لایا جائے۔

ایسے مقامی انتظامیوں پر حکومت کا جو کنٹرول پہلے سے قایم تھا وہ قایم رکھا گیا ہے۔ یعنی حکومت کسی بھی پنچایت، پنچایت سمیتی یا ضلع پریشد کی کسی بھی قرار داد کو منسوخ کر سکتی ہے اور اگر حکومت کی رائے میں کوئی پنچایت، پنچایت سمیتی یا ضلع پریشد اپنے آئینی فرائض کو صحیح ڈھنگ سے ادا نہیں کر رہی ہے یا وہ اپنی ذمہ داریاں نبھانے سے قاصر ہے تو وہ اسے مناسب نوٹس دے کر تحلیل کر سکتی ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ موجودہ پنچایت راج سسٹم پہلے سے کہیں زیادہ جمہوری ہے اور مقامی باشندوں کو ایسے سیاسی، انتظامی اور ترقیاتی امور میں عملی طور پر حصہ لینے کا موقع دیتا ہے جن کا تعلق ان کی روزمرہ زندگی سے ہے۔

ضیاء یوکالپ : ضیاء یوکالپ کا اصل نام محمد ضیاء تھا۔ یہ مشہور ترکی ساجیات داں 1876 میں دیار باقر میں پیدا ہوئے اور 1923 میں ان کا انتقال ہوا۔ ضیاء یوکالپ نے ترکی میں سماجی مطالعہ کی بناء ڈالی۔ ضیاء نے سیکولر مدارس میں تعلیم حاصل کی اور ساتھ ہی ساتھ قدیم اسلامیات کا مطالعہ بھی کیا۔ 18 سال کی عمر میں ضیایوکالپ نے خودکشی کی بھی کوشش کی تھی۔ نوجوان ترک (Young Turks) انقلابیوں کی تحریک سے وہ بہت متاثر تھے۔ 1895 میں ضیاء اس کی خفیہ سوسائٹی کے ایک رکن بن گئے۔ 1898 میں انھیں گرفتار کیا گیا اور ایک سال کی قید کے بعد ان کو ان کے وطن بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کیا۔ اس زمانہ میں ترکی کے انقلابی نوجوان ملک بدر کردیے گئے تھے۔ اور اس دوران سبھوں نے پیرس میں پناہ لی۔ ان پر فرانسیسی ساجیات کا بڑا گہرا اثر پڑا۔ ان میں سے ایک پرنس صباح الدین لاپلے (La Play) کا پیرو تھا۔ پرنس صباح الدین کا خیال تھا کہ صرف ساجیات کے مطالعہ کی مدد سے سلطنت عثمانیہ کے سربراہ سماجی تبدیلی لاسکتے ہیں جس کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کو تقویت بخشی جاسکتی ہے۔ بعد میں ان ہی خیالات کی حمایت یوکالپ نے پرزور طریقے سے کی۔ مختلف خدمات سرانجام دیتے ہوئے 1910 میں ضیاء یوکالپ کا تقرر سلونیکا میں ساجیات پڑھانے پر ہوا۔ اور پانچ سال بعد یوکالپ استنبول یونیورسٹی میں ساجیات کا پروفیسر بن گئے۔ یہ سلسلہ 1919 تک جاری رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انھیں ملک بدر کرکے مالٹا بھیج دیا گیا جہاں سے وہ 1921 میں واپس آئے۔

واپسی کے بعد ضیاء یوکالپ نے اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کی بھرپور حمایت کی اور سماجی تبدیلیوں کے تعلق سے ساجیاتی مقالوں کا سلسلہ شائع کیا۔ 1923 میں انھیں انقرہ کی کلچرل مطبوعات کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ 1923 میں ضیاء یوکالپ کی مشہور کتاب "ترکی قومیت کے مبادی" شائع ہوئی۔

ضیاء یوکالپ کا ایقان تھا کہ نوجوان ترکوں کا لایا ہوا سیاسی انقلاب اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب کہ وہ سماجی انقلاب کی بنیادوں پر قائم ہوا اور یہ سماجی انقلاب معیشت خاندان فنون لطیفہ اخلاق اور قانون کے میدانوں پر محیط ہونا چاہیے۔ ضیاء یوکالپ درکھائم کی سماجی فکر سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ چنانچہ وہ درکھائم کے نظریہ اجتماعی نمائندگی یا اجتماعی نیابت پر ایقان رکھتا تھا۔ یوکالپ کا خیال تھا کہ درکھائم سائنٹفک ساجیات کا سب سے اہم مفکر تھا۔ جنگ بلقان کی ناکامی کے بعد ترکی میں بڑی بحرانی کیفیت پیدا ہوئی اور مغربیت ترکیت اور اسلامیت کے مابین ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی۔ ایسے پیچیدہ موقف میں ضیاء نے اس امر کی وضاحت کی کہ ان تینوں کا امتزاج ٹکراؤ کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ ایک بڑی نتیجہ خیز رہنمائی تھی جس کے ذریعہ ضیاء یوکالپ نے بتایا کہ ترک تمدن اسلام اور مغربی تکنیک کو ملایا جاسکتا ہے۔ ضیاء ترکی کی قومی حکومت کو سیکولر بنانے کا حامی تھے اور ان ہی خطوط پر انھوں نے سماجی اور تعلیمی تبدیلیوں کے ماڈل بنانے پر زور دیا۔ ضیاء بڑے کھلے دل سے اس بات کا معترف تھے کہ وہ درکھائم کے پیرو ہیں اور اس نے درکھائم کی سماجی فکر کو ترکی تہذیب پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ضیاء نے قوم اور تمدن کے تعلق سے جو تصورات پیش کیے ہیں وہ بڑی حد تک نئے اور بجنل ہیں۔ بہرحال جدید ترکی کی ساجیاتی فکر پر ضیاء یوکالپ کی فکر کی بڑی گہری چھاپ ہے۔

ط

طبقات الامم: یہ کتاب قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن صاعد کی تصنیف ہے۔ ان کا وطن قرطبہ تھا۔ 420ھ مطابق 1695ء میں پیدا ہوئے اور 462ھ / 1070ء میں طلیطالہ میں وفات پائی۔ صاعد اپنے زمانہ کے مشہور فاضل اور طلیطلہ کے قاضی تھے۔ وہ دینی علوم کے علاوہ متداول علوم ادب تاریخ فلسفہ طب، ریاضی، ہیئت و نجوم میں بھی پوری دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں مگر ان میں صرف المعروف بطبقات الامم موجود رہ گئی اور اسمیں دنیا کی متمدن قوموں کے علوم و فنون کی ہمہ گیر جامع تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب قرون وسطیٰ کی علمی تاریخ ہے اس کے ایک باب میں ہندوستان کے علوم خصوصاً ہیئت و نجوم پر مفید بحث ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن عربی ممالک اور یورپ سے شائع ہو چکے ہیں۔

طریقت: اس کی جمع طرق اور معنی راستہ کے ہیں۔ احادیث کے اسناد کے سلسلوں کو طریق کہا جاتا ہے اسی طرح تصوف کے مختلف سلاسل اس وقت مروج ہیں وہ بھی طرق کہلاتے ہیں لیکن طریقت ایک خاص اصطلاحی لفظ ہے۔ جو باطن کو آلائشوں اور گندگیوں سے پاک و صاف کرنے کی جدوجہد، تگ و دو کرنے اور اس کی حفاظت اور نگہداشت کا نام ہے۔ اس کا مقصد سالکین کی اصلاح و تربیت اور نفوس کی رہنمائی ہے۔ متاخرین نے شریعت کے اعمال کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم ظاہری اعمال کی ہے جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، بیع و شرا اور نکاح و طلاق کے مسائل و احکام اور دوسری قسم باطنی اعمال کی ہے جیسے محبت الٰہی صبر شکر رضا تسلیم توکل تفویض اور اخلاص وغیرہ۔

شریعت کا کام ظاہر کی اور طریقت کا کام باطن کی اصلاح ہے پس طریقت شریعت سے جدا نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت اس کے خادم اور غلام کی ہے جو نفس کے علاج اور باطن کی اصلاح و تربیت کا ایک ذریعہ ہے لیکن چونکہ لوگوں کے مزاج و طبیعت میں فرق ہوتا ہے۔ ہر ایک کی صلاحیت و استعداد جدا ہوتی ہے نیز ہر زمانہ کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان سب کی رعایت سے نفس کے علاج اور اصلاح باطن کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی طریقہ شریعت کے خلاف ہو تو اس کو رد کردیا جائے گا۔ اصلی چیز شریعت ہے جس پر ہر حال میں عمل واجب ہے۔ طریقت و تصوف علاج ہیں یہ نہ فی نفسہ قطعی اور واجب العمل ہیں اور نہ محض ان پر آخرت کی فلاح کا انحصار ہے اگر شریعت کا دامن ہاتھ میں نہ ہو تو طریقت قابل قبول نہ ہوگی۔

طریقۂ امتحان کا ارتقا: باقاعدہ نظام تعلیم سے ہمیشہ یہ توقع کی گئی کہ وہ یہ بھی بتائے کہ اس نظام میں مروج تعلیمی عمل سے کس طالب علم نے کتنا حاصل کیا۔ شروع شروع میں متعلقہ استاد یا علما اور ماہرین کی ایک جماعت اس بارے میں فیصلہ کرتی تھی اور وہی اس طالب علم کو اس کی لیاقت کی سند دے دیا کرتی تھی۔ دستور اس وقت تسلی بخش سمجھا جاتا رہا اور تعلیم کی ضرورت اور اس کا رواج صرف اس طبقے تک محدود رہا جو سماج کی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے کام میں براہ راست کوئی حصہ نہ لیتا تھا۔ اس وقت کی تعلیم کا مقصد بھی یا تو انسان کو اپنی عاقبت سنوارنے کے لائق بنانا تھا یا بلند ترین ذہنی کاوشوں اور اعلیٰ جمال پسندی کا اہل بناتا تھا۔ پیداوار سے متعلق کاموں یا پیشوں کی تربیت محنت کش طبقے کے لوگوں میں باپ سے بیٹے کو ملتی رہتی تھی جو اس وقت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ لیکن پیداواری قوتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ پیداوار کے کاموں کو انجام دینے والوں میں مخصوص اہلیت اور لیاقت ہونی چاہیے تو اس طبقے کے لوگوں کے لیے باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا جانے لگا۔ تعلیم کے مقاصد اور طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے تعلیم کے مروجہ نظام، اس کے نصاب اور اس

کے اسناد دینے کے طریقوں کو بھی بدلنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ یہ ضرورت روزمرہ شدید تر ہوتی گئی اور اس نے انیسویں صدی میں ہی نظام تعلیم کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

یوں توں ہر استاد کی دی ہوئی سند کو سماج میں یکساں وقعت کبھی نہیں دی گئی لیکن بدلے ہوئے حالات میں یہ توقع اور بھی کم ہو گئی کہ اپنے بہت سے طالب علموں میں سے ہر ایک کی مختلف طرح کی لیاقتوں کے بارے میں استاد کی رائے ضرور ناقابل بھروسہ ہوگی۔ اس لیے طلبا کا باقاعدہ امتحان لینے کا طریقہ رائج ہونے لگا۔ ایک استاد کی رائے کے مقابلے میں اس امتحان کے نتیجے کو زیادہ معروضی اور اس لیے زیادہ قابل اعتبار سمجھا جانے لگا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب صنعتی ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہونے لگی اور ہر معاشی شعبے میں مشینوں کا استعمال اور سائنس اور ٹیکنولوجی کا عمل دخل بڑھنے لگا تو یہ محسوس ہوئی کہ اب پورے محنت کش طبقے کے لیے تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ہر کام کے لیے مخصوص لیاقت رکھنے والے لوگوں کو الگ چھانٹا جائے۔ اس سلسلے میں امتحان کے مروجہ طریقے کا جب جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ سوالات کے انتخاب اور جوابات کو جانچنے کے لحاظ سے اس طریقے میں داخلی عناصر کا بہت دخل ہے اور نہ یہ مخصوص لیاقت رکھنے والوں کو الگ الگ چھانٹ سکتا ہے۔ اس لیے اس کے مہیا کیے ہوئے نتائج نہ قابل اعتبار ہیں نہ کار آمد۔ چنانچہ ماہرین نے طلبا کی لیاقت کا قابل بھروسہ اندازہ حاصل کرنے کے طریقوں کی جستجو شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں نفسیات، سماجیات اور شماریات کے عالموں نے ان کی بہت مدد کی۔ اس مسلسل اور مشترک جستجو کے نتیجے میں امتحان کے بہتر، زیادہ معتبر اور زیادہ کار آمد طریقوں کا جو ایک تصور ابھر کر سامنے آیا ہے اسے علمی اصطلاح میں "قدر پیائی" کہتے ہیں۔

طریقۂ تعلیم (Methods of Teaching): زمانہ قدیم میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر وہ شخص جو کچھ پڑھنا لکھنا جانتا ہو وہ کمسن بچوں کی تعلیم کے فرائض انجام دے سکتا ہے اور مدرس یہ خیال کرتا تھا کہ چند مفید اور اہم امور یا واقعات بچوں کو رٹوا دے اور ان کو معمولی لکھنے پڑھنے کے قابل بنا دے تو بہت کافی ہے۔ طلبا بغیر سمجھے بوجھے ایسے علمی مواد کو رٹ لیتے تھے۔ اس کے بعد یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ایسا طریقہ تعلیم اختیار کیا جانا چاہیے جو بچوں کی تدریس میں مفید اور ان کی نفسیات کے مطابق ہو۔ نیز تدریس کے دوران طلبا کی استعداد و ذہانت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں مدلل طریقہ پر تعلیم دی جائے تاکہ ان میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جو عملی زندگی میں ان کے لیے ضروری ہے۔

جدید طریقۂ تعلیم میں طلبا کی ذاتی دلچسپی (Interest) کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ تاوقتیکہ بچہ کو سبق سے دلچسپی نہ ہو سبق میں اس کو دلکشی پیدا ہو سکتی۔ وہیں اہم مقصد کے حصول کے لیے تعلیم کے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ ان میں سے بعض چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لیے مختص ہیں۔ مثلاً فروبل یا مانٹیسوری (Montessori) کا طریقۂ تعلیم اور ان سے مقابلتاً اونچی جماعتوں کے بچوں کے لیے موزوں ہیں۔ مثلاً ہربارٹ (Herbart) کے پانچ موضوعی اقدام (The five formal steps)، ڈالٹن پلان (Dalton Plan)، اکتشافی طریقہ (Heuristic Method)، منصوبی طریقہ (Project Method) اور ڈیوی کا طریقۂ تعلیم، سر جان اڈمس (Sir John Adams) نے بلا لحاظ مواد مضمون (Subject matter)، طریق تدریس کی تین عام زمروں (گروپس) میں تقسیم کی ہے۔

(1) استدلالی (Dialectic Method) یعنی وہ طریقہ تعلیم جس میں پہل استاد کی جانب سے کی جاتی ہے اور استاد طلبا کو معلومات فراہم کرتا ہے اور طلبا دیے ہوئے مواد کو یاد کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے طریقۂ تعلیم میں سبق کی توضیح و تشریح لکچر وغیرہ کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

(2) ناصحانہ طریقہ (Didactic Method) جس میں پہل میں استاد شاگرد برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں اور مدرس طلبا کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً سوالات کے ذریعہ ان سے جوابات لے کر بہت سی باتیں خود ان سے نکلوانے کی کوشش کرتا ہے۔

(3) اکتشافی طریقہ (Heuristic Method) جس میں پہل طلبا کی جانب سے ہوتی ہے اور مدرس ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ طلبا خود اپنے طور پر کام کریں اور سبق کو آگے بڑھائیں اور خود ہی مسائل (Problems) کو حل کریں اور مدرس غیر محسوس طریقہ پر ان کی رہبری کرتا رہے۔

تعلیمی اصلاحات سے متعلق پستالوزی (Pestalozzi, 1746-1827) نے بہت سے بیش بہا خیالات پیش کیے اور ایک نئے طریقہ تعلیم کی داغ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بیل ڈالی۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہی مدرسہ ایک اچھا مدرسہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جو گھر کے نمونہ پر قایم ہو۔ وہ اپنے طریقہ تعلیم میں تجربہ اور مشاہدہ پر زور دیتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بچے تجربہ اور مشاہدہ ہی سے حقیقی معنوں میں علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح سے ان میں سبق سے دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ تعلیم آسان سے مشکل کی طرف لے جاتا ہے۔ زبان کے سکھانے میں بھی وہ بچوں سے خود ان کے مشاہدات کے اظہار پر زور دیتا ہے اور حساب کی تفہیم میں نقاط اور خطوط پر۔ وہ کہتا ہے کہ گنتی کی مشق بیج، رنگوں اور کوڑیوں سے کروائی جائے۔ اس طرح وہ دوسرے مضامین کی تعلیم میں بھی مشاہدہ کو خاص اہمیت دیتا ہے۔

فروبل (1852-1783) نے جو پستالوزی کے طریقہ تعلیم سے بہت متاثر تھا بچوں کی تعلیم میں خود فعلی (Self Activity) اور کھیلوں کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس نے مختلف قسم کے کھلونے اور سامان مشغلہ ایجاد کیے جو Gifts and Occupations کہلاتے ہیں۔ ان سب کا تدریس سے گہرا تعلق ہے۔ فروبل بچوں کے حواس کی تربیت خصوصاً بصارت (Sight)، سماعت (Sound) اور لمس (Touch) کی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچہ کی مناسب طریقہ پر نشوونما کے لیے ڈرائنگ، گھریلو کام کاج، باغبانی، کاغذ تراشی اور اسی قسم کے تخلیقی کاموں سے مدد لی جانی چاہیے۔ وہ بچوں کے لیے رسمی قسم کی تدریس کے بجائے روزمرہ قسم کی بات چیت اور استاد کے ساتھ قریبی ربط ضبط کو ترجیح دیتا ہے۔ اس قسم کے مدرسہ کو وہ بچوں کا باغ (Kindergarten) کہتا ہے۔ یعنی ایسا باغ جہاں کمسن بچوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ بچہ کی تربیت کے لیے وہ گیتوں (Songs) حرکات (Actions) اور ترکیب و توضیح کو ضروری سمجھتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قصہ یا کہانی پڑھائی جائے تو اس کو پہلے گا کر سنایا جائے اس کے بعد اس کو ادا کر کے بتلایا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرح سے بچہ کی تخیل و تفکر کی تربیت ہو گی اور آنکھ اور ہاتھ کے عضلات نشوو نما پائیں گے۔ فروبل نے اپنے کھلونوں میں تدریجی نشوونما کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ ہر نئے کھلونے میں طبقہ کھلونوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کھیلوں سے وہ جو کچھ سیکھا ہے ان کا استعمال مشاغل میں کرتا ہے۔ مشاغل میں ان تمام چیزوں سے مدد لی جاتی ہے جو تعمیری اور تخلیقی کاموں میں مدد لی جاتی ہے جو تعمیری اور تخلیقی کاموں میں مفید ہوں۔ مثلاً کاغذ، ریتی، چکنی مٹی وغیرہ سے کام لینا۔ اس سے دستی کام کی خاص مشق ہوتی ہے اور بچے اپنے طور پر نئے نئے نمونے بناتے ہیں۔

کمسن بچوں کی تعلیم میں ڈاکٹر مانٹیسوری (Dr. Montessori) کے طریقۂ تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عرصہ تک ڈاکٹر مانٹیسوری بحیثیت ڈاکٹر کے بچوں کے علاج معالجہ کا کام انجام دیتی رہی۔ 1889 میں اس نے معذور بچوں (Handicapped Children) کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ معذور بچوں کی تعلیم میں اس کو جو غیر معمولی کامیابی ہوئی اس کی بنا پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر ان ہی اصول پر نارمل بچوں (Normal Children) کو بھی تعلیم دی جائے تو یقیناً اس سے نہایت اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔ اسی خیال کے مدنظر اس نے مختلف حواس کی نشو و نما کے لیے مختلف قسم کا سامانِ تعلیم (Didactic Apparatus) اور ان پر تجربہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر بچوں کو یہ سامانِ تعلیم فراہم کیا جائے تو وہ نہایت انہماک اور دلچسپی کے ساتھ کام میں مصروف ہو جاتے ہیں اور اس قسم کی مصروفیت بغیر کسی اختلالِ توجہ (Distraction) کے کافی دیر تک جاری رہ سکتی ہے۔ اس کے طریقہ تعلیم میں اُستانی بچوں کو ضروری سامانِ تعلیم فراہم کرتی اور استعمال بتلا دیتی ہے۔ اس کے بعد بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جس طرح بھی چاہیں دیے ہوئے سامانِ تعلیم کو استعمال کریں۔ مانٹیسوری کے طریقہ تعلیم میں بچوں کی حسی تربیت، انفرادی آزادی اور ذاتی سعی کو پیش نظر رکھا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں کی ذہنی و جسمانی نشوو نما کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مانٹیسوری نے بچوں کے لیے جو سامانِ تعلیم تیار کیا ہے اس کو ایسی جگہ رکھا جاتا ہے جہاں بچوں کا ہاتھ آسانی سے پہنچ سکے اور استاد کی رہبری میں وہ اپنی مرضی کے مطابق آزادی کے ساتھ کام کر سکیں۔ البتہ اتنی روک ٹوک جائز ہے کہ ایک بچہ دوسرے کے کام میں خلل انداز نہ ہوا اس طرح بچوں میں خود انضباطی بھی پیدا ہوتی ہے۔ مانٹیسوری نے بچوں کی حسی تربیت اور روزمرہ کی ضروریات کے پیش نظر مختلف مدارج کے لیے جو سامانِ تعلیم تیار کیا ہے اس سے طلبا کو کسی اور کی مدد کے بغیر اپنی دشواریوں پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ حسی تربیت کے اختتام کے قریب طلبا اپنے سابقہ تجربہ اور عمل کی روشنی میں لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

فروبل کی طرح ہر بارٹ (1841 - 1776) بھی پستالوزی کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

طریقہ تعلیم سے بہت متاثر تھا۔ ہربارٹ پہلا معلم تعلیم ہے جس نے نظام تعلیم کی عمارت اور نفسیاتی اصول پر قابو کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہتا ہے کہ تمام نئے خیالات کی تعبیر اُن خیالات سے کی جائے جو پہلے ہی سے بچہ کے ذہن میں موجود ہوں۔ ہربارٹ کے تعلیمی نظام کے اس جزو کو استدراک (Apperception) کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس طرح سے بچوں کو تعلیم دیے جانے میں بچوں کو سبق سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور ان کی توجہ برقرار رہتی ہے اور سابقہ معلومات یا استدراکی مواد سے تدریس میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ذہن ایک سادہ تختی کے مانند ہے جس پر بچہ کی معلومات کے نقوش کندہ ہوتے ہیں۔ استاد کو چاہیے کہ اس سادہ تختی پر ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ مفید نقوش مرتسم کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا یہ بھی ادّعا ہے کہ سبق اس وقت تک عمدگی سے نہیں دیا جا سکتا جب تک اس میں دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود نہ ہو۔ ہر بارٹ کی اس قسم کی تدریس کے لیے حسب ذیل پانچ موضوعی اقدام (The five formal steps) بہت مشہور ہیں جن کی رو سے مدرّس، طلبا کو جدید مواد کے سبق دیتا ہے۔ (1) تیاری (Preparation): موزوں سوالات کے ذریعہ تیار کرتا ہے۔ (2) احضار یعنی پیش کرنا (Presentation): پھر مواد کو دلچسپ پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔ (3) موازنہ (Comparison): اس کے بعد دیے ہوئے مواد کو طلبا کی سابقہ واقفیت یا تجربہ سے مربوط کر کے طلبا کے لیے اسے قابل فہم بناتا ہے۔ (4) تعمیم (Generalization): من بعد اسے موزوں شکل میں لاتا ہے تاکہ طلبا کے ذہنوں میں آسانی سے سما سکے اور (5) اطلاق (Application) یعنی آخر میں اس کا عمل استعمال کرواتا ہے۔

ڈیوی (Dewey) نے اپنے تجرباتی مدرسہ میں عمل سے سیکھنے کے اصول کو ممتاز جگہ دی ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ تعلیم سماجی مقاصد اور سماجی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر دی جانی چاہیے۔ پستالوزی کی طرح ڈیوی بھی اس خیال کا حامی ہے کہ وہی مدرسہ ایک مثالی مدرسہ (Ideal School) کہا جا سکتا ہے جو ایک مثالی گھر کے نمونہ پر قایم کیا جائے۔ نیز یہ کہ گھر اور مدرسہ میں اس قسم کی مطابقت ہو کہ بچہ مدرسہ کو گھر کی زندگی کا ایک سلسلہ سمجھے اور جس طرح وہ خود کو اپنے گھر کا ایک رکن تصور کرتا ہے اسی طرح وہ اپنے کو سماج کا بھی ایک رکن سمجھنے لگے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب مدرسہ کو گھر کی طرح چلا کر اس کی مصروفیات کو گھر کے مطابق بنایا جائے۔ ڈیوی کے تجرباتی مدرسہ میں استاد ہر بات کو بتلاتا نہیں بلکہ بچے استاد سے مشورہ کرتے ہیں۔ استاد ان کے جوابات دیتا ہے اور حسب ضرورت تجاویز پیش کرتا ہے۔ لیکن زیادہ کام خود طلبا کرتے ہیں۔ ان تجربات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بچے عمل سے بہت کچھ سیکھتے ہیں اور انھیں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

ڈیوی نے مدرسہ کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 4 سال سے 8 سال تک ۔ یہ کھیل کا زمانہ ہے۔ دوسرا دور 8 سال سے 12 سال تک یہ خود رو توجہ کا زمانہ ہے اور تیسرا دور 12 سال کے بعد یہ ارادی توجہ کا زمانہ ہے۔ پہلے دور میں گھر کی مصروفیات کا مطالعہ شامل ہے۔ اس دور کے آخر میں بچہ کو زمانہ ماقبل کی تاریخ اور ابتدائی ایجادات اور تجربات سے واقف کروایا جاتا ہے۔ دوسرے دور میں بچہ میں کسی مسئلہ کے اسباب و علل اور اس کے نتائج کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس دور کی مصروفیات سماجی دور کی مصروفیات سے متعلق ہوتی ہیں۔ آخری دور میں بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ مسائل کو خود سے حل کرے۔

ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا دوسرا منصوبی طریقہ (Project Method) ہے جس کو ڈیوی کے پیروؤں نے امریکی مدارس میں جاری کیا۔ اس طریقہ تعلیم میں بچے کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کر دیا جاتا ہے اور بچہ اس کے حل اور اس کی تکمیل کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ منصوبہ بچہ کی عمر اور تجربہ کے لحاظ سے موزوں ہو تو اس سے بچہ میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور بچہ بخوشی اس کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں واردھا اسکیم (Wardha Scheme) بھی قریب قریب ڈیوی کے اصول تعلیم کے مطابق ہے۔

اکتشافی طریقہ میں (Heuristic Method) میں اس کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ طلبا کی اس طرح تربیت ہو کہ ان کا ذہن سائنسی (Scientific) طریقہ پر نشوونما پائے تاکہ ان کے استدلال (Reasoning) اور بصیرت (Insight) میں اضافہ ہو اور ان کے خیالات اور عمل میں صحت پیدا ہو۔ یہ کافی نہیں کہ طلبا کو واقعات (Facts) سے روشناس کر کے ان کی معلومات میں اضافہ کیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو اس کی بھی تعلیم دی جائے کہ نئی معلومات کس طرح حاصل کی جا سکتی ہیں اور ان کی تربیت ایسی ہو کہ وہ بطور خود اپنی ذاتی سعی اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کوشش سے علم حاصل کر سکیں اور از خود نتائج اخذ کر سکیں۔ اس کے لیے طلبا میں ذاتی سعی، ذاتی مطالعہ، بحث و مباحثہ اور عمل و فکر کی عادت ڈالی جانا ضروری ہے اور اس طرح سے انھیں کام سے دلچسپی پیدا ہو گی اور حصول مقصد سے مسرت۔ اکتشافی طریقہ (Heuristic Method) میں طلبا بطور خود تجربات جاری رکھتے ہیں اور ان میں تنقیدی ذوق پیدا ہوتا ہے اور واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد نتائج کے قبول کرنے کی ان میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ سائنس کی تعلیم کے لیے یہ طریقہ نہایت مفید سمجھا جاتا ہے۔

جماعت واری تدریس میں عام طور پر پوری جماعت کے طلبا کو کم و بیش ایک ہی معیار کا تصور کر کے انھیں تعلیم دی جاتی ہے اور طلبا کی انفرادی صلاحیتوں، ذہانت اور حصول علم کی استعداد کا کم خیال رکھا جاتا ہے لیکن ڈالٹن پلان (Dalton Plan) میں جو اونچی جماعتوں کے طلبا کے لیے مختص ہے، طلبا کی انفرادی صلاحیتوں کو بلند کرنے کا زیادہ زیادہ خیال کیا جاتا ہے اور ان کے لیے سہولت پیدا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اساتذہ کی رہبری میں اپنی ذہنی قوتوں کو پوری طرح اجاگر کر سکیں۔ اس پلان کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیمی سال کی ابتدا میں اسٹاف کی میٹنگ کی جاتی ہیں۔ ہر مختلف مضامین کی ماہواری تقسیم کر دی جاتی ہے جس کے ہر حصہ کو ماہانہ تفویض کہا جاتا ہے۔ طلبا کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ دی ہوئی تفویض (Assignment) کو اپنے منشا کے مطابق مقررہ وقت پر مکمل کرلیں۔ اس پر عمل پیرائی کے لیے طلبا کو درسی کتب، حوالہ کی کتابوں (Reference Books) ، نقشوں اور چارٹس سے متعلق ہدایتی نوٹس بھی دیے جاتے ہیں تاکہ وہ حسب ضرورت ان سے استفادہ کر سکیں۔ اس اسکیم کی کامیابی کا دار و مدار اس پر ہوتا ہے کہ تفویض (Assignments) کی تیاری میں کس قدر احتیاط برتی گئی ہے۔ چونکہ تفویض (Assignments) کی تکمیل کا کام طلبا پر چھوڑ دیا جاتا ہے اس لیے رسمی تدریس (Formal Teaching) کو اس طریقہ تعلیم میں ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر مضمون کے لیے مختلف کمرے مختص ہوتے ہیں جن میں درسی کتاب، حوالہ کی کتابیں، نقشے، چارٹ اور دیگر ضروری چیزیں موجود رہتی ہیں اور اساتذہ بھی طلبا کی رہبری کے لیے موجود رہتے ہیں۔ حصول علم میں اس قسم کی آزادی سے طلبا کی تعلیمی دلچسپی اور خصوصاً ان کو اپنے پسندیدہ مضمون میں ترقی کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اور طلبا میں ذمہ داری کا احساس اور مقررہ کام کے مقررہ وقت پر انجام دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نیز یہ کہ ذہین طلبا مقررہ کام سے زیادہ کام بھی کر لیتے ہیں۔

طریقۂ تعلیم - غیر رسمی (Method of Teaching-Non-formal)

طریقۂ تعلیم - غیر رسمی (Method of Teaching-Non-formal) : تعلیم سے متعلق پانچویں پنج سالہ منصوبہ بابتہ 1974-79 میں اس بات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام کو بدلنے اور اس کے دائرہ کو وسیع کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ تعلیمی نظام کے اس سارے ڈھانچے پر نظر ثانی کرنے کی معقول وجوہ موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں یونیسکو کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ تعلیم کے میدان میں دو نئے رجحانات ابھر رہے ہیں۔ اول تو یہ کہ تعلیمی اداروں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو رہا ہے اور ان میں بڑا تنوع پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کا روایتی طریقہ بتدریج معدوم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ غیر رسمی طور طریق کو اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ تاہم یہ دونوں رجحانات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض تعلیمی اداروں کا وہ پچھلا تقدس باقی نہیں رہا ہے لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ان کی جگہ نئے تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھا چلا جارہا ہے۔ جزوقتی تعلیم عام ہو رہی ہے اور غیر نصابی طریق تعلیم کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ مستقبل میں ان سارے طریقوں کو خواہ وہ رسمی ہوں یا غیر رسمی ادارہ جاتی ہوں یا غیر ادارہ اصولاً تسلیم کرنا ہی پڑے گا اور دونوں نظام ہائے تعلیم کو مساوی اہمیت دینی پڑے گی۔

ہمارے ماہرین تعلیم نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ جو نظام تعلیم سامراجی مقاصد کی تکمیل کی غرض سے واقع کیا گیا تھا وہ ہمارے آزاد جمہوری معاشرہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ ایسے معاشرہ میں زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا اور بالغ افراد کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے واقف کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ وہ مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض کو انجام دے سکیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تعلیم کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے ایک مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین نے مابعد آزادی تعلیمی ضرورتوں پر اس طرح روشنی ڈالی تھی۔ "اگر ہم ایک قابل عمل جمہوری نظام قایم کرنا چاہتے ہیں جس میں اکثریت کے سوچے سمجھے ارادہ کو غلبہ حاصل ہو تو کیا اس کے لیے یہ امر ناگریز نہیں ہے کہ ایسا ادارہ بدخواہی اور بداندیش کے بجائے ذہانت، روشن خیالی اور فیض رسانی کا حامل ہو۔ میرا یہ یقین پختہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہوتا جا رہا ہے کہ موجودہ حالات میں تعلیم بالغان کا مسئلہ در اصل زندگی اور موت کا مسئلہ ہے جسے نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ پس پشت ڈالا جا سکتا ہے۔"

اب تک ہمارے یہاں تعلیم بالغان کا پروگرام صرف ناخواندگی کو دور کرنے کی حد تک محدود تھا لیکن اب محسوس کیا گیا کہ اس سارے منصوبے کو کچھ اس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ ہر بالغ فرد آزادی کے بعد تشکیل پانے والی سماج کا ایک ذمہ دار شہری بن سکے۔ اس پہلو پر ہمارے دور آزادی کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی زور دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا: "تعلیم بالغان جسے ہم نے سماجی تعلیم کا نام دیا ہے۔ اسی وجہ سے ناگزیر ہو جاتی ہے کہ سماجی تعلیم سے ہماری مراد ایسی تعلیم ہے جو ایک شہری کو مکمل انسان بنا سکے۔ لکھ پڑھ کر ہی کوئی انسان دنیا کے حالات سے واقف ہو سکتا ہے۔ صرف علم ہی کے ذریعہ وہ اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکتا ہے اور طبعی حالات سے، جن کا اسے آئے دن سامنا کرنا پڑتا ہے، پورا پورا استفادہ کر سکتا ہے۔ طریقۂ پیدائش اور ہنر میں مہارت پیدا کر کے ہی کوئی شخص معاشی خوشحالی میں اضافہ کر سکتا ہے۔ سماجی تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہر شہری کو حفظان صحت کی مبادیات بتلائی جائیں تاکہ وہ اپنی اور اپنی قوم کی صحت پر توجہ دے سکے اور اس طرح ہماری جمہوری زندگی ایک صحت مند اور بامراد راستہ پر گامزن ہو۔ آخری بات جو کسی طرح کم اہم نہیں یہ ہے کہ وہ دنیا کے حالات کو سمجھتے ہوئے اپنی حکومت کو صحیح مشورہ دے سکے۔ صرف اسی صورت میں حکومت کے اقدامات امن اور ترقی کے ضامن بن سکتے ہیں۔

ہندوستان کا پانچ نکاتی بالغان کا پروگرام حسب ذیل امور پر مشتمل رہا ہے:

(1) خواندگی اور اس کے بعد کے مراحل۔
(2) شہریت کی تعلیم و تربیت۔
(3) صحت اور حفظان صحت کی تعلیم۔
(4) معاشی بہتری کی تعلیم اور
(5) تفریحی اور تہذیبی مشاغل کے صحت مند طریقے۔

طلاق: کسی بھی شادی کے متعلق جو ہندو میرج ایکٹ 1955 سے قبل یا بعد میں کی گئی ہو حسب ذیل صورتوں میں طلاق کی ڈگری دی جا سکتی ہے۔

(1) شادی کے بعد فریق ثانی نے کسی دوسرے سے ازدواجی تعلقات قایم کر لیے ہیں۔
(2) شادی کے بعد فریق ثانی نے نہایت بے رحمی کا برتاؤ کیا ہے۔
(3) طلاق کی درخواست دینے سے دو سال قبل سے فریق ثانی سے ازدواجی تعلقات قایم نہیں ہیں۔
(4) فریق ثانی نے ہندو مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کر لیا ہے۔
(5) فریق ثانی اس حد تک فاترالعقل ہو گیا ہو کہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل اور ناممکن ہو۔
(6) فریق ثانی متعدی اور لاعلاج برص کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔
(7) فریق ثانی تارک الدنیا ہو گیا ہے۔
(8) فریق ثانی متعدی نوعیت کی جنسی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔
(9) فریق ثانی سات سال سے یا اس سے زیادہ مدت سے لاپتہ ہے۔

فریقین میں سے کوئی بھی فریق ایسی صورت میں طلاق کی ڈگری کی درخواست دے سکتا ہے جبکہ عدالت سے علاحدگی کی ڈگری کے ایک سال کے اندر فریق ثانی سے ازدواجی تعلقات مکرر قایم نہ ہوئے ہوں۔ یا فریق ثانی عدالت سے ازدواجی تعلقات کی تجدید کی ڈگری کے بعد بھی تعلقات کو منقطع رکھے۔

ایک عورت بھی طلاق کی درخواست عدالت میں دے سکتی ہے اگر شوہر نے دوسری شادی کر لی ہو یا بوقت شادی اس کی ایک بیوی موجود تھی یا اگر شوہر نے دوسری عورت کے ساتھ زنا کے جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ یا اگر اس عورت کی شادی پندرہ سال کی عمر سے پہلے کی گئی تھی اور اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچنے پر اس نے شادی سے انکار کر دیا ہو عدالت کو بعض خاص صورتوں میں اس کا اختیار دیا ہے کہ بجائے طلاق کی ڈگری دینے کے عدالتی علاحدگی کا حکم دے۔

طلب نامہ (Summon): اگر کسی شخص نے ایسا جرم کیا ہے جس کے متعلق بروئے قانون طلب نامہ جاری ہونا چاہیے تو ایسی صورت میں عدالت اس شخص کے لیے طلب نامہ جاری کرے گی طلب نامہ کی تعمیل عہدہ دار کوتوالی کے ذریعہ یا کسی سرکاری ملازم کے ذریعہ کروائی جاسکے گی اگر وہ شخص جس کے نام طلب نامہ جاری کیا گیا ہو گواہ ہے اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کوشش کے بعد مکان پر نہ ملے تو اس کی تعمیل اس طور سے کی جائے گی کہ طلب نامے کا ایک پرت شخص مذکور کے لیے اس کے اہل خاندان میں سے کسی مرد کو جو اس کے ساتھ رہتا ہو حوالے کیا جائے گا اور اس کی دستخط دوسری پرت پر لی جائے گی۔ اگر وہ شخص جس کے نام طلب نامہ جاری ہو کسی سرکاری محکمے میں ملازم و کارگزار ہو تو طلب نامہ کے دونوں پرت اس ملازم کے افسر بالا دست کے پاس بھیجے گی۔ جب کسی عدالت کے جاری کیے ہوئے طلب نامے کی تعمیل کسی ایسے مقام پر کرنی ہو جو اس کی حدود سماعت کے باہر ہو تو طلب نامہ کے دونوں پرت اس حاکم فوج داری کے پاس بھیجے جائیں گے جہاں وہ شخص رہتا ہو اور حاکم مذکور اس طلب نامے کی تعمیل اس طرح کرائے گا جس طرح اپنے جاری کیے ہوئے طلب نامے کی تعمیل کروائی جاتی ہے۔ طلب نامے کی تعمیل اس شخص کی ذات پر کی جاتی ہے جس کی طلبی کے لیے طلب نامہ جاری کیا گیا ہو۔ تعمیل اس طور سے ہوگی کہ طلب نامے کی ایک پرت اس شخص کے حوالے کی جائے یا بغرض حوالگی پیش کی جائے۔

طویل مدتی قیمت (Long-run Price): طویل مدت قیمت وہ ہے جس میں فرم کی تعداد اور پلانٹ میں تبدیلی کے ذریعہ رسد بہت زیادہ متغیر ہو جاتی ہے قیمت بڑھنے سے غیر معمولی منافع کی صورت میں نہ صرف موجودہ فرم پیداوار بڑھاتے ہیں بلکہ نئے فرم بھی منافع کمانے کے لیے صنعت میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قیمت کے گھٹنے سے نقصان کی صورت میں یہ صرف موجودہ فرم پیداوار گھٹاتے ہیں بلکہ کچھ فرم صنعت سے نکل جاتے ہیں۔ نیز اس مدت میں جب پلانٹ کے پیمانے میں تبدیلی ہوجاتی ہے اور مصارف کی نوعیت طویل مدتی ہوجاتی ہے تو طلب اور رسد کے درمیان ایک نئی سطح پر توازن ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تمام فرم یکساں کارگزار نہیں ہوتے اس لیے سب سے کم کارگزار فرم اپنی متوازن پیداوار فروخت کرتا ہے جس کے اوسط مصارف کمترین اور قیمت کے مساوی ہوتے ہیں۔ ایسے فرم کو مختتم فرم (Marginal Firm) کہتے ہیں۔ ایسے فرم جو نسبتاً زیادہ کار گزار ہوتے ہیں وہ اندرون مختتم فرم (Intra Marginal Firm) کہلاتے ہیں۔ ایسے فرم کو جو غیر معمولی منافع (کسی زیادہ کارگزار عامل کی وجہ سے) حاصل ہوتا ہے وہ اس کے معاوضے کا جز بن جاتا ہے اگر طویل مدتی مصارف میں اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح تمام فرم کے کمترین اوسط مصارف مساوی ہوجاتے ہیں لہٰذا طویل مدت میں نہ تو فرم غیر معمولی منافع کماتا ہے اور نہ نقصان اٹھاتا ہے۔ فرم متوازن پیمانے پر متوازن پیداوار فروخت کرتا ہے۔ چونکہ متوازن پیداوار کے اوسط مصارف کمترین اور مختتم مصارف کے مساوی ہوتے ہیں اس لیے طویل مدتی قیمت طلب کی طرف سے افادہ مختتم اور رسد کی طرف سے نہ صرف مصارف مختتم بلکہ کمترین اوسط مصارف کے مساوی ہوتی ہے۔ طویل مدت میں تمام فرم کی اس حالت کو فرم کا طویل مدتی توازن (Long-run Equilibrium of Firm) اور صنعت کی اس حالت کو طویل مدتی توازن صنعت (Long-run Equilibrium of Industry) کہتے ہیں۔

طویل مدتی مصارف: طویل مدتی مصارف سے مراد ایسی مدت کے مصارف ہیں جس میں فرم (Firm) یا پیداکار کاروبار کو پہنچانے اور کارخانے میں تبدیلی کے ذریعہ پیداوار کی مختلف اکائیوں کو کمترین اوسط مصارف پر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مدت میں چونکہ تمام عاملین متغیر ہوجاتے ہیں اس لیے معین اور متغیر مصارف کا فرق باقی نہیں رہتا اور محض فی اکائی اوسط مصارف اور مختتم مصارف لاحق ہوتے ہیں۔ پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ فی اکائی مختتم اور اوسط مصارف دونوں میں پہلے گھٹنے اور پھر بڑھنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ قلیل مدت کی طرح طویل مدت میں بھی پہلے مختتم مصارف اپنی کمترین حدوں کو پہنچ کر بڑھنے لگتے ہیں۔ نیز جب تک اوسط مصارف گھٹتے ہیں مختتم مصارف سے زیادہ اور جب بڑھنے لگتے ہیں تو مختتم مصارف سے کم ہوتے ہیں اور اسی لیے کمترین اوسط مصارف ہمیشہ مختتم مصارف کے مساوی ہوتے ہیں۔ کوئی فرم یا کاروبار طویل مدت میں جس پیمانے پر کمترین اوسط مصارف سے جو پیداوار حاصل کرتا ہے اسے ان سب فرم (Optimum Firms) اور اس مقدار پیداوار کو (Optimum Output) انسب پیداوار کہا جاتا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ع

عادت: اس کے لغوی معنی طرز طریقہ اور کسی چیز کے بار بار کرنے یا ہونے کے ہیں۔ یہ عود و معاودت سے ماخوذ ہے مگر اب یہ لفظ اسلامی شریعت کی ایک اصطلاح کے طور پر بولا جاتا ہے جس سے کسی قوم کی مخصوص عادت اور رسم و رواج مراد ہے گو اس کی حیثیت اسلامی فقہ و قانون کے براہ راست ماخذ کی نہیں ہے تاہم اس کا بالواسطہ ماخذ ضرور ہے اس لیے فقہ میں اس کی رعایت کی گئی ہے اور فقہا نے تصریح کی ہے کہ عادت ایک فیصلہ کن چیز ہے قرآن و حدیث کے نصوص سے صراحتہ اور دلالتہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شریعت میں اس کا لحاظ کیا جائے گا عرف کا لفظ اس کا مراوف سمجھا جاتا ہے۔ یعنی فقہا اس کو علم اور عرف کو خاص سمجھتے ہیں اور بعض کا خیال اس کے برعکس ہے۔

عارضی اور دوامی حکم امتناعی (Temporary and Perpetual Injunction): کسی دعوے (Suit) کے دوران عدالت عارضی حکم امتناعی (Temporary Injunction) اس طور پر دے سکتی ہے کہ کوئی فریق مقدمہ کسی کام کو دوران مقدمہ تک یا اس وقت تک عدالت حکم نہ دے انجام نہ دے۔ دوامی حکم امتناعی (Perpetual Injunction) مدعی کے استدلال اور فریقین مقدمہ کی بحث کے سماعت کے بعد عدالت سے دیا جاسکتا ہے وہ فریق مقدمہ جو عدالت سے دوامی حکم امتناعی دینے کا مستدعی ہے اسے عدالت میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اگر کسی کام کے کرنے سے فریق مقابل کو دوامی طور پر نہ روکا جائے تو اس کے حقوق متاثر ہوں گے۔

کسی شخص کو معاہدے کی تکمیل سے روکنے کے خلاف دوامی حکم امتناعی دیا جاسکتا ہے اگر کوئی شخص کسی کی جانب سے ایک جائداد کا ٹرسٹی (Trustee) ہو اور وہ ایسا عمل کرے کہ اصل شخص کے حقوق اس جائداد کے متعلق متاثر ہوں تو ٹرسٹی (Trustee) کے خلاف دوامی حکم امتناعی دیا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کی جائداد پر جبراً قبضہ کرے یا قبضہ کرنے کی دھمکی دے تو اس کے خلاف ایسی صورت میں دوامی حکم امتناعی (Perpetual Injunction) دیا جاسکے گا جب اس کا اندازہ لگانے کا کوئی معیار (Standard) نہ ہو کہ ایسے جبراً قبضہ سے اس شخص کا کتنا نقصان ہوگا یا جب ایسے جبراً قبضے کا کوئی واقعی بدل نہیں دیا جاسکتا یا جب دوامی حکم امتناعی نہ دینے کی صورت میں فریقین میں قانونی نزاع (Litigation) کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوجانے کا امکان ہو۔ اگر کسی معاہدے کے تحت ایک فریق کے لیے کچھ فرائض کی انجام دہی ضروری ہو اور اس میں شخص ثالث کی جانب سے رکاوٹ پیدا کی جارہی ہو تو قانون داد رسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت عدالت کو صوابدید دیا گیا ہے کہ وہ فریق کی شکایت پر اس شخص ثالث کو ایسا عمل کرنے کا حکم دے جس کی وجہ سے وہ رکاوٹ واقع نہ ہو بشرطیکہ عدالت ایسا حکم قانوناً دینے کی مجاز ہو۔

عاقلہ: عقل سے بنا ہے عقل میں روکنے، حفاظت کرنے اور مدافعت کرنے کا مفہوم شامل ہے اس لیے عاقلہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت اور مدافعت کرتے ہیں یہیں سے عقل کے معنوی دیت اور عاقلہ کے معنی دیت ادا کرنے والے کے بھی آتے ہیں۔ فقہی اصطلاح میں اس کا بھی مفہوم رائج ہے۔

زمانہ جاہلیت کے قبائلی نظام میں حادثات و خطرات کی تلافی کے لیے امداد باہمی اجتماعی جرمانہ اور تاوان ادا کرنے میں پورا خاندان اور قبیلہ شریک ہوتا تھا اس لیے خاندان کو عاقلہ کہا جاتا تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی اس شکل کو برقرار رکھا اور خلفائے راشدین نے افادیت کے خیال سے اس کو زیادہ تنظیمی صورت دینے کے لیے اس میں مزید وسعت پیدا کی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

حضرت عمر نے خاندان اور قبیلہ کے علاوہ اہل دیوان کو بھی عاقلہ میں شامل کرلیا اہل دیوان سے ایک دفتر اور ایک محکمہ کے وہ تمام لوگ مراد ہوتے ہیں جن کے نام رجسٹر میں درج ہوتے ہیں۔

عالمی ادارۂ صحت (World Health Organisation, WHO): اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی کونسل نے صحت سے متعلق امور پر غور وخوض کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی تھی جس نے 22جولائی 1946 کو عالمی ادارۂ صحت کا دستور مرتب کرکے اس ادارہ کو قائم کیا جس نے 7/اپریل 1948 سے کام کرنا شروع کیا۔

اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دنیا کے لوگوں کو اعلیٰ ترین سطح کی صحت سے ہمکنار کرائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ ادارہ اقوام متحدہ، اس کی خصوصی ایجنسیوں، حکومتوں کے صحت سے متعلق اداروں اور دوسری تنظیموں سے ربط قائم کرتاہے، صحت سے متعلق خدمات کو مستحکم کرنے کی غرض سے حکومتوں کی مدد کرتا ہے، بیماریوں کے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے سلسلے میں اقدامات کرتا ہے، زچہ بچہ کی صحت مندی کے لیے تدابیر کرتا ہے، صحت سے متعلق امور پر تحقیقات کراتا ہے اور تربیت کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کرتاہے۔ یہ ادارہ صحت سے متعلق بین الاقوامی امور پر مشتمل مسائل پر غور وخوض کے لیے اجتماعات کرنے، معاہدے کرنے اور قواعد وضوابط مرتب کرنے کا بھی مجاز ہے۔

"سن 2000 تک سب کے لیے صحت" اس ادارہ کا بنیادی مقصد ہے۔ ہر سال 7اپریل کو عالمی صحت کا دن منایا جاتا ہے۔ اسمبلی، مجلس عاملہ اور سکریٹریٹ اس ادارہ کے اہم حصے ہیں۔ اس میں 192 ممبر شامل ہیں۔ اس کی سرگرمیاں علاقائی تنظیموں کے ذریعے مختلف ملکوں تک پہنچتی ہیں۔ اس کا سربراہ ڈائریکٹر جنرل ہوتا ہے۔ اس کا صدر دفتر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں واقع ہے۔

عالمی امن کونسل (World Peace Council): یہ کونسل 1950 میں وارسا میں منعقدہ دوسری عالمی امن کانگریس کے ذریعے قائم کی گئی تھی۔ اس میں 140 ملکوں کی 30 بین الاقوامی تنظیموں کے نمائندے شریک ہیں۔ نیوکلیائی جنگ کو روکنا، ساری دنیا میں قیام امن اور اور محکوم ملکوں کی آزادی کی جدوجہد میں امداد کرنا، دنیا کے مختلف سماجی واقتصادی نظاموں کے درمیان پرامن بقائے باہم کو فروغ دینا، اقوام عالم کے مابین اختلافات کو مذاکرات ومعاہدات کے ذریعے رفع کرنا، مکمل ترک اسلحہ کو عملی جامہ پہنانا، نسلی امتیاز اور نوآبادیاتی نظام کو ختم کرنا، قوموں کی آزادی اور خود مختاری کے حقوق کا احترام کرنا اس کے لائحہ عمل کا حصہ ہیں۔

کونسل کی ایگزیکیٹو کمیٹی کو عالمی اسمبلی منتخب کرتی ہے۔ اسمبلی کا اجلاس ہر تیسرے سال منعقد ہوتا ہے۔

اس کونسل کو اقوام متحدہ، اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت وترقی، اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیمی، علمی وثقافتی تعاون میں غیر حکومتی تنظیم کے طور پر مشاہد کا درجہ حاصل ہے۔

اس کا صدر مقام ہیلسنکی (فن لینڈ) ہے۔

عالمی بینک: دیکھیے بین الاقوامی بینک برائے تعمیر وترقی۔

عالمی تنظیم برائے دانش ورانہ ملکیت (World Intellectual Property Organisation, WIPO): یہ تنظیم اپریل 1970 میں ایک معاہدہ کے تحت جود میں آئی جس پر 51ملکوں نے 1967 میں اسٹاک ہوم میں دستخط کیے تھے۔ اسے دسمبر 1974 میں اقوام متحدہ کی تحقیقی ایجنسی قراردے دیاگیا۔ اس کے مقاصد میں رکن ملکوں کے درمیان تعاون کے ذریعے دنیا بھر میں دانشورانہ ملکیت کے تحفظ کا فروغ، دانشورانہ ملکیت سے متعلق یونینوں کے درمیان انتظامی اشتراک کا تیقن شامل ہیں۔

دانش ورانہ ملکیت کی دو قسمیں ہیں: صنعتی ملکیت خصوصاً ایجادات، ٹریڈ مارک اور ڈیزائن اور حق طباعت (کاپی رائٹ) خصوصاً ادبی، موسیقاتی، فنی، تصویری اور فلمی کاموں کی ملکیت۔

WIPO تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جنرل اسمبلی، کانفرنس اور تال میل کمیٹی۔ اس تنظیم کا سربراہ ایک ڈائریکٹر جنرل ہے جو جنرل اسمبلی کے ذریعے منتخب ہوتا ہے۔ جنوری 1999 میں اس تنظیم کے ممبروں کی تعداد 171 تھی اس کا صدر مقام جنیوا (سوئٹزر لینڈ) ہے۔

عالمی غذائی پروگرام (World Food Programme, WFP): یہ پروگرام تنظیم اقوام متحدہ اور ادارۂ غذا وزراعت کا

مشترکہ پروگرام ہے جسے ناگہانی حالات میں ترقی پذیر ملکوں کو غذائی امداد بہم پہنچا کر ان کی اقتصادی واجتماعی ترقی کو متحرک کرنے کے لیے وضع کیا گیا۔ یہ پروگرام جنوری 1963 سے جاری ہے کمیٹی برائے غذائی امدادی پالیسی وپروگرام (C.F.A.) سے متعلق کمیٹی اس پروگرام کا انتظامیہ ادارہ ہے جو 42ارکان پر مشتمل ہے۔ ان میں سے 27 ارکان ترقی پذیر ملکوں سے اور 15ترقی یافتہ ملکوں سے لیے جاتے ہیں۔ 1995 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ایک قرارداد کی رو سے اس کمیٹی کو ایک ایگزیکٹیو بورڈ میں تبدیل کردیا گیا۔

اس پروگرام کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کا تقرر مشترکہ طور سے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل اور ادارۂ غذا وزراعت کے ڈائریکٹر جنرل کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔

اس پروگرام کا صدر مقام روم (اٹلی) ہے۔

عالمی موسیاتی تنظیم (World Meteorological Organisation, WMO) : اس تنظیم نے اقوام متحدہ کے ایک تحقیقی ادارہ کے طور پر 19/مارچ 1951 سے اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ بین الاقوامی پیانہ پر موسم سے متعلق معلومات کا تبادلہ اور ان کا استعمال ہی اس تنظیم کا مقصد ہے۔

اس تنظیم کے ممبروں کی تعداد 179 ہے۔ کانگریس اس کا اعلیٰ ترین حصہ ہے جس کا اجلاس ہر چوتھے سال منعقد ہوتا ہے جس میں اس کی پالیسی، پروگرام اور بجٹ کو منظوری حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ایگزیکٹیو کونسل 36 ممبروں پر مشتمل ہے۔ اس کا جلسہ سال میں ایک بار منعقد ہوتا ہے۔ وہ کانگریس سے اپنے مطالبات سے متعلق سفارشیں کرتی ہے، کانگریس کے فیصلوں اور ضابطوں پر عمل درآمد کراتی ہے۔

اس تنظیم کا مستقل سکریٹریٹ جنیوا میں اور علاقاتی دفاتر افریقہ، ایشیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں واقع ہیں۔

عام احکام گرفتاری (General Rules of Arrest of Persons) : گرفتاری کا عام طریقہ یہ ہے کہ گرفتار کنندہ کسی شخص کو گرفتاری کی غرض سے ہاتھ لگائے اور اسے فرار ہونے سے روکے۔ اگر وہ شخص جسے گرفتار کرنا مقصود ہو راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے تو اسے قوت کے ذریعہ فرار ہونے سے باز رکھا جائے گا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ اس شخص کی ہلاکت واقع ہوسکتی ہو اور اس شخص کو ہلاک کیے بغیر گرفتاری عمل میں نہیں لائی جاسکتی تو ایسی صورت میں وہ تدابیر اختیار کیے جاسکتے ہیں جس پر عمل کرنے سے اس شخص کو ہلاک کرکے گرفتار کیا جائے۔ اگر وہ شخص جسے گرفتار کرنا مقصود ہو کوئی عورت ہو تو اسے کسی دوسری عورت کے ذریعہ گرفتار کیا جائے۔

عام حق رائے دہی (Universal Franchise) : چونکہ جمہوریت کی بنیاد اس مسلمہ اصول پر قائم ہے کہ سیاسی اقتدار کے مالک عوام ہیں اور حکومت کے سارے اختیارات کا منبع وہی ہیں اور چونکہ جمہوری مملکت کا حتمی مقصد اپنے شہریوں کے لیے نشوونما اور ترقی کے بہترین مواقع فراہم کرنا ہے لہٰذا نظام میں بالغوں کی عام حق رائے دہی (Universal Adult Suffrage) کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ایسا ایجاد نہیں ہوسکا ہے جس کے ذریعہ ہر فرد اپنی شخصیت کی بہترین صلاحیتوں کو ابھار سکے۔ اسی لیے ہر شخص کو برابری سے ووٹ کا حق دیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی پسند کی حکومت اور اپنی پسند کی پالیسیوں کا انتخاب کرسکے۔ حق رائے دہی کو عام کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے کیونکہ جو قیود بھی عائد کی جائیں گی، مثلاً جائداد کی ملکیت تعلیمی لیاقت جیسی شرائط، فرد کی سیاسی آزادی اور مساوات کے منافی ہوں گی۔ عام حق رائے دہی بذات خود دوسرے نظاموں سے بہتر نہیں لیکن جمہوریت کے اخلاقی نصب العین کے حصول کے لیے ناگزیر ہے اکثر جمہوری ملکوں میں اگرچہ بڑی حد تک عام حق رائے دہیٔ بالغان کا رواج ہے لیکن چند سماجی گروہوں یعنی نابالغوں، غیر ملکیوں، مخبوط الحواس لوگوں اور سزایافتہ قیدیوں کو ووٹ کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ رائے دہی کا مستحق ہونے کے لیے عام شرائط میں ملک کی شہریت کم از کم عمر (مختلف ملکوں میں 18 سے لے کر 35 سال کے درمیان مختلف عمروں کی شرط رائج ہے) ملک میں اقامت گزینی، حلقہ انتخاب کا باشندہ ہونا اور رائے دہندگان کی فہرست میں نام کا اندراج ہونا شامل ہیں۔ انیسویں صدی میں برطانیہ اور اکثر ملکوں میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا لیکن آج بیشتر جمہوری ملکوں میں انھیں یہ حق حاصل ہے۔ خواندگی اور تعلیم اگرچہ حق رائے دہی کی شرط نہیں ہے لیکن جمہوریت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر ووٹر تعلیم یافتہ، باشعور اور امیدواروں،

جماعتوں اور اصولوں اور پروگراموں کے درمیان انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

عاملہ (Executive): عاملہ حکومت کی وہ شاخ ہے جس کی اولین ذمے داری قوانین اور پالیسی کو نافذ کرنا ہے۔ بیشتر جمہوری ملکوں میں دو طرح کی حکومتیں یعنی پارلیمانی اور صدارتی کام کرتی ہیں۔ پارلیمانی طرز حکومت میں سیاسی عاملہ (کابینہ) مجلس قانون ساز کی اکثریتی پارٹی کی ایک کمیٹی ہوتی ہے جو انتظامی پالیسی اور قوانین کو اس مجلس سے منظور کراتی اور اجتماعی طور سے اس کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت وقت اس وقت تک برسراقتدار رہتی ہے جب تک اسے پارلیمانی اکثریت کا اعتماد حاصل رہتا ہے۔ چونکہ کابینہ کی تشکیل پارلیمان کے اندر سے ہوتی ہے او راس کے عہدہ کی میعاد اس کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے اس لیے اسے پارلیمانی عاملہ بھی کہتے ہیں۔ کابینہ پالیسی سازی کے علاوہ انتظامی شاخ کو کنٹرول کرتی ہے اور منتظم ہونے کی حیثیت سے شہریوں سے براہِ راست اور مستقل ربط رکھتی ہے۔ پارلیمانی نظام کے تحت ایک سربراہ مملکت یا نمائشی منتظم اعلا کسی میعاد کے لیے مقرر ہوتا ہے جسے اس میعاد کے اندر سوائے مواخذے کی کارروائی کے اور کسی طریقہ سے برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی حیثیت محض دستوری اور رسمی سربراہ مملکت کی ہوتی ہے۔ حکومت کا عملی سربراہ یا واقعی منتظم اعلا، وزیرِ اعظم ہوتا ہے جو کابینہ کا سربراہ اور پارلیمان میں حکمراں پارٹی یا پارٹیوں کا قائد ہوتا ہے۔ انگلستان کا دستوری سربراہ مملکت بادشاہ یا ملکہ ہے ہندستان اور دوسرے ملکوں پر وہ بالواسطہ طور پر منتخب شدہ صدر ہوتا ہے۔

صدارتی نظام حکومت کی بنیاد تفریق اختیارات پر ہے۔ یعنی مقننہ اور انتظامیہ کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ صدر انتظامیہ، سربراہ ہونے کی حیثیت سے الگ مقررہ میعاد کے لیے براہِ راست عوام کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے اور قانون ساز مجلس کا انتخاب علاحدہ میعاد کے لیے ہوتا ہے۔ اس نظام میں انتظامیہ کا رکن مجلس قانون ساز کا رکن نہیں ہوتا اور نہ کوئی قانون ساز کسی انتظامی عہدہ پر فائز ہوسکتا ہے۔ صدر منتظم بیک وقت سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت دونوں کے فرائض ادا کرتا ہے۔ صدارتی انتظامیہ براہِ راست دستور اور عوام کے تئیں جواب دہ ہوتی ہے۔ وہ پارلیمان کے تئیں جواب دہ نہیں ہوتی۔ یعنی کابینی نظام حکومت کی طرح پارلیمانی اکثریت عدم اعتماد کے ووٹ سے صدر یا اس کی وزارت کو برطرف نہیں کرسکتی۔ سیاسی انتظامیہ کے تحت حکومت کے مستقل محکموں اور مستقل افسروں اور ملازمتوں پر مستقل انتظامیہ حکومت کے تمام کاموں کو چلاتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا اور دوسرے صدارتی نظاموں میں صدر کا عہدہ ساری انتظامی مشینری کا اعصابی مرکز ہوتا ہے۔ وہ محض منتظم اعلا ہی نہیں بلکہ سربراہ مملکت، قانون سازی کے میدان کا قائد اور ملکی رائے عامہ کا رہنما بھی ہوتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں سربراہ مملکت کی ذمہ داریوں کے سوا وزیرِ اعظم بہت سے فرائض انجام دیتا ہے۔ کابینہ کے خاص فرائض برطانیہ کی ہالڈین کمیٹی (حکومتی مشینری سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ 1918) نے یہ بتائے ہیں۔

(1) پارلیمان کے سامنے پیش کی جانے والی تمام پالیسیوں کا آخری تعین کرنا۔

(2) پارلیمان کی منظور کردہ پالیسی کے مطابق انتظامی شاخ کو کنٹرول کرنا۔

(3) حکومت کے مختلف محکموں کے درمیان مسلسل تال میل قائم کرنا اور ان کے متعلقہ دائرہ کار کی حد بندی کرنا۔

عبادات: عبادت کی جمع ہے اس کے معنی ہیں بندگی، اطاعت اور فرمانبرداری کرنا عجز و تذلل کا اظہار کرنا اور شریعت کی اصطلاح میں خدائے عزو جل کی اطاعت و فرماں برداری، اس کے احکام کی بجاآوری، اس کے سامنے اپنی بندگی و عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا اور عاجزی درماندگی اور سرافگندگی ظاہر کرنا، عبادت کہلاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان و جنات کی پیدائش اسی کام کے لیے ہوئی ہے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم وسیع ہے دوسرے مذاہب کی طرح یہ نہ چند مخصوص اعمال و اشغال اور رسموں کا نام ہے اور نہ کسی خاص ہیئت اور وضع کے مطابق پوجاپاٹ کرلینے کا بلکہ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو اس لیے اگر کوئی فعل و عمل یہ سمجھ کر کیا جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور اس کا مقصد حکم الٰہی کی بجاآوری ہو تو یہ عبادت سمجھا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ کام بھی جن کو دنیاوی سمجھا جاتا ہے اور جن سے خدا کی کسی مخلوق یا خود کرنے والے کی اپنی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے وہ بھی عبادت اور بندگی ہی ہیں۔ جیسے کسی کے

ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا کسی کی مدد کرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، یہ سارے کام اگر حکم الٰہی کے ماتحت اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر کیے جائیں تو بلاشبہ عبادت ہوں گے اور ان پر بھی اللہ کی طرف سے ثواب ملے گا۔ اور اگر اس کے برخلاف یہ کام کسی صحیح مقصد کے محض ہوس رانی کے جذبہ سے کیے جائیں اور ان کا مقصد اللہ کے حکم کی تعمیل نہ ہو بلکہ زیادہ نمائش حصول شہرت اور دوسروں کو احسان مند بناناہو تو یہ عبادت نہ کہے جائیں گے بلکہ ان سے گناہ ہوگا۔

اسلام درحقیقت دو چیزوں سے عبارت ہے ایمان اور عمل صالح، ایمان پر عقیدہ کے ضمن میں گفتگو ہو چکی ہے رہے اعمال تو فقہاء ان کے لیے حسب ذیل تین ابواب قایم کیے ہیں (1) عبادات (2) اخلاق (3) معاملات۔ مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے اعمال صالحہ دو ہی قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق براہ راست خدا سے ہوتا ہے اور ان کو خاص خاص اوقات میں خاص خاص ارکان و شرائط اور حدود و قیود کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے ان ہی کو فقہی اصطلاح میں عبادات کہتے یں اور دوسری نوعیت کا تعلق خدا کے بندوں اور اس کی مخلوقات سے ہوتا ہے ان کو معاملات اخلاق کہا جاتا ہے۔

اسلام کی بڑی عبادات حسب ذیل ہیں:

(1) نماز (2) زکوٰۃ (3) روزہ (4) حج۔

مذکورہ بالا تین جسمانی و مالی ہیں لیکن بعض عبادتوں کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہوتا ہے اس لیے ان کو قلبی عبادات کہا جاتا ہے اور یہ حسب ذیل ہیں:

تقویٰ، اخلاص توکل، صبر، شکر۔

عدالت ثالثی (Court of Arbitration):

پرماننٹ کورٹ آف آربیٹریشن (ثالثی) کو ہیگ ٹریبونل (Hague Tribunal) بھی کہا جاتا ہے۔ 1899 میں منعقدہ ہیگ (Hague) کی پہلی کانفرنس کے ایک کنونشن میں یہ ٹریبونل قایم کیا گیا جو ہیگ (Hague) میں واقع ہے۔ 1963 میں ساٹھ ممالک تھے جو اس کنونشن کی تائید میں تھے۔ کورٹ آف آربیٹریشن (Court of Arbitration) کے لیے ہر ملک اپنے ایسے چار مقننن کو مامور کرسکتا ہے جو بین الاقوامی قانون پر عبور رکھتے ہوں۔ 1962 میں دو سو مقننین (Jurist) اس عدالت کی فہرست میں شامل تھے۔ ایک مقدمہ کا آغاز اس وقت کیا جاتا ہے جب دو یا دو سے زیادہ ممالک ایک متفقہ قرارداد پر جو کسی نزاع کو ہیگ ٹریبونل (Hague Tribunal) سے رجوع کرنے کے لیے دستخط کریں۔ فریقین نزاع قانون دانوں کو فہرست (Panel of Jurists) سے نزاع کے فیصلے کے لیے ثالث انتخاب کرسکتے ہیں یا ایک نئے ثالث کا تقرر کرسکتے ہیں جو نزاع کی سماعت کرے کورٹ کا اجلاس ہیگ (Hague) میں ہوتا ہے بجز اس کے کہ فریقین نزاع کو باہمی قرارداد کے ذریعہ کسی اور جگہ کا تعین کیا گیا ہو۔ اس ٹریبونل نے اب تک متعدد بین الاقوامی نزاعات کا فیصلہ کیا ہے۔

عدالت دیوانی کا اختیار سماعت (Jurisdiction of Civil Court):

ضابطہ دیوانی کی رو سے مقدمہ فیصلہ عدالت ابتدائی میں رجوع کرنا چاہیے جو مجاز سماعت ہے۔ کیونکہ ایسا فیصلہ جو کسی عدالت غیر مجاز نے صادر کیا ہو قانوناً کالعدم ہوتا ہے۔ ہر ملک میں مختلف مدارج کی دیوانی عدالتیں قایم کی جاتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں جو عدالتیں دیوانی مقدمات کے انفصال کے لیے قایم کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(1) سپریم کورٹ (2) ہائی کورٹ (3) صدر عدالت ضلع (4) عدالت ضلع (5) عدالت منصفی (6) عدالت مطالبات خفیفہ

دیوانی مقدمات کی عدالتوں میں رجوع ہوں گے اس کے متعلق دیوانی مقدمات کے لیے یہ قرار دیا گیا ہے کہ مقدمات اس عدالت میں رجوع ہوں گے جہاں جائداد مدعوہ واقع ہو یعنی اس عدالت میں جس کے اختیار سماعت کی حدود ارضی کے اندر جائداد واقع ہو۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ مقدمات جو جائداد غیر منقولہ کے متعلق نہ ہوں وہ اس مقام پر رجوع کیے جاسکیں گے جہاں مدعاعلیہ سکونت رکھتا ہو یا جہاں بنائے دعویٰ پیدا ہوئی ہے۔

ف۔ عدالت مجاز کا تعین ہونے کے بعد مدعی کو چاہیے کہ اپنا عرضی دعویٰ مرتب کرے کیونکہ ہر مقدمہ کی ابتدا عرضی دعویٰ سے ہوتی ہے۔ عرضی دعویٰ سے متعلق حسب ذیل احکام ہیں۔ عرضی دعویٰ صاف صاف عدالت کی زبان میں فقرہ وار لکھی جائے گی اور اس میں حسب ذیل مراتب درج ہوں گے۔

(1) اس عدالت کا نام جس میں مقدمہ دائر کیا جائے۔

(2) مدعی کا نام و ولدیت، قوم، عمر، پیشہ اور سکونت

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(3) مدعاعلیہ کا نام، ولدیت، قوم، عمر، پیشہ اور سکونت جہاں تک دریافت ہوسکے۔

(4) جب مدعی یا مدعاعلیہ نابالغ یا فاترالعقل ہو تو اس کی کیفیت۔

(5) واقعات جو مقدمہ کی بنائے دعویٰ ہوں وہ کب پیدا ہوئے۔

(6) واقعات جن سے ظاہر ہو کہ عدالت کو اختیار سماعت حاصل ہے۔

(7) دادرسی مستدعیہ۔

(8) اگر مدعی نے اپنے دعوے میں کچھ کم کر دیا ہو یا کوئی جز ترک کیا ہو تو کم کیے ہوئے یا ترک کیے ہوئے جزو کی مقدار۔

(9) اختیار سماعت عدالت اور رسوم عدالت کی اغراض کے لیے جائداد یا حق مدعوہ کی مالیت جہاں تک ممکن ہو۔

ف۔ مدعی کو چاہیے کہ وہ ان تمام دستاویزات کو جن پر عرضی دعوے میں استدلال کیاگیا ہو اس کو عرضی دعوے کے ساتھ پیش کردے۔ عرضی دعوے عدالت مجاز میں پیش کرنے کے بعد اس کی تنقیح کی جاتی ہے یعنی یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اس کی ترتیب میں احکام مقدمہ کافی ہیں یا نہیں۔ و نیز یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ عدالت مجاز سماعت ہے یا نہیں اگر عرضی دعوے میں کوئی سقم نہ ہو تو وہ قبول کی جاتی ہے اور اس پر نمبر مقدمہ درج کیا جاتا ہے۔

ف۔ جب مقدمہ حسب ضابطہ رجوع ہوجائے تو مدعاعلیہ کے نام طلب نامہ (سمن) جاری کیا جاتا ہے ہر طلب نامہ کے ساتھ عرضی دعوے کی نقل منسلک رہتی ہے طلب نامہ کی تعمیل کے بعد مدعاعلیہ کا فرض ہے کہ وہ اصالتاً یا بذریعہ وکیل تاریخ پیشی پر حاضر ہوکر جواب دہیٰ کرے۔ مدعاعلیہ کو اختیار ہے اور اگر عدالت حکم دے تو لازم ہے کہ مقدمہ کی سماعت اول پر یا اس کے قبل اپنا جواب دعویٰ پیش کرے۔ اگر مقدمہ کی پیشی کے وقت کوئی فریق بھی حاضر نہ ہو تو عدالت مقدمہ کے اخراج کا حکم دے سکے گی۔ اور اگر مدعی حاضر ہو اور مدعاعلیہ حاضر نہ ہو تو یک طرفہ فیصلہ ہوجائے گا اور اگر مدعی حاضر نہ ہواور مدعاعلیہ حاضر ہو تو مقدمہ خارج کردیا جائے گا۔ فریقین سے استفسار کیا جاتا ہے کہ بیانات مندرجہ پلیڈنگ سے اقبال ہے یا انکار انکشاف حال کے لیے فریقین مقدمہ عدالت کی اجازت سے دوسرے فریق کو دوچند سوالات کرسکتا ہے اور فریق ثانی پر ان سوالات کا جواب دینا لازمی ہوگا۔ فریقین کو ایک دوسرے کی دستاویزات کے معائنہ کا بھی اختیار ہے تاکہ مدعی کو اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں اور مدعاعلیہ کو اپنی جواب دہی میں مدد ملے۔ ان ابتدائی امور کے بعد حاکم عدالت تنقیحات طے کرتا ہے تنقیح طلب امور اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی فریق واقعات یا قانون کے متعلق کسی امر کو بیان کرے اور فریق ثانی اس سے انکار کرے۔

عدالتی تنقیح (Judicial Review) : دستوری یا عدالتی تنقیح (Constitutional Judicial Review) کا اصول ریاست ہائے متحدہ امریکا کے وفاقی دستور کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ اس کے معنی کو الیگزینڈر ہیملٹن نے "فیڈرالسٹ" میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے : "عدالتوں کا خاص فریضہ قوانین کی تشریح کرنا ہے۔ (ملک کا) دستور درحقیقت ایک بنیادی قانون ہے اور ججوں کو اسے بنیادی تسلیم کرنا ہے۔ اب یہ کام ججوں کا ہے کہ وہ دستور کے معنی اور قانون ساز مجلس کے بنائے ہوئے عام قانون کے معنی کا تعین کریں۔ امریکی دستور کی دفعہ 6 کے تحت ریاستہائے متحدہ امریکا کے دستور اس کے تحت بنائے گئے قوانین اور وفاقی حکومت کے ذریعہ کیے گئے معاہدات کو ملک کا اعلیٰ ترین قانون قرار دیا گیا ہے اور ججوں کو ان کا اطلاق کرنے کا پابند بنایا گیا ہے۔ لیکن امریکی دستور میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ امریکی سپریم کورٹ کو مقننہ اور انتظامیہ کی ان کارروائیوں کو اس بنیاد پر کالعدم قرار دینے کا اختیار ہے جنھیں وہ دستور کی دفعات کے مطابق نہ پائے۔ اس اختیار کا دعویٰ سب سے پہلے امریکی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جان مارشل (John Marshall) نے مشہور مقدمہ مربری بنام میڈسن (Merbury Vs. Madsion) (1803) کے فیصلہ میں کیا۔ مارشل نے یہ دلیل دی کہ قانون کی تشریح و تعبیر کرنا عدالتی شاخ کا مسلمہ اختیار ہے۔ اگر کسی مقدمہ میں دو قوانین ٹکراتے ہوں تو یہ فیصلہ عدالت کرے گی کہ کون سا قانون نافذ کیا جائے۔ اسی طرح اگر کوئی عام قانون بنیادی قانون یعنی دستور سے متصادم ہو تو عدالت یا تو دستور کو نظرانداز کرکے عام قانون کا اطلاق کرے گی یا عام قانون کو نظرانداز کرکے دستور کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ چونکہ دستور مقننہ کے بنائے ہوئے قانون سے بالاتر ہے اور ججوں کو بنیادی قانون کو نافذ کرنے کا پابند بنایا گیا ہے لہٰذا ایسے تمام معاملات میں عام قانون کے بجائے دستور کا اطلاق کیا جائے گا۔

چیف جسٹس مارشل کے فیصلہ کے بعد سے آج تک عدالتی تنقیح کے اصول کی دستوریت کو کسی نے چیلنج نہیں کیا کیونکہ اس کی پشت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پر معقول وجوہات ہیں۔ (1)امریکی دستور ایک تحریری دستور ہے جس میں بہت سی دفعات عام اور مبہم الفاظ میں لکھی گئی ہیں۔ ان کو معنی پہنانا عدلیہ کا کام ہے۔ (2) وفاقی مملکت وفاقی دستور کی تشکیل کردہ ہے۔ وفاقی دستور کی روح مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم ہے۔ لہٰذا دستور دونوں سے بالاتر ہے۔ اس کی بالاتری کو قائم رکھنے کے لیے اور مرکز وریاستوں کے درمیان اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے ایک وفاقی عدلیہ کا ہونا ضروری ہے۔ (3) وفاقی عدلیہ نہ صرف مرکز اور ریاستوں کے درمیان ثالث کا کام کرتی ہے بلکہ ایک کو دوسرے کے اختیارات کی پامالی سے روکتی بھی ہے۔ (4) یہ وفاقی حکومت کی دونوں شاخوں (مقننہ و انتظامیہ) کو بھی ایک دوسرے کے اختیارات کی پامالی سے روکتی ہے کیونکہ ان سبھی کے اختیارات دستور میں لکھے ہوئے ہیں۔ محدود حکومت کا یہ نظام عدالتی تنقیح کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا اور (5) عدلیہ، دستور میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا اسے ان کی پامالی کرنے والے قوانین کے اقدامات کو دستوری بنیاد پر کالعدم کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

یہ اصول محض ریاست ہائے متحدہ امریکا ہی میں رائج نہیں بلکہ اسے آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، ہندستان، آئرلینڈ، اٹلی اور ترکی میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ جرمنی کے سوا مغربی یورپ کے ملکوں میں عدالتی تنقیح کے برخلاف قومی مجلس قانون ساز کی بالاتری کا اصول رائج ہے۔ یعنی کوئی بھی عدالت پارلیمان کے بنائے ہوئے قانون کو خلاف دستور یا کالعدم نہیں قرار دے سکتی۔

عدالتی شاخ (Judiciary) : عدلیہ کی عاملہ سے علاحدگی اور اس قانون کی تشریح اور اطلاق میں آزادی و غیر جانبداری جمہوری نظام حکومت کا جزو لاینفک ہے۔ انگلستان میں عدلیہ کی آزادی اور قانون کی حکرانی کا اصول سترہویں صدی کی دستوری کشمکش کے بعد دستاویز حقوق (1689) کے ذریعہ مستحکم ہوا۔ عدلیہ کی آزادی دراصل قانون کی حکرانی اور شہریوں کی بنیادی آزادیوں اور حقوق کے تحفظ کے لیے لازمی ہے۔ ہنری سجوک (Henry Sidgwick) کے مطابق کسی قوم کے تہذیبی درجہ کا اندازہ لگانے کے لیے اس سے زیادہ فیصلہ کن معیار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کہ وہاں کی عدلیہ شہریوں اور شہریوں کے مابین اور شہریوں اور حکومت کے درمیان کس حد تک انصاف کرتی ہے۔ عدالتی نظام کی کامیابی کے لیے ججوں کی آزادی غیر جانبداری اور بے خوفی کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ بہترین تعلیم و تربیت کے حامل اور اپنے پیشہ کے ماہر ہوں اور عدالتی کارروائی آسان، کم خرچ، براہ راست، محفوظ اور تیز رفتار ہو۔

تنظیم : تمام جمہوری ملکوں میں عدلیہ کی آزادی کی ضمانت، ججوں کے تقرر کے طریقہ، ان کی میعاد کار، عہدہ کے تعین اور برطرفی کے طریقہ سے کی جاتی ہے۔ ججوں کا تقرر اگرچہ منتظم اعلیٰ کرتا ہے لیکن وہ عدالتی انتظام یا فرائض کی انجام دہی میں اس کی مداخلت سے آزاد ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں جج اس وقت تک اپنے عہدہ پر برقرار رہتے ہیں جب تک ان کا برتاؤ اچھا رہے۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکا میں سپریم کورٹ کے جج تاحیات کام کرتے ہیں لیکن انھیں رضاکارانہ طور پر ریٹائر ہونے کا اختیار ہے۔ انتظامیہ کو ججوں کی تنخواہیں یا دیگر مشاہرے میں رد وبدل کی اجازت نہیں ہے۔ ان کا تعین قانون کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور وہ براہ راست عوامی خزانہ سے دی جاتی ہیں۔ ججوں کو برطرف کرنے کا اختیار انتظامیہ کو نہیں دیا جاتا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ججوں کو کانگریس میں مواخذہ (Impeachment) کی کارروائی سے اور برطانیہ و ہندستان میں پارلیمان کے دونوں ایوانوں سے برطرفی کی قرارداد منظور ہونے کے بعد ہی سربراہ مملکت برطرف کرسکتا ہے۔

فرائض : عدالتوں کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں :

(1) قانون کی تشریح کرنا اور قانون کے مطابق عدل و انصاف کرنا۔

(2) قانون کی منشا کو واضح کرنے کے لیے اعلانی فیصلے دینا۔

(3) وفاقی نظام میں، وفاقی عدالتوں کو مقننہ اور انتظامیہ کے اقدامات کی عدالتی تنقیح کا اختیار ہونا۔

(4) صدر منتظم کے ایماء پر اسے قانونی مسائل پر مشورہ دینا۔

(5) قانون سازی کا اختیار۔ روزمرہ کے عدالتی عمل میں ججوں کو نئے قانونی ضوابط تشکیل کرکے قانون کو جامع بنانے کا اختیار ہے۔ اسے کیس لا یا جج کا بنایا ہوا قانون یا نظیر (Precedent) کہتے ہیں۔

(6) رٹ یا رواجی فرمانوں (Writs) کے ذریعہ شہریوں کی آزادیوں اور حقوق کی حفاظت کرنا۔

عدالتی فیصلہ (Judicial Pronouncement): ہر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مقدمہ کا فیصلہ کارروائی ختم ہوتے ہی یا اس کے بعد کسی تاریخ پر جس کی اطلاع فریقین یا ان کے وکلاء کو دی جائے گی برسر اجلاس عدالت میں سنایا جائے گا۔ فیصلہ ملزم کے مواجہہ میں سنایا جائے گا البتہ اگر ملزم کو اصالتاً حاضری سے معاف کیا گیا ہو اور سزائے مجوزہ صرف جرمانہ ہو یا ملزم بری کیا جائے تو ایسی صورت میں فیصلہ ملزم کے وکیل کے مواجہہ میں سنایا جائے گا۔ کوئی فیصلہ صرف اس وجہ سے ناجائز نہ ہوگا کہ کوئی فریق یا اس کا وکیل اس تاریخ یا اس مقام پر جس کی اطلاع فیصلہ سنانے کے لیے دی گئی تھی حاضر نہیں تھا یا یہ کہ اس تاریخ اور مقام کی اطلاع فریقین یا ان کے وکلاء یا ان میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھی۔ ہر فیصلہ زبان عدالت میں حاکم فوج داری اپنے قلم سے لکھے گا۔ فیصلے میں امور فیصلہ طلب اور ان کا فیصلہ معہ وجوہ درج ہوگا اور فیصلہ سناتے وقت اس پر تاریخ لکھ کر حاکم فوج داری اپنے دستخط ثبت کرے گا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہائی کورٹ کے جج اور سیشن جج اپنا فیصلہ لکھا سکیں گے اگر کوئی فیصلہ سیشن جج نے لکھوایا ہو تو ایسے فیصلے کے ہر صفحے پر سیشن جج دستخط کرے گا۔

عدالتی کارروائی (Judicial Proceeding) : ہر حاکم فوج داری ضلع یا حاکم فوج داری حصہ ضلع جس کو اختیار سماعت حاصل ہو یا وہ مجسٹریٹ جس کو بہ طور خاص اختیار دیا گیا ہو ہر جرم کی سماعت حسب ذیل صورتوں میں کرسکے گا۔

(1) جب اس کے پاس کوئی استغاثہ ایسے واقعات کی نسبت کیا جائے جس سے وہ جرم بنتا ہو۔

(2) جب عہدہ دار کوتوالی کے سوا کسی اور شخص کی طرف سے اطلاع ملے کہ جرم کا ارتکاب ہوا ہے۔

جب کوئی حاکم فوج داری جرم کی سماعت کرے تو ملزم کو شہادت لیے جانے سے قبل اطلاع دی جائے گی کہ وہ اس امر کا حق رکھتا ہے کہ مقدمہ کی تحقیقات کسی اور عدالت میں کرائے اور اگر اس عدالت میں تحقیقات ہونے کی نسبت ملزم یا ملزموں میں سے کسی کو اعتراض ہو تو مقدمہ بلا کسی کارروائی مزید کے کسی اور حاکم فوج داری مجاز کے پاس یا کوئی ایسا حاکم فوج داری نہ ہو تو عدالت سیشن میں بھیج دے گا۔

جب کوئی حاکم فوج داری کسی جرم کی تحقیقات پر بنا استغاثہ کرے تو وہ فوراً مستغیث کا اظہار حلفی قلم بند کرکے اس کے دستخط لے گا اور اپنے دستخط کرے گا۔ اگر استغاثہ تحریری کسی ایسے حاکم فوج داری کے سامنے پیش ہو جو مقدمے کی سماعت کا اختیار نہیں رکھتا ہو تو اس پر یہ لکھ کر واپس کر دیا جائے گا کہ عدالت مجاز میں پیش کیا جائے اور اگر استغاثہ تحریری نہ ہو تو مستغیث کو عدالت مجاز میں رجوع ہونے کی ہدایت کرے گا۔

عرب بعث اشتراکی پارٹی (Arab Socialist Bath Party) : عرب بعث اشتراکی پارٹی کو عام استعمال میں بعث پارٹی کہا جاتا ہے اس کا اصل عربی نام "حزب البعث العربی الاشتراکی" ہے۔ یہ اشتراکیت پر مبنی عرب اتحاد کی علم بردار اور ایک سیاسی تحریک ہے۔ اس کی بنیاد شام کے شہر دمشق میں ایک مسیحی مفکر میشل افلاق (Michel Aflaq) اور روشن خیال مسلمان صلاح الدین البیطار (Salah ad-Din al-Bitar) نے 1943 میں رکھی تھی۔ 1947 میں اس نے اپنا دستور وضع کیا اور 1953 میں شام کی شامی اشتراکی پارٹی میں ضم ہوگئی۔ شروع میں اس کا مقصد ناوابستہ تحریک کی حمایت کرنا، استعماری قوتوں کی مخالفت کرنا، اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دینا، طبقاتی تقسیم کو ختم کرنا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران عربوں کی قومی آزادی کی تحریک کو ایک متحدہ سمت عطا کرنا تھا۔ بعد ازاں اس تحریک کا دائرہ اثر وسیع ہوگیا اور اس کی شاخیں عراق، اردن، لبنان اور خلیج عرب کے دوسرے ملکوں تک پھیل گئیں۔ 1947 کی پالیسی اور پروگرام میں بعث پارٹی کے درج ذیل مقاصد بیان کیے گئے تھے۔

(1) عرب قوم کو سیاسی طور پر متحد کرنا

(2) عربوں کو بیرونی مداخلت سے آزادی اور تحفظ فراہم کرنا

(3) اشتراکیت کو فروغ دینا

1950 کی دہائیوں میں بعث پارٹی نے عربوں میں زبردست اثر و نفوذ حاصل کیا حتیٰ کہ فوج کے ساتھ مل کر وہ شام اور عراق میں برسراقتدار آگئی۔ شام میں اس کی حکومت کی تشکیل 1969 میں فوجی انقلاب کے بعد عمل میں آئی لیکن ترقی پسند اور قوم پرست رہنماؤں کے مابین رسہ کشی کے باعث مستحکم اقتدار قائم نہیں ہوسکا۔ بالآخر 13/ نومبر 1970 میں لیفٹیننٹ جنرل حافظ الاسد نے فوجی انقلاب کے ذریعہ نورالدین اتاسی کو معزول کرکے اقتدار پر قبضہ کرلیا اور 22/ فروری 1971 کو اس کے صدر بن گئے اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے۔ فی الوقت ان کا بیٹا

402

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بشیر الدین الاسد برسر اقتدار ہے۔

عراق میں بعث پارٹی نے فوج کے ساتھ مل کر ہاشمی حکومت کا تختہ پلٹنے میں جنرل عبدالکریم قاسم کی مدد کی تھی لیکن جلد ہی دونوں میں اتحاد بحال نہ رہ سکا۔ 1963 میں بعث پارٹی صرف نو مہینہ کے لیے اقتدار میں آئی اور پھر بعد میں 17/ جولائی 1968 کو صدر عبدالرحمٰن عارف کی حکومت کے خلاف ایک کامیاب فوجی انقلاب کے نتیجہ میں اقتدار پر قبضہ کیا اور جنرل احمد ابوبکر صدر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ جولائی 1979 میں پرامن انتقال اقتدار کے نتیجہ میں نائب صدر صدام حسین، صدر کے عہدہ پر فائز کر دیے گئے اور تاحال اس منصب پر فائز ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں بعث پارٹی کا اتنے عرصہ تک برسر اقتدار رہنا اس کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

عرب لیگ (The League of Arab States):

عرب لیگ (جمعیۃ الدول العربیہ) آزاد وخود مختار عرب ملکوں کی ایک رضاکارانہ تنظیم ہے جس کا مقصد عرب ملکوں کی اقتصادی، اجتماعی، علمی، تہذیبی اور دفاعی پالیسیوں اور سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرنا اور عرب اتحاد اور عربوں کی مشترکہ بہبود کے لیے کام کرنا ہے۔ اس کا قیام اسکندریہ میں منعقدہ عرب اتحاد کی تمہیدی کانفرنس کے نتیجہ میں 22مارچ 1945 کو ایک میثاق پر دستخط ہونے کے بعد عمل میں آیا جس میں مصر، عراق، سعودی عرب، شام، لبنان، اُردن اور یمن شامل تھے۔

اس کے اراکین میں الجریا، بحرین، کوموروس، جبوتی، مصر، عراق، اردن، کویت، لبنان، لیبیا، موریطانیہ، مراکش، عمان، فلسطین، قطر، سعودی عرب، صومالیہ، سوڈان، شام، تیونس، متحدہ عرب امارات، اور یمن شامل ہیں۔ مصر کو 1979 میں لیگ کی رکنیت سے معطل کردیا گیا تھا لیکن بعدازاں واپس لے لیا گیا۔

لیگ کا اعلا ترین ادارہ اس کی کونسل ہے جس کی نشستیں ہر سال مارچ اور ستمبر میں منعقد ہوتی ہیں جو لیگ کے رکن ممبروں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ اس کونسل سے 16 کمیٹیاں ملحق ہیں جو سیاسی کمیٹی، ثقافتی کمیٹی، اقتصادی کمیٹی، مواصلاتی کمیٹی، اجتماعی کمیٹی، قانونی کمیٹی، عرب ماہرین کمیٹی، اطلاعاتی کمیٹی، صحت کمیٹی، انسانی حقوق کمیٹی، انتظامی ومالی امور کی کمیٹی، موسمیات کی کمیٹی، امداد باہمی کے ماہرین کی کمیٹی، عرب خواتین کی کمیٹی، تنظیم فلاح نوجوانان، رابطہ افسروں کی کانفرنس کے ناموں سے موسوم ہیں۔

عرب لیگ کی پالیسیوں کو اس کا سکریٹریٹ نافذ کرتا ہے اور لیگ کے کارندوں کو مالی اور انتظامی خدمات مہیا کرتا ہے۔ سکریٹریٹ اقتصادی، سیاسی، قانونی، ثقافتی، اجتماعی، امور محنت، پٹرولیم، مالیات، فلسطین، صحت، اطلاعات، مواصلات، آداب سفارت اور امور افریقہ کے شعبہ جات پر مشتمل ہے۔ لیگ کا انتظامی افسر اس کا سکریٹری جنرل ہوتا ہے جسے لیگ کی کونسل اپنے ارکان کی دوتہائی اکثریت کی رائے سے منتخب کرتی ہے۔

1950 کے مشترکہ دفاع اور اقتصادی تعاون کے معاہدہ کے تحت عرب لیگ نے 1964 میں مشترکہ فوجی کمان قائم کی اور عرب اقتصادی کونسل اور مشترکہ دفاعی کونسل قائم کی۔ عرب اقتصادی کونسل کا نام 1977 میں بدل کر اقتصادی واجتماعی کونسل کردیا گیا۔ لیگ سے ملحق تقریباً بائیس تحقیقی ادارے سرگرم کار ہیں۔

سیاسی میدان میں لیگ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ علاقائی اور بین الاقوامی سطحوں پر مشترکہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنا کر عالم عرب کے اعلا ترین مفادات کا دفاع کرے اور پرامن طریقوں سے تنازعات کا حل تلاش کرے۔

عرب مشترکہ منڈی (Arab Common Market):

13/اگست 1964 کو ایک معاہدہ کے تحت عرب مشترکہ منڈی کا قیام عمل میں آیا جس نے یکم جنوری 1965 سے کام کرنا شروع کردیا۔ اقتصادی اصلاحات کے پیش نظر مئی 1997 میں دو فنڈ قائم کیے گئے۔

لیگ کو اقوام متحدہ کے دائرہ کار میں ایک علاقائی تنظیم کی حیثیت حاصل ہے جس میں لیگ کا سکریٹری جنرل ایک مشاہد ہے۔ نیویارک اور جنیوا میں لیگ کے مستقل نمائندے موجود رہتے ہیں اور عدیس ابابا میں افریقی اتحاد کی تنظیم میں بھی اسے نمائندگی حاصل ہے۔ بون، وی آنا، برسلز، اتھینیز، میڈرڈ، واشنگٹن، نئی دہلی، بیجنگ، ماسکو، روم، لندن اور پیرس میں بھی لیگ کے دفاتر قائم ہیں۔

لیگ کا صدر دفتر مصر میں ہے۔

عرف: لغوی معنی بلند اور نمایاں چیز کے ہیں اور اس کا اطلاق اچھے اور پسندیدہ قول و عمل پر بھی ہوتا ہے اسی طرح جو کام مسلسل اور پے درپے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کیا جائے اس کو بھی عرف و معروف کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں اس سے کسی جگہ یا قوم کے مخصوص رسم و رواج اور دستور مراد ہوتے ہیں جن کی اسلامی قانون میں رعایت کی گئی ہے۔

عرف شریعت اسلامی کا ایک ضمنی اور معاون ماخذ ہے قرآن و سنت کے نصوص میں صراحۃً اور دلالۃً اس کا ذکر ملتا ہے فقہا نے لکھا ہے کہ عرف سے ثابت ہونے والی بات کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو نص سے ثابت ہونے والی بات کی ہوتی ہے۔ عرف و عادت ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔

عزرائیل: خدا کے اس فرشتہ کا نام ہے جو جانداروں کی جان نکالنے پر مقرر ہے۔ ہر جاندار کی موت کا وقت مقرر ہے جب کسی کی جان نکالنے کا خدا اس کو حکم دیتا ہے تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرتا ہے۔

عشر: اسلامی حکومت کی زمینیں جو مسلمان ماتحتین یا ان کے قایم مقام لوگوں کے قبضہ میں ہوتی ہیں ان کی پیداوار اگر قدرتی وسائل مثلاً بارش سے ہو تو دسواں حصہ اور اگر سینچائی سے ہو تو بیسواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ عشر کی معافی یا کمی کا خلیفہ کو کوئی حق نہیں ہے۔

عشور: یہ محصول مال تجارت پر لیا جاتا ہے اس کی حیثیت کسٹم ڈیوٹی کی ہے۔ یہ ٹیکس ان مسلمانوں اور ذمیوں سے بھی لیا جاتا ہے جو دارالحرب اور دارالاسلام کے درمیان تجارتی کاروبار کرتے ہیں اور ان غیر مسلم تاجروں سے بھی لیا جاتا ہے جو دارالحرب سے دارالاسلام میں بغرض تجارت مال لے کر داخل ہوں۔ لیکن جس شخص سے سال میں یہ ایک مرتبہ وصول کرلیا جائے گا پھر دوبارہ وصول نہیں کیا جائے گا خواہ وہ اندرون سال کتنی ہی بار آمد و رفت کا سلسلہ کیوں نہ جاری رکھے۔ دو سو درہم یا بیس مثقال سے کم مال پر کسٹم ڈیوٹی نہ عائد ہوگی۔ مسلمانوں کے مال تجارت پر چالیسواں اور ذمی کے اسباب تجارت میں سے بیسواں اور تاجروں کے مال تجارت سے دسواں حصہ لے کر بیت المال کی ملکیت میں دیا جائے گا۔

عصرالمامون: یہ ڈاکٹر احمد فرید رفاعی کی تصنیف ہے جو تین جلدوں پر مشتمل اور مصر سے کئی بار چھپی ہے اس میں خلفائے عباسیہ کے گل سرسبد مامون (عبداللہ بن ہارون الرشید ولادت 170ھ وفات 218ھ کے عہد کی سیاسی علمی اور ادبی تاریخ بیان کی گئی ہے مصنف نے اموی اور مامون کے پیش رو عباسی خلفا کے دور کے سیاسی و ادبی حالات پر بھی مختصر بحث کی ہے اور مامون کی سیرت و شخصیت حالات و کمالات نظام مملکت اور اس کے زمانہ کی ادبی سرگرمیوں کا مفصل ذکر کیا ہے اس سے اس دور کے اہم ادیبوں، انشاپردازوں اور شاعروں کے حالات اور کارناموں کا مرقع سامنے آجاتا ہے۔ انشا پردازوں کی تحریروں کے اقتباسات اور شعراء کے کلام کے نمونے دیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف مامون بلکہ اموی اور عباسی دور کی بھی سیاسی و ادبی تاریخ ہے۔

عصری معلومات ماخذ (Current Affairs Sources): اندرون ملک اور بیرونی ممالک نیز بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے عصری، سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی وغیرہ دائروں میں رونما ہونے والے واقعات اور ملک کے حالات اور ان سب پر افراد اور جماعتوں کے رد عمل اور تاثرات سے واقفیت کا ذریعہ عام طور پر اخبارات اور خبرنامے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ معلومات ہمیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی ملتی ہیں۔ لیکن ان جملہ مواصلاتی ذرائع سے وقت گذر جانے کے بعد دوبارہ ان معلومات کا حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جبکہ ان کی تلاش طالب علموں، سیاسی جماعتوں اور دوسرے عناصر کو بھی ہوتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے حاصل معلومات دوبارہ حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اخبارات اگرچہ موجود ہوتے ہیں لیکن ان میں سے درکار خبریں یا بیان، مضمون یا اداریہ تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جبکہ اخبارات اب تحقیق خصوصاً سماجی اور سیاسی موضوعات پر تحقیق کے لیے اہم ماخذ بن چکے ہیں۔

معلومات کی نشاندہی کی اس دقت کو دور کرنے کی غرض سے معروف اخبارات نے اپنے اشاریے مرتب کرکے شائع کرنا شروع کردیا ہے۔ یہ اشاریے رسائل کے مضامین کے اشاریہ سے کچھ مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ان میں مصنف کا اندراج نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس میں شخص، جگہ اور واقعہ کو اس کے نام کے تحت درج کرتے ہیں۔

اشاریہ اخبار کی سب سے قدیم مثال انگلینڈ کے "ٹائمس" اخبار کی ہے جو 1790 سے دستیاب ہے۔ پہلے اسے ایک نجی کمپنی شائع کرتی تھی۔ 1906 سے خود اخبار نے شائع کرنا شروع کردیا۔ اب امریکہ سے "نیویارک ٹائمس"، فرانس سے "لی ماند" (Le Monde) کے علاوہ دوسرے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ممالک کے اخبارات نے بھی اپنے اشاریے شائع کرنے شروع کردیے ہیں۔ ہندستان میں ٹائمس آف انڈیا نے اپنا اشاریہ 973 میں شائع کرنا شروع کیا لیکن چند برسوں میں ہی بند کردیا۔ اب صرف ہندو اخبار کا اشاریہ شائع ہوتا ہے۔ کچھ مثالیں ایک سے زائداخباروں کے یکجا اشاریہ شائع ہونے کی بھی ہیں۔

عصری معلومات کے ماخذ کے طور پر اخبارات میں موجود معلومات کے خلاصے بھی متعین وقفہ سے شائع ہوتے ہیں ان میں قابل ذکر کیسنگ ریکارڈ آف ورلڈ ایونٹس (Keesing Record of World Events) اور فیکٹس آن فائل (Facts on File) ہیں۔ ہندستان سے ڈاٹا انڈیا (پریس ٹرسٹ آف انڈیا) ایشین ریکارڈر اور انڈین اکنامک ڈائری چند تلخیصی مطبوعات شائع ہوتی ہیں۔ کچھ ریڈیو کی نشریات کے خلاصے بھی شائع ہورہے ہیں۔ اکثر اشاریے اب "سی ڈی روم" پر بھی دستیاب ہیں۔

عقل: لغظی معنی روکنا منع کرنا ہے مگراصطلاحاً عقل ادراک انسانی مادہ کے ایک خاص وصف کا نام ہے اور اس سے فہم و بصیرت سمجھ بوجھ اور رشد و تمیز مراد ہوتی ہے۔ یہ وصف بلوغ کے بعدانسان میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے بھلے برے، نیک و بد اور اچھے خراب میں امتیاز کی صلاحیت و قوت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے بعد وہ شریعت کے احکام کے مکلف ہوتا ہے اگر بلوغ کے بعد بھی آدمی کے اندر عقل و رشد نہ پیدا ہوسکے تو وہ شریعت کے احکام کا مکلف نہیں ہوتا۔

عقل علم و انکشاف کا سب سے بڑا ذریعہ ہے احساس و ادراک کے پانچ ذرائع ہیں (1) قوت باصرہ (2) قوت سامعہ (3) قوت شامہ (4) قوت ذائقہ (5) قوت لامسہ۔ ان کو حواس خمسہ بھی کہتے ہیں اور یہ انسانوں کی طرح حیوانوں میں بھی پائے جاتے ہیں جو چیز انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ عقل ہے اس کی بدولت خدا نے نوع انسانی کو تمام زندہ مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔

عقل کا کام غور و فکر تدبر، اعتبار اور نظر ہے اس لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ مذہب کے تمام اصول و فروغ کی تلقین عقل ہی کی بنا پر کی گئی ہے قرآن مجید نے اپنی دعوت و تعلیم کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے اس لیے شریعت کی تمام باتیں اس کے احکام و ہدایات اور امور ونواہی عقل و حکمت کا ادراک کرے۔ لیکن عقل سے خودرائی اور خودپسندی مراد نہیں ہے اور نہ ہر شخص کی عقل بلکہ عقل میں اہمیت عقل سلیم اور فطرت صالحہ کی ہے مذہب روحانیات اور الٰہیات کے مسائل میں انسانی عقل پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی عقل کی اسی نارسائی کی بنا پر اللہ نے پیغبروں کو مبعوث کیا۔ (ملاحظہ ہو رسول نبی اور نبوت و رسالت)

خالص عقل پرستی اور تعقیل پسندی اس زمانہ میں تجدید پسندی کے مرادف سمجھی جاتی ہے اس طرح کے لوگوں کو جہاں کوئی بات عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے اس کو فوراً رد کر دیا عقل و نقل کی بحث قدیم ضرور ہے مگر صحابہ کرام کے زمانہ میں عقلی موشگافیوں کا وجود نہ تھا بعد میں یونانی فلسفہ کے اثر سے جب لوگوں میں عقلی بحثوں سے دلچسپی بڑھی تو اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر متعدد فرقے پیدا ہوئے معتزلہ نے خاص طور پر عقل و استدلال پر بڑا زور دیا۔ ان کے نزدیک عقائد اصول معارف اور اعمال و احکام سب عقلی ہیں ان کے مقابلہ دوسرے فرقوں نے عقل کا رد شروع کیا اور اس میں وہ اس قدر آگے نکل گئے کہ درایت اور عقلیت کو سرے سے نظر انداز کردیا۔

عقل کی باب میں دونوں جماعتوں کا نقطہ نظر افراط و تفریط پر مبنی اور اعتدال کے منافی ہے۔

عقیدہ: یہ عقد سے مشتق ہے جس کے معنی گرہ لگانا باندھنا رسی کو مضبوطی سے بٹنا ہیں۔ اس سے اعتقاد بنا ہے جس کا معنی کسی چیز کی تصدیق کرنا اور اس کو مضبوطی سے اختیار کرنا ہوتا ہے۔ مگر عموماً یہ لفظ کسی چیز کو بطور دین و مذہب اختیار کرنے اور اس پر پختہ یقین کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے عقیدہ کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ چیزیں اور باتیں جن کی دینی حیثیت سے تصدیق کرنا ضروری ہو اور جن کو ماننا، تسلیم کرنا اور جن پر مضبوطی سے قایم رہنا لازمی ہو۔ اسی لیے دین میں عقیدہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اگر کسی کے عقائد درست نہ ہوں تو اس کا دین ایمان اور اسلام بھی درست نہ ہوگا۔ اصل دین عقائد ہی کا نام ہے۔ عبادات اخلاق اور معاملات بھی دین کا حصہ ہیں لیکن عقائد کے بغیر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اسلام کے بنیادی عقائد تین ہیں۔ (1) توحید (2) رسالت (3) معاد لیکن ایمان مفصل میں مزید باتوں کا ذکر ہے جو یہ ہیں:

ایمان باللہ : اللہ پر ایمان لانا یہی توحید ہے۔

ایمان بالملائکہ : اللہ کے فرشتوں پر ایمان لانا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ایمان بالرسل: خدا کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا۔

ایمان بالکتب: خدا کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا۔

ایمان بالآخرۃ: قیامت اور روز جزا پر ایمان لانا۔

ایمان بالقدر تقدیر پر ایمان لانا کہ اچھی یا بری تقدیر پر اللہ ہی کی طرف سے ہے ایمان بالبعث بعدالموت۔ مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر ایمان لانا۔ ہر مسلمان کے لیے ان ساتوں چیزوں پر ایمان لانا ان پر پختہ یقین رکھنا زبان سے ان کا اقرار کرنا اور دل سے ان کو تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے اگر کوئی ان میں سے کسی ایک بات کا بھی انکار کردے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

علاقائی تحفظ: علاقائی تحفظ (Regional Security) کی کیفیت اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ تاریخ انسانی۔ قدیم یونان میں اہجیائی اور پیلوپونے زیائی شہری مملکتوں کی گٹ بندیاں' اور ایرانیوں کے خلاف یونانیوں کا عام اتحاد علاقائی انجمن کی مثالیں ہیں۔ ہر علاقائی اتحاد یکجہتی اور تعاون کی خواہش پر مبنی ہوتا ہے۔ حالیہ تاریخ میں "منرواصول" (Monroe Doctrine, 1823) اگرچہ اصلاً براعظم امریکا میں ریاست ہائے متحدہ کی بالاتری اور وہاں بیرونی طاقتوں کی مداخلت کی ممانعت کا یک طرفہ اعلان تھا لیکن بعد میں وہ بین الامریکی علاقائی تحفظ کے نظام کا نقطہ بنا اور پہلے پین امریکی یونین اور پھر اس نے تنظیم ریاست ہائے امریکی (Organisation of American States) کے قیام سے ادارتی شکل حاصل کرلی۔ انیسویں صدی نے اقوام کے متعدد اتحادات، جوابی اتحادات، اور توازن طاقت کے نظام کے ارتقاء کا مشاہدہ کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر جمعیت اقوام کی تنظیم اس مقصد سے وجود میں آئی تھی کہ امن عالم کے قیام کے لیے توازن طاقت کے پر خطر نظام کی جگہ اجتماعی تحفظ کا نظام نافذ کیا جائے۔ جمعیت کے میثاق نے منرو اصول جیسی موجودہ علاقائی مفاہمتوں اور مستقبل کے علاقائی اتحادات کے جواز کو دفعہ 21 کے تحت تسلیم کیا۔ "اس میثاق" کی کوئی دفعہ قیامِ امن کے سلسلہ میں کیے ہوئے بین الاقوامی سمجھوتوں، مثلاً ثالثی کے معاہدوں یا منرو اصول جیسی علاقائی مفاہمتوں کے جواز پر اثر انداز نہیں سمجھی جائے گی۔

دونوں عالمی جنگوں کے دوران جمعیت کے ارکان نے وفاقی نوعیت کے کئی علاقائی انتظامات مثلاً بلقان اتحاد، لوکارنو معاہدات، یورپی یونین کی تجویز کیے جن میں نہ جمعیت نے ان پر کوئی اعتراض کیا نہ ہی ان انتظامات کا جمعیت کے مقاصد سے ٹکراؤ ہوا۔

دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ سے پہلے "اقوام متحدہ" کی ڈمبارٹن اوکس کانفرنس (1944) نے جو جنگ کے خاتمہ پر ایک نئی عالمی تنظیم کے خطوط متعین کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی علاقائی اداروں کا وجود تسلیم کیا بشرطیکہ وہ اقوام متحدہ کی تنظیم کے منشور سے "مطابقت" رکھتے ہوں۔ عظیم طاقتوں نے اتفاق رائے سے یہ طے کیا تھا کہ امن وجنگ کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کی بنیادی ذمے داری اور کلی اختیار نئی عالمی تنظیم کو دیا جائے لیکن اس کے ساتھ علاقائی تنظیموں کے مقامی اور علاقائی تنازعات میں امدادی رول کی اہمیت بھی تسلیم کی۔ مزید برآں یہ بھی طے کیا گیا کہ سیکیورٹی کونسل قیامِ امن کے لیے ان تنظیموں کو تنفیذی کارروائی کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔ 1945 کی اقوام متحدہ کی سان فرانسسکو کانفرنس میں علاقائیت اور عالمی تنظیم کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان بڑا مباحثہ ہوا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ تنظیم اقوام متحدہ کو اعلا ترین اور قیام امن کی کارروائیوں کے لیے اہل ترین تسلیم کرتے ہوئے علاقائی تنظیموں کو اس میدان میں امدادی اور ماتحت رول دیا جائے۔ لیکن سیکیورٹی کونسل سے کسی فیصلہ کے صادر ہونے کے لیے پانچوں مستقل ارکان کی تائید کو لازمی قرار دینے (یعنی ویٹو کے حق کی شمولیت) سے علاقائی تنظیموں کی آزادانہ اقدام کرنے کی صلاحیت مجروح ہوتی تھی چنانچہ منشور کے تحت اولین توجہ اس بات پر مرتکز ہوئی کہ علاقائی تنظیمیں تنازعات کے پرامن تصفیہ میں سیکیورٹی کونسل سے تعاون کریں۔ لیکن ناگہانی حالات میں دفعہ 51 کے تحت اقوام متحدہ کی اجازت کے بغیر بھی ان تنظیموں کو انفرادی اور اجتماعی دفاع کا حق دیا گیا ہے۔

"علاقائیت" اور "علاقائی تنظیم" کی اصطلاحیں عمومی اور لچک دار ہیں اور ان کے کوئی واضح یا متعین معنی نہیں ہیں چنانچہ ہر عام اصول کے مانند اس کی تفصیلات کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ عرف عام میں "علاقہ" (Region) سے مراد کرۂ ارض کا کوئی محدود اور معروف خطہ ہے۔ لیکن اس کا عام مفہوم جغرافیائی وحدت کی قید سے آزاد ہے۔ علاقائی تنظیموں کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ "محدود رکنیت رکھنے والی مملکتوں کی وہ انجمنیں ہیں جن کا دائرۂ کار قدرتی طور پر معروف یا سیاسی طور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پر متعین کوئی جغرافیائی خطہ ہو اور جو اس خطہ میں اپنے فطری مفادات کے تحفظ یا فروغ کے مقصد سے قائم کی گئی ہوں"۔ یہ تعریف اتنی وسیع اور لچک دار ہے کہ اس میں نہ صرف اندرون علاقہ کے تنازعات کے پرامن تصفیہ کے لیے قائم علاقائی تنظیمیں بلکہ ناٹو اور وارسا معاہدہ جیسی اجتماعی دفاع کی علاقائی فوجی تنظیمیں بھی آجاتی ہیں جن کا مقصد اندرون علاقہ قیامِ امن ہی نہیں بلکہ ایک بیرونی دشمن کا مقابلہ کرنا بھی شامل ہے۔ ایک دوسری تعریف میں جغرافیائی حقائق کو حذف کرکے تنظیم میں شریک ملکوں کے درمیان مشترکہ اقدار پر زور دیا گیا ہے۔ یہ پہلی تعریف سے بھی زیادہ وسیع ہے اور اس میں دولت مشترکہ اقوام اور فرانسیسی برادری جیسے گروہ بھی آجاتے ہیں۔ چونکہ علاقہ کی ہیئت کے بارے میں کوئی متفقہ معیار نہیں ہے اس لیے ملکوں کی کوئی بھی تنظیم جو تعاون کے مقصد سے تشکیل کی گئی ہو علاقائی نام اختیار کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ خود اقوام متحدہ کے منشور میں علاقہ یا علاقائی تنظیم کی کوئی تعریف نہیں دی گئی ہے۔ سان فرانسسکو کانفرنس میں اس کی کوشش کی گئی تھی لیکن اسے رد کردیا گیا کیونکہ اس کی کوئی بھی تعریف ہمہ گیر نہیں ہوسکتی۔ منشور نے علاقائی تنظیموں کے اقوام متحدہ سے تسلیم کیے جانے کی محض یہ شرط رکھی ہے کہ وہ اس کے اغراض ومقاصد سے مطابقت رکھیں اور اقوام متحدہ کے تنفیذی ادارہ یعنی سکیورٹی کونسل سے تعاون کریں۔

اقوام متحدہ کے منشور کا باب ہشتم "علاقائی انتظامات" پر مشتمل ہے۔ اس کی دفعات 52 تا 54 کے تحت رکن ملکوں کو بین الاقوامی امن وتحفظ کے قیام میں مدد دینے کی غرض سے علاقائی تنظیمیں بنانے کی آزادی دی گئی ہے۔ دفعہ 52 (1) میں بین الاقوامی امن وتحفظ کے میدان میں مقامی یا علاقائی اقدام کے لیے علاقائی انتظامات یا اداروں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے مطابق ہوں۔ اس دفعہ کی شق (2) اور (3) کے تحت علاقائی تنظیمیں تنازعات کے پرامن تصفیہ میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ جنگ کو روکنے کے لیے تنفیذی اقدامات بھی کرسکتی ہیں۔ لیکن دفعہ 53 (1) کے تحت کوئی علاقائی تنظیم سکیورٹی کونسل کی اجازت یا اس کے حکم کے بغیر کوئی تنفیذی کارروائی نہیں کرسکتی۔ دفعہ 54 کے تحت علاقائی تنظیموں کی ذمے داری ہے کہ وہ قیامِ امن وتحفظ کے مقصد سے کی گئی یا کی جانے والی اپنی کارروائیوں کے بارے میں سکیورٹی کونسل کو باخبر رکھیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ علاقائی تنظیموں کی اکثریت کا مقصد باب ہشتم میں دیے گئے مقاصد کی تکمیل سے زیادہ باب ہفتم کی دفعہ 51 سے میل رکھتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "اس منشور کی کوئی دفعہ مسلح حملہ ہونے کی صورت میں ارکان کے انفرادی واجتماعی دفاع کے فطری حق پر اثر انداز نہیں ہوگی"۔ تا آنکہ سکیورٹی کونسل قیام امن کے لیے ضروری اقدامات نہ کرے۔ اس دفعہ کا سہارا لے کر اکثر علاقائی تنظیموں مثلاً تنظیم معاہدہ شمال اطلس (NATO) تنظیم ریاست ہائے امریکا (OAS) عرب لیگ اور تنظیم اتحاد افریقہ نے اقوام متحدہ سے الگ رہ کر تنفیذی اور تعزیری کارروائیاں کی ہیں۔ منشور کا مقصد اس دفعہ سے ایک ایسا لچک دار طریقہ کار مہیا کرنا تھا کہ جس میں عالمی اور علاقائی دونوں طرز کی تنظیمیں اپنے مشترکہ مقاصد کے حصول میں اتفاق سے کام کرتیں۔ لیکن 1945 کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ شروع ہونے اور اس کے نتیجہ میں دنیا کے اکثر ملکوں کے دو بلاکوں میں تقسیم ہوجانے سے اقوام متحدہ کی تنظیم کی اہمیت اور کارکردگی ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ علاقائی تنظیموں نے منشور کے باب ہشتم کی قیود سے آزاد رہ کر کام کرنے کو ترجیح دی اور اقوام متحدہ اور علاقائی تنظیموں کے درمیان تال میل کو غیر ضروری سمجھا۔ دوسری طرف خود علاقائی اداروں کی کارکردگی کچھ زیادہ امیدافزا نہیں رہی۔ انھوں نے علاقائی تنازعات کے پرامن تصفیہ میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی نہ ہی مقامی مسائل کا تصفیہ کرکے اقوام متحدہ کا بار ہلکا کرنے میں مدد دی۔

علاقائی تعاون برائے ترقی (Regional Cooperation for Development, R.C.D): یہ ایک بین الحکومتی سہ فریقی تنظیم ہے جسے ایران، ترکی اور پاکستان نے قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد تینوں ممالک کے درمیان اقتصادی، تکنیکی اور ثقافتی امور میں تعاون کرنا ہے اس تنظیم نے تنظیم معاہدۂ وسطیٰ کو تقویت پہنچائی جو تینوں ملکوں کی دفاعی تنظیم تھی۔ وزارتی کونسل اور علاقائی منصوبہ بندی کونسل اس کے پالیسی ساز ادارے ہیں اور سکریٹریٹ اس کا انتظامی ادارہ ہے۔

اس تنظیم کا صدر مقام تہران (ایران) ہے۔

علاقائی مطالعات (Area Studies): اگرچہ علاقائی

مطالعات کی ابتدا انیسویں صدی کے مستشرقوں کی کوشش سے ہوچکی تھی لیکن جدید علاقائی مطالعات کی بنیاد امریکا میں دوسری عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد سرد جنگ کے زمانہ میں پڑی۔ مستشرقین کا میدان اور طریقۂ تحقیق اور مقصد موجودہ مطالعات کے ہدف، مقاصد اور مناہج سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی تمام تر توجہ مشرقی ملکوں کی پرانی تہذیب ادبیات، لسانیات اور مذاہب کے مطالعہ پر مرکوز تھی۔ ان تحقیقات کا مقصد سیاسی نہیں بلکہ تمام تر ادبی اور علمی تھا۔ ان کی تحقیقات ان کی اپنی حکومتوں کی پالیسی سازی میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھیں۔

معاصر علاقائی مطالعات کا تصور یہ ہے کہ کرہ ارض کے ممالک، متعین جغرافیائی اور تہذیبی علاقوں میں منقسم ہیں۔ ان علاقوں کی اقوام میں بہت سی باتوں کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ان علاقوں کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی، ادبی، لسانی اور زندگی کے دوسرے بہت سے امور کا موزوں طور پر علمی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ان مطالعات کا سیاسی مقصد یہ ہے کہ بیرونی علاقوں سے متعلق ہر پہلو سے معلومات مہیا کرکے قومی پالیسی سازوں کو ان علاقوں کے معاملات کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنے اور موزوں فیصلے کرنے کی سہولت دی جائے۔

علاقائی مطالعہ کے پروگرام کی چند نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(1) مقامی زبانوں سے اتنی واقفیت کہ محقق بنیادی ماخذ پڑھ سکے اور فیلڈ ورک پر جاسکے۔

(2) مشترکہ سیمینار یا مجلس مذاکرہ، جس میں ایک سے زائد محقق حصہ لیں۔

(3) ٹیم ورک اور اجتماعی تحقیقات۔

(4) بین الموضوعاتی کام اور ادبیات وعلوم اجتماعیہ کا ملا جلا مطالعہ۔

(5) متعلقہ علاقوں سے متعلق تحقیقاتی مواد مثلاً اخبارات، سرکاری دستاویزات، نقشے، کتابیں، رسائل وغیرہ کی فراہمی۔

(6) علاقائی پروگرام میں غیر ملکی ماہرین کی شرکت اور

(7) فیلڈ ورک اور ذاتی مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت۔

ان مطالعات کی غرض سے دنیا کو ان چند علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم حتمی نہیں ہے بلکہ اس میں مقامی تغیرات بھی پائے جاتے ہیں۔ مشرقی ایشیا، مغربی ایشیا، جنوبی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا، وسطی ایشیا، مغربی یورپ، مشرقی یورپ، وسطی یورپ، سوویت یونین، شمالی امریکا، لاطینی امریکا، شمالی افریقہ، مشرقی افریقہ، مغربی افریقہ اور جنوبی افریقہ۔ فی الوقت بیشتر ترقی یافتہ بلکہ بعض ترقی پذیر ملکوں میں بھی علاقائی مطالعات کے پروگرام یونیورسٹیوں کے روایتی شعبوں میں اور نئے طرز کے بین الموضوعاتی ادارے اور مراکز یونیورسٹیوں اور ان سے باہر کام کررہے ہیں۔ اس کے ساتھ محققوں کی قومی اور بین الاقوامی انجمنیں بھی سرگرمِ کار ہیں۔ ہندستان میں علاقائی مطالعات کی تنظیم سب سے پہلے نئی دلّی میں 1950 میں اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے قیام سے ہوئی جو 1969 میں نوتشکیل جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا حصہ بن گیا۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مختلف یونیورسٹیوں میں علاقائی مراکز قائم کیے جو کامیابی سے چل رہے ہیں۔ جنوبی ایشیا (راجستھان یونیورسٹی) جنوب مشرقی ایشیا، (جادوپور) مغربی ایشیا (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سوویت یونین اور مشرقی یورپ (بمبئی یونیورسٹی) وغیرہ۔

علالت: مرض اور بیماری کو کہتے ہیں۔ اسلامی شریعت میں مریضوں کے حالات تندرست اور صحت مند لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں ان کے لیے دشواریوں میں آسانی پیدا کی گئی ہے اور احکام شریعت میں تخفیف اور سہولت کردی گئی ہے۔ اس کی کچھ صورتیں ملاحظہ ہوں۔

وضو او غسل کرنے میں مرض بڑھ جانے یا اس کے دیر میں اچھے ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کی اجازت ہے۔

مرض کی حالت میں نماز کا قیام ضروری نہیں۔ بیٹھ کر یا لیٹ کر یا اشارہ کے ذریعہ جس طرح آسانی ہو نماز پڑھنا جائز ہے۔ مریض جماع کرکے بھی نماز ادا کرسکتا ہے۔

روزہ کے دنوں میں روزہ نہ رکھنے مرض کی وجہ سے اعتکاف سے باہر ہوجانے اور حج میں اپنا قایم مقام بھیج دینے کی گنجائش ہے۔ مریض کو حج میں قربانی سے پہلے سر منڈا لینے کی رخصت ہے مگر فدیہ دینا ہوگا۔

مرض کی وجہ سے بعض ممنوع چیزیں مباح ہوجاتی ہیں مثلاً نجس اشیاء اور شراب وغیرہ سے علاج کرانا ڈاکٹر اور حکیم کو ان مقامات کا معائنہ کرانا جن کے دیکھنے کی شرعی ممانعت ہے۔

مریض اپنی ملکیت اور جائداد کے تہائی حصہ کی وصیت کرسکتا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ہے اگر مریض اپنے کسی قرض خواہ کا کچھ قرض ادا کرتا ہے تو اس میں دوسرے قرض خواہوں کو بھی حصہ پانے کا حق حاصل ہوگا۔ مریض کو بیع کا حق ہے مگر قرض خواہوں یا ورثہ کو مناسب قیمت پر بھی فروخت نہیں کرسکتا۔ قرض کا اقرار حالت صحت کی طرح علالت میں بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جس قرض کا ثبوت صرف مرض موت کا اقرار ہو وہ اس وقت تک نہیں ادا کیا جائے گا جب تک کہ وہ قرضے نہ ادا ہوجائیں جن کا اقرار متوفی نے صحت کی حالت میں کیا تھا یا جو دوسری شہادتوں سے ثابت ہوں۔ جس قرض کا اقرار کسی وارث کے حق میں مرض الموت میں کیا جائے وہ نہ ثابت ہوگا اور نہ نافذ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک مریض کا نکاح جائز ہے مگر امام مالک کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

علم آبادی - شماریات : انسانی آبادی کے جائے وقوع ہیئت تعداد اور ان میں تبدیلیوں کا سائنٹفک مطالعہ علم آبادی کا موضوع ہے۔

سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں سیاسی حساب دانوں (Political Arithmetician) نے علم آبادی کی ابتدا کی۔ ان لوگوں کا مطمح نظریہ یہ تھا کہ مملکت کے وسائل کا تخمینہ کیا جائے اور چونکہ مملکت کے وسائل میں انسانی آبادی اہم مقام رکھتی ہے اس لیے آبادی کے بارے میں معلومات اکٹھا کی جانے لگیں۔ ابتدائی دور کے علما میں جان گرانٹ (John Grant)، سرولیم پٹی (Sir Willian Petty) کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں مالتھس نے اپنا مشہور نظریہ آبادی پیش کیا۔ مالتھس کے نظریہ آبادی کا علم آبادی کے ارتقا پر کیا اثر مرتب ہوا ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

ہر علم کے کچھ ماخذ ہیں اور علم کی نوعیت پر اس کے ماخذ کی نوعیت اور خصوصیات کا زبردست اثر ہوتا ہے۔ علم آبادی کا مواد حسب ذیل اہم ماخذ سے حاصل کیا جاتا ہے۔

(1) مردم شماری، (2)ولادت اور اموات کی رجسٹریشن سسٹم، اور (3)خاص سروے۔ ان میں سے پہلے دو ماخذ پر علم آبادی کی بنیاد رکھی گئی ہے اور حالیہ زمانے میں خاص مسائل کے مطالعے کے لیے سروے کے ذریعہ معلومات فراہم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مردم شماری کے طریقے کی ابتدا کہا جاتا ہے کہ کینیڈا کے صوبے کیوبک میں 1666 سے ہوئی۔ پہلی قومی مردم شماری سویڈن میں 1749 میں کی گئی۔ ممالک متحدہ امریکا میں 1790 اور انگلستان میں 1801 سے مردم شماری کا طریقہ شروع ہوا۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں پہلی مرتبہ مردم شماری 1872 میں ہوئی اور پھر سارے ہندوستان میں مردم شماری 1881 سے شروع ہوئی۔ مردم شماری کے طریقوں میں بتدریج ترقی ہوتی گئی مگر آج بھی دنیا میں ایسے ممالک ہیں جہاں کبھی مردم شماری نہیں کی گئی۔ مردم شماری علم آبادی کے مواد کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہے۔

ولادت اور اموات کے رجسٹریشن کا طریقہ بھی سارے مہذب ممالک میں اختیار کیا جاچکا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں جہالت عام ہے اس کی اہمیت کو عوام محسوس نہیں کرتے اور ولادت اور اموات کے رجسٹریشن کا نظام ناقص ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اس خرابی کو دور کرنے کی مختلف کوششیں کی گئی ہیں اور اس نقص کو دور کرنے کے دو اہم طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

قومی سامپل سروے (National Sample Survey) اور قومی سامپل اسکیم (National Sample Scheme) جیسے طریقوں سے آبادی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور رجسٹریشن سسٹم کے ذریعہ حاصل کردہ اعداد وشمار کے نقائص کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

علم آبادی کا مطالعہ عموماً تین ابواب کے تحت کیا جاتا ہے۔ آبادی میں تبدیلیاں ان ہی میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ تین ابواب حسب ذیل ہیں۔ پیدائش، اموات اور ہجرت۔

پیدائش : آبادی میں تبدیلی کا انحصار شرح پیدائش پر ہوتا ہے اگر شرح پیدائش شرح اموات سے زائد ہو تو آبادی میں اضافہ ہوگا اور اگر یہ کم ہو تو آبادی میں کمی واقع ہوگی۔ کسی ملک میں ہجرت کرکے آنے والوں کی تعداد ہجرت کرکے ملک سے جانے والوں کی تعداد سے زاید ہو تو آبادی میں اضافہ ہوگا ورنہ کمی واقع ہوگی۔ اس خیال کو اختصار کے ساتھ اس طرح بھی ظاہر کرسکتے ہیں۔ آبادی - پیدائش - اموات ± ہجرت۔

شرح پیدائش کا انحصار بڑی حد تک سماجی طرز عمل پر ہوتا ہے۔ سماج اور شادی شدہ جوڑوں کے اقدار اور طرز عمل اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ علم آبادی میں کسی سماج یا مختلف سماجوں میں شرح پیدائش کی تبدیلی کی تشریح حیاتیاتی یا طبیعاتی نقطہ نظر سے نہیں کی جاتی۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ قوت پیدائش اور شرح پیدائش میں امتیاز کیا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

جائے۔ عام آبادی میں قوت پیدائش کی تبدیلیوں سے بحث نہیں ہوتی بلکہ شرح پیدائش میں تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جو ایک سماجی عمل ہے۔ شرح پیدائش کی تشریح آبادی کی ہیئت ترکیبی سے بھی کی جاسکتی ہے۔ آبادی کی ہیئت ترکیبی کے مطالعہ سے آبادی کی خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے اور اس سے مختلف نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اور شرح پیدائش و اموات سے اس کو مربوط کیا جاسکتا ہے۔ آبادی کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ مختلف نقاط نظر سے کیا جاسکتا ہے جن میں سے چند اہم کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

(1) آبادی کی عمر کے نقطہ نظر سے ہیئت ترکیبی — دو مختلف آبادیاں اگر تعداد میں مساوی ہوں لیکن ایک میں معمر افراد کا تناسب دوسری آبادی سے زاید ہو تو ان دو آبادیوں کے مسائل جد ہوں گے۔

(2) جنس کے نقطہ نظر سے آبادی کی ہیئت ترکیبی — آبادی جنس کے اعتبار سے کس طرح تقسیم ہوتی ہے اہم ہے۔ ایک آبادی میں مردوں کا فی صد عورتوں کے مقابلے میں زیادہ ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس آبادی کی خصوصیات ایک ایسی آبادی کے مقابلہ میں جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے مختلف ہوں گی۔

(3) آبادی کی ہیئت ترکیبی کا شرح پیدائش شرح اموات اور بعض دیگر سماجی خصوصیات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً خاص قسم کے جرائم ایسی آبادی میں زاید ہوں گے جس میں کم عمر افراد کی تعداد زیادہ ہو۔ انحصاری تناسب (Dependency Ratio) کا بھی تعلق آبادی کی عمر اور جنسی ترکیب سے ہوگا۔

(4) اسی طرح نسلی اور مذہبی نقطہ نظر سے بھی آبادی کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ ممکن ہے۔

(5) ایک بہت ہی اہم نقطہ نظر جس سے آبادی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے وہ جائے سکونت ہے۔ یعنی آبادی کا کتنا تناسب شہری اور کتنا دیہی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس تناسب کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ صنعتی ترقی کے ساتھ ہی دیہی آبادی کا تناسب گھٹ جاتا ہے۔ دیہات میں عموماً شرح پیدائش شہر میں پائی جانے والی شرح پیدائش سے زاید ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ آبادی کی ہیئت ترکیبی کا اثر شرح پیدائش اور شرح اموات پر بہت اہم ہوتا ہے۔

شرح پیدائش کے بارے میں نظریات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) حیاتیاتی نظریہ شرح پیدائش۔ (2) معاشی نظریہ شرح پیدائش۔

حیاتیاتی نظریہ شرح پیدائش : کئی ایسے نظریات پیش کیے گئے ہیں جن کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ شرح پیدائش میں تبدیلی قوت پیدائش میں تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ آبادی کی گنجائش میں اضافے کے ساتھ قوت پیدائش گھٹ جاتی ہے۔ اس کی وجہ گنجانی میں اضافہ ہے۔ اسپنسر (Speneer) کا خیال تھا کہ دماغی محنت میں اضافے سے قوت پیدائش میں کمی واقع ہوتی ہے چنانچہ وہ سمجھتا تھا کہ تعلیم یافتہ عورتوں میں قوت تولید گھٹ جاتی ہے۔ ڈبل ڈے (Double Day) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ضروریات زندگی میں کمی سے قوت تولید میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے کہ فطرت بقا کے لیے ایسے حالات میں قوت تولید کو بڑھا دیتی ہے۔ حال میں کیسٹرو (Castro) نامی برازیل کے ماہر اغذیہ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جب کسی ملک میں معاشی ترقی ہوتی ہے تو غذا میں پروٹین کے تناسب میں اضافہ ہوتا ہے اور پروٹین میں اضافے سے قوت پیدائش میں کمی واقع ہوتی ہے۔

مالتھس کے نظریہ آبادی کو بعض ماہرین نیم حیاتیاتی اور نیم معاشی نظریہ شرح پیدائش تصور کرتے ہیں۔ آبادی کے نظریات میں مالتھس کے اس نظریے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مالتھس نے کہا کہ

(1) جب وسائل زندگی میں اضافہ ہوتا ہے تو آبادی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

(2) آبادی میں اضافے کی شرح وسائل زندگی میں اضافے کی شرح سے بہت تیز ہوتی ہے۔ مالتھس کا خیال تھا کہ آبادی میں اضافہ (Geometrical Progression) ہندسی شرح سے ہوتا ہے اور وسائل میں اضافہ حسابی شرح (Arithmetical Progression) سے ہوتا ہے۔ اس لیے آبادی ہمیشہ ضروریات زندگی کے اضافے سے آگے نکل جاتی ہے اور غربت اور افلاس بیماری اور ہلاکت انسان کے حصے میں آتے ہیں۔

(3) آبادی کے اس اضافے پر دو طرح کی تحدیدات عاید ہوتی ہیں جن سے آبادی ضروریات زندگی کی حدود میں رہتی ہے۔ (1) مثبت موانعات (Positive Checks) جس سے شرح اموات میں اضافہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہوتا ہے۔ ہر قسم کے وبائی امراض جنگ و جدل اور آفات سماوی اس میں شامل ہیں۔ (2) ایجابی موانعات (Preventive Checks) جن سے شرح پیدائش میں کمی ہوتی ہے۔ ان میں مالتھس دیر سے شادی تجرد اور اخلاقی ضبط کو استعمال کرتا ہے۔ ضبط تولید کا وہ کہیں ذکر نہیں کرتا۔

معاشی نظریہ شرح پیدائش — جدید نظریہ معاشی شرح پیدائش کو مختصراً اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ بچے تین وجوہات کی بنا پر مطلوب ہوتے ہیں :

(1)ان سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔

(2) بڑھاپے میں سہارا بنتے ہیں۔

(3) والدین کے مادری اور پدری جذبے کی تسکین کے لیے درکار ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ معیار زندگی میں اضافے کے ساتھ بچوں کی تعداد میں کیوں کمی ہوتی ہے۔ اس کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ معیار زندگی میں اضافے کے ساتھ والدین اپنے بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کے خواہاں ہوتے ہیں اور زاید بچے ہوں تو اس معیار پر ان کی پرورش نہیں کی جاسکتی۔ پھر معیار زندگی کے اضافے کے ساتھ ماں باپ کم وقت بچوں پر صرف کرسکتے ہیں۔ ان کی دوسری مصروفیات بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے معیار زندگی میں اضافے کے ساتھ والدین کم بچے چاہتے ہیں کیونکہ زاید بچے معیار زندگی میں کمی کا باعث ہوتے ہیں۔ اس نظریے کو ابتداً امریکا میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر بیکر (Baclaer) نے پیش کیا۔

موجودہ زمانہ میں ترقی یافتہ ممالک میں شرح پیدائش گوناگوں وجوہات کی بنا پر گھٹ گئی ہے ایک ہی سماج کے مختلف طبقات یا مختلف سماجوں میں یا پھر مختلف نسلی اور مذہبی گروہوں میں شرح پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان اختلافات کو ملک کے سماجی اور تمدنی حالات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مثلاً سماج میں عورتوں کے مقام پر بھی اس کا انحصار ہوتا ہے۔

شرح اموات — موجودہ دور میں غیر ترقی یافتہ ملک میں شرح پیدائش میں خاطر خواہ کمی نہیں ہوسکی ہے۔ لیکن ان ممالک میں ترقی یافتہ ممالک کی طرح شرح اموات میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ سائنس کی ترقی ہے اب ایسے طریقے معلوم کر لیے گئے ہیں اور ایسی ادویات ایجاد کی گئی ہیں جن کی وجہ سے مہلک وبائی امراض پر قابو پانا ممکن ہوگیا ہے۔ چیچک، پلیگ اور ہیضہ جیسے وبائی امراض جن سے ماضی میں آبادیوں میں زبردست کمی ہوتی رہی ہے۔ اور مختلف قسم کے بخار جیسے ملیریا دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک میں بھی ان میں کمی واقع ہوئی ہے۔ خالص پانی کی فراہمی ڈی ڈی ٹی کا چھڑکاؤ مختلف قسم کی ٹیکے اندازی سے جاہل اور غریب ممالک میں شرح اموات میں زبردست کمی واقع ہوئی ہے۔ مگر ان ممالک میں ضبط تولید کے طریقوں کو ابھی تک بڑے پیمانے پر قبول نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے شرح پیدائش اور شرح اموات میں زبردست تفاوت رونما ہوگیا ہے اور آبادی کے بڑھنے کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ ایسی صورت حال کو صحافتی زبان میں آبادی میں "دھماکہ خیز اضافہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ہجرت : آبادی میں تبدیلی نقل مقام سے بھی عمل میں آتی ہے۔ اس ہجرت کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بین قومی ہجرت اور اندرون ملک ہجرت۔ بین قومی ہجرت میں یا تو لوگ کسی ملک کے باہر جاتے ہیں یا پھر کسی ملک میں آتے ہیں۔ ایک ہی ملک میں لوگ ایک مقام یا علاقے سے دوسرے مقام یا علاقے میں منتقل ہوں تو اس کو اندرونی ہجرت یا نقل مقام کہا جائے گا۔

ہجرت کے محرکات مختلف ہوتے ہیں اور ان محرکات کی بناء پر بھی ہجرت کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

(1) دور قدیم کی ہجرت (Primitve Migration) — اس قسم کی ہجرت قدیم زمانہ میں انسان اپنے ماحول کی سختیوں سے بچنے کے لیے کیا کرتا تھا مثلاً موسموں کی سختی، پانی کی کمی، چراگاہوں کی تلاش اس کے محرک ہوا کرتے تھے۔

(2) جبری ہجرت — اس قسم کی ہجرت حکمت کی سختی سے بچنے کے لیے ہوتی ہے مثلاً یہودیوں کو ہٹلر کے جرمنی سے بڑی تعداد میں نکلنا پڑا تھا۔

(3) آزاد ہجرت — لوگ اپنی مرضی سے اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ترک وطن کرتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(4) اجتماعی ہجرت (Mass Migration) — جب ایک گروہ کے لوگ بڑی تعداد میں ہجرت کرنے لگتے ہیں تو دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور یہ ہجرت اجتماعی بن جاتی ہے۔

ہجرت کے نظریات: ہم یہاں مختصراً ہجرت کے نظریوں کا جائزہ لیں گے۔ ہجرت کے نظریوں میں رینسٹائن (Ranesteine) کا نظریہ بہت قدیم ہے جس نے کہا کہ ہجرت دریا کی طرح ہوتی ہے کہ خاص مقسام سے لوگ دوسرے مقام کو مسلسل جاتے رہتے ہیں جس طرح دریا بہتا ہے۔ رینسٹائن (Ranesteine) نے اپنا نظریہ قوانین ہجرت کی شکل میں پیش کیا۔ اسٹوفر (Stouffer) کا نظریہ سفر کے مواقع کا نظریہ (Theory of Travelling Opportunities) کہلاتا ہے۔ اس نے کہا کہ زیادہ لوگ کم فاصلے پر ہجرت کریں گے بہ نسبت طویل فاصلے کے۔ کیونکہ جتنا فاصلہ طویل ہوگا ان لوگوں کو ان مواقع کو چھوڑنا ہوگا جو راستے میں پڑے ہیں۔

بشر (Basher) نے اپنے نظریہ میں زیادہ زور خاندانی فیصلہ ہجرت کے طریقے پر دیا ہے۔ لوگ کس طرح یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ہجرت کریں گے؟ ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ عقلی بنیادوں پر ہجرت کے حسن و قبح پر کافی احتیاط کے ساتھ غور و خوض کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ وقتی جذبے اور فوری منفعت کے لیے بغیر کافی سوچ بچار کے ہجرت کا فیصلہ کرلیا جائے۔ یہ صورت جذباتی ہجرت کہلاتی ہے۔

لئی کا نظریہ ہجرت — لئی نے اپنا نظریہ ہجرت اس طرح پیش کیا کہ —

(1) جہاں سے ہجرت کی جاتی ہے اس مقام سے کچھ مثبت اور کچھ منفی عوامل وابستہ ہوتے ہے۔

(2) جس مقام کو ہجرت کی جاتی ہے اس کے ساتھ کچھ مثبت اور منفی عوامل وابستہ ہوتے ہیں۔

(3) ہجرت میں موانعات ہوتے ہیں۔

(4) شخصی عوامل — مثبت اور منفی عوامل شخصی عوامل کی روشنی میں دیکھے جاتے ہیں اور اس کے بعد ہجرت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ آبادیوں کے بڑے پیمانے پر منتقلی کے زبردست معاشی سماجی اور تمدنی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مہاجرین کے دوسرے سماجوں میں جذب ہونے کے بہت سی مشکل سماجی معاشی اور نفسیاتی مسائل ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں آبادی میں زبردست اضافے سے اس مسئلہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

انسانی آبادیوں میں تبدیلیوں کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اور آبادی کی تبدیلی کے اس عالمی رجحان کو ایک نظریہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اس نظریہ کو عبوری آبادی کا نظریہ (Theory of Demographic Transition) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو مختصراً اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔

(1) انسانی تاریخ کے ابتدائی دور میں شرح اموات بہت اونچی تھی۔ اور شرح پیدائش بھی بہت زیادہ تھی۔ اس دور میں انسانی آبادی کے بقا کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ ایسی سماجی اقدار پر زور دیا جائے جن سے شرح پیدائش اونچی رہے۔ مثلاً ایسی عورتوں کی سماج میں زیادہ وقعت ہو جن کے زیادہ بچے ہوں۔

(2) اس کے بعد کے دور میں انسانی معاشرے ترقی کرکے ایک ایسے دور میں داخل ہوئے جبکہ شرح اموات میں کمی ہوئی۔ غذا کی فراہمی میں دشواریاں ختم ہوتی گئیں۔ صفائی اور حفظان صحت کا علم اور انتظام بہتر ہوتا گیا۔ شرح اموات میں کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آبادی میں اضافے کی رفتار بہت تیز ہوجاتی ہے۔ یہ صورت حال آج غیر ترقی یافتہ ممالک میں پائی جاتی ہے۔

(3) جب آبادی تیزی سے بڑھتی ہے تو یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ اضافے آبادی سے معیار زندگی پر برا اثر مرتب ہوگا لوگ مختصر خاندان کو ترجیح دینے لگتے ہیں اور اس کے لیے ضبط تولید کو اپنایا جاتا ہے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر شرح اموات اور شرح پیدائش میں توازن پیدا ہوجاتا ہے اور آبادی میں تیزی سے اضافہ رک جاتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی اسی اصول کے مطابق آبادی میں اضافے کی رفتار گھٹ جائے گی۔ یہ نظریہ ترقی یافتہ ممالک کے تجربے کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

اب ہم علم آبادی میں استعمال ہونے والی چند اہم اصطلاحات کی تعریف اور مختصر تشریح پیش کرتے ہیں جن سے اس علم کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(1) خام شرح پیدائش — ایک سال میں ایک ہزار کی آبادی میں ہونے والی

زندہ ولادتیں خام شرح پیدائش کہلاتی ہے یہ ایک کارآمد طریقہ پیائش ہے۔ مگر اس میں بعض خامیاں پائی جاتی ہیں۔ دو ممالک کی شرح پیدائش میں تقابل کے لیے یہ ناموزوں ہے۔ آبادی کی عمر جنس اور ازدواج کے اختلافات اس طریقے میں نظر انداز ہوجاتے ہیں۔

(2) خام شرح اموات — ایک سال میں ایک ہزار کی آبادی میں جتنی اموات واقع ہوئی ہیں وہ خام شرح اموات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس میں بھی وہی نقائص پائے جاتے ہیں جو خام شرح پیدائش میں ہوتے ہیں۔

(3) فطری شرح اضافہ — خام شرح پیدائش — خام شرح اموات سے فطری شرح اضافے کا پتہ لگتا ہے۔ اسی کو فی صد شرح میں بیان کیا جاتا ہے۔ آبادی کے اضافے کی شرح — فطری شرح اضافے میں ہجرت کے ذریعہ تبدیلی آبادی کو شامل کرلیاجائے تو اس آبادی میں اضافے کی شرح معلوم ہوگی۔

متعین عمر کی شرح پیدائش

یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ایک ہزار عورتوں کو جو ایک خاص عمر کے گروپ سے تعلق رکھتی ہیں ایک سال میں کتنی زندہ اولادیں ہوتی ہیں۔ عموماً عمروں کی اس طرح درجہ بندی کی جاتی ہے۔ 15 سال سے 19 سال۔ 20 سال 24 سال۔ 25 سال سے 29 سال۔ 30 سال سے 34 سال۔ 35 سال سے 39 سال۔ 40 سے 44 سال اور 45 سال سے 49 سال۔ ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ ہر زمرے کی ایک ہزار عورتوں کو ایک سال میں کتنی اولادیں ہوتی ہیں۔ اس طریقے سے دو ممالک یا دو اوقات میں شرح پیدائش کا مقابلہ زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ خام شرح تولیدی (Gross Reproduction Ratio) ایک عورت اوسطاً کتنی لڑکیوں کو جنم دیتی ہے اس طریقے میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ کتنی عورتیں اپنی عمر کے اس دور میں جبکہ ان میں بچے جننے کی صلاحیت ہے فوت ہوں گی۔ اس شرح سے آیندہ کئی شرح پیدائش کا اندازہ ہوتا ہے۔

خام مجموعی شرح تولید (Gross Reproduction Rate) کی خالص شرح تولید (Net Reproduction Rate) کی طرح ہے مگر اس میں کتنی عورتیں اپنی عمر کے مختلف ادوار میں جبکہ ان میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے فوت ہوں گی اس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

شرح اموات اطفال — اس شرح میں ایک ہزار زندہ پیدا ہونے والے بچوں میں ایک سال میں صفر سے لے کر بارہ ماہ تک عمر کے کتنے بچے فوت ہوتے ہیں اس کا تخمینہ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک اہم شرح ہے۔

توقع حیات — ایک خاص عمر پر پہنچنے کے بعد آبادی کے ایک گروہ کی باقی اوسط زندگی کتنے سال ہوگی یہ اوسط توقع حیات کہلاتی ہے۔

انحصاری تناسب (Dependency Ratio) 14 سال یا اس سے کم عمر کے افراد اور 60 سال اور اس سے زاید عمر کے افراد کی جملہ تعداد کو 15 سال اور 64 سال کے درمیان کے عمر کے افراد کی جملہ تعداد سے تقسیم کرنے سے انحصاری تناسب (Dependency Ratio) حاصل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا اندازہ ہوتا ہے کہ آبادی میں کتنے لوگ پیداوار کام میں لگے ہوئے ہیں اور کتنے پیداوار کام کے قابل نہیں ہیں اس کو اس طرح بھی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

14 سال یا اس سے کم عمر کے افراد کی جملہ تعداد 65 سال اور اس سے زاید عمر کے افراد کی جملہ تعداد 15 سال سے لے کر 64 سال تک کی عمر کے افراد کی جملہ تعداد۔

علم سیاسیات (Political Science) : علم سیاسیات وہ علمی مضمون ہے جس میں حکومت اور ریاست کا سائنسی اور معروضی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ برطانیہ اور دولت مشترکہ کے بعض ملکوں کے علمی اداروں میں سیاسیات کے کسی علم (سائنس) کے وجود کا سرے سے انکار کیا گیا ہے چنانچہ وہاں اس مضمون کو سیاسی مطالعات یا محض سیاسیات (پالیٹکس) کہا جاتا ہے۔ امریکا میں سیاسیات کے سائنسی مطالعہ میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی اور وہاں کے ماہرین سیاست نے اپنے مضمون کو روایتی مضمون اور اس کے مشتملات سے ممیز کرنے کے لیے "جدید سیاسی تحلیل" (Modern Political Analysis) کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ براعظم یورپ کے ممالک میں علم سیاسیات کوئی ایک جامع علمی مضمون نہیں چنانچہ وہاں "علوم سیاسی" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور اس کے تحت حکومت وانتظام، قانون، دساتیر، عدالتی نظام وغیرہ کا علاحدہ علاحدہ مطالعہ کیا جاتاہے۔

روایتی یا ادارتی نقطہ نظر سے علم سیاسیات کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ یہ "مملکت کا علم ہے" یا "سماجی علوم کی وہ شاخ ہے جو مملکت کے نظریہ، تنظیم، حکومت اور سیاست سے بحث کرتی ہے"۔ لیکن آج کے سلوکی یا سائنسی نقطہ نظر سے یہ علم مملکت (جو ایک سیاسی ادارہ ہے) کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بجائے "سیاسی نظام" یا "سیاسی عمل" سے بحث کرتا ہے۔ چنانچہ جدید ماہرین سیاست مجرد تصورات یا رسمی ڈھانچوں کے بجائے مملکت کے اداروں کے اندر کام کرنے والی واقعی سیاسی اور سماجی طاقتوں اور افراد اور گروہوں کے سیاسی برتاؤ یا عمل کا تجزیہ کرتے اور اس طرح کسی سیاسی نظام کے اجزائے ترکیبی، اس کے سیاسی کلچر، اس کی کارکردگی اور اس کی ترقی اور استحکام کے مسائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

موجودہ علم سیاسیات (جسے فطری علوم کے معنی میں "علم یا سائنس" نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ نہ کوئی جامع ثبوتی نظریہ پیش کرسکا ہے نہ کرسکے گا) کی ترقی اور اس کے تنوع کا سہرا بلاشبہ امریکی ماہرین سیاسیات کے سر باندھا جانا چاہیے جنھوں نے فطری اور سماجی علوم خصوصاً سماجیات (سوشیالوجی) کے زیر اثر سماج کے سیاسی پہلو کے معروضی اور تجربی مطالعہ کا بیڑا اٹھایا اور اس مضمون کو نئے مواد، نئے اسالیب، نے مناہج اور نئے تصورات سے مالا مال کیا۔ امریکی علم سیاسیات میں سلوکی انقلاب یا تحریک یا رویہ کے نتیجہ میں علم سیاسیات اور سماجیات کے درمیان حد فاصل مسلسل سمٹتی گئی ہے۔ وہاں کا ماہر سیاسیات بخوبی ماہر سماجیات کہلانے کا بھی مستحق ہے۔

علم سیاسیات کی ابتداء اس کی ماہیت، اس کی حدود اور اس کے طریقوں کے بارے میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا رہا، پایا جاتا ہے اور پایا جاتا رہے گا۔ اگر موجودہ زمانے میں مختلف مدرسوں کے ماہرین سیاسیات کسی بات پر متفق ہیں تو وہ ہے اس مضمون کی انتشار کی کیفیت اور اس کا اندازہ یونیسکو کی 1950 میں شائع شدہ رپورٹ "معاصر علم سیاسیات" (Contemporary Political Science) امریکن پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی 1951 میں شائع کردہ رپورٹ "علم سیاسیات کے اہداف" (Goals for Political Science) لے۔ سومٹ اور جے ٹانن ہوس کی کتاب "امریکی علم سیاسیات: ایک علمی مضمون کا سوانحی خاکہ" (A.Somit and J. Tannen Haus; American political science; A Profile of a Discipline (1964) اور ان ہی مصنفوں کی "امریکی علم سیاسیات کی ترقی" (The Development of American Political Science (1967) سے ہوسکتا ہے۔

علم سیاسیات کی ابتدا کو خواہ افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے فرض کیا جائے یا نشاۃ ثانیہ کے فرزند اور تجربیت کے پیش رو نکولائی میکیاویلی سے وابستہ کیا جائے یا انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی یونیورسٹیوں میں اس مضمون کے آزادانہ شعبہ جات کے قیام سے اور خواہ 1925 میں چارلس میریم کی "سیاسیات کے جدید پہلو" (Charles E. Merriam; New Aspects of Politics) کی اشاعت سے، یہ محض ذاتی ذوق کا معاملہ ہے۔ مشتملات کے لحاظ سے یہ مضمون بہرحال اپنا ایک ممتاز اور جداگانہ وجود رکھتا ہے کیونکہ اس کا مقصد انسانی زندگی کے سیاسی پہلو کا عمیق تجزیہ کرنا اور تعمیمات پیش کرنا ہے۔ فرق محض منہاج اور طرز فکر کا ہے۔

علم سیاسیات کے ذیلی مضامین اپنے تاریخی ارتقاء کے اعتبار سے پانچ ادوار یا مراحل سے گزرے ہیں: فلسفیانہ دور، قانون پسندی کا دور، حقیقت پسندی کا دور، سلوکیت اور عقلیت کا دور۔

(1) سیاسی فلسفہ کا دور قدیم یونان (300 ـ 500 قبل مسیح) سے شروع ہو کر کم و بیش انیسویں صدی تک رہا۔ اس میں اخلاقیات کو زیادہ دخل رہا۔

(2) رسمی اور قانونی طرز فکر کو انیسویں صدی میں فروغ ہوا۔ اس مدرسہ فکر کے قائدوں میں جے. ڈبلیو. برگس (J.W. Burgess)، جریمی بنتھم (Jeremy Bentham)، جان آسٹن (John Austin)، ڈبلیو. ڈبلیو. ولوبی (W.W.Willoughby)، ریمنڈ گیٹیل (Raymond G. Gettel) اور جے. ڈبلیو. گارنر (J.W. Garner) تھے۔ اس طریقہ کو بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک عروج حاصل رہا۔ اس کے مطابق مدرسین اور محققین مملکت کے خالی خولی ڈھانچوں کی تنظیم اور رسمی قانونی نظام اور قانونی روابط کا مطالعہ کرتے رہے۔

(3) حقیقت پسندی کا دور بے ثمر قانونیت کے ردعمل کے طور پر شروع ہوا اور اس کا بیسویں صدی کی تیسویں اور چالیسویں دہائی میں غلبہ رہا۔ اس کے علمبرداروں میں والٹر بیج ہاٹ (Walter Bagehot)، ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson)، جیمس برائس (James Bryce)، چارلس بیرڈ (Charles E. Beard)، آرتھر بنٹلی (Arthur F. Bentley) اور ڈیوڈ ٹرومین (David Truman) ہیں۔ ان محققوں نے اپنے مطالعات میں نہ صرف مملکت کے اداروں بلکہ ان کے پس پشت کام کرنے والی سماجی طاقتوں اور عوامل کا بھی پوری توجہ سے مطالعہ کیا۔ نفسیات اور سماجی جبر کی اہمیت تسلیم کی اور اس طرح علم سیاسیات میں تجربیت، معروضیت اور علمیت کے

لیے راستہ ہموار کیا۔

(4) سلوکی طرز فکر دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر امریکا میں پروان چڑھا۔ "سلوکیت" (Behaviouralism) کی تعریف یا ماہیئت کے بارے میں بڑا اختلاف رائے پایا گیا ہے۔ یہ انقلاب یا تحریک یا رویہ گذشتہ مرحلوں کی طرز فکر (جسے اجتماعی طور سے "کلاسیکی طرز فکر" کہا جاتا ہے) کا رد عمل تھا۔ اس مرحلہ میں مجرد فلسفیانہ افکار کے ورد کو سیاسی ڈھانچوں کے مطالعہ اور قانونیت کو رد کر کے سیاسی عمل، کوائف اور عوامل کا سائنسی طریقہ یا کمیتی اور پیمائشی معیاروں سے تجزیہ کر کے ثبوتی تصورات اور ثبوتی نظریات پیش کرنے اور اس طرح سیاسیات کی "سائنس" کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔ اس مدرسہ فکر نے حکومتی ڈھانچوں کے بجائے سیاسی نظام اور سیاسی عمل پر، خالی اداروں کے بجائے ان اداروں کے ذریعہ کام کرنے والی سماجی، معاشی اور سیاسی طاقتوں پر زور دیا۔ اس کی انتہا سیاسی نظام اور سیاسی کلچر کی بقا اور ترقی ہے۔

امریکی علم سیاسیات میں سلوکی انقلاب بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے اواخر تک جاری رہا جبکہ اس کی وحشیانہ تجربیت کے خلاف ردّعمل رونما ہوا۔ اس ردّعمل کو ڈیوڈ ایسٹن نے "بعد سلوکی انقلاب" (Post-Behavioural Revolution) سے موسوم کیا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے منہاجیات اور تکنیک پر تمام تر زور دینے کی مذمت کی اور سیاسی تحقیق اور مطالعہ میں اصل مواد اور سماج کے واقعی مسائل اور ان کو حل کرنے اور مناسب پالیسیاں وضع کرنے کے لیے صحیح اور بروقت معلومات فراہم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اس تحریک کے عروج کے زمانہ میں ٹیلکاٹ پارسنس (Talcott Parsons) کے سماجیاتی نظریوں کے زیر اثر گیبریل ایلمنڈ (Gabriel A. Almond) ڈیویڈ ایسٹن (David Easton) اور شکاگو اسکول کے ان کے دوسرے ساتھیوں نے "سیاسی نظام"، "سیاسی کلچر"، "سیاسی شعور پذیری"، "سیاسی اقدار" اور "سیاسی اشتراک" وغیرہ کے نظریے وضع کیے جن کی مقبولیت امریکا سے باہر بھی پھیلی اور وسیع پیمانہ پر ساختیاتی، عملیتی نطاق فکر (Structural Functional Framework) کے اندر ان نظریات کا اطلاق کیا گیا۔

ان چاروں مراحل سے گزر کر اب سیاسیات کا مضمون اجتماعیات سے منہ موڑ کر اقتصادیات کا اثر قبول کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پارسنس کے اس نظریہ کو کہ انسان عقلیت سے نہیں بلکہ اپنے سماج کے معیاروں اور اقدار کے زیر اثر کام کرتا ہے، رد کر کے انسان کے عقلیت پسند ہونے کے تصور کو اختیار کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ پرانے علم اقتصادیات میں "اقتصادی انسان" کا تصور اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو ہر حالت میں عقلی طور سے اپنے فائدہ کو وسیع اور اپنے ذاتی مفاد کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ اس عقلیتی (Rationalistic) طرز فکر (گیم تھیوری اس کی ایک پیداوار ہے) کے نتیجہ میں حالیہ برسوں میں رائے دہی، اجتماعی اقدام، اجتماعیت پسند، تنازع، رائے دہی کے نظام کے اثرات، معاہدات وغیرہ کے بارے میں عقلیتی نظریے پیش کیے گئے ہیں۔ اس مدرسے کے ممتاز ماہرین میں طامس شیلنگ (Thomas Schelling)، کینتھ بولڈنگ (Kenneth Boulding)، رابرٹ ایکسلراڈ (Robert Axelrad)، ولیم رائکر (William Riker)، رچرڈ اسٹائڈر (Richard Stider)، چارلس لنڈ بلام (Charles Lind Blom) شامل ہیں۔

علم سیاسیات کے مناہج اور اس کے ارتقاء کے مراحل کے اس مختصر جائزہ سے واضح ہوتا ہے کہ فی الوقت اس میدان کی امتیازی خصوصیت کثیرالموضوعاتی (Multi-Disciplinism) اور تنوع پسندی (Eclecticism) ہے۔ انسان کی سیاسی زندگی کو سمجھنے کے لیے مختلف و متعدد طرز ہائے فکر، مناہج واسالیب اور نظریات اپنی اپنی جگہ اپنا حصہ ادا کرتے رہیں گے۔

جہاں تک علم سیاسیات کے ذیلی مضامین کا تعلق ہے نہ تو ان کی تعداد متعین کی جاسکتی ہے نہ ہی فرداً فرداً ان کے ارتقاء کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ ہر ذیلی مضمون کی ذیلی شاخوں میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ان میں چند نمایاں ذیلی مضامین یہ ہیں۔

(1) سیاسی فلسفہ، (2) سیاسی افکار کی تاریخ، (3) جدید سیاسی نظریہ، (4) سیاسی برتاؤ (سیاسی جماعتوں، رائے عامہ، فشاری گروہوں، انتظامی عمل، تشریعی عمل اور عدالتی عمل وغیرہ کا مطالعہ)، (5) قانون عامہ (دستوری قانون اور انتظامی قانون کا مطالعہ)، (6) نظم ونسق عامہ (پبلک ایڈمنسٹریشن) اور اس کی شاخیں، (7) قومی، علاقائی اور مقامی حکومت، (8) تقابلی سیاسیات (مغربی، کمیونسٹ اور ترقی پذیر سیاسی نظاموں کا مطالعہ، مقابلہ اور نظریہ سازی)، (9) سیاسی سماجیات (پولیٹیکل سوشیالوجی) اور (10) بین الاقوامی تعلقات (اور اس کی شاخیں : بین الاقوامی سیاست، خارجہ پالیسی، ڈپلومیسی، بین الاقوامی قانون، بین الاقوامی تنظیم، بین الاقوامی انتظام وغیرہ)۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

علم کے سماجی عوامل (Sociology of Knowledge):

علم کی سماجی حدبندی کا تجزیہ کرنے میں، ماہر سماجیات نے علم کو وسیع معنوں میں لیا ہے۔ اس کے دائرے میں وہ تمام چیزیں آتی ہیں جو انسانی کلچر کی پیداوار ہیں مثلاً خیالات، نظریات، عقائد، فلسفہ، سائنس، ٹکنالوجی۔ مگر علم کا کوئی بھی تصور ہو، سماجیات کی اس شاخ کا بنیادی رجحان ایک جیسا ہی رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم اور دیگر سماجی اور ثقافتی عوامل کا آپسی تال میل ہمیشہ رہتا ہے۔ سماجیات کی اس روایت کی ابتدا دراصل Bacon کے اس قول میں ڈھونڈی جاسکتی ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی سمجھ کوئی سادہ سوکھی روشنی نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی ارادوں اور ذہنی کیفیات کی آمیزش ہوتی ہے۔ اسی بات کو Nietzsche نے اپنے مختلف مقولوں میں کچھ یوں کہا کہ انسانی ضرورتیں اس کے تصور پر اثرانداز ہوتی ہیں اور اس پر بھی کہ وہ دنیا کو کیسے دیکھتا ہے۔ انسانی اقدار، مشاہدات کو اپنا رنگ دیتے ہیں۔

علم کو سماجی تناظر میں دیکھنے کی روایت جرمنی اور فرانس میں شروع ہوتی ہے۔ خصوصاً بیسویں صدی کے شروع دور میں۔ اس رجحان کے ابھرنے میں ایک خاص قسم کا پیچیدہ سماجی اور ثقافتی پس منظر سامنے آتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں مختلف انسانی گروہوں کے درمیان نظریاتی اختلافات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ سماجی بقاء کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ یہ جھڑپ اتنی شدید ہوجاتی ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے فکری رجحانات کو ہر اعتبار سے غلط اور بے بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس ماحول میں آپسی بے اعتباری اور تصادم ایک عام بات ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس ماحول میں سماجیات آف نالج (Sociology of Knowledge) نے علمی اور نظریاتی اختلافات کو سمجھنے کے لیے کچھ نئے سوالات اٹھائے اور اس اختلافی ماحول کو ایک نئے پیرائے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مثلاً کوئی نظریہ اپنی موجودہ شکل میں کیسے قائم رہتا ہے، اس سوال کا جواب نفسیاتی، معاشی، سماجی یا نسلی ماٰخذ میں تلاش کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب کسی بات کو بے بنیاد قرار دیا جائے یا کسی عقیدے کو جھوٹا ثابت کیا جائے تو سماجیات آف نالج کے تجزیہ کے مطابق، نظریہ کو صحیح یا غلط ثابت نہیں کیا جائے گا بلکہ اس سماجی بنیاد کو دریافت کیا جائے گا جس پر اس نظریہ نے اپنی عمارت تعمیر کی ہے۔ اسی طرح مختلف اقوال اور بیانات کے حق میں مختلف ثبوت اتنے اہم نہیں ہوں گے جتنے کہ وہ خاص اغراض جن کا تعلق انسانی نفسیات، لاشعوری ارادے، سماجی منصب اور تناظر کی پیچیدگیوں میں ہوتا ہے۔

سماجیات کی اس روایت نے مختلف صورتیں اختیار کیں مگر ان سب میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ اس تجزیہ میں بیانات، عقائد اور خیالات کی ظاہری شکل کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے ان کے اصل پس منظر کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اصل معنی تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ گویا کہ کہی ہوئی اور سوچی ہوئی باتوں کے ظاہر اور باطن میں فرق مانا جاتا ہے۔ یہاں باطن سے مراد بولنے والے کا سماج اور اس کی زندگی کا دائرہ ہے۔ انسانی فکر میں Sociology of Knowledge کا مقام ایک انقلابی روایت سے کم نہیں ہے۔ انسانی فکر میں پہلی بار اس بات کی جانب نشاندہی کی گئی کہ خیالات کے سچ یا جھوٹ کی تلاش سماجی اور تاریخی سوتوں میں کی جانی چاہیے۔ سماجیات کی اس روایت کو سب سے زیادہ فروغ Karl Marx اور Frederick Engels کے خیالات سے حاصل ہوا۔ خصوصاً ان کا وہ قول کہ پیداواری رشتوں کی بنیاد پر خیالات کا ڈھانچہ تعمیر ہوتا ہے اور یہ کہ شعور زندگی سے ہے نہ کہ زندگی شعور سے۔ اپنے تفصیلی جائزے میں انھوں نے بتایا کہ مادّی زندگی میں پیداواری نظام اس بات کا تعین کرتا ہے کہ انسانی زندگی میں سماجی، سیاسی اور علمی شعبوں کا کردار کیا ہوگا۔ خصوصی طور پر یہاں مارکس خیالات کو سماجی کلاس کے ڈھانچے میں باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گرچہ اس بیان میں اس بات کی بھی وضاحت ہے کہ کلاس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ صرف یہ کہ حقیقی زندگی میں ان کی بنیادی حیثیت نہیں ہوتی۔

اسی روایت کی توسیع کرتے ہوئے Karl Mannheim نے اپنی مشہور کتاب Ideology and Utopia میں یہ بتایا کہ فرد کے شعور میں کلاس سے زیادہ گروپ کی اہمیت ہوتی ہے۔ Mannheim کے بقول کٹر مارکسی نظریہ نے کلاس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ فرد کی اس پیچیدہ تصویر میں Mannheim گروپ کے تعلق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر کسی گروپ کے افراد میں آپسی بندھاؤ ہے تو وہ تاریخ کو ایک مسلسل تحریک کی شکل میں دیکھیں گے جس کے ارتقاء میں کچھ خاص نصب العین کا حصول مضمر ہوگا۔ اس کے برعکس وہ گروپ جو سماجی طور پر منتشر ہے اور آپس میں مضبوط رشتوں سے بندھا ہوا نہیں ہے، اس گروپ کے افراد سماجی اور تاریخی تبدیلی کو حادثات اور لاشعوری عوامل سے تعبیر کریں گے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سماجیات کی تاریخ میں علمی شعور اور سماجی عوامل کے آپسی رشتے کا تجزیہ ایک دلچسپ شکل میں فرانسیسی سوشیولوجسٹ ایمائل ڈرکھائم کی تصنیف میں ملتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی شعور کی اندرونی ساخت کی تشکیل خود سماج کے مخصوص ڈھانچے میں ہوتی ہے۔ یہ بات کہنے کے لیے اس کے سامنے تین مشاہدات تھے۔ نمبر ایک تو یہ کہ مختلف علاقوں کی بنیادی سوچ اور منطق کے اصولوں کے فرق کا تہذیبی پہلو یہ ثابت کرتا ہے کہ اس فرق کا انحصار تاریخی اور سماجی عوامل کے سبب ہے۔ ڈرکھائم کا دوسرا مشاہدہ یہ تھا کہ بنیادی سوچ اُس زبان کی گرفت میں ہوتی ہے جسے فرد سماج میں حاصل کرتا ہے (اس مثال میں عوام اور دانشور کی سوچ یکساں دیکھا گیا ہے)۔ یہ بات اس وجہ سے بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ کیونکہ سوچ کے حوالے میں وہ تمام چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں جو اکثر اوقات افراد کے تجربوں کا حصہ نہیں ہوتیں۔ جس کا واضح طور پر یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس سوچ کو موجودہ افراد سے پہلے اجتماعی زندگی نے ماضی میں تصنیف کیا ہوگا۔ تیسرے مشاہدے کا تعلق اس بات سے ہے کہ کسی ایک خیال کو قبول یا مسترد کرنے کے پیچھے صرف یہ بات شامل حال نہیں ہوتی کہ فرد کے لیے یہ خیال سچ ہے یا نہیں۔ بلکہ اس کا انحصار اس پر بھی ہے کہ دوسرے عقائد کے ساتھ یہ بات کس حد تک ہم آہنگ ہے۔

علم کے سماجی عوامل کی تحقیق کرنے والی سماجیات اس میدان کی جانب توجہ دلاتی ہے جس میں یونیورسٹیوں سے متعلق دانشور مختلف وجوہات کی بنا پر الگ الگ علمی خاکے بناتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے کہ علم کی پیروکار سماج کے مختلف حلقوں اور گروہوں سے کیوں بیگانہ ہوجاتے ہیں یا یہ لوگ ان تحقیقات سے کیوں گریز کرتے ہیں جس کے انکشافات سے سیاسی یا سماجی اتھل پتھل ہونے کا اندیشہ ہو یا سماجی ساخت کو ایک نئی شکل ملنے کا امکان پیدا ہو۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ علمی کارکنان کبھی کبھی علمی بحثوں کے تکنیکی نکتوں میں کیوں الجھ جاتے ہیں اور کیوں سماجی اور ثقافتی تجربوں سے گریز کرتے ہیں۔ خصوصاً وہ تجربے جو عام طور سے تسلیم کیے گئے نصب العین سے توجہ ہٹا دیں۔ شاید یہ نئی وضع کی ریسرچ ہمیں یہ بھی بتائے کہ دانشور ریسرچ کے نظام کے انتظامی ہتھکنڈوں میں کیوں الجھ جاتا ہے اور اصل مسائل سے متعلق تحقیق ایک Formality پوری کرنے کا خاکہ ہوکر رہ جاتی ہے۔

Sociology of Knowledge کی تحقیق ہمیں یہ بتائے گی کہ Intellectual کا رول سماجی تبدیلی سے کیونکر تبدیل ہوجاتا ہے اور سماجی ڈھانچے کی تبدیلی کا اثر اس کے کام پر کس طرح اور کیونکر پڑتا ہے۔

انسانی گروپ کی مختلف شکلیں مثلاً ایک ہی منصب، پیشے، مذہبی فرقہ یا نسل ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہر گروپ کی ایک خصوصی فکر کی جڑیں اس کے وجود کی گہرائی سے جاکر ملتی ہیں۔ فکر اور زندگی کا تعلق فقط عام آدمی سے متعلق ہی نہیں بلکہ اس کا اطلاق دانشور اور دانشوروں کے گروہ پر بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کیا انسانی فکر و عمل کی جڑیں انسان کی پیدائشی ساخت میں ہوتی ہیں یا اس پر ماحول اثر انداز ہوتا ہے ان دو باتوں کے ماننے والے دانشوروں کو دو سیاسی گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات دیکھنے میں یہ آئی کہ قدرتی ساخت کو بنیاد ٹھہرانے والے دانشور سیاسی طور پر دقیانوسی تھے اور ماحول کو بنیاد ٹھہرانے والے انقلابی یا جمہوری نظام کے پیروکار تھے۔ علم کے سماجی عوامل کی سماجیات نے سائنس کی تاریخ نگاری کو ایک نیا موڑ اس لیے دیا کیونکر عام طور سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فکری رجحانات کے ارتقاء میں موضوع اور دلیل کی منطق کارفرما ہوتی ہے اور اس کا بظاہر کوئی تعلق زندگی کی سماجی اور ثقافتی ساخت سے نہیں ہے۔

علمی آزادی (Academic Freedom): آج کے دور میں علمی آزادی کا ہر ملک میں چرچا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ دانشوروں کو تحقیقات کرنے، تعلیم دینے اور اپنے خیالات کی اشاعت کی پوری آزادی ہو۔ یہ حق اکثر ملکوں میں آئین کے ذریعہ دے دیا گیا ہے۔ جہاں یہ آزادی نہیں ہے اس کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ اس لیے کہ کوئی محقق اپنی تحقیقات میں سچائی تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس سے متعلقہ تمام مواد تک اس کی رسائی نہ ہو۔ اس کے ساتھ محققین پر بھی یہ ذمہ داری آتی ہے کہ وہ اپنی تحقیق میں پوری غیر جانب داری اور سچائی کا رویہ اختیار کریں۔ شخصی مصالح اور جذبات کو آڑے نہ آنے دیں۔

علم کی آزادی کی تحریک عہدِ نشاۃ ثانیہ میں یورپ میں اٹھی۔ اس دور میں آزادی کے مختلف پہلوؤں پر جدوجہد چل رہی تھی اور یہ بھی اس کا ایک حصہ تھی۔ ان میں تھامس ہابس، جان لاک اور والٹیر جیسے اہل علم اور دانشور پیش پیش تھے۔ جرمنی میں فریڈرک اعظم کے دور میں

جامعات کے اندر اس قسم کی آزادی کو پہلی مرتبہ تسلیم کیا گیا۔ انگلستان میں اس مہم میں جرمی بینتھم، ریکارڈو، ہربرٹ اسپنسر، ڈارون اور تھامس ہکسلے آگے آگے تھے۔ 1928ء میں انگلستان میں پہلی یونیورسٹی قائم ہوئی جو ہر قسم کے مذہبی تسلط سے آزاد تھی۔ اس کے بعد یورپ اور امریکا میں آہستہ آہستہ محض علمی ادارے قائم ہونے لگے جو ہر قسم کے مذہبی اثر سے آزاد تھے اور جن میں علوم کا مطالعہ نہایت غیر جانب دارانہ طور پر کیا جاتا تھا۔

عماد : لفظی معنی ستون اور کھمبے کے ہیں مجازاً بلند و بالا عمارتوں کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں عاد ارم کو ذات العمائد اسی حیثیت سے کہا گیا ہے کہ وہ شاندار اور بلند ترین عمارتوں والے تھے۔ اصطلاحاً اس سے دین اسلام کے یہ پانچ بنیادی ارکان مراد ہوتے ہیں۔

اللہ کے رسول کی شہادت، یعنی زبان سے یہ اقرار کرنا اور دل سے ماننا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد عربی ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

نماز : روزانہ پنج وقتہ نمازیں ادا کرنا۔

زکوٰۃ : صاحب استطاعت مسلمانوں کے پاس اگر بقدر نصاب مال ہو تو سال گزرنے کے بعد ان کو زکوٰۃ دینا۔

روزہ : ہر سال رمضان کے مہینے بھر روزہ رکھنا۔

حج : عمر میں ایک دفعہ اگر وسعت ہو تو خانہ کعبہ کی زیارت کرنا اور مناسک حج ادا کرنا ان چیزوں کو عماد اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی حیثیت دین کے ستون کی ہے اور ان ہی پر اسلام کی عمارت قایم ہے اگر یہ بنیادیں منہدم ہو گئیں تو دین بھی منہدم ہو جائے گا اور اس کی عمارت قایم نہیں رہے گی۔ آنحضرت ﷺ نے نماز کے بارے میں فرمایا۔ **الصلوتعماد الدین من اقامھا اقام الدین و عن ھد مھا ھدم الدین** (نماز دین کی بنیاد اور ستون ہے جس نے اس کو قایم کیا اس نے دین کو قایم کیا اور جس نے اس کو ڈھایا اس نے دین کو ڈھایا)

عمداً ضرب پہنچانا (Voluntarily Causing Hurt): ضرب پہنچانا اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ کسی شخص کے جسم میں درد یا مرض یا ضعف پیدا کردیا جائے۔ محض ضرب پہنچانا کوئی جرم نہیں ہے۔ اگر کسی اتفاقی فعل سے کسی کو ضرب پہنچے تو وہ جرم میں داخل نہیں ہے۔ ضرب پہنچانے میں اگر نیت مجرمانہ ہو تو کہا جائے گا کہ عمداً ضرب پہنچائی گئی۔ کسی شخص کے جسم میں درد یا مرض یا ضعف پیدا کرنے میں نیت مجرمانہ کا شامل ہونا لازمی ہے۔

جس فعل میں ضرب پہنچانے کی نیت موجود نہ ہو اور جس فعل سے ضرب پہنچانے کا احتمال نہ ہو اور اس کا احتمال کا علم ملزم کو نہ ہو تو ایسا فعل عمداً ضرب پہنچانے کی تعریف میں نہیں آتا۔

عمداً ضرب شدید پہنچانا (Voluntarily Causing Grievous Hurt) : یہ جرم عمداً ضرب پہنچانے کی سنگین شکل ہے۔ اس میں ضرب کی مختلف سنگینی و شدید صورتیں شامل ہیں۔

ضرب شدید کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(1) ضرب کی وہ قسم جس میں مرد کی مردی کی طاقت زائل ہو جائے۔ یہ قصد جسم کو خارجی طور پر چوٹ پہنچا کر یا دوا کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(2) ضرب لگا کر قوت بصارت یا قوت سماعت ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا۔

(3) کسی عضو یا جوڑ کو ہمیشہ کے لیے بیکار کر دینا۔ ملزم کے ضرب سے کسی عضو یا بدن کے جوڑ کا ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جانا۔

(4) سر یا چہرے کا ہمیشہ کے لیے بدصورت ہو جانا۔

بدصورت کرنا اس وقت کہا جائے گا جب کوئی بیرونی معنرت پہنچائی جائے مثلاً ناک یا کان کاٹ ڈالنا یا بدشکل کر دینا۔

(5) کسی ہڈی یا دانت کا توڑ ڈالنا، اکھاڑ ڈالنا یا اس کا مقام تبدیل کر دینا۔

(6) کوئی ضرب جس سے جان خطرہ میں پڑ جائے یا بیس دن تک وہ شخص سخت جسمانی درد میں مبتلا رہے۔

اگر کسی شخص کو اس قدر سخت ضرب پہنچے کہ اس کو ہسپتال میں جانے کی ضرورت پیش آئے لیکن بیسویں دن وہ کافی صحت پانے کے بعد ہسپتال سے واپس ہو جائے تو بیسواں دن شمار نہیں ہو سکتا اور اس لیے یہ ضرب شدید قرار نہیں دی جائے گی۔

ایک عورت کو ایسی ضرب پہنچائی گئی کہ وہ سترہ دن تک ہسپتال میں رہی منجملہ ان کے تین دن تک اس کی حالت خطرناک رہی تو ملزم

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ضرب شدید پہنچانے کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

کسی شخص کا بیس دن تک محض ہسپتال میں رہنا کافی نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ وہ بیس دن تک سخت درد جسمانی میں مبتلا تھا اور وہ اپنے معمولی کاروبار بھی کرنے سے قاصر رہا۔

جب ملزم کی نیت ہلاکت کی نہ ہو اور نہ اس کو اس امر کا علم ہو کہ اس ضرب سے ہلاکت کا احتمال ہے لیکن ضرب سے ہلاکت واقع ہوجائے تو اس صورت میں وہ محض ضرب یا ضرب شدید کا جیسی صورت ہو، ملزم قرار دیا جائے گا نہ کہ جرم قتل انسانی مستلزم سزا کا۔

مثلاً ایک شخص چارپائی میں لیٹا ہوا تھا ملزم نے اس کو چارپائی پر سے کھینچ کر ایک لکڑی سے مارا۔ اس کا طحال (Spleen) بڑھا ہوا تھا جس کے باعث وہ فوراً ہلاک ہوگیا۔ یہاں ملزم ضرب شدید پہنچانے کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

محض ضرب شدید پہنچانا جرم نہیں ہے جب تک ملزم کی نیت ضرب شدید پہنچانے کی نہ ہو یا اس کے فعل سے ضرب شدید پہنچانے کا احتمال نہ ہو۔ اگر اتفاق سے ملزم کے فعل سے کسی کو ضرب شدید پہنچا ہو تو وہ جرم میں داخل نہیں ہے ایسے فعل کو فعل الٰہی کہا جاسکتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں عمداً ضرب شدید پہنچانے کے جرم کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔

کوئی شخص جو اس نیت سے کوئی فعل کرے کہ اس کے ذریعہ سے کسی شخص کو کسی قسم کا ضرب شدید پہنچا ہے یا اس علم سے کہ اس کا احتمال ہے کہ اس فعل کے ذریعہ سے وہ کسی شخص کو کسی قسم کا ضرب شدید پہنچائے گا اور اس کے ذریعہ سے وہ کسی شخص کو کسی قسم کا ضرب شدید پہنچائے تو کہا جائے گا کہ اس نے عمداً شدید ضرب پہنچایا ہے اور وہ اس جرم کا مرتکب ہوگا۔

اس تعریف میں ضرب شدید پہنچانے کی نیت یا اس کے پہنچنے کے احتمال کا علم کے الفاظ نہایت اہم ہیں۔ کسی جرم کی تعریف میں یہ الفاظ مستعمل ہوں تو کہا جائے گا کہ وہ فعل "قصداً و عمداً" کیا گیا۔

فعل کی نوعیت سے نیت مجرمانہ کا قیاس ہوسکے گا۔ جب ملزم کوئی ایسا فعل کرے جس سے وہ جانتا ہو کہ ضرب شدید پہنچ سکتا ہے تو اس کے متعلق یہ قیاس کیا جاسکے گا کہ اس کی نیت ضرب شدید پہنچانے کی تھی یا کم از کم اس کو علم تھا کہ ضرب شدید پہنچنے کا احتمال ہے ایسا قیاس اس صورت میں اور بھی زیادہ آسانی سے کیا جاسکے گا جب ملزم اور شخص مضروب میں سابقہ عداوت ہو۔

عمل بالارکان: ارکان دین کے اجزا اور اس کے پانچ بنیادی ارکان مراد ہیں ان پر عمل کرنے کو عمل بالارکان کہتے ہیں۔ ایمانیات کے سلسلہ میں یہ ایک اصطلاحی لفظ بن گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ و رسول کا زبان سے اقرار کرنا اور ان پر دل سے یقین رکھنا ایمان ہے اسی طرح اعضا و جوارح اور ہاتھ پاؤں کے ذریعہ ارکان دین پر عمل کرنا اور اللہ و رسول کے احکام بجا لانا بھی ایمان ہے چنانچہ متکلمین اور اصولین کا قول ہے کہ الایمان تصدیق قلبونا قرار باللسان و عمل بالارکان۔

عملی و بار آور طریقۂ تعلیم (Practical and Productive Method of Teaching): تعلیم، سماج کی تبدیلی کا ایک حربہ ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا رشتہ زندگی اور عمل سے اکثر دور کا رہا ہے۔ رسمی تعلیم کا طریقہ جو جاگیر داری سماج میں رائج تھا صرف چند طبقات کی اجارہ داری بن کر رہ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ذہنی مزدور اور جسمانی مزدور میں ایک طرح کا طبقاتی امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم تین حصوں میں بٹ گئی۔ یعنی عام تعلیم، فنی تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم۔ علم الانسان کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ذہنی نشوونما کا ہاتھ کے استعمال سے راست تعلق رہا ہے۔ جمہوریت اور سماجی انصاف کے تصورات نے تعلیم کو طبقاتی حدود سے نکال کر عوام تک وسعت دے دی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز تر ترقی کی وجہ سے ذرائع پیداوار اور خود انسانی زندگی میں ایک انقلاب سا آگیا ہے۔ اور تعلیم کا تصور ناقابل فہم ہو کر رہ گیا ہے۔ موجودہ تکنیکی دور میں تعلیم سے نہ صرف قوم کی مجموعی پیداوار میں راست اضافہ ہوتا ہے بلکہ وہ بہتر رہائش زندگی کے لیے بھی ناگزیر سمجھی جانے لگی ہے۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ پیداوار کو ملحوظ رکھتے ہوئے عام تعلیم کے رخ کو موڑا جائے۔

ان ضروریات کے پیش نظر جسمانی آرٹ، علمی آرٹ اور صنعتی آرٹ وغیرہ جیسے کئی ایک عملی پروگرام پیش کیے جاتے رہے ہیں تاہم یہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

پروگرام اب تک بالکل رسمی طور پر صرف اسکول کی چاردیواری تک ہی محدود رہے ہیں۔ ترقی یافتہ سماج کی بڑھتی ہوئی صنعتی اور شہری ضروریات کے مدنظر ایسے پروگرام زیادہ موثر اور کارگر ثابت نہ ہو سکے۔ اس لیے اس صدی کی ابتدا میں ایک خاص قسم کے پروگرام کی بنیاد رکھی گئیں جسے "عملی تجربہ" (Work Experience) کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں مال و اسباب کی پیداوار اور کاروبار، صنعت اور دیگر پیشہ ورانہ اداروں میں کام آنے والی خدمات کا عملی تجربہ شامل ہے۔ یہاں اکثر صورتوں میں طلبا کو ان کے کام کی اجرت بھی دی جاتی ہے۔ سوشلسٹ ملکوں میں اسی طرح کے پروگرام کو کثیرالفنون (Politechnical) تربیت کا نام دیا گیا ہے۔ ترقیاتی امور کے ماہرین معاشیات ایسے تجربہ کو پیشہ ورانہ تعلیم کا آخری مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ ایسے تجربہ کو پیشہ ورانہ تعلیم کا آخری مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ ایسے تجربہ کے مواقع فراہم کرنا آجریں کی ذمہ داری ہے۔

ہندوستان میں عام تعلیم کے جزوی حیثیت سے پیشہ ورانہ تعلیم کی تاریخ ایک سو سال سے بھی پرانی ہے۔ وڈ کے تعلیمی مراسلہ (1854) میں ثانوی مرحلہ پر ایسی پیشہ ورانہ تعلیم کی پیش قیاسی کی گئی ہے ۔ ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہاتھ سے قلم چلانے کے علاوہ اور بھی کام لینے چاہیے۔ صرف روزگار پیدا کرنے ہی کے نہیں بلکہ ہمہ جہتی تعلیم کے حصول کے بھی۔

ذاکر حسین کمیٹی کے مطابق گاندھی جی کے تعلیمی نظریات میں سماجی طور پر مفید کاموں کو اور بھی زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ 1938 میں قومی اساس پر جو "بنیادی تعلیم" رائج کی گئی وہ اسی نمونہ پر تھی۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی طرف سے جو تعلیمی کمیشن (1964-1966) مقرر کیا گیا تھا اس نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ تعلیم کو بدلتی ہوئی سماجی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ وہ تکنیکی دور کے شانہ بہ شانہ چل سکے۔ اس کمیشن نے جسمانی کام یعنی پیشہ ورانہ تیاری، شخصیت کی تربیت اور علم کے باہمی متعلق کو نہ صرف ایک مربوط شکل میں پیش کیا بلکہ مستقبل کے لیے نئی نئی راہیں بھی بتلائیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ایسا پروگرام ہر طرح کی تعلیم کا چاہے وہ عام ہو کہ پیشہ ورانہ لازمی جزو ہونا چاہیے۔ عام تعلیم کا نصاب ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے خود مکتفی بننے کی صلاحیت پیدا ہو۔ قوم کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو اور سماج میں جدید نقطہ نظر پیدا ہو۔ اس پروگرام میں حسب ذیل امور شامل ہیں۔

کام کی نوعیت کا پتہ چلانا جس میں ذاتی گھریلو اسکول اور برادری کی اشیائی دیکھ بھال، زراعت اور صنعت سے متعلقہ پیداواری کام اور زراعت صنعت غذا صحت عامہ تعمیر امکنہ سیر و تفریح تعلیمات، حکومت، سیاست، قانون اور سماجی ترسیلات کی خدمات بھی شامل ہیں۔

مختلف کاموں میں استعمال ہونے والے آلات و اوزار کا تجربہ حاصل کرنا نگہداشت کے کاموں کے طریقوں کی جانکاری حاصل کرنا اور طریقہ پیدائش اشیا و خدمات سے واقفیت حاصل کرنا اسکول، گھر، کھیت یا کارخانہ یا کسی دوسری جگہ کے کاموں میں جہاں کوئی چیز زیر پیدائش یا زیر تعمیر ہو عملی طور پر حصہ لینا۔

ایسے پروگراموں میں محنت شاقہ تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے، کسی مسئلہ کو حل کرنے کا تجربہ حاصل کرے۔ بلا امتیاز ذات، عقیدہ و مرتبہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور کام کے حسن وقبح کو جاننے کے کافی مواقع ملتے ہیں۔

یہ توقع کی جاتی ہے کہ اسکول میں "عملی تجربہ" حاصل کرنے سے طالب علم میں سخت جسمانی محنت کرنے اور اچھا کام کرنے کی عادت پیدا ہو گی اور کام کے فنی پہلوؤں سے اس کی جانکاری میں اضافہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس میں آگے دیکھنے کام، کرنے کے نئے نئے طریقے معلوم کرنے او اس میں اختراع و ایجاد کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گی۔ اس طرح وہ متعدد نوعیت کے کاموں کا تجربہ حاصل کرنے کی وجہ سے آئندہ اپنی پسند کے پیشہ ورانہ تعلیمی نصاب کے انتخاب میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طلبا کی ایک کثیر تعداد اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ مدارج میں آرٹ کے مضامین اختیار کرنے کی بجائے پیشہ ورانہ تعلیم سے منسلک ہو جائے گی۔ یہ طریقہ تعلیم ایسے ہے کہ ملک کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ سماج کا دست نگر ہونے اور اہل کاری کی جائدادوں کے لیے جو بہر صورت محدود ہوتی ہیں مارا مارا پھرنے کی بجائے قوم کی پیدائش دولت کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکے گا۔

عنفوان شباب (Adolescence) : عنفوان شباب فرد کی عمری ارتقاء کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ جب کہ بچہ زندگی کے دوسرے دور میں قدم رکھتا ہے۔ تقریباً ہر زبان اور ہر تہذیب میں اس کے لیے جدا جدا الفاظ

موجود ہیں۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بارہ اور سترہ سال کے درمیان عمر کا جو حصہ ہوتا ہے اس میں فرد نمایاں جسمانی تبدیلی اور ذہنی تجربات اور تغیرات کی متحرکن اور ولولہ انگیز منزلوں سے گزرتا ہے۔ تقریباً ہر بچہ یا بچی کے لیے عنفوان شباب کا وقت جدا جدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا قطعی تعین ایک دشوار مسئلہ ہے۔ عام طور پر عنفوان شباب سے پہلے کے دور کو بچپن اور بعد کے دور کو جوانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں عنفوان شباب کے لیے Adolescence کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جس کے سیدھے سادھے معنی بچپن کے دور سے گزر کر پختگی کے دور میں داخل ہونے کے ہیں۔ پختگی سے یہاں مراد جسمانی جنسی ذہنی اور جذباتی پختگی کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیات محض اضافی نوعیت اور پختگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہر تہذیب اور تمدن میں ہزاروں برس سے عنفوان شباب کے موضوع پر خیال آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ بہت سے سماجوں میں اس دور کی ابتدا کے ساتھ رسومات بھی وابستہ رہی ہیں۔ البتہ عنفوان شباب کے موضوع پر سب سے پہلے باقاعدہ تصنیف "اوسیانڈر" (Osiander) نے 1795 میں شائع کی جس کے بعد رفتہ رفتہ اور مصنفین نے بھی اس موضوع پر لکھنا شروع کیا۔ لیکن اس عنوان پر سب سے پہلی اہم کتاب 1904 میں ہال (Hall) نے لکھی۔ اور اس سے ایک سال بعد یعنی 1905 میں سگمنڈ فرائڈ نے اس موضوع پر اپنی عالمانہ تحقیق پیش کی۔ فرائڈ نے عنفوان شباب کے جنسی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بڑی تفصیلی بحث کی۔ موجودہ سماجیات میں اس مضمون پر سب سے اہم کتاب اراکسن (Erikson) کی ہے جو 1950 میں شائع ہوئی۔ دراصل اراکسن ایک نوفرائڈی ماہر سماجیات اور انسانیات ہے۔

عنفوان شباب کا مسئلہ محض جذباتی، عضویاتی، ذہنی یا جسمانی تغیرات کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا بہت ہی گہرا تعلق فرد کی شخصیت کی نشوونما سے ہے۔ زندگی کے ارتقاء اور تجربات کے اس دور میں فرد اپنے انداز فکر اور سماجی برتاؤ کو ایک خاص سمت میں موڑتا ہے۔ اور اس اعتبار سے آئندہ زندگی کے لیے عمر کا یہ حصہ فیصلہ کن مضمرات کا حامل ہوتا ہے۔ عنفوان شباب کے دور میں ہر بچہ زندگی کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہوتا ہے جب کہ وہ نہ اپنے کو بچہ سمجھ سکتا ہے اور نہ بڑا۔ چونکہ یہ دور توانائی اور طباعی کے سرچشموں کے پھوٹنے کا دور ہوتا ہے اس لیے اس زمانے میں ہر بچہ انتہائی تیزی کے ساتھ زندگی کے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے اگر عنفوان شباب میں بچہ کی ذہنی اور جسمانی تربیت پر توجہ نہ دی جائے تو اس بات کا اندیشہ رہتا ہے کہ اس کا آئندہ رویہ اور برتاؤ انحراف کی طرف مائل ہو جائے گا۔ یہ خرابیوں کا دور ہوتا ہے۔ امیدوں، امنگوں اور حوصلہ مندیوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے کردارسازی کے نقطہ نظر سے اس دور کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

ہندستانی ہی نہیں بلکہ عالمی سماج میں بھی نوجوانوں کی ایک مخصوص اہمیت ہے۔ ان کو اکثر سیاسی مقاصد اور دہشت گردی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اپنی ناتجربہ کاری اور جذباتیت کی وجہ سے یہ اکثر انجام کی پرواہ کیے بغیر اپنا استحصال کرواتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں طلبہ کے ہنگامے اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ گجرات، آسام اور بہار میں اس قسم کے ہنگامے عام ہیں۔ آسام کی الفا (ULFA) پارٹی نے سیاسی قیادت سنبھالی تھی۔ یہ بھی طالب علموں پر مشتمل تھی۔

افغانستان میں طالبان کا گروہ بھی دراصل طالب علموں کا گروہ ہی تھا۔ جو بعد میں انتہا پسند گروپ بن گیا اور لاانتہا توڑ پھوڑ کا باعث بنا۔

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ این.ایس.ایس. وغیرہ کے ذریعہ نوجوانوں کی توانائی کو تعمیری انداز میں استعمال ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندستان میں نوجوان بے راہ روی کا شکار ہیں کیونکہ ان کو جس قسم کی رہنمائی اور سہولتوں کی ضرورت ہے وہ ان کو نہیں مل پارہی ہیں۔

عوارض دائیہ: عوارض عارضہ کی جمع ہے جس کے معنی افتاد ناگہانی یا دفعتاً پیش آنے والی چیز کے ہیں رکاوٹوں اور موانع کو بھی عوارض کہا جاتا ہے۔ دائیہ داء سے بنا ہے جس کے معنی مرض کے ہیں پس عوارض دائیہ سے وہ امراض اور بیماری مراد ہے جو انسان کو پیش آتی رہتی ہیں اور ان کی وجہ سے شریعت کے ان احکام میں تخفیف یا سہولت ہوجاتی ہے جن کا انسان مکلف ہے یا بعض احکام سے مختلف احکام بھی ہوجاتے ہیں چنانچہ مریضوں کے احکام بدل جاتے ہیں اور وہ تندرست لوگوں کے احکام سے مختلف ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص بیماری کی وجہ سے کھڑے ہوکر نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو بیٹھ کر یا لیٹ کر پڑھ لے اسی طرح روزے چھوڑ دے اور مرض کے رفع ہونے کے بعد ان کو قضا ادا کرے۔ پانی استعمال کرنے سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مرض یا زخم بڑھ جانے کے خطرہ ہو تو وضو کے بجائے تیمم کرلے۔ فقہ کی کتابوں میں مریض کے احکام علاحدہ بیان ہوئے ہیں۔

عوامی ترسیل (Mass Communication): انسان فکر پر مبنی تخلیق کرتا ہے۔ اور اس کی تہذیب اور تمدن کی پوری عمارت ان ہی فکری تخلیقات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ہر فکر کسی نہ کسی عمل کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ خواہ وہ عمل مثبت مضمرات کا حامل ہو یا منفی۔ انسانی فکر ترسیل کے ذریعہ دوسروں تک پہنچتی ہے۔ فکری ترسیل کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے۔ لیکن سائنس اور ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں ترسیل فکر کے وسائل اتنے وسیع اور عام ہوگئے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں ساری دنیا بہت ہی مختصر اور محدود نظر آنے لگی ہے۔ نشرو اشاعت پریس ریڈیو ٹیلی ویژن، سنیما اور انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعہ افکار بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچ جاتے ہیں۔ ریڈیائی لہروں ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر نے نظریات اور خیالات کی ترسیل کو بہت آسان بنا دیا ہے جس کی وجہ سے بہت سی سہولتیں اور بعض پیچیدگیاں بھی ہو گئی ہیں۔ یہ تمام ذرائع عوامی ترسیل کے زمرہ میں آتے ہیں۔ عوامی ترسیل سماجی کنٹرول کا بڑا موثر ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ موجودہ دور کو پروپگنڈہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اسے پبلسٹی کا زمانہ بھی کہتے ہیں۔ تجارت، صنعت اور تعلیم ہر میدان میں تشہیر کے نتائج خاطر خواہ نظر آتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ایجاد ضرورت کی ماں بن گئی ہے۔ لوگ روزانہ نئی جدتوں اور ایجادوں کی تشہیر کرتے ہیں اور عوامی ترسیل کے ذرائع کو اختیار کرکے اپنی اختراعات کو قومی، بین الاقوامی مارکٹ میں لاتے ہیں۔ عوامی ترسیل پر بہت زیادہ تحقیقاتی کام ہورہے ہیں کیونکہ ان ذرائع کا موجودہ پیچیدہ سماج پر بہت گہرا مثبت اور منفی اثر پڑ رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں عوامی ترسیل سرد جنگ میں ایک ہتھیار کا کام کرتی ہے۔

عوامی کتب خانہ ہندستانی: عوامی کتب خانہ کی تعریف مختلف افراد اور اداروں نے کی ہیں۔ کسی نے اس سے ملنے والی خدمات کے دائرہ کو بنیاد بنایا ہے تو کسی نے مالیات کے ذریعہ حصول پر زور دیا ہے۔ خدمات سے مستفید ہونے والے افراد کی مناسبت سے بھی کتب خانہ کی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن غالباً سب سے جامع تعریف ایک فقرہ میں کارلائل نے کی ہے "یہ عوام کی یونیورسٹی ہے" یونیسکو لائبریری مینی فسٹو کے مطابق عوامی کتب خانہ "تعلیم، ثقافت اور معلومات کی ایک جاندار ترغیبی قوت ہے۔"

عوامی کتب خانہ دراصل ایک ایسا ادارہ ہے جو فیس کی طلب کے بغیر اور بلاتفریق مذہب، ذات و صنف سب کے استفادہ کے لیے کھلا ہے۔ یہ فرد کبھی ختم نہ ہونے والی تعلیم کی تکمیل کا ایک موثر وسیلہ ہے جہاں معلومات کو وسیع کرنے کے لیے مواد موجود ہے، جہاں غیر جانبدار اور قابل اعتماد معلوماتی مواد مفت فراہم کیا جاتا ہے۔ البتہ یونیسکو نے عوامی کتب خانہ کے دائرہ میں "برائے نام چندہ" لینے والے کتب خانوں کو بھی شامل کیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے دنیا میں کتب خانہ موجود ہونے کے شواہد قبل مسیح کی صدیوں سے ملتے ہیں اور اگر تعلیم و تہذیب کے عالمی سفر پر نگاہ ڈالی جائے تو یونان، مشرق وسطی ہندستان اور چین نیز عہد وسطی کی اسلامی دنیا میں کئی بڑے اور اہم کتب خانوں کی تفصیل ملتی ہیں لیکن عوامی کتب خانہ جو یونیسکو یا آج کے دور کے کسی دانشور کی تعریف پر پورا اترتا ہو اس کی تاریخ بہت پرانی نہیں۔ بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ حکومت کی کوششوں سے عام آدمیوں کے استفادہ کے لیے قائم اس سماجی ادارہ کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہی شروع ہوتی ہے۔ انگلینڈ میں عوامی کتب خانہ قانون 1850 میں پاس ہوا تھا۔

ہندستان میں یوروپی اقوام نے اپنے افراد کے ذوق مطالعہ کی تسکین، مذہبی تبلیغ اور علوم مغربی کے ہندستان میں فروغ کی خاطر اپنی آمد کے ساتھ کتب خانے قائم کرنے شروع کردیے تھے۔ جسوئٹ مشنریوں نے سترہویں صدی میں آگرہ میں کتب خانہ قائم کیا۔ فورٹ سینٹ جارج فورٹ ولیم میں کتب خانے قائم ہوئے۔ اٹھارہویں صدی میں برہام پور، کانپور اور کلکتہ میں گشتی کتب خانے قائم ہوئے۔ انیسویں صدی کے شروع میں کلکتہ پبلک لائبریری قائم کی گئی۔ لیکن یہ تمام کوشش ایک خاص طبقہ کو سہولت فراہم کرنے کے لیے کی گئی تھیں۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ سے استفادہ بھی صرف ممبران سوسائٹی کرسکتے تھے۔ البتہ 1804 میں قائم بمبئی لٹریری سوسائٹی کا کتب خانہ جو آگے چل کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ کی حیثیت سے معروف ہوا ممبران سوسائٹی کے لیے محدود نہیں تھا اور یہاں سے کتابیں نہ صرف گھر کے لیے بلکہ ممبئی سے باہر بھی لے جائی جاسکتی تھیں۔ ملک میں عوامی کتب خانہ قائم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کرنے میں بڑا رول چند روشن خیال مہاراجاؤں اور نوابین کا رہا ہے اور ان میں بھی بڑودہ، ٹراونکور اور کشمیر کے مہاراجہ اور حیدر آباد اور رام پور نیز بھوپال اور ٹونک کے نوابین کے نام سرفہرست ہیں۔

لیکن حکومت کی سطح پر عوامی کتب خانہ کے قیام کے لیے کسی قانون کے نہ ہونے کی صورت میں عوامی کتب خانہ کا کوئی ملک گیر نظام انگریزی دور حکومت میں نہیں ملتا۔ 1947 میں ملک کے آزاد ہونے کے وقت ملک میں عوامی کتب خانہ تحریک مضبوط نہیں تھی اگرچہ 1933 میں ایک آل انڈیا پبلک لائبریری کانفرنس کے منعقد ہونے کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ ملک میں عوامی کتب خانہ کی ترویج کے کسی جامع منصوبہ کی عدم موجودگی میں تحریک کا کمزور ہونا لازمی تھا۔ اس ضمن میں پہلی کوشش ریاست ممبئی میں 40-1939 میں لائبریری ڈیولپمنٹ کمیٹی کے قیام کی صورت میں ہوئی جو اے. اے. فیضی کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی اور جس نے ریاست میں کتب خانہ کی ترویج کے لیے ایک چھ ادواری منصوبہ کی سفارش کی۔ کل ہند سطح پر جائزہ اور سفارش کے لیے مرکزی حکومت نے 1957 میں کے.پی. سنہا کی سربراہی میں ایک لائبریری ایڈوائزری کمیٹی قائم کی جس نے ایک ماڈل لائبریری بل اور ایک 25 سالہ عوامی کتب خانہ منصوبہ پیش کیا۔

پلاننگ کمیشن نے پہلے پانچ سالہ پلان میں ضلعی کتب خانوں کے قیام کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ پلان کے ایک حصہ کی صورت میں تجویز کیا اور ملک کے 29 علاقوں میں پائلٹ پراجکیٹ کے تحت لائبریریاں قائم کی گئیں۔ اسی دوران 1951 میں یونیسکو کے تعاون سے دہلی پبلک لائبریری ایک نمونہ کے عوامی کتب خانہ کے طور پر قائم ہوئی۔ کونے مارا پبلک لائبریری کو ریاستی مرکزی کتب خانہ کادرجہ دیا گیا۔ دوسرے پلان کے دوران 9 ریاستوں نے ریاستی مرکزی کتب خانے قائم کیے اور ملک میں 254 ضلعی کتب خانے بھی قائم ہوئے لیکن ایک باہم منسلک ملک گیر لائبریری خدمات نظام نہیں وجود میں آسکا۔ تیسرے پلان کے دوران پلاننگ کمیشن نے ایک کتب خانہ منصوبہ کے لیے ورکنگ گروپ تشکیل کیا جس کی سفارش تھی کہ پانچویں پلان کی تکمیل تک ملک کے ہر بلاک صدر مقام اور ہر 5000 آبادی والے گاؤں میں کتب خانے قائم ہونے چاہئیں جبکہ صورت حال یہ تھی کہ 1965 میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں میں سے صرف تقریباً تین ہزار گاؤں میں کتب خانہ نام کا کوئی ادارہ تھا۔ چوتھے پلان میں پبلک لائبریری کے ورکنگ گروپ نے 31 کروڑ روپے کے بجٹ کا منصوبہ پیش کیا لیکن پلان صرف 2 کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی۔ چھٹے پلان کے دوران تک ملک کے صرف چار شہر مدراس، حیدر آباد، بنگلور اور دہلی۔ ایسے تھے جہاں عوامی کتب خانہ نظام مع مرکزی کتب خانہ اور ذیلی شاخوں کے قائم تھا۔ ساتویں پلان کابڑا کارنامہ قومی پالیسی برائے کتب خانہ و معلوماتی نظام کی تشکیل تھی۔ 1986 میں قائم چٹوپادھیائے کمیٹی کی سفارشات میں گاؤں میں عوامی کتب خانہ کا قیام اور ہر کتب خانہ میں بچوں کے لیے علاحدہ شعبہ کا بندوبست شامل ہیں۔ گاؤں میں قائم کیمونٹی کتب خانے معلوماتی مرکز کے ساتھ تعلیم بالغان کی توسیع میں بھی معاون ہوں گے۔

پہلے پانچ سالہ منصوبہ سے اب تک ہر پانچ سالہ منصوبہ میں عوامی کتب خانوں کی ضرورت ان کے قیام اور توسیع کے لیے مالیات کا اندازہ اور ان کی اہمیت کا ذکر ملتا ہے لیکن پچاس برس کے بعد بھی گاؤں کی سطح پر بمشکل 5% علاقوں میں کتب خانے قائم ہیں۔ اس کی بڑی وجہ بیشتر ریاستوں میں کتب خانہ قانون کا نہ ہونا ہے۔ ملک میں سب سے پہلے ریاست مدراس میں ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن کی کوششوں سے 1948 میں پبلک لائبریری قانون پاس ہوا۔ اب تک 25 ریاستوں اور 7 مرکز کے زیرانتظام علاقوں میں سے صرف دس ریاستوں- آندھرا پردیش، تامل ناڈو، کرناٹک، کیرالہ، گوا، مغربی بنگال، منی پور، مہاراشٹر، میزورم و ہریانہ- میں ہی قانون بن سکا ہے۔ آسام، گجرات اور اڑیسہ میں کتب خانہ کے فروغ کے لیے ڈائریکٹریٹ قائم ہیں۔ اترپردیش میں افسر برائے امور خاص کتب خانوں کی توسیع کے کام دیکھتا ہے۔ چنڈی گڑھ میں مرکزی ریاستی کتب خانہ موجود ہے۔ ہماچل پردیش میں اسکول کتب خانے اسکول اوقات کے بعد عوامی کتب خانے کا رول ادا کرتے ہیں۔

لیکن اگر عوامی کتب خانہ نظام سے مراد کتب خانوں کا ایک ایسا نظام ہے جس میں معلوماتی وسائل کی فراہمی کے لیے گشتی کتب خانے بھی اتنے ہی قابل بھروسہ ہوں جتنے کہ ریاستی مرکزی کتب خانے ہیں تو ملک ابھی بہت پیچھے ہے۔ ملک کے موجودہ کتب خانے کتابوں کے لین دین اور دارالمطالعہ کی سہولت ہی فراہم کرپاتے ہیں۔ درجہ بندی اور فہرست کتب خانہ کی تیاری کا کوئی مرکزی نظام نہیں ہے۔ کتابوں کے حصول میں تال میل نہیں ہے۔ جسمانی طور پر معذور افراد اور پسماندہ طبقہ کے افراد

کے لیے سہولتوں کا فقدان ہے ان حالات میں راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن کی وجہ سے تبدیلی کے آثار ہیں لیکن ضرورت ہے کہ جملہ ریاستیں کتب خانہ سہولت کو پائیدار بنیادوں پر فراہم کرنے کے لیے قانون فراہم کریں۔

عہدہ داران تحت قانون صنعتی نزاعات (Authorities under Industrial Disputes Act) : دیکھو کلیدی مضمون قانون صنعتی مزدوران۔

غ

غریبی اور افلاس (Poverty) : ہندستان جیسے ملک کے باشندوں کے لیے غربت اور افلاس کوئی نئی چیز نہیں لیکن اس کے باوجود غریبی کی تعریف (Definition) کرنا مشکل ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں غریبی کی تعریف برابر بدلتی رہتی ہے۔ ان لوگوں نے ستر کی دہائی میں غریبی کو پھر سے نیا تعارف دیا۔ اور اس کو مادّی انداز کے بدلے اضافی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سب نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے بھی عالمی بینک نے غریبی کی تعریف کرتے ہوئے ان لوگوں کو غریب کہا ہے جن کی آمدنی ایک ڈالر روز (1985 کی Purchasing Power Parity کے مطابق) فی کس سے کم ہو۔ اس پیمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے خطِ افلاس سے نیچے رہنے والوں کی تعداد اور تناسب کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ کسی ملک کی آبادی میں افراد، خاندان اور گروہ سب ہی غریبی کا شکار ہوسکتے ہیں جب ان کے پاس ان ذرائع کا فقدان ہوتا ہے جن سے وہ خوراک حاصل کرسکیں، مختلف مشاغل میں حصہ لے سکیں اور ایک باوقار زندگی گزار سکیں۔

اس کے علاوہ افلاس کا موضوعاتی اور غیرموضوعاتی (Subjective and Objective) بٹوارہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کسی سماج یا ملک پر بھی منحصر ہے کہ وہ کس کو مفلسی کے خانے میں رکھے۔ آج کل سماجی اخراج (Exclusion) مفلسی کی پہچان بن گیا ہے۔ مفلس لوگ سماج میں پوری طرح سے خارج کیے ہوئے لوگ ہوتے ہیں گو کہ ان کی محنت پر ہی سماج بنتا ہے۔ پھر بھی ان کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انسانی ترقیاتی رپورٹ 2000 کے مطابق یو.اے.ای. میں خطِ افلاس سے نیچے کوئی نہیں ہے۔ یہی حال سعودی عرب کا ہے۔ بھارت میں 35 فیصد لوگ خطِ افلاس سے نیچے ہیں۔ سیارالیون میں 68 فیصد لوگ انتہائی غریب ہیں۔ ہندستان میں پہلی بار منظم طریقے 1967 میں افلاس کی تعریف پلاننگ کمیشن کے ذریعہ بنائے گئے ورکنگ گروپ نے کی تھی۔ اس سے پہلے 1962 میں کم سے کم صارفانہ حد مقرر کی گئی تھی جو کہ متوازن غذا کے سلسلے میں بنی غذائی مشاورتی مجلس کے مشوروں پر مبنی تھی۔ غذائیت کی کمی مکمل افلاس اور اسائش کی کمی اضافی افلاس کی نشان دہی کرتی ہے۔

ہندستان کو کبھی سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا لیکن اب ہم صدیوں سے غربت اور افلاس سے نبرد آزما ہیں۔ اب افلاس ہماری زندگی میں ہی نہیں بلکہ نفسیات میں سرائیت کرگیا ہے۔ ہندستان میں مکمل افلاس اور اضافی افلاس دونوں کے ہی درشن ہو جاتے ہیں۔

غربت کی دوسری قسم ہے۔ ضرورت (Want) جس کا نتیجہ عدم مساوات کے علاوہ سماجی ناانصافی (Social Injustice) بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک ستم ظریفی ہی ہے کہ جو افلاس پر غور کرتے ہیں اور تھیوریاں بناتے ہیں وہ کبھی اس کو بھوگتے نہیں اور جو بھوگتے ہیں وہ اس کے فلسفے اور تھیوری سے ناواقف ہوتے ہیں۔

غریبی کو تمام مسائل کی ماں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جہالت، اضافۂ آبادی، ماحولیاتی آلودگی، بیماری، گندی بستیاں یہاں تک کہ فرقہ وارانہ تصادم بھی کسی نہ کسی طرح غریبی سے جڑے ہوتے ہیں اس کے دوسرے روپ احتیاج (Want)، کسمپرسی (Deprivation) اور بے روزگاری (Unemployment) ہیں۔ اس سے پیدا ہونے والے بعض اہم مسائل ہیں مثلاً بال مزدوری اور مہاجر مزدور (Migrated Labour) ہیں۔ ہندوستان میں بے روزگاری بھی ایک دیوپیکر مسئلہ ہے۔ نویں پانچ سالہ منصوبے کے آخری سال میں ہندستان میں 964 ملین (تقریباً دس کروڑ) لوگ بے روزگار ہوں گے اور آج 100 ملین (دس کروڑ) بچے اسکول نہیں جارہے ہیں یعنی وہ بھی مزدور ہی بنیں گے۔

غریبی کی ایک خاصیت ہے کہ غربت مزید غربت پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک دام اتلا ہے۔ ماضی کی غربت مستقبل میں غربت کو جنم دیتی ہے۔ پن چند نے اپنے مقالے "ہندستان میں معاشیات کو قومیانے کا ارتقائی عمل" (نئی دہلی 1969، صفحہ 141) میں اس پر کئی طرح سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کو عمل اور رد عمل کے طور پر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کم آمدنی کی وجہ سے قوت خرید بھی کم ہوجاتی ہے جس کا اثر مانگ پر پڑتا ہے۔ یہ آگے چل کر بزنس میں کم پیسہ لگانے کے رجحان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ کاری میں کمی ہو جاتی ہے اس لیے مال بھی کم تیار ہوتا ہے جو نتیجتاً کم آمدنی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ غربت کے دام اتلا (Vicious Circle) کو توڑنا بہت مشکل ہے۔

ہندستان کے پس منظر میں سامراج واد کی لمبی تاریخ غربت کا ایک اور سبب ہے۔ ڈینیل تھورنر اور کارل مارکس وغیرہ نے برٹش راج سے قبل پنپنے والے معاشی حالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا اور اس وقت کے معاشرے کو خود کفیل بتایا تھا۔

ہندستان کی غریبی کا ایک سبب ہندستان میں دھماکہ خیز اضافہ آبادی ہے۔ ایک ارب آبادی کو پار کرنے والا بھارت اسی رفتار سے مستقبل قریب میں (2020 میں) دو ارب ہوسکتا ہے۔ خطِ افلاس سے نیچے رہنے والے لوگوں کا فیصد تھوڑا سا کم ہورہا ہے لیکن ان کی اصلی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ کیونکہ آبادی بڑھ رہی ہے۔

ہندستانی فطرت میں مضمر تن آسانی، قناعت، کام چوری اور غیر سائنسی انداز فکر کچھ اور وجوہات ہیں جن کی وجہ سے غربت بڑھ رہی ہے۔ ہندستان کی غربت کوئی انوکھی غربت نہیں ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک اس کا شکار ہیں۔ دراصل تمام ترقیاتی منصوبوں کا اثر پس ماندہ ممالک اور افراد پر یا تو الٹا پڑرہا ہے یا یہ منصوبے ان کے لیے قطعی بے اثر ہیں۔

1991 میں ہونے والے سروے کے دوران معلوم ہوا کہ دنیا کی آبادی کو پانچ حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ 20 فیصد امیر ترین ممالک کا کل قومی پیداوار کے 84.7 فیصد، عالمی تجارت کے 85.2 فیصد، گھریلو بچت کے 85.5 اور گھریلو سرمایہ کاری کے 85 فیصد پر قبضہ ہے اور غریب ترین ممالک جو صحرا سہارا کے چاروں طرف واقع ہیں۔ کل قومی پیداوار کا 1.4 فیصد، عالمی تجارت کے 0.9 فیصد گھریلو بچت کا 0.7 فیصد اور نجی سرمایہ کاری کا محض 0.9 فیصد ہی مہیا کرپاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں غریب ترین ممالک ترقی کے اثر سے اچھوتے ہی رہے ہیں۔

غریبی سدا سے ہی بنی نوع انسان کے لیے سب سے بڑا خطرہ رہی ہے۔ اقوام متحدہ کے موجودہ سکریٹری جنرل جناب کوفی عنان نے نئے ملینیم کے سلسلے میں لکھے گئے اپنے کتابچے "ہم دنیا کے لوگ" میں بھوک مری احتیاج اور غریبی کو انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بتایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دنیا کی تقریباً آدھی آبادی دو ڈالر روزانہ سے بھی کم پر اکتفا کررہی ہے اور ایک ارب بیس کروڑ لوگ ایک ڈالر سے بھی کم میں گزارا کرتے ہیں جن میں سے پچاس کروڑ ایشیا اور تیس کروڑ افریقہ میں ہیں کیونکہ انھیں ممالک میں آبادی بے حد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ آج کی چھ ارب آبادی میں جو آخری ارب جڑا ہے اس میں صرف 12 سال لگے ہیں۔ آنے والے پچیس سالوں میں غریب ممالک کی آبادی دو ارب اور بڑھ جائے گی۔ اس طرح غربت بڑھے گی۔ بڑھتی ہوئی عالمیت (Globalisation)، صارفیت (Consumerism)، نج کاری (Privatization) اور منافع پر مبنی معاشی نظام کے پنپنے سے غریبوں کا حال بدتر ہوتا جارہا ہے۔ غیر منظم مزدوروں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور منظم مزدور گھٹ رہے ہیں۔ خط افلاس سے نیچے کئی گروہوں اور افراد کو ڈھکیلا جارہا ہے۔ غریبی اور بدحالی بڑھتی جارہی ہے۔ امیر ممالک زیادہ امیر ہورہے ہیں اور غریب ممالک زیادہ غریب ہورہے ہیں۔

آخر میں یہ واضح کردینا ضروری ہے۔ انسانی ترقیاتی رپورٹ کئی سالوں سے 'آمدنی کے لحاظ سے افلاس' اور 'انسانی کے لحاظ سے افلاس' دو خانوں میں غربت کو بانٹتی ہے۔ آمدنی کے اعتبار سے ہندستان مفلس ہے۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے۔ 35.5 فیصد لوگ خط افلاس سے نیچے ہیں۔ پاکستان کے اعداد وشمار موجود نہیں ہیں لیکن انسانی افلاس (Human Poverty) کے مطابق ہندستان کے 34.6 فیصد لوگ اور پاکستان کے 40.1 فیصد لوگ خطِ افلاس سے نیچے ہیں۔ انسانی خط افلاس سے نیچے رہنے والی آبادی بہت زیادہ بدحال ہوتی ہے۔ انسانی افلاس کا مطلب ہے انسانی حقوق کا عدم تحفظ بچوں کی اونچی شرح اموات، ناخواندگی، خواتین کا استحصال، معالجاتی سہولتوں کی غیر موجودگی اور عوام کے لیے لمبی زندگی کے محدود امکانات وغیرہ۔ یہ سب ہی عوامل افلاس کی وجہ سے پنپتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ سماجی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ناانصافی اس کے ذمہ دار ہوتی ہے۔

آخر میں کہا جاسکتا ہے افلاس ایک بہت گہری پیچیدہ اور بیکراں سماجی حقیقت ہے اور ہزار پائے کی طرح بنی نوع انسان پر مسلط ہے۔ اس کا علاج اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے منصوبہ بندی کے علاوہ سیاسی خواہش (Political Will) کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن یہ دونوں ہی باتیں فی الحال غیر موجود ہیں۔ اس لیے ملکی اور عالمی دونوں سطحوں پر اس کا تدارک ہو نہیں سکا ہے۔

غفلت (Negligence): غفلت سے مراد ترک احتیاط ہے جس کی وجہ سے کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچے لیکن ہر ترک احتیاط غفلت کی تعریف میں داخل نہیں ہوتی تاوقتیکہ غافل پر احتیاط برتنے کا کوئی قانونی فرض عائد نہ ہو۔ پس قانون میں غفلت کی تعریف اسی طرح کی گئی ہے۔

"غفلت سے مراد کسی ایسے عمل کا ترک کرنا ہے جسے کوئی معقول اور سمجھ دار آدمی انجام دے یا کسی ایسے فعل کا انجام دینا مراد ہے جسے کوئی معقول اور سمجھ دار آدمی انجام نہ دے۔"

غفلت کے سبب مدعی کو بنائے نالش صرف اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جبکہ وہ حسب ذیل امور کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو۔

(الف) مدعاعلیہ پر مدعی کے ساتھ احتیاط سے عمل کرنے کی ذمہ داری ہو۔

(ب) اور مدعاعلیہ نے اپنے اس فرض کو ترک کیا ہو۔

(ج) اور یہ کہ مدعی نے مدعاعلیہ کی غفلت کی وجہ سے نقصان اٹھایا ہو اور ایسا فعل غفلت کا قدرتی اور معمولی نتیجہ ہو۔

غفلت کی بنا پر ہرجانہ کا دعوئی صرف اس صورت میں ہوسکے گا جب یہ ثابت ہو کہ مدعاعلیہ پر احتیاط سے عمل کرنے کی قانونی ذمہ داری تھی۔ جب کوئی قانونی ذمہ داری نہ ہو تو ایسی صورت میں دعوئی نہ ہوسکے گا۔ احتیاط سے عمل کرنے کا معیار یہ قایم کیا گیا ہے کہ جس طرح معمولی فہم کا آدمی عمل کرتا ہے اس طرح عمل کیا گیا ہو۔ یہ امر کہ کس قدر احتیاط سے عمل کیا جانا چاہیے ہر مقدمہ کے حالات پر منحصر ہوگا۔ اسی طرح جب کسی کام کی انجام دہی میں خاص ہنر کی ضرورت ہو تو جو شخص اس کام کو انجام دینا شروع کرے اس میں اس قدر قابلیت ہونی چاہیے جو اس کام کے انجام دینے والے معمولی فہم کے اشخاص میں ہوتی ہے اگر ایسی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ مضرت پہنچائے تو اس پر غفلت کی بنا پر ہرجانہ کی ذمہ داری عاید ہوسکے گی۔

غنیمت: وہ اموال جو کفار سے جنگ و جدل کے بعد حاصل ہوں غنیمت کہلاتے ہیں ان کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کیا جاتا ہے اور بقیہ مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

غیر جانبداری (Neutrality): روایت اور بین الاقوامی قانون میں غیر جانبداری کے معنی دو فریقوں کے درمیان جنگ میں تیسرے فریق یا فریقوں کی عدم شرکت اور غیر جانبداری کے اعلان کے تھے۔ اس قانون کے تحت امن و جنگ کی طرح غیر جانبداری بھی ایک رسمی قانونی حالت تھی۔ جسے غیر متحارب ہونے کی حالت کہا جاتا تھا۔ پرانا قانون، غیر جانبدار نہ اور متحارب ملکوں کے تعلقات کو کسی حد تک منضبط کرتا اور غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض متعین کرتا تھا۔ لیکن آج کے دور میں امن و جنگ کے درمیان تاریخی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ان دونوں اصطلاحوں کے معنی یکسر بدل چکے ہیں۔ چونکہ امن و جنگ کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہے لہٰذا قانونی غیر جانبداری کا تصور بھی مبہم ہو گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے امن عالم کے قیام کی ذمہ داری سنبھالنے سے بھی رکن ملکوں کے لیے غیر جانبداری برتنا مشکل ہو گیا ہے۔

پرانے زمانہ میں چھوٹی ریاستوں کی آزادی یا تو توازن طاقت کی رہین منت ہوتی تھی (مثلاً بلجیم اور ریاست ہائے بلقان دوسری عالمی جنگ تک) یا کسی محافظ ملک کے تسلط کی (مثلاً پرتگال یا وسطی و جنوبی امریکا کی چھوٹی ریاستیں) یا وہ ریاستیں جو سامراجی ملکوں کے لیے کشش نہیں رکھتی تھیں (مثلاً سوئٹزرلینڈ اور اسپین)۔ اس طرح ممالک ان میں سے کسی ایک یا دوسرے یا سبھی عوامل کی بنا پر اپنی غیر جانبداری کو قائم رکھتے تھے۔

سوئٹزرلینڈ کو روایتی منفی معنی میں کانگریس آف نیشن (1815) نے ایک "غیر جانبدار" ملک قرار دیا گیا۔ غیر جانبداری کا یہ تصور "ناوابستگی" کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ آج کے ناوابستہ ممالک دونوں بلاکوں کے فوجی اتحادات سے الگ رہتے ہوئے دونوں فریقوں سے مثبت طور پر تعاون کرتے ہیں اور حسب موقع ایک بلاک کے خلاف دوسرے کی حمایت بھی کرتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ف

فاسق: فسق سے بنا ہے اس کے اصل لغوی معنی خروج (نکلنا) کے ہیں۔ اس لغوی معنی کی رعایت سے معروف سے منکر اطاعت سے نافرمانی اور نیکی سے برائی کی طرف نکل جانے کو فسق کہتے ہیں۔ پس فاسق وہ لوگ ہوئے جو اللہ کے نافرمان باغی حدود شریعت سے تجاوز کرنے والے مسلسل گناہوں کا ارتکاب کرنے والے اور خدا کے احکام کو مستقل ترک کرنے والے ہوں فقہا متکلمین کی اصطلاح میں فاسق وہ شخص ہے جو اسلام کو بطور عقیدہ مانتا ہو لیکن اس کے احکام پر عمل کرنے سے پہلو تہی اور مسلسل انحراف کرتا ہو گوکہ کفر سے کم درجہ کی چیز ہے مگر فاسق سخت سزا اور عذاب کا مستحق ہوگا۔

فاضل قانون دانوں کی رائے (Opinion of Jurists): فاضل مصنفین کی رائے کو بھی بین الاقوامی قانون کے قواعد کے تعین کے لیے بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سپریم کورٹ کے بعض ججوں نے بین الاقوامی نوعیت کی ایک نزاع کے تصفیے کے سلسلے میں لکھا ہے کہ جہاں کوئی معاہدہ نہ ہو اور عاملہ اور مقننہ کی طرف سے کوئی خاص ہدایت نہ ہو اور اس بارے میں کوئی عدالتی فیصلہ بطور نظیر پیش نہ ہو تو ایسی صورت میں اس مسئلہ میں جو رواج اور عمل درآمد ہے اسے نیز فاضل قانون دانوں کی رائے کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جنھوں نے سالہا سال کی محنت، ریسرچ اور تجربے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری: یہ شہرہ آفاق کتاب گیارہویں صدی ہجری کے ہندوستانی علما کا کارنامہ ہے۔ شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے علما فضلا کی ایک منتخب جماعت نے شیخ نظام برہان پوری کی رہنمائی اور نگرانی میں نہایت تحقیق و جستجو اور بڑے اہتمام و کاوش سے اس کو مرتب ومدون کیا تھا اس میں فقہ و فتاویٰ کی سیکڑوں کتابوں کا خلاصہ اور نچوڑ آگیا ہے۔

فتاویٰ کے مولفین نے عموماً راجح اور مفتی بہ مسائل نقل کیے ہیں اور ہر ہر مسئلہ کے ساتھ اس کے ماخذ کا مفصل حوالہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس قدر مسائل اور جزئیات کا اس میں استقصا کیا گیا ہے اس سے فتاویٰ کے دوسرے مجموعے خالی ہیں اس کو نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ فقہ حنفی کی معتبر کتاب خیال کی جاتی ہے۔ اورنگ زیب نے اس کا فارسی ترجمہ بھی کرایا تھا تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

فرانز بوواز: فرانز بوواز 1858 میں جرمنی میں پیدا ہوا اور 1942 میں امریکا میں اس انتقال ہوا۔ بوواز مشہور جرمن ماہر انسانیات گزرا ہے۔ اس نے اپنی تعلیم کی تکمیل جرمنی میں کی لیکن 1887 کے بعد سے امریکا میں سکونت اختیار کر لی جہاں اس نے باقی زندگی انسانیاتی تحقیقات میں صرف کی۔ اس بات کا بجاطور پر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بوواز نے انسانیات کی از سر نو تعمیر کی اور اس کے خدوخال کو واضح کیا۔ تحقیقات کے ابتدائی دور میں بوواز علم الاقوام (Ethnology) سے بہت متاثر تھا۔ یوں تو بوواز کے ہمعصروں میں ٹائلر مورگن اور اسپنسر جیسی عظیم شخصیتیں موجود تھیں پھر بھی بوواز نے اپنا ایک الگ مقام پیدا کر لیا۔ ایک زمانے تک بوواز کو جغرافیہ سے دلچسپی تھی۔ اور اسی دلچسپی نے اسے بے شمار ممالک کی سیاحت اور تمدنوں کے مشاہدہ پر اکسایا جن کے بغور مطالعہ سے اس نے تمدن کے تصور پر بڑی دقیق بحثیں کیں۔ اس کا خیال تھا کہ تمدن محض انسان کے خارجی ماحول کے تخلیقی اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ ماحول ہے جو خالص انسانی ہوتا ہے اور جس کا راست تعلق انسان کی اس امتیازی خصوصیت سے ہے۔ جو دوسرے حیوانات کو حاصل نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر تمدن تاریخی اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن تاریخی اسباب

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بذات خود انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس لیے تمدن علاحدہ اور غائر مطالعہ انسان فہمی کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہر زمانہ میں انسان کو دو قسم کی کیفیات سے سابقہ رہتا ہے۔ ایک وہ خارجی تمدنی کیفیت ہوتی ہے۔ جس میں انسان اپنے آپ کو پاتا ہے اور دوسری وہ داخلی کیفیت ہوتی ہے جو انسان کی معروضی صفات اور صلاحیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان دونوں کے ملاپ، امتزاج اور ٹکراؤ سے تمدنی زندگی مختلف جہتوں میں رواں دواں ہوتی ہے۔ بوواز نے موروثیت اور ماحول کے متعدد پہلوؤں پر تحقیقاتی مقالے لکھے ہیں۔ اور انسانی ارتقاء کے بے شمار عوامل پر بحثیں کی ہیں۔ بوواز نہ صرف ایک ماہر انسانیات تھا بلکہ وہ ایک زبردست استاد بھی تھا جس کے انتہائی قابل شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ چھ کتابوں کے علاوہ بوواز نے 700 مونوگراف اور مضامین لکھے ہیں اور جدید انسانیات کی تشکیل اور تراش خراش میں اس کا غیر معمولی حصہ رہا ہے۔

فرانسیسی برادری (French Community)

: یہ برادری برطانوی دولت مشترکہ کے طرز پر فرانس کی سربراہی میں فرانس کی سابقہ نوآبادیات پر مشتمل ایک رضاکارانہ انجمن ہے۔ چوتھی ری پبلک تک یہ فرانسیسی یونین کے نام سے موسوم کی جاتی تھی لیکن 1958 کے دستور کے تحت فرانسیسی برادری قائم ہوجانے کے بعد فرانس کے سابقہ مقبوضات کو پیش کش کی گئی کہ وہ فرانسیسی برادری میں شمولیت اختیار کرکے یا تو اندرونی خودمختاری حاصل کرسکتے ہیں یا مکمل طور سے فرانس سے تعلقات منقطع کرسکتے ہیں۔ 1958 کے اخیر تک فرانسیسی گنی کے سوا فرانسیسی مغربی افریقہ اور فرانسیسی استوائی افریقہ کے تمام ممالک اور مدغاسکر نے برادری میں شمولیت اختیار کرلی اور انھیں خودمختار ریاستوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ اصلاً اس برادری کا دائرۂ اختیار خارجہ امور، دفاع، کرنسی، اقتصادی و مالی پالیسی، فوجی اہمیت کے مواد اور اعلیٰ تعلیم تک پھیلا ہوا تھا۔ 1960 میں ایک دستوری ترمیم کے ذریعہ رکن ملکوں کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ مکمل طور سے آزاد ہو کر بھی برادری کی رکنیت قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس کے تحت چھ ملکوں یعنی وسطی افریقی جمہوریہ، چاڈ، کانگو عوامی جمہوریہ، گابون، مدغاسکر اور سینگال نے برادری میں شامل رہنے کا فیصلہ کیا اور باقی ملکوں نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔ لیکن فرانس نے ان سبھی نوآبادیات کے ساتھ بین الاقوامی قانون کے تحت تعاون کے معاہدے کرلیے۔ برادری کے ارکان فرانس کے صدر کو برادری کا سربراہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کے سربراہان مملکت اس کی کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ ممالک فرانک کے منطقہ سے مربوط ہیں اور فرانس انھیں اقتصادی اور ترقیاتی امداد کے معاملہ میں دوسرے ملکوں پر ترجیح دیتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب اس برادری کا وجود برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ اگرچہ دستور کی متعلقہ دفعات اب بھی باقی ہیں لیکن برادری کے ادارے اب باضابطہ طور پر فعال نہیں ہیں البتہ پیرس میں ایک سکریٹریٹ ضرور ہے جو برادری کے ارکان اور فرانس کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

فرانکلن ہنری گڈنگس (Franklin Henry Giddings)

: فرانکلن گڈنگس مشہور امریکی سماجیات داں گزرا ہے۔ جو 1855 میں پیدا ہوا اور 1931 میں وفات پائی۔ امریکی سماجیاتی نظریہ اور تحقیق کا اسے بانی سمجھا جاتا ہے۔ 1894 میں کولمبیا یونیورسٹی میں گڈنگس کا تقرر سماجیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ہوا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا میں وہ سب سے پہلا ہمہ وقتی پروفیسر رہا ہے۔ امریکی سماجیات میں گڈنگس (Giddings) کو اس لیے بھی اہم مقام حاصل ہے کہ گڈنگس کے ساتھ ہی سماجیاتی نقطہ نظر میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ گڈنگس سے پہلے تک سماجیات کو فلسفہ اخلاق اور فلسفہ تاریخ کا ایک نیا روپ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن گڈنگس نے سماجیات میں منطق تحقیق اور خالص سائنسی تجربہ کی بنیاد ڈالی۔ گڈنگس کا بنیادی فلسفہ آگسٹ کامٹے کے سائنسی نقطہ نظر اور ہربرٹ اسپنسر (Harbert Spencer) کے ارتقائی زاویہ نگاہ کا امتزاج تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سماجی ارتقاء کائناتی ارتقا کا ایک جز ہے۔ افراد میں جو توانائیاں پائی جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے گروہوں میں تفریقات دوری انجذاب اور آہنگ کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ان میں پیدا ہونے والے توازن کا مطالعہ سماجی ارتقاء اور سماجیات کا موضوع ہے۔ اس طرح گڈنگس نے بتایا کہ ہر سماجی نظم ہمیشہ ایک متحرک توازن برقرار رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی نظر میں ایک طرف تو سماجیات کو بنیادی نظریات اور سماجی اصولوں کی تلاش ہونی چاہیے اور دوسری طرف سماج کی متحرک میکانیت پر بھی گہری نظر رکھنی چاہیے۔

1896 میں گڈنگس کی مشہور کتاب "The Principles of Sociology" (اصول سماجیات) شائع ہوئی۔ اس کتاب میں گڈنگس نے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

احساس نوع اور ہم شعوری (We Feeling, Consciousness of Kind) کے تصورات پیش کیے جن کو ساجیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ گڈنگس کے لکچرس، مقالے اور کتابیں سماجی ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔ ان میں اس نے انسانی فطرت سماجی مسائل اور سماجی طریق کے موضوعات پر عالمانہ بحثیں کی ہیں اور ساجیاتی ادب میں نئے خطوط اور رجحانات کی بنا ڈالی۔ 1906 میں گڈنگس نے یہ بات بڑے واضح الفاظ میں پیش کی کہ افراد کے مابین جو عمل اور رد عمل پائے جاتے ہیں وہ سماجی عمل اور سماجی زندگی پر راست اور فوری اثر ڈالتے ہیں گوکہ گڈنگس کو اپنے پیش کیے ہوئے بہت سے تصورات کو تفصیل سے پیش کرنے کا موقع نہیں ملا تاہم جدید ساجیات کے خدوخال بنانے میں اس کے افکار کا بہت بڑا حصہ ہے۔

فرسودگی (Depreciation): ٹوٹ پھوٹ یا زیادہ استعمال سے کسی اثاثہ کی قدر میں جو کمی آجاتی ہے اسے معاشیات میں فرسودگی کہتے ہیں۔ کسی کمپنی کے منافع کا حساب لگاتے وقت اثاثہ کی فرسودگی کا بھی حساب لگایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی کاروبار میں جو لاگت آتی ہے اس میں اثاثہ کا استعمال بھی شامل کیا جانا چاہیے۔ اور چونکہ مجموعی فرسودگی کا صحیح پتہ اثاثہ کی عمر ختم ہونے پر ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس لیے اثاثہ کی عمر کا ایک اندازہ تیار کرلیا جاتا ہے کہ وہ کتنے سال تک چلے گا۔ اور اس کے بعد اس کی مجموعی لاگت کو اس مدت سے تقسیم کرکے اس کو سالانہ فرسودگی کی مد میں رکھا جاتا ہے۔ یہ رقم ہر سال کم ہوتی جاتی ہے۔ اور جب اثاثہ پوری طرح فرسودہ ہوجاتا ہے تو پھر فرسودگی صفر ہوجاتی ہے۔ چونکہ قیمتیں بڑھتی رہتی ہیں۔ اس لیے اکثر تھوڑے عرصہ کے بعد اثاثہ کی قیمت کا دوبارہ اندازہ لگایا جاتا ہے۔ فرسودگی اور ناکارگی میں فرق ہے۔ ناکارگی کا پہلے سے اندازہ لگانا ممکن نہیں وہ کسی وقت بھی معاشی یا ٹکنیکل سبب سے ہوسکتی ہے۔ جب کوئی اثاثہ ناکارہ ہوجاتا ہے تو پھر اس کی باقی ماندہ فرسودگی کو نقصان میں ڈال کر قلمزد کردیا جاتا ہے۔

بعض صورتوں میں اثاثہ کی عمر کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ پیداوار سے قریبی طور پر جڑی ہوئی ہوتی ہے اور مدت کے بدلنے سے پیداوار رک سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ایسے اثاثہ کی نہایت مختصر مدت میں شرح فرسودگی بڑھاکر قلمزد کردیا جاتا ہے۔

حسابات میں فرسودگی کو شامل کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اثاثہ ناکارہ ہونے کے بعد فرسودگی کے فنڈ سے اس کی جگہ نیا اثاثہ حاصل کیا جاسکے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پیداوار میں اثاثی سرمایہ سے جن خدمات کا استفادہ کیا جاتا ہے اسے بھی پیداوار کی قیمت میں شریک کیا جائے۔ عملاً فرسودگی کی مد کو خالص نقد کے برابر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس سے قرضہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے قائم اثاثہ جات (Fixed Assets) خریدے جاسکتے ہیں یا کسی دوسرے کاروبار میں لگا سکتے ہیں۔

فرض: اس کام کو کہیں گے جس کا کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہو فقہا کی اصطلاح میں اس حکم کو فرض کہتے ہیں جو قرآن و حدیث دونوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے اچھی طرح ثابت ہو یعنی ایسا کام جس کی خدا اور رسول نے صاف صاف بہت صراحت کے ساتھ تاکید سے حکم دیا ہو جیسے پنج وقتہ نمازیں، زکوٰۃ، حج اور رمضان کے روزے۔

اگر کوئی شخص فرض کا منکر ہو تو وہ کافر کہلائے گا اور عمل نہ کرنے والا فاسق کہا جائے گا۔ جو سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔ فرض کی دو قسمیں ہیں (1) فرض عین (2) فرض کفایہ۔

فرض عین: وہ حکم ہے جس کو ادا کرنا ہر مسلمان پر علاحدہ علاحدہ فرض ہے۔ ایک مسلمان کے ادا کرنے سے یہ فریضہ دوسرے مسلمان پر ساقط نہ ہوگا۔ جیسے نماز اور رمضان کے روزہ وغیرہ۔ مگر فرض کفایہ کو اگر کچھ مسلمان بھی ادا کریں تو سب کی طرف سے ادا ہوجائے گا اور اگر سب چھوڑ دیں تو گنہگار ہوں گے۔ جیسے نماز جنازہ۔

فروبل۔ فریڈرک ولھلم آگسٹ (Frobel, Fredrich Wilhelm August, 1782-1852) : جرمن ماہر تعلیم اور مصلح فروبل اپنے "کنڈرگارٹن" یعنی "بچوں کے باغ" کے لیے مشہور ہے۔ اس کا یہ ایک پختہ عقیدہ تھا کہ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ خود اپنے آپ کو تعلیم دے اور اس کی مدد سے اپنی ہستی کو پہچانے۔ فروبل 21/ اپریل 1782 کو جرمنی کے ایک اوبرو یزباخ نامی مقام پر پیدا ہوا جو ہر طرف سے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس کا پادریوں کا خاندان تھا۔ ابھی اس کی عمر نو ماہ ہی کی تھی جب اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ باپ کا وقت زیادہ تر گرجا گھر میں گزرتا۔ سوتیلی ماں اس کا کوئی خیال نہ رکھتی۔ ان سب کی وجہ سے وہ اپنے آپ میں کھویا رہتا، پڑھنے لکھنے اور علمی مشاغل میں دلچسپی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نہ لیتا۔ اسکول میں دل نہ لگتا۔ دوسرے طالب علموں سے ملنے جلنے سے کتراتا اور ان سب کی وجہ سے وہ اپنا زیادہ تر وقت جنگلوں میں صرف کرتا اور آہستہ آہستہ اسے نیچر (Nature) کے مطالعہ اور ان سے سائنسی نتائج اخذ کرنے کا شوق ہو گیا۔ اس نے خود ہی کائنات کے اندرونی اتحاد کا فلسفہ مرتب کیا۔

بڑے ہونے کے بعد شروع میں وہ ایک جنگلات کے افسر کے یہاں کام سیکھنے گیا۔ اس کے بعد جینایونیورسٹی میں کچھ دن تعلیم حاصل کی اور قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے جیل بھی بھگتنا پڑی۔ تھوڑے دن اِدھر اُدھر نوکری کرنے کے بعد اس نے 23 سال کی عمر میں فرینکفورٹ کے ایک ماڈل اسکول میں مدرسی کر لی۔ یہ ایک مشہور سویز ماہر تعلیم پستالوزی کے اصولوں پر چلایا جاتا تھا۔

1806 میں اس نے بیرن خاں ہولنرہاس کے یہاں اس کے تین بچوں کی تعلیم اور نگرانی کی نوکری کر لی۔ بیرن کو بچوں سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ فروبل نے یہاں رہ کر شدت سے محسوس کیا کہ بچوں کی تعلیم کے لیے ماں اور باپ دونوں کی دلچسپی کتنی ضروری ہے۔ اس زمانہ میں اسے بیرن کی بیوی سے بھی کافی دلچسپی ہو گئی۔ 1811 میں اس نے یہ نوکری چھوڑ دی اور یونیورسٹی میں داخل ہو گیا لیکن بیرن کی بیوی سے خفیہ خط وکتابت جاری رکھی۔

گاٹجن یونیورسٹی میں اس نے اپنا مشہور "قانون کرہ فلکی" (Law of Sphere) پیش کیا جس میں اس نے بتلایا کہ کس طرح روحانی طاقتیں کائنات میں کارفرما ہیں۔ ان کی مدد سے وہ سائنس اور کلچر کی از سر نو تعمیر کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں اسے نپولین کی جنگوں میں شامل ہونا پڑا اور بطور سپاہی وہ یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ تعلیم کے ذریعہ جرمنی کی کس طرح تعمیر نو کی جا سکتی ہے۔ 1814 میں وہ ایک عجائب گھر کا ناظم بن گیا۔ دو سال ہی بعد اسے بھی چھوڑ کر وہ جنگلات سے گھرے ایک گاؤں گریشم آ گیا اور اپنا ایک اسکول قایم کر لیا۔ تین یتیم بھتیجے، ایک بھائی اور بھاوج اور اس کے دو لڑکے یہ سب مل کر طالب علم، استاد اور گھر کے منتظم بن گئے۔ فروبل ہمیشہ اس پر زور دیا کرتا تھا کہ بغیر خاندانی زندگی کے بچوں کی صحیح تعلیم ممکن نہیں لیکن اس نے خود کہیں 1818 میں ولہلمین ہاف میسٹر کے ساتھ شادی کی جو نہایت شائستہ تھی اور مذہبی طور پر اس کے خیالات سے ہمدردی رکھتی تھی۔ چنانچہ شادی کے ایک سال بعد ہی فروبل نے اپنا اسکول پڑوس کے ایک گاؤں کیل ہاؤس میں منتقل کر دیا اور جلد ہی وہ ایک نہایت کامیاب ادارہ بن گیا۔

انتہائی کوشش کے باوجود فروبل کو سرکاری امداد نہ مل سکی بلکہ بعض شہادت کی بنا پر حکومت نے فروبل ہی کو اس اسکول سے ہٹا دیا۔ اس زمانہ میں اس نے اپنے مشہور مضامین کا مجموعہ "انسان کی تعلیم" شایع کیا جس میں اس نے اپنے تعلیمی اصولوں کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا۔ اس اسکول سے جانے کے بعد فروبل نے پانچ سال سوئٹزرلینڈ میں گزارے۔ اس کے بعد وہ پھر جرمنی واپس آیا اور ایک ادارہ بچوں کی تربیت اور سرگرمی کے لیے قایم کیا جسے کنڈر گارٹن کا نام دیا اور ساتھ ہی آئندہ کے استادوں کے لیے ایک بورڈنگ اسکول بھی قایم کیا۔ ان کے قایم ہونے کے ایک سال پہلے اس کی بیوی کا 1840 میں انتقال ہو گیا۔ اسی زمانہ میں اپنے بچوں کے کھلونے اور دوسری تعلیمی چیزیں تیار کرنے کا ایک کارخانہ بھی قایم کیا۔ اس نے بچوں کے کھیلوں اور گیتوں پر ایک کتاب بھی شایع کی جو بے حد مقبول ہوئی اور اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا۔ فروبل کا یہ بنیادی عقیدہ تھا کہ جب تک بچے کی ابتدائی تعلیم مضبوط بنیادوں پر نہ قایم ہو کوئی تعلیمی یا سماجی اصلاح ممکن نہیں۔ فروبل کے کنڈرگارٹن کے نظام پر جرمنی میں 1851 سے 1860 تک پابندی لگی رہی لیکن اس کے باوجود وہ ساری دنیا میں بے حد مقبول ہوا۔

21/ جون 1852 کو میرین تھال میں اس کا انتقال ہو گیا۔

فریب کا اثر (Effect of Fraud): جب کوئی شخص جسے کوئی مقدمہ رجوع کرنے یا درخواست پیش کرنے کا حق ہو فریب سے ایسے حق کے علم سے یا اس دستاویز حقیقت کے علم سے جس پر وہ مبنی ہو باز رکھا گیا یا جب کوئی دستاویز جو اس حق کے ثابت کرنے کے لیے ضرور ہو فریبا پوشیدہ کی گئی ہو تو میعاد اس مقدمہ کے رجوع کرنے کے لیے یا درخواست پیش کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہو۔

(الف) اس شخص کے مقابلہ میں جو فریب کا مرتکب ہوا ہو یا اس کا معین یا شریک ہو یا

(ب) اس شخص کے مقابلہ میں جو اشخاص متذکرہ ضمن (الف) کی وساطت سے بلا نیک نیتی بلا ادائیگی بدل قیمتی دعوے دار ہو۔ اس وقت سے شمار ہوگی جب فریب کا علم اول مرتبہ شخص متضرر کو ہو یا دستاویز پوشیدہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کیے جانے کی صورت میں جب اس کو دستاویز پیش کرنے یا اس کی پیشی کا حکم حاصل کرنے کے لیے اول مرتبہ موقع حاصل ہو۔

عدالت نصفت (Equity) میں یہ قاعدہ تسلیم کیا گیا ہے کہ میعاد بمقابل ایسے شخص کے حق کے جس کو داوری حاصل کرنے کے لیے فریب دیا گیا ہو اس وقت تک آغاز نہ ہوگی جب تک کہ اس کو فریب کا علم نہ ہو لیکن جب ان حالات کا جن سے فریب ہوا ہو علم ہوجائے تو اس کے بعد انقضائے میعاد بطور امتناع کے موثر ہوگی۔ ان اشخاص کو جو دوسروں کی جائداد فریبا تصرف کرتے یں کوئی مدت ان کی بددیانتی کے باعث محفوظ نہیں رکھی جائے گی۔ ان کی اولاد کو اس جائداد کو جس پر ان کے مورثوں نے فریبا قبضہ حاصل کرلیا تھا واپس کرنے پر مجبور ہوگی۔

فریب یا دھوکہ (Fraud): فریب ایسے غلط بیانات پر مشتمل ہوتا ہے جو دھوکہ دینے کی نیت سے کیے جائیں اور جن پر عمل کرانے کی نیت ہو اور بیان کنندہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹ ہیں یا وہ ان کا صحیح ہونا باور نہ کرتا ہو یا وہ ان کا جھوٹ دریافت کیے بغیر بے احتیاطی سے کرے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ اس قسم کے غلط بیانات مدعی سے راست کیے گئے ہوں۔ اگر کسی دوسرے شخص سے یہ جانتے ہوئے کیے گئے ہوں کہ وہ مدعی تک پہنچ جائیں گے اس ٹارٹ میں بھی ضروری ہے کہ اس پر مدعی نے عمل کیا ہو اور اس کو نقصان پہنچا ہو۔ فریب کا ارتکاب صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ بیان کنندہ اسے جھوٹ سمجھتا ہے یا اس کی صحت کی بابت یقین نہ رکھتا ہو اگر بیان کنندہ اپنے بیان کو صحیح سمجھتا ہے یا اس کی صحت کی بابت یقین رکھتا ہے تو ایسا بیان فریب کی تعریف میں داخل نہ ہوگا۔

فریڈرش ریاٹزل (Friedrich Ratzel, 1844-1904): ریاٹزل مشہور جرمن جغرافیہ داں تھا۔ ریاٹزل کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ 1876 سے پہلے کا ہے۔ اس دور میں وہ ایک صحافی اور جغرافیہ داں تھا۔ البتہ 1876 کے بعد اس کی عالمانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں اس نے انسانیاتی نظریات پیش کیے ہیں۔ ریاٹزل نے 25 کتابیں اور 518 رسالے لکھے ہیں جس سے اس کی علمی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی سب سے اہم تصنیف "تاریخ انسانیت" (The History of Mankind) ہے جو تین جلدوں میں 1885 تا 1888 کے درمیان شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اس کی کتاب انسانیاتی جغرافیہ (Anthropogeographics) اور سیاسی جغرافیہ (Politische Geographie) بھی مشہور ہیں۔ انسانیات میں اس کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے حسب ذیل نکات واضح کیے۔

(1) تمام انسان ایک اکائی ہیں۔

(2) تاریخی پس منظر میں ماحول ثقافت پر اثر ڈالتا ہے۔

(3) ثقافتی مطالعہ میں زماں و مکاں کے آپسی تعلق اور بین عمل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ انسانیات، حیاتیات اور جغرافیہ کے میدان میں اس کی تخلیقات اب بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

فریقین معاہدہ (Parties to Contract): فریقین معاہدہ سے مراد یہ ہے کہ فریقین معاہدہ ان فرائض اور ذمہ داریوں سے آزاد ہوجائیں جو معاہدے کی وجہ سے ان پر عاید ہوتی ہیں اس کے چار طریقہ ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ ہر دو فریقین معاہدہ نے اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی تکمیل کرلی ہو جو معاہدے کے تحت عاید ہوتی ہیں تو ایسی صورت میں معاہدہ مکمل ہو جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو فریقین معاہدہ اس بات پر راضی ہوجائیں کہ معاہدے کو ختم کردیا جائے ایسی صورت میں فریقین کو یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ معاہدے کی پیش رفت میں جو فرائض و ذمہ داریاں (Mutual Obligation) تکمیل پاچکی ہیں یا جو تکمیل شدنی ہیں ان کی تکمیل یا عدم تکمیل کی کیا صورت ہوگی۔ اگر معاہدے کا ایک جز ایک فریق معاہدہ کی طرف سے مکمل ہوچکا ہو تو فریق ثانی کو اس کے بدل (Consideration) کے متعلق یقیناً جدید معاہدہ کرنا ہوگا۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ معاہدہ کی تکمیل تحت قانون ناممکن ہوجائے اور ایسے حالات پیدا ہوجائیں جس کی وجہ سے معاہدہ کی عمل آوری نہ کی جاسکے۔ چوتھا طریقہ نقض معاہدہ ہے۔ لیکن ایسی صورت میں فریق متضرر پر کسی قسم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی البتہ فریق پر یہ لازم ہوگا کہ وہ معاہدہ کی عدم تکمیل کا ہرجانہ فریق مقابل کو ادا کرے۔ نقض معاہدہ (Breach of Contract) اس صورت میں واقع ہوتا ہے جبکہ ایک فریق معاہدہ ان ذمہ داریوں کی تکمیل سے قاصر ہے جو معاہدے کے تحت اس کو تکمیل کرنا ضروری تھا شاید جب ایک دوکاندار خرید کردہ سامان کو وقت پر خریدار کے پاس نہ لے جائے تو یہ نقض معاہدہ (Breach of Contract)

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی تعریف میں آجائے گا۔ نقض معاہدہ (Breach of Contract) کی ایک اور صورت یہ ہے کہ فریق معاہدہ واضح طور پر فریق مقابل پر یہ ظاہر کر دے کہ وہ اس ذمہ داری کو پورا نہ کرے گا جو معاہدے کے تحت اس پر عاید ہوتی ہیں۔ نقض معاہدہ کی مزید ایک صورت یہ ہے کہ ایک فریق معاہدہ کوئی ایسا عمل کرے جس کی وجہ سے معاہدے کی تکمیل ناممکن ہوجائے مثال کے طور پر اگر کسی شخص نے کسی عورت سے شادی کا معاہدہ کیا ہو لیکن اس نے کسی دوسری عورت سے شادی کرلی تو یہ عمل اس معاہدے کی تکمیل میں مانع ہوجائے گا جو اس نے پہلے کیا تھا۔ قانون کی اصطلاح میں اسے (Implied Repudiation of the Contract) کہا جائے گا۔

فسطائیت (Fascism) : فسطائیت ایک ایسی کلیت پسند قوم پرست سیاسی تحریک کا نام ہے جس کی بنیاد اٹلی میں بنیٹو مسولینی (Benito Mussolini) نے 1919 میں رکھی تھی اور جس نے 1922 سے 1943 تک فسطائی پارٹی کی قیادت کی اور مستقل برسر اقتدار رہا۔

فسطائیت کی اصطلاح اطالوی زبان کے لفظ فاشیو (Fascio) سے ماخوذ ہے جس کے معنی سلاخوں کا بنڈل یا خوشی کے ہیں جو وحدت اور طاقت کی علامت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس تحریک کے ارکان کے مابین مضبوط اور نہایت مستحکم اتحاد پایا جاتا ہے۔ شروع میں فسطائیت قوم پروری کے عناصر سے مرکب تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ یہ تحریک داخلی امور میں اقتدار پرستی اور کلیت پسندی اور خارجہ امور میں جارحانہ استعماریت کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ اس کی مثال مسولینی کے ایماء پر 1936 میں حبشہ (Ethiopia) پر اٹلی کی جارحیت اور اس کی آزادی کی پامالی کے دوران (1936-39) اسپانوی خانہ جنگی میں مداخلت اور 1939 میں البانیہ کی فتح پر دی جاسکتی ہے۔

اٹلی میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ فسطائیت ہی اٹلی کو انتشار، بدامنی اور طوائف الملوکی سے نجات دلانے اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس خیال کے فروغ کے نتیجہ میں فسطائی پارٹی کو مکمل اقتدار حاصل ہوگیا۔ اٹلی میں فسطائی پارٹی کا مقصد شہریوں کے اندر نظم و ضبط کا احساس پیدا کرنا اور قومی مفادات کو شخصی اور گروہی مفادات پر مقدم رکھنے کی تعلیم دینا تھا۔ چنانچہ مملکت کو سب سے بالاتر تسلیم کیا گیا لیکن جیسے جیسے فسطائی پارٹی مملکت کے حقوق و فرائض کو سلب کرتی گئی افراد و مفادات اس کے تابع ہوتے گئے۔ جب طاقت کے ساتھ فسطائی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوگیا تو اس نے اپنے مخالفوں کا صفایا کرنا شروع کردیا اور اس کے لیے ہر قسم کی قتل و غارت گری اور جبر و تشدد کو روا رکھا۔ فسطائیوں کے نزدیک جمہوریت، مساوات، حریت پسندی، پارلیمانی نظام حکومت اور اشتراکیت نہایت ناپسندیدہ الفاظ تھے۔ فسطائی رہنما اشتمالیت کی تباہی کو اپنا مقصد واحد سمجھتے تھے لیکن بورژوائیوں کی دشمنی میں وہ اشتراکیوں کی صف میں شامل تھے۔ فسطائی خود کو انقلابی تصور کرنے کے ساتھ ہی پارلیمانی جمہوریت سے نفرت کرتے تھے اور اسے کم ظرف، غیر موثر اور فرسودہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نظام حکومت کی اساس اطاعت تھی۔

اٹلی کے فسطائی نظام حکومت میں حکومت کے سارے اختیارات قائد (Duce) یعنی مسولینی کو حاصل تھے جو چند منتخب افراد پر مشتمل فسطائی مجلس اعلیٰ کے مشورہ سے حکومت کرتا تھا۔ اس مجلس کے ارکان بیشتر وہ لوگ تھے جو مسولینی کے معتمد خاص اور فسطائی انقلاب برپا کرنے میں پیش پیش رہے تھے۔ ان کی رکنیت تاحیات تھی۔ ان کے علاوہ قائد کے ذریعہ منتخبہ کچھ مخصوص افسران ہوتے تھے جنھیں تین سال کی رکنیت عطا کی جاتی تھی۔ ایک نام نہاد پارلیمنٹ بھی تھی جس کے ممبران کو پارٹی نامزد کرتی تھی اور جن کا کام محض قائد کی تقریر سننا تھا۔ اکتوبر 1922 میں مسولینی کی قیادت میں قائم ہونے والی فسطائی جماعت کی حکومت دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کے ہاتھوں شکست کے نتیجہ میں 25 جولائی 1943 کو ختم ہوگئی۔ بادشاہ نے مسولینی کو برطرف کرکے گرفتار کروالیا۔ اس کی جماعت خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ اور فسطائیوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین کالعدم قرار دے دیے گئے۔

فسطائیت ایک ایسا عملی فلسفہ ہے جس کی جڑیں سوریل کی حرفی اشتراکیت، ہیگل کی جدلیت، اور نطشے کے مغربی تہذیب کے مفروضات میں پیوست ہیں۔ مسولینی کا خیال تھا کہ "فسطائیت عمل بھی ہے اور فکر بھی"۔ قومی جاہ و حشمت اس کا نصب العین اور امن و امان برقرار رکھنا اس کا ایمان تھا۔ مسولینی نے پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی کی داخلی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ اس کی جماعت کی اپنی ایک رضاکارانہ فوج تھی جس پر اس کی مکمل گرفت تھی۔ فسطائی جماعت کے اراکین سیاہ قمیص زیب تن کرتے تھے۔ ان کا نعرہ تھا: "مسولینی ہمیشہ راہ راست پر ہے"۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فسطائیت کا لفظ محض مسولینی ہی کے افکار و نظریات کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ان خصوصیات و نظریات کی حامل دوسری کلیت پسند تحریکوں مثلاً قومی اشتراکیت اور نازیت وغیرہ کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہٹلر کی نازی تحریک مسولینی ہی کی تحریک کی پیداوار تھی اور ان دونوں ہی تحریکات میں بنیادی فرق محض اتنا تھا کہ فسطائی تحریک قوم پرست اور نازی تحریک نسل پرست تھی۔ اور فی زمانہ اس کا استعمال ایسے افراد اور تحریکات کے لیے بھی ہوتا ہے جن کا مقصد ایک کلیت پسند مملکت یا کسی ملک یا محض ایک قوم کی بالادستی قائم کرنا ہو۔ اسی طرح اس کا اطلاق شاونیت اور جارحانہ توسیع پسندی کے رجحانات رکھنے والے افراد و جماعت پر بھی ہوتا ہے۔

فضائی قانون (Air Law): بین الاقوامی قانون کی اصطلاح میں فضائی قانون سے شہری ہوابازی (Civil Aviation) کے وہ قواعد مراد ہیں جن کی پابندی طیاروں کی پرواز کے وقت ضروری ہے۔ فضائی قانون کا تعلق ریڈیو اور ٹیلی گراف سے بھی ہوتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد طیاروں کے ذریعہ سامان کے حمل و نقل کے طریقے میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی وجہ سے یہ ضرورت سمجھی گئی کہ طیاروں کی پرواز اور نقل حرکت پر ایک پابندی ہو اور باقاعدگی پیدا کی جائے۔ 1919 میں ایک بین الاقوامی کنونشن منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں اقوام کے دو مختلف نوعیت کے خیالات میں ایک ہم آہنگی اور سمجھوتہ کی صورت نکالی گئی۔ ہوائی پرواز کے متعلق اک نقطہ خیال یہ تھا کہ کسی ملک کو اس پوری ہوائی فضا پر اقتدار اعلیٰ حاصل رہے جو اس ملک کے اوپر واقع ہے دوسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ جس طرح پہلے سمندر میں جہازوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندی نہیں ہے اسی طرح کھلی ہوا پر کوئی پابندی نہ ہونی چاہیے۔ کنونشن نے ملک کے اقتدار اعلیٰ کو اس فضا پر تسلیم کیا جو اس ملک کے اوپر واقع ہے لیکن دوسرے ممالک کے ایسے طیاروں کی اس پرواز کی اجازت دی جو بالکل بے ضرر (Innocent) ہوں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بین الاقوامی ہوائی حمل و نقل کے قواعد کو کچھ اور موثر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور جنگ کے ختم کے بعد پہلے ہی نومبر 1944 میں شکاگو کنونشن بین الاقوامی شہری ہوابازی (International Civial Aviation) کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی اور اب عام طور پر تسلیم کیا گیا کہ کسی ملک کے بالائی فضا پر اس ملک کو قانونی اقتدار حاصل ہے۔

فطرآئین (Physiocrats): اٹھارہویں صدی کے ماہرین معاشیات کا ایک گروہ جس کا لیڈر کوئزنے (Quesnay) تھا اور جو بعد میں فطرآئین یا ماہرین معاشیات (Les Economistes) کہلانے لگے۔ وہ قدرتی نظام کے حامی تھے اور ان کے نزدیک حکومت کا کام صرف اس قدر تھا کہ وہ لوگوں کی جائداد کی حفاظت کرے اور قدرتی نظم و ضبط قائم رکھے۔ ان کے خیال میں دولت (Wealth) حاصل کرنے کا ذریعہ صرف زراعت ہے۔ اس لیے صرف زراعت پر ہی ٹیکس لگانا چاہیے۔ وہ آزاد تجارت کے بھی بڑے حامی تھے۔ اور ان سب مسائل میں تجارتیں یا تجارت پسندوں (Mercantalists) سے ان کا سخت اختلاف تھا۔ آزاد تجارت کے مسئلہ میں ان کے خیالات برطانیہ کے کلاسکی معاشین خاص طور پر آدم اسمتھ کے خیالات سے بہت قریب تھے۔ کوئزنے نے 1858 میں ایک معاشی جدول (Tablean Economique) شائع کیا تھا جس کو گردش دولت (Circulation of Wealth) اور معاشیات کے اندرونی روابط کے بارے میں جدید تصورات کی ابتدائی شکل کہا جاسکتا ہے۔ کوئزنے کے علاوہ آکینٹیلان (R. Cantillon) اینج جارج اور جے.ایس.مل اس مکتب خیال کی اہم شخصیتیں تھیں۔

فطرتی انصاف (Natural Justice): فطرتی انصاف کے تصور کو وضاحت سے بیان کرنا یا اس کی تعریف (Definition) تعین کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ تصور زمان و مکان کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ تاہم فطرتی انصاف کا نظریہ 25 صدیوں سے بھی زاید عرصہ سے مختلف نام اور نئے نئے لباس میں عود کرتا رہا ہے اور تاریخ و تہذیب و تمدن کے بدلتے ادوار میں مختلف معنی و مفہوم کا حامل رہا ہے۔ لارڈ ایشر (Lord Eisher) کا مقولہ (Dictum) غالباً دور حاضرہ کے مفہوم کی قریب ترین تفسیر ہے۔ لارڈ موصوف کا مقولہ یہ ہے کہ "فطرتی انصاف کیا ہے؟ نسل آدم کا حق و باطل کی بابت فطرتی احساس "Natural Justice? Man's Natural Sense of Right and Wrong." حقیقتاً فطرتی انصاف کی اس سے زیادہ وضاحت مشکل ہے۔ قطعی تعریف ممکن نہیں البتہ اس کے اثرات و مدارج بیان کیے جا سکتے ہیں۔

(2) فطرتی انصاف کا تصور اولاً یونانی فلسفیوں (Stoics) نے پیش کیا تھا اور افلاطون و ارسطو نے وضاحت سے اپنی تحریرات میں قلم بند کیا جرمن جیورسٹ کیلسن (Kelson) کا ادعا ہے کہ روح انصاف کی ہر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

توضیح ان کے صحائف میں موجود ہے۔ افلاطون کی نظر میں فطرت (Nature) اور آئیڈیل ہم معنی ہیں یعنی مابعد الطبیعیاتی اور غیر مرئی (Metaphysical & Beyond Appearance) مثلاً افلاطون کا فطرتی سیب (Natural Apple) وہ نہیں جو جنگل میں فطرت کے حوادث سے پیدا ہوتا ہے بلکہ باغ فردوس کا خیالی طلائی سیب حوریں جس کی نگرانی کرتی ہیں۔ (The Ideal Golden Apple of the Garden of Hesperides) اس طرح افلاطون کا فطرتی انصاف بھی ایک آئیڈیل ہے جو مشعل راہ ہو سکتا ہے لیکن انسان کی دسترس سے باہر۔ ان معنوں میں افلاطونی فطرتی انصاف ایک لاہوتی (Divine) اور مافوق الفطرت (Supernatural) تصور ہے۔

(3) ارسطو کے نزدیک انصاف (Justice) دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو مروجہ قوانین کے مطابق ہو دوسرا وہ جو آفاقی (Universal) یعنی سب کے لیے مساوی و خیر اندیش (Fairplay) اس آفاقی انصاف کا دارومدار مخصوص معاشرہ کے احساس حق و باطل پر مبنی ہے اور وہ جملہ نوع انسانی کے لیے جزو مشترک ہے اس کو فطرتی انصاف بھی کہتے ہیں۔

(4) رومیوں نے ارسطو سے آفاقی انصاف کا تصور لیا اور اس کو عملی جامہ پہنا کر "قانون فطرت" (Law of Nature) کی شکل دی بعد ازاں اس قانون فطرت کو (Jus jentium) کی صورت میں مدون کیا۔ رومیوں کی نظر میں (Jus jentium) ہمہ قوانین کے بنیادی اجزا کا حامل ایک ایسا مرکب ہے جس کو تبدیل کرنے کی کوئی ریاست مجاز نہیں۔ رومیوں نے فطرت (Nature) کا مفہوم اسٹائک (Stoic) فلسفیوں سے سیکھا جو "فطرت" کو خرد (Reason) کا ہم معنی سمجھتے تھے۔ جس بات پر سب لوگ متفق ہو جائیں وہی رومیوں کے نزدیک فطرت یا خرد ہے۔ اس لحاظ سے رومیوں کی نظر میں فطرت و خرد ایک تھے۔ یہ قانون ناقابل تبدیل (Immutable) تھا۔ لیکن یہ تصور زیادہ دن قایم نہ رہ سکا۔ جوں جوں تمدن منازل ارتقا سے گزرتا گیا اور انسانی شخصیت کی عظمت بڑھتی گئی قانون و قواعد بدلنے پڑے۔ ایسے اصول قانون کی دریافت جو غیر تبدیل ہو انسانی دسترس سے خارج ہے۔

(5) زوال روما کے بعد یورپ پر دور تاریک (Dark Ages: 400-1000 A.D.) چھا گیا اس دور میں سینٹ آگسٹائن (St. Augustine, 354-490 A.D.) جیسے مذہبی فلسفیوں نے قانون فطرت کے اصولوں کو نصرانی قانون الٰہی (Christian Divine Law) کے ہم معنی قرار دیا اور چرچ کو اس کا ترجمان۔ ساتویں صدی میں حجاز میں اسلام کا ظہور ہوا اور مابعد صدیوں میں مسلم فقہا نے قرآنی احکام کو وحی الوہی اور غیر تبدیل (Immutable) شکل دی جو نصرانی راہبین نے عیسائی نظریات کو دے رکھی تھی۔ اسلام کو بھی دین فطرت (Natural Religion) سمجھا گیا یعنی ایسا مذہب جو آفاقی عقل و خرد کے مطابق ہو اور احکام قرآنی کو قانون الٰہی (Divine Law) لہٰذا ناقابل تنسیخ و ترمیم۔

(6) آبائے نصرانیت (Christian Fathers) اور مسلم فقیہہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جو جامد اور دایم حقیقت پر ایمان رکھتا تھا۔ اس دور میں انسان اور اس کے اداروں کے ارتقاء کا کوئی تصور علمائے دین کے سامنے نہ تھا۔ بجائے ارتقائے آدم (Evolution of Man) کے وہ لوگ ضد ارتقائے آدم (Devolution of Man) کے قائل تھے کیونکہ آدم و حوا کو کسی گناہ کی پاداش میں جنت سے زمین پر پھینک دیا گیا تھا۔ اس لیے ان بزرگوں کے نزدیک قانون الٰہی (Divine Law) قانون دائمی (Eternal Law) اور قانون فطرت (Natural Law) سب ہم معنی اصطلاحات تھیں۔

(7) ازمنہ وسطیٰ (Middle Ages: 1000-1500 A.D.) میں سینٹ تھامس اکوینس (St. Thomas Aquinas, 1226-1274) نے چرچ کے قانون الٰہی اور رومیوں کے قانون فطرت میں مطابقت کی کوشش کی۔ موصوف کی رائے میں قانون فطرت ایک دائمی حقیقت ہے جس کی ہدایت انسان کو خرد (Reason) کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یہاں بھی قانون فطرت (Natural Law) کو قانون خرد (Law of Reason) کے ہم معنی سمجھا گیا۔ بقول سینٹ تھامس اکوینس "حق یہ ہے کہ تو اپنی فطرت یعنی خرد کے مطابق عمل کر۔" لہٰذا مروجہ قانون (Conventional Law) کو قانون فطرت یعنی قانون خرد کے مطابق ہونا چاہیے۔ موصوف کا کہنا تھا کہ "قانون فطرت انسان کے تخیر کو پابند کرتا ہے اور مروجہ قانون اس کے عمل کو۔" یہاں قانون فطرت عین ان معنوں میں مستعمل ہوا ہے جن معنوں میں

آج فطرتی انصاف (Natural Justice) کو سمجھا جاتا ہے۔

(8) عہد نشاۃ ثانیہ (Renaissance: 16th and 17th Centuries) میں قانون فطرت کے تصور میں ایک بار پھر تبدیلی آئی اور اس کو فطرتی حقوق آدم (Natural Rights of Man) کے ہم معنی قرار دیا گیا۔ گروشیس (Grotius: 1583-1645) کو یقین تھا کہ قانون فطرت، انسان کی فطرت (Nature) پر مبنی ہے یعنی خرد صحیحہ (Right Reason) کی ہدایت پر۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اخلاقی حاجت (Moral Necessity) پیدا ہوتی ہے انسان کی عقلی (Rational) اور معاشرتی (Social) فطرت کے باعث۔ لہٰذا قانون فطرت کے اصول معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً انسان کی عقلی اور معاشرتی فطرت معلوم کی جائے اور ثانیاً یہ دیکھا جائے کہ یہ اصول مہذب اقوام کے پسندیدہ بھی ہیں۔ ہوبس (Hobbes, 1588-1679) کی نظر میں قانون فطرت دراصل انفرادی حقوق آدم (Individual Rights of Man) کے تحفظ کا نام ہے۔ لوک (Lock: 1632-1704) ہر صورت قانون فطرت کے جواز پر شبہ ظاہر کرتا ہے۔ اس قانون پر پابندی کرانے پر مقتدر کون ہے؟ اور جو پابند تعمیل نہ ہو وہ قانون کیسا؟

(9) اٹھارھویں صدی کے اوائل میں قانون فطرت کے تصور میں زبردست تبدیلی آئی اور اس کو خرد پر مبنی حقوق آدم (Rights of Man) کا آئینہ دار سمجھا گیا۔ عقل ہمیں سکھاتی ہے کہ ہر شخص کے چند ایسے بنیادی حقوق ہیں جو مروجہ قوانین کی دسترس سے خارج ہیں۔ مثلاً حریت (Liberty) مساوات (Equality)، آزادی ضمیر (Freedom of Conscience) وغیرہ۔ ان حقوق کو امریکہ کے دستور میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ روسو (Rosseu, 1712-1778) ان حقوق کے ناقابل تنسیخ ہونے اور قوم کے اقتدار اعلیٰ رہنے کی ہمیشہ وکالت کرتا رہا۔ ڈیوڈ ہیوم (David Hume, 1711-1776) کے خیال میں قانون فطرت، خرد پر مبنی نہیں ہو سکتا اور نہ عقل انسانی کبھی ناقابل تبدیل قانون مدون کر سکتی ہے۔ یوں بھی انسانی افعال ہمیشہ خرد پر مبنی نہیں ہوا کرتے ہیں۔ خرد کی حیثیت ایک غلام کی سی ہے جو جذبات کے تابع رہتی ہے اور رہنا بھی چاہیے۔ یہی اس کا صحیح مقام ہے۔

(10) اٹھارھویں صدی کے اواخر میں خرد پر مبنی قانون فطرت کی کشش کم تر ہوتی گئی اور فلسفی کانٹ (Kant, 1724-1804) نے خرد کو رہبری کے اونچے مقام سے ہٹا دیا اور جنون و جذبات کو رہبر قرار دیا۔ کانٹ، فطشے (Fitche, 1762-1814) اور ہیگل (Hegal, 1770-1831) یہ تینوں فلسفی آدمی (Man) کو ایک جانور سمجھتے تھے جو قوانین طبعی (Physical Laws) کے تابع ہے لیکن ان پر حکمرانی کا مقتدر بھی اس نئے رومانی فلسفہ نے قانون فطرت (قانون خرد) کے تصورات پر کاری ضرب لگائی اور ان کا زوال شروع ہو گیا۔

(11) انیسویں صدی عموی طور پر قانون فطرت کے نظریات کی مخالف رہی۔ اس زمانہ کی جملہ قانونی تحریکات یعنی تاریخی رومانیت (Historical Romanticism) افادیت (Utilitarianism)، تجزیاتی اثباتیت (Analytical Positivism)، معاشی مادیت (Economic Materialism)، قانون فطرت اور "فطری حقوق" کی دشمن تھیں۔ بینتھم (Bentham, 1748-1832) قانون فطرت یا فطرتی حقوق کو دو افسانے (Fiction) یا ادبی بلاغت (Rhetoric) سمجھتا رہا۔ ساوگنی (Savigny, 1779-1861) نے جرمنی میں اور سر ہنری مین (Sir Henry Maine, 1820-1880) نے انگلستان میں قانون فطرت کے مفروضات (Assumptions) کا بے دردانہ تجزیہ کیا اور انھیں رد کر دیا۔ تاریخی اسکول کی نظر میں کوئی قانون فطرت یا کوئی دائمی قانون اس قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتا جس کو قانون کی تاریخ نے جنم دیا ہو۔

(12) آسٹن (Austen, 1790-1859) کی تجزیاتی اثباتیت (Analytical Posiivism) دراصل قانون فطرت کے نظریات کے خلاف ایک سنگین رد عمل تھا۔ تجزیاتی اسکول کے خزانہ میں رواجی قانون (Conventional law or law of the land) سے ہٹ کر قانون کے بنیادی عناصر جیسی کوئی چیز نہ تھی جن کو قانون فطرت، قانون الٰہی یا دائمی قانون (Eternal Law) کا نام دیا جاسکے۔ آسٹن کی نظر میں ہر قانون اقتدار اعلیٰ کا مظہر ہوتا ہے جو اس کو نافذ کرنے کی قوت رکھتا ہے او جس قانون کے پیچھے ایسی قوت نہ ہو وہ قانون نہیں افسانہ ہے۔

(13) انیسویں صدی کے ربع آخر میں علم اصول قانون کا عمرانیاتی اسکول

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(Sociological School of Jurisprudence) نمودار ہوا۔ اس نے بھی قانون فطرت کے تصورات پر کاری ضرب لگائی۔ جھیرنگ (Jhering, 1816-1892) اور دوگت (Duguit, 1859-1928) کی رائے میں قانون کسی منزل کا راستہ ہے اور وہ منزل معاشرہ کی ضروریات بلکہ اس کے تقاضوں کی تکمیل ہے۔ یہ تکمیل خیال آرائیوں سے نہیں ہوتی۔ آئیڈیل انصاف یا فطری انصاف محض خیال آرائی ہے حقیقت نہیں۔ اس ماحول میں نظریات قانون فطرت (Theories of Natural Law) کی بقا دشوار تھی اس لیے وہ نظریات مرگ مفاجات کی نظر ہوگئے۔

(14) بیسویں صدی کے اوائل میں پہلی جنگ عظیم (World War I: 1914-18) بھونچال کی طرح آئی اور معاشرہ کی آسودگی اور اقتصادی خوش حالی کو ہلا ڈالا۔ انیسویں صدی کی آسودگی (Security) خوش حالی (Prosperity) اور صیانت (Protection) سب ایک جھٹکے میں ہوا ہوگئے۔ اس لیے ذہن انسانی پھر آئیڈیل انصاف کی جستجو میں سرگرداں ہوا۔ نئی بوتلوں میں پرانی شراب ڈالی گئی اور نئے لباس میں پرانی حقیقتیں جلوہ گر ہوئیں۔ قانون فطرت کے تصورات کا پھر ایک بار احیاء ہوا۔ اسٹاملر(Stamler) نے عادل قانون (Just Law) کا نقشہ اتارا اور اسکے خد و خال پر کرنے کی سعی کی۔ یہ کوشش حقیقتاً پرانے قانون فطرت کو نئے پیراہن میں پیش کرنے کے سوا کچھ نہ تھی۔ یوں دیکھا جائے تو اقوام متحدہ کا "آفاقی اعلان حقوق انسانی" (Universal Declaration of Human Rights) اور ہندوستانی دستور کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights)دراصل قانون فطرت ہی کی جدید دستاویزات ہیں اور یہ حقوق مروجہ قانون ریاست سے بالاتر سمجھے گئے ہیں۔ آج امریکہ انھیں حقوق کی علم برداری کا مدعی ہے۔

(15) ان مساعی کے پس پشت جن کا مقصود اعلیٰ تر قانون کے اصول کی دریافت ہے "مایوسی کے وہ جذبات کارفرما ہیں جو مروجہ قانون کے مطابق انصاف رسانی کی ناکامی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی یہ خواہش بھی کہ ایسی چند خارجی اقدار (Objective Values) معلوم کی جائیں جو مروجہ قوانین و قواعد کو پرکھنے کے لیے کسوٹی کا کام دیں اور جو قانون اس معیار پر پورا نہ اترے وہ رد کیا جائے۔ مثلاً قانون کے نام پر ہم کسی طرح نازی جرمنی کے غیر انسانی احکامات کو جائز قرار دے سکتے ہیں جن کی بنا پر لاکھوں بے گناہوں کا خون کیا گیا۔ یا مثلاً ہندوستان میں ایمرجنسی کے دوران قانون میسا کے تحت ہزاروں گرفتاریاں صحیح سمجھی جاسکتی ہیں۔ یا آرائش بلد کے نام پر غریبوں کی بستیوں کو بلڈوزر سے تباہ و تاراج کرنے کا جواز پیدا ہوسکتا ہے۔

(16) آج کا نقطہ نظریہ ہے کہ انسان کااحساس حق و باطل (Sense of Right & Wrong) یعنی انصاف ایک اضافی اصطلاح ہے جس کے معنی و مفہوم ہر ایک قوم اور ہر دور تمدن کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور ہر بدلتے زمانہ کے ساتھ معیار انصاف رسانی میں تبدیلی لانی پڑتی ہے۔ پھر بھی ہر زمانہ میں انصاف کو حق، مساوات اور بے لوث فیصلوں کا ہم معنی سمجھا گیا یعنی اس مخصوص دور تمدن کے معیار حق و باطل کے مطابق۔ فی زمانہ فطرتی انصاف کے اس تصور کو کلیتاً عدالت کی صواب دید پر نہیں چھوڑا گیا۔ چونکہ ہر جج کے مخصوص تعصبات اس کے فیصلوں کا پس منظر ہوتے ہیں۔ اس لیے فطرتی انصاف کا خارجی معیار (Objective Norm) قایم کرنا ضروری تھا۔ پھر دور حاضر کی پیچیدہ زندگی اور اس کے پیچیدہ تر معاشرتی سیاسی اور اقتصادی مسائل کے پیش نظر حق، مساوات اور بے لوثی کا ایک نیا معیار ڈھالا گیا جو "اصول فطرتی انصاف" (Principles of Natural Justice) کے نام سے موسوم ہے اور یہ نیا معیار عدالتی ضابطہ (Judicial Procedure) کے چند اساسی قواعد کے سوا کچھ نہیں۔

(17) دوسری جنگ عالم (Second World War: 1939-1945) کے بعد سے "اصول فطرتی انصاف" (Principles of Natural Justice) کی اصطلاح کو حسب ذیل دو قواعد ضابطہ تک محدود کر دیا گیا ہے جن کو رومی دو لاطینی محاوروں میں بیان کرتے ہیں:

(الف) neino Judex in causa sua یعنی مدعی جج نہیں ہوسکتا۔

(ب) audi alteram partem) یعنی فیصلہ کے قبل طرفین کو سماعت کرنا لازم ہے۔

ان دو بنیادی قواعد اور چند ذیلی قاعدوں کو انصاف رسانی کی اساس قرار دے کر عدالت کے انفرادی ضمیر پر تحدید عاید کی گئی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دراصل یہ دونوں قواعد قدیم اور جامعہ "نظریہ قانون فطرت" کی باقیات الصالحات ہیں۔

(18) پہلے قاعدہ کو یعنی "مدعی جج نہیں ہوسکتا جسٹینین (Justinian, 483-565 A.D.) نے Institutes-535 A.D. کی کتاب 4 فصل 5 صفحہ 1 (Bk 4, T.5, L.1) میں بیان کیا ہے۔ یہ قاعدہ صرف اس ایک صورت تک محدود نہیں جبکہ جج خود کسی مقدمہ میں مدعی ہو بلکہ اس کا اطلاق ہر اس صورت پر ہوتا ہے جہاں مقدمہ سے جج کا کوئی مفاد وابستہ ہو۔ یہ مفاد (Interest) چاہے قانونی ہو یا ذاتی یا اقتصادی یا کوئی اور ہر صورت جج کو سماعت مقدمہ کا نااہل کر دیتا ہے۔ یہ اصول جج کے سوا ہر اس شخص سے متعلق ہے جو مجرد شہادت پر فیصلہ کا مجاز ہو مثلاً ثالث یا صدر شعبہ (Head of the Department) چنانچہ سپریم کورٹ آف انڈیا نے اس اصول پر بمقدمہ ریاست اترپردیش بنام محمد نوح (1858 S.C.A.-73) عمل کیا ہے۔ محمد نوح پولیس کا سپاہی تھا مہتمم پولیس نے اس پر جعل سازی کا الزام عاید کیا اور پھر خود ہی انکوائری کمیٹی کی صدارت کی اور نوح کو برطرف کر دیا۔ سپریم کورٹ نے ایسی سماعت کو فطرتی انصاف کے منافی قرار دیا۔

(19) دوسرا قاعدہ "فیصلہ سے قبل طرفین کو سماعت کرنے کا لزوم" حال ہی میں انگلستان کی اعلیٰ ترین عدالت (House of Lords) میں یہ اصول زیر غور آیا تھا اور معزز عدالت نے اس کی توثیق کردی ملاحظہ ہو۔ Ridge Vs. Baldwin (1963), 2-Au-E.R.66 اس مقدمہ میں لارڈ ریڈ (Lord Reid) نے تجویز کی کہ "کوئی ادارہ جس کو کسی فیصلہ کا اقتدار سونپا گیا ہو اس وقت تک فیصلہ صادر کرنے کا مجاز نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس نے ایسے فریق کو جو اس کے فیصلہ سے متاثر ہوگا اپنا مقدمہ پیش کرنے کا موقع نہ دیا ہو" یہ فیصلہ کلاسکی (Classical) فیصلہ بن گیا ہے اور سپریم کورٹ آف انڈیا نے بھی اسے اپنا لیا (ملاحظہ ہو (Associated Cement Co. Vs. P.N. Sharma, AIR 1965, S.C. 1595) تابعد کے جملہ فیصلے اس اصول کے حامی ہیں۔

(20) المختصر "فطرتی انصاف" کا فلسفیانہ تصور جو یونانی (Stoic) فلسفیوں کی ذہنی پیداوار تھی اور جس پر افلاطون اور ارسطو نے فلسفہ عدل کی عمارتیں کھڑی کیں اور جس کو رومیوں (Romans) نے "نظریہ قانون فطرت" کی شکل دی اور جس کو ازمنہ وسطیٰ میں آبائے نصرانیت اور مسلم فقہا نے قانون الٰہی، قانون دائمی سے تعبیر کیا۔ یہی وہ تصور ہے جس کو بیسویں صدی میں "اصول فطرتی انصاف" (Principles of Natural Justice) کے نام سے پکارا گیا۔ نشاۃ ثانیہ میں اس تصور نے انسان کے "فطرتی حقوق" کا جامہ پہنا جو معاشرتی معاہدہ (Social Contract) کے تحت سوسائٹی کو سپرد کیے گئے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے نصف اول نے "فطرت" کو "خرد" کا ہم معنی سمجھا اور قانون فطرت نے قانون خرد کی شکل اختیار کی۔ لیکن اس صدی کے نصف آخر میں کانٹ، فطشے اور ہیگل کے حملوں نے خرد کی بالادستی کو مقام رہبری سے گرا کر جنون و جذبات کو اس مقام پر بیٹھا دیا جس کے نتیجہ میں قانون فطرت یا قانون خرد کے تصورات کمزور پڑ گئے اور بالآخر انیسویں صدی میں فطرتی موت مر گئے۔ اب پھر بیسویں صدی میں جب جنگ عظیم اور جنگ عالم ثانی کی آتش فشانیوں سے اٹھنے والے اقتصادی مایوسی اور حقیقی انصاف سے ناامیدی کے گہرے بادل چھا گئے تو انسانی ذہن نے فطرتی انصاف، کی شکل میں امید کی کرن دیکھی اور اس طرح فطرتی انصاف کا پیراہن پہن کر قدیم نظریہ قانون فطرت پھر ایک بار زندہ ہو گیا۔ لیکن اس بار فطرتی انصاف کے اصولوں کو دو قواعد ضابطہ تک محدود رکھا گیا۔ ان دو قواعد کے تحت چند عدالتی ضابطہ (Judicial Procedure) بھی بنائے گئے جو انھیں دو اساس قواعد سے مشتق ہیں۔ ان قواعد کا اطلاق نہ صرف عدلیہ پر ہوتا ہے بلکہ نیم عدالتی (Quasi Jucidial) اور انتظامی اداروں کی کارروائیوں پر بھی۔ مگر یہ انتظامیہ کے پالیسی امور پر اثرانداز نہیں ہوتے۔

فطری قانون (Natural Law): گزشتہ تین ہزار سال کے دوران ایک ایسے قانون کا تصور جو اصلی قانون (Positive Law) سے بالاتر ہو اور مروجہ قوانین کے جواز کو پرکھنے کے لیے معیار بن سکے، بار بار نمودار ہوتا رہا ہے۔ ہر تمدن نے اس برتر تصور قانون کو نیا جامہ پہنایا ہے لیکن آخرکار یہ قانون ایک راز سربستہ ہی رہا بس ہر دم تلاش جاری ہے۔ یہ تلاش دراصل انسان کے پیدائشی (Inborn) احساس عدل کو مادی پیکر

(Concrete Form) میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے اور چونکہ آدمی کی طرح یہ احساس بھی ارتقائی نوعیت رکھتا ہے اس لیے ہر دور تمدن میں یہ مادی پیکر بدلتے رہے ہیں اور ہر دم نئے پیکر کی تلاش جاری ہے جو اس مخصوص عہد کے احساس عدل کی صورت گری کر سکے۔ اس دائمی تلاش نے صدیوں کے اوراق پر جو نقوش چھوڑے ہیں ان کا مختصر خاکہ اس بالا تر قانون کے تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

(2) عہد عتیق میں کلدان اور مصر کے تمدن نے اس بالاتر قانون کو کشف الوہی (Divine Revelations) کی شکل دی تھی جو تاج دار وقت پر عدل رسانی کے لیے وارد ہوا کرتے تھے۔ دور مابعد میں یہ انکشاف الہام رسوم بن کر قوموں کی ہدایت کے لیے پیش ہوتے رہے۔ موسیٰ کے محکمات عشریہ (Ten Commandments) روما کے فرامین اثنا عشریہ (Twelve Tables) یا انجیل و قرآن کے اوامر و نواہی (Orders and Injunctions) بالاتر قانون کے مظاہر ہیں جس نے انسانیت کے احساس عدل کو مادی پیکر دیا ہے۔ اسی طرح چین میں کنفیوشش (Confucius) کے فیصلے (600 ق م) اور ہند میں منو (Manu) کی دھرم شاستر (500ق م) اپنے اپنے تمدن اور زمانہ کے احساس عدل کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(3) قدیم یونان نے عدل فطری (Natural Justice) نظریہ کو جملہ قوانین و قواعد کا مقصود عین اور منتہی قرار دیا تھا۔ لیکن قدیم یونانیوں کے ذہن میں فطرت (Nature) کا وہ مفہوم نہیں تھا جو آج نظریہ ارتقا کے زیراثر بیسویں صدی میں ہم رکھتے ہیں۔ مثلاً یونانیوں کی نظر میں فطری سیب (Natural Apple) سے مراد جنگل کا وہ خود رو سیب نہ تھا جس کے تخم سے ہم اپنے باغ میں کاشت کردہ سیب اگاتے ہیں بلکہ خیابان ہسپرائیڈ (Garden of Hesperides) کا "طلائی سیب" تھا جو زمین کے ہر سیب کے لیے آئیڈیل اور نمونہ ہے۔ فطری شے (Natural Object) سے ان کی مراد اس شے کا جوہر ہوتا تھا جو اغراض میں پنہاں ہے۔ اور وہ خیالی جوہر ہی اس شے کی حقیقت سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح فطری عدل (Natural Justice) بھی یونانیوں کی نظر میں ایک ایسا نظریہ تھا جس کا حصول فطری قانون (Natural Law) کے اطلاق ہی سے ممکن تھا اور یہ فطری قانون ایک خیالی قانون (Ideal Law) تھا جس کے ساتھ ہم آہنگی پر اصلی قانون (Positive Law) کا مقصود عین اور لازم تھے۔ فلسفہ کے جوہر و عرض کا امتیاز یونانیوں کی قانونی دنیا میں فطری و اصلی قوانین کے ساتھ بھی وابستہ تھا۔

(4) یونانی تمدن میں فطری قانون کی بابت خیال آرائیاں (Speculations) افلاطون (400 ق م) سے آغاز ہوتی ہیں ایک عاقل کا ادراک (Reason of the Wiseman) جس کو افلاطون نے اپنے معرکۃ الآرا کتاب "جمہوری" میں فلسفی بادشاہ سے موسوم کیا ہے۔ فطری قانون کی دریافت کا واحد وسیلہ اور فطری عدل کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بالاتر قانون مروجہ قوانین کے جواز کو پرکھنے کا معیار تھا۔

(5) رومیوں کی عمل پسند (Practicle) امنگ نے فطرت کے اس یونانی تصور کو جو ادراک (Reason) پر مبنی تھا مفتوحہ دنیا پر حکمرانی کی غرض سے ایک آفاقی ضابطہ قانون (Universal System of Rules) کی شکل دے دی۔ رومی (قانون اقوام) اور یونانی قانون فطرت ہم معنی بن گئے۔ یعنی ایک ایسا آفاقی قانون جس کی کسوٹی پر مروجہ قوانین کے جواز کو پرکھا جاسکے۔ سیسرو (Cicero) ہمیشہ اس بات پر زور دیتا رہا کہ "اس قانون کو بدلنے یا اس سے انحراف کرنے یا اس کو منسوخ کرنے کی اجازت نہیں نہ سینٹ (Senate) نہ عوام اس قانون سے ہمیں چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔"

(6) ازمنہ وسطیٰ (500-1500 ع) میں مغربی ممالک میں نصرانیت نے اور مشرق قریب میں اسلام نے ایک ایسے الوہی قانون کا تصور پیش کیا جو انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور قواعد سے بالاتر تھا۔ لیکن اس عہد میں "فطرت" کا مفہوم بدلتا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں سینٹ تھامس اکوینس (St. Thomas Aquneas) نے قانون کی برتری (Supermacy) کا اعلان کیا لیکن یہ قانون کسی انسان کا بنایا ہوا قانون نہ تھا بلکہ یہ وہ قانون تھا جو آفاق (Universal) اور وحدت الوجود (Unity of Existence) میں کارفرما ہے۔ اس کو فطری قانون (Natural Law) نام سے موسوم کیا گیا۔ مغرب میں نصرانی چرچ مصر تھا کہ جملہ مروجہ قوانین "فطری قوانین" سے ہم آہنگ نہ ہونے چاہئیں اور یہ فطری قانون، ایک ایسا برتر قانون ہے جس کی تعبیر کا مجاز صرف پوپ کو ہے۔ مشرق میں کم و بیش اسی

دور میں مسلم فقیہہ بھی محکمات قرآنی کو قانون الٰہی یا قانون فطرت قرار دے رہے تھے۔ ہر دو کی نظر میں یہ قانون دائمی اور غیر تبدیل اصولوں کا حامل تھا جس کے تابع جملہ دنیاوی قوانین کو رہنا چاہیے۔ واضح رہے کہ ازمنہ وسطی میں فطرت (Nature) کا مفہوم یونانی تصور سے جداگانہ تھا۔

(7) نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور اصلاح (Reformation) کے دوران اور بالخصوص 16 و 17ویں صدی عیسوی میں فطری قانون کے تصور نے ایک نیا روپ لیا۔ گروشیس (Grotius) اور اس کے تابعین نے اس کو قانون بین الاقوام کی اساس قرار دیا تاکہ اقوام عالم کے باہمی تعلقات استوار کیے جائیں۔ اٹھارھویں صدی میں فطری قانون کو ادراک کلی (Universal Reason) کا ہم معنی سمجھا گیا۔ لیکن اس صدی کے اواخر میں ادراک کلی کے خطرناک مضمرات کو انقلاب فرانس نے ہویدا کردیا۔ اس نظریے نے حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے قوانین مروجہ کے استعمال کا جواز پیدا کیا۔ آخرش فلسفی کانت (Kant) نے اس ادراک کو جو انسانی غرور کی منارہ تھی اعلیٰ مقام سے ہٹاکر قعر مذلت میں ڈھکیل دیا۔

(8) انیسویں صدی نے ادراک کلی (Universal Reason) کے جنازہ کو فطری قانون کی نعش کے ساتھ بصد احترام دفن کردیا۔ ان کی جگہ "ریاست" اور "جمہور" کو دے دی گئی اور دونوں کو خیالی فطری قانون کی پابندی سے آزاد کر دیا گیا۔ یہ صدی سائنسی طریق کار (Scientific Method) کی شاندار کامیابی سے شروع ہوئی۔ اس کے نصف دوم میں ڈارون کے نظریہ ارتقا نے سائنسی طریق کار کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اس کا اثر سائنس کے ماسوا قانون پر بھی پڑا ایک معیاری فطری قانون (Normal Natural Law) کی جگہ قانون علت و معلول (Casual Law) کو حاصل ہوئی اور خیال آرائیوں کی گنجائش ختم ہوگئی۔ ایسے دور میں ایک تنی قانون فطرت کو جسے تجربہ گاہ میں نہیں آزمایا جاسکتا تھا زندہ رکھنا دشوار تھا۔

(9) تاہم ایک بالاتر قانون کا تصور جو دائمی حقائق کا مظہر ہو اور آئیڈیل انصاف کی تڑپ جو قوانین مروجہ سے تسکین نہ پاسکتی ہو (انسان کے دل و دماغ سے مٹائی نہ جاسکی۔ بیسویں صدی نے ان قدیم معیاروں کو ایک بار پھر سر اٹھاتے دیکھا جو فطری قانون کو اصلی قوانین کی کسوٹی سمجھتے تھے۔ آج ہم مکرر سن رہے ہیں "شراب کا بیوپار شخصی آزادی کا لوازمہ نہیں" یا یہ کہ فلاں قانون "بنیادی حقوق کا بطلان کرتا ہے" یا فلاں قاعدہ "فطری عدل" کے مغائر ہے یا کوئی فیصلہ "اس کی خلاف ورزی کرتا ہے" لہٰذا کالعدم ہے وغیرہ۔ یہ سب ارشادات قدیم فطری قانون کے احیا کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

(10) دوسری جنگ عالم کے بعد پھر ایک بار ان دوامی اقدار کی تلاش برآمد ہوتی ہے جن کی کسوٹی پر مروجہ قوانین کو پرکھا جاسکے۔ اسٹملر نے جرمنی میں اور ڈل وکوہیو (Del Vecohio) نے اٹلی میں، عادل قانون (Just Law) کا خاکہ پیش کیا ہے جو حقیقتاً قدیم فطری قانون کو نیا جامہ پہنانے کی سعی ہے یوں دیکھا جائے تو امریکن دستور کے "بنیادی حقوق" جن کو دستور ہند نے بھی اپنایا ہے اور اقوام متحدہ کا "منشور حقوق انسانی" (Universal Declaration of Human Rights) دراصل فطری قانون کی جدید دستاویزات ہیں اور انھیں اصلی قانون سے بالاتر مرتبہ حاصل ہے۔

فقہ: فقہ سے مشتق ہے اس کے معنی سوجھ بوجھ اور فہم معرفت و بصیرت کے بھی ہیں اور فتح (کھولنا) اور شق (پھاڑنا) کے بھی ہیں۔ نتیجہ کے لحاظ سے دونوں معنی یکساں ہیں۔ اصطلاح شریعت میں احکام اعمال شرعیہ اور دینی قوانین کے مسائل اور ان کے دلائل کے علم کا نام فقہ ہے۔ پس فقہ وہ ہے جو تفکر و تدبر کرکے قوانین دین اور احکام شریعت کے حقائق کا پتہ لگائے اور مشکل و مطلق امور کو واضح کرے اس اہم اور مشکل ذمہ داری سے فقہ اسی وقت عہدہ برآ ہوسکتا ہے جب وہ ظاہری علوم سے واقفیت کے ساتھ قلب و دماغ کی صفائی اور نفس و روح کی طہارت بھی رکھتا ہو دنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں کا رمز شناس اور اپنے زمانہ کے حالات و تقاضوں سے باخبر ہو۔

موجودہ زمانہ کی طرح اسلام کے ابتدائی دور میں فقہ نے باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار نہ کی تھی اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں اس کی باقاعدہ تدوین بھی نہیں ہوئی تھی۔ قدیم زمانہ میں فقہ کا مفہوم نہایت وسیع اور اسلامی زندگی کے تمام شعبوں کا محیط تھا اس میں الٰہیات یعنی خدا کی ذات و صفات، علم طریقت یعنی نجات یا ہلاکت کے موجب اعمال و افعال اور شریعت کے ظاہری احکام و مسائل پر تفصیل سے بحث

ہوئی تھی اور فی الجملہ اس کے اندر تمام دینی علوم شامل تھے اس میں ابتداء فقیہ وہ شخص کہلاتا تھا جس کو ایسا ملکہ استنباط اور دینی بصیرت حاصل ہوئی تھی۔ جس کے ذریعہ وہ احکام شریعت، اسرار معرفت او مسائل حکمت سے واقفیت حاصل کرلیتا تھا نیز وہ فروعی مسائل کے استنباط اور ان کی باریکیوں کا عالم ہوتا تھا جو شخص اس دینی بصیرت اور ملکہ استنباط کا حامل ہوتا تھا وہی فقیہ کہلاتا تھا گویا اس کے دائرہ یں دنیا و آخرت میں نفع و نقصان پہنچانے والے تمام اعمال آتے تھے۔

بعد میں یونانی فلسفہ کے اثرات نے عقائد کی سادگی ختم کرکے ان کو مباحث طویل اور پرپیچ کر دیے اس لیے عقائد و کلام کا ایک علاحدہ فن وجود میں آگیا اس کے نتیجہ میں فقہ کی ذمہ داری میں جزئیات اور ان کے علل و اسباب سے واقفیت اور ان ہی فروعی مباحث و مسائل میں انہماک و اشتغال تک محدود ہوگئی فقہ کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ شرعی قوانین اور ان کے تفصیلی دلائل سے واقف ہو اور شریعت کے عملی احکام کا علم ہو اس زمانہ میں فقہا کے دائرہ عمل میں جو احکام و امور داخل سمجھے جاتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

عبادات یعنی نماز، روزہ، زکوۃ اور حج معاملات یعنی معاشرتی و مالیاتی قوانین مثلاً خرید و فروخت، عاریت امانت، ضمانت وغیرہ مناکحات یعنی عائلی قوانین جیسے نکاح و طلاق، عدت، نسب، ولایت و ہیئت وراثت وغیرہ عقوبات یعنی جرائم جیسے قتل ،چوری، شراب اور تہمت وغیرہ اور ان کی تعزیرات و حدود قصاص اور خون بہا وغیرہ۔

فقہ اکبر: یہ عقائد میں ایک مختصر رسالہ ہے جو چھپ گیا ہے اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں ملا علی قاری کی شرح متداول ہے۔

فقہ و فقہا- شہادت: غیب (غائب اور پوشیدہ) کی ضد ہے اس کی اصلی معنی حاضر موجود اور ظاہر کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب و الشہادۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ غائب و موجود اور چھپے اور کھلے کا جاننے والا ہے۔ یہیں سے یہ لفظ گواہی قطعی خبر اور اس بیان کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو کسی متنازعہ فیہ اور تحقیق طلب معاملہ میں دیا جائے تاکہ اس سے صحیح رائے قایم کرنے اور فیصلہ کی نتیجہ تک پہنچنے میں مدد ملے کیونکہ جو شخص کسی واقعہ کا چشم دید گواہ ہو اس کا بیان اور اس کی خبر و اطلاع اس واقعہ کے بارے میں علم و واقفیت اور مشاہدہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے قطعی ہوتی ہے۔

مقدمات اور نزاعی مسائل کے فیصلے اور عدالتی کارروائی کے وقت شہادت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر بھی شہادت فرض کفایہ ہے اور اس کو چھپانا یا جھوٹی گواہی دینا بڑا گناہ ہے۔

شہادت کے لیے کبھی چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی تین کبھی دو اور کبھی ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی کافی ہوتی ہے مگر گواہ کو عاقل بالغ دانا بینا معتبر اور راست باز ہونا چاہیے وہ متہم نہ ہو اور اس پر حد قذف نہ جاری کیا گیا ہو اگر جھوٹے گواہ کا جھوٹ ظاہر ہوگیا تو قاضی اس کو مناسب سزا دے گا اور آئندہ اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی۔ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم گواہی اسی حالت میں درست مانی جاسکتی ہے جب کوئی مسلمان گواہ موجود نہ ہو البتہ ایک غیر مسلم کی دوسرے غیر مسلم کے متعلق شہادت مانی جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے احکام و شریعت کو لوگوں تک پہنچایا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی ہے یہ لوگوں کے لیے خدا کی اس کے دین کی اس کی کتاب اور کتاب کے احکام و ہدایات اور تعلیمات کی شہادت ہے۔ نبی کے بعد صحابہ نے تابعین کے لیے اور انھوں نے اپنے بعد والوں کے لیے اسی طرح دین کی شہادت دی ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے بس امت محمدیہ ہر دور میں لوگوں کے لیے دین کی شہادت دیتی رہی ہے چنانچہ قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ پیغمبر تم پر شہید (دین کا گواہ) ہے اور تم لوگوں پر شہید (دین گواہ) ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہادت علی الناس اس امت کا خاص منصب اور عظیم فریضہ ہے جس کا اس سے عہد لیا گیا ہے اور جس کی وہ امین بنائی گئی ہے۔ اس امانت میں خیانت اور کتمان شہادت ایک بڑا جرم ہے۔

انبیاء علیہم السلام قیامت کے دن اپنی اپنی امتوں کے بارے میں اللہ کے روبرو شہادت دیں گے کہ اللہ کا دین ان کو پہنچ چکا تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنی گمراہی کی روشنی سے باز نہ آئے۔ امت محمدیہ کو بھی آخرت میں یہ مرتبہ حاصل ہوگا اور وہ گمراہوں کے خلاف انبیا کی تائید میں اس روز شہادت دے گی۔

خدا کی الوہیت اور سیدنا محمد عربی علیہ الالاف تحیۃ کی رسالت کے اقرار کو بھی شہادت کہا گیا ہے جس کو ہم اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمد رسول اللہ کہہ کردیتے ہیں۔ یہ الفاظ کلمہ شہادت کہے

جاتے ہیں۔ فقہا نے اس اقرار کے لیے شہادت باللسان کی قید لگائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ محض دل سے اعتراف کافی نہیں ہے بلکہ زبان سے بھی شہادت ضروری ہے۔

جو لوگ اللہ کے دین کی اشاعت اور دنیا سے فتنہ و فساد مٹانے کے لیے میدان کارزار میں مارے جاتے ہیں ان کو بھی شہدا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دراصل خدا کے دین کی شہادت اور گواہی دیتے ہوئے راہ خدا میں اپنے کو قربان کرتے ہیں۔ شہید کسی قوم کے ترجمان نمائندہ اور لیڈر کو بھی کہتے ہیں۔ جو قوم کے اہم مسائل نازک معاملات اور پنچایتوں وغیرہ کے موقع پر موجود رہتا ہے۔

فقہ و فقہا- کتاب: لغت میں ہر لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے ہیں۔ صحیفہ اور خط کو بھی کتاب کہتے ہیں اور اس سے فریضہ حکم اور فیصلہ بھی مراد ہوتا ہے لیکن اسلامی اصطلاح میں اس سے قرآن مجید مراد ہے۔ تدریج تئیس (23) سال میں اللہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا اور اب ٹھیک اسی طور پر مصاحف میں لکھا ہوا موجود ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ سے یہ متواتر نقل ہوا ہے۔ ہجرت سے پہلے مکہ میں 13 سال تک جو قرآن نازل ہوا تھا اس میں بنیادی اعمال و عقائد اترے اور جو مدینہ میں 10 سال تک قرآن نازل ہوا اس میں تفصیلی احکام اور زندگی کے مختلف گوشوں کے متعلق بنیادی معاملات ہیں۔

اسلامی قانون کا سب سے اہم اور اولین ماخذ بھی ہے یہ شریعت کے اصول و کلیات اور اسلام کی بنیادی ہدایات و تعلیمات پر مشتمل ہے اس میں جزوی قوانین کا ذکر ہے۔ رسول اللہ کی حدیث و سنت میں اس کے اجمالات و اشارات کی توضیح کی گئی ہے۔

کتاب کی آیتوں کی دو قسمیں ہیں: (1) محکمات و متشابہات۔ ان کی تعریف و تعین میں علمائے اصول کا بڑا اختلاف ہے ایک گروہ کے خیال میں محکم کی مراد معلوم ہوتی ہے اور متشابہ کا علم اور اس کی تاویل صرف اللہ کو معلوم ہے بعض کے نزدیک محکم کی مراد واضح اور متشابہ کی غیر واضح ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ محکم کی تاویل میں ایک کے سوا مزید احتمال کی گنجائش نہیں ہوتی اور متشابہ کی تاویل میں متعدد وجوہ کا احتمال ہوتا ہے۔

اس سلسلہ کی ایک بحث نسخ کی ہے اکثر علما قرآن میں نسخ کے قائل ہیں مگر بعض علماء کے نزدیک قرآن میں نسخ نہیں ہوتا۔ پھر جو لوگ نسخ کے قائل ہیں ان میں جماعت کا خیال ہے کہ کتاب کا کتاب ہی سے نسخ ہوسکتا ہے لیکن بعض کے نزدیک سنت سے بھی اس کا نسخ ہوسکتا ہے اور سنت کے کتاب سے نسخ میں کوئی کلام نہیں۔

فلاحی ریاست (Welfare State) : فلاحی مملکت یا فلاحی ریاست درحقیقت علم سیاسیات سے تعلق رکھنے والا ایک خطاب ہے۔ یہ اس حکومت کو دیا جاتا ہے جو اپنے تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کو حکومت کا فرض اور شہریوں کا حق سمجھتی ہے۔ مہذب معاشرہ میں حکومت کا فرض محض ملک کی سرحد کو تحفظ مہیا کرانا یا دائرۂ حکومت کو بڑھانا نہیں ہے۔ باغیوں کی سرکوبی، کرنسی چھاپنا، سڑکیں اور ڈاک و تار کا نظام بہتر بنانا بھی اس کے لیے کافی نہیں۔ آج حکومت کی ذمہ داری عوام الناس کے معیار زندگی کو بلند کرنا، حادثات زندگی سے حفاظت کرنا اور ناگہانی آفات کے شکار لوگوں کو پھر سے بسانا بھی ہے۔

کہانی مشہور ہے کہ گوتم بدھ نے عنفوان شباب میں بیماری بڑھاپا اور موت کے دلدوز مناظر دیکھ لیے تھے اور اسی لیے انھوں نے بیراگ لے لیا تھا۔ انھوں نے ترک دنیا میں نجات ڈھونڈلی تھی۔ یہ مسائل آج بھی اتنے ہی سنگین ہیں۔ آج کا انسان بیماری بڑھاپے اور موت کو ختم تو نہیں کرسکا ہے لیکن ان کے منفی اثرات کو کافی حد تک کنٹرول کرنے لگا ہے۔ اس کام میں حکومت اس کی حصہ دار ہوتی ہے۔

یہ ستم ظریفی ہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام دونوں پر مشتمل طرز حکومت فلاحی ریاست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ درحقیقت آج تقریباً ہر متمدن سماج فلاحی ریاست چلانے کا اعلان کرتا ہے۔

ڈاکٹر سچدیوا کے خیال کے مطابق یہ چار ماڈل ہیں۔ اور ہر فلاحی نظام ان میں سے کسی ایک یا زیادہ پر مبنی ہوسکتا ہے۔ یہ ماڈل مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) خاندانی نظام پر مبنی ماڈل (Familial Model)

(2) معالجاتی ماڈل (Residual Model)

(3) ملا جلا معاشیاتی ماڈل (Mixed Economy Model)

(4) آمرانہ ماڈل (State Control Model)

(1) خاندانی نظام پر مبنی ماڈل : اس ماڈل میں فلاح و بہبود کا مرکز حکومت فرد واحد کو نہیں بناتی بلکہ خاندان کو اکائی مانتے ہوئے اسی کے ذریعہ سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ مثلاً برطانیہ میں بچوں کے پیدا ہونے پر کنبہ کو وظیفہ ملنے لگتا ہے یا ہندستان میں بوڑھوں کے لیے آشرموں کے بدلے عمردراز شہریوں کے لیے پنشن کا بندوبست کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے کنبے میں ہی رہیں۔ مگر انھیں کچھ راحت مل سکے۔

(2) معالجاتی ماڈل میں مصیبت زدہ افراد خاندان یا گروہوں کی مصیبت کو کم کرنے یا مدد پہنچانے کا کام کیا جاتا ہے لیکن مصیبت یا دشواریوں سے بچنے کی احتیاطی تدبیر اختیار نہیں کی جاتیں۔

(3) ملاجلا معاشیاتی ماڈل ملے جلے معاشیاتی نظام کی طرح ہی ہوتا ہے۔ اس میں افراد خاندان اور گروہ کافی حد تک اپنی مدد اپنے آپ کرتے ہیں۔ حکومت فلاحی کام کرنے کے لیے شہریوں سے پیسہ بھی لیتی ہے یہ کسی حد تک بیمے کی شکل میں ہوتا ہے۔

(4) آمرانہ یا حکومتی ماڈل پوری طرح ریاست پر منحصر ہوتا ہے تمام اشتراکی اور اشتمالی ممالک اپنے شہریوں کی ہر ضرورت کو پالنے سے قبر تک پورا کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ فلاحی ریاست کی جائے پیدائش ہے۔ 1601 میں ملکہ الیزبیتھ اول کے دوران حکومت اس طرح الیزبیتھن پورلو (Elizabethen Poor Law) کی داغ بیل پڑی جس میں زمانہ حال تک تبدیلی ہوتی رہی اور قانون کسی حد تک برقرار رہے۔ مزدوروں کے حقوق، پبلک ہیلتھ قانون، سکونتی قانون اور سب سے بڑھ کر بزرگوں کے لیے پنشن کے قانون بن گئے۔ مارگریٹ تھیچر کے زمانے میں ضرور اس طرز حکومت کو دھکا لگا۔ آج برطانیہ کو آزاد شراکتی فلاحی ریاست (Libral Collectivistic Welfare State) مانا جاتا ہے۔ اسی طرح یو.ایس.اے. کم تر درجہ کی فلاحی ریاست (Reluctant Welfare State) ہے۔ وہاں پرائیویٹ ادارے زیادہ کام کرتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے فلاحی کام کم ہی کیے جاتے ہیں۔ سویڈن مکمل طور پر فلاحی ریاست ہے البتہ جرمنی کی فلاحی ریاست بیمے کے نظام پر مبنی ہے۔

تیسری دنیا کے باقی ممالک کی طرح ہندستان بھی فلاحی ریاست بننے کی طرف گامزن ہے لیکن ابھی منزل دور ہے۔

فلاحی ریاست کے لیے ضروری عوامل ہیں :

(1) مکمل روزگار بے روزگاری کا خاتمہ۔

(2) امیر اور غریب کی درمیانی خلیج کا خاتمہ۔

(3) سماجی خدمات کے دائرے میں توسیع۔

(4) تربیت شدہ افراد کی تعداد میں اضافہ۔

(5) غریبی، جہالت، وبائی امراض، گندی بستیوں اور بھوک پر بتدریج کنٹرول۔

ہندستان میں ایک ارب آبادی ہو جانے کی وجہ سے یہ سب حالات پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے علاوہ صدیوں کی غلامی بدعنوانی اور دوسری مشکلات راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اپنے آئین میں ہندستان نے فلاحی ریاست ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں ہر میدان میں پیش رفت بھی کی ہے۔ عورتوں بچوں اور نوجوانوں کے علاوہ معذوروں، بزرگوں اور درج شدہ ذاتوں کے لیے ہندستان کی جامع پالیسیاں ہیں۔ روزگار کے حق کو بنیادی حقوق کے قریب تر لانے کے لیے۔ ٹرائی سیم (TRYSEM) اور آئی آر ڈی پی (IRDP) شروع کیا گیا۔ محدود پیانہ پر بزرگوں کو پنشن دینے کا تجربہ کیا گیا۔ بچوں کے لیے آئی سی ڈی ایس (ICDS) کی اسکیم شروع کی گئی۔ جس کے تحت ہندستان کے 20 فیصد بچوں کو اضافی غذائیت اور دوسری سہولیات ملتی ہے۔

اس سب کے باوجود ہندستان میں خطِ افلاس سے نیچے رہنے والے تقریباً 33 فیصد لوگ موجود ہیں۔ بے روزگاری کے مسئلے کے علاوہ تقریباً دس کروڑ بچے اسکول سے باہر ہیں۔ ان میں سے اکثر مزدوری کرتے ہیں۔ اس لیے ہندستان بنیادی ضرورتوں کے سلسلے میں بہت پیچھے ہے۔ اس حالت میں ہندستان کو فلاحی ریاست نہیں قرار دیا جاسکتا اگرچہ حکومتی پالیسی کے ہدایتی اصول اور اکثر دستوری شقیں سماجی انصاف، برابری اور انسانی حقوق پر منحصر ہیں۔ لیکن غربت، جہالت اور کثرت آبادی بھارت کے فلاحی ریاست ہونے میں حارج ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فلاحی معاشیات (Welfare Economics): فلاحی معاشیات ایسے ایجابی معیارات (Positive Criteria) قائم کرنے سے متعلق ہے جن کی بنا پر پیداوار اور تقسیم دولت سے متعلق ایسی پالیسیاں اختیار کی جاسکیں جن سے بیشترین سماجی فلاح (Maximum Social Welfare) حاصل ہوسکے۔ بہبود معاشیات کے چند اہم نظریوں کو پیش کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ سماجی بہبود سے کیا مراد ہے اور کیا یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں کمی و بیشی کا معروضی (Objective) طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر نہیں تو سماجی بہبود کے ایجابی نظریے کی تشکیل ناممکن ہوگی۔ سماجی بہبود سے مراد ان تمام افراد کی معاشی خوشحالی کا مجموعہ ہے جن پر سماج مشتمل ہوتا ہے اور افراد کی معاشی بہبود سے مراد وہ تشفی یا افادہ ہے جو اسے مبادلہ پذیر (Exchange) مادی اور غیر مادی اشیا کے استعمال سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی بہبود سے مراد اجتماعی تشفی یا افادہ ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سماجی بہبود کی اس تعریف کے ضمن میں معاشین نے افراد کی معاشی آزادی جسے صارفین کی خود مختاری (Sovereignty of Consumers) بھی کہتے ہیں ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔

سماجی فلاح کی مذکورہ تعریف کے پیش نظر یہ ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا اس میں کمی یا بیشی کا معروضی طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں اگر افادہ ایک معروضی قسم کی کوئی شے ہوتا تو ظاہر ہے کہ مختلف افراد کے افادے کا تخمینہ اور تقابل کرکے ہم یہ کہہ سکتے کہ معیشت میں پیداوار اور تقسیم دولت میں تبدیلی کی وجہ سے مجموعی افادہ میں کمی یا بیشی واقع ہوئی ہے۔ لیکن افادہ ایک موضوعی اور ذہنی حالت کا نام ہے جس کی پیائش کے لیے ہمارے پاس افادہ پیما (Utility Meter) جیسا کوئی آلہ نہیں اس لیے ہم یہ نہیں کرسکتے کہ سماجی فلاح میں پیداوار اور تقسیم میں تبدیلی سے کس قدر کمی یا بیشی واقع ہوئی ہے۔ نیز زر یا روپیہ کے ذریعہ بھی فلاح میں کمی یا بیشی کی پیائش نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ اول تو زر ایک ایسا پیمانہ قدر ہے جس کی خود اپنی قدر مختلف افراد کے نزدیک مختلف ہوتی ہے دوسرے یہ کہ وہ کسی خاص شخص کے نزدیک مختلف اشیا کی مختلف مقداروں کے افادہ مختتم کا ہی تخمینہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لہٰذا زر کے توسط سے مختلف افراد کو اشیا اور خدمات سے جو مختلف مقداروں میں کلی افادہ (Total Utility) حاصل ہوتا ہے اس کا تخمینہ اور مقابلہ کرنے سے جو مجموعی افادہ حاصل ہوگا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال اگر ہم یہ نہ معلوم کرسکیں کہ کسی حالت میں سماجی فلاح میں "کس قدر" کمی یا بیشی ہوئی بلکہ صرف یہ کہہ سکیں کہ سماجی فلاح میں ایک خاص حالت کے مقابلے میں دوسری حالت میں اضافہ ہوگیا تو ہمارا مقصد پورا ہوسکتا ہے۔

جہاں تک انفرادی فلاح کا تعلق ہے اگر کوئی شخص اپنے ذاتی ترجیحاتی پیمانے (Scale of preference) کی بنا پر مختلف اشیا کے مجموعے کے مقابلہ میں کسی دوسرے مجموعے کا انتخاب کرے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نزدیک نتیجہ مجموعہ اشیا سے زیادہ افادہ حاصل ہوگا۔ اس طرح انتخاب کسی شخص کی انفرادی خوشحالی کے تقابل کا ایک معروضی ذریعہ ہے۔ لیکن چونکہ مختلف افراد جن پر سماج مشتمل ہوتا ہے ان کے ترجیحاتی پیمانے موضوعی اور مختلف ہوتے ہیں اس لیے مختلف افراد کی خوشحالی کا معروضی طور پر تخمینہ اور تقابل ممکن نہیں جس کی وجہ سے انفرادی انتخاب سے ایک اجتماعی انتخاب اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ سماج افراد سے علیحدہ "عضویہ" نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا کوئی علیحدہ "دماغ" ہوتا ہے جس کے انتخاب کو سماجی فلاح میں اضافہ کا مظہر قرار دیا جائے۔ نیز جیسا کہ ابتدا میں ہی وضاحت کردی گئی کہ کسی ایک شخص یا ایک جماعت کے ترجیحاتی پیمانے کو پورے سماج کا ترجیحاتی پیمانہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اگر سماج کے تمام افراد کا ترجیحاتی پیمانہ یکساں ہو جو حقیقت کے خلاف ہے تو کسی ایک شخص کا انتخاب سماج کے انتخاب کے مترادف ہوگا لہٰذا افادے کی موضوعی نوعیت اور افادے کے بین شخصی تقابل (Interpersonal Complication of Utility) کی دقت کو دور کرنے کے لیے معاشین نے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں جن کی بنا پر سماجی بہبود کے مختلف نظریے پائے جاتے ہیں۔

فلاحی مملکت (Welfare State): فلاحی مملکت اس مملکت کو کہتے ہیں جو شہریوں کی جملہ ضروریات زندگی کی فراہمی کی ذمہ دار ہوتی ہے تاکہ وہ معیاری اور باعزت زندگی گزار سکیں۔ فلاحی مملکت اپنے شہریوں کے سماجی معاشی تحفظ کے لیے ایسا ماحول تیار کرتی ہے جس میں رہ کر ہر شہری اپنی شخصیت کی اعلیٰ تعمیر کرے اور اپنی صلاحیت کو بہتر طور پر بروے کار لاسکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ایسا نظام وضع کرتی ہے جس میں وہ نہ صرف تمام شہریوں کے لیے بنیادی ضروریات کی فراہمی

کی ضمانت دیتی ہے اور ان کے تمام اہم معاملات مثلاً تعلیم، صحت، مکانات کی فراہمی اور ضعیفی کی پنشن وغیرہ سے متعلق معیار متعین کرتی ہے بلکہ اس کے لیے مالی امداد کے علاوہ اکثر خود ہی ساری خدمات انجام دیتی ہے۔

اشیائے خورد و نوش کی فراہمی، رہائش کے مسائل حل کرنا، تعلیم و تربیت کے مواقع پیدا کرنا، صحت عامہ کا خیال کرتے ہوئے مفت طبی سہولتیں بہم پہنچانا، غریبوں، معذوروں کی نگہداشت کرنا، احتیاج، بیماری، اور بڑھاپے کے خلاف تحفظ فراہم کرنا، سڑکوں، پلوں، ذرائع نقل و حمل، مواصلات و رسل و رسائل کی خدمات انجام دینا، تعلیم گاہوں، کتب خانوں اور تفریح گاہوں کا انتظام کرنا، فلاحی مملکت کی خصوصیات میں شامل ہے۔

فلاحی مملکت کا یہ تصور سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا چنانچہ اس نے معاشرہ کے تمام غریبوں، محتاجوں، معذوروں اور تمام بے سہارا لوگوں بشمول یتیموں، بیواؤں، بوڑھوں وغیرہ کے لیے قانونی طور پر بیت المال میں ان کا حق متعین کرکے زکوٰۃ و صدقات کی رقوم مستقل طور پر ان کے لیے مخصوص کردیں۔ خلفائے راشدین بالخصوص حضرت عمرؓ نے باضابطہ سرکاری طور پر نومولود بچہ کے لیے اس کی پیدائش کے دن سے ہی روزینہ متعین کیا۔ بوڑھوں، معذوروں اور بے سہارا لوگوں کے لیے وظائف جاری کیے۔ تعلیم و تربیت اور صحت عامہ کا مفت انتظام کیا، مسافروں کی سہولت کے لیے مسافرخانے اور سرائیں تعمیر کروائیں۔ آب پاشی کے لیے نہریں کھدوائیں، مواصلات اور نقل و حمل کے لیے سڑکیں بنوائیں اور لوگوں کے احوال جاننے کے لیے پرچہ نویس متعین کیے۔

یورپ کے عہد وسطیٰ میں فلاحی مملکت کا کوئی تصور نہیں ملتا۔
عصر حاضر میں سب سے پہلے برطانیہ میں فلاحی مملکت کی بنیاد 1906 کی لبرل اصلاحات کے طفیل پڑی۔ لیکن دراصل فلاحی مملکت اپنے موجودہ مفہوم میں اسی وقت وجود میں آئی جب 1942 میں مشہور ماہر اقتصادیات ولیم بیوریج (William Beveridge) نے ایک ہمہ گیر سماجی تحفظ سے متعلق رپورٹ حکومت برطانیہ کو پیش کی جس کو حکومت نے منظور کرکے 1948 میں نافذ کیا۔ بیوریج نے اس رپورٹ میں سفارش کی تھی کہ "صحت کی خدمات اور پنشن وغیرہ کے معاملہ میں کم سے کم معیار 'حقوق' کے طور پر تسلیم کیے جائیں"۔ حکومت کی منظوری کے بعد ان سفارشات کی بڑے پیانہ پر تشہیر کی گئی۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ میں ہر شخص قطع نظر اپنی آمدنی کے سماجی تحفظ کے نظام کے تحت آگیا۔

20 ویں صدی عیسوی میں عام طور پر تمام ریاستوں نے اپنے شہریوں کے لیے سماجی تحفظ کے کچھ نہ کچھ ایسے اقدامات کیے جو فلاحی مملکت سے منسلک ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں فلاحی مملکت کے تصور نے دوسری عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد قبولیت حاصل کی اور اس سے متعلق بہت سے اقدامات کیے گئے۔ ہندستان نے 1950 میں اپنے دستور میں مملکتی پالیسی کے رہنما اصولوں کو شامل کرکے اس تصور کو اپنایا۔ اگرچہ یہ رہنما اصول عدالتی چارہ جوئی کے دائرے سے باہر ہیں تاہم حکومت اپنے وسائل کی حد تک انھیں بروئے کار لانے کی پابند ہے۔

فی الوقت فلاحی مملکت کے نظم و نسق سے متعلق بنیادی مسائل درج ذیل ہیں:

(1) ریاست کی شہری خدمات کی مطلوبہ سطحوں کا تعین۔

(2) ریاست کی، افراد کے ذاتی و خاندانی منافع اور ان کی خدمات کے نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعمیری کام کی انجام دہی۔

(3) ریاست کی اپنے فرائض کی عمل آوری میں اعلیٰ معیار کی برقراری اور اپنی ذرائع آمدنی میں سے روزی امداد عطیات کی فراہمی۔

(4) عصر حاضر کی فلاحی مملکتوں کے سامنے یہ وہ اہم مسائل ہیں جن پر قابو پانا وسیع تناظر میں فلاحی مملکت کے تصور کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

فلسفہ اور علم: چونکہ ان میں سے ہر ایک کا زندگی کے ساتھ رشتہ ہے اس لیے دونوں کا آپس میں بھی تعلق ہونا لازمی ہے۔ جس طرح سکہ کے دو پہلو ہوتے ہیں اسی طرح فلسفہ اور تعلیم بھی ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں۔ جان ایڈمس اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ "تعلیم فلسفہ کا ارتقائی پہلو ہے"۔ جرمنی کے مشہور فلسفی نکٹ نطشے کا قول ہے کہ فلسفہ کی مدد کے بغیر تعلیم کا مقصد کبھی بھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اسی سے کم و بیش خیال جینٹائل (Gentile) نے ظاہر کیا ہے کہ "تعلیم کا کام فلسفہ کے بغیر صحیح راستے پر نہیں چل سکتا"۔ کسی دوسرے فلسفی کا کہنا ہے کہ تعلیم کے سبھی سوالات آخر میں چل کر فلسفہ کے سوالات بن جاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایچ ایچ ہورن (H.H. Horne) فرماتے ہیں کہ "جس طرح مختلف سڑکوں پر لگے ہوئے سائن بورڈ ایک شہر کی نشاندہی

کرتے ہیں اسی طرح الگ الگ امر واقعہ (Facts) ایک ہی مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

حقیقت ہی فلسفہ کا بہشتی مقام ہے اور کئی سائن بورڈوں میں سے تعلیم ایک سائن بورڈ ہے۔

انھیں سب وجوہات سے فلسفہ کو تعلیم کی بنیاد کہا جاتا ہے اور فلسفہ تعلیم کی ہی بدولت تعلیم کے عام مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تعلیم کی دنیا میں کام کرنے والوں کے سامنے وقتاً فوقتاً نئے مسائل پیش ہوا کرتے ہیں اور ان کے جواب کی تلاش میں فلسفہ تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔

جب ہم تاریخ کے اوراق الٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی معلّمین (Educaters) ہوئے ہیں وہ سبھی شروع شروع میں فلسفی رہے ہیں۔ مشہور مفکر سقراط ایک نامور استاد بھی رہا ہے۔ طریقۂ سوال و جواب اس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں کوئی بات آنکھ بند کر کے قبول نہیں کر لینا چاہیے بلکہ سوال و جواب اور جرح کے بعد ماننی چاہیے۔ اسی مسئلہ کو لے کر اسے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ سقراط ہی کی طرح اس کے شاگرد افلاطون کی تصنیف ریاست (Republic) میں تعلیم کے متعلق نہایت اچھوتی اور جامع باتیں ملتی ہیں۔ لیکن افلاطون کو دنیا کے ایک بہت بڑے فلسفی کی حیثیت سے کون نہیں تسلیم کرتا۔ پھر افلاطون کے شاگرد ارسطو (Aristotle) بیسویں صدی والے (The Philosopher) کے نام سے نوازے جاتے ہیں۔ اس نے اپنی تصنیف پالیٹکس (Politics) میں اپنے استاد افلاطون کے خیالات سے کافی ملتے جلتے خیالات ظاہر کیے ہیں کہ تعلیم کی باگ ڈور ریاست (State) کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے اسکول لائی سیمی (Lyceme) میں حیاتیات (Biology) اور طبیعیات (Natural Science) کے درس پر کافی زور دیا ہے۔ یہ بات افلاطون کی اکادمی (Academy) میں نہیں تھی۔ تعلیم کی بابت سترہویں صدی کے مشہور انگریز فلسفی لاک (Locke) کے خیالات اس کی دو تصانیف ایسیز آن دی ہیومین انڈر اسٹینڈنگ (Essays on the Human Under-standing) اور تھاٹس کنسرننگ ایجوکیشن (Thoughts Concerning Education) میں ہمیں صاف صاف دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پیدائش کے وقت اس نے دماغ کو کوری تختی ٹیبولا رازا (Tabula Raza) کی طرح بتایا ہے۔ یعنی کہ جب آدمی پیدا ہوتا ہے تب اس کا دماغ صاف سلیٹ کی طرح ہوتا ہے جس پر حواس کے معرفت ہونے والے تجربے (Sense Experiences) درج ہوتے رہتے ہیں اور تب انسان کو ہر طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہے۔

فرانس کے مشہور فلسفی روسو (Rousseau) کی بابت جب ہم چرچہ کرتے ہیں تو فوراً اس کے بارے میں والٹائر (Voltaire) کا کہا ہوا قول یاد آتا ہے کہ Rousseau resembles philosopher as a monkey to a "man" یعنی کہ روسو ایک فلاسفر ہونے کے ان تمام بنیادی تقاضوں کو اسی طرح پورا کرتا ہے جس طرح انسان اپنی فطری ساخت کے اعتبار سے لنگور سے قریب ہے۔ اس فلسفی نے اپنے فلسفہ طبیعیات، فطرتیت کی بنیاد پر منفی تعلیم (Negative Education) کی عمارت کھڑی کی ہے اور اس کی ایمیل (Emile) تعلیمی دنیا کے لیے ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ اس طرح فلسفیوں کے بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں جنھوں نے تعلیم کو بہت کچھ بخشا ہے۔ جیسے برٹرنیڈرسل، اے.این. وائٹ ہیڈ (A.N. White-head)، اڈولس ہکسلے (Alduous Huxly) جو ممتاز معلّم (Educater) کی نمایاں حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

ایک بار جان ڈیوی (John Dewey) نے امریکا کی ایک یونیورسٹی فلسفہ کا پروفیسر بننے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ خالص فلسفہ (Pure Philosophy) میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن فیکلٹی تعلیم (Faculty of Education) ذمہ دار صدر (Incharge) بنتے ہی ڈیوی اسکول (Dewey School)، ایک نمونہ (Model) کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ ڈیوی کا خیال تھا کہ اسکول میں جو تجربے ہوتے ہیں ان کے ذریعہ فلسفہ تعلیم کو ہم حاصل کرتے ہیں۔ اب تک یہ مانا جاتا رہا ہے کہ فلسفہ تعلیم کو ہم حاصل کرتے ہیں۔ اب تک یہ مانا جاتا رہا ہے کہ فلسفہ، تعلیم کی بنیاد ہے لیکن جی. ای. پالٹریج (G.E. Paltridge) نے کہا ہے کہ "غور و فکر کرنے پر یہ کہنا اتنا ہی درست ہے کہ فلسفہ تعلیم پر منحصر ہے جتنا کہ یہ کہنا کہ تعلیم کا فلسفہ پر انحصار ہے۔ یعنی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ہی فلسفہ نے تعلیم کی رہنمائی کی ہے۔ گرکلوں یا خانقاہوں کا وجود فلسفہ کی بنیاد پر ہی بتایا جاتا ہے۔ ویدوں کی طرف واپس چلو کی آواز سوامی دیانند سرستی نے بلند کی اور بہت جلد ہی فطرت کی گود میں دو گرکلوں، کانگڑی اور برندابن کی شروعات ہوئی۔ مہاتما

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گاندھی کا سچائی اور عدم تشدد کا فلسفہ ہی ان کی بنیادی تعلیم کے اسباب ہیں۔ اپنے اپنے فلسفیانہ خیالات کو عملی شکل دینے کے لیے رویندرناتھ ٹیگور نے وشوبھارتی اور ملک کے مشہور مفکر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پروان چڑھایا۔ ان کے علاوہ اینی بیسنٹ (Annie Besant) ویویکانند، اَروِند گھوش، ڈاکٹر رادھا کرشن جیسی معروف ہستیوں کو ملک میں آج کون نہیں جانتا۔ ہماری دنیائے علم میں تعلیمی فکر و عمل کے باب میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ ایجوکیشن کمیشن (1944-46) کی رپورٹ کے پہلے صفحہ پر صاف صاف لکھا ہے کہ "اس وقت ہندوستان کی قسمت کی تعمیر اس کی درس گاہوں میں ہو رہی ہے"۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج سائنس (Science) اور تکنیکات (Technology) کا دور ہے اور اس زمانہ میں تعلیم کے ذریعہ ہی ملک کے عوام کو خوش حالی، امن اور عافیت کی زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل ہو سکتا ہے۔ ملک کی از سر نو تعمیر (Reconstruction) اور قومی عروج (National Development) میں ان لوگوں کے قانون پر ذمہ داری ہوگی جو ہمارے اسکول اور کالجوں سے ہر سال نکل رہے ہیں۔ یہ لوگ مثالی شہری (Ideal Citizen) ثابت ہوں اس کے لیے یہ لازم ہے کہ تعلیم کی مناسبت، ملک کی موجودہ اہم ضروریات سے ہو۔

فلسفۂ تعلیم (Educational Philosophy): فلسفہ کو انگریزی میں فلاسفی کہتے ہیں۔ یہ لاطینی زبان (لیٹن) کے دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ فائلو + سوفیا ۔ فائلو کے معنی ہوتے ہیں محبت اور سوفیا کے عقل مندی۔ اس طور پر فلاسفی کا مطلب ہوا عقل مندی کی محبت۔ ایک بار گلیکن کے پوچھنے پر کہ صحیح معنوں میں فلسفی کون ہے سقراط نے جواب دیا تھا کہ وہ جن میں سچائی کو دیکھنے کی چاہ ہوتی ہے۔ اگر فلسفہ زندگی کا طور طریقہ ہے اور فلسفی وہ ہے جس میں سچائی کو دیکھنے کی چاہ ہوتی ہے تو بے شک فلسفہ اور زندگی میں گہرا تعلق ہے۔ لارڈ چسٹرٹن ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "اگر مکان مالکن کے لیے کسی کو کرایہ پر مکان دینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے ہونے والے کرایہ دار کی آمدنی کیا ہے" تو اس سے بھی ضروری یہ جاننا ہے کہ اس کی زندگی کا فلسفہ کیا ہے۔ مشہور یونانی فلسفی سینیا (Seneea) کا خیال ہے کہ محض جینا ہی ہمارا مقصد نہیں ہے بلکہ اچھی طرح جینا ہمارا مقصد ہے۔ ان حضرات کے اقوال سے بھی ظاہر ہے کہ فلسفہ اور زندگی میں بہت قریبی رشتہ ہے۔

فلسفہ کی طرح علم بھی زندگی سے بے حد قریب ہے۔ زندگی کی شروعات سے ہی آدمی کو مختلف چیزوں کی معلومات ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس کے آخری دم تک علم کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ اسی لیے علم کو ارتقائی عمل (Life Long Process) کہا گیا ہے۔

فلسفۂ وجودیت (Existentialism) : فلسفہ وجودیت ایک نیا مکتب فکر ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ایک مربوط انداز فکر کی شکل اختیار کرنے والا یہ فلسفہ پہلے تمام فلسفوں کی نفی کرتا ہے اور نفیٔ ذات (Self Denial) کے تصور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ یہ انسان کی اپنی پسند، فیصلے اور انفرادیت کو اہمیت دیتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار اس کو 'قنوطی انداز فکر' (Philosophy of Despair) بھی کہا گیا ہے۔ لیکن اس کی جدت اور ندرت ہی نہیں بلکہ بے باکی بھی قابل غور ہے۔

Existence (وجود) کو لاطینی لفظ Ex-sistere سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے نمایاں انداز میں کھڑا ہونا۔ انسان وہ واحد جاندار ہے جو اپنے وجود کے بارے میں پوری طرح سے ہوشمند ہے۔ ان الفاظ کا ترجمہ جرمن زبان میں Dat Sein ہے جس کا مفہوم ہے "وہاں موجود ہونا"۔ کلاسیکل انداز میں ابھرنے والی فکر وجودیت میں دو بنیادی نکتے تھے جو ابتدائی فلسفیانہ تفکر میں بہت مقبول تھے۔

(1) Existence وجود : مادی اشیا سے متعلق تھیوریز۔

(2) Essence نچوڑ : غیر مادی تصورات خیالات اور فلسفوں سے متعلق تھیوریز۔

جن مفکرین کو فلسفہ وجودیت کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے ان میں ولیم جیمس، مارکس، نطشے، فرائڈ اور سوروکن کانگے کارڈ کے نام سرفہرست ہیں۔ رولو مے (Rollo May) نے دور حاضر میں ایک قابل ذکر مقابلہ 'وجود' (1958) میں لکھا اس کے بعد فرایڈمین مورس (Friedman Maurice) نے "وجودیت کی دنیا" (1964) میں شائع کرلیا۔ اس نے تفصیل سے وجودیت کے فلسفہ کو بیان کیا ہے۔ اس نے مفکرین کو مختلف مکاتب فکر میں تقسیم کیا ہے۔ ایک طرف تو سارتر (Sartre) اور نطشے ہیں جو کہ مکمل طور پر موضوعاتی ہیں۔ دوسرے مثلاً مارٹن بوبار ماریٹ کیمس ہے جو قطعی موضوعاتی نہیں ہیں۔ پہلے مفکرین نے ادب اور دوسرے طرح کے مفکرین نے نفسیات اور فلسفہ کو متاثر کیا۔ دوسرے کچھ نے موضوعاتی اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

غیر موضوعاتی ہونے کی بحث کو بالکل بیکار قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان بیک وقت موضوعاتی اور غیر موضوعاتی دونوں طرح کی شخصیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے دنیا "World" کو تین درجات میں تقسیم کیا ہے۔

(1) نمایاں (Unwelt) : ماحول کا مادّی اور نمایاں حصہ۔
(2) خواہشاتی (Mitwelt) : خواہشوں اور خوابوں کی دنیا اور
(3) داخلی (Eigen Welt) : اندرونی دنیا جو ہر انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے جس میں کوئی حصہ دار نہیں ہوتا۔

وجودیت کے بنیادی پانچ نکات ہیں :

(1) مایوسی (Disillusionment) : وجودیت پر یقین رکھنے والے یہ سوچتے ہیں کہ عوام کے غلط تصورات اور عقائد ان کو تباہ کن نتائج تک لے جاتے ہیں۔ بہتر زندگی گزارنے کے لیے ان تصورات کا ٹوٹ جانا ہی اچھا ہوتا ہے تاہم وقتی طور پر ان کے ٹوٹنے سے انسان اپنے آپ کو مایوس اور بھٹکا ہوا سمجھتا ہے۔

(2) انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) :
معاشی اور سیاسی کنٹرول خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو۔ ہر فرد کے پاس ہر موقع پر کم سے کم دو راستے ہوتے ہیں۔ معاشرہ جتنا آزاد خیال ہوتا ہے۔ یہ راستے اتنے ہی متنوع رہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نتائج کی ذمے داری ہمیشہ فرد واحد کو اٹھانی چاہیے کیونکہ وہ سوچ کر ایک راستہ اپناتا ہے۔ وہ کوئی ذمے داری الزام غلط سسٹم یا معاشرہ کی کمزوریوں کو نہیں دے سکتا۔

(3) معنی خیزئ اندوہ (Meaning in Suffering) :
ہر چیز کی طرح غم و اندوہ کو بھی وجودیت پرست اپنے آپ چھانٹا ہوا سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ غم اندوہ کو نہ صرف معنی خیز بلکہ زندگی کے لیے ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ یہی نہیں وہ احساس جرم اور پشیمانی (Guilt and Repentence) کو قطعی فطری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ احساسات انسانی فطرت پر منفی اثر نہیں ڈالتے۔

(4) مکالے کی ضرورت (Necessity of Dialogues):
کیونکہ وجودیت میں ذاتیاتی موضوعی (Subjective) عنصر کو اہمیت دی گئی اس لیے یہ نتائج نکل سکتے ہیں کہ انفرادیت پرستی جنم لے اور سب صرف اپنی مرضی چلائیں۔ اس لیے اس کو روکنے کے لیے دو افراد اور دو گروہوں میں ہمیشہ قریبی رابطہ ہونا چاہیے۔ دونوں کو ایک دوسرے کا لحاظ کرنا چاہیے۔

(5) گہرا عقیدہ اور یقین محکم (Commitment) :
وجودیت پرست کچھ بنیادی عقائد رکھتے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا عقیدہ اپنی انفرادیت پر ہوتا ہے۔ عموماً یہ لوگ دنیا کے تقاضوں اور اعتراضات کو ایک حد تک نظرانداز کردیتے ہیں اور اپنی زندگی اپنے انداز سے جینا چاہتے ہیں۔

وجودیت پرست سب سے پہلے فلسفہ میں پھر ادب میں اس کے بعد نفسیات اور سماجیات میں داخل ہوگئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سماج کے حساب سے ڈھلنے کے بدلے سماج کو اپنے حساب سے ڈھالنا چاہتے ہیں۔ پرانے زمانے سے چلے آرہے نیکی اور بدی کے پیمانوں کو یہ جیسا کا تیسا ماننے کے بدلے عقل اور دلائل کی کسوٹی پر کسنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سوچتے ہیں کہ ہر انسان کو اپنے آئین خود بنانا چاہیے اور ہر ممکن حد تک آزاد رہنا چاہیے۔ سارتر نے طنزیہ طور پر لکھا ہے۔ انسان کی فطرت بد ہے کہ وہ آزاد ہے "Man is condemned to be free" ۔

سوشل ورک میں عمل میں لائے گئے کئی طرح کے طریقۂ علاج وجودیت پر مبنی ہے۔ یہ انسان کی انفرادیت پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ اس کی ناکامیوں، مایوسیوں جذباتی عدم توازن اور انحرافی برتاؤ کے لیے خود اس کو ہی ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ یہ انسان کو حالات کا شکار نہ سمجھ کر حالات کو انسان کے تابع سمجھتے ہیں۔ سماج کی بہتری ان کے نزدیک یہی ہے کہ انسان کی انفرادیت کو زیادہ سے زیادہ آزادی سے پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن دوسروں کی آزادی کو قربان کرنا وجودیت کے فلسفہ کے خلاف ہے۔

وجودیت نے سماج کے ساتھ ہی ساتھ مختلف تحریکوں کو بھی متاثر کیا۔ آج آزادئ نسواں کی تحریک اس سے بہت متاثر ہے۔ انسانی حقوق کے نظریہ کے پنپنے میں بھی فلسفہ وجودیت کا دخل ہے۔

وجودیت پرستی مشہور ماہر سماجیات سوروکن اور اس کے بعد کے مفکروں کے ذریعہ علم سماجیات میں داخل ہوگئی۔ بالواسطہ طور پر یہ سوشیولوجی میں سائنسی انداز فکر پروان چڑھانے کا باعث بنی۔ آج کے دور کی حصہ دارانہ سماجیات (Participatory Sociology) اس کی مرہون منت ہے۔ اخلاقیات کو سماجیات کا حصہ بننے سے اسی فلسفہ کے اثر نے روکا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فلسفہ وجودیت ایک آندھی یا طوفان کی طرح سماجیات پر نہیں چھایا بلکہ غیر محسوس طور پر یہ دھیرے دھیرے اثر کرتا رہا اور سماجیات کو گہرائی بخشتا رہا۔

فنونِ لطیفہ کی تعلیم (Art Education): فنون لطیفہ کی تعلیم کے دو بنیادی پہلو ہیں۔ ایک پہلو کا تعلق موضوع سے ہے اور دوسرے کا طریقہ تعلیم سے۔ آرٹ کے مضامین میں مصوری، ڈرائنگ، ڈیزائن اور مجسمہ سازی کے فن شامل ہیں۔ ان مضامین کی تعلیم عام طور سے آرٹ اسکولوں میں دی جاتی رہی ہے۔ اور فارغ التحصیل طلبہ جو آرٹ اسکولوں سے نکلتے تھے وہ یا تو پیشہ ورانہ خدمات انجام دیتے تھے یا پھر عام تعلیمی اداروں میں ڈرائنگ کے استاد کی حیثیت سے تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ ان میں جو لوگ امتیاز حاصل کرتے تھے انھیں آرٹ اسکولوں میں استاد مقرر کر دیا جاتا تھا۔

آرٹ اسکولوں میں آرٹ کی جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ طلبہ قدرتی اور مصنوعی چیزوں کی پوری پوری عکاسی کر سکیں اور ہو بہو ایسی نقل اتار دیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہو جائے۔ ان اسکولوں میں انفرادی، تخلیقی فرقوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا نیز آرٹ اسکولوں میں وہی منتخب لوگ داخل کیے جاتے تھے جو اس کام میں ماہر ہوں۔ عام لوگوں کا یا سب کا داخلہ ممکن نہ تھا۔

لیکن دیکھتے دیکھتے زمانے نے رنگ بدلا اور بیسویں صدی کے یورپ اور امریکا کے ماہرین تعلیم نے ایسے تعلیمی اصول پیش کر دیے جن کی وجہ سے آرٹ کی تعلیم کا تمام تر نظریہ بدل گیا۔ وہ باتیں جو خاص طور سے آرٹ کے طریقۂ تعلیم کو تبدیل کرنے کی موجب ہوئیں ان میں سے خاص خاص یہ تھیں۔

(1) جو بچہ اس دنیا میں جنم لیتا ہے۔ چاہے وہ کسی رنگ کا ہو، کسی قوم کا ہو، کسی مذہب کا ہو، کسی ملک کا ہو، ایک دوسرے سے کسی نہ کسی چیز میں مختلف ہوتا ہے۔ لیکن تمام بچوں کی فطری صفات ایک عمر میں یکساں ہوتی ہیں۔

(2) ہر بچے میں خلاقیت قدرت کی طرف سے موجود ہوتی ہے۔ لیکن وہ پوشیدہ رہتی ہے۔ گھر، مدرسہ اور سماج کا یہ فرض ہے کہ اس پوشیدہ خلاقیت کو بچوں کو آشکارا کرنے کا موقع دیں۔

(3) جو بچہ اس دنیا میں جنم لیتا ہے اُسے کچھ نہ کچھ نئی بات ضرور کہنی ہوتی ہے بشرطیکہ آپ اسے اپنی بات کہنے کے لیے مناسب مواقع فراہم کر سکیں۔

(4) آرٹ کی تعلیم محض کتابی تعلیم ہی نہیں رہنی چاہیے بلکہ آرٹ کو انسان کی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہونا چاہیے۔ مثلاً باغ لگانا، گملے سجانا، کپڑے ڈیزائن کرنا، مکان سجانا، روزمرہ کی زندگی کے لیے چیزیں فراہم یا منتخب کرنا وغیرہ وغیرہ۔ ماہرین تعلیم نے یہ محسوس کیا کہ ایسی تعلیم کے ذریعے وہ بچے میں ایسی اقدار پیدا کر سکتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے گھر، مدرسے اور سماج میں خوشحالی اور ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں ۔ غرض اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ عوام نیز گردو پیش کی زندگی اور ماحول کو خوش حال اور خوشگوار بنا سکتے ہیں۔

(5) آرٹ کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ علم انسان کو ذکی الحس بنائے تاکہ وہ آرٹ کے فن کے قدیم اور جدید شاہکاروں کو پرکھ سکے۔ ان سے متعلق تنقید میں حصہ لے سکے۔ انسان کے ذوق کو ابھارنے اور اس میں وہ صلاحیت اور وسعت نظر پیدا کرے جس سے وہ فن کو سمجھ سکے، اس سے لطف اندوز ہو سکے اور تمام نوع انسان کے فنون کو وسیع النظری سے دیکھ سکے۔ مندرجہ بالا تحقیقات کی بنا پر قریب سو سال ہوئے جبکہ امریکا اور یورپ میں آرٹ کا طریقہ رائج ہوا اور اس کو ترقی پسند تعلیم (Progressive Education) سے منسوب کیا گیا۔ اس کے بانیوں میں سے ویانا کے چِزک اور نیویارک کے ڈو بہت مشہور ہیں۔ بعد میں جن ماہرین تعلیم نے اس طریقہ کو اپنایا ان میں چند قابل ذکر اشخاص کے نام یہ ہیں۔ جان ڈیوی، تھومس منرو، میلون، ایس. میکوئی اور اوواٹونا وغیرہ۔ ان کے علاوہ اور جن لوگوں نے اس طریقۂ تعلیم پر مزید تحقیق اور اس کی وضاحت کی ۔ ان میں لووِن فیلڈ کا نام قابل ذکر ہے۔ لیکن ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ طریقۂ تعلیم کے مخصوص آرٹ اسکولوں سے نکل کر اُسے تربیت اساتذہ کے اداروں (ٹیچرس کالجوں) میں بھی اپنایا گیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ نہ آرٹ اسکولوں کی دین ہے، نہ آرٹسٹوں کی بلکہ ٹیچرس کالجوں میں آرٹ کے ماہرین تعلیم کی بالغ نظری کا نتیجہ ہے۔ اب رفتہ رفتہ یورپ اور امریکا میں آرٹ اسکول بھی اس کو اپنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

بیسویں صدی میں ایک بارگی آرٹ کی تعلیم کا طریقہ اور نظریہ

بدل گیا۔ جو مقاصد تعلیم، خاص طور پر ترقی پسند آرٹ کی تعلیم کے چند مقاصد ابھر کر سامنے آئے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں اور عام طور پر مسلمہ ہیں۔

(1) آرٹ کی تعلیم بچوں میں خلاقیت پیدا کرتی ہے نیز شخصیت کو ابھارنے میں مدد دیتی ہے۔

(2) آرٹ کی تعلیم جمالیاتی ذوق پیدا کرتی ہے نیز خوبصورتی اور بدصورتی میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔

(3) آرٹ کی تعلیم ملی احساسات کی ترجمانی کرتی ہے نیز آزادانہ خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے ابھارتی ہے۔

(4) آرٹ کی تعلیم اظہار خیال نیز احساسات کو ظاہر کرنے کے لیے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرنا سکھاتی ہے۔

(5) آرٹ کی تعلیم انسانی رشتہ کو مضبوط کرتی ہے نیز اچھا اور نیک انسان بننے میں مدد کرتی ہے۔

آرٹ کی یہ ترقی پسند تعلیم (Progressive Education) موجودہ زمانہ میں آرٹ کے مدارس سے نکل کر اب امریکا اور یورپ کے ابتدائی و ثانوی مدارس کی تعلیم کا ایک اہم جزو بن چکی ہے اور ہمارے ملک میں بھی اس کی ابتدا ہو چکی ہے۔ لیکن خاص کر پبلک اسکولوں میں۔

فوج داری عدالتوں کے اختیارات و تجویز (Powers of Criminal Courts and Trial): معمولاً کسی جرم کی تحقیقات یا تجویز فوجداری کی اس عدالت میں ہوگی جس کے اختیارات سماعت کے حدود ارضی کے اندر اس جرم کا ارتکاب ہوا ہو۔ جب کسی شخص پر بوجہ کسی فعل کے جو اس سے سرزد ہوا ہو یا اس فعل کے نتیجے کے طور پر کسی جرم کا ارتکاب کا الزام لگایا جائے تو اس کی تحقیقات یا تجویز اس عدالت میں ہو سکے گی جس کے اختیار سماعت کے حدود ارضی کے اندر وہ فعل وقوع میں آیا ہو یا وہ نتیجہ ظہور میں آتا ہو۔

ڈاکہ، ڈاکہ مع قتل، ڈاکوؤں میں شریک ہونے کے جرم کی تحقیقات اس عدالت میں ہو سکے گی جس کے اختیار سماعت حدود ارضی کے اندر ملزم موجود ہو یا اس حاکم فوج داری کی عدالت میں ہوگی جہاں بالعموم ڈکیتی کی تحقیقات و تجویز ہوتی ہو۔ حراست جائز سے فرار ہونے کے جرم کی تحقیقات اس عدالت میں ہو سکے گی جس کے اختیار سماعت کی حدود ارضی میں ملزم موجود ہو یا اس عدالت میں ہوگی جس کے اختیار سماعت کے حدود ارضی سے ملزم فرار ہوا تھا۔ اس طرح جرم سرقہ کی تحقیقات اس عدالت میں ہو سکے گی جس کے اختیار سماعت کی حدود ارضی کے اندر سرقہ ہوا ہو یا مال مسروقہ سارق یا کسی اور شخص کے قبضے میں ہو جو اس کو مسروقہ جان کر یا جاننے کی وجہ رکھ کر حاصل کرے یا لے رکھے۔ اگر کوئی جرم ایسی حالت میں ہو جائے جبکہ ملزم کوئی سفر خشکی یا تری طے کرتا ہو تو اس جرم کی تحقیقات اس عدالت میں ہو سکے گی جس کے اختیار سماعت کے حدود ارضی میں یا اس حدود ارضی میں سے ہو کر ملزم کے ساتھ اس شخص کا سفر ہوا ہو جس کا مال سرقہ ہوا ہو۔ اگر اس امر کی بابت شک ہو کہ کس جرم کی تحقیقات کس عدالت میں ہونی چاہیے تو ہائی کورٹ اس امر کو طے کرے گا کہ کس عدالت میں جرم کی تحقیقات کی جائے۔

فئی: اگر کفار مغلوب و مرعوب ہو کر بغیر جنگ کے اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں تو یہ مال و اسباب بیت المال کا حق سمجھا جائے گا اور ان کو فاتحین اور مجاہدین میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

فیبین تحریک (Fabianism): جس زمانہ میں یورپ میں مارکسزم کی بنیاد پر سوشلسٹ تحریک ابھر رہی تھی برطانیہ میں یہ غیر مارکسی اصولوں پر قائم ہو رہی تھی۔ 1880 میں چند بڑے مفکروں مثلاً سڈنی وبیٹرس ویب، سڈنی آلیور اور جارج برنارڈ شا وغیرہ نے فیبین سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ ان کا خیال تھا کہ سماجی تبدیلی بتدریج آنی چاہیے۔ انھوں نے کبھی عوامی تنظیم قائم کرنے کی کوشش نہیں کی وہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعہ حکمرانوں کو اس کا قائل کرنا چاہتے تھے کہ وہ سوشلزم کی طرف اقدام کریں۔

فیصلہ ثالثی (Arbitrator's Award): اگر آجر اور مزدور کے درمیان کوئی صنعتی نزاع ہو تو اس کے تصفیے کا ایک قانونی طریقہ یہ ہے کہ فریقین اس نزاع کو ایک ثالث (Arbitrator) کے ذریعہ طے کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ لیکن ثالث کے ذریعہ اس صنعتی نزاع کو طے کرنے کا تصفیہ فریقین کی باہمی رضامندی سے حکومت کی جانب سے اس نزاع کو لیبر کورٹ یا لیبر ٹریبونل میں رجوع کیے جانے کے حکم سے قبل

ہونا چاہیے۔ ثالث کا فیصلہ (Award) فریقین کے لیے قابل تعمیل ہوگا۔

فیلڈ ورک (Field Work) : سماجی اور تمدنی انسانیات اور ساجیات کے طریقہ تحقیق میں فیلڈ ورک کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ فیلڈورک سے مراد کسی سماج کا اس کے تمدنی ماحول میں فطری اور برموقعہ مطالعہ اور تجزیہ ہے۔ سماجی انسانیات میں انیسویں صدی کے آخری ربع سے فیلڈورک کی طرف توجہ دی جارہی ہے۔ اس طریقہ تحقیق میں ماہرین تحقیق کسی سماج یا تمدن کا برموقعہ مطالعہ کرتے ہیں اور یہ مطالعہ روابط اور مشاہدہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ انسانیات کے ساتھ ساتھ ساجیات کے طریقہ تحقیق میں بھی فیلڈ ورک کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اب تقریباً تمام سماجی علوم مثلاً سیاسیات سماجی نفسیات میں بھی اس طریقہ تحقیق سے کام لیا جارہا ہے۔ مارگن، لیوی اسٹراس، میلی نوسکی (Malinowski) اور بواز (Bois) نے ابتداً فیلڈ ورک کے ذریعہ سماجی اور تمدنی مسائل کی تفہیم تشریح اور اس کے تجزیہ میں تحقیقات کیں اور ان کے ریسرچ سے پتہ چلا کہ یہ طریقہ تحقیق موجودہ ساجوں اور تمدنوں کے لیے کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

فیلڈورک کا سب سے پہلا اقدام یہ ہوتا ہے کہ ریسرچ کرنے والے یا فیلڈ ورکر موقعہ پر خود موجود رہیں۔ وہاں کے سماجی رسم و رواج تمدنی طریقوں عقائد نظریات اور رجحانات سے پوری طرح واقفیت حاصل کریں اور اس کے بعد اپنے پیش نظر تحقیق کے لیے مواد جمع کریں۔ فیلڈورکر کے لیے یہ بات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ وہ جس سماج کے بارے میں تحقیق کررہا ہے اس کے افراد کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو کیونکہ جب تک لوگوں کو فیلڈورکر پر اعتبار نہ ہو وہ اکثر اپنے سماجی اور تمدنی امور و مضمرات پر کھل کر گفتگو کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس مقصد کے حصول کے لیے متعلقہ سماج یا کلچر کی زبان سیکھنا اور ان میں گھل مل جانا بہت زیادہ اہم ہے۔ یہی وہ طریق کار ہیں جنھوں نے میلی نوسکی (Malinowski) اور دوسرے مشہور انسانیات دانوں اور ساجیات دانوں کے فیلڈورک کو انتہائی حقیقت پسندانہ اور مفید ثابت کیا۔ فیلڈورکر کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ سماج میں اپنے طور طریقہ کے ذریعہ اجنبیت کے احساس کو مٹا دے۔ اور متعلقہ لوگوں کے حقیقی نقطہ نظر اور اس کی پوری گہرائیوں سے واقف ہو۔ خواہ وہ اس کے اپنے نظریات کے مطابق ہوں یا ان کے مغائر۔ فیلڈورک کے طریقوں میں انٹرویو سوال بند اور کیس اسٹڈی (Case Study) کے طریقے شامل ہیں۔ نظری مطالعہ (Observation) اور حصہ دار نظری مطالعہ (Participant Observation) بھی مقبول طریقے ہیں جو سماجی تحقیق کی کلید ہیں۔

آج کل تمام سماجی علوم میں فیلڈورک کا طریقہ رائج ہے اور بالخصوص ساجیات میں یہی طریقہ سب سے اہم سمجھا جاتا ہے کیونکہ سماج ایک متحرک حقیقت ہے اس لیے اس کی برموقعہ تحقیق وہ واحد ذریعہ ہے جس سے سماجی عمل کے محرکات اور مضمرات کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ ساجیات اور انسانیات کے فیلڈورک میں فرق صرف اتنا ہے کہ سماجی انسانیات میں فیلڈورکر کو عام طور سے اپنے سماج سے باہر ایک دوسرے سماج مثلاً قبائلی سماج وغیرہ میں جاکر رہنا بسنا پڑتا ہے اور اس کے برخلاف ساجیات میں فیلڈورکر کو عام طور سے اس قسم کے سماج کا مطالعہ کرتا ہے جس سے اسے روز و شب کا سابقہ رہتا ہے۔ موجودہ سماج اتنی تیزی سے تبدیلی پذیر ہے کہ فیلڈورک کے بغیر طوفانی رفتار سے بدلنے والے ساجوں کے محرکات کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ فیلڈ ورک میں تحقیق کرنے والے کی ہوشیاری اور اس کے طرز عمل کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور یہی ایک ایسا سبب ہے جو فیلڈورک کو بہت ہی نازک اور اہم طریقہ تحقیق بنادیتا ہے۔

ساجیات میں فیلڈورک کی ضرورت تحقیق کے لیے پڑتی ہے لیکن سماج کاری میں فیلڈ ورک ریڑھ کی ہڈی کے طور پر کام کرتا ہے۔ عموماً تعلیم میں صرف ہونے والے وقت کا چالیس فیصد سماجی کارکن فیلڈ میں گزارتے ہیں اس میں محض تحقیق نہیں ہوتی۔ بلکہ ذاتی گروہی یا سماجی ضروریات اور دشواریوں کے لیے امدادی اقدامات بھی شامل ہیں۔ یہ فیلڈورک دیہات، قبائل، سلم، معذوروں کے اداروں، اصلاحی تحریکوں اور سماجی ترقیاتی منصوبوں میں شامل ہو کر کیا جاتا ہے۔

تمام برتاوی علوم، ساجیات اور سماج کاری میں فیلڈ ورک شامل ہے لیکن اس کی اقسام الگ الگ ہوتی ہیں۔

فہرست کتب خانہ (Library Catalogue) : کتب خانہ کے ذخیرہ علمی سے مطلوبہ مواد حاصل کرنے کے لیے فہرست کتب خانہ ایک ضروری آلہ ہے۔ کتب خانہ میں علمی مواد کسی ضابطہ درجہ بندی کے ذریعہ تشکیل درجہ نمبر (Class Number) کی مدد سے علم کے شعبوں اور

ان کے ذیلی موضوعات کے مطابق رکھے جاتے ہیں۔ قارئین اپنے درکار مواد تک دسترس کے لیے کتاب کے کسی جزو معلومات مثلاً عنوان کتاب، یا اس کے نفس مضمون یا اس کے ذیلی موضوعات، وغیرہ کسی جزو کو نقطہ رسائی (Access Point) بنا سکتے ہیں۔ کتب خانہ کے بہتر استعمال کا انحصار قاری کے اپنے اختیار کیے گئے نقطہ رسائی کی مدد سے درکار مواد تک پہنچنے کی کامیابی پر ہوتا ہے۔ فہرست کتب خانہ کے مختلف مدخل (Entries) قاری کے امکانی نقطہ رسائی کی تسکین کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

زمانہ قدیم میں جب کتب خانے عبادت گاہوں کا ایک حصہ تھے، کتابیں پہلے وسیع دائرہ مضامین کے اعتبار سے کمروں یا الماریوں میں رکھ دی جاتیں۔ اس طرح رکھنے میں مزید تقسیم ان کے قد و قامت کے مطابق کی جاتی۔ چنانچہ چھوٹی کتابیں، درمیانہ سائز کی اور بڑی کتابیں علاحدہ علاحدہ قطاروں میں ہوتیں۔ فہرست جو مصنف یا عنوان سے تیار ہوتیں اس طرح سے فرد سامان (Inventory) ہوتیں جن میں اپنی ضرورت کی کتاب کی تلاش کے لیے مختلف شقوں کی فہرستوں کو دیکھنا پڑتا تھا۔ فہرستیں رجسٹر کی شکل میں ہوتی تھیں اور اگرچہ رجسٹر کی شکل بدلتی رہی۔ پہلے تمام صفحات یکجا سلے ہوئے ہوتے تھے پھر بغیر سلے ہوئے صفحات کو دو گتوں کے درمیان نتھی کرنے لگے تاکہ حسب ضرورت درمیان میں کہیں بھی صفحات لگائے جا سکیں۔ رجسٹر کی جگہ کارڈ کا استعمال فرانس میں اگرچہ اٹھارہویں صدی سے ملتا ہے لیکن کارڈ کی شکل میں فہرست کتب خانہ کا عام چلن بیسویں صدی سے شروع ہوا۔ اور اب تو 12.5x7.5 سینٹی میٹر کے کارڈ سے آگے بڑھ کر کمپیوٹر کی یادداشت (Memory) میں مدخل درج کی جانے لگی ہیں۔

فہرست کتب خانہ کارڈ میں دی جانے والی مواد علمی کی معلوماتی تفصیل اور اجزا معلومات کی ترتیب کی معیار بندی کے لیے ضابطہ دور جدید میں سب سے پہلے برٹش میوزیم کے پہلے لائبریرین انتھونی پانزی (Anthony Panizzi) نے 1841 میں بنایا۔ ضابطہ بنانے والوں میں دوسرے معروف نام چارلس کوفن جیوٹ (Charles Coffin Jewett) چارلس امی کٹر (Charles Ammi Cutter) اور ایس آر رنگاناتھن کے ہیں۔ یہ تمام کوششیں انفرادی تھیں۔ 1961 میں بین الاقوامی فیڈریشن برائے انجمن و ادارہ جات کتب خانہ (International Federation of Library Associations & Institutions) جسے عرف عام میں "افلا" کہتے ہیں، نے یونیسکو کی سرپرستی میں ایک عالمی کانفرنس برائے فہرست سازی کتب خانہ پیرس میں منعقد کی جس میں ضابطہ سازی کے چند رہنما اصول طے ہوئے اور بعد میں اجتماعی طور پر غور کے بعد جو ضابطے وجود میں آئے وہ انھیں اصولوں کی روشنی میں منضبط ہوئے تھے۔ ان کے مطابق امریکن برطانوی اور کینیڈین لائبریری انجمنوں نے ایک متفقہ ضابطہ 1967 میں اینگلو امریکن کیٹلاگنگ رولز کے نام سے مرتب کیا۔ 1978 میں اس کا دوسرا ایڈیشن تیار ہوا اور مزید غور کے بعد ایک ترمیم شدہ اشاعت 1988 میں "اے اے سی 2 ترمیم شدہ" کے نام سے شائع ہوئی۔ آج دنیا کے بڑے حصے میں فہرست کتب خانہ مرتب کرنے کے لیے یہی قواعد مشعل راہ ہیں۔ یہ ضابطہ صرف کتابوں کی فہرست سازی تک محدود نہ رہ کر ترسیل معلومات کے جملہ وسائل — مائیکروفلم و مائکروفش، موسیقی نشان، تصاویر، آواز بند، مقناطیسی ٹیپ وغیرہ— کے لیے نشان راہ ہے۔ ضابطہ میں پہلے بیانیہ تفصیل (Description) کے قواعد درج ہیں جن کے مطابق کسی بھی معلوماتی وسیلہ کے لیے معیاری بیان درج ذیل ترتیب میں ہے :

عنوان اور بیان ذمہ داری متن دائرہ
ایڈیشن دائرہ
مواد (تفصیل قسم) دائرہ
اشاعت، تقسیم وغیرہ وغیرہ
مادی ساخت (صفحات، تصاویر وغیرہ) دائرہ
سلسلہ اشاعت دائرہ (Series)
وضاحتی بیان (Note) دائرہ
معیار نمبر شمار و دستیابی تفصیل

اس کے بعد انتخاب نقطہ رسائی (Choice of Access Points) کے قواعد ہیں۔ اسی دوران "افلا" نے بین الاقوامی کتابیاتی کنٹرول (Universal Bibliographic Control) کے منصوبہ کے تحت بین الاقوامی معیار بیان کتاب وضع کیا جسے آئی ایس بی ڈی (ISBD) کہتے ہیں تاکہ کتابیاتی فہرست کے سلسلے میں مختلف مقام اور علاقہ میں تیار مدخل میں یکسانیت، ابہام سے پاکی اور ایک کل میں مدغم ہونے کی صلاحیت ہو یہ معیار 1974 میں آخری شکل کو پہنچا اور بڑی حد تک اے اے سی آر (اینگلو امریکن کیٹلاگنگ) کے معیاری بیان سے مطابقت رکھتا ہے۔ اب یہ کتاب کے علاوہ رسائل، مائیکروفلم اور دوسرے ذرائع معلومات کے لیے بھی

دستیاب ہے۔

اقسام فہرست کتب خانہ : کسی بھی فہرست کارڈ (Catalogue Card) میں کتاب کی بیانی تفصیل کے ساتھ طلبی نمبر بھی درج ہوتا ہے جس کی مدد سے کتاب نکالی جاتی ہے اور دوبارہ اسی جگہ رکھی جاتی ہے۔ ہر ایک کتاب کے لیے ایک صدر مدخل کارڈ (Main Entry Card) تیار ہوتا ہے اور چند اضافی کارڈ (Added Entries) تیار ہوتے ہیں۔ کارڈ کی ترتیب پہلی سطر پر لکھے ہوئے الفاظ یا علامت (طلبی نمبر) میں سے کسی ایک سے ہوتی ہے۔ جب صدر مدخل کارڈ بہ اعتبار الفاظ حروف تہجی کے ترتیب سے رکھے جاتے ہیں تو اسے لغتی فہرست کتب خانہ (Dictionary Catalogue) کہتے ہیں لیکن اگر صدر مدخل کارڈ طلبی نمبر (جو ہندسہ یا حروف ہندسہ سے مل کر بنتی ہے) کے مطابق ترتیب دیا جاتا ہے تو اسے درجہ بند فہرست کتب خانہ (Classified Catalogue) کہتے ہیں۔ درجہ بند فہرست کے دو حصے ہوتے ہیں جس میں دوسرا حصہ عنوان، مصنف وغیرہ ناموں سے الفبائی اصول پر مرتب ہوتا ہے اور اسے الفبائی انڈکس یا الفبائی اشاریہ کہتے ہیں۔

فہرست کتب خانہ کے بیشتر کارڈ کتاب میں موجود معلومات کی بنیاد پر تیار کیے جاتے ہیں لیکن موضوعاتی کارڈ موضوعاتی سرمدخل (Subject Heading) سے بنائے جاتے ہیں۔ سرمدخل کے لیے ایک فہرست لائبریری آف کانگریس نے ایل سی سبجیکٹ ہیڈنگس (LCSH) کے نام سے تیار کی ہے اور اس کا اختصار سیرس لسٹ (Sears List) کے نام سے دستیاب ہے۔ دونوں کتابوں میں باربار ترمیم ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ سرمدخل وضع کرنے کے چند اصول بھی مرتب ہوئے ہیں جن کی مدد سے حسب ضرورت یہ وضع کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں قابل ذکر ڈاکٹر ایس آر رنگاناتھن کا وضع کیا ہوا طریقہ زنجیری کڑی (Chain Procedure) ہے اور ڈیرک آسٹن کا طریقہ پریس (Precis) ہے۔ حال ہی میں برٹش نیشنل ببلوگرافی سروس نے ایک اور طریقہ کمپاس (Compas) کے نام سے وضع کیا ہے۔

مرکزی کیٹلاگ سازی و دوران طباعت کیٹلاگ سازی (Centralised Cataloguing and Cataloguing in Publication)۔ فہرست کتب خانہ ایک مرکزی کتب خانہ میں ترتیب دے کر اس کے کارڈ، دوسرے کتب خانوں کو مہیا کرنے کی روایت لائبریری آف کانگریس نے 1901 میں ڈالی۔ اس خدمت کا مقصد دوسرے کتب خانوں کو دوبارہ کارڈ بنانے کے کام سے راحت دینا اور کیٹلاگ سازی میں یکسانیت پیدا کرنا تھا۔ مختلف تبدیلیوں کے ساتھ کارڈ فراہم کرنے کی یہ خدمت 1969 میں کارڈ کی جگہ مقناطیسی فیتہ (Magnetic Tape) کی شکل میں ڈسک کی شکل میں اور دی جانے لگی۔ مشین کی مدد سے تیار اور مشین کی مدد سے اس سے استفادہ کی بدولت اس کا نام مارک (MARC) یا مشینی مطالعہ کارڈ پڑ گیا۔ اب مدخل کی تیاری کے لیے فہرستی تفصیلات کی نئی ترتیب بندی کی گئی جسے مارک فارمیٹ (Marc Format) کا نام دیا گیا۔ اب اس مقناطیسی فیتہ کی تیاری کتاب کی طباعت کے دوران ناشرین سے صفحہ عنوان منگواکر پہلے ہی کرلی جاتی ہے تاکہ کتاب شائع ہونے پر صفحہ عنوان کی پشت پر کیٹلاگ کی جملہ تفصیلات بھی چھپی ہوئی ملیں۔ برطانوی قومی کتابیات نے کارڈ فراہم کرنے کی خدمت 1956 میں شروع کی تھی اور برٹش لائبریری کتابیاتی خدمات مرکز بھی مارک فارمیٹ میں مقناطیسی ٹیپ پر کیٹلاگ تفصیل فراہم کر رہا ہے۔

ق

قابل ادخال شہادت (Admissibility of Evidence):

وہ شہادت جو اور طور پر قابل قبول نہ ہو فریقین کی باہمی رضامندی سے قابل ادخال شہادت قرار نہیں پا سکتی۔ کسی دستاویز کے قابل ادخال شہادت قرار دینے کے متعلق ہر وقت کسی عدالتی کارروائی کے دوارن عذر کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ کہ کسی دستاویز کے قابل ادخال شہادت قرار دینے کے متعلق عذر اسی وقت کرنا چاہیے جب وہ دستاویز عدالت میں داخل کی جائے لیکن اگر فریق مقابل نے عذر نہیں کیا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ دستاویز قابل ادخال شہادت ہے۔ عدالت کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اس دستاویز کو قابل قبول قرار نہ دے اگر قانوناً قابل ادخال شہادت نہیں ہے۔ 1959 میں سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ اے آئی آر 1909 (1959 اے آئی آر) میں دیا ہے جس میں یہ اظہار کیا گیا ہے اگر ہائی کورٹ میں کسی دستاویز کے قبول کیے جانے کے متعلق کوئی عذر نہیں کیا گیا تو اس دستاویز کے متعلق سپریم کورٹ میں یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دستاویز قابل ادخال شہادت نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی عدالت نے کسی شہادت کو ناقابل ادخال قرار نہیں دے سکتی بجز اس کے کہ اس فریق نے جس نے وہ شہادت پیش کی ہو معقول وجہ سے یہ ثابت کرے کہ اس شہادت کو قابل ادخال قرار دینا ضروری ہے۔ ہائی کورٹ کے ایک فیصلے میں یہ اظہار خیال کیا گیا ہے کہ زبانی شہادت کا تعلق واقعات سے ہے کسی قانون تعبیر سے نہیں اس لیے ہائی کورٹ ایسے اصول مقرر نہیں کرسکتا کہ عدالت تحت کن حالات میں زبانی شہادت کو وقیع قرار دے یہ عدالت کی صوابدید پر ہے جو قانونی طور پر دی گئی ہے اس صوابدید میں کمی نہیں کی جاسکتی۔

شہادت میں وہ تمام بیانات شامل نہیں ہیں جو کسی واقعہ پر بحث کے وقوع پذیر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق کسی گواہ کی طرف سے دیے جائیں جسے عرف عام میں زبانی شہادت کہا جاتا ہے۔ شہادت میں وہ تمام تحریری دستاویزات بھی شامل ہیں جو عدالت میں کسی واقع کے متعلق بطور ثبوت پیش کیے جائیں جسے عرف عام میں دستاویزی شہادت کہتے ہیں۔ اگر کوئی واقعہ زبانی یا تحریری (دستاویزی) شہادت کی رو سے عدالت کی رائے میں صحیح قرار دیا ہے تو ایسے واقعہ ثابت شدہ واقعہ (Proved) قرار دیا جائے گا۔

اگر کسی شخص نے جرم کے ارتکاب کے متعلق اقبالی بیان دیا ہو تو وہ بیان اس کے خلاف قایم کرنے میں اور جرم ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لیکن اس شخص کے اقبالی بیان کو کسی اور شخص کے خلاف استعمال نہیں کیا جاسکتا کسی شریک جرم کا اقبالی بیان دوسرے شریک جرم کو مجرم قرار دینے کے لیے کافی نہ ہوگا۔ قانون شہادت کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ کئی اشخاص کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے متعلق بیان دیں بلکہ کسی شخص کے خلاف ارتکاب جرم کا الزام صرف ایک بیان پر انحصار کرتے ہوئے ثابت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر عدالت کی رائے میں یہ بیان جرم ثابت کرنے کے لیے کافی قرار پائے کسی گواہ کے بیان پر غور کرتے وقت اس گواہ کے کردار (Character) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

قابل پیمائش صلاحیت - معاشیات : بیشتر متغیر اور معاشی فیصلے فرداً فرداً قابل پیمائش اور قابل عمل ہوتے ہیں۔ مثلاً خام قومی آمدنی، سرمایہ کاری اور محاصل اندازی وغیرہ معاشی امور کی انجام دہی کے لیے علیحدہ علیحدہ پیمانے ہیں۔ انفرادی بچت اور صرف سے متعلق فیصلے عام طور پر علیحدہ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن متغیرے جیسے معاشی نمو، فرسودگی وغیرہ مسلسل ہوتے ہیں۔ معاشی رویے کے اظہار کے لیے معاشی متغیرہ کے مفروضے پر تیار کردہ ریاضیاتی ماڈل حقیقت کو ایک حد تک تبدیل کردیتے ہیں۔ مثلاً کلاسیکی معاشیین نے سرمایہ کاری کے اتار چڑھاؤ کی وضاحت کے لیے اسراع کے اصول کو استعمال کیا۔ اس متاوثر سرمایہ کاری کے غیر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مسلسل روپے کو اگر سرمایہ کاری کی شرح نمو میں توازن اخذ کرنے کے لیے استعمال کیا جائے (جیسے کہ ہراڈ ڈومر (Herrod Domer) کے ماڈل میں) تو تسلسل ضروری ہوجاتا ہے لیکن سرمایہ کاری کی شرح نمو کا ایسا ہموار توازن اس سرمایہ کاری میں تغیرات کی اجازت نہیں دیتا جس سے کہ نمونہ اخذ کیا گیا ہے۔

ریاضیاتی معاشیات میں معاشی قوانین سے برتاؤ کی کسی نہ کسی حد پر متجانس متغیر کے مفروضہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اثرات معاشی متغیروں سے متعلق نتائج اخذ کرنے کے مسئلہ پر بہت دور رس ہوتے ہیں۔ مارشل کا کوئی بین شخصی تقابل نہیں کا مفروضہ جزوی طور پر افادوں کی عدم جمعیت کے اظہار کے لیے اور جزوی طور پر افراد کے درمیان غیر متجانس کے مسئلہ سے احتراز کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ غیر متجانس اجزائے ترکیبی کے ذریعے مجموعی سرمائے کی وضاحت کرتے وقت بھی یہی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

معاشی تجزیے کے سلسلہ میں ریاضیاتی معاشیات کے استعمال کے خلاف عام طور پر اس لیے متنبہ کیا جاتا ہے کہ معاشی عوامل اور معاشی متغیروں میں سے اکثر قابل پیائش نہیں ہوتے۔ اس تعلق سے تشفی یا افادے کے نظریہ کو مستند مثال مانا جاسکتا ہے کیونکہ تشفی کے تعین کے سلسلہ میں مختلف سماجی اور نفسیاتی عوامل مل کر کام کرتے ہیں۔ اس لیے افادوں کی پیائش یا اندازہ کے لیے کسی بنیادی پیانہ کا تعین مشکل ہوجاتا ہے۔ ابتدائی دور (1870 کے قریب) کے مصنفین جیسے برناولی (Bernaoulli)، منیزر (Menzer)، وارلاس (Walras) اور جیوانس (Jevans) نے افادوں کو قابل پیائش قرار دیا ہے۔ جب تک کہ افادوں کے پیانہ میں بدل پذیری کی خصوصیات ہے قابل پیائش افادے کوئی مسئلہ نہیں کھڑا کریں گے لیکن اگر کوئی فرد نفسیاتی استقلال رکھتا ہو تو تبدل پذیری کا امکان نہیں رہتا۔ پیریٹو (Pareto) نے قابل پیائش افادوں کے مستقل ہونے سے متعلق دلائل پیش کیے ہیں۔ حال ہی میں وان نیومن (Van Neumann) اور مارگنسٹرن (Morgenstern) (1944) نے افادوں کے تعلق سے قابل پیائش ریاضیاتی توقعات کا تعارف کروایا ہے۔ کم ترقی یافتہ معیشتوں میں فاضل محنت کے نظریوں کے تعلق سے قابل پیائش صلاحیت نے ایک نزاع کی سی صورت پیدا کردی ہے۔ سین (1966) کا کہنا ہے کہ یہ نظریہ لا متناہی طور پر متنازع فیہ ہے کیونکہ معاملہ محنت کی پیائش سے تعلق رکھتا ہے۔ کام کرنے والے مزدور کی حاشیائی (Marginal) پیدا آوری صفر کے مساوی ہوسکتی ہے لیکن آدمی - گھنٹوں کی ہونا ضروری نہیں۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے طبعیات اور دیگر علوم کی طرح قابل پیائش صلاحیت معاشیات میں بھی ایک اہم مسئلہ بن گئی ہے۔ حالیہ مدت تک ماہرین طبعیات کا کہنا تھا کہ حرارت ناقابل پیائش ہے۔ لیکن ریاضیاتی معاشیات کے اصولوں نے معاشیات میں قابل پیائش صلاحیت کے مسئلہ کو ایک حد تک حل کرلیا ہے۔

قانون اقل ترین اجرت (The Minimum Wages Act 1948)

قانون اقل ترین اجرت (The Minimum Wages Act 1948) : ہندوستان میں کسی خاص صنعت کے متعلق اقل ترین اجرت کا تعین قانون اقل ترین اجرت کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس کے کئی طریقے قانون میں مدون کیے گئے ہیں یا تو قانونی چارہ کار اختیار کرکے اقل ترین اجرت کا تعین کیا جاتا ہے یا ویج بورڈ (Wage Board) یا اجتماعی معاملت (Collective Bargaining) کے ذریعہ۔ سپریم کورٹ کے بھی بعض نہایت اہم فیصلے ہیں جس میں اجرتوں کے مسائل کے متعلق بعض دور رس اصول مرتب کیے گئے ہیں قانون اقل ترین اجرت 1948 میں نافذ کیا گیا تاکہ مزدوروں کو آجروں کے مظالم و استبداد سے نجات دلائی جائے اور مختلف خدمتوں کے متعلق اقل ترین اجرت کا تعین کیا جائے۔ اس قانون کا اصل منشا یہ ہے کہ اجرتوں کا تعلق دستوری طور پر ہو تاکہ آجرین اپنی مرضی سے اجرتوں کا تعین نہ کرسکیں۔ مقننہ کا یہ منشانہ تھا کہ اس قانون کو ہر صنعت پر نافذ کریں بلکہ صرف ان صنعتوں سے متعلق کرنا مقصود تھا جہاں مزدوروں کی صحیح طور پر تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے یا انتظامیہ کے غیر صحیح طریقہ کار کی وجہ سے مزدوروں کو جتنی اجرت ملنا چاہیے نہیں مل رہی ہے یا یہ کہ اجرت بہت کم مل رہی ہے۔ جیسے جیسے حالات بدلتے جائیں مقننہ کو اس قانون کے تحت یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان صنعتوں کی فہرست میں اضافہ کرے جس میں مختلف نوعیت کے مزدوروں کے متعلق یا مختلف مقامات پر واقع صنعتوں کے متعلق اقل ترین اجرت کے تعین کی ضرورت ہے قانوناً حکومت کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ مختلف نوعیت کے مزدوروں کی اقل ترین اجرت میں کودے اور اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرے۔ اقل ترین اجرت کے تعین کے لیے حکومت ایک کمیٹی مقرر کرتی ہے جو متعلقہ امور کی چھان بین کرکے حکومت کو کسی خاص صنعت کے متعلق ہر خدمت کے لیے اقل ترین اجرت معین کرنے

کی سفارش کرتی ہے۔ حکومت ان سفارشات کی بنیاد پر ایک اعلان گزٹ میں شائع کرتی ہے جس میں کسی صنعت کی مختلف خدمتوں کے متعلق اقل ترین اجرت کی تجاویز درج ہوتی ہیں۔ تاکہ عوام اقل ترین اجرت کی ان تجاویز سے واقف ہوں۔ اس اعلان میں ایک تاریخ بھی درج کی جاتی ہے جو تاریخ اشاعت اعلان سے دو ماہ سے کم نہیں ہوتی جس کے اندر عوام اپنی رائے ان مجوزہ اقل ترین اجرتوں کے متعلق دے سکتے ہیں ان اعتراضات یا رائے پر جو عوام سے ان تجاویز کے بارے میں وصول ہوتی ہیں غور کرکے حکومت مشاورتی بورڈ سے مشورہ کرتی ہے جو اس غرض کے لیے قانوناً قایم کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اقل ترین اجرتوں کے تعین کے متعلق اپنے فیصلے کو گزٹ میں شائع کرتی ہے۔ حکومت کو اس کا بھی اختیار ہے کہ ان خدمتوں میں اضافہ کرسکے جن کے متعلق حکومت کی رائے میں اقل ترین اجرت ادا نہ کرنے کی صورت میں کیا تعزیری اقدام کیے جائیں ان کا فیصلہ کرتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اقل ترین اجرت کا تعلق حکومت کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ ویج بورڈ (Wage Board) سے مشورے کے بعد یا اجتماعی معاملت (Collective Bargaining) کے بعد ہی حکومت قطعی فیصلہ اس بارے میں کرتی ہے۔ چونکہ اقل ترین اجرت کا تعین صنعتی مسائل میں انتہائی دشوار کام ہے اس لیے اس کا لحاظ ضروری ہوجاتا ہے کہ معاشرتی انصاف اور کسی صنعتی ادارے کے مالیاتی موقف کو پیش نظر رکھ کر اقل ترین اجرت کا تعین کیا جائے۔

قانون انتظامیہ یا نظم و نسق (Administrative Law): (1) قانون انتظامیہ کا تعلق انتظامیہ سے ہے اور اس میں عہدیداران انتظامیہ کے اختیارات اور ان کی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ قانون انتظامیہ کی اہمیت اور اس کا گہرا مطالعہ بیسویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ (خصوصاً پہلی جنگ عظیم کے بعد اور دوسری جنگ عظیم کے ختم پر)۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس قانون کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انگلستان میں پروفیسر ڈائسی کے زیر اثر یہ تصور عام تھا کہ انگلستان میں قانون انتظامیہ کا سرے سے کوئی وجود نہیں ہے اور نیز انیسویں صدی عیسوی کے سیاسی فلسفہ عدم مداخلت (Non Interference) کا اس قدر اثر تھا کہ پبلک حکومت کی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھی۔ حکومت کا کام صرف اندرون ملک نظم و نسق کا قیام اور ملک کو بیرونی حملوں سے بچانے کا کام نیز عدل گستری اور ٹیکسوں کا عائد کرنا اوران کو وصول کرنا ایسے چند امور تک محدود تھا۔ اس سیاسی فلسفہ کی وجہ سے بجائے فائدے کے نقصان ہوتا رہا اور اس کے نتیجہ کے طور پر چند لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی دولت جمع ہوگئی۔ اسی زمانے میں انگلستان میں وہ عظیم انقلاب آیا جس کو صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ نئی نئی ایجادات اور سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست ترقی ہونے کی وجہ سے نئی نئی فیکٹریاں کھلنے لگیں اور دیہاتی لوگ شہروں میں بسنے لگے جس کی وجہ سے شہروں کی آبادی میں کافی اضافہ ہوا۔ مالکان فیکٹری اَن پڑھ و غیر مزدوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے جنس و عمر کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ عورتوں اور بچوں سے زیادہ کام لیا جاتا اور کم سے کم اجرت دی جاتی تھی۔ فیکٹریوں کا حال ابتر تھا صفائی اور روشنی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ نئی نئی بیماریاں پھیلنے لگیں۔ ان غریب مزدوروں کی تباہ حالت کو دیکھ کر ان کے لیڈروں نے اپنی آواز بلند کی اور احتجاج شروع کردیا۔ مجبوراً حکومت کو مداخلت کرنی پڑی اس مداخلت کو ضروری سمجھ کر لوگوں نے اپنے سابقہ تصور کو بدل دیا اور بجائے اس کے کہ حکومت کی مداخلت پر احتجاج کریں اس کی مداخلت کو برداشت کرنے لگے بلکہ ان کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیا جانے لگا اب عوام کو اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ حکومت ہی ان کی پریشانیوں کو دور کرکے ان کے لیے سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہے حکومت نے بھی عوام کی سماجی بھلائی اور معاشی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے دائرہ عمل کو وسیع سے وسیع تر کرنا شروع کر دیا۔ نئے نئے منصوبے تیار کیے گئے لیکن ان منصوبوں پر عمل آوری صرف اسی صورت میں ممکن تھی جبکہ پارلیمنٹ سے حکومت کو یہ اختیار دیے جائیں۔

ف۔ (2) پارلیمانی طرز حکومت کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ وہی پارٹی حکومت تشکیل دے سکتی ہے جس کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہو۔ جب حکومت وقت کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہو تو اس کے اختیارات میں اضافہ کے لیے قوانین کا بنانا اور جاری کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے انگلستان میں حکومت وقت نے بہت سے قوانین جاری کروائے جس سے حکومت کے اختیارات میں کافی اضافہ ہوا۔ حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان تمام اختیارات کو خود استعمال کرے اس لیے اس نے بہت سے انتظامی ادارے قایم کیے اور ان اختیارات کو ان کے سپرد کیا گیا۔ پارلیمنٹ کا آئے دن زیادہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سے زیادہ وقت قانون بنانے میں صرف ہوتا ہے چونکہ ایسے امور کی بابت قانون بنانا جو پوری طرح سائنس یا ٹکنالوجی سے متعلق ہوں ممکن نہیں ہے اس لیے پارلیمنٹ قانون بناکر اس میں صرف اپنی پالیسی ظاہر کر دیتی ہے اور اہم امور کا خاکہ تیار کر دیا جاتا ہے۔ تفصیلات اور ذیلی امور کا تکملہ حکومتی اداروں کے ذمہ ہوتا ہے اس قسم کے قانون کو قانون مفوضہ (Delegated Legislation) یا ذیلی قانون کہتے ہیں۔ اس قسم کے قانون کے نفاذ کے بعد حکومت کو پورے پورے اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں اگرچہ کہ پارلیمنٹ اس قسم کے مفوضہ قانون پر اپنا کنٹرول رکھتی ہے تاہم اس قسم کے قانون کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت عوام کی سماجی بھلائی کے وہ تمام کام انجام دے سکتی ہے جن سے عوام کا سماجی تحفظ ہوسکے۔

ف (3) ہندوستان میں جب تک انگریزوں کی حکومت تھی وہ سوائے ان چند امور کے جو روایتی طور پر حکومت کے تفویض ہوتے ہیں مثلاً اندرون ملک نظم و ضبط اور امن و آمان قایم رکھنا ملک کو بیرونی حملوں سے بچانا عدالتی مقامات کا فیصلہ کرنا ٹیکسوں کا عاید اور وصول کرنا کوئی دیگر کام جس سے ملک کے عوام کی معاشی و سماجی حالت بہتر ہو انجام نہیں دی جس طرح انگلستان میں حکومت کی مداخلت کی ضرورت محسوس ہوئی اسی طرح ہندوستان میں بھی یہ محسوس کیا گیاکہ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جبکہ حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ یوں بھی 1939 کے قانون دفاع ہند کے تحت حکومت کو اغراض جنگ کے لیے وسیع اختیارات دے دیے گئے تھے جن کو حکومت جنگ ختم ہونے کے بعد بھی استعمال کرتی رہی۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے کئی قوانین جاری کیے جس کی وجہ سے حکومت کو مزید اختیارات حاصل ہوئے اور حکومت اس قابل ہوئی کہ وہ تمام سماجی بھلائی کے کام جو اس کے سپرد کیے گئے تھے انجام دے سکے نیز ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انتظامی ادارے قایم کر دیے گئے اور ان کے فرائض کی عمل آوری کے لیے انتظامی عدالتیں بھی قایم کی گئیں۔

ف (4) ان اہم تبدیلیوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت کے جو تین بڑے جز ہیں یعنی مقننہ جس کا کام قانون بنانا ہے۔ عاملہ جس کا کام ان قوانین کا نفاذ کرنا ہے اور عدلیہ جس کا کام ان قوانین کو لاگو کرنا ہے ان میں سے کسی ایک جز کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنے ذمے کا کام دوسرے جز کے سپرد کرے یا اس کی مداخلت کو برداشت کرے اصل میں یہ طریقہ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر اختیار کیا جاتا ہے جس کو اصول علاحدگی اختیارات (Seperation of Power) کہتے ہیں۔

پارلیمانی طرز حکومت میں اصول علاحدگی اختیارات پر پوری طرح عمل نہیں ہوسکتا کیونکہ اس طرز حکومت میں عاملہ، مقننہ کا نہ صرف ایک جز ہوتی ہے بلکہ وہ مقننہ کے سامنے ذمہ دار بھی ہوسکتی ہے۔ اسی لیے اس قسم کی طرز حکومت کو ذمہ دارانہ حکومت (Responsible Government) بھی کہتے ہیں۔ البتہ عدلیہ مقننہ کے اثر و عاملہ کے کنٹرول سے بالکل آزاد ہوتی ہے اس حد تک اصول علاحدگی اختیارات پر عمل ہوسکتا ہے۔ حالیہ دور میں حکومت کا دائرہ عمل بہت وسیع ہوچکا ہے اور شاید ہی کوئی شعبہ زندگی ایسا ہو جس میں حکومت مداخلت نہ کرتی ہو یہ مداخلت ان اختیارات کے استعمال سے کی جاتی ہے جو پارلیمنٹ نے اس کے سپرد کیے ہوں۔ قانون انتظامیہ کا تعلق ان ہی سپردکردہ اختیارات اور اس کے استعمال سے ہے۔ اس بات کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے کہ انتظامیہ اپنے مفوضہ اختیارات سے تجاوز نہ کرے یا اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے جس کی وجہ سے عوام کے حقوق میں مداخلت ہوتی ہے جس سے ان کے حقوق کے پامال ہونے کا اندیشہ لاحق ہوجاتا ہے۔ پس اس بات کی ضرورت ہے کہ ان سپردکردہ اختیارات پر سیاسی کنٹرول اور عدالتی کنٹرول قایم ہو۔ سیاسی کنٹرول پارلیمنٹ کا ہوتا ہے اور عدالتی کنٹرول عدالتوں کا۔ یہ کنٹرول شہریوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں۔ قانون انتظامیہ میں اسی سیاسی کنٹرول اور عدالتی کنٹرول کے طریقے اور ضرورت وغیرہ سے بحث ہوتی ہے پارلیمنٹ کا سیاسی کنٹرول اس طرح ہوتا ہے کہ وہ تمام ذیلی قوانین جو کسی اصل قانون کے تحت بنائے و جاری کیے جاتے ہیں مثلاً بائی لاز، ریگولیشن رولز، نوٹی فکیشن وغیرہ ان کے متعلق یہ لازم ہے کہ وہ پارلیمنٹ کی سلیکٹ کمیٹی کے روبرو پیش ہوں اور اگر پارلیمنٹ مناسب سمجھے تو اس کو ان ذیلی قوانین میں رد و بدل کرنے کا یا ان کو منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ف (5) عدالتی کنٹرول نہ صرف ان ذیلی قوانین پر ہوتا ہے بلکہ انتظامی عدالتوں کے طریقے کارروائی اور فیصلوں پر بھی ہوتا ہے ذیلی قوانین پر کنٹرول اس طرح ہوتا ہے کہ جب کبھی ان کو چیلنج کیا جاتا ہے تو عدالت پہلے یہ دیکھتی ہے کہ اصل قانون جس کے تحت پارلیمنٹ نے اختیارات تفویض کیے ہیں خود دستوری ہے یا نہیں اگر وہ دستوری اختیارات سے زیادہ یا خلاف ہو تو اس کو عدالت کالعدم یا غیر دستوری قرار دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا ذیلی قوانین اصل قانون میں دیے ہوئے اختیارات سے بڑھ کر تو نہیں ہیں۔ اگر وہ بڑھ کر ہوں تو ان کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے اختیارات کے غلط استعمال پر بھی پابندی یا کنٹرول ہوتا ہے۔ اگر اختیارات کا استعمال کسی شخص کو بدنیتی سے نقصان پہنچانے کے لیے کیا جائے تو عدالت ذریعہ "رٹ" اختیارات کے اس استعمال کو غیر قانونی قرار دیتی ہے۔ انتظامی عدالتوں کے فیصلوں اور کارروائی کے طریقوں پر پابندی یا کنٹرول رٹ یا آرڈر کے ذریعہ ہوتا ہے مثلاً "سرشوریاری" (Certiorari) کی رٹ اس وقت نافذ ہوتی ہے جبکہ انتظامی عدالت کا عہدیدار اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر رہا ہو۔ مینڈیمس (Mandamus) کے رٹ کا اس وقت نفاذ ہوتا ہے جب یہ ادارے اپنے سپرد کیے ہوئے اختیارات کو استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

پروہی بشن (Prohibition) کی رٹ کا نفاذ اس وقت عمل میں آتا ہے جب انتظامیہ اپنے اختیارات سے بڑھ کر عمل کرتا ہے۔ ہیبس کارپس (Habeas Corpus) کی رٹ کا نفاذ اس وقت عمل میں آتا ہے جبکہ کسی شہری کو حبس بے جا میں رکھا جائے۔

کووارنٹو (Quowaranto) کی رٹ اس وقت جاری ہوتی ہے جب یہ ادارے کوئی ایسا عمل کریں جس کا انھیں اختیار ہی نہ ہو پس یہ تمام رٹ ان صورتوں میں جاری ہوتے ہیں جبکہ ضابطہ کی کارروائی میں نقص ہو یا ان انتظامی عدالتوں کے ریکارڈ میں کوئی ظاہری خامی ہو یا ان عدالتوں نے قدرتی انصاف کے اصولوں کو پیش نظر نہ رکھا ہو۔ قدرتی انصاف سے یہ مطلب ہے کہ حاکم عدالت کسی معاملہ میں کوئی ذاتی غرض رکھتا ہو تو وہ اس مقدمہ کی سماعت نہ کرے۔ بالفاظ دیگر انتظامی عدالت غیر جانب دار ہو نیز جس شخص کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کیا گیا ہو اس کو اپنی صفائی کا حق دے اور جو کچھ اپنی صفائی میں بیان کرے اس کو سنے اگر وجوہات نہ سنی جائیں اور فریقین کو شہادت یا بیان تحریری پیش کرنے کا یا ان کو گواہوں پر جرح کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے تو یہ سب قدرتی انصاف کے خلاف سمجھے جائیں گے اور عدالت کو مداخلت کا حق پیدا ہو جائے گا۔ پس عدالتی کنٹرول کی وجہ سے شہریوں کی آزادی و حقوق کی حفاظت ہوتی ہے اگر کوئی شخص کسی انتظامی عدالت کے فیصلے سے ناراض ہو تو اس کو حق حاصل ہے کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں درخواست پیش کرے۔

قانون انتظامیہ میں پارلیمنٹ کے سیاسی کنٹرول اور عدالتوں کے جوڈیشل کنٹرول کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس سے شہریوں کی آزادی اور حقوق کا تحفظ ہوتا ہے۔ قانون دستوری اور قانون انتظامیہ میں یہ فرق بتایا جاتا ہے کہ پہلا حکومت کے ڈھانچے سے متعلق ہے اور دوسرا حکومت کے انتظامیہ سے متعلق۔ یوں دیکھا جائے تو ان دونوں قوانین کا تعلق عوامی قانون سے ہے اور دونوں میں بہت ہی قریبی تعلق ہے۔

ف (6) حکومت اپنے اختیارات انتظامی ایجنسیوں کو تفویض کرتی ہے ہندوستان میں اس قسم کی جو ایجنسیاں ہیں ان کی چند مثالیں یہ ہیں۔

(1) دی سنٹرل بورڈ آف ریونیو
(2) دی ریلوے بورڈ
(3) دی ٹرانسپورٹ اتھارٹی
(4) انکوائری کمیشن
(5) ویج (اجرت) بورڈ
(6) ٹیارٹ بورڈ
(7) عہدیداران ٹیکس کی تشخیص

ان ایجنسیوں نے قوانین کی پابندی کرانے کے لیے چند انتظامی عدالتیں بھی قایم کی ہیں۔

مثلاً الیکشن ٹرابیونل (Election Tribunal) انڈسٹریل ٹرائبونل (Industrial Tribunal) انکم ٹیکس اپلیٹ ٹرائبونل (Income Tax Appellete Tribunal) وغیرہ۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اس قسم کی انتظامی اتھارٹیز کا آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے اور پھر وسیع اختیارات اور صوابدید استعمال ہوتے ہیں ان کا دائرہ عمل بھی کافی وسیع ہوتا ہے جس میں اختیارات قواعد سازی و تجویز مقدمات اور دیگر اہم معاملات میں فیصلہ کرنا وغیرہ بھی شامل ہے۔

ف (7) تنازعات کے فیصلے کا اختیار ملک کی عدالتوں کو دیا گیا ہے دستور ہند میں ایک باقاعدہ اور تدریجی نظام عدالت قایم کیا گیا ہے پھر بھی یہ عدالتیں نہ تو تعداد میں کافی ہیں اور نہ سماج کے آئے دن کے نئے نئے جھگڑوں کے فیصلے کی صلاحیت رکھتی ہیں مثال کے طور پر حکومت ہند آجکل نئے نئے منصوبہ بندی پروگراموں پر عمل کر رہی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سماجی سہولتیں عوام کو بہم پہنچائے و نیز حکومت مزدوروں کے مسائل کا حل بھی تلاش کر رہی ہے دنیا کی بعض حکومتوں نے اپنے ذمہ بہت سے کام لے لیے ہیں اور کئی معاملات میں رکاوٹیں بھی پیدا کر رہی ہیں جس کی وجہ سے اشخاص کے حقوق و مفادات سے ٹکراؤ کا امکان بڑھ گیا ہے۔ اگر خانگی اشخاص اور حکومت یا انتظامیہ میں جھگڑا پیدا ہوجائے تو انتظامی عدالتیں ایسے جھگڑوں کا بہتر طریقے سے تصفیہ کر سکتی ہیں۔ بجائے عام عدالتوں کے۔ اس ضرورت کے پیش نظر انتظامیہ کو اختیارات دیے گئے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ ان انتظامی عدالتوں کا قیام ہے۔

یہ عدالتیں انتظامیہ عدالتوں کی نوعیت (Court of Law and Justice) عدالت انصاف کی تعریف میں داخل نہیں ہوتیں نہ یہ عاملہ کی تعریف میں آتی ہیں بلکہ ان کی درمیانی شکل ہے۔ یعنی یہ عدلیہ و عاملہ کی درمیانی حیثیت رکھتی ہیں اوپر بیان کیے ہوئے اصول علاحدگی اختیارات کے برخلاف یہ باوجود عاملہ کے جز ہونے کے عدالتی اختیارات استعمال کرتی ہیں۔ پروفیسر ڈائسی کے اصول قانون کی حکومت (Rule of Law) کے بھی نظائر ہیں۔ کیونکہ پروفیسر صاحب کی رائے میں جھگڑوں کا تصفیہ ملک کی معمولی عدالتوں کو کرنا چاہیے۔

انتظامی عدالتیں قانون کے ذریعہ سے قایم کی جاتی ہیں اگرچہ کہ وہ عدالتی اختیارات استعمال کرتی ہیں لیکن وہ عدالتوں کے خاص قواعد کی پابند نہیں ہیں یعنی وہ نہ ضابطہ دیوانی کی پابند ہیں اور نہ قانون شہادت کی۔

ان عدالتوں کے حاکم وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے خاص دائرہ عمل میں ماہر ہوتے ہیں اور ان کی معلومات کی وجہ سے ان خاص مقدمات کے فیصلوں میں سہولت ہوتی ہے جو ان کے دائرہ عمل سے متعلق ہوں۔ دستور ہند میں اس قسم کی انتظامیہ عدالتوں کو مانا گیا ہے خصوصاً دفعہ 136 میں عدالتوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ انتظامی عدالتوں کا بھی ذکر ہے جس کی وجہ سے ان عدالتوں کو دستوری درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ یہ عدالتیں نیم عدالتی اختیارات استعمال کرتی ہیں اور اگرچہ ان عدالتوں کی کارروائی عدالتی کارروائی سمجھی جاتی ہے۔ یہ ضابطہ دیوانی یا قانون شہادت کے اصولوں کی پابند نہیں ہیں۔

قانون حق آسائش (Law of Easement): حق آسائش سے مراد وہ حق ہے جو کسی جائداد کے مالک یا قابض کو اپنی جائداد کے استفادے کے لیے کسی اور زمین یا جائداد پر جو اس کی ملکیت نہ ہو کوئی عمل کرنے یا نہ کرنے کے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح سے استفادے کا جو حق پیدا ہوتا ہے اسے غالب حقیقت (Dominant Ownership) اور جس شخص کو حق حاصل ہوتا ہے اسے غالب حق دار (Dominant Owner) کہتے ہیں۔ وہ شخص جسے اپنی زمین یا جائداد سے شخص اول الذکر کو استفادے کا حق دینا ہوتا ہے اسے تابع حق دار (Servient Owner) اور اس ذمہ داری کو تابع حقیقت (Servient Heritage) کہا جاتا ہے۔ ایک مثال سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے۔ اگر کسی شخص کو اپنے مکان جانے کے لیے دوسرے شخص کی زمین سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے اور اس طرح اسے حق راہ حاصل ہے تو اس حق کو حق آسائش کہا جائے گا دوسری مثال یہ بھی ہو سکتی ہے اگر ایک شخص اپنی ضرورت کے لیے اس باولی یا چشمے سے جو دوسرے شخص کی زمین پر واقع ہے پانی استعمال کرتا ہے تو اسے بھی حق آسائش کی تعریف میں لایا جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اپنی زمین کا کوئی حصہ اس غرض کے لیے مختص کرے کہ عوام اسے آمد و رفت کے لیے استعمال کریں تو اس طرح سے اس راستے پر سے گزرنے کے حق کو حق آسائش کی تعریف میں نہ لایا جائے گا۔ اس طرح اگر کوئی شخص اپنے گھر کی نالی (Drain) صاف کرنے پر مجبور ہے تاکہ اس کے پڑوس کے گھر کی نالی صاف رہے تو یہ عمل قانون آسائش کے تحت آسائش کی تعریف میں نہیں آئے گا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act):

ہندوستان میں دادرسی خاص کے تعلق سے اولاً 1877 میں قانون نافذ کیا گیا۔ 1963 میں اس قانون کو قانون دادرسی خاص، 1964 (The Specific Relief Act, 1964) کے ذریعہ منسوخ کیا گیا اور اس وقت یہی (1963) قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act, 1964) نافذ ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قانون دادرسی خاص کے ذریعہ عدالتوں کے اختیار سماعت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا نقض معاہدہ (Breach of Contract) کی صورت میں ہرجانہ (Damages) دلانے کا اختیار سماعت (Jurisdiction) عدالتوں کو قانون معاہدہ کے تحت حاصل ہے۔ قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کا یہ منشا نہیں ہے کہ کسی شخص کو اس دادرسی (Relief) کے حق سے روکا جائے جو نقض معاہدہ (Breach of Contract) کی صورت میں اسے اور طور پر قانوناً حاصل ہوں اور اسے صرف قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت معاہدے کی تعمیل مختص (Specific Performance) کی دادرسی خاص کرنے کا پابند کیا جائے۔

قانون دادرسی خاص کا یہ بھی منشا نہیں ہے کہ دستاویزات کے متعلق انڈین رجسٹریشن ایکٹ، 1901 (Indian Registration Act, 1901) کی عمل آوری کو متاثر کیا جائے۔

قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) سے انفرادی حقوق حاصل کرنے کے لیے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن کسی تعزیری قانون (Penal Law) کو روبہ عمل لانے کے لیے قانون دادرسی خاص سے کوئی مدد نہیں لی جاسکتی۔ اگر کوئی شخص کسی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ پر قبضہ پانے کا حق رکھتا ہو تو وہ ضابطہ دیوانی 1908 (Code of Civil Procedure, 1908) میں مدون شدہ قواعد کے تحت دادرسی حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کی جائداد غیر منقولہ بغیر کسی قانونی کارروائی کے اس کی رضامندی کے بغیر حاصل کی گئی ہو تو وہ قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت عدالت میں چارہ جوئی کرکے ایسی جائداد غیر منقولہ کو واپس حاصل کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ عدالتی کارروائی جائداد پر فریق مقابل کے قبضہ کی تاریخ سے چھ ماہ کے اندر کی جائے اس قسم کی عدالتی کارروائی گورنمنٹ کے خلاف نہیں کی جاسکتی اس قسم کے دعوے (Suit) پر عدالت سے جو فیصلہ ہوگا اس کی ناراضی سے اپیل (Appeal) یا ریویو (Review) کی قانونی دادرسی خاص میں گنجائش نہیں رکھی گئی لیکن کوئی شخص اس جائداد پر اپنے حق کے متعلق عدالت دیوانی میں علاحدہ طور پر چارہ جوئی کرسکتا ہے۔

اگر کسی شخص کے قبضے میں ایسی جائداد منقولہ ہو جس کا وہ مالک نہ ہو تو اس کے خلاف قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت اس استدعا کے ساتھ عدالت میں چارہ جوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ اس جائداد منقولہ کو ایسے شخص کو فوری واپس کردے جو اس جائداد منقولہ کو اپنے قبضے میں رکھنے کا قانونی حق رکھتا ہو لیکن ایسی عدالتی چارہ جوئی صرف ذیل کی صورتوں میں ہی کی جاسکتی ہے:

(1) جب وہ جائداد منقولہ مدعی کے ایجنٹ (Agent) یا ٹرسٹی (Trustee) کی حیثیت سے مدعاعلیہ کے قبضے میں ہو۔

(2) جب اس جائداد منقولہ کی قیمت کی ادائیگی مدعی کے لیے مناسب دادرسی نہ ہو۔

(3) جب اس جائداد منقولہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے مدعی کے نقصان کا تعین کرنا دشوار ہو۔

(4) جب مدعی نے غلطی سے اس جائداد منقولہ کو مدعاعلیہ کے قبضے میں دے دیا ہو مقدمہ نیو سروس سوسائٹی بنام وی کے الکزینڈر اے آئی آر 1868 (New Service Society Vs. V.K. Alaxander A.I.R.1968) میں اس قسم کا اظہار خیال کیا گیا ہے کہ قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) نے اس قسم کے دعوے (Suit) کی نوعیت کو محدود نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مجموعہ ضابطہ دیوانی (Civil Procedure Code) کے معینہ طریقوں کے تحت ہی عدالتی چارہ جوئی کی جائے۔

قانون دیوالیہ (افعال دیوالہ) (Insolvency Act) :

قانون دیوالہ کے اعتبار سے وہ افعال جن کے وقوع پذیر ہونے سے کوئی شخص دیوالیے کے فعل کا مرتکب قرار پائے گا وہ حسب ذیل قرار دیے گئے ہیں:

(1) ہندوستان میں یا کسی بیرون ملک اگر کوئی مقروض شخص اپنی تمام یا بیشتر جائداد کسی شخص ثالث کو اپنے قرض خواہوں کے عام نمائندے کی غرض سے منتقل کرے۔

(2) ہندوستان میں یا کسی بیرون ملک اگر کوئی مقروض شخص اپنی جائداد اپنے قرض خواہوں کو شکست دینے کے لیے یا قرض کی ادائگی میں تاخیر کی نیت سے منتقل کرے۔

(3) ہندوستان میں یا بیرون ملک اپنی جائداد منتقل کرے اور یہ منتقلی قانون دیوالیہ یا کسی اور قانون نافذ الوقت کے تحت اس شخص کے دیوالیہ قرار دینے کی صورت میں فریبانہ ترجیح کی بناء پر کالعدم قرار پا سکتی ہو۔

(4) قرض دار اپنے سکونتی مکان یا عام مقام کاروبار سے دور چلا جائے یا غیر حاضر ہوجائے۔

(5) قرض دار ایسی جگہ منتقل ہوجائے جہاں سے کوئی مراسلت نہ کی جاسکتی ہو۔

(6) اگر قرض دار کی کوئی جائداد کسی عدالتی ڈگری کی تعمیل میں قرق ہوئی ہو۔

(7) اگر قرض دار نے خود درخواست دی ہوکہ اسے دیوالیہ قرار دیا جائے۔

(8) اگر وہ اپنے قرض خواہوں کو یہ اطلاع دے کہ اس نے اس قرض کی ادائگی بند کردی ہے یا بند کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔

(9) اگر کسی قرض کے سلسلے میں کسی عدالتی ڈگری کی بناہ پر کسی شخص کو قید کی سزادی گئی ہو۔

یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ کسی ایجنٹ کا عمل امور بالا کے متعلق اصل شخص کا عمل قرار پائے گا۔

قانون رسد (Law of Supply): کسی شے کی رسد سے مراد اس کی وہ مختلف مقداریں ہیں جو فروشندہ اس کی مختلف قیمتوں پر فروخت کرنے کے لیے تیار ہو۔

فروشندہ عموماً کسی شے کی زیادہ قیمت پر اس کی زاید مقدار اور کم قیمت پر کم مقدار فروخت کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے چنانچہ اس رجحان کو قانون رسد کہتے ہیں۔ کسی شے کی زیادہ مقدار پیدا کرنے کے مصارف مختتم چونکہ عموماً بڑھتے جاتے ہیں اور فروشندہ کسی شے کی مقدار فروخت کی قیمت اس کے مصارف مختتم سے کم نہیں لے سکتا اس لیے زیادہ قیمت پر شے کی مقدار رسد زیادہ اور کم قیمت پر کم ہوتی ہے اور نفع مصارف کے مماثل فروشندے کو بھی خالص فائدہ حاصل ہوتا ہے جسے نفع پیدا کنندہ (Producer's Surplus) کہتے ہیں۔

قانون شہادت (Evidence Act): قانون شہادت وہ قانون ہے جو عدالتی کارروائیوں میں واقعات کو پیش کرنے اور انھیں ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون شہادت ہندوستان میں 1872 میں نافذ کیا گیا۔ یہ قانون انگلستان کے قانون شہادت پر مبنی ہے۔ لیکن ان امور کے متعلق جو قانون شہادت میں واضح طور پر درج نہیں ہیں انگلستان کے قانون شہادت سے مدد لینا صحیح نہ ہوگا۔ اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ قانون شہادت انگلستان کے قانون شہادت کی بالکل نقل نہیں ہے اور انگلستان میں قانون شہادت پوری طرح باقاعدہ مدون نہیں ہے بلکہ عدالتی فیصلہ جات کی بنیاد پر جو اصول طے پائے ہیں اس نے قانون کی حیثیت پالی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ 1873 کے بعد مختلف نوعیت کے فیصلہ جات صادر کیے گئے ہوں۔

قانون شہادت ضابطہ (Procedure) کا قانون ہے۔ توہین عدالت (Contempt of Court) کے مقدمات میں قانون شہادت سے مدد نہیں لی جاتی ہے صرف حلف نامے (Affidavit) کی بنا پر توہین عدالت کے مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

قانون شہادت کا اطلاق عدالتی کارروائی پر ہوتا ہے۔ قانون صنعتی تنازع (Industrial Disputes Act) کے تحت قایم کی جانے والی لیبر عدالت (Labour Court) یا لیبر ٹریبونل (Labour Tribunal) اور اس لیے لیبر کورٹ یا لیبریا انڈسٹریل ٹریبونل (Labour or Industrial Tribunal) کو کسی بھی شخص کی طلبی اور بحلف بیان لینے کا اختیار ہوتا ہے جیسا کہ کسی اور عدالت کو حاصل ہو اور اس طرح اس کارروائیوں سے جو کسی لیبر کورٹ یا لیبر انڈسٹریل ٹریبونل (Labour or Industrial Tribunal) میں زیر سماعت ہوں قانون شہادت متعلق ہوجاتا ہے اور اس کا فیصلہ قدرتی انصاف اور قانون شہادت کو پیش نظر رکھ کر کیا جانا ضروری ہے۔ (ملاحظہ ہو اے ڈی آر 1959 کلکتہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ یوں ہے کہ لیبر کورٹ میں جو کاروائی ہوتی ہے وہ بالکلیہ عدالتی نہیں بلکہ کارروائی کی نوعیت عدالتی کارروائی کے مماثل ہوتی ہے۔ اس لیے قانون شہادت

پوری طرح متعلق نہیں ہوتا اور لیبر کورٹ یا ٹریبونل (Labour Court or Tribunal) ایسی شہادت کو قبول کرسکتا ہے جو قانون شہادت کے تحت قابل قبول نہیں۔ (A.I.R 1962)

ملازمین سرکار (Government Servants) کے خلاف ڈپارٹمنٹل تحقیقات (Departmental Enquiry) کی کاروائی میں قانون شہادت متعلق نہیں ہوتا بلکہ مختلف قسم کے ٹریبونل (Tribunal) اور ملازمین سرکار کے خلاف ڈپارٹمنٹل تحقیقات کرتے وقت قدرتی انصاف (Natural Justice) کو پیش نظر رکھنا چاہیے قدرتی انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ کسی فریق کو اپنی پوری متعلقہ شہادت پیش کرنے کا موقع دینا چاہیے جن پر اس کا استدلال ہے فریق مقابل کی شہادت اس کی موجودگی میں لینا چاہیے اور یہ کہ اسے اس گواہ پر جرح کرنے کا حق دینا چاہیے جو فریق مقابل کی طرف سے پیش کیا جائے اور یہ کہ اس کارروائی میں کوئی ایسا مواد (Material) اس کے خلاف فیصلے کے لیے استعمال نہ کرنا چاہیے جسے دیکھنے کا اسے موقع نہ دیا گیا ہو۔ اگر ان اصولوں کی پابندی کی گئی ہو تو یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ ٹریبونل (Tribunal) کی کارروائی یا ڈپارٹمنٹل تحقیقات (Departmental Enquiry) میں قانون شہادت کی پابندی نہیں کی گئی۔

حلف نامے (Affidavits) بطور ثبوت عدالت میں کسی سماعت کے مقدمہ کے ذیلی امر کے متعلق داخل کیے جاتے ہیں۔ اگر ایسے حلف نامے کے سلسلے میں کوئی جوابی حلف نامہ (Counter Affidavit) داخل کیا گیا ہو اور فریق مقابل نے حلف نامہ داخل کرنے والی کی طلبی اور اس پر جرح کی استدعا کی ہو اور وہ شخص عدالت میں حاضر ہوگیا ہو اور اس پر جرح کی گئی ہو تو ایسی صورت میں ایسے حلف نامے کو اس مقدمے کی حد تک مکمل شہادت کی حیثیت حاصل ہوگی لیکن اگر حلف نامہ داخل کرنے والے شخص نے عدالت میں حاضری سے گریز کیا ہو تو اسے حلف نامے کو شہادت کا درجہ نہیں دیا جاسکے گا۔ چنانچہ آسام ہائی کورٹ نے ایک مقدمے میں فیصلہ کیا ہے کہ ایسا حلف نامہ جس میں حلف لینے والے کو عدالت میں جرح کے لیے پیش نہ کیا گیا ہو قابل ادخال شہادت نہیں ہے ملاحظہ ہو اے آئی آر 1967 (A.I.R.1967)۔

کسی ثالث (Arbitrator) کے روبرو جو کارروائی ہوتی ہے اگرچہ قانون شہادت اس سے پوری طرح متعلق نہیں ہوتا لیکن اگر کسی ثالث (Arbitrator) نے کسی فریق کی عدم موجودگی میں گواہوں کے بیانات قلم بند کیے ہوں تو ایسی صورت میں اس کارروائی کو قانونی طور پر صحیح نہ سمجھا جائے گا۔

دستاویزی شہادت (Documentary Evidence) کسی مقدمے میں ادعا کے ثبوت کے طور پر دستاویزی شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔ کسی مقدمے میں ریکارڈ (Record) کی طلبی پر جو ریکارڈ عدالت میں داخل کیا جاتا ہے اسے اس وقت تک ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا جب تک ریکارڈ کے ان کاغذات پر جس پر فریق کا استدلال ہے اور قانونی طور پر ثابت نہ کیا جائے۔ اگر کسی فریق نے کسی دستاویز سے پہلے انکار کیا ہو لیکن بعد میں اس دستاویز کی صحت (Genuinness) کو قبول کرلیا ہو تو ایسی صورت میں عدالت ایسی دستاویز کو قابل ادخال شہادت قرار دے سکتی ہے۔ کوئی عدالت کسی رجسٹری شدہ دستاویز کو اس پر دستاویز کی تکمیل (Execution of Document) کے قطعی ثبوت (Conclusive Proof) قرار دینے کی پابند نہیں ہے لیکن عدالت ایسے رجسٹری شدہ دستاویز کو اس کی تکمیل کا کافی ثبوت (Sufficient Proof) قرا دے سکتی ہے۔ کسی دستاویز کی تکمیل یا مصنف ہونا (Execution or Authorship) ایک ایسا واقعہ ہے جس کو اس طرح ثابت کرنا ضروری ہے جیسا کہ کسی اور واقعہ کو ثابت کیا جاتا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے راست شہادت (Direct Evidence) اور واقعات متعلقہ کی شہادت (Circumstancial Evidence) ضروری ہے لیکن واقعات متعلقہ کی شہادت کافی وقیع ہونی چاہیے اگر اس دستاویز کو کسی جرم ثابت کرنے کے لیے استعمال کرنا ہے۔ راجستھان ہائی کورٹ نے ایک نظیر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ رجسٹری شدہ دستاویز کو مزید ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے قانون شہادت کی دفعہ نمبر 79 کے تحت اس کی صحت (Genuinness) کو صحیح ماننے کا مفروضہ (Presumption) درست ہوگا اور چونکہ فریق نے ایک مکان کو خریدنے کے متعلق رجسٹری شدہ بیعنامہ پیش کیا ہے اس لیے اس بیع نامہ کو صحیح سمجھنا چاہیے اور اس کے لیے مزید ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ فریق کو اس خرید کردہ مکان کے متعلق دعویٰ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے (A.I.R.1963)۔

اگر کسی دستاویز کی نقل کو داخل کیا گیا ہو اور وہ نقل مرکزی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

حکومت یا اسٹٹ گورنمنٹ کے کسی گزیٹڈ افسر (Gazetted Officer) کی تصدیق کردہ ہو تو قانونی تصور یہ ہے کہ یہ نقل صحیح ہے اور جس عہدہ دار نے نقل کی تصدیق کی ہے وہ ایسی تصدیق کرنے کا مجاز تھا۔

ایسے کاغذات جو کسی عدالتی مقدمے کے ریکارڈ (Record) میں یا سرکاری دفتر (Govt. Office) کے ریکارڈ میں ہوں عام طور پر پبلک دستاویز (Public Document) کہا جاتا ہے اور افسر متعلقہ کسی فریق کی درخواست پر اس کی نقل مصدقہ ضروری قانونی اسٹامپ دے سکتا ہے اور وہ نقول مصدقہ عدالت میں بطور ثبوت داخل کی جاسکتی ہے اور ایسی نقل مصدقہ عدالتوں میں قابل قبول ہوں گی۔ مقدمہ مادانچ رامپا بنام ماتھر وبوجپا (Madamance Rampa Vs. Matur and Bojappa)اے آئی آر 1963 (A.I.R.1963) میں سپریم کورٹ نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ دستاویزات کی نقول مصدقہ ثبوت کے لیے عدالت میں قابل قبول ہے اگر ہائی کورٹ نے ایسی نقل کو قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ وہ دستاویز اور طور پر ثابت نہیں کی جاسکتی تو یہ ایک قانونی غلطی ہے۔

وہ حسابات (Books of Account) جو عام طور پر کاروبار کے سلسلے میں رکھے جاتے ہیں قابل ادخال شہادت ہیں اگر یہ اندراجات اس امر تنقیح طلب سے متعلق ہوں جو کسی عدالت کے روبرو زیر تجویز ہوں لیکن ایسے اندراجات کسی شخص کو کامل طور پر ذمہ دار قرار دینے کے لیے قانونی طور پر کافی نہیں ہیں کسی دستاویز میں درج شدہ امور کو راست شہادت اولیٰ (Primary Evidence) یا ثانوی یا منقولی شہادت (Secondary Evidence) سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ راست شہادت اولیٰ (Primary Evidence) تو وہ دستاویز ہی ہے جس میں وہ امور درج ہوں جسے ثابت کرنا ہے ثانوی شہادت (Secondary Evidence) میں اس دستاویز کی نقل یا فوٹوکاپی یا اس شخص کا بیان شریک ہے جس نے اس دستاویز کو دیکھا ہے۔ زبانی شہادت (Oral Evidence) کسی واقعہ کو ثابت کرنے کے لیے زبانی شہادت بھی قابل ادخال شہادت ہے لیکن کسی شخص کا ایسا بیان جو حلفی نہ ہو قابل ادخال شہادت نہ ہوگا۔ زبانی شہادت راست (Direct) ہونا چاہیے اگر اس واقعہ کا تعلق دیکھنے سے ہو تو زبانی شہادت ایسے شخص کی ہونی چاہیے جس نے اس واقعہ کو دیکھا ہو اگر اس واقعہ کا تعلق کسی بات کے سننے سے ہے تو زبانی شہادت ایسے شخص کی ہونی چاہیے جس نے وہ بات سنی ہو۔ ایک مجسٹریٹ کسی ایسے شخص کے بیان کو قلم بند کرانے سے اس بنا پر انکار نہیں کرسکتا کہ وہ شخص بہرا ہے۔ بشرطیکہ وہ شخص بات کرسکتا ہو اور لکھ سکتا ہو اور بشرطیکہ عدالت کے اس انکار سے کسی جرم کو ثابت کرنے میں دشواری ہو۔ اگرچہ اس امر کی بابت کوئی شخص عدالت میں یہ بیان نہیں دے سکتا کہ دوسرے اشخاص نے بھی مجرم کے متعلق جرم کے ارتکاب کا شبہ (Suspicion) کیا ہے لیکن وہ عدالت میں یقیناً اپنا یہ بیان قلم بند کروا سکتا کہ اسے کسی شخص کے متعلق جرم کے ارتکاب کا شبہ ہے۔

قانون صنعتی تنازعات (The Industrial Disputes Act, 1947, XIV of 1947): قانون کے تحت لفظ انڈسٹری (Industry) سے مراد کوئی کاروبار، تجارت، اجارہ داری، پیشہ اور صنعتی کاروبار ہے۔عدالتوں نے لفظ صنعت کی تعبیر کے متعلق فیصلہ جات صادر کیے ہیں۔ مقدمہ اسٹیٹ آف ممبئی بنام ہاسپٹل مزدور سبھا میں عدالت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ گورنمنٹ کی جانب سے عوام کو تعلیم اور طبی امداد دینے کے لیے جو ہاسپٹل قایم کیے گئے ہیں وہ انڈسٹری کی تعریف میں آتے ہیں۔ مقدمہ مدراس جم خانہ بنام جم خانہ کلب کا انتظامیہ Madras Jymkhana Club Vs. Management of Jymkhana Club عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ جم خانہ کلب انڈسٹری کی تعریف میں نہیں آتا۔ اسی طرح عدالت نے ایک اور فیصلہ کیا کہ بار ایسوسی ایشن کی جانب سے جو کینٹین چلائی جاتی ہے وہ انڈسٹری کی تعریف میں نہیں آتی۔ بار ایسوسی ایشن کینٹین بنام چیف کمشنر دہلی اور دیگر (Bar Association Canteen Vs. Chief Commissioner Delhi and others) ۔

قانون صنعتی مزدوران (Law of Industrial Labours): ابتدائی دور میں مختلف صنعتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے طبقے کا سوسائٹی میں کوئی مقام نہ تھا اور ان کے ساتھ جیسا سلوک اور برتاؤ کیا جانا چاہیے تھا نہیں کیا جاتا تھا اگرچہ ان سے کام کی حد تک کوئی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مزدور طبقہ تعلیم یافتہ نہ تھا۔ ان میں اتحاد نہ تھا اور خود اعتمادی نہ تھی۔ چونکہ اس طبقے میں آجر یا صنعت کاروں کے ساتھ شرائط ملازمت و اجرت وغیرہ کے بارے میں معاملت کرنے کی کوئی صلاحیت نہ تھی اس لیے مزدور معمولی اجرت پر زیادہ کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس طبقے میں باہمی متحد ہونے کا رجحان اور گروپ بندی کا تصور پیدا ہوا اور اس طبقے نے زیادہ اجرت اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کام کرنے کے لیے بہتر حالات کی مانگ کی ابتدا کی۔ حکومت نے بھی اس غرض کی تکمیل کے لیے کئی قوانین نافذ کیے۔ ان قوانین کا منشا مزدوروں کو سہولت فراہم کرنا تھا تاکہ کارخانوں اور مختلف صنعتی اداروں میں جو مال تیار ہوتا ہے اس میں غیر ضروری رکاوٹ نہ ہو۔

قانون صنعتی مزدوران: قانون صنعتی مزدوران کئی قوانین پر مشتمل ہے:

(1) قانون کارخانہ جات (Factories Act) کے نفاذ کی اصلی غرض و غایت یہ تھی کہ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حفاظت ہو اور ان کی عام صحت اور بہبودی کا انتظام کارخانے کے انتظامیہ کی جانب سے کیا جائے۔

(2) مزدوروں کو معاوضے کی ادائگی کا قانون (The Workmen Compensation Act) اس قانون کی تدوین کا منشا یہ تھا کہ ان مزدوروں کو خاطر خواہ معاوضہ دیا جائے جو کارخانے میں کام کرنے کے دوران کسی حادثے میں زخمی ہوجاتے ہیں۔

(3) ٹریڈ یونین ایکٹ (Trade Union Act) کے ذریعہ چند حقوق اور ذمہ داریوں کے ساتھ مزدوروں کی انجمنوں کے قیام اور رجسٹریشن کی سہولت مہیا کی گئی۔

(4) قانون ادائگی اجرت (The Payment of Wages Act) کے ذریعہ مزدوروں کو اس کا اختیار دیاگیا کہ اگر آجر یا صنعت کار نے ادائگی اجرت میں کوتاہی کی ہو یا کم اجرت دی ہو تو اس کے لیے عدالتی چارہ کار اختیار کرے۔

(5) بچوں کی ملازمت کے متعلق جو قانون بنایا گیا ہے (The Employment of Children's Act) اس میں بعض صنعتوں میں پندرہ سال سے کم عمر بچوں کو ملازم نہ رکھنے کی پابندی عاید کی گئی ہے۔

(6) قانون صنعتی تنازعات (Industrial Disputes Act) کے ذریعہ وہ اصول مدون کیے گئے ہیں جن کے تحت آجر اور مزدوروں کی صنعتی نزاع کا تصفیہ کیا جاسکتا ہو اور یہ چیز بھی واضح کی گئی ہے کہ صنعتی نزاع کسے کہتے ہیں۔

(7) قانون اقل ترین اجرت (The Minimum Wages Act) اس قانون کے ذریعہ مختلف صنعتوں میں اقل ترین اجرت کا تعین کیا گیا ہے۔

(8) دی امپلائیز پراویڈنٹ فنڈ ایکٹ (The Employees Provident Fund Act) اور میٹرنٹی بینیفٹ ایکٹ (The Maternity Benefit Act, 1969) کے ذریعہ دستور ہند میں جو ہدایتی اصول مرتب کیے گئے ہیں ان کی تعمیل کی گئی۔

قانون طلب (Law of Demand): کسی شے کی طلب سے مراد اس کی وہ مختلف مقداریں ہیں جو خریدار اس کی مختلف قیمتوں پر خریدنے کے لیے تیار ہو۔ عموماً خریدار زیادہ قیمت پر کسی شے کی کم مقدار اور کم قیمت پر زیادہ مقدار خریدنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اس رجحان کو قانون طلب کہتے ہیں۔

اس رجحان کی وجہ یہ ہے کہ خریدار کسی قیمت پر شے کی وہی مقدار خریدے گا جس کا افادہ مختتم قیمت کے مساوی ہو اور اسی صورت میں اس کو بیشترین خالص افادہ حاصل ہوگا۔ اگر ایک خریدار کے نزدیک کسی شے کی 2-1 اور 3 اکائیوں کی صورت میں افادہ مختتم علی الترتیب 2,3 اور 1 روپیہ کے مساوی ہو اور قیمت فی شے 2 روپے ہو تو وہ شے کی 2 اکائیاں خریدے گا کیونکہ 2 اکائیوں کی جملہ لاگت 4 روپے ہوں گے اور ان سے جملہ افادہ 5 روپے کے مساوی ہوگا اور اس طرح خریدار کو ایک روپے کے مساوی خالص افادہ حاصل ہوگا جسے معاشی اصطلاح میں نفع صارف (Consumer's Surplus) کہتے ہیں۔ اس طرح اگر فی اکائی کی قیمت ایک روپیہ ہو تو شے کی 3 اکائیاں خریدے گا اس لیے کہ 3 اکائیوں کی صورت میں فی اکائی افادہ مختتم ایک روپیہ کے مساوی ہے اور اس سے خالص افادہ یا نفع صارف 3 روپے کے مساوی حاصل ہوگا۔ کسی شے کی مقدار طلب کے سلسلے میں اس کے افادہ مختتم اور قیمت کے مساوی ہونے کے تعلق سے نہ صرف قانون طلب کی تشریح ہوتی ہے بلکہ نام نہاد تضاد قدر (Paradox of Value) کی توجیہ بھی ہوجاتی ہے۔ یعنی پانی جیسی انتہائی مفید شے کی قیمت بہت کم ہوتی ہے لیکن ہیرے جیسی مشتبہ افادیت کی شے کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہیرے کی قلت کی بنا پر اس کا افادہ مختتم زیادہ اور پانی کی کثرت کی بنا پر اس کا افادہ مختتم بہت کم ہوتا ہے اس لیے پانی کے مقابلے میں ہیرہ بیش قیمت ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر بنیادی

طور پر کسی شے کی قدر وقیمت کا انحصار اس کی قلت اور افادیت پر ہوتا ہے۔

قانون کی حکمرانی (Rule of Law): قانون کی حکمرانی سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی فرد خواہ کتنا ہی طاقت ور اور کسی بھی منصب پر فائز کیوں نہ ہو، قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ یعنی قانون کی نظر میں امیر غریب، بادشاہ فقیر، چھوٹا اور بڑا سب برابر ہیں۔ قانون کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتے گا۔ مجرم خواہ کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو اسے قانون کے مطابق سزا دی جائے گی۔

قانون کی حکمرانی کا یہ تصور سب سے پہلے 7 ویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسلام نے پیش کیا۔ اسلامی شریعت میں عوام، خلیفہ حتیٰ کہ رسول بھی قانون سے بالاتر نہیں تھے۔ اس کے بعد 13 ویں صدی عیسوی کے اوائل میں میگنا کارٹا کی دستاویز کے وجود میں آجانے کے بعد برطانیہ میں یہ تصور ابھرا اور بعد میں ترقی کرکے برطانوی دستور کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ اس کے رو سے قانونی کارروائیوں میں عدلیہ بادشاہ کے وزیروں اور ملازموں کے اعمال کو جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ اسی طرح امریکا میں اگر انتظامیہ کا کوئی عمل خلاف دستور یا خلاف قانون ہو تو عدالتیں اس کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ کرسکتی ہیں۔ تاہم برطانیہ میں آج بھی بادشاہ اپنے ذاتی اعمال کے سلسلہ میں قانون سے بالاتر ہے۔ قانون کی حکمرانی کے تصور کو اکثر مقننہ کی عدلیہ کے اختیارات سے علاحدگی کی علامت کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

قانون (Law) : ماہیت، ماخذ اور اقسام : قانون ہر سماج اور مملکت کی مرضی کا اظہار اور اس کی وحدت کو قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ آج کے زمانہ میں ایسے سماج کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو قانون کے بغیر کام کرسکتا ہو۔ حکومت وسیع قانونی اصول بھی وضع کرتی ہے اور دقیق قانونی ضوابط بھی۔ جمہوری حکومت کا مقصود انصاف اور حق کا حصول ہے۔ قانون اس مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ سینٹ آگسٹائین نے کہا تھا کہ جو عنصر مملکت کو ڈکیتوں کے گروہ سے ممتاز کرتا ہے وہ "انصاف" ہے۔

قانون کے معنی کے بارے میں کوئی ایک رائے نہیں پائی جاتی۔ جس طرح حق و صداقت کے بے شمار مفہوم اور نظریے ہیں اسی طرح قانون کی ماہیت کے بارے میں بھی مختلف مکاتب فکر مربوط ہیں۔ قانون سے مراد انسانی عمل یا برتاؤ کا ضابطہ ہے۔ سر ولیم بلیکاسٹون نے قانون کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ شہری برتاؤ کا وہ ضابطہ ہے جسے کسی مملکت کا اعلیٰ ترین حاکم صادر کرنے کا حکم دے اور منکرات سے روکے۔

قانون کے دو لازمی عناصر ہیں۔

(1) اس کی عمومیت، یعنی وہ زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے مختلف النوع اور متعدد صورتوں میں ضابطہ، معیار یا رہ نما اصول کا کام دے سکے۔ اور (2) اس کی حاکمیت اور تعزیری صلاحیت یعنی اس کی اطاعت نہ کرنے والے کو سزا ملے۔ یہ قانون کی ایک تعریف ہے۔ قانون کی ماہیت اور اس کی بنیاد کے بارے میں چند خاص مکاتب فکر یہ ہیں :

ثبوتی نظریہ : اس کا بانی جان آسٹن ہے جس کی تعریف کے مطابق قانون وہ ضابطہ ہے جسے ایک عاقل انسان کی رہ نمائی کے لیے وہ دوسرا عاقل انسان وضع کرے جو اس کے اوپر اقتدار رکھتا ہو۔ لہٰذا قانون کی بنیاد اچھائی یا برائی کا اخلاقی اصول نہیں بلکہ سیاسی حاکم کا اقتدار ہے۔ ثبوتیوں کے نزدیک ثبوتی قانون کا ماخذ ہمیشہ واضح اور متعین قانونی حاکم ہوتا ہے۔ قانون ایک حکم ہے جسے مملکت کا اعلیٰ ترین حاکم اپنے محکوموں کے لیے جاری کرتا ہے۔ اس ثبوتی تعریف میں قانون کے چار عناصر پر زور دیا گیا ہے۔ (1) حکم، (2) اس کی پشت پر حاکم کا اقتدار اور سزا دینے کی صلاحیت، (3) فرض، اور (4) حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ۔

تاریخی نظریہ : اس کے بانی سر ہنری مین (1822-1888) (Sir Henry Maine) ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق (1) قانون تاریخی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ قانون پہلے دریافت ہوتا ہے پھر اس کی تشکیل کی جاتی ہے۔ (2) قانون کسی تاریخی دور میں کسی قوم کے قومی شعور کا مظہر ہے لہٰذا وہ ہمیشہ زمان و مکان اور مخصوص قوم سے نسبت رکھتا ہے۔ (3) فطری حقوق جیسے آفاقی اصولوں کی کوئی معروضی بنیاد نہیں۔ تاریخ میں محض مخصوص اقوام کے افراد کے حقوق مثلاً جرمنوں، انگریزوں، فرانسیسیوں اور اطالویوں کے حقوق پائے جاتے ہیں۔ (4) قانون کا ایک تاریخی عمل ہے اس کے ارتقاء میں اصلاح کے ذریعہ خلل نہیں ڈالنا چاہیے۔ (5) قانون چونکہ تاریخی اعتبار سے نسبتی ہے لہٰذا نہ تو اس کا کوئی آفاقی جواز ہے نہ آفاقی طور پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اور (6) قانونی تعزیرات سماجی دباؤ کی ایک شکل ہیں۔ یہ مجرد ضابطوں یا انصاف کے اصولوں پر مبنی نہیں ہیں۔

عمرانیاتی نظریہ : اس کے مطابق قانون ایک سماجی حقیقت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہے۔ ایک طرف سماج میں افراد اور جماعتوں کے مستقل عمل کا نتیجہ ہے تو دوسری طرف اس پر عمل سماجی کنٹرول کا ایک وسیلہ بھی ہے اس کا مطالعہ وقت کی تہذیب اور سیاسی نظام کے دائرہ میں کرنا چاہیے۔ محض موجودہ قانون ہی کو نہیں بلکہ اس کے نتائج کو بھی دیکھنا چاہیے۔ قانون ایک تجربی عمل ہے۔ افکار حاضرہ، شخصیات، گروہی مفادات، اقتصادی حالات، عوامی جذبات اور سماجی ماحول سبھی قانون کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن بیک وقت وہ خود بھی موجودہ نظام قانون کی پیداوار ہوتے ہیں۔

فطری قانون کا نظریہ : اس کے حامیوں کا کہنا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے یعنی ثبوتی قانون جب تک قانون فطرت اور قانون ربانی کے مطابق نہ ہوں نہ تو جائز و برحق ہیں نہ قابل اطاعت۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ فطرت انسانی کو خالق کائنات کی طرف سے زندگی، آزادی، مساوات اور حصول مسرت کے چند بنیادی حقوق عطا کیے گئے ہیں۔ انسان ان ہی حقوق کی حفاظت کے لیے آپس میں معاہدہ کرکے مملکت کی تشکیل کرتے ہیں۔ لہٰذا مملکت ان حقوق کی خالق نہیں بلکہ ان کی نگہبان ہے۔

قانون کی اقسام : قانون نظاموں کی زمرہ بندی تین طریقوں سے کی جاتی ہے۔ (1)جغرافیائی بنیاد پر یعنی ایک طرف تو بین الاقوامی قانون کا نظام ہے جو بین الاقوامی نظام کی ساری اکائیوں پر نافذ کیا جاتا ہے۔ دوسرے علاحدہ علاحدہ قومی قانونی نظام۔ ان مختلف قومی نظاموں کا گہرا رشتہ چند تہذیبوں سے ہے۔ مثلاً موجودہ دور میں دنیا کے مختلف خطوں میں یہ نظام مروج ہیں۔ رومی قانون، سول قانون، اینگلو امریکی، رواجی قانون (کامن لاء)، سویت قانون اور اسلامی قانون۔ (2)ماخذ کے اعتبار سے یعنی ججوں کا بنایا ہوا کامن لاء اور ایکویٹی، مجلس قانون ساز کا بنایا ہوا وضعی قانون اور انتظامی قانون اور اس کی شاخیں اور (3)موضوع کے اعتبار سے یعنی دستوری قانون، دیوانی قانون، فوج داری قانون اور ان کی شاخیں۔

قانون معاہدہ (The Law of Contract): قانون معاہدہ کا تعلق معاہدات کے بنانے اور ان کے نافذ کرنے سے ہے۔ سیدھی سادی زبان میں معاہدہ کی تعریف یہ ہے کہ ایک ایسا وعدہ جو قانوناً نافذ نہیں کیا جاتا۔ اس کے برخلاف تجارت اور کاروبار کے لیے معاہدات کی ضرورت ہوتی ہے بہت سے بے ضابطہ معاہدے بھی قانوناً نافذ کیے جاتے ہیں۔ معاہدہ کے متعلق دو تصورات بالکل بنیادی ہیں ایک تو وہ فرائض ہیں جو کسی معاہدے کے تحت قبول کیے جاتے ہیں۔ یہ فرائض بطیب خاطر و ارادتاً قبول کیے جاتے ہیں۔ دوسرا بنیادی تصور ان ذمہ داریوں کا ہے جو اس طور سے واقع ہوتی ہیں کہ ایک فریق کسی کام کے کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور دوسرا فریق اس وعدے کو ان شرائط کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ جن کے تحت وہ وعدہ کیا گیا ہو۔ باہمی رضامندی معاہدے کی بنیاد ہے پوتھیر (Pothier) کے الفاظ میں معاہدہ دو فریق کے ارادوں کے اتفاق کا نتیجہ ہے۔ جس میں ایک فریق دوسرے فریق کے لیے کسی کام کا وعدہ کرتا ہے اور دوسرا فریق اس وعدے کو قبول کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ انگلستان میں اس چیز کی بنیاد پڑی کہ اس قسم کے معاہدات کو کاغذ پر لکھا جاتا تھا یا بالفاظ دیگر تحریر میں لایا جاتا اور اس پر نام کی مہر لگا دی جاتی۔ موجودہ زمانے میں عام طور پر اس قسم کے معاہدات تحریری ہوتے ہیں اور دستاویز معاہدہ کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ بعد میں معاہدے کے ساتھ بدل (Consideration)کا تصور پیدا ہوا اور اس وجہ سے بھی معاہدے کا تحریری ہونا ضروری ہوگیا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کسی فریق معاہدہ نے تحریری معاہدہ کیا ہو اور بعد میں وہ معاہدہ شکنی کرے تو اسے ہرجہ (Damages) ادا کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

قانون موضوعہ (Jus Scriptum): لیکس (Lax) پورے رومن عوامی اسمبلی کا بنایا ہوا قانون تھا۔ ایسے قوانین کو عام طور پر لیگاس (Legas) کہا جاتا تھا۔ رومن اسمبلی کا طریقہ کار اور اصول یونانی سٹی اسٹیٹس (City States) کی طرح تھا یعنی ہر شہری خود آتا تھا اور رائے دیتا تھا۔ رائے دینے کے لیے کوئی نمائندہ نہیں بھیجتا تھا۔ لیکن یہ اختیار شہنشاہ وقت کی جانب سے دیا گیا تھا جو بالکل محدود تھا یعنی صرف انھیں تجاویز پر رائے دہی کی جاسکتی تھی جو مجسٹریٹ کی جانب سے اسمبلی میں پیش کی جائیں اور اس پیش کردہ تجویز میں کسی ترمیم یا بحث کا اختیار نہ تھا۔ لوگوں کا صرف یہ فرض تھا کہ وہ مجسٹریٹ کی اس تجویز کے متعلق "ہاں" یا "نہیں" کہیں۔ دستوری ضابطہ یہ بھی تھا کہ مجسٹریٹ پہلے کسی مختص تجویز کے متعلق سینیٹ (Senate) سے رائے لیتا تھا اور اس کے بعد اس تجویز کو اسمبلی کے سامنے پیش کرتا تھا۔ جمہوری دور کے آخری زمانے میں اسمبلی کو کسی قانونی مسودے کی نامنظوری کا عملاً اختیار نہ تھا اور حقیقی اختیار سینیٹ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اور مجسٹریٹ کو حاصل تھا۔

قانون میعاد سماعت (Limitation Act): قانون میعاد سماعت کے نفاذ کی وجہ (Reasons for Inforcement of Limitation Act) اور اس کے فوائد:

قانون میعاد سماعت ایک ایسا قانون ہے جس کی رو سے حقوق کا ادعا مدت معینہ میں کرنا لازمی ہے یہ قانون دنیا کے ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ عام اصول اس قانون کا ہے کہ مقدمہ کی سماعت ایک مقررہ مدت کے لیے ہو اگر قانون میعاد سماعت نافذ نہ ہوتا تو عدالتوں میں ایسی دستاویزات کی بنا پر دعوے رجوع کیے جاتے جو صدیوں قبل تکمیل کی گئیں تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہر شخص کی جائداد خطرہ میں رہتی اور یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ کس وقت کون سا دعویٰ رجوع کیا جائے گا اور کب اس کے مقابل ڈگری حاصل کی جائے گی۔ اس قانون کی بعض اصطلاحات کی تعریف یا وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

درخواست گزار (Applicant) میں ایسا شخص بھی داخل ہوگا جس کی وساطت سے کسی درخواست گزار کو درخواست کرنے کا حق حاصل ہو مثلاً نیلام مشترک اپنا حق اور ذمہ داری مدیون ڈگری سے یا اس کے واسطے سے حاصل کر سکتا ہے۔

(Bill of Exchange) میں ہنڈی اور چیک بھی داخل ہیں۔ قانون دستاویزات قابل بیع اور شرح میں بل آف ایکسچینج کی تعریف کی گئی ہے کہ بل آف ایکسچینج وہ تحریری دستاویز ہے جس میں کسی خاص شخص کو بلاشرط یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ایک معین رقم کسی خاص شخص کو یا اس کے حکم پر گزیدہ دستاویز کو ادا کرے۔ بل آف ایکسچینج اور ہنڈی میں تین فرق ہوتے ہیں ایک تو لکھنے والا دوسرا جس کے نام سے کہ وہ لکھا جائے اور وہ جس کو کہ روپیہ ملنا چاہیے۔ بل آف ایکسچینج قابل فروخت معاوضہ کا ادا کیا جاتا ہے زر نقد کی ادائیگی ہوتی ہے اور ادائیگی بلاشرط ہوتی ہے۔

چیک بھی بل آف ایکسچینج ہے جو کسی خاص مہاجن کے نام لکھا جائے اور جو سوائے عندالمطالبہ اور کوئی طور پر قابل ادا نہ قرار دیا ہو۔

ہنڈی: بل آف ایکسچینج میں داخل کر دی گئی ہے اور اس کی تعریف کسی قانون میں نہیں کی گئی اس لیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بل آف ایکسچینج اور ہنڈی دونوں تقریباً ایک ہی چیز ہیں۔

تمسک سے مراد ہر دستاویز جس کی رو سے ایک شخص دوسرے شخص کو اس شرط پر روپیہ ادا کرنے کا اقرار کرے کہ کسی خاص فعل کے عمل میں آنے یا نہ آنے پر (جیسی صورت ہو) اقرار مذکور فسخ ہو جائے گا۔ ہر دستاویز جس پر گواہی یا قابض کے حکم پر یا حاصل دستاویز کو واجب الادا ہو اور جس کی رو سے ایک شخص دوسرے شخص کو روپیہ دینے کا اقرار کرے یا ہر دستاویز جس پر گواہی ثابت ہو اور جس کی رو سے ایک شخص دوسرے شخص کو غلہ یا اور کسی زراعتی پیداوار حوالے کرنے کا اقرار کرے۔

مدعی (Plaintiff) میں ہر ایسا شخص داخل ہوگا جس سے یا جس کی وساطت سے مدعی کو دعوے کا حق حاصل ہو بالفاظ دیگر اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جسے دادرسی کا استحقاق حاصل ہو اس میں وہ شخص بھی شامل ہے جس کے ذریعہ سے ایسی دادرسی ہو سکتی ہے اس کے علاوہ قائم مقام وارث مہتمم وصی وغیرہ داخل ہیں۔ دفعہ 25 ضابطہ دیوانی کی رو سے متعدد اشخاص بزمرہ مدعیان شریک کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ان کو ایک ہی فعل یا ایک ہی سلسلہ مفاد کی بابت کسی دادرسی کا مشترکہ حق ہونا واقعات مندرجہ عرضی دعوے سے پایا جاتا ہو اور مقدمہ ایسی نوعیت کا ہو کہ اگر ایسے اشخاص علاحدہ علاحدہ مقدمہ رجوع کریں تو قانون یا واقعات کا کوئی مشترک سوال پیدا ہوتا ہے۔

مدعاعلیہ (Defendant) اس میں ہر ایسا شخص داخل ہوگا جس پر یا جس کی وساطت سے مدعاعلیہ پر دعوے کیے جانے کی ذمہ داری عاید ہو ہر وہ شخص مدعاعلیہ ہے جس کے مقابلہ میں مدعی کو کسی دادرسی کا استحقاق ہونا بیان کیا جائے اور اس کے خلاف نالش دائر کی جائے شخص مذکور کا جانشیں مہتمم وصی موہوب لہٗ معطی لہٗ موصی لہٗ یا منتقل الیہ مدعاعلیہ ہو سکتا ہے متعدد اشخاص بزمرہ مدعاعلیہ شریک کیے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے خلاف ایک ہی فعل یا سلسلہ افعال کی بابت اس کی دادرسی کا مشترکہ یا منفرد علی السبیل البدل حق ہونا واقعات مندرجہ عرضی سے پایا جائے اور ان کے مقابلہ میں علاحدہ علاحدہ دعویٰ رجوع ہونے کی صورت میں قانون یا واقعات کا کوئی مشترک سوال پیدا ہوتا ہے۔

قانون میعاد سماعت میں معینہ میعاد گزرنے کے بعد مقدمہ کا اخراج: جب قانون میعاد گزرنے کے بعد کوئی مقدمہ رجوع یا مرافعہ یا درخواست پیش ہو بمطابقت احکام دفعات 4 تا 25 خارج کی

جائے گی گو مقدمہ میں میعاد کا عذر نہ کیا گیا ہو مقدمہ مرافعہ یا درخواست کا پیش ہونا اس وقت سمجھا جائے گا جب عہدیدار مجاز کے روبرو پیش کی جائے اور مقدمہ یا مرافعہ کے مفلسی دار ہونے کی صورت میں اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ اس کے رجوع کرنے کی اجازت کی درخواست پیش کی جائے اور اگر دعویٰ کسی کمپنی کے نام ہو جس کی مسدودی بارادہ عدالت ہورہی ہو تو اس وقت سمجھا جائے گا جب کہ دعویدار کا دعویٰ خارج المیعاد ہو تو اس کے سود یا منافع یا واصلات کا دعویٰ بھی خارج المیعاد سمجھا جائے گا۔

قانونی ناقابلیت (Legal Inability): (1) جب وہ شخص جو مقدمہ رجوع کرنے یا ڈگری کی تعمیل کی درخواست پیش کرنے کا حق دار ہو اس وقت جب سے کہ میعاد محسوب ہونی چاہیے نابالغ، مجنون، فاترالعقل ہو تو وہ ناقابلیت کے رفع ہونے کے بعد اس قدر مدت کے اندر مقدمہ رجوع یا درخواست پیش کرسکے گا جو ضمیمہ قانون میں مقرر ہے۔

(2) جب شخص مذکور اس وقت جب سے کہ معیار مقرر ہوجائے منجملہ ان ناقابلیتوں کے جو بیان کی گئیں ایک سے زائد ناقابلیتوں میں مبتلا ہو یا جب ایک ناقابلیت کے رفع ہونے کے قبل دوسری قسم کی ناقابلیت شروع ہوجائے تو وہ سب ناقابلیتوں کے رفع ہونے کے بعد اسی قدر مدت کے اندر مقدمہ رجوع یا درخواست پیش کرسکے گا جو قانون میں مذکور ہو۔

(3) جب شخص مذکور کی وفات تک ایسی ناقابلیت باقی رہے تو اس کا قایم مقام قانونی اس کی وفات کے بعد اس قدر مدت کے اندر مقدمہ رجوع یا درخواست پیش کرسکے گا جو قانون میں مقرر ہے۔

جب قایم مقام قانونی شخص مذکور کی وفات کے وقت کسی ناقابلیت میں مبتلا ہو تو احکام اس سے متعلق ہوں گے۔

قبضہ (Possession): بقول ہنری مین (Henry Maine) قانون میں "قبضہ کا تصور دو اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک مقبوضہ شے پر تسلط جسمانی (Physical Control) دوری یہ نیت (Animus) کہ تسلط اپنی چیز پر ہے۔" بالفاظ دیگر تسلط قبضہ کے مفہوم میں شامل ہے تسلط جسمانی اور نیت اخراج غیر (Intent to Exhude Others) گویا قبضہ کے اجزا ترکیبی یہ ہیں۔

(1) مقبوضہ شے (Corpus) (2) نیت قبضہ (Animus Possidendi) یعنی یہ نیت کہ بلاشرکت غیرے مقبوضہ شے پر تسلط (Control) رکھا جائے۔

(2) شے مقبوضہ (Corpus Possessionis) خود بھی دو اجزا پر مشتمل ہوتی ہے ایک یہ کہ قابض کو اس شے پر تصرف جسمانی حاصل ہے۔ دوسرے یہ معقول مفروضہ (Reasonal Assumption) کہ دیگر اشخاص شے کے تسلط میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس لیے تسلط کلی (Full Control) ضروری نہیں مثلاً اگر کسی کا پالتو جانور جنگل میں چر رہا ہو اور وہ شخص موجود نہ ہو تو بھی اس کا تسلط برقرار رہے گا۔ اس طرح اگر کسی کا جہاز سمندر میں ڈوب جائے تو بھی مالک باقیات کا قابض متصور ہوگا بشرطیکہ اس کی نیت باقیات کو حاصل کرنے کی ہو۔ معقول مفروضہ کے لیے ضروری ہے کہ قابض اغیار کے اخراج کی قدرت رکھتا ہو۔ اس کے لیے شخصی جرأت لازمی نہیں قانون اس کی نگہبانی کرتا ہے۔ لیکن قابض کو استقرار قبضہ کی جانب اقدام کرنا چاہیے تاکہ اغیار شے مقبوضہ میں مداخلت سے باز رکھے جاسکیں۔ جائز قبضہ ایک بار حاصل ہوجانے کے بعد برقرار رہتا ہے۔ قانون صرف طاقتور ہی کی تائید نہیں کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بچہ کو سڑک پر ایک اشرفی مل جائے تو وہ بچہ اشرفی کا قابض متصور ہوگا حالانکہ اس بچہ میں یہ قوت نہیں ہے کہ ایک طاقتور غنڈے کے مقابل اپنے قبضہ کی مدافعت کرسکے لیکن جب تک غنڈہ اس اشرفی کو چھین نہ لے بچہ بھی قابض متصور ہوگا اور چھین جانے کے بعد قانون کی مدد سے بچہ اشرفی کا قبضہ مکرر حاصل کرسکے گا۔ جسمانی قبضہ اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قابض کو شے مقبوضہ پر تسلط حاصل رہے۔ تسلط ختم ہو تو قبضہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی جنگلی جانور جیسے شیر وغیرہ قابض کی قید سے نکل بھاگے تو شے مقبوضہ (Corpus) باقی نہ رہے گی اور قبضہ ختم ہوجائے گا۔ برخلاف اس کے اگر پالتو جانور بھٹک جائے تو قبضہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کے حصول کا امکان باقی ہے۔

(3) نیت (Animus) نیت قبضہ کسی فرد کا وہ دانستہ ارادہ ہے جو اغیار کو شے مقبوضہ میں مداخلت سے باز رکھتا ہے۔ میں اس خزانہ کا قابض

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نہیں بن سکتا جو بلا میرے علم و اطلاع میں مدفون ہے۔ نیت کا خصوصی (Specific) ہونا لازم نہیں عمومی (General) ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں ہر اس کتاب کا قابض سمجھا جاؤں گا جو میری لائبریری میں موجود ہے۔ گو میں کسی خاص کتاب کے وجود سے واقف نہ ہوں۔

قبضے کئی اقسام کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو اہم یہ ہیں۔

(الف) قبضہ واقعی اور قبضہ قانونی (Possession in fact and Possession in Law)

(ب) قبضہ بلاواسطہ اور قبضہ بالواسطہ (Immediate and Mediate Possession)

(الف) قبضہ واقعی اس طرح ثابت کیا جائے گا جیسے کوئی اور واقعہ۔ اس کا وجود یا عدم وجود درجہ تسلط (Degree of Control) پر منحصر ہے۔ تسلط ایسا ہونا چاہیے جو دوسروں کو مداخلت سے باز رکھ سکے۔ اگر تسلط اس درجہ سے کم تر ہو جس کا قانوناً لزوم ہے تو وہ قبضہ نہ ہوگا حراست (Detention) ہوگی یا حفاظت (Custody)۔

قبضہ قانونی اس ادعا (Claim) کا نام ہے جو منفرد تسلط رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ قبضہ واقعی اور قبضہ قانونی کا باہم یکجا ہونا ضروری نہیں۔ ملازم آقا کے مال کا قابض متصور نہ ہوا حالانکہ وہ مال ملازم کے واقعی تسلط ہی میں کیوں نہ ہو۔ ملازم کا قبضہ قانون کی نظر میں حراست (Detention) ہوگا۔ قابض اور شے مقبوضہ کے باہمی تعلق کا قبضہ قانونی ایک حق (Right) ہے جس کو قانون تسلیم کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔

(ب) قبضہ بلاواسطہ اس قبضہ کو کہتے ہیں جو قابض بالراست شے مقبوضہ پہ رکھے اور قبضہ بالواسطہ وہ قبضہ ہے جو کسی دوسرے شخص کے توسط سے قایم ہو۔ اگر میں کوئی کتاب بذات خود خریدوں تو مجھے اس کتاب کا قبضہ بلاواسطہ حاصل ہوگا۔ اگر ملازم کو خریدنے کو بھیجوں تو قبضہ بالواسطہ ہوگا یعنی بتوسط ملازم گویا قبضہ بالواسطہ کی صورت میں دو افراد بیک وقت ایک ہی شے کے قابض ہوتے ہیں۔ اس قسم کا دوہرا قبضہ آقا اور ملازم پٹہ دار اور پٹہ گیر (Landlord & Tenant) راہن اور مرتہن (Mortgagor & Mortgagee) وغیرہ کے قبضہ جات کی شکل میں نظر آتا ہے۔ قبضہ بالواسطہ اغیار کے مقابلہ میں قایم رکھا جاسکتا ہے لیکن اصل قابض کے مقابلہ میں نہیں۔ برخلاف قبضہ بلا واسطہ ساری دنیا کے مقابلہ میں نافذ رہے گا۔ بشمول اس شخص کے جو بالراست قابض ہو۔

(5) قانون نے قبضہ اور دیگر اشکال تسلط (Forms of Control) مثلاً حفاظت اور حراست (Detention) میں امتیاز پیدا کیا ہے۔ اگر کسی شخص کو شے مقبوضہ پر قدرے تسلط حاصل ہو لیکن اتنا کامل نہیں کہ اغیار کو مداخلت سے باز رکھ سکے تو ایسا تسلط حفاظت کہلائے گا۔ مثلاً اگر میں کسی جوہری کی دکان پر جاکر اس کی ہیرے کی انگوٹھی ہاتھ میں لے کر معائنہ کروں تو میرا تسلط (Control) حفاظت (Custody) کہلائے گا۔ جوہری کا قبضہ بالواسطہ قایم رہے گا۔ کیونکہ میری نیت اس کو بے دخل کرنے کی نہیں اگر میں اس انگوٹھی کو لے کر بھاگ جاؤں تو اس انگوٹھی کا قابض بن جاؤں گا کیونکہ اس عمل سے میری نیت جوہری کو بے دخل کرنے کی ظاہر ہوتی ہے۔ بہرکیف قابض (Holder) اگر شے مقبوضہ پر تسلط کلی نہ رکھتا ہو یا اس کی نیت اغیار کو مداخلت سے باز رکھنے کی نہ ہو تو اسے قابض اور شے مقبوضہ کے رشتہ کو حفاظت (Custody) کہتے ہیں۔ ایک ملازم ان جملہ اشیا کی حفاظت کا حامل ہوتا ہے جو آقا نے اس کو استعمال کے لیے دی ہیں۔ اسی طرح جہاں قبضہ واقعی ہو لیکن قانون کسی وجہ سے اس قبضہ کو تسلیم نہ کرے تو یہ شکل تسلط حراست (Detention) ہوگی مثلاً اگر حصول کرایہ کے لیے حامل (Bailee) اشیا محصولہ کا قبضہ نہ چھوڑے تو حامل کا قبضہ حراست (Detention) متصور ہوگا۔ محافظ (Custodian) طلبی پر شے مقبوضہ بلاعذر قابض اصلی کے حوالے کر دیتا ہے لیکن حارس (Detainer) چند در چند وجوہات کی بنا پر انکار کر سکتا ہے۔

(6) بعض اوقات کتب قانونی میں تعبیری قبضہ (Constructive Possession) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اصطلاح مبہم اور غیر واضح ہے۔ بہتر ہوگا اگر استعمال نہ کی جائے۔ سامنڈ (Salmond) کے خیال میں تعبیری قبضہ کا اطلاق اس وقت ہوگا جبکہ قانون کسی کو قبضہ عطا کرے جس کا واقعی قبضہ نہ ہو کلارک اور لنڈل (Clark and Lindell) کہتے ہیں کہ تعبیری قبضہ اس شخص کو

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

حاصل رہے گا جس نے کوئی اپنی چیز کھو دی ہے اور دوسرے کو نہیں ملی۔ یا جبکہ کوئی چیز ملازم کی تحویل میں ہو۔ پولک (Pollock) اور رائٹ (Wright) اپنی شہرہ آفاق تصنیف (Possession) میں تعبیری قبضہ کی اصطلاح کو حق حصول قبضہ کی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ مختلف اساتذہ قانون نے تعبیری قبضہ (Construction Possession) کی اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال کی ہے۔

(7) آخر میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ حصول قبضہ کے طریق کار نے تصور قبضہ پر کافی اثر ڈالا ہے۔ چونکہ شے مقبوضہ پر تسلط دراصل قبضہ کی جان ہوتی ہے۔ اس لیے یہ سوال کہ آیا قبضہ جائز طور پر حاصل کیا گیا ہے یا نہیں اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے یہ جواز لازمی نہیں۔ چور بھی قبضہ حاصل کرلیتا ہے حالانکہ اس کا حصول قبضہ ارتکاب جرم ہے۔ عملاً قبضہ واقعی کے بجائے حق قبضہ کو اہمیت دی جاتی ہے۔ دراصل قبضہ بڑی حد تک حقیقت کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے تصور عامہ میں قبضہ اور حق قبضہ ملحوظ ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک چور شے مقبوضہ پر استقرار قبضہ کا ادعا نہیں کرسکتا۔ لیکن اس نظریہ کو زیادہ وسعت نہیں دی جاسکتی۔ اگر مالک کے ہاتھ سے شے مقبوضہ نکل جائے تو چاہے وہ واقف ہو یا نہ ہو مالک کا قبضہ ختم ہوجائے گا۔

قبول (Acceptance): کسی ایجاب کو ایجاب کنندہ کے دیے ہوئے شرائط کے تحت منظور کرنے کو قانونی اصطلاح میں قبول کیا جاتا ہے۔ لیکن اس امر کا بار ثبوت کہ قبول کنندہ نے ایجاب و قبول کرلیا ہے۔ قبول کنندہ پر رہے گا۔ فریقین کی باہمی رضامندی سے کسی کام کی تکمیل کے عہد سے معاہدے کا تصور سیدھا ہوتا ہے۔ اس باہمی رضامندی کا تصور خانگی زندگی اور دیگر کاروبار کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے۔ کسی ایجاب (Offer) کا مشروط طور پر قبول کرنا (Accept) قانونی طور پر قبول کی تعریف میں نہیں آتا۔ اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں لفظ ایجاب (Offer) اور قبول (Acceptance) کو بالکل قانونی وجوب دے دیا گیا تھا اور یہ دونوں الفاظ قانونی اصطلاحات میں شریک کر لیے گئے ہیں۔

قبول کنندہ (Offeree) بالکل واضح ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں معاہدے کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر ایجاب (Offer) کو قبول (Accept) کرتے وقت قبول کنندہ (Offeree) نے کوئی نئی شرط عائد کردی ہے۔ جسے جانچنے کا ایجاب کنندہ (Offerer) کو موقع ہی نہ ملا ہو تو حقیقت میں اسے قبول (Acceptance) نہیں سمجھا جائے گا بلکہ وہ ایک جوابی ایجاب (Counter Offer) سمجھا جائے گا اور قانون کی نظر میں اس جوابی ایجاب کی حیثیت صرف یہ ہوگی کہ ابتدائی ایجاب (Offer) کالعدم متصور ہوگا۔ ایک معروف مقدمہ (Hyde Vs. Wrench) کے واقعات یہ ہیں کہ فریق نے 7/ جون کو 1000 پونڈ میں اپنی جائداد فروخت کرنے کا ایجاب (Offer) کیا۔ 8/ جون کو فریق ثانی نے یہ جواب دیا کہ وہ اس جائداد کو 950 پونڈ میں خریدنے کے لیے تیار ہے۔ فریق اول نے 27/جون کو اس دام پر اپنی جائداد فروخت کرنے سے انکار کیا بالآخر فریق ثانی نے 29/ جون کو کہا کہ وہ (1000) ایک ہزار پونڈ میں وہ جائداد خریدنے کے لیے تیار ہے عدالت نے فیصلہ کیا کہ کوئی معاہدہ واقع نہیں ہوا ہے۔ 8/ جون کے خط سے فریق ثانی نے ابتدائی ایجاب (Offer) کو نامنظور کر دیا اور بعد میں فریق اول کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ فریق ثانی کو 29/ جون کے اس خط پر کہ وہ 10000 پونڈ میں جائداد خریدنے کے لیے تیار ہے غور کرے۔

مقصد یہ ہے کہ قبول (Acceptance) صرف انھیں شرائط کے تحت ہونا چاہیے جو ایجاب (Offer) میں درج کی گئی ہیں ورنہ معاہدے کی تکمیل کا قانونی تصور پیدا نہ ہوگا۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قبول کنندہ (Offeree) کا ایجاب کو صرف ذہنی طور پر قبول کرنا کافی نہیں ہے قبول کنندہ کو چاہیے کہ وہ اپنے قبول کے ارادے کو ظاہری ذریعہ سے ایجاب کنندہ تک پہنچائے۔ ایجاب (Offer) کو قبول (Accept) کرنے کا اظہار ایک ایسے ذریعہ سے کیا جانا چاہیے جس سے دوسرے بھی واقف ہو سکیں اسے اعلان قبول (Manifestation of Assent) کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے یہ وعدہ کیا ہے کہ کوئی مختص کام کر دیا جائے تو معاوضہ دیا جائے گا تو اس مختص کام کی تکمیل کرنا قانونی طور پر قبول (Acceptance) کی تعریف میں آتا ہے۔

قتل انسان (Homicide) : یہ ایک عام اصطلاح ہے جس سے یہ مراد ہے کہ ایک انسان ایک اور انسان کے ذریعہ ہلاک ہو۔ یہاں ذریعہ یا وساطت ہلاکت انسان ہی ہونا چاہیے اور شکار بھی انسان ہی ہونا چاہیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

قاتل بھی انسان ہو اور مقتول بھی انسان ہی ہونا چاہیے۔

بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں قتل انسان کو قانونی اور جائز قرار دیا گیا ہے۔ ان صورتوں میں خواہ نیت مجرمانہ ہی کیوں نہ ہو اس قسم کی ہلاکت کو جواز قانونی حاصل ہوجاتا ہے اور قاتل پر کسی قسم کی قانونی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے فعل سے کسی دوسرے کی جان کو عین اور فوری خطرہ پایا جائے تو ایسے شخص کو حفاظت خود اختیاری کے اصول کے تحت قانون اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی جان کے تحفظ میں اس حملہ آور کو ہلاک کردے۔ اس طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قتل کرنے کی نیت سے اپنی تلوار اٹھالے اور اس کی گردن پر وار چلانے کی عین نوبت پر ہو تو اس کو اپنی گردن اڑا دیے جانے کا فوری خطرہ پیدا ہوجائے تو اس خطرہ کی نوبت پر وہ شخص حملہ آور کو ہلاک کرکے اپنی جان بچا سکتا ہے۔ حفاظت خود اختیاری کا اصول یہاں کار فرما ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا قانونی فرض پورا کرنے کے سلسلہ میں کوئی فعل کرے جس سے ہلاکت انسانی وقوع میں آئے تو اس پر کوئی قانونی ذمہ داری عاید نہیں کی جاسکتی۔ مثال کے طور پر اگر جلاد اپنے فرائض منصبی کے تحت قتل کے مجرم کو پھانسی پر چڑھا دے یا اس کی گردن پر مہلک وار کرے تو اس جلاد پر کوئی فوج داری ذمہ داری عاید نہیں کی جاسکتی۔

ذیل میں قتل انسانی (Homicide) کی وہ قسمیں درج ہیں جن میں ہلاکت واقع ہوتی ہے اور جو غیر قانونی اور تعزیری قرار پاتی ہیں۔

(1) قتل انسان مستلزم سزا جو "قتل عمد" کی حد تک نہ پہنچتا ہو۔

(2) قتل عمد۔

(3) بے احتیاطی یا غفلت کے باعث ہلاکت عمل میں آنا۔

(4) خودکشی۔

قتل انسان مستلزم سزا جو قتل عمد کی حد تک نہیں پہنچتا ہو۔ یہ جرم قتل عمد سے عین دوسرے درجہ کا ہے اور اس جرم کی پاداش میں قتل عمد کی سزا صادر نہیں کی جاسکتی یعنی نہ تو پھانسی کی یا حبس دوام کی سزا دی جاسکتی ہے۔

یہ جرم اس وقت سرزد ہونا متصور ہوتا ہے جب کہ کوئی شخص اس نیت و علم سے ایسا فعل کرے جس سے ایسا ضرر جسمانی وقوع میں آئے جس سے ہلاکت کا احتمال ہو۔ ہلاکت اور ضرر جسمانی کا تعلق بلاواسطہ اور صریح ہونا چاہیے نہ کہ بعید۔ ہلاکت کا تعلق ضرر جسمانی سے بالصراحت ہونا چاہیے۔ مثلاً ملزم ایک آدمی کے منہ میں اس نیت سے کپڑا ٹھونس دے کہ وہ بول نہ سکے اور اس کی نیت اس کو ہلاک کرنے کی نہ ہو۔ ایسی صورت میں صرف یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کو اس امر کا علم تھا کہ اس کے فعل سے غالبًا ہلاکت وقوع میں آئے گی اور اس لیے ہلاکت وقوع میں آنے کی صورت میں اس کو اس جرم کے تحت سزا صادر کی جاسکے گی۔ اس جرم میں ہلاکت کے متعلق احتمال اور علم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اس جرم کی روح رواں ہیں۔ اس فعل سے ہلاکت وقوع میں آنے کا احتمال یا علم ملزم کو ہونا چاہیے گو اس کو ہلاک کرنے کی نیت نہ ہو۔ اس جرم میں نیت ہلاکت اہم نہیں ہے بلکہ اپنے فعل سے احتمال ہلاکت یا علم ہلاکت اہم ہے۔

قتل عمد (Murder): قانون فوج داری میں سب سے سنگین جرم قتل عمد ہے۔ اس میں ایک شخص دوسرے شخص کو نیت مجرمانہ کے ساتھ اور قصداً ہلاک کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ جان کر اتنی جسمانی تکلیف پہنچائی جائے کہ اس سے موت واقع ہوسکتی ہو اور وہ شخص فوت ہوجائے۔ خواہ نیت جسمانی تکلیف پہنچانے ہی کی ہو تو ایسی صورت میں بھی یہ کہا جائے گا کہ قتل عمد وقوع میں آیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص دوسرے کے جسم پر مہلک ہتھیار سے وار پروار کرے اور تقریباً اٹھارہ پسلیاں توڑ ڈالے تو یقیناً یہ قیاس کیا جائے گا کہ معمولی اور عام حالات میں اس قسم کی ضربات جسمانی سے ایک شخص ہلاک ہوسکتا ہے اور اس طرح کی ضربات جسمانی ہلاکت کے لیے معمولاً کافی ہے۔

اگر کسی شخص کو اپنے فعل سے تعین کا حامل ہوجائے یا اس امر کا علم بدرجہ اتم ہوجائے کہ فی الواقعی ہلاکت عمل میں آئے گی تو وہ شخص قتل عمد کا مجرم قرار پائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی پبلک کنویں میں زہر ملا دے جہاں سے دیہات کی ساری آبادی ہر روز پینے کا پانی لے جاتی ہو تو اس کے مہلک فعل سے ساری آبادی کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ آبادی کی ہلاکت کا اس کو سخت احتمال ہے اور اسے علم کامل ہے کہ جو بھی اس کنویں کا پانی پی لے گا اس کی ہلاکت واقع ہوگی۔ اس مثال

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں ملزم کسی شخص کو بالراست زہر دے کر ہلاک نہیں کرتا ہے لیکن اس طرح کنویں میں زہر ملانے سے اس کو یقین ہے اور اس کا اسے علم ہے کہ پوری آبادی اس کنویں سے پینے کے لیے پانی لے جاتی ہے۔ ملزم کا یہ فعل اس کو قتل عمد کا سزاوار قرار دیتا ہے۔

اس جرم میں بھی احتمال اور علم ہلاکت پر زور دیا گیا ہے لیکن ان دو الفاظ میں اغلبیت اور یقین کا مادہ موجود ہے جو قتل انسان مستلزم سزا کے جرم میں نہیں پایا جاتا ہے۔ یعنی احتمال اور علم ہلاکت یقین کے اس درجہ تک پہنچتا ہے کہ جس سے نیت مجرمانہ کا مفہوم ماخوذ ہوتا ہے۔ قتل عمد کی پیش رفت میں جو بھی فعل کیا جائے وہ نیت مجرمانہ پر محمول ہوگا۔

قتل عمد کی بعض استثنائی اشکال ہیں جن میں افعال ہلاکت گو نیت مجرمانہ پر مبنی ہوں، قتل عمد نہیں پہنچتے ہیں بلکہ ایسے افعال قتل انسان مستلزم سزا کے حد تک محدود ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض اہم اشکال کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

(1) جب کہ ملزم سخت و ناگہانی اشتعال طبع کے باعث ایسی حالت میں کہ ضبط قدرت نہ رہے کسی کو ہلاک کردے تو وہ قتل عمد کا مجرم قرار نہیں پائے گا۔

مثلاً جب کہ کوئی شخص اپنی زوجہ کے ساتھ کسی شخص کو زنا کرتے ہوئے دیکھے اور وہ اس وقت زانی یا زانیہ کو قتل کر ڈالے تو یہ مستثنیٰ متعلق ہوگی اور ملزم صرف قتل انسان مستلزم سزا کا مرتکب ہوگا نہ کہ قتل عمد کا۔ یہاں ہلاکت کا فعل اشتعال طبع کے فوری اثر پر مبنی ہونا چاہیے۔ اشتعال طبع اور فعل ہلاکت میں کوئی وقت گزرنے نہ پائے۔ اشتعال طبع کے فوری بعد فعل ہلاکت عمل میں آئے۔ اگر حالات ایسے ہوں جن سے یہ معلوم ہو کہ حالت اشتعال طبع گزر جانے کے بعد ملزم نے سوچ سمجھ کر جرم کا ارتکاب کیا ہے تو ملزم کو سابقہ اشتعال طبع سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سے گا اور وہ قتل عمد کا مجرم قرار پائے گا۔ واضعان قوانین نے ایسے اشتعال طبع کو فطری اور جبلی قرار دیا اور اس کو فطرت انسانی کا ایک کمزور جز قرار دے کر قتل عمد کے جرم میں استثنا کو درج کر دیا۔

قتل عمد کی ایک اور استثنائی صورت یہ ہے کہ اگر ملزم بغیر پہلے سے سوچے سمجھے ناگہانی لڑائی میں بحالت غیظ و غضب قتل کا مرتکب ہو تو وہ قتل انسان مستلزم سزا کا مجرم ہوگا نہ کہ قتل عمد کا۔ اگر سابقہ ارادہ لڑائی کا ہو تو وہ یہ مستثنیٰ متعلق نہ ہوگا۔ اس مستثنیٰ کو متعلق کرنے کے لیے یہ امر قابل لحاظ نہ ہوگا کہ لڑائی کی بنا کیا تھی اور آیا کوئی اصلی وجہ تھی یا نہیں اور اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ پہلا حملہ کس کی جانب سے ہوا۔ صرف یہ کافی ہوگا کہ لڑائی ناگہانی ہو اور پہلے سے سوچ سمجھ کر ہلاک کرنے کے لیے لڑائی کا بہانہ نہ پیدا کیا گیا ہو۔ وضاحت استثنا کے لیے ایک اور مثال یہ ہے کہ مقتول نے ملزم کو دھکا دیا جب ملزم نے جس سے اس کے پیٹ پر ایک ضرب لگائی جس سے وہ اس وقت فوت ہوگیا۔ ملزم کا یہ فعل اس استثنا میں داخل ہے۔ یہ ہلاکت ناگہانی لڑائی اور غیظ و غضب کی حالت میں وقوع میں آئی ہے۔ اس ہلاکت کی پیش رفت میں سوچ سمجھ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان حالات کے تحت ملزم پر قتل عمد کا جرم عاید نہیں ہوگا بلکہ قتل انسان مستلزم سزا کا۔

قدر پیائی (Evaluation):

"قدر پیائی" یا اندازۂ قدر ایک نسبتاً علمی اصطلاح ہے۔ کسی چیز کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ "کتنی" ہے اور "کیسی" ہے۔ اس کی قدر پیائی یا اندازہ قدر کرنا کہلاتا ہے۔

اردو زبان میں "قدر" کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک "مقدار" کے معنوں میں جیسے "کس قدر"، "اس قدر" وغیرہ اور دوسرے "وقعت" کے معنوں میں جیسے "قدر افزائی"، "قابل قدر" وغیرہ۔ اسی طرح لفظ "پیا" بھی ایک طرف "پیائش" کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے "زاویہ پیا" یا "حرارت پیا" وغیرہ اور دوسری طرف "وسیع جائزے" کے معنوں میں جیسے "فلک پیا" وغیرہ۔ قدر پیائی کے اصطلاحی معنوں میں ان دونوں الفاظ کے یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔

قدر پیائی پیانے چار قسم کے ہوتے ہیں۔

(1) نامیہ پیانے: جیسے کسی مکان یا کمرے کا نمبر یا طالب علم کا رول نمبر وغیرہ۔ اس پیانے میں عدد صرف نام کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ پیانے کی خام ترین شکل ہے۔

(2) ترتیب پیانے: جیسے درجہ "تنظیم" یا مکان کی تیسری منزل وغیرہ۔ اس پیانے میں عدد، اشیا کے ترتیب وار مقام کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ترتیب کسی نہ کسی فوقیت کی بنا پر ہوتی ہے۔ جیسے مکان کی تیسری منزل، دوسری منزل کے اوپر اور چوتھی منزل کے نیچے ہوگی۔ ان دونوں پیانوں میں پیائش کی اکائیاں آپس میں برابر نہیں ہوتیں ۔ مثلاً یہ ضروری نہیں کہ مکان کی ہر منزل کی اونچائی برابر ہو۔ اسی طرح ان پیانوں کی

اکائیوں کے حصے بھی نہیں کیے جا سکتے یعنی نہ کسی طالب علم کا رول نمبر سوا پینتالیس ہو سکتا ہے نہ کسی مکان کی پونے پانچویں منزل۔

(3) تفاوتی پیمانے : یہ پیمانے چیزوں کے تغیر کو مسلسل ناپتے ہیں۔ اس میں پیمائش کی اکائیاں اور ان کے چھوٹے حصے ایک دوسرے کے برابر مان لیے جاتے ہیں مثلاً یہ سمجھنا درست ہوگا کہ 40 درجہ حرارت اور 41 درجہ حرارت میں حرارت کی اتنی ہی مقدار کا فرق ہوتا ہے جتنا 80 درجہ حرارت اور 81 درجہ حرارت میں۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ 80 درجہ حرارت رکھنے والی شے 40 درجہ حرارت رکھنے والی شے سے یقیناً دگنی گرم ہوگی۔ یعنی ان پیمانوں کی اکائیوں کو جوڑا اور گھٹایا تو جا سکتا ہے۔ لیکن ان کو ضرب یا تقسیم کرنا درست نہ ہوگا۔ یہ کمی اس وجہ سے رہ جاتی ہے کہ ان اشیا کی صفر مقدار کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

(4) متناسب پیمانے : وہ ہوتے ہیں جن میں تغیر پذیر شے کا قطعاً نہ ہونا یعنی ان کی صفر مقدار بھی متعین ہوتی ہے۔ جیسے فاصلے کے پیمانے میں ایک مقام یا نشان کو صفر مان کر اس سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ان پیمانوں کی اکائیاں نہ صرف ایک دوسرے کے برابر ہوتی ہیں بلکہ ان پر جمع تفریق ضرب اور تقسیم کے عمل بھی کیے جا سکتے ہیں۔

قدر پیمائی کا استعمال یوں تو مختلف میدانوں میں عام طور پر کیا جا رہا ہے جیسے کہ پیداواری، تجارتی، کاروباری ادارے یا تنظیمی شعبے وغیرہ۔ غرض کہ ہر اس میدان میں جہاں کسی بھی طرز عمل یا طریقہ کار کی بنا پر کسی صورت حال میں تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن تعلیم کے میدان میں خاص طور پر مروج ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تصور کی ابتدا اور بیشتر ترقی اسی میدان میں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسی میدان میں اس کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضرورت محسوس کی گئی اور اب بھی کی جاتی ہے۔

تعلیم کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کی بدولت کسی شخص کا طرز عمل بدل جاتا ہے۔ اس طرز عمل کا تعلق اس کی ذہنی کاوشوں سے، اس کے احساسات سے، ان کاموں سے جنھیں وہ انجام دیتا ہے یا دوسروں کے ساتھ اس کے ملنے جلنے سے ہو سکتا ہے۔ ایسی تعلیم انسان کو جانے اور انجانے دونوں طور پر ملتی رہتی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی باقاعدہ تعلیم کا انتظام سماجی طور پر کیا جاتا رہا ہے۔ باقاعدہ تعلیم، افراد کے طرز عمل کو کس سمت میں بدلے (اور کس سمت میں نہ بدلے) اور اسے تبدیل کرتی ہوئی کس نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اس کا تعین ہمیشہ سماجی طور پر ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہوتا ہے۔

قدر پیمائی اور تعلیمی عمل : بقول ڈاکٹر ذاکر حسین اور دوسرے معلمین کہ ہر تعلیمی عمل کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔ "سوچنا، کرنا اور پرکھنا"۔ یعنی (1) کام کا منصوبہ بنانا، (2) منصوبے کے مطابق کام کرنا اور (3) کیے ہوئے کام کا جائزہ لینا یا اس کی قدر پیمائی کرنا اور اس کی روشنی میں اگلے کام کا منصوبہ بنانا۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین ہی کہ "تعلیم بامقصد کام ہے" کسی بامقصد کام کا منصوبہ اس کام کے مقاصد کو سامنے رکھ کر ہی بنایا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے نصب العین اور ایک معینہ تعلیمی پروگرام کے مقاصد میں فرق ہے۔ نصب العین طویل مدتی بہت ہیں اور ان کا بیان بھی مبہم ہوتا ہے جبکہ مقاصد ایک معین مدت میں حاصل کرنے ہوتے ہیں اور ان کو واضح طور پر طلبا کے طرز عمل کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے "طلبا ان الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکیں گے "یا" طلبا ہندوستان کے دستور میں دیے ہوئے شہریوں کے بنیادی حقوق تحریر کر سکیں گے" وغیرہ وغیرہ۔

تعلیم و تدریس کے کسی منصوبے میں مقاصد کے تعین کے بعد مواد تعلیم کے طور پر ایسے تعلیمی تجربات منتخب کیے جاتے ہیں جن سے تعلیم کے وہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔ آخر میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان تعلیمی تجربات کے ذریعے متوقع مقاصد کہاں تک حاصل ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں تدریس کے اس پورے پروگرام کی قدر پیمائی کی جاتی ہے تاکہ اگلے پروگرام کا منصوبہ بنایا جا سکے۔ اس طرح منظم کیے ہوئے تعلیمی منصوبے میں مقاصد تعلیمی تجربات اور قدر پیمائی میں سے ہر ایک باقی دو کو متاثر بھی کرتا ہے اور ان سے خود بھی متاثر ہوتا ہے۔ قدر پیمائی میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ مقاصد تعلیم کہاں تک حاصل ہوئے۔ دوسری طرف مقاصد تعلیم ایسے مقرر کرنے ہوتے ہیں جن کی قدر پیمائی ممکن ہو۔ مقاصد اور قدر پیمائی کا یہ دوسرا تعلق ہے۔ اسی طرح تعلیمی تجربات مقاصد کو سامنے رکھ کر ہی منتخب کیے جاتے ہیں اور مقاصد بھی وہی مقرر کیے جاتے ہیں جن کے لیے تعلیمی تجربات کرنا ممکن ہوں۔ مقاصد اور تعلیمی تجربات میں یہ دوہرا رشتہ ہے۔ آخر میں قدر پیمائی تعلیمی تجربات کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

بنیاد پر ہی کی جاتی ہے۔ جس چیز کا طلبا کو تجربہ ہی نہ ہو اس کو قدر پیائی میں شامل نہیں کیا جاتا۔ دوسری طرف تعلیمی تجربات کو ہی منتخب کیا جاتا ہے جن کی قدر پیائی بھی کی جا سکے۔

اس طرح قدر پیائی پورے تعلیمی عمل میں سرایت کیے ہوتی ہے۔ وہ مدت تعلیم کے بعد انجام دیا جانے والا ایک عمل نہیں ہے بلکہ دوران تعلیم جاری رہتا ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف یہ بتانا ہے کہ طالب علموں کا طرز عمل انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا اور کیسا رہا بلکہ مقاصدِ تعلیم، مواد تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس حد تک مناسب اور موثر ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد صنعتی ترقی کی رفتار میں سب سے زیادہ تیزی ریاستہائے متحدہ امریکا میں آئی۔ مغربی یورپ کے صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک آپس میں جنگ کرنے کی وجہ سے اس کے نقصانات کا شکار اور اس کی ترقی میں مصروف رہے۔ دنیا کے باقی ممالک تو ان کے معاشی استحصال کے پہلے سے ہی شکار تھے اور بعد میں بھی رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے نتائج بھی مغربی ممالک میں تقریباً یہ ہی ہوئے۔ چنانچہ ان میں سے ریاستہائے متحدہ امریکا میں ہی صنعتی ترقی کی رفتار سب سے زیادہ تیز رہی۔ تعلیمی اصلاحات بھی وہیں زیادہ ہوئیں۔ وہیں قدر پیائی کے تصور کی ابتدا ہوئی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی زیادہ وہیں کی گئیں۔ بعد میں یہ طریقے دوسرے ملکوں میں بھی اپنائے گئے۔

ہندوستان میں اس تصور کا ذکر اگرچہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہونے لگا تھا مگر آزادی کے بعد اس کا چرچا بڑھا۔ 1956 کے بعد سے مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم نے اس تصور کی اشاعت اور طریقۂ امتحان کو اس کے مطابق بدلنے کی باقاعدہ کوشش شروع کر دیں۔ آج نہ صرف مرکز میں بلکہ تقریباً ہر ریاست میں اس تصور کی اشاعت اور ترویج کے لیے ایک مخصوص ادارہ قایم ہے اور طریقۂ امتحان کو اس کے مطابق تبدیل کرنے کی پورے ہندوستان میں کوشش کی جا رہی ہے۔

قدر پیائی کے معروضی طریقے : مقدار کی پیائش کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مادی اشیا کو شمار کرنے یا ان کی وسعت، وزن، یا حجم کی پیائش کرنے کے لیے معروضی معیار اور پیانے موجود ہیں۔ بعض غیر مادی اشیا کی پیائش کے لیے بھی معروضی پیانے سائنسدانوں نے وضع کر لیے ہیں جیسے علم طبعیات میں مادی اشیا کے ثقل، ان کی حرارت یا رفتار کو ناپنے کے پیانے یا وقت اور برقی قوت کی پیائش کے لیے پیانے۔ باقی دوسری غیر مادی چیزوں کی معروضی پیائش کے طریقے وضع کرنے کی کوشش بھی سائنسدانوں نے کی ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ مثلاً حیاتیات، نفسیات اور سماجیات کے عالموں نے ایسے بہت سے معروضی پیانے وضع کیے ہیں۔ اس طرح کے پیانے وضع کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہوتی ہیں۔

(الف) ایک یہ کہ جس چیز کی پیائش کرنا ہے اگر وہ واضح نہ ہو تو تعریف کے ذریعے اس کے مفہوم کو متعین کر دیا جائے۔ مثلاً "ذہانت" کا تصور واضح نہیں ہے۔ اس کی پیائش کرنے والے پہلے اس کی تعریف بیان کر کے اس کا ایک مفہوم متعین کرتے ہیں۔

(ب) دوسرے یہ کہ اس چیز میں تبدیلی کی سمت کا تعین کر دیا جائے یعنی یہ کہ کسی چیز کی وسعت کو ناپنا ہے یا اس کے وزن کو یا اس کی حرارت کو وغیرہ وغیرہ۔ ان دو باتوں کا خیال رکھتے ہوئے پھر اس چیز کی پیائش کے لیے موزوں پیانے کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

کسی چیز کی وقعت یا قدر کی معروضی پیائش کے لیے دو مسئلے حل طلب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "کیا بتائیں کہ یہ کیسی ہے" اور دوسرے یہ کہ "کیسے فیصلہ کریں کہ یہ ایسی ہے"۔

اشیا کی مقداری پیائش متناسب یا تفاوری پیانوں پر حاصل ہونے کی صورتوں میں پیائش کے نتائج کو شماریات کے اصولوں کے مطابق مرتب صورت میں پیش کرنے سے یہ دونوں مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح محدود یا لامحدود جماعت کے پس منظر کے ساتھ یہ نتائج اس شے کی وقعت کا فیصلہ بھی معروضی طور پر پیش کرتے ہیں۔

اگر کسی شے کی پیائش ان دونوں میں سے کسی پیانے پر حاصل نہیں ہو سکتی تو اس صورت میں پہلا مسئلہ حل کرنے کے لیے پہلے یہ طے کیا جاتا ہے کہ وہ چیز زیادہ سے زیادہ کیسی ہو سکتی تھی۔ یعنی اس کے (مثبت) نصب العین اور اس کی (منفی) برعکس صورت کی وضاحت کی جاتی ہے۔ پھر ان کے درمیان کے فصل کو چند طاق درجوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ درمیان کا ایک درجہ "اوسط"، "معمولی" یا "مناسب" حیثیت کے لیے اور ایک دو یا تین درجے اس سے منفی سمت میں اور اتنے ہی مثبت سمت میں رکھ لیے جاتے ہیں جیسے "بہت چھوٹا"، چھوٹا، مناسب، بڑا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اور بہت بڑا وغیرہ۔ اس طرح اس چیز کی وقعت کا ایک ترتیبی پیمانہ وضع کر لیا جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ حل کرنے کے لیے متعدد ماہرین یا موضوع سے تعلق رکھنے والوں سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک اس چیز کی وقعت اس ترتیبی پیمانے میں کس درجہ کی ہے۔ بعد میں ان سب لوگوں کی رائے کو شماریات کے اصولوں کے تحت پیش کر دیا جاتا ہے۔

موزوں آلات پیائش کے بغیر قدر پیائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ماہرین نے پیائش کے متعدد آلات وضع کیے ہیں اور ان کو وضع کرنے کے اصول اور طریقے متعین کیے ہیں۔ کسی موزوں آلہ پیائش کے لیے یہ ضروری ہے کہ "درست" اور "معتبر" ہو۔ "درست" ہونے سے مراد یہ ہے کہ آلہ مقصود شے کی ہی پیائش کرتا ہو۔ مثلاً میٹر دو نقطوں کے درمیان فاصلہ ناپنے کے لیے "درست" آلہ ہے کسی شے کا وزن یا کسی شخص کی سمجھ ناپنے کے لیے "درست" آلہ نہیں ہے۔ کسی آلہ پیائش کے "معتبر" ہونے سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کی اس آلے سے جتنی بار بھی پیائش کی جائے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ حاصل ہو۔

کسی بھی چیز کے "کتنی" یا "کیسی" ہونے کے بارے میں ہمارا فیصلہ یا تو داخلی (موضوعی) ہو سکتا ہے یا معروضی۔ یہ کمرہ بہت چھوٹا ہے "ایک موضوعی فیصلہ ہے۔ یہ کمرہ 5 میٹر لمبا اور 3 میٹر چوڑا ہے۔ جبکہ مجھے 8 میٹر لمبے اور 4 میٹر چوڑے کمرے کی ضرورت ہے۔ ایک معروضی فیصلہ ہے۔ پہلی صورت میں "چھوٹے" ہونے کا معیار داخلی معیار ہے۔ اس کمرے کے بارے میں دوسرے کسی شخص کا فیصلہ یا دوسرے وقت خود اپنا فیصلہ ہی اس سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اسی لیے داخلی یا موضوعی فیصلہ نا معتبر ہوتا ہے۔ معروضی فیصلے میں معیار معلوم، واضح اور قایم رہنے والا ہوتا ہے۔ جو شخص جب بھی اور جتنی بار بھی اس کمرے کی پیائش کرے گا اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس کمرے کی لمبائی 5 میٹر اور چوڑائی 3 میٹر ہے۔ اسی لیے معروضی فیصلے کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔

قدر پیائی میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ فیصلے زیادہ سے زیادہ معروضی رہیں۔ اس لیے ہمیشہ معیار کو پہلے واضع کر دیا جاتا ہے۔

قدر پیائی میں دو فیصلے بہ یک وقت کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کوئی چیز "کتنی" ہے اور "کیسی" ہے؟ کتنی کا تعلق مقدار سے ہے اور "کیسی" کا تعلق اس کی وقعت یا قدر سے۔ دونوں صورتوں میں پیائش کا عمل ضروری ہو جاتا ہے۔

قدر۔ موضوعی نظریہ (Subjective Theory of Value): کلاسیکی فکر سے بے اطمینانی کے سبب اور مارکس کے نظریات کے رد عمل میں انفرادی ملکیت اور آزادی کاروبار کے حامی معاشی مفکرین نے قدر کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق قدر کا تعین اشیا کی لاگت پیداوار سے نہیں بلکہ اس افادہ (Utility) سے ہوتا ہے جو اس سے صارفین کو حاصل ہو۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں جیونز (Jevons)، ویزر (Wiezer)، مینگر (Menger) نے واضح کیا کہ اشیا کی قدر ان کے حاشیائی افادہ (Marginal Utility) سے متعین ہوتی ہے اور عاملین پیداوار (Factor of Production) مثلاً محنت اور سرمایہ کی قدر ان اشیا صرف کی قدر سے ماخوذ اور اس پر منحصر ہوتی ہے۔ جن کی پیداوار کے لیے ان عاملین پیداوار کی ضرورت ہو۔ بام ورک (Bhoem Bawerk) جان بیٹس کلاک (John Bates Clark)، فلپ وکسٹیڈ (Philip Wickstead) اور کے. وکسل (K. Wicksell) نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس نظریہ کی مزید وضاحت کی جس کے مطابق عاملین پیداوار کی قدر ان کی حاشیائی پیدآوری (Marginal Productivity) سے متعین ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں الفریڈ مارشل (Alfred Marshall) نے رسد کی اہمیت پر بھی زور دیا۔ تقسیم کے نو کلاسیکی (Neo Classsical) نظریہ کے مطابق پیداواری خدمات یا عاملین پیداوار قدر ان کی طلب اور رسد سے متعین ہوتی ہے۔ یہی نظریہ جدید علم معاشیات کا نظریہ تقسیم قرار پایا ہے۔

قرابت داری (ساخت) (Kinship Structure): ہر معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے سے مختلف بندھنوں کے ذریعہ وابستہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ آفاقی بندھن وہ ہیں جو انسان کی خلقی جبلیت (Inherent Drive) افزائش نسل پر منحصر ہوتے ہیں۔ تولد (Reproduction) کی خواہش دو طرح کے بندھنوں کو عالم وجود میں لاتی ہے۔ اولاً وہ بندھن جو زن و مرد کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ دونوں طرف کے رشتہ داروں کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ ثانیاً وہ بندھن جو والدین اور بچوں کے درمیان اور ان کی سگی اولادوں (Siblings) یعنی انھیں والدین کے بچوں کے درمیان استوار ہوتا ہے۔ ان دونوں طرح کے بندھنوں سے دو طرح کی قرابت داریاں وجود میں آتی ہیں۔ پہلی قسم کا بندھن جو معاشرتی اور قانونی ذرائع سے معروف ازدواجی رشتہ سے پیدا ہوتا ہے اسے نسبتی قرابت داری (Affinal / Conjugal

Kinship) کہتے ہیں اور اس رشتہ سے تعلق رکھنے والے عزیزوں یا رشتہ داروں کو نسبتی قرابت دار (Affinal/ Conjugal Kins) کہا جاتا ہے۔ نسبتی قرابت دار ایک دوسرے کے ساتھ خون کے رشتہ سے تعلق نہیں رکھتے جیسا کہ مذکورہ بالا دوسری قسم کے رشتہ داروں کے معاملہ میں ہوتا ہے جو صلبی قرابت دار کہلاتے ہیں۔ وہ رشتہ داری جو خون کے رشتوں پر استوار ہوتی ہے اسے صلبی قرابت داری (Consanguous Kins) یا ایک ہی خون کی رشتہ داری کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ صلبی قرابت داری کا تعین حیاتیاتی حقیقت کے ذریعہ نہیں بلکہ معاشرتی اعتراف (Recognition) کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص 'خویش' سے براہ راست رشتہ رکھتا ہے تو وہ اولی قرابت دار (Primary Kin) کہلائے گا مثلاً خویش کا باپ اس کا اولی صلبی قرابت دار (Primary Consanguous Kin) ہوگا اور اس کی بیوی اس کی اولی نسبتی قرابت دار (Primary Affinal Kin) ہوگی۔ کوئی بھی قرابت دار جو خویش کے ساتھ اولی قرابت دار کے ذریعہ رشتہ رکھتا ہوگا اسے ثانوی قرابت دار (Secondary Kin) قرار دیا جائے گا۔ مثلاً خویش کے باپ کا بھائی یا اس کی سوتیلی ماں ثانوی صلبی قرابت دار (Secondary Consanguous Kin) ہوں گے۔ بیوی کے ماں باپ بھائی بہن وغیرہ خویش کے ثانوی قرابت دار (Seondary Affinal Kin) ہوں گے۔ قرابت دار گروہ (Kinship Group) کی دو جہتیں ہوتی ہیں۔ اگر اس گروہ میں افراد زیادہ ہوں تو یہ وسیع جہت گروہ (Broad Range Group) بن جائے گا۔ یہ عام طور سے قدیمی سگے عزیزوں (Primitive Sibs) میں پائے جاتے ہیں جن کی قرابت داریاں دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ اگر اس کے برخلاف اس گروہ میں افراد کم ہوں تو یہ محدود جہت گروہ (Narrow Range Group) ہو جائے گا۔ اس طرح کی ساخت بالعموم مغربی قرابت داری نظام میں پائی جاتی ہے۔ اگر ماں اور باپ دونوں کی قرابت داریوں کا اعتراف کیا جائے تو یہ دوطرفہ مجموعہ بندی (Bilateral Grouping) ہوجائے گی۔ جب ان میں کسی ایک نسب (Descent) کو نظر انداز کردیا جاتا ہے تو یہ یک طرفہ مجموعہ بندی (Unilateral Grouping) بن جاتی ہے۔ ان کے برخلاف ایسے گروہ بھی ہوتے ہیں جو دو نسب (Double-Descent) اور ذو نسل قرابت دار گروہ (Bilinear Kin Group) کہلاتے ہیں۔ موخرالذکر میں صرف وہ افراد شامل ہوتے ہیں جو کسی کے ساتھ پدر نسلی (Patrilineal) اور مادر نسلی (Matrilineal) دونوں طرح کے رشتے رکھتے ہوں۔ ذونسب میں ان بعض قرابت داروں کو شامل کر لیا جاتا ہے جو دونوں سلسلوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ اگر افراد میں واصل (Binder) مشترک جد (Ancestor) ہو تو وہ ہم نسب (Cognates) ہوں گے۔ اگر یہ جد مرد ہو تو یہ ہم پدر (Agnates) یا ددیہالی قرابت دار (Agnatic Kin) یا پدر نسلی قرابت دار (Patrilineal Kin) ہوں گے۔ البتہ جدیت عورت سے تعلق رکھتی ہو تو انھیں رحمی قرابت دار (Uterine Kin) یا مادر نسلی قرابت دار (Matrilineal Kin) کہا جائے گا۔ وہ قرابت دار جن کی ایک دوسرے کے ساتھ راست نسب (Direct Descent) کے ذریعہ رشتہ داری ہوتی ہے وہ نسلی قرابت دار (Lineal Kin) ہوتے ہیں جو اصل گروہ یا مجموعہ سے الگ شاخ بناتے ہیں وہ ہم جد قرابت دار (Collective Kin) قرار پاتے ہیں۔ مثلاً چچا پھوپھا ماموں خالو وغیرہ اور ان کی اولادیں اس طرح قرابت داری کا نظام، معاشرتی رشتوں کا ایک ایسا جال (Network) ہے جسے مجموعی معاشرتی رشتوں کے ایک جزو کی حیثیت حاصل ہے اور جس کے ذریعہ وسیع معاشرتی ڈھانچہ عالم وجود میں آتا ہے۔

قرض: ادھار کو کہتے ہیں اصطلاحاً اس سے وہ معاملہ مراد ہوتا ہے جس میں ایک شخص دوسرے شخص کو کوئی چیز دے اور لینے والا دینے والے کو اسے آئندہ واپس کرے اس میں شرط یہ ہے کہ جو چیز قرض دی جائے وہ مثلی ہوتا کہ لینے والا دینے والے کو اسی طرح کی چیز واپس کرسکے۔ گویا قرض دی جانے والی چیز ایسی ہو کہ وہ ناپ یا تول یا گنتی میں آسکے۔ جس چیز کا قرض دینا لینا صحیح نہیں اگر اس کو کسی نے قرض دیا تو اس پر قبضہ کرنے سے اس کا مالک ہوجائے گا مگر اس سے نفع اٹھانا صحیح نہیں لیکن اگر اس کی بیع کردی تو بیع درست ہوگی۔

قرض معین مدت کے لیے ہونا چاہیے۔ میعاد مجہول ہونے کی صورت میں دین صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ معمولی جہالت ہو تو جائز ہے جیسے یوں کہے کہ جب کھیت کٹے گا تب قرض ادا کروں گا لیکن اگر زیادہ جہالت ہو تو جائز نہیں جیسے کسی نے کہا کہ جب آندھی آئے گی یا پانی برسے گا تو قرض دوں گا۔ ادائے قرض میں چیز کے مہنگے سستے ہونے کا اعتبار نہیں جیسے دس سیر گیہوں قرض لیے تھے ان کی قیمت دس روپے تھی اور ادا کرنے کے دن اس سے زیادہ یا کم ہوگئی تو اس کا بالکل لحاظ نہیں کیا جائے گا وہی دس سیر گیہوں دیے جائیں گے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ایک شہر میں غلہ قرض لیا اور دوسرے میں قرض خواہ نے مطالبہ کیا تو جہاں قرض لیا تھا وہاں جو قیمت تھی وہ دے دی جائے۔

مہر کی نوعیت بھی ایک دین جیسی ہے اس لیے بیوہ دوسرے دائنوں کی طرح اپنے متوفی شوہر کی جائداد سے اس کے پانے کی مستحق ہوگی۔ لیکن دوسرے دائنوں سے اس کا حق بڑھا ہوا نہیں ہو سکتا۔ البتہ اسے جائداد کے رکھنے کا حق ہوتا ہے۔

ایک متوفی مسلمان کے ورثہ دین مہر کے ذاتی طور سے ذمہ دار نہیں ہوتے متوفی کے دوسرے دینوں کی طرح دین مہر کا بھی ہر وارث اپنے حصہ کے بقدر ذمہ دار ہوگا اس لیے اگر بیوہ بربنائے دعویٰ مہر اپنے شوہر کی جائداد اور قابض ہو تو اس کے شوہر کے دوسرے وارثوں میں سے ہر ایک اپنے حصے کے تناسب سے دین مہر کا حصہ رسدی ادا کرکے اپنا حصہ واپس پانے کا مستحق ہے۔

قرض کی ادائیگی کی اسکیم (Scheme of Arrangement):

اگر کوئی شخص دیوالیہ قرار دیا گیا ہو تو وہ ایک ایسی اسکیم یا پلان مرتب کرسکتا ہے جس پر عمل آوری سے واجب الادا قرضوں کی ادائیگی ممکن ہو۔ یہ اسکیم یا پلان عدالت میں پیش کی جائے گی اور عدالت ایسے اسکیم کی وصولی پر قرض خواہوں کو نوٹس دے کر اس اسکیم سے آگاہ کرے گی اور اگر بیش تر قرض خواہ اسے متفق ہوں تو عدالت اس کے متعلق حکم مناسب صادر کرے گی۔ اس اسکیم میں قرض دار اور قرض خواہ کی متفقہ رائے سے ترمیم بھی ممکن ہے کوئی ایسی اسکیم عدالت سے منظور نہ ہوگی اگر اس اسکیم میں کسی ایک قرض دار کے قرض کی ادائیگی کو متروک کر دیا گیا ہو۔ اس طرح کی اسکیم کی منظوری پر عدالت اس پر عمل آوری کا حکم دے سکے گی اور حکم دیوالیہ جو سابق عدالت سے دیا گیا ہو اسے منسوخ کر دے گی اگر اس منظورشدہ اسکیم کی تعمیل میں کوئی قسط روک دی گئی ہو یا بعد میں عدالت کی یہ رائے قایم ہو کہ اس اسکیم پر عمل آوری کی وجہ سے ناانصافی ہونے کا اندیشہ ہے یا یہ کہ اسکیم کی منظوری جعل سازی کی بنا پر حاصل کی گئی ہے تو ایسی صورت میں عدالت قرض دار کو پھر دیوالیہ قرار دے گی اور اسکیم کو منسوخ کردے گی۔ لیکن ایسی کسی جائداد کی منتقلی یا رقمی داد و ستد جو اس اسکیم کے پیش رفت میں کی گئی ہو متاثر نہ ہوگی۔

قرضہ (Credit): فوری ادائیگی کے بغیر سامان یا خدمات حاصل کرنا قرض پر حاصل کرنا کہلاتا ہے۔ قرضہ تین اقسام کا ہوتا ہے۔ (1) صارف کا قرضہ۔ جو دوکاندار یا مالیاتی ادارے معمولی صارفین کو باقاعدہ یا بے قاعدہ طور پر اس لیے دیتے ہیں کہ وہ اشیا صرف خرید سکیں۔ (2) تجارتی قرضہ۔ یہ قرضہ ایسا ہے جیسے کچا مال مہیا کرنے والا کسی کارخانے دار کو دے یا کارخانے دار تھوک یا چلر فروشوں کو۔ موجودہ دور میں پیداواری صنعتوں، خدمتوں اور تجارت میں تمام کاروبار نقدر نہیں بلکہ قرضہ پر ہوتے ہیں۔ (3) بینک کے قرضے۔ وہ قرضے ہیں جو بینک مختلف شکلوں میں دیتے ہیں۔

قرضہ کی مدد سے پیداکار مال کی پیداوار اور اس کی فروخت کے درمیانی عرصہ کی ضروریات پورا کرسکتا ہے۔ اور صارف اپنی مستقبل کی آمدنی کی بنا پر ضرورت کی اشیا خرید سکتا ہے۔ بینک کے اور دوسرے اقسام کے قرضہ زری رسد (Money Supply) کا بہت بڑا حصہ ہیں اور انھیں معاشی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے حکومتیں قرضوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگاتی ہیں تاکہ جب قیمتیں چڑھ رہی ہوں تو مجموعی طلب بڑھنے نہ پائے۔ پابندیاں کئی طرح سے لگائی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی کمپنی کی قرض حاصل کرنے کی حد اس کے اثاثوں تک محدود کر دی جاتی ہے اور شرح سود بڑھا دی جاتی ہے۔

قطبیت اور طاقتی بلاک (Bipolarity and Power Blocs):

قطبیت سے مراد دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر بین الاقوامی سیاست کے میدان میں دو عظیم ترین طاقتوں یعنی ریاستہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین — کا ظہور تھا جنھوں نے اپنی علاقائی وسعت، بڑی آبادی، اقتصادی وسائل کی فراوانی اور فوجی صلاحیتوں کی برتری کی بناء پر قبل جنگ کی عظیم طاقتوں — برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان کی سیاسی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا۔ اور اس طرح تاریخی کثیر طاقتی توازن قوت کی جگہ دو طاقتی توازن قوت کو جنم دیا۔ یہ قطبینی صورت حال بین الاقوامی نظام میں اپنی نوعیت کی واحد اور نئی صورت حال تھی۔ پندرہویں صدی کے آخر میں قائم ہونے والا یورپ کا مملکتی نظام جو 1815 کے بعد سے پہلی عالمی جنگ کی شروعات تک تدریجاً ایک عالمی نظام میں تبدیل ہوا، ہمیشہ سے "طاقت کا نزاعی نظام" رہا ہے جس کی بقا اور استحکام کا دارومدار کثیر طاقتی توازن کے اصول پر تھا۔ یہ اصول تین صدیوں تک یورپ میں کامیاب رہا۔ اتحادات اور جوابی اتحادات کے ذریعہ کام کرنے والے عالمی توازن قوت کا ارتقا پہلی عالمی جنگ کے دوران مکمل ہوا۔ 1815 میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

نپولیائی جنگوں کے خاتمہ پر آٹھ ملکوں یعنی آسٹریا، فرانس، برطانیہ، پرتگال، روس، پروشیا، اسپین اور سویڈن کو عظیم طاقتوں کا سفارتی درجہ حاصل تھا۔ پرتگال، اسپین اور سویڈن جلد ہی اس مرتبہ سے محروم ہوگئے اور عظیم طاقتوں کی تعداد پانچ رہ گئی۔ پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں اطالیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکا اور صدی کے خاتمہ پر جاپان ان کی صف میں شامل ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کے چھڑ جانے کے وقت عظیم طاقتوں کی تعداد دوبارہ آٹھ ہوگئی۔ آسٹریا، فرانس، جرمنی، برطانیہ، اطالیہ، جاپان، روس اور ریاستہائے متحدہ امریکا۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر آسٹریا ہمیشہ کے لیے اور جرمنی اور روس عارضی طور سے عظیم طاقتوں کی فہرست سے خارج ہوگئے۔ دوسری عالمی جنگ کے چھڑ جانے پر عظیم طاقتوں کی تعداد پھر سات ہوگئی۔ جرمنی اور سوویت روس کا درجہ بحال ہوچکا تھا لیکن اس جنگ کے خاتمہ پر عظیم طاقتوں کی تعداد گھٹ کر تین رہ گئی۔ برطانیہ، سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکا۔ اگرچہ فرانس اور چین کو ان کے مطابق مرتبہ اور امکانی صلاحیتوں کی بنا پر مذاکرات میں اور بین الاقوامی تنظیموں میں عظیم طاقتیں تسلیم کیا گیا۔ جنگ کے دوران برطانیہ کی طاقت بڑی حد تک زائل ہوچکی تھی اور جنگ کے بعد اس کی حیثیت مستقل زوال آمادہ ہوتی گئی یہاں تک کہ ریاستہائے متحدہ امریکا کو اس کی عالمی اور علاقائی دفاعی ذمہ داریاں خود سنبھالنی پڑیں۔ جنگ کے بعد طاقت کے اعتبار سے کوئی ملک ریاستہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین کی برابری نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے انھیں عظیم ترین طاقتیں (Super Powers) کہا جاتا رہا۔

دوسری جنگ عظیم محوری طاقتوں کی جارحیت کے خلاف پانچ اتحادیوں — برطانیہ، روس، ریاستہائے متحدہ امریکا، فرانس اور چین کی جنگ تھی۔ ان طاقتوں نے جنگ کے خاتمہ پر عالمی امن کے لیے اجتماعی تحفظ کے اصول پر مبنی اقوام متحدہ کی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تنظیم کا تنفیذی ادارہ سیکورٹی کونسل تھی جس کی کارکردگی کے لیے پانچوں بڑی طاقتوں کے اتفاق رائے کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ جنرل اسمبلی محض اس کے فیصلوں کی توثیق اور حمایت کے لیے بنائی گئی تھی۔ جنگ کے بعد کشیدگی صورت حال اور دونوں عظیم ترین طاقتوں کے درمیان مفادات اور نظریات کے ٹکراؤ کے سبب اجتماعی تحفظ اور عظیم طاقتوں کے اشتراک کار کے منصوبے ناکام ہوگئے۔ دونوں طاقتوں کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں کشیدگی اور مقابلہ کی جو صورت حال ظاہر ہوئی اسے "سرد جنگ" کا نام دیا گیا۔ اس کشمکش میں سوویت یونین اور ریاستہائے متحدہ امریکا کی قیادت میں دو حریف بین الاقوامی طاقتی بلاکوں کی تشکیل ہوئی جو علی الترتیب مشرقی یا کمیونسٹ بلاک اور مغربی یا سرمایہ دار بلاک کے نام سے جانے جاتے تھے۔

کمیونسٹ بلاک: دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر سوویت یونین کا نہ صرف مشرقی جرمنی پر قبضہ تھا بلکہ اس نے سارے مشرقی یورپ اور جنوب مشرقی یورپ میں کمیونسٹ حکومتیں قائم کراکے انھیں اپنے حلقہ اثر میں داخل کرلیا تھا۔ یوریشیا میں ماسکو کے زیر اثر کمیونسٹ ملکوں کے اس مجموعہ کو مختلف طور سے کمیونسٹ بلاک، کمیونسٹ کیمپ اور کمیونسٹ بین الاقوامی نظام کہا گیا۔ اس بلاک میں 13 ممالک شامل تھے جو سطح ارض کے 25 فی صد علاقہ کو محیط ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی دنیا کی کل آبادی کا تقریباً 36 فی صد تھی۔ اس بلاک میں دنیا کا علاقہ کے اعتبار سے سب سے بڑا ملک یعنی سوویت یونین اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک یعنی چین کے علاوہ مشرقی یورپ کے آٹھ ممالک یعنی پولینڈ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، ہنگری، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور البانیہ اور مشرقی ایشیا میں منگولیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں شمالی کوریا اور شمالی ویت نام شامل تھے۔ یوگوسلاویہ 1948 میں روس کے اسٹالین سے برگشتہ ہوکر ناوابستہ ہوگیا۔ البانیہ اور چین بھی 1958 میں اس سے علاحدہ ہوگئے۔ بعد میں کیوبا میں انقلاب کے نتیجہ میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی اور ایشیا اور افریقہ کے بعض ناوابستہ ملکوں اور مغربی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی روس کی حمایت کی۔ 1958 میں کمیونسٹ نظام سے باہر 63 کمیونسٹ پارٹیاں کام کررہی تھیں جن کے ارکان کی تعداد اسی (80) نوے (90) لاکھ کے درمیان تھی۔ ماسکو کی قیادت میں کمیونسٹ بلاک تقریباً دس برس متحدہ طور پر مغربی ملکوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہا۔ اسی اثنا میں اس کے اندر بھی اختلافات رونما ہوچکے تھے۔ یوگوسلاویہ 1948 سے غیر جانبدار رہا۔ چین 1958 میں روس کا مخالف ہوا۔

1969 میں روس اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں نے اپنی قیادت میں ایک علاحدہ بلاک قائم کرلیا۔ چیکوسلواکیہ میں فوجی مداخلت کی تو رومانیہ نے غیر جانبدارانہ رجحانات کا اظہار شروع کیا۔ اجتماعی دفاع کے وارسا معاہدہ کی تنظیم میں پولینڈ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، اور روس شامل تھے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مغربی بلاک: ریاستہائے متحدہ امریکا نے اپنی قیادت میں مغربی بلاک کی تشکیل کیمونزم کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اپنے معاشی نظام اور ملک کی حفاظت کے لیے کی۔ سرد جنگ کا پہلا بحران ترکی اور یونان پر کیمونسٹ دباؤ (1946) اور دوسرا برلن کا محاصرہ (1948-49) تھا۔ اس کا تیسرا مظاہرہ جنگ کوریا تھی۔ ان واقعات نے ریاستہائے متحدہ امریکا اور اس کے حامیوں کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ان ممالک میں اس کے مفادات خطرے میں ہیں۔ اس کے جواب میں امریکا نے ٹرومین اصول، مارشل منصوبہ اور معاہدۂ شمالی اوقیانوس پیش کیا اور عالمی پیمانہ پر کیمونسٹ اثرات کو پھیلنے سے روکنے اور اپنے مقبوضات کی حفاظت کے لیے اتحادات اور فوجی اڈوں کا سلسلہ قائم کیا۔ امریکا کے زیر قیادت کیمونسٹ مخالف طاقتی نظام مندرجہ ذیل عناصر سے مرکب ہوا:

(1) اجتماعی دفاع کے علاقائی فوجی اتحادات یعنی معاہدہ شمالی اوقیانوس (15 ممالک)، معاہدہ ریوڈی جانیرو (21 ممالک)، آنزس معاہدہ (تین ممالک) اور معاہدۂ جنوب مشرقی ایشیا۔ ان کے علاوہ انفرادی ملکوں سے دفاعی معاہدے مثلاً فلپائن، جاپان، جنوبی کوریا، فارموسا، ایران اور پاکستان سے۔

(2) فوجی معاہدات کے تحت دنیا کے مختلف حصوں میں فوجی مراکز۔

(3) کیمونسٹ بلاک کے علاقوں کے گرد یعنی مغربی یورپ سے بحر متوسط تک، مشرقی اوسط میں، جنوبی مشرقی ایشیا میں، مغربی بحر کاہل میں، جاپان، کوریا، الاسکا اور شمالی کینیڈا میں فوجی تنصیبات۔

(4) خود ریاستہائے متحدہ امریکا میں فضائی طاقت اور براعظمی میزائلوں کی تنصیب۔

(5) مغربی بلاک کے دوست ملکوں کا فوجی و اقتصادی امداد کا نظام اور

(6) یورپ اور ایشیا میں بڑے پیمانہ پر امریکی فوجوں اور اسلحہ کی تعیناتی۔

کیمونسٹ بلاک کی طرح مغربی بلاک میں بھی قوم پرستی اس کے ضعف کی باعث ہوئی۔ فرانس نے امریکا اور ناٹو (NATO) سے آزادی کا اعلان کیا۔ مغربی یورپ میں اقتصادی برادری کے قیام سے امریکی اثرات کا زوال ہوا۔ مغربی جرمنی اور جاپان اقتصادی طاقت میں امریکا کے ہم سر ہوگئے۔ 1962 کے کیوبا میزائل بحران کے بعد سے دونوں بلاکوں کا زوال شروع ہوا۔ سرد جنگ کی کشیدگی بتدریج کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ 1969 کی فضا "مفاہمت" (Detente) کے نام سے مشہور ہوئی جس میں دونوں عظیم ترین طاقتیں اپنے نیوکلیائی اسلحہ کو محدود کرنے کی گفتگو اور سیاسی، اقتصادی اور تکنیکی تعاون کے راستوں کو اختیار کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ کچھ ماہرین سیاسیات کا کہنا تھا کہ سرد جنگ اور طاقتی بلاکوں کی سیاست عرصہ تک قائم رہے گی۔ لیکن 1975 کے بعد کے واقعات سے اس کی ناپائداری واضح ہوتی گئی۔

قلیل مدتی قیمت (Short-term Price): ایک ایسی درمیانی مدت کی قیمت ہے جس میں ہر ایک فرم موجودہ پلانٹ کے ذریعہ متغیر عاملین میں اضافہ اور کمی کرکے پیداوار میں اضافہ اور کمی کر سکتا ہے۔ بازار مدت میں جب طلب میں اضافے سے قیمت بڑھ جاتی ہے اور خالص منافع حاصل ہوتا ہے تو ہر ایک فرم بیشترین منافع کمانے کے لیے پیداوار بڑھاتی ہے۔ اس کے برعکس طلب میں تخفیف سے قیمت گھٹ جاتی اور فرم کو نقصان ہوتا ہے تو اسے کمترین کرنے کے لیے ہر ایک فرم پیداوار گھٹاتی ہے نتیجتاً قلیل مدت میں رسد متغیر ہوجاتی ہے اور طلب کے ساتھ ایک نئی سطح پر توازن ہوجاتا ہے جس پر ہر ایک فرم اتنی ہی مقدار فروخت کرتی ہے جس سے بیشترین منافع اور کمترین نقصان ہوتا ہے۔ جب قیمت اوسط مصارف سے زیادہ ہوتی ہے تو فرم پیداوار کو بڑھاتی ہے جس کے ساتھ ساتھ اس کے مصارف مختتم بڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے جب تک کہ مصارف مختتم بڑھتے بڑھتے قیمت کے مساوی نہ ہو جائیں منافع میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور دونوں کے مساوی ہونے پر منافع بیشترین ہوجاتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر قیمت اوسط مصارف سے کم ہو تو فرم پیداوار گھٹاتی ہے جس سے مصارف مختتم بھی گھٹتے ہیں۔ لہٰذا پیداوار اس حد تک گھٹائی جاتی ہے کہ مصارف مختتم قلیل مدتی اور قیمت مساوی ہوجائیں۔ اسی طرح نقصان کمترین ہو جاتا ہے اور نتیجتاً قلیل مدتی متوازن قیمت، طلب کی طرف سے افادہ مختتم اور رسد کی طرف سے مصارف مختتم کے مساوی ہوا کرتی ہے۔ چونکہ اس مدت میں ہر فرم کو یا تو منافع ملتا ہے یا کمترین نقصان ہوتا ہے اس لیے اس صورت کو فرم کا قلیل مدتی توازن (Short-run Equilibrium of Firm) کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کہ اگر قیمت فرم کے کمترین اوسط متغیر مصارف سے کم ہو تو فرم عارضی طور پر پیداوار کا کام بند کردیتی ہے۔

قلیل مدتی مصارف : دیکھیے قلیل مدتی قیمت۔

قوم پرستی (Nationalism) : انسانوں کا کوئی گروہ خواہ وہ سیاسی طور پر اپنی مملکت میں منظم ہو یا نہ ہو، جب گروہی اتحاد کا احساس رکھتا اور جذباتی وحدت کا اظہار کرتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ ایک "قوم" (نیشن) ہے یا مشترکہ "قومیت" (نیشنلٹی) رکھتا ہے۔ جب کوئی قوم اپنے جداگانہ تہذیبی یا سیاسی تشخص اور حق خود اختیاری کا مطالبہ کرتی، یا کوئی آزاد قوم دوسری اقوام کے خلاف اپنے جداگانہ وجود اور مفادات کی پرزور حمایت کرتی یا بیرونی اشیاء اور اثرات سے اجتناب کرتی ہے تو اس روش کو "قوم پرستی" (نیشنلزم) کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قوم پرستی کی یہ تعریف کی جاسکتی ہے کہ یہ "ایک ایسا رویہ یا ذہنی کیفیت ہے جس میں ہر فرد یہ محسوس کرے کہ ہر شخص کو دنیاوی معاملات میں تمام تر قومی مملکت کا وفادار ہونا چاہیے"۔ قوم پرستی ایک تحریک بھی ہے اور ایک تصور بھی۔ اس تصور کا وجود "قومی مملکت" کے وجود میں آنے کے ساتھ ہوا۔ یعنی مملکت کی بنیاد قومیت ہونی چاہیے۔ عہدِ قدیم میں یا تو شہری مملکت ہوتی تھی مثلاً ایتھنس، اسپارٹا، یا قدیم روم یا وسیع و عریض سلطنتیں مثلاً مقدونیہ، ایران یا چین۔ اس ابتدائی زمانہ میں بھی لوگ اپنے نسلی اور تہذیبی اختلافات کا احساس رکھتے تھے اور ہر گروہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا تھا۔ مثلاً یونانی لوگ خود کو مہذب ترین اور دوسری اقوام کو "بربری" یا وحشی کہتے تھے۔ یہودی اپنی قوم کو خدا کی منتخب قوم مانتے تھے اور چین کے لوگ اپنے ملک کو دنیا کا مرکز سمجھتے تھے۔ لیکن نسلی اور تہذیبی تفوق یا علاحدگی کے یہ احساسات عہدِ جدید کی قوم پرستی کی روح سے بالکل مختلف تھے۔ موجودہ قوم پرستی کا تصور جدید مملکت کے تصور سے وابستہ ہے۔ جب قرون وسطی کے خاتمہ پر یورپ میں جاگیردارانہ نظام کا شیرازہ منتشر ہوا اور مختلف علاقوں میں آزاد قومی بادشاہتیں قائم ہوئیں تو ان علاقوں کے باشندوں نے اپنے آپ کو آزاد ملک اور قوم سے منسوب کرنا شروع کیا اور ان کی وفاداری کا مرکز پرانے جاگیردار یا شہنشاہ کی جگہ پہلے قومی بادشاہ کی ذات اور پھر خود قوم بن گئی۔ قومی مملکت کے وجود میں آنے سے پہلے ایک انتظام والے ممالک یا علاقوں کی حد بندی قومیت کے اصول پر نہیں ہوتی تھی بلکہ لوگ سیاسی تنظیم کی دوسری شکلوں مثلاً شہری مملکت یا جاگیر اور جاگیردار، خاندانی ریاست، مذہبی گروہ یا فرقہ یا سلطنت کے وفادار ہوتے تھے۔ قوم پرستی کے عروج کے ساتھ یہ تصور بھی واضح ہوا کہ ہر قومیت کو اپنی علاحدہ مملکت میں منظم ہونا چاہیے۔ قوم پرستی یعنی ایک متحدہ گروہ سے وابستگی کا نیا شعور مختلف عوامل کا نتیجہ تھا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد، قومی زبانوں کا ارتقاء، قومی آزادی کی جنگیں، جداگانہ قومی کلیساؤں کا قیام، مشترکہ تاریخ اور روایات اور بہت سے دوسرے عوامل نے مل کر قوم پرستی کی جدید روح، رویہ یا تحریک کو جنم دینے میں حصہ لیا۔ قوم پرستی کے بنیادی عناصر میں مشترکہ خون یا قرابت کے رشتے، مشترکہ زبان، مشترکہ مذہب، مشترکہ تاریخ اور مشترکہ رسوم و رواج ہیں۔ لیکن یہ تمام کے تمام قوم کی تشکیل کے لیے ضروری نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد عناصر کا مجموعہ کسی گروہ میں اتحاد کا جذبہ بیدار اور اس کی طرف سے تہذیبی یا سیاسی خود اختیاری کے مطالبہ کا راستہ ہموار کرسکتا ہے۔

جدید قوم پرستی کی دو سب سے پہلی پرزور تحریکیں امریکی اور فرانسیسی انقلابات کی شکل میں رونما ہوئیں۔ یہاں سے لاطینی امریکا کے نئے ملکوں میں سرایت کرنے کے بعد انیسویں صدی کے شروع میں اس نے وسطی یورپ میں اور اس صدی کے وسط میں مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ (سلطنت عثمانیہ) میں زور پکڑا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اس نے ایشیا میں جڑ پکڑی اور موجودہ دہائی تک ایشیا و افریقہ کے ہر ملک میں اس کی عملداری قائم ہوگئی۔ جہاں انیسویں صدی کو یورپ میں قوم پرستی کا دور کہا جاتا ہے وہیں بیسویں صدی ایشیا و افریقہ میں پرزور قومی تحریکوں کی نشوونما اور جدوجہد کی صدی ہے۔

قوم پرستی دو شکلیں اختیار کرسکتی ہے :

(1) اعتدال پسندانہ اور حریت پسندانہ قوم پرستی، اور

(2) انتہا پسندانہ یا جارحانہ قوم پرستی۔

پہلی شکل میں قومی تحریک نہ صرف اپنے لیے آزادی، مساوات، انصاف اور تحفظ کی اقدار حاصل کرنا چاہتی ہے بلکہ دوسری قوموں کے حقوق اور مفادات کا بھی احترام اور پاسداری کرتی ہے۔ یہ قوم پرستی پرامن بقائے باہم، بین الاقوامی امن و تعاون میں یقین رکھتی ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ کسی بھی حریت پسند ملک کے بین الاقوامی روابط تمام تر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اخلاقی اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ جارحانہ قوم پرستی کا نعرہ ہوتا ہے "میری قوم صحیح ہے یا غلط میری قوم" ہے۔ اس میں دوسری اقوام پر اپنی قوم کی برتری کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک قومی طاقت کی اندھادھند توسیع اور قومی مفادات کی بے لگام جدوجہد مقصود بالذات ہے۔ اس انتہا پسندی نے اس صدی میں جرمنی میں قومی اشتراکیت اور اطالیہ میں فسطائی آمریت کی شکل اختیار کی۔ نازیوں نے جرمن قوم کی برتری کا تخیل اپنا کر سارے یورپ اور وہاں سے ساری دنیا پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ فسطائیت نے سامراج اور استعمار کو قوم پرستی کا اگلا قدم قرار دیا۔ اور مسولینی نے سلطنت روما کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ نازیوں اور فسطائیوں کے ان ہی اقدامات نے دنیا کو دوسری عالمی جنگ کے جہنم میں جھونک دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ میں تنگ نظر قوم پرستی کو زوال ہوا اور اس کی جگہ وہاں بین المملکتی تنظیموں کے ذریعہ علاقائی اقتصادی انضمام اور سیاسی انضمام کے نصب العین نے جنم لیا۔

قومی آمدنی : دیکھیے آمدنی قومی (National Income)۔

قومی کتب خانہ، ہندستان (National Library, India) :

قومی کتب خانہ کا قیام 8/ستمبر 1948 کو پہلے سے موجود امپیریل کتب خانہ کے نام کو پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعہ تبدیل کرکے عمل میں آیا۔ امپیریل کتب خانہ خود بھی 1903 میں اس وقت موجود "کلکتہ پبلک لائبریری" اور امپیریل کتب خانہ کے ادغام سے قائم ہوا تھا۔ کلکتہ پبلک لائبریری 21/مارچ 1836 کو کلکتہ کے چند ممتاز شہریوں نے انگلش مین (اسٹیٹسمین) اخبار کے ایڈیٹر جے ایچ سڈنس (J.H.Siddons) کی ترغیب پر قائم کی تھی لیکن انیسویں صدی کے آخری دنوں میں جب یہ کتب خانہ مشکلات سے دوچار تھا، وائسرائے لارڈ کرزن نے اسے امپیریل کتب خانہ میں شامل کرکے 30/جنوری 1903 کو نئے امپیریل کتب خانہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتب خانہ "اس مقصد کے تحت کہ یہ ایک حوالجاتی کتب خانہ ہو، طالب علم کے کام کی جگہ اور مورخین کے واسطے مواد کا ذخیرہ، جہاں امکان کی حد تک ہندستان کے بارے میں ہر تصنیف چاہے وہ کبھی بھی لکھی گئی ہو، دیکھی جاسکے اور پڑھی جاسکے" قائم کیا جاتا ہے۔ اپنے اِس دور میں جو 1947 تک آتا ہے۔ کتب خانہ کو چند نہایت ممتاز افراد بطور لائبریرین ملے، ان میں برٹش میوزیم کے جان میکفرلین (John Macfarlane) معروف بنگالی ادیب ہری ناتھ ڈے اور خان بہادر اسداللہ شامل ہیں۔ اسداللہ صاحب کی کوششوں سے 1933 میں انڈین لائبریری ایسوسی ایشن قائم ہوئی اور ملک میں پہلی بار ایک کل وقتی ڈپلوما کورس برائے لائبریریز (Libraries) شروع کیا گیا۔

1948 میں تبدیلی نام کے ساتھ کتب خانہ مٹکاف ہال سے جہاں وہ بحیثیت کتب خانہ قائم تھا، آزاد ہندستان کے پہلے گورنر جنرل راج گوپال آچاری کی تجویز پر "بلویڈر اسٹیٹ (Belveder Estate)" وائسرائے کے ماہ سرما کی قیام گاہ میں منتقل ہوا اور عوام کے لیے اسے ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا آزاد، نے یکم فروری 1953 کو ان الفاظ کے ساتھ کھول دیا "مجھے بڑی مسرت ہے کہ (اس) کتب خانہ کے دروازہ کو ان تمام لوگوں کے لیے جو اس سے استفادہ کے خواہشمند ہیں کھولنے کی سعادت آج مجھے مل رہی ہے جس پر 48 سال قبل اس کے دروازے بند کردیے گئے تھے۔" قومی کتب خانہ کو جناب بی ایس کیسون جیسا مخلص لائبریرین ملا۔ 1963 میں وظیفہ یاب ہونے کے بعد انھیں دوبارہ 1970 میں بلایا گیا اور 1971 میں ان کے دوبارہ سبکدوش ہونے پر لائبریرین کا عہدہ ختم کرکے ڈائریکٹر کا عہدہ قائم کیا گیا اور پروفیسر آر کے داس گپتا پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اب کتب خانہ کا ناظم اعلیٰ ایک ڈائریکٹر ہوتا ہے جو کتب خانہ کے انتظام و انصرام کا کام اپنے اسٹاف کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ قومی کتب خانہ مرکزی عمارت، متصل توسیعی عمارت، پرساشن بھون اور لیباریٹری کی عمارتوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ قدیم اخبارات کے مطالعہ کے لیے ایک دارالمطالعہ اسپلینڈ روڈ پر بھی ہے۔ ایک نئی توسیع بھاشہ بھون کے نام سے زیر تعمیر ہے۔ کتب خانہ میں کارکنوں کی منظور شدہ تعداد 790 ہے۔ 18 سال سے زیادہ عمر کا کوئی بھی ہندستانی شہری اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ مرکزی دارالمطالعہ میں 320 قارئین کے لیے بیٹھنے کی سہولت ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شعبہ جات میں الگ الگ مطالعہ کی سہولتیں ہیں۔ مجموعی طور پر کتب خانہ میں 574 افراد کے بیٹھنے کا بندوبست ہے۔ کتب خانہ تین قومی چھٹیوں کے علاوہ پورے سال کھلا رہتا ہے۔ ممبرشپ کے لیے عمر قید کے پیش نظر بچوں کے لیے ایک علاحدہ شعبہ ہے جس میں 6 سال سے 14 سال تک کے بچے ممبر بن سکتے ہیں۔

ذخیرہ کتب: کتب خانہ میں کتابوں کی مجموعی تعداد 20 لاکھ سے تجاوز کرچکی ہے۔ اس میں ہندستان کی مختلف زبانوں کی کتابیں 4 لاکھ سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

زیادہ ہیں۔ اسی طرح ہندستان کی مرکزی و ریاستی حکومتوں کی مطبوعات کی تعداد بھی 4 لاکھ سے زیادہ ہے۔ 78 ہزار نقشے اور تین ہزار سے زائد مخطوطات ہیں۔ 1954 کے جمع کتب قانون (Delivery of Book Act) (ترمیم 1956) کے تحت ملک کے سرکاری اور نجی ناشرین کتب و رسائل و اخبارات کو اس کتب خانہ کو اپنی ہر کتاب کی ایک جلد (ہر اخبار و رسائل کا ایک شمارہ) کتب خانہ کو بھیجنا لازم ہے۔ اس قانون کے تحت کتب خانہ کو اوسطاً سال میں 18000 کتابیں موصول ہوتی ہیں۔ یہ کتابیں بنیاد ہیں جن کو درج کرکے سنٹرل ریفرنس لائبریری "ہندستانی قومی کتابیات" تیار کرتی ہے۔

کتابوں کی تعداد سے اہم یہاں موجود وہ نادر و کمیاب مطبوعات ہیں جو مختلف ذاتی ذخیروں کے عطیات کی بدولت یہاں جمع ہوگئیں ہیں۔ ان میں چھ ہزار سے زائد فورٹ ولیم کالج کی کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ بوہار ذخیرہ جو بردوان سے میر جملہ کے میر منشی، منشی صدرالدین کے کتب خانہ سے موصول ہوا، اسوتوش مکرجی ذخیرہ، سر جادوناتھ سرکار ذخیرہ، دیاپوری پلے ذخیرہ اور امام باڑہ ذخیرہ قابل ذکر ہیں۔ بوہار اور جادو ناتھ سرکار ذخیرہ میں عربی و فارسی کے 1154 مخطوطات ہیں جبکہ دیاپوری پلے ذخیرہ میں تاڑ کے پتے پر لکھے ہوئے 370 مخطوطات ہیں۔ کتب خانہ میں اردو زبان کے 21 مخطوطے ہیں۔ اسوتوش مکرجی ذخیرہ میں موجود چند کتابیں اگر اپنی قدامت کی بدولت نادر ہیں (لاطینی زبان کی کتب مطبوعہ 1552 اور تامل زبان میں بائبل مطبوعہ 1723) تو دوسری اپنی ندرت جلد کے لیے (بائبل مطبوعہ 1809 کی جلد انبوس کی لکڑی سے بنی ہے اور کتاب کا ہر صفحہ سنہری نقاشی کا نمونہ ہے) "کلکتہ کے مناظر" نامی کتاب میں سر چارلس کی سنگی چھاپہ پر بنی تصویریں ہیں جبکہ تھومس ڈینیل کی کتاب "مشرقی مناظر" (Oriental Scenery) فن تصویر کشی کا نمونہ ہے۔ لندن میں 1570 میں شائع اقلیدس کی جیومیٹری کا پہلا انگریزی ترجمہ یا گوئٹے کے فاؤسٹ کا نسخہ جو تقریباً نصف میٹر کا ہے اور جس کی جلد "مرکو" سے بنی ہے اور ٹائٹل ابھرا ہوا جس پر سونے کا پانی ہے اور مخطوطات میں قرآن شریف کے نادر خطاطی کے نمونے، "خاورنامہ"، "عجائب المخلوقات" اور "تاریخ ہرات" قابل ذکر ہیں۔ کتب خانہ کے مصوری کے ذخیرے میں ابرک کے ورق پر بنی تصاویر اور چینی مصوری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

بیرونی ممالک سے ثقافتی لین دین کے تحت کتب خانہ میں 81 ملکوں کی سرکاری مطبوعات اور 205 اداروں کی مطبوعات آتی ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ اور اس سے منسلک نیز اس کے زیریں اداروں کی مطبوعات بھی کتب خانہ میں "برائے تحویل" آتی ہیں۔ کتب خانہ یونیسکو کے سالنامہ انڈکس ٹرانسلیشنم کے لیے ہندستانی تراجم کی فہرست فراہم کرتا ہے۔

تحفظی خدمات و مطبوعات: کتب خانہ مواد کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے نیز قدیم و بوسیدہ مواد کو نئی زندگی دینے کے لیے کتب خانہ میں شعبہ تحفظ، لیبارٹری اور عکسی نقل تیار کرنے کا شعبہ قائم ہے۔ کتب خانہ میں مرکزی طور پر ایرکنڈیشن کا بندوبست ہے۔

کتب خانہ سے استفادہ کی سہولت میں اضافہ کے پیش نظر مختلف اقسام کی فہرستیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں درج ذیل قابل ذکر ہیں :

ہندستانی موضوعات کی کتابیات (Bibliograpy of Indology)
فہرست بنگالی کتب رابندر ناتھ ٹیگور
فہرست فارسی مخطوطات بوہار ذخیرہ
ہندستانی زبانوں میں موجود لغات و دائرۃ المعارف کی فہرست
یورپین زبانوں میں مطبوعہ کتابوں کی فہرست
فہرست فارسی مخطوطات جے این سرکار ذخیرہ

جدیدکاری و خودکاری : کتب خانہ اپنے تکنیکی کاموں اور قارئین کی خدمات کے لیے جدید وسائل و درکار ساز و سامان فراہم کررہا ہے۔ کمپیوٹر کی سہولت موجود ہے کتب خانہ خریداری رسائل و کتب، کتابوں کی درجہ بندی و فہرست سازی وغیرہ کے لیے درکار ڈیٹابیس تیار کرچکا ہے اور کلیدی الفاظ کے ذریعہ مکمل متن ڈیٹابیس ترتیب دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

قومی معلوماتی مرکز (نیشنل انفارمیٹک سنٹر (National Informatic Centre)

: حکومت کی مختلف وزارتوں اور محکمہ جات کو ترقیاتی اور انتظامی پالیسیوں کے وضع کرنے اور ملک یا علاقے کو درپیش مسائل کے موثر حل کے لیے مختلف اقسام کی مقامی علاقائی یا ملکی سطح کی قابل بھروسہ معلومات کی ضرورت پڑتی ہے۔ 1975 میں حکومت ہند نے اس طرح کی معلومات بروقت تیز رفتاری کے ساتھ حاصل کرنے کے لیے قومی معلوماتی مرکز دہلی میں قائم کیا۔ مزید اس مرکز کے قیام سے ملک میں کمپیوٹر کلچر کا فروغ بھی مقصود تھا۔ قومی معلوماتی مرکز نے ایک

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

نظام معلومات تشکیل کیا ہے جس کا نام نِس نٹ (NICNET) نیشنل انفارمیشن سینٹر نٹ ورک ہے اس مرکز کے علاقائی دفاتر پونے، حیدر آباد، بھوبنیشور اور دہلی میں ہیں۔ اس مرکز کے ذریعہ سٹیلائٹ کے ذریعہ پورے ملک میں درج ذیل معلوماتی خدمات فراہم کی جارہی ہیں۔

انٹرنٹ گزرگاہ (Gateway to Internet): امریکہ کی برق رفتار ایجنسی اسپرنٹ نٹ (Sprint Net) کے واسطے سے نِس نٹ دنیا کے 160 ملکوں میں موجود 200 عالمی نٹ ورک یا نظام کمپیوٹر سے تعلق پیدا کرکے معلومات حاصل کی جاسکتی ہے۔

ای میل کی سہولت جس سے پورے نِس نٹ نظام میں کہیں بھی پیغام بھیجا جاسکتا ہے اور ذخیرہ ڈیٹا سے درکار معلوماتی وسائل کی نشاندہی اور حسب ضرورت نقل حاصل کی جاسکتی ہے۔

معلومات دسترس راہ نما (Information Server Navigator): انٹرنٹ ایک بہت بڑا نظام معلوماتی ذخیرہ ڈیٹا ہے اور اس میں ہر ماہ 1000 نئے ذرائع معلومات شامل ہوتے جاتے ہیں۔ اس نظام سے اپنی ضرورت کی معلومات کے وسائل تک پہنچنے کا کام پیچیدہ ہے۔ نِس نٹ کی بدولت اس رہنما کے ذریعہ دسترس آسان ہوجاتی ہے۔

کثیرالابلاغ ویڈیو کانفرنس سہولت (Multimedia Video Conferencing): نِس نٹ مختلف شہروں میں موجود افراد سے رابطہ قائم کرنے کی سہولت فراہم کرکے کسی ایک مقام پر جمع ہوئے بغیر تبادلہ خیال مع کانفرنس کی جملہ لوازمات کی سہولت مہیا کردیتا ہے۔ فی الحال یہ سہولت دہلی، کلکتہ، بنگلور، پونا اور احمد آباد شہروں میں دستیاب ہے۔

عدالتی کارروائی سی ڈی روم: 1992 سے ملک کے جملہ ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں زیر غور مقدمات کی تفصیل حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے اور فیصل مقدمات کی تفصیل بھی دستیاب ہے۔

کتابیاتی معلوماتی خدمات (Bibliographic Informatic Service): نِس نٹ کی مدد سے ملک کے 120 سے زائد صحت کے اداروں کو میڈلار ذخیرہ ڈیٹا (Medlar Data Base) تک دسترس ممکن ہوگئی ہے۔ میڈلار طبی میدان میں تحقیق کی تازہ ترین پیش رفت پر مضامین کی فہرست و تلخیص فراہم کرنے کا نہایت برق رفتار کتابیاتی رسالہ ہے جو برقی رو (On Line) پر دستیاب ہے۔ اس کی بدولت علاج میں سہولت ہوجاتی ہے۔

معلومات عامہ فراہمی میقات (General Information Service Terminal): ملک کے بارے میں عوام کو عام جانکاری دینے کی غرض سے یہ خدمت شروع کی گئی ہے۔ اس کے ذریعہ لوگوں کو ملک کے ترقیاتی منصوبوں اور پراجیکٹس سے واقف کرانے کے ساتھ عام نوعیت کی معلومات مثلاً ڈاک نظام، تفریحی مقامات، ملکی معیشت، تعلیم، طبی سہولیات وغیرہ بھی دی جاتی ہیں۔

قیاس: یہ فقہ اسلامی کا چوتھا اصول و ماخذ ہے اس کے لغوی معنی تقدیر اندزہ لگانا اور مطابق و مساوی کرنا ہیں۔ فقہا کی اصطلاح میں علت و سبب کو دار و مدار بناکر دو مسئلوں میں سے جو حکم ایک مسئلہ کا ہو وہی حکم دوسرے مسئلہ کا قرار دینا قیاس کہلاتا ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ اصول کلیات دین اور نصوص شریعت محدود و متناہی ہیں لیکن ہر دور میں پیش آنے والے واقعات و حوادث اور مسائل گوناگوں اور لامحدود ہیں اس بنا پر اصول و کلیات اور تصریحی احکام کے مفہوم میں غور و فکر کرکے اور ان کی روح و حقیقت سے واقفیت حاصل کرکے اس حد تک اس کا دامن وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہر دور کے تقاضوں کو وہ اپنے اندر سمیٹ سکیں۔ قرآن حکیم نے اکثر تفقہ، تدبر اور تفصل کی دعوت دی ہے جو قیاس کے لیے بنیاد اور ثبوت ہے اس کے علاوہ احادیث اور صحابہ کے عمل سے بھی قیاس کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی لیے علماء اسلام میں بجز ایک قلیل جماعت کے سب ہی قیاس کے قائل ہیں۔

قیاس کا اصلی دار و مدار علت پر ہے پس جن مسائل میں کوئی نص صراحتہً وارد نہ ہو ان کو اسی طرح کے ایسے مسائل پر قیاس کیا جائے گا جن کے بارے میں نص وارد ہے۔ فقہاء کے نزدیک قیاس اسی وقت کیا جائے گا جب قرآن و سنت اجماع سے حکم ثابت نہ ہو جو قیاس کسی نص کے خلاف ہو وہ مردود قرار دیا جائے گا اسی سے ظن غالب کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس میں خطاء کا احتمال موجود رہتا ہے ۔ قیاس سے اونچے ماخذ و دلائل یعنی قرآن و حدیث اور اجماع نہ ہونے ہی کی صورت میں فقہا اس پر عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

قیمت کی حدبندی (Price Fixing): قیمت کی حد بندی اصطلاح سے مراد قیمت کو عمداً اس طرح مقرر کرنا ہے جو مسابقت میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

طلب و رسد کے خودکار اثر کے تحت متوازن سطح پر متعین ہونے والی قیمت سے مختلف ہو۔ اس سلسلہ میں ایک مقررہ قیمت (Administered Price) سے مراد وہ قیمت ہے جو عام طور پر جزوی اجارہ کی صورت میں پائی جاتی ہے جبکہ ایک فرم طلب کا کوئی خاص لحاظ کیے بغیر ایک خاص قیمت مقرر کرتا ہے جسے خریدار مان لیتے ہیں اور اس میں فرم اس وقت تک تبدیلی نہیں کرتا جب تک کہ اسے زیادہ آمدنی حاصل ہونے کی توقع نہ ہو۔ ایک ایسا فرم خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر بازار میں جملہ طلب کا ایک بڑا حصہ فراہم کرے تو وہ ایک خاص قیمت مقرر کرسکتا ہے اور دوسرے فرم اس کی پیروی کرتے ہیں۔ اس طرح ایک فرم کے قیمت مقرر کرنے کو قیمت کی رہبری (Price Leadership) کہا جاتا ہے۔

قیمت کی حد بندی کے سلسلہ میں قیمت پر کنٹرول (Price Control) اور راتب بندی (Rationing) کے تصورات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر بازار میں مسابقت کے تحت طلب میں اضافے یا رسد میں تخفیف کی وجہ سے قیمت کا توازن بہت ہی اونچی سطح پر پہنچ جانے کا امکان ہو اور اس کی وجہ سے سیاسی یا سماجی انصاف متاثر ہوں تو قیمت کا کنٹرول اور راتب بندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ جنگ جیسی ہنگامی حالت یا کسی شے کی رسد میں غیر معمولی قلت کے پیش نظر حکومت قیمت کو کم سطح پر مقرر کرتی ہے اور موجودہ مقدار رسد کی فراہمی کی نگرانی کرتی ہے اور مقدار رسد کو راتب بندی کے ذریعہ صارفین میں تقسیم کا انتظام کرتی ہے جس سے کم آمدنی والے بھی کم قیمت پر کچھ مقدار خرید سکتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ک

کابینی اور صدارتی حکومت (Cabinet and Presidential Government) : جمہوری مملکت میں کابینی اور صدارتی طرز حکومت کی دو شکلیں ہیں۔ ان دونوں کی بنیاد علی الترتیب مقننہ اور عاملہ کے اختیارات کے انضمام اور ان کی تفریق پر ہے۔ کابینی یا پارلیمانی نظام حکومت میں عاملہ (یعنی کابینہ) مقننہ (یعنی پارلیمنٹ) کی ایک کمیٹی یا کونسل ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے میں پیوست اور ایک دوسرے پر منحصر ہوتی ہیں۔ اس نظام میں کابینہ یا وزارت پارلیمنٹ کے عوامی یا نمائندوں میں اکثریت حاصل کرنے والی جماعت کے قائدین پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کابینہ اپنی کارکردگی کے لیے اجتماعی طور سے پارلیمانی اکثریت کے تئیں جواب دہ ہوتی ہے۔ برطانیہ اور دوسری پارلیمانی جمہوریتوں میں وزراء کے لیے پارلیمنٹ کا رکن ہونا ضروری ہے۔ کابینہ کی میعادکار متعین نہیں ہوتی بلکہ وہ پارلیمنٹ کے ایوان زیریں کا اعتماد حاصل رہنے تک برسراقتدار رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کابینہ کو ایوان زیریں کی اکثریت، عدم اعتماد کا ووٹ منظور کرکے برطرف کرسکتی ہے۔ وزارت میں وزیراعظم کو قائد اور نگراں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں اکثریتی پارٹی کا رہنما ہوتا ہے۔ دوسرے وزراء اسی کی مرضی سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ پارلیمانی نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ صدارتی نظام کے مقابلہ میں زیادہ جمہوری، زیادہ ذمہ دار اور زیادہ لچک دار ہوتا ہے۔ پارلیمانی نظام میں پارلیمنٹ، عاملہ اور رائے دہندگان کے درمیان ایک توازن قائم رہتا ہے۔ یہ تینوں مل کر موثر اور ذمہ دار حکومت کی ضمانت دیتے ہیں۔ وزارتی ذمہ داری کے اصول کے نتیجہ میں وزارت حزب اختلاف حکمراں پارٹی کے پس نشینوں اور پارلیمنٹ سے باہر رائے عامہ کا اثر قبول کرتی اور عوام کی ضروریات اور ان کی خواہشات کا فوری احساس کرتی ہے۔ جب کبھی مقننہ اور عاملہ کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے تو اسے یا تو وزارت کی برطرفی کرکے ورنہ ایوان کو تحلیل کرنے کے بعد نئے انتخابات کے ذریعہ فوراً رفع کردیا جاتا ہے۔ اس نظام حکومت کی دو بڑی خامیاں ہیں۔ اگر رائے دہندگان کی حمایت دو سے زاید سیاسی پارٹیوں میں منقسم ہو تو نتیجہ کثیر جماعتی نظام اور مخلوط یا کمزور وزارتوں کی شکل میں ظاہر ہے۔ قسم قسم کے گروہوں کے دباؤ کے تحت حکومت آزادانہ، جراتمندی اور ذمہ داری سے عوامی پالیسی کی تشکیل اور تکمیل کا کام نہیں کرسکتی۔ اکثر پارلیمانی اکثریتوں کے رد وبدل سے وزارتی بحران آتے رہتے ہیں اور حکومتوں کے جلد جلد بدلنے سے سیاسی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے اور انتظامی بے یقینی اور عوامی بے چینی بڑھتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندستان میں گزشتہ کئی برسوں سے مخلوط حکومتوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ دوسری جانب اگر حکمراں پارٹی کو قطعی اور غالب اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہو اور کوئی موثر حزب اختلاف نہ پائی جائے تو وزارت یا وزیراعظم کی آمریت کا خطرہ پیدا ہو جانے کا رجحان قوی ہو جاتا ہے۔ ان دونوں امکانات کے باوجود پارلیمانی حکومت عاملہ کی وحدت اور قانون ساز شاخ سے پورے تعاون اور تال میل کی ضمانت دیتی ہے اور پارلیمانی اکثریت کی حمایت حاصل ہونے پر مضبوط اور مستحکم حکومت فراہم کرتی ہے۔

صدارتی نظام حکومت میں عاملہ اپنی میعاد کے معاملہ میں دستوری طور پر مقننہ سے علاحدہ ہوتی ہے اور اس کے تئیں جواب دہ نہیں ہوتی۔ اس میں عاملہ کا سربراہ ایک متعینہ مدت کے لیے منتخب ہوجاتا ہے، جس کے دوران پارلیمنٹ اسے مواخذہ کی کارروائی کے بغیر، محض عدم اعتماد کے ووٹ سے برطرف نہیں کرسکتی۔ جہاں مقننہ سے علاحدہ اور آزاد ہونے کی بناء پر صدارتی عاملہ بہت مضبوط اور موثر ہوتی ہے وہیں ہمیشہ دونوں شاخوں میں ٹکراؤ کا خطرہ موجود رہتا ہے کیونکہ پالیسی اور قانون اور بجٹ کی منظوری مقننہ کے اختیار میں ہوتی ہے۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں تعطل اور اس کے نتیجہ میں عوام کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ نظام بے لوچ ہے کیونکہ

اگر پارلیمنٹ یا وزارت یا حکومت کا سربراہ ناپسندیدہ یا غیر موثر شخص ہو تو میعاد سے پہلے کسی کو بھی ہٹایا نہیں جاسکتا۔

کارٹل (Cartel): چند فرمیں مل کر یہ معاہدہ کرتی ہیں کہ وہ اپنی پیداوار کی ایسی قیمت مقرر کریں گی جو ان سب کے لیے قابل قبول ہوگی اور بعض اوقات ہر فرم کے لیے اصل کاری (Investment) اور پیداوار کا کوٹہ بھی مقرر کر لیا جاتا ہے۔ سب مل کر ایک دستاویز پر دستخط کرتے ہیں جس میں کارٹل کے اصول اور قاعدے درج ہوتے ہیں۔ ہر ایک پر اس کی پابندی قانوناً لازمی ہوتی ہے۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں جرمانہ دینا ہوتا ہے۔

کارٹل دراصل بنیادی طور پر ایک طرح کا گٹھ جوڑ ہے جسے ایک باقاعدہ شکل دی جاتی ہے۔ یہ ایک معمولی قسم کا معاہدہ نہیں ہے جس کے تحت قیمتوں کے بارے میں کوئی خاص پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ چند فرمیں مل کر کسی صنعت یا صنعتوں پر اجارہ داری قائم کرتی ہیں اور اس کے لیے پیداوار میں کمی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کارٹل سازی برطانیہ میں غیر قانونی ہے۔ امریکا میں بھی اس کی بعض سرگرمیوں پر پابندی ہے۔ پچھلی دو لڑائیوں کے درمیان جرمنی میں اسے قانونی حیثیت دی گئی تھی تاکہ آہستہ آہستہ پیداوار کو ایسی سطح تک پہنچا دیا جائے کہ بین الاقوامی تجارت میں مقابلہ کیا جاسکے۔

کارروائی روبرو حاکم فوج داری (Proceedings before a Magistrate): اگر حاکم فوج داری سماعت کنندہ جرم کارروائی کرنے کی کافی وجہ خیال کرے اور مقدمہ اس قسم کا ہو جس میں ابتداءً طلب نامہ (Summon) جاری ہونا چاہیے تو ملزم کی حاضری کے لیے طلب نامہ جاری کیا جائے گا اور اگر مقدمہ اس قسم کا ہو جس میں ابتداءً حکم نامہ گرفتاری (Warrant of Arrest) جاری ہونا چاہیے تو حکم نامہ جاری کیا جائے گا کہ ملزم اس کے روبرو تاریخ و وقت و مقام معینہ پر حاضر ہو یا حاضر کیا جائے۔ جب ملزم کی حاضری کے لیے طلب نامہ جاری کیا جائے تو حاکم فوج داری کافی وجوہ کی بنا پر ملزم کی اصالتاً حاضری معاف کرکے یہ اجازت دے سکے گا کہ وہ وکیل کے ذریعہ حاضر ہو اور ملزم جس کی حاضری کے لیے طلب نامہ جاری ہو پردہ نشین ہو تو لازم ہوگا کہ اس کو اصالتاً حاضری سے معاف کرکے وکیل کے ذریعہ پیروی کی اجازت دی جائے لیکن دوران کارروائی مقدمہ میں جس وقت حاکم فوج داری کو اس کی ضرورت معلوم ہوگی ملزم کو اصالتاً حاضر ہونے کا حکم دے سکے گا جب ملزم حاکم فوج داری کے روبرو حاضر ہو یا حاضر کیا جائے تو اس کی موجودگی میں مستغیث کا بیان لیا جائے گا اور ملزم کو وہ واقعات جن کی بنا پر اس پر الزام لگایا گیا ہو سمجھا کر دریافت کیا جائے گا کہ اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں اگر وہ ارتکاب جرم کا اقبال کرے تو اس کا اقبال جہاں تک ممکن ہو اس کے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ اگر مقدمہ قابل اجرا طلب نامہ ہو تو ملزم کی نسبت اس اقبال کی بنا پر تجویز صادر کی جائے گی۔ اگر ملزم جرم کا اقبال نہ کرے وہ ہر صورت میں جب مقدمہ قابل اجرا حکم نامہ ہو تو حاکم فوج داری تمام شہادت جو بر تائید الزام پیش ہو قلم بند کرے گا۔ اگر تمام شہادت سے اور ملزم سے بشرط ضرورت استفسار کرنے کے بعد حاکم فوج داری کی رائے میں ملزم کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ پایا جائے تو وہ اسے بری کردے گا اور اگر جرم ثابت ہو تو اس کے لحاظ سے فرد جرم مرتب کرے گا۔ جب فرد جرم مرتب ہوجائے تو وہ ملزم کو سنائی اور سمجھائی جائے گی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں اور ثبوت صفائی پیش کرنا چاہتا ہے یا نہیں اور ملزم کی درخواست پر فرد قرار داد جرم کی ایک نقل اس کو بلا اجرت دی جائے گی۔ اگر ملزم اس جرم کا اقبال کرے تو حاکم فوج داری اس کا اقبال جہاں تک ممکن ہو اس کے الفاظ میں قلم بند کرے گا جب ملزم اقبال کرے تو حاکم تحقیقات کنندہ اس کو مجرم قرار دے کر تجویز صادر کرے گا۔ اگر ملزم جرم کا اقبال نہ کرے یا جواب دینے سے انکار کرے یا جواب نہ دے تو اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ ان گواہوں پر جن کی گواہی الزام کی تائید میں ہے جرح کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ ایسی خواہش کرے تو گواہ یا گواہان مکرر طلب کیے جائیں گے اور ان سے سوالات جرح کیے جائیں گے اور حالات مکرر قلم بند کیے جائیں گے اس کے بعد ملزم اپنی صفائی کی شہادت پیش کرسکے گا اگر وہ کوئی تحریری بیان داخل کرے تو وہ بھی قبول کیا جائے گا۔ اگر ملزم اپنی صفائی میں کسی گواہ کو اظہار یا کسی دستاویز یا شے کو طلب کرے تو حاکم فوج داری ان کی طلبی کا حکم جاری کرے گا بجز اس کے کہ اس کی رائے میں ایسی درخواست مقدمے کو طوالت دینے کی غرض سے یا انصاف میں خلل ڈالنے کی غرض سے کی گئی ہو۔ جب ایسی درخواست نامنظور ہو تو نامنظوری کے وجوہ قلم بند کیے جائیں گے۔ اگر کسی مقدمہ میں فرد قرارداد جرم مرتب کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گئی ہو اور حاکم فوج داری ملزم کو بے گناہ تجویز کرے تو اس کی برأت کا حکم دے گا اور اگر اسے مجرم تجویز کرے تو حسب قانون سزا صادر کرے گا۔ حاکم فوج داری احکام ضمانت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تا تجویز حراست میں رکھنے کے لیے حکم صادر کرے گا۔ فرد جرم میں حسب ذیل امور درج کیے جائیں گے۔

(1) وہ جرم لکھا جائے گا جس کا الزام ملزم پر لگایا جائے۔

(2) اگر قانون تعزیرات میں اس جرم کا کوئی خاص نام مقرر ہوا ہو تو وہ نام درج کیا جاسکے گا۔

(3) قانون اور قانون کی اس دفعہ کا حوالہ درج کیا جائے گا جس کی رو سے ملزم کا فعل جرم قرار پائے۔

(4) اگر ملزم نے سابق میں کسی جرم میں سزا پائی ہو اور ایسی سزا یابی کا ثابت کرنا اس غرض سے مقصود ہو کہ اس کا اثر سزا پر پڑے جو عدالت دینے کی مجاز ہو تو سزایابی سابق کا حال قید کی مدت تاریخ اور مقام فرد جرم میں درج کیا جائے گا۔

قانونی طور پر فرد قرارداد جرم کے مرتب کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر شرط قانون جو اس جرم کے واقع ہونے کے لیے ضروری ہو اور جس کا الزام لگایا گیا ہے اس مقدمے میں پوری ہوگئی ہو۔ فرد جرم میں فیصلہ سنانے سے قبل عدالت تبدیلی یا اضافہ کرسکے گی۔

ہر شخص کو جس پر کسی عدالت فوج داری میں کوئی الزام لگایا گیا ہے یہ حق حاصل ہوگا کہ وکیل کے ذریعہ جواب دہی کرے۔

ہر گواہ کا بیان جیسے جیسے وہ بیان کرتا جائے عدالت کی زبان میں حاکم عدالت بطور بیان مسلسل خود اپنے قلم سے لکھے گا اور اگر گواہ کو بالمواجہ فریقین برسر اجلاس بیٹھ کر سنائے گا اور اس پر اس کی دستخط لے کر اپنی دستخط کرے گا اور اس کے نیچے یہ یادداشت درج کرے گا کہ بیان سن کر گواہ نے اس کی تصدیق کی گواہ کو اس کا بیان پڑھ کر سنانا ہو اگر حاکم فوج داری کو یہ معلوم ہو کہ اس کے لکھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو یا گواہ کسی امر کی نسبت بیان کرے کہ وہ صحیح طور پر نہیں لکھا گیا تو حاکم عدالت اس بیان کی اصلاح ایک یادداشت کے ذریعہ جس پر گواہ کے دستخط لیے جائیں گے کردے گا۔ جب شہادت ایسی زبان میں ادا کی جائے اس وقت لی جائے۔ جب کہ ملزم اس وقت اصالتاً حاضر نہ ہو اور ملزم وہ زبان نہ سمجھتا ہو تو اس کا پورا پورا ترجمہ کسی ایسی زبان میں جس کو وہ سمجھتا ہو سنایا جائے گا۔ البتہ جب کوئی دستاویز کسی مسلمہ یا مشتبہ امر کے متعلق بغرض شہادت پیش کی جائے تو عدالت کو اختیار ہوگا کہ اس سے صرف اسی قدر ترجمہ کرائے جو ضروری معلوم ہوں۔ جب کسی مقدمے یا کارروائی میں حاکم فوج داری کو یہ معلوم ہو کہ کسی گواہ کا بیان انصاف رسانی کے لیے ضروری ہے اگر وہ حاضر عدالت نہیں ہوسکتا یا پردہ نشیں خاتون ہو تو عدالت اس گواہ کی شہادت قلم بند کرنے کے لیے کمیشن جاری کرے گی۔

کارل ماؤن ہائم (Karal Maunheim, 1893-1947):

کارل ماؤن ہائم جرمن سماجیات داں گزرا ہے جس نے برلن بڈاپسٹ، پیرس، فرائبرگ اور ہائیڈلبرگ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ اس زمانہ میں ہائیڈلبرگ مشہور جرمن دانشوروں کا مرکز تھا۔ اور میکس ویبر ماننے والوں کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ 1930 سے1933 تک ماؤن ہائم فرینکفورٹ یونیورسٹی میں سماجیات کا پروفیسر رہا۔ لیکن 1933 کی سیاسی تبدیلیوں کے بعد اسے جرمنی سے فرار ہونا پڑا۔ اس کے بعد لندن یونیورسٹی میں 1933 سے 1945 تک سماجیات کا لکچرر رہا۔ 1945 سے بعد کا زمانہ اس نے اسی یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں گزارا جہاں وہ سماجیات اور فلسفہ تعلیم کا پروفیسر تھا۔ کارل ماؤن ہائم کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ جرمنی میں قیام کا ہے اور دوسرا حصہ قیام انگلستان کا۔ اتفاق سے یہ دونوں تاریخی ادوار اس کی ذہنی اور تخلیقی تبدیلیوں سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ یعنی پہلے دور میں کارل ماؤن ہائم سماجیاتِ علم (Sociology of Knowledge) پر کام کرتا رہا۔ اس کی سماجیاتِ علم کی فکر پر جرمن آئیڈیلزم کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ کارل مارکس اور ٹونیز نے تحقیقاتی تصادم اور طبقاتی مفادات یا باہمی اعتماد کی اہمیت پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھی تھی لیکن مین ہائم نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ محض طبقاتی یا مفاداتی اختلافات ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر لوگوں کے انداز فکر پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہی انداز فکر بعد میں پیدا ہونے والے اختلافات کی بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح ماؤن ہائم نے علم اور فکر کے تجزیہ اور تحقیق پر زیادہ زور دیا۔ چنانچہ اپنی کتاب آئیڈیالوجی اینڈ یوٹوپیا میں اس کا مضمون سماجیاتِ علم (Wissenssoziologie) اس کے نقطہ نظر کی تفصیلی تشریح ہے۔ اسی طرح کارل ماؤن ہائم کی کتاب "انسان اور سماج" (Man and Society)

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

بھی اس کے اسی انداز فکر کی ترجمان ہے۔ انگلستان منتقل ہونے کے بعد کارل مانہائم کی فکر میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس نے سماجیات علم کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کارل مانہائم وسیعی سماجیات (Macro-Sociology) اور اختصار آمیز سماجیات (Micro- Sociology) کی اصطلاحات کے حوالے سے سوچنے لگا۔ لیکن اپنے تمام مباحث میں کارل مین ہائم اپنی تخلیق کردہ عام سماج (Mass Society) کی وسیع اصطلاح اور تصور کو ترک نہیں کرسکا۔ یعنی اس کا جامع سماجیات علم کا تصور اس کے ذہن پر ہمیشہ حاوی رہا۔ کچھ بھی ہو کارل مین ہائم کو اہم سماجیاتی موضوعات کا غیر معمولی ادارک حاصل تھا۔

کارندگی (Agency): قانونی اعتبار سے لفظ کارندگی (Agency) ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اور اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو اصل (Principal) اور اس کے مامور کردہ کارندے (Agent) میں ہوتا ہے مثال کے طور پر کوئی معاہدہ کرنے کسی کام کے انجام دینے یا جائداد کے فروخت کرنے یا مختار (Power of Attorney) کی صورت میں ہر وہ اختیار استعمال کرنے کا مجاز ہوجاتا ہے جو اپنی جائداد پر اصل (Principal) کو حاصل ہیں۔

کاروبار کا آغاز: ایک پبلک کمپنی اس وقت تک کاروبار کا آغاز نہیں کرسکتی جب تک اسے کاروبار آغاز کرنے کا سرٹیفکیٹ نہ ملے جو چند شرائط کی تکمیل کے بعد دیا جاتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ عدالت کسی کمپنی کو ختم کردینے یا تحلیل کردینے کا حکم دے سکتی ہے اگر کمپنی رجسٹریشن کی تاریخ سے ایک سال کے اندر کاروبار کا آغاز نہ کرے۔

کافر: کفر سے مشتق ہے اس کے لفظی معنی چھپانا اور انکار کرنا ہے۔ اس لیے کافر چھپانے والے اور انکار کرنے والے کو کہیں گے۔ کاشتکار کو کافر کہنے کی یہی وجہ ہے کہ وہ زمین میں بیج کو چھپاتا ہے۔ سمندر کو کافر اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی گہرائی میں تاریکی کی وجہ سے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ ناشکری کرنے والا اس بنا پر کافر کہلاتا ہے کہ وہ اپنے محسن کا شکر نہیں ادا کرتا اور اس کی نعمت اور احسان کو چھپاتا ہے اسلامی اصطلاح میں کافر وہ شخص کہلاتا ہے جو ضروریات دین اور شریعت کے منصوص قطعی احکام کا منکر ہو۔ اسلامی عقائد، فرائض دین اور اوامر شریعت کو جھٹلاتا اور نہ مانتا ہو۔ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری اور اس کی نشانیوں کی تکذیب کرتا ہو۔ مشرک کی طرح کافر کی بھی بخشش نہیں ہوگی۔ کفر سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کافر دل سے توبہ کرکے اسلام کے عقائد کو تسلیم کرے۔

کامن ویلتھ ترجیح (Commonwealth Preference):
برطانیہ کے 1919 اور 1957 کے مالیات کے قوانین اور 1932 اور 1958 کے درآمدی محاصل کے قوانین کے تحت بے شمار ضمنی قوانین بنائے گئے ہیں جن کے تحت برطانیہ میں بعض درآمدی اشیا کے لیے کسٹم کی شرح یا تو گھٹا دی گئی ہے یا اس کو بالکلیہ طور پر ختم کردیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ شے مکمل طور پر کامن ویلتھ کے کسی ملک میں یا آئرلینڈ میں پیدا کی گئی ہو اور صنعتی پیداوار کی صورت میں کم از کم اس کا 25 فی صدی ان ملکوں میں تیار کیا گیا ہو۔ بعض صورتوں میں ان صنعتی اشیا کا 75 فی صدی کامن ویلتھ ملکوں میں تیار ہونا ضروری ہے۔ اس کے جواب میں کامن ویلتھ کے ممالک برطانیہ کے ساتھ بعض اوقات ترجیحی برتاؤ کرتے ہیں۔ اس قسم کا ترجیحی نظام 1932 میں اٹاوہ (Otava) میں طے کیا گیا تھا۔

ٹیرف اور تجارت کے عام معاہدہ کے تحت اس قسم کے ترجیحی معاہدوں کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد سے برطانیہ کی مجموعی تجارت میں کامن ویلتھ کا حصہ بہت کم رہ گیا ہے۔ یورپی ساجھا منڈی میں برطانیہ کی شرکت سے یہ ترجیح اور بھی ختم ہوگئی ہے۔ اس وقت کامن ویلتھ کے چند ملکوں کو جو خاص مراعات حاصل ہیں اس کے لیے برطانیہ کو ساجھا منڈی سے اس کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔

کامن ویلتھ و برطانوی سلطنت (Commonwealth British Empire): کامن ویلتھ آف نیشنز یا دولت مشترکہ اقوام برطانیہ شمالی آئرلینڈ اور برطانیہ کے بعض سابقہ مقبوضات اور نوآبادیات کے اتحاد کا نام ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق جب یہ 1931 میں قائم ہوئی تو اس وقت اس کے ممبر برطانیہ کے علاوہ آئرلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور یونین آف ساؤتھ افریقہ تھے۔ یعنی یہ برطانیہ اور اس کی سفید فام نوآبادیوں پر مشتمل تھی۔ اس وقت اس کا نام برطانوی کامن ویلتھ آف نیشنز تھا۔ 1947 میں جب ہندستان آزاد ہوا اور دو ملکوں ہندستان اور پاکستان میں بٹ گیا تو یہ دونوں ملک کامن ویلتھ کے ممبر بنے اور اس کے بعد برطانوی نوآبادیات کے ملک جیسے جیسے آزاد ہوتے گئے اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں شریک ہوتے گئے۔ اس کے نام میں سے لفظ برطانوی نکل گیا اور صرف کامن ویلتھ آف نیشنز باقی رہ گیا۔ اس طرح اس کی ہیئت بھی کافی بدل گئی۔

کامن ویلتھ کی تاریخ برطانوی سلطنت کی تاریخ سے گہرے طور پر مربوط ہوئی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سلطنت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی جو تمام براعظموں کے ایک کروڑ 60 لاکھ مربع میل رقبہ اور 50 کروڑ سے زیادہ آبادی پر پھیلی ہوئی تھی۔

برطانوی سلطنت کی بنیاد سولہویں صدی عیسوی میں پڑی۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ جب صنعتی اشیاء پیدا ہونے لگیں تو انگلستان کو ان کے لیے منڈیوں اور خام مال کی ضرورت پیش آئی۔ نئی نئی تجارتی کمپنیاں قائم ہونے لگیں جنھیں خاص علاقوں میں نہ صرف تجارت کی اجارہ داری ملی بلکہ کچھ سیاسی اختیارات بھی حاصل ہوئے۔ شروع میں یہ ان مقامات پر اپنی تجارت کی حفاظت کے لیے قلعہ بندیاں کرنے لگیں اور اگر مقامی حکومت کمزور ہوتی تو اطراف کے علاقوں میں پھیلنا شروع کردیتیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستان میں اسی طرح قدم جمائے تھے۔ مسالے، کافی اور چائے کی تجارت کی غرض سے اس نے مشرقی اور مغربی سواحل پر قلعہ بندیاں کیں اور پھر آہستہ آہستہ کمزور حکومتوں کا تختہ الٹنے لگی۔ انھیں آپس میں لڑاتی رہی اور اس طرح سارے ہندستان پر چھا گئی۔ یہی طریقہ اس نے افریقہ، مشرقی بعید اور جنوب مشرقی ایشیا میں اختیار کیا۔ اسی کی طرح فرانسیسیوں، پرتگالیوں اور ڈچوں وغیرہ نے بھی مختلف علاقوں میں سلطنتیں قائم کیں۔

17 ویں صدی میں تمباکو اور شکر کی مانگ بہت بڑھ گئی اور اس کی وجہ سے نیشکر اور تمباکو کی کاشت جزائر کیریبین اور شمالی امریکا کے جنوب مشرقی حصہ میں کافی بڑھ گئی چنانچہ اس علاقہ اور شمالی امریکا کے شمال مشرقی علاقوں میں یورپی باشندوں کی آبادکاری تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ چونکہ یہ نوآبادیات مختلف کمپنیوں کی طرف سے قائم کی جارہی تھیں اس لیے یہاں برطانیہ کے نمونہ پر نظم و نسق بھی قائم ہونے لگا۔ ان نوآبادیات میں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت بڑھنے لگی۔ چنانچہ افریقہ سے غلاموں کی درآمد اور ان کی تجارت میں بھی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا اور اس کے لیے افریقہ کے ساحل پر بھی کمپنیاں قائم ہونے لگیں اور پھر ان کمپنیوں نے افریقہ کے اندرونی علاقوں میں پھیلنا اور ان پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ دولت کی اس دوڑ میں انگریز اکیلے نہیں تھے اس میں ہسپانوی، پرتگالی، فرانسیسی، ڈچ سب ہی شامل تھے۔

سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل تک ڈچ اور ہسپانوی سلطنت کمزور ہونا شروع ہوچکی تھی اور ان کے علاقوں پر انگریز قابض ہونے لگے تھے۔ اسی کے ساتھ ہندستان کینیڈا اور افریقہ میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان مسابقت اور کشمکش شروع ہوچکی تھی۔ چنانچہ اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے اب کمپنیوں کی جگہ اپنا راست اقتدار قائم کرنا شروع کیا۔ چنانچہ 1680 میں برطانیہ، امریکا اور ویسٹ انڈیز میں اس قسم کا اقدام کیا اور بادشاہ کی طرف سے گورنر مقرر کیے جس کی وجہ سے ان نوآبادیات کے منتخب نمائندوں اور گورنروں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ بعد ازاں برطانوی پارلیمنٹ نے افریقہ اور مشرق میں تجارتی کمپنیوں کی اجارہ داری ختم کردی۔ 1857 کے بعد ہندستان کا اقتدار پوری طرح برطانوی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن یہ پالیسی امریکا میں کامیاب نہ ہوسکی۔ وہاں کی جنگ آزادی کی کامیابی کے بعد امریکا کی نوآبادی برطانوی سلطنت کے ہاتھوں سے نکل گئی اور اس طرح امریکا برطانیہ کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اس کی سلطنت ہندستان جنوب و جنوب مشرقی ایشیا اور پھر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں پھیلتی گئی۔ برطانیہ کے ہاتھوں نپولین کی شکست کے بعد بہت سارے فرانسیسی مقبوضات بھی برطانیہ کے ہاتھ لگے۔

انیسویں صدی کے آغاز تک برطانیہ صرف ایک تجارتی ملک نہیں رہ گیا بلکہ صنعتی ملک بھی بن چکا تھا۔ اب چند کمپنیوں کی تجارتی اجارہ داری کی سخت مخالفت ہونے لگی اور آزاد تجارت (Free Trade) کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ فرانسیسی انقلاب کے اثر سے روشن خیال طبقوں میں نوآبادیات کے مقامی باشندوں کی بدحالی کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی۔ ساتھ ہی بڑھتی ہوئی آزاد تجارت کے لیے اور اقتدار کو مضبوط بنانے کی غرض سے یہ ضروری تھا کہ ان نوآبادیات میں نقل و حمل اور رسل و رسائل کے وسیلے وسیع کیے جاتے۔ چنانچہ غلاموں کی تجارت کے خاتمہ کے ساتھ ان علاقوں میں سڑکیں، ریلیں، تار وغیرہ کی سہولتیں مہیا کرنے کے کام بھی شروع کیے گئے۔ نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے سول سروس قائم کی گئی اور آہستہ آہستہ نظم و نسق میں مقامی باشندوں کو بھی لیا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

جانے لگا۔

1914 میں جب پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی تو برطانوی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی لیکن اس کے ساتھ اس کے زوال کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ ان مقبوضات اور نوآبادیوں میں آزادی و خود مختاری اور اس کے اتحادیوں کی فتح ہوئی اور ترکی سے عراق و فلسطین اور افریقہ میں جرمن نوآبادیوں پر برطانیہ کو تولیت حاصل ہوئی لیکن اس کے باوجود ہندستان اور دوسرے مقبوضہ علاقوں میں آزادی کی تحریکوں نے عوامی شکل اختیار کرلی۔ مقبوضہ ملکوں میں نہ صرف معاشی اور سیاسی مسائل پر ہیجان بڑھنے لگا بلکہ مقامی آبادی کے خلاف سفید فاموں کے برتاؤ پر بھی غصہ کی آگ بھڑکنے لگی۔ جنگ کے دوران برطانیہ پر زبردست معاشی دباؤ پڑا تھا اور اب اس کے لیے ہر محاذ پر آزادی کی لڑائیوں کا سامنا آسان نہیں تھا چنانچہ سب سے پہلے اس نے مصر پر سے اپنا کنٹرول ہٹایا اور صرف نہر سویز پر قبضہ باقی رکھا۔ عراق کی آزادی کو تسلیم کیا۔ ہندستان کو اندرونی معاملات میں کچھ اختیارات دیے اور وہ نوآبادیاں جہاں سفید فام حکمراں تھے مثلاً آسٹریلیا، کنیڈا، نیوزی لینڈ وغیرہ نے ان کی آزادی تسلیم کرلی اور 1931 میں برطانیہ کے ساتھ ان آزاد ملکوں کی ایک برطانوی کامن ویلتھ وجود میں آئی۔ شاہِ انگلستان اس کا سربراہ رہا لیکن تمام ممبروں کو آپس میں مساوی تسلیم کرلیا گیا۔

دوسری عالم گیر جنگ میں ایک طرف تو برطانیہ مالی اور فوجی اعتبار سے بہت کمزور ہو گیا اور دوسری طرف نوآبادیات اور کالونیوں میں آزادی کی جنگ انتہائی بلندی پر پہنچ گئی۔ انگلستان نے ہر جگہ اپنا اقتدار باقی رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہو سکی اور آزادی دینی پڑی۔ جنگ کے بعد فلسطین پر سے تولیت ختم ہوئی۔ ہندستان آزاد ہوا اور ہندستان اور پاکستان دونوں نے کامن ویلتھ کا ممبر بننا قبول کیا۔ لیکن ملک معظم برطانیہ اس کے صدر باقی رہے۔

کامن ویلتھ کو اس طرح باقی رکھنے کی خواہش دو طرفہ تھی۔ برطانیہ کے پچھلے تمام مقبوضات میں برطانوی سرمایہ داروں کا بہت بڑا سرمایہ، باغات، زراعت اور صنعتوں وغیرہ میں لگا ہوا تھا اور اس کی حفاظت کی اسے ہمیشہ فکر رہا کرتی تھی۔ دوسرے برطانیہ کے لیے خوراک صنعتوں کے لیے خام مال بھی یہاں سے جاتا تھا۔ اسی لیے وہ کامن ویلتھ ملکوں کی وقتاً فوقتاً مدد کرتا رہتا تھا۔ اس میں اکثر سابق محکوم ملکوں کا بھی فائدہ تھا اس لیے کہ ان کے خام مال کی برآمدات کا راستہ کھلا رہا اور ساتھ ہی مقابلتاً پس ماندہ ملکوں کی ترقی کے لیے برطانیہ کی مدد مفید ثابت ہوئی۔

کتاب الاثار: یہ ان احادیث و آثار کا مجموعہ ہے جن کی حیثیت حنفی مسلک کے ماخذ کی ہے۔ اس کی اکثر روایتیں امام ابو حنیفہ کے واسطہ سے ہیں۔ یہ ایک ہزار سے زیادہ احادیث و آثار پر مشتمل ہے۔ اس کے راوی امام ابو یوسف کے صاحبزادے یوسف ہیں اور یہ لجنتہ المعارف النعمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوچکی ہے۔

کتاب الام: یہ امام شافعی کی سب سے اہم اور فقہ اسلامی کی عظیم الشان کتاب ہے۔ امام صاحب کے اجتہادات، افکار و خیالات، مسائل پر انداز بحث اور معتقدات کو پیش کرنے کے طریقے اور اصول فقہ کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس میں کلی مسائل کے لیے احکام فرعیہ بھی موجود ہیں۔ کتاب نہایت فصیح و بلیغ انداز بیان اور موثر و دل نشیں پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ یہ دراصل ان تصانیف پر مشتمل ہے جن کا ذکر بیہقی نے جداگانہ کتابوں کے طور پر کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مسائل پر ان کے مختصر افکار تو کتاب الام میں آگئے ہوں لیکن مفصل معلومات الگ کتابوں میں مندرج ہوں۔ امام کے شاگرد بویطی اس کے جامع تھے۔ ابواب کی ترتیب ان کے دوسرے شاگرد ربیع بن سلیمان مرادی نے کی تھی۔ یہ بڑی ضخیم کتاب پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مصر سے پوری کتاب سات جلدوں میں چھپ گئی ہے۔

کتاب الاموال: ابو عبید قاسم بن سلام متوفی 224ھ/ 939ء کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ ابو عبید اسلامی علوم کے ممتاز ماہر اور ادب و عربیت کے امام کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ اس کتاب میں ان اموال کا ذکر ہے جو اسلامی حکومت کی تحویل (بیت المال) میں ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا مالیاتی نظام، جس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ نے رکھی تھی اور جو خلفائے راشدین کے عہد میں بتدریج ترقی کی منازل طے کرتا رہا اور پھر اسلامی دور کی ابتدائی دو صدیوں میں اسے جن تغیرات کا سامنا کرنا پڑا یہی کتاب الاموال کا موضوع ہے۔ مصنف نے مختلف عنوانات کے تحت آیات و احادیث خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیصلے نیز دوسرے صحابہ و تابعین کے فتوے اور ائمہ کے اقوال ذکر کرکے ان کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

منشا کی وضاحت کی ہے۔ اکثر مسائل پر بڑی عالمانہ و محققانہ بحث کی گئی ہے۔

گو اس کی روایات و احادیث قوت و استناد کے لحاظ سے کم درجہ کی ہیں لیکن چونکہ اصلاً اس میں اعمال و سنت نبوی اور صحابہ و تابعین کے طرز عمل اور مسلک کا ذکر ہے جن کی تائید حدیث کی دوسری کتابوں کی روایتوں سے ہوجاتی ہے اس لیے نفس کتاب کے مستند ہونے میں کلام نہیں۔

حدیث کے علاوہ فقہی و اجتہادی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے کیونہ مصنف نے صحابہ، تابعین، محدثین و فقہا کے اقوال و فتاوی اور دلائل ذکر کرکے ان پر تنقید و محاکمہ بھی کیا اور اپنی ترجیح کو دلائل کے ساتھ بیان کیا۔ آیات سے استدلال کے سلسلہ میں تفسیری مباحث و نکات پر بھی گفتگو ہے۔ آیتوں کی تشریح میں حدیثوں اور حدیثوں کی تشریح میں صحابہ کے بیان کردہ مفہوم پر اعتماد کیا ہے۔ یہ کتاب پہلے مصر سے چھپی تھی پاکستان میں اردو ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔

کتاب الحجہ علی اھل المدینہ: اس میں امام مالک اور دوسرے علمائے مدینہ کے مقابلہ میں امام ابو حنیفہ اور اہل عراق کے مسلک کی ترجیح دلائل کے ساتھ ثابت کی ہے۔ یہ بڑی اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو چند سال قبل دائرہ المعارف حیدرآباد سے مفتی مہدی حسن مرحوم کے مفید اور محققانہ حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

کتاب الخراج: یہ امام ابو یوسف کی سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس موضوع پر متعدد علما نے کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ان خصوصیات کی حامل نہیں ہے جن کی امام ابو یوسف کی کتاب حامل ہے۔ اس میں اسلامی مالیات اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے متعلق امور پر بحث ہے۔ یہ صرف موضوع سے متعلق قرآنی آیات، احادیث و آثار اور اقوال تابعین ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں ان کے معانی کی تشریح و تعین اور اس سلسلہ میں عربی زبان کے شواہد اور استعمالات بھی ذکر کیے ہیں۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنفین نے حکومت اور عامہ مسلمین کی نئی نئی ضرورتوں اور مشکلات کا قرآن و حدیث اور آثار ہی کی روشنی میں اجتہاد کرکے حل پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ہارون رشید کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ لیکن اس کے مقدمہ میں اس کو جو نصیحتیں کی گئی ہیں ان سے امام ابو یوسف کی حق گوئی اور جرات کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے یہ کتاب متعدد بار چھپی ہے اور اس کے فرانسیسی، روسی، ترکی اور اردو ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔

کتابیات (Bibliography) : مطبوعات میں روزافزوں اضافہ کی بدولت ایک دانشور کے لیے کسی مضمون پر یا اس کے ذیلی موضوعات پر موجود کتابی مواد کی جانکاری ناممکن ہوچکی ہے۔ کتابوں کے علاوہ رپورٹ، مقالے، سمعی وبصری مواد، تعلیمی و تفریحی وی ڈی آر سافٹ ویر پروگرام کی بدولت خزانہ علم میں اضافہ ایک مسلسل عمل ہے۔ علم کے اس توسیع پذیر خزانہ سے اپنے مطلوبہ مواد کی نشاندہی اور شناخت کے لیے کتابیات ایک لازمی ذریعہ بن چکی ہے۔ بقول کائنز ببلوگرافی کی بدولت علم کے انبار میں ایک نظم پیدا ہوتا ہے۔ کتابیات کی ایک سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ لفظ ببلوگرافی پہلی بار لوئی جیکب دی سینٹ چارلس نے اپنی کتاب (مطبوعہ 1645-46) ببلوگرافیاپیرسیانا (Bibliographia Parisiana) کے لیے استعمال کیا تھا۔ چونکہ ببلوگرافی کا لفظ یونانی زبان کے لفظ ببلیون (Biblion) اور گریفین (Graphien) سے مل کر بنا ہے، اس کے لغوی معنی ہیں کتاب لکھنا اور اپنے ابتدائی دور میں یہ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ بعد کے برسوں میں اس کے معنی بدلتے رہے کسی نے اسے کتاب کے قابل بھروسہ بیان کا ہنر یا سائنس قرار دیا جس کے تحت کتاب کی مادی ساخت اور اس کے علمی متن کو واضح کیا گیا ہو تو کسی نے کتابیات کو کتاب کے متن کے مختلف اشاعتوں میں بتدریج تبدیلی کے مطالعہ کا فن کہا ہے۔ کتاب کے مصنف، بار اشاعت اور مادی ساخت وغیرہ کے صحیح بیان کو بھی کتابیات کہا گیا ہے لیکن جو تعریف سب سے واضح اور زمانہ حال میں تسلیم شدہ ہے اس کے مطابق کتابیات کتابوں کی ایک فہرست ہے اور بس۔

کتابیات کو تین قسموں میں رکھا گیا ہے :

متعین یا منظم کتابیات (Systematic/ Enumerative Bibliography)

تجزیاتی کتابیات (Critical Bibliography)

تاریخی کتابیات (Historical Bibliograpy)

تاریخی کتابیات میں فہرست بناتے وقت خطاطی کے فن، طباعت اور تزئین کاری کے فن اور جلدسازی کے فن پر نظر ہوتی ہے۔ اس ضمن

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں کتاب بحیثیت ایک فنی شاہکار کے مطالعہ کی جاتی ہے جبکہ تجزیاتی کتابیات میں کتاب کے مصنف اس کے مختلف ایڈیشن، چھاپہ خانہ اور متن سے مطابقت وغیرہ پر توجہ دی جاتی ہے۔ تجزیاتی کتابیات میں کتاب بحیثیت ایک مادی شے کے مطالعہ کی جاتی ہے۔ متعین کتابیات ایک فن ہے۔ یہ فن کتابیات کی تشکیل کرنے کا ہے۔ اس میں پہلا قدم کتابوں کی شناختی تفصیل مثلاً مصنف، عنوان، مقام اشاعت، ناشر، صفحات، تصاویر وغیرہ متعین کرلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کتابوں کے اندراجات کو حوالہ کی ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک مربوط ڈھنگ سے ترتیب دیا جاتا ہے۔

کتابیات کا بنیادی مقصد تو متلاشی مواد کو اس کی مطلوبہ کتاب یادوسرے علمی معلومات کے وسائل کی نشاندہی کرنا ہے اور اس کی تفصیلات کی تصدیق کرنا ہے لیکن اس کی مدد سے محققین اپنے دائرہ علم میں ہونے والی پیش رفت سے بھی باخبر رہتے ہیں۔ مزید کتابیات تحقیق کے کام میں توارد سے بھی آگاہ کرتی ہے۔

منظم یا متعین کتابیات جو عام طور پر حوالہ خدمات میں کام آتی ہے درج اقسام میں رکھی گئی ہے۔ عالمی کتابیات (Universal Bibliography)، قومی کتابیات (National Bibliography)، تجارتی کتابیات (Trade Bibliography) اور موضوعاتی کتابیات (Subject Bibliography)

عالمی کتابیات فی الحال ایک تصوراتی اصطلاح ہے جس کا مفہوم ایک ایسی کتاب سے ہے جس میں دنیا بھر میں جملہ علوم پر ضبط تحریر میں آیا ہوا یا صدابند کیے گئے علمی مواد کا احاطہ کیا گیا ہو۔ اس کے اندراجات زمان و مکان کی قید کے علاوہ زبان، مادی ساخت، اظہار بیان، مضامین سب کا ہر طرح سے مکمل احاطہ کیے ہوئے ہوں۔ ایسی کتابیات مرتب کرنے کی ایک کوشش کونریڈ گیسنر (Conrad Gessner) نے کی تھی۔ چنانچہ ببلو تھکایونیورسلس (Bibliotheca Universalis) زیورچ سے 1545 میں شائع ہوئی جس میں 12000 کتابوں کا اندراج تھا۔ یہ کتابیات مصنفین کے ناموں کے اعتبار سے مرتب تھی۔ دس سال بعد 1555 میں ایک ضمیمہ شائع ہوا جس میں مزید 3000 کتابوں کا اندراج تھا۔ گیسنر کی دکھائی ہوئی راہ پر بہت لوگوں نے چلنے کی کوشش کی جس کا آخری سرا دو اسکالر پال آٹلٹ (Paul Otlet) اور ہنری لافانٹین (Henry La Fontain) کی انیسویں صدی کے آخری سالوں کی کوشش ہے جس کے نتیجہ میں ناشرین کی فہرست مطبوعات سے 12 ملین کارڈ بنائے گئے۔ کتابیات تو نہیں شائع ہو سکی البتہ ایک نیا ضابطہ درجہ بندی، یونیورسل ڈیسیمل کلاسی فکیشن وجود میں آگیا۔ ممکن ہے کمپیوٹر کی مدد سے دنیا بھر کی مطبوعات پر مشتمل ایک عالمی کتابیات وجود میں آجائے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے اردو کتابوں کی عالمی فہرست "قاموس الکتب" کے نام سے تین جلدوں میں شائع کی ہے لیکن یہ فنی اعتبار سے بہت نامکمل ہے۔

قومی کتابیات (National Bibliography) : یہ کسی ایک ملک کی جملہ مطبوعات کا احاطہ کرتی ہوئی تسلسل سے شائع ہونے والی کتابیات ہے۔ اس طرح کی مطبوعات شائع کرنے کی ہمت افزائی یونیسکو نے کی ہے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد سے دنیا کے اکثر ممالک نے اپنے ملک کی مطبوعات پر مشتمل قومی کتابیات شائع کرنی شروع کردی ہے۔ اس میں برطانیہ سے شائع برٹش نیشنل ببلوگرافی جو اب سی ڈی پر بھی دستیاب ہے، قابل ذکر ہے۔ ہندوستان میں سنٹرل ریفرنس کتب خانہ، کلکتہ، انڈین نیشنل ببلوگرافی 1957 سے شائع کر رہا ہے رومن خط میں شائع یہ کتابیات ملک کی دستور ہند میں درج جملہ زبانوں کی کتابوں کا قابل بھروسہ ریکارڈ ہے۔

تجارتی کتابیات (Trade Bibliography) : عموماً ناشرین کے ذریعہ شائع کتابوں کی فہرستوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال انڈین بکس ان پرنٹ ہے جو پہلی بار دہلی سے 1969 میں شائع ہوئی اور اب ہر سال شائع ہورہی ہے۔ اس کی دوسری معروف مثالیں امریکن بکس ان پرنٹ (1948 سے سالانہ اشاعت) اور برٹش بکس ان پرنٹ (1967 سے سالانہ اشاعت) ہیں۔

موضوعاتی کتابیات (Subject Bibliography) : یہ ایسی کتابیات ہے جو کسی مخصوص مضمون یا اس کے ذیلی موضوعات پر شائع جملہ کتابوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا موضوع جملہ دائرہ علوم انسانی کا ایک مضمون، کوئی فرد، کوئی مقام، کوئی واقعہ وغیرہ ہوسکتا ہے۔ اس طرح کی کتابیات بسیط یا منتخب ہوسکتی ہے، کسی ایک زبان یا ایک ملک کی ہوسکتی ہے یا علم و ادب کے کسی شاخ یا ذیلی موضوع کی ہوسکتی ہے۔ یہ تسلسل سے شائع یا ایک بار شائع ہوسکتی ہے۔ اس ضمن کی سب سے قابل ذکر مثال یونیسکو کے تعاون سے شروع کی گئی انٹرنیشنل ببلوگرافی آف سوشل سائنسز کی سلسلہ وار اشاعت ہے جس کے تحت معاشیات، سیاسیات،

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

عمرانیات اور سماجی و ثقافتی عمرانیات پر الگ الگ سالانہ کتابیات شائع ہوتی ہیں۔ اردو میں چند مثالیں رفیع الدین ہاشمی: کتابیات اقبال (1977)، ابواللیث صدیقی: اردو میں سائنسی ادب (1981)، سلیم اختر: تنقید و تاریخ ادب کی کتابیں (1973) وغیرہ ہیں۔

کتب: کتاب کی جمع ہے کتاب کے لغوی معنی لکھنا، نوشتہ لکھی ہوئی چیز اور مجموعہ اوراق ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے :

(1) نوشتہ تقدیر تجویز الٰہی حکم ازلی علم الٰہی

(2) اعمال نامہ خدا کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز کا ریکارڈ ہوتا ہے

(3) خط اور پیغام

(4) احکام و قوانین

(5) اللہ کا اپنے رسولوں پر اتارا ہوا کلام

کتاب کا لفظ عموماً اسی آخری معنی میں زیادہ مستعمل ہے اور شریعت کی اصطلاح میں اس سے وہ آسمانی کتابیں اور صحیفے مراد ہیں جو اللہ نے لوگوں کو اصلاح اور ہدایت کے لیے اپنے پیغمبروں پر حضرت جبریل کے ذریعہ نازل کی تھیں اور ان میں اپنے احکام ہدایات اور اپنی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتیں تحریر کی تھیں اسی لیے مسلمانوں کے عقیدے کا ایک اہم جز ان ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ہے جو مختلف زمانے میں خدا نے اپنے برگزیدہ بندوں پر اتاری تھیں خواہ ان کا علم ہو یا نہ ہو سب پر اجمالی ایمان لانا کافی ہے۔ بعض پیغمبروں کو صحیفے اور بعض کو کتابیں دی گئی تھیں چار مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں:

(1) توراۃ: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی

(2) زبور: حضرت داؤد علیہ السلام پر اتاری گئی

(3) انجیل: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دی گئی

(4) قرآن مجید: یہ پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوا۔ قرآن مجید سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں گو وہ سب بھی خدا ہی کی طرف سے تھیں مگر ان کے ماننے والوں نے ان کے اندر من مانی تحریف کرکے خدا کے احکام کو بدل ڈالا لیکن قرآن مجید لفظاً و معناً ہر حیثیت سے محفوظ ہے اور اس میں ایک شوشہ کا بھی رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام تر کلام الٰہی ہے اس لیے اب سارے لوگوں کو اس پر ایمان لانا ضروری ہے کوئی شخص اس پر ایمان لائے بغیر نہ مسلمان ہوسکتا ہے اور نہ آخرت میں اس کی نجات ہوسکتی ہے تمام رسولوں کی طرح ان آسمانی کتابوں پر ایمان بھی ضروری ہے کسی کتاب کا انکار بھی کفر ہے۔

کراماً کاتبین: دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتا یا کہتا ہے یہ دونوں فرشتے اسے لکھتے رہتے ہیں اور قیامت کے دن ہمارے تمام اعمال کا ریکارڈ خدا کے سامنے پیش کریں گے۔

کسٹمس یونین (Customs Union): کسٹمس یونین دو یا دو سے زیادہ ملکوں کے درمیان قائم کی جاتی ہے۔ جو ملک اس یونین میں شریک ہوتے ہیں وہ آپس میں آزاد تجارت پر عمل کرتے ہیں اور کوٹہ، ٹیرف کی پابندیوں کو ختم کردیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ ممالک یونین سے باہر دوسرے ملکوں کے خلاف ٹیرف وغیرہ کی رکاوٹیں قائم کرلیتے ہیں۔ یہ آزاد تجارتی رقبہ کے برعکس ہے جس میں ممبر ایک دوسرے کے خلاف تجارتی رکاوٹیں تو نہیں لگاتے مگر غیر ممبروں کے خلاف ہر ملک الگ الگ رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے جیساکہ یورپی مشترکہ منڈی کی صورت میں موجود ہے۔

کسی زمانہ میں سمجھا جاتا تھا کہ کسٹمس یونین قائم کرنے سے اس کے ممبروں کو یقینی طور پر معاشی فائدہ ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے ممبر ملک ایک دوسرے کے خلاف کوئی پابندی نہیں لگاتے اس لیے پیداکار کو یقینی طور پر فائدہ پہنچتا ہے۔ ریکارڈو کا یہی خیال تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آزاد تجارت صنعتی ترقی کے لیے نہایت مفید ہے اور کسٹمس یونین اس کی طرف ایک قدم ہے لیکن بعد میں ان خیالات میں تبدیلی آنے لگی۔ جیکب وائیز نے 1950 میں اس مسئلہ پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کسٹم یونین کے قیام سے ایک تو تجارت کو فروغ ملتا ہے دوسرے تجارت میں انحراف پیدا ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں صنعت کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن دوسری صورت میں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ کے اور بھی پہلو ہیں۔ ممبر ملکوں میں آپس میں ٹیرف وغیرہ کی رکاوٹیں ہٹانے سے تجارت کے شرائط بدل جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ مختلف اشیا کی طلب میں تبدیلی آتی ہے۔ چنانچہ اس کے کسی ملک کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں اس کا انحصار پیداواری اشیا کی طلب ہوتا ہے۔ البتہ ایک بات واضح ہے کہ اندرونی رکاوٹیں دور

ہونے سے منڈی وسیع ہو جاتی ہے اور اشیا کی لاگت گھٹ جاتی ہے۔

کسی مدعی یا مدعاعلیہ کے اضافہ یا قایم کیے جانے کا اثر:

جب بعد رجوع ہونے کے کسی مقدمہ کے کوئی مدعاعلیہ اضافہ کیا جائے یا کسی مدعاعلیہ کے بجائے قایم کیا جائے تو اس کی نسبت مقدمہ کا رجوع ہونا اس وقت سے متصور ہوگا جب فریق بنایا گیا ہو۔

ضمن (1) کا کوئی مضمون اس صورت میں متعلق نہ ہوگا جب کوئی فریق کسی مقدمہ کے دوران کسی حق کے منتقل ہونے یا حاصل ہونے کی وجہ سے اضافہ کیا جائے یا قایم کیا جائے جب کوئی مدعی یا مدعاعلیہ مدعی بنایا جائے۔

ملحوظ رہے کہ اگر عدالت تحت آرڈر (1) رول (10) ضابطہ دیوانی کسی شخص کو فریق بنانے کا حکم دے تو میعاد کا سوال پیدا نہ ہوگا اور جو قیود کہ احکام صدر میں بیان کیے گئے ہیں وہ متعلق نہ ہوں گے۔ اسی طرح جب کہ نیک نیتی سے دعوے غلط نام سے رجوع کیا گیا ہو تو یہ غلطی تحت آرڈر (1) رول (10) ضمن (1) صحیح شخص کا نام اضافہ کرکے رفع کی جاسکتی ہے اور میعاد کا سوال اس صورت میں بھی پیدا نہ ہوگا۔

کشف الاسرار علی الیزدوی: فخر الاسلام علی بن محمد یزدوی (متوفی 482ھ / 1089ء) ماوراالنہر کے مشہور حنفی فقیہ تھے۔ علماء احناف میں امام ابو زید بوسی کے بعد ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ حنفی فقہ کے اصول کو سب سے پہلے ایک فن کی حیثیت سے مدون کیا اور اس کی صحت و غلطی معلوم کرنے کے لیے قوانین وضع کیے اور اس موضوع پر کنز الوصول الی معرفۃ الاصول کے نام سے ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی جو اصول یزدوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں جن میں کشف الاسرار بہت مشہور و متداول ہے۔ یہ شرح ضخیم اور گوناگوں فوائد پر مشتمل ہے اس کے مصنف عبدالعزیز بن احمد بن علاؤ الدین بخاری اپنے عہد کے مشاہیر علما و اصحاب کمال میں تھے ان کی وفات 730 میں ہوئی۔

کلچر (ثقافت) (Culture): شستگی لطافت اور شائستگی کے عام مفہوم کے علاوہ کلچر کی اصطلاح انسانیاتی (Anthropological) تناظر میں مخصوص معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس خاص مفہوم میں کلچر سے مراد انسان کا سماجی ورثہ ہوتا ہے۔ انسانی گروہ دو اعتبار سے باہم مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو جسمانی ساخت اور ہیئت ہے اور دوسرا سماجی یا عمرانی ورثہ۔ انسان اپنی جسمانی خصوصیات بنیادی طور پر حیاتیاتی (Biological) یا تولیدی (Hereditary) اصولوں کے مطابق ورثے میں پاتا ہے اور کلچر یا سماجی ورثہ اسے ایک مختلف اصول کے تحت ملتا ہے۔ کلچر کے ورثہ اور اکتساب کی مثال ایسے انسانی نومولود کی زندگی سے ملتی ہے جس کی پرورش بھیڑیوں کے غول میں ہوئی ہو اور خاصی بڑی عمر میں اس کی بازیافت عمل میں آئی ہو۔ ایسے بچے انسانی تمدنی ورثے سے محروم پائے جاتے ہیں۔ تمدنی خصوصیات کے توارث کی مثال ایسے چینی یا افریقی بچوں کی زندگی سے بھی مل سکتی ہے جن کی پرورش و پرداخت چینی یا افریقی ماحول سے علاحدہ انگلستان کے کسی کنبے میں ہوئی ہو۔ ان بچوں کی جسمانی اور نسلی خصوصیتیں تو باقی رہیں گی لیکن وہ چینی اور افریقی تمدن کی بنیادی خصوصیتوں سے عاری رہیں گے اور انگلستان کے معاشرے کی خصوصیتیں قبول کریں گے۔

کلچر نہ صرف ورثے میں پایا جاتا ہے بلکہ انسان اپنے ارضی مسکن پر زندگی کا تسلسل قایم رکھنے کے لیے اپنے ماحول میں تبدیلیاں بھی لاتا ہے اور کلچر کے اندر رد و بدل کا باعث بھی بنتا ہے۔ تجربوں کی روشنی میں اور دوسروں کو دیکھ کر انسان اپنے مادی اور غیر مادی تمدن (Material and Non-material Culture) کے اندر تبدیلی عمل میں لاتا اور کلچر کو نئے روپ دیتا ہے۔ زبان بھی کلچر کے دائرہ عمل سے باہر نہیں بلکہ یہ بھی کلچر کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس میں تبدیلی کا ایک ذریعہ بھی۔

کلچر کی باضابطہ تعریف و توضیح کی کوشش عالم یا ماہرین عمرانیات (Sociologists and Anthropologist) نے 19 ویں صدی سے ہی کی ہے۔ ان توضیحات کی روشنی میں اس کی ماہیت اور اس پر مبنی نظریات اور تصورات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ 19 ویں صدی سے لے کر اب تک کلچر کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں ان پر مختلف مکتب خیال جیسے مدرسہ ارتقاء (Evolutionary School) اور مدرسہ نفوذ (Diffusionist School) کے اثرات نمایاں ہیں۔ کلچر کے اور بھی گہرے مطالعے کے نتیجے میں سماجی ڈھانچے (Social Structure) اور تمدنی سانچے (Cultural Pattern) کے نظریات بروئے کار آئے۔

سب سے پہلے کلچر کی جامع تعریف ایک برطانوی انسانیات داں

ای.بی. ٹائیلر (E.B.Tylor) نے کی تھی۔ اس نے اس اصطلاح کا استعمال ایک ایسے ہمہ گیر مفہوم میں کیا تھا جس میں علوم، عقائد، فنون، اخلاق، رسم و رواج اور معاشرے کے رکن کی حیثیت سے انسان کی تمام اکتسابی عادات اور صلاحیتیں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی یہ خصوصیات اکتسابی اور فوق اندامی (Super Organic) ہیں کیونکہ ان کے اکتساب اور ان کی انتقال پذیری کا عمل حیاتیاتی توارث کے اصولوں سے مختلف طرز پر ہوتا ہے اور محض معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہی انسان کلچر کو نہ صرف ورثے میں پاتا ہے بلکہ اس میں انفرادی یا اجتماعی عمل سے تغیر اور تبدیلی کا باعث بھی بنتا ہے۔

کلچر میں تبدیلی اور اس کے پھیلاؤ کے متعلق انسانیات کے ماہرین نے مختلف نظریے پیش کیے ہیں۔ مدرسہ ارتقاء کے نظریے کے مطابق کلچر کے اندر کایا پلٹ بے ساختہ ہوتی ہے اور یہ تغیر معینہ قوانین کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ تبدیلی تمدن کے ان قوانین کے عمل کے نتیجے میں کلچر کے سلسلہ وار مختلف ادوار (Stages) ہوتے ہیں۔ اس نظریے کے حامیوں کا خیال ہے کہ مادی اور غیرمادی کلچر کے عناصر مثلاً آگ کے استعمال، مٹی کے برتن بنانے کے ہنر، سفال گری، خاندان، مذہب اور شادی بیاہ وغیرہ نے مختلف ارتقائی منزلیں خاص اصولوں کے تحت طے کی ہیں۔ لیکن کلچر کے تمام عناصر کے اندر تبدیلی کے کسی ہمہ گیر قانون کے وجود کا ثبوت نہ مل سکا۔ یہ بات مشاہدے میں آئی کہ اگرچہ بعض اوزاروں کی ہیئتیں مختلف ادوار میں کم وبیش بعض ہمہ گیر اصولوں کے تحت بدلی ہیں لیکن خاندانی ساخت، شادی بیاہ اور مذہبی عقائد کے اندر کوئی سہل ڈرامائی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

تاریخی مکتب خیال کے لوگ جو نظریہ نفوذ (Diffusionist School) کے حامی ہیں کلچر کی تاریخ کی ترتیب یا باز تعمیر کلچر کے نفوذ یا پھیلاؤ کے مطالعے کے ذریعہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ کلچر کے بے ساختہ بروئے کار آنے کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ محض نقالی اور ایک دوسرے سے سیکھ کر ہی مادی اشیاء اور رسوم و رواج کا پھیلاؤ عمل میں آیا ہے۔ ان کا طریق کار کرہ ارض کے ایک بڑے علاقے کے اندر کلچر کی یکسانیت کے بغور مطالعے پر مبنی ہے۔ اسی طرح کے مطالعے کی بنیاد پر وہ تمدنی عناصر کے نفوذ یا پھیلاؤ کے طریقوں کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کلچر مختلف عناصر کا کوئی اتفاقیہ مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہی عناصر اس کے اجزا بنتے ہیں جس میں باہم موزونیت پائی جاتی ہے۔ اصل میں اس مکتب خیال کے لوگوں نے واقفیت کی کمی کو ہی اپنے نقطہ نظر کی دلیل تصور کیا ہے۔

ٹائلر نے کلچر کی جو تعریف کی اس میں جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود کلچر کے ایک عام تصور اور سماجی تنظیم و آئین کے درمیان فرق یا امتیاز نمایاں نہیں ہوتا۔ اسی عمومی مفہوم میں تاریخی مکتب خیال کے لوگوں نے اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ میلینو سکی (Malinowski) اور فرینز باوس (Franz Baos) کی تفصیلات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ان کی تصنیفات میں جابجا کلچر کی اصطلاح سے اس کے عمل پذیر اور منظم اور مکمل ہونے کے علاوہ مقامی تہذیبوں کی اہمیت کا تاثر بھی ذہنوں پر مرتب ہوتا ہے۔ اس تاثر کی روشنی میں مدرسہ ارتقاء و نفوذ کے مفروضات مثلاً نوع انسانی کی یکسانیت، انسانی تاریخ کی یکجہتی اور کلچر کے اتحاد کے تصورات دھندلے ہونے لگے اور یہ خیال جاگزیں ہوتا گیا کہ اگر یہ تصورات درست ہیں تو انھیں بہت سے متفرق معاشروں کے تقابلی مطالعے کے ذریعہ ہی واضح کرنا ہوگا۔

معاشروں کے مکمل نسلیاتی (Ethnographic) مطالعے میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا کلچر کی قوت کی حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہوتی گئی حتیٰ کہ برطانوی عالم اور انسانیات داں ریڈ کلف براون (Radcliff Brown) کی قیادت میں سماجی انسانیات (Social Anthropology) اور تمدنی انسانیات (Cultural Anthropology) کے عملی دائروں کی تخصیص عمل میں آئی۔ سماجی انسانیات کو سماجی ساخت یا ڈھانچوں کے تقابلی مطالعے کا موضوع قرار دیا گیا اور اس کے مقابلے میں تمدنی انسانیات کا شعبہ کلچر یا تمدنوں کے تقابلی مطالعے کا موضوع قرار پایا۔ ان موضوعات کے دائروں کی تخصیص کے سبب معاشی ڈھانچے (Social Structure) اور تمدنی سانچے یا طرز (Cultural Pattern) کے نظریے وجود میں آئے۔ سماجی ڈھانچے کا نظریہ ریڈکلف براون اور ان کے رفقاء کار سے منسوب کیا جاتا ہے اور تمدنی سانچے کا نظریہ خاصی جامع شکل میں کروبر (Kroeber) نے پیش کیا۔

ریڈکلف براون اور ان کے رفقاء کار نے سماجی ڈھانچے کو مختلف گروہوں طبقوں یا افراد کے درمیان تعلقات یا رشتہ داریوں کا تانابانا (Network) یا نظام بتایا ہے۔ سماج کے کسی مکمل نظام کو قائم رکھنے کے لیے افراد جو کردار ادا کرتے ہیں اسے اس نظریے کے مطابق معاشرے کا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

طریقِ عمل (Function) کہا گیا ہے۔

کروبر کے خیال میں تمدنی سانچے یا طرز ایسی ترتیب یا اندرونی تعلقات کی حیثیت رکھتے ہیں جو کسی کلچر کو ہم آہنگی عطا کرتے ہیں اور اسے محض بے تکے ٹکڑوں کا مجموعہ بننے سے روکتے ہیں۔ کروبر نے تمدنی سانچوں کے متعلق اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کئی اقسام کے سلسلہ وار سانچوں کا ذکر کیا ہے جنھیں وہ آفاقی (Universal) منظم (Systematic) معاشرتی یا مکمل (Social or Whole) اور اسلوب (Style) کی قسم کے سانچوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔

سماجی ڈھانچے اور کلچری سانچوں کے نظریوں کو باہم مربوط کرنے کی کوشش بھی کی گئیں مثلاً فوسٹر (Foster) نے اس امر کی توضیح کی کہ سوسائٹی یا معاشرے سے مراد لوگ (People) ہیں اور کلچر یا تمدن سے مراد لوگوں کا کردار (Behaviour) ہے۔ کروبر (Kroeber) اور پارسن (Parson) نے خاص بحث و تمحیص کے بعد اس امر پر اتفاق کیا کہ سوسائٹی اور کلچر دونوں اہم ہیں اور لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ بعض غیر انسانی مخلوق جیسے شہد کی مکھی اور دیمک وغیرہ میں سوسائٹی یا اجتماعی زندگی کی تنظیم تو ہے لیکن کلچر مفقود ہوتا ہے۔ دونوں کے نظریوں میں مفاہمت کے باوجود دونوں کا فرق باقی رہا۔

لیکن انسانیاتی مطالعوں میں اضافے کے ساتھ یہ بات عیاں ہوتی گئی کہ عمرانیات یا سماجیات (Sociology) سماجی انسانیات (Social Anthropology) اور تمدنی انسانیات (Cultural Anthropology) کے علمی اور عملی دائروں کی مکمل طور پر حد بندی مشکل ہے اس لیے سوسائٹی یا معاشرے کو کلچری یا تمدنی انسانیات کے وسیع تر دائرۂ عمل سے خارج قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ اس کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔

کلچر کا منطقی دائرۂ عمل، کردار اور کردار کے نتیجے میں سامنے آنے والے مظاہر اور اشیاء کا مطالعہ ہے۔ اس طرح کے مطالعے کی روشنی میں کردار قابلِ فہم ہوتا ہے۔ کلچر ایک طرف تو کردار کا معیار (Norm) ہے اور دوسری طرف یہ ان نظریات (Ideologies) پر مبنی ہے جو کردار کے بعض منتخب اسلوب یا طرز کا جواز پیش کرتے ہیں۔ پھر ہر ایک کلچر کے اندر کچھ وسیع تر نوعیت کے عام اصول ہوتے ہیں جن کی بنیاد کردار (Behaviour) کے سانچوں (Patterns) کی تعمیر کے کام میں آسکتی ہے۔

اس سلسلے میں ناہموار تمدنی تبدیلی (Cultural Lag) کو سمجھ لینا بھی بہت ضروری ہے۔ غیر مادی تمدن بہت سست رفتاری سے بدلتا ہے جبکہ مادی تمدن تیز رفتار ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر تمدن کا جو حصہ تصورات اخلاقیات فلسفہ اقدار اور سماجی معیاروں سے تعلق رکھتا ہے اس کا بدلنا بے حد مشکل ہوتا ہے جبکہ مادی مظاہر مثلاً مکان سواری مشینوں وغیرہ کا انداز بدلنا آسان ہے۔ ہم خلا میں راکٹ چھوڑتے ہوئے بھی ناریل توڑتے ہیں۔ جدید ترین کاروں کے پیچھے جوتا لٹکا کر بری نظر سے ان کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیل گاڑی سے کار تک کا سفر آسان ہے لیکن ضعیف الاعتقادی سے سائنسی رویہ تک کا سفر بہت طویل ہے۔ اس طرح مادی اور غیر مادی تمدن الگ الگ رفتار سے بدلتا ہے اور معاشرے کے لیے متعدد دشواریاں پیدا کرتا ہے لیکن یہی کلچر کا مزاج ہے جو ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

کلیساؤں کی عالمی کونسل (World Council of Churches, WCC): 23/ اگست 1948 کو ایمسٹرڈم (نیدرلینڈس) میں 44 ملکوں کے 147 کلیساؤں کے نمائندوں کے اجتماع میں اس کونسل کا قیام عمل میں آیا۔ بعد ازاں اس کے ارکان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ آج اس میں 100 سے زائد ملکوں کے 330 ممبر شریک ہیں۔ اس کی رکنیت کی بنیاد خدا، حضرت عیسیٰ اور اناجیل پر عقیدہ ہے۔ اس کا مقصد عالمی پیمانہ پر عیسائیت کی تبلیغ، مسیحی مذہب کے نقطہ نظر سے دنیا کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کا مطالعہ اور اس کا حل پیش کرنا ہے۔ مسیحی کلیساؤں کے درمیان قریب تر تعاون کو فروغ دینا اور مختلف مسیحی فرقوں کے مابین اتحاد قائم کرنا کونسل کے مقاصد میں شامل ہے۔ اگرچہ رومن کیتھولک کلیسا کونسل میں شریک نہیں لیکن اسے اپنے مشاہدین کو اس کے اجلاسوں میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

کونسل کی عالمی کانفرنس ہر چھٹے یا ساتویں برس منعقد ہوتی ہے۔ درمیانی وقفہ میں اس کی مرکزی کمیٹی کونسل کے سکریٹریٹ کی مدد سے کام کرتی رہتی ہے۔

کلی معاشیات (Macro-Economics): جزوی معاشیات کے برعکس کلی معاشیات میں انفرادی اکائیوں کی بجائے مختلف معاشی مجموعوں (Economic Aggregate) کے باہمی رشتوں سے بحث کی جاتی ہے۔ ان میں سب سے اہم ہیں قومی آمدنی، مجموعی بچت، (Aggregate Savings) اور صارفین کے مصارف یا اخراجات (Expenditure)، سرمایہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کاری، مجموعی روزگار، زر کی مقدار، قیمتوں کی اوسط سطح اور توازن ادائی (Balance of Payment)، کلی معاشیات کا بڑا کام ان مجموعوں کی حد (Magnitude) کے تعین کی وضاحت کرتا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ان میں تبدیلی کی شرح کیا رہتی ہے۔ اس کا ایک اہم کام اس کا پتہ رکھنا ہے کہ سرکاری اخراجات، ٹیکس اور مالی پالسی عام معاشی سرگرمی پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔ یعنی ان کا اثر قومی آمدنی، روزگار وغیرہ پر کیا پڑتا ہے۔ کلی معاشیات گہرائی کے ساتھ اس کی وضاحت کرتی اور تجزیہ کرتی ہے کہ ان مجموعوں کا آپسی رشتہ کیا ہے۔ وہ کیا حالات ہیں جن کے تحت یہ نظام سکونی یا حرکی توازن میں رہتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کا پتہ لگاتا ہے کہ اس توازن کی خصوصیات کیا ہیں۔ اس کی مدد سے یہ پیشن گوئی کی جاسکتی ہے کہ بعض اہم مقداروں (Magnitudes) میں تبدیلی سے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ مثلاً جو سرمایہ کاری کرتی ہے یا خرچ کرتی ہے۔ اس کی حد میں کمی یا زیادتی سے کیا اثرات نمودار ہوسکتے ہیں۔ جدید کلی معاشیات کی ابتدا لارڈ کینز (Lord Keynes) کی 1936 کی تصنیف "روزگار، سود اور زر کا عام نظریہ" سے ہوتی ہے۔

کمپنی جو کسی قانون کے ذریعہ قایم کی گئی ہو

(Statutory Company): جو کمپنی مرکز یا اسٹیٹ کی مقننہ کے منظور کردہ قانون کے ذریعہ قایم کی جاتی ہے اسے اسٹاٹیوٹری کمپنی کہتے ہیں۔ ریزروبینک آف انڈیا، اسٹیٹ بینک آف انڈیا، انڈسٹریل فنانشل کارپوریشن، یونائیٹڈ ٹرسٹ آف انڈیا، اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن اور لائف انشورنس کارپوریشن ایسی کمپنیوں کی مثالیں ہیں۔ ایسی کمپنیوں کا کوئی میمورنڈم آف ایسوسی ایشن نہیں رہتا بلکہ یہ کمپنیاں قانون ہی کے ذریعہ اپنے اختیارات کو حاصل کرتی ہیں اور ان کمپنیوں کے اختیارات کو بھی استعمال کرتی ہیں جو کمپنی لاء کے تحت رجسٹری شدہ کمپنیوں کو حاصل ہیں۔ اس نوعیت کی کمپنیوں کے اختیارات اور دائرہ عمل میں تبدیلی اس قانون میں ترمیم کے ذریعہ کی جاسکتی ہے جس کے تحت وہ قایم کی گئی ہوں۔

کمپنی جو لمیٹڈ نہ ہو (Unlimited Company): ایسی کمپنی جس کے ممبروں کی رقمی ذمہ داری کی کوئی حد مقرر نہیں ہوتی اسے ان لمیٹڈ کمپنی (Unlimited Company) کہتے ہیں۔ کمپنی کے ممبر کمپنی کے قرض کے اس حد تک ذمہ دار ہوتے ہیں جس حد تک ان کا مفاد کمپنی سے وابستہ رہتا ہے اور ان کی ذمہ داری کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس نوعیت کی کمپنی پبلک اور پرائیویٹ ہوسکتی ہے۔

کمپنی کا اختتام (Winding of Company): ایک کمپنی قانونی ضابطہ کے ذریعہ قایم کی جاتی ہے اسی طرح کمپنی کا اختتام بھی قانونی ضابطے کے تحت واقع ہوتا ہے۔ کمپنی کے اختتام سے مراد یہ ہے کہ اس کا انتظامیہ ڈائرکٹرز سے کنٹرول سے لے لیا جاتا ہے اور لیکویڈیٹر (Liquidator) کے کنٹرول میں دے دیا جاتا ہے اور کمپنی کے قرض اس کے اثاثے کو فروخت کرکے ادا کیے جاتے ہیں اور اگر کوئی رقم بچ جاتی ہے تو اس رقم کو کمپنی کے ممبروں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ بہرحال کمپنی کی تحلیل سے کمپنی کی زندگی ختم ہوجاتی ہے اور اس کی جائداد ایک ایڈمنسٹریٹر کے زیرنگرانی دے دی جاتی ہے اور اس جائداد کو کمپنی کے ممبر اور حصہ داروں کے مفاد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ایڈمنسٹریٹر کو کمپنی لاء کی اصطلاح میں لیکویڈیٹر کہتے ہیں۔

ایک کمپنی کا اختتام یا تحلیل حسب ذیل صورتوں میں ہوتی ہے۔

(1) عدالت کے حکم سے

(2) ممبروں کی رضامندی سے

اگر کمپنی دستوری میٹنگ نہ کرے اور رجسٹرار کمپنی کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ جو قانوناً دینا چاہیے نہ دے تو عدالت یہ حکم دے سکے گی کہ کمپنی کے کاروبار کو ختم کردیا جائے۔ کمپنی کے اختتام کی درخواست رجسٹرار کمپنی کی جانب سے عدالت میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی کمپنی رجسٹریشن کے ایک سال کے اندر کاروبار آغاز نہ کرے تو عدالت کے حکم کی بنا پر کمپنی کو ختم کیا جائے لیکویڈیٹر مقرر کیا جاتا ہے۔ اگر کمپنی کے ممبروں کی تعداد کم سے کم معینہ تعداد سے کم ہوگئی ہو یعنی پبلک کمپنی کی صورت میں سات سے کم ہوگئی ہو اور پرائیوٹ کمپنی کی صورت میں دو سے کم ہوگئی ہو تب بھی کمپنی عدالت کے حکم کی بنا پر ختم ہوسکتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کمپنی کا اختتام عدالت کے حکم پر منحصر ہے اور عدالت تمام امور متعلقہ پر غور کرکے ہی حکم دے گی۔

کمپنی کا رجسٹریشن (Registration of Company): کمپنی کا رجسٹری کرانا اس کے قیام کا دوسرا مرحلہ ہے۔ کمپنی لاء کے تحت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

رجسٹرار آف کمپنی کے پاس کمپنی کی رجسٹری کروائی جاتی ہے۔ پبلک کمپنی کی صورت میں کوئی سات شخص اور پرائیوٹ کمپنی کی صورت میں کوئی دو شخص جنھوں نے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن پر دستخط کیے ہیں رجسٹرار کے دفتر پر رجوع ہوکر کمپنی کی رجسٹری کروائیں گے۔ یہ کمپنیاں یا تو حصص کی حد تک محدود ہوتی ہیں یا ضمانت کی حد تک محدود ہوتی ہیں یا غیر محدود نوعیت کی ہوتی ہیں۔ پروموٹر کو رجسٹریشن سے قبل حسب ذیل امور کی پابندی کی جانی چاہیے۔

(1) کمپنی لاء کے تحت رجسٹرار کمپنی سے کمپنی کے نام کی اجازت کا حصول۔

(2) دیگر ضروری کاغذات کی تیاری اور اس کی طباعت۔

(3) اگر کمپنی کسی کاروبار کے لیے ہو تو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن ایکٹ (Industurial Development and Regulation Act) کے تحت اجازت کا حصول۔

(4) اگر کمپنی کا سرمایہ پچیس لاکھ سے زیادہ ہو تو کنٹرولر آف کیپٹل اشوز (Controller of Capital Issues) سے اجازت کا حصول۔

(5) ابتدائی معاہدات اور پراسپکٹس (Prospectus) یا پراسپکٹس کی غیر موجودگی میں اسٹیٹمنٹ (Statement) کی پیش سازی۔

رجسٹرار کمپنی کے سامنے مندرجہ بالا کاغذات کے علاوہ حسب ذیل کاغذات کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

(1) میمورنڈم آف ایسوسی ایشن (Memorandum of Association) جو مطبوعہ ہوگا اور جس پر ہر ممبر کے دستخط ہوں گے اور ہر ممبر کا پتہ اور پیشہ درج ہوگا اور دوسرے کسی شخص کے بطور گواہ دستخط ہوں گے۔

(2) ایسے اشخاص کے نام جنھوں نے کمپنی کے ڈائرکٹرز کی حیثیت سے کام کرنے کی رضامندی دی ہے۔

(3) اگر پہلے سے اطلاع نہیں دی گئی ہو تو رجسٹری ہو جانے کے بعد کمپنی کے مقام کاروبار کی اطلاع رجسٹری کے تیس دن کے اندر رجسٹرار کو دی جانی چاہیے۔

کمپنی کا قیام (Forming of Company): کمپنی کے قیام کے سلسلے میں چار مرحلے کمپنی ایکٹ کے تحت رکھے گئے ہیں:

(1) پروموشن

(2) رجسٹریشن

(3) سرمائے کی فراہمی

(4) کاروبار کا آغاز

کمپنی کی قانونی شخصیت (Incorporation of Company): ایک کمپنی قانون شخص (Legal Person or Legal Entity) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور اس کی جانب سے دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ کمپنی جائداد حاصل کرسکتی ہے اور جائداد فروخت کرسکتی ہے اور اشخاص ثالث سے معاہدہ کرسکتی ہے۔ کمپنی کی ایک دوامی حیثیت رہتی ہے اور اس کی اپنی ایک مہر (Common Seal) ہوتی ہے۔ کمپنی کے کسی ممبر کی وفات یا اس کے حصص کی منتقلی سے اس کے وجود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کمپنی کے عمل کی ذمہ داری انفرادی طور پر کمپنی کے کسی ممبر پر عاید نہیں ہوتی اور کوئی قرض خواہ اپنا قرض کمپنی کی جائداد یا دیگر اثاثہ سے وصول کرسکتا ہے نہ کہ شخصی طور پر کمپنی کے ممبران سے کمپنی کے متعدد اقسام ہیں۔ مثلاً چارٹرڈ کمپنی، رجسٹرڈ کمپنی، پبلک کمپنی، پرائیوٹ کمپنی، لمیٹڈ کمپنی، حصص، لمیٹڈ کمپنی تابع ضمانت (دیکھو متعلقہ نوشتہ)

کمپنی لاء (Company) : سادہ الفاظ میں کمپنی ان متعدد اشخاص کی شراکت کو کہتے ہیں جو باہمی طور پر کسی کاروبار یا تجارت کرنے کی غرض سے ایک مشترکہ سرمائے میں رقم جمع کرتے ہیں اور اس مشترکہ سرمائے کو اس کاروبار یا تجارت میں لگاتے ہیں اور اس تجارت یا کاروبار کے نفع و نقصان میں شریک رہتے ہیں۔ اس مشترکہ سرمائے کو کمپنی کا اصل سرمایہ کہتے ہیں اور وہ اشخاص جو اس طرح رقم لگاتے ہیں یا وہ اشخاص جو اس رقم کے مالک ہوتے ہیں وہ کمپنی کے رکن کہلاتے ہیں۔ اصل سرمایہ کے تناسب سے ممبر کا جو حق قرار پاتا ہے اسے کمپنی لاء کی اصطلاح میں اس ممبر کا حصہ کہتے ہیں۔ یہ حصص بعض مختص پابندیوں کے ساتھ قابل منتقلی ہیں۔ ایک کمپنی اس وقت قایم ہوتی ہے جب اسے کمپنی لاء کے تحت رجسٹر کیا جاتا ہے اور عملاً اس کا وجود اس تاریخ سے عمل میں آتا ہے جو تاریخ

رجسٹریشن کے سرٹیفکیٹ میں درج کی جاتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر دس یا اس سے زیادہ اشخاص مل کر بینک کا کاروبار کر رہے ہوں یا بیس یا اس سے زیادہ اشخاص مل کر اور کوئی دوسرا کاروبار کر رہے ہوں تو ان کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کمپنی لاء کے تحت رجسٹری کرائیں ورنہ ان اشخاص کی یہ شراکت غیر قانونی قرار پائے گی۔ لیکن پبلک کمپنی کی صورت میں سات یا سات سے زیادہ اشخاص مل کر یا پرائیوٹ کمپنی کی صورت میں دو یا دو سے زیادہ اشخاص مل کر کسی قانونی غرض کی عمل آوری کے لیے بھی شراکت بنا سکتے ہیں اور کمپنی لاء کے تحت اس انجمن کی رجسٹری کروا سکتے ہیں۔

کمشنر بلدیہ : میونسپل کارپوریشن جو بلدیہ کے نظم و نسق کے لیے ذمہ دار ہوتی ہے اس کے چیف ایکزیکٹو افسر کو عام طور پر کمشنر کہا جاتا ہے۔ کمشنر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ شہر کے نظم و نسق کی تمام عملی سرگرمیوں پر نگرانی رکھے اور میونسپل کارپوریشن کے ریزولیشنز کی تعمیل کرے۔ میونسپل کمشنر نظم و نسق کے تعلق سے اہم اختیارات رکھتا ہے۔ عوامی بہبود سے متعلق اس کی تجاویز کو منتخب ممبروں کی کمیٹیاں ہی رد کر سکتی ہیں۔ شہری محصولات کی وصولی کی تمام تر ذمہ داری کمشنر پر رہتی ہے۔ کمشنر کی مدد کے لیے ایک پورا عملہ ہوتا ہے۔ اس طرح تعمیری کاموں کی تکمیل کی نگرانی بھی بڑی حد تک کمشنر سے متعلق ہے لیکن بنیادی طور پر شہر یا ریاست میں تعمیری ترقی کی ذمہ داری متعلقہ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی ہو گئی ہے جو ایک خود مختار ادارہ ہوتی ہے۔ ہر نچ کی کارکردگی کی نگرانی کے لیے ماہرین کمشنر کی مدد کرتے ہیں، جن کا انتخاب اور تقرر سلیکشن کمیٹیاں کرتی ہیں۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ : ہر پنج سالہ منصوبہ میں دیہی زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقیاتی اسکیموں کی طرف کافی توجہ دی گئی۔ اس منصوبہ بندی میں زراعت اور کاشتکاری میں جدید طریقے اپنانے پر زور دیا گیا تاکہ اناج کی پیداوار اور دیگر خام اشیاء کے حصول میں ملک خود کفیل ہو سکے۔ بھاری صنعتوں کے بر خلاف زراعت کی ترقی کا انحصار مقامی ماہرین زراعت اور مقامی لیڈروں کی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ زراعتی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک گیر رابطے بنانے کے لیے 1952 میں کیمونٹی ڈیولپمنٹ کی تحریک شروع کی گئی۔ کیمونٹی تحریک نے مقامی باشندوں کی عام ترقی کو ملک کی ترقی سے ایک حد تک جوڑ دیا۔ اس تحریک کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ مقامی ترقی کی تحریک کی ابتداء مقامی لوگوں کی کوششوں سے ہونی چاہیے، نہ کہ کسی بیرونی ذریعہ سے۔ مقامی آبادی ہی کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے کہ مقامی ضروریات کیا ہیں اور وہ کون سے مقامی وسائل ہیں جن سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ مالیہ کے فراہمی کے لیے بھی مقامی لوگ ہی مؤثر تدابیر اپنا سکتے ہیں۔ کیمونٹی ڈیولپمنٹ تحریک کا یہ بھی مقصد تھا کہ مقامی لوگ اپنی ضروریات کا اچھی طرح جائزہ لیں اور ان کی تکمیل کے لیے دلچسپی سے کام کریں تاکہ تحریک کے پھیلاؤ کے لیے مضبوط اساس مل سکے۔ اس تحریک کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مقامی لیبر کے لیے مزدوری کے مواقع مہیا کیے جائیں جو عموماً بیکاری کی زندگی گزارتے ہیں تاکہ ایسا طبقہ پنپ سکے جو پورے سماج کے لیے مفید ہو۔ اس کے علاوہ یہ جذبہ بھی پیدا ہو کہ مقامی لوگ اپنے موضع یا علاقے کی منصوبہ بندی کی اسکیموں کی تکمیل میں زیادہ جوش و خروش سے حصہ لیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب کوئی منصوبہ کسی خاص مقام کے لیے ہو اور اس منصوبے کی نوعیت بالکل مقامی ہو یعنی اس کے ذریعہ صرف وہاں کے مقامی باشندوں کو آسایش اور سہولیات مہیا ہو سکتی ہوں تو یقیناً وہاں کے باشندوں کو ایسی اسکیموں سے دلچسپی ہوگی۔ کیمونٹی ڈیولپمنٹ کارگزاریوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ سلسلہ ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کے اختیار کرنے سے مقامی لوگ منصوبہ بندی کے نظریے سے اپنی ضروریات کی تکمیل پر غور کریں گے۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیمونٹی ڈیولپمنٹ تحریک کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں سرکاری عہدہ داروں کے تحت کیمونٹی ڈیولپمنٹ کو رکھا گیا اور ہر بلاک کے لیے ایک بلاک ڈیولپمنٹ افسر مقرر کیا گیا۔

کمیونزم اور کمیونسٹ تحریک (Communism and Communist Movement) : کمیونسٹ سماج کی عام طور پر اس طرح تعریف کی جاتی ہے کہ وہ سماج میں ذرائع پیداوار و دولت پر انفرادی ملکیت نہیں بلکہ پورے سماج کی اجتماعی ملکیت قائم کرتا ہے۔ جس میں ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے اور اسے سماج سے ضرورت کے مطابق چیزیں مل جاتی ہیں۔

اس قسم کے کمیونسٹ سماج کی ابتدائی شکلیں قدیم زمانہ میں اکثر ملتی ہیں مثلاً ہزاروں سال پہلے میکسیکو میں جوانڈین باشندوں کی بستیاں تھیں ان میں سب مل کر کاشت کرتے تھے اور پھر پیداوار آپس میں

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ضرورت کے لحاظ سے بانٹ لی جاتی تھی اس قسم کے سماج دنیا کے بعض دوسرے حصوں میں بھی پائے جاتے تھے۔

جب ذاتی ملکیت کا طریقہ رائج ہونا شروع ہوا تو اس کے ساتھ معاشی نابرابری امیری اور غریبی بھی آئی اور اس کے ساتھ لوگ ایسی دنیا کے بارے میں سوچنے لگے جس میں یہ نابرابری اور امیری غریبی نہ ہو۔ اس قسم کے خیالات قدیم یونان میں بھی ملتے ہیں۔ افلاطون نے اپنی تصنیف "ریپبلک" میں ایک ایسے سماج کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں جائداد پر انفرادی نہیں بلکہ مشترکہ ملکیت ہو۔ نو افلاطونیوں نے بھی جائداد کی مشترکہ ملکیت پر زور دیا ہے۔ بعض یہودی اور ابتدائی عیسائی کیمونٹیوں میں بھی یہ خیال بہت مقبول تھا۔ ان مذہبی گروہوں کی دلیل یہ تھی کہ جائداد پر انفرادی کنٹرول غیر اخلاقی اور مذہب کے خلاف ہے۔ خدا نے یہ کائنات سب کے لیے بنائی ہے اور سب کو اس سے استفادہ کا یکساں حق حاصل ہے۔

جاگیردارانہ نظام میں ہندستان، چین وغیرہ میں دیہات کی زندگی خود کفیل ہوتی تھی۔ سب مل کر زمین پر کاشت کرتے اور پیداوار کا ایک حصہ جاگیردار کے لیے نکال کر بقیہ حصہ کو نہ صرف کاشت کرنے والوں بلکہ اور دوسرے پیشہ وروں میں بھی تقسیم کردیا جاتا تھا۔ خود یورپ میں جہاں زمین جاگیروں میں بٹی ہوئی تھی، نچلی سطح پر کسان مل کر کاشت کرنے اور لگان نکالنے کے بعد پیداوار تقسیم کر لیا کرتے تھے چنانچہ جب زراعت میں سرمایہ داری داخل ہونے لگی تو جگہ جگہ اس کی مخالفت میں کسانوں نے بغاوتیں کیں۔ اس قسم کی بغاوتیں چودھویں صدی میں انگلستان میں اور سولہویں صدی میں جرمنی میں بھی برپا ہوئیں۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں اس کے بارے میں علمی طور پر بھی کافی مباحثہ رہا اور کتابیں لکھی گئیں۔ سر تھامس مور نے اپنی تصنیف "یوٹوپیا" میں ایک ایسے سماج کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں جائداد مشترکہ ملکیت ہوگی۔ اس نے خودغرضی اور بڑھتی ہوئی معاشی انفرادیت کی مذمت کی۔

جدید دور کے آغاز میں کئی ایسے عیسائی گروہ موجود تھے جو ابتدائی دور کے عیسائیوں کی طرح ایک قسم کے کیمونزم کا پرچار کرتے تھے۔ تھامس منزر کی سرکردگی میں اناباپٹسٹ (Anabaptist) نے کسانوں کی بغاوتوں کی رہ نمائی کی تھی۔ اور ان کا نعرہ بھی کیمونزم سے بہت ملتا جلتا تھا چنانچہ جب یہ بغاوتیں ناکام ہوگئیں تو انھیں سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔

17 ویں صدی میں انگلستان کی لیولرز (Levellers) کی تحریک بھی اسی قسم کی تھی بلکہ اس تحریک کے چھوٹے سے گروہ نے زمینوں پر قبضہ کرکے اپنے خیالات کو عملی جامہ بھی پہنانا شروع کیا تھا۔ ان مذہبی تحریکوں میں شریک ہونے والے اکثر لوگ غریب اور پس ماندہ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کا اس جوش و خروش سے اس میں حصہ لینا ایک قدرتی بات تھی۔

جو مذہبی تحریکیں دور اصلاحات (Reformation) میں وجود میں آئیں انھوں نے سرمایہ داری کی ترقی میں مدد کی۔ 18 ویں صدی میں صنعتی انقلاب رونما ہوا تو اس سے سرمایہ داری کو اور تقویت ملی اور اس نے جدید کیمونزم کو بھی جنم دیا۔ نئی صنعتوں میں اجرتیں بہت کم تھیں۔ کام کے گھنٹے بہت زیادہ تھے اور عام حالت بہت خراب تھی اس سے احتجاج کی لہر اٹھنے لگی۔ صنعتی انقلاب ابھی قدم بھی نہیں جما پایا تھا کہ اس زمانہ کے دانش وروں کو سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا احساس ہونے لگا۔ مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے لکھا تھا کہ انسانی مصائب اور باہمی جھگڑوں کی اصل جڑ ذاتی ملکیت کا طریقہ ہے۔ مشہور فلسفی ایمنوول کانٹ نے بھی تقریباً ان ہی الفاظ میں اس کی مذمت کی۔

انقلاب فرانس کے دوران اگرچہ معاشی مساوات کے انقلابی نعروں کو عملی شکل تو نہ مل سکی لیکن انقلابیوں نے مثلاً بابیف (Babeuf) اور اس کے ساتھیوں نے ذاتی ملکیت اور معاشی نابرابری کے خلاف زبردست آواز بلند کی۔ بابیف پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا لیکن اس کے پیداکردہ طبقہ واری شعور کو نہ دبایا جاسکا اور بابوازم (Babouvism) کی تحریک خفیہ طور پر چلتی رہی۔

ایسے زمانہ میں جبکہ ایک طرف صنعتی انقلاب اور اس کے جلو میں سرمایہ دارانہ نظام بڑھنے لگا تو کیمونسٹ تحریک شروع ہوچکی تھی۔ انگلستان میں رابرٹ اون نے مزدور سبھاؤں کی مدد سے ایک طرح کا کیمونسٹ نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس زمانہ میں دانش وروں نے امریکا میں چھوٹی چھوٹی کیمونسٹ کیمونٹیاں قائم کرنے کی کوشش کی۔ فرانس اور اٹلی میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انقلابی تحریکیں ابھرنے لگیں۔ کیمونزم اور سوشلزم کی اصطلاحات ایک ہی معنی میں استعمال ہونے لگیں۔ 1848 میں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس نے اپنا مشہور عالم "کیمونسٹ مینی فیسٹو" شائع کیا۔ (دیکھیے مضامین مارکسزم اور سوشلزم)۔ اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

نے سارے یورپ میں انقلابی تحریکوں کو ایک نیا رخ دیا اور نئی جمعیت دے دی اور مارکس کے نظریات اور خیالات بائیں بازو کی تحریکوں پر چھاگئے۔ سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کا پہلا بین الاقوامی ادارہ قائم ہوا اور اس نے پوری مغربی دنیا کی سوشلسٹ اور کیمونسٹ تحریکوں کی مرکزی طور پر رہ نمائی شروع کی۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں سوشل ڈیماکریٹک پارٹیاں قائم ہوگئیں۔ شروع میں تو یہ مارکس کے مرتب کردہ کیمونسٹ مینی فیسٹو پر چلتی رہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ اس سے دور ہونے لگیں اور انھوں نے اصلاح پسندی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مختلف سوشل ڈیماکریٹک پارٹیوں میں اختلافات بڑھنے لگے۔ بڑا اور نمایاں اختلاف روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں پیدا ہوا جس نے اس تحریک کو بالکل نیا رخ دے دیا۔ یہاں 1903 میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی دو گروہوں میں بٹ گئی۔ جس گروپ کو بالشوک (اکثریت) کہا جاتا ہے اس کی سرکردگی لینن کو حاصل تھی اور اقلیتی گروپ مینشوک (اقلیت) کہلانے لگا اس کے اہم لیڈروں میں ٹراٹسکی بھی تھا۔ لینن اور بالشوک پارٹی کا خیال تھا کہ صرف انقلاب کے ذریعہ اور ہتھیاروں کا سہارا لے کر ہی زار شاہی اور سرمایہ داری کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے اور سوشلزم قائم ہوسکتا ہے۔

1905 میں جب زار روس کو جاپان میں شکست ہوئی اور روس سخت بے چینی کا شکار ہوا تو بالشوک پارٹی نے لینن کی سرکردگی میں انقلاب منظم کیا لیکن یہ ناکام رہا اور کچل دیا گیا۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے دوران جب حالات دوبارہ موافق ہوئے تو بالشویکوں نے لینن کی رہ نمائی میں پھر انقلاب منظم کیا۔ اس مرتبہ یہ انقلاب کامیاب ہوا اور 1917 میں سوویت یونین میں سوشلسٹ نظام قائم ہوگیا۔ بالشوک پارٹی کا نام بدل کر کیمونسٹ پارٹی رکھ دیا گیا۔

جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو یورپ کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں میں اس بات پر سخت اختلاف پیدا ہوگیا کہ اس جنگ کی تائید کی جائے یا نہیں اور اکثر پارٹیوں نے اپنے اپنے ملک کی حکومتوں کی تائید کی لیکن ان سب پارٹیوں میں ایک اقلیت ایسی بھی تھی جو اسے سامراجی جنگ سمجھتی تھی جس کا مقصد دنیا کی نوآبادیوں کی دوبارہ تقسیم تھا اور وہ جنگ کے حالات سے فائدہ اٹھا کر انقلاب برپا کرنا، سرمایہ داری و سامراجیت کا تختہ الٹنا اور سوشلزم قائم کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ان سب اقلیتی گروہوں نے اپنے آپ کو سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں سے الگ کرلیا اور بعد میں یہ سب کیمونسٹ پارٹیاں کہلانے لگیں۔ جنگ میں جرمنی کی شکست کے فوراً بعد جرمن کیمونسٹ پارٹی نے انقلاب منظم کیا لیکن وہ ناکام رہا۔ جنوری 1919 میں ہیلاکن کی سرکردگی میں کیمونسٹ حکومت قائم ہوگئی لیکن بڑے خون خرابے کے بعد وہ بھی ختم ہوگئی۔

سارے یورپ میں جو کیمونسٹ پارٹیاں قائم ہوئی تھیں ان سب کی ایک کانفرنس لینن کی رہ نمائی میں منعقد ہوئی جس میں کیمونسٹ تحریک کی تیسری انٹر نیشنل کومنٹرن کی بنیاد پڑی۔ اور آئندہ سے یہی ادارہ ساری دنیا کی کیمونسٹ تحریکوں اور پارٹیوں کا بین الاقوامی مرکز بن گیا۔ اس کا مقصد ساری دنیا کے مزدوروں کو متحد اور منظم کرنا تھا تاکہ ایک ایسا سوشلسٹ سماج قائم ہوسکے جس میں کوئی لوٹ کھسوٹ اور طبقہ نہ ہو۔ روسی انقلاب اور وہاں جس طرح کا نظام قائم کیا گیا تھا اسے ماڈل قرار دیا گیا اور اس نئی سوشلسٹ حکومت کی حفاظت تمام کیمونسٹوں کا فرض قرار پایا۔ کیمونسٹ انٹر نیشنل کی مدد اور رہ نمائی میں نہ صرف یورپ میں کیمونسٹ تحریک منظم کی گئی بلکہ امریکا، ایشیا اور افریقہ میں بھی اسے پھیلانے کی طرف قدم اٹھائے گئے۔ ان ممالک میں آزادی، خود مختاری اور سامراج کا خاتمہ اس کے اہم مقاصد قرار پائے اور اس کے لیے وسیع تر اتحاد کا طریقہ اپنایا گیا۔

روس میں انقلاب کی کامیابی اور جرمنی اور آسٹریا کے انقلابات نے ساری دنیا کی سامراجی اور سرمایہ دار مملکتوں میں شدید خوف پیدا کردیا۔ انھوں نے نہ صرف اس کے خلاف پرچار کی زبردست مہم شروع کی بلکہ اسے کچلنے اور دبانے پر بھی بڑا زور صرف کیا۔ لینن کی وفات کے بعد روس میں ٹراٹسکی کی پالیسی کو شکست ہوئی اور اسٹالن کی سرکردگی میں کیمونسٹ تحریک کا ایک اہم مقصد سوویت یونین میں سوشلزم کو کامیاب بنانا اور اس کی حفاظت کرنا ٹھہرا۔ یورپ میں ابتدائی انقلابوں کی ناکامی کے بعد کوئی نیا انقلاب رونما نہیں ہوا۔ لیکن مشرق میں 1921 میں چینی کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد پڑی۔ شروع میں اس کا کومنتانگ کے رہ نما چیانگ کائی شیک کے ساتھ تعاون رہا لیکن جب کیمونسٹوں کا اثر تیزی سے بڑھنے لگا تو چیانگ نے انھیں دبانے کی کوشش کی اور خانہ جنگی شروع ہوگئی جو 1949 میں کیمونسٹ انقلاب کی فتح پر ختم ہوئی۔

1930 کے بعد جب یورپ میں فاشزم کا زور بڑھنے لگا اور پھر ہٹلر برسراقتدار آیا تو یورپ کی کیمونسٹ پارٹیوں نے سوشلسٹوں اور دوسری

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فاشزم مخالف طاقتوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کی مہم شروع کردیں۔ فرانس میں کچھ عرصہ کے لیے متحدہ محاذ کی ایک حکومت قائم ہوگئی۔ اگرچہ اس کی پالیسی کا رخ دوسری عالمی یونین کی طرف پھیر دینے میں زیادہ دلچسپی تھی لیکن جب ہٹلر نے یورپ پر قبضہ کرلیا تو دوسری عالم گیر جنگ چھڑ گئی اور سوویت یونین، برطانیہ، امریکا اور ڈی گال کی جلاوطن حکومت کا متحدہ محاذ قائم ہوگیا اور ہٹلر کو آخرکار شکست ہوئی تو ہٹلر کے خلاف طاقتوں کو منظم کرنے اور اس کے خلاف گوریلا لڑائیوں میں یورپ کے کیمونسٹوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس جنگ میں سوویت یونین کا بھی اہم حصہ رہا تھا۔ اس لیے جنگ کے بعد یورپ کے تقریباً ہر ملک میں کیمونسٹ پارٹیاں ایک بڑی طاقت بن کر ابھریں۔ اٹلی، فرانس میں تو انھیں حکومت میں بھی شامل کیا گیا۔ جن ملکوں میں مثلاً پولینڈ، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگیری وغیرہ میں سوویت یونین کی فاتح فوجیں پہنچ گئی تھیں وہاں سرمایہ داری کا خاتمہ کردیا گیا اور کیمونسٹ پارٹیوں کی سرکردگی میں سوشلسٹ حکومتیں قائم ہوگئیں۔ جرمنی کا وہ حصہ جو سوویت کنٹرول میں آیا وہاں بھی سوشلسٹ نظام نافذ کردیا گیا۔ اس طرح شمالی کوریا بھی ایک سوشلسٹ ملک بن گیا۔ اسی کے ساتھ ویت نام، ملایا، لاوس، کمپوچیا وغیرہ میں بھی کیمونسٹ پارٹیوں کی سرکردگی میں آزادی کی جنگ شروع ہوگئی اور امریکا کی مداخلت کے باوجود ویت نام، لاوس اور کمپوچیا میں سوشلسٹ حکومتیں قائم ہوگئیں۔

1953 میں استالن کے انتقال اور اس کے بعد خروشچیف کے برسر اقتدار آنے کے بعد 1957 سے سوویت یونین اور چین کی کیمونسٹ پارٹیوں میں اختلافات بڑھنے لگے اور بین الاقوامی سطح پر بھی وہ ایک دوسرے کی کھلے بندوں مخالفت کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر ساری دنیا کی کیمونسٹ تحریک پر پڑا اور بعض ملکوں میں کیمونسٹ پارٹیاں دو حصوں میں بٹ گئیں۔ حالانکہ چین کی حامی پارٹیوں کی تعداد بہت کم رہی۔

ان تمام اختلافات اور تنازعات کے باوجود کیمونسٹ تحریک بنیادی طور پر مارکس اینگلز اور لینن کی تعلیمات کی پیرو رہی اور یورپ ایشیا اور افریقہ کے اکثر ملکوں میں اس کا اثر برابر بڑھتا رہا۔ یورپ میں فرانس، اٹلی وغیرہ میں یہ دوسرے نمبر کی پارٹی رہی۔ لاطینی امریکا میں اس نے فوجی ڈکٹیٹرشاہیاں ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا اور افریقہ کے نوآزاد ملکوں میں جہاں سرمایہ داروں نے ابھی جنم بھی نہیں لیا تھا سوشلزم کو اپنا لیا۔

ساری دنیا میں کیمونسٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد کئی کروڑ تک پہنچ گئی۔

کیمونسٹ بین الاقوامیہ (Communist International):

تیسری بین الاقوامیہ کا دوسرا نام کیمونسٹ بین الاقوامیہ ہے۔ اس کا مخفف کومنٹرن (Comintern) ہے۔ کیمونسٹ بین الاقوامیہ قومی کیمونسٹ جماعتوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم تھی جو 1919 میں عمل میں آئی تھی جس کا اعلانیہ مقصد عالمی انقلاب کی راہ ہموار کرنا تھا۔ کیمونسٹوں کی اسی تحریک پر سوویت یونین کا کنٹرول تھا۔ دوسری بین الاقوامیہ، جو مختلف ملکوں کی اشتراکی اور بائیں بازو کی جماعتوں کی تنظیم تھی پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے پر ختم ہوگئی لیکن یہی تیسری بین الاقوامیہ کے قیام کا موجب بن گئی۔ جنگ عظیم کے موقع پر اشتراکی جماعتوں کی اکثریت نے دائیں بازو کو یہ اختیار دے دیا کہ اگر وہ چاہیں تو جنگ کے بارے میں دشمن کی جارحیت کے خلاف اپنی متعلقہ قومی حکومت کی حمایت کرسکتی ہیں۔ اگرچہ یہ اشتراکی مفادات کے خلاف تھا۔ بین الاقوامیہ کا بنیادی مقصد دائیں بازو کی قوم پرستی کے عمل کو واضح کرنا اور عالمی امن کے پرچم تلے دوسری بین الاقوامیہ کی تشکیل نو کرنا تھا۔ چنانچہ بائیں بازو کے گروپ نے روس کے لیڈر لینن کی قیادت میں قوم پرستی اور امن پسندی کے تصور کو مسترد کردیا اور قومی جنگ کو طبقاتی جنگ میں تبدیل کردینے پر زور دیا۔

1915 میں لینن نے شہری امن کے بجائے شہری جنگ کی تجویز پیش کی اور اس کے لیے مزدوروں اور فوجیوں کے ذریعہ پروپیگنڈا کرانے پر زور دیا۔ دو سال بعد روس میں لینن اقتدار پر قابض ہوگیا اور 1919 میں ماسکو میں اس نے کومنٹرن کا پہلا اجلاس طلب کیا تاکہ دوسری بین الاقوامیہ کی کوششوں کا جائزہ لیا جاسکے۔ اس اجلاس میں محض 19 مندوبین اور چند غیر روسی کیمونسٹوں نے شرکت کی۔ ماسکو ہی میں دوسرا اجلاس 1920 میں منعقد ہوا جس میں 37 ملکوں کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں لینن نے کیمونسٹ بین الاقوامیہ کا ممبر بننے کے لیے 21 نکاتی شرائط پیش کیں۔ یہ نکات کومنٹرن کا ممبر بننے کے لیے شرط اولیں کا درجہ رکھتے تھے اور اس کی روشنی میں تمام ممبروں کو اپنے ملک کی ساخت کو سوویت یونین کے طرز پر ڈھالنے کی کوشش کرنا تھا۔

کومنٹرن کے نظم و نسق کی ساخت سوویت کیمونسٹ پارٹی کی اس حد تک مماثل تھی کہ اگر کانگریس کا اجلاس نہ ہوتا تو ایک انتظامیہ کمیٹی

کام سرانجام دیتی تھی اور چھوٹی سی میڈیم اعلیٰ مجلس منتظمہ کی حیثیت سے کام کرتی۔ اس طرح دھیرے دھیرے سارے اختیارات ان اعلیٰ شعبوں (عضویات) میں مرکوز ہوکر رہ گئے تھے۔ اور فیصلوں کی عمل آوری بین الاقوامیہ کے تمام ممبر ملکوں پر لازم ہوتی تھی۔ مزید برآں یہ کہ کومنٹرن پر شروع ہی سے سوویت یونین کا غلبہ تھا۔ سوویت یونین کے ذریعہ قائم کی گئی بین الاقوامیہ کے باب میں اس نے یہ طے کیا کہ اس کا صدر دفتر ماسکو میں ہوگا۔ اس وجہ سے سوویت کیونسٹ پارٹی انتظامیہ کے شعبوں میں غیر مناسب نمائندگی کے ذریعہ فیض یاب ہونے لگی اور زیادہ تر بیرونی کیونسٹ دنیا کی پہلی اشتراکی مملکت سے وفاداری کا دم بھرنے لگے۔

تیسری بین الاقوامیہ کا اولین مقصد پوری دنیا میں کیونسٹ انقلاب برپا کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بوژوا جماعتوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دے کر ان سے ہر قسم کے تعاون کی راہ مسدود کردی تھی۔ یہ تحریک بین الاقوامی میدان میں روسی خارجہ پالیسی کی آلہ کار اور اس کے قومی مفادات کے حصول کا ذریعہ تھی۔ اس تحریک پر روسی کیونسٹ جماعتوں کا مکمل کنٹرول تھا اور دوسرے ملکوں میں کومنٹرن کی ممبر جماعتوں کو ماسکو کی ہدایات پر عمل آوری لازمی تھی۔ غیر روسی جماعتوں کے الحاق کے لیے یہ شرط رکھی گئی تھی کہ وہ ٹریڈ یونینوں، مزدوروں اور محنت کشوں کی تنظیموں میں نفوذ حاصل کرکے کیونزم کی تبلیغ کریں۔ کومنٹرن کے ممبروں میں اجرت یافتہ مزدوروں کے علاوہ کسانوں کی تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ اس طرح یہ کسانوں کی تحریک بھی بن گئی۔ اس کے اثرات مشرقی اور تمام نوآبادیاتی ملکوں تک پھیل گئے اور ایک حد تک اس نے پوری استعماریت کے خلاف ایک عظیم جدوجہد کی شکل اختیار کرلی۔

لینن کے انتقال اور دوسری جنگ عظیم چھڑجانے کے بعد تیسری بین الاقوامیہ زوال پذیر ہوگئی اور پھر یہ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکی چنانچہ مئی 1943 میں ماسکو میں ایک اجلاس کے دوران تمام ملکوں کی کیونسٹ جماعتوں کے متفقہ فیصلہ سے اسے باضابطہ طور پر تحلیل کردیا گیا۔

کنڈر گارٹن (Kindergarten): کنڈرگارٹن جرمن لفظ ہے جس کے معنی "بچوں کا باغ" ہے۔ یہ لفظ اب عام طور پر چار اور چھ سال کے درمیان کے بچوں کے اسکول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس میں بچوں کی جذباتی اور روحانی کیفیت پر زور دیا جاتا ہے۔ انھیں خود سیکھنے کی کافی آزادی دی جاتی ہے۔ استاد اپنے خیالات مسلط نہیں کرتا۔ کھیلوں کے ذریعہ اپنے آپ کو سمجھنے اور ترقی کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔ اس قسم کے اسکول کا خیال شروع 19 ویں صدی میں پیدا ہوا اور اس کی ترقی اور ارتقا میں مشہور ماہرین تعلیم مثلاً رابرٹ اوون (Robert Awen) (برطانیہ)، پستالوزی (سوئٹزرلینڈ)، فروبل (جرمنی) اور ماریا ماھیسوری (اٹلی) کا خاص حصہ ہے۔

انگلستان میں یہ صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے۔ اس لیے کہ بچوں سے کام لینے پر پابندی تھی اور ماں باپ اور بڑے بھائی بہن سب کارخانوں میں طویل مدت کے لیے کام کرتے تھے اور اس لیے چھوٹے بچوں کی تعلیم اور دیکھ بھال کے لیے ایک ادارے کی سخت ضرورت تھی۔ اس قسم کا سب سے پہلا اسکول سوتی کارخانے کے مالک رابرٹ اوون نے اسکاٹ لینڈ میں 1816 میں اپنے مزدوروں کے بچوں کے لیے قایم کیا تھا۔ اوون کا خیال تھا کہ یہ صاف ستھرے ہونے چاہئیں اور ان میں بچوں کے لیے ایسی سرگرمیاں ہونی چاہئیں جن میں انھیں دلچسپی ہو۔ بعد میں انگلستان میں بچوں کے جو اسکول قایم ہوئے ان میں سبق رٹانے اور اخلاقی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اور بچوں کو آزادی نہیں ملتی تھی۔ 1836 میں آخر کار پستالوزی کے اصولوں پر استادوں کے تربیتی اسکول قایم کیے گئے۔

1837 میں بلیکن برگ (جرمنی) میں فروبل نے کنڈر گارٹن کے نام سے اسکول قایم کیا جن کا مقصد چھوٹے بچوں کو کھیل کے ذریعہ تعلیم دینا تھا۔ وہ ان کے اطراف ایسا ماحول پیدا کرنا چاہتا تھا جیسا کہ ایک باغ میں ایک درخت کے لیے آزادانہ طور پر بڑھنے کے لیے ہوتا ہے۔ فروبل کے انتقال کے 25 سال بعد یورپ کے اکثر ملکوں اور امریکا اور جاپان میں ایسے اسکول قایم ہوئے اور امریکا میں کنڈرگارٹن نظام تعلیم کی پہلی سیڑھی بن گیا۔

کنز العمال: یہ فن حدیث کی ایک کتاب کا نام ہے۔ اس کے مصنف شیخ علاؤ الدین علی بن حسام الدین عبدالملک بن قاضی خان متقی ہندی تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق جونپور سے تھا مگر ان کی ولادت برہان پور میں 885ھ میں ہوئی تھی۔ بعد میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے اور وہیں نوے سال کی عمر میں 975ھ / 1567ء میں وفات ہوئی تھی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

شیخ علی متقی جس پائے کے عالم تھے اس پائے کے صوفی بھی تھے۔ ان کا شمار اولیاء اللہ اور اکابر صوفیہ میں ہوتا ہے۔ فارسی اور عربی میں سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان میں کنزالعمال بہت مشہور اور ضخیم ہے۔ اس میں دراصل علامہ سیوطی (911ھ/ 1505ء) کی تصنیف جمع الجوامع کی فقہی ابواب پر مرتب و مدون کیا گیا ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ انھوں نے احادیث کی اس سے زیادہ مفید اور جامع کتاب نہیں دیکھی اس لیے پہلے علامہ سیوطی کی جامع صغیر اور اس کے زوائد مرتب کیے اور اس کا نام منہج العمال فی سنن الاقوال رکھا۔ اس کے بعد قسم اول کے باقی اقوال کی تبویب یافتہ غایۃ العمال فی سنن الاقوال کے نام سے تیسرے مجموعہ مستدرک الاقوال میں قسم دوئم کے افعال کی جمع و ترتیب کی آخر میں علامہ ابن اثیر کی جامع الاصول کے طرز پر ان سب کا ایک مجموعہ کنز العمال فی سنن الاقوال کے نام سے مرتب کیا۔

کنزالعمال میں 46184 حدیثیں شامل ہیں۔ مصنف نے سیوطی کی کتاب کی تبویب اور ترتیب نہایت قابلیت اور بڑی خوبی سے کی تھی اس بنا پر شیخ ابوالحسن بکری شافعی کہتے تھے کہ سیوطی نے جمع الجوامع لکھ کر دنیا والوں پر احسان کیا تھا اور علی متقی نے اس کو فقہی ابواب پر مرتب کرکے خود سیوطی پر احسان کیا ہے۔ ماکنز العمال دائرۃ المعارف حیدر آباد سے پہلے بڑے سائز پر چھپی تھی حال ہی میں وہیں سے اس کے چند اجزا دوبارہ شائع ہوئے ہیں۔ کنزالعمال کا مختصر مطبع میمنۃ مصر سے سند احمد بن حنبل کے حاشیے پر شائع ہوا ہے۔

کنزرویٹیو پارٹی (Conservative Party) : یہ برطانیہ کی ایک سیاسی جماعت ہے جس کی پیش رو انیسویں صدی کی توری پارٹی تھی۔ اس پارٹی کے افراد عموماً قدامت پسند لوگ ہیں جو اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں کنزرویٹیو پارٹی کے اراکین نجی کاروبار کی آزادی اور موجودہ اداروں کو قائم رکھنے کے خواہاں ہیں۔ اس پارٹی کے ارکان میں عموماً اونچے طبقہ، اونچے درمیانی طبقہ، بیکار، کاروباری طبقہ اور متوسط پیشہ ور طبقے سے متعلق افراد شامل ہیں۔ تاہم مزدور طبقہ سے متعلق افراد بھی اس جماعت کے حامی ہیں۔

درمیانی چند وقفوں کو چھوڑ کر کنزرویٹو پارٹی 1922 سے 1946 تک برسر اقتدار رہی۔ 1946 کے عام انتخابات میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم 1951 سے 1964 تک یہ متواتر برسر اقتدار رہی۔ جون 1970 کے انتخابات میں ایڈورڈ ہیتھ کی قیادت میں یہ پارٹی پھر برسر اقتدار آگئی لیکن فروری 1974 میں الیکشن ہار گئی۔ اس کے بعد مسز مارگریٹ تھیچر اس کی قائد منتخب ہوئیں۔ تاہم 1979 سے اپریل 1997 تک کنزرویٹو پارٹی برسر اقتدار رہی۔ مارگریٹ تھیچر وزیراعظم منتخب ہوتی رہیں لیکن بعدازاں انھیں جان میجر کو اقتدار منتقل کرنا پڑا جنھیں پارٹی نے قائد تسلیم کرلیا تھا۔

یکم مئی 1997 کو اٹھارہ سال تک اقتدار میں رہنے کے بعد کنزرویٹو پارٹی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے انتخابات میں 435 میں سے کل 165 نشستیں حاصل ہوئیں جو پچانوے سال کی تاریخ میں سب سے کم تھیں اور 30.7 فیصد ووٹ حاصل ہوئے جو 1832 کے بعد سب سے کم فیصد تھا۔ اسکاٹ لینڈ اور ویلس سے اس کا ایک بھی امیدوار کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے سات وزراء اپنے اپنے مقامی حلقہ ہائے انتخاب میں شکست کھا گئے۔ بیسویں صدی میں یہ تعداد سب سے زیادہ تھی۔

دراصل وزیراعظم جان میجر کی حکومت "بلیک ویڈنس ڈے" کے صدمہ سے کبھی نہیں ابھر سکی۔ جب 16 ستمبر 1992 کو یورپی زرمبادلہ کی شرح کے مطابق پونڈ کی قیمت کو کم کرنا پڑا تھا اور لوگوں پر نئے نئے ٹیکسوں کا بوجھ ڈالنا پڑا تھا۔ انتخابی مہم میں کنزرویٹو پارٹی کو یورپی یونین کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات کے موضوع پر اختلافات کا سامنا کرنا پڑا اور انفرادی طور پر ملوث پارٹی کے رہنماؤں کو بدعنوانیوں کی وضاحت کرنا دشوار ہوگیا۔

کوتوالی کی انسدادی کارروائی : ہر عہدہ دار کوتوالی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ جرم قابل دست اندازی کے انسداد کی کارروائی کرے اور اگر انسداد کسی شخص کو گرفتار کرنے کے بغیر نہ ہوسکے تو اس کو گرفتار کرے اور بصورت ضرورت اپنے بالادست عہدہ دار کو اطلاع کرے۔ ہر عہدہ دار کوتوالی کو اس کا اختیار ہوگا کہ جب کوئی شخص اس کے روبرو کسی سرکاری جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کو نقصان پہنچانے کا اقدام کرے تو وہ اس کے اس فعل میں دست اندازی کرے۔ جب کسی عہدہ دار کوتوالی منتظم تھانہ کو یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ اس کے علاقہ کے اندر کسی مقام میں جھوٹے باٹ پیمانہ جات یا آلات پیمائش رکھے ہیں تو وہ بلا حکم نامہ اس مقام میں بغرض معائنہ یا تلاشی داخل ہوسکتا ہے۔ اگر جھوٹے پیمانہ جات یا باٹ

یا آلات وزن کشی دستیاب ہوں تو وہ ان کو اپنے قبضے میں لے سکتا ہے۔

کوثر: یہ لفظ کثیر کا مبالغہ ہے اور کثر سے بنا ہے جس کے معنی کثرت، زیادتی اور دولت و ثروت کے ہیں۔ پس کوثر کے معنی یہ ہوئے کہ بڑی کثرت، برکت اور ثروت والا۔ اسی لیے جو آدمی زیادہ سخی اور فیاض ہوتا ہے اس کو بھی کوثر کہتے ہیں۔

قرآن مجید کی ایک سورہ کا نام کوثر ہے اس سورہ میں ایک جگہ اس کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی مراد کی تشریح میں علما سے متعدد اقوال منقول ہیں۔

(1) سب سے مشہور قول یہ ہے کہ اس سے جنت کی ایک نہر مراد ہے جس کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا اور دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔

(2) دوسرا قول یہ ہے کہ کوثر جنت کے ایک حوض کا نام ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آنحضرت صلعم کو عطا کرے گا۔

(3) اس سے قرآن نبوت اسلام حکمت خانہ کعبہ اور شفاعت نبوی وغیرہ مراد لیے گئے ہیں۔

(4) ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے خیر کثیر مراد ہے گویا یہ لفظ عام ہے یعنی آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں جو انعامات بخشے ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔

کورٹ آف انٹرنیشنل جسٹس (Court of International Justice)

کورٹ آف انٹرنیشنل جسٹس کا اجلاس ہیگ میں ہوتا تھا۔ 1945 میں اس کے فرائض نئے قایم شدہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس (International Court of Justice) کو منتقل کیے گئے جو اقوام متحدہ کے منشور (Charter of United Nations) کے ذریعہ قایم کیا گیا۔ یہ کورٹ لیگ آف نیشن (League of Nations) کے دفعہ نمبر 14- کے تحت قایم کیا گیا تھا۔ یہ عدالت دو ملکوں کے درمیان ایسی نزاع کے تصفیے کے لیے قایم کی گئی جو اپنی مرضی سے اس عدالت میں رجوع کریں۔ اس کے علاوہ یہ عدالت مشاورت (Advisory Opinion) طور پر اپنی رائے بھی ان امور کے متعلق دینے کی مجاز ہے جو اسمبلی یا کونسل کی جانب سے اس کورٹ میں رجوع کریں۔ اس کورٹ کے فرائض ثالثی یا سفارشی (Recommendatory) نوعیت کے نہیں ہیں۔ اس عدالت میں ابتدا میں گیارہ جج تھے اور چار ڈپٹی جج کسی قومیت کے ہوسکتے ہیں صرف شرط یہ ہے کہ ایک ملک سے صرف ایک جج مقرر کیا جائے۔ غیر جانب دارانہ تصفیے کی خاطر جج کی تنخواہ بھی مقرر ہے مگر جب تک وہ ہیگ (Hague) کے جج رہتے ہیں انھیں کوئی اور دوسرا قانونی کام تفویض نہیں کیا جاتا۔ اس عدالت نے متعدد فیصلے کیے ہیں اور کئی امور پر مشاورتی رائے دی ہے۔

کولمبو منصوبہ (Colombo Plan)

جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کی اقتصادی ترقی کے لیے کولمبو منصوبہ شری لنکا کی راجدھانی کولمبو میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس منعقدہ جنوری 1950 میں وضع کیا گیا۔ ابتدا میں یہ منصوبہ محض نو آزاد ایشیائی ممالک کو محیط تھا لیکن بعد ازاں اس میں جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک اور ریاستہائے متحدہ امریکا بھی شامل ہوگئے۔ اس طرح یہ دولت مشترکہ کی 7 اقوام کے گروپ سے بڑھ کر 24 ملکوں کی تنظیم بن گیا۔

دراصل ایشیائی ممالک ناقص تغذیہ کا شکار تھے اور صنعت کاری میں پسماندہ اور جدید ترین پیداوار کے طریقوں سے بہت کم واقف تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ان کی آبادی میں تو اضافہ ہوا لیکن خوراک کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی گئی۔ اسی لیے دولتِ مشترکہ کے ملکوں نے اس علاقہ کی حالات بہتر بنانے کی غرض سے یہ عملی پروگرام شروع کیا۔ کولمبو منصوبہ کی پہلی مشاورتی کمیٹی نے یہ طے کیا تھا کہ ان ممالک میں موجودہ اور مطلوبہ وسائل کا تخمینہ کیا جائے، اس علاقہ کے ترقیاتی مسائل کی سمت دنیا کی توجہ مبذول کرائی جائے اور ایک ایسا طائق کار وضع کیا جائے جو مقامی ملکوں میں رہنے والوں کا معیار زندگی بلند کرنے میں مدد دینے کے لیے بین الاقوامی تعاون کو وسعت دے سکے۔ اس منصوبہ کے مقاصد میں مقامی سطح پر ترقیاتی ضرورتوں کے سلسلے میں بحث و مباحثہ کے لیے ایک فورم فراہم کرنا، تکنیکی تعاون کے لیے عطیات دہندہ اور عطیات کنندہ ارکان کی شمولیت کا دائرہ وسیع کرنا تاکہ ترقیاتی مدد بآسانی میسر آسکے اور ممبر ملکوں کے ترقیاتی پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ ابتدا میں یہ منصوبہ چھے سال کو محیط تھا۔ پھر وقتاً فوقتاً اس کی میعاد میں توسیع کی جاتی رہی لیکن 1980 میں مشاورتی کمیٹی نے اسے غیر معینہ مدت کے لیے وسعت دے دی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کولبو منصوبہ میں اس وقت افغانستان، آسٹریلیا، بنگلہ دیش، بھوٹان، کمبوچیا، جزائر فجی، ہندستان، انڈونیشیا، اسلامی جمہوریہ ایران، جاپان، جنوبی کوریا، عوامی جمہوریہ لاؤس، ملیشیا، مالدیپ، میانمار، نیپال، نیوزی لینڈ، پاکستان، پپوانیو گنی، فلپائن، سنگاپور، سری لنکا، تھائی لینڈ اور ریاستہائے متحدہ امریکا شامل ہیں۔

مشاورتی کمیٹی کولبو منصوبہ کی اعلیٰ ترین پالیسی ساز کمیٹی ہے جو سبھی ممبر ملکوں پر مشتمل ہے۔ اس کا اجلاس ہر دوسرے سال منعقد ہوتا ہے تاکہ ارکان کی اقتصادی، سماجی ترقی کا جائزہ لیا جاسکے، تکنیکی تعاون سے متعلق پروگراموں پر تبادلہ خیال ممکن ہوسکے اور منصوبہ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاسکے۔ کولبو منصوبہ کونسل ہر رکن ملک کی نمائندگی کرتی ہے اور سال میں کئی بار اپنے اجلاس منعقد کرتی ہے جن میں ترقیاتی معاملات کا تشخص عمل میں آتا ہے، آئندہ اقدامات کے لیے سفارش کی جاتی ہے اور ان کی عمل آوری کا تیقن کیا جاتا ہے۔ منصوبوں کے لیے مالیات کی فراہمی متعلقہ ملکوں، دولت مشترکہ کی حکومتوں، ریاستہائے متحدہ امریکا اور عالمی بینک کرتے ہیں۔

کولبو منصوبہ کا صدر دفتر کولبو (سری لنکا) میں واقع ہے۔

کولن ضابطہ درجہ بندی (Colon Classification) :

کتب خانہ میں کتابیں رکھنے کے لیے ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مطلوبہ کتاب کی تلاش میں غیر ضروری وقت نہ صرف ہو اور استعمال کے بعد کتاب اپنی متعین جگہ پر واپس رکھی جاسکے۔ یہ نظام کسی ایک ضابطہ درجہ بندی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک کتابیں اپنے نفس مضمون کے مطابق رکھی جانے کے بجائے علوم کی فلسفیانہ تقسیم کے مطابق بنے خانوں میں رکھ دی جاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی جگہ بدلتی رہتی تھی۔ کتابوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر انیسویں صدی کے نصف آخر میں کتابوں کی درجہ بندی ان کے نفس مضمون کے مطابق کرنے کے لیے کئی ضابطے وجود میں آئے۔ ان میں ڈیوی ڈیسمل ضابطہ جو 1876 میں شائع ہوا سب سے معروف ہے۔ اس دور کے بیشتر ماہرین نے روایتی مضامین کے پہلی دوسری اور تیسری سطح کے موضوعات کی فہرست کو علامتی نمبر دے کر اپنا ضابطہ وضع کیا اسی لیے انھیں شماری یا طبقاتی ضابطہ درجہ بندی (Enumerative or Hierarchical Scheme) کہا گیا۔ ان ضابطوں پر عامل افراد کو اس وقت مشکل کا سامنا ہوتا ہے جب علمی پیش رفت کے نتیجہ میں نئے مضامین یا ذیلی موضوعات وجود میں آتے ہیں جو درجہ بندی کی فہرست میں نہیں موجود ہوتے اور نہ اس نئے مضمون یا موضوع کے نمبر کے وضع کرنے کا کوئی قاعدہ موجود ہوتا ہے۔

مروج ضابطوں کی اسی قسم کی مشکلات نے ڈاکٹر ایس رنگاناتھن کو ایک ایسا ضابطہ وضع کرنے کی جانب متوجہ کیا جو اس وقت موجود مضامین و موضوعات کی محض فہرست نہ ہو بلکہ ضابطہ ایسے واضح اصول و قواعد پر قائم ہو کہ نئے مضامین و موضوعات کا فکری سطح پر تجزیہ کرکے ان کی جگہ علمی مضامین کے متعین زمروں میں بنائی جاسکے۔ اس طرح جو ضابطہ وجود میں آیا اس کا نام کولن کلاسی فی کیشن پڑا (Colon Classification) اور جو پہلی بار کتابی شکل میں مدراس سے 1933 میں شائع ہوا۔ اپنے ضابطہ کی فکری اساس اور اس کی نمبر سازی کی صلاحیت کو بہتر بنانے کی غرض سے رنگاناتھن ضابطہ میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہے اور 1972 میں اپنے انتقال کے سال تک وہ اس کا ساتواں ایڈیشن مکمل کرچکے تھے۔ لیکن اشاعت کے اعتبار سے چھٹا ترمیم شدہ ایڈیشن ان کی زندگی کا آخری مکمل ایڈیشن ہے (ساتویں ایڈیشن کی پہلی جلد 1983 میں شائع کی گئی)

کولن کلاسی فی کیشن کی نظریاتی اساس کا عنصر چند مفروضات (Postulates)، اصول (Principles) اور معیاری قاعدے (Normative Laws) ہیں جنھیں رنگاناتھن نے مخصوص اصطلاحات کی مدد سے واضح کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر لائبریری سائنس کی علمی دنیا میں سند قبول حاصل کرچکی ہیں۔ مفروضات میں پانچ بنیادی زمرہ مفروضہ (Five Fundamental Categories) جس کے تحت زمروں کو شخصیت (Personality)، مادہ (Matter, M)، توانائی (Energy, E) مکان (Space,S) اور زمانہ (Time, T) کا نام دیا گیا ہے۔ بنیادی مفروضہ ہے جس کے مطابق ہر مضمون فکری سطح پر اپنے اندر یہ پانچوں یا ان میں سے چند زمرے رکھتا ہے اور انھیں کی مدد سے اس کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ دوسرے مفروضے ہیں "ترتیب زمرہ مفروضہ" (Postulate for Order of Categories) "مفروضہ برائے اساسی درجہ مضمون" (Postulate of Basic Class) وغیرہ کسی ایک مضمون کے ذیلی موضوعات کو زمروں میں تقسیم کرنے کے بعد کسی ایک زمرہ میں موجود موضوعات میں ترتیب باہم

کے لیے رنگاناتھن نے چند اصول مرتب کیے ہیں۔ مثلاً سماجیات میں ذیلی موضوعات مرد، عورت، شہری، دیہاتی، بچہ، ضعیف جیسی اصطلاحات میں اولیت کسے دی جائے اور دوسروں کو کس ترتیب میں درج کیا جائے جیسے مسائل اس مفروضہ سے حل ہوتے ہیں۔ کسی ایک زمرہ کے تحت ابھرنے والے نئے موضوعات کو پہلے سے موجود موضوعات کی صف میں کیسے شامل کیا جائے اس کے لیے رنگاناتھن نے چند تراکیب وضع کی ہیں جن کے نام ہیں تاریخی ترکیب (Chronological Device) جغرافیائی ترکیب، الفبائی ترکیب، موضوعی ترکیب اور معاون حافظہ (Memoric Device) ترکیب وغیرہ۔ رنگاناتھن نے اپنے ضابطہ کو سائنسی خطوط پر توسیع دینے کی غرض سے کئی اصطلاحات وضع کی ہیں ان میں "پہلو مضمون" یا جہت مضمون (Facet) "مرکوزی جزو مضمون" (Focus)، "اساسی درجہ مضمون" (Basic Class)، "صف" (Array)، "زمرہ" (Category) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ "دور" (Phase)، "مرکب مرکوزی جزو" (Compound Focus) اور "مخلوط مرکوز جزو" (Complex Focus) مضامین کے اساسی عنصر کا اظہار کرتے ہیں۔

کولن ضابطہ میں ہر اساسی مضمون مثلاً مذہب، فلسفہ، عمرانیات، فزکس، کیمسٹری کے تحت ان کے اندر موجود بنیادی زمروں کی بھی تفصیل ہے۔ مثلاً "ادب" میں صرف ایک ہی اساسی زمرہ یعنی شخصیت کی سطح پر "زبان" "صنف" "مصنف" اور ادبی تحقیق کے نمبر شمار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جبکہ معاشیات میں شخصیت کے زمرے کی شکل میں بینک، ان کی اقسام، سفر کے ذرائع وغیرہ ہیں اور تقسیم دولت، انتظام صنعت وغیرہ توانائی کا مظہر ہیں۔ کولن ضابطہ میں علوم کو 41 اساسی درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سات علوم طبیعات یا بشریات و عمرانی علوم جیسے وسیع دائرہ مضامین ہیں۔ مروجہ مضامین 33 درجوں میں تقسیم ہیں۔ (دیکھیے ضمیمہ)

علامات (Notation) درجہ بندی میں نفس مضمون کا اظہار علامات کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ رنگاناتھن نے روایتی اور اساسی مضامین کے اظہار کے لیے انگریزی حروف کے ساتھ چند یونانی حروف اور ہندسوں کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ تعلیم کو "T" اور طبیعات کو "C" سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مضامین کے ذیلی موضوعات کو ہند-عربی ہندسوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مختلف زمروں کو باہم منسلک کرنے کے عمل میں رموز اوقاف مثلاً کولن، سیمی کولن، کاما وغیرہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لیے اس ضابطہ کی علامات کو مخلوط علامات (Mixed Notation) کہا گیا ہے۔ کولن ضابطہ میں درجہ بندی کے عمل میں کتاب کے اساسی مضمون کے تعین کے بعد۔ مضمون کے تحت ضابطہ میں درج زمروں میں سے کتاب کے عنوان میں موجود اصلاحات یا بنیادی خیالات کا متبادل ضابطہ میں درج جدول میں تلاش کرکے اس کے علامتی نمبر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پھر ان علامتی نمبروں کو آپس میں تعلق نشانات (Connecting Symbol) کی مدد سے جوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً کتاب "عورتوں میں جراثیم کے ذریعہ پیدا ہونے والی بیماریوں کا یونانی طریقہ سے الیکٹرو تھریپی علاج" LD,9F:423:626 میں "L" مضمون طب کو ظاہر کرتا ہے D یونانی طریقہ علاج ہے 9F خواتین کو ظاہر کرتا ہے جو "شخصیت" زمرہ کے تحت آتا ہے اس لیے اس سے پہلے شخصیت کی شناخت "کاما" دیا گیا ہے۔ علاج اور طریقہ علاج دونوں توانائی زمرہ کا مظہر ہیں اس لیے کولن سے جوڑے گئے ہیں۔

ضابطہ درجہ بندی میں ایک جزو تو کتاب کے نفس مضمون کا درجہ نمبر وضع کیا جاتا ہے۔ دوسرا کتاب کی منفرد حیثیت تعین کرنے اور الماری میں اس کی جگہ متعین کرنے کے لیے بک نمبر (Book Number) وضع کیا جاتا ہے۔ رنگاناتھن نے بک نمبر کا ایسا انوکھا فارمولا بنایا ہے جس کے مطابق کتاب نمبر کی مدد سے قاری کتاب میں موجود مضمون کی عصریت کتاب کی زبان کتب خانہ میں اس کے موجود نسخے کتاب کی جلد اس کی شرح ہر ایک سے محض کتاب نمبر دیکھ کر ہی واقف ہوجاتا ہے۔ مثلاً معاشیات پر 1996 کی چھپی کتاب کا نمبر ہوگا X-N6 اگر اس پر بک نمبر N6 کے بجائے 168N6-2:1 ہوتا تو معلوم ہوجاتا کہ یہ معاشیات پر اردو میں شائع 1996 کی کتاب کی دوسری جلد کا دوسرا نسخہ ہے۔

کولن ضابطہ درجہ بندی کی کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں اصول و ضوابط، مضامین میں موجود زمرے اور مثالیں دی گئی ہیں۔ دوسرے حصہ میں مضامین کے تحت جدول مرکوزی عناصر کی تفصیل پیش کرتی ہیں۔ تیسرے حصہ میں ہندیات (Indology) پر موجود سنسکرت کی ادب عالیہ مع ان کے درجہ نمبر درج ہیں۔

کولن ضابطہ درجہ بندی کی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں ڈیوی ڈیسمل ضابطہ کی مرکوزی اجزا کے جدول ہزاروں صفحات پر پھیلے ہیں کولن میں انھیں 120 صفحات میں سمو دیا گیا ہے اور مزید تشکیل کے قاعدے بنا دیے گئے ہیں۔ اس کی نظری بنیادوں سے متاثر

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ہوکر انگلینڈ میں ایک کلاسی فی کیشن ریسرچ گروپ (Classification Research Group) قائم ہوا جو انھیں خطوط پر ایک عام ضابطہ درجہ بندی وضع کرنے میں مصروف ہے۔ ہندستان میں بنگلور میں واقع ڈاکومینٹیشن ریسرچ اینڈ ٹریننگ سینٹر (DRTC) میں کولن ضابطہ پر مزید تحقیق کا کام ہورہا ہے۔

کونسل برائے اقتصادی امداد باہم (COMECON) :

یہ کونسل یورپی براوری کی طرح سوویت یونین کے زیرقیادت کیمونسٹ بلاک یا مشرقی بلاک کے ملکوں کی اقتصادی براوری یا مشترکہ منڈی ہے۔ اس کی بنیاد مغربی یورپ میں امریکا کے زیراہتمام مارشل منصوبہ کے جواب میں 1949 میں رکن ملکوں کی اقتصادی ترقی میں مدد دینے کی غرض سے رکھی گئی تھی جسے مشترکہ وسائل کے استفادہ اور باہمی تعاون کے ذریعہ فروغ دیا جاسکے۔ اس کے ارکان میں بلغاریہ، پولینڈ، چیکوسلواکیہ، رومانیہ، کیوبا، مشرقی جرمنی، منگولیا، ہنگری اور سوویت یونین شامل تھے۔ منگولیا نے اس کونسل میں 1962 اور کیوبا نے 1972 میں شمولیت اختیار کی لیکن البانیہ نے 1961 میں علاحدگی اختیار کرلی۔ رکن ممالک کے علاوہ کونسل میں دوسرے اشتراکی ملکوں کو مشاہد کی حیثیت حاصل تھی۔ یوگوسلاویہ ایک مستقل مشاہد کی حیثیت سے کونسل کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔

کونسل۔ معاشی امداد باہمی (Council for Mutual Economic Assistance):

یہ کونسل جنوری 1939 میں قائم ہوئی تاکہ ممبر ملکوں کی معاشی ترقی میں تعاون ہوسکے۔ ابتدا میں سوویت یونین، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ، رومانیا اور چیکوسلوواکیہ اس کے ممبر تھے۔ فروری 1949 میں البانیا اس میں شامل ہوا۔ لیکن 1961 کے ختم تک وہ علیحدہ بھی ہوگیا۔ ستمبر 1950 میں مشرقی جرمنی نے رکنیت قبول کرلی۔ 1962 میں منگولیا، 1964 میں یوگوسلوویا نے تجارت مالیات کرنسی اور صنعتوں کے معاملات کی حد تک رکنیت قبول کی۔ کیوبا 1972 میں اور ویت نام 1979 میں ممبر بنے۔ 1969 تک اس کے ممبروں کی تجارت کا 60 فی صدی حصہ آپس میں تھا۔

1949 سے استالن کے انتقال تک اس ادارہ کی سرگرمیاں بہت محدود تھیں۔ ممبر ملکوں میں آپس میں جو تجارت ہوتی اور قرضوں کا جو انتظام ہوتا انھیں صرف درج کرلیا جاتا تھا۔ 1950 کے بعد سے اس کی کوشش شروع ہوئی کہ ہر ملک کسی خاص میدان میں تخصیص (Specialisation) کرے تاکہ ایک ہی قسم کی چیزیں کئی جگہ تیار نہ ہوں۔

جون 1962 میں ماسکو میں ایک میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ ہر ممبر ملک اپنا معاشی منصوبہ مسودہ کی منزل ہی پر کونسل کے سامنے پیش کرے تاکہ اس میں بروقت مناسب ترمیم ہوسکے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ بجائے متوازن تجارت کے ہمہ جہتی (Multilateral) ادائیگی کا انتظام کیا جائے۔ 1962 میں ایک بین الاقوامی بینک برائے معاشی تعاون قائم کیا گیا تاکہ دو یا تین ممبر ملک اگر کوئی پروجکٹ شروع کریں تو اسے مالی امداد دی جاسکے۔ ساتھ ہی ملکوں کے درمیان کرنسی اور ادائیگی طے ہوسکیں۔ اس بینک سے 1964 سے کام شروع کیا۔

1969 میں کونسل کی میٹنگ میں ایک اصل کاری بینک (Investment Bank) قائم کرنے کی تجویز منظور ہوئی جو ممبر ملکوں کو طویل مدتی قرضے دیتا ہے اور اس کی مدد سے ممبر اپنی تجارت کو بھی وسعت دے سکتے ہیں۔

کوئزنے - فرانسواز (Quesnay Francois, 1694-1774) :

یہ معاشین کے ایک گروہ فطر آئینوں (Physiocrats) کا سرکردہ رکن تھا۔ کوئیزنے کا پیشہ طبابت اور سرجری تھا۔ اور وہ فرانس کی سرجری کی اکادمی کا سکریٹری اور اس کے رسالہ کا ایڈیٹر تھا۔ مشہور فرانسیسی خاتون مادام پومپاڈور کا طبیب بھی تھا لیکن طبابت کے ساتھ اسے معاشیات سے بھی دلچسپی رہی۔ 1756 اور 1757 میں اس نے معاشیات پر انسکائیکلوپیڈیا کے لیے مضامین لکھے۔ اور اس کے بعد وہ زراعت اور تجارت سے متعلق ایک رسالہ میں مضامین لکھتا رہا۔ 1778 میں اس نے معاشیات پر ایک رسالہ معاشی جدول (Tablean Economique) لکھا اور پھر اس رسالہ پر ایک تبصرہ شائع کیا۔ اس رسالہ میں سماج کی تقسیم تین طبقوں میں کی گئی ہے۔ (1) زمیندار یا جاگیر دار۔ (2) کسان اور کھیت مزدور۔ (3) دوسرے لوگ جنھیں اس نے مجہول طبقہ کا نام دیا۔ اس کے مطابق صرف زرعی طبقہ زائد قدر پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ دوسرے طبقے صرف اسی قدر پیدا کرتے ہیں جتنا کہ وہ استعمال کررہے ہیں۔ آگے چل کر مالتھوس نے جو نظریہ پیش کیا اس کی جھلک کوئزنے کے یہاں بھی ملتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ بچت میں بہت زیادہ اضافہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سے اشیا کے صرف میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اور اگر خرچ کم ہوجائے تو خالص آمدنی میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ گویا کلی معاشیات (Macro-Economics) کی ابتدا ہے جس نے الجبرا کی ترقی اور کمپیوٹر کی ایجاد سے آج بہت ترقی کرلی ہے۔

کوئزنے اپنے کتابچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ملک میں صرف واحد ٹیکس کا طریقہ رائج کرنا چاہیے اور وہ بھی صرف زرعی زمین پر۔ اس سے ٹیکس جمع کرنے کے اخراجات بہت کم ہوجائیں گے۔ اس کے خیال سے صرف زراعت ہی زاید قدر پیدا کرتی ہے اور اس لیے تمام ٹکسوں کا بار آخر میں اسی پر پڑتا ہے۔

کیری بین برادری اور مشترکہ منڈی (Caribbean Community and Common Market) :

یہ برادری 1973 میں چاگوارامس نامی معاہدہ کے تحت ٹرینڈاڈ میں وجود میں آئی تاکہ کیری بین کے علاقوں میں اتحاد مستحکم ہو۔ درحقیقت اس نے کیری بین آزاد تجارتی انجمن کی جگہ لے لی تھی جسے 1965 میں قائم کیا گیا تھا۔ برادری علاقے کو ایک اقتصادی اور سیاسی وحدت میں تبدیل کرنے کے لیے تشکیل کی گئی تھی۔ اس کے ارکان کی تعداد 16 ہے اور 11 ممالک کو مشاہد کی حیثیت حاصل ہے۔

حکومتوں کے سربراہوں کی کانفرنس برادری کا اعلیٰ ترین ادارہ جسے پالیسی سازی کا اختیار حاصل ہے، اسے برادری کی جانب سے معاہدے کرنے اور ریاستوں اور بین الاقوامی تنظیموں سے روابط قائم کرنے کا اختیار ہے۔ اس کا ایک بیورو بھی ہے جو فیصلوں پر عمل درآمد کراتا ہے۔ مشترکہ منڈی کی کونسل متفقہ طور سے فیصلے کرتی ہے۔ برادری کا ایک سکریٹریٹ بھی ہے۔ اس کا صدر مقام جارج ٹاؤن (گیانا) ہے۔

کیلاگ معاہدہ (Kellogg Pact) :

کیلاگ معاہدہ سے عدم جنگ کا وہ عام معاہدہ مراد ہے جس پر 27 اگست 1928 کو فرانس، بلجیم، ریاستہائے متحدہ امریکا، چیکوسلوواکیہ، برطانیہ، اٹلی، جرمنی، پولینڈ اور جاپان نے دستخط کیے تھے۔ اس معاہدہ میں بین الاقوامی تنازعات کے تصفیہ کے لیے جنگ کا سہارا لینے کی مذمت کی گئی تھی اور جنگ کو قومی پالیسی کے آلہ کار کے طور پر استعمال نہ کرنے کے اعلان کے ساتھ ہی اپنے جملہ تنازعات کا محض پرامن ذرائع سے تصفیہ کرنے کا عزم کیا گیا تھا۔

یہ معاہدہ دراصل فرانس کے وزیر خارجہ ارسٹائڈ برائنڈ (Aristide Briand) اور ریاستہائے متحدہ امریکا کے ریاستی سکریٹری فرینک بیلنگ کیلاگ (Frank Billing Kellog) کے مابین گفت و شنید کا نتیجہ تھا۔ کیلاگ کی تجویز پر اسے ایک عام معاہدہ کی شکل دی گئی اور 1934 تک دنیا کے تقریباً تمام ملکوں نے اس پر دستخط کردیے۔ بعض ملکوں مثلاً فرانس اور برطانیہ نے مشروط طور پر دستخط کیے۔ اس معاہدہ کے مفہوم کی تشریح و تعبیر میں بڑی وسعت تھی مثلاً یہ معاہدہ ذاتی دفاع کی جنگوں پر پابندی عائد نہیں کرتا تھا۔ میثاق انجمن اقوام جو فوجی ذمہ داریاں عائد کرتا اس کی ادائیگی میں بھی یہ مزاحم نہ ہوتا اسی طرح منرو اصول یا مابعد جنگ اتحادی معاہدات کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔ یہی وہ اسباب تھے جس کی وجہ سے یہ کوئی موثر عملی کردار ادا کرنے میں ناکام رہا اور بین الاقوامی امور میں اس معاہدہ کی حیثیت بھی کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں رہی۔ چونکہ اس معاہدہ کا محرک فرینک بی کیلاگ تھا اس لیے اسے اسی کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ یہ معاہدہ "معاہدہ پیرس (The Pact of Paris)" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

کینز (Keynes):

ماہر معاشیات اور جرنلسٹ جو اپنے انقلابی معاشی نظریوں کے لیے مشہور ہے۔

کینز نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ مشہور عالم معاشیات آلفریڈ مارشل کا شاگرد رہا۔ ایک عرصہ تک وہ انڈیا آفس میں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ کیمبرج میں معاشیات کا لکچرر بن گیا۔ پہلی جنگ شروع ہونے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں آگیا۔ جنگ کے بعد پیرس کی امن کانفرنس میں وہ برطانوی حکومت کے معاشی مشیر کے طور پر شریک ہوا۔ اس کے بعد 1919 میں اس نے اپنے مضمون امن کے معاشی نتائج میں جرمنی سے بہت زیادہ مقدار میں تاوان جنگ وصول کرنے پر سخت تنقید کی۔

جنگ کے بعد کینز نے لندن میں مالیاتی پیشہ اختیار کیا۔ وہ ایک قدامت پرست ماہر معاشیات گردانا جاتا تھا لیکن 1930 کی معاشی سرد بازاری (عالم گیر) (Depression) سے اس کے خیالات میں زبردست انقلاب آیا۔ 1935 میں اس نے "روزگار، سود اور زر کا عام نظریہ" پر ایک کتاب لکھی جس میں اس نے معاشیات کے کلاسکی نظریہ سے انحراف کرکے یہ بتلایا کہ معیشت بے روزگاری کی بہت اونچی سطح پر اپنا توازن

اختیار کرے گی۔ اگر حکومت خاص اور سخت اقدامات نہ کرے۔ اس لیے کہ سرد بازاری کے زمانہ میں صارفین سرمایہ کاروں اور حکومت کے مجموعی اخراجات کی سطح بہت ہی کم ہوجاتی ہے۔ اور وہ پورے معاشی وسائل کو استعمال نہیں کرسکتے۔

کینز نے دوسری عالم گیر جنگ کے زمانہ میں برطانیہ کی جنگی مالیات میں مرکزی کردار ادا کیا اور 1944 میں وہ برٹن ووڈس (Britton Woods) کی کانفرنس میں برطانیہ کا خاص نمائندہ تھا۔ اسی کانفرنس میں بین الاقوامی مالی فنڈ قائم ہوا تھا۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

گ

گاٹ (G.A.T.T.): دیکھیے ٹیرف و تجارت عام معاہدہ۔

گاندھی ازم (Gandhism) : مہاتما گاندھی ایک سماج سدھارک تھے، ماہر تعلیم تھے، سیاسی لیڈر تھے یا پھر ایک عالم روحانیت تھے؟ آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مہاتما گاندھی نے ہر میدان میں کام کیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے تمام مقالے کتابیں خطوط اداریہ وغیرہ آج 100 جلدوں میں دستیاب ہیں۔ یہی نہیں ان کی حیات اور کارناموں پر بھی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ 1869 میں دنیا آب و گل میں آنکھ کھولنے والے ایک گجراتی بنیہ خاندان کے چشم و چراغ نے بجا طور پر برصغیر کی حالت بدل ڈالی اور عالمی سیاست، پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ ان کو اپنی ذات میں انجمن غلط نہیں کہا گیا ہے۔ اس مفکر، فلسفی، سیاست داں اور سماجی کارکن کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے مگر گاندھی ازم کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گاندھی نے خود ہی کہا ہے کہ "گاندھی ازم کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ میرے خیالات جامد نہیں ہیں۔"

بہرکیف گاندھی جی کے فلسفہ کے سلسلے میں مطالعہ کرتے وقت یہ اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مکتب فکر کے کچھ بنیادی نکتے ہیں۔ مثلاً

(1) ہند قدیم کے اور ویدک فلسفہ کا حوالہ۔

(2) خود انحصاری کے باوجود بنی نوع انسان کے ایک دوسرے سے گہرے تعلق کا احساس۔

(3) دنیاوی معاملات میں بھی روحانیت کی تلاش۔

(4) مقصد کے حصول کے ذرائع کی بھی پاکیزگی پر اصرار۔

(5) روحانیت، سوراج، تعلیم بالغاں، دیہی زندگی کی حمایت اور اخلاقیات وغیرہ میں ایک بنیادی تعلق اور رشتے کا احساس۔

(6) باقاعدہ قسم کی جبریہ تنظیم مثلاً پولیس اور فوج وغیرہ کے لیے ناپسندیدگی۔

ان سب نکات کے زیر سایہ مہاتما گاندھی کے فلسفہ کے مختلف پہلو اس طرح اجاگر ہوتے ہیں :

خدا اور مذہب کا تصور : گاندھی جی کے خیال کے مطابق 'خدا اور مذہب' روایتی تصور سے دور ایک بہت وسیع و عریض نظریے کے دو پہلو تھے۔ ان کے خیال میں اپنے مذہب کو ماننے کا مطلب دوسرے مذاہب کی مذمت کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ان کا مذہب سچائی ہے انھوں نے یہ لکھا ہے "بجائے اس کے یہ کہا جائے کہ خدا سچائی ہے۔ دراصل یہ کہنا چاہیے کہ سچائی خدا ہے۔" (رادھا کرشنن "عصری ہندستان"، 1938 لندن، الین اینڈ ان ون، صفحہ 21) انھوں نے مذہب کو اخلاقیات سے الگ نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے دھرم کی تبدیلی کی مخالفت کی کیونکہ ان کے خیال میں یہ محض بیکار کی بات تھی۔ سب دھرموں کی بنیادی ایکتا کا سبق پڑھانے والے باپو مختلف مذاہب کے لوگوں کی آپسی شادی کے مخالف تھے۔

آدرش معاشرہ اور گاندھی واد : مہاتما گاندھی ایک مثالی معاشرہ کی کچھ خصوصیت کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہیں۔ مثلاً

(1) رام راجیہ (Ram Rajya)

(2) غیر حاکمانہ جمہوریت (Stateless Democracy)

(3) خود انحصاری (Self reliance)

(4) دیہی جمہوریت (Village Republic)

(5) وقف کا فلسفہ (Dcotrine of Trusteeship)

(6) بنیادی تعلیم کی اسکیم (Basic Education Scheme)

رام راجیہ : رام راجیہ گاندھی جی کے لیے انصاف اور سماجی انصاف پر مبنی سماجی نظام کا نام ہے۔ رام ان کے لیے دش رتھ کے بیٹے رام کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انصاف پسندی کا نام ہے۔ ان کے خیال میں رام راجیہ اس جمہوریت کا نام ہوگا جہاں سادگی پسند تعلیم، معالجاتی سہولیات، کھیتی باڑی کا انتظام مناسب انداز میں ہوگا۔ یہ معاشرہ صارفی نہیں ہوگا بلکہ جائز ضرورتوں کے پورے کرنے کے سادہ نظام پر مبنی ہوگا۔

غیر حاکمانہ جمہوریت : گاندھی جی کے نزدیک جمہوریت کا مطلب "حکومت کے کنٹرول سے آزادی" تھا۔ حکمرانی کا عمل تشدد کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا اور وہ ہر قسم کے تشدد کے خلاف تھے۔ انھوں نے آزاد جمہوریت کا نظریۂ ٹالسٹائی سے لیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے تفصیل سے کئی جگہ لکھا ہے۔ 'ہری جن' نامی اخبار میں انھوں نے 15ر ستمبر 1946 کو لکھا ہے کہ "اس قسم کی جمہوریت کو عمل میں لانا اگرچہ مشکل ہے لیکن اس کے حصول کی کوشش کرتے ہوئے کم سے کم سرکاری کی قوت کو کم تو کیا جاسکتا ہے۔" وہ پولیس فوج اور برٹش نظام عدل کو بھی ایک لازمی برائی سے بڑھ کر اہمیت نہیں دیتے تھے۔

خود انحصاری : مہاتما گاندھی نے سودیشی اور خود انحصاری کو ایک ہی چیز سمجھا ہے۔ ان کو غیر ملکی ہی نہیں بلکہ دوسرے صوبوں کے سامان پر انحصار کرنا بھی پسند نہیں تھا۔ سودیشی کی تحریک کو وہ آزادی کی جدوجہد کا بنیادی نقطہ مانتے رہے۔ آس پاس ملنے والی اشیا سے اپنی ضرورتیں پوری کرنا اور برامدات کی نفی کرنا، ان کے نزدیک سادہ زندگی کی پہلی شرط تھی۔

دیہی جمہوریت : مہاتما گاندھی جمہوریت کی قوت کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بانٹنا چاہتے تھے کیونکہ مرکز میں قوت کا جماؤ ایک قسم کی آمریت کی ابتدا ہوسکتی تھی۔ ان کو عوام، ان کے نمائندوں اور پنچایت سسٹم پر پورا بھروسہ تھا۔ پارلیمنٹ، کابینہ، مرکز کی قوت وغیرہ ان کے لیے اتنے معنی خیز نہیں تھے جتنے دبے کچلے غریب دیہاتی عوام ان کی خواہشیں اور طاقت کا ان میں بٹوارہ تھا۔ ان کی ہی خواہش کے مدنظر ہندستان میں پنچایت کا نظام لاگو کیا گیا اور حال ہی کے سالوں میں آئین میں 73 اور 74 ترمیمات کرکے پنچایتوں کو زیادہ حقوق ہی نہیں دیے گئے بلکہ خواتین کے لیے 33% ریزرویشن کرکے عورتوں کو سیاسی عمل میں لازمی طور پر حصہ داری دی گئی ہے۔ گاندھی جی کا پنچایتی نظام پر اٹوٹ وشواس تھا۔

وقف کا فلسفہ (Doctrine of Trusteeship) :
اس زمانے کا مقبول عام فلسفہ کیمونزم گاندھی جی پر بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہا۔ لیکن ان کو کیمونزم کی شدت اور سخت گیری پر اعتراض تھا۔ تمام ذرائع فرد کے لیے مخصوص نہ ہوکر سماج کے لیے ہوں۔ یہ ان کا بھی تصور تھا لیکن وہ امیروں سے چھین کر دولت غریبوں میں بانٹنے کے حق میں نہیں تھے اس میں بھی اہنسا کی نفی ہوتی تھی۔ ان کے حساب سے یہ بہتر تھا کہ دولت، دولتمندوں کے پاس ہی رہنے دی جائے لیکن وہ خود کو اس کا مالک نہیں بلکہ ٹرسٹی سمجھیں اور اپنے لیے نہ رکھ کر رضاکارانہ طور پر اپنی دولت کو عوام الناس کے لیے وقف کردیں۔ گاندھی جی کا یہ نظریہ مکمل طور سے ان کا ذاتی تھا کیونکہ مشرقی اور مغربی دونوں فلسفوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا خیال تھا سرمایہ دارانہ نظام برخاست ہوکر وقف کا نظام آئے گا کیونکہ :-

(1) انسانی فطرت میں خود غرضی سے زیادہ قربانی کا جذبہ ہے۔

(2) پرائیویٹ پراپرٹی سے پریشانیاں ہوتی ہیں جس کو جائیداد کے مالک یا سرمایہ دار بھی محسوس کرتے ہیں۔

اس کے باوجود ان کا خیال تھا کہ :

(1) دولت اور سرمایہ کے استعمال اور ملکیت کے قاعدے قانون مرتب ہونے چاہیے۔

(2) دولت کچھ لوگوں کے خود غرضانہ مقاصد کے لیے استعمال نہیں کی جانی چاہیے۔

(3) زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم اجرت یا مزدوری مقرر ہونی چاہیے۔

(4) پیداوار ضرورت پر منحصر ہونی چاہیے نہ کہ لالچ یا منافع پر۔

ٹرسٹی شپ کے نظریہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن کچھ سوال لاجواب ہی رہے۔ مثلاً وقف کے نظام کی شکل کیا ہوگی اور اس کے ماڈل کیا ہوں گے؟ سرمایہ و محنت کا تصادم اس کے ذریعہ ختم ہو جائے گا یا برقرار رہے گا؟ کیونکہ اس نظام کو نافذ نہیں کیا گیا اس لیے ان سب سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔

بنیادی تعلیم کی اسکیم : مہاتما گاندھی بنیادی تعلیم پر زور دیتے رہے جہالت کو وہ لعنت سمجھتے رہے لیکن وہ انگریزی طرز تعلیم کے بھی بہت مخالف تھے۔ انھوں نے پرائمری تعلیم کے سلسلے میں کچھ تجربات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کیے تھے۔ 1937 کو انھوں نے واردھا میں تمام ماہرین تعلیم کو بلا کر ایک میٹنگ کروائی۔ یہاں انھوں نے نئی تعلیم کا پروپوزل رکھا جو کہ ہری جن میں 2/ اکتوبر 1927 میں پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔ اس میں مندرجہ ذیل نکات تھے۔

(1) سات سال کی مفت اور لازمی تعلیم۔

(2) مادری زبان بطور ذریعہ تعلیم۔

(3) دستکاری کی بنیاد پر تعلیم۔

(4) تعلیم کی خود انحصاری۔

(5) حب الوطنی کی تعلیم۔

(6) شخصیت کا آزادانہ نشوونما۔

(7) عدم تشدد پر مبنی تعلیم کا نظام۔

آزادی کے بعد کے کچھ سالوں میں اس پر تجربات بھی ہوئے۔ لیکن خام مال کی بربادی اور تیار مال کی کھپت نہ ہونے کے سبب اس اسکیم کو لاگو نہیں کیا جاسکا۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ "میں نے ہندستان کو بہت کچھ دیا ہے لیکن یہ طریقہ تعلیم اور اس کی تکنیک ہیں محسوس کرتا ہوں کہ ان سب سے بہتر ہے۔ میرے خیال میں اس ملک کو میں اس سے بہتر کچھ نہیں دے سکتا۔" (مہاتما گاندھی "تعلیم کا مسئلہ"، احمد آباد 1949، صفحہ 4) جامعہ ملیہ اسلامیہ نے گاندھی جی کی بنیادی تعلیم کے لیے تجربہ گاہ کا کام کیا تھا۔

اچھوتوں کی فلاح و بہبود : سماجی انصاف کی فیلڈ میں مہاتما گاندھی کا اچھوتوں اور دلتوں کے سدھار کا نظریہ بہت گہرائی تک اثر انداز ہوا۔ مہاتما گاندھی چھوا چھوت کو ہندستانی اور خاص طور پر ہندو سماج کے لیے کلنک سمجھتے تھے۔ انیس سو اکتیس کی گول میز کانفرنس کے دوران ڈاکٹر امبیدکر اور گاندھی جی میں زبردست اختلاف پیدا ہوا۔ ڈاکٹر امبیدکر اچھوتوں کو ہندو سماج سے علاحدہ رکھنا چاہتے تھے جبکہ گاندھی جی ان کو ہندو سماج میں ہی ایک جائز مقام دلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اچھوتوں کو ہری جن (بھگوان کے بچے) کہا۔ ان کا خیال تھا کہ گندے پیشے کرنے والے دراصل سماج کے محسن ہیں ان کو اچھوت سمجھنا بڑی بھول ہے۔ انھوں نے اپنا بول و براز صاف کرنے کی رسم اختیار کی۔ وہ اچھوتوں کی بستیوں میں رہے اور اپنے آشرم میں ان بچوں کو دوسروں کے ساتھ گھلا ملا کر رکھا اس کی ان کو اکثر قیمت بھی چکانی پڑی لیکن وہ اپنے فلسفے پر قائم رہے۔ ہندی آئین میں دی جانے والی خصوصی مراعات اچھوتوں کو گاندھی جی کی پیروی کے خیال سے ہی دی گئی ہیں۔

سرودے کا نظریہ (Concepts of Sarvodaya) :

مہاتما گاندھی نے سرودے کا مخصوص نظریہ پیش کیا تھا۔ 1904 میں مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ کے دوران قیام رسکن کی کتاب "آخرکار" پڑھی جس کی تین تعلیمات اس طرح تھیں۔

(1) فرد کی بھلائی، عوام الناس کی بھلائی میں مضمر ہیں۔

(2) وکیل اور نائی کی مزدوری ایک جیسی ہونی چاہیے۔

(3) ہاتھ سے کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

اپنے اخبار انڈین اوپنین (Indian Opinion) کے عملے کے ساتھ وہ ان اصولوں کا تجربہ کرتے تھے۔ وہاں ہر کارکن کی ماہانہ اجرت تین پونڈ تھی۔ انھوں نے غیر طبقاتی سماج کا خواب دیکھا تھا جس میں مشینیں بے روزگاری نہ پھیلا سکیں۔ طاقت سب میں برابر بٹے، لامرکزیت ہو، لوگ اپنی ضرورتیں کم کریں، صارفیت نہ ہو، سائنس اور تکنالوجی کا فائدہ سب کو ہو، ایک چھوٹے سے گروہ کو نہیں۔ ذرائع کی پاکیزگی اور مقصد کی نیکی دونوں ہی ضروری ہیں۔ سب کا بھلا ہوا، اکثریت اقلیت کو نہ دبا سکے، ہر ایک اپنے فائدے کا منصوبہ نہ بنا کر سب کے فائدہ کی بات سوچے جس سے انجام کار ہر ایک کا بھلا ہوگا۔ ان کا فلاح عام (سرودے) کا نظریہ یہی تھا۔

سماجی ترقی کا نظریہ : سماجی ترقی کا نظریہ بھی گاندھی جی کی مخصوص فکر کا ہی پرتو تھا۔ انھوں نے شہروں کی بڑھتی تعداد، انڈسٹریوں کے ابھرنے اور بڑی دیوپیکر مشینوں کے ذریعہ پیداوار وغیرہ سب کو انسان اور انسانیت کے لیے ایک گمبھیر خطرہ بتایا ہے۔ سماجی ترقی کے لیے صنعتی اور معاشرتی ترقی کی ضرورت کی نفی کرتے ہوئے انھوں نے ترقی کے لیے مندرجہ ذیل حالات کو اہمیت دی۔

(1) دیہی سماج، دیہی انداز میں ترقی ہونی چاہیے اور گھریلو صنعت کو بڑھاوا دینا چاہیے۔

(2) جسمانی محنت کو دماغی محنت سے افضل سمجھنا چاہیے۔

(3) سیاسی طاقت کا بٹوارہ ہونا چاہیے۔ مرکزیت سے پرہیز کرنا چاہیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(4) سماجی انصاف اور مساوات کا دور دورہ ہونا چاہیے۔

ان کا خیال تھا کہ مشینوں کے ذریعہ بے روزگاری پھیلتی ہے اور امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب بنتا جاتا ہے۔ صنعتی ترقی کو انھوں نے گناہ سے کم نہیں سمجھا۔ ان کے خوابوں کا بھارت گاؤں کا دیش تھا۔ جہاں امن چین ہوتا، روٹی کپڑا مکان تعلیم اور علاج ہر ایک کے لیے ہوتا۔ فینسی چیزیں اور صارفیت کسی کے لیے بھی نہ ہوتے۔ کھیتی باڑی کے لیے بھی قدرتی کھاد استعمال کی جاتی۔ مصنوعی اور کیمیائی عمل سے بننے والی اشیا کے بنانے کا طریقہ ہی ان کے نزدیک غیر قدرتی تھا۔ اس لیے ان کو ازحد ناپسند تھا۔

گاندھی واد اور مسائل نسواں : عورتوں کی سماجی حیثیت اور مسائل نسواں کے سلسلے میں مہاتما گاندھی کبھی روایت پسند اور کبھی روایت شکن نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بچپن کی شادی، جسم فروشی اور جہیز کی رسم کو بہت ناپسند کیا۔ عقد ثانی کو بھی پسند کیا ہے لیکن بیوگی کے سلسلے میں ان کے خیالات کچھ پیچیدہ ہیں۔ مثلاً اگر سوچ سمجھ کر اور تمام نتائج پر غور کرکے کوئی عورت شوہر کی موت کے بعد بیوہ کی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو وہ قابل تعظیم ہے۔ اس طرح گھر پاک اور مذہبی رنگ میں رنگتا ہے اور اس کا رتبہ اونچا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر یہ بیوگی اس پر لادی گئی ہے مذہب یا روایت کے ذریعہ، تب یہ ناقابل برداشت بوجھ اور پوشیدہ گناہ کی شکل اختیار کرکے گھر کو نجس کردیتی ہے۔ (بحوالہ کرجی آر.این. معاشرتی افکار، صفحہ 30-423) ینگ انڈیا میں 21/ اکتوبر 1926 کے شمارے میں انھوں نے یہ صاف صاف لکھا ہے کہ میرا آدرش سیتا جیسی بیوی اور رام جیسے شوہر ہیں۔

انھوں نے ہری جن کے 24/ فروری 1940 کے شمارے میں لکھا ہے کہ عورت اور مرد کچھ معاملات میں برابر ہیں لیکن ان کے کردار مختلف ہیں۔ یہ عورت پر ظلم ہے اگر اسے گھر سے باہر نکال کر اس کے ہاتھ میں بندوق تھما دی جائے کہ وہ گھر کی حفاظت کرے۔ مرد کماتا ہے عورت گھر چلاتی ہے۔ وہ نئی نسل پروان چڑھاتی ہے۔ اگر وہ یہ نہیں کرے گی تو بنی نوع انسان کی نسل ختم ہو جائے گی۔ وہ اہنسا کا اوتار ہے اس کی طاقت اس کی قوت برداشت ہے۔

مہاتما گاندھی اگرچہ عورتوں کے حامی تھے اور ان کی تعلیم کی وکالت بھی کرتے تھے لیکن وہ قدامت پسند تھے اس کے باوجود سرودے ورکز میں خواتین کی تعداد ہمیشہ قابل ذکر رہی۔ آج بھی گاندھی ازم سے رہنمائی حاصل کرتی ہوئی ماحولیاتی تنظیموں میں عورتوں کی تعداد کافی ہے۔ آدی باسی تحریکوں کی سربراہی کرتی ہوئی خواتین بھی نمایاں انداز میں کام کررہی ہیں اس کا سہرا بھی گاندھی کے سر ہی بندھنا چاہیے۔

آج کے پس منظر میں مہاتما گاندھی کتنے کھرے اترتے ہیں یہ ایک بڑا سوال ہے۔ اپنی اخلاقی جرأت، انفرادیت، عدم تشدد اور برداشت کی قوت کی بدولت وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے مگر کیا ان کی تعلیمات پر چلا جاسکتا ہے۔ اس کا مکمل جواب تو موجود نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک مکمل طور پر آدرش وادی شخص تھے۔ اس لیے ان کی تعلیمات پر چلنا ان کے آدرش کو پورا کرنا آسان نہیں ہے اس کے باوجود ان کی بہت سی تعلیمات خاص طور پر صنعتی معاشرے کی مخالفت اور سادہ اور قدرتی زندگی کی حمایت آج ماحولیات کے ماہرین کے لیے ایک نقطہ آغاز بن گئی ہے۔ ان کی تعلیمات مثلاً بڑے باندھ نہ بنانا غیر قدرتی کھاد کا استعمال نہ کرنا، قدرتی ذرائع کا اندھادھند استعمال نہ کرنا آج کے زمانے میں پھر سے اپنائے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ مشینوں کے استعمال سے بڑھنے والا خطرہ یعنی بے روزگاری آج ہندستان ہی نہیں بلکہ تمام ترقی پذیر ممالک کے لیے ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ بابائے قوم جنگ آزادی کے مجاہد ہی نہیں تھے، جنوبی افریقہ میں نسلی مساوات کی جدوجہد کا آغاز کرنے والے ہی نہیں تھے۔ دلتوں اور کوڑھیوں کے مسیحا ہی نہیں تھے بلکہ معاشرہ کے سماجی معاشی اور سیاسی خدوخال درست کرنے والے اصلاح کار کے علاوہ ایک مخلص سماجی کارکن تھے جن کے کارنامے ان کی کتابوں اخباروں (ینگ انڈیا اور ہری جن) اشرموں اور شاگردوں کی وجہ سے کبھی نہیں بھولے جاسکیں گے۔

وہ ماہر سماجیات نہیں تھے لیکن ہندستان کے سماج اخلاق مذہب سیاست آئین اور تعلیمی نظام پر انھوں نے گہری چھاپ چھوڑی ہے۔

گایوس (Gaius): گایوس (Gaius) نے اشخاص کے متعلق جو رومن لاء کا قانونی تصور پیش کیا ہے وہ یہ کہ تمام رومن دو حصوں میں منقسم تھے ایک آزاد اور دوسرے غلام۔ رومن لاء میں غلام کی حیثیت ایک انسانی یا جان دار شے کی ہوتی تھی جس پر ملکیت قایم کی جاسکتی تھی یا جسے فروخت

کیا جاسکتا تھا جیسے کہ کوئی شخص اپنی کسی دوسری جائداد کو کرتا ہے۔ غلام صرف اپنے مالک کے رحم وکرم پر رہتا تھا اوراس کے کوئی حقوق نہ تھے اور قانون فوج داری کے تحت تعزیری ذمہ داری سے ہٹ کر اس پر کوئی اور قانونی ذمہ داری نہیں ہوتی تھی۔ غلاموں کے متعلق یہی اصول تھا جس کا ذکر کیا گیا یعنی غلام کی حیثیت ایک شے یا چیز کی ہوتی تھی لیکن حقیقت میں وہ ایک انسان تھا اور اس وجہ سے بعد میں اس اصول میں مناسب تبدیلی کی گئی۔

گرفتاری بلا حکم نامہ گرفتاری (Arrest without Warrant): ہر عہدہ دارکوتوالی کو اس کا اختیار ہوتا ہے کہ حاکم فوج داری کے حکم کے بغیر کسی ایسے شخص کوگرفتار کرے جس کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

(1) ہر وہ شخص جس نے جرم قابل دست اندازی کا ارتکاب کیا ہو یا جس کے متعلق معتبر اطلاع ملی ہو یا اور طور پر یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ اس نے ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جو قابل دست اندازی ہے۔

(2) ہر وہ شخص جس کے پاس نقب زنی کا آلہ بغیر کسی وجہ کے موجود ہو۔

(3) ہر وہ شخص جس کے مجرم ہونے کی نسبت حکومت کی جانب سے اشتہار دیا گیا ہو۔

(4) ہر وہ شخص جس کے متعلق یہ باور کرنے کی معقول وجہ ہو کہ اس کے پاس مال مسروقہ ہے۔

(5) ہر وہ شخص جو کسی عہدہ دار کوتوالی کے فرائض کی انجام دہی میں مانع ہو۔

(6) ہر وہ شخص جو حراست قانونی سے فرار ہوگیا ہو یا فرار ہونے کا اقدام کرے عہدہ دار کوتوالی کو اس کا اختیار ہوگا کہ ایسے شخص کو جسے وہ گرفتار کرنے کا مجاز ہو اپنے حدود ارض کے باہر بھی تعاقب کرکے گرفتار کرے۔

عہدہ دار کوتوالی میں منتظم تھانہ اور سپاہی کوتوالی بھی شریک ہیں۔ کوئی عہدہ دار کوتوالی کسی شخص کو جو بعد حکم گرفتار کیا گیا ہو چوبیس گھنٹے سے زیادہ کوتوالی کی تحویل میں نہ رکھ سکے گا۔ نیز یہ کہ عہدہ دار کوتوالی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اگر اس نے کسی شخص کو بلاحکم عدالت گرفتار کیا ہو تو اس کی اطلاع فوراً متعلقہ حاکم فوج داری کو دے۔

گلڈ سوشلزم (Guild Socialism): برطانیہ میں گلڈ سوشلسٹ تحریک پہلی جنگ عظیم سے کچھ قبل شروع ہوئی وہ عام سوشلسٹوں کی طرح اجرتوں کے نظام اور منافع کے لیے پیداوار کے خلاف تھے۔ انھیں حکومت پر ذرا بھروسہ نہیں تھا اور وہ پیداکار کے کنٹرول پر زور دیتے تھے۔ ان کے سامنے عہد وسطی کے آزاد پیداکار تھے جن کے اپنے گلڈ تھے۔ جنھیں اپنے روزگار پر کنٹرول تھا۔ چنانچہ گلڈ سوشلسٹ بھی صنعتی تنظیموں، ٹریڈ یونینوں، کلیساؤں، امداد باہمی کے اداروں اور میونسپلٹیوں کو خود مختاری دلوانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سماج کے ہر گروہ کو اپنے کام کو آزادی سے کرنے کا موقع حاصل ہونا چاہیے۔ اس پر اوپر سے کوئی کنٹرول نہیں ہونا چاہیے۔ اور افراد جس یونٹ میں کام کررہے ہوں اس کے کاروبار میں اپنی رائے دینے کا انھیں پورا حق ہونا چاہیے۔ ریاست کا کام صرف ضروری قومی خدمات مثلاً پولس وغیرہ کے انتظام تک محدود ہونا چاہیے۔ اس طرح حکومت بھی دوسرے اور اداروں کی طرح ایک ادارہ ہوگی۔

گلڈ سوشلزم کے دانشوروں میں سب سے اہم جی.ڈی.ایچ.کول. ہیں جو آکسفورڈ میں ڈان تھے اور انھوں نے گلڈ سوشلزم کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے۔ اس تحریک نے عوام میں کبھی مقبولیت حاصل نہیں کی لیکن لیبر تحریک کے لیڈر اس کے تصورات سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔

گورنمنٹ کمپنی: گورنمنٹ کمپنی ایسی کمپنی کو کہتے ہیں جس کے اکیاون فیصد سے زیادہ حصص گورنمنٹ خریدے۔ ایسی کمپنی کی حیثیت پبلک کمپنی کی باقی رہتی ہے اور اسی طرح کاروبار انجام دیتی ہے جیسے کہ دوسری کوئی پبلک کمپنی کاروبار انجام دیتی ہو۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ل

لازمی تعلیم (Compulsory Education): زیور تعلیم سے آراستہ ہونا ہر فرد کا پیدائشی حق ہے۔ دنیا میں کروڑوں افراد ایسے بھی ہیں جو اس حق سے محروم ہیں۔ یہ صورت حال بالخصوص ترقی پذیر ممالک میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کی اہمیت کا احساس عوام کے لیے بھی انیسویں صدی کے آخری ربع میں پیدا ہو چکا تھا۔ جس کے باعث خواندگی کے اوسط میں مسلسل ترقی ہوتی گئی اور بحالت موجودہ آبادی کا بیشتر حصہ نوشت و خواند کی قابلیت رکھتا ہے۔ ناخواندگی کو دور کرنے میں جری تعلیم کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ لیکن اس خصوص میں بھی عمل میں یکسانیت نہیں پائی جاتی جس کا اندازہ ذیل کے بعض اعداد سے ہوتا ہے۔

انگلستان میں 1876 میں ہر بچہ کے لیے دس سال کی عمر تک تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور پھر سنہ 1900 میں ترک مدرسہ کی عمر 14 سال تک بڑھا دی گئی۔ بعد میں قانون تعلیم سنہ 1944 (The Education Act of 1944) کے ذریعہ گیارہ سال کی عمر کے بعد مختلف نوعیت مگر مساوی حیثیت کی ثانوی تعلیم کے مواقع تمام بچوں کے لیے مہیا کیے گئے۔

فرانس میں مارچ 1882 کے قانون کے ذریعہ چھ تا تیرہ سال کی عمر کے تمام بچوں کے لیے مدرسہ کی حاضری لازمی کر دی گئی۔ سنہ 1928 میں فرانس میں ناخواندگی کا اوسط صرف نو فی صد تھا۔

جرمنی میں چھ تا آٹھ سال کی عمر تک مدرسہ کی ہمہ وقتی حاضری اور اس کے بعد اٹھارہ سال کی عمر تک جزوقتی حاضری کے ساتھ تعلیم تمام بچوں کے لیے لازمی کر دی گئی۔

سوویت یونین کے تمام کارہائے نمایاں میں جس پر اس کو فخر ہے سب سے موثر اور دور رس کارنامہ تعلیم کے میدان میں انجام پایا ہے۔ 1917 میں خواندگی کا فی صد 9 تا 50 سال کی عمر والوں میں 35 تھا۔ 1939 میں بڑھ کر 89 ہو گیا۔ 1956 میں ثانوی تعلیم لازمی کر دی گئی اور تمام فیس بشمول یونیورسٹی فیس موقوف کر دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سترہ سال کی عمر تک تمام نوجوانوں کے لیے علمی یا فنی تعلیم کا حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اسکول جانے والی جملہ آبادی 3 کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ لازمی تعلیم سات سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا: مدارس میں جری حاضری کے قوانین تمام ریاستوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے طلبا کی عمروں اور حاضری کی مدت میں کوئی یکسانیت نہیں ہے مثلاً :

نام ریاست	لازمی تعلیم کی عمر	مدت حاضری
نیو میکسیکو	16 تا 6 سال	7 ماہ
جارجیا	8 تا 14 سال	6 ماہ
مساچوسیس	7 تا 16 سال	8 ماہ

ہندوستان میں تعلیمی ترقی کا منصوبہ اولاً سارجنٹ پلان (1944) میں پیش کیا گیا تھا۔ اس منصوبہ کے تحت بنیادی لازمی تعلیم کو چالیس سال کے عرصہ میں رائج کرنے کی تجویز تھی۔ چونکہ یہ مدت بہت زیادہ طویل تھی اس لیے حکومت نے حصول آزادی کے بعد ہی "کھیر کمیٹی" مقرر کی تاکہ بنیادی لازمی تعلیم کو مختصر مدت میں رائج کرنے کی تدابیر پر غور کرے۔ اس کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ چھ تا گیارہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے دو پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعہ لازمی تعلیم کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ چونکہ اس منصوبہ کی عمل آوری کے پہلے ہی سال تعلیم پر مزید اٹھارہ کروڑ روپیوں کا خرچہ لاحق ہو رہا تھا اس لیے حکومت کی معاشی کمیٹی نے یہ رائے دی تھی کہ تعلیمی پروگرام کی رفتار کو سست کر دیا جائے۔ لہٰذا اس پروگرام کو فوری طور پر نافذ نہیں کیا گیا۔

ہندوستان میں مکمل لازمی تعلیم کے نفاذ میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔ اول تو آبادی میں سالانہ ایک فی صد کا اضافہ اور دوسرے ملک کی معاشی زبوں حالی۔ اگر ہندوستان میں ہر ایک بچہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے تو مرکزی حکومت کی آمدنی کا 4 حصہ اور ریاستی حکومتوں کی تمام تر آمدنی اس پر خرچ ہو جائے گی۔ حصول آزادی کے بعد سے متعدد پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعہ ناخواندگی کو دور کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مگر کوئی قابل لحاظ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ بعض مقامات میں تو ناخواندہ بالغوں کی تعداد نوے فی صد سے زیادہ ہے۔

لازمی تعلیم کے اجمالی خاکہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ لازمی تعلیم کس عمر میں شروع ہونی چاہیے اور کب ختم ہونی چاہیے، کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔ ہر ملک کے حالات یکساں نہیں ہوتے اس لیے عمل میں فرق کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے ماسوا لازمی تعلیم کا منصوبہ کسی ملک میں بھی صد فی صد کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ تیسرے یہ کہ جب تک جزوقتی تسلسلی تعلیم کا انتظام نہ ہو مختصر میعاد کی لازمی تعلیم ضائع ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کے بغیر طلبا جو کچھ سیکھیں گے بہت جلد بھول جائیں گے۔ (یہاں لازمی تعلیم کے مسائل کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے)۔

لاطینی امریکا کی انجمن برائے یک جہتی (Latin American Integration Association, LAIA): اس انجمن کا قیام اگست 1980 میں لاطینی امریکی آزاد تجارتی انجمن (LAFTA) کی جگہ عمل میں آیا جس کی تشکیل فروری 1960 میں ہوئی تھی۔ ارجنٹینا، بولیو، برازیل، چلی، کولمبیا، ایکویڈر، میکسیکو، پیراگوئے، پیرو، ارگوئے، وینزویلا، اس کے ارکان میں شامل ہیں۔

ممبر ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کونسل اس انجمن کی پالیسیوں پر عمل آوری کی ذمہ دار ہے۔ جب بھی نمائندوں کی کمیٹی ضرورت محسوس کرے اور مناسب سمجھے کونسل کا اجلاس طلب کرسکتی ہے۔ دراصل نمائندوں کی کمیٹی ہی انجمن کا مستقل ادارہ ہے۔ انجمن کے کئی کمیشن ہیں اور ایک سکریٹریٹ بھی ہے۔ اس کا صدر دفتر مانٹ ویڈیو (ارگو) میں واقع ہے۔

LAFTA کا قیام مانٹے ویڈیو کے معاہدہ کے ذریعہ بین الحکومتی تنظیم کی حیثیت سے فروری 1961 میں عمل میں آیا تھا تاکہ ممبر ملکوں کے درمیان تجارت کو فروغ ہو، علاقائی یک جہتی مستحکم ہو اور انھیں اقتصادی و اجتماعی تحفظ حاصل ہو۔ اس کا مقصد لاطینی امریکا کی مشترکہ منڈی قائم کرنا تھا لیکن اس کی تکمیل نہیں ہو سکی لہٰذا LAIA کا قیام عمل میں لایا گیا۔

لاطینی امریکی اقتصادی نظام (Latin American Economic System): اس نظام کو پنانا کنونشن کے تحت اکتوبر 1975 میں رواج ملا۔ اس کا مقصد لاطینی امریکی منطقہ میں اقتصادی و اجتماعی ترقی کے لیے تعاون اور باہمی صلاح و مشورہ کرنا ہے۔ اس کے ممبر ملکوں کی تعداد 27 ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین ادارہ لاطینی امریکی کونسل ہے جس کا اجلاس ہر سال وزارتی سطح پر منعقد ہوتا ہے۔ اس میں ہر رکن ملک کا ایک نمائندہ شامل ہوتا ہے۔ اس کا ایک مستقل سکریٹریٹ ہے۔

اس کا صدر دفتر وینے زویلا میں واقع ہے۔

لائسنس یا اجازت نامہ (License): اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو یا اشخاص کو اپنی جائداد غیر منقولہ پر کوئی کام کرنے کا کوئی اختیار دیتا ہے جو اگر بغیر اجازت کیا جائے تو غیر قانونی ہوگا اور وہ کام حق آسائش کی تعریف میں نہیں آتا تو ایسی اجازت کو قانون آسائش کی اصطلاح میں لائسنس کہا جاتا ہے۔ لائسنس دینے کا صرف اس شخص کو حق حاصل ہے جو اس جائداد پر اپنے حق کو منتقل کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔ لائسنس دینے کا اختیار واضح (Express) یا متصور (Implied) ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا معاہدہ جس سے کوئی حق آسائش قایم ہوتا ہو لیکن وہ ناقابل عمل ہو اسے لائسنس کے طور پر روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔

لسٹر فرانیک وارڈ (Lester Frank Ward): لسٹر فرانیک وارڈ (1841-1913) امریکی ساجیات داں گزرا ہے۔ اس کا شمار گذشتہ صدی کے انداز فکر رکھنے والے مفکرین کے سلسلہ کی آخری اہم کڑی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ وارڈ کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ماہر نباتیات اور ارضیات کی حیثیت سے گزرا ہے۔ اور ان علوم کی ابتدائی معروفیات نے اس کی ساجیاتی فکر پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اپنی زندگی کے نصف ثانی اور بہتر تخلیقی حصہ اس نے ساجیاتی فکر پر صرف کیا۔ ساجیات پر وارڈ کی پہلی اہم تصنیف متحرک ساجیات (Dynamic Sociology) ہے جو 1883 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد وارڈ نے اور کئی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کتابیں ساجیات پر لکھیں۔ اس کی تصانیف میں سماج کے متحرک اور اصلاحی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وارڈ کا ایقان تھا کہ سماجی تبدیلی کے رجحانات پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ وارڈ کو اطلاقی سماجیات کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی تصانیف میں خالص سماجیات (Pure Sociology) اور اطلاقی سماجیات (Applied Sociology) میں نمایاں امتیاز کیا ہے۔ اس کے نقطہ نظر سے خالص سماجیات کا کام تشخیصی ہے۔ خالص سماجیات میں ان نظریات سے بحث کی جاتی ہیں۔ جن کے مطابق سماجی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ اس کے برخلاف اطلاقی سماجیات کا مقصد معالجی ہے اور اس کا یہ کام ہے کہ نظریاتی دریافتوں کی روشنی میں اجتماعی زندگی کے حالات کو بہتر بنایا جائے۔ وارڈ کا خیال تھا کہ اطلاقی سماجیات بھی ایک علم ہے جس کی تحقیقات سے سماجی عمل کے رجحانات کو بڑی حد تک کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرز فکر نے بعد میں سماج کاری کو ایک مکمل اور بامعنی ہیشہ بنا دیا۔

وارڈ جمہوریت پسند تھا اور اس کی سماجیاتی تحقیقات کا مقصد ایک ایسی فضا پیدا کرنا ہے جو انسانی مساوات کے ذریعہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی فراہم کرسکے۔ انیسویں صدی کے مفکرین کی طرح وارڈ نظام ساز تھا۔ یعنی اس نے دیگر ذہنی اور تصوراتی نظام ہائے زندگی کی طرح ایک مثالی سماجی نظام کی تشکیل کے لیے علم کو آلہ کار بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی تحقیقات کا دارومدار بڑی حد تک مشاہدہ اور تصورات تک محدود تھا۔ اس نے عددی اور مقداری تحقیق کی طرف توجہ نہیں کی۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ وارڈ آنے والی نسلوں میں زیادہ مقبول نہیں رہ سکا۔ تاہم سماجیاتی ادب میں اس کے مقام کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

لغت (Dictionary) : لغت دوران تعلیم سب سے پہلے ہمارا جس حوالہ جاتی کتاب سے تعارف ہوتا ہے وہ لغت ہے۔ لغت میں کسی الفاظ کے معنی یا کسی مضمون، پیشہ یا فن میں استعمال اصطلاحات کی وضاحت درج ہوتی ہے۔ الفاظ یا اصطلاحات لغت میں عام طور پر حروف تہجی کے اعتبار سے درج ہوتی ہیں۔

لغت کو فرہنگ، معجم، قاموس وغیرہ چند دوسرے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام لغت کی خصوصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ خصوصیت کے اعتبار سے لغت کو درج ذیل اقسام میں رکھا گیا ہے:

عام لغت، مخصوص صفات لغت، مضمون کی لغت اور لغت برائے ترجمہ۔

عام لغت کو اکثر ہدایتی لغت (Prescriptive) اور بیانیہ لغت (Descriptive) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک اور خصوصیت جس کی بنیاد پر لغت تقسیم کی جاتی ہے اس کا حجم ہے چنانچہ بسیط لغت جو کئی جلدی ہوتی ہے اور مختصر یا جیبی لغت جو ایک جلدی ہوتی ہے۔

عام نوعیت کی لغت میں الفاظ کے معنی کے ساتھ ہجا اور تلفظ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں الفاظ کی ابتداء، نحوی حیثیت اور ان کا مناسب استعمال بھی معلوم ہوتا ہے۔ بڑی لغت میں الفاظ کے معنی کے علاوہ کچھ دوسری قسم کی معلومات بھی دی جانے لگی ہیں۔ مثلاً مخففات، سرنامیہ، مترادفات، اوزان و پیائش کے پیمانے مختلف ملکوں کے سکے، جھنڈے وغیرہ ایسی لغات بھی ہیں جن میں معروف افراد کا چند الفاظ میں سوانحی ذکر درج ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں لغت میں الفاظ کے ساتھ ساتھ کچھ حد تک انسائیکلوپیڈیا کی معلومات بھی درج کی جانے لگی ہیں۔

مخصوص صفات لغات الفاظ کے ادبی پہلو، مخصوص سماجی طبقے میں مستعمل الفاظ کے مفہوم اور الفاظ کے لسانی پہلو کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ منفرد حیثیت کے افراد کے لیے الفاظ کی تفصیل بھی دیتی ہیں مثلاً ہم قافیہ الفاظ، نرسری گیتوں کے لیے الفاظ۔ ذولسانی اور کثیر لسانی لغات ترجمہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے مرتب کی جاتی ہیں۔ اس قسم کی لغت سیاحوں کے لیے بھی مفید ہوتی ہیں۔

مضامین سے متعلق لغت میں تکنیکی اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ عموماً یہ عام لغات کے ساتھ نہیں رکھی جاتی ہیں۔ اشاریہ سازی کے عمل میں کمپیوٹر کے اثرات کے تحت لغت کی نئی قسم تھسارس (کنز اللغات) وجود میں آئی ہے اب جملہ مضامین کے تھسارس موجود ہیں جن میں مضمون کے مخصوص ڈسکرپٹرس (Descriptors) یا اصطلاحات جو سرمدخل کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں درج ہوتی ہیں۔

لغت کی ایک قسم کنکارڈینس (Concordance) ہے جو دراصل مذہبی کتابوں میں موجود الفاظ و اصطلاح کے مفہوم کی وضاحت کرتی ہیں۔

مثالیں: عام لغات : نوراللغات نئی دہلی 1989، اردو لغت تاریخی اصول پر، کراچی 1977، مہذب اللغات، لکھنؤ 1960-89

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

دو لسانی : انگریزی اردو ڈکشنری مرتبہ کلیم الدین احمد نئی دہلی 1994

لسانی صفت : قاموس المترادفات مرتبہ وارث سرہندی، لاہور

اردو ضرب الامثال کا ایک جامع مجم، اسلام آباد 1986

لقط: جن اموال کے مالکوں کا پتہ نہ لگے وہ بھی بیت المال کی ملکیت ہوں گے۔

لگان (Rent)- تقسیم دولت : لگان کا تصور ابتدا صرف زمین (Land) کے ساتھ وابستہ تھا۔ جیسا کہ ریکارڈو کے نظریہ تقسیم کے بیان میں واضح کیا جاچکا ہے۔ مگر آگے چل کر ماہرین معاشیات نے محسوس کیا کہ بہت سی پیدا آور خدمات کی رسد قلیل مدت (Short Term) میں بے لچک (Unelastic) ہوتی ہے۔ جس پیدا آور خدمت کی رسد بے لچک ہو یا کم لچک دار ہو اس کے مالک کے لیے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ اس کی طلب میں اضافہ پر اس کی قیمت بڑھا دے۔ قیمت میں یہ اضافہ بجاطور پر لگان قرار دیا جاسکتا ہے۔ عرصہ طویل میں جب اس پیدا آور خدمت کی رسد بڑھ جاتی ہے تو اس کی قیمت پھر گر جاتی ہے اور اس کا مالک لگان سے محروم ہوجاتا ہے۔ مشینوں اور دیگر اشیا اصل (Capital Goods) اور فنی مہارت (Technical Skill) وہ چیزیں ہیں جن کی رسد میں طلب بڑھنے پر فوری اضافہ ممکن نہیں۔ ان سے متعلق لگان کو مارشل نے شبہ لگان (Quasi Rent) قرار دیا ہے تاکہ اسے اصل لگان یعنی زمین کے لگان سے ممتاز کیا جاسکے۔ جس کا سبب زمین کی رسد کا مستقل طور پر بے لچک ہوتا ہے۔

بسا اوقات کسی پیدا آور خدمت کے لیے ایک مخصوص صنعت میں اپنی خصوصی کارکردگی کی بناء پر اتنا معاوضہ حاصل کرنا ممکن ہوجاتا ہے جو اسے کسی دوسری صنعت میں نہیں مل سکتا۔ فلمی اداکاروں اور مغنیوں کی اونچی آمدنیاں اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کی آمدنی کا جو حصہ ان کی خصوصی صلاحیت کا مرہون منت ہو اسے صلاحیت کی لگان (Rent of Ability) قرار دیا گیا ہے۔ لگان کی مقدار اس پیدا آور خدمت کی موجودہ آمدنی اور اس کی کسی دوسری صنعت میں متبادل آمدنی (Alternative Earning) یا کسی دوسری صنعت کے لیے اس کو حاصل کرنے کی لاگت (Opportunity Cost) کے مابین فرق کے مساوی ہوتی ہے۔

اس طریقے پیمائش کے مطابق کسی بھی عامل پیداوار یا پیدا آور خدمت کی آمدنی میں لگان کے عنصر کا بآسانی پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

لمیٹڈ کمپنی تابحد حصص (Company Limited By Shares): کمپنی جس کے ممبروں کی ذمہ داری میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کے تحت ان کے حصص کی غیر اداشدہ رقم کی حد تک محدود ہوتی ہے اسے لمیٹڈ کمپنی تابحد حصص کمپنی لاء کی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ اس نوعیت کی کمپنیاں عام طور پر پسندیدہ اور رائج ہیں کیونکہ اس میں اہم بات یہ ہے کہ ممبروں کی ذمہ داری ان کے حصص کی قیمت کی حد تک محدود ہوتی ہے۔ اگر کسی حصہ دار نے اپنے حصے کی رقم ادا کردی ہو تو اس پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ حصص کی غیر اداشدہ رقم کی وصولی کمپنی کے قیام کے دوران یا کمپنی کے اختتام پر وصول کی جاسکتی ہے۔ ایسی کمپنیاں دو قسم کی ہوسکتی ہیں۔ (1) پبلک کمپنی (2) پرائیویٹ کمپنی۔

لمیٹڈ کمپنی تابحد ضمانت (Company Limited By Guarantee): کمپنی جس کے ممبروں نے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کے تحت کمپنی کی تحلیل یا اختتام کی صورت میں کمپنی کے اثاثے میں رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری لی ہو اسے کمپنی لمیٹڈ بائی گارنٹی کہتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ گارنٹی کی رقم اس صورت میں ادا طلب ہوتی ہے جب کمپنی ختم ہو یا تحلیل ہو۔

لوتھر گولک (Luther Gullic): بہتر پبلک نظم و نسق پر امن ماحول اور معاشرے کی ترقی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس ضمن میں اور بہتر کی تلاش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ دانشوروں اور سیاست دانوں کا اس سلسلہ میں بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ لوتھر گولک ایک معروف امریکی سیاست داں گزرا ہے۔ اس نے پبلک نظم و نسق کو ہر دباؤ سے آزاد رکھنے کی ہمیشہ وکالت کی۔ گو وہ خود ایک سیاست داں تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ امریکی گورنمنٹ کی کارکردگی میں جو اصلاحات کی جائیں ان میں ایک یہ ہو کہ پبلک نظم و نسق کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر پبلک نظم و نسق سیاسی دباؤ میں رہتا ہے تو انتظامیہ کی کارکردگی منفی ہو جاتی ہے اور یہ پوزیشن ملک کو کمزور بناتی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

لوک ریت (Folk Lore): لوک ریت میں وہ تمام علوم، فنون لطیفہ، حرفت اور بطریق زندگی شامل ہیں جو زبانی نسلاً بعد نسل کسی سماج میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ انسانیات دانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ لوک ریت کا تعلق صرف قدیم قبائلی اور قبل صنعتی زرعی سماج سے ہے۔ لوک ریت میں لوک آرٹ لوک حرفت لوک لباس لوک رسوم و رواج لوک عقائد لوک دوائیں اور طریقہ علاج لوک کنائے اور اشارے اور لوک بولی شریک ہیں۔ یہ تمام تمدنی عناصر زبانی اور تقلید کے ذریعہ اگلی نسل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر لوک ادب میں لوک کہانیاں روایتیں اور داستانیں، دیومالائیں، کہاوتیں، پہیلیاں، شاعری اور گیت شامل ہیں۔ قدیم سماج کے یہ تمام مظاہر تمدنی نیرنگیوں اور معنی آفرینیوں کے لحاظ سے بے مایہ یا کم مایہ نہیں ہیں گو کہ ان پر تحقیق اور ریسرچ ابھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ اور خاص طور سے ترقی پذیر ممالک کی لوک ریت کا تفصیلی مطالعہ اور جائزہ ابھی انتہائی ابتدائی منزل پر ہے۔

تمدنی انسانیات یا سماجی انسانیات نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ کسی تمدن کا ہر مظہر نہ صرف ایک تمدنی اظہار ہوتا ہے بلکہ اس کی اس سماج میں بڑی تفاعلی اہمیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لوک کہانیاں لوک گیت پہیلیاں اور دیومالائیں محض اس تمدن کا ایک تاریخی سرمایہ نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی اس سماج کے لیے بڑی بنیادی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ یہ تمام سرمایہ نہ صرف تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے بلکہ اس میں موجودہ اور آئندہ زندگی کے تعلق سے راست یا بالواسطہ ہدایت انتباہ اور رہنمائی کے اصول مضمر ہوتے ہیں۔ لوک ریت کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ان سماجوں کا تمدنی تسلسل برقرار رہتا ہے۔ لوک ریت ایک طرف تو ماضی سے رشتہ کو منسلک کرتی ہے اور دوسری طرف حال کے مسائل کا حل پیش کرنے کے علاوہ مستقبل کے تعلق سے فلسفیانہ اور فکری رہنمائی کرتی ہے۔ ہر تمدن میں لوک ریت کے وسیع خزانے موجود ہوتے ہیں گو کہ ان کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے پر ابھی تک بہت زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ تاہم زبانی منتقل ہونے والے تمدنوں کا یہ سرمایہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کے مطالعہ اور تجزیہ کے بغیر انسانی اجتماعی زندگی کے رموز و مضمرات کے بہت سے نکات تشریح طلب رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل سماجیات داں اور ماہرین انسانیات لوک ریت کے مطالعہ کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

لوئی ہنری مارگن (Luis Henry Margan, 1818-1881): مارگن مشہور امریکی ماہر انسانیات ہے۔ یہ نیویارک کے نواح میں پیدا ہوا۔ مارگن نے قانون کی ڈگری حاصل کی اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی پیشہ میں صرف کیا۔ اس کی انسانیات سے دلچسپی تعلیم کی تکمیل کے بعد اس وقت شروع ہوئی جب اس کا ربط نوجوانوں کے ایک کلب سے پیدا ہوا جس کا نام گرانڈ آرڈر (Grand Order) تھا اس کلب کی دلچسپیوں میں ثقافتی مطالعہ اور تحقیقات شامل تھیں۔ اسی سلسلہ میں مارگن نے امریکا کے سینکا (Seneca) انڈین قبائل کی تاریخ، ثقافت اور قبائلی زندگی پر بہت کچھ لکھا۔ یہیں سے اس کی انسانیاتی میں دلچسپی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی سب سے مشہور کتاب (Ancient Society) ہے جو 1877 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے سماج کے ارتقاء پر روشنی ڈالی۔ اس ارتقائی مطالعہ میں جائیداد اور معیشت کے اداروں کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس (Marx) اور اینجلس (Engels) مارگن سے بہت متاثر ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں مارگن کے کارناموں پر کافی تنقیدیں کی گئی ہیں۔ لیکن گذشتہ دو دہوں میں مارگن کے انسانیاتی نظریوں پر پھر سے توجہ دی جارہی ہے۔ چنانچہ اس کی کتاب 1962 میں دوبارہ شائع ہوئی۔ 1963 اور 1964 کے درمیان مارگن پر مقالے لکھے گئے۔ اس کا شمار اس علم کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔

لیبر پارٹی (Labour Party): 1900 میں برطانیہ کی ٹریڈ یونینوں اور اشتراکیوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا جسے "لیبر ری پریذنٹیشن کمیٹی" (Labour Representation Committee) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ 1906 میں اس تنظیم کا نام بدل کر لیبر پارٹی کر دیا گیا۔ اس کی کامیابی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1906 کے انتخابات میں اس پارٹی نے پچاس امیدوار کھڑے کیے تھے جن میں سے 29 منتخب ہو کر ہاؤز آف کامنز تک پہنچ گئے۔ 1922 میں اس نے پارلیمنٹ میں لبرل پارٹی کی جگہ حزب اختلاف کی حیثیت حاصل کرلی اور برطانیہ کی دوسری سربرآوردہ پارٹی بن گئی۔ 1924 اور 1929 میں اسے اقلیتی حکومت سازی کے مواقع فراہم ہوئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد 1945 میں اس پارٹی کو پہلی بار آزادانہ حکومت سازی کا موقع ملا۔ اس نے اپنے انتخابی منشور میں اعلان کیا تھا کہ اگر یہ برسر اقتدار آگئی تو ہندستان کو آزادی سے ہمکنار کردے گی۔ چنانچہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

اپنی کامیابی کے بعد لیبر پارٹی کے قائد لارڈ ایٹلی نے آئینی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی غرض سے 1946 میں ایک کیبنٹ مشن ہندستان بھیجا اور پھر مارچ 1947 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندستان کا آخری وائسرائے مقرر کیا۔ انھوں نے 3 جون کو اپنا منصوبہ پیش کرکے ہندستان کو دو حصوں یعنی ہندستان اور پاکستان میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا جسے کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں ہی نے منظور کرلیا۔ انجام کار لیبر پارٹی کے دور اقتدار میں ہندستان کو آزادی کی نعمت حاصل ہوئی اور اسی کے دور اقتدار میں ہندستان نے دولت مشترکہ کی رکنیت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا جو آج بھی جاری ہے۔

اپنے دور اقتدار میں اس نے نہ صرف ہندستان بلکہ دوسری نوآبادیوں کو بھی آزادی سے ہمکنار کیا اور بہت سی داخلی اصلاحات نافذ کیں۔ اس کے بعد لیبر پارٹی تیرہ سال تک اقتدار سے محروم رہی کیونکہ اسے متواتر تین انتخابات میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس مدت میں وہ اندرونی خلفشار اور اختلافات کا شکار رہی لیکن گیٹسکل کی قیادت میں اس نے اپنے اختلافات ختم کرکے انتخابات میں حصہ لے کر اکتوبر 1964 میں ہیرالڈ ولسن کی قیادت میں کامیابی حاصل کی اور حکومت سازی کی۔ مارچ 1966 کے انتخابات میں اسے پھر کامیابی حاصل ہوئی۔ جون 1970 کے انتخابات میں نہ کنزرویٹیو پارٹی کو اکثریت حاصل ہوئی اور نہ ہی لیبر پارٹی کو۔ اس لیے لیبر پارٹی نے لبرل پارٹی کی مدد اور حمایت سے اقلیتی حکومت کی تشکیل کی۔ اس کے بعد وہ انتخابات میں شکست کھاتی رہی اور کنزرویٹیو پارٹی برسر اقتدار آتی رہی۔ آخر یکم مئی 1997 کو لیبر پارٹی نے کنزرویٹیو پارٹی کو شکست دے کر وزیراعظم ٹونی بلیر کی قیادت میں حکومت سازی کی۔

لیبر پارٹی کو ان انتخابات میں 418 نشستیں حاصل ہوئی۔ اپنے انتخابی پروپیگنڈے میں لیبر پارٹی نے اپنے آپ کو ایک نئی لیبر پارٹی کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اور انکم ٹیکس کی شرح میں 23% سے زیادہ اضافہ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

لیکس ریگائٹ (Leges Regiat): مورخین نے رومن لاء کے ان قوانین کے بارے میں جسے لیکس (Leges) کہتے ہیں بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ قوانین شہنشاہوں کے زمانے میں بنائے گئے تھے لیکن ابتدائی دور میں باقاعدہ قانون سازی نہیں کی جاتی تھی بلکہ وہ قدیم رواج تھے جنھیں شاہی دربار سے قانون کا درجہ دیا جاتا تھا۔ آگسٹس (Augustus) نے جب رومن شہنشاہیت قایم کی اس وقت قانون ساز اسمبلی نے اپنے کام فوری بند نہیں کیا لیکن حقیقت میں قانون ساز اسمبلی شاہی خواہش کی تکمیل کے لیے محض ایک ضابطے کی تکمیل تھی۔

لیوفرابنیس (Leo Frobenius, 1873-1938): فروبنیس انیسویں صدی میں مشہور ماہر انسانیات ہے۔ وہ ایک بڑا مہم پسند تھا اور اس نے ثقافتوں کے مشاہدہ اور مطالعہ کے لیے بڑی مشقتیں اٹھائیں۔ فروبنیس نے صرف ثقافتی مواد ہی جمع نہیں کیا بلکہ اس نے اس مواد کو اس طرح مرتب اور منظم کیا کہ اس کی مدد سے علم الاقوام کی تحقیق میں بہت ہی قیمتی معلومات کا اضافہ ہوا۔

فروبنیس برلن میں پیدا ہوا اور اپنی نوجوانی ہی میں اس نے افریقہ کی ثقافتوں کا بغور مطالعہ شروع کیا۔ اور اکیس برس کی کم عمر میں یعنی 1894 میں اس نے افریقہ کے خفیہ سماجی گروہوں پر ایک ضخیم کتاب شائع کی۔ ثقافتی انسانیات پر اس نے جو تحقیقات کی ہیں اس سے قدیم قبائلی ثقافت پر اس کی گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔

فروبنیس کو انسانیات کے میدانوں میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ثقافت کی وضاحت اور اس کے تجزیہ میں اس کا طریقہ تحقیق نئی راہوں کی دریافت کا باعث بنا۔ اس نے جرمنی کے جامعات میں ثقافتی انسانیات پڑھائی۔ اس کی اہم تصنیفات ثقافت کے موضوع پر ہیں جس میں "The Origin of African Civilisations" بہت مشہور ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

م

ماتحت ممالک (Dependencies) : یورپ کی جدید مملکتوں نے پندرہویں اور سولہویں صدیوں کی جغرافیائی دریافتوں کے نتیجہ میں بہت سے سمندر پار علاقوں کو فتوحات یا نوآباد کاری کے ذریعہ اپنا محکوم بنایا اور انھیں محکوم یعنی اپنی ترقی کے لیے حاکم ملک کے محتاج ہونے کا درجہ دیا۔ حاکم اور محکوم ملکوں کے درمیان رشتہ کی بنیاد سیاسی، قانونی، نسلی اور تہذیبی نابرابری کے تصور پر ہوتی ہے۔ محکوم ملک میں نوآبادکار حکومت مقامی آبادی کی فلاح و بہبود اور ترقی کے دعوے کی آڑ میں حاکم طاقت کے فوجی، سیاسی اور اقتصادی مفادات کو بڑھاتی اور اس کے لیے نوآبادی کے مادی اور انسانی وسائل کا استحصال کرتی ہے۔ محکوم ملکوں کے کمتر قانونی درجہ کا سبب عام طور پر ان کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس ماندگی کو قرار دیا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی حکومت ناگزیر طور پر سامراجی حکومت ہوتی ہے۔ محکوم علاقوں میں قوم پرستی اور آزادی کی تحریکات شروع ہونے اور خاص طور سے پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں نوآبادیات کے درجہ میں کچھ فرق واقع ہوا۔ یعنی "محکوم" اور "نوآبادی" کی اصطلاحات کی جگہ "محفوظ" (Protectorate) اور "تابع دار" (Vassal) مملکت کی اصطلاحیں رائج کی گئیں۔ پھر پہلی جنگ عظیم ہی کے بعد کچھ نے "ڈومینین" (Dominion) کچھ نے "غیر ملحقہ علاقہ" (Unicorporated Territory) اور کچھ نے "تحویلی" (Mandated) علاقہ کی شکل اختیار کرلی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اکثر معتدبہ علاقے آزاد ہو گئے۔ جو باقی رہے انھیں اقوام متحدہ کے "تولیتی علاقہ" (Trust) کی حیثیت دی گئی اور اقوام متحدہ کی تولیتی کونسل کے زیر اہتمام یکے بعد دیگرے ان کو آزادی دلائی گئی۔ جو علاقے اب بھی نوآبادیات کے درجہ میں تھے انھیں "غیر خود اختیاری" (Non-self Governing) کا مہذب نام دیا گیا۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے اختتام تک ایشیا و افریقہ سے سبھی سامراجی عملداریوں اور نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

ماحول (Environment) : ماحول میں وہ تمام خارجی حالات اور اثرات شامل ہیں جو کسی عضویہ کی حیات اور اس کے ارتقا پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ کسی حیاتی عضویہ کو ماحول سے خارج بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ماحول اور اس کے اثرات کا جب سماجیات میں ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد انسانی معاشرہ میں افراد اور ان کے اطراف پائے جانے والے جغرافیائی ماحول کے بین عمل کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے۔ ہپوکریٹس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں ایک رسالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "ہوائیں پانی اور مقامات"۔ اس مقالہ کو ماحولیاتی اصولوں کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ماشکو نے 1748 میں اور ٹوائن بی نے 1934 میں ماحول کے سماج پر اثرات کا جائزہ لیا۔ انسانی تاریخ و تمدن کے ارتقاء پر جغرافیائی اور ماحولیاتی اثرات کا مطالعہ بے شمار مفکرین نے کیا ہے۔ سماجی جغرافیہ میں انسان اور ماحول کے بین عمل پر کافی بحثیں ہوئی ہیں۔ اب سماجیات داں اس بات کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں کہ ماحول کے بے شمار اور پیچیدہ عوامل انسانی برتاؤ اور انسانی تعلقات پر گہرا اثرات ڈالتے ہیں۔ تاہم ماحول کے بے شمار عوامل کا جائزہ اب بھی اپنی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ اور یہ کام انسانیات، آثاریات اور سماجیات کے ماہرین مل جل کر ہی کرسکتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں ذرائع حمل و نقل اور رسل و رسائل کی بے پناہ ترقی کی وجہ سے دنیا کے دور دراز ممالک کے مابین جو قریبی نازک اور حساس بین عمل کی صورتیں پیدا ہورہی ہیں انھوں نے ماحولیاتی مطالعہ کی پیچیدگی کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اب اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار دنیا میں ماحول کی نئی نزاکتیں اور نئی حرکیات کا تفصیلی اور غائر مطالعہ کیا جائے۔

صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی زرعی پیداوار کے اضافے اور

کارخانوں کی مصنوعات کی پیداوار کی بڑھوتری میں مقابلہ شروع ہوگیا۔ زمینی ذخیروں، جنگلوں کی لکڑیوں، توانائی کے ذرائع اور زمین کی غلہ اگانے کی قوت کو بری طرح انسانی لالچ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آبادی کے تحاشا بڑھنے سے ضرورتیں بھی بڑھنے لگیں اور ہر قسم کی پیداوار بڑھنے لگی لیکن قدرتی وسائل میں کمی ہونے لگی۔

صارفیت کو بڑھاوا ملا۔ سیدھا سادہ طرز زندگی پیچھے چھوٹنے لگا۔ اور پیداوار بڑھانے کی اندھی دوڑ میں فطرت کا نظام لڑکھڑانے لگا۔ ماحولیاتی عدم توازن بڑھنے لگا لیکن صنعتی معاشرے کا مزہ چکھنے کے بعد قبائلی یا دیہاتی سماج میں واپس نہیں جایا جاسکتا۔ اس طرح صنعتی سماج اپنی تمام تر خامیوں اور مسائل کے ساتھ برقرار رہا۔

صنعتی ترقی کی وجہ سے بڑھتی ماحول کی آلودگی شاید بیسویں اور اکیسویں صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ انسانی سماج میں آلودگی سے ہونے والی دشواریوں میں سرفہرست ہیں:

زمینی گرمی اور گرین ہاؤس اثرات : ہوا میں تیزابی بادلوں کی لگاتار بڑھوتری نئی صنعتیں نئے کارخانے بے شمار کاریں بسیں اور ٹریکٹرز اور بے حساب کلورو فلورو کاربن پر منحصر منصوعات، یہ سب مل کر زمینی گرمی بڑھاتے ہیں اور اس کی وجہ سے پورے زمینی سیارے پر گرین ہاؤس جیسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی بدولت سمندروں کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور دوسرے ایسے نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔ جن کے دور رس منفی اثرات ہوتے ہیں۔ 1990 میں ہونے والی بین الاقوامی تبدیلی آب و ہوا پینل نے بیان دیا تھا کہ ماحول کی موجودہ حالت (بغیر کسی اصلاح کے) برقرار رکھنے کے لیے نقصان دہ گیسوں کی پیداوار میں ساٹھ فیصدی کی کمی ضروری ہے۔ ورنہ گرین ہاؤس اثرات بڑھتے جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی سمندروں جنگلوں اور صحراؤں میں ہونے والی آلودگی کے سبب ہر روز لاتعداد زندگیاں زمین سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ اس طرح زمینی گرمی رفتہ رفتہ تمام قسم کی زندگیوں کو فنا کردے گی۔

سماجی ناانصافی اور استحصال : استحصالی سماجوں میں ناانصافی اپنے عروج پر ہوتی ہے اور ماحولیاتی آلودگی کو فروغ دیتی ہے۔ بنیادی ناانصافی ہوتی ہے۔ (1) مستقبل کی نسلوں کے ساتھ، (2) مادی طور پر کمتر انسانوں کے ساتھ، (3) اور دوسری اقسام زندگی کے ساتھ (چرند پرند اور نباتات وغیرہ)۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ اگر سماج میں عدم مساوات نہ ہو اور سماجی انصاف پورے طور پر موجود ہو تو ماحولی آلودگی میں بھی لگام لگ جاتی ہے۔ بنیادی طور پر ماحول میں سدھار عوام الناس کی بیداری اور کوششوں سے ہی ممکن ہے۔

مارشل۔ آلفرڈ (Marshal Alfred, 1852-1924):

انگلستان اور دنیا کا یہ مشہور معاشیات داں نوکلاسکی (Neo-Classical) معاشیات کا بڑی حد تک بانی سمجھا جاتا ہے۔

مارشل کی ابتدائی تعلیم مرچنٹ ٹیلر کے اسکول میں ہوئی اور سنٹ جان کالج سے ریاضی میں ڈگری حاصل کی۔ 1868 میں وہ کیمبرج میں اخلاقی سائنس کا لکچرار مقرر ہوا اور اسی زمانہ میں اس نے معاشیات کا مطالعہ شروع کیا۔ 1882 میں وہ برسٹل چلا گیا جہاں سیاسی معاشیات (Political Economy) کا پروفیسر بنا۔ 1885 میں وہ علم معاشیات کے پروفیسر کی حیثیت سے دوبارہ کیمبرج واپس آگیا اور یہاں 1908 تک کام کرتا رہا اور بعد میں وظیفہ پر علیحدگی اختیار کی۔

اس زمانہ میں مارشل نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے حسب ذیل زیادہ مشہور رہیں: بیرونی تجارت کا خالص نظریہ (Pure Theory of Foreign Trade)، 1879، "اصول معاشیات" (Principles of Economics)، 1890، "صنعت اور تجارت" (Industry & Trade)، 1919 اور زر قرضہ اور تجارت (Money, Credit and Commerce)، 1923 ان میں سے اس کی سب سے اہم کتاب "اصول معاشیات" ہے۔ اس کے ذریعہ اس نے معاشیات کے بالکل نئے تصورات پیش کیے مثلاً طلب کی لچک (Elasticity of Demand)، مثل لگان (Quasi Rent)، نفع صارف (Consumers Surplus) وغیرہ ان نظریات نے آئندہ چل کر معاشیات کے نظریوں کے ارتقاء میں اہم حصہ ادا کیا اور بعد کے آنے والے معاشیین پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ جزوی معاشیات (Micro-Economic) کے نظریوں کو ترقی دینا اور انھیں انتہائی واضح بنانا ہے۔ ان نظریات کے سلسلے میں جو کچھ بھی اس نے لکھا ہے اسے سمجھنے میں آج کے ابتدائی معاشیات کے طالب علم کو بھی ذرا سی دقت نہیں ہوتی۔ اس نے اپنے نظریہ قدر میں پچھلے تمام نظریوں کو سمو دیا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اور بتلایا ہے کہ کس طرح کسی شے کی طلب کا انحصار صارف کی خوش حالی یا اس شے کی افادیت پر ہے۔ ایک صارف کے پاس کسی شے کی زیادہ مقدار کی موجودگی میں اس شے کی مزید خرید سے اسے کم افادہ حاصل ہوگا۔ اور یہ افادہ گھٹتے ہوئے صفر تک پہنچ جائے گا۔ کوئی صارف کسی شے کی مزید اکائیاں اس وقت تک خریدتا رہے گا جب تک کہ یہ زاید افادہ صفر نہ ہو جائے۔ یعنی یہ کہ مزید خرید اس وقت رک جائے گی۔ جب وہ محسوس کرنے کہ اس مزید خرید کی صورت میں شے کی قیمت اس کے افادہ سے کہیں زیادہ ہے۔ توازن کے اس نقطہ پر اگر قیمت گرنے لگے تو پھر اس کے لیے یہ سود مند ہوگا کہ وہ زر کے بدلے زیادہ اشیا حاصل کرے۔ چنانچہ اگر اشیا کی قیمتیں گرنے لگیں تو ان کی مانگ بڑھے گی اور اس طرح ایک خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قیمتوں پر مانگ یا طلب کیا ہوگی۔ مارشل نے قیمت کی معمولی تبدیلی سے طلب میں آنے والے فرق کے لیے لچک (Elasticity) کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اسی طرح جہاں تک رسد کا تعلق ہے پیداوار میں اضافہ کے لیے قیمتوں میں اضافہ ضروری ہے اور اس طرح اس کے لیے بھی ایک خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

مارشل کو اس کا احساس تھا کہ اپنے اس نظریہ میں اس نے بہت سیدھا سادھا راستہ اختیار کیا اور اثر انداز ہونے والے بہت سارے عناصر کو نظر انداز کردیا ہے۔ مثلاً اس نے یہاں مقابلہ کے عنصر کو ذہن میں نہیں رکھا اور یہ فرض کر لیا کہ زر کا حاشیائی افادہ (Marginal Utility) ہمیشہ مستقل یا یکساں رہتا ہے۔ اس کی اس نے توجیہ یہ کی کہ اس کا نظریہ قیمتوں میں نہایت معمولی تبدیلیوں کے لیے اور محض ایسی اشیا کے لیے ہے جن پر آمدنی کا بہت معمولی حصہ صرف ہوتا ہے۔ اسی ڈھانچہ کے اندر مارشل نے نفع صارف (Consumer Surplus) سے بحث کی ہے۔ کوئی شے اگر ایک خاص مقدار میں کسی مسابقتی بازار میں فروخت کی جائے تو ہر یونٹ کی قیمت یکساں ہوگی۔ اور ہر انفراد خریدار کو اسی قیمت پر خریدنا ہوگا۔ لیکن خریدار کے لیے قیمت اس کی خریدی ہوئی کل مقدار کی آخری اکائی کے افادہ کے برابر ہوتی ہے۔ افادہ کے جدول سے یہ واضح ہے کہ ہر بعد والی اکائی کا افادہ اس سے پہلے کی اکائی سے کم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ کل افادہ تو بڑھتا ہے لیکن مختتم افادہ گھٹتا جاتا ہے۔ افادہ کی ان اکائیوں کو جمع کیا جاسکتا ہے۔ شے کی جتنی اکائیوں کی قیمت ادا کی جاچکی ہے اس سے اوپر کی یہ زاید قیمت صارف کے لیے زاید ہے۔ مارشل اس تجزیہ کی خامیوں سے واقف تھا۔ اس لیے کہ اس میں وقت کے عنصر کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یعنی کسی چیز کی پیداوار میں کتنا وقت لگتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ "ہر معاشی مسئلہ میں وقت کا عنصر اصل مشکل کا مرکز ہوتا ہے۔"

کلاسکی ماہرین معاشیات نے زمین کو پیداوار کا ایک عامل (Factor) قرار دیا تھا جو معین ہوتا ہے اور یہ پیداوار کے دوسرے عاملین سے اس طرح مختلف ہے کہ اس سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اس کا تعلق کیے ہوئے کام سے نہیں ہوتا۔ مارشل نے اسی تصور کو اور آگے بڑھایا اور یہ بتلایا کہ تھوڑی سی مدت کے لیے انسان کے جمع کیا ہوا سرمایہ کی مقدار بھی محدود ہے اور وہ مدت جو اسے مصنوعات کی تیاری کے لیے درکار ہوتی ہے اس میں وہ مثل لگان (Quasi Rent) حاصل کرتا ہے۔

مارشل امداد : دیکھیے مارشل پلان۔

مارشل پلان : دوسری جنگ عظیم کے بعد ترقی یافتہ ملکوں میں صرف امریکا ہی ایک ایسا ملک تھا جو جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہا تھا۔ اور وہ ان ملکوں کی تعمیر نو میں مدد کرسکتا تھا جو تباہ ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ یورپ کے اکثر ملک امریکا کے سخت مقروض تھے اور جو مال وہ امریکا سے خریدتے اس کی ادائگی کے لیے ان کے پاس زر مبادلہ نہیں تھا۔ چنانچہ 1946 میں امریکا اور کینیڈا نے ان ملکوں کو بڑی مقدار میں قرضے دیے۔ ان میں سے ایک سو کرور پونڈ برطانیہ کو ملے۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مختصر مدت تک یہ امداد کافی ہوگی اور یہ ممالک اپنی حیثیت کو بحال کرسکیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور ان ملکوں میں ڈالر کی شدید قلت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ 1948 اور 1950 کے درمیان امریکا نے یورپ کی معاشی بحالی کے پروگرام کے تحت اور بھی قرضے دیے جس میں برطانیہ کے حصہ میں ڈیڑھ سو کروڑ پونڈ آئے۔ اس امداد کا نام اس وقت کے امریکا کے وزیر خارجہ (سکریٹری آف اسٹیٹ) جارج مارشل کے نام پر مارشل پلان یا مارشل امداد رکھا گیا۔ اس امداد کی تقسیم یورپی معاشی تعاون کی تنظیم (European Economic Co-operation) کی نگرانی میں عمل میں آئی۔

مارکس ازم (Marxism) : مارکس ازم یا مارکس واد وہ فلسفہ ہے جس کا اثر تمام اقوام عالم پر لمبے عرصے تک اور بہت گہرا پڑا۔ اس نے عوام اور خواص دونوں کو بے حد متاثر کیا۔ اگرچہ یہ معاشیات اور سیاسیات

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سے جڑا فلسفہ تھا لیکن سماجیات کے ہر پہلو پر اس نے اثر کیا۔ اس نے یورپ میں جنم لے کر بھی ایشیا اور افریقہ ہی نہیں بلکہ لاطینی امریکا تک میں اپنی جڑیں جما لیں۔ اس نے معاشرتی علوم کے علاوہ تاریخ اور ادب کے ساتھ ساتھ دوسری فیلڈس میں بھی آب یاری کی۔ موسیقی اور مصوری بھی اس کے اثر سے اچھوتے نہیں رہے۔ تاریخ لکھنے کے انداز میں ایک نئے مکتب فکر کا اضافہ ہوا جو تیسری دنیا کے ممالک میں بہت مقبول ہوا۔ ادب میں پابلونرودا چلی میں اور ترکی میں ناظم حکمت مارکسزم سے متاثر مقبول ترین شعرا تھے۔ اردو میں مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری اور نیاز حیدر بہت مشہور ہوئے۔ دوسرے بہت سے مارکسسٹ شعراء کی طرح یہ لوگ بھی زیر زمیں تحریکوں سے جڑے رہے۔ ہندستان میں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں پیدا ہونے والی ٹریڈ یونین تحریکوں کا ڈائریکٹ ماسکو سے تربیت یافتہ مزدور لیڈروں سے گہرا رابطہ رہا۔ یوں بھی برصغیر مارکسزم کے لیے بہت زرخیز زمین رہا ہے۔

مارکسزم جتنا گہرا اور ثقیل فلسفہ ہے اتنا ہی کم اسے سمجھا گیا ہے ستم رسیدہ عوام نے اسے نجات دہندہ ہی نہیں بلکہ ایک خواب کے طور پر اپنایا لیکن اس کے فلسفہ کی گہرائی اور گیرائی کو سمجھنے والے صرف کچھ ہی لوگ ہیں۔

مارکسزم کو سمجھنا آسان نہیں ہے اسے سمجھنے کے لیے کارل مارکس کی سوانح حیات اور ذہنیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ کال مارکس ایک یہودی وکیل ہنرچ مارکس کے بیٹے تھے۔ وہ 1818 میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے صرف ایک سال پہلے ہی ان کے والدین یہودی سے عیسائی بن گئے تھے۔ گمان غالب ہے کہ اس میں جبر کو دخل تھا۔ مارکس کی مذہب سے نفرت کا غالبًا یہی سبب تھا۔ کارل مارکس ہونہار طالب علم تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی آف بون سے قانون کی ڈگری لی۔ 1843 میں وہ پیرس گئے۔ یہاں فرانسیسی انقلاب کے ناکام ہونے کے اسباب کا مطالعہ کرتے وقت ان کو احساس ہوا کہ تاریخ آج تک غلط انداز سے لکھی گئی ہے۔ ایک عام انسان کا رول اس میں بالکل معمولی سمجھا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ اپنی انقلابی تحریروں کے باعث ان کو پیرس سے جلاوطن کر دیا گیا اور 1849 میں وہ لندن آگئے۔ گزربسر کے لیے انھوں نے نیویارک ڈیلی ٹری بیون میں لکھنا شروع کردیا۔ آج یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ تحریریں مارکس اور انجلز دونوں کی ملی جلی کوششیں تھیں۔ مارکس کو کبھی بھی انگریزی اچھی طرح نہیں آئی۔ مارکس کی زندگی میں ان کی بیوی اور ایک دوست انجلز کا بہت بڑا رول رہا۔ یہ دونوں ہی وفا اور دوستی کے اعلیٰ ترین معیاروں کے مظہر تھے۔ مارکس نے بہت دشوار زندگی گزاری۔ یہ دونوں ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ مارکس صرف کچھ ہفتوں کے لیے لندن آئے تھے لیکن حالات ایسے پیش آئے کہ وہ کبھی واپس نہ جاسکے اور یہیں 1883 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی مشہور ترین کتاب داس کیپٹل (Das Kapital)، 1867 میں یہیں سے شائع ہوئی۔ آج یہ دنیا کی تیسری سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ ان کی ایک اور بے حد مقبول کتاب کمیونسٹ اعلانیہ (Communist Manifesto) تھی۔ یہ دونوں کتابیں ان کے مقلدوں کے لیے بائبل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کارل مارکس ایک قدآور مفکر تھے۔ انھوں نے اُس وقت موجود بہت سے اخلاقی اور فلسفیانہ رجحانات سے انحراف کیا۔ اور نئے مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی۔ جس نے آگے چل کر کمیونزم اور سوشل ازم کو ہی نہیں بلکہ لینن ازم، ماؤازم، جوچے فلاسفی اور ٹریڈ یونین ازم وغیرہ کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ ان کے انوکھے فلسفیانہ سفر میں کچھ نئی اصطلاحیں اور نئے تصورات ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں سے کچھ چنندہ مندرجہ ذیل ہیں:

(1) جدلیاتی مادیّت : دراصل یہ ہیگل کے فلسفے کا رد عمل ہے۔ ہیگل ہی نہیں بلکہ اس زمانے کی فلسفیانہ اور مذہبی Psyche خیالات و تصورات کو مادہ پرستی کی بنیاد مانتی تھی۔ لیکن اس کے رد عمل کے طور پر مکمل مادہ پرستی کی ابتدا مارکس نے کی۔ انھوں نے خیالات اور تصورات کو ہی نہیں بلکہ احساست اور جذبات کو بھی ٹھوس حقیقت کے سامنے لایعنی سمجھا ہے۔ یہیں سے عالمی ادب میں ادب برائے زندگی کے نظریات کی شروعات ہوئی۔

(2) تواریخی مادیّت : کارل مارکس کے خیال میں سماج کی بنیاد مختلف قسم کی پیداوار کی تکنیک پر رکھی جاتی ہے۔ جب پیداوار کی تکنیک تبدیل ہوتی ہے تو پیداوار پر منحصر رشتے بلکہ پورا سماجی نظام بھی تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس تھیوری کے مدنظر انسانی تمدن کو پانچ ادوار میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(1) قدیم اشتراکی دور (Primitive Communist Period)

(2) غلامی کا دور (The Period of Slavery)

(3) جاگیرداری کا دور (The Period of Feudalism)

(4) سرمایہ داری کا دور (The Period of Capitalism)

(5) پرولتاری انقلاب اور اس کے بعد کا دور (Revolution by Proletariats and Establishment of Socialist Government)

مارکس کے خیال کے مطابق چاروں شروعاتی دور قابض اور غیر قابض (Haves or Have not) طبقوں کے درمیان کشمکش کا اظہار کرتے ہیں۔ اوپری طبقہ اپنی شکل تبدیل کرتا ہے لیکن اپنی فطرت بلکہ اراکین بھی تبدیل نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں جو پہلے غلاموں کے مالک تھے وہی جاگیردار بنے اور وہی سرمایہ دار بھی بنے جو پہلے غلام تھے۔ ان کی اگلی نسلیں بے زمین مزدور بن گئیں اور بعد میں کارخانوں میں مزدور بن گئیں۔ لیکن اوپری طبقہ کا لالچ بڑھتا رہا اور اس کے ساتھ ہی ان کا استحصالی رویہ بھی بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ بعد میں کارخانوں میں سڑنے والے مزدوروں کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچتا ہے۔ اس وقت ان کے صبر کا پیانہ لبریز ہوجاتا ہے اور پھر کچھ بھی کرنے کے لیے وہ تیار ہوجاتے ہیں۔ مارکس نے کہا ہے "ان کے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا، زنجیروں کے سوا" اس لیے انھیں کوئی بھی خطرہ مول لیتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔ (They have nothing to lose but their chains) مفہوم یہ ہے کہ مزدوروں کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ کیمونسٹ اعلانیہ میں مارکس نے لکھا ہے کہ مزدور استحصال کی انتہا کو پہنچ کر متحد ہوتے ہیں اور پھر وہ انقلابی قدم اٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد پرولتاریوں کی آمرانہ حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ (Dictatorship of Proletariat) اس طرح کی حکومت میں کسی فرد کو جائیداد ترکے میں نہیں ملے گی کوئی فرد زمینوں اور کارخانوں کا مالک نہیں ہوگا۔ پیداوار استعمال کے لیے ہوگی نہ کہ منافع کے لیے ہر تندرست آدمی کام کرے گا۔ ہر فرد اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق سماج کو دے گا اور اپنی ضرورت کے مطابق لے گا۔ اس طرح انھوں نے تواریخ لکھنے کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اور عوام اور ان کی تحریکات کو تاریخ کا سرمایہ بتایا نہ کہ بادشاہوں کے قصوں اور جنگوں کی داستانوں کو۔

(3) اضافی قیمت (Surplus Value): مارکس کی بہت مشہور تھیوری اضافی قیمت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو ان کی تمام تھیوریز کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ یہ کیمونسٹ نظام کی حق میں ایک دلیل ہے اور ساتھ ہی مارکسزم کو سماجی انصاف سے جوڑتی ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ خام مال تو قدرت کی پیداوار ہے لیکن اس کو منافع کے ساتھ بیچنے کے قابل کون بناتا ہے۔ مثلاً لکڑی کا ایک ٹکڑا اگر سو روپیہ کا خریدا جاتا ہے تو اس کی میز بنا کر چھ سو روپیہ میں بیچا جاتا ہے۔ یہ پانچ سو روپیہ اضافی قیمت ہے جس کا ذمہ دار ہنرمند مزدور ہی ہے لیکن اس پر قبضہ سرمایہ دار کا ہوتا ہے اور مزدور اپنا ہنر کوڑیوں کے مول بیچنے کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ یہیں سے سرمایہ اور محنت کی کشاکش شروع ہوتی ہے۔ جو آخرکار مختلف ادوار سے گزر کر انقلاب پر ختم ہوتی ہے۔

(4) بیگانگی اور علاحدگی کا نظریہ (Theory of Alienation): مارکسزم کے ایک ستون کے طور پر بے گانگی اور علاحدگی کا نظریہ کام کرتا ہے۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ مزدور جو چیزیں تخلیق کرتا ہے۔ ان سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیے وہ خود کو ان کا خالق نہیں سمجھتا بلکہ ان سے لاتعلق اور بیگانہ ہوجاتا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے بے کام کرنے والے راج اور مزدور چونکہ اس ہوٹل کے لیے ملکیت کا احساس نہیں رکھتے۔ اس لیے وہ کبھی اس سے کوئی تعلق محسوس نہیں کرتے۔ مارکس کے مطابق یہ علاحدگی کا نظریہ سماج کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح مخلوق خالق پر حاوی ہوجاتی ہے اور انسان اشیا کے سامنے اپنے آپ کو بونا محسوس کرتا ہے۔ مارکس کا کہنا ہے کہ خالق کو اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کا غلام نہ ہوکر ان کو بھوگنے والا اور استعمال کرنے والا ہونا چاہیے ورنہ کام کرنے والا فرد یا معاشرہ، پیداوار کے عمل کے نتائج سے، اپنی زندگی کے حالات سے، دوسرے افراد سے اور اپنی ذات سے بھی رفتہ رفتہ لاتعلق ہوجاتا ہے۔ یہ مایوسی کی انتہا ہے۔

مارکس کے فلسفہ کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور ہر طرح سے ریسرچ کی گئیں لیکن اس کی گہرائی تک کم ہی لوگ پہنچ سکے۔

مارکس کے فلسفے نے آدھی دنیا پر لمبے عرصے تک راج کیا۔ سماجی افکار کی شکل کو ہی بدل دیا۔ یہاں یہ تعجب اور خوشی کا باعث ہے کہ مارکس نے ہندستانی معیشت کے بارے میں نیویارک سے نکلنے والے اخبار میں کافی کچھ لکھا۔ اس کی موت کے تقریباً نصف صدی بعد اور بیسویں اور تیسوی دہائی میں ہندستان نے اس کے فلسفے کے ہر شیڈ کو اپنا لیا تھا۔ کچھ علاقہ مکمل طور پر آج بھی سرخ بنے ہوئے ہیں۔

مارکس نے بہت کچھ لکھا۔ عملی کام بھی کیا۔ ورکرز انٹرنیشنل 1864 میں قائم ہوئی یہاں لندن میں ہی مارکس نے اس میں شمولیت اختیار کرلی ہیں۔ پھر انھوں نے ڈاس کیپٹل شائع کردائی۔ 1867 میں مارکس نے ورکرز انٹرنیشنل میں قابل قدر تقریریں کیں جو بعد میں شائع ہوئیں۔ مارکس اور انجلز نے مل کر نیویارک ڈیلی ٹریبون میں کالم لکھے۔ مل کر ایک مشہور کتاب 'جرمن آئیڈیالوجی' بھی لکھیں۔

آج بھی ہر مفکر یا تو مارکس سے متفق ہوتا ہے یا غیر متفق۔ ان کو نظرانداز کرنا ناممکن ہے۔ مارکس ازم کے زیراثر لینن ازم، ماؤازم، ٹیٹوازم اور جوچے فلاسفی کا آغاز اور ارتقا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریڈ یونین ازم بھی پروان چڑھا۔ سیاست سے قطع نظر سنجیدہ سماجی مفکروں میں میکس ویبر ایک اور فلسفی تھے جنھوں نے مارکس سے بہت حد تک استفادہ کیا اور ساجیات کے ایک نامور مفکر بنے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ گہرائی اور وسعت دونوں کے اعتبار سے مارکس کا کوئی ثانی اب تک نہیں ہے۔ وہ بیک وقت عوام اور خواص کا آدرش رہے۔

مارکس۔ کارل (Marx, Karl, 1818-1883) : عہد جدید کا مشہور عالم، فلسفی اور ماہر معاشیات اور نظریہ مارکسزم کا بانی (دیکھیے مارکسزم) کارل مارکس 5/ مئی 1818 کو شہر ٹریر-جرمنی (Trier) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ یہودی خاندان سے تھا لیکن بعد میں اس نے پروٹسٹنٹ عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اس کا پیشہ وکالت تھا۔ اور اس کا خاندان خوش حال اور مہذب سمجھا جاتا تھا۔ مارکس نے ابتدائی تعلیم ٹریر میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم پہلے بان اور پھر برلن میں پائی۔ یہاں اس نے تاریخ اور فلسفہ میں ڈگری حاصل کی۔ ساتھ ہی قانون بھی پڑھا۔ 1841 میں اس نے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے ایپقور (Epicures) پر مقالہ پیش کیا۔ برلن کے زمانہ میں مارکس کا تعلق بائیں بازور کے ہیگلی (Heglian) گروہ سے تھا جو ہیگل کے فسلفہ سے انقلابی نتائج اخذ کیا کرتا تھا۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد مارکس کا ارادہ پروفیسر بننے کا تھا اور اسی لیے وہ بان (Baoun) چلا آیا لیکن اس کے خیالات کی وجہ سے اسے کہیں جگہ نہیں ملی اور یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں بائیں بازو کی ہیگلی خیالات کا بڑا زور تھا۔ اس وقت مشہور فلسفی لڈوک فیورباخ مادیت کو اپنانے لگا تھا۔ چنانچہ مارکس اور بہت سارے نوجوان فلسفی اس کے پیرو بن گئے۔

1842 میں رہائن لینڈ کے چند ترقی پسند سرمایہ داروں نے جن کا رابطہ نوہیگلی گروہ سے تھا ایک اخبار رہائنش زیتنگ (Rheinische Zeitung) نکالا اور چند دن بعد مارکس کو اس کا اڈیٹر ان چیف بنا دیا گیا۔ مارکس کی ادارت میں یہ اخبار جمہوریت کا حامی اور انقلابی بن گیا۔ حکومت نے پہلے تو اس پر سخت سے سخت سنسر لگایا اور پھر مارچ 1843 میں اسے بند کردیا۔ اس زمانہ میں مارکس نے محسوس کیا کہ معاشیات سے اس کی واقفیت بہت محدود ہے۔ چنانچہ اس نے اب اصول معاشیات کا مطالعہ شروع کیا۔

1843 میں مارکس نے جنی وان وسٹ فالن (Jenny Von Weatphaien) سے شادی کی جو ایک امیر اور خوشحال خاندان کی تھی۔ اس کا بھائی بعد میں پرشیا میں وزیر داخلہ ہوگیا تھا۔ شادی کے بعد مارکس پیرس چلا آیا اور یہاں سے ایک اخبار نکالنا شروع کیا جو زیادہ دن نہ چل سکا۔ اس لیے کہ اسے چھاپ کر خفیہ طور پر جرمنی بھیجنا بہت مشکل تھا۔ اس وقت تک وہ کافی انقلابی بن چکا تھا۔

ستمبر 1844 میں فریڈرک انگلس (F. Engles) چند دن کے لیے پیرس آیا۔ یہاں اس کی مارکس سے ملاقات ہوئی اور اس کے بعد سے وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ یہاں انھوں نے سوشلزم کے مختلف رائج نظریوں کے خلاف سخت مہم چلائی اور کئی رسالے لکھے۔ یہیں انھوں نے انقلابی پرولتاری سوشلزم کا نظریہ اور طریقہ عمل کا خاکہ مرتب کیا۔ جرمنی کی پرشیا کی حکومت نے یہ دیکھ کر فرانس پر سخت دباؤ ڈالا اور 1848 میں مارکس کو پیرس سے بھی ملک بدر کردیا گیا۔ اور وہ برسلز (بلجیم) آگیا۔ یہاں مارکس اور انگلس ایک خفیہ سوسائٹی کیمونسٹ لیگ میں شریک ہوگئے اور اس لیگ کی دوسری کانگریس (1847) . جو لندن میں منعقد ہوئی تھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کانگریس کی تجویز پر دونوں نے کیمونسٹ اعلانیہ (Communist Manifesto) مرتب کیا جس نے آگے چل کر ساری دنیا میں شہرت حاصل کرلی۔ یہ فروری 1848 میں شائع ہوا۔ اس اعلانیہ میں موجودہ اور آنے والے دور کا ایک نیا تصور اور نیا خاکہ پیش کیا گیا تھا جس کی بنیاد مادیت پر تھی اس میں جدلیات کو ارتقا کے ایک مکمل نظریہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اس میں طبقہ واری کشمکش کا نظریہ بھی پیش کیا گیا تھا۔

اور بتایا گیا تھا کہ مزدور طبقہ کو کس طرح انقلابی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

1848 میں جب انقلابی لہر چلی تو مارکس کو بلجیم سے بھی نکال دیا گیا وہاں سے وہ پیرس ہوتا ہوا کولون (جرمنی) آگیا اور یہاں نیور ہائش زیتنگ (New Rehbinische Zeitung) کا چیف اڈیٹر بن گیا۔ لیکن 16ر مئی 1840 کو پھر جلا وطن ہونا پڑا۔ وہاں سے پیرس آیا۔ مزدوروں کے ایک مظاہرے میں حصہ لینے کی بنا پر پیرس بھی چھوڑنا پڑا اور جون 1849 میں وہ لندن آگیا۔

مارکس اور اینگلس کے درمیان خط و کتابت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لندن کی زندگی اس کے لیے بڑی سخت تھی۔ پورے خاندان کو سخت مشکلوں اور افلاس کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں اس نے اپنی مشہور معرکۃ الآرا کتاب "سرمایہ" (Capital) کا پہلا حصہ مکمل کیا اور ساتھ ہی اپنے سائنٹفک نظریہ کے مخالفتوں کا جواب بھی دیتا رہا۔ اس زمانہ میں اینگلس نے اس کی کافی مالی مدد کی۔ کچھ عرصہ بعد حالات کچھ بہتر ہوئے اور سیاسی سرگرمیوں کے مواقع پیدا ہوئے تو مارکس پھر میدان عمل میں اتر آیا۔ 1864 میں لندن مزدوروں کا پہلا بین الاقوامی ادارہ "پہلی انٹرنیشنل" قائم ہوا۔ مارکس اس کا روح رواں تھا۔ اس کا مقصد یورپ کے تمام مزدوروں کی انقلابی جد وجہد میں تال میل پیدا کرنا اور ان کے لیے یکساں لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں اس نے پیرس اور دوسری کئی اہم کتابیں اور رسالے بھی لکھے۔

1872 میں "انٹرنیشنل" کی یک کانگریس ہیگ میں ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ اس کا حلقہ اثر اب یورپ کے علاوہ ساری دنیا تک پھیلانا چاہیے چنانچہ اس کا دفتر نیویارک منتقل کردیا گیا۔

اس زمانہ میں مارکس کی صحت بہت خراب ہوچکی تھی لیکن وہ بے شمار مضامین وغیرہ لکھنے کے علاوہ سرمایہ کی دوسری جلدوں کے لیے مواد اکٹھا کرتا رہا۔ کئی یورپی زبانیں سیکھیں۔ آخر کار 14ر مارچ 1883 کو مارکس کا انتقال ہوگیا اور لندن کے ہائی گیٹ قبرستان میں اپنی بیوی کے پہلو میں وہ دفن ہے۔

مارکس کے نظریوں اور فلسفوں پر بہت ساری تنقیدیں ہوئیں۔ اس سے بڑھ کر اس کے بہت سارے حامی بھی پیدا ہوتے رہے لیکن اس بات پر سب کو اتفاق ہے کہ پچھلی صدی کے کسی اور مفکر کی تعلیمات نے دنیا کی تاریخ پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا جتنا کہ مارکس کی تصانیف نے ڈالا ہے۔

مارکسزم (Marxism): کارل مارکس کے نظریوں اور تعلیمات پر مبنی نظام کو مارکسزم کہا جاتا ہے۔ مارکس انیسویں صدی کے تین سب سے عظیم مکاتیب افکار سے متاثر تھا۔ جنھیں اس نے جذب کیا اور آگے بڑھایا۔ یہ تھے کلاسکی جرمن فلسفہ، برطانوی کلاسکل معاشیات اور فرانسیسی سوشلزم۔ مارکس ہی کے نظروں کی بنیاد پر 19 ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی میں یورپ اور امریکا کی بڑی بڑی مزدور تحریکیں منظم ہوئیں اور سامراج کے خلاف آزادی کی لڑائیاں لڑی گئیں۔ پہلے روس اور پھر چین میں انقلاب آئے اور ان ملکوں کے علاوہ یورپ، ایشا اور لاطینی امریکا میں کئی کیمونسٹ ریاستیں وجود میں آئیں۔ مارکسزم کی بنیادی دین معاشی میدان میں ہے جہاں اس نے سرمایہ داری نظام کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ (دیکھیے مارکسی فلسفہ)۔

مارکسی سوشل ڈیماکریس: 19 ویں صدی کے اواخر میں سوشلزم کی سطح پر کارل مارکس اور مارکسزم ابھرے اور اس کے بعد سے ساری دنیا میں چھائے رہے۔

مارکس انتہائی ذہین تھا اور اس نے جرمن فلسفہ، برطانوی اصول معاشیات اور فرانسیسی سوشلزم کو ایک دوسرے میں سمو کر پورے سماج کے ارتقا کا نظریہ پیش کیا اور 1848 میں سائنٹفک سوشلزم کے بارے میں ایک مکمل تصویر "کیمونسٹ منی فسٹو" میں پیش کیا۔ یہ اس نے اپنے رفیق کار انگلس کے ساتھ مل کر تیار کی تھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: مارکس اور مارکسزم) کیمونسٹ منی فسٹو، کیمونسٹ لیگ کا پروگرام تھا۔ 1864 میں لندن میں انگلستان اور یورپ کے مزدوروں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی اور ایک بین الاقوامی ورکنگ منس اسوسی ایشن بنائی گئی جو عام طور پر پہلی انٹرنیشنل کہلاتی ہے۔ اس میں اگرچہ کئی نقاط نظر کے لوگ شریک تھے لیکن مارکس اور اس کے خیالات اس پر حاوی رہے۔ یہ تحریک انگلستان میں جڑ نہیں پکڑ سکی لیکن جرمنی میں تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی۔

مارکسی فلسفہ: مارکس طالب علمی کے زمانہ سے مشہور فلسفی لڈوگ فیورباخ کا پیرو اور مادہ پرست تھا۔ فرانسیسی مادہ پرستی 18 ویں صدی سے نہ صرف اس وقت کے سیاسی نظام کے خلاف بلکہ عیسائی دینیات اور مابعدالطبعیاتی نظریوں کے خلاف جدوجہد کر رہی تھی۔ مارکس نے اگرچہ بعد میں فیورباخ کی بعض کمزوریوں کو اجاگر کرنے کے باوجود اس کی حمایت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میں اس لیے تھا کہ وہ ہیگل کی عینیت (Idealism) کے خلاف جدوجہد کررہا تھا۔ مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کے بارے میں لکھا ہے۔ "ہیگل نے سوچنے کے عمل کو خیال یا عین (Ideal) کی شکل دے کر بالکل ایک آزاد شے یعنی حقیقی دنیا کا خالق بنا دیا ہے۔ میرے نزدیک عین صرف وہ مادی دنیا ہے جس کی عکاسی انسانی دماغ پر ذہن (Mind) کرتا ہے۔ اور جسے وہ خیال کی شکل دیتا ہے۔" اس فلسفہ کی انگلس نے مزید وضاحت اس طرح کی ہے۔

"کائنات کا اتحاد اس کے وجود میں نہیں ہے۔ اس کا اصل اتحاد اس کے مادی ہونے میں ہے۔ حرکت، مادہ کی صفت وجود (Mode of Existence) ہے۔ حرکت کے بغیر دنیا میں مادہ کا کہیں وجود نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ خیال یا شعور آخر ہیں کیا؟ کہاں سے آئے ہیں؟ تو اس کا جواب صاف ہے کہ یہ انسانی دماغ سے آئے ہیں اور انسانی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ خود نیچر کی پیداوار ہے اور اپنے ماحول میں مسلسل ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ ہیگل کا نمو یا ارتقا حقیقت میں عکس ہیں اس خیال یا عین کا جو دنیا کے پیدا ہونے سے پہلے سے موجود تھے۔"

اس طرح مارکس کا نظریہ ہیگل کے نظریہ کا بالکل الٹا ہے۔ مارکس کا فلسفہ مادیت کا فلسفہ ہے جس میں نیچر کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے برعکس عینیت پسندوں کے یہاں اولیت روح کو ہے۔

جہاں مارکس ہیگل کی عینیت پسندی کے خلاف تھا وہاں ہیگل کی جدلیت (Dialectics) کو ارتقا یا نمو کا سب سے مکمل نظریہ اور جرمن کلاسکی فلسفہ کی سب سے بڑی دین سمجھتا تھا۔ مارکس اور انگلس کے خیال میں نیچر کا عمل جدلی ہے۔

جدلیت : جدلیت کا سب سے بڑا اور بنیادی تصور یہ ہے کہ یہ کائنات کوئی بنی بنائی ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ مسلسل حرکت اور تبدیلی میں ہے۔ چیز پیدا ہوتی ہے اور پھر گزر جاتی ہے اور اس طرح ہر چیز ناپائیدار اور ختم ہونے والی ہے۔ اس طرح مارکس کے نزدیک جدلیت بیرونی دنیا اور انسانی خیالات و تصورات کے حرکت کے قوانین کا علم ہے۔ (تفصیلات کے لیے فلسفہ جدلیات)۔

تاریخی مادیت : مارکس نے اپنے فلسفہ مادیت کی مدد سے سماجی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جسے اس نے تاریخ کا مادی نقطہ نظر کا نام دیا۔ اس نے بتلایا کہ ٹکنالوجی انسان کو یہ بتلاتی ہے کہ نیچر سے کس طرح نپٹنا چاہیے۔ انسان جب اپنی ابتدائی ضروریات پیدا کرتا ہے تو وہ ایسے سماجی رشتوں کو جنم دیتا ہے جو اس کی مرضی سے آزاد ہوتے ہیں اور یہ پیداواری رشتے سماجی ارتقاء کی مختلف منزلوں میں الگ الگ ہوتے ہیں اور یہ ہر منزل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ (دیکھو معاشی نظریہ مارکس)

مارکسی نظریہ تقسیم : کارل مارکس (Karl Marx) نے اپنے نظریات کی تعمیر کلاسکی فکر بالخصوص رکارڈو کی فکر کے اس بنیادی نکتہ پر رکی ہے۔ اشیا اور خدمات کی قدر محنت سے متعین ہوتی ہے۔ مارکس کے نزدیک کسی شے کی قدر محنت کی اس مقدار سے متعین ہوتی ہے جو اس کی پیداوار کے لیے سماجی طور پر لازمی ہو۔ انفرادی پیداواری اعمال میں ایک شے کی تیاری پر صرف کی جانے والی محنت کی مقداروں کے اوسط کو اس شے کی پیداوار کے لیے درکار سماجی لازمی محنت (Socially Necessary Labour) قرار دیا جاسکتا ہے۔

محنت اور صرف محنت میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قدر سے زیادہ قدر پیدا کرسکتی ہے۔ محنت کی قدر محنت کی اس قدر کے مساوی ہے جو اشیا اور خدمات کی اتنی پیداوار کے لیے درکار ہو جو مزدور کی گزر بسر کے لیے کافی ہوسکے تاکہ سماج میں محنت کش مزدوروں کی رسد بحال رہے۔ مزدور اپنے مجموعی اوقات کار کے صرف ایک حصہ میں اتنی پیداوار کر سکتا ہے۔ باقی اوقات کار کی محنت سے جو قدر پیدا ہوتی ہے مارکس اس کو قدر زائد (Surplus Value) قرار دیتا ہے۔ چونکہ محنت کی قدر بھی محنت کی پیداوار (یعنی رسد) کے لیے درکار سماجی لازمی محنت سے متعین ہوتی ہے۔ اس لیے قدر زائد مزدور کو نہیں ملتی۔ سرمایہ دارانہ سماج کے مخصوص پیداواری رشتے (Relations of Production) سرمایہ دار کے لیے یہ ممکن بنا دیتے ہیں کہ وہ اس قدر زائد کا مالک بن بیٹھے۔ یہی استحصال (Exploitation) قدر زائد کو سرمایہ دار کا منافع بنا دیتا ہے۔ منافع کی شرح قدر زائد اور اس سرمایہ کی باہمی نسبت سے طے پاتی ہے جو مزدوروں کو اجرت دینے اور خام مال (Raw Material) بہم پہنچانے میں لگایا گیا ہو۔ یہ متغیر سرمایہ (Circulating Capital) کہلاتا ہے۔ اپنے منافع میں اضافہ کے لیے سرمایہ دار کوشش کرتا ہے کہ سماجی لازمی محنت کی وہ مقدار کم سے کم ہو جو محنت کی رسد کو بحال رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مقصد مشینوں اور دوسری اشیا اصل (Capital Goods) کے استعمال سے حاصل کیا جاتا ہے جو پیداواری عمل میں محنت کی ضرورت کم کرنے کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

صلاحیت رکھتے ہیں اور اشیا ضرورت کو کم لاگت پر پیدا کر کے قدر زائد میں اضافہ عمل میں لاسکتے ہیں۔ اس قائم سرمایہ (Fixed Capital) کی بدولت قدر زائد میں تو اضافہ ہوجاتا ہے مگر منافع کی شرح میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ شرح قدر زائد اور مجموعی سرمایہ کی باہمی نسبت سے طے پاتی ہے جو متغیر سرمایہ اور قائم سرمایہ دونوں پر آمادہ کرتی ہے کہ سرمایہ میں اضافہ کے ساتھ قدر زائد میں اضافہ کے باوجود شرح منافع میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے محنت کی طلب میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بے روزگاری بڑھتی ہے اور مزدور طبقہ کی غربت و افلاس میں اضافہ ہوتا ہے۔ شرح منافع میں مسلسل کمیتی قائم سرمایہ میں مسلسل اضافہ، بڑھتی ہوئی بے روزگاری، عوام کی قوت خرید میں غربت و افلاس کے سبب مسلسل کمی اور اس کے نتیجہ میں تیار شدہ سامانوں کے لیے بازار تنگ ہوجانے کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ معیشت میں بحرانی کیفیت (Crisis) پیدا ہوجاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا بنیادی تضاد یعنی پیداوار اشیا کے اجتماعی طریقہ اور ذرائع پیداوار اور خود پیداوار کی انفرادی ملکیت کے درمیان عدم توافق کے بحران کی صورت میں بہت بڑھتا ہے۔ صورت حال کی اصلاح صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ذرائع پیداوار کو بھی سماجی ملکیت بنا دیا جائے تاکہ یہ تضاد دور ہوجائے۔

کلاسکی معاشین کے نزدیک اشیا کی قدر ان کی لاگت پیداوار (Cost of Production) سے متعین ہوتی ہے جس کے بنیادی عناصر اجرت، منافع (بشمول سود) اور لگان ہیں۔ مارکس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قدر کی بنیاد صرف محنت ہے اور منافع اور لگان قدر زائد کے استحصال کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس فکر کے مطابق قدر کی تعین میں اس بات کو کوئی اہمیت نہیں حاصل ہے کہ صارفین (Consumers) کے نزدیک کسی شے کی کیا افادیت (Utility) ہے اور بازار میں اس کی طلب کتنی ہے۔ مزید براں مارکس نے اس حقیقت کو بھی نظرانداز کردیا کہ اشیا اصل اور مشین مزدوروں کی کارکردگی اور پیداوار کی قدر میں اضافہ کرتے ہیں۔ بعد کے زمانے میں کلاسکی فکر اور مارکس کے نظریات کے ان کمزور پہلوؤں پر شدید تنقید کی گئی ہے۔

ماسٹر پلان اور ٹاؤن پلاننگ : شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو بہتر سہولیات فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے پلاننگ سے کام کیا جائے۔ شہر کی وسعت میں آبادی کے پھیلاؤ کو اس طرح ضم کیا جائے کہ شہر کی خوبصورتی خراب نہ ہو۔ مکانات بد نما نہ بنائے جائیں۔ جگی جھونپڑیوں کے لیے انکروچمنٹ نہ کی جائے۔ پارک، باغات اور دوسرے کھلے میدان کا فائدہ سب ہی شہریوں کو ملے۔ اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ شہری ترقی کے لیے ایسی منصوبہ بندی کی جائے جس میں شہر کی متوقع وسعت، آبادی کے دباؤ اور لوگوں کی ضرورتوں کو مد نظر رکھا جائے۔

ہر ملک میں ٹاؤن پلاننگ کو اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ اسی کی بنیاد پر شہر کی توسیع اور اس کی عصری ضروریات کی تکمیل کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ڈائرکٹ ٹاؤن پلانر یا سٹی پلانر کا تقرر کیا جاتا ہے جو مختلف شہروں کا سروے کر کے ہر شہر کی آئندہ توسیع کے امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ماسٹر پلان تیار کرتا ہے۔ شہر کی آئندہ ہونے والی توسیع اسی ماسٹر پلان کے مطابق ہی کی جاتی ہے۔ ماسٹر پلان کی تیاری میں شہر کی آئندہ توسیع کے ساتھ ساتھ پانی کی فراہمی اور حفظان صحت اور دیگر شہری سہولیات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے تاکہ لوگ پر سکون زندگی جی سکیں۔

ماسوائے عدالتی چارہ کار (Extra Judicial Remedies):

ماسوائے عدالتی چارہ کار اس قسم کے چارہ کار شخص متضرر کو بلا مداخلت عدالت قانوناً حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً

(1) ایک شخص جو آراضی پر قابض ہو دوسرے شخص کو جو ناجائز طور پر داخل ہو جبراً نکال سکتا ہے۔

(2) ہر وہ شخص جو مالک آراضی ہو اس کو قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ اس آراضی پر جبراً داخل ہو جس سے کہ وہ ناجائز طور پر بے دخل کر دیا گیا ہو۔

(3) مال کی واپسی کا حق ہر اس شخص کو حاصل ہے جو اس مال کا حقیقی مالک یا متصرف ہو اور دوسرا شخص ناجائز طور پر اس کو اس کے مال کے تصرف سے محروم کردے۔ ہر ایسے شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مداخلت کنندہ سے اپنے مال کو جبراً واپس لے لے۔

اوپر کی تینوں صورتوں میں ایسے جبر کا استعمال نامناسب نہیں ہونا چاہیے اور امن عامہ میں خلل واقعہ ہونے کا احتمال نہ ہو۔

جب کسی شخص کی آراضی پر کسی دوسرے شخص کے جانور یا اشیا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ناجائز طور پر داخل ہوں اور نقصان پہنچا رہے ہوں تو ایسے جانور یا اشیا صرف اس وقت تک روکے جاسکتے ہیں جب تک ان کا مالک واقعی نقصان کی تلافی نہ کردے۔ مگر ان کو فروخت کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

مالتھس - تھامس رابرٹ : مالتھوس کا نام ویسے آبادی کے اضافہ پر پابندی لگانے کے نظریہ کے لیے مشہور ہے۔ لیکن وہ اپنے وقت کا ایک مشہور عالم معاشیات بھی تھا۔ اس نے سینٹ جان کالج کیمبرج میں تعلیم حاصل کی اور اس کالج کا فیلو بن گیا۔ چرچ آف انگلینڈ میں داخل ہوکر پادری بھی بنا لیکن بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہیلی بری (Haily Bury) کالج میں تاریخ اور علم معاشیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔ 1789 میں اس نے آبادی کے مسئلہ پر ایک کتاب "آبادی کا اصول جس کا اثر سماج کی آئندہ بہتری پر پڑتا ہے" شائع کی۔ 1803 میں اسی کتاب کو نظرثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا اس کے علاوہ اس نے "غریبی کا قانون" (Poor Law)، 1817، علم معاشیات کے اصول (1820) اور علوم معاشیات کی تعریف (1827) لکھیں۔ مالتھوس نے آبادی کے مسئلہ پر کئی مضامین بھی لکھے۔ ان تحریروں سے اسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔

مالتھس کے مطابق آبادی میں اضافہ ایکسو قدرتی شرح سے ہوتا ہے جسے حسابی سلسلہ (Arithmetic Progression) کہتے ہیں۔ یہ اضافہ بلا رکاوٹ ہوتا ہے اس لیے معیار زندگی پر دباؤ ہمیشہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس نے اضافہ آبادی میں سست رفتاری لانے کے لیے اخلاقی دباؤ کے طریقے تجویز کیے تھے۔ مالتھس کی اس مسئلہ پر ریکارڈو سے بڑی بحثیں رہیں۔ وہ "سے (Say) کا قانون" کے بھی سخت خلاف تھا۔ "سے کا قانون" مختصراً یہ ہے کہ اشیا کی رسد خود بخود اپنی طلب پیدا کرلیتی ہے۔ اشیا کی نہ بیش پیداوار ہوتی ہے نہ کم پیداوار۔ اس لیے ایک شخص جو کچھ خریدتا ہے وہ کسی اور شخص کی فروخت کی ہوئی ہوتی ہے۔ مالتھس کی دلیل اس بنیادی مفروضہ پر تھی کہ منصوبہ بند بچت اور سرمایہ کاری برابر رہتے ہیں۔ اس کے نزدیک بچت سرمایہ کاری ہے۔ اگر بچت میں اضافہ ہوتا ہے تو صرف میں کمی واقع ہوتی ہے اور دوسری طرف سرمایہ کاری میں اضافہ سے صرفی اشیا کی پیداوار بڑھتی ہے۔ اور چونکہ مزدوروں کی رسد غیر لچک دار ہے اس لیے اجرتیں بڑھتی ہیں اور اس سے لاگت بڑھتی ہے۔

مال کا تصرف بے جا مجرمانہ (Criminal Misappropriation of Property) : کوئی شخص جو بددیانتی سے کسی مال کا تصرف بے جا کرے یا اس کو اپنے کام میں لائے تو کہا جائے گا کہ وہ تصرف بے جا مجرمانہ کے جرم کا مرتکب ہوا۔ بددیانتی سے کسی کے مال کا تصرف کرنے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں۔ کسی شخص کا کوئی فعل بددیانتی سے کرنا اس حالت میں کہا جائے گا جب وہ اس نیت سے کیا جائے کہ خود اس کے یا کسی اور شخص کے حق میں استحصال ناجائز ہو یا کسی دوسرے شخص کو ناجائز نقصان پہنچے۔ استحصال ناجائز کے یہ معنی ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی جائداد کو ناجائز ذرائع سے حاصل کرے یا اسے ناجائز طریقہ پر اپنے پاس رکھے۔ یا وہ ایسی جائداد حاصل کرے جس کا وہ حق دار نہ ہو۔ یہاں جائداد سے مراد جائداد منقولہ سے ہے مثلاً میز، کرسی، زیورات وغیرہ جن کا حمل و نقل کیا جاسکتا ہے۔ کسی شخص کو اس کے اس مال سے محروم کیا جائے جس کا وہ حق دار ہے تو کہا جائے گا کہ اس کو نقصان ناجائز پہنچایا گیا۔

عارضی طور پر بددیانتی سے تصرف بے جا کرنا بھی جرم ہے۔ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں نہ ہو یا مالک کے لیے حفاظت کی خاطر اپنے پاس رکھے یا مالک کو واپس کرنے کے لیے اپنی تحویل میں لے ایسی صورت میں بددیانتی سے تصرف کرنے کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس صورت میں بددیانتی سے تصرف کرنا سمجھا جائے گا جب اس مال کو تصرف میں لایا جائے حالانکہ یہ جانتا ہو کہ اس کا مالک کون ہے۔

زید، بکر کے قبضہ سے اس کا مال لے اور لیتے وقت نیک نیتی کے ساتھ یہ باور کرتا ہو کہ وہ خود اس کا ہے تو ایسی صورت میں زید سرقہ کا مرتکب ہوگا لیکن اگر زید اپنی غلطی معلوم کرنے کے بعد اس مال کو بددیانتی سے اپنے تصرف میں لے آئے تو وہ اس جرم کا مرتکب ہوگا۔ اسی طرح زید کو شارع عام پر ایک روپیہ ملے اور اس کو یہ علم نہ ہو کہ وہ کس کی ملکیت ہے اور زید اس روپیہ کو اٹھالے تو زید اس جرم کا مرتکب نہ ہوگا۔

زید شارع عام پر ایک خط پائے اور اس میں ایک مہاجنی ہنڈی ہو اور الفاظ و خط کے مضمون سے زید دریافت کرے کہ وہ ہنڈی فلاں شخص کی ہے پھر زید اس کو اپنے تصرف میں لے آئے تو زید اس جرم کا مرتکب ہے۔

تصرف بے جا مجرمانہ اس وقت ہوتا ہے جب ملزم کا مال کا قبضہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

حاصل کرتے وقت کوئی مجرمانہ نیت نہ ہو لیکن قبضہ حاصل کرنے کے بعد اس کی نیت بدل جائے اور وہ اس مال کا تصرف بے جا کرے یا اس کو اپنے کام میں لے آئے تصرف اگر بدنیتی سے ہو تو اس صورت میں یہ جرم سرزد ہوتا ہے۔ جب قبضہ مجرمانہ نیت کے بغیر حاصل کیا گیا ہو اور ملزم ایسے مال کو بددیانتی سے اپنے دوامی یا عارضی تصرف میں لائے تو وہ نیت بے جا مجرمانہ کا مرتکب ہوگا۔ مال ملزم کے قبضہ میں ایسے حالات میں آنا چاہیے کہ اس کا قبضہ مجرمانہ نہ کہلایا جاسکے ایسی صورت میں قبضہ جائز ہوتا ہے۔ مثلاً مال اسے پڑا ہوا ملے یا وہ مال پر قبضہ کا اپنے آپ کو مستحق سمجھے اور یہ دلیل پیش کرے کہ قابض کی جانب سے اس کو یہ مال لے لینے کی اجازت ہے۔

مالکانہ اختیار (Implied Undertaking as to the Title) : کسی خریدی ہوئی شی پر مالکانہ اختیار کے لیے ایک خریدار کے تین قانونی تحفظ قایم کیے گئے ہیں۔

سب سے پہلے تو قانونی تصور یہ ہے کہ بائع کو وہ چیز فروخت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر بعد میں یہ معلوم ہوجائے کہ فروخت کنندہ اس چیز کا مالک نہیں تھا جو اس نے فروخت کی ہے تو خریدار معاہدہ فسخ کرسکتا ہے اور ادا کی ہوئی قیمت واپس لے سکتا ہے۔

دوسرا اہم قانونی تصور یہ ہے کہ خریدار خریدی ہوئی چیز کا قابض رہے گا اور اس کے قبضہ میں کسی شخص کی جانب سے کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اسے قانون کی اصطلاح میں تصدیق اصلیت یا وارنٹی (Warranty) کہتے ہیں۔ وارنٹی (Warranty) کی صورت میں خریدار ہر طرح کے اصلیت جاننے کا مستحق ہوگا۔ وارنٹی (Warranty) کا ایک اور قانونی تصور یہ ہے کہ خریدی ہوئی چیز پر کسی قسم کا کوئی قانونی بار نہ ہوگا اور نہ ہی ایسی کوئی بات بوقت فروخت خریدار کے علم میں لائی گئی ہو۔

مالکی: حنفی مکتب کے بعد اہل سنت مسلمانوں کے دوسرے قدیم فقہی مکتب کا نام مالکی ہے یہ امام مالک بن انس اصبحی کی جانب منسوب ہے۔ ان کی ولادت 93ھ میں اور وفات 179ھ میں ہوئی۔ اس مکتب کی نشوونما امام مالک کے وطن مدینہ سے ہوئی پھر یہ پورے حجاز میں پھیلا اس کے بعد بصرہ، مصر اور اس کے ماتحت اندلس صقلیہ اور مغرب اقصیٰ سے لے کر سوڈان کے شہروں پر غالب آگیا اور بغداد میں بھی اس کی اشاعت ہوئی مگر چوتھی صدی ہجری کے بعد یہاں اور پانچویں صدی کے بعد بصرہ میں اس کا انحطاط شروع ہوگیا۔ قزوین اور نیشاپور میں بھی پھلا پھولا۔ فارس، یمن اور شام کے بعض شہروں میں بھی اس کی اشاعت ہوئی لیکن اصلاً مکتب کا مرکز افریقہ اور بلاد مغرب تھے اس زمانہ میں بھی مغرب اقصیٰ الجزائر تیونس، اندلس اور طرابلس وغیرہ کے عام باشندوں کا یہی مسلک ہے۔ بالائی مصر، سوڈان، بحرین اور کویت میں بھی مالکیہ پائے جاتے ہیں۔

مال کی واپسی (Specific Restitution): یہ چارہ کار صرف اس شخص کو حاصل ہے جو ناجائز طور پر اپنے مال سے محروم کیا گیا ہو ایسے شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مدعاعلیہ کے خلاف ہرجانہ کی نالش کرے یعنی اپنے مال کی قیمت مع ہرجہ و خرچہ وصول کرے یا اپنے مال کی واپسی کا دعوئی کرے۔

مالیات (Finance): مختلف کاموں کے لیے سرمایہ کی فراہمی مالیات کہلاتی ہے۔ مالیات مختصر مدت (عام طور پر ایک سال) درمیانی مدت ایک سال سے چھ سات سال کے لیے اور طویل مدت کے لیے ہوسکتے ہیں۔ مالیات صرف (Consumption) کے لیے بھی فراہم کیے جاسکتے ہیں اور سرمایہ کاری کے لیے بھی۔ اگر سرمایہ کاری کے لیے ہو تو اس سے کل سرمایہ کی مقدار میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

مالیات عامہ : مالیات عامہ کا عام لوگوں کے مالیہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں البتہ اس کی مدد سے آج کی معیشت میں عوامی معیشت کے اصول مدون کیے جاتے ہیں۔ ایک مدت تک مالیات عامہ ٹیکس وصول کرنے کے قوانین وضع کرنے اور انھیں نافذ کرنے کی حد تک مخصوص رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حکومت کا بجٹ صرف ٹیکس کے اصول کرنے تک محدود تھا۔ عام معاشی ترقی اور حکومت کے فرائض میں گوناگوں اضافہ کے سبب آج کی معاشی دنیا میں بجٹ کے مدات اب محض حکومت کی آمدنی اور اس کے اخراجات کی تفصیل نہیں پیش کرتے بلکہ یہ چند مسلمہ مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ سمجھے جاتے ہیں۔ سہولت کے لحاظ سے یہ مقاصد تین مختلف لیکن باہم پیوست شعبوں میں منقسم کیے گئے ہیں۔ ان کے نام "شعبہ تعین، شعبہ تقسیم اور شعبہ استحکام" ہیں۔ آج حکومت دنیا کے بیشتر ملکوں میں نہ تو خاموش تماشائی ہے اور نہ ہی پورے طور پر معاشی عمل کی رہبر۔ وہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

دراصل ان دونوں کے درمیان اپنی آمدنی اور خرچ کے سبب معاشی سرگرمی کے عمل میں قابل لحاظ حد تک ایک متاثر کن عنصر ہے۔

بالغ رائے دہی کی اساس پر قائم ہونے والی جمہوری حکومتیں اکثریت کی بہبود اور بہتری کے لیے اقدامات کرنے پر مجبور نظر آتی ہیں۔ دیگر عمرانی اصولوں کی طرح معاشی اصولوں میں بھی فیصلے سیاسی پس منظر میں کیے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف آخر سے معاشی نظام "فلاحی ریاست" کو وجود میں لانے کے لیے مصروف ہے اور معاشی تجزیہ اور معاشی آلہ کار اس کے دروبست میں مصروف نظر آتے ہیں۔

کلاسکی معاشی اصول کی رو سے شعبہ تعین بجٹ کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس میں نظام بازار ان اصولوں کو مرتب کرتا ہے جس کے تحت وسائل کے ذریعہ صنعتوں کے لیے وسائل کی فراہمی اور ان کی مجموعی پیداوار اور نظام قیمت کا جائزہ لیتے ہیں۔ مسابقتی حالات سے انحراف کی وجہ سے دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے تحت صنعتی نظام کو مجلس قانون ساز کے وضع کردہ قوانین کے تحت لایا جاتا ہے یا فرم کی پیداوار اور قیمت پالیسی متعین کی جاتی ہے۔ دوسری وہ صورت حال ہے جس میں نظام بازار کے اقدامات ناکافی ثابت ہوتے ہیں اور حکومت کی پالیسی اس اصول سے مکمل طور پر انحراف کرتی ہے جو "صارف کے اقتدار" میں مضمر ہے۔ یہ مسئلہ سماجی ضروریات اور استحقاقی ضروریات کی تکمیل سے تعلق رکھتا ہے۔ سماجی ضروریات میں سیلاب کے کنٹرول، حفظان صحت، عدلیہ کی تنظیم اور دفاعی خدمات کو بہم پہنچانا شامل ہیں۔ عوام کی استحقاقی ضروریات میں تعلیم عام کرنے کی تدابیر، کم قیمت پر عوام کے لیے مکانات کی تعمیر وغیرہ شامل ہیں۔ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ موخرالذکر مسائل بڑی حد تک سیاسی فیصلوں پر منحصر ہوتے ہیں اور سیاسی سطح پر ہی عوام کو مطمئن کرنے والے فیصلے ممکن ہیں۔

تقسیمی شعبہ : آمدنی اور دولت کی مناسب تقسیم کے شعبے کی کامیابی کا راز ان دوسرے شعبوں کی کارگزاری پر منحصر ہے۔ جنہیں تعین اور استحکام کا نام دیا گیا ہے۔ موجودہ معاشرہ میں آمدنی کی تقسیم وراثت کے قوانین باشندوں میں صلاحیتوں کی تقسیم تعلیمی سہولتوں کی فراہمی سماجی نقل پذیری اور بازار کی ساخت پر منحصر ہے۔ غیر مناسب تقسیم کے تدارک کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات میں ٹیکس اور منتقلی نظام کو زیادہ فعال بنانا مناسب اجرتوں کے قوانین وضع کرنا چند اہم زرعی فصلوں کی قیمتوں کو برقرار رکھنے کے لیے قوانین نافذ کرنا، اندرونی صنعتوں کا تحفظ اور مناسب تجارت کے قوانین وضع کرنا شامل ہیں۔ اس ضمن میں جو دو اصول دولت کی مناسب تقسیم کو بروئے کار لانے میں مفید سمجھے جاتے ہیں وہ تمام شہریوں کے لیے "مواقع کی یکسانیت" اور "معاشی بہتری کی برابری" ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہاں بھی سیاسی سطح پر ہی فیصلے کرنے پڑیں گے۔ اس لیے کہ وہ یہ فیصلے پورے سماج کی ساخت کو متاثر کرتے ہیں اور سماجی رشتوں کو استوار کرنے اور ان کے باہم پیوست عناصر میں ربط قائم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

شعبہ استحکام : معاشی اصطلاح میں یہ "باضابطہ مالیہ" کا شعبہ ہے۔ یہاں ہم وسائل کا پورے طور پر استعمال اور زر کی مستحکم قیمت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تین واضح اور ایک دوسرے پر اثر انداز مسئلے قابل غور ہیں جو مکمل روزگار، قیمتوں کے استحکام اور معاشی نمو سے متعلق ہیں۔ بعض معاشیین کے نزدیک مکمل روزگار اور مستحکم قیمتیں متضاد مقاصد ہیں اور یہ دونوں مل کر معاشی نمو سے تضاد ظاہر کرتے ہیں مگر معاشی ترقی اور سماجی بہبود کے پس منظر میں ان تینوں کا بیک وقت کارکرد ہونا ضروری ہے اس لیے کہ یہی تین عناصر مل کر معیشت کو مربوط اور اس کی ترقی کے تسلسل کو جاری رکھنے کا موقع فراہم کرسکتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ کینس کا معاشی تجزیہ بحرانی معاشیات کا تجزیہ بن کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ کینس نے قیمتوں کی تبدیلی کے معیشت پر مثبت اثر کا تذکرہ کیا ہے۔ قیمتوں کے اضافہ کے دو رخ محتاج توجہ ہیں ایک وہ جس میں مکمل روزگار کی حد پہنچ جانے کی وجہ سے وسائل کم یاب ہوجاتے ہیں اور لاگت میں اضافہ کے سبب بیروزگاری فروغ پاتی ہے۔ اس کے تدارک کے لیے اجتماعی اخراجات میں ایسے اضافے کرنے پڑیں گے کہ وہ اصل پیداوار کے اضافوں کے برابر ہوں۔ دوسری صورت ان دباؤ ڈالنے والے گروہوں سے تعلق رکھتی ہے جو اجرتوں میں اضافہ کی مانگوں کی وجہ سے (مثلاً ٹریڈ یونین) یا اجارہ دارانہ پالیسی اختیار کرنے کی وجہ سے (جیسے بعض اجارہ دار فرمیں) قیمتوں کی سطح بلند کرتے ہیں۔

یہاں ایک لچک دار سماجی نظام اور ایک مطابقتی پالیسی ہی بہتر نتائج برآمد کرسکتی ہے۔ ایک رخ جس پر آج کل خاص توجہ دی جارہی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہے یہ ہے کہ معیشت کی شرح تو ایسی ہونی چاہیے کہ مکمل روزگار کی سطح برقرار رکھی جاسکے۔

مالیات عامہ کا ایک رخ جو کلاسیکی معاشین کے زمانہ سے آج تک اسی کا اہم جزو رہا ہے۔ یہ ہے کہ کن سماجی خواہشات کی تسکین ہونی چاہیے اور کون ان کی قیمت ادا کرے گا؟ اس ضمن میں دو نظریات مقبول رہے ہیں۔ ان میں ایک "فائدہ کا نظریہ" ہے اور دوسرا "قوت ادائیگی کا نظریہ"۔

ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فائدہ کے نظریہ میں ٹیکس کی ادائیگی اور اس کے معاوضے میں حکومت کی طرف سے بدل فراہم کرنے میں پائے جانے والے رشتہ سے بحث کی جاتی ہے جو نظام بازار کے اصولوں میں مضمر ہے۔ اس کے برخلاف قوت ادائیگی کا نظریہ ٹیکس کو ایک لازمی ادائیگی سمجھتا ہے جس پر بازار کے اصول منطبق نہیں ہوتے۔ اس نظریہ کے تحت ہر شخص کو قانون کی نظر میں یکساں قرار دیا جاتا ہے اور اس کو اپنی آمدنی کے لحاظ سے برابری کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ "خالص آمدنی" قوت ادائیگی کا اشاریہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آمدنی کے لحاظ سے بڑھتا ہوا ٹیکس اور بغیر کمائی ہوئی آمدنی پر ٹیکس اس کے لازمی عناصر ہیں۔ فائدہ کے نظریہ سے اس لیے بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے کہ عوامی خواہشات شخصی خواہشات سے مختلف ہیں۔

ایچ. ورتھ اور پیگو نے بہبود معاشیات کے پس منظر میں قوت ادائیگی کے نظریہ کو واضح کیا ہے۔ دو اصول اس ضمن میں متعین کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ مختلف صنعتوں میں وسائل اس طرح منقسم ہونے چاہیے کہ ان کے حاشیائی حاصل برابر ہوں۔ دوسرے عوامی خرچ کو اس نقطہ تک لے جانا چاہیے جہاں پر کہ آخری روپیہ کے خرچ سے حاصل ہونے والا افادہ ٹیکس کے آخری روپیہ کے انفرادی عدم افادہ کے برابر ہو۔

مالیاتی پالسی : حکومتی پالسی کا وہ حصہ جس میں ٹیکس اور دوسرے طریقوں سے آمدنی حاصل کرنے اور خرچ کا سانچہ (Pattern) اور اس کی سطح تعین سے بحث کی جاتی ہے۔ حکومتیں بجٹ کے فاضلات کی سطح اور مالیات مہیا کرنے کے وسائل کی مدد سے یہ طے کرسکتی ہیں کہ معیشت میں مجموعی طلب کی سطح (Level of Demand) کو کس طرح قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔

مانٹیسوری۔ ماریا (Montessori Maria, 1870-1952) : ماہر تعلیم اور مانٹیسوری طریقہ تعلیم کی بانی۔ مانٹیسوری تعلیم کی بنیاد ان اصولوں پر ہے کہ ہمیں بچہ کی تخلیقی صلاحیتوں اور اس کی سیکھنے کی خواہش پر پورا بھروسہ ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ایک فرد کے طور پر برتاؤ کرنا چاہیے۔

ماریا مانٹیسوری اٹلی کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے 1894 میں روم یونیورسٹی سے طب کی ڈگری لی۔ تعلیم ختم کرنے کے ساتھ ہی انھیں روم یونیورسٹی کی نفسیاتی کلینک میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا۔ یہاں انھوں نے ذہنی طور پر معذور بچوں کی تعلیم سے دلچسپی لینی شروع کی۔ 1899 اور 1901 کے درمیان وہ روم کے اعصابی امراض کے ایک اسکول میں ڈائرکٹر بھی رہیں۔ یہاں ان کا طریقہ بہت کار آمد ثابت ہوا۔ 1897 سے 1907 تک وہ عورتوں کے ایک کالج میں شعبۂ حفظان صحت کی صدر رہیں۔ 1900 سے 1907 تک انھوں نے روم یونیورسٹی میں علم تعلیم پر بھی تعلیم دی۔ 1904 سے 1908 تک وہ علم انسانیات کی بھی پروفیسر رہیں۔ اس پورے عرصہ میں علوم فلسفہ، نفسیات اور تعلیمات میں ان کا مطالعہ برابر جاری رہا۔

1907 میں مانٹیسوری نے اپنا پہلا "بالک گھر" شروع کیا۔ یہ روم کے غریب علاقوں کے بچوں کے لیے تھا۔ اب وہ اپنے اصولوں کو عام ذہانت کے بچوں پر استعمال کرنے لگیں۔ اس میں انھیں کافی کامیابی ہوئی۔ اگلے چالیس برسوں تک وہ پورے یورپ، ہندوستان اور امریکا گھومتی رہیں۔ تقریریں کرتیں، مضامین لکھتیں اور مانٹیسوری طریقۂ تعلیم کے استادوں کے اسکول قایم کرواتیں۔ 1922 میں وہ اطالوی اسکولوں کی انسپکٹر مقرر ہوئیں۔ فاشسٹوں کی وجہ سے 1934 میں انھیں اٹلی چھوڑنا پڑا۔ اسپین اور سیلون (اب سری لنکا) میں کچھ دن گزارنے کے بعد وہ ہالینڈ میں بس گئیں۔ اس مدت میں انھوں نے اپنے طریقۂ تعلیم پر کئی کتابیں لکھیں۔

مانٹیسوری نظام تعلیم: مشہور اطالوی ماہر تعلیم و نفسیات ماریا مانٹیسوری کا قایم کیا ہوا قبل مدرسہ تربیت اور ابتدائی تعلیم کے نظام میں بچوں کے اندر پہل کرنے اور مشاہدے کی صلاحیتیں ابھاری جاتی ہیں اور اس کے لیے انھیں جسمانی حرکت کی پوری آزادی دی جاتی ہے اور ساتھ ہی ایسے کھلونے وغیرہ مہیا کیے جاتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ کھیل سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ شروع ہی سے لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیتوں کو فروغ دیا

جاتا ہے۔ مانٹیسوری طریقہ شروع میں دماغی طور پر کمزور بچوں کے لیے استعمال کیا گیا اور وہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ اسے عام بچوں کی تعلیم کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔

عام بچوں پر یہ طریقہ آزمانے سے پہلے مانٹیسوری نے اپنے زمانے کے یورپ کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اسکولوں میں بچوں کو نظم و ضبط کا پابند نہیں بنایا جاتا بلکہ بالکل بے حرکت بنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے روم کی غریب بستیوں کے ایک اسکول کے اپنے تجربات کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھا اور "مانٹیسوری طریقہ" پر ایک کتاب شائع کی۔

انھیں اپنے تجربہ سے یہ پتہ چلا کہ اگر بچوں کو بعض بالکل سادہ اور معمولی چیزیں دی جائیں تو وہ ان میں اتنی دلچسپی لینے لگتے ہیں جتنی اور کسی چیز میں نہیں۔ مثلاً سکھلانے سے پہلے ایک فریم میں گولیاں جما دی جاتی ہیں۔ اور ان کی مدد سے بچے آسانی اور دلچسپی سے گنتی سیکھ لیتے ہیں۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی مدد سے بائیں سے دائیں طرف پڑھنے کی عادت ڈالی جا سکتی ہے۔ مختلف سائز اور اوزان کے اسطوانوں کی مدد سے بچوں کے ہاتھوں کے پٹھوں کو ورزش دی جا سکتی ہے۔ تین سے چھ سال کے بچے ان چیزوں کی مدد سے خود ہی اپنے آپ کو پندرہ منٹ سے ایک گھنٹے تک مشغول رکھ سکتے ہیں اور کوئی باہر کی چیز ان کی توجہ نہیں ہٹائے گی اور اس قسم کے ہر گھنٹہ کے بعد بچے بجائے تھکن محسوس کرنے کے تر و تازہ نظر آئیں گے۔ ان ہی طریقوں سے شریر لڑکے بھی راستہ پر آجاتے ہیں۔ ان بچوں کے لیے جو کھلونے اور دوسرا سامان استعمال ہوتا ہے وہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ہر بچہ خود اپنے آپ سے استعمال کر سکے۔ کئی بچوں کے ایک ساتھ مل کر انھیں استعمال کرنے کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی۔ البتہ مل کر کام کرنے کے اور دوسرے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اپنے کمرے یا رہنے کے مقام کو صاف ستھرا رکھنا، سب کو کھانا کھلانا وغیرہ۔

مانٹیسوری نظام کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ انفرادی اپج کو ابھارا جائے اور خود کام کرنے کی عادت ڈالی جائے۔ از خود تعلیم حاصل کرنا ہی بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ اس میں استاد پیچھے رہتا ہے۔ وقت ضرورت رہبری کر دیتا ہے۔ لیکن سارا کام بچے کو خود اپنے آپ کرنا ہوتا ہے۔ اس نظام میں جسمانی اور دماغی ارتقا کا باہمی بہت قریبی تعلق ہوتا ہے۔ طالب علم کی دلچسپی اور ذہنی صلاحیت میں تال میل رکھا جاتا ہے۔ اس کے تحت بچے چھ سال کی عمر سے ہی پڑھنا لکھنا اور گنتی سیکھ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مانٹیسوری نے بعد میں ایسے طریقے مرتب کیے جن کے تحت بچہ انفرادی طور پر گرامر، علم ہندسہ، ریاضی کے بڑے بڑے سوالات، ضرب و تقسیم، اعشاریہ، موسیقی، حیاتیات، جغرافیہ، تاریخ اور ابتدائی عام سائنس وغیرہ سیکھ سکتا ہے۔

1948 میں ڈاکٹر مانٹیسوری نے ایک نہایت اہم کتاب لکھی جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی تھی کہ کس طرح تاریخ کے دور کے مطالعہ سے موجودہ دور کے بچے کا ذہن ترقی کر سکتا ہے۔ انھوں نے آخری کتاب 1949 میں لکھی جس میں تین سال سے کم عمر کے بچے کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے۔

مانس (Manus): مانس (Manus) کو حق زوجیت کہا جاسکتا ہے۔ رومن لاء میں شوہر کو بیوی پر کامل اقتدار حاصل تھا۔ اس کی مثال حقوق پدری (Patria Potestas) سے دی جاسکتی ہے جس کے تحت باپ کو بچوں پر کامل حقوق حاصل ہوتے تھے۔ مانس کے حقوق تین طریقوں سے حاصل ہوتے تھے۔

(1) ایک مذہبی رسم کے ذریعہ جسے کنفرائک (Confrreatic) کہا جاتا تھا۔

(2) کوئمپشیو(Coemptio) کے ذریعہ۔ روما میں عام طور پر شادیوں کا یہی طریقہ رائج تھا۔

(3) یوسو (Usus) اگر کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ اس کی بیوی کے طور پر ایک سال تک رہتی رہی ہو تو اس شخص کو اس عورت پر مانس (Manus) کے حقوق حاصل ہوجاتے تھے۔ بارہ جدول (XII Tables) میں بھی اس قسم کی شادی کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی شادی کے ذریعہ حق زوجیت کا جو تصور قایم ہوا ہے اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ یوسو (Usuo) کے ذریعہ ازدواجی رشتہ کے جواز کو قانونی اعتبار سے زیادہ مستحسن قرار نہیں دیا گیا۔ ایک زمانے میں مانس یعنی حق زوجیت کے ساتھ ازدواجی رشتہ ہی شادی کی واحد شکل تھی جسے قانوناً قابل قبول قرار دیا گیا تھا لیکن بارہ جدول کے زمانے تک یہ صورت باقی نہیں رہی اور یہ ممکن ہوسکا کہ مانس کے بغیر بھی شادی یا ازدواجی رشتہ قایم ہوسکے۔ لیکن بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مانس کے بغیر شادی ہی اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

زمانے میں زیادہ عام تھی جس زمانے کی تاریخ کا ہمیں صحیح طور پر علم ہے۔ ایسی شادی اس وقت عمل میں آئی تھی جب کہ عورت اور مرد سن بلوغ کو پہنچ سکے ہوں اور اگر سن بلوغ کو نہ پہنچے ہوں تو باپ کی رضامندی حاصل کرلی ہو کسی عورت کا کسی مرد کے ساتھ شادی کی نیت سے ازدواجی زندگی کا آغاز کرنا اس قسم کی شادی کی دلیل قرار پاتی تھی۔ قانونی طور پر اس قسم کی شادی کے لیے کسی خاص رسم کی ادائگی کی ضرورت نہ تھی خواہ عورت و مرد رومی ہوں یا عیسائی ہوں یا ان کا کسی مذہب سے تعلق نہ ہو۔

مائکرو معاشیات: دیکھیے جزوی معاشیات۔

مباح: لفظی معنی روا اور جائز کے ہیں اصطلاحاً اس کام کو کہیں گے جس کا کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہوں کرنے میں نہ ثواب ہے اور نہ کرنے میں عذاب نہیں ہے۔

مبادلہ - شرح: شرح یا قیمت جس پر ایک کرنسی کا دوسری کرنسی یا سونے کے ساتھ تبادلہ کیا جاتا ہے۔ یہ تبادلہ اسی وقت (Spot) یا آگے کی کسی تاریخ کے لیے (Foreward) ہوتا ہے۔ شرح تبادلہ کا انحصار ان کرنسیوں کی اس وقت کی طلب اور رسد اور متعلقہ معیشتوں کی توازن ادائگی پر ہوتا ہے کہ آیا وہ خسارہ کی معیشت ہیں یا بچت کی۔ اور آئندہ کے مطالبات کی یابجائی کے لیے کتنی بیرونی کرنسی کی ضرورت ہوگی یا کتنی آمدنی کی امید ہے۔ اگر تبادلہ زر پر حکومتوں کا کنٹرول نہ ہو تو شرح مبادلہ آزاد رہے گی۔ سونے یا زر مبادلہ کے محفوظات کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لیے کہ طلب کا عمل کرنسیوں میں توازن لے آئے گا اور اس کے مطابق شرح مبادلہ ایک جگہ پر قائم ہوجائے گی۔

شرح مبادلہ کو اگر آزاد چھوڑ دیا جائے تو کم ترقی یافتہ ملکوں کی معیشت تباہ ہوجائے گی کیونکہ ان ملکوں کی شرح مبادلہ میں ہمیشہ خسارہ رہتا ہے۔ چنانچہ پچھلی جنگ عظیم کے بعد بین الاقوامی مالی فنڈ نے اس میدان میں افرا تفری کو روکنے کے لیے کچھ اقدامات کیے۔ اس وقت چونکہ امریکی ڈالر سب سے زیادہ طاقت ور تھا اس لیے ہر ملک کی کرنسی کی شرح مبادلہ ڈالر کو بنیاد بنا کر مقرر کی گئی اور یہ طے پایا کہ اس میں کمی یا زیادتی ایک فی صدی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ڈالر پر کوئی پابندی نہیں رکھی گئی اس لیے کہ امریکا نے یہ ذمہ داری لی کہ جب بھی طلب ہوگی وہ 35.0875 ڈالر کے عوض ایک اونس سونا دے گا لیکن اگست 1971 تک امریکا میں معاشی کسادبازاری اس نوبت پر پہنچ گئی کہ اب اس نے یہ شرط پوری کرنے سے انکار کردیا اور امریکی ڈالر کا تبادلہ سونے یا کسی اور کرنسی میں ممنوع قرار دیا اور درآمدات پر دس فی صدی سرچارج لگایا۔ اس کے علاوہ اپنے توازن ادائگی کے خسارہ کو ٹھیک کرنے کے لیے اور دوسرے طریقہ اختیار کیے۔ کچھ عرصہ تک بعض ترقی یافتہ ملکوں کی کرنسیاں آزاد (Floating) رہیں لیکن انھیں ایک حد کے اندر رکھا گیا۔ دسمبر 1971 میں بین الاقوامی مالی فنڈ کے دس ملکوں کے گروپ (دیکھیے بین الاقوامی مالی فنڈ) نے اپنی کرنسی کے شرح مبادلہ میں پھر تبدیلی کی جس سے دوسری کرنسیوں کی اوسط شرح کے مقابلہ میں ڈالر کی شرح دس فی صد گھٹ گئی اور ایک اونس سونے کی قیمت 38 ڈالر مقرر ہوئی۔ یہ بھی طے پایا کہ عارضی طور پر کرنسیوں میں اتار چڑھاؤ 25 فی صدی تک ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومتیں اس کی بھی پابند ہیں کہ بغیر مالی فنڈ کے مشورے کے کرنسیوں کی شرح بدلی نہیں جاسکتی لیکن آئے دن اس کی خلاف ورزی ہوتی رہتی ہے۔ 1969 میں فرانسیسی حکومت نے شرح مبادلہ میں 12.4 فی صدی کی کمی کردی۔

بین الاقوامی سطح پر آزاد شرح مبادلہ اور قائم شرح یا ان دونوں کا درمیانی راستہ نکالنے کے متعلق بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ خاص طور پر جب سے امریکی ڈالر کی شرح مبادلہ مسلسل گرتی جارہی ہے۔ جاپان اور مغربی جرمنی کی کرنسیوں کی شرح مبادلہ بڑھتی جارہی ہے۔ یہ آسان مسئلہ نہیں ہے۔ شرح مبادلہ میں تبدیلی کے اثرات دوررس ہوتے ہیں اور اس سے ایک پورے ملک کی معیشت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ملک آزاد مبادلہ کے سخت حامی تھے۔ چنانچہ کینیڈا نے 1970 میں آزاد مبادلہ کی پالسی اختیار کی اور 1971 میں مغربی جرمنی، ہالینڈ اور یورپ کے کئی ملکوں نے اس راستہ کو اختیار کیا لیکن انھیں جلد ہی پھر سے قائم شرح (Fixed Rate) کی طرف لوٹنا پڑتا۔ پچھلے برسوں میں آزاد شرح اور قائم شرح کے درمیان کوئی صورت نکالنے کی بہت ساری کوششیں ہوتی ہیں لیکن ترقی یافتہ ملکوں کی معیشتیں ایسے نراج سے گزر رہی ہیں کہ کوئی مستقل راستہ تلاش کرنا ممکن نہیں۔

مبسوط: محمد کی سب سے مبسوط و ضخیم کتاب ہے جو چھ جلدوں پر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

مشتمل ہے۔ دس ہزار سے زیادہ فقہی احکام و مسائل کا مجموعہ ہے اس ضمن میں ان احکام کی احادیث و آثار سے دلائل بھی نقل کیے ہیں۔

مِتاکشرا (Mitakshara) : منو (Manu) کے بعد یاجنیائیولکیا (Yajnyavalkya) کتاب کو کافی اہمیت ہے اس میں بعض ایسے سوترا درج ہیں جو منو کے پاس نہیں ہیں۔ اس کتاب پر بہت سے تبصرے ہیں اس میں سب سے مشہور تبصرہ وہ ہے جسے متاکشرا کہتے ہیں۔ اور عملی طور پر متاکشرا کے بعد سے ہی ہندو لاء کی ابتدا ان صوبوں میں ہوئی جہاں اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہ تبصرہ و جنانیشور (Vijnaneshwara) نے لکھا ہے اور اس کتاب پر بنارس اور مغربی ہندوستان میں عمل کیا جاتا ہے یاجنیائیولکیا (Yajnyavalkya) کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس نے یجروید (Yajurveda) سے براہ راست اخذ کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں یعنی منو اور یاجنیائیولکیا تاریخ تصنیف کے اعتبار سے کافی فصل رکھتی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یاجنیائیولکیا کی کتاب ان سوتراؤں پر مبنی ہیں جو اس کتب خیال سے بہت پہلے کے ہیں۔

متبنی کسے لیا جاسکتا ہے: وہ شخص جو ہندو ہو اور جو کسی جگہ متبنی نہ لیا گیا ہو اور جو شادی شدہ نہ ہو اور جس کی عمر پندرہ سال سے کم ہو اسے متبنی لیا جاسکتا ہے اگر مقامی رسم و رواج اجازت دیں تو شادی شدہ لڑکے کو یا ایسے لڑکے کو جس کی عمر پندرہ سال سے زیادہ ہو متبنی لے سکتے ہیں۔

متحرک ماڈل - معاشیات : حرکی تجزیہ معاشیات میں متوقع مسلمات پر قائم ہے۔ توقعات کا انحصار پہلے سے حاصل شدہ معلومات یا ایک احتمالی بناؤ پر ہوسکتا ہے یا اس میں قابل شناخت احتمالی بناؤ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ پہلی صورت میں توقعات میں خطر کا عنصر ہوتا ہے جبکہ دوسرے میں غیر یقینی کی کیفیت۔

1774 میں ڈوپانٹ ڈی نوموری (Dupoint-de Numours) نے متحرک ماڈلوں کے متعلق بیان کیا کہ وہ تو توازن کی طرف مائل رہتے ہیں۔ متحرک ماڈلوں کے بنیادی تجزیاتی مطالعہ کا تعلق توازن کے وجود اس کی یکتائی اور استحکامی خصوصیات سے ہوتا ہے۔ کینز (1936) کے سکونی عام توازن کے ماڈل کو ضارب۔ مسرع (Multiplier Accelerator) کی حیثیت سے وسعت دی گئی تاکہ سرمایہ کاری کے رویہ کے مطابق تجارتی چکر کا مطالعہ کیا جاسکے۔ فریڈ من (Friedman) نے 1957 میں مستقل متوقع آمدنی اور مستقل صرف کے نظریات پیش کیے۔ ریاضی کی رو سے متحرک ماڈلوں کی تصریحاتی خطی یا غیر خطی فرق یا تفرقی مساواتوں کو جنم دیتی ہیں۔ ایسی مساواتوں کے حل سے متعلق استحکام کے ریاضیاتی نظریے ریاضیاتی طبعیات سے اخذ کردہ ہیں۔

متحرک راہوں کی ریاضیاتی کی مستحسن تعین سے متعلق سب سے پہلی کوشش رامزے (1928) نے کی تھی۔ مستحسن بچتوں کے ماڈل کا استعمال حاشیائی افادہ صرف پر اس کا انحصار ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ روایاتی طور پر تغیری احصا کا استعمال حالات اخذ کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ معاشی ترقی کے مسائل کے تعلق سے نظریہ کنٹرول کا حالیہ ارتقا قابل لحاظ حد تک مفید ثابت ہوا ہے۔ معاشی متغیروں میں امتیاز ریاستی نمایاں متغیر اور کنٹرول متغیر کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ پانٹریاجن (Pontryagin) کا نظریہ (1962) یا بل مان (Bellman) کا متحرک پروگرام بنانے کا طریقہ کار (1957) دونوں ہی معاشیات اور دیگر علوم میں وسیع پیانے پر اختیار کیے جانے والے کنٹرول کے نظریے ہیں۔

معاشی حرکیات میں قابل لحاظ ارتقا کا ثبوت نمو اور فلاح کے نظریات کا وجود ہے۔ ماہرین طبعیات و ریاضیات میں وان نیومن (Von Neumann) معاشی نمو سے متعلق اپنے کارناموں کی وجہ سے ممیز مانا جاتا ہے۔ کم ترین و بیش ترین کے اصول کو استعمال کرتے ہوئے وہ ظاہر کرتا ہے کہ متوازن نمو کی صورت میں شرح نمو سود کی شرح کے مساوی ہوتی ہے۔ ٹرن پائیک (Turnpike) کے ضوابط اور دو سیکٹروں (Sectors) اور متعدد سیکٹروں کے ماڈل سے متعلق اس کے نوشتے معاشیات کے جدید رسائل کی زینت ہیں۔

خطرات اور غیر یقینی صورت حال سے متعلق ابھی کچھ زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ خطرات کے تجزیہ کے لیے ٹنٹنر (Tintner) (1973) نے اسٹاک کے طریق عمل اور پروگرام بنانے والے ماڈل کی تجویز پیش کی۔ غیر یقینی حالات میں معاشی فیصلوں سے متعلق اظہار رائے کرنے والوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے بازیوں کے نظریے (Game Theory) کا استعمال کیا ہے۔ اگر والڈ (Vold) (1950) ان مسائل کو "قدرت کے خلاف بازی" تصور کرتا ہے تو سیویج (Savage) (1954) ان کو شعوری احتمالات۔ ان کے مفروضات اور اطلاق کی محدود صلاحیت کی بنا پر دونوں ہی طریقوں پر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تنقید کی جاتی ہے۔

متقابلی معاشی نظام : آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک معاشی نظاموں کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت نہ تھی اس لیے کہ اس زمانہ تک صرف ایک ہی معاشی نظام تمام ترقی یافتہ ممالک میں رائج تھا جس کو سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بیک لفظ اسی نظام کو سرمایہ داری (Capitalism) بھی کہا جاتا ہے۔ جو ممالک معاشی لحاظ سے غیر ترقی یافتہ تھے وہ بھی انھیں ترقی یافتہ ممالک کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش میں لگے ہوتے تھے۔

پہلی عالمی جنگ (1915 تا 1918) کے بعد صورت حال بدل گئی۔ کارل مارکس (Karl Marks) کی تعلیمات کی روشنی میں اور لینن (Lenin) کے زیر قیادت روس جیسے وسیع اور بڑی آبادی والے ملک میں ایک بالکل ہی نیا معاشی نظام قائم کیا گیا جو اشتراکی (Socialist) یا اشتمالی (Communist) نظام معیشت کے نام سے مشہور ہوا۔ لینن نے سیاسی اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد تیزی کے ساتھ روسی معیشت کو اشتراکی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش شروع کردی۔ 1916 میں لینن کے مرنے کے بعد اسٹالن نے اس کام کو اور زیادہ شدت کے ساتھ جاری رکھ کر پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ آج سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے ساتھ اشتراکی معاشی نظام بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں رائج ہے۔ اس طرح دنیا اب معاشی نظام کے لحاظ سے دو بڑے گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ مغربی یورپ شمالی امریکا اور جاپان میں سرمایہ دارانہ نظام اور روس مشرقی یورپ چین اور کیوبا میں اشتراکی یا اشتمالی نظام رائج ہے۔

لہٰذا اب سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشی نظاموں کا مقابلہ و موازنہ علم معاشیات کا ایک اہم موضوع بحث بن گیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی حسب ذیل بنیادی خصوصیات گنائی جاتی ہیں :

(1) اس نظام کے تحت ہر شخص کو ذاتی جائیداد رکھنے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنی پسند کے مطابق پیشہ اختیار کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔

(3) ہر خریدنے والے کو یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی ضرورت اور پسند کی چیزیں جہاں سے چاہے خریدے۔

(4) اسی طرح ہر فروشندے کو یہ آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنا مال یا جائیداد جہاں جس کے ہاتھ اور جس قیمت چاہے بیچے۔

(5) حکومت باشندگان ملک کے اس قسم کے معاشی لین دین اور کاروبار سے بالکل اپنے کو الگ تھلگ رکھتی ہے۔ اس معاشی نظام کے تحت ملک کے ذرائع اور وسائل مثلاً زمین محنت اور اصل (Capital) کا استعمال لوگوں کے مابین آزادانہ خرید و فروخت کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ کوئی مرکزی تنظیم اس میں مداخلت نہیں کرتی۔ لوگوں کو جو چیز زیادہ پسند ہوتی ہے اس کی وہ زیادہ قیمت دینے پر تیار ہوتے ہیں چنانچہ ذرائع اور وسائل کے مالک اپنے ذرائع و وسائل کو انھیں چیزوں کے پیدا کرنے اور انھیں خدمات کی فراہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کی زیادہ قیمت ملنے کی ان کو امید ہوتی ہے اس لیے جتنی زیادہ قیمت پر مال یا خدمات فروخت ہوں گی اتنا ہی زیادہ منافع ملے گا۔ اور چونکہ ہر شخص کو آزادی ہوتی ہے اس لیے ان کے درمیان مسابقت بھی ہوتی ہے۔ ہر فروشندہ یہ کوشش کرتا ہے کہ اچھے سے اچھا مال کم سے کم دام پر بازار میں لائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ بک سکے اس لیے کہ جتنا زیادہ مال فروخت ہوگا اتنا ہی زیادہ منافع فروشندے کو ملے گا۔

لہٰذا مندرجہ بالا خصوصیات کی وجہ سے باشندگان ملک کو اپنی ضروریات اور پسند کی چیزیں ممکنہ حد تک اچھے سے اچھے قسم کی اور کم سے کم ادم پر مہیا ہوجاتی ہیں۔ یہ سب کام خود بخود بغیر کسی سرکاری مداخلت کے انجام پا جاتا ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ملک کے ذرائع اور وسائل ممکنہ حد تک بہترین طریقہ پر استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس سے بہتر اور کوئی دوسرا معاشی نظام ممکن نہیں۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں چند ایسی خرابیاں بھی پیدا ہوگئیں جس کی وجہ سے عام لوگوں میں اور مفکرین کے درمیان اس نظام کی طرف سے بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ ان

خرابیوں کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:

(1) سرمایہ دارانہ نظام میں جلد ہی آزاد مسابقتی معیشت کے بجائے ایک اجارہ دارانہ نظام معیشت میں بدل جاتا ہے اور ملک کی دولت سمٹ کر تیزی کے ساتھ گنے چنے سرمایہ داروں کے قبضے میں آجاتی ہے۔

(2) سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے تحت لوگوں کی آمدنیوں میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ آمدنی والے اپنی پسندیدہ اشیا کے لیے اونچی قیمتیں دینے کے موقف میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا کارخانہ دار اور دیگر پیداکار وہی مال زیادہ تیار کرتے ہیں جو امیروں کے عیش و عشرت کے لیے درکار ہوتا ہے اس طرح اس نظام میں کم آمدنی والے غریب طبقہ کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ بہ الفاظ دیگر سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ملک کے ذرائع اور وسائل امیروں کے لیے عیش و عشرت کا سامان تیار کرنے میں استعمال ہوتے ہیں اور غریبوں کی بنیادی ضروریات یعنی روٹی کپڑا اور مکان تک کا بندوبست نہیں کیا جاتا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے معترضین کا یہ کہنا ہے کہ ملک کے ذرائع وسائل کا اس طرح استعمال درست نہیں۔ اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اس نظام کو بدل کر اشتراکی معاشی نظام قائم کیا جائے جس کے تحت ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی اشیا بنانے کے کام کو اولیت دی جائے گی۔ اس کے بعد بھی اگر ذرائع وسائل بچ رہیں تو پھر آرام و عیش کی اشیا بنانے میں کام لایا جائے گا۔

(3) دوسری خرابی سرمایہ دارانہ نظام کی یہ ہے کہ ہر آٹھ دس سال کے وقفے کے بعد اس نظام کی گاڑی چلتے چلتے اچانک پٹری سے اتر جاتی ہے۔ معیشت سرد بازاری کا شکار ہوجاتی ہے۔ اس کے نہایت برے معاشی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں مزدور بے روزگار ہوجاتے ہیں۔

مجسٹریٹ جو موت کی تحقیقات کر سکتے ہیں (Magis-trates who may hold inquest)

(Magis-trates who may hold inquest): حاکم فوج داری ضلع حاکم فوج داری حصہ ضلع مجسٹریٹ درجہ اول جس کو حکومت نے خاص اختیار دیا ہو وجہ موت کی تحقیقات کے مجاز ہوں گے۔ اگر کوئی شخص کوتوالی کی حراست میں فوت ہوجائے تو اس حاکم فوج داری کا جو قریب تر ہو اور تحقیقات کا مجاز ہو یہ فرض ہوگا کہ تفتیش کوتوالی کے علاوہ مزید وجہ موت کی تحقیقات کرے۔ اس تحقیقات میں حاکم فوج داری کو وہ کل اختیار حاصل ہوں گے جو کسی جرم کی تحقیقات کے وقت حاصل ہوتے ہیں اور اس ضمن میں شہادت قلم بند کرے گا۔

مجلس اقوام متحدہ- کانفرنس برائے تجارت و ترقی (United Nations Conference on Trade and Development)

(United Nations Conference on Trade and Development): پچھلی جنگ عظیم کے بعد ایشیا و افریقہ کے اکثر ملکوں نے سیاسی طور پر آزادی حاصل کرلی لیکن وہ اب تک اپنے پرانے حکمراں سامراجی ملکوں سے معاشی آزادی حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ اپنے کچے مال کے لیے انھیں ان ہی ترقی یافتہ ملکوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اور اپنی صنعتی و معاشی ترقی اور سرمایہ کے لیے بھی ان ہی ملکوں کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے اور یہ ترقی یافتہ ملک کچا مال تو سستے داموں خرید لتے ہیں لیکن صنعتی اشیا کے لیے بہت زیادہ قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ اس لیے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان ایک طرف توازن ادائگی بڑھتا جاتا ہے اور دوسری طرف معیار زندگی میں بھی فرق بڑھتا جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کی وجہ سے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تناؤ برابر بڑھ رہا ہے۔

اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مجلس اقوام متحدہ کے ملکوں کی پہلی دوسری اور تیسری کانفرنس بالترتیب 1964، 1968 اور 1972 میں منعقد ہوئی۔ 1978 کے اجلاس میں کچھ تجویزیں پیش ہوئی تھیں جو سب نے منظور کرلی تھیں۔ لیکن امریکا اور مغربی جرمنی نے انھیں رد کردیا۔ مئی 1979 میں منیلا میں کانفرنس ہوئی جس میں یورپ کے دس ممالک نے ایک تجویز رکھی کہ 750 ملین ڈالر کا ایک فنڈ قائم کیا جائے جس کی مدد سے 18 بنیادی خام اشیا کی قیمتوں کو متوازن سطح پر رکھا جاسکے۔

مجلس اقوام متحدہ کی تجارت و ترقی کی کانفرنس (U.N.C.T.A.D.) کے ڈائرکٹر جنرل نے 1972 کی ایک کانفرنس میں اس مسئلہ پر تفصیلی

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

رپورٹ پیش کی تھی جس میں بتلایا گیا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کو معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سالانہ پیداوار میں کم از کم 5 فی صدی فی سال کا اضافہ کرے اس کے لیے درآمد میں کم از کم چھ فی صد سالانہ کا اضافہ ضروری ہے لیکن ان کی برآمد میں اضافہ جو ابتدا میں 4 فی صد تھا، گرتے گرتے صرف دو فی صدی رہ گیا تھا۔ اور اگر یہی رجحان باقی رہا تو ان ملکوں میں توازن ادائیگی کا بحران بھی بڑھ جائے گا اور ان کی حالت اور بھی خراب ہو جائے گی۔ آج کے دور میں تیل کے بحران اور مغربی ملکوں میں بڑھتے ہوئے افراط زر نے صنعتی پیداوار کی قیمتوں میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کی حالت پر ان باتوں کا بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔

ان مسائل کا حل دو طرح سے ممکن ہے ایک تو یہ کہ تجارت کے شرائط ترقی پذیر ملکوں کے خلاف نہ ہوں اور دوسرے ان ملکوں کو اپنی برآمدات بڑھانے میں مدد دی جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک اپنے معیار زندگی کے اضافہ میں کچھ کمی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پچھلے 15 سال سے اسی سمت میں کوششیں جاری ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کی منزل ابھی دور ہے۔

مجلس قانون ساز (Legislative Assembly)

: منتخب نمائندگان کا رول : اس بارے میں بڑا اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ منتخب نمائندہ کا اپنے انتخاب کنندگان سے کیا رشتہ ہونا چاہیے۔ ریاستہائے متحدہ امریکا اور فرانس میں نمائندہ کو انتخاب کرنے والوں کا مندوب (Delegate) تصور کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے یعنی وہ بطور نمائندہ کے مجلس قانون ساز میں اپنی صواب دید کے مطابق کام نہ کرکے اپنے منتخب کرنے والوں کی مرضی اور ہدایت کے مطابق کام کرے گا۔ اس کے برخلاف برطانیہ کی روایت یہ ہے کہ نمائندہ محض اپنے منتخب کرنے والوں کا مندوب اور ان کی مرضی کا پابند نہیں بلکہ تمام مسائل پر مفاد عامہ کے مطابق اپنے آزادانہ فیصلہ سے کام کرنے کا حق دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ قومی مفاد کو مقامی مفاد پر مقدم رکھے۔ اسی لیے جہاں امریکا اور فرانس میں نمائندہ کے لیے حلقہ انتخاب کا باشندہ ہونا ضروری ہے۔ برطانیہ اور دولت مشترکہ کے ملکوں میں نمائندوں کے لیے حلقہ انتخاب میں سکونت پذیر ہونا لازمی نہیں ہے۔ لیکن قومی پارٹیوں کے ارتقاء اور مجالس قانون ساز میں پارٹی ڈسپلن کے رائج ہونے کے نتیجہ میں نمائندہ اور مندوب کے درمیان فرق لایعنی ہو گیا ہے۔ درحقیقت جمہوری نمائندگی کے نظام میں قانون ساز کو بیک وقت عوام کے ایک معتمد، اپنے حلقہ کے مفادات کے نگہبان، ایک سیاست داں، ایک پارٹی ممبر اور سرکاری انتظامیہ اور عوام کے درمیان رابطہ کے طور پر کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ موقع و محل کے اعتبار سے ان مختلف طریقوں سے کام کرتا ہے۔

مجالس قانون ساز کی ساخت : ایک ایوانی یا دو ایوانی (Unicameral or Bicameral) اکثر جمہوری ملکوں کی مجالس قانون ساز دو ایوانی ہیں۔ دو ایوانی اور سہ ایوانی پارلیمانوں کی ابتدا یورپ میں قرون وسطی میں ہوئی۔ یہ ایوان اس زمانہ کے جاگیردارانہ سماج کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ چنانچہ تیرہویں صدی میں انگلستانی پارلیمان دو ایوانوں میں منقسم ہوچکی تھی۔ طبقہ امراء اور اونچے پادریوں (جو روحانی امراء کہلائے) نے دارالامراء کی تشکیل کی اور دوسری طرف کاؤنٹیوں اور شہروں کے عام باشندوں کی نمائندگی کرنے والوں نے دارالعوام کی شکل اختیار کی۔ فرانس اور دوسرے مغربی یورپی ملکوں میں پادریوں کا ایوان الگ ہوتا تھا۔ امراء کا دوسرا اور عوام کے نمائندوں کا تیسرا۔ موجودہ جمہوری دور میں دو ایوانیت کا وجود کچھ تو روایت اور اتباع کا مرہون منت ہے اور کچھ اس ساخت کی عملی افادیت کا۔

دو ایوانی مجلس قانون ساز میں ایوان اول کو ایوان زیریں یا عوامی ایوان کہتے ہیں اور اگرچہ ایوان دوم یا ایوان بالا کو اس کے برابر قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں لیکن مالی مسودے عموماً ایوان زیریں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان دونوں ایوانوں کے مرتبہ اور اختیارات کا تعین مختلف ملکوں میں مختلف طرز سے کیا گیا ہے۔

دو ایوانی نظام کے محاسن و معائب کے بارے میں کافی بحث ہوتی رہی ہے۔ اس کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں :

(1) دوسرا ایوان، قانون سازی کے نظام اوقات کی تشکیل میں مدد دے کر ایوان اول کے بار کو کم کرتا ہے۔

(2) ایوان زیریں کے پاس کیے ہوئے مسودوں پر نظر ثانی کرتا اور جلدبازی میں پاس ہوئے یا ناموزوں مسودوں کو واپس بھیج کر دوبارہ غور کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

(3) ان ممتاز مردوں اور عورتوں کی خدمات ملک کے لیے حاصل کرنے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے مواقع فراہم کرتا ہے جو انتخابی سیاست سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ یہ دانش وروں، ماہروں اور فن کاروں وغیرہ کو نمائندگی دینے کا بہترین وسیلہ ہے۔

(4) یہ ایوان زیرین میں اقتدار کے بے جا استعمال کے رجحان پر روک لگاتا ہے۔

(5) یہ نامزدگی کے ذریعہ ان مفادات کی نمائندگی کرسکتا ہے جن کی ایوان زیریں میں (انتخابات کے ذریعہ) نمائندگی نہیں ہوسکتی مثلاً اقلیتی یا پس ماندہ طبقے۔

(6) وفاقی ممالک میں ایوان بالا وفاق کی اکائیوں کے حقوق و مفادات کا محافظ ہوتا ہے۔ دو ایوانیت کے خلاف حسب ذیل دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

(1) یہ قوانین کی منظوری میں تاخیر کرکے ان حالات میں سنگین نتائج برآمد کرسکتا ہے جبکہ قومی مفاد فوری اقدام کا طالب ہو۔

(2) یہ عوامی مالیہ پر ایک غیر ضروری بار ہے جس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ عوام ایوان بالا کی کارروائیوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے۔

(3) اگر اسے موثر اختیارات دیے جائیں تو یہ ایوان زیرین کے راستہ میں مزاحمت کر سکتا ہے۔ اگر موثر اختیارات نہ دیے جائیں تو اس کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔

(4) ایوان بالا شکست خوردہ سیاست دانوں کی آماج گاہ بننے کا رجحان رکھتا ہے۔ انتخابات میں شکست خوردہ امیدوار، نامزدگی کے ذریعہ سیاسی پنشن کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

(5) ہر وہ ایوان جس کی تشکیل براہ راست انتخابات کے ذریعہ نہ کی جائے جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے منافی ہوگا۔ جب تک وہ ایوان جو عام رائے دہندگان کے ذریعہ منتخب ہوتا ہے ان کے سامنے جواب دہ رہے گا مطلق العنانی کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

اکثر وفاقی ملکوں میں مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکا، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، ہندستان، جرمنی، پاکستان اور روس کی مجالس دو ایوانی ہیں۔ نیوزی لینڈ کے سوا دولت مشترکہ کی تمام ریاستوں میں دوسرا ایوان پایا جاتا ہے۔ آسٹریلیا میں کوئنس لینڈ کو چھوڑ کر سبھی ریاستی مجالس اور ہندستان کی دس ریاستی مجالس دو ایوانی ہیں۔ دولت مشترکہ کے تمام ملکوں میں مالیات کے معاملہ میں ایوان زیرین زیادہ طاقت ور ہے اور کابینی طرز حکومت کے نتیجہ میں منتخب ایوان ہمیشہ ایوان بالا پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ کابینہ اجتماعی طور سے ایوان زیریں کے تئیں جواب دہ ہوتی ہے اور ایوان اس کی زندگی یا موت کا فیصلہ کرتا ہے۔

مجالس قانون ساز کی رکنیت کی شرائط، میعاد اور طریقۂ انتخاب: ذیل میں مختلف ملکوں میں ایوانی زیرین اور ایوان بالا کے رکنیت کی شرائط، عہدہ کی میعاد اور طریقۂ انتخاب کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

الف۔ ایوان زیریں

ممالک	شرائط	میعاد	طریقۂ انتخاب
ریاستہائے متحدہ امریکا	عمر 25 سال 7 سال تک ریاستہائے متحدہ امریکا کی شہریت	2 سال	انتخابی حلقوں میں براہ راست خفیہ آزادانہ رائے دہی کے ذریعہ
برطانیہ	عمر 21 سال برطانوی شہریت	5 سال	حلقہ انتخاب سے
فرانس	23 سال فرانس کی شہریت	5 سال	ایضاً
ہندستان	10 سال ہندستانی شہریت	5 سال	ایضاً

ب۔ ایوان بالا

ممالک	شرائط	میعاد	طریقۂ انتخاب
ریاستہائے متحدہ امریکا	30 سال	6 سال (1/3 ہر دوسرے سال ریٹائر ہو جاتے ہیں)۔	ریاستوں سے براہ راست
برطانیہ	سیاسیات یا قومی زندگی کے دوسرے میدانوں میں نمایاں خدمات	1. موروثی تاحیات 2. روحانی امراء 3. قانونی ارکان	وزیراعظم کی سفارش پر بادشاہ یا ملکہ مقرر کرتی ہے۔

فرانس	35 سال	9 سال (1/3 ہر تیسرے سال)	بالواسطہ انتخاب سے
ہندستان	18 سال	استمراری (1/3 ارکان ہر دوسرے سال ریٹائر ہوتے ہیں)	12 کو صدر جمہوریہ علوم و فنون اور سماجی خدمات میں امتیاز کی بنا پر نامزد کرتا ہے۔ باقی مرکزی علاقوں کی اسمبلیوں سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔

پارلیمنٹ کی اندرونی تنظیم اور ضابطہ کارروائی : پارلیمنٹ کی اندرونی تنظیم اور ضابطہ کارروائی کا تعین خود اسی کی مرضی سے ہوتا ہے۔ برطانیہ میں اس کا ارتقاء کئی صدیوں کے دوران ہوا ہے دوسری پارلیمانوں نے بڑی حد تک اسی کے نمونہ کا اتباع کیا ہے۔ مثال کے طور پر ہندستانی لوک سبھا کے ارکان، مراعات، ایوان کا ضابطہ کارروائی، عام قانون سازی اور مالی قانون سازی کا عمل معمولی تصرف کے ساتھ برطانیہ سے مستعار لیا گیا ہے۔

برطانوی دارالعوام کی طرح ہندستانی لوک سبھا بھی حکمران پارٹی اور حزب اختلاف میں منقسم ہو جاتی ہے۔ حکمران پارٹی کا پارلیمانی قائد وزیراعظم ہوتا ہے۔ وہ خود یا اس کا کوئی نمائندہ قائد ایوان مقرر کیا جاتا ہے۔ حزب اختلاف کے قائد کو وزیراعظم کی طرح خصوصی مرتبہ اور خصوصی تنخواہ ملتی ہے۔ ایوان کی کارروائی کی صدارت کے لیے ایک اسپیکر کو عام انتخابات کے بعد ارکان خود منتخب کرتے ہیں۔ لیکن وہ اکثریتی پارٹی کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس کے لیے اپنی پارٹی سے مستعفی ہونا ضروری نہیں۔ اس کے اختیارات دولت مشترکہ کی تمام پارلیمانوں کے اسپیکروں کے اختیارات سے وسیع تر ہیں۔ وہ نشستوں کی ترتیب اور اوقات نشست کا تعین کرتا اور تقریروں اور مباحثوں کے لیے وقت مقرر کرتا ہے۔ کسی بھی قسم کے نامناسب الفاظ کو ایوان کی کارروائی سے حذف کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔ قائد ایوان سے مشورہ کرکے ایوان کی کارروائیوں کی ترتیب کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ تمام پارلیمانی کمیٹیوں پر پورا اختیار رکھتا ہے۔ ان میں سے کچھ کو وہ خود مقرر کرتا ہے۔ وہی تمام کمیٹیوں کے چیرمینوں کو نامزد کرتا ہے وہ خود ضوابط کمیٹی کا چیرمین ہوتا ہے۔ یہی کمیٹی کا کاروبار کی نوعیت اور ضابطہ کارروائی کے معاملات طے کرتی ہے۔ برطانوی اسپیکر کی طرح اسے بھی سوالات، قرار دادوں اور ترمیموں کو داخل کرنے یا نہ کرنے اور تحریک التواء کو منظور یا نامنظور کرنے اور ترمیمات کو منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ ہر وقت ایوان سے خطاب اور اس کے ضابطوں اور عمل کی تشریح کر سکتا ہے۔

پارلیمانی کمیٹیاں : استمراری احکامات کے تحت مندرجہ ذیل میقاتی کمیٹیاں تشکیل کی جاتی ہیں۔ کاروبار صلاح کار کمیٹی، پرائیویٹ ارکان کے بلوں سے متعلق کمیٹی، عرضداشتوں کی کمیٹی، عوامی حسابات کی کمیٹی، تخمینہ جات کی کمیٹی، مراعات کمیٹی، مفوضہ ضابطہ سازی کی کمیٹی، سرکاری یقین دہانیوں سے متعلق کمیٹی، ارکان کے ایوان کی نشستوں سے غیر حاضر رہنے سے متعلق کمیٹی اور ضوابط سے متعلق کمیٹی۔

مجلس قانون ساز کے کام : اگرچہ جمہوری تقسیم عمل کے نتیجہ میں مقننہ کا اصل کام قانون سازی ہے لیکن جمہوری پارلیمانین اس کے علاوہ بھی کئی ضمنی کام انجام دیتی ہیں جن میں تاسیسی، انتخابی، عدالتی، مشاورتی اور انتظامی فرائض شامل ہیں۔ عام قانون سازی کے علاوہ پارلیمان کا کام بجٹ پر غور کرنا سرکاری مالیہ کی منظوری دینا اور انتظامیہ کی نگرانی کرنا بھی ہے۔

قانون سازی : ہر بل (مسودہ قانون) خواہ وہ عوامی نوعیت کا ہو یا نجی، خواہ اسے حکومت کی جانب سے پیش کیا گیا ہو یا کسی آزاد رکن کی طرف سے، اس وقت تک قانون نہیں بن سکتا جب تک پارلیمان اس کے اصول اور جزئیات پر پوری طرح سے غور نہ کرلے اور اس کو اپنی منظوری نہ دے دے۔ برطانوی ضابطہ کے مطابق (جو ہندستان اور دولت مشترکہ کی پارلیمانوں میں رائج ہے) کوئی بھی بل دارالامراء یا دارالعوام میں پیش کیا جاسکتا ہے، سوائے مالی بلوں کے جو فقط دارالعوام اور لوک سبھا میں پیش کیے جاتے ہیں۔ پیش ہونے کے بعد بل مندرجہ ذیل مراحل سے گزرتا ہے۔ (1) پہلی خواندگی جو محض رسمی ہوتی ہے اور اس پر مباحثہ نہیں ہوتا۔ (2) دوسری خواندگی جس میں بل پر بہ حیثیت مجموعی بحث کی جاتی ہے اور اس میں ترمیمات پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس مرحلہ سے بل پاس ہوکر (3) کمیٹی کے مرحلہ سے گزرتا ہے جس میں اس کی ہر ایک دفعہ ہر ایک شق اور ہر ہر لفظ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ (4) "رپورٹ کا مرحلہ" اگر کمیٹی نے کوئی ترمیم پیش نہیں کی ہے تو یہ مرحلہ محض رسمی ہوتا ہے اور اس کے بعد تیسری خواندگی ہوتی ہے۔ اگر ترمیم پیش ہوتی ہے تو کمیٹی کے مرحلہ

کی طرح ایوان میں اسپیکر کی صدارت میں پھر سے مباحثہ ہوتا ہے۔ (5) تیسری خواندگی میں مباحثہ طویل نہیں ہوتا۔ اس آخری مرحلہ میں بل کی منظوری کے لیے ووٹ لیے جاتے ہیں۔ اس مرحلہ سے پاس ہوکر بل ایوان بالا کو جاتا ہے وہاں بھی اسے انھیں منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کی منظوری کے بعد سربراہ مملکت کی منظوری حاصل کرکے پارلیمنٹ کا ایکٹ بن جاتا ہے۔ ہندستان میں کسی بل کے بارے میں دو ایوانوں کے درمیان اختلاف کو دور کرنے کے لیے دونوں کے مشترکہ اجلاس کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

مالی قانون سازی : تقریباً سبھی جمہوریتوں میں مالیہ کو کنٹرول کرنے کا اختیار نمائندہ اسمبلی کو دیا گیا ہے۔ یہ اصول قرون وسطی میں نمائندگی کے بغیر ٹیکس کاری نہیں، کے اصول کے ثابت ہونے کے بعد سے چلا آرہا ہے۔ برطانیہ میں مالی قانون سازی کا طریقہ اور عمل بہت مشکل اور پیچیدہ ہے۔ پارلیمنٹ کو نہ صرف بجٹ کی چھان بین کرنے بلکہ منظوری کے بعد حسابات کی جانچ کرنے کا وسیع اختیار حاصل ہے۔ بجٹ کے مباحثہ کے دوران ارکان پارلیمان عوامی شکایات کا ازالہ کرا سکتے اور حکومت کی پالیسی اور کارکردگی پر نکتہ چینی کرسکتے ہیں۔ برطانیہ اور ہندستان میں "آڈیٹر جنرل" اور "پارلیمان کی عوامی حسابات کمیٹی" دونوں ہی انتظامیہ کو کنٹرول کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ مالی قانون سازی کے عمل میں ہر سال دو قوانین منظور کیے جاتے ہیں۔

(1) قانون تصرف مال (Appropriation Act) جس کے ذریعہ پارلیمنٹ حکومت کو اس کے بجٹ کے مطالبات کی پوری رقم کو عوامی خزانہ سے نکالنے اور خرچ کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور (2) قانون مالیہ کاری (Finance Act) جس کے ذریعہ پارلیمانی حکومت کو بجٹ میں تجویز کردہ ٹیکس کو نافذ کرنے اور وصول کرنے کی اجازت دیتی ہے۔

مفوضہ ضابطہ سازی پر کنٹرول : موجودہ دور میں عوامی مسائل اتنے چند درچند اور اس قدر پیچیدہ ہوگئے ہیں کہ ہر ملک میں مجلس قانون ساز کے پاس اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ ہر معاملہ میں جامع و کامل قانون وضع کرسکے۔ لہٰذا پارلیمان اپنے ایکٹ میں محض اصولوں اور بنیادی باتوں کو شامل کرتی ہے اور اس میں بیان کردہ مقاصد کی تکمیل کے لیے جزوی ضوابط سازی کا اختیار متعلقہ سرکاری محکموں کو تفویض کردیتی ہے۔ اب اگر پارلیمان ان محکموں کے بنائے ہوئے ضابطوں کی چھان بین اور نگرانی نہ کرے، جنھیں قوانین کے برابر درجہ حاصل ہوتا ہے، تو یہ محکمے مطلق العنان ہو جائیں گے۔ اس لیے برطانیہ اور ہندستان میں مفوضہ ضابطہ سازی سے متعلق پارلیمانی کمیٹیاں تشکیل کی جاتی ہیں۔ اور ہر محکمہ کے لیے لازم ہے کہ وہ حکومت کے توسط سے اپنے بنائے ہوئے تمام ضوابط اس کمیٹی کو پیش کرے۔ یہ کمیٹی ہر سال اپنی رپورٹ پارلیمان کو پیش کرتی ہے۔

انتظامیہ کی نگرانی : پارلیمانی اداروں کا کام محض قانون سازی تک محدود نہیں بلکہ مخلوط نوعیت کا ہے۔ ان میں سے تاریخی ارتقاء کے نتیجہ میں ایک اہم کام انتظامیہ کو کنٹرول کرنا ہے۔ کنٹرول یا نگرانی کے یہ معنی نہیں کہ یہ ادارے انتظامیہ کے کاموں میں مستقلاً دخل انداز ہوتے یا قوانین کی تنفیذ میں عملاً حصہ لیتے ہیں بلکہ ان کا کام محض کابینہ اور انتظامیہ کی پالیسی اور کارکردگی کا جائزہ لینے، نکتہ چینی کرنے اور اصلاح کرنے کا ہے۔ نگرانی کا یہ عمل روزمرہ کے مباحثوں، پارلیمانی تحقیقات، سوالات، ضمنی سوالات مختلف تحریکات التوا، پارلیمانی کمیشنوں اور کمیٹیوں اور مالیہ کے کنٹرول کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ پارلیمانی نظام حکومت میں ایوان زیریں کے سامنے کابینہ کی اجتماعی ذمہ داری کا اصول اس سلسلہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

تاسیسی امور : تحریری دستور کی حامل جمہوریتوں میں مقننہ کو دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار دیا جاتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکا کے دستور میں ترمیم کے لیے ایک ایسی اسکیم رکھی گئی ہے جس میں ترمیم کی تجویز کانگریس کے دونوں ایوانوں کی دوتہائی اکثریت یا دو تہائی ریاستوں کے مطالبہ پر کانگریس کی طرف سے بلائے گئے قومی کنونشن سے منظوری اور تین چوتھائی ریاستوں کی مجالس قانون ساز یا تین چوتھائی ریاستوں میں ریاستی کنونشنوں سے اس کی توثیق کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ہندستان میں دستور کی دفعہ 368 کے تحت پارلیمنٹ کو دستور کی تمام دفعات میں ترمیم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ عام ترمیمیں دو ایوانوں کی دوتہائی اکثریت سے منظور ہوکر صدر جمہوریہ کی منظوری سے ترمیمی ایکٹ بن جاتی ہے۔ بعض وفاقی دفعات کی ترمیم کے لیے ضروری ہے کہ نصف ریاستوں کی مجالس قانون ساز اس کے حق میں توثیقی قراردادیں منظور کریں۔

انتخابی امور : ریاستہائے متحدہ امریکا میں اگر صدارت کے عہدہ کے امیدواروں کے ووٹ برابر ہوں یا کسی کو اکثریتی ووٹ نہ ملیں تو

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دستور کے مطابق ایوان نمائندگان صدر کا انتخاب کرے گا اور اس انتخاب میں ہر ریاست کو ایک ووٹ حاصل ہوگا۔ ایوان بالا یعنی سینیٹ کو ججوں، سفیروں اور دوسرے اہم انتظامی عہدہ داروں کی تقرریوں کی منظوری دینے کا اختیار ہے۔ ہندستان میں صدر جمہوریہ کا انتخاب پارلیمان کے دونوں ایوانوں کے ارکان اور ریاستی اسمبلیوں کے ارکان پر مشتمل ایک انتخابی کالج کے ذریعہ ہوتا ہے۔

عدالتی امور : آج کل اکثر پارلیمانوں کو سرکاری حکام کے خلاف مواخذہ (Impeachment) کی کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ امریکا کے دستور میں صدر، نائب صدر اور تمام شہری حکام کے خلاف غداری، رشوت یا دوسرے بڑے جرائم کی پاداش میں مواخذہ کرنے کا اختیار کانگریس کو دیا گیا ہے۔ الزامات کی جانچ ایوان نمائندگان کرتا ہے اور سینیٹ بطور ایک عدالت کے مقدمہ کی سماعت کرتی اور دوتہائی اکثریت سے ملزم کو مجرم قرار دیتی ہے۔ اگر مواخذہ کی کارروائی صدر یا نائب صدر کے خلاف ہے تو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس مقدمہ کی کارروائیوں کی صدارت کرتا ہے۔

برطانوی دارالامراء، دارالعوام کی طرف سے پیش کردہ الزام پر مواخذہ کی کارروائی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دارالامراء ملک کی اعلیٰ ترین عدالت استغاثہ بھی ہے۔

ہندستانی پارلیمنٹ بھی دستور کی خلاف ورزی کی پاداش میں صدر جمہوریہ کو مواخذہ کی کارروائی کے ذریعہ برطرف کرسکتی ہے۔

مجمع خلاف قانون (Unlawful Assembly): یہ جرائم خلاف امن عامہ خلائق کے تحت آتا ہے۔ اس جرم کا اصل مقصد یہ ہے کہ اشخاص کے شورش انگیز مجمع کو روکا جائے تاکہ امن عامہ کے قیام میں سہولت واقع ہو۔

پانچ یا زیادہ اشخاص کا ہر مجمع "خلاف قانون" کہلائے گا بشرطیکہ اس کی غرض مشترک کسی جرم کے ارتکاب کی ہو۔ اس جرم کا اصل جز یہ ہے کہ شرکاء کی غرض مشترک ہو۔

اس قانون میں بعض مخصوص جرائم کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا ارتکاب مشترکہ طور پر کیا جائے تو اس جرم کا مرتکب ہو شریک مجمع قرار پاتا ہے۔ غرض مشترک ضروری ہے یعنی کسی جرم کے ارتکاب کا علم و ارادہ ہر شریک مجمع کو ہونا چاہیے۔

بعض جرائم کا ذکر یہاں کیا جانا مناسب ہوگا جن کے مشترکہ ارتکاب سے یہ جرم سرزد ہوتا ہے۔

جب اس مجمع کی غرض مشترک مرکزی حکومت یا ریاست کی حکومت یا مجلس وضع قوانین یا کسی سرکاری ملازم کو جبر مجرمانہ یا نمائش جبر مجرمانہ کے ذریعہ خوف زدہ کرنا ہو۔ اس کے علاوہ کسی قانون یا قانونی حکم کی تعمیل میں رکاوٹ پیدا کرنا ناجائز غرض قرار دی جاتی ہے۔ جس فعل میں تعرض کیا گیا ہو وہ فعل قانون کے موافق ہونا چاہیے۔ اگر پانچ یا زائد آدمی کسی جائز غرض کے لیے جمع ہوں تو ایسے آدمیوں کا مجمع "مجمع خلاف قانون" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مثلاً اگر ایک عہدہ دار کوتوالی بغیر حکم نامہ تلاشی کے ایک دکان کی تلاشی لینے لگے اور پانچ سے زائد آدمی اس کی مزاحمت کریں تو یہ آدمی مجمع خلاف قانون کے شرکا نہیں سمجھے جاسکتے۔ اس مجمع کی غرض مشترک نقصان رسانی یا مداخلت بے جا مجرمانہ یا کسی اور جرم کے ارتکاب کی نہیں ہونی چاہیے۔

مجمع خلاف قانون کا منتشر کرنا (Dispersal of Unlawful Assembly) : ہر حاکم فوج داری کو اس کا اختیار ہوگا کہ اپنے حدود سماعت میں کسی مجمع خلاف قانون کو یا پانچ سے زیادہ اشخاص کے کسی ایسے مجمع کو جس کی نسبت احتمال ہو کہ وہ امن میں خلل ڈالے گا منتشر ہوجانے کا حکم دے اور اس مجمع کے شرکاء کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ منتشر ہوجائیں اگر حکم صادر کرنے کے بعد بھی مجمع منتشر نہ ہو تو حاکم فوج داری عہدہ دار کوتوالی کو حکم دے سکے گا کہ وہ مجمع کو منتشر کرے اور اگر ضرورت ہو تو اس کے شرکاء میں سے کسی کو گرفتار کرسکے گا۔

مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ: یہ کتاب ڈاکٹر محمد حمیداللہ حیدرآبادی (مقیم حال پیرس) کا ایک عظیم الشان علمی، دینی اور تاریخی کارنامہ ہے اس میں آنحضرت ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانے کے بہت سے احکام و فرامین سیاسی وثیقے اور دوسرے خطوط و مراسلات جمع کیے گئے ہیں جو حدیث سیرت طبقات فقہ اور تاریخ کی کتابوں میں متفرق طور پر موجود تھے۔ یہ مختلف قبائل و اقوام سے معاہدوں، پرانے معاہدوں کی تجدید، دعوت اسلام کے خطوط، عمال کے تقرر اور ان کے اختیارات کے احکام، طریق حکومت کی ہدایات، انعام و عطایا کی دستاویزوں ان نامور اشخاص کے

متعلق استثنائی احکام، دینی فرامین، جنگی و سیاسی ہدایات، مفتوح قوموں کے ساتھ طرز عمل اور مفتوحہ ملکوں کے نظم و نسق کے متعلق ہدایات اور دوسرے دینی سیاسی اور انتظامی امور پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر حمیداللہ کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا یہی موضوع تھا۔ انھوں نے ان احکام و فرامین اور دستاویزوں کو جمع کرکے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ پیش کیا تھا۔

ماخذ مجموعہ الوثائق السیاسۃ الاسلام و اصول الحکم۔ یہ کتاب شیخ علی عبدالرزاق کی تصنیف اور 1343ھ/ 1925ء میں مصر سے شائع ہوئی تھی۔ مصنف شیخ مفتی محمد عبدہ کے شاگرد جامعہ ازہر کے فاضل اور مصر کی مذہبی عدالتوں میں عہدہ قضا پر فائز تھے وہ جدت پسند واقع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں بھی ان کے بعض ترقی پسندانہ خیالات موجود ہیں۔ اس میں وہ خلافت کی منسوخی اور دین و سلطنت کی تفریق کا ذکر کرکے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ فقہ اسلامی کو شہری زندگی کے ضابطے کی حیثیت سے ترک کردینا چاہیے تاکہ ایسا نیا اور ترقی پذیر معاشرہ وجود میں آئے جو عقل و حکمت و متمدن قوموں کے تجربات پر مبنی ہو۔

مچلکہ ضمانت امن و نیک چلنی (Personal Bond for good behaviour and to keep the peace):

جب کسی شخص پر بلوہ یا حملہ یا کسی اور جرم کا جو نقض امن کا باعث ہو یا اس کی اعانت یا اس جرم کے ارتکاب کی صریح نیت سے مسلح اشخاص کو جمع کرنے یا ناجائز عمل کے اور تدابیر عملی میں لانے کا الزام ہو اور متعلقہ عدالت میں اس جرم کا جرم قرار پائے تو عدالت مذکور اس شخص سے حفظ امن کا مچلکہ مع یا بلاضمانت لینے کا حکم دے سکے گی اور اس کے لیے مناسب مدت مقرر کرے گی جو تین سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ جب کسی حاکم فوج داری کو یہ اطلاع ہے کہ اس کے حدود سماعت کے اندر کوئی شخص نقض امن یا کوئی ایسا ناجائز فعل کرنے والا ہے جس سے غالباً نقض امن پیدا ہوگا یا یہ کہ اس کے حدود سماعت کے اندر کوئی ایسا شخص رہتا ہے جو اس کے حدود سماعت کے باہر امور بالا میں سے کسی ایک امر کا مرتکب ہونے والا ہے تو حاکم فوج داری کو مجاز ہوگا کہ اس شخص کو حکم دے کہ وہ اپنی نیک چلنی کا مچلکہ یا ضمانت دے اور اس کے لیے مناسب مدت مقرر کرے گا جو ایک سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

محصول پیشہ (Professional Tax):

اگر کوئی شخص کسی شہری حدود میں سال میں ایک مخصوص مدت تک جو کم از کم چھ ماہ ہو کوئی کاروبار کرتا ہے یا جس کام سے اسے آمدنی ہوتی ہے تو انتظامیہ کو اس کا اختیار ہوتا ہے کہ اس شخص سے محصول پیشہ (Professional Tax) وصول کرے۔ کسی بھی شخص یا ادارے سے ایک سال میں زیادہ سے زیادہ کتنا محصول پیشہ وصول کیا جا سکتا ہے اس کا تعین دستور ہند کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ محصول پیشہ عام طور پر ہر چھٹے ماہ وصول کیا جاتا ہے۔ محصول پیشہ شہری انتظامیہ کے لیے سب سے کمزور وسیلہ آمدنی ہے کیونکہ اس ذریعہ سے بلدیات کو خاطر خواہ آمدنی نہیں ہوتی۔

محصول تفریحات (Entertainment Tax):

سنیما، تھیٹر، سرکس اور دیگر ورائٹی شوز تفریح کا وسیلہ ہوتے ہیں اور یہ تفریحی وسیلے شہری انتظامیہ کے لیے آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ حدود بلدیہ میں ایسی تفریح گاہیں جہاں داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہوتا ہے اس پر محصول تفریحات یعنی Entertainment Tax عائد کرنے کا اختیار شہری انتظامیہ کو ہوتا ہے۔ یہ محصول تفریح گاہ میں داخلے کے ٹکٹ کی بنیادی قیمت کے تناسب سے متعین کیا جاتا ہے۔ دہلی میں تفریحی ٹیکس کی شرح 60 فی صد ہے تو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں کہیں کم ہے کہیں زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مقامی حکومت اس ٹیکس کا تعین اپنے ماحول اور ضرورت کے مطابق کرتی ہے۔ یہ ایک بالواسطہ محصول ہے اور اس سے بلدیات کو خاطر خواہ آمدنی ہوتی ہے۔ بعض ریاستوں میں محصول تفریحات ریاستی حکومت وصول کرتی ہے لیکن اس کی وصولی کے اخراجات وضع کرنے کے بعد باقی رقم متعلقہ شہری انتظامیہ یعنی مقامی حکومت کو دے دی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شہری انتظامیہ کو ملنے والے ٹیکسوں میں یہ بالواسطہ محصول ہوتے ہیں جن میں حسب ضرورت اضافہ کیا جا سکتا ہے جبکہ راست محصول یعنی ڈائرکٹ ٹیکسوں جیسے پراپرٹی ٹیکس، آکٹرائے یا محصول پیشہ میں آسانی سے اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کبھی کبھار ایسی نوبت آتی ہے تو مجالس بلدیہ کے لیے منتخب ممبران سخت احتجاج کرتے ہیں کیونکہ ان ٹیکسوں کے اضافہ سے ان کی ہر دلعزیزی میں فرق آتا ہے۔ لیکن بالواسطہ محصول میں یہ نوبت نہیں آتی کیونکہ محصول میں اضافہ کا راست دباؤ محصول دہندہ پر نہیں پڑتا۔ سنیما، تھیٹر یا کسی بھی تفریح کے وسیلہ کے لیے مہنگے سے مہنگا ٹکٹ خریدتے وقت کوئی بھی ٹیکس کی مد پر نظر نہیں

ڈالنا کیونکہ وہ پوری ادائیگی کو اس تفریح کی قیمت سمجھتا ہے جس کے لیے اس نے ٹکٹ خریدا ہے۔ اس طرح محصول تفریح کسی پر بار نہیں بنتا کیونکہ اس کے ذریعے خوشی کے لمحات ملتے ہیں اور خوشی ہر قیمت میں سستی ہوتی ہے۔

محصول جائداد (Property Tax): مقامی حکومت یعنی میونسپل کمیٹی یا میونسپل کارپوریشن کا سب سے اہم ذریعہ آمدنی محصول جائداد ہے یعنی پراپرٹی ٹیکس۔ محصول جائداد زمین کے رقبے اور اس پر تعمیر ڈھانچے کے حساب سے طے کیا جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں جائداد کا ٹیکس طے کرتے وقت متعلقہ علاقے کی کمرشیل ویلیو کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے جس کی اساس جائداد کی اس آمدنی پر ہے جو اسے کرایہ پر اٹھانے سے ہو سکتی ہے۔ اس ٹیکس کی ادائیگی مالک جائداد کو ہر سال کرنی ہوتی ہے۔ کچھ مقامی حکومتیں پراپرٹی ٹیکس کی ادائیگی کو باقاعدہ بنانے کے لیے مختلف سہولتیں دیتی ہیں جیسے ایک خاص مدت میں ادائیگی کرنے پر رعایت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جائداد کی دیکھ بھال کے لیے بھی طے شدہ ٹیکس میں فی صد کے حساب سے کمی کر دی جاتی ہے اسے Maintenance Rebate کہتے ہیں۔ ہر شہری انتظامیہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی صوابدید سے کوئی بھی طریقہ محصول جائداد کی تشخیص کرنے کا اختیار کر سکتی ہے۔ لوکل فینانس انکوائری کمیٹی (Local Finance Enquiry Committee) اور ٹیکسیشن انکوائری کمیشن (Taxation Enquiry Commission) نے اپنی سفارشات میں جائداد سے ملنے والے یا تشخیصی کرائے کی بنیاد پر محصول جائداد طے کرنے کے طریقے کو ترجیح دی ہے۔

محصول سواری (Transport Tax): ہر مقامی حکومت ان سواریوں پر بھی محصول وصول کرتی ہے جو اسی کی مملکت کے رقبے میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ محصول عموماً ریاستی حکومت وصول کرتی ہے اور اس کا ایک حصہ متعلقہ شہری انتظامیہ کو بطور گرانٹ دیتی ہے۔ اس محصول سے مقامی حکومتوں کو اتنی آمدنی نہیں ہوتی جتنی کہ محصول جائداد یا تفریحی ٹیکس وغیرہ سے ہوتی ہے۔

محنت کشوں کا عالمی کنفیڈریشن (World Confederation of Labour, WCL): اس کنفیڈریشن کا قیام بین الاقوامی مسیحی ٹریڈ یونینوں کے وفاق کے نام سے 1920 میں عمل میں آیا تھا لیکن 1940 میں اس کا وجود ختم ہوگیا کیونکہ اس کے پینتیس لاکھ ممبر اٹلی اور جرمنی میں تھے جہاں فسطائی اور نازی طاقتیں اقتدار پر قابض تھیں اور انھوں نے یونینوں سے ان کے باقی رہنے کا حق ہی چھین لیا تھا۔ 1945 میں اس کی تشکیل نو کی گئی لیکن اسے کسی ادارے میں ضم نہیں ہونے دیا گیا اور محنت کشوں کے عالمی کنفیڈریشن کے نام سے موسوم کیا گیا۔

آج اس میں پروٹسٹنٹ، بدھ اور مسلم ممبر بھی شامل ہیں۔ یہ ہمیشہ ٹریڈ یونینوں کی آزادی اور ان کی ترقی کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ 90 ملکوں میں اس کے ممبران کی تعداد تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ ہے۔

اس کا انتظامی ادارہ کانگریس ہے جس کا اجلاس ہر چوتھے سال منعقد ہوتا ہے۔ جس میں یہ سکریٹری جنرل کا تقرر کرتی ہے۔ اس کی جنرل کونسل کی نشست ہر سال منعقد ہوتی ہے۔ اس کی علاقائی تنظیمیں لاطینی امریکا، افریقہ اور ایشیا میں قائم ہیں اور ایک دفتر ارتباط کینیڈا میں ہے۔ اس کا صدر مقام بروسلز (بلجیم) ہے۔

مخلوط تعلیم (Co-education): لڑکے اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم کا معاملہ تعلیم نسواں سے کہیں زیادہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔ جن ملکوں نے ضرورتاً عورتوں کی تعلیم کا انتظام کیا وہاں بھی مخلوط تعلیم شروع کرنے میں بڑی رکاوٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی کئی ملک ایسے ہیں جنہوں نے مخلوط تعلیم کو ہر منزل پر رائج نہیں کیا ہے۔ بالخصوص ثانوی اسکول میں لڑکے اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم کو نامناسب سمجھا گیا ہے۔ طلبہ اس وقت اپنی نشو و نما کی ایک ایسی نازک منزل میں ہوتے ہیں جو نفسیاتی لحاظ سے ایک ہیجانی کیفیت کی حامل ہے۔ یہ عنفوانِ شباب کا دور ہوتا ہے جس میں جنسی محرکات پوری قوت کے ساتھ نوجوانوں پر غالب آجاتے ہیں کیونکہ ان میں اتنی ذہنی اور جذباتی پختگی نہیں ہوتی کہ کامیابی کے ساتھ ان پر حاوی ہو سکیں۔ چنانچہ بیشتر ملکوں میں مخلوط تعلیم کے معاملہ میں بہت احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی منزل چونکہ چھوٹی عمر کے بچوں سے متعلق ہوتی ہے جن میں ابھی تک جنسی شعور پیدا نہیں ہوا ہوتا ہے اس لیے اس منزل پر عموماً مخلوط تعلیم کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم رائج کرنے میں زیادہ رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا کیونکہ یہاں طلبہ بلوغ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کی منزل میں ہوتے ہیں اور ان سے نسبتاً ضبط نفس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن بہت سے ملکوں میں جن میں یورپ کے بعض ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہیں ثانوی منزل تعلیم پر لڑکے اور لڑکیوں کے الگ الگ اسکول قایم کیے گئے ہیں۔

مخلوط تعلیم کے حق میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان میں علمی لحاظ سے سب سے وزنی دلیل یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک ہی مدرسہ قایم کرنے کی صورت میں مادی اور انسانی وسائل کی بچت ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ترقی پذیر ممالک کا ذکر ہی کیا ترقی یافتہ ملک بھی بہ مشکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ دوسری دلیلیں جو مخلوط تعلیم کے حق میں دی جاتی ہیں وہ کوئی ایسی باضابطہ تحقیقات پر مبنی نہیں ہیں جنھیں بلا خوف تردید تسلیم کیا جا سکے۔ اور بھی بات ان دلیلوں پر صادق آتی ہے جو مخلوط تعلیم کے خلاف پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً مخلوط تعلیم کے حامیوں کا پرزور دعویٰ ہے کہ اس طرح نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا اخلاق بلند ہوتا ہے، جذباتی اور ذہنی توازن قایم رہتا ہے، جسمانی صحت میں ترقی ہوتی ہے، مطالعہ میں ان کا جی لگتا ہے، جمالیاتی ذوق فروغ پاتا ہے نیز لڑکے اور لڑکیوں کا ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنا فطرت سے زیادہ قریب ہے۔ مخلوط تعلیم کے مخالفین سے اس کے برعکس مضر نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مخلوط تعلیم کی موافقت اور مخالفت میں جو دعوے کیے جاتے ہیں ان کے لیے کوئی سائنٹفک ثبوت نہیں ہے۔ عملی تجربہ کی بنا پر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جس ممالک میں مخلوط تعلیم رائج کی گئی ہے ان کی اخلاقی سیرت کو کوئی قابل ذکر صدمہ نہیں پہنچا اور چونکہ اس طرح مادی اور انسانی وسائل میں بچت فائدے مضمر ہیں اس لیے مخلوط تعلیم کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

مخلوط تعلیم کے کئی مدارج ہیں۔ اول لڑکے اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں بعض چیزیں مشترکہ ہیں اور بعض جدا جدا۔ مثلاً لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری اور لڑکوں کے لیے تکنیکی ٹریننگ یا غیر نصابی مشاغل میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے کھیل اور ورزش کا علاحدہ پروگرام۔ ایسی صورت میں لڑکے اور لڑکیوں کے نصاب کے مشترکہ حصوں میں تعلیم ایک ساتھ ہو سکتی ہے اور خصوصی مشاغل میں ان کی کلاس الگ الگ ہوگی۔ دوم مشترکہ چیزوں میں بھی ان کی کلاس الگ الگ ہو سکتی ہے۔ اس صورت حال میں صرف تعلیمی سامان اور کسی قدر عمارت کے معاملہ میں کفایت ہو سکے گی۔ سوم مخلوط تعلیم کی انتہائی شکل یہ ہوگی کہ لڑکے اور لڑکیاں اسکول کے جملہ مشاغل میں خواہ نصابی ہوں یا غیر نصابی ایک ساتھ حصہ لیں۔ عام طور پر مختلف ممالک میں مخلوط تعلیم کی شکلیں الگ الگ ہیں اور اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کسی مخصوص ملک کی سماجی روایات اور اخلاقی اقدار کی رو سے مخلوط تعلیم کی کون سی شکل وہاں پسندیدہ قرار دی جائے گی۔

قومی تعلیمی پالیسی (1986) میں تعلیم برائے مساوات (Education for Equality) کو خاص توجہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ تعلیم کو عورتوں کے مقام و مرتبے میں بنیادی تبدیلی لانے کے وسیلے کی حیثیت سے برتا جائے گا۔

تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم میں خواتین کی شمولیت پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے اور پیشہ ورانہ نصابات (Professional Courses) میں جنس (Sex) کے دقیانوسی تصورات ختم کرنے اور غیر روایتی پیشوں اور ابھرتی ہوئی تکنالوجیوں (Technologies) میں عورتوں کی شمولیت کو بڑھاوا دینے کے لیے عدم امتیاز کی پالیسی (Policy of Non-discrimination) پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کا عزم کیا گیا ہے۔

مداخلت (Intervention) : بین الاقوامی قانون کی رو سے کسی ملک کا کسی دوسرے ملک کے داخلی معاملات میں حالت موجودہ کو برقرار رکھنے یا اسے تبدیل کرنے کی غرض سے تحکمانہ تعرض کرنے کا نام مداخلت ہے۔ اس طرح کی مداخلت جائز بھی ہو سکتی ہے اور ناجائز بھی۔ تاہم ہمیشہ اس کا تعلق متاثرہ ملک کی داخلی اور خارجی آزادی و خودمختاری سے ہوتا ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی قانون میں باضابطہ ہر قسم کی مداخلت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے تاہم اس کے ساتھ کچھ مستثنیات بھی تسلیم کی گئی ہیں۔ بعض صورتوں میں مداخلت کا حق ہے لیکن بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں مداخلت کا حق تو نہیں لیکن بین الاقوامی قانون کی رو سے اس کی اجازت ہے۔ تاہم مداخلت کا یہ مفہوم عدم مداخلت یا تعرض سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس مداخلت کا مقصد ہمیشہ تحکمانہ مداخلت ہونا چاہیے۔ بین الاقوامی قانون میں کسی ملک کو کسی دوسرے ملک کے داخلی معاملات میں سات بنیادوں پر مداخلت کا حق دیا گیا ہے۔

(1) جو ملک معاہدۂ تحفظ (Protectorate) کے تحت کسی دوسرے ملک کا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

محافظ ہو اسے تحفظ یافتہ ملک کے خارجی امور میں مداخلت کا حق حاصل ہے۔

(2) اگر کوئی ایسا خارجی مسئلہ ہو جو دو ملکوں کے مابین مشترکہ ہو تو اس سے متعلق کسی ملک کی یک طرفہ کارروائی کرنے کی صورت میں دوسرے ملک کو مداخلت کا حق حاصل ہوگا۔

(3) اگر کوئی ملک کسی معاہدہ کے تحت اپنی داخلی و خارجی خود مختاری کے بعض حصوں سے دست بردار ہوگیا ہے لیکن متعلقہ پابندیوں پر پوری طرح کاربند نہیں ہے تو دوسرے فریقوں کو مداخلت کا حق حاصل ہوگا۔

(4) اگر کوئی ملک خواہ زمانہ امن ہو یا جنگ، بین الاقوامی قانون کے کسی ایسے ضابطہ کی خلاف ورزی کرتا ہے جو رواجی طور پر یا کسی معاہدہ کے ذریعہ پوری دنیا میں تسلیم شدہ ہے تو دوسرے ملکوں کو مداخلت کرکے خلاف ورزی کرنے والے ملک کو روکنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔

(5) اگر کسی ملک نے معاہدہ کے ذریعہ کسی دوسرے ملک میں کسی مخصوص نظام حکومت کی ضمانت دی ہے تو وہ اس کے بدلنے کی صورت میں مداخلت کرسکتا ہے۔

(6) بیرون ملک اپنے شہریوں کے تحفظ کے لیے تمام متعلقہ ملک کو مداخلت کا حق حاصل ہے اور دوسرے فریق پر اس مداخلت کو قبول کرنے کی قانونی پابندی عائد کی گئی ہے۔

(7) انجمن اقوام کے میثاق اور اقوام متحدہ کے منشور دونوں میں بین الاقوامی امن و سلامتی کی بقا کے لیے کسی ایسے ملک کے خلاف اجتماعی مداخلت کا حق دیا گیا ہے جو جنگ، جارحیت، طاقت کے استعمال یا اس کی دھمکی کے ذریعہ نقض امن کا خطرہ پیدا کرنے کا موجب ہو۔

ان صورتوں کے علاوہ مداخلت کی بعض ایسی شکلیں بھی ہیں جو گو کہ متاثرہ ملک کی آزادی یا اس کی داخلی خود مختاری کے منافی ہوں اور گو کہ متاثرہ ملک پر اس مداخلت کو قبول کرنے کی ذمہ داری عائد نہیں کی گئی ہے، تاہم انھیں غیر قانونی بھی نہیں کہا جاسکتا۔ مثلاً اگر تحفظ نفس یا توازن طاقت کو برقرار رکھنے کی غرض سے مداخلت کی جائے تو جائز متصور ہوتی ہے۔ اقلیمی مفاہتوں (جیسے منرو یا برژنیف اصول) کی رو سے اس منطقہ کی بالادست طاقت اپنے زیر اثر ملکوں کے اندر مداخلت کرسکتی ہے۔ اور اس منطقہ سے باہر کے ممالک اس سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ 1956 میں ہنگری میں اور 1968 میں چیکوسلواکیہ میں روس کی مداخلت کے خلاف مغربی ممالک نے اس اصول کے تحت کوئی عملی اقدام نہیں کیا تھا اور اسی اصول کے تحت سوویت یونین نے 1962 میں امریکا کے دباؤ میں آکر کیوبا سے اپنے میزائل نکال لیے تھے کیونکہ کیوبا امریکا کے دائرہ اثر میں تھا اور منرو اصول کے مطابق کسی بیرونی طاقت کو وہاں فوجی اڈہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے بلکہ کمیونسٹ بلاک کے تحلیل ہوجانے کے بعد جب سے دنیا یک قطبی نظام کے تحت آگئی، اس اصول نے بڑی حد تک اپنی معنویت کھو دی ہے۔

مداخلت بے جا بر جائداد غیر منقولہ (Trespass on Immovable Property) :

جائداد غیر منقولہ مثلاً مسکونہ یا آراضی وغیرہ کے ہر مالک و قابض کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جائداد کو غیر اشخاص کی مداخلت سے محفوظ رکھے۔ دیگر اشخاص پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ معقول وجہ یا مالک یا قابض جائداد کی صریح یا معنوی رضامندی کے بغیر اس کی جائداد میں مداخلت نہ کریں۔ اگر ایسا کیا جائے تو وہ مداخلت بے جا کی تعریف میں داخل ہوگا۔ پس بغیر جائز اختیار کے کسی دوسرے شخص کی آراضی پر داخل ہونا مداخلت بے جا کہلاتا ہے اور ایسا عمل ٹارٹ ہے اور اس کے لیے واقعی نقصان ثابت کرنا ضروری نہیں ہے کیوں کہ جائداد کے حقوق قطعی نوعیت کے ہوتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی مداخلت کو قانون روا نہیں رکھتا۔ مثلاً دوسرے شخص کی دیوار میں کیل گاڑنا یا دیوار پر اشتہار چسپاں کرنا یا آراضی پر شکار کرنا مداخلت بے جا ہے یا کسی مکان مسکونہ میں قابض مکان کی اجازت کے بغیر داخل ہونا یا کسی مقام پر ٹھہرے رہنا جب کہ ٹھہرے رہنے کا حق ساقط ہوچکا ہو مداخلت بے جا پر جائداد غیر منقولہ ہیں۔

مداخلت بے جا پر جائداد غیر منقولہ کا ارتکاب یا تو جسمانی طور پر مداخلت کنندہ کے داخل ہونے سے ہوتا ہے یا مداخلت کنندہ کسی دیگر شخص کی جائداد غیر منقولہ پر کسی ٹھوس چیز کے رکھنے یا داخل کرنے سے ہوتا ہے مثلاً کسی دوسرے کی آراضی پر مالک کی اجازت کے بغیر دیوار تعمیر کرنا یا اینٹ و پتھر پھینکنا یا پانی چھوڑنا وغیرہ۔

مداخلت بے جا ایک ایسا عمل ہے جو کسی مالک یا قابض آراضی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے حق ملکیت یا حق قبضہ میں دخل انداز ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ایسی مداخلت کا مداخلت کنندہ کو کوئی قانونی حق یا جواز نہ ہو۔ اگر مداخلت کنندہ کو مالک یا قابض آراضی کی صریح یا معنوی اجازت حاصل ہو تو ایسی مداخلت بے جا نہ ہوگی۔ مثلاً کسی عدالت یا محکمہ مجاز کے حکم کی تعمیل کے غرض سے کسی مکان مسکونہ یا آراضی پر داخل ہونا مداخلت بے جا نہیں کہلائے گا۔

ف۔ مداخلت بے جا کے ارتکاب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعی کو کسی قسم کا نقصان پہنچے یا مکان یا آراضی کے کسی بیرونی حصہ کو توڑ کر یا منہدم کرکے مداخلت کنندہ داخل ہوا ہو نہ مدعی کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ مداخلت کنندہ نے کسی خاص نیت کے تحت مداخلت بے جا کا ارتکاب کیا ہو۔ لیکن اگر یہ ثابت ہوجائے کہ اس کی نیت مجرمانہ تھی تو وہ ٹارٹ ہی نہیں جرم بھی ہوگا۔ مداخلت بے جا کی نالش کا حق نہ صرف مالک آراضی کو بلکہ قابض آراضی کو بھی حاصل ہے اگر جائداد مالک یا قابض کے قبضہ میں نہ ہو اور مدعی صرف اجازت یافتہ ہو جو عارضی طور پر مکان یا آراضی میں سکونت رکھتا ہو تو اس کو مداخلت بے جا کی نالش کا حق نہ ہوگا۔

مدافعتی میکانزم (Defence Mechanism) : مدافعتی میکانزم کی اصطلاح سب سے پہلے مشہور ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے وضع کی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح فرد بعض اوقات بے بنیاد خوف یا نامناسب غصہ کی وجہ سے اپنے سے زیادہ زبردست یا بالادست فرد یا افراد کے خلاف مدافعتی طرز یا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ فرائڈ کے بعد یہ اصطلاح (Defence Mechanism) دیگر متعدد نفسیات دانوں نے استعمال کی۔ اور اس ضمن میں تحقیقاتی کام بھی کیے۔ فرائڈ کے مطابق مدافعتی میکانز کے تحت استحصال، پسماندگی علاحدگی اور دوسری ناکامی اور مایوسیوں کی وجہ سے افراد یا گروہ نیا ردعمل اختیار کرتے ہیں جس میں گروہی وابستگی علاحدگی خارجی دباؤ سے انکار اور اس سے مقابلے کے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ فرائڈ اور دوسرے نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ مدافعت کا احساس اور شعور تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ اور انسان میں بالخصوص سماجی سطح پر بھی یہ شعور ان کے اجتماعی منظم طریقہ ہائے کار سے بھی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ سماجیاتی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر ایسے گروہ جو دوسرے گروہوں کے دباؤ میں محرومیوں امتیازی سلوک یا ناانصافیوں کا شکار ہوتے ہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک مدافعتی نظام ترتیب دے لیتے ہیں جس کی مدد سے وہ حالات کا مقابلہ کرنے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ پیچیدہ اور مخلوط سماجوں میں مختلف قسم کے اقلیتی گروہوں میں بھی مدافعتی طرز عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدافعتی میکانزم بسااوقات عام سماجی تبدیلیوں کے دھارے میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے لیکن مدافعت کا یہ طریقہ کار ان افراد یا گروہوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو اپنی سماجی اور تمدنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وسیع تر پیمانے پر مدافعتی میکانزم پر ابھی بہت کم تحقیقاتی کام ہوئے ہیں۔ سماجیاتی اعتبار سے اس موضوع پر ریسرچ کی بڑی ضرورت ہے۔

مدافعاتی نظام انفرادی طور پر نفسیات کا موضوع بحث ہے لیکن اس کے اثرات سماج پر بہت گہرے ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ مدافعاتی نظام گروہوں اور اقلیتوں کی نفسیات ڈھالنے اور سماج میں ان کے ایڈجسٹ منٹ میں بھی بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اقلیتوں کے مسائل سمجھنے کے لیے مدافعاتی نظام کی نفسیات سمجھنا ضروری ہے۔

مدت کے شمار میں حق حین حیاتی کی مدت محسوب ہوگی (Exclusion in favour of Reversioner of Servient Tenement) : جب کوئی آراضی یا پانی جس کے متعلق کسی حق آسائش سے تمتع ہوا ہو کسی شخص کے قبضہ حق حین حیاتی کی یا کسی اور حق کی بنا پر ہوچکی ہو جس کی مدت تاریخ غلطی سے تین سال سے زیادہ ہو تو اسے حق آسائش کے استعمال کی وہ مدت جس میں حین حیاتی یا مذکور دائم رہا ہو۔ متذکرہ بالا بیس سال کی مدت کے شمار میں محسوب نہ کی جائے گی بشرطیکہ اسے حق آسائش کے دعوے کی مزاحمت شخص مستحق سے حین حیاتی یا حق مذکور کے اختتام کے تین سال کے اندر کی ہو۔

مذہب کا سماجیاتی پہلو (Sociology of Religion) : 19 ویں صدی میں ماہر سماجیات نے جب مذہب کے سماجی پہلوؤں کا تجزیہ شروع ہوا تو دو سوالات آئے: (1) سماج میں مذہب کی شروعات کہاں سے ہوئی؟ (2) مذہب کا ارتقاء کیسے ہوا؟ مذہب کے ارتقاء کا سوال دراصل ڈارون کی کتاب The Origin of Species سے متاثر تھا۔ یہ کتاب 1859 میں شائع ہوئی تھی۔ جس طرح ڈارون نے جانوروں اور پیڑوں کے ارتقاء

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کی تھیوری پیش کی اسی طرح ماہر سماجیات نے سماج اور اس کے مختلف اداروں کے ارتقاء کا تجزیہ کیا۔ مذہب کی شروعات کو دو طرح سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ مذہب کا سب سے قدیم تصور روحیت (Animism) جس کے مطابق بے جان چیزوں میں بھی روح ہوتی ہے اور دوسرا تصور جس کو Naturism کا نام دیا گیاہے، جس کے مطابق قدرتی دنیا کی میں مافوق الفطرت طاقت شامل ہے۔ مشہور Anthropologist ایڈورڈ ٹائلر (Edward Tylor) کا ماننا تھا کہ مذہب کی روحیت والی شکل اس کی سب سے قدیم شکل ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ روحیت کی پیدائش اس وقت ہوئی جب انسانیت کے ابتدائی دور میں دو سوالات کا سامنا ہوا۔ ایک سوال تو یہ تھا کہ زندہ اور مردہ جسم میں فرق کیونکر ہوتا ہے اور دوسرا سوال یہ کہ انسان کی وہ کون سی شکل ہے جو خواب یا چشم باطن میں دکھائی دیتی ہے۔ خواب اور داخلی تصور کو سمجھانے کے لیے، ٹائلر کے مطابق روح کا تصور ایجاد ہوا۔ روح کا تصور سامنے آنے کے بعد سماجی اور قدرتی دنیا میں ہونے والے واقعات کو روح کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی گئی۔

مذہب کی دوسری شکل میں وہ عقیدہ شامل ہے کہ قدرت کی طاقت دراصل مافوق الفطرت ہے۔ Max Muller کا کہنا تھا کہ اس عقیدے کی ابتداء انسان کے اس تجربے سے شروع ہوتی ہے جس میں قدرتی طاقت انسان کے جذبات کو جھنجھوڑتی ہے۔ مثلاً قدرتی دنیا انسان کو متحیر کرتی ہے، اس کو خوف زدہ کرتی ہے۔ کہیں کہیں تو قدرت اپنا کرشمہ دکھاتی ہے۔ قدرت کے اس چیلنج کو انسان نے شروع میں سمجھنے کے لیے فطرت کی طاقتوں کو مشخص کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوا، سورج، پہاڑ، سمندر نے دیوی دیوتاؤں کی شکل اختیار کرلی۔

19 ویں صدی میں مذہب کے تئیں دوسری دلچسپی اس کے ارتقاء کی بابت تھی۔ ٹائلر کے خیالات کو صرف ایک مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ ٹائلر کا ماننا تھا کہ جس طرح سماج کا ارتقاء ہوا ہے اسی لحاظ سے سب سے سادہ اور شروعاتی مذہب کی شکل روحیت تھی جس میں انسان کا عقیدہ متعدد روحوں میں ہوتا تھا۔ دوسری جانب وحدانیت کا تصور جو کہ نہ صرف مذہب کی پیچیدگی کا اظہار کرتا ہے بلکہ سماج کی پیچیدگی سے بھی منسلک ہے۔ ٹائلر کا ماننا تھا کہ جدید انسان کے مذہب میں آج بھی بہت ساری ایسی صفات ہیں جن کو سمجھنے کے لیے مذہب کی شروعاتی شکل کو رجوع کرنا ہوگا۔

مذہب کے ارتقائی تصور کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا۔ پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ مذہب کی شروعاتی شکل سے متعلق تجزیہ قیاس اور اندازہ پر مبنی ہے۔ گرچہ ٹائلر اور مولر بتاتے ہیں کہ قدیم سماج کے لوگ ایک خاص قسم کا نظریہ رکھتے تھے مگر یہ نہیں بتاتے کہ وہی خاص نظریہ کیوں وجود میں آیا۔ دونوں مفکر نے مذہب کا تجزیہ انسانی ضرورت کو سامنے رکھ کر کیا۔ اسی نظریہ سے متعلق مذہب کو سمجھنے کے لیے ایک اور نظریہ ہے جسے Functionalism یا وہ مطمع نظر جس کے مطابق سماج میں ہونے والی ہر حرکت یا تصور میں اس کی عمومی افادیت کا مقصد پنہاں ہوتا ہے۔ اسی تصور کے تحت مذہب بھی سماج کے عمومی افادیت میں معاون ہوتا ہے۔ اس تصور کے تحت چونکہ سماج کو رشتوں کی مضبوطی، آپسی بندھاؤ، اقدار پر متفقہ یقین کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے مذہب سماج کا وہ حصہ ہے جو ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کئی ماہر سماجیات نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا مثلاً فرانسیسی ماہر سماجیات ایمائل ڈرکھائم (Emile Durkheim) نے اسی خیال کو اپنی مشہور کتاب "The Elementry Forms of the Religious Life" جو 1912 میں شائع ہوئی، میں پیش کیا۔ اس کتاب میں آسٹریلیا کے قبائلی سماج کے بارے میں بتاتے ہوئے ڈرکھائم نے مذہب کی سب سے سادہ شکل Totemism یا ٹوٹم عقیدہ کے ذریعے مذہب اور سماج کے رشتے کو اجاگر کیا۔ ٹوٹم عقیدہ میں کوئی بھی قبیلہ مظاہر فطرت میں سے کوئی چیز عموماً کوئی جانور جس کو کسی قبیلہ، خاندان یا ہم رشتہ جماعت نے اپنی علامت یا اپنے تشخص کا نشان قرار دیا ہو، چن لیتا تھا اور اسے مقدس تصور کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ٹوٹم مقدس کیوں مانا جاتا تھا۔ اس کا جواب ڈرکھائم نے یوں دیا کہ ٹوٹم قبائلی جماعت کی علامت تھا اور ان اقدار کا مظہر جسے کسی جماعت یا گروہ نے اپنی بنیاد قرار دیا تھا۔ ڈرکھائم کا کہنا تھا کہ ٹوٹم کے لیے لوگوں کا احترام درحقیقت سماج کی بنیادی قدروں کے لیے تھا۔ مذہب میں جس کی عبادت کی جارہی ہے وہ دراصل سماج ہی ہے۔ ڈرکھائم کا کہنا تھا کہ مذہب فقط عقیدہ کا نام نہیں ہے، اس میں رسومات اور تقریبات بھی ہوتی ہیں۔ مذہبی رسومات فرد کو اس کی روزمرہ کی زندگی سے نکال کر تجربے کے بلند درجہ میں پہنچا دیتی ہیں۔ یہاں ہم عقیدہ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلیٰ طاقتوں کے روبرو کھڑے ہیں۔ ان اعلیٰ طاقتوں کو یا تو ٹوٹم سے جوڑ دیا جاتا ہے یا دیوی دیوتاؤں سے، مگر درحقیقت یہ انسانی اجتماعیت کے فرد پر غالب ہونے کا ایک مظہر ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

مذہب اور سماج کے تعلق پر ایک اور مطمح نظر دلچسپی کا حامل ہے۔ یہ نظریہ کارل مارکس نے پیش کیا۔ مارکس کا کہنا تھا کہ مذہب، انسان کی اپنے آپ سے بیگانگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ مارکس کا کہنا تھا کہ مذہب بے دل دنیا کا دل ہے۔ مذہب ایک جائے عافیت ہے روزمرہ کی کرخت سماجی حقیقت سے۔ مارکس کا خیال تھا کہ مذہب اپنی روایتی شکل میں ختم ہوجائے گا بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کو ہوجانا چاہیے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مذہب میں جو مثبت قدریں ہیں وہ انسانیت کی بہبود کے لیے رہ نما بن سکتی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ خدا کے اس تصور سے کیوں ڈرا جائے جس کی تخلیق خود ہم ہی نے کی ہے اور خدا پر ان قدروں کو کیوں چسپاں کیا جائے جن کو انسان خود عملی شکل دے سکتا ہے۔

مارکس نے مذہب کے بارے میں اپنے ایک مشہور جملے میں یہ کہا تھا کہ مذہب انسانوں کی افیم ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہب دنیاوی خوشی اور اکرام کو موت کے بعد کی زندگی کے لیے موقوف کردیتا ہے اور یہ بھی سکھاتا ہے کہ زندگی کے موجودہ حالات سے سمجھوتہ کیسے کیا جائے۔ مذہب کے اس نظریے سے انسان کی توجۂ انسانی نابرابری اور ناانصافی سے ہٹ کر اس دنیا پر مرکوز ہوجاتی ہے جس کا وعدہ اس کے عقیدے نے کیا ہے۔

مذہب اور سماج کے رشتے پر جرمن ماہر سماجیات میکس ویبر (Max Weber) کا نظریہ خاصا اہم ہے۔ اس نے دنیا کے بڑے مذاہب کا تجزیہ کیا اور یہ بتایا کہ کس طرح ہر مذہب نے مختلف طریقے سے انسانی تاریخ کو متاثر کیا۔ اس نے تفصیلی طور پر ہندو مذہب، بدھ مذہب، تاؤ مذہب، یہودی مذہب کا تقابلی جائزہ لیا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism (1904-5) میں مغرب کی تاریخ پر عیسائیت کے اثر کا تجزیہ کیا۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ میکس ویبر نے اسلام کے مطالعے کا ایک لمبا پروجیکٹ تیار کیا لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں مکمل نہیں کرپایا۔ Weber اور Durkheim کا نظریہ مذہب اور سماج کے رشتے پر خاصا متضاد ہے۔ Weber کا ماننا تھا کہ نہ تو مذہب کوئی دقیانوسی طاقت ہے اور نہ ہی وہ سماج کو اس کی دی ہوئی شکل میں باندھے رکھتا ہے بلکہ مذہب وہ تحریک ہے جس سے زبردست سماجی تبدیلیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ عیسائیت کا پروٹسٹنٹ نظریہ Weber کے مطابق وہ نظریاتی سرمایہ تھا جس کے تحت مغربی سماج میں سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ ملا۔

مارکس، ڈرکھائم اور ویبر نے مذہب اور سماج کے رشتوں میں مختلف صفات کی شناخت کی۔ ان کے یہ مختلف پہلو ایک دوسرے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر مذہب کو سماجیاتی تناظر کی تمام پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ مارکس کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ مذہب کے نظریاتی پہلو ہیں اور وہ بالادست جماعت کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زیرِ دست جماعتیں اسی مذہب کی بنا پر اپنے گرے اور برے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہوجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر مغرب کے نوآبادیاتی حکمرانوں کو عیسائیت سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ کسی ملک کے باشندوں کو ماتحت بناسکے۔ گرچہ عیسائی مشنری اپنے کام میں مخلص تھے مگر ان کی باتوں کا یہ اثر ہوا کہ جب غیر عیسائی لوگ عیسائی بنے تو وہ اپنی موروثی روایت سے بھی متنفر ہوگئے۔ روایت کی اس بربادی سے مغربی حکمرانوں کو حکومت کرنے کی آسانی ہوگئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ عیسائیت کے مختلف فرقوں نے 19 ویں صدی کے امریکا میں غلامانہ نظام کو جائز قرار دیا۔ یہاں تک کہ ایسے اصول مرتب کیے جس کے تحت غلام کا غلام ہونا ایک آفاقی قانون کے ماتحت قرار دیا گیا اور نافرمانبردار غلاموں کو یہ کہہ کر سزا دلوائی گئی کہ انھوں نے خدا کے نظام کی توہین کی ہے۔

میکس ویبر بھی اپنے نظریہ میں سماجی حقیقت کے قریب تھا جب اس نے بتایا کہ مذہبی نظریات کا اثر دیے ہوئے سماجی نظام کو انقلابی حد تک تبدیل کرتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ عیسائی پادریوں نے انسانی غلامی کو بھلے ہی جائز قرار دیا ہو لیکن بہت سارے گرجاؤں کے نمائندوں نے اسی انسانی غلامی کے خلاف تحریکیں بھی شروع کی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں مذہب سماجی تبدیلی کا آلہ کار ہے اور اس تبدیلی میں خون خرابہ بھی ہوسکتا ہے اور شدید سماجی اتھل پتھل بھی۔

اسی طرح ایمائل ڈرکھائم نے سماجی تبدیلی سے زیادہ سماجی نظام پر مذہب کے اثر کو زیادہ اہم بتایا۔ لیکن اس تصور کے تحت ہم ان سماجی حالات کو بھی سمجھ سکتے ہیں جس میں مذہبی فرقے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مذہب اور سماج کے آپسی رشتے کے تجزیہ میں سماجیاتی تناظر میں ایک اور موضوع بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس موضوع کو سماجیات کی زبان میں Secularization کہتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس کے تحت دنیاوی معاملات، مذہب کی گرفت اور دائرے سے باہر آجاتے ہیں۔ اس موضوع سے متعلق بہت سارے سوالات سامنے آتے ہیں۔ مثلاً انسانی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

زندگی کے وہ کون سے شعبے ہیں جو مذہب کی گرفت سے باہر ہو چلے ہیں اور اس کے برعکس وہ کون سے شعبے ہیں جہاں مذہب کا کنٹرول اپنے روایتی انداز میں ہنوز باقی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق یورپ کے بعض ممالک میں، جدید نظام کے باشندے کسی نہ کسی دیوی دیوتا میں یقین رکھتے ہیں اور امریکا جیسے ملک میں بڑے مذاہب کے ساتھ ساتھ چھوٹے مذہبی فرقے اور گروہ بندیاں سینکڑوں کی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ شمالی آئرلینڈ میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک گروہوں کی آپسی لڑائی اسی انداز میں ہوتی ہے جیسا کہ صدیوں پہلے ہوتی تھی۔ اور ہندستان کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے 21 ویں صدی کے پس منظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج میں مذہب کی علاحدگی اور مذہب کا کنٹرول اجتماعی زندگی پر نمایاں طور پر اثرانداز ہوتا ہے۔ آج بھی آپسی مذہبی عداوت اتنی ہی شدومد سے سامنے آتی ہے جتنی وہ سماج کی تعمیری تحریکیں جو کسی نہ کسی مذہب سے متاثر ہوتی ہیں۔ بظاہر مذہب، سماج سے علاحدہ بھی ہو جائے تب بھی سماجیات کی تحقیق بتاتی ہے کہ مذہب کا اخلاقی معیار کسی نہ کسی شکل میں لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتا رہتا ہے۔

مرابحت و تولیت: جو چیز جس قیمت پر خریدی گئی اور اس پر جو مزید خرچ یا لاگت پڑی اگر ان سب باتوں کو ظاہر کرکے اس چیز کی قیمت پر نفع کی ایک مقدار بڑھاکر اسے فروخت کیا جائے تو یہ مرابحت ہے اور اگر نفع کچھ نہیں لیا بلکہ جتنے میں خریدا تھا اور جو کچھ اس پر لاگت آئی تھی اس کو قیمت میں جوڑ کر اتنے ہی میں بیچ کر دیا جائے تو یہ تولیت ہے گویا راس المال پر جو مرابحت یا تولیت کی بنیاد ہے اگر نفع کی مقدار بڑھائی جائے تو مرابحہ اور اگر نہ بڑھائی جائے تو تولیت ہے۔

مرافعہ (Appeal) : اگر کسی حاکم فوج داری نے جس کا درجہ حاکم فوج داری ضلع سے کم ہو جرم ثابت قرار دے کر سزا سنائی ہو تو اس کا مرافعہ حاکم فوج داری ضلع کے پاس ہوسکے گا۔ اگر کسی حاکم فوج داری ضلع نے جرم ثابت قرار دے کر سزا سنائی ہو تو اس کا مرافعہ عدالت سیشن میں ہوسکے گا۔

جب کوئی مرافعہ پیش کیا جائے تو اس مرافعہ کی اطلاع پیروکار سرکار یا وکیل سرکار کو دی جائے گی۔ مگر عدالت مرافعہ بعد طلبی و ملاحظہ مثل مقدمہ و سماعت بحث فریقین کافی وجہ دست اندازی کی نہ پائے تو مرافعہ نامنظور کرے گی۔

عدالت مرافعہ اس امر کی مجاز ہوگی کہ اگر مرافعہ تجویز برآت ملزم کے خلاف ہو تو اسے منسوخ کرکے مزید تحقیقات کی ہدایت کرے۔ اگر مرافعہ سزا کی تجویز کے خلاف ہو تو عدالت مرافعہ کو اس کا اختیار ہوگا کہ اس تجویز کو منسوخ کرکے ملزم کو بری یا رہا کردے یا مقدمے کو از سر نو سماعت کرنے کے لیے عدالت تحت کو حکم دے یا جو جرم عدالت تحت نے ملزم کی نسبت ثابت قرار دیا ہو اس سزا کو بحال کرے یا اس کو اور نوعیت قرار دے کر یا بلا کسی تبدیلی کے سزا کو کم کردے۔

مردم شماری : دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہر دس سال بعد پوری آبادی کی گنتی کی جاتی ہے۔ اس کی مدد سے آبادی کے بارے میں سماجی، معاشی اور مذہبی معلومات جمع کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مردم شماری رومن عہد میں شروع ہوئی تاکہ ٹیکس کے بارے میں اندازے جمع کیے جاسکیں۔ برطانیہ میں 1801 سے برابر مردم شماری ہورہی ہے اور اب تو اکثر ملکوں میں پیداوار اور اس کی تقسیم، آمدنی، طبقہ واری اور زبان کی بنیاد پر تقسیم وغیرہ سے متعلق بھی پابندی کے ساتھ اعداد و شمار جمع کیے جاتے ہیں۔ اس سے معاشی و سماجی منصوبہ بندی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مزاحمت بے جا (Unnecessary Restraint): کسی شخص کو کسی ایسی جگہ یا سمت جانے سے روکا جائے جس میں اسے جانے کا حق ہو تو یہ مزاحمت بے جا کہلائے گی۔

مزدور (Labour) : مزدور سے مراد وہ شخص ہے جو کسی صنعتی یا کاروباری ادارے میں ملازم ہو اور خواہ فنی کام یا غیر فنی کام پر متعین ہو۔

مزدور طبقے کی بین الاقوامی یک جہتی (International Labour Solidarity) : تمام سرمایہ دار ممالک میں مزدور طبقہ سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی زیادتیوں کا شکار رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس طبقہ نے جدوجہد کی اور معاشرتی نظام میں اپنا ایک مقام پیدا کیا اور اتنی طاقت پیدا کی کہ بڑے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے اور انھیں منوالیا۔ تمام ممالک کے مزدور طبقہ

(Working Class) کی یک جہتی کا تصور فرانس اور امریکہ کے سیاسی انقلاب اور انگلستان کے صنعتی انقلاب کے بعد زیادہ مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قایم ہوا۔

مزدوروں کا یونین کے اعتبار سے 1836 نہایت اہم سال ہے۔ کیوں تکہ اس سال بین الاقوامی مزدور تحریک (International Labour Movement) کا آغاز ہوا بروسلز (Brussels Belgium) میں ایک مزدور کو اس بنیاد پر گرفتار کیا گیا کہ اس نے اپنے ساتھیوں کی ایک میٹنگ (Meeting) طلب کی تھی۔ بلجیم گورنمنٹ کے اس عمل کے ردعمل کے طور پر لندن کی مزدور ایسوسی ایشن (Workmen Association in London) نے بلجیم کی مزدور یونین کے نام ایک بین الاقوامی نوعیت کا مکتوب روانہ کیا اور خود کو ان کی جدوجہد سے وابستہ کیا۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ ہر ملک میں مزدور طبقہ (Working Class) کے عام حالات کم و بیش یکساں رہے ہیں۔

مسابقت تعین قیمت : قیمت کا تعین بازار کی تین بنیادی صورتوں کے تحت ہوسکتا ہے۔ ایک مسابقت (Competition) دوسرے اجارہ (Monopoly) اور تیسرے ناکمل مسابقت (Imperfect Competition)۔

مسابقت کی صورت اس وقت کہلاتی ہے جبکہ (1) خریداروں اور فروشندوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ کوئی ایک خریدار فروشندہ قیمت پر اثر انداز نہ ہو۔ (2) خرید وفروخت میں آنے والی شے بالکل معیاری اور یکساں ہو اور (3) بازار میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ ایسی حالت میں مختلف قیمتوں پر شے کی جو مختلف مقداریں تمام پیداکار فروخت کے لیے تیار ہوتے ہیں ان کے مجموعے کو بازاری رسد کہتے ہیں۔ اسی طرح ان قیمتوں پر تمام خریدار جو مختلف مقداریں خریدنے کے لیے تیار ہوتے ہیں ان کے مجموعے کو بازاری طلب کہتے ہیں۔

بازار میں مختلف قیمتوں پر پہلے کے مقابلے میں شے کی مختلف مقداریں اگر زیادہ طلب کی جائیں تو اس صورت کو اضافہ طلب اور برعکس صورت کو تخفیف طلب کہتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قیمتوں پر شے کی رسد کی مختلف مقداریں پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہوں تو اسے اضافہ رسد اور اگر کم ہوں تو تخفیف رسد کہتے ہیں۔

مسابقت کے تحت قیمت عموماً اس سطح پر متعین ہوتی ہے جس پر جملہ مقدار طلب اور جملہ مقدار رسد مساوی ہوجائیں۔ اس قیمت کو متوازی قیمت (Equilibrium Price) اور طلب ورسد کی مساوات (Equilibrium of Demand & Supply) کہتے ہیں۔ لیکن ایسی قیمت جن پر مقدار رسد کا مقابلے میں مقدار طلب زیادہ ہو تو خریداروں کے درمیان مسابقت سے قیمت چڑھنے لگتی ہے جس کی وجہ سے مقدار رسد بڑھنے اور مقدار طلب گھٹنے لگتی ہے اور بالآخر پہلے کے مقابلے میں قیمت ایک اونچی سطح پر متعین ہوجاتی ہے جس پر طلب و رسد کا توازن ہوجاتا ہے۔ اسکے برخلاف اگر کسی قیمت پر طلب کے مقابلے میں رسد کی مقدار زیادہ ہو تو فروشندوں کے درمیان مسابقت سے قیمت گرنے لگتی ہے جس کی وجہ سے طلب بڑھتے اور رسد گھٹنے لگتی ہے اور بالآخر پہلے کے مقابلے میں قیمت ایک نیچی سطح پر متعین ہوجاتی ہے جس پر طلب و رسد میں توازن قائم ہوجاتا ہے۔

متوازن قیمت کے تعین کے اس عام اصول میں وقت کے عنصر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ طلب اور خصوصاً رسد کی مقدار میں تبدیلی کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے بازار میں قلیل مدتی اور طویل مدتی قیمتوں کی نوعیت اور ان کے تعین کا مسئلہ بھی اہم ہے۔

مساوات (Equality) : حریت کی طرح مساوات بھی جمہوریت کا ایک بنیادی اصول ہے۔ جس طرح ہر شخص انسان ہونے کے ناطہ جمہوری مملکت میں قانونی آزادی کا حق رکھتا ہے اسی طرح ہر شخص دوسرے اشخاص کی طرح مملکت کے اندر سب کے برابر درجہ اور قانون مساوات کا بھی حق دار ہے۔ جمہوری مساوات کی بنیاد اخلاقی ہے۔ یعنی سبھی انسان عقل و فہم میں برابر ہیں۔ اس سے فطری مساوات قطعاً مراد نہیں، نہ ہی اس سے برتاؤ کی یکسانیت مراد ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کی سب سے تلخ حقیقت برابری نہیں بلکہ نابرابری ہے۔ چونکہ تمام انسان اپنی صلاحیتوں، ضرورتوں اور حوائج میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لیے ان سب کے ساتھ یکساں برتاؤ ممکن نہیں۔ چنانچہ جمہوری مساوات اصلاً قانون مرتبہ کی مساوات ہے لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ مملکت ایک شخص کو جو حقوق عطا کرے گی وہی سب کو مساوی طور پر عطا کرے گی۔ اگر افراد قانون کے نزدیک برابر اور مواقع کے یکساں طور سے حق دار نہیں ہوں گے تو وہ اپنی شخصیت کے اظہار اور تکمیل کی آزادی سے بہرہ ور نہیں ہوسکیں گے۔ اسی لیے آزادی و مساوات لازم وملزوم ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

لاسکی کے نزدیک مساوات بنیادی طور سے کسی حد تک یکسانیت لانے کا عمل (Delevelling Process) ہے۔ یعنی سماج میں کسی بھی شخص کو ایسا مقام نہیں دیا جائے گا جس سے وہ اپنے ہمسایوں سے اتنا آگے بڑھ جائے جو ان کی شہرت کی نفی کے مترادف ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنا حق مجھے ترقی کا ہے اتنا ہی حق دوسروں کو بھی حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی نظام کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ سبھی کو محنت کرنے اور اس کا پھل حاصل کرنے کی آزادی ہو۔ نابرابری کے معنی یہ ہیں کہ مواقع، چند افراد یا کسی ایک طبقہ کے لیے مخصوص کر دیے جائیں تاکہ وہ دوسروں کی محرومیوں کی بنا پر آزادی سے فیض یاب ہوسکیں۔ اس طرح کے لوگ مملکت پر حاوی ہوکر اپنے شخصی اور طبقاتی مفاد کو عوامی مفاد کا پیمانہ قرار دیتے ہیں۔

مساوات کا تصور چند اہم نکات پر مبنی ہے۔ (1) مساوات کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ مملکت میں خصوصی مراعات نہ ہوں۔ خواہ سیاست ہو یا معیشت ہر شخص کی مرضی کو قانونا دوسروں کی مرضی کے برابر ہونا چاہیے۔ (2)مساوات کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ سبھی کے لیے ترقی کے معقول مواقع فراہم کیے جائیں۔ معقول مواقع سے مراد یہ نہیں کہ سب کو ایک جیسے مواقع دیے جائیں یا سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے کیونکہ انسانوں کی فطری صلاحیتیں کبھی یکساں نہیں ہوتیں۔ معقول مواقع فراہم کرنے کی ذمہ داری مملکت کی ہے یعنی وہ تعلیم و تربیت اور روزگار کی اتنی سہولیات بہم پہنچائے کہ عام لوگوں کی صلاحیتیں رائگاں نہ جائیں۔ یہ مساوات کی ایک بنیادی شرط ہے۔

معاشی مرتبہ کی انتہائی نابرابریاں جمہوریت اور آزادی کے منافی ہیں۔ اور (3)اس لیے سیاسی مساوات اس وقت تک بے معنی رہے گی جب تک کہ اس کے ساتھ معاشی مساوات حاصل نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں مساوات کے بیک وقت تین پہلو ہیں جو باہم لازم و ملزوم ہیں۔ (1)شہری مساوات کے معنی قانون کے سامنے برابری اور یکساں قانونی تحفظ ہے۔ (2)سیاسی مساوات کے معنی سیاسی زندگی میں مساوی طور پر حصہ لینے کا حق یعنی انتخابات میں رائے دینے، سیاسی مسائل پر اظہار خیال کرنے، حکومت پر تنقید اور سیاسی عہدوں کے لیے امیدوار ہونے کا حق۔ اور (3) اقتصادی مساوات، یعنی سب کے لیے ترقی کے معقول مواقع عام ہوں۔ روزگار، معقول اجرت، معقول اوقات کار اور آفات سے حفاظت کے حقوق حاصل ہوں تاکہ ہر شخص کو زندگی میں معقول طریقہ سے آگے بڑھنے کا موقع مل سکے۔

مستحب: لغت میں پسندیدہ اور اچھے فعل کو کہتے ہیں فقہا کی اصطلاح میں وہ کام جس کو رسول اللہ ﷺ نے پابندی سے نہ کیا ہو بلکہ کبھی کیا اور کبھی ترک کردیا ہو اس کو کرنے میں ثواب اور نہ کرنے میں عذاب نہ ہوگا۔

مسجد: اس کی جمع مساجد ہے اور لفظی معنی سجدہ کرنے کی جگہ کے ہیں۔ مسجد کو خانہ خدا کہا جاتا ہے او اس کے اندر مسلمان خدا کی عبادت کرتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ ابتداء اسلام میں بھی مسجدیں رشد و ہدایت اسلام کی تعلیم و تلقین، تبلیغ و اشاعت اور دوسری ملی و قومی سرگرمیوں کا مرکز ہوتی تھیں۔

مسلمان مسجد کو بہت مقدس اور لائق تعظیم سمجھتے ہیں اور اس کی ظاہر صفائی ستھرائی کی طرح باطنی پاکیزگی اور نظافت کا بھی بڑا خیال کرتے ہیں اور اس کے اندر گناہ کرنے اور خلاف شریعت کام کرنے سے سخت پرہیز کرتے ہیں۔

مسجد بنانے اور تعمیر کرنے کی بڑی فضیلت ہے اس کو صاف ستھرا رکھنے کی بھی بہت تاکید کی گئی ہے لیکن سونے اور چاندی سے اس کی آرائش کرنا ممنوع ہے اور اس کے اندر نقش و نگار بنانا، یا رنگوں اور تحریروں سے اس کو مزین کرنا بھی مناسب نہیں کیونکہ اس سے نمازیوں کو خلل ہوتا ہے۔ مریض مسجد میں رک سکتا ہے لیکن اجنبی اس میں قیام نہیں کرسکتا۔ مسافر اور معتکف کو مسجد میں لیٹنے، سونے اور کھانا کھانے کی عام اجازت ہے بوقت ضرورت عام لوگوں کے لیے بھی مسجد کے اندر یہ سب کام مباح ہیں۔ مسجد کے اندر نکاح کرنا مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ کرنا جائز ہے۔ کفار و مشرکین اور غیر مسلم بھی مسجد میں داخل ہوسکتے ہیں لیکن ناسمجھ بچوں، پاگلوں اور مخبوط الحواس لوگوں کو مسجد میں نہیں آنے دینا چاہیے۔ گم شدہ چیزوں کی تلاش بھی اس میں جائز نہیں۔ اسی طرح حدود اللہ کا اس کے اندر اجرا بھی مناسب نہیں، جنازہ کی نماز پڑھنا بھی اس کے احترام کے منافی ہے۔ مسجد کے اسباب اور سامان کو اپنی ضرورت میں استعمال کرنا ناجائز ہے۔ جب مسجد میں داخل ہو تو دایاں پاؤں اور نکلتے وقت بایاں پاؤں آگے کرنا چاہیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

مسجد کے لیے کوئی زمین وقف کرنے کے بعد اس سے واقف کا حق ملکیت ختم ہوجاتا ہے مگر تولیت کی صورت میں اس کو اختیار باقی رہتا ہے۔ متولی اپنا اختیار دوسروں کو بھی دے سکتا ہے اگر متولی میں شرعی عذر پیدا ہوجائے تو اس کو اس کے عہدہ سے برطرف کردیا جائے گا۔ اگر وقف کی تولیت کسی متعین شخص یا خاندان سے مخصوص نہ ہو تو متولی کا انتخاب خود واقف کرے گا یا حاکم و قاضی کرے گا اگر اسلامی حکومت نہ ہو تو یہ اختیار محلّہ کے عام لوگوں اور مصلیوں کو حاصل ہوگا۔

متولی کو امانت دار، معتبر، متدین، متقی، عاقل و بالغ ہونا چاہیے خائن اور مسرف کو متولی بنانا جائز نہیں۔

مسند: اس کے متعدد نسخے ہیں۔ محمد بن محمود خوارزمی (665ھ) نے ان تمام مسندوں کو یکجا کر دیا ہے جو علما نے امام ابو حنیفہ کی حدیثوں سے مرتب کیے ہیں۔

مسند خوارزمی: یہ دراصل ان پندرہ محدثین کے مسانید کا مجموعہ ہے جس کو انھوں نے مختلف وقتوں میں امام ابو حنیفہ سے روایت کیا ہے اس کو مسند الامام الاعظم بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ مجازی اطلاق ہے اس کے اصل جامع و مرتب قاضی القضاۃ ابوالموید محمد بن محمد بن حسن خوارزمی خطیب تھے جو 703ھ/ 1206ء میں پیدا ہوئے اور مدتوں خوارزم میں قضا کی خدمت پر بھی مامور رہے ان کا انتقال 665ھ/ 1267ء میں ہوا۔ ان کی مسند میں مندرجہ ذیل محدثین کے مسانید شامل ہیں:

اول: ابو محمد بن عبداللہ بن محمد بن یعقوب حارثی بخاری

دوم: حافظ ابوالقاسم طلحہ بن محمد بن جعفر

سوم: ابوالحسن محمد بن مظہر بن موسیٰ

چہارم: حافظ ابو نعیم اصبہانی

پنجم: شیخ ابوبکر محمد بن عبدالباقی بن محمد انصاری

ششم: ابواحمد عبداللہ بن عدی جرجانی صاحب الجرح والتعدیل

ہفتم: حسن بن زیاد لولوی

ہشتم: حفاظ عمر حسن شیبانی

نہم: حافظ ابوبکر احمد بن محمد بن خالد کلاعی

دہم: ابو عبداللہ حسین بن محمد بن خسرو بلخی

یازدہم: امام ابو یوسف قاضی

دوازدہم: امام محمد بن حسن شیبانی

سیزدہم: امام حماد بن ابی حنیفہ

چہاردہم: امام محمد بن حسن شیبانی

پانزدہم: ابوالقاسم عبداللہ ابن ابی العوام السعدی

محمد بن محمود خوارزمی نے اس کی تصنیف کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ میں نے شام میں بعض جاہلوں کو امام اعظم کی تحقیر و تنقیص کرتے اور ان پر قلت حدیث اور روایت کا الزام عائد کرتے ہوئے سنا۔ وہ کہتے تھے کہ امام شافعی کی مسند اور امام مالک کی موطا تو مشہور ہیں لیکن امام ابو حنیفہ کا کوئی مجموعہ حدیث موجود نہیں اس بنا پر مجھ کو غیرت و حمیت لاحق ہوئی اور میں نے ان مسانید کو جمع کیا۔

مسیح: دیکھیے حضرت عیسیٰ مسیح (مذہب، جلد 8)۔

مشتری اور کرایہ دار کے حقوق (Rights of Lessee and Purchaser): اگر کوئی شخص ایسی جائداد غیر منقولہ کو فروخت کرے یا کرایہ پر دے جس کا وہ حق نہیں رکھتا تھا یا جس جائداد پر اس کا حق مکمل نہیں تھا تو ایسی صورت میں مشتری (Purchaser) یا کرایہ دار (Lessee) کو چند حقوق حاصل ہوجاتے ہیں۔

اگر بائع (Vendor) نے بعد میں اس جائداد پر مالکانہ حقوق حاصل کرلیے ہوں تو مشتری یا کرایہ دار بائع کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ معاہدہ کی تکمیل کرے اور قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت اس کے متعلق قانونی چارہ جوئی عدالت میں کرسکتا ہے۔ اگر کسی شخص ثالث کی رضامندی جائداد پر بائع کے حق ملکیت کے لیے ضروری ہے تو مشتری بائع کو مجبور کرسکتا ہے کہ اس شخص ثالث کی رضامندی حاصل کرے اور اس کے متعلق قانون دادرسی خاص کے تحت عدالتی چارہ کار اختیار کرسکتا ہے۔ اگر کسی شخص نے یہ کہہ کر اپنی جائداد غیر منقولہ فروخت کی ہو کہ وہ کہیں رہن نہیں ہے اور حقیقت میں وہ جائداد رہن

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہو اور رہن کی رقم اس رقم سے زیادہ نہ ہو جس پر وہ جائداد فروخت کی گئی ہو تو مشتری اس رہن کے انفکاک (Redemption) کے متعلق بائع (Vendor) کو مجبور کرسکتا ہے اور اس کے متعلق قانون داوری خاص (Specific Relief Act) کے تحت عدالت میں چارہ جوئی کرسکتا ہے۔

مشرقی افریقی برادری (East African Community, EAC) : 6/ جون 1967 کو تین افریقی ملکوں یعنی یوگنڈا، کینیا اور تنزانیہ کے سربراہان مملکت کے مابین کمپالا (یوگنڈا) میں ایک معاہدہ کے تحت یہ برادری دسمبر 1967 میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد رکن ملکوں کے درمیان مشترکہ منڈی کو مستحکم بنانے کے لیے ادارہ جاتی اور قانونی نظام کار مہیا کرنا، محصولات، تجارت، مالیات، زراعت اور صنعتی ترقی کے سلسلے میں پالیسیوں میں یکسانیت لانا اور مشترکہ اقتصادی منصوبوں کو عملی شکل دینا ہے۔ اس برادری میں سابق مشرقی افریقی تنظیم برائے مشترکہ خدمات کو بھی ضم کردیا گیا ہے۔ یہ برادری مشرقی افریقی اتھارٹی، مشرقی افریقی قانون ساز اسمبلی، مشترکہ منڈی کونسل، مشترکہ منڈی کی عدالت، مرکزی سکریٹریٹ اور ایک عدالتِ استغاثہ پر مشتمل ہے۔

مشرقی افریقی ترقیاتی بینک، ریلوے، بندرگاہیں، ڈاک اور تار، اور ہوائی پیمائی سے متعلق اس کے علاحدہ علاحدہ کمیشن بھی قائم ہیں۔ ان کے علاوہ عوامی بہبود، اطلاعات، صنعتی تحقیق، ادبیات، شہری ہواپیمائی، موسمیات، قدرتی وسائل سے متعلق تحقیقات، اعداد و شمار، صحت و ادویہ، امراضِ وبائی جیسے بے شمار موضوعات پر مشترکہ خدمات اور ادارے بھی قائم ہیں۔

مشرکین: یہ شرک اور اشتراک سے بنا ہے شرک کے معنی شرکت اور ساجھا اور اشتراک کے معنی شریک اور ساجھی بنانا ہیں۔ مشرکین مشرک کی جمع ہے جس کے لغوی معنی شریک کرنے اور ساجھی بنانے والے ہوئے لیکن اصطلاحاً خدا کی ذات و صفات میں کسی کو ساجھی بنانے اور شریک سمجھنے والے کو مشرکین کہا جاتا ہے۔

شرک کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:

شرک فی الذات: کسی کو خداوند کا شریک بنانا یا خدا ہی کی طرح اس کو بھی قدیم واجب الوجود اور ابدی سمجھنا۔ کسی کو خدا سے یا خدا کو کسی سے قرار دینا کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا کسی کو اس کا باپ بیٹا کہنا۔

شرک فی الصفات: جو صفات کمال خدا کے ساتھ مخصوص ہیں جیسے مارنا، جلانا، پیدا کرنا، تدبیر قدرت، علم و حکمت وغیرہ ان میں کسی یا تمام صفتوں میں کسی کو اس کا جیسا ساجھی قرار دینا۔

شرک فی اللوازم: خدا کی صفات کمال سے جو باتیں لازم آئی ہیں ان میں سے کسی ایک چیز میں بھی دوسروں کو اس کا جیسا ساجھی اور شریک ٹھہرانا۔ جیسے خدا خالق ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام عالم میں اس کا ل و اختیار اور انتظام بھی ہو اور اس کی بندگی و اطاعت کی جائے وہی محبت کا حقیقی مرکز ہو اس کی ذات سجدہ اور تکریم و تعظیم کے لائق سمجھی جائے اگر کوئی ایسا نہ سمجھے اور اس کے برخلاف کرے وہ مشرک ہوا۔

شرک فی الاختیارات: خدا کے حقوق و اختیارات اصلی میں کسی اور کو اس کا جیسا حصہ دار اور اس کا سہیم (شریک) خیال کرنا جیسے جنت دوزخ میں داخل کرنے کا حقیقی اختیار اور انسانوں کی زندگی کے لیے شریعت اور قانون ہدایت وضع کرنے کا اختیار اصلی شرک ظلم عظیم اور بہت بڑی معصیت ہے سچی توبہ کے بغیر مشرک کی مغفرت اور بخشش نہ ہوگی اللہ تعالیٰ دوسرے گناہوں کو جس کے لیے چاہے گا معاف کردے گا۔ لیکن شرک کو کبھی نہیں معاف کرے گا۔

مشینی مطالعہ فہرست کتب خانہ (مارک) (Machine Readable Catalogue-MARC) : آج علم کتب خانہ کا شائد ہی کوئی طالب علم ہوگا جس نے مارک کا نام نہ سن رکھا ہو۔ نہ صرف مارک بلکہ مارک فارمیٹ (مارک ساخت)، مارک ٹیپ اور مارک ریکارڈ جیسے الفاظ علم کتب خانہ کی اصطلاحات میں اہم حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہاں مشین سے مراد کمپیوٹر ہے جو فہرست کتب خانہ میں درج اجزاء معلومات کی شناخت کرتا ہے۔ یہ اجزا جسے ریکارڈ کہا جاتا ہے۔ بیانی تفصیل مواد صدر مدخل (Main Entry) اضافی مدخل (Added Entry) موضوعاتی سرمدخل (Subject Heading) طلبی نمبر (Call Number)، اشاعتی تفصیلات، قیمت وغیرہ ہوتے ہیں۔ عام کیٹلاگ کارڈ اور مارک ریکارڈ میں فرق صرف یہ ہے کہ اس میں درج معلومات کے ساتھ ساتھ معلومات کی نوعیت کی وضاحت کے لیے رہنما اشارے جو ہندسوں اور حروف کی شکل میں ہوتے ہیں درج ہوتے ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

جب ہم ایک کارڈ دیکھتے ہیں اور اس میں کسی شخص یا ادارے کا نام پڑھتے ہیں تو ہمارا دماغ شناخت کرلیتا ہے کہ یہ مصنف کا نام ہے یا ناشر کا نام ہے۔ اگر کسی مقام کا نام پڑھتے ہیں تو ہم اسے مقام اشاعت سمجھ لیتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو مصنف کے نام سے تمام کارڈوں کو مرتب کرلیتے ہیں یا عنوان سے تمام کارڈوں کو ترتیب دے لیتے ہیں۔ لیکن ایک مشین میں یہ صلاحیت خود سے نہیں ہوتی اور مشین سے ترتیب دینے کا کام لینے کے لیے ہمیں جملہ معلومات کے شروع میں ایسے رہنمائی کے نشانات دینے ہوتے ہیں جو کمپیوٹر شناخت کرلے اور یہ سمجھ سکے کہ یہ کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوتی ہے۔

مارک فارمیٹ میں کتابیاتی تفصیل کے ہر جزو کو فیلڈ یا دائرہ کا نام دیا جاتا ہے۔ کتاب اور دوسرے علمی مواد کے لیے غیر متعین دائرے پر غیر متعین وسعت کی شکل میں رکھے جاتے ہیں کیونکہ کتابوں کے عنوان کی لمبائی متعین نہیں ہوتی اور بہت سی کتابوں میں مصنف، عنوان، ذیلی عنوان کے علاوہ زائد معلومات مثلاً سلسلہ اشاعت (Service Note) وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح سمعی، بصری مواد کے ساخت جسمانی کی تفصیل زیادہ بھی ہوسکتی ہے جس کے لیے دائرہ میں وسعت درکار ہوگی۔

مارک کی ابتدا امریکہ میں لائبریری آف کانگریس سے ہوئی۔ یہ کتب خانہ امریکی مطبوعات کے لیے کاپی رائٹ کتب خانہ ہے جہاں قانوناً ہر امریکی علمی مواد کا ایک نسخہ جمع کیا جاتا ہے۔ کیٹلاگ سازی میں یکسانیت اور جملہ کتب خانوں کو ایک ہی نسخہ کے لیے علاحدہ علاحدہ کیٹلاگ تفصیل کا فیصلہ کرنے اور کارڈ بنانے سے بچانے کی غرض سے اس کتب خانہ میں معیاری کارڈ تیار کرکے ان کی نقلیں ایک منصوبہ بند ڈھنگ سے دوسرے کتب خانوں کو فراہم کرنے کا کام یہاں 1901 میں شروع کیا گیا۔ 1960 کے دہے میں جب کتب خانہ میں کمپیوٹر کے واسطے سے کاموں کو انجام دینے کے امکانات پیدا ہوگئے تو کتب خانہ نے ایک تجرباتی منصوبہ کمپیوٹر کے ذریعہ ٹیپ اور ڈسک پر کیٹلاگ کارڈ میں درج کی جانے والی تفصیل منتقل کرنے کا بنایا۔ اس وقت ضرورت ہوئی کہ کارڈ کی تفصیل کی ساخت اس طرح متعین ہو کہ کمپیوٹر اسے شناخت کرسکے۔ تجرباتی منصوبہ کے کامیابی کے بعد اسے ایل سی مارک فارمیٹ کہا گیا جسے اب یو ایس مارک (US MARC) کہتے ہیں۔

اس ساخت میں چند اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں جو درج ذیل ہیں:

دائرہ (فیلڈ) : کارڈ میں درج کی جانے والی کتابیاتی تفصیل میں ہر ایک کو دائرہ کہا گیا ہے، مصنف دائرہ، عنوان دائرہ، اشاعتی تفصیل دائرہ وغیرہ۔

ٹیگ (Tag) : اگر ہم دائرہ کے پہلے کمپیوٹر کی شناخت کے لیے لکھیں دائرہ مصنف، دائرہ عنوان، وغیرہ تو کمپیوٹر کی یادداشت مرکز میں زیادہ جگہ گھر جائے گی اس لیے اس تفصیل کو تین ہندسوں سے ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ

000 ٹیگ برائے کنٹرول فیلڈ (مثلاً لائبریری آف کانگریس طلب نمبر)
100 ٹیگ برائے مصنف دائرہ
200 ٹیگ برائے عنوان اور متعلقہ معلومات دائرہ
300 ٹیگ برائے مادی بناوٹ مثلاً صفحات، تصاویر، دائرہ
400 ٹیگ برائے سلسلہ اشاعت دائرہ

لائبریری آف کانگریس نے دائروں اور ان کے لیے مفصل ٹیگ کی تفصیل کتابی شکل میں شائع کی ہے۔

ذیلی دائرے (Sub Field) ہر دائرے میں جملہ تفصیلات کی شناخت کے لیے ذیلی دائرے اور ان کے ذیلی دائرہ کوڈ کو انگریزی حروف اصغر سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً دائرہ 300 مادی ساخت کے تحت a ٹیگ برائے صفحات b ٹیگ برائے تصاویر اور c ٹیگ برائے سائز متعین ہیں۔

مصالحت (Conciliation): مصالحت کا منشا یہ ہے کہ آجر یا کسی صنعت کار کے درمیان کسی صنعتی نزاع کا ایک شخص ثالث کی مداخلت کے ذریعہ تصفیہ کروایا جائے۔ حکومت قانون صنعتی تنازعات کے تحت کسی خاص رقبے کے لیے یا کسی خاص صنعت کے لیے مصالحتی عہدہ دار مامور کرسکتی ہے۔ حکومت مصالحتی بورڈ بھی مقرر کرسکتی ہے جس میں ایک چیئرمین اور دو تا چار دوسرے ارکان ہوسکتے ہیں جو کسی نزاع کے فریقین کے درمیان کسی سمجھوتے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی خدمات جن کا تعلق مفادعامہ سے ہو ان کے متعلق اگر کوئی نزاع آجر اور مزدوروں کے درمیان ہو تو مصالحتی عہدہ دار کا تقرر ضروری ہوتا ہے۔ ایسی خدمات جن کا تعلق مفادعامہ سے نہ ہو تو ان کے لیے کسی صنعتی نزاع کے لیے مصالحتی عہدہ دار کا تقرر ضروری نہیں ہے۔ مگر عام رجحان مصالحتی عہدہ دار کے تقرر کا ہے۔ جلد تصفیے کے لیے مصالحتی عہدہ دار کے لیے ضروری ہے کہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

دو ہفتے کے اندر مصالحت کروادی جائے اور مصالحتی بورڈ کی صورت میں دو مہینے ہیں۔ مصالحتی عہدہ دار یا بورڈ کا فیصلہ فریقین کے لیے اس وقت تک قابل پابندی ہے جب تک فریقین چاہیں مصالحت حقیقت میں ایک محض سے اجتماعی معالمت ہے۔ مصالحتی عہدہ دار کا فرض ثالث کے فرض سے بالکل مختلف ہے۔ مصالحتی عہدہ دار فریقین کو آپس میں تصفیہ کرنے میں مدد دے سکتا ہے وہ ان پر کوئی شرط مسلط نہیں کرسکتا۔ قانون مصالحت کے دوران ہڑتال یا لاک آؤٹ کی ممانعت ہے۔ اگر حکومت یہ رائے قایم کرے کہ آجر اور مزدور کے درمیان کوئی صنعتی نزاع موجود ہے تو حکومت ایک حکم کے ذریعہ اس نزاع کو ایک مصالحتی بورڈ، لیبر کورٹ یا لیبر ٹربیونل کے حوالے کرے گی تاکہ فریقین کے عذرات سماعت کرکے اس نزاع کا تصفیہ کریں۔ یہ تصفیہ حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے کہ فریقین کے درمیان کوئی نزاع فی الحقیقت صنعتی نزاع ہے یا صنعتی نزاع کی صورت اختیار کرنے والی ہے اور آیا اس نزاع کو لیبر کورٹ یا لیبر ٹربیونل کے سپرد کرنا چاہیے یا نہیں۔

مصالحت اور لیبر کورٹ (Conciliation and Labour Court): اگر کوئی صنعتی نزاع (Industrial Dispute) ہو اور فریقین اس نزاع کو سپرد ثالثی (Arbitration) کے لیے تیار نہ ہوں تو گورنمنٹ کو قانون نے اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ اس صنعتی نزاع کو ایک مصالحتی بورڈ (Conciliatory Board) میں پیش کرنے کا حکم دے۔ اس مصالحتی بورڈ کی صدارت حکومت کے لیبر ڈپارٹمنٹ کا ایک افسر کرے گا اور فریقین یعنی آجر اور مزدور کا ایک ایک نمائندہ رہے گا۔ اگر باہمی گفتگو کے ذریعہ وہ صنعتی نزاع طے پایا ہو تو اسے قانون کی اصطلاح میں تصفیہ (Settlement) کہتے ہیں۔ اس تصفیہ کا تحریری ہونا ضروری ہے۔ ایک افسر مصالحت کنندہ (Conciliation Officer) کو اس کا اختیار قانونی طور پر دیا گیا ہے کہ وہ کسی دستاویز یا سابقہ تصفیے کو طلب کرے جو نزاع زیر بحث کے تصفیے کے لیے ضروری ہے دستاویزات طلب کرنے کے سلسلہ میں ایک افسر مصالحت کنندہ کو وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو عدالت کو قانون ضابطہ دیوانی کے تحت حاصل ہیں۔ اگر فریقین میں مصالحت ہو جائے تو افسر مصالحت کنندہ (Conciliation Officer) گورنمنٹ کے پاس وہی رپورٹ پیش کرے گا اور اس رپورٹ کے ساتھ دستاویز مصالحت (Settlemtent) بھی روانہ کیا جاےء گا۔

اگر فریقین میں مصالحت نہ ہوسکے تو افسر مصالحت کنندہ اس کی بابت بھی تفصیلی رپورٹ گورنمنٹ میں روانہ کرے گا۔ جس میں فریقین کے اہم اختلافات اور دلائل ظاہر کیے جائیں گے۔ اس رپورٹ کی وصولیابی پر گورنمنٹ کو اس کا اختیار قانونی طور پر دیا گیا ہے کہ وہ اس صنعتی نزاع کو لیبر کورٹ یا ٹربیونل یا اگر صنعتی نزاع قومی اہمیت کا حامل ہو یا قومی نوعیت کا ہو تو اسے نیشنل ٹربیونل (Tribunal) کے سپرد کرے جو اس غرض کے لیے گورنمنٹ کے قایم کردہ ہوں۔ اگر افسر مصالحت کنندہ نے یہ رپورٹ دی ہو کہ فریقین میں مصالحت نہیں ہوسکتی تو ایسی رپورٹ کی وصولیابی پر گورنمنٹ کو یہ حکم بھی دینے کا اختیار ہے کہ اس صنعتی نزاع کی نہ مزید تحقیقات کی جائے اور نہ کوئی فیصلہ کیا جائے۔ ایسی صورت میں گورنمنٹ کے اس حکم کی اطلاع فریقین کو دی جائے گی۔

لیبر کورٹ(Labour Court) ٹربیونل یا نیشنل ٹربیونل کو واقعات کے جانچنے اور تحقیقات کرنے کے قانوناً وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو عام طور پر عدالتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

فریقین کے استدلال کی سماعت کے بعد لیبر کورٹ یا ٹربیونل فیصلہ صادر کرے گا جسے قانون صنعتی نزاع کی اصطلاح میں ایوارڈ (Award) کہا جاتا ہے۔ فریقین پر ہر ایوارڈ میں دیے ہوئے ہر حکم کی پابندی ضروری ہے۔

لیبر کورٹ یا ٹربیونل کے فیصلے کے خلاف کسی اپیل یا ردیژن کی گنجائش قانون صنعتی نزاع میں نہیں رکھی گئی ہے البتہ دستور ہند کی دفعہ نمبر 226 کے تحت کسی ایسے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ پیش کی جاسکتی ہے۔ اس امر کے متعلق کہ کون سا صنعتی نزاع لیبر کورٹ میں رجوع نہ کیا جائے مختلف عدالتی فیصلہ جات میں مقدمہ ممبئی موہن آف جرنلسٹ مین یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ صنعتی نزاع جو کسی مزدور کی تخفیف کی وجہ سے پیدا ہوا ہو فیصلے کے لیے لیبر کورٹ میں رجوع کیا جائے۔ اس کے برخلاف ایک عدالتی فیصلہ یوں بھی ہے۔ ایک صنعتی انتظامیہ نے بعض ملازمین کی کام کم ہونے کی وجہ سے تخفیف کی۔ گورنمنٹ کو تخفیف کے متعلق غور نہ کرنا چاہیے اور چونکہ یہ واقعہ صنعتی نزاع کی صورت رکھتا ہے۔ اس لیے اسے لیبر کورٹ یا ٹربیونل کے سپرد کرنا چاہیے۔

اگر کسی صنعتی نزاع کے متعلق مصالحتی سمجھوتہ لیبر کورٹ یا لیبر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ٹربیونل کے دیے ہوئے فیصلے کے خلاف فریقین کی جانب سے کوئی عمل کیا جائے تو قانون صنعتی نزاع کے تحت وہ جرم سمجھا جائے گا۔ مصالحتی بورڈ یا لیبر کورٹ یا لیبر ٹربیونل میں انتظامیہ کی جانب سے کسی ایک افسر کے ذریعہ اور مزدور کے کسی کارندے کے ذریعہ نمائندگی کی جاسکتی ہے۔ کوئی وکیل لیبر کورٹ میں کسی فریق کی جانب سے نمائندگی نہیں کرسکتا لیکن اگر لیبر کورٹ یا ٹربیونل میں کوئی فریق کسی وکیل کے ذریعہ پیروی کرنا چاہے تو قانوناً وہ فریق متعلقہ کی رضامندی سے اور عدالت کی اجازت سے وکیل مقرر کرسکتا ہے۔ قانون صنعتی نزاع کے تحت کوئی مصالحتی سمجھوتہ اس تاریخ سے نافذالعمل ہوگا۔ جس تاریخ سے فریقین متفق ہوں۔ اگر مصالحتی سمجھوتہ میں کوئی تاریخ درج نہ ہو تو اس تاریخ سے نافذالعمل ہوگا جس تاریخ پر فریقین نے مصالحتی سمجھوتے پر دستخط کیے ہوں۔ مصالحتی سمجھوتہ کو منسوخ کرنے کا نوٹس دوسرے فریق کو دیا ہو اور اس نوٹس کو دیے ہوئے دو ماہ گزر چکے ہوں تو سمجھوتہ منسوخ ہوجائے گا۔ کسی لیبر کورٹ یا ٹربیونل کا دیا ہوا فیصلہ تاریخ فیصلہ سے ایک سال تک نافذ رہے گا۔ گورنمنٹ اس مدت میں توسیع کرسکتی ہے لیکن اس توسیع کی جملہ مدت تاریخ فیصلہ سے تین سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

مظہر (Indicator) : کچھ دائرے ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں مزید وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وضاحت کو دائرے کے اندر ظاہر کرنے کے لیے ٹیگ کے ہندسے کے بعد مزید ہندسوں کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے ان ہندسوں کو جو ایک یا دو ہوسکتے ہیں مظہر کہتے ہیں۔

لائبریری آف کانگریس نے مارک فارمیٹ کا استعمال 1969 میں شروع کیا اور اب مقامی ضرورت کے تحت تبدیلی کے ساتھ انگلینڈ اور کناڈا نے بھی مارک فارمیٹ برائے نیشنل کتابیات سازی اپنا لیا ہے۔

معاشیات کلی۔ نظریۂ تقسیم (Macro-Economic Theories of Distribution): اس امر کی دریافت کے بعد کہ قومی آمدنی کی سطح متعین کرنے میں رجحان بچت اور سرمایہ کاری کو فیصلہ کن مقام حاصل ہے، اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس آمدنی کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے والے اسباب و عوامل کا بھی پتہ لگایا جائے۔ عام طور پر قومی آمدنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اجرت جس میں تنخواہیں بھی شامل ہیں اور منافع جس میں سود اور کرایہ بھی شامل ہے۔ اس تقسیم کو بعض اوقات محنت کے ذریعہ آمدنی اور ملکیت کے ذریعہ آمدنی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

نکولا کالدور (N. Kaldor) نے واضح کیا کہ قومی آمدنی کی اجرت اور منافع کے درمیان تقسیم عمل میں لانے والے فیصلہ کن عوامل مزدوروں اور سرمایہ داروں کے علیحدہ رجحان بچت اور سرمایہ کاری کی مقدار ہیں۔ قومی آمدنی میں منافع کا حصہ سرمایہ کاری اور قومی پیداوار کی باہمی تناسب پر منحصر اور شرح منافع کا انحصار اجتماع اصل کی شرح (Rate of Accumulation) اور آمدنی اور سرمایہ کے باہمی تناسب (Income-Capital Ratio) پر ہے۔ کالدور نے اپنا نظریہ قومی آمدنی کو ایک سطح پر قائم اور قیمتوں کو مقرر فرض کرکے وضع کیا ہے۔ بعض دوسرے معاشین نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ قومی آمدنی اور قیمتوں کو تغیر پذیر فرض کرکے ان اسباب و عوامل کی دریافت عمل میں لائیں جن کے نتیجہ میں آمدنی کی سطح اور اس کی تقسیم دونوں متعین ہوتے ہیں۔ سڈنی وائنٹراب (Sidney Weintraumb) کے نظریہ میں رسد کے پہلو پر زیادہ زور دیتے ہوئے محنت کی پیداوار کو کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ کینتھ بولڈنگ (Kenneth Boulding) نے ترجیح نقد اور کمپنیوں کی جانب سے حصہ داروں کے درمیان منافع کی تقسیم کی پالیسی (Dividend Distribution Policy) کو بھی اہمیت دی ہے۔ مائیکل کیلسکی (Michael Kalecki) نے درجہ اجارہ داری (Degree of Monopoly) کو فیصلہ کن قرار دیا ہے۔ مسز جون رابنسن (Mrs. Joan Robinson) نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ قومی آمدنی کی سطح کی تعین اور اجرت اور منافع کے دو حصوں میں اس کی تقسیم ایک ساتھ عمل میں آتی ہے۔ اس عمل میں فیصلہ کن اہمیت اجتماع کی شرح (Rate of Accumulation) کو حاصل ہے مگر توازن (Equilibrium) کی شرط کے طور پر بچت اور سرمایہ کاری کی مساوات کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ سرمایہ کاری کی مقدار کو متعین فرض کرلیجیے تو اس کے مساوی بچت عمل میں آنے کے لیے آمدنی کی سطح اور اس کی تقسیم دونوں میں تبدیلی ناگزیر ہے کیونکہ اجرت پانے والوں اور منافع کمانے والوں کے رجحان بچت مختلف ہوتے ہیں۔ پیدا آوری (Productivity) کی اہمیت صرف اسی صورت میں ہے جبکہ مسابقت کے بجائے اجارہ داری کا دور دورہ ہو۔ ایسی صورت میں درجہ اجارہ داری (Degree of Monopoly) بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ البتہ مسز جون

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

رابسن کے نزدیک اس سوال کا جواب بہت دشوار ہے کہ عوامل کی شرح کیوں کر متعین ہوتی ہے۔

معاشیات حرکی (Economic Dynamics): معاشیات کا وہ شعبہ جس میں معاشی نظام کی تبدیلیوں کا وقت کے عنصر کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جاتا ہے، حرکی معاشیات کہلاتا ہے۔ یہ معاشی نظام بازار، فرم یا پوری معیشت ہوسکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی (Inter Related) معیشتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ معاشیات میں کسی حرکی تجزیہ کا نچوڑ یہ ہے کہ اس میں حرکت کا وقت کے لحاظ سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ غیر حرکی یا جامد (Statics) معاشیات میں کسی نظام کا تجزیہ توازن کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ ہم نظام کے متغیرات (Variables) کے باہمی رشتوں کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں۔ ان شرائط کی نشان دہی کرتے ہیں جن کا کسی نظام میں توازن قائم رکھنے کے لیے موجود رہنا ضروری ہے۔ مثلاً رسد مساوی ہے طلب کے، حاشیائی آمدنی (Revenue) مساوی ہے حاشیائی لاگت کے، بچت مساوی ہے اصل کاری کے اور پھر اس کے بعد اس نظام کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں جبکہ وہ توازن کی حالت میں ہے۔ اس توازن وقت کے عنصر کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ جامد ہے کیونکہ وہ وقت کے ساتھ نہیں بدلتا یہ ہمیشہ کے لیے قائم (Fixed) ہے۔ سوائے ایسی صورت کے جبکہ اس نظام کا کوئی اندرونی توازن بدل جائے۔ لیکن یہ ایک غیر حقیقی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز وقت کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔

جامد معاشیات کا نقطہ نظر معاشی مسائل کی وضاحت اور ان کے حل میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ لیکن کسی نظام کی توازنی کیفیت کی وضاحت کی صورت میں ہم حرکی معاشیات کے حدود میں داخل ہوجاتے ہیں۔ حرکی معاشیات میں ابتداء ہی ان رشتوں سے کی جاتی ہے جو پوری طرح وقت کے پابند ہیں۔ یعنی ان میں سے ایسے متغیرات ہوتے ہیں جو وقت کے لحاظ سے بدلتے ہیں۔ مثلاً جزوی معاشیات (Micro-Economics) میں عنکبوتی نظریہ (Colo-web Theory) حرکیاتی تجزیہ کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ جس میں کسی منڈی میں قیمت اور پیداوار کس وقت میں منزل طے کرتے ہیں اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح معاشی نمو (Economic Growth) کے نظریہ میں ان عوامل کا تجزیہ کیا جاتا ہے جن سے قومی آمدنی میں وقت کے لحاظ سے تبدیلی آتی ہے۔ اور پھر اس شرح تبدیلی کے تعین کاروں (Determinants) کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود حرکی معاشیات میں کسی قسم کے توازن کی تلاش کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔ مثلاً عنکوبتی نظریہ میں ہمیں بنیادی طور پر اس مسئلہ سے دلچسپی رہتی ہے کہ قیمت اور پیداوار کیا کبھی اس قدر پر پہنچ پائیں گے کہ جہاں وہ قائم (Constant) رہ سکیں یا یہ مسلسل جھولتی رہیں گی۔ اسی طرح نمو کے نظریہ میں اصل سوال یہ رہتا ہے کہ کیا معیشت کسی قائم شرح پر مسلسل ترقی کرتی رہے گی (توازنی شرح) اور اگر ایسا ہوگا تو اس شرح کا تعین کون سی چیز کرے گی۔ حرکیاتی معاشیات کی اہمیت دراصل اس میں نہیں ہے کہ وہ توازن کے تصور کو رد کردیتی ہے بلکہ اس میں ہے کہ بہت سارے مسائل ایسے ہیں جن میں ہمیں دلچسپی ہے اور جن میں تبدیلی وقت کے لحاظ سے آتی ہے اور ان مسائل کا حل ہمیں حرکی معاشیات کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے۔

معاشیات - کلاسکی : کلاسکی معاشیات کا دور آدم اسمتھ کی کتاب دولت اقوام (Wealth of Nations, 1776) سے شروع ہوتا ہے۔ اور جان اسٹورٹ مل کے اصول علم معاشیات (Principles of Political Economy) (1848) پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں ڈیوڈ ریکارڈو (David Ricardo) کی تصنیفات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس سے پہلے فرانسیسی فطر آئینیوں (Physiocrats) کا یہ خیال تھا کہ معاشی دولت کی بنیاد مکمل طور پر زراعت پر ہے۔ آدم اسمتھ نے اس تصور کی مخالفت کی اور مصنوعات کی اہمیت پر زور دیا۔ اس نے بتایا کہ قدر (Value) کا اصل پیمانہ محنت (Labour) ہے۔ ریکارڈو نے ان تصورات کو اور آگے بڑھایا اور اضافی قیمتوں کا نظریہ پیش کیا جس کی بنیاد پیداوار کی لاگت پر ہے۔ جس میں محنت کی لاگت (Cost of Labour) کو مرکزی مقام حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ اس نے یہ تسلیم کیا کہ زری مصارف (Capital Cost) ایک اضافی عنصر ہے۔ سرمایہ نہ صرف مزدوروں کی پیداواری صلاحیت کو بڑھانے میں مدد کرتا ہے بلکہ اس کی مدد سے مزدور اس مدت میں بھی اپنی گزر بسر کا انتظام کرسکتے ہیں جبکہ مال کارخانہ سے نکل کر صارفین تک پہنچتا ہے۔ اجرتوں کے فنڈ کے پیچھے یہی تصور تھا۔

ان کے لحاظ سے اجرتوں کا انحصار دو طاقتوں پر ہے۔ (1) محنت کی طلب۔ یعنی اجرتیں ادا کرنے کے لیے کتنا سرمایہ یا بچت موجود ہے اور (2) محنت کی رسد جو مختصر سی مدت کے لیے تو معین ہوتی ہے لیکن طویل مدت کے لیے اس کا دارومدار معیار زندگی پر ہوتا ہے اور اس کا تعلق گذر

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

بسر کی ضروریات سے ہے۔ یہ ضروریات صرف مزدور کو زندہ رکھنے اور اپنی آبادی میں اضافہ کی حد تک محدود نہیں ہوتی ہیں۔ اس کا انحصار رسم ورواج اور طریقہ زندگی پر ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جیسے جیسے حقیقی معیار زندگی اونچا ہوتا ہے ضروریات زندگی بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ ٹی. آر. مالتھس نے اپنے نظریے آبادی میں یہ خیال پیش کیا تھا کہ آبادی کے اضافہ پر پابندی لگانا چاہیے اس لیے کہ آبادی میں اضافہ کی رفتار زرعی پیداوار میں اضافہ کی رفتار سے ہمیشہ تیز رہتی ہے۔ ریکارڈو نے زمین کی پیداواری صلاحیت کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ فطرآئینوں (Physiocrats) اور آدم اسمتھ کا یہ خیال تھا کہ مالگزاری یا لگان یا زمین کا ٹیکس زمین کی قدرتی زرخیزی کی بنا پر مقرر ہوتا ہے۔ لیکن ریکارڈو کے خیالات اس سے کچھ مختلف تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ مسابقت کی وجہ سے منافع اور اجرت کی شرح یکساں ہوگی اور زرخیز زمینوں پر جو فاضل ہوگی وہ لگان ہوگا۔

کلاسکی معیشت کی بنیاد مسابقت پر قائم ہے۔ ان کلاسکی معاشین کا یہ خیال تھا کہ افراد اگرچہ انسانیت اور ذاتی منفعت کا شکار ہوتے ہیں لیکن مسابقت کی وجہ سے پورے سماج کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جیسے کہ آدم اسمتھ نے کہا ہے۔ ہمیں کھانا قصاب کی مہربانی کی وجہ سے نہیں ملتا ہے بلکہ اس لیے کہ اسے اپنا خود کا مفاد عزیز ہے۔ اور پھر اس سے ان معاشین نے یہ نتیجہ نکالا کہ معیشت میں حکومت کی مداخلت کم سے کم ہونی چاہیے۔ انھوں نے کلی معاشیات (Macro-Economics) کے مسائل مثلاً قومی آمدنی بچت اخراجات توازن ادائی وغیرہ (دیکھیے مضمون معاشیات کلی) پر بہت کم توجہ کی خاص طور پر بیوپار چکر (Trade Cycle) کو بالکل نظرانداز کردیا۔ انھوں نے جے. بی. سے (J.B.Say) کے قانون بازار کو مان لیا جس کے تحت مجموعی طلب میں کمی کی وجہ سے کوئی بڑی معاشی سردبازاری (Recession) نہیں پیدا ہوسکتی۔ مالتھس نے اس خیال کی مخالفت کی۔ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بچت میں اضافہ سے نہ صرف صَرف کی مقدار گھٹے گی بلکہ سرمایہ کاری میں اضافہ سے پیداوار بھی بڑھے گی۔ لیکن دوسروں نے اس کے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا۔ یہ معاشین جن میں مالتھس بھی شامل ہے اس نظریہ کے بھی حامی تھے کہ شرح سود میں تبدیلی کے ذریعہ جو سرمایہ کاری ہوتی ہے وہ بچت کے مترادف ہے۔ کلاسکی معاشین کا انگلستان اور دوسرے ملکوں کے معاشین پر آج تک گہرا اثر ہے۔ 19 ویں صدی کے آخر تک مل کی کتاب نصاب میں شریک تھی۔ الفرڈ مارشل کی کتاب "اصول معاشیات" (1890) بڑی حد تک ان ہی کے نظریوں پر مبنی ہے۔ 1930 کے دہے کے معاشی بحران اور جے. ایم. کینز (J.M.Keynes) کے انقلابی اختلاف نے معاشی نظریوں میں انقلاب پیدا کیا۔

معاشیات - کیمبرج مکتب : انگریز ماہرین معاشیات کا یہ گروہ مشہور ماہر معاشیات الفریڈ مارشل (1842-1924) کا پیرو تھا۔ مارشل 1885 سے 1908 تک کیمبرج میں علم معاشیات کا پروفیسر رہا اور معاشین کا یہ گروہ اسی کے اطراف جمع رہا۔ مارشل کے بعد اس گروہ کا ایک فرد اے. سی. پگو (Pigou) معاشیات کا پروفیسر بنا اور 1944 تک اس منصب پر فائز رہا۔

معاشی ارتکاز (Economic Concentration): آزاد یا سرمایہ دارانہ معیشت میں ایک ایسی منزل بھی آتی ہے جبکہ صنعتی پیداوار مقابلتاً اور روزگار کا بڑا حصہ چند کمپنیوں کے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ کسی صنعت میں بھاری ارتکاز کے معنی یہ ہیں کہ اس صنعت کے روزگار کا 80 فیصدی حصہ تین یا چار بڑی کمپنیوں کے ہاتھ میں سمٹ آیا ہے۔ اور وہ صنعت کم ارتکاز والی ہوگی۔ جہاں تقریباً ایک ہی سائز کی سو کمپنیاں کام کررہی ہوں۔

صنعتوں میں ارتکاز کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے قیمتوں پیداوار اور منافع وغیرہ سب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر کسی صنعت میں بہت ساری کمپنیاں کام کررہی ہیں تو ہر کمپنی اتنی چھوٹی ہوتی ہے کہ وہ منڈی کی قیمتوں پر اثرانداز نہیں ہوسکتی۔ اسے خود منڈی کی قیمت پر اپنا مال بیچنا ہوتا ہے لیکن اگر اس میں ارتکاز ہو اور صرف چند بڑی کمپنیوں کے کنٹرول میں پیداوار کا بڑا حصہ ہو اور اثاثہ اور فروخت بھی ان کے ہاتھ میں ہو تو پھر کمپنیاں گٹھ جوڑ کرلیتی ہیں۔ بے دریغ پیسہ اشتہار بازی، تنخواہوں اور الاونسوں پر خرچ کرتی ہیں، نئے صنعت کاروں کو میدان میں آنے نہیں دیتیں اور اس طرح بے شمار طریقے اختیار کرتی ہیں جو صارفین کے مفاد کے خلاف ہوتے ہیں۔ مثلاً قیمتیں اصل لاگت سے کہیں زیادہ لگائی جاتی ہیں۔

ارتکاز کی آخری شکل اجارہ داری ہے اس میں پیداوار اور تقسیم چند ہاتھوں میں مکمل طور پر مرکوز ہوتی ہے۔ قیمت لاگت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور پیدوار یکساں طور پر بڑھنے کی بجائے اس میں رکاوٹیں بڑھتی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

جاتی ہیں۔ منافع تیزی کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ (دیکھیے اجارہ داری)

معاشی اعداد وشمار : زندگی کے اکثر شعبوں میں اعداد وشمار کی فراہمی اور ترتیب گزشتہ چند دہوں میں بے حد بڑھ گئی ہے۔ اعداد وشمار کا استعمال دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ وہ خاص شعبے جہاں اعداد وشمار کا استعمال خاص طور پر زیادہ ہوتا ہے وہ تجارت، حکومتی ادارے اور سائنسی تحقیقی ادارے ہیں۔ اعداد وشمار کی اصطلاح صرف اعداد ہی تک محدود نہیں جیسا کہ ایک عام آدمی سمجھتا ہے بلکہ وہ ان مختلف طریقوں کے استعمال کا مجموعہ ہے جو فراہمی، تحلیل و تجزیہ اور ان کے انطباق سے متعلق ہیں۔ اعدادوشمار کے طریقے ہم کو مبہم اور غیر یقینی حالات میں صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں مفید اور کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ اور ان سے عملی کاموں اور سائنسی تحقیقات میں بھی مدد ملتی ہے۔

معاشی اعداد وشمار سے وہ اعداد و شمار مراد ہیں جن کا تعلق ہمارے معاشی مسائل سے ہوتا ہے چنانچہ قومی آمدنی، زراعتی و صنعتی پیداوار، درآمدات و برآمدات کی مقدار جیسے مسائل سے وابستہ اعداد وشمار وہ اہم اعداد وشمار ہیں جو معاشی مسائل کے حل کرنے میں بڑی حد تک ذمہ دار ہیں اگر ہم گزشتہ دس سالوں میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہم کو پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کون سی اشیائے صرف ہیں جو ہمارے مطالعہ کے لیے اہم ہوسکتی ہیں۔ عام طور پر جب کبھی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا ذکر آتا ہے تو لوگ اشیائے صارفین کے چلر فروشی کے قیمتوں میں تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً چاول، گیہوں، دالیں، کپڑا وغیرہ۔

جیسے ہی ہم اشیا زیر مطالعہ نوعیت قیمت (چلر یا ٹھوک) اور مدت مطالعہ سے متعلق تصفیہ کرلیں ہم کو مواد کی ترتیب اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا تجزیہ کرنے میں مشکل نہیں ہوتی۔ نتیجہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں کمی بیشی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ہم کو مدت مقررہ میں ان اشیا کی پیداوار اور ان اشیا کی پیداوار کے ضمن میں استعمال ہونے والے چیزوں (Inputs) کی قیمتوں کا جائزہ لینا پڑے گا کیونکہ یہ چیزیں اشیائے صرف کی قیمتوں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کو جو بھی اعداد وشمار درکار ہوں گے وہ معاشی اعداد وشمار کہلائیں گے۔ اسی مطالعہ کی بنیاد پر ہی ایک ماہر نظم و نسق منطقی نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ کس طرح قیمتوں کے چڑھاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔ مثلاً راشننگ کے ذریعہ اشیائے صرف کی تقسیم پر پابندی عاید کرکے یا قیمتوں پر نگرانی کرکے۔

معاشی اعداد وشمار اس طرح دوگونا فرائض انجام دیتے ہیں ایک معاشی نظریہ کا حل اور وضاحت دوسرے اس کے عملی لائحہ عمل کے لیے ضروری مواد کی فراہمی۔ معاشی نظریہ سے انسان کی ان تمام کوششوں کی وضاحت ہوتی ہے جو وہ معاشی بہتری کے لیے کرتا ہے اور اعداد وشمار سے حاصل ہونے والے مشاہدات ہی وہ ذرائع ہیں جن سے انسان کی ان کوششوں پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ کسی قوم کی زندگی پر رائے عامہ اور نظم و نسق کے بدلتے ہوئے حالات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اس تعلق سے کوئی پالیسی کبھی مستحکم بنیاد پر نہیں بنائی جاسکتی تاوقتیکہ وہ معاشی زندگی کے حالات کا تجزیہ اور معاشی جستجو کے نتائج پر مبنی نہ ہو۔ معاشی اعداد وشمار اس پالیسی کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں۔

ابتدا میں اعداد وشمار رائے عامہ کے مفادات کے لیے جمع کیے جاتے ہیں۔ متعدد ممالک میں معاشی اعداد وشمار کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ آبادی اور زراعتی پیداوار کے اعداد اٹھارہویں صدی سے مختلف مہذب ممالک میں جمع کیے جارہے ہیں کیونکہ وہ ملک کے معاشی معاملات کو حل کرنے میں ناگزیر ہوتے ہیں لیکن ان اعداد وشمار اور معاشی نظریوں کے درمیان کوئی تعلق انیسویں صدی کے ربع آخر تک موجود نہ تھا۔ معاشی اعداد وشمار جو 1950 تک مختلف ممالک میں جمع کیے گئے تھے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان اعداد وشمار کی ترتیب و تالیف کرنے والے ادارے مختلف نوعیت اور مقاصد کے تھے اور دوسرے یہ کہ مختلف ممالک میں مختلف معاشی نظام رائج تھا۔ معاشی اعداد وشمار کے ڈھانچے میں قابل لحاظ تغیر تیس سال قبل عمل میں آیا جبکہ اس بات کا احساس پیدا ہوا کہ مختلف قسم کے اعداد وشمار کے بہتری کے لیے جزوی اقدامات غیر تشفی بخش ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ معاشی اعداد وشمار کی فراہمی اور ترتیب کے طریقوں میں یکسانیت اور اشتراک پیدا کیا جائے تاکہ ان اعداد وشمار کے ذریعہ ملک کی قومی آمدنی اور اس سے متعلق عناصر (Components) میں تغیرات کو بہتر طور پر ظاہر کیا جاسکے۔ چنانچہ قومی آمدنی کو معلوم کرنے کے لیے پہلا بین الاقوامی نمونہ نظام تشکیل دیا گیا وہ اقوام متحدہ کی جانب سے 1954 میں عمل میں آیا۔ ملک کی ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے قومی آمدنی کے ضمن میں فراہم کردہ اعداد وشمار ہی بنیاد

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ہوتے ہیں اس لیے معاشی اعداد وشمار کا خاص اور اہم استعمال قومی آمدنی کے اندازوں کی ترتیب و تالیف ہے۔ ان ہی اندازوں سے ہم کو ملک کے مختلف معاشی شعبوں کی ترقی مثلاً زراعت صنعت و حرفت، تجارت اور حمل ونقل وغیرہ کی مجموعی سطح معلوم ہوتی ہے۔ معاشی اعداد وشمار کا دوسرا اہم استعمال اشاریہ نشانات (Index Numbers) کی ترتیب و تالیف میں ہوتا ہے۔ اشاریہ نشانات کا استعمال زیادہ تر معاشی شعبوں مثلاً تجارت اور صنعت و حرفت تک محدود ہوگیا ہے حالانکہ ان اشاریہ نشانات کو مختلف اوقات میں مختلف جغرافیائی علاقوں کے لیے مختلف کاروباری اور صنعتی اداروں کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نظری اعتبار سے اشاریہ نشانات عام طور پر مجموعی حیثیت سے ایسے ہی ذرائع ثابت ہوتے ہیں جیسے کہ دوسرے اعداد وشمار کے طریقے۔ معاشی اور تجارتی شعبوں میں اشاریہ نشانات زیادہ تر قیمتوں، کاروبار کا پھیلاؤ، پیداوار کی لاگت، روزگار، اجرتوں، پیداوار کے پھیلاؤ اور مصارف زندگی وغیرہ کے تقابل کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اشاریہ نشانات ابتدا سے آج تک قیمتوں کے تقابل و تغیر کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے آئے ہیں۔

معاشی اعداد وشمار کے ذرائع : آج کل بیشتر ممالک معاشی منصوبہ بندی کے لیے ضروری اور بنیادی اعداد وشمار جمع کرتے ہیں۔ معاشی اعداد وشمار اب فراہمی اور ترتیب و تالیف کی حد سے بڑھ چکی ہے۔ مختلف ممالک کی حکومتیں مسلسل اور پابندی سے اب سالانہ سہ ماہی یا ماہواری اشاعتیں نکال رہی ہیں۔ جن میں معاشی اعداد وشمار سرکاری اعداد وشمار (Official Statistics) کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں۔ گزشتہ چند دہوں میں سرکاری اعداد وشمار (Official Statistics) میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں فراہمی اعداد وشمار کا واضح اور جامع نظام موجود ہے جو وہاں کی معاشی وسماجی منصوبہ بندی میں اور حکومت کی عملی پالیسی کو مرکزی اور مقامی سطح تک نافذ کرنے کے لیے اہم اور کارآمد رول انجام دیتا ہے۔ سرکاری اعداد وشمار مارکٹ ریسرچ اور کاروباری اور دیگر اواروں کے اعتراض کو ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال ہورہے ہیں۔ ان اعداد وشمار کا بیشتر حصہ معاشی وسماجی شعبوں میں ریسرچ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہندوستان کی صورت میں بھی یہاں ایک ترقی یافتہ نظام اعداد وشمار موجود ہے۔ سرکاری اعداد وشمار سے متعلق متعدد اشاعتیں ہمارے ملک میں چھپتی ہیں۔ مرکزی ادارہ اعداد وشمار، منسٹری آف پلاننگ، ہند رسالہ اعداد وشمار شائع کرتا ہے جس میں زراعت، صنعتی پیداوار، تجارت، حمل و نقل، درآمدات و برآمدات اور قومی آمدنی کے اندازے وغیرہ ہوتے ہیں۔ مرکزی اعداد وشمار کا یہ ادارہ ماہواری رسالہ اعداد وشمار بھی شائع کرتا ہے جس میں ملک کی معدنی پیداوار کا ماہواری مواد رہتا ہے۔ مختلف ریاستی حکومتیں بھی ہر سال رسالہ اعداد وشمار شائع کرتی ہیں جس میں مختلف معاشی معاملات کا مواد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ موسم اور حالات اور فصول (Season and Corp Report) سے متعلق بھی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں جس میں مختلف فصول کے رقبہ جات اور پیداوار سے متعلق مواد ہوتا ہے۔

معاشی تعزیر (Economic Sanction): بعض معاشی سرگرمیوں کے بارے میں ایسا اقدام جس سے دوسرے ملک کی معیشت کو نقصان پہنچتا ہو۔ مثلاً کچھ ملک مل کر ایک ملک سے تجارت پر مکمل پابندی لگادیں۔ ایک ملک کے دوسرے ملکوں میں موجود محفوظات کو لے جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ ایسے عمل کو معاشی تعزیر کہتے ہیں۔ مثلاً آج کل عرب ملکوں نے مصر کے خلاف معاشی تعزیر لگائی ہے جس کے تحت ان سب ملکوں نے مصر کے ساتھ تجارتی اور ہر قسم کے معاشی تعلقات ختم کردیے ہیں اور اسے تیل برآمد کرنے پر بھی پابندی لگادی ہے۔ یارھوڈیشیا کے خلاف اقوام متحدہ نے اس کی حکومت کی نسل پرستی کی پالیسی کے خلاف معاشی تعزیر کا حکم جاری کیا ہے۔

معاشی نظریہ، مارکس : مارکس کے خیال میں پیداواری رشتے مجموعی طور پر معاشی نظام کی بنیاد بنتے ہیں اور ان پر سیاسی و قانونی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ یعنی زندگی کی مادی ضروریات کے طریقہ پیداوار پر سماجی سیاسی اور عملی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اپنے ارتقا کی ایک منزل پر ایسا وقت آتا ہے جب سماج کی پیداواری قوتوں اور سماج کے پیداواری رشتوں کے درمیان تصادم پیدا ہوجاتا ہے۔ اور یہ رشتے اور آگے ترقی کی جانب رکاوٹ بن جاتے ہیں تو یہاں سے سماجی انقلاب کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور جب معاشی بنیاد بدلتی ہے تو اس کے ساتھ پورا معاشی ڈھانچہ بھی بدل جاتا ہے۔ ہم جب کسی سماج کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ سماجی زندگی تضادات سے بھری ہوئی ہے۔ سماج کے ایک حصہ کا مفاد دوسرے حصہ سے ٹکراتا ہے۔ کسان جاگیردار سے، سرمایہ دار مزدور سے برسرپیکار نظر آتا ہے۔ قوموں اور سماج میں کشمکش ملتی ہے اور خود قوموں اور سماج

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کے اندر تضادات ابھرتے ہیں۔ انقلاب آتے ہیں۔ انقلاب ناکام ہوتے ہیں۔ جنگ ہوتی ہے۔ امن قائم ہوتا ہے۔ ترقی ہوتی ہے اور پھر یکایک ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ ان سب کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ اگر سماج میں کارفرما قوانین کو ہم سمجھ لیں، ہر سماج طبقوں میں بٹا ہوتا ہے۔ جاگیرداروں، کھیت مزدوروں، کسانوں، سرمایہ داروں وغیرہ میں ہر طبقہ کا اپنا الگ مفاد ہوتا ہے جو دوسروں سے ٹکراتا ہے۔ یعنی نظریہ مارکسزم کے مطابق سماج کی تاریخ دراصل طبقہ واری کشمکش کی تاریخ ہے اور اگر ہم کسی دو کی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت طبقہ واری تقسیم اور ان کے مفادات کے ٹکراؤ کا مطالعہ کریں تو پھر ہم تاریخ کے سارے پیچیدہ مسائل کا سبب معلوم کرسکتے ہیں۔ مارکس نے اس نقطہ نظر سے معاشی مسائل کا تفصیلی مطالعہ اور تجزیہ کیا۔ چنانچہ اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" کے پیش لفظ میں اس نے لکھا ہے۔

"اس تصنیف کا واحد مقصد یہ ہے کہ موجودہ سماج میں کارفرما معاشی قوانین حرکت کو بے نقاب کیا جائے۔" اس میں اس نے ایک خاص تاریخی دور میں پیداواری تعلقات کو ان کی ابتدا، عروج اور زوال کی منزلوں میں پیش کیا ہے۔ مارکس کے نزدیک اس دور میں یعنی سرمایہ داری کے دور میں اشیا (Commodity) کی پیداوار سب سے اہم ہے اور اس نے اس کتاب سرمایہ کی ابتدا اشیا کی پیداوار سے کی ہے۔

قدر: کموڈٹی شے یا جنس سب سے پہلے ایسی چیز ہے جس سے انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ دوسرے اس سے تبادلہ کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اسے دے کر دوسری چیز حاصل کی جاسکتی ہے۔ کسی چیز کی افادیت اسے استعمالی قدر (Use Value) بنا دیتی ہے۔ مبادلی قدر (Exchange Value) یا قدر (Value) وہ شرح یا تناسب ہے جس سے ایک قسم کی قدر استعمال کا تبادلہ دوسری قسم کی قدر استعمال سے کیا جاسکتا ہے۔ ہم روزانہ اس کی لاکھوں مثالیں دیکھتے ہیں جب ہر قسم کی قدر استعمال کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اب ان بے شمار چیزوں میں آپس میں کسی خاص سماجی نظام میں مشترک چیز کیا ہے جس کی بنا پر ان کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ان میں مشترک چیز یہ ہے کہ "یہ محنت کی پیداوار ہیں"۔ اشیا کے تبادلہ میں انتہائی مختلف اقسام کی محنت کو ہم پلہ کیا جاتا ہے۔ اشیا کی پیداوار اصل میں سماجی رشتوں کا ایک نظام ہے جس میں انفرادی پیداکار (Producer) مختلف اشیا تیار کرتے ہیں (محنت کی سماجی تقسیم) اور تبادلہ کا یہ عمل ایک دوسرے کے مساوی قرار دیا جاتا ہے۔ ان تمام اشیا کی پیداوار میں کسی خاص قسم کی محنت نہیں بلکہ صرف انسانی محنت کو اہمیت حاصل ہے۔ انسانی محنت عام معنی میں کسی سماج کی پوری محنت طاقت یا لیبرپاور کا اظہار تمام اشیا کی مکمل قدر (Total Value) سے ہوتا ہے۔ رات دن جو لاکھوں کروڑوں تبادلہ (Exchange) کے عمل ہوتے رہتے ہیں ان سے یہ چیز ظاہر ہے۔ اس طرح ایک خاص شے نمائندہ ہوتی ہے۔ سماجی طور پر ضروری مزدور کے وقت (Labour Time) کے ایک حصہ کے۔ کسی قدر (Value) کی مقدار کا تعین اس محنت کی مقدار سے کیا جاتا ہے جو سماجی طور پر ضروری ہے یا مزدور کے اس وقت سے جو سماجی طور سے ایک خاص چیز ایک خاص قدر استعمال کو تیار کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ہم "قدر" کا مفہوم اسی وقت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جبکہ اس پر کسی خاص قسم کی تاریخی سماج میں پیداوار کے ایک سماجی نظام کے طور پر غور کریں۔ مارکس نے مختصراً اسے اس طرح بیان کیا ہے "جہاں تک قدر کا تعلق ہے تمام اشیا (Commodities) مزدور کے وقت (Labour Time) کا ایک خاص پوشیدہ حصہ ہیں"۔

اشیا کے اندر پوشیدہ نوعیتوں کی محنت کا تجزیہ کرنے کے بعد مارکس نے قدر کی ہیئت (Form of Value) اور زر کا تجزیہ کیا ہے۔ یہاں اس نے بتلایا ہے کہ قدر کی زری شکل کب وجود میں آئی اور تبادلہ تاریخی طور پر کن منزلوں سے گزرا اور انسان چیز کے بجائے چیز کے تبادلہ سے نکل کر مختلف منزلیں طے کرتا ہوا زر یا سونے کے ذریعہ تبادلہ تک پہنچا اور پھر مارکس نے زر کے مختلف کاموں (Functions) کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور بتلایا ہے کہ زر اشیا سے تبادلہ کے کام آتا ہے گردش کے کام آتا ہے ادائیگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ڈھیروں جمع کیا جاتا ہے۔ یہ مختلف اقسام کے استعمال سماجی پیداوار کی مختلف منزلوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قدر زائد (Surplus Value) اشیا کے پیداواری عمل کی ایک خاص منزل پر زر سرمایہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اشیا اس طرح حرکت کرتی ہیں۔ اشیا زر اشیا یعنی اشیا فروخت کی جاتی ہیں دوسری اشیا خریدنے کے لیے اور سرمایہ کا عام فارمولا یہ ہے۔ زر، اشیا، زر یعنی خریداری (منافع پر) فروخت کے لیے۔ اس طرح زر کی ابتدائی قدر میں اسے گردش میں لانے کے بعد جو اضافہ ہوتا ہے اسے مارکس نے "قدر زائد" کا نام دیا ہے۔ یہی اضافہ ہے جو زر کو سرمایہ میں بطور ایک خاص اور تاریخی طور پر متعین پیداوار کے سماجی رشتہ کے تبدیل کردیتا ہے۔ قدر زاید محض اشیا کی گردش

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(Circulation) سے نہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں صرف تبادلہ ہوتا ہے۔ اور نہ یہ قیمت بڑھانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بیچنے والے کا منافع خریدنے والے کا نقصان بن جاتا ہے۔ اور اس طرح دونوں کا مجموعہ وہی رہتا ہے اس کے علاوہ یہاں ہم جو چیز دیکھتے ہیں وہ کوئی انفرادی بات نہیں ہے بلکہ ایک عام سماجی مظہر ہے۔ قدر زائد حاصل کرنے کے لیے زر کے مالک کو "ایسی شے تلاش کرنی چاہیے جس کی استعمالی قدر (Use Value) میں ایک خاص خوبی یہ ہو کہ وہ قدر پیدا کرنے کا ذریعہ بنے"۔ یعنی اس شے کے استعمال کے عمل کے ساتھ قدر پیدا کرنے کا عمل بھی واقع ہو۔ ایسی شے موجود ہے اور وہ ہے انسانی محنت (Labour Power) اور صرف محنت قدر پیدا کرتی ہے۔

سرمایہ دار محنت اور اس کی قدر خریدتا ہے جو دوسری تمام اشیا کی قدر کی طرح اس شے کی پیداوار کے لیے سماجی طور پر ضروری مزدور کے وقت (Labour Time) سے متعین ہوتی ہے۔ (یعنی مزدور اور اس کے خاندان کی گزر بسر کی لاگت) محنت خریدنے کے بعد پیسے والے آدمی کو اسے استعمال کا حق مل جاتا ہے۔ اور وہ مزدور سے پورے دن (8 گھنٹے) کام لے سکتا ہے۔ اب فرض کیجیے اس میں سے 4 گھنٹے میں مزدور اتنی پیداوار ادا کرلیتا ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی گزر بسر کے لیے کافی ہو۔ اور بقیہ 4 گھنٹہ میں وہ زائد پیداوار کرتا ہے یا "زائد قدر" پیدا کرتا ہے جس کے لیے سرمایہ دار اسے کچھ ادا نہیں کرتا۔ اس لیے پیداوار کے عمل کے نقطہ نظر سے اصل یا سرمایہ کے دو اجزا کو الگ الگ کرنا چاہیے۔ ایک تو ہے قائم (Constant) اصل جو ذرائع پیداوار (مشینی، اوزار، کچے مال) وغیرہ پر صرف ہوتی ہے اور جس کی قدر بغیر کسی تبدیلی کے تیار شدہ شے کے کھاتے میں منتقل ہوجاتی ہے۔ دوسری ہے متغیر اصل جو محنت پر صرف ہوتی ہے۔ اس دوسرے اصل کی قدر غیر متغیر نہیں ہے۔ بلکہ محنت کے عمل سے زاید قدر پیدا کرتی ہے اور اس طرح سرمایہ محنت کا استحصال کرتا ہے۔ اس کا حساب پورے اصل نہیں بلکہ متغیر اصل سے کرنا چاہیے اور ایسی صورت میں بقول مارکس یہ استحصال سوفی صدی ہوتا ہے۔

سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے دو تاریخی اسباب کا ہونا ضروری تھا۔ ایک تو ایسے حالات جن میں چند لوگوں کے ہاتھ میں رقومات جمع ہو جائیں جبکہ اشیا کی پیداوار مقابلتاً بلند سطح پر پہنچ چکی ہو اس کے علاوہ ایسے مزدور کا وجود جو دو طرح سے آزاد ہو۔ یعنی ایک آزاد مزدور۔ ایک پرولتاری جس کے پاس گزر بسر کے لیے اپنی محنت فروخت کرنے کے سوا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔

قدر زائد میں اضافہ کرنے کے دو اصل طریقے ہیں۔ ایک فی یوم کام کے گھنٹوں (Working Day) میں بے پناہ اضافہ (مطلق قدر زائد) اور دوسری کام کے دنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد (اضافی قدر زاید)۔ پہلے طریقہ کا تجزیہ کرتے ہوئے مارکس نے تفصیل سے بتلایا ہے کہ کام کے دن چھوٹے کرنے کے لیے مزدور طبقہ کس طرح مسلسل جدوجہد کرتا آیا ہے۔ اور کس طرح سرکاریں کام کے دن طویل کرنے میں سرمایہ دار طبقہ کی مدد کرتی رہی ہیں (چودہویں صدی سے سترہویں صدی تک) اور پھر کس طرح کام کے دن کی تعداد کم کرنے کے لیے (19 ویں صدی عیسوی) وہ مسلسل جد وجہد کرتے رہے ہیں۔ سرمایہ کی اشاعت کے بعد کے دور میں مزدوروں کی جدوجہد نے ساری دنیا میں بہت ساری شکلیں اختیار کیں۔

مارکس نے آگے چل کر سرمایہ داری کی مختلف منزلوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بعد اجتماع اصل کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح قدر زاید کا ایک حصہ اصل یا سرمایہ میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ یہ حصہ سرمایہ دار اپنی ذاتی ضروریات یا عیش و عشرت پر صرف نہیں کرتا بلکہ اسے نئی پیداوار میں لگاتا ہے۔ اور یہ بتلایا کہ اس سے پہلے تمام ماہرین معاشیات اور خود آدم اسمتھ نے سمجھنے میں یہ غلطی کی تھی کہ پوری قدر زاید جو اصل میں تبدیل کردی جاتی ہے وہ متغیر اصل (Variable Capital) کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ مارکس نے بتلایا کہ یہ صحیح ہے۔ اصل میں یہ قدر زاید دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک ذرائع پیداوار (مشین وغیرہ) میں اور دوسرے متغیر اصل میں۔

سرمایہ داری کے ارتقا کے ساتھ مزدوروں کی جگہ مشینیں بڑی تیزی سے لینے لگتی ہیں اور اس طرح ایک طرف دولت بڑھتی جاتی ہے اور دوسرے سرے پر افلاس۔ اس ارتکاز دولت سے مزدوروں کی فوج کا ایک محفوظ دستہ وجود میں آجاتا ہے۔ اور اس کی مدد سے سرمایہ پیداوار میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ کرنے لگتا ہے۔ سرمایہ کے ارتکاز قرض کی آسانیوں اور ذرائع پیداوار میں اضافہ سے بیش پیداوار (Over Production) اور پھر بحران کا سامنا ہوتا ہے۔

مارکس نے نہایت تفصیل کے ساتھ سرمایہ کے ارتکاز کا جائزہ

لیا ہے اور دکھلایا ہے کہ کس طرح چھوٹے سرمایہ کو ہضم کرکے اجارہ داری جنم لیتی ہے اور اسی کے ساتھ افلاس اور معاشی استحصال آبادی کی بڑی اکثریت کی قسمت بن جاتے ہیں۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں مزدوروں کی جدوجہد بغاوت اور انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ (دیکھیے طبقہ واری جد وجہد)۔

مارکس نے دکھلایا ہے کہ کس طرح صنعتوں کی طرح جاگیرداری نظام میں اور پھر زراعت میں سرمایہ داری نظام کے تحت قدر زاید پیدا ہوتی ہے۔ اور امیر امیر تر بنتے ہیں اور غریب غریب تر۔ سرمایہ داری طریقہ زراعت میں جو ترقی ہوتی ہے وہ دراصل نہ صرف کھیت مزدور کو لوٹنے بلکہ خود زمین کو لوٹنے کے فن میں ترقی ہے۔ سرمایہ داری طریقہ پیداوار میں نہ صرف ٹکنالوجی ترقی پاتی ہے بلکہ اس کی مدد سے دولت کے سارے وسائل یعنی زمین اور مزدور دونوں کا خون نچوڑ لیا جاتا ہے۔

معاوضہ (Compensation): کسی آجر یا صنعت کار کی طرف سے کسی مزدور کو معاوضہ ورک مین کمپن سیشن ایکٹ (The Workman Compensation Act) کے تحت دیا جاتا ہے۔ اگر کسی مزدور کو اپنی خدمت کی انجام دہی کے دوران یا اس کی وجہ سے کسی حادثے سے دوچار ہونا پڑا ہے تو آجر یا صنعت کار کا یہ قانونی فرض ہوتا ہے کہ اس مزدور کو مناسب معاوضہ دے۔ قانونی الفاظ میں اسے یوں کہا جائے گا کہ اگر کسی مزدور شخص کو ضرر کارخانے میں خدمت کی انجام دہی کے دوران یا اس کی وجہ سے پہنچا ہے تو ایسی صورت میں کارخانے کے مالک کا یہ فرض ہوگا کہ اس مزدور کو معاوضہ ادا کرے اگر ضرر کی نوعیت ایسی ہو کہ مزدور تین دن سے زیادہ عرصے تک کے لیے ناکارہ نہیں ہوا تو ایسی صورت میں معاوضہ دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر کوئی مزدور نشے کی حالت میں ہو یا اپنے افسر بالا کی ہدایت کے خلاف کوئی کام کرتے ہوئے حادثے سے دوچار ہوگیا ہو تو ایسی صورت میں قانوناً وہ معاوضے کا مستحق نہ ہوگا۔

معاہدات (Treaties) : معاہدہ ایک عام لفظ ہے اور اس سے مراد ایک ایسا باضابطہ اقرار نامہ ہے جو دو یا دو سے زائد افراد یا حکومتوں کے درمیان طے پائے۔ عام طور پر اس کا استعمال بین الاقوامی معاہدوں کے لیے مختص ہے اور اس صورت میں اس کا اطلاق بالخصوص اہم اور سیاسی نوعیت کے معاہدات پر ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بعض اوقات لفظ معاہدہ (Treaty) کے علاوہ دوسرے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اعلان (ڈکلریشن)، قانون (ایکٹ)، سمجھوتہ (پیکٹ)، میثاق (کنونشن) تاہم عملی اہمیت کے اعتبار سے ان الفاظ کے مابین کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ 1815 میں ویانا کانگریس کا فائنل ایکٹ، 1856 کا اعلان پیرس، 1949 کا دوران جنگ شہریوں کے تحفظ اور جنگی قید کے ساتھ سلوک کی بابت میثاق جنیوا اور 1954 کا معاہدۂ بلقان، یہ سب وہ معاملات تھے جن پر عمل آوری ان پر دستخط کرنے والوں کے لیے لازمی ہے۔

بین الاقوامی معاہدہ کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اسے جبراً روبہ عمل لایا جاسکتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ افراد کے مابین معاہدہ سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ عام مسلمہ قانون کے مطابق افراد کے مابین ان کی مرضی کے علی الرغم بالجبر طے پانے والا معاہدہ باطل ہوتا ہے۔ فی الواقع یہ معاہدہ بین الاقوامی قانون کی حیثیت رکھتا ہے جس پر متعلقہ فریق، خواہ یہ ان کے نفس پر کتنا ہی بار خاطر ہو، عمل کرنے کے پابند ہیں۔ ایسے معاہدے جن میں مختلف ریاستوں کے لیے عام قواعد و ضوابط، طریقۂ کار اور رویہ سے متعلق اصول وضع کیے جاتے ہیں ان کو عام طور پر قانون ساز معاہدہ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ دو مرحلوں سے گزر کر عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ ایک تو معاہد ملکوں کے مجاز نمائندوں کے دستخط اور دوسرے ان حکومتوں کے سربراہوں کی مہر توثیق۔ توثیق ہر معاہدہ کے لیے ضروری نہیں اس لیے بالعموم عام اور معمولی نوعیت کے معاہدات کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

افراد کے مابین معاہدات زبانی بھی ہوسکتے ہیں اور تحریری بھی، البتہ تحریری معاہدات دستاویزی صورت میں ہونے چاہئیں جن پر فریقین کے دستخط اور مہر ثبت ہوں۔ اگر فریقین معاہدہ کی بابت کچھ شرائط (Considerations) رکھتے ہوں تو ان کا ذکر معاہدہ میں ہونا چاہیے۔ کسی معاہدہ کی بابت اگر قانونی چارہ جوئی کی جائے تو عدالت شرائط کے باب میں کوئی بازپرس نہیں کرتی تاآنکہ فریقین میں سے کوئی دوسرے پر مکروفریب کا الزام عائد نہ کرے۔

اگر خط و کتابت کے ذریعہ تمام شرائط مفصل تحریر کردی جائیں تو فریقین کے مابین ڈاک کے ذریعہ بھی معاہدہ پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اس طرح کی دستاویز پر مہر لگانے والا مہر پر انگلی رکھ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ میں اسے اپنا فعل اور دستاویز جان کر دیتا ہوں۔ فریقین کے لیے اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

طرح کے دستاویز پر عمل کرنا لازمی ہے۔ تاہم زبانی، تحریری یا غیر مہر ثبت شدہ ایسے کسی بھی معاہدہ کے لیے شرائط کا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ عدالتی چارہ جوئی سے باہر ہوگا۔

معاہدات جن کی تعمیل خاص کروائی جاسکتی ہے

:(Contracts which can be specifically enforced)

ذیل میں ایسے معاہدات ہیں جن کی تعمیل خاص (Specific Performance) کیے لیے قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت عدالتی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔

(1) ایسا معاہدہ جس کی عدم تکمیل کی صورت میں فریق مقابل کے نقصان کے اندازہ کرنے کا کوئی معیار (Standard) نہ ہو ایسے معاہدہ کی تعمیل خاص کے لیے چارہ کار قانونی قانون دادرسی خاص کے تحت اختیار کیا جاسکتا ہے۔

(2) ایسا معاہدہ جس کی عدم تکمیل کا کوئی رقمی بدل فریق مقابل کے لیے معین نہ کیا جاسکے تو ایسے معاہدے کی تکمیل کے لیے بھی قانون دادرسی خاص کے تحت چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔

اگر کسی معاہدے کا ایک جز اس نوعیت کا ہو جس کی تعمیل خاص کروائی جاسکتی ہے اور معاہدے کا دوسرا جز کسی اور نوعیت کا ہو جس کی تعمیل خاص نہیں کروائی جاسکتی تو عدالت قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت معاہدے کے جز اول کی تعمیل خاص کی دادرسی (Relief) دے سکتی ہے۔

ایسے معاہدات جن کی تکمیل پوری طور پر نہیں ہوسکتی بلکہ صرف ایک جز کی تکمیل ممکن ہو تو ایسی صورت میں عدالت کو اس کا اختیار ہوگا کہ جس طور پر بھی ممکن ہو معاہدے کے تعمیل خاص کا حکم دے اور معاہدے کے اس جز کی بابت جس کی تکمیل نہیں ہوسکتی ہرجانہ (Damage) عاید کرے بشرطیکہ معاہدے کا وہ جز جس کی تکمیل نہیں ہوسکتی پورے معاہدے کے اعتبار سے بہت کم تناسب رکھتا ہو۔ اگر معاہدے کا زیادہ جز تکمیل شدہ ہو لیکن اس عدم تکمیل کا رقمی بدل معین کیا جاسکتا ہو تو عدالت اس فریق کو معاہدے کی تعمیل خاص کی دادرسی کلیتاً نہ دے گی البتہ عدالت یہ حکم دے سکے گی کہ جس حد تک ممکن ہو فریق مقابل معاہدے کی تکمیل کرے بشرطیکہ فریق اول نے اس معاہدے کی بابت معاہدے کی تکمیل شدہ جز کو چھوڑ کر باقی معاہدے کا پورا بدل (Consideration) فریق مقابل کو ادا کردیا ہو۔

اگر کسی معاہدے کی صرف جزوی تکمیل ہی ممکن ہے اور عدم تکمیل معاہدہ کی وجہ سے نقصان کا رقمی اندازہ کرنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں عدالت معاہدے کے عدم تکمیل شدہ جز کی تعمیل خاص کا حکم دے سکے گی بشرطیکہ فریق اول نے معاہدے کا پورا بدل فریق مقابل کو (Consideration)ادا کر دیا ہو۔

معاہدات جن کی تعمیل خاص نہیں کرائی جاسکتی

:(Contracts not Specifically Enforceable)

ایسے معاہدات بھی ہیں جن کی تکمیل کے لیے قانون دادرسی خاص کے تحت کوئی قانونی چارہ کار اختیار نہیں کیا جاسکتا مثلاً ایسا معاہدہ جس کی عام تکمیل کی وجہ سے فریق متضرر کو جو نقصان ہوا ہے اس کا تعین کیا جاسکتا ہو یا ایسے معاہدات جن میں کافی تفصیلات ہوں یا وہ معاہدات جو فریقین کی شخصی خصوصیات پر مبنی ہوں یا ایسے معاہدات جن کی نوعیت ایسی ہو کہ جن کی تعمیل خاص نہ کروائی جاسکے یا ایسا معاہدہ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے انفساخ ہو ان تمام معاہدات کے متعلق قانون دادرسی خاص (Specific Relief Act) کے تحت تعمیل خاص کی دادرسی نہیں دی جاسکتی۔

ایسا معاہدہ جس کی تعمیل کی پیش رفت میں کوئی کام مسلسل کرتا ہے یا جس کی نگرانی عدالت نہیں کرسکتی اس کے لیے بھی قانون دادرسی خاص کے تحت قانونی چارہ کار اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح کسی موجودہ یا آئندہ ہونے والے نزاع کو سپرد ثالثی (Arbitration) کرنے کے معاہدہ کے متعلق بھی عدالت تعمیل خاص (Specific Performance) کی دادرسی نہ دے سکے گی لیکن اگر معاہدہ کسی قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی رہن نامہ یا ضمانت نامہ دینے کے متعلق کیا گیا ہو تو عدالت اس معاہدے کے متعلق قانون دادرسی خاص (Special Relief Act) کے تحت تعمیل خاص (Specific Performance) کو دادرسی (Relief) دے سکے گی بشرطیکہ قرض فوری طور پر واپس نہ کیا جاسکتا ہو۔

اسی طرح کسی کمپنی کے تمسکات (Debentures) خریدنے کے سلسلے میں کیے ہوئے معاہدے کے متعلق تعمیل خاص کی دادرسی دی جاسکے گی۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اگر معاہدہ کسی عمارت کی تعمیر کے لیے کیا گیا ہو تو عدالت اس معاہدے کی تعمیل خاص کا حکم دے سکے گی بشرطیکہ وہ عمارت جو تعمیر کی جانے والی ہو یا بالکل معین ہو تاکہ عدالت کو تعمیر کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے اور فریق معاہدہ نے معاہدے کی پیش رفت میں اس زمین کا قبضہ حاصل کر لیا ہو جس پر عمارت تعمیر کی جانے والی ہے اور عدم تکمیل معاہدہ کی صورت میں فریق معاہدہ کو کسی رقمی معاوضے کی ادائگی عدالت کی رائے میں معقول داد رسی (Adequate Relief) نہ ہو۔

معاہدہ (Treaty): بین الاقوامی قانون میں یہ ایک ایسا سمجھوتہ ہے جو آزاد اور مقتدر ممالک میں یا ان کی تنظیموں کے درمیان طے پائے۔ عام طور پر قوموں کے حقوق و فرائض سے معاہدے میں بحث کی جاتی ہے۔ تاہم معاہدوں کے ذرائع بعض مخصوص اشخاص کو بھی انفرادی طور پر عطا کیے جا سکتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ہے کہ معاہدہ اسٹیٹ کا ایسا حکم ہے جو اس سے متصادم ہو بے اثر ہو جاتا ہے۔ معاہدات کا منشا یہ ہے کہ اقوام کے تعلقات کو مضبوط کیا جائے اس لیے بین الاقوامی قانون کا یہ ایک اہم ماخذ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے ریاستیں وجود میں آئیں معاہدات بھی نمودار ہوئے یونان میں یعنی قدیم معاہدوں کو تقدس کے اظہار کے لیے آج بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ معاہدات مختلف امور سے متعلق ہوتے ہیں۔ سیاسی معاہدات منجملہ اور امور کے دوستانہ تعلقات کو جنگ کے کسی علاقے کی حوالگی اور دو مملکتوں کی سرحدوں کے حدود کے تعین کے متعلق ہوتے ہیں تجارتی معاہدات مچھلی کے شکار کے حق، جہاز رانی، درآمد کردہ اشیا پر محصول اور زر کے تبادلے کے متعلق کیے جاتے ہیں۔ کوئی ایسا ٹریبونل نہیں ہے جو اس قسم کے معاہدات کی تعبیر و تشریح کر سکے۔ فریقین معاہدہ البتہ اپنی باہمی رضامندی سے معاہدے سے متعلق کسی نزاع کو انٹر نیشنل کورٹ آف جسٹس میں فیصلے کے لیے یا ہیگ ٹریبونل میں ثالثی کے لیے رجوع کر سکتے ہیں۔

معاہدہ کارندگی (Contract of Agency): اس معاہدے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کارندہ اس کی ذمہ داری لیتا ہے کہ اصل (Principal) اور کسی تیسرے شخص کے درمیان معاہدات کی تعبیر و تکمیل کرے معاہدہ کارندگی سے دو اہم نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اصل اور کارندے (Agent) کے درمیان ایک ایسی ذمہ داری قایم ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ ہر دو پر کچھ حقوق اور فرائض عاید ہو جاتے ہیں اور دوسرا اہم نتیجہ یہ ہے کہ معاہدہ کارندگی کے تحت کارندہ (Agent) اس شخص اور ثالث کے درمیان سمجھا جاتا ہے۔

معاہدہ کی خلاف ورزی کی یا فعل ناجائز کے تسلسل کی صوت میں میعاد: معاہدہ کی خلاف ورزی کے تسلسل کی صورت میں اور کسی ایسے فعل ناجائز کے تسلسل کی صورت میں جس کو معاہدہ سے تعلق نہ ہو برخلاف ورزی یا فعل سے جدید میعاد شروع ہوتی رہے گی۔

معاہدہ کا دعوئی ایسے فعل کی بابت ہو جو بلا خاص ضرر کے قابل سماعت نہ ہو۔

جو دعوئی کسی ایسے فعل کے معاوضہ کی بابت ہو جو صرف اسی صورت میں بنائے دعوے ہو سکتا تھا جب اس نے فی الواقعی کوئی خاص ضرر پہنچنے کی تاریخ شمار کی ہو۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی سطح زمین کا مالک ہے اور دوسرا طبقہ زیر زمین کا مالک ہے یہ دوسرا شخص اس میں سے بغیر کوئی ظاہری نقصان پہنچائے سطح زمین سے کوئلہ نکالتا ہے لیکن آخر کار سطح زمین بیٹھ گئی۔ اس صورت میں میعاد سماعت بیٹھ جانے کے وقت سے شمار ہو گی۔

معاہدہ کے شرائط (Terms of a Contract): عدالتوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ فریقین معاہدہ کے ارادے کو معاہدے کا بنیادی جز سمجھنا چاہیے اور اس بنیادی جز کو معاہدے کے متن، نام اور ان حالات کے تحت جانچنا چاہیے۔ جن کے تحت معاہدہ کیا گیا ہو۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ کوئی بھی معاہدہ ان شرائط کے تابع جانچا جائے گا جو رائج الوقت ہیں اور جب معاہدہ ان شرائط کے تابع ہے تو اس کا صریحی ذکر نہ کیا جائے جبکہ واضح طور پر ایک معاہدہ عمل میں آیا ہے پھر بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس معاہدے کے متعلق فریقین معاہدہ پر عائد ہوتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ فریقین میں اس کا ذکر نہ آیا ہو ایسی صورت میں مقامی رواج کو معاہدے کی تکمیل یا عدم تکمیل کے متعلق کافی وقیع شہادت تصور کیا جائے۔ اس نظریے کے برخلاف بعض عدالتوں نے بھی فیصلہ دیا ہے کہ معاہدے میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہوں ان کا عام مفہوم لیا جائے بجز اس کے کہ معاہدے کے متن سے کوئی اور مفہوم نکلتا ہو۔

معاہدۂ عام بابت محصولات وتجارت (General Agreement on Tariffs and Trade, GATT) : یہ معاہدہ 1948 میں محصولات میں تخفیف اور عالمی تجارت کی راہ میں حائل دشواریوں کے ازالہ کے لیے وجود میں آیا۔ اس میں 83 ممالک شریک تھے۔ اس تنظیم نے 1964 میں جنیوا میں ترقی پذیر ملکوں کی رہنمائی، ان کی برآمدات میں توسیع اور ان کے عملہ کی تربیت کے لیے ایک "بین الاقوامی مرکزی تجارت" قائم کیا۔ اس کا سالانہ اجلاس جنیوا میں ہوتا رہا اور اس کا صدر مقام بھی جنیوا ہی (سوئٹزرلینڈ) رہا۔ لیکن اب اس کی جگہ عالمی تجارتی تنظیم (World Trade Organisation) نے لے لی ہے جسکا قیام یکم جنوری 1995 کو عمل میں آیا۔

معاہدۂ وارسا (Warsaw Pact) : معاہدۂ وارسا ناٹو کی طرح سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے اشتراکی ملکوں کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ ہے جس پر بیس سال کی مدت کے لیے البانیہ، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، جرمن عوامی جمہوریہ، ہنگری، پولینڈ، رومانیہ اور سوویت یونین نے مئی 1955 میں دستخط کیے۔ اس معاہدہ کا مقصد ناٹو کے جواب میں سوویت یونین اور مشرقی یورپی ملکوں کے درمیان اجتماعی تحفظ اور متحدہ فوجی کمان کا قیام تھا۔ اس تنظیم میں بعد ازاں مشرقی جرمنی بھی شریک ہوگیا لیکن 1961 میں البانیہ کو اس کی رکنیت سے خارج کردیا گیا اور 1968 میں اس نے خود بھی اس سے استعفیٰ دے دیا۔

اس معاہدہ کی بنیاد پر تمام رکن ملکوں کی مسلح افواج پر محیط ایک متحدہ قومی کمان قائم کی گئی اور ہر فریق نے عہد کیا کہ وہ اپنے بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کا استعمال کرنے یا طاقت کا استعمال کرنے کی دھمکی سے گریز کرے گا۔ یورپ میں کسی فریق پر حملہ کی صورت میں فوری طور پر ان تمام ذرائع سے جن کو وہ ضروری خیال کرے اس ملک کی امداد کرے گا۔ ان سبھی ملکوں کے ساتھ سوویت یونین نے پہلے ہی سے دفاعی معاہدے کر رکھے تھے۔

مشترکہ کمان کا دفتر ماسکو میں ہے۔

معذور بچوں کی تعلیم (Education of the Handicapped Children) : عام صحت مند لوگوں کی تعلیم ایک سماجی عمل ہے جس کے ذریعہ کوئی معاشرہ اپنی بقا اور استحکام کی غرض سے اپنی تہذیب اور روایات کو نوجوان نسل میں منتقل کرتا ہے۔ اس میں اکتساب علم کے علاوہ ذہنی شائستگی، شہریوں کی تعلیم، انفرادی صلاحیتوں کی نشوونما، پیشہ ورانہ ٹریننگ اور کردار سازی شامل ہیں۔

معذور افراد کی خصوصی تعلیم کی غرض بھی یہ ہے کہ جہاں ممکن ہو ان مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ اسے تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (1) ذہنی طور پر معذور افراد کی تعلیم۔ (2) جسمانی طور پر معذور افراد کی تعلیم اور (3) سماجی طور پر معذور افراد کی تعلیم۔

ذہنی معذورین کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ان میں ایک حد تک خود اعتمادی پیدا کی جائے اور انھیں اس طرح تربیت دی جائے کہ وہ سماج کے لیے زیادہ بوجھ ثابت نہ ہوں۔ ایسی تعلیم کے لیے خصوصی سازو سامان و آلات کے علاوہ خصوصی طور پر تربیت یافتہ اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں طبی امداد اور رہنمائی بھی شامل ہے۔

جہاں تک جسمانی معذورین کا سوال ہے مختلف نوعیت کے معذورین کے لیے مختلف قسم کی تعلیم ضروری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نابینا اشخاص کے لیے بریل (نابینا لوگوں کے لیے ایک نظامِ تحریر و طباعت) کی کتابیں درکار ہوتی ہیں۔ بہروں اور گونگوں کے لیے ایک اشارتی زبان، سماعتی آلات اور ہونٹوں کے اتار و چڑھاؤ کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک معذور فرد اپنی معذوری کے باوجود بہتر زندگی گزار سکے اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کے سہارے کے بغیر وہ ایک کارآمد شہری بن سکے۔ اسی لیے ان کے پیشوں کا بھی بہت احتیاط سے انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ان کی تربیت کے لیے خاص قسم کے آلات درکار ہوتے ہیں اور خاص قسم کی سہولتیں بہم پہنچانی پڑتی ہیں۔

سماجی طور پر معذور بچوں کے تعلیمی مقصد کے دو رخ ہیں۔ ایک تو وہ بچے ہیں جن کی سماجی طور پر مناسب دیکھ بھال نہیں ہوئی ہے۔ ایک ایسا نارمل ماحول نصیب نہیں ہوا ہے جو ان کی نشوونما کا باعث ہوتا اور مختلف اسباب کی بنا پر وہ ماں باپ کے پیار، محبت اور جذباتی آسودگی سے محروم رہے ہیں۔ ایسے بچے یتیم بھی ہو سکتے ہیں اور بے توجہی اور عتاب کے مارے ہوئے بھی۔ ان ہی میں ناجائز اور ایسے بچے بھی شامل ہیں جو شرابیوں یا مجرموں کی یا پھر مطلقہ یا جنسی کج روی کے شکار والدین کی اولاد ہوں۔ ان کے علاوہ دیگر سماجی مصائب و آلام بھی اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

ایسے بچوں کی تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انھیں لکھا پڑھا کر سماج میں پھر سے بسایا جائے۔ ان کو بہت سی ایسی باتیں جن کے وہ عادی ہو چکے تھے بھلا دینا پڑتا ہے اور بہت سی ایسی باتیں سیکھنی پڑتی ہیں جو انھیں اب تک سکھائی نہیں گئی۔ ذہنی اور جسمانی طور سے یہ بچے نارمل ہوتے ہیں اس لیے وہ سب کچھ سیکھ سکتے ہیں جو ایک نارمل بچہ سیکھ سکتا ہے لیکن ایسی تعلیم شروع کرنے سے پہلے انھیں اس بات کی تربیت دینی پڑتی ہے کہ وہ سماج کے مسلمہ اصول و آداب کے مطابق اپنے طرز عمل اور برتاؤ میں تبدیلی لے آئیں۔ غرض یہ بازیابی یا ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک عمل ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بچہ کے پورے ماحول کو بدل دیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر ایک بچہ کی تعلیم کے لیے پورے خاندان کی تربیت و تعلیم ضروری ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیم اس کی بھی متقاضی ہے کہ خاندان کی سماجی اور نفسیاتی طور پر رہنمائی کی جائے۔ کیونٹی ویلفیر کے پروگرام نافذ کیے جائیں، تعلیم بالغان کو فروغ دیا جائے اور اصلاحی خدمات کے ذریعہ ایک صحت مند سماجی ماحول پیدا کیا جائے۔

معذور افراد کی تعلیم کے سلسلے میں قومی پالسی (1986) میں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے معذور افراد کو سماج کے عام افراد کے ساتھ برابر کا حصہ دار بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ اس غرض سے مندرجہ ذیل اقدام طے پائے ہیں:

(1) جہاں کہیں ممکن ہوگا چلنے پھرنے سے معذور اور دوسرے معمولی معذوریوں کے شکار بچوں کی تعلیم دیگر عام بچوں کے ساتھ دی جائے۔

(2) بہت زیادہ معذور (Severely Handicapped) بچوں کے لیے ممکن حد تک ضلع کے مرکزی مقامات پر ہوسٹل والے خصوصی اسکولوں (Special Schools with Hostels) کا انتظام کیا جائے گا۔

(3) معذور افردا کو پیشہ ورانہ تربیت دینے کے لیے مناسب انتظامات کیے جائیں گے۔

(4) معذور بچوں کی خصوصی مشکلات بخوبی دور کرنے کا اہل بنانے کے لیے بالخصوص ابتدائی درجات کے اساتذہ کے لیے تربیتی پروگراموں کو از سر نو ترتیب دیا جائے گا۔

(5) معذوروں کی تعلیم کے لیے رضاکارانہ کوششوں (Voluntary Efforts) ممکن طور پر حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

غرضیکہ معذور افراد کی تعلیمی پروگرام بھی تعلیم برائے مساوات (Education for Equality) مہم کے ایک پہلو کی حیثیت رکھتا ہے۔

معقبات: اس کے معنی بھی نگراں کے ہیں۔ قرآن میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہیں اس کی دو اور صفتیں بیان کرکے ان کے کام کی نوعیت واضح کردی گئی ہے فرمایا کہ وہ انسان کے آگے اور پیچھے سے اس کو گھیرنے اور احاطہ کرنے والے ہیں اور اللہ کے حکم سے آدمی کے اعمال کو محفوظ کرتے رہتے ہیں۔

معیار طلا: دیکھیے سونا معیا (Gold Standard)۔

مغرب مستقل مشاورتی کمیٹی (Western Permanent Advisory Committee):

شمالی افریقہ کے عرب ممالک کی یہ کمیٹی الجزائر، مراکش اور تیونس پر مشتمل ہے جس کا قیام 1964 میں عمل میں آیا تاکہ ان تینوں ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کو فروغ دیا جاسکے اور اقتصادی تال میل پیدا ہو۔ بعد ازاں اس میں اور بھی ممالک نے شمولیت اختیار کی تاہم لیبیا کمیٹی سے 1970 میں علاحدہ ہو گیا لیکن موریطانیہ نے اس میں 1975 میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس کی نشستیں سال میں چار مرتبہ منعقد ہوتی ہیں۔ یہ ایک سکریٹریٹ، ایک صنعتی مطالعات کے مرکز اور اقتصادی و تکنیکی امور کا جائزہ لینے والی کمیٹیوں اور کمیشنوں پر مشتمل ہے۔ اس کا صدر مقام تیونس ہے۔

مغربی افریقی اقتصادی برادری (Economic Community of West African States, ECOWAS):

یہ مشترکہ منڈی مغربی افریقہ کے 15 ملکوں کے درمیان مئی 1975 کے لاگوس معاہدہ کے تحت وجود میں آئی۔ اس نے جون 1975 سے کام کرنا شروع کیا۔ اس برادری کا مقصد اس خطہ میں اقتصادی تعاون اور ترقی میں اضافہ کرنا، کسٹم یونین قائم کرنا اور مشترکہ اقتصادی پالیسیاں اختیار کرنا ہے۔ لیکن بعد ازاں اس نے سیاسی تنازعات میں ملوث ہونا شروع کردیا اور 1993 میں اس نے اپنے منشور میں ترمیم کرکے علاقائی فوجی تنازعات کو منضبط کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

برادری کا اعلیٰ ترین ادارہ سربراہان مملکت وحکومت کی سالانہ کانفرنس ہے جس کے اجلاس ممبر ملکوں کی راجدھانیوں میں باری باری منعقد ہوتے ہیں۔ اس کے ماتحت ایک مجلس وزرا ہے۔ اختلافات کو رفع کرنے کی غرض سے ایک ٹریبونل اور انتظامی امور کے لیے ایک سکریٹریٹ ہے جو بہت سے انتظامی کمیشنوں پر مشتمل ہے۔

اس کے ارکان میں بینن، برکنیافاسو، کیپ ورڈی، آئیوری کوسٹ، گیمبیا، گھانا، گنی، گنی بساؤ، لائبیریا، مالی، مارٹینیا، نائجر، نائجیریا، سینیگال، سیرالیون اور ٹوگو شامل ہیں۔

اس کا صدر مقام ابوجا (نائجیریا) ہے۔

مغربی یورپی یونین (Western European Union, WEU): مغربی یورپی یونین کا قیام 1948 کے بروسلز اجتماعی دفاع کے معاہدہ کے تحت 1955 میں عمل میں آیا۔ تحفظ اور دفاع کے میدان میں یورپی تعاون کے لیے یہ ایک بین الحکومتی تنظیم ہے۔ اس کا مقصد مغربی یورپ کے اجتماعی دفاع کے لیے فوجی پالیسیوں میں تال میل اور اسلحہ و ساز وسامان کی جدید کاری کے ساتھ ساتھ سیاسی، اجتماعی، قانونی اور تہذیبی امور میں بھی تعاون کرنا ہے۔ ایک طرف تو یہ یورپی یونین کے دفاعی پہلو سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری طرف ناٹو کے یورپی ستون کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔

بلجیم، فرانس، جرمنی، یونان، اٹلی، لکسمبرگ، نیدرلینڈس، پرتگال، اسپین اور برطانیہ اس کے ارکان ہیں۔ نومبر 1992 میں ڈنمارک اور آئرلینڈ کو مشاہدین کی حیثیت حاصل ہوئی اور آئس لینڈ، ناروے اور ترکی کو ایسوسی ایٹ ممبر کا درجہ دیا گیا۔ 1994 میں بلغاریہ، چیک جمہوریہ، ایسٹونیا، ہنگری، لیٹویا، لتھوانیا، پولینڈ، رومانیہ اور سلوواکیہ کو بھی ایسوسی ایٹ ممبر بنا لیا گیا۔ یکم جنوری 1995 کو یورپی یونین سے الحاق ہو جانے کے بعد آسٹریا، فن لینڈ اور سویڈن کو بھی مشاہد کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

یونین کی کونسل اس کا پالیسی ساز ادارہ ہے جو بین الحکومتی اداروں کو ہدایات دینے کی مجاز ہے۔ اس کے اجلاس سال میں کم از کم دوبار ضرور منعقد ہوتے ہیں۔ اس کی صدارت ہر چھ ماہ بعد ممبر ملکوں میں باری باری میں گشت کرتی رہتی ہے۔ یکم جولائی 1994 سے قبل اس کی معیاد ایک سال تھی۔

یونین کی ایک اسمبلی ہے جس کا اجلاس سال میں دوبار عموماً پیرس میں منعقد ہوتا ہے۔ اس کا صدر دفتر برسلز (بلجیم) میں واقع ہے۔

مفتاح کنوز السنہ: یہ احادیث و آثار کی فہرست ہے جس کو ایک فاضل مستشرق۔ فنسنک ہولندی نے انگریزی میں مرتب کیا تھا وہ لیڈن یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے پروفسر تھے محمد فواد عبدالباقی نے مفتاح کنوزالسنہ کے نام سے اس فہرست کا عربی ترجمہ کیا ہے جو پہلی دفعہ 1352ھ / 1924ء میں مصر سے شائع ہوا تھا۔ اس میں صحاح ستہ کے علاوہ حدیث سیرت اور مغازی کی جن کتابوں کی حدیثوں کی فہرست قلمبند کی گئی ہے ان کے نام یہ ہیں:

7۔ مسند زید بن علی 8۔ موطاء امام مالک 9۔ مسند ابوداؤد طیالسی 10۔ مسند احمد بن حنبل 11۔ سنن دارمی 12۔ کتاب المغازی لاواقدی 13۔ طبقات ابن سعد 14۔ عبرت ابن ہشام۔

مقابلہ (Competition): انسان کی اجتماعی زندگی میں مقابلہ ایک اہم اور ناگزیر سماجی طریق ہے۔ ہر سماج میں افراد اپنی صلاحیتوں اور مقاصد کے فرق کی بناء پر مختلف قسم کی کوششوں اور جدوجہد میں معروف رہتے ہیں۔ تقریباً ہر فرد کو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلہ پر مقابلہ کی دوڑ میں شریک ہونا ہی پڑتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج میں ہمیشہ کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو مقابلہ سے گھبراتے ہیں اور ممکنہ حد تک اس سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ انسان کی اجتماعی زندگی معاونتی اور غیر معاونتی طریقہ ہائے عمل سے عبارت ہوتی ہے۔ اس لیے ہم مسلکی تعاون انجذاب کے معاونتی طریقوں کے ساتھ ساتھ مقابلے تصادم اور جنگ کے عدم معاونتی طریق بھی افراد کے طرز عمل کا تعین کرتے ہیں۔

ان طریق میں مقابلہ عدم معاونتی طریق کی پہلی منزل ہے جس میں افراد یا گروہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے صاف طور سے ٹکرائے بغیر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہتر معاشی موقف اعلیٰ تر سماجی رتبے یا حیثیتوں کے حصول کے لیے صبح سے شام تک انسان مقابلہ کی دوڑ میں شریک رہتا ہے اور جدید دور کی تو یہ اتنی اہم خصوصیت بن چکی ہے کہ موجودہ دور کو مقابلے کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ مقابلہ کے طریق میں ضروری نہیں کہ افراد یا گروہ ایک دوسرے سے متصادم ہوں یا منفی خطوط پر مزاحمت یا دشمنی مول لیں۔ بلکہ محض اتنا کافی

ہے کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ دوسروں سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ لیکن بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ افراد یا گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مقابلہ کی سب سے واضح اور اچھی مثالیں معاشی جدوجہد کے میدان میں ملتی ہیں۔ ویسے سماجی حیثیتوں اور مراتب کے لیے یا سیاسی پوزیشن کے حصول کے لیے ہر زمانہ میں مقابلہ پایا جاتا رہا ہے۔ بنیادی طور پر مقابلہ مطابقت اور بہتر موقف حاصل کرنے کے لیے ایک انتہائی موثر طریقہ کار ہے تعلیم کا میدان ہو کہ کھیل کا سیاست ہو کہ سماج ہو یا معیشت، ہر میدان انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر مقابلہ میں مصروف ہے۔ اور ان ہی کوششوں کے نتیجہ کے طور پر سماجی تنظیم نو اور اس کی پیش رفت جاری رہتی ہے۔

مقامی حکومت (Local Government) : مقامی حکومت اس حکومت کو کہتے ہیں جو ایک محدود رقبہ میں مرکزی یا صوبائی حکومت کے ماتحت علاقائی سطح پر چند امور سے متعلق پالیسی بناتی اور اسے نافذ کرتی ہے۔ تین سطحی نظام حکومت میں سب سے اوپر مرکزی حکومت، درمیان میں صوبائی حکومت اور سب سے نیچے مقامی حکومت ہوتی ہے۔ مقامی حکومت کوئی مخصوص حکومت نہیں بلکہ دوسری اکائیوں کی طرح ایک عام حکومت ہے اور ان تمام امور کا جو اس کے ذمہ کیے جائیں، انجام دینا اس کے فرائض میں شامل ہے۔

وحدانی نظام حکومت میں مقامی حکومت کی تشکیل اور اس کے اختیارات و فرائض کا تعین مرکزی حکومت خود کرتی ہے جبکہ وفاقی نظام میں عموماً مقامی حکومت صوبائی حکومت کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہندستان میں مقامی حکومت کے جملہ امور صوبائی حکومت کے ماتحت کردیے گئے ہیں۔ یہاں دو قسم کی مقامی حکومت رائج ہے:

(1) ایک دیہی مقامی حکومت جو پنچایتی راج کے نام سے موسوم ہے۔

(2) دوسرے بلدیاتی حکومت جو بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں رو بہ عمل آتی ہے۔

پنچایتی راج تین سطحی نظام حکومت (یعنی گرام پنچایت، بلاک پنچایت اور ضلع پریشد) پر مشتمل ہے۔ اور اس میں گرام پنچایت بلاک کے، اور بلاک ضلع پریشد کے ماتحت ہوتا ہے۔ جبکہ بلدیاتی نظام حکومت پنچایتی راج سے مختلف ہے۔ یہاں پنچایتی راج کی طرح تین سطحی نظام نہیں پایا جاتا بلکہ ہر شہری علاقہ میں اس شہر کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف قسم کی تنظیمیں مثلاً میونسپل کارپوریشن، میونسپل کونسل، ٹاؤن ایریا کمیٹی، ایریا کمیٹی، نوٹی فائڈ ایریا کمیٹی اور کنٹونمنٹ بورڈ وغیرہ کام کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر تنظیم اپنی جگہ پر خود مختار اکائی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس کا کسی دوسری تنظیم سے کوئی قانونی رشتہ نہیں ہوتا۔

مقامی شہری انتظامیہ : دنیا کے ہر ملک میں آبادی کا ایک حصہ شہروں میں رہتا ہے۔ صنعتی ترقی کی وجہ سے شہروں میں روزگار کی فراہمی کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دیہی علاقوں کے باشندے شہروں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ شہر میں بلدی سہولتوں کی فراہمی ضروری ہے، اس غرض کے لیے دنیا کے ہر ملک میں مجالس بلدی مختلف ناموں سے قایم کی گئی ہیں۔ قانون سازی کے ذریعہ شہری سہولتوں کی فراہمی اور دیگر ترقیاتی امور مثلاً رہائش کے لیے مکانوں کی تعمیر، آب رسانی کے انتظام کی منصوبہ بندی اور اس کی تکمیل شہری انتظامیہ کی ہی ذمہ داری ہے۔ مجلس بلدیہ یعنی شہری انتظامیہ جسے عموماً میونسپلٹی کہتے ہیں، ایک شہر کے لیے قایم کی جاتی ہے۔ اس کے ارکان منتخب ہوتے ہیں۔ مجالس بلدیات کو بلدی امور کے تعلق سے پوری آزادی رہتی ہے اور اس مقصد کے لیے مرکزی حکومت سے ملنے والی گرانٹ کے علاوہ مجالس بلدی کو بعض محصول وصول کرنے کا اختیار بھی ہوتا ہے۔ بڑے شہروں کے لیے جو مجالس بلدیہ قایم کی جاتی ہیں انھیں میونسپل کمیٹی/میونسپل کارپوریشن کہتے ہیں اور ان کے ارکان بھی منتخب ہوتے ہیں۔

مقدمہ بازی میں ناجائز امداد (Illegal aid in litigation) : مقدمہ بازی میں ناجائز امداد اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی شخص ثالث کسی دیوانی مقدمہ کے فریق کو روپیہ سے یا اور طور پر ناجائز امداد دے تاکہ وہ اپنا دعویٰ چلا سکے یا اس دعوے کی جواب دہی کر سکے۔ لیکن امداد ناجائز متصور نہ ہوگی۔ اگر شخص ثالث کو اس فریق مقدمہ کے ساتھ غرض مشترک ہو یا شخص ثالث بطور خیرات مدد کرے اور وہ نیک نیتی سے یہ باور کرتا ہو کہ وہ فریق مقدمہ غریب آدمی ہے اور اس کو دوسرا امیر آدمی ستا رہا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مکروہ: لفظی معنی ناگوار، برا، ناپسندیدہ اور فقہی اصطلاح میں ایسا برا کام جس سے بچنے کی شریعت نے تاکید کی ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں 1۔ مکروہ تحریمی 2۔ مکروہ تنزیہی ۔ مکروہ تحریمی اس برے کام کو کہتے ہیں جو حرام کے قریب قریب ہو گو اس کا منکر کافر نہیں ہوتا تاہم اس کو کرنے والا فاسق گنہگار ہے جو عذاب کا مستحق قرار پائے گا۔ جیسے کتے کا جھوٹا۔ مکروہ تنزیہی تنزیہہ کے لفظی معنی پاک اور صاف کرنا ہیں۔ پس مکروہ تنزیہی بھی ایسا فعل ہے جو پاکبازی اور پرہیزگاری کے خلاف ہے جس کو ایک پاکباز کو نہ کرنا چاہیے۔ اس کی برائی معمولی درجہ کی ہے مگر یہ غیر مناسب ہے اس لیے اس کو چھوڑنا اچھا ہتا ہے۔ جیسے بلی کا جھوٹا۔

ملازمین سرکار کے مسائل: حکومت کا وہ شعبہ جو ملازمین سرکار کے معاملات کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے اکثر مسائل سے دوچار رہتا ہے۔ اس شعبہ کی ذمہ داریوں میں ملازمین کی تنخواہ، شرائط ملازمت، نظم و ضبط، مشترکہ مشاورت، بد عنوانیاں اور رشوت ستانی جیسے مسائل شامل ہوتے ہیں۔

تنخواہ: ملازمین کے تمام مسائل میں تنخواہ کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ نہ صرف مطلوبہ معیار کی اسامیوں کے لیے موزوں افراد کی بھرتی کے نقطۂ نظر سے اہم ہے بلکہ دوران ملازمت سارے عملہ کے معیار کارکردگی اور ان کی دیانتداری سے بھی بنیادی تعلق رکھتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ملازمین میں کارکردگی کے معیار کو بڑھانے اور فرض شناسی کا احساس پیدا کرنے کا محرک بننے کے ساتھ انھیں تحریص و ترغیب سے بچانا بھی شامل ہے۔ ملازمین کی زندگی کے سماجی اور معاشی پہلوؤں سے اس شعبہ کا گہرا تعلق ہوتا ہے ۔ خدمات عامہ کی تاریخ میں اضافۂ تنخواہ کا مسئلہ کئی مراحل سے گزرا ہے۔ کسی زمانہ میں تنخواہ میں اضافہ یا ترقی کو ایک شخصی رعایت اور مہربانی سمجھا جاتا تھا پھر ایک وقت آیا کہ بطور حق اس کا مطالبہ ہونے لگا اور اب تو تنخواہ کمیشنوں کے ذریعہ اس کا تعین ہوتا ہے جو ملازمین کے مختلف مفادات اور امور کو پیش نظر رکھ کر اپنی سفارشات پیش کرتے ہیں ۔ ان سفارشات کا نفاذ برسراقتدار حکومت کو کرنا ہوتا ہے لیکن ان سفارشات میں رد و بدل کا اختیار حکومت کے پاس ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ حکومت کسی بھی سفارش کو قطعی نظر انداز کر سکتی ہے تاہم ہر ملک میں تاریخی پس منظر کے مطابق تنخواہوں کے اصول متعین ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر ملک میں قابل گزارہ اجرت، اجرت مطابق بنیادی ضرورت، کم سے کم اجرت، مقابلتاً واجبی اجرت، اجرت دینے کی استعداد اور مساوی کام کی مساوی اجرت وغیرہ کے لیے الگ الگ اصول مقرر ہیں۔

ملازمین سرکار۔ چال چلن اور ضبط و نظم: تنخواہ پانے والے ملازمین کا طریقہ جس قدر قدیم ہے اسی طرح ان کے چال چلن اور ضبط و نظم کا مسئلہ بھی پرانا ہے۔ چال چلن اور ضبط و نظم کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے اور یوں سمجھئے کہ وہ ایک ہی مسئلہ کے دو رخ ہیں۔ بغیر ضبط و نظم کے بہتر چال چلن کا تصور ممکن نہیں۔ چال چلن اس طرز عمل کو کہتے ہیں جو عام برتاؤ کی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے۔ کسی شخص کا چال چلن اس کا اپنا خانگی اور نجی معاملہ ہوتا ہے لیکن جب کوئی شخص خدمت عامہ کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے تو اس عہدہ کے مفاد کی خاطر اس کے چال چلن پر بعض پابندیاں عاید کی جاتی ہیں اور انھیں ایک منضبط شکل دی جاتی ہے۔ کسی ملک کی حکومت اس ملک کی سب سے بڑی اور مثالی آجر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے ملازمین کے چال چلن سے متعلق بعض قواعد و ضوابط مقرر کرتی ہے۔ یہ قواعد ملازمین کی شخصی، سیاسی اور سماجی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ شہریوں کو اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ہر روز ہی کسی نہ کسی سرکاری دفتر یا محکمہ سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ سرکاری ملازمین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے طرز عمل سے ایمانداری، غیر جانبداری، خلوص اور دیانتداری کا ایک مخصوص معیار برقرار رکھیں گے۔ چال چلن کے قواعد میں در اصل اس معیار کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ضبط و نظم، دفتری قواعد کا ایک ایسا ضابطہ ہوتا ہے کہ جو ملازمین کی عادات و اطوار پر نگرانی رکھنے اور ان میں احساس فرض شناسی پیدا کرنے کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک ضابطہ اخلاق ہوتا ہے بلکہ ملازمین کی بے راہ روی کی روک تھام بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ملازمین کی بد چلنی یا خلاف قاعدہ طرز عمل کی صورت میں ان کے خلاف کارروائی بھی اسی ضابطہ کے تحت کی جاتی ہے۔ مقررہ ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی ہی کی صورت میں تادیبی کارروائی کی نوبت آتی ہے۔ تادیبی نظام میں ملازمین پر نگرانی رکھنے کے مختلف طریقے متعین کیے جاتے ہیں اور مختلف تادیبی کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں ملازمین کا ایک جگہ سے دوسری جگہ اور تبادلہ، سالانہ انکریمنٹ پر پابندی کے علاوہ معطلی اور جرم ثابت

ہونے پر ملازمت سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔

مشاورتی انتظامیہ : مشاورتی انتظامیہ (Participative Management) کے تصور نے اس رواج کو جنم دیا جس کے تحت آج ملازمت کی شرائط آجر اور ملازمین کی باہمی مشاورت سے طے پاتی ہیں۔ منشا یہ ہے کہ باہمی مفاد کے امور میں ایک مستقل ربط پیدا کیا جائے تاکہ آپسی تنازعات کی صورتیں کم سے کم پیدا ہوں۔ یہ طریقۂ کار در اصل جمہوری نظام کی پیداوار ہے۔ انتظامیہ اور ملازمین کے درمیان باہمی مشاورت کے معاملہ میں برطانیہ کو اولین مقام حاصل ہے۔ مگر یہ طریقہ تقریباً ہر جمہوری ملک میں رائج ہو چکا ہے۔ اکثر ملکوں میں باہمی مشاورت، معاملہ فہمی اور ثالثی کا طریقہ حکومت کی مشینری کا ایک جزو لاینفک بن چکا ہے اور اس کے نتائج کافی امید افزا رہے ہیں۔

بد عنوانیاں: رشوت ستانی اور بد عنوانیاں نظم و نسق عامہ کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ یہ بیماری تشکیل سماج کی ابتداء سے چلی آرہی ہے اور اب بھی یہ کسی نا کسی شکل میں نظم و نسق کی ہر سطح پر موجود ہے۔ اس کے برے اثرات کا اندازہ ان تادیبی کارروائیوں سے لگایا جا سکتا ہے جو اس سلسلہ میں اختیار کی جاتی ہیں۔ بد عنوانیوں کے وجوہ مختلف ہوتے ہیں جن میں سماجی، سیاسی اور معاشی اسباب کے علاوہ حکومت کے مقررہ قواعد و ضوابط کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ برائیاں کم یا زیادہ مختلف شکلوں میں ہر جگہ موجود ہیں۔

رشوت ستانی کا بر وقت ازالہ نہ ہو تو قوم کے لیے خطرناک بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے جمہوریت کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور نظم و نسق کی ترقی رک جاتی ہے۔ ملازمین کو بد عنوانیوں سے روکنے کی مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ نظر رکھی جاتی ہے کہ ملازمین کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد ان کی آمدنی کے تناسب میں ہے یا زیادہ ہے۔ اگر زیادہ ہے تو کسی انوسٹی گیشن ایجنسی سے اس کی تحقیق کرائی جاتی ہے اور کرپشن ثابت ہونے پر ملازم کے خلاف تادیبی اور قانونی کارروائی کی جاتی ہے۔

ل۔ جان اسٹورٹ (Mill, John Stuart, 1806-1873)

: 19 ویں صدی کے اس مشہور فلسفی اور معاشیات داں کی تصنیفات میں اپنے عہد کے فلسفہ منطق اور معاشیات سے متعلق تمام اہم نظریوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ معاشیات میں افادیت (Utilitarianism) کا بہت بڑا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

جان اسٹوارٹ ل، جیمس ل کا لڑکا تھا۔ بچپن کی زندگی اور ابتدائی تعلیم کا دور باپ کی سخت نگرانی اور پابندیوں میں گزرا۔ بارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ معاشیات کی اہم کتابوں سے واقف ہو چکا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں اسے اپنے باپ کی تصنیف علم معاشیات کے ابتدائی اصول (Elements of Political Economy) کے پروف پڑھنے پڑے۔ اس نے معاشیات کی ابتدائی تعلیم اپنے باپ ہی سے حاصل کی۔ 1823 میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں چلا گیا اور 35 سال اس میں رہا۔ وہاں سے ہٹنے کے بعد وہ تین سال تک پارلیمنٹ کا ممبر بھی رہا۔ اور اس کے بعد وہ فرانس چلا آیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری کے باوجود وہ پڑھنے لکھنے کے لیے کافی وقت نکال لیتا تھا۔ معاشیات منطق فلسفہ قانون سائنس وغیرہ پر اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان میں سے ہر علم کے بارے میں اس نے کتابیں لکھی ہیں۔

جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے اس کی دو کتابیں سب سے اہم اور مشہور ہیں۔ ایک Political Economy with some of their Applications to Social Philosophy اور دوسری Essays on Some Unsettled Questions of Political Economy ہے۔ پہلی کتاب کا مقصد اپنے وقت کے معاشی نظریوں کا مکمل جائزہ پیش کرنا تھا۔ اصل میں اس نے آدم اسمتھ کی تصنیف "دولت اقوام" کو نئے نظریوں اور حالات کے اضافہ اور نظرثانی کے بعد پیش کیا تھا۔ ل کی یہ تصنیف اتنی کامیاب رہی کہ 19 ویں صدی کے اختتام تک یہ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہی۔ اور معاشیات کے کلاسکی کتب کی سب سے اہم تصنیف بنی رہی۔ ل نے خود یہ بات تسلیم کی تھی کہ یہ اس کی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ اس نے اور بہت سارے لوگوں کی تخلیقات کو ایک جا کرکے پیش کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ل میں تخلیقی صلاحیت نہیں تھی۔ اس نے اپنے دور کی معیشت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کا تجزیہ کرکے یہ بتلایا تھا کہ آئندہ چل کر صنعتیں صرف چند کمپنیوں کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی جائیں گی اور مسابقت میں کمی کے باعث قیمتوں میں اضافہ ہوگا اور کاروبار سے حاصل ہونے والا فائدہ ضائع ہو جائے گا۔ اسی بنا پر ل نے ٹریڈ یونینوں کے ہڑتال کے حق کی حمایت کی اور اس پر زور دیا کہ طاقت ور آجروں کے مقابلہ میں ٹریڈ یونینوں کا طاقت ور ہونا

ضروری ہے۔

مل نے اپنے نظریہ قدر میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ قیمتوں کا انحصار طلب ورسد کی مساوات پر ہوتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتلایا کہ ملکوں کی آپسی تجارت کے شرائط پر اس کا بھی اثر پڑتا ہے کہ ان ملکوں میں ایک دوسرے کی اشیا کی کس قدر مانگ ہے۔ مل نے تجارت کے مختلف امکانات کا تجزیہ کرتے وقت طلب کی لچک کا بھی تصور پیش کیا۔ مل کے باپ کا یہ خیال تھا کہ کرایہ یا لگان (Rent) فاضل آمدنی ہے اور اس پر ٹیکس لگنا چاہیے۔ مل نے اس تصور کی حمایت کی جس سے اسے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مل نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ تمام بے کمائے لگان (Unearned Rents) میں آئندہ جو اضافہ ہو اس پر ٹیکس لگنا چاہیے۔

ملک غیر کے معاہدات کی بنا پر مقدمات (Cases on basis of Contracts of a Foreign Country):

جو مقدمہ کسی ایسے معاہدہ کی بنا پر جو ملک غیر میں طے پایا ہو ہندوستان میں رجوع کیا جائے تو اس سے قانون متعلق ہوگا۔ جو مقدمہ کسی ایسے معاہدہ کی بنا پر جو ملک غیر میں طے پایا ہو ہندوستان کی عدالتوں میں رجوع کیا جاسکے اس کی جواب دہی میں کسی غیر ملک کے قانون میعاد سماعت کا کوئی قاعدہ پیش نہ ہوسکے گا۔ بجز اس کے کہ اس قاعدہ کی رو سے معاہدہ ساقط ہوگیا ہو اور فریقین اس مدت کے اندر جو قانون مذکور میں مقرر ہے اس ملک میں مستقل سکونت رکھتے ہوں مذکور صدر اصول قانون بین الاقوام کے قاعدہ کے تحت وضع کیا گیا ہے کہ تمام مقدمات اس مدت کے اندر رجوع ہونے چاہئیں جو اس ملک کے قانون خاص اتمام کی رو سے مقرر کی گئی ہو ورنہ وہ منقضی المیعاد ہوں گے۔

منشا یہ ہے کہ معاہدہ ملک غیر کی جواب دہی میں قانون میعاد سماعت ملک غیر کے قانون پر اس وقت استدلال ہوسکے گا جبکہ قانون میعاد سماعت ممالک غیر کی بنا پر معاہدہ ساقط ہوگیا ہو اور فریقین معاہدہ اس مدت کے اندر ملک غیر میں مستقل سکونت رکھتے ہوں۔

ملکیت (Ownership): (1) کسی شے کے بلاشرکت غیرے استفادہ کا حق ملکیت کہلاتا ہے (آسٹن) دراصل ملکیت اس تعلق کو ظاہر کرتی ہے جو ایک شخص اور اس کے وابستہ حق میں پایا جاتا ہے۔ ان معنوں میں ملکیت ہمہ اقسام حقوق پر حاوی ہوتی ہے چاہے اس کا تعلق ذات سے ہو یا جائداد سے مثلاً قرضہ رہن حصہ کمپنی وغیرہ اور ہر شخص اپنے جملہ محصلہ حقوق کا مالک ہوگا۔

(2) حق ملکیت پر مختلف پہلو سے نظر ڈالی جاسکتی ہے۔

(الف) مادی و غیر مادی ملکیت (Corporeal & Incorporeal Ownership)

(ب) واحد مشترکہ ملکیت (Sole & Co-ownership)

(ج) امانتی و استفادی ملکیت (Trust & Beneficial Ownership)

(د) مبذول و مشروط (Vested & Contingent Ownership)

(3) قدیم معاشرہ (Primitive Society) میں مادی و غیر مادی ملکیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ امتیاز تو رومیوں کا پیدا کردہ ہے۔ عمومی طور پر مادی ملکیت سے مراد وہ حق ہوتا ہے جو ایک شخص کو کسی جائداد یا مال کے بلاشرکت غیرے استفادہ کی بابت حاصل ہوتا ہے۔ اس حق کی تحدیدات کو غیر مادی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح غیر مادی ملکیت سے مراد وہ سب حقوق ہوتے ہیں جو مادی ملکیت پر تحدیدات عاید کرتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ زید ایک مکان کا مالک ہے تو یہ ملکیت مادی ہوگی اسے یہ ادعا مقصود ہے کہ زید اس مکان کے متعلق ہر قسم کے تصرفات کا مجاز ہے یعنی وہ اس کو رہن رکھ سکتا ہے یا پٹہ پردے سکتا ہے فروخت کرسکتا ہے وغیرہ۔ رہن پٹہ حق آسائش اقرار بیع غیر مادی حقوق ہیں جو زید کی ملکیت پر تحدیدات عاید کرتے ہیں۔ اگر زید اس مکان کو ایک شخص کے حق میں رہن کردے دوسرے کو پٹہ دے دے تیسرے کے حق میں اقرار بیع کرے تو اس تحدیدات کے سبب زید کی مادی ملکیت برائے نام رہ جائے گی کیونکہ یہ دیگر افراد کے غیر مادی حقوق کے تابع ہوگی۔ تاہم زید قانون کی نظر میں مکان کا مالک ہوگا کیونکہ اگر وہ جملہ تحدیدات کو ہٹا سکے تو اس کا اصلی حق پھر سے عود کر آئے گا۔

(4) عموماً ملکیت واحد ہوا کرتی ہے۔ لیکن بعض اشکال میں یہ مشترکہ بھی ہوسکتی ہے۔ زید اپنے مکان کا واحد مالک ہوگا لیکن فرم کے شرکاء فرم کی جملہ جائداد کے مشترکہ مالک ہوں گے۔ یعنی فرم کی زمین مکان تجارت مال و اسباب کے متعلق ہر شریک کامل جائداد کا مالک متصور ہوگا۔ اس کو مشترکہ ملکیت (Co-ownership) کہا جاتا ہے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

بقول سامنڈ یہ کہنا غلط ہے کہ مشترکہ مالکان کے حصص شرکاء میں منقسم ہوجاتے ہیں یا ہر شریک کا حصہ معین ہوتا ہے۔ کسی شریک کا حصہ معین نہیں ہوتا ہے جب تک کہ تقسیم عمل میں نہ آئے۔ اگر تقسیم سے پہلے کوئی شریک مرجائے تو مرنے والے کے وارثان کو کوئی حق نہیں پہنچے گا بلکہ باقی بقید حیات شرکا فرم کی کامل جائداد کے مالک بن جائیں گے۔ اس طرح اگر دو افراد بینک سے مشترکا دس ہزار روپیہ قرض لیں تو ہر فرد پورے دس ہزار کا ذمہ دار ہوگا نہ کہ منفرد پانچ پانچ ہزار کا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں بینک کسی ایک شریک سے منفرداً یا ہر دو سے مشترکا پوری رقم وصول کرنے کا مستحق ہوگا۔ جب بذریعہ تقسیم (Partition) فرم معدوم (Dissolve) ہوجاتی ہے تو شریک مخصوص حصہ کا مالک بن جاتا ہے اور واحد ملکیت قایم ہوجاتی ہے۔

(5) امانت دوہری ملکیت کی عیاں مثال ہے یعنی امانتی جائداد (Trust Property) کے بیک وقت دو مالک ہوتے ہیں ایک امین (Trustee) کہلاتا ہے دوسرا مستفاد (Beneficiary) امین پر یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کا استعمال مستفاد کے استفادہ کے لیے کرے۔ امین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ امانتی جائداد کو اپنے ذاتی تصرف میں لائے۔ امین صرف قانونی مالک ہوتا ہے اور اس کی ملکیت ایک قانونی افسانہ (Legal Fiction) ہے مستفاد اصل مالک ہوتا ہے لیکن اس کو جائداد میں تصرفات کرنے کا حق نہیں پہنچتا تبدل و تصرف صرف امین کرسکتا ہے بریں ہم مستفاد کے فائدہ کے لیے یا جائداد کے تحفظ کی خاطر۔

(6) امانت (Trust) کا مقصود یہ ہے کہ ان افراد کے حقوق و مفادات (Right & Interest) کی حفاظت کی جائے جو فی نفسہ جائداد کی حفاظت کے قابل نہیں مثلاً ناپید یا نابالغ بچے نااہل یا دیوانے اشخاص یا جب اصل مالکان کے مفادات ایک دوسرے کے مستفاد نہیں ان صورتوں میں امانت کی تخلیق ضروری ہوجاتی ہے۔ المختصر جب ملکیت دو افراد کو حاصل ہو تو امانت وجود میں آتی ہے۔ ان میں سے ایک پابند ہوتا ہے کہ وہ جائداد کا تصرف دوسرے کے فائدہ کے لیے کرے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ اصل مالک اپنی جائداد کو امانت میں تبدیل کرکے خود امین بن جائے یا کسی غیر شخص کو امین قرار دے۔

ہر دو اشکال میں مالک کا حق ملکیت زائل ہوجاتا ہے او مستفاد اصل مالک بن جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امانتی اور استفادی ملکیت ایک ہی شخص میں مرکوز ہوجائے۔ اس صورت میں امانت زائل ہوجائے گی۔ مثلاً جب امین یا مستفاد اپنا حق دوسرے کو منتقل کردے تو امانت باقی نہ رہے گی اور منتقل الیہ مالک کامل ہوجائے گا۔

(7) ملکیت مبذول (Vested) بھی ہوسکتی ہے اور مشروط (Contingent) بھی جب مالک کا حق مکمل ہو تو ملکیت مبذول (Vested) کہلاتی ہے جب حق نامکمل (Inchoate) ہو تو ملکیت مشروط (Contignent) ہوگی۔ جب وہ شرط پوری ہوجائے جس کے سبب ملکیت مشروط تھی تو مشروط ملکیت مبذول ملکیت میں تبدیل ہوجاتی ہے مثلاً زید نے یہ وصیت کی کہ اس کی وفات پر اس کی بیوی تاحیات مالک رہے گی اور بیوی کے مرجانے پر بکر مالک ہوگا اگر وہ تب تک زندہ رہے اور اگر بکر بیوی سے پہلے مرجائے تو عمر مالک ہوگا۔ اس شکل میں بیوی مبذول ملکیت کی حامل ہوگی اور بکر و عمر دونوں مشروط ملکیت کے، بکر کی ملکیت تابع ہوگی بیوی کی زندگی کے اور عمر کی ملکیت تابع ہوگی بکر کی موت کے۔

(8) یہ امر ملحوظ رہے کہ کسی حق کی مشروط ملکیت اس حق کے اتفاقاً حاصل کرلینے یا حصول کے امکان سے جداگانہ چیز ہے۔ زید کو اس مکان میں مشروط ملکیت حاصل نہ ہوگی جس کا مالک حسن اتفاق سے اپنے مکان کو زید کے حق میں وصیت کر بیٹھے یا جس کو خریدنے کا زید خیال کرے۔ مشروط ملکیت مستقبل کے امکانات پر مبنی نہیں ہوتی ہے یہ ملکیت مبنی ہوتی ہے حال کے نامکمل حق پر۔

(9) شرائط دو قسم کی ہوتی ہیں ایک شرط ماقبل (Condition Precedent) دوسری شرط مابعد (Condition Subsequent) ۔ شرط ماقبل وہ ہے جس کے پورا ہونے پر مشروط ملکیت مبذول ملکیت بن جاتی ہے۔ شرط مابعد وہ ہے جس کے تعمیل پانے پر مبذول ملکیت زائل ہوجاتی ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ شرط اس ملکیت کے تسلسل کے لیے لگائی جاتی ہے مثلاً زید وصیت کرتا ہے کہ اس کے بعد بیوی جائداد کی مالک رہے گی بشرطیکہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔ یہ شرط شرط مابعد ہوگی۔ زید کی وفات پر جائداد کی ملکیت بیوی پر مبذول ہوگی لیکن یہ شرط مابعد کے تابع رہے گی۔ یعنی اگر بیوی دوسری شادی کرلے

تو ملکیت زائل ہوکر زید کے دیگر وارثان پر عود کرے گی۔ اور وارثان کی مشروط ملکیت بیوی کے عقد ثانی کے بعد مبذول ملکیت میں بدل جائے گی۔

(10) ملکیت چاہے وہ کسی قسم کی ہو عموماً بلامالک کی آزاد مرضی کے زائل نہیں ہوتی اس کی استثنائی شکلیں محدود ہیں۔ (Negotiable Instruments) نمایاں استثنا ہے کہ اگر کوئی دیانت داری (Good Faith) سے قیمت دے کر (Negotiable Instrument) خریدے تو چاہے مشتری کوئی چور ہی کیوں نہ ہو اصل مالک کی ملکیت زائل اور خریدار کو ملکیت حاصل ہوجائے گی بجز اس قسم کی چند مستثنیٰ صورتوں کی ملکیت مالک کی آزاد مرضی ہی سے زائل ہوسکتی ہے۔ قبضہ اور ملکیت کا یہ اہم امتیاز ہے کہ قبضہ کی منتقلی بلا قابض کی رضامندی کے ہوسکتی ہے جیسے چور یا غاصب کا قبضہ۔ لیکن ملکیت اس طرح حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر زید بحالت دیوانگی اپنا مال و جائداد عمر کو بیع کردے تو ایسی بیع زید کی ملکیت کو زائد نہ کرے گی کیونکہ یہ انتقال جائداد زید کی آزاد مرضی سے نہیں ہوا ہے۔

ملوکیت (Monarchy) : ملوکیت اب عہد رفتہ کی یادگار ہے۔ بادشاہتیں یا تو مطلق العنان یا محدود بااختیار یا دستوری ہوتی ہیں۔ آج کے نیپال خلیجی ممالک اور بعض افریقی ملکوں میں مطلق العنان اور بااختیار بادشاہتیں ہیں۔ برطانیہ اور مغربی یورپ کی بادشاہتیں محدود اور دستوری ہیں۔ ان میں بادشاہ/ ملکہ محض دستوری سربراہ مملکت ہے۔ حکومتی اختیارات منتخبہ اداروں کو حاصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ یا تو موروثی ہوتا ہے یا بزور قوت اقتدار حاصل کرکے خود کو بادشاہ مقرر کرلیتا ہے۔ افریقہ اور ایشیا میں اکثر بادشاہتیں معدوم ہوچکی ہیں۔ جو موجود ہیں مثلاً جاپان، ملیشیا، تھائی لینڈ میں وہ دستوری ہیں۔ موجودہ مطلق العنان بادشاہتیں بھی اب عارضی نظر آتی ہیں۔

ممبران کا رجسٹر (Register of Members): ہر کمپنی کا فرض ہے کہ وہ ممبران کا ایک رجسٹر رکھے۔ اس رجسٹر میں حسب ذیل امور مندرج ہوں گے:

(1) ممبران کا نام اور پیشہ

(2) ہر ممبر کے حصص کی تعداد

(3) وہ تاریخ جس پر اس ممبر کا نام رجسٹر آف ممبرز میں درج کیا گیا ہو

ممبران کا رجسٹر کمپنی کے دفتر میں رکھا جائے گا۔ یہ رجسٹر اس شہر میں کسی دوسرے مقام پر بھی رکھا جاسکتا ہے۔

مملکت (State) : مملکت کی اصطلاح سیاسی جماعت یا نظام کے لیے سب سے پہلے اطالیہ میں سولہویں صدی کے شروع میں رائج ہوئی۔ اس سے قبل اس کے مختلف مفاہیم تھے: "اسٹیٹس" (Status) یا مرتبہ، "اسٹیٹ (Estate) (جائیداد)، صاحبان جائیداد کا اجتماع، حکومت یا حکمرانوں کی جماعت، دستور اور شکل حکومت۔ سیاسی ہیئت (باڈی پالیٹک) کے لیے اصطلاح کے استعمال کو میکیاویلی نے "پرنس" میں رائج کیا۔ سولہویں صدی میں یہ مفاہیم فرانس اور انگلستان میں عام ہوئے اور سرکاری زبان میں مستعمل ہونے لگے۔ ارنسٹ بارکر کی تعریف کے مطابق "مملکت قانونی طور پر ایک منظم قوم ہے یا وہ قوم ہے جو قانونی ضوابط کے تحت کام کرنے کے لیے منظم ہوئی ہو"۔ جے. ڈبلیو. گارنر کی تعریف کے مطابق "مملکت" علم سیاسیات اور قانون کے ایک تصور کے طور پر انسانوں کی وہ جماعت ہے جو زمین کے کسی متعینہ حصہ پر مستقل طور سے قابض ہو، بیرونی کنٹرول سے آزاد یا کم و بیش آزاد ہو، اور جس کی اپنی ایک منظم حکومت ہو جس کے احکام اس آبادی کی عظیم اکثریت عادۃً مانتی ہو"۔

مملکت کے عناصر ترکیبی یہ ہیں:

(1) آبادی، (2) علاقہ، (3) اقتدار اعلیٰ، (4) حکومت، ان عناصر کے ساتھ پائیدار مملکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے علاقہ میں معاشی وسائل اتنے ہوں کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہوسکے یا اس کی معیشت اتنی ترقی یافتہ ہو کہ اگر خام مواد کے لیے دوسروں کا محتاج ہونا پڑے تو اس کی سیاسی آزادی زائل نہ ہو۔ اسی کے ساتھ سیاسی کلچر بھی ترقی یافتہ شکل میں موجود ہو۔ یعنی قومی اغراض و مقاصد پر، داخلی حکومت کے اصولوں پر اور سیاسیات کے طور طریقوں پر عام اتفاق رائے پایا جائے۔

مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ (1) وہ اپنے حدود میں ایک کل نظام ہے۔ یعنی مملکت کا سماج کی دوسری تنظیموں سے وہی رشتہ ہے جو کل کا جزو سے ہوتا ہے۔ وہ سماج کے تمام گروہوں اور افراد کو محیط ہوتی ہے۔ (2) مملکت اپنے تمام اجزاء پر بالاتری رکھتی ہے۔ اس کو طاقت کے استعمال کی اجارہ داری حاصل ہے۔ سماج کی تمام تنظیموں میں مملکت ہی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

ایک ایسی منفرد تنظیم ہے جو جبراً اپنی اطاعت کرا سکتی ہے۔ اس مملکت کی رکنیت سماج کے تمام ارکان پر جبری ہے۔ کوئی شخص اس کے علاقہ میں رہتے ہوئے اس کی رکنیت سے استعفا نہیں دے سکتا۔ دوسرے لفظوں میں قانونی بالاتری اور جبری طاقت کی اجارہ داری (اقتدار اعلیٰ) اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس اقتدار اعلیٰ کو وہ نظم و ضبط قائم کرنے اور فلاح عامہ کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ مملکت کا قانون ہے۔

مملکت اور حکومت : مملکت سے مراد منظم سیاسی جماعت ہے۔ حکومت مملکت کی نمائندہ یا کارندہ ہے جو اس کی جانب سے ملکی و بیرونی معاملات کے انتظام میں اس کے حاکمانہ اختیارات کو استعمال کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں حکومت مملکت کی وہ تنظیم ہے جو انتظامی اداروں کے علاوہ تین بڑی شاخوں یعنی عاملہ، مقننہ اور عدلیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں مملکت اور حکومت مترادف تھے۔ کیونکہ مملکت کا اقتدار اعلیٰ حکمراں کی ذات میں ضم ہوتا تھا اور ملک کی ساری زمین اس کی ملکیت ہوتی تھی۔ لیکن جمہوری دور میں دونوں کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ تاکہ حکومت جو مملکت کی محض ایک انتظامی مشنری ہے اور جو اس کے مقاصد کو بروئے کار لاتی ہے مطلق العنان نہ ہوجائے اور خود اقتدار مطلق نہ بن جائے۔ حکومت کو مملکت کے ایک ماتحت ادارہ کی حیثیت دینے کا مقصد اس کو محدود کرنے اور شہریوں کی آزادی کے تحفظ کے لیے تھا۔ جب حکومت نااہل ہو یا غیر ذمہ دار ہو جائے یا اپنی دستوری حدود سے تجاوز کرے تو مملکت کے ارکان اسے بدل سکتے ہیں۔ لیکن یہ امتیاز محض قانونی اور نظری ہے۔ ہیرلڈ لاسکی کے نزدیک "مملکت کے عملی انتظام کے مقاصد کی تکمیل کے لیے حکومت ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ مملکت کا ہر کام حکومت کا کام ہوتا ہے۔ مملکت کی مرضی اس کے قوانین میں ظاہر ہوتی ہے لیکن ان قوانین کو ہیئت اور مواد حکومت فراہم کرتی ہے اور وہی ان کو نافذ کرتی ہے۔ حقیقت میں مملکت محض ایک تجریدی تصور ہے۔ وہ خود کبھی کام نہیں کرتی۔ بلکہ ایک اہل اور قانونی حکومت اس کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کے اختیارات کا سرچشمہ قانون ہے۔ چنانچہ مملکت کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اس کی حکومت کامیابی سے اس کی بالاتر جبری طاقت کو استعمال کرے۔

مملکت اور سماج : مملکت اور سماج ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ مملکت سماج کی وہ قانونی تنظیم ہے جو اپنے ارکان کی عام فلاح و بہبود کے مقصد سے قانون کو وضع کرنے اور اس کو جبری طور سے نافذ کرنے کے واحد مقصد کے لیے وجود میں آتی ہے۔ سماج مملکت کی حدود میں قوم کی تمام رضاکارانہ تنظیموں اور جماعتوں کے مجموعہ کا نام ہے جو پورے سماج کے کنٹرول کے سوا مختلف اور متنوع مقاصد کے لیے کام کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر پرائیویٹ گروہ یا جماعت یا انجمن کی نوعیت رضاکارانہ ہوتی ہے اور ایک مخصوص مقصد کے لیے مثلاً اقتصادی، تعلیمی، تہذیبی، علمی وغیرہ کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اس کے برعکس مملکت رضاکارانہ ہونے کے بجائے جبری ہے۔ یہ جبری طریقہ سے کام کرتی ہے۔ اور اس کا کوئی ایک خاص مقصد نہیں ہوتا بلکہ قانون سازی اور سماجی امور کے کنٹرول کا خصوصی اور عام مقصد ہے۔ سماج کی دوسری تنظیموں کے برخلاف یہ سماج کے تمام افراد کو اور سارے گروہوں پر حاوی ہے اور اپنی جبری طاقت کے ذریعہ اپنے احکام ان پر نافذ کرسکتی ہے۔

مملکت اور قوم : "نیشن" (قوم) کا لفظ اطالوی زبان کے لفظ (Nasci) سے نکلا ہے جس کے معنی پیدائش کے ہیں۔ اس سے مراد وہ گروہ ہے جو ایک ہی جگہ پیدا ہوکر پروان چڑھا ہو۔ قوم ہر اس سماج یا جماعت کو کہتے ہیں جس میں اپنے جداگانہ گروہی تشخص کا اور اپنے ایک ہونے کا احساس پایا جائے

مملکت اور شہری مملکت : جدید مملکت کا لازمی عنصر علاقائیت ہے۔ آج موناکو جیسے چند غیر اہم چھوٹے علاقوں اور معمولی آبادیوں والی مملکتوں کو چھوڑ کر بیشتر مملکتیں وسیع و عریض علاقہ اور معتدبہ آبادیوں پر مشتمل ہیں۔ مثلاً کچھ ملکوں (سوویت یونین، چین، ریاستہائے متحدہ امریکا، برازیل، آسٹریلیا) کا علاقہ تیس لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔ دو ملکوں (ہندستان اور ارجنٹائن) کا دس لاکھ سے زیادہ ہے اور 11 ممالک (سوڈان، الجزائر، کانگو، سعودی عرب، میکسیکو، انڈونیشیا، لیبیا، ایران، منگولیا، پیرو اور چاڈ) ایسے ملک ہیں جن کا علاقہ پانچ لاکھ مربع میل سے لے کر نو لاکھ ستر ہزار تک ہے۔ اس کے بعد بہت سی مملکتیں دس ہزار سے لے کر ایک لاکھ بیس ہزار مربع میل کا علاقہ رکھتی ہیں۔ اسی لیے جدید مملکت علاقائی مملکت ہے۔ اس کے بنیادی خصائص مرکزی حکومت اور بیورو کریسی یا دفترشاہی ہیں اور اگر ریاست جمہوری ہے تو عموماً نمائندگی کا اصول کام کرتا ہے۔ اس کے برخلاف شہری مملکتوں کا آج کہیں وجود نہیں (سوئٹزرلینڈ کی چند کینٹنیں اس سے مستثنیٰ ہیں)۔ 500-300 برس قبل مسیح میں بحر متوسط

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے مشرقی ساحل پر چھوٹی بڑی مختلف النوع شہری مملکتیں قائم تھیں۔ ان کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں تمام امور کا انتظام شہریوں کی جماعت براہ راست کرتی تھی اس میں کسی بیوروکریسی کا وجود نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ اکائیاں نمائندگی کے اصول سے واقف تھیں، نہ ہی انھیں اس کی ضرورت تھی۔

اس اتحاد کے احساس کی دو بڑی بنیادیں ہیں۔ (1)وطن میں ایک ساتھ رہنے سے ہمسائیگی، باہمی ہمدردی اور وطن سے وابستگی کا جذبہ (جسے وطنیت کہتے ہیں) بیدار ہوتا ہے اور (2) مشترکہ تاریخ اور تہذیبی شعور۔ یعنی صدیوں کی مشترکہ روایات کے نتیجہ میں گروہ کے اندر تہذیبی یگانگت اور قومی ورثہ سے لگاؤ کا جذبہ ابھرتا ہے (جسے قومیت کہتے ہیں) قوم اور قومیت کا بنیادی عنصر اتحاد کا یہی جذبہ ہے۔ لیکن عصر حاضر میں قوم اور قومیت کی مختلف بنیادیں پائی گئی ہیں: مثلاً (1) ایک مملکت میں رہنے والے اپنی مشترکہ وفاداری کی بناء پر ایک قوم ہونے کا احساس کریں۔ اس معنی میں قوم اور مملکت ایک ہی کیفیت کے دو رخ ہیں۔ (2) کسی وسیع تر مملکت کے اندر رہتے ہوئے بھی بعض گروہ اپنی جداگانہ تہذیبی تشخص کا احساس کرسکتے ہیں جس کی بنیاد زبان، مذہب، نسل یا علاقہ ہوسکتا ہے۔ اسے "یشنلٹی" کہتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ میں آئرش، اسکاٹ اور ویلش قومیتیں یا سوویت یونین کی اقلیتی قومیات۔ اور (3)افریقہ اور ایشیا کے ممالک جہاں ساجی اتحاد سے زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ قومیت کا نیا تصور محض ایک غیر ملکی یا نوآبادکار طاقت کے خلاف مشترکہ جدوجہد میں مقصد کی وحدت سے پیدا ہوا۔ ان تینوں کے علاوہ اور بھی بہت سی بنیادیں ممکن ہیں۔

قوم اور قومیت کا ارتقاء تاریخی عمل کا نتیجہ ہے۔ قومی شعور کی بیداری کے ساتھ قومی جماعت، تہذیبی اور سیاسی آزادی اور خودمختاری کی طالب ہوتی ہے۔ (اس کیفیت کو قوم پرستی یا نیشنلزم کہتے ہیں)۔ یورپ میں پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح (Reformation) کے نتیجہ میں ہونے والی مذہبی جنگوں کے خاتمہ پر قومی مملکتیں معرض وجود میں آنے لگیں۔ ان کے قیام کی بنیاد صلح ویسٹ فیلیا (1648) (Peace of Westphalia) تھی جس کے نتیجہ میں قرون وسطی کے یورپ کے جاگیردارانہ نظام کی جگہ متعدد آزاد، خودمختار، قومی اور مذہبی سیاسی اکائیوں نے لے لی اور ان قومی مملکتوں کی آزادی، مساوات اور اقتدار اعلیٰ (ساورنٹی) کو ویسٹ فیلیا میں ہوئے بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ قانون اور سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ قومیت کا دوسرا دور پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر شروع ہوا۔ اس جنگ کے دوران امریکی صدر ووڈ رو ولسن نے اپنے چودہ نکاتی اعلان میں جنگ کے بعد وسطی طاقتوں (جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور ترکی) کی سلطنتوں میں شامل مختلف قومیتوں کو حق خود اختیاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں آسٹریا، ہنگری اور ترکی کی سلطنتیں مختلف آزاد قومی اکائیوں میں تقسیم ہو گئیں۔ قوم پرستی کا تیسرا دور دوسری عالمی جنگ کے بعد شروع ہوا جو تقریباً اپنے اختتام پر ہے۔ اس دوران ایشیا اور افریقہ میں تمام ملکوں کی نوآبادیات کے باشندوں میں قومی شعور اور آزادی کی امنگ بیدار ہوئی۔ اور انھوں نے آزادی کی تحریکات چلا کر غیر ملکی استعماری طاقتوں سے نجات حاصل کی۔ یہ سلسلہ ہندستان اور انڈونیشیا کی برطانیہ اور ہالینڈ سے آزادی سے شروع ہوا اور اس کے نتیجہ میں 1960 تک دونوں براعظموں میں بیشتر نوآبادیات نے آزادی حاصل کر لی۔ لیکن "ایک قوم ایک ملک" کا نظریہ تمام صورتوں میں منطبق نہیں ہوتا۔ بہت سے ممالک ایسے ہیں جن میں ایک سے زائد قومیتیں آباد ہیں۔ ان گروہوں کو عموماً تہذیبی آزادی حاصل ہوتی ہے اور اس طرح بجائے چھوٹی چھوٹی سیاسی ٹکڑیوں کے ایک بڑی اور پائیدار کثیر قومی ملکیت قابل ترجیح ہے۔ سوئٹزرلینڈ، یوگوسلاویہ، برطانیہ اور پاکستان اس کی مثالیں ہیں۔

مملکت کی ابتدا: سیاسی فلسفی صدیوں سے مملکت کی ابتدا کے بارے میں سوالات کرتے آئے ہیں۔ لیکن چونکہ انھیں معقول تاریخی، بشریاتی اور ساجیاتی معلومات اور شہادتیں مہیا نہ تھیں، اس لیے انھوں نے مملکت کی ابتدا کے بارے میں طرح طرح کے مفروضات قائم کیے مثلاً خدا کی مشیت، یا گناہ اولین، ساجی معاہدہ، نامیاتی ارتقاء خاندان، نجی ملکیت اور خالص طاقت اور فتوحات۔ نئی تحقیقات کی روشنی میں فرداً فرداً یہ سارے مفروضات غلط ثابت ہوئے ہیں۔

الوہی نظریہ (مملکت) (Divine Right of Kingship): مملکت کی ابتدا سے متعلق نظریات میں شاید سب سے پرانا نظریہ یہ ہے کہ اسے خداوند تعالیٰ نے اپنی مرضی سے قائم کیا۔ یہ خیال مشرق کی قدیم سلطنتوں میں بھی پایا جاتا تھا جہاں کے حکمراں خود کو دیوتاؤں کی اولاد تصور کرتے تھے۔ شروع کے عبرانیوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کی حکومت خدا کی بنائی ہوئی تھی۔ عیسائی کلیسا کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے مملکت کو انسان کے اوپر اس کے گناہوں کے عوض مسلط کیا ہے جس کا ثبوت جنت

سے آدم کا نکالا جاتا ہے۔ مملکت کا الوہی نظریہ قرون وسطیٰ کے دوران بے چوں و چرا جاری رہا۔ اگرچہ روما کی سلطنتِ مقدس میں پاپاؤں اور رومی شہنشاہوں کے درمیان بالادستی کی کشمکش کے دوران یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا کہ دنیاوی حکمرانوں کی حاکمیت براہ راست خدا کا عطیہ تھی یا بالواسطہ پوپ کے وسیلہ سے حاصل ہوئی تھی۔ احتجاجی (پروٹسٹنٹ) تحریک نے قومی بادشاہوں کے اس دعوے کو تقویت پہنچائی کہ حاکمیت اور اقتدار انھیں براہ راست خدا کی جانب سے ملا تھا اور خدا نے خود اپنی مرضی سے انھیں حکمرانی پر مامور کیا تھا۔ اسی خیال نے بعد میں "بادشاہوں کے الوہی حق کے نظریہ" کو جنم دیا جسے انھوں نے ابھرتے ہوئے درمیانی طبقوں کے جمہوری دعووں اور عوامی اقتدار کے نظریہ کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں کے سیاسی انقلابات مطلق العنان بادشاہوں کے حکمرانی کے خدائی حق کے خلاف عوام کے نام سے برپا کیے گئے تھے۔

سماجی معاہدہ (مملکت) (Social Contract Theory) : عوامی اقتدار کا نظریہ جس نے بالآخر بادشاہوں کے خدائی حق کے نظریہ پر فتح پائی، بڑی حد تک اس تصور پر مبنی تھا کہ مملکت کو اصلاً اور عمداً خود انسانوں نے ایک سماجی معاہدہ کے ذریعہ تشکیل کیا جس کی ہر فرد نے منظوری دی۔ سماجی معاہدہ کے نظریات مختلف پیرایوں میں اور مختلف سیاسی مقاصد کے لیے قرون وسطیٰ میں، مذہبی جنگوں اور انگلستان، امریکا اور فرانس کے انقلابات کے دوران پیش کیے گئے۔ لیکن طامس ہابس، جان لاک اور ژان ژاک روسو کے نظریات نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ ان تینوں مفکروں کا مفروضہ ہے کہ سماج میں آنے سے قبل انسان ایک "حالت فطرت" میں تھے جس کی دشواریوں سے مجبور ہو کر انھوں نے آپس میں ایک معاہدہ کرکے مملکت کو قائم کیا تاکہ وہ ان کے امور کو درست کر سکیں۔ ہابس کا مقصد اس نظریہ سے مطلق العنان بادشاہت کا جواز فراہم کرنا، لاک کا محدود، ذمہ دار پارلیمانی طرز کی حکومت کی حمایت اور روسو کا عوامی اقتدار اور جمہوریت کی حمایت کرنا تھا۔

جدید مفکروں کے خیال میں سماجی معاہدہ کا نظریہ ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تاریخی، منطقی اور قانونی اعتبار سے یہ نظریہ بے معنی ہے۔ یہ کہنا کہ سماج انسانوں کے معاہدہ سے تخلیق ہوا غلط ہے۔ کیونکہ سماج کی بنیادوں کے بارے میں اب تک کوئی قطعی علم نہیں ہو سکا ہے۔ اتنا مسلّم ہے کہ سماج انسانوں کے لیے فطری ہے۔ کیونکہ انسان فطری طور سے سماجی اور سیاسی حیوان ہے۔ جماعت سے باہر اس کا بہ حیثیت انسان کے کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ سماج فطری ارتقاء کا نتیجہ ہے جو مملکت سے پہلے بھی موجود تھا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بعد میں مملکت کے ارتقاء میں انسانوں کی اپنی مرضی کو بھی دخل رہا ہو۔ تاریخی اعتبار سے یہ نظریہ اس لیے بھی غلط ہے کہ ہمیں اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ ابتدائی دور میں انسان میں نہ اتنا سماجی شعور پایا جاتا تھا اور نہ وہ اتنا انفرادیت پسند اور آزاد تھا کہ دوسرے باشعور اور آزاد انسانوں سے کوئی سمجھوتہ کرتا۔ ابتدائی انسان، جماعت میں رہتا تھا اور قانون انفرادی کے بجائے اجتماعی ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سماج کی بنیاد حیثیت پر تھی نہ کہ معاہدہ پر۔ معاہدہ سماج کی ابتدا نہیں بلکہ اس کی انتہا ہے۔ قانونی اعتبار سے بھی یہ نظریہ اس لیے غلط ہے کہ کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل نفاذ نہیں ہوتا جب تک اسے مملکت کی منظوری حاصل نہ ہو جبکہ یہ معاہدہ مملکت سے باہر ہوا۔ فلسفیانہ اعتبار سے مملکت کوئی مصنوعی شے نہیں جس سے افراد کا رشتہ رضاکارانہ ہو۔

حالت فطرت اور قانون فطرت کے نظریات میں بہت سی منطقی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مملکت اپنی ضرورت اور افادیت کی بناء پر انسان کے لیے فطری ہے۔ دوسری طرف اس نظریہ کی خوبی اس کے تاریخی رول میں ہے۔ یہ نظریہ بادشاہوں کے الوہی حق اور مطلق العنانی کے خلاف ہتھیار کے طور پر وضع کیا گیا تھا۔ سماجی معاہدہ کے ہر نظریہ نے اپنے دور میں عوام کو متاثر کیا اور اس کے طفیل جمہوریت کی نشوونما اور ترقی کا راستہ ہموار ہوا۔ مملکتی اقتدار اعلیٰ کے جدید نظریہ کے ارتقاء میں بھی اس کا خاصا حصہ رہا ہے۔

طاقت کا نظریہ (Theory of Power) : اس کے مطابق مملکت کی ابتدا جنگی فتوحات اور جبر سے ہوئی۔ اس لیے بعض محققین نے یہ کہا ہے کہ مملکت کی بنیاد چونکہ ناانصافی پر ہے اس لیے لازماً یہ ایک برائی ہے۔ فاتحوں نے مفتوحوں کے علاقہ پر قبضہ کرکے انھیں غلام بنایا اور ان سے بے بیگار لے کر اپنی مملکت کو مضبوط کیا۔ شروع کی مسیحیت رومی حکومت کو اور قرون وسطیٰ کی کلیسا یا مذہبی حکمرانوں کے اقتدار کو طاقت پر مبنی سمجھتی اور ان کی مذمت کرتی تھی۔

نامیاتی نظریہ (Organic Theory) : یہ خیال کہ مملکت اسی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

طرح سے ایک کل ہے جس طرح کوئی بھی دوسرا نامی، جس کے اجزاء اس کے شہری ہیں۔ مملکت نامیاتی کوائف کے مانند شروع ہوئی اور اسی طرح بڑھی۔ یہ سراسر غلط ہے۔ مملکت کی نامیہ سے تشبیہ دینا الگ بات ہے لیکن جسمانی طور سے وہ نامیہ ہرگز نہیں ہے۔

ارتقائی نظریہ یا تاریخی نظریہ (Evolutionary Theory or Historical Theory) : گارنر کا کہنا ہے کہ "مملکت نہ تو خدا کی بنائی ہوئی ہے نہ برتر طاقت کا نتیجہ ہے نہ ہی وہ انسانوں کی کسی قرارداد یا جلسہ کی تخلیق ہے"۔ بلکہ یہ انسان کے تاریک گوشوں میں چھوٹے سے پیانہ پر شروع ہوئی ہوگی اور تب سے آج کی علاقائی مملکت تک ایک طویل اور تاریخی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ارتقائی نظریہ، مملکت کے ارتقاء کو واضح کرتا ہے نہ کہ اس کی قطعی ابتدا کو۔ اس نظریہ کے مطابق مملکت کی تشکیل میں مختلف ادوار اور مراحل میں بہت سے عوامل نے حصہ لیا ہوگا مثلاً قرابت اور خاندان کا رشتہ، مذہب، معاشی سرگرمیاں، طاقت اور سیاسی شعور کی بیداری۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے عوامل یکساں طور پر سے یا ہر مملکت کی تعمیر میں موجود رہے ہوں۔ قدیم یونانیوں کا یہ تصور ہے کہ مملکت انسان کے لیے نہ صرف فطری ہے بلکہ ان کی بقا کے لیے اور انھیں "اچھی زندگی" گزارنے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ ارسطو نے کہا کہ انسان اپنی فطرت سے ایک سیاسی حیوان ہے جو سیاسی جماعت میں رہ کر ہی اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ مملکت سے باہر انسان در حقیقت انسان نہیں بلکہ یا تو وہ دیوتا ہوگا یا درندہ۔ تاریخی اور علمی تحقیقات کے نتیجہ میں مملکت کا فطری، ارتقائی اور افادی نظریہ از سرنو زندہ ہوا اور اسی کو آج مملکت کے آغاز کی معقول ترین تشریح تسلیم کیا جاتا ہے۔

مملکت کا دائرہ کار : مملکت کی ماہیت کے بارے میں دو عام نظریے پائے جاتے ہیں۔ (1) مملکت ایک طاقتی نظام ہے جس کی بنیاد جبر پر ہے اور جس کا طریقہ کار جبر ہے۔ لیکن چونکہ انسان کے معاملات ایک مرکزی طاقت کے بغیر قابو میں نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے امن و امان کا قیام ضروری ہے لہٰذا مملکت کا وجود بھی ایک ناگزیر برائی ہے۔ اور (2) مملکت کوئی ناگزیر برائی نہیں بلکہ لازمی اچھائی ہے۔ یہ منفی معنی میں طاقتی نظام نہیں بلکہ ایک فلاحی نظام ہے۔ انفرادی طور پر انسان یا چھوٹے گروہ اپنی بھلائی کی اتنی کوشش نہیں کر سکتے جتنی کہ عظیم تر گروہ یعنی مملکت اپنے وسائل اور اپنی قانونی طاقت سے سب کے لیے کر سکتی ہے۔ وہی سب کی آزادی و برابری کی ضمانت دے سکتی ہے۔

ان دونوں نظریوں کے تابع کے طور پر مملکتی دائرۂ کار کے بارے میں بھی مندرجہ ذیل نظریے پائے جاتے ہیں :

(1) غیر مداخلت کار مملکت (Laissez Faire State): یعنی مملکت بذات خود ایک برائی ہے لیکن انسانی فطرت کی کمزوریوں کی وجہ سے ضروری بھی ہے۔ لہٰذا اسے امن و امان قائم رکھنے کے سوا سماج کے دیگر مسائل میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مملکت کو فقط یہی فرائض انجام دینے چاہئیں : (الف) افراد اور سماج کی غیر ملکی حملوں سے حفاظت۔ (ب) افراد کی دوسرے افراد کے جسمانی حملوں، ایذا رسانی اور دشنام طرازی سے حفاظت۔ (ج) افراد اور گروہوں کے درمیان قانونی طریقہ سے کیے گئے معاہدوں کی پابندی کرانا۔ (د) پولس اور عدالتوں کا قیام اور انتظام اور (و) امن و امان کی مشنری کو چلانے کے لیے ضروری ٹیکسوں کا نفاذ۔

(2) حریت پسند جمہوری مملکت (Liberal Democratic State): سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بے لگام ترقی کے نتیجہ میں عظیم سماجی برائیاں ــــ استحصال، افلاس، بیماری، گندگی، جہالت وغیرہ پیدا ہوئیں جن کے نتیجہ میں سماج میں طبقاتی نابرابری اور ناانصافی کو عروج حاصل ہوا۔ غیر مداخلت کار مملکت اشرافیہ کے زوال کے بعد نئے بورژوا کار طبقوں کی تعمیر کی ابتدا ہوئی تھی۔ لیکن بعد میں انھیں جمہوریت پسندوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو مملکت کے اقدام کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ مزدوروں کی حالت سدھارنے، تعلیم، صحت عامہ اور صفائی ستھرائی پر توجہ دی گئی۔ مملکت اب محض برائی نہیں رہ گئی بلکہ مثبت اچھائی کا ذریعہ بھی بن گئی۔ مملکت کا دائرۂ کار محض امن و امان کے قیام تک محدود نہیں رہا بلکہ اس سے بڑھ کر فرد اور سماج کی بہبود کی کوششوں تک وسیع ہو گیا۔ مملکت نے فرد کو اس کی قسمت پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کے لیے کم از کم معیار زندگی کی ضامن ہو گئی اور اسے روزگار، روٹی اور مکان کی سہولیات فراہم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ جمہوری مملکتیں اقتصادی ترقی کے لیے مرکزی منصوبہ بندی کر کے، قومی اہمیت کی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے کر اور عوامی افادیتوں (Utilities) کو سرکاری انتظام میں لے کر عوامی بہبود کو بڑھانے کی پوری کوشش کرتی ہیں اور فلاحی مملکتیں کہلاتی ہیں۔

(3) اشتراکی مملکت (Socialist State) کا نظریہ نجی ملکیت کو ساری سماجی برائیوں اور نابرابریوں کی جڑ قرار دیتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کہ مملکت، اہم وسائل پیداوار اور تقسیم و مبادلہ کو اپنے انتظام میں لے اور معاشی نظام کی مرکزی سطح پر منصوبہ بندی کرے تاکہ وہ چند طبقوں کے لیے نہیں بلکہ سارے سماج کی ضروریات کی تکمیل کر سکے۔ اشتراکیت کا مقصد "سماجی انصاف" کا قیام ہے۔ اس نظام معیشت کے حامیوں کی رائے میں چونکہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے اس لیے کام کے لحاظ سے اسے معاوضہ ملنا چاہیے۔

(4)کیمونسٹ مملکت (Communist State) کا نظریہ نجی ملکیت کے مکمل خاتمہ، اور غیر طبقاتی سماجی نظام کے قیام کی تلقین کرتا ہے۔ اس میں تمام وسائل پیداوار و تقسیم سرکاری ملکیت ہوں گے۔ مملکت نہ صرف معیشت کو کنٹرول کرے گی بلکہ کیمونسٹ پارٹی کی نگرانی میں فرد اور سماج دونوں کی زندگی کو کیمونسٹ نظریہ کے مطابق ڈھالے گی۔

کارپوریٹ مملکت : کارپوریٹیزم (Corporatism) اور کارپوریٹ مملکت (Corporate State) کا تصور "عوامی نمائندگی اور اکثریتی اصول پر مبنی جمہوریت کی ضد کے طور پر تشکیل ہوا۔ اکثریت کے اصول کی مختلف حلقوں کی طرف سے مخالفت کی گئی ہے جس میں ملوکیت، اشرافیت اور فاشسیت پیش پیش ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے اکثریت کی حکمرانی کو برا اور نقصان دہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا اکثریت کو نظر انداز کرنا چاہیے یا اس کو بالجبر سرنگون کرنا چاہیے۔ اکثریت کی حکمرانی کے خطرات کے بارے میں کئی یورپی مفکروں نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً امیل فیگیٹ نے اپنی کتاب "نااہلی کا مذہب" (Emile Fagute, The Cult of Incompetence) میں اور آرٹیگائی گاسیٹ نے اپنی کتاب "عوام کی بغاوت" (Ortegay Gasset, The Revolt of the Masses) میں۔ امریکا میں جان اڈمز (John Adams)، جیمس فینی مور کوپر (James Fenimore Cooper) اور ہنری اڈمز (Henry Adams) اسی خیال کے موید تھے۔ عصر حاضر کے کئی عظیم سماجی مفکروں مثلاً رابرٹو مشلز، میکس ویبر، گیتانو موسکا اور ولفریدو پارتیو نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ اکثریت بذات خود حکومت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اکثریت غیر عقلی ہوتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی بلکہ سیاست دان اسے پروپیگنڈا جبر و تشدد کے ذریعے میں ہموار کرلیتے ہیں۔

اکثریتی حکومت کے تصور کو بالکل بن باس دینے کی مکمل ترین کوشش گلڈ، سنڈیکالی یا کارپوریٹ مملکت کے نظریات ہیں۔ ان کے مطابق جغرافیائی نمائندگی کے بجائے منظم پیشہ ور جماعتوں کو نمائندگی دی جانی چاہیے اور مملکت کی حکمرانی کے لیے یہی منظم پیشہ ور گروہ زیادہ اہل ہیں۔ ان میں سے ہر پیشہ اپنے اندرونی معاملات میں اپنی حکومت آپ کے اصول پر کام کرے گا اور کسی مرکزی حکومت یا اکثریت کی حکمرانی یا دباؤ سے آزاد ہوگا۔ گیبریل آنزیو (Gabriele d'Anunzio) نامی ایک اطالوی ادیب اور مفکر نے1919 میں کارپوریٹ مملکت کا ایک خیالی نقشہ تیار کیا تھا جس نے فاشیت کے کارپوریٹ نظریہ پر بہت اثر ڈالا۔ اس کے نظریہ کے مطابق سماج کے تمام گروہوں کو نو بڑے کارپوریشنوں کے تحت منظم کیا جائے جو تنخواہ یاب ملازموں، تکنیکی ملازموں، انتظامی ملازموں، تجارتی ملازموں، عام ملازموں، سرکاری ملازموں اور عہدہ داروں، جملہ پیشوں، صارفین کی کوآپریٹیو انجمنوں اور جہاز رانوں پر مشتمل ہوں گے۔ ایک دسواں کارپوریشن ان تمام معاملات کو سرانجام دینے کے لیے ہوگا جو نوکارپوریشنوں کے حلقہ اثر سے باہر ہوگا۔ اس کارپوریشن کی حیثیت تال میل کے ادارہ کی ہوگی۔ باقی کارپوریشن اپنی اندرونی حکومت میں کلی طور پر آزاد ہوں گے۔

اطالیہ کی فاشسٹ حکومت وہ پہلی حکومت تھی جس نے گلڈ اشتراکیت، سنڈیکالیت، اشتراکیت اور ٹریڈ یونینسٹ کے نظریہ و عمل کو جدید صنعتی نظام کے رجحانات میں پیوست کرنے کی کوشش کی اور نئے حکومتی ڈھانچہ کو "کارپوریٹیزم" کا نام دیا۔ اس نظریہ کے تحت اطالوی معیشت کے اہم زمروں مثلاً جہاز رانی کی صنعت، پارچہ بافی کی صنعت، زراعت وغیرہ کو قومی سطح پر چند "کارپوریشنوں" کے تحت منظم کیا گیا جن میں مالکوں، مزدوروں اور عام پبلک کے نمائندے شامل ہوتے تھے۔ ان کارپوریشنوں کو برائے نام اپنے زمرہ میں شرائطِ ملازمت، تنخواہوں، پیداواری مقداروں اور پیداوار کی لاگت اور قیمت کو طے کرنے کے وسیع اختیارات دیے گئے تھے۔ یہ مختلف کارپوریشن ایک بالاتر "کارپوریشنوں کے ایوان" کے رکن بنائے گئے جس کا کام معیشت کی مرکزی منصوبہ بندی اور نگرانی کرنا تھا۔ لیکن یہ کارپوریٹ نظام درحقیقت جمہوری نظام کا نعم البدل ہرگز نہیں تھا کیونکہ کارپوریشن کی خودمختاری کے پردہ میں مسولینی اور اس کی فاشسٹ پارٹی نے ملک کی ساری معیشت پر اپنے کنٹرول کو مستحکم کر لیا تھا۔ ہر کارپوریشن کے حکام کو فاشسٹ پارٹی منتخب کرتی تھی اور اس کے اختیارات کو مسولینی کی مرضی سے استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کارپوریشنوں میں صارفین کے جو نمائندے شامل کیے جاتے تھے وہ عموماً فاشسٹ پارٹی کے رکن ہوتے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تھے جو فقط مسولینی کی پالیسیوں کی حمایت کرتے تھے۔ اطالیہ میں 1934 میں اس طرح کے 22 کارپوریشن قائم کیے گئے۔ 1939 تک مسولینی ان کارپوریشنوں کے ذریعہ مملکت کے روایتی اداروں کو بے اثر بنا چکا تھا۔ چونکہ اطالیہ میں کارپوریٹ مملکت کا تجربہ بہت تھوڑے عرصہ کے لیے کیا گیا اس لیے اس کے بارے میں قطعی نتائج اخذ نہیں کیے جاسکتے۔

مملکتی اقتدار اعلیٰ کا نظریہ : **مملکتی اقتدار اعلیٰ کا مفہوم** : مملکتی اقتدار اعلیٰ موجودہ علاقائی مملکت کا بنیادی اور امتیازی وصف ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے دو پہلو ہیں۔ قانونی اور سیاسی۔ قانونی اعتبار سے مملکت اپنے علاقہ کے اندر قوانین کو وضع کرنے، ان کی تشریح کرنے اور ان کو نافذ کرنے کا بالاتر اور آزادانہ اختیار رکھتی ہے۔ وہ اپنے ماتحت تمام افراد اور گروہوں پر بالاتر اور ان کی حاکم ہے۔ لیکن خود کسی دوسرے بالاتر حاکم کے ماتحت نہیں۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ کے معنی یہ ہیں کہ مملکت اپنی علاقائی حدود میں اپنے احکام کی اطاعت کرانے کے لیے طاقت کی اجارہ داری رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے طاقت کے جائز استعمال کی اجارہ داری حاصل ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی اندرونی بالاتری اور بیرونی آزادی کو قائم رکھتی ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے یہ دونوں پہلو مربوط ہیں کیونکہ قانونی اقتدار اعلیٰ کے موثر ہونے کا دارو مدار مملکت کی بالاترین جبری طاقت پر ہوتا ہے۔ سماج کی تمام تنظیموں میں صرف مملکت ہی یہ انفرادی خصوصیت رکھتی ہے کہ وہ اپنے ارکان سے بزور طاقت اپنے احکام کی تعمیل کراسکتی ہے۔

لیکن اقتدار اعلیٰ کے معنی مملکت کا عام اقتدار یا اس کی جبری طاقت کا استعمال نہیں۔ فی زمانہ ساورنٹی (Sovereignty) ایک قانونی اور منطقی تصور ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک قانونی انجمن ہونے کی حیثیت سے مملکت کے اندر کوئی ایسا مرکز ضرور ہونا چاہیے جو مملکت کے دائرہ میں واقع ہونے والے تمام قانونی مسائل کو قانونی طور سے حل کرنے کی حتمی اور اعلیٰ ترین طاقت رکھتا ہو جب تک مملکت کے اندر قانونی مسائل پر حرف آخر صادر کرنے والا ایک اعلیٰ ترین مرکز نہیں ہوگا، مملکت اور اس کے قانون کی وحدت برقرار نہیں رہ سکتی۔ مقتدر اعلیٰ وہ ہے جسے آخری فیصلہ کرنے کا اختیار اور قانوناً حق حاصل ہو۔ اقتدار اعلیٰ غیر منقسم غیر محدود اور ناقابل تحدید ہے۔

تاریخی پس منظر : جدید مملکت کا بنیادی اور امتیازی وصف اس کی حاکمیت ہے۔ حاکمیت کے تصور کو علاقائی مملکت کے ارتقاء کی روشنی میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ سولہویں صدی کی مذہبی کشمکش کے نتیجہ میں جدید علاقائی وقومی اور مختار کل مملکت کے وجود میں آنے سے قبل سارا مسیحی یورپ ایک دولت مشترکہ اور ایک تہذیبی، مذہبی اور سیاسی اکائی مانا جاتا تھا۔ قرون وسطیٰ کے دوران اس برادری کے دو ہمہ گیر ادارے تھے۔ کلیسا اور مقدس مسیحی شہنشاہیت۔ اس زمانہ میں سیاسی حاکمیت کے معروف تصور کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اگر نظری اعتبار سے کوئی بالاتر اقتدار پایا جاتا تھا تو وہ پوپ اور شہنشاہ کے درمیان منقسم تھا۔ مرکزی اداروں کے باوجود اس زمانے کا یورپی سماج ایک مقامی سماج تھا جس میں سیاسی اقتدار منتشر تھا اور جسے مقامی جاگیردار مقامی طور پر استعمال کرتے تھے۔ ہر جاگیردار بادشاہ کا ماتحت ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ آزاد حاکم (ساورین) تھا۔ پوپ اور شہنشاہ کے درمیان دنیاوی اقتدار کے لیے رسہ کشی ہونے لگی۔ اس کشمکش میں اپنے اخلاقی انحطاط کے باعث کلیسا میدان ہار گیا۔ پھر ایک طرف مارٹن لوتھر نے احتجاجی اصلاح کا علم بلند کیا تو دوسری طرف یورپ کے مختلف حصوں میں قومیت نے جنم لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تحریک اصلاح کے نتیجہ میں یورپ کی مذہبی جنگیں ختم ہوگئیں تو اس وقت تک متحارب علاقوں میں مختلف قومیتیں اپنے بادشاہوں کی قیادت میں سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے متحد و منظم ہوچکی تھیں۔ سیاسی اقتدار بتدریج بادشاہ کے ہاتھوں میں مرتکز ہوتا گیا جس نے جاگیردار طبقہ کے اقتدار اور مراعات کو پامال کرکے اپنی آزادی مستحکم کی۔ چنانچہ جب پوپ اور شہنشاہ کے خلاف ان قومی حکمرانوں کی بغاوت کامیاب ہوگئی تو صلح نامہ ویسٹ فیلیا (1648) کے تحت قرون وسطیٰ کے جاگیردارانہ یورپ کی جگہ آزاد خود مختار نامذہبی سیاسی اکائیوں کا نیا نظام وجود میں آیا اور ان میں سے ہر ایک اکائی کو ویسٹ فیلیا کے بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ آزاد اور مساوی تسلیم کرلیا گیا۔ ان اکائیوں کی بنیادی خصوصیت علاقائی اقتدار اعلیٰ اور اندرونی سیاسی خودمختاری تھی۔

ہیئت سیاسی کے لیے مملکت (اسٹیٹ) اور اس کے امتیازی وصف کے لیے اقتدار اعلیٰ (ساورنٹی) کی اصطلاحیں سولہویں صدی اور اس کے بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ سیاسی ہیئت اجتماعی (باڈی پالیٹک) کے لیے قدیم یونان میں مدنی آبادی (Polis)، روم میں دولت مشترکہ (Republica)، قرون وسطیٰ میں جماعت شہریاں (Civitas) یا سلطنت (Regnum) کی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اصطلا میں مروج تھیں۔ ان سب کی بنیاد جدید علاقائی مملکت کی بنیاد یعنی ساورنٹی سے مختلف تھی۔ اگرچہ بعض مفکروں کو بالاتر سیاسی اقتدار کے وجود کا مبہم احساس تھا لیکن کسی نے اسے سیاسی سماج کی بنیاد قرار نہیں دیا۔ مثلاً یونانی شہری مملکت ایک جامع تہذیبی مذہبی اور سیاسی نظام تھی جس کا مقصد خود کفالتی اور اخلاقی نمو تھا۔ بعد کے ادوار میں فطری قانون یا ربانی قانون کی بالاتری قائم رہی۔ نکولو میکیاویلی پہلا مفکر ہے جس نے اپنی کتاب حکمران (The Prince) میں پہلی بار لفظ اسٹیٹ (State) کا استعمال نئی حقیقت کے لیے کیا۔ میکیاویلی کے نزدیک یہ بات مسلّم تھی کہ مملکت بالذات مطلق العنان اقتدار اعلیٰ رکھتی ہے۔ یہی اس کی اساس اور یہی اس کا جواز ہے اور یہ کہ مذہب و اخلاقیات سب سماجی نظام کی ضروریات کے تابع ہونے چاہئیں۔

"ساورین" اور "ساورنٹی" کے الفاظ کو سب سے پہلے پندرہویں صدی میں فرانسیسی ماہرین قانون نے استعمال کیا۔ سولہویں صدی میں فرانسیسی سیاسی فلسفی اور ماہر قانون ژان بودین (1530 تا 1597) نے پہلی مرتبہ واضح کیا۔ ساورنٹی کی ماہیت اور خصوصیات سے بحث کی۔ اقتدار اعلیٰ کو جو اولاً حکمراں کا ایک ذاتی وصف خیال کیا جاتا تھا بودین نے پوری مملکت کا عنصر ترکیبی قرار دیا۔ لیکن خود بودین موجودہ سیاسی حقیقت کو نظریہ کی شکل دینے کے باوجود الجھاؤ سے نہیں بچ سکا۔ کیونکہ اس نے اقتدار اعلیٰ کو مملکت کے ایک خاص عضو یعنی بادشاہ کی طاقت کے مترادف قرار دیا تھا۔

بودین کی تعریف کے مطابق اقتدار اعلیٰ مملکت کے اندر شہریوں اور رعایا پر غالب وہ اعلیٰ ترین اقتدار ہے جو (دوسرے حکام کے) قوانین کا پابند نہ ہو۔ لیکن اس نے سیادت کو فطری و ربانی قانون اور ملکی قانون کا پابند بتایا۔ بودین کے نظریہ کی خامی یہ ہے کہ اگرچہ اس کے مقتدر اعلیٰ پر یہ سب پابندیاں عائد ہیں لیکن ایسے افراد یا اداروں کا وجود نہیں پایا جاتا جو بالآخر مقتدر اعلیٰ کی دسترس سے آزاد رہ کر اس پر ان پابندیوں کو نافذ کر سکیں۔

بودین کے بعد ایک ڈچ ماہر قانون اور بین الاقوامی قانون کے بانی ہیوگو گروتیس (1583-1645) نے بھی اس سے ملتی جلتی تعریف کی یعنی یہ وہ بالاترین سیاسی اقتدار ہے جو اس شخص کو ودیعت کیا جائے جس کے اعمال کسی دوسرے شخص کے تابع نہ ہوں اور جس کی مرضی کو ردّ نہ کیا جا سکے۔ اس نے یہ وضاحت بھی کی کہ مملکت پر بیرونی میدان میں عائد ہونے والی پابندیاں اس کی حاکمیت کے منافی نہیں ہیں۔

سترہویں صدی میں انگریز فلسفی طامس ہابز (1676- 1588) نے اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ وہ مملکت کے مطلق العنان اقتدار کا حامی تھا۔ اگرچہ اس کے نزدیک مقتدر اعلیٰ کے اقتدار کو کسی ایک شخص یا کسی جماعت کے سپرد کیا جا سکتا ہے لیکن اس نے شاہی اقتدار کو ترجیح دی۔ انگلستان کی اس وقت کی خانہ جنگی اور پیورٹن انقلاب کے تجربات نے اس کو یہ باور کرادیا تھا کہ ایک مطلق العنان حکمران ہی مملکت کے اندر امن و امان قائم رکھ سکتا ہے۔ ہابز کے نزدیک قوانین صحیح معنوں میں سیاسی مقتدر اعلیٰ کے احکام کے سوا کچھ نہیں جو خود کسی بھی قانونی پابندیوں کے تابع نہیں۔ ربانی یا فطری قوانین مقتدر اعلیٰ کے نزدیک کوئی قانونی اہمیت نہیں رکھتے سوائے اس کے کہ وہ خود اپنی تشریح کے مطابق انھیں قبول کرے۔

ہابز کے برخلاف دوسرے انگریز فلسفی جان لاک (1704-1632) نے محدود دستوری بادشاہت اور پارلیمانی حکومت کی حمایت کی۔ اس نے مملکت اور حکومت میں تفریق کرکے اول الذکر کو سماجی معاہدہ پر مبنی اور دوسرے کو سیاسی جسد کے اعتماد پر مبنی قرار دیا۔ اس طرح اس نے حکومت کے محدود مقتدر اعلیٰ کا نظریہ پیش کیا۔

سترہویں صدی میں شاہی مطلق العنان کے دفاع کے ردّ عمل نے اٹھارہویں صدی میں اقتدار اعلیٰ کے عوامی نظریہ اور جمہوریت کو فروغ دیا۔ اس کا ترجمان فرانسیسی فلسفی ژان ژاک روسو (1778- 1712) ہے۔ اس نے اقتدار اعلیٰ کا منبع کسی فرد یا جماعت کے بجائے ساری ہیئت سیاسی یا مشیت عامہ کو قرار دیا۔ مشیت عامہ کا اقتدار اعلیٰ اس کے نزدیک مطلق العنان اور غیر محدود ہے۔ لیکن روسو کا نظریہ باوجود اس خوبی کے کہ اس نے عوامی اقتدار اعلیٰ کے ذریعہ حاکمیت اور آزادی کو باہم پیوست کردیا اور جمہوریت کا راستہ ہموار کیا اس لحاظ سے ناقابل عمل ہے کہ وہ نمائندہ حکومت کے امکان کا قائل نہیں تھا۔ یہ امر بدیہی ہے کہ موجودہ دور میں براہ راست جمہوریت کا قیام ممکن نہیں۔

مملکتی اقتدار اعلیٰ کا قانونی نظریہ جسے جریمی بنتھم (1832-1748) اور جان آسٹن (1859- 1790) نے پیش کیا بعض ترمیمات کے ساتھ یہ بیسویں صدی کا وسیع پیمانہ پر قابل قبول نظریہ ہے۔

اقتدار اعلیٰ کا مرکز: اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) ایک منطقی اور

قانونی تصور ہے۔ جان آسٹن اور اس سے پہلے سر ولیم اسٹون اور اس کے بعد اے. وی. ڈائسی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر حکومت میں قانونی اقتدار اعلیٰ کا ایک متعین اور واضح مرکز ہوتا ہے خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو یا ادارہ۔ مثلاً بلیک اسٹون اور آسٹن نے برطانوی پارلیمنٹ کو اور ڈائسی نے ملکہ باجلاس پارلیمنٹ کو مملکت برطانیہ کے اندر قانونی سیادت کا مرکز قرار دیا۔ لیکن یہ مفروضہ غلط ہے۔ جدید مملکت میں اقتدار اعلیٰ کسی ایک متعین مرکز میں مرتکز نہیں ہوتا بلکہ مختلف مرکزوں یا اداروں یا سطحوں میں منتشر (Diffused) ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال وفاقی نظام ہے۔

آمریت میں مقتدر اعلیٰ کی نشان دہی بہت آسان ہے لیکن جمہوریت میں ہم اقتدار اعلیٰ کی دو سطحیں پاتے ہیں۔ (1) حتمی طور سے اور آخری سطح پر جمہوری مملکت کا مقتدر اعلیٰ خود اس کا دستور اساسی ہوتا ہے کیونکہ یہی مملکت کو ایک قانونی انجمن کی حیثیت سے وجود میں لانے کا سبب اور اس کی تنظیم اور کارکردگی کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس دعوے کے خلاف یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ زندہ اشخاص کی جماعت کو مقتدر اعلیٰ ہونا چاہیے نہ کہ محض یک غیر جاندار قانونی نقشہ کو۔ یعنی حتمی اقتدار اعلیٰ اس دستور ساز جماعت کو حاصل ہے جو دستور کو وضع کرتی، اس کو بدل سکتی اور اس میں ترمیم کر سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دستور کی حیثیت ایک مستقل اور مسلسل طور سے کام کرنے والے منصوبہ کی ہے جو مملکت کی تمام کارروائیوں کو بلا توقف کنٹرول کرتا ہے۔ دستور ساز جماعت محض خاص وقفوں پر، جبکہ دستور معطل ہوتا ہے، یا اگر وہ دستور میں ترمیم کرتی ہے تو خود اس دستور کے مقررہ ضابطوں کے تحت حرکت میں آتی ہے۔ لہٰذا وہ دستور مقتدر اعلیٰ ہے جو مستقل طور سے کنٹرول کرتا ہے نہ کہ وہ جماعت جو شاذ و نادر کام کرتی ہے۔ (2) دوسری سطح پر اور دستور کے حتمی اقتدار اعلیٰ کے تحت، وہ جماعت جو روزمرہ کے عام قوانین کو وضع کرتی ہے "فوری" مقتدر اعلیٰ کہلائی جاسکتی ہے۔ اس قانون ساز جماعت یا ادارہ کے مختلف نظاموں میں مختلف نوعیت ہوتی ہے۔ امریکا میں قانون سازی اور قانون کے اطلاق کا کام کانگریس اور صدر اور برطانیہ میں پارلیمنٹ اور ملکہ کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

اس مقام پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ وہ جماعت جو قانون بناتی ہے قوم یا رائے عامہ یا رائے دہندگان کی جماعت کی طرف سے دیے گئے اختیار سے کام کرتی ہے لہٰذا رائے عامہ یا رائے دہندگان کی جماعت کو فوری مقتدر اعلیٰ مانا جانا چاہیے۔ لیکن عوامی اقتدار اعلیٰ یا قومی یا رائے دہندگان کے اقتدار اعلیٰ کا تصور محض سیاسی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ قانون ساز جماعت کے خالص قانونی اقتدار اعلیٰ کا کام قانونی مسائل کا خالص قانونی طریقہ سے دستور کی ماتحتی میں اور کسی حد تک رائے عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے آخری تصفیہ کرنا ہے۔ رائے دہندگان سیاسی اعتبار سے اقتدار اعلیٰ کے حامل ہوسکتے ہیں لیکن وہ روزمرہ کی زندگی میں قانونی مقتدر اعلیٰ کے قانونی فرائض انجام دینے کے قابل نہیں۔

جان آسٹن کا نظریہ : فلسفہ سیاست اور اصول قانون میں

جان آسٹن کے نظریہ اقتدار اعلیٰ کو وحدانی نظریہ بھی کہا جاتا ہے جو کافی بحث کا موضوع رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جریمی بنتھم اور آسٹن کے اثباتی مکتبہ فکر نے اقتدار اعلیٰ کی قانونی نوعیت کو واضح کرنے میں فیصلہ کن رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ بعض جزوی خامیوں کے باوجود یہی نظریہ دور حاضر کا مسلّم الثبوت نظریہ ہے۔ اس کا حریف نظریۂ تکثیریت، حقائق کے بوجھ تلے دب کر فراموش ہوچکا ہے۔

آسٹن کے نظریہ کو خود اسی کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی متعین انسانی حاکم، جو کسی دوسرے حاکم کی عادۃً اطاعت نہ کرتا ہو۔ کسی سماج میں مقتدر اعلیٰ ہے تو وہ سماج (مع حاکم کے) سیاسی اور آزاد سماج کہلائے گا۔ اس کے مطابق قانون آسٹن کے نزدیک ان تمام ضوابط کا مجموعہ ہے جنھیں وہ انسان جو سیاسی طور پر حاکم ہوں ان انسانوں پر نافذ کریں جو سیاسی طور پر محکوم ہوں۔ دوسرے لفظوں میں سیاسی حاکم کسی متعین (Determinate) شخص یا جماعت کو ہونا چاہیے۔ انگلستان کے معاملہ میں آسٹن نے قانونی اقتدار اعلیٰ کا مرکز، اعلیٰ ترین قانون ساز جماعت یعنی پارلیمنٹ کو قرار دیا۔ فقط اسی حاکم کے جاری کردہ احکام قوانین کا درجہ رکھتے ہیں اور اس حاکم کا اقتدار مطلق العنان غیر محدود اور ناقابل تقسیم ہے۔

آسٹن کے نظریہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت اس نے ثبوتی قوانین کو ایک طرف اخلاق سے اور دوسری طرف رواجی قانون اور روایات سے ممیز کیا اور اس طرح مملکت کے وضعی قانون کی برتری اور لزوم کو ثابت کیا۔ چونکہ مملکت ایک ایسی منفرد تنظیم ہے جس کا فریضہ سارے سماج کو متحد کرنا، اس کے معاملات کو منضبط کرنا اور اس کے تمام کاموں میں تال میل پیدا کرنا ہے، لہٰذا آسٹن کے خیال میں

اسے اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لیے مقتدر اعلیٰ اختیارات اور طاقت کی اجارہ داری دینا نہ صرف روا بلکہ ناگزیر ہے۔ ورنہ نہ تو مملکت، اس کی تنظیم اور اس کے قوانین کی وحدت برقرار رہے گی اور نہ ہی سماج میں نظم و ضبط اور وحدت قائم رہے گی۔

ممنوعہ مال (Contraband): بین الاقوامی قانون کی اصطلاح میں ممنوعہ مال (Contraband) اس سامان کو کہتے ہیں جو جنگ کے لیے ضروری ہو اور جو کسی غیر جانب دار ملک سے دشمن کو پہنچایا جارہا ہو۔ ایسے سامان کو مخالف فریق اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے اور کسی ملک میں لا سکتا ہے۔ بین الاقوامی قانون نے ایسے سامان کی قطعی تفصیل نہیں بتائی جسے مال ممنوعہ کی تعریف میں لایا جاسکتا ہے۔

منافع (Dividend): کمپنی لاء کی اصطلاح میں ڈیوڈنڈ (Dividend)اس منافع کو کہتے ہیں جو کسی حصہ دار کو اس کے حصے کے تناسب سے کمپنی کی جانب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ کمپنی کا وہ منافع ہے جو حصہ داروں کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے۔ ایک کمپنی جو تجارتی کاروبار کرتی ہے وہ منافع ہی کے غرض سے قایم کی جاتی ہے۔ اس لیے حصہ داروں میں منافع کی تقسیم ضروری ہے۔ اس کی بابت مخصوص ذکر میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کرنے کی ضرورت تھی۔

منرو اصول (Monroe Doctrine): منرو اصول امریکا کی خارجی پالیسی کے اس اصول کو کہتے ہیں جو روس اور یورپ کو امریکا کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنے سے باز رکھنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ یہ اصول دراصل امریکی صدر جیمس منرو (James Monroe) کا وہ اعلان ہے جسے انھوں نے کانگریس کے نام اپنے سالانہ پیغام میں 2/ دسمبر 1823 کو کیا تھا۔ اُس وقت اسے ریاستہائے متحدہ امریکا کی خارجہ پالیسی میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل تھی۔ منرو کا خیال تھا کہ قدیم دنیا اور نئی دنیا (شمالی اور جنوبی امریکا) کے ممالک اپنا ایک دوسرے سے مختلف نظام رکھتے ہیں اور ان کا یہ امتیازی وصف باقی رہنا چاہیے۔ منرو کے پیغام کے چار بنیادی نکات درج ذیل ہیں :

(1) ریاستہائے متحدہ امریکا یورپ کے داخلی امور یا ان کی آپسی جنگ میں مداخلت سے گریز کرے گا۔

(2) ریاستہائے متحدہ امریکا نصف کرۂ ارض غربی (Western Hemisphere) میں موجود نوآبادیات کو تسلیم کرتا ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔

(3) نصف کرۂ ارض غربی کو مستقبل میں بہ آسانی نوآبادیات کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

(4) یورپی طاقتوں کی جانب سے نصف کرۂ ارض غربی پر اثر و نفوذ کی کسی بھی قسم کی کوئی کوشش براہ راست ریاستہائے متحدہ امریکا پر جارحیت متصور ہوگی۔

اس کا مقصد نصف کرۂ ارض غربی کو خارجی مداخلت اور تسلط سے تحفظ عطا کرنا تھا۔ منشا یہ تھا کہ براعظم امریکا کے تمام علاقے ریاستہائے متحدہ امریکا کے زیراثر ہیں اس لیے کسی بھی خارجی طاقت کو اس خطہ میں مداخلت کرنے، نفوذ کرنے یا اپنی نوآبادی بنانے کی مطلق اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس اعلان کا فوری سبب یہ تھا کہ یورپی اتحاد جنوبی امریکا میں مداخلت کرکے وہاں کی نوآباد ریاستوں پر اسپین کا تسلط پھر سے قائم کرنا چاہتا تھا جو حال ہی میں اندرونی شورش کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا۔ صدر منرو نے جیسا کہ ان کے پیغام کے بنیادی نکات سے واضح ہے یہ ضمانت بھی دی تھی کہ اس وقت براعظم امریکا میں یورپی ملکوں کی جو نوآبادیات ہیں جیسے کینیڈا ان سے ریاستہائے متحدہ امریکا کوئی تعرض نہیں کرے گا اور نہ ہی وہ خود یورپیوں کے باہمی تنازعات یا ان کی آپسی جنگوں میں کوئی مداخلت کرے گا۔ اس پالیسی کو برطانیہ نے فوراً ہی تسلیم کرلیا تھا۔

منرو اصول اصلاً امریکا کی خارجہ پالیسی کا نام ہے جسے منرو نے یورپ کو امریکا کے داخلی امور میں مداخلت سے باز رکھنے کے لیے وضع کیا تھا کیونکہ امریکا اس وقت (1823) فوجی طاقت کا مالک نہیں تھا اور وہ برطانیہ کے بحری بیڑہ کی ممکنہ جارحیت کا اسی کے ذریعہ دفاع کرسکتا تھا۔ نصف کرۂ ارض غربی میں اس کی خلاف ورزیاں بھی ہوئیں لیکن امریکا نے اسے نظرانداز کردیا کیونکہ منرو اصول کی حیثیت محض پالیسی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تیس برسوں میں یہ اصول کی حیثیت سے معروف نہیں تھا اور اسے قانونی حیثیت حاصل نہیں تھی لیکن منرو کے جانشین عام طور پر اس کی تائید کرتے رہے ہیں۔ 1870 کے بعد منرو اصول کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ امریکا جب عالمی طاقت کی حیثیت سے ابھرنے لگا تو صدر تھیوڈور روز ویلٹ نے 1904 میں اس تصور کو مزید مستحکم کیا۔ 1930 سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

امریکا نے پورے براعظم امریکا کی خارجہ پالیسی پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ اس نے کیوبا میزائل بحران میں منرو اصول کو نافذ کیا اور اب منرو کی خارجہ پالیسی منرو اصول کے نام سے معروف ہے۔

منشور اٹلانٹک (Atlantic Charter): دوسری جنگ عظیم کے دوران 1941 میں وزیراعظم برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے پریسیڈنٹ آف ڈی روزولٹ نے امن کے مقصد کے لیے مشترکہ پروگرام بنایا تھا جو سرکاری دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پروگرام میں بعض اہم مسائل کے متعلق چند اصولی فیصلے کیے گئے تاکہ ملک کی سالمیت کے خلاف جارحانہ کارروائی کی خدمت، کسی ملک کے علاقے کو مقامی باشندوں کی مرضی کے خلاف دوسرے ملک کے اقتدار میں رکھنے کی مخالف، ان ملکوں کے اقتدار اعلیٰ کی دوبارہ بحالی جنھیں زبردستی اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ تجارتی پابندیوں میں نرمی اور سہولت خام اشیا کے فصول کے لیے تمام ممالک کو سہولتوں کی فراہمی، دنیا کے معاشی اور معاشرتی نظام میں استحکام کے کھلے سمندروں میں جہازرانی کی آزادی، قوت کے استعمال سے اکتساب جارحانہ کارروائی کرنے والے ملک کو بے ہتھیار کرنا شامل ہیں بعد میں اس منشور کو اقوام متحدہ کے اعلانٰ (Declaration) میں شامل کیا گیا (یکم جنوری 1942)۔

منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission): تحریک آزادی کے زمانہ میں ہندستان کے رہنماؤں نے آزاد ہندستان کی تشکیل کے خاکہ میں رنگ آمیزی شروع کردی تھی۔ جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے ایک منصوبہ بندی کمیٹی کا قیام عمل میں لانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اسی لیے جب مجلس آئین ساز نے آئین وضع کیا تو اس میں اس نے "ریاستی پالیسی کے رہنما اصول کو چوتھے باب میں جگہ دے کر ہندستان میں اقتصادی منصوبہ بندی کی نظریاتی بنیاد رکھی۔ ان اصولوں کے مطابق ہندستان میں ایک ایسا فلاحی سماج قائم کرنا ہے جس میں ہر شخص کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع فراہم ہوسکے۔ ان اصولوں کو عملی جامہ پہنانے اور ملک سے افلاس، ناخواندگی اور بیماری کو دور کرنے کی غرض سے حکومت ہند نے اقتصادی ترقی اور سماج میں تبدیلی کے لیے منصوبہ بندی کی راہ اختیار کی اور 1950 میں مرکزی کابینہ کی ایک قرارداد کے ذریعہ ملک میں ایک منصوبہ بندی کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی حیثیت ایک مشاورتی ادارہ کی ہے۔ یہ ادارہ وزیراعظم ہند کی سربراہی میں اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کا نائب صدر اس کی پالیسیاں طے کرتا ہے اور اس کی کارکردگی کے لیے ذمہ دار ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن ملک کے مجموعی مادی اور انسانی وسائل اور ضروریات کا تخمینہ لگا کر پنج سالہ منصوبہ تیار کرتا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کی تیاری کے ساتھ ساتھ یہ مختلف پراجکٹوں کی کارکردگی اور ان کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کی سفارشات مرکزی کابینہ اور قومی ترقیاتی کونسل سے منظور ہو جانے کے بعد پارلیمنٹ میں پیش کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد پنج سالہ اور یکسالہ منصوبوں کی اسکیمیں اور ان کے لیے امدادی رقوم مرکزی بجٹ میں شامل کی جاتی ہیں۔ ریاستی منصوبوں کی تکمیل ریاستی حکومتوں کے ذمہ ہوتی ہے۔

منصوبہ کمیشن انتظامی اختیارات کا حامل نہیں ہے۔

منکیر نکیر: یہ دو فرشتوں کے نام ہیں جو قبروں میں مردوں سے سوالات کرتے ہیں اور ان سے ان کے دین و مذہب خدا رسول اور کتاب کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ صحیح جواب دینے والوں کو قبر میں راحت پہنچاتے ہیں اور غلط جواب دینے والے کو عذاب اور تکلیف دیتے ہیں۔

موطا امام مالک: امام دارالہجرت مالک بن انس (متوفی 179ھ / 795ء) کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ وہ ان چار ائمہ اسلام میں تھے جن کے اجتہادی مسلک پر مسلمان برابر عمل کرتے رہے ہیں۔ موطا فقہی احکام کے متعلق روایتوں کا ذخیرہ اور علوم مدینہ کا خزانہ ہے اس میں احادیث کے علاوہ اہل مدینہ کا تعامل اکابر صحابہ و تابعین کے آثار اور فتوے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ موطا پامال اور روندے ہوئے راستہ کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موطا کی روایات و آثار علما و فقہا کے نزدیک متفق علیہ اور معمول بہ ہیں۔ امام مالک نے ان ہی شیوخ کی روایتیں نقل کی ہیں جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے۔ پہلے یہ دس ہزار حدیثوں پر مشتمل تھی لیکن انتخاب کے بعد اس کی روایتوں کی تعداد اس طرح ہے۔

600 مسند و مرفوع، 2345 مرسل، 613 موقوف روایات، 285 تابعین کے اقوال و فتاویٰ اور 75 بلاغات مالک۔ عباسی خلیفہ منصور نے ایک دفعہ امام صاحب سے کہا میں فقہی اختلافات سے گھبرا گیا ہوں۔ آپ حجاز کے علمائے سرخیل میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی تصنیف موطا کو

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

خانہ کعبہ میں آویزاں کردوں تاکہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ملک میں اس کی نقلیں بھیجوں تاکہ اس کے مطابق فتوے دیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ صحابہ تمام اطراف ملک میں پھیل گئے تھے ہر ایک کے فتوے اپنے اپنے علاقہ میں مقبول ہیں۔ ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جو صحت و غلطی دونوں کرسکتا ہے تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں۔ فقہاے مجتہدین میں یہ شرف امام مالک ہی کو حاصل ہے کہ خاص ان کے قلم سے یہ مکمل مجموعہ مرتب ہوا ہے۔ موطا سے پہلے اور اس کے زمانے میں جو مسانید اور مجموعہ فتاوئی مرتب کیے گئے ان میں کسی کو امام مالک کے موطا جیسی شہرت و مقبولیت نصیب نہیں ہوئی ۔ اس سے پہلے کتابوں کا اصل دارو مدار صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاوئی پر تھا۔ لیکن امام مالک نے صحیح حدیثوں کو اصلی مدار بنایا ہے اور صحابہ و تابعین کے آثار و اقوال کو ضمنی و ثانوی درجہ دیا ہے۔

گو موطا کو صحاح سے کمتر سمجھا جاتا ہے لیکن محققین قدما متاخرین نے اس کو بخاری سے بھی فائق قرار دیا ہے۔ امام صاحب سے موطا تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے۔ اس کے 16 نسخے مشہور ہیں لیکن معتبر و متداول نسخے ان چار حضرات کے ہیں۔

(1) یحٰی بن یحٰی معموری (2) ابن بکیر (3) ابو مصعب (4) ابن وہب

ان چاروں میں بھی زیادہ مشہور و متداول یحٰیی کی روایت والا نسخہ ہے۔ موطا کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ حقدین میں قاضی ابن عبدالبر مالکی 463ھ/ 1071ء کی شرح استیعاب و التمہید اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ دہلوی 1176ھ/ 1762ء کی مسوی مصفی زیادہ مشہور ہیں۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی مبسوط شرح اور خیر المسالک بھی مفید ہے۔

موطا امام محمد: امام مالک سے ان کے متعدد تلامذہ نے موطا کی روایت کی تھی اس فہرست میں امام محمد کا نام بھی ہے جن کو موطا نے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس میں امام مالک کے ساتھ دوسرے شیوخ کی روایات بھی تحریر کی ہیں اور احادیث نقل کرنے کے بعد اپنا اور امام ابو حنیفہ کا مسلک بھی بتا دیا ہے اور جو روایتیں ان کے مسلک کے خلاف ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہوگیا ہے۔

میٹنگ (Meeting) : کمپنی کے حصص داروں یا ممبران کی مختلف میٹنگ منعقد ہوسکتی ہے۔ حصہ داروں کی پہلی میٹنگ دستوری میٹنگ (Statutory Meeting) کہلاتی ہے۔ کمپنی لاء کے تحت کسی کمپنی کے کاروبار شروع ہونے کی تاریخ سے چھ ماہ کے اندر پہلی میٹنگ کا انعقاد ضروری ہے۔

میعاد شروع ہونے کے بعد جاری رہے گی (Continuous Running of Time) : جب میعاد شروع ہوجائے تو وہ اس صورت میں بھی جاری رہے گی جب میعاد شروع ہونے کے بعد ناقابلیت متذکرہ صدر بیدار ہوگر شرط یہ ہے کہ جب کسی دائن کی جائداد کے متعلق صداقت نامہ اہتمام ترکہ اس کے مدیون کو دیا جائے تو اس میعاد میں جو قرضہ وصول کرنے کے مقدمہ کے لیے مقرر ہے وہ مدت اس وقت تک محسوب نہیں ہوگی جب تک اس کی مہتمی کی حیثیت باقی رہے۔

جب ایک مرتبہ میعاد شروع ہوجائے تو کسی درمیانی عوارض کے داخل ہونے سے نہیں رک سکے گی۔ مثلاً جب میعاد آغاز ہوجائے تو فریقین کی وفات سے وہ رک نہیں سکتی اسی طرح درمیانی ناقابلیت کی وجہ سے یا کسی اور واقعات مابعد کے باعث جو قانون کے کسی استثنٰی میں داخل نہ ہو میعاد شروع ہونے کے بعد رک نہ سکے گی اسی طرح دیوالیہ قرار پانے سے میعاد میں توسیع نہیں ہوسکے گی البتہ میعاد شروع ہونے کے وقت کوئی ناقابلیت قانونی میں مبتلا ہو تو دفعہ نمبر 6 اور نمبر 7 کے تحت میعاد محفوظ رہ سکتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

میکائیل : یہ خدا کے ایک مقرب فرشتے کا نام ہے یہ خدا کی طرف سے جانداروں کو روزی پہچانے کی خدمت پر مامور ہیں۔

میکرو اکنامکس : دیکھیے کلی معاشیات (Macro-Economics)۔

میکس ویبر (Max Weber, 1864-1920) : میکس ویبر مشہور جرمن سماجیات داں گزرا ہے۔ ویبر کا تعلق ایک دانشور گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ وکیل تھا۔ ابتدا ہی سے ویبر کو ایسا ماحول ملا کہ وہ اس کی نشوونما اور ذہنی تربیت کے لیے انتہائی سازگار تھا۔ اس نے ہائیڈل برگ اور برلن کی جامعات میں تعلیم حاصل کی جہاں اس نے قانون، معاشیات، تاریخ اور فلسفہ میں کافی عبور حاصل کیا۔ ویبر کی صحت کچھ ایسی نہ تھی کہ وہ یونیورسٹی میں باقاعدہ کام کرسکتا اس لیے بالآخر اس کو خانگی طور پر اپنی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تحقیقاتی سرگرمیوں پر اکتفا کرنا پڑا۔ ویبر کے ذہن و شعور اور اس کی فکر کے نشوونما پر کانٹ اور کارل مارکس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اس نے سماجیات، معاشیات، مذہب اور تاریخ کے میدانوں میں کافی تحقیقاتی کام کیے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسے ان تمام علوم میں اہمیت حاصل ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اگر اس کی تمام تحقیقات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک ماہر سماجیات تھا۔ ویبر کا مشہور مقالہ "پروٹسٹنٹ اخلاق اور سرمایہ داری کی روح" ہے جس نے 1904 اور 1905 کے بعد سے دنیائے فکر میں بہت اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ اس تحقیق میں ویبر نے یہ پتہ چلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کے عقائد اور اس کے اقدار کا سماجی عمل اور سماجی برتاؤ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اس نے پروٹسٹنٹ تحریک اور سرمایہ داری میں رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ تحقیق ویبر کے لیے آئندہ تقابلی مطالعہ مذہب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ ویبر نے چند بڑے مذاہب مثلاً یہودیت، کنفیوشیزم اور ہندومت کا مطالعہ کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ کس طرح عقائد اور اخلاقی نظام سماجی اداروں کی تشکیل کے اہم محرک ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح ویبر نے سماجی عمل کا تجزیہ کیا۔ اس تجزیہ کے دوران ویبر نے بے شمار تصورات اور اصطلاحات وضع کیے اور ان کی توضیح و تشریح کرکے سماجیات کے سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کیا۔ سماجی عمل کے مطالعہ میں ویبر نے گروہی تشکیل کے طریق پر توجہ دی اور پھر اس طریق کے مضمرات اور محرکات پر بحثیں کیں۔ گروہی تشکیل اور اس کے مضمرات کا تجزیہ سماجیات کے سرمایہ میں ایک اہم کام ہے۔ ویبر کا ایک اور اہم کارنامہ اقتدار یا لیڈرشپ کی اقسام پر بحث ہے۔ مختلف قسم کے اقتدار اور لیڈرشپ کا ویبر نے تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا ایک عظیم کارنامہ آئیڈیل ٹائپ یا مثالی ٹائپ کی اصطلاح ہے جس کے ذریعہ ویبر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسانی گروہ مختلف ماحولیاتی ٹائپ کے نمونوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ اور جب تک ان کا بغور اور منفرد مطالعہ نہ کیا جائے کسی گروہ کے سماجی عمل کا تجزیہ اور اس کی تفہیم ممکن نہیں۔

سماجی عمل کی تعریف وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

(1) سماجی عمل کرنے والے کے علاوہ دوسرے لوگوں کے ماضی حال یا مستقبل میں ہونے والے رد عمل یا پچھلے برتاؤ سے متاثر ہوسکتا ہے۔

(2) ہر باہری عمل (Overt Action) ضروری نہیں کہ سماجی ہو مثلاً بت پرستی جس میں رابطہ صرف بت اور پجاری میں ہوتا ہے۔ انفرادی عمل ہے۔

(3) جب تک دو افراد یا گروہوں میں کوئی حتمی یا مثبت رابطہ قائم نہ ہو تب تک ان کا برتاؤ سماجی برتاؤ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً سڑک پر چلنے والے اگر بغیر بات چیت کیے گزر جائیں تو ان کا برتاؤ غیر سماجی ہوگا اگر وہ آپس میں بات چیت کریں یا ٹکرا جائیں اور لڑنے لگیں تو یہ سماجی برتاؤ ہوگا۔

(4) کئی لوگوں کا ایک جیسا برتاؤ سماجی برتاؤ نہیں ہے۔ جیسے بارش ہونے پر سڑک پر چل رہا ہر آدمی چھتری کھول لیتا ہے یا شیڈ میں چلا جاتا ہے تو یہ کوئی سماجی نہیں بلکہ انفرادی برتاؤ ہوگا لیکن ایک ڈرل ماسٹر کی کسرت کی نقل سماجی عمل ہے۔

انھوں نے سماجی عمل کی چار اقسام بتائی ہیں۔ مثلاً منطقی، تجزیاتی، جذباتی اور روایتی۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے نظریات میں سرفہرست ہیں:

(1) سماجی طبقات اور ان کا رتبہ

(2) اقتدار کا نظریہ

(3) سماجی تبدیلی اور سرمایے داری

(4) سماجی نظام

(5) مذہب کی سماجیات

(6) نوکر شاہی

ان سب نظریات میں نوکر شاہی کا نظریہ بہت انوکھا ہے۔ سماج میں نوکر شاہی یا لال فیتہ شاہی کے سبب افیسر کو بے حد اختیارات مل جاتے ہیں ان کی ذاتی زندگی اور دفتری زندگی بالکل علاحدہ ہوجاتی ہے۔ وہ سماج کے لیے نہیں بلکہ اپنی نوکری کے لیے وفادار ہوتے ہیں۔ یہ نظام سرمایہ دارانہ سماج میں بہتر طور پر چل سکتا ہے۔

مذہب کی سماجیات میں انھوں نے "پروٹسٹنٹ اخلاقیات اور سرمایہ داری کی روح" مقالہ لکھا اس میں بھی انھوں نے نوکر شاہی اور سرمایہ داری کا رشتہ بیان کیا ہے۔

میکس ویبر ایک نسبتاً سنجیدہ سماجیات داں تھے۔ وہ مارکس یا درکھائم کی طرح پرجوش نہیں تھے۔ انھوں نے اس کے باوجود بہت سے نئے نظریات دیے اور بیش بہا مقالے لکھے۔ حال میں ان کے فلسفہ کی بازیافت ہوئی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

میک موہن لائن (McMahon Line): میک موہن لائن، ہندوستان، تبت اور چین کی اس بین الاقوامی سرحد کو کہتے ہیں جسے جولائی 1914 میں شملہ کانفرنس میں طے ہونے والے معاہدہ کے مطابق سرہنری میک موہن (Sir Henry McMahon) نے متعین کی تھی۔ اسی معاہدہ پر ہندوستان اور تبت نے دستخط کردیے تھے لیکن چین کے نمائندوں نے معاہدہ میں تبت کے مقام اور اس کی سرحدوں سے متعلق طے پانے والے اصولوں سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اس پر دستخط کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ تبت چین کے ماتحت ہے اور اسے اسی قسم کا معاہدہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ سرحدی خطہ 700 میل طویل ہے اور برما (میانمار) کے درۂ ڈپ ہک سے گزر کر شمالی مشرقی برما میں مقام ازورازی تک پہنچتا ہے۔ برطانوی وفد کی قیادت میک موہن نامی ایک افسر نے کی تھی اس لیے اسی کے نام سے یہ سرحد موسوم ہے۔

چین کی کیونسٹ حکومت نے 1954 کے ہند چین معاہدہ کے ذریعہ تبت پر اپنا اقتدار مسلّم کرانے اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے بعد یہ کہہ کر کہ اس سرحدی معاہدہ کو برطانوی سامراج نے چین پر جبراً مسلط کیا تھا، اسے کالعدم قرار دے دیا اور اس سرحد کے جنوب میں واقع شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) کے تیس ہزار مربع میل علاقے پر اپنی ملکیت کا دعویٰ پیش کردیا۔ چین اور برما کے درمیان سرحد جو فی الواقع اسی میک موہن لائن کا حصہ تھی اور جسے چین نے 1960 میں جائز بین الاقوامی سرحد کے طور پر تسلیم بھی کرلیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے 1962 میں ہندوستان پر بڑے پیمانہ پر حملہ کرکے نیفا اور لداخ کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا اور تاحال ان میں سے بعض پر قابض ہے۔

میگنا کارٹا (Magna Carta): میگنا کارٹا برطانوی دستوری تاریخ کی اس اہم دستاویز کا نام ہے جسے بادشاہ جان (King John) نے اپنے بڑے بڑے امرا اور جاگیرداروں (Barons) کے دباؤ میں آکر اور ان کے مطالبات سے مجبور ہوکر 15 جون 1215 کو جاری کیا۔ یہ دستاویز انگریزوں کی آزادی کی بنیاد اور بنیادی حقوق کی ضامن تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا اصل مقصد جاگردارانہ حقوق کی ضمانت تھا۔ اس میں مذہب، رسومات اور عوام کے حقوق کی بھی ضمانت دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "کسی آزاد شخص کو ملک کے قانون یا خاص جاگیرداروں کے قانونی فیصلہ کے بغیر نہ تو گرفتار کیا جائے گا اور نہ ہی جیل میں ڈالا جائے گا، نہ جلاوطن کیا جائے گا اور نہ اس پر اپنی مرضی مسلط کی جائے گی۔ ان ہی تجاویز کے ذریعہ عظیم کونسل کے فرائض کو متعین کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔"

اس دستاویز کی دستوری اہمیت اس کے مشمولات سے زیادہ اس حقیقت سے واضح ہے کہ اس کے ذریعہ قانون کی حکمرانی کا اصول قائم ہو گیا یعنی یہ تسلیم کرلیا گیا کہ بادشاہ قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ بعد کی صدیوں میں یہ دستاویز عوامی حریت کی ایک علامت بن گئی کیونکہ اس میں ٹیکس لگانے کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری اور جیوری کے ذریعہ مقدمہ کی سماعت جیسے اہم اصول شامل تھے اور اس میں جائیداد اور انصاف کے سلسلہ میں فرد کے حقوق کو واضح لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جاگیرداریت کے زوال کے بعد میگنا کارٹا کی اہمیت ختم ہوگئی اور ولش اون ٹیوڈر (Welsh Owen Tudor (C. 1400-1461) کے عہد میں اسے بالکل فراموش کردیا گیا تھا البتہ 17 ویں صدی عیسوی میں اس کا پھر انکشاف ہوا اور پارلیمانی پارٹی نے اسے جمہوری دستاویز کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اس کے بعد سے میگنا کارٹا بقول منرو "جمہوریت کی بنیاد" بن گیا۔ اس کی چار اصل کاپیاں، ایک ایک سالسبری اور لنکن کیتھڈرلس (Salisbury and Lincoln Cathedrals) میں اور دو برٹش لائبریری میں اب بھی محفوظ ہیں۔

میلول لوئس کوشتھ ڈیوی (Melvil L.K.Dewey): ہندستان کا شاید ہی کوئی شہر ہوگا جہاں کے کتب خانوں میں سے کسی نہ کسی میں ڈیوی اعشاری ضابطہ درجہ بندی نہ رائج ہو لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس ضابطہ کے خالق نے یہ ضابطہ اپنی عمر کے چھبیسویں سال ہی میں مکمل کرلیا تھا۔ میلول ڈیوی جن کا پورا نام میلول لوئس کوشتھ ڈیوی تھا 10/دسمبر 1851 کو امریکہ کے شہر ایڈمس، نیویارک میں پیدا ہوئے۔ کتب خانہ تحریک اس وقت اپنے مشنری (Missionary) دور سے گذر رہی تھی۔ لائبریرین کا تصور ایک ایسے فرد کا تھا جو جملہ علوم انسانی سے باخبر اور متین و سنجیدہ مزاج کے ساتھ عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی و سیاسی تربیت کے لیے کوشاں ہو۔ اس ماحول میں ڈیوی ایک ایسا مزاج لے کر پیدا ہوئے جس کی ممتاز خصوصیات کام کے عملی پہلو کو آسان بنانے، خیال کو اختصار سے ادا کرنے اور امداد باہمی کے اصولوں پر یقین تھیں۔ ان کے نزدیک لائبریرین میں انتظام و انصرام کی صلاحیت اور کام انجام دینے کے طریقہ کار سے واقفیت ضروری تھی۔ اس کی وفاداری

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اپنے کام کی مہارت اور کتب خانہ میں نظم سے ہوئی ضروری تھی نہ کہ "سماج سدھار" کے خیالی مشن سے۔ ڈیوی اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ہی ایمہرسٹ کالج کے کتب خانہ میں کام کرنے لگے اور یہ سلسلہ 1874 میں گریجویشن کرنے کے بعد بھی جاری رہا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ انھوں نے نیویارک اور نیوانگلینڈ کے مختلف کتب خانے بھی دیکھے۔ جس بات نے انھیں سب سے زیادہ پریشان کیا وہ مروج ضابطہ درجہ بندی تھا۔ جو کتاب کے نفس مضمون کے بجائے ان کی رکھنے کی جگہ سے جڑا ہوا تھا جس کی بدولت کتابوں کے علامتی نمبروں کو بار بار بدلنا پڑتا تھا۔ انھیں ایک آسان ضابطہ بنانے کی فکر ہوئی جس کے علامتی نشان بھی آسان ہوں۔ اپنی ڈائری کے اندراج کے مطابق ایک نئے ضابطہ کے خط و خال کا خیال انھیں ایک اتوار کے دن گرجاگھر میں ایک لمبی مذہبی تقریر سننے کے دوران آیا۔ انھوں نے کتاب کے مضمون کو بنیاد بناکر جملہ علوم کو دس شعبہ جات علم میں تقسیم کیا اور ہر شعبہ کو مزید دس ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح مضمون کو وسیع دائرہ سے مخصوص دائرہ تک لے گئے۔ تقسیم کے ان عنوانات کے علامتی نشان کے لیے انھوں نے عربی ہندسہ کے اعشاری اعداد کا استعمال کیا چونکہ اس طریقہ سے ایک موضوع اپنے مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کیے جانے کی بدولت مختلف شعبہ جات علم کے تحت منتشر ہوجاتا تھا اس لیے انھوں نے ایک الفبائی نسبتی اشاریہ (Relative Index) ترتیب دیا جس میں جملہ علوم اور ان کے ذیلی موضوعات کے نام اپنے اساسی مضمون سے نسبت ظاہر کرتے ہوئے الفبائی ترتیب میں مع متعلقہ علامتی نشان درج تھے۔ اپنے ضابطہ کے پہلے دس شعبہ جات علم کو انھوں نے صفر تا 9 کے اعداد سے ظاہر کیا لیکن انھیں تین عددی بنانے کے لیے ہر ایک میں دو صفر کا اضافہ کیا۔ دوسرے خلاصہ میں ہر شعبہ علم کو مزید دس ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا اور ان کا علامتی نشان دو عددی رکھا جسے تین عددی بنانے کے لیے ایک صفر کا اضافہ ہر علامتی نشان کے ساتھ کیا۔ تیسرا خلاصہ جو ہر ذیلی خلاصہ کے مزید دس ذیلی شعبوں میں منقسم تھا اب تین عددی علامتی نشان سے مرتب تھا۔

پہلا خلاصہ	دوسرا خلاصہ	تیسرا خلاصہ
000 عمومیات	500 سائنس (عام مطالعہ)	510 ریاضی
100 فلسفہ	510 ریاضی	511 حساب
200 مذہب	520 فلکیات	512 الجبرا
300 سماجیات	530 طبعیات	513 جیومیٹری
400 لسانیات	540 کیمیا	514 علم مثلثات
500 سائنس طبعی علوم	550 علم طبقات الارض	515 نظری علم ہندسہ
600 فنون مفیدہ	560 علم بشریات	516 مخروطی علم جیومیٹری
700 فنون لطیفہ	570 علم حیاتیات	517 احصار
800 ادب	580 علم نباتات	518
900 تاریخ و جغرافیہ	590 علم حیوانات	519 امکانیات

1876 میں پہلی بار شائع ہونے کے بعد سے اپنی بنیادی اساس سے انحراف کے بغیر آج درجہ بندی کا یہ ضابطہ اپنے اکیسویں ایڈیشن میں ہے۔ اپنے ضابطہ کی کامیابی اور اس کی تبلیغ کے لیے ایک رسالہ کی ضرورت محسوس کرکے ڈیوی نے "لائبریری جرنل" کے نام سے آر آر بوکر کی شرکت میں ایک رسالہ بھی شائع کرنا شروع کیا۔ اسی سال انھوں نے زبان میں اختصار کے جذبہ کے تحت ہجا اصلاح انجمن (Spelling Reform Association) بنائی اور اپنے نام کو مختصر کرکے میلول ڈیوی کرلیا۔ انتظامی معاملات میں معیاربندی کے خیال کے تحت ایک دوسری تنظیم امریکن اعشاری بیورو (American Metric Bureau) کے نام سے قائم کی۔ امدادباہمی کو فروغ دینے کے لیے 1876 میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کے قیام کی تحریک میں سرگرم رہے اور اس کے ناظم مقرر کیے گئے۔ 1877 میں انگلینڈ میں لائبریری ایسوسی ایشن (Library Association) کے قیام میں شرکت کے لیے انگلینڈ گئے۔

1883 میں کولمبیا کالج میں بحیثیت ناظم کتب خانہ شریک ہونے پر علم کتب خانہ کی عملی تعلیم کے لیے پہلا کتب خانہ تربیت اسکول قائم کیا۔ پانچ سال بعد جب 1888 میں وہ نیویارک اسٹیٹ لائبریری، البنی (Albany) آئے تو کتب خانہ تربیت اسکول بھی البنی آگیا۔ ڈیوی نے کتب خانہ خدمات کو فروغ دینے کے لیے نیویارک۔ بروکلن کتب خانوں کے رسائل کی مشترک فہرست شائع کی۔ البنی میں گشتی کتب خانہ، نابیناؤں اور خواتین کے لیے کتب خانے منتخب کتابوں کی فہرست کی اشاعت، لیجسلیٹو حوالہ جاتی خدمات جیسے توسیعی کام بھی کیے۔ انھوں نے لیک پلیسڈ کلب اور لیک پلے سڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن قائم کیں۔ کلب میں بزرگ کتب خانہ کارکنان کے لیے معمولی خرچ پر قیام کا بندوبست تھا۔ ان کا قائم کیا ہوا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

فارسٹ پریس اب بھی OCLC کے ایک حصہ کی حیثیت سے موجود ہے۔ غرض کتب خانہ سے متعلق کوئی کام ایسا نہ تھا جس کی بنا میلول ڈیوی نے نہ ڈالی ہو۔ کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھنے والے اس فرد نے ایک بار اپنی مثال دھوپ گھڑی سے دی "جس کا نہ کوئی پہیہ زنگ آلود ہوتا ہے نہ جس کی گراریاں گھستی ہیں، جو نہ تھکتی ہے نہ آرام کی خواہش کرتی ہے"۔ آج ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ یا عالمی اعشاری ضابطہ کی شکل میں ڈیوی کے تشکیل ڈھانچہ پر ضابطہ درجہ بندی دنیا کا معروف ترین ضابطہ ہے جو لائبریری آف کانگریس کے مطبوعہ کارڈوں اور برٹش لائبریری کے مطبوعہ کارڈوں پر بھی ثبت ہوتا ہے۔ آرام کی خواہش نہ رکھنے والا یہ مرد مجاہد 80 برس کی عمر میں 1931 میں ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سو گیا۔

میمن: یہ مغربی ہند میں آباد ایک قوم کا نام ہے یہ بھی ہندوؤں سے مسلمان ہوئے اور ان کے یہاں بھی ہندو رسم و رواج اب تک پائے جاتے ہیں اس قوم کے لوگ اکثر سنی ہیں۔

میمورنڈم آف ایسوسی ایشن (Memorandum of Association): کسی کمپنی کا میمورنڈم آف ایسوسی ایشن انتہائی اہم دستاویز ہے اور کافی اہمیت کا حامل ہے۔ سب سے پہلا عمل جو کسی کمپنی کے قیام سے قبل کیا جاتا ہے وہ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کا تیار کرنا ہے کیونکہ بغیر میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کے کمپنی کی رجسٹری نہیں ہو سکتی۔ یہ کمپنی کا اہم ترین منشور ہے جس کی بنیاد پر کمپنی قایم کی جاتی ہے اور اس کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس میں کمپنی کے مقاصد اور اس کے کاوبار کے دائرہ عمل کا تعین ہوتا ہے اور پبلک سے کمپنی کے تعلق کا تعین کیا جاتا ہے۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کمپنی کے سرمائے کے متعلق قواعد کا تعین کیا جاتا ہے اور ممبران کی ذمہ داری معین کی جاتی ہے۔ اس میمورنڈم کے ذریعہ نہ صرف دائرہ عمل کو معین کیا جاتا ہے بلکہ اسے محدود بھی کیا جاتا ہے۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں مندرج امور سے ہٹ کر کمپنی کوئی کاروبار نہیں کر سکتی اگر وہ ایسا کرے تو کمپنی کا یہ عمل خلاف قانون ہوگا۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن کا مطبوعہ ہونا ضروری ہے او اس کے پیراگرافوں کا سلسلہ نمبر درج ہونا چاہیے اور اس پر ہر ممبر کے دستخط پتہ اور پیشہ بھی درج ہونا چاہیے اور ایک ایسے گواہ کے دستخط ہونے چاہئیں جو ممبران کے دستخط کی تصدیق کرے۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کمپنی کا نام اور لمیٹڈ یا پرائیوٹ لمیٹڈ جیسی بھی صورت ہو نام کے آخر میں لکھا جانا چاہیے۔ چونکہ کمپنی کی حیثیت ایک قانونی شخص (Legal Person) کی ہوتی ہے اس لیے اس کا نام اس طرح ہونا چاہیے جو کسی اور کمپنی کے نام کے بالکل مماثل نہ ہو اور کوئی ایسا نام نہ ہو جو گورنمنٹ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں ممبروں کی ذمہ داری کی نوعیت بتلائی جاتی ہے۔ ایک لمیٹڈ کمپنی کی صورت میں کمپنی کے ڈائرکٹرز، منیجر کی ذمہ داری کا بھی تعین کیا جاتا ہے۔ سرمائے کے متعلق بھی میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں وہ رقم جو حصص کے فروخت سے جمع کی جائے گی ظاہر کی جاتی ہے اور یہ بات بھی درج کی جاتی ہے کہ اس رقم کو معینہ حصص میں کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ اس رقم کو یعنی وہ رقم جو حصص کے فروخت سے جمع ہوتی ہے شیئر کیپٹل (Share Capital) کہتے ہیں اور یہی کمپنی کا منظور شدہ سرمایہ (Authorised Capital) ہوتا ہے۔ کمپنی لاء کے تحت سرمائے کی مقدار کا تعین نہیں کیا گیا ہے لیکن سرمایہ کمپنی کے مجوزہ کاروبار کی نوعیت کی مناسبت سے ہونا چاہیے تاکہ آئندہ کمپنی کے کاروبار میں اضافہ بھی ممکن ہو۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکے گی۔ البتہ ذیل کی صورتوں میں تبدیلی ممکن ہے:

(1) کمپنی کے نام کی تبدیلی۔ کسی کمپنی کے نام میں تبدیلی بغیر گورنمنٹ کی منظوری کے نہ ہو سکے گی۔ بجز اس کے کہ وہ تبدیلی بالکل برائے نام ہو۔

(2) کمپنی کے مقاصد میں تبدیلی۔ کمپنی کے مقاصد میں تبدیلی کچھ پابندیوں کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ یہ تبدیلی حصہ داروں کے مفاد میں اور ان اشخاص کے مفاد میں ہونی چاہیے جنھوں نے کمپنی میں سرمایہ لگایا ہو۔ اصل غرض یہ ہے کہ ان بنیادی مقاصد میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے جس کے لیے کمپنی قایم کی گئی ہے۔

حسب ذیل صورتوں میں کمپنی اپنے مقاصد میں تبدیلی کر سکتی ہے:

(1) کمپنی کے کاروبار کو زیادہ بہتر طور پر اور کفایت شعاری سے چلانے کے لیے۔

(2) اصل مقصد کے حصول کے لیے مزید سرمائے کی فراہمی کے لیے۔

(3) کمپنی کے کاروبار کرنے کے مقامات میں اضافے کے لیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(4) کسی ایسے کاروبار کی ابتدا کرنے کے لیے جو کمپنی کے موجودہ کاروبار چلانے میں معاون ہو۔

حسب صراحت بالا کسی تبدیلی سے قبل کمپنی کو ممبران کی میٹنگ میں ایک اسپیشل ریزولیشن لینے کی ضرورت ہے اور اس منظوری کو کمپنی لاء بورڈ (Company Law Board) سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ منظوری دینے سے قبل کمپنی لاء بورڈ اس امر پر غور کرے گا کہ آیا مجوزہ تبدیلی کی اطلاع ان متعلقہ تمام اشخاص کو دی جاچکی ہے جن کے حقوق اس تبدیلی سے متاثر ہوتے ہوں اور یہ کہ ان اشخاص کی رضامندی حاصل کی گئی ہے جن کا سرمایہ اس کمپنی کے کاروبار میں لگایا ہوا ہو اور یہ کہ اس تبدیلی کی اطلاع رجسٹرار کمپنی کو دے دی گئی ہے جو اپنے عذرات یا سفارشات کمپنی لاء بورڈ کے روبرو پیش کرسکتا ہے تمام امور پر غور کرنے کے بعد میں کمپنی لاء بورڈ تبدیلیوں کے متعلق منظوری دے سکے گا اور منظوری دیتے وقت کمپنی لاء بورڈ کمپنی کے ہر ممبر کے حقوق کو پیش نظر رکھے گا۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کمپنی کے کاروبار کا جو مقام درج ہو اگر اس میں کوئی تبدیلی مقصود ہو تو کمپنی، رجسٹرار کمپنی کی منظوری سے ایسا کرسکتی ہے۔ اس کے لیے دیگر ضابطے کی تکمیل کے علاوہ اسپیشل میٹنگ میں اس کے متعلق ریزولیشن لینا ضروری ہے۔ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جاسکتی جس سے ممبران کی ذمہ داری غیر محدود ہوجائے۔ کسی ممبر کو مزید حصص خریدنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا بجز اس کے ممبر خود اس کے لیے راضی ہو۔

مینسی پیٹس (Mancipatis): رومن لاء میں جائداد کی منتقلی کا یہ طریقہ تھا اسے بیع نقد کیا جاسکتا ہے۔ اس طریقے میں جائداد کی منتقلی کی ایک رسم باقاعدہ ادا کی جاتی تھی جس میں بائع اور خریدار کی موجودگی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ پانچ بالغ شہریوں کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ ایک ترازو بھی رہتا تھا۔ ایک آدمی ترازو پکڑتا تھا اور ایک تانبے کا سکہ اور خریدار اس شے کو اپنے ہاتھ میں لے کر یہ کہتا تھا کہ "میں قطعی طور پر کہتا ہوں کہ یہ شے ہے اور میں نے اس تانبے کے سکے کے عوض اور ترازو میں تول کر خریدا ہے۔" اس کے بعد وہ اس تانبے کے سکے کو ترازو پر مار کر خریدار کو دے دیتا تھا۔ اس قسم کے اہتمام کے ساتھ جو واقعہ خرید و فروخت ہوتا تھا اسے علامتی بیع بھی کہا جاتا تھا۔

میوکھا (Mayukha) : گجرات میں اور شہری ممبئی میں ہندو لاء کے تبصروں میں اختلافی مسائل میں میوکھا (Mayukha) کو ترجیح دی جاتی ہے۔ احمد نگر پونا خاندیش میں بھی میوکھا کو متاکشرا کے مانند اہمیت دی جاتی ہے لیکن اسے متاکشرا پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ میوکھا کو نیل کنٹھ (Nilkantha) نے لکھا ہے جس کا تعلق مہاراشٹر سے تھا لیکن وہ بنارس میں بس گیا تھا۔

میئر (Mayor): میونسپل کارپوریشن کے منتخب ارکان ایک صدر کا انتخاب کرتے ہیں جسے میئر (Mayor) کہا جاتا ہے۔ میئر کا عہدہ ایک اعزاز ہوتا ہے کیونکہ میئر اپنے شہر کا پہلا شہری کہلاتا ہے۔ میئر میونسپل کارپوریشن کے اجلاسوں کی صدارت کرتا ہے۔ میونسپل کارپوریشن کے اجلاس طلب کرنے کا بھی اختیار میئر کو حاصل ہے۔ اور اس کا بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ میونسپل کمشنر کو شہری سہولیات اور دیگر معاملات کے تعلق سے مناسب ہدایات دے اور اس پر نظر رکھے کہ اس کی ہدایات پر کارروائی ہو رہی ہے یا نہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ن

نابینا بچوں کی تعلیم (Education of the Blind Children): 1931 کے بعد نابینا لوگوں کی مردم شماری نہیں ہوئی۔ اندازہ یہ ہے کہ تعداد پانچ کروڑ تک پہنچ گئی ہو گی۔ مرکزی سرکار نے پہلی رپورٹ 1944 میں پیش کی تھی۔ آزادی کے بعد بھارتی بریل کوڈ تیار ہوا۔ موجودہ بریل کی ابتدا لوئی بریل (Louis Braille) نامی ایک فرانسیسی نے کی تھی۔ بریل کے حروف ابھرے ہوئے چھ نقطوں (Dots) کی مدد سے بنتے ہیں۔

ملک میں تقریباً 200 مختلف ادارے اور انجمنیں نابینا لوگوں کے لیے ہیں۔ ان میں سے 140 اداروں میں پرائمری یا مڈل درجوں تک عام درسی تعلیم کے علاوہ کچھ صنعتیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ بالغ نابینا کی تربیت کے لیے لگ بھگ ایک درجن ادارے ہیں۔ دہرہ دون میں مرکزی سرکار کا ایک نیشنل سنٹر مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہے۔ ٹریننگ سنٹر، اسکول بریل پریس، تعلیمی سامان تیار کرنے کا ورکشاپ، لائبریری، شیلٹرڈ ورکشاپ (Sheltered Workshop) اور کم بینائی والوں کا اسکول۔ ملک کے ایک درجن ہائی اسکولوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا احمدی نابینا اسکول بھی ایک ایسا ادارہ ہے جس میں جدید ریاضی (Modern Mathematics) اسٹوگرافی اور ڈکٹافون ٹائپنگ کی تعلیم دی جا رہی ہے اور اردو بریل میں کتابیں بھی تیار کرائی گئی ہیں۔ ملک میں دو خاص انجمنیں ہیں۔ نیشنل ایسوسی ایشن فار دی بلائنڈ اور نیشنل ایسوسی ایشن آف انسٹرکٹرز آف دی بلائنڈ اور اساتذہ کی تربیت (ٹیچر ٹریننگ) کے چار مراکز ہیں۔

اس ملک میں دو فیصدی سے کم ہی نابینا بچوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔

روزگار کے لیے محفوظ ملازمت (Sheltered Employment) پر بھروسہ ہے۔ پرائیوٹ اداروں میں سرکار مالی مدد اور وظیفہ دیتی ہے۔

نابینا لوگوں کی طرف پبلک کے انداز میں بنیادی طور سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لوگ عموماً ان پر ترس کھاتے ہیں لیکن صلاحیتوں کا اعتراف کر کے انھیں باوقار انسان بنانے کی طرف توجہ کم ہے۔ پھر بھی انھیں کچھ سہولتیں حاصل ہیں، مثلاً روزگار کے خصوصی دفتر، ذاتی کاروبار کے لیے قومیائے بینک سے قرض، ٹرین، ہوائی جہاز اور بس کے کرایوں میں رعایت، بریل کے خطوط بلا ڈاک محصول اور اچھا کام کرنے والوں اور روزگار دینے والوں کو صدر جمہوریہ کا قومی عطیہ۔

دہرہ دون میں ایک نیشنل انسٹی ٹیوٹ قایم کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔

معذور بچوں کے عام اسکولوں میں اختلاط (Integration) پر زور دیا جا رہا ہے۔

نارد سمرتی (Narada Smrithi): ہندو لا کی سب سے آخری کتاب جس سے عام طور پر سب واقف ہیں وہ نارد سمرتی (Narada Smrithi) کی ہے۔ یہ کتاب بھی ایک رشی نارد (Narada) سے منسوب کی جاتی ہے اور بیان یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب منو پر مبنی ہے اور منو کی دھرم ساشتر سے چار ہزار اشلوک اس کتاب میں درج ہیں لیکن یہ کتاب فی الحقیقت منو سے بعض امور میں اختلاف رکھتی ہے اور سب سے زیادہ اہم اختلاف وراثت میں متبنی لڑکے کے درجے سے متعلق ہے۔

نارڈی کونسل (Nordic Council) : نارڈی کونسل پانچ ملکوں یعنی ڈنمارک، فن لینڈ، آئس لینڈ، ناروے اور سویڈن پر مشتمل ہے جس کا قیام 1952 میں عمل میں آیا۔ یہ نارڈی ریاستوں کی حکومتوں اور پارلیمانوں کے درمیان تعاون کے لیے ایک اہم کڑی ہے۔ اس کا مقصد رکن ملکوں کے مشترکہ اقتصادی، اجتماعی، تہذیبی، ماحولیاتی، قانونی اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

مواصلاتی مسائل پر صلاح و مشورہ کرتا ہے۔ یہ نارڈی ریاستوں کے مابین تعاون کے علاوہ یورپ، یورپی یونین اور EEF کے درمیان تعاون کو بھی فروغ دیتی ہے۔ کونسل 87 منتخبہ ارکانِ پارلیمان پر مشتمل ہے اور اس کی کمیٹیوں کی نشستیں سال میں کئی بار منعقد ہوتی ہیں۔ نارڈی کونسل ہر سال ادب، موسیقی اور ماحولیات کے لیے انعامات دیتی ہے۔

اس کا صدر دفتر ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن میں واقع ہے۔

نازی ازم (Nazism): نازی ازم ایک ایسی تحریک کا نام ہے جو جرمن قوم کو جنگ عظیم اول (1918-1914) کی شکست خوردگی کے احساس اور معاہدہ وارسائی کی مشکلات سے نکالنے، ان کا حوصلہ بلند کرنے اور ان کے اندر عزم و استقلال کی روح پھونکنے کے لیے وجود میں آئی تھی۔ یہ تحریک جرمنی کی قومی اشتراکی جماعت نے جو عرف عام میں نازی جماعت کے نام سے معروف ہے، شروع کی تھی جس کا قائد ایڈولف ہٹلر تھا۔ اس کا بنیادی مقصد جرمن قوم کی مفقودہ عزت و وقار مسلوبہ سیاسی طاقت وقوت اور تباہ شدہ معیشت کو بحال کرنا تھا۔ نسلی تفوق، جارحانہ قوم پرستی اور قائد کی کورانہ تقلید و اطاعت اس کے بنیادی عناصر تھے۔

بین الاقوامی تعلقات سے متعلق نازیوں کا خیال تھا کہ چونکہ محض جرمن قوم ہی پاک اور خالص آریائی نسل کی حامل ہے اس لیے صرف اس کو دنیا میں حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ ان کے نزدیک خدا کی منشا یہی ہے کہ جرمن قوم دوسری قوموں کو اپنے زیرِ نگیں رکھے اس لیے جنگ جاری رکھنا ناگزیر ہے اور جنگ کی بابت ان کا نظریہ یہ تھا کہ نرمی اور رحم دلی زوال کی علامت اور جنگ سے قوم کی بلندی اور طاقت کا اظہار ہوتا ہے لہٰذا پوری قوم کو فوجی، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی طاقتوں کے ذریعہ جنگ کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔

نازی ازم کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

(1) یہ تحریک پہلی جنگ عظیم میں جرمن قوم کی بری طرح شکست خوردگی کے بعد جمہوریت، اشتمالیت اور رواداری کے خلاف ایک شدید ردعمل کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس کا مقصد جرمنی کی عظمت رفتہ کو بحال کرنا تھا۔

(2) اس تحریک نے ریاستی اقتدار اور کلیاتی نظام کا نعرہ بلند کیا تاکہ جرمن قوم کو ہر طرح سے طاقت ور بنایا جاسکے۔

(3) اس تحریک نے قوم اور ریاست میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا۔

(4) قومی ہم آہنگی کے لیے نسل اور خونی رشتہ کی بڑی اہمیت ہے اس لیے ہٹلر نے جرمن قوم کو جو نارڈک اور آریائی نسل پر مشتمل ہے پاک و خالص کرنے کا تہیہ کیا تھا۔

(5) قوم کی برتری کے لیے جنگ ناگزیر ہے اور صرف جرمن قوم ہی دنیا پر حکومت کرنے کی اہل ہے اس لیے پوری قوم کو جنگی تیاری میں مصروف رہنا ضروری ہے۔

(6) قوم کی کامیابی کورانہ اطاعت میں مضمر ہے کیونکہ ایک طاقتور قائد ہی قوم کو ہر قسم کی پریشانیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔

(7) پوری قوم کو ایک ہی ادارہ کا تابع ہونا ضروری ہے لہٰذا کسی بھی دوسرے ادارہ اور انجمن کا وجود جائز نہیں۔

(8) حکومت کا نظام مرکزیت کا حامل ہونا چاہیے۔

(9) تمام مذہبی و ثقافتی سرگرمیاں ریاست کے تابع ہونا چاہئیں۔

(10) بین الاقوامی امن اور رواداری اور جمہوریت وغیرہ کے نعرے بے سود، کمزوری کی دلیل اور زوال کی علامت ہیں۔

ناطرف داری (Neutrality): غیر جانبداری بین الاقوامی قانون میں اگر ایک ملک دوسرے ملک کی جنگ میں شریک ہونے سے احتراز کرے اور ناطرفدارانہ رویہ اختیار کرے تو اسے ناطرف داری کہتے ہیں۔ جنگ کی ابتدا ہی میں ایک ایسا ملک جو جنگ میں شریک نہ ہو اپنی ناطرف داری کا اعلان کرتا ہے جس سے نہ صرف بین الاقوامی تعلقات کی وضاحت ہوجاتی ہے بلکہ ناطرف داری کا اعلان کرنے والے ملک کے باشندوں پر بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے تحفظ کی ذمہ داری نہ رہے گی۔ اگر وہ کسی جنگ کرنے والے ملک کا عملی طور پر ساتھ دیں تو ناطرف داری کا اعلان کرنے والے ملک کا یہ فرض ہے کہ وہ ان ممالک سے جو برسرِ جنگ ہیں کسی قسم کا جانبدارانہ طرزِ عمل اختیار نہ کرے اور نہ کوئی امتیازی سلوک کرے۔ جو ممالک برسرِ جنگ ہیں ان کا یہ فرض ہے کہ غیر جانب دار مملکت کے علاقے اور سمندر کے متعلق غیر جانب داری کا لحاظ کریں۔ ناطرف داری مستقل نوعیت کی بھی ہوسکتی ہے اگر وہ معاہدے کے ذریعہ کسی ملک سے متعلق کی جائے یا اس پر عائد کی جائے اگرچہ کہ اس عمل سے اقتدار اعلیٰ ایک حد تک محدود ہوجاتا ہے۔ 1815 میں کانگریس آف

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

وینس (Congress of Venice) کے ذریعہ سوئٹزرلینڈ کو مستقل طور پر ناطرف دار ملک قرار دیا گیا ہے۔ بحری جنگ کی وجہ سے غیر جانب داری کو کافی اہمیت حاصل ہوگئی کیوں کہ فریقین جنگ کی جانب سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ دشمن کی تجارت کو تلف کیا جائے اور وہ ممالک جو جنگ میں شریک ہیں یہ چاہتے ہیں کہ ان کی غیر جانب دارانہ تجارت پر کوئی ملک اثرانداز نہ ہو۔ بحری جنگ کے متعلق ناطرف داری کے بارے میں جو کنونشن منعقد ہوا اس میں ناطرف دار ملک کے فرائض کی کافی وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن اس میں ناکہ بندی (Blockade) یا ممنوعہ مال (Contraband) کے متعلق کوئی قواعد شامل نہیں کیے گئے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں غیر جانب داری کے متعلق بہت سی خلاف ورزیاں ہوئیں اور اپنے عمل کو درست قرار دینے کے لیے یہ استدلال پیش کیا گیا کہ جنگ کے نئے طریقوں کی وجہ سے بین الاقوامی قانون کے مسلمہ اصولوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

ناقابل نفاذ معاہدات (Non-Enforceable Contract) : معاہدہ بعض صورتوں میں قابل نفاذ نہیں رہتا لیکن ایسے معاہدوں کو ناقابل نفاذ قرار نہیں دیا جائے گا جبکہ فریقین معاہدہ نے معاہدے میں ایسی گنجائش رکھی ہو جس کی وجہ سے ہر دو فریقین اس معاہدہ کی پابندیوں سے آزاد ہوجائیں۔ البتہ عدالتوں نے معاہدے کو ایسی صورتوں میں قابل فسخ قرار دینے کی اجازت دی ہے جب کہ معاہدے کی تکمیل کے بعد ایسے ناممکن حالات پیدا ہوجائیں یا حالات میں ایسی غیر متوقعہ تبدیلی ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے معاہدے کا مقصد بھی فوت ہوجائے جو معاہدے کی بنیاد ہی پر قانونی طور پر اثرانداز ہوتی ہو تو عدالت اس کا حل تشفی کے بعد ایسے معاہدے کو ناقابل نفاذ (Non-Enforceable) قرار دے گی اور معاہدے کو فسخ کر دے گی۔ کوئی معاہدہ محض ایسی صورت میں ناقابل نفاذ نہ ہوگا کہ وہ حالات ہی بدل گئے ہیں جس کے تحت معاہدہ کیا گیا ہو بلکہ دیگر امور پر بھی غور کرنا ہوگا۔ مثلاً عام طور پر قیمتوں میں اضافہ یا معیار زر میں گورنمنٹ کی جانب سے کمی وغیرہ بہرحال کسی معاہدے کا ناقابل نفاذ قرار دیا جانا عدالت کے فیصلے پر مبنی ہے جو منجملہ مختلف امور کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ مختصراً کوئی معاہدہ انھیں صورتوں میں ناقابل نفاذ دیا جائے گا۔ جبکہ فریقین معاہدہ یہ ثابت کر سکیں کہ واقعات مابعد خلاف توقع واقع ہوئے اور وہ امکانی طور پر ان واقعات کو پیش قیاسی تکمیل معاہدہ نہیں کر سکتے تھے۔

اگر معاہدے کے بعد قانون میں ایسی تبدیلی ہوجائے جس کی وجہ سے معاہدے کی تکمیل غیر قانونی ہوجاتی ہو تو ایسا معاہدہ قابل عمل نہ ہوگا اور نتیجتاً ناقابل نفاذ ہوجائے گا لیکن بعد میں جو قانون مدون کیا گیا ہو وہ ایسا ہے کہ معاہدے کی عمل آوری پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی تو ایسی صورت میں معاہدہ بدستور قابل عمل رہے گا۔ معاہدہ ناقابل نفاذ ہونے کی صورت میں قدرتی طور پر منسوخ ہوجاتا ہے اور اگر کسی فریق نے معاہدے کی پیش رفت میں کوئی مالی منفعت حاصل کی ہو تو اس مالی منفعت کو فریق ثانی کو واپس کرنا ہوگا۔

ناکشیدگی (دیتانت) : "دیتانت" (De'tente) فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کشیدگی کے ازالہ یا مفاہمت کے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کے میدان میں یہ لفظ "سرد جنگ" کے بعد کی بین الاقوامی فضا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ 1945 سے کم و بیش 1962 تک کا عرصہ سرد جنگ کی شدت کے لیے مشہور ہے جس میں دونوں عظیم ترین طاقتیں (امریکا و سوویت یونین) عالمی پیمانہ پر رسہ کشی میں مصروف تھیں اور اگرچہ "گرم جنگ" کی نوبت نہیں آئی تاہم فریقین کو ہر وقت ایک دوسرے کی جانب سے اچانک حملہ کا خطرہ و خدشہ لاحق رہتا تھا۔ 1962 کے کیوبا میزائل بحران نے دنیا کو نیوکلیائی جنگ کے دہانہ پر لاکھڑا کیا تھا۔ اس کے نتیجہ نے دونوں فریقوں کو نیوکلیائی جنگ سے اجتناب کے مشترکہ مفاد سے آگاہ کیا۔ 1963 سے روس و امریکا کے تعلقات میں کشیدگی ختم ہونے لگی۔ اس عمل کو "دیتانت" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ صورت حال تعلقات میں محض "ناکشیدگی" کی غمازی کرتی ہے اور "پرامن بقائے باہم" (Peaceful Coexistence) سے کمتر درجہ کی صورت ہے۔ بعدازاں یہ روش تعلقات کی بحالی، پورے اشتراک و تعاون اور پرامن بقائے باہم کا پیش خیمہ بن گئی۔

جون تا نومبر 1963 کا عرصہ ناکشیدگی کے عمل کا نقطہ آغاز مانا گیا ہے کیونکہ اس دوران امریکا و روس نے جاسوس قیدیوں کے تبادلہ اور نیوکلیائی تجربات کے جزوی امتناع کے معاہدہ پر دستخط کرکے اور "گرم

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

لائین" قائم کرکے سرد جنگ کے طریق کو ترک کرنے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے دو فریقی اور کثیر فریقی مذاکرات کا رسمی طریقہ اپنانے کا اشارہ دیا۔ 1967 میں بیرونی خلا کا معاہدہ ہوا۔ اس سال کی اسرائیل - عرب جنگ کے نتیجہ میں دونوں طاقتوں کے درمیان کشیدگی بڑھی لیکن 1969 میں گلاس برو چوٹی کانفرنس میں وزیراعظم الکسی کوسی گن اور صدر لنڈن جانسن نے غیر رسمی طور پر مقامی جنگوں میں روس و امریکا کے ٹکراؤ سے بچنے پر اتفاق کیا۔ اسی سال وارسا پیکٹ اور ناٹو کے درمیان وسطی یورپ میں دونوں بلاکوں کی افواج میں دو طرفہ متوازن تخفیف کی بات چیت شروع ہوئی۔ 1970 میں مغربی جرمنی نے سوویت روس، پولینڈ اور مشرقی جرمنی سے معاہدے کرکے 1945 کی سرحدوں کو بین الاقوامی سرحد تسلیم کرلیا۔ 1970 میں ویانا میں ریاستہائے متحدہ امریکا اور سوویت یونین کے درمیان استراتجکی اسلحہ کو محدود کرنے کے مذاکرات (SALT) شروع ہوئے اور 1972 میں بین براعظمی (Inter-Continental) میزائلوں کی پیداوار محدود کرنے کا معاہدہ ترک اسلحہ کی سمت میں ایک تعمیری قدم تھا۔

1970 میں نیوکلیائی اسلحہ کی عدم توسیع کا معاہدہ (N.P.T.) نیوکلیائی ہتھیاروں کی توسیع کے خطرات پر امریکا و روس کے اتفاق کا نتیجہ تھا۔ 1972 میں دونوں طاقتوں کی حمایت سے اقوام متحدہ نے بایوکیمیکل ہتھیاروں کی تیاری اور ذخیرہ اندوزی کی ممانعت اور اتلاف پر ایک کنونشن منظور کیا۔ 1973 میں امریکا و روس کے درمیان آپس میں نیوکلیائی ٹکراؤ کو روکنے کا معاہدہ ہوا اس سے پہلے دونوں نے فضا یا سمندر میں دونوں کے جہازوں کے درمیان اتفاقی نیوکلیائی ٹکراؤ کے حادثوں سے بچنے اور حادثوں کے نتیجہ پر فوری صلاح و مشورہ کا معاہدہ کیا تھا۔

سرد جنگ کے خاتمہ اور ناکشیدگی کے عروج کا محرک نیوکلیائی توازنِ طاقت کے خطرات ہی نہیں بلکہ دونوں طاقتوں کے خانگی حالات بھی ہیں۔ دونوں نظاموں کے اندر عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہوچکی ہے اور وہ اپنی حکومتوں سے بہتر معیار زندگی اور فراواں وسائل زندگی کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔ یہ مطالبات اور توقعات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ اس بناء پر تقریباً تمام ترقی یافتہ ملکوں کے سیاست داں اس فکر میں مبتلا ہیں کہ محدود قومی وسائل کو کیوں کر روز افزوں اقتصادی اور سماجی مسائل کے حل میں لگایا جائے۔

ناکشیدگی کا مرحلہ مستقبل کے کس سیاسی یا طاقتی نقشہ کی بنیاد بنے گا، اس بارے میں بین الاقوامی امور کے مبصروں کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ سرد جنگ کے انتہا پسندوں کا کہنا ہے کہ ناکشیدگی محض عارضی ہے اور سرد جنگ اور قطبیت (Polarisation) کی کیفیت غیر معینہ مدت تک باقی رہے گی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ برطانیہ، فرانس، چین، جرمنی اور جاپان کے نیوکلیائی طاقت بننے کے ساتھ بین الاقوامی نظام کثیر قطبی یا متعدد طاقتی مرکزوں کا نظام ہو جائے گا۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ بین الاقوامی زندگی کے بعض معروضی عوامل مثلاً کرۂ ارض کی جغرافیائی وحدت، کفالت باہم کی ضرورت، اقتصادی، سماجی اور قدرتی مسائل کا دباؤ، داخلی اور خارجی سیاست میں فرق کا خاتمہ اور نوع انسانی کی نیوکلیائی قیامت سے تحفظ کا مسئلہ، یہ سب عظیم طاقتوں کو ایک بین الاقوامی پلیٹ فارم اختیار کرنے اور مشترکہ مسائل کے حل میں اشتراک و تعاون پر مجبور کریں گے۔ اس دور کی سیاست صحیح معنوں میں "عالمی" سیاست ہوگی اور پرامن تعاون و بقائے باہم پر مبنی ہوگی۔

ناکہ بندی (Blockade): مخالف قوت کے حمل و نقل اور رسد کے ذرائع کو منقطع کرنے کے لیے بحری فوجوں کے استعمال کو بین الاقوامی قانون کی اصطلاح میں ناکہ بندی کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح کبھی کبھی محاصرہ بندی کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ ناکہ بندی کے ذریعہ جہازوں کو دشمن کی بندرگاہ تک پہنچنے سے روکا جاسکتا ہے۔ 1856 میں اعلان پیرس میں یہ کہا گیا تھا کہ ناکہ بندی تمام ممالک کے متعلق ہونا چاہیے اور ناکہ بندی کو اس وقت قانونی حیثیت حاصل ہوگی جبکہ وہ ہر ملک کے خلاف نافذ کی جائے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ناکہ بندی نہایت موثر طور پر یوں کی گئی کہ سمندری جہازوں کے علاوہ سرنگوں (Mines) اور طیاروں کو بھی ناکہ بندی کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ 1962 میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے کیوبا (Cuba) کی ناکہ بندی کی تھی۔

ناکمل مسابقت : مسابقت اور اجارہ کی درمیانی صورت ناکمل مسابقت کی ہے۔ جس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک جزوی اجارہ (Partial Monopoly) اور دوسری اجارتی مسابقت (Monopolistic Competition)۔ یکساں قسم کے اشیا پیدا کرنے والے فرموں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہو اور ہر ایک فرم اتنی مقدار فراہم کرتا ہو کہ وہ قیمت پر اثر

انداز ہو سکتا ہے تو یہ صورت حال جزوی اجارہ کہلاتی ہے۔ اگر دو فرم ہوں تو اس کو دو اجارہ (Dupoly) اور اگر دو سے زیادہ ہو تو چند اجارہ (Oligopoly) کہتے ہیں۔ جزوی اجارہ کی صورت میں ہر ایک فرم دوسرے فرم سے قیمت کی تبدیلی کے ذریعہ مسابقت کر سکتا ہے لیکن چونکہ ہر ایک فرم ایک ہی قسم کی شے فروخت کرتا ہے اس لیے اگر ایک فرم قیمت گھٹا کر فروخت بڑھاتا ہے تو دوسرے فرم بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک فرم قیمت بڑھا دے تو دوسرے فرم قیمت نہیں بڑھائیں گے جس کی وجہ سے قیمت بڑھانے والے فرم کی فروخت میں بہت کمی ہوسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرم حتی الامکان قیمتیں گھٹانے یا بڑھانے سے گریز کرتے ہیں اور ایک ایسی قیمت پر تمام فرم ایک ایسی مقدار فروخت کرتے ہیں جس پر اوسط مصارف قیمت سے کم ہوتے ہیں اور تمام فرموں کو غیر معمولی منافع ملتا ہے جو لازماً بیشترین نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ جزوی اجارہ کی کیسی حالت میں اس طرح کی قیمت میں استقامت پائی جاتی ہے؟

جہاں تک اجارتی مسابقت کا تعلق ہے اس میں فرم کی تعداد تو زیادہ ہوتی ہے لیکن ہر ایک فرم کی پیداوار میں کسی نہ کسی قسم کا فرق پایا جاتا ہے مثلاً سگریٹ، ریڈیو سٹ، برقی پنکھے، موٹر کار وغیرہ جیسی صنعتی اشیا یکساں نہیں ہوتیں۔ چنانچہ تفریق پیداوار (Product Differentiation) کی ایسی صورت میں چونکہ ہر ایک فرم کو اپنی پیداوار کی حد تک اجارہ ہوتا ہے اس لیے وہ اجارہ دار کی طرح ایک ایسی قیمت مقرر کرتا ہے جہاں مقدار فروخت کے مصارف مختتم اور آمدنی مختتم مساوی ہوتے ہیں اور بیشترین منافع حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اجارتی مسابقت میں چونکہ صنعت میں نئے فرم داخل ہو کر موجودہ فرم سے مسابقت کر سکتے ہیں اس لیے طویل مدت میں نئے فرم داخل ہونے سے ایک طرف موجود فرم کی مقدار طلب میں تخفیف ہو جاتی ہے کیونکہ کچھ خریدار نئے فرم کی پیداوار خریدنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف موجودہ فرم کے اوسط مصارف میں اضافہ ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اپنی فروخت کو قائم رکھنے یا بڑھانے کے لیے اشتہارات پر مزید اخراجات کرتے ہیں ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرم جو مقدار فروخت کرتا ہے اس کے اوسط مصارف قیمت کے مساوی ہوجاتی ہیں اور اس کو صرف معمولی منافع (Normal Profit) ملتا ہے لیکن مقدار فروخت کے مصارف مختتم اور آمدنی مختتم لازماً مساوی رہتے ہیں اور یہ صورت فرم کے طویل مدتی توازن کی ہوتی ہے۔ مسابقت میں بھی فرم کو طویل مدتی توازن کی صورت میں معمولی منافع ملتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مسابقت میں ہر فرم شے کی متوازن مقدار پیدا کرتا ہے۔ جس کے اوسط مصارف کمترین ہوتے ہیں اور مختتم مصارف کے مساوی ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اجارتی مسابقت میں فرم طویل مدتی توازن کی حالت میں شے کی متوازن مقدار سے کم مقدار پیدا کرتا ہے اس لیے اوسط مصارف کمترین نہیں ہوتے جس کے معنی یہ ہیں کہ فرم کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک فرم اپنی پیداواری صلاحیت سے کمترین اوسط مصارف کے ساتھ جس قدر پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے کم پیدا کرتا ہے اور زاید صلاحیت (Excess Capacity) رکھتا ہے۔ نیز ہر فرم اپنی فروخت کو بڑھانے کے لیے اشتہارات وغیرہ پر زاید وسائل استعمال کرتا ہے چنانچہ اجارتی مسابقت کے تحت اس صورت حال کو مسابقت کے نقصان (Waste of Competition) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حقیقی دنیا میں جزوی اجارہ داری اور اجارتی مسابقت کی ملی جلی حالت پائی جاتی ہے۔

ناوابستگی (Non-Alignment) : تاریخی اعتبار سے مملکتیں، بین الاقوامی معاملات یا اقتدار کی کشمکش میں حد سے زیادہ ملوث ہونے کے خطرہ سے بچنے کے لیے دو قسم کی پالیسیاں اختیار کرتی رہی ہیں۔

(1) عزلت گزینی (Isolationism) کی پالیسی اور (2) غیرجانبداری کی پالیسی۔ موجودہ زمانہ میں عزلت گزینی عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ آج دنیا کی شاید ہی کوئی طاقت بین الاقوامی روابط سے عمداً بے تعلقی کے معنی میں عزلت پسند ہو۔ انیسویں صدی میں برطانیہ کی "پرشکوہ عزلت" (Splendid Isolation) کے معنی یورپی سیاست سے کنارہ کشی کے نہیں تھے کیونکہ فرانس اور پروشیا کے سوا وہ یورپ کی تمام کشمکشوں میں شریک رہا۔ اس اصطلاح کا تعلق مروجہ توازنِ طاقت کے نظام سے تھا جس میں برطانیہ میزان بردار کی حیثیت رکھنے کی بناء پر دوسری طاقتوں کے معاملات میں غیر جانبداری برتتا اور محض توازن میں خلل پڑنے پر اسے درست کرنے کے لیے مداخلت کرتا تھا۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ امریکا کی روایتی عزلت پسندی بھی افسانوی تھی کیونکہ براعظم امریکا کی سیاسیات میں امریکن پوری طرح دخیل تھے اور یورپی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے لیکن چونکہ ہم خیال برطانیہ کی طاقتور بحریہ توازن کے تحفظ کے لیے موجود تھی اس لیے وہ مداخلت کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

دونوں عالمی جنگوں کے دوران امریکی عزلت گزینی یورپ اور شرق بعید میں خلفشار، جمعیت اقوام کی ناکامی اور دوسری عالمی جنگ میں فتح ہوئی۔ اس کے بعد امریکا نے عالمی طاقت کا رول اختیار کرکے عالمی مفادات وضع کیے اور بین الاقوامی میدان سے اس کی علاحدگی کا کوئی امکان نہیں رہا۔ عزلت گزینی کی طرح غیر جانبداری بھی اپنے معنی بدل چکی ہے۔ پچاس برس قبل دو ملکوں کی جنگ میں تیسرے ملک کی طرف سے غیر جانبداری کا اعلان غیر جانبدار کو چند قانونی حقوق عطا کرکے اس پر چند ذمہ داریاں عائد کرتا تھا۔ آج سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا جیسے منفی معنی میں غیر جانبداروں کا وجود ہے لیکن غیر جانبداری کی منفی پالیسی کا نہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد دونوں عظیم ترین طاقتوں سے وابستہ بین الاقوامی بلاکوں کے درمیان سرد جنگ میں غیر جانبداری کے تصور نے ناوابستگی (Non-alignment) کا روپ اختیار کیا۔ اس کے معنی منفی طور پر بین الاقوامی سیاست سے انخلا نہیں بلکہ محض دونوں طاقتی بلاکوں سے آزاد رہنے اور فوجی اتحادات کے نظام میں شرکت سے پرہیز کرنے کے تھے۔ ناوابستگی کی نئی پالیسی یا رویہ یا تحریک کے بانی ہندستانی وزیراعظم جواہر لال نہرو تھے۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اسے "مثبت غیر جانبداری" کہا۔ نہرو نے طاقتی بلاکوں اور ان کے اقتدار کی کشمکش سے الگ رہنے اور عالمی مسائل پر آزادانہ رائے قائم کرنے کی تلقین کی۔ ان کی نظر میں یہ پالیسی نہ صرف سیاسی اعتبار سے مفید تھی بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی قابل ترجیح تھی۔ کیونکہ اس طرح ناوابستہ ممالک دونوں بلاکوں کے درمیان صلح صفائی کراسکتے اور قیام امن میں مدد دے سکتے تھے۔ دوسری طرف انھوں نے ایشیا و افریقہ کے نوآزاد ملکوں کو یہ پالیسی اپنانے کا مشورہ دیا جس سے وہ سابق سامراجی اور استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کرسکتے تھے۔ اس اصول پر مبنی ناوابستگی کے دو خاص پہلو نمایاں ہوئے :

(1) طاقتی بلاکوں، ان کے ساجھے داروں اور تیسری دنیا میں ان کا ساتھ دینے والوں کی پالیسی اور عمل کے تئیں تنقیدی رویہ اپنایا گیا۔ اور

(2) استعماریت، سامراجیت، نئی استعماریت اور نسل پرستی کی شدید مخالفت کی گئی۔ نہرو کے نقش قدم پر ایشیا و افریقہ کے بیشتر آزاد ملکوں نے ناوابستگی کی پالیسی اختیار کی۔ تیسری دنیا میں ناوابستگی کے رجحان کی عمومیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ناوابستہ ملکوں کی پہلی چوٹی کانفرنس میں جو بلغراد (یوگوسلاویہ) میں ستمبر 1961 میں منعقد ہوئی کل 25 ملکوں نے شرکت کی تھی۔ جولائی 1978 میں بلغراد میں ناوابستہ ملکوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں 86 ناوابستہ ملک، 12 مشاہد ملک اور چھے مہمان ملک شریک ہوئے۔

ناوابستگی کی تعریف پر، یا اس کے اجزائے ترکیبی پر یا اس کو ماننے والے ملکوں کی صفات کے بارے میں کوئی اتفاق نہیں پایا جاتا لیکن ایک عام معیار فوجی اتحادات میں عدم شمولیت ہے۔ ناوابستگی، عالمی امور میں آزاد فکری اور آزاد روی کا رویہ ہے۔ اس رویہ کو اپنانے والوں نے اپنے مخصوص حالات اور مسائل کے مطابق اس کی تعبیر اور اطلاق کرکے اپنے قومی مفادات کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ناوبستہ ممالک ایک "تیسری طاقت" یا "بلاک" بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ محض ایک گروہ ہیں۔ وہ اپنے مقامی اور علاقائی جھگڑوں سے بالاتر ہوکر بین الاقوامی سطح پر ایک آواز سے بولنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ سرد جنگ کے خاتمہ اور طاقتی بلاکوں کے انتشار کے بعد ناوابستگی کا پرانا تصور کافی بدل چکا ہے۔ لیکن "پہلی دنیا" (سرمایہ دار) اور "دوسری دنیا" (اشتراکی) کے درمیان "تیسری دنیا" (ترقی پذیر ممالک) کا تصور برقرار ہے۔ یہ تیسرا فریق بین الاقوامی سطح پر متحد ہوکر دونوں ترقی یافتہ دنیاؤں (سوویت یونین کے انتشار کے باوجود) سے اپنے مطالبات منوا سکتا ہے اور نئے اقتصادی نظام میں اپنے لیے انصاف حاصل کرسکتا ہے۔ اسی ضرورت میں ناوابستگی یا آزاد خارجہ پالیسی کے نئے تصور کی افادیت اور معنویت مضمر ہے۔

نبوت: نبا سے مشتق ہے جس کے معنی خبر کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اس خبر رسانی کا نام نبوت ہے جسے اللہ نے انسانوں تک اپنے شرعی احکام پہچانے اور انھیں اپنی مرضی کی باتیں بتانے کے لیے قایم کی ہے چونکہ انسان کی پیدائش کا مقصد خدا کی اطاعت و عبادت ہے اور اس پر آخرت کی فلاح و کامرانی کا بھی دار و مدار ہے اس لیے ہر آدمی کو خدا کے احکام اور اس کی مرضی سے واقف ہونا ضروری ہے لیکن ظاہر ہے کوئی شخص محض اپنی عقل تجربہ اور غور و فکر سے خدا کے احکام اور اس کی مرضی سے واقف نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اللہ کی ربوبیت رحمت عدل اور حکمت کا تقاضا ہوا کہ جس طرح اس نے انسانوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کیا ہے۔ اس طرح ان کی روحانی اوراخلاقی ضرورتیں بھی پوری کرے نبوت و رسالت کا سلسلہ قایم کرکے اللہ نے انسان کی اس ضرورت کا

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

سامان بہم پہنچایا ہے۔

نبوت اس قوت اور ملکہ کا نام ہے جس سے ان اشیا کا ادراک کیا جاسکتا ہے جن کا ادراک حواس تمیزی اور عقل سے نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انسانی کمالات تمام آدمیوں میں یکساں نہیں ہوتے بلکہ بعض افراد سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو بظاہر انسانی حد و امکان سے بھی باہر معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے شاعری ضاعی قوت تقریر وغیرہ میں بعض اتنے ممتاز ہوتے ہیں کہ دوسرے اشخاص کوشش کے باوجود بھی ان کے ہم پلہ نہیں ہوسکتے اسی طرح حقائق اشیا کے ادراک کی قوت بھی کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتی ہے اور بعض انسانوں میں ترقی کرکے اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ کسب و تعلیم کے بغیر ان کو حقائق اشیا کا ادراک ہوجاتا ہے۔ حالانکہ ان کو کسی چیز کا خارجی اور بیرونی علم نہیں ہوتا لیکن اس قوت کی وجہ سے خود بخود ان اشیا کا علم ہوجاتا ہے اس قوت کا نام ملکہ نبوت اور اس علم کو الہام اور وحی کہا جاتا ہے۔

بعض چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے ان کو کسبی کہا جاتا ہے جیسے علم، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ لیکن بعض چیزیں محض اللہ کے فضل سے حاصل ہوجاتی ہیں اور ان کے حصول کے لیے سعی و محنت نہیں کرنی پڑتی جیسے ذہانت، عقلمندی اور خوبصورتی وغیرہ اسی طرح نبوت بھی ایک عطیہ الٰہی اور موہبت باری ہے خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے تاہم منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل البتہ قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے ضروری ہیں۔

نبوت اسلام کا اہم بنیادی عقیدہ ہے ایک مسلمان کے لیے توحید و آخرت ہی کی طرح اس کو بھی ماننا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کو اللہ کے احکام مرضی کا علم نہیں ہوسکتا۔ توحید و آخرت کا صحیح علم بھی ثبوت ہی کے ذریعہ ممکن ہے اس لیے غذا، پانی اور ہوا کی طرح یہ انسان کی ناگزیر ضرورت ہے اس کا انکار ایمان و اسلام کا انکار اور کفر کے برابر ہے۔

نجی زمرہ (Private Sector) : نجی زمرہ معاشیات کے ایسے تمام عناصر یا کاروباری اداروں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ریاستی یا مرکزی حکومت کی کسی بھی قسم کی شرکت نہ ہو۔ نجی زمرہ، کمپنی زمرہ اور شخصی زمرہ دونوں پر محیط ہے۔ دوسرے الفاظ میں ملکی معیشت میں نجی زمرہ سے مراد وہ سارے کاروبار، صنعتی و تجارتی ادارے اور خدمات ہیں جو حکومت کے بجائے نجی افراد اور گروہوں کے زیرانتظام چلائے جاتے ہیں۔

نجی زمرہ میں منافع کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ حکومتی اثر سے آزاد ایسی تمام سرگرمیاں جو بنیادی طور پر منافع حاصل کرنے کے لیے کی جائیں نجی زمرہ میں شامل ہوتی ہیں تاہم ایسی تنظیموں کی سرگرمیاں بھی اس زمرہ میں شامل ہیں جو منافع کے بجائے سماجی ضروریات کی تکمیل کے لیے کی جاتی ہیں۔ مثلاً نجی اسپتال اور پرائیوٹ اسکول وغیرہ۔

بنیادی طور پر نجی زمرہ کے کاروباری اداروں میں خواہ ایک فرد کی ملکیت ہو یا جماعت کی، ذاتی مفاد مقدم ہوتا ہے۔ یعنی کاروبار سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چونکہ اس میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کام کرتی ہے اس لیے یہ سلسلے اس وقت تک جاری رہتے ہیں جب تک منافع کی توقع ہوتی ہے ورنہ بند کردیے جاتے ہیں۔ ایسے کاروباری اداروں کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ معاشرہ کے لیے سودمند ہوں (مثلاً سگریٹ، بیڑی، تمباکو اور شراب جیسے کاروبار) کیونکہ ان کا بنیادی مقصد منافع کا حصول ہے۔ چنانچہ یہ ادارے مختلف ممالک میں وقت اور حالات کے مطابق مختلف شکلوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔

نجی زمرہ میں تنہا تجارت کا تصور بہت قدیم ہے۔ ایسا کاروبار ایک ہی شخص کی ملکیت ہوتا ہے جو اپنے کاروبار میں اپنا سرمایہ اور محنت لگاتا ہے اور اس کے تمام مسائل سے خود ہی نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس کے سارے سرد و گرم برداشت کرتا اور اس کے نفع و نقصان کا تنہا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بوقت ضرورت ملازم بھی رکھتا ہے تاہم وہ اپنی کاروباری جدوجہد میں آزاد اور کسی کی رائے کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی خاص قانون کی پابندی اس پر لازم ہوتی ہے۔ مختلف ممالک میں عام طور پر چھوٹے کاروبار عموماً اسی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔

نجی زمرہ میں شرکتی کاروبار بھی شامل ہیں۔ ایسے کاروبار ہندستان میں قانون شرکت ہند مجریہ 1932 کے تحت چلائے جاسکتے ہیں۔ اس کاروبار میں معاہدہ کا ہونا خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری لازمی ہے۔ ایسے لوگ جو قانون معاہدہ ہند کے تحت نااہل سمجھے جاتے ہیں مثلاً دیوانے، سزایافتہ اور دیوالیہ وغیرہ شرکاء کاروبار نہیں ہوسکتے۔ البتہ نابالغ اس سے مستثنیٰ ہیں اور انھیں شریک کاروبار بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کی ذمہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

داری کاروبار میں لگائے گئے سرمایہ کی حد تک ہی محدود ہو۔

قانون شرکت کی رو سے عام شراکتی کاروبار میں کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ بیس افراد شریک ہوسکتے ہیں۔ شراکتی کاروبار کا بنیادی مقصد حصولی منافع ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی سماجی فلاح و بہبود کا کام یا بلامنافع معاہدہ کی صورت میں مساوی طور پر تقسیم کردیا جاتا ہے۔ انتظامی نقطہ نظر سے تمام شرکاء کاروبار میں حصہ لینے کا حق رکھتے ہیں تاہم بعض اوقات ایک یا ایک سے زائد شرکاء کو کاروبار چلانے کے لیے رکھ لیا جاتا ہے۔ شراکت میں ہر شریک کی حیثیت مالک اور ایجنٹ دونوں کی ہوتی ہے۔ شراکت میں ہر شریک کی ذمہ داری لامحدود ہوتی ہے اس لیے بسا اوقات شرکاء کو کاروبار میں بھاری نقصان کی صورت میں نہ صرف کاروبار میں لگے سرمایہ سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے بلکہ ذاتی جائداد بھی خسارہ کی زد میں آجاتی ہے۔

نجی زمرہ میں مشترکہ سرمایہ کمپنی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جمہوریہ اور صنعتی انقلاب نے اس تصور کو جنم دیا۔ تجارتی اور صنعتی ہونے کی وجہ سے عام شراکتی کاروبار کا دامن تنگ محسوس ہونے لگا۔ بڑے پیانہ پر تجارت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی جو کاروبار میں شرکا کی تعداد بڑھائے بغیر ممکن نہ تھا۔ لیکن اس کا ایک نقصان یہ تھا کہ اتنے زیادہ افراد مل کر کاروبار نہیں کرسکتے تھے اس لیے احساس ہوا کہ کاروبار کی، کاروبار کرنے والوں سے الگ اپنی شخصیت ہونی چاہیے۔ اس طرح کمپنی وجود میں آئی۔ چنانچہ آج جو لوگ کمپنی میں سرمایہ لگاتے ہیں وہ کمپنی کے مالک ضرور ہوتے ہیں لیکن کمپنی ان کے نام سے نہیں بلکہ اپنے نام سے چلتی ہے جس کی قانونی شخصیت کاروبار کرنے والوں کی شخصیت سے الگ ہوتی ہے۔ کمپنی چونکہ ایک قانونی وجود ہے اس لیے اس کے کاروبار، حصہ داروں کے جمہوری طور پر منتخب نمائندے انجام دیتے ہیں اور حصہ داروں کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے تاکہ کاروبار میں نقصان ہونے پر حصہ داروں کو زیادہ مالی نقصان برداشت نہ کرنا پڑے۔ کمپنی کو حصہ داروں سے الگ شخصیت قرار دینے کا فائدہ یہ ہے کہ عوام بڑی تعداد میں شریک ہوکر بغیر کسی انتظامی بار کے منافع سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ کمپنی کی بہت سی قسمیں ہیں اور یہ اپنے اصول و ضوابط میں ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔

اس وقت ہندستان نجکاری کی پالیسی پر تیزی سے گامزن ہے۔ اس لیے نجی زمرہ کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اور آئندہ چند برسوں میں اس کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔

نسلی امتیاز (Apartheid): نسلی امتیاز جنوبی افریقہ کے سفید فاموں کی زبان افریکانس کا ایک لفظ ہے جس کا مہذب مفہوم مختلف نسلوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت سے جداگانہ ارتقاء بیان کیا جاتا رہا ہے لیکن فی الواقع یہ ایک کھلی ہوئی نسلی تفریق کی پالیسی کا نام ہے۔ جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت اس نظریہ کے تحت سیاہ فاموں کی اکثریتی آبادی کو معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے سفید فاموں سے الگ تھلگ اور ان کے تابع رکھنا چاہتی تھی۔ گوکہ نسلی تعصب اور امتیاز جنوبی افریقہ میں سترہویں صدی کے وسط میں یورپیوں کی آبادکاری کا آغاز ہوتے ہی پایا جاتا ہے۔ تاہم نسلی امتیاز کا معروف نظریہ جنوبی افریقہ کی انتہاپسند جماعت نے ایجاد کیا جو 1948 سے 9 / مئی 1994 تک برسراقتدار رہی۔ اس جماعت کا موقف یہ تھا کہ جنوبی افریقہ میں سفید فام تہذیب کے تحفظ کی ضمانت محض اس کی وضع کردہ نسلی امتیاز کی پالیسی کے ذریعہ ہی دی جاسکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جنوبی افریقہ میں ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بند نسلی معاشرے تشکیل دیے جائیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جنوبی افریقہ میں آبادی کے تناسب کے اعتبار سے سیاہ فام 80 اور سفید فام محض 12 فیصد تھے اس کے باوجود 70 فیصد زمینیں سفید فاموں کے لیے وقف تھیں اور افریقیوں کی ایک بڑی اکثریت سفید فام مالکوں کے مزدور کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ انھیں سیاسی اور معاشی حقوق سے محروم کرکے ان کے بے دست و پا مزدور ہونے کی حیثیت کو نسلی امتیاز کی پالیسی کے ذریعہ قانونی شکل دے دی گئی تھی۔ 1948 کے بعد نیشنل پارٹی کی حکومت نے نسلی امتیاز کی پالیسی کو روبہ عمل لانے کے لیے بہت سے قوانین نافذ کیے تھے جو درج ذیل ہیں:

(1) سیاہ فام اور سفید فاموں کے مابین شادی کی ممانعت کا قانون مجریہ 1949

(2) 1950 میں کمیونزم پر پابندی کا قانون۔

(3) 1953 میں سیاہ فام مزدوروں کو خود ہڑتال کرنے اور دوسرے مزدوروں کو ہڑتال پر آمادہ کرنے سے ممانعت کا قانون۔

(4) 1959 میں ہندوستان کی خودمختاری کا قانون، جس کے ذریعہ سیاہ فام

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

آبادیوں کو ایک علاقہ میں محصور کردیا گیا۔

(5) 1963 میں ملزموں کو عدالت کی منظوری حاصل کیے بغیر حراست میں رکھنے کا قانون۔

1952 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں نسلی امتیاز کے مسئلہ پر بحث کے دوران بالعموم یہ رائے ظاہر کی گئی کہ نسلی امتیاز نہ صرف عالمی امن کے لیے خطرہ بلکہ بنیادی انسانی حقوق کے منافی بھی ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ نے جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی تحقیقات کے لیے ڈاکٹر بنچ (Dr. Bunche) کی قیادت میں ایک کمیشن مقرر کیا لیکن وہاں کی حکومت نے اسے داخلہ کی اجازت نہیں دی۔ تاہم اس کمیشن نے نسلی امتیاز کی پالیسی کی مذمت کی اور امید ظاہر کی کہ جنوبی افریقہ کی حکومت اپنی نسل پرستی کی پالیسی ترک کردے گی۔

عالمی رائے عامہ کے زیرِ اثر 1989 میں ایف ڈبلیو ڈی کلرک کی حکومت نے نسلی امتیاز کی پالیسی کے تئیں کچھ نرم رویہ اختیار کیا اور بتدریج اس کے خاتمہ کے لیے گفتگو پر آمادگی ظاہر کی۔ انجام کار فروری 1990 میں فوری طور پر افریقی نیشنل کانگریس کے قائد 30 سال سے مقید نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) کو جیل سے رہا کردیا۔ 17/ مارچ 1992 کو تمام رنگ و نسل کے لوگوں کو مساوی حقوق دینے کی غرض سے محض سفید فاموں کے درمیان استصواب رائے (ریفرنڈم) کرایا گیا جس میں 85.6 فیصد لوگوں نے اس کے حق میں رائے دی۔ 22/ دسمبر 1993 کو پارلیمنٹ نے ایک عبوری دستور کی منظوری دی جس کا مقصد کثیر نسلی پارلیمنٹ کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ 27/ اپریل 1994 کو عبوری دستور کو پانچ سال کے لیے نافذ کردیا گیا اور اس کی رو سے عام انتخابات کے بعد افریقی نیشنل کانگریس کے قائد نیلسن منڈیلا نے زبردست اکثریت سے فتحیاب ہوکر 10/ مئی 1994 کو جنوبی افریقہ کے صدر کی حیثیت سے حلف لیا۔ اس طرح جنوبی افریقہ میں صدیوں سے جاری نسلی امتیاز و تفریق کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

نسلیتی تمدنی گروہ (Ethnic Groups):

نسلیتی تمدنی گروہ وسیع تر آبادی کے ایک جز کا ایسا تمدنی گروہ ہوتا ہے جو نسل قومیت یا تمدن کی اساس پر نمایاں کلچر اور خصوصیات کا حامل ہو۔ روتھ بنیڈک کا خیال ہے کہ ایسے گروہ کی بنیاد نسل نہیں ہوتی بلکہ اس گروہ کی امتیازی پہچان اس کی تمدنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کے جزوی تمدنی گروہ موجود رہے ہیں جن کے اپنے اطراف پائے جانے والے وسیع تر سماج اور اس کے تمدن سے ہمیشہ تصادم اور مسابقت کے تعلقات رہے ہیں۔ افریقہ میں کالا ہاری کے بشمن قبائل سے لے کر مشرق بعید جنوب مشرقی ایشیا یورپ امریکا تمام ممالک میں اس قسم کے نسلیتی تمدنی گروہ پائے جاتے ہیں۔ آج سے تقریباً دو ہزار پانچ سو سال پہلے ہیروڈوٹس نے ایسے نسلیتی تمدنی گروہوں کا ذکر کیا ہے اور یہ سلسلہ سلطنت بازنطین سلطنت عثمانیہ اور بعد کی تمام تہذیبوں میں موجود رہا ہے۔

لیکن سماجیاتی اعتبار سے محققین نے ہمہ نسلی اور ہمہ تمدنی مطالعے اٹھارہویں صدی سے پہلے نہیں کیے۔ البتہ انیسویں صدی سے اس موضوع پر آہستہ آہستہ تحقیقات کا سلسلہ بڑھتا جارہا ہے۔ یوں تو توریت میں بھی نسلیتی گروہوں کے تذکرے ملتے ہیں لیکن جدید اور سائنسی معنوں میں اس قسم کی تحقیقات کی تاریخ نسبتاً بہت ہی مختصر اور محدود ہے۔ عام طور سے وسیع آبادیوں میں چھوٹے چھوٹے نسلیتی گروہ پائے جاتے ہیں جو زیادہ تر نسلیتی اساس پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان میں اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے یا امریکا میں مختلف مقامات کے لسانی یا نسلی گروہ مثلاً ہندستانی اور چینی نسلی اور لسانی بنیادوں پر اپنی ایک ممتاز حیثیت کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے مخصوص گروہ نسلیتی تمدنی گروہ کہلاتے ہیں۔ لیکن نسلیتی گروہ کو ذاتوں سے مشابہت دینا درست نہیں ہے۔ ہندستان میں ذات پات یا جاتیوں کا وجود زیادہ تر درون ازدواجی اور مذہبی اساس پر قائم ہے۔ اس کے علاوہ اس کا تعلق سماجی درجہ بندی سے بھی ہے لیکن نسلیتی گروہ ان پابندیوں سے علاحدہ ایسا گروہ ہوتا ہے جو خواہ کسی وسیع تر سماج میں درجہ بندی کے اونچے زینے پر ہو یا نچلے زینے پر تہذیبی خود مرکزیت کے تصور کی بنا پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے پر مصر ہوتا ہے۔ سماجیاتی اعتبار سے نسلیتی گروہوں کو وسیع تر سماج کے میکانزم میں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ایسے گروہ سماجی تبدیلی کی راہ میں ایک طرف تو بعض اوقات رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں اور دوسری طرف اپنی تہذیب و تمدن کی برتری کے احساس کا شکار ہوتے ہیں۔ سماجی تبدیلی سماجی منصوبہ بندی اور سماجی ترقی کے لیے ایسے گروہوں کی نفسیات کا تجزیہ ضروری ہے جس کے بغیر بہتر اور کامیاب اقدامات ممکن نہیں۔

نسوانیات (مسائل نسواں۔Women's Issues): عورتوں کی مخصوص پریشانیوں اور محرومیوں کے سلسلے میں بحث مباحثہ وغیرہ کافی پرانا سلسلہ ہے۔ سماج میں عورتوں کا نچا درجہ ایک طرح سے عالمی پروبلم ہے۔ تقریباً ہر مہذب اور غیر مہذب سماج میں عورتوں کے ساتھ زیادتیاں عام طور پر ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ہندستان میں حمایتِ نسواں کا نعرہ لگانے والے پہلے فرد شاید راجہ رام موہن رائے سمجھے جاسکتے ہیں۔ جنھوں نے 1829 میں ستی کے رواج کو ختم کرنے والا قانون بنوایا اس میں انھوں نے لارڈ ولیم بینٹنگ کی مدد سے قدامت پرستوں کو کرارا جواب دیا۔ اس سلسلے میں بیواؤں کی شادی کا قانون بنوا کر ایشور چندر ودیا ساگر نے بھی بہت بڑا کام کیا۔ یہ سدھاروادی تحریک کی شروعات تھی۔ مشرقی ہندستان میں برہمو سماج، مغربی خطے میں پراتھنا سماج، شمالی ہند میں آریہ سماج اور جنوبی ہند میں تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ انیسویں صدی کی کچھ حمایت نسواں سے متعلق تحریکات تھیں۔

نسوانی مسائل اور ان سے تعلق رکھنے والی تحریکات کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی پشت پر رہنے والی نفسیات کا خلاصہ کردیا جائے۔ عورتوں کا درجہ ہمیشہ سے ہی کمتر نہیں ہے۔ انسانی تہذیب کی ابتدا میں شادی کی رسم موجود نہیں تھی اس لیے تمام رشتوں کا مرکز "ماں" ہوتی تھی۔ یاد رہے کہ اس دور میں تحفظ کے نقطہ نظر سے بڑے بڑے خاندانوں اور رشتوں کی بنیاد پر بننے والے قبیلوں میں رہنے کا رواج تھا جس میں مرکزی مقام "ماں" کا ہوتا تھا جس کی وجہ سے سب اپنے آپ کو رشتوں میں منسلک سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں اور اس کے کافی بعد تک مادری نظام لاگو رہا۔ اس دور میں عورتوں کا رتبہ کافی اہم تھا۔ ان کو روحانی اور جسمانی قوت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قدیم تہذیبوں میں دیویوں کا رتبہ دیوتاؤں سے کم نہیں ہے۔ مصر و یونان میں ہی نہیں بلکہ ہندستان میں بھی دولت، قوت، جنسیات، علم و فن وغیرہ ہر شعبہ کے لیے ایک دیوی مقرر کی گئی ہے۔ تمام قدیم مذاہب میں "ماں" اور دیوی ہم معنی طور پر استعمال ہونے والی اصطلاحات ہیں۔ دیویوں کو ماں کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔

تہذیب و تمدن کے اس ابتدائی دور کے بعد رفتہ رفتہ شادی کی رسم ایجاد ہوئی اور اس کے بعد خاندان میں باپ کے رشتے کا آغاز ہوا۔ پتھر کے دور کے بعد جب لوہے اور دیگر دھاتوں کا دور شروع ہوا تو مردوں نے قوت بازو کی وجہ سے مرکزی مقام حاصل کرلیا۔ اس طرح عورتوں کے رتبہ کا زوال شروع ہوا اور مردوں نے ان کو اپنی ملکیت اور کبھی کبھی عزت و ناموس سمجھنا شروع کردیا۔ یہ صورت حال تقریباً ہر سوسائٹی میں پیش آئی۔ اس کے علاوہ ابتدا سے ہی عورتوں کو پاکیزگی کی اور جنسیات سے بے رغبتی کی تعلیم دی جاتی تھی اس لیے مردوں اور عورتوں کے اخلاقی قوانین بھی مختلف بنے۔ اور ہر سوسائٹی میں یہ دوہرے معیار آج تک رائج ہیں۔ عورتوں کے آزادانہ اختلاط کو ان کے خاندان کی بے عزتی سمجھا جانے لگا۔ اس لیے ان کی شخصیت کی نشو ونما کے امکانات محدود ہوتے چلے گئے۔ اس طرح ان کو محض مردوں کا سایہ سمجھا جانے لگا ایک فرد کی طرح ان کی پہچان ختم ہوگئی۔

یہی صورت حال برصغیر میں بھی چلتی رہی۔ ہند قدیم میں عورتوں کی حالت اتنی سقیم نہیں تھی لیکن ویدک دور میں غیر آریہ لوگوں سے دور رکھنے کے لیے ان پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ ان کو اپنے طور پر سوچنے بچارنے کے ناقابل سمجھا جانے لگا۔ ان کو ناپاک، ناقابل اعتبار، ناقص العقل اور گناہگار سمجھا گیا ہے۔ لیکن 'بعد از ویدک دور' جو کہ سمرتی دور بھی کہلاتا ہے، میں عورتوں کی حالت بے حد نچلی سطح تک پہنچا دی گئی۔ ان کو پابندیوں سے لاد دیا گیا۔ منوسمرتی مکمل طور پر شودروں اور عورتوں کی دشمن کتاب کو کہا ہے۔ اس میں اکثر جگہ دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھا ہے۔ عورتوں کے پڑھنے لکھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ نوکری، روزگار اور جائیداد کی وراثت بھی ناممکن سمجھی گئی۔ کیونکہ خاندان میں ان کی وجہ سے ہمیشہ خطرہ بنا رہتا تھا۔ اس لیے بچپن کی شادی رائج کر دی گئی۔ بودھاین (Bodhayan) نے کہا ہے کہ چار سال کی عمر کے بعد کبھی بھی لڑکی کی شادی کی جاسکتی ہے۔ کنیادان کے لیے شاستروں میں "گوری دان" کا رواج پسند کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ لڑکی ماہواری آنے کی عمر سے پہلے ہی بیاہ دی جائے۔ بیوہ کے لیے زندگی کی نعمتیں حرام کردی گئیں اور ستی کو رائج کیا گیا۔

آگے چل کر قرون وسطی میں یہی صورت حال باقی رہی۔ بچپن کی شادی، ستی، بیواؤں کے ساتھ بدسلوکی اسی طرح چلتے رہے بلکہ ہندوؤں کے علاوہ دوسروں نے بھی ان رسموں کو قبول کر لیا۔ ستی کے علاوہ میدان جنگ میں جانے والے راجاؤں کی بیویاں خوشی خوشی ان کی زندگی میں ہی گروہوں میں اجتماعی خودکشی آگ میں کود کر کرلیتی تھیں۔ اس طرح ستی

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے ساتھ ساتھ 'جوہر' نام کی رسم بھی رائج ہوگئی جو بیوگان زندہ بچ بھی جاتی تھیں وہ بھی اپنے وجود پر شرمندہ رہتی تھیں اور جانوروں سے بدتر زندگی گزارتی تھیں۔ ازدواج ثانی کی سخت مخالفت اور بچپن کی شادی نے 'بچی بیواؤں' کی تعداد میں اضافہ کردیا۔ اس طرح اکثر پانچ سال کی بچی نہ بچپن گزار سکتی تھی نہ جوانی اسے سر منڈا کر، سفید لباس پہن کر اور ایک وقت کھا کر ریاضت کی زندگی گزارنی پڑتی تھی۔ عورتیں خاندان کی عزت کو دھبا نہ لگاسکیں اس کے لیے مغربی ممالک میں عصمت کی پیٹی (Chastity Belt) چین میں ان کے پیروں کو چھوٹا کردینا اور افریقی ممالک میں ان کے پرائیویٹ اعضا کا سی دینا وغیرہ رسومات رائج رہی ہیں۔ اس طرح ان کے باکرہ ہونے کے بہت سے ٹیسٹ بھی ہوتے رہے ہیں۔ کسی نہ کسی شکل میں یہ آج بھی چل رہے ہیں۔ ہندوستان میں اگنی پریکشا کا دستور رہا ہے۔

یہ کہنا مکمل طور سے درست نہیں ہے کہ برصغیر میں عورتوں کے ساتھ بے حد بدسلوکی کی گئی۔ یہاں عورت ماں بن کر درجہ بلند کرسکتی تھی لیکن غیر شادی شدہ یا بانجھ کا کوئی درجہ نہ تھا۔ شادی کو معاشرہ از حد ضروری قرار دیتا تھا۔ لیکن بیوی سے تعلق رکھنے والا ہر رشتہ مثلاً سالا یا سالی گالی سمجھا جاتا تھا۔ اس چیز سے بچنے کے لیے جنم لیتے ہی بیٹیوں کو ختم کر ڈالنا یا دخترکشی کو راجستھان اور بنگال وغیرہ میں رائج کردیا گیا۔ قرونِ وسطیٰ میں اونچے گھرانوں میں لڑکیاں اکثر غیر شادی شدہ رہیں تاکہ ان کے وارثا کو سر نہ نیچا کرنا پڑے۔ اس کی مغل خاندان میں بھی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً جہاں آرا زیب النساء وغیرہ اکبر اعظم نے کچھ سدھارواوی اقدامات کیے تھے مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اصلی اصلاحی تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی جس کا سہرا مشنریوں کے سر بندھنا چاہیے۔ انھوں نے ستی ہوتی ہوئی عورتوں اور گنگا کی بھینٹ چڑھائے ہوئے بچوں کو بچا کر ان کو بپتسمہ دیا۔ اس طرح دھرم کے ٹھیکیدار چونکے اور ہندو دھرم کی اصلاح کا کام شروع ہوا اور ایک طرح سے اس کی صحیح شکل صورت کی تلاش شروع ہوئی۔ ایک وقت وہ آیا جب کچھ سدھاروادی تحریکات مشنریوں سے متاثر رہیں اور کچھ ان کی مخالف لیکن کل ملا کر انیسویں صدی کی اصلاحی تحریک تقریباً مکمل طور پر حمایت نسواں کی علمبردار رہی۔ دوسرے مسائل مثلاً غریبی، بیماری اور طبقاتی کشمکش پر بالکل دھیان نہیں دیا گیا جیسا کہ پہلے ہی کہا گیا یہ سدھارواری تحریک راجہ رام موہن رائے نے شروع کی۔ یہ مشرقی ہندستان سے شروع ہوئی تھی اور پھر پورے ملک میں پہنچ گئی۔ یہ کافی حد تک صرف ہندوؤں تک محدود رہی۔ مسلمانوں میں اس قسم کی تحریکیں کافی بعد میں آئیں لیکن مسلمانان ہند نے نسوانی انداز کی کتابیں اور رسالے شائع کرنے کا کام انیسویں صدی میں ہی شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ مصور غم علامہ راشدالخیری نے سدھارواد کے پردے میں قدامت پرستی کی ہی تلقین کی لیکن مسائل کی طرف لوگوں کی بھرپور انداز میں توجہ مبذول ضرور ہوئی۔ اس سلسلے میں پہلی منظم کوشش مولانا ارشد علی تھانوی نے کی۔ انھوں نے 1939 میں برٹش سرکار سے درخواست کرکے مسلم رعایا کے قوانین میں کچھ ترمیم کرائی۔ انھوں نے جہلة الناجزة للعاجزة نام ایک کتابچہ بھی (عربی میں) لکھا تھا۔

بیسویں صدی کی سدھارواری تحریک کافی حد تک مہاتما گاندھی کے زیر اثر رہی۔ خواتین کا سیاسی زندگی میں حصہ لینا پسند کیا جانے لگا۔ اور آزادی کی جدوجہد میں ان کا قابل ذکر حصہ رہا۔ آزادی کے بعد جو آئین ہند تیار ہوا اس میں مرد و زن کو مکمل مساوات دی گئی۔

اگر بیسویں صدی کے نصف آخر کو دیکھا جائے تو عورتوں کی جدوجہد مساوات و آزادی کو کئی ادوار میں بانٹا جا سکتا ہے مثلاً ہندستانی سماج کے پچھڑے ہوئے طبقوں کی عورتوں کی فلاح و بہبود کی مہم، سیاسی بیداری کا دور اور سیاسی حصہ داری کا زمانہ، آزادی کے بعد آئینی جدوجہد اور فلاحی قانونوں کا دور، خواتین کے کمیشن کا قیام، عورتوں کے لیے انسانی حقوق کی جدوجہد، ریزرویشن کا مدعا اور پنچایت سے پارلیمنٹ کا سفر وغیرہ خواتین کی ترقی کے سفر کے سنگ میل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پذیر ممالک میں ہندستان نے کافی اہم مقام حاصل کیا ہے۔ ان تمام اقدامات کی مختصر سی تفصیل سے یہ تصویر واضح ہوجائے گی۔

انیسویں صدی میں اونچے طبقے کی عورتوں کے سلسلے میں کام ہوا۔ یاد رہے کہ ستی کی رسم اور عقد بیوگان کی ممانعت اور روک ٹوک صرف اونچی ذات اور اونچے طبقے کی عورتوں پر لاگو ہوتی تھی۔ اس لیے شروع کا دور ان کے مسائل کے لیے وقف رہا۔ اس دور میں ان دوسرے طبقوں کو نظرانداز کیا گیا۔

ہری جن اور دلت طبقوں کی عورتیں بہت ہی بری حالت میں تھیں۔ اس زمانے میں کچھ سماج سدھارکوں نے ان کی حالت میں سدھار کیا۔ اس میں گاؤں کے علاوہ چائے کے باغات میں کام کرنے والے

مزدوروں اور مزدورنوں کے علاوہ غیر منظم مزدوروں کے طور پر کام کرنے والی عورتوں کے سلسلے میں اقدامات اٹھائے گئے۔ اس کے کچھ عرصے بعد بابائے قوم نے عورتوں کی سیاسی زندگی کی بنیاد رکھی اور گھروں سے باہر آنے کی تلقین کی۔ اگرچہ آج کے دور کی قدروں کے مطابق تو وہ کافی قدامت پسند ہی کہے جاسکتے ہیں لیکن اس زمانے کے لحاظ سے یہ باغی اقدامات تھے۔ آزادی ملی اور آئین نے عورت کو مکمل مساوات دی۔ لیکن اس کا حصول کرنے والے کچھ ہی لوگ رہے۔ ہندو کوڈ بل بننے کے بعد عورت اور مرد کو مکمل مساوات حاصل ہوگئی۔ ہندو دوسری شادی نہیں کرسکتے ہیں۔ طلاق کا حق دونوں کو یکساں حاصل ہے۔ جائیداد میں برابر حصہ مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار قانون بنے جس میں حال میں بننے والا 498A قانون عورتوں کو بے شمار حقوق اور مردوں سے بہتر رتبہ دینے کا باعث بنا۔ خواتین کے قومی کمیشن (National Commission for Women) کا قیام 1990 میں عمل میں آیا۔ اس نے عورتوں کی فلاح و بہبود کو "ترقی" کی حد تک پہنچایا اور عورتوں کو بیچارگی کے تصور سے نکالا۔ اس نے مسلم عورتوں اور دلت عورتوں کے لیے علاحدہ کام کیے۔ اس کی شاخیں تمام ریاستوں میں قائم ہوگئیں اور رفتہ رفتہ کافی فعال بھی ہوگئیں۔ اس سے پہلے ساتویں دہائی میں عورتوں کے لیے سرکار نے بھی کافی کام کیا۔ 1971 میں عورتوں کی حالت کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس نے اپنی رپورٹ 1975 میں پیش کی۔ اس کی روشنی میں کئی کمیٹیاں بنائی گئیں اور کچھ دیگر بنیادی قدم اٹھائے گئے۔ مثلاً DWCRA وغیرہ پروگرام شروع کیے گئے۔ 1989 میں شروع ہونے والی مہیلا سماکھیا تحریک میں مساوات کے لیے تعلیم کا پروگرام شروع کیا گیا جو بہت بااثر رہا۔

سرکار کی طرف سے موثر قدم اٹھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

(1) قانونوں میں سدھار کیا گیا۔

(2) پانچ سالہ منصوبوں میں عورتوں کو خاص مقام دیا گیا۔

(3) عورتوں کے لیے پروگرام اور پروجکٹ شروع کیے گئے۔

(4) ان کے مخصوص سیل، بیورو اور شعبہ وغیرہ قائم کیے گئے۔

بین الاقوامی جدوجہد کے طور پر عورتوں کی انجمنوں نے عورتوں کے انسانی حقوق، عورتوں لڑکیوں اور بچیوں کی تجارت وغیرہ کئی مسائل پر دنیا کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس سلسلے میں ہندی عورتوں کا اہم رول رہا ہے۔ بھارت میں سیاسی عمل میں عورت کی حصہ داری کو لازمی بنانے کے لیے پنچایتوں میں ان کو 33 فیصدی ریزرویشن دے دیا۔ جس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ ایک طرف تو انھوں نے کافی کام لیا اور ان میں اپنی ذات کی نفی کرنے کا رجحان کم ہوگیا۔ ان میں بیداری بھی آئی لیکن دوسری طرف ان میں ایسی بھی مثالیں ملیں کہ پنچایت میں عورتوں کی حصہ داری صرف نام کی رہی۔ بہرحال ہر حلقہ میں مسائل نسواں کے سلسلے میں بیداری کی لہر دوڑ چکی ہے ملکی اور عالمی دونوں سطحوں پر اس سلسلے میں کام ہورہا ہے۔

آج کے چیدہ مسائل کچھ یوں ہیں:

(1) عورت کی حیثیت اور رتبہ کا گھر اور باہر کی دنیا میں تعین۔

(2) عورت کی فرد کے طور پر پہچان، صرف ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے روپ میں وجود رکھنا آج کافی نہیں۔

(3) دیوی اور داسی دونوں کے کردار کو ادا کرنے سے انکار، ایک انسان کے طور پر پہچان مکمل مساوات اور معاشرے کے ذرائع، مراعات اور مسائل میں برابر کی حصہ داری۔

(4) فلاحی فلسفہ سے 'ترقی' اور ترقی سے 'پرقوت' بننے (Empowerment) کی طرف مارچ۔

(5) اپنی ذات کی نفی کرنے والے تمام فلسفوں اور روایتوں سے انحراف اور خود آگاہی (Self Actualization) کی طرف سفر۔

(6) مالی اور سیاسی قوت میں حصہ داری۔

(7) تعصب آمیز اور عورت کو ناقابل اور کمتر سمجھنے والے ہر لائحۂ عمل اور فلسفہ سے پرہیز۔

(8) گھر اور باہر کے جسمانی تشدد سے مکمل تحفظ کا حصول۔

(9) خصوصی معالجہ اور غذا کا انتظام، دوران حمل اور وضع حمل کے بعد کی دیکھ بھال کا بندوبست۔

اس طرح پرانے زمانے کے پسندیدہ فلسفے کی بنیاد پر 'منی آنچل میں دودھ اور آنکھ میں پانی' والی عورت کی تصویر دھیرے دھیرے دھندلی پڑ رہی ہے۔ خاتون خانہ کی دیوی نما امیج کے الگ ہٹ کر ترقی پسند تحریک کے عروج میں بے مراعات نسوانیت (Privilege Free Womenhood) کا نعرہ دیا گیا۔ اس کے بعد فیمنزم (Feminism) کا دور آیا جس نے بننے

سنورنے، ناز نخرے کرنے اور نسوانی ہولاؤں کو بیکار قرار دیا گیا۔ اس تحریک کی ایک شاخ نے عورتوں میں ہم جنسی کو بڑھاوا دیا (تفصیل کے لیے دیکھیں "ہم جنسی")۔ لیکن اس فلسفہ کے ماننے والوں میں سبھی ہم جنس پرست نہیں تھے اس طرح فیمنزم کی دو شاخیں ہو گئیں۔ ہم جنس پرست اور غیر ہم جنس پرست لیکن دونوں ہی طبقے مردوں کو اپنا دشمن گردانتے رہے۔ یہ فلسفہ مغرب میں مقبول رہا۔ ہندستان نے گاندھی کے فلاحی نسوانیت کے فلسفہ کو بھی ابھارا جس میں عورت کے سیاسی رول اور اہمیت کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن اس کو مرد کے سایہ سے مکمل آزادی نہیں دی گئی ہے۔ اس کے باوجود تعلیم، عقد بیگان اور جائیداد میں حصہ داری کی حمایت کی گئی ہے۔ طوائفوں کو انھوں نے سماج کے عام دھارے کے ساتھ جوڑنے کی بات کی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیں گاندھی ازم)۔ آج نسوانی طرز فکر نے ادب، تواریخ، معاشیات، سیاسیات، ماحولیات اور جغرافیہ وغیرہ تمام علوم کو ایک نیا زاویہ دیا ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کے سلسلے میں ساری دنیا کے ساتھ ہندستان میں بھی بہت کام ہوا ہے اس کے باوجود ابھی تک عورت کو اس کا مقام نہیں ملا ہے۔ آج بھی عورت ہیڈ آف دی اسٹیٹ ہو سکتی ہے لیکن ہیڈ آف دی فیملی نہیں۔ آج بھی عورت کی پہچان اس کے باپ یا شوہر کے حوالے سے ہے۔ ہر سرکاری فارم میں اس بدعت کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ عورتوں کو ابھی بہت عرصے تک جدوجہد کرنا ہوگا۔

نصفت (Equity): نصفت جس کو انگریزی میں ایکویٹی کہتے ہیں ان اصول قانون کا نام ہے جن کو قدیم روما میں پریٹرون (Praeters) یا مجسٹریٹ نے اور انگلستان میں لارڈ چانسلروں نے مدون کیا تھا۔ نصفت کے معنی مساوات قایم کرنا ہے عام فہم معنی میں نصفت سے مراد انصاف خصوصا قدرتی انصاف کے ہیں۔ نصفت کا اصل مفہوم اس وقت سمجھ میں آئے گا جبکہ قدیم روم و نیز انگلستان میں اس کے ارتقا کی تاریخ اختصار کے ساتھ بیان کردی جائے۔

قدیم روما میں جب بارہ تختیوں کے قانون (Law of Twelve Tables) کی تدوین میں عمل میں آئی تو قدیم قانون میں جو زیادہ تر رسم و رواج پر مبنی تھا یکسانیت پیدا ہوئی اور اس کے ضبط تحریر میں لانے سے عوام اس سے روشناس ہوئے اور قانون ملک کی ایک مستقل حیثیت پیدا ہوئی اس سے ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا لیکن دوسری طرف قانون تغیر پذیر نہیں رہا اور جوں جوں سماجی ضروریات بڑھتی گئیں اور تمدن میں ترقی ہوگی گئی تو یہ مستقل قانون ان ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر رہا۔ فتوحات کی بنا پر دنیا کی دیگر اقوام سے اہل روما کے تعلقات بڑھتے گئے اور غیر ملکی باشندے شہر روما میں آنے جانے لگے۔ روم کا قانون جس کا اطلاق صرف روم والوں پر تھا اور جسے جس سول (Jus Civile) کہتے تھے، ایک طرف تو خود اہل روم کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر رہا تو دوسری طرف غیر ملکی باشندوں کے لیے یہ قانون ناقابل اطلاق تھا۔ بہت سارے حقوق ایسے تھے جن کو جس سول تسلیم ہی نہیں کرتا تھا اور جو حقوق مسلمہ تھے ان کی خاطر خواہ حفاظت نہیں ہوتی تھی کیونکہ جو چارہ کار تھے وہ ناکافی اور جو ضابطہ ان کے حصول کے لیے تھا اس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ ان قوانین میں بہت ساری خامیاں اور کمیاں تھیں جس کی وجہ سے انصاف رسانی میں خلل واقع ہورہا تھا۔ جب پریٹرون یعنی مجسٹریٹوں کا تقرر عمل میں آنے لگا تو صورت حال میں بہتری ہونے لگی وہ اس طرح کہ ہر سال جب کسی پریٹر کا تقرر عمل میں آتا تو وہ اپنے چند اصول مدون کرکے ان کا اعلان کرتا تھا کہ وہ عدل گستری میں ان ہی اصولوں پر عمل کرے ان اعلانات کو فرمان (Edict) کہتے ہیں رومیوں نے جب یونان کو فتح کیا تو اس ملک کے علوم و فنون سے بہت متاثر ہوئے۔ خصوصا یونانی فلسفہ سے۔ یونانی فلسفہ میں قانون قدرت اور قدرتی انصاف کا بھی تصور تھا اس تصورسے اہل روم بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس قانون قدرت اور قدرتی انصاف کے تصور کا پریٹرون پر بھی کافی اثر تھا۔ چنانچہ جب پریٹرون نے دیکھا کہ ان کے ملکی قانون کے اطلاق سے ناانصافیاں ہورہی ہیں تو انھوں نے اس قانون قدرت و انصاف کے چند اصولوں کو اپنایا اور اپنے فرمان (Edict) میں ان کو شامل کردیا پریٹر کے پاس جب کبھی کوئی تنازعہ فیصلے کے لیے آتا تو وہ نزاعی امور کو ایک فارمولے کی شکل میں تیار کرکے اپنی رائے کے ساتھ ایک دوسرے شخص کے پاس روانہ کر دیتا تھا جس کو جوڈکس (Judex) یعنی منصف کہتے تھے۔ یہ شخص انھی اصولوں پر مقدمہ کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ جہاں تک غیر ملکی باشندوں کے تنازعات کا تعلق تھا تو یہی پریٹر ان اقوام کے قوانین کے ایسے اصول منتخب کرلیتا تھا جو عام طور پر دیگر اقوام کے قوانین میں بھی پائے جاتے تھے۔ ان منتخبہ اصولوں کے مجموعہ کو جس جنٹم (Jus Gentium) یعنی قانون اقوام کہا

جاتا تھا۔ یہی قانون ہمارے موجودہ قانون بین الاقوام کی ابتدائی شکل تھی۔ پس وہ اصول جن کو پریٹر اپنے فرمان میں شریک کرتا تھا اور جو ملک کے قانون سے مختلف ہوتے تھے اور جن کا ماخذ قانون قدرت یا قدرتی انصاف تھا نصفت (Equity) کہلائے۔ ہر سال نئے پریٹر کا تقرر ہوا کرتا تھا اور وہ اپنے پیش رو کے فرمان کو برقرار رکھتے ہوئے چند نئے اصولوں کو ان میں شامل کرتا تھا تاکہ نئے نئے تصورات اور سماجی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرسکے اور اس طرح قدیم روم کے قانون میں ایک نئے جز کا اضافہ ہوا جس کو ایکویٹی یا نصفت کہتے ہیں۔

انگلستان میں زمانہ قدیم سے ملک کے قدیم رسم و رواج پر عمل ہوا کرتا تھا اور جب قرون وسطیٰ میں شاہی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا تو ان عدالتوں میں انھی رسم و رواج پر مقدمات کا فیصلہ ہونے لگا۔ جب ان رسوم و رواجوں کو عدالتی فیصلوں میں جذب کیا گیا تو ان کی ایک قانونی شکل پیدا ہوئی۔ اس قانون کو کامن لاء (Common Law) یعنی قانون عام یا رواجی قانون کا نام دیا گیا۔ یہ قانون اگرچہ کہ غیر مدونہ تھا تاہم وہ غیر تغیر پذیر اور انتہائی سخت تھا۔ بہت سارے حقوق ایسے تھے جن کو یہ قانون تسلیم ہی نہیں کرتا تھا اور مسلمہ حقوق کی خاطر خواہ حفاظت نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ان کے چارہ کار ناکافی تھے اور جس ضابطہ پر عمل ہوتا تھا وہ بھی نہایت ہی ناقص تھا۔ ہر قانون کو چاہیے کہ وہ تمدن میں ترقی کا ساتھ دے اور سماجی ضروریات جوں جوں بڑھتی جائیں قانون میں بھی تبدیلی ہونی چاہیے ورنہ اس سے سخت ناانصافی اور بے اطمینانی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے اس کامن لا کا بھی یہی حال تھا۔ عوام میں اس کی وجہ سے بے چینی پیدا ہونے لگی اور وہ لوگ جن کو اس زمانہ کی شاہی عدالتوں سے انصاف کی توقع نہیں تھی یا ان کو انصاف مل ہی نہیں سکتا تھا بادشاہ کے پاس بہت ہی مودبانہ انداز میں اپنی عرضیاں پیش کرنے لگے کیونکہ وہ انصاف کا منبع سمجھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو بادشاہ ان عرضیوں کی خود سماعت کرکے فیصلہ صادر کیا کرتا تھا لیکن جب ان عرضیوں میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا اور بادشاہ اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکا تو اس نے اپنے مشیر خاص کو جس کے قبضہ میں بادشاہ کی مہر ہوا کرتی تھی اور جس کو لارڈ چانسلر کہتے تھے طلب کرکے ان تمام عرضیوں کو اس کے حوالے کردیا کرتا تھا تاکہ وہ بادشاہ کے نمائندہ کی حیثیت سے ان عرضیوں کا فیصلہ کردے۔

جب عوام کو معلوم ہوا کہ یہ کام بادشاہ نے لارڈ چانسلر کو تفویض کر دیا ہے تو وہ بجائے بادشاہ کو عرضی دینے کے براہ راست لارڈ چانسلر کو اپنی عرضی دینے لگے اور لارڈ چانسلر ان عرضیوں کا فیصلہ کرنے لگا۔

لارڈ چانسلر کے اجلاس کو کورٹ آف چانسری (Court of Chancery) یعنی چانسلر کی عدالت کہنے لگے اور اس کورٹ کی یہاں سے ابتدا ہوئی وہ قانون جس پر لارڈ چانسلر عمل کرنے لگا یہ ملک کے رواجی قانون سے مختلف تھا اور زیادہ تر قدرتی انصاف پر مبنی تھا نصفت (Equity) کہلایا جانے لگا۔

نصفت کی ماہیت (Form of Equity) : عدالت چانسلری کے قیام کے بعد لارڈ چانسلر تین قسم کے اختیارات سماعت استعمال کرنے لگا۔ پہلی قسم کے اختیار سماعت کو مخصوص اختیار سماعت کہتے ہیں۔ اس مخصوص اختیار سماعت کے تحت لارڈ چانسلر ان حقوق کو تسلیم کیا کرتا تھا جن کو کامن لا کی عدالتوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کی بہترین مثال امانت (Trust) کی ہے امانت کے کسی قسم کے حق کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے ناانصافی ہورہی تھی۔ لارڈ چانسلر نے (Beneficiary) کے حقوق کی حفاظت کی اور سارے کا سارا قانون امانت اسی کا مرہون منت ہے۔ دوسری قسم کا اختیار سماعت متوازی کہلاتا تھا کیونکہ ایسا اختیار سماعت کامن لا کی عدالتوں کو بھی حاصل تھا فرق صرف اتنا تھا کہ چند مخصوص قسم کے چارہ کار مثلاً حکم امتناعی یا معاہدہ کی تعمیل خاص، صرف عدالت چانسلری میں ہی حاصل ہوسکتے تھے۔ تیسری قسم کا اختیار سماعت امدادی کہلاتا ہے کیونکہ اس کے تحت لارڈ چانسلر فریقین مقدمہ کی مدد کرتا تھا اور چند ایسے ضوابط جو کامن لاء کی عدالتوں میں تسلیم نہیں کیے جاتے تھے ان کو لارڈ چانسلر نے جاری کیا مثلاً ریسیور کا تقرر، معائنہ دستاویزات، حساب فہمی، سوالنامہ وغیرہ۔

ان تین اقسام کے اختیار سماعت کی وجہ سے انگلستان کے لارڈ چانسلروں نے بہت سے اصول مدون کیے اور نئے نئے چارہ کار ایجاد کیے اور ضابطہ قانون میں اصلاح کری جس کی وجہ سے انگلستان کے عوام کو بہت سی سہولتیں بہم پہنچیں اور ایک بالکل جدید قسم کا قانون تیار ہوا جو کامن لاء کے ہم پلہ بلکہ اس سے بھی بالاتر تھا اور اسی جدید قسم کے قانون کو نصفت یا ایکویٹی کا نام دیا گیا۔ عدالت چانسری 1873 تک ایک علاحدہ عدالت کی حیثیت سے کارگزار رہی لیکن اس کے قانون عدالت نے اس

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

عدالت کو برخاست کر دیا اور ایک ہائی کورٹ اور ایک کورٹ آف اپیل کا قیام عمل میں آیا اور قرار دیا گیا کہ آئندہ سے انگلستان کی ہر عدالت کو کامن لاء کے چارہ کار کے ساتھ ساتھ نصفتی چارہ کار بھی جاری کرنے کا حق ہوگا اور جہاں کامن لاء اور نصفت کے اصولوں میں تصادم ہو وہاں نصفتی اصولوں کو ترجیح دی جائے۔

پس عدالت چانسری صرف اسی وقت مداخلت کرتی تھی جبکہ کامن لاء کی عدالت انصاف رسانی سے قاصر ہو اگر کامن لاء کے تحت کسی فریق کو پورا پورا انصاف مل سکتا ہو تو عدالت چانسری مداخلت نہیں کرتی تھی اور خود نصفت کا یہ مقولہ تھا کہ وہ قانون کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہے نہ کہ اس کو تباہ کرنے کے لیے اور قانون کا تتبع اپنا فرض سمجھتی تھی۔

عرف عام میں نصفت کے معنی قدرتی انصاف اور مساوات کے ہیں لیکن قانون میں نصفت کے معنی قدرتی انصاف کے اس جز کے ہیں جس کو بذریعہ عدالت قابل تعمیل قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نصفت کے اصول پر بہت سارے ایسے حقوق کو تسلیم کیا گیا جو غیر مسلمہ تھے اور جدید چارہ کار ایجاد کیے گئے جس کے ذریعہ ان حقوق کی حفاظت ہونے لگی لیکن نصفت پر ناجائز فعل کے لیے چارہ کار فراہم نہ کر سکی نصفت نے انگلستان کے قانون میں بہت سارے ایسے اصولوں کو داخل کیا جس سے انصاف رسانی اور عدل گستری میں کافی مدد ملی اور اس کا درجہ دنیا کے دیگر قوانین میں بہت بلند ہوگیا چنانچہ جب ہندوستان میں انگریزوں نے عدالتوں کو قایم کیا تو اپنے کامن لاء اور نصفت کو اس ملک میں عدل گستری کی بنیاد بنایا۔ ہندوستان کا قانون امانت و قانون دادرسی خاص تمام تر انگلستان کے قانون نصفت پر مبنی ہیں نیز نصفت کے اکثر اصول قانون معاہدہ و قانون انتقال جائداد و ضابطہ دیوانی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ قانونی چارہ کار و نصفتی چارہ کار کا بین فرق یہ ہے کہ اول الذکر بطور حق کے طلب کیے جاسکتے ہیں اور موخرالذکر کا دارومدار عدالت کی صوابدید پر ہے۔

نصفت کی ماہیت کا اندازہ ان بنیادی اصولوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

(1) مساوات نصفت ہے۔

(2) جس کو نصفت کی تلاش ہے وہ نصفت پر عمل کرے۔

(3) جو کوئی نصفت کے قریب آتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ پاک رکھے۔

(4) نصفت نیت کو دیکھتی ہے نہ کہ ظاہری عمل کو۔

(5) نصفت قانون کا تتبع کرتی ہے۔

(6) نصفت کسی ناجائز فعل کو بلا چارہ کار کے برداشت نہیں کرتی۔

(7) نصفت یہ تصور کرتی ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کی انجام دہی کی نیت رکھتا ہے۔

(8) نصفت یہ تصور کرتی ہے کہ جو کام ہونا چاہیے تھا وہ ہو چکا۔

(9) جہاں نصفت مساوی ہو وہاں قانون پر عمل ہوگا۔

(10) جہاں دو کے حق میں نصفت مساوی ہو وہاں وقت کے لحاظ سے جو پہلے ہو اس کو ترجیح دی جائے گی۔

(11) تاخیر نصفت کو شکست دیتی ہے۔

(12) نصفت ہر شخص کی ذات پر موثر ہوتی ہے۔

نصفت کے چند اہم چارہ کار یہ ہیں:

(1) حکم امتناعی، عارضی و دوامی

(2) معاہدہ کی تعمیل خاص

(3) حساب فہمی

(4) رسیور کا تقرر

(5) طلبی و معائنہ دستاویزات

(6) تنسیخ معاہدہ

(7) جزوی تعمیل معاہدہ

(8) تنسیخ دستاویزات وغیرہ۔

ان اصولوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ نصفت کا اصل مقصد انصاف ہے۔ محض قانونی جکڑ بندیوں میں پھنس کر انصاف کا خون نہیں کیا جانا چاہیے۔ عدالت چانسری اپنے کو عدالت ضمیر کہا کرتی تھی۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسا فعل کرے جو اس کے ضمیر کے خلاف ہو تو باوجود اس کے کہ قانون طرف دار ہو عدالت چانسری فریق متضرر کو اس کا حق دلاتی تھی۔ کئی لوگ جو فریب یا نقض معاہدہ یا وعدہ خلافی کے مرتکب ہو کر بھی قانون کا سہارا لے کر بری الذمہ ہوجایا کرتے تھے ان کو عدالت چانسری سے مفر نہیں تھا۔

نظام تسمیہ (Nomenclature) : یہ ناموں کا ایسا نظام یا زمرہ (Set) ہے جو فرد یا جماعت (Community) کی طرف سے بالعموم فرد اشیا یا رشتوں وغیرہ کے سلسلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا عملی مقصد ایک شے فرد یا رشتہ کو دوسری شے فرد یا رشتہ سے متمیز کرنا ہے۔ طبعی علوم میں نظام تسمیہ کے ذریعہ کیمیائی یا حیاتیاتی دستہ بندی (Grouping) کی جاتی ہے تاکہ اشیا کی علمی درجہ بندی (Classification) کی جاسکے۔ معاشرتی علوم میں نظام تسمیہ کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ کسی شخص یا فرد کا نام اس لیے رکھا جاتا ہے کہ وہ دوسرے افراد سے الگ پہچانا جائے اور اپنے لیے اس نام کو اس طرح مختص کرلے کہ اس کے حوالہ پر جوابی عمل (Response) کرے۔ اجتماعی نوعیت قرابت داری کی اصطلاحات (Kinship Terminology) کی ہوتی ہے۔ اس نوعیت کے نظام میں ہر نام ایک فرد کی دوسرے فرد سے رشتہ داری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس نوعیت کا ہر نام بالعموم خود وضاحتی ہوتا ہے۔ مثلاً باپ ماں بیٹا بیٹی بھائی بہن وغیرہ۔ یہ سارے ہی نام خود وضاحتی بھی ہیں اور بالعموم آفاقی بھی۔ لیکن بعض قرابتی نام ایسے بھی ہیں جو ایک معاشرہ سے دوسرے معاشرہ میں بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ہم باپ کے بھائی کو چچا، ماں کے بھائی کو ماموں، باپ کی بہن کے شوہر کو پھوپھا اور ماں کی بہن کے شوہر کو خالو کہتے ہیں۔ لیکن برطانوی سماج میں ان سب کو صرف (Uncle) (انکل) کہتے ہیں۔ نظام تسمیہ سے ہر معاشرہ رشتہ داریوں کی آئندہ شکل اور آئندہ رشتہ داریوں کا تعین کرتا ہے۔ یعنی ناموں کا وہ دستہ (Group) جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کے درمیان جنسی تعلق شادی یا ازدواجی خاندان کا قیام ممنوع ہے اور ناموں کا وہ دستہ جس کے درمیان جنسی تعلق شادی یا زوجی خاندان کے قیام کی اجازت ہے۔ نام کی بنیاد پر ایک سے فرق کیے جاتے ہیں۔ نظام تسمیہ کی اصطلاح کا بالعموم استعمال انسانیات (Anthropology) میں ہوتا رہا ہے۔ سماجیات (Sociology) میں اس کا استعمال کم ہوا ہے۔ موخرالذکر میں اسے کثرت سے قرابت داری کی اصطلاح (Kinship Terminology) کے مترادف و متبادل بھی استعمال کیا گیا ہے۔

نظام تعلیم۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا (System of Education -United States of America, U.S.A.) : امریکا کی 97 فیصد آبادی نوشت و خواندگی کی قابلیت رکھتی ہے۔ جبری تعلیم اور عوامی مدارس میں مفت تعلیم کے ذریعہ ناخواندگی کو فی الواقع نکال دیا گیا ہے۔ ملک کا کوئی حصہ چاہے وہ کتنا ہی الگ تھلگ ہو مفت عوامی مدرسہ سے محروم نہیں ہے جہاں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ امریکا کے تین چوتھائی نوجوان سترہ سال کی عمر تک مدرسہ میں تعلیم پاتے ہیں۔

ریاستی نظام ہائے تعلیم میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ انفرادی ریاستوں اور مقامی طبقوں کو ہمیشہ سے یہ فکر لاحق رہی ہے کہ مفت تعلیم کے عوامی مدارس قایم کیے جائیں۔ نوجوانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم اور طریق تعلیم پر قومی حکومت نے کبھی بھی اپنے اقتدار کو استعمال نہیں کیا ہے۔ امریکی عوامی مدارس کی یہ کوشش رہی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہمہ جہتی تعلیم فراہم کی جائے جس کے ذریعہ مضبوط کردار، اعلیٰ نصب العین اور سماجی شعور کا نشوونما ہو سکے۔

ابتدائی مدرسہ : ابتدائی مدارس کی تعداد تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار اور طلبا کی تعداد ملک میں دو کروڑ سینتیس لاکھ ہے۔ نوے فیصد طلبا مفت عوامی مدارس میں پائے جاتے ہیں جن کو ریاستی یا مقامی حکومتوں سے امداد ملتی ہے۔ مدت تعلیم بالعموم آٹھ سال ہوا کرتی ہے۔ پڑھنا لکھنا اور حساب جیسی بنیادی مہارتیں ابتدا ہی سے سکھلائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، ابتدائی سائنس، مطالعہ قدرت اور حالات حاضرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ راست مشاہدہ، توجہ سننے اوراظہار خیال کی قوتوں کو ترقی دینے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

کمرہ جماعت کی رسمی تعلیم کی تکمیل فلم، تصاویر، ریڈیو پروگرام، اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ عجائب گھر، تصویر خانہ، کتب خانہ، کارخانہ، کاروباری گھر وغیرہ مدرسہ کے متعلقات مانے جاتے ہیں جہاں بچوں کو اکثر لے جایا جاتا ہے۔

ابتدائی مدارس میں لڑکے اور لڑکیاں مل جل کر کام کرتے اور کھیلتے ہیں اور اس طرح صحت مند سماجی تعلقات کی نشوونما کے متعدد مواقع انھیں حاصل ہوتے ہیں کیونکہ مدرسہ کو سماج، شہر، ریاست، قوم اور دنیا کا ایک جز تصور کیا جاتا ہے۔

ابتدائی مدرسہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچہ جس دنیا میں رہتا ہے اس سے متعلق بنیادی معلومات فراہم کی جائیں۔ اس کی انفرادی قابلیتوں کو ترقی دی جائے اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے میں مدد دی جائے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ثانوی (فوقانی) مدرسہ : ثانوی مدارس کی تعداد 28 ہزار ہے جن میں 88 فی صد مفت عوامی مدارس ہیں۔ سینیر اور جونیر ثانوی مدارس میں سالانہ داخلہ لینے والے طلبا کی تعداد ستر لاکھ سے اوپر ہوا کرتی ہے۔ روایتاً ثانوی مدارس میں 4 سالہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ حالیہ سالوں میں متعدد ریاستوں میں ثانوی مدارس قایم کیے گئے ہیں۔ اس نظام کے تحت ایک طالب علم ابتدائی مدرسہ کے چھ سال مکمل کرنے کے بعد تین سال ثانوی مدرسہ میں اور پھر مزید تین سال سینیر ثانوی مدرسہ میں گزارتا ہے۔ اب امریکا میں دو ہزار چھ سو پچاس ثانوی مدارس ہیں جن کے ذریعہ ابتدائی مدارس سے ثانوی مدارس میں منتقل ہونے میں طلبا کو سہولت ہوتی ہے۔

مفت عوامی مدرسہ دو اغراض پورے کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بیشتر طلبا کو یونیورسٹی کے لیے تیار کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ طلبا کی ایک بڑی تعداد کے لیے تجارت، صنعت اور زراعت میں عملی اور بنیادی تربیت مہیا کرتا ہے۔

ابتدائی مدرسہ میں طالب علم کو مضامین کے انتخاب کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ لیکن ثانوی مدرسہ کے ابتدائی سالوں میں انگریزی، سماجی علم، ریاضی، اخلاقیات، سائنس اور جسمانی تعلیم میں مقررہ نصاب کی تکمیل کرنے کے بعد طالب علم کا پیشہ ورانہ مضامین یا فنون لطیفہ یا بدیسی زبانوں میں سے کسی کو انتخاب کر سکتا ہے۔ ثانوی مدرسہ کے آخری دو سالوں میں انفرادی طالب علم کو مضامین کی ایک بڑی فہرست میں سے انتخاب کرنے کی اجازت ہے۔ بعض بڑے شہری مدارس میں طلبا کے انتخاب کے لیے ایک سو مضامین بھی موجود ہیں۔

رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہر طالب علم کو زاید از نصاب معروفیات میں بھی حصہ لینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس خصوص میں انتخاب کا میدان بہت وسیع ہے۔ گیمس اور اسپورٹس، جماعتی مذاکرے، مدرسہ کا اخبار، آرکسٹرا وغیرہ۔ یہ ایسی معروفیات ہیں جن میں نوجوان اوقات فرصت میں اپنی صلاحیتوں کو معروف رکھ سکتے ہیں۔ جدید رجحان تو یہ ہے کہ ان معروفیات کو مدرسہ کے باضابطہ نظام العمل میں شامل کر لیا جائے۔

اعلیٰ تعلیم : کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد 25 لاکھ سے زاید ہے۔ تقریباً پندرہ سو کالج ایسے ہیں جہاں مخلوط تعلیم کا انتظام ہے۔ امریکا میں کالج کی تعلیم معدودے چند خوش نصیب طلبا کے لیے محدود نہیں ہے۔ ثانوی مدرسہ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہر طالب علم کو یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا موقع حاصل ہے۔ کالج کی تعلیم کے اخراجات مختلف ہیں مگر اکثر اداروں میں فیس بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس کے ماسوا اخراجات کی ادائگی کے لیے نوجوانوں کو جز وقتی ملازمت کے مواقع حاصل ہیں۔ تعلیمی وظایف اور قرضوں کے ذریعہ بھی طلبا کی مدد کی جاتی ہے۔

متعدد قسم کی اعلیٰ تعلیم کے ادارے امریکا میں موجود ہیں۔ جونیر کالجیز، پول، آرٹس کالجیز، انجینئرنگ و تکنیکل اسکولس، پیشہ ورانہ مدارس، گریجویٹ اسکولس وغیرہ۔ پولس آرٹس کالج کو (جو فنون یا سائنسی مضامین میں چار سالہ نصاب تعلیم کا انتظام کرتا ہے) امریکی یونیورسٹی کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کے نصاب کی تکمیل کے بعد پیشہ ورانہ تعلیم کی تکمیل کے لیے مزید چار یا پانچ سال درکار ہیں۔ عالمی شہرت کے حامل بہت سے کالج اسی نام کی عظیم یونیورسٹیوں کے ایک جز ہیں۔ مثلاً برسٹل (Bristol)، کولمبیا (Colombia)، ہاروارڈ (Harward) وغیرہ۔

نظام تعلیم ۔ مغربی ایشیا (System of Education - West Asia):

مغربی ایشیا ترکی، عراق، جزیرہ نمائے عرب، ایران اور پاکستان پر مشتمل ہے۔ یہ تمام ممالک جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ایک واحد خطے کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ وہاں پر روایاتی نظام تعلیم اسلامی تھا اور اب بھی ہے۔

قرآن اور احادیث نبوی میں علم کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اسلام میں خود نبی کریم ﷺ کو پہلے معلم کی حیثیت حاصل ہے جنہوں نے اپنے تابعین کو عقیدہ اور عمل پر درس دیا تھا۔ ہجرت کے بعد مسجد نبوی میں باضابطہ حلقہ مطالعہ ہوا کرتا تھا اور اصحاب صفہ نے اپنے آپ کو تلاوت، قرآت اور تدریس قرآن کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے مدارس کا ایک جال بچھا دیا تھا جہاں حکومت کی طرف سے معلمین اور قرّا کا تقرر کیا جاتا تھا اور انھیں تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اس طرح ان ممالک میں روایاتی نظام تعلیم کی بنیاد رسول اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہ کے زمانہ میں رکھی گئی۔

ایک مسلم خاندان میں بچے کی تعلیم، کارآموزی طریقہ کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ ایک باپ کا یہ فرض ہوا کرتا تھا کہ بچہ جونہی بات

کرنا سیکھ لے اس کو کلمہ پڑھنا اور عبادت کے ارکان سکھائے۔ چھ یا سات سال کی عمر میں بچے کو ابتدائی مدرسہ میں داخل کیا جاتا تھا جو کتب کہلاتا تھا۔ تمام اسلامی ممالک میں مسجد یا اس کے ملحقہ حصے میں مدرسہ ہوا کرتا تھا جو اکثر اوقات عالی مرتبت لوگوں یا متمول تجار کی طرف سے وقف کیا جاتا تھا۔ ان مدارس میں بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی یا نہایت معمولی فیس لی جاتی تھی۔

ابتدائی مدرسہ میں نصاب تعلیم کا مرکز قرآن ہوا کرتا تھا۔ ایک مدرس اس حد تک معلومات فراہم کرتا تھا جو قرآن کی تلاوت اور مذہبی فرائض کے انجام دینے کے لیے ضروری تھی۔ طلبا قرآن کا پڑھنا اور اس کے بعض سورتوں اور بسا اوقات مکمل قرآن کو حفظ کرنا سیکھتے تھے۔ قرآن کو کامل صحت کے ساتھ حفظ کرنے پر اصرار کیا جاتا تھا۔ قرآن کی تدریس کے ساتھ ساتھ زیادہ اہم مذہبی اقوال اور روایات، اذان، وضو اور مسجد میں عبادت کے تعلق سے صحیح تاثر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسہ میں بھی طلبا کو نماز با جماعت کے آداب سے واقف کرایا جاتا تھا۔ قصص الانبیا کے علاوہ حکایات الصالحین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے منجملہ ابتدائی مدرسہ میں صرف و نحو، خطاطی اور بعض نظمیں سکھلائی جاتی تھیں۔

ابتدائی مدرسہ کا استاد "معلم" کہلاتا تھا۔ استاد شاگرد کا رشتہ اس بنیادی اصول پر قایم تھا کہ تمام طلبا کے ساتھ منصفانہ اور مساوات کا سلوک کیا جائے۔ استاد کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ اپنے گھر کی خانگی خدمات کے لیے طلبا سے کام لے۔ مسلمانوں کے دیندار طبقہ کا یہ خیال تھا کہ مذہبی تعلیم بلا معاوضہ ہونی چاہیے۔ وہ احتسابا ہونی چاہیے نہ کہ اکتسابا لیکن اکثر اساتذہ کو ان کی محنت کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ تاہم مالدار لوگ اکثر اوقات اپنے بچوں کے لیے خانگی استاد بھی ملازم رکھ لیتے تھے جو "موذب" کہلاتے تھے۔

چونکہ ان مدرسوں پر حکومتی نگرانی اور اختیار کا وجود نہیں تھا اس لیے یہ ابتدائی مدارس سیکڑوں برس تک قدیم طریقہ پر چلتے رہے۔ تدریس مضامین اور تعلیمی طریقوں میں کوئی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ حال حال تک اساتذہ کی قابلیت اور مدارس کے عام معیار کو بہتر بنانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ مساجد جن کی تاریخ ابتدائے اسلام سے شروع ہوتی ہے، اعلیٰ تعلیم کے مدرسوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں مدرسے قایم تھے۔ لیکن نویں صدی کے شروع میں پہلا مدرسہ جو مسجد سے علاحدہ تھا، نیشاپور میں قایم ہوا۔ شروع میں اس کی حیثیت مذہبی علوم کے لیے صرف ایک خانگی اسکول کی سی تھی۔ چند ہی دنوں میں اساتذہ اپنے گھروں میں مدرسے قایم کرنے لگے۔ سلجوقیوں نے جو اسلام کی دینوی عظمت میں عباسیوں کے جانشیں بنے تھے، ایسے مدرسوں کو عوامی اداروں میں تبدیل کر دیا۔ ان مدرسوں کی نگہداشت کے لیے بڑی بڑی جائدادیں وقف کی صورت میں فراہم کی گئی تھیں۔ یعنی وقف خیری، جن میں مکانات، دوکانیں اور زمین شامل تھیں۔ ایسے وقف کا انتظام ناظر یا متولی کے ہاتھوں میں ہوتا جو عموماً قاضی ہوا کرتا تھا۔ وقف کی آمدنی زیادہ تر مدرسوں کے اسٹاف کی تنخواہوں پر صرف کی جاتی۔ طلبا اساتذہ اور اکثر عوام کے استفادہ کے لیے ان مدرسوں کے ساتھ کتب خانے بھی ہوا کرتے تھے۔ مدرسوں کے ساتھ شفاخانے بھی ملحق ہوا کرتے تھے۔ جہاں طالب علموں اور مدرسہ کے متعلقہ لوگوں کا بیمار پڑنے پر علاج کیا جاتا تھا۔ مدرسہ کا اسٹاف عام طور پر صدر اساتذہ، مراتب مدرسہ، اساتذہ، موید، نقیب، خازن اور دربان پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ مدرسہ کے لکچر ہال میں ایک موید ہوا کرتا تھا جو استاد کے لکچروں اور اسباق کو دہراتا تھا۔ اس کا مرتبہ استاد سے کم تر اور طالب علم سے بالاتر ہوتا تھا۔ مجلس یا جماعت کی ترتیب اور تنظیم نقیب کیا کرتا تھا۔

اسلام جب کہ صرف ایک مذہب تھا تعلیم و تدریس غیر پیچیدہ معاملات تھے۔ لیکن وہ اپنے گہوارے سے نکل کر افریقہ اور مغربی ایشیا کے پڑوسی ممالک میں پھیل گیا تو معاملہ مختلف تھا۔ صرف و نحو اور تاریخ نویسی کے منظم علوم اور خاص طور پر علم کی اسلامی اور مذہبی شاخیں مثلاً احادیث، تفسیر، فقہ اور الکلام میں ترقی ہوئی اور ان میں ذوق پیدا کیا گیا اور قیاس آرائی نے بھی مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں نمایاں حصہ لینا شروع کیا۔ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد مدرسوں کا نصاب تعلیم ان مضامین پر مشتمل تھا۔

(الف) علوم نقلیہ جیسے قرآن، تفسیر، قرآت، حدیث، فقہ۔ ان کے ساتھ فرائض، اصول فقہ، الکلام اور تصوف پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ اور

(ب) علوم عقلیہ جیسے منطق، حساب، ہندسہ، ہیئت، موسیقی، طب، فلاحت اور علم الالٰہیات۔ نصاب تعلیم حالانکہ زیادہ تر دینی تھا لیکن اسے لبرل کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں ادب، ریاضی اور فلسفہ بھی شامل تھے۔ کسی مدرسہ کے اجازہ یا سند یافتہ کے لیے ایک پروفیسر، امام

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مسجد، مفتی یا اعلیٰ عالم قانون کی حیثیت سے کسب معاش کے راستے کھل جاتے تھے۔

نظامیہ، پہلا مدرسہ یا حقیقی اکیڈمی تھا جو 1065 میں نظام الملک نے بغداد میں قایم کیا تھا۔ اس نے مغربی ایشیا کی علمی زندگی میں زبردست سرگرمی پیدا کر دی تھی۔ اس کے قیام کے ایک سو سال کے اندر ایسے ہی ادارے ہر جگہ قایم ہو گئے۔ بعض مشہور مدرسے لاہور، ملتان، سمرقند، بخارا، خوارزم، نیشاپور، اصفہان، شیراز، بصرا، کوفہ، موصل، مدینہ، مکہ، حلب، دمشق اور بیت المقدس میں تھے۔

مغربی ایشیا کے لوگوں میں تعلیم کے لیے ابتدا ہی سے بڑا جوش تھا۔ عربوں کی خلافت کے دور میں عثمانی ترکوں کی سلطنت میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اور افغانستان اور ہندوستان میں ترک اور مغل سلاطین کے تحت یہی جوش جاری و ساری رہا۔ یوروپی سیاسی اثر کی وجہ سے صرف انیسویں صدی کے پہلے ربع میں مغربی ایشیا کی تعلیمی دنیا میں تبدیلی کے آثار پیدا ہوئے۔ فرانسیسی اور برطانوی مشنریوں اور سیاسی لیڈروں کے اثر کی وجہ سے جدید نظام تعلیم نے ہر جگہ جڑیں پکڑ لی ہیں۔ اور اس سے صدی میں روایاتی نظام تعلیم نے ثانوی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

ترکی میں مذہبی مدارس ختم کر دیے گئے اور ان کی جگہ ریاستی مدارس قایم کیے گئے ہیں جن میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہوتی ہے۔ یکم نومبر 1948 کے قانون کے ذریعہ سولہ اور چالیس سال کی عمر کے درمیان ہر شخص کو عربی رسم الخط کی بجائے لاطینی حروف تہجی سیکھنے کے لیے مدرسہ کی حاضری کا پابند کر دیا گیا۔ تاہم 1948 میں مذہبی تعلیم اختیاری کر دی گئی۔ ثانوی مدارس میں تین سالہ نصاب تعلیم رائج ہے۔ جس کے بعد طالب علم فنی یا تجارتی اداروں میں مزید تین سال کی تعلیم کے لیے شریک ہو سکتا ہے۔

عراق میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ وہاں بدیسی مدارس بھی ہیں۔ فنون لطیفہ کا ایک ادارہ ہے اور انجینئرنگ، طب، قانون، تجارت، معاشیات، دواسازی اور کیمیا اور اساتذہ کی تربیت کے مدارس ہیں۔

سعودی عرب میں تعلیم کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن لازمی تعلیم کا کوئی قانون نہیں ہے۔ دیہات میں جہاں طلبا کی تعداد کم سے کم 60 ہو ابتدائی مدارس قایم کیے گئے ہیں۔ ابتدائی تعلیم چھ سال کی عمر سے شروع ہو کر بارہ سال کی عمر میں ختم ہو جاتی ہے۔ ثانوی تعلیم اٹھارہ سال کی عمر تک جاری رہتی ہے۔ بعض ثانوی مدارس فنی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم مدینہ اور ریاض میں یونیورسٹیوں کے ذریعہ دی جاتی ہے۔

ایران میں ایسے مدارس میں یوروپی سائنسی علوم سکھائے جاتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخری دور میں قایم کیے جانے لگے تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے قدیم نظام تعلیم کی جگہ لے لی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں عیسائی مشنریوں کی انجمنوں نے کئی مدارس قایم کیے لیکن رضاشاہ کے دور کے آخری برسوں میں ان کو بند کر دیا گیا۔ ان کے دور حکومت میں تعلیم کی از سر نو تنظیم عمل میں لائی گئی اور خانگی (غیر سرکاری) مدارس پر حکومت کی سخت نگرانی قایم کر دی گئی۔ ملک کے دستور نے عام جبری تعلیم کو پیش نظر رکھا تھا لیکن 1944 کے قانون نے آخر کار اس پر عمل کے لیے دس سال کی مدت کا تعین کیا لیکن ابھی تک پورے ملک میں اس پر عمل نہیں ہو سکا ہے۔ ابتدائی مدارس تمام شہروں اور بہت سے مواضعات میں اور ثانوی مدارس تمام بڑے شہروں میں قایم کیے گئے ہیں۔ 1948 میں جامعہ طہران کا قیام عمل میں آیا۔ طہران اور بیشتر صوبائی صدر مقامات میں اساتذہ کی تربیت کے کالج موجود ہیں۔ متعدد فنی کالج بھی ہیں۔

افغانستان میں ابتدائی ثانوی پیشہ ورانہ تمام تعلیم مفت اور حکومت کی نگرانی میں ہے۔ ابتدائی تعلیم 1931 میں لازمی کر دی گئی۔ ثانوی مدارس تمام صوبوں میں ہیں۔ جن میں اعلیٰ طبقوں کے طالب علموں کو انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ خاص فوجی اور قبائلی مدارس بھی ہیں اور بڑے شہروں میں لڑکیوں کے مدارس قایم ہیں۔ کابل کی جامعہ 1946 میں قایم کی گئی۔

پاکستان - وہ قوتیں جو ہندوستان میں تقسیم سے پہلے بااثر تھیں، پاکستان میں بھی جدید نظام تعلیم کو مروج کرنے کی ذمہ دار ہوئیں۔ اس نئے ملک کے میدان میں از سر نو تنظیم کے زبردست مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا اور اب بھی وہ اسی جد و جہد میں مصروف ہے۔ 1951 کی مردم شماری کے مطابق خواندہ اشخاص کا فیصد صرف 18.9 تھا۔ مرکزی حکومت میں تعلیم کی نگرانی ایک وزیر کے ذمہ ہے اور وہاں متعدد ہم رتبہ اور مشاورتی ایجنسیاں ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کا انتظام زیادہ تر خانگی (غیر سرکاری) جماعتیں کرتی ہیں۔ ان مدارس پر حکومت کی انتظامی نگرانی امدادی گرانٹ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے ذریعہ کی جاتی ہیں۔ مسٹر بھٹو کے دور حکومت میں ابتدائی تعلیم کے سوا ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو قومیا لیا گیا۔

نظام تعلیم ۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی (System of Education - Federal German Republic):

وفاقی جمہوریہ جرمنی (مغربی جرمنی) میں تعلیم کی ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر ہے جو اپنے تعلیمی قوانین وضع کرتے وقت اس کا لحاظ رکھتی ہیں کہ یہ قوانین وفاقی حکومت کے بنیادی دستور سے مطابقت رکھتی ہوں۔ سائنسی تحقیق و ترقی البتہ وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں کے زیر اثر ہیں۔ یونیورسٹیوں کی توسیع یا ریسرچ کے اداروں کے اخراجات کی ذمہ داری ان دونوں حکومتوں پر ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعاون کی ایک مثال 1970 میں ایک مشترکہ کمیشن کا قیام ہے تاکہ تعلیمی منصوبہ بندی سے متعلق ایسی پالیسیاں وضع کی جا سکیں جو تعلیمی ترقی میں معاون ہو سکیں۔

سوئیڈن اور فرانس میں تعلیمی اصلاحات اور انگلستان میں جامع ثانوی مدرسوں کی تحریک نے مغربی جرمنی کے بعض حلقوں میں اپنے نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلایا، مقصد یہ ہے کہ ہر فرد کو یکساں تعلیمی مواقع میسر آ سکیں اور ملکی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے ماہرین کی فراہمی، طلبا کے ذہنی رجحانات اور صلاحیتوں کے مطابق تعلیم، ایک طرح کے مدرسے سے دوسرے مدرسے میں منتقلی، حرفتی تعلیم کے لیے ماہر، معلمین کی تیاری پیشہ ورانہ تعلیم کے اصراف کثیر کی فراہمی وغیرہ وہ اہم مسائل ہیں جن کا دریافت کرنے کی کوشش برابر ہوتی رہتی ہے۔

تعلیم منزل بہ منزل : "ماقبل ابتدائی تعلیم" کے لیے نرسری اور کنڈرگارٹن کا انتظام ہے۔ تین سال کی عمر میں بچے کنڈرگارٹن میں داخل کیے جاتے ہیں۔ اس عمر کے سارے بچوں کو ان اسکولوں میں داخلہ نہیں مل پاتا۔ 1971 میں چھ سال سے کم عمر کے ہر تین بچوں میں صرف ایک کو کنڈرگارٹن میں جگہ مل سکی تھی۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں ان اسکولوں کی تعداد میں اضافے کے سلسلے میں عملی قدم اٹھاتی رہتی ہیں کیوں کہ ایسے اسکولوں کے مطالبے بڑھتے جا رہے ہیں۔

ابتدائی تعلیم : یہاں 1920 میں تعلیم لازمی کی گئی تھی۔ اب چھ سال کی عمر سے پندرہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے۔ اس طرح نو سال اسکول میں حاضری لازمی ہے۔ جو بچے پندرہ برس کی عمر میں تعلیم ختم کر لیتے ہیں انھیں مزید تین برس جز وقتی حرفتی اسکول میں تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ تعلیم سولہ سال کی عمر تک لازمی کر دی جائے۔ ابتدائی مدرسوں میں بچے دس برس کی عمر تک یعنی چار سال تعلیم پاتے ہیں۔ بعض صوبوں میں چھ سال سے کم عمر کے بچوں کے داخلے بھی کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نصاب میں بھی طرح طرح کے تجربے ہو رہے ہیں خاص طور پر ریاضیات اور کسی ایک غیر ملکی زبان کی تعلیم، تیسری اور چوتھی جماعتوں سے شروع کیے جانے پر تجربے ہو رہے ہیں۔

ثانوی تعلیم : مغربی جرمنی میں تین قسم کے ثانوی مدرسے ہیں:

(1) ابتدائی مدرسہ (جمنیزیم اسکول Gymnasium School)

(2) مڈل اسکول (ریل شولے Real Schule)

(3) عام ثانوی مدرسے (ہیوپٹ شولے Haupt Schule - Secondary School)

گریمر اسکول قدیم ترین اور مشہور ادارے ہیں ان میں کلاسیکی و جدید زبانوں، عمرانیات، ریاضیات اور سائنس کے ثانوی مدرسے شامل ہیں جن میں ذہین بچوں کا داخلہ ہوتا ہے۔ ان مدرسوں میں نو برس تک تعلیم دی جاتی ہے۔ فائنل امتحان کے بعد طلبا گریمر اسکول سرٹیفکٹ (جسے ابی ٹور (Abitur) کہتے ہیں) حاصل کرتے ہیں۔ اس سرٹیفکٹ کو حاصل کرنے پر طلبا یونیورسٹی یا کسی دوسرے اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ مڈل ثانوی مدرسوں میں بچے چھ سال تعلیم کے بعد امتحان میں کامیابی کے بعد طلبا صنعتی، حرفتی اور انتظامی کاموں کے لیے ٹریننگ لے سکتے ہیں۔ عام ثانوی مدرسوں میں وہ تمام طلبا داخل ہوتے ہیں جنھیں گریمر یا مڈل اسکولوں میں سے کسی میں داخلہ نہیں مل پاتا۔ ان مدرسوں میں پانچ سال تعلیم لازمی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں چھوٹے چھوٹے دیہاتی مدرسوں کو ختم کر کے کئی دیہاتوں کے لیے مرکزی اسکول قایم کر دیے گئے ہیں تاکہ پندرہ سال تک کی عمر کے بچوں کو علاحدہ علاحدہ جماعتوں میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مل سکیں۔ ملک میں پرائیوٹ ادارے بھی ہیں جن میں تعلیم مفت نہیں ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

اعلیٰ تعلیم : مغربی جرمنی میں اعلیٰ تعلیمی ادارے پچھلی صدی میں ولیم ہمبرلٹ کے وضع کیے ہوئے اصولوں پر قایم کیے گئے تھے۔ بعض دوسرے ممالک نے بھی ان اصولوں سے استفادہ کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں اور طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے فی زمانہ ان اصولوں کی پیروی مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے صوبائی حکومتوں کے زیر نگرانی ہیں جن پر مرکزی حکومت کا اختیار نسبتاً کم ہے۔ اس صدی کے چھٹی دہائی سے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلبا کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ آئین کی دفعہ 12 کی رو سے ہر اس طالب علم کو جس نے آبی ٹور کر لیا ہے یونیورسٹیوں یا دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کی آزادی ہے۔ طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ماہرین تعلیم اور منتظمین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ داخلوں پر پابندی عائد کی جانی چاہیے لیکن صوبائی حکومتیں ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی آزادی پر زور دیتی ہیں۔ اس لیے داخلوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی ہے۔

جرمنی میں دانش گاہوں کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ اول یہ کہ طلبا کو اپنی پسند کی یونیورسٹی میں داخلے کی سہولت کے علاوہ ایک دانش گاہ کو چھوڑ کر اپنی ضرورت، شوق اور دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے دوسری دانش گاہ کو منتقل ہو سکتا ہے۔ ہر طالب علم کو اس کی آزادی ہے کہ وہ یونیورسٹی کے ایسے اساتذہ کے ساتھ کام کرے اور ان کے لکچر میں شریک ہو جن سے اس کی علمی معلومات کے حصول میں اضافہ ہو۔ دویم طلبا کو امتحان میں شرکت کی آزادی۔ فائنل امتحان اس وقت لیا جاتا ہے جب طالب علم خود اس کی درخواست کرے۔ پیشہ ورانہ اداروں نے بھی پچھلے چند برسوں میں بہت ترقی کی ہے۔ مختلف صنعتوں اور پیشوں کا معیار مسلسل بلند ہوتا جارہا ہے اس لیے ان اداروں میں بھی تدریس اور نصاب میں نئے تجربات اور تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

پیشہ ورانہ اور حرفتی تعلیم کے لیے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے علاوہ تین طرح کے پیشہ ورانہ اسکول جو جزوقتی ہیں۔

(1) جو طلبا پندرہ سال کی عمر میں لازمی تعلیم ختم کر کے کام پر لگ جاتے ہیں ان اسکولوں میں داخلہ لے لیتے ہیں۔ ان میں ہفتے میں آٹھ گھنٹے تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم ان پیشوں سے تعلق رکھتی ہے جن میں یہ طلبا کام کرتے ہیں۔

(2) تخصیصی پیشہ ورانہ اسکول : یہ کل وقتی اسکول ہیں۔ ان اسکولوں کی شہرت زیادہ ہے اور پچھلے بیں پچیس برسوں میں ان کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے۔ ان میں تعلیم کی مدت ایک سال ہے۔

(3) تخصیصی پیشہ ورانہ ہائر گریڈ اسکول اور ٹکنیکل گریمر اسکول: ان اسکولوں میں اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم دی جاتی ہے جو طلبا عام ثانوی مدرسوں کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں انھیں ان اسکولوں میں داخلہ مل سکتا ہے۔ تعلیم کی مدت ڈیڑھ سال سے تین سال ہے۔ ٹکنیکل گرامر اسکول تعلیم کی مدت تین سال ہے اور فائنل امتحان میں کامیاب طلبا یونیورسٹیوں اور دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ لے سکتے ہیں۔ ٹکنیکل گرامر اسکولوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور مخصوص پیشہ ورانہ اسکول فیک شولے (Fach Schule) بھی ہے۔ جن میں بیشتر وقت مختلف پیشوں کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور ان میں صرف ان نوجوانوں کو داخلہ مل سکتا ہے جنھوں نے پیشہ ورانہ اسکول کا نصاب تکمل کر لیا ہو۔

اساتذہ کی تعلیم و تدریس : فی زمانہ ہر منزل کے اسکولوں کے لیے معلموں کی تعلیم و تدریس کے انتظامات علاحدہ علاحدہ ہیں۔ ٹریننگ کے لیے "ابی ٹور" سرٹیفکٹ ضروری ہے۔ ابتدائی اور مختلف ثانوی مدرسوں کے لیے نصاب اور تعلیم کی مدت مختلف ہے۔ گریمر اور مڈل مدرسوں کے اساتذہ کی تعلیم و تدریس یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔ 1968 تک مغربی جرمنی میں ٹریننگ کالجوں میں ستر ہزار پانچ سو (70,500) معلموں کو تربیت (ٹریننگ) دی جا رہی تھی۔ 1975 میں یہ تعداد بڑھ کر ایک لاکھ چالیس ہزار (1,40,000) ہو گئی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ 1965 میں ہر طرح کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں 3,84,400 طلبا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دس سال بعد 1975 میں یہ تعداد 7,79,600 ہو گئی۔ اس میں تقریباً پانچ لاکھ طلبا یونیورسٹیوں اور تکنیک کالجوں میں، ایک لاکھ چالیس ہزار ٹیچرس ٹریننگ کالجوں اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار تخصیصی کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تخصیصی اداروں میں طلبا کی تعداد میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

نظریہ تقسیم ۔ حاشیائی پیداوار (Marginal Productivity Theory of Distribution)

: جہاں تک عاملین پیداوار یا پیداواری

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

خدمات کی رسد کا تعلق ہے نوکلاسیکی فکر اس بارے میں کوئی عمومی نظریہ نہیں پیش کرسکا۔ مختلف عاملین پیداوار زمین سرمایہ اور محنت کی رسد کے حالات جداگانہ ہیں جن کا الگ الگ مطالعہ کیا جاتا ہے۔ البتہ عاملین پیداوار کی طلب کے بارے میں ایک جامع نظریہ مرتب کیا گیا ہے جس کا اطلاق اصلاً محنت اور سرمایہ پر ہوتا ہے۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے نوکلاسیکی فکر اسے ایک مخصوص سامان سرمایہ (Capital Goods) قرار دے کر سرمایہ میں شامل کرلیتا ہے۔ اب مجموعی پیداوار کی تقسیم صرف دو حصوں میں عمل میں آتی ہے۔ اجرت اور سود کسی خاص وقت میں سماج میں کسی عامل پیداوار کی قیمت وہ متعین ہوتی ہے جو اس کی موجودہ رسد اور اس کی طلب میں مساوات اور توازن پیدا کرسکے۔ معیشت میں کسی عامل پیداوار کی مجموعی طلب مختلف صنعتوں میں اس کی طلب کا مجموعہ ہوتی ہے اور کسی ایک صنعت میں اس کی طلب منفرد کاروباری اداروں کی طلب کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مسابقت پر مبنی معیشت میں منفرد کاروباری ادارہ کے لیے کسی عامل پیداوار کی قیمت بازار میں متعین ہوتی ہے وہ اکیلا اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ کسی عامل پیداوار کی حاشیائی پیداآوری اس کی مقدار بڑھنے کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے۔ ایک کاروباری ادارہ کسی عامل پیداوار کی اتنی ہی مقدار طلب کرتا ہے جس پر اس عامل پیداوار کی حاشیائی پیداواری اس کی قیمت بازار کے مساوی ہو۔ یہی مساوات نوکلاسیکی نظریہ تقسیم کے اس دعوی کی بنیاد ہے کہ مسابقت پر مبنی معیشت میں عاملین پیداوار کی قیمتیں ان کی حاشیائی پیدا آوری باعتبار قدر کے مساوی ہوتی ہیں۔

نوکلاسیکی نظریہ تقسیم کی وضاحت کے لیے پیداوار تفاعل (Production Function) کا تصور بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے جو پیداوار کی مقدار اور ان عاملین پیداوار کی مقداروں کے درمیان رشتہ کو نمایاں کرتا ہے جو اس پیداوار کے حصول کے لیے درکار تفاعل پیداوار کی مدد سے عاملین پیداوار کی حاشیائی پیداآوری کی پیائش کی جاتی ہے اور یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ مکمل مسابقت کی حالت میں عاملین پیداوار کے معاوضے ان حاشیائی پیداآوری کے مساوی ہوتے ہیں۔ منفرد تفاعل پیداوار کو حاشیائی پیداآوری کے مساوی ہوتے ہیں۔ منفرد تفاعل پیداوار کو باہم جمع کرنے سے معیشت کا مجموعی تفاعل پیداوار (Aggregate Production Function) معلوم ہوتا ہے۔ اعداد وشمار کی روشنی میں معیشتوں کے مجموعی تفاعل پیداوار کا تخمینہ لگایا جاچکا ہے۔ اور تفاعل پیداوار کے تجزیہ سے اہم نتائج بھی اخذ کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ سرمایہ اور محنت باہمی نسبت (Ratio of Capital to Labour) اجرت اور شرح سود کی باہمی نسبت (Ratio of Wages to the Rate of Interest) کے موافق سمت میں حرکت کرتی ہے۔ نیز یہ کہ شرح سود اور شرح اجرت ایک دوسرے کے مخالف سمت میں حرکت کرتی ہیں اور فی مزدور خالص قومی پیداوار (Net National Product Per Labour) کی تعداد و شرح سود کے مخالف سمت میں حرکت کرتی ہے۔ تفاعل پیداوار اور اس کے تجزیہ سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں قومی پیداوار میں سرمایہ اور محنت کے اضافی حصوں کے تعین اور ان حصوں میں تبدیلی کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

نوکلاسیکی نظریہ تقسیم میں سب سے مشکل مسئلہ سرمایہ کی پیائش کا مسئلہ ہے۔ سرمایہ کی مادی شکلیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے اس کی مقدار قدر کے پیانہ سے ہی ناپی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے قیمتوں بالخصوص شرح سود کو معلوم کرنا ہوگا مگر قیمتوں اور شرح سود کے تعین کے لیے سرمایہ کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے۔ حاشیائی پیداوار پر مبنی نظریہ تقسیم کو اس لیے ناقابل قبول قرار دیا جاتا ہے کہ یہ ایک دائرہ میں استدلال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر محنت کی حاشیائی پیداآوری ناپنے کے لیے ہمارے پاس اجرت کے سوا کوئی اور پیانہ نہیں ہے جبکہ یہ پیائش اجرت ہی کے تعین کے لیے درکار ہے۔

ناکمل مسابقت (Imperfect Competition) کا تصور اور نظریہ تقسیم۔ آج سے پچاس سال پہلے مسز جون رابنسن (Joan Robinson) اور ایڈورڈ ہیٹنگر چیمبرلن (E.H. Chamberlin) اور بعض دوسرے ماہرین معاشیات نے یہ واضح کیا کہ مسابقت کا نظریہ ایک مفروضہ ہے۔ عملی دنیا میں اجارہ دارانہ مسابقت (Monopolistic Competition) اور ناکمل مسابقت (Imperfect Competition) کا دور دورہ ہے۔ چونکہ تقسیم کا حاشیائی پیداآوری پر مبنی نظریہ مسابقت محض نام کے مفروضہ پر قائم تھا۔ اس لیے اس حقیقت کے سامنے آنے کے بعد اس پر اعتماد میں کمی آگئی ہے۔ نئے نظریہ نے یہ ثابت کر دیا کہ عاملین پیداوار کے معاوضے عام طور پر ان کی حاشیائی پیداوار کی قدر سے کم ہوتے ہیں۔ اجارہ دارانہ عناصر کے سبب خصوصی منافع حاصل کیا جاتا ہے جن کو مسابقت کا عمل ختم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایم کیلیکی (M. Kalecki) نے بتایا کہ مجموعی پیداوار میں محنت کا حصہ درجہ اجارہ داری (Degree of

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

(Monopoly) پر منحصر ہے۔ درجہ اجارہ داری جتنا زیادہ ہوگا مجموعی قومی پیداوار میں مزدور کا حصہ اتنا ہی کم ہوگا۔

نظریہ قدر : مفہوم : معاشیات میں کسی شے کی قدر سے مراد کسی دوسری شے کی وہ مقدار ہے جو اس کی ایک اکائی کے مبادلہ میں حاصل کی جائے۔ اگر ایک میٹر کا مبادلہ دو کلو چاول سے ہو تو ہم کہیں گے کہ ایک میٹر کپڑے کی قدر دو کلو چاول ہے یا ایک کلو چاول کی قدر آدھا میٹر کپڑا ہے۔ زر کی معیشت (Money Economy) میں کسی شے کا دوسری شے سے راست مبادلہ کے بجائے زر یعنی یک عام آلہ مبادلہ کے ذریعہ ہوتا ہے اس لیے کسی شے کی قدر کا تخمینہ اور اظہار بھی زر کی مقدار سے کیا جاتا ہے۔ جسے قیمت (Price) کہتے ہیں۔ اگر ایک کلو چاول کا مبادلہ دو روپے کے ذریعے کیا جائے تو چاول کی قیمت دو روپے فی کلو کہلائے گی۔ ایسی تمام اشیا جن سے انسان کی حاجتوں کی راست تشفی ہوتی ہے ان کو اشیا صرف (Consumer's Goods) کہتے ہیں ان کے استعمال کو صَرف (Consumption) اور استعمال کرنے والے کو صارف (Consumer) کہتے ہیں۔ اشیا صرف کی تیاری اور فراہمی جن مادی اور غیر مادی وسائل سے ہوتی ہے ان کو اشیائے پیداوار (Producer's Goods) اور ایسے کام کرنے والے کو پیدا کار (Producer) کہتے ہیں۔ اشیا صرف کی قیمتوں کے تعین کے نظریے کو قیمت کا نظریہ (Theory of Price) اور روایتی طور پر نظریہ قدر (Theory of Value) کہا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ نظریہ قیمت کا اطلاق عاملین پیداوار کی قیمتوں کے تعین پر کیا جاتا ہے جسے عام طور پر معاشیات میں تقسیم کا نظریہ (Theory of Distribution) کہتے ہیں۔

اشیا صرف کے تعین کے عام اصول کی تشریح کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی شے کی قیمت کا تعین اس کی طلب اور رسد کے زیر اثر ہوتا ہے اور چونکہ طلب کا انحصار شے کے افادہ اور رسد کا انحصار مصارف پیداوار پر ہوتا ہے اس لیے اشیا صرف کے افادے اور مصارف پیداوار سے متعلقہ قوانین سے واقفیت ضروری ہے۔ (دیکھو صرف اشیا - افادہ مختتم)

نظریۂ تکثیریت : مملکت، قانون اور اقتدار اعلیٰ کا وحدانی نظریہ، جس کی وکالت ژان بودین، ہیوگو گروشیس، طامس ہابز، جریمی بنتھم اور آسٹن نے کی محض اس سادہ سی حقیقت کی تشریح کرتا ہے کہ انسانی سماج میں مملکت نہ صرف قانون سے متعلق چند منفرد اور آخری فرائض انجام دیتی ہے اور اس مقصد سے سب پر حاوی اور بالاتر ہے بلکہ اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی افراد اور گروہوں سے بالاتر ہے۔ کیونکہ فقط اسی کو فرد اور گروہ کی آزادی کی ضمانت دینے کی صلاحیت حاصل ہے۔

تکثیری نظریہ، مملکت کی انفرادی اور کلّی حیثیت کو، اس کے مقتدر اختیارات کو اور اس کے قوانین کی بالاتری کو چیلنج کرتا ہے۔ تکثیریت کا کوئی ایک واضح یا متعین بیان نہیں پایا جاتا۔ مختلف ملکوں میں مختلف مفکروں نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے مملکت کے مطلق العنان اقتدار پر اعتراض کیا اور اس اقتدار کو مساویانہ طور سے سماج کی دوسری آزاد تنظیموں میں تقسیم کرنے کی وکالت کی ہے۔ تکثیریوں میں انگلستان میں ہیرلڈ لاسکی، جی ڈی ایچ کول اور ایف اے لنڈسے، جرمنی میں اوٹوفان گیرگ اور فرانس میں لیوں ڈگویت اور ایملی درکیم پیش پیش رہے ہیں۔

تکثیریت دراصل مغربی حریت پسندی (لبرلزم) کی ایک شاخ ہے اور بیسویں صدی کے اوائل میں استحصال پسند سرمایہ داری اور مطلق العنان مملکت کے خطرات کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئی۔ تکثیریت کی بنیاد اس قضیہ پر ہے کہ موجودہ مملکت کے اقتدار اعلیٰ کی جگہ فرد کی آزادی اور گروہ کی خود مختاری کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ فرد اور گروہ کی آزادی کے لیے سیاسی اقتدار کو مملکت میں مرتکز کرنے کے بجائے سماج کے تمام گروہوں کے درمیان منتشر کردیا جائے۔ لیکن نراجیوں کی طرح کسی تکثیری مفکر نے مملکت کے ازالہ کی وکالت نہیں کی ہے۔ کیونکہ اگر سیاسی اقتدار کو سماج کے آزاد گروہوں کے درمیان تقسیم کردیا جائے یعنی قانون ساز مملکت کی جگہ ہر گروہ اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہو جائے اور قانون سازی کرے اور اسے نافذ کرے تب بھی تنوع اور ان گنت گروہوں کے درمیان تال میل اور ان کے قضیوں کے تصفیہ کے لیے ایک مرکزی ادارہ کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ تکثیری مفکر مملکت کو محض عوامی خدمت کے ایک ادارہ یا گروہوں کے درمیان تال میل کی ایجنسی کی حیثیت سے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی مملکت کو اختیارات گروہوں کی جانب سے تفویض ہوں گے۔ وہ از خود کوئی قانون یا پالیسی وضع نہیں کرے گی بلکہ ان ہی قوانین کو نافذ کرے گی جنھیں سبھی گروہ پہلے سے وضع کرکے اس کے سپرد کریں گے۔ لیکن اس نظریے کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مخالفین کی رائے میں تکثیریوں کی مخالف مملکت دلیلیں اور ان کے خیالی نقشے فرسودہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جمہوری مملکت مطلق العنان جابر اور کلیت پسند ہونے کے بجائے فرد اور گروہ کی آزادی اور بہبود کی ضامن ہوگئی ہے اور سرمایہ دار مملکت نے فلاحی مملکت کی شکل اختیار کرلی ہے۔

مختصراً ان مفکرین کے نزدیک :

(1) فرد کی آزادی محض مملکت کے اندر اور اسی کے ذریعہ ممکن ہے۔ تکثیری نظریہ موجودہ دور کی گروہی زندگی کی پیچیدگی کو نظرانداز کرتا ہے اور افراد پر گروہوں کی آمریت اور ظلم و جبر کے امکانات سے بحث کرنے میں ناکام رہا ہے۔ (مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ امریکا میں اس وقت نجی کاروباری اداروں کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے کم و بیش سوا سو سرکاری ادارے کام کررہے ہیں۔ آج کی مملکت طبقہ داری یا استحصال پسند مملکت نہیں بلکہ پوری سیاسی جماعت کی کارندہ ہے اور سبھی کی بھلائی کے لیے کام کرتی ہے۔

(2) اگر بالفرض نجی گروہوں یا تنظیموں کو اپنے ارکان پر مکمل اختیار (Sovereignty) دے دیا جائے تب بھی اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ مملکت انھیں کے ذریعہ افراد کو پامال کرسکتی ہے۔ اس کی مثال فاشسٹ اٹلی اور فرانکو کے اسپین میں ملتی ہے۔

(3) یہ خیال خام ہے کہ تکثیری سماج میں مملکت ایک بے طاقت تال میل کے ادارہ کی حیثیت سے گروہی قضیوں یا تعطلات کا تصفیہ کرسکے گی۔ اس طرح کی مملکت بالآخر اور یقیناً سیاسی نزاج کا راستہ دکھائے گی۔ اور

(4) تکثیری نظریہ موجودہ گروہی زندگی اور تکنو کارپوریٹ سماج کے حقائق سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ سماجی امور کو منضبط کرنے کے لیے بااقتدار مملکت کی ضرورت آج سے زیادہ کسی اور دور میں پیش نہیں آئی تھی۔

نفع (Profit)۔ تقسیم دولت : منافع کے بارے میں کلاسیکی فکر کو اوپر کے سطور میں واضح کیا جاچکا ہے۔ حاشیائی پیداآوری پر مبنی نظریہ تقسیم کے مطابق معیشت میں مسابقتی توازن قائم ہو تو منافع کا وجود نہیں ہوگا۔ جان بیٹس کلارک (J.B. Clark) کے خیال میں منافع ان حرکی تبدیلیوں (Dynamic Changes) کے نتیجہ میں نمودار ہوتا ہے جو کاروباری جدوجہد کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں اور جن کی بدولت عاملین پیداوار محنت اور سرمایہ کی پیداواروں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ عاملین پیداوار کے معاوضوں کی شرحوں کے ان بڑھی ہوئی پیداوار کے مساوی ہونے میں وقت لگتا ہے۔ درمیانی وقت میں کاروباری افراد کو منافع ہوتا ہے جو بڑھی ہوئی پیداآوری اور معاوضوں کی پرانی شرحوں کے درمیانی فرق کے برابر ہوتا ہے۔ شمپیٹر (J.A. Schumpeter) نے کاروباری جدوجہد کا قدرے تفصیلی تجزیہ کیا اور اس کا جوہر ان اختراعات (Innovations) کو قرار دیا جن کی بدولت پیداوار اور خدمات کی نئی تنظیم عمل میں لاکر ان کی پیدوار میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جب تک مسابقت کا عمل معاوضوں کو بڑھا کر بڑھی ہوئی پیداآوری کے مساوی نہ کردے اور مسابقت کے نتیجہ میں بڑھی ہوئی پیداوار کے دام نہ گرجائیں اختراعات عمل میں لانے والے کاروباری افراد کو منافع ملتا رہے گا۔

نائٹ (F.H.Knight) نے نفع کے ظہور کا سبب اس عدم تعین کو بتایا ہے جو پیداواری عمل کی تنظیم کے ساتھ لازماً وابستہ ہے۔ پیداواری عمل کے آغاز میں اس امر کا صرف ایک اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے کہ تیار ہونے پر پیداوار بازار میں کن داموں پر فروخت ہوسکے گی۔ جب نئے پیداواری طریقے اختیار کیے جارہے ہوں یا کسی نئے سامان کی پیداوار عمل میں لائی جارہی ہو تو خود پیداوار کی مقدار بھی غیر متعین ہوتی ہے۔ کاروباری جدوجہد (Enterprise) کا جوہر انھیں غیر متعین حالات میں آمدنی کے اندازہ کی روشنی میں لاگت کی ذمہ داری قبول کرکے پیداوار کی تنظیم عمل میں لاتا ہے۔ منافع اس عمل کا صلہ ہے۔ جب اندازے غلط نکلتے ہیں تو خسارہ ہوتا ہے۔ منافع عدم تیقن (Uncertainty) کے کامیاب مقابلہ کا صلہ ہے۔

نائٹ کے بعد معاشین نے غیر متعین حالات میں کیے جانے والے کاروباری فیصلوں کا زیادہ تفصیلی جائزہ لیا۔ اور بعض نے اس بات پر زور دیا کہ منافع کے ظہور اور اس کی مقدار کے تعین میں بازار کے حالات اور مسابقت کی کیفیت کو کافی دخل ہے۔ کینز (J.M.Keynes) کے نظریات کے زیراثر قیمتوں اور روزگار کی سطح میں تبدیلیوں کے فرق کو بھی محسوس کیا گیا اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ منافع کی مقدار کا تعین پوری معیشت کی سطح پر ہونے والی کلی (Macro) تبدیلیاں کرتی ہیں۔

اگرچہ آج بھی منافع کا کوئی تشفی بخش نظریہ نہیں پایا جاتا مگر منافع کی توجیہ میں عدم تیقن (Uncertainty) کو کلیدی اہمیت حاصل

618

ہو چکی ہے۔ اب منافع کا مطالعہ زیادہ تر کلی معاشیات (Macro-Economics) کے پس منظر میں کیا جاتا ہے۔ بچت، سرمایہ کاری، مقدار زر، ترجیح نقد (Liquidity Preference) پیداآوری اور درجہ اجارہ داری (Degree of Monopoly) وغیرہ وہ بنیادی عوامل ہیں جو قومی آمدنی کی سطح کے تعین اور اجرت اور منافع کے درمیان اس کی تقسیم دونوں ایک ساتھ عمل میں لاتے ہیں۔

نکسلیت (Naxalism): نکسلیت سے مراد نکسل باڑیوں کی وہ جماعت ہے جن کو ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی نے اپنی جماعت سے نکال دیا تھا۔ ان کے لیے نکسلیت کی اصطلاح اس وقت رائج ہوئی جب مارچ 1967 میں مغربی بنگال کے ضلع دارجلنگ کے ایک پرگنہ نکسل باڑی میں وہاں کے کسانوں نے ماؤنوازوں کے اکسانے پر زمینداروں کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ یہ بغاوت زمینداروں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کرنے اور زمین کی مشترکہ ملکیت قائم کرنے کے لیے برپا ہوئی تھی۔

22 اپریل 1969 کو لینن کی سال گرہ کے موقع پر نکسل باڑیوں نے مارکسی لیننی کیمونسٹ پارٹی کے نام سے ایک انقلابی پارٹی بنانے کا اعلان کیا جس کا مقصد پارلیمانی نظام اور اس کے اداروں کے خلاف مسلح بغاوت کرنا اور قتل، تشدد اور جائدادوں کی ضبطی کے لیے مہم چلانا تھا۔ نکسل باڑیوں کی 1967 کی بغاوت کے بعد اس تحریک کا نام نکسلیت پڑ گیا۔ اس تحریک کے قائد کانوسانیال، چارومجمدار، جگت سنتھالی، آشیم چٹرجی اور پرمود سین گپتا وغیرہ رہے ہیں۔

اپریل 1967 میں نکسلیوں کی ایک کانفرنس میں، جس میں پانچ ہزار کاشت کار شریک ہوئے تھے، درج ذیل فیصلہ لیا گیا تھا۔

(1) جوتیداروں کی زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔

(2) اپنے قبضہ میں موجود زمینوں پر کاشت کی جائے اور اس سے حاصل شدہ تمام پیداوار کو اپنے قبضہ میں رکھا جائے۔

(3) جہاں جوتیدار خود زمین کاشت کر رہے ہوں ان زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے۔

یہ تحریک شروع میں غریب کسانوں کی حمایت کرنے، بے زمین مزدوروں کو زمین دلانے اور زمینی اصلاحات نافذ کرنے جیسے مطالبات لے کر اٹھی تھی لیکن اپنے آغاز ہی سے تشدد کی طرف مائل ہوگئی اور بتدریج اپنے مطالبات منوانے کے لیے تشدد کے دلدل میں پھنستی چلی گئی۔ چنانچہ اپنے مطالبات میں حق بجانب ہونے کے باوجود غلط طریقہ کار اپنانے کی وجہ سے حکومت نے اسے سختی کے ساتھ کچل دیا تاہم یہ تحریک ناپید نہیں ہوئی ہے بلکہ مغربی بنگال سے نکل کر مدھیہ پردیش، بہار، اترپردیش اور آسام وغیرہ کے مختلف اضلاع میں اب بھی اس کی پرتشدد سرگرمیاں جاری ہیں۔

نمائندگی (Representation): حق رائے دہی کو تمام بالغ شہریوں کے لیے عام کرنے کے بعد دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ مجلس قانون ساز کے لیے نمائندوں کا انتخاب کس بنیاد پر کیا جائے۔ موجودہ دور، علاقائی مملکتوں اور نمائندہ جمہوری حکومتوں کا دور ہے۔ براہ راست جمہوریت یا حکومت کے انتظام میں تمام شہریوں کی شرکت فقط یونانی شہری ریاستوں میں ممکن تھی یا سوئٹزرلینڈ کی بعض چھوٹے کینٹوں میں اب بھی پائی جاتی ہے۔ بڑی قومی مملکتوں میں سیاسی جمہوریت کا ارتقاء نمائندگی کے ذریعہ ہوا ہے۔ آج کے دور میں عوام حکومت کے سرکاری کاموں میں حصہ نہیں لیتے بلکہ پارلیمانی نظام میں پارلیمنٹ کے لیے اپنے نمائندوں کو منتخب کرکے اپنی جانب سے انھیں قانون بنانے کا اختیار تفویض کردیتے ہیں۔ اور اسی قانون ساز جماعت کی اکثریت کے اندر سے منتخب شدہ ایک کابینہ حکومت چلاتی ہے۔ صدارتی نظام میں عوام کے ذریعہ قانون سازوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے اور وہی مقررہ وقت پر انتظامیہ کے سربراہ کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں نمائندگی کی تین بنیادیں پائی جاتی ہیں۔

(الف) جغرافیائی یا علاقائی نمائندگی: یہ نظام اکثر ملکوں میں رائج ہے۔ اس کے تحت ملک کو کم وبیش مساوی آبادی رکھنے والے ایک رکنی انتخابی حلقوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ ہر حلقہ انتخاب میں وہ امیدوار جو دوسرے سب امیدواروں سے زیادہ ووٹ حاصل کرلے، کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ اسے سادہ اکثریت کا اصول کہتے ہیں۔ ہندستان کے ایوان ہائے زیریں کے انتخاب کے لیے یہی طریقہ رائج ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکا، برطانیہ، کنیڈا، فرانس اور سویڈن میں بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ لیکن چونکہ سادہ اکثریت کے اصول کے تحت اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ کامیاب امیدوار مجموعی ووٹوں کی نصف سے بھی کم تعداد سے کامیاب ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ پوری طرح اکثریت کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کرسکتا لہٰذا بعض

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

جمہوری ملکوں میں قطعی اکثریت (Absolute Majority) کا اصول اپنایا گیا ہے۔ قطعی اکثریت کے نظام میں بھی دو طریقوں میں سے ایک کو اپنایا جاتا ہے۔ (1)ترجیحی ووٹ (Preferrential Ballot) کا طریقہ یعنی جس میں ہر ووٹر، بیلٹ پر اپنی ترجیح کے مطابق امیدواروں کے نام پر نشان لگاتا ہے۔ اگر پہلی ترجیح کے ووٹوں کی گنتی میں کسی امیدوار کو قطعی اکثریت نہ ملے تو سب سے کم ووٹ پانے والے امیدوار کو خارج کرکے دوسری ترجیح کے ووٹوں کو امیدواروں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ کمزور امیدواروں کے اخراج اور تیسری یا چوتھی ترجیح کے ووٹوں کی گنتی اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کسی ایک امیدوار کو قطعی اکثریت حاصل نہ ہوجائے۔ (2)دوسرا طریقہ دوسرے بیلیٹ (Second Ballot) کا نظام ہے اس کے تحت جب کسی امیدوار کو قطعی اکثریت حاصل نہیں ہوتی تو دو سر فہرست امیدواروں کے درمیان انتخاب کے لیے پھر سے ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔

(ب) متناسب نمائندگی (Proportional Representation):

متناسب نمائندگی کے انتخابی نظام کا مقصد ایسی قانون ساز مجلس کی تشکیل کرنا ہے جس میں آبادی کے تمام خاص گروہوں اور جماعتوں کو ان کے عددی تناسب کے لحاظ سے نمائندگی حاصل ہو۔ اکثریت کے اصول والے انتخابی نظام میں اقلیتی پارٹیوں کی معقول و متناسب نمائندگی اس لیے ممکن نہیں کہ اس میں اکثریتی پارٹی کو اکثر مجموعی حاصل شدہ ووٹ کے تناسب سے زیادہ تعداد میں نشستیں مل جاتی ہیں۔ اس نظام کا فارمولا یہ ہے کہ جس امیدوار کو دوسرے امیدواروں کے مقابلہ میں زیادہ ووٹ ملیں وہ کامیاب ہوگا خواہ ان سب کے مجموعی ووٹوں کے مقابلہ میں اس کے ووٹوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے متناسب نمائندگی کے نظام کا مزعومہ مقصد یہ ہے کہ ایسی مجلس قانون ساز تشکیل کی جائے جو صحیح معنوں میں جمہوری اور نمائندہ ہو یعنی شکست خوردہ امیدواروں کے ووٹوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے جیسا کہ اکثریتی نظام میں ہوتا ہے۔

متناسب نمائندگی کے نظام میں بھی دو طریقے مستعمل ہیں۔

(1)پارٹی لسٹ کا طریقہ یعنی کثیر رکنی حلقہ ہائے انتخاب میں مقابلہ انفرادی امیدواروں کے درمیان نہیں بلکہ پارٹیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ہر رائے دہندہ کو ہر سیاسی پارٹی کے امیدواروں کی فہرستیں علاحدہ علاحدہ ملتی ہیں۔ ہر ووٹر یا تو اپنی پارٹی کے امیدواروں کی فہرست پر نشان لگا دیتا ہے یا اگر پارٹی کے امیدوار مقررہ نشستوں سے زیادہ ہوتے ہیں تو اپنی ترجیح کے مطابق وہ اپنے ووٹ کو ان کے درمیان تقسیم کردیتا ہے۔ پارٹی لسٹ نظام کا بنیادی مقصد اس بات کا تیقن کرنا ہے کہ ہر پارٹی کو حاصل شدہ ووٹ کے تناسب سے ہی نشستیں ملیں۔ (2)دوسرا طریقہ واحد قابل منتقلی ووٹ (Single Transferable Vote) کا نظام ہے اس میں کثیر رکنی حلقوں میں مقابلہ پارٹیوں کے درمیان نہیں بلکہ انفرادی امیدواروں کے درمیان ہوتا ہے لیکن ہر ووٹر اپنی ترجیح کے مطابق امیدواروں کے ناموں پر نمبر ڈالتا ہے۔ اس نظام میں کامیابی کے لیے تمام ووٹوں میں سے ایک مقررہ کوٹا حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ کوٹا پہلی ترجیح کے ووٹوں سے حاصل نہیں ہوتا تو مذکورہ بالا ترجیحی بیلٹ کے طریقہ کی طرح دوسری تیسری اور چوتھی ترجیحوں کے ووٹ شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ آئرلینڈ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کی سینٹ اور ریاستہائے متحدہ امریکا کی چند بلدیات میں مستعمل ہے۔

متناسب نمائندگی کے مبینہ فوائد غیر یقینی ہیں۔ اس کے حامیوں کا کہنا ہے کہ (1) نسبتی اکثریت کا اصول محض دو جماعتی نظام والے ملکوں میں موثر نمائندگی دے سکتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکا اور برطانیہ کے سوا اکثر ممالک کثیر جماعتی ہیں۔ اس لیے اقلیتوں اور خصوصی مفادی گروہوں کی نمائندگی متناسب نمائندگی کے طریقوں ہی سے ممکن ہے۔ (2)اس نظام میں چونکہ کئی نشستوں والے وسیع علاقائی حلقوں سے کام لیا جاتا ہے لہٰذا بار بار انتخابی ضلعوں کی حدبندی اور گیری مینڈرنگ جیسی برائیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ (3)چونکہ قانون ساز اسمبلی میں تمام تر مفادی گروہوں اور اقلیتی پارٹیوں کو نمائندگی ملے گی اور یہ اسمبلی صحیح معنوں میں قومی رائے کی آئینہ ہوگی لہٰذا لابی گردی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

لیکن ان ملکوں کا تجربہ جہاں متناسب نمائندگی کی مختلف شکلیں آزمائی گئی ہیں بتاتا ہے کہ یہ نظام کہیں بھی سیاسی زندگی کے معیار کو کسی نمایاں حد تک بلند کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ قانون ساز ایوان کو متعدد پارٹیوں اور چھوٹے چھوٹے دھڑوں میں تقسیم کردیتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی کثرت کے سبب اس نظام میں کسی ایک پارٹی کی حکومت بننا مشکل ہوجاتا ہے۔ مخلوط وزارتوں کا نتیجہ سیاسی و انتظامی خلفشار اور کمزور حکومت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کمزور حکومت کے معنی غیر ذمہ دار حکومت کے ہوتے ہیں۔ جمہوری نظام حکومت کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اس میں مختلف گروہوں کے اقتصادی، تہذیبی اور دوسرے مفادات میں ہم آہنگی لائے اور

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ٹکراؤ کے بجائے تعاون اور سمجھوتہ کا دائرہ وسیع ہو۔ متناسب نمائندگی اس کے برخلاف ہر اقلیت اور ہر ناراض گروہ کو یہ دعوت دیتی ہے کہ وہ سیاسی پارٹی کی شکل میں منظم ہوکر معمولی اختلافات کو استمراری نوعیت دے جبکہ عظیم تر سیاسی پارٹیوں کے تحت ان کا تصفیہ ممکن ہے۔ چنانچہ مضبوط اور موثر حکومت کے لیے ایک رکنی انتخابی حلقوں کا طریقہ بیشتر صورتوں میں کارآمد ثابت ہوا ہے۔ ویمر جرمنی (1919 تا 1933) اور چوتھی فرانسیسی جمہوریہ (1946 تا 1958) میں متناسب نمائندگی کا نتیجہ نہ صرف سیاسی عدم استحکام بلکہ جمہوریت کے زوال کی شکل میں برآمد ہوا۔

(ج) پیشہ ورانہ نمائندگی (Functional Representation): علاقائی نمائندگی کے مروجہ نظام کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ کسی جغرافیائی علاقہ میں بسنے والے عوام کے تمام مفادات مشترک نہیں ہوتے۔ مختلف النوع مفادات کی صحیح معنوں میں نمائندگی اسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حلقوں کے بجائے اقتصادی یا پیشہ وارانہ گروہوں کو انتخاب کی بنیاد بنایا جائے۔ لیکن علاقائی نمائندگی کے اصول نے کئی صدیوں سے مملکت کے اندر افراد اور گروہوں کے مستقل مشترکہ مفادات اور مملکت کی سیاسی وحدت کی ضمانت دی ہے۔ پیشہ ورانہ نمائندگی پر مبنی کارپوریٹ مملکت یا گلڈ کانگریس ان مستقل مفادات کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے گی۔ اور اگر انھیں اقتدار مل گیا تو مملکت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس کے راستہ میں چند عملی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ (1) کن گروہوں کو نمائندگی کی بنیاد بنایا جائے؟ (2) یہ کس طرح طے کیا جائے کہ کون سا شہری کس پیشہ ورانہ گروہ کا رکن ہے؟ (3) نشستوں کو کس بنیاد پر ان گروہوں کے درمیان تقسیم کیا جائے؟ اور (4) امن و امان، حفظان صحت وغیرہ کے مشترکہ مفادات کا کس طرح تحفظ کیا جائے؟ جہاں تک نشستوں کی تقسیم کا مسئلہ ہے یہ کام کارپوریٹ جماعتوں کے آپسی سمجھوتہ سے طے ہونا ناممکن ہے کیونکہ کوئی بھی گروہ محض اپنے ارکان کی تعداد کے تناسب سے نمائندگی پر اکتفا نہیں کرے گا۔ ہر صنعت اور ہر پیشہ اپنی سماجی اور اقتصادی اہمیت کو اپنی عددی طاقت پر مقدم رکھتا ہے۔ چنانچہ پیشہ ورانہ اسکیم، سیاسی اور اقتصادی تفریق کو ہوا دے گی کیونکہ اس کی بنیاد ہی اختلافات پر ہے۔ اس کے برخلاف علاقائی نمائندگی کی بنیاد شہریوں کی مساوات اور ان کے مشترکہ مفادات پر مبنی ہے۔ یہ اسکیم اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب وہ جمہوری اعتبار سے منتخب کی ہوئی حکومت یا کسی آمر کے ماتحت ہو۔ فاشسٹ اٹلی میں مسولینی نے اپنی قوم کی آزادانہ اور مساویانہ نمائندگی کے اصول کو ختم کرکے ان کارپوریشنوں کو نمائندگی دی جو مسولینی اور اس کی فاشسٹ پارٹی کی مرضی کے آلہ کار تھے۔ ویمر جرمنی اور فرانس میں اقتصادی کونسلوں کی تشکیل میں بڑی دشواری پیش آتی تھی کیونکہ کوئی بھی پیشہ ور گروہ ان کے فیصلوں سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

نیشنل کمیشن آف لیبر (National Commission of Labour):

ہندوستان میں قانون صنعتی تنازعات کی تفصیلات پر غور کرنے سے قبل یہ مناسب ہوگا کہ اس تاریخی پس منظر کو بھی سامنے رکھا جائے جو ہندوستان میں صنعتی نزاعات کے فیصلے کے متعلق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ 1966 میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مزدور طبقہ (Labour Class) کی بہتری کے متعلق ایک کمیشن قایم کیا۔ جسے نیشنل کمیشن آف لیبر (National Commission of Labour) کا نام دیا گیا۔ اس کمیشن کے سپرد حسب ذیل امور کے متعلق سفارش کرنے کی خواہش کی گئی۔

(1) آزادی کے بعد مزدوروں کے عام حالات میں تبدیلی پر ریویو اور تبصرہ۔

(2) صنعتی تنازعات کے فیصلوں کے متعلق موجودہ قوانین پر تبصرہ اور اس بات پر ریویو (Review) کہ آیا موجودہ قوانین مزدوروں کے مفادات کی کماحقہ حفاظت کرتے ہیں یا نہیں اور اس امر کی جانچ کہ موجودہ قانون کس حد تک مزدور طبقہ (Working Class) کے متعلق دستور ہند کے رہبرانہ اصولوں (Directive Principles) پر پورے اترتے ہیں۔

(3) حسب ذیل امور کی بابت خصوصی جانچ:

(i) مزدوروں کی موجودہ آمدنی اور مزدوری کے تعین کی بنیاد اور اقل ترین اجرت (Minimum Wages) کے قانونی طور پر تعین کرنے کی ضرورت۔

(ii) مزدوروں کا عام معیار زندگی اور معیار صحت

(iii) مزدوروں کے معاشرتی معیار (Social Status) کا تحفظ

(iv) آجر (Employer) اور مزدوروں کے باہمی تعلقات کی موجودہ نوعیت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

(v) بہتر صنعتی تعلقات کے قیام کے سلسلے میں ٹریڈ یونین (Trade Union) اور آجروں کی تنظیم (Employers Organisation) کا رول

اس کمیشن نے ان امور پر غور کرتے وقت سابقہ کمیشن اور کمیٹیوں کی رپورٹ اور سفارشات کو بھی سامنے رکھا۔ مثلاً

(1) Whitley Commission, 1931

(2) Rege Committee, 1946

اور کافی تفصیل کے ساتھ امور متعلقہ پر روشنی ڈالی اور تقریباً تین سو سفارشات اپنی رپورٹ میں پیش کیں۔ ان میں بعض اہم سفارشات یہ ہیں:

(1) شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی (Fast Urbanisation) کی وجہ سے مزدور طبقہ (Working Class) کے لیے مختلف مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ سب سے پہلے مکان کا مسئلہ ہے۔ دوسرا حمل و نقل کی دشواری اور تیسرا بلدی سہولتوں کی تکمیل۔ مثلاً پانی ڈرینج وغیرہ۔ چوتھا اور سب سے اہم مسئلہ اشیاء احتیاج کی بڑھتی ہوئی قیمت۔ صنعتی ادارہ کے انتظامیہ کو چاہیے کہ ان خطوط پر غور کرے اور فوری نہیں تو رفتہ رفتہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرے۔

(2) مزدوروں کے بچوں کے لیے سہولتیں۔

(3) یہ رجحان کہ صنعتی تنازعات کا تصفیہ لیبر عدالت (Labour Court) کے ذریعہ کروایا جائے زیادہ عام ہوتا جارہا ہے۔ اس کی ضرورت ہے کہ اس رجحان کو کم کیا جائے اور مصالحت (Conciliation) یا جوائنٹ اسٹاف کونسل (Joint Staff Council) یا ثالث (Arbitrator) کے ذریعہ ان نزاعات کا فیصلہ ہو۔

کام کرتے وقت مزدوروں کی حفاظت اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی قانون میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس بات کی نگرانی کی ضرورت ہے کہ صنعتی ادارہ کا انتظامیہ (Management) ان حفاظتی تدابیر کو اختیار کرے جس سے مزدوروں کی حفاظت ہوسکے اور انھیں کسی خطرے سے دوچار ہونا نہ پڑے۔

(4) کام کرنے کے اوقات میں مناسب کمی کرنی چاہیے اور رات میں کام کرنے والوں کے اوقات کار دن میں کام کرنے کے مقابلے میں کم ہونا چاہیے۔

(5) لیبر ویلفیئر آفیسر کا تقرر ہونا چاہیے جو مختلف صنعتی اداروں میں امور متذکرہ بالا کی نگرانی کرسکے۔

(6) کریش (Creches) کا قیام ہر اس فیکٹری میں ہونا چاہیے جہاں پچاس یا اس سے زیادہ عورتیں کام کرتی ہوں۔ اس طرح کینٹین کا قیام بھی عمل میں آنا چاہیے۔

طبی امداد (Medical Facilities) کے تحت ایک ایمرجنسی ہاسپٹل کے قیام کی ہر فیکٹری میں شدید ضرورت ہے اور اگر فیکٹری کا رقبہ کافی وسیع ہو تو پرائمری ہیلتھ سینٹر کے علاوہ چلتا پھرتا دواخانہ کی بھی ضرورت ہے۔ تعلیمی اور تفریحی مراکز بھی ہوں تاکہ مزدوروں کے بچوں کو تعلیمی سہولتیں حاصل ہوں اور مزدوروں کے لیے فرصت کے اوقات میں تفریحی مواقع حاصل رہیں۔

نیم وفاقیہ (Confederation): نیم وفاقیہ یا کنفیڈریشن بذات خود کوئی مملکت نہیں بلکہ آزاد و خود مختار مملکتوں کی انجمن یا لیگ کو کہتے ہیں۔ یہ انجمن شریک ملکوں کے عوام کے ووٹ سے نہیں بلکہ سربراہان مملکت یا حکومتوں کے درمیان سمجھوتہ یا میثاق سے تشکیل کی جاتی ہے۔ کنفیڈریشن اور اتحاد (Alliance) اس بات میں مختلف ہیں کہ اتحاد کسی مخصوص مقصد کے لیے اور ایک عارضی مدت کے لیے قائم ہوتا ہے۔ اس کی کوئی مرکزی تنظیم نہیں ہوتی بلکہ اتحادی زعماء وقتاً فوقتاً آپسی صلاح و مشورہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس کنفیڈریشن ایک استقراری کیفیت ہے اور اس کی ایک مرکزی تنظیم ہوتی ہے جو رکن حکومتوں کے اتفاق رائے سے کنفیڈرل معاملات پر پالیسی بناتی اور اسے نافذ کرتی ہے۔ لیکن اس کے فیصلوں کی حیثیت محض سفارشات کی ہوتی ہے جن پر عمل کرنا ارکان پر واجب نہیں ہوتا۔ ریاستہائے متحدہ امریکا 1776 تک اور سوئٹزرلینڈ 1875 تک اس کی مثالیں ہیں۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

و

واجب: یہ بھی ایسا کام ہے جو ضروری اور لازمی ہو فقہاء نے اس سے وہ حکم مراد کیا ہے جس کے چھوڑنے پر سزا ہوگی اور بلاعذر چھوڑنے والا سخت گنہگار سمجھا جائے گا۔ تاہم یہ فرض کی طرح ایسا ضروری نہیں ہے کہ اس کے منکر کو کافر کہا جائے جیسے فرض نماز کی جماعت یا عیدین کی نمازیں۔

واقعاتی شہادت (Circumstantial Evidence): اس تعلق سے 1962 میں میسور ہائی کورٹ نے خیال کیا ہے۔ ملزم اور متوفی (Accused and Deceased) کا واقعہ کے دن ساتھ دیکھا جاتا۔ متوفی کے جسم پر ایسے آلات سے ضربات پہنچائے گئے ہوں جو ملزم کی تحویل سے برآمد ہوئے ہوں۔ گرفتاری کے وقت ملزم کے لباس کا خون آلود ہونا اس انگوٹھی کا جو متوفی نے پہن رکھی تھی ملزم کے پاس برآمد ہونا یہ سب ایسی مثالیں ہیں جنھیں واقعاتی شہادت متعلقہ کی تعریف میں لایا جاسکتا ہے۔ کسی جرم کے واقعہ متعلقہ کی واقعاتی شہادت کی جانچ کرنی چاہیے۔ تعزیراتی مقدمات (Criminal Cases) میں لذیت یا وجہ تحریک (Motive) کو کافی اہمیت ہے۔ نیت (Intention) ایک دماغی کیفیت ہے (State of Mind) جسے کسی شہادت سے ثابت نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے دیگر واقعات متعلقہ سے ثابت کرنا ہوگا۔

وحدانیت اور وفاقیت: "وحدانیت" (Unitartianism) جدید مملکت کی ساخت سے متعلق ایک اصول ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مملکت کے تمام اختیارات کو قانونی طور پر ایک مرکزی یا قومی حکومت کو سپرد کر دیا جائے۔ وحدانی نظام میں ایک مرکزی حکومت مملکت کے سارے علاقہ پر مکمل اختیار رکھتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پالیسی سازی اور پالیسی کی تنفیذ ایک ہی مرکز سے ہونی چاہیے۔ انتظامی ضرورت، سہولت یا مصلحت کے پیش نظر مرکزی نظام میں بھی عدم مرکزیت یا تفویض اختیارات ناگزیر ہوتی ہے۔ وحدانیت وفاقیت سے تین باتوں میں مختلف ہے:

(1) اختیارات کے محل وقوع یعنی وحدانی نظام میں سارے اختیارات قانوناً ایک حکومت میں مرتکز ہوتے ہیں۔ جبکہ وفاقی حکومت میں وفاقی دستور اختیارات کو دو سطحوں کی حکومتوں، مرکزی اور مقامی، میں تقسیم کر دیتا ہے اور ان دونوں سے بالاتر ہوتا ہے۔

(2) اختیارات کی تقسیم: وحدانی نظام میں مرکز اپنی انتظامی سہولت کے پیش نظر ذیلی اکائیوں یا مقامی حکومتوں کی تشکیل کرتا ہے اور انھیں اپنے کچھ اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ یہ اختیارات مرکزی مجلس قانون ساز کے عام قانون کے ذریعہ نہ کہ کسی بالاتر دستور کے ذریعہ تفویض کیے جاتے ہیں جبکہ وفاقی نظام میں تقسیم اختیارات کی حیثیت، مرکز اور اکائیوں میں دستوری ہے۔ دونوں سطحوں کے متعلقہ اختیارات میں کوئی رد و بدل دستور کی متعلقہ دفعات میں ترمیم کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ دستور میں اختیارات کی تقسیم کی اسکیم کا تحفظ وفاقی عدلیہ کرتی ہے۔

(3) حکومتی اکائیوں کی حیثیت: وحدانی نظام میں حکومتی و انتظامی اکائیوں کی حیثیت محض مرکز کے ماتحت کارندوں کی ہوتی ہے۔ نہ تو ان کے جداگانہ وجود کی کوئی دستوری ضمانت ہوتی ہے نہ ہی ان کے اختیارات کی۔ انھیں آزادانہ قانون بنانے اور نافذ کرنے کی آزادی نہیں ہوتی۔ وہ محض مرکزی مجلس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت مرکز کی منظوری سے ذیلی قواعد (By Laws) بنا سکتی ہیں۔ اس کے برعکس وفاقی نظام میں اکائیوں کی جداگانہ حیثیت ان کی خود مختاری اور اختیارات، دستوری طور سے مسلّم ہوتے ہیں۔ وفاقی مملکت کی مقامی حکومتیں اپنے معاملات پر آزادانہ قانون بنانے، انھیں نافذ کرنے اور ٹیکس وصول کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مرکزیت بڑے حجم یا کثرت آبادی والے ملکوں کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ ایسے ملکوں کے لیے جو وسیع علاقوں اور آبادیوں کو محیط ہوں، مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، ہندستان اور جن میں جغرافیہ، آب و ہوا، وسائل، اقتصادی حالت، سماجی عوامل اور قومیت و نسل، زبان و مذہب کے اختلافات کے نتیجہ میں علاقائی تنوع پایا جاتا ہو، وفاقیت موزوں ترین ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قومی اہمیت کے امور کو ایک قومی حکومت کے سپرد کرکے اور مقامی اہمیت کے معاملات میں مقامی حکومتوں کو خود مختاری دے کر، کثرت میں وحدت، انتظام میں عدم مرکزیت اور اختیارات کی تقسیم کی راہ ہموار کرتی ہے۔ دونوں سطحیں اپنے متعلقہ میدانوں میں مستعدی اور یکسوئی سے حکومت کے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وفاقیت کوئی اخلاقی نظریہ نہیں بلکہ محض سیاسی تنظیم کا ایک افادی اصول ہے۔ یہ جمہوری اور استبداری دونوں نظاموں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وفاقی تنظیم کی کوئی ایک متعینہ ساخت نہیں ہوتی۔ وفاقی نظام ہر ملک کے انفرادی حالات اور ضروریات کے مطابق مختلف طرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک کے انفرادی وفاقی نظام میں بھی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد بدلتے ہوئے حالات اور مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

ان دونوں سیاسی اصولوں کی موزونیت یا غیر موزونیت کا انحصار مملکت کے حجم، آبادی کی نوعیت، انتظامی مسائل اور سیاسی و سماجی و اقتصادی حالات پر منحصر ہے۔ وحدانیت عموماً ایسے ملکوں کے لیے مناسب ہے جس کا علاقہ نسبتاً چھوٹا ہو اور جس کی آبادی میں تہذیبی، سماجی اور سیاسی معاملات میں یکسانیت پائی جائے۔ چنانچہ برطانیہ، فرانس اور اطالیہ کی طرح دنیا کے بیشتر چھوٹے ملک وحدانی ہیں۔ وحدانیت کی چند واضح خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں قوانین اور انتظام کی یکسانیت پائی جاتی ہے جس سے ملک مجموعی طور پر نئے حالات اور مسائل سے بہتر طریقہ سے اور ہر وقت مقابلہ کرسکتا ہے۔ وفاقی نظام میں اکائیوں کی خود مختاری کے نتیجہ میں ایسے بہت سے اہم مسائل پر جہاں یکساں قومی پالیسی کی ضرورت ہوتی ہے، بھانت بھانت کی پالیسیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ بعض ریاستیں نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں بعض کم اور بعض نسبتاً پس ماندہ رہ جاتی ہیں۔ وحدانیت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ یک انتظامی نظام اور ایک عملہ ہونے کی بناء پر کفایتی ہوتا ہے۔ جبکہ وفاقیت میں مرکزی اور مقامی حکومتوں کی الگ الگ انتظامی مشنری اور الگ عملہ ہوتا ہے جس سے عوام کا مالی بار بڑھتا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں مرکز کا عمل دخل حد سے زیادہ بڑھنے اور اس کے نتیجہ میں مرکزی بیورو کریسی کے حد سے زیادہ پھیلنے اور مقامی امور پر حد سے زیادہ کنٹرول کرنے کا خطرہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ نظام مقامی معاملات میں عوام کی دلچسپی کو زائل کرنے اور مقامی حکام میں پیش قدمی کی اسپرٹ کی ہمت شکنی کا رجحان رکھتا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ مختلف عوامل کی بناء پر اکثر وفاقی نظاموں کا رجحان مرکزیت کی طرف اور وحدانی نظاموں کا عدم مرکزیت کی طرف ہے۔ جس کی مثال برطانیہ، فرانس و اطالیہ میں مقامی حکومتوں کے دائرہ کار کے بڑھنے سے ملتی ہے۔ جمہوریت اور مقامی خود مختاری کی بنیاد ملک کے سیاسی کلچر پر منحصر ہوتی ہے۔ سیاسی ڈھانچہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

وحی: لغوی معنی اشارہ کرنا، چپکے سے بات کرنا، مخفی طور پر خبر دینا، وسوسہ ڈالنا ہے حکم اور پیغام نیز کلام خفی کو بھی وحی کہتے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں اس سے خدا کا کلام اور پیغام مراد ہوتا ہے۔ جو وہ فرشتوں کے ذریعہ انبیا علیہم السلام پر نازل کرتا اور بھیجتا ہے۔

وحی کے نازل کیے جانے کی تین صورتیں ہیں۔

(1) نبی بغیر کسی واسطہ کے اللہ کا کلام سنے (2) فرشتہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام پیغمبر پر اتارے (3) نبی کے قلب پر کلام الٰہی نازل ہوا اور اس کا باطن عالم قدس کی طرف مسخر کرلیا جائے اور اس میں پیغام الٰہی القا کیا جائے۔

وحی صرف پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے۔ غیر انبیا کے دل پر اگر خدا کی طرف سے کوئی بات ڈالی جاتی ہے تو اس کو الہام کہتے ہیں۔ رویائے صادقہ کی بھی یہی نوعیت ہے۔

آنحضرت ﷺ پر مختلف طریقوں سے وحی نازل ہوتی تھی ایک صورت یہ تھی فرشتہ انسان کی صورت میں ظاہر ہو کر آپ کو خدا کا کلام سناتا (2) کبھی حضرت جبریل اپنی اصل صورت میں آکر کلام الٰہی پہنچانے جاتے (3) خود خدا تعالیٰ پردہ کے پیچھے کلام فرماتا تھا (4) ایک صورت یہ تھی کہ گھنٹی کی جھنکار کے مانند وحی اترتی تھی۔ (5) کبھی آپ کے نفس

مقدس میں کلام الٰہی روح کی طرح ڈال دیا جاتا تھا۔

وراثت : فقہ میں وراثت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بلا عوض اور بغیر مشقت کسی چیز کا مالک ہو جائے جیسے کوئی مال یا جائداد خرید و فروخت اور ہدیہ وہبہ کے بغیر کسی کی طرف سے کسی کو مل جائے تو اس کو وراثت کہیں گے۔ اصطلاحاً اس سے مسلمان کی وہ منقولہ یا غیر منقولہ جائداد اور مال و اسباب مراد ہے جو اپنی وفات کے وقت چھوڑ جاتا ہے اور وہ اس کے عزیزوں اور قرابت داروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ جائداد اور مال و اسباب میت کے قبضہ و تصرف اور ملکیت میں رشتہ داروں سے وراثتاً آئے ہوں یا اس نے کما کر ان کو حاصل کیا ہو۔ اسی کو ترکہ بھی کہا جاتا ہے اور اس کی تقسیم کی یہ صورتیں شریعت نے بتائی ہیں۔

(1) مرنے والے کے متروکہ مال و جائداد سے پہلے اس کی تجہیز و تدفین کا انتظام کیا جائے گا۔

(2) اس کے بعد اگر اس کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کو ادا کیا جائے گا۔

(3) پھر اگر اس نے کسی کے لیے کوئی وصیت کی ہو تو اب جو مال بچا ہوگا اس میں سے اس کو دیا جائے گا بشرطیکہ اس نے ایک تہائی یا اس سے کم کی وصیت کی ہو لیکن اگر ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی ہو تو اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

(4) اس کے بعد جو ترکہ بچے گا وہ میت کے وارثوں میں ان کے حصول کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ وارث اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی مسلمان کی موت کے بعد اس سے رشتہ و قرابت کی بنا پر اس کے ترکہ اور جائداد میں سے حصہ پائے۔ وارث کی اقسام حسب ذیل ہیں۔

(1) ذوی الفروض: یہ متوفی کے وہ رشتہ دار ہیں جن کا اس کے ترکہ میں ایک مقررہ اور معین حصہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔ ان کی تعداد بارہ ہے جن میں حسب ذیل چار مرد اور آٹھ عورتیں ہیں۔

(1)باپ، (2) دادا اور اس سے اوپر کی پیڑھی والے یعنی پردادا وغیرہ۔ (3)اخیافی (دودھ شریک) بھائی، (4)شوہر، (5)بیٹی، (6)پوتی اور اس سے نیچے کی پیڑھی والی یعنی پرپوتی وغیرہ، (7) حقیقی بہنیں، (8)سوتیلی بہنیں، (9)اخیافی (دودھ شریک) بہنیں، (10)بیوی، (11)ماں، (12)دادی یا اس سے اوپر کی پیڑھی کی عورتیں یعنی پردادی وغیرہ۔ دادا اس وقت وارث ہوگا جب باپ نہ ہو اور پردادا دونوں کے نہ ہونے پر وارث ہوگا اسی طرح دادی بھی اس وقت ترکہ پائے گی جب ماں موجود نہ ہو اور پردادی کو دونوں کے نہ ہونے پر ترکہ ملے گا۔ پوتیوں کو بیٹی کے نہ ہونے پر وراثت ملے گی اور پرپوتی اس وقت وارث ہوگی جب بیٹی اور پوتی دونوں نہ ہوں۔

(2)عصبات : یہ میت کے وہ ورثہ ہیں جن کے حصے متعین نہیں ہیں بلکہ ذوی الفروض کے حصے تقسیم کرنے کے بعد جو بچ جاتا ہے وہ ان کو ملتا ہے اگر اصحاب فروض نہ ہوں تو یہ متوفی کے پورے ترکہ کے مستحق ہوتے ہیں۔

ان کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) نسبی : ان کا میت سے نسب و قرابت کا تعلق ہوتا ہے جیسے بیٹا پوتا پرپوتا بھائی بھتیجا چچا اور چچا زاد بھائی وغیرہ۔ بعض صورتوں میں باپ اور دادا بھی عصبہ ہوتے ہیں۔

(ب) سببی : ان سے وہ غلام مراد ہیں جن کو آدمی آزاد کرتا ہے۔ جب یہ آزاد کردہ غلام فوت ہو تو آزاد کرنے والا اس کا وارث ہوگا۔

(3) ذوی الارحام : ذوی الفروض اور عصبات کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کو ذوی الارحام کہا جاتا ہے جیسے نواسا، نواسی، بھتیجیاں، بھانجے، پھوپھی، خالہ اور ماموں وغیرہ۔ ان کے حصے شریعت نے متعین نہیں کیے ہیں بلکہ جب اصحاب فروض اور عصبات موجود نہ ہوں تو ان کو ترکہ ملے گا۔ لیکن حضرت زیدبن ثابت کے نزدیک ذوی الارحام متوفی کے ترکہ کے مستحق نہیں ہوتے۔ یہی امام مالک اور امام شافعی کا بھی مسلک ہے۔

ذوی الارحام چار طرح کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ان میں جو میت سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کے ہوتے ہوئے بعید والے کو حصہ نہیں ملتا۔

ان تینوں قسموں کے علاوہ وارثوں کی بعض اور قسمیں بھی ہیں لیکن ان کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ تفصیل کے لیے فقہ و فرائض کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

شیعی مسلک میں ورثا کی یہ تین قسمیں ہیں:

(1) براہ راست نسبی قرابتدار جیسے والدین اور اولاد۔ (2) بالواسطہ قرابتدار جیسے شوہر اور بیوی اور (3) ولا کا تعلق یعنی اگر کوئی شخص کسی کو آزاد کرے اور آزاد کیے جانے والا شخص مر گیا تو آزاد کرنے والا۔

اوپر جن وارثوں کا ذکر ہوا ہے ان میں بعض اوقات ایسے عوارض پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے وراثت مستحق نہیں رہتے۔ یہ عوارض حسب ذیل ہیں:

(1) رقی یعنی غلامی: اگر کوئی غلام یا مدبر و مکاتب یا ام ولد کے رشتہ دار مر جائیں تو یہ ان کے ترکہ سے وراثت پانے کا استحقاق نہیں رکھتے۔

(2) قتل: جب قتل سے قصاص یا کفارہ لازم آئے جیسے قتل عمد شبہ عمد اور قتل خطا تو اس نوعیت کے قاتل کو اپنے مقتول کی وراثت میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

(3) اختلاف دار: متوفی اور وارث میں سے اگر ایک مسلم اور دوسرا غیر مسلم ہو تو اس کے نتیجے میں ان کے درمیان وراثت جاری نہ ہوگی۔ لیکن غیر مسلموں کا اختلاف دین ایک دوسرے کے لیے مانع وراثت نہیں ہے۔

وسطی امریکی مشترکہ منڈی (Central American Common Market, CACM)

وسطی امریکی مشترکہ منڈی (Central American Common Market, CACM): ایکواڈور، گوئٹے مالا، ہنڈورس اور نکاریگوا کی یہ مشترکہ منڈی تنظیم ریاستہائے وسطی امریکا کے زیراہتمام دسمبر 1960 میں وسطی امریکی اقتصادی یک جہتی کے مقصد سے ماناگوا میں قائم ہوئی۔ کوسٹاریکا، ایلسلواڈور، گوئٹے مالا، ہنڈورس، نکاریگوا اور پناما اس کے ممبر ہیں۔ اکتوبر 1993 میں ان سبھی چھ ملکوں نے مکمل اقتصادی یک جہتی کے اپنے عزم کا اعادہ کیا۔ اسی طرح دسمبر 1995 میں ہنڈورس میں وسطی امریکا میں جمہوری تحفظ کے معاہدہ پر سبھی چھ ملکوں نے دستخط کیے۔

اس مشترکہ منڈی کا صدر دفتر گوئٹے مالا میں واقع ہے۔

وصیت: آدمی اپنی زندگی میں اپنی ملکیت کی چیزوں میں سے کچھ دوسرے کے لیے مقرر کردے اور کہے کہ یہ میرے مرنے کے بعد اس کی طرف منتقل کردی جائے تو اسی کو وصیت کہتے ہیں۔ فقہ میں اس کے چار ارکان ہیں۔

(1) موصی: وصیت کرنے والا آدمی۔ (2) موصی لہٗ: جس شخص کے لیے وصیت کی جائے۔ (3) وصی جو شخص وصیت کے تعمیل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہو۔ (4) موصی بہ جس چیز کی وصیت کی جائے۔ وصیت دراصل مرنے کے بعد کے زمانہ میں کسی کو کسی چیز کے مالک و وارث بنانے کا نام ہے۔ اس لیے اس کا نفاذ موصی کی موت کے بعد ہوگا اس لیے وصیت کا قبول بھی موصی کی موت کے بعد ہوگا۔ اگر موصی لہٗ نے اس کی زندگی ہی میں اس کو قبول کر لیا یا رد کر دیا تو باطل سمجھی جائے گی۔ اگر موصی کی وفات سے پہلے ہی موصی لہٗ مر جائے تو وصیت باطل ہو جائے گی اور موصی بہ (وصیت کی گئی چیز) موصی کی جائداد میں شامل ہو جائے گی۔ مگر اہل تشیع کے نزدیک یہ موصی کی طرف منتقل ہونے کے بجائے موصی لہٗ کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جائے گی بشرطیکہ موصی نے وصیت کو منسوخ نہ کر دیا ہو اگر موصی لہٗ کے اولاد نہ ہوں تو موصی کے وارثوں کی جانب منتقل ہو جائے گی۔ جب موصی لہٗ وصیت کی چیز کو قبول کرے تو وہ اس کی ملکیت ہوگی البتہ اگر موصی کی وفات کے بعد ہی مر جائے اور وصیت قبول کرنے کا اس کو موقع نہ ملے تو بغیر قبول بھی وہ موصی لہٗ کی ملکیت متصور ہوگی۔

فقہ میں وصیت کے مخصوص الفاظ اور صیغے ہیں جن کے ذریعہ وصیت کرنے والا وصیت کرتا ہے۔ مثلاً میں فلاں کے لیے اس قدر وصیت کرتا ہوں کہ اس کے لیے اس قدر عطا کرتا ہوں یا یہ چیز اس کے لیے ہے۔ یا یوں کہے کہ یہ میری موت کے بعد فلاں کے لیے ہبہ ہے۔

وصیت کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اس کا ثبوت قرآن اور احادیث دونوں سے ملتا ہے۔ اس لیے تمام علماء امت بھی اس پر متفق ہیں۔ لیکن وصیت صرف ایک تہائی مال یا اس سے کم میں کی جاسکتی ہے گوکہ اس کی صراحت قرآن مجید میں نہیں ہے مگر حدیثوں میں موجود ہے اس لیے کوئی مسلمان اپنی جائداد کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کسی کو بذریعہ وصیت منتقل نہیں کرسکتا جو وصیت تہائی سے زیادہ کی جائے اس کے نفاذ کی صرف ایک صورت ہے کہ ورثا موصی کی موت کے بعد اس پر اپنی رضامندی ظاہر کردیں۔ اگر کسی نے اپنی جائداد کے تہائی کی ایک شخص

کے لیے وصیت کی پھر اسی قدر یعنی تہائی کی دوسرے کے لیے بھی وصیت کی اور وارثوں نے اس کو منظور کر لیا تو وصیت درست سمجھی جائے گی لیکن اگر انھوں نے اس پر رضامندی ظاہر نہ کی تو صرف ایک تہائی ہی کی وصیت درست ہوگی اور دونوں اشخاص کو اس میں سے برابر برابر دے دیا جائے گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

اگر کسی نے وصیت کی مگر اس کے ذمہ اس قدر قرض ہے کہ اس کا ترکہ قرض کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں ہے تو وصیت کا نفاذ نہیں کیا جائے گا۔

غیر مسلم ذمّی مسلمان کے لیے اور مسلمان غیر مسلم ذمّی کے لیے وصیت کر سکتے ہیں لیکن قاتل کے لیے وصیت کرنا درست نہیں۔

وصیت ہر چیز کی کی جاسکتی ہے خواہ کم ہو یا بیش معلوم ہو یا مجہول موجود ہو یا معدوم متعین ہو یا مبہم لیکن جس شخص کے لیے وصیت کی جائے اس کا وجود وصیت کرنے والے کی موت کے وقت ہونا چاہیے اس لیے اگر کسی نے جس کسی کے لیے وصیت کی اور وہ وصیت کرنے والے کی موت تک پیدا نہ ہوا تو یہ وصیت باطل ہوگی۔

ہر صحیح الدماغ عاقل و بالغ شخص جو کسی جائداد کا داقعی مالک و مختار ہو وہ اپنی جائداد وصیت کے ذریعہ دوسرے شخص کے لیے منتقل کرسکتا ہے۔ لیکن جو مالک نہ ہو یا نابالغ مجنون، بیہوش غلام اور مکرہ (ایسا شخص جس سے جبراً وصیت کرائی جائے) ہو اس کے لیے وصیت کرنا جائز نہیں۔ وصیت تحریری اور زبانی دونوں طرح کی جاسکتی ہے۔

وصیت کرنے والا اپنی وصیت سے قولاً یا فعلاً رجوع کر سکتا ہے۔ قولاً اس طرح رجوع کرے گا کہ وہ یہ کہے کہ میں نے فلاں کے لیے جو وصیت کی تھی اس سے رجوع کر لیا۔ اور فعلاً رجوع کی شکل یہ ہے کہ جس چیز کی وصیت کر چکا تھا اس کو فروخت کر دیا یا کسی شخص کو ہبہ کر دیا۔

وصیت نیکی خیر اور فی سبیل اللہ کاموں میں جائز ہے۔ مگر گناہ اور معصیت کے کاموں میں جائز نہیں۔

وقف : جو اشیا منقولہ وغیر منقولہ ذاتی ملکیت سے نکال کر فی سبیل اللہ دے دی جائیں۔ ان کی تمام آمدنی بیت المال کا حق متصور ہوگی۔

ولایت (Guardianship): رومن لاء کے تحت وہ بچے جو سن بلوغ تک نہ پہنچے ہوں (یعنی 14 سالہ لڑکی اور 22 سالہ لڑکا) ان کے لیے ولی کا ہونا ضروری تھا بشرطیکہ وہ حقوق پدری (Patrica Potestas) کے تابع نہ ہوں۔ اگر کسی بچے کا ولی نہ ہو اور اس پر باپ کے حقوق پدری نہ ہوں تو ایسی صورت میں ولایت قریب ترین اگنیٹ (Agnate) کے سپرد ہوتی تھی یہ عمل جسٹینین (Justinian) کے زمانے تک رہا۔ البتہ جسٹینین (Justinian) کے زمانے میں حق ولایت قریب ترین رشتہ دار کو دیا گیا خواہ وہ اگنیٹ ہو یا کاگنیٹ۔ اگر کوئی موزوں اگنیٹ یا کاگنیٹ نہ ہو تو مجسٹریٹ کو اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ولی مقرر کرے۔ ان عورتوں کے لیے جن پر کوئی حق پدری (Patrica Potestas) نہ ہو یا جس پر مانس (Manus) یعنی حقوق زوجیت نہ ہوں ان کے لیے بھی ولی مقرر کیا جاتا تھا۔ ولی ان اشخاص کے لیے بھی مقرر کیا جاتا تھا جو صحیح الدماغ نہیں ہوتے تھے۔ ابتدا میں ایسے اشخاص کے لیے قریب ترین اگنیٹ کو ولی مقرر کیا جاتا تھا بعد میں مجسٹریٹ کو اس کا اختیار دیا گیا کہ وہ ولی مقرر کرے۔ کم عمر بچوں کے لیے بھی ولی مقرر کیا جاتا تھا۔ بچوں کو سن بلوغ کو پہنچنے پر جوان سمجھا جاتا تھا لیکن رومن لاء کے ایک طویل ارتقا کے بعد ان اشخاص کے لیے جو بالغ تو ہو چکے ہوں لیکن جن کی عمر پچیس سال سے کم تھی محافظ (Curator) مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ تقرر عام طور پر مجسٹریٹ کرتے تھے۔

ولفریڈو پریٹو (Vilfredo Pareto, 1848-1923) : ولفریڈو پریٹو مشہور اطالوی مفکر ہے جو پیرس میں پیدا ہوا۔ معاشیات اور سماجیات دونوں علوم میں پریٹو کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ٹالکاٹ پارسنس کی رائے میں درکھائم اور میکس ویبر کے بعد پریٹو اپنے زمانہ کا سب سے بڑے سماجیات داں گزرے ہیں۔ پریٹو کی بہت سی تخلیقات ریاضیاتی معاشیات پر مشتمل ہیں۔ اور آج بھی اس کے نظریات اور فارمولوں کے موئد اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں موجود ہیں۔ بحیثیت سماجیات داں بھی پریٹو کی تخلیقات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ سوئٹزرلینڈ میں گزارا جہاں انھوں نے اپنا تمام وقت تحقیق اور تصنیف میں صرف کیا۔

پریٹو نے سماجی عمل کی جس طرح توضیح کی ہے اس میں میکس ویبر کی فکر کا عکس نظر آتا ہے گوکہ دونوں آزادانہ طور سے اپنی اپنی تخلیقات میں مصروف تھے۔ پریٹو نے سماج کو ایک نظام بتایا اور اس کی پیچیدگی کے تجزیہ پر زور دیا۔ اور انسانی برتاؤ کے منطقی اور غیر منطقی طریق

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کے محرکات کو واضح کرنے کی کوشش کی جن بے شمار تصورات اور اصطلاحات پر پریٹو نے کام کیا۔ ان میں ایک اہم کام خواص یا مآثرین (Elite) کا تجزیہ ہے۔ پریٹو کا خیال تھا کہ ہر سماج میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو غیر معمولی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کی بناء پر دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ یہی وہ بااثر طبقہ یا خواص کا طبقہ ہوتا ہے جو سماج پر حکمرانی کرتا ہے۔ ہر دور میں خواص یا مآثرین کے طبقے جدا جدا اشکال میں ملتے ہیں۔ کہیں یہ جاگیرداروں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ کہیں امرا کی شکل میں، اور آج سیاستدانوں، دانشوروں، پروفیسروں وغیرہ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ پریٹو نے "مدوری گردشِ خواص" (Circulation of Elites) کا نظریہ بھی پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی سماج میں خواص کا کوئی مستقل یا موروثی گروہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ جیسے جیسے حالات بدلتے رہتے ہیں نئے اور طاقتور گروہ یا افراد پرانے گروہ یا افراد کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ لیکن بہرحال خواص کا گروہ ہی وہ گروہ ہوتا ہے جو سماج پر قابو رکھ سکتا ہے۔ یا اس پر حکومت کرسکتا ہے۔ پریٹو کے اس نظریہ کو اٹلی کی اس زمانہ کی حکومت نے اپنے فاشسٹ نظریہ کی حمایت کے طور پر استعمال کیا۔ چنانچہ آخری زمانہ میں خود پریٹو بھی اٹلی کی فاشسٹ حکومت کی سینیٹ کا ایک ممبر ہوگئے تھے۔ لیکن ان سیاسی اور نظریاتی امور سے قطع نظر پریٹو کی سماجیاتی تحقیقات کی اہمیت کو بمشکل ہی نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

ان کی زندگی عجیب و غریب حالات میں گزری انھوں نے انجینئر بننے کی کوشش کرتے ہوئے ریاضی میں تعلیم حاصل کی اور اطالوی ریلوے میں انجینئر ہوگئے۔

نوکری کرتے ہوئے وہ مقالے بھی لکھتے رہے لیکن سیاسی دباؤ کے سبب ان کو لکھنے کی اکثر اجازت نہ ملتی لیکن کچھ سال بعد انھیں کافی دولت وراثت میں ملی اور انھوں نے انجینئر کی نوکری چھوڑ کر لوشین یونیورسٹی میں پروفیسر کی نوکری کرلی۔ 1900 میں انھوں نے بیماری کی وجہ سے وہ نوکری بھی چھوڑ دی۔ چار سال بعد انھوں نے معاشیات کے بدلے سماجیات کو اپنا موضوع بنایا۔

ان کے لکھے گئے مقالات میں ان کے مندرجہ ذیل نظریات ملتے ہیں۔

(1) سائنٹفک سماجیات کا نظریہ۔

(2) سماج کا تصور۔

(3) منطقی اور غیر منطقی عمل کا تصور۔

(4) سماج کے خدوخال ابھارنے والے محرکات کا تصور۔

(5) انسانی برتاؤ کے گہرے اور سطحی پہلوؤں کا تصور۔

(6) خواص کے طبقے میں اتار چڑھاؤ کا تصور۔

(7) سماج کی تبدیلی کا مدوری تصور۔

انھوں نے کسی حد مارکس کے نظریات کو چیلنج کیا تاہم کسی خاص مکتب فکر سے وابستہ ہوئے بغیر انھوں نے کافی حد تک سائنٹفک انداز میں سماجی نظام کا تجزیہ کیا جو کے کئی اور مکاتب فکر کا محرک بنا۔

ولیم فیلڈنگ آگبرن (William Fielding Ogburn, 1886-1959)

ولیم فیلڈنگ آگبرن مشہور امریکی سماجیات داں رہا ہے۔ ابتدا میں اس نے معاشیات، تاریخ، سیاسیات اور سماجیات پر لکچر دیے۔ اور بعد میں زندگی کا بڑا حصہ اس نے سماجیات کے پروفیسر کی حیثیت سے گزارا۔ چونکہ تمام اہم سماجی علوم سے اس کا تعلق تھا اس لیے بین علمی مطالعہ پر اس صدی کے تیسرے دہے میں آگبرن نے بہت زور دیا۔ گوکہ بین علمی مطالعہ کو عام مقبولیت دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ حاصل ہوئی۔ آگبرن اور فرانزبو باوس سے پہلے سماجی ارتقا کو حیاتیاتی اصولوں سے منسلک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن باوس نے اپنی انسانیاتی تحقیقات میں بتایا کہ گذشتہ کئی ہزار برس سے انسان کی جسمانی خصوصیات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جب کہ اس زمانہ میں تمدنی نشیب و فراز کے بہت سے مراحل طے ہوئے۔ اس اندازِ فکر کی روشنی میں آگبرن نے سماجی تبدیلی اور تمدنی تغیرات کے علاحدہ مطالعہ پر زور دیا۔ یہ وہ پہلا مفکر ہے جس نے سماجی تبدیلی پر 1922 میں سب سے پہلی مکمل کتاب لکھی۔ آگبرن سماجی حقیقتوں کے عددی اور مقداری مطالعہ پر بھی زیادہ زور دیتا ہے۔ چنانچہ سماجیاتی طریق تحقیق میں مقداری پیمائش کو آگبرن کے زمانہ سے بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ آگبرن کا سماجیاتی تحقیقات کا مرکز بحث سماجی تبدیلی رہا ہے۔ اس صدی کے دوسرے دہے میں شروع ہونے والے سماجیات دانوں کی صف اول میں آگبرن کا شمار کیا جاتا ہے۔ جس نے بعد کے سماجیات دانوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

آگبرن کا تذکرہ نیم کاف کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگا دونوں نے مل کر کئی مقالات لکھے۔ ناہموار تمدنی تبدیلی یا تمدنی پچھڑاؤ کا تصور ان کا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ایک خاص نظریہ تھا۔ یہ سماجی پچھڑاؤ (Cultural Lag) انھوں نے مادّی اور غیر مادّی تمدن میں کھوج نکالا۔ ان کا خیال تھا کہ مادی تمدن مثلاً تکنیکی وسائل بہ آسانی بدلے جاسکتے ہیں۔ جبکہ غیرمادی تمدن مثلاً فلسفہ اخلاقیات اور مذہب وغیرہ اتنی آسانی سے نہیں بدل سکتے ہیں۔ بیل گاڑی کے بدلے آمدو رفت کے لیے کار کا استعمال بہت آسانی سے ممکن ہو گیا ہے جبکہ نظربد سے ڈرنے کے لیے کار کے پیچھے جوتے لٹکانا اسی طرح جاری رہا۔ لڑکیوں کا جینس پہننا سماج نے اپنا لیا لیکن پاک بازی اور پاک دامنی کے تصورات ویسے ہی صرف عورتوں کے لیے مخصوص رہے۔

اس کے علاوہ بھی آگبرن اور نیم کاف نے کئی نظریات پیش کیے ہیں اور سماجیات کے خدوخال ابھارنے میں ان کا رول اہم رہا ہے۔

ووڈرو ولسن (Woodrow Wilson) پبلک نظم و نسق: امریکا کے ماہرین حکومت نے ابتدا ہی سے سیاست کے مسائل اور انتظامی امور کے درمیان ایک حد قائم کی۔ ووڈرو ولسن کا اس سلسلہ میں بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ اس نے 1880 میں سیاست اور نظم و نسق کے درمیان ایک واضح خط فاصل قایم کیا۔ صدر بننے سے پہلے ووڈرو ولسن شعبہ تدریس سے متعلق تھے اور وہ یونیورسٹی پریسیڈنٹ بھی چنے گئے تھے۔ اس وجہ سے ان کا حکومت اور پبلک نظم و نسق سے کافی گہرا تعلق تھا۔ ووڈرو ولسن نے جو مضامین لکھے ان میں بتایا کہ پبلک نظم و نسق قانون کو عملی جامہ پہنانے کا نام ہے۔ اس لیے کسی بھی قانون کا کسی معاملے پر اطلاق کرنا پبلک نظم و نسق کی تعریف میں آتا ہے۔ محصول کا تعین اور حصول، جرم و سزا کا سلسلہ، فوج میں بھرتی، ڈاک و تار کی تقسیم کا انتظام، ایسے تمام امور کو پبلک نظم و نسق کہا جاسکتا ہے۔ مگر وہ قانون جن کے تحت ان امور کی تکمیل کرنی ہوتی ہے اسے پبلک نظم و نسق نہیں کہا جا سکتا۔ حکومت کی عام پالیسی اور منصوبہ بندی پبلک نظم و نسق نہیں ہے لیکن حکومت کی پالیسی اور منصوبہ بندی پر عمل آوری پبلک نظم و نسق ہے۔ غرض پبلک نظم و نسق کو حکومت کے کسی ایک شعبے سے نہیں جوڑا جا سکتا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی حد فاصل قایم کی جا سکتی ہے۔ ووڈرو ولسن کے مطابق حکومت کی پالیسی اور نظم و نسق علاحدہ علاحدہ امور ہیں بلکہ سیاست اور نظم و نسق بھی الگ الگ سلسلے ہیں۔ ووڈرو ولسن بعد میں امریکا کے صدر بنے تو اس وقت بھی ان کی رائے یہی تھی کہ ایک ایسا عہدہ جس کی نوعیت سیاسی ہو اور دوسرا وہ عہدہ جس کی نوعیت سیاسی نہ ہو، ان کے درمیان ایک امتیازی حد مقرر کی جانی چاہیے، کیونکہ یہ امتیازی حد بندی ہی ذمہ داریوں کی شناخت ہوتی ہے۔

وی.پی. ولنگ بای (V.P. Willonghby) پبلک نظم و نسق: یہ شخص ایک امریکی سیاست داں تھا جس نے پبلک نظم و نسق کو ایک بالکل الگ معیار دیا۔ اس نے پبلک نظم و نسق کو نہ صرف سیاست سے الگ رکھنے کی سفارش کی بلکہ اس کی نظر میں نظم و نسق پارلیمنٹ کا عدلیہ اور ایکزیکٹو کی طرح حکومت کا اٹوٹ حصہ ہوتا ہے۔ یہ خیال اگرچہ امریکا کے دستور پر پورا نہیں اترتا لیکن ووڈرو ولسن کا جو نظریہ سیاست اور نظم و نسق کو الگ الگ رکھنے کا تھا، اس کو مضبوط اور قوی بناتا ہے۔ پبلک نظم و نسق کی اصطلاح کو وسیع تر مفہوم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی حکومت کی پوری مشنری جو بلا لحاظ محکمہ اور شعبہ مجموعی حیثیت سے کام کرے، اسے پبلک نظم و نسق کہا جا سکتا ہے۔ اسی سیاست داں کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ حکومت کے نظم و نسق کی حقیقی ذمہ دار مجلس قانون ساز ہوتی ہے نا کہ ایکزیکٹو جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔

وید (Veda): آریوں کے زمانے میں وید رائج تھے۔ مورخین کا خیال ہے کہ ویدوں کا زمانہ (1500-1200) ق م کا ہے۔ وید قدیم ترین قدس اشلوک پر مشتمل ہیں۔ ان میں قربانی اور خاندانی دیوتاؤں کا تصور پیش کیا گیا ہے جنھیں مختلف مظاہر قدرت سے منسوب کیا گیا ہے جیسے پانی آگ وغیرہ۔ رگ وید میں یہ انتساب درج ہے "ان دیکھنے والوں کے نام جو ہمارے آباو اجداد تھے اور ہم سے پہلے راستہ ڈھونڈنے والے تھے۔ ہندو لاء کے ارتقا کے تین دور قایم کیے جاسکتے ہیں۔ پہلا ویدوں کا دور اس دور کو ماقبل سوترا دور کہا جاسکتا ہے۔ دوسرا دھرم شاستر کا اس دور کے دو ذیلی دور ہو سکتے ہیں سوترا دور سمرتی دور تیسرا دور مابعد سمرتی دور ہو سکتا ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہ

ہاؤزنگ بورڈ (Housing Board): کسی ملک کے نظم و نسق کے لیے مختلف مسائل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ رہائش کا ہوتا ہے۔ آج کل شہروں میں خصوصاً اور دیہی علاقوں میں عموماً مکانوں کی قلت ہے۔ اس کے لیے مختلف ممالک میں عملی اقدامات کیے گئے ہیں اور ضروری قانون سازی بھی کی گئی ہے۔ ایک قانون کے ذریعہ ہاؤزنگ بورڈ قائم کیا جاتا ہے جو نامزد کردہ اشخاص پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس بورڈ کو حکومت بطور گرانٹ ضروری رقم فراہم کرتی ہے تاکہ مختلف مقامات پر مکانات یعنی رہائشی یونٹوں کی تعمیر کی جا سکے۔ ہاؤزنگ بورڈ کی قانونی حیثیت ایک مجلس مقامی کی ہوتی ہے۔ اسے حکومت کی منظوری سے قرض لینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر ہاؤزنگ بورڈ لائف انشورنس کارپوریشن اور ہڈکو (Housing Urban Development Corporation) سے قرض لیتا ہے۔ اب ایک نیا بینک HDFC یعنی ہاؤسنگ ڈیولپمنٹ فینانس کارپوریشن بھی قائم ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ تعمیر مکانات میں مدد کے لیے اور کئی مالیاتی ادارے سرکار نے قایم کیے ہیں۔ یہ سب ادارے مختلف ہاؤزنگ بورڈ، میونسپل کارپوریشن اور اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو تعمیری مکانات کے منصوبوں کے لیے مناسب سود پر حکومت کی گارنٹی پر قرض دیتے ہیں۔ قرض دیتے وقت تعمیر منصوبے کی جانچ کی جاتی ہے۔ آج کل جو مکانات ہاؤزنگ بورڈ یا ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی جانب سے تعمیر کیے جاتے ہیں وہ نقد ادائگی کے ساتھ ہائر پرچیز اسکیم (Hire Purchase Scheme) کے تحت بھی ہوتے ہیں یعنی جسے بھی مکان الاٹ کیا جاتا ہے وہ اقساط میں مکان کی قیمت ادا کر کے مکان کا مالک بن جاتا ہے۔ شہر میں دیہی آبادی جس تیزی سے منتقل ہو رہی ہے اس کے پیش نظر رہائش کا مسئلہ نہایت اہم اور پبلک نظم و نسق کے لیے خاص توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ اس وجہ سے ہی شہروں اور ریاستوں میں ڈیولپمنٹ اتھارٹیاں قائم کی جاتی ہیں جن کا کام نہ صرف شہری مسائل حل کرنے اور شہری ترقی سے متعلق ہوتا ہے بلکہ وہ رہائشی منصوبہ بندی کرنے اور منصوبہ کی تکمیل کی بھی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ دہلی میں یہ کام دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی (DDA) کرتی ہے۔

ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) (House of Commons): برطانیہ کا ہاؤس آف کامنس دنیا کی اہم ترین پبلک میٹنگ ہے۔ دارالعوام کی قدامت اس کی انتہائی ہمت افزا تاریخ اس کی بہترین روایات، اس کا زوال، توانائی اور لاجواب طریقہ کار اور پارلیمنٹ سسٹم کے طریقہ حکمرانی پر اس کا عدیم المثال اثر اور انگریز قوم سے اس کی جدا نہ ہونے والی ہم آہنگی اپنی آپ خود مثال ہیں۔ ہاؤس آف کامنس قانون سازی کا اگر قدیم ترین ادارہ نہیں تو اہم ترین ضروری ہے کیونکہ برطانوی ہاؤس آف کامنس نے حقیقی طور پر پارلیمنٹری سسٹم کے طریقہ حکمرانی میں اہم ترین حصہ لیا ہے۔

ہربارٹ، جوہان فریڈرک (Herbert, Johann Friedrich, 1722-1891): مشہور جرمن ماہر تعلیم و فلسفی ہربارٹ یورپ کے مشہور فلسفیوں لیبنز، کانٹ اور فشٹے سے بہت متاثر رہا اور علم نفسیات میں اس کا کام کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے انیسویں صدی میں حقیقت پسندی میں از سر نو دلچسپی پیدا کی۔ جدید سائنٹفک تعلیم کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے سقراط سے پہلے کی حقیقت پسندی کے فلسفہ کو ایک نئی سطح پر پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے تعلیم کے عمل کی توضیح اس طرح کی کہ:

> "یہ خیالات کو عمل کے ڈھانچے میں منتقل کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور نیکی کے بارے میں اس نے بتلایا کہ یہ انسانی ارتقا کا ایک جمالیاتی پہلو ہے۔ اخلاقیات

کی سائنس کو ترقی دینے میں اس کا غیر معمولی حصہ ہے۔"

1805 میں وہ گاٹیجن (Gothengen) میں پڑھاتا تھا اور 1809 سے 1833 تک وہ کونگسبرگ (Konigsberg) میں فلسفہ کا پروفیسر رہا۔ اس کے بعد وہ گاٹیجن واپس آیا اور فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس کی فلسفہ اور نفسیات پر تصنیفات انتہائی مبسوط خیال کی جاتی ہیں۔

تعلیم پر اس کے خیالات 19 ویں صدی میں بے حد مقبول تھے اور یورپ اور خاص طور پر امریکا کے طریقہ تعلیم پر اس کا کافی اثر تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام سوئٹزرلینڈ میں گزارے تھے۔ وہاں وہ مشہور ماہر تعلیم پستالوزی سے ملا۔ اس کے خیالات سے کافی متاثر ہوا اور انھیں سائنٹفک بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ ہربارٹ نے اپنے طریقہ تعلیم کی پانچ منزلیں قایم کی تھیں۔

(1) تیاری : بچے کو نئی معلومات دیتے وقت اس کا سلسلہ پچھلے سبق اور پچھلی معلومات سے قایم رکھنا چاہیے تاکہ بچے کی دلچسپی اپنے سبق سے برابر قایم رہے۔

(2) پیش کشی: نئی معلومات پیش کرتے وقت انھیں تجربات اور ٹھوس حقائق سے جوڑنا چاہیے۔

(3) تعلق پیدا کرنا: نئی معلومات پیش کرتے وقت ان کا مقابلہ پرانی معلومات سے کرنا چاہیے۔ دونوں کی مشترک اور متضاد چیزوں کو واضح کرنا چاہیے تاکہ نئے خیالات اچھی طرح گھر کر سکیں۔

(4) تعیم کرنا : یعنی مختلف مثالوں کی بنیاد پر کلیہ قایم کرنا یا تحریر کے ذریعہ عام تصور قایم کرنا۔ یہ طریقہ زیادہ عمر کے لڑکوں کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس کی مدد سے دماغ دیکھی اور سُنی چیزوں سے آگے سوچ سکتا ہے۔

(5) علم کا استعمال (اطلاق) : یعنی جو علم حاصل ہو اسے اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ طالب علم کے سوچنے اور عمل کا جز بن جائے اور اس کی مدد سے صحیح تصویر قایم کر سکے۔

شروع میں ہربارٹ کے نظریے بے حد مقبول ہوئے لیکن بعد میں جب دوسرے اور نظریے اور خاص طور پر ڈیوی کے نظریے سامنے آئے تو پھر یہ بات نہ رہی۔

ہربرٹ اسپنسر(Herbert Spencer, 1820-1903):
ہربرٹ اسپنسر مشہور انگریز فلسفی سائنس داں گزرا ہے جس نے انیسویں صدی کے ذہنی انقلاب میں نمایاں حصہ لیا۔ اسپنسر کا شمار ان ابتدائی مفکرین میں کیا جاتا ہے جن کا ایقان تھا کہ انسانی سماج کا ارتقائی نقطہ نظر سے سائنسی مطالعہ ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹائیلر (Tylor) اور مورگن (Morgan) کے ساتھ اسپنسر کا نام اولین تمدنی ارتقائی موئدین میں لیا جاتا ہے۔ اس کی مشہور کتاب اصول سماجیات ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف میں اسپنسر نے مختلف سماجوں کے مطالعہ کے بعد سماجیات کے اصول وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگست کامٹے (Comte) کے بعد اسپنسر کی تصانیف کو سماجیات میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ چونکہ اسپنسر انیسویں صدی کے ارتقائی مفکرین بالخصوص ڈاروِن سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس لیے اسپنسر نے بھی سماج کے ارتقائی نظریہ کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ سماجیات پر اس کی دوسری کتابیں بیانی سماجیات اور مطالعہ سماجیات ہیں اپنے پیش کردہ سماج کے عضویاتی نظریہ میں اسپنسر نے انسانی سماج کو نباتاتی نشوونما کی مثال کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح ایک بیج سے بڑا درخت نشوونما پاتا ہے اسی طرح افراد کے آہنگ سے ایک پیچیدہ سماج ظہور میں آتا ہے۔ اور سماج کے مختلف ادارے درخت کے مختلف حصوں کی طرح آپسی ارتباط کے ذریعہ پورے سماج کی بقا اور نشوونما کا باعث بنتے ہیں۔ اسپنسر کی اس عضویاتی تمثیل پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں جو بڑی حد تک بجا ہیں۔ لیکن ان اعتراضات سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسپنسر نے سماج کے مختلف اجزاء کے تجرباتی مطالعہ کی ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس اعتبار سے سماجیات کی ترقی میں اس کا زبردست حصہ رہا ہے۔ اسپنسر نے سماج، تقسیم کار اور صنعتی ترقی کے موضوعات پر بحثیں کیں۔

عمل اور منفی عمل (Function and Dysfunction) کے سلسلے میں بھی اسپنسر نے اہم اور دلچسپ وضاحتیں کی ہیں۔ انیسویں صدی میں سماجیات کے ارتقا میں اسپنسر کو اہم مقام حاصل رہا۔

ہڑتال (Strike) : اگر مزدوروں نے ہڑتال کی ہو یا کسی صنعتی یا کاروباری ادارے نے لاک آؤٹ کیا ہو تو ہڑتال یا لاک آؤٹ غیر قانونی ہوجائے گا۔ اگر ایسی ہڑتال یا لاک آؤٹ فریق مقابل کو اس نوٹس کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

دیے بغیر کیا جائے جو قانوناً دیا جانا ضروری ہے۔ اگر خلاف قانون ہڑتال کی گئی ہو تو قانون میں اس کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

ہڑتال اور لاک آؤٹ (Strike and Lockout):
دفعہ نمبر 22 قانون صنعتی نزاع 1947 کے تحت کسی ایسے صنعتی ادارے کے مزدوروں کی ہڑتال یا اس کے انتظامیہ کی طرف سے اس صنعتی ادارے کا لاک آؤٹ جس کا تعلق افادیت عامہ سے ہو غیر قانونی ہوگا۔ اگر ہڑتال کا نوٹس انتظامیہ کو یا لاک آؤٹ کی صورت میں انتظامیہ کی جانب سے مزدوروں کو نوٹس نہ دیا گیا ہو اور ہڑتال یا لاک آؤٹ ایسے نوٹس دینے کی تاریخ سے چودہ دن گزرنے سے قبل کی جائے۔

اگر کوئی صنعتی نزاع کسی ثالث کے سامنے زیر تصفیہ ہو یا جس نزاع کے متعلق مصالحتی کارروائی زیر دوران ہو تو اس صنعتی نزاع کے سلسلے میں مزدوروں کی جانب سے ہڑتال یا انتظامیہ کی طرف سے لاک آؤٹ غیر قانونی ہوگا۔

اس امر کے متعلق کوئی ہڑتال یا لاک آؤٹ قانونی ہے یا نہیں مختلف عدالتی فیصلہ جات میں اور یہ فیصلہ جات ان واقعات کی روشنی میں کیے گئے ہیں جس کے تحت کوئی ہڑتال یا لاک آؤٹ وقوع ہوئے ہوں۔ اگر کوئی ہڑتال یا لاک آؤٹ اس بنا پر کی گئی ہے کہ تنخواہ وقت پر نہیں دی گئی تو ایسی ہڑتال کو غیر قانونی نہیں کہا جائے گا۔ اگر کسی مزدور نے ایک مدت تک کام کیا ہے تو اس مدت کی اجرت یا تنخواہ کو روکا نہیں جاسکتا۔ اگر اس اجرت کے سلسلے میں ہڑتال کی گئی ہے تو اسے غیر قانونی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مقدمہ ایم ایس بی وی رائے بنام رائے فارسٹ لیبر یونین رائے اے آئی آر 1965 ۔

اگر خلاف قانون ہڑتال کی گئی ہو تو قانون میں اس کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ کسی ہڑتالی کو مالی مدد دینا بھی قانونی طور پر جرم قرار دیا گیا ہے۔

شرائط ملازمت قانون صنعتی نزاع 1947 کے تحت کسی مزدور کی شرائط ملازمت میں آجر کی طرف سے کوئی تبدیلی نہ کی جاسکے گی تاوقتیکہ ان تبدیلیوں کے بارے میں مزدور کو کوئی نوٹس یا اطلاع نہ دی گئی ہو اور ایسا نوٹس دینے کے بعد اکیس دن نہ گزر گئے ہوں۔ ایسے نوٹس کی البتہ ضرورت نہ ہوگی اگر شرائط ملازمت کی تبدیلی کسی مصالحت یا ثالثی یا لیبر کورٹ کے ایوارڈ کی تعمیل میں کی جاری ہو۔

ہم جنسی (Homosexuality): مشرق وسطیٰ اور مغربی ممالک میں ہم جنسی زمانہ قدیم سے ہی موجود رہی ہے لیکن ہندستان میں اس کا رواج کم تھا جس معاشرے میں مباشرت کے چونسٹھ طریقے سمجھائے گئے ہیں اور ان کو ایک فن کا درجہ دیا گیا وہاں عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے قریب آنے کے موقعے ملتے رہے۔ واتسائن کے لکھے ہوئے کام شاستر میں ہم جنسی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن زیادہ یا کم کسی نہ کسی حد تک یہ تقریباً ہر سماج میں موجود رہی ہے۔ حال میں شائع ہونے والی انٹرنیشنل پہچان بنانے والی کتاب 'چھوٹی چھوٹی چیزوں کے خدا' (ارن دھتی رائے) میں طفل بازی کا طویل تذکرہ ہے۔

ایک ہی جنس کے دو افراد، ایک دوسرے کے جنسی اعضا سے چھیڑ چھاڑ کرکے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ فعل عورت اور مرد دونوں ہی کرتے ہیں اور اپنے اپنے طور پر اس کا لطف اٹھاتے ہیں۔ مردوں میں یہ فعل تقریباً مکمل مباشرت کی شکل رکھتا ہے۔ عورتوں میں یہ جسمانی قربت، جلق اور جنسی اعضا سے چھیڑ چھاڑ تک ہی محدود رہتا ہے۔ کچھ لوگ جو ہم جنسی رجحانات رکھتے ہیں ہم جنسی کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور مخالف جنس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے جبکہ کچھ لوگ دونوں رجحانات رکھتے ہیں اور ان کو Bisexual کہا جاتا ہے۔ طفل بازی اور ہم جنسیت کو ایک ہی چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بہکا کر ان کو مفعول نسوانی کردار ادا کرنے پر مجبور کرنا الگ بات ہے اور دو ہم جنس افراد کا باہمی رضامندی سے جنسی قربت اختیار کرنا الگ چیز ہے۔ آخرالذکر میں کسی کے بھی طفل نازک ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تعلقات دوستی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور کافی عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ ہندستان کی قدیم کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں ہے لیکن اور تمام پرانی کتابوں یہاں تک کہ قرآن مجید میں بھی ہم جنسیت کا تذکرہ ہے۔ یہاں ہم جنسی کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ ایک پیغمبر حضرت لوطؑ کا ذکر ہے جن کے لڑکوں پر تمام شہر فدا ہو گیا تھا لیکن ان کی بددعا کے باعث وہ شہر نیست و نابود ہوگیا۔ اسلام کی اس قدر بندش کے باوجود مسلم ممالک میں اس کا عام رواج ہے۔ مغربی ممالک میں آج یہ بحث ہے کہ یہ فعل فطری ہے یا غیر فطری۔ عموماً یہ جیلوں، ہوسٹلوں اور دیگر اقامتی اداروں میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب جنس مخالف سے تعلق

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نہیں ہوسکتا لیکن ایک نظریۂ فکر یہ بھی ہے کہ یہ بالکل فطری ہے اور کچھ لوگ پیدائشی ہم جنس ہوتے ہیں۔ مغربی ممالک میں ان کے کلب ہوتے ہیں۔ ان کی بے حد فعال تنظیمیں ہیں ان کا ادب ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شادیوں کو پوری طرح قانونی تحفظ مل چکا ہے۔ اپنے بیٹے کے پارٹنر کو داماد یا بیٹی کی ساتھی کو بہو کے کردار میں ان کا خاندان اور سماج قبول کرچکا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکا میں تقریباً 22 فیصد لوگ ہم جنس ہیں جن میں مرد و زن دونوں شامل ہیں۔

ہندستان میں بھی یہ رجحانات سر اٹھا رہے ہیں۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ سطح پر آرہے ہیں۔ انیسویں صدی کے لکھنؤ میں یہ عام رواج تھا۔ مخنث حضرات کا یہ استعمال عام تھا اور آج بھی ہے۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں محبوب کا تصور ایک نوجوان لڑکے کا ہی ہے۔ میؔر جیسے سنجیدہ شاعر نے بھی 'عطار کے لونڈے' کا ذکر کیا ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

سبزۂ خط سے یہ تیرا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

اس کا مفہوم ہے "اے نوجوان اگرچہ اب تیری داڑھی نمودار ہوچکی ہے مگر تیری زلفیں ابھی بھی اس طرح من موہنی ہیں، یہ سرکشی کرکے چہرے پر بکھر جاتی ہیں یہ سانپ کی طرح لہرا رہی ہیں اور ان کی دلکشی بدستور ہے۔ سبزۂ خط جو زہر مہرے کی طرح ہے ان کا توڑ نہیں کرسکا یعنی ان کی دل فریبی کم نہیں کرسکا۔ مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اے نوجواب تو لڑکپن میں بھی میرا محبوب تھا اور جوان ہوکر بھی میرا محبوب ہے۔ کیونکہ تو اتنا ہی دل پذیر آج بھی ہے۔"

اردو شاعری میں محبوب کے لیے عورت کا تصور ابتذال کی علامت تھا۔ اس لیے دوپٹے اور موباف کا ذکر دوسرے درجے کی ہی شاعری میں موجود ہے۔

آزادیٔ نسواں (Feminism) کی سترہویں دہائی کی کوششوں میں ہم جنسیت کا رجحان نمایاں ہے۔ Lesbian Feminist اور Non Lesbian Feminist کی اصطلاحیں بھی استعمال ہوتی رہیں۔ شیلا رتھ نام کی ایک مشہور فیمنسٹ نے لکھا ہے۔

"نسوانیت کی علم بردار (ہم جنس عورتیں) محبت، ہمدردی، خوبصورتی، طاقت، احساسات، عقل، وفاداری، سماج اور بہت سی دوسری چیزوں کو اہمیت دیتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ حیوانیت، بے معنی درد اور ظلم مختصراً مردوں کی عورتوں پر غیر متوازن فوقیت کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔"

یہ طبقہ شادی کو استحصال کی شروعات سمجھتا ہے۔ کیونکہ عورت اپنے میں ہی مکمل ہے۔ اور وہ ازدواجی زندگی کے تحت بغیر کسی وجہ کے غلامانہ زندگی گزارتی ہے۔ ان کے نزدیک شادی ایک غیر قدرتی بندھن ہے جو صرف معاشی اہمیت رکھتا ہے معاشرتی نہیں۔

سماجیات کا طالب علم ان سب نکتوں کو دوسرے انداز سے دیکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان چیزوں کا سماج کے ڈھانچے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ سماجی نظام اسے کیسے قبول کرتا ہے۔ خاص طور پر ہندی سماج پر ان تحریکات کی وجہ سے کس قسم کا ردعمل ہوتا ہے۔

آج ہم جنسوں نے کنبہ اور خاندان کی تعریف ہی بدل دی ہے کیونکہ ان کے بچے پیدا نہیں ہوتے۔ مغربی ممالک میں شادی ایک مذاق بن گئی ہے ہم جنسی پر مبنی شادیاں اسے اور بھی غیر ذمہ دارانہ شکل دے رہی ہیں۔ فی الحال ہندی سماج میں یہ سب ممکن نہیں ہے لیکن ایسے رجحانات پل رہے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایک فلم "فائر" بنی جس میں عورتوں کی ہم جنسی کا ذکر ہے۔ آج سے پچاس سال پہلے عصمت چغتائی نے 'لحاف' نامی افسانہ لکھا تھا۔ اس میں ہم جنس عورتوں کا ذکر ہے لیکن اس نصف صدی کے سفر میں ہندی سماج نے ہم جنسی کو جنسِ مخالف کی قربت میسر نہ آنے کی وجہ سے ہارے کے ہتھیار کے طور پر ہی استعمال کیا ہے۔ ادب اور فلم میں ہم جنسی کو فطری عمل کے طور پر نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کو غیر فطری حالات کی پیداوار ایک بیماری کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ کبھی کبھار اس کے برعکس صورت حال بھی سامنے آتی ہے۔ مثلاً شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح حیات میں اپنے ہم جنسی رویہ کا فخریہ ذکر کیا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ہندی سماج میں جنس مخالف کی کشش ابھی بھی مدھم نہیں ہوئی ہے۔ ایک بہت چھوٹے سے طبقے کو چھوڑ کر ابھی بھی ہم جنس پرست سماجی طور پر لعنت اور ملامت کا شکار ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر شادی کرکے گھر بساتے ہیں اور خفیہ طور پر اپنی ہم جنسیت کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ کھلے عام ہم جنسیت کا اعلان نہیں کرتے۔

گوا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکے غیر

ملکی مردوں کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں۔ پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ ان کے 'انکل' پیار کے بدلے بے شمار تحائف اور کیش دے جاتے ہیں اس طرح ہم جنسیت کی سرحدیں طوائفیت تک جالمتی ہیں۔

ہندستان میں کبھی کبھار ہم جنسوں کے جلسے اور جلوس دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم جنسیت ایک سماجی مسئلہ ہے یا نہیں؟ یہ کہنا مشکل ہے لیکن اس سے پیدا ہونے والا احساس جرم اور احساس تنہائی ضرور ایک مسئلہ ہے۔ عام طور پر ہم جنسوں میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد عام لوگوں کی بہ نسبت دوگنی ہوتی ہے۔ یہ لوگ عموماً اپنے چھوٹے چھوٹے گروپوں میں رہتے ہیں اور عام معاشرہ میں اپنا مقام نہیں بنا پاتے۔

اس طرح ہم جنسیت دوسرے سماجی مسائل کو جنم دیتی ہے جن کا حتمی حل ابھی تک نہیں نکلا ہے۔

ہندستان — آئین (Indian Constitution) :

ہندستان کا موجودہ آئین سو سال سے زیادہ مدت کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد ہندستان کے جمہوری آئین کے لیے جد وجہد جنگ آزادی کا ایک حصہ رہی ہے۔ پندرہویں صدی کے آخری حصہ میں انگلستان کے تاجروں نے مشرقی ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی نامی ایک کمپنی قائم کی تھی جسے 1600 میں ملکہ ایلزبیتھ اول نے ایک شاہی چارٹر عطا کیا تھا اور اس کے اختیارات متعین کردیے تھے۔ کمپنی کے ممبروں کو کمیٹی کے نام سے جانا جاتا تھا جو بعدازاں کمپنی کے ڈائرکٹر کہلائے جانے لگے۔ ان ممبروں کی جماعت کو کورٹ آف ڈائریکٹرس کا نام دیا گیا تھا۔

ہندستان کے ساتھ تجارتی تعلقات کے سلسلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات میں کمی بیشی ہوتی رہی اور اسے مختلف اوقات میں مختلف چارٹر دیے جاتے رہے اور برطانوی پارلیمنٹ اسے مختلف قوانین کے تحت اختیارات سے مسلح کرتی رہی۔ یہ سلسلہ 1857 تک جاری رہا۔ 1857 میں کمپنی کے خلاف بغاوت ہوگئی جو ہندستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئی کیونکہ کمپنی نے اپنی تاجرانہ سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہندستان کے مقامی حکمرانوں کے داخلی معاملات میں دخل اندازی شروع کردی تھی اور وہ حکمرانوں پر حکم چلانے لگی تھی۔ اس بغاوت کے بعد انگریزوں کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو قائم رکھنا ناممکن ہوگیا اس لیے 1858 میں ملکہ وکٹوریہ نے کمپنی کو ہندستان کے اقتدار سے محروم کرکے ہندستان کی حکمرانی کا بار خود اپنے ذمہ لے لیا اور برطانوی پارلیمنٹ نے 1858 کا قانون پاس کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ اس قانون نے ایک انڈین کونسل قائم کرکے ایک وزیر ہند کا تقرر کردیا جو انگلستان کی کابینہ کا رکن ہوتا تھا اور کونسل اسے مشورہ دیتی تھی۔

اس کے بعد 1861 میں برطانوی پارلیمنٹ نے انڈین کونسلس ایکٹ پاس کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ ہندستانیوں کو بھی ملکی معاملات میں شامل کیا جائے۔ اس ایکٹ کی روشنی میں ہندستانیوں کو قانون سازی کے عمل میں شریک کرنے کی سمت میں پیش رفت ہوئی۔ بعد ازاں 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے 1892 کا انڈین کونسلس ایکٹ منظور کرکے اصلاحات کی ایک اور قسط ہندستانیوں کو دے دی۔ اس کی رو سے ممبروں کے انتخاب پر عمل آوری ہوئی۔ مجلس قانون ساز کو وسعت دی گئی اور ممبروں کے اختیارات میں اضافہ ہوا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے مسلسل مطالبہ کرنے پر 1909 کا انڈین کونسلس ایکٹ پاس ہوا جسے منٹو مارلے اصلاحات بھی کہتے ہیں۔ اس ایکٹ کے تحت ہندستانیوں کو نہ صرف یہ کہ قانون سازی کے عمل میں شامل کیا گیا بلکہ انھیں ملک کے انتظامی امور میں بھی شریک کیا گیا۔ تاہم اس ایکٹ کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ اس نے فرقہ وارانہ طریقہ انتخاب کو رائج کرکے ہندستان کی تقسیم کا سنگ بنیاد رکھ دیا کیونکہ اس کی ایک شق کی رو سے مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ مسلمان نمائندوں ہی کو منتخب کریں۔ اس ایکٹ سے مایوس ہوکر ہندستانیوں نے نئی اصلاحات کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اس کے نتیجے میں برطانوی پارلیمنٹ نے پہلی مرتبہ 1919 کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ اس ایکٹ کو مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے تحت وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل میں تبدیلیاں کی گئیں، مرکزی مقننہ کو دو ایوانوں پر مشتمل کیا گیا جنھیں لیجسلیٹیو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کا نام دیا گیا۔ صوبہ جات میں دو عملی حکومت قائم کی گئی۔ لیکن اس ایکٹ نے نہ تو مرکزی عاملہ کو ایک نمائندہ ادارہ بنایا اور نہ ہی اسے مرکزی مقننہ کے تئیں جواب دہ ٹھہرایا۔ اس طرح اس نے جداگانہ طریقہ انتخاب کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے دوسرے فرقوں کے لیے بھی وسعت دی۔

ان تمام خامیوں کے باوجود 1919 کا ایکٹ ایک انقلابی قدم تھا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

جس نے خودمختار حکومت کے قیام کی سمت میں پہل کی اور پہلی بار ہندستانی ممبران مجلس قانون ساز کو انتظامی امور میں شریک ہونے کے لیے راہ ہموار کی۔ دوہری حکومت کے تحت صوبے کے انتظامیہ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ کچھ محکموں کو گورنر کے اختیار میں دے دیا گیا جن کا انتظام اس کی کونسل کے ممبروں کے ذمہ تھا اور کچھ محکموں کو ہندستانی ممبروں کے ذمہ کردیا گیا۔ اس عمل نے تقریباً سولہ سال تک نوصوبہ جات میں خود مختار اور جواب دہ حکومت کے قیام کے سلسلہ میں ہندستانیوں کی تربیت کی۔

اس ایکٹ میں ایک شق یہ بھی تھی کہ اس کے نفاذ کے دس برس بعد ایک کمیشن کا تقرر عمل میں آئے گا جو ہندستان پہنچ کر اس دستور کی کارکردگی کا جائزہ لے گا۔ لیکن دس برس گزرنے سے پہلے ہی انگلستان کی کنزرویٹیو حکومت نے 1927 میں اس کمیشن کا تقرر کردیا جس کے ساتوں ممبر انگریز تھے اسی لیے اسے All white Commission کہا جاتا ہے۔ اس کے سربراہ سر جان سائمن تھے۔ چونکہ اس میں کوئی ہندستانی ممبر نہیں تھا اس لیے ہندستان کے رہنماؤں اور عوام نے اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا لہٰذا جب سائمن کمیشن نے ہندستان کا دورہ کیا تو اسے ہر جگہ سیاہ جھنڈیوں اور عوام کے غصہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ برطانوی حکومت کو پیش کردی اور اس رپورٹ پر لندن میں یکے بعد دیگرے تین گول میز کانفرنسوں نے غور وخوض کیا۔ ان کانفرنسوں میں سے پہلی کانفرنس 1930، دوسری کانفرنس 1931 اور تیسری کانفرنس 1932 میں منعقد ہوئی۔ پہلی کانفرنس میں کانگریس شریک نہیں ہوئی کیونکہ اس کے تمام رہنما جیلوں میں محبوس تھے۔ البتہ جب 1931 میں ان کی رہائی عمل میں آئی اور گاندھی اروِن ملاقات کے نتیجے میں گاندھی اروِن پیکٹ پر دستخط ہوگئے تو کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے گاندھی جی نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی کیونکہ اس معاہدہ کی رو سے گاندھی جی نے اس کانفرنس میں شریک ہونا منظور کر لیا تھا۔ لیکن ان کانفرنسوں میں بھی فرقہ وارانہ مسئلہ طے نہیں ہوسکا اور وزیراعظم برطانیہ نے خود اپنے میکڈانالڈ ایوارڈ کا اعلان کردیا۔ اس کے خلاف گاندھی جی نے برت رکھا تو پونا پیکٹ کے تحت ہریجنوں کے مسئلے پر حکومت سے سمجھوتہ ہوگیا۔

1935 میں برطانوی پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کردیا۔ اس کے تحت صوبجات کو خودمختاری دی گئی، مرکز میں وفاق کے قیام کی کوشش کی گئی، مقننہ کی توسیع کی گئی اور حق رائے دہی میں اضافہ کیا گیا۔ وفاقی عدلیہ کا قیام عمل میں آیا، انڈیا کونسل کو ختم کردیا گیا، فرقہ وارانہ طریقہ انتخابات کو وسعت دی گئی اور صوبائی ممبروں کے اختیارات کو وسیع کیا گیا۔

کانگریس نے اس ایکٹ کے تحت پہلی مرتبہ انتخابات میں حصہ لے کر سات صوبجات میں اکثریت حاصل کرکے حکومت سازی کی۔ اپنی وزارت کے دوران کانگریسی وزیروں نے عوام کے تئیں بڑی اہم خدمات انجام دیں لیکن کانگریسی وزارتوں کو 1939 میں برطانوی حکومت کے اس فیصلہ کے خلاف احتجاجاً مستعفی ہوجانا پڑا کہ اس نے ہندستانی رہنماؤں کو اعتماد میں لیے بغیر ہندستان کو بھی دوسری عالم گیر جنگ میں جھونک دیا تھا۔ گاندھی جی نے اس موقعہ پر جنگ کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ کی شروعات کی۔ جب جنگ تیز ہوئی اور جاپان نے جنوب مشرقی ایشیا کی جانب کوچ کیا تو برطانیہ نے جنگ میں ہندستان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور حکومت نے اپنے ایک وزیر سراسٹیفورڈ کرپس کو مذاکرت کے لیے ہندستان بھیجا۔ سر کرپس نے ہندستان کے لیے ڈوی نین کا درجہ دینے کی پیش کش کی اور آئندہ آئینی حل کے لیے منصوبہ پیش کیا لیکن یہ تمام باتیں جنگ کے بعد ہی ممکن تھیں۔ ان وجوہات کی بنا پر کرپس کی تجاویز کو ہندستان کے رہنماؤں نے نامنظور کردیا۔

بعد ازاں برطانیہ پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے کانگریس نے اپنے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں "ہندستان چھوڑو" تحریک سے متعلق قرارداد 8ر اگست 1942 کو بمبئی میں منظور کی اور گاندھی جی نے "کرو یا مرو" کا نعرہ دیا۔ نتیجتاً کانگریس کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کرکے مختلف جیلوں میں بند کر دیا گیا جہاں سے ان کی رہائی 1945 میں ہی ممکن ہوئی۔ اس کے بعد ہندستان کے لوگوں کے لیے آزادی نہیں بلکہ انتقال اقتدار کا سوال تھا۔ اسی اثنا میں 1940 میں مسلم لیگ نے دو قومی نظریے کے تحت ہندستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ اور جب کانگریسی رہنما جیلوں میں بند تھے تو اس نے حکومت کا تعاون حاصل کرکے اپنے مطالبہ کے لیے حمایت حاصل کرلی۔ اس کے بعد شملہ کانفرنس 1945 میں ناکام ہوگئی اور جنگ کے خاتمہ کے بعد انگلستان میں لیبر پارٹی برسراقتدار آگئی۔ اس نے اپنے انتخابی منشور میں اعلان کیا تھا کہ اگر وہ برسر اقتدار آئی تو ہندستان کے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

مسئلہ کو حل کردے گی۔ لہٰذا اس نے ایک پارلیمانی وفد کو ہندستان بھیجا تاکہ وہ ہندستان کی صورت حالات کا جائزہ لے اور پھر مارچ 1946 میں ایک کابینی مشن ہندستان بھیجا۔ اس مشن نے ہندستانی رہنماؤں سے مذاکرات کیے اور ایک منصوبہ پیش کیا جسے کیبنٹ مشن پلان کا نام دیا جاتا ہے لیکن اس منصوبہ کے ہندستانی رہنماؤں کے ذریعہ نامنظور کیے جانے پر ایک عبوری حکومت کے قیام اور مجلس آئین ساز کے انتخاب کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ انجام کار ستمبر 1946 میں جواہر لال نہرو کی قیادت میں ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ پہلے تو مسلم لیگ نے اس میں شمولیت اختیار نہیں کی لیکن ایک ماہ بعد وہ اس میں شامل ہوگئی۔

بعد ازاں 9/ دسمبر 1946 کو مجلس آئین ساز کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ مسلم لیگ نے اس کا بھی بائیکاٹ کیا اور اپنے لیے ایک نئی مجلس آئین ساز کا مطالبہ کیا۔ تاہم مجلس آئین ساز نے ڈاکٹر راجندر پرساد کی صدارت میں کام جاری رکھا اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیدکر کی سربراہی میں آئین کا مسودہ تیار کیا۔

20/ فروری 1947 کو برطانوی وزیراعظم نے اعلان کیا کہ جون 1948 تک برطانیہ اقتدار کو ہندستانی رہنماؤں کو منتقل کردے گا اور یہ کہ ہندستان کے آخری گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نافذ کیا گیا ہے۔ نئے وائسرائے نے ہندستان پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا اور 3 جون 1947 کو اپنا پلان پیش کیا جسے 3 جون پلان کے نام سے بھی رسوم کیا جاتا ہے اس کے تحت 15/ اگست 1947 کو ہندستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کرنے کی تجویز تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے اسے منظور کیا۔ بعدازاں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندستان کی آزادی کا قانون (Indian Independence Act) پاس کردیا۔ اس طرح 14/ اگست کو پاکستان کا قیام عمل میں آگیا اور 15/ اگست کو ہندستان آزاد ہوگیا۔

مجلس آئین ساز نے دو سال گیارہ مہینے اور اٹھارہ دن کی محنت کے بعد 26/ نومبر 1949 کو نئے ہندستان کا آئین منظور کرکے 26/ جنوری 1950 کو اسے نافذ کردیا۔ اس آئین نے ہندستان کو ایک مقتدر جمہوری جمہوریہ میں منتقل کردیا۔ اس کے تحت 1952 میں انتخابات ہوئے اور مرکز اور ریاستوں میں انڈین نیشنل کانگریس برسر اقتدار آگئی۔

ہندستان دستور کے خدوخال : آزاد ہندستان کے آئین کے مطابق ہندستان ریاستوں کا ایک وفاق اور آزاد جمہوری جمہوریہ ہے جس میں پارلیمانی نظام حکومت رائج ہے۔ یہ آئین مجلس قانون ساز نے 26/ نومبر 1949 کو منظور کیا اور 26/ جنوری 1950 کو نافذ کیا۔

یہ دستور وفاقی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وحدانی طرز حکومت کی چند خصوصیات کا بھی حامل ہے۔ یونین کی انتظامیہ کے صدر راشٹرپتی ہیں۔ آئین کے لحاظ سے انتظامیہ کا پورا اقتدار صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں مرکوز ہے۔ ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ صدر جمہوریہ یہ اقتدار آئین کے مطابق ہی استعمال کرسکتے ہیں۔ آئین کی دفعہ 4 (1) کے تحت وزیراعظم کی سربراہی میں ایک مجلس وزراء ہوگی جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں صدر جمہوریہ کی مدد کرے گی اور انھیں مشورے دیا کرے گی۔ اس طرح اصل اقتدار وزیراعظم کی سرکردگی میں قائم مجلس وزرا کے ہاتھ میں ہوگا جو اجتماعی طور پر لوک سبھا کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ اسی طرح ریاستوں میں بھی انتظامیہ کا صدر گورنر ہوگا لیکن اصل میں اقتدار وزیراعلیٰ کی سرکردگی میں قائم مجلس وزراء کے ہاتھ میں ہوگا جو مشترکہ طور پر ریاستی اسمبلی کے تئیں جواب دہ ہوگی۔

آئین کے تحت مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کا دائرۂ اختیار مقرر کردیا گیا ہے۔ آئین سازی کے بقیہ اختیارات لوک سبھا کو حاصل رہیں گے۔

ان کے علاوہ مقامی خودمختار حکومتوں کا نظام بھی رائج ہے۔ آئین کی دفعہ 40 میں یہ کہا گیا ہے کہ ریاستیں اپنے علاقے میں پنچایتیں قائم کریں گی اور انھیں ایسے اختیارات سپرد کریں گی جس سے وہ مقامی خوداختیاری نظام چلا سکیں۔ پنچایتی راج کا نظام پورے ملک میں رائج ہے اور ہر ریاست میں ایک گاؤں یا کئی گاؤں کے گروپ میں پنچایتیں قائم ہیں اور انھیں مناسب اختیارات دیے گئے ہیں۔ بڑے شہروں میں منتخبہ میونسپل کارپوریشن قائم ہیں اور درمیانی اور چھوٹے شہروں میں منتخبہ میونسپل کونسلیں یا کمیٹیاں مصروف کار ہیں۔

لوک سبھا ریاستی اسمبلیوں اور صدر اور نائب صدر کے انتخاب کے سارے انتظامات اور ان پر کنٹرول، ووٹروں کی فہرست وغیرہ کی تیاری ایک الیکشن کمیشن کے سپرد ہے جو ایک چیف الیکشن کمشنر اور دو دوسرے الیکشن کمشنروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کا تقرر صدر جمہوریہ کرتے ہیں اور اس کا تیقن کرتے ہیں کہ ان کی آزادی پوری طرح برقرار رہے۔

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

636

ہندستان کے پارلیمانی نظام حکومت کی بنیاد بالغ حق رائے دہی پر ہے جس میں ہر شخص کو جو 18 سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے، رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ پہلے یہ عمر 21 سال تھی۔ سوائے ان اشخاص کے جنھیں دیوانہ پن، بدعنوانیوں یا اس مقام سے تعلق نہ رکھنے پر اس حق سے محروم کر دیا گیا ہو۔

آئین میں عدلیہ، کنٹرولر جنرل آڈیٹر اور پبلک سروس کمیشن کو آزادانہ حیثیت حاصل ہے۔ پورے ملک میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا گیا ہے۔

ہندستان میں 28 ریاستیں اور مرکز کے زیرانتظام علاقے 6 ہیں۔ آندھرا پردیش، آسام، اترانچل، اروناچل، بہار، گجرات، گوا، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، جھارکھنڈ، چھتیس گڑھ، کرناٹک، کیرالا، مدھیہ پردیش، منی پور، میگھالیہ، ناگالینڈ، اڑیسہ، پنجاب، راجستھان، سکم، تامل ناڈو، تریپورہ، اترپردیش اور مغربی بنگال ریاستیں ہیں جبکہ جزائر انڈمان و نکوبار، چنڈی گڑھ، دادر اور نگر حویلی، دہلی، لکش دیپ، میزورام اور پانڈی چیری یونین [illegible]انتظام علاقے ہیں۔ آئین کے لحاظ سے شہریت کے اصول [illegible] کے لیے یکساں ہیں۔ وہ تمام لوگ جو ہندستان کے باشندے [illegible] لیے جاتے ہیں جو اس آئین کے نافذ ہونے کے وقت ہندستان [illegible] ہوچکے تھے یا ہندستان میں پیدا ہوئے یا جن کے ماں یا باپ میں سے کوئی ایک ہندستان میں پیدا ہوا ہو یا وہ کم از کم پانچ سال سے یہاں مقیم ہیں، ہندستان کے قومی کہلائے جائیں گے۔ وہ لوگ شہریت سے محروم ہو جائیں گے جو خود ترک وطن کرلیں۔ قانوناً ان کی شہریت کی مدت ختم ہو جائے یا انھیں شہریت سے محروم کردیا جائے۔

بنیادی حقوق : ہر شہری کو انفرادی اور اجتماعی طور پر چند بنیادی آزادیاں حاصل ہیں۔ انھیں پانچ قسموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(1) ہر شخص دوسروں کے مساوی ہے۔ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں، کسی شخص کے ساتھ مذہب، نسل، فرقہ، جنس یا مقام پیدائش کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں برتا جاسکتا۔ روزگار کے معاملہ میں بھی ہر شخص کے حقوق یکساں ہوں گے۔ (2) ہر شخص کو تقریر، اظہار خیال، اجتماع، کوئی ادارہ یا یونین بنانے، نقل مکانی کسی جگہ قیام کرنے، جائداد خریدنے، رکھنے یا اس سے دست بردار ہونے کی آزادی ہوگی۔ کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے کی آزادی ہوگی۔ ان میں سے بعض آزادیاں اسی وقت تک حاصل رہیں گی جب تک کہ ان کے استعمال سے ملک کے تحفظ کو خطرہ لاحق نہ ہو، کسی دوست ملک سے تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کا اثر اخلاق پر برا نہ پڑے۔ (3) استحصال کے خلاف حق: ہر قسم کی جبری مزدوری، بچوں کی مزدوری اور انسانوں کے کاروبار کی پوری طرح ممانعت ہے۔ (4) ضمیر کی آزادی کا حق، کوئی بھی پیشہ اختیار کرنے کی آزادی، کسی مذہب کی پیروی اور تبلیغ کی آزادی۔ (5) اقلیتوں کا اپنے کلچر زبان رسم الخط اور اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انھیں چلانے کا حق۔ (6) بنیادی حقوق کو نافذ کروانے کے لیے آئینی حق۔

بنیادی فرائض : 1976 میں آئین میں ایک ترمیم کے ذریعہ دس بنیادی فرائض بھی متعین کر دیے گئے ہیں جن کے لحاظ سے اور چیزوں کے علاوہ ہر ہندستانی شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ آئین کی پابندی کرے۔ ان اصولوں پر چلے جن کے لیے آزادی کے لیے جد وجہد کی گئی تھی۔ ملک کی حفاظت قومی خدمت اور ملک کی مختلف زبانوں علاقوں اور مذاہب کے لوگوں میں بھائی چارہ پیدا کرنے میں مدد دے۔

رہ نما اصول : آئین میں ریاستی پالیسی کے چند رہنما اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ملک کی حکومت چلانے میں انھیں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور کسی عدالت میں انھیں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ ہر ریاست کا یہ فرض ہے کہ قانون سازی کرتے وقت انھیں ذہن میں رکھے۔ ان میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہر ریاست ہر وقت اس امر کی کوشش کرے گی کہ ایک ایسا سماجی نظام قائم ہو جس میں لوگوں کی بھلائی کو اولیت حاصل ہو اور اس نظام کی بنیاد سماجی معاشی اور سیاسی انصاف پر قائم ہو۔ حکومت اس امر کی کوشش کرے گی اور ایسی پالیسی پر عمل کرے گی جس سے ہر مرد اور عورت کو مناسب روزگار کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ مساوی کام کا ہر ایک کو مساوی معاوضہ مل سکے اور عام معاشی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کی کوشش کی جائے کہ ہر شخص کو روزگار اور تعلیم کا حق مل سکے اور بے روزگاری، بڑھاپے، بیماری اور معذوری وغیرہ کی صورت میں مناسب امداد مل سکے۔ اسی کے ساتھ حکومت یہ کوشش کرے گی کہ مزدوروں کو گزربسر کے لیے اجرت ملے۔ ماحول ایسا ہو جس میں انسان کام کرسکے۔ ہر ایک کو بہتر معیار زندگی، آرام اور سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور لطف اندوز ہونے کے مواقع حاصل ہو سکیں۔

معاشی میدان میں ریاست کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ دولت

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

کی ملکیت اور اس پر کنٹرول اس طرح ہو جس سے سب کا فائدہ ہو اور اس کا خیال رکھا جائے گا کہ معاشی نظام اس طرح کام نہ کرے کہ دولت اور ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جائیں اور وہ عام لوگوں کے مفاد کے خلاف کام کریں۔ ریاست کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ صنعتوں کے انتظام میں مزدور بھی حصہ دار بنیں۔

ان کے علاوہ دوسرے اور اصولوں میں اس کا ذکر ہے کہ اس طرح انتظام کیا جائے کہ بچے صحت مند ماحول میں پرورش پا سکیں۔ چودہ سال کی عمر تک انھیں مفت اور لازمی تعلیم دی جائے۔ پست ماندہ اور کمزور طبقوں اور قبیلوں کی تعلیمی اور معاشی بہتری پر خاص طور سے توجہ کی جائے۔ پنچایتیں قائم کی جائیں۔ عدالت کو انتظامیہ سے الگ کیا جائے۔ سارے ملک میں یکساں قوانین نافذ کیے جائیں۔ سب کے لیے یکساں مواقع مہیا کیے جائیں۔ قومی یادگاروں کی حفاظت کی جائے۔ بین الاقوامی امن و تحفظ کو فروغ دیا جائے، اقوام کے مابین عادلانہ اور باوقار تعلقات کا قیام عمل میں لایا جائے، بین الاقوامی قانون اور معاہدوں وغیرہ کا احترام کیا جائے اور باہمی تنازعات کو پرامن طریقہ سے سلجھایا جائے۔

ہندستانی قومی محافظ خانہ (نیشنل آرکائیوز آف انڈیا):

دہلی میں انڈیا گیٹ کے پاس جن پتھ پر سنگ سرخ سے بنی خوبصورت عمارت میں موجود دفتر جسے ہم نیشنل آرکائیوز یا قومی محافظ خانہ کے نام سے جانتے ہیں انگریزی عہد حکومت میں امپیریل ریکارڈ آفس کے نام سے کلکتہ میں 1891 میں قائم کیا گیا تھا۔ اس دفتر کے قیام کی سفارش حکومت کے سول آڈیٹر ہیوسینڈمان (Hugh Sandeman) نے 1860 میں اس تجویز کے ساتھ کی تھی کہ دفتر میں جمع سرکاری کاغذات میں سے عارضی نوعیت کے غیرضروری کاغذات کی چھٹنی کرکے اہم کاغذات کو گرینڈ سنٹرل آرکائیو کو بھیج دیا جائے۔ لیکن اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا سہرا جی ڈبلیو فارسٹ (G.G.Forrest) کے سر ہے جو 1891 میں آفیسر انچارج برائے ریکارڈ بنائے گئے۔ دارالحکومت کے دہلی منتقل ہونے پر امپیریل ریکارڈ آفس بھی دلی منتقل کیا گیا اور اس کے لیے کوئنس وے (حال جن پتھ) پر 1926 میں عمارت تعمیر کی گئی۔ ریکارڈ کی منتقلی 1936 میں مکمل کی گئی۔ 1947 میں دفتر کا نام نیشنل آرکائیوز یا قومی محافظ خانہ رکھا گیا اور 1990 سے اس کے سربراہ کے عہدہ کا نام ڈائریکٹر جنرل رکھا گیا۔

نیشنل آرکائیوز اصولاً حکومت کے ان جملہ سرکاری دستاویزی نوعیت کے کاغذات کے جن کی حکومت کے کاموں میں ضرورت نہیں رہ جاتی محافظ خانہ کا کام کرتی ہے۔ اس کے پاس نہ صرف موجودہ حکومت بلکہ اس کی پیش رو حکومتوں اور ان برطانوی ریزیڈنٹ افسروں کے دستاویزی کاغذات بھی ہیں جو ملک کی مختلف خودمختار ریاستوں میں متعین کیے جاتے تھے۔ اپنی اس تحفظی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے قومی محافظ خانہ کو درج ذیل کام کرنے پڑتے ہیں:

سرکاری یا نجی حیثیت کے دستاویزات کو حاصل کرنا اور ان میں سے اہم تاریخی اہمیت کی دستاویزات علاحدہ کرنا اور انھیں مرتب کرنا۔

کمزور اور شکستہ دستاویزوں کی مرمت اور مضبوط بنانا۔

دستاویزوں کی شناخت کے لیے حوالہ جاتی رہنما فہرستیں تیار کرنا

مرکزی و ریاستی حکومتوں کو سرکاری کاغذات کو سنبھالنے اور محفوظ رکھنے سے متعلق تکنیکی مشورہ دینا۔

دوسرے ممالک اور بین الاقوامی محافظ خانوں اور انجمنوں سے رابطہ قائم رکھنا۔

قومی محافظ خانہ کو مشورہ دینے کی غرض سے 1919 میں انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن (Indian Historical Records Commission) قائم کیا گیا۔ کمیشن محافظ خانہ کو تکنیکی معاملات اور ریکارڈ کی ترتیب و تحفظ کے سلسلے میں مشورے دیتا ہے۔ کمیشن کے مشورہ کے تحت ہی آرکائیوز میں دستاویزوں اور دوسرے تاریخی مواد کی تربیت کے لیے ایک کورس شروع کیا گیا۔ کمیشن ہر سال سالانہ کانفرنس منعقد کرتا ہے جس میں نئے تاریخی مواد کی دریافت پر گفتگو ہوتی ہے اور اس کی سالانہ روداد شائع ہوتی ہے۔

قومی محافظ خانہ کے جملہ کاموں کو درج ذیل شعبوں کی سرگرمیوں کے ضمن میں سمجھ سکتے ہیں:

سرکاری و نجی کاغذات و دستاویزات: قومی محافظ خانہ کو حکومت کی جملہ وزارتوں اور دوسرے اداروں سے تاریخی اہمیت کے وہ تمام کاغذات و دستاویزات منتقل کردیے جاتے ہیں جن کی انتظامی ضرورت ختم ہوجاتی ہے۔ محافظ خانہ ان کی چھٹائی، مرمت اور ترتیب کے بعد ان کے لیے رہنما فہرستیں تیار کرتا ہے۔ یونیسکو کی ایک اسکیم کے تحت محافظ خانہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

نے 1947 تا 1960 تک کے عرصہ میں موجود انیس وزارتوں کے کاغذات کی فہرستیں مرتب کرکے شائع کردی ہیں۔ سرکاری دفاتر کے کاغذات کے علاوہ یہاں ملک کے مشاہیر کے ذاتی کاغذات بھی جمع ہیں اس طرح کے 70 سے زیادہ افراد کے کاغذات میں قابل ذکر گوپال کرشن گوکھلے، بدرالدین طیب جی، مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کے کاغذات ہیں۔ آزادی سے پہلے کے ہندستان سے متعلق اہم کاغذات کی قلم پر نقلیں انگلینڈ، فرانس، پرتگال اور امریکہ وغیرہ سے حاصل کی گئی ہیں۔

عمل تحفظ تجربہ گاہ : محافظ خانہ کی بڑی ذمہ داری تحویل میں آئے مواد کا تحفظ ہے۔ مواد چاہے کاغذ پر ہو، تاڑ کے پتوں، چمڑے یا کپڑے پر ہو، موسم و جراثیم کی بدولت خراب اور کمزور ہوکر ضائع ہوسکتا ہے۔ تجربہ گاہ کا کام بخوراتی عمل (Fumigation) کے ذریعہ ان کو جراثیم سے پاک کرنے اور ورق سازی (Lamination) کے ذریعہ انھیں مضبوط بنانا اور محفوظ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی جلدبندی بھی کی جاتی ہے۔ اس کام میں جو نئی دوائیں اور طریقے دریافت ہوتے ہیں ان سے دوسرے اداروں کو بھی واقف کرایا جاتا ہے۔ محافظ خانہ کے پاس دستی ورق سازی کے علاوہ مشینی ورق سازی کے لیے ہائیڈرالک لیمینیشن پریس ہے۔ اسی طرح بخوراتی عمل کے ذریعہ بڑے پیانہ پر جراثیم دور کرنے کے لیے فیومیگیشن چیمبر موجود ہے۔ تجربہ گاہ ماہرین کی خدمت دوسرے اداروں اور دوسرے ممالک کو بھی فراہم کرتا ہے۔

کتب خانہ : محافظ خانہ کے ساتھ نایاب و قدیم کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ کتب خانہ کا بنیادی ذخیرہ فورٹ ولیم کالج کی عربی و فارسی زبان کی کتابیں، برطانوی عہد میں ضبط شدہ کتابیں اور اردو وفارسی کے انیسویں صدی کے اخبارات پر مشتمل ہے۔ کتابوں کا ذخیرہ 2 لاکھ کے قریب ہے۔ کتابوں کے علاوہ برطانوی عہد کے لیجسلیٹو کونسل اور لیجسلیٹو اسمبلی کی روداویں، مردم شماری کی مطبوعات، گزٹ، گزیٹیر، جنتریاں اور کلکتہ گزٹ (1792-1863) وغیرہ اخبارات کے جلدیں ہیں جو ہندستان کی تاریخ مرتب کرنے والوں کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔

اسکول برائے آرکائیول ٹریننگ : انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن کے مشورہ پر 1943 میں قائم تربیتی شعبہ کو 1980 میں اسکول کا نام دیا گیا۔ اسکول میں ایک سالہ ڈپلوما کورس برائے تحفظ و ترتیب کاغذات و دستاویزات اور مختصرالمدتی کورس برائے تنظیم سرکاری دستاویزات، تحفظ مواد اور ریپروگرافی (Reprography) وغیرہ کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ یونیسکو سے تعاون کی بدولت کورس میں داخلہ کے لیے ترقی پذیر ممالک سے بھی طلبا آتے ہیں۔ ضرورت پر کلچرل تبادلہ پالیسی کے تحت کسی ایک ملک کے اسٹاف کے لیے بھی تربیت کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

سہولیات مطالعہ توسیعی و اشاعتی سرگریاں : محافظ خانہ کا شعبہ سرکاری کاغذات و دستاویزات اتوار اور تین قومی تعطیلات کے علاوہ پورے سال محققین کے لیے کھلا رہتا ہے۔ ضروری تعارفی حوالہ کے بعد تحقیقی کام کرنے والوں کو اندر جانے کا اجازت نامہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مہینہ میں ایک دن عام آدمیوں کو بھی محافظ خانہ دیکھنے کی اجازت ہے۔ تاریخی موضوعات پر نمائش لگائی جاتی ہیں، لکچر کرائے جاتے ہیں۔ موضوعاتی مذاکرے اور کانفرنس کے ذریعہ بھی محافظ خانہ کی سرگرمیوں کی تشہیر کی جاتی ہے۔

محافظ خانہ نے اپنے ذخائر سے واقفیت عام کرنے کی غرض سے مخطوطات، نقشہ جات، فورٹ ولیم کالج کی کتابوں، نیز مخطوطات کی فہرستیں شائع کی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں موجود ریکارڈ کے انتخاب، پہلی جنگ آزادی کے کاغذات، خفیہ محکمہ کے کاغذات وغیرہ کی فہرستیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ محافظ خانہ میں موجود دستاویزوں کی مطبوعہ حوالہ جاتی رہنما فہرستیں بھی دستیاب ہیں۔ ذاتی ذخیروں میں موجود تاریخی مواد سے واقفیت بہم پہنچانے کے لیے نیشنل رجسٹر برائے ذاتی ریکارڈ شائع کیے گئے ہیں۔ "انڈین آرکائیوز" کے نام سے سال میں دو بار ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے۔ قومی محافظ خانہ سے مطبوعات کی مکمل فہرست مل سکتی ہے۔

ہندستان کے دور جدید کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے قومی محافظ خانہ سے استفادہ ناگزیر ہے اسی کے ساتھ کتب و دستاویزات کے لیے تحفظی تدابیر میں مشورہ و تعاون میں محافظ خانہ نمایاں خدمات انجام دیتا ہے۔

ہندستانی کمیونسٹ پارٹی (Communist Party of India)

: روسی انقلاب کے نتیجہ میں 1921 سے 1925 کے عشرہ میں کمیونسٹ گروپ ہندستان کے مختلف حصوں میں سرگرم ہوگیا تھا۔ اس گروپ نے دسمبر 1925 کو کانپور میں جمع ہوکر ہندستانی کمیونسٹ پارٹی کی

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

بنیاد رکھی۔

ہندستانی کیمونسٹ پارٹی نے سب سے پہلے مارکس اور لینن کے نظریات پر مبنی قومی تحریک شروع کی اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ 1926-29 کے دوران پارٹی نے قابل لحاظ ترقی کی اور مزدور طبقہ کی تحریک چھیڑ دی۔ 1943 میں پارٹی نے اپنا پہلا اجلاس عام منعقد کیا اور 1945-46 کے عام انتخابات میں محدود پیمانہ پر حصہ لیا۔ 1947 میں پارٹی سن بلوغ (Matured) کو پہنچ چکی تھی اس لیے اس کا شمار بڑی پارٹیوں میں ہونے لگا۔ آزادی کے بعد پارٹی نے فروری 1948 میں دوسرا اور 1953 میں تیسرا اجلاس عام منعقد کیا۔ تیسرے اجلاس میں اس نے اعلان کیا کہ استعماریت نہ تو ابھی ختم ہوئی ہے اور نہ ہی مکمل اشتراکیت میں تبدیل ہوسکتی ہے اس لیے اس نے اپنی پالیسی کے اعلانیہ میں واضح کیا کہ ہندستان میں روسی یا چینی انقلاب کی تکنیک کو رو بہ عمل نہیں لایا جاسکتا کیونکہ یہاں کے حالات مختلف ہیں۔ پارٹی کا خیال تھا کہ ہندستان میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسان، مزدور اور محنت کش طبقے کا ایک متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت ہے۔ اس تجویز کی پارٹی کے ایک طاقتور گروپ نے زبردست مخالفت کی۔ بالآخر اس گروپ نے پارٹی سے علاحدہ ہوکر 1964 میں مارکسی کیمونسٹ پارٹی کے نام سے ایک الگ جماعت قائم کرلی۔

ہندستانی کیمونسٹ پارٹی اپنے دستور کی رو سے ہندستان کے مزدور طبقہ کی سیاسی پارٹی ہے۔ اس کے مقاصد میں انسانوں کے استحصال کی تمام شکلوں کا خاتمہ اور ہندستان میں اشتراکی اور بالآخر کیمونسٹ معاشرہ کا قیام شامل ہے۔ نظریاتی طور پر یہ ہمیشہ روس نواز رہی ہے۔ سرد جنگ کے زمانہ میں یہ روس اور کیمونسٹ بلاک سے وابستگی کی داعی تھی۔ ہندستانی کیمونسٹ پارٹی کے موجودہ جنرل سکریٹری اے.بی.وردن ہیں۔ پارٹی کی تنظیم دوسری کیمونسٹ پارٹیوں کی طرح جمہوری مرکزیت کے اصول پر مبنی ہے۔ قومی سطح پر اعلیٰ ترین مجلس کل ہند پارٹی کانگریس ہے جو بالعموم ہر تیسرے سال منعقد ہوتی ہے۔ یہ کانگریس 150 ارکان پر مشتمل پارٹی کی قومی کونسل کا منتخبہ ادارہ ہوتی ہے۔ قومی کونسل کانگریس کے آئندہ اجلاس کے انعقاد تک پارٹی کا اعلیٰ ترین بااختیار ادارہ ہوتی ہے۔ اس کے فرائض میں پارٹی کے دستور کا نفاذ، سیاسی موقف کا تعین اور پارٹی کانگریس کے فیصلوں کی تعمیل کرانا شامل ہے۔ قومی کونسل اپنے ہی اراکین میں سے 31 ارکان کو منتخب کرکے مرکزی مجلس عامہ تشکیل کرتی ہے جو آئندہ اجلاس منعقد ہونے تک اس کی طرف سے کام کرتی ہے۔ یہ مجلس سیاسی اور تنظیمی مسائل کو طے کرتی، پارٹی کی پالیسی کو وضع کرتی اور عوامی تحریکوں اور پارٹی کی ریاستی شاخوں کی نگرانی اور رہنمائی کرتی ہے۔ یہ اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ قومی کونسل کے ہر اجلاس میں پیش کرتی ہے۔ مجلس کی نشست ہر دوسرے مہینہ منعقد ہوتی ہے۔ اس طرح پارٹی کی تنظیم ریاستی اور ضلعی سطح پر بھی کی جاتی ہے۔

اس وقت ہندستانی کیمونسٹ پارٹی کے لوک سبھا میں 3 اور راجیہ سبھا میں 5 ایم.پی. اور ملک کی مختلف ریاستوں میں کل 27 ایم.ایل.اے. ہیں۔ مغربی بنگال میں یہ حکومت میں شریک ہے اور اس کا ممبر وزیر کے منصب پر بھی فائز۔

ہندو عورت کی وراثت (Rules of Succession of the Property of a Female Hindu) : کسی متوفی ہندو عورت کی وراثت ذیل کے سلسلے سے ہوگی۔

(1) بیٹے، بیٹی اور متوفی کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد اور شوہر

(2) شوہر کے ورثا

(3) ماں اور باپ

(4) باپ کے ورثا

(5) ماں کے ورثا

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر کسی ہندو عورت کو اپنے باپ یا ماں سے جائداد وراثتاً ملی ہو تو اس کے فوت ہونے کی صورت میں کسی بیٹے یا بیٹی کی غیر موجودگی میں یا کسی فوت شدہ بیٹے یا بیٹی کی اولاد کی غیر موجودگی میں وراثت متوفی کے باپ کے وارثوں پر عود کرے گی اور کسی دوسرے ورثا کو جائداد کی وراثت نہ ملے گی۔ اسی طرح اگر کسی ہندو عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے جائداد وراثتاً ملی ہو تو اس کے فوت ہونے پر کسی بیٹے یا بیٹی کی غیر موجودگی میں یا کسی فوت شدہ بیٹے یا بیٹی کی اولاد کی غیر موجودگی میں وراثت شوہر کے ورثا پر عود کرے گی اور کسی دوسرے وارث کو جائداد کی وراثت نہ ملے گی۔

سلسلہ بالا کے تحت وراثت کی تقسیم یوں ہوگی کہ سلسلہ نمبر 1 کے ورثا کو ترجیح دی جائے گی اور اگر سلسلہ نمبر 1 کا کوئی وارث نہ ہو تو

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

سلسلہ نمبر 2 کے ورثا کو ترجیح دی جائے گی۔ ایک ہی سلسلہ میں کئی ورثا ہوں تو سب میں جائداد مساوی تقسیم ہوگی۔

ہندو قانون تنبیت و پرورش ایکٹ، 1956 (The Hindu Adoption and Maintenance Act, 1956):

ہندو قانون تنبیت و پرورش 21 دسمبر 1956 میں نافذ کیا گیا اس قانون کے نفاذ کے بعد سے ہندو لا کے متعلق کوئی تعبیر و تشریح یا کوئی رواج یا کوئی رسم جسے قانون کا درجہ دیا گیا ہے ان امور کی حد تک منسوخ متصور ہوگی۔ جن کا تذکرہ ہندو قانون تنبیت ایکٹ 1956 میں کیا گیا ہے۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد سے کوئی ہندو کسی شخص کو اس قانون کے تحت ہی متبنیٰ لے سکتا ہے۔ ایسی تنبیت جو اس قانون کے تحت نہ ہو کالعدم قرار پائے گی کوئی ہندو جو صحیح الدماغ ہو اور جو بالغ ہو کسی لڑکے یا لڑکی کو متبنیٰ لے سکتا ہے اگر متبنیٰ لینے والے شخص کی کوئی بیوی ہو تو اس بیوی کی رضامندی متبنیٰ لینے سے پہلے ضروری ہے۔ بجز اس کے وہ بیوی تارک الدنیا، فاترالعقل ہوگئی ہو یہ رضامندی تنبیت کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح ایک ہندو عورت بھی متبنیٰ لے سکتی ہے بشرطیکہ وہ صحیح الدماغ ہو اور اگر شادی شدہ ہے تو اس کی شادی ختم ہوچکی ہو یا اس کے شوہر کا انتقال ہوچکا ہو یا اس کا شوہر تارک الدنیا ہوچکا ہو یا ہندو مذہب ترک کرچکا ہو۔

ہندو قانون وراثت، 1956 (Hindu Succession Act, 1956):

ہندو قانون وراثت (1956) کے نفاذ کے بعد سے ہندو لا کے متعلق کوئی تعبیر و تشریح یا کوئی رواج یا کوئی رسم جسے قانون کا درجہ دیا گیا ہو ان امور کی حد تک منسوخ متصور ہوگا جس کا تذکرہ ہندو قانون وراثت میں کیا گیا ہو۔

اس قانون کے نفاذ کے بعد سے کسی ہندو کے فوت ہونے پر وراثت کی درجہ بندی مقرر کی گئی ہے۔ بیٹا بیٹی، بیوہ، ماں وغیرہ ورثائے درجہ اول ہیں۔ باپ، پوتی کا بیٹا وغیرہ ورثا درجہ دوم ہیں۔

وراثت پہلے درجہ اول کے ورثا پر عود کرے گی اگر درجہ اول میں مندرج رشتہ دار موجود نہیں ہیں تو درجہ دوم کے رشتہ داروں پر وراثت عود کرے گی۔ اگر ان دونوں درجوں کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے تو متوفی کے اگنیٹس (Agnates) پر وراثت عود کرے گی۔ اگنیٹس اس وقت متصور ہوگا جب کہ وہ صرف ذکور کے توسط سے خونی رشتے سے ہو یا تبنیت کے رشتے سے رشتہ دار ہو۔ اگر رشتہ دار بالا میں کوئی بھی نہ ہو تو متوفی کے کاگنیٹس (Cognates) پر وراثت عود کرے گی۔ ایک شخص دوسرے شخص کا کاگنیٹ اس وقت متصور ہوگا جبکہ وہ خونی رشتے سے یا تبنیت کے رشتے سے رشتہ دار ہو لیکن صرف ذکور ہی کے توسط سے ہو۔

اگر متوفی نے خاص طور پر جائداد کے متعلق کوئی وصیت یا معاہدہ نہیں کیا ہو تو جائداد کی تقسیم درجہ اول کے رشتہ داروں میں حسب ذیل قاعدے کے تحت عمل میں آئے گی۔

(1) متوفی کی بیوہ یا اگر ایک سے زیادہ بیوہ ہوں تو انھیں جائداد کا ایک حصہ ملے گا۔

(2) متوفی کے بقید حیات فرزندان، دختران اور والدہ کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

(3) متوفی کے فوت شدہ فرزندان و دختران کے ورثا کو ایک حصہ ملے گا۔

درجہ اول کے تمام ورثا میں متوفی کی جائداد ایک ساتھ تقسیم ہوگی اور کسی اور وارث کو جو درجہ اول کی فہرست میں شامل نہ ہو جائداد نہ ملے گی۔

درجہ دوم کے ورثا میں تقسیم جائداد کا یہ طریقہ ہے کہ سلسلہ نمبر1 کے ورثا سلسلہ نمبر 2 کے ورثا پر ترجیح پائیں گے۔ اسی طرح سلسلہ نمبر 2 کے ورثا سلسلہ نمبر 3 کے ورثا پر ترجیح پائیں گے اور جائداد اس سلسلہ نمبر کے تمام ورثا میں مساوی طور پر تقسیم ہوگی آگنیٹس اور کاگنیٹس میں جائداد کی تقسیم اصول ذیل کے تحت ہوگی۔

(1) دو ورثا کے منجملہ وہ وارث جو متوفی سے کم سے کم درجے کا سلسلہ رکھتا ہو اسے ترجیح دی جائے گی۔

(2) اگر ورثا کا متوفی سے ایک ہی درجے کا سلسلہ ہو تو اس وارث کو ترجیح دی جائے گی جس کے اور کوئی وارث نہ ہوں۔

درجے کے تعین کی غرض سے وارث کا متوفی سے رشتہ دیکھا جائے گا اور اس غرض کے لیے درجے سے مراد پشت ہوگی یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ کوئی رشتہ دار متوفی کا کس پشت سے اگنیٹ یا کاگنیٹ ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہندو لا کے اہم خد و خال (Salient Features of Hindu Law) : ہندو لا کے اہم خد و خال تین اجزا پر مشتمل ہیں۔ غیر منقسم خاندان، قانون وراثت اور قانون تبنیت۔ مشترکہ خاندان کا سسٹم جائداد کی مشترکہ ملکیت کے تصور سے وابستہ ہے۔ ہندو قانون وراثت کے اصول بھی زیادہ مدلل طور پر اسی نقطہ خیال کے حامل ہیں۔ ہندو لا کے تحت وراثت کے حق کا تصوراس کے متعلق منضبط ہوتا ہے جو متوفی کو روحانی فائدہ پہنچانے کے متعلق ضروری خیال کیا جائے اور یہی اعلیٰ ترین قانونی مبصرین کا بھی خیال ہے لیکن بنگال میں ہندو لا کے تحت وراثت کا سلسلہ رواج کی بنیاد پر ہے نہ کہ کسی روحانی تصور کے تحت۔ قانون وراثت کے متعلق بھی قدیم رسم و رواج کی کافی تشریح کی گئی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم آریوں میں آبا و اجداد کی پرستش کی رسم جاری تھی اور کسی متوفی کی مذہبی رسومات کی ادائگی کے لیے ایک بیٹے کی ضرورت کی اہمیت ناگزیر تھی۔ اس مذہبی تصور سے قطع نظر کسی شخص کو بھی اپنی جائداد کی حفاظت اور اس سے استفادے کے لیے اولاد کی ضرورت تھی جو اس کی مدد کرسکے اور ضعیفی میں اس کا ساتھ ہندو لا پر منو (Manu) کی کتاب منوسمرتی کو مفسرین اور مبصرین نے ابتدائی زمانے سے ہی مستقل سند کا درجہ دیا ہے اگرچہ کہ بعض مسائل میں ان مفسرین نے اس خیال کو تبدیل بھی کیا ہے۔ منوسمرتی کی تاریخ تصنیف کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض انگریز مورخین نے اس تاریخ کو 1280 سال قبل مسیح اور بعض مصنفین نے ایک ہزار سال قبل مسیح قرار دیا ہے۔

ہندو لا کے مکاتب خیال پر عمل آوری (Execution of Schools of Hindu Law) : میتھلااور شمالی بہار میں بھی متاکشرا کے اصولوں کے تحت عمل آوری کی جاتی ہے۔ بنگال میں متاکشرا کی پابندی نہیں کی جاتی البتہ ایسے مسائل جن کا ذکر اس صوبے میں رائج ہندو لا میں نہیں ہے انھیں متاکشرا کی پابندی کی جاتی ہے۔ فی الحقیقت ہندو لا کے دو اہم مکاتب خیال ہیں ایک مکتب خیال متاکشرااور دوسرا دائے بھاگ ہے۔ ان دو مکاتب خیال میں بعض اہم مسائل میں اختلاف ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ہندو لا میں اتنے مکاتب خیال ہیں جتنی تعداد شارحین کی ہے چنانچہ بنگال۔ میتھلا، بنارس، مہاراشٹر، ڈراویڈین کے علاحدہ علاحدہ مکاتب خیال ہیں۔ بہرحال جس نے بھی متاکشرا اور دائے بھاگ کا تقابلی مطالعہ کیا ہے ان پر واضح ہوگا کہ ہر دو مکاتب خیال بعض امور میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ کسی لڑکے کا پیدائش سے ہی جائداد میں حق ملکیت حاصل ہونے کا تصور دائے بھاگ میں نہیں ہے۔ حالانکہ یہ تصور مشترکہ خاندان کا بنیادی اصول ہے۔ دائے بھاگ میں ایسے لڑکے کو تقسیم جائداد کے مطالبے کا کوئی حق نہیں دیا گیا جس کا باپ زندہ ہو۔ دائے بھاگ میں ایک غیر منقسم خاندان کی جائداد میں بیوہ کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے اور وہ اپنے حق کی حد تک تقسیم کا ادعا کرسکتی ہے۔

ہندو لا- ہندو لا کے ماخذ (Sources of Hindu Law): ہندو لا حقیقتاً بے شمار رسومات اور مخصوص روایات پر مشتمل ہے۔ جب آریا ہندوستان آئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں مختلف قسم کے رسم و رواج نافذ ہیں جو ان کے اپنے رسم و رواج سے مختلف تھے۔ آریوں نے ان رسوم کو بعض صورتوں میں مکمل طور پر اور بعض صورتوں میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اپنایا۔ ایسے رسوم کو آریوں نے نہیں اپنایا جو ان کے رسم و رواج میں جذب نہیں ہوسکتے تھے اور جو ان کے لیے ناقابل قبول تھے۔ اس مفروضے کی کوئی وجہ نہیں کہ آریوں نے ہندوستان میں آکر اپنی رسومات کو مسلط کرنے کی کوشش کی۔ ہندو لا پر عبور رکھنے والے ماہرین کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہندو لا کی ترتیب منو (Manu) نے کی۔ منو کے ہندو لا میں عام مفروضات کے خلاف بہت کم روایات کا ذکر ہے اور روایتی قاعدے جو ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں اس میں تعبیر و تشریح کے ذریعہ کافی تبدیلیاں وقتاً فوقتاً کی گئی ہیں۔ شروتی (Shruties) کو ہندو لا کا بنیادی ماخذ سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ سمرتی (Smirthi) اور رسم و رواج بھی ہندو لا کے اہم ماخذ ہیں۔

ہندو میرج ایکٹ (Hindu Marriage Act) : ہندو میرج ایکٹ 18 مئی 1955 میں نافذ کیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد سے ہندو لا کے متعلق کوئی تعبیر و تشریح یا کوئی رسم جسے قانون کا درجہ دیا گیا ہو ان امور کی حد تک منسوخ متصور ہوگا جس کا تذکرہ ہندو میرج ایکٹ 1955 میں کیا گیا ہو۔

ہندو مینارٹی اور گارجین شپ ایکٹ (Hindu Minority and Guardianship Act) : یہ ایکٹ 1956 میں نافذ کیا گیا اس قانون کے نفاذ کے بعد سے ہندو لا کے متعلق کوئی تعبیر و تشریح یا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

کوئی رواج یا کوئی رسم جسے قانون کا درجہ دیا گیا ہو ان امور کی حد تک منسوخ متصور ہوگا جس کا تذکرہ ہندو مینارٹی اور گارجین شپ ایکٹ میں کیا گیا ہو۔

اس ایکٹ میں نابالغ سے مراد وہ لڑکا یا لڑکی ہے جس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو ایک ہندو نابالغ لڑکے کا قدرتی سرپرست اس کا باپ ہوگا۔ ایک ہندو غیر شادی شدہ لڑکی کا قدرتی سرپرست بھی اس کا باپ ہوگا۔ اس کے بعد ماں۔ ایک ایسا لڑکا جس کی عمر پانچ سال نہ ہوئی ہو اس کی قدرتی سرپرست اس کی ماں ہوگی۔ ایک ناجائز لڑکے یا غیر شادی شدہ ناجائز لڑکی کی قدرتی سرپرست اس کی ماں ہوگی اور اس کے بعد اس کا باپ ہوگا۔ ایک شادی شدہ لڑکی کا سرپرست اس کا شوہر ہوگا لیکن اس قانون کے تحت کوئی قدرتی سرپرست نہ ہوگا اگر اس نے ہندو مذہب ترک کردیا ہو یا تارک الدنیا ہوگیا ہو اور سنیاس لے لیا ہو۔ ایک متبنیٰ لڑکے کا سرپرست جو نابالغ ہو اس کا متبنیٰ باپ ہوگا اور اس کے بعد اس کی متبنیٰ ماں یعنی متبنیٰ باپ کی بیوی۔ ایک قدرتی سرپرست کو اس کا اختیار ہوگا کہ وہ اس بچے کی فلاح و بہبود کے لیے جو مناسب سمجھے انتظام کرے اور ایسے انتظام کرے جو نابالغ کی جائداد کے تحفظ کے لیے ضروری ہوں لیکن سرپرست کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ وہ نابالغ پر کسی دستاویز کے ذریعہ کوئی ذمہ داری عاید کرے۔

قدرتی سرپرست کو اس کا اختیار نہ ہوگا کہ وہ عدالت کی اجازت کے بغیر نابالغ لڑکے کی جائداد کو رہن کرے یا اس پر کوئی بار ڈالے یا منتقل کرے یا بیع یا ہبہ کرے یا نابالغ کی جائداد کو پانچ سال کی مدت سے زیادہ مدت کے لیے کرائے پر دے۔ اگر اس قاعدے کے خلاف قدرتی سرپرست نابالغ کی جائداد منتقل کرے تو ایسی منتقلی باطل قرار پائے گی عدالت اس قانون کے تحت نابالغ کی جائداد کے رہن کرنے یا بار ڈالنے کی اجازت نہ دے گی بجز اس کے کہ عدالت کے سامنے یہ ثابت کیا جائے کہ جائداد کی ایسی منتقلی نابالغ کے فائدے کے لیے تھی۔ ایک ہندو باپ جو ایک لڑکے کا قدرتی سرپرست ہے اس کو اس کا اختیار ہوگا کہ وصیت کے ذریعہ کسی اور شخص کو نابالغ لڑکے لیے اور اس کی جائداد کے لیے سرپرست مقرر کرے۔ ایسا تقرر بے اثر ہوگا اگر نابالغ کی ماں زندہ ہے۔ لیکن ماں کے انتقال کے بعد اس وصیت کے مطابق عمل ہوگا اگر نابالغ کی ماں نے کوئی اور وصیت نہ کی ہو۔ ایک ہندو عورت جو کسی نابالغ لڑکے کی قدرتی سرپرست ہوگئی ہے وصیت کے ذریعہ کسی اور شخص کو نابالغ کی دیکھ بھال اور اس کی جائداد کی حفاظت کے لیے سرپرست مقرر کرسکتی ہے۔

اس طرح وصیت کے ذریعہ جو سرپرست مقرر کیے جاتے ہیں انھیں قدرتی سرپرست کے انتقال کے بعد سرپرست کی حیثیت حاصل ہوگی اور نابالغ کی اور اس کی جائداد کی بہتری کے لیے ان شرائط اور پابندیوں کے تحت کام ہوگا جو قانوناً یا وصیت کے ذریعہ عاید کی گئی ہوں۔ کسی عورت کی صورت میں سرپرست کے فرائض عورت کی شادی ہونے پر ختم ہوجائیں گے۔ ایک نابالغ کسی دوسرے نابالغ کا سرپرست مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

اگر کسی نابالغ کا کسی مشترکہ جائداد میں حق ہو تو ایسی صورت میں اس کے لیے کوئی سرپرست مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ہائی کورٹ اس جائداد پر نابالغ کے حق کے تحفظ کے لیے سرپرست مقرر کرسکتا ہے۔

نابالغ کی دیکھ بھال اور اس کی جائداد کا تحفظ سرپرست کے تقرر کا اصل مقصد ہے۔ اگر عدالت یہ رائے قایم کرے کہ کسی خاص شخص کی سرپرستی نابالغ کے مفاد کے خلاف ہے تو ایسی صورت میں وہ شخص سرپرست باقی نہیں رہ سکتا۔

ہندو وراثت کے عام قاعدے (General Provisions Relating to Hindu Succession): ہندو وراثت ایکٹ (1956) کے تحت عام طور پر مکمل خونی رشتہ دار کو نصف مکمل خونی رشتہ دار پر ترجیح دی جائے گی۔ مکمل خونی رشتہ دار سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن کے جد اعلیٰ ایک ہوں اور ایک ہی بیوی کی اولاد سے ہوں۔ نصف خونی رشتہ دار سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن کے جد اعلیٰ ایک ہوں مگر الگ الگ بیویوں کی اولاد سے ہوں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی بچہ متوفی کی وفات کے وقت پیدا نہیں ہوا تھا وہ پیدا ہونے کے بعد اسی طرح جائداد کا وارث ہوگا جیسے کہ متوفی کی وفات کے وقت موجود ہونے کی صورت میں رہتا اور اس کی یہ وراثت متوفی کی وفات کے وقت سے قایم ہوگی۔

ہنگامہ (Affray): جب دو یا زیادہ اشخاص آمد و رفت عام کی کسی جگہ یا کسی اور عام مقام پر اس طرح ٹھہریں کہ اس سے امن عامہ خلائق

میں خلل پڑے تو ان اشخاص میں سے ہر ایک ہنگامہ کا مرتکب ہوگا۔
[illegible]
کی لڑائی یا کسی حرکت سے امن عامہ میں خلل پڑا ہو۔ کسی آدمی پر حملہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ وہ "ہنگامہ" کی حد تک نہ پہنچے مثلاً جب حملہ کسی عام مقام پر نہ کیا گیا ہو یا صرف وہی آدمی موجود ہوں جو لڑ رہے ہوں محض سخت کلامی ہنگامے کی حد تک نہیں پہنچ سکتی۔

عام مقام سے مراد ہر ایسا مقام ہے جہاں عوام فی الواقع جاتے ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ نہیں ہے کہ عوام کو وہاں جانے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے مکان کے احاطے میں کوئی نمائش کرے جس میں عوام کو آنے کی اجازت ہو تو ایسا احاطہ مقام عام سمجھا جائے گا۔

ذیل کے مقامات عام مقامات ہیں:

(1) کرایہ کی گاڑی، ٹرام، ریل گاڑی

(2) ریلوے اسٹیشن پر مال کا گودام

(3) ریلوے پلیٹ فارم

ذیل کے مقامات عام مقامات نہیں ہیں:

(i) چبوترہ جو شارع عام سے ملحق ہو۔

(ii) ریلوے اسٹیشن اور ریلوے پلیٹ فارم اس وقت جب کہ کوئی گاڑی آنے یا جانے والی نہ ہو۔

(iii) خانگی باغ۔

ہنگامی حالات (Emergency): ہنگامی حالات سے مراد ایسے حالات ہیں جس میں شہریوں کو معمول کے مطابق زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ دستور ہند میں دفعہ 352، 356 اور 360 کے تحت ان تینوں قسم کے ہنگامی حالات سے نپٹنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

(1) فوجی ہنگامی حالات

(2) دستوری ہنگامی حالات

(3) مالی ہنگامی حالات۔

(1) دستور کی دفعہ 352 کے تحت اگر صدر جمہوریہ یہ محسوس کرے اور پوری طرح مطمئن ہو کہ پورے ملک یا اس کے کسی خطہ میں جنگ، بیرونی حملہ، مسلح بغاوت کی وجہ سے ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہے تو وہ کابینہ کے مشورے سے پورے ملک یا متعلقہ علاقے میں قومی ہنگامی حالات کا اعلان کرسکتا ہے۔ صدر کے حکمنامہ کے بعد مرکزی حکومت کے اختیارات میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ کسی بھی ریاست کو کسی بھی معاملہ میں ہدایت دے سکتی ہے اور صدر سوائے حق زندگی کے تمام بنیادی حقوق کو دفعہ 359 کے تحت معطل کرسکتا ہے۔ اس حکمنامہ کا اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ بغیر کسی دستوری ترمیم کے ملک کا وفاقی نظام وحدانی نظام میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب تک قومی ہنگامی حالات کا نفاذ ہوچکا ہے۔ پہلا اکتوبر 1962 میں چینی حملہ کے وقت، دوسرا 1971 میں بنگلہ دیش کی جنگ کے دوران اور تیسرا 1975 میں داخلی شورش کی بنیاد پر۔

(2) اگر ملک میں معاشی بحران پیدا ہوجائے اور ملک کے معاشی استحکام کو سخت خطرہ لاحق ہو اور صدر جمہوریہ یہ محسوس کرے اور اس فیصلہ سے مطمئن ہو کہ سخت اقدامات کیے بغیر ملک کی معاشی ساکھ کو بحال نہیں رکھا جاسکتا تو وہ دفعہ 360 کے تحت مالی ہنگامی حالات کا اعلان کرسکتا ہے۔ مالی ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد صدر اپنے احکامات کے ذریعہ ریاستوں کو ان کے اخراجات میں کمی کرنے اور مالی معاملات میں کفایت شعاری اختیار کرنے پر مجبور کرسکتا ہے۔ اسی طرح وہ سرکاری ملازمین بشمول عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ کے ججوں کے ان کی تنخواہوں اور الاؤنسوں میں تخفیف کرسکتا ہے۔

(3) کسی بھی ریاست کا گورنر اگر صدر کو یہ رپورٹ دے کہ ریاستی حکومت دستوری دفعات کے مطابق نہیں چلائی جارہی ہے یا جب کسی بھی ریاست کی دستوری مشنری، سیاسی عدم استحکام یا امن و امان کی خراب صورت حال کی وجہ سے ناکام ہوجائے اور صدر اس صورت حال سے مطمئن ہو تو دفعہ 356 کے تحت صدر راج نافذ کرکے ریاستی حکومت کو معطل کرسکتا ہے۔

صدر راج نافذ ہونے کی صورت میں ریاستی حکومت کے تمام اختیارات و فرائض صدر اپنے ہاتھ میں مرکوز کر لیتا ہے اور ریاستی اسمبلی کو معطل یا تحلیل کردیتا ہے۔ اگر اسمبلی تحلیل کردی جائے تو چھ ماہ کے اندر انتخاب کرانا لازمی ہو جاتا ہے البتہ کسی بھی وجہ سے اگر چھ ماہ کے اندر انتخاب کرانا ممکن نہ ہو تو صدر راج کی مدت میں زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی مزید توسیع کی جاسکتی ہے۔

ہولڈنگ کمپنی (Holding Company): ایک کمپنی جو ایک

یا کئی کمپنیوں پر کنٹرول کرتی ہے عام طور پر یہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے وہ ان ذیلی کمپنیوں کے حصص کا بڑا حصہ (50 فی صدی سے زیادہ) خرید لیتی ہے۔ ہولڈنگ کمپنی کا تعلق صرف کنٹرول سے ہوتا ہے، سرمایہ کاری سے بالکل نہیں۔ وہ ان سب ذیلی کمپنیوں کی طرف سے مالی انتظامی اور بیوپاری کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ برطانیہ امریکا اور دوسرے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں بڑی کمپنیاں زیادہ تر ہولڈنگ کمپنیاں ہیں۔ خود ہندوستان میں بھی اب اس قسم کی کمپنیاں قائم ہو رہی ہیں۔ اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا اسی سرکاری شعبہ کے فولاد کے تمام کارخانوں کی ہولڈنگ کمپنی ہے۔

ہولڈنگ کمپنی میں کئی فائدے ہیں۔ اس میں دوسری کمپنیوں کے واصلات خریدے بغیر ان پر کنٹرول حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اکثر ان سب کمپنیوں کا مجموعی سرمایہ ہولڈنگ کمپنی سے زیادہ ہوتا ہے اور ان ذیلی کمپنیوں کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے مال کے لیے وسیع بازار اور زیادہ تجربہ کار اور ماہر انتظامی عہدہ دار مل جاتے ہیں۔ جو ان کارخانوں کے مالیات انتظام اور پیداوار کو بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

ہوورڈ ڈبلو. اوڈم (Howard W. Odum, 1884-1954): ہوورڈ اوڈم امریکی سماجیات داں گزرا ہے۔ اس نے فرانکلن گڈنگس کے تحت سماجیاتی تربیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ونت، سمنر، اسپنگلر اور گڈنس نے بھی اس کی سماجیاتی فکر پر گہرا اثر ڈالا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی جنوبی ریاستوں میں اوڈم نے سماجیات کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنی زندگی گزاری اس کے خاص کارنامے سماجیات میں نسلی تعلقات، علاقائی مطالعے، سماجی منصوبہ بندی اور لوک سماجیات ہیں۔ ان چاروں میدانوں میں اوڈم نے تحقیقاتی کام کیے۔ لیکن سب سے زیادہ توجہ اس نے نسلی تعلقات اور لوک سماجیات پر دی۔ اوڈم کی تحریرات کا نیگرو اور سفید فاموں کے تعلقات پر گہرا اثر پڑا ہے۔ اسی طرح لوک سماجیات میں بھی سماجی ارتقا کی دلچسپ بحثیں شامل ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ بدلتے ہوئے عالمی سماج میں دنیا کے ہر علاقے میں لوک سماج زیادہ عالمی یکسانیت اور یگانگت کا غماز ہے جس سے سماجی تفہیم میں مدد لی جاسکتی ہے۔ سماجی ارتقا کی اس نے تین منزلیں بتائی ہیں۔ پہلی منزل لوک طریقوں کی ہے جو قدیم سماج میں پائی جاتی ہے۔ دوسری منزل تکنیکی طریقوں کی ہے جو ترقی پذیر سماجوں میں نظر آتی ہے۔ اور تیسری منزل مملکتی طریق کی ہے جو ترقی یافتہ ملک کے سماجوں کی خصوصیت ہے اس کا خیال تھا کہ سماجی تغیرات میں لوک طریقوں بدلتے ہوئے اقدار، اداروں، اخلاقی نظام اور ٹکنالوجی کے مابین متوازن آہنگ پیدا کرنا ضروری ہے۔

ی

یورپی آزاد تجارتی علاقہ (European Free Trade Area — E.F.T.A.): یورپی معاشی تعاون کی تنظیم کے ممبروں پر 1950 سے یہ دباؤ بڑھ رہا تھا کہ اس تنظیم کے 16 ممبر ملکوں (آسٹریا، بلجیم، ڈنمارک، فرانس، یونان، آئس لینڈ، آئرلینڈ، اٹلی، لکومبرگ، نیدرلینڈ، ناروے، پرتگال، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ترکی اور برطانیہ) پر مشتمل ایک آزاد تجارت کا علاقہ قائم کیا جائے۔ 1955 اور 1956 کی کانفرنسوں میں بھی یہ مسئلہ موضوع بحث رہا۔ آخر کار 1957 میں یورپی آزاد تجارت کا علاقہ وجود میں آیا۔ اس کے بعد اس نے ساجھا منڈی کے ملکوں سے بات چیت شروع کی تاکہ ان کے ساتھ مل کر آزاد تجارت کے علاقے کو وسعت دی جائے۔ لیکن چونکہ مشترکہ منڈی والوں کو اپنے اتحاد میں رخنہ کا اندیشہ تھا۔ اس لیے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر میں یورپی آزاد تجارت کی تنظیم (E.F.T.A.) قائم ہوئی لیکن یہ اسکنڈینیویا برطانیہ اور پرتگال و سوئٹزرلینڈ تک محدود رہی بعد میں فن لینڈ اور آئس لینڈ بھی اس میں شریک ہوگئے۔ (دیکھیے یورپی آزاد تجارت کی تنظیم)

یورپی ادائیگی معاہدہ (European Payment Union — E.P.U): یہ ادارہ 1950 میں یورپ کے 17 ملکوں کے تعاون سے قائم کیا گیا۔ اس زمانہ میں ان ممالک کی معاشی حالت ایسی نہیں تھی کہ کھلے عام زر کے تبادلہ کی اجازت دے سکتے چنانچہ یہ ادارہ ممبر ملکوں کے آپس کے لین دین کے مسائل حل کرتا تھا اور اگر کسی ملک کے توازن ادائی میں خسارہ ہوتا تو اس ادارے سے خود بخود قرض مل جاتا۔ ہر ملک کا ایک کوٹہ مقرر تھا۔ اور اس کوٹہ کے 20 فی صدی کی حد تک قرض مل سکتا تھا۔ بقیہ خسارہ سونے یا ڈالر سے پورا کرنا ہوتا۔ اسی طرح جن ملکوں کے پاس فاضل رقم (ای.پی.یو) ہوتی وہ اس فاضل رقم کا بیس فی صدی خسارہ والے ملکوں کو قرض دے سکتے تھے اور بقیہ فاضل رقم ڈالر یا سونے کی شکل میں ملتی تھی۔ کوٹہ کی بنیاد مغربی یورپ کے ملکوں سے تجارت کی اساس پر کی جاتی تھی۔ 1958 میں اسے ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ (E.P.U.) یا یورپی زری معاہدہ نے لے لی۔

یورپی برادری (European Community): یورپی برادری سے فی الوقت مراد تین علاحدہ برادریاں ہیں یعنی یورپی اقتصادی برادری (European Economic Community) یورپی کوئلے و فولاد کی برادری (European Coal and Steel Community) اور یورپی ذراتی توانائی کی برادری (European Atomic Energy Community) ہیں۔ ان سب کا مقصد یورپ کے اقتصادی اتحاد کے راستہ سے اس کے سیاسی اتحاد کی جانب پیش قدمی کرنا ہے۔ یورپی کوئلے و فولاد کی برادری 1951 میں بلجیم، فرانس، وفاقی جرمنی، اطالیہ، لکسمبرگ اور نیدرلینڈس کے معاہدہ کے ذریعہ قائم ہوئی۔ اس کا مقصد ان ملکوں کے کوئلے و فولاد کی پیداوار کو یکجا کرنا ہے۔ یورپی اقتصادی برادری اور یورپی وزارتی توانائی برادری کی تشکیل مارچ 1957 میں مذکورہ چھے طاقتوں کے معاہدہ روم پر دستخط کرنے سے عمل میں آئی۔ انھوں نے جنوری 1958 سے کام کرنا شروع کیا۔ اصلاً ان تینوں برادریوں کے اپنے اپنے کمیشن اور کونسلیں ہیں۔ لیکن ایک معاہدہ کے تحت تینوں برادریوں کے اختیارات جولائی 1967 سے ایک کمیشن اور ایک کونسل کے سپرد کردیے گئے ہیں۔ منصوبہ یہ ہے کہ تینوں علاحدہ معاہدوں کی جگہ ایک معاہدہ اور تینوں برادریوں کی جگہ ایک واحد برادری قائم کی جائے۔ جنوری 1973 میں ان برادریوں میں برطانیہ، آئرلینڈ اور ڈنمارک بھی شامل ہوگئے۔ برادریوں کے مقاصد میں ان نو ملکوں کے درمیان اشیا، اشخاص، خدمات اور سرمایہ کی آزادانہ نقل و حرکت، یکساں محصولی پالیسیاں اور برادری کے اندر تجارتی مقابلہ کی آزادی شامل ہے۔ برادری اپنی درآمدات اور برآمدات کے سلسلہ میں ایک پالیسی اپناتی ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

تینوں برادریوں کے پانچ مشترکہ مرکزی ادارے یہ ہیں :

(1) برادریوں کا کمیشن جو پالیسی بناتا ہے اور پالیسی کا نفاذ کرتا ہے۔

(2) وزارتی کونسل جس کی رضامندی سے کمیشن اپنی پالیسیوں کو نافذ کرتا ہے۔

(3) یورپی پارلیمنٹ جو برادری کے انتظامی اداروں کی نگرانی کرتی اور مسائل اور پالیسیوں پر بحث و مباحثہ کرتی ہے۔

(4) یورپی عدالت جو برادریوں کے معاہدوں کی تعبیر و تشریح کرتی ہے، اور

(5) یورپی کونسل جو ارکان کے سربراہان حکومت پر مشتمل ہوتی ہے اور غیررسمی مذاکرات کے لیے سال میں تین بار اجلاس کرتی ہے۔ ان کے علاوہ کئی مشاورتی ادارے اور مالی ایجنسیاں مثلاً یورپی سرمایہ کاری، بینک، اجتماعی فنڈ، یورپی زراعتی فنڈ، یورپی مالی تعاون فنڈ، یورپی ترقیاتی فنڈ اور علاقائی ترقیاتی فنڈ بھی کام کرتے ہیں۔

یورپی اقتصادی برادری ریاستہائے متحدہ امریکا اور جاپان کے ساتھ دنیا کی تیسری عظیم ترین اقتصادی طاقت ہے۔ یورپی کمیشن کا صدر مقام بروسلز ہے۔

یورپی زری معاہدہ (European Money Agreement—E.M.A.)

یورپی زری معاہدہ (European Money Agreement—E.M.A.): دوسری عالم گیر جنگ کے بعد یورپی ممالک اس موقف میں نہیں تھے کہ اپنی کرنسیوں کے آزادانہ تبادلے کی اجازت دیں اس لیے ایک یورپی ادائیگی یونین (European Payment Union) قائم کی گئی جس کے ذریعہ ارکان ملکوں کی ادائیگیوں کا مسئلہ حل کیا جاتا تھا جب ان ممالک کی معاشی حالت بہتر ہوئی اور کھلے عام تبادلہ کی اجازت دینے کے موقف میں آگئے تو 1958 میں یورپی ادائیگی یونین کی جگہ یورپی زری معاہدہ نے لے لی۔ اس معاہدہ نے یورپی ادائیگی یونین کے کاروبار سنبھال لیے۔ لیکن صرف اس فرق کے ساتھ کہ تمام تصفیے صرف سونے یا قابل مبادلہ کرنسی کے ذریعہ ہی ہوسکتے ہیں۔ لیکن اب پہلے کی طرح ضرورت پر خود بخود قرضہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس نئے انتظام کے تحت ایک یورپی فنڈ بھی قائم کیا (دیکھیے یورپی فنڈ)۔

یورپی ساجھا منڈی (European Common Market — E.C.M.)

یورپی ساجھا منڈی (European Common Market — E.C.M.) : مغربی یورپ کے چھ ملکوں یعنی فرانس، مغربی، جرمنی، اٹلی، بلجیم، نیدرلینڈ اور لکسم برگ نے 1957 میں معاہدہ روم کے ذریعہ ایک ساجھا منڈی قائم کرنے کے لیے دستخط کیے اور یکم جنوری 1958 کو یہ ساجھا منڈی (E.C.M.) یا یورپی معاشی کمیونٹی (E.E.C.) وجود میں آئی۔ اس معاہدہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ دستخط کرنے والے ملک آپس میں سامان خدمات سرمایہ مزدور وغیرہ کی آزادانہ درآمد و برآمد پر عمل کریں گے اور ان کی نقل حرکت پر کسی قسم کی پابندی نہ ہوگی۔ بیرونی تجارت کے بارے میں انھوں نے ایک مشترکہ پالیسی بھی مرتب کی تھی۔ معاہدہ میں اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی تھی کہ یہ ممالک کاروبار کو بڑھانے کے لیے اعانت اور بھرمالی (Dumping) سے پرہیز کریں اس کے علاوہ اجارہ داریوں میں فوق قومی (Supernational) کنٹرول قائم کرنے اور کمپنیوں کے ایک دوسرے میں انضمام کی ہمت افزائی کو روکنے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔

اس ادارہ کے کاروبار چلانے کے لیے ممبروں کا ایک کمیشن بنایا گیا تھا ان کا انتخاب چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ پالیسی کے مسائل وزیروں کی کونسل طے کرتی ہے جس میں ہر ممبر ملک کا ایک وزیر حصہ لیتا ہے۔ کمیشن اس کے سامنے اپنی تجویزیں پیش کرتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت ایک پارلیمانی اسمبلی اور عدالت انصاف (Court of Justice) بھی قائم کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ چند اور مشاورتی ادارے مثلاً سماجی اور مالی کمیٹیاں وغیرہ۔ اور ایک سرمایہ کاری بینک (Investment Bank) بھی قائم کیا گیا ہے۔ جسے ممبر ملکوں کے پس ماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا اختیار ہے۔ یہ ملک معاون ممبروں (Associate Members) کی مدد بھی کرتا ہے۔ اس تنظیم کے تحت ایک یورپی سماجی فنڈ بھی قائم کیا گیا تھا۔ تاکہ بے روزگار ہونے والے مزدوروں اور خاص طور پر ساجھا منڈی (کامن مارکٹ) کے قیام سے بے روزگار ہونے والے لوگوں کو دوبارہ روزگار دلوانے میں مدد دی جائے۔

شروع میں منصوبہ یہ تھا کہ ساجھا منڈی کی تمام منزلیں بتدریج طے کی جائیں گی اور اس کے لیے چار چار سال کی تین منزلیں طے کی گئی تھیں جن میں آپس میں کسٹم محصول کی برخواستگی اور 1970 تک مشترکہ ٹیرف (Tariff) قائم کرنے کی تجویز تھی۔ لیکن بعد میں اس میں تیزی پیدا کردی گئی اور جولائی 1968 تک اندرونی کسٹم محصول اٹھا دیا گیا اور بیرونی ٹیرف کا نظام قائم کر دیا گیا۔ زراعت سے درآمدی محصول کوٹہ وغیرہ

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

برخواست کردیے گئے۔ مزدوروں کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک میں آنے جانے کی کچھ سہولتیں مہیا کی گئیں۔ ساجھا منڈی میں نئے ملکوں کی شرکت کے لیے راستہ کھلا رکھا گیا تھا چنانچہ بعد میں انگلستان، ناروے اور ڈنمارک بھی اس میں شریک ہوگئے۔ حال ہی میں یونان نے بھی اس تنظیم کی رکنیت قبول کرلی ہے اور اب اسپین رکنیت کے لیے کوشاں ہے۔

یورپی فنڈ (European Fund): 1958 میں جب یورپی زرعی معاہدہ وجود میں آیا تو اس نے ساٹھ کروڑ ڈالر کے سرمایہ سے ایک یورپی فنڈ بھی قائم کیا۔ یہ سرمایہ کچھ تو پرانی یورپی ادائیگی علاقہ (European Payment Area) سے منتقل کیا گیا اور کچھ ممبروں نے دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپی ملکوں میں آپس میں توازن ادائیگی میں خسارہ کی صورت میں حالات سے نبٹنے کے لیے اس فنڈ سے دو سال کے لیے قرض دیا جاسکے۔

یورپی کونسل (Council of Europe): مغربی یورپی ملکوں کے درمیان عظیم تر اتحاد، اقتصادی و اجتماعی تعاون اور پارلیمانی جمہوریت کی بقا کے لیے یورپی کونسل کا قیام یورپی کانگریس کے ذریعہ 1949 عمل میں آیا۔ یورپی کانگریس کا اجلاس 26 ملکوں کے تقریباً ایک ہزار یورپی باشندوں نے ہیگ میں منعقد کیا تھا جس میں ایک متحدہ یورپ پر زور دیا گیا تھا۔ یورپی کونسل یورپی اقوام کا اجتماع تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ان آدرشوں اور اصولوں کا حصول اور تحفظ ممکن ہوسکے جو ان کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ دراصل یہ کونسل یورپی یونین کے قیام کے سلسلے میں ایک اہم قدم تھی۔

1974 سے سربراہان ریاست و حکومت کا اجلاس ممبر ملکوں کی راجدھانیوں میں سال میں کم از کم دوبار ضرور منعقد ہوتا ہے۔ یہ کونسل بڑا بااختیار ادارہ ہے جو یوپی یونین کی ترجیحات طے کرتا ہے، ہدایات دیتا ہے اور متنازعہ معاملات کا تصفیہ کرتا ہے۔ ممبر ملکوں کے وزرائے خارجہ پر مشتمل اس کی وزارتی کونسل کے اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ مذاکرہ کے لیے کونسل کی ایک پارلیمانی اسمبلی اور انتظامی امور کے لیے ایک سکریٹریٹ کونسل کے صدر مقام استراسبور (فرانس) میں واقع ہے۔

یورپی مشترکہ منڈی: دیکھیے یورپی ساجھا منڈی۔

یورپی معاشی کمیونٹی: دیکھیے یورپی ساجھا منڈی۔

یورپی یونین (European Union, EU): یورپی یونین کا قیام میثاق پیرس (1951)، میثاق روم (1957)، یورپی ایکٹ (1986)، یورپی یونین سے متعلق میثاق ماسٹرچ (1992) اور میثاق ایمسٹرڈم (1997) کے ذریعہ عمل میں آیا۔

دراصل 19/ ستمبر 1946 کو سب سے پہلے سر ونسٹن چرچل نے زیورخ میں "ریاست ہائے متحدہ یورپ" کا خیال ظاہر کیا تھا۔ دو سال بعد 26 ملکوں کے تقریباً ایک ہزار یورپی نمائندے ہیگ میں جمع ہوئے جنھوں نے ایک متحدہ یورپ کا تصور پیش کیا۔ یہ اجتماع یورپی کانگریس کے نام سے موسوم ہوا جو 1949 میں یورپی کونسل کی شکل میں منتج ہوا۔ یہ کونسل یورپی اقوام کا اجتماع تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے اراکین کے مابین اتحاد عظیم قائم ہو تاکہ ان آدرشوں اور اصولوں کا تحفظ اور ان کی تکمیل عمل میں آسکے جو ان کا مشترکہ ورثہ ہیں۔

بعد ازاں 18 اپریل 1951 کو فرانسیسی وزیر خارجہ رابرٹ شوماں کی تجویز پر بیلجیم، فرانس، وفاقی جموریہ جرمنی، اٹلی، لکسمبرگ اور نیدرلینڈس نے میثاق فرانس پر دستخط کرکے یورپی کوئلے و فولاد کی برادری قائم کی۔ اس کا مقصد ان ملکوں کے کوئلے اور فولاد کی پیداوار کو یک جا کرنا تھا۔ یہ عمل ایک متحدہ یورپ کے قیام کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ اس کامیابی کے بعد دو مزید برادریوں کے قیام کی سمت میں اقدامات کیے گئے جو 25/ مارچ 1957 کو یورپی اقتصادی برادری (European Economic Community) اور یورپی ذراتی توانائی برادری (European Atomic Energy Community) معاہدۂ روم پر دستخط کرنے کے نتیجہ میں وجود میں آئیں۔ انھوں نے جنوری 1958 سے کام کرنا شروع کیا۔ ان معاہدوں کا مقصد مختلف مراحل میں ایک مشترکہ منڈی کو وجود میں لانا تھا تاکہ اقتصادی پالیسیاں مرتب ہوسکیں اور پُرامن مقاصد کے لیے نیوکلیائی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوسکے۔ اصلاً ان تینوں برادریوں کے اپنے اپنے کمیشن اور وزارتی کونسلیں تھیں لیکن ایک معاہدہ کے تحت تینوں برادریوں کے اختیارات جولائی 1967 میں ایک کمیشن اور ایک کونسل کے سپرد کر دیے گئے۔ منصوبہ یہ تھا کہ تینوں علاحدہ معاہدوں کی جگہ ایک معاہدہ اور تینوں برادریوں کی جگہ ایک واحد برادری قائم کی جائے۔ جنوری 1973 میں

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

648

ان برادریوں میں برطانیہ، آئرلینڈ اور ڈنمارک بھی شامل ہوگئے۔ برادریوں کے مقاصد میں ان ممبر ملکوں کے درمیان اشیا، اشخاص، خدمات اور سرمایہ کی آزادانہ نقل و حرکت، یکساں محصولی پالیسیاں اور برادری کے اندر تجارتی مقابلہ کی آزادی شامل تھی۔ بعد ازاں اس کے اراکین میں یونان (یکم جنوری 1981)، اسپین اور پرتگال (یکم جنوری 1986) بھی شامل ہوگئے۔ اسی طرح جرمنی کے دونوں حصوں کے انضمام کے بعد اکتوبر 1990 میں جرمنی اس کے ممبروں میں شامل ہوگیا۔ اس کے بعد یکم جنوری 1995 کو آسٹریا، فن لینڈ اور سویڈن بھی اس اتحاد میں شامل ہوگئے۔

برادری کو وسعت دینے کی غرض سے کوششوں میں تیز رفتاری ہوئی اور ان کے نتیجہ میں دسمبر 1985 میں واحد یورپی قانون (Single European Act) پر دستخط ہوگئے۔ معاہدہ روم پر یہ پہلی نظرثانی تھی جس نے فیصلہ کے عمل میں یورپی پارلیمنٹ کو بڑی حد تک ملوث کرلیا۔ 1991 سے 1993 کے درمیان کئی مراحل طے کرنے کے بعد آخرکار یکم نومبر 1993 کو یورپی یونین کا قیام عمل میں آیا۔ یونین کا مقصد یورپ کے لوگوں کے مابین مستحکم اتحاد کا قیام ہے۔ اس کی ترجیحات میں معاہدۂ ایمسٹرڈم پر عمل آوری شامل ہے جس کی رو سے شہریوں کو نئے حقوق حاصل ہوں، نقل و حرکت کی آزادی ہو، یورپی یونین کے اداروں کو استحکام حاصل ہو، لوگوں کو روزگار مہیا ہو، اقتصادی اور مالی اتحاد قائم ہو، برادریوں کو مزید وسعت ملے، ایک مشترکہ خارجہ اور حفاظتی پالیسی پر عمل آوری ہو اور انصاف اور داخلی امور میں فروغ حاصل ہو۔

یورپی یونین کی اپنی ایک آزاد پالیسی ساز عاملہ ہے جسے یورپی کمیشن کہا جاتا ہے، مختلف مشاورتی کمیٹیاں ہیں اور ایک کونسل آف منسٹرس ہے۔ یونین کا کمیشن پالیسی وضع کرتا اور اس کا نفاذ کرتا ہے۔ اس کی وزارتی کونسل کی رضامندی سے ہی کمیشن اپنی پالیسیوں کو نافذ کرتا ہے۔ یورپی پارلیمنٹ یونین کے انتظامی اداروں کی نگرانی کرتی ہے اور اس کے مسائل اور پالیسیوں پر بحث و مباحثہ کرتی ہے۔ یورپی عدالت یونین کے معاہدوں کی تعبیر و تشریح کرتی ہے اور یورپی کونسل ارکان کے سربراہان حکومت پر مشتمل ہوتی ہے۔

مارچ 1999 تک یورپی یونین میں آسٹریا، بلجیم، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، یونان، جمہوریہ آئرلینڈ، اٹلی، لکسمبرگ، نیدرلینڈس، پرتگال، اسپین، سویڈن، جرمنی اور برطانیہ شامل تھے جن کی کل تعداد پندرہ ہے۔

یوسف ۔ ابو یوسف : یعقوب بن ابراہیم کوفہ میں 113ھ / 731ء میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب انصار کے قبیلہ اوس سے جاملتا ہے۔ والد کی معاشی حالت اچھی نہ تھی اس لیے کم عمری ہی میں حصول معاش میں لگ گئے۔ مگر ان کو علم کا شوق تھا اس لیے اہل علم کی صحبتوں میں پہنچ جاتے۔ ان کے والد ان کو زبردستی روکتے۔ پہلے امام ابن ابی لیلیٰ (متوفی 148ھ 765ء) کی مجلس درس میں حاضر ہوئے۔ پھر امام اعظم ابوحنیفہ متوفی 150ھ / 767ء کی مجلس میں گئے۔ زندگی بھر بلاناغہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ان دونوں کے علاوہ متعدد نامور فقہا و محدثین سے بھی روایت کی ہے۔ امام ابو یوسف سے استفادہ کرنے والوں میں امام محمد بن حسن شیبانی اور امام احمد بن حنبل وغیرہ کا نام ممتاز ہے۔

تیسرے عباسی خلیفہ مہدی کے زمانہ میں (166ھ / 782ء) بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوئے اور ہادی کے زمانہ میں پورے بغداد کے قاضی بنائے گئے۔ ہارون رشید نے (171ھ/ 787ء) میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور کیا۔ وفات تک اس ذمہ داری کو بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ان کے فیصلے بے لاگ اور شریعت کے مطابق ہوا کرتے۔ امیر و غریب اور حاکم و محکوم کے ساتھ کوئی امتیاز نہ کرتے۔ خود خلیفہ کے ساتھ بھی کوئی رو رعایت نہ کرتے ان کی زندگی تقویٰ خشیت الٰہی اور خوف آخرت میں بے مثال تھی۔ بڑے خوش اخلاق اور نہایت متواضع تھے۔ عام لوگوں سے بے تکلفی سے ملتے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہونے اور مال و دولت کی فراوانی کے باوجود ان کی زندگی ہمیشہ طالب علمانہ رہی۔ ان میں غرور تمکنت کا شائبہ نہ تھا۔ غریبوں کی برابرامداد و اعانت کرتے۔ جرأت و حق گوئی آپ کا خاص وصف تھا خلیفہ کے سامنے بھی حق بات کہنے میں جھجک نہ ہوتی۔ (182ھ/ 768ء) میں وفات پائی۔ خلیفہ وقت ہارون رشید نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے خاندان کے خاص مقبرہ میں دفن کرایا۔ اولاد میں یوسف زیادہ مشہور ہوئے۔ یہ اپنے باپ کی زندگی ہی میں بغداد کے مشرقی حصہ کے قاضی مقرر ہوگئے تھے۔

امام ابو یوسف کا درجہ فقہ میں بلند تھا۔ ان کا سب سے اہم اور بڑا کارنامہ اصول فقہ کی تدوین اور حنفی مسلک کی تکمیل و اشاعت ہے۔ وہ دراصل اس مسلک کے معمار اعظم تھے۔ ان کے اقوال و اجتہادات کو حنفی فقہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عام خیال تو یہ ہے کہ وہ مجتہد فی المذہب تھے۔ لیکن اہل تحقیق ان کو مجتہد مطلق مانتے ہیں کیونکہ وہ دلائل ہی سے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

امام ابوحنیفہ کے اقوال کو قبول یا رد کرتے تھے۔ بے شمار مسائل میں ان کی رائے امام ابو حنیفہ سے مختلف تھی۔ ان کی حق پسندی اور فقہی مسائل میں معتدل روئے کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے وضوح حق کے بعد اپنے بعض اجتہادات سے رجوع کرلیا تھا اور جب حج کرنے گئے اور امام مالک (متوفی 179ھ/ 795ء) سے ملاقات اور بعض مسائل پر تبادلہ خیال ہوا تو انھوں نے اپنا مسلک چھوڑ کر ان کا مسلک اختیار کرلیا اور ایک موقع پر یہ فرمایا کہ ابوعبداللہ نے رجوع کرکے آپ کی رائے اختیار کرلی۔ اگر میرے استاد ابوحنیفہ بھی ان چیزوں کو دیکھتے جو اب میں نے دیکھی ہیں تو میری ہی طرح وہ بھی رجوع کرلیتے۔ علم حدیث میں بھی ان کا پایہ بلند تھا اور اس حیثیت سے وہ فقہائے احناف میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ عام محدثین کو اعتراف ہے کہ اصحاب رائے میں وہ احادیث و آثار کے علم و اتباع میں بہت نمایاں تھے۔

امام ابو یوسف کی تصانیف میں جو دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں ان میں سے بعض مشہور یہ ہیں۔ کتاب الآثار، اختلافات ابی حنیفہ و ابی الیلیٰ، الرد علی سیر الاوزاعی اور کتاب الخراج۔

یوسوکیپیو (Usucapio) : رومن لا میں قبضہ بر بنائے قدامت پسندی کو یوسوکیپو (Usocapio) کہا جاتا تھا۔ بارہ جدول (XII Tables) میں مندرجہ اصولوں کے تحت دو سال کا مسلسل قبضہ کسی زمین پر ملکیت قائم کرنے کے لیے کافی تھا۔ جائداد غیر منقولہ کی صورت میں ایک سال کا مسلسل قبضہ ملکیت کے ادعا کے لیے کافی تھا۔

یونین یا مرکزی حکومت : مرکزی انتظامیہ صدر جمہوریہ و نائب صدر جمہوریہ اور وزیراعظم کی سربراہی میں وزراء کی کونسل پر مشتمل ہوتی ہے۔

صدر جمہوریہ کا انتخاب ایک انتخابی ادارہ کرتا ہے جو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور ریاستی اسمبلیوں کے منتخبہ ممبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے لیے متناسب نمائندگی کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یونین کا پورا انتظامی اقتدار صدر جمہوریہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ آئین کے مطابق اسے استعمال کرتے ہیں۔ وہ دفاعی فوجوں کے سپہ سالار اعلیٰ بھی ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کو طلب کرسکتے ہیں اس کے اجلاس برخاست کرسکتے ہیں، اس سے خطاب کرسکتے ہیں، اسے پیغام بھیج سکتے ہیں۔ جب پارلیمنٹ کا اجلاس نہ ہورہا ہو تو وہ آرڈیننس جاری کرسکتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے منظور شدہ بلوں کو آخری منظوری دے سکتے ہیں۔ مالیاتی بل پیش کروا سکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں سزاؤں کو کم کرسکتے ہیں یا معطل اور معاف بھی کرسکتے ہیں۔ اگر بیرونی حملہ ہو یا صدر جمہوریہ ملک کی سلامتی کو خطرہ محسوس کریں تو غیر معمولی حالات (ایمرجنسی) کا اعلان کرسکتے ہیں۔

نائب صدر جمہوریہ کا انتخاب ایک انتخابی ادارہ کرتا ہے جو راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے ممبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس انتخاب میں متناسب نمائندگی کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ پانچ سال کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ راجیہ سبھا کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے صدر جمہوریہ اپنے فرائض انجام نہ دے سکیں تو ان کی جگہ وہ کارگزار صدر جمہوریہ بن جاتے ہیں۔ صدر جمہوریہ کے انتقال کی صورت میں وہ چھ ماہ تک کارگزار صدر جمہوریہ رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد صدر انتخاب لازمی ہے۔ مجلس وزراء جس کے سربراہ وزیراعظم ہوتے ہیں۔ صدر جمہوریہ کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشورہ دیتی ہے۔ وزیراعظم کو صدر جمہوریہ نامزد کرتے ہیں اور پھر وہ وزیراعظم کے مشورہ پر دوسرے وزیر مقرر کرتے ہیں۔ مجلس وزرا مشترکہ طور پر لوک سبھا کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے۔ وزیراعظم کا فرض ہوتا ہے کہ وہ مجلس وزراء کے ہر فیصلہ سے صدر جمہوریہ کو مطلع کریں ساتھ ہی پارلیمنٹ میں جو مسائل پیش آنے والے ہوں ان سے واقف کروائیں۔

آئین میں وزارت کے کاروبار چلانے کے لیے قواعد موجود ہیں ان ہی کے مطابق کاروبار انجام پاتے ہیں۔ ہر وزیر کے ذمہ کام کا تعین صدر جمہوریہ وزیراعظم کے مشورہ سے کرتے ہیں۔ وزارتوں کے کام میں آپسی تال میل کے لیے ایک وزارتی سکریٹریٹ ہوتا ہے۔

حکومت کے کاروبار کو بہتر طریقہ پر چلانے کے لیے صدر جمہوریہ ایک سروس کمیشن، اٹارنی جنرل اور کنٹرولر، آڈیٹر جنرل بھی متعین کرتے ہیں۔

قانون ساز ادارے : یونین کا قانون ساز ادارہ پارلیمنٹ کہلاتا ہے۔ یہ صدر جمہوریہ اور دو ایوانوں یعنی راجیہ سبھا اور لوک سبھا پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر ایوان کو اپنا اجلاس پچھلے اجلاس کے چھٹے مہینے کے اندر اندر کرنا ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں مشترکہ اجلاس بھی منعقد ہوسکتے ہیں۔

راجیہ سبھا : راجیہ سبھا کے ممبروں کی تعداد 250 ہے۔ ان

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

Jameay Urdu Encyclopedia Samaji Uloom

میں سے بارہ اراکین صدر جمہوریہ ادیبوں، سائنس دانوں اور سماجی کارکنوں میں سے نامزد کرتے ہیں۔ بقیہ اراکین کا انتخاب صوبائی اسمبلیاں کرتی ہیں۔

لوک سبھا : لوک سبھا کے کل ممبروں کی تعداد 544 (مارچ 2001) ہے۔ یہ ممبر براہِ راست طریقہ سے ریاستوں اور یونین علاقوں سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ دو ممبر صدر جمہوریہ اینگلو انڈین برادری سے نامزد کرتے ہیں۔ لوک سبھا کا ممبر بننے کے لیے امیدوار کا 25 سال کا اور راجیہ سبھا کے لیے تیس سال کی عمر کا ہونا ضروری ہے۔ آئین میں ممبران پارلیمنٹ کے حقوق اور مراعات کا تعین کر دیا گیا ہے۔

پارلیمنٹ کا اصل کام ملک کے لیے قانون بنانا اور وزارتوں کے لیے مالیہ مہیا کرنا ہے تاکہ وہ ملک کے کاروبار کو چلا سکیں۔ مجلس وزراء مشترکہ طور پر لوک سبھا کے سامنے جوابدہ ہے۔ پارلیمنٹ کو صدر جمہوریہ کے مواخذہ اور عدالت عظمیٰ اور ہائی کورٹ کے ججوں، الیکشن کمشنر اور کنٹرولر، آڈیٹر جنرل کی برطرف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ آئین میں اس کے لیے طریقہ کار کی وضاحت کی گئی ہے۔

تمام بلوں کا لوک سبھا اور راجیہ سبھا سے منظور ہونا ضروری ہے۔ مالیاتی بل صرف لوک سبھا ہی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مالیات سے متعلق تمام بل صدر جمہوریہ کی سفارش ہی سے پیش ہوسکتے ہیں لیکن ان کی منظوری کا اختیار صرف لوک سبھا کو حاصل ہے۔ آئین میں تبدیلی کا اختیار بھی صرف پارلیمنٹ ہی کو ہے۔ قانون سازی کے کام کو بہتر بنانے کے لیے کئی کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں جن کی تفصیلات مع اختیارات کے آئین میں درج ہیں۔

عدلیہ : ملک کی سب سے بڑی عدلیہ عدالت عظمیٰ (سپریم کورٹ) ہے۔ اس میں ایک چیف جسٹس اور پچیس جج ہوتے ہیں۔ کسی جج کی عمر 65 سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ ان کا تقرر صدر جمہوریہ کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔ آئین میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ ججوں کی آزادی برقرار رہے۔ کسی جج کو اسی وقت برطرف کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کی علاحدگی کے بارے میں پارلیمنٹ کے کل ممبروں کی اکثریت نے یا حاضر ممبروں کی دوتہائی تعداد نے فیصلہ کیا ہو۔ اسی صورت میں صدر جمہوریہ اسے علاحدہ کرسکتے ہیں۔ سپریم کورٹ مرکز اور ریاستوں اور ریاستوں کے آپسی تنازعات کو سنتی اور ان کا تصفیہ کرتی ہے۔ بنیادی حقوق پر عمل کرانے کے سلسلے میں اسے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ مختلف ہائی کورٹوں کے فیصلوں کے خلاف اسے اپیلیں سننے کا حق حاصل ہے اور اس کے لیے آئین میں تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔

ریاستیں : ریاستوں کی حکومت کا ڈھانچہ مرکز سے بہت مشابہہ ہے۔ ریاست کی عاملہ میں سرفہرست گورنر ہوتا ہے اور چیف منسٹر کی سربراہی میں ایک مجلس وزارت ہوتی ہے۔ گورنر کا تقرر صدر جمہوریہ پانچ سال کے لیے کرتے ہیں اور وہ اپنے عہدہ پر ان کی مرضی سے رہ سکتا ہے۔ گورنر کے لیے لازم ہے کہ وہ 35 سال کا ہو، اس کا ہندستانی شہری ہونا ضروری ہے۔ ریاست کے تمام انتظامی اختیارات گورنر میں مرکوز ہوتے ہیں اور مجلس وزارت اس کی طرف سے کاروبار چلاتی ہے۔ گورنر کو مجلس وزرا کے مشورہ اور مدد سے کام کرنا ہوتا ہے۔ البتہ آئین میں کچھ فرائض اس کے لیے الگ بھی رکھے گئے ہیں۔

وزیرِ اعلیٰ کا تقرر گورنر کرتا ہے اور دوسرے وزراء بھی وزیرِ اعلیٰ کے مشورہ سے مقرر ہوتے ہیں۔ مجلس وزراء ریاستی اسمبلی کے تئیں جوابدہ ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ گورنر ایڈوکیٹ جنرل کو بھی مقرر کرتا ہے۔

ہر ریاست میں کم از کم ایک قانون ساز اسمبلی یا ودھان سبھا ہوتی ہے۔ بعض ریاستوں میں دو ایوانی مقننہ بھی ہوتی ہے اسے ایوان بالا یا ودھان پریشد بھی کہتے ہیں۔ ودھان پریشد میں ودھان سبھا کے کل ممبروں کے ایک تہائی کے برابر ممبر ہوسکتے ہیں جن کی کل تعداد 40 سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ ان ممبروں کی ایک تہائی تعداد ودھان سبھا منتخب کرتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کا اپنا ممبر نہیں ہونا چاہیے۔ ایک تہائی ممبروں کو لوکل بورڈ، میونسپلٹیاں، پنچایت کمیٹیاں وغیرہ منتخب کرتے ہیں۔ ایک بارہواں حصہ رجسٹرڈ اساتذہ اور دوسرا بارہواں حصہ رجسٹرڈ گریجویٹ منتخب کرتے ہیں۔ بقیہ گورنر اہم شخصیتوں مثلاً دانشوروں، امداد باہمی کے کارکنوں وغیرہ میں سے نامزد کرتا ہے۔

جہاں تک ودھان سبھا کا تعلق ہے اس کا انتخاب راست طریقہ سے عمل میں آتا ہے اور اس کے لیے ریاست کو انتخابی حلقوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ کسی ودھان سبھا میں کل ممبر 40 سے کم اور 500 سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔

آئین میں ان تمام موضوعات کی تفصیل دی گئی ہے جو ریاستوں کے حلقہ اثر میں آتے ہیں اور ودھان سبھائیں ان ہی کے بارے میں قانون بناتی ہیں۔ مالیات سے متعلق بل صرف ودھان سبھا میں پیش ہوسکتے

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہیں۔ ودھان پریشد ان میں ترمیم پیش کرسکتی ہے لیکن ان کی منظوری ودھان سبھا سے ملنا ضروری ہے۔ اسمبلیوں سے منظور ہونے کے بعد بل گورنر کے دستخط کے بعد قانون بن جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں گورنر اس بل کو صدر جمہوریہ کی منظوری کے لیے روک بھی سکتا ہے۔

ودھان سبھا کو ریاستوں کی حد تک وہی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو لوک سبھا کو یونین کی حد تک حاصل ہیں۔

عدالتیں : ہر ریاست میں ایک ہائی کورٹ ہوتی ہے۔ چھوٹی ریاستوں میں ایک سے زیادہ ریاستوں کے لیے ایک ہائی کورٹ ہوتی ہے۔ ملک میں اس وقت 21 ہائی کورٹ ہیں۔ یہ ہر ریاست کی عدلیہ کا اعلیٰ ترین ادارہ ہوتا ہے۔ ججوں کا تقرر صدر جمہوریہ، ریاستی چیف جسٹس کے تقرر کے وقت صدر جمہوریہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور اس ریاست کے گورنر کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

ریاستی ہائی کورٹ اپنے حلقہ اثر میں کسی شخص عہدہ دار یا حکومت کے نام حکم، رٹ یا ہدایت جاری کرسکتی ہے۔ ریاست کی تمام عدالتیں اس کی ماتحت ہوتی ہیں۔ آئین میں ماتحت عدالتوں اور ان کے فرائض کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔

مقامی حکومتیں : ریاستی حکومتوں کے علاوہ آئین میں شہریوں کے لیے میونسپل کارپوریشن اور کاؤنسل ضلع کی سطحوں پر لوکل بورڈ اور دیہاتوں کے لیے پنچایتوں کے نظام کی تفصیلات دی گئی ہیں اور ہر ایک ادارے کے اختیارات اور فرائض کا تعین کیا گیا ہے۔ ان کا مقصد تعلیم، حفظان صحت، سڑکوں وغیرہ کی دیکھ بھال و تعمیر اور زراعت کے بعض شعبوں میں مقام آبادی کا تعاون حاصل کرنا ہے۔

یونیورسل ڈیسیمل کلاسی فکیشن (عالمی اعشاری درجہ بندی ضابطہ)

یونیورسل ڈیسیمل کلاسی فکیشن (عالمی اعشاری درجہ بندی ضابطہ) : یہ ضابطہ ڈیوی اعشاری درجہ بندی ضابطہ کی توسیع ہے۔ بروسلز کے مقام پر 1895 میں منعقد ایک بین الاقوامی کتابیات کانفرنس کے اختتام پر بلجیم کے دو اشخاص پال آٹلٹ (Paul Otlet) اور لافونٹین (La Fontaine) نے مل کر ایک بین الاقوامی ادارہ برائے ترتیب کتابیات (International Institute of Bibliography) قائم کیا۔ ادارہ کا مقصد سماجی علوم و علوم انسانی پر دنیا بھر میں دستیاب مضامین کو کتابیاتی گرفت میں لانا تھا جب مضامین کے کارڈ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوگئے تو ان میں ایک منطقی ترتیب کے لیے ایک ایسے درجہ بندی ضابطہ کی تلاش ہوئی جو دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی زیر عمل ہو۔ اس وقت ڈیوی اعشاری ضابطہ ہی اس معیار پر پورا اتر رہا تھا کہ یہ آسان بھی تھا اور بطور بنیاد اعشاری اعداد کے استعمال کی بدولت اس کی توسیع کرنا آسان تھا۔ میلول ڈیوی سے منظوری لینے کے بعد آٹلٹ اور لافونٹین نے ضابطہ میں توسیع و ترمیم کرکے 1905 میں ضابطہ کو منیول برائے عالمی کتابیات (Manuele de Repertoire Univers Bibliographique) کے نام سے فرانسیسی زبان میں شائع کردیا۔ ضابطہ میں توسیع و تنسیخ کا عمل بعد میں بھی جاری رہا اور اب اس کام میں ڈونکر ڈویس (F.Donker Duyvis) ادارہ کے نئے سکریٹری کو بھی شامل کیا گیا۔ پہلی عالمی جنگ کی بدولت کام کی رفتار دھیمی پڑگئی اور دوسرے اضافہ شدہ ایڈیشن کی اشاعت 1933 میں ہوسکی۔ ادارہ کا نام وقت کے ساتھ بدلتا رہا۔ 1931 میں ادارہ برائے عالمی اسنادیات سازی (IID) ہوا جو 1937 میں فیڈریشن برائے عالمی اسنادیات سازی (FID) ہوگیا۔ ضابطہ کے دوسرے ایڈیشن کا نام یونیورسل ڈیسیمل کلاسی فکیشن (UDC) رکھا گیا۔ ضابطہ کے مکمل ایڈیشن جرمن، روسی، انگریزی، اسپینی، جاپانی اور آٹھ دوسری زبانوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ مکمل ایڈیشن میں 150,000 بنیادی و ذیلی موضوعات مع اپنے علامتی نشان موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اوسط درجہ ایڈیشن انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور جاپانی زبانوں کے علاوہ 13 دوسری زبانوں میں بھی دستیاب ہیں۔ ان میں اندراجات مکمل ایڈیشن کا 30% ہیں۔ مختصر ایڈیشن جو مکمل ایڈیشن کے 15% کے قریب اندراجات رکھتے ہیں 17 زبانوں میں دستیاب ہیں۔ ہندستان میں انگریزی ایڈیشن استعمال کیا جاتا ہے جس کی اشاعت برٹش اسٹینڈرڈ انسٹی ٹیوٹ کرتا ہے یہ بیورو برائے انڈین اسٹینڈرڈ سے دستیاب ہے۔

تیسرے ایڈیشن کی تیاری میں ڈونکر ڈویس کی شخصی پسند غالب ہونے کی وجہ سے ضابطہ کے سائنسی مضامین کے حصہ میں زیادہ تفصیل سے توسیع ہوئی ہے۔ اب یہ حصہ ضابطہ کے تقریباً 80% حصے پر محیط ہے۔

ڈیوی اعشاری ضابطہ کی طرح اس ضابطہ کا پہلا خلاصہ شعبہ جات علم کے دس شعبوں میں منقسم ہے۔ دوسرے خلاصہ میں بھی بڑی حد تک ڈیوی اعشاری ضابطہ سے مماثلت ہے لیکن اس کے بعد کی توسیع ڈیوی سے مختلف ہے۔ پہلے خلاصہ میں 4 کے ہندسہ کو خالی چھوڑ دیا گیا ہے اور لسانیات کے شعبہ کو 8 کی علامت یعنی ادب کے ساتھ منسلک کردیا گیا

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.

ہے۔ ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ ڈیوی اعشاری ضابطہ کے برعکس پہلے اور دوسرے خلاصہ میں علامات ایک عددی اور دو عددی ہیں۔

عالمی اعشاری درجہ بندی ضابطہ امدادی جدول (Auxiliary Tables) اور بنیادی جدول (Basic Tables) پر مبنی ہے۔ امدادی جدول دو قسم کے ہیں۔ عمومی امدادی نشانات و ذیلی تقسیم اور خصوصی امدادی ذیلی تقسیم۔ یوں تو پورا ضابطہ ہند عربی اعشاری ہندسوں پر قائم ہے لیکن امدادی نشانات اور رموز اور اوقاف اور ریاضی کے نشانات کی مدد سے تشکیل کیے گئے ہیں۔ مثلاً اتصال کے اظہار کے لیے مثبت + کا نشان، تعلق کے اظہار کے لیے کولن ":" کا نشان۔ عموی امدادی ذیلی تقسیم، پورے نظام ضابطہ میں حسب ضرورت بطور لاحقہ استعمال ہو سکتی ہے جبکہ خصوصی امدادی ذیلی تقسیم مخصوص مضامین/موضوعات کے لیے ہے۔

امدادی نشانات و ذیلی تقسیم کی بدولت ضابطہ میں تجزیاتی امتزاج کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے جس کی بدولت مضمون یا موضوع کے جملہ پہلوؤں کا اظہار مرکب علامتی نشان سے کیا جاسکتا ہے۔ اپنی اس صفت اور قابل توسیع علامات کی بدولت یہ ضابطہ کمپیوٹری معلوماتی بازیابی کے کام میں بھی کامیابی سے استعمال ہو سکا ہے۔ ضابطہ کا بنیادی مقصد معلومات کی بازیابی میں امداد ہے اس لیے ترتیب شعبہ جات علم میں تقدیم و تاخیر یا مناسبت باہمی کے اصولوں سے صرف نظر کرکے شعبہ علم کی جزیات کے تسلسلی بیان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

ترمیم و تنسیخ: ضابطہ کو مطالعہ علوم کے بدلتے ہوئے رجحانات سے ہمکنار رکھنے کا کام عدم مرکزیت کے اصول پر مبنی ہے۔ کوئی فرد یا ادارہ اپنی تجویز اپنے ملک کی اس مقصد کے لیے قائم قومی تنظیم کو بھیجتا ہے جسے غور و فکر کے بعد FID کے صدر دفتر بھیج دیا جاتا ہے جہاں یہ مختلف کمیٹیوں میں غور کے بعد پہلے عارضی طور پر چار مہینہ کے لیے قبول ہوتی ہے اور اگر اس عرصہ میں تنقید کا نشانہ نہ بنی تو اپنالی جاتی ہے اس کی اطلاع "یوڈی سی توسیع و تصحیح" (UDC Extention and Correction) میں کردی جاتی ہے جو سالانہ وقفہ سے شائع ہوتا ہے۔ ہندستان میں اس کے لیے قومی تنظیم انسڈاک (INSDOC)، نئی دہلی میں قائم ہے۔

Digitized by commissionedwriting.com for the IdeaMines collective.